علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

فلمی الف لیلہ

دنیا کی سب سے طویل ترین ہڈبیتی / جگ بیتی...... ادب و صحافت اور فلمی شخصیات کی ان کہی کہانیاں

جلد اوّل

فلمی الف لیلیٰ، ہر ممتاز فنکار، ادیب اور فلمی شخصیت کے سکینڈل، علی سفیان آفاقی کی زبانی۔۔۔

تزئین، پی ڈی ایف: حمیدی

(علی سفیان آفاقی ایک لیجنڈ صحافی اور کہانی نویس کی حیثیت میں منفرد شہرہ اور مقام رکھتے تھے۔انہوں نے فلم پروڈیوسر کی حیثیت سے بھی ساٹھ سے زائد مقبول ترین فلمیں بنائیں اور کئی نئے چہروں کو ہیرو اور ہیروئن بنا کر انہیں صف اوّل میں لا کھڑا کیا۔پاکستان کی فلمی صنعت میں ان کا احترام محض انکی قابلیت کا مرہون منت نہ تھا بلکہ وہ شرافت اور کردار کا نمونہ تھے۔انہیں اپنے عہد کے نامور ادباء اور صحافیوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور بہت سے قلمکار انکی تربیت سے اعلا مقام تک پہنچے۔علی سفیان آفاقی غیر معمولی طور انتھک اور خوش مزاج انسان تھے۔انکا حافظہ بلا کا تھا۔ انہوں نے متعدد ممالک کے سفر نامے لکھ کر رپوتاژ کی انوکھی طرح ڈالی۔آفاقی صاحب نے اپنی زندگی میں سرگزشت ڈائجسٹ میں کم و بیش پندرہ سال تک فلمی الف لیلہ کے عنوان سے عہد ساز شخصیات کی زندگی کے بھیدوں کو آشکار کیا تھا۔اس اعتبار سے یہ دنیا کی طویل ترین ہڈ بیتی اور جگ بیتی ہے۔اس داستان کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کہانی سے کہانیاں جنم لیتیں اور ہمارے سامنے اُس دور کی تصویر کشی کرتی ہیں۔روزنامہ۔۔۔۔آن لائن انکے قلمی اثاثے کو یہاں محفوظ کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے)

آپ نے ایکٹرسوں اور ایکٹروں کے انٹرویو ضرور پڑھے ہوں گے۔ان میں ایک سوال ہمیشہ کیا جاتا ہے ''آپ کو اداکار یا اداکارہ بننے کا خیال کیسے آیا؟''

جواب ہوتا ہے ''مجھے بچپن ہی سے اداکاری کا شوق تھا۔''

آپ نے کوئی ایسا انٹرویو نہیں پڑھا ہو گا جس میں یہ سوال اور یہی جواب آپ کی نظروں سے نہ گزرا ہو۔

پارٹ ون اس تمہید کے بعد ہم آپ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہمیں بھی فلموں کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ فلمیں بنانے اور لکھنے کا نہیں، فلمیں دیکھنے کا۔ ہم نے جب ہوش سنبھالا تو اس زمانے میں فلمیں بہت کم بنا کرتی تھیں۔ شہروں میں سینما گھر بھی بہت کم ہوتے تھے۔ فلمیں دیکھنے والوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی۔ فلم دیکھنے پر بہت پابندیاں تھیں۔ آج کل تو جسے دیکھئے منہ اٹھا کر سینما گھر چلا جاتا ہے اور ویڈیو فلم لا کر وی سی آر پر دیکھ لیتا ہے (یہ بھی کئی دہائیاں پہلے کی بات ہے) مگر اس (ہمارے) زمانے میں فلم دیکھنا بہت مشکل کام تھا۔اوّل تو یہ کہ بڑے بوڑھے اور شرفاء فلم دیکھنے کو ایک برائی سمجھتے تھے اس لئے ہر ایک کے لئے فلم دیکھنا ممکن نہ تھا گھر والے اجازت نہیں دیتے تھے اور اگر اجازت ملتی بھی تھی تو بڑی چھان بین کے بعد کون سی فلم ہے یہ کس نے بنائی ہے؟ کہانی کیسی ہے؟ اداکار کون کون ہیں؟ کون سے سینما میں لگی ہے! ساتھ اور کون فلم دیکھنے کے لئے جائے گا؟ اس طویل سوالنامے کو پُر کرنے کے بعد ہی گھر سے فلم دیکھنے کی اجازت ملا کرتی تھی آپ سوچتے ہوں گے کہ محض ایک فلم دیکھنے کے لئے اتنی بہت سی پابندیاں کیوں برداشت کی جاتی تھیں؟

بات یہ ہے کہ آپ کو اس زمانے کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔آج کے نوجوان تو کیا درمیانی عمر کے لوگ بھی اس عہد کے معاشرے کے بارے میں لاعلم ہیں جب خاندان یکجا رہا کرتے تھے اور گھر کے بڑوں کی اجازت کے بغیر کوئی گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ گھر سے باہر جانے کے لئے بھی بڑوں سے اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری ہوتا تھا اور پھر یہ پابندی ہوا کرتی تھی کہ سات یا آٹھ بجے تک ضرور بالضرور گھر واپس پہنچ جائیں۔ کھانا گھر کے تمام افراد ایک ہی وقت پر ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھایا کرتے تھے اور اس موقع پر تمام افراد کی حاضری لگتی تھی اور پتا چل جاتا تھا کہ کون غائب ہے۔اس طرح وہ ''مجرم'' اگلے روز صفائی پیش کرنے کے لئے گھر کے سربراہ کی عدالت میں پیش کر دیا جاتا تھا

اگر جیب خرچ ملتا تھا تو وہ بھی بند کر دیا جاتا تھا۔ دوستوں سے ملنے اور گھر میں دوسروں کے ساتھ کھیلنے پر پابندی لگادی جاتی تھی۔ گویا ایک طرح سے حقہ پانی بند کر دیا جاتا تھا۔ یہ تو لڑکوں کا حال تھا۔ لڑکیوں کے فلم دیکھنے پر عام طور پر پابندی عائد تھی۔ ہاں کبھی کبھار کوئی گھریلو قسم کی فلم آجاتی تھی تو لڑکیاں اپنی بڑی عمر کی رشتہ داروں کی نگرانی میں فلم دیکھنے چلی جاتی تھیں اور زنانہ کلاس میں بیٹھ کر فلم دیکھ لیا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں عورتیں اور مرد علیحدہ علیحدہ بیٹھتے تھے جو خوش نصیب لڑکیاں فلم دیکھ آتی تھیں پھر وہ ہفتوں مہینوں تک اپنی سہیلیوں اور دوسری عورتوں کو ان فلموں کی کہانیاں سناتی رہتی تھیں اور یہ کہانیاں عموماً فلم سے بھی بہت زیادہ لمبی ہوتی تھیں لیکن سب کے سب منہ کھولے سنا کرتے تھے۔ کہانیوں کے ساتھ ساتھ فلموں کے مکالمے اور گانوں کا خلاصہ بھی سنا دیا جاتا تھا۔

تو یہ تھا وہ ماحول جب ہم نے ہوش سنبھال کر دنیا کو دیکھا اور اس کے ساتھ ہی ہمیں فلم دیکھنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔ اس کی ایک خاص وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ہمیں کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا۔ ہر طرح کی کہانیاں ہم بہت غور سے سنا کرتے تھے ۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو کہانی سنانے والوں نے ہم سے کہا کہ بھئی اگر تمہیں کہانیوں کا اتنا ہی شوق ہے تو تم خود کیوں نہیں پڑھتے۔ اس طرح کہانیوں کے شوق میں ہم نے جلدی جلدی پڑھنا سیکھ لیا اور جب کہانیاں پڑھنی آگئیں تو پھر کہانیاں لکھنے کے شوق میں لکھنا بھی سیکھ لیا۔ خیر' یہ تو جملہ معترضہ سمجھ لیجئے۔ ہم یہ بتا رہے تھے کہ ہمیں بچپن ہی سے فلم دیکھنے کا شوق تھا مگر ہم صرف کہانیاں سن کر گزارا کر لیا کرتے تھے کیونکہ اتنی چھوٹی عمر کے بچوں کو سینما جانے اور فلم دیکھنے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے اپنے یا دوسرے رشتے داروں کے گھر میں جب لڑکیوں کا جمگھٹا لگتا اور ان میں سے ایک خوش نصیب جو فلم دیکھ کر آئی ہوتی، فلم کی کہانی سنانی شروع کرتی تو ہم بھی ان میں گھس کر بیٹھ جاتے اور یہ کہانیاں سن کر بہت حیران ہوتے کہ ایک بند ہال میں' کپڑے کے پردے پر یہ سب کچھ کیسے ہو جاتا ہے؟ چنانچہ شوق کے ساتھ جستجو بھی بڑھتی گئی۔

ہم نے اپنے خاندان کی لڑکیوں کی زبانی بہت سی فلموں کی کہانیاں سنیں جن کے نام ہمیں یاد نہیں رہے اور نام میں رکھا بھی کیا ہے؟ مقصد تو کہانی سے تھا۔ البتہ ہم ہیرو اور ہیروئین اور دوسرے کرداروں کے نام ضرور کرید کرید کر پوچھا کرتے تھے۔ ان کرداروں کو ادا کرنے والے اداکار کون تھے؟ یہ ہمیں علم نہ تھا کیونکہ اداکاروں وغیرہ کے بارے

میں ہماری معلومات صفر کے برابر تھیں۔ فلم کو ہم محض ایک کہانی یا داستان سمجھتے تھے۔ یہ کیسے بنتی ہے؟ کن مراحل سے گزرتی ہے؟ کام کرنے والے کون لوگ ہوتے ہیں؟ ان باتوں سے ہمیں کوئی سروکار نہ تھا۔ فلم کی ہیروئن کے اصل نام سے ہمیں کوئی غرض نہیں تھی۔ ہمیں تو اس کا فلمی نام ہی معلوم ہوتا تھا اور وہی ہمارے دل پر نقش ہو جایا کرتا تھا۔

ہوش سنبھالنے کے بعد ہم نے جو پہلی فلم دیکھی اس کا نام ''کنگن'' تھا۔ یہ نام ہمیں آج بھی یاد ہے بلکہ اس فلم کی تھوڑی بہت کہانی بھی یاد ہے۔ فلم کا ہیرو (جس کا نام ہمیں بعد میں پتا چلا کہ اشوک کمار تھا) فلم کی ہیروئن کے لئے کنگن لے کر آیا تھا مگر جب کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی یا کوئی اور مشکل پڑی تو ہیروئن یہ کنگن کمرے میں ایک میز پر رکھ کر خودکشی کرنے کے لئے سمندر پر چلی گئی۔ وہ ایک ساڑھی پہنے ہوئے تھی اور ساڑھی سمیت ہی سمندر میں داخل ہو گئی اور آگے ہی آگے بڑھتی رہی۔ ادھر ہیرو نے جب کنگن میز پر رکھے ہوئے دیکھے تو وہ بے تحاشا بھاگتا ہوا سمندر کی طرف گیا۔ نہ جانے اسے کس نے بتایا تھا کہ ہیروئن کنگن رکھ کر سیدھی سمندر میں جا کر ڈوب جائے گی۔ بہر حال ادھر وہ بھاگتا ہوا سمندر کی طرف جا رہا تھا، ادھر ہیروئن ایک خواب میں چلنے والی ہستی کے مانند سمندر کی طرف جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ سمندر کے ساحل پر پہنچ کر بھی اس نے اپنا چلنا بند نہیں کیا اور اسی طرح آگے بڑھتی رہی۔ ہمیں ہیروئن کے ڈوب جانے کے خیال سے بہت ڈر لگ رہا تھا اور رونا بھی آ رہا تھا۔ ہم نے یہ فلم زنانہ کلاس میں کھڑے ہو کر دیکھی تھی کیونکہ وہاں بیٹھنے کی تو کیا تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ یہ ایک بڑا سا باکس تھا جس میں لکڑی کی بینچیں بچھی ہوئی تھیں۔ اس باکس میں خواتین کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں اور ان ہی کے درمیان میں سے سر گھسا کر ہم فلم دیکھنے میں مصروف تھے۔ عورتیں مختلف اوقات میں مختلف قسم کے تبصرے بھی کر رہی تھیں۔ خصوصاً آخری سین میں تو سب کا غم اور فکر کے مارے برا حال تھا۔ ادھر اسکرین پر یہ منظر تھا کہ کبھی ہیرو کو اندھا دھند بھاگتے ہوئے دکھایا جاتا تھا اور کبھی ہیروئن پر کیمرہ جاتا تھا جو پہلے پنڈلیوں تک 'پھر گھٹنوں تک' اس کے بعد کمر تک' یہاں تک کہ گردن تک سمندر میں ڈوب چکی تھی مگر اس کے باوجود مسلسل آگے بڑھے جا رہی تھی۔ کئی لڑکیوں کا یہ خیال تھا کہ اچھی قیمتی ساڑھی خراب ہو رہی ہے مگر زیادہ تر خواتین بلکہ نیچے ہال میں مرد تماشائی بھی سخت فکر مند تھے۔ عورتیں

ہیرو پر ناراض ہو رہی تھیں۔" ارے کم بخت۔ جلدی کر۔ اب پہنچ بھی چک۔ ورنہ وہ بے چاری ڈوب جائے گی۔"
دوسری صاحبہ ہیروئن کو ڈانٹ رہی تھیں۔"ذرا صبر کر۔ آہستہ چل۔ وہ تجھے بچانے کے لئے بھاگا ہوا آرہا ہے۔"
تیسری آواز آتی" کیسی بہادر لڑکی ہے کہ سمندر سے نہیں ڈرتی۔ ڈوبے چلی جارہی ہے۔"
لیکن جب ہیروئن کی گردن تک سمندر کا پانی پہنچ گیا تو سارے ہال میں خاموشی چھا گئی۔ زیر لب دعاؤں یا آہوں اور سسکیوں کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ آوازیں بھی بند ہو گئیں اور سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ہر ایک کی نگاہیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں اور دلوں کی دھڑکن بند ہونے کے قریب تھی۔
ہیرو تھا کہ کسی طرح سمندر تک پہنچنے ہی نہیں پا رہا تھا اور ہیروئن تھی کہ مستقل آگے بڑھے جارہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کا سر بھی سمندر کے پانی میں ڈوب گیا۔ اب اس کی ساڑھی کا ایک ابھرا ہوا پلو ہی رہ گیا تھا۔ جو بڑے سے غبارے کی طرح سطح سمندر پر نظر آرہا تھا۔ دوسروں کا جو حال تھا وہ تو ہمیں معلوم نہیں کیونکہ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی لیکن خود ہمارے دل کی دھڑکن بند ہونے کے قریب تھی اور جب ہیروئن کا صرف آنچل ہی پانی کے اوپر رہ گیا تو ہماری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ ہمارے آس پاس تمام خواتین کا یہی حال تھا بلکہ ایک خاتون نے تو"انا اللہ" پڑھ کر ہیروئن کی روح کو ایصال ثواب بھی کر دیا حالانکہ سب کو معلوم تھا کہ فلم کی کہانی کے مطابق بھی ہیروئن ہندو تھی اور اصل زندگی میں ہندو تھی۔ (یہ ہمیں بعد میں پتا چلا تھا)۔
عین اسی وقت جب کہ ہیروئن کا آنچل سطح سمندر پر تیرتا ہوا نظر آرہا تھا، فلم کا ہیرو سمندر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہال میں مختلف آوازوں نے اسے مطلع کیا کہ وہ رہا آنچل۔ بائیں جانب' جلدی کرو، جان کی بازی لگا دو۔
ہیرو بھی آخر کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ آخر ایک ہیرو تھا۔ اس نے بھی ہیروئن کا آنچل دیکھ لیا تھا اور سمندر میں کودنے کے بعد بہت تیزی سے اس طرف بڑھ رہا تھا۔ چند عورتوں نے پھر ایک بار دعائیں پڑھنی شروع کر دی تھیں۔ یہاں تک کہ ہیرو آنچل کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ایک غوطہ لگایا اور پھر جب باہر نکلا تو ہیروئن اس کے بازوؤں میں تھی۔ فلم بینوں نے اطمینان کی سانس لی اور سارے ہال میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن ابھی پوری طرح یہ اطمینان نہیں ہوا تھا کہ ہیروئن زندہ بھی ہے یا مر گئی؟

ہیرو اسے اٹھائے سمندر کے ساحل تک پہنچ گیا اور پھر اسے ریت پر ڈال کر اسے مخاطب کر کے مختلف مکالمے بولنے لگا۔

ایک آواز آئی ''ارے کم بخت' یہ تو دیکھ لے کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر گئی؟''

نیچے سے ایک سے ایک مردانہ آواز نے مشورہ دیا ''اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ فوراً''۔

لیکن چند ہی لمحوں کے بعد ہیروئن نے آنکھیں کھول دیں اور ہیرو کو سامنے دیکھ کر بہت حیرت کا اظہار کیا۔ شاید اس قسم کے مکالمے بھی بولے کہ میں کہاں ہوں ؟ مجھے تم نے کیوں بچایا ہے۔ مجھے مرنے کیوں نہیں دیا؟

ان سب باتوں کے جواب میں ہیرو نے اپنی جیب میں سے کنگن نکالے اور ہیروئن کی کلائیوں میں پہنا دیے تو ہیروئن نے شرما کر ہیرو کے بازوؤں میں سر چھپالیا اور فلم دیکھنے والوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ خواتین نے باآواز خدا کا شکر ادا کیا ''شکر ہے کہ عین وقت پر پہنچ گیا ورنہ وہ بے چاری تو بے موت مر جاتی۔ ''

ہم نے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھ لئے مگر آنسو پھر بھی جاری تھے۔ جب ہم بڑے ہوئے تو پتا چلا کہ یہ خوشی کے آنسو تھے۔

فلم ختم ہوگئی۔ فلم کے اندر ہیرو' ہیروئن خوش تھے اور سینما گھر میں دیکھنے والے بھی خوش و خرم تھے۔ اس کو فلمی زبان میں '' ہیپی اینڈنگ'' کہا جاتا ہے۔ فلم ختم ہوتے ہی باہر نکلنے کے لئے دھکم پیل شروع ہو گئی۔ ہم اپنی جن کزنز وغیرہ کے ساتھ فلم دیکھنے گئے تھے وہ ہم سے بچھڑ گئی تھیں مگر فلم کے ختم ہوتے ہی انہیں ہماری یاد آگئی اور انہوں نے ہمیں پکارنا شروع کر دیا۔ ہم بھی خواتین کی ٹانگوں کے نیچے سے راستہ تلاش کرتے ہوئے ان تک پہنچ گئے اور پھر گھر کی راہ لی۔

یہ ہمارا فلم دیکھنے کا پہلا موقع تھا۔ فلم کی ہیروئن رادھا ہمیں بہت اچھی لگی تھی بلکہ سچ پوچھئے تو ہمیں اس سے محبت ہو گئی تھی کئی دن تک وہ ہمارے ہوش و حواس پر چھائی رہی۔ ہم اخبار یا کتاب میں کسی عورت کی تصویر دیکھتے تو اس کے نیچے ''رادھا'' لکھ دیتے تھے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ وہ ہماری زندگی کا پہلا فلمی پیار تھا۔ ہمیں تو صرف ''رادھا'' سے سروکار تھا۔ ہر اچھی شکل کی لڑکی ہمیں رادھا نظر آتی تھی۔ یہاں تک کہ ہمارے گھر کے سامنے والے دو منزلہ گھر میں رہنے والی ایک نازک سی، خوب صورت سی لڑکی کو بھی ہم نے رادھا کہنا شروع کر دیا۔ اس لڑکی کا نام ہمیں معلوم

نہیں تھا حالانکہ وہ ہمارے گھر کے سامنے رہتی تھی۔ ہمارے بڑے سے تین منزلہ مکان کی کھڑکی سے ہم اسے اکثر اس کے گھر میں چلتے پھرتے دیکھا کرتے تھے مگر کبھی غور نہیں کیا تھا۔اس عمر میں لڑکیوں پر غور کرتا بھی کون ہے مگر جب سے ہم نے فلم ''کنگن '' میں رادھا کو دیکھا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے ہمارا ذوق حسن بیدار ہو گیا ہے۔اب ہم ہر عورت کو غور سے دیکھنے لگے تھے شاید رادھا کی تلاش میں۔ مگر اس ایک واقعے سے آپ یہ رائے بھی قائم کر سکتے ہیں کہ فلمیں بچوں کے اخلاق پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں اور کس طرح انہیں وقت سے پہلے ہی بالغ بنا دیتی ہیں۔اب سوچتے ہیں تو فلموں کے یہ مضر اثرات واضح طور پر محسوس کرتے ہیں۔ مگر اس وقت ہمیں یہ ایک ضروری کام محسوس ہوتا تھا۔اب ذرا ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ ایک طرف تو ہمیں ہر لڑکی رادھا نظر آنے لگی تھی اور دوسری طرف ہمارے گھر کے سامنے والی لڑکی کی حرکتیں ملاحظہ فرمائیں کہ وہ دن دیہاڑے' سڑک پر کمیٹی کا جو نلکا لگا ہوا تھا' اس پر باریک کپڑے کی ساری پہن کر نہایا کرتی تھی۔اس زمانے میں گھروں میں غسل خانے بہت کم ہوتے تھے۔ غریبوں اور کنجوسوں کے گھروں میں تو نلکا تک نہیں ہوتا تھا۔ کمیٹی کے نلکے سے ہی یہ لوگ برتن بھر بھر کر لے جایا کرتے تھے اور یہیں غسل بھی فرماتے تھے۔

مسلمانوں میں تو یہ رواج نہیں تھا مگر ہندوؤں میں یہ عام دستور تھا کہ مرد حضرات صرف ململ کی دھوتی پہن کر نل کے نیچے کھڑے ہو کر غسل کر لیا کرتے تھے اور خواتین ململ کی ساری باندھ کر سر عام نہانے کو معیوب نہیں سمجھتی تھیں۔اس زمانے میں جب تفریح کے زیادہ سامان میسر نہیں تھے نوجوانوں کے لئے یہ نظارہ بھی تفریح سے کم نہ تھا چنانچہ خواتین کے غسل کے وقت آس پاس لڑکوں کی آمدورفت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔آس پاس کے گھروں کے دروازوں اور کھڑکیوں سے لڑکے بالے کھڑے ہو کر بہانے بہانے یہ تماشا دیکھا کرتے تھے۔ہماری رادھا کا غسل بھی سارے محلے میں مشہور تھا' یہاں تک کہ دوسرے محلوں کے منچلے بھی اس موقعے پر اپنے دوستوں سے ملنے کے لئے یہاں آجایا کرتے تھے مگر وضع داری اور اخلاق کا تقاضا بھی ملحوظ رکھتے تھے۔ کیا مجال جو کوئی کھڑا ہو جائے یا چلتے چلتے رک جائے اور نظر جما کر غسل کا نظارہ کرے۔البتہ کن انکھیوں سے گزرتے ہوئے دیکھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔

ہمارے گھر کے سامنے والی ’’رادھا‘‘ہم سے عمر میں بڑی تھی۔ہم اگر بچپن سے نکل کر لڑکپن کی حد میں داخل ہو رہے تھے تو وہ لڑکپن سے گزر کر جوانی کے آنگن میں پہنچ چکی تھی۔صورت شکل بھی دلکش تھی۔مسکراہٹ میں بھی کشش تھی۔چال ڈھال میں لچک اور دیکھنے کے انداز میں معصوم سی لگاوٹ بھی تھی۔تو پھران حالات میں اگر ہم نے اسے ’’رادھا‘‘ بنالیا تو اس میں ہمارا کیا قصور تھا؟

ہماری سادگی یا بے وقوفی دیکھئے کہ ہم کئی دن تک محض فلمی ’’رادھا‘‘ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رہے۔یہ ہمیں چند دن بعد معلوم ہوا کہ رادھا تو اس کا فلمی نام تھا۔ حقیقی زندگی میں وہ لیلا چٹنس تھی۔لیلا چٹنس کا تعلق ایک اچھے گھرانے سے تھا۔بی اے تک کی تعلیم یافتہ تھی جو اس زمانے میں ایک انوکھی سی بات تھی کہ فلم کی ہیروئن اور بی اے لیکن وہ ایسا دور تھا جب بمبئی کی فلمی دنیا میں بی۔اے اور ایم اے پاس ہیروئنوں کی کافی تعداد موجود تھی اور ظاہر ہے کہ یہ سب کی سب اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔اب ذرا نصف صدی قبل کی بمبئی کی فلمی صنعت سے اپنی آج کی فلمی ہیروئنوں کا موازنہ کیجئے تو شرمندگی سی محسوس ہوتی ہے۔

ہم نے اس کے بعد لیلا چٹنس کی ایک دو اور فلمیں بھی دیکھیں اور وہ ہر بار ہمیں اچھی لگی۔زیادہ فلمیں ہمیں دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ کبھی کبھار ہی موقع ملتا تھا۔کافی عرصے بعد ہم نے اسی لیلا چٹنس کو فلموں میں ماں کے کردار ادا کرتے ہوئے دیکھا۔فلم ’’داغ‘‘ میں دلیپ کمار کی ماں ،لیلا چٹنس نہیں تھی جس کے مرنے پر دلیپ کمار نے یہ فقرہ بار بار دہرا کر لوگوں کو رُلا دیا تھا’’پارو، میری ماں مر گئی۔‘‘ہم نے جب بھی لیلا چٹنس کے مرنے کی کوئی فلم دیکھی ہمیں کنگن کی رادھا یاد آگئی۔چند سال قبل لیلا چٹنس کے مرنے کی خبر پڑھی تو بہت دیر تک اداس بیٹھے رہے۔

ایک فلم دیکھنے کے بعد ہمارے شوق میں اور اضافہ ہو گیا مگر فلم ’’بلبل بغداد‘‘شہر میں آئی تو یہ نام سنتے ہی ہم بے چین ہو گئے اور اتنی ضد کی کہ ایک بڑے کزن کے ساتھ ہمیں یہ فلم دیکھنے کی اجازت مل گئی۔اب ہم بڑے ہو گئے تھے اس لئے یہ فلم ہم نے ’’مردانے‘‘میں بیٹھ کر دیکھی اور سچ تو یہ ہے کہ ’’بلبل بغداد‘‘ کو دیکھ کر ہم اپنی پہلی محبت رادھا کو بھول گئے۔آپ اسے ہرجائی پن کہیں یا بے وفائی کا نام دیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ’’بلبل بغداد‘‘ کی ہیروئن ہمارے خوابوں میں بس گئی۔’’کنگن‘‘کی گھریلو ٹائپ کی رادھا کے مقابلے میں یہ ایک چست و چالاک اور بہادر قسم کی لڑکی

تھی اس کا لباس بھی بہت اسمارٹ سا تھا جو عموماً سیاہ رنگ کا ہوتا تھا۔اس کے لمبے لمبے بال کھلے رہتے تھے اور جب وہ بھاگ دوڑ کرتی تھی تو فضا میں اڑتے ہوئے بال بہت اچھے لگتے تھے۔"بلبل بغداد" ٹوپی بھی پہنتی تھی اور اپنی یونیفارم کے ساتھ ٹوپی پہن کر وہ اور زیادہ گوری اور خوب صورت لگتی تھی۔دشمن بادشاہ کی فوجیں اس کو پکڑنے کی دھن میں لگی رہتی تھیں مگر وہ ان سب کو تگنی کا ناچ نچاتی تھی۔ تلوار بازی میں وہ کئی کئی سپاہیوں کو ہلاک کر دیتی تھی اور جب دشمنوں کے نرغے میں گھر جاتی تھی تو "ہے" کا نعرہ بلند کر کے محل کی چھت سے نیچے صحن میں چھلانگ لگا دیا کرتی تھی۔ سپاہی دوڑے دوڑے گرتے پڑتے صحن میں پہنچتے تو وہ پھر تلوار بازی سے چند سپاہیوں کو ہلاک کرنے کے بعد "ہے" کا نعرہ بلند کرتی اور ایسی چھلانگ لگاتی کی دوبارہ صحن سے محل کی چھت پر پہنچ جاتی تھی۔اس کا یہ کارنامہ ہمارے لئے سب سے زیادہ مرعوب کن تھا اور ہم کافی عرصے تک سوچتے رہے کہ آخر یہ ایسا کیونکر ممکن تھا۔ یہ گوری چٹی،خوب صورت،اسمارٹ اور بہادر لڑکی الٹی چھلانگ کس طرح لگا لیتی تھی۔اور سینکڑوں سپاہیوں کو کس طرح زیر کر لیتی تھی یہ ادائیں ہمارے دل میں گھر کر گئیں۔لڑائی مار کٹائی کے علاوہ جب وہ زنانہ لباس میں گانے گاتی تھی تو ایک بالکل مختلف لڑکی نظر آتی تھی اور اس روپ میں بھی ہمارے دل کو بہت بھاتی تھی۔"بلبل بغداد" کا اصل نام کیا تھا یہ ہمیں آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔نہ ہی ہم نے کبھی معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی یاد اور شکل وصورت آج تک ہمارے دل ودماغ سے نہیں نکل سکی ہے۔پتا نہیں وہ کون تھی،اب کہاں ہے؟ ہے بھی یا نہیں ہے۔

" بلبل بغداد" نے جیسے ہم پر جادو کر دیا تھا۔اٹھتے بیٹھتے ہمیں اس کی شکل نظر آتی تھی۔اس کی حرکتیں ہماری نگاہوں میں گھومتی رہتی تھیں۔اس کے مکالمے ہمارے کانوں میں گونجا کرتے تھے۔ہم اپنے ہم عمر دوستوں کو بہت عرصے تک " بلبل بغداد" کی کہانی سناتے رہے۔یہاں تک کہ وہ انہیں بھی ازبر ہو گئی۔ ہم نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا کہ ہمیں فلم "بلبل بغداد" ایک بار پھر دیکھنے کی اجازت مل جائے مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔گھر والوں کے خیال میں ہم پہلے ہی بہت زیادہ فلمیں دیکھ چکے تھے (صرف دو) جو ہماری عمر کے لحاظ سے بہت نامناسب بات تھی اس لئے ایک بار پھر ہمارا فلم دیکھنے کے لئے جانا کسی طور بھی قابل قبول نہ تھا۔ہم نے بہت ضد کی روئے، بھوک ہڑتال بھی کر دی مگر کسی کا دل نہ پسیجا بلکہ ہماری اماں نے ہمیں وارننگ دے دی کہ اگر تم باز نہیں آؤ گے تو یہ معاملہ تمہارے ابا کے سامنے

پیش کر دیا جائے گا۔اس دھمکی کے بعد اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم دل مسوس کر رہ گئے۔ کئی دن تک چپکے چپکے آنسو بہاتے رہے۔ یہاں تک کہ ہمارے ایک بڑی عمر کے کزن کو ہم پر ترس آ گیااور انہوں نے ہمیں یہ کہہ کر تسلی دی کہ ایک بہت زوردار تاریخی فلم کچھ عرصے بعد آنے والی ہے۔ ہم تمہیں وہ فلم دکھانے کے لئے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔تب کہیں جاکر ہمارے دل کو کچھ ڈھارس بندھی۔ یہ فلم ''سکندر'' تھی۔

اس کے بعد ہم نے کون کون سی فلمیں دیکھیں اور کس طرح دیکھیں، یہ ایک الگ داستان ہے۔ مذکورہ بالا واقعات ہم نے محض تمہید کے لئے پیش کئے ہیں جن سے ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہم کو بچپن ہی سے فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ کچھ بڑے ہوئے تو پابندیاں بھی قدرے کم ہو گئیں اور ہمیں فلمیں دیکھنے کے زیادہ مواقع ملنے لگے۔ پاکستان بننے کے بعد ہمیں فلمیں دیکھنے کی زیادہ آزادی میسر آئی۔ حالات بھی سازگار تھے۔اس زمانے میں فلمیں بھی بہت اچھی آیا کرتی تھیں اس لئے ہم بھارتی، پاکستانی،انگریزی سبھی فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ فلموں کے بارے میں پڑھا کرتے تھے۔ فلموں کی باتیں کیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ فلم کا شوق ہمارے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔

جن دنوں ہم میرٹھ میں رہا کرتے تھے ایک بار وہاں فسادات ہو گئے۔ ہمارے گھر والے احتیاطاً میرٹھ سے بھوپال چلے گئے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں ہم پیدا ہوئے تھے جہاں ہم نے بچپن کے دن گزارے تھے اور جہاں ''رادھا'' رہتی تھی۔ میرٹھ میں ہمیں مزید ایک سال رہنا تھا۔ ہوسٹل میں رہنا گھر والوں کو پسند نہیں تھا اس لئے ایک دور کے رشتے دار کے فلیٹ میں ہمارے قیام کا بندوبست کیا گیا جو ہمارے کالج کے نزدیک بھی تھا۔ یہ فلیٹ ایک بہت بڑی بلڈنگ میں تھا جس کا نام ''نادر علی بلڈنگ'' تھا۔ یہاں سبھی مسلمان گھرانے رہا کرتے تھے اور ہر عمر کے بہت سے لوگ تھے۔ ہمارے ہم عمر بھی کم نہ تھے۔ ہمارا قیام کمال کے گھر میں تھا۔ اداکار، ہدایت کار اور فلم ساز سید کمال۔ ان کو اس زمانے میں بلال کہا جاتا تھا اور یہ ہم سے ایک سال جونیئر تھے۔ نادر علی بلڈنگ میں ہم نے جو ایک سال گزارا وہ ہماری زندگی کا بہترین سال تھا۔ ہم عمروں کا جمگھٹا، بے فکری، بے تکلفی شرارتیں اور سب سے بڑھ کر فلمیں دیکھنے کی آزادی۔ میرٹھ کے دوران قیام ہم نے خوب فلمیں دیکھیں جن کی کہانیاں، اداکار اور گانے ہمیں آج بھی یاد ہیں۔ اسی زمانے میں ہم نے بمبئی اور دلی کے فلمی میگزین پڑھ کر اپنی فلمی معلومات میں خوب اضافہ کیا۔ دلیپ کمار، راج کپور اور

دیو آنند اس دور کے سپر اسٹار تھے اور یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ کمال کی شکل وصورت راج کپور سے ملتی تھی۔ وہ راج کپور کی فلم دیکھ کر آتے تو بہت دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بغور اپنا جائزہ لیتے اور راج کپور کے مکالمے بولتے۔ کمال کو رقص کا شوق تھا اور یہ ایک خداداد صلاحیت تھی کہ وہ باقاعدہ سیکھے بغیر بہت اچھا رقص کر لیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ رقص فلمی گانوں کے ریکارڈوں پر اور بے تکلف دوستوں کے سامنے ہی ہوا کرتا تھا۔

ہمارا فلمی شوق تو برقرار تھا مگر اسی زمانے میں ہمیں لکھنے اور ہدایت کاری کرنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا تھا۔ ایک بار ہم نے بلڈنگ میں ڈرامہ کرنے کا پروگرام بنایا جس کا عنوان ''جہنم کا داروغہ'' تھا۔ یہ ایک کامیڈی پلے تھا جس میں زیادہ تر اداکار نو عمر اور بچے تھے۔ سوچا کہ اسے مزید پرکشش بنانے کے لئے کیوں نہ اس میں کمال کے رقص بھی شامل کر لئے جائیں۔ کمال کو بڑی مشکل سے راضی کیا۔ بلڈنگ کی لڑکیوں سے کمال کے لئے زنانہ ملبوسات حاصل کرنے کے لئے چھوٹے بچوں کو مختلف فلیٹوں میں بھیجا تو زنانہ ملبوسات کا ڈھیر لگ گیا۔ یہ کمال کے رقص کی مقبولیت اور ہمارے ڈرامے میں لڑکیوں کی دلچسپی کا ثبوت تھا۔ یہ ڈرامہ کمال کے ڈرائنگ روم میں کیا گیا تھا اور اس کے لئے دو آنے ٹکٹ رکھا گیا تھا۔ ہماری توقع کے برعکس درجنوں لڑکیاں اور ان کی مائیں ڈرامہ دیکھنے آئیں تو ہال چھوٹا پڑ گیا یہاں تک کہ اسٹیج کے لئے بھی جگہ نہ رہی۔ پہلے ڈرامہ شروع ہوا جس پر لڑکیوں نے خوب ہوٹنگ کی۔ اس کے بعد کمال کے ڈانس کی باری آئی تو کمال کسی بات پر ناراض ہو کر اسٹیج سے رخصت ہو گئے جب منانے کا ہر طریقہ ناکام ہو گیا تو ہم بھی گراموفون اور ریکارڈ سمیٹ کر نو دو گیارہ ہو گئے۔ لڑکیوں نے بہت شور مچایا۔ سیٹیاں بجائیں۔ آوازے کسے۔ مگر منتظمین میں سے وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ کئی دن تک لڑکیاں ہم لوگوں کا مذاق اُڑاتی رہیں۔ اس کے بعد ''انار کلی'' ڈراما اسٹیج کیا گیا۔ اس ڈرامے میں انار کلی کا کردار کمال نے ادا کیا تھا اور رقص بھی بہت غضب کا کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی مقبولیت میں تو اضافہ ہو ہی گیا مگر لڑکیاں انہیں دیکھ کر چپکے چپکے ''انار کلی'' کہہ کر گذر جاتی تھی۔ یہ میں اس زمانے کی لڑکیوں کا تذکرہ کر رہا ہوں جب وہ برقعے پہنا کرتی تھیں۔

میرٹھ میں ایک سال رہنا ہوا اور فلموں سے زیادہ وابستگی ہو گئی۔ سید کمال نے پہلے پہلے وہیں اداکاری کی تھی اور ہم نے اپنی زندگی کا پہلا ڈرامہ تصنیف کر کے اس کی ہدایت کاری بھی پہلی بار میرٹھ میں ہی کی تھی۔ بعد میں ہم بھوپال چلے

گئے اور پھر پاکستان چلے آئے۔ کمال پر فلم کا رنگ اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ وہ پاکستان آتے تو ہم سے فرمائش کرتے کہ انہیں فلموں میں کام دلایا جائے۔ اس دوران میں انہوں نے بمبئی کی خاک بھی چھانی اور ایکٹر بننے کی کوشش کی مگر یہ الگ داستان ہے جو آگے چل کر آپ پڑھیں گے۔

ہم پاکستان آئے تو نہ صرف فلمیں دیکھنے کے شوق میں اضافہ پیدا ہو گیا تھا بلکہ ایک نئی کرید یہ بھی دل میں پیدا ہو گئی تھی کہ آخر فلمیں بنتی کس طرح ہیں۔ لاہور کے بارے میں ہم جانتے تھے کہ یہ پاکستان بننے سے پہلے ایک فلمی مرکز تھا۔ یہاں نگار خانے تھے اداکار' ہدایت کار' فلم ساز' موسیقار' گلوکار اور ہنر مندوں کا یہ کافی اہم مرکز سمجھا جاتا تھا اس لئے لاہور پہنچ کر ہمیں فلم اسٹوڈیو دیکھنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم نئے نئے لاہور پہنچے تھے اور ماڈل ٹاؤن میں رہا کرتے تھے۔ یہاں ہمارا میل جول نہیں ہوا تھا۔ کسی جان پہچان یا تعارف شفارش کے بغیر فلم اسٹوڈیو کے اندر جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور فلم اسٹوڈیو کے باہر چکر لگانے کے ہم قائل نہیں تھے تاہم لاہور کے نگار خانوں کے بارے میں ہم نے مختلف اوقات میں مختلف لوگوں سے معلومات حاصل کر لی تھیں۔

یہ 1950ء کا ذکر ہے۔ اس زمانے میں لاہور میں صرف چار فلم نگار خانے تھے۔ ایک شاہ نور اسٹوڈیو جو شوکت حسین رضوی ایک پرانے جلے ہوئے اسٹوڈیو کی بنیادوں پر تعمیر کر رہے تھے۔ یہ ملتان روڈ پر تھا اور ملتان روڈ اس زمانے میں ایک دور دراز اور غیر آباد سڑک سمجھی جاتی تھی۔ دوسرا پنچولی اسٹوڈیو تھا۔ یہ اپر مال روڈ پر واقع تھا اور ابھی تک پنچولی اسٹوڈیو ہی کہلاتا تھا۔ تیسرا اس کا نام پنجاب آرٹ اسٹوڈیو تھا۔ ایک مسلم ٹاؤن میں نہر کے کنارے واقع تھا اور سنا تھا کہ اس میں بھی فلموں کی شوٹنگ ہوا کرتی ہے۔ پہلے اس کا نام پنچولی اسٹوڈیو تھا۔

مسلم ٹاؤن ہی کے نزدیک فیروز پور روڈ پر بھی ایک عدد اسٹوڈیو تھا۔ یہ اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو کہلاتا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے اس کا نام " لیلا مندر اسٹوڈیو " تھا' جب ہم ماڈل ٹاؤن بس میں سوار ہو کر فیروز پور روڈ مسلم ٹاؤن اور نہر کے سامنے سے گزرتے تو دور ہی دور سے اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو کو دیکھ لیتے تھے۔ یہی ہمیں بس کی کھڑکی میں سے بالکل سامنے نظر آتا تھا۔ اس کی دیواریں بہت اونچی اونچی تھیں اور ایک بہت بڑا اور اونچا دروازہ تھا۔ اس کے بعد کچھ نظر نہیں آتا تھا اس اثنا میں ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ہم سڑک پر جس نہر کے پل پر سے گزرتے ہیں اسی نہر

کے کنارے تھوڑے فاصلے پر پنچولی اسٹوڈیو بھی ہے جب ہمیں کسی نے پہلی بار یہ نام بتایا تو ہم بہت حیران ہوئے۔ بھلا یہ کیسا نام ہوا؟ پنچولی؟ دراصل اس سے پہلے ہم نے نہ تو سیٹھ پنچولی کا نام سنا تھا اور نہ ہی ان کی بنائی ہوئی کوئی فلم دیکھی تھی۔ بعد میں پتا چلا ان کا پورا نام سیٹھ دل سکھ ایم پنچولی تھا اور وہ لاہور کی فلمی صنعت کے بہت بڑے ستون تھے۔ ان کے دو اسٹوڈیوز اور سینما تھے۔ بہت بڑی اور شاندار کوٹھی تھی جو کیپٹل سینما کے برابر میں تھی۔ پلازا سینما سیٹھ پنچولی کا تھا۔

''اسکرین اینڈ ساؤنڈ'' اسٹوڈیو کے بڑے سے پھاٹک کو دیکھ دیکھ کر ہماری آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور یہ ہمارے لئے الف لیلیٰ کے گنبد در بند کی طرح تھا جس کے اندر جانے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تھا اسکرین اینڈ ساؤنڈ کے اندر جانے کا راستہ تو ہمیں دور ہی سے نظر آجاتا تھا مگر یہ دروازہ علی بابا چالیس چور کے غار کے دروازے کی مانند ہمارے لئے بند ہی تھا۔ اس کے اندر جانے کے لئے جو جادوئی منتر پڑھا جاتا ہے' ہم اس سے واقف نہیں تھے۔

بس میں ہمارے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ سفر کیا کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہر روز صبح ماڈل ٹاؤن سے لاہور کے مختلف علاقوں میں جاتے اور شام کو یارات کو واپس آیا کرتے تھے۔ کسی ماڈل ٹاؤن والے سے اگر پوچھا جاتا کہ بھئی آپ کہاں جارہے ہیں؟ تو وہ جواب میں کہتا'' شہر جارہا ہوں۔''
گویا لاہور ماڈل ٹاؤن والوں کے لئے ایک دوسرا شہر تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ چھ سات میل کا فاصلہ درمیان میں حائل تھا۔ جس میں سے بیشتر ویران اور غیر آباد تھا۔ سڑکوں پر روشنی تک نہیں ہوا کرتی تھی۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختصر سی آبادی نظر آجاتی تھی اور اس کے بعد پھر وہی جنگل بیابان۔ ماڈل ٹاؤن کی بسوں کے سوا سفر کا کوئی دوسرا معقول ذریعہ نہیں تھا۔ یا پھر سائیکل ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی گاؤں سے دودھ لانے والے ریڑھے بھی نظر آجاتے تھے۔ غرضیکہ عجب لق ودق جگہ تھی۔ شام ڈھلنے کے بعد لوگ شہر سے ماڈل ٹاؤن یا ماڈل ٹاؤن سے شہر جانے سے گھبراتے تھے اور دامن بچاتے تھے کیونکہ راہ میں چور مل جاتے تھے۔ جو ان کی سائیکل اور جیب سے چند روپے نکلوا کر غائب ہو جایا کرتے تھے اگر کسی کی کلائی میں گھڑی ہوتی تو وہ غریب اس سے بھی ہاتھ دھو

بیٹھتا تھا۔

ان بسوں میں سوار ہونے والے بیشتر لوگوں کو فلموں یا فلم اسٹوڈیو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ایک تو اس لئے کہ نیا نیا پاکستان بنا تھا۔ سبھی لٹ پٹ کر آئے تھے اور اپنی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ دوسرے اس لئے کہ مسلمانوں میں فلمیں اس زمانے میں اتنی مقبول نہیں تھیں اور بہت کم لوگ فلموں کے بارے میں بات چیت کرتے تھے۔ فلمیں دیکھنے والوں کی تعداد بھی برائے نام ہی تھی۔

ایک دن ہم حسب معمول ماڈل ٹاؤن کی بوسیدہ سی بس میں سوار ہوئے جس کی کھڑکیوں کے اکثر شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ گرمیوں میں تو اندر آنے والی ہوا کا بہت مزہ آتا تھا اور ساری بس قدرتی ائر کنڈیشنڈ ہو جاتی تھی مگر سردی کے موسم میں یہ ٹوٹے ہوئے شیشے مسافروں کی قلفی جما دیا کرتے تھے۔اس زمانے میں لاہور کے موسم بھی بہت شدید ہوا کرتے تھے۔ گرمی ہے تو بہت زیادہ۔ لو، حبس دھوپ کی شدت، یہاں تک کہ تارکول کی سڑکیں بھی پگھل جاتی تھیں اور اگر سردی ہے تو وہ بھی بے انتہا۔ وہ سردیوں کا موسم تھا اور ہر شخص اپنے پاس والے مسافر کے ساتھ چپکا بیٹھا تھا جو لوگ کھڑے تھے وہ بھی ایک دوسرے سے اس قدر نزدیک تھے کہ لگتا تھا کہ بغلگیر ہو رہے ہیں۔ٹوٹے ہوئے شیشوں کی کھڑکیوں سے آنے والی یخ بستہ ہوا سے بچنے کی اس کے سوا کوئی اور صورت نہ تھی۔

ہمیں اتفاق سے بیٹھنے کی جگہ مل گئی تھی۔ ہم ہمیشہ اس طرف کی کھڑکی کے سامنے بیٹھنے کی کوشش کرتے تھے جس طرف سے اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو نظر آتا تھا۔اس روز بھی ہم اپنی پسندیدہ جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہمارے پاس ایک جوان العمر فیشن ایبل صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سوٹ بوٹ میں تھے۔ سانولا رنگ تھا مگر نقش و نگار بہت اچھے تھے۔ سیاہ مونچھوں کی وجہ سے وہ اور بھی زیادہ رعب دار نظر آتے تھے۔ خاصے پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے۔ سفر کافی لمبا تھا اس لئے انہوں نے بس میں بیٹھتے ہی ہم سے باتیں شروع کر دیں۔ ہم سے پوچھا ”کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟“ وغیرہ۔ پھر اپنے بارے میں بتایا کہ ان کا نام گل تھا۔ آگے پیچھے کیا تھا یہ ہمیں یاد نہیں رہا۔ وہ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ فوٹو گرافی کا شوق تھا اور بہت جلد اعلیٰ تربیت کے لئے ملک سے باہر جانے والے تھے۔ یہ سن کر ہم خاصے مرعوب ہوئے کیونکہ اس زمانے میں یورپ جانا ایک کارنامہ ہی

سمجھا جاتا تھااور گنتی کے چند لوگ ہی یہ سعادت حاصل کرتے تھے۔ پھر انہوں نے ہمیں لاہور کے بارے میں بتایا۔ وہ لاہور ہی کے رہنے والے تھے۔ ہم سے بولے کہ لاہور آپ کو اس لئے اور بھی اچھا لگے گا کہ یہاں فلمی مرکز ہے۔ فلمیں بنتی ہیں' ایکٹر اور ایکٹر سیں یہاں رہتی ہیں۔ فلموں کے بارے میں ان کی معلومات ہم سے بہت زیادہ تھیں مثلاً انہوں نے بتایا کہ مسلم ٹاؤن میں پنچولی اسٹوڈیو کے آس پاس اداکار علاؤالدین اور سنتوش کمار رہتے ہیں۔ اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو کے بالکل سامنے فیروز پور روڈ کی دوسری جانب اداکارو ہدایت کار نذیر اور اداکارہ سورن لتا رہتی ہیں۔

انہوں نے اور بھی کئی فلم والوں کے بارے میں ہمیں بتایا مگر ہم ان سے بیشتر لوگوں سے ناواقف تھے اس لئے کہ ہم نے تو پاکستان آنے سے پہلے صرف بمبئی میں بنی ہوئی فلمیں ہی دیکھی تھیں۔ لاہور کی فلموں اور فلم والوں کے متعلق ہماری معلومات صفر کے برابر تھیں۔

انہوں نے یکایک ہم سے پوچھا ''تمہیں اداکار بننے کا شوق ہے ؟''

ہم نے کہا ''نہیں مگر ہمیں فلمیں دیکھنے کا شوق ہے۔''

''اداکاروں کو دیکھنے کا شوق بھی نہیں ہے ؟'' انہوں نے پوچھا

''نہیں۔ بس فلموں میں دیکھنا ہی اچھا لگتا ہے۔ دو چار آرٹسٹ ہی ایسے ہیں جنہیں دیکھنے کو جی چاہتا ہے مگر وہ بمبئی میں ہیں۔''

گل صاحب نے کہا'' یہاں کے آرٹسٹ بمبئی کے آرٹسٹوں سے کم نہیں ہیں مگر آپ نے ان کی فلمیں نہیں دیکھیں اور آج کل لاہور میں فلمیں بھی بہت کم بنتی ہیں۔ یہاں تو نئے سرے سے فلم انڈسٹری بنے گی۔'' انہوں نے ہمیں بتایا کہ ان کی فلم والوں سے جان پہچان ہے۔

''آپ کو فلم کی شوٹنگ دیکھنے کا شوق ہے ؟'' انہوں نے پوچھا۔ ہم نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا وہ بولے ''موقع ملا تو میں آپ کو فلم اسٹوڈیو دکھاؤں گا۔''

انہوں نے ہمیں بتایا کہ اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو کے سامنے والی کوٹھی میں نذیر صاحب اور سورن لتا رہتے ہیں جن کی محبت کی شادی ہے۔ ان دونوں نے ''وامق عذرا'' اور ''لیلیٰ مجنوں'' میں ہیرو اور ہیروئن کے طور پر کام کیا اور ایک

دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ یہاں تک کہ شادی کرلی۔ نذیر صاحب پہلے بھی شادی شدہ تھے اور ان کی پہلی بیگم لاہور میں رہا کرتی تھیں۔ سورن لتا سے شادی کے بعد نذیر صاحب نے اپنی پہلی بیوی سے ملنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

''وہ کیوں؟'' ہم نے پوچھا۔

گل صاحب نے ادھر اُدھر دیکھا اور چپکے سے بولے '' سورن لتا سے ڈرتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ سب لوگ نذیر صاحب سے ڈرتے ہیں۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری میں بھی ان کا بہت رعب تھا مگر وہ سورن لتا سے ڈرتے ہیں۔''

ہم نے دل میں سوچا کہ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ اللہ ہر فرعون کے لئے ''موسیٰ'' پیدا کرتا ہے۔

''شوکت حسین رضوی اور نور جہاں کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے؟'' گل صاحب نے ہم سے پوچھا

ہم نے سادگی سے کہا ''نہیں''

''ارے، آپ نے ان کی فلمیں نہیں دیکھیں؟''

ہم نے کہا ''ہم نے ان کی دو فلمیں تو دیکھی ہیں اور ہمیں نور جہاں اچھی بھی لگتی ہیں، وہ بہت اچھا گاتی ہیں مگر ہم انہیں جانتے نہیں ہیں۔''

وہ ہنسنے لگے ''بھئی آپ بھی خوب ہیں۔ جاننے سے یہی مطلب ہے کہ آپ نے ان کی فلمیں دیکھیں ہیں یا نہیں اور کیا ان کو پسند بھی کرتے ہیں؟''

''ہاں ہاں، بہت زیادہ'' ہم نے کہا

انہوں نے کہا ''کہ آپ کو تو پتا ہوگا کہ شوکت صاحب بمبئی سے پاکستان آ گئے ہیں۔ لاہور میں جلا ہوا اسٹوڈیو انہوں نے لے لیا ہے اور وہیں ''شاہ نور اسٹوڈیو'' کے نام سے نیا اسٹوڈیو بنا رہے ہیں۔''

ہم سنتے رہے، اس وقت ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب ہم دن رات شاہ نور اسٹوڈیو میں رہا کریں گے۔

گل صاحب نے کہا ''شوکت صاحب اور نور جہاں شیش محل میں رہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے شیش محل؟''

ہم نے انکار میں سر ہلا دیا۔

بولے ''وہ ڈیوس روڈ پر ہے۔ بڑی شاندار اور بڑی عمارت ہے' پورا محل ہے۔''
''ان سے ملنا ہے تو کسی دن میں آپ کو لے چلوں گا۔ میں نے ان کی تصویریں بنائیں ہیں۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔''

ہم ہوں ہاں کر کے چپ ہو گئے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہمیں اداکاروں وغیرہ سے ملنے کا کبھی اشتیاق نہیں رہا۔ ہمیں تو فلم کی شوٹنگ دیکھنے کا شوق تھا کیونکہ ہم یہ جاننا چاہتے تھے کہ فلم بنتی کس طرح ہے؟

ابھی ہماری معلوماتی بات چیت یہیں تک پہنچی تھی کہ بس ریگل کے اسٹاپ پر پہنچ گئی۔ یہ مال روڈ پر بہت اہم بس سٹاپ تھا اور زیادہ تر لوگ یہاں اتر جاتے تھے۔ گل صاحب بھی یہاں اتر گئے اور ہم بھی۔ ''خدا حافظ، پھر ملیں گے'' کہہ کر رخصت ہو گئے۔ نہ یہ بتایا کہ وہ رہتے کہاں ہیں؟ اور اگر ملیں گے تو کب اور کیسے ملیں گے؟ ہم یہ سوچتے رہ گئے کہ شاید وہ دوبارہ ماڈل ٹاؤن کے اسٹاپ پر مل جائیں گے مگر اس کے بعد وہ چھلاوے کی طرح غائب ہو گئے۔ وہ دن اور آج کا دن۔ ہم نے انہیں پھر کبھی نہیں دیکھا۔ مگر وہ ہمارے دل میں فلم اسٹوڈیوز دیکھنے کا شوق اور زیادہ بھڑکا گئے تھے۔ کچھ وقت اور گذر گیا۔ ہم لاہور سے کچھ مانوس ہو گئے۔ لکشمی چوک اور رائل پارک کا بھی پتا چل گیا جہاں فلمی دفاتر تھے۔ کچھ عرصے بعد ہم ایک روزنامے میں کام کرنے لگے اور صحافی بن گئے۔ اخباروں میں اس زمانے میں فلموں کا تذکرہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ نہ کوئی فلمی خبر شائع ہوتی تھی۔ فلمی خبروں اور تصویروں کے لئے فلمی جرائد مخصوص تھے اس لئے اخبار کے دفتر میں ہمیں کوئی ایسا نہیں ملا جس سے ہم فلم اسٹوڈیو دیکھنے کے بارے میں گفتگو کرتے۔

ہمارے ایک عزیز انگریزی روزنامہ '' پاکستان ٹائمز'' میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیں ایک دن ایک گندمی رنگ نوجوان سے ملایا اور بتایا کہ ان کا نام نبی احمد ہے۔

نبی احمد صاحب کم گو آدمی تھے مگر جب انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ فلمی صنعت سے وابستہ ہیں اور ایک فلم میں اسسٹنٹ کیمرہ مین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں تو ہمیں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ہم نے ان سے فلموں کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے جس میں وہ کیمرہ مین نظام ناخدا کے معاون ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنے شوق کا اظہار کرتے انہوں نے خود ہی ہم سے پوچھا ''آپ فلم کی شوٹنگ دیکھنا چاہتے ہیں''؟

ہم نے سر ہلا دیا۔

بولے ”پرسوں ہماری فلم ”دو کنارے“ کی شوٹنگ ہے۔آپ نے اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو دیکھا ہے ؟“

ہم نے کہا”وہ تو ہم روز ہی دیکھتے ہیں‘ ہمارے راستے میں ہے۔“

”بس تو پھر آپ پرسوں دن میں کسی وقت اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو میں آجائیں۔“

”مگر ہم اندر کیسے جائیں گے ؟“ہم نے پوچھا

”آپ گیٹ کے باہر کیفے ڈی پھونس میں کسی لڑکے کو بتا دیجئے گا۔وہ مجھے اندر خبر کر دے گا اور میں آپ کو اسٹوڈیو کے اندر لے جاؤں گا۔“

ہم نے بے تابی سے پوچھا”مگر پرسوں کیوں ؟ہم تو کل ہی آجائیں گے۔“

کہنے لگے ”کل نہ آئیں کیونکہ کل شوٹنگ نہیں ہے۔“

اس طرح ہماری فلم کی شوٹنگ دیکھنے کی خواہش خود بخود پوری ہو گئی۔نبی احمد صاحب بعد میں پاکستان کے صف اول کے کیمرہ مین بن گئے تھے اور انہوں نے بہت سی یادگار فلموں کی عکاسی کی۔وہ ایک پڑھے لکھے نوجوان تھے۔انہیں فوٹو گرافی سے عشق تھا۔وہ فوٹو گرافی کے بارے میں باہر سے آئے ہوئے انگریزی میگزین بہت باقاعدگی سے خریدا کرتے تھے۔اس زمانے میں ان کی قیمت ڈیڑھ دو روپے ہوتی تھی مگر اس وقت یہ بہت بڑی رقم تھی۔اب یہی میگزین سینکڑوں روپے میں ملتے ہے۔ہم نے فلمی دنیا سے وابستگی کے زمانے میں کبھی کسی اور فوٹو گرافر کو فوٹو گرافی کے متعلق غیر ملکی میگزین خریدتے نہیں دیکھا۔یہ شوق اور دیوانگی نبی احمد صاحب ہی کے حصے میں آئی تھی۔

ہم ” پرسوں“کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے اور عالم تخیل میں بڑے رنگین اور خوبصورت خواب دیکھتے رہے۔فلمی دنیا تو گلیمر اور رنگ و نور کی دنیا کہلاتی ہے۔ہم نے عالم خیال میں شیشے کی طرح چمکتا ہوا اور جگمگاتا ہوا اسٹوڈیو دیکھا۔اداکاروں کے ٹھاٹ باٹھ کا تصور کیا اور کیفے ڈی پھونس کے بارے میں بہت شاندار توقعات وابستہ کر لیں۔ہم تو اس کے نام ہی سے بہت مرعوب ہو گئے تھے۔یوں لگتا تھا جیسے فرانس کا کوئی ریستوران ہو گا۔خوب صورت ویٹر اور

ویٹریسیں ہوں گی اور ہر طرف طرح دار اداکاروں کا ہجوم ہو گا۔ ہم کیفے ڈی پھونس میں جائیں گے تو مینجر یا ویٹر سے کس زبان میں بات کریں گے پھر سوچا کہ انگریزی میں بات کرنا بہتر ہو گا اس طرح ان لوگوں پر ہمارا بھی رعب پڑ جائے گا۔ آخر فلم اسٹوڈیو کا کیفے ہے۔ کوئی مذاق تو نہیں ہے۔

ان ہی خیالات میں کھوئے ہوئے ہم اس روز خوب بن ٹھن کر اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو جانے کے لئے ماڈل ٹاؤن بس میں سوار ہوئے تو خود کو دوسرے مسافروں سے زیادہ اہم اور ممتاز تصور کر رہے تھے اس لئے کہ ہم ایک فلم اسٹوڈیو میں شوٹنگ دیکھنے کی غرض سے جا رہے تھے جب کہ باقی لوگ اس سعادت سے محروم ہی تھے۔
اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو سے پہلے مسلم ٹاؤن کا بس اسٹاپ تھا۔ ہم وہاں بس سے اتر گئے اور پیدل چلتے ہوئے اسٹوڈیو کی طرف چل پڑے۔ سڑک سے اتر کر جو راستہ اسٹوڈیو کی طرف جا رہا تھا وہ کچا تھا۔ کچھ دور چلے اور چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر ہمیں کوئی شاندار ریستوران اور کیفے نظر نہیں آیا۔ ویسے اسٹوڈیو کی عمارت کا بیرونی حصہ بھی خاصہ بوسیدہ تھا۔ پاس سے گزرتے ہوئے ایک لڑکے سے ہم نے پوچھا کہ بھائی کیفے ڈی پھونس کس طرف ہے؟
اس نے بے نیازی سے ایک طرف کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور چلتا بنا۔ ہم اس سمت چلے تو چند قدم کے بعد ہی ایک تندور نما ہوٹل نظر آیا۔ اس کے سامنے لکڑی کی چند بینچیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک دو ٹوٹی پھوٹی میزیں بھی تھیں۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے آگے پھونس کا ایک چھپر سا لگا ہوا تھا جو اس ریستوران کی وجہ تسمیہ تھی۔ ایک میلے کچیلے سے صاحب سامنے بیٹھے دیگچی میں چائے ابال رہے تھے مٹی کے ایک دو چولھوں پر ایک دو ہنڈیاں اور بھی رکھی ہوئی تھیں۔ ان صاحب کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی مگر بڑے اسٹائل سے سگریٹ پی رہے تھے اور خالص اشوک کمار کے انداز میں اس کی راکھ بھی جھاڑتے جا رہے تھے جو چائے کے برتنوں پر گر رہی تھی مگر انہیں اس کی مطلق پروا نہیں تھی۔ ہمارے تصورات کو ایک شدید دھچکا سا لگا۔ یہ کیفے ہمارے تصورات کے خوبصورت ریستوران کے بالکل بر عکس تھا۔ نام اتنا شاندار اور حلیہ اس قدر پھٹیچر، یقین نہیں آیا کہ یہی فلمی دنیا کے ستاروں کی آماجگاہ کیفے ڈی پھونس ہو سکتا ہے۔ ہم نے آگے بڑھ کر ان صاحب کو متوجہ کیا "سنئے؟"
"فرماؤ جی!" انہوں نے پوچھا۔

''یہی کیفے ڈی پھونس ہے''۔ ''یہاں تک تو آ گئے۔اب اس کے آگے بولو؟''انہوں نے سگریٹ کا کش لے کر پوچھا۔

''وہ ایک اسسٹنٹ کیمرہ مین ہیں۔ نبی احمد صاحب'ہمیں ان سے ملنا ہے۔''

''تو ملو' منع کس نے کیا ہے ؟''

''انہوں نے کہا تھا کہ یہاں کسی سے کہیں گے تو وہ ہمیں نبی احمد صاحب کے پاس پہنچا دے گا۔''

''کوئی بات نہیں بینچ پر تشریف رکھو۔ابھی لڑکا چائے لے کر اندر جائے گا تو تمھیں بھی لے جائے گا۔''

ہم خاموشی سے لکڑی کی بینچ پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے دیگچی میں مٹھی بھر چائے کی پتی جھونک دی پھر سر سے پیر تک ہمارا جائزہ لیا۔تھری پیس سوٹ' چمکتا ہوا جوتا'سر پر ہیٹ' گلے میں ٹائی۔

پوچھا''ایکٹر بننے آئے ہو؟''

ہم گھبرا گئے ''ارے نہیں' بالکل نہیں۔ہم تو بس ویسے ہی شوٹنگ دیکھنے آئے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔یہاں جو ایکٹر بننے آتا ہے وہ یہی کہتا ہے۔بھائی'ایکٹر بننا ہے تو شوق سے بنو۔اس میں شرمانے کی کیا بات ہے جو بن گئے ہیں وہ کون سے خوش ہیں جو تم ایکٹر بن کر کچھ بن جاؤ گے مگر ہماری کون سنتا ہے جس کے سر پر یہ بھوت سوار ہوتا ہے اسے تو بڑے سے بڑا عامل بھی نہیں اتار سکتا''پھر پوچھا'' چائے پیو گے ؟''

''نہیں'شکریہ''

''چائے پیئے بغیر ہی شکریہ۔کمال کے آدمی ہو بھئی''پھر انہوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر فلک شگاف نعرہ لگایا

''چھوٹے 'چھوٹے 'ابے کدھر مر گیا ہے تو؟''

''ادھر ہوں جی''ایک نو عمر میلا کچیلا سا لڑکا کہیں سے یکایک نمودار ہو گیا۔

''لے بھائی'بیس کپ چائے ہے۔سیٹ پر لے جا۔پرچی لانا مت بھولنا اور ہاں بابو جی کو بھی ساتھ لے جا۔انہیں نبی احمد صاحب سے ملنا ہے۔''

لڑکے نے گندی سی ایلومونیم کی ٹرے میں چائے دانی اور چھوٹی چھوٹی پیالیاں رکھیں اور چل پڑا''میرے پیچھے آ جاؤ

جی۔"

ہم اس کے پیچھے چل پڑے‘ یہ کیفے ‘اسٹوڈیو کی چار دیواری کے باہر تھا‘اسٹوڈیو کے قلعہ نما بڑے سے گیٹ سے گزر کر ہم پھر کچھ دور ایک کچی سڑک پر چلے۔ سامنے اسٹوڈیو کی عمارت تھی۔ نچلی منزل پر کمرے اور دفاتر تھے۔اوپر کی منزل پر اسٹوڈیو فلور تھا مگر ہمیں اوپر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ لڑکا بدستور گنگناتا ہوا ہمارے آگے آگے چلتا رہا۔ عمارت کا چکر کاٹنے کے بعد دوسری طرف پہنچا جہاں لکڑی کی بوسیدہ سی سیڑھیاں اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔ان سیڑھیوں میں جگہ جگہ سیڑھیاں غائب تھیں اور خالی جگہ تھی۔اس پر چلو تو سیڑھیاں ملنے لگتی تھیں۔ ہمیں تو ایسا لگا جیسے سرکس کے رسے پر چل رہے ہیں مگر چھوٹا بڑے اطمینان سے اسی رفتار سے اوپر چڑھ رہا تھا۔اب وہ گنگنانے کے بجائے سیٹی بجا رہا تھا۔ لکڑی کے اس پُل صراط سے گزر کر ہم ایک بڑے ہال میں پہنچ گئے۔ یہ شوٹنگ فلور تھا۔اس میں داخل ہوتے ہی ہمیں ایک عجیب قسم کی بد بو محسوس ہونے لگی۔ ہال میں مصنوعی پہاڑیاں بنائی گئی تھیں۔ایک چھوٹا سا تالاب بھی تھا۔ ہر طرف درختوں کے تنے اور ٹہنیاں کاٹ کر مٹی کے سہارے کھڑے کر دیے گئے تھے۔ یہ ایک پر فضا پہاڑی مقام کا سیٹ تھا۔اس زمانے میں پہاڑ اور غار بنانے کے لئے چٹائیاں استعمال کی جاتی تھیں۔ بعد میں ان پر سلیٹی رنگ پھیر دیا جاتا تھا کہ وہ سچ مچ کے پہاڑ نظر آئیں۔اس سیٹ پر ایک طرف چند مونڈھے اور ایک دو لکڑی کی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کیمرہ مین ایک شاٹ کی تیاری کر رہا تھا۔ کیمرے کے سامنے ایک نوجوان‘ایک نوجوان خوب صورت سی لڑکی سے مزاحیہ باتیں کر رہا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ کامیڈین ظریف ہیں اور لڑکی کا نام اختری ہے جو اس فلم کی ہیروئن ہیں۔

اختری اس سے پہلے بے بی اختری کے نام سے بھی فلموں میں کام کرتی رہی تھیں۔ متناسب جسم اور خوش شکل تھیں۔ اداکاری میں زیادہ ماہر نہیں تھیں۔ ظریف کو ہم نے "دو کنارے" کے سیٹ پر پہلی بار دیکھا۔اختری کو دیکھنے کا بھی پہلا اتفاق تھا۔سچ تو یہ ہے کہ اس سے پہلے ہم ان دونوں کے ناموں سے بھی واقف نہیں تھے۔اس زمانے میں پاکستان میں گنتی کی ہیروئنیں تھیں۔ایک تو یہی اختری تھیں۔ دوسری راگنی تھیں جن کے نام سے ہم واقف تھے اور ان کی فلم بھی دیکھ چکے تھے۔ایک ارشاد تھیں جو بہت جلد شادی کر کے فلمی دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ صبیحہ خانم

اس وقت فلمی دنیا میں داخل ہونے کے جتن کر رہی تھیں۔

ہندوستان سے آنے والی ہیروئنوں میں سورن لتا تھیں جن کی ایک پاکستانی فلم ''سچائی'' ریلیز ہو چکی تھی۔ مگر بہت سے پاکستانیوں کی طرح ہم نے بھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ فلم نذیر صاحب نے بنائی تھی۔ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں اچھی بھارتی فلمیں کھلے عام سینماؤں میں دکھائی جاتی تھیں۔ مشہور اداکاروں کی فلموں کو چھوڑ کر گمنام اداکاروں اور اناڑی ہدایت کاروں کی فلمیں کوئی نہیں دیکھتا تھا۔

ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کی بیگم نینا بھی لاہور آچکی تھیں۔ انہوں نے یہاں جس فلم میں پہلی بار کام کیا اس کا نام ''اکیلی'' تھا اور یہ سید عطا اللہ ہاشمی نے بنائی تھی۔ بمبئی سے شمیم اور نجمہ بھی پاکستان آچکی تھیں۔ شمیم نے ''سیندور'' میں کام کیا تھا اور یہ فلم بہت کامیاب ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ہی انور کمال پاشا صاحب نے شمیم سے شادی کرلی اور وہ فلمی دنیا کو چھوڑ کر گھر میں بیٹھ گئیں۔

نجمہ نے بھی بمبئی کی چند فلموں میں کام کیا تھا۔ لاہور آکر بھی چند فلموں میں اداکاری کی اس زمانے میں فلمیں ہی کتنی بنتی تھیں۔ یہ امرتسر کی رہنے والی تھیں۔ ذہین اور ادب ذوق بھی تھیں۔ انہوں نے کچھ عرصے بعد ملک باری سے شادی کر کے اداکاری ترک کر دی تھی۔ لے دے کر اس وقت پاکستان میں یہی گنتی کی ہیروئنیں تھیں۔

اختری کو ایک نوجوان گندمی رنگ کے ہدایت کار بڑی شائستگی سے سمجھا رہے تھے۔ ظریف بے تکان بولے چلے جا رہے تھے جس کی وجہ سے اختری اپنے مکالمے بھول جاتی تھیں۔ یہ ہدایت کار عاشق بھٹی تھے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد سب سے پہلے جس فلم کا آغاز ہوا تھا وہ ''دو کنارے'' ہی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ چند فلموں کے بعد ریلیز ہوئی تھی۔

گورے رنگ کے سفید پتلون قمیص میں ملبوس چھوٹے قد اور بھاری جسم کے ایک صاحب کیمرہ مین تھے۔ یہ نظام ناخدا تھے۔ بہت اچھے اور مزے دار آدمی تھے۔ پان بہت کھاتے تھے۔ نبی احمد صاحب ان ہی کے معاون تھے اور کیمرے کے آگے پیچھے پھر رہے تھے ہم ایک طرف کو کھڑے ہو گئے۔

چھوٹے نے بھی چائے کی ٹرے آہستگی سے ایک مونڈھے پر رکھ دی اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ سارے سیٹ پر خاموشی

چھائی ہوئی تھی۔ ہم تو سمجھے کہ شاید شوٹنگ ہو رہی ہے مگر بعد میں پتا چلا کہ یہ ریہرسل ہے۔ شاٹ بعد میں لیا جائے گا۔ ریہرسل کے درمیان میں وقفہ آیا تو نبی احمد صاحب کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ وہ فوراً ہماری طرف آئے۔ ہمیں لے جا کر ایک مونڈھے پر بیٹھایا اور کہا کہ شارٹ ختم ہو گا تو ڈائریکٹر اور نظام ناخدا صاحب سے ہمارا تعارف کرا دیں گے۔ پھر انہوں نے چھوٹے کو اشارے سے بلایا اور ہمیں ایک چائے کی پیالی پیش کرنے کی ہدایت کی۔

یہ پیالیاں چھوٹے سائز کی تھیں۔ اس سے پہلے ہم نے دوسرے تندور نما ہوٹلوں میں بھی ایسی ہی پیالیاں دیکھی تھیں۔ چائے خاصی مزے دار تھی۔ سیٹ پر موجود ایک اور لڑکے نے دوسرے لوگوں کو بھی چائے پیالیوں میں ڈال کر دی۔ اس اثنا میں ریہرسل بھی ہوتی رہی اور اس کے بعد شارٹ لیا گیا۔

دوسرے شارٹ سے پہلے وقفہ ہوا تو نبی احمد صاحب ہمیں لے کر عاشق بھٹی صاحب کے پاس گئے اور ان سے ملوایا۔ نظام ناخدا بھی پان چباتے ہوئے آ گئے۔ ان لوگوں سے زیادہ بات چیت نہ ہو سکی کیونکہ وہ مصروف تھے مگر کچھ عرصے بعد ہدایت کار عاشق بھٹی اور نظام ناخدا صاحب سے ہماری بہت اچھی واقفیت ہو گئی۔ نظام ناخدا صاحب سی اے رؤف صاحب کے غالباً برادر نسبتی تھے۔ ان کے لئے "لکس" کی فلمیں بنایا کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد رؤف صاحب سے ہماری بہت اچھی ملاقات ہو گئی۔ یہ رؤف صاحب وہی ہیں جنھوں نے کراچی میں انٹرنیشنل فلم اسٹوڈیو بنایا ہے۔

کچھ دیر بعد دوسرے شارٹ کی ریہرسل شروع ہوئی۔ ظریف تو فر فر اپنے مکالمے بول رہے تھے مگر اختری کو مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس کا ایک سبب ظریف بھی تھے۔ وہ ہر بار مکالمے میں کوئی تبدیلی کر دیتے تھے اور اختری اپنا مکالمہ بھول جاتی تھیں۔ عاشق بھٹی صاحب ہر بار ظریف سے کہتے "یار، زیادہ گڑ بڑ مت کرو۔ تم مکالموں میں تبدیلی کر دیتے ہو اور وہ اپنے ڈائیلاگ بھول جاتی ہے۔"

ظریف آئندہ مکالمے تبدیل نہ کرنے کا وعدہ کر لیتے مگر وہ شاید اپنی عادت سے مجبور تھے۔ دراصل وہ بے حد حاضر جواب اور ذہین تھے۔ انہیں ہر بار کوئی اچھا سا فقرہ سوجھ جاتا تھا جو وہ مکالموں میں شامل کر لیتے تھے۔ آخر اختری بے چاری تنگ آ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کہا "ظریف صاحب، آپ پہلے اپنے ڈائیلاگ یاد کر لیں اس کے بعد شوٹنگ ہو گی۔

وہ خاموشی سے ایک مونڈھے پر جا کر بیٹھ گئیں۔ عاشق بھٹی صاحب اور نظام ناخدا صاحب نے انہیں سمجھا بجھا کر منایا اور ظریف کو بھی مکالمے بدلنے سے منع کیا۔ اس طرح خدا خدا کر کے یہ سین مکمل ہوا۔

نبی احمد صاحب کو ذرا فراغت ہوئی تو وہ ہمیں سیٹ دکھانے لگے۔ ہم نے بدبو کی شکایت کی تو انہوں نے بتایا کہ رنگ میں سریش ملا کر سیٹ پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اسی کی بدبو ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس فلم کے ہیرو سریش ہیں۔ سریش بعد میں بمبئی چلے گئے اور بہت سی کامیاب فلموں میں ہیرو بنے مگر اس روز ہماری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ہمیں بتایا گیا کہ کبھی اداکار ایک ساتھ اکٹھے نہیں ہوتے ہیں۔ مناظر کے حساب سے اداکاروں کو بلایا جاتا ہے۔ اس فلم میں اجمل بھی کام کر رہے تھے مگر وہ بھی سیٹ پر نظر نہیں آئے۔ سچ پوچھیے تو ہم اب بور ہو گئے تھے۔ شوٹنگ میں ہمیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک ایک مکالمے کے لئے ریہرسل کی جاتی تھی اور کئی بار اسے فلمایا جاتا تھا۔ نبی احمد صاحب نے کہا کہ دیکھنے والوں کے لئے شوٹنگ خاصا بورنگ کام ہوتا ہے البتہ گانے یا رقص کی شوٹنگ زیادہ دلچسپ ہوتی ہے مگر کافی عرصے بعد جب ہم نے ایک ناچ اور گانے کی شوٹنگ دیکھی تو وہ بھی انتہائی بیزار کن تھی۔ ناچ اور گانا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں فلمایا جا رہا تھا اور اس کی بار بار ریہرسل کی جا رہی تھی۔ ہم تو سینما میں پورا ناچ اور گانا دیکھنے کے عادی تھے۔ یہ پیوند کاری ہمیں بالکل پسند نہیں آئی۔ فلم اسٹوڈیو کے بارے میں ہمارا جو تصور تھا۔ اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو کو دیکھ کر وہ پاش پاش ہو گیا۔ کیفے ڈی پھونس سے لے کر فلم کے سیٹ تک ہر چیز نے ہمیں بہت مایوس کیا۔ نبی احمد صاحب، ہمیں چھوڑنے کے لئے اسٹوڈیو کے باہر تک آئے۔ وہ ہمیں بتا رہے تھے کہ سارے اداکار چائے اور کھانے کے لئے اسی کیفے ڈی پھونس میں آتے ہیں کیونکہ پنچولی اسٹوڈیو کے نزدیک کوئی ایسا ہوٹل بھی نہیں ہے۔ فلمیں ہی اس زمانے میں برائے نام بنتی تھیں۔

فلم والے تقریباً بے کار ہی تھے اس لئے کیفے ڈی پھونس میں بیٹھ کر گپ شپ کیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی اجمل، ایم اسماعیل اور چاچا غلام محمد کو ہم نے وہاں بیٹھے دیکھا۔ غلام محمد صاحب کو ہر ایک چاچا غلام محمد کہا کرتا تھا۔ وہ بہت دلچسپ آدمی تھے اور ہر وقت لطیفے سناتے رہتے تھے۔ وہ زیادہ اچھے اداکار نہیں تھے مگر ملنساری اور اخلاق کی وجہ سے لوگ

انہیں اپنی فلموں میں کاسٹ کر لیا کرتے تھے۔ان کا اردو کا تلفظ بھی زیادہ نہیں تھا مگر پھر بھی وہ ایک مقبول اداکار تھے۔نبی احمد صاحب تو ہمیں ان تمام اداکاروں سے بھی ملانا چاہتے تھے مگر ہم ان سے واقف نہیں تھے اس لئے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا اور رخصت کی اجازت لے لی۔اس طرح ہم نے فلم بنتے دیکھنے کا شوق پورا کر لیا یہ تجربہ ہمارے لئے زیادہ خوش کن نہیں تھا مگر ہمارے فلم کے شوق میں ذرا بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔

اس کے بعد کافی عرصے تک ہم فلم اسٹوڈیو اور فلم والوں سے بے تعلق رہے۔وجہ یہ تھی کہ ہم صحافی بن گئے تھے اور ایک روزنامہ اخبار سے وابستہ تھے۔اخباری مصروفیات نے ہمیں کسی طرف توجہ دینے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔

ہم ''تسنیم'' سے ''نوائے وقت'' میں اور پھر نوائے وقت سے روزنامہ ''آفاق'' میں پہنچ گئے۔آفاق میں سنڈے میگزین بھی ہمارے سپرد تھا۔اس زمانے میں اخبارات میں فلموں کے بارے میں خبریں شائع نہیں ہوتی تھیں اس لئے ہم ایک طرح سے فلموں سے بالکل کٹ آف ہو کر رہ گئے تھے لیکن فلمیں دیکھنے کے شوق میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔

اسی زمانے میں ہماری ملاقات معروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو سے ہو گئی۔ہم ان کے مداح تھے مگر ہم سے زیادہ ہمارے اخبار کے ایڈیٹر پروفیسر سرور صاحب ان کے پرستار تھے۔وہ کسی طرح منٹو صاحب کو گھیر گھار کر ''آفاق'' کے دفتر میں لے آئے۔''آفاق'' میں انہوں نے چند کہانیاں لکھیں اور پھر وہ خاکے تحریر کیے جو بعد میں ''گنجے فرشتے'' کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔بیشتر خاکے بمبئی کی فلمی دنیا کے لوگوں کے بارے میں تھے۔

منٹو صاحب سے نہ صرف ہمیں ملنے کا شرف حاصل ہوا بلکہ ہم نے انہیں ''آفاق'' کے دفتر میں لکھتے ہوئے بھی دیکھا۔وہ کرسی پر دونوں پیر اٹھا کر بیٹھ گئے۔گھٹنوں پر تختی رکھ لی اور لکھنا شروع کر دیا۔ہم نے منٹو صاحب کو کبھی سوچتے نہیں دیکھا۔بس وہ قلم اٹھاتے اور لکھنا شروع کر دیتے تھے۔نہ درمیان میں کوئی وقفہ آتا تھا نہ سوچنے کے لئے رکتے تھے'نہ کوئی لکھا ہوا لفظ یا فقرہ کاٹتے تھے۔

منٹو صاحب کی افسانہ نگاری کے تو ہم مداح تھے ہی لیکن فلم کے حوالے سے بھی ہم ان سے بہت متاثر اور مرعوب تھے۔وہ بمبئی میں رہ کر کئی فلموں کے اسکرین پلے اور مکالمے لکھ چکے تھے۔انہوں نے ایک کہانی ''آٹھ دن'' بھی

لکھی تھی۔وہ بمبئی ٹاکیزاور بعد میں فلمستان کے روح رواں ایس مکر جی اور اشوک کمار کے لاڈلے تھے۔ان کے مشورے کے بغیر وہ دونوں کوئی کام نہیں کرتے تھے۔وہ بمبئی کے بے شمار اداکاروں،فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو بھی جانتے تھے۔ ہم نے سوچا کہ فلمی کہانی لکھنے کے لئے ہمیں منٹو صاحب سے زیادہ موزوں اور کوئی شخص نہیں مل سکتا مگر ان سے ہماری اتنی شناسائی اور بے تکلفی نہیں ہوئی تھی کہ اس قسم کی گفتگو کرتے۔ سعادت حسن منٹو تو ایسی شخصیت تھے جن سے بات کرتے ہوئے بڑے بڑے لوگ گھبراتے تھے وہ صاف گو اور بے دھڑک آدمی تھے۔ذرا سی بھی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔

ہم ان دنوں روزنامہ ''آفاق'' کے سنڈے ایڈیشن کے انچارج تھے اس لئے لکھنے والوں سے ہمارا واسطہ پڑتا رہتا تھا۔اس بہانے ہماری منٹو صاحب سے بھی قربت ہو گئی۔یہاں تک کہ بعد میں ہم نے ان کے فلیٹ پر بھی جانا شروع کر دیا جو ہمارے دفتر کے نزدیک ہی تھا۔شام کے وقت ہم اکثر وہاں چلے جاتے اور منٹو صاحب کی اور ان کے ملاقاتیوں کی باتیں سنتے رہتے جو ادب و فلم کے علاوہ سیاست کے بارے میں بھی ہوتی تھیں۔ منٹو صاحب کا حلقہ بہت وسیع تھا اور زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد ان کے مداح اور عقیدت مند تھے۔ان محفلوں میں ہم نے بیٹھ کر بہت کچھ سیکھا اور حاصل کیا۔

ہماری جن لوگوں سے اکثر ملاقات رہا کرتی تھی ان میں مشہور شاعر اور دانشور ظہیر کاشمیری صاحب بھی شامل تھے۔ان کے علم و فضل اور شاعرانہ عظمت سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا مگر وہ جب موڈ میں ہوتے تو خاصے بے تکلف بھی ہو جایا کرتے تھے۔ہم بطور رشوت کئی میگزین انہیں پڑھنے کے لئے دیا کرتے تھے۔وہ چائے خانوں میں بھی بیٹھا کرتے تھے اس لئے وہاں بھی ان سے ملاقات کا موقع حاصل ہو جاتا تھا۔

ظہیر کاشمیری صاحب قیام پاکستان سے پہلے بھی فلموں کے لئے لکھ چکے تھا اور پاکستان بننے کے بعد بھی کہانیاں وغیرہ لکھتے رہے۔انہوں نے کچھ عرصہ بعد ''تین پھول'' کے نام سے ایک فلم بھی بنائی تھی جس کے ہدایت کار بھی وہ خود ہی تھے۔ یہ فلم کامیاب نہ ہو سکی بلکہ بد قسمتی سے ان کی کوئی بھی فلم کبھی کامیابی سے ہم کنار نہ ہوئی۔ ایک دن موقع پا کر ہم نے ظہیر کاشمیری صاحب سے پوچھا'' ظہیر صاحب یہ اسکرین پلے کیا ہوتا ہے اور کیسے لکھا جاتا ہے ؟

ظہیر صاحب مسکرائے اور اس کے جواب میں انہوں نے انگریزی اور اردو میں ہمیں ایک طویل لیکچر دیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میرے عزیز اسکرین پلے ایک ٹیکنی کل کام ہے۔ یہ بہت مشکل ہوتا ہے اور ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اسکرین پلے لکھنے کے لئے پہلے بہت سی موٹی موٹی کتابیں پڑھنی پڑتی ہیں۔ انسانی نفسیات کا گہرا مشاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ ادب کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے' ساری زندگی گزر جاتی ہے اس کے بعد کہیں جا کر کافی عرصے میں اسکرین پلے لکھنا آتا ہے۔

ہم تو ظہیر صاحب کی باتوں کو سن کر ڈر ہی گئے تھے۔ اتفاق سے دوسرے ہی دن ہمیں منٹو صاحب کے پاس جانے کا موقع مل گیا۔ بمبئی کی فلموں کا ذکر چل نکلا اور عصمت چغتائی کی فلمی کہانیوں کی بات شروع ہوئی تو ہم نے منٹو صاحب سے پوچھ لیا'' منٹو صاحب' یہ اسکرین پلے کیا ہوتا ہے۔ کیا یہ بہت مشکل کام ہے؟''

کہنے لگے ''اسکرین پلے کا مطلب ہے کہانی کو مختلف سینوں میں بانٹ دینا۔ اردو میں اسے منظر نامہ کہتے ہیں۔ کسی فلمی کہانی کو مختلف مناظر کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ بس اسی کو اسکرین پلے یا منظر نامہ کہتے ہیں۔''

ہم نے کہا ''مگر کاشمیری صاحب تو کہہ رہے تھے کہ یہ بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ ساری زندگی سیکھتے رہو تب کہیں جا کر آتا ہے۔ وہ ہنسنے لگے۔ اتفاق دیکھئے کہ اسی وقت ظہیر کاشمیری صاحب بھی آ گئے۔

منٹو صاحب نے کہا'' یار ظہیر۔ لڑکوں کو کیوں ڈراتا ہے؟ اسکرین پلے لکھنے میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں؟''

ظہیر کاشمیری کو ہر ایک ظہیر صاحب ہی کہا کرتا تھا۔ اسی طرح منٹو صاحب کو بھی صاحب کے بغیر کوئی مخاطب نہیں کرتا تھا مگر ہم نے دیکھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو صرف نام لے کر پکارا کرتے تھے۔

ظہیر صاحب ہنسنے لگے۔ منٹو صاحب نے ہمیں اس بارے میں کچھ اور باتیں بتائیں اور چند فلموں کی مثالیں دے کر بھی سمجھایا۔ اس روز ہمارے دل پر سے ایک بہت بھاری بوجھ ہٹ گیا اور ہمیں یہ احساس ہوا کہ اسکرین پلے کوئی ایسا کام نہیں ہے جسے ہم نہ کر سکیں۔

اسی زمانے میں ہماری ملاقات ڈبلیو زیڈ احمد صاحب سے بھی ہوئی۔ انہوں نے ''فلم کوآپریٹو'' کے نام سے ایک فلم ساز ادارہ بنایا تھا۔ مال روڈ پر واقع پنچولی اسٹوڈیو میں اس کا بہت شاندار دفتر تھا۔ اس زمانے میں یہ اسٹوڈیو ملکہ اسٹوڈیو

کہلاتا تھا کیونکہ یہ ملکہ پکھراج کو الاٹ ہو گیا تھا۔

ڈبلیو زیڈ احمد صاحب صحافیوں کی بہت قدر کرتے تھے۔ ادیبوں اور شاعروں کے بھی بہت دلدادہ تھے۔ ہماری آمد ورفت شروع ہوئی تو بہت جلد گہرے مراسم ہو گئے۔ ہم نے احمد صاحب کی کوٹھی پر بھی جانا شروع کر دیا جہاں شام سے صبح تک فلموں کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ احمد صاحب نے ہمیں فلموں اور اسکرین پلے وغیرہ کے متعلق بہت کچھ بتایا۔ وہ ہمیں ہالی ووڈ کی مشہور فلموں کی کہانیاں اس قدر تفصیل سے سناتے تھے کہ پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ہم خود وہ فلم دیکھ رہے ہیں۔ اسی زمانے میں ہماری، فلم کے بہت سے ممتاز لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ احمد صاحب نے اپنے اسٹوڈیو میں اس وقت کے، قریب قریب سبھی قابل ذکر فنکاروں کو ماہانہ تنخواہ پر ملازم رکھ لیا تھا۔ سنتوش کمار کی تنخواہ بارہ سو روپے تھی۔ شمی کو ہیروئن رکھا گیا تھا۔ ان کی تنخواہ غالباً آٹھ سو روپے ماہوار تھی۔ ہمالیہ والا اس منصوبے میں ان کے حصے دار بھی تھے مگر بعد میں ایسے اختلافات ہوئے کہ شدید مقدمہ بازی کی نوبت آ گئی۔ مسعود پرویز صاحب بھی اس ادارے کے لئے ایک فلم ""ستمگر"" بنا رہے تھے جس کے موسیقار خورشید انور تھے۔ احمد صاحب نے اپنی فلم ""روحی"" میں سنتوش کمار اور شمی کو مرکزی کردار دیئے تھے۔ رشید عطرے اس فلم کے موسیقار تھے۔

اس زمانے میں پاکستان میں برائے نام ہی فلمیں بنتی تھیں اس لئے ""فلم کو آپریٹو"" کی وجہ سے خاصی چہل پہل ہو گئی اور بہت سے لوگوں کو روزگار مل گیا۔ احمد صاحب کا پروگرام تھا کہ ایک سال میں چھ فلمیں بنائی جائیں گی اور ہر ایک کا ڈائریکٹر مختلف ہو گا۔ بعد میں یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اس ادارے کی بنائی ہوئی صرف ایک فلم ""روحی"" ریلیز ہوئی۔ باقی فلمیں نامکمل ہی رہ گئیں یا شروع ہی نہ ہو سکیں۔

اس زمانے کے دلچسپ واقعات بھی آپ کو سنائیں گے۔ پاکستان کے فلم والوں سے ہمارا تعارف اور جان پہچان صحیح معنوں میں اسی زمانے میں ہوئی تھی۔ احمد صاحب اور سیف صاحب سے ارادت مندی اور تعلقات کا بھی اسی زمانے میں آغاز ہوا۔ یہ دونوں حضرات بلا کے باتونی اور دنیا بھر کے موضوعات پر حاوی تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ شام کے وقت

ہم احمد صاحب کی کوٹھی پر جاتے۔ سیف صاحب بھی موجود ہوا کرتے تھے۔ شام کی چائے اور رات کے کھانے کے بعد کافی کا دور چلتا رہتا۔ شعر و ادب اور دنیا بھر کی فلموں کی باتیں ہوتی رہتیں یہاں تک کہ صبح ہو جاتی۔ کار اس زمانے میں نہ ہمارے پاس تھی اور نہ سیف صاحب کے پاس۔ چنانچہ فرید احمد کو جگایا جاتا جو ڈرائنگ روم ہی میں کسی صوفے پر سوئے ہوئے پائے جاتے تھے۔ سخت سردی کا موسم' اس پر رات کا اندھیرا۔ احمد صاحب فرید کو آواز دیتے ''سنی' اٹھو بھئی۔ ان لوگوں کو چھوڑنے جانا ہے۔'' سنی ان کا گھریلو نام تھا۔ یہ وہی فرید احمد ہیں جو بعد میں ہدایت کار بنے۔ جان پہچان' عندلیب' بندگی جیسی یادگار فلمیں بنائیں اور پھر کینیڈا چلے گئے تھے۔ چند ماہ قبل وطن واپس آ گئے تھے کیونکہ کینیڈا میں ڈاکٹروں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ ان کا کینسر اب لا علاج ہو چکا ہے' وہ تین ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکیں گے اس لئے تمام پرہیز اور علاج چھوڑ دیں اور جو جی میں آئے کریں' جس شخص کی زندگی کی میعاد ہی صرف تین ماہ باقی رہ گئی ہو اسے کسی بھی پابندی میں جکڑنا بے معنی تھا۔ چنانچہ فرید احمد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لاہور آ گئے۔ اپنے پرانے دوستوں اور پرانے رشتے داروں سے ملے۔ زندگی کے آخری لمحات اپنے والد کے بیڈ روم میں گزارے اور ڈاکٹروں کی پیش گوئی کے مطابق ٹھیک تین ماہ اور ایک دن بعد چپکے سے سوتے سوتے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان فرید احمد کی اور بھی بہت سی کہانیاں ہیں جو آگے چل کر سنائی جائیں گی۔

اس زمانے میں یہ صرف سنی تھے اور گورنمنٹ کالج سے تازہ تازہ گریجویٹ بن کر نکلے تھے۔ تھیٹر اور فلم ان کا شوق تھا۔ احمد صاحب انہیں گہری نیند سے جگاتے اور ہم لوگوں کو کار میں ڈراپ کرنے کے لئے کہتے کیونکہ اس قدر کڑاکے کی سردی میں صبح کے چار بجے کوئی اور ڈرائیور یہ خدمت انجام نہیں دے سکتا تھا۔ وہ بے چارے خاموشی سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتے' احمد صاحب باہر کار تک آ کر ہم سب کو خدا حافظ کہتے۔

فلم کو آپریٹو میں ہم نے جن قابل ذکر شخصیات کو دیکھا ان میں اداکارہ ''نینا'' بھی تھیں۔ یہ ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کی بیگم تھیں۔ ان کا اصلی نام شاہدہ تھا۔ علی گڑھ کے ایک انتہائی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور بی اے پاس تھیں۔ محسن عبداللہ سے ان کی شادی ہوئی تھی جو بمبئی کی ایک لیبارٹری میں کام کرتے تھے۔ ڈبلیو زیڈ احمد اس زمانے میں بمبئی میں فلمیں بنانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ شالیمار پکچرز کے نام سے انہوں نے پونا میں ایک فلم اسٹوڈیو بنایا

تھااور ہندوستان کا کوئی قابل ذکرادیب اور شاعر ایسانہ تھاجسے انہوں نے شالیمار کمپنی میں ملازم نہ رکھاہو۔یہاں تک کہ شاعرانقلاب جوش ملیح آبادی بھی ان کے سٹوڈیو میں ملازم تھے۔

بمبئی میں احمد صاحب نے شاہدہ بیگم کو دیکھاتو فلم میں کام کرنے کی پیش کش کی جوانہوں نے پس و پیش کے بعد قبول کرلی۔''ایک رات، من کی جیت''جیسی فلموں میں کام کرنے کے بعد وہ ہندوستان کی صف اول کی ہیروئن بن گئی تھیں ۔ اسی دوران میں محسن عبداللہ سے علیحدگی ہوگئی اورانہوں نے ڈبلیوزیڈاحمد سے شادی کرلی۔ان کی یاد گار فلموں میں ''میرابائی'' بھی شامل ہے۔کہتے ہیں کہ ان کے پاکیزہ حسن اور فطری اداکاری کے باعث ہندوؤں نے انہیں پوجناشروع کردیاتھا۔اخباروں نے تبصروں میں لکھاکہ ''میرابائی''اس سے بڑھ کر کیاہو گی؟اپنے حسن و جمال' بے ساختہ اور سادہ اداکاری کے باعث انہوں نے ہندوستان کی بڑی بڑی ہیروئینوں کے چراغ گل کردیئے تھے۔وہ کرشن جنم پرایک فلم میں کام کررہی تھیں کہ پاکستان قائم ہوگیا۔فسادات کی آگ نے بمبئی اور پوناکواپنی لپیٹ میں لے لیا۔احمد صاحب کے تمام رشتے دار پاکستان میں تھے۔وہ خود بھی کٹر پاکستانی تھے اس لئے پاکستان چلے آئے۔پاکستان آکر ''نینا'' نے صرف ایک فلم '' اکیلی''میں کام کیاتھاجو سید عطاءاللہ شاہ ہاشمی نے بنائی تھی۔اس کے بعد وہ اداکاری سے کنارہ کش ہوگئیں۔البتہ فلم کو آپریٹو میں اوراحمد صاحب کی فلموں میں ڈیکوریشن اور ملبوسات کے بارے میں وہ مشورہ دیتی رہتی تھیں۔

چند سال قبل طویل علالت کے بعدان کاانتقال ہوگیاتواحمد صاحب نے اپنے اسٹوڈیو کے احاطے میں ہی ان کو دفن کر دیا۔احمد صاحب ان کاتذکرہ یوں کرتے جیسے وہ ابھی تک زندہ سلامت ہوں۔وہ''بیگم صاحب''کہہ کران کانام لیتے تھے۔ہم آج تک یہ فیصلہ نہیں کرپائے کہ وہ ایک عظیم اداکارہ تھیں یاعظیم خاتون؟یہ فیصلہ کرناآسان بھی نہیں ہے۔ہم نے ان کی زبان سے کبھی فلمی زمانے کاکوئی تذکرہ نہیں سناتھا۔کبھی محسوس ہی نہیں ہواکہ ہمارے سامنے جو شفیق اور پروقار خاتون بیٹھی بے تکلفی سے باتیں کررہی ہیں کسی زمانے میں ہندوستان کی چوٹی کی ہیروئن تھیں۔

''روحی''کی ہیروئن شمی سے ہماری پہلے بھی ملاقات ہوچکی تھی۔وہ بونے سے قداور دلکش شکل وصورت رکھنے والی خاموشی پسند خاتون تھیں۔ہرایک سے بے تکلف بھی نہیں ہوتی تھیں۔اس زمانے میں وہ اور صبیحہ خانم ہی دو بڑی

ہیروئنیں تصور کی جاتی تھیں۔ تھوڑے عرصے بعد ہی انہوں نے اداکار سدھیر سے شادی کر کے اداکاری سے منہ موڑلیا۔شادی کے بعد انہوں نے سدھیر صاحب کی ایک فلم ''ساحل'' میں ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ پھر چند سال بعد سدھیر صاحب ہی کی ایک اور فلم ''بغاوت'' میں بھی ہیروئن کا رول ادا کیا اور اس کے بعد فلمی کیمرے نے کبھی ان کی جھلک تک نہیں دیکھی۔شادی کے بعد شمی نے فلمی تقریبات میں شرکت کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

پاکستان میں چھوٹے پیمانے پر صنعت فلم سازی دوبارہ قائم ہونے لگی تھی اگرچہ مشہور بھارتی فلمیں بھی سینما گھروں میں دکھائی جاتی تھیں لیکن پاکستان میں بننے والی فلموں کی تعداد میں بھی رفتہ رفتہ اضافہ ہونے لگا تھا۔شاہ نور اسٹوڈیو میں اب تین فلور بن چکے تھے۔ساز و سامان بھی مل گیا تھا۔کچھ شوکت حسین رضوی صاحب نے خود ہی تیار کر لیا تھا۔اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو کے علاوہ پنچولی اسٹوڈیو اور ملکہ اسٹوڈیو میں بھی فلمیں بننے لگی تھیں۔ بڑی غربت اور بے سروسامانی کا عالم تھا مگر پھر بھی لوگ نئے اور روشن مستقبل کی امید میں کاموں میں لگے ہوئے تھے۔پاکستان میں فلمی میگزین بھی نکل رہے تھے مگر ان کی تعداد بہت کم تھی۔''ڈائریکٹر'' کے مدیر شباب کیرانوی تھے۔''فلم لائٹ'' کے مالک و مدیر عیسیٰ غزنوی تھے۔''تیر و نشتر'' کے مالک و مدیر خواجہ خادم حسین تھے۔یہ لاہور کے فلمی پرچے تھے۔لاہور ہی سے انگریزی کا میگزین ''فلم ورلڈ'' اور ''مووی فلیش'' نکلتے تھے۔کراچی سے ہفت روزہ ''نگار'' شائع ہوتا تھا اور فلمی حلقوں میں اس کا بہت اثر تھا۔یہ اخباری سائز پر تھا۔اخباری سائز پر ہی ایک اور ہفتہ روزہ ''کردار'' بھی شائع ہوتا تھا جس کے مالک و مدیر خواجہ بقااللہ تھے۔بعد میں کراچی سے 'جب ایسٹرن فلم اسٹوڈیو بنا تو ایک انگریزی میگزین ''ایسٹرن فلمز'' بھی اسی ادارے کے زیر اہتمام شائع ہونے لگا۔فلمی پرچوں ہی کی اس زمانے میں قدر و قیمت ہوا کرتی تھی۔ بڑے بڑے اداکار اور فلم ساز و ہدایت کاران کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگے رہتے تھے۔میگزین کے سرورق پر جو رنگین تصویر شائع ہوتی تھی یہ بھی ایک اعزاز سمجھا جاتا تھا جس کے لئے ہیروئنوں میں مقابلہ جاری رہتا تھا۔اس سرورق کے اخراجات عام طور پر خود ہیروئن یا فلم ساز ادا کرتا تھا۔

ہم 1952ء میں روزنامہ ''آفاق'' سے وابستہ ہو گئے تھے۔اس زمانے کے بڑے نامور اور ممتاز صحافی اس اخبار میں کام کرتے تھے اور اس کی اشاعت بھی بہت زیادہ تھی۔کچھ عرصے بعد سنڈے ایڈیشن بھی ہمارے ذمے کر دیا گیا۔اسی

زمانے میں ہماری شناسائی سارے قابل ذکر شاعروں' ادیبوں اور افسانہ نگاروں سے ہوئی کیونکہ ''آفاق' ' کا سنڈے ایڈیشن ایک مؤقر اشاعت سمجھی جاتی تھی۔ ہر ایک اس میں اپنی تحریریں شائع کرانا چاہتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ''آفاق'' لکھنے والوں کو معاوضے بھی دیا کرتا تھا۔ غزل یا نظم کا معاوضہ دس روپے تھا۔ نثری مضمون یا افسانے کا معاوضہ پندرہ روپے مقرر تھا۔ اس زمانے میں یہ بھی خاصی رقم تھی۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب کہ ''امروز'' کے سوا کوئی دوسرا اخبار لکھنے والوں کو معاوضہ ہی نہیں ادا کرتا تھا۔ سعادت حسن منٹو صاحب کے لئے خصوصی طور پر پچیس روپے معاوضہ مقرر تھا۔ ہاں' ہم یہ بتانا بھول گئے کہ فلمی ماہنامہ ''ڈائریکٹر'' بھی لکھنے والوں کو معاوضہ ادا کرتا تھا۔ اس وقت کے ممتاز اور اہل قلم اس میں لکھا کرتے تھے اور وہاں ان کی آمد و رفت بھی تھی۔ شباب کیرانوی اسی زمانے میں لاہور کے علمی و ادبی حلقوں میں معروف اور مقبول ہو چکے تھے۔

''آفاق'' میں بھی نئے اور پرانے لکھنے والوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ سبھی سے ہماری دوستی ہو گئی تھی۔ ابراہیم جلیس کراچی سے آتے تو ہمارے دفتر ضرور آتے۔ گپ شپ بھی ہو جاتی اور آمدنی بھی۔ کبھی وہ منیر نیازی کے ساتھ گھومتے ہوئے آجاتے۔ منیر نیازی کہتے ''یار آفاقی۔ یہ شکرا، کراچی سے آیا ہوا ہے۔ اس کی خاطر مدارت بھی کرنی ہے۔''
وہ ایک غزل یا نظم لکھ کر دیتے اور ابراہیم جلیس کے ساتھ قہقہے لگاتے ہوئے رخصت ہو جاتے۔ وہ بڑے عجیب اور خوب صورت انسان تھے۔

بمبئی اور دلی سے شائع ہونے والے اردو' انگریزی فلمی پرچے بھی کھلے عام بازار میں فروخت ہوا کرتے تھے۔ ''فلم فیئر'' بہت خوب صورت پرچہ تھا۔ اس کی قیمت صرف آٹھ آنے تھی۔ اسی زمانے میں بمبئی سے اخباری سائز پر ایک اور اچھا فلم میگزین شائع ہونے لگا' اس کا نام ''اسکرین'' تھا۔ اس کی قیمت صرف چار آنے تھی حالانکہ کافی ضخیم پرچہ تھا اور اس میں خبریں اور تبصرے بھی زیادہ ہوا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں لاہور میں ایک ایسا ہنگامہ خیز فلمی واقعہ رونما ہوا جس نے پاکستان کی ننھی منی سی فلمی دنیا میں ہلچل مچا دی۔ معلوم ہوا کہ ہالی ووڈ کی ایک مشہور فلم ساز کمپنی نے اپنی فلم ''بھوانی جنکشن'' کی فلم بندی لاہور میں کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لاہور والوں کی تو جیسے عید ہو گئی۔ ہالی ووڈ کی فلم کا یونٹ لاہور آنے والا تھا۔ جس میں اس دور کے سپر

اسٹار ایوا گارڈنر اور اسٹیورٹ گرینجر مرکزی ادا کر رہے تھے۔ ایوا گارڈنر اپنے حسن و جمال اور اسکینڈلز کے باعث دنیا بھر میں مشہور تھیں۔ اسٹیورٹ گرینجر کی بہت سی فلموں نے دھومیں مچادی تھیں۔ وہ اس زمانے کی ایک مشہور ہیروئن جین سمنز کے شوہر بھی تھے۔ اس فلم کے ہدایت کار جارج کیوکر تھے جو ہالی ووڈ کے صف اول کے ہدایت کاروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ پاکستان کے روزنامے اس زمانے میں فلموں کی خبریں شائع نہیں کرتے تھے مگر ہالی ووڈ کی فلم کی تو بات ہی اور تھی۔ ""ڈان"" سے لے کر ""پاکستان ٹائمز"" اور ""امروز"" سے لے کر "" جنگ' نوائے وقت اور آفاق"" اخبارات میں بھی ""بھوانی جنکشن"" کے حوالے سے خبریں شائع ہونے لگیں۔

فلم "" بھوانی جنکشن"" اسی نام کے ایک انگریزی ناول کی کہانی پر مبنی تھی۔ اس کا پس منظر بھارت کا تھا۔ یہ انگریزی دور حکومت کی کہانی تھی جب کانگریس نے انگریزی حکومت کے خلاف پر زور تحریک شروع کی تھی۔ بھوانی جنکشن کے مقام پر کانگرسیوں نے ریل گاڑیوں کے سامنے ہزاروں رضاکاروں کو لٹا دیا تھا' حکومت کے لئے یہ مشکل آئی تھی کہ اگر ٹرین کا پہیہ رک جائے تو سرکار کی سبکی ہو گی اور اگر رضاکاروں پر سے ٹرین گزار دی جائے تو سینکڑوں افراد ہلاک ہوں گے۔ اور سارے ملک میں ہنگامہ مچ جائے گا۔

اس فلم کی شوٹنگ کے لئے پہلے بھارت میں پروگرام بنایا گیا تھا اور فلم ساز کی خواہش تھی کہ ""بھوانی"" کے اصل مقام پر تمام مناظر فلمائے جائیں مگر بھارت حکومت نے کانگرسیوں کے جذبات کو مجروح نہ کرنے کے پیش نظر وہاں فلم بندی کی اجازت نہیں دی۔ فلم کا تمام منصوبہ مکمل ہو چکا تھا اور اس پر لاکھوں ڈالر خرچ ہو چکے تھے۔ اس منصوبے کو ملتوی یا منسوخ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کا حل یہی تلاش کیا گیا کہ فلم کی شوٹنگ بھارت کی بجائے پاکستان میں کر لی جائے۔ مناظر اور پس منظر کے حساب سے دونوں ملک ایک جیسے ہیں۔ لوگوں کی رنگت اور چہرے بھی زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ رہی سہی کسر میک اپ اور لباسوں سے پوری کر لی جائے گی۔ چنانچہ یہ پراجیکٹ بھارت سے پاکستان منتقل کر دیا گیا۔ پاکستان کی حکومت نے نہ صرف شوٹنگ کی اجازت دے دی بلکہ ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرنے کا وعدہ بھی کر لیا۔ پاکستان کی نوکر شاہی کی ذہنیت سے آپ اور ہم سبھی واقف ہیں۔ ان کے ذہن سے انگریز کی غلامی کا زہر آج

تک نہیں نکلا ہے۔ ہر سفید فام ان کے لئے مرعوب کن ہے۔ یہ اس کے آگے آنکھیں بچھانے کو بھی بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔

فلم ''بھوانی جنکشن'' کی ابتدائی تیاریوں کے سلسلے میں پہلے کچھ لوگ لاہور آئے۔ انہوں نے شوٹنگ کرنے کے لئے مناسب جگہوں کا انتخاب کیا۔ لاہور کا قلعہ اور آس پاس کے مقامات انہیں پسند آئے۔ فلم کے اہم مناظر ریلوے اسٹیشن پر فلمائے جانے تھے۔ اس مقصد کے لئے ریلوے انتظامیہ نے لاہور ریلوے اسٹیشن کے دو پلیٹ فارم ان کے سپرد کر دیئے۔ یہ وہ انتظامیہ تھی جو پاکستانی فلم سازوں کو پلیٹ فارم پر ایک دو مناظر فلمانے کے لئے بھی بڑی مشکل سے اجازت دیتی تھی۔ اسٹیشن کا پلیٹ فارم نمبر ایک اور پلیٹ فارم نمبر دو فلم یونٹ کے حوالے کر دیئے گئے جہاں انہوں نے اپنی ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کرلیں۔ لاہور کی جگہ پلیٹ فارم پر بھوانی جنکشن کا نام لکھ دیا گیا۔ چند روز کے اندر ہی انہوں نے لاہور کے ریلوے اسٹیشن کے ایک حصے کا حلیہ ہی بدل کر رکھ دیا۔

اس زمانے میں پاکستان کی فلمی صنعت اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ ہر چیز کی کمی تھی پھر بھارتی فلموں سے مقابلہ بھی جاری تھا اس کے باوجود فلمی صنعت سے تعلق رکھنے والے جدوجہد میں مصروف تھے۔ ایک طرف انہیں حکومت کی بے پروائی، بے نیازی بلکہ ہتک آمیز سلوک کا سامنا تھا تو دوسری طرف فلم ڈسٹری بیوٹرز تھے جو سستے داموں بھارت کی اعلیٰ ترین فلمیں درآمد کرکے کسی رسک کے بغیر بے شمار منافع کما رہے تھے۔ سینما گھروں کے مالکوں کا رویہ بھی یہی تھا۔ وہ بہرصورت پاکستانی فلموں کے مقابلے میں بھارت کی سپرہٹ فلموں کی نمائش کو ترجیح دیتے تھے جو ان کے لئے منافع کا ذریعہ تھا۔ فلم بینوں کی طرف سے بھی کوئی حوصلہ افزائی میسر نہ تھی۔ عام آدمی تو بھارتی فلموں اور فن کاروں کے گلیمر کا رسیا تھا۔ وہ دلیپ کمار، راج کپور، مدھوبالا اور نرگس کو چھوڑ کر پاکستان کے گمنام فن کاروں کے اناڑی پن سے بنی ہوئی فلموں کو دیکھنے کیوں جاتا؟ اس کے مقابلے میں تعلیم یافتہ طبقے نے دیکھے بغیر ہی پاکستانی فلموں کو مسترد کر دیا تھا اور یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ یہ انتہائی بے مغز، بے مقصد اور غیر معیاری ہوتی ہیں۔ یہ لوگ انگریزی اور بھارتی فلمیں تو دیکھ لیا کرتے تھے مگر پاکستانی فلموں کے نام پر ناک بھوں چڑھاتے اور ہزاروں اعتراض جڑ دیتے تھے۔ سرکاری افسروں کا بھی یہی رویہ تھا۔ ان کے خیال میں اگر کچھ لوگ پاکستان میں فلمیں بنا رہے تھے یا بنانے کی کوشش

کررہے تھے تو انہیں دیوانہ یا جنونی ہی کہا جاسکتا ہے۔ فلموں کے حوالے سے عام لوگوں کو، خواص کو یہاں تک کہ اخبارات تک کو پاکستانی فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک عجیب سرد مہری اور کسمپرسی کا عالم طاری تھا۔
ایسے میں جب ہالی ووڈ کی ایک بہت بڑی فلم ''بھوانی جنکشن'' کو لاہور میں بنانے کا فیصلہ کیا گیا تو ایک چہل پہل سی پیدا ہو گئی۔ ''بھوانی جنکشن'' کے فن کاروں اور ہدایت کار کو پاکستان میں بہت شہرت اور مقبولیت حاصل تھی۔ ایوا گارڈنر لاہور کے فلم بینوں کی ''ڈارلنگ'' تھیں۔ اسٹیورٹ گرینجر کی بھی کئی فلمیں ہٹ ہو چکی تھیں۔ ہدایت کار جارج کیوکر اپنے میدان میں ماہر اور ہنر مند شخص سمجھے جاتے تھے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ہالی ووڈ کے فلم یونٹ کو کام کرتے ہوئے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ سرکاری حلقوں سے لے کر عوام اور اخبار نویسوں تک سبھی اس یونٹ کے انتظار میں بیٹھ گئے۔
''بھوانی جنکشن'' کے لئے .... بہت وسیع پیمانے پر انتظامات کئے گئے مثال کے طور پر قریب قریب فلم کے چالیس نوجوان اور ذہین لوگوں کو معاون ہدایت کار کے طور پر بھرتی کیا گیا جن میں سے بعض آگے چل کر نامور ہدایت کار بنے۔ فرید احمد، قدیر جیسے ہدایت کاروں کو اسی فلم میں پہلی بار فلم سازی کا تجربہ حاصل ہوا تھا۔ ان چالیس معاونوں کے سپرد مختلف کام تھے۔ اسی شوٹنگ کے لئے سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایکسٹراؤں کی ضرورت تھی۔ انہیں فراہم کرنے کی ذمہ داری بھی معاون ہدایت کاروں پر ڈال دی گئی۔ مقامی طور پر جتنے بھی کام ہو سکتے تھے وہ سب پاکستانیوں کے سپرد کر دیئے گئے۔ اس فلم میں کام کرنے والوں نے ہمت افزائی کے بعد فلمی صنعت کے مختلف شعبوں میں کام کیا اور بڑا نام پیدا کیا۔ نیلو نے پہلی بار اسی فلم میں ایک ایکسٹرا کے طور پر کام کیا تھا۔ بعد میں انہوں نے حوصلہ پا کر پاکستانی فلموں میں چھوٹے موٹے کردار کئے اور پھر رقاصہ کے طور پر متعارف ہوئیں، یہاں تک کہ بہت بڑی اور مقبول ہیروئن بن گئیں۔ اس طرح کی اور بھی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ''بھوانی جنکشن'' کے یونٹ کی پاکستان میں آمد تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند تھی۔ جس کی تازگی نے بہت سے تعلیم یافتہ اور ذہین نوجوان ذہنوں کو فلمی صنعت کی طرف راغب کیا اور انہیں یہ احساس دلایا کہ فلم بھی ایک تخلیقی کام ہے اور ذریعہ عزت بن سکتی ہے۔
''بھوانی جنکشن'' کا فلم یونٹ لاہور کے فلیٹیز ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ یہ اس زمانے میں لاہور کا بہترین ہوٹل سمجھا جاتا

تھا۔ فلم یونٹ کے لئے ہوٹل کا بیشتر حصہ بک کر لیا گیا تھا جس میں اداکار، ہنر منداور یونٹ کے دوسرے افراد مقیم تھے۔ ان لوگوں کے کھانے پینے کا بطور خاص بندوبست کیا گیا تھا۔ پینے کے لئے پانی بھی بذریعہ ہوائی جہاز باہر سے منگایا جاتا تھا۔ ہوٹل کے باورچی خانے کی بہت اچھی طرح صفائی کی گئی تھی اور باہر سے آئے ہوئے باورچیوں کی نگرانی میں کھانا تیار کیا جاتا تھا۔ نظم وضبط کا یہ عالم تھا کہ اداکاروں سمیت ہر شخص کو رات نو بجے سو جانا پڑتا تھا کیونکہ کمروں کی روشنیاں بجھادی جاتی تھیں۔ صبح اٹھنے اور ناشتہ کرنے کے لئے بھی ایک وقت مقرر تھا۔ ایوا گارڈنر کو بھی اسی وقت اٹھ کر تیار ہونا پڑتا تھا۔ اس بات کی سخت نگرانی کی جاتی تھی کہ فلم یونٹ کے ارکان سے کوئی بھی ملاقات نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ ٹیلی فون پر بات کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ان تمام کاموں کے انچارج ایک ادھیڑ عمر لیکن نہایت محنتی اور اسمارٹ امریکن تھا جن کا نام پال ملز تھا۔ پال ملز اس فلم یونٹ کے مختار مطلق تھے۔ ان کی مرضی کے مطابق پتا تک حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ پروڈکشن کے تمام انتظامات بھی ان ہی کے سپرد تھے جو وہ اپنے امریکی اور پاکستانی عملے کے ذریعے سر انجام دیا کرتے تھے۔ لیکن فلم کے سربراہ دراصل ہدایت کار جارج کیو کر تھے جن کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ حکم کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ایک جنرل کی طرح احکامات صادر کرتے تھے جن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مسٹر پال ملز اپنی فوج کے ساتھ موجود تھے۔

ہم بھی صحافی تھے۔ ایک ممتاز اخبار سے ہمارا تعلق تھا۔ مغرب کے لوگ صحافیوں کو ویسے بھی بہت عزت اور اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں اضافی سہولت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ یہ تھی کہ پنجاب کے محکمہ اطلاعات کے ایک انفارمیشن آفیسر آغا حسام الدین اکبر ہمارے بہت گہرے دوست تھے۔ انہیں حکومت کی جانب سے فلم یونٹ کو مشورے دینے پر مامور کیا گیا تھا۔ پال ملز صاحب ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر وقت پال ملز کے پاس جا سکتے تھے اور ان کی ہر بات مانی جاتی تھی۔ یہ حسام الدین اکبر صاحب فلموں کے بھی شوقین تھے اور ہمارے گہرے دوست بھی تھے۔ جب وہ پال ملز کے مشیر مقرر ہوئے تو ہمارے مزے آ گئے " سیاں بھئے کوتوال پھر ڈر کس کا؟"

اکبر صاحب نے سب سے پہلے تو ہمیں پال ملز سے ملوایا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ پال ملز تک رسائی کسی بڑے سے بڑے افسر تک کے لئے بھی ممکن نہیں تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ صبح سے رات گئے تک مصروف رہتا تھا۔ اس کے پاس ٹیلی فون

سننے کے لئے بھی وقت نہیں تھا۔ کوئی بہت اہم ٹیلی فون کال ہی اس تک پہنچائی جاتی تھی۔ لاہور کے بڑے بڑے لوگ (اور خواتین) اس سے ملنے کی آس میں رہتے تھے کہ شاید اس بہانے ایوا گارڈنر یا اسٹیورٹ گرینجر سے ملاقات ہو جائے مگر پال ملز کے پاس ان سے بات کرنے کی مہلت نہ تھی۔ ایسے بااختیار اور مصروف شخص سے اکبر صاحب نے ہمیں بڑے معزز انداز سے ملایا۔ انہوں نے فون کیا کہ وہ گاڑی لے کر ہمارے دفتر پہنچ رہے ہیں جہاں سے ہمیں پال ملز کے پاس لے جائیں گے۔ فلم یونٹ کی سروس میں بہت سی گاڑیاں تھیں۔ اس زمانے میں لاہور میں صرف پرائیویٹ ٹیکسیاں ہوا کرتی تھیں۔ یہ بڑی کاریں تھیں، میٹر کا کوئی سوال نہیں تھا۔ باہر سے آئے ہوئے سیاحوں کے سوا کوئی ان کا بھاری کرایہ ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اکبر صاحب نے پہلے تو لاہور کی تمام پرائیویٹ ٹیکسیوں کو چند روز کے لئے کرائے پر حاصل کیا۔ پھر راولپنڈی اور پشاور سے پرائیویٹ ٹیکسیاں بھی منگائی گئیں۔ اس کے باوجود ضرورت پوری نہ ہوئی تو اپنے جاننے والوں کی کاریں کرائے پر حاصل کر لیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور میں کاریں چند سو کی تعداد میں تھیں۔ مال روڈ جیسی مصروف اور مشہور سڑک پر کھڑے ہو جائیں تو کافی دیر کے بعد کوئی کار گزر جاتی۔ شہر میں کاروں کے مالک انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔

وقت مقررہ پر حسام الدین اکبر صاحب ہمارے دفتر پہنچ گئے۔ وہاں سے فلیٹیز کا سفر پانچ منٹ سے زیادہ کا نہ تھا۔ فلیٹیز پہنچے تو دیکھا کہ ایک اژدھام ہے۔ عورتیں، مرد، بچے، امیر، غریب ہر قسم کے لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے۔ یہ سب فلمی ستاروں سے ملنے یا ان کی ایک جھلک دیکھنے کی آس پر صبح سے رات گئے تک کھڑے رہتے تھے۔ ان میں دولت مند، بااثر اور ممتاز لوگ بھی تھے۔ سرکاری افسر بھی دیدار کے مشتاق تھے۔ مگر یہ بے چارے ہوٹل کے برآمدے تک بھی نہیں پھٹک سکتے تھے ملاقات تو دور کی بات ہے۔

ہماری کار وہاں پہنچی تو مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا۔ کار پورچ کے پاس جا کر رک گئی۔ وہاں سے ہم پال ملز کے کمرے کی طرف چل پڑے جو ایک گوشے میں نچلی منزل پر تھا۔ ہم ایسے علاقے میں سے گزر رہے تھے جہاں جاتے ہوئے بقول اکبر فرشتوں کے پر جلتے تھے۔ دور کھڑے لوگوں نے بڑی حسرت اور حسد سے ہمیں دیکھا۔ ہم حسام الدین اکبر صاحب کے ساتھ تھے اس لئے ہمارے لئے تمام بند دروازے کھلے ہوئے تھے۔

پال ملز کا کمرہ کاغذات اور مختلف قسم کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ان کی بڑی سی میز پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے اور دو تین ٹیلی فون ہمیشہ بج رہے تھے۔وہ لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ بیک وقت فون پر باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔وہ چھ فٹ سے زیادہ قد کے ایک صحت مند آدمی تھے۔صورت شکل اور لب و لہجے کے اعتبار سے خالص امریکی لگتے تھے۔اس سے پہلے ہم نے کسی سچ مچ کے امریکی کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔جب انہیں دیکھا تو وہ بھی کسی امریکن فلم کا کردار ہی نظر آئے۔یہ تجربہ ہمیں بعد میں ہوا کہ امریکی عام زندگی میں بھی اسی طرح بولتے جاتے ہیں جیسے کہ فلموں میں نظر آتے ہیں۔ان کی فلموں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہوتی۔

انہوں نے فون رکھا تو اکبر صاحب نے ہمارا تعارف کرایا اور کچھ مبالغے سے بھی کام لیا۔پال ملز نے بڑے گرم جوشی سے کھڑے ہو کر ہم سے ہاتھ ملایا۔اپنی عدیم الفرصتی پر ندامت کا اظہار کیا اور پھر شانے اچکاتے ہوئے بولے۔

''ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔بادل اور بارش کی وجہ سے بھی ایک دو دن ضائع ہو چکے ہیں لاہور کے لوگ یہ سمجھ رہے ہیں جیسے ہم یہاں محض سیر و تفریح کرنے اور دعوتیں اٹینڈ کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ان کی میزبانی کا میں شکر گزار ہوں مگر ہماری مجبوریاں کوئی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔''

اتنی دیر میں ایک فیشن ایبل اور خوب صورت خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔انہوں نے کہا''آپ کی سیکرٹری نے مجھے ملاقات کا وقت دیا تھا۔''

''آپ کہتی ہیں تو ضرور دیا ہو گا۔میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟''

انہوں نے بات شروع کی''مجھے مس ایوا گارڈنر سے ملنے کا بہت شوق ہے۔''

پال ملز نے فوراً بات کاٹ دی''سوری میڈم۔یہ ممکن نہیں ہے اور کوئی خدمت۔''

وہ کچھ پریشان سی ہو گئیں''جی۔وہ دراصل۔''

''میڈم،آپ ہماری مشکل سمجھنے کی کوشش کریں۔ہم پہلے ہی شیڈول سے پیچھے جا رہے ہیں۔''

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھیں مگر پھر خاموشی سے رخصت ہو گئیں۔

''دیکھا آپ نے''پال ملز نے کہا''میرا زیادہ وقت اس قسم کی باتوں میں ضائع ہو جاتا ہے۔''

فون کی گھنٹی بجی۔ پال ملز نے ایک لمحہ سنا ایک آہ سرد بھر کر مجبوری کے عالم میں چھت کی طرف دیکھا اور پھر کہا ''او کے۔ بھیج دو۔''

چند لمحے بعد ایک اسمارٹ، خوش لباس اور خوش شکل صاحب اندر داخل ہوئے۔

''میں گورنمنٹ ہاؤس سے آیا ہوں۔ آپ سے گورنر صاحب کے سیکرٹری نے بات کی ہوگی؟''

''مگر میں نے معذرت کر دی ہے۔ افسوس کہ میں گورنر صاحب کی فرمائش پوری نہیں کر سکتا۔''

انہوں نے کہا ''اگر مس گارڈنر اور مسٹر گرینجر ساری تقریب میں شریک نہیں ہو سکتے تو صرف ایک گھنٹے کے لیے آ جائیں۔ گورنر ہاؤس میں بہت اعلیٰ پیمانے کی تقریب ہے۔ شہر کی ''بالائی'' وہاں موجود ہو گی۔''

پال ملز نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''نوجوان۔ آپ جانتے ہیں کہ ہماری شوٹنگ مسلسل ہو رہی ہے۔ وہ دونوں قلعے میں شوٹنگ کر رہے ہیں۔ وہاں سے آنا ان کا کیسے ممکن ہے؟''

''لیکن۔''

''سوری آپ گورنر تک میری معذرت پہنچا دیجئے۔ تھینک یو اور گڈ بائی۔'' پال ملز نے انہیں فارغ کر دیا۔

ہمیں یہ سب کچھ بہت عجیب سا لگا۔ جو صاحب ابھی ہمارے سامنے ایک اداکارہ سے وقت حاصل کرنے کی بھیک مانگ رہے تھے۔ وہ ایک بڑے بیوروکریٹ تھے جو پاکستانی اداکاروں سے سیدھے منہ بات کرنا بھی اپنی توہین خیال کرتے تھے۔ ادھر گورنر صاحب کی فن شناسی پر ہمیں حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ اگر کوئی بڑے سے بڑا پاکستانی آرٹسٹ گورنر صاحب سے ملاقات کی درخواست کرتا تو شاید مہینوں اس کے لئے سفارشیں ہی ڈھونڈتا رہتا۔ مگر ہالی ووڈ کے دو فن کاروں کو اپنی اعلیٰ ترین پارٹی میں چند لمحے کے لیے شریک کرنے کے لیے بھی منت سماجت کی جا رہی تھی اور اس کے باوجود تمام سرکاری رعب داب رائگاں جا رہا تھا۔

پال ملز نے کندھے اچکائے۔ ایک نئی سگریٹ سلگائی اور کہا ''آخر یہ لوگ سمجھتے کیوں نہیں ہیں کہ ہم یہاں کام کرنے آئے ہیں جو ہمیں مقررہ وقت میں ختم کرنا ہے۔''

آغا حسام الدین اکبر نے صفائی پیش کی۔ ''دراصل آرٹسٹوں کا کریز تو سبھی کو ہوتا ہے۔ امریکہ میں بھی صدر انہیں

وہائٹ ہاؤس میں بلا کر خوش ہوتے ہیں۔''

''مگر وہ انہیں فارغ وقت میں بلاتے ہیں۔ان کے کام میں حرج نہیں پیدا کرتے۔''

پال ملز نے اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا۔کاغذات کا مطالعہ 'لکھنا' پڑھنا 'فائلیں دیکھنا' اس دوران میں بے شمار ٹیلی فون بھی سنتے رہنا۔ہم اس شخص کو سرتاپا مصروف دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ہماری کافی ختم ہو چکی تھی۔یہ پال ملز نے بھی دیکھ لیا تھا۔ہم نے رخصت کی اجازت چاہی تو وہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور کہا۔

'' آپ کو جس قسم کی بھی مدد کی ضرورت ہو تو مسٹر اکبر کو بتادیں۔یہ آپ کا مسئلہ حل کر دیں گے۔آپ پر یہاں آنے پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔اگر اکبر چاہیں تو آپ کو شوٹنگ پر بھی لا سکتے ہیں۔''

ہم نے شکریہ ادا کیا اور جانے کے لیے مڑے مگر وہیں ساکت رہ گئے۔اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور خوشبو کا ایک جھونکا اندر داخل ہوا۔خوشبو کے پیچھے پیچھے ایک انتہائی خوبصورت عورت بھی اندر آئی۔اس کے حسن وجمال اور دلکشی کے پیش نظر اسے آسمانی مخلوق ہی کہا جا سکتا تھا۔مگر آسمانی مخلوق نے جب زبان کھولی تو انگریزی بولنی شروع کر دی۔

''ہائی پال '' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔اسے آپ ملین ڈالر مسکرہٹ بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ اپنی مسکراہٹ کا بہت معقول معاوضہ وصول کرنے کی عادی تھی۔

''ہائی ایوا۔'' پال ملز نے کاغذات سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔'' تم اور اس وقت یہاں؟''

''آج کا میرا شیڈول ختم ہو گیا ہے۔وہ لوگ ابھی مصروف ہیں۔تمھارے خیال میں مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟''

پال ملز مسکرایا۔'' ہنی اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو باتھ روم میں جا کر ایک گرم باتھ لیتا۔پھر اپنے کمرے میں ڈرنکس کرتا اور ریلیکس کرتا۔اسکرپٹ کا مطالعہ کرتا۔اس لیے کہ کل صبح تمہیں اس مصیبت کا سامنا کرنا ہو گا۔''

''اوکے پال۔'' ایوا گارڈنر نے اپنے خوبصورت شانوں کو حرکت دی اور جیسے کمرہ حرکت میں آ گیا۔'' تم بہت خود غرض ہو۔مگر یو آر دی باس۔بائی۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے رخصت ہو گئی۔اس کے جاتے ہی کمرے میں روشنی مدھم پڑ گئی مگر خوشبو بہت دیر تک پھیلی

رہی۔ ہمیں یقین نہیں آرہا تھا کہ چند لمحے پیشتر جو دراز قد اور انتہائی پر کشش عورت ہمارے سامنے کھڑی ہوئی تھی وہ ہالی ووڈ کی اسٹار ایوا گارڈنر تھی جس کی ایک جھلک دیکھنے کو کروڑوں انسان ترستے ہیں۔ ایک فرلانگ کے فاصلے پر گورنر ہاؤس میں بیٹھے ہوئے خود ہمارے گورنر صاحب اسے چند لمحوں کے لیے اپنا مہمان بنانے کے خواہاں ہیں۔ان گنت دلوں کی ملکہ ایوا گارڈنر یوں اچانک ہمارے سامنے آکر کھڑی ہو جائے گی یہ ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔

ایو اگارڈنر کو ہم نے فلموں میں دیکھا تھا مگر سچ مچ ایوا گارڈنر فلموں والی ایوا گارڈنر سے کہیں حسین اور دلربا تھی۔ وہ رعنائی کا مجسمہ تھی۔اس کا رنگ شہد اور دودھ کے آمیزے جیسا تھا۔ بال بھورے تھے۔آنکھیں سبزی مائل تھیں یا براؤن؟ کچھ یاد نہیں آرہا۔اس کی مسکراہٹ میں ایسی کشش تھی کہ جی چاہتا تھا بس وہ مسکراتی رہے' کوئی اور کام نہ کرے۔ وہ اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس تھی۔ اسکرٹ میں سے اس کی سڈول اور خوبصورت ٹانگیں نمایاں نظر آرہی تھیں۔ہم نے سوچا کہ واقعی اس عورت کو ہیروئن ہی ہونا چاہیے تھا۔اور اگر اس کے درجنوں اسکینڈلز سننے میں آتے ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔

آغا حسام الدین اکبر اور ہم پال ملز کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

''کیوں آغا صاحب۔'' اکبر صاحب ہمیں کبھی کبھی آغا بھی کہتے تھے'' کیسی لگی؟''

ہم نے کہا'' بہت اچھی۔''

''ہماری فلموں میں چلے گی''

''بالکل نہیں۔''

وہ حیران رہ گئے'' وہ کیوں؟''

''بھائی نہ اسے ناچ آتا ہے نہ گانا۔ درختوں اور کھمبوں کے پیچھے چھپ کر عشق کرنا بھی نہیں آتا۔سب سے بڑھ کر یہ کہ جاہل ہے۔یعنی اردو سے نابلد ہے۔''

آغا حسام الدین اکبر ہنسنے لگے۔'' مجھے آپ کے فیصلے سے اتفاق ہے۔یقین رکھیے ہم اسے پاکستان کی کسی فلم میں کاسٹ نہیں کریں گے۔''

ہوٹل کے دوسرے حصے میں خاصی گہما گہمی نظر آرہی تھی۔ وہاں اسٹاف کے پاکستانی ارکان اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

اکبر صاحب نے کہا ''کل ریلوے اسٹیشن پر شوٹنگ ہے۔ چلو گے ؟''

''کیوں نہیں، ضرور۔''

''گیارہ بجے تیار رہنا۔ آفس سے لے لوں گا۔''

انہوں نے ہمیں دوبارہ ہمارے آفس کے سامنے ڈراپ کر دیا۔ یہ تو نہیں کہ ہم ایوا گارڈنر ہی کے دھیان میں کھوئے رہے مگر دوبارہ اس کا سراپا آنکھوں کے سامنے لہرا سا گیا۔ اور اس کی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ اس کی آواز میں شرینی اور نزاکت نہیں تھی۔ لیکن ایک عجیب سی لگاوٹ تھی جو۔۔۔ مردانہ احساسات متاثر کرتی تھی

دوسرے دن اکبر صاحب ٹھیک گیارہ بجے ہمارے دفتر میں موجود تھے۔ ان کی گاڑی میں سوار ہو کر ہم نے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا۔ اس زمانے میں زیادہ ہجوم تو ہوتا نہیں تھا مگر ہم نے دیکھا کہ ریلوے اسٹیشن کے آس پاس سینکڑوں ہزاروں کا مجمع لگا ہوا ہے۔ یہ سب لوگ شوٹنگ اور اداکاروں کو دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ پولیس کا معقول انتظام تھا جو انہیں ایک مخصوص علاقے سے آگے نہیں جانے دیتی تھی۔ ہماری گاڑی پر تو اسٹکر لگا ہوا تھا۔ بلا روک ٹوک سائیڈ کے راستے سے اندر پہنچ گئے۔ یہ پلیٹ فارم وہ تھا جہاں وزیروں وغیرہ کے سیلون کھڑے ہوتے ہیں۔ مگر ہالی ووڈ کی فلم کی خاطر وزیروں نے بھی اپنی مونچھ نیچی کر لی تھی۔ خدا جانے ان کے خصوصی سیلون کون سے پلیٹ فارم پر لگے ہوئے تھے۔ گاڑی سے اتر کر اندر پہنچے تو اندر کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ یہ معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ لاہور کا پلیٹ فارم ہے۔ جگہ جگہ اردو، ہندی اور انگریزی میں '' بھوانی جنکشن'' کے بورڈ لگے ہوئے تھے ریلوے کی وردیاں پہنے ہوئے کچھ انگریز بھی ٹکٹ چیکرز کے روپ میں پھر رہے تھے۔ ایک طرف ہندوستان کی پولیس کی وردیوں میں ملبوس سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ نیکر، پنڈلیوں پر پٹیاں، سروں پر پگڑیاں، کالے کالے، دبلے پتلے چہرے۔ انگریزی عہد حکومت

میں اس علاقے میں ایسے ہی پولیس والے ہوتے ہوں گے اسی لیے ہالی ووڈ کے فلم سازوں نے بالکل ویسا ہی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

ہالی ووڈ کے بارے میں آپ کی چاہے جو بھی رائے ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ صحیح ماحول اور فضا پیدا کرنے کے معاملے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اسی لیے تو سارا یورپ مل کر بھی ہالی ووڈ کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا اور اب بھی ہے۔

اکبر صاحب نے ایک دو پاکستانی اسٹاف ممبروں سے بات کی پھر ہم سے کہا۔ ”آغا صاحب ابھی کچھ دیر لگے گی۔ آیئے اتنی دیر کافی پیتے ہیں۔“

پلیٹ فارم کے ڈائننگ روم کو ایک ریستوران میں بدل دیا گیا تھا اور یہ بھی فلم والوں کے تصرف میں تھا۔ اجلے اجلے کپڑوں والے اسمارٹ ویٹر خدمت پر مامور تھے۔ ان میں سے بہت سے انگریزی بھی جانتے تھے۔ فلم کے لیے ان کو خاص طور پر ملازم رکھا گیا تھا۔ ریلوے ڈائننگ ہال کا بھی حلیہ بدلا ہوا تھا۔ میز کرسیاں نئی تھیں، ان پر خوب صورت اور اجلے میز پوش پڑے ہوئے تھے۔ حسام الدین اکبر صاحب اس یونٹ کے اہم رکن تھے اور ہم ان کے مہمان تھے۔ اس لیے وی آئی پی شخصیت تھے۔ نہایت عمدہ قسم کی کافی، بہت اچھی قسم کی کراکری، اعلیٰ درجے کے کیک پیس۔ ان سب چیزوں سے ہماری خاطر مدارت کی گئی۔ اکبر صاحب کی وجہ سے ویٹر وغیرہ بھی ہمارے آس پاس چکر لگاتے رہے۔ ہم فلم کے بارے میں اکبر صاحب سے گپیں لگاتے رہے۔ انہیں اس بارے میں جتنی بھی معلومات تھیں وہ انہوں نے ہمیں پہنچا دیں۔ انہوں نے بتایا کہ اس فلم کی تمام منصوبہ بندی ہالی ووڈ میں ہی کر لی گئی تھی۔ فلم کی کہانی کے اسکرپٹ کے علاوہ ایک شوٹنگ اسکرپٹ بھی تیار ہے جس میں ہر منظر کی تفصیل، اداکاروں کے مکالمے اور ان کی نقل و حرکت کے علاوہ کیمروں کی نقل و حرکت بھی نقشوں کے ذریعے بتائی گئی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس کا عملی مظاہرہ ہم نے کچھ دیر بعد خود بھی دیکھ لیا۔

ہم ”بھوانی جنکشن“ کے پلیٹ فارم پر پہنچے تو سامنے فاصلے پر پل پر سینکڑوں افراد کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے اور خاموش رہنے کی مسلسل ہدایات کے باوجود باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ ہم حیران تھے کہ اس شور و غل میں

شوٹنگ کیوں کر ہو گی۔ پلیٹ فارم کے درمیان میں کیمرامین ایک ڈولی پر کیمرا لگائے کھڑے تھے۔ ان کے معاونین بھی تھے اور کئی طرف چھوٹی چھوٹی تیز روشنیاں بھی نصب تھیں۔ ایک صاحب ریڈیو کی قسم کی ایک چیز لیے مستعد کھڑے تھے۔

ہم نے پوچھا'' اداکار اور ہدایت کار کہاں ہیں؟''

اکبر صاحب نے اشارے سے بتایا تو دیکھا کہ کافی فاصلے پر ایک بڑا سا رنگین چھاتا لگا ہوا تھا۔ اس کے نیچے دو کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں پر ایوا گارڈنر اور اسٹیورٹ گرینجر تشریف فرما تھے اور کسی مشروب سے شوق فرما رہے تھے۔ ان سے کچھ دور ایک اور رنگین بڑے سے چھاتے کے سائے میں ایک ادھیڑ عمر کے صاحب ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ ڈائیریکٹر جارج کیوکر ہیں۔ جارج کیوکر کا نام ہم نے بہت سن رکھا تھا وہ ہالی ووڈ کے ہی نہیں' دنیا کے چند بہترین ہدایت کاروں میں شمار کیے جاتے تھے۔

چند لمحے بعد ایک صاحب نے میگا فون کے ذریعے اعلان کیا کہ شارٹ تیار ہے۔ یہ سنتے ہی ایوا گارڈنر اور اسٹیورٹ گرینجر اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کیمرے کے سامنے دھوپ میں جا کر منظر کی ریہرسل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اسٹیورٹ گرینجر نے خاکی بش شرٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ ایوا گارڈنر سفید بلاؤز اور نیلے اسکرٹ میں ملبوس تھیں۔ ایک امریکی اسسٹنٹ ڈائیریکٹر نے ہاتھ میں اسکرپٹ تھام رکھا تھا۔ اور وہ ان دونوں سے کچھ باتیں کر رہا تھا ہم ان سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے اس کے باوجود پلیٹ فارم پر ہزاروں تماشائیوں کی آوازوں کا اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چند لمحے بعد وہی اسسٹنٹ جارج کیوکر کے پاس گیا اور وہ اٹھ کر اداکاروں کے پاس پہنچ گئے۔ اداکاروں نے مکالمے ادا کیے اور کچھ ایکٹنگ بھی کی۔ مثلاً ایوا گارڈنر نے بڑھ کر اسٹیورٹ گرینجر کے گلے میں بانہیں ڈالنی چاہیں مگر انہوں نے اپنے گلے سے ان کی بانہیں الگ کر دیں۔ کچھ کہا اور تیزی سے چلتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ ایوا گارڈنر انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

ہدایت کار نے'' اوکے'' کہا۔ ہمیں آواز تو نہیں آئی مگر اندازہ ہے کہ یقیناً یہی کہا ہو گا۔ اس منظر کے ختم ہونے پر اداکار اپنے چھاتے کی پناہ میں چلے گئے اور ہدایت کار نے اپنے چھاتے کے سائے میں کرسی سنبھال لی۔

ہم نے اکبر صاحب سے پوچھا۔ ”بھئی یہ کیا تماشا ہے۔ شوٹنگ کب ہو گی ؟ “

وہ بولے ----- ” شوٹنگ ہو تو گئی۔ یہ شارٹ ہی تو تھا جو آپ دیکھ رہے تھے۔“

ہم نے حیران ہو کر کہا۔ ”مگر اتنے شور میں شوٹنگ کیسے ہو گئی؟ مکالمے کیسے سمجھ میں آئیں گے ؟“

وہ ہنسنے لگے۔ بولے۔ ” وہ بش شرٹ اور نیکر والا آدمی جو ریڈیو نما چیز لیے پھر رہا ہے وہ دراصل ٹیپ ریکارڈر ہے۔ اس نے دونوں کے مکالمے کا گائیڈ ٹریک ریکارڈ کر لیا ہے۔ بعد میں جب فلم تیار ہو جائے گی تو اسٹوڈیو میں ان مکالموں کو ڈب کر لیا جائے گا۔“

گائیڈ ٹریک اور مکالموں کو ڈب کرنے والی بات ہمارے لیے بالکل نئی تھی۔ مگر سوچا کہ حسام الدین اکبر کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔ یہ لگ بھگ چالیس سال پہلے کا قصہ ہے۔ اس کے بیس پچیس سال بعد پاکستان میں بھی یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ آؤٹ ڈور شوٹنگ میں مکالموں کا گائیڈ ٹریک ریکارڈ کر لیا جاتا تھا جسے بعد میں سٹوڈیو میں آرٹسٹوں کی آوازوں میں ڈب کر لیا جاتا تھا۔ گویا باقی دنیا کی طرح ہم نے بھی اب جدید ٹیکنالوجی اختیار کر لی ہے۔ مگر کتنے عرصے بعد ؟

آغا اکبر ہم سے کہنے لگے ” آپ نے دیکھا کتنا اچھا جوڑا ہے ؟“

”کس کا جوڑا؟“ ہم نے بے خیالی میں پوچھا۔

”ارے یہی ایوا گارڈنر اور اسٹیورٹ گرینجر کا جوڑا۔ دونوں خوبصورت اسمارٹ اور پر کشش ہیں۔“

ہم نے کہا” اور قد میں بھی قریب قریب برابر ہیں۔“

کہنے لگے ” یہ تو میک اپ کے محتاج ہی نہیں ہیں انہیں تو کہیں بھی دیکھیں تو یہی معلوم ہو گا کہ واقعی ہیرو اور ہیروئن ہیں۔“

ہم نے کہا” آغا صاحب اسی لیے تو یہ ہالی ووڈ کی فلموں کے ہیرو اور ہیروئن ہیں۔ ذرا غور فرمایئے کہ ساری دنیا سے لوگ ایکٹر بننے کے لیے ہالی ووڈ جاتے ہیں اور پھر ہالی ووڈ والے ان میں سے چند لوگوں کو منتخب کرتے ہیں تو پھر وہ کیسے ہوں گے ؟“

ہنس کر کہنے لگے۔" دنیا بھر کے انسانوں کی" بالائی"ہوں گے "

"آپ کا مطلب ہے ملائی؟"

کہنے لگے "ہاں۔ میں دراصل کتابی زبان بول رہا تھا۔"

ادھر ہم یہ باتیں کر رہے تھے' ادھر پلیٹ فارم کے ایک دوسرے حصے پر فلم کے یونٹ والے پہنچ کر خود بخود اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔انہیں کسی نے کچھ بھی نہیں بتایا تھا مگر ہر شخص خود کار مشین کی طرح اپنا اپنا کام کر رہا تھا۔کیمرا مین نے کیمرا ڈولی پر رکھ دیا۔لائٹ والوں نے روشنیاں مقررہ جگہوں پر نصب کر دیں۔دو آدمیوں نے کرسیاں اور میزیں لا کر سجا دیں۔ایک شخص نے ایک بڑا سا رنگین چھاتا لا کر ان کرسیوں پر رکھ دیا۔یہ سب کام ہو چکا تو ہیرو اور ہیروئن کو مطلع کیا گیا۔انہوں نے کیمرے کے سامنے پہنچ کر چہلیں کرنی شروع کر دیں۔یہ کوئی ہلکا پھلکا سین تھا اس لیے دونوں کچھ اچھے موڈ میں تھے اور بار بار ایک دوسرے کے گلے لگ جاتے تھے۔کافی فاصلے پر کھڑا ہوا مجمع ہر بار ان کے گلے لگنے پر شور مچاتا تھا اور آوازے کستا تھا۔ مگر وہ ان سب سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھے۔

ریہرسل کے بعد جارج کیوکر تشریف لائے۔انہوں نے ایک بار پھر ریہرسل دیکھی اور شاٹ لینے کی ہدایت کی۔جوں ہی شاٹ ختم ہوا۔وہ لوگ پھر تین تیرہ ہو گئے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران تھے کہ فلم کے مکالموں کے علاوہ آپس میں وہ کوئی بات چیت نہیں کرتے تھے۔ایسا لگتا تھا جیسے ایک دوسرے سے ناراض ہیں۔اس شاٹ کے ختم ہوتے ہی ہیرو اور ہیروئن کو چھٹی دے دی گئی۔اب برابر والے نئے پلیٹ فارم پر شوٹنگ ہونے والی تھی۔یونٹ کے سب لوگ روحوں کی طرح خود بخود اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔اس پلیٹ فارم پر ایک ریلوے انجن کھڑا ہوا تھا۔اس کے سامنے سینکڑوں مرد اور عورتیں ریل کی پٹڑی میں لیٹے اور بیٹھے ہوئے تھے۔منظر یہ تھا کہ کانگرسیوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ریل کے انجن کے نیچے آ کر کٹ مریں گے مگر ٹرین کو نہیں جانے دیں گے۔سفید دھوتی کرتوں میں ملبوس' بیشمار مرد نہرو کٹ ٹوپیاں لگائے ہوئے گلوں میں جنیو ڈالے گھوم رہے تھے۔بعض حضرات کے سر منڈھے ہوئے تھے مگر گدی میں موٹی موٹی چوٹیاں لٹکی ہوئی تھیں۔عورتیں بھی سفید ساریوں میں ملبوس پٹڑی پر دراز تھیں۔انگریز ڈرائیور کنڈکٹر اور اسٹیشن ماسٹر سخت پریشان تھے کہ ٹرین کو کیسے آگے بڑھایا جائے۔آخر

ترکیب یہ نکالی گئی کہ گندے پانی کی بالٹیاں لالا کران پر ڈالی گئیں اور وہ سب " ہائے رام اور رام رام" کہتے ہوئے اٹھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔پٹری صاف ہوتے ہی ٹرین حرکت میں آگئی۔

سین تو ختم ہو گیا مگر تماشائیوں کا ہجوم کم نہیں ہوا۔انہیں لاکھ بتایا گیا کہ شوٹنگ ختم ہو گئی ہے مگر انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔وہ اس انتظار میں تھے کہ ایک بار پھر وہ ایوا گارڈنر اور اسٹیورٹ گرینجر کے درشن کریں گے اور انہیں بغل گیر ہوتے ہوئے دیکھ کر آوازے کسیں گے۔جب وہ دونوں آپس میں بے تکلف ہو رہے تھے تو لوگ گلے پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے " شرم کراوئے۔اوئے کڑیے کی کرنی ایں۔ماں پیو دالحاظ کراوئے وغیرہ وغیرہ۔"

افسوس کہ انہیں دوبارہ یہ مفید مشورے دینے کا موقع نصیب نہ ہوسکا کیونکہ ایوا گارڈنر اور اسٹیورٹ گرینجر کی شوٹنگ واقعی پیک اپ ہو چکی تھی۔

دوسرے دن ہم دفتر گئے۔سب کو معلوم تھا کہ ہم گزشتہ روز "بھوانی جنکشن" کی شوٹنگ دیکھنے گئے تھے۔جن میں انتظار حسین سر فہرست تھے۔

دفتر پہنچے تو سب سے پہلے انتظار حسین نے پوچھا۔"کیوں میاں کل کیا ہوا؟"

"ظاہر ہے شوٹنگ ہوئی۔"

"ایوا گارڈنر کو دیکھا؟"

"ہوں دیکھا۔"

"کیسی ہے یار۔سچ بتانا۔"

ہم نے کہا۔" شہد ملائی کی طرح ہے۔اگر تم سچ مچ دیکھ لو تو سانس رک جائے تمھاری۔ویسے ایوا گارڈنر اور اسٹیورٹ گرینجر کی جوڑی بہت اچھی ہے۔"

بولے۔" تو پھر شادی کرادو۔"

"ان دونوں کی؟"

"نہیں یار، ہم دونوں کی۔"

ہم نے سنجیدگی سے کہا'' انتظار حسین۔لاہور میں اس کا قیام بہت مختصر ہے۔اتنی جلدی تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔''

اتنی دیر میں آغا حسام الدین اکبر کا فون آگیا۔

''آغا صاحب' آج قلعے میں شوٹنگ ہے۔ایوا گارڈنر بھی ہو گی۔چلو گے ؟''

''کس وقت ؟'' ہم نے پوچھا۔

''بس میں آپ کو لینے آرہا ہوں۔''

ہم نے اپنا بکھرا ہوا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔

''میاں پریشان کیوں ہو گئے ؟''

ہم نے کہا۔'' شوٹنگ پر جانا ہے۔''

''ایوا گارڈنر بھی ہو گی ؟''

''اسی لئے تو جا رہے ہیں۔''

''شوٹنگ میں دیکھا یا فلم میں دیکھا۔بات تو ایک ہی ہے۔بلا وجہ وقت ضائع کرنے کا فائدہ کیا ہے ؟''

ہم نے کہا''انتظار صاحب، بات یہ ہے کہ انگور کھٹے ہیں۔اچھا ہم تو چلے۔''

دفتر کے نیچے پہنچے تو چند لمحے بعد آغا حسام الدین اکبر بھی جیپ لے کر آ گئے۔ہم دونوں شاہی قلعہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

''شوٹنگ کب تک ہے ؟'' ہم نے پوچھا

''ہم پہنچیں گے تو ہو رہی ہو گی۔''

ہم قلعے پہنچے تو وہاں پولیس کا سخت پہرا تھا مگر ہمارے پاس آغا حسام الدین اکبر ویزا کی صورت میں موجود تھے۔ہم قلعے کے اندر پہنچ گئے۔بارہ دری کے سامنے شوٹنگ کا اہتمام تھا مگر ہر کوئی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔

اکبر صاحب نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ باس کا موڈ بہت خراب ہے کیونکہ ایوا گارڈنر ابتک نہیں پہنچی ہے۔

اسٹیورٹ گرینجر ایک سایہ دار درخت کے نیچے بچھی ہوئی کرسیوں پر تنہا بیٹھا ہوا تھا۔کل کی طرح آج بھی وہ خاکی بش

شرٹ اور خاکی پتلون میں ملبوس تھا اور غالباً فلم کے اسکرپٹ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جارج کیوکر صاحب پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ایک جانب ٹہل رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا جارج کیوکر کی چہل قدمی میں تیزی آتی جارہی تھی۔

حسام الدین اکبر نے یہ ماحول دیکھا اور پھر ہم نے سرگوشی میں بولے ''بہت دیر ہوگئی۔ شوٹنگ تو صبح آٹھ بجے شروع ہو جانی چاہیے تھی۔''

ہم نے کہا۔ ''سنا ہے اداکار اسی طرح دیر سے آتے ہیں۔ ہماری فلموں کے اداکار بھی کبھی وقت پر نہیں پہنچتے۔''

وہ بولے۔ ''یہ ہماری فلموں کی شوٹنگ نہیں ہے۔ ہالی ووڈ کی فلم کی شوٹنگ ہے۔ وہاں وقت کی پابندی مذہبی فریضے کی طرح ہوتی ہے۔''

دس پندرہ منٹ اور گزر گئے۔ اس دوران میں کسی نے بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ سوائے ہدایت کار جارج کیوکر کے جس کے ٹہلنے کی رفتار میں اب کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

یکایک ایک بھن بھناہٹ سی پیدا ہوئی۔ کچھ لوگوں نے آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیں۔ پھر ایک کار کے انجن کی آواز سنائی دی اور چند منٹ بعد دو تین آدمی تیزی سے چلتے ہوئے بارہ دری کے سامنے پہنچ گئے۔ ان میں ایوا گارڈنر بھی شامل تھیں۔ وہ ایک ہلکے نیلے رنگ کے اسکرٹ اور اسی رنگ کے پھولدار بلاؤز میں ملبوس تھیں۔ سر پر تنکوں کا بنا ہوا ایک خوبصورت ہیٹ تھا۔ اس کی کمر میں گہرے نیلے رنگ کی ایک بیلٹ بندھی ہوئی تھی۔ ایوا گارڈنر کے ساتھ پال ملز بھی تھا۔ ان دونوں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر اس طرف بڑھے جدھر جارج کیوکر ٹہل رہا تھا۔ ان دونوں کو آتے ہوئے دیکھ کر جارج کیوکر نے چہل قدمی بند کر دی اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر خاموش کھڑا ہو گیا۔

اس نے اپنی کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور پھر ایوا گارڈنر کی طرف دیکھا۔

''تمہیں شوٹنگ پر آٹھ بجے رپورٹ کرنی تھی۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے مگر۔۔۔۔۔۔''

''میں یہاں ہزاروں میل دور سے اس لئے نہیں آیا ہوں کہ ڈور کیپر کی طرح تمہارا انتظار کروں۔ یہ رویہ میں

برداشت نہیں کر سکتا۔" اب اس نے باقاعدہ چلانا شروع کر دیا تھا۔
ایوا گارڈنر نے پریشانی سے پال ملز کی جانب دیکھا۔ وہ آگے بڑھا اور بولا "جارج' میں اس کی وضاحت کر دوں گا۔"
"مجھے وضاحت نہیں شوٹنگ کی ضرورت ہے۔" پھر اس نے غصے میں زمین پر پیر مارا اور کہا "حد ہو چکی ہے۔ اب میں نہیں ٹھہروں گا۔ میری واپسی کا بندوبست کر دو۔"
پال ملز اس کے نزدیک چلا گیا اور آہستگی سے اس سے باتیں کرنے لگا۔
جارج کیوکر نے کہا "سب نالائق ہیں۔ نکمے ہیں۔ میں کن لوگوں میں پھنس گیا ہوں۔ تم لوگ ایک کار تک کا بندوبست نہیں کر سکتے تو پھر اتنی دور آنے کا فائدہ کیا ہے؟
پال ملز نے دبی زبان میں اس سے پھر کچھ کہا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر اس کرسی پر جا کر بیٹھ گیا جو ہدایت کاوں کے لئے مخصوص ہوتی ہے اور جس پر نمایاں حروف میں " ڈائریکٹر" لکھا ہوا تھا۔
ایوا گارڈنر ایک بت کی طرح اسی جگہ خاموش کھڑی رہی۔ اسٹیورٹ گرینجر بدستور مطالعے میں مصروف تھا۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر ان لوگوں کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ پال ملز نے ایوا گارڈنر کے پاس جا کر اس نے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ وہ آہستگی سے جارج کیوکر کی جانب گئی اور نرم لہجے میں کہنے لگی۔ " آئی ایم سوری جارج۔ مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"
"میں جانتا ہوں۔ تمہارا قصور نہیں ہے کسی کا بھی قصور نہیں ہے۔ قصور تو صرف میرا ہے۔ مجھے اس پراجیکٹ کے لئے رضامند ہی نہیں ہونا چاہیے تھا۔" پھر وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اوکے۔ شوٹنگ پیک اپ۔"
یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر کی طرف چلا گیا۔ ہر ایک نے خاموشی سے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ اسٹیورٹ گرینجر اٹھ کر ایوا گارڈنر کے پاس چلا گیا اور وہ دونوں آہستگی سے باتیں کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ قلعے کی رونق کم ہونے لگی۔

حسام الدین اکبر نے کہا۔ "شوٹنگ تو پیک اپ ہو گئی ہے۔ آؤ ہم بھی واپس چلتے ہیں۔"
ہم دونوں خاموشی سے قلعے سے باہر نکلے اور جیپ میں سوار ہو گئے۔

اسی شام حسام الدین اکبر صاحب نے ہمیں بتایا کہ فلم کے یونٹ کے لئے دو درجن سے زائد کاروں کا بندوبست کیا گیا ہے لیکن بد قسمتی سے جس ٹیکسی میں ایوا گارڈنر کو قلعے جانا تھا وہ راستے میں خراب ہو گئی۔ٹرانسپورٹ کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود نہیں تھا۔نہ ہی ایوا کو اس طرح سڑک پر چھوڑا جا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈرائیور نے ایک تانگا کرائے پر لیا اور دوبارہ فلیٹیز ہوٹل چلا گیا۔اتفاق سے وہاں بھی کوئی خالی ٹیکسی موجود نہ تھی۔فلیٹیز کے مینجر نے دوسرے ہوٹلوں کو فون کر کے ٹیکسی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر نہ مل سکی۔کافی دیر کے بعد فلم یونٹ کی ایک ٹیکسی ہوٹل پہنچی تو اس میں ایوا گارڈنر کو لے کر پال ملز بذات خود لوکیشن پر گیا۔وہ جانتا تھا کہ تاخیر کی وجہ سے جارج کیوکر کا پارا بہت اونچا چڑھا ہوا ہو گا لیکن اس کی وضاحت بھی ڈائریکٹر کا غصہ کم نہ کر سکی۔اس روز تو شوٹنگ پیک اپ کر دی گئی مگر دوسرے دن وہی مناظر قلعے میں فلما لئے گئے۔مگر اس روز ہم وہاں موجود نہ تھے۔

بعد میں ہم نے بھی پاکستان کی فلمی صنعت میں کام کیا۔بھارتی فلم انڈسٹری کے بارے میں پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں کہ وہاں بڑے اداکار کس طرح تاخیر سے شوٹنگ پر پہنچنا اپنی شان سمجھتے ہیں اور کسی ہدایت کار یا فلم ساز کی مجال نہیں ہوتی کہ انہیں ٹوکے یا سرزنش کرے مگر ہم نے اپنی آنکھوں سے ایوا گارڈنر جیسی ہیروئن کو ہدایت کار کے سامنے سر جھکائے' مجرموں کی طرح کھڑا ہوا دیکھا ہے حالانکہ اس غریب کا اپنا قصور بھی نہ تھا۔ہدایت کار نے اسے اور فلم کے پروڈکشن انچارج کو جس طرح ڈانٹا تھا وہ الفاظ بھی اب تک ہمارے کان میں گونج رہے ہیں۔

''بھوانی جنکشن'' کی فلم بندی لاہور میں 1955ء میں ہوئی تھی۔جتنے دن فلم کا یونٹ لاہور میں مقیم رہا کوئی پرندہ بھی اداکاروں کے پاس پر نہ مار سکا۔انہوں نے کسی تقریب یا محفل میں شرکت نہیں کی۔کسی بڑے سے بڑے آدمی کی دعوت نہیں کھائی۔ہم نے بھی اگر ان فلم اسٹاروں کو دیکھا تو محض اتفاقیہ۔حالانکہ اس وقت سارا لاہور ایوا گارڈنر کو دیکھنے کا خواہش مند تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس فلم کی وجہ سے لاہور کی فلمی دنیا میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی تھی۔بہت سے نوجوانوں نے معاون ہدایت کار کے طور پر اس فلم میں کام کیا۔انہیں کسی نے عملی تربیت تو نہیں دی لیکن انہوں نے

جارج کیوکر جیسے عظیم ہدایت کار کو دیکھ کر بہت کچھ سیکھا۔ان میں سے بعض لوگ کچھ عرصے بعد ترقی کر کے پاکستان کے بڑے اور ممتاز ہدایت کار بھی بن گئے۔ جو زیادہ کامیاب نہ ہو سکے تھے وہ بھی کسی نہ کسی طور پر فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔اس طرح فلمی دنیا میں تعلیم یافتہ لوگوں کے داخلے کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

جن اداکاروں نے ایکسٹراؤں کے طور پر کام کیا تھا ان میں سے بھی کچھ افراد کو ترقی کرنے کا موقع ملا۔نیلو کی مثال تو سب سے نمایاں ہے لیکن کچھ اور لڑکے اور لڑکیاں بھی ''بھوانی جنکشن'' میں کام حاصل کرنے کے بعد فلموں میں کام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ان میں سے بعض نے ترقی بھی کی اور مختلف شعبوں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ یہ وہ دور تھا جب روزناموں اور اچھے اخباروں میں فلم اور فلم والوں کے بارے میں خبریں شائع نہیں کی جاتی تھیں۔ مگر اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا تھا جو فلمی صنعت سے ہمارے براہ راست رابطے کا بہانہ بن گیا اور پھر اخبارات میں فلموں کے لئے کچھ جگہ مخصوص کی جانے لگی۔یہاں تک کہ پھر وہ زمانہ بھی آ گیا کہ ہر اخبار فلمی خبروں اور تصویروں سے پر نظر آنے لگا۔

جن دنوں شوکت حسین رضوی صاحب کی پنجابی فلم ''چن وے'' بن رہی تھی۔اس وقت ہماری دوستی لاہور کے بعض فلمی صحافیوں سے ہو گئی تھی جن کے ذریعے فلمی خبریں ہم تک پہنچا کرتی تھیں۔ ''چن وے'' پر ہدایت کارہ کی حیثیت سے تو نور جہاں کا نام دیا جا رہا تھا لیکن در حقیقت اس کے ہدایت کار خود شوکت صاحب تھے۔انہوں نے اس سے پہلے کبھی پنجابی فلم نہیں بنائی تھی اس لئے ''چن وے'' پر بطور ہدایت کار اپنا نام دینا پسند نہیں کیا۔نور جہاں اور شوکت حسین رضوی اس زمانے میں بہت بڑے نام تھے۔ بمبئی سے جو فلم والے پاکستان آ گئے تھے ان میں یہ نام سر فہرست تھے۔نور جہاں کا اداکارہ اور گلوکارہ کی حیثیت سے طوطی بول رہا تھا۔سارا ہندوستان اس کا دیوانہ تھا۔جب پاکستان بنا تو اس خطے میں نور جہاں پہلے ہی ایک سپر اسٹار کی حیثیت سے پہچانی جاتی تھیں۔ شوکت حسین رضوی بھی اپنی کامیاب ترین فلموں کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔اس لئے ''چن وے'' پاکستانیوں کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتی تھی۔

''چن وے '' کے ہیرو سنتوش کمار تھے۔ دراصل اس زمانے میں سنتوش کمار پاکستان میں اکلوتے ہیرو تھے۔ اردو پنجابی ہر زبان کی فلموں میں کام کرنے کے لئے ان ہی کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ ''چن وے'' میں بھی ان کو نور جہاں کے ساتھ ہیرو کاسٹ کیا گیا۔ سنتوش کمار تعلیم یافتہ، ذہین اور حاضر جواب نوجوان تھے۔ خوداعتمادی بھی بلا کی تھی مگر وہ فطرتاً کچھ شرمیلے واقع ہوئے تھے۔ آخر وقت تک ''کچھ شرمیلا'' پن ان میں باقی تھا وہ دوسرے ہیروز کی طرح لڑکیوں کے پیچھے نہیں بھاگتے تھے۔ نہ ہی ہیروئن کے ساتھ عشق لڑانا شروع کر دیتے تھے۔ بے تکلف اور ہنس مکھ آدمی تھے۔ مگر خواتین کے ساتھ تعلقات اور بات چیت میں کچھ شرمیلے تھے۔ پاکستان کے بہت سے دوسرے ہیروز کی طرح وہ کچھ ہیروئنوں کے پیچھے مارے مارے نہیں پھرے۔ ان کا صرف ایک اسکینڈل صبیحہ خانم کے ساتھ بنا تھا۔ یہ بھی اسکینڈل نہیں تھا، رومانس تھا۔ جس کے نتیجے میں ان دونوں کی شادی ہو گئی تھی۔ اپنی تمام بے تکلفی کے باوجود سنتوش صاحب عورتوں کے ساتھ بے باکی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر تھے۔ ایک جھجک ان پر غالب آجاتی تھی۔ اداکاری کے آغاز کے دنوں میں تو ہیروئنوں سے باتیں کرتے ہوئے ان کا چہرہ باقاعدہ سرخ ہو جاتا تھا۔ ان کے اس دور کو دیکھ کر ہمیں بھارت کے سدابہار ہیرو اشوک کمار کے بارے میں سعادت حسن منٹو کا لکھا ہوا خاکہ یاد آجاتا تھا۔ اشوک کمار اس زمانے میں بھی سپر اسٹار تھے مگر عالم یہ تھا کہ تین چار لڑکیوں کا جمگھٹا دیکھ کر وہ بوکھلا جاتے تھے۔ لڑکیوں کے فون سن کر انہیں پسینہ آجاتا تھا۔ کچھ ایسا ہی حال سنتوش کمار کا بھی تھا۔

''چن وے'' کی شوٹنگ کے سلسلے میں جب پہلی بار نور جہاں اور سنتوش کمار ایک رومانی منظر میں اکٹھے ہوئے تو سنتوش صاحب گھبرا سے گئے۔ ایک اتنی بڑی اور نامور ہیروئن کے ساتھ رومانی سین کرنے کا یہ ان کے لئے پہلا موقع تھا۔ پھر یہ کہ وہ ہیروئن اسٹوڈیو کے مالک اور فلم ساز و ہدایت کار کی بیوی بھی تھی جو کیمرے کے ساتھ ہی کھڑا ہوا تھا۔ رومانی سین کے مطابق مکالمے بولتے ہوئے سنتوش کو نور جہاں کا ہاتھ تھام کر انہیں اپنی طرف کھینچنا تھا۔ مکالمے تو وہ بول گئے مگر جب ہاتھ پکڑنے کا مرحلہ آیا تو سنتوش کمار جھجک کر رہ گئے۔ دو تین بار ریہرسل کی گئی۔ بڑی مشکل سے انہوں نے ایک بار جھجکتے ہوئے بڑی احتیاط سے نور جہاں کا ہاتھ پکڑا تو ایک صاحب نے کہا ''بھائی ہیروئن کا ہاتھ پکڑ رہے ہو یا اس کی نبض دیکھ رہے ہو؟''

شوکت صاحب آخر تنگ آ گئے۔ سنتوش صاحب سے کہنے لگے ''بھائی یہ تمہاری ہیروئن ہے' تم اس سے عشق کرتے ہو۔ اتنا زیادہ احترام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

نور جہاں نے بھی ادھر ادھر کی باتیں کر کے کچھ حوصلہ بڑھایا تب کہیں جا کر یہ رومانی سین ہدایت کار کی مرضی کے مطابق فلمایا جاسکا۔ اس کے بعد سنتوش کمار کے معاملے میں بذات خود اس کا نظارہ کیا ہے۔ ''چن وے'' میں سنتوش کمار اپنی ہیروئن کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ہچکچا رہے تھے مگر جب ہدایت کار لقمان (مرحوم) نے اپنی پہلی پنجابی فلم '' پتن '' بنائی تو اس میں مسرت نذیر ہیروئن تھیں۔ بطور ہیروئن یہ مسرت نذیر کی پہلی فلم تھی۔ لقمان صاحب نے پہلے دن ہی ایک رومانی سین فلمانے کا پروگرام بنایا۔ سین یہ تھا کہ ہیرو اور ہیروئن ایک پر فضا مقام پر رومانی گفتگو کر رہے ہیں اور ہیروئن رخصت ہونے سے پہلے ہیرو کے گلے لگ جاتی ہے اور پھر شرما کر بھاگ جاتی ہے۔ بے چاری مسرت نذیر کے لئے تو اسٹوڈیو کی روشنیوں میں اتنے بہت سے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اس پر ستم یہ کہ انہیں سب کے سامنے ایک رومانی منظر کی ضرورت کے مطابق ہیرو سے پیار بھرے مکالمے بولنے تھے اور پھر اس کے گلے بھی لگنا تھا۔

مسرت نذیر کو جب لقمان صاحب نے یہ سین سنایا اور سمجھایا تو وہ پریشان ہو گئیں۔ پہلے تو انہوں نے یہ منظر فلمانے سے ہی صاف انکار کر دیا۔

''مگر مسرت یہ سین تو بہت ضروری ہے۔''

''آپ اس کی جگہ کوئی اور اچھا سا سین رکھ دیں۔ آپ ڈائریکٹر ہیں کیا اتنا بھی نہیں کر سکتے ؟''

انہوں نے کہا'' بھئی میں ڈائریکٹر ضرور ہوں مگر یہ فلم کی کہانی کا تقاضا ہے۔''

مسرت نذیر نے چاروں طرف دیکھا اور پھر کہا۔ '' اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے میں یہ سین نہیں کروں گی۔ آپ ان سب کو باہر نکال دیں۔''

لقمان صاحب ہنسنے لگے۔ بولے '' یہ کوئی فالتو لوگ نہیں ہیں۔ یونٹ کے لوگ ہیں۔ ان کے بغیر شوٹنگ نہیں ہو سکتی۔ مگر مجھے بہت شرم آرہی ہے۔''

بالآخر سنتوش صاحب نے مسرت کو سمجھانے کی ذمے داری سنبھالی۔ پہلے تو چائے منگائی گئی۔ پھر سنتوش نے مسرت نذیر کے ساتھ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کیں اور بتایا کہ ''شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم تو لڑکی ہو۔ میں خود شرماجاتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ جھجک دور ہو جاتی ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ یہ سب مصنوعی ہے۔ جھوٹ موٹ کی باتیں ہیں۔'' ریہرسل شروع ہوئی تو مسرت نذیر نے بہت رسمی انداز میں مکالمے ادا کئے اور ہیرو سے اس طرح گلے ملیں جیسے کوئی سزا بھگت رہی ہیں۔

''مسرت یہ تم کیا کر رہی ہو۔'' لقمان صاحب نے کہا۔ ''اس منظر میں حقیقت کا رنگ نظر آنا چاہیے۔ تم تو یوں کر رہی ہو جیسے سب کچھ مصنوعی ہے۔''

مسرت نے سادگی سے کہا ''سنتوش صاحب نے مجھ سے یہی تو کہا ہے کہ جھوٹ موٹ ہے۔ مصنوعی ہے۔''

''ارے بھئی وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر فلم دیکھنے والوں کو تو یہ بالکل اصلی نظر آنا چاہیے۔ ورنہ ان پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔''

ایک بار پھر سنتوش کمار نے مسرت نذیر کو سمجھایا۔ اداکاری کی مجبوریاں اور باریکیاں سمجھائیں۔ ریہرسل میں ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح یہ سین کافی دیر کے بعد فلمایا گیا ورنہ لقمان صاحب تو ناامید ہو کر سوچتے تھے کہ کیا یہ لڑکی واقعی ہیروئن بن سکے گی؟۔

یہ تذکرہ تو درمیان میں نکل آیا ورنہ ہم آپ کو ''چن وے'' کے زمانے کی باتیں سنا رہے تھے۔ ''چن وے'' میں شوکت صاحب نے سائیڈ ہیرو کے طور پر ایک نئے نوجوان کو موقع دیا تھا۔ ان کا نام جہانگیر خان تھا۔ یہ صوبہ سرحد سے تعلق رکھتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور لاہور کے مشہور انگریزی اخبار ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں رپورٹر تھے۔ خوبرو اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ اداکاری کا بھی شوق تھا۔ جب شوکت صاحب نے انہیں سائیڈ ہیرو کا کردار کرنے کی پیشکش کی تو تھوڑے سوچ بچار کے بعد وہ رضامند ہو گئے مگر وہ اچھے اداکار ثابت نہ ہوئے۔ ''چن وے'' میں شوکت صاحب کی کوششوں کے باوجود وہ اچھی اداکاری نہ کر سکے۔ جب یہ فلم نمائش کے لئے پیش کی گئی تو تماشائیوں کو جہانگیر خان کی اداکاری بالکل پسند نہیں آئی۔ اس زمانے میں گوال منڈی کے چوک کے علاقے کے کباب اور تکے اور دہی لسی بہت مشہور تھی۔ سارے شہر سے لوگ وہاں کھانے پینے کے لئے آیا کرتے تھے۔ ''چن

وے " کی نمائش کے بعد جہانگیر خان بھی سفید کلف دار شلوار قمیض پہن کر ایک سجے ہوئے تانگے میں سوار ہو کر گوال منڈی کے چوک میں پہنچ گئے۔ دکان دار نے ان کی بہت آؤ بھگت کی۔ انہیں پہلے تو تکے اور کباب کھلائے اور پھر ان کے سامنے کھیر کا کونڈا رکھ دیا اور کہا۔ "باؤ جی کھاؤ۔"

باؤ جی خاصے خوش خوراک تھے۔ نوجوان تھے۔ تندرست اور توانا تھے۔ انہوں نے کھیر سے شوق فرمانا شروع کر دیا۔ کچھ کھانے کے بعد ہاتھ روکا تو پہلوان جی اور ان کے شاگردوں نے کہا۔ "باؤ جی ہور کھاؤ۔"

باؤ جی نے تھوڑی سی کھیر اور کھالی اور رومال سے منہ صاف کرنے کے بعد بولے۔ بس پہلوان جی اب گنجائش نہیں رہی۔"

پہلوان جی نے کہا۔ "باؤ جی گنجائش کی بات نہیں ہے۔ یہ کھیر تو آپ کو ختم کرنی پڑے گی۔"

"ارے نہیں جناب۔ بس بڑی مہربانی۔"

پہلوان جی کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ بولے۔ "باؤ جی آج یہ کھیر ختم کرنی پڑے گی"۔ جہانگیر خان نے جب دیکھا کہ وہ سب کے سب بہت سیریس ہیں تو پریشان ہو گئے۔ شکریہ ادا کیا، منت سماجت کرنے لگے۔

پہلوان جی کچھ دیر خاموشی سے سنتے رہے پھر بولے۔ باؤ جی۔ یہ آپ کو ختم کرنی پڑے گی ورنہ ایک وعدہ کرنا پڑے گا۔"

"ہاں ہاں بولیں۔"

"وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی فلموں میں کام نہیں کرو گے"!

جہانگیر خان نے فوراً وعدہ کر لیا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ وہ خود بھی اپنی اداکاری سے مطمئن نہیں تھے۔ دراصل وہ فلمی نقاد تھے۔ اخبار میں انگریزی فلموں پر تنقید و تبصرے لکھتے رہتے تھے۔ انہیں بخوبی احساس تھا کہ وہ اداکاری کے میدان میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے چن وے کے سوا کسی فلم میں اداکاری نہیں کی۔ نہ ہی کسی نے انہیں فلموں میں کام کرنے کی پیش کش کی۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے محکمہ اطلاعات میں ملازمت کر لی اور کافی ترقی کی۔ ایک زمانے میں جب خام فلم کے لیے فلم سازوں کو حکومت کی طرف سے پرمٹ حاصل کرنا لازم ہو گیا تھا تو یہ پرمٹ جاری کرنے کا اختیار جہانگیر خان کے پاس تھا۔ وہ کراچی میں اپنے شاندار دفتر میں بیٹھ کر فلم سازوں کو پرمٹ

جاری کرتے رہتے تھے۔ مگر ایسے فلم سازوں سے انہیں چڑ تھی جو بھارتی فلموں کے چربے بنانے کے لیے بدنام تھے۔ اس قسم کے ایک دو واقعات ہمارے سامنے بھی رونما ہوئے۔ جب انہوں نے بہت بڑے بڑے فلم سازوں کو پریڈ کرا دی۔ یہ واقعات وقت آنے پر بیان کیے جائیں گے۔ مگر جہانگیر خان کے بارے میں ایک قابل ذکر بات سن لیجئے۔ یہ وہی جہانگیر خان ہیں جن کا نام میناشوری کے حوالے سے بہت مشہور ہوا تھا۔ میناشوری جب مس 56ء میں کام کرنے کے لیے بمبئی سے کراچی آئی تھیں تو جہانگیر خان کے ساتھ ان کا افیئر ہو گیا جو بہت زور شور سے کافی عرصے تک جاری رہا۔ مس 56ء کے ہدایت کار شوری صاحب تھے جو مینا کے ساتھ آئے ہوئے تھے مگر جب وہ پاکستان سے رخصت ہوئے تو مینا ان کے ساتھ نہیں تھیں۔ مینا کو شوری صاحب سے علیحدہ کرنے میں جہانگیر خان کا بہت نمایاں ہاتھ تھا۔

یہ داستان آپ کو الف لیلہ سے مختلف نظر آئے گی کیونکہ اس میں بھی ایک کہانی سے دوسری اور دوسری کہانی سے تیسری داستان نکلتی رہے گی۔ اب یہی دیکھیے کہ قصہ '' چن وے'' کے زمانے کا ہو رہا تھا اور تان ٹوٹی جہانگیر خان اور مینا شوری پر۔

یہ داستان آپ اس کے بعد بھی تفصیل سے پڑھیں گے۔ تو ذکر ہو رہا تھا۔'' چن وے'' کی شوٹنگ کا۔ شوٹنگ تو خیر شاہ نور میں ہو ہی رہی تھی مگر ''چن وے'' کی شوٹنگ کے زمانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے سارے ملک میں شہرت حاصل کر لی اور دیکھا جائے تو اسی واقعے کی بدولت فلمی دنیا سے ہمارا رابطہ زیادہ قریبی ہو گیا۔ ہوا یہ کہ '' چن وے'' میں نور جہاں ہیروئن تھیں مگر اس فلم میں سائیڈ ہیروئن کا کردار نگہت سلطانہ کر رہی تھیں۔

''چن وے'' میں انہوں نے کام کیا تو شوخی و بے باکی کے باعث بہت جلد فلمی حلقوں میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ اسی زمانے میں یہ بھی سننے میں آیا کہ شوکت حسین رضوی ان پر مہربان ہو گئے ہیں۔ یہ افواہ اتنی زیادہ پھیلی کہ مادام نور جہاں کے کانوں تک پہنچ گئی۔ شوکت صاحب کی رہائش گاہ اس وقت شاہ نور اسٹوڈیو ہی میں تھی۔ انہوں نے اپنے لیے ایک خوبصورت آرام دہ کوٹھی تعمیر کرا لی تھی اور بڑے سلیقے سے اس کی آرائش کی تھی۔ ایک روز جب '' چن وے''

کی شوٹنگ ہو رہی تھی اور سیٹ پر نگہت سلطانہ موجود تھیں کسی نے جا کر مادام نور جہاں کے کانوں میں پھونک دیا کہ وہ شوکت صاحب سے بہت زیادہ بے تکلف ہو رہی ہیں۔ یقین نہ آئے تو خود جا کر دیکھ لیں۔

نور جہاں میں صبر و برداشت کہاں۔ فوراً کوٹھی سے نکل کر فلم کے سیٹ پر پہنچ گئیں اور وہاں جا کر نگہت سلطانہ کو کھری کھری سنائیں بلکہ مار پیٹ بھی شروع کر دی۔ شوکت صاحب اور دوسرے لوگ سنبھالتے ہی رہ گئے مگر وہ ایک بپھری ہوئی شیرنی بنی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ فلم کی شوٹنگ ملتوی کر دی گئی اور شوکت صاحب نور جہاں کو سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ نگہت سلطانہ پہلے تو عذر و معذرت کے موڈ میں تھیں مگر فلم انڈسٹری میں ہمیشہ سے کچھ ایسے عناصر بھی موجود ہیں جو بات کا بتنگڑ بنا کر اور معاملات کو بڑھا کر خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ نگہت سلطانہ کے پاس پہنچ گئے۔ پہلے تو اظہار ہمدردی کیا۔ پھر نور جہاں کی زیادتی پر احتجاج کیا۔ اس کے بعد نگہت سلطانہ کو اس بات پر اکسایا کہ وہ مادام نور جہاں کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھوا دیں اور عدالت میں دعویٰ دائر کر دیں۔ نگہت سلطانہ اس بات کے لیے تیار نہ تھیں۔ نہ تو وہ مالی اعتبار سے مقدمے کے اخراجات برداشت کر سکتی تھیں اور نہ شوکت رضوی اور نور جہاں ہستیوں سے بگاڑ کر اپنا مستقبل خطرے میں ڈالنا چاہتی تھیں۔ یہ تو ایسی ہی بات تھی کہ سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کر لیا جائے۔ شوکت صاحب اس وقت بہت بڑا نام تھے۔ اسٹوڈیو اونر تھے۔ نور جہاں کے نام کا اس زمانے میں بھی سکہ چلتا تھا۔ نگہت سلطانہ نے بہت انکار کیا مگر یار لوگوں نے انہیں مقدمہ دائر کرنے پر رضامند کر لیا۔ انہیں بڑے بڑے سبز باغ دکھائے۔ یہ بھی کہا کہ نور جہاں تم سے حاسد اور خائف ہیں کیونکہ تم بہت جلد نور جہاں کی جگہ لے لو گی۔ وہ کتنی ہی سینئر سہی ان کو تمھارے ساتھ یہ ہتک آمیز سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح لاہور کی ایک عدالت میں نگہت سلطانہ کی طرف سے نور جہاں اور شوکت حسین رضوی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا گیا۔

اخبارات ویسے تو فلم والوں کی کوئی خبر شائع نہیں کرتے تھے مگر یہ نور جہاں اور شوکت حسین رضوی جیسی ہستیوں کا معاملہ تھا۔ پھر ایک ابھرتی ہوئی نوخیز اداکارہ کا نام بھی اس میں شامل تھا۔ اس لیے قارئین کے لیے اس خبر میں دلچسپی کا کافی سامان تھا۔ چنانچہ ایک روز صبح کے تمام اخبارات کے صفحہ اول پر دو اور تین کالمی خبر شائع ہو گئی۔ نور جہاں اور شوکت حسین کا نام سر فہرست تھا۔ پھر خبر میں بیان بھی درج تھا جو نگہت سلطانہ کی جانب سے دیا گیا تھا۔ گویا مسالے کا

تمام سامان موجود تھا۔اس خبر کو ان لوگوں نے بھی پڑھا جو اخبار نہیں پڑھتے تھے۔ تمام دن اس پر تبصرے ہوتے رہے۔ فلمی دنیا کے حوالے سے اچھائیاں اور برائیاں بھی ہوتی رہیں۔ ہم بھی اپنے اخبار کے دفتر میں پہنچے تو یہی تذکرہ تھا۔ شام کو لکشمی چوک اور مال روڈ کے ریستورانوں میں بھی یہی خبر موضوع بحث بنی ہوئی تھی۔ ہر کوئی اپنی معلومات اور بساط کے مطابق حاشیہ آرائی کر رہا تھا۔ دوسرے دن اخباری کالموں میں اس خبر پر سب نے تبصرے کیے۔ اس طرح دو تین روز تک یہ خبر سارے شہر کے لیے بلکہ سارے ملک کے لیے موضوع بحث بنی رہی۔

نور جہاں اور شوکت حسین رضوی کو تو ساری دنیا جانتی تھی مگر ہر ایک دوسرے سے پوچھ رہا تھا "یہ نگہت سلطانہ کون ہے؟"

اس زمانے میں اخبارات میں تصاویر تو شائع ہوتی نہیں تھیں۔ کبھی کبھار اکا دکا بعض تصویریں بلاک پرنٹنگ میں شائع ہو جاتی تھیں۔ کسی نے نگہت کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے ہر کوئی یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ آخر یہ نگہت سلطانہ کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔ ایسی کون توپ چیز ہے کہ جس پر شوکت حسین رضوی جیسا شخص مہربان ہو گیا۔ جسے دیکھئے وہ نگہت سلطانہ کو دیکھنے اور اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب تھا۔

ہم نے عرض کیا ہے کہ اس زمانے میں روزنامہ "آفاق" کے سنڈے ایڈیشن کے انچارج تھے۔ ہمارے انچارج ظہور عالم شہید صاحب (مرحوم) تھے۔ وہ "آفاق" کے نیوز ایڈیٹر بھی تھے۔ ہم ان کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ جب یہ خبر شائع ہوئی ہے اور ہر شخص نگہت سلطانہ کے بارے میں جاننا چاہتا ہے کیوں نہ کچھ کیا جائے۔"

وہ کہنے لگا۔" ہاں بھئی۔ یہ تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ یہ نگہت سلطانہ کیا شے ہے؟ "

ہم نے کہا۔"اگر آپ اجازت دیں تو ہم نگہت سلطانہ سے ایک انٹرویو کر لیں؟"

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے۔" ہاں۔ انٹرویو تو ہونا چاہیے مگر فلم ایکٹریس کا انٹرویو چھاپو گے؟"

ہم نے کہا۔" کیا حرج ہے۔ قارئین اس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو ہمیں انہیں معلومات پہنچانی چاہیں۔"

کہنے لگے" ٹھیک ہے۔ کر لو انٹرویو۔ مگر مجھے دکھا ضرور دینا۔"

ہم دفتر سے نکلے اور سیدھے لکشمی چوک پہنچ گئے۔ ایک ریستوران کے اندر گئے۔ چند شعرا وہاں بیٹھے چائے نوشی میں

مصروف تھے۔ سبھی ہمارے شناسا تھے۔ ہم نے ان کے ساتھ چائے بھی پی اور معلومات بھی حاصل کیں۔ایک شاعر نے بتایا کہ وہ نگہت سلطانہ کا فلیٹ جانتے ہیں۔ سامنے رائل پارک میں ہے۔ دوسری منزل پر نگہت سلطانہ کی رہائش ہے۔انہوں نے یہ پیش کش بھی کر دی کہ اگر کہو تو تمھارے ساتھ چلوں؟

ہم نے کہا'' نہیں بھئی۔ ہمیں انٹرویو لینا ہے۔ کسی اور شخص کی موجودگی مناسب نہ ہو گی۔''

رائل پارک میں ہم نگہت سلطانہ کے فلیٹ تک پہنچ گئے۔ سامنے گلی میں چند بچے کھیل رہے تھے۔اس زمانے میں رائل پارک اتنا آباد نہیں تھا۔ نہ ہی دولت کی اتنی فراوانی تھی۔ کار دیکھنے کو نہیں ملتی تھی۔ چند پریس تھے۔ کچھ دکانیں بھی تھیں۔ نگہت سلطانہ جس گلی میں رہتی تھیں وہ رہائشی علاقہ تھا۔ گلی میں جو بچے کھیل رہے تھے ہم نے ان سے پوچھا تو ایک بچہ کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔'' کیا کام ہے آپ کو نگہت باجی سے؟''

ہم نے پوچھا'' وہ تمھاری باجی ہیں؟''

''جی ہاں وہ میری باجی ہیں۔ میں ان کے ساتھ رہتا ہوں۔''

ہم نے کہا'' تو ہمیں اپنی باجی کے گھر لے چلو۔ ہم اخبار سے آئے ہیں۔ان سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

وہ کچھ فکر مند سا ہو گیا۔ بولا''تم انہیں پکڑنے تو نہیں آئے؟''

ہم نے کہا'' نہیں بھئی۔ ہم پولیس والے نہیں۔ اخبار والے ہیں۔ تم چل کر ان کا فلیٹ دکھا دو۔''

بچے نے فوراً رہنمائی کی اور سیڑھیاں چڑھ کر ہم دوسری منزل پر پہنچ گئے۔ بچے نے کہا۔''آپ یہاں ٹھہریں میں باجی کو بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

ہم نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ معمولی سا فلیٹ تھا۔ہم نے فلم ایکٹریسوں کے بارے میں جس گلیمر اور چمک دمک کا تصور وابستہ کر رکھا تھا یہ جگہ اس کے برعکس تھی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور ایک سانولی سلونی، خوش شکل لڑکی سامنے جلوہ گر ہو گئی۔

''آپ کون ہیں۔ کیا کام ہے؟''

ہم نے کہا''ہم آفاق اخبار سے آئے ہیں۔ نگہت سلطانہ سے انٹرویو کرنا ہے۔''

''آپ کو شوکت صاحب یا نور جہاں نے تو نہیں بھیجا؟''

''ارے نہیں بھئی بتا تو رہے ہیں کہ ہم اخبار کے دفتر سے آئے ہیں۔''

ہم اندر گئے تو فلیٹ کے اندر بھی وہی عالم تھا جو باہر نظر آرہا تھا۔ غالباً دو کمروں کا فلیٹ تھا۔ بالکل سادہ' برآمدے میں ایک دو چار پائیاں پڑی تھیں۔ امارت تو کیا خوشحالی کی کوئی علامت بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ بلکہ غربت کا راج تھا۔ ایک نہایت پرکشش اور متناسب جسم کی جو لڑکی ہمارے آگے آگے چل رہی تھی وہ معمولی سی شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ میک اپ سے خالی تھا۔ مگر وہ مسلسل بولے جارہی تھی۔'' آپ کا کیا نام ہے۔ کون سے اخبار سے آئے ہیں۔ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ آپ کو شوکت صاحب نے تو نہیں بھیجا۔ آپ میرا انٹرویو کب چھاپیں گے ؟ ''

وہ ہمارے جواب کا انتظار کیے بغیر سوال پہ سوال کیے جارہی تھی۔ اس دوران میں ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ یہاں ایک پرانا سا صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا۔ درمیان میں چھوٹی سی میز پر کچھ فلمی پرچے بکھرے ہوئے تھے۔

''آیئے بیٹھ جایئے۔ یہ جگہ زیادہ اچھی تو نہیں ہے مگر ہم لوگ تھوڑے دن پہلے ہی کراچی سے آئے ہیں۔ سوچا تھا کہ لاہور کی فلموں میں کام مل جائے گا مگر یہاں تو ایک اور ہی جھگڑا شروع ہو گیا ہے۔ پتا نہیں اب یہاں رہ بھی سکیں گے یا واپس کراچی جانا پڑے گا۔ کراچی میں تو انڈسٹری ہے ہی نہیں۔ کبھی کبھار کوئی فلم بن جاتی ہے۔ مجھے فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق ہے۔ سب کہتے ہیں کہ میں ہیروئن بن سکتی ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟''

اس سوال پر ان کی باتوں کا تسلسل ٹوٹا تو ہم نے ایک بار پھر غور سے ان کا جائزہ لیا۔ رنگ سانولا ضرور تھا مگر چہرہ اور جسم بہت دلکش تھا۔ ہمارے خیال میں فلموں کے لئے وہ بہت موزوں تھیں۔ ناک نقشہ تو خوبصورت تھا ہی مگر سب سے نمایاں اور حسین ان کی آنکھیں تھیں۔ ہم نے سوچا کہ اگر یہ لڑکی سنجیدگی سے کام کرے اور باتیں کم کرے تو واقعی ہیروئن بن سکتی ہے۔

اب وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔ ''یہ بتایئے آپ کیا پئیں گے ؟ چائے یا ٹھنڈا؟''

ہم نے کہا'' تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔''

''یہ سگا بھائی نہیں ہے۔ مگر بالکل بھائیوں کی طرح ہے۔ یہ میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔''
یہ اسحاق اکرام تھے جو واقعی نگہت سلطانہ کے لئے بھائیوں سے زیادہ ہمدرد اور غم گسار تھے۔ بعد میں وہ ہدایت کار حسن طارق کے چیف اسسٹنٹ بھی ہو گئے تھے اور جب تک طارق صاحب زندہ رہے وہ ان ہی سے وابستہ رہے۔ کچھ عرصے پہلے ان کا انتقال ہو گیا ہے۔

ہم نے نگہت سلطانہ سے باتیں شروع کیں تو کوئی مشکل ہی پیش نہیں آئی۔ ہم ان سے جو کچھ پوچھنا چاہتے تھے، وہ اس سے زیادہ ہمیں بتانا چاہتی تھیں۔ وہ حد سے زیادہ باتونی تھیں۔ (اور آج بھی ویسی ہی ہیں) اور دلچسپ باتیں کرتی تھیں ان میں ذرا سی بھی بناوٹ نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے بارے میں' اپنے خاندان کے بارے میں' اپنی فلموں کے بارے میں اور پھر نور جہاں والے جھگڑے کے بارے میں ہمیں سب کچھ بتا دیا۔ ان کی طولانی گفتگو چائے کے دوران بھی جاری رہی۔ چائے نیچے کسی تندور نما ہوٹل سے منگائی گئی تھی مگر بہت مزیدار تھی۔ چائے کے ساتھ بسکٹ بھی تھے۔ مگر سب سے بڑھ کر نگہت سلطانہ خود تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے والد مشرقی پاکستان کے تھے' عراق گئے تو وہاں شادی کر لی۔ اس طرح وہ حسن بنگال اور جادوئے عراق دونوں کا مجموعہ تھیں۔ ملاحت' دلکشی' بالوں کی خوبصورتی' چہرے کی کشش' آنکھوں کی سحر انگیزی اور جسم کا تناسب سبھی کچھ انہیں ایک ہیروئن بنانے کے لئے کافی تھا۔ مگر ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ باتیں بہت کرتی تھیں۔ سادہ دل تھیں مگر طبیعت میں لا ابالی پن اور بچپنا تھا جو ہمیشہ رہا۔ وہ قوت فیصلہ سے محروم تھیں۔ ان کو اچھے مشیر نہیں مل سکے۔ انہوں نے سنجیدگی سے کبھی اداکاری سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ غیر ذمے داری سے ہر ایک کے بارے میں جو منہ میں آتا تھا کہہ جاتی تھیں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان اور ہندوستان میں فلمی ہیروئن کے لئے جس قسم کے ہوشیار سرپرستوں کی ضرورت ہوتی ہے نگہت سلطانہ ان سے محروم تھیں۔ اس کے والد نابینا تھے۔ والدہ بالکل سیدھی سادی' انہیں ٹھیک سے اردو بولنی بھی نہیں آتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نگہت سلطانہ کو اپنا نگراں اور مشیر بھی خود ہی بننا پڑا۔ کوئی صحیح راہ دکھانے والا نہ تھا اس لئے نگہت کو فلمی دنیا میں وہ مقام نہ حاصل ہو سکا جس کی وہ مستحق تھیں۔

نگہت سلطانہ سے ہم نے کافی طویل انٹرویو کیا۔اس دوران ادھر ادھر کی بے شمار باتیں ہوئیں۔ہم انہیں فلموں کے بارے میں کیامشورہ دیتے۔ہم توخود ہی اس کوچے سے نابلد تھے لیکن اس روز ہمارے درمیان دوستی کاایسارشتہ قائم ہوا جو آج تک قائم ہے۔اس طویل عرصے میں مختلف اوقات میں جو حالات سامنے آئے وہ ایک الگ داستان ہے جو مناسب وقت پر سنائی جائے گی۔

نگہت نے خوب ڈھیر ساری باتیں کیں لیکن یہ انکشاف بھی فرمادیاکہ وہ شاعرہ ہیں۔

''شاعرہ؟'' ہم حیران رہ گئے۔''کوئی شعر سناؤ۔''

اس نے ایک شعر سنایاجودراصل شعر کاقیمہ کرنے کے مترادف تھا۔

ہمیں شک وشبہ میں مبتلادیکھاتواس نے کہا۔''آپ کویقین نہیں آیا؟میرے پاس توشعروں کی کاپی بھی ہے۔ دکھاؤں۔''

ہم نے کہا''دکھاؤ۔''

وہ ڈھونڈ کرایک کاپی لے آئی۔اس پر مختلف اشعار درج تھے۔ہم بعض مشہور شعرا کا ہینڈرائیٹنگ بھی پہچان گئے۔ جنھوں نے اپنے ہاتھوں سے نگہت کی شان میں اشعار لکھے تھے۔ان میں سے ایک بہت عظیم شاعر تھے۔فلمی دنیامیں بھی انہوں نے بہت نام پیدا کیا نگہت کابیان تھا کہ یہ شعر اس نے خود لکھے ہیں مگر کاپی پر کسی اور سے خوشخط لکھوائے ہیں۔

ہم نے کہا۔'' اچھایوں کرو کہ یہ شعر اپنے ہاتھ سے ایک کاغذ پر لکھ دو۔ہم تمھارے ہینڈرائٹنگ میں چھاپ دیں گے۔''

اس نے فوراً قلم سنبھالااور شکستہ خط میں اشعار لکھ دیے۔

ہم نے دفتر پہنچتے ہی ایک طویل انٹرویو لکھااوراس میں لفاظی کے دریابہا دیے۔نگہت کوبنگال کے حسن اور عراق کی پر اسرار زمین کی تخلیق قرار دیا۔ اس کے سراپاکاشاعرانہ انداز میں نقشہ کھینچا۔مختصر یہ کہ اپنے پہلے فلمی انٹرویو میں ہم نے پورازور قلم صرف کردیا۔

فوٹو گرافر تو ہمارے پاس تھا نہیں مگر نگہت نے ہمیں دو تین اچھی سی تصاویر فراہم کر دی تھیں۔ ہم نے اگلے ایڈیشن میں اخبار کے پورے صفحے پر یہ انٹرویو تصویروں اور نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کیا تو ہر طرف ہلچل مچ گئی نگہت کی تصاویر نے اور بھی قیامت ڈھادی تھی۔ پھر ہمارا افسانوی انداز بیان سونے پر سہاگا تھا جس میں ہم نے اسے الف لیلوی کردار کے روپ میں پیش کیا تھا۔

دوسرے دن صبح ہم نے گھر پر اخبار دیکھا تو خود ہی پریشان ہو گئے۔ اخبار کے پورے ایک صفحے پر نگہت سلطانہ جلوہ گر تھیں۔ ان کی تصاویر' ان کا بیان' ان کی باتیں' ان کا پس منظر' ان کی شاعری' خود ان کے ہینڈ رائٹنگ میں۔ ایسا انٹرویو تو کسی روزنامے میں شائع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اخبار تو بڑے بڑے فلم والوں کے بارے میں چند سطور سے زیادہ شائع نہیں کرتے تھے۔ کہاں یہ کہ ایک گمنام اداکارہ کے نام سارا صفحہ وقف کر دیا گیا تھا۔

گیارہ بجے ہم دفتر پہنچے تو ہمارے ساتھیوں نے مزید ڈرادیا۔ بولے ''میر نوراحمد صاحب کئی بار پوچھ چکے ہیں۔ آج تمہاری خیریت نظر نہیں آتی۔''

ظہور عالم شہید صاحب ہمارے نیوز ایڈیٹر تھے اور دراصل وہی ہفت روزہ ایڈیشن کے انچارج تھے۔ وہ بطور خاص صبح ہی دفتر پہنچ گئے تھے اور ہمارے منتظر تھے۔ بہت شفقت فرماتے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی سنجیدگی سے بولے ''اوئے الو کے کان' یہ تم نے کیا کر دیا؟'' الو کے کان ان کی پسندیدہ گالی تھی جو وہ پیار اور غصے دونوں صورتوں میں استعمال کیا کرتے تھے۔

''کیا ہوا شہید صاحب؟'' ہم نے معصومیت سے پوچھا۔

''میں نے تمہیں فلم ایکٹریس کا انٹرویو لینے کی اجازت دی تھی تم نے تو الف لیلہ کی داستان لکھ دی ہے اور سارے صفحے کا انٹرویو چھاپ دیا ہے۔ اتنی تصویروں کی کیا ضرورت تھی۔ ایک تصویر ہی کافی تھی۔ یہ انٹرویو زیادہ سے زیادہ دو کالم کا ہونا چاہیے تھے۔ اب جو ہو گا تم ہی بھگتنا۔''

میر صاحب کے کمرے میں طلبی ہوئی۔ وہ کئی بار ہمارے بارے میں دریافت کر چکے تھے۔ ہم عموماً دیر سے دفتر پہنچتے تھے اور دیر تک موجود رہتے تھے۔ دعائیں پڑھتے ہوئے میر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے میں مہر

صاحب بھی موجود تھے اور مقامی ایجنٹ شمشاد صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے (یہ آج کل لاہور میں نوائے وقت کے ایجنٹ ہیں) ہم چپکے سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ میر صاحب کے اشارے پر گرم چائے کا کپ ہمارے سامنے رکھ دیا گیا۔ مہر صاحب چائے کے بہت شوقین تھے اور ہر بار چائے پینے کے بعد کہتے تھے ''بھئی یہ زیادہ گرم نہیں تھے' خوب گرم چائے لے کر آؤ۔''

اس طرح ہر قت چائے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ چائے نوشی میں ان کا ذوق بے حد اچھا تھا۔ شاید وہیں سے ہمیں بھی اچھی چائے کا ذوق پیدا ہو گیا۔

میر صاحب اور مہر صاحب کے بولنے سے پہلے ہی ایجنٹ صاحب بے اختیار کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ''آفاقی صاحب' بہت بہت مبارک ہو۔ آپ نے تو حد ہی مکا دی ہے۔''

ہم سمجھے کہ لو بھئی اعتراضات کا آغاز ہو گیا مگر انہوں نے آگے بڑھ کر ہمارا ہاتھ تھام لیا اور جوش میں آکر کہنے لگے ''آپ نے کمال کر دیا۔ ہر جگہ اس انٹرویو کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ اتنی مانگ ہے کہ اب ہم دوسرا ایڈیشن چھاپ رہے ہیں۔''

ہمیں خوشی تو ہوئی مگر سوچا کہ یہ ایجنٹ صاحب کی ذاتی کاروباری رائے ہے' بزرگ ایڈیٹر حضرات کیا فرمانے والے ہیں؟ ابھی تک اسرار ہی تھا۔

سب سے پہلے میر صاحب نے ہمیں مخاطب کیا ''بھئی یہ انٹرویو تو بہت خوب ہے۔''

مہر صاحب بولے ''لیکن مبالغہ آرائی کچھ زیادہ ہو گئی ہے اور انٹرویو میں شاعرانہ اور ادبی رنگ غالب آگیا ہے۔ ''

ایجنٹ صاحب نے فرمایا ''مگر مولانا پبلک نے بہت پسند کیا ہے۔''

''بھئی ہم پبلک کی نہیں اصول کی بات کر رہے ہیں۔''

میر صاحب فرمانے لگے ''اگر انٹرویو کچھ کم ہو جاتا اور تصویریں اتنی زیادہ نہ ہوتیں تو بہتر تھا اور وہ بھی ایک فلم ایکٹریس کا اس قدر طولانی انٹرویو۔''

''میر صاحب'' ایجنٹ نے کہا ''جو بھی ہے سرکولیشن کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ ''

میر صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ہم نے کہا" آئندہ خیال رکھیں گے۔"

بولے "ٹھیک ہے۔"

ہم اجازت لے کر چلے آئے۔ ہمارے کمرے میں مبارک باد دینے والوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ ہر کوئی پوچھ رہا تھا" کیا واقعی وہ اتنی ہی خوب صورت ہے؟"

ایک صاحب شکوہ کررہے تھے" یار ایسی جگہوں پر اکیلے ہی چلے جاتے ہو۔" ٹیلی فون کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ کوئی اعتراض کررہا تھا، کوئی رشک کررہا تھا اور کوئی ناراضگی کا اظہار کررہا تھا۔

ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی، ایک زنانہ آواز نے پوچھا۔"آفاقی صاحب ہیں؟"

ہم نے کہا" بول رہے ہیں۔"

دوسری طرف سے ایک پرجوش آواز سنائی دی" آفاقی یار، تم نے تو کمال کر دیا۔ اتنا اچھا انٹرویو تو کسی ہالی ووڈ کی ایکٹریس کا بھی نہیں چھپا ہوگا۔"

ہم نے کہا" شکریہ، آپ کون بول رہے ہیں؟"

"ارے تمہیں کیا ہو گیا ہے، پہچانا نہیں؟ میں نگہت بول رہی ہوں۔ آج تم ضرور آنا۔ پیٹ بھر کر مٹھائی کھلاؤں گی۔"

ہم نے آس پاس والوں کو دیکھا۔ نگہت کی بلند آواز ان سب تک پہنچ رہی تھی اور وہ سب ہمیں چبا جانے والے انداز میں گھور رہے تھے۔

"اچھا ٹھیک ہے" کہہ کر ہم نے فون بند کر دیا۔

"اچھا تو اب یہ چکر شروع کر دیا تم نے؟"

ہم جھینپ گئے سارا دن یہی سلسلہ جاری رہا۔ اس پہلے فلمی انٹرویو کی مقبولیت نے ہمیں خوش اور بے حد پر اعتماد کر دیا تھا۔ ایک بڑے شاعر کا فون آیا" بھائی تم کس کی باتوں میں آگئے؟ اسے شاعرہ بھی بنا دیا۔ وہ تو صحیح شعر تک نہیں پڑھ سکتی۔ اس نے اچھا بے وقوف بنایا ہے تمہیں۔"

یہ وہی مشہور شاعر تھے جن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزل ہم نگہت سلطانہ کی کاپی میں دیکھ چکے تھے اور احتیاطاً یہ کاغذ پھاڑ کر ساتھ بھی لے آئے تھے۔ یہ اس وقت بھی بہت بڑے اور مشہور شاعر تھے۔ پاکستانی اور بھارتی فلموں میں بھی ان کا بہت بڑا نام تھا اور آج بھی ہے۔

ہم نے کہا ”بے وقوف تو اس نے اور لوگوں کو بھی بنایا ہے۔“

طنزیہ انداز میں بولے ”سچ کہا آپ نے۔ دنیا میں بے وقوفوں کی کمی نہیں ہے۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔“

ہم نے جل کر کہا ”صحیح کہا آپ نے۔ ایک تو اس وقت بھی مل گئے ہیں۔ اور فون پر ہم سے مخاطب ہیں۔“

غصے سے بولے ”آپ کو چھوٹے بڑے کا لحاظ بھی نہیں ہے۔“

ہم نے کہا ”حضور ناراض نہ ہوں۔ ہم نگہت کی کاپی میں آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزل پڑھ چکے ہیں۔“

وہ کچھ سٹپٹا سے گئے۔

ہم نے کہا ”اور وہ کاغذ ہم پھاڑ کر اپنے ساتھ بھی لے آئے ہیں۔“

انہیں اچانک سانپ سونگھ گیا' ٹیلی فون بند ہو گیا۔

اسی شام ان سے لکشمی چوک کے ایک ریستوران میں ملاقات ہوئی تو فوراً ایک طرف لے گئے اور بولے ”آفاقی صاحب' یہ بات آپ تک ہی رہنی چاہیے' وعدہ کریں۔“

ہم نے وعدہ کر لیا اور آج تک نبھا رہے ہیں۔ ان کا نام ہم نے آج بھی کسی کو نہیں بتایا۔ اس شام انہوں نے ہمیں چائے بھی پلوائی اور سموسے بھی کھلائے۔

دوپہر کے قریب ہمیں ایک فون موصول ہوا۔

”ہیلو“ ایک مردانہ آواز نے کہا ”آفاقی صاحب ہیں؟“

”جی فرمائیے؟“

”آفاقی صاحب' السلام علیکم“ انہوں نے بڑے خلوص اور مٹھاس سے کہا۔

”وعلیکم السلام“

''میرا نام اطہر مانی ہے۔ میں سید شوکت حسین رضوی صاحب کا اسسٹنٹ ہوں۔''

ہم سنبھل کر بیٹھ گئے ''جی''

کہنے لگے ''آفاقی صاحب' شوکت صاحب اور میڈم نور جہاں بہت بڑی شخصیات ہیں۔آپ نے ان کے مقابلے میں ایک معمولی ایکٹریس کو آسمان پر بٹھا دیا۔''

ہم نے کہا ''تو پھر ؟ ہم آپ کے جواب دہ نہیں ہیں۔''

بولے '' ناراض نہ ہوں' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ شوکت صاحب کو اس انٹرویو سے بہت تکلیف پہنچی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان سے اور میڈم سے تو کچھ پوچھا نہیں اور نگہت کا اتنا بڑا انٹرویو چھاپ دیا۔''

ہم نے کہا ''مگر اس انٹرویو میں میڈم یا شوکت صاحب کا تو ذکر بھی نہیں ہے۔''

کہنے لگے ''یہ فون پر کرنے کی بات نہیں ہے۔ دراصل میڈم آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ کیا آپ کسی وقت شاہ نور اسٹوڈیو تشریف لا سکتے ہیں ؟''

ہم حیران رہ گئے ''کیوں نہیں مگر کب ؟''

وہ بولے ''میں کل ہی فون کر کے آپ کو بتا دوں گا۔ شاہ نور اسٹوڈیو آپ کے دفتر سے بہت دور ہے اس لئے آپ کو لینے کے لئے گاڑی آجائے گی۔''

ہم نے کہا ''شکریہ'' اور فون بند کر دیا۔

ہمارے ساتھ یہ معاملہ ہے کہ ہمیں کبھی کسی شخصیت سے ملنے کا اشتیاق نہیں رہا خواہ وہ لیڈر ہو' حکمران ہو' فلم اسٹار ہو یا کوئی اور ہو۔ ہوش سنبھالنے کے بعد ہم نے کبھی کسی سے ملاقات کی خواہش نہیں کی مگر جب معلوم ہوا کہ نور جہاں جیسی ہستی نے ہمیں ملاقات کے لئے بلایا ہے تو ہمیں ایک گونہ خوشی سی ہوئی۔ نور جہاں اس وقت بھی ایک بہت ممتاز فن کارہ تھیں۔ سارے برصغیر میں ان کی دھوم تھی۔ ان کی فلموں اور گانوں نے قیامت ڈھا رکھی تھی۔ ان کی پہلی فلم ''خاندان'' ہم نے کبھی نہیں دیکھی مگر ان کا گایا ہوا نغمہ '' تو کون سی بدلی میں میرے چاند ہے آجا'' اکثر گنگنایا کرتے تھے ان کے دوسرے گانے بھی بہت اچھے لگتے تھے۔ '' انمول گھڑی'' ''لال حویلی'' اور '' گاؤں کی گوری

،، فلمیں ہم نے دیکھ رکھی تھیں اور ہمیں نور جہاں بہت اچھی لگی تھیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ مگر ہم نے کبھی لاہور آ کر بھی نہیں سوچا تھا کہ نور جہاں سے ملاقات کی کوئی سبیل نکالی جائے۔ حالانکہ بطور صحافی ہم جن چائے خانوں میں بیٹھا کرتے تھے وہاں فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے یا تعلق پیدا کرنے کے خواہش مندوں کی بھی کمی نہ تھی اور فلم والوں کی اکثر خبریں ہمیں ان کی زبانی معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ نور جہاں اور نگہت سلطانہ کے جھگڑے کا قصہ بھی ہم تفصیل کے ساتھ سن چکے تھے مگر ان دنوں چونکہ اخبارات میں فلمی خبریں شائع کرنے کا رواج نہ تھا اس لیے جب تک نگہت سلطانہ نے میڈم نور جہاں کے خلاف مقدمہ دائر نہیں کر دیا اس وقت تک یہ خبر بھی کسی اخبار میں شائع نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے جب گھر بیٹھے ہمیں نور جہاں جیسی فنکارہ کی جانب سے ملاقات کی دعوت موصول ہوئی تو ہم بہت خوش ہوئے۔ مگر ہم نے یہ خبر کسی اور کو نہیں بتائی کیونکہ خود ہمارے دفتر میں نور جہاں کے پرستاروں کی کوئی کمی نہ تھی اور ان کے سامنے یہ راز ظاہر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ان سب کو بھی لاد کر اپنے ہمراہ لے چلو---اس لیے خاموشی ہی مناسب سمجھی۔

دوسرے دن دو بجے کے قریب مانی صاحب کا دوبارہ فون آیا۔ ہم تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ شاید ہم سے کسی نے مذاق کیا ہے ورنہ نور جہاں اور شوکت حسین رضوی کو کیا پڑی ہے کہ ہم سے ملاقات کریں؟

""میں مانی عرض کر رہا ہوں،، انہوں نے بڑی سلیس اردو میں کہا۔ پھر علیک سلیک کے بعد بتایا کہ اگر ہم فارغ ہوں تو وہ شام چار بجے ہمیں لینے کے لیے آ جائیں گے۔ ہم تو اگر فارغ نہ بھی ہوتے تو فراغت نکال لیتے۔ اس لیے فوراً حامی بھر لی۔

ٹھیک چار بجے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور ایک دراز قد دبلے پتلے نوجوان اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے شیروانی پہن رکھی تھی اور کلین شیو تھے۔ خاصے خوش شکل تھے۔

""خادم کو اطہر مانی کہتے ہیں۔""

ہم نے اٹھ کر اپنا تعارف کرایا۔ وہ کچھ دیر ہمیں دیکھتے رہے۔ پھر ہنسنے لگے۔ کہا ""میں تو سمجھا تھا کہ داڑھی مونچھوں

والے بڑی عمر کے آدمی ہوں گے مگر آپ تو ہمارے ہم عمر نکلے۔"

اس طرح اطہر مانی صاحب سے ہماری دوستی کا آغاز ہوا جو ان کی وفات تک قائم رہی۔ انہوں نے چند سال بعد شوکت صاحب کی ملازمت ترک کر دی تھی اور ریکارڈنگ اور پبلسٹی کا کام شروع کر کے خاصے خوش حال ہو گئے تھے۔ ایک فلم ڈانسر شرارہ کے ساتھ ان کی شادی ہو گئی تھی اور بہت اچھی گھریلو زندگی گزری مگر چند سال کے بعد مانی صاحب کا چھریرا جسم بھی موٹاپے میں بدل گیا اور شرارہ جو ڈانس کرتے ہوئے سچ مچ شرارہ نظر آتی تھیں، گھریلو بیوی بن کر ان سے بھی زیادہ موٹی ہو گئی تھیں۔ انہیں درجنوں بیماریاں بھی تھیں یا غالباً وہ دوسروں پر رعب ڈالنے کی خاطر من گھڑت بیماریاں بھی بیان کر دیا کرتی تھیں۔ ہماری ہمیشہ ان دونوں سے بہت اچھی ملاقات رہی اور گھر میں آنا جانا بھی ہوتا رہا۔ بعد میں مانی صاحب بھی بیمار رہنے لگے تھے اور اپنا کاروبار انہوں نے اپنے بیٹوں کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بہت مخلص، بے لوث اور نفیس آدمی تھے۔ وضع دار ایسے کہ جس سے ملتے تھے، ہمیشہ دوستی کے تقاضے نبھاتے تھے۔ ان کی وفات اس لحاظ سے بے وقت کہی جاسکتی ہے کہ ان کی عمر زیادہ نہ تھی مگر کیونکہ موت کا وقت معین تھا اس لیے رخصت ہو گئے۔ وہ دہلی لکھنؤ یا کانپور کے رہنے والے تھے۔ شروع میں فلم کا شوق تھا۔ اداکار بننے گئے تھے مگر شوکت صاحب نے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی اور پھر مشورہ دیا کہ اداکاری کا خیال چھوڑ دیں۔ ہدایت کاری سیکھیں۔ اس طرح وہ ان کے ساتھ لگ گئے تھے۔ مگر بعد میں شوکت صاحب نے فلموں سے زیادہ اسٹوڈیو کی جانب توجہ دینی شروع کر دی تو وہ بھی فلم انڈسٹری چھوڑ چھاڑ کر چل دیئے لیکن فلم کی ایک فن کارہ کو یادگار کے طور پر بیوی بنا کر لے گئے۔ شرارہ نے بھی شادی کے بعد فلمی دنیا کو ترک کر دیا تھا۔ ان کی ایک عادت یہ تھی کہ ملتے ہی اپنی بیماریوں کا تذکرہ لے بیٹھتی تھی۔ مانی صاحب بہت دلچسپ اور زندہ دل آدمی تھے۔ بیوی سے ان کی نوک جھونک جاری رہتی تھی۔ جب شرارہ بولنے پر آتیں تو کاما یا فل اسٹاپ مشکل ہی سے لگاتی تھیں مگر مانی صاحب انہیں لقمے دیتے رہتے تھے۔ وہ کہتے "اور آپ نے اپنی فلاں بیماری کے متعلق تو بتایا ہی نہیں؟"

اور شرارہ سنجیدگی سے کہتیں " ہاں خوب یاد دلایا" آفاقی صاحب کیا بتاؤں، یہ ایک نئی بیماری پیدا ہو گئی ہے۔"

وہ بیماری کی تفصیل بیان کرنی شروع کرتیں اور مانی صاحب ہنستے رہتے۔

تو یہ اطہر مانی تھے جو ہمیں شوکت صاحب کی شاندار بڑی سی امریکن کار میں بٹھا کر شاہ نور اسٹوڈیو لے جا رہے تھے۔ لاہور میں ان دنوں گنتی کی کاریں تھیں اور شوکت صاحب جیسی کار تو خال خال ہی نظر آتی تھی۔

ہم مال روڈ سے چوبرجی تک پہنچے تو گنجان آبادی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ کچھ دور آگے چل کر ویران اور سنسان علاقہ شروع ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی دوسرے شہر جا رہے ہیں مگر راستے میں مانی صاحب کی زبان تالو سے نہیں لگی۔ وہ فلموں کے بارے میں مستقل معلومات فراہم کرتے رہے۔

"شوکت صاحب نے شیش محل چھوڑ کر اب اسٹوڈیو میں ہی کوٹھی بنوالی ہے۔ ویسے اسٹوڈیو میں بیوی بچوں کے ساتھ رہنا مناسب تو نہیں ہے مگر انہیں تو دن رات اسٹوڈیو ہی کی فکر رہتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔"

خدا خدا کر کے شاہ نور اسٹوڈیو کے آثار نظر آئے۔ اس کے سامنے ایک کھلا میدان تھا جو کافی عرصے تک رہا اور یہاں فلمی میلوں وغیرہ کی شوٹنگیں ہوتی رہیں۔ آج کل وہاں ہر طرف عمارتین اور دکانیں نظر آتی ہیں۔ شاہ نور اسٹوڈیو ان کے پیچھے چھپ کر رہ گیا ہے۔

اسٹوڈیو کے اندر داخل ہوتے ہی بائیں جانب دفتر تھا اور اس سے پہلے ایک چھوٹا سا چبوترا بنا کر مسجد تعمیر کر لی گئی تھی۔ شوکت صاحب کی کار کو دیکھتے ہی لوگوں نے سلام کرنے شروع کر دیئے۔ ہم اخلاقاً ہاتھ ہلا ہلا کر جواب دیتے رہے۔ کار بالکل سامنے والے فلور کے سامنے جا کر رک گئی۔ اس کی دائیں جانب شوکت صاحب کی رہائش گاہ تھی۔ مانی صاحب ہمیں لے کر ایک چھوٹے سے برآمدے میں اور پھر ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ بہت شاندار سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا۔ انہوں نے ہمیں بٹھایا اور خود غائب ہو گئے۔ ہم خوبصورت قالین' پردے اور ڈیکوریشن دیکھتے رہے۔ چند لمحوں بعد اندر کے دروازے سے شوکت صاحب اور میڈم نور جہاں اندر داخل ہوئے۔ ہم استقبال کے لئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

یہ کم و بیش پینتالیس سال پہلے کا ذکر ہے۔ شوکت صاحب صحت و جوانی کا پیکر تھے۔ سرخ سفید رنگت' ہونٹ ایسے گلابی جیسے لپ اسٹک لگا رکھی ہو۔ دراز قد، گھونگریالے سیاہ بال' خوب صورت ناک و نقشہ' وہ مردانہ حسن کا نمونہ تھے۔ سفید پاجامے اور کرتے میں وہ کسی ریاست کے نواب نظر آ رہے تھے۔

ان کے ہمراہ میڈم نور جہاں تھیں۔ وہ اس زمانے میں میڈم نہیں کہلاتی تھیں صرف نور جہاں یا نور جہاں بیگم کہلاتی تھیں۔ شوکت صاحب انہیں پیار سے نوری کہہ کر مخاطب کرتے۔ شوکت صاحب کی وجاہت اور خوب روئی اپنی جگہ مگر نور جہاں کی شان ہی نرالی تھی۔ فلموں میں بنی ٹھنی ہیروئن نظر آتی تھیں۔ اس وقت ہمارے سامنے جو نور جہاں کھڑی تھیں وہ سادگی اور پرکاری کا پیکر تھیں۔ گورا رنگ ' چمکدار سیاہ آنکھیں' دلکش ناک نقشہ' چہرے پر معصومیت کے ساتھ ساتھ ایک شائستہ اور شرمیلی سی مسکراہٹ۔ جب وہ مسکراتی تھیں تو سب سے پہلے ان کی آنکھیں مسکرانا شروع کرتی تھیں۔ شوخ و شریر آنکھوں میں بے پناہ کشش تھی۔ ان کا سراپا ایک خوش اندام گھریلو خاتون کا سراپا تھا۔ وہ سادہ سی شلوار اور قمیص میں ملبوس تھیں۔ سر پر دوپٹہ تھا جو کھسک کر ان کے شانوں پر آجاتا تھا تو وہ اسے دوبارہ اپنے سر پر ڈال لیتی تھیں۔

ہم انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پیکر تو وہی تھا جو فلموں میں دیکھا کرتے تھے مگر انداز یکسر مختلف' کہاں ہیروئن کی شوخی و بے باکی اور کہاں یہ شرافت' معصومیت اور سادگی؟ ان کا چہرہ بھی میک اپ سے مبرا تھا ممکن ہے ہلکا پف یا پاؤڈر استعمال کیا ہو۔ انہوں نے گھریلو خاتون کے انداز میں بالوں کی چوٹی بنائی ہوئی تھی۔ اس وقت تک انہوں نے بال نہیں ترشوائے تھے۔

ہم انہیں دیکھتے رہ گئے اچھا' تو یہ ہیں نور جہاں! نور جہاں ایسی ہوتی ہیں؟ بھئی حد ہو گئی۔ اتنی سادہ تو عموماً گھریلو عورتیں بھی نہیں ہوتیں۔ انہوں نے جب "السلام علیکم" کہا تو کانوں میں شہد ٹپک گیا۔ اس قدر شیریں اور پاکیزہ آواز کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ فلموں میں تو دیکھا اور سنا تھا مگر حقیقی زندگی میں ہم نے پہلی بار نور جہاں کو بولتے ہوئے سنا تھا۔ جب انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا تو منہ سے پھول جھڑنے لگے۔ نہایت شستہ اور نستعلیق اُردو میں وہ بڑے وقار سے گفتگو کرتی رہیں۔ لب ولہجہ اور تلفظ ایسا کہ لکھنؤ اور دلی والے بھی اس پر رشک کریں اور آواز کی مٹھاس اور الفاظ کی نشت و برخاست سونے پر سہاگا۔

مگر نور جہاں کی میٹھی باتیں سننے سے پہلے ہمیں شوکت صاحب کی گرج چمک سے واسطہ پڑا۔ ہم نے سلام کیا۔

"بیٹھئے بیٹھئے" انہوں نے کہا اور خود بھی ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ نور جہاں ان کے برابر فروکش ہو گئیں۔ ہم بھی

سامنے والے نرم اور خوب صورت صوفے میں دھنس گئے۔

"بھئی وعلیکم السلام مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہماری بات بھی نہ پوچھی اور اس لڑکی کا اتنا بڑا انٹرویو چھاپ دیا۔ارے میاں یہ نئی لڑکیاں تو پبلسٹی حاصل کرنے کے لیے اسی طرح اسکینڈلز بناتی ہیں اور اخبار والوں کو دیکھئے کہ ان کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ارے بھئی ہم سے تو پوچھا ہوتا آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟"

اب وہ نثر سے شاعری پر اتر آئے تھے۔ان کا لب ولہجہ لکھنوی پوربی انداز کا تھا۔آواز میں مردانہ دبدبہ اور تمکنت تھی۔قدرت نے انہیں مردانہ وجاہت کا پیکر بنایا تھااور ان کے بارے میں بمبئی کی فلم نگری میں بھی یہ تصور عام تھا کہ شوکت حسین رضوی فلمی دنیامیں سب سے خوبصورت' وجیہہ اور خوش پوش شخص ہیں۔وہ ہزاروں کے مجمع میں بھی نمایاں اور ممتاز نظر آتے ہیں۔شوکت صاحب کے بارے میں ہمارا پہلا تاثر ہی نہایت بھرپور تھا' بعد میں ان سے اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔وہ بھی مہربانی اور شفقت فرمانے لگے۔مختلف موضوعات پر باتیں ہوا کرتی تھیں۔لطیفہ بازی بھی جاری رہتی تھی۔شاعری سے انہیں بہت دلچسپی رہی ہے' جب ترنگ میں ہوتے تو پرانے شعرا کے سینکڑوں اشعار سناتے چلے جاتے۔ رومانی اور عشقیہ شاعری ان کی پسندیدہ صنف تھی۔

وہ ہمارا جواب سننے کے منتظر تھے اور ہم دل ہی دل میں ان کی ستائش کر رہے تھے۔چند لمحے خاموشی رہی تو پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے" حضرت کچھ منہ سے تو بولیے۔میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہہ دی؟"

ہم نے کہا" شوکت صاحب' آپ نے دیکھا ہوگا کہ نگہت سلطانہ کے تمام انٹرویو میں آپ کا یا بیگم صاحبہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔آپ کی شکایت اس وقت بجا ہوتی اگر آپ کے بارے میں نگہت کی باتیں شائع کی جاتیں۔"

وہ قدرے لاجواب سے ہوگئے۔

میڈم نور جہاں نے کہا" مگر آپ نے ایک معمولی سی اداکارہ کو اتنی اہمیت دے دی ہے۔"

شوکت صاحب بولے" ہاں یہ تو ہے۔آپ جانتے ہیں کہ اس نے ہمارے خلاف مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔اس انٹرویو کے بعد تو لوگوں کی ہمدردیاں نگہت سلطانہ کے ساتھ ہو جائیں گی اور پھر آپ نے اس کی ساری جھوٹی سچی باتیں چھاپ دیں۔ارے میاں پہلے تصدیق تو کرلی ہوتی۔"

ہم نے کہا" دراصل سچی بات یہ ہے کہ فلموں کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ کسی فلمی ہستی سے یہ ہمارا پہلا انٹرویو ہے۔"

"بھئی آپ نے تو بسم اللہ ہی غلط کر دی۔" شوکت صاحب نے کہا" پہلا فلمی انٹرویو لیا بھی تو گمنام اداکارہ کا۔ اس نے اپنی گفتگو میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے اور آپ نے وہ سب کچھ بلا کم و کاست چھاپ دیا۔"

ہم نے عرض کی" آپ تو جانتے ہیں کہ اخباروں میں فلموں اور فلم والوں کا ذکر ہوتا ہی نہیں ہے۔ اسی بہانے فلمی خبریں اور انٹرویو بھی شائع ہو جایا کریں گے۔ ہم نے تو جو کچھ چھاپا ہے وہ نگہت سلطانہ کا اپنا بیان ہے۔ انہوں نے اپنے بارے میں جو حالات بیان کیے وہ ہم نے چھاپ دیے۔ مانی صاحب نے بتایا ہے کہ آپ کو شکایت پیدا ہوئی ہے تو معذرت کے لیے چلے آئے۔ اب آپ کا اور بیگم صاحبہ کا انٹرویو بھی شائع کر دیں گے۔"

کہنے لگے" بھئی انٹرویو دینا بہت جھگڑے کا کام ہے۔ انٹرویو آپ نور جہاں سے کر لیجئے۔" پھر ہماری طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرائے اور بولے" آپ نے نگہت کے بارے میں افسانہ طرازی کی ہے اس پر مجھے کوئی تعجب نہیں ہے۔ ارے بھائی یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے رخصت ہو گئے۔

اتنی دیر میں مانی صاحب دوبارہ کمرے میں آ گئے۔ اس بار وہ چائے کے اہتمام کے ساتھ آئے تھے۔ ایک ملازم ٹرے میں چائے اور دوسرے لوازمات لیے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ یہ نوعمر لڑکا تھا اور کسی پیدائشی نقص کی وجہ سے قدرے لنگڑا کر چل رہا تھا۔

میڈم نور جہاں نے کہا" اشرف' چائے یہاں رکھ دو میں خود بنا لوں گی۔ تم جا کر دیکھو کہ بچے کہاں ہیں' کیا کر رہے ہیں؟"

"جی بہتر ہے۔" کہہ کر اشرف لنگڑاتا ہوا رخصت ہو گیا۔

"یہ اشرف بھی ایک کیریکٹر سے کم نہیں ہے۔ لڑکپن میں شوکت صاحب کے گھر میں کام کرنے کے لیے آیا تھا اور اب بالوں میں سفیدی آ چکی ہے مگر آج بھی شوکت صاحب کے گھر میں اسی طرح" مدار المہام" کے فرائض سر انجام دیتا ہے"۔ نور جہاں نے ہمیں بتایا

ہم نے بعد میں شاہ نور اسٹوڈیو اور شوکت صاحب کے ہمراہ کافی عرصہ گزارا اور اشرف کو پھرکی کی طرح گھومتے ہوئے ہی پایا۔ اس کی زبان سے " جی بہتر ہے" کے سوا کوئی دوسرا فقرہ ہمارے کانوں نے نہیں سنا۔ اشرف کا تذکرہ آگے بھی ہوگا جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ جن دنوں شوکت صاحب کے گھر میں خاتون خانہ یا کوئی گھر والی نہیں تھی اس زمانے میں اشرف کے اختیارات کتنے وسیع تھے۔ اگرچہ اس نے کبھی بھی ان سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ آج بھی اس کا حلیہ اور رویہ وہی ہے جو روز اول تھا۔

یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا جو خاصا طویل ہوگیا۔ اشرف کے رخصت ہونے کے بعد اطہر مانی صاحب چائے بنانے کے ارادے سے آگے بڑھے مگر میڈم نور جہاں نے چائے کی ٹرے اپنے سامنے کھسکالی اور چائے بنانے میں مصروف ہو گئیں۔ ہم بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ سب سے پہلے انہوں نے چائے دانی کا ڈھکن کھول کر اس میں چینی ڈالی اور چمچہ چلا کر دوبارہ اس پر ٹکوزی ڈھانپ دی۔ اس کے بعد چائے کی پیالیوں میں چینی ڈالنے سے پہلے ہم سے دریافت کیا" آپ کتنی چینی پیتے ہیں؟"

"جی دو چمچے کافی ہوں گے۔"

وہ مسکرائیں " کفایت شعاری نہ کریں۔ زیادہ پیتے ہیں تو اور بھی ڈال دوں گی۔"

ہم نے کہا" جی نہیں شکریہ۔"

انہوں نے ہمارے دیکھتے دیکھتے نہایت سلیقے اور نفاست سے چائے بنائی۔ چائے نہایت خوش رنگ اور لذیذ تھی۔ چائے کے برتن بھی بہت قیمتی اور خوب صورت تھے۔ شوکت صاحب ہر معاملے میں " بہترین" سے کم پر مطمئن نہیں ہوتے۔ ان کی پوشاک سے لے کر گھر کی سجاوٹ اور کھانے کے برتنوں تک ہر چیز میں یہی حسن اور نفاست نظر آتی ہے۔ ہم حیران تھے کہ ایک اتنی بڑی فنکارہ کتنی مہارت سے ایک گھریلو سلیقہ مند عورت کی طرح چائے بنا رہی تھی۔ دل ہی دل میں ہم نگہت سلطانہ کا شکریہ بھی ادا کر رہے تھے جن کے انٹرویو کی بدولت ہمیں میڈم نور جہاں کے ہاتھ سے بنی ہوئی چائے نصیب ہو رہی تھی۔

مانی صاحب نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر ہماری تعریف شروع کر دی" بہت شریف آدمی ہیں' بہت اچھے صحافی ہیں۔ اخلاق بہت اچھا ہے۔ میں نے شکایتاً فون کیا تو فوراً آ گئے۔ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ان کی تحریر میں بڑی چاشنی ہے"۔

میڈم نورجہاں مسکرائیں۔ کہنے لگے" ہاں وہ تو نگہت کے انٹرویو سے ہی ظاہر ہے۔"

ہم کچھ جھینپ سے گئے۔مانی صاحب ہمیں اشارہ کر رہے تھے کہ اب انٹرویو شروع کرو۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم نے کبھی کسی فلم اسٹار سے انٹرویو نہیں کیا تھا نہ ہی کوئی پیشگی تیاری کی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نورجہاں جیسی ہستی سے کیا دریافت کریں۔ ہم بلا مبالغہ بہت باتونی ہیں ہمارے احباب کو ہمیشہ ہم سے یہ شکوہ ہی رہا کہ آفاقی جب تم بولتے ہو تو کامہ اور فل سٹاپ کے بغیر بولے چلے جاتے ہو اور ہمیں موقع ہی نہیں دیتے مگر اس وقت کوئی بات ذہن میں نہیں آرہی تھی۔ یہ اس طرح ہے کہ چاہے آپ کتنے ہی لطیفہ گو ہوں اگر اچانک کوئی فرمائش کر دے کہ کوئی لطیفہ تو سنائیں تو آپ کو لطیفہ یاد نہیں آتا۔کچھ ایسا ہی عالم ہمارا بھی تھا۔

ہم نے اپنے سوالات کا آغاز ان کی ابتدائی فلمی زندگی سے کیا۔ پھر بمبئی کی فلموں اور فلم سازوں کے بارے میں پوچھا۔ ان کے ساتھ جن اداکاروں نے کام کیا تھا ان کے متعلق میڈم کے تاثرات دریافت کیے۔ پھر فلم" چن وے" کے حوالے سے چند سوالات کیے مگر شاید میڈم اس انتظار میں تھیں کہ ہم نگہت سلطانہ کا ذکر چھیڑیں اور وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالیں۔ جب ہم نگہت کا نام بھی زبان پر نہ لائے تو وہ نہ رہ سکیں اور انہوں نے خود ہی نگہت سلطانہ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔اخبارات میں جو واقعہ شائع ہو چکا تھا اس کے بارے میں صحیح صورت حال بیان کرنے لگیں اور کہا کہ آپ یہ سب ضرور چھاپیں۔

ہم نے کہا" دراصل یہ مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے اس لیے اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا جا سکتا ورنہ توہین عدالت ہو جائے گی۔"

بولیں" یہ خوب طریقہ ہے کہ نگہت کا بیان تو چھپ گیا مگر میرا بیان نہیں چھپ سکتا۔"

ہم نے کہا" وہ تو مقدمے کے حوالے سے خبر تھی کہ انہوں نے اپنے بیان میں یہ الزام لگایا ہے۔ جب عدالت میں آپ کا بیان ہو گا تو وہ اس سے بھی زیادہ نمایاں شائع کیا جائے گا۔"

نگہت سلطانہ کے مقدمے کا قصہ یہ تھا کہ وہ غریب تو نئی نئی کراچی سے لاہور آئی تھی۔ شہرت اور دولت سے محروم تھی۔ شوکت حسین رضوی اور نور جہاں کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی تھی مگر لاہور میں کچھ لوگ جو شوکت صاحب کے مخالف تھے انہوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نگہت سلطانہ کو شہ دی اور مقدمے کے تمام اخراجات بھی برداشت کرنے کا وعدہ کیا۔ ورنہ لاہور میں رہ کر ان لوگوں سے مقدمہ بازی تو اسی طرح کی بات تھی جیسے پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھا جائے۔

ابھی یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ میڈم نور جہاں کے دونوں بچے آندھی اور طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوئے۔ آتے ہی انہوں نے صوفوں پر چھلانگیں لگانی شروع کر دیں۔ چھوٹا اصغر ان کی کمر پر سوار ہونے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ اکبر صاحب قالین پر قلابازیوں کے کرتب دکھانے لگے۔ ایک دم کمرے میں بھونچال سا آگیا اور ماحول ہی بدل گیا۔ میڈم انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہیں مگر توبہ کیجئے وہ کہاں سننے والے تھے۔ اسی ہنگامے میں نور جہاں نے تعارف کی رسم ادا کی۔

"یہ اکبر حسین رضوی ہیں۔ میرے بڑے بیٹے اور یہ اچھو ہیں' اصغر حسین رضوی۔ یہ بہت شیطان ہے۔ ایک منٹ بھی نچلا نہیں بیٹھتا۔"

دونوں بچوں کو کمرے میں دلچسپی کی کوئی چیز یا مشغلہ نظر نہیں آیا تھا اس لیے وہ اچھلتے کودتے ہوئے کمرے سے رخصت ہو گئے اور کمرے میں سکون ہو گیا۔

ابھی ہم کوئی بات کرنے بھی نہ پائے تھے کہ ہاؤس ہولڈ کے انچارج اشرف صاحب دروازے میں نمودار ہوئے اور انہوں نے اطلاع دی کہ دھوبی کپڑے لے کر آیا ہے۔ اس زمانے میں گھروں میں دھوبی ہی کپڑے دھویا کرتے تھے۔ دھوبی یا دھوبن جب میلے کپڑے لے کر جاتے تو گھر کی خاتون ایک کاپی میں ان کی تفصیل لکھ لیتیں۔ جب کپڑے دُھل کر واپس آتے تو وہ کاپی کے حساب سے چیک کر لیے جاتے تھے۔ اسے عام اصطلاح میں "کپڑے ملانا" کہا جاتا تھا یعنی جو کچھ لکھا ہوا ہے اس سے ملا کر دیکھ لیجئے کہ کوئی کمی بیشی تو نہیں ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ کپڑے ملانے کا فرض کوئی اور سر انجام دے گا مگر حیران رہ گئے جب میڈم نور جہاں نے کہا" ہاں

ہاں، بلالو دھوبی کو۔اور کپڑوں والی کاپی بھی لے آؤ۔"

"جی بہتر" کہہ کر اشرف الہ دین کے چراغ کی طرح غائب ہو گیا۔اسی دروازے سے دھوبی کپڑوں کی گٹھڑی لیے ہوئے داخل ہوا۔

"سلام بی بی جی۔"

"سلام کیسے ہو؟ گھر میں سب خیریت ہے نا؟" میڈم نے پوچھا۔

"آپ کی دعا ہے جی، دیکھ لیجئے اس بار دیر نہیں کی۔ کتنی جلدی، دھلائی لے کر آیا ہوں۔"

"ہاں بھئی یہ بات تو ٹھیک ہے مگر ہر بار ایسا ہی کیا کرو۔ میاں بھی ناراض نہیں ہوں گے۔" میاں وہ شوکت صاحب کو کہا کرتی تھیں۔

یکایک انہیں خیال آیا کہ ایک صحافی بھی انٹرویو لینے کے لیے کمرے میں موجود ہے۔ بولیں" معاف کیجئے اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو دھوبی کو فارغ کر دوں؟"

اس طرح ہم سے اجازت لینے کے بعد انہوں نے اشرف کی لائی ہوئی کاپی کھولی ادھر دھوبی نے اجلے کپڑے میں لپٹی ہوئی گٹھڑی کھولی اور کپڑے ملانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

نور جہاں کا یہ روپ ہمارے لیے بالکل انوکھا تھا۔ وہ ایک عام گھریلو گرہستین کی طرح دھوبی سے حساب کتاب اور شکوے شکایت کرنے میں مصروف تھیں" فلاں کپڑے کا رنگ چھوٹ گیا، فلاں کپڑا اپھاڑ کے لے آئے۔ فلاں چیز گم کر دی وغیرہ وغیرہ۔"

کچھ دیر بعد ہم نے اجازت طلب کی اور شوکت صاحب کی گاڑی ہمیں دفتر پہنچا گئی۔ مانی صاحب بھی ہمارے ساتھ ہی تھے اور اس انٹرویو کے خوش اسلوبی سے مکمل ہونے پر کافی خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ نور جہاں کو ہم نے فلموں میں اور ریکارڈوں میں گاتے ہوئے سنا تھا۔ان کی آواز کی مٹھاس اور خوب صورتی کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ایک دنیا ان کی آواز اور ان کی گائیکی کی معترف ہے لیکن جب ہم نے انہیں بولتے ہوئے سنا تو حیران رہ گئے۔ میڈم نور جہاں میں ہم نے یہ کمال دیکھا کہ وہ اردو اور پنجابی دونوں زبانیں بڑی خوب صورتی سے بولتی ہیں اور

دونوں کے ساتھ پورا انصاف کرتی ہیں جب وہ اردو بولتی ہیں تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ ان کی مادری زبان نہیں ہے۔اور جب وہ پنجابی بولتی ہیں تو اس قدر ٹھیٹ کہ یہ خیال ہی نہیں آتا کہ وہ اردو بول بھی سکتی ہوں گی۔

میڈم نور جہاں کا انٹرویو ہم نے اگلے ایڈیشن میں شائع کر دیا۔اس میں ان کی سادگی اور گھریلو پن کا مکمل نقشہ کھینچ دیا تھا۔اسے بھی پسند کیا گیا لیکن وہ نگہت سلطانہ والے انٹرویو جیسی بات نہ تھی۔دراصل اس انٹرویو میں نگہت نے مبالغے کی انتہا کر دی تھی اور ہم نے اپنا سارا زور قلم اس کی سجاوٹ اور مرصع الفاظ کے استعمال پر صرف کر دیا۔

''آفاق'' میں دونوں انٹرویو مقبول ہوئے۔نگہت سلطانہ کے انٹرویو کا تو دوسرا ایڈیشن بھی شائع کیا گیا تھا۔میڈم نور جہاں کے انٹرویو میں وہ رنگینی اور لفاظی نہیں تھی پھر بھی اسے بہت پسند کیا گیا۔پڑھنے والوں کو پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ برصغیر کی عظیم فن کارہ اپنے گھر میں کس طرح رہتی ہے۔اس حوالے سے فلمی حلقوں میں ہماری پہچان ہو گئی۔فلم والوں کو اخبارات سے شکایت تھی کہ وہ کبھی ان کے بارے میں دوسطری خبر تک شائع نہیں کرتے مگر ہم نے تو بڑے طویل انٹرویو چھاپ دیے تھے۔یہ فلمی صنعت کی بہت بڑی حوصلہ افزائی تھی اگرچہ ہم نے یہ سب کچھ فلمی صنعت کی حوصلہ افزائی کے خیال سے نہیں کیا تھا۔یہ تو ایک صحافتی مصلحت تھی۔ہم نے ایک ہوشیار صحافی کی طرح موقعے سے پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

اگلے دن سے دفتر میں ٹیلی فون آنا شروع ہو گئے۔قارئین نے خطوط بھی لکھے۔ان کو یہ شکایت تھی کہ ہم نے نور جہاں اور نگہت سلطانہ کے جھگڑے کے بارے میں ان دونوں سے کوئی سوال کیا نہ حقیقت بیان کی۔عام لوگوں کو تو فلمی ہستیوں کا مزہ پڑ گیا تھا مگر ہم توہین عدالت کے ڈر سے اس بارے میں کچھ نہیں لکھ سکتے تھے۔یہ بات ہم فون کرنے والوں کو تو بتا دیتے تھے مگر خط لکھنے والوں کو سمجھانا ہمارے بس میں نہیں تھا۔

ہم کبھی کبھی سوچتے ہیں کہ اگر ہم نے نگہت سلطانہ سے انٹرویو نہ کیا ہوتا اور پھر بعد میں شاہ نور اسٹوڈیو کے ماحول کا مزہ نہ چکھا ہوتا تو کیا پھر بھی ہم فلمی دنیا کا رخ کرتے؟ یا ساری زندگی صحافت کی وادیوں میں ہی گزار دیتے؟اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک معمولی سا واقعہ یا چھوٹا سا اتفاق کس طرح لوگوں کی زندگیوں کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ ہمیں فلمیں دیکھنے کا شوق ضرور تھا مگر فلمی ہستیوں سے ملنے کا کوئی اشتیاق نہیں تھا مگر دوسرے

لوگوں کا معاملہ بالکل برعکس تھا۔ ہمارے دوست احباب تو ایک طرف، خود دفتری رفقا بھی ہم پر رشک کیا کرتے تھے اور فرمائشیں کرتے رہتے تھے کہ یار ہمیں بھی نور جہاں سے ملادو۔ اور کوئی نگہت سلطانہ سے ملاقات کا خواہش مند تھا۔ کچھ لوگ دوسرے فن کاروں کے پرستار تھے۔ جن کی ہم نے شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ سوائے ان مرد فن کاروں کے جو لکشمی چوک کے چائے خانوں میں آیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ایک دو کو چھوڑ کر سبھی فلم اسٹار ان چائے خانوں اور رائل پارک کے دفتروں میں مٹر گشت کرتے ہوئے نظر آجاتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ کسی کی بھی اسٹار ویلیو نہیں تھی۔ جب فلمیں ہی نہیں بنیں گی تو اسٹار ویلیو کیسے بنے گی؟

صرف دو ایکٹر ایسے تھے جو لکشمی چوک میں گھومتے پھرتے نظر نہیں آئے۔ ان میں ایک سنتوش کمار تھے اور دوسرے سدھیر ورنہ دوسرے اداکار تو فلموں میں کام کرنے کے بعد بھی بے تکلفی سے ان کوچوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ سدھیر نے آغاز ہی سے خود کو الگ تھلگ اور گوشہ نشین رکھا تھا۔ سنتوش کمار میں بھی ایک ارسٹوکریٹ جیسی خصوصیات تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان اداکاروں کو دیکھنے کا لوگوں کو ہمیشہ اشتیاق رہتا تھا۔ ایک بار لکشمی چوک میں یہ خبر گرم ہوئی کہ سنتوش کمار آئے ہیں اور فلم ساز میاں رفیق کے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ یہ خبر منٹوں میں دور دور تک پھیل گئی اور دفتر کے سامنے ایک بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا جو شام تک موجود رہا لیکن یہ خبر غلط تھی۔ سنتوش کمار اس دفتر میں آئے ہی نہ تھے لیکن ان کے پرستار ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے صبح سے شام تک کھڑے رہے۔ سنتوش کے پاس اس زمانے میں کار نہیں تھی۔ کار تو دوسرے فلمی ستاروں کے پاس بھی نہیں تھی یہ لوگ کمپنی کی گاڑیوں میں یا تانگوں میں اسٹوڈیو جایا کرتے تھے۔ وہ بھی عجب زمانہ تھا مفلسی اور بے روزگاری کا زمانہ۔ مگر حوصلے سب کے بلند تھے۔ آج کے بالکل برعکس جب کہ آج پیسے کی ریل پیل ہے۔

ایک دن ہم دفتر گئے تو پتا چلا کہ میر صاحب کئی بار یاد کر چکے ہیں۔

جب ہم میر نور احمد صاحب کے دفتر میں پہنچے تو وہاں مقامی ایجنٹ کے علاوہ ایک دو اور اصحاب بھی موجود تھے۔ میر صاحب نے حسب معمول گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو طلب کیا اور کہا "بھئی یہ چائے تو زیادہ گرم نہیں تھی، خوب گرم

چائے لے کر آؤ۔"

اس کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ ظہور عالم شہید صاحب بھی اس میٹنگ میں موجود تھے۔ تجویز یہ تھی کہ اخبار میں باقاعدگی سے ہر ہفتے فلمی خبریں اور تصویریں شائع کی جائیں۔ ایجنٹ اور سرکولیشن کا خیال تھا کہ اس سے اخبار کی اشاعت میں کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔ ہماری رائے دریافت کی گئی تو ہم نے بھی اس کے حق میں رائے دی۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ فلمی حصہ مرتب کون کرے گا؟

ایجنٹ صاحب نے فرمایا" آفاقی صاحب کے سوا کون کر سکتا ہے۔ اللہ کے فضل سے انہیں فلموں کا خوب پتہ ہے"۔

اب سب کی نگاہیں ہماری طرف مرکوز ہو گئیں۔

ہم نے کہا" ہم تو تیار ہیں مگر اس کے لیے ہمیں فلموں والوں سے ملنا بھی پڑے گا اور اسٹوڈیو بھی جانا پڑے گا۔"

مطالبہ معقول تھا اس لیے فوراً تسلیم کر لیا گیا۔ اس طرح ہمارے لیے فلم اسٹوڈیوز جانے اور فلم والوں سے ملاقات کرنے کا راستہ کھل گیا۔

اسی زمانے میں ہم لکشمی چوک پر فلمی ماہنامہ " فلم لائٹ " کے دفتر میں بھی جایا کرتے تھے۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر عیسیٰ خان غزنوی تھے۔ یہ پرچہ اس زمانے میں بہت مقبول فلمی میگزین تھا۔ بااثر بھی تھا۔ عیسیٰ خان بذات خود بہت دلچسپ اور رنگین ہستی تھے۔ ان سے ہماری ملاقات لکشمی چوک کے چائے خانوں میں ہوئی تھی اور وہ ہمیں اپنے دفتر لے گئے تھے۔ " فلم لائٹ " کے دفتر میں ہم ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی آمدورفت دیکھتے رہتے تھے اور یہ بھی کہ وہ اپنے بارے میں مضمون، خبر یا تصویر شائع کرانے کے لیے کیا کیا جتن کرتے تھے۔ یہ سب تماشا ہماری نگاہوں کے سامنے ہوتا رہتا تھا۔

جب " آفاق " میں ہر ہفتے فلم کے بارے میں خبریں وغیرہ شائع کرنے کا پروگرام طے ہوا تو ہم نے فوراً لکشمی چوک کا رخ کیا اور عیسیٰ غزنوی کی معلومات سے استفادہ کرنے کی ٹھانی۔ انہوں نے ہمیں فلم والوں سے بھی ملوایا، فلم اسٹوڈیوز بھی دکھا دیے اور فلمی صنعت کے اسرار و رموز بھی بتا دیے۔ اس طرح چند ہفتوں کے اندر ہم ایک تجربہ کار اور بارسوخ شخصیت بن گئے۔ تصویریں ہمیں خود اداکاروں اور فلم سازوں نے فراہم کر دی تھیں۔ کچھ بنے بنائے

بلاک عیسیٰ غزنوی سے مل گئے تھے۔ خبروں کی بھی کمی نہ تھی۔ مضامین اور انٹرویوز کے بھی ڈھیر لگ گئے تھے۔ یہ سب کچھ اتنا زیادہ تھا کہ اس کے لیے دو تین کالم کافی نہ تھے چنانچہ ہم نے شہید صاحب سے مشورہ کیا۔

''شہید صاحب ہمیں تو فلم کا پورا صفحہ چھاپنا پڑے گا۔''

''کیوں؟ کوئی پابندی ہے؟'' انہوں نے پوچھا

''نہیں بات یہ ہے کہ بہت دلچسپ اور کارآمد میٹر اکٹھا ہو گیا ہے۔''

''تو پھر کیا ہوا۔ بس دو تین کالم کافی ہیں۔''

''مگر شہید صاحب' اس طرح تو مقصد پورا نہیں ہو گا۔ نہ قارئین خوش ہوں گے اور نہ ہی فلمی صنعت کے لوگوں میں ہمارے اخبار کی جگہ بنے گی۔''

انہوں نے عینک کے پیچھے سے ہمیں گھورا پھر مسکرائے اور بولے ''الو کے کان تم ضرور کوئی گڑبڑ کرو گے اور ڈانٹ کھاؤ گے۔ جانتے ہو کہ اوپر والے محدب شیشہ لگا کر دیکھتے ہیں۔''

ہم نے کہا ''شہید صاحب' ایک بار تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے۔ اگر وہ اعتراض کریں گے تو آئندہ احتیاط سے کام لیں گے۔''

شہید صاحب نے کہا ''تم مانو گے تھوڑی۔ اچھا بابا جواب بھی تم خود ہی دینا۔''

شہید صاحب کی طرف سے اجازت ملنے پر ہم نے فلمی صفحے کی تیاری شروع کر دی۔ فلم ہماری دلچسپی اور کمزوری تو ہمیشہ ہی سے رہی تھی مگر پچھلے چند دنوں میں جب فلم والوں سے واسطہ پڑا تو بقول عیسیٰ غزنوی' فلمی جراثیم ہم پر پوری طرح حملہ آور ہو گئے۔ ہمارے دل میں پاکستان کی فلمی صنعت کے لئے ایک محبت اور وابستگی پیدا ہو گئی۔ طرح طرح کے مسائل ہمارے سامنے آئے تھے۔ قسم قسم کے لوگوں سے ہماری ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ پاکستان کی فلمی صنعت کن مشکلات سے دو چار ہے اور اسے کس قسم کی امداد کی ضرورت ہے؟ یہ باتیں بھی ہمارے گوش گزار ہو چکی تھیں۔ پھر سچی بات یہ ہے کہ ہمارا حب الوطنی کا جذبہ بھی جوش میں آ گیا تھا۔ ہم بمبئی کے معیاری فلمی میگزین پڑھنے کے بعد یہ سوچنے لگے تھے کہ آخر ہمارے ملک میں فلمی صنعت اتنی بڑی اور اہم کیوں نہیں ہو سکتی؟ یہاں اچھی فلمیں کیوں

نہیں بن سکتیں؟ یہاں کے فلم والوں کے پاس دولت کی ریل پیل کیوں نہیں ہوسکتی؟ بھارتی اداکاروں کو چھوڑ کر لوگ پاکستانی فن کاروں کے پرستار کیوں نہیں بن سکتے؟ یہ تو خیر لمبے قصے تھے مگر ہمارے قبضے میں اخباری میڈیا تھا۔ ہمیں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ ہم پاکستان کی فلمی صنعت اور فلمی ہستیوں کو اسی انداز میں رنگ آمیزی کے ساتھ لوگوں کے سامنے کیوں نہ پیش کریں کہ پاکستانی قارئین اور فلم بین پاکستانی فلموں کی طرف متوجہ ہوں اور پاکستانی اداکاروں اور ہدایت کاروں کو بھی اہمیت دیں؟

بظاہر یہ کام بہت مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا تھا۔ بھارتی فلمیں اور فلمی ستارے پاکستانی فلم بینوں کے رگ وپے میں بسے ہوئے تھے۔ ایک دو سال پہلے تک وہی ان کے محبوب تھے اور وہ ان کی ہی فلموں کو دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ اس لئے بھارتی فلم ستاروں اور فلموں کا سحر سارے ملک پر طاری تھا۔ اس کے مقابلے میں پاکستان میں تو فلمیں ہی برائے نام بنتی تھیں اور وہ بھی انتہائی کم لاگت سے بنائی جاتی ہیں۔ مشہور پرانے اداکار بمبئی چلے گئے تھے جو یہاں رہ گئے تھے۔ وہ گمنام تھے۔ بمبئی سے جو نامور لوگ لاہور آئے تھے وہ ہر قسم کی مشکلات سے دوچار تھے۔ نہ فنکار موجود تھے نہ تکنیک کار نظر آتے تھے اور نہ ہی نگار خانے اور ضروری ساز وسامان تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ پیسے کی شدید کمی تھی۔ فلم سازی کی سرگرمیوں کا یہ حال تھا کہ جن سرپھروں نے ہمت کر کے فلمیں بنانے کی کوشش کی وہ سر ٹکرا کر رہ گئے۔ 1948ء میں یہاں کی بنی ہوئی صرف چار فلمیں ریلیز ہوئی تھیں۔ ان کے نام یہ تھے تیری یاد' ہچکولے' شاہدہ اور سچائی۔ تیری یاد کے ہدایت کار داؤد چاند تھے۔ کاسٹ میں آشا پوسلے 'ناصر خان (دلیپ کمار کے بھائی) شعلہ اور غلام محمد شامل تھے۔ بھارت کے دلیپ کمار' راج کپور، دیو آنند' مدھو بالا' نرگس اور مینا کماری کے مقابلے میں ان کی کیا حیثیت تھی؟

""ہچکولے"" کے ہدایت کار بھی داؤد چاند تھے۔ ماسٹر عنایت حسین نے اس کی موسیقی ترتیب دی تھی اور بے سروسامانی کے عالم میں اتنی اچھی دھنیں بنائی تھیں کہ اس فلم کے کئی گانے آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ اس فلم میں سدھیر نے کام کیا تھا مگر سدھیر کو اس وقت جانتا کون تھا؟ بھارت سے آنے والی ہیروئن نجمہ ان کے ساتھ ہیروئن تھیں۔ یہ ہندوستان میں بھی ہیروئن تھیں۔ پاکستان آکر چند فلموں میں کام کرنے کے بعد انہوں نے ملک باری سے

شادی کرلی، فلم کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ نجمہ بہت حاضر جواب اور ذہین اداکارہ تھیں۔ بمبئی میں رہ کر سمجھ بوجھ بھی ہو گئی تھی۔ خوب صورت بھی تھیں۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک بار ان سے انٹرویو لیا تو بہت دیر تک ادب پر باتیں کرتی رہیں۔ سعادت حسن منٹو کی وہ بہت مداح تھیں۔ خود بھی امر تسر کی رہنے والی۔ ہم نے پوچھا ''منٹو صاحب کی تحریروں میں آپ کو کیا بات پسند آئی ؟''

جواب دیا ''سچائی اور بے باکی۔ منٹو کی کہانیوں میں امر تسر نظر آتا ہے۔'' اور بھی بہت سی دلچسپ باتیں ہوئیں۔

ہم نے پوچھا ''آپ پاکستان کیوں آ گئیں۔ یہاں تو فلمی صنعت ہی نہیں ہے۔ بمبئی میں کھلا میدان تھا۔ ؟''

کہنے لگیں ''پاکستان میرا اپنا ملک ہے۔ یہاں بھی کھلا میدان ہو جائے گا۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری کو بھی تو یہیں کے لوگوں نے بنایا تھا تو پھر ہم اپنے ملک کی انڈسٹری کو کیوں نہیں بنائیں گے ؟''

نجمہ کے اس جذبے نے ہمارا دل خوش کر دیا۔ ان کا انٹرویو بھی ہمارے فلمی صفحے میں شائع ہوا اور موضوع بحث بنا رہا۔

''شاہدہ'' کے ہدایت کار لقمان صاحب تھے۔ اب ان کا انتقال ہو چکا ہے مگر آخر دم تک ان کا یہی دعویٰ تھا کہ ''شاہدہ'' پاکستان میں شروع ہونے والی پہلی فلم تھی۔ وہ یہ باور کرانے کے لئے بہت سے کاغذات بھی اپنے ساتھ لئے پھرتے تھے۔ ہماری بعد میں ان سے بہت دوستی ہو گئی تھی جو آخر وقت تک قائم رہی۔

ایک دن ہم نے کہا ''لقمان صاحب' آپ اس بات پر اتنا جھگڑا کیوں کرتے ہیں، کیا فرق پڑتا ہے ؟''

بولے '' واہ فرق کیوں نہیں پڑتا؟ جب پاکستان کی فلمی تاریخ لکھی جائے گی تو میں چاہتا ہوں کہ اس میں یہ درج ہو کہ پاکستان کی پہلی فلم لقمان نے بنائی تھی۔ یار تم نہیں جانتے کہ تاریخ میں نام آنے کا کیا مطلب ہے ؟''

ہم لاجواب ہو گئے۔ وہ بے چارے اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر یہ تنازع آج تک حل نہیں ہو سکا ہے کہ پاکستان کی پہلی فلم کون سی تھی؟

''شاہدہ'' میں بھی ناصر خان ہیرو تھے۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ وہ دلیپ کمار کے بھائی تھے اور ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ جب وہ ان کے مقابلے میں بڑے اداکار سمجھے جاتے تھے حالانکہ دلیپ کے چھوٹے بھائی تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ لاہور آ گئے تھے اور لکشمی چوک کے ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔ ان کا اور دلیپ کمار کا معاملہ کچھ ایسا ہی تھا

جیسا کہ سنتوش کمار اور درپن کا تھا۔ درپن چھوٹے بھائی تھے مگر سنتوش سے پہلے پاکستان میں ہیرو بن گئے تھے۔ ان کا نام عشرت تھا۔ پاکستان سے شکستہ دل ہو کر بمبئی گئے تو وہاں فلموں میں کام کرنے کے لئے درپن بن گئے اور پھر پاکستان واپس آنے کے بعد بھی درپن ہی رہے۔ وہ بمبئی کیوں گئے تھے' وہاں کیا گل کھلاتے رہے اور واپس کیوں آئے؟ یہ داستان بھی مناسب وقت پر سنائیں گے۔

عشرت کے ساتھ ہیروئن شمیم تھیں۔ یہ بھی بمبئی سے آئی تھیں۔ وہاں انہوں نے چند فلموں میں کام کیا تھا جن میں سب سے زیادہ مشہور اور مقبول ''سیندور'' تھی۔ شمیم وہاں کی اچھی خاصی ہیروئن تھیں۔ کم از کم منور سلطانہ سے تو بڑی ہیروئن تھیں جو قیام پاکستان کے بعد دلیپ کمار کے ساتھ ہیروئن آئی تھیں۔ شمیم ایک دلکش شخصیت کی مالک تھیں مگر ہماری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی چند فلموں کے بعد ہی انور کمال پاشا صاحب نے ان سے شادی کر لی تھی اور وہ پردہ نشین ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

''سچائی'' اداکار و ہدایت کار نذیر صاحب کی فلم تھی جس کے موسیکار جی اے چشتی تھے۔ بمبئی میں نذیر صاحب لیلیٰ مجنوں' وامق عذرا اور یادگار جیسی ہٹ فلمیں بنا چکے تھے۔ غصے کے بہت تیز تھے۔ سارا بمبئی ان کے غصے سے ڈرتا تھا۔ کے آصف ان کے بھانجے تھے جو آصف دھانسو کے نام سے بمبئی کی فلمی دنیا میں مشہور ہوئے۔ مگر نذیر صاحب اپنے زمانے میں خود بھی بڑے دھانسو تھے۔ بڑے بڑے ان کا نام سن کر کانپ جاتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ پنجاب سے فلم کے شوق میں جو بھی نوجوان بمبئی جاتا تھا وہ سب سے پہلے نذیر صاحب کے پاس پہنچتا تھا۔ وہ حسب مقدور سب کی مدد کرتے تھے۔ ان کے رہنے سہنے کا بندوبست کر دیتے تھے اور مستحق لوگوں کو کام بھی دلوا دیا کرتے تھے۔ یہ سب زور آور پنجابی نذیر صاحب کے جاں نثار اور مداح بن جاتے تھے۔ بمبئی کے پارسی ماحول میں یہ ہٹے کٹے اور اونچے لمبے نوجوان خوف کی علامت تھے۔ ان ہی کے بل بوتے پر نذیر صاحب بڑے بڑوں کو جھاڑ پلا دیتے تھے۔ ان کی فلمیں بھی کامیاب ہو رہی تھیں۔ ڈرامائی اداکار بھی بہت اچھے تھے۔ اس لئے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ '' لیلیٰ مجنوں'' میں نذیر صاحب کی ہیروئن سورن لتا بنیں اور پھر دونوں میں ایسا پیار ہوا کہ سچ مچ دونوں ہیرو ہیروئن بن گئے حالانکہ دونوں شادی شدہ تھے۔ سورن لتا نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی جب کہ نذیر صاحب کی خاندانی اور گھریلو بیوی لاہور

میں رہا کرتی تھی۔ان سے نذیر صاحب کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی مگر سورن لتا کے ساتھ گھر بسایا اور نیا خاندان بنایا تو پُرانوں سے بے تعلق ہو کر رہ گئے تھے۔سورن لتا بہت سلیقے اور قرینے کی خاتون تھیں۔انہوں نے نذیر صاحب کو مکمل طور پر اپنا بنالیا تھا۔وہ بنارس کی رہنے والی تھیں۔ہندوستان کی مقبول ترین فلم ''رتن'' کی ہیروئن بھی یہی سورن لتا تھیں۔انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش اور نذیر صاحب کی دیکھ بھال بہت اچھی طرح کی۔ایک بار ٹی وی انٹرویو میں انہوں نے فلموں کے حوالے سے بہت معقول باتیں کیں۔مگران کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ کافی عرصے تک نذیر صاحب کی فلموں میں ہیروئن بننے پر اصرار کیا کرتی تھیں۔ پاکستان آنے کے بعد پہلے نذیر صاحب اور سورن لتا نے کئی فلموں میں بطور ہیرو ہیروئن کام کیا۔بعد میں نذیر صاحب کیریکٹر ایکٹر بن گئے مگر میڈم سورن لتا نوجوانوں کے مقابلے میں بھی ہیروئن بنا کرتی تھیں مگر صرف نذیر صاحب کی فلموں میں۔باہر کی فلموں میں انہوں نے بہت کم کام کیا مگر بطور ہیروئن نہیں۔

''لیلیٰ مجنوں'' 1945ء میں ریلیز ہوئی تھی اور بمبئی کی فلم کہلاتی تھی مگر بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ اس کی کافی شوٹنگ لاہور میں بھی کی گئی تھی۔ملک باری نے فلمی تقسیم کاری کا آغاز لاہور میں نذیر صاحب کی فلم ''لیلیٰ مجنوں'' کو ریلیز کر کے ہی کیا تھا بعد میں ''دامق عذرا'' بھی انہوں نے ہی ریلیز کی تھی۔وہ ایک غریب گھرانے کے نوجوان تھے۔اور رشتے میں نذیر صاحب کے بھانجے تھے۔مگر حسن و جمال میں یکتا۔نذیر صاحب کی نظر میں آئے تو وہ ملک باری پر مہربان ہو گئے۔اس مہربانی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ نذیر صاحب اپنی پہلی بیوی سے جنم لینے والی بیٹی ثریا کی شادی ملک باری سے کرنے کے خواہش مند تھے۔پاکستان بننے کے بعد بھی نذیر صاحب کی فلمیں ملک باری ہی ریلیز کرتے رہے اور صحیح معنوں میں ملک باری کو غربت سے نکال کر دولت مندوں کی صف میں شامل کرنے والے نذیر صاحب ہی تھے مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ ثریا کی شادی ملک باری سے نہ ہو سکی۔قیام پاکستان کے بعد ثریا نے ناصر خان سے شادی کر لی تھی اور بمبئی چلی گئی تھیں لیکن یہ شادی بھی زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی تھی۔ناصر خان نے کچھ عرصے بعد بیگم پارہ سے شادی کر لی تھی جو آج بھی زندہ ہیں اگرچہ ناصر خان کافی عرصے پہلے انتقال کر چکے ہیں۔بیگم پارہ عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب کی سالی بھی ہیں۔

ملک باری نے پاکستان بننے کے چند سال بعد نجمہ سے شادی کی تھی۔ سالہا سال کے بعد ان کی دوسری شادی اداکارہ سلونی سے ہوئی۔

ہم تو ''آفاق'' کے فلمی صفحے کا ذکر کر رہے تھے مگر طائر خیال کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ہم پہلے ہی آپ کو خبردار کر چکے ہیں کہ اس الف لیلہ میں آپ کو بات سے بات اور کہانی سے کہانی نکلتی ہوئی ملے گی اس لئے کہانی در کہانی سے گھبرائیں نہیں۔

میر صاحب کا خیال تھا کہ ڈیڑھ دو کالم فلم کے لئے وقف کر دیے جائیں گے تو بہت کافی ہیں مگر ہم نے پہلے ایڈیشن میں ہی فلم کے بارے میں پورا صفحہ شائع کر دیا۔ اس میں زیر تکمیل فلموں کی خبریں بھی تھیں۔ انٹرویو اور مضامین بھی تھے، تصویریں بھی تھیں۔ ایک اچھے فلم میگزین میں جو کچھ ہو سکتا ہے وہ سب اس میں تھا اور خاص بات یہ تھی کہ پہلی بار اس صفحے کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ پاکستان میں بھی فلمی صنعت کا وجود ہے جس سے بہت اچھے اور نامور لوگ وابستہ ہیں۔ فلمی صفحہ بہت خوب صورت تھا اور سچی بات یہ ہے کہ اردو اخباروں کے اعتبار سے یہ ایک انوکھی بات تھی۔ جس نے اسے دیکھا بس دیکھتا اور پڑھتا ہی رہ گیا مگر جب صبح سویرے ہم نے ''آفاق'' اٹھایا اور فلمی صفحہ کھولا تو ایک لمحے کے لئے تو ہمارا دل دھک سے رہ گیا۔ کہاں تو یہ کہ روزناموں میں کبھی فلم کا تذکرہ تک نہیں آتا تھا اور کہاں یہ کہ ایک پورا صفحہ فلمی ہستیوں اور فلمی خبروں سے بھرا پڑا تھا۔ ظہور عالم شہید صاحب کی وارننگ بھی ہمیں یاد آگئی کہ جو بھی انجام ہوگا تم خود ہی بھگتنا۔ ہمیں اندازہ تھا کہ اس وقت صحافتی حلقوں میں یہی صفحہ زیر بحث ہوگا اور ہمارے ایڈیٹر صاحبان محدب شیشہ لگا کر اس کے مندرجات دیکھ رہے ہوں گے۔

مگر مرتا کیا نہ کرتا، دفتر تو آخر جانا ہی تھا۔ دفتر پہنچے تو وہی پرانا منظر نامہ تھا۔ ہمارے ساتھی ہمیں دھمکا رہے تھے۔ چپڑاسی نے بتایا کہ میر صاحب کئی بار طلب کر چکے ہیں اور ان کے پاس مولانا غلام رسول مہر بھی تشریف فرما ہیں۔ ہم نے چاروں قل اور الحمد شریف پڑھ کر اپنے اوپر پھونک ماری اور میر صاحب کے کمرے میں پہنچ گئے اور خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

سب سے پہلے میر صاحب نے چپڑاسی سے وہی شکایت کی کہ چائے گرم نہیں تھی، بہت زیادہ گرم چائے لاؤ پھر

انہوں نے ہماری طرف توجہ دی۔ ''آفاقی صاحب' میں نے آپ کا یہ فلمی صفحہ دیکھا ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اخبار کھول لیا۔ ہم دم بخود بیٹھے رہے۔ بولے ''ویسے تو ٹھیک ہے مگر پورا ایک صفحہ کچھ زیادہ نہیں ہو گیا؟''

ہمارے بولنے سے پہلے مقامی ایجنٹ شمشاد صاحب بول پڑے ''میر صاحب 'پورا صفحہ بہترین ہے۔ ہر جگہ اسی کا چرچا ہے اشاعت پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔''

غلام رسول مہر صاحب نے فرمایا ''فلم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر کوئی توازن بھی تو ہونا چاہیے''۔

شہید صاحب بھی وہیں موجود تھے انہوں نے تجویز پیش کی کہ چند روز تک اس کارد عمل دیکھا لیا جائے۔ پھر فیصلہ کیا جائے۔اس تجویز کو سب نے پسند کیا۔

میر نور احمد صاحب اور مولانا غلام رسول مہر صاحب کا تذکرہ ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ میر صاحب فلموں کے شوقین تھے۔ غالباً فلم سنسر بورڈ کے زمانے میں انہیں فلمیں دیکھنے کی عادت پڑی تھی۔ ویسے بھی وہ روشن خیال اور فنون لطیفہ کے شیدائی تھے کئی فلم ایکٹریس ان کو بہت زیادہ پسند تھیں کئی ہفتے بعد ایک روز کہنے لگے ''وہ ایک ایکٹریس ہوا کرتی تھی جس کی آنکھیں بہت بڑی بڑی تھیں۔''

ہم نے کہا ''راگنی ؟''

''ہاں ہاں راگنی۔ اچھی ایکٹریس تھی مگر آپ نے کبھی اس کی تصویر نہیں چھاپی ؟''

ہم نے کہا ''دراصل اس کی کوئی فلم ان دنوں زیر تکمیل نہیں ہے۔ آپ فرمائیں تو راگنی کا انٹرویو چھاپ دیں؟''

بولے ''مستحق تو ہے' آگے آپ خود سوچ لیں۔''

ہم نے فوراً راگنی کا پتا ٹھکانا معلوم کیا۔ اس زمانے میں وہ اس سڑک پر رہا کرتی تھیں جو سنٹرل جیل کے بالمقابل تھی۔ آج فیروز پور روڈ پر شمع سنیما کے سامنے سے گزر کر جو سڑک شادمان کی طرف جاتی ہے یہ وہی سڑک تھی۔ خدا جانے اس کا نام کیا تھا اس پر بہت کم کوٹھیاں تھیں۔ ان کے پیچھے اور آس پاس کھیت تھے۔ کچھ عرصے بعد اس سڑک پر صبیحہ خانم نے بھی کوٹھی خریدی تھی۔ ہدایت کار و فلم ساز منور ایچ قاسم کی کوٹھی بھی اس سڑک پر تھی جس کے سامنے والی کوٹھی کے ایک حصے میں سید کمال بھی رہتے رہے۔ آج کل تو یہ لاہور کا مرکزی علاقہ ہے مگر اس وقت بہت کم آباد اجڑا

اجڑا سا تھا۔ ہم نے فون پر بات کی اور راگنی سے ملاقات کا وقت مقرر کر لیا۔

فلمی صفحے کی وجہ سے ''آفاق ''کا نام ''کھل جا سم سم'' کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ فلم سے وابستہ ہر شخص اسے جانتا تھا اور ہر طرح تعاون کرنے کو آمادہ رہتا تھا۔ راگنی اس زمانے میں ایک زمیندار میاں اسلم کی بیوی تھیں۔ یہ شادی بس اچانک ہی ہو گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ رشتے آسمانوں پر طے پاتے ہیں۔ راگنی اور میاں اسلم کا رشتہ بھی آسمانوں پر ہی طے پایا تھا ورنہ راگنی جیسی مشہور و معروف اور حسین و جمیل اداکارہ کے لئے رشتوں کی کیا کمی تھی۔ ایم ڈی کنور جو بہت خوب صورت اور باوقار آدمی تھے اور فلموں میں اداکاری بھی کرتے تھے وہ راگنی سے شادی کرنے کی حسرت ہی دل میں لیے بیٹھے رہے مگر ان کی تقدیر میں راگنی نہ تھیں۔ وہ رئیس اور بااثر آدمی تھے۔ جب میاں اے آر کاردار نے بمبئ میں فلم ''شاہ جہاں'' بنانے کا ارادہ کیا اور راگنی کو ممتاز محل کے رول میں منتخب کیا تو ایم ڈی کنور نے ''شاہ جہاں'' کا کردار حاصل کرنے کے لئے زمین آسمان ایک کر دیے اور بہر صورت یہ کردار حاصل کر کے ہی رہے۔ مقصد صرف راگنی سے قریب رہنا تھا۔

راگنی کو ہم نے ہمیشہ بہت کم گو' سنجیدہ متین اور باوقار پایا۔ ان کے انداز و اطوار میں رکھ رکھاؤ اور تمکنت تھی۔ وہ ہر ایک سے بے تکلف نہیں ہوتی تھیں۔ گفتگو بھی کم کرتی تھیں بلکہ انٹرویو دینے سے بھی گریز کرتی تھیں۔ عمر بڑھی تو بزرگی کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت میں کچھ اور بھاری بھر کم پن پیدا ہو گیا۔ وہ شائستگی اور اخلاق کا نمونہ تھیں۔

ہم ان سے انٹرویو کے لیے گئے تو سائیکل کے سوا کوئی دوسری سواری ہمیں میسر نہ تھی۔ اس زمانے کے اعتبار سے ان کی کوٹھی خاصی جدید انداز کی تھی۔ سامنے ایک بر آمدہ تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ دور دور تک نہ کوئی سواری نظر آتی تھی نہ انسان۔

ہم کوٹھی کے اندر تو پہنچ گئے مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اندر کیسے خبر پہنچائیں۔ کوٹھی کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ دربان اور چوکیدار رکھنے کا اس زمانے میں رواج نہیں تھا۔ بر آمدے کے سامنے کھڑے ہو کر سوچتے رہے کہ اپنی آمد کی اطلاع کیوں کر دیں۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر بر آمدے میں پہنچے تو وہاں تین چار لوہے کی کرسیاں اور دو تین مونڈھے پڑے ہوئے تھے۔ دیوار پر اطلاعی گھنٹی کہیں نظر نہ آئی۔ کچھ دیر انتظار کیا کہ شاید کوئی باہر نکلے مگر کوئی نہیں

آیا۔

آخرایک ترکیب سوجھ گئی۔ ہم دوبارہ سائیکل کے پاس پہنچے اور گھنٹی بجانی شروع کر دی۔ایک آدھ منٹ سائیکل کی گھنٹی بجاتے رہے تو سائیڈ کے کمرے سے ایک ملازم نما آدمی باہر نکلااور ہمیں دیکھ کر بہت ناراض ہوا۔ بولا'' کوئی وقت بھی ہوناچاہیے' جب جی چاہامنہ اٹھا کر چلے آتے ہیں؟''

ہم حیرت سے دیکھتے رہے کہ کس قدر بدتمیز ملازم ہے۔اس نے کہا'' اب کھڑے منہ کیادیکھ رہے ہو۔جو خط پتر دینا ہے وہ نکالو۔''

''اوہو'' ہم نے سوچا'' یہ ہمیں ڈاکیا سمجھ رہاتھا۔''

''ہم پوسٹ مین نہیں ہیں؟'' ہم نے کہا

اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی'' تو پھر کون ہو؟''

''ہم جرنلسٹ ہیں۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آیا'' کیاہو جی؟''

''صحافی ہیں' اخبار والے۔''

''اخبار والا تو صبح آتاہے۔وہ اخبار دے کر چلا بھی گیاہے۔''

خدایا کہاں پھنس گئے'' یہ بتاؤ کہ میڈم اندر ہیں؟''

''میڈم جی سے کیاکام ہے؟''

''انہوں نے ہمیں بلایاہے۔ان سے کہو کہ انٹرویو کے لیے آئے ہیں۔''

''انٹرویو؟'' وہ ہماری شکل دیکھنے لگا۔

اتنی دیر میں ایک اور صاحب برآمد ہوئے۔یہ لمبے چوڑے ایک معقول شخص تھے۔بعد میں معلوم ہوا کہ وہی راگنی کے شوہر میاں اسلم ہیں۔

''کیابات ہے بھئی؟'' انہوں نے اپنے ملازم سے پوچھا

''لو جی' اب میاں صاحب سے خود ہی بات کر لو'' وہ بولا۔

ہم نے کہا'' ہم انٹرویو کے لیے آئے ہیں۔ میڈم راگنی نے ملاقات کے لیے وقت دیا ہے۔''

''اچھا اچھا' معاف کرنا آپ کو تکلیف ہوئی۔'' انہوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر اپنا تعارف نہیں کرایا'' آیئے آپ بیٹھئے۔ وہ ابھی آجاتی ہیں۔'' پھر وہ ملازم سے مخاطب ہوئے'' جاؤ تم چائے بسکٹ کا بندوبست کرو۔ ''اتنا کہہ کر وہ اندر چلے گئے۔

ملازم بھی ہمیں گھورتا ہوا رخصت ہو گیا۔ ہم لوہے کی ایک آرام دہ کرسی تلاش کر کے اس پر بیٹھ گئے۔ ایک بار پھر تنہائی تھی اور ہم تھے۔ سامنے والی سڑک بھی بالکل سنسان تھی۔ آج کل اس سڑک پر ہر وقت ٹریفک کا ہنگامہ رہتا ہے۔

کافی دیر گزر گئی۔ ہم سمجھے کہ شاید وہ صاحب راگنی کو مطلع کرنا بھول گئے ہیں مگر کچھ دیر بعد راگنی اندر سے برآمد ہوئیں۔ ہم انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک تو اخلاق و تہذیب کا تقاضا تھا دوسرے یہ کہ ان کی شخصیت ایسی باوقار تھی کہ خواہ مخواہ تعظیم دینے کو جی چاہتا تھا۔ ہم نے فلم'' شاہ جہاں'' میں انہیں ملکہ ممتاز محل کے روپ میں دیکھا تھا۔ ان کی بہت سی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ ان کے بارے میں خبریں بھی پڑھی تھیں۔ مگر جب انہیں بنفس نفیس سامنے پایا تو ان کی شخصیت نے کچھ اور زیادہ متاثر کیا۔ ان کی رنگت چمپئی تھی وہی بڑی بڑی حیران سی آنکھیں جن کی سارے زمانے میں شہرت تھی۔ ناک نقشہ اور سراپا بے عیب۔ قد و قامت ایسا کہ شاعر غزل کہنے پر مجبور ہو جائیں۔

''معاف کیجئے آپ کو انتظار کرنا پڑا۔'' انہوں نے بڑی اپنائیت سے کہا'' دراصل میں نہا رہی تھی۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ صحیح وقت پر آجائیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگیں۔ ان کی آواز میں مٹھاس نہیں تھی۔ فلموں میں بھی ان کی آواز بالکل ویسی ہی سنائی دیتی تھی۔ شکل وصورت کے مقابلے میں ان کی آواز قدرے مختلف تھی۔ غور سے دیکھا تو ان کے بال بھیگے ہوئے نظر آئے۔ ان کے بال ترشے ہوئے تھے اور شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ سادہ شلوار قمیص میں بھی وہ ایک شہزادی نظر آرہی تھیں۔

''آپ نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟'' انہوں نے پوچھا

"ابھی تو بتایا ہی نہیں۔" ہم نے جواب دیا۔
وہ ہنسنے لگیں "ٹیلی فون پر تو بتایا تھا نا؟" ہم نے اپنا نام دہرایا۔اس کے بعد بھی راگنی سے ملاقات ہوتی رہی۔عام طور پر اسٹوڈیو میں کسی فلم کے کسی سیٹ پر ہی ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔وہ محفلوں میں شرکت سے گریز کرتی تھیں۔ الگ تھلگ رہنا پسند کرتی تھیں مگر جب بھی ان سے ملاقات ہوئی اسی وضع داری سے ملیں اور ہمارا نام ہمیشہ انہیں یاد رہا۔خدا جانے یہ ان کے حافظے کی خوبی تھی یا ہمارا نام ہی اس قدر آسان اور دلکش تھا۔

ان سے انٹرویو شروع کرنے سے پہلے وہی ملازم چائے لے کر آگیا۔بسکٹ اور کچھ دوسری چیزیں بھی چائے کے ساتھ تھیں۔انہوں نے خود چائے بنائی اور پیالی ہمیں دیتے ہوئے ہمیں کہنے لگیں " مجھے اچھی چائے بنانی نہیں آتی۔چائے کا مجھے زیادہ شوق بھی نہیں ہے مگر پان بہت اچھا لگاتی ہوں۔"
وہ پان کھانے کی دلدادہ تھیں۔سیٹ پر بھی ان کے ہمراہ ملازم یا ملازمہ پاندان لیے ہوئے موجود رہتا تھا اور سیٹ پر موجود لوگوں کے علاوہ آنے جانے والے بھی ان سے پان کی فرمائش کرتے رہتے تھے۔اسی خیال سے وہ پاندان بھر کر لاتی تھیں۔

چائے کے بعد انہوں نے پوچھا" پان سے شوق کریں گے ؟"
ہم نے شکریہ ادا کیا اور کہا" اجازت ہو تو انٹرویو شروع کریں؟"
"بھئی آپ کیا پوچھیں گے ؟"
ہم نے کہا" یہ تو ابھی آپ کو پتا چل جائے گا۔"
بولیں" زیادہ مشکل سوال مت پوچھئے گا مجھے انٹرویو دینے کی عادت نہیں ہے۔"
ہم نے ان کی ابتدائی زندگی اور فلموں میں شمولیت کے بارے میں دریافت کیا۔پھر بمبئی اور پاکستان کی فلمی صنعت کے فرق کے بارے میں پوچھا۔زیر تکمیل فلموں کی بات کی۔بس ادھر اُدھر کی باتوں میں ایک گھنٹہ گزر گیا اور ہم ان سے اجازت طلب کر کے چلے گئے۔

راگنی کاانٹرویو ہم نے ذرااہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ان کی شخصیت اور سراپا کاخاص طور پر تذکرہ کیا۔ان کی پچھلی فلموں کا بھی حوالہ دیا۔دفتر گئے تو ہم بے چینی سے میر نوراحمد صاحب کے رد عمل کاانتظار کرنے لگے۔

میر صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔دفتر میں آتے ہی انہوں نے ہمیں طلب فرمایا۔

پہلے تو حسب معمول اپنے ملازم خاص سے کہا'' بھئی حفیظ اچھی سی خوب گرم چائے لے کرآؤ۔'' پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے'' فلم پیج توکافی اچھاہوتاجارہا ہے۔''

ہم چپ رہے'' یہ انٹرویوآپ نے بہت اچھاچھاپاہے۔پرانے آرٹسٹوں کی قدر کرنی چاہیے مگر''....

ہم ان کی طرف دیکھنے لگے بولے'' مگر تصویریں کچھ اور بھی ہو جاتیں تواچھالگتا۔بہت چارمنگ فیس ہے۔''

ہم نے بڑی مشکل سے یہ تصویریں اکٹھی کی تھیں۔اسٹاف فوٹو گرافر تو ہمارے پاس تھانہیں۔ان کی کسی زیر تکمیل فلم کی تصویر بھی نہیں مل سکی تھی مگر عیسیٰ غزنوی ہمارے کام آگئے تھے۔

جب ہم نے بھارتی اور پاکستانی فلموں پر بے لاگ اور تفصیلی تبصرہ لکھناشروع کیاتو بہت مشکل پیش آئی۔بھارتی فلموں کے تقسیم کارلاہور میں تھے۔ان کے حق میں تبصرہ نہ ہو تو وہ شعبہ اشتہارات سے شکایت کرتے تھے۔

ایک بار ہم نے فلم ساز آغاجی اے گل کی فلم'' دلا بھٹی'' پر تبصرہ لکھاتو وہ اتنے برہم ہوئے کہ اخبارات کے اشتہارات ہی بند کردیے۔اس زمانے میں فلمی اشتہارات آمدنی کااچھاذریعہ تھے اور آغا جی اے گل کی فلمیں اکثر ریلیز ہوتی رہتی تھیں۔اشتہاروں کی بندش پر ہمارے مینجر شعبہ اشتہارات فوراًشکایت لے کر میر نوراحمد صاحب کے پاس پہنچ گئے اور بتایاکہ ہمارے لکھے ہوئے تبصرے نے اخبار کو کتنامالی نقصان پہنچایا ہے۔ہماری طلبی ہوئی۔سب سے پہلے روایت کے مطابق'' خوب گرم'' چائے منگائی گئی پھر مینجر شعبہ اشتہارات نے اپنی شکایت دہرائی۔میر صاحب نے ہماری طرف دیکھا۔ہم نے کہا۔میر صاحب' اس کاصرف ایک ہی علاج ہے کہ ہم تبصرہ شائع کرنابند کردیں''۔

''کس لیے؟''

''اس لیے کہ قارئین اگر تبصروں پر بھروسا کرناچھوڑدیں اورانہیں یہ احساس ہو جائے کہ اس اخبار میں توہر فلم کی تعریف ہی شائع ہوتی ہے توان کااعتبار اٹھ جائے گا۔آج کل تو وہ ہماری رائے پر بھروسا کرتے ہیں اور ہمارے تبصرے

پڑھ کر فلم دیکھنے یا نہ دیکھنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ''

میر صاحب نے بلاتوقف فیصلہ سنادیا'' یہ بالکل ٹھیک بات ہے۔''

پھر وہ منیجر صاحب سے مخاطب ہوئے جن کا نام ایف ڈی یا ایم ڈی خامی تھا مگر وہ صرف خامی صاحب کہلاتے تھے۔

''آپ کی کیا رائے ہے خامی صاحب؟''

خامی صاحب نے کہا'' میں اخبار کی پالیسی کے بارے میں عرض نہیں کر سکتا۔ میں تو اپنے اشتہاروں کے حوالے سے ہی بات کر سکتا ہوں۔''

میر صاحب نے کہا'' تو پھر تبصرے شائع نہ کیا کریں؟''

خامی بولے'' میر صاحب' وہ بھی ضروری ہیں کیونکہ اشتہار دینے والے تبصروں کو اضافی پبلسٹی سمجھتے ہیں جو مفت میں انہیں حاصل ہو جاتی ہے۔''

''بھئی یہ تو بڑی مشکل ہے۔'' میر صاحب نے کہا'' ہم صرف تعریف تو نہیں چھاپ سکتے۔''

ہم نے کہا'' میر صاحب' اس کی ایک صورت ہو سکتی ہے۔''

''وہ کیا ہے؟''

''وہ یہ کہ جو فلمیں واقعی بہت خراب ہوں ان پر تبصرہ ہی نہ کیا جائے اور ایسی فلمیں بہت کم ہوتی ہیں۔''

یہ تجویز سب کو پسند آگئی اور اس کے بعد فلمی تبصرے کے سلسلے میں یہی پالیسی اختیار کی گئی۔

میر صاحب نے ہمیں فلمی صفحے کے بارے میں کبھی براہ راست ہدایت نہیں دی۔ بس اتنا کہہ دیا کرتے تھے'' وہ ایک اداکار ہوا کرتا تھا' اپنے زمانے میں بہت نامور تھا۔ اب نہ جانے کہاں ہے؟''

ہم اس اداکار یا اداکارہ کو تلاش کر کے اس کے بارے میں فیچر، انٹرویو یا مضمون شائع کر دیتے اور میر صاحب خوش ہو جاتے'' بھئی آپ نے خوب تلاش کیا۔ گڑے مردے اکھاڑنا کوئی آپ سے سیکھے۔''

فلمی صفحے کی وجہ سے ہماری سبھی لوگوں سے شناسائی ہو گئی تھی۔ اسٹوڈیو جاتے تو اسٹوڈیو اونر ہماری پذیرائی کرتے۔ فلم ساز، ہدایت کار' اداکار' ہنر مند سبھی سے یاد اللہ ہو گئی۔ وہ تعلقات پھر ہمیشہ اسی طرح قائم رہے۔ فلمی صنعت میں

جو لوگ موجود تھے ان سے تو ہماری اچھی ملاقات ہو گئی تھی مگر جو نئے لوگ آتے گئے وہ ہمارے سامنے ہی ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اس لحاظ سے پاکستان کی فلمی صنعت اور فلم کے لوگوں کو ہم نے اپنی آنکھوں کے سامنے بڑھتے اور پھلتے پھولتے ہوئے دیکھا ہے۔ بہت سے نئے چہرے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بام عروج کو پہنچے اور پھر شہاب ثاقب کی طرح آسمان فلم سے گر کر غائب ہو گئے۔ مفلس ہماری آنکھوں کے سامنے لکھ پتی بن گئے اور کئی لکھ پتی کنگال ہو گئے۔ ان سب کے عروج وزوال کا تماشا بالکل کل کی سی بات لگتا ہے۔ ان میں سے بہت سے اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ جو ہیں وہ فلمی دنیا میں نہیں ہیں۔ اس نگری کی ہر چیز بدل گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی جادوگر نے جادو کے زور سے زمین وآسمان سبھی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ فلم نگر کا حال طلسم ہوشربا کے ''شہر ناپرساں'' جیسا ہو گیا ہے۔

ہم نے فلمی نگار خانوں کے چکر لگانے شروع کر دیے تھے۔ وہاں جسے دیکھئے وہ ہماری آؤ بھگت میں لگا رہتا تھا۔ اسی زمانے میں ایک یہ تبدیلی بھی رونما ہوئی کہ روزنامہ ''امروز'' اور اسی ادارے کے انگریزی روزنامہ '' پاکستان ٹائمز '' نے بھی '' آفاق '' کی دیکھا دیکھی فلمی سرگرمیوں کو شائع کرنا شروع کر دیا۔ '' امروز'' کے فلم سیکشن کے انچارج مسعود اشعر تھے اور پاکستان ٹائمز میں یہ ذمے داری آئی اے رحمان صاحب کے سپرد کی گئی تھی۔ یہ دونوں ہمارے دوست تھے۔ وہ باقاعدگی سے اسٹوڈیو نہیں جا سکتے تھے اس لیے فلمی خبروں اور دوسری معلومات کے لیے ہماری خدمات حاصل کرتے تھے۔ ہم ہر ہفتے ٹیلی فون پر انہیں اہم خبریں بتا دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ دونوں بھی ہمارے ساتھ کسی فلمی تقریب میں یا اسٹوڈیو کا پھیرا لگانے کے لیے چلے جایا کرتے تھے۔ مگر دراصل انہیں معلومات وغیرہ پہنچانے کا ذریعہ ہم ہی تھے۔ تصویریں بھی ہم ہی انہیں فراہم کر دیتے تھے۔

''پاکستان ٹائمز'' اس زمانے میں ملک کا سب سے بااثر انگریزی روزنامہ تھا۔ فیض احمد فیض صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس کے عملے میں ذہین ترین اور انتہائی قابل افراد شامل تھے۔ ہمارا پاکستان ٹائمز اور امروز کے دفتر میں آنا جانا تھا۔ اس بہانے اس دور کے ممتاز ترین صحافیوں سے ملاقاتیں رہتی تھیں۔ ہمارے زمانے میں کام کرنے والے جونیئر صحافی بھی بعد میں ملک کے نامور اخبار نویس بن گئے۔ وہ بھی خوب زمانہ تھا۔ ہر شعبے میں بہترین لوگ ہی کام کرتے

ہوئے نظر آتے تھے۔اس زمانے میں توان کی کوئی قدر نہیں تھی کہ ان سے بھی بڑے بڑے لوگ اس میدان میں موجود تھے۔بعد میں یہی نووارد اساتذہ میں شامل ہوئے۔

پروگریسو پیپرز کے زیر اہتمام ایک انتہائی معیاری اور خوبصورت ہفت روزہ لیل ونہار بھی نکلنے لگا تھا۔سبط حسن صاحب اس کے مدیر تھے۔اور لاہور کے سبھی قابل ذکر لوگ اس میں لکھا کرتے تھے۔ریاض شاہد نے بھی اس کے عملے میں کام کیا۔ اس سے پہلے وہ ہفت روزہ ''چٹان'' میں بھی نائب مدیر رہے جہاں ہم کافی عرصے یہی ذمے داری ادا کرتے رہے تھے۔پھر فلم میں بھی ہم ریاض شاہد سے پہلے پہنچے۔بعد میں وہ بھی فلمی دنیا میں آئے اور اپنے کارناموں سے سب کو چونکا دیا۔ہم ازراہ مذاق ان سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے پیچھے پیچھے ہر جگہ کیوں پہنچ جاتے ہو لیکن ہدایت کاری میں وہ ہم سے آگے رہے۔جب انہوں نے اپنی پہلی فلم ''سسرال'' ڈائریکٹ کی اس وقت ہم محض کہانی نویس تھے لیکن فلم سازی ہم نے ان سے پہلے شروع کی۔

''سسرال'' ایک چونکا دینے والی فلم تھی۔اس میں لاہور کے اندرونی علاقوں کے گھروں میں عکاسی کی گئی تھی۔فلم کی بیشتر شوٹنگ بھی پرانے لاہور کے گلی کوچوں اور مکانوں میں کی گئی۔حسن لطیف ملک نے بڑی محنت اور لگن سے طرزیں بنائی۔نورجہاں کا گایا ہوا اور منیر نیازی کا لکھا ہوا مشہور نغمہ جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سوجا اس فلم میں تھا۔ یہ کئی اعتبار سے واقعی ایک چونکا دینے والی فلم تھی۔اسے آرٹ فلم بھی کہہ سکتے ہیں۔مگر نہ تو اسے کامیابی حاصل ہوئی اور نہ ہی یار لوگوں نے اسے سراہا۔حالانکہ جب بمبئی سے مشہور اداکار بلراج ساہنی لاہور آئے تو انہوں نے واپس جا کر ''فلم فئیر'' میں اس فلم کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور بہت تعریف کی۔لیکن پاکستان میں کسی نے گھاس نہ ڈالی۔فن کاروں اور ہنر مندوں کی ناقدری کا رواج ہمارے ملک میں بہت پرانا ہے۔کسی اور ملک میں یہ فلم بنی ہوتی تو فلم اور بنانے والا دونوں بہت داد پاتے۔

ہمارا نگار خانوں میں آنا جانا تو ہو گیا تھا مگر بہت کم۔وجہ یہ تھی کہ اسٹوڈیو بہت دور تھے اور ٹرانسپورٹ بہت کم اور مہنگی تھی۔بس یہی ایک ذریعہ تھا یا پھر تانگے تھے جو بہت سست رفتار اور مہنگے تھے۔بعد میں موٹر رکشا بھی چلنے لگے۔

رکشا والے لکشمی چوک سے شاہ نور اسٹوڈیو کے لئے ڈیڑھ روپے کرایہ لیتے تھے جو اس وقت بہت گراں گزرتا تھا۔آج

وہ چالیس پینتالیس روپے وصول کرتے ہیں۔ ٹیکسی والے سو کے لگ بھگ طلب کرتے ہیں۔ایک آسانی یہ تھی کہ شاہ نور اورایور نیو دونوں اسٹوڈیو ساتھ ساتھ تھے۔بعد میں باری اسٹوڈیو بھی ان ہی کے درمیان میں قائم ہو گیا۔تمام فلمی سر گرمیاں ان تینوں نگار خانوں تک محدود تھیں۔اس لئے آسانی یہ تھی کہ ایک بار جاتے تو پیدل تینوں نگار خانوں میں گھوم لیا کرتے تھے۔ہماری آمدورفت زیادہ تر دن کے وقت تھی۔شام کو واپس آنا پڑتا تھا کیونکہ ماڈل ٹاؤن میں ہمارا گھر بھی بہت دور تھا اور وہاں جانے کے لئے آخری بس ساڑھے نو یا پونے دس بجے تک مل سکتی تھی۔

قریب قریب تمام فلم والوں سے ہماری دوستی ہو گئی تھی۔آپ سوچتے ہوں گے کہ ہم ان سے لفٹ کیوں نہیں لیتے تھے؟

اول تو یہ طریقہ ہمیں پسند نہیں ہے کہ کسی سے لفٹ مانگی جائے۔دوسرے لفٹ دیتا بھی کون؟کاریں محض گنتی کے لوگوں کے پاس تھیں۔باقی بس یا تانگے کے ذریعے آتے جاتے تھے۔

لفٹ لینے کی بات نکلی ہے تو اداکار ساقی یاد آ گئے۔

ساقی صاحب بلوچ تھے۔سندھ سے آئے تھے اور لاہور میں بس گئے تھے کیونکہ فلم کے رسیا تھے۔ان سے ہماری دوستی 1951ء میں ہوئی تھی۔ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے دفتر میں کچھ لوگ پابندی سے اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ان میں ساقی صاحب اور دلجیت مرزا بھی تھے۔ایجنسی کے مالک شیخ رحمان تھے۔بہت دلچسپ آدمی تھے اور فلم کا انہیں جنون تھا۔تمام قابل ذکر انگریزی اور ہندوستانی فلمیں انہیں ازبر تھیں۔بعد میں انہوں نے ایک پنجابی فلم ''آبرو'' بھی بنائی مگر فلم سازی میں زیادہ کامیاب نہ رہے۔بہت دلچسپ اور باغ و بہار آدمی تھے۔جن دنوں ہم ''نوائے وقت'' میں کام کرتے تھے اس کے برابر ہی ان کا دفتر تھا۔پہلے علیک سلیک ہوئی پھر آنا جانا ہوا اور اس کے بعد دوستی ہو گئی۔بہت سے لوگ جو بعد میں فلمی صنعت میں جگمگائے ان دنوں شیخ صاحب کے دفتر میں بیٹھ کر گپ شپ اور چائے نوشی کیا کرتے تھے۔دلجیت مرزا نے کچھ خاکے بنائے تھے جن کا وہ ہم سب کے سامنے مظاہرہ کرتے رہتے تھے۔ساقی بھی اپنے خاکے اداکاری کے ساتھ پیش کرتے۔کنور آفتاب ٹی وی کے نامور ہدایت کار بنے وہ بھی اس مجلس میں پابندی سے شریک ہوا کرتے تھے۔انہیں ہمیشہ فلم بنانے کی جستجو رہی۔ایک فلم ''جھلک'' کے فلم ساز،

مصنف اور ہدایت کار بھی بنے مگر کامیاب نہ ہو سکے تو ٹی وی کا رخ کیا مگر جب بھی ملتے یہی کہتے
"یار آفاقی کیا فلموں میں ہمارے لئے کوئی کام نہیں ہے؟ یار کوئی ترکیب نکالو۔"
اس مجلس میں لطیفہ بازی بھی ہوتی اور فلموں کے بارے میں دھواں دھار گفتگو بھی ہوا کرتی تھی۔ان میں ساقی صاحب واحد آدمی تھے۔جن کے پاس ایک کھلی چھت کی کار تھی وہ بہت خلیق' بامروت اور ملنسار آدمی تھے اور آخر دم تک ویسے ہی رہے۔ایکٹر بننے کی جستجو میں لاہور آئے تھے اور آخرانہوں نے ایکٹر بن کر ہی دم لیا۔خوش مزاج ہونے کے علاوہ خوش لباس اور خوش گفتار بھی تھے۔ عملی مذاق بھی کر لیا کرتے تھے۔ایک بار (کئی سال کے بعد) جب وہ اداکار بن چکے تھے اور شمیم آرا نامور ہیروئن بن گئی تھیں تو جرمنی کے ایک ائرپورٹ پر اتفاق سے ان دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ شمیم آرا نے ساقی کو دیکھا تو بے تابی سے ان کی طرف لپکیں۔اس زمانے میں بہت کم پاکستانی ملک سے باہر جاتے تھے اور اگر دیار غیر میں کوئی اپنا نظر آجاتا تھا تو عید ہو جاتی تھی۔ شمیم آرا بھی اچانک ایک مغربی ملک کے ائرپورٹ پر ساقی کو دیکھ کر خوش اور حیران ہو کر ان کی طرف بڑھیں مگر ساقی صاحب بالکل انجان بن گئے اور خالص امریکن لہجے میں انگریزی بولنے لگے جب شمیم آرا کو یقین آگیا کہ وہ ساقی نہیں ہیں اور انہیں غلط فہمی ہوئی ہے تو وہ معذرت کر کے واپس پلٹیں۔ساقی صاحب نے انہیں اردو میں آواز دی "شمیم' بن گئیں نا بے وقوف؟"
شمیم آرا ان سے بہت ناراض ہوئیں مگر مارے خوشی کے آنکھوں میں آنسو بھی آگئے۔یہ قصہ ہمیں شمیم آرا اور ساقی صاحب دونوں نے سنایا تھا۔

ساقی کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ کئی زبانیں بالکل اصل تلفظ اور لب و لہجے کے ساتھ بول سکتے تھے۔امریکنوں کے انداز میں شانے ہلا ہلا کر انگریزی بولتے اور اس میں انگریزی کے علاوہ اپنے خود ساختہ بے معنی فقرے بھی شامل کر لیتے اور سننے والا حیران ہو کر ان کو دیکھتا رہ جاتا۔وہ کم از کم ہفت زبان تو ضرور تھے۔فارسی' پشتو، سندھی اور پنجابی کے علاوہ فرنچ بھی بولا کرتے تھے۔خدا جانے وہ فرنچ ہی تھی یا ان کی کوئی خود ساختہ زبان تھی مگر لب و لہجہ خالص فرنچ ہی تھا۔

ساقی صاحب لکشمی چوک میں مل جاتے اور اسٹوڈیو جانے کا ارادہ ہوتا تو پوچھتے ’’آفاقی صاحب! اسٹوڈیو چلنا ہے؟‘‘ پروگرام ہوتا تو ہم فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی چمچماتی ہوئی کار میں ہمیں بٹھاتے اور کار کسی پیٹرول پمپ کے سامنے لے جا کر روک دیتے۔

’’یار بہت کڑکی ہے، آدھا گیلن پیٹرول تو ڈلوا دو۔‘‘

آدھا گیلن کا مطلب تھا چودہ آنے۔

ہم شکایت کرتے ’’بڑے افسوس کی بات ہے۔ اس بہانے ہم سے کرایہ وصول کرو گے؟‘‘

’’ایمان سے جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ یار کبھی کبھی دوستوں کی مدد بھی کر دیا کرتے ہیں۔ اللہ اجر دیتا ہے۔‘‘

بعد میں جب ہمارے اور ان کے حالات بہتر ہو گئے تو ہم دونوں پرانے دنوں کی باتیں یاد کر کے ہنسا کرتے تھے۔ ساقی اس زمانے میں ہمیں اسٹوڈیو لے جانے اور وہاں سے واپس لانے کا سب سے معقول ذریعہ تھے۔ اس زمانے میں فلمیں ہی کتنی بنا کرتی تھیں اور ساقی تو بالکل بیکار ہی تھے۔ گھر سے منگا کر خرچہ کرتے تھے۔

ان ہی دنوں ہم ایک بار الحمرا آرٹ کونسل گئے تو وہاں ایک نوجوان کو غزل گاتے سن کر بہت جی خوش ہوا۔ بعد میں مسعود اشعر نے ان سے ملاقات کرائی۔ ان کا نام خلیل احمد تھا۔ بہت اچھے اور دلچسپ آدمی تھے اور ان دنوں مسعود اشعر کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ خلیل احمد کو گلوکار بننے کا شوق تھا۔ ویسے کسی انگریزی کمپنی میں ملازم تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ فلم ’’گلنار‘‘ کے لئے میڈم نور جہاں کے ساتھ ایک ڈوئیٹ بھی گا چکے ہیں جو کہ ایک نئے گلوکار کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ خلیل احمد کی آواز میں مٹھاس اور سریلا پن تھا مگر وہ گلوکار نہ بن سکے۔ کچھ عرصے بعد موسیقار بن گئے ہماری پہلی فلم ’’کنیز‘‘ کے موسیقار بھی خلیل احمد ہی تھے۔

خلیل احمد اور مسعود اشعر کی دعوت پر ہم ان کے گھر بھی گئے۔ یہ مکان اور فلیٹ کی ملی جلی شکل تھی۔ میکلوڈ روڈ پر ایک مکان کی دوسری منزل پر چند کمرے تھے جن میں یہ رہا کرتے تھے۔ ان کے برابر والے کمرے میں ایک چھوٹے قد کے گول مٹول نوجوان ’ایک سنجیدہ مزاج خان صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ گول مٹول‘ نوجوان کا نام قمر زیدی تھا۔ یہ گلنار میں امتیاز علی تاج صاحب کے اسسٹنٹ تھے۔ ہم یہ سن کر بہت مرعوب ہوئے۔ وہ ہمیں ’’گلنار‘‘ کے

قصے سناتے رہے۔

قمر زیدی بہت ہنسنے ہنسانے والے آدمی تھے۔ لطیفے تو سناتے ہی تھے مگر نقلیں اتارنے میں بھی انہیں مہارت حاصل تھی۔ ہر اداکار کی وہ ایسی نقل اتارتے کہ نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے۔ ''گلنار'' کے ہدایت کار امتیاز علی تاج تھے۔ شوکت تھانوی پہلی بار کسی فلم میں اداکاری بھی کر رہے تھے۔ ببو بیگم اپنے زمانے کی بہت نامور اور دولت مند ہیروئن تھیں۔ سنا ہے کہ وہ اپنے جوتوں میں ہیرے لگواتی تھیں۔

یہ وہی ببو بیگم ہیں جن سے ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے والد سر شاہ نواز بھٹو نے شادی بھی کی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں یہ باقاعدہ شادی نہیں تھی لیکن کافی عرصے تک ببو بیگم ان کے نام سے منسوب رہیں اور ان کا تذکرہ بڑے پیار اور احترام سے کیا کرتی تھیں۔ بھٹو صاحب برسر اقتدار آئے تو انہوں نے ببو بیگم کو مالی امداد اور زمین بھی دی تھی۔ ببو بیگم اپنی جوانی میں تو حشر سامانیاں کرتی ہی تھیں مگر جب ہم نے انہیں دیکھا تو ادھیڑ عمر ہو چکی تھیں۔ جسم فربہ ہو گیا تھا' رنگ سانولا تھا مگر نقش و نگار بہت تیکھے اور دلکش تھے۔ وہ بے اولاد تھیں اور زندگی کے آخری سال انہوں نے اپنے جاننے والوں کے گھروں میں کاٹے۔ اگلے وقتوں میں لاکھوں کمائے اور لاکھوں ہی لٹائے۔ کہتے ہیں کلکتہ یا بمبئی کی کسی دکان میں جاتی تھیں تو ساری دکان خرید لیتی تھیں۔ اس شاہانہ اصراف کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑھاپے کے لئے کچھ بھی بچا کر نہ رکھا۔ آخر وقت تک معاش کے لئے فلموں میں کام کرتی رہیں۔ جس کسی کے گھر رہتیں اسے اپنے اخراجات کی رقم دینے کی کوشش کرتیں۔ اگر پیسے پاس نہ ہوتے تو گھر کے کام اور دیکھ بھال کر کے اس احسان کو اتارنے کی کوشش کرتیں۔ بڑی وضع دار اور خود دار خاتون تھیں۔ کسی پر بوجھ بننا انہوں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ بہت کسمپرسی کے عالم میں ان کا انتقال ہوا۔

ببو بیگم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہر وقت ہنستی ہنساتی رہتی تھیں۔ کیا مجال جو کبھی غمگیں یا سنجیدہ نظر آ جائیں۔ حاضر جوابی اور فقرہ بازی میں ان کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ کسی پر بھی فقرہ کسنے سے باز نہیں رہتی تھیں۔ سبھی ان کا لحاظ اور احترام کرتے تھے۔

ہماری اس وقت تک ببو بیگم سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ''گلنار'' کی شوٹنگ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ قمر زیدی

نے ''گلنار'' کے سیٹ کا ایسا دلچسپ اور بھرپور نقشہ کھینچا کہ ہنستے ہنستے ہم سب کا برا حال ہو گیا اور خود ہمیں بھی ''گلنار'' کی شوٹنگ پر جانے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ''گلنار'' کی شوٹنگ عموماً رات کے وقت ہوا کرتی تھی اور رات کے وقت اسٹوڈیو جانا ہمارے بس میں نہ تھا مگر قمر زیدی کی باتوں نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ''گلنار'' کے سیٹ پر ضرور جائیں۔ قمر زیدی نے بھی ہماری مدد کی اور کہا کہ وہ ہمیں لے جانے اور لانے کے لئے گاڑی کا بندوبست کرا دیں گے۔

قمر زیدی کے بارے میں اتنا بتا دیں کہ یہ وہی قمر زیدی ہیں جنہوں نے کراچی جا کر بیرون ملک پاکستان کی پہلی فلم ''رشتہ ہے پیار کا'' بنائی تھی۔ اس فلم میں وحید مراد اور زیبا مرکزی کرداروں میں تھے۔ یورپ کے کئی شہروں میں اس فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ اتنے عرصے بیرون ملک ساتھ رہنے کی بنا پر یہ افواہیں بھی گرم ہونے لگی تھیں کہ زیبا اور وحید مراد کی شادی ہونے والی ہے مگر یہ محض افواہ اور قیاس آرائی ہی رہی۔

قمر زیدی نے فلم ''سالگرہ'' بھی بنائی جس کے تمام گانے آج بھی ہٹ ہیں۔ گیت کار شیون رضوی ہندوستان سے نئے نئے آئے تھے۔ ان کے لکھے ہوئے نغموں کی دھنیں موسیقار ناشاد نے بنائی تھیں اور ایسی کہ وہ امر ہو گئے مثلاً

لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے

یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے

شیون رضوی صاحب بہت اعلیٰ پائے کے نغمہ نگار تھے۔ بعد میں فلم ساز اور ہدایت کار بن گئے تو ''میری زندگی ہے نغمہ'' جیسی ہٹ فلم بنائی۔

قمر زیدی بہت ہنسوڑ اور لطیفہ باز بلکہ لطیفہ ساز تھے۔ ہم سب ان سے کہا کرتے تھے کہ بھائی تم کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ ہدایت کاری کا خیال چھوڑو اور کامیڈین بن جاؤ تو خوب کماؤ گے۔ پاکستان کے گوپ کہلاؤ گے۔ مگر زیدی نے ہمت نہ ہاری اور آخر کار ہدایت کار بن کر ہی دم لیا۔ قسمت نے پہلی فلم ہی سپر ہٹ بنوا دی۔ ان کی آخری فلم ''پالکی'' تھی۔ اس کے فلم ساز کراچی کے تھے مگر یہ لاہور میں بنی تھی۔ محمد علی' ندیم' زیبا اور روحی بانو اس فلم کے اہم اداکار تھے۔ یہ فلم کافی عرصے میں تیار ہوئی اور زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ قمر زیدی ادھیڑ عمری سے پہلے ہی وفات پا گئے۔ آخر عمر میں ہنسنا ہنسانا بھول گئے تھے۔ غم روزگار نے انہیں ایک مختلف آدمی بنا دیا تھا۔

میکلوڈ روڈ کے مذکورہ بالا فلیٹ میں کئی شاعروں ادیبوں اور فلم کے امیدواروں کا آنا جانا تھا مگر یونس راہی دوستوں کے حلقے میں شامل تھے۔ آگے چل کر وہ بھی مصنف اور ہدایت کار بنے۔ خاموش مگر دلچسپ آدمی تھے۔ انہوں نے بھی زیادہ عمر نہیں پائی۔ اکثر مالی پریشانیوں میں مبتلا رہتے تھے۔ جس کی وجہ دو شادیاں تھیں۔ انہوں نے ایک ابھرتی ہوئی ایکٹریس سے دوسری شادی کر لی تھی اور اس کے بعد بے سکون اور مالی اعتبار سے پریشان ہی رہے۔
اس فلیٹ کی ایک اور تاریخی اہمیت بھی تھی۔ فلیٹ کے اوپر جانے کی سیڑھیوں سے پہلے تھوڑی سی کھلی جگہ تھی۔ کسی زمانے میں برصغیر کے نامور گلوکار محمد رفیع اس جگہ بیٹھ کر لوگوں کو گانا سنایا کرتے تھے۔ اس وقت انہیں گلوکار بننے کا شوق تھا مگر امکان کوئی نہیں نظر آتا تھا۔ قسمت مہربان ہوئی تو بمبئی پہنچ گئے اور فلمی دنیا کے بہت بڑے گلوکار بن گئے۔ ہم لوگ مذاق میں خلیل احمد سے کہا کرتے تھے کہ بھائی تم بھی نیچے سیڑھیوں میں بیٹھ کر گایا کرو۔ اس طرح تم بھی رفیع کی طرح بڑے گلوکار بن جاؤ گے۔ مگر خلیل احمد تعلیم یافتہ اور نخرے والے آدمی تھے۔ وہ تو فرمائش پر بھی کسی کو گانا نہیں سناتے تھے' دوستوں کی محفل کی بات اور ہے۔

''گلنار'' کی شوٹنگ دیکھنے کے لئے ہم قمر زیدی کے ساتھ شاہ نور اسٹوڈیو پہنچے۔ وہاں سبھی سے ہماری یاد اللہ ہو چکی تھی۔ سب سے ملتے ملاتے ''گلنار'' کے سیٹ پر پہنچ گئے۔ یہ لکھنؤ کی ایک قدیم نوابی حویلی کا سیٹ تھا جس پر حقیقت کا گمان گزرتا تھا۔ ''گلنار'' کی کہانی اردو کی معروف مثنوی ''زہر عشق'' سے اخذ کی گئی تھی۔ فلم کے ہدایت کار امتیاز علی تاج جیسے فاضل اور تجربہ کار ادیب تھے۔ مکالمے شوکت تھانوی نے لکھے تھے جو لکھنؤ سے بخوبی واقف تھے اور وہاں اکثر آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ پھر شوکت حسین رضوی بھی موجود تھے جو لکھنؤ ہی کے تھے۔ یوں تو وہ اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ اس زمانے میں فلمیں سوچ سمجھ کر اور تحقیق کے بعد بنائی جاتی تھیں۔ پھر اس فلم سے متعلق حضرات تو مستند اور معتبر لوگ تھے۔ اس لئے ''گلنار'' کے سیٹ پر بالکل حقیقت کا گمان گزرتا تھا۔ حویلی ایسی کہ جیسے سچ مچ کوئی دیو لکھنؤ کی کسی حویلی کو اٹھا کر لے آیا ہے۔ بارہ دریاں، محرابیں کھڑکیاں' دروازے، جھاڑ فانوس' تخت پوش' قالین ہر چیز بالکل اصل نظر آتی تھی۔

سیٹ پر نور جہاں موجود تھیں مگر پہچانی نہیں جا رہی تھیں۔ چست پاجامہ' کلیوں دار کرتہ' اس پر مخمل کی کوٹی' لمبی چوٹی کمر پر لہراتی ہوئی' پیروں میں سلیم شاہی جوتی۔ یوں لگتا تھا جیسے پرانے نوابوں کے دور میں پہنچ گئے ہیں۔ کنیزیں' مامائیں' مغلانیاں دست بستہ کھڑی تھیں۔ ایک جانب بڑا سا تخت بچھا ہوا تھا جس پر قالین اور تخت پوش تھا۔ ہر طرف قالین' سفید برف جیسی چاندنیاں اور گاؤ تکیے نظر آ رہے تھے۔ تخت پوش پر بو بیگم قدیم لکھنؤ لباس میں ایک بڑے سے چاندی کے پاندان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔

منظر یہ تھا کہ وہ پان بنا رہی ہیں کہ نور جہاں آ کر آداب بجا لاتی ہیں اور پھر کوئی بات کرتی ہیں۔ امتیاز علی تاج صاحب نے سین کو اوکے کر دیا۔ دوسرے سین کی تیاری شروع ہوئی تو اس وقفے میں شوکت حسین رضوی صاحب بھی سیٹ پر آ گئے۔ ایک لحاظ سے وہ اس فلم کے مشیروں میں شامل تھے اور فلم میں خالص لکھنؤ ماحول پیدا کرنے کے سلسلے میں رہنمائی کیا کرتے تھے۔ ان کے اور شوکت تھانوی صاحب کے مابین فقرے بازی شروع ہو گئی۔ شوکت صاحب بہت بڑے مزاح نگار تھے اور انتہائی سنجیدہ چہرہ بنا کر بہت مذاحیہ باتیں کر جاتے تھے اور لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ وہ بہت حاضر جواب اور فقرہ بازی کے فن کے امام سمجھے جاتے تھے۔ ان میں اور بو بیگم میں چوٹیں جاری رہتی تھیں مگر ہم نے اگر کبھی شوکت تھانوی صاحب کو لاجواب ہوتے ہوئے دیکھا تو بو بیگم کے سامنے۔ وہ بڑی فراخدلی سے ان کے اچھے فقروں کی داد بھی دیا کرتے تھے۔

قمر زیدی صاحب نے ہمارا بھی تعارف کرایا۔ شوکت تھانوی صاحب سے ہماری ملاقات تھی مگر امتیاز علی تاج سے ملنے کا وہ پہلا موقع تھا۔ وہ بہت بڑی شخصیت تھے۔ جامہ زیب اور خوب صورت' سرخ و سفید رنگت' مناسب ناک نقشہ' درمیانہ قد و قامت 'شائستگی اور اخلاق و آداب ان پر ختم تھا۔ غالباً یہ امتیاز علی تاج کی آخری فلم تھی۔ بعد میں انہوں نے کوئی فلم ڈائریکٹ نہیں کی۔ چند سال کے بعد ان کے اپنے گھر میں کسی نے انہیں قتل کر دیا۔ آج تک قاتل کا سراغ ملا نہ ہی یہ معلوم ہوا کہ تاج صاحب جیسے شریف' مرنجاں و مرنج اور بے ضرر آدمی کو قتل کرنے کا سبب کیا تھا۔ چلتے چلتے یہ بھی بتا دیں کہ ریڈیو کی مشہور اناؤنسر یاسمین طاہر ان ہی کی صاحب زادی ہیں جن کی نعیم طاہر سے شادی ہوئی ہے۔ اردو کی ایک نامور اور صاحب طرز ادیبہ حجاب امتیاز علی تاج صاحب کی بیگم تھیں۔ بقید حیات ہیں۔ لکھنا

لکھنا انہوں نے بند کر دیا ہے۔ زیادہ وقت بلیوں کی پرورش میں گزارتی ہیں جن کی تعداد درجنوں میں ہے۔

''گلنار'' کے سیٹ پر سنتوش صاحب کو بھی دیکھا۔ وہ بھی چوڑی دار سفید پاجامہ اور انگر کھا زیب تن کئے ہوئے تھے۔

''گلنار'' بہت محنت' لگن اور کافی سرمائے سے بنائی گئی تھی مگر شاید موضوع کی وجہ سے زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ مگر پھر ایسے لوگ اور ایسا ماحول کسی اور فلم کے سیٹ پر دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

''گلنار'' کی فلم بندی کے زمانے میں ہی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے سارے ملک میں سنسنی پھیلا دی۔ اخبارات میں بھی خبریں شائع ہوئیں مگر اس کے اثرات بہت دور رس اور انتہائی افسوس ناک ثابت ہوئے۔

پاکستان کی کرکٹ ٹیم ہندوستان کا پہلا دورہ کر کے واپس آئی تو اس میں اوپننگ بیٹسمین نذر محمد کی بہت واہ واہ ہو رہی تھی۔ نذر محمد نے ٹیسٹ میچ میں اوپننگ کرنے کے بعد آخری کھلاڑی تک کے ساتھ کھیلنے کا ریکارڈ قائم کیا تھا اور پھر بھی آؤٹ نہیں ہوئے تھے۔ ہر طرف ان کے کھیل کی دھوم تھی۔ وہ فضل محمود کی طرح قومی ہیرو بن گئے تھے۔ خوش شکل اور مردانہ شخصیت کے مالک تھے۔ باتیں بہت دلچسپ کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ موسیقی کے دلدادہ تھے اور خود بھی بہت سریلے تھے۔ سننے میں آیا کہ میڈم نور جہاں کی ان سے ملاقات ہوئی تو یہ سلسلہ باقاعدہ ملاقاتوں تک پہنچ گیا یہاں تک کہ دوسری جگہوں پر بھی ملاقاتیں ہونے لگیں۔

ایک روز میڈم نور جہاں ان سے ملاقات کے لئے گئی ہوئی تھیں کہ کسی کھوجی نے شوکت صاحب کو خبر دے دی۔ شوکت صاحب آگ بگولا ہو کر مخبر کے ہمراہ گئے۔ اس گھر پر پہنچے تو میڈم نور جہاں وہاں موجود تھیں مگر نذر محمد کا نام و نشان تک نہ تھا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ شوکت صاحب کے گرجنے کی آواز سنی تو نذر محمد نے مکان کی دوسری منزل سے چھلانگ لگا دی اور اپنا ایک بازو تڑوا بیٹھے۔ اس طرح پاکستان کی کرکٹ ٹیم ایک مایہ ناز کھلاڑی سے محروم ہو گئی۔ نذر محمد ڈاکٹروں کے پاس جانے کے بجائے جراحوں اور پہلوانوں کے چکر میں رہے جس کی وجہ سے بازو کی ہڈی ہمیشہ کے لئے خراب ہو گئی اور وہ پھر کرکٹ نہ کھیل سکے۔ البتہ انہوں نے اپنے فرزند مدثر نذر کی صورت میں پاکستان کرکٹ ٹیم کو ایک نامور کھلاڑی کا تحفہ ضرور پیش کر دیا۔

اب شوکت صاحب اور نور جہاں کا قصہ سنئے۔ شوکت صاحب نے اس مکان میں نور جہاں کو پالیا مگر نذر محمد موجود نہ تھے۔ میڈم نور جہاں نے اپنی صفائی میں یہ کہا کہ وہ اپنی عزیز سہیلی سے ملنے کے لئے آئی تھیں لیکن شوکت صاحب کا دل صاف نہ ہوا۔ انہوں نے برا بھلا کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور غصے میں نور جہاں کو وہیں چھوڑ کر واپس چلے آئے۔ اگلے ہی روز نذر محمد کا بازو ٹوٹ جانے کی خبر بھی عام ہوگئی۔ اس زمانے میں دنیا بہت سمٹی ہوئی تھی۔ ہر بات پل بھر میں عام ہو جایا کرتی تھی۔ میڈم نور جہاں تو اس واقعے کی تردید ہی کرتی رہیں مگر شوکت صاحب کو یقین نہ آیا۔ وہ غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے واپس لوٹ گئے اور سب کو بتادیا کہ وہ نور جہاں کی صورت تک نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس حالت میں نور جہاں کے شاہ نور اسٹوڈیو واپس آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ''گلنار'' کے فلم ساز میاں احسان جو اس گھرانے کے بہت پرانے دوست بھی تھے نور جہاں کو اپنے گھر لے گئے۔ ''گلنار'' کی شوٹنگ رک گئی۔ شاہ نور اسٹوڈیو میں میڈم نور جہاں کے گانوں کی صدا بندی بھی بند ہوگئی۔ اس وقت تک وہ شاہ نور کے علاوہ کسی اور اسٹوڈیو میں گانا ریکارڈ نہیں کراتی تھیں۔ اس طرح جو تھوڑا بہت فلمی کام ہو رہا تھا وہ بھی ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ نور جہاں گھر سے باہر رہائش پذیر تھیں۔

چند دن تو بندش جاری رہی پھر متعلقہ لوگوں نے اور خاص طور پر امتیاز علی تاج صاحب نے شوکت صاحب کو سمجھایا کہ اس طرح تو دوسرے لوگوں کا بہت نقصان ہو رہا ہے۔ شوکت صاحب نے نور جہاں کو شوٹنگ اور ریکارڈنگ کے لئے شاہ نور اسٹوڈیو آنے کی اجازت تو دے دی مگر گھر کے دروازے ان پر بند ہی رکھے۔ اس طرح نور جہاں کا شاہ نور اسٹوڈیو میں آنا جانا شروع ہوگیا مگر شوکت صاحب ان سے بے تعلق ہی رہے۔ انہوں نے نور جہاں کی موجودگی میں ''گلنار'' کے سیٹ پر جانا ترک کر دیا۔ جب نور جہاں کے گانے کی صدا بندی ہوتی تو وہ ریکارڈنگ ہال سے دور دور ہی رہتے مگر یہ بے رخی زیادہ عرصے نہ چل سکی۔

شوکت حسین رضوی اور نور جہاں کی ازدواجی زندگی میں آئندہ جا کر جو خرابیاں پیدا ہوئیں یہ واقعہ اس کا سنگ بنیاد بنا اور پھر رفتہ رفتہ فاصلے پیدا ہوتے چلے گئے۔ شوکت صاحب اپنی خودداری اور ضد کے ہاتھوں مجبور تھے۔ ادھر میڈم نور جہاں کو ہمدردوں اور دوستوں کے روپ میں ایسے لوگ مل گئے جنہوں نے ان دونوں کے درمیان ایسے حالات پیدا

کردیے کہ نوبت مقدمہ بازی اور بد ترین الزام تراشی تک پہنچ گئی۔ قصوروار کون تھا؟ اس کا فیصلہ ہم اور آپ تو نہیں کر سکتے۔ دونوں کے پاس شکایات کا انبار اور الزامات کا پلندا موجود ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ شوکت صاحب واقعی نور جہاں کے عشق میں گرفتار تھے۔ سنا ہے کہ کسی زمانے میں وہ بھی شوکت صاحب سے سچا عشق کرتی تھیں مگر شوکت صاحب کی حالت ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ وہ بجھ سے گئے تھے۔ خاموش اور مغموم رہنے لگے تھے۔
جس وقت نور جہاں شاہ نور اسٹوڈیو میں آتی تھیں تو شوکت صاحب ادھر ادھر ہو جاتے تھے مگر پھر بڑی بے چینی کے ساتھ ''گلنار'' کے سیٹ کے باہر گھومتے نظر آتے۔ اگر نور جہاں کے گانے کی صدابندی ہوتی تو شوکت صاحب ریکارڈنگ ہال کے آس پاس ہی پائے جاتے۔ اس اثنا میں بعض مشترکہ دوستوں نے نور جہاں کی جانب سے صفائی پیش کرنی شروع کر دی تھی اور نور جہاں کے پیغام بھی شوکت صاحب کو پہنچانے لگے تھے مگر شوکت صاحب روٹھے ہی رہے۔

ایک رات ''گلنار'' کی شوٹنگ جاری تھی۔ میڈم نور جہاں کے کام میں وقفہ آیا تو وہ تازہ ہوا کھانے کے لئے سیٹ سے باہر نکل کر باغ میں پہنچ گئیں۔ وہاں قالین بچھے ہوئے تھے۔ تھک ہار کر لیٹیں تو آنکھ لگ گئی۔
شوکت صاحب حسب معمول چاروں طرف بولائے بولائے پھر رہے تھے۔ نور جہاں کو باغ میں سوتے ہوئے دیکھا تو ایک بار تو نظر انداز کر کے چلے گئے مگر پھر وہیں منڈلانے لگے۔ آخر نہ رہا گیا تو نور جہاں کے پاس پہنچ گئے۔ انہیں جھنجوڑ کر بیدار کیا اور پوچھا'' یہاں فرش پر کیوں لیٹی ہو؟''
نور جہاں نے جواب نہ دیا مگر آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔
شوکت صاحب نے پھر پوچھا''نور جہاں' یہاں کیوں لیٹی ہو؟''
نور جہاں بے اختیار اٹھ کر شوکت صاحب سے لپٹ گئیں اور رونے لگیں ''میاں' مجھے معاف کر دو''
شوکت صاحب کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ انہیں گلے لگا لیا اور پھر گود میں اٹھا کر گھر کے اندر لے گئے۔
یہ واقعہ ہمیں لقمان صاحب نے سنایا تھا۔ وہ اب مرحوم ہو چکے ہیں مگر وہ کہتے تھے کہ وہ اس واقعے کے عینی شاہد تھے۔ وہ شوکت صاحب کے پرانے اسسٹنٹ تھے اور بمبئی میں ان دونوں کے گھر میں بھی رہ چکے تھے۔ شوکت صاحب اور

نور جہاں کے حقیقی دوستوں کی طرح وہ بھی ان کی علیحدگی سے پریشان تھے۔اس منظر کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھااور اپنی خوشی برداشت نہ کرسکے شاعر نے کہا ہے۔

بڑامزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

مگر ملاپ کا یہ مزہ دیرپا نہ ثابت ہوا۔ایک بار ان دونوں کے درمیان بے اعتمادی کی جو لکیر پیدا ہوگئی تھی وہ وقت کے ساتھ گہری ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ علیحدگی' مقدمہ بازی اور طلاق تک نوبت پہنچ گئی۔

صبیحہ خانم پاکستان بننے کے بعد ہیروئن بنی تھی۔اس سے پہلے ان کی والدہ تھیٹر میں کام کیا کرتی تھیں۔نام توان کا اقبال بیگم تھا مگر بالو کے نام سے مشہور تھیں۔ گجرات کے ایک اچھے خاندان سے ان کا تعلق تھا مگر ایک خوبرو نوجوان کی محبت میں ایسی گرفتار ہوئیں کہ اپنی اور اس کی حیثیت بھی فراموش کردی۔یہ صاحب محمد علی تھے۔

اقبال بیگم کے ماں باپ کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے بیٹی کو سمجھایا اور پابندیاں عائد کردیں مگر وہاں تو معاملہ عشق تک پہنچ چکا تھا۔محمد علی نے بالو کی یاد میں شاعری شروع کردی اور سرعام گاتا پھرتا۔ان گانوں کو پنجابی موسیقی میں ایک نئی صنف '' ماہیا'' کا نام دیا گیا۔''ماہیا'' دراصل عشقیہ اشعار ہوتے ہیں جنہیں ایک مخصوص طرز میں گایا جاتا ہے۔یہ طرز بھی محمد علی کی اپنی ایجاد تھی۔ادھر تو محمد علی کے کھلے عشق نے بدنام کردیا تھا ادھر اقبال بیگم بھی سب کچھ ترک کرکے محمد علی کے ساتھ زندگی گزارنے پر تل گئی تھی۔اس طرح اس نے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ دیا۔محمد علی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کوچوان تھا۔ تعلیم بھی نہیں تھی۔اقبال بیگم سے شادی کے بعد عشق کے تقاضے نہ نبھا سکا اور بالو کو گزراوقات کے لئے تھیٹر میں کام کرنا پڑا۔محمد علی نے سب کام کاج چھوڑ دیا اور بیوی کی آمدنی پر گزارا کرنے لگا۔ان دونوں کی محبت یا عشق کی نشانی صبیحہ کی صورت میں عالم وجود میں آئی۔صبیحہ کے نانا اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔بچپن میں صبیحہ نے کچھ وقت وہاں گزارا بھی تھا مگر صدمات اور مایوسیوں نے بالو کو ٹی بی جیسے موذی مرض میں مبتلا کردیا۔ یہاں تک کہ وہ جوانی کے عالم میں ہی وفات پاگئی۔صبیحہ کے نانا نے بہت زور مارا کہ نواسی کو اپنے پاس رکھیں مگر محمد علی عدالت کے بل پر صبیحہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔اس طرح صبیحہ نے ایک بے عمل' گمراہ اور خود غرض باپ کے زیر سایہ پرورش پائی۔محمد علی کو شراب خانہ خراب نے اپنی گرفت میں لے لیا

تھا۔ کام کاج اول تو تھا نہیں اور جو تھا بھی تو وہ آمدنی شراب کی نذر ہو جاتی تھی۔ ان حالات میں اس لڑکی نے حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم کیا جسے کچھ عرصے بعد پاکستانی فلمی صنعت کی ''خاتون اول'' بننا تھا۔ مگر اس کے لئے صبیحہ کو بہت پاپڑ بیلنے پڑے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صبیحہ نے جو بھی لیاقت یا مقام حاصل کیا۔ بذات خود اپنی کوشش' محنت اور لگن سے حاصل کیا۔

باپ کو تو مے نوشی سے ہوش نہ تھا۔ صبیحہ نے اپنے طور پر لکھنا پڑھنا سیکھا۔ عرفان کھوسٹ کے والد سلطان کھوسٹ' ریڈیو تھیٹر اور فلم کے فن کار تھے۔ محمد علی سے ان کی دوستی تھی۔ انہوں نے صبیحہ میں ذہانت کے جراثیم دیکھے تو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اس طرح جو تھوڑی بہت تعلیم و تربیت صبیحہ کو ملی وہ سلطان کھوسٹ کی بدولت ملی۔

صبیحہ کو اس کا باپ ہیروئن بنانا چاہتا تھا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ گورا بے داغ رنگ' دلکش نقوش' سریلی آواز' کمی صرف یہ تھی کہ قد چھوٹا تھا۔ محمد علی کو صبیحہ کی صلاحیتوں سے نہیں کمائی سے مطلب تھا۔ اس لئے وہ اسے ہیروئن بنانے پر تلا ہوا تھا مگر اس زمانے میں فلم سازی برائے نام ہو رہی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ابتدائی سالوں میں جب صبیحہ کو فلم سازوں نے دیکھا تو اسے مسترد کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ہیروئن بننے کے قابل نہیں ہے مگر صبیحہ نے اپنی کوشش جاری رکھی۔

ہم نے صبیحہ کو پہلی بار رائل پارک میں سلطان کھوسٹ کے ساتھ پیدل جاتے ہوئے دیکھا' وہ برقعے میں ملفوف تھی۔ ایک صاحب نے بتایا کہ سلطان کھوسٹ کے ساتھ جو لڑکی ہے وہ صبیحہ ہے۔ اس وقت صبیحہ نے ایک دو فلموں میں کام کر لیا تھا مگر کوئی مقام حاصل نہ کر سکی تھی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جس فلم ساز نے صبیحہ کو مسترد کر دیا تھا بعد میں اس نے منہ مانگے معاوضے پر صبیحہ کو اپنی کئی کامیاب فلموں میں کاسٹ کیا۔

صبیحہ نے جس فلم میں پہلی بار کام کیا وہ پنجابی فلم ''بیلی'' تھی۔ اس لحاظ سے بڑی فلم تھی کہ اس کے مصنف سعادت حسن منٹو اور ہدایت کار مسعود پرویز تھے۔ ایسے مایہ ناز مصنف اور قابل ہدایت کار کے اشتراک سے بننے والی اس فلم میں صبیحہ ہیروئن نہیں تھی۔ اس فلم کی ہیروئن شاہینہ تھیں۔ بلند قامت سرخ و سفید رنگت' دراز قد نیلی آنکھیں اور لمبوتر چہرہ۔ یہ شاہینہ کا سراپا تھا۔ وہ موسیقار رفیق غزنوی کی بیٹی تھیں اور اس رشتے سے سلمیٰ آغا کی قرابت دار بھی

سمجھ لیجئے۔ شاہینہ نے پاکستان کی بعض ابتدائی فلموں میں کام کیا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکیں اور پھر اچانک غائب ہو گئیں۔ ''بیلی'' میں شاہینہ کے مقابلے میں سنتوش کمار ہیرو تھے۔ صبیحہ نے اس فلم میں ایک بے حد معمولی سا کردار کیا تھا۔ ''بیلی'' کے موسیقار رشید عطرے تھے۔ اس کے باوجود یہ فلم بری طرح فلاپ ہو گئی۔ اس کی موسیقی بہت اچھی تھی۔ باقی کوئی چیز بھی قابل ذکر نہ تھی۔ جب فلم ریلیز ہوئی تو تماشائیوں نے پہلے شو میں ہی فرنیچر توڑ دیا اور بہت اودھم مچایا۔ یہ اس زمانے کا دستور تھا کہ اگر فلم بینوں کو فلم پسند نہیں آتی تھی تو وہ سینما کا فرنیچر توڑ دیا کرتے تھے۔ سیٹوں کی گدیاں چاقو سے کاٹ دیتے تھے بلکہ بعض اوقات اسکرین بھی پھاڑ دیا کرتے تھے۔

''بیلی'' کے بارے میں ایک لطیفہ بھی مشہور ہے۔ وہ یہ کہ ''بیلی'' کے پہلے شو میں مسعود پرویز اور رشید عطرے بھی فلم دیکھنے پہنچ گئے اور اوپر بالکونی میں بیٹھ کر تماشائیوں کا ردعمل دیکھنے لگے۔ فلم بینوں کو سعادت حسن منٹو اور مسعود پرویز کی فلم سے کافی بلند توقعات وابستہ تھیں مگر فلم ان کی توقعات کے برعکس تھی۔ تھوڑی دیر تو انہوں نے برداشت کیا پھر بے چین ہو کر کروٹیں بدلنے لگے۔ اس کے بعد ہوٹنگ اور شوروغل شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ نوبت توڑ پھوڑ تک پہنچ گئی۔ تماشائیوں نے غصے میں آکر کرسیاں توڑنی شروع کر دیں۔ ادھر ہال میں تماشائیوں کا یہ عالم تھا اور ادھر بالکونی میں رشید عطرے صاحب اس تمام ہنگامے سے بے نیاز اپنی موسیقی میں کھوئے ہوئے تھے۔ جب کوئی نغمہ شروع ہوتا وہ مسعود پرویز کی توجہ اس طرف مبذول کراتے اور کہتے '' مسعود صاحب' یہ پیس دیکھا آپ نے۔ وائلن اور طبلے کو کس طرح پیش کیا ہے۔''

مسعود پرویز تماشائیوں کے ردعمل اور فلم کی ناکامی کی وجہ سے پریشان بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بار پھر جب رشید عطرے صاحب نے ان سے کہا ''مسعود صاحب' ذرا یہ ستار کا پیس دیکھئے' کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔''

اسی وقت ٹوٹی ہوئی کرسی کا ایک پایہ کسی نے نیچے ہال میں سے اوپر اچھال دیا جو مسعود پرویز صاحب کے پاس آکر گرا۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے وہ ٹکڑا اٹھا کر رشید عطرے صاحب کو دکھایا اور بولے ''ذرا یہ پیس بھی ملاحظہ کر لیجئے۔''

''بیلی'' ناکام ہو گئی لیکن اس فلم میں صبیحہ کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ کسی نے اس نئے چہرے کو خاص توجہ بھی نہیں دی۔ اس طرح صبیحہ کی پہلی فلم ناکامی سے دوچار ہو گئی تھی۔ مگر صبیحہ کی اداکاری اور شکل وصورت فلم سازوں کو پسند آگئی

تھی۔انہوں نے صبیحہ کو فلموں میں کاسٹ کرنا شروع کر دیا۔دوسری فلم ''ہماری بستی'' میں وہ نجمہ کے ساتھ کام کرتی ہوئی نظر آئیں۔ نجمہ کے مقابلے میں یہ بھی ثانوی کردار تھا۔ تیسری فلم ''دوآنسو'' انور کمال پاشا نے بنائی تھی مگراس فلم کی ہیروئن شمیم تھیں۔اس فلم کے دوران میں ہی انور کمال پاشا نے شمیم سے شادی کرلی تھی۔اس فلم کے بعد صبیحہ نے امین ملک کی فلم ''غیرت'' اور ''پنجرہ'' میں کام کیا۔یہ دونوں فلمیں نہ چل سکیں۔ان میں صبیحہ کے ساتھ مسعود ہیرو تھے۔ مسعود بمبئی سے آئے تھے اور وہاں ان کی فلم ''دیور'' بہت زبردست ہٹ ہوئی تھی۔ بہت شریف' تعلیم یافتہ اور ملنسار آدمی تھے مگراداکاری کے میدان میں قسمت زیادہ مہربان نہیں تھی۔ انہوں نے بعد میں چنداور فلموں میں کام کیا۔ فلم سازی اور ہدایت کاری بھی کی مگران کی کوئی فلم صحیح معنوں میں کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوئی۔ان کی باتیں اور واقعات بھی کم نہیں ہیں۔ مگراس وقت تذکرہ صبیحہ خانم کا ہو رہا ہے۔

صبیحہ کے حسن وجمال اور اداکارانہ صلاحیتوں میں تو کوئی کلام نہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ ناکام فلموں میں کام کرنے کے باوجود فلم سازوں نے انہیں یاد رکھا اور انہیں اداکاری کا موقع ملتا رہا مگر وقت مہربان نہ تھا۔ان کی پہلی فلم جسے کامیاب کہا جاسکتا ہے انور کمال پاشا کی ''غلام'' تھی۔اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس فلم میں تین ہیروئنیں تھیں۔راگنی' صبیحہ اور شمی۔ شمی اور صبیحہ اس زمانے میں ہم پلہ سمجھی جانے لگی تھیں۔ان کی صورت شکل بھی اچھی تھی مگران کی اداکاری میں صبیحہ خانم والی بات نہیں تھی۔ ''غلام'' نے فلم بینوں اور فلم سازوں کو صبیحہ کی طرف مائل کر دیا۔انور کمال پاشا نے بھی اس فلم سے شہرت حاصل کی۔غالباً یہ پہلی اور آخری فلم تھی جس میں صبیحہ اور شمی نے ایک ساتھ کام کیا تھا۔اس کے بعد وہ ایک دوسرے کی حریف بن گئیں اور چشمک شروع ہوگئی۔ شمی تو جلد ہی سدھیر سے شادی کر کے فلمی دنیا سے کنارہ کش ہوگئی مگر صبیحہ اوج ثریا تک پہنچ گئیں۔

لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب صبیحہ باقاعدہ اور مقبول ہیروئن بننے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی تھیں اور حقیقی معنوں میں ہیروئن کے مقام پر فائز نہیں ہوئی تھیں۔

اس زمانے میں ہمارے ایک صحافی دوست مظہر یوسف زئی ایک فرمائش لے کر ہمارے پاس آئے۔ مظہر یوسف زئی

اس زمانے میں کلیم عثمانی کے ساتھ مل کر ایک فلمی ماہنامہ ''گل وخار'' شائع کیا کرتے تھے۔ دلچسپ اور سوشل قسم کے آدمی تھے جب کہ ان کے ساتھ کلیم عثمانی سنجیدہ اور ثقہ قسم کے مزاج رکھتے تھے۔ اس کے باوجود دونوں میں دوستی بھی تھی اور حصہ داری بھی۔ مزاجوں کے فرق کا فائدہ یہ تھا کہ ایک کی کمی دوسرا پوری کر دیا کرتا تھا۔ مظہر یوسف زئی آج کل بھی کراچی میں ہیں اور تمباکو کمپنی سے منسلک ہیں۔

مظہر یوسف زئی کی خواہش تھی کہ ہم ''آفاق'' کی فلمی صفحے پر صبیحہ خانم کا انٹرویو اور تصویر شائع کریں۔ مگر انہوں نے براہ راست مدعا بیان کرنے کے بجائے ہم سے تقاضا شروع کر دیا کہ صبیحہ خانم کے گھر چل کر چائے پیو۔

ہم پہلے توٹالتے رہے مگر جب انہوں نے ناراضگی کا اظہار شروع کر دیا تو مجبوراً رضامند ہو گئے۔ انہوں نے دوسرے دن شام کا وقت مقرر کر دیا اور ہمیں لینے کے لئے دفتر میں آ گئے۔

اس زمانے میں صبیحہ خانم وکٹوریہ پارک کے ایک بنگلے میں رہنے لگی تھیں۔ وکٹوریہ پارک مال روڈ کے عقب میں ایک رہائشی علاقہ تھا جہاں پرانی طرز کے بنگلے بنے ہوئے تھے۔ یہاں کسی زمانے میں زیادہ تر اینگلو انڈین رہا کرتے تھے۔ یہ جگہ ہمارے دفتر کے نزدیک ہی تھی۔ ہم پیدل ہی مظہر یوسف زئی کے ساتھ وکٹوریہ پارک چلے گئے۔

ایک پرانے لیکن صاف ستھرے بنگلے میں لے جا کر انہوں نے ہمیں بٹھا دیا اور خود اندر جا کر ہمارے آنے کی اطلاع کر دی۔ ڈرائینگ روم میں معمولی سا صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا۔ پردے بھی لٹکے ہوئے تھے۔ فرش پر قالین نہیں تھا لیکن کمرے میں گلدستے وغیرہ بڑے سلیقے سے سجائے گئے تھے۔ جو مکینوں کی خوش ذوقی کا مظہر تھے۔ ہم مظہر یوسف زئی کے ساتھ بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ اتنی دیر میں پردہ ہٹا اور صبیحہ خانم گہرے سبز رنگ کی ساڑی میں ملبوس اندر داخل ہوئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے صبیحہ کو قریب سے دیکھا تھا۔ وہ حسن وصحت کا نمونہ نظر آ رہی تھیں۔ فلموں کے مقابلے میں اصل زندگی میں وہ زیادہ دلکش نظر آئیں۔ گورا رنگ' خوبصورت ناک نقشہ' بات کرنے کا شائستہ انداز اور گہرے سبز رنگ کی ساڑھی میں وہ بہت پر کشش نظر آ رہی تھیں۔

ہم نے کھڑے ہو کر ان سے علیک سلیک کی۔ وہ بے تکلفی سے بیٹھ گئیں اور ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد چائے بھی آ گئی۔ انہوں نے چائے کے ساتھ پیسٹری وغیرہ کا بھی اہتمام کیا تھا۔ چائے کے دوران میں یہ معلوم

ہوا کہ انہوں نے پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان دینے کی تیاری کی ہے لیکن کوئی اسکول امتحان کے لئے ان کا داخلہ بھیجنے کو تیار نہیں ہے۔ انہوں نے انگریزی پڑھنے کے لئے ایک اینگلوانڈین خاتون کی خدمات بھی حاصل کر رکھی تھیں جن کا نام ہمیں یاد نہیں رہا مگر انہوں نے ماڈرن انداز اور طور طریقوں کے ساتھ ساتھ صبیحہ کو انگریزی بولنے کا ڈھنگ بھی سکھا دیا تھا۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صبیحہ آغاز ہی سے بہت ڈھنگ سے زندگی بسر کرنے کے منصوبے بنا رہی تھیں اور انہوں نے جو کچھ بھی حاصل کیا محض اپنی ذاتی کوشش اور محنت سے حاصل کیا۔ ان کا شوق دیکھا تو ہمیں بہت تعجب ہوا۔ اس سے پہلے ہم نے کسی ایکٹریس کو پڑھنے یا امتحان دینے کی خواہش میں مبتلا نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے بعد کوئی ایسی اداکارہ نظر آئی۔

مظہر یوسف زئی نے کہا ''اگر مدرستہ البنات کی ہیڈ مسٹریس سے سفارش کی جائے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ یار تم تو صحافی ہو' تمہاری بات وہ ضرور مانیں گی۔''

صبیحہ خانم نے بھی ملتجیانہ نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور ہم نے وعدہ کر لیا کہ کوشش ضرور کریں گے۔

اس اثنا میں صبیحہ اٹھ کر اندر گئیں تو مظہر یوسف زئی نے ہم سے کہا ''یار چائے پی لی' پیسٹری کھا لی دنیا بھر کی باتیں کئے جا رہے ہو' انٹرویو کیوں نہیں لیتے؟''

ہم نے کہا ''کیا انٹرویو بھی لینا ہے؟''

بولے ''اور نہیں تو کیا۔ میں نے صبیحہ خانم سے خاص طور پر کہا تھا کہ تم ان کا انٹرویو'' آفاق'' میں چھاپو گے۔ دیکھا نہیں وہ انٹرویو کے خیال سے تیار ہو کر بیٹھی ہیں۔''

ہم نے کہا ''مگر تم نے پہلے تو بتایا نہیں تھا۔ ہم تو انٹرویو کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارے پاس کاغذ وغیرہ ہے۔''

بولے ''بے کار بہانے مت کرو۔ انٹرویو کے لئے تیاری کی کیا ضرورت ہے۔ تم کوئی اناڑی تو ہو نہیں۔ رہا کاغذ تو وہ ہم تمہیں دے دیں گے۔''

ہم نے کہا ''دیکھو بھائی' تم نے چائے پینے کے لئے کہا تھا انٹرویو کی بات نہیں ہوئی تھی۔ اب انٹرویو کسی اور وقت کر

لیں گے کافی دیر ہو گئی ہے۔''

ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی صبیحہ خانم دوبارہ کمرے میں داخل ہوئیں اور مظہر یوسف زئی نے ہمیں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرنے شروع کر دیے کہ انٹرویو شروع کر دو۔ ہم انجان بن گئے۔ صبیحہ خانم سے ہم نے اجازت طلب کی اور وعدہ کیا کہ مدرستہ البنات کی ہیڈ مسٹریس سے ان کے بارے میں بات کریں گے۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولیں مگر چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ انہیں یہ بات اچھی نہیں لگی کہ ہم نے ان کا انٹرویو نہیں لیا۔ پھر بھی بڑے اخلاق سے مسکرا کر انہوں نے ہمیں رخصت کیا اور بنگلے کے باہر تک رخصت کرنے آئیں۔

ان کے گھر سے کچھ دور پہنچتے ہی مظہر یوسف زئی نے ہم سے جھگڑا شروع کر دیا۔

''کمال کرتے ہو۔ میری عزت خاک میں ملا دی۔ میں نے دوست سمجھ کر وعدہ کیا تھا اور تم نے ذرا بھی لحاظ نہیں کیا۔''

ہم نے کہا ''بھائی وعدہ کیا تھا تو ہمیں بھی بتا دیا ہوتا۔ اتنی دیر میں بتایا کہ انٹرویو کے لئے وقت ہی باقی نہیں رہا تھا۔ ان سے پھر کبھی انٹرویو کر لیں گے۔''

مگر مظہر صاحب روٹھے ہی رہے اور کئی دن تک ہم سے نہیں ملے۔

ہم نے دوسرے دن ''مدرسہ البنات'' میں فون کیا۔ یہ اس زمانے میں لاہور کی بہت بڑی اور مشہور' لڑکیوں کی درسگاہ تھی جہاں بڑی مشکل سے داخلہ ملتا تھا۔ ہم نے ہیڈ مسٹریس سے بات کی اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے اگلے دن سہ پہر کا وقت طے کر دیا۔

اگلے دن ہم ''مدرستہ البنات'' پہنچے تو ایک اور حیرت ہماری منتظر تھی۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے اس خیال سے کہ ایک صحافی ان کے اسکول میں آ رہا ہے' خاص اہتمام کیا تھا۔ پہلے تو انہوں نے اپنے کمرے میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ پھر اسکول کا معائنہ کرایا۔ خاصے قاعدے قرینے کا اسکول تھا۔ ہمیں خیال بھی نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ یہ وہی آئی پی سلوک کیا جائے گا مگر ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ معائنہ کرانے کے بعد ہمیں اسکول کے ہال میں لے گئیں جہاں مختلف کلاسوں کی طالبات اور استانیاں خصوصی طور پر اکٹھی کی گئی تھیں۔ انہوں نے ہمارے سامنے تقریر بازی کا مقابلہ پیش کیا۔ نظمیں اور نعتیں پڑھیں۔ اپنے اسکول اور طریقہ تعلیم کے بارے میں بتایا اور ہیڈ مسٹریس صاحبہ

نے آخر میں اسکول کے مسائل بھی پیش کر دیے۔ گویا یہ ایک طرح کا سپاسنامہ تھا۔ ہم اس دوران میں نہایت حیران و پریشان بیٹھے رہے۔ جب یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا تو ہم دوبارہ ہیڈ مسٹریس کے دفتر میں پہنچ گئے۔ انہوں نے چائے سے ہماری تواضع کی اور امید ظاہر کی کہ ہم ان کے اسکول کے بارے میں اپنے اخبار میں ضرور لکھیں گے۔ ہم نے فوراً وعدہ کر لیا مگر ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حرف مدعا کیوں کر زبان پر لائیں۔

آخر ہم نے دل کڑا کر کے ان سے کہا "ہم بھی ایک مسئلہ آپ سے حل کرانا چاہتے ہیں۔"

"ہاں ہاں فرمایئے؟"

ہم نے بتایا کہ ایک فلم ایکٹریس پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان دینا چاہتی ہیں۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ان کے امتحان کا داخلہ بھیج دیں"۔

وہ تعجب سے ہمیں دیکھنے لگیں پھر بولیں "دیکھئے جب تک کوئی لڑکی ہمارے اسکول کی طالبہ نہ ہو اس کا داخلہ نہیں بھیجا جا سکتا۔"

ہم نے کہا "تو پھر آپ انہیں اپنے اسکول کی طالبہ بنا لیجئے۔ وہ فیس وغیرہ دینے کو تیار ہیں۔"

انہوں نے پریشان ہو کر ہمیں دیکھا اور بولیں "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایک فلم ایکٹریس کو اسکول میں داخلہ دے کر میں اپنے اسکول کے نام پر بٹہ لگوا لوں؟ معاف کیجئے یہ ناممکن ہے۔"

ہم نے انہیں قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں بولیں "اور کوئی کام ہو تو بتایئے۔ افسوس کہ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ مجھے اوپر والوں کو بھی جواب دینا ہوتا ہے اور دوسرے لڑکیوں کے والدین بھی اعتراض کریں گے وغیرہ وغیرہ۔"

ہم مایوس ہو کر چلے گئے۔ ان کے اسکول کے بارے میں تو ہم نے ایک فیچر بنا کر چھاپ دیا مگر صبیحہ خانم کو میٹرک کے امتحان میں داخلہ نہ دلا سکے۔ ہم نے یہ بات مظہر یوسف زئی کو بھی بتا دی تھی۔ خدا جانے انہوں نے صبیحہ خانم کو بتائی یا نہیں۔ خود ہماری بھی ان سے کافی عرصے تک ملاقات نہ ہو سکی۔ اس طرح یہ پہلی ملاقات قصہ پارینہ بن کر رہ گئی۔

خدا جانے صبیحہ خانم کو یہ سب یاد بھی ہے یا نہیں؟

"شمی" پنجابی فلم تھی جس کے فلم ساز ملکہ پکھراج کے شوہر شبیر حسین شاہ تھے بلکہ خود ملکہ پکھراج ہی سارے انتظامات کرتی تھیں۔ قصہ یہ ہوا کہ "شمی" میں زرینہ ریشماں ہیروئن تھیں۔ یہ بھی اس زمانے کی ہیروئن تھیں۔ بعد میں انہوں نے اپنا نام تبدیل کر کے یاسمین رکھ لیا۔ چند فلموں میں کام کرنے کے بعد کیمرہ مین اور فلم ساز جعفر شاہ بخاری سے شادی کر کے مختصر سے عرصے کے لیے غائب ہو گئیں۔ مگر دوبارہ یاسمین کے نام سے نمودار ہو گئیں کچھ عرصے بعد انہوں نے سید شوکت حسین رضوی سے شادی کر لی جعفر شاہ بخاری سے ان کا ایک بیٹا ناصر تھا۔ وہ غالباً لندن میں ہے۔ سید شوکت حسین رضوی کے دو بیٹوں کی والدہ ہیں' دونوں بیٹے جوان ہو چکے ہیں اور شوکت صاحب کے حصے کا اسٹوڈیو کا کام سنبھالے ہوئے ہیں۔

ڈبلیو زیڈ احمد پنجاب کے ایک بہت عالی قدر خاندان کے فرد تھے۔ جس کا ہر فرد اس زمانے میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ سبھی لوگوں نے مختلف شعبوں میں مقام پیدا کیا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد جیسا ادیب بھی اس خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ احمد صاحب کے دوسرے تمام بھائی اعلیٰ ترین سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے اور پاکستان آکر بھی بڑے ممتاز افسر بنے۔ ڈبلیو زیڈ احمد نے بھی بی اے پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان جانے کا ارادہ کیا۔ وہ چاہتے تو دوسرے بھائیوں کی طرح مقابلے کے امتحان میں حصہ لے کر یقیناً سی ایس پی افسر بن کر حکمرانی کر سکتے تھے مگر ان کا رجحان فنون لطیفہ کی طرف تھا۔ وہ اردو' انگریزی اور پنجابی کے علاوہ بنگالی اور مرہٹی زبان بھی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ قدرتی ذہانت سے مالا مال تھے۔ تخلیقی قوت ان کے اندر اتنی زیادہ تھی کہ ساری عمر اسے لٹانے اور ضائع کرنے کے باوجود آج بھی وہ نئی نسل کے لوگوں سے زیادہ تخلیقی کام کرنے کے اہل تھے۔ لیکن ان کے ساتھ المیہ یہ تھا کہ وہ بہت بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کرتے تھے۔ لیکن اسے عملی جامہ پہنانے میں فیل ہو جاتے تھے۔ انڈیا میں تو وہ اپنے سارے منصوبے مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے وجہ یہ تھی کہ وہاں سرمایہ آسانی سے اور افراط میں مل جاتا تھا۔ مارکیٹ بھی بہت بڑی تھی۔ بڑے کاموں کے لئے انڈیا کی فلم انڈسٹری بہت مناسب تھی۔ احمد صاحب کے ساتھ قدرت نے یہ ستم ظریفی کی کہ انہوں نے فلمی زندگی کا آغاز انڈیا میں کیا اور بہت وسیع پیمانے پر کیا۔ اللہ نے انہیں بے پناہ کامیابیوں سے نوازا جس کی وجہ سے روپے کی ریل پیل ہو گئی۔ بمبئی کے سرمایہ دار سیٹھ تو لکشمی دیوی کی

پوجا کرتے ہیں۔ جو شخص انہیں دولت کما کر دیتا ہے وہ اس کے غلام ہو جاتے ہیں۔ احمد صاحب کی فلموں نے سارے ہندوستان میں دھومیں مچادی تھیں' ہر طرف ان ہی کا چرچا تھا۔ شہرت اور دولت ان کی باندی تھی پھر سرمائے کی کیا کمی ہوسکتی تھی۔ وہ بڑے سے بڑا منصوبہ بھی بناتے تو اس کے لئے سرمایہ حاضر کرنے والے موجود تھے۔ مگر جب وہ پاکستان آئے تو انڈیا میں کامیابی حاصل کرنے والے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی اس محدود فلمی دنیا میں کام کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ بمبئی سے آنے والے دوسرے مشہور فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو دیکھ لیجئے۔ سبھی کے ساتھ یہ سانحہ گزرا تھا۔ محبوب خان اور کاردار بھی پاکستان بننے کے بعد کراچی اور لاہور آئے تھے مگر اتنی مختصر مارکیٹ دیکھ کر واپس لوٹ گئے۔ شوکت حسین رضوی' سبطین فضلی' ڈبلیو زیڈ احمد' حسنین فضلی' ایم صادق سبھی کے ساتھ یہی سانحہ پیش آیا۔ وہاں سے آنے والوں میں جن لوگوں نے نئے حالات کے مطابق خود کو ایڈجسٹ کیا ان میں نذیر صاحب' ایس ایم یوسف اور کسی حد تک نذیر اجمیری صاحب کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان کے سوا دوسرے لوگوں نے یہ محسوس کیا جیسے ایک سمندر سے نکل کر وہ چھوٹی سی جھیل میں پہنچ گئے ہیں۔ اسی لئے یہ لوگ منصوبہ بندی کرتے رہے مگر عملی میدان میں وہ کارنامے سرانجام نہ دے سکے جو انڈیا میں ان کی شہرت اور کامیابی کا سبب بنے تھے۔

ہم احمد صاحب کے بہت پرانے مداح ہیں۔ ان کی قابلیت' ذہانت اور تخلیقی قوتوں کے معترف بھی ہیں مگر احمد صاحب پاکستان کے محدود حالات میں خود کو ایڈجسٹ نہ کرسکے۔ یہاں بھی وہ ہندوستان کی طرح بڑے پیمانے پر منصوبے بناتے رہے اور عملی طور پر کچھ بھی نہ کرسکے۔ ان پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں

میری ہمتوں کی پستی میرے شوق کی بلندی

ہمت ان کی کبھی پست نہیں ہوئی مگر شوق کی بلندی آسمان سے بھی اونچی نکل گئی۔ مختصر طور پر ہمارے خیال میں احمد صاحب کا یہ تجزیہ ہے۔

مگر پہلے ان کے ماضی کی داستان سن لیجئے۔ وہ انگلستان جانے کے لئے بمبئی پہنچے تو اس شہر کی سیر بھی کی۔ چند جاننے والے بھی مل گئے بمبئی کو عروس البلاد کہا جاتا تھا۔ یہ شہر دیکھنے کے لائق تھا۔ یورپ جانے کے لئے بحری جہاز یہیں

سے چلا کرتے تھے اس لئے احمد صاحب بھی بمبئی کے راستے لندن جانے کے لئے وہاں پہنچے تھے مگر اس مقام سے آگے نہ بڑھ سکے۔

ہوا یہ کہ ان کے ایک دوست کسی فلم کمپنی میں اسکرین پلے لکھتے تھے۔ انہیں کمپنی والوں نے ایک بنگالی ناول سے کہانی بنانے کی ہدایت کی۔ وہ بہت کوشش کرتے رہے مگر بات نہ بنی۔ احمد صاحب سے تذکرہ کیا تو انہوں نے ایک نظر بنگالی ناول پر ڈالی اور دو دن میں اسکرین پلے لکھ کر دے دیا۔ وہ صاحب جب یہ اسکرین پلے لے کر فلم کمپنی میں پہنچے تو سیٹھ نے دریافت کیا کہ یہ اسکرین پلے کس نے لکھا ہے ؟

انہوں نے بتایا کہ میرے ایک دوست نے لکھا ہے' وہ بنگلہ بھی جانتے ہیں۔

سیٹھ نے کہا "ان سے مجھے ضرور ملاؤ۔"

دوست کے اصرار پر احمد صاحب ملاقات کے لئے سیٹھ کے پاس چلے گئے۔ سیٹھ نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ تو پیدا ہی اسکرین پلے لکھنے کے لئے کئے گئے ہیں۔ احمد صاحب نے بہت عذر کئے مگر سیٹھ صاحب پیچھے پڑ گئے۔ کچھ انہیں بھی فلم کا شوق تھا۔ یہ طے پایا کہ چند روز رک کر احمد صاحب' سیٹھ صاحب کی کہانی مکمل کر دیں گے۔ کہانی مکمل ہوئی تو سیٹھ صاحب گلے کا ہار بن گئے ادھر احمد صاحب کو بھی فلمی دنیا کی بابت معلومات حاصل ہوئیں۔ خلاصہ یہ کہ انہوں نے اعلیٰ تعلیم اور انگلستان کے سفر کا ارادہ ملتوی بلکہ منسوخ کر دیا اور بمبئی میں فلم سازی کرنے کا پروگرام بنالیا۔

احمد صاحب بہت خوبصورت گفتگو کرتے ہیں' دلائل اور منطق پیش کرنا ان پر ختم ہے۔ ان کی باتوں میں جادو تھا بلکہ آج بھی ہے۔ چنانچہ ان کی شیریں بیانی کی وجہ سے انہیں بمبئی میں سرمایہ مل گیا۔ احمد صاحب نے فوراً ایک بہت بڑے پیمانے پر منصوبہ بنالیا۔ وسائل کی کمی نہ تھی اس لئے اس پر عمل درآمد بھی ہو گیا۔ شالیمار اسٹوڈیو بھی بن گیا۔ انڈیا میں احمد صاحب کی پہلی فلم "ایک رات" تھی جس میں پرتھوی راج ہیرو تھے اور نینا ہیروئن تھیں۔ یہ فلم انتہائی کامیاب ثابت ہوئی بلکہ اس نے سارے ہندوستان کو چونکا دیا۔ فلم کا موضوع' ہدایت کاری' مکالمے' اداکاری اور سب سے بڑھ کر چھوٹے چھوٹے علامتی ٹچ ایسے تھے جو فلم بینوں کے دلوں میں اتر گئے۔ احمد صاحب کی فلموں میں یہ خوبیاں

ہمیشہ رہی ہیں' وہ اعلیٰ درجے کے لکھنے والے اور اس سے بھی بلند پایہ ہدایت کار ہیں۔ ایسے فنکارانہ ٹچ لگاتے ہیں جو دیکھنے والے کے دل کو چھو لیتے ہیں ''ایک رات'' ایک تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند تھی۔اس پہلی فلم سے ہی ڈبلیو زیڈ احمد نے ہندوستان کی فلمی صنعت میں اپنا لوہا منوالیا۔

لیکن ٹھہریئے۔اس کہانی کو آگے بڑھانے سے پہلے ضروری ہے کہ کچھ احمد صاحب کی بیگم اور ان کی فلموں کی ہیروئن کے بارے میں بیان کر دیا جائے۔ فلمی الف لیلیٰ کے آغاز میں بھی ان کا مختصر تعارف کرا چکے ہیں۔اب کچھ مزید سنئے احمد صاحب نے اپنی بیگم شاہدہ کو اپنی فلموں میں ''پراسرار نینا'' کے نام سے پیش کیا اور ان کی پراسراریت کی ایسی دھواں دھار پبلسٹی کی کہ فلم ریلیز ہوئی تو ہر شخص یہ دیکھنے کے لئے سینما پر ٹوٹ پڑا کہ آخر نینا میں ایسی کون سی پراسراریت ہے؟اسرار کوئی بھی نہیں تھا لیکن دیکھنے والوں کو ایک دلکش اور نہایت باوقار ہیروئن نظر آئی۔ان کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی کشش تھی۔ اداکاری وہ بالکل حقیقی اور سادہ کرتی تھیں اور وہی ان کی اداکاری کی خوبی قرار دی گئی۔

شاہدہ بیگم علی گڑھ کے ایک بہت بڑے اور روشن خیال خاندان کی بیٹی تھیں۔انہوں نے یا ان کے خاندان والوں نے کبھی خواب وخیال میں بھی ان کے اداکارہ بننے کے بارے میں نہیں سوچا ہوگا۔انہیں اداکاری سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔نہ ہی انہیں فلمی دنیا سے وابستگی کا شوق تھا۔اداکاری میں ان کی عدم دلچسپی کا اندازہ ان کی فلمیں دیکھ کر بھی ہو جاتا ہے۔بس یوں لگتا تھا جیسے کوئی فرض ادا کر رہی ہیں لیکن ان کی پرکشش شخصیت اور سراپا کی پاکیزگی کے باعث وہ فلم بینوں کو دوسری ہیروئنوں سے بالکل مختلف نظر آتی تھیں۔

شاہدہ بیگم نے علی گڑھ سے بی اے پاس کیا تھا اور ان کی شادی ایک تعلیم یافتہ نوجوان محسن عبداللہ سے ہوئی تھی۔ محسن عبداللہ بمبئی کی لیبارٹری میں انجینئر کے طور پر کام کرتے تھے گویا فلمی دنیا سے وابستہ تھے۔فلم سے ان کا ایک تعلق یہ بھی تھا کہ ان کی بہن رینو کا دیوی کے نام سے فلموں میں اداکاری کرتی تھیں اور نامور ہیروئن تھیں۔یہ وہی خاتون ہیں جو بعد میں پاکستان آکر بیگم خورشید مرزا کے نام سے جانی گئیں اور ٹی وی ڈراموں میں بہت مقبول ہوئیں اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

احمد صاحب کی ملاقات شاہدہ بیگم یعنی مسز محسن عبداللہ سے ہوئی تو انہیں خیال گزرا کہ وہ بہت اچھی ہیروئن بن سکتی ہے لیکن ان کے شوہر اس بات کے حق میں نہ تھے۔ احمد صاحب بذات خود اس وقت شادی شدہ تھے۔ ان کی شادی سندھ کے ایک بہت بڑے خاندان میں ہوئی تھی۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ جو قیام کے بعد سندھ کے گورنر بھی بنے تھے' احمد صاحب کے خسر تھے۔ اس طرح جب احمد صاحب اور شاہدہ بیگم آمنے سامنے ہوئے تو دونوں شادی شدہ تھے۔ بعد میں محسن عبداللہ اور ان کی بیگم کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے۔ کچھ لوگ اس کی ذمے داری محسن عبداللہ کے طرز عمل پر ڈالتے ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ احمد صاحب نے سوچ سمجھ کر ان اختلافات کو بڑھایا۔ سعادت حسن منٹو نے بھی اس موضوع پر لکھا تھا' ان کا کہنا تھا کہ احمد صاحب ہر کام طویل منصوبہ بندی کے تحت کرتے ہیں چنانچہ شاہدہ بیگم کو حاصل کرنے کے لئے بھی انہوں نے ایک طویل المیعاد منصوبہ بنایا تھا۔ بہر حال' حقیقت کیا تھی اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ شاہدہ بیگم اور محسن عبداللہ میں پہلے عارضی علیحدگی ہوئی پھر کچھ عرصے بعد طلاق بھی ہو گئی۔

اس دور کے ایک مشہور اداکار ہمالیہ والا تھے۔ ان کا اصل نام محمد افضل تھا۔ وہ ہندوستان کے پہاڑی شہر دار جلنگ کے رہنے والے تھے۔ بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دوسرے تمام بھائی اور رشتے دار اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ ہندوستان میں بھی بڑے اہم عہدں پر فائز رہے اور پاکستان آنے کے بعد بھی اپنی قابلیت اور صلاحیت کے بل بوتے پر بڑے بڑے کام کرتے رہے۔ مگر افضل صاحب کا قصہ سب سے مختلف تھا۔ ان کا پڑھنے لکھنے میں بالکل دل نہیں لگتا تھا اس لئے انہوں نے پڑھنے کا نام ہی نہیں لیا۔ وہ آزاد منش اور بے پروا قسم کے نوجوان تھے۔ قدو قامت' صورت شکل اور بارعب آواز کی بدولت نمایاں شخصیت کے مالک تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں اداکار بننے کا شوق تھا۔ عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ فلمی دنیا میں جا کر لوگ بگڑ جاتے ہیں لیکن ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ بگڑے ہوئے لوگ ہی فلم انڈسٹری میں آتے ہیں اور نام انڈسٹری کا بدنام ہو جاتا ہے۔ ہمارے ایک دوست نے ایک بار اس قسم کے لوگوں کے سروے کرنے کے بعد لکھا تھا کہ ہر اچھے خاندان کا گندہ انڈا ہی فلم انڈسٹری کا رخ کرتا ہے۔ ہم نے بھی یہی دیکھا کہ فلمی صنعت میں جو لوگ بری عادتوں میں مبتلا تھے فلموں سے متعلق ہونے سے پہلے بھی وہ

ایسے ہی تھے۔

افضل صاحب نے وہی کیا جو ہندوستان کا ہر فلم زدہ نوجوان کیا کرتا تھا۔ انہوں نے ریل کا ٹکٹ لیا اور سیدھے بمبئی پہنچ گئے۔ بانکے چھبیلے اور بلند و بالا مردانہ وجاہت کے مالک تھے اس لئے انہیں فلموں میں کام حاصل کرنے کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شکل وصورت، قدو قامت اور آواز کی بدولت وہ بہت جلد مشہور ویلن بن گئے۔ بمبئی میں انہوں نے بہت سی اچھی عادتیں بھی سیکھیں مثلاً وقت کی پابندی۔ وعدہ ایفا کرنے کی عادت۔ دراصل بمبئی میں ہندوستان کے سارے صوبوں کے لوگ فلمی دنیا میں موجود تھے۔ اردو تو خیر بولی ہی جاتی تھی مگر پڑھے لکھے لوگ عموماً انگریزی میں بات چیت کرتے تھے۔ ہمالیہ والا نے باقاعدہ انگریزی کی تعلیم تو حاصل کی نہیں تھی مگر وہ محض بول بول کر انگریزی بولنے کے عادی ہو گئے تھے اور ان کی شخصیت اور لب ولہجے سے سننے والا اتنا مرعوب ہو جاتا تھا کہ ان کی انگریزی میں غلطیاں نکالنے کا اسے ہوش ہی نہیں رہتا تھا۔

ہمالیہ والا نے بمبئی میں اچھا وقت گزارا تھا۔ بہت زندہ دل اور بے فکرے قسم کے آدمی تھے۔ فلموں میں کامیابی حاصل ہوئی تو پیسے بھی کمائے اور نام بھی پایا۔ مگر جب پاکستان آئے تو حالات ہی مختلف پائے۔ یہاں تو فلمیں ہی نہیں بنتی تھیں، کام کہاں سے ملتا۔ مگر ہمالیہ والا ایک نامور شخصیت اور جانے پہچانے اداکار تھے۔ انہیں اپنا ٹھاٹ باٹ اور وضع داری ہر صورت میں برقرار رکھنی تھی۔ اپر مال پر ملکہ اسٹوڈیو کے نزدیک انہوں نے ایک وسیع و عریض کوٹھی حاصل کی۔ دو چار ملازم رکھے اور جو پیسے بمبئی سے بچا کر لائے تھے وہ گھریلو سامان کی خریداری میں صرف کر دیے۔ ایک عدد کار بھی خرید لی کیونکہ بہر حال بمبئی کے مشہور اداکار تھے۔ کار ان کے لئے ایک لازمی ضرورت تھی۔ شروع میں ان کے پاس چھوٹی مورس مائیز کار تھی۔ جب فلمی صنعت نے کروٹ بدلی اور حالات بہتر ہوئے تو بڑی لمبی چوڑی امریکن پیکارڈ کار خرید لی۔ اس کی چھت کھلی ہوئی تھی۔ شام کے وقت جب وہ اپنے بے تکلف دوستوں کے ساتھ اس کھلی چھت کی کار میں ہوا خوری کو نکلتے تھے تو لوگ مڑ مڑ کر دیکھنے لگتے تھے۔ ایک تو کاریں ہی اس زمانے میں برائے نام تھیں۔ اس پر بڑی، لمبی چوڑی امریکن پیکارڈ اور اس میں تشریف فرما ہمالیہ والا جیسے اداکار کو سبھی دیکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

ہمالیہ والا بہت اچھے اداکار تھے۔اداکاری کی صلاحیتوں کے علاوہ قدرت نے انہیں مردانہ وجاہت کا نمونہ بنایا تھا۔چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد۔اس کے مطابق ڈیل ڈول۔بڑی بڑی آنکھیں۔گھونگریالے بال(جو بعد میں بہت کم رہ گئے تھے (موزوں ناک نقشہ' کھلتا ہوا گندمی رنگ اور بہت مرعوب کن بھاری بھرکم آواز۔ ان چیزوں کی آمیزش کا نام ہمالیہ والا تھا۔بہت بااخلاق اور خوش مزاج آدمی تھے۔ہم نے انہیں بہت کم غصے کی حالت میں دیکھا۔مگر غصے میں بھی بہت رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کرتے تھے۔لڑائی جھگڑا یعنی ہاتھا پائی انہیں پسند نہیں تھی۔طبعاً صلح کل آدمی تھے۔انہوں نے اپنی زندگی کی واحد اور پہلی جنگ غالباً ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کے ساتھ لڑی اور بڑی باقاعدگی اور حوصلے کے ساتھ لڑی۔وہ پنجے جھاڑ کر احمد صاحب کے پیچھے پڑ گئے۔ہمارے خیال میں احمد صاحب کی زندگی میں ہمالیہ والا ہی ایسے آدمی تھے جس نے احمد صاحب کو زچ کر دیا تھا۔اس کے سوا ان کی کوئی لڑائی ہمیں یاد نہیں۔

ایک بار شاہ نور اسٹوڈیو میں ان کا علی ایڈیٹر سے جھگڑا ہو گیا۔علی صاحب دبلے پتلے تھے۔ مگر جب ہاتھا پائی پر اتر ہی آئے تو ہمالیہ والا پریشان ہو گئے "ارے بھئی زبان سے بات کیجئے۔دور سے بات کیجئے۔بے قابو ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اب منظر یہ تھا کہ ہمالیہ والا آگے آگے تھے اور علی صاحب پیچھے پیچھے۔اس روز انہوں نے شاہ نور اسٹوڈیو کے بے شمار گملے ایک دوسرے کو مار مار کر توڑ دیے۔ ہمالیہ والا صرف جوابی کاروائی میں دفاعی کاروائی کے طور پر گملے مار رہے تھے۔ورنہ علی کو زخمی کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔اگر وہ علی صاحب کی کلائی پکڑ لیتے تو وہ چھڑانے میں کامیاب نہ ہوتے مگر بتایا نا کہ وہ لڑائی جھگڑے سے بچتے تھے۔

ہمالیہ والا بہت دلچسپ آدمی تھے۔دوستوں کے دوست، چھڑے چھانٹ تھے اور کافی عمر تک کنوارے رہے۔غالباً چالیس پنتالیس کے لگ بھگ ہوں گے جب انہوں نے ایک گھریلو خاتون سے شادی کرلی تھی۔اس شادی کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ہمالیہ والا کو تو ساری زندگی کنوارے رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔بے پروا اور بے فکرے انسان تھے۔جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔پینے پلانے میں بھی اعتدال کی راہ نہیں اپناتے تھے اور زیادتی کی صورت میں کئی بار بہک بھی جاتے تھے۔ایک بار لاہور اور کراچی کے فلمی ستارے سیلاب زدگان کی مدد کے سلسلے میں کرکٹ میچ کھیلنے کی صورت

میں ڈھاکہ اور چٹا گانگ گئے تو ہم بھی منتظم کے طور پر ساتھ تھے۔ یہ غالباً 65ء یا 60ء کا واقعہ ہے۔ ڈھاکہ کے سب سے شاندار ہوٹل شاہ باغ میں فلم کا قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مغربی پاکستان کے فلمی ستارے مشرقی پاکستان گئے تھے۔ ائرپورٹ پر لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ لوگ عمارت کی چھت پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ ائر پورٹ کے دروازے کھڑکیاں اور شیشے ٹوٹ گئے۔ بڑی مشکل سے پولیس نے فلمی ستاروں کو حفاظت کے ساتھ ہوٹل پہنچایا۔ وہاں بھی سیکڑوں ہزاروں کا مجمع تھا۔ مغربی پاکستان کی فلمیں مشرقی پاکستان میں ریلیز ہوتی رہتی تھیں۔ مگر اس سے پہلے فلم "سسی" نے مشرقی پاکستان میں بے حد مقبولیت حاصل کی تھی۔ اس کی ہیروئن صبیحہ اور ہیرو سدھیر تھے مگر پبلک کو ان سے زیادہ مزاحیہ اداکار نذر کی طلب تھی۔ جنہوں نے شیر گل کے نام سے کردار کیا تھا۔ ہر طرف "شیر گل شیر گل" کے نعرے بلند ہوا کرتے تھے۔ فلمی ہیروئنوں کو چھوڑ کر لوگ نذر کے پیچھے آٹو گراف لینے کے لئے دوڑا کرتے تھے۔ ہوٹل کے سامنے رات دن لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ڈھاکہ کا ہر صاحب حیثیت شخص فلمی ستاروں کو مدعو کرنے کا خواہاں تھا مگر یہ ممکن نہ تھا۔

ہوٹل میں ہم اور سید کمال ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ برابر والے کمرے میں ہمالیہ والا اور ساقی کا قیام تھا۔ ایک شام کو یہ ہوا کہ کسی دعوت میں ہوٹل سے باہر جانے سے پہلے ہمالیہ والا نے ہمارے پاس دو سو روپے رکھوائے اور کہا کہ دیکھو۔ کسی کو بتانا نہیں ورنہ یہ لوگ مجھ سے مانگ لیں گے یا خرچ کرا دیں گے۔

دعوت میں پینے پلانے کا سلسلہ بھی چلتا رہا جو اس زمانے میں رواج تھا۔ ہم تو جلدی لوٹ آئے مگر ہمالیہ والا رات گئے ہوٹل واپس پہنچے۔ یکایک انہیں اپنے دو سو روپوں کا خیال آیا کہ وہ کہاں گئے۔ پہلے تو انہوں نے اپنے سارے کپڑوں کی تلاشی لی۔ پھر ساقی صاحب کے کپڑوں میں تلاش کیا۔ اس کے بعد ساقی کو جگا کر پوچھا کہ تم نے میرے دو سو روپے تو نہیں دیکھے؟ انہوں نے صاف انکار کر دیا اور پھر سو گئے۔ ہمالیہ والا کو دو سو روپے کسی طرح بھلائے نہیں بھول رہے تھے۔ کافی رات گزر گئی تھی۔ میں اور کمال اپنے اپنے بیڈ پر لیٹے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک کمرے کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ کمرے میں بہت مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا تو آہستہ سے کھلتے ہوئے دروازے میں سے ایک ہیولا سا اندر داخل ہوا اور دبے پاؤں کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھا۔

ہم پہچان گئے کہ وہ ہمالیہ والا تھے۔چپ چاپ دیکھتے رہے۔وہ دبے پاؤں الماری کے پاس گئے اور الماری میں لٹکے ہوئے تمام کپڑوں کی تلاشی لینے میں مصروف ہوگئے۔پھر دبے پاؤں ہم دونوں کے نزدیک آئے اور ہمارے سرہانے کچھ تلاش کرنے لگے۔کمال نے ایک دم ٹیبل لیمپ جلادیا۔کمرے میں روشنی پھیل گئی اور ہمالیہ والا بھی بھونچکارہ گئے۔وہ صرف جانگیااور بنیان پہنے ہوئے تھے۔یہ ان کا شب خوابی کا لباس تھا۔وہ سوتے میں خراٹے بھی بہت زبردست لیتے تھے اور ساقی صاحب ہر روز ہم سے التجا کرتے تھے کہ یار مجھ سے کمرہ بدل لو۔میری نیند پوری نہیں ہوتی۔

ہم نے کہا"مگر ہماری نیند کیسے پوری ہوگی؟"

"تم تو بہت گہری نیند سوتے ہو۔تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔" وہ بولے۔

ہمالیہ والا صاحب نے ہم لوگوں کو بیدار پایا تو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیااور سرگوشی میں بولے "نقصان ہوگیاہے کسی نے میرے دوسو روپے نکال لئے ہیں۔" یہ کہااور کمرے سے رخصت ہوگئے۔

ہم نے کمال کو بتایاکہ یہ دوسوروپے انہوں نے ہمارے پاس رکھوائے تھے۔کمال نے کہاکہ انہیں روپے واپس کردو مگر ہم نے کہا"اس وقت وہ پھر کہیں رکھ کر بھول جائیں گے۔صبح دے دیں گے۔"

دوسرے دن صبح ناشتے پر سب اکٹھے ہوئے تو معلوم ہواکہ ہمالیہ والا آس پاس کے تمام کمروں میں اپنے دوسوروپے تلاش کرتے رہے تھے۔ڈائننگ ہال میں ہماری صورت دیکھتے ہی انہیں یاد آگیااور وہ ہمارے پاس آکر کہنے لگے "میرے دوسوروپے دے دو۔"

ہم نے خاموشی سے دو نوٹ ان کے حوالے کردیے۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب ہمالیہ والا کی شادی ہوئی توان کی بیگم نے ان کے سامنے دوشرطیں رکھیں۔

ایک یہ کہ وہ شراب نہیں پیئیں گے۔

دوسری یہ کہ وہ سرشام گھرآجایاکریں گے۔

ہمالیہ والانے بخوشی یہ شرطیں منظور کرلیں۔شادی کے بعد کچھ روزان پر عمل بھی کیامگروقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ ان کی پرانی عادتیں عود کر آئیں۔ایک رات بیگم انتظار کرتی رہیں مگر ہمالیہ والا صاحب غائب تھے۔کافی رات گئے وہ واپس تشریف لائے تو ترنگ میں تھے۔

بیگم نے سنجیدگی سے کہا'' وقت دیکھا ہے آپ نے؟''

''سوری۔کچھ دیر ہو گئی۔''

''کچھ نہیں۔کافی دیر ہو گئی ہے۔دیکھئے' آپ اپنا وعدہ یاد رکھئے۔اگر آپ دوبارہ ایسا کریں گے تو میں ساری کراکری توڑ دوں گی۔''

انہوں نے دوبارہ وعدہ کر لیا مگر دو تین دن کے بعد پھر اسی عالم میں رات گئے واپس لوٹے۔بیگم نے ذرا بھی جھگڑا نہیں کیا۔خاموشی سے اٹھیں اور برتنوں کی الماری میں سے قیمتی برتن نکال نکال کر زمین پر پھینکنے شروع کر دیے۔ ہمالیہ والا صاحب بہت پریشان ہوئے۔بڑی مشکل سے بیگم کو روکا اور ایک بار پھر پکا وعدہ کیا کہ آئندہ معاہدے کی پابندی کریں گے۔

بیگم نے کہا'' اگر آپ نے وعدہ خلافی کی تو میں آپ کے تمام سوٹ جلا دوں گی۔''

ہمالیہ والا صاحب نے انہیں یقین دلایا کہ آئندہ وہ عہد کی پابندی کریں گے۔چند دن تو خیر سے گزر گئے مگر پرانی عادتیں کہاں چھٹتی ہیں۔ایک رات پھر ہمالیہ والا دیر سے گنگناتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔بیگم نے ان سے تو کچھ نہیں کہا مگر الماری میں سے قیمتی سوٹ نکال کر لان میں ڈالے اور ماچس کی تیلی لگا دی۔ہمالیہ والا صاحب کے تو ہوش اڑ گئے بلکہ کہنا چاہیے کہ ہوش ٹھکانے آ گئے۔انہوں نے بڑی مشکل سے کچھ سوٹ بچائے اور بیگم سے ایک بار پھر پختہ عہد کیا کہ آئندہ انہیں شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔

بیگم نے کہا'' ہمالیہ صاحب۔اگر آپ اس کے بعد بھی باز نہیں آئیں گے تو میں آپ پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دوں گی''۔

ہمالیہ والا نے دوسرے دن یہ بات اپنے ایک قریب ترین دوست کو سنائی۔انہوں نے کہا'' دیکھو ہمالیہ والا'' تمہیں اب تک یہ تو معلوم ہو چکا ہو گا کہ بھابی اپنی بات کی کتنی پکی ہے۔میری مانو تو سچ مچ باز آ جاؤ۔مجھے ڈر ہے کہ بھابی اپنی

دھمکی ضرور پوری کرے گی۔"

اس کے بعد ہمالیہ والا صاحب واقعی باز آ گئے اور رفتہ رفتہ بالکل تبدیل ہو گئے۔ یہ واقعہ ان کے قریب ترین دوست نے ہمیں سنایا تھا جن کا اب انتقال ہو چکا ہے۔ مگر ساری دنیا نے یہ دیکھا کہ ہمالیہ والا جیسا بے پرواور بے فکرا شخص انتہائی ذمے دار اور مثالی شوہر کے سانچے میں ڈھل گیا۔ شام کا وقت وہ گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ گزارتے تھے اور بہت خوشگوار گھریلو زندگی بسر کرتے رہے۔ ان میں یہ انقلاب پیدا کرنے والی ہستی ان کی بیگم کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟ وہ ایک باشعور' سگھڑ اور سمجھ دار خاتون تھیں۔ ہمالیہ والا کو جن لوگوں نے شادی سے پہلے دیکھا تھا اور پھر بعد میں ایک شوہر اور مشفق باپ کے روپ میں دیکھا انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی شخص اسقدر بدل سکتا ہے؟

ہمالیہ والا کی ایک عادت یہ تھی کہ وہ شوٹنگ کے دوران میں مکالمے بھول جایا کرتے تھے۔ بعض اوقات تو چھوٹے چھوٹے فقرے بھی غلط بول جاتے تھے۔ مگر خوبی یہ تھی کہ الفاظ تمام کے تمام وہی ہوتے۔ صرف ان کی ترتیب بدل دیا کرتے تھے۔ جب بار بار ری ٹیک ہونے لگتی تو وہ اس کی ذمے داری دوسروں پر ڈال دیا کرتے تھے۔ کبھی کہتے کہ فلاں شخص ہل رہا ہے۔ کبھی کہتے کہ اوپر والا لائٹ مین مسکرا رہا ہے۔ ہدایت کار سر پکڑ لیتا تھا اور کہتا "آخر آپ ادھر اُدھر دیکھتے ہی کیوں ہیں؟"

ہمالیہ والا صاحب کی ایک دلچسپ عادت یہ تھی کہ وہ عموماً اس وہم کا اظہار کرتے رہتے تھے کہ ان کے خلاف انٹریگ (سازش) ہو رہی ہے۔ وہ کہتے "آفاقی۔ تمہیں بتاؤں۔ دراصل اس یونٹ میں میرے خلاف بہت انٹریگ ہو رہی ہے۔"

ہم پوچھتے "کون انٹریگ کر رہا ہے؟"

معصومیت سے کہتے "یار یہی تو پتا نہیں چل رہا مگر زبردست انٹریگ ہو رہی ہے۔"

ہمالیہ والا بہت دلچسپ' بااخلاق اور وضع دار تھے۔ اداکار بھی بہت اچھے تھے۔ اسی لیے ان کے مکالمے بھولنے کی عادت کے باوجود فلم ساز اور ہدایت کار ان کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ حالانکہ بعض اوقات ان کی اس عادت کے باعث

بہت نقصان بھی ہو جاتا تھا۔

جن دنوں وہ انور کمال پاشا صاحب کی فلم " انار کلی " میں اکبر اعظم کا کردار ادا کر رہے تھے' ایک روز اپنا مکالمہ بھول گئے۔ انہیں بڑے شاہانہ دبدبے سے یہ کہنا تھا کہ "مابدولت حکم دیتے ہیں کہ باغی کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔" یا کچھ اسی قسم کا مکالمہ تھا۔

ہمالیہ والا صاحب بھول گئے اور ری ٹیک شروع ہو گئیں۔

کبھی وہ کہتے " مابدولت تمہیں باغی کو لانے کا حکم دیتے ہیں۔"

یہاں تک کہ ایک بار جوش میں آکر بولے " مابدولت' تمہیں آرڈر کرتے ہیں۔"

پاشا صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔" ہمالیہ۔ تم اکبر ہو۔ اکبر بادشاہ۔ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔"

وہ ہر بار بھول جانے پر بڑے اخلاق سے " سوری" کہتے اور ہدایت کار اور سیٹ پر موجود دوسرے لوگوں کی خفگی کو نظر انداز کر کے مسکراتے ہوئے کہتے " او کے او کے۔ ایک بار پھر ٹیک کر لیتے ہیں۔"

ان کے مکالمے بھولنے کے واقعات کم نہیں ہیں اور کافی دلچسپ ہیں۔ ایک بار سیف الدین سیف کی فلم " رات کی بات" کی شوٹنگ میں وہ نہ صرف مکالمے بھول گئے بلکہ سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا۔ سین یہ تھا کہ نیر سلطانہ فلم میں ان کی پاک دامن اور نیک فطرت بیگم ہیں۔ ہمالیہ والا عیش پسند رئیس ہیں اور رات گئے شراب کے نشے میں جھومتے ہوئے حویلی میں داخل ہوتے ہیں۔ بیگم خدمت کے لیے آگے بڑھتی ہیں تو انہیں جھڑک دیتے ہیں۔ اس کے بعد میاں بیوی کے مابین مکالمہ بازی شروع ہو جاتی ہے۔ مگر ہمالیہ صاحب نے اپنی بیگم کے مکالموں کے "کیو" بھی یاد کر لیے "کیو" وہ لفظ یا فقرہ ہوتا ہے جو مکالمے کے آخر میں بولا جاتا ہے۔ اس کیو کو سن کر مقابل اداکار اس کے جواب میں اپنا مکالمہ ادا کرتا ہے۔ ہمالیہ والا خدا جانے کس موڈ میں تھے کہ انہوں نے اپنی بیوی کے "کیو" بھی اپنے مکالموں کے ساتھ شامل کر لیے۔ اب مکالمے کچھ اس طرح ہو گئے۔

بیوی" آپ میری وفا پر بھروسا کریں میرے سرتاج۔"

شوہر" میرے سرتاج' میں اپنے معاملات میں تمھاری دخل اندازی برداشت نہیں کر سکتا۔"

جعفر ملک اس فلم کے ہدایت کار تھے۔انہوں نے شاٹ 'کٹ کرادیا اور کہا'' ہمالیہ صاحب۔میرے سرتاج تو آپ کا'' کیو'' ہے۔آپ اپنی بیوی کو میرے سرتاج کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

''اوکے۔اوکے' دوبارہ ٹیک کرلیں گے'' ہمالیہ صاحب نے مسکرا کر کہا مگر دوسری بار بھی وہی مکالمہ ادا کیا۔پتا چلا کہ اپنی بیوی کے تمام '' کیو'' انہیں یاد ہوگئے ہیں۔

اس قسم کی غلطیوں میں ہمالیہ صاحب کا کوئی قصور نہیں ہوتا تھا۔بات یہ تھی کہ وہ دراصل سلیقے سے کام کرنے کے عادی تھے۔ہدایت کار سے ان کا یہ تقاضا ہوا کرتا تھا کہ میرے سین میرے حوالے کیے جائیں تاکہ میں اپنے مکالمے یاد کرکے آؤں۔حالانکہ اس زمانے میں کوئی دوسرا اداکار مکالمے یاد کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کیا کرتا تھا۔ٹریجڈی یہ تھی کہ ہمالیہ صاحب کے مکالمے یاد کرنے کا انداز ہی خرابی کی جڑ تھا۔وہ اپنے ڈرائنگ روم میں ٹہلتے جاتے اور ان کا سیکرٹری مکالمے بول کر انہیں سناتا اور وہ ان مکالموں کو یاد کرلیتے تھے۔بعض اوقات سیکرٹری موجود نہ ہوتا تو یہ فرض کوئی دوسرا ملازم سرانجام دیتا تھا۔ہمالیہ صاحب تو اس کے پڑھے ہوئے مکالمے یاد کرتے رہتے تھے۔اس طرح اس قسم کے لطیفے جنم لیتے تھے۔

ہمالیہ صاحب نے عروج کے زمانے میں ہی سالہا سال پہلے اچانک ہی فلمی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرکے پراپرٹی ڈیلر کے طور پر کام شروع کردیا تھا۔اس زمانے میں آج کی طرح بے شمار پراپرٹی ڈیلرز نہیں تھے۔خرید وفروخت بھی زیادہ نہیں ہوتی تھی' مگر ہمالیہ والا نے ایک بہت بڑا ادارہ بنایا۔شاندار دفتر میں بیٹھ کر وہ بڑے ٹھاٹ سے کام کیا کرتے تھے۔اس کاروبار میں انہوں نے خوب کمایا۔

آغاجی اے گل کے جنازے کے موقع پر انہیں قبرستان میں دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔اس قدر بلند وبالا شاندار شخصیت کا مالک اپنا سایہ بن کر رہ گیا تھا۔وہ چھڑی ہاتھ میں لیے اس سے ٹیک لگائے ہوئے کھڑے تھے۔بہت خلوص اور محبت سے ملے اور گھر والوں کی خیر وعافیت دریافت کرتے رہے۔اس کے بعد ان سے کہیں ملاقات نہ ہوسکی۔چند سال قبل ایک دن صبح کے اخبار میں مختصر سی خبر پڑھی کہ ہمالیہ والا کا انتقال ہوگیا ہے۔ان کے گھر کا پتا نہیں تھا۔معلوم کرتے ہوئے گئے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک بھٹکتے رہے۔افسوس کہ اتنے نامور فن کار کے پتے سے کوئی واقف نہ

تھا۔ آخر مایوس ہو کر لوٹ آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے سفر آخرت کے موقع پر فلمی دنیا کے بہت کم لوگ موجود تھے۔ یہ اس شخص کے آخری سفر کا احوال ہے جو فلمی دنیا کو ترک کرنے کے باوجود بڑی باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ ہر فلمی شخصیت کے انتقال کے موقع پر لازماً موجود رہتا تھا۔ بہت دکھ ہوا۔ زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ بڑی کوشش اور نیت کے باوجود ہم خود بھی اس عظیم انسان کے جنازے کو کاندھا نہ دے سکے۔

ہمالیہ والا کو ہم نے مختلف رنگوں میں دیکھا۔ ان کی دلچسپ محفلوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ بعض اوقات اتوار کے دن وہ اپنے قریبی دوستوں اور صحافیوں کو اپنی کوٹھی پر مدعو کرتے تھے۔ ان کا گھر دور تھا اور سواری کسی کے پاس بھی نہیں تھی اس لیے ان کا ڈرائیور یا وہ خود کار میں سب کو بھر کرلے جاتے۔ دوپہر کے وقت دال بھات بھجیا، پوری کچوری' پکوڑوں اور دہی بھلوں وغیرہ کا کھانا پیش کیا جاتا۔ چائے کافی کے دور چلتے، لطیفے بازی ہوتی۔ ادھر ادھر کی خبریں اور گپ شپ کا سلسلہ چلتا اور پھر ان کی کار سب کو واپس چھوڑ آتی تھی۔

وہ بڑے رئیسانہ انداز میں رہنے کے عادی تھے مگر پاکستان آنے کے بعد ابتدائی دن بڑی آزمائش کے دن تھے۔ وہ خود سنایا کرتے تھے کہ ایسے دن بھی آئے جب ان کے پاس پیٹرول کے لیے بھی پیسے نہ ہوتے تھے۔ ملازموں کو تنخواہ نہیں دے سکتے تھے۔ اس لیے سب کی چھٹی کردی تھی۔ خود ہی اپنی زین کی پتلون اور دو گھوڑا بوسکی کی قمیص دھو کر استری کرتے تھے۔ یہ اس زمانے میں رئیسوں کا پہناوا اور فیشن ایبل لباس سمجھا جاتا تھا۔ پھر اپر مال سے پیدل چلتے ہوئے لکشمی چوک جاتے۔ راستے میں کوئی مل جاتا تو یہ ظاہر کرتے جیسے ٹہلنے کے ارادے سے نکلے ہیں۔ اس طرح انہوں نے کبھی اپنی "کڑکی" یا مفلسی کا کسی کو شک تک نہ ہونے دیا۔ مفلسی کے دن گزر گئے اور اچھا وقت آیا تو بھی دیکھنے والوں کو ہمالیہ والا میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ ایسے بامروت اور منچلے لوگ اب کہاں؟

ہمالیہ والا کے حوالے سے ہم نے مشرقی پاکستان کے سفر کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مغربی پاکستان کے فلمی ستارے مشرقی پاکستان گئے تھے اور وہاں ان کا والہانہ استقبال کیا گیا تھا۔ اس وقت ڈھاکہ میں بھی فلم سازی کا آغاز ہو چکا تھا مگر زیادہ تر فلمیں بنگلہ زبان میں بنائی جاتی تھیں۔ دراصل اردو فلمیں بنانے کی راہ میں بہت سی دشواریاں تھیں۔ نہ لکھنے والے میسر تھے نہ شاعر۔ اداکاروں کا اردو کا تلفظ اور لب ولہجہ بھی درست نہیں تھا۔ وہاں اردو فلموں کا آغاز

ہوا تو ابتدا میں وہاں کے فلم ساز موسیقی تیار کرانے کے لئے لاہور ہی آیا کرتے تھے۔ کئی فلموں کی فلم بندی بھی لاہور میں ہوئی۔

خوش قسمتی سے مشہور شاعر سرور بارہ بنکوی ڈھاکا ہی میں تھے۔ فلم سازوں نے انہیں تلاش کر لیا اور بے فکر ہو گئے۔ سرور صاحب نے گانے اور مکالمے لکھنے شروع کر دیے۔ شاعر تو وہ بے بدل تھے ہی مگر مکالمے بھی بہت اچھے لکھتے تھے۔ اداکاروں کو اردو مکالموں کی ادائیگی بتانے کے لئے بھی سیٹ پر موجود رہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرور صاحب نے ڈھاکہ میں اردو فلمیں بنانے کے سلسلے میں بہت مدد کی اور فلم سازوں کی بہت سی مشکلات دور کر دیں۔ وہ ہدایت کاروں کے بھی استاد بن گئے اور اداکاروں کے بھی۔ ڈھاکہ کی فلمی صنعت میں سبھی ان کی عزت کرتے تھے۔ شبنم کو اردو سکھانے میں بھی سرور صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وہ بے حد شگفتہ مزاج، وضع دار اور خوش اخلاق انسان تھے۔ دوسروں کے کام آکر انہیں خوشی ہوتی تھی۔ ڈھاکہ والوں نے بھی انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور ہر طرح ان کی پذیرائی کی۔ ہر ایک سے ان کے گھریلو تعلقات تھے۔ لاہور آتے تو شبنم کے گھر میں قیام کرتے تھے۔ شبنم اور روبن گھوش بھی انہیں گھر کا ایک فرد ہی سمجھتے تھے۔ سرور صاحب نے بہت عمدہ اور معیاری نغمے لکھے ہیں۔ بعد میں فلم ساز اور ہدایت کار بھی بن گئے۔ ان کی ایک فلم ”تنہا“ میں کام کرنے کے لئے شمیم آراء بھی ڈھاکہ گئی تھیں۔ یہ فلم بہت آرٹسٹک تھی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ ہارون اس کے ہیرو تھے۔ سرور صاحب نے بعد میں اردو فلمیں بھی بنائیں۔ ادب میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔ بہت خوش الحان تھے۔ ترنم سے اشعار پڑھتے تو سماں سا بندھ جاتا تھا۔ مگر جب بھی دوستوں کی محفل میں بیٹھتے تو ان کی کوشش ہوتی تھی کہ شعر و شاعری کی نوبت نہ آئے۔ لطیفہ بازی، ادب اور فلم کے بارے میں ہی گفتگو ہوتی رہے۔ مگر سب گھیر گھار کر ان کو غزل سرائی کی طرف لے آتے تھے۔ ایسی محفلیں بھی ہوئی ہیں جن میں حمایت علی شاعر اور سرور بارہ بنکوی دونوں موجود تھے اور شاعری کا دور چلا تو رات گئے تک جاری رہا۔ سرور صاحب کو ڈھاکہ سے اور ڈھاکہ والوں کو سرور صاحب سے عشق تھا۔ بنگلہ دیش بنا تو وہ پاکستان آ گئے اور کراچی میں قیام کیا لیکن جوں ہی موقع ملا ڈھاکہ چلے گئے اور ڈھاکہ کے فلم والوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا حالانکہ دونوں ملکوں کے لوگوں میں خاصی کشیدگی اور شکوہ شکایت کی فضا پائی جاتی تھی۔ لیکن سرور صاحب کی

بات علیحدہ تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بنگلہ دیش والے ابھی کچھ عرصے ناراض رہیں گے مگر سرور صاحب وہاں سے مشترکہ فلم سازی کا معاہدہ کرکے آگئے جس کی وہاں کی حکومت نے بھی منظوری دے دی تھی۔ اس اعتبار سے بنگلہ دیش اور پاکستان کے مابین مشترکہ فلم سازی کی راہ سرور صاحب نے ہی ہموار کی تھی۔ لیکن اس معاہدے کی تکمیل کے سلسلے میں انہیں بہت پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ مالی حالات بھی خراب ہوگئے مگر سرور صاحب نے کبھی ان چیزوں کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن ایک دو بار میرے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ ڈھاکہ جاکر رہنا چاہتے ہیں۔

ہم سے ان کی خاصی بے تکلفی تھی اور وہ میری باتوں پر ہنستے رہتے تھے۔ انتقال سے چند دن پہلے ایک روز مال روڈ کی ایک دکان پر ملے۔ حسب معمول بجھا ہوا پائپ ان کے منہ سے لگا ہوا تھا۔ یہ ان کی عادت تھی کہ بہترین تمبا کو ''ایرن مور'' استعمال کرتے تھے مگر صبح ایک بار پائپ بھرتے تو وہی شام تک چلتا رہتا۔ سلگا کر ایک دو کش لگاتے اور باتوں میں مصروف ہوجاتے۔ پائپ بجھ جاتا تو کچھ دیر بعد پھر جلا لیتے۔ جلانے بجھانے کا یہ سلسلہ رات تک چلتا رہتا۔ کسی زمانے میں ہم بھی پائپ پیا کرتے تھے اور تمبا کو ''ایرن مور'' ہماری کمزوری تھا بلکہ در حقیقت اس کی مہکتی ہوئی خوشبو کے لالچ میں آکر ہی ہم نے یہ تمبا کو استعمال کرنا شروع کیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی قیمت بڑھتی گئی مگر ایرن مور کے شیدائی بلیک میں بھی اس کی تلاش کرکے لاتے تھے۔ جب سرور صاحب کے ساتھ ملاقات ہوتی تو ہم ان کے ڈبے کا استعمال شروع کردیتے۔ وہ سارے دن میں ایک یا دو بار پائپ بھرتے ہوں گے مگر ہم دو تین گھنٹے میں ہی تین چار پائپ بھر کر پھونک ڈالتے۔ لوگ ان سے کہتے تھے کہ یہ آپ کے مال پر عیاشی کرتا ہے' تمبا کو کا ڈبا اس سے بچا کر رکھیں مگر سرور صاحب مسکراتے رہتے۔ ان کا ذوق بہت اچھا تھا۔ لباس ہو' کھانا ہو' تمبا کو ہو' چائے ہو یا شاعری ہو۔ ہر چیز میں اعلیٰ ترین سے کم پر سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ لباس سادہ استعمال کرتے تھے مگر تراش خراش اور کپڑے کا استعمال غضب کا ہوتا تھا۔

ایک روز ہم اپنی بیگم کے ساتھ ایک دکان پر کھڑے تھے کہ اچانک فضا میں ''ایرن مور'' کی خوشبو پھیل گئی پھر دو گرم اور ملائم ہاتھوں نے ہماری آنکھوں بند کر دیں۔ دیکھا تو سرور صاحب پائپ منہ میں دبائے کھڑے تھے۔ کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ بتایا کہ ڈھاکہ جانے والا ہوں۔ اب وہیں اپنے پرانے مکان میں رہا کروں گا۔ ہم نے کہیں بیٹھ کر

چائے نوشی کی دعوت دی مگر وہ جلدی میں تھے۔
چند دن بعد ڈھاکہ سے ان کے انتقال کی خبر آئی تو یقین نہیں آیا۔ وہ ڈھاکہ کے عشق میں وہاں گئے تھے اور اسی زمین میں دفن ہو گئے۔

مشرقی پاکستان بھی ہمارا کئی بار جانے کا اتفاق ہوا' اس کا تذکرہ آتا رہے گا۔ مگر ایک سفر بہت یادگار تھا۔ بہتر ہو گا کہ اس کا ذکر ہو جائے۔ فلم ساز اے مجید جو کئی بار پاکستان فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے چیئرمین منتخب ہوئے' مشرقی پاکستان میں ایک فلم بنا رہے تھے۔ یہ 1959ء کی بات ہے۔ اس فلم کا نام ''جنگلی'' تھا۔ اس کی کہانی ہم نے لکھی تھی اور ہدایت کار حسن طارق تھے۔ اس کی فلم بندی سندر بن کے حسین و گنجان جنگلوں میں ہونی تھی۔ پروگرام یہ تھا کہ بیشتر فلم بندی جنگل ہی میں ختم کر لی جائے۔ ''جنگلی'' ایک ایسے شخص کی کہانی تھی جو جنگلی جانور پکڑ کر بیرون ملک بھیجا کرتا تھا۔ یہ کردار علاؤالدین کو سونپا گیا تھا۔ اس فلم کی ہیروئن نیلو تھیں۔ یہ جنگل میں پرورش پانے والی ایک الھڑ لڑکی کا کردار کر رہی تھیں۔ اس لڑکی کا باپ شہر میں قتل کر کے بچی کو لے کر فرار ہو گیا اور گھنے جنگل میں رہنے لگا۔ بچی نے اسی جنگل میں پرورش پائی۔ باپ کے سوا کوئی دوسرا شخص اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب ایک دن جنگل میں ہیرو کو دیکھا تو بہت حیران ہوئی اور جھونپڑی میں واپس جا کر باپ کو بتایا کہ میں نے تمہارے جیسی ایک چیز دیکھی ہے۔ باپ فکرمند ہو گیا اور بیٹی کو مشورہ دیا کہ اس کے نزدیک بھی نہ جانا۔ وہ مرد ہے اور تجھے مردوں سے دور رہنا چاہیے۔

بیٹی نے پوچھا ''مرد تو تم بھی ہو؟''
باپ نے کہا ''مگر میں تیرا باپ ہوں۔ یہ بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ بس وہی کر جو میں نے بتایا ہے۔''
باپ کا کردار اجمل صاحب ادا کر رہے تھے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ جب جنگل میں لڑکی کی ملاقات دوبارہ ہیرو سے ہوئی تو وہ بھاگنے لگی۔ اس نے روک کر بھاگنے کا سبب پوچھا تو ہیروئن نے بھولے پن سے صاف بتا دیا کہ باپو نے تم سے بات کرنے سے بھی منع کیا ہے۔ اس کردار کی خصوصیت یہ تھی کہ ہیرو اس سے جو بھی باتیں کرتا تھا وہ جا کر باپ کو بتا دیا

کرتی تھی اور پھر اس سے ان کا مطلب پوچھا کرتی تھی۔

اس فلم میں اداکار ساون کو ایک جنگلی قبیلے کے سردار کا کردار دیا گیا تھا۔ ساون اس سے پہلے چھوٹے چھوٹے کردار کیا کرتے تھے۔ پہلی بار ایک اہم کردار انہیں ملا تو انہوں نے اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔

اس فلم میں سب سے دلچسپ کردار نذر کا تھا۔ وہ کامیڈین تھے۔ ہیرو کے دوست تھے لیکن بے حد ڈرپوک تھے۔ اگر ان کا بس چلتا تو ایک لمحہ بھی جنگل میں نہ رہتے مگر دوست کی محبت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ چوہے تک سے ڈرتے تھے لیکن ہر قسم کے درندوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ ایک بار جنگل میں جنگلی ان دونوں کو پکڑ لیتے ہیں اور نذر صاحب سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ آدم خور ہیں۔ ہمیں بھون کر یا کچا کھا جائیں گے۔ انہیں ایک جھونپڑی میں قید کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہاں سے فرار ہونے کے لئے زمین کے اندر ایک سرنگ کھودتے ہیں۔ کئی دن کی مشقت کے بعد سرنگ سے ایک جگہ باہر نکلتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ مگر دیکھتے ہیں کہ وہ سرنگ قبیلے کے سردار کی جھونپڑی میں جا کر نکلی ہے۔ دوبارہ سرنگ کے راستے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں مگر پکڑے جاتے ہیں۔ کہانی کا یہ خاکہ اس لئے بیان کیا گیا ہے تاکہ آپ کو اس فلم کے موضوع اور ماحول کے بارے میں اندازہ ہو جائے۔

فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں تمام اداکاروں کو پہلے ڈھاکہ اور پھر سندربن کے جنگلات میں جانا تھا۔ جنگل کے اندر جھونپڑیوں کی ایک بستی بنائی گئی تھی اور روشنی کے لئے جنریٹر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سارے اداکار لاہور سے بھیج دیے گئے۔ سب سے آخر میں نذر صاحب رہ گئے۔ نذر صاحب کا مسئلہ یہ تھا کہ فضائی سفر سے ان کی جان نکلتی تھی۔ وہ کراچی اور لاہور کا سفر بھی ٹرین کے ذریعے کرتے تھے۔ جبکہ دوسرے اداکار ہمیشہ ہوائی جہاز کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ آوٹ ڈور شوٹنگ کے لئے بھی وہ اپنی وین کے ذریعے ہی جایا کرتے تھے۔ جس میں تمام گھریلو سامان اور سونے کا بھی بندوبست تھا۔ ان کی ایک نہ ایک بیگم ان کے ہمراہ ضرور جاتی تھیں۔ نذر صاحب کی دو بیویاں اور کئی بچے تھے۔ دونوں بیگمات ایک ہی گھر میں رہتی تھیں۔ اور آخر دم تک نذر صاحب نے یہ وضع نبھائی۔

ڈھاکہ جانے کے لئے ٹرین تو استعمال نہیں کی جاسکتی تھی۔ بحری جہاز سے بہت زیادہ وقت لگ جاتا اس لئے مجبوراً ہوائی جہاز کے ذریعے انہیں لاہور سے ڈھاکہ جانا پڑا۔ انہیں لاہور سے ہوائی جہاز میں سوار کرنے کی ذمے داری ہمیں سونپی

گئی تھی کیونکہ اندیشہ تھا کہ ڈر کے مارے کہیں وہ عین وقت پر اپنا ارادہ ہی منسوخ نہ کر دیں۔ جس روز انہیں رخصت ہونا تھا اس سے پہلے ان کے گھر میں دعا درود کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ نیاز بانٹی جا رہی تھی۔ قرآن شریف کے ختم ہو رہے تھے۔ تعویز گلے میں اور بازو میں باندھے جا رہے تھے۔ امام ضامن اتنے تھے کہ ان کا وزن خود نذر صاحب کے وزن کے برابر ہو گیا تھا۔ ائر پورٹ پر ان کی دونوں بیگمات اور تمام بچے انہیں خدا حافظ کہنے کے لئے موجود تھے اور وہ ہر ایک سے یوں رخصت ہو رہے تھے جیسے جنگ پر جا رہے ہوں۔ بیویاں اور بچے رو رہے تھے۔ خود نذر صاحب بھی بار بار آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ خدا خدا کر کے انہیں ہوائی جہاز میں سوار کرایا گیا اور وہ ڈھاکہ روانہ ہو گئے۔ ڈھاکہ تو وہ خیریت سے پہنچ گئے مگر جب جنگل میں جانا پڑا تو بہت گھبرائے۔ دوسرے لوگ بھی ابتدا میں تو پریشان رہے کیونکہ جنگلی جانور وہاں پالتو کتے بلیوں کی طرح گھومتے پھرتے تھے۔ مگر پھر بھی ماحول کی ندرت اور خوبصورتی نے سب کے دل موہ لئے۔ مگر نذر صاحب کا ڈر کے مارے براحال رہا۔ شوٹنگ بھی شروع ہو گئی۔ مجید صاحب نے ہیرو کے کیمپ میں بہت سے جنگلی جانوروں کو پنجروں میں بند کر کے رکھا تھا تاکہ حقیقی ماحول پیدا کیا جا سکے۔ نذر صاحب ان پنجروں کے پاس تک نہیں جاتے تھے ایک روز شوٹنگ کے لئے گئے تو جنگل میں علاؤالدین صاحب کو ایک چیتے کا بچہ نظر آ گیا۔ اسے گھیر گھار کر پکڑ لیا گیا اور یہ بچہ سارے یونٹ کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ مگر نذر صاحب کی راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کے ماں باپ یقیناً اس کی تلاش میں یہاں تک پہنچ جائیں گے اور ہم سب کو کھا جائیں گے۔ اس چیتے کے بچے کے ساتھ علاؤالدین نے کئی مناظر بھی فلمائے۔ وہ اسے اپنے کاندھے پر بٹھائے رکھتے تھے اور اس کے ساتھ کھیلتے رہتے تھے۔ وہ بھی سب سے مانوس ہو گیا تھا اور پالتو بلی کی طرح گھل مل گیا تھا۔

چند دن تو بہت ٹھیک کام ہوا۔ سب لوگ مصروف ہو گئے تو ہر ایک کی توجہ صرف فلم کی طرف مبذول ہو گئی۔ مگر پھر تقدیر نے اپنا رنگ دکھایا اور جنریٹر خراب ہو گیا۔ اسے مرمت کے لیے چٹاگانگ بھیجا گیا اور اس اثناء میں شوٹنگ معطل ہو گئی۔ قسمت نے ایک اور ستم یہ ڈھایا کہ ایک رات طوفان آ گیا۔ مشرقی پاکستان کے طوفان کا حال تو سبھی جانتے ہیں مگر جو لوگ گھنے جنگل میں گھاس پھونس کی جھونپڑیوں میں قیام پذیر ہوں اور انہیں قیامت خیز طوفان گھیر لے تو سوچئے کہ کیا عالم ہو گا۔ جھونپڑیاں اڑ گئیں۔ سامان کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ درخت جڑوں سے اکھڑ گئے۔ بارش ایسی

موسلادھار کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ خدا جانے کس طرح فلم یونٹ کے لوگوں نے وہ رات کاٹی۔ صبح ہوتے خدا خدا کر کے طوفان ختم ہوا تو ہر طرف بربادیوں کی داستانیں بکھری ہوئی تھیں۔ شکر ہے کہ کوئی جانی نقصان نہ ہوا جو کہ معجزے سے کم نہ تھا۔ ایک اور خوش قسمتی یہ تھی کہ جیپیں صحیح حالت میں تھیں۔ چنانچہ واپس چٹاگانگ اور پھر لاہور جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ کافی دن پہلے ہی ضائع ہو چکے تھے۔ اور سب اداکاروں کو دوسری فلموں کی شوٹنگ کے لئے لاہور بھی پہنچنا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ شوٹنگ کے لئے سارا یونٹ دوبارہ جائے گا۔ مگر قسمت کو منظور نہ تھا۔ ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی رہی۔ آخر حسن طارق صاحب نے باقی ماندہ شوٹنگ مغربی پاکستان میں کرنے کا پروگرام بنایا۔ گھنے جنگل تلاش کر کے کچھ شوٹنگ بھی کی گئی۔ بستی کا سیٹ دوبارہ لگایا گیا۔ قبیلے کے مندر کا سیٹ بھی لاہور کے اسٹوڈیو میں تعمیر ہوا جس میں نیلو کا رقص اور علاؤالدین اور ساون کی خوفناک لڑائی بھی فلم بند کی گئی۔ مگر یہ فلم مکمل نہ ہو سکی۔ اگر مکمل ہو کر ریلیز ہو جاتی تو یہ کئی لحاظ سے ایک منفرد اور مختلف فلم ہوتی۔ لیکن قدرت کو منظور نہ تھا۔ تمام سرمایہ، کوششیں، اداکاروں کی محنت۔ ہدایت کار کی جانفشانی۔ سبھی کچھ رائگاں چلا گیا۔ اب تو خیر اس فلم کے مکمل ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

"جنگلی" اب ایک قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ اس کے ہدایت کار حسن طارق رہے نہ ہیرو علاؤالدین۔ اجمل صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہاں تک کہ فلم کا نیگیٹو تک باقی نہیں رہا۔ اگر باقی رہ گئیں تو صرف یادیں اور کہانیاں۔

مگر ہم کچھ آگے نکل آئے ہیں۔ فلمی صنعت کے ابتدائی زمانے کی بہت سی باتیں ابھی بیان کرنے سے رہ گئی ہیں جن میں سے بعض بہت دلچسپ ہیں۔

یہ تو آپ کو بتا چکے ہیں کہ رات کو اگر آخری بس نکل جاتی تھی تو ہمیں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑ جاتا تھا۔ مال روڈ سے ماڈل ٹاؤن جانے کے لئے رات کے وقت تانگے کے سوا کوئی دوسری سواری میسر نہ تھی اور تانگے والے رات کے وقت اتنی دور جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ آج کل کا لاہور تو تھا نہیں جہاں آدھی رات کو بھی چہل پہل رہتی ہے۔ اس زمانے میں تو اندھیرا ہوتے ہی لاہور کے چند علاقوں کے سوا ہر طرف ویرانی اور سناٹا ہوتا تھا۔ فیروز پور روڈ پر اچھرہ سے آگے سڑک پر روشنی تک نہ تھی گویا چار پانچ میل کا علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اندھیری راتوں میں چور اچکے بھی

مصروف عمل ہوتے تھے۔ سڑک پر کوئی دوسری سواری یا راہ گیر دور دور تک نظر نہیں آتا تھا۔ان حالات میں تانگے والے کو کیا پڑی تھی کہ وہ ماڈل ٹاؤن کے دور دراز علاقے تک جائے اور پھر وہاں سے واپس بھی آئے۔ گھوڑا چاہے کتنا ہی اچھا اور تیز کیوں نہ ہو وہ ماڈل ٹاؤن تک پہنچنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے سے کم وقت نہیں لیتا تھا کیونکہ سارے دن کا تھکا ہوا ہوتا تھا۔ان حالات میں ماڈل ٹاؤن جانے پر وہی تانگے والے آمادہ ہوتے تھے جن کا گھر اچھرہ یا مسلم ٹاؤن میں ہوتا تھا۔ اس طرح انہیں آنے جانے میں تین گھنٹے لگ جاتے تھے۔ کوئی نہ کوئی تانگا تو مل ہی جاتا تھا مگر بہت نخروں کے بعد۔ کرائے پر بھاؤ تاؤ بھی ہوتا تھا لیکن پونے دو روپے یا دو روپے میں معاملہ طے ہو جاتا تھا۔ آپ سوچیں گے کتنا کم کرایہ تھا مگر اس زمانے میں یہ بھی بہت بڑی رقم تھی۔

ایک رات ہم میکلوڈ روڈ کے چوک پر بس کے انتظار میں ٹہل رہے تھے جس کا وقت گزر چکا تھا۔ مگر کبھی کبھی کوئی بس لیٹ بھی ہو جاتی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ ایک اور صاحب بھی بس کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ ہم دونوں کے سوا سڑک پر کوئی تیسرا فرد بشر نظر نہیں آ رہا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ ہلکی سی دھند ہو چکی تھی۔اوور کوٹ اور دوسرے لوازمات کے باوجود ہم سردی میں ٹھٹھر رہے تھے۔ لاہور کی بیشتر آبادی اس وقت تک سو چکی تھی۔ ہم فلم دیکھنے کے چکر میں اپنی آخری بس سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ بھاگم بھاگ سینما سے اسٹاپ پر پہنچے تو وہاں ان ایک صاحب کے سوا کوئی دوسرا مسافر نظر نہ آیا جس سے یہ شک گزرا کہ غالباً آخری بس بچے کھچے چند مہم جو مسافروں کو لے کر رخصت ہو چکی ہے۔ مگر ایک امید موہوم کے سہارے ہم اپنے جسم کو گرم رکھنے کے لئے بس کے انتظار میں ٹہلتے رہے۔ سوا دس بج گئے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ اب بس کے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اتفاق سے ایک تانگا بھی آ گیا اور تانگے والے نے ہمارے پاس رک کر بڑے اخلاق سے دریافت کیا'' بابو جی ، کہاں جانا ہے ؟''

ہم نے ماڈل ٹاؤن کا نام لیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا'' میں اچھرہ واپس جا رہا ہوں ، آپ کہیں تو وہاں تک لے چلوں ؟''

ہم نے پوچھا'' اور وہاں سے آگے ہم کیسے جائیں گے ؟''

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا ''کوئی بات نہیں۔آپ کو ماڈل ٹاؤن چھوڑ دوں گا مگر کرایہ دو روپے ہو گا۔''
حالات اور وقت کے اعتبار سے اس کا مطالبہ معقول تھا۔ہم بھی ٹہل ٹہل کر اور منہ سے بھاپ نکال نکال کر تھک گئے تھے۔اس لئے فوراً ہامی بھر لی اور تانگے میں سوار ہو گئے۔تانگے والے نے پیار سے گھوڑے کو چمکارا اور چلنے کا اشارہ کیا۔ہم نے دیکھا کہ اسٹاپ پر موجود صاحب بڑی حسرت سے ہمیں دیکھ رہے ہیں' سوچا انہیں بھی ساتھ بٹھالیں۔یہ بھی شاید اسی منزل کے مسافر ہیں۔تانگے سے اتر کر ان کے پاس گئے۔اور پوچھا ''کہاں جائیں گے ؟''
کہا ''جی مجھے مسلم ٹاؤن جانا ہے۔''
''تو پھر آ جایئے۔آپ کو چھوڑ دیں گے۔ہم ماڈل ٹاؤن جا رہے ہیں۔''
وہ پہلے تو تکلف کرتے رہے مگر پھر ہمارے اصرار پر رضا مند ہو گئے۔تانگا چل پڑا ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے۔پھر ہم نے انہیں بتایا کہ ہماری بس کیوں مس ہو گئی۔
وہ مسکرائے اور بولے۔''یورپ میں یہ کہاوت مشہور ہے کہ اگر لڑکی یا بس مس ہو جائے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔اس لئے کہ دوسری آتی ہی ہو گی۔''
ہم نے کہا ''ٹھیک فرمایا آپ نے مگر یہاں دوسری بس دوسرے دن ہی نظر آتی ہے۔رہا سوال لڑکی کا تو وہ دور دور تک نظر نہیں آتی۔''
اس طرح بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور یہ لمبا سفر آرام سے کٹ گیا۔انہیں ادب اور شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔کئی اشعار انہوں نے سنائے۔پھر فلموں کی باتیں شروع ہو گئیں۔ہم نے ان کا چہرہ کئی بار غور سے دیکھا تھا مگر کوئی شناسائی نظر نہیں آئی تھی۔وہ نوجوان' صحت مند اور خوش شکل آدمی تھے۔دھیمی آواز میں اور بڑے شائستہ لہجے میں بولتے تھے۔باتوں باتوں میں تعارف ہوا تو ہم نے اپنا نام بتایا' وہ بولے ''میرا نام علاؤالدین ہے۔''
علاؤالدین کہتے ہوئے انہوں نے عین کے نیچے زیر لگادیا کہ یہ پنجاب کا دستور ہے۔
ہم نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اداکار ہیں۔بمبئی میں بھی فلموں میں کام کر چکے ہیں۔
پوچھنے لگے ''آپ نے دلیپ کمار اور نرگس کی فلم '' میلہ '' تو دیکھی ہو گی ؟''

ہم نے کہا" جی نہیں"

"اس فلم میں، میں نے نرگس کے باپ کا کردار کیا ہے۔"

ہمیں ہنسی آگئی کہ اتنی کم عمری میں وہ ہیروئن کے والد بزرگوار بن بیٹھے۔

بولے" اچھی فلم تھی۔ کردار بھی اچھا تھا اس لیے کر لیا۔ وہاں رہتا تو کافی مواقع تھے مگر میں پاکستان آگیا۔"

اس وقت تک ہم پاکستان کی فلمی صنعت سے بالکل ناآشنا تھے اس لیے نہ جان سکے کہ مستقبل کا ایک عظیم فن کار ہمارا ہم سفر تھا۔

مسلم ٹاؤن کے پل پر پہنچ کر انہوں نے کہا" مجھے یہاں اتار دیجئے۔ آپ کا بہت شکریہ" یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے چار آنے نکال کر ہمیں پیش کر دیے اور بولے "معافی چاہتا ہوں کہ سردست یہی پیش کر سکتا ہوں۔"

ہم نے کہا" آپ یہ رکھ لیجئے ہمیں تو ماڈل ٹاؤن جانا ہی تھا۔ آپ نہ ہوتے پھر بھی کرایہ تو ادا کرنا ہی پڑتا۔"

وہ بہت اصرار کرتے رہے اور ہم انکار۔ آخر انہوں نے مجبور ہو کر چونی واپس جیب میں رکھ لی اور بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

علاؤالدین صاحب سے یہ ہماری پہلی ملاقات تھی مگر افسوس کہ ہم اس وقت تک ان کے نام تک سے واقف نہ تھے۔ بعد میں جب" آفاق" میں فلمی صفحہ شروع ہوا تو دوسرے اداکاروں کے ساتھ علاؤالدین سے بھی ملاقات ہونے لگی جو بڑھ کر پر خلوص دوستی کے رشتے میں تبدیل ہو گئی۔ علاؤالدین نے بعد میں بہت ترقی کی۔ بہت اچھے دن دیکھے۔ ان کے پاس شاندار اور قیمتی کار بھی تھی۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ شہرت ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ فلموں میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہیرو آخر میں کریکٹر ایکٹر بن جاتے ہیں۔ مگر علاؤالدین کے ساتھ بالکل الٹا معاملہ پیش آیا۔ وہ پہلے کریکٹر ایکٹر تھے پھر ویلن بنے اور اس کے بعد ہیرو بن گئے۔ اور تینوں حیثیت میں بہت کامیاب رہے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب فلم ساز علاؤالدین کے بغیر فلم بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

علاؤالدین بہت دلچسپ، بامروت اور خلیق ہمدرد آدمی تھے۔ ان کے بارے میں واقعات آتے رہیں گے کیونکہ ان کے ساتھ ہم نے کافی وقت گزارا ہے۔ ایک زمانے میں ہفتے میں دو تین بار ان سے شام کو ملاقات ضروری تھی۔ بات

یہ تھی کہ مسلم ٹاؤن میں اس زمانے میں فلم والوں کا جمگھٹا تھا۔ سنتوش کمار اور ان کا خاندان۔ علاؤالدین‘ تنویر نقوی۔ لقمان اور بہت سے لوگ وہاں رہتے تھے۔ تنویر نقوی‘ لقمان اور علاؤالدین کی کوٹھیاں تو بالکل متصل تھیں۔ ہم لقمان صاحب کے ساتھ اکثر ان کے گھر چلے جاتے تھے اور پھر ان تین گھروں میں کسی ایک گھر میں محفل آراستہ ہو جاتی تھی۔ دوسرے لوگ بھی وہیں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ علاؤالدین کھلے دل کے انسان تھے۔ اپنے سارے خاندان کو انہوں نے بہت عیش و آرام سے رکھا۔ والد کے تو وہ تابعدار تھے۔ جو کمایا وہ گھر والوں پر خرچ کر دیا۔ اللہ نے انہیں پیسہ بھی بہت دیا اور نام بھی۔ لیکن زندگی کے آخری سالوں میں حالات بگڑ گئے تھے۔ اس کا بڑا سبب ان کے نوجوان بیٹے کی اچانک وفات تھی۔ وہ گھر سے کار لے کر شاپنگ کے لئے نکلا اور کچھ دیر بعد اس کی لاش واپس آئی تو علاؤالدین اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ دراصل کئی بیٹیوں کے بعد بڑی دعاؤں اور نذر نیاز کے بعد اللہ نے انہیں یہ بیٹا عطا کیا تھا اور اس کی پیدائش پر انہوں نے ایسا جشن منایا تھا کہ ساری فلمی صنعت کو مدعو کر لیا تھا۔ ساری رات خورد و نوش کا سلسلہ جاری رہا۔ علاؤالدین کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ مگر سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں یہ بیٹا اچانک ایک حادثے کی نذر ہو گیا۔ یوں تو سارے خاندان کے لئے یہ صدمہ بہت بڑا تھا مگر علاؤالدین کو اس بیٹے سے عشق تھا۔ اس کی اچانک موت نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ کئی ہفتے تک وہ ساکت و خاموش رہے۔ کوئی اصرار کر کے کھلا دیتا تو کھا لیتے ورنہ بیٹھے آسمان کو تکتے رہتے۔ اتنا دلچسپ‘ شگفتہ اور باتونی انسان بولنا تک بھول گیا تھا۔ کئی ماہ کے بعد وہ رفتہ رفتہ قدرے نارمل ہوئے مگر مسکراہٹ ان کے چہرے پر نہ آتی۔ دوستوں اور مداحوں کے اصرار پر انہوں نے فلم میں کام کرنا شروع کر دیا مگر وہ پہلے والی باغ و بہار شخصیت ناپید ہو چکی تھی۔ چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھے رہتے۔ کوئی مخاطب کرتا تو آہ بھر کر جواب دے دیتے۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ کئی کئی صفحات پر مشتمل مکالمے ایک ہی وقت میں ادا کر دیا کرتے تھے بعد میں چھوٹے چھوٹے فقرے بھی بھولنے لگے تھے۔ اور جب ری ٹیک ہوتی تو بہت شرمندہ ہوتے تھے۔ بیٹے کی موت کے بعد وہ جیتے جی مر گئے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن سچ مچ مر گئے۔ وہ بہت دلچسپ اور رنگا رنگ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی داستانیں بے شمار ہیں۔ دلچسپ واقعات‘ لطیفے اور اشعار انہیں ازبر تھے۔ سنانے کا انداز بھی بہت دلکش تھا۔ بہت سریلی آواز کے مالک تھے اور بہت اچھا گاتے تھے۔ طبلہ‘ ہارمونیم بھی بہت اچھا بجا لیتے تھے۔ دراصل وہ

گھر سے گلوکار بننے کے ارادے سے نکلے تھے مگر تقدیر نے اداکار بنادیا اور اداکار بھی ایسا کہ جس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ ابھی تو یہ داستان جاری ہے اور اس میں علاؤالدین کا تذکرہ بھی بارہا آئے گا۔

ابتدائی دنوں کے واقعات کے سلسلے میں اس زمانے کے فلم سازوں' اداکاروں اور صحافیوں کے بارے میں بھی بتادینا ضروری ہے۔

انڈیا سے جو فلم ساز پاکستان آئے تھے ان میں سب سے پہلے فلم سازی کا آغاز نذیر صاحب نے کیا تھا۔ نذیر صاحب کے بارے میں بتایا جاچکا ہے کہ وہ بھارت میں ایک کامیاب اور نامور فلم ساز تھے' اداکار وہدایت کار بھی تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک کاروباری ذہن کے مالک بھی تھے۔ وہ ایک پریکٹیکل آدمی تھے۔ منصوبے بنانا اور ان کے بارے میں غور و فکر کرنا ان کی عادت نہیں تھی۔ یعنی اس معاملے میں وہ ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کی ضد تھے۔ احمد صاحب طویل المیعاد اور شاندار منصوبے بنانے میں ماہر ہیں لیکن اکثر انہیں عملی جامہ پہنانے کی نوبت نہیں آئی۔ نذیر صاحب کا معاملہ برعکس تھا۔ وہ انڈیا سے کافی سرمایہ لے کے آئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ کسی اچانک فیصلے کے تحت بھاگ دوڑ میں پاکستان نہیں آئے تھے بلکہ انہوں نے سیاسی حالات کو بھانپ لیا تھا اور پاکستان منتقل ہونے کے لئے اقدامات شروع کردیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ محض خالی ہاتھ ہلاتے ہوئے نہیں آئے بلکہ وہاں کے اثاثے فروخت کرنے کے بعد معقول سرمایہ بھی لے کر آئے۔ لاہور میں انہوں نے مسلم ٹاؤن کے علاقے میں زمینیں خریدیں۔ یہیں انہوں نے اپنی کوٹھی بھی بنائی۔ اسٹوڈیو نزدیک ہی تھا اور بہت سے اداکار وغیرہ بھی مسلم ٹاؤن ہی میں آباد تھے۔ انہوں نے اپنی زمینیں بعد میں اچھے داموں پر فروخت بھی کردیں۔ مسلم ٹاؤن میں بی پی ڈبل روٹی کی فیکٹری جس زمین پر بنائی گئی وہ بھی نذیر صاحب ہی کی ملکیت تھی۔ نذیر صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ انڈیا سے آنے والے بیشتر فلم والوں کی طرح انہوں نے نہ تو الاٹ منٹ کرائی۔ نہ حکومت سے قرضہ یا کوئی اور سہولت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ بس چپ چاپ حالات اور وسائل کے مطابق کام شروع کردیا۔ جب کہ دوسرے نامور لوگوں نے سینما، زمینیں اور کوٹھیاں الاٹ کرائیں اور قرضے حاصل کئے۔ ان پرانے اور تجربہ کار لوگوں کی بے عملی کا ایک سبب وہ مالی

سہولتیں بھی تھیں جو انہیں پاکستان آتے ہی حاصل ہو گئی تھی۔ جب خوشحالی ہاتھ پیر ہلائے بغیر ہی مل جائے تو محنت کون کرے؟اور وہ بھی نامساعد حالات میں۔

اس لحاظ سے نذیر صاحب کو پاکستان کی فلمی صنعت کا ستون کہا جا سکتا ہے۔
ان کی پھرتی ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے 1948ء ہی میں اپنی پہلی فلم بناڈالی۔ اس کا نام ''سچائی'' تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے ہیرو وہ خود اور ہیروئن میڈم سورن لتا تھیں۔ بے بی اختری اور مجید صاحب نے اس فلم میں کام کیا تھا۔ مجید صاحب بمبئی سے آئے ہوئے تھے۔ بھاری جسم کے خوش شکل اور وجیہہ آدمی تھے۔ وہاں کیریکٹر ایکٹر تھے اور اچھے اداکار تھے۔ صرف ایک خرابی یہ تھی کہ ان کی آواز قدرے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود ہندوستان کے اچھے اداکاروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ابتدائی چند سال کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا اور آج تو خود فلم والے بھی اس کے نام سے واقف نہیں ہیں۔ (ٹی وی کے ناظرین نے کچھ عرصہ پہلے مشہور فلم '' نور اسلام'' ضرور دیکھی ہو گی۔ اس فلم میں مجید صاحب نے تاتاریوں کے خان اعظم کا کردار ادا کیا تھا)۔ '' سچائی'' کے موسیقار چشتی صاحب تھے۔
چشتی صاحب اپنی جگہ ایک مکمل ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی فن کاری کا لوہا تو قیام پاکستان سے پہلے ہی منوا چکے تھے طرز بنانے میں انہیں کمال حاصل رہا ہے اور فوراً ہی بنا دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ طرز بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جو موسیقار کسی نغمے کے بارے میں کہتا ہے کہ اس کی اچھی طرز نہیں بن سکتی وہ غلط کہتا ہے۔ تن آسان ہے یا پھر نالائق۔ ورنہ طرز تو خبر کی بھی بن سکتی ہے۔ ایک بار لوگوں نے آزمائش کے طور پر ان کے سامنے تازہ اخبار رکھ دیا اور ایک خبر کے بارے میں فرمائش کی کہ اس کی طرز بنایئے۔ چشتی صاحب ہارمونیم لے کر بیٹھ گئے اور چند منٹ کے اندر سچ مچ اس خبر کی طرز بنادی۔ چشتی صاحب کی صلاحیتیں بے پناہ ہیں مگر اسی حساب سے ان کی ناقدری بھی کی جاتی۔ کسی اور ملک میں ہوتے تو پوجے جاتے اور دولت میں کھیلتے۔ یہاں کئی سال سے بے کار رہے اور مالی ابتری کا شکار رہے۔ وہ کئی سال تک فلم سازوں سے شکایت کرتے رہے کہ بھائی تم مجھ سے کام کیوں نہیں کراتے؟ اگر موسیقی اچھی نہ ہو تو معاہدہ ختم کر دینا مگر کام تو کراؤ۔ میری صلاحیتوں کو ضائع کیوں کر رہے ہو مگر فلم ساز بے چارے بھیڑ چال میں لگے ہوئے تھے۔ جن دو چار موسیقاروں کے پیچھے لگ گئے' بس لگے ہوئے ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ وہ چشتی

صاحب کی طرزوں کو توڑ مروڑ کر بلکہ خراب کر کے پیش کر رہے ہیں۔ چشتی صاحب سے ہمارا براہ راست واسطہ تو نہیں رہا مگر ویسے بہت ملاقات رہی اور ہم نے ان کی خداداد لیاقت کا ہمیشہ اعتراف اور احترام کیا۔

نذیر صاحب کی فلم ""سچائی"" زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ وجہ بیان کی جاچکی ہے کہ بے سروسامانی کے عالم میں برائے نام سرمائے سے بنائی جانے والی فلمیں بھارت کی اے ون فلموں کا بھلا کیا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ پھر بھی سچائی نے مقامی فلم والوں کو ایک حوصلہ اور اعتماد بخشا اور یہ امید دلائی کہ ان حالات میں بھی فلمیں بن سکتی ہیں۔

نذیر صاحب نے زیادہ دیر انتظار نہیں کیا۔ بتایا تو ہے کہ وہ عملی آدمی تھے۔ کام کرنے پر یقین رکھتے تھے۔ اگلے ہی سال انہوں نے ایک پنجابی فلم ""پھیرے"" بنائی اور یہ زبردست ہٹ ہو گئی۔ اس فلم میں دونوں میاں بیوی کے علاوہ نذر اور علاؤالدین نے بھی کام کیا تھا۔ ""پھیرے"" صحیح معنوں میں پاکستان کی پہلی کامیاب فلم تھی۔ یہ 1949ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ بڑی بڑی کاسٹ کی اور بڑے بجٹ کی بھارتی فلموں کے مقابلے اس کی کامیابی نذیر صاحب کی ہنر مندی کا ثبوت تھی۔

اگلے سال انہوں نے ایک اور پنجابی فلم بنا کر سب کو چونکا دیا۔ اس کا نام "" لارے"" تھا۔ اس فلم میں ان کے اور میڈم کے علاوہ نذر اور زینت وغیرہ نے بھی کام کیا تھا۔ ان دونوں فلموں کی موسیقی چشتی صاحب نے مرتب کی تھی اور دونوں فلموں کے سبھی گانے ہٹ ہو گئے تھے۔ یہ بھی ایک تعریف کی بات ہے کہ اس وقت جب کہ لاہور کی ریکارڈنگ کا مناسب بندوبست تھا نہ ہی تربیت یافتہ سازندے دستیاب تھے' چشتی صاحب نے تہلکہ خیز موسیقی بنا کر سب کو چونکا دیا۔ "" لارے اور پھیرے"" بہت کامیاب رہیں اور ان کے گانے آج بھی مقبول ہیں۔

نذیر صاحب اس کے بعد بھی متواتر فلمیں بناتے رہے اور ان میں سے بیشتر کامیاب بھی ہوئیں۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نذیر صاحب کی کارکردگی اور کارگزاری کم ہوتی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ فلموں کی کامیابی کے باوجود ان کی کفایت شعاری کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کا غصہ اور چڑچڑا پن بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ ان کا بس چلتا تو شاید وہ مفت میں فلم بناتے۔ بے روزگاری اور کڑکی کا زمانہ تھا اس لئے انہیں اداکار اور کارکن مل ہی جاتے تھے۔ مگر جب فلم سازی کا دھندا بڑھنے لگا تو اچھے فنکاروں اور ہنر مندوں نے دوسروں کے ساتھ کام کرنے

کو ترجیح دی۔ادھر نذیر صاحب پیسے بچانے کے لئے نوجوان اور مقبول فن کاروں کو کاسٹ کرنے کے بجائے خود ہی ہیرو بنتے رہے اور میڈم سورن لتاان کی ہر فلم میں لازماً ہیروئن ہوتی تھیں۔نوخیز ،نوجوان اور خوب صورت نئی ہیروئنوں میں فلم بینوں کو قدرتی طور پر زیادہ دلچسپی اور کشش محسوس ہوتی تھی۔جیسے جیسے فلم سازی کے اخراجات بڑھتے جارہے تھے، نذیر صاحب کی سرگرمیاں کم ہوتی جارہی تھیں۔کچھ سال بعد انہوں نے یہ تبدیلی تو گوارا کرلی کہ اپنی جگہ نوجوان اور مقبول ہیرو کاسٹ کرنے لگے مگر میڈم سورن لتا کے مقابلے میں درپن ہیرو کا رول کرتے ہوئے عجیب سے لگتے تھے۔اس طرح رفتہ رفتہ نذیر صاحب کی فلم سازی کی سرگرمیاں کم ہوتی چلی گئیں اور ایک وقت ایسا آیا کہ انہوں نے فلمیں بنانا ہی ترک کردیں۔انہیں معاشی اور مالی مسئلہ بھی درپیش نہیں تھا۔اللہ کا دیا بہت کچھ تھا اس لئے گوشہ نشین سے ہوگئے اور آرام وسکون کے ساتھ زندگی گزارنے لگے۔

نذیر صاحب سخت گیر اور غصہ ور مشہور تھے اس لئے لوگ ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔پیسے بچانے کے لئے وہ ہر ترکیب استعمال کرتے تھے۔اول تو معاوضہ بہت کم اوپر سے جب مطالبہ کیا جاتا تو وہ اپنی مالی پریشانیاں ایسے اندوہناک انداز میں بیان کرتے کہ مانگنے والا خود ہی شرمسار ہوجاتا۔ اداکار بہت اچھے تھے۔کیمرے کے سامنے تو اداکاری کرتے ہی تھے کیمرے سے ہٹ کر بھی مناسب موقعوں پر ایسی اداکاری کا مظاہرہ کرتے تھے کہ دیکھنے اور سننے والوں کی آنکھوں سے آنسو آجاتے تھے۔وہ اپنی عمر، بیماری اور مصروفیات کا بیان کرتے۔پھر مالی پریشانیوں کی تفصیل بتاتے اور ایسی سرد آہیں بھرتے کہ فضا سوگوار ہوجاتی۔

ایک طرف تو یہ بے بسی اور بے کسی تھی۔دوسری طرف شوٹنگ کے دوران میں وہ سراپا غضب ہوتے تھے۔کوئی اداکار غلطی کر بیٹھتا یا ری ٹیک کرادیتا تو وہ آگ بگولا ہوجاتے تھے کیونکہ اس کا مطلب تھا شفٹ اور فلم نیگیٹو کا زیاں۔لہٰذا وہ اس پر برس پڑتے۔ان کی ڈانٹ سے سبھی ڈرتے تھے اور رعب بھی بہت تھا۔اس لئے ان کی ڈانٹ کا الٹا اثر ہوتا تھا۔ اچھے بھلے اداکار مکالمے بھول جاتے تھے اور پھر جتنا زیادہ وہ غصے کا اظہار کرتے اتنی ہی زیادہ غلطیاں سرزد ہوتیں۔نذیر صاحب کا غصہ بھی بڑھتا جاتا۔ یہاں تک کہ ایک ہنگامہ سا برپا ہوجاتا۔عطا بزداران کے لئے اسٹل فوٹو گرافی کرتے تھے۔بعد میں انہوں نے اس شعبے میں بہت نام پیدا کیا۔وہ بہت اچھے اسٹل فوٹو گرافر تھے اور شوٹنگ کے

دوران میں ہی بہت اچھی تصاویر بنا لیتے تھے جو کہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ انہوں نے نذیر صاحب سے بہت کچھ سیکھا مگر ان کے غصے سے عاجز رہتے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے متبادل کام مل جانے کے بعد نذیر صاحب کے ساتھ کام ہی نہیں کیا۔ عطا بزدار بھی ان ہی لوگوں میں تھے۔ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ وہ نذیر صاحب کے زمانے کے دلچسپ واقعات بھی سنایا کرتے تھے۔

ایک بار نذیر صاحب کسی بات پر ناراض ہو کر مارنے کے لئے عطا کی طرف لپکے تو وہ بھاگ اٹھے۔ نذیر صاحب غصے میں تپ رہے تھے۔ ان کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اسٹوڈیو سے باہر نکل گئے اور سڑک پر کافی دور تک چلے گئے۔ ساتھ ہی برا بھلا بھی کہتے جا رہے تھے اور دھمکیاں بھی دے رہے تھے ''رک جا۔ ورنہ خیر نہیں ہے۔''

عطا صاحب کہاں رکنے والے تھے۔

دوسرے دن وہ شوٹنگ پر پہنچے تو نذیر صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے۔ عطا کو پاس بلایا اور پوچھا ''نالائق کل دوڑ کیوں لگادی تھی؟ مجھ بڈھے آدمی کو بھی اتنی دور تک دوڑایا۔''

عطا نے کہا ''اگر دوڑ نہ لگاتا تو آپ سے مار کھاتا۔''

کہنے لگے ''ہاں۔ یہ بات تو ٹھیک ہے، پھر بہت پیار سے سمجھایا، دیکھو بیٹا۔ ایسی حرکت نہ کیا کرو جس سے مجھے غصہ آئے۔

اس نے کہا ''نذیر صاحب۔ انسان غلطی کا پتلا ہے اور پھر آپ کے سامنے تو ڈر کے مارے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔''

''میں کیا کرتا ہوں؟''

''آپ ڈانٹتے ہیں اور مار پیٹ بھی کرتے ہیں۔''

''یار۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔''

علاؤالدین صاحب نے بھی نذیر صاحب کے بہت سے لطیفے سنائے۔ امداد (دادو) ایک چھوٹے موٹے کردار کرنے والے اداکار تھے۔ ہم جب فلموں سے وابستہ نہیں ہوئے تھے وہ اس وقت سے اداکاری کر رہے تھے مگر ہم نے آخر وقت تک انہیں چھوٹے موٹے کردار کرتے ہوئے ہی پایا۔ غضب کے حاضر جواب اور جگت باز۔ سبھی ہدایت کار

اور فلم سازان کی جگتوں پر ہنسا کرتے تھے۔ مگر اداکاری کے معاملے میں وہ صفر تھے اسی لیے زندگی بھر اداکار نہ بن پائے۔ دو چار سین کے کرداروں تک ہی محدود رہے۔ انہوں نے ہماری پہلی پروڈکشن "کنیز" میں بھی چند سین کا کردار ادا کیا تھا۔ لیکن کبھی اس سے زیادہ ترقی نہ کر پائے۔

علاؤالدین نے بتایا کہ جب کوئی ایک سے زیادہ غلطیاں کر دیتا تھا نذیر صاحب پیر سے چپل اتار کر اس کی طرف لپکتے تھے۔ کوئی نیا اور اناڑی ہوتا تو چپکا بیٹھا رہتا اور مار کھا لیتا۔ پرانے اور تجربہ کار لوگ فوراً اٹھ کر بھاگ کھڑے ہوتے اور نذیر صاحب کے ہاتھ نہ آتے۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد وہ پیار سے چمکار کر بلاتے اور کہتے کہ آ جاؤ کچھ نہیں کہوں گا۔

ان کی اس عادت کی وجہ سے بھی اداکار غلطیاں کر دیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ سین کی ضرورت اور مکالمے کے بجائے اداکار کا دھیان نذیر صاحب کے ہاتھوں کی طرف لگا رہتا تھا کہ کب غلطی ہو گی اور وہ چپل پیر سے اتار کر لپکیں گے۔ امداد کے ساتھ چند بار یہ واردات ہو چکی تھی۔ ایک دن نذیر صاحب ذرا خوش گوار موڈ میں تھے اور امداد سے کہہ رہے تھے کہ بیٹا' تم لوگ آخر سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ میں تمھیں اداکاری سکھاتا ہوں اور تم نہیں سیکھتے۔ کتنے بد قسمت ہو۔

امداد نے کہا" سر جی۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں؟"

بولے" ہاں ہاں۔ کہو۔ "

اس نے کہا" نذیر صاحب۔ کیا آپ چپل کے بجائے تسمے والی جوتی نہیں پہن سکتے؟"

نذیر صاحب نے حیران ہو کر پوچھا" ارے بے وقوف اداکاری سے اس سوال کا کیا تعلق ہے؟"

امداد نے کہا" بہت بڑا تعلق ہے سر۔ بات یہ ہے کہ آپ چپل پہنتے ہیں اس لیے ایک منٹ میں اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں۔ اگر تسمے والی پہنیں گے تو اسے اتارنے میں کچھ دیر تو لگے گی۔ ایسے میں اداکار کو بچنے کا موقع مل جائے گا۔ اب یہ ہوتا ہے کہ ہماری توجہ ایکٹنگ اور مکالموں کی بجائے آپ کے ہاتھ اور چپل پر لگی رہتی ہے۔ تو پھر ہم اداکاری کیسے سیکھیں گے؟"

نذیر صاحب ہنسنے لگے۔

نذیر صاحب کا ایک اور واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ بابا عالم سیاہ پوش پنجابی کے بہت اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔نذیر صاحب کی ایک فلم کی انہوں نے کہانی لکھی اور ایک ایسا کردار تحریر کیا جو مخصوص قسم کی بہت مشکل زبان بولتا تھا۔ شوٹنگ کا آغاز ہوا تو نذیر صاحب نے مختلف اداکاروں کو بلایا اور آزمایا مگر بابا عالم سیاہ پوش نے کسی بھی اداکار کو پسند نہیں کیا۔یہی کہتے رہے کہ یہ مکالموں اور کردار کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گا۔

اس کردار کا حلیہ یہ تھا کہ سر منڈا ہوا تھا۔ سر منڈانے کے لیے بھی بہت سے اداکار رضامند نہیں تھے۔نذیر صاحب تنگ آ گئے۔ شوٹنگ میں مزید تاخیر بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ آخر انہوں نے ایک دن ضروری مشورے کے لیے بابا عالم سیاہ پوش کو بلایا اور انہیں لے کر ایک علیحدہ کمرے میں چلے گئے۔ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔اندر سے کچھ عجیب و غریب قسم کی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد نذیر صاحب اور بابا عالم سیاہ پوش کمرے سے باہر نکلے تو ایک حجام بھی ان کے پیچھے برآمد ہوا۔ بابا عالم سیاہ پوش کا سر منڈا ہوا تھا اور ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

انہوں نے نذیر صاحب سے شکایت کی " یہ آپ نے بہت زیادتی کی ہے میرے ساتھ۔"

نذیر صاحب نے کہا" باباجی۔ زیادتی تو آپ نے کی ہے میرے ساتھ۔ایسا کریکٹر اور ایسی زبان لکھی ہے کہ کوئی اداکار نہیں کر سکتا۔اب آپ ہی اس کے ساتھ انصاف کریں۔"

بعد میں بابا عالم سیاہ پوش نے یہ کردار کیا اور بہت خوب کیا۔اس فلم کا نام " لارے" تھا۔یہ بھی کامیاب رہی مگر پہلی فلم " پھیرے" جتنی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

باباسیاہ عالم پوش کی بات چل نکلی ہے تو ان کے بارے میں بھی سن لیجئے۔ وہ پنجابی کے بہت اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ بہت بڑے عالم تھے۔ اردو فارسی کے بھی ماہر تھے۔ کہتے ہیں کہ نوجوانی میں انہیں ایک لڑکی سے پیار ہو گیا تھا۔اس کی شادی کہیں اور ہو گئی۔ عالم نے اس دن کے بعد سیاہ پوشی اختیار کر لی اور دنیا ترک کر دی۔ نتیجہ یہ کہ جوانی میں ہی بابا عالم سیاہ پوش کے نام سے مشہور ہو گئے۔ جب ہماری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ نہ سیاہ پوش تھے اور نہ ہی ترک دنیا کے قائل رہے تھے۔ لیکن بابا عالم سیاہ پوش کے نام ہی سے جانے پہچانے جاتے تھے۔انہوں نے بہت سی فلموں کی

کہانیاں لکھیں اور داد حاصل کی لیکن پیسے نہ کما سکے۔اس زمانے میں فلمی صنعت میں پیسے ہی کہاں تھے جو انہیں ملتے۔ کافی کام کیا مگر خالی ہاتھ ہی رہے۔ بابا سیاہ عالم پوش تھوڑے سے ہکلاتے تھے۔جملہ شروع کرنے سے پہلے ذرا اٹکتے تھے اور ایک انگلی اپنے جبڑے پر مارتے تھے تو بالکل روانی سے بولنا شروع کر دیتے تھے۔بہت رکھ رکھاؤ والے خلیق انسان تھے۔ہم سے تو بہت سینئر تھے مگر بہت عزت دیتے تھے۔پیار سے ''آفاق ملت'' کہہ کر پکارتے تھے۔کبھی شعر و شاعری اور ادب کی بات چھڑ جاتی تھی تو وارث شاہ سے لے کر غالب و ذوق اور عرفی و بیدل تک کے اشعار سنا دیتے۔افسوس کہ فلمی صنعت میں خوشحالی کا دور آنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

نذیر صاحب نے جوان کے ساتھ سلوک کیا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ دیتے تھے اور جب تک پوری طرح مطمئن نہ ہو جاتے آگے قدم نہ بڑھاتے۔مثال کے طور پر ایک اور واقعہ سنئے۔

نذیر صاحب نے پاکستان میں آکر سب سے پہلے ''ہیر رانجھا'' کے نام سے ایک فلم شروع کی تھی۔یہ فلم اردو زبان میں بنائی جا رہی تھی۔ظاہر ہے کہ وہ اور میڈم سورن لتا اس فلم میں ''ہیر رانجھا'' تھے۔ایم اسماعیل صاحب کیدو کا بد نام زمانہ کردار ادا کر رہے تھے۔یہ فلم مکمل تو ہو گئی تھی مگر تقسیم کار سے تنازع کے باعث ریلیز نہ ہو سکی۔بعد میں لیبارٹری میں آگ لگ گئی اور فلم کا نیگیٹو جل کر راکھ ہو گیا۔اس طرح یہ فلم کسی نے بھی نہ دیکھی۔

''ہیر رانجھا'' کے لیے اسٹوڈیو کے باہر والی نہر پر شوٹنگ ہو رہی تھی۔پل کی جگہ نہر پر ایک شہتیر ڈال دیا گیا تھا جیسا کہ دیہات میں عموماً ہوتا ہے۔فلم کی ہیروئن سورن لتا کو اس شہتیر سے گزر کر نہر کے پار جانا تھا۔ریہرسل میں وہ جب بھی شہتیر سے گزرنے لگتیں تو غیر ارادی طور پر نیچے شہتیر کی طرف دیکھنے لگتیں۔ نذیر صاحب نے انہیں بتایا کہ بھئی آپ کا ہیرو دوسری جانب سامنے کھڑا ہے۔آپ کو اس کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے مگر آپ نیچے شہتیر کو دیکھتی رہتی ہیں۔جب شاٹ ہونے لگا تو میڈم سورن لتا نے پھر شہتیر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔نذیر صاحب کو غصہ آگیا اور انہوں نے انہیں خوب ڈانٹا۔نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے شوٹنگ رک گئی اور میڈم سورن لتا ناراض ہو کر ایک طرف بیٹھ گئیں۔جب غصہ اترا تو نذیر صاحب نے انہیں سمجھایا کہ دیکھو فلم میں تم اسی گاؤں کی رہنے والی لڑکی ہو اور بچپن ہی سے اس شہتیر سے گزرتی رہی ہو۔تمہیں تو اس پر سے گزرنے کی عادت ہونی چاہیے۔اس لئے

تمہارا نیچے دیکھنا بہت غیر فطری اور برا لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد پھر شوٹنگ شروع ہو گئی اور میڈم نے صحیح شاٹ دے دیا۔ اگلے وقتوں کے فلم بنانے والے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بہت اہمیت دیا کرتے تھے تاکہ فلم میں حقیقت کا رنگ پیدا ہو جائے۔

رواج یہ ہے کہ شوٹنگ کے دوران میں فلم ساز کی طرف سے کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔ نذیر صاحب کی شوٹنگ میں کھانا ان کے گھر سے پک کر آتا تھا اور سب کو خود تقسیم کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی میں دوبارہ مانگنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

''آفاق'' ہی کے زمانے میں ہماری شباب کیرانوی سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ بھی ہماری طرح صحافی تھے۔ فرق یہ تھا کہ ہم ایک روزنامہ میں کام کرتے تھے اور وہ ایک فلمی ماہنامہ ''ڈائریکٹر'' کے مدیر تھے۔ ڈائریکٹر اپنے وقت کا بہت مقبول اور بااثر فلمی میگزین تھا۔ اس کے مینجنگ ایڈیٹر چوہدری فضل حق صاحب تھے۔ کافی عرصے تک لوگ انہیں اور شباب صاحب کو شریک کار اور حصے دار ہی سمجھتے رہے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ شباب صاحب صرف ان کے ملازم تھے۔ لیکن جس انداز سے شباب کیرانوی دفتر میں براجمان ہوتے تھے اور ادارتی امور میں انہیں جو اختیارات حاصل تھے اس کے پیش نظر دیکھنے والے یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ وہ چوہدری فضل حق کے پارٹنر ہیں۔ چوہدری فضل حق ایک باغ و بہار شخصیت تھے۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، بھرا ہوا جسم' گہرا سانولا رنگ' جب ہم نے انہیں دیکھا تو غالباً پچاس پچپن کے پیٹے میں ہوں گے لیکن صحت منداور توانا تھے۔ وہ تھوڑے سے ہکلاتے تھے مگر بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ مال روڈ پر کمرشل بلڈنگ اس زمانے میں لاہور کا بہترین شاپنگ سینٹر سمجھی جاتی تھی۔ اس لمبی سی دومنزلہ عمارت کی نچلی منزل میں دکانیں تھیں' بالائی منزل پر دفاتر وغیرہ تھے۔ ان ہی میں سے ایک دفتر ''ڈائریکٹر'' کا بھی تھا۔ اول تو لاہور کی مال روڈ پر کمرشل بلڈنگ جیسی جگہ پر کسی فلمی پرچے کا دفتر ہونا ہی ایک تعجب اور اعزاز کی بات تھی۔ مگر جب سیڑھیاں چڑھ کر دفتر میں پہنچتے تو دفتر کا ٹھاٹ باٹ دیکھ کر کچھ اور مرعوبیت ہو جاتی۔ دفتر میں ایک بڑے کمرے میں چوہدری فضل حق کا دفتر تھا۔ اس میں اور بھی بہت سے کارندے بیٹھا کرتے تھے۔ چوہدری صاحب کے اور بھی بہت سے کاروبار تھے جن میں زمین کی خرید و فروخت کا کاروبار بھی

شامل تھا۔ وہ کافی خوشحال بلکہ پیسے والے آدمی تھے۔ تعلیم یافتہ اور ذہین تھے۔ میل جول اور بات چیت کا ڈھنگ بھی جانتے تھے۔ اس لئے ایک کامیاب انسان تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کو بھی بہت اچھی تعلیم و تربیت دی تھی جو دفتر بہت کم آتے تھے۔

''ڈائریکٹر'' کے دفتر میں شباب کیرانوی کا کمرہ چوہدری صاحب کے کمرے سے زیادہ سجا ہوا تھا۔ صوفہ سیٹ بھی بچھے ہوئے تھے اور فرنیچر بھی بہت اچھی قسم کا تھا۔ اس کے برابر والے کمرے میں خوش نویس اور عملے کے دوسرے ارکان بیٹھا کرتے تھے۔

شباب صاحب کا نام اور تذکرہ تو ہم نے سن رکھا تھا کیونکہ عیسیٰ غزنوی کے دفتر میں دوسرے فلمی صحافیوں کے علاوہ شباب کیرانوی کا تذکرہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ مگر ان سے پہلی ملاقات ان ہی کے دفتر میں ہوئی۔ ڈائریکٹر کی مقبولیت اور اثر ورسوخ کا ایک سبب یہ تھا کہ لاہور کے نامور اہل قلم حضرات اس فلمی پرچے میں لکھا کرتے تھے اور اکثر کی دفتر میں آمد ورفت بھی تھی۔ سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی، عشرت رحمانی، احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی جیسے لوگوں کا اس دفتر میں آنا جانا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو شباب صاحب کا حسن اخلاق اور شگفتہ مزاجی تھی مگر ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ڈائریکٹر کے لکھنے والوں کو معاوضہ بھی دیا جاتا تھا جو اس زمانے میں ایک انوکھی بات تھی۔ اس وقت '' امروز' آفاق'' اور ''ڈائریکٹر'' کے سوا کوئی دوسرا اخبار یا جریدہ تمام لکھنے والوں کو معاوضہ ادا نہیں کرتا تھا۔ کمرشل بلڈنگ کے سامنے ہی کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس تھے جو لاہور کے دانش وروں اور ادیبوں' شاعروں کا مستقل ٹھکانا سمجھے جاتے تھے۔ جو اہل قلم کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کی طرف جاتے ان میں سے کچھ گپ شپ یا اچھی چائے کے لالچ میں ''ڈائریکٹر'' کے دفتر میں بھی ضرور جاتے۔ یہاں انہیں چائے یا کافی کے علاوہ فلمی ایکٹریسوں کو دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ اس کمرشل بلڈنگ کے ایک کونے پر پہلوان پان والے کی دکان تھی جہاں دور دور سے لوگ پان کھانے کے لئے آیا کرتے تھے۔ پہلوان صاحب کی دکان دیکھنے میں تو عام پنواڑیوں کی دکان جیسی تھی مگر اس میں بڑے اہتمام سے بڑے اور نامور پہلوانوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ پان والے صاحب بھی کسرتی بدن کے پہلوان تھے۔

سردی گرمی ہر موسم میں ان کا لباس بنیان اور لنگی پر مشتمل ہوتا تھا۔ان کا پان تو اپنے لطف اور ذائقے کی وجہ سے مشہور تھا ہی مگر پان بنانے اور کھلانے کا انداز بھی نرالا تھا۔

جب ہم پہلی بار شباب صاحب کے ساتھ شام کے وقت ان کی دکان پر پہنچے تو وہاں حسب معمول گاہکوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔شباب صاحب کو دیکھا تو وہ زیر لب مسکرائے مگر منہ سے کچھ نہیں بولے۔شباب صاحب کے ساتھ انہوں نے یہ خصوصی رعایت برتی کہ دوسرے گاہکوں کو نظرانداز کرکے سب سے پہلے ان کی طرف توجہ دی۔دکان پر موجود دوسرے گاہکوں نے ذرا بھی چون وچرا نہیں کی اس لئے کہ پہلوان جی ان کی ضرورت تھے۔ان کی پہلوان جی کو ضرورت نہیں تھی۔اس کے پاس گاہکوں کی کوئی کمی نہ تھی اور ویسے بھی انہیں گاہکوں کی پروا بھی نہیں تھی۔وہ صبح سے رات تک دکان پر بیٹھے رہتے تھے۔صرف کچھ دیر کے لئے غیر حاضر ہوتے تھے۔گاہک بولتے بھی تو کیسے بولتے۔ پہلوان جی کے بازوؤں کی مچھلیوں اور کشادہ سینے کو دیکھنے کے بعد کس میں جرات تھی کہ ان سے بحث کرتا۔
پہلوان صاحب دکان پر دوزانوں بیٹھے تھے۔وہیں بیٹھے بیٹھے وہ آس پاس ہاتھ بڑھا کر گاہکوں کی ضرورت کی تمام چیزیں سمیٹ کر گاہک کو دے دیا کرتے تھے۔انہوں نے ایک پان لگایا۔ایک ڈبا اٹھا کر اس میں سے کوئی چیز پان پر چھڑکی اور پھر پان کا بیڑا بنا کر ہماری طرف بڑھا دیا۔ہم نے ہاتھ آگے بڑھایا تو انہوں نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔شباب صاحب نے کہا”آگے جا کر منہ کھول دو۔پہلوان جی‘ ہر ایک کو اپنے ہاتھ سے پان کھلاتے ہیں۔“
ہم نے آگے بڑھ کر منہ کھول دیا اور پہلوان جی نے پان ہمارے منہ میں ڈال دیا۔ یہ پہلوان جی کی عادت تھی کہ وہ ہر ایک کو اپنے ہاتھ سے پان کھلاتے تھے اور جو کوئی لاعلمی میں اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا تھا وہ اسے پان دینے سے انکار کر دیتے تھے اور اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیتے تھے۔منہ سے وہ ایک لفظ بھی نہیں بولتے تھے۔کسی نے کبھی انہیں بولتے ہوئے نہیں سنا۔بہت سے لوگ انہیں گونگا سمجھتے تھے حالانکہ وہ گونگے نہیں تھے۔ان پہلوان جی کی دکان کی ایک خصوصیت گولی والی سوڈے کی بوتل بھی تھی۔گولی والی سوڈے کی بوتل آج کل تو ناپید ہی ہوگئی ہے۔اس زمانے میں بھی اس کا رواج برائے نام رہ گیا تھا۔یہ بوتل موٹے شیشے کی بنی ہوئی ہوتی تھی۔اس کی گردن طوطے کی گردن کے برابر موٹی اور بہت مضبوط ہوا کرتی تھی۔اس کے منہ پر شیشے کی ایک گولی فٹ ہوتی تھی۔اس گولی کو ہٹانے اور بوتل کھولنے کے لئے

لکڑی کا ایک ٹوپی نما آلہ استعمال ہوتا تھا۔ اسے گولی کے اوپر رکھ کر گھونسا مارو تو گولی بوتل کے اندر چلی جاتی تھی اور بوتل کے اندر سے گیس کی وجہ سے سوڈا ابل کر جھاگ کی صورت میں بوتل سے باہر نکلنے لگتا تھا۔ اس بوتل کو پینے کے لئے بھی بڑی مہارت کی ضرورت تھی۔ اگر بوتل کھلتے ہی آپ اسے منہ سے لگا کر پینا شروع نہیں کریں گے تو سوڈے کا جھاگ آپ کے کپڑے خراب کر دے گا۔ بہت سے لوگ اپنے اناڑی پن کی وجہ سے کپڑے خراب کر بیٹھتے تھے۔
اب نہ وہ دکان ہے نہ پہلوان۔ نہ وہ پہلوانوں کی تصویریں۔ اس جگہ اب نئی دکانیں اور نئے لوگ نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ سب خواب تھا۔

شباب صاحب سے ہماری پہلی ملاقات لالہ وزیر محمد صدیقی کے ذریعے ہوئی تھی۔ لالہ وزیر محمد قیام پاکستان سے بھی پہلے پشاور میں اخبارات کے واحد ایجنٹ تھے۔ صحیح معنوں میں پشاوری پٹھان تھے۔ اونچا قد، بھاری بھرکم جسم، بھاری آواز، کیونکہ وہ ہر اخبار اور جریدے کے ایجنٹ تھے اس لئے جب بھی لاہور کے دورے پر آتے تو سبھی دفاتر میں جاتے تھے۔ اس طرح ہماری بھی ان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ غائبانہ طور پر ہم سے واقف تھے اور ہمارے مداح بھی تھے۔ بہت پرخلوص، بامروت اور صاف گو آدمی تھے۔ چند ہی ملاقاتوں کے بعد انہوں نے ہمیں بیٹا بنا لیا۔ اس کے بعد لازم تھا کہ وہ جب کبھی لاہور آئیں تو ہمیں فون کریں اور ہم ان سے ضرور ملاقات کریں۔ لالہ کے دو بیٹے تھے جو اس وقت ہم سے بھی چند سال بڑے تھے۔ مگر لالہ وزیر محمد کی زندہ دلی اور بے تکلفی دیکھ کر ان کی عمر کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔

ایک دن ہم دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف لالہ وزیر محمد صدیقی بول رہے تھے۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے پوچھا "آفاقی۔ اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟"

ہم نے کہا "لالہ کام کر رہے ہیں"

"ہر وقت کام مت کیا کرو۔ اپنی صحت دیکھی ہے؟ اس عمر میں بھی تمہاری کلائی تھام لوں تو چھڑا نہیں سکو گے۔"

یہ بات وہ اکثر ہمیں یاد دلاتے رہتے تھے۔

"تم اس وقت ڈائریکٹر کے دفتر میں آجاؤ۔"

ہم نے کہا'' مگر لالہ۔۔۔۔۔۔''

انہوں نے گونج دار آواز میں حکم صادر کیا''نہ اگر۔۔۔۔۔۔نہ مگر۔۔۔۔۔۔میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں'' یہ نادر شاہی حکم سنا کر فون بند کر دیا۔لالہ وزیر محمد کا ہر معاملے میں یہی نادر شاہی انداز تھا۔

ہم نے فوراً گام سمیٹا اور کرشل بلڈنگ پہنچ گئے۔سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے تو سب سے پہلے چوہدری فضل حق صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔انہوں نے بتایا کہ لالہ وزیر محمد اگلے کمرے میں بیٹھے ہیں۔اگلے کمرے میں پہنچے تو لالہ سامنے والے بڑے صوفے پر تشریف فرما تھے۔سلام کے جواب میں ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔پیشانی چومی اور پاس بٹھالیا پھر پوچھا''شباب صاحب سے ملے ہو؟''

ہم نے انکار میں سر ہلایا۔سامنے دیکھا تو ایک بہت بڑی میز کی دوسری جانب بڑی سی کرسی پر ایک گندمی رنگ' گول مٹول جوان بیٹھا تھا۔جس کی ہر چیز گول تھی۔جسم گول، چہرہ گول، آنکھیں بھی گول گول۔یہ چمکدار شخص مسکرا رہا تھا۔ہم نے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔انہوں نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ ہماری طرف بڑھا دیا۔شباب صاحب بہت چھوٹے قد کے تھے۔ان کے ہاتھ پاؤں بھی چھوٹے چھوٹے تھے۔مگر ارادے اور ذہنی صلاحیتیں اتنی ہی بڑی تھیں۔وہ ہنس مکھ اور خوش مزاج آدمی تھے۔ مطالعہ بھی بہت زیادہ تھا۔بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے۔اس لئے بہت جلد ہماری بے تکلفی ہو گئی۔

شباب صاحب نے ٹیلی فون اٹھا کر چائے کے لئے آرڈر دیا اور ساتھ ہی سموسے بھی لانے کو کہا۔خصوصی لوگوں کے لئے وہ مال روڈ کے پار واقع ٹی ہاؤس سے چائے منگایا کرتے تھے چنانچہ یہی اعزاز ہمیں بھی بخشا گیا۔

لالہ وزیر محمد نے کہا''شباب صاحب! یہ لڑکا نوجوان ہے۔کنوارا ہے۔فلمی لوگوں سے بھی ملتا ہے مگر بہت شرمیلا ہے۔اب میں اسے آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔آپ اس کی شرم دور کر دیں'' یہ کہہ کر وہ بہت زور سے قہقہہ مار کر ہنسے۔

جواب میں شباب صاحب بھی ہنسنے لگے۔ہم سامنے والے صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔اس لئے شباب صاحب کی ٹانگوں سے لے کر چہرہ تک سبھی ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ شباب صاحب کی ہنسی کا ہم نے یہ انداز دیکھا کہ وہ قہقہہ

مار کر ہنستے تو پہلے ان کا چہرہ ہنسنے لگتا۔ آواز کچھ دیر بعد سنائی دیتی تھی۔ اس طرح ہم نے کسی اور کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ ایک اور بات ہم نے یہ نوٹ کی کہ شباب صاحب جس کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے وہ ان کے قد کے مقابلے میں اونچی تھی جس کی وجہ سے ان کے پیر زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ وہ ہوا میں ہی معلق رہتے تھے۔ وہ ان پیروں کو مختلف انداز میں حرکت دیتے رہتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنے پیروں کے سامنے ایک تپائی سی رکھنی شروع کر دی تھی جس پر وہ اپنے پیر رکھ لیا کرتے تھے۔

ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دفتر سریلی آوازوں اور نقرئی قہقہوں سے گونجنے لگا۔ کئی فلم ایکٹریس بیک وقت دفتر میں داخل ہو گئی تھیں اور عورتوں کی عادت کے مطابق سب نے ایک ساتھ ہی بولنا شروع کر دیا تھا۔ فلم سے وابستہ لوگوں کو ہم نے ''فلم لائٹ'' کے دفتر میں بھی آتے جاتے دیکھا تھا مگر یہاں رونق کچھ زیادہ تھی۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ اس دفتر میں صنف نازک سے تعلق رکھنے والی فن کارائیں عموماً آتی رہتی تھیں۔ ایک تو اس لئے کہ انہیں پبلسٹی مل جاتی تھی۔ ان کی تصویریں اور خبریں شائع ہو جاتی تھیں۔ دوسرے یہ کہ اس وقت شباب صاحب ایک فلم بنانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ تیسری بات یہ تھی کہ یہاں سب کی خاطر مدارات کچھ زیادہ ہوتی تھی۔ ادھر ''فلم لائٹ'' کے دفتر میں عیسیٰ خان ہر ایک کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈائریکٹر کے دفتر میں لالہ وزیر محمد کے الفاظ میں '' پرستان'' کا نظارہ دیکھنے کو ملتا تھا۔ جب خواتین نے بہت زیادہ باتیں بنانی شروع کر دیں اور شباب صاحب نے ان کی باتوں پر ہنسنا شروع کر دیا تو چوہدری صاحب بھی نہ رہ سکے اور اپنے کمرے سے اٹھ کر چلے آئے۔

ان کی بھی ہر ایک سے بے تکلفی تھی اور وہ بعض ایسی باتیں بھی کہہ جاتے تھے جو کوئی اور ان لڑکیوں سے کھلے عام نہیں کہہ سکتا تھا۔ مگر لڑکیوں میں چوہدری صاحب کی دلچسپی محض زبانی ہنسی مذاق تک ہی محدود تھی۔

سبھی لوگ بے تکلفی سے باتوں میں مصروف ہو گئے مگر ہم لالہ وزیر محمد کے پہلو میں خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نے اپنی دانست میں سرگوشی میں ہم سے پوچھا''تم کیوں خاموش بیٹھے ہو۔شرمانے کی کیا بات ہے؟''
ان کی گونج دار آواز نے یہ سرگوشی سب کے کانوں تک پہنچادی اور سب لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔
شباب صاحب نے ہر ایک سے ہمارا تعارف کرایا۔پھر لالہ وزیر محمد نے حسب عادت ہماری تعریف میں کچھ کلمات کہے جن میں ٹیپ کا بند یہ تھا کہ یہ بہت شریف لڑکا ہے اس لئے لڑکیوں کے سامنے ذرا ذرا شرماتا ہے۔سب لڑکیوں نے دلچسپی سے ہمیں دیکھنا شروع کر دیا۔اتنی دیر میں چائے آگئی۔ہم چائے پی کر اور مصروفیت کا بہانہ کر کے چلے آئے۔لیکن اس کے بعد شباب صاحب سے تعلقات بڑھتے گئے۔ان کے اصرار پر ہم نے ڈائریکٹر میں لکھنا بھی شروع کر دیا۔ہم نے تو اپنی دانست میں محض دوستی میں مضامین لکھے تھے مگر جب شباب صاحب نے پہلے مضمون کی اشاعت پر پندرہ روپے کا چیک ہمیں دیا تو ہم حیران رہ گئے کیونکہ پندرہ روپے اس زمانے میں بہت معاوضہ تھا۔بعد میں آنا جانا زیادہ ہو گیا تو وہاں ادیبوں اور شاعروں سے بھی ملاقاتیں ہونے لگیں۔
اس طرح مزید دلچسپی پیدا ہو گئی۔شباب صاحب سے بے تکلفی بڑھی تو دفتری اوقات کے بعد بھی ہم ملنے لگے۔اس کے بعد تو ایسی دوستی ہوئی کہ گھریلو تعلقات میں بدل گئی اور ساری زندگی قائم رہی۔ہمیں معلوم نہیں تھا کہ شباب صاحب اس وقت بھی شادی شدہ تھے۔ہماری کافی عرصے بعد شادی ہوئی اور اس طرح گھریلو تعلقات اور زیادہ گہرے ہو گئے۔شباب صاحب سے دوستی اور بے تکلفی اتنی بڑھی کہ راز و نیاز شروع ہو گئے۔شباب صاحب عموماً اپنے دل کی بات کسی سے نہیں کہتے تھے نہ کسی کو ہم راز بناتے تھے۔مگر ہمارے معاملے میں یہ بندش بھی نہ رہی اور رفتہ رفتہ ایسا وقت بھی آیا جب ان کا اور ہمارا کوئی راز ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں رہا۔
ان کے دفتر میں ہم نے کسی ہیروئن کو تو نہیں دیکھا مگر دوسری ایکٹریس عموماً قدم رنجہ فرمایا کرتی تھیں۔زینت' آشا پوسلے ،سلمیٰ ممتاز وغیرہ سے اکثر وہاں ملاقات ہوا کرتی تھی مگر ہم کسی سے بے تکلف نہیں تھے۔

ایک دن ہمیں پھر لالہ وزیر محمد کا ٹیلی فون موصول ہوا اور انہوں نے ہمیں بلا تاخیر ڈائریکٹر کے دفتر میں پہنچنے کا حکم دیا۔لالہ جواب میں عذر یا معذرت سننے کے قائل نہیں تھے اس لئے کچھ کہنا لاحاصل تھا۔
تھوڑی دیر بعد ہم شباب صاحب کے دفتر میں پہنچے تو سارا کمرا نازنینوں سے بھرا ہوا تھا اور خوب قہقے اڑ رہے تھے۔یہ

سب چھوٹے موٹے کردار کرنے والی لڑکیاں تھیں۔لالہ وزیر محمد اپنے مخصوص صوفے پر تشریف فرما تھے۔انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی ہاتھ تھام کر اپنے برابر بٹھالیا۔ایک لمحے کے لئے خاموشی چھاگئی۔اور سب نے ہمیں دیکھنا شروع کر دیا۔ہمیں کچھ بے چینی سی ہونے لگی۔سب کی نظریں ہم پر لگی ہوئی تھیں۔شباب صاحب کے چہرے پر بھی شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس وقت ایک سازش کے تحت ہمیں بلایا گیا ہے۔شباب صاحب نے فون پر چائے کا آرڈر دیا اور دوبارہ لطیفہ بازی اور گپ شپ کا دور چلنے لگا۔محفل میں موجود بیشتر لڑکیوں سے ہم مانوس نہیں تھے اس لئے خاموش رہے۔

لالہ وزیر محمد نے اپنی گونج دار آواز میں کہا''کڑیو۔آفاقی میرا بیٹا ہے۔بہت اچھا جرنلسٹ اور رائٹر ہے مگر یہ شرمیلا ہے۔میں چاہتا ہوں کہ تم آج اس کی شرم دور کر دو۔''

لالہ وزیر محمد پشاوری لب و لہجے میں اردو بولتے تھے اور اکثر پشتو الفاظ بھی استعمال کر ڈالتے تھے۔

لڑکیوں نے جواب میں ہنسنا شروع کر دیا۔

لالہ نے دو لڑکیوں کی طرف دیکھا اور کہا''اتنی دور کیوں بیٹھی ہو۔ادھر آکر آفاقی کے پاس بیٹھو۔''

لڑکیوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور بے تکلفی سے ہمارے برابر آکر بیٹھ گئیں۔ہم کچھ اور سمٹ گئے۔اتنی دیر میں چوہدری فضل حق صاحب بھی کمرے میں آگئے۔وہ شباب صاحب کو''حافظ جی'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔آتے ہی انہوں نے کہا۔

''حافظ جی۔آج تو بڑی رونق لگی ہوئی ہے۔''

لالہ بولے''چوہدری صاحب۔۔۔۔۔۔آج آفاقی کی شرم دور کرنی ہے۔''

چوہدری صاحب بھی آکر ایک صوفے کے کونے پر ٹک گئے اور بولے''آفاقی لڑکی تو نہیں ہیں جو لڑکیوں سے شرمائیں گے۔''

یہ سب کچھ ایک منصوبے کے تحت ہو رہا تھا۔مگر اس طرح سب کی توجہ کا مرکز بننے کی وجہ سے ہمیں کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

''آفاقی۔ان لڑکیوں سے باتیں کرو'' لالہ نے حکم دیا۔

ہم نے کہا''کیا باتیں کریں؟''

بولے ''تم تو بہت باتونی ہو۔کچھ بھی باتیں کرو لطیفے سناؤ۔''

ہم پھر بھی خاموش رہے۔دراصل یہ سب کچھ ہمیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

لالہ نے لڑکیوں سے کہا''کڑیو۔تم ادھر آکر آفاقی کے پاس بیٹھو۔''

لڑکیوں نے ذرا تامل کیا۔انہیں ہمارے چہرے پر ناراضگی کے آثار نظر آنے لگے تھے مگر لالہ کا حکم کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔ایک صاحب زادی اٹھ کر کھڑی ہوئیں اور ہمارے پاس آکر رک گئیں۔شاید اس لئے کہ صوفے پر کسی اور کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔

لالہ نے کہا''آفاقی کی گود میں بیٹھ جاؤ۔''

وہ لڑکی سچ مچ ہماری گود میں بیٹھنے لگی تو ہم غصے میں ایک دم کھڑے ہو گئے۔

''لالہ۔ کیا تماشا بنانے کے لئے ہمیں بلایا تھا؟'' ہم نے غصہ بھری آواز میں کہا تو سب نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔لڑکی جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔

شباب صاحب نے کہا''آفاقی صاحب۔یہ تو ہنسی دلگی کی باتیں ہیں۔''

ہم نے کہا''ہمیں ایسا مذاق بالکل پسند نہیں ہے۔آئندہ ہم اس دفتر میں کبھی نہیں آئیں گے۔''

یہ کہہ کر ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

کسی کو توقع نہیں تھی کہ صورتحال ایک دم ایسی ہو جائے گی۔سب ہمیں پکارتے رہ گئے۔ان میں لالہ وزیر محمد صدیقی کی آواز سب سے نمایاں تھی۔

''آفاقی۔رک جاؤ۔واپس آجاؤ' اب ایسا مذاق نہیں ہو گا۔''

مگر ہم غصے میں بھرے ہوئے دفتر سے باہر آگئے اور فٹ پاتھ پر پیدل چل پڑے۔ ہمیں سچ مچ غصہ آگیا تھا اور یہ سب کچھ ہمیں بہت توہین آمیز لگ رہا تھا۔ہمارا دفتر زیادہ دور نہیں تھا اس لئے چند منٹ بعد ہم اپنے آفس میں پہنچ گئے۔غصہ

ٹھنڈا کرنے کے لئے غسل خانے میں جا کر منہ دھویا۔ ٹھنڈا پانی منگا کر پیا اور کام میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر بعد شباب کیرانوی صاحب کا ٹیلی فون آ گیا۔

''یار' تم تو مذاق کی بات پر برا مان گئے۔''

ہم نے کہا ''شباب صاحب۔ آپ جانتے ہیں کہ ایسا مذاق مجھے پسند نہیں ہے اور یہ تو بھری محفل میں کسی کو ذلیل کرنے والی بات ہے۔''

''یقین کرو، یہ ساری اسکیم لالہ وزیر محمد کی تھی۔ اور مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ تم یوں برا مان جاؤ گے۔ اچھا، جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہاری توہین ہوئی ہے تو معاف کر دو۔''

ہم نے کہا ''ٹھیک ہے۔''

بولے ''اس طرح نہیں۔ آج شام کو دفتر سے میرے پاس ضرور آنا۔ ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔''

کچھ دیر بعد لالہ وزیر محمد صدیقی بنفس نفیس آ گئے۔ سیڑھیاں چڑھ کر آئے تھے اس لئے سانس بے ترتیب تھا۔ ان کے ہمراہ کوئی ایک مصاحب قسم کا آدمی ضرور ہوتا تھا۔ اس وقت بھی ''امروز'' کے شعبہ سرکولیشن کے ایک صاحب ان کے ہمراہ تھے۔ ناراضگی اپنی جگہ مگر لالہ کا احترام اپنی جگہ تھا۔ آخر انہوں نے ہمیں بیٹا کہا تھا۔ ہم نے کھڑے ہو کر ان کی پذیرائی کی وہ تھوڑی دیر تک کرسی پر بیٹھ کر اپنا سانس ٹھیک کرتے رہے۔ پھر مصاحب کی طرف دیکھا جس نے ایک پان ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پان کھا کر ان کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے تو انہوں نے اپنی بھاری آواز میں کہا

''بیٹا۔ کیا ناراض ہو گئے ہو؟''

ہم نے کہا ''لالہ۔ ویسے ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔''

بولے ''واقعی تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے تمہارے مزاج کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔''

یہ کہہ کر انہوں نے اپنی کمر میں بندھا ہوا پستول ہولسٹر میں سے نکالا اور ہماری طرف بڑھا کر بولے ''لو۔ تم اپنی شکایت دور کر لو۔''

ہم نے پریشان ہو کر پستول کی طرف دیکھا۔

بولے ”پٹھانوں میں یہی دستور ہے۔اگر تمہاری بے عزتی ہوئی ہے تو اس کا بدلہ لے سکتے ہو۔“
وہ بالکل سیریس تھے، ہم نے کہا۔ مگر لالہ، ہم نے تو کبھی پستول ہاتھ میں لے کر بھی نہیں دیکھا۔ گولی کیسے چلائیں گے۔
وہ ہنسنے لگے۔ان کی گونج دار ہنسی کی آواز سن کر برابر والے سرکولیشن کے شعبے سے لوگ چلے آئے۔ ”ارے لالہ۔ آپ! ہمیں بتایا بھی نہیں۔“
”یارا تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ابھی میرا اور آفاقی کا معاملہ ہے۔ یہ طے ہو گیا تو پھر تمہارے پاس آؤں گا۔“
مختصر یہ کہ ہمارا دل صاف ہو گیا بلکہ دل میں شرمندہ بھی ہوئے کہ اس طرح غصے کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔
لالہ بولے ”تمہاری رگوں میں شریف خون ہے۔ایسے ماحول میں تمہیں بلانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ “
بعد میں جب ہم فلمی صنعت سے وابستہ ہو گئے تو لالہ کو خوشی بھی ہوئی مگر حیرت بھی تھی۔ کہا کرتے تھے کہ تم لڑکیوں کے ساتھ کیسے کام کرتے ہو گے ؟ ہم نے کہا ”کسی دن خود آ کر دیکھ لیجئے۔“
لالہ فلموں کے اتنے زیادہ شوقین نہیں تھے مگر موسیقی کے رسیا تھے اور ثریا کے مداح تھے۔ کہا کرتے تھے ” یارا، اس کی آواز میں جو خاص بات ہے وہ کسی بھی گانے والی کی آواز میں نہیں ہے۔“
انہوں نے ثریا کے بہت سے ریکارڈ اکٹھے کر رکھے تھے۔
ہم نے لالہ کے لئے چائے منگائی۔ کہنے لگے ”دیکھو بیٹا۔ جو ہونا تھا‘ وہ تو ہو گیا مگر اب تمہیں میرے پاس پشاور آنا پڑے گا۔“
ہم نے کہا ”لالہ اتنے سے قصور کی اتنی بڑی سزا؟“
ہنسنے لگے‘ کہا ”نہیں۔ بس مجھ سے وعدہ کرو اور دیکھو‘ چھ سات دن کی چھٹی لے کر آنا۔“
”اتنے دن تک پشاور میں کیا کروں گا؟“
”تمہیں مری اور نتھیا گلی بھیجیں گے۔“
ہم پشاور گئے لالہ نے قصہ خوانی بازار میں ایک مکان خاص طور پر ہمارے لئے کرائے پر حاصل کیا تھا۔ ہم کو ایسے تنگ اور گنجان علاقوں میں رہنے کی عادت نہیں تھی۔ رات کو لالہ خود ہمیں گھر تک چھوڑنے آئے اور اپنے ایک بیٹے کو

ہماری رفاقت کے لئے گھر میں چھوڑ گئے۔ صبح ناشتا ان کی دکان پر جا کر کرنا تھا۔ ہم نے سنا تھا کہ پشاور میں بچھو بہت ہوتے ہیں۔ لوگوں نے ہمیں بتایا کہ اگر جوتا بھی پہنو تو پہلے اسے جھاڑ کر دیکھ لو کہ اس کے اندر بچھو تو نہیں ہے۔ کپڑوں میں، دیواروں پر، فرش پر، الماریوں میں ہر جگہ بچھو چھپے ہوتے ہیں۔ ہم سہمے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ہمارے خوف کو دیکھ کر لالہ کے بیٹے نے ہر طرف خوب غور سے دیکھ کر تلاشی لی پھر ہمیں اطمینان دلانے کے لئے بولے "ویسے ہر طرف تو دیکھ لیا ہے مگر کبھی کبھی چھت پر سے بھی بچھو ٹپک پڑتے ہیں۔"

ہمارا ڈر کے مارے برا حال ہو گیا۔ نہ جانے کس طرح وہ رات ہم نے گزاری۔ صبح تنگ سے غسل خانے میں جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا مگر لالہ کے بیٹے نے پہلے جا کر غور سے دیکھا بھالا اور پھر لائن کلیئر دے دی۔ ان دنوں ہماری بہن بھی پشاور ہی میں مقیم تھیں۔ بہنوئی ائر فورس میں تھے اور جب ہم ان کی کوٹھی پر گئے تو اس صاف ستھرے ماحول کو دیکھ کر جی چاہا کہ رات وہیں رہا کریں مگر لالہ رضامند نہیں ہوئے۔

"دیکھو بیٹا۔ یہ پٹھانوں کی بے عزتی ہے کہ ان کا مہمان کسی اور کے گھر رہے، اپنی بہن کے گھر رہنا ہے تو تم دوبارہ پشاور آ جانا۔"

لالہ نے دو دن ہمیں پشاور میں مہمان رکھا اور ہمارا رات کے وقت خون خشک ہوتا رہا۔ تیسرے دن انہوں نے اپنے بیٹے کی جیب میں نوٹوں کی ایک گڈی ڈالی اور ہمیں اس کے ہمراہ مری اور نتھیا گلی کی سیر کے لئے روانہ کر دیا۔ بیٹے کو انہوں نے تاکید کی تھی کہ اگر آفاقی نے ایک پیسہ بھی خرچ کیا تو تمہاری خیریت نہیں ہے۔ اس طرح پہلی بار مری اور نتھیا گلی کی سیر ہم نے لالہ وزیر محمد کا مہمان بن کر ان کے خرچے پر کی تھی۔ یہ دراصل ان کی طرف سے اس بات کی تلافی تھی جس کی وجہ سے ہم ناراض ہو گئے تھے، ایسے وضع دار لوگ اب کہاں؟

ان کا بیٹا راولپنڈی کے ریلوے اسٹیشن تک ہمیں چھوڑنے آیا۔ ٹرین رات کو تین بجے جانے والی تھی۔ اتنی دیر تک وقت گزارنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ اسی ہفتے راولپنڈی میں محبوب صاحب کی فلم "آن" ریلیز ہوئی تھی جس کا بہت شہرہ تھا۔ سوچا فلم دیکھ کر وقت گزارا جائے مگر سنیما پہنچے تو ایک قیامت کا سامان تھا۔ آدمی پر آدمی چڑھا ہوا تھا۔ پچاس پچاس روپے میں ٹکٹ بلیک ہو رہے تھے۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم تھی مگر لالہ کے بیٹے نے فوراً سو روپے نکال

کر بلیکئے کے حوالے کر دے ئے۔

"ارے ارے یہ کیا کرتے ہو۔ اتنا مہنگا ٹکٹ لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم لاہور جا کر یہ فلم دیکھ لیں گے۔"

اس نے کہا "آفاقی بھائی۔ اگر لالہ کو پتا چل گیا کہ تم فلم دیکھنے گئے تھے مگر ٹکٹ نہ ملا اور واپس لوٹ گئے تو وہ مجھے گولی مار دے گا۔"

چنانچہ اس غریب کو گولی سے بچانے کے لئے ہم نے فلم "آن" پچاس روپے کے ٹکٹ پر دیکھی۔

شباب صاحب کے دفتر میں ایکٹریسوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ ڈائریکٹر کے دفتر میں بھی لڑکیاں آتی رہتیں تھیں۔ جب وہ فلم ساز بنے تو اس تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ ان میں زیادہ ابھرتی ہوئی ایکٹریس یا اداکارہ بننے کی امیدوار لڑکیاں ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ شباب صاحب اپنی فلم میں اکثر نئی لڑکیاں متعارف کراتے رہتے تھے جو خود بخود ان کے دفتر میں پہنچ جاتی تھیں۔

ڈائریکٹر کے دفتر میں ہی انہوں نے اپنی پہلی فلم "جلن" بنائی۔ دراصل چودھری فضل حق نے کسی کے اشتراک سے یہ فلم بنائی تھی۔ فلم سازی کا تمام کام شباب صاحب نے کیا تھا اور اے۔ حمید اس کے ہدایت کار تھے۔ اے حمید پرانے کیمرامین تھے اور شباب صاحب کے یار غار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ صحافت اور فلم میں شباب صاحب کو متعارف کرانے کا سہرا اے حمید ہی کے سر جاتا ہے۔ وہ شباب صاحب کے اس وقت سے قائل تھے جب انہیں کوئی شاعر نہیں مانتا تھا۔ انہوں نے ہی اخبار کے مالکوں اور فلم سازوں سے شباب صاحب کا تعارف کرایا اور بعد میں جب وہ فلم ساز بنے تو اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر ان کے بہت سے کام آئے۔ اے حمید ایک عجیب شخصیت تھے۔ ان کے بارے میں آپ آئندہ پڑھیں گے۔

"جلن" کے ہیرو عنایت حسین بھٹی تھے۔ مزاحیہ اداکار دلجیت مرزا بھی پہلی بار اسی فلم میں پیش کئے گئے تھے۔ یہ فلم کامیاب نہ ہو سکی۔ چودھری فضل حق صاحب نے دوسری فلم بنانے کے لیے ایک زمیندار بابو مجدد صاحب سے معاہدہ کیا۔ یہ فلم "ٹھنڈی سڑک" تھی جس کی کہانی ہماری لکھی ہوئی پہلی فلمی کہانی تھی لیکن فلم کے آغاز سے پہلے

چودھری صاحب اور ان کے پارٹنر میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بابو مجدد نے شباب صاحب سے شکایت کی۔ شباب صاحب نے چودھری صاحب سے اس سلسلے میں بات کی تو وہ ناراض ہو گئے۔

"حافظ جی۔ آپ میرے مقابلے میں ایک نئے آدمی کی حمایت کر رہے ہیں؟"

شباب صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کا موقف درست ہے اور آپ کو ان کے ساتھ ناانصافی نہیں کرنی چاہیے۔ بس اسی بات پر چودھری صاحب بھڑک اٹھے۔ اور کہا "فیصلہ کر لیجئے آپ ان کے ساتھ ہیں یا میرے؟"

"میرے خیال میں وہ حق بجانب ہیں" شباب صاحب نے کہا۔

"تو پھر آج کے بعد آپ سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ آپ "ڈائریکٹر" چھوڑ دیجئے۔"

شباب صاحب نے اپنے کاغذات سنبھالے اور تانگے میں بیٹھ کر گھر چلے گئے۔ مگر یہ بہت کڑوی گولی تھی۔ ڈائریکٹر سے انہیں معقول تنخواہ ملتی تھی۔ اثر ورسوخ بھی بہت تھا لیکن انہوں نے اصول کی خاطر سب کچھ تیاگ دیا۔ اب حالت یہ تھی کہ کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ اگلا مہینہ کیوں کر گزرے گا' اس کا بھی علم نہیں تھا۔

بابو مجدد بہت سادہ' پر خلوص اور دوست نواز آدمی تھے۔ بالکل دیہاتی تھے مگر دل کے بہت اچھے تھے۔ وہ دراصل اے حمید کے توسط سے چوہدری فضل حق سے ملے تھے اور ان ہی کے زیادہ شناسا تھے۔ جب انہیں پتا چلا کہ ان کی خاطر شباب صاحب نے چوہدری فضل حق کو چھوڑ دیا ہے تو وہ شباب صاحب کے پاس پہنچ گئے اور ان سے کہا کہ آپ فلم بھی بنائیں اور فلمی پرچہ بھی نکالیے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

انہوں نے سمن آباد میں دفتر کے لئے ایک کوٹھی کرائے پر لے دی اور فلم کا کام شروع ہو گیا۔ شباب صاحب نے "پکچر" کے نام سے ایک فلمی ماہنامہ بھی نکالنا شروع کر دیا۔ بابو مجدد نے شباب صاحب کے لئے رہنے کا بندوبست بھی کر دیا اور اپنی زمینوں سے کھانے پینے کا سامان بھی فراہم کر دیا۔ اس طرح فلم "ٹھنڈی سڑک" کا آغاز ہوا۔

ابتدائی دور کی ایک شخصیت انور کمال پاشا بھی تھے۔ وہ بہت بڑے مصنف اور ڈرامانویس حکیم احمد شجاع پاشا کے اکلوتے بیٹے تھے۔ یعنی واحد اولاد نرینہ تھے۔ اس لئے باپ کے بے حد لاڈلے اور منہ چڑھے تھے۔ حکیم احمد شجاع اپنے عہد کی بہت اہم شخصیت تھے۔ ڈرامے اور فلم سے ان کا تعلق پرانا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی سہراب مودی جیسے

ہدایت کاران سے کہانی لکھواتے رہے۔

انور کمال پاشا ایک خوب رو گورے چٹے اور بے حد ذہین آدمی تھے۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد انہوں نے ایکسائز کے محکمے میں ملازمت کر لی مگر فلم کے شوق نے اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیا۔ شفیق باپ نے بھی ان کا شوق دیکھتے ہوئے فلم سازی شروع کر دی۔ ''شاہدہ'' کے فلم ساز جس کے ہدایت کار لقمان صاحب تھے' حکیم احمد شجاع ہی تھے۔ انور کمال پاشا فلم کے سیٹ پر آتے رہتے تھے اور ہدایت کاری کے رموز سیکھنے کی کوشش میں تھے۔ تحریر کا ملکہ انہیں وراثت میں ملا تھا۔ ''شاہدہ'' تو کامیاب نہ ہوئی مگر انور کمال پاشا نے فیصلہ کر لیا کہ فلم سازی اور ہدایت کاری کئے بغیر چین سے نہ بیٹھیں گے چنانچہ اچھی بھلی نوکری چھوڑ چھاڑ کر فلموں کی دنیا میں چلے آئے۔ ان کی ذہانت' فراست اور صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ایک تقسیم کار شیخ لطیف نے انہیں ہدایت کاری کے فرائض سونپ دیے۔ ان کی پہلی فلم ''دو آنسو'' تھی جس میں صبیحہ اور سنتوش نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔

دو آنسو پاکستان کی پہلی اردو فلم تھی جس نے سولو سنیما میں سلور جوبلی منائی۔ اس کی کامیابی سے انور کمال پاشا کے حوصلے بہت بلند ہو گئے۔ ان کی دوسری فلم ''گبھرو'' تھی۔ اس میں بھی سنتوش کمار کے ساتھ شمیم ہیروئن کے کردار میں تھیں۔ یہ فلم 1950ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس طرح پاکستان کے اولین فلم سازوں اور ہدایت کاروں میں انور کمال پاشا کا نام بھی شامل ہے۔ بعد میں انہوں نے فلم سازی اور ہدایت کاری میں بہت نام پیدا کیا۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ پاکستان کے ممتاز ترین اور کامیاب ترین فلم ساز و ہدایت کار بن گئے۔ ان کے مکالموں نے فلم بینوں پر سحر طاری کر دیا تھا۔ وہ پاکستان کے واحد مصنف' فلم ساز اور ہدایت کار تھے جن کے نام پر لوگ سنیما گھروں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ان کا نام معیار اور کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ فلمی دنیا میں ان کا ڈنکا بج رہا تھا۔ دولت' شہرت اور کامیابی ان کے گھر کی کنیزیں تھیں۔

انور کمال پاشا بے حد ذہین' بے حد باتونی انسان تھے۔ بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے مگر ان کی سب سے بڑی کمزوری تعلّی اور خوشامد پسندی تھی۔ باتوں باتوں میں دوسروں کی تضحیک کرنا ان کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ بلا کے حاضر جواب تھے لیکن اکثر ان کے جملے دوسروں کے دلوں میں گھاؤ ڈال دیا کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ اپنے

آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور خود کو ہر اعتبار سے دوسروں سے برتر سمجھتے تھے۔ جب کامیابیاں قدم چومتی تھیں اس زمانے میں بھی ان کی باتیں لوگوں کی دل آزاری کا سبب بنتی تھیں۔ مگر جب کامیابی نے منہ موڑا اور تقدیر نے ساتھ چھوڑا تو ان کی کہی ہوئی باتیں لوگوں کو یاد آ گئیں۔ خود ان کے عملے کے لوگ جن پر انور کمال پاشا نے بہت احسانات کئے تھے' ان کی زبان کی تلوار سے گھائل تھے۔ ایک بار جب زوال شروع ہوا تو پھر انہوں نے کمال کا منہ نہ دیکھا۔ زینہ بہ زینہ پستیوں ہی میں اترتے چلے گئے۔ یہ داستان بہت طویل ہے۔ لیکن فی الحال ان کے ابتدائی زمانے کے حوالے سے ان کا ذکر ہو رہا ہے۔ پاشا صاحب کو خدا نے اتنی جلدی اور اتنی مسلسل کامیابیاں عطا کر دیں کہ وہ انہیں سنبھال نہ سکے۔ ''گبھرو'' کے بعد انہوں نے ''دلبر'' بنائی۔ اس فلم میں وہ خود شمیم کے بالمقابل ہیرو تھے۔ وہ خوب صورت اور دلکش شخصیت کے مالک تھے' قد و قامت اور سراپا بھی خوب تھا۔ انہیں یہ خوش فہمی ہو گئی تھی کہ وہ اس زمانے کے ہر ہیرو سے بہتر ہیرو بن سکتے ہیں۔ لیکن اداکاری کے امتحان میں فیل ہو گئے اور '' دلبر'' کے بعد پھر دوبارہ اداکاری نہیں کی لیکن اداکاروں کے سامنے کہتے رہتے تھے کہ اگر میں چاہوں تو تم سب سے اچھی اداکاری کر سکتا ہوں۔

انور کمال پاشا کو اصل شہرت فلم '' غلام'' سے ملی۔ یہ بہت اچھے موضوع پر بنائی گئی تھی اور اس کی کہانی اور مکالمے بھی بہت اچھے تھے۔ یہ فلم 1953ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ''دلبر'' کے تجربے کی ناکامی کے بعد پاشا صاحب نے دوبارہ سنتوش کمار کو اپنی فلم میں ہیرو کے کردار میں لے لیا تھا۔ شمیم اداکاری ترک کر چکی تھیں اس لیے صبیحہ کو ہیروئن کاسٹ کیا گیا تھا۔ اس فلم میں راگنی اور شمی نے بھی کام کیا تھا۔ گویا اس میں بیک وقت تین ہیروئن تھیں۔ ایم اسماعیل نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ اپنے موضوع کے اچھوتے پن اور پرزور مکالموں کی خوبصورتی کے باعث 'غلام'' نے فلم بینوں اور نقادوں کو چونکا دیا اور پہلی بار انور کمال پاشا کا صحیح معنوں میں نوٹس لیا گیا۔

اس کامیابی نے پاشا صاحب کے حوصلے بھی بلند کر دیے اور ان کی خود پسندی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ لیکن چلتی کا نام گاڑی ہے۔ اب وہ ایک کامیاب مصنف اور اور ہدایتکار تھے اس لیے سبھی' دنیا کے دستور کے مطابق ان کے آگے پیچھے پھرنے لگے تھے۔ اگلے سال ان کی فلم '' گمنام'' ریلیز ہوئی جس نے دھومیں مچا دیں اور انور کمال پاشا کو پاکستان

کی فلمی صنعت کی ایک اہم اور قابل ذکر شخصیت کے طور پر مستحکم کر دیا۔گمنام میں صبیحہ کی اداکاری غضب کی تھی۔ کہانی اور مکالمے ایسے کہ دیکھنے والوں کو بھی یاد ہو گئے تھے۔ماسٹر عنایت حسین کی موسیقی نے اسے ایک انوکھا حسن عطا کر دیا تھا۔اس فلم میں سدھیر ہیرو تھے۔راگنی اور ایم اسماعیل صاحب نے بھی بہت اہم کردار ادا کئے تھے۔"گمنام" نے بڑی بڑی بھارتی فلموں کے مقابلے میں خود کو منوایا اور اس طرح انور کمال پاشا کے دور عروج کا آغاز ہوا۔انور کمال پاشا ایک لیجنڈ بن گئے۔ہدایت کاری میں بھی پہلی مرتبہ انہوں نے صحیح معنوں میں اپنا لوہا منوایا تھا۔اس لحاظ سے گمنام ان کے کیریئر کی یادگار فلم ہے۔اس فلم نے جہاں پاشا صاحب کو اعتماد اور کامیابی بخشی وہیں ان کی خود پسندی کو بھی بام عروج پر پہنچا دیا۔ باتیں وہ پہلے بھی بہت بڑھ بڑھ کر کیا کرتے تھے مگر اب کھلے عام بڑے بڑوں کا مضحکہ اڑانے لگے۔

سعادت حسن منٹو نے ان ہی دنوں ان کے بارے میں "ڈائریکٹر" میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان "لاؤڈ اسپیکر" تھا۔ منٹو صاحب بلا کے منہ پھٹ اور صاف گو تھے۔مگر اس طرح دوسروں کی دل آزاری نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اپنے مقابلے میں دوسروں کو کم تر بتاتے تھے۔اس مضمون میں انہوں نے فلمی اصلاح کے مطابق انور کمال پاشا صاحب کا "پھلکا" اڑا کر رکھ دیا تھا۔اس کا آغاز ہی انہوں نے یوں کیا تھا کہ دنیا کا دستور ہے کہ لوگ "پدرم سلطان بود" کے قائل ہیں اور فخریہ طور پر کہتے ہیں کہ میرا باپ بہت بڑا آدمی تھا۔مگر انور کمال پاشا کا معاملہ برعکس ہے۔وہ کہتے ہیں کہ میرا باپ تو گھسیارا تھا۔جو کچھ ہوں وہ میں ہوں۔

منٹو صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں یہ خاکہ تحریر کیا تھا اور انور کمال پاشا کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا تھا۔جو لوگ پاشا صاحب کی زبان کے گھائل تھے یا ان کی کامیابیوں کی وجہ سے حسد کرتے تھے انہیں یہ مضمون بہت پسند آیا۔پاشا صاحب نے بھی یہ مضمون پڑھا، ظاہر ہے کہ سرتاپا آگ بگولا ہو گئے مگر سامنے سعادت حسن منٹو جیسا بے باک' نڈر اور منہ پھٹ آدمی تھا جس کے قلم کا کاٹا پانی تک نہیں مانگتا تھا۔اس لیے اس توہین کو ہضم کر گئے مگر اس بات کو دل میں رکھ لیا۔

اسی زمانے میں سعادت حسن منٹو کو سید شوکت حسین رضوی نے شاہ نور اسٹوڈیو میں اسٹوری ڈیپارٹمنٹ میں رکھ لیا۔

ان کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا۔ صبح شوکت صاحب کی گاڑی منٹو صاحب کو ان کے فلیٹ سے لے کر اسٹوڈیو جاتی تھی اور شام کے وقت انہیں گھر چھوڑ آتی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پاشا صاحب ''گمنام'' کی کامیابی کے نشے میں چور تھے۔اس زمانے میں پاکستان میں فلم ساز ہی گنتی کے تھے اور کامیاب اور تسلسل کے ساتھ فلمیں بنانے والوں کا تو وجود ہی نہیں تھا۔انور کمال پاشا شاہ نور اسٹوڈیو میں فلمیں بنا رہے تھے جہاں ان کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ان کے پاس بہت بڑی امریکن کار تھی۔جب ان کی کار اسٹوڈیو میں داخل ہوتی تھی تو سارے اسٹوڈیو کو خبر ہو جاتی تھی اور سب لوگ اٹینشن ہو جاتے تھے۔اب اسی اسٹوڈیو میں سعادت حسن منٹو نے بھی ٹھکانا بنا لیا تھا۔ گویا ایک جنگل میں دو شیر دندنا رہے تھے۔

پاشا صاحب نے پہلے تو منٹو صاحب کی موجودگی کا نوٹس ہی نہیں لیا حالانکہ دل میں کھٹک تھی۔ادھر منٹو صاحب نے کبھی کسی کی پرواہی نہیں کی تھی' وہ پاشا صاحب کے کروفر سے بے نیاز اپنے معمولات میں مصروف رہا کرتے تھے۔ لیکن پاشا صاحب اپنے دل کی چبھن مٹانے کے بہانے ڈھونڈ رہے تھے۔وہ اپنی آئندہ فلم ''انتقام'' کی تیاریوں میں مصروف تھے جو ریلیز ہونے کے بعد ایک اور زبردست ہٹ فلم ثابت ہوئی۔

ایک روز منٹو صاحب اپنے کمرے کے سامنے دھوپ میں ٹہل رہے تھے کہ پاشا صاحب حسب معمول اپنے دو تین مصاحبوں کے ساتھ نمودار ہوئے۔ منٹو صاحب کو دیکھا تو ان کے پاس گئے۔علیک سلیک ہوئی۔اس کے بعد پاشا صاحب نے کہا'' منٹو صاحب۔میری کہانی میں ایک سچویشن پھنس گئی ہے۔اس سلسلے میں آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔''

منٹو صاحب نے جواب دیا'' میں کسی کو مفت مشورہ نہیں دیتا۔''

پاشا صاحب کا سرخ وسفید چہرہ اور زیادہ گلنار ہو گیا۔ غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کیا۔اپنے پیچھے کھڑے ہوئے پروڈکشن کنٹرولر کو اشارہ کیا جنہوں نے فوراً بریف کیس میں سے چیک بک نکال کر پاشا صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ پاشا صاحب نے کھڑے کھڑے پانچ سو روپے کا ایک چیک کاٹا اور منٹو صاحب کے حوالے کر دیا اور بولے'' اب تو آپ مشورہ دیں گے نا؟''

''ہاں۔اب بتائیے کیا مشکل ہے ؟''

پاشا صاحب نے انہیں کوئی سچویشن بتائی۔ منٹو صاحب نے کہا'' یہ تو کوئی ایسی پرابلم نہیں ہے'' اور وہیں کھڑے کھڑے تین چار حل بتادیے۔

پاشاصاحب نے شکریہ ادا کیااور رخصت ہو گئے مگر فلم میں منٹو صاحب کے مشورے کو کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔یہ تو بس بات کرنے کا ایک بہانہ تھا جسے منٹو صاحب کی حقیقت نے پروان نہ چڑھنے دیا۔

''انتقام'' ریلیز ہوئی اور گمنام سے بھی زیادہ کامیاب ہوئی۔اس کے نغموں کی بمبئی تک دھوم مچ گئی۔اب پاشا صاحب پاکستان کی فلمی دنیا کا سب سے بڑا نام بن چکے تھے۔پاشاصاحب کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ہمیں بھی ان سے واسطہ پڑااور انہیں نزدیک سے دیکھنے کا بھی موقع ملا۔یہ بیان پھر کبھی۔لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انور کمال پاشا نے پاکستان کی فلمی صنعت کی تعمیر میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔انہوں نے جو مقام' مرتبہ اور اہمیت حاصل کر لی تھی وہ ان کے بعد کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی۔ مستقبل میں تو کسی دوسرے انور کمال پاشا کے جنم لینے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔فلم بین ان کے مکالموں کے شیدائی تھے اور فلم کے دوران ہی سینما میں بلند آواز سے ان کے لکھے ہوئے فقروں پر داد دیا کرتے تھے۔ پاشاصاحب ایک زمانے میں اس قدر خود اعتمادی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے کہ کہانی تحریر کرتے وقت ہی بتادیا کرتے تھے کہ کن مکالموں پر تماشائی تالیاں بجائیں گے اور لوگ بلاشبہ ان ہی مناظر اور مکالموں پر بے تحاشہ داد دیا کرتے تھے۔

پاشاصاحب کے مکالموں میں گھن گرج اور ڈرامائی عنصر زیادہ تھا۔کسی حد تک اس پر تھیٹر کا رنگ بھی چھایا ہوا تھا۔وہ شوکت الفاظ کے قائل تھے۔ایسے فقرے تحریر کرتے تھے کہ عام فلم بین کے دل پر اثر کرتے تھے۔ ان کی فلم ''سرفروش'' میں انہوں نے ایک مکالمہ لکھا تھا جو سارے ملک میں مشہور ہو گیا۔ترقی پسند لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا لیکن عوام نے اس کی بے اندازہ داد دی۔منظر یہ تھا کہ فلم کے ہیرو سنتوس کمار رات کے وقت چوری کے ارادے سے ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں۔وہ تمام سامان پوٹلی میں باندھ لیتے ہیں کہ اچانک اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔وہ چوری کا مال ایک طرف رکھ کر وہیں نیت باندھ لیتے ہیں اور نماز پڑھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس اثنا میں

ہیروئن کی بھی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ چوری کا سامان بھی دیکھ لیتی ہے اور چور کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر بہت حیران ہوتی ہے۔ جب سنتوش کمار سلام پھیرتے ہیں تو وہ حیران ہو کر ان سے کہتی ہے " تم کیسے چور ہو۔ ایک طرف چوری کرتے ہو اور دوسری طرف نماز بھی پڑھتے ہو۔"

اس کے جواب میں سنتوش کہتے ہیں " چوری میرا پیشہ ہے اور نماز میرا فرض۔"

اس فقرے کی عام تماشائیوں نے تو بہت داد دی لیکن ترقی پسند لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ لیکن کسی نہ کسی حوالے سے سارے ملک میں اس کا چرچا ہو گیا۔ اس بات کو طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ انور کمال پاشا اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور نہ ہی سنتوش کمار اور فلم کی دوسری ہیروئن میناشوری بقید حیات ہیں لیکن آج کے دور میں اگر اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں تو آپ کو اس فقرے کے پیچھے پوشیدہ فلسفہ نظر آجاتا ہے۔ ہمارے آس پاس ہر طرف مسجدیں آباد ہیں۔ رمضان المبارک میں روزے داروں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ حج کے زمانے میں بہت بڑی تعداد میں لوگ فریضہ حج ادا کرنے جاتے ہیں۔ عمرہ کرنے والوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ جمعہ کے روز مسجدیں نمازیوں سے لبالب بھر جاتی ہیں۔ تبلیغی جماعتوں کے اجتماعات میں لاکھوں افراد شریک ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ہر طرف ملاوٹ 'دھاندلی' رشوت' چوری' ڈاکازنی اور بددیانتی کا دور دورہ ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر اتنے بہت سے نیک لوگوں کے ہوتے ہوئے معاشرے میں اتنی خرابیاں کیوں ہیں؟ اس کا جواب وہی ہے کہ آج ہم لوگ مذہبی فرائض کو مذہب تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ مذہب نے انسانوں کو بہتر انسان بننے کے سلسلے میں جو ہدایات دی ہیں ان پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ آج کے ماحول کو دیکھ کر انور کمال پاشا کے اس فقرے کی صداقت واضح ہو جاتی ہے کہ " چوری میرا پیشہ ہے اور نماز میرا فرض" یعنی بقول شاعر رند کے رند رہے' ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

انور کمال پاشا فلم بینوں اور عوام کے مزاج شناس تھے اسی لیے وہ ان کو خراج تحسین پیش کرتے تھے۔

صرف انور کمال پاشا کو پاکستان کے فلم سازوں اور ہدایت کاروں میں یہ خصوصیت حاصل تھی کہ ان کی فلم کے بارے میں لوگ یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے تھے کہ اس میں اداکار کون ہے؟ موسیقار کون ہے۔ وہ تو بس انور کمال پاشا کا نام دیکھ کر سینماؤں پر ٹوٹ پڑتے تھے اور سینما گھروں کے سامنے والی سڑکوں پر ٹریفک جام ہو جاتا

تھا۔ یہ مقام ہندوستان اور پاکستان کے اور کس فلم ساز کو حاصل ہوا؟ انور کمال پاشا کو بھی اپنے اس ’’ کرشمے‘‘ کا احساس ہو گیا تھا۔ ایک تو وہ تھے ہی خود پسند۔ جب کامیابیاں نصیب ہونے لگیں تو اور زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کرنے لگے۔ بڑے اداکاروں کو معاوضہ بھی زیادہ دینا پڑتا تھا جب کہ انور کمال پاشا کو یہ زعم تھا کہ فلم ان کے نام پر چلتی ہے۔ انہوں نے ایک بار زیادہ معاوضہ طلب کرنے کے باعث سنتوش کمار اور صبیحہ خانم کو اپنی فلم میں کاسٹ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور ان کے بجائے نئے اور نو آموز اداکاروں کو آزمایا۔ انہوں نے اپنی پنجابی فلم ’’ چن ماہی ‘‘ میں ایک بالکل نئی ہیروئن کو متعارف کرا دیا۔ یہ اداکارہ بہار تھیں جو بعد میں ایک مشہور اور کامیاب ہیروئن بن گئی تھیں۔ اس فلم کے ہیرو اسلم پرویز تھے۔ اس وقت تک اسلم پرویز کو ہیرو کے طور پر کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔
نامور اداکاروں کو نظر انداز کر کے بالکل نئی کاسٹ سے فلم بنانا ہر زمانے میں بڑے دل گردہ کی بات سمجھی گئی ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ پاشا صاحب کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی کا، خوش فہمی کا شکار ہو گئے ہیں اور کوئی ان کی فلم دیکھنے ہی نہیں جائے گا۔ مگر جب ’’ چن ماہی‘‘ ریلیز ہوئی تو تماشائی سینماؤں پر ٹوٹ پڑے۔ اور یہ فلم ہٹ ثابت ہوئی۔ اس فلم سے انور کمال پاشا نے اپنی ذات کو منوا لیا اور پھر جب تک ان کا زوال شروع نہیں ہوا۔ ان کا نام ہی سند کے طور پر معتبر سمجھا جاتا رہا۔
پاشا صاحب صحیح معنوں میں ایک ’’شومین‘‘ تھے اور اس زمانے میں پاکستان کے سب سے بڑے ’’ شومین‘‘ تھے۔ کسی نہ کسی حوالے سے وہ ہر وقت خبروں میں رہتے تھے۔ حاسد اور ان کی کامیابی سے جلنے والے بھی کم نہیں تھے اور پھر پاشا صاحب اپنی باتوں کی وجہ سے بھی فلمی حلقوں میں زیر بحث رہا کرتے تھے۔ وہ پھبتی کسنے اور فقرہ چست کرنے میں ماہر تھے۔ لیکن ان کی گفتگو میں غرور اور خود پسندی کا عنصر زیادہ ہو گیا تھا جو لوگوں کو پسند نہیں تھا۔ لاڈلے تو وہ بچپن ہی سے تھے مگر فلموں میں کامیابیاں اور شہرت حاصل کرنے کے بعد آس پاس کے لوگوں اور ضرورت مندوں نے انہیں خوشامند پسند بھی بنا دیا تھا۔ ان کو بھی ایسے ہی لوگ زیادہ پسند آتے تھے جو چاپلوسی اور خوشامند میں دوسروں سے بڑھ کر ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے یونٹ کے بہت سے لوگ محض انہیں خوش کرنے کے لیے ان کی ہر بات میں ہاں میں ہاں ملاتے رہتے تھے اور انہیں یقین دلاتے رہتے تھے کہ ان سے بڑھ کر تو کیا ان کے مقابلے کا بھی

کوئی دوسرا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ پاکستان کی فلمی صنعت کی شاید ہی کوئی قابل ذکر ہستی ایسی ہو جس کا انہوں نے مذاق نہ اڑایا ہو اور اس کے بارے میں ریمارکس نہ پاس کئے ہوں۔ جب وہ بولنے پر آتے تھے تو مسلسل بولتے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے رفتہ رفتہ ان پر ایک خمار سا طاری ہو گیا تھا۔ پھر وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ سامنے کون بیٹھا ہے اور نہ یہ سوچتے تھے کہ ان کی باتیں کسی پر کیا اثر کریں گی؟

جب بمبئی سے ضیا سرحدی پاکستان آئے تو ان کا بہت شہرہ تھا۔ اپنی فلم "ہم لوگ" کی وجہ سے وہ سارے برصغیر میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اس فلم سے پہلے بھی مصنف کے طور پر انہیں ایک بلند مقام حاصل تھا۔ بمبئی سے پاکستان آنے سے پہلے وہاں ان کی آخری فلم "فٹ پاتھ" تھی جس میں دلیپ کمار ہیرو تھے لیکن یہ فلم ناکام ہو گئی تھی۔

ایک دن پاشا صاحب کے سامنے ضیا سرحدی کا تذکرہ ہوا اور ایک صاحب نے ان کی بہت تعریف کی۔ پاشا پہلے تو سنتے رہے پھر بولے "واقعی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ضیا سرحدی بہت بڑے رائٹر اور ڈائریکٹر ہیں۔ جو شخص دلیپ کمار جیسے شخص کو ہوٹ کرا دے اس سے بڑا اور کون ہو سکتا ہے؟"

ان کے فقروں اور زہر بھرے تبصروں سے فلمی صنعت کا کوئی بھی شخص محفوظ نہیں تھا۔ ایک بار ایک ہی کہانی پر پاشا صاحب اور منشی صاحب دونوں مقابلے میں فلم بنا رہے تھے۔ پاشا صاحب نے کہا "منشی صاحب میرے مقابلے میں کیا فلم بنائیں گے وہ تو خود تقسیم کاروں اور فلم سازوں کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں جب کہ میں نے اپنی خوشامد کرانے کے لیے تنخواہ دار لوگ رکھے ہوئے ہیں۔"

ایک بار پرانے ایورنیو اسٹوڈیو میں ہمارا جانا ہوا۔ نہر کے کنارے پہلے پنچولی اسٹوڈیو تھا۔ بعد میں اسے آغا جی اے گل نے کرائے پر حاصل کر کے اس کا نام ایورنیو اسٹوڈیو رکھ دیا تھا۔ جب انہوں نے ملتان روڈ پر اپنا نیا اور شاندار اسٹوڈیو بنایا تو اسے بھی ایورنیو اسٹوڈیو کا نام دیا جو کہ ان کے ادارے کا پرانا نام تھا۔ اس طرح پہلے والا اسٹوڈیو "پرانا ایورنیو" کہلانے لگا۔ اس زمانے میں پاشا صاحب اسی اسٹوڈیو میں اپنی فلمیں بنا رہے تھے۔ ہم چند دوستوں کے ساتھ وہاں پہنچے تو دروازے پر سبطین فضلی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی اندر داخل ہوئے۔ وہاں صحن میں پاشا صاحب کا "دربار" لگا ہوا تھا۔ ان کے عملے کے لوگ ان کے چاروں طرف بیٹھے پاشا صاحب کی باتیں سن رہے تھے۔

ہم لوگ نزدیک پہنچے تو سبطین فضلی صاحب کی عظمت اور احترام کے پیش نظر چند لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پاشا صاحب بدستور کرسی پر بیٹھے رہے۔ جب علیک سلیک کے بعد سبطین فضلی صاحب اور ہم لوگ بیٹھ گئے تو پاشا صاحب اپنے اسٹاف کے ان لوگوں سے مخاطب ہوئے جو احتراماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور بولے " تنخواہ تو میں تم کو دیتا ہوں اور تم دوسروں کے احترام میں اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہو۔"

سبطین فضلی صاحب بہت وضع دار اور خوش اخلاق انسان تھے مگر یہ فقرہ سن کر ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہم لوگوں کو بھی پاشا صاحب کی یہ بات پسند نہ آئی اس لیے ان کی چائے کی دعوت کے باوجود شکریہ کر کے چلے آئے۔

ہم نے بتایا ہے کہ پاشا صاحب بہت بڑے " شومین " تھے۔ وہ پبلسٹی کا فن جانتے تھے۔ ان کی فلم شروع ہوتے ہی ان کے بیانات اور انٹرویوز کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جن میں وہ کہتے تھے کہ اگلی فلم ان کی بہترین فلم ہو گی۔ وہ شاندار سیٹ لگواتے تھے اور ہر طرف ان کی زیر تکمیل فلم کا چرچا رہتا تھا۔ فلم کی ریلیز کے موقع پر ڈھول تاشے بجاتے ہوئے تانگوں پر سوار لوگ اس فلم کے سائن بورڈ لگا کر سارے شہر میں گشت کرتے تھے۔ جس دن فلم نمائش کے لیے پیش کی جاتی تھی اس روز ان کے اسٹاف کے لوگ ہار پھول اور آتش بازی کے گولے لے کر سینما پہنچ جاتے تھے۔ ادھر فلم ختم ہوتی اور لوگ " واہ واہ۔ کیا بات ہے ' کہتے ہوئے باہر نکلتے اور ادھر گولے چلنے شروع ہو جاتے اور دور دور تک فضا دھماکوں سے گونج اٹھتی۔ سب کو پتا چل جاتا کہ پاشا صاحب کی فلم ریلیز ہوئی ہے اور ہٹ ہو گئی۔ پاشا صاحب سنیما سے باہر نکلتے تو انہیں پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا جاتا اور جلوس کی صورت میں دفتر تک لے جایا جاتا تھا۔ تماشائیوں کا ہجوم بھی اس میں شامل ہو جاتا۔ فلم کے بہت سے اداکار بھی اس موقعے پر موجود رہا کرتے تھے۔

پاشا صاحب کے ستارے عروج پر تھے۔ اس لئے صرف لاہور ہی نہیں سارا پاکستان انور کمال پاشا کا دیوانہ تھا۔ مگر جب ستاروں نے رخ پھیرا تو کامیابی نے بھی منہ موڑ لیا اور پھر یکے بعد دیگرے ان کی فلمیں فلاپ ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ بطور ہدایت کار دوسرے فلم سازوں کے لیے فلمیں بنانے لگے مگر کوئی فلم کامیاب نہ ہو سکی۔

آغا جی اے گل کی فلم "محبوب" کے وہ ہدایت کار تھے۔ اس فلم میں رانی کو پہلی بار پیش کیا گیا تھا۔ شمیم آرا اس کی

ہیروئن تھیں۔ فلم میں سبھی بڑے اسٹارز اور موسیقار موجود تھے مگر پاشا صاحب کے دن بدل گئے تھے اس لئے فلاپ ہو گئی۔

ان کی آخری فلم غالباً پنجابی فلم ''آخری بلٹ'' تھی جو خالی کارتوس ہی ثابت ہوئی۔ پاشا صاحب اس کے بعد منصوبے ہی بناتے رہے فلم نہ بنا سکے۔

ہم نے پاشا صاحب کے انتہائی عروج کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔اسٹوڈیو میں ان کی کار داخل ہونے سے پہلے ان کا عملہ اطلاع کر دیتا تھا ''میاں صاحب یا پاشا میاں'' آرہے ہیں۔ سب مؤدب کھڑے ہو جاتے۔ وہ اندر داخل ہوتے تو ہر طرف ہٹو بچو کا شور مچ جاتا۔ ہر ایک کی نگاہ ان کی طرف ہوتی تھی۔ سب کو خبر ہو جاتی تھی کہ پاشا صاحب آرہے ہیں۔ آخری دنوں میں ہم نے یہ منظر بھی دیکھا کہ ایورنیو اسٹوڈیو میں معمول کے مطابق لوگوں کا ہجوم ہے۔ پاشا صاحب چپ چاپ ان ہی لوگوں کے درمیان میں سے نکل کر جا رہے ہیں اور کوئی پلٹ کر نہیں دیکھتا۔

ان کی تین چار فلمیں فلاپ ہونے کے بعد ایک بار ان کی نئی فلم کے گانے کی صدابندی کے موقعے پر ہم بھی موجود تھے۔ جیسے ہی گانے کی ٹیک ختم ہوئی ہر طرف ''واہ واہ'' کا شور مچ گیا۔ جسے دیکھئے پاشا صاحب کو بڑھ بڑھ کر مبارک باد پیش کر رہا تھا۔ موسیقار سے لے کر سازندوں تک سبھی ''بہترین'' کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ پاشا صاحب نے سب کو خاموش کر دیا اور کہا ''چپ ہو جاؤ۔ بند کرو یہ فضولیات۔ ہر گانے اور ہر فلم پر تم اسی طرح تعریف کرتے ہو مگر فلم فلاپ ہو جاتی ہے۔ مجھے پتا ہے کہ تم سب خوشامدی ہو۔''

مگر افسوس کہ پاشا صاحب کو یہ راز بہت دیر بعد معلوم ہوا۔ اس کے بعد تقدیر کے جھٹکوں نے انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

پاشا صاحب اپنی بعض بشری کمزوریوں کے باوجود ایک انتہائی ذہین اور باصلاحیت آدمی تھے۔ خوش شکل، خوش لباس اور جب جی چاہتا تو بے حد خوش اطوار۔ ہمارا بھی ان سے پہلے بطور صحافی اور بعد میں مصنف کے طور پر واسطہ پڑا۔

اس سے پہلے سبطین فضلی صاحب کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ وہ کئی سال قبل مرحوم ہو چکے ہیں۔ بہت باغ و بہار قسم کے آدمی تھے۔ انتہائی خوش اخلاق، خوش گو اور خوش لباس۔ بہت خاندانی آدمی تھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے۔ قیام

پاکستان سے پہلے ہی سبطین فضلی اوران کے بھائی حسنین فضلی نے کلکتہ میں ایک فلم سازادارہ ""فضلی برادران"" کے نام سے قائم کیا تھااور بہت ہٹ فلمیں بنائی تھیں۔ ""قیدی' چورنگ، عصمت"" وغیرہ ان کی مشہور فلموں میں شمار ہوتی ہیں۔ فضلی برادرز عموماً معاشرتی موضوعات پر مسلم سوشل فلمیں بناتے تھے جو ہندوستان کے مسلمانوں کو تو پسند آتی ہی تھیں' دلچسپی اور معیار کی وجہ سے ہندو بھی انہیں بہت ذوق و شوق سے دیکھتے تھے۔ان کے سب سے بڑے بھائی فضل احمد کریم فضلی تھے۔وہ بھی بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھے اور قیام پاکستان سے پہلے انڈین سول سروس میں تھے۔پاکستان بننے کے بعد یہاں آگئے اور بہت اعلیٰ عہدوں پر کام کرتے رہے۔وہ بہت اعلیٰ ادبی ذوق کے مالک تھے۔ بہت اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔مشرقی پاکستان کے پس منظر میں انہوں نے ایک ناول بھی لکھا تھا جسے اپنے موضوع اور معیار کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔فضل کریم فضلی صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے فنون لطیفہ کے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر کراچی میں ایک فلم سازادارہ قائم کیا اور "" چراغ جلتا رہا"" بنائی۔اس کی کہانی' مکالمے اور گانے ان ہی کے تحریر کردہ تھے۔اس فلم کی قابل ذکر خوبی یہ ہے کہ اس میں زیبا' محمد علی اور دیبا کو پہلی بار متعارف کرایا گیا تھا۔اس فلم کے ہیرو طاہر تھے اور محمد علی نے اس میں ویلن کا کردار ادا کیا تھا مگر قسمت کی بات دیکھئے کہ محمد علی بعد میں بڑے ہیرو بن گئے اور ""چراغ جلتا رہا"" کے ہیرو کے نام سے آج کوئی بھی واقف نہیں ہے۔

فضل کریم فضلی کے بھائی حسنین فضلی نے کراچی میں ""وفا"" کے نام سے ایک فلم شروع کی تھی کہ اس کے دوران میں ان کا انتقال ہو گیا۔سبطین فضلی لاہور میں رہتے تھے جہاں انہیں ایک سنیما میں حصہ الاٹ ہوا تھا۔فلیٹ بھی ملا تھا۔معاش کی طرف سے بے فکری تھی اس لئے وہ منصوبے زیادہ بناتے رہے۔فلمیں صرف تین ہی بنائیں۔ان کی پہلی فلم "" دوپٹہ"" تھی جس میں نور جہاں کے ساتھ ایک نئے ہیرو کو اجے کمار کے نام سے پیش کیا گیا تھا۔سدھیر اور زرینہ ریشماں نے بھی اس فلم میں کام کیا تھا۔ فیروز نظامی نے اس فلم کی موسیقی ترتیب دی تھی۔یہ فلم 1952ء میں ریلیز ہوئی تھی اور بے حد کامیاب رہی تھی۔وسائل اور دیگر سہولتوں کے فقدان کے باوجود یہ بہت معیاری فلم تھی۔اس فلم کی ریلیز کے بعد بمبئی کے فلم اخبارات نے لکھا تھا کہ انڈیا کے فلم سازوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے کیونکہ

پاکستان میں ''دوپٹہ'' جیسی فلمیں بننے لگی ہیں۔ یہ فلم بھارت میں بھی بھیجی گئی تھی مگر متعصب ہندوؤں نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اس سنیما میں آگ لگادی جہاں یہ فلم ریلیز ہوئی تھی اور دھمکی دی کہ سارے بھارت میں جہاں بھی اس کی نمائش ہوگی اس سنیما کو جلادیا جائے گا۔ اس طرح بھارت میں پاکستانی فلموں کی نمائش کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کردیا گیا لیکن بھارت کے فلم ساز ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ ان کی فلمیں پاکستان میں درآمد ہوں اور وہ یہاں سے دولت کمائیں۔ یہاں انہیں اپنے منصوبوں کو آگے بڑھانے کے لئے لالچی اور مفاد پرست عناصر بھی مل جاتے تھے۔ جو لوگ پاکستان میں بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندیوں کے خلاف بولتے ہیں انہیں یہ علم نہیں ہے کہ یہ مسئلہ دراصل کیا ہے۔ پاکستانی فلم ساز ہمیشہ یہی مطالبہ کرتے رہے کہ اگر بھارتی فلمیں پاکستان آئیں تو پاکستانی فلمیں بھی بھارت جائیں مگر بھارتی فلم ساز یک طرفہ کاروبار کے قائل رہے ہیں۔

''دوپٹہ'' کے بعد اگر پاکستانی فلمیں بھارت جانے لگتیں تو پاکستان کی فلمی صنعت کا حلیہ ہی بدل جاتا۔ دراصل اس وقت صحیح معنوں میں پاکستانی فلم سازوں میں مقابلے کا جذبہ اور بہترین فلمیں بنانے کا احساس پیدا ہوتا۔ پاکستان میں بھارتی فلموں کی درآمد سے یہ مقصد حل نہیں ہو سکتا تھا۔

دوپٹہ کے زمانے میں نور جہاں اپنے شباب پر تھیں۔ اداکاری بھی انہوں نے بہت اچھی کی تھی۔ فضلی صاحب کی ہدایت کاری بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ اس فلم کے نغمے آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں۔

چاندنی راتیں

سب جگ سوئے ہم جاگیں

تاروں سے کریں باتیں

اسی فلم کا نغمہ ہے۔ اس فلم کے نغمات مشیر کاظمی نے لکھے تھے۔ نغمات اچھے لکھتے تھے مگر انہیں زیادہ کام نہ مل سکا۔ اس گانے کی شان نزول وہ یہ بتاتے تھے کہ سخت کڑکی اور مفلسی کے دن تھے۔ یہاں تک کہ فاقہ کشی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ گرمیوں کی چاندنی رات تھے۔ وہ صحن میں چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ بھوک کے مارے نیند آنکھوں سے دور تھی اور وہ کروٹیں بدل رہے تھے۔ اس عالم میں ان کے دل کی آواز ان اشعار کے ذریعے ان کی زبان پر آگئی۔

چاندنی راتیں
سب جگ سوئے ہم جاگیں
تاروں سے کریں باتیں

ان کے ان ہی جذبات کا عکاس نغمہ تھا۔ صبح تک سارا نغمہ مکمل ہو گیا۔ وہ یہ گیت لے کر فضلی صاحب کے دفتر میں پہنچ گئے۔ انہوں نے گیت سنا اور بہت پسند کیا۔ اس گیت کا معاوضہ انہیں پچاس روپے ملا تھا۔

مشیر کاظمی بہت دلچسپ آدمی تھے۔ شاعر بھی اچھے تھے۔ مگر ساری زندگی پریشان ہی رہے۔ آخر ایک بار انہوں نے کوشش کر کے ایک فلم بھی بنا ڈالی مگر وہ بھی فلاپ ہو گئی۔ ایوب خان کے دور میں انہوں نے ایوب خان کی حمایت میں ایک نظم لکھی تو ان کی نظروں میں آ گئے۔ اس کے بعد ایوب خان کے جلسوں میں انہیں بطور خاص بلوایا جاتا تھا۔ انہوں ے ایک پلاٹ بھی انہیں دے دیا تھا اس طرح قدرے فارغ البالی نصیب ہو گئی ورنہ زندگی بھر پریشان ہی رہے۔ لیکن بہت ہنس مکھ اور یار باش آدمی تھے۔ ہر وقت ہنستے ہی رہتے تھے۔ اپنی پریشانیاں کسی کو نہیں سناتے تھے۔

جس زمانے میں بھارتی فلم ''جال'' کی درآمد کے خلاف پاکستانی فلمی صنعت نے مہم شروع کی تو سبھی قابل ذکر ممتاز اداکار' ہدایت کار اور فلم ساز گرفتار کر لیے گئے تھے۔ درجہ دوئم اور سوئم کے لوگ باہر رہ گئے تھے جو لکشمی چوک میں جلوس نکالتے رہتے تھے۔ ہم اس زمانے میں روزنامہ ''آثار'' میں تھے۔ یہ دراصل ''زمیندار'' پر بندش اور اس کے ایڈیٹر اختر علی خاں کے جیل جانے کے بعد اختر علی خاں کے بیٹے اور مولانا ظفر علی خاں کے پوتے منصور علی خان نے اس نام سے نکالا تھا۔ ظہور الحسن ڈار اس کے ایڈیٹر اور ہم جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ ہم دونوں کی ہمدردیاں ظاہر ہے کہ فلم انڈسٹری کے ساتھ تھیں مگر اخبار کی پالیسی ''جال'' کے حق میں تھی کیونکہ تقسیم کاروں سے بھارتی فلموں کے بڑے بڑے اشتہار ملتے تھے۔ اب یہ ہوتا کہ اداریے میں ''جال'' کی درآمد کی حمایت کی جاتی مگر ہمارے کالم میں اس کی مخالفت ہوتی تھی۔

ایک روز دوپہر کو ''زندہ باد'' اور ''مردہ باد'' کے نعرے بلند ہونے لگے۔ چپڑاسی نے آ کر بتایا کہ فلم والوں کا جلوس

آرہا ہے۔ منصور علی خاں تو گھبرا ہی گئے۔ فوراً دفتر کے دروازے بند کرنے کی ہدایت کی اور پولیس کو فون کرنے بیٹھ گئے۔ ہم نے انہیں تسلی دی اور سمجھایا کہ فکر نہ کریں۔ کچھ نہیں ہو گا۔ ہم دفتر کے برآمدے میں گئے تو دیکھا کہ سڑک کی دوسری جانب بیس پچیس آدمی کھڑے "آثار" کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں۔ اس جلوس کے قائد مشیر کاظمی تھے۔ ہمیں دیکھا تو دور ہی سے ہاتھ ہلا کر علیک سلیک کی۔ ہم نے جواب میں انہیں آنے کا اشارہ کیا تو وہ اپنے ساتھیوں کو یہ بتا کر کہ میں جا کر مذاکرات کرتا ہوں' ہمارے پاس آگئے۔ دفتر کے اندر ہم نے چائے سگریٹ پیش کی۔ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ کچھ کھانے کو بھی مل جائے تو منگا لیں۔ ہم نے بن مکھن منگایا اور کھلایا۔ وہ کھا پی کر اپنے "عوام" میں پہنچ گئے اور کہا کہ آئندہ یہ اخبار ہماری مخالفت میں نہیں لکھے گا۔ میں ایڈیٹروں سے بات چیت کر کے آیا ہوں۔

ان ہی مشیر کاظمی کا ایک اور لطیفہ بھی ہے۔ ایک فلم ساز نے بھارتی فلم کا چربہ بنایا اور مشیر کاظمی سے کہا کہ اس کے گانوں کا بھی چربہ کر دو۔ مشیر کاظمی نے بہتیرا کہا کہ میں اس سے اچھے گانے لکھ دوں گا مگر فلم ساز نہ مانا۔ بے چارے شاعر نے پیٹ کی خاطر ان ہی گیتوں کو الٹ پلٹ دیا۔ بھارتی گیت کے بول یہ تھے۔

ایک پیسہ دے دے بابو۔۔۔۔۔۔ او جانے والے بابو ایک پیسہ دے دے۔

مشیر کاظمی نے اسے یوں کر دیا۔

ایک آنہ دے دے بابو

ایک آنہ دے دے

فلم ساز نے اسی دھن میں گیت ریکارڈ کر لیا۔ فلم ریلیز ہوئی تو سب دوستوں نے مشیر کاظمی کو پکڑ لیا اور بہت شرمندہ کیا کہ یار ہو بہو چربہ کر دیا۔ شرم کرو۔

مشیر کاظمی بولے "بھئی آپ لوگ بھی کمال کرتے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ یہ گیت ہو بہو چربہ ہے۔ بھائی آپ کو آنے اور پیسے کا بھی علم نہیں ہے۔ پورے تین پیسوں کا فرق ہے۔"

کئی سال ہوئے مشیر کاظمی کا انتقال ہو گیا۔ فلمی صنعت اور شاعری سے انہیں عمر بھر کچھ نہ ملا۔

دیکھئے ''دوپٹہ'' اور فضلی صاحب کے تذکرے سے بات کہاں پہنچ گئی۔

سبطین فضلی صاحب بذات خود بہت خوش اطوار' خوش گفتار اور رومان پرست آدمی تھے۔ آزاد خیال بھی تھے۔اور اپنے خیالات کا بلا جھجک اظہار کر دیتے تھے۔ بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ بڑے اطمینان سے رئیسانہ انداز میں کام کرنے کے عادی تھے۔ جن دنوں ان کی فلم بن رہی ہوتی وہ ہر چیز کو فراموش کر کے باتیں کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ باتیں بہت دلکش انداز میں اور آہستہ آہستہ کرتے تھے۔ ہنستے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے اور ہنستے اور ٹہلتے ہوئے باتیں شروع کر دیتے۔اگر کندھے پر انہوں نے ہاتھ رکھ دیا تو سمجھ لیجئے کہ ایک گھنٹے سے پہلے نہ وہ ہاتھ اٹھائیں گے ،نہ باتوں کا سلسلہ ختم کریں گے۔اس زمانے ہیں یہ منظر عام تھا کہ سیٹ پر شوٹنگ کی تیاری مکمل ہوتی تھی مگر فضلی صاحب باتوں اور گپ شپ میں مصروف رہتے۔اسسٹنٹ بار بار آکر دبی زبان میں بتاتا'' سر۔شاٹ تیار ہے، آرٹسٹ بھی ریڈی ہیں۔''

فضلی صاحب بڑے اطمینان سے کہتے۔ ''اچھا اچھا بھئی۔ جلدی کس بات کی ہے۔ شاٹ بھی لے لیں گے۔'' مگر سارا وقت نکل جاتا اور شاٹ نہ ہوتا۔ فضلی صاحب مسکرا کر کہتے ''کوئی بات نہیں کل شاٹ لے لیں گے۔''

یہ رئیسانہ ٹھاٹ باٹ پاکستان کی مختصر سی بے سروسامان فلمی صنعت میں نہیں چل سکتا تھا۔نہ ہی پاکستان میں بنائی جانے والی فلموں کے طریقہ کار کو سبطین فضلی صاحب اپنا سکتے تھے۔اس لئے بھی وہ فلم سازی نہ کر سکے۔ نئی نسل کے ہدایت کاروں کو تیزی اور برق رفتاری سے مشکلات کے باوجود کام کرتے ہوئے دیکھتے تو کہتے ''بھئی آپ لوگ پتا نہیں ایسے حالات میں اتنی اچھی فلمیں کیسے بنا لیتے ہیں؟''

دوسروں کی خوبیوں کی داد دینے میں ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ان دنوں محفل آرائیاں بھی خوب ہوا کرتی تھی اور بہت رونق رہتی تھی۔

فضلی صاحب نے دوسری فلم سدھیر کے اشتراک سے بنائی تھی۔اس کا نام ''آنکھ کا نشہ'' تھا اور یہ بھی بہت معیاری فلم تھی اس فلم کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس میں پاکستان کی دو صف اول کی ہیروئنوں نے ایک ساتھ کام کیا تھا۔ صبیحہ خانم اور مسرت نذیر کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی محفل میں ان میں سے ایک موجود ہوتی تو دوسری ہیروئن اس محفل میں

قدم نہیں رکھتی تھی مگر سدھیر صاحب نے خدا جانے کیا جادو پڑھ کر پھونکا کہ وہ دونوں ایک ہی فلم میں کام کرنے پر آمادہ ہو گئیں اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسرت نذیر نے اس فلم میں جوانی سے بڑھاپے تک کا کردار کیا تھا حالانکہ وہ اس زمانے میں بہت مقبول ہیروئن تھیں۔ یہ بہت معیاری فلم تھی اور بہت پسند کی گئی تھی۔

فضلی صاحب کی آخری فلم "تصویر" تھی جو کسی اعتبار سے بھی ان کے معیار۔۔۔۔۔۔ کی نہ تھی۔ فضلی صاحب نے اس کے بعد کوئی فلم نہیں بنائی بلکہ دل برداشتہ ہو کر فلم بنانے سے ہی تائب ہو گئے۔ غم روزگار سے آزاد تھے۔ قناعت پسند بھی تھے۔ بس جو بھی اللہ نے دے رکھا تھا اسی پر مطمئن تھے اور آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ بہت فن کارانہ مزاج کے مالک تھے۔ اپنی فلموں کا اسکرین پلے بھی خود ہی لکھتے تھے اور اس کام میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ اگر وہ پاکستان میں فلمیں بناتے تو بہت سے نئے ہدایت کار جنم لے سکتے تھے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ انہوں نے' شوکت حسین رضوی نے اور ڈبلیو زیڈ احمد جیسے ہنر مندوں نے پاکستان آکر اپنا کام ہی چھوڑ دیا تھا ورنہ یہ لوگ پاکستان کی فلمی صنعت کا حلیہ اور انداز بدل کر رکھ سکتے تھے۔

فضلی صاحب کی فلم "دوپٹہ" بہت خراب حالات میں بنی تھی۔ اس وقت تو پاکستان کی فلمی صنعت کے پاس کچھ بھی نہیں تھا مگر فضلی صاحب نے اتنی اعلیٰ معیار کی فلم بنائی کہ بھارت کے فلم سازوں کو بھی حیران اور پریشان کر دیا۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے ہنر مند ہدایت کار تھے۔ اداکاروں سے کام لینے اور مناظر میں جان ڈالنے کا فن جانتے تھے۔

انہوں نے ہیرو کا نام اجے کمار رکھا تو ہم نے ان سے پوچھا۔ "فضلی صاحب۔ آپ نے ایک مسلمان کا ہندوانہ نام کیوں رکھ دیا؟"

وہ کچھ پریشان ہو گئے' کہنے لگے۔ "بھئی کیا کریں' بس ایسا ہی رواج ہے۔"

ہم نے کہا "یہ تو بھارت کا رواج ہے۔ ہم پاکستانی ہیں۔"

ہنس کر کہنے لگے۔ "اب تو خیر ہو گیا۔ اگلی بار خیال رکھیں گے۔"

نام رکھنا بھی فلمی دنیا میں بھیڑ چال کے ضمن میں آتا ہے۔ پاکستان بن گیا مگر شاہ زمان نے اپنا نام سدھیر رکھ لیا۔ موسیٰ رضا' سنتوش کمار بن گئے۔ عشرت حسین' درپن کہلائے۔ حالانکہ یہ سب کٹر پاکستانی تھے مگر بس بھیڑ چال۔

ایک بار ہم نے اسی زمانے میں سنتوش کمار صاحب سے کہا۔ ''سنتوش صاحب' اچھا بھلا نام ''موسیٰ'' چھوڑ کر آپ سنتوش کمار کیوں بن گئے ؟''

بولے۔ ''مولانا(یہ ان کی عادت تھی) دراصل بمبئی میں کام شروع کیا تھا۔ انہوں نے سنتوش کمار نام رکھ دیا۔''

ہم نے کہا'' تو کیا پاکستان آنے کے بعد نام بدلنے پر پابندی تھی' آپ نے ان لوگوں کو ''وچن'' دے رکھا تھا؟''

ہنسنے لگے۔ بولے ''یار اب رہنے دو۔ کیوں شرمندہ کرتے ہو۔ اب تو اس نام کو بہت دن ہو گئے ہیں۔ یہی چلنے دو۔''

مگر درپن صاحب نے یہ جرات دکھائی کہ اپنا اصلی نام عشرت اپنایا مگر کچھ عرصے بعد بمبئی سے واپس آئے تو ''درپن'' بن کر آئے۔ اس زمانے میں یہ تصور عام تھا کہ ہندوانے نام لوگ زیادہ پسند کرتے تھے اور یہ خوش نصیبی لاتے تھے۔ ہندوستان میں مسلمان ایکٹر اور ایکٹریس مصلحتاً بھی ہندوانے نام رکھا کرتے تھے تاکہ ہندو فلم بین تعصب کی وجہ سے ان کا بائیکاٹ نہ کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ یوسف خاں دلیپ کمار بن گئے۔ ممتاز نے مدھو بالا کا نام اختیار کر لیا۔ مختار مینا کماری بن گئیں مگر اسی زمانے میں دلیپ کمار کے بھائی ناصر خاں نے اپنا نام ترک نہیں کیا اور بہت مقبول ہیرو بن گئے۔ پاکستان میں بھی اسلامی ناموں کا رواج عام ہو گیا۔ یوسف خاں' کمال' حبیب' وحید مراد سبھی نے مقبولیت حاصل کی۔ یہاں تک کہ محمد علی بھی اسٹار بن گئے۔

فضلی صاحب کی ایک عادت نرالی تھی۔ وہ کئی گھنٹے غسل خانے میں وقت گزارتے تھے۔ ان کا غسل خانہ بھی نہایت صاف شفاف اور آراستہ تھا' خوشبوؤں سے مہکتا رہتا تھا۔ اسی جگہ وہ اخبار کا مطالعہ کرتے تھے' کتابیں پڑھتے تھے' اسکرپٹ پر غور کرتے تھے' خط و کتابت کرتے تھے۔ ان کاموں میں وقت تو لگتا ہے۔ فضلی صاحب کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع تھا۔ خوش لباس اور خوش گفتار آدمی تھے۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ 1970ء کی دہائی کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ شبنم کے گھر ایک پارٹی تھی۔ لاہور کی فلمی دنیا کے سبھی قابل ذکر لوگ موجود تھے۔ شبنم نے ایک نیا کھیل متعارف کرایا تھا۔ یہ میوزیکل چیئر کی قسم کا تھا۔ میوزک بجائی جاتی تھی اور لوگ خالی کرسیوں کے ارد گرد چکر لگانے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اچانک میوزک بند ہونے پر ہر ایک کو کرسی پر بیٹھنا ہوتا تھا۔ ایک کرسی کم ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص بیٹھنے سے رہ جاتا تھا۔ اس شخص کو سب مل کر سزا سناتے تھے۔ مثلاً یہ کہ گانا سناؤ' ناچو'

بلی یا کتے کی آواز نکالو۔ وغیرہ۔ ایک صاحب کو یہ سزا دی گئی کہ اپنی بیگم کے جوتے اپنے رومال سے صاف کرو۔ ایک مرتبہ فضلی صاحب اس کھیل میں بیٹھنے سے رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ انہیں سزا سنائی جاتی انہوں نے کوٹ کی جیب سے ریشمی رومال نکال کر اپنی بیگم کے جوتے صاف کرنے شروع کر دیے۔ سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ فضلی صاحب نے سب کو ہنستے ہوئے دیکھا تو معصومیت سے پوچھنے لگے۔ "کیا کوئی غلطی ہو گئی؟ کسی اور کے جوتے صاف کرنے تھے؟"

فضلی صاحب نے تمام زندگی بڑے عیش اور آسائش سے گزاری مگر آخری ایام میں مالی پریشانیوں کا شکار ہو گئے تھے۔ انہوں نے طویل بیماری بھی اٹھائی۔ یہاں تک کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ ان جیسے خوش لباس اور مجلسی شخص کو ایک بستر پر سفید چادر کے نیچے بے بسی سے لیٹے دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ اسی عالم میں وہ انتقال کر گئے۔ ان کی بیگم ثریا نے ان کی بہت خدمت کی۔ ان کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں۔ چوبیس گھنٹے ان کے لئے خود کو وقف کر لیا تھا۔ حالانکہ دونوں میاں بیوی ماڈرن طرز زندگی کے عادی تھے اور محفلوں کی جان سمجھے جاتے تھے۔ مگر آخری دنوں میں یہ عالم دیکھا کہ فضلی صاحب۔۔۔۔۔ سفید چادر اوڑھے بے حس و حرکت لیٹے ہوئے ہیں اور ان کی بیگم سادہ لباس میں ان کی خدمت کر رہی ہیں یا نمازیں پڑھنے اور دعائیں کرنے میں مصروف ہیں۔

فضلی صاحب میں غرور اور بناوٹ نام کو نہ تھا۔ ہر ایک سے بے تکلفی اور خلوص کے ساتھ میل جول بڑھا لیتے تھے۔ ہمارے زمانے کی فلموں کے مکالمے بڑے جاندار ہوتے تھے۔ یہ فلم بینوں کے قلب و ذہن میں رچ بس جاتے اور زندگی بھر یاد رہتے تھے۔ جب ہم چھوٹے تھے اس وقت بھی فلم دیکھنے والوں کو فلموں کے مکالمے یاد ہو جاتے تھے اور وہ انہیں دہراتے رہتے تھے۔ وہ فلمیں اور مکالمے آج بھی لوگوں کو یاد ہیں لیکن یہ اسی وقت ہوتا تھا جب مکالمے واقعی جان دار' بامعنی اور خوبصورت ہوں۔ ہم نے جب فلم "سکندر" دیکھی تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ یہ فلم بھی ہمیں ایک بڑی عمر کے کزن کی سفارش پر دیکھنے کو نصیب ہوئی تھی۔ اس فلم میں شان و شوکت بہت تھی۔ پرتھوی راج کپور یونانی لباس میں سچ مچ یونانی دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ سہراب مودی' راجہ پورس کے روپ میں خوب سجے تھے۔ سکندر کی یونانی محبوبہ کا کردار ونمالا نے ادا کیا تھا۔ ونمالا کا رنگ گورا' بال بھورے اور آنکھیں سبز تھیں۔ یہ فلم بلیک اینڈ وائٹ

تھی مگر پھر بھی ونمالا ایک غیر ملکی حسینہ نظر آتی تھیں۔اس فلم میں جنگ کے مناظر بھی بہت شاندار تھے۔ مگر سب سے بڑی خوبی اس کے مکالمے تھے۔جب شکست کھانے کے بعد راجہ پورس کو سکندر اعظم کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو سکندر دریافت کرتا ہے۔"بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے ؟"

راجہ پورس باوقار انداز میں جواب دیتا ہے۔"جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔"
سکندر اتنا متاثر ہوتا ہے کہ راجہ پورس کو آزاد کر کے اپنے برابر کے تخت پر جگہ دیتا ہے۔
اس زمانے میں بے شمار کامیاب فلموں کے مکالمے فلم بینوں کو ازبر ہو جاتے تھے۔ضیا سرحدی کی فلم "ہم لوگ" کے یہ مکالمے بچے بچے کی زبان پر تھے۔
"جس دیے میں تیل نہ ہو اسے جلنے کا کیا ادھیکار ؟"
"دیا نہیں' دیے کا تیل جلتا ہے۔"
"اور جب دیے کا تیل ختم ہو جائے ؟"
"تو پھر صبح ہو جائے گی۔"
ان مکالموں میں خوشگوار مستقبل کا پیغام ہے۔آس ہے' امید ہے اور امید پر ہی دنیا قائم ہے۔دراصل پرانے زمانے کی فلموں میں بامقصد کہانی ہوتی تھی۔ سوچنے اور غور کرنے کا مواد بھی ہوتا تھا جو کہ اب ناپید ہے۔بڑی بامقصد اور خوبصورت فلمیں اس زمانے میں بنائی گئیں اور کامیاب بھی ہوئیں۔تعجب کی بات ہے کہ اب زمانہ آگے بڑھ رہا ہے مگر فلموں کا معیار پیچھے جا رہا ہے۔ ورنہ یہی عوام تھے جو بہت اچھی اور فن کارانہ فلموں کو بھی پسند کیا کرتے تھے۔ اچھے مکالموں کی داد دیا کرتے تھے۔خود ہماری فلموں کے مکالمے لوگ ہمیں سنا دیا کرتے تھے۔
ایک بار میاں جاوید قمر نے ہمیں ایک کہانی لکھنے کے سلسلے میں بلایا۔میاں جاوید قمر فلم تقسیم کار تھے۔بعد میں فلم ساز بھی ہو گئے تھے۔فیصل آباد میں ان کا بابر سینما تھا اور فیکٹریاں بھی تھیں۔یہ وہی میاں جاوید قمر ہیں جنہوں نے ہدایت کار حسن طارق کی وفات کے بعد اداکارہ رانی سے شادی کر لی تھی مگر یہ شادی زیادہ عرصے قائم نہ رہی۔ رانی بیمار پڑ گئیں اور علاج کے لیے لندن جانے لگیں۔ڈاکٹروں نے انہیں پھیپھڑے کا کینسر بتایا تھا۔اس موقعے پر میاں صاحب

نے رانی کے ساتھ جانا تو کجا ان سے رابطہ قائم کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ رانی کا لندن میں آپریشن ہوا تو ان کے شوہر ان کے ساتھ نہ تھے۔ وہاں اسپتال میں کرکٹر سرفراز نواز نے ان کی بہت خدمت اور دیکھ بھال کی۔ رانی تکلیف دہ وقت میں سرفراز نواز کے اس حسن سلوک سے اتنی متاثر ہوئیں کہ میاں جاوید قمر سے طلاق لینے کے بعد سرفراز نواز سے شادی کرلی۔ اگرچہ اس شادی کا انجام بھی زیادہ خوشگوار نہ تھا۔ یہ داستان رانی کی کہانی کے ساتھ بیان کی جائے گی۔

میاں جاوید قمر نے حسن طارق کی تہذیب' انجمن اور امراؤ جان ادا جیسی فلمیں ریلیز کی تھیں۔ وہ خود بھی فلم ساز تھے۔ پنجابی میں فلم جیرا ابلیڈ بنائی جس میں منور ظریف نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ یہ فلم بہت کامیاب ہوئی۔ ان کی ایک اور فلم لائسنس بھی ہٹ ہو گئی تھی۔ ہم نے بھی ان کے لیے ایک فلم نمک حرام بنائی تھی۔ ہم اس کے مصنف اور ہدایت کار تھے۔ اس فلم کے ساتھ یہ المیہ ہوا کہ اردو فلمیں دیکھنے والے اسے پنجابی فلم سمجھتے رہے اور سینما میں نہ گئے۔ ادھر پنجابی فلم دیکھنے والے جب سینما میں پہنچے اور اردو فلم دیکھنے کو ملی تو وہ بھی خوش نہ ہوئے۔ یہ ایک طنزیہ کامیڈی تھی۔ پہلے اس میں وحید مراد اور زیبا مرکزی کرداروں کے لیے چنے گئے تھے مگر ہمیں انگلستان جانا تھا اور ان دونوں فن کاروں کی تاریخیں ملنا دشوار تھا۔ ہمارے اصرار کے باوجود میاں جاوید نے انتظار کرنے کے بجائے منور ظریف اور آسیہ کو کاسٹ کر لیا۔ ساتھ میں دوسری ہیروئن نشو کو بنایا۔ ان فنکاروں کے پیش نظر ہم نے کہانی میں تبدیلیاں کرنی شروع کر دیں اس لئے کہ وحید مراد اور زیبا کی اداکاری کا انداز منور ظریف اور آسیہ سے یکسر مختلف تھا۔ یہ فلم بہت بھاگ دوڑ میں بنائی گئی تھی۔ بے چارہ منور ظریف رات کر کبھی دس بجے کبھی بارہ بجے دن بھر کی شوٹنگ سے فارغ ہو کر ہمارے سیٹ پر پہنچتا تھا اور ساری رات شوٹنگ کرتا تھا۔ اگلے دن پھر صبح سے مصروف ہو جاتا تھا۔ یہی حال آسیہ کا بھی تھا۔ اکثر وہ دونوں شاٹ کے درمیان میں سو جاتے تھے۔ انہیں جھنجوڑ کر جگانا پڑتا تھا۔ مگر اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ ان کی عدیم الفرصتی راہ میں مشکل بن گئی تھی مگر دونوں نے بہت اچھی اداکاری کی۔

نشو اس زمانے میں ماں بننے والی تھیں۔ ہم آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے اسلام آباد گئے تو یہ راز فاش ہوا۔ انہیں پہاڑوں پر بھی چڑھنا تھا۔ کشتی میں بھی سوار ہونا تھا۔ جھیل کے کنارے بھاگ دوڑ بھی کرنا تھی مگر اس حالت میں کیا ہو سکتا تھا۔ وہ تو ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ تھیں مگر ہمارا دل نہ مانا اور ہم نے شوٹنگ کی نوعیت ہی بدل دی۔

نشو اس زمانے میں کھوئی کھوئی سی رہتی تھیں۔ لاہور سے جس سین کی شوٹنگ کے لئے بطور خاص اسلام آباد گئی تھیں اس کا کنٹی نیوٹی کالباس لاہور ہی میں بھول گئیں۔ اس قسم کے لطیفے وہ عموماً کرتی رہتی تھیں۔ صبح شوٹنگ کے لئے آتیں تو پتا چلتا کہ اپنی وگ گھر بھول آئی ہیں۔ دوبارہ گاڑی بھیجی جاتی اور شوٹنگ روکنی پڑتی۔ یہ فلم مکمل ہوگئی اور ہم یورپ چلے گئے۔ ہماری غیر موجودگی میں یہ ریلیز ہوئی اور زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکی مگر میاں جاوید قمر نے منافع کما لیا۔

میاں صاحب نے ہمیں فلم کی کہانی لکھنے کے لئے بلایا تو ہم نے مصروفیت کا عذر کیا۔ وہ اصرار کرنے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اگر کہانی لکھوائیں گے تو ہم سے۔ پھر انہوں نے انکشاف کیا۔ ''آفاقی صاحب' آپ کی فلم ''کنیز'' مجھے اتنی پسند تھی کہ میں نے درجنوں بار دیکھی۔ اس کے مکالمے مجھے زبانی یاد ہو گئے تھے۔''

ہم نے کہا۔ ''اچھا تو سنایئے۔''

''کون سے سین کے؟''

''جو بھی آپ مناسب سمجھیں۔''

میاں صاحب نے ہمیں فوراً محمد علی' وحید مراد اور صبیحہ خانم کے مکالمے سنانے شروع کر دیے اور ہم حیران رہ گئے۔ ہم نے آپکو بتایا ہے کہ ان دنوں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اچھی فلموں کے مکالمے بھی لوگوں کو یاد ہو جاتے تھے۔ کئی فلم بین محض چند مخصوص سین دیکھنے کے لئے ہی بار بار سنیما میں جایا کرتے تھے۔ انور کمال پاشا اور ریاض شاہد کے لکھے ہوئے مکالمے لوگوں کو اتنے پسند آتے کہ ہر جگہ ان کا استعمال شروع کر دیتے تھے۔ ریاض شاہد کی فلم ''بدنام'' کے مکالمے تو ضرب المثل بن گئے۔ مثلاً نیلو سے علاؤالدین کے یہ مکالمے۔

''کہاں سے آئے ہیں یہ جھمکے' کون لایا ہے یہ جھمکے' کس نے دیے ہیں یہ جھمکے' کیوں پہنے ہیں یہ جھمکے؟''

یا پھر ''فرنگی'' میں سدھیر کا یہ مکالمہ۔ جب مخالف گروہ کے آدمی سدھیر کو اچانک دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں۔

''کون اکبر خان؟''

''پہچانو تو بھی اکبر خان' نہ پہچانو تب بھی اکبر خان۔''

کئی فلموں میں مکالمے بازی ضرورت سے زیادہ بھی ہو جاتی تھی۔ منیر نیازی نے اس زمانے میں ایک مزاحیہ کالم لکھا تھا جس میں یہ لکھا کہ ہماری فلموں میں کردار' کردار سے مخاطب نہیں ہوتے بلکہ مکالمہ' مکالمے سے مخاطب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مکالمہ زمین پر کھڑا ہے۔ دوسرا مکالمہ گھوڑے پر سوار ہے۔ تیسرا مکالمہ درخت پر چڑھا ہوا ہے۔ چوتھا مکالمہ کار پر سوار ہے وغیرہ وغیرہ۔ کسی لحاظ سے یہ بات درست بھی تھی۔ بعض فلموں میں حقیقتاً اتنے زیادہ مکالمے ہوتے تھے کہ کوفت ہونے لگتی تھی اور یہ مکالمے برائے مکالمہ ہوتے تھے۔ یہ تھیٹر کے ڈرامے کا انداز تھا۔ جو کافی عرصے تک پاکستانی فلموں میں رائج رہا۔ دراصل ہندوستان میں فلمی صنعت کے کرتا دھرتا تھیٹر کے سیٹھ ہی تھے۔ تھیٹر والوں نے فلمیں بنانی شروع کیں تو وہی انداز اپنایا۔ ویسی ہی کہانیاں' ویسے ہی موضوعات' ویسا ہی ماحول اور مزاج' مکالمے بھی اسی قسم کے ہوتے تھے۔ آغاز میں لکھنے والے بھی تھیٹر کے ڈرامے لکھنے والے لوگ ہی تھے۔ اس زمانے میں آغا حشر کے ایسے مکالمے بہت مقبول ہوا کرتے تھے۔

''توفیق کس حال میں ہے؟''

''شیر لوہے کے جال میں ہے۔''

کافی عرصے تک بمبئی اور کلکتہ کی فلمی صنعت میں یہی انداز رہا۔ بعد میں رفتہ رفتہ تبدیلی پیدا ہوئی اور روزمرہ کی زبان بھی استعمال ہونے لگی۔

تنویر نقوی مایہ ناز شاعر اور نغمہ نگار تھے۔ انہوں نے بمبئی کے فلم سازوں کی پسند اور استعداد کے بارے میں یہ لطیفہ سنایا تھا کہ ایک صاحب فلم ساز کو کہانی سنانے گئے۔ بہت زور لگایا، کافی دیر تک سناتے رہے مگر فلم ساز کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ آخر مصنف نے جوش میں آکر کہا۔

ہیرو نے کھڑکی میں سے پکار کر کہا ''دلبر دلبر''۔

یہ سن کر فلم ساز ایک دم کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ''کیا کہا' دوبار دلبر؟''

مصنف ''جی سیٹھ صاحب دوبار دلبر۔''

فلم ساز ''اس کا جواب ہی نہیں ہے۔ یہ کہانی منظور' ایڈوانس لے لو۔''

پرانے دور میں بہت اچھی اور بامقصد فلمیں بنتی رہی ہیں مگر یہ نہیں کہ بے مقصد اور محض تفریحی فلمیں نہیں بنا کر تھیں۔ فلمیں تو ہر قسم کی بنا کرتی تھیں۔ بہت سی فلموں کا مقصد محض اور محض تفریح ہوتا تھا۔ مار دھاڑ سے لبریز فلمیں بھی کافی تعداد میں بنائی جاتی تھیں۔

ناڈیا ایک یہودی ایکٹریس تھی، لمبی تڑنگی، رنگ گورا بھبوکا، جسم نہایت متناسب، بال مغربی انداز میں ترشے ہوئے، آنکھیں نیلی اور بے حد مقبول ہیروئن تھی۔ ''ہنٹر والی، طوفان میل، جنگل کوئین'' وغیرہ اس کی مشہور فلمیں تھیں۔ تماشائی اس کے دلدادہ تھے۔ اس کی فلموں میں جان کاؤس جنگجو قسم کے ہیرو ہوا کرتے تھے۔ وہ پہلوان نما ہیرو تھے اور بہت بہادری کے کارنامے سرانجام دیتے تھے۔ اکثر فلموں میں وہ جنگل میں ٹارزن کی طرح محض لنگوٹی پہن کر گھومتے پھرتے تھے۔ کبھی درندوں سے لڑتے، کبھی دشمنوں کے دانت کھٹے کرتے۔ جان کاؤس کے سلسلے میں ایک لطیفہ یہ بھی مشہور ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے مصنف اور ہدایت کار ''(اس وقت وہ فلموں میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے) شوکت ہاشمی بمبئی سے لاہور پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر کچھ لوگوں نے انہیں جان کاؤس سمجھ لیا۔ ان سے تصدیق کی تو انہوں نے بھی کسی کا دل توڑنا گوارا نہ کیا اور تصدیق کر دی۔ بس پھر کیا تھا لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور آؤ بھگت شروع کر دی۔

کسی کو شک گزرا تو پوچھا کہ جناب فلموں میں تو آپ بہت طاقت ور اور تگڑے نظر آتے ہیں مگر دیکھنے میں کافی ''ماٹھے'' ہیں۔

انہوں نے جواب دیا۔ ''یہ سب کیمرا ٹرک کی کرامت ہے۔''

بعد میں یہ راز کھل گیا مگر کافی عرصے تک یہ کہانی لوگ مزے لے لے کر سنتے اور سناتے رہے۔

اس دور میں ہر طرح کی فلمیں بنا کرتی تھیں۔ جادوئی فلموں کا بھی رواج تھا جو کہ اب دیکھنے میں نہیں آتیں۔ ان فلموں کے ہدایت کاروں کو یہ آسانی تھی کہ اگر کوئی اداکار یا ہیرو، ہیروئن نخرہ کرتا تھا تو وہ اسے فلم میں طوطا یا مینا بنا دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد ساری فلم میں وہ اداکار پنجرے میں بند نظر آتا۔ اسی لئے اداکار ان ہدایت کاروں کے

غضب سے ڈرتے تھے کہ نہ جانے کب ناراض ہو جائیں اور طوطا بنا دیں۔ ڈراؤنی فلمیں بھی بنائی جاتی تھیں اور کافی ڈراؤنی ہوتی تھیں۔

ہم آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتے تھے اور میرٹھ میں رہا کرتے تھے مگر ہر ہفتے چھٹی کے دن میرٹھ سے دہلی جاتے جہاں ہماری بڑی بہن رہتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اور ہمارے بہنوئی بہت خوش ہوتے تھے اور ہماری خوب آؤ بھگت کرتے تھے۔ ریستوران میں کھانا کھلایا جاتا تھا مگر سب سے بڑی خاطر یہ تھی کہ ہمیں ایک فلم دکھائی جاتی تھی۔ ایک بار ہم دہلی گئے تو ان دونوں کا جھگڑا ہو گیا تھا اور آپس میں بول چال بند تھی۔ دونوں نے الگ الگ ہمارے ساتھ بہت پیار کا برتاؤ کیا مگر بول چال بند ہونے کی وجہ سے نہ تو ریستوران گئے اور نہ ہی فلم کا پروگرام بن سکا جو ہمارے لئے بہت بے چینی اور پریشانی کا باعث تھا۔ خدا خدا کر کے آٹھ بجے کے قریب ان کی بول چال کھل گئی۔ کھانا تو گھر میں موجود تھا مگر اب ہم روٹھ گئے کہ فلم دیکھے بغیر نہیں سوئیں گے۔ اچھی فلمیں کافی فاصلے پر لگی ہوئی تھیں۔ ان دونوں نے ہمیں بہت سمجھایا کہ اب کسی فلم کا ٹکٹ نہیں ملے گا مگر ہم کہاں ماننے والے تھے۔ ہمارے گھر کے نزدیک ایک سنیما تھا جس میں فلم ''بھاگتا بھوت'' لگی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ دونوں یہ فلم دیکھنے کے حق میں نہیں تھے مگر ہم ضد کر کے بیٹھ گئے تھے کہ اگر ہمیں آج فلم نہ دکھائی گئی تو ہم اگلے ہفتے دہلی نہیں آئیں گے۔ آخر انہوں نے ہماری ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ مگر سوال یہ تھا کہ ہمیں تنہا فلم دیکھنے کے لئے نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ ایک پرانے گھریلو ملازم قاسم بابا کے نام قرعہ فال نکلا۔

اب ذرا قاسم بابا کے بارے میں سنئے۔ ان کی عمر ستر پچھتر سال کے قریب ہو گی۔ فلموں سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ البتہ تھیٹر کے ڈراموں کے رسیا تھے اور ان ہی کی کہانیاں اور مکالمے ہمیں سناتے رہتے تھے کہ میاں کہانی تو ''اندر سبھا'' کی تھی، آج کل کیا خاک کہانیاں بنتی ہیں۔

قاسم بابا افیمی تھے۔ یوں تو سارے دن ہی افیم کی پینک میں رہتے تھے مگر شام ہوتے ہی کافی مقدار میں افیم کھا کر بالکل انٹا غفیل ہو جاتے اور ہوں ہاں کے سوا کوئی بات نہ کرتے۔ اس عالم میں اگر وہ چلتے پھرتے بھی تھے تو اس طرح جیسے

خواب کے عالم میں بعض لوگ چلتے ہیں۔انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کہاں جارہے ہیں۔ کیوں جارہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ صبح ہونے کے بعد بھی انہیں کچھ یاد نہیں رہتا تھا کہ رات کو انہوں نے کیا کیا تھا کہاں گئے تھے؟

ہمیں ان قاسم بابا کے حوالے کر دیا گیا۔ سنیما گھر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر بھی نہیں تھا اور سیدھی اور بڑی سڑک وہاں تک جاتی تھی۔ ہماری بہن لال کنواں بازار میں کٹرہ دینہ بیگ کی گلی میں رہتی تھیں۔اس گلی کے آغاز میں ہمدرد دواخانہ تھا۔اس کے بالمقابل فتح پوری کا محلہ تھا۔اس کی ایک گلی کا نام گلی قاسم جان تھا جہاں اردو کے مایہ ناز شاعر غالب کی رہائش تھی۔اپنی نوعمری میں ہم ان تاریخی گلیوں اور بازاروں میں گھومتے رہے ہیں۔اسی گلی کے سامنے سے گزر کر اندر ہی اندر دہلی کے مشہور ترین بازار چاندی چوک میں چلے جاتے تھے۔

ہم ڈرپوک تو بالکل نہیں ہیں مگر جب قاسم صاحب کو ان کی پینک سے ہوشیار کر کے ہمارا ہاتھ ان کے ہاتھ میں پکڑایا گیا اور بتایا گیا کہ وہ ہمارے ساتھ قریب کے سنیما میں جائیں گے تو انہیں بہت ناگوار گزرا۔افیمچیوں کے مخصوص انداز میں وہ بھی ناک سے بولا کرتے تھے۔ کہنے لگے۔

"ارے میاں چھوڑو یہ بائیسکوپ' اس میں کیا رکھا ہے۔ تھیٹر کا ڈراما لگے گا اور آپ کو دکھائیں گے۔اندر سبھا، لال پری' نیلی پری' سبز پری' کالا دیو' پیلا دیو کوہ قاف کے نظارے۔ یہ باتیں بھلا بائیسکوپ میں کہاں؟"

ہم نے کہا" قاسم بابا، بہت اچھی فلم لگی ہے۔ بھاگتا بھوت۔"

بولے" ارے میاں اس کا نام ہی غلط ہے۔ بھوت بھی بھلا بھاگتا ہے۔ میں تمہیں کل بھوت پریت کی بہت سی کہانیاں سنادوں گا۔ یہ رات کا وقت ہے۔ خواہ مخواہ بائیسکوپ دیکھ کر ڈر جاؤ گے۔"

مگر ہمیں تو صرف فلم دیکھنے سے مطلب تھا۔ اچھی بری سے کوئی سروکار نہ تھا۔ سچ پوچھئے تو فلم دیکھنے کی ہمیں دیوانگی تھی اور یہ کیفیت ساٹھ ستر کی دہائی تک رہی۔ اب یہ عالم ہے کہ بہت اچھی فلم ہو تو دیکھتے ہیں ورنہ دس پندرہ منٹ بعد ہی اکتا جاتے ہیں کہ کتنی لمبی فلم ہے' آخر کب ختم ہو گی؟

ہم "بھاگتا بھوت" دیکھنے کے لئے قاسم بابا کی نگرانی میں پیدل چل پڑے۔ ان کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھا۔ سردی کا موسم تھا اس لئے انہوں نے روئی کا دگلا پہنا ہوا تھا۔ یہ روئی کا ایک اوور کوٹ سمجھ لیجئے۔اس کے اندر بھی

انہوں نے گرم بنیان، بنڈی، سویٹر اور اور نہ جانے کیا کیا پہن رکھا تھا حالانکہ اتنی زیادہ سردی نہیں تھی مگر وہ کہہ رہے تھے کہ سردی سے کانپ رہا ہوں۔ انہوں نے ایک کمبل بھی احتیاطاً ساتھ لے لیا تھا۔

فلم کا یہ آخری شو تھا۔ ان دنوں آخری شو پر زیادہ رش نہیں ہوتا تھا اور یہ تو ویسے بھی ڈراؤنی فلم تھی۔ اس پر ستم یہ کہ سردی کا موسم تھا۔ رش زیادہ نہیں تھا اس لئے آسانی سے ٹکٹ مل گئے۔ ہم نے گیلری کا ٹکٹ لیا۔ قاسم بابا کے لئے اسٹال کا ٹکٹ لیا گیا کیونکہ وہاں لکڑی کی بینچیں ہوا کرتی تھیں اور قاسم بابا کو وہاں سونے کا آرام تھا۔

ہال میں زیادہ تماشائی نہیں تھے اور جب فلم شروع ہوئی تو کئی لوگ اٹھ اٹھ کر چلے گئے۔ اس طرح سنیما ہال اور سونا ہو گیا۔ پتا نہیں کہانی کیا تھی۔ اتنا یاد ہے کہ ایک شخص محبت میں ناکام ہو جاتا ہے اور ہیرو کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد وہ بھوت بن جاتا ہے اور ہیرو ہیروئن کی زندگی وبال کر دیتا ہے۔ اب ذرا بھوت کا حلیہ ملاحظہ فرمایئے۔ وہ ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا جس کے سارے جسم پر سفید کپڑے کی پٹیاں بندی ہوئی تھیں۔ ساری فلم میں وہ دوڑتا بھاگتا پھرتا ہے۔ ہیرو ہیروئن کو تنگ کرتا ہے۔ ایک سین میں ہیرو کے ہاتھ میں اس کے جسم کے گرد لپٹی ہوئی پٹی کا ایک سرا آ جاتا ہے۔ وہ اسے کھولتا ہے تو یہ پٹی شیطان کی آنت بن جاتی ہے۔ ہیرو اسے کھولتے کھولتے تھک جاتا ہے مگر پٹی کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ آخر بھوت کھلی پٹیوں سمیت بھاگ جاتا ہے۔ بھوت اور بھی کئی ڈراؤنی حرکتیں کرتا ہے اچانک تاریک سڑکوں پر نمودار ہو کر لوگوں کا گلا دبا دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہمیں بھی ڈر تو لگ رہا تھا مگر ڈر کے مارے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بس بیٹھے بیٹھے ڈرتے رہے۔ فلم ختم ہوئی تو سینما ہال قریب قریب خالی ہو چکا تھا۔ جو لوگ باقی بچے تھے وہ فوراً غائب ہو گئے۔ ہم نے قاسم بابا کو تلاش کرنا شروع کر دیا مگر ان کا کوئی پتا نہیں چلا۔ اتنی دیر میں سینما سے باہر نکلے۔ وہاں لال کنواں بازار جیسا بارونق علاقہ ویران اور سنسان پڑا تھا۔ رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری سڑک ویران ہو گئی۔ ہم وہاں کب تک کھڑے رہتے۔ تیز قدموں سے گھر کی طرف چل پڑے مگر ڈر کے مارے برا حال تھا۔ سڑک پر روشنی زیادہ نہیں تھی اور یہ اندیشہ تھا کہ کہیں کسی تاریک گلی میں سے بھاگتا ہوا بھوت نہ برآمد ہو جائے۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگے مگر بھوت سامنے سے نمودار ہو گیا اور ہم سے ٹکرا گیا۔ ہماری بہت زور کی چیخ نکل گئی مگر حیرت

اس بات پر ہوئی کہ بھوت ہم سے بھی زیادہ تیز آواز میں چیخا۔ ہم دونوں کی گھگی بندھ گئی تھی۔ جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ خوف سے برا حال تھا نہ جانے کتنی دیر یہ عالم رہا۔ پھر ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو پتا چلا کہ وہ بھوت نہیں، ایک فلم بین تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے اور ایک دوسرے کو "بھاگتا بھوت" سمجھ رہے تھے وہ ہاتھ باندھے کھڑا " رام رام" کر رہا تھا اور ہم دل ہی دل میں لاحول اور آیات پڑھ رہے تھے جب ایک دوسرے کی اصلیت معلوم ہوئی تو جان میں جان آئی۔ وہ شخص اچانک گھگیاتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا اور سامنے والی تاریک گلی میں غائب ہوگیا۔ اب ہم پھر اس سڑک پر تنہا رہ گئے۔ ایک ایک قدم من من بھر کا ہو گیا تھا۔ مگر گھر جانا بھی ضروری تھا ورنہ سڑک پر بھاگتے بھوت کا خوف تھا۔ خدا خدا کر کے ہم کٹڑہ دینہ بیگ تک پہنچے۔ یہ آٹھ دس فٹ چوڑی پتھروں کے فرش کی گلی تھی۔ اس گلی کے آخر میں وہ گھر تھا جہاں ہمیں جانا تھا۔ گلی میں صرف ایک مریل سا بلب روشن تھا اور وہ قریب قریب تاریک ہی تھی۔ اس اندھیری گلی میں جانے کی ہمت تو نہیں پڑ رہی تھی مگر جائے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ اللہ کا نام لے کر گلی میں داخل ہوگئے۔ ہمارے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ جسم میں سنسناہٹ تھی اور کلیجا کانپ رہا تھا۔ ہم نے آس پاس دیکھا۔ ہر کھمبے کے پیچھے ہمیں ایک بھاگتا بھوت کھڑا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ بھوت بہت تیز بھاگتا تھا۔ مگر پھر بھی ہم نے بھاگ کر گھر تک پہنچنے کا فیصلہ کیا اور دوڑ لگا دی۔ ہمارے دوڑتے ہی ہر طرف سے بھوتوں نے بھی بھاگنا شروع کر دیا۔ کئی بھوت تیز بھاگتے ہوئے ہم سے آگے نکل گئے۔ مگر ہم پھر بھی نہ رکے۔ اپنے گھر کی ڈیوڑھی پر ہی جا کر دم لیا۔ پہلے تو ہم نے گھبراہٹ میں کنڈی کھٹ کھٹانی شروع کر دی۔ پھر دیکھا کہ دروازہ تو صرف بھڑا ہوا تھا۔ ہم فوراً اندر داخل ہوگئے اور اندر سے کھٹکا لگا لیا۔ اس کے بعد ہمیں پتلی سی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا تھا مگر ان سیڑھیوں میں بھی بھوت چھپا محسوس ہو رہا تھا۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی ایک عجیب سی آواز سنائی دی اور پھر سامنے والے قاسم بابا کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ ہم وہیں سہم کر رہ گئے۔ دروازے میں یکایک ایک ہیولا نمودار ہوا۔ ہم اتنے خوفزدہ ہوئے کہ چیخ بھی ہمارے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ پھر اس بھوت نے ہماری طرف قدم بڑھایا اور ہم وہیں ساکت رہ گئے۔ زمین نے ہمارے قدم جکڑ لیے تھے۔ ہمارے منہ سے دبی دبی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ہم شاید " بھو----بھو------بھو----بھوت" کہہ رہے تھے۔ بھوت جب ذرا روشنی میں آیا تو پتا چلا

کہ وہ قاسم بابا تھے۔

انہوں نے کہا" میاں تم اندھیرے میں اکیلے کیوں چلے آئے؟ صبح جا کر تمہیں لے آتا۔"

ہمیں غصہ تو بہت آیا مگر کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے اور لحاف اوڑھ کر بستر میں گھس گئے۔ ساری رات ہمیں بھاگتا بھوت خواب میں نظر آتا رہا۔ دوسرے دن ہماری بہن نے ہمارا بہت مذاق اڑایا۔ دن کی روشنی پھیلتے ہی ہمارا سارا خوف غائب ہو چکا تھا۔

انیسہ آپا نے کہا" بولو' اب جاؤ گے" بھاگتا بھوت" دیکھنے؟"

ہم نے فوراً کہا" جائیں گے مگر دن کے شو میں۔"

اس طرح کی ڈراؤنی اور جادوئی فلمیں ہم نے بہت دیکھیں۔ ڈرے بھی مگر باز نہیں آئے۔ قاسم بابا ہمیں تھیٹر کا کھیل دیکھنے کے لیے آمادہ کرتے رہے۔

"میاں شام کو چلیں گے۔ کھانا' پانی' پھل' مٹھائی ساتھ لے جائیں گے۔ لحاف بھی رکھ لیں گے۔ صبح تک کھیل چلے گا۔ نیند آئی تو ایک جھپکی لے لینا۔ وہاں کون سی بینچ ہوتی ہے جس پر سے گر جانے کا ڈر ہو۔ وہاں تو دری کا فرش ہوتا ہے۔ آرام سے ٹانگیں پسار کر بیٹھیں گے۔ ایسی ایسی پریاں اور دیو دکھاؤں گا کہ بائیسکوپ کو بھول جاؤ گے۔"

مگر ہم نے بابا قاسم کی یہ پیش کش کبھی قبول نہیں کی۔

ہر نوعیت اور ہر قسم کی فلمیں ہمارے بچپن اور لڑکپن کے زمانے میں بھی بنا کرتی تھیں اور آج بھی دنیا کے ہر ملک میں یہی رواج ہے۔ بھارت میں اس وقت بھی ہر موضوع پر مختلف زبانوں میں فلمیں بنائی جاتی ہیں لیکن ان کے بجٹ مختلف ہوتے ہیں۔ علاقائی زبانوں کی فلمیں آج بھی کم لاگت سے بنائی جاتی ہیں اور بلیک اینڈ وہائٹ ہوتی ہیں۔ ان میں کام کرنے والے اداکار بھی الگ ہوتے ہیں جو کم معاوضہ لیتے ہیں۔ اس طرح یہ کم خرچ سے بننے والی فلمیں اگر کم منافع بھی کماتی ہیں تو بنانے والے نقصان میں نہیں رہتے۔

پاکستان میں بھی ابتدائی سالوں میں ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ پنجابی فلمیں کم لاگت سے بنتی تھیں۔ پنجابی فلموں کے اداکار بھی مختلف تھے جو کم معاوضہ وصول کرتے تھے۔ کیونکہ یہ ایک محدود مارکیٹ کے لیے بنائی جاتی تھیں۔ رنگین اردو فلمیں

بننے کے باوجود پنجابی فلمیں بلیک اینڈ وہائٹ ہی بنائی جاتی تھیں۔ مگر جب ان فلموں کو رنگین بنادیا گیا' ان میں کام کرنے والوں کے معاوضے بہت زیادہ بڑھ گئے اور لاگت میں بھی بے انتہا اضافہ ہو گیا تو یہ گھاٹے کا سودا ہو گیا۔ بھارت میں بیشتر بنگالی اور تامل فلمیں آج بھی بلیک اینڈ وہائٹ بنتی ہیں۔ گجراتی' مراٹھی فلمیں زیادہ تر بلیک اینڈ وہائٹ میں ہوتی ہیں اور سستی بنتی ہیں۔ آرٹ فلموں کا بجٹ آج بھی پندرہ بیس لاکھ روپے ہے جو آسانی سے وصول ہو جاتا ہے۔ جادوئی' ماردھاڑ کی فلمیں' مذہبی فلمیں' معاشرتی فلمیں' مزاحیہ فلمیں' نغماتی فلمیں' سبھی طرح کی فلمیں بنتی ہیں اور سب اپنے اخراجات پورے کر لیتی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں معاملہ دوسرا ہے کہ ہر فلم کی لاگت ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہر فلم کا موضوع ایک جیسا ہوتا ہے۔ ہر فلم میں وہی مہنگے اداکار کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں فلم سازوں کو گھاٹا نہ ہو گا تو کیا ہو گا۔ بھارت میں سستی جادوئی فلمیں ہر زمانے میں بنتی رہی ہیں۔ ہمارے ہاں '' سر کٹا انسان'' بہت مہنگی فلم ہے۔ بس یہی فرق ہے اور یہی ہماری فلمی صنعت کی بدحالی کی وجہ۔

اسی زمانے میں ایک روز اداکار سلطان اور ان کے بھائی جہانگیر ہم سے ملے۔ یہ دونوں اداکار اورنگزیب کے بھائی ہیں۔ ایک اعلیٰ خاندان سے ان کا تعلق ہے۔ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ تینوں بھائی خوب رو، صحت منداور دلکش شخصیت کے مالک ہیں۔ اورنگزیب ان میں سے سب سے چھوٹے ہیں اور '' رنگو'' کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ سلطان اور جہانگیر کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا اس لیے دونوں میں بہت زیادہ بے تکلفی تھی۔ وہ بھائیوں سے زیادہ بے تکلف اور جگری دوست معلوم ہوتے تھے۔ اکثر وہ ساتھ ہی رہتے تھے۔ سلطان کو اداکاری کا شوق تھا جس پر ان کے والد کو اعتراض تھا لیکن آخر وہ انہیں منانے میں کامیاب ہو گئے۔ چند فلموں میں سلطان نے ہیرو کے طور پر کام کیا مگر زیادہ مقبول اور کامیاب نہ ہو سکے۔ جہانگیر بھی ایک خوبصورت شخصیت کے مالک تھے مگر انہیں اداکاری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سلطان نے کچھ عرصے بعد اداکارہ نسرین سے شادی کر لی تھی جو ایک دلکش اور پرکشش شخصیت کی مالک تھیں لیکن ہیروئن کے طور پر وہ بھی زیادہ نمایاں نہ ہو سکیں۔ ان کے حسن وجمال اور پر وقار شخصیت کے باعث انہیں فلموں میں کاسٹ کیا جاتا تھا مگر انہیں اداکاری کبھی نہ آئی۔ ان کی شخصیت اور سراپا کی دلکشی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار جب فلم اسٹار کرکٹ میچ کے سلسلے میں تمام فلمی ستارے کراچی پہنچے تو ایک تقریب میں اس وقت کے وزیر اعظم پاکستان

جناب حسن شہید سہروردی بھی موجود تھے مگر صبیحہ اور مسرت نذیر کو نظر انداز کرکے انہوں نے بطور خاص نسرین کے ساتھ بہت دیر تک بات چیت کی۔

نسرین خوش جمال ہونے کے ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھیں۔ بہت اچھی انگریزی بولتی تھیں۔ محفل کے آداب اور طور طریقوں سے بھی بخوبی واقف تھیں اس لیے ہر محفل میں سب کی نگاہوں کا مرکز بن جاتی تھیں۔ انہوں نے نذیر اجمیری صاحب کی فلم " شہرت " میں ہیروئن کا کردار کیا تھا لیکن فلموں میں محض خوبصورتی سے کام نہیں چلتا' اداکارانہ صلاحیتیں بھی ہونی لازمی ہیں۔ اسی لیے وہ بطور ہیروئن زیادہ کامیاب نہ ہوسکیں۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے اداکار سلطان سے شادی کرلی اور ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہیں۔ سلطان بھی اداکاری میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کرسکے تھے اور فلمی دنیا سے کنارہ کش ہوکر انہوں نے کاروبار شروع کردیا تھا۔ اس طرح فلمی افق پر تو یہ دونوں ستارے بن کر نہ جگمگا سکے مگر ان دونوں کے ستارے ایک دوسرے سے بالکل ہم آہنگ ہو گئے۔
سلطان اور جہانگیر ایک دن ہمیں ملے تو بہت ہیجان میں مبتلا تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے دور سے اشارے کرنے شروع کردیے اور کار سے اتر کر ہماری طرف دوڑے آئے۔

" کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے ؟" ہم نے پوچھا۔

بولے " آفاقی۔ تمہیں ایک خبر سنانی ہے جو تم خود بھی نہیں جانتے۔"

" اچھا۔ وہ کس بارے میں ؟"

" تمھارے دوست اعجاز کے بارے میں۔"

" اعجاز نے کیا کردیا؟" ہم نے پوچھا۔

" کیا تو نہیں مگر کرنے والا ہے۔" جہانگیر نے کہا۔

سلطان نے کہا " وہ بہت بڑا دھماکا کرنے والا ہے۔"

ہم نے کہا " بھائی وہ تو فن کار آدمی ہے وہ بھلا کیا دھماکا کرے گا؟"

" ادھر آؤ۔ ریستوران میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

وہ ہمیں لے کر مال روڈ کے ایک ریستوران میں چلے گئے۔ چائے کا آرڈر دیا اور پھر کہا'' تمھارا دوست بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ اسے سمجھاؤ ایسا نہ ہو کہ منہ کے بل گر جائے۔''

'' بھئی کچھ بات بھی تو بتاؤ۔ کیوں پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔'' ہم نے کہا

'' تو سنو اعجاز آج کل میڈم نور جہاں کے ساتھ عشق کر رہا ہے۔''

ہم ہنسنے لگے'' چھوڑو یار۔ کیوں بے پر کی اڑا رہے ہو کہاں میڈم نور جہاں اور کہاں اعجاز اور اعجاز تو بہت اچھا اور شریف آدمی ہے۔''

'' عشق کرنا غیر شریفانہ کام تو نہیں ہوتا۔ اس نے تمہیں کچھ بتایا ''!

'' نہیں تو۔''

'' تو پھر سن لو۔ آج کل وہ دونوں مختلف جگہوں پر ملاقاتیں کرتے ہیں۔ وہ نور جہاں سے ملاقات کے لیے ان کی کوٹھی پر جاتا ہے تو اپنی کار مسرت نذیر کی کوٹھی کے سامنے کھڑی کر کے وہاں سے پیدل ہی میڈم نور جہاں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔''

'' مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

'' ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

پھر انہوں نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ کس طرح ایک دن پہلے گلبرگ کے مین بلیوارڈ پر رات کو ساڑھے بارہ بجے انہوں نے میڈم کی کار کو کھڑا پایا۔ وہ مدد کے لیے کار کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ میڈم اور اعجاز کار میں موجود ہیں۔ میڈم کی کار اچانک خراب ہو گئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ دونوں گھبرا گئے۔

'' مگر تم اتنی رات گئے وہاں کیا کر رہے تھے؟'' ہم نے پوچھا۔ اس لیے کہ اس زمانے میں لاہور میں آٹھ نو بجے ہی رات ہو جاتی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک برائے نام رہ جاتا تھا اور گلبرگ کی شاہراہ رات کو دس بجے کے بعد بالکل سونی نظر آتی تھی۔

وہ ہنسنے لگے۔'' یار ہم تو ٹھہرے آوارہ گرد۔ ساری رات گھومتے پھرتے ہیں مگر اعجاز اور میڈم کو اتنی رات گئے یوں

گھومنے کی کیا ضرورت ہے؟‘‘

ہمیں ان کی بات پر یقین نہیں آیا۔ پھر بھی کہا ہم اعجاز سے بات کریں گے۔

’’دیکھو۔ ہمیں ضرور بتانا۔ یہ خبر سو فی صد درست ہے۔‘‘

ہم ایورنیو اسٹوڈیو پہنچے تو دور ہی سے اعجاز نظر آ گئے۔ اعجاز ہیرو کے طور پر مقبول ہونے لگے تھے۔ ان کو پسند کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا اور تو اور کئی ہیروئنیں بھی انہیں میٹھی نظروں سے دیکھنے لگیں تھیں اور ان سے شادی کرنے کی خواہش مند تھیں۔ ان کی فلمیں بھی کامیاب ہو رہی تھیں اور لوگوں کا خیال تھا کہ اگر اسی طرح محنت کرتے رہے تو وہ بہت جلد صف اول کے ہیرو بن جائیں گے۔ جہاں تک شکل و صورت کا تعلق ہے اعجاز بنے بنائے ہیرو تھے۔ گورے چٹے، بڑی بڑی آنکھیں، دلکش ناک نقشہ۔ ان کا قد زیادہ لمبا نہیں تھا مگر ان میں مردانہ وجاہت اور کشش موجود تھی۔ ان سے ہماری دوستی پرانی تھی۔ ان کے اندر کوئی بری عادت بھی نہیں تھی۔ نہ شراب، نہ سگریٹ، نہ پان، نہ اور کوئی بری عادت۔ ان کا کوئی اسکینڈل بھی نہیں بنا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ صنف نازک کی صحبت میں قدرے گھبرائے ہوئے سے نظر آتے تھے۔ اب اگر ایسے آدمی کے بارے میں اچانک پتا چلے کہ وہ میڈم نور جہاں کے ساتھ چپکے چپکے عشق کر رہا ہے تو کوئی کیسے یقین کر لے؟ اسی لئے ہمیں بھی سلطان اور جہانگیر کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ سوچا کہ یہ اعجاز سے جیلس ہو گئے ہیں اس لئے ایسی افواہیں اڑا رہے ہیں۔

اعجاز نے ہمیں دیکھا تو پاس چلے آئے۔ ہم فوراً انہیں بازو سے تھام کر ایک طرف لے گئے۔

’’بھئی کہاں ہو؟ بہت عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی۔‘‘ ہم نے کہا

’’بس۔ آج کل کام زیادہ ہے۔ اس لیے ڈے نائٹ مصروف رہتا ہوں۔‘‘

’’فلموں میں یا اور کسی کام میں؟‘‘

انہوں نے ایک لمحہ ہمیں دیکھا اور پھر اپنی مخصوص ہنسی ہنسنے لگے۔ ’’ قصہ کیا ہے؟‘‘

ہم نے کہا۔ ’’ قصہ تو تم سناؤ کہ کوئی رومانس چل رہا ہے۔‘‘

ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ’’ تمہیں کس نے بتایا؟‘‘

''بس بتا دیا کسی نے اور تمھارے اڑے ہوئے رنگ نے اس کی تصدیق کر دی۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور تم نے ہمیں خبر تک نہ ہونے دی۔''

وہ گھبرا گئے ''کہاں تک نوبت پہنچ گئی؟''

ہم نے کہا ''شادی تک۔''

''ارے نہیں یار۔ بالکل جھوٹ ہے۔''

''ارے یہ بھی جھوٹ ہے کہ تم راتوں کو میڈم کی کوٹھی پر جاتے ہو اور اپنی کار مسرت نذیر کی کوٹھی کے سامنے کھڑی کر جاتے ہو۔ وہ غریب مفت میں بدنام ہو رہی ہے اور یہ بھی جھوٹ ہے کہ آدھی رات گئے میڈم کی کار میں گھومتے پھرتے ہو؟''

اعجاز بے چارے سیدھے سادھے آدمی ہیں۔ فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ ''یار کیا بتاؤں میں تو خود بہت پریشان ہوں۔ میڈم تو بس میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ میری فلموں کے سیٹ پر آ جاتی ہیں اور کافی دیر تک بیٹھی رہتی ہیں۔ اور تو اور رات کو گیارہ بارہ بجے کار لے کر میرے گھر پر آ جاتی ہیں اور جب تک میں باہر نہ نکلوں ہارن بجاتی رہتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں سمن آباد میں رہتا ہوں۔ وہاں کا ماحول اور قسم کا ہے۔ ان کے ہارن سن کر پڑوس کے لوگ باہر نکل آتے ہیں۔ جب تک میں گھر سے نکل کر ان کے پاس نہ جاؤں وہ ہارن بجاتی رہتی ہیں۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟ یار میں تو بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ تم کو پتا ہے کہ گھر میں میرے ساتھ بہنیں بھی رہتی ہیں۔ ہمارے گھر کا ماحول بالکل فلمی نہیں ہے لیکن ان باتوں کی وجہ سے مجھے بہت شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔''

اعجاز کا یہ دکھڑا سن کر ہم نے بغور ان کے چہرے کا جائزہ لیا۔ انہوں نے سلطان اور جہانگیر کی فراہم کردہ خبر کی تصدیق تو کر دی تھی مگر کسی اور انداز میں۔

ہم نے پوچھا ''سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم میڈم سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''

اعجاز نے فوراً جواب دیا ''یار کیسی باتیں کر رہے ہو! کہاں میں' کہاں میڈم'۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

ہم نے اعجاز کی بات پر یقین کر لیا۔ اس لئے کہ وہ صاف گو آدمی تھے۔ ہمیں ان کی باتوں پر یقین تھا۔

اس کے دو تین دن بعد ہم ''گمراہ'' کے سیٹ پر گئے تو پاشا صاحب شوٹنگ میں مصروف تھے۔ اعجاز بھی سیٹ پر تھے اور ان کی ہیروئن بھی شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھیں مگر اس سیٹ پر ایک خصوصی مہمان بھی موجود تھا اور وہ تھیں میڈم نور جہاں۔

میڈم نور جہاں عام طور پر کسی اور کے سیٹ پر جانے کی عادی نہ تھیں مگر انہیں ''گمراہ'' کے سیٹ پر موجود دیکھا تو اعجاز کی باتوں کی تصدیق ہو گئی۔ اعجاز نے قدرے شرمیلی نظروں سے ہمیں دیکھا اور چائے کی دعوت دی۔ ہم نے محسوس کیا کہ سیٹ پر موجود ہر شخص کو میڈم نور جہاں کی موجودگی کا سبب معلوم تھا۔ کچھ دیر بعد میڈم سیٹ پر سے رخصت ہو گئی تو پاشا صاحب نے ہم سے کہا۔ ''آفاقی صاحب' یہ لڑکا ابھرتا ہوا اداکار ہے۔ اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔ اسے ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہیے۔''

اعجاز جھینپے سے انداز میں مسکرانے لگے اور بولے۔ ''پاشا جی، میری طرف سے کوئی چکر نہیں ہے۔''

ہم چائے پی کر چلے آئے اور مطمئن ہو گئے۔ دو دن بعد وہ دونوں فرشتے (سلطان اور جہانگیر ہم نے یہی نام رکھ چھوڑا تھا) ہمیں ملے اور پوچھا۔ ''کیوں؟ اپنے دوست سے پتا کیا؟''

ہم نے جواب دیا۔ ''ہاں' مگر وہ اس معاملے میں انٹرسٹیڈ نہیں ہے۔''

وہ دونوں بے ساختہ ہنسنے لگے۔ ''آفاقی، کس کی باتوں میں آئے ہو۔ یہ سو فیصد سچی خبر ہے دیکھ لینا۔''

ہم نے کہا ''یار کیوں کسی کو بدنام کرتے ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

چند دن اور گزر گئے۔ کراچی سے ہفت روزہ ''نگار'' کے مالک و مدیر الیاس رشیدی صاحب لاہور آئے تو خلاف معمول دو تین دن تک ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بس وہ فون پر اتنا کہہ دیا کرتے تھے کہ ذرا مصروف ہوں۔ فارغ ہو کر ملوں گا۔

آخر ایک دن صبح ان کا فون آیا۔ ''شام کو کیا کر رہے ہوں؟''

ہم نے کہا ''آپ کہیے؟''

بولے ''شام کو چھ بجے کے بعد ہوٹل پر آجانا۔''
وہ مال روڈ پر ایلفنسٹن ہوٹل میں قیام کرتے تھے۔ جو بعد میں انڈس ہوٹل ہو گیا تھا۔

شام کو ہم پہنچے تو وہ اسی وقت اسٹوڈیو سے آئے تھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ باہر مال روڈ پر خوب رونق اور جگمگاہٹ تھی۔ اس زمانے میں مال روڈ پر سروس روڈ اور مال روڈ کے درمیان میں سبز گھاس کے تختے بھی تھے جن پر شام کو یار لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ الیاس صاحب ہمیں ساتھ لے کر ایک تختے پر بیٹھ گئے۔
''کن کاموں میں مصروف ہیں؟'' ہم نے پوچھا۔ ''اتنے دن ہو گئے ہیں لاہور آئے ہوئے اور ملاقات تک نہ ہو سکی۔''

انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک پان نکال کر منہ میں ڈالا۔ پھر کہنے لگے ''اگر تمہارے پیٹ میں رہ جائے تو ایک خبر سناؤں؟''
ہم نے کہا ''کیسی خبر؟''
بولے '' یہ کسی کو بتانے کی نہیں ہے مگر میرے لئے پیٹ میں رکھنا بھی مشکل ہے۔ اس لئے تمہیں بتا رہا ہوں۔ وعدہ کرو کہ کسی کو نہیں بتاؤ گے''!
ہم نے وعدہ کر لیا۔
کہنے لگے ''اعجاز اور نور جہاں کی شادی ہو گئی ہے۔''
یوں لگا جیسے ہمارے سر پر بم پھٹ گیا۔ ساکت انہیں دیکھتے رہ گئے۔
''الیاس بھائی۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''
''سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اسی چکر میں لگا ہوا تھا۔''
''مگر۔۔۔ مگر یہ کب ہوا۔ کیسے ہوا، یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔''
بولے ''پھر بھی ہو گیا۔''
اس کے بعد انہوں نے تفصیل سنائی کہ کس طرح یہ رومان اندر اندر پروان چڑھ رہا تھا۔ میڈم ہر قیمت پر اعجاز سے

شادی کرنے پر مصر تھیں۔اعجاز کی بھی رضامندی شامل تھی اگرچہ وہ کھل کر بیان نہیں کرتا تھا۔آخر یہ کہ چپکے چپکے نکاح ہو گیا۔گنتی کے چند لوگ اس میں شامل تھے۔پھر کہا۔"دیکھو میں نے یہ خبر صرف تم ہی کو بتائی ہے' کسی کو بتانہ دینا۔"

ہم نے وعدہ کر لیا۔وہ مزید تفصیلات بتاتے رہے اور ہم اس بات پر افسردہ ہو گئے کہ اعجاز نے ہمیں دھوکے میں رکھا۔ پھر سوچا کہ ایسے معاملات میں ہر ایک کو راز دار بھی نہیں بنایا جا سکتا۔وہ بھی اپنی جگہ حق بجانب تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" الیاس صاحب نے پوچھا۔

ہم نے کہا"جو ہونا تھا،اب وہ ہو چکا۔اب تو یہی دعا کرنی چاہیے کہ یہ شادی کامیاب رہے۔"

الیاس بھائی نے بتایا کہ میڈم بالکل بدل گئی ہیں۔نمازیں پڑھتی ہیں۔قرآن کی تلاوت کرتی ہیں۔انہوں نے اعجاز کی خاطر اداکاری ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے فی الحال گانے گائیں گی لیکن اگر اعجاز نے کہا تو گلوکاری بھی چھوڑ دیں گی۔ انہوں نے اعجاز سے شادی کرنے کے لئے بہت قربانیاں دی ہیں۔

ہم فکر مند ہو گئے"الیاس بھائی،اب اعجاز کو سمجھانا چاہیے کہ وہ اس شادی کو ہمیشہ نبھائے۔ایسا نہ ہو عمروں کے فرق کی وجہ سے کچھ عرصے بعد اکتا جائے۔"

"ارے نہیں بھئی۔وہ بہت سیریس ہے۔"

ہم دونوں بہت دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے اور دعائیں کرتے رہے کہ اللہ ان دونوں کو نیک توفیق عطا کرے۔

اعجاز سے ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔نہ ہی ہم نے کوشش کی۔ملتے بھی تو کیا کہتے؟

مگر زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ اچانک فلمی دنیا میں ایک بم پھٹ گیا۔اعجاز اور نورجہاں کی شادی کی خبر کا راز فاش ہو گیا۔

ہوا یہ کہ شادی کے موقع پر میڈم باقاعدہ دلہن بنی تھیں۔اس موقع پر ایک ہمراز فوٹو گرافر معراج کو بلایا گیا تھا تاکہ اس یادگار موقع کی تصاویر بنالی جائیں۔معراج اور منظور اسٹل فوٹو گرافر تھے اور فلم انڈسٹری میں بہت مقبول تھے۔ہر

ایک سے ان کی دوستی اور بے تکلفی تھی۔ ہر ایک کے راز دار تھے۔ان کا گرین اسٹوڈیو مال روڈ پر کافی ہاؤس کے نزدیک تھا جہاں سر شام فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے دوست احباب اکٹھے ہو کر جام و مینا سے شغل فرماتے تھے۔ شام کے بعد یہ اسٹوڈیو ایک کلب کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا۔

معراج ،منظور کی بے پروائی کے باعث یہ راز فاش ہو گیا۔انہوں نے فلم ڈیولپ کر کے خشک کرنے کے لئے لٹکا دی۔اسی وقت اداکار ہمالیہ والا پہنچ گئے ان کی نظر پڑی تو دیکھا کہ نور جہاں دلہن بنی بیٹھی ہیں۔ پھر دولہا کے لباس میں اعجاز بھی نظر آ گئے۔انہوں نے اپنے دماغ پر زور ڈالا مگر کوئی ایسی فلم یاد نہ آئی جس میں اعجاز اور نور جہاں ایک ساتھ کام کر رہے تھے۔اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ تصویریں حقیقی زندگی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہمالیہ والا گرین اسٹوڈیو سے سیدھے ایورنیو اسٹوڈیو پہنچے اور چند منٹ کے اندر یہ خبر عام ہو گئی۔ ہر ایک نے اس پر تبصرے شروع کر دیے۔ فلمی دنیا کے لئے یہ ایک چونکا دینے والی اطلاع تھی۔ کچھ عرصے سے افواہیں تو گرم تھیں مگر واقعی ایسا ہو جائے گا یہ کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔

الیاس رشیدی صاحب ہمیں ایورنیو اسٹوڈیو میں ہی مل گئے۔اعجاز بھی وہیں موجود تھے اور اس اچانک انکشاف سے بوکھلا گئے تھے۔انہوں نے میڈم نور جہاں کی کوٹھی پر فون کیا اور دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ جب بھانڈا پھوٹ ہی گیا ہے تو اب اس خبر کی تصدیق کر دینی چاہیے۔

میڈم نے اعجاز سے یہ بھی کہا کہ آپ فوراً گھر پہنچ جائیں۔اس طرح الیاس صاحب اور ہم اعجاز کی کار میں بیٹھ کر گلبرگ روانہ ہو گئے۔اعجاز کچھ پریشان بھی تھے' بے حد خوش بھی تھے۔خوب قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے۔ مگر ایک دم خاموش ہو کر فکر مند بھی ہو جاتے تھے۔ ہم سے کہنے لگے۔"یار آفاقی سوری مگر تم تو جانتے ہو کہ معاملہ ہی کچھ ایسا تھا۔"

ہم نے کہا۔"ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے۔"

گلبرگ میں میڈم کی کوٹھی پر پہنچے تو وہ کار کے ہارن کی آواز سن کر ایک سادہ سی ساری میں ملبوس ننگے پاؤں دوڑی ہوئی آئیں۔مارے خوشی کے ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ہم نے مبارک باد پیش کی تو انہوں نے مسکرا کر قبول کر لی۔ پھر

اعجاز کو بتایا کہ اس خبر کی تصدیق کے لئے کہاں کہاں سے ' کس کس کے ٹیلی فون آئے ہیں۔

''الیاس بھائی' کیا بتاؤں' بہت سی ہیروئنیں توانگاروں پر لوٹ رہی ہیں۔''

مٹھائی منگائی گئی۔ چائے اور کافی آگئی اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اعجاز بھی خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔ میڈم نورجہاں بھی مارے خوشی کے زمین پر قدم نہیں رکھ رہی تھیں۔ سارا ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ ہم نے میڈم نورجہاں کو ایک بالکل نئے روپ میں دیکھا۔ اس کے بعد بھی ہم اعجاز کے ساتھ اور اکثر الیاس بھائی کے ساتھ ان کے گھر جاتے رہے۔ ہم نے ہمیشہ میڈم کو سادہ لباس میں ہی دیکھا۔ اعجاز کو رخصت کرنے اور خوش آمدید کہنے کے لئے وہ خود کار تک آتی تھیں۔ کھانا خود ہی پکاتی تھیں۔ نمازیں پڑھتی تھیں۔ گھر کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ اعجاز کے ساتھ ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ بار بار فون کرکے اس کی خیریت پوچھتی رہتی تھیں۔ کئی بار دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ظاہر داری کررہی ہیں۔ ہر وقت اعجاز کے گرد گھومتی رہتی تھیں۔ اس کے برابر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ جاتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مشاہدے اور اندازے کے مطابق اگر میڈم نورجہاں نے زندگی میں کسی سے عشق کیا تو وہ اعجاز تھے۔ شوکت صاحب کے ساتھ بھی انہیں بہت محبت رہی مگر اعجاز کے ساتھ انہیں عشق تھا۔ اعجاز کی ہر زیادتی کو انہوں نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ یہاں تک کہ اپنی عزت نفس اور ضدی طبیعت کو بھی اعجاز کی خاطر کچل ڈالا۔ اعجاز کی محبوبہ فردوس کے لئے فلم ''ہیر رانجھا'' میں گانے بھی ریکارڈ کرائے۔ انہوں نے اپنا گھر بچانے کی بہت کوشش کی مگر اس میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ اس کا انہیں ہمیشہ قلق رہا۔

چند سالوں قبل گلبرگ کے ایک ریستوران میں میڈم ایک نجی قسم کے ڈنر میں موجود تھیں بہت اچھے موڈ میں تھیں اور بے تکلفی سے باتیں کررہی تھیں۔ کسی نے عشق اور محبت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ایک آہ بھری اور کہا۔

''عشق میں خدا کسی کو مبتلا نہ کرے۔ یہ انسان کو ذلیل کردیتا ہے۔ کہیں کا نہیں چھوڑتا''

میڈم نورجہاں واقعی اس موضوع پر اظہار خیال کرنے کی مجاز ہیں۔

اعجاز سے شادی کے بعد ان کے دوست کی حیثیت سے ہمیں بارہا میڈم کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بھی کھلایا اور ایک دن الیاس صاحب کو اور ہمیں اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی بھنی ہوئی مرغی کا مزہ بھی چکھایا

جسے آج تک ہم نہیں بھولے۔ ہم نے میڈم کو اعجاز کے رشتے سے بھابھی کہنا شروع کر دیا۔ وہ یہ سن کر خوش ہوتی تھیں۔ پھر حالات بدل گئے۔ اعجاز کے ساتھ ان کی علیحدگی ہو گئی۔ مگر ہم اکثر بے خیالی میں انہیں ''بھابی'' کہہ کر مخاطب کرتے رہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اس بات پر کبھی نہیں ٹوکا۔

''گلنار'' کی شوٹنگ دیکھنے کے لئے ہم قمر زیدی کے ساتھ شاہ نور اسٹوڈیو پہنچے۔ وہاں سبھی سے ہماری یاد اللہ ہو چکی تھی۔ سب سے ملتے ملاتے ''گلنار'' کے سیٹ پر پہنچ گئے۔ یہ لکھنؤ کی ایک قدیم نوابی حویلی کا سیٹ تھا جس پر حقیقت کا گمان گزرتا تھا۔ ''گلنار'' کی کہانی اردو کی معروف مثنوی ''زہر عشق'' سے اخذ کی گئی تھی۔ فلم کے ہدایت کار امتیاز علی تاج جیسے فاضل اور تجربہ کار ادیب تھے۔ مکالمے شوکت تھانوی نے لکھے تھے جو لکھنؤ سے بخوبی واقف تھے اور وہاں اکثر آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ پھر شوکت حسین رضوی بھی موجود تھے جو لکھنؤ ہی کے تھے۔ یوں تو وہ اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ اس زمانے میں فلمیں سوچ سمجھ کر اور تحقیق کے بعد بنائی جاتی تھیں۔ پھر اس فلم سے متعلق حضرات تو مستند اور معتبر لوگ تھے۔ اس لئے ''گلنار'' کے سیٹ پر بالکل حقیقت کا گمان گزرتا تھا۔ حویلی ایسی کہ جیسے سچ مچ کوئی دیو لکھنؤ کی کسی حویلی کو اٹھا کر لے آیا ہے۔ بارہ دریاں، محرابیں کھڑکیاں' دروازے، جھاڑ فانوس' تخت پوش' قالین ہر چیز بالکل اصل نظر آتی تھی۔

سیٹ پر نور جہاں موجود تھیں مگر پہچانی نہیں جا رہی تھیں۔ چست پاجامہ' کلیوں دار کرتہ' اس پر مخمل کی کوٹی' لمبی چوٹی کمر پر لہراتی ہوئی' پیروں میں سلیم شاہی جوتی۔ یوں لگتا تھا جیسے پرانے نوابوں کے دور میں پہنچ گئے ہیں۔ کنیزیں' ماماَئیں' مغلانیاں دست بستہ کھڑی تھیں۔ ایک جانب بڑا سا تخت بچھا ہوا تھا جس پر قالین اور تخت پوش تھا۔ ہر طرف قالین' سفید برف جیسی چاندنیاں اور گاؤ تکیے نظر آ رہے تھے۔ تخت پوش پر بو بیگم قدیم لکھنؤ لباس میں ایک بڑے سے چاندی کے پاندان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔

منظر یہ تھا کہ وہ پان بنا رہی ہیں کہ نور جہاں آ کر آداب بجا لاتی ہیں اور پھر کوئی بات کرتی ہیں۔ امتیاز علی تاج صاحب نے سین کو اوکے کر دیا۔ دوسرے سین کی تیاری شروع ہوئی تو اس وقفے میں شوکت حسین رضوی صاحب بھی سیٹ

پر آ گئے۔ایک لحاظ سے وہ اس فلم کے مشیروں میں شامل تھے اور فلم میں خالص لکھنؤ ماحول پیدا کرنے کے سلسلے میں رہنمائی کیا کرتے تھے۔ان کے اور شوکت تھانوی صاحب کے مابین فقرے بازی شروع ہو گئی۔شوکت صاحب بہت بڑے مزاح نگار تھے اور انتہائی سنجیدہ چہرہ بنا کر بہت مذاحیہ باتیں کر جاتے تھے اور لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔وہ بہت حاضر جواب اور فقرہ بازی کے فن کے امام سمجھے جاتے تھے۔ان میں اور ببو بیگم میں چوٹیں جاری رہتی تھیں مگر ہم نے اگر کبھی شوکت تھانوی صاحب کو لاجواب ہوتے ہوئے دیکھا تو ببو بیگم کے سامنے۔وہ بڑی فراخدلی سے ان کے اچھے فقروں کی داد بھی دیا کرتے تھے۔

قمر زیدی صاحب نے ہمارا بھی تعارف کرایا۔شوکت تھانوی صاحب سے ہماری ملاقات تھی مگر امتیاز علی تاج سے ملنے کا وہ پہلا موقع تھا۔وہ بہت بڑی شخصیت تھے۔جامہ زیب اور خوب صورت' سرخ و سفید رنگت' مناسب ناک نقشہ' درمیانہ قدو قامت 'شائستگی اور اخلاق و آداب ان پر ختم تھا۔غالباً یہ امتیاز علی تاج کی آخری فلم تھی۔بعد میں انہوں نے کوئی فلم ڈائریکٹ نہیں کی۔چند سال کے بعد ان کے اپنے گھر میں کسی نے انہیں قتل کر دیا۔آج تک قاتل کا سراغ ملا نہ ہی یہ معلوم ہوا کہ تاج صاحب جیسے شریف' مرنجاں و مرنج اور بے ضرر آدمی کو قتل کرنے کا سبب کیا تھا۔چلتے چلتے یہ بھی بتا دیں کہ ریڈیو کی مشہور اناؤنسر یاسمین طاہر ان ہی کی صاحب زادی ہیں جن کی نعیم طاہر سے شادی ہوئی ہے۔ اردو کی ایک نامور اور صاحب طرز ادیبہ حجاب امتیاز علی تاج صاحب کی بیگم تھیں۔بقید حیات ہیں۔لکھنا لکھانا انہوں نے بند کر دیا ہے۔زیادہ وقت بلیوں کی پرورش میں گزارتی ہیں جن کی تعداد درجنوں میں ہے۔

""گلنار"" کے سیٹ پر سنتوش صاحب کو بھی دیکھا۔وہ بھی چوڑی دار سفید پاجامہ اور انگرکھا زیب تن کئے ہوئے تھے۔

""گلنار"" بہت محنت' لگن اور کافی سرمائے سے بنائی گئی تھی مگر شاید موضوع کی وجہ سے زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔مگر پھر ایسے لوگ اور ایسا ماحول کسی اور فلم کے سیٹ پر دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

""گلنار""کی فلم بندی کے زمانے میں ہی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے سارے ملک میں سنسنی پھیلا دی۔اخبارات میں بھی خبریں شائع ہوئیں مگر اس کے اثرات بہت دور رس اور انتہائی افسوس ناک ثابت ہوئے۔

پاکستان کی کرکٹ ٹیم ہندوستان کا پہلا دورہ کر کے واپس آئی تو اس میں اوپننگ بیٹسمین نذر محمد کی بہت واہ واہ ہو رہی

تھی۔نذر محمد نے ٹیسٹ میچ میں اوپننگ کرنے کے بعد آخری کھلاڑی تک کے ساتھ کھیلنے کا ریکارڈ قائم کیا تھااور پھر بھی آؤٹ نہیں ہوئے تھے۔ ہر طرف ان کے کھیل کی دھوم تھی۔وہ فضل محمود کی طرح قومی ہیرو بن گئے تھے۔ خوش شکل اور مردانہ شخصیت کے مالک تھے۔باتیں بہت دلچسپ کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ موسیقی کے دلدادہ تھے اور خود بھی بہت سریلے تھے۔سننے میں آیا کہ میڈم نورجہاں کی ان سے ملاقات ہوئی تو یہ سلسلہ باقاعدہ ملاقاتوں تک پہنچ گیا یہاں تک کہ دوسری جگہوں پر بھی ملاقاتیں ہونے لگیں۔

ایک روز میڈم نورجہاں ان سے ملاقات کے لئے گئی ہوئی تھیں کہ کسی کھوجی نے شوکت صاحب کو خبر دے دی۔ شوکت صاحب آگ بگولا ہو کر مخبر کے ہمراہ گئے۔اس گھر پر پہنچے تو میڈم نورجہاں وہاں موجود تھیں مگر نذر محمد کا نام و نشان تک نہ تھا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ شوکت صاحب کے گرجنے کی آواز سنی تو نذر محمد نے مکان کی دوسری منزل سے چھلانگ لگادی اور اپنا ایک بازو تڑوا بیٹھے۔اس طرح پاکستان کی کرکٹ ٹیم ایک مایہ ناز کھلاڑی سے محروم ہوگئی۔نذر محمد ڈاکٹروں کے پاس جانے کے بجائے جراحوں اور پہلوانوں کے چکر میں رہے جس کی وجہ سے بازو کی ہڈی ہمیشہ کے لئے خراب ہوگئی اور وہ پھر کرکٹ نہ کھیل سکے۔ البتہ انہوں نے اپنے فرزند مدثر نذر کی صورت میں پاکستان کرکٹ ٹیم کو ایک نامور کھلاڑی کا تحفہ ضرور پیش کردیا۔

اب شوکت صاحب اور نورجہاں کا قصہ سنئے۔شوکت صاحب نے اس مکان میں نورجہاں کو پالیا مگر نذر محمد موجود نہ تھے۔میڈم نورجہاں نے اپنی صفائی میں یہ کہا کہ وہ اپنی عزیز سہیلی سے ملنے کے لئے آئی تھیں لیکن شوکت صاحب کا دل صاف نہ ہوا۔انہوں نے برا بھلا کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور غصے میں نورجہاں کو وہیں چھوڑ کر واپس چلے آئے۔اگلے ہی روز نذر محمد کا بازو ٹوٹ جانے کی خبر بھی عام ہوگئی۔اس زمانے میں دنیا بہت سمٹی ہوئی تھی۔ہر بات پل بھر میں عام ہو جایا کرتی تھی۔میڈم نورجہاں تو اس واقعے کی تردید ہی کرتی رہیں مگر شوکت صاحب کو یقین نہ آیا۔وہ غصے میں پیچ وتاب کھاتے ہوئے واپس لوٹ گئے اور سب کو بتادیا کہ وہ نورجہاں کی صورت تک نہیں دیکھنا چاہتے۔اس حالت میں نورجہاں کے شاہ نور اسٹوڈیو واپس آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔"گلنار" کے فلم ساز میاں احسان جو اس

گھرانے کے بہت پرانے دوست بھی تھے نور جہاں کو اپنے گھر لے گئے۔ ''گلنار'' کی شوٹنگ رک گئی۔ شاہ نور اسٹوڈیو میں میڈم نور جہاں کے گانوں کی صدا بندی بھی بند ہو گئی۔ اس وقت تک وہ شاہ نور کے علاوہ کسی اور اسٹوڈیو میں گانا ریکارڈ نہیں کراتی تھیں۔ اس طرح جو تھوڑا بہت فلمی کام ہو رہا تھا وہ بھی ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ نور جہاں گھر سے باہر رہائش پذیر تھیں۔

چند دن تو بندش جاری رہی پھر متعلقہ لوگوں نے اور خاص طور پر امتیاز علی تاج صاحب نے شوکت صاحب کو سمجھایا کہ اس طرح تو دوسرے لوگوں کا بہت نقصان ہو رہا ہے۔ شوکت صاحب نے نور جہاں کو شوٹنگ اور ریکارڈنگ کے لئے شاہ نور اسٹوڈیو آنے کی اجازت تو دے دی مگر گھر کے دروازے ان پر بند ہی رکھے۔ اس طرح نور جہاں کا شاہ نور اسٹوڈیو میں آنا جانا شروع ہو گیا مگر شوکت صاحب ان سے بے تعلق ہی رہے۔ انہوں نے نور جہاں کی موجودگی میں ''گلنار'' کے سیٹ پر جانا ترک کر دیا۔ جب نور جہاں کے گانے کی صدا بندی ہوتی تو وہ ریکارڈنگ ہال سے دور دور ہی رہتے مگر یہ بے رخی زیادہ عرصے نہ چل سکی۔

شوکت حسین رضوی اور نور جہاں کی ازدواجی زندگی میں آئندہ جا کر جو خرابیاں پیدا ہوئیں یہ واقعہ اس کا سنگ بنیاد بنا اور پھر رفتہ رفتہ فاصلے پیدا ہوتے چلے گئے۔ شوکت صاحب اپنی خودداری اور ضد کے ہاتھوں مجبور تھے۔ ادھر میڈم نور جہاں کو ہمدردوں اور دوستوں کے روپ میں ایسے لوگ مل گئے جنہوں نے ان دونوں کے درمیان ایسے حالات پیدا کر دیے کہ نوبت مقدمہ بازی اور بدترین الزام تراشی تک پہنچ گئی۔ قصوروار کون تھا؟ اس کا فیصلہ ہم اور آپ تو نہیں کر سکتے۔ دونوں کے پاس شکایات کا انبار اور الزامات کا پلندا موجود ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ شوکت صاحب واقعی نور جہاں کے عشق میں گرفتار تھے۔ سنا ہے کہ کسی زمانے میں وہ بھی شوکت صاحب سے سچا عشق کرتی تھیں مگر شوکت صاحب کی حالت ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ وہ بجھ سے گئے تھے۔ خاموش اور مغموم رہنے لگے تھے۔

جس وقت نور جہاں شاہ نور اسٹوڈیو میں آتی تھیں تو شوکت صاحب ادھر ادھر ہو جاتے تھے مگر پھر بڑی بے چینی کے ساتھ ''گلنار'' کے سیٹ کے باہر گھومتے نظر آتے۔ اگر نور جہاں کے گانے کی صدا بندی ہوتی تو شوکت صاحب ریکارڈنگ ہال کے آس پاس ہی پائے جاتے۔ اس اثنا میں بعض مشترکہ دوستوں نے نور جہاں کی جانب سے صفائی پیش

کرنی شروع کر دی تھی اور نور جہاں کے پیغام بھی شوکت صاحب کو پہنچانے لگے تھے مگر شوکت صاحب روٹھے ہی رہے۔

ایک رات ''گلنار'' کی شوٹنگ جاری تھی۔ میڈم نور جہاں کے کام میں وقفہ آیا تو وہ تازہ ہوا کھانے کے لئے سیٹ سے باہر نکل کر باغ میں پہنچ گئیں۔ وہاں قالین بچھے ہوئے تھے۔ تھک ہار کر لیٹیں تو آنکھ لگ گئی۔

شوکت صاحب حسب معمول چاروں طرف بولائے بولائے پھر رہے تھے۔ نور جہاں کو باغ میں سوتے ہوئے دیکھا تو ایک بار تو نظر انداز کر کے چلے گئے مگر پھر وہیں منڈلانے لگے۔ آخر نہ رہا گیا تو نور جہاں کے پاس پہنچ گئے۔ انہیں جھنجوڑ کر بیدار کیا اور پوچھا ''یہاں فرش پر کیوں لیٹی ہو؟''

نور جہاں نے جواب نہ دیا مگر آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

شوکت صاحب نے پھر پوچھا ''نور جہاں' یہاں کیوں لیٹی ہو؟''

نور جہاں بے اختیار اٹھ کر شوکت صاحب سے لپٹ گئیں اور رونے لگیں ''میاں' مجھے معاف کر دو''

شوکت صاحب کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ انہیں گلے لگالیا اور پھر گود میں اٹھا کر گھر کے اندر لے گئے۔

یہ واقعہ ہمیں لقمان صاحب نے سنایا تھا۔ وہ اب مرحوم ہو چکے ہیں مگر وہ کہتے تھے کہ وہ اس واقعے کے عینی شاہد تھے۔ وہ شوکت صاحب کے پرانے اسسٹنٹ تھے اور بمبئی میں ان دونوں کے گھر میں بھی رہ چکے تھے۔ شوکت صاحب اور نور جہاں کے حقیقی دوستوں کی طرح وہ بھی ان کی علیحدگی سے پریشان تھے۔ اس منظر کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنی خوشی برداشت نہ کر سکے شاعر نے کہا ہے۔

بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

مگر ملاپ کا یہ مزہ دیرپا نہ ثابت ہوا۔ ایک بار ان دونوں کے درمیان بے اعتمادی کی جو لکیر پیدا ہو گئی تھی وہ وقت کے ساتھ گہری ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ علیحدگی' مقدمہ بازی اور طلاق تک نوبت پہنچ گئی۔

صبیحہ خانم پاکستان بننے کے بعد ہیروئن بنی تھی۔ اس سے پہلے ان کی والدہ تھیٹر میں کام کیا کرتی تھیں۔ نام تو ان کا اقبال بیگم تھا مگر بالو کے نام سے مشہور تھیں۔ گجرات کے ایک اچھے خاندان سے ان کا تعلق تھا مگر ایک خوبرو نوجوان کی

محبت میں ایسی گرفتار ہوئیں کہ اپنی اوراس کی حیثیت بھی فراموش کر دی۔ یہ صاحب محمد علی تھے۔
اقبال بیگم کے ماں باپ کواس بات کا علم ہوا توانہوں نے بیٹی کو سمجھایااور پابندیاں عائد کر دیں مگر وہاں تو معاملہ عشق تک پہنچ چکا تھا۔ محمد علی نے بالو کی یاد میں شاعری شروع کر دی اور سر عام گاتا پھرتا۔ان گانوں کو پنجابی موسیقی میں ایک نئی صنف ''ماہیا'' کا نام دیا گیا۔''ماہیا'' دراصل عشقیہ اشعار ہوتے ہیں جنہیں ایک مخصوص طرز میں گایا جاتا ہے۔ یہ طرز بھی محمد علی کی اپنی ایجاد تھی۔ادھر تو محمد علی کے کھلے عشق نے بدنام کر دیا تھاادھر اقبال بیگم بھی سب کچھ ترک کر کے محمد علی کے ساتھ زندگی گزارنے پر تل گئی تھی۔اس طرح اس نے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ دیا۔ محمد علی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کوچوان تھا۔ تعلیم بھی نہیں تھی۔اقبال بیگم سے شادی کے بعد عشق کے تقاضے نہ نبھا سکااور بالو کو گزراوقات کے لئے تھیٹر میں کام کرنا پڑا۔ محمد علی نے سب کام کاج چھوڑ دیااور بیوی کی آمدنی پر گزارا کرنے لگا۔ان دونوں کی محبت یا عشق کی نشانی صبیحہ کی صورت میں عالم وجود میں آئی۔ صبیحہ کے نانااسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ بچپن میں صبیحہ نے کچھ وقت وہاں گزارا بھی تھا مگر صدمات اور مایوسیوں نے بالو کو ٹی بی جیسے موذی مرض میں مبتلا کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ جوانی کے عالم میں ہی وفات پا گئی۔ صبیحہ کے نانا نے بہت زور مارا کہ نواسی کو اپنے پاس رکھیں مگر محمد علی عدالت کے بل پر صبیحہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔اس طرح صبیحہ نے ایک بے عمل، گمراہ اور خود غرض باپ کے زیر سایہ پرورش پائی۔ محمد علی کو شراب خانہ خراب نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔کام کاج اول تو تھا نہیں اور جو تھا بھی تو وہ آمدنی شراب کی نذر ہو جاتی تھی۔ان حالات میں اس لڑکی نے حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم کیا جسے کچھ عرصے بعد پاکستانی فلمی صنعت کی ''خاتون اول'' بننا تھا۔ مگراس کے لئے صبیحہ کو بہت پاپڑ بیلنے پڑے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صبیحہ نے جو بھی لیاقت یا مقام حاصل کیا۔ بذات خود اپنی کوشش، محنت اور لگن سے حاصل کیا۔

باپ کو تو مے نوشی سے ہوش نہ تھا۔ صبیحہ نے اپنے طور پر لکھنا پڑھنا سیکھا۔ عرفان کھوسٹ کے والد سلطان کھوسٹ، ریڈیو تھیٹر اور فلم کے فن کار تھے۔ محمد علی سے ان کی دوستی تھی۔انہوں نے صبیحہ میں ذہانت کے جراثیم دیکھے تو اپنی نگرانی میں لے لیا۔اس طرح جو تھوڑی بہت تعلیم و تربیت صبیحہ کو ملی وہ سلطان کھوسٹ کی بدولت ملی۔

صبیحہ کواس کا باپ ہیروئن بنانا چاہتا تھا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ گورا بے داغ رنگ، دلکش نقوش، سریلی آواز، کمی صرف یہ تھی کہ قد چھوٹا تھا۔ محمد علی کو صبیحہ کی صلاحیتوں سے نہیں کمائی سے مطلب تھا۔ اس لئے وہ اسے ہیروئن بنانے پر تلا ہوا تھا مگر اس زمانے میں فلم سازی برائے نام ہو رہی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ابتدائی سالوں میں جب صبیحہ کو فلم سازوں نے دیکھا تو اسے مسترد کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ہیروئن بننے کے قابل نہیں ہے مگر صبیحہ نے اپنی کوشش جاری رکھی۔

ہم نے صبیحہ کو پہلی بار رائل پارک میں سلطان کھوسٹ کے ساتھ پیدل جاتے ہوئے دیکھا' وہ برقعے میں ملفوف تھی۔ ایک صاحب نے بتایا کہ سلطان کھوسٹ کے ساتھ جو لڑکی ہے وہ صبیحہ ہے۔ اس وقت صبیحہ نے ایک دو فلموں میں کام کر لیا تھا مگر کوئی مقام حاصل نہ کر سکی تھی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جس فلم ساز نے صبیحہ کو مسترد کر دیا تھا بعد میں اس نے منہ مانگے معاوضے پر صبیحہ کو اپنی کئی کامیاب فلموں میں کاسٹ کیا۔

صبیحہ نے جس فلم میں پہلی بار کام کیا وہ پنجابی فلم "بیلی" تھی۔ اس لحاظ سے بڑی فلم تھی کہ اس کے مصنف سعادت حسن منٹو اور ہدایت کار مسعود پرویز تھے۔ ایسے مایہ ناز مصنف اور قابل ہدایت کار کے اشتراک سے بننے والی اس فلم میں صبیحہ ہیروئن نہیں تھی۔ اس فلم کی ہیروئن شاہینہ تھیں۔ بلند قامت سرخ وسفید رنگت' دراز قد نیلی آنکھیں اور لمبوترا چہرہ۔ یہ شاہینہ کا سراپا تھا۔ وہ موسیقار رفیق غزنوی کی بیٹی تھیں اور اس رشتے سے سلمیٰ آغا کی قرابت دار بھی سمجھ لیجئے۔ شاہینہ نے پاکستان کی بعض ابتدائی فلموں میں کام کیا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکیں اور پھر اچانک غائب ہو گئیں۔

"بیلی" میں شاہینہ کے مقابلے میں سنتوش کمار ہیرو تھے۔ صبیحہ نے اس فلم میں ایک بے حد معمولی سا کردار کیا تھا۔ "بیلی" کے موسیقار رشید عطرے تھے۔ اس کے باوجود یہ فلم بری طرح فلاپ ہو گئی۔ اس کی موسیقی بہت اچھی تھی۔ باقی کوئی چیز بھی قابل ذکر نہ تھی۔ جب فلم ریلیز ہوئی تو تماشائیوں نے پہلے شو میں ہی فرنیچر توڑ دیا اور بہت اودھم مچایا۔ یہ اس زمانے کا دستور تھا کہ اگر فلم بینوں کو فلم پسند نہیں آتی تھی تو وہ سنیما کا فرنیچر توڑ دیا کرتے تھے۔ سیٹوں کی گدیاں چاقو سے کاٹ دیتے تھے بلکہ بعض اوقات اسکرین بھی پھاڑ دیا کرتے تھے۔

"بیلی" کے بارے میں ایک لطیفہ بھی مشہور ہے۔ وہ یہ کہ "بیلی" کے پہلے شو میں مسعود پرویز اور رشید عطرے

بھی فلم دیکھنے پہنچ گئے اور اوپر بالکونی میں بیٹھ کر تماشائیوں کا رد عمل دیکھنے لگے۔ فلم بینوں کو سعادت حسن منٹو اور مسعود پرویز کی فلم سے کافی بلند توقعات وابستہ تھیں مگر فلم ان کی توقعات کے برعکس تھی۔ تھوڑی دیر تو انہوں نے برداشت کیا پھر بے چین ہو کر کروٹیں بدلنے لگے۔ اس کے بعد ہوٹنگ اور شور و غل شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ نوبت توڑ پھوڑ تک پہنچ گئی۔ تماشائیوں نے غصے میں آکر کرسیاں توڑنی شروع کر دیں۔ ادھر ہال میں تماشائیوں کا یہ عالم تھا اور ادھر بالکونی میں رشید عطرے صاحب اس تمام ہنگامے سے بے نیاز اپنی موسیقی میں کھوئے ہوئے تھے۔ جب کوئی نغمہ شروع ہوتا وہ مسعود پرویز کی توجہ اس طرف مبذول کراتے اور کہتے ''مسعود صاحب' یہ پیس دیکھا آپ نے۔ وائلن اور طبلے کو کس طرح پیش کیا ہے۔''

مسعود پرویز تماشائیوں کے رد عمل اور فلم کی ناکامی کی وجہ سے پریشان بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بار پھر جب رشید عطرے صاحب نے ان سے کہا ''مسعود صاحب' ذرا یہ ستار کا پیس دیکھئے' کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔''

اسی وقت ٹوٹی ہوئی کرسی کا ایک پایہ کسی نے نیچے ہال میں سے اوپر اچھال دیا جو مسعود پرویز صاحب کے پاس آکر گرا۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے وہ ٹکڑا اٹھا کر رشید عطرے صاحب کو دکھایا اور بولے ''ذرا یہ پیس بھی ملاحظہ کر لیجئے۔''

''بیلی'' ناکام ہو گئی لیکن اس فلم میں صبیحہ کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ کسی نے اس نئے چہرے کو خاص توجہ بھی نہیں دی۔ اس طرح صبیحہ کی پہلی فلم ناکامی سے دوچار ہو گئی تھی۔ مگر صبیحہ کی اداکاری اور شکل و صورت فلم سازوں کو پسند آگئی تھی۔ انہوں نے صبیحہ کو فلموں میں کاسٹ کرنا شروع کر دیا۔ دوسری فلم '' ہماری بستی'' میں وہ نجمہ کے ساتھ کام کرتی ہوئی نظر آئیں۔ نجمہ کے مقابلے میں یہ بھی ثانوی کردار تھا۔ تیسری فلم ''دو آنسو'' انور کمال پاشا نے بنائی تھی مگر اس فلم کی ہیروئن شمیم تھیں۔ اس فلم کے دوران میں ہی انور کمال پاشا نے شمیم سے شادی کر لی تھی۔ اس فلم کے بعد صبیحہ نے امین ملک کی فلم ''غیرت'' اور ''پنجرہ'' میں کام کیا۔ یہ دونوں فلمیں نہ چل سکیں۔ ان میں صبیحہ کے ساتھ مسعود ہیرو تھے۔ مسعود بمبئی سے آئے تھے اور وہاں ان کی فلم ''دیور'' بہت زبردست ہٹ ہوئی تھی۔ بہت شریف' تعلیم یافتہ اور ملنسار آدمی تھے مگر اداکاری کے میدان میں قسمت زیادہ مہربان نہیں تھی۔ انہوں نے بعد میں چند اور فلموں میں کام کیا۔ فلم سازی اور ہدایت کاری بھی کی مگر ان کی کوئی فلم صحیح معنوں میں کامیابی سے ہم کنار

نہیں ہوئی۔ان کی باتیں اور واقعات بھی کم نہیں ہیں۔ مگر اس وقت تذکرہ صبیحہ خانم کا ہو رہا ہے۔

صبیحہ کے حسن و جمال اور اداکارانہ صلاحیتوں میں تو کوئی کلام نہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ ناکام فلموں میں کام کرنے کے باوجود فلم سازوں نے انہیں یاد رکھا اور انہیں اداکاری کا موقع ملتا رہا مگر وقت مہربان نہ تھا۔ ان کی پہلی فلم جسے کامیاب کہا جاسکتا ہے انور کمال پاشا کی ''غلام '' تھی۔اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس فلم میں تین ہیروئنیں تھیں۔راگنی' صبیحہ اور شمی۔ شمی اور صبیحہ اس زمانے میں ہم پلہ سمجھی جانے لگی تھیں۔ان کی صورت شکل بھی اچھی تھی مگر ان کی اداکاری میں صبیحہ خانم والی بات نہیں تھی۔''غلام'' نے فلم بینوں اور فلم سازوں کو صبیحہ کی طرف مائل کر دیا۔ انور کمال پاشا نے بھی اس فلم سے شہرت حاصل کی۔غالباً یہ پہلی اور آخری فلم تھی جس میں صبیحہ اور شمی نے ایک ساتھ کام کیا تھا۔اس کے بعد وہ ایک دوسرے کی حریف بن گئیں اور چشمک شروع ہو گئی۔شمی تو جلد ہی سدھیر سے شادی کر کے فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو گئی مگر صبیحہ اوج ثریا تک پہنچ گئیں۔

لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب صبیحہ باقاعدہ اور مقبول ہیروئن بننے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی تھیں اور حقیقی معنوں میں ہیروئن کے مقام پر فائز نہیں ہوئی تھیں۔

اس زمانے میں ہمارے ایک صحافی دوست مظہر یوسف زئی ایک فرمائش لے کر ہمارے پاس آئے۔مظہر یوسف زئی اس زمانے میں کلیم عثمانی کے ساتھ مل کر ایک فلمی ماہنامہ ''گل و خار'' شائع کیا کرتے تھے۔دلچسپ اور سوشل قسم کے آدمی تھے جب کہ ان کے ساتھ کلیم عثمانی سنجیدہ اور ثقہ قسم کے مزاج رکھتے تھے۔اس کے باوجود دنوں میں دوستی بھی تھی اور حصہ داری بھی۔مزاجوں کے فرق کا فائدہ یہ تھا کہ ایک کی کمی دوسرا پوری کر دیا کرتا تھا۔مظہر یوسف زئی آج کل بھی کراچی میں ہیں اور تمبا کو کمپنی سے منسلک ہیں۔

مظہر یوسف زئی کی خواہش تھی کہ ہم ''آفاق'' کی فلمی صفحے پر صبیحہ خانم کا انٹرویو اور تصویر شائع کریں۔ مگر انہوں نے براہ راست مدعا بیان کرنے کے بجائے ہم سے تقاضا شروع کر دیا کہ صبیحہ خانم کے گھر چل کر چائے پیو۔

ہم پہلے تو ٹالتے رہے مگر جب انہوں نے ناراضگی کا اظہار شروع کر دیا تو مجبوراً رضامند ہو گئے۔انہوں نے دوسرے دن شام کا وقت مقرر کر دیا اور ہمیں لینے کے لئے دفتر میں آ گئے۔

اس زمانے میں صبیحہ خانم وکٹوریہ پارک کے ایک بنگلے میں رہنے لگی تھیں۔ وکٹوریہ پارک مال روڈ کے عقب میں ایک رہائشی علاقہ تھا جہاں پرانی طرز کے بنگلے بنے ہوئے تھے۔ یہاں کسی زمانے میں زیادہ تر اینگلو انڈین رہا کرتے تھے۔ یہ جگہ ہمارے دفتر کے نزدیک ہی تھی۔ ہم پیدل ہی مظہر یوسف زئی کے ساتھ وکٹوریہ پارک چلے گئے۔

ایک پرانے لیکن صاف ستھرے بنگلے میں لے جا کر انہوں نے ہمیں بٹھا دیا اور خود اندر جا کر ہمارے آنے کی اطلاع کر دی۔ ڈرائینگ روم میں معمولی سا صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا۔ پردے بھی لٹکے ہوئے تھے۔ فرش پر قالین نہیں تھا لیکن کمرے میں گلدستے وغیرہ بڑے سلیقے سے سجائے گئے تھے۔ جو مکینوں کی خوش ذوقی کا مظہر تھے۔ ہم مظہر یوسف زئی کے ساتھ بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ اتنی دیر میں پردہ ہٹا اور صبیحہ خانم گہرے سبز رنگ کی ساڑی میں ملبوس اندر داخل ہوئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے صبیحہ کو قریب سے دیکھا تھا۔ وہ حسن و صحت کا نمونہ نظر آ رہی تھیں۔ فلموں کے مقابلے میں اصل زندگی میں وہ زیادہ دلکش نظر آئیں۔ گورا رنگ، خوبصورت ناک نقشہ، بات کرنے کا شائستہ انداز اور گہرے سبز رنگ کی ساڑھی میں وہ بہت پر کشش نظر آ رہی تھیں۔

ہم نے کھڑے ہو کر ان سے علیک سلیک کی۔ وہ بے تکلفی سے بیٹھ گئیں اور ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد چائے بھی آ گئی۔ انہوں نے چائے کے ساتھ پیسٹری وغیرہ کا بھی اہتمام کیا تھا۔ چائے کے دوران میں یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان دینے کی تیاری کی ہے لیکن کوئی اسکول امتحان کے لئے ان کا داخلہ بھیجنے کو تیار نہیں ہے۔ انہوں نے انگریزی پڑھنے کے لئے ایک اینگلو انڈین خاتون کی خدمات بھی حاصل کر رکھی تھیں جن کا نام ہمیں یاد نہیں رہا مگر انہوں نے ماڈرن انداز اور طور طریقوں کے ساتھ ساتھ صبیحہ کو انگریزی بولنے کا ڈھنگ بھی سکھا دیا تھا۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صبیحہ آغاز ہی سے بہت ڈھنگ سے زندگی بسر کرنے کے منصوبے بنا رہی تھیں اور انہوں نے جو کچھ بھی حاصل کیا محض اپنی ذاتی کوشش اور محنت سے حاصل کیا۔ ان کا شوق دیکھا تو ہمیں بہت تعجب ہوا۔ اس سے پہلے ہم نے کسی ایکٹریس کو پڑھنے یا امتحان دینے کی خواہش میں مبتلا نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے بعد کوئی ایسی اداکارہ نظر آئی۔

مظہر یوسف زئی نے کہا ”اگر مدرستہ البنات کی ہیڈ مسٹریس سے سفارش کی جائے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ یار تم تو

صحافی ہو‘ تمہاری بات وہ ضرور مانیں گی۔“

صبیحہ خانم نے بھی ملتجیانہ نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور ہم نے وعدہ کر لیا کہ کوشش ضرور کریں گے۔

اس اثنا میں صبیحہ اٹھ کر اندر گئیں تو مظہر یوسف زئی نے ہم سے کہا ”یار چائے پی لی‘ پیسٹری کھالی دنیا بھر کی باتیں کئے جا رہے ہو‘ انٹرویو کیوں نہیں لیتے؟“

ہم نے کہا ”کیا انٹرویو بھی لینا ہے؟“

بولے ”اور نہیں تو کیا۔ میں نے صبیحہ خانم سے خاص طور پر کہا تھا کہ تم ان کا انٹرویو ”آفاق“ میں چھاپو گے۔ دیکھا نہیں وہ انٹرویو کے خیال سے تیار ہو کر بیٹھی ہیں۔“

ہم نے کہا ”مگر تم نے پہلے تو بتایا نہیں تھا۔ ہم تو انٹرویو کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارے پاس کاغذ وغیرہ ہے۔“

بولے ”بے کار بہانے مت کرو۔ انٹرویو کے لئے تیاری کی کیا ضرورت ہے۔ تم کوئی اناڑی تو ہو نہیں۔ رہا کاغذ تو وہ ہم تمہیں دے دیں گے۔“

ہم نے کہا ”دیکھو بھائی‘ تم نے چائے پینے کے لئے کہا تھا انٹرویو کی بات نہیں ہوئی تھی۔ اب انٹرویو کسی اور وقت کر لیں گے کافی دیر ہو گئی ہے۔“

ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی صبیحہ خانم دوبارہ کمرے میں داخل ہوئیں اور مظہر یوسف زئی نے ہمیں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرنے شروع کر دیے کہ انٹرویو شروع کر دو۔ ہم انجان بن گئے۔ صبیحہ خانم سے ہم نے اجازت طلب کی اور وعدہ کیا کہ مدرستہ البنات کی ہیڈ مسٹریس سے ان کے بارے میں بات کریں گے۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولیں مگر چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ انہیں یہ بات اچھی نہیں لگی کہ ہم نے ان کا انٹرویو نہیں لیا۔ پھر بھی بڑے اخلاق سے مسکرا کر انہوں نے ہمیں رخصت کیا اور بنگلے کے باہر تک رخصت کرنے آئیں۔

ان کے گھر سے کچھ دور پہنچتے ہی مظہر یوسف زئی نے ہم سے جھگڑا شروع کر دیا۔

”کمال کرتے ہو۔ میری عزت خاک میں ملا دی۔ میں نے دوست سمجھ کر وعدہ کیا تھا اور تم نے ذرا بھی لحاظ نہیں کیا۔“

ہم نے کہا "بھائی وعدہ کیا تھا تو ہمیں بھی بتا دیا ہوتا۔ اتنی دیر میں بتایا کہ انٹرویو کے لئے وقت ہی باقی نہیں رہا تھا۔ ان سے پھر کبھی انٹرویو کر لیں گے۔"

مگر مظہر صاحب روٹھے ہی رہے اور کئی دن تک ہم سے نہیں ملے۔

ہم نے دوسرے دن "مدرسہ البنات" میں فون کیا۔ یہ اس زمانے میں لاہور کی بہت بڑی اور مشہور' لڑکیوں کی درسگاہ تھی جہاں بڑی مشکل سے داخلہ ملتا تھا۔ ہم نے ہیڈ مسٹریس سے بات کی اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے اگلے دن سہ پہر کا وقت طے کر دیا۔

اگلے دن ہم "مدرستہ البنات" پہنچے تو ایک اور حیرت ہماری منتظر تھی۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے اس خیال سے کہ ایک صحافی ان کے اسکول میں آرہا ہے' خاص اہتمام کیا تھا۔ پہلے تو انہوں نے اپنے کمرے میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ پھر اسکول کا معائنہ کرایا۔ خاصے قاعدے قرینے کا اسکول تھا۔ ہمیں خیال بھی نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ یہ وی آئی پی سلوک کیا جائے گا مگر ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ معائنہ کرانے کے بعد ہمیں اسکول کے ہال میں لے گئیں جہاں مختلف کلاسوں کی طالبات اور استانیاں خصوصی طور پر اکٹھی کی گئی تھیں۔ انہوں نے ہمارے سامنے تقریر بازی کا مقابلہ پیش کیا۔ نظمیں اور نعتیں پڑھیں۔ اپنے اسکول اور طریقہ تعلیم کے بارے میں بتایا اور ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے آخر میں اسکول کے مسائل بھی پیش کر دیے۔ گویا یہ ایک طرح کا سپاسنامہ تھا۔ ہم اس دوران میں نہایت حیران و پریشان بیٹھے رہے۔ جب یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا تو ہم دوبارہ ہیڈ مسٹریس کے دفتر میں پہنچ گئے۔ انہوں نے چائے سے ہماری تواضع کی اور امید ظاہر کی کہ ہم ان کے اسکول کے بارے میں اپنے اخبار میں ضرور لکھیں گے۔ ہم نے فوراً وعدہ کر لیا مگر ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ حرف مدعا کیوں کر زبان پر لائیں۔

آخر ہم نے دل کڑا کر کے ان سے کہا "ہم بھی ایک مسئلہ آپ سے حل کرانا چاہتے ہیں۔"

"ہاں ہاں فرمایئے؟"

ہم نے بتایا کہ ایک فلم ایکٹریس پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان دینا چاہتی ہیں۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ان کے امتحان کا داخلہ بھیج دیں"۔

وہ تعجب سے ہمیں دیکھنے لگیں پھر بولیں ”دیکھئے جب تک کوئی لڑکی ہمارے اسکول کی طالبہ نہ ہو اس کا داخلہ نہیں بھیجا جا سکتا۔“

ہم نے کہا ”تو پھر آپ انہیں اپنے اسکول کی طالبہ بنا لیجئے۔ وہ فیس وغیرہ دینے کو تیار ہیں۔“

انہوں نے پریشان ہو کر ہمیں دیکھا اور بولیں ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایک فلم ایکٹریس کو اسکول میں داخلہ دے کر میں اپنے اسکول کے نام پر بٹہ لگوالوں؟ معاف کیجئے یہ ناممکن ہے۔“

ہم نے انہیں قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں بولیں ”اور کوئی کام ہو تو بتایئے۔ افسوس کہ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ مجھے اوپر والوں کو بھی جواب دینا ہوتا ہے اور دوسرے لڑکیوں کے والدین بھی اعتراض کریں گے وغیرہ وغیرہ۔“

ہم مایوس ہو کر چلے گئے۔ ان کے اسکول کے بارے میں تو ہم نے ایک فیچر بنا کر چھاپ دیا مگر صبیحہ خانم کو میٹرک کے امتحان میں داخلہ نہ دلا سکے۔ ہم نے یہ بات مظہر یوسف زئی کو بھی بتا دی تھی۔ خدا جانے انہوں نے صبیحہ خانم کو بتائی یا نہیں۔ خود ہماری بھی ان سے کافی عرصے تک ملاقات نہ ہو سکی۔ اس طرح یہ پہلی ملاقات قصہ پارینہ بن کر رہ گئی۔ خدا جانے صبیحہ خانم کو یہ سب یاد بھی ہے یا نہیں؟

”شمی“ پنجابی فلم تھی جس کے فلم ساز ملکہ پکھراج کے شوہر شبیر حسین شاہ تھے بلکہ خود ملکہ پکھراج ہی سارے انتظامات کرتی تھیں۔ قصہ یہ ہوا کہ ”شمی“ میں زرینہ ریشماں ہیروئن تھیں۔ یہ بھی اس زمانے کی ہیروئن تھیں۔ بعد میں انہوں نے اپنا نام تبدیل کر کے یاسمین رکھ لیا۔ چند فلموں میں کام کرنے کے بعد کیمرہ مین اور فلم ساز جعفر شاہ بخاری سے شادی کر کے مختصر سے عرصے کے لیے غائب ہو گئیں۔ مگر دوبارہ یاسمین کے نام سے نمودار ہو گئیں کچھ عرصے بعد انہوں نے سید شوکت حسین رضوی سے شادی کر لی جعفر شاہ بخاری سے ان کا ایک بیٹا ناصر تھا۔ وہ غالباً لندن میں ہے۔ سید شوکت حسین رضوی کے دو بیٹوں کی والدہ ہیں‘ دونوں بیٹے جوان ہو چکے ہیں اور شوکت صاحب کے حصے کا اسٹوڈیو کا کام سنبھالے ہوئے ہیں۔

ڈبلیو زیڈ احمد پنجاب کے ایک بہت عالی قدر خاندان کے فرد تھے۔ جس کا ہر فرد اس زمانے میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔

سبھی لوگوں نے مختلف شعبوں میں مقام پیدا کیا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد جیسا ادیب بھی اس خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ احمد صاحب کے دوسرے تمام بھائی اعلیٰ ترین سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے اور پاکستان آکر بھی بڑے ممتاز افسر بنے۔ ڈبلیو زیڈ احمد نے بھی بی اے پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان جانے کا ارادہ کیا۔ وہ چاہتے تو دوسرے بھائیوں کی طرح مقابلے کے امتحان میں حصہ لے کر یقیناً سی ایس پی افسر بن کر حکمرانی کر سکتے تھے مگر ان کا رجحان فنون لطیفہ کی طرف تھا۔ وہ اردو' انگریزی اور پنجابی کے علاوہ بنگالی اور مرہٹی زبان بھی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ قدرتی ذہانت سے مالا مال تھے۔ تخلیقی قوت ان کے اندر اتنی زیادہ تھی کہ ساری عمر اسے لٹانے اور ضائع کرنے کے باوجود آج بھی وہ نئی نسل کے لوگوں سے زیادہ تخلیقی کام کرنے کے اہل تھے۔ لیکن ان کے ساتھ المیہ یہ تھا کہ وہ بہت بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کرتے تھے۔ لیکن اسے عملی جامہ پہنانے میں فیل ہو جاتے تھے۔ انڈیا میں تو وہ اپنے سارے منصوبے مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے وجہ یہ تھی کہ وہاں سرمایہ آسانی سے اور افراط میں مل جاتا تھا۔ مارکیٹ بھی بہت بڑی تھی۔ بڑے کاموں کے لئے انڈیا کی فلم انڈسٹری بہت مناسب تھی۔ احمد صاحب کے ساتھ قدرت نے یہ ستم ظریفی کی کہ انہوں نے فلمی زندگی کا آغاز انڈیا میں کیا اور بہت وسیع پیمانے پر کیا۔ اللہ نے انہیں بے پناہ کامیابیوں سے نوازا جس کی وجہ سے روپے کی ریل پیل ہو گئی۔ بمبئی کے سرمایہ دار سیٹھ تو لکشمی دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔ جو شخص انہیں دولت کما کر دیتا ہے وہ اس کے غلام ہو جاتے ہیں۔ احمد صاحب کی فلموں نے سارے ہندوستان میں دھوم مچا دی تھیں' ہر طرف ان ہی کا چرچا تھا۔ شہرت اور دولت ان کی باندی تھی پھر سرمائے کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ وہ بڑے سے بڑا منصوبہ بھی بناتے تو اس کے لئے سرمایہ حاضر کرنے والے موجود تھے۔ مگر جب وہ پاکستان آئے تو انڈیا میں کامیابی حاصل کرنے والے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی اس محدود فلمی دنیا میں کام کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بمبئی سے آنے والے دوسرے مشہور فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو دیکھ لیجئے۔ سبھی کے ساتھ یہ سانحہ گزرا تھا۔ محبوب خان اور کاردار بھی پاکستان بننے کے بعد کراچی اور لاہور آئے تھے مگر اتنی مختصر مارکیٹ دیکھ کر واپس لوٹ گئے۔ شوکت حسین رضوی' سبطین فضلی' ڈبلیو زیڈ احمد' حسنین فضلی' ایم صادق سبھی کے ساتھ یہی سانحہ پیش آیا۔ وہاں سے آنے والوں میں جن لوگوں نے نئے حالات کے مطابق خود کو ایڈجسٹ کیا ان میں نذیر

صاحب، ایس ایم یوسف اور کسی حد تک نذیر اجمیری صاحب کا نام لیا جا سکتا ہے۔ان کے سوا دوسرے لوگوں نے یہ محسوس کیا جیسے ایک سمندر سے نکل کر وہ چھوٹی سی جھیل میں پہنچ گئے ہیں۔ اسی لئے یہ لوگ منصوبہ بندی کرتے رہے مگر عملی میدان میں وہ کارنامے سرانجام نہ دے سکے جو انڈیا میں ان کی شہرت اور کامیابی کا سبب بنے تھے۔

ہم احمد صاحب کے بہت پرانے مداح ہیں۔ان کی قابلیت، ذہانت اور تخلیقی قوتوں کے معترف بھی ہیں مگر احمد صاحب پاکستان کے محدود حالات میں خود کو ایڈجسٹ نہ کر سکے۔یہاں بھی وہ ہندوستان کی طرح بڑے پیمانے پر منصوبے بناتے رہے اور عملی طور پر کچھ بھی نہ کر سکے۔ان پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں

میری ہمتوں کی پستی میرے شوق کی بلندی

ہمت ان کی کبھی پست نہیں ہوئی مگر شوق کی بلندی آسمان سے بھی اونچی نکل گئی۔ مختصر طور پر ہمارے خیال میں احمد صاحب کا یہ تجزیہ ہے۔

مگر پہلے ان کے ماضی کی داستان سن لیجئے۔وہ انگلستان جانے کے لئے بمبئی پہنچے تو اس شہر کی سیر بھی کی۔چند جاننے والے بھی مل گئے بمبئی کو عروس البلاد کہا جاتا تھا۔یہ شہر دیکھنے کے لائق تھا۔یورپ جانے کے لئے بحری جہاز یہیں سے چلا کرتے تھے اس لئے احمد صاحب بھی بمبئی کے راستے لندن جانے کے لئے وہاں پہنچے تھے مگر اس مقام سے آگے نہ بڑھ سکے۔

ہوا یہ کہ ان کے ایک دوست کسی فلم کمپنی میں اسکرین پلے لکھتے تھے۔انہیں کمپنی والوں نے ایک بنگالی ناول سے کہانی بنانے کی ہدایت کی۔وہ بہت کوشش کرتے رہے مگر بات نہ بنی۔احمد صاحب سے تذکرہ کیا تو انہوں نے ایک نظر بنگالی ناول پر ڈالی اور دو دن میں اسکرین پلے لکھ کر دے دیا۔وہ صاحب جب یہ اسکرین پلے لے کر فلم کمپنی میں پہنچے تو سیٹھ نے دریافت کیا کہ یہ اسکرین پلے کس نے لکھا ہے؟

انہوں نے بتایا کہ میرے ایک دوست نے لکھا ہے، وہ بنگلہ بھی جانتے ہیں۔

سیٹھ نے کہا"ان سے مجھے ضرور ملاؤ۔"

دوست کے اصرار پر احمد صاحب ملاقات کے لئے سیٹھ کے پاس چلے گئے۔ سیٹھ نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ تو پیدا ہی اسکرین پلے لکھنے کے لئے کئے گئے ہیں۔ احمد صاحب نے بہت عذر کئے مگر سیٹھ صاحب پیچھے پڑ گئے۔ کچھ انہیں بھی فلم کا شوق تھا۔ یہ طے پایا کہ چند روز رک کر احمد صاحب' سیٹھ صاحب کی کہانی مکمل کر دیں گے۔ کہانی مکمل ہوئی تو سیٹھ صاحب گلے کا ہار بن گئے ادھر احمد صاحب کو بھی فلمی دنیا کی بابت معلومات حاصل ہوئیں۔ خلاصہ یہ کہ انہوں نے اعلیٰ تعلیم اور انگلستان کے سفر کا ارادہ ملتوی بلکہ منسوخ کر دیا اور بمبئی میں فلم سازی کرنے کا پروگرام بنالیا۔

احمد صاحب بہت خوبصورت گفتگو کرتے ہیں' دلائل اور منطق پیش کر ان پر ختم ہے۔ ان کی باتوں میں جادو تھا بلکہ آج بھی ہے۔ چنانچہ ان کی شیریں بیانی کی وجہ سے انہیں بمبئی میں سرمایہ مل گیا۔ احمد صاحب نے فوراً ایک بہت بڑے پیمانے پر منصوبہ بنالیا۔ وسائل کی کمی نہ تھی اس لئے اس پر عمل درآمد بھی ہو گیا۔ شالیمار اسٹوڈیو بھی بن گیا۔ انڈیا میں احمد صاحب کی پہلی فلم ''ایک رات'' تھی جس میں پرتھوی راج ہیرو تھے اور نینا ہیروئن تھیں۔ یہ فلم انتہائی کامیاب ثابت ہوئی بلکہ اس نے سارے ہندوستان کو چونکا دیا۔ فلم کا موضوع' ہدایت کاری 'مکالمے' اداکاری اور سب سے بڑھ کر چھوٹے چھوٹے علامتی ٹچ ایسے تھے جو فلم بینوں کے دلوں میں اتر گئے۔ احمد صاحب کی فلموں میں یہ خوبیاں ہمیشہ رہی ہیں' وہ اعلیٰ درجے کے لکھنے والے اور اس سے بھی بلند پایہ ہدایت کار ہیں۔ ایسے فنکارانہ ٹچ لگاتے ہیں جو دیکھنے والے کے دل کو چھو لیتے ہیں ''ایک رات'' ایک تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند تھی۔ اس پہلی فلم سے ہی ڈبلیو زیڈ احمد نے ہندوستان کی فلمی صنعت میں اپنا لوہا منوالیا۔

لیکن ٹھہرے ئے۔ اس کہانی کو آگے بڑھانے سے پہلے ضروری ہے کہ کچھ احمد صاحب کی بیگم اور ان کی فلموں کی ہیروئن کے بارے میں بیان کر دیا جائے۔ فلمی الف لیلیٰ کے آغاز میں بھی ان کا مختصر تعارف کرا چکے ہیں۔ اب کچھ مزید سنئے احمد صاحب نے اپنی بیگم شاہدہ کو اپنی فلموں میں ''پراسرار نینا'' کے نام سے پیش کیا اور ان کی پراسراریت کی ایسی دھواں دھار پبلسٹی کی کہ فلم ریلیز ہوئی تو ہر شخص یہ دیکھنے کے لئے سنیما پر ٹوٹ پڑا کہ آخر نینا میں ایسی کون سی پراسراریت ہے؟ اسرار کوئی بھی نہیں تھا لیکن دیکھنے والوں کو ایک دلکش اور نہایت باوقار ہیروئن نظر آئی۔ ان کی

شخصیت میں ایک خاص قسم کی کشش تھی۔ اداکاری وہ بالکل حقیقی اور سادہ کرتی تھیں اور وہی ان کی اداکاری کی خوبی قرار دی گئی۔

شاہدہ بیگم علی گڑھ کے ایک بہت بڑے اور روشن خیال خاندان کی بیٹی تھیں۔ انہوں نے یا ان کے خاندان والوں نے کبھی خواب و خیال میں بھی ان کے اداکارہ بننے کے بارے میں نہیں سوچا ہوگا۔ انہیں اداکاری سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ نہ ہی انہیں فلمی دنیا سے وابستگی کا شوق تھا۔ اداکاری میں ان کی عدم دلچسپی کا اندازہ ان کی فلمیں دیکھ کر بھی ہو جاتا ہے۔ بس یوں لگتا تھا جیسے کوئی فرض ادا کر رہی ہیں لیکن ان کی پرکشش شخصیت اور سراپا کی پاکیزگی کے باعث وہ فلم بینوں کو دوسری ہیروئنوں سے بالکل مختلف نظر آتی تھیں۔

شاہدہ بیگم نے علی گڑھ سے بی اے پاس کیا تھا اور ان کی شادی ایک تعلیم یافتہ نوجوان محسن عبداللہ سے ہوئی تھی۔ محسن عبداللہ بمبئی کی لیبارٹری میں انجینئر کے طور پر کام کرتے تھے گویا فلمی دنیا سے وابستہ تھے۔ فلم سے ان کا ایک تعلق یہ بھی تھا کہ ان کی بہن رینو کا دیوی کے نام سے فلموں میں اداکاری کرتی تھیں اور نامور ہیروئن تھیں۔ یہ وہی خاتون ہیں جو بعد میں پاکستان آکر بیگم خورشید مرزا کے نام سے جانی گئیں اور ٹی وی ڈراموں میں بہت مقبول ہوئیں اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

احمد صاحب کی ملاقات شاہدہ بیگم یعنی مسز محسن عبداللہ سے ہوئی تو انہیں خیال گزرا کہ وہ بہت اچھی ہیروئن بن سکتی ہے لیکن ان کے شوہر اس بات کے حق میں نہ تھے۔ احمد صاحب بذات خود اس وقت شادی شدہ تھے۔ ان کی شادی سندھ کے ایک بہت بڑے خاندان میں ہوئی تھی۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ جو قیام کے بعد سندھ کے گورنر بھی بنے تھے' احمد صاحب کے خسر تھے۔ اس طرح جب احمد صاحب اور شاہدہ بیگم آمنے سامنے ہوئے تو دونوں شادی شدہ تھے۔ بعد میں محسن عبداللہ اور ان کی بیگم کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے۔ کچھ لوگ اس کی ذمے داری محسن عبداللہ کے طرز عمل پر ڈالتے ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ احمد صاحب نے سوچ سمجھ کر ان اختلافات کو بڑھایا۔ سعادت حسن منٹو نے بھی اس موضوع پر لکھا تھا' ان کا کہنا تھا کہ احمد صاحب ہر کام طویل منصوبہ بندی کے تحت کرتے ہیں چنانچہ شاہدہ بیگم کو حاصل کرنے کے لئے بھی انہوں نے ایک طویل المیعاد منصوبہ بنایا تھا۔ بہر حال'

حقیقت کیا تھی اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ شاہدہ بیگم اور محسن عبداللہ میں پہلے عارضی علیحدگی ہوئی پھر کچھ عرصے بعد طلاق بھی ہو گئی۔

اس دور کے ایک مشہور اداکار ہمالیہ والا تھے۔ ان کا اصل نام محمد افضل تھا۔ وہ ہندوستان کے پہاڑی شہر دار جلنگ کے رہنے والے تھے۔ بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دوسرے تمام بھائی اور رشتے دار اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ ہندوستان میں بھی بڑے اہم عہدں پر فائز رہے اور پاکستان آنے کے بعد بھی اپنی قابلیت اور صلاحیت کے بل بوتے پر بڑے بڑے کام کرتے رہے۔ مگر افضل صاحب کا قصہ سب سے مختلف تھا۔ ان کا پڑھنے لکھنے میں بالکل دل نہیں لگتا تھا اس لئے انہوں نے پڑھنے کا نام ہی نہیں لیا۔ وہ آزاد منش اور بے پروا قسم کے نوجوان تھے۔ قدو قامت' صورت شکل اور بارعب آواز کی بدولت نمایاں شخصیت کے مالک تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں اداکار بننے کا شوق تھا۔ عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ فلمی دنیا میں جا کر لوگ بگڑ جاتے ہیں لیکن ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ بگڑے ہوئے لوگ ہی فلم انڈسٹری میں آتے ہیں اور نام انڈسٹری کا بدنام ہو جاتا ہے۔ ہمارے ایک دوست نے ایک بار اس قسم کے لوگوں کے سروے کرنے کے بعد لکھا تھا کہ ہر اچھے خاندان کا گندہ انڈا ہی فلم انڈسٹری کا رخ کرتا ہے۔ ہم نے بھی یہی دیکھا کہ فلمی صنعت میں جو لوگ بری عادتوں میں مبتلا تھے فلموں سے متعلق ہونے سے پہلے بھی وہ ایسے ہی تھے۔

افضل صاحب نے وہی کیا جو ہندوستان کا ہر فلم زدہ نوجوان کیا کرتا تھا۔ انہوں نے ریل کا ٹکٹ لیا اور سیدھے بمبئی پہنچ گئے۔ بانکے چھبیلے اور بلند و بالا مردانہ وجاہت کے مالک تھے اس لئے انہیں فلموں میں کام حاصل کرنے کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شکل وصورت 'قدو قامت اور آواز کی بدولت وہ بہت جلد مشہور ویلن بن گئے۔ بمبئی میں انہوں نے بہت سی اچھی عادتیں بھی سیکھیں مثلاً وقت کی پابندی۔ وعدہ ایفا کرنے کی عادت۔ دراصل بمبئی میں ہندوستان کے سارے صوبوں کے لوگ فلمی دنیا میں موجود تھے۔ اردو تو خیر بولی ہی جاتی تھی مگر پڑھے لکھے لوگ عموماً انگریزی میں بات چیت کرتے تھے۔ ہمالیہ والا نے باقاعدہ انگریزی کی تعلیم تو حاصل کی نہیں تھی مگر وہ محض بول بول کر انگریزی بولنے کے عادی ہو گئے تھے اور ان کی شخصیت اور لب ولہجے سے سننے والا اتنا مرعوب ہو

جاتا تھا کہ ان کی انگریزی میں غلطیاں نکالنے کا اسے ہوش ہی نہیں رہتا تھا۔

ہمالیہ والا نے بمبئی میں اچھا وقت گزارا تھا۔ بہت زندہ دل اور بے فکرے قسم کے آدمی تھے۔ فلموں میں کامیابی حاصل ہوئی تو پیسے بھی کمائے اور نام بھی پایا۔ مگر جب پاکستان آئے تو حالات ہی مختلف پائے۔ یہاں تو فلمیں ہی نہیں بنتی تھیں، کام کہاں سے ملتا۔ مگر ہمالیہ والا ایک نامور شخصیت اور جانے پہچانے اداکار تھے۔ انہیں اپنا ٹھاٹ باٹ اور وضع داری ہر صورت میں برقرار رکھنی تھی۔ اپر مال پر ملکہ اسٹوڈیو کے نزدیک انہوں نے ایک وسیع و عریض کوٹھی حاصل کی۔ دو چار ملازم رکھے اور جو پیسے بمبئی سے بچا کر لائے تھے وہ گھریلو سامان کی خریداری میں صرف کر دیے۔ ایک عدد کار بھی خرید لی کیونکہ بہر حال بمبئی کے مشہور اداکار تھے۔ کار ان کے لئے ایک لازمی ضرورت تھی۔ شروع میں ان کے پاس چھوٹی مورس مائنز کار تھی۔ جب فلمی صنعت نے کروٹ بدلی اور حالات بہتر ہوئے تو بڑی لمبی چوڑی امریکن پیکارڈ کار خرید لی۔ اس کی چھت کھلی ہوئی تھی۔ شام کے وقت جب وہ اپنے بے تکلف دوستوں کے ساتھ اس کھلی چھت کی کار میں ہوا خوری کو نکلتے تھے تو لوگ مڑ مڑ کر دیکھنے لگتے تھے۔ ایک تو کاریں ہی اس زمانے میں برائے نام تھیں۔ اس پر بڑی، لمبی چوڑی امریکن پیکارڈ اور اس میں تشریف فرما ہمالیہ والا جیسے اداکار کو سبھی دیکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

ہمالیہ والا بہت اچھے اداکار تھے۔ اداکاری کی صلاحیتوں کے علاوہ قدرت نے انہیں مردانہ وجاہت کا نمونہ بنایا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد۔ اس کے مطابق ڈیل ڈول۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ گھونگریالے بال (جو بعد میں بہت کم رہ گئے تھے) موزوں ناک نقشہ، کھلتا ہوا گندمی رنگ اور بہت مرعوب کن بھاری بھرکم آواز۔ ان چیزوں کی آمیزش کا نام ہمالیہ والا تھا۔ بہت بااخلاق اور خوش مزاج آدمی تھے۔ ہم نے انہیں بہت کم غصے کی حالت میں دیکھا۔ مگر غصے میں بھی بہت رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کرتے تھے۔ لڑائی جھگڑا یعنی ہاتھا پائی انہیں پسند نہیں تھی۔ طبعاً صلح کل آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی واحد اور پہلی جنگ غالباً ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کے ساتھ لڑی اور بڑی باقاعدگی اور حوصلے کے ساتھ لڑی۔ وہ پنجے جھاڑ کر احمد صاحب کے پیچھے پڑ گئے۔ ہمارے خیال میں احمد صاحب کی زندگی میں ہمالیہ والا ہی ایسے آدمی تھے جس نے احمد صاحب کو زچ کر دیا تھا۔ اس کے سوا ان کی کوئی لڑائی ہمیں یاد نہیں۔

ایک بار شاہ نور اسٹوڈیو میں ان کا علی ایڈیٹر سے جھگڑا ہو گیا۔ علی صاحب دبلے پتلے تھے۔ مگر جب ہاتھا پائی پر اتر ہی آئے تو ہمالیہ والا پریشان ہو گئے ''ارے بھئی زبان سے بات کیجئے۔ دور سے بات کیجئے۔ بے قابو ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اب منظر یہ تھا کہ ہمالیہ والا آگے آگے تھے اور علی صاحب پیچھے پیچھے۔ اس روز انہوں نے شاہ نور اسٹوڈیو کے بے شمار گملے ایک دوسرے کو مار مار کر توڑ دیے۔ ہمالیہ والا صرف جوابی کاروائی میں دفاعی کاروائی کے طور پر گملے مار رہے تھے۔ ورنہ علی کو زخمی کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اگر وہ علی صاحب کی کلائی پکڑ لیتے تو وہ چھڑانے میں کامیاب نہ ہوتے مگر بتایا نا کہ وہ لڑائی جھگڑے سے بچتے تھے۔

ہمالیہ والا بہت دلچسپ آدمی تھے۔ دوستوں کے دوست، چھڑے چھانٹ تھے اور کافی عمر تک کنوارے رہے۔ غالباً چالیس پنتالیس کے لگ بھگ ہوں گے جب انہوں نے ایک گھریلو خاتون سے شادی کر لی تھی۔ اس شادی کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ ہمالیہ والا کو تو ساری زندگی کنوارے رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ بے پروا اور بے فکرے انسان تھے۔ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔ پینے پلانے میں بھی اعتدال کی راہ نہیں اپناتے تھے اور زیادتی کی صورت میں کئی بار بہک بھی جاتے تھے۔ ایک بار لاہور اور کراچی کے فلمی ستارے سیلاب زدگان کی مدد کے سلسلے میں کرکٹ میچ کھیلنے کی صورت میں ڈھاکہ اور چٹاگانگ گئے تو ہم بھی منتظم کے طور پر ساتھ تھے۔ یہ غالباً 65ء یا 60ء کا واقعہ ہے۔ ڈھاکہ کے سب سے شاندار ہوٹل شاہ باغ میں فلم کا قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مغربی پاکستان کے فلمی ستارے مشرقی پاکستان گئے تھے۔ ائرپورٹ پر لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ لوگ عمارت کی چھت پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ ائرپورٹ کے دروازے کھڑکیاں اور شیشے ٹوٹ گئے۔ بڑی مشکل سے پولیس نے فلمی ستاروں کو حفاظت کے ساتھ ہوٹل پہنچایا۔ وہاں بھی سیکڑوں ہزاروں کا مجمع تھا۔ مغربی پاکستان کی فلمیں مشرقی پاکستان میں ریلیز ہوتی رہتی تھیں۔ مگر اس سے پہلے فلم '' سسی '' نے مشرقی پاکستان میں بے حد مقبولیت حاصل کی تھی۔ اس کی ہیروئن صبیحہ اور ہیرو سدھیر تھے مگر پبلک کو ان سے زیادہ مزاحیہ اداکار نذر کی طلب تھی۔ جنہوں نے شیر گل کے نام سے کردار کیا تھا۔ ہر طرف ''شیر گل شیر گل'' کے نعرے بلند ہوا کرتے تھے۔ فلمی ہیروئنوں کو چھوڑ کر لوگ نذر کے پیچھے آٹو گراف لینے کے لئے

دوڑا کرتے تھے۔ہوٹل کے سامنے رات دن لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ڈھاکہ کا ہر صاحب حیثیت شخص فلمی ستاروں کو مدعو کرنیکا خواہاں تھا مگر یہ ممکن نہ تھا۔

ہوٹل میں ہم اور سید کمال ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔برابر والے کمرے میں ہمالیہ والا اور ساقی کا قیام تھا۔ایک شام کو یہ ہوا کہ کسی دعوت میں ہوٹل سے باہر جانے سے پہلے ہمالیہ والا نے ہمارے پاس دو سو روپے رکھوائے اور کہا کہ دیکھو۔کسی کو بتانا نہیں ورنہ یہ لوگ مجھ سے مانگ لیں گے یا خرچ کرادیں گے۔
دعوت میں پینے پلانے کا سلسلہ بھی چلتا رہا جو اس زمانے میں رواج تھا۔ہم تو جلدی لوٹ آئے مگر ہمالیہ والا رات گئے ہوٹل واپس پہنچے۔یکایک انہیں اپنے دو سو روپوں کا خیال آیا کہ وہ کہاں گئے۔پہلے تو انہوں نے اپنے سارے کپڑوں کی تلاشی لی۔پھر ساقی صاحب کے کپڑوں میں تلاش کیا۔اس کے بعد ساقی کو جگا کر پوچھا کہ تم نے میرے دو سو روپے تو نہیں دیکھے ؟انہوں نے صاف انکار کر دیا اور پھر سو گئے۔ہمالیہ والا کو دو سو روپے کسی طرح بھلائے نہیں بھول رہے تھے۔کافی رات گزر گئی تھی۔میں اور کمال اپنے اپنے بیڈ پر لیٹے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک کمرے کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔کمرے میں بہت مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ہم دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا تو آہستہ سے کھلتے ہوئے دروازے میں سے ایک ہیولا سا اندر داخل ہوا اور دبے پاؤں کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھا۔ہم پہچان گئے کہ وہ ہمالیہ والا تھے۔چپ چاپ دیکھتے رہے۔وہ دبے پاؤں الماری کے پاس گئے اور الماری میں لٹکے ہوئے تمام کپڑوں کی تلاشی لینے میں مصروف ہو گئے۔پھر دبے پاؤں ہم دونوں کے نزدیک آئے اور ہمارے سرہانے کچھ تلاش کرنے لگے۔کمال نے ایک دم ٹیبل لیمپ جلا دیا۔کمرے میں روشنی پھیل گئی اور ہمالیہ والا بھی بھونچکا رہ گئے۔وہ صرف جانگیا اور بنیان پہنے ہوئے تھے۔یہ ان کا شب خوابی کا لباس تھا۔وہ سوتے میں خراٹے بھی بہت زبردست لیتے تھے اور ساقی صاحب ہر روز ہم سے التجا کرتے تھے کہ یار مجھ سے کمرہ بدل لو۔میری نیند پوری نہیں ہوتی۔

ہم نے کہا”مگر ہماری نیند کیسے پوری ہو گی ؟“
”تم تو بہت گہری نیند سوتے ہو۔تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔“ وہ بولے۔

ہمالیہ والا صاحب نے ہم لوگوں کو بیدار پایا تو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی میں بولے
''نقصان ہو گیا ہے کسی نے میرے دو سو روپے نکال لئے ہیں۔'' یہ کہا اور کمرے سے رخصت ہو گئے۔
ہم نے کمال کو بتایا کہ یہ دو سو روپے انہوں نے ہمارے پاس رکھوائے تھے۔ کمال نے کہا کہ انہیں روپے واپس کر دو مگر ہم نے کہا ''اس وقت وہ پھر کہیں رکھ کر بھول جائیں گے۔ صبح دے دیں گے۔''
دوسرے دن صبح ناشتے پر سب اکٹھے ہوئے تو معلوم ہوا کہ ہمالیہ والا آس پاس کے تمام کمروں میں اپنے دو سو روپے تلاش کرتے رہے تھے۔ ڈائننگ ہال میں ہماری صورت دیکھتے ہی انہیں یاد آ گیا اور وہ ہمارے پاس آ کر کہنے لگے
''میرے دو سو روپے دے دو۔''
ہم نے خاموشی سے دو نوٹ ان کے حوالے کر دیے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب ہمالیہ والا کی شادی ہوئی تو ان کی بیگم نے ان کے سامنے دو شرطیں رکھیں۔
ایک یہ کہ وہ شراب نہیں پئیں گے۔
دوسری یہ کہ وہ سر شام گھر آ جایا کریں گے۔
ہمالیہ والا نے بخوشی یہ شرطیں منظور کر لیں۔ شادی کے بعد کچھ روز ان پر عمل بھی کیا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی پرانی عادتیں عود کر آئیں۔ ایک رات بیگم انتظار کرتی رہیں مگر ہمالیہ والا صاحب غائب تھے۔ کافی رات گئے وہ واپس تشریف لائے تو ترنگ میں تھے۔
بیگم نے سنجیدگی سے کہا ''وقت دیکھا ہے آپ نے؟''
''سوری۔ کچھ دیر ہو گئی۔''
''کچھ نہیں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ دیکھئے' آپ اپنا وعدہ یاد رکھئے۔ اگر آپ دوبارہ ایسا کریں گے تو میں ساری کراکری توڑ دوں گی۔''
انہوں نے دوبارہ وعدہ کر لیا مگر دو تین دن کے بعد پھر اسی عالم میں رات گئے واپس لوٹے۔ بیگم نے ذرا بھی جھگڑا نہیں کیا۔ خاموشی سے اٹھیں اور برتنوں کی الماری میں سے قیمتی برتن نکال نکال کر زمین پر پھینکنے شروع کر دیے۔

ہمالیہ والا صاحب بہت پریشان ہوئے۔ بڑی مشکل سے بیگم کو روکا اور ایک بار پھر پکا وعدہ کیا کہ آئندہ معاہدے کی پابندی کریں گے۔

بیگم نے کہا ”اگر آپ نے وعدہ خلافی کی تو میں آپ کے تمام سوٹ جلادوں گی۔“

ہمالیہ والا صاحب نے انہیں یقین دلایا کہ آئندہ وہ عہد کی پابندی کریں گے۔ چند دن تو خیر سے گزر گئے مگر پرانی عادتیں کہاں چھٹتی ہیں۔ ایک رات پھر ہمالیہ والا دیر سے گنگناتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ بیگم نے ان سے تو کچھ نہیں کہا مگر الماری میں سے قیمتی سوٹ نکال کر لان میں ڈالے اور ماچس کی تیلی لگادی۔ ہمالیہ والا صاحب کے تو ہوش اڑ گئے بلکہ کہنا چاہیے کہ ہوش ٹھکانے آ گئے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے کچھ سوٹ بچائے اور بیگم سے ایک بار پھر پختہ عہد کیا کہ آئندہ انہیں شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔

بیگم نے کہا ”ہمالیہ صاحب۔ اگر آپ اس کے بعد بھی باز نہیں آئیں گے تو میں آپ پر پٹرول چھڑک کر آگ لگادوں گی“۔

ہمالیہ والا نے دوسرے دن یہ بات اپنے ایک قریب ترین دوست کو سنائی۔ انہوں نے کہا ” دیکھو ہمالیہ والا“ تمہیں اب تک یہ تو معلوم ہو چکا ہو گا کہ بھابی اپنی بات کی کتنی پکی ہے۔ میری مانو تو سچ مچ باز آ جاؤ۔ مجھے ڈر ہے کہ بھابی اپنی دھمکی ضرور پوری کرے گی۔“

اس کے بعد ہمالیہ والا صاحب واقعی باز آ گئے اور رفتہ رفتہ بالکل تبدیل ہو گئے۔ یہ واقعہ ان کے قریب ترین دوست نے ہمیں سنایا تھا جن کا اب انتقال ہو چکا ہے۔ مگر ساری دنیا نے یہ دیکھا کہ ہمالیہ والا جیسا بے پروا اور بے فکرا شخص انتہائی ذمے دار اور مثالی شوہر کے سانچے میں ڈھل گیا۔ شام کا وقت وہ گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ گزارتے تھے اور بہت خوشگوار گھریلو زندگی بسر کرتے رہے۔ ان میں یہ انقلاب پیدا کرنے والی ہستی ان کی بیگم کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟ وہ ایک باشعور، سگھڑ اور سمجھ دار خاتون تھیں۔ ہمالیہ والا کو جن لوگوں نے شادی سے پہلے دیکھا تھا اور پھر بعد میں ایک شوہر اور مشفق باپ کے روپ میں دیکھا انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی شخص اسقدر بدل سکتا ہے؟

ہمالیہ والا کی ایک عادت یہ تھی کہ وہ شوٹنگ کے دوران میں مکالمے بھول جایا کرتے تھے۔ بعض اوقات تو چھوٹے

چھوٹے فقرے بھی غلط بول جاتے تھے۔ مگر خوبی یہ تھی کہ الفاظ تمام کے تمام وہی ہوتے۔ صرف ان کی ترتیب بدل دیا کرتے تھے۔ جب بار بار ری ٹیک ہونے لگتی تو وہ اس کی ذمے داری دوسروں پر ڈال دیا کرتے تھے۔ کبھی کہتے کہ فلاں شخص ہل رہا ہے۔ کبھی کہتے کہ اوپر والا لائٹ مین مسکرا رہا ہے۔ ہدایت کار سر پکڑ لیتا تھا اور کہتا" آخر آپ ادھر اُدھر دیکھتے ہی کیوں ہیں؟"

ہمالیہ والا صاحب کی ایک دلچسپ عادت یہ تھی کہ وہ عموماً اس وہم کا اظہار کرتے رہتے تھے کہ ان کے خلاف انٹریگ (سازش) ہو رہی ہے۔ وہ کہتے " آفاقی۔ تمہیں بتاؤں۔ دراصل اس یونٹ میں میرے خلاف بہت انٹریگ ہو رہی ہے۔"

ہم پوچھتے " کون انٹریگ کر رہا ہے؟"

معصومیت سے کہتے " یار یہی تو پتا نہیں چل رہا مگر زبردست انٹریگ ہو رہی ہے۔"

ہمالیہ والا بہت دلچسپ' بااخلاق اور وضع دار تھے۔ اداکار بھی بہت اچھے تھے۔ اسی لیے ان کے مکالمے بھولنے کی عادت کے باوجود فلم ساز اور ہدایت کاران کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ حالانکہ بعض اوقات ان کی اس عادت کے باعث بہت نقصان بھی ہو جاتا تھا۔

جن دنوں وہ انور کمال پاشا صاحب کی فلم " انار کلی " میں اکبر اعظم کا کردار ادا کر رہے تھے' ایک روز اپنا مکالمہ بھول گئے۔ انہیں بڑے شاہانہ دبدبے سے یہ کہنا تھا کہ "مابدولت حکم دیتے ہیں کہ باغی کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔" یا کچھ اسی قسم کا مکالمہ تھا۔

ہمالیہ والا صاحب بھول گئے اور ری ٹیک شروع ہو گئیں۔

کبھی وہ کہتے " مابدولت تمہیں باغی کو لانے کا حکم دیتے ہیں۔"

یہاں تک کہ ایک بار جوش میں آکر بولے " مابدولت' تمہیں آرڈر کرتے ہیں۔"

پاشا صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔" ہمالیہ۔ تم اکبر ہو۔ اکبر بادشاہ۔ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔"

وہ ہر بار بھول جانے پر بڑے اخلاق سے " سوری" کہتے اور ہدایت کار اور سیٹ پر موجود دوسرے لوگوں کی خفگی کو

نظرانداز کر کے مسکراتے ہوئے کہتے " او کے اوکے۔ایک بار پھر ٹیک کر لیتے ہیں۔"
ان کے مکالمے بھولنے کے واقعات کم نہیں ہیں اور کافی دلچسپ ہیں۔ایک بار سیف الدین سیف کی فلم " رات کی بات" کی شوٹنگ میں وہ نہ صرف مکالمے بھول گئے بلکہ سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا۔ سین یہ تھا کہ نیر سلطانہ فلم میں ان کی پاک دامن اور نیک فطرت بیگم ہیں۔ ہمالیہ والا عیش پسند رئیس ہیں اور رات گئے شراب کے نشے میں جھومتے ہوئے حویلی میں داخل ہوتے ہیں۔ بیگم خدمت کے لیے آگے بڑھتی ہیں تو انہیں جھڑک دیتے ہیں۔اس کے بعد میاں بیوی کے مابین مکالمہ بازی شروع ہو جاتی ہے۔ مگر ہمالیہ صاحب نے اپنی بیگم کے مکالموں کے " کیو" بھی یاد کر لیے " کیو" وہ لفظ یا فقرہ ہوتا ہے جو مکالمے کے آخر میں بولا جاتا ہے۔اس کیو کو سن کر مقابل اداکار اس کے جواب میں اپنا مکالمہ ادا کرتا ہے۔ ہمالیہ والا خدا جانے کس موڈ میں تھے کہ انہوں نے اپنی بیوی کے "کیو" بھی اپنے مکالموں کے ساتھ شامل کر لیے۔اب مکالمے کچھ اس طرح ہو گئے۔

بیوی" آپ میری وفا پر بھروسا کریں میرے سرتاج۔"
شوہر" میرے سرتاج' میں اپنے معاملات میں تمھاری دخل اندازی برداشت نہیں کر سکتا۔"
جعفر ملک اس فلم کے ہدایت کار تھے۔انہوں نے شاٹ 'کٹ کرادیا اور کہا" ہمالیہ صاحب۔میرے سرتاج تو آپ کا" کیو" ہے۔آپ اپنی بیوی کو میرے سرتاج کیسے کہہ سکتے ہیں؟"
"اوکے۔اوکے' دوبارہ ٹیک کرلیں گے" ہمالیہ صاحب نے مسکرا کر کہا مگر دوسری بار بھی وہی مکالمہ ادا کیا۔ پتا چلا کہ اپنی بیوی کے تمام " کیو" انہیں یاد ہو گئے ہیں۔
اس قسم کی غلطیوں میں ہمالیہ صاحب کا کوئی قصور نہیں ہوتا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ دراصل سلیقے سے کام کرنے کے عادی تھے۔ ہدایت کار سے ان کا یہ تقاضا ہوا کرتا تھا کہ میرے سین میرے حوالے کیے جائیں تاکہ میں اپنے مکالمے یاد کر کے آؤں۔ حالانکہ اس زمانے میں کوئی دوسرا اداکار مکالمے یاد کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کیا کرتا تھا۔ٹریجڈی یہ تھی کہ ہمالیہ صاحب کے مکالمے یاد کرنے کا انداز ہی خرابی کی جڑ تھا۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں ٹہلتے جاتے اور ان کا سیکرٹری مکالمے بول کر انہیں سناتا اور وہ ان مکالموں کو یاد کر لیتے تھے۔ بعض اوقات سیکرٹری موجود نہ ہوتا تو یہ فرض

کوئی دوسرا ملازم سرانجام دیتا تھا۔ ہمالیہ صاحب تو اس کے پڑھے ہوئے مکالمے یاد کرتے رہتے تھے۔ اس طرح اس قسم کے لطیفے جنم لیتے تھے۔

ہمالیہ صاحب نے عروج کے زمانے میں ہی سالہا سال پہلے اچانک ہی فلمی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے پراپرٹی ڈیلر کے طور پر کام شروع کر دیا تھا۔ اس زمانے میں آج کی طرح بے شمار پراپرٹی ڈیلرز نہیں تھے۔ خرید و فروخت بھی زیادہ نہیں ہوتی تھی، مگر ہمالیہ والا نے ایک بہت بڑا ادارہ بنایا۔ شاندار دفتر میں بیٹھ کر وہ بڑے ٹھاٹ سے کام کیا کرتے تھے۔ اس کاروبار میں انہوں نے خوب کمایا۔
آغا جی اے گل کے جنازے کے موقع پر انہیں قبرستان میں دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس قدر بلند و بالا شاندار شخصیت کا مالک اپنا سایہ بن کر رہ گیا تھا۔ وہ چھڑی ہاتھ میں لیے اس سے ٹیک لگائے ہوئے کھڑے تھے۔ بہت خلوص اور محبت سے ملے اور گھر والوں کی خیر و عافیت دریافت کرتے رہے۔ اس کے بعد ان سے کہیں ملاقات نہ ہو سکی۔ چند سال قبل ایک دن صبح کے اخبار میں مختصر سی خبر پڑھی کہ ہمالیہ والا کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کے گھر کا پتا نہیں تھا۔ معلوم کرتے ہوئے گئے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک بھٹکتے رہے۔ افسوس کہ اتنے نامور فن کار کے پتے سے کوئی واقف نہ تھا۔ آخر مایوس ہو کر لوٹ آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے سفر آخرت کے موقع پر فلمی دنیا کے بہت کم لوگ موجود تھے۔ یہ اس شخص کے آخری سفر کا احوال ہے جو فلمی دنیا کو ترک کرنے کے باوجود بڑی باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ ہر فلمی شخصیت کے انتقال کے موقع پر لازماً موجود رہتا تھا۔ بہت دکھ ہوا۔ زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ بڑی کوشش اور نیت کے باوجود ہم خود بھی اس عظیم انسان کے جنازے کو کاندھا نہ دے سکے۔

ہمالیہ والا کو ہم نے مختلف رنگوں میں دیکھا۔ ان کی دلچسپ محفلوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ بعض اوقات اتوار کے دن وہ اپنے قریبی دوستوں اور صحافیوں کو اپنی کوٹھی پر مدعو کرتے تھے۔ ان کا گھر دور تھا اور سواری کسی کے پاس بھی نہیں تھی اس لیے ان کا ڈرائیور یا وہ خود کار میں سب کو بھر کر لے جاتے۔ دوپہر کے وقت دال بھات بھجیا، پوری کچوری، پکوڑوں اور دہی بھلوں وغیرہ کا کھانا پیش کیا جاتا۔ چائے کافی کے دور چلتے، لطیفے بازی ہوتی۔ ادھر ادھر کی

خبریں اور گپ شپ کا سلسلہ چلتا اور پھر ان کی کار سب کو واپس چھوڑ آتی تھی۔

وہ بڑے رئیسانہ انداز میں رہنے کے عادی تھے مگر پاکستان آنے کے بعد ابتدائی دن بڑی آزمائش کے دن تھے۔ وہ خود سنایا کرتے تھے کہ ایسے دن بھی آئے جب ان کے پاس پیٹرول کے لیے بھی پیسے نہ ہوتے تھے۔ ملازموں کو تنخواہ نہیں دے سکتے تھے۔ اس لیے سب کی چھٹی کر دی تھی۔ خود ہی اپنی زین کی پتلون اور دو گھوڑا بوسکی کی قمیص دھو کر استری کرتے تھے۔ یہ اس زمانے میں رئیسوں کا پہناوا اور فیشن ایبل لباس سمجھا جاتا تھا۔ پھر اپر مال سے پیدل چلتے ہوئے لکشمی چوک جاتے۔ راستے میں کوئی مل جاتا تو یہ ظاہر کرتے جیسے ٹہلنے کے ارادے سے نکلے ہیں۔ اس طرح انہوں نے کبھی اپنی ''کڑکی'' یا مفلسی کا کسی کو شک تک نہ ہونے دیا۔ مفلسی کے دن گزر گئے اور اچھا وقت آیا تو بھی دیکھنے والوں کو ہمالیہ والا میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ ایسے بامروت اور منچلے لوگ اب کہاں؟

ہمالیہ والا کے حوالے سے ہم نے مشرقی سفر کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مغربی پاکستان کے فلمی ستارے مشرقی پاکستان گئے تھے اور وہاں ان کا والہانہ استقبال کیا گیا تھا۔ اس قت ڈھاکہ میں بھی فلم سازی کا آغاز ہو چکا تھا مگر زیادہ تر فلمیں بنگلہ زبان میں بنائی جاتی تھیں۔ دراصل اردو فلمیں بنانے کی راہ میں بہت سی دشواریاں تھیں۔ نہ لکھنے والے میسر تھے نہ شاعر۔ اداکاروں کا اردو کا تلفظ اور لب ولہجہ بھی درست نہیں تھا۔ وہاں اردو فلموں کا آغاز ہوا تو ابتدا میں وہاں کے فلم ساز موسیقی تیار کرانے کے لئے لاہور ہی آیا کرتے تھے۔ کئی فلموں کی فلم بندی بھی لاہور میں ہوئی۔ خوش قسمتی سے مشہور شاعر سرور بارہ بنکوی ڈھاکا ہی میں تھے۔ فلم سازوں نے انہیں تلاش کر لیا اور بے فکر ہو گئے۔ سرور صاحب نے گانے اور مکالمے لکھنے شروع کر دیے۔ شاعر تو وہ بے بدل تھے ہی مگر مکالمے بھی بہت اچھے لکھتے تھے۔ اداکاروں کو اردو مکالموں کی ادائیگی بتانے کے لئے بھی سیٹ پر موجود رہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرور صاحب نے ڈھاکہ میں اردو فلمیں بنانے کے سلسلے میں بہت مدد کی اور فلم سازوں کی بہت سی مشکلات دور کر دیں۔ وہ ہدایت کاروں کے بھی استاد بن گئے اور اداکاروں کے بھی۔ ڈھاکہ کی فلمی صنعت میں سبھی ان کی عزت کرتے تھے۔ شبنم کو اردو سکھانے میں بھی سرور صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وہ بے حد شگفتہ مزاج' وضع دار اور خوش اخلاق انسان تھے۔ دوسروں کے کام آکر انہیں خوشی ہوتی تھی۔ ڈھاکہ والوں نے بھی انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور ہر

طرح ان کی پذیرائی کی۔ ہر ایک سے ان کے گھریلو تعلقات تھے۔ لاہور آتے تو شبنم کے گھر میں قیام کرتے تھے۔ شبنم اور روبن گھوش بھی انہیں گھر کا ایک فرد ہی سمجھتے تھے۔ سرور صاحب نے بہت عمدہ اور معیاری نغمے لکھے ہیں۔ بعد میں فلم ساز اور ہدایت کار بھی بن گئے۔ ان کی ایک فلم ''تنہا'' میں کام کرنے کے لئے شمیم آراء بھی ڈھاکہ گئی تھیں۔ یہ فلم بہت آرٹسٹک تھی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ ہارون اس کے ہیرو تھے۔ سرور صاحب نے بعد میں اردو فلمیں بھی بنائیں۔ ادب میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔ بہت خوش الحان تھے۔ ترنم سے اشعار پڑھتے تو سماں سا بندھ جاتا تھا۔ مگر جب بھی دوستوں کی محفل میں بیٹھتے تو ان کی کوشش ہوتی تھی کہ شعر و شاعری کی نوبت نہ آئے۔ لطیفہ بازی' ادب اور فلم کے بارے میں ہی گفتگو ہوتی رہے۔ مگر سب گھیر گھار کر ان کو غزل سرائی کی طرف لے آتے تھے۔ ایسی محفلیں بھی ہوئی ہیں جن میں حمایت علی شاعر اور سرور بارہ بنکوی دونوں موجود تھے اور شاعری کا دور چلا تو رات گئے تک جاری رہا۔ سرور صاحب کو ڈھاکہ سے اور ڈھاکہ والوں کو سرور صاحب سے عشق تھا۔ بنگلہ دیش بنا تو وہ پاکستان آ گئے اور کراچی میں قیام کیا لیکن جوں ہی موقع ملا ڈھاکہ چلے گئے اور ڈھاکہ کے فلم والوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا حالانکہ دونوں ملکوں کے لوگوں میں خاصی کشیدگی اور شکوہ شکایت کی فضا پائی جاتی تھی۔ لیکن سرور صاحب کی بات علیحدہ تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بنگلہ دیش والے ابھی کچھ عرصے ناراض رہیں گے مگر سرور صاحب وہاں سے مشترکہ فلم سازی کا معاہدہ کر کے آ گئے جس کی وہاں کی حکومت نے بھی منظوری دے دی تھی۔ اس اعتبار سے بنگلہ دیش اور پاکستان کے مابین مشترکہ فلم سازی کی راہ سرور صاحب نے ہی ہموار کی تھی۔ لیکن اس معاہدے کی تکمیل کے سلسلے میں انہیں بہت پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ مالی حالات بھی خراب ہو گئے مگر سرور صاحب نے کبھی ان چیزوں کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن ایک دو بار میرے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ ڈھاکہ جا کر رہنا چاہتے ہیں۔

ہم سے ان کی خاصی بے تکلفی تھی اور وہ میری باتوں پر ہنستے رہتے تھے۔ انتقال سے چند دن پہلے ایک روز مال روڈ کی ایک دکان پر ملے۔ حسب معمول بجھا ہوا پائپ ان کے منہ سے لگا ہوا تھا۔ یہ ان کی عادت تھی کہ بہترین تمباکو ''ایرن مور'' استعمال کرتے تھے مگر صبح ایک بار پائپ بھرتے تو وہی شام تک چلتا رہتا۔ سلگا کر ایک دو کش لگاتے اور باتوں میں مصروف ہو جاتے۔ پائپ بجھ جاتا تو کچھ دیر بعد پھر جلا لیتے۔ جلانے بجھانے کا یہ سلسلہ رات تک چلتا رہتا۔ کسی

زمانے میں ہم بھی پائپ پیا کرتے تھے اور تمبا کو ''ایرن مور'' ہماری کمزوری تھا بلکہ در حقیقت اس کی مہکتی ہوئی خوشبو کے لالچ میں آ کر ہی ہم نے یہ تمبا کو استعمال کرنا شروع کیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی قیمت بڑھتی گئی مگر ایرن مور کے شیدائی بلیک میں بھی اس کی تلاش کر کے لاتے تھے۔ جب سرور صاحب کے ساتھ ملاقات ہوتی تو ہم ان کے ڈبے کا استعمال شروع کر دیتے۔ وہ سارے دن میں ایک یا دو بار پائپ بھرتے ہوں گے مگر ہم دو تین گھنٹے میں ہی تین چار پائپ بھر کر پھونک ڈالتے۔ لوگ ان سے کہتے تھے کہ یہ آپ کے مال پر عیاشی کرتا ہے' تمبا کو کا ڈبا اس سے بچا کر رکھیں مگر سرور صاحب مسکراتے رہتے۔ ان کا ذوق بہت اچھا تھا۔ لباس ہو' کھانا ہو' تمبا کو ہو' چائے ہو یا شاعری ہو۔ ہر چیز میں اعلیٰ ترین سے کم پر سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ لباس سادہ استعمال کرتے تھے مگر تراش خراش اور کپڑے کا استعمال غضب کا ہوتا تھا۔

ایک روز ہم اپنی بیگم کے ساتھ ایک دکان پر کھڑے تھے کہ اچانک فضا میں ''ایرن مور'' کی خوشبو پھیل گئی پھر دو گرم اور ملائم ہاتھوں نے ہماری آنکھوں بند کر دیں۔ دیکھا تو سرور صاحب پائپ منہ میں دبائے کھڑے تھے۔ کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ بتایا کہ ڈھاکہ جانے والا ہوں۔ اب وہیں اپنے پرانے مکان میں رہا کروں گا۔ ہم نے کہیں بیٹھ کر چائے نوشی کی دعوت دی مگر وہ جلدی میں تھے۔ چند دن بعد ڈھاکہ سے ان کے انتقال کی خبر آئی تو یقین نہیں آیا۔ وہ ڈھاکہ کے عشق میں وہاں گئے تھے اور اسی زمین میں دفن ہو گئے۔

مشرقی پاکستان بھی ہمارا کئی بار جانے کا اتفاق ہوا' اس کا تذکرہ آتا رہے گا۔ مگر ایک سفر بہت یادگار تھا۔ بہتر ہو گا کہ اس کا ذکر ہو جائے۔ فلم ساز اے مجید جو کئی بار پاکستان فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے چیئرمین منتخب ہوئے' مشرقی پاکستان میں ایک فلم بنا رہے تھے۔ یہ 1959ء کی بات ہے۔ اس فلم کا نام ''جنگلی'' تھا۔ اس کی کہانی ہم نے لکھی تھی اور ہدایت کار حسن طارق تھے۔ اس کی فلم بندی سندر بن کے حسین و گنجان جنگلوں میں ہونی تھی۔ پروگرام یہ تھا کہ بیشتر فلم بندی جنگل ہی میں ختم کر لی جائے۔ '' جنگلی'' ایک ایسے شخص کی کہانی تھی جو جنگلی جانور پکڑ کر بیرون ملک بھیجا کرتا تھا۔ یہ کردار علاؤالدین کو سونپا گیا تھا۔ اس فلم کی ہیروئن نیلو تھیں۔ یہ جنگل میں پرورش پانے والی ایک الھڑ لڑکی کا کردار کر رہی تھیں۔ اس لڑکی کا باپ شہر میں قتل کر کے بچی کو لے کر فرار ہو گیا اور گھنے جنگل میں رہنے لگا۔

بچی نے اسی جنگل میں پرورش پائی۔ باپ کے سوا کوئی دوسرا شخص اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب ایک دن جنگل میں ہیرو کو دیکھا تو بہت حیران ہوئی اور جھونپڑی میں واپس جا کر باپ کو بتایا کہ میں نے تمہارے جیسی ایک چیز دیکھی ہے۔ باپ فکرمند ہو گیا اور بیٹی کو مشورہ دیا کہ اس کے نزدیک بھی نہ جانا۔ وہ مرد ہے اور تجھے مردوں سے دور رہنا چاہیے۔

بیٹی نے پوچھا ''مرد تو تم بھی ہو؟''

باپ نے کہا ''مگر میں تیرا باپ ہوں۔ یہ بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ بس وہی کر جو میں نے بتایا ہے۔''

باپ کا کردار اجمل صاحب ادا کر رہے تھے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ جب جنگل میں لڑکی کی ملاقات دوبارہ ہیرو سے ہوئی تو وہ بھاگنے لگی۔ اس نے روک کر بھاگنے کا سبب پوچھا تو ہیروئن نے بھولے پن سے صاف بتا دیا کہ باپو نے تم سے بات کرنے سے بھی منع کیا ہے۔ اس کردار کی خصوصیت یہ تھی کہ ہیرو اس سے جو بھی باتیں کرتا تھا وہ جا کر باپ کو بتا دیا کرتی تھی اور پھر اس سے ان کا مطلب پوچھا کرتی تھی۔

اس فلم میں اداکار ساون کو ایک جنگلی قبیلے کے سردار کا کردار دیا گیا تھا۔ ساون اس سے پہلے چھوٹے چھوٹے کردار کیا کرتے تھے۔ پہلی بار ایک اہم کردار انہیں ملا تو انہوں نے اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔

اس فلم میں سب سے دلچسپ کردار نذر کا تھا۔ وہ کامیڈین تھے۔ ہیرو کے دوست تھے لیکن بے حد ڈرپوک تھے۔ اگر ان کا بس چلتا تو ایک لمحہ بھی جنگل میں نہ رہتے مگر دوست کی محبت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ چوہے تک سے ڈرتے تھے لیکن ہر قسم کے درندوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ ایک بار جنگل میں جنگلی ان دونوں کو پکڑ لیتے ہیں اور نذر صاحب سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ آدم خور ہیں۔ ہمیں بھون کر یا کچا کھا جائیں گے۔ انہیں ایک جھونپڑی میں قید کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہاں سے فرار ہونے کے لئے زمین کے اندر ایک سرنگ کھودتے ہیں۔ کئی دن کی مشقت کے بعد سرنگ سے ایک جگہ باہر نکلتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ مگر دیکھتے ہیں کہ وہ سرنگ قبیلے کے سردار کی جھونپڑی میں جا کر نکلی ہے۔ دوبارہ سرنگ کے راستے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں مگر پکڑے جاتے ہیں۔ کہانی کا یہ خاکہ اس لئے بیان کیا گیا ہے تاکہ آپ کو اس فلم کے موضوع اور ماحول کے بارے میں اندازہ ہو جائے۔

فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں تمام اداکاروں کو پہلے ڈھاکہ اور پھر سندر بن کے جنگلات میں جانا تھا۔ جنگل کے اندر جھونپڑیوں کی ایک بستی بنائی گئی تھی اور روشنی کے لئے جنریٹر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سارے اداکار لاہور سے بھیج دیے گئے۔ سب سے آخر میں نذر صاحب رہ گئے۔ نذر صاحب کا مسئلہ یہ تھا کہ فضائی سفر سے ان کی جان نکلتی تھی۔ وہ کراچی اور لاہور کا سفر بھی ٹرین کے ذریعے کرتے تھے۔ جبکہ دوسرے اداکار ہمیشہ ہوائی جہاز کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ آوٹ ڈور شوٹنگ کے لئے بھی وہ اپنی وین کے ذریعے ہی جایا کرتے تھے۔ جس میں تمام گھریلو سامان اور سونے کا بھی بندوبست تھا۔ ان کی ایک نہ ایک بیگم ان کے ہمراہ ضرور جاتی تھیں۔ نذر صاحب کی دو بیویاں اور کئی بچے تھے۔ دونوں بیگمات ایک ہی گھر میں رہتی تھیں۔ اور آخر دم تک نذر صاحب نے یہ وضع نبھائی۔

ڈھاکہ جانے کے لئے ٹرین تو استعمال نہیں کی جاسکتی تھی۔ بحری جہاز سے بہت زیادہ وقت لگ جاتا اس لئے مجبوراً ہوائی جہاز کے ذریعے انہیں لاہور سے ڈھاکہ جانا پڑا۔ انہیں لاہور سے ہوائی جہاز میں سوار کرنے کی ذمے داری ہمیں سونپی گئی تھی کیونکہ اندیشہ تھا کہ ڈر کے مارے کہیں وہ عین وقت پر اپنا ارادہ ہی منسوخ نہ کردیں۔ جس روز انہیں رخصت ہونا تھا اس سے پہلے ان کے گھر میں دعا درود کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ نیاز بانٹی جا رہی تھی۔ قرآن شریف کے ختم ہو رہے تھے۔ تعویذ گلے میں اور بازو میں باندھے جا رہے تھے۔ امام ضامن اتنے تھے کہ ان کا وزن خود نذر صاحب کے وزن کے برابر ہو گیا تھا۔ ائرپورٹ پر ان کی دونوں بیگمات اور تمام بچے انہیں خدا حافظ کہنے کے لئے موجود تھے اور وہ ہر ایک سے یوں رخصت ہو رہے تھے جیسے جنگ پر جا رہے ہوں۔ بیویاں اور بچے رو رہے تھے۔ خود نذر صاحب بھی بار بار آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ خدا خدا کر کے انہیں ہوائی جہاز میں سوار کرایا گیا اور وہ ڈھاکہ روانہ ہو گئے۔ ڈھاکہ تو وہ خیریت سے پہنچ گئے مگر جب جنگل میں جانا پڑا تو بہت گھبرائے۔ دوسرے لوگ بھی ابتدا میں تو پریشان رہے کیونکہ جنگلی جانور وہاں پالتو کتے بلیوں کی طرح گھومتے پھرتے تھے۔ مگر پھر بھی ماحول کی ندرت اور خوبصورتی نے سب کے دل موہ لئے۔ مگر نذر صاحب کا ڈر کے مارے برا حال رہا۔ شوٹنگ بھی شروع ہو گئی۔ مجید صاحب نے ہیرو کے کیمپ میں بہت سے جنگلی جانوروں کو پنجروں میں بند کر کے رکھا تھا تاکہ حقیقی ماحول پیدا کیا جاسکے۔ نذر صاحب ان پنجروں کے پاس تک نہیں جاتے تھے ایک روز شوٹنگ کے لئے گئے تو جنگل میں علاؤالدین صاحب کو ایک چیتے کا بچہ

نظر آ گیا۔اسے گھیر گھار کر پکڑ لیا گیااور یہ بچہ سارے یونٹ کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ مگر نذر صاحب کی راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ان کا کہنا تھا کہ اس کے ماں باپ یقیناًاس کی تلاش میں یہاں تک پہنچ جائیں گے اور ہم سب کو کھا جائیں گے۔اس چیتے کے بچے کے ساتھ علاؤالدین نے کئی مناظر بھی فلمائے۔ وہ اسے اپنے کاندھے پر بٹھائے رکھتے تھے اوراس کے ساتھ کھیلتے رہتے تھے۔وہ بھی سب سے مانوس ہو گیا تھااور پالتو بلی کی طرح گھل مل گیا تھا۔

چند دن تو بہت ٹھیک کام ہوا۔سب لوگ مصروف ہو گئے تو ہر ایک کی توجہ صرف فلم کی طرف مبذول ہو گئی۔ مگر پھر تقدیر نے اپنا رنگ دکھایااور جنریٹر خراب ہو گیا۔اسے مرمت کے لیے چٹاگانگ بھیجا گیااوراس اثناء میں شوٹنگ معطل ہو گئی۔ قسمت نے ایک اور ستم یہ ڈھایا کہ ایک رات طوفان آ گیا۔ مشرقی پاکستان کے طوفان کا حال تو سبھی جانتے ہیں مگر جو لوگ گھنے جنگل میں گھاس پھونس کی جھونپڑیوں میں قیام پذیر ہوں اور انہیں قیامت خیز طوفان گھیر لے تو سوچئے کہ کیا عالم ہو گا۔ جھونپڑیاں اڑ گئیں۔ سامان کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ درخت جڑوں سے اکھڑ گئے۔ بارش ایسی موسلادھار کہ جل تھل ایک ہو گئے۔خدا جانے کس طرح فلم یونٹ کے لوگوں نے وہ رات کاٹی۔ صبح ہوتے خدا خدا کر کے طوفان ختم ہوا تو ہر طرف بربادیوں کی داستانیں بکھری ہوئی تھیں۔ شکر ہے کہ کوئی جانی نقصان نہ ہوا جو کہ معجزے سے کم نہ تھا۔ایک اور خوش قسمتی یہ تھی کہ جیپیں صحیح حالت میں تھیں۔ چنانچہ واپس چٹاگانگ اور پھر لاہور جانے کا فیصلہ کیا گیا۔کافی دن پہلے ہی ضائع ہو چکے تھے۔اور سب اداکاروں کو دوسری فلموں کی شوٹنگ کے لئے لاہور بھی پہنچنا تھا۔پروگرام یہ تھا کہ شوٹنگ کے لئے سارا یونٹ دوبارہ جائے گا۔ مگر قسمت کو منظور نہ تھا۔ ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی رہی۔ آخر حسن طارق صاحب نے باقی ماندہ شوٹنگ مغربی پاکستان میں کرنے کا پروگرام بنایا۔ گھنے جنگل تلاش کر کے کچھ شوٹنگ بھی کی گئی۔ بستی کا سیٹ دوبارہ لگایا گیا۔قبیلے کے مندر کا سیٹ بھی لاہور کے اسٹوڈیو میں تعمیر ہوا جس میں نیلو کا رقص اور علاؤالدین اور ساون کی خوفناک لڑائی بھی فلم بند کی گئی۔ مگر یہ فلم مکمل نہ ہو سکی۔اگر مکمل ہو کر ریلیز ہو جاتی تو یہ کئی لحاظ سے ایک منفرد اور مختلف فلم ہوتی۔لیکن قدرت کو منظور نہ تھا۔ تمام سرمایہ، کوششیں، اداکاروں کی محنت۔ ہدایت کار کی جانفشانی۔ سبھی کچھ رائگاں چلا گیا۔اب تو خیر اس فلم کے مکمل ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

''جنگلی ''اب ایک قصہ پارینہ بن چکی ہے۔اس کے ہدایت کار حسن طارق رہے نہ ہیرو علاؤالدین۔اجمل صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔یہاں تک کہ فلم کا نیگیٹو تک باقی نہیں رہا۔اگر باقی رہ گئیں تو صرف یادیں اور کہانیاں۔ مگر ہم کچھ آگے نکل آئے ہیں۔فلمی صنعت کے ابتدائی زمانے کی بہت سی باتیں ابھی بیان کرنے سے رہ گئی ہیں جن میں سے بعض بہت دلچسپ ہیں۔

یہ تو آپ کو بتا چکے ہیں کہ رات کو اگر آخری بس نکل جاتی تھی تو ہمیں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑ جاتا تھا۔مال روڈ سے ماڈل ٹاؤن جانے کے لئے رات کے وقت تانگے کے سوا کوئی دوسری سواری میسر نہ تھی اور تانگے والے رات کے وقت اتنی دور جانا پسند نہیں کرتے تھے۔وہ آج کل کا لاہور تو تھا نہیں جہاں آدھی رات کو بھی چہل پہل رہتی ہے۔ اس زمانے میں تو اندھیرا ہوتے ہی لاہور کے چند علاقوں کے سوا ہر طرف ویرانی اور سناٹا ہوتا تھا۔فیروز پور روڈ پر اچھرہ سے آگے سڑک پر روشنی تک نہ تھی گویا چار پانچ میل کا علاقہ تاریکی میں ڈوب ہوا تھا۔ اندھیری راتوں میں چور اچکے بھی مصروف عمل ہوتے تھے۔سڑک پر کوئی دوسری سواری یا راہ گیر دور دور تک نظر نہیں آتا تھا۔ان حالات میں تانگے والے کو کیا پڑی تھی کہ وہ ماڈل ٹاؤن کے دور دراز علاقے تک جائے اور پھر وہاں سے واپس بھی آئے۔گھوڑا چاہے کتنا ہی اچھا اور تیز کیوں نہ ہو وہ ماڈل ٹاؤن تک پہنچنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے سے کم وقت نہیں لیتا تھا کیونکہ سارے دن کا تھکا ہوا ہوتا تھا۔ان حالات میں ماڈل ٹاؤن جانے پر وہی تانگے والے آمادہ ہوتے تھے جن کا گھر اچھرہ یا مسلم ٹاؤن میں ہوتا تھا۔اس طرح انہیں آنے جانے میں تین گھنٹے لگ جاتے تھے۔کوئی نہ کوئی تانگا تو مل ہی جاتا تھا مگر بہت نخروں کے بعد۔کرائے پر بھاؤ تاؤ بھی ہوتا تھا لیکن پونے دو روپے یا دو روپے میں معاملہ طے ہو جاتا تھا۔آپ سوچیں گے کتنا کم کرایہ تھا مگر اس زمانے میں یہ بھی بہت بڑی رقم تھی۔

ایک رات ہم میکلوڈ روڈ کے چوک پر بس کے انتظار میں ٹہل رہے تھے جس کا وقت گزر چکا تھا۔مگر کبھی کبھی کوئی بس لیٹ بھی ہو جاتی تھی۔ہم نے دیکھا کہ ایک اور صاحب بھی بس کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ہم دونوں کے سوا سڑک پر کوئی تیسرا فرد بشر نظر نہیں آ رہا تھا۔جاڑے کا موسم تھا۔ہلکی سی دھند ہو چکی تھی۔اوور کوٹ اور دوسرے لوازمات کے باوجود ہم سردی میں ٹھٹھر رہے تھے۔ لاہور کی بیشتر آبادی اس وقت تک سو چکی تھی۔ہم فلم دیکھنے کے

چکر میں اپنی آخری بس سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ بھاگم بھاگ سنیما سے اسٹاپ پر پہنچے تو وہاں ان ایک صاحب کے سوا کوئی دوسرا مسافر نظر نہ آیا جس سے یہ شک گزرا کہ غالباً آخری بس بچے کھچے چند مبہم جو مسافروں کو لے کر رخصت ہو چکی ہے۔ مگر ایک امید موہوم کے سہارے ہم اپنے جسم کو گرم رکھنے کے لئے بس کے انتظار میں ٹہلتے رہے۔ سوا دس بج گئے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ اب بس کے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اتفاق سے ایک تانگا بھی آ گیا اور تانگے والے نے ہمارے پاس رک کر بڑے اخلاق سے دریافت کیا "بابو جی' کہاں جانا ہے؟"

ہم نے ماڈل ٹاؤن کا نام لیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا " میں اچھرہ واپس جا رہا ہوں' آپ کہیں تو وہاں تک لے چلوں ؟"

ہم نے پوچھا "اور وہاں سے آگے ہم کیسے جائیں گے ؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا "کوئی بات نہیں۔ آپ کو ماڈل ٹاؤن چھوڑ دوں گا مگر کرایہ دو روپے ہو گا۔"

حالات اور وقت کے اعتبار سے اس کا مطالبہ معقول تھا۔ ہم بھی ٹہل ٹہل کر اور منہ سے بھاپ نکال نکال کر تھک گئے تھے۔ اس لئے فوراً ہامی بھر لی اور تانگے میں سوار ہو گئے۔ تانگے والے نے پیار سے گھوڑے کو چمکارا اور چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے دیکھا کہ اسٹاپ پر موجود صاحب بڑی حسرت سے ہمیں دیکھ رہے ہیں' سوچا انہیں بھی ساتھ بٹھا لیں۔ یہ بھی شاید اسی منزل کے مسافر ہیں۔ تانگے سے اتر کر ان کے پاس گئے۔ اور پوچھا "کہاں جائیں گے ؟"

کہا "جی مجھے مسلم ٹاؤن جانا ہے۔"

"تو پھر آ جایئے۔ آپ کو چھوڑ دیں گے۔ ہم ماڈل ٹاؤن جا رہے ہیں۔"

وہ پہلے تو تکلف کرتے رہے مگر پھر ہمارے اصرار پر رضا مند ہو گئے۔ تانگا چل پڑا ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ پھر ہم نے انہیں بتایا کہ ہماری بس کیوں مس ہو گئی۔

وہ مسکرائے اور بولے۔ "یورپ میں یہ کہاوت مشہور ہے کہ اگر لڑکی یا بس مس ہو جائے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ دوسری آتی ہی ہو گی۔"

ہم نے کہا "ٹھیک فرمایا آپ نے مگر یہاں دوسری بس دوسرے دن ہی نظر آتی ہے۔ رہا سوال لڑکی کا تو وہ دور دور تک

نظر نہیں آتی۔''

اس طرح بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور یہ لمبا سفر آرام سے کٹ گیا۔ انہیں ادب اور شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ کئی اشعار انہوں نے سنائے۔ پھر فلموں کی باتیں شروع ہو گئیں۔ ہم نے ان کا چہرہ کئی بار غور سے دیکھا تھا مگر کوئی شناسائی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ نوجوان' صحت منداور خوش شکل آدمی تھے۔ دھیمی آواز میں اور بڑے شائستہ لہجے میں بولتے تھے۔ باتوں باتوں میں تعارف ہوا تو ہم نے اپنا نام بتایا' وہ بولے ''میرا نام علاؤالدین ہے۔''

علاؤالدین کہتے ہوئے انہوں نے عین کے نیچے زیر لگا دیا کہ یہ پنجاب کا دستور ہے۔

ہم نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اداکار ہیں۔ بمبئی میں بھی فلموں میں کام کر چکے ہیں۔

پوچھنے لگے ''آپ نے دلیپ کمار اور نرگس کی فلم '' میلہ'' تو دیکھی ہو گی؟''

ہم نے کہا'' جی نہیں''

''اس فلم میں' میں نے نرگس کے باپ کا کردار کیا ہے۔''

ہمیں ہنسی آگئی کہ اتنی کم عمری میں وہ ہیروئن کے والد بزرگوار بن بیٹھے۔

بولے'' اچھی فلم تھی۔ کردار بھی اچھا تھا اس لیے کر لیا۔ وہاں رہتا تو کافی مواقع تھے مگر میں پاکستان آگیا۔''

اس وقت تک ہم پاکستان کی فلمی صنعت سے بالکل ناآشنا تھے اس لیے نہ جان سکے کہ مستقبل کا ایک عظیم فن کار ہمارا ہم سفر تھا۔

مسلم ٹاؤن کے پل پر پہنچ کر انہوں نے کہا'' مجھے یہاں اتار دیجئے۔ آپ کا بہت شکریہ'' یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے چار آنے نکال کر ہمیں پیش کر دیے اور بولے ''معافی چاہتا ہوں کہ سردست یہی پیش کر سکتا ہوں۔''

ہم نے کہا'' آپ یہ رکھ لیجئے ہمیں تو ماڈل ٹاؤن جانا ہی تھا۔ آپ نہ ہوتے پھر بھی کرایہ تو ادا کرنا ہی پڑتا۔''

وہ بہت اصرار کرتے رہے اور ہم انکار۔ آخر انہوں نے مجبور ہو کر چونی واپس جیب میں رکھ لی اور بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

علاؤالدین صاحب سے یہ ہماری پہلی ملاقات تھی مگر افسوس کہ ہم اس وقت تک ان کے نام تک سے واقف نہ تھے۔

بعد میں جب'' آفاق'' میں فلمی صفحہ شروع ہوا تو دوسرے اداکاروں کے ساتھ علاؤالدین سے بھی ملاقات ہونے لگی جو بڑھ کر پر خلوص دوستی کے رشتے میں تبدیل ہوگئی۔ علاؤالدین نے بعد میں بہت ترقی کی۔ بہت اچھے دن دیکھے۔ ان کے پاس شاندار اور قیمتی کار بھی تھی۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ شہرت ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ فلموں میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہیرو آخر میں کریکٹر ایکٹر بن جاتے ہیں۔ مگر علاؤالدین کے ساتھ بالکل الٹا معاملہ پیش آیا۔ وہ پہلے کریکٹر ایکٹر تھے پھر ویلن بنے اور اس کے بعد ہیرو بن گئے۔ اور تینوں حیثیت میں بہت کامیاب رہے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب فلم ساز علاؤالدین کے بغیر فلم بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

علاؤالدین بہت دلچسپ' بامروت اور خلیق ہمدرد آدمی تھے۔ ان کے بارے میں واقعات آتے رہیں گے کیونکہ ان کے ساتھ ہم نے کافی وقت گزارا ہے۔ ایک زمانے میں ہفتے میں دو تین بار ان سے شام کو ملاقات ضروری تھی۔ بات یہ تھی کہ مسلم ٹاؤن میں اس زمانے میں فلم والوں کا جمگھٹا تھا۔ سنتوش کمار اور ان کا خاندان۔ علاؤالدین' تنویر نقوی۔ لقمان اور بہت سے لوگ وہاں رہتے تھے۔ تنویر نقوی' لقمان اور علاؤالدین کی کوٹھیاں تو بالکل متصل تھیں۔ ہم لقمان صاحب کے ساتھ اکثر ان کے گھر چلے جاتے تھے اور پھر ان تین گھروں میں کسی ایک گھر میں محفل آراستہ ہو جاتی تھی۔ دوسرے لوگ بھی وہیں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ علاؤالدین کھلے دل کے انسان تھے۔ اپنے سارے خاندان کو انہوں نے بہت عیش و آرام سے رکھا۔ والد کے تو وہ تابعدار تھے۔ جو کمایا وہ گھر والوں پر خرچ کر دیا۔ اللہ نے انہیں پیسہ بھی بہت دیا اور نام بھی۔ لیکن زندگی کے آخری سالوں میں حالات بگڑ گئے تھے۔ اس کا بڑا سبب ان کے نوجوان بیٹے کی اچانک وفات تھی۔ وہ گھر سے کار لے کر شاپنگ کے لئے نکلا اور کچھ دیر بعد اس کی لاش واپس آئی تو علاؤالدین اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ دراصل کئی بیٹیوں کے بعد بڑی دعاؤں اور نذر نیاز کے بعد اللہ نے انہیں یہ بیٹا عطا کیا تھا اور اس کی پیدائش پر انہوں نے ایسا جشن منایا تھا کہ ساری فلمی صنعت کو مدعو کر لیا تھا۔ ساری رات خورد و نوش کا سلسلہ جاری رہا۔ علاؤالدین کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ مگر سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں یہ بیٹا اچانک ایک حادثے کی نذر ہو گیا۔ یوں تو سارے خاندان کے لئے یہ صدمہ بہت بڑا تھا مگر علاؤالدین کو اس بیٹے سے عشق تھا۔ اس کی اچانک موت نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ کئی ہفتے تک وہ ساکت و خاموش رہے۔ کوئی اصرار کر کے کھلا دیتا تو کھا لیتے ورنہ بیٹھے

آسمان کو تکتے رہتے۔ اتنا دلچسپ' شگفتہ اور باتونی انسان بولنا تک بھول گیا تھا۔ کئی ماہ کے بعد وہ رفتہ رفتہ قدرے نارمل ہوئے مگر مسکراہٹ ان کے چہرے پر نہ آتی۔ دوستوں اور مداحوں کے اصرار پر انہوں نے فلم میں کام کرنا شروع کر دیا مگر وہ پہلے والی باغ و بہار شخصیت ناپید ہو چکی تھی۔ چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھے رہتے۔ کوئی مخاطب کرتا تو آہ بھر کر جواب دے دیتے۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ کئی کئی صفحات پر مشتمل مکالمے ایک ہی وقت میں ادا کر دیا کرتے تھے بعد میں چھوٹے چھوٹے فقرے بھی بھولنے لگے تھے۔ اور جب ری ٹیک ہوتی تو بہت شرمندہ ہوتے تھے۔ بیٹے کی موت کے بعد وہ جیتے جی مر گئے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن سچ مچ مر گئے۔ وہ بہت دلچسپ اور رنگا رنگ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی داستانیں بے شمار ہیں۔ دلچسپ واقعات' لطیفے اور اشعار انہیں ازبر تھے۔ سنانے کا انداز بھی بہت دلکش تھا۔ بہت سریلی آواز کے مالک تھے اور بہت اچھا گاتے تھے۔ طبلہ' ہارمونیم بھی بہت اچھا بجا لیتے تھے۔ دراصل وہ گھر سے گلوکار بننے کے ارادے سے نکلے تھے مگر تقدیر نے اداکار بنا دیا اور اداکار بھی ایسا کہ جس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ ابھی تو یہ داستان جاری ہے اور اس میں علاؤالدین کا تذکرہ بھی بارہا آئے گا۔

ابتدائی دنوں کے واقعات کے سلسلے میں اس زمانے کے فلم سازوں' اداکاروں اور صحافیوں کے بارے میں بھی بتا دینا ضروری ہے۔

انڈیا سے جو فلم ساز پاکستان آئے تھے ان میں سب سے پہلے فلم سازی کا آغاز نذیر صاحب نے کیا تھا۔ نذیر صاحب کے بارے میں بتایا جا چکا ہے کہ وہ بھارت میں ایک کامیاب اور نامور فلم ساز تھے' اداکار او ہدایت کار بھی تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک کاروباری ذہن کے مالک بھی تھے۔ وہ ایک پریکٹیکل آدمی تھے۔ منصوبے بنانا اور ان کے بارے میں غور و فکر کرنا ان کی عادت نہیں تھی۔ یعنی اس معاملے میں وہ ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کی ضد تھے۔ احمد صاحب طویل المیعاد اور شاندار منصوبے بنانے میں ماہر ہیں لیکن اکثر انہیں عملی جامہ پہنانے کی نوبت نہیں آئی۔ نذیر صاحب کا معاملہ برعکس تھا۔ وہ انڈیا سے کافی سرمایہ لے کے آئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ کسی اچانک فیصلے کے تحت بھاگ دوڑ میں پاکستان نہیں آئے تھے بلکہ انہوں نے سیاسی حالات کو بھانپ لیا تھا اور پاکستان منتقل ہونے کے لئے اقدامات شروع کر دیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ محض خالی ہاتھ ہلاتے ہوئے نہیں آئے بلکہ وہاں کے اثاثے فروخت کرنے کے

بعد معقول سرمایہ بھی لے کر آئے۔لاہور میں انہوں نے مسلم ٹاؤن کے علاقے میں زمینیں خریدیں۔یہیں انہوں نے اپنی کوٹھی بھی بنائی۔اسٹوڈیو نزدیک ہی تھااور بہت سے اداکاروغیرہ بھی مسلم ٹاؤن ہی میں آباد تھے۔

انہوں نے اپنی زمینیں بعد میں اچھے داموں پر فروخت بھی کردیں۔ مسلم ٹاؤن میں بی پی ڈبل روٹی کی فیکٹری جس زمین پر بنائی گئی وہ بھی نذیر صاحب ہی کی ملکیت تھی۔نذیر صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ انڈیا سے آنے والے بیشتر فلم والوں کی طرح انہوں نے نہ تو الاٹ منٹ کرائی۔نہ حکومت سے قرضہ یا کوئی اور سہولت حاصل کرنے کی کوشش کی۔بس چپ چاپ حالات اور وسائل کے مطابق کام شروع کردیا۔جب کہ دوسرے نامور لوگوں نے سنیما، زمینیں اور کوٹھیاں الاٹ کرائیں اور قرضے حاصل کیئے۔ان پرانے اور تجربہ کار لوگوں کی بے عملی کا ایک سبب وہ مالی سہولتیں بھی تھیں جو انہیں پاکستان آتے ہی حاصل ہوگئی تھی۔جب خوشحالی ہاتھ پیر ہلائے بغیر ہی مل جائے تو محنت کون کرے؟ اور وہ بھی نامساعد حالات میں۔

اس لحاظ سے نذیر صاحب کو پاکستان کی فلمی صنعت کا ستون کہا جاسکتا ہے۔

ان کی پھرتی ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے 1948ء ہی میں اپنی پہلی فلم بناڈالی۔ اس کا نام ''سچائی'' تھا۔ظاہر ہے کہ اس کے ہیرو وہ خود اور ہیروئن میڈم سورن لتا تھیں۔بے بی اختری اور مجید صاحب نے اس فلم میں کام کیا تھا۔مجید صاحب بمبئی سے آئے ہوئے تھے۔بھاری جسم کے خوش شکل اور وجیہہ آدمی تھے۔ وہاں کیریکٹر ایکٹر تھے اور اچھے اداکار تھے۔صرف ایک خرابی یہ تھی کہ ان کی آواز قدرے بیٹھی ہوئی تھی۔اس کے باوجود ہندوستان کے اچھے اداکاروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ابتدائی چند سال کے بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا اور آج تو خود فلم والے بھی اس کے نام سے واقف نہیں ہیں۔(ٹی وی کے ناظرین نے کچھ عرصہ پہلے مشہور فلم'' نور اسلام'' ضرور دیکھی ہوگی۔اس فلم میں مجید صاحب نے تاتاریوں کے خان اعظم کا کردار ادا کیا تھا)۔'' سچائی'' کے موسیقار چشتی صاحب تھے۔ چشتی صاحب اپنی جگہ ایک مکمل ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔وہ اپنی فن کاری کا لوہا تو قیام پاکستان سے پہلے ہی منوا چکے تھے طرز بنانے میں انہیں کمال حاصل رہاہے اور فوراً ہی بنادیتے تھے۔وہ کہا کرتے تھے کہ طرز بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔جو موسیقار کسی نغمے کے بارے میں کہتا ہے کہ اس کی اچھی طرز نہیں بن سکتی وہ غلط کہتا ہے۔تن آسان ہے

یا پھر نالائق۔ ورنہ طرز تو خبر کی بھی بن سکتی ہے۔ ایک بار لوگوں نے آزمائش کے طور پر ان کے سامنے تازہ اخبار رکھ دیا اور ایک خبر کے بارے میں فرمائش کی کہ اس کی طرز بنایئے۔ چشتی صاحب ہارمونیم لے کر بیٹھ گئے اور چند منٹ کے اندر سچ مچ اس خبر کی طرز بنادی۔ چشتی صاحب کی صلاحیتیں بے پناہ ہیں مگر اسی حساب سے ان کی ناقدری بھی کی جاتی۔ کسی اور ملک میں ہوتے تو پوجے جاتے اور دولت میں کھیلتے۔ یہاں کئی سال سے بے کار رہے اور مالی ابتری کا شکار رہے۔ وہ کئی سال تک فلم سازوں سے شکایت کرتے رہے کہ بھائی تم مجھ سے کام کیوں نہیں کراتے؟ اگر موسیقی اچھی نہ ہو تو معاہدہ ختم کردینا مگر کام تو کراؤ۔ میری صلاحیتوں کو ضائع کیوں کر رہے ہو مگر فلم ساز بے چارے بھیڑ چال میں لگے ہوئے تھے۔ جن دو چار موسیقاروں کے پیچھے لگ گئے' بس لگے ہوئے ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ وہ چشتی صاحب کی طرزوں کو توڑ مروڑ کر بلکہ خراب کر کے پیش کر رہے ہیں۔ چشتی صاحب سے ہمارا براہ راست واسطہ تو نہیں رہا مگر ویسے بہت ملاقات رہی اور ہم نے ان کی خداداد لیاقت کا ہمیشہ اعتراف اور احترام کیا۔

نذیر صاحب کی فلم ''سچائی'' زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ وجہ بیان کی جاچکی ہے کہ بے سروسامانی کے عالم میں برائے نام سرمائے سے بنائی جانے والی فلمیں بھارت کی اے ون فلموں کا بھلا کیا مقابلہ کرسکتی تھیں۔ پھر بھی سچائی نے مقامی فلم والوں کو ایک حوصلہ اور اعتماد بخشا اور یہ امید دلائی کہ ان حالات میں بھی فلمیں بن سکتی ہیں۔

نذیر صاحب نے زیادہ دیر انتظار نہیں کیا۔ بتایا تو ہے کہ وہ عملی آدمی تھے۔ کام کرنے پر یقین رکھتے تھے۔ اگلے ہی سال انہوں نے ایک پنجابی فلم ''پھیرے'' بنائی اور یہ زبردست ہٹ ہوگئی۔ اس فلم میں دونوں میاں بیوی کے علاوہ نذر اور علاؤالدین نے بھی کام کیا تھا۔ ''پھیرے'' صحیح معنوں میں پاکستان کی پہلی کامیاب فلم تھی۔ یہ 1949ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ بڑی بڑی کاسٹ کی اور بڑے بجٹ کی بھارتی فلموں کے مقابلے اس کی کامیابی نذیر صاحب کی ہنر مندی کا ثبوت تھی۔

اگلے سال انہوں نے ایک اور پنجابی فلم بنا کر سب کو چونکا دیا۔ اس کا نام '' لارے'' تھا۔ اس فلم میں ان کے اور میڈم کے علاوہ نذر اور زینت وغیرہ نے بھی کام کیا تھا۔ ان دونوں فلموں کی موسیقی چشتی صاحب نے مرتب کی تھی اور دونوں فلموں کے سبھی گانے ہٹ ہوگئے تھے۔ یہ بھی ایک تعریف کی بات ہے کہ اس وقت جب کہ لاہور کی

ریکارڈنگ کا مناسب بندوبست تھا نہ ہی تربیت یافتہ سازندے دستیاب تھے' چشتی صاحب نے تہلکہ خیز موسیقی بنا کر سب کو چونکا دیا۔ "لارے اور پھیرے" بہت کامیاب رہیں اور ان کے گانے آج بھی مقبول ہیں۔

نذیر صاحب اس کے بعد بھی متواتر فلمیں بناتے رہے اور ان میں سے بیشتر کامیاب بھی ہوئیں۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نذیر صاحب کی کارکردگی اور کارگزاری کم ہوتی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ فلموں کی کامیابی کے باوجود ان کی کفایت شعاری کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کا غصہ اور چڑچڑا پن بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ ان کا بس چلتا تو شاید وہ مفت میں فلم بناتے۔ بے روزگاری اور کڑکی کا زمانہ تھا اس لئے انہیں اداکار اور کارکن مل ہی جاتے تھے۔ مگر جب فلم سازی کا دھندا بڑھنے لگا تو اچھے فنکاروں اور ہنر مندوں نے دوسروں کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دی۔ ادھر نذیر صاحب پیسے بچانے کے لئے نوجوان اور مقبول فن کاروں کو کاسٹ کرنے کے بجائے خود ہی ہیرو بنتے رہے اور میڈم سورن لتا ان کی ہر فلم میں لازماً ہیروئن ہوتی تھیں۔ نوخیز 'نوجوان اور خوب صورت نئی ہیروئنوں میں فلم بینوں کو قدرتی طور پر زیادہ دلچسپی اور کشش محسوس ہوتی تھی۔ جیسے جیسے فلم سازی کے اخراجات بڑھتے جا رہے تھے' نذیر صاحب کی سرگرمیاں کم ہوتی جا رہی تھیں۔ کچھ سال بعد انہوں نے یہ تبدیلی تو گوارا کر لی کہ اپنی جگہ نوجوان اور مقبول ہیرو کاسٹ کرنے لگے مگر میڈم سورن لتا کے مقابلے میں درپن ہیرو کا رول کرتے ہوئے عجیب سے لگتے تھے۔ اس طرح رفتہ رفتہ نذیر صاحب کی فلم سازی کی سرگرمیاں کم ہوتی چلی گئیں اور ایک وقت ایسا آیا کہ انہوں نے فلمیں بنانا ہی ترک کر دیں۔ انہیں معاشی اور مالی مسئلہ بھی درپیش نہیں تھا۔ اللہ کا دیا بہت کچھ تھا اس لئے گوشہ نشین سے ہو گئے اور آرام و سکون کے ساتھ زندگی گزارنے لگے۔

نذیر صاحب سخت گیر اور غصہ ور مشہور تھے اس لئے لوگ ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ پیسے بچانے کے لئے وہ ہر ترکیب استعمال کرتے تھے۔ اول تو معاوضہ بہت کم اوپر سے جب مطالبہ کیا جاتا تو وہ اپنی مالی پریشانیاں ایسے اندوہناک انداز میں بیان کرتے کہ مانگنے والا خود ہی شرمسار ہو جاتا۔ اداکار بہت اچھے تھے۔ کیمرے کے سامنے تو اداکاری کرتے ہی تھے کیمرے سے ہٹ کر بھی مناسب موقعوں پر ایسی اداکاری کا مظاہرہ کرتے تھے کہ دیکھنے اور سننے والوں کی آنکھوں سے آنسو آ جاتے تھے۔ وہ اپنی عمر' بیماری اور مصروفیات کا بیان کرتے۔ پھر مالی پریشانیوں کی

تفصیل بتاتے اور ایسی سرد آہیں بھرتے کہ فضا سوگوار ہو جاتی۔

ایک طرف تو یہ بے بسی اور بے کسی تھی۔ دوسری طرف شوٹنگ کے دوران میں وہ سراپا غضب ہوتے تھے۔ کوئی اداکار غلطی کر بیٹھتا یا ری ٹیک کرا دیتا تو وہ آگ بگولا ہو جاتے تھے کیونکہ اس کا مطلب تھا شفٹ اور فلم نیگیٹو کا زیاں۔ لہٰذا وہ اس پر برس پڑتے۔ ان کی ڈانٹ سے سبھی ڈرتے تھے اور رعب بھی بہت تھا۔ اس لئے ان کی ڈانٹ کا الٹا اثر ہوتا تھا۔ اچھے بھلے اداکار مکالمے بھول جاتے تھے اور پھر جتنا زیادہ وہ غصے کا اظہار کرتے اتنی ہی زیادہ غلطیاں سرزد ہوتیں۔ نذیر صاحب کا غصہ بھی بڑھتا جاتا۔ یہاں تک کہ ایک ہنگامہ سا برپا ہو جاتا۔ عطا بزدار ان کے لئے اسٹل فوٹو گرافی کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اس شعبے میں بہت نام پیدا کیا۔ وہ بہت اچھے اسٹل فوٹو گرافر تھے اور شوٹنگ کے دوران میں ہی بہت اچھی تصاویر بنا لیتے تھے جو کہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ انہوں نے نذیر صاحب سے بہت کچھ سیکھا مگر ان کے غصے سے عاجز رہتے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے متبادل کام مل جانے کے بعد نذیر صاحب کے ساتھ کام ہی نہیں کیا۔ عطا بزدار بھی ان ہی لوگوں میں تھے۔ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ وہ نذیر صاحب کے زمانے کے دلچسپ واقعات بھی سنایا کرتے تھے۔

ایک بار نذیر صاحب کسی بات پر ناراض ہو کر مارنے کے لئے عطا کی طرف لپکے تو وہ بھاگ اٹھے۔ نذیر صاحب غصے میں تپ رہے تھے۔ ان کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اسٹوڈیو سے باہر نکل گئے اور سڑک پر کافی دور تک چلے گئے۔ ساتھ ہی برا بھلا بھی کہتے جا رہے تھے اور دھمکیاں بھی دے رہے تھے ''رک جا۔ ورنہ خیر نہیں ہے۔''

عطا صاحب کہاں رکنے والے تھے۔

دوسرے دن وہ شوٹنگ پر پہنچے تو نذیر صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے۔ عطا کو پاس بلایا اور پوچھا ''نالائق کل دوڑ کیوں لگا دی تھی؟ مجھ بڈھے آدمی کو بھی اتنی دور تک دوڑایا۔''

عطا نے کہا ''اگر دوڑ نہ لگاتا تو آپ سے مار کھاتا۔''

کہنے لگے ''ہاں۔ یہ بات تو ٹھیک ہے'' پھر بہت پیار سے سمجھایا ''دیکھو بیٹا۔ایسی حرکت نہ کیا کرو جس سے مجھے غصہ آئے۔''

اس نے کہا ''نذیر صاحب۔انسان غلطی کا پتلا ہے اور پھر آپ کے سامنے تو ڈر کے مارے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔''

''میں کیا کرتا ہوں ؟''

''آپ ڈانٹتے ہیں اور مار پیٹ بھی کرتے ہیں۔''

''یار۔یہ بھی ٹھیک ہے۔مگر اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔''

علاؤالدین صاحب نے بھی نذیر صاحب کے بہت سے لطیفے سنائے۔امداد (دادو) ایک چھوٹے موٹے کردار کرنے والے اداکار تھے۔ہم جب فلموں سے وابستہ نہیں ہوئے تھے وہ اس وقت سے اداکاری کر رہے تھے مگر ہم نے آخر وقت تک انہیں چھوٹے موٹے کردار کرتے ہوئے ہی پایا۔غضب کے حاضر جواب اور جگت باز۔سبھی ہدایت کار اور فلم سازان کی جگتوں پر ہنسا کرتے تھے۔مگر اداکاری کے معاملے میں وہ صفر تھے اسی لیے زندگی بھر اداکار نہ بن پائے۔دو چار سین کے کرداروں تک ہی محدود رہے۔انہوں نے ہماری پہلی پروڈکشن ''کنیز'' میں بھی چند سین کا کردار ادا کیا تھا۔لیکن کبھی اس سے زیادہ ترقی نہ کر پائے۔

علاؤالدین نے بتایا کہ جب کوئی ایک سے زیادہ غلطیاں کر دیتا تھا نذیر صاحب پیر سے چپل اتار کر اس کی طرف لپکتے تھے۔کوئی نیا اور اناڑی ہوتا تو چپکا بیٹھا رہتا اور مار کھالیتا۔پرانے اور تجربہ کار لوگ فوراً اٹھ کر بھاگ کھڑے ہوتے اور نذیر صاحب کے ہاتھ نہ آتے۔یہاں تک کہ کچھ دیر بعد وہ پیار سے چمکار کر بلاتے اور کہتے کہ آجاؤ کچھ نہیں کہوں گا۔ ان کی اس عادت کی وجہ سے بھی اداکار غلطیاں کر دیا کرتے تھے۔اس لیے کہ سین کی ضرورت اور مکالمے کے بجائے اداکار کا دھیان نذیر صاحب کے ہاتھوں کی طرف لگا رہتا تھا کہ کب غلطی ہو گی اور وہ چپل پیر سے اتار کر لپکیں گے۔امداد کے ساتھ چند بار یہ واردات ہو چکی تھی۔ایک دن نذیر صاحب ذرا خوش گوار موڈ میں تھے اور امداد سے کہہ رہے تھے کہ بیٹا' تم لوگ آخر سمجھتے کیوں نہیں ہو۔میں تمھیں اداکاری سکھاتا ہوں اور تم نہیں سیکھتے۔کتنے بدقسمت ہو۔

امداد نے کہا" سر جی۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں؟"

بولے" ہاں ہاں۔ کہو۔"

اس نے کہا" نذیر صاحب۔ کیا آپ چپل کے بجائے تسمے والی جوتی نہیں پہن سکتے؟"

نذیر صاحب نے حیران ہو کر پوچھا" ارے بے وقوف اداکاری سے اس سوال کا کیا تعلق ہے؟"

امداد نے کہا" بہت بڑا تعلق ہے سر۔ بات یہ ہے کہ آپ چپل پہنتے ہیں اس لیے ایک منٹ میں اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں۔ اگر تسمے والی پہنیں گے تو اسے اتارنے میں کچھ دیر تو لگے گی۔ ایسے میں اداکار کو بچنے کا موقع مل جائے گا۔ اب یہ ہوتا ہے کہ ہماری توجہ ایکٹنگ اور مکالموں کی بجائے آپ کے ہاتھ اور چپل پر لگی رہتی ہے۔ تو پھر ہم اداکاری کیسے سیکھیں گے؟"

نذیر صاحب ہنسنے لگے۔

نذیر صاحب کا ایک اور واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ بابا عالم سیاہ پوش پنجابی کے بہت اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ نذیر صاحب کی ایک فلم کی انہوں نے کہانی لکھی اور ایک ایسا کردار تحریر کیا جو مخصوص قسم کی بہت مشکل زبان بولتا تھا۔ شوٹنگ کا آغاز ہوا تو نذیر صاحب نے مختلف اداکاروں کو بلایا اور آزمایا مگر بابا عالم سیاہ پوش نے کسی بھی اداکار کو پسند نہیں کیا۔ یہی کہتے رہے کہ یہ مکالموں اور کردار کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گا۔

اس کردار کا حلیہ یہ تھا کہ سر منڈا ہوا تھا۔ سر منڈانے کے لیے بھی بہت سے اداکار رضامند نہیں تھے۔ نذیر صاحب تنگ آ گئے۔ شوٹنگ میں مزید تاخیر بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ آخر انہوں نے ایک دن ضروری مشورے کے لیے بابا عالم سیاہ پوش کو بلایا اور انہیں لے کر ایک علیحدہ کمرے میں چلے گئے۔ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ اندر سے کچھ عجیب و غریب قسم کی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد نذیر صاحب اور بابا عالم سیاہ پوش کمرے سے باہر نکلے تو ایک حجام بھی ان کے پیچھے برآمد ہوا۔ بابا عالم سیاہ پوش کا سر منڈا ہوا تھا اور ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

انہوں نے نذیر صاحب سے شکایت کی" یہ آپ نے بہت زیادتی کی ہے میرے ساتھ۔"

نذیر صاحب نے کہا" بابا جی۔ زیادتی تو آپ نے کی ہے میرے ساتھ۔ ایسا کریکٹر اور ایسی زبان لکھی ہے کہ کوئی

اداکار نہیں کر سکتا۔اب آپ ہی اس کے ساتھ انصاف کریں۔''

بعد میں بابا عالم سیاہ پوش نے یہ کردار کیا اور بہت خوب کیا۔اس فلم کا نام'' لارے'' تھا۔یہ بھی کامیاب رہی مگر پہلی فلم '' پھیرے'' جتنی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

بابا سیاہ عالم پوش کی بات چل نکلی ہے تو ان کے بارے میں بھی سن لیجیئے۔وہ پنجابی کے بہت اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ بہت بڑے عالم تھے۔اردو فارسی کے بھی ماہر تھے۔کہتے ہیں کہ نوجوانی میں انہیں ایک لڑکی سے پیار ہو گیا تھا۔اس کی شادی کہیں اور ہو گئی۔عالم نے اس دن کے بعد سیاہ پوشی اختیار کر لی اور دنیا ترک کر دی۔نتیجہ یہ کہ جوانی میں ہی بابا عالم سیاہ پوش کے نام سے مشہور ہو گئے۔جب ہماری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ نہ سیاہ پوش تھے اور نہ ہی ترک دنیا کے قائل رہے تھے۔لیکن بابا عالم سیاہ پوش کے نام ہی سے جانے پہچانے جاتے تھے۔انہوں نے بہت سی فلموں کی کہانیاں لکھیں اور داد حاصل کی لیکن پیسے نہ کما سکے۔اس زمانے میں فلمی صنعت میں پیسے ہی کہاں تھے جو انہیں ملتے۔ کافی کام کیا مگر خالی ہاتھ ہی رہے۔بابا سیاہ عالم پوش تھوڑے سے ہکلاتے تھے۔جملہ شروع کرنے سے پہلے ذرا اٹکتے تھے اور ایک انگلی اپنے جبڑے پر مارتے تھے تو بالکل روانی سے بولنا شروع کر دیتے تھے۔بہت رکھ رکھاؤ والے خلیق انسان تھے۔ہم سے تو بہت سینئر تھے مگر بہت عزت دیتے تھے۔پیار سے '' آفاق ملت'' کہہ کر پکارتے تھے۔کبھی شعر و شاعری اور ادب کی بات چھڑ جاتی تھی تو وارث شاہ سے لے کر غالب و ذوق اور عرفی و بیدل تک کے اشعار سنا دیتے۔افسوس کہ فلمی صنعت میں خوشحالی کا دور آنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

نذیر صاحب نے جوان کے ساتھ سلوک کیا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ دیتے تھے اور جب تک پوری طرح مطمئن نہ ہو جاتے آگے قدم نہ بڑھاتے۔مثال کے طور پر ایک اور واقعہ سنئے۔

نذیر صاحب نے پاکستان میں آکر سب سے پہلے '' ہیر رانجھا'' کے نام سے ایک فلم شروع کی تھی۔یہ فلم اردو زبان میں بنائی جا رہی تھی۔ظاہر ہے کہ وہ اور میڈم سورن لتا اس فلم میں ''ہیر رانجھا'' تھے۔ایم اسماعیل صاحب کیدو کا بد نام زمانہ کردار ادا کر رہے تھے۔یہ فلم مکمل تو ہو گئی تھی مگر تقسیم کار سے تنازع کے باعث ریلیز نہ ہو سکی۔بعد میں لیبارٹری میں آگ لگ گئی اور فلم کا نیگیٹو جل کر راکھ ہو گیا۔اس طرح یہ فلم کسی نے بھی نہ دیکھی۔

''ہیر رانجھا'' کے لیے اسٹوڈیو کے باہر والی نہر پر شوٹنگ ہو رہی تھی۔ پل کی جگہ نہر پر ایک شہتیر ڈال دیا گیا تھا جیسا کہ دیہات میں عموماً ہوتا ہے۔ فلم کی ہیروئن سورن لتا کو اس شہتیر سے گزر کر نہر کے پار جانا تھا۔ ریہرسل میں وہ جب بھی شہتیر سے گزرنے لگتیں تو غیر ارادی طور پر نیچے شہتیر کی طرف دیکھنے لگتیں۔ نذیر صاحب نے انہیں بتایا کہ بھئی آپ کا ہیرو دوسری جانب سامنے کھڑا ہے۔ آپ کو اس کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے مگر آپ نیچے شہتیر کو دیکھتی رہتی ہیں۔ جب شاٹ ہونے لگا تو میڈم سورن لتا نے پھر شہتیر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ نذیر صاحب کو غصہ آ گیا اور انہوں نے انہیں خوب ڈانٹا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے شوٹنگ رک گئی اور میڈم سورن لتا ناراض ہو کر ایک طرف بیٹھ گئیں۔ جب غصہ اترا تو نذیر صاحب نے انہیں سمجھایا کہ دیکھو فلم میں تم اسی گاؤں کی رہنے والی لڑکی ہو اور بچپن ہی سے اس شہتیر سے گزرتی رہی ہو۔ تمہیں تو اس پر سے گزرنے کی عادت ہونی چاہیے۔ اس لئے تمہارا نیچے دیکھنا بہت غیر فطری اور برا لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد پھر شوٹنگ شروع ہو گئی اور میڈم نے صحیح شاٹ دے دیا۔ اگلے وقتوں کے فلم بنانے والے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بہت اہمیت دیا کرتے تھے تاکہ فلم میں حقیقت کا رنگ پیدا ہو جائے۔

رواج یہ ہے کہ شوٹنگ کے دوران میں فلم ساز کی طرف سے کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔ نذیر صاحب کی شوٹنگ میں کھانا ان کے گھر سے پک کر آتا تھا اور سب کو خود تقسیم کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی میں دوبارہ مانگنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

ایک بار نذیر صاحب کسی بات پر ناراض ہو کر مارنے کے لئے عطا کی طرف لپکے تو وہ بھاگ اٹھے۔ نذیر صاحب غصے میں تپ رہے تھے۔ ان کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اسٹوڈیو سے باہر نکل گئے اور سڑک پر کافی دور تک چلے گئے۔ ساتھ ہی برا بھلا بھی کہتے جا رہے تھے اور دھمکیاں بھی دے رہے تھے ''رک جا۔ ورنہ خیر نہیں ہے۔''

عطا صاحب کہاں رکنے والے تھے۔

دوسرے دن وہ شوٹنگ پر پہنچے تو نذیر صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے۔ عطا کو پاس بلایا اور پوچھا ''نالائق کل دوڑ کیوں

لگادی تھی؟ مجھ بڈھے آدمی کو بھی اتنی دور تک دوڑایا۔"

عطا نے کہا" اگر دوڑ نہ لگاتا تو آپ سے مار کھاتا۔"

کہنے لگے "ہاں۔ یہ بات تو ٹھیک ہے" پھر بہت پیار سے سمجھایا "دیکھو بیٹا۔ ایسی حرکت نہ کیا کرو جس سے مجھے غصہ آئے۔"

اس نے کہا "نذیر صاحب۔ انسان غلطی کا پتلا ہے اور پھر آپ کے سامنے تو ڈر کے مارے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔"

"میں کیا کرتا ہوں؟"

"آپ ڈانٹتے ہیں اور مار پیٹ بھی کرتے ہیں۔"

"یار۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔"

علاؤالدین صاحب نے بھی نذیر صاحب کے بہت سے لطیفے سنائے۔ امداد (دادو) ایک چھوٹے موٹے کردار کرنے والے اداکار تھے۔ ہم جب فلموں سے وابستہ نہیں ہوئے تھے وہ اس وقت سے اداکاری کر رہے تھے مگر ہم نے آخر وقت تک انہیں چھوٹے موٹے کردار کرتے ہوئے ہی پایا۔ غضب کے حاضر جواب اور جگت باز۔ سبھی ہدایت کار اور فلم سازان کی جگتوں پر ہنسا کرتے تھے۔ مگر اداکاری کے معاملے میں وہ صفر تھے اسی لیے زندگی بھر اداکار نہ بن پائے۔ دو چار سین کے کرداروں تک ہی محدود رہے۔ انہوں نے ہماری پہلی پروڈکشن "کنیز" میں بھی چند سین کا کردار ادا کیا تھا۔ لیکن کبھی اس سے زیادہ ترقی نہ کر پائے۔

علاؤالدین نے بتایا کہ جب کوئی ایک سے زیادہ غلطیاں کر دیتا تھا نذیر صاحب پیر سے چپل اتار کر اس کی طرف لپکتے تھے۔ کوئی نیا اور اناڑی ہوتا تو چپکا بیٹھا رہتا اور مار کھالیتا۔ پرانے اور تجربہ کار لوگ فوراً اٹھ کر بھاگ کھڑے ہوتے اور نذیر صاحب کے ہاتھ نہ آتے۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد وہ پیار سے چمکار کر بلاتے اور کہتے کہ آجاؤ کچھ نہیں کہوں گا۔ ان کی اس عادت کی وجہ سے بھی اداکار غلطیاں کر دیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ سین کی ضرورت اور مکالمے کے بجائے اداکار کا دھیان نذیر صاحب کے ہاتھوں کی طرف لگا رہتا تھا کہ کب غلطی ہو گی اور وہ چپل پیر سے اتار کر لپکیں گے۔ امداد کے ساتھ چند بار یہ واردات ہو چکی تھی۔ ایک دن نذیر صاحب ذرا خوش گوار موڈ میں تھے اور امداد سے کہہ

رہے تھے کہ بیٹا‘ تم لوگ آخر سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ میں تمھیں اداکاری سکھاتا ہوں اور تم نہیں سیکھتے۔ کتنے بد قسمت ہو۔

امداد نے کہا” سر جی۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں؟“

بولے” ہاں ہاں۔ کہو۔ “

اس نے کہا” نذیر صاحب۔ کیا آپ چپل کے بجائے تسمے والی جوتی نہیں پہن سکتے؟“

نذیر صاحب نے حیران ہو کر پوچھا” ارے بے وقوف اداکاری سے اس سوال کا کیا تعلق ہے؟“

امداد نے کہا” بہت بڑا تعلق ہے سر۔ بات یہ ہے کہ آپ چپل پہنتے ہیں اس لیے ایک منٹ میں اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں۔ اگر تسمے والی پہنیں گے تو اسے اتارنے میں کچھ دیر تو لگے گی۔ ایسے میں اداکار کو بچنے کا موقع مل جائے گا۔ اب یہ ہوتا ہے کہ ہماری توجہ ایکٹنگ اور مکالموں کی بجائے آپ کے ہاتھ اور چپل پر لگی رہتی ہے۔ تو پھر ہم اداکاری کیسے سیکھیں گے؟“

نذیر صاحب ہنسنے لگے۔

نذیر صاحب کا ایک اور واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ بابا عالم سیاہ پوش پنجابی کے بہت اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ نذیر صاحب کی ایک فلم کی انہوں نے کہانی لکھی اور ایک ایسا کردار تحریر کیا جو مخصوص قسم کی بہت مشکل زبان بولتا تھا۔ شوٹنگ کا آغاز ہوا تو نذیر صاحب نے مختلف اداکاروں کو بلایا اور آزمایا مگر بابا عالم سیاہ پوش نے کسی بھی اداکار کو پسند نہیں کیا۔ یہی کہتے رہے کہ یہ مکالموں اور کردار کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گا۔

اس کردار کا حلیہ یہ تھا کہ سر منڈا ہوا تھا۔ سر منڈانے کے لیے بھی بہت سے اداکار رضامند نہیں تھے۔ نذیر صاحب تنگ آ گئے۔ شوٹنگ میں مزید تاخیر بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ آخر انہوں نے ایک دن ضروری مشورے کے لیے بابا عالم سیاہ پوش کو بلایا اور انہیں لے کر ایک علیحدہ کمرے میں چلے گئے۔ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ اندر سے کچھ عجیب و غریب قسم کی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد نذیر صاحب اور بابا عالم سیاہ پوش کمرے سے باہر نکلے تو ایک حجام بھی ان کے پیچھے برآمد ہوا۔ بابا عالم سیاہ پوش کا سر منڈا ہوا تھا اور ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

انہوں نے نذیر صاحب سے شکایت کی " یہ آپ نے بہت زیادتی کی ہے میرے ساتھ۔"

نذیر صاحب نے کہا" باباجی۔زیادتی تو آپ نے کی ہے میرے ساتھ۔ایسا کریکٹر اور ایسی زبان لکھی ہے کہ کوئی اداکار نہیں کر سکتا۔اب آپ ہی اس کے ساتھ انصاف کریں۔"

بعد میں باباعالم سیاہ پوش نے یہ کردار کیا اور بہت خوب کیا۔اس فلم کا نام " لارے" تھا۔یہ بھی کامیاب رہی مگر پہلی فلم " پھیرے" جتنی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

باباسیاہ عالم پوش کی بات چل نکلی ہے تو ان کے بارے میں بھی سن لیجئے۔وہ پنجابی کے بہت اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ بہت بڑے عالم تھے۔اردو فارسی کے بھی ماہر تھے۔کہتے ہیں کہ نوجوانی میں انہیں ایک لڑکی سے پیار ہو گیا تھا۔اس کی شادی کہیں اور ہو گئی۔عالم نے اس دن کے بعد سیاہ پوشی اختیار کرلی اور دنیا ترک کر دی۔نتیجہ یہ کہ جوانی میں ہی باباعالم سیاہ پوش کے نام سے مشہور ہو گئے۔جب ہماری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ نہ سیاہ پوش تھے اور نہ ہی ترک دنیا کے قائل رہے تھے۔لیکن باباعالم سیاہ پوش کے نام ہی سے جانے پہچانے جاتے تھے۔انہوں نے بہت سی فلموں کی کہانیاں لکھیں اور داد حاصل کی لیکن پیسے نہ کما سکے۔اس زمانے میں فلمی صنعت میں پیسے ہی کہاں تھے جو انہیں ملتے۔ کافی کام کیا مگر خالی ہاتھ ہی رہے۔باباسیاہ عالم پوش تھوڑے سے ہکلاتے تھے۔جملہ شروع کرنے سے پہلے ذرا اٹکتے تھے اور ایک انگلی اپنے جبڑے پر مارتے تھے تو بالکل روانی سے بولنا شروع کر دیتے تھے۔بہت رکھ رکھاؤ والے خلیق انسان تھے۔ہم سے تو بہت سینئر تھے مگر بہت عزت دیتے تھے۔پیار سے " آفاق ملت" کہہ کر پکارتے تھے۔کبھی شعر و شاعری اور ادب کی بات چھڑ جاتی تھی تو وارث شاہ سے لے کر غالب و ذوق اور عرفی و بیدل تک کے اشعار سنادیتے۔افسوس کہ فلمی صنعت میں خوشحالی کا دور آنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

نذیر صاحب نے جو ان کے ساتھ سلوک کیا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ دیتے تھے اور جب تک پوری طرح مطمئن نہ ہو جاتے آگے قدم نہ بڑھاتے۔مثال کے طور پر ایک اور واقعہ سنئے۔

نذیر صاحب نے پاکستان میں آکر سب سے پہلے " ہیر رانجھا" کے نام سے ایک فلم شروع کی تھی۔یہ فلم اردو زبان میں بنائی جارہی تھی۔ظاہر ہے کہ وہ اور میڈم سورن لتا اس فلم میں "ہیر رانجھا" تھے۔ایم اسماعیل صاحب کیدو کا بد

نام زمانہ کردار ادا کر رہے تھے۔ یہ فلم مکمل تو ہوگئی تھی مگر تقسیم کار سے تنازع کے باعث ریلیز نہ ہو سکی۔ بعد میں لیبارٹری میں آگ لگ گئی اور فلم کا نیگیٹو جل کر راکھ ہو گیا۔اس طرح یہ فلم کسی نے بھی نہ دیکھی۔

''ہیر رانجھا'' کے لیے اسٹوڈیو کے باہر والی نہر پر شوٹنگ ہو رہی تھی۔ پل کی جگہ نہر پر ایک شہتیر ڈال دیا گیا تھا جیسا کہ دیہات میں عموماً ہوتا ہے۔ فلم کی ہیروئن سورن لتا کو اس شہتیر سے گزر کر نہر کے پار جانا تھا۔ ریہرسل میں وہ جب بھی شہتیر سے گزرنے لگتیں تو غیر ارادی طور پر نیچے شہتیر کی طرف دیکھنے لگتیں۔ نذیر صاحب نے انہیں بتایا کہ بھئی آپ کا ہیرو دوسری جانب سامنے کھڑا ہے۔ آپ کو اس کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے مگر آپ نیچے شہتیر کو دیکھتی رہتی ہیں۔ جب شاٹ ہونے لگا تو میڈم سورن لتا نے پھر شہتیر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ نذیر صاحب کو غصہ آگیا اور انہوں نے انہیں خوب ڈانٹا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے شوٹنگ رک گئی اور میڈم سورن لتا ناراض ہو کر ایک طرف بیٹھ گئیں۔ جب غصہ اترا تو نذیر صاحب نے انہیں سمجھایا کہ دیکھو فلم میں تم اسی گاؤں کی رہنے والی لڑکی ہو اور بچپن ہی سے اس شہتیر سے گزرتی رہی ہو۔ تمہیں تو اس پر سے گزرنے کی عادت ہونی چاہیے۔ اس لئے تمہارا نیچے دیکھنا بہت غیر فطری اور برا لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد پھر شوٹنگ شروع ہو گئی اور میڈم نے صحیح شاٹ دے دیا۔ اگلے وقتوں کے فلم بنانے والے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بہت اہمیت دیا کرتے تھے تاکہ فلم میں حقیقت کا رنگ پیدا ہو جائے۔

رواج یہ ہے کہ شوٹنگ کے دوران میں فلم ساز کی طرف سے کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔ نذیر صاحب کی شوٹنگ میں کھانا ان کے گھر سے پک کر آتا تھا اور سب کو خود تقسیم کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی میں دوبارہ مانگنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

'' آفاق'' ہی کے زمانے میں ہماری شباب کیرانوی سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ بھی ہماری طرح صحافی تھے۔ فرق یہ تھا کہ ہم ایک روزنامہ میں کام کرتے تھے اور وہ ایک فلمی ماہنامہ ''ڈائریکٹر'' کے مدیر تھے۔ ڈائریکٹر اپنے وقت کا بہت مقبول اور بااثر فلمی میگزین تھا۔ اس کے مینجنگ ایڈیٹر چوہدری فضل حق صاحب تھے۔ کافی عرصے تک لوگ انہیں اور شباب صاحب کو شریک کار اور حصے دار ہی سمجھتے رہے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ شباب صاحب صرف

ان کے ملازم تھے۔ لیکن جس انداز سے شباب کیرانوی دفتر میں براجمان ہوتے تھے اور ادارتی امور میں انہیں جو اختیارات حاصل تھے اس کے پیش نظر دیکھنے والے یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ وہ چوہدری فضل حق کے پارٹنر ہیں۔ چوہدری فضل حق ایک باغ و بہار شخصیت تھے۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، بھرا ہوا جسم' گہرا سانولا رنگ' جب ہم نے انہیں دیکھا تو غالباً پچاس پچپن کے پیٹے میں ہوں گے لیکن صحت مند اور توانا تھے۔ وہ تھوڑے سے ہکلاتے تھے مگر بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ مال روڈ پر کمرشل بلڈنگ اس زمانے میں لاہور کا بہترین شاپنگ سینٹر سمجھی جاتی تھی۔ اس لمبی سی دو منزلہ عمارت کی نچلی منزل میں دکانیں تھیں' بالائی منزل پر دفاتر وغیرہ تھے۔ ان ہی میں سے ایک دفتر ''ڈائریکٹر'' کا بھی تھا۔ اول تو لاہور کی مال روڈ پر کمرشل بلڈنگ جیسی جگہ پر کسی فلمی پرچے کا دفتر ہونا ہی ایک تعجب اور اعزاز کی بات تھی۔ مگر جب سیڑھیاں چڑھ کر دفتر میں پہنچتے تو دفتر کا ٹھاٹ باٹ دیکھ کر کچھ اور مرعوبیت ہو جاتی۔ دفتر میں ایک بڑے کمرے میں چوہدری فضل حق کا دفتر تھا۔ اس میں اور بھی بہت سے کارندے بیٹھا کرتے تھے۔ چوہدری صاحب کے اور بھی بہت سے کاروبار تھے جن میں زمین کی خرید و فروخت کا کاروبار بھی شامل تھا۔ وہ کافی خوشحال بلکہ پیسے والے آدمی تھے۔ تعلیم یافتہ اور ذہین تھے۔ میل جول اور بات چیت کا ڈھنگ بھی جانتے تھے۔ اس لئے ایک کامیاب انسان تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کو بھی بہت اچھی تعلیم و تربیت دی تھی جو دفتر بہت کم آتے تھے۔

'' ڈائریکٹر '' کے دفتر میں شباب کیرانوی کا کمرہ چوہدری صاحب کے کمرے سے زیادہ سجا ہوا تھا۔ صوفہ سیٹ بھی بچھے ہوئے تھے اور فرنیچر بھی بہت اچھی قسم کا تھا۔ اس کے برابر والے کمرے میں خوش نویس اور عملے کے دوسرے ارکان بیٹھا کرتے تھے۔

شباب صاحب کا نام اور تذکرہ تو ہم نے سن رکھا تھا کیونکہ عیسیٰ غزنوی کے دفتر میں دوسرے فلمی صحافیوں کے علاوہ شباب کیرانوی کا تذکرہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ مگر ان سے پہلی ملاقات ان ہی کے دفتر میں ہوئی۔ ڈائریکٹر کی مقبولیت اور اثر و رسوخ کا ایک سبب یہ تھا کہ لاہور کے نامور اہل قلم حضرات اس فلمی پرچے میں لکھا کرتے تھے اور اکثر کی دفتر میں آمد و رفت بھی تھی۔ سعادت حسن منٹو 'شوکت تھانوی، عشرت رحمانی' احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی جیسے لوگوں کا

اس دفتر میں آنا جانا تھا۔اس کی ایک وجہ تو شباب صاحب کا حسن اخلاق اور شگفتہ مزاجی تھی مگر ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ڈائریکٹر کے لکھنے والوں کو معاوضہ بھی دیا جاتا تھا جو اس زمانے میں ایک انوکھی بات تھی۔اس وقت ’’امروز‘ آفاق‘‘ اور ’’ڈائریکٹر‘‘ کے سوا کوئی دوسرا اخبار یا جریدہ تمام لکھنے والوں کو معاوضہ ادا نہیں کرتا تھا۔کمرشل بلڈنگ کے سامنے ہی کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس تھے جو لاہور کے دانش وروں اور ادیبوں‘ شاعروں کا مستقل ٹھکانا سمجھے جاتے جاتے تھے۔جو اہل قلم کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کی طرف جاتے ان میں سے کچھ گپ شپ یا اچھی چائے کے لالچ میں ’’ڈائریکٹر‘‘ کے دفتر میں بھی ضرور جاتے۔یہاں انہیں چائے یا کافی کے علاوہ فلمی ایکٹریسوں کو دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔اس کمرشل بلڈنگ کے ایک کونے پر پہلوان پان والے کی دکان تھی جہاں دور دور سے لوگ پان کھانے کے لئے آیا کرتے تھے۔ پہلوان صاحب کی دکان دیکھنے میں تو عام پنواڑیوں کی دکان جیسی تھی مگر اس میں بڑے اہتمام سے بڑے اور نامور پہلوانوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔پان والے صاحب بھی کسرتی بدن کے پہلوان تھے۔ سردی گرمی ہر موسم میں ان کا لباس بنیان اور لنگی پر مشتمل ہوتا تھا۔ان کا پان تو اپنے لطف اور ذائقے کی وجہ سے مشہور تھا ہی مگر پان بنانے اور کھلانے کا انداز بھی نرالا تھا۔

جب ہم پہلی بار شباب صاحب کے ساتھ شام کے وقت ان کی دکان پر پہنچے تو وہاں حسب معمول گاہکوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔شباب صاحب کو دیکھا تو وہ زیر لب مسکرائے مگر منہ سے کچھ نہیں بولے۔شباب صاحب کے ساتھ انہوں نے یہ خصوصی رعایت برتی کہ دوسرے گاہکوں کو نظر انداز کر کے سب سے پہلے ان کی طرف توجہ دی۔دکان پر موجود دوسرے گاہکوں نے ذرا بھی چون وچرا نہیں کی اس لئے کہ پہلوان جی ان کی ضرورت تھے۔ان کی پہلوان جی کو ضرورت نہیں تھی۔اس کے پاس گاہکوں کی کوئی کمی نہ تھی اور ویسے بھی انہیں گاہکوں کی پروا بھی نہیں تھی۔وہ صبح سے رات تک دکان پر بیٹھے رہتے تھے۔صرف کچھ دیر کے لئے غیر حاضر ہوتے تھے۔گاہک بولتے بھی تو کیسے بولتے۔ پہلوان جی کے بازوؤں کی مچھلیوں اور کشادہ سینے کو دیکھنے کے بعد کس میں جرات تھی کہ ان سے بحث کرتا۔

پہلوان صاحب دکان پر دوزانوں بیٹھے تھے۔وہیں بیٹھے بیٹھے وہ آس پاس ہاتھ بڑھا کر گاہکوں کی ضرورت کی تمام چیزیں سمیٹ کر گاہک کو دے دیا کرتے تھے۔انہوں نے ایک پان لگایا۔ایک ڈبا اٹھا کر اس میں سے کوئی چیز پان پر چھڑکی اور

پھر پان کا بیڑا بنا کر ہماری طرف بڑھا دیا۔ ہم نے ہاتھ آگے بڑھایا تو انہوں نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ شباب صاحب نے کہا ''آگے جا کر منہ کھول دو۔ پہلوان جی ' ہر ایک کو اپنے ہاتھ سے پان کھلاتے ہیں۔''

ہم نے آگے بڑھ کر منہ کھول دیا اور پہلوان جی نے پان ہمارے منہ میں ڈال دیا۔ یہ پہلوان جی کی عادت تھی کہ وہ ہر ایک کو اپنے ہاتھ سے پان کھلاتے تھے اور جو کوئی لاعلمی میں اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا تھا وہ اسے پان دینے سے انکار کر دیتے تھے اور اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیتے تھے۔ منہ سے وہ ایک لفظ بھی نہیں بولتے تھے۔ کسی نے کبھی انہیں بولتے ہوئے نہیں سنا۔ بہت سے لوگ انہیں گونگا سمجھتے تھے حالانکہ وہ گونگے نہیں تھے۔ ان پہلوان جی کی دکان کی ایک خصوصیت گولی والی سوڈے کی بوتل بھی تھی۔ گولی والی سوڈے کی بوتل آج کل تو ناپید ہی ہو گئی ہے۔ اس زمانے میں بھی اس کا رواج برائے نام رہ گیا تھا۔ یہ بوتل موٹے شیشے کی بنی ہوئی ہوتی تھی۔ اس کی گردن طوطے کی گردن کے برابر موٹی اور بہت مضبوط ہوا کرتی تھی۔ اس کے منہ پر شیشے کی ایک گولی فٹ ہوتی تھی۔ اس گولی کو ہٹانے اور بوتل کھولنے کے لئے لکڑی کا ایک ٹوپی نما آلہ استعمال ہوتا تھا۔ اسے گولی کے اوپر رکھ کر گھونسا مارو تو گولی بوتل کے اندر چلی جاتی تھی اور بوتل کے اندر سے گیس کی وجہ سے سوڈا ابل کر جھاگ کی صورت میں بوتل سے باہر نکلنے لگتا تھا۔ اس بوتل کو پینے کے لئے بھی بڑی مہارت کی ضرورت تھی۔ اگر بوتل کھلتے ہی آپ اسے منہ سے لگا کر پینا شروع نہیں کریں گے تو سوڈے کا جھاگ آپ کے کپڑے خراب کر دے گا۔ بہت سے لوگ اپنے اناڑی پن کی وجہ سے کپڑے خراب کر بیٹھتے تھے۔ اب نہ وہ دکان ہے نہ پہلوان۔ نہ وہ پہلوانوں کی تصویریں۔ اس جگہ اب نئی دکانیں اور نئے لوگ نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ سب خواب تھا۔

شباب صاحب سے ہماری پہلی ملاقات لالہ وزیر محمد صدیقی کے ذریعے ہوئی تھی۔ لالہ وزیر محمد قیام پاکستان سے بھی پہلے پشاور میں اخبارات کے واحد ایجنٹ تھے۔ صحیح معنوں میں پشاوری پٹھان تھے۔ اونچا قد، بھاری بھرکم جسم ' بھاری آواز ' کیونکہ وہ ہر اخبار اور جریدے کے ایجنٹ تھے اس لئے جب بھی لاہور کے دورے پر آتے تو سبھی دفاتر میں جاتے تھے۔ اس طرح ہماری بھی ان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ غائبانہ طور پر ہم سے واقف تھے اور ہمارے مداح بھی تھے۔ بہت پر خلوص ' بامروت اور صاف گو آدمی تھے۔ چند ہی ملاقاتوں کے بعد انہوں نے ہمیں بیٹا بنا لیا۔ اس کے

بعد لازم تھا کہ وہ جب کبھی لاہور آئیں تو ہمیں فون کریں اور ہم ان سے ضرور ملاقات کریں۔لالہ کے دو بیٹے تھے جو اس وقت ہم سے بھی چند سال بڑے تھے۔ مگر لالہ وزیر محمد کی زندہ دلی اور بے تکلفی دیکھ کر ان کی عمر کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔

ایک دن ہم دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔دوسری طرف لالہ وزیر محمد صدیقی بول رہے تھے۔علیک سلیک کے بعد انہوں نے پوچھا''آفاقی۔اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟ ''

ہم نے کہا''لالہ کام کر رہے ہیں''

''ہر وقت کام مت کیا کرو۔اپنی صحت دیکھی ہے؟اس عمر میں بھی تمہاری کلائی تھام لوں تو چھڑا نہیں سکو گے۔''

یہ بات وہ اکثر ہمیں یاد دلاتے رہتے تھے۔

''تم اس وقت ڈائریکٹر کے دفتر میں آجاؤ۔''

ہم نے کہا''مگر لالہ۔۔۔۔۔۔''

انہوں نے گونج دار آواز میں حکم صادر کیا''نہ اگر۔۔۔۔۔۔نہ مگر۔۔۔۔۔۔میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں'' یہ نادر شاہی حکم سنا کر فون بند کر دیا۔لالہ وزیر محمد کا ہر معاملے ہیں یہی نادر شاہی انداز تھا۔

ہم نے فوراً کام سمیٹا اور کرشل بلڈنگ پہنچ گئے۔سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے تو سب سے پہلے چوہدری فضل حق صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔انہوں نے بتایا کہ لالہ وزیر محمد اگلے کمرے میں بیٹھے ہیں۔اگلے کمرے میں پہنچے تو لالہ سامنے والے بڑے صوفے پر تشریف فرما تھے۔سلام کے جواب میں ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔پیشانی چومی اور پاس بٹھالیا پھر پوچھا''شباب صاحب سے ملے ہو؟''

ہم نے انکار میں سر ہلایا۔سامنے دیکھا تو ایک بہت بڑی میز کی دوسری جانب بڑی سی کرسی پر ایک گندمی رنگ' گول مٹول جوان بیٹھا تھا۔جس کی ہر چیز گول تھی۔جسم گول،چہرہ گول،آنکھیں بھی گول گول۔یہ چمکدار شخص مسکرا رہا تھا۔ہم نے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔انہوں نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ ہماری طرف بڑھا دیا۔شباب صاحب بہت چھوٹے قد کے تھے۔ان کے ہاتھ پاؤں بھی چھوٹے چھوٹے تھے۔مگر ارادے اور ذہنی صلاحیتیں اتنی ہی بڑی تھیں۔وہ ہنس مکھ

اور خوش مزاج آدمی تھے۔ مطالعہ بھی بہت زیادہ تھا۔ بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ اس لئے بہت جلد ہماری بے تکلفی ہو گئی۔

شباب صاحب نے ٹیلی فون اٹھا کر چائے کے لئے آرڈر دیا اور ساتھ ہی سموسے بھی لانے کو کہا۔ خصوصی لوگوں کے لئے وہ مال روڈ کے پار واقع ٹی ہاؤس سے چائے منگایا کرتے تھے چنانچہ یہی اعزاز ہمیں بھی بخشا گیا۔

لالہ وزیر محمد نے کہا ''شباب صاحب! یہ لڑکا نوجوان ہے۔ کنوارا ہے۔ فلمی لوگوں سے بھی ملتا ہے مگر بہت شرمیلا ہے۔ اب میں اسے آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ آپ اس کی شرم دور کر دیں'' یہ کہہ کر وہ بہت زور سے قہقہہ مار کر ہنسے۔

جواب میں شباب صاحب بھی ہنسنے لگے۔ ہم سامنے والے صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لئے شباب صاحب کی ٹانگوں سے لے کر چہرہ تک سبھی ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ شباب صاحب کی ہنسی کا ہم نے یہ انداز دیکھا کہ وہ قہقہہ مار کر ہنستے تو پہلے ان کا چہرہ ہنسنے لگتا۔ آواز کچھ دیر بعد سنائی دیتی تھی۔ اس طرح ہم نے کسی اور کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ ایک اور بات ہم نے یہ نوٹ کی کہ شباب صاحب جس کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے وہ ان کے قد کے مقابلے میں اونچی تھی جس کی وجہ سے ان کے پیر زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ وہ ہوا میں ہی معلق رہتے تھے۔ وہ ان پیروں کو مختلف انداز میں حرکت دیتے رہتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنے پیروں کے سامنے ایک تپائی سی رکھنی شروع کر دی تھی جس پر وہ اپنے پیر رکھ لیا کرتے تھے۔

ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دفتر سریلی آوازوں اور نقرئی قہقہوں سے گونجنے لگا۔ کئی فلم ایکٹریس بیک وقت دفتر میں داخل ہو گئی تھیں اور عورتوں کی عادت کے مطابق سب نے ایک ساتھ ہی بولنا شروع کر دیا تھا۔ فلم سے وابستہ لوگوں کو ہم نے ''فلم لائٹ'' کے دفتر میں بھی آتے جاتے دیکھا تھا مگر یہاں رونق کچھ زیادہ تھی۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ اس دفتر میں صنف نازک سے تعلق رکھنے والی فن کارائیں عموماً آتی رہتی تھیں۔ ایک تو اس لئے کہ انہیں پبلسٹی مل جاتی تھی۔ ان کی تصویریں اور خبریں شائع ہو جاتی تھیں۔ دوسرے یہ کہ اس وقت شباب صاحب ایک فلم بنانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ تیسری بات یہ تھی کہ یہاں سب کی خاطر مدارات کچھ زیادہ ہوتی تھی۔ ادھر ''فلم

لائٹ" کے دفتر میں عیسیٰ خان ہر ایک کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ڈائریکٹر کے دفتر میں لالہ وزیر محمد کے الفاظ میں "پرستان" کا نظارہ دیکھنے کو ملتا تھا۔جب خواتین نے بہت زیادہ باتیں بنانی شروع کر دیں اور شباب صاحب نے ان کی باتوں پر ہنسنا شروع کر دیا تو چوہدری صاحب بھی نہ رہ سکے اور اپنے کمرے سے اٹھ کر چلے آئے۔

ان کی بھی ہر ایک سے بے تکلفی تھی اور وہ بعض ایسی باتیں بھی کہہ جاتے تھے جو کوئی اور ان لڑکیوں سے کھلے عام نہیں کہہ سکتا تھا۔مگر لڑکیوں میں چوہدری صاحب کی دلچسپی محض زبانی ہنسی مذاق تک ہی محدود تھی۔ سبھی لوگ بے تکلفی سے باتوں میں مصروف ہو گئے مگر ہم لالہ وزیر محمد کے پہلو میں خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔انہوں نے اپنی دانست میں سرگوشی میں ہم سے پوچھا "تم کیوں خاموش بیٹھے ہو۔شرمانے کی کیا بات ہے؟"
ان کی گونج دار آواز نے یہ سرگوشی سب کے کانوں تک پہنچادی اور سب لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔
شباب صاحب نے ہر ایک سے ہمارا تعارف کرایا۔پھر لالہ وزیر محمد نے حسب عادت ہماری تعریف میں کچھ کلمات کہے جن میں ٹیپ کا بند یہ تھا کہ یہ بہت شریف لڑکا ہے اس لئے لڑکیوں کے سامنے ذرا ذرا شرماتا ہے۔سب لڑکیوں نے دلچسپی سے ہمیں دیکھنا شروع کر دیا۔اتنی دیر میں چائے آگئی۔ہم چائے پی کر اور مصروفیت کا بہانہ کر کے چلے آئے۔لیکن اس کے بعد شباب صاحب سے تعلقات بڑھتے گئے۔ان کے اصرار پر ہم نے ڈائریکٹر میں لکھنا بھی شروع کر دیا۔ہم نے تو اپنی دانست میں محض دوستی میں مضامین لکھے تھے مگر جب شباب صاحب نے پہلے مضمون کی اشاعت پر پندرہ روپے کا چیک ہمیں دیا تو ہم حیران رہ گئے کیونکہ پندرہ روپے اس زمانے میں بہت معاوضہ تھا۔بعد میں آنا جانا زیادہ ہو گیا تو وہاں ادیبوں اور شاعروں سے بھی ملاقاتیں ہونے لگیں۔
اس طرح مزید دلچسپی پیدا ہو گئی۔شباب صاحب سے بے تکلفی بڑھی تو دفتری اوقات کے بعد بھی ہم ملنے لگے۔اس کے بعد تو ایسی دوستی ہوئی کہ گھریلو تعلقات میں بدل گئی اور ساری زندگی قائم رہی۔ہمیں معلوم نہیں تھا کہ شباب صاحب اس وقت بھی شادی شدہ تھے۔ہماری کافی عرصے بعد شادی ہوئی اور اس طرح گھریلو تعلقات اور زیادہ گہرے ہو گئے۔شباب صاحب سے دوستی اور بے تکلفی اتنی بڑھی کہ راز و نیاز شروع ہو گئے۔شباب صاحب عموماً اپنے دل کی بات کسی سے نہیں کہتے تھے نہ کسی کو ہم راز بناتے تھے۔مگر ہمارے معاملے میں یہ بندش بھی نہ رہی اور رفتہ

رفتہ رفتہ ایسا وقت بھی آیا جب ان کا اور ہمارا کوئی راز ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں رہا۔

ان کے دفتر میں ہم نے کسی ہیروئن کو تو نہیں دیکھا مگر دوسری ایکٹریس عموماً قدم رنجہ فرمایا کرتی تھیں۔ زینت' آشا پوسلے ، سلمیٰ ممتاز وغیرہ سے اکثر وہاں ملاقات ہوا کرتی تھی مگر ہم کسی سے بے تکلف نہیں تھے۔

ایک دن ہمیں پھر لالہ وزیر محمد کا ٹیلی فون موصول ہوا اور انہوں نے ہمیں بلاتاخیر ڈائریکٹر کے دفتر میں پہنچنے کا حکم دیا۔

لالہ جواب میں عذر یا معذرت سننے کے قائل نہیں تھے اس لئے کچھ کہنا لاحاصل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم شباب صاحب کے دفتر میں پہنچے تو سارا کمرا نازنینوں سے بھرا ہوا تھا اور خوب قہقے اڑ رہے تھے۔ یہ سب چھوٹے موٹے کردار کرنے والی لڑکیاں تھیں۔ لالہ وزیر محمد اپنے مخصوص صوفے پر تشریف فرما تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی ہاتھ تھام کر اپنے برابر بٹھالیا۔ ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔ اور سب نے ہمیں دیکھنا شروع کر دیا۔ ہمیں کچھ بے چینی سی ہونے لگی۔ سب کی نظریں ہم پر لگی ہوئی تھیں۔ شباب صاحب کے چہرے پر بھی شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس وقت ایک سازش کے تحت ہمیں بلایا گیا ہے۔ شباب صاحب نے فون پر چائے کا آرڈر دیا اور دوبارہ لطیفہ بازی اور گپ شپ کا دور چلنے لگا۔ محفل میں موجود بیشتر لڑکیوں سے ہم مانوس نہیں تھے اس لئے خاموش رہے۔

لالہ وزیر محمد نے اپنی گونج دار آواز میں کہا" کڑیو۔ آفاقی میرا بیٹا ہے۔ بہت اچھا جرنلسٹ اور رائٹر ہے مگر یہ شرمیلا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم آج اس کی شرم دور کر دو۔"

لالہ وزیر محمد پشاوری لب و لہجے میں اردو بولتے تھے اور اکثر پشتو الفاظ بھی استعمال کر ڈالتے تھے۔

لڑکیوں نے جواب میں ہنسنا شروع کر دیا۔

لالہ نے دو لڑکیوں کی طرف دیکھا اور کہا" اتنی دور کیوں بیٹھی ہو۔ ادھر آ کر آفاقی کے پاس بیٹھو۔"

لڑکیوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور بے تکلفی سے ہمارے برابر آ کر بیٹھ گئیں۔ ہم کچھ اور سمٹ گئے۔ اتنی دیر میں چوہدری فضل حق صاحب بھی کمرے میں آ گئے۔ وہ شباب صاحب کو" حافظ جی" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ آتے ہی انہوں نے کہا۔

''حافظ جی۔ آج تو بڑی رونق لگی ہوئی ہے۔''

لالہ بولے ''چوہدری صاحب۔۔۔۔۔ آج آفاقی کی شرم دور کرنی ہے۔''

چوہدری صاحب بھی آکر ایک صوفے کے کونے پر ٹک گئے اور بولے ''آفاقی لڑکی تو نہیں ہیں جو لڑکیوں سے شرمائیں گے۔''

یہ سب کچھ ایک منصوبے کے تحت ہو رہا تھا۔ مگر اس طرح سب کی توجہ کا مرکز بننے کی وجہ سے ہمیں کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

''آفاقی۔ ان لڑکیوں سے باتیں کرو'' لالہ نے حکم دیا۔

ہم نے کہا ''کیا باتیں کریں؟''

بولے ''تم تو بہت باتونی ہو۔ کچھ بھی باتیں کرو لطیفے سناؤ۔''

ہم پھر بھی خاموش رہے۔ دراصل یہ سب کچھ ہمیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

لالہ نے لڑکیوں سے کہا ''کڑیو۔ تم ادھر آکر آفاقی کے پاس بیٹھو۔''

لڑکیوں نے ذرا تامل کیا۔ انہیں ہمارے چہرے پر ناراضگی کے آثار نظر آنے لگے تھے مگر لالہ کا حکم کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔ ایک صاحب زادی اٹھ کر کھڑی ہوئیں اور ہمارے پاس آکر رک گئیں۔ شاید اس لئے کہ صوفے پر کسی اور کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔

لالہ نے کہا ''آفاقی کی گود میں بیٹھ جاؤ۔''

وہ لڑکی سچ مچ ہماری گود میں بیٹھنے لگی تو ہم غصے میں ایک دم کھڑے ہو گئے۔

''لالہ۔ کیا تماشا بنانے کے لئے ہمیں بلایا تھا؟'' ہم نے غصہ بھری آواز میں کہا تو سب نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ لڑکی جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔

شباب صاحب نے کہا ''آفاقی صاحب۔ یہ تو ہنسی دلگی کی باتیں ہیں۔''

ہم نے کہا ''ہمیں ایسا مذاق بالکل پسند نہیں ہے۔ آئندہ ہم اس دفتر میں کبھی نہیں آئیں گے۔''

یہ کہہ کر ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

کسی کو توقع نہیں تھی کہ صورتحال ایک دم ایسی ہو جائے گی۔ سب ہمیں پکارتے رہ گئے۔ ان میں لالہ وزیر محمد صدیقی کی آواز سب سے نمایاں تھی۔

''آفاقی۔ رک جاؤ۔ واپس آ جاؤ' اب ایسا مذاق نہیں ہوگا۔''

مگر ہم غصے میں بھرے ہوئے دفتر سے باہر آ گئے اور فٹ پاتھ پر پیدل چل پڑے۔ ہمیں سچ مچ غصہ آ گیا تھا اور یہ سب کچھ ہمیں بہت توہین آمیز لگ رہا تھا۔ ہمارا دفتر زیادہ دور نہیں تھا اس لئے چند منٹ بعد ہم اپنے آفس میں پہنچ گئے۔ غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے غسل خانے میں جا کر منہ دھویا۔ ٹھنڈا پانی منگا کر پیا اور کام میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر بعد شباب کیرانوی صاحب کا ٹیلی فون آ گیا۔

''یار' تم تو مذاق کی بات پر برا مان گئے۔''

ہم نے کہا ''شباب صاحب۔ آپ جانتے ہیں کہ ایسا مذاق مجھے پسند نہیں ہے اور یہ تو بھری محفل میں کسی کو ذلیل کرنے والی بات ہے۔''

''یقین کرو، یہ ساری اسکیم لالہ وزیر محمد کی تھی۔ اور مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ تم یوں برا مان جاؤ گے۔ اچھا، جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہاری توہین ہوئی ہے تو معاف کر دو۔''

ہم نے کہا ''ٹھیک ہے۔''

بولے ''اس طرح نہیں۔ آج شام کو دفتر سے میرے پاس ضرور آنا۔ ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔''

کچھ دیر بعد لالہ وزیر محمد صدیقی بنفس نفیس آ گئے۔ سیڑھیاں چڑھ کر آئے تھے اس لئے سانس بے ترتیب تھا۔ ان کے ہمراہ کوئی ایک مصاحب قسم کا آدمی ضرور ہوتا تھا۔ اس وقت بھی ''امروز'' کے شعبہ سرکولیشن کے ایک صاحب ان کے ہمراہ تھے۔ ناراضگی اپنی جگہ مگر لالہ کا احترام اپنی جگہ تھا۔ آخر انہوں نے ہمیں بیٹا کہا تھا۔ ہم نے کھڑے ہو کر ان کی پذیرائی کی وہ تھوڑی دیر تک کرسی پر بیٹھ کر اپنا سانس ٹھیک کرتے رہے۔ پھر مصاحب کی طرف دیکھا جس نے ایک پان ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پان کھا کر ان کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے تو انہوں نے اپنی بھاری آواز میں کہا

''بیٹا۔ کیا ناراض ہو گئے ہو؟''

ہم نے کہا''لالہ۔ ویسے ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔''

بولے ''واقعی تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے تمہارے مزاج کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔''

یہ کہہ کر انہوں نے اپنی کمر میں بندھا ہوا پستول ہولسٹر میں سے نکالا اور ہماری طرف بڑھا کر بولے ''لو۔ تم اپنی شکایت دور کر لو۔''

ہم نے پریشان ہو کر پستول کی طرف دیکھا۔

بولے ''پٹھانوں میں یہی دستور ہے۔ اگر تمہاری بے عزتی ہوئی ہے تو اس کا بدلہ لے سکتے ہو۔''

وہ بالکل سیریس تھے، ہم نے کہا، مگر لالہ ہم نے تو کبھی پستول ہاتھ میں لے کر بھی نہیں دیکھا۔ گولی کیسے چلائیں گے؟''

وہ ہنسنے لگے۔ ان کی گونج دار ہنسی کی آواز سن کر برابر والے سرکولیشن کے شعبے سے لوگ چلے آئے۔ ''ارے لالہ۔ آپ! ہمیں بتایا بھی نہیں۔''

''یارا تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ ابھی میرا اور آفاقی کا معاملہ ہے۔ یہ طے ہو گیا تو پھر تمہارے پاس آؤں گا۔''

مختصر یہ کہ ہمارا دل صاف ہو گیا بلکہ دل میں شرمندہ بھی ہوئے کہ اس طرح غصے کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

لالہ بولے ''تمہاری رگوں میں شریف خون ہے۔ ایسے ماحول میں تمہیں بلانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ''

بعد میں جب ہم فلمی صنعت سے وابستہ ہو گئے تو لالہ کو خوشی بھی ہوئی مگر حیرت بھی تھی۔ کہا کرتے تھے کہ تم لڑکیوں کے ساتھ کیسے کام کرتے ہو گے؟ ہم نے کہا''کسی دن خود آ کر دیکھ لیجئے۔''

لالہ فلموں کے اتنے زیادہ شوقین نہیں تھے مگر موسیقی کے رسیا تھے اور ثریا کے مداح تھے۔ کہا کرتے تھے'' یارا، اس کی آواز میں جو خاص بات ہے وہ کسی بھی گانے والی کی آواز میں نہیں ہے۔''

انہوں نے ثریا کے بہت سے ریکارڈ اکٹھے کر رکھے تھے۔

ہم نے لالہ کے لئے چائے منگائی۔ کہنے لگے ''دیکھو بیٹا۔ جو ہونا تھا' وہ تو ہو گیا مگر اب تمہیں میرے پاس پشاور آنا پڑے گا۔''

ہم نے کہا ”لالہ اتنے سے قصور کی اتنی بڑی سزا؟“

ہنسنے لگے ' کہا ”نہیں۔بس مجھ سے وعدہ کرو اور دیکھو ' چھ سات دن کی چھٹی لے کر آنا۔“

”اتنے دن تک پشاور میں کیا کروں گا؟“

”تمہیں مری اور نتھیا گلی بھیجیں گے۔“

ہم پشاور گئے،لالہ نے قصہ خوانی بازار میں ایک مکان خاص طور پر ہمارے لئے کرائے پر حاصل کیا تھا۔ہم کو ایسے تنگ اور گنجان علاقوں میں رہنے کی عادت نہیں تھی۔رات کو لالہ خود ہمیں گھر تک چھوڑنے آئے اور اپنے ایک بیٹے کو ہماری رفاقت کے لئے گھر میں چھوڑ گئے۔

صبح ناشتا ان کی دکان پر جا کر کرنا تھا۔ہم نے سنا تھا کہ پشاور میں بچھو بہت ہوتے ہیں۔لوگوں نے ہمیں بتایا کہ اگر جوتا بھی پہنو تو پہلے اسے جھاڑ کر دیکھ لو کہ اس کے اندر بچھو تو نہیں ہے۔کپڑوں میں ' دیواروں پر ' فرش پر ' الماریوں میں ہر جگہ بچھو چھپے ہوتے ہیں۔ہم سہمے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ہمارے خوف کو دیکھ کر لالہ کے بیٹے نے ہر طرف خوب غور سے دیکھ کر تلاشی لی پھر ہمیں اطمینان دلانے کے لئے بولے ”ویسے ہر طرف تو دیکھ لیا ہے مگر کبھی کبھی چھت پر سے بھی بچھو ٹپک پڑتے ہیں۔“

ہمارا ڈر کے مارے برا حال ہو گیا۔نہ جانے کس طرح وہ رات ہم نے گزاری۔ صبح تنگ سے غسل خانے میں جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا مگر لالہ کے بیٹے نے پہلے جا کر غور سے دیکھا بھالا اور پھر لائن کلیئر دے دی۔ان دنوں ہماری بہن بھی پشاور ہی میں مقیم تھیں۔ بہنوئی ایئر فورس میں تھے اور جب ہم ان کی کوٹھی پر گئے تو اس صاف ستھرے ماحول کو دیکھ کر جی چاہا کہ رات وہیں رہا کریں مگر لالہ رضامند نہیں ہوئے۔

”دیکھو بیٹا۔یہ پٹھانوں کی بے عزتی ہے کہ ان کا مہمان کسی اور کے گھر رہے ' اپنی بہن کے گھر رہنا ہے تو تم دوبارہ پشاور آ جانا۔“

لالہ نے دو دن ہمیں پشاور میں مہمان رکھا اور ہمارا رات کے وقت خون خشک ہوتا رہا۔تیسرے دن انہوں نے اپنے

بیٹے کی جیب میں نوٹوں کی ایک گڈی ڈالی اور ہمیں اس کے ہمراہ مری اور نتھیا گلی کی سیر کے لئے روانہ کر دیا۔ بیٹے کو انہوں نے تاکید کی تھی کہ اگر آفاقی نے ایک پیسہ بھی خرچ کیا تو تمہاری خیریت نہیں ہے۔ اس طرح پہلی بار مری اور نتھیا گلی کی سیر ہم نے لالہ وزیر محمد کا مہمان بن کر ان کے خرچے پر کی تھی۔ یہ دراصل ان کی طرف سے اس بات کی تلافی تھی جس کی وجہ سے ہم ناراض ہو گئے تھے' ایسے وضع دار لوگ اب کہاں؟

ان کا بیٹا راولپنڈی کے ریلوے اسٹیشن تک ہمیں چھوڑنے آیا۔ ٹرین رات کو تین بجے جانے والی تھی۔ اتنی دیر تک وقت گزارنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ اسی ہفتے راولپنڈی میں محبوب صاحب کی فلم ''آن'' ریلیز ہوئی تھی جس کا بہت شہرہ تھا۔ سوچا فلم دیکھ کر وقت گزارا جائے مگر سنیما پہنچے تو ایک قیامت کا سامان تھا۔ آدمی پر آدمی چڑھا ہوا تھا۔ پچاس پچاس روپے میں ٹکٹ بلیک ہو رہے تھے۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم تھی مگر لالہ کے بیٹے نے فوراً سو روپے نکال کر بلیکئے کے حوالے کر دیئے۔

''ارے ارے یہ کیا کرتے ہو۔ اتنا مہنگا ٹکٹ لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم لاہور جا کر یہ فلم دیکھ لیں گے۔''

اس نے کہا ''آفاقی بھائی۔ اگر لالہ کو پتا چل گیا کہ تم فلم دیکھنے گئے تھے مگر ٹکٹ نہ ملا اور واپس لوٹ گئے تو وہ مجھے گولی مار دے گا۔''

چنانچہ اس غریب کو گولی سے بچانے کے لئے ہم نے فلم ''آن'' پچاس روپے کے ٹکٹ پر دیکھی۔

شباب صاحب کے دفتر میں ایکٹریسوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ ڈائریکٹر کے دفتر میں بھی لڑکیاں آتی رہتیں تھیں۔ جب وہ فلم ساز بنے تو اس تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ ان میں زیادہ ابھرتی ہوئی ایکٹریس یا اداکارہ بننے کی امیدوار لڑکیاں ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ شباب صاحب اپنی فلم میں اکثر نئی لڑکیاں متعارف کراتے رہتے تھے جو خود بخود ان کے دفتر میں پہنچ جاتی تھیں۔

ڈائریکٹر کے دفتر میں ہی انہوں نے اپنی پہلی فلم '' جلن'' بنائی۔ دراصل چودھری فضل حق نے کسی کے اشتراک سے یہ فلم بنائی تھی۔ فلم سازی کا تمام کام شباب صاحب نے کیا تھا اور اے۔ حمید اس کے ہدایت کار تھے۔ اے حمید پرانے کیمرامین تھے اور شباب صاحب کے یار غار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ صحافت اور فلم میں شباب صاحب کو متعارف

کرانے کا سہرا اے حمید ہی کے سر جاتا ہے۔ وہ شباب صاحب کے اس وقت سے قائل تھے جب انہیں کوئی شاعر نہیں مانتا تھا۔ انہوں نے ہی اخبار کے مالکوں اور فلم سازوں سے شباب صاحب کا تعارف کرایا اور بعد میں جب وہ فلم ساز بنے تو اپنے اثر ورسوخ کی بنا پر ان کے بہت سے کام آئے۔ اے حمید ایک عجیب شخصیت تھے۔ ان کے بارے میں آپ آئندہ پڑھیں گے۔

''جلن'' کے ہیرو عنایت حسین بھٹی تھے۔ مزاحیہ اداکار دلجیت مرزا بھی پہلی بار اسی فلم میں پیش کئے گئے تھے۔ یہ فلم کامیاب نہ ہو سکی۔ چودھری فضل حق صاحب نے دوسری فلم بنانے کے لیے ایک زمیندار بابو مجدد صاحب سے معاہدہ کیا۔ یہ فلم '' ٹھنڈی سڑک '' تھی جس کی کہانی ہماری لکھی ہوئی پہلی فلمی کہانی تھی لیکن فلم کے آغاز سے پہلے چودھری صاحب اور ان کے پارٹنر میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بابو مجدد نے شباب صاحب سے شکایت کی۔ شباب صاحب نے چودھری صاحب سے اس سلسلے میں بات کی تو وہ ناراض ہو گئے۔

''حافظ جی۔ آپ میرے مقابلے میں ایک نئے آدمی کی حمایت کر رہے ہیں؟''

شباب صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کا موقف درست ہے اور آپ کو ان کے ساتھ ناانصافی نہیں کرنی چاہیے۔ بس اسی بات پر چودھری صاحب بھڑک اٹھے۔ اور کہا '' فیصلہ کر لیجئے آپ ان کے ساتھ ہیں یا میرے؟''

''میرے خیال میں وہ حق بجانب ہیں'' شباب صاحب نے کہا۔

''تو پھر آج کے بعد آپ سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ آپ '' ڈائریکٹر'' چھوڑ دیجئے۔''

شباب صاحب نے اپنے کاغذات سنبھالے اور تانگے میں بیٹھ کر گھر چلے گئے۔ مگر یہ بہت کڑوی گولی تھی۔ ڈائریکٹر سے انہیں معقول تنخواہ ملتی تھی۔ اثر ورسوخ بھی بہت تھا لیکن انہوں نے اصول کی خاطر سب کچھ تیاگ دیا۔ اب حالت یہ تھی کہ کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ اگلا مہینہ کیوں کر گزرے گا' اس کا بھی علم نہیں تھا۔

بابو مجدد بہت سادہ' پر خلوص اور دوست نواز آدمی تھے۔ بالکل دیہاتی تھے مگر دل کے بہت اچھے تھے۔ وہ دراصل اے حمید کے توسط سے چوہدری فضل حق سے ملے تھے اور ان ہی کے زیادہ شناسا تھے۔ جب انہیں پتا چلا کہ ان کی خاطر شباب صاحب نے چوہدری فضل حق کو چھوڑ دیا ہے تو وہ شباب صاحب کے پاس پہنچ گئے اور ان سے کہا کہ آپ

فلم بھی بنائیں اور فلمی پرچہ بھی نکالیے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

انہوں نے سمن آباد میں دفتر کے لئے ایک کوٹھی کرائے پر لے دی اور فلم کا کام شروع ہو گیا۔ شباب صاحب نے ''پکچر'' کے نام سے ایک فلمی ماہنامہ بھی نکالنا شروع کر دیا۔ بابو محمد دنے شباب صاحب کے لئے رہنے کا بندوبست بھی کر دیا اور اپنی زمینوں سے کھانے پینے کا سامان بھی فراہم کر دیا۔ اس طرح فلم ''ٹھنڈی سڑک'' کا آغاز ہوا۔

ابتدائی دور کی ایک شخصیت انور کمال پاشا بھی تھے۔ وہ بہت بڑے مصنف اور ڈرامانویس حکیم احمد شجاع پاشا کے اکلوتے بیٹے تھے۔ یعنی واحد اولاد نرینہ تھے۔ اس لئے باپ کے بے حد لاڈلے اور منہ چڑھے تھے۔ حکیم احمد شجاع اپنے عہد کی بہت اہم شخصیت تھے۔ ڈرامے اور فلم سے ان کا تعلق پرانا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی سہراب مودی جیسے ہدایت کار ان سے کہانی لکھواتے رہے۔

انور کمال پاشا ایک خوب رو گورے چٹے اور بے حد ذہین آدمی تھے۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد انہوں نے ایکسائز کے محکمے میں ملازمت کر لی مگر فلم کے شوق نے اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیا۔ شفیق باپ نے بھی ان کا شوق دیکھتے ہوئے فلم سازی شروع کر دی۔ ''شاہدہ'' کے فلم ساز جس کے ہدایت کار لقمان صاحب تھے' حکیم احمد شجاع ہی تھے۔ انور کمال پاشا فلم کے سیٹ پر آتے رہتے تھے اور ہدایت کاری کے رموز سیکھنے کی کوشش میں تھے۔ تحریر کا ملکہ انہیں وراثت میں ملا تھا۔ '' شاہدہ'' تو کامیاب نہ ہوئی مگر انور کمال پاشا نے فیصلہ کر لیا کہ فلم سازی اور ہدایت کاری کئے بغیر چین سے نہ بیٹھیں گے چنانچہ اچھی بھلی نوکری چھوڑ چھاڑ کر فلموں کی دنیا میں چلے آئے۔ ان کی ذہانت 'فراست اور صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ایک تقسیم کار شیخ لطیف نے انہیں ہدایت کاری کے فرائض سونپ دیے۔ ان کی پہلی فلم ''دو آنسو'' تھی جس میں صبیحہ اور سنتوش نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔

دو آنسو پاکستان کی پہلی اردو فلم تھی جس نے سولو سنیما میں سلور جوبلی منائی۔ اس کی کامیابی سے انور کمال پاشا کے حوصلے بہت بلند ہو گئے۔ ان کی دوسری فلم ''گبھرو'' تھی۔ اس میں بھی سنتوش کمار کے ساتھ شمیم ہیروئن کے کردار میں تھیں۔ یہ فلم 1950ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس طرح پاکستان کے اولین فلم سازوں اور ہدایت کاروں میں انور کمال پاشا کا نام بھی شامل ہے۔ بعد میں انہوں نے فلم سازی اور ہدایت کاری میں بہت نام پیدا کیا۔ یہاں تک کہ

ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ پاکستان کے ممتاز ترین اور کامیاب ترین فلم ساز و ہدایت کار بن گئے۔ ان کے مکالموں نے فلم بینوں پر سحر طاری کر دیا تھا۔ وہ پاکستان کے واحد مصنف، فلم ساز اور ہدایت کار تھے جن کے نام پر لوگ سنیما گھروں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ان کا نام معیار اور کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ فلمی دنیا میں ان کا ڈنکا بج رہا تھا۔ دولت، شہرت اور کامیابی ان کے گھر کی کنیزیں تھیں۔

انور کمال پاشا بے حد ذہین، بے حد باتونی انسان تھے۔ بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے مگر ان کی سب سے بڑی کمزوری تعلّی اور خوشامد پسندی تھی۔ باتوں باتوں میں دوسروں کی تضحیک کرنا ان کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ بلا کے حاضر جواب تھے لیکن اکثر ان کے جملے دوسروں کے دلوں میں گھاؤ ڈال دیا کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ اپنے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور خود کو ہر اعتبار سے دوسروں سے برتر سمجھتے تھے۔ جب کامیابیاں قدم چومتی تھیں اس زمانے میں بھی ان کی باتیں لوگوں کی دل آزاری کا سبب بنتی تھیں۔ مگر جب کامیابی نے منہ موڑا اور تقدیر نے ساتھ چھوڑا تو ان کی کہی ہوئی باتیں لوگوں کو یاد آ گئیں۔ خود ان کے عملے کے لوگ جن پر انور کمال پاشا نے بہت احسانات کئے تھے، ان کی زبان کی تلوار سے گھائل تھے۔ ایک بار جب زوال شروع ہوا تو پھر انہوں نے کمال کا منہ نہ دیکھا۔ زینہ بہ زینہ پستیوں ہی میں اترتے چلے گئے۔ یہ داستان بہت طویل ہے۔ لیکن فی الحال ان کے ابتدائی زمانے کے حوالے سے ان کا ذکر ہو رہا ہے۔ پاشا صاحب کو خدا نے اتنی جلدی اور اتنی مسلسل کامیابیاں عطا کر دیں کہ وہ انہیں سنبھال نہ سکے۔ ''گبھرو'' کے بعد انہوں نے ''دلبر'' بنائی۔ اس فلم میں وہ خود شمیم کے بالمقابل ہیرو تھے۔ وہ خوب صورت اور دلکش شخصیت کے مالک تھے، قد و قامت اور سراپا بھی خوب تھا۔ انہیں یہ خوش فہمی ہو گئی تھی کہ وہ اس زمانے کے ہر ہیرو سے بہتر ہیرو بن سکتے ہیں۔ لیکن اداکاری کے امتحان میں فیل ہو گئے اور ''دلبر'' کے بعد پھر دوبارہ اداکاری نہیں کی لیکن اداکاروں کے سامنے کہتے رہتے تھے کہ اگر میں چاہوں تو تم سب سے اچھی اداکاری کر سکتا ہوں۔

انور کمال پاشا کو اصل شہرت فلم ’’ غلام ‘‘ سے ملی۔ یہ بہت اچھے موضوع پر بنائی گئی تھی اور اس کی کہانی اور مکالمے بھی بہت اچھے تھے۔ یہ فلم 1953ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ’’دلبر ‘‘ کے تجربے کی ناکامی کے بعد پاشا صاحب نے دوبارہ سنتوش کمار کو اپنی فلم میں ہیرو کے کردار میں لے لیا تھا۔ شمیم اداکاری ترک کر چکی تھیں اس لیے صبیحہ کو ہیروئن کاسٹ کیا گیا تھا۔ اس فلم میں راگنی اور شمی نے بھی کام کیا تھا۔ گویا اس میں بیک وقت تین ہیروئن تھیں۔ ایم اسماعیل نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ اپنے موضوع کے اچھوتے پن اور پر زور مکالموں کی خوبصورتی کے باعث ’ ’ غلام ‘‘ نے فلم بینوں اور نقادوں کو چونکا دیا اور پہلی بار انور کمال پاشا کا صحیح معنوں میں نوٹس لیا گیا۔ اس کامیابی نے پاشا صاحب کے حوصلے بھی بلند کر دیے اور ان کی خود پسندی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ لیکن چلتی کا نام گاڑی ہے۔ اب وہ ایک کامیاب مصنف اور اور ہدایتکار تھے اس لیے سبھی ٗ دنیا کے دستور کے مطابق ان کے آگے پیچھے پھرنے لگے تھے۔ اگلے سال ان کی فلم ’’ گمنام ‘‘ ریلیز ہوئی جس نے دھومیں مچادیں اور انور کمال پاشا کو پاکستان کی فلمی صنعت کی ایک اہم اور قابل ذکر شخصیت کے طور پر مستحکم کر دیا۔ گمنام میں صبیحہ کی اداکاری غضب کی تھی۔ کہانی اور مکالمے ایسے کہ دیکھنے والوں کو بھی یاد ہو گئے تھے۔ ماسٹر عنایت حسین کی موسیقی نے اسے ایک انوکھا حسن عطا کر دیا تھا۔ اس فلم میں سدھیر ہیرو تھے۔ راگنی اور ایم اسماعیل صاحب نے بھی بہت اہم کردار ادا کئے تھے۔ ’’ گمنام ‘‘ نے بڑی بڑی بھارتی فلموں کے مقابلے میں خود کو منوایا اور اس طرح انور کمال پاشا کے دور عروج کا آغاز ہوا۔ انور کمال پاشا ایک لیجنڈ بن گئے۔ ہدایت کاری میں بھی پہلی مرتبہ انہوں نے صحیح معنوں میں اپنا لوہا منوایا تھا۔ اس لحاظ سے گمنام ان کے کیریئر کی یادگار فلم ہے۔ اس فلم نے جہاں پاشا صاحب کو اعتماد اور کامیابی بخشی وہیں ان کی خود پسندی کو بھی بام عروج پر پہنچا دیا۔ باتیں وہ پہلے بھی بہت بڑھ بڑھ کر کیا کرتے تھے مگر اب کھلے عام بڑے بڑوں کا مضحکہ اڑانے لگے۔

سعادت حسن منٹو نے ان ہی دنوں ان کے بارے میں ’’ ڈائریکٹر ‘‘ میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان ’’ لاؤڈ اسپیکر ‘‘ تھا۔ منٹو صاحب بلا کے منہ پھٹ اور صاف گو تھے۔ مگر اس طرح دوسروں کی دل آزاری نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اپنے مقابلے میں دوسروں کو کم تر بتاتے تھے۔ اس مضمون میں انہوں نے فلمی اصلاح کے مطابق انور کمال

پاشا صاحب کا'' پھلکا'' اڑا کر رکھ دیا تھا۔اس کا آغاز ہی انہوں نے یوں کیا تھا کہ دنیا کا دستور ہے کہ لوگ'' پدرم سلطان بود'' کے قائل ہیں اور فخریہ طور پر کہتے ہیں کہ میرا باپ بہت بڑا آدمی تھا۔ مگر انور کمال پاشا کا معاملہ برعکس ہے۔وہ کہتے ہیں کہ میرا باپ تو گھسیارا تھا۔جو کچھ ہوں وہ میں ہوں۔

منٹو صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں یہ خاکہ تحریر کیا تھا اور انور کمال پاشا کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا تھا۔جو لوگ پاشا صاحب کی زبان کے گھائل تھے یا ان کی کامیابیوں کی وجہ سے حسد کرتے تھے انہیں یہ مضمون بہت پسند آیا۔پاشا صاحب نے بھی یہ مضمون پڑھا، ظاہر ہے کہ سرتاپا آگ بگولا ہو گئے مگر سامنے سعادت حسن منٹو جیسا بے باک' نڈر اور منہ پھٹ آدمی تھا جس کے قلم کا کاٹا پانی تک نہیں مانگتا تھا۔اس لیے اس توہین کو ہضم کر گئے مگر اس بات کو دل میں رکھ لیا۔

اسی زمانے میں سعادت حسن منٹو کو سید شوکت حسین رضوی نے شاہ نور اسٹوڈیو میں اسٹوری ڈیپارٹمنٹ میں رکھ لیا۔ ان کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا۔ صبح شوکت صاحب کی گاڑی منٹو صاحب کو ان کے فلیٹ سے لے کر اسٹوڈیو جاتی تھی اور شام کے وقت انہیں گھر چھوڑ آتی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پاشا صاحب'' گمنام'' کی کامیابی کے نشے میں چور تھے۔اس زمانے میں پاکستان میں فلم ساز ہی گنتی کے تھے اور کامیاب اور تسلسل کے ساتھ فلمیں بنانے والوں کا تو وجود ہی نہیں تھا۔انور کمال پاشا شاہ نور اسٹوڈیو میں فلمیں بنا رہے تھے جہاں ان کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ان کے پاس بہت بڑی امریکن کار تھی۔جب ان کی کار اسٹوڈیو میں داخل ہوتی تھی تو سارے اسٹوڈیو کو خبر ہو جاتی تھی اور سب لوگ اٹینشن ہو جاتے تھے۔اب اسی اسٹوڈیو میں سعادت حسن منٹو نے بھی ٹھکانا بنا لیا تھا۔ گویا ایک جنگل میں دو شیر دندنا رہے تھے۔

پاشا صاحب نے پہلے تو منٹو صاحب کی موجودگی کا نوٹس ہی نہیں لیا حالانکہ دل میں کھٹک تھی۔ادھر منٹو صاحب نے کبھی کسی کی پرواہی نہیں کی تھی' وہ پاشا صاحب کے کروفر سے بے نیاز اپنے معمولات میں مصروف رہا کرتے تھے۔ لیکن پاشا صاحب اپنے دل کی چبھن مٹانے کے بہانے ڈھونڈ رہے تھے۔وہ اپنی آئندہ فلم'' انتقام'' کی تیاریوں میں مصروف تھے جو ریلیز ہونے کے بعد ایک اور زبردست ہٹ فلم ثابت ہوئی۔

ایک روز منٹو صاحب اپنے کمرے کے سامنے دھوپ میں ٹہل رہے تھے کہ پاشا صاحب حسب معمول اپنے دو تین مصاحبوں کے ساتھ نمودار ہوئے۔ منٹو صاحب کو دیکھا تو ان کے پاس گئے۔علیک سلیک ہوئی۔اس کے بعد پاشا صاحب نے کہا'' منٹو صاحب۔میری کہانی میں ایک سچویشن پھنس گئی ہے۔اس سلسلے میں آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔''

منٹو صاحب نے جواب دیا'' میں کسی کو مفت مشورہ نہیں دیتا۔''

پاشا صاحب کا سرخ وسفید چہرہ اور زیادہ گلنار ہو گیا۔ غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کیا۔اپنے پیچھے کھڑے ہوئے پروڈکشن کنٹرولر کو اشارہ کیا جنہوں نے فوراً بریف کیس میں سے چیک بک نکال کر پاشا صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ پاشا صاحب نے کھڑے کھڑے پانچ سو روپے کا ایک چیک کاٹا اور منٹو صاحب کے حوالے کر دیا اور بولے'' اب تو آپ مشورہ دیں گے نا؟''

''ہاں۔اب بتایئے کیا مشکل ہے؟''

پاشا صاحب نے انہیں کوئی سچویشن بتائی۔ منٹو صاحب نے کہا'' یہ تو کوئی ایسی پرابلم نہیں ہے'' اور وہیں کھڑے کھڑے تین چار حل بتا دیے۔

پاشا صاحب نے شکریہ ادا کیا اور رخصت ہو گئے مگر فلم میں منٹو صاحب کے مشورے کو کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔یہ تو بس بات کرنے کا ایک بہانہ تھا جسے منٹو صاحب کی حقیقت نے پروان نہ چڑھنے دیا۔

''انتقام'' ریلیز ہوئی اور گمنام سے بھی زیادہ کامیاب ہوئی۔اس کے نغموں کی بمبئی تک دھوم مچ گئی۔اب پاشا صاحب پاکستان کی فلمی دنیا کا سب سے بڑا نام بن چکے تھے۔پاشا صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ہمیں بھی ان سے واسطہ پڑا اور انہیں نزدیک سے دیکھنے کا بھی موقع ملا۔یہ بیان پھر کبھی۔لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انور کمال پاشا نے پاکستان کی فلمی صنعت کی تعمیر میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔انہوں نے جو مقام' مرتبہ اور اہمیت حاصل کر لی تھی وہ ان کے بعد کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی۔ مستقبل میں تو کسی دوسرے انور کمال پاشا کے جنم لینے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔فلم بین ان کے مکالموں کے شیدائی تھے اور فلم کے دوران ہی سینما میں بلند آواز سے ان کے لکھے ہوئے

فقروں پر داد دیا کرتے تھے۔ پاشا صاحب ایک زمانے میں اس قدر خود اعتمادی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے کہ کہانی تحریر کرتے وقت ہی بتادیا کرتے تھے کہ کن مکالموں پر تماشائی تالیاں بجائیں گے اور لوگ بلاشبہ ان ہی مناظر اور مکالموں پر بے تحاشہ داد دیا کرتے تھے۔

پاشا صاحب کے مکالموں میں گھن گرج اور ڈرامائی عنصر زیادہ تھا۔ کسی حد تک اس پر تھیٹر کا رنگ بھی چھایا ہوا تھا۔ وہ شوکت الفاظ کے قائل تھے۔ ایسے فقرے تحریر کرتے تھے کہ عام فلم بین کے دل پر اثر کرتے تھے۔ ان کی فلم "سر فروش" میں انہوں نے ایک مکالمہ لکھا تھا جو سارے ملک میں مشہور ہو گیا۔ ترقی پسند لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا لیکن عوام نے اس کی بے اندازہ داد دی۔ منظر یہ تھا کہ فلم کے ہیرو سنتوس کمار رات کے وقت چوری کے ارادے سے ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ تمام سامان پوٹلی میں باندھ لیتے ہیں کہ اچانک اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔ وہ چوری کا مال ایک طرف رکھ کر وہیں نیت باندھ لیتے ہیں اور نماز پڑھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس اثنا میں ہیروئن کی بھی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ چوری کا سامان بھی دیکھ لیتی ہے اور چور کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر بہت حیران ہوتی ہے۔ جب سنتوش کمار سلام پھیرتے ہیں تو وہ حیران ہو کر ان سے کہتی ہے "تم کیسے چور ہو۔ ایک طرف چوری کرتے ہو اور دوسری طرف نماز بھی پڑھتے ہو۔"
اس کے جواب میں سنتوش کہتے ہیں "چوری میرا پیشہ ہے اور نماز میرا فرض۔"
اس فقرے کی عام تماشائیوں نے تو بہت داد دی لیکن ترقی پسند لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ لیکن کسی نہ کسی حوالے سے سارے ملک میں اس کا چرچا ہو گیا۔ اس بات کو طویل عرصہ گزر چکا ہے۔

انور کمال پاشا اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور نہ ہی سنتوش کمار اور فلم کی دوسری ہیروئن مینا شوری بقید حیات ہیں لیکن آج کے دور میں اگر اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں تو آپ کو اس فقرے کے پیچھے پوشیدہ فلسفہ نظر آ جاتا ہے۔ ہمارے آس پاس ہر طرف مسجدیں آباد ہیں۔ رمضان المبارک میں روزے داروں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ حج کے زمانے میں بہت بڑی تعداد میں لوگ فریضہ حج ادا کرنے جاتے ہیں۔ عمرہ کرنے والوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے۔

جمعہ کے روز مسجدیں نمازیوں سے لبالب بھر جاتی ہیں۔ تبلیغی جماعتوں کے اجتماعات میں لاکھوں افراد شریک ہوتے ہیں۔اس کے باوجود ہر طرف ملاوٹ' دھاندلی' رشوت' چوری' ڈاکازنی اور بددیانتی کا دور دورہ ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر اتنے بہت سے نیک لوگوں کے ہوتے ہوئے معاشرے میں اتنی خرابیاں کیوں ہیں؟اس کا جواب وہی ہے کہ آج ہم لوگ مذہبی فرائض کو مذہب تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ مذہب نے انسانوں کو بہتر انسان بننے کے سلسلے میں جو ہدایات دی ہیں ان پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ آج کے ماحول کو دیکھ کر انور کمال پاشا کے اس فقرے کی صداقت واضح ہو جاتی ہے کہ '' چوری میرا پیشہ ہے اور نماز میرا فرض'' یعنی بقول شاعر رند کے رند رہے' ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

انور کمال پاشا فلم بینوں اور عوام کے مزاج شناس تھے اسی لیے وہ ان کو خراج تحسین پیش کرتے تھے۔
صرف انور کمال پاشا کو پاکستان کے فلم سازوں اور ہدایت کاروں میں یہ خصوصیت حاصل تھی کہ ان کی فلم کے بارے میں لوگ یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے تھے کہ اس میں اداکار کون ہے؟موسیقار کون ہے۔ وہ تو بس انور کمال پاشا کا نام دیکھ کر سینماؤں پر ٹوٹ پڑتے تھے اور سینما گھروں کے سامنے والی سڑکوں پر ٹریفک جام ہو جاتا تھا۔ یہ مقام ہندوستان اور پاکستان کے اور کس فلم ساز کو حاصل ہوا؟انور کمال پاشا کو بھی اپنے اس '' کرشمے'' کا احساس ہو گیا تھا۔ایک تو وہ تھے ہی خود پسند۔ جب کامیابیاں نصیب ہونے لگیں تو اور زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کرنے لگے۔
بڑے اداکاروں کو معاوضہ بھی زیادہ دینا پڑتا تھا جب کہ انور کمال پاشا کو یہ زعم تھا کہ فلم ان کے نام پر چلتی ہے۔انہوں نے ایک بار زیادہ معاوضہ طلب کرنے کے باعث سنتوش کمار اور صبیحہ خانم کو اپنی فلم میں کاسٹ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور ان کے بجائے نئے اور نو آموز اداکاروں کو آزمایا۔انہوں نے اپنی پنجابی فلم '' چن ماہی '' میں ایک بالکل نئی ہیروئن کو متعارف کرا دیا۔ یہ اداکارہ بہار تھیں جو بعد میں ایک مشہور اور کامیاب ہیروئن بن گئی تھیں۔اس فلم کے ہیرو اسلم پرویز تھے۔اس وقت تک اسلم پرویز کو ہیرو کے طور پر کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔
نامور اداکاروں کو نظر انداز کر کے بالکل نئی کاسٹ سے فلم بنانا ہر زمانے میں بڑے دل گردہ کی بات سمجھی گئی ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ پاشا صاحب کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی کا،خوش فہمی کا شکار ہو گئے ہیں اور کوئی ان کی فلم دیکھنے ہی

نہیں جائے گا۔ مگر جب " چن ماہی" ریلیز ہوئی تو تماشائی سینماؤں پر ٹوٹ پڑے۔اور یہ فلم ہٹ ثابت ہوئی۔اس فلم سے انور کمال پاشا نے اپنی ذات کو منوالیا اور پھر جب تک ان کا زوال شروع نہیں ہوا۔ان کا نام ہی سند کے طور پر معتبر سمجھا جاتا رہا۔

پاشا صاحب صحیح معنوں میں ایک "شومین" تھے اور اس زمانے میں پاکستان کے سب سے بڑے "شومین" تھے۔ کسی نہ کسی حوالے سے وہ ہر وقت خبروں میں رہتے تھے۔حاسد اور ان کی کامیابی سے جلنے والے بھی کم نہیں تھے اور پھر پاشا صاحب اپنی باتوں کی وجہ سے بھی فلمی حلقوں میں زیر بحث رہا کرتے تھے۔وہ پھبتی کسنے اور فقرہ چست کرنے میں ماہر تھے۔لیکن ان کی گفتگو میں غرور اور خود پسندی کا عنصر زیادہ ہو گیا تھا جو لوگوں کو پسند نہیں تھا۔لاڈلے تو وہ بچپن ہی سے تھے مگر فلموں میں کامیابیاں اور شہرت حاصل کرنے کے بعد آس پاس کے لوگوں اور ضرورت مندوں نے انہیں خوشامند پسند بھی بنا دیا تھا۔ان کو بھی ایسے ہی لوگ زیادہ پسند آتے تھے جو چاپلوسی اور خوشامند میں دوسروں سے بڑھ کر ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے یونٹ کے بہت سے لوگ محض انہیں خوش کرنے کے لیے ان کی ہر بات میں ہاں میں ہاں ملاتے رہتے تھے اور انہیں یقین دلاتے رہتے تھے کہ ان سے بڑھ کر تو کیا ان کے مقابلے کا بھی کوئی دوسرا نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔پاکستان کی فلمی صنعت کی شاید ہی کوئی قابل ذکر ہستی ایسی ہو جس کا انہوں نے مذاق نہ اڑایا ہو اور اس کے بارے میں ریمارکس نہ پاس کئے ہوں۔جب وہ بولنے پر آتے تھے تو مسلسل بولتے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے رفتہ رفتہ ان پر ایک خمار سا طاری ہو گیا تھا۔پھر وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ سامنے کون بیٹھا ہے اور نہ یہ سوچتے تھے کہ ان کی باتیں کسی پر کیا اثر کریں گی؟

جب بمبئی سے ضیا سرحدی پاکستان آئے تو ان کا بہت شہرہ تھا۔اپنی فلم " ہم لوگ" کی وجہ سے وہ سارے برصغیر میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔اس فلم سے پہلے بھی مصنف کے طور پر انہیں ایک بلند مقام حاصل تھا۔بمبئی سے پاکستان آنے سے پہلے وہاں ان کی آخری فلم " فٹ پاتھ" تھی جس میں دلیپ کمار ہیرو تھے لیکن یہ فلم ناکام ہو گئی تھی۔

ایک دن پاشا صاحب کے سامنے ضیا سرحدی کا تذکرہ ہوا اور ایک صاحب نے ان کی بہت تعریف کی۔پاشا پہلے تو سنتے رہے پھر بولے " واقعی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ضیا سرحدی بہت بڑے رائٹر اور ڈائریکٹر ہیں۔جو شخص دلیپ کمار جیسے

شخص کو ہوٹ کرادے اس سے بڑا اور کون ہو سکتا ہے؟""

ان کے فقروں اور زہر بھرے تبصروں سے فلمی صنعت کا کوئی بھی شخص محفوظ نہیں تھا۔ ایک بار ایک ہی کہانی پر پاشا صاحب اور منشی صاحب دونوں مقابلے میں فلم بنا رہے تھے۔ پاشا صاحب نے کہا" منشی صاحب میرے مقابلے میں کیا فلم بنائیں گے وہ تو خود تقسیم کاروں اور فلم سازوں کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں جب کہ میں نے اپنی خوشامد کرانے کے لیے تنخواہ دار لوگ رکھے ہوئے ہیں۔"

ایک بار پرانے ایورنیو اسٹوڈیو میں ہمارا جانا ہوا۔ نہر کے کنارے پہلے پنچولی اسٹوڈیو تھا۔ بعد میں اسے آغا جی اے گل نے کرائے پر حاصل کر کے اس کا نام ایورنیو اسٹوڈیو رکھ دیا تھا۔ جب انہوں نے ملتان روڈ پر اپنا نیا اور شاندار اسٹوڈیو بنایا تو اسے بھی ایورنیو اسٹوڈیو کا نام دیا جو کہ ان کے ادارے کا پرانا نام تھا۔ اس طرح پہلے والا اسٹوڈیو "پرانا ایورنیو" کہلانے لگا۔ اس زمانے میں پاشا صاحب اسی اسٹوڈیو میں اپنی فلمیں بنا رہے تھے۔ ہم چند دوستوں کے ساتھ وہاں پہنچے تو دروازے پر سبطین فضلی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی اندر داخل ہوئے۔ وہاں صحن میں پاشا صاحب کا "دربار" لگا ہوا تھا۔ ان کے عملے کے لوگ ان کے چاروں طرف بیٹھے پاشا صاحب کی باتیں سن رہے تھے۔ ہم لوگ نزدیک پہنچے تو سبطین فضلی صاحب کی عظمت اور احترام کے پیش نظر چند لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پاشا صاحب بدستور کرسی پر بیٹھے رہے۔ جب علیک سلیک کے بعد سبطین فضلی صاحب اور ہم لوگ بیٹھ گئے تو پاشا صاحب اپنے اسٹاف کے ان لوگوں سے مخاطب ہوئے جو احتراماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور بولے" تنخواہ تو میں تم کو دیتا ہوں اور تم دوسروں کے احترام میں اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہو۔"

سبطین فضلی صاحب بہت وضع دار اور خوش اخلاق انسان تھے مگر یہ فقرہ سن کر ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہم لوگوں کو بھی پاشا صاحب کی یہ بات پسند نہ آئی اس لیے ان کی چائے کی دعوت کے باوجود شکریہ کر کے چلے آئے۔

ہم نے بتایا ہے کہ پاشا صاحب بہت بڑے" شومین " تھے۔ وہ پبلسٹی کا فن جانتے تھے۔ ان کی فلم شروع ہوتے ہی ان کے بیانات اور انٹرویوز کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جن میں وہ کہتے تھے کہ اگلی فلم ان کی بہترین فلم ہو گی۔ وہ شاندار سیٹ لگواتے تھے اور ہر طرف ان کی زیر تکمیل فلم کا چرچا رہتا تھا۔ فلم کی ریلیز کے موقع پر ڈھول تاشے بجاتے ہوئے

تانگوں پر سوار لوگ اس فلم کے سائن بورڈ لگا کر سارے شہر میں گشت کرتے تھے۔ جس دن فلم نمائش کے لیے پیش کی جاتی تھی اس روزان کے اسٹاف کے لوگ ہار پھول اور آتش بازی کے گولے لے کر سینما پہنچ جاتے تھے۔ادھر فلم ختم ہوتی اور لوگ " واہ واہ۔ کیا بات ہے" کہتے ہوئے باہر نکلتے اور ادھر گولے چلنے شروع ہو جاتے اور دور دور تک فضا دھماکوں سے گونج اٹھتی۔سب کو پتا چل جاتا کہ پاشا صاحب کی فلم ریلیز ہوئی ہے اور ہٹ ہو گئی۔پاشا صاحب سنیما سے باہر نکلتے تو انہیں پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا جاتا اور جلوس کی صورت میں دفتر تک لے جایا جاتا تھا۔ تماشائیوں کا ہجوم بھی اس میں شامل ہو جاتا۔ فلم کے بہت سے اداکار بھی اس موقعے پر موجود رہا کرتے تھے۔

پاشا صاحب کے ستارے عروج پر تھے۔اس لئے صرف لاہور ہی نہیں سارا پاکستان انور کمال پاشا کا دیوانہ تھا۔ مگر جب ستاروں نے رخ پھیرا تو کامیابی نے بھی منہ موڑ لیا اور پھر یکے بعد دیگرے ان کی فلمیں فلاپ ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ بطور ہدایت کار دوسرے فلم سازوں کے لیے فلمیں بنانے لگے مگر کوئی فلم کامیاب نہ ہو سکی۔

آغا جی اے گل کی فلم "محبوب" کے وہ ہدایت کار تھے۔اس فلم میں رانی کو پہلی بار پیش کیا گیا تھا۔ شمیم آرا اس کی ہیروئن تھیں۔ فلم میں سبھی بڑے اسٹارز اور موسیقار موجود تھے مگر پاشا صاحب کے دن بدل گئے تھے اس لئے فلاپ ہو گئی۔

ان کی آخری فلم غالباً پنجابی فلم "آخری بلٹ " تھی جو خالی کارتوس ہی ثابت ہوئی۔پاشا صاحب اس کے بعد منصوبے ہی بناتے رہے فلم نہ بنا سکے۔

ہم نے پاشا صاحب کے انتہائی عروج کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔اسٹوڈیو میں ان کی کار داخل ہونے سے پہلے ان کا عملہ اطلاع کر دیتا تھا "میاں صاحب یا پاشا میاں" آرہے ہیں۔سب مؤدب کھڑے ہو جاتے۔وہ اندر داخل ہوتے تو ہر طرف ہٹو بچو کا شور مچ جاتا۔ ہر ایک کی نگاہ ان کی طرف ہوتی تھی۔سب کو خبر ہو جاتی تھی کہ پاشا صاحب آرہے ہیں۔آخری دنوں میں ہم نے یہ منظر بھی دیکھا کہ ایورنیو اسٹوڈیو میں معمول کے مطابق لوگوں کا ہجوم ہے۔پاشا صاحب چپ چاپ ان ہی لوگوں کے درمیان میں سے نکل کر جارہے ہیں اور کوئی پلٹ کر نہیں دیکھتا۔

ان کی تین چار فلمیں فلاپ ہونے کے بعد ایک بار ان کی نئی فلم کے گانے کی صدا بندی کے موقعے پر ہم بھی موجود

تھے۔ جیسے ہی گانے کی ٹیک ختم ہوئی ہر طرف ''واہ واہ'' کا شور مچ گیا۔ جسے دیکھئے پاشا صاحب کو بڑھ بڑھ کر مبارک باد پیش کر رہا تھا۔ موسیقار سے لے کر سازندوں تک سبھی ''بہترین'' کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ پاشا صاحب نے سب کو خاموش کر دیا اور کہا ''چپ ہو جاؤ۔ بند کرو یہ فضولیات۔ ہر گانے اور ہر فلم پر تم اسی طرح تعریف کرتے ہو مگر فلم فلاپ ہو جاتی ہے۔ مجھے پتا ہے کہ تم سب خوشامدی ہو۔''

مگر افسوس کہ پاشا صاحب کو یہ راز بہت دیر بعد معلوم ہوا۔ اس کے بعد تقدیر کے جھٹکوں نے انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

پاشا صاحب اپنی بعض بشری کمزوریوں کے باوجود ایک انتہائی ذہین اور باصلاحیت آدمی تھے۔ خوش شکل، خوش لباس اور جب جی چاہتا تو بے حد خوش اطوار۔ ہمارا بھی ان سے پہلے بطور صحافی اور بعد میں مصنف کے طور پر واسطہ پڑا۔

اس سے پہلے سبطین فضلی صاحب کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ وہ کئی سال قبل مرحوم ہو چکے ہیں۔ بہت باغ و بہار قسم کے آدمی تھے۔ انتہائی خوش اخلاق، خوش گو اور خوش لباس۔ بہت خاندانی آدمی تھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے ہی سبطین فضلی اور ان کے بھائی حسنین فضلی نے کلکتہ میں ایک فلم ساز ادارہ ''فضلی برادران'' کے نام سے قائم کیا تھا اور بہت ہٹ فلمیں بنائی تھیں۔ ''قیدی، چورنگ، عصمت'' وغیرہ ان کی مشہور فلموں میں شمار ہوتی ہیں۔ فضلی برادرز عموماً معاشرتی موضوعات پر مسلم سوشل فلمیں بناتے تھے جو ہندوستان کے مسلمانوں کو تو پسند آتی ہی تھیں، دلچسپی اور معیار کی وجہ سے ہندو بھی انہیں بہت ذوق و شوق سے دیکھتے تھے۔ ان کے سب سے بڑے بھائی فضل احمد کریم فضلی تھے۔ وہ بھی بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھے اور قیام پاکستان سے پہلے انڈین سول سروس میں تھے۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں آ گئے اور بہت اعلیٰ عہدوں پر کام کرتے رہے۔ وہ بہت اعلیٰ ادبی ذوق کے مالک تھے۔ بہت اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں انہوں نے ایک ناول بھی لکھا تھا جسے اپنے موضوع اور معیار کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔ فضل کریم فضلی صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے فنون لطیفہ کے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر کراچی میں ایک فلم ساز ادارہ قائم کیا اور ''چراغ جلتا رہا'' بنائی۔ اس کی کہانی، مکالمے اور گانے ان ہی کے تحریر کردہ تھے۔ اس فلم کی قابل ذکر خوبی یہ ہے کہ اس میں زیبا، محمد علی اور دیبا

کو پہلی بار متعارف کرایا گیا تھا۔اس فلم کے ہیرو طاہر تھے اور محمد علی نے اس میں ویلن کا کردار ادا کیا تھا مگر قسمت کی بات دیکھئے کہ محمد علی بعد میں بڑے ہیرو بن گئے اور ''چراغ جلتا رہا'' کے ہیرو کے نام سے آج کوئی بھی واقف نہیں ہے۔

فضل کریم فضلی کے بھائی حسنین فضلی نے کراچی میں ''وفا'' کے نام سے ایک فلم شروع کی تھی کہ اس کے دوران میں ان کا انتقال ہو گیا۔ سبطین فضلی لاہور میں رہتے تھے جہاں انہیں ایک سنیما میں حصہ الاٹ ہوا تھا۔فلیٹ بھی ملا تھا۔ معاش کی طرف سے بے فکری تھی اس لئے وہ منصوبے زیادہ بناتے رہے۔فلمیں صرف تین ہی بنائیں۔ان کی پہلی فلم ''دوپٹہ'' تھی جس میں نور جہاں کے ساتھ ایک نئے ہیرو کو اجے کمار کے نام سے پیش کیا گیا تھا۔سدھیر اور زرینہ ریشماں نے بھی اس فلم میں کام کیا تھا۔فیروز نظامی نے اس فلم کی موسیقی ترتیب دی تھی۔یہ فلم 1952ء میں ریلیز ہوئی تھی اور بے حد کامیاب رہی تھی۔وسائل اور دیگر سہولتوں کے فقدان کے باوجود یہ بہت معیاری فلم تھی۔اس فلم کی ریلیز کے بعد بمبئی کے فلم اخبارات نے لکھا تھا کہ انڈیا کے فلم سازوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے کیونکہ پاکستان میں ''دوپٹہ'' جیسی فلمیں بننے لگی ہیں۔یہ فلم بھارت میں بھی بھیجی گئی تھی مگر متعصب ہندوؤں نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اس سنیما میں آگ لگادی جہاں یہ فلم ریلیز ہوئی تھی اور دھمکی دی کہ سارے بھارت میں جہاں بھی اس کی نمائش ہوگی اس سنیما کو جلا دیا جائے گا۔اس طرح بھارت میں پاکستانی فلموں کی نمائش کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا لیکن بھارت کے فلم ساز ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ ان کی فلمیں پاکستان میں درآمد ہوں اور وہ یہاں سے دولت کمائیں۔یہاں انہیں اپنے منصوبوں کو آگے بڑھانے کے لئے لالچی اور مفاد پرست عناصر بھی مل جاتے تھے۔ جو لوگ پاکستان میں بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندیوں کے خلاف بولتے ہیں انہیں یہ علم نہیں ہے کہ یہ مسئلہ دراصل کیا ہے۔پاکستانی فلم ساز ہمیشہ یہی مطالبہ کرتے رہے کہ اگر بھارتی فلمیں پاکستان آئیں تو پاکستانی فلمیں بھی بھارت جائیں مگر بھارتی فلم ساز یک طرفہ کاروبار کے قائل رہے ہیں۔

''دوپٹہ'' کے بعد اگر پاکستانی فلمیں بھارت جانے لگتیں تو پاکستان کی فلمی صنعت کا حلیہ ہی بدل جاتا۔دراصل اس وقت صحیح معنوں میں پاکستانی فلم سازوں میں مقابلے کا جذبہ اور بہترین فلمیں بنانے کا احساس پیدا ہوتا۔پاکستان میں

بھارتی فلموں کی درآمد سے یہ مقصد حل نہیں ہو سکتا تھا۔

دوپٹہ کے زمانے میں نورجہاں اپنے شباب پر تھیں۔اداکاری بھی انہوں نے بہت اچھی کی تھی۔ فضلی صاحب کی ہدایت کاری بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔اس فلم کے نغمے آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں۔

چاندنی راتیں

سب جگ سوئے ہم جاگیں

تاروں سے کریں باتیں

اسی فلم کا نغمہ ہے۔اس فلم کے نغمات مشیر کاظمی نے لکھے تھے۔نغمات اچھے لکھتے تھے مگر انہیں زیادہ کام نہ مل سکا۔ اس گانے کی شان نزول وہ یہ بتاتے تھے کہ سخت کڑکی اور مفلسی کے دن تھے۔یہاں تک کہ فاقہ کشی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ گرمیوں کی چاندنی رات تھے۔وہ صحن میں چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ بھوک کے مارے نیند آنکھوں سے دور تھی اور وہ کروٹیں بدل رہے تھے۔اس عالم میں ان کے دل کی آواز ان اشعار کے ذریعے ان کی زبان پر آگئی۔

چاندنی راتیں

سب جگ سوئے ہم جاگیں

تاروں سے کریں باتیں

ان کے ان ہی جذبات کا عکاس نغمہ تھا۔ صبح تک سارا نغمہ مکمل ہو گیا۔وہ یہ گیت لے کر فضلی صاحب کے دفتر میں پہنچ گئے۔انہوں نے گیت سنا اور بہت پسند کیا۔اس گیت کا معاوضہ انہیں پچاس روپے ملا تھا۔

مشیر کاظمی بہت دلچسپ آدمی تھے۔شاعر بھی اچھے تھے۔ مگر ساری زندگی پریشان ہی رہے۔آخر ایک بار انہوں نے کوشش کر کے ایک فلم بھی بنا ڈالی مگر وہ بھی فلاپ ہو گئی۔ایوب خان کے دور میں انہوں نے ایوب خان کی حمایت میں ایک نظم لکھی تو ان کی نظروں میں آگئے۔اس کے بعد ایوب خان کے جلسوں میں انہیں بطور خاص بلوایا جاتا تھا۔ انہوں ے ایک پلاٹ بھی انہیں دے دیا تھا اس طرح قدرے فارغ البالی نصیب ہو گئی ورنہ زندگی بھر پریشان ہی رہے۔لیکن بہت ہنس مکھ اور یار باش آدمی تھے۔ہر وقت ہنستے ہی رہتے تھے۔اپنی پریشانیاں کسی کو نہیں سناتے تھے۔

جس زمانے میں بھارتی فلم ''جال'' کی درآمد کے خلاف پاکستانی فلمی صنعت نے مہم شروع کی تو سبھی قابل ذکر ممتاز اداکار' ہدایت کاراور فلم ساز گرفتار کرلیے گئے تھے۔ درجہ دوئم اور سوئم کے لوگ باہر رہ گئے تھے جو لکشمی چوک میں جلوس نکالتے رہتے تھے۔ ہم اس زمانے میں روزنامہ ''آثار '' میں تھے۔ یہ دراصل ''زمیندار'' پر بندش اور اس کے ایڈیٹر اختر علی خاں کے جیل جانے کے بعد اختر علی خاں کے بیٹے اور مولانا ظفر علی خاں کے پوتے منصور علی خان نے اس نام سے نکالا تھا۔ ظہور الحسن ڈار اس کے ایڈیٹر اور ہم جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ ہم دونوں کی ہمدردیاں ظاہر ہے کہ فلم انڈسٹری کے ساتھ تھیں مگر اخبار کی پالیسی ''جال'' کے حق میں تھی کیونکہ تقسیم کاروں سے بھارتی فلموں کے بڑے بڑے اشتہار ملتے تھے۔ اب یہ ہوتا کہ اداریے میں '' جال'' کی درآمد کی حمایت کی جاتی مگر ہمارے کالم میں اس کی مخالفت ہوتی تھی۔

ایک روز دوپہر کو ''زندہ باد'' اور ''مردہ باد'' کے نعرے بلند ہونے لگے۔ چپڑاسی نے آکر بتایا کہ فلم والوں کا جلوس آرہا ہے۔ منصور علی خاں تو گھبرا ہی گئے۔ فوراً دفتر کے دروازے بند کرنے کی ہدایت کی اور پولیس کو فون کرنے بیٹھ گئے۔ ہم نے انہیں تسلی دی اور سمجھایا کہ فکر نہ کریں۔ کچھ نہیں ہوگا۔ ہم دفتر کے برآمدے میں گئے تو دیکھا کہ سڑک کی دوسری جانب بیس پچیس آدمی کھڑے ''آثار'' کے خلاف نعرے لگارہے ہیں۔ اس جلوس کے قائد مشیر کاظمی تھے۔ ہمیں دیکھا تو دور ہی سے ہاتھ ہلا کر علیک سلیک کی۔ ہم نے جواب میں انہیں آنے کا اشارہ کیا تو وہ اپنے ساتھیوں کو یہ بتا کر کہ میں جاکر مذاکرات کرتا ہوں' ہمارے پاس آگئے۔ دفتر کے اندر ہم نے چائے سگریٹ پیش کی۔ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ کچھ کھانے کو بھی مل جائے تو منگالیں۔ ہم نے بن مکھن منگایا اور کھلایا۔ وہ کھاپی کر اپنے ''عوام'' میں پہنچ گئے اور کہا کہ آئندہ یہ اخبار ہماری مخالفت میں نہیں لکھے گا۔ میں ایڈیٹروں سے بات چیت کرکے آیا ہوں۔ ان ہی مشیر کاظمی کا ایک اور لطیفہ بھی ہے۔ ایک فلم ساز نے بھارتی فلم کا چربہ بنایا اور مشیر کاظمی سے کہا کہ اس کے گانوں کا بھی چربہ کردو۔ مشیر کاظمی نے بہتیرا کہا کہ میں اس سے اچھے گانے لکھ دوں گا مگر فلم ساز نہ مانا۔ بے چارے شاعر نے پیٹ کی خاطر ان ہی گیتوں کو الٹ پلٹ دیا۔ بھارتی گیت کے بول یہ تھے۔

ایک پیسہ دے دے بابو۔۔۔۔۔۔اوجانے والے بابو ایک پیسہ دے دے۔

مشیر کاظمی نے اسے یوں کر دیا۔

ایک آنہ دے دے بابو

ایک آنہ دے دے

فلم ساز نے اسی دھن میں گیت ریکارڈ کر لیا۔ فلم ریلیز ہوئی تو سب دوستوں نے مشیر کاظمی کو پکڑ لیا اور بہت شرمندہ کیا کہ یار ہو بہو چربہ کر دیا۔ شرم کرو۔

مشیر کاظمی بولے "بھئی آپ لوگ بھی کمال کرتے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ یہ گیت ہو بہو چربہ ہے۔ بھائی آپ کو آنے اور پیسے کا بھی علم نہیں ہے۔ پورے تین پیسوں کا فرق ہے۔"

کئی سال ہوئے مشیر کاظمی کا انتقال ہو گیا۔ فلمی صنعت اور شاعری سے انہیں عمر بھر کچھ نہ ملا۔

دیکھئے "دوپٹہ" اور فضلی صاحب کے تذکرے سے بات کہاں پہنچ گئی۔

سبطین فضلی صاحب بذات خود بہت خوش اطوار' خوش گفتار اور رومان پرست آدمی تھے۔ آزاد خیال بھی تھے۔ اور اپنے خیالات کا بلا جھجک اظہار کر دیتے تھے۔ بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ بڑے اطمینان سے رئیسانہ انداز میں کام کرنے کے عادی تھے۔ جن دنوں ان کی فلم بن رہی ہوتی وہ ہر چیز کو فراموش کر کے باتیں کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ باتیں بہت دلکش انداز میں اور آہستہ آہستہ کرتے تھے۔ ہنستے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے اور ہنستے اور ٹہلتے ہوئے باتیں شروع کر دیتے۔ اگر کندھے پر انہوں نے ہاتھ رکھ دیا تو سمجھ لیجئے کہ ایک گھنٹے سے پہلے نہ وہ ہاتھ اٹھائیں گے، نہ باتوں کا سلسلہ ختم کریں گے۔ اس زمانے میں یہ منظر عام تھا کہ سیٹ پر شوٹنگ کی تیاری مکمل ہوتی تھی مگر فضلی صاحب باتوں اور گپ شپ میں مصروف رہتے۔ اسسٹنٹ بار بار آکر دبی زبان میں بتاتا " سر۔ شاٹ تیار ہے، آرٹسٹ بھی ریڈی ہیں۔"

فضلی صاحب بڑے اطمینان سے کہتے۔ "اچھا اچھا بھئی۔ جلدی کس بات کی ہے۔ شاٹ بھی لے لیں گے۔" مگر سارا وقت نکل جاتا اور شاٹ نہ ہوتا۔ فضلی صاحب مسکرا کر کہتے "کوئی بات نہیں کل شاٹ لے لیں

گے۔‘‘

یہ رئیسانہ ٹھاٹ باٹ پاکستان کی مختصر سی بے سروسامان فلمی صنعت میں نہیں چل سکتا تھا۔نہ ہی پاکستان میں بنائی جانے والی فلموں کے طریقہ کار کو سبطین فضلی صاحب اپنا سکتے تھے۔ اس لئے بھی وہ فلم سازی نہ کر سکے۔ نئی نسل کے ہدایت کاروں کو تیزی اور برق رفتاری سے مشکلات کے باوجود کام کرتے ہوئے دیکھتے تو کہتے ’’بھئی آپ لوگ پتا نہیں ایسے حالات میں اتنی اچھی فلمیں کیسے بنا لیتے ہیں؟‘‘

دوسروں کی خوبیوں کی داد دینے میں ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ان دنوں محفل آرائیاں بھی خوب ہوا کرتی تھی اور بہت رونق رہتی تھی۔

فضلی صاحب نے دوسری فلم سدھیر کے اشتراک سے بنائی تھی۔اس کا نام ’’آنکھ کا نشہ‘‘ تھا اور یہ بھی بہت معیاری فلم تھی اس فلم کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس میں پاکستان کی دو صف اول کی ہیروئنوں نے ایک ساتھ کام کیا تھا۔ صبیحہ خانم اور مسرت نذیر کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی محفل میں ان میں سے ایک موجود ہوتی تو دوسری ہیروئن اس محفل میں قدم نہیں رکھتی تھی مگر سدھیر صاحب نے خدا جانے کیا جادو پڑھ کر پھونکا کہ وہ دونوں ایک ہی فلم میں کام کرنے پر آمادہ ہوگئیں اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسرت نذیر نے اس فلم میں جوانی سے بڑھاپے تک کا کردار کیا تھا حالانکہ وہ اس زمانے میں بہت مقبول ہیروئن تھیں۔یہ بہت معیاری فلم تھی اور بہت پسند کی گئی تھی۔

فضلی صاحب کی آخری فلم ’’تصویر‘‘ تھی جو کسی اعتبار سے بھی ان کے معیار۔۔۔۔۔۔کی نہ تھی۔ فضلی صاحب نے اس کے بعد کوئی فلم نہیں بنائی بلکہ دل برداشتہ ہو کر فلم بنانے سے ہی تائب ہو گئے۔ غم روزگار سے آزاد تھے۔ قناعت پسند بھی تھے۔ بس جو بھی اللہ نے دے رکھا تھا اسی پر مطمئن تھے اور آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔وہ بہت فن کارانہ مزاج کے مالک تھے۔اپنی فلموں کا اسکرین پلے بھی خود ہی لکھتے تھے اور اس کام میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ اگر وہ پاکستان میں فلمیں بناتے تو بہت سے نئے ہدایت کار جنم لے سکتے تھے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ انہوں نے ‘ شوکت حسین رضوی نے اور ڈبلیو زیڈ احمد جیسے ہنر مندوں نے پاکستان آکر اپنا کام ہی چھوڑ دیا تھا ورنہ یہ لوگ پاکستان کی فلمی صنعت کا حلیہ اور انداز بدل کر رکھ سکتے تھے۔

فضلی صاحب کی فلم ''دوپٹہ'' بہت خراب حالات میں بنی تھی۔اس وقت تو پاکستان کی فلمی صنعت کے پاس کچھ بھی نہیں تھا مگر فضلی صاحب نے اتنی اعلیٰ معیار کی فلم بنائی کہ بھارت کے فلم سازوں کو بھی حیران اور پریشان کر دیا۔وہ ایک اعلیٰ پائے کے ہنر مند ہدایت کار تھے۔اداکاروں سے کام لینے اور مناظر میں جان ڈالنے کا فن جانتے تھے۔

انہوں نے ہیرو کا نام اجے کمار رکھا تو ہم نے ان سے پوچھا۔ ''فضلی صاحب۔آپ نے ایک مسلمان کا ہندوانہ نام کیوں رکھ دیا؟''

وہ کچھ پریشان ہو گئے' کہنے لگے۔ ''بھئی کیا کریں' بس ایسا ہی رواج ہے۔''

ہم نے کہا'' یہ تو بھارت کا رواج ہے۔ہم پاکستانی ہیں۔''

ہنس کر کہنے لگے۔ ''اب تو خیر ہو گیا۔اگلی بار خیال رکھیں گے۔''

نام رکھنا بھی فلمی دنیا میں بھیڑ چال کے ضمن میں آتا ہے۔پاکستان بن گیا مگر شاہ زمان نے اپنا نام سدھیر رکھ لیا۔موسیٰ رضا' سنتوش کمار بن گئے۔ عشرت حسین' درپن کہلائے۔حالانکہ یہ سب کٹر پاکستانی تھے مگر بس بھیڑ چال۔

ایک بار ہم نے اسی زمانے میں سنتوش کمار صاحب سے کہا۔''سنتوش صاحب' اچھا بھلا نام ''موسیٰ'' چھوڑ کر آپ سنتوش کمار کیوں بن گئے؟''

بولے۔''مولانا (یہ ان کی عادت تھی) دراصل بمبئی میں کام شروع کیا تھا۔انہوں نے سنتوش کمار نام رکھ دیا۔''

ہم نے کہا''تو کیا پاکستان آنے کے بعد نام بدلنے پر پابندی تھی' آپ نے ان لوگوں کو ''وچن'' دے رکھا تھا؟''

ہنسنے لگے۔بولے'' یار اب رہنے دو۔کیوں شرمندہ کرتے ہو۔اب تو اس نام کو بہت دن ہو گئے ہیں۔یہی چلنے دو۔''

مگر درپن صاحب نے یہ جرات دکھائی کہ اپنا اصلی نام عشرت اپنایا مگر کچھ عرصے بعد بمبئی سے واپس آئے تو ''درپن'' بن کر آئے۔اس زمانے میں یہ تصور عام تھا کہ ہندوانے نام لوگ زیادہ پسند کرتے تھے اور یہ خوش نصیبی لاتے تھے۔ ہندوستان میں مسلمان ایکٹر اور ایکٹریس مصلحتاً بھی ہندوانے نام رکھا کرتے تھے تاکہ ہندو فلم بین تعصب کی وجہ سے ان کا بائیکاٹ نہ کر دیں۔یہی وجہ ہے کہ یوسف خاں دلیپ کمار بن گئے۔ ممتاز نے مدھوبالا کا نام اختیار کر لیا۔ مختار مینا کماری بن گئیں مگر اسی زمانے میں دلیپ کمار کے بھائی ناصر خاں نے اپنا نام ترک نہیں کیا اور بہت مقبول

ہیرو بن گئے۔ پاکستان میں بھی اسلامی ناموں کا رواج عام ہو گیا۔ یوسف خاں‘ کمال‘ حبیب‘ وحید مراد سبھی نے مقبولیت حاصل کی۔ یہاں تک کہ محمد علی بھی اسٹار بن گئے۔

فضلی صاحب کی ایک عادت نرالی تھی۔ وہ کئی گھنٹے غسل خانے میں وقت گزارتے تھے۔ ان کا غسل خانہ بھی نہایت صاف شفاف اور آراستہ تھا‘ خوشبوؤں سے مہکتا رہتا تھا۔ اسی جگہ وہ اخبار کا مطالعہ کرتے تھے‘ کتابیں پڑھتے تھے‘ اسکرپٹ پر غور کرتے تھے‘ خط و کتابت کرتے تھے۔ ان کاموں میں وقت تو لگتا ہے۔ فضلی صاحب کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع تھا۔ خوش لباس اور خوش گفتار آدمی تھے۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ 1970ء کی دہائی کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ شبنم کے گھر ایک پارٹی تھی۔ لاہور کی فلمی دنیا کے سبھی قابل ذکر لوگ موجود تھے۔ شبنم نے ایک نیا کھیل متعارف کرایا تھا۔ یہ میوزیکل چیئر کی قسم کا تھا۔ میوزک بجائی جاتی تھی اور لوگ خالی کرسیوں کے ارد گرد چکر لگانے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اچانک میوزک بند ہونے پر ہر ایک کو کرسی پر بیٹھنا ہوتا تھا۔ ایک کرسی کم ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص بیٹھنے سے رہ جاتا تھا۔ اس شخص کو سب مل کر سزا سناتے تھے۔ مثلاً یہ کہ گانا سناؤ‘ ناچو‘ بلی یا کتے کی آواز نکالو۔ وغیرہ۔ ایک صاحب کو یہ سزا دی گئی کہ اپنی بیگم کے جوتے اپنے رومال سے صاف کرو۔

ایک مرتبہ فضلی صاحب اس کھیل میں بیٹھنے سے رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ انہیں سزا سنائی جاتی انہوں نے کوٹ کی جیب سے ریشمی رومال نکال کر اپنی بیگم کے جوتے صاف کرنے شروع کر دیے۔ سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ فضلی صاحب نے سب کو ہنستے ہوئے دیکھا تو معصومیت سے پوچھنے لگے۔ ”کیا کوئی غلطی ہو گئی؟ کسی اور کے جوتے صاف کرنے تھے؟“

فضلی صاحب نے تمام زندگی بڑے عیش اور آسائش سے گزاری مگر آخری ایام میں مالی پریشانیوں کا شکار ہو گئے تھے۔ انہوں نے طویل بیماری بھی اٹھائی۔ یہاں تک کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ ان جیسے خوش لباس اور مجلسی شخص کو ایک بستر پر سفید چادر کے نیچے بے بسی سے لیٹے دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ اسی عالم میں وہ انتقال کر گئے۔ ان کی بیگم ثریا نے ان کی بہت خدمت کی۔ ان کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں۔ چوبیس گھنٹے ان کے لئے خود کو وقف کر لیا تھا۔ حالانکہ دونوں میاں بیوی ماڈرن طرز زندگی کے عادی تھے اور محفلوں کی جان سمجھے جاتے تھے۔ مگر آخری

دنوں میں یہ عالم دیکھا کہ فضلی صاحب۔۔۔۔۔۔ سفید چادر اوڑھے بے حس و حرکت لیٹے ہوئے ہیں اور ان کی بیگم سادہ لباس میں ان کی خدمت کر رہی ہیں یا نمازیں پڑھنے اور دعائیں کرنے میں مصروف ہیں۔

فضلی صاحب میں غرور اور بناوٹ نام کو نہ تھا۔ ہر ایک سے بے تکلفی اور خلوص کے ساتھ میل جول بڑھا لیتے تھے۔

ہمارے زمانے کی فلموں کے مکالمے بڑے جاندار ہوتے تھے۔ یہ فلم بینوں کے قلب و ذہن میں رچ بس جاتے اور زندگی بھر یاد رہتے تھے۔ جب ہم چھوٹے تھے اس وقت بھی فلم دیکھنے والوں کو فلموں کے مکالمے یاد ہو جاتے تھے اور وہ انہیں دہراتے رہتے تھے۔ وہ فلمیں اور مکالمے آج بھی لوگوں کو یاد ہیں لیکن یہ اسی وقت ہوتا تھا جب مکالمے واقعی جان دار' بامعنی اور خوبصورت ہوں۔ ہم نے جب فلم "سکندر" دیکھی تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ یہ فلم بھی ہمیں ایک بڑی عمر کے کزن کی سفارش پر دیکھنے کو نصیب ہوئی تھی۔ اس فلم میں شان و شوکت بہت تھی۔ پرتھوی راج کپور یونانی لباس میں سچ مچ یونانی دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ سہراب مودی' راجہ پورس کے روپ میں خوب سجے تھے۔ سکندر کی یونانی محبوبہ کا کردار ونمالا نے ادا کیا تھا۔ ونمالا کا رنگ گورا' بال بھورے اور آنکھیں سبز تھیں۔ یہ فلم بلیک اینڈ وائٹ تھی مگر پھر بھی ونمالا ایک غیر ملکی حسینہ نظر آتی تھیں۔ اس فلم میں جنگ کے مناظر بھی بہت شاندار تھے۔ مگر سب سے بڑی خوبی اس کے مکالمے تھے۔ جب شکست کھانے کے بعد راجہ پورس کو سکندر اعظم کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو سکندر دریافت کرتا ہے۔ "بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

راجہ پورس باوقار انداز میں جواب دیتا ہے۔ "جو بادشاہ' بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔"

سکندر اتنا متاثر ہوتا ہے کہ راجہ پورس کو آزاد کر کے اپنے برابر کے تخت پر جگہ دیتا ہے۔

اس زمانے میں بے شمار کامیاب فلموں کے مکالمے فلم بینوں کو ازبر ہو جاتے تھے۔ ضیا سرحدی کی فلم "ہم لوگ" کے یہ مکالمے بچے بچے کی زبان پر تھے۔

"جس دیے میں تیل نہ ہو اسے جلنے کا کیا ادھیکار؟"

"دیا نہیں' دیے کا تیل جلتا ہے۔"

"اور جب دیے کا تیل ختم ہو جائے؟"

’’تو پھر صبح ہو جائے گی۔‘‘

ان مکالموں میں خوشگوار مستقبل کا پیغام ہے۔ آس ہے‘ امید ہے اور امید پر ہی دنیا قائم ہے۔ دراصل پرانے زمانے کی فلموں میں بامقصد کہانی ہوتی تھی۔ سوچنے اور غور کرنے کا مواد بھی ہوتا تھا جو کہ اب ناپید ہے۔ بڑی بامقصد اور خوبصورت فلمیں اس زمانے میں بنائی گئیں اور کامیاب بھی ہوئیں۔ تعجب کی بات ہے کہ اب زمانہ آگے بڑھ رہا ہے مگر فلموں کا معیار پیچھے جا رہا ہے۔ ورنہ یہی عوام تھے جو بہت اچھی اور فن کارانہ فلموں کو بھی پسند کیا کرتے تھے۔ اچھے مکالموں کی داد دیا کرتے تھے۔ خود ہماری فلموں کے مکالمے لوگ ہمیں سنا دیا کرتے تھے۔

ایک بار میاں جاوید قمر نے ہمیں ایک کہانی لکھنے کے سلسلے میں بلایا۔ میاں جاوید قمر فلم تقسیم کار تھے۔ بعد میں فلم ساز بھی ہو گئے تھے۔ فیصل آباد میں ان کا بابر سینما تھا اور فیکٹریاں بھی تھیں۔ یہ وہی میاں جاوید قمر ہیں جنہوں نے ہدایت کار حسن طارق کی وفات کے بعد اداکارہ رانی سے شادی کر لی تھی مگر یہ شادی زیادہ عرصے قائم نہ رہی۔ رانی بیمار پڑ گئیں اور علاج کے لیے لندن جانے لگیں۔ ڈاکٹروں نے انہیں پھیپھڑے کا کینسر بتایا تھا۔ اس موقعے پر میاں صاحب نے رانی کے ساتھ جانا تو کجا ان سے رابطہ قائم کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ رانی کا لندن میں آپریشن ہوا تو ان کے شوہر ان کے ساتھ نہ تھے۔ وہاں اسپتال میں کرکٹر سرفراز نواز نے ان کی بہت خدمت اور دیکھ بھال کی۔ رانی تکلیف دہ وقت میں سرفراز نواز کے اس حسن سلوک سے اتنی متاثر ہوئیں کہ میاں جاوید قمر سے طلاق لینے کے بعد سرفراز نواز سے شادی کر لی۔ اگرچہ اس شادی کا انجام بھی زیادہ خوشگوار نہ تھا۔ یہ داستان رانی کی کہانی کے ساتھ بیان کی جائے گی۔

میاں جاوید قمر نے حسن طارق کی تہذیب‘ انجمن اور امراؤ جان ادا جیسی فلمیں ریلیز کی تھیں۔ وہ خود بھی فلم ساز تھے۔ پنجابی میں فلم جیرا بلیڈ بنائی جس میں منور ظریف نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ یہ فلم بہت کامیاب ہوئی۔ ان کی ایک اور فلم لائسنس بھی ہٹ ہو گئی تھی۔ ہم نے بھی ان کے لیے ایک فلم نمک حرام بنائی تھی۔ ہم اس کے مصنف اور ہدایت کار تھے۔ اس فلم کے ساتھ یہ المیہ ہوا کہ اردو فلمیں دیکھنے والے اسے پنجابی فلم سمجھتے رہے اور سینما میں نہ گئے۔ ادھر پنجابی فلم دیکھنے والے جب سینما میں پہنچے اور اردو فلم دیکھنے کو ملی تو وہ بھی خوش نہ ہوئے۔ یہ ایک طنزیہ کامیڈی تھی۔ پہلے اس میں وحید مراد اور زیبا مرکزی کرداروں کے لیے چنے گئے تھے مگر ہمیں انگلستان جانا تھا

اوران دونوں فن کاروں کی تاریخیں ملنا دشوار تھا۔ ہمارے اصرار کے باوجود میاں جاوید نے انتظار کرنے کے بجائے منور ظریف اور آسیہ کو کاسٹ کر لیا۔ ساتھ میں دوسری ہیروئن نشو کو بنایا۔ ان فنکاروں کے پیش نظر ہم نے کہانی میں تبدیلیاں کرنی شروع کردیں اس لئے کہ وحید مراد اور زیبا کی اداکاری کا انداز منور ظریف اور آسیہ سے یکسر مختلف تھا۔ یہ فلم بہت بھاگ دوڑ میں بنائی گئی تھی۔ بے چارہ منور ظریف رات کر کبھی دس بجے کبھی بارہ بجے دن بھر کی شوٹنگ سے فارغ ہو کر ہمارے سیٹ پر پہنچتا تھا اور ساری رات شوٹنگ کرتا تھا۔ اگلے دن پھر صبح سے مصروف ہو جاتا تھا۔ یہی حال آسیہ کا بھی تھا۔ اکثر وہ دونوں شاٹ کے درمیان میں سو جاتے تھے۔ انہیں جھنجوڑ کر جگانا پڑتا تھا۔ مگر اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ ان کی عدیم الفرصتی راہ میں مشکل بن گئی تھی مگر دونوں نے بہت اچھی اداکاری کی۔

نشو اس زمانے میں ماں بننے والی تھیں۔ ہم آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے اسلام آباد گئے تو یہ راز فاش ہوا۔ انہیں پہاڑوں پر بھی چڑھنا تھا۔ کشتی میں بھی سوار ہونا تھا۔ جھیل کے کنارے بھاگ دوڑ بھی کرنا تھی مگر اس حالت میں کیا ہو سکتا تھا۔ وہ تو ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ تھیں مگر ہمارا دل نہ مانا اور ہم نے شوٹنگ کی نوعیت ہی بدل دی۔ نشو اس زمانے میں کھوئی کھوئی سی رہتی تھیں۔ لاہور سے جس سین کی شوٹنگ کے لئے بطور خاص اسلام آباد گئی تھیں اس کا کنٹی نیوٹی کا لباس لاہور ہی میں بھول گئیں۔ اس قسم کے لطیفے وہ عموماً کرتی رہتی تھیں۔ صبح شوٹنگ کے لئے آتیں تو پتا چلتا کہ اپنی وگ گھر بھول آئی ہیں۔ دوبارہ گاڑی بھیجی جاتی اور شوٹنگ روکنی پڑتی۔ یہ فلم مکمل ہو گئی اور ہم یورپ چلے گئے۔ ہماری غیر موجودگی میں یہ ریلیز ہوئی اور زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکی مگر میاں جاوید قمر نے منافع کما لیا۔

میاں صاحب نے ہمیں فلم کی کہانی لکھنے کے لئے بلایا تو ہم نے مصروفیت کا عذر کیا۔ وہ اصرار کرنے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اگر کہانی لکھوائیں گے تو ہم سے۔ پھر انہوں نے انکشاف کیا۔ ''آفاقی صاحب' آپ کی فلم ''کنیز'' مجھے اتنی پسند تھی کہ میں نے درجنوں بار دیکھی۔ اس کے مکالمے مجھے زبانی یاد ہو گئے تھے۔''

ہم نے کہا۔ ''اچھا تو سنایئے۔''

''کون سے سین کے؟''

''جو بھی آپ مناسب سمجھیں۔''

میاں صاحب نے ہمیں فوراً محمد علی' وحید مراد اور صبیحہ خانم کے مکالمے سنانے شروع کر دیے اور ہم حیران رہ گئے۔ ہم نے آپکو بتایا ہے کہ ان دنوں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اچھی فلموں کے مکالمے بھی لوگوں کو یاد ہو جاتے تھے۔ کئی فلم بین محض چند مخصوص سین دیکھنے کے لئے ہی بار بار سنیما میں جایا کرتے تھے۔ انور کمال پاشا اور ریاض شاہد کے لکھے ہوئے مکالمے لوگوں کو اتنے پسند آتے کہ ہر جگہ ان کا استعمال شروع کر دیتے تھے۔ ریاض شاہد کی فلم ''بدنام'' کے مکالمے تو ضرب المثل بن گئے۔ مثلاً نیلو سے علاؤالدین کے یہ مکالمے۔

''کہاں سے آئے ہیں یہ جھمکے' کون لایا ہے یہ جھمکے' کس نے دیے ہیں یہ جھمکے' کیوں پہنے ہیں یہ جھمکے؟''

یا پھر ''فرنگی'' میں سدھیر کا یہ مکالمہ۔ جب مخالف گروہ کے آدمی سدھیر کو اچانک دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں۔

''کون اکبر خان؟''

''پہچانو تو بھی اکبر خان' نہ پہچانو تب بھی اکبر خان۔''

کئی فلموں میں مکالمے بازی ضرورت سے زیادہ بھی ہو جاتی تھی۔ منیر نیازی نے اس زمانے میں ایک مزاحیہ کالم لکھا تھا جس میں یہ لکھا کہ ہماری فلموں میں کردار' کردار سے مخاطب نہیں ہوتے بلکہ مکالمہ' مکالمے سے مخاطب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مکالمہ زمین پر کھڑا ہے۔ دوسرا مکالمہ گھوڑے پر سوار ہے۔ تیسرا مکالمہ درخت پر چڑھا ہوا ہے۔ چوتھا مکالمہ کار پر سوار ہے وغیرہ وغیرہ۔ کسی لحاظ سے یہ بات درست بھی تھی۔ بعض فلموں میں حقیقتاً اتنے زیادہ مکالمے ہوتے تھے کہ کوفت ہونے لگتی تھی اور یہ مکالمے برائے مکالمہ ہوتے تھے۔ یہ تھیٹر کے ڈرامے کا انداز تھا۔ جو کافی عرصے تک پاکستانی فلموں میں رائج رہا۔ دراصل ہندوستان میں فلمی صنعت کے کرتا دھرتا تھیٹر کے سیٹھ ہی تھے۔ تھیٹر والوں نے فلمیں بنانی شروع کیں تو وہی انداز اپنایا۔ ویسی ہی کہانیاں' ویسے ہی موضوعات' ویسا ہی ماحول اور مزاج' مکالمے بھی اسی قسم کے ہوتے تھے۔ آغاز میں لکھنے والے بھی تھیٹر کے ڈرامے لکھنے والے لوگ ہی تھے۔ اس زمانے میں آغا حشر کے ایسے مکالمے بہت مقبول ہوا کرتے تھے۔

''توفیق کس حال میں ہے؟''

''شیر لوہے کے جال میں ہے۔''

کافی عرصے تک بمبئی اور کلکتہ کی فلمی صنعت ہیں یہی انداز رہا۔ بعد میں رفتہ رفتہ تبدیلی پیدا ہوئی اور روزمرہ کی زبان بھی استعمال ہونے لگی۔

تنویر نقوی مایہ ناز شاعر اور نغمہ نگار تھے۔ انہوں نے بمبئی کے فلم سازوں کی پسند اور استعداد کے بارے میں یہ لطیفہ سنایا تھا کہ ایک صاحب فلم ساز کو کہانی سنانے گئے۔ بہت زور لگایا، کافی دیر تک سناتے رہے مگر فلم ساز کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ آخر مصنف نے جوش میں آکر کہا۔

ہیرو نے کھڑکی میں سے پکار کر کہا ''دلبر دلبر''۔

یہ سن کر فلم ساز ایک دم کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ''کیا کہا' دو بار دلبر؟''

مصنف ''جی سیٹھ صاحب دو بار دلبر۔''

فلم ساز ''اس کا جواب ہی نہیں ہے۔ یہ کہانی منظور' ایڈوانس لے لو۔''

پرانے دور میں بہت اچھی اور بامقصد فلمیں بنتی رہی ہیں مگر یہ نہیں کہ بے مقصد اور محض تفریحی فلمیں نہیں بناکر تھیں۔ فلمیں تو ہر قسم کی بنا کرتی تھیں۔ بہت سی فلموں کا مقصد محض اور محض تفریح ہوتا تھا۔ مار دھاڑ سے لبریز فلمیں بھی کافی تعداد میں بنائی جاتی تھیں۔

ناڈیا ایک یہودی ایکٹریس تھی، لمبی تڑنگی' رنگ گورا بھبوکا' جسم نہایت متناسب' بال مغربی انداز میں ترشے ہوئے' آنکھیں نیلی اور بے حد مقبول ہیروئن تھی۔ ''ہنٹر والی' طوفان میل' جنگل کوئین'' وغیرہ اس کی مشہور فلمیں تھیں۔ تماشائی اس کے دلدادہ تھے۔ اس کی فلموں میں جان کاؤس جنگجو قسم کے ہیرو ہوا کرتے تھے۔ وہ پہلوان نما ہیرو تھے اور بہت بہادری کے کارنامے سرانجام دیتے تھے۔ اکثر فلموں میں وہ جنگل میں ٹارزن کی طرح محض لنگوٹی پہن کر گھومتے پھرتے تھے۔ کبھی درندوں سے لڑتے' کبھی دشمنوں کے دانت کھٹے کرتے۔ جان کاؤس کے سلسلے میں ایک لطیفہ یہ بھی مشہور ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے مصنف اور ہدایت کار ''(اس وقت وہ فلموں میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے) شوکت ہاشمی بمبئی سے لاہور پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر کچھ لوگوں نے انہیں جان کاؤس سمجھ

لیا۔ان سے تصدیق کی توانہوں نے بھی کسی کا دل توڑنا گوارانہ کیا اور تصدیق کر دی۔بس پھر کیا تھا لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور آؤ بھگت شروع کر دی۔

کسی کو شک گزرا تو پوچھا کہ جناب فلموں میں تو آپ بہت طاقت ور اور تگڑے نظر آتے ہیں مگر دیکھنے میں کافی ”ماٹھے“ ہیں۔

انہوں نے جواب دیا۔”یہ سب کیمرا ٹرک کی کرامت ہے۔“

بعد میں یہ راز کھل گیا مگر کافی عرصے تک یہ کہانی لوگ مزے لے لے کر سنتے اور سناتے رہے۔

اس دور میں ہر طرح کی فلمیں بنا کرتی تھیں۔جادوئی فلموں کا بھی رواج تھا جو کہ اب دیکھنے میں نہیں آتیں۔ان فلموں کے ہدایت کاروں کو یہ آسانی تھی کہ اگر کوئی اداکار یا ہیرو' ہیروئن نخرہ کرتا تھا تو وہ اسے فلم میں طوطا یا مینا بنا دیا کرتے تھے۔اس کے بعد ساری فلم میں وہ اداکار پنجرے میں بند نظر آتا۔اسی لئے اداکاران ہدایت کاروں کے غضب سے ڈرتے تھے کہ نہ جانے کب ناراض ہو جائیں اور طوطا بنا دیں۔ڈراؤنی فلمیں بھی بنائی جاتی تھیں اور کافی ڈراؤنی ہوتی تھیں۔

ہم آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتے تھے اور میرٹھ میں رہا کرتے تھے مگر ہر ہفتے چھٹی کے دن میرٹھ سے دہلی جاتے جہاں ہماری بڑی بہن رہتی تھیں۔ظاہر ہے کہ وہ اور ہمارے بہنوئی بہت خوش ہوتے تھے اور ہماری خوب آؤ بھگت کرتے تھے۔ریستوران میں کھانا کھلایا جاتا تھا مگر سب سے بڑی خاطر یہ تھی کہ ہمیں ایک فلم دکھائی جاتی تھی۔ایک بار ہم دہلی گئے تو ان دونوں کا جھگڑا ہو گیا تھا اور آپس میں بول چال بند تھی۔دونوں نے الگ الگ ہمارے ساتھ بہت پیار کا برتاؤ کیا مگر بول چال بند ہونے کی وجہ سے نہ تو ریستوران گئے اور نہ ہی فلم کا پروگرام بن سکا جو ہمارے لئے بہت بے چینی اور پریشانی کا باعث تھا۔خدا خدا کر کے آٹھ بجے کے قریب ان کی بول چال کھل گئی۔کھانا تو گھر میں موجود تھا مگر اب ہم روٹھ گئے کہ فلم دیکھے بغیر نہیں سوئیں گے۔اچھی فلمیں کافی فاصلے پر لگی ہوئی تھیں۔ان دونوں نے ہمیں بہت سمجھایا کہ اب کسی فلم کا ٹکٹ نہیں ملے گا مگر ہم کہاں ماننے والے تھے۔ہمارے گھر کے نزدیک ایک سنیما تھا جس میں فلم ”بھاگتا بھوت“ لگی ہوئی تھی۔ظاہر ہے کہ وہ دونوں یہ فلم دیکھنے کے حق میں نہیں تھے مگر ہم ضد کر کے

بیٹھ گئے تھے کہ اگر ہمیں آج فلم نہ دکھائی گئی تو ہم اگلے ہفتے دہلی نہیں آئیں گے۔ آخر انہوں نے ہماری ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ مگر سوال یہ تھا کہ ہمیں تنہا فلم دیکھنے کے لئے نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ایک پرانے گھریلو ملازم قاسم بابا کے نام قرعہ فال نکلا۔

اب ذرا قاسم بابا کے بارے میں سنئے۔ان کی عمر ستر پچھتر سال کے قریب ہو گی۔ فلموں سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ البتہ تھیٹر کے ڈراموں کے رسیا تھے اور ان ہی کی کہانیاں اور مکالمے ہمیں سناتے رہتے تھے کہ میاں کہانی تو ''اندر سبھا'' کی تھی' آج کل کیا خاک کہانیاں بنتی ہیں۔

قاسم بابا افیمی تھے۔یوں تو سارے دن ہی افیم کی پینک میں رہتے تھے مگر شام ہوتے ہی کافی مقدار میں افیم کھا کر بالکل انٹا غفیل ہو جاتے اور ہوں ہاں کے سوا کوئی بات نہ کرتے۔اس عالم میں اگر وہ چلتے پھرتے بھی تھے تو اس طرح جیسے خواب کے عالم میں بعض لوگ چلتے ہیں۔انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کہاں جا رہے ہیں۔ کیوں جا رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ صبح ہونے کے بعد بھی انہیں کچھ یاد نہیں رہتا تھا کہ رات کو انہوں نے کیا کیا تھا کہاں گئے تھے؟

ہمیں ان قاسم بابا کے حوالے کر دیا گیا۔ سنیما گھر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر بھی نہیں تھا اور سیدھی اور بڑی سڑک وہاں تک جاتی تھی۔ ہماری بہن لال کنواں بازار میں کٹرہ دینہ بیگ کی گلی میں رہتی تھیں۔اس گلی کے آغاز میں ہمدرد دواخانہ تھا۔اس کے بالمقابل فتح پوری کا محلہ تھا۔اس کی ایک گلی کا نام گلی قاسم جان تھا جہاں اردو کے مایہ ناز شاعر غالب کی رہائش تھی۔اپنی نوعمری میں ہم ان تاریخی گلیوں اور بازاروں میں گھومتے رہے ہیں۔اسی گلی کے سامنے سے گزر کر اندر ہی اندر دہلی کے مشہور ترین بازار چاندی چوک میں چلے جاتے تھے

ہم ڈرپوک تو بالکل نہیں ہیں مگر جب قاسم صاحب کو ان کی پینک سے ہوشیار کر کے ہمارا ہاتھ ان کے ہاتھ میں پکڑایا گیا اور بتایا گیا کہ وہ ہمارے ساتھ قریب کے سنیما میں جائیں گے تو انہیں بہت ناگوار گزرا۔افیمچیوں کے مخصوص انداز میں وہ بھی ناک سے بولا کرتے تھے۔ کہنے لگے۔

''ارے میاں چھوڑو یہ بائیسکوپ' اس میں کیا رکھا ہے۔ تھیٹر کا ڈراما لگے گا اور آپ کو دکھائیں گے۔اندر سبھا، لال پری' نیلی پری' سبز پری' کالا دیو' پیلا دیو کوہ قاف کے نظارے۔ یہ باتیں بھلا بائیسکوپ میں کہاں؟''

ہم نے کہا"قاسم بابا، بہت اچھی فلم لگی ہے۔بھاگتا بھوت۔"

بولے" ارے میاں اس کا نام ہی غلط ہے۔بھوت بھی بھلا بھاگتا ہے۔میں تمہیں کل بھوت پریت کی بہت سی کہانیاں سنادوں گا۔یہ رات کا وقت ہے۔خواہ مخواہ بائیسکوپ دیکھ کر ڈر جاؤ گے۔"

مگر ہمیں تو صرف فلم دیکھنے سے مطلب تھا۔ اچھی بری سے کوئی سروکار نہ تھا۔سچ پوچھئے تو فلم دیکھنے کی ہمیں دیوانگی تھی اور یہ کیفیت ساٹھ ستر کی دہائی تک رہی۔اب یہ عالم ہے کہ بہت اچھی فلم ہو تو دیکھتے ہیں ورنہ دس پندرہ منٹ بعد ہی اکتا جاتے ہیں کہ کتنی لمبی فلم ہے' آخر کب ختم ہو گی؟

ہم" بھاگتا بھوت" دیکھنے کے لئے قاسم بابا کی نگرانی میں پیدل چل پڑے۔ان کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھا۔سردی کا موسم تھا اس لئے انہوں نے روئی کا دگلا پہنا ہوا تھا۔یہ روئی کا ایک اوور کوٹ سمجھ لیجئے۔اس کے اندر بھی انہوں نے گرم بنیان' بنڈی' سویٹر اور اور نہ جانے کیا کیا پہن رکھا تھا حالانکہ اتنی زیادہ سردی نہیں تھی مگر وہ کہہ رہے تھے کہ سردی سے کانپ رہا ہوں۔انہوں نے ایک کمبل بھی احتیاطاً ساتھ لے لیا تھا۔

فلم کا یہ آخری شو تھا۔ان دنوں آخری شو پر زیادہ رش نہیں ہوتا تھا اور یہ تو ویسے بھی ڈراؤنی فلم تھی۔اس پر ستم یہ کہ سردی کا موسم تھا۔رش زیادہ نہیں تھا اس لئے آسانی سے ٹکٹ مل گئے۔ہم نے گیلری کا ٹکٹ لیا۔قاسم بابا کے لئے اسٹال کا ٹکٹ لیا گیا کیونکہ وہاں لکڑی کی بینچیں ہوا کرتی تھیں اور قاسم بابا کو وہاں سونے کا آرام تھا۔

ہال میں زیادہ تماشائی نہیں تھے اور جب فلم شروع ہوئی تو کئی لوگ اٹھ اٹھ کر چلے گئے۔اس طرح سنیما ہال اور سونا ہو گیا۔پتا نہیں کہانی کیا تھی۔اتنا یاد ہے کہ ایک شخص محبت میں ناکام ہو جاتا ہے اور ہیرو کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔مرنے کے بعد وہ بھوت بن جاتا ہے اور ہیرو ہیروئن کی زندگی وبال کر دیتا ہے۔اب ذرا بھوت کا حلیہ ملاحظہ فرمایئے۔وہ ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا جس کے سارے جسم پر سفید کپڑے کی پٹیاں بندی ہوئی تھیں۔ساری فلم میں وہ دوڑتا بھاگتا پھرتا ہے۔ہیرو ہیروئن کو تنگ کرتا ہے۔ایک سین میں ہیرو کے ہاتھ میں اس کے جسم کے گرد لپٹی ہوئی پٹی کا ایک سرا آجاتا ہے۔وہ اسے کھولتا ہے تو یہ پٹی شیطان کی آنت بن جاتی ہے۔ہیرو اسے کھولتے کھولتے تھک جاتا ہے مگر پٹی کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ آخر بھوت کھلی پٹیوں سمیت بھاگ جاتا ہے۔بھوت اور بھی کئی ڈراؤنی حرکتیں کرتا ہے اچانک تاریک

سڑکوں پر نمودار ہو کر لوگوں کا گلا دبا دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہمیں بھی ڈر تو لگ رہا تھا مگر ڈر کے مارے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بس بیٹھے بیٹھے ڈرتے رہے۔ فلم ختم ہوئی تو سینما ہال قریب قریب خالی ہو چکا تھا۔ جو لوگ باقی بچے تھے وہ فوراً غائب ہو گئے۔ ہم نے قاسم بابا کو تلاش کرنا شروع کر دیا مگر ان کا کوئی پتا نہیں چلا۔ اتنی دیر میں سینما سے باہر نکلے۔ وہاں لال کنواں بازار جیسا بارونق علاقہ ویران اور سنسان پڑا تھا۔ رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری سڑک ویران ہو گئی۔ ہم وہاں کب تک کھڑے رہتے۔ تیز قدموں سے گھر کی طرف چل پڑے مگر ڈر کے مارے برا حال تھا۔ سڑک پر روشنی زیادہ نہیں تھی اور یہ اندیشہ تھا کہ کہیں کسی تاریک گلی میں سے بھاگتا ہوا بھوت نہ برآمد ہو جائے۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگے مگر بھوت سامنے سے نمودار ہو گیا اور ہم سے ٹکرا گیا۔ ہماری بہت زور کی چیخ نکل گئی مگر حیرت اس بات پر ہوئی کہ بھوت ہم سے بھی زیادہ تیز آواز میں چیخا۔ ہم دونوں کی گھگی بندھ گئی تھی۔ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ خوف سے برا حال تھا نہ جانے کتنی دیر یہ عالم رہا۔ پھر ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو پتا چلا کہ وہ بھوت نہیں، ایک فلم بین تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے اور ایک دوسرے کو "بھاگتا بھوت" سمجھ رہے تھے وہ ہاتھ باندھے کھڑا "رام رام" کر رہا تھا اور ہم دل ہی دل میں لاحول اور آیات پڑھ رہے تھے جب ایک دوسرے کی اصلیت معلوم ہوئی تو جان میں جان آئی۔ وہ شخص اچانک گھگیاتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا اور سامنے والی تاریک گلی میں غائب ہو گیا۔ اب ہم پھر اس سڑک پر تنہا رہ گئے۔ ایک ایک قدم من من بھر کا ہو گیا تھا۔ مگر گھر جانا بھی ضروری تھا ورنہ سڑک پر بھاگتے بھوت کا خوف تھا۔ خدا خدا کر کے ہم کٹرہ دینہ بیگ تک پہنچے۔ یہ آٹھ دس فٹ چوڑی پتھروں کے فرش کی گلی تھی۔ اس گلی کے آخر میں وہ گھر تھا جہاں ہمیں جانا تھا۔ گلی میں صرف ایک مریل سا بلب روشن تھا اور وہ قریب قریب تاریک ہی تھی۔ اس اندھیری گلی میں جانے کی ہمت تو نہیں پڑ رہی تھی مگر جائے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ اللہ کا نام لے کر گلی میں داخل ہو گئے۔ ہمارے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ جسم میں سنسناہٹ تھی اور کلیجا کانپ رہا تھا۔ ہم نے آس پاس دیکھا۔ ہر کھمبے کے پیچھے ہمیں ایک بھاگتا بھوت کھڑا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ بھوت بہت تیز بھاگتا تھا۔ مگر پھر بھی ہم نے بھاگ کر گھر تک پہنچنے کا فیصلہ کیا اور دوڑ لگا دی۔ ہمارے دوڑتے ہی ہر طرف سے

بھوتوں نے بھی بھاگنا شروع کر دیا۔ کئی بھوت تیز بھاگتے ہوئے ہم سے آگے نکل گئے۔ مگر ہم پھر بھی نہ رو کے۔ اپنے گھر کی ڈیوڑھی پر ہی جا کر دم لیا۔ پہلے تو ہم نے گھبراہٹ میں کنڈی کھٹ کھٹانی شروع کر دی۔ پھر دیکھا کہ دروازہ تو صرف بھڑا ہوا تھا۔ ہم فوراً اندر داخل ہو گئے اور اندر سے کھٹکا لگا لیا۔ اس کے بعد ہمیں تپلی سی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا تھا مگر ان سیڑھیوں میں بھی بھوت چھپا محسوس ہو رہا تھا۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی ایک عجیب سی آواز سنائی دی اور پھر سامنے والے قاسم بابا کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ ہم وہیں سہم کر رہ گئے۔ دروازے ہیں یکا یک ایک ہیولا نمودار ہوا۔ ہم اتنے خوفزدہ ہوئے کہ چیخ بھی ہمارے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ پھر اس بھوت نے ہماری طرف قدم بڑھایا اور ہم وہیں ساکت رہ گئے۔ زمین نے ہمارے قدم جکڑ لیے تھے۔ ہمارے منہ سے دبی دبی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ہم شاید " بھو---- بھو------بھو----بھوت" کہہ رہے تھے۔ بھوت جب ذرا روشنی میں آیا تو پتا چلا کہ وہ قاسم بابا تھے۔

انہوں نے کہا" میاں تم اندھیرے میں اکیلے کیوں چلے آئے؟ صبح جا کر تمہیں لے آتا۔"

ہمیں غصہ تو بہت آیا مگر کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے اور لحاف اوڑھ کر بستر میں گھس گئے۔ ساری رات ہمیں بھاگتا بھوت خواب میں نظر آتا رہا۔ دوسرے دن ہماری بہن نے ہمارا بہت مذاق اڑایا۔ دن کی روشنی پھیلتے ہی ہمارا سارا خوف غائب ہو چکا تھا۔

انیسہ آپا نے کہا" بولو' اب جاؤ گے" بھاگتا بھوت" دیکھنے؟"

ہم نے فوراً کہا" جائیں گے مگر دن کے شو میں۔"

اس طرح کی ڈراؤنی اور جادوئی فلمیں ہم نے بہت دیکھیں۔ ڈرے بھی مگر باز نہیں آئے۔ قاسم بابا ہمیں تھیٹر کا کھیل دیکھنے کے لیے آمادہ کرتے رہے۔

" میاں شام کو چلیں گے۔ کھانا' پانی' پھل' مٹھائی ساتھ لے جائیں گے۔ لحاف بھی رکھ لیں گے۔ صبح تک کھیل چلے گا۔ نیند آئی تو ایک جھپکی لے لینا۔ وہاں کون سی بینچ ہوتی ہے جس پر سے گر جانے کا ڈر ہو۔ وہاں تو دری کا فرش ہوتا ہے۔ آرام سے ٹانگیں پسار کر بیٹھیں گے۔ ایسی ایسی پریاں اور دیو دکھاؤں گا کہ بائیسکوپ کو بھول جاؤ گے۔"

مگر ہم نے بابا قاسم کی یہ پیش کش کبھی قبول نہیں کی۔

ہر نوعیت اور ہر قسم کی فلمیں ہمارے بچپن اور لڑکپن کے زمانے میں بھی بنا کرتی تھیں اور آج بھی دنیا کے ہر ملک میں یہی رواج ہے۔ بھارت میں اس وقت بھی ہر موضوع پر مختلف زبانوں میں فلمیں بنائی جاتی ہیں لیکن ان کے بجٹ مختلف ہوتے ہیں۔ علاقائی زبانوں کی فلمیں آج بھی کم لاگت سے بنائی جاتی ہیں اور بلیک اینڈ وہائٹ ہوتی ہیں۔ ان میں کام کرنے والے اداکار بھی الگ ہوتے ہیں جو کم معاوضہ لیتے ہیں۔ اس طرح یہ کم خرچ سے بننے والی فلمیں اگر کم منافع بھی کماتی ہیں تو بنانے والے نقصان میں نہیں رہتے۔

پاکستان میں بھی ابتدائی سالوں میں ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ پنجابی فلمیں کم لاگت سے بنتی تھیں۔ پنجابی فلموں کے اداکار بھی مختلف تھے جو کم معاوضہ وصول کرتے تھے۔ کیونکہ یہ ایک محدود مارکیٹ کے لیے بنائی جاتی تھیں۔ رنگین اردو فلمیں بننے کے باوجود پنجابی فلمیں بلیک اینڈ وہائٹ ہی بنائی جاتی تھیں۔ مگر جب ان فلموں کو رنگین بنا دیا گیا' ان میں کام کرنے والوں کے معاوضے بہت زیادہ بڑھ گئے اور لاگت میں بھی بے انتہا اضافہ ہو گیا تو یہ گھاٹے کا سودا ہو گیا۔

بھارت میں بیشتر بنگالی اور تامل فلمیں آج بھی بلیک اینڈ وہائٹ بنتی ہیں۔ گجراتی' مراٹھی فلمیں زیادہ تر بلیک اینڈ وہائٹ میں ہوتی ہیں اور سستی بنتی ہیں۔ آرٹ فلموں کا بجٹ آج بھی پندرہ بیس لاکھ روپے ہے جو آسانی سے وصول ہو جاتا ہے۔ جادوئی' مار دھاڑ کی فلمیں' مذہبی فلمیں' معاشرتی فلمیں' مزاحیہ فلمیں' نغماتی فلمیں' سبھی طرح کی فلمیں بنتی ہیں اور سب اپنے اخراجات پورے کر لیتی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں معاملہ دوسرا ہے کہ ہر فلم کی لاگت ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہر فلم کا موضوع ایک جیسا ہوتا ہے۔ ہر فلم میں وہی مہنگے اداکار کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں فلم سازوں کو گھاٹا نہ ہو گا تو کیا ہو گا۔ بھارت میں سستی جادوئی فلمیں ہر زمانے میں بنتی رہی ہیں۔ ہمارے ہاں "سر کٹا انسان" بہت مہنگی فلم ہے۔ بس یہی فرق ہے اور یہی ہماری فلمی صنعت کی بدحالی کی وجہ۔

اسی زمانے میں ایک روز اداکار سلطان اور ان کے بھائی جہانگیر ہم سے ملے۔ یہ دونوں اداکار اورنگزیب کے بھائی ہیں۔ ایک اعلیٰ خاندان سے ان کا تعلق ہے۔ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ تینوں بھائی خوب رو، صحت مند اور دلکش شخصیت کے مالک ہیں۔ اورنگزیب ان میں سے سب سے چھوٹے ہیں اور " رنگو" کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ سلطان اور

جہانگیر کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا اس لیے دونوں میں بہت زیادہ بے تکلفی تھی۔ وہ بھائیوں سے زیادہ بے تکلف اور جگری دوست معلوم ہوتے تھے۔ اکثر وہ ساتھ ہی رہتے تھے۔ سلطان کو اداکاری کا شوق تھا جس پر ان کے والد کو اعتراض تھا لیکن آخر وہ انہیں منانے میں کامیاب ہو گئے۔ چند فلموں میں سلطان نے ہیرو کے طور پر کام کیا مگر زیادہ مقبول اور کامیاب نہ ہو سکے۔ جہانگیر بھی ایک خوبصورت شخصیت کے مالک تھے مگر انہیں اداکاری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سلطان نے کچھ عرصے بعد اداکارہ نسرین سے شادی کر لی تھی جو ایک دلکش اور پرکشش شخصیت کی مالک تھیں لیکن ہیروئن کے طور پر وہ بھی زیادہ نمایاں نہ ہو سکیں۔ ان کے حسن و جمال اور پر وقار شخصیت کے باعث انہیں فلموں میں کاسٹ کیا جاتا تھا مگر انہیں اداکاری کبھی نہ آئی۔ ان کی شخصیت اور سراپا کی دلکشی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار جب فلم اسٹار کرکٹ میچ کے سلسلے میں تمام فلمی ستارے کراچی پہنچے تو ایک تقریب میں اس وقت کے وزیراعظم پاکستان جناب حسن شہید سہروردی بھی موجود تھے مگر صبیحہ اور مسرت نذیر کو نظر انداز کر کے انہوں نے بطور خاص نسرین کے ساتھ بہت دیر تک بات چیت کی۔

نسرین خوش جمال ہونے کے ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھیں۔ بہت اچھی انگریزی بولتی تھیں۔ محفل کے آداب اور طور طریقوں سے بھی بخوبی واقف تھیں اس لیے ہر محفل میں سب کی نگاہوں کا مرکز بن جاتی تھیں۔ انہوں نے نذیر اجمیری صاحب کی فلم ''شہرت'' میں ہیروئن کا کردار کیا تھا لیکن فلموں میں محض خوبصورتی سے کام نہیں چلتا' اداکارانہ صلاحیتیں بھی ہونی لازمی ہیں۔ اسی لیے وہ بطور ہیروئن زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے اداکار سلطان سے شادی کر لی اور ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہیں۔ سلطان بھی اداکاری میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کر سکے تھے اور فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو کر انہوں نے کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اس طرح فلمی افق پر تو یہ دونوں ستارے بن کر نہ جگمگا سکے مگر ان دونوں کے ستارے ایک دوسرے سے بالکل ہم آہنگ ہو گئے۔

سلطان اور جہانگیر ایک دن ہمیں ملے تو بہت ہیجان میں مبتلا تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے دور سے اشارے کرنے شروع کر دیے اور کار سے اتر کر ہماری طرف دوڑے آئے۔

''کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے؟'' ہم نے پوچھا۔

بولے ”آفاقی۔ تمہیں ایک خبر سنانی ہے جو تم خود بھی نہیں جانتے۔“

”اچھا۔ وہ کس بارے میں؟“

”تمھارے دوست اعجاز کے بارے میں۔“

”اعجاز نے کیا کر دیا؟“ ہم نے پوچھا۔

”کیا تو نہیں مگر کرنے والا ہے۔“ جہانگیر نے کہا۔

سلطان نے کہا ”وہ بہت بڑا دھماکا کرنے والا ہے۔“

ہم نے کہا ”بھائی وہ تو فن کار آدمی ہے وہ بھلا کیا دھماکا کرے گا؟“

”ادھر آؤ۔ ریستوران میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

وہ ہمیں لے کر مال روڈ کے ایک ریستوران میں چلے گئے۔ چائے کا آرڈر دیا اور پھر کہا ”تمھارا دوست بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ اسے سمجھاؤ ایسا نہ ہو کہ منہ کے بل گر جائے۔“

”بھئی کچھ بات بھی تو بتاؤ۔ کیوں پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔“ ہم نے کہا

”تو سنو اعجاز آج کل میڈم نور جہاں کے ساتھ عشق کر رہا ہے۔“

ہم ہنسنے لگے ” چھوڑو یار۔ کیوں بے پر کی اڑا رہے ہو کہاں میڈم نور جہاں اور کہاں اعجاز اور اعجاز تو بہت اچھا اور شریف آدمی ہے۔“

”عشق کرنا غیر شریفانہ کام تو نہیں ہوتا۔ اس نے تمہیں کچھ بتایا“!

”نہیں تو۔“

”تو پھر سن لو۔ آج کل وہ دونوں مختلف جگہوں پر ملاقاتیں کرتے ہیں۔ وہ نور جہاں سے ملاقات کے لیے ان کی کوٹھی پر جاتا ہے تو اپنی کار مسرت نذیر کی کوٹھی کے سامنے کھڑی کر کے وہاں سے پیدل ہی میڈم نور جہاں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔“

”مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

''ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

پھر انہوں نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ کس طرح ایک دن پہلے گلبرگ کے مین بلیوارڈ پر رات کو ساڑھے بارہ بجے انہوں نے میڈم کی کار کو کھڑا پایا۔ وہ مدد کے لیے کار کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ میڈم اور اعجاز کار میں موجود ہیں۔ میڈم کی کار اچانک خراب ہو گئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ دونوں گھبرا گئے۔

''مگر تم اتنی رات گئے وہاں کیا کر رہے تھے؟'' ہم نے پوچھا۔ اس لیے کہ اس زمانے میں لاہور میں آٹھ نو بجے ہی رات ہو جاتی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک برائے نام رہ جاتا تھا اور گلبرگ کی شاہراہ رات کو دس بجے کے بعد بالکل سونی نظر آتی تھی۔

وہ ہنسنے لگے۔ '' یار ہم تو ٹھہرے آوارہ گرد۔ ساری رات گھومتے پھرتے ہیں مگر اعجاز اور میڈم کو اتنی رات گئے یوں گھومنے کی کیا ضرورت ہے؟''

ہمیں ان کی بات پر یقین نہیں آیا۔ پھر بھی کہا ہم اعجاز سے بات کریں گے۔

''دیکھو۔ ہمیں ضرور بتانا۔ یہ خبر سو فی صد درست ہے۔''

ہم ایورنیو اسٹوڈیو پہنچے تو دور ہی سے اعجاز نظر آ گئے۔ اعجاز ہیرو کے طور پر مقبول ہونے لگے تھے۔ ان کو پسند کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا اور تو اور کئی ہیروئنیں بھی انہیں میٹھی نظروں سے دیکھنے لگیں تھیں اور ان سے شادی کرنے کی خواہش مند تھیں۔ ان کی فلمیں بھی کامیاب ہو رہی تھیں اور لوگوں کا خیال تھا کہ اگر اسی طرح محنت کرتے رہے تو وہ بہت جلد صف اول کے ہیرو بن جائیں گے۔ جہاں تک شکل وصورت کا تعلق ہے اعجاز بنے بنائے ہیرو تھے۔ گورے چٹے' بڑی بڑی آنکھیں' دلکش ناک نقشہ۔ ان کا قد زیادہ لمبا نہیں تھا مگر ان میں مردانہ وجاہت اور کشش موجود تھی۔ ان سے ہماری دوستی پرانی تھی۔ ان کے اندر کوئی بری عادت بھی نہیں تھی۔ نہ شراب' نہ سگریٹ' نہ پان' نہ اور کوئی بری عادت۔ ان کا کوئی اسکینڈل بھی نہیں بنا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ صنف نازک کی صحبت میں قدرے گھبرائے ہوئے سے نظر آتے تھے۔ اب اگر ایسے آدمی کے بارے میں اچانک پتا چلے کہ وہ میڈم نور جہاں کے ساتھ چپکے چپکے عشق کر رہا ہے تو کوئی کیسے یقین کر لے؟ اسی لئے ہمیں بھی سلطان اور جہانگیر کی باتوں پر

یقین نہیں آیا۔ سوچا کہ یہ اعجاز سے جیلس ہو گئے ہیں اس لئے ایسی افواہیں اڑا رہے ہیں۔

اعجاز نے ہمیں دیکھا تو پاس چلے آئے۔ ہم فوراً انہیں بازو سے تھام کر ایک طرف لے گئے۔

''بھئی کہاں ہو؟ بہت عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی۔'' ہم نے کہا

''بس۔ آج کل کام زیادہ ہے۔ اس لیے ڈے نائٹ مصروف رہتا ہوں۔''

''فلموں میں یا اور کسی کام میں؟''

انہوں نے ایک لمحہ ہمیں دیکھا اور پھر اپنی مخصوص ہنسی ہنسنے لگے۔ '' قصہ کیا ہے؟''

ہم نے کہا۔ '' قصہ تو تم سناؤ کہ کوئی رومانس چل رہا ہے۔''

ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ '' تمہیں کس نے بتایا؟''

''بس بتا دیا کسی نے اور تمھارے اڑے ہوئے رنگ نے اس کی تصدیق کر دی۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور تم نے ہمیں خبر تک نہ ہونے دی۔''

وہ گھبرا گئے ''کہاں تک نوبت پہنچ گئی؟''

ہم نے کہا ''شادی تک۔''

''ارے نہیں یار۔ بالکل جھوٹ ہے۔''

''ارے یہ بھی جھوٹ ہے کہ تم راتوں کو میڈم کی کوٹھی پر جاتے ہو اور اپنی کار مسرت نذیر کی کوٹھی کے سامنے کھڑی کر جاتے ہو۔ وہ غریب مفت میں بدنام ہو رہی ہے اور یہ بھی جھوٹ ہے کہ آدھی رات گئے میڈم کی کار میں گھومتے پھرتے ہو؟''

اعجاز بے چارے سیدھے سادھے آدمی ہیں۔ فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ ''یار کیا بتاؤں میں تو خود بہت پریشان ہوں۔ میڈم تو بس میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ میری فلموں کے سیٹ پر آ جاتی ہیں اور کافی دیر تک بیٹھی رہتی ہیں۔ اور تو اور رات کو گیارہ بارہ بجے کار لے کر میرے گھر پر آ جاتی ہیں اور جب تک میں باہر نہ نکلوں ہارن بجاتی رہتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں سمن آباد میں رہتا ہوں۔ وہاں کا ماحول اور قسم کا ہے۔ ان کے ہارن سن کر پڑوس کے لوگ باہر نکل آتے ہیں۔

جب تک میں گھر سے نکل کر ان کے پاس نہ جاؤں وہ ہارن بجاتی رہتی ہیں۔اب بتاؤ میں کیا کروں؟ یار میں تو بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ تم کو پتا ہے کہ گھر میں میرے ساتھ بہنیں بھی رہتی ہیں۔ ہمارے گھر کا ماحول بالکل فلمی نہیں ہے لیکن ان باتوں کی وجہ سے مجھے بہت شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔"

اعجاز کا یہ دکھڑا سن کر ہم نے بغور ان کے چہرے کا جائزہ لیا۔ انہوں نے سلطان اور جہانگیر کی فراہم کردہ خبر کی تصدیق تو کر دی تھی مگر کسی اور انداز میں۔

ہم نے پوچھا "سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم میڈم سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

اعجاز نے فوراً جواب دیا "یار کیسی باتیں کر رہے ہو! کہاں میں' کہاں میڈم'۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ہم نے اعجاز کی بات پر یقین کر لیا۔ اس لئے کہ وہ صاف گو آدمی تھے۔ ہمیں ان کی باتوں پر یقین تھا۔

اس کے دو تین دن بعد ہم "گمراہ" کے سیٹ پر گئے تو پاشا صاحب شوٹنگ میں مصروف تھے۔ اعجاز بھی سیٹ پر تھے اور ان کی ہیروئن بھی شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھیں مگر اس سیٹ پر ایک خصوصی مہمان بھی موجود تھا اور وہ تھیں میڈم نور جہاں۔

میڈم نور جہاں عام طور پر کسی اور کے سیٹ پر جانے کی عادی نہ تھیں مگر انہیں "گمراہ" کے سیٹ پر موجود دیکھا تو اعجاز کی باتوں کی تصدیق ہو گئی۔ اعجاز نے قدرے شرمیلی نظروں سے ہمیں دیکھا اور چائے کی دعوت دی۔ ہم نے محسوس کیا کہ سیٹ پر موجود ہر شخص کو میڈم نور جہاں کی موجودگی کا سبب معلوم تھا۔ کچھ دیر بعد میڈم سیٹ پر سے رخصت ہو گئیں تو پاشا صاحب نے ہم سے کہا۔ "آفاقی صاحب' یہ لڑکا ابھرتا ہوا اداکار ہے۔ اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔ اسے ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہیے۔"

اعجاز جھینپے سے انداز میں مسکرانے لگے اور بولے۔ "پاشا جی، میری طرف سے کوئی چکر نہیں ہے۔"

ہم چائے پی کر چلے آئے اور مطمئن ہو گئے۔ دو دن بعد وہ دونوں فرشتے (سلطان اور جہانگیر ہم نے یہی نام رکھ چھوڑا تھا) ہمیں ملے اور پوچھا۔ "کیوں؟ اپنے دوست سے پتا کیا؟"

ہم نے جواب دیا۔ "ہاں' مگر وہ اس معاملے میں انٹرسٹیڈ نہیں ہے۔"

وہ دونوں بے ساختہ ہنسنے لگے۔ ''آفاقی، کس کی باتوں میں آئے ہو۔ یہ سو فیصد سچی خبر ہے دیکھ لینا۔''
ہم نے کہا ''یار کیوں کسی کو بدنام کرتے ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''
چند دن اور گزر گئے۔ کراچی سے ہفت روزہ ''نگار'' کے مالک و مدیر الیاس رشیدی صاحب لاہور آئے تو خلاف معمول دو تین دن تک ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بس وہ فون پر اتنا کہہ دیا کرتے تھے کہ ذرا مصروف ہوں۔ فارغ ہو کر ملوں گا۔

ایک روز صبح کے وقت ہم ان کے کمرے میں گئے تو وہ اکیلے ہی تھے۔ بہت حیرت ہوئی پوچھا ''کیا بات ہے خلاف معمول کوئی مہمان موجود نہیں ورنہ یہاں تو رات کو بھی لوگ سو جاتے ہیں''۔
وہ جذباتی ہو گئے کہنے لگے ''آفاقی یہ سب کتنے مخلص اور پیار کرنے والے لوگ ہیں مجھے اس شہر میں اجنبی اور پردیسی ہونے کا احساس نہیں ہونے دیتے''۔
ہم نے کہا ''اس میں خلوص سے زیادہ خود غرضی کا دخل ہے۔ بھائی جہاں سارے دن مفت میں کھانا پینا اور تفریح ملے اور شام کو بہترین مہنگی شراب بھی دستیاب ہو جائے ایسی جگہ چھوڑ کر کون کافر جائے گا؟''
''ارے نہیں چندا'' انہوں نے اپنے خاص انداز میں کہا ''ایسی بات نہیں؟ یہ لوگ واقعی مجھ سے پیار کرتے ہیں''۔
ہم نے کہا ''کسی دن راشن بند کر کے دیکھ لو اصلیت معلوم ہو جائے گی''۔
انہوں نے راشن تو بند نہیں کیا کہ وضع داری مانع تھی لیکن کچھ عرصے بعد انہیں احساس ہو گیا کہ ہم نے جو کہا تھا وہ غلط نہ تھا۔

ایک روز ہم شام کے وقت محمد علی صاحب کے ہوٹل پہنچے تو دیکھا کہ کمرے میں رونق لگی ہوئی ہے۔ فلمی صنعت سے متعلق بہت سے لوگ موجود تھے۔ حمایت علی شاعر اور احمد رشدی بھی حاضرین محفل میں شامل تھے۔ حمایت علی شاعر کا محمد علی بہت لحاظ اور احترام کرتے تھے اس لئے کہ وہ ان کے بڑے بھائی ارشاد صاحب کے دوست ہیں۔ محمد علی کے ساتھ حمایت علی شاعر نے لاہور میں کئی فلموں میں کام کیا۔ ان کی فلم ''لوری'' میں علی زیب دونوں نے کام کیا تھا۔ کمرے میں تاش کی بازی جمی ہوئی تھی۔ ایک طرف کسی فلمی موضوع پر دھواں دار بحث جاری تھی۔ چائے

کافی کا دور چل رہا تھا۔ شائقین کیلئے جام و مینا کا بھی بندوبست تھا۔ حاضرین محفل بستر پر صوفے پر، قالین پر ہر جگہ براجمان تھے ہم اس وقت بھی حیران ہوا کرتے تھے اور آج بھی حیران ہیں کہ ایک چھوٹے سے کمرے میں اتنے بہت سے لوگ کیوں کر سما جاتے تھے؟ محمد علی اس کے جواب میں مسکرا کر کہتے تھے۔

''آفاقی دل بڑا ہونا چاہیے''۔

کھانے پینے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ انڈس ہوٹل میں ایک بہت اچھا ریستوران بھی تھا۔ کھانے پینے کی ہر چیز وہاں سے دستیاب ہو جاتی تھی۔ چنانچہ مال مفت، دل بے رحم والا حساب تھا۔

رات گئے تک یہ محفل جاری رہی۔ پھر آہستہ آہستہ مجمع چھٹنے لگا۔ آخر میں بارہ ساڑھے بارہ بجے صرف چار ہی باقی رہ گئے۔ یعنی محمد علی، حمایت علی شاعر، احمد رشدی اور ہم۔ ہم دونوں گھر جانا چاہتے تھے۔ حمایت علی شاعر کو محمد علی نے رات کے قیام کیلئے روک لیا تھا۔ اب ان کا اصرار تھا کہ کہیں باہر جا کر کھانا کھایا جائے۔ ہم نے بہتیرا کہا کہ پیٹ میں گنجائش نہیں ہے مگر وہ نہیں مانے۔ کھلانے پلانے میں محمد علی ہمیشہ سے شیر ہیں۔ یہ تجویز پیش کی گئی کہ انڈس ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئے ہیں کہیں باہر چلنا چاہیے۔

باہر نکلے تو جاڑوں کی رات تھی۔ بارہ ساڑھے بارہ کا عمل تھا۔ لاہور کی مال روڈ سنسان اور ویران پڑی تھی۔ کافی دیر کے بعد اکا دکا کار گزر جاتی تھی۔ پیدل چلنے والوں کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ اس زمانے میں لاہور ایسا ہی اونگھتا ہوا، شریفانہ قسم کا شہر تھا۔ کراچی والے مذاق اڑاتے تھے کہ یہاں تو لوگ سات بجے ہی سو جاتے ہیں۔ یا گھروں میں گھس کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں ٹریفک کا ہجوم بھی نہیں تھا بلکہ ٹریفک برائے نام ہی تھا۔ ہمیں مال روڈ پر تقریباً سو گز دور ایک ریستوران میں جانا تھا۔ اس کا نام غالباً ''روبینہ'' تھا۔ اب ناپید ہو گیا ہے۔ اس کی یہ خوبی تھی کہ رات کو دو تین بجے تک یہاں کھانا مل جاتا تھا۔ رات کو شوٹنگ یا دوسرے کاموں سے فارغ ہونے والوں یا مے نوشوں کیلئے یہ بہترین اڈا تھا۔ کھانا بھی اچھا ہوتا تھا اس ہوٹل کے مالک کسی زمانے میں فلم کے رسیا تھے۔ بعد میں مشرق وسطیٰ چلے گئے اور وہاں سے پیسہ کما کر آئے تو لاہور میں ایک ریستوران اور '' کار واش'' قائم کیا۔ یہ ''کار واش'' اس زمانے میں لاہور والوں کیلئے بڑی جدت تھی کہ ایک طرف سے کار اندر داخل ہو کر دوسری طرف سے دھلی دھلائی باہر نکل

جائے۔ شیمپو صابن بھی اس پر مل دیا جائے۔ انسانی ہاتھ لگنے کی نوبت ہی نہ آئے۔اور لطف یہ کہ آپ خود بھی کار کے اندر شیشے چڑھا کر بیٹھے رہیں۔ یورپ امریکہ میں تو یہ عام چیز تھی مگر لاہور والوں کیلئے ایک عجوبہ تھا اس لیے بہت سے لوگ محض لطف لینے کیلئے "کار واش" پہنچ جاتے تھے۔ بیوی بچوں کو بھی کار کے اندر بھر لیتے اور اندر بیٹھ کر کوک وغیرہ پیتے رہتے اور چپس وغیرہ کھاتے۔ بلکہ نان کباب سے بھی شوق فرماتے تھے۔ گویا ایک طرح سے یہ بھی زندہ دلان لاہور کی سیر و تفریح کا حصہ تھا۔

سردی کافی تھی اور سڑک کو سنسان پا کر کچھ زیادہ ہی لگ رہی تھی۔ انڈس ہوٹل سے باہر نکلے تو ہمیں سامنے دو پولیس والے نظر آئے لمبے لمبے ڈنڈے ہاتھوں میں سنبھالے، اوور کوٹ پہنے کھڑے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھا تو بولے "بابو جی۔ بالکل فکر نہ کرو۔ ہم آپ کی حفاظت کیلئے یہاں کھڑے ہیں"۔

یہ کہہ کر انہوں نے سڑک پر لاٹھیاں مار کر گویا ایک طرح سے ہمیں سلامی دے کر رخصت کر دیا۔ اس میں کچھ محمد علی کی فیاضی کا بھی دخل تھا۔ وہ ہر روز انہیں دو چار روپے بخشش دے دیا کرتے تھے۔

"روبینہ" میں پہنچے تو اندر خاصی گہما گہمی تھی۔ دس پندرہ سے زیادہ مہمان موجود تھے۔ اتنی رات گئے۔ یہ بھی ایک ریکارڈ ہی تھا۔ ہوٹل کے مینجر نے بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ وہ ہمیں بھی جانتے تھے اور پھر ایک اداکار بھی ہمارے ساتھ تھا۔ جتنی بھی آؤ بھگت کرتے کم تھی۔ فوراً مؤدب بیرے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

رشدی صاحب بولے "ایسی اہمیت دیکھ کر تو گھر میں کھانے کو جی ہی نہیں چاہتا"۔

حمایت علی شاعر نے پوچھا "کیوں۔ کیا گھر میں تمہیں اہمیت نہیں دی جاتی؟"

وہ بولے "کتنی بھی اہمیت سہی۔ یہ بات تو نہیں ہے کہ درجن بھر لوگ سر جھکائے کھڑے ہیں اور ایک اشارے پر حاضر ہو جاتے ہیں۔ بیوی تو اتنی رات گئے مشکل ہی سے کھانا گرم کرنے کیلئے بستر سے نکلتی ہے۔ دوبارہ بلاؤ تو گھورتی ہے مگر ان بیروں کی کیا بات ہے"۔

محمد علی نے کہا "جتنی ٹپ آپ بیروں کو دیتے ہیں وہی بھابی کو بھی دیں تو پھر دیکھئے۔ اس کے علاوہ بیروں کو تنخواہ بھی ملتی ہے۔ بیوی کو بھلا کون تنخواہ دیتا ہے"۔

رشدی صاحب ترنگ میں تھے۔ بولے ''بس۔ کل سے میں بھی گھر میں ٹپ اور تنخواہ دیا کروں گا''۔

جتنی دیر میں گرم گرم کھانا آیا ہم لوگ گپ شپ کرتے رہے۔ حمایت صاحب کہہ رہے تھے۔ ''آفاقی تم بھی رات کو یہیں رہ جاؤ''۔

ہم نے کہا ''کلام تو نہیں سنائیں گے ؟''

وہ ہنسنے لگے ''بھئی اس کی گارنٹی نہیں ہے''۔

ابھی کھانا ہماری میز پر لگایا ہی جارہا تھا کہ رشدی صاحب ہاتھ دھونے کیلئے غسل خانے کی طرف چل پڑے۔ راستے میں ایک میز پر تین چار لمبے چوڑے اور تنومند سے سوٹ پوش حضرات بیٹھے تھے۔

آخر ایک دن صبح ان کا فون آیا۔ ''شام کو کیا کر رہے ہوں ؟''

ہم نے کہا ''آپ کہئے ؟''

بولے ''شام کو چھ بجے کے بعد ہوٹل پر آجانا۔''

وہ مال روڈ پر ایلفنسٹن ہوٹل میں قیام کرتے تھے۔ جو بعد میں انڈس ہوٹل ہو گیا تھا۔

شام کو ہم پہنچے تو وہ اسی وقت اسٹوڈیو سے آئے تھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ باہر مال روڈ پر خوب رونق اور جگمگاہٹ تھی۔ اس زمانے میں مال روڈ پر سروس روڈ اور مال روڈ کے درمیان میں سبز گھاس کے تختے بھی تھے جن پر شام کو یار لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ الیاس صاحب ہمیں ساتھ لے کر ایک تختے پر بیٹھ گئے۔

''کن کاموں میں مصروف ہیں ؟'' ہم نے پوچھا۔ ''اتنے دن ہو گئے ہیں لاہور آئے ہوئے اور ملاقات تک نہ ہو سکی۔''

انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک پان نکال کر منہ میں ڈالا۔ پھر کہنے لگے ''اگر تمہارے پیٹ میں رہ جائے تو ایک خبر سناؤں ؟''

ہم نے کہا ''کیسی خبر ؟''

بولے ”یہ کسی کو بتانے کی نہیں ہے مگر میرے لئے پیٹ میں رکھنا بھی مشکل ہے۔اس لئے تمہیں بتارہا ہوں۔وعدہ کرو کہ کسی کو نہیں بتاؤ گے“!

ہم نے وعدہ کرلیا۔

کہنے لگے ”اعجاز اور نور جہاں کی شادی ہو گئی ہے۔“

یوں لگا جیسے ہمارے سر پر بم پھٹ گیا۔ساکت انہیں دیکھتے رہ گئے۔

”الیاس بھائی۔یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”سچ کہہ رہا ہوں۔میں اسی چکر میں لگا ہوا تھا۔“

”مگر۔۔۔مگر یہ کب ہوا۔کیسے ہوا،یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔“

بولے ”پھر بھی ہو گیا۔“

اس کے بعد انہوں نے تفصیل سنائی کہ کس طرح یہ رومان اندر اندر پروان چڑھ رہا تھا۔میڈم ہر قیمت پر اعجاز سے شادی کرنے پر مصر تھیں۔اعجاز کی بھی رضامندی شامل تھی اگرچہ وہ کھل کر بیان نہیں کرتا تھا۔آخر یہ کہ چپکے چپکے نکاح ہو گیا۔گنتی کے چند لوگ اس میں شامل تھے۔پھر کہا۔”دیکھو میں نے یہ خبر صرف تم ہی کو بتائی ہے‘ کسی کو بتانہ دینا۔“

ہم نے وعدہ کر لیا۔وہ مزید تفصیلات بتاتے رہے اور ہم اس بات پر افسردہ ہو گئے کہ اعجاز نے ہمیں دھوکے میں رکھا۔پھر سوچا کہ ایسے معاملات میں ہر ایک کو رازدار بھی نہیں بنایا جاسکتا۔وہ بھی اپنی جگہ حق بجانب تھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ الیاس صاحب نے پوچھا۔

ہم نے کہا”جو ہونا تھا،اب وہ ہو چکا۔اب تو یہی دعا کرنی چاہیے کہ یہ شادی کامیاب رہے۔“

الیاس بھائی نے بتایا کہ میڈم بالکل بدل گئی ہیں۔نمازیں پڑھتی ہیں۔قرآن کی تلاوت کرتی ہیں۔انہوں نے اعجاز کی خاطر اداکاری ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے فی الحال گانے گائیں گی لیکن اگر اعجاز نے کہا تو گلوکاری بھی چھوڑ دیں گی۔انہوں نے اعجاز سے شادی کرنے کے لئے بہت قربانیاں دی ہیں۔

ہم فکر مند ہو گئے ”الیاس بھائی، اب اعجاز کو سمجھانا چاہیے کہ وہ اس شادی کو ہمیشہ نبھائے۔ ایسا نہ ہو عمروں کے فرق کی وجہ سے کچھ عرصے بعد اکتا جائے۔“

”ارے نہیں بھئی۔ وہ بہت سیریس ہے۔“

ہم دونوں بہت دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے اور دعائیں کرتے رہے کہ اللہ ان دونوں کو نیک توفیق عطا کرے۔

اعجاز سے ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ نہ ہی ہم نے کوشش کی۔ ملتے بھی تو کیا کہتے ؟

مگر زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ اچانک فلمی دنیا میں ایک بم پھٹ گیا۔ اعجاز اور نور جہاں کی شادی کی خبر کا راز فاش ہو گیا۔

ہوا یہ کہ شادی کے موقع پر میڈم باقاعدہ دلہن بنی تھیں۔ اس موقع پر ایک ہمراز فوٹو گرافر معراج کو بلایا گیا تھا تا کہ اس یادگار موقع کی تصاویر بنالی جائیں۔ معراج اور منظور اسٹل فوٹو گرافر تھے اور فلم انڈسٹری میں بہت مقبول تھے۔ ہر ایک سے ان کی دوستی اور بے تکلفی تھی۔ ہر ایک کے راز دار تھے۔ ان کا گرین اسٹوڈیو مال روڈ پر کافی ہاؤس کے نزدیک تھا جہاں سر شام فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے دوست احباب اکٹھے ہو کر جام و مینا سے شغل فرماتے تھے۔ شام کے بعد یہ اسٹوڈیو ایک کلب کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا۔

معراج ، منظور کی بے پروائی کے باعث یہ راز فاش ہو گیا۔ انہوں نے فلم ڈیولپ کر کے خشک کرنے کے لئے لٹکا دی۔ اسی وقت اداکار ہمالیہ والا پہنچ گئے ان کی نظر پڑی تو دیکھا کہ نور جہاں دلہن بنی بیٹھی ہیں۔ پھر دولہا کے لباس میں اعجاز بھی نظر آ گئے۔ انہوں نے اپنے دماغ پر زور ڈالا مگر کوئی ایسی فلم یاد نہ آئی جس میں اعجاز اور نور جہاں ایک ساتھ کام کر رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ تصویریں حقیقی زندگی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہمالیہ والا گرین اسٹوڈیو سے سیدھے ایورنیو اسٹوڈیو پہنچے اور چند منٹ کے اندر یہ خبر عام ہو گئی۔ ہر ایک نے اس پر تبصرے شروع کر دیے۔ فلمی دنیا کے لئے یہ ایک چونکا دینے والی اطلاع تھی۔ کچھ عرصے سے افواہیں تو گرم تھیں مگر واقعی ایسا ہو جائے گا یہ کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔

الیاس رشیدی صاحب ہمیں ایورنیو اسٹوڈیو میں ہی مل گئے۔ اعجاز بھی وہیں موجود تھے اور اس اچانک انکشاف سے بوکھلا گئے تھے۔ انہوں نے میڈم نور جہاں کی کوٹھی پر فون کیا اور دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ جب بھانڈا پھوٹ ہی گیا ہے تو اب اس خبر کی تصدیق کر دینی چاہیے۔

میڈم نے اعجاز سے یہ بھی کہا کہ آپ فوراً گھر پہنچ جائیں۔ اس طرح الیاس صاحب اور ہم اعجاز کی کار میں بیٹھ کر گلبرگ روانہ ہو گئے۔ اعجاز کچھ پریشان بھی تھے' بے حد خوش بھی تھے۔ خوب قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے۔ مگر ایک دم خاموش ہو کر فکر مند بھی ہو جاتے تھے۔ ہم سے کہنے لگے۔ ''یار آفاقی سوری مگر تم تو جانتے ہو کہ معاملہ ہی کچھ ایسا تھا۔''

ہم نے کہا۔ ''ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے۔''

گلبرگ میں میڈم کی کوٹھی پر پہنچے تو وہ کار کے ہارن کی آواز سن کر ایک سادہ سی ساری میں ملبوس ننگے پاؤں دوڑی ہوئی آئیں۔ مارے خوشی کے ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ہم نے مبارک باد پیش کی تو انہوں نے مسکرا کر قبول کر لی۔ پھر اعجاز کو بتایا کہ اس خبر کی تصدیق کے لئے کہاں کہاں سے' کس کس کے ٹیلی فون آئے ہیں۔

''الیاس بھائی' کیا بتاؤں' بہت سی ہیروئنیں تو انگاروں پر لوٹ رہی ہیں۔''

مٹھائی منگائی گئی۔ چائے اور کافی آگئی اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اعجاز بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ میڈم نور جہاں بھی مارے خوشی کے زمین پر قدم نہیں رکھ رہی تھیں۔ سارا ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ ہم نے میڈم نور جہاں کو ایک بالکل نئے روپ میں دیکھا۔ اس کے بعد بھی ہم اعجاز کے ساتھ اور اکثر الیاس بھائی کے ساتھ ان کے گھر جاتے رہے۔ ہم نے ہمیشہ میڈم کو سادہ لباس میں ہی دیکھا۔ اعجاز کو رخصت کرنے اور خوش آمدید کہنے کے لئے وہ خود کار تک آتی تھیں۔ کھانا خود ہی پکاتی تھیں۔ نمازیں پڑھتی تھیں۔ گھر کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ اعجاز کے ساتھ ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ بار بار فون کر کے اس کی خیریت پوچھی رہتی تھیں۔ کئی بار دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ظاہر داری کر رہی ہیں۔ ہر وقت اعجاز کے گرد گھومتی رہتی تھیں۔ اس کے برابر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ جاتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مشاہدے اور اندازے کے مطابق اگر میڈم نور جہاں نے

زندگی میں کسی سے عشق کیا تو وہ اعجاز تھے۔ شوکت صاحب کے ساتھ بھی انہیں بہت محبت رہی مگر اعجاز کے ساتھ انہیں عشق تھا۔ اعجاز کی ہر زیادتی کو انہوں نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ یہاں تک کہ اپنی عزت نفس اور ضدی طبیعت کو بھی اعجاز کی خاطر کچل ڈالا۔ اعجاز کی محبوبہ فردوس کے لئے فلم ''ہیر رانجھا'' میں گانے بھی ریکارڈ کرائے۔ انہوں نے اپنا گھر بچانے کی بہت کوشش کی مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس کا انہیں ہمیشہ قلق رہا۔

چند سالوں قبل گلبرگ کے ایک ریستوران میں میڈم ایک نجی قسم کے ڈنر میں موجود تھیں بہت اچھے موڈ میں تھیں اور بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں۔ کسی نے عشق اور محبت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ایک آہ بھری اور کہا۔

''عشق میں خدا کسی کو مبتلا نہ کرے۔ یہ انسان کو ذلیل کر دیتا ہے۔ کہیں کا نہیں چھوڑتا''

میڈم نور جہاں واقعی اس موضوع پر اظہار خیال کرنے کی مجاز ہیں۔

اعجاز سے شادی کے بعد ان کے دوست کی حیثیت سے ہمیں بارہا میڈم کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بھی کھلایا اور ایک دن الیاس صاحب کو اور ہمیں اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی بھنی ہوئی مرغی کا مزہ بھی چکھایا جسے آج تک ہم نہیں بھولے۔ ہم نے میڈم کو اعجاز کے رشتے سے بھابی کہنا شروع کر دیا۔ وہ یہ سن کر خوش ہوتی تھیں۔ پھر حالات بدل گئے۔ اعجاز کے ساتھ ان کی علیحدگی ہو گئی۔ مگر ہم اکثر بے خیالی میں انہیں ''بھابی'' کہہ کر مخاطب کرتے رہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اس بات پر کبھی نہیں ٹوکا۔

1953ء میں جب کہ فلم ساز اور ہدایت کار کے طور پر انور کمال پاشا کا طوطی بول رہا تھا، ایک اور دھماکا خیز شخصیت نے فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ یہ ایم اے خان سینئر تھے جنہیں بڑے خاں صاحب بھی کہا جاتا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی ایم اے خان جونیئر تھے۔ وہ بھی پاکستان' مشرقی پاکستان اور بعد میں بنگلہ دیش میں فلم سازی کے شعبے سے منسلک رہے۔ بڑے دلچسپ اور مخلص آدمی تھے۔ ان کے بڑے بھائی ایم اے خاں سینئر کو جب فلم ''سسی'' بنانے کا فرض سونپا گیا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ''سسی'' کو ایک انتہائی کامیاب اور یادگار فلم بنا دیں گے۔ ایم اے خاں کا تعلق ڈیرہ دون سے تھا۔ گہرا سانولا رنگ' لمبا قد، پر وقار سراپا' ان کی آواز سننے والوں کو متاثر کر دیا کرتی

تھی۔ بہت مرعوب کن شخصیت کے مالک تھے۔ انگلستان بھی ہو آئے تھے۔ ''سسی'' دراصل جگدیش چندر آنند کی فلم تھی۔ جس میں چوہدری عید محمد بھی شریک تھے۔

انہوں نے اس فلم بندی کا فریضہ بڑے ایم اے خاں کو سونپ دیا تھا۔ خاں صاحب بہت اچھی انگریزی بولتے تھے۔ بلکہ اکثر انگریزی ہی بولتے تھے۔ اردو اور پنجابی بھی بڑی روانی سے بولا کرتے تھے۔
ایم اے خاں نے زندگی کا آغاز ایک سنیما آپریٹر کی حیثیت سے کیا تھا' بعد میں مشینوں کے ماہر بن گئے۔ انگریزی انہوں نے اپنی کوششوں سے سیکھی تھی۔ انگلستان گئے تو انگریزوں سے وقت کی پابندی اور منصوبہ بندی سیکھ کر آئے۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت ترقی کی تھی۔ وہ لاہور میں چوہدری عید محمد کے ادارے ایور گرین پکچرز کے جنرل منیجر تھے جب فلم ''سسی'' بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔
''سسی'' بنانے کا پس منظر یہ تھا کہ اس سے پہلے پاکستان کے فلم تقسیم کار پاکستان میں فلم بنانے سے متفق نہ تھے مگر جب بھارتی فلموں کی درآمد کے خلاف تحریک زور پکڑ گئی تو انہوں نے بھی اپنے خیالات پر نظرثانی کی اور اس طرح پاکستان کے چیدہ چیدہ فلم تقسیم کاروں نے فلم سازی کا آغاز کر دیا۔
ایم اے خان سے ہماری ملاقات ان کے شاندار دفتر میں ہوئی تو ہم ان کی ان تھک مصروفیات اور صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ مسلسل مختلف کام کرتے تھے اور سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے رہتے تھے۔ ان کے دفتر پر کسی انگریزی دفتر کا گمان گزرتا تھا۔ وہ یوں تو رعب داب والے آدمی تھے مگر جس سے بے تکلف ہو جاتے تھے اس کے ساتھ لطیفہ بازی بھی شروع کر دیتے تھے۔ ان کے لطیفے اکثر انگریزی میں ہوا کرتے تھے۔ وہ پہلیاں بھی بوجھنے کو دیا کرتے تھے اور عام طور پر خود ہی پہلی پہیلی بوجھتے تھے۔ وہ خوش لباس انسان تھے ہر کام کو بہت تفصیل کے ساتھ مقررہ وقت پر کرنے کے عادی تھے۔ ''سسی'' کی تخلیق میں ان کی صلاحیتوں کا بہت دخل تھا۔ انہیں کھیلوں سے بھی دلچسپی تھی۔ خصوصاً کرکٹ کے وہ دلدادہ تھے۔ انہوں نے کراچی میں امدادی کاموں کے سلسلے میں فلم اسٹار کرکٹ میچ بھی کرائے تھے۔ لاہور سے فلمی ستاروں کی ٹرین بھر کر کراچی جاتی تھی اور وہاں خوب رونق اور گہما گہمی ہو جاتی تھی۔
انہوں نے پہلی بار ہمیں اشتہاروں کے لیے خوبصورت سرخیاں بنانے کے لیے بلایا تھا۔ ہم صحافی تھے۔ ان کے دفتر

کے اسٹینو نسیم الثقلین صاحب بھی ہمارے ملاقاتی تھے۔ وہ بھی بہت باصلاحیت اور ذہین آدمی تھے اور بعد میں ترقی کر کے لاہور آفس کے کرتا دھرتا بن گئے تھے۔ افسوس کہ اب ایم اے خان اور نسیم الثقلین دونوں ہی دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ نسیم صاحب نے ہم سے فرمائش کر کے بعض فلمی اشتہاروں کے لیے مضمون بنوائے تھے۔ یہ ایم اے خان کو اتنے پسند آئے کہ ہم سے ملنے کی فرمائش کر دی۔ یہ ان سے ہمارے طویل تعلقات کا آغاز تھا۔

فلم ”سسی“ کئی اعتبار سے پاکستان کی یادگار فلم تھی جس نے حالات کا رخ بدل دیا۔ مثلاً جس زمانے میں پچاس ساٹھ ہزار میں فلم بنا کرتی تھی اس فلم پر ساڑھے تین لاکھ لاگت آئی تھی۔ اس فلم میں بہت بڑے بڑے شاندار سیٹ لگائے گئے تھے۔ اس کی آؤٹ ڈور فلم بندی سوات کے دشوار گزار مقامات پر کی گئی تھی جہاں شام ڈھلتے ہی خونخوار ریچھوں کا قبضہ ہو جاتا تھا۔ لاہور کے نزدیک ایک جگہ مصنوعی جھیل بنا کر وہاں دھوبی گھاٹ کا سیٹ بنایا گیا تھا۔ اس علاقے میں بدمعاشوں اور ڈاکوؤں کا راج تھا۔ جب ایم اے خان نے پولیس سے تحفظ مانگا تو پولیس والوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہاں تو خطرناک ڈاکوؤں کا راج ہے۔ آپ آئی جی پولیس سے خود ہی بات کر لیں۔ خان صاحب نے آئی جی پولیس کے بجائے علاقے کے تین بدنام ترین ڈاکوؤں کو مدعو کر لیا اور انہیں بتایا کہ ہماری آٹھ دس دن شوٹنگ ہو گی۔ اداکار اور یونٹ کے لوگ یہاں رہیں گے۔ آپ ان کی حفاظت کا ٹھیکہ کر لیجئے۔

ڈاکو یہ سن کر بہت حیران ہوئے۔ پہلے تو سمجھے کہ شاید ان سے مذاق کیا جا رہا ہے۔ خان صاحب نے انہیں سمجھایا کہ آپ لوگوں سے زیادہ اس کام کے لئے اور کوئی موزوں نہیں ہے۔ وہ خان کے جذبے سے اتنے متاثر ہوئے کہ کسی معاوضے کے بغیر یہ فرض ادا کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور کہا کہ آپ بے فکر رہیے۔ ہمارے ہوتے ہوئے کوئی فلم یونٹ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ بلکہ انہوں نے کئی بار ضرورت کی چیزیں بھی مہیا کر دیں اور کوئی معاوضہ وصول نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جناب آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آپ نے ہم پر بھروسا کیا ہے۔ آپ کے لئے تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔ اس طرح خان صاحب نے وہ مقولہ صحیح ثابت کر دیا کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔

ایم اے خان کا بہت سے لوگوں نے مذاق اڑایا کہ یہ شخص اتنا روپیہ صرف کر رہا ہے۔ وصول کیسے ہو گا؟ مگر ایم اے خان یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اگر فلم ڈھنگ سے بنائی جائے تو بہت زیادہ منافع بھی کما سکتی ہے۔ اور انہوں نے

''سسی'' کے سپر ہٹ ہونے کے بعد یہ ثابت کر دیا۔ ''سسی'' نے مغربی اور مشرقی پاکستان میں تیس چالیس لاکھ روپے کا منافع کمایا تھا۔ جو اس زمانے میں خواب وخیال ہی سمجھا جاتا تھا' مشرقی پاکستان کے چھوٹے چھوٹے دیہات میں بھی ''سسی'' کی دھوم مچ گئی تھی۔

ایم اے خان انگریز قسم کے آدمی تھے۔ وقت کی گھڑی کے مانند پابندی کرتے تھے۔ سب سے پہلے شوٹنگ پر پہنچتے تھے۔ ایک بار فلم کی ہیروئن صبیحہ خانم بیس منٹ لیٹ ہو گئیں تو خان صاحب نے شوٹنگ پیک اپ کرا دی اور صبیحہ کی جگہ دوسری ہیروئن لینے کا فیصلہ کر لیا۔ بہت سے لوگوں نے درمیان میں پڑ کر یہ مسئلہ حل کرایا۔ اس دوران میں فلم کی شوٹنگ ایک مہینے تک رکی رہی۔ خدا خدا کر کے صلح وصفائی ہوئی تو فلم کی شوٹنگ کا آغاز ہوا۔ ایک بار فلم کے ہدایت کار داؤد چاند پانچ منٹ لیٹ ہو گئے تو خان صاحب نے انہیں گھڑی دکھا دی۔ داؤد چاند بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے جگدیش چندر آنند سے کہا کہ اگلی فلم بھی اگر ایم اے خان بنائیں گے تو وہ ان کے ساتھ کام نہیں کریں گے۔ ''سسی'' تو جیسے تیسے مکمل ہو گئی اور ہٹ ہو گئی مگر اگلی فلم ''سوہنی'' کے لئے ایم جے رانا کو ہدایت کار منتخب کیا گیا جو داؤد چاند کے اسسٹنٹ تھے۔ ''سوہنی'' کے لئے منشی دل بھی ہدایت کاری کے امیدوار تھے مگر انہوں نے بھی یہ کہہ کر معذرت کر لی تھی کہ یا تو خان صاحب رہیں گے یا پھر میں رہوں گا۔ ظاہر ہے کہ خان کا طوطی بول رہا تھا اس لئے ' ان کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح ایم جے رانا کے نام قرعہ فال پڑا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ''سسی'' کی بے پناہ کامیابی کے بعد ''سوہنی'' اور بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ بنائی گئی تھی لیکن یہ فلم فلاپ ہو گئی۔

''سوہنی'' کی شوٹنگ شروع ہونے لگی تو ہماری بھی خان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ ''سوہنی'' میں وہ انڈر واٹر فوٹو گرافی کا تجربہ بھی کریں گے۔ اس مقصد کے لئے لاہور اقبال پارک میں سوئمنگ پول کے آس پاس پہاڑیوں کا سیٹ لگایا گیا۔ پانی کے اندر فوٹو گرافی اسی سوئمنگ پول میں کرنی تھی۔

ہم نے کہا ''خان صاحب' فلم انڈسٹری والے آپ کا مذاق اڑا رہے ہیں''

''وہ کیوں؟''

''آپ '' سوہنی'' کو پانی میں تیرتے اور غوطے لگاتے ہوئے دکھائیں گے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ماہر تیراک تھی۔ تو پھر وہ دریا میں کیسے ڈوب گئی؟''

خان صاحب نے سگریٹ ہونٹوں سے نکالی اور مسکرائے۔ بولے ''فلم والوں کو یہ پتا ہی نہیں ہے کہ میں کیا دکھانا چاہتا ہوں۔ پھر وہ کیوں اعتراض کر رہے ہیں۔''

ہم نے پوچھا ''آپ کیا دکھانا چاہتے ہیں؟''

ہنس کر کہنے لگے ''یہ میرا بزنس سیکریٹ ہے۔ کیوں بتاؤں؟''

ان مناظر کے لئے صبیحہ خانم کو خاص طور پر تیراکی سکھائی گئی۔ جاڑوں کے دن اور پانی میں بھیگنا قیامت سے کم نہ تھا۔ ہم بھی پتلون کے پائنچے چڑھائے سیٹ پر گھومتے رہے تھے۔ خان صاحب بھی پتلون کے پائنچے چڑھائے گھومتے تھے۔ اس سیٹ پر سبھی اپنے پائنچے سمیٹ کر کام کرتے نظر آتے تھے جو کہ بذات خود ایک دلچسپ منظر تھا۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ یہ ساری محنت اکارت گئی کیونکہ انڈر واٹر فوٹو گرافی کا مناسب بندوبست نہ ہو سکا۔ جو بندوبست خان صاحب نے کیا تھا اس میں خامیاں پیدا ہو گئیں۔ بہر حال ''سوہنی'' بہت بری طرح فلاپ ہو گئی۔

ایم اے خان جو فلمی صنعت کے سب سے بڑے فلم ساز بلکہ مغل اعظم کہلانے لگے تھے اس منصب سے ہٹا دیے گئے۔ بلندی پستی کے ایسے تماشے فلم کی دنیا میں عام ہیں۔

''سسی'' کے ہدایت کار داؤد چاند بھی بہت پرانے اور تجربہ کار آدمی تھے۔ داؤد چاند احمد نگر کے رہنے والے تھے اور ''چاند بی بی'' کے خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ چاند بی بی ہندوستان کی تاریخ کا ناقابل فراموش کردار ہیں۔ ان کے خاندان سے تعلق رکھنے والوں نے اپنے نام کے ساتھ '' چاند'' لگانا شروع کر دیا۔ اس طرح داؤد صاحب بھی چاند بن گئے حالانکہ ان کا رنگ سیاہ تھا۔ آغا سلیم رضا انہیں کالا چاند کہا کرتے تھے اور داؤد صاحب ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔

''سسی'' کا ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ جب فلم کا سنسر پرنٹ نکالا گیا تو شریک فلم ساز چوہدری عید محمد نے فلم دیکھ کر سر پکڑ لیا اور کہا کہ یہ فلم تو کامیاب نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے داؤد چاند سے کہا کہ اس فلم میں بہت سے فالتو سین ہیں۔ آپ

کل آئیں اور انہیں کاٹ کر فلم سے نکال دیں۔ داؤد صاحب کو یہ بات اچھی تو نہیں لگی مگر وہ اگلے دن ''رتن ''سنیما میں پہنچ گئے جو چوہدری عید محمد کا تھا اور یہیں ان کا دفتر بھی تھا۔ سنیما میں فلم دیکھی گئی تو چوہدری صاحب یہ نہیں بتا سکے کہ کون سا سین فالتو ہے۔ اس طرح فلم ویسی کی ویسی ہی ریلیز کر دی گئی اور اس نے ریکارڈ قائم کر دیا۔

ہم داؤد چاند کے بارے میں بتا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز بمبئی سے کیا تھا۔ فلم کے شوق میں گھر سے بھاگے تو سیدھے بمبئی کے فلمی نگار خانے میں پہنچ گئے۔ مزدوری کی' ایکسٹراؤں میں بھی شامل رہے۔ پھر چھوٹے چھوٹے کردار بھی کیے۔ اس کے بعد ہومی واڈیا کے اسسٹنٹ ہو گئے۔ ہومی واڈیا وہی صاحب ہیں جو واڈیا مووی ٹون کے ادارے کے مالک تھے اور نا ڈیا کی فلمیں ہنٹر والی' سائیکل والی' طوفان میل وغیرہ انہوں نے ہی بنائی تھیں۔ داؤد چاند کا بمبئی سے جی بھر گیا تو کلکتہ چلے گئے وہ بھی فلم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ میڈن تھیٹرز کا معروف ادارہ دیوالیہ ہو کر ختم ہو گیا تھا اور ایک کروڑ پتی سیٹھ سکھ لال کرنانی نے اسے خرید لیا تھا۔ اس ادارے میں داؤد چاند نے پہلے ایڈیٹنگ کی اور پھر ہدایت کار بن گئے۔ کلکتہ میں انہوں نے ایک فلم ''سسی پنوں'' کی ہدایت کاری کی جو بہت کامیاب رہی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس فلم میں صبیحہ کی والدہ اقبال بیگم نے ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ بعد میں داؤد چاند نے ان کی بیٹی صبیحہ سے اسی نام کی فلم میں ہیروئن کے طور پر کام لیا۔ یہ دونوں فلمیں کامیاب رہیں۔

دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں داؤد چاند لاہور آ گئے۔ یہاں انہوں نے ''پرائے بس میں'' کے نام سے فلم بنائی جو بہت کامیاب ہوئی۔ داؤد چاند بہت پرانے اور تجربہ کار ہدایت کار تھے۔ ''سسی'' کے بعد انہوں نے چاند پروڈکشن کے نام سے ذاتی فلم ساز ادارہ بنا لیا تھا۔ ''بلبل'' ان کی پہلی فلم تھی اور ہٹ ہو گئی تھی۔

داؤد چاند سادہ دل اور سادہ مزاج آدمی تھے۔ ہم نے انہیں جب بھی دیکھا معمولی سے لباس میں ہی دیکھا۔ کسی قسم کی بڑائی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اردو ان کی زبان تھی نہ پنجابی۔ مگر انہوں نے دونوں زبانوں میں کامیاب فلمیں بنائیں۔ ان کے بارے میں لطیفے بھی مشہور ہوتے رہتے تھے۔ مثلاً ایک فلم میں مصنف نے مکالمے میں لکھ دیا کہ میں تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ داؤد صاحب نے مکالمہ سن کر فوراً دو اینٹیں منگائیں اور جس وقت یہ مکالمہ بولا گیا تو اسکرین پر دو ہاتھ اینٹ پر اینٹ مارتے ہوئے دکھائے گئے۔

آغا سلیم رضا سے ہماری ملاقات صحافی کے طور پر ہوئی تھی۔انہوں نے اس قدر شفقت اور بے تکلفی کا مظاہرہ کیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے تعلقات گھریلو قسم کے ہو گئے اور ہم قریب قریب ان کے گھر کے ایک فرد ہی بن گئے۔ وہ ہمارے بزرگ بھی تھے' بے تکلف دوست بھی تھے اور ناصح بھی تھے۔ مگر نصیحتوں کا موقع بہت کم آتا تھا۔ان کی نصیحتیں کچھ اس قسم کی ہوا کرتی تھیں۔

''آفاقی' تم جلدی شادی نہ کرنا۔''

''آفاقی' تم بہت خشک زندگی گزارتے ہو۔ زندگی میں کچھ رنگینی بھی ہونی چاہیے۔

آفاقی، ہر وقت شرافت سے چمٹے رہتے ہو۔ یاد ہے اقبال نے کیا کہا ہے ؟''

بہتر ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

تم ہر وقت عقل سے کام لیتے ہو۔''

آغا سلیم رضا کو زندگی کی ہر اچھی چیز سے پیار تھا۔خوب صورت چہرے اچھے دوست 'اچھا ماحول' اچھی باتیں' اچھا لباس' اچھا کھانا غرض یہ کہ انہیں ہر چیز بہت اچھی درکار تھی۔ کہا کرتے تھے' ''دیکھو بھئی' مجھے فلم بنانے کا بہت شوق ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ سب کام تم لوگ کرو۔ میرے لئے ایک اچھا دفتر بنا دو، جس میں اچھا فرنیچر ہو۔اے سی لگا ہو۔ فرشی قالین ہو۔ایک خوبصورت سی اسٹینو ہو جو اسکرٹ پہن کر پھرے۔ بس میں منصوبے بناتا رہوں اور تم نوجوان کام کرتے رہو۔''

آغا صاحب ہر وقت فلم بنانے کے منصوبے بناتے رہتے تھے لیکن عملی طور پر انہوں نے کبھی مختصر سی دستاویزی فلم تک نہ بنائی۔ البتہ ایک دو بار دفتر ضرور بنائے یا پھر ''کمار'' بنائے۔ آغا صاحب ''کمار'' بنانے کے لئے سارے لاہور میں مشہور تھے۔

''وہ کیسے بنتے ہیں ؟'' ہم نے پوچھا۔

کسی نے بتایا کہ جو شخص اداکاری کے جنون میں مبتلا ہو اور اس کی اصلاح کا کوئی امکان نہ رہے تو آغا صاحب اسے

''کمار'' بنادیتے ہیں۔ کمار اس زمانے میں ہر بڑے ایکٹر کے نام کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ آغا صاحب فلم کے شوقین سے کہتے کہ دیکھو' ہم تمہیں بہت بڑا ہیرو بنادیں گے۔ آج سے تمہارا نام چاند کمار ہے۔ پھر چاند کمار کا رائل پارک میں جلوس نکالا جاتا۔ سبھی فلم والے آغا صاحب کے جاننے والے تھے۔ آغا صاحب کمار کو ساتھ لے کر ہر ایک کے دفتر میں جاتے اور اس سے وعدہ لیتے کہ اپنی فلم میں ''کمار'' کو ضرور ہیرو رکھیں گے۔ پھر کمار باقاعدگی سے آغا صاحب کے پاس حاضری دیا کرتے یہاں تک کہ کچھ عرصے بعد خود ہی مایوس ہو کر فلمی دنیا سے ہی رخصت ہو جاتے۔ آغا صاحب کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا۔

آغا صاحب ''رنگیلا'' کو بھی کمار بناتے بناتے رہ گئے۔ رنگیلا کا نام سعید خان تھا۔ رنگیلا نے چھوٹے چھوٹے تندور نما ہوٹلوں میں کام کر کے زندگی کا آغاز کیا تھا۔ بعد میں آرٹ کا شوق ہوا تو فلموں کے سائن بورڈ بنانے لگے۔ رنگیلا کو بھی اداکار بننے کا بہت شوق تھا۔ کسی نے آغا صاحب کے بارے میں بتایا تو وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ آغا صاحب نے دیکھا کہ اس لڑکے میں کمار بننے کے تمام جراثیم موجود ہیں اس لئے فوراً اس کی سرپرستی شروع کر دی اور کہا:

''دیکھو، ہم تمہارے لئے ضرور کچھ کریں گے''۔

اس امید میں رنگیلا نے آغا صاحب کے گھر کے چکر لگانے شروع کر دیئے۔ ان کے گھر سے ناشتے دان میں کھانا بھی لے آتے اور دوسرے کام بھی دوڑ دوڑ کر کرتے۔ آغا صاحب کا اسے اداکار بنانے کا مطلق ارادہ نہ تھا یہاں تک کہ انہوں نے اسے ''کمار'' بنانے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی ورنہ تاجپوشی کی رسم رائل پارک میں ضرور ادا کی جاتی۔ دراصل آغا صاحب کو رنگیلا سے کوئی توقع نہیں تھی۔ وہ ہنسا کرتے تھے۔

''دیکھو۔ ایسے ایسے لوگ بھی ہیرو بننے آجاتے ہیں۔ کیا یہ لوگ کبھی آئینہ نہیں دیکھتے؟''

مگر تقدیر رنگیلا کو بہت کچھ بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ رنگیلا اسی طرح فلمی دفتروں کے پھیرے لگاتا رہا یہاں تک کہ شباب کیرانوی نے اسے اپنی فلم '' گلبدن'' میں برائے نام کردار دے دیا۔ رنگیلا کو اداکار بنانے کا سہرا شباب کیرانوی کے سر ہے۔ جب ان کی ایک فلم ''سنگ دل'' میں رنگیلا کا یہ فقرہ ہر ایک کی زبان پر چڑھ گیا کہ ''میں نے ہانگ کانگ کے نلکوں کا پانی پیا ہے '' تو رنگیلا کے دن پھر گئے۔ پھر وہ کامیڈین' ہیرو' فلم ساز' ہدایت کار 'موسیقار،

گلوگار سبھی کچھ بن گیا اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب فلمی دنیا میں رنگیلا کا سکہ چلتا تھا۔ بڑے بڑے فلم ساز اسے اپنی فلموں میں کاسٹ کرنے کے خواہش مند رہتے تھے۔ رنگیلا نے کامیڈین کے طور پر شہرت حاصل کی تب بھی اسے حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا نام ''گھوڑے کے منہ والا'' رکھا گیا۔ فلموں سے باہر تو سب اسے گھوڑے کے منہ والا کہتے ہی تھے فلم کے سین میں بھی کہنے لگے۔ جس ہیرو کے ساتھ وہ کام کرتا تھا وہ اسے تھپڑ ضرور رسید کرتا تھا مگر رنگیلا مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہا۔

پھر ایک دن سنا کہ رنگیلا فلم ساز اور ہدایت کار بن گیا ہے۔ جس نے سنا اس نے رنگیلا کا مذاق اڑایا ''دیکھو۔ چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں۔ رنگیلا بھی ہدایت کار بن گیا اس فلم انڈسٹری کا اللہ ہی حافظ ہے۔''

اب مسئلہ یہ تھا کہ اس فلم میں وہ خود ہیرو تھا مگر اس کے بالمقابل ہیروئن کون ہو گی؟

ایک دن ہم ایورنیو اسٹوڈیو میں آغا جی اے گل کے کمرے میں گئے تو یہی مسئلہ زیر بحث تھا۔ ایک ہیروئن (جن کا نام قصداً نہیں لکھ رہا) وہاں موجود تھیں اور آغا صاحب سے کہہ رہی تھیں کہ رنگیلا کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میرے پاس اپنی فلم میں کام کرنے کی پیش کش لے آیا تھا۔

''تو پھر فلم کر لو'' آغا صاحب نے کہا۔

''توبہ کیجئے آغا صاحب۔ رنگیلا کے ساتھ ہیروئن بننے سے تو بہتر ہے کہ میں خودکشی کر لوں۔ میں اتنی گئی گزری تو نہیں ہوں۔''

صف اول کی کسی مشہور ہیروئن نے رنگیلا کے ساتھ کام کرنے کی ہامی نہیں بھری۔ مجبوراً اس نے رضیہ کو اپنے ساتھ ہیروئن کے طور پر لے لیا۔

رنگیلا کی فلم جن دنوں بن رہی تھی ہر روز ایک نیا لطیفہ سننے کو ملتا تھا۔

''پتا ہے کیا ہوا؟ رنگیلا نے ساری شوٹنگ کینسل کر دی۔ اب دوبارہ سیٹ لگے گا۔''

''رنگیلا کی ڈائریکشن سے سب اداکار تنگ ہیں اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں کہ آئندہ اس کی فلم میں کام نہیں کریں گے۔''

''بھئی دوسری فلم بنانے کی نوبت آئے گی تو انکار کریں گے۔''
اس کی بے وقوفی اور حماقتوں کی داستانیں اس کی فلم میں کام کرنے والے بھی مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ان دنوں یہ سننے میں آتا تھا کہ رنگیلا بدحواس ہے۔غائب دماغ ہے۔اسے کچھ بھی نہیں آتا مگر تجربات کرتا رہتا ہے۔ہر ایک کو یقین تھا کہ رنگیلا کی فلم سپر فلاپ ہو جائے گی۔

ان ہی دنوں میں علی زیب کی فلم ''جیسے جانتے نہیں'' بھی بن رہی تھی۔سید سلیمان اس کے ہدایت کار تھے۔جب ریلیز کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ رنگیلا کی فلم ''دیا اور طوفان'' اور علی زیب کی ''جیسے جانتے نہیں'' ایک ہی دن نمائش کے لئے پیش کی جا رہی ہیں۔علی زیب کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ان کی جوڑی بے حد مقبول تھی اور فلموں کی کامیابی کے لئے ان کا نام ہی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ان کی پہلی ذاتی فلم ''آگ'' بے حد کامیاب ہوئی تھی۔اس فلم پر انہوں نے زیادہ سرمایہ اور توجہ صرف کی تھی۔اس لئے توقع تھی کہ یہ فلم بہت معیاری ہو گی اور سپر ہٹ ہو جائے گی۔ریلیز سے ایک روز پہلے رات کے وقت ہم ایک سیٹ پر گئے جہاں محمد علی اور زیبا شوٹنگ کر رہے تھے۔رنگیلا بھی وہاں آ گیا۔سب اس کے پیچھے پڑ گئے کہ تمہیں کیا سوجھی ہے کہ ''جیسے جانتے نہیں'' کے مقابلے میں اپنی فلم لگا رہے ہو؟ محمد علی نے بھی کہا کہ رنگیلے ‘کیوں اپنے پیر پر کلہاڑی مارتے ہو۔باز آجاؤ ورنہ بہت نقصان اٹھاؤ گے۔

رنگیلا حسب عادت سب کی باتیں سنتا اور مسکراتا رہا۔دوسرے دن دونوں فلمیں ریلیز ہوئیں اور رنگیلا کی فلم ''دیا اور طوفان'' سپر ہٹ قرار دی گئی۔''جیسے جانتے نہیں'' علی زیب کی اداکاری‘ سید سلیمان کی ہدایت کاری اور شاندار پروڈکشن کے باوجود اوسط درجے کی فلم ثابت ہوئی۔
اگلے دن وہی سیٹ تھا ‘وہی لوگ تھے۔محمد علی اور سید سلیمان افسردہ تھے۔زیبا بھی خاموش سی نظر آ رہی تھیں۔رنگیلا کی فلم کا تذکرہ ہر ایک کی زبان پر تھا۔رنگیلا نے سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ساڑھے آٹھ بجے کے قریب رنگیلا اسٹوڈیو پہنچے اور فلمی دستور کے مطابق سب سے مبارک بادیں وصول کیں۔فلمی دنیا میں کامیابی سے بڑی خوبی کوئی اور چیز نہیں ہے۔رنگیلا کی فلم کامیاب ہو گئی تھی اور اب ہر ایک کی زبان پر ان کے لئے تعریف کے سوا کچھ نہ تھا۔

رنگیلا سیٹ پر گئے تو سب سے پہلے محمد علی اور زیبا کے پاس گئے۔ محمد علی نے کھلے دل سے رنگیلا کو فلم کی کامیابی پر مبارک بادپیش کی۔ زیبا کے پاس گئے۔ زیبا نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ اس طرح رنگیلا نے اپنے آپ کو منوالیا اور اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس کی دوسری فلم ''دل اور دنیا'' پہلی فلم سے بھی زیادہ کامیاب ہوئی۔ اس فلم کا معیار ہر لحاظ سے بہت اچھا تھا۔ اس کے بعد رنگیلا کی خوش قسمتی کا دور شروع ہو گیا۔ وہ شخص جس کا سب مذاق اڑایا کرتے تھے' جو آغا سلیم رضا کے گھر سے ناشتے دان لے کران کے دفتر جایا کرتا تھا' جو چند روپے کے عوض فلموں کے سائن بورڈ بنایا کرتا تھا' وہ فلمی دنیا کی بہت اہم اور ممتاز ہستی بن گیا۔ رنگیلا کی کامیاب فلموں کی قطار سی لگ گئی۔ بڑی بڑی ہیروئنیں رنگیلا کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ تھیں مگر رنگیلا کو بڑی ہیروئنوں کے ناموں کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی فلم صرف اسی کے نام پر فروخت ہو جاتی تھی۔ اس کے ساتھ دوسرے اور تیسرے درجے کی ہیروئنیں بھی قبول کر لی جاتی تھیں۔ رنگیلا کا نام چل رہا تھا۔ اس کے لئے خاص طور پر کہانیاں لکھی جا رہی تھیں۔ اس نے ہر ایک سے اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کرالیا تھا۔ وہ اداکار بھی تھا' فلم ساز اور ہدایت کار بھی تھا، کہانی نویس اور گلوکار بھی تھا' موسیقار بھی تھا اور ہر حیثیت میں کامیاب تھا۔

رنگیلا نے فلمی صنعت کو فتح کر لیا تھا فتوحات کا دور ''کبڑا عاشق'' بنانے تک جاری رہا۔ یہ فلم کیا فلاپ ہوئی رنگیلا کے ستارے گردش میں آگئے۔ وہ چند ماہ کے اندر عرش سے فرش پر پہنچ گیا۔ فلم سازوں نے منہ موڑ لیا۔ فلم بینوں نے اس کی فلمیں دیکھنا چھوڑ دیں۔ ایسی ناکامی کے بعد بہت کم اداکار فلمی صنعت میں زندہ رہتے ہیں۔ مگر رنگیلا نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ کسی قسم کی احساس کمتری کا شکار بھی نہیں ہوا۔ لوگوں کی باتوں اور مذاق کا بھی اس نے برا نہیں مانا۔ وہ نئے سرے سے مقدر بنانے کے لئے کمربستہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس نے دوسری زندگی حاصل کر لی جو کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

رنگیلا کو قدرت نے بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اگر کسی مغربی ملک میں ہوتا تو نہ جانے کس مقام پر ہوتا لیکن اس کی باتوں اور حرکتوں سے اس کی بے پناہ ذہانت کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس کی زبان سے کبھی کوئی چونکا دینے والی بات سننے کو نہیں ملی۔ مگر اس کے کام نے سب کو چونکا دیا۔ شہرت اور دولت نے اسے مغرور نہیں کیا۔ اس کا طرز عمل بھی

تبدیل نہیں ہوا۔ بس فرق یہ ہوا کہ اب وہ تاش کے کھیل میں زیادہ بڑی رقمیں ہارنے لگا۔ تاش رنگیلا کی کمزوری ہے مگر تاش کے کھیل میں وہ خوش قسمت نہیں ہے۔ شاید اسی لئے دوسرے شعبوں میں قسمت کا دھنی ہے۔

میری رنگیلا سے کبھی دوستی نہیں رہی۔ نہ زیادہ ملاقات کا موقع ملا۔ سر راہ ملتے رہے۔ اس سے بات بھی کوئی کیا کرے۔ لیکن جب کبھی رنگیلا کی ضرورت پڑی اس نے ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ رنگیلا نے ایک زمانے میں فلموں میں نئے چہرے تلاش کرنے شروع کئے تھے۔ کئی شادیاں بھی کیں۔ کچھ اصل، کچھ نقلی۔ ایک بار شمیم آرا کے یونٹ کے ساتھ منیلا جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں رنگیلا بھی فلم کے یونٹ کے ساتھ مقیم تھا۔ اس نے ایک چھوٹے قد کی فلپائنی لڑکی سے تعارف کراتے ہوئے کہا ''آفاقی صاحب، یہ آپ کی بہو ہے ''

پھر اس سے کہا ''سلام کرو، یہ تمہارے بزرگ ہیں۔''

اس لڑکی نے فوراً سلام کر لیا۔ پتا چلا کہ جب کبھی رنگیلا صاحب کسی فلم کے سلسلے میں منیلا جاتے ہیں تو یہ حاضر ہو جاتی ہے۔ ان کی خدمت کرتی ہے کپڑے دھوتی ہے۔ استری کرتی ہے اور دوسرے سارے کام کرتی ہے۔ خدا جانے بیوی ہے یا نہیں، مگر وہ سب کام کرتی ہے جو بیویوں کو کرنا چاہیے۔

فلم ''گلنار'' کا ذکر آپ سن ہی چکے ہیں۔ قمر زیدی کا بھی اس ضمن میں نام آچکا ہے۔ قمر زیدی ''گلنار'' میں سید امتیاز علی تاج کے اسسٹنٹ تھے۔ وہ کام سے زیادہ لطیفہ بازی میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ چھوٹے قد کے موٹے سے گول مٹول آدمی تھے۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ لوگوں کی نقلیں اتارنے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیٹ پر بھی ان کی ضرورت کام کے وقت نہیں بلکہ اس وقت پڑتی تھی جب کام نہیں ہوتا تھا۔ انہیں بلا کر ان سے لطیفے اور نقلیں سنی جاتیں اور مختلف شعرا کے ہو بہو انداز میں شعر پڑھنے میں مظفر نرالا کو بھی بہت مہارت حاصل تھی۔ خاص طور پر استاد قمر جلالوی کا پورا دیوان انہیں ازبر تھا اور وہ خوب لہک لہک کر ان کے اشعار ان ہی کے ترنم میں سناتے تھے اور خوب داد سمیٹتے تھے۔ مظفر نرالا کا ذکر چل نکلا ہے تو کچھ تفصیل بھی سن لیجئے۔

مظفر نزالا کراچی کے رہنے والے تھے۔ نقلیں اتارنے اور لطیفے سنانے میں وہ بھی کسی سے کم نہیں تھے۔اس زمانے میں لہری صاحب بھی کراچی کی محفلوں میں مزاحیہ کرداروں کے نمونے اور چھوٹے چھوٹے خاکے پیش کیا کرتے تھے۔ لیکن لہری کو جو عروج اور شہرت ملی وہ مظفر نزالا کو حاصل نہ ہو سکی۔اس کی کچھ نہ کچھ تو وجہ ہو گی لیکن ہمارے خیال میں اس کی دو وجوہات تھیں۔ایک تو یہ کہ مظفر نزالا نے خود کو الگ تھلگ یعنی ریزرو نہیں رکھا جس کی وجہ سے ایک فن کار کے طور پر ان کا امیج نہ بن سکا۔وہ میل جول میں بھی لہری کی طرح بے تکلف اور پر اعتماد نہ تھے۔دوسرا سبب تھا کہ لہری کے مقابلے میں ان کی صلاحیتیں محدود تھیں۔وہ مخصوص قسم کے کرداروں میں ایک مخصوص انداز میں مکالمے ادا کرتے تھے۔یعنی ان کی اداکاری میں تنوع نہیں تھا لیکن سب سے بڑی وجہ تو مقدر تھی۔لہری کے مقابلے میں وہ مقدر کے سکندر ثابت نہ ہوئے۔ انہیں اتنے مختلف قسم کے کردار نہ مل سکے جتنے لہری کو ملے تھے لیکن اس سلسلے میں کچھ قصور خود مظفر نزالا کا بھی تھا۔لاہور فلمی سرگرمیوں کا مرکز تھااور کراچی میں ابھرنے والے فن کار اور ہنر مند تھوڑی سی کامیابی حاصل کرنے کے بعد ہی لاہور کا رخ کیا کرتے تھے۔ظاہر ہے کہ انہیں آنے کے ساتھ ہی تو کام اور شہرت نہیں مل جاتی تھی لیکن وہ لاہور میں مستقل ٹھکانا بنا کر فلم سازوں سے میل ملاپ بڑھاتے تھے اور فلمی حلقوں میں نظر آنے لگتے تھے۔اس طرح انہیں کام ملنے لگتا تھااور صلاحیت کے مطابق کامیابی بھی حاصل ہو جاتی تھی۔ کراچی کے جن فنکاروں نے یہ طریقہ اپنایا وہ بہت کامیاب اور مقبول ہوئے۔ جنہوں نے کراچی ہی میں رہنے کو ترجیح دی اور گاہے بگاہے لاہور کا پھیرا لگاتے رہے وہ پیچھے رہ گئے۔

لہری صاحب کو جب احساس ہوا کہ انہیں فلمی حلقوں میں پسند کیا گیا ہے تو وہ فوراً بوریا بستر سنبھال کر لاہور آ گئے اور یہیں مستقل ٹھکانا بنا لیا۔ان کے گھر والے کراچی میں تھے۔ان کے ساتھ رہنے کے لئے لاہور بھی آتے جاتے رہتے تھے مگر لہری کا گھر لاہور ہی میں تھا۔ہر فلم ساز جانتا تھا کہ ضرورت پڑنے پر لہری کہاں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن مظفر نزالا کے ساتھ یہ معاملہ نہیں تھا۔جب کسی فلم میں کام ہوتا تو وہ لاہور تشریف لے آتے اور اعلان کر دیتے کہ اب میں لاہور ہی میں رہوں گا۔ مگر جیسے ہی مصروفیت ختم ہوتی اور چند دن بے کاری میں بسر ہوتے تو وہ ٹکٹ کٹا کر عازم کراچی ہو جاتے۔ جن فلموں میں ان کا کام باقی رہتا تھا ان کے فلم سازوں کو بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا کیونکہ ہمارے

ہاں فلم بندی کسی منظم منصوبہ بندی کے تحت تو ہوتی نہیں ہے۔بس یہ ہوتا ہے کہ جب ہیرو اور ہیروئن کی تاریخیں مل گئیں فوراً شوٹنگ کا بندوبست کر لیا لیکن جو فن کار کراچی چلے جاتے تھے ان سے رابطہ کرنا اور انہیں مقررہ وقت پر لاہور لانا ایک مسئلہ بن جاتا تھا۔اس طرح فلم ساز کو پریشانی بھی ہوتی تھی اور اکثر نقصان بھی اٹھانا پڑتا تھا۔مظفر نرالا کہا کرتے تھے کہ اگر لاہور میں رہوں گا تو کھاؤں گا کہاں سے اور بیوی بچوں کو کہاں سے کھلاؤں گا؟اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ہم انہیں یہ سمجھاتے تھے کہ بھائی کچھ عرصہ تو انتظار کرنا ہی پڑے گا۔جب فلم سازوں کو اطمینان ہو جائے گا کہ اب تم لاہور کے ہو گئے ہو تو وہ تمہیں کام دینے لگیں گے۔ان کی اداکاری بہت اچھی تھی۔ اگر وہ لاہور میں مستقل رہتے تو یقیناً بہت معروف ہو جاتے۔کئی بار محمد علی صاحب نے بھی یہ کوشش کی کہ مظفر نرالا کو لاہور میں رکھ لیا جائے۔ انہوں نے نرالا کو اپنے گھر میں مہمان بھی رکھا مگر جب بے کاری کا ایک مہینہ گزرا تو نرالا صاحب رسی تڑا کر کراچی روانہ ہو گئے۔

خود ہمارے ساتھ بہت تلخ تجربہ پیش آیا۔ہماری فلم ”آس“ میں ہم نے نرالا کو ایک کردار کے لئے منتخب کیا۔وہ فلم کے ہیرو محمد علی کے بے تکلف دوست تھے‘شاعر تھے اور کوئی بات شعر کے بغیر نہ کرتے تھے۔ہمیں اس کردار کے لئے نرالا بہت موزوں نظر آئے۔ان دنوں وہ لاہور ہی آئے ہوئے تھے اور انہوں نے ہمیں یقین دلا دیا کہ اب وہ لاہور ہی میں رہیں گے۔محمد علی صاحب نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ان دنوں بھی نرالا محمد علی ہی کے ہاں مہمان تھے۔ فلم کا ایک سیٹ مکمل ہو چکا تو دوسرے اداکاروں کا کام شروع ہو گیا۔نرالا صاحب ہر روز ہم سے تقاضے کرتے کہ میرا کام کب کریں گے؟ہم انہیں تسلی دیتے رہتے تھے۔جب کچھ دن گزرے تو نرالا صاحب کو پھر کراچی کی یاد نے ستایا اور وہ ہم سے یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ بس تھوڑے دنوں میں واپس آ جاؤں گا۔محمد علی صاحب نے ہم سے کہا بھی کہ آفاقی اسے روک لو۔یہ گیا تو پھر جلدی واپس نہیں آئے گا۔

مگر نرالا صاحب بولے۔”آفاقی بھائی آپ کس کی باتوں میں آ رہے ہیں؟میں تو بس دو چار دن کے بعد واپس پہنچ جاؤں گا۔“

کئی دن گزر گئے مگر نرالا صاحب نہ لوٹے اس دوران میں ہماری شوٹنگ شروع ہو گئی۔ ایک سیٹ پر شبنم‘ محمد علی‘

ساقی اور نرالا کا یکجا کام تھا۔اور سب تو موجود تھے مگر نرالا غائب تھے۔ایک مشکل یہ تھی کہ کراچی میں ان کے گھر پر ٹیلی فون بھی نہیں تھا۔ہم نے پہلے کراچی میں کئی لوگوں کو فون کیا جنہوں نے نرالا صاحب کا گھر ڈھونڈا اور انہیں پیغام پہنچایا پھر ان کے لئے سیٹ بک کرائی گئی۔اس طرح دو تین دن ضائع ہو گئے ادھر ہمارے لئے ہر لمحہ قیمتی تھا اور ہم بے حد پریشان تھے۔خدا خدا کر کے نرالا صاحب لاہور پہنچے اور انہوں نے شوٹنگ میں حصہ لیا۔

بے حد شریف آدمی تھے۔بہت معذرت کی اور یقین دلایا کہ اگلی بار یہ مشکل پیش نہیں آئے گی مگر دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک کر پیتا ہے۔شوٹنگ ختم ہونے کے بعد چند روز وہ لاہور میں کام کی تلاش میں ٹھہرے اور پھر کراچی رخصت ہو گئے۔انہی وجوہات کی بنا پر مظفر نرالا کو وہ شہرت اور کامیابی حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اچھے انسان اور بہت اچھے فن کار تھے۔بہت شریف اور مرنجان مرنج آدمی تھے۔شعر و ادب کے دلدادہ تھے۔ان کی گفتگو بہت مزیدار ہوتی تھی جس میں مزاح سے زیادہ ادبی چاشنی ہوتی تھی۔انہیں بے شمار اشعار یاد تھے۔باتوں باتوں میں کسی شاعر کا ذکر لے کر بیٹھ جاتے اور پھر شعر و شاعری کا آغاز ہو جاتا۔مظفر نرالا میں ہم نے کوئی بری عادت نہیں دیکھی۔ سوائے اس کے کہ پان بہت کھاتے تھے۔ان کے منہ میں ہر وقت پان بھرا رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بولتے تھے تو بہت سی باتیں صاف طور پر سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ان کے ہونٹ ہمیشہ سرخ ہی نظر آتے تھے۔کوئی اس طرف توجہ دلاتا تو کہتے ''حضرت' یہ تو خون دل ہے۔''

یہ حقیقت ہے کہ انہیں فراغت اور خوش حالی کے دن کبھی دیکھنے نصیب نہیں ہوئے ان کی گھریلو زندگی کے بارے میں بھی بہت کم معلومات تھیں۔وہ اس موضوع پر بات کرنے سے احتراز کرتے تھے۔انہیں مزاحیہ اداکاری میں جو مقام حاصل کرنا چاہیے تھا وہ اس تک نہ پہنچ سکے۔کچھ عرصہ قبل کراچی میں ان کا انتقال ہو گیا۔فلمی دنیا ایک اچھے فن کار سے محروم ہو گئی۔مگر فلمی دنیا کے لئے تو وہ کافی زمانہ پہلے ہی مرحوم ہو چکے تھے۔اول تو انہیں فلموں میں کم ہی کام ملتا تھا مگر جب پنجابی فلموں کا سیلاب آیا تو وہ اور ان جیسے بہت سے اداکار اس ریلے میں بہہ گئے۔نرالا خود بھی شعر کہتے تھے اگرچہ وہ اس راز کو افشا نہیں کرتے تھے۔

ہم نے ایک بار کہا'' نرالا صاحب' ہمیں کوئی بتا رہا تھا کہ آپ بھی شاعر ہیں۔شعر کہتے ہیں۔''

کہنے لگے "حضور! افسوس ہے کہ آپ کو یہ بات کسی کے بتانے سے معلوم ہوئی۔ آپ نے خود محسوس نہیں کیا کہ آخر یہ " نرالا" کیا بلا ہے؟"

"تو پھر کوئی شعر سنایئے؟"

بولے" اب تو دوسروں کے اشعار سنانے کی اتنی عادت پڑ گئی ہے کہ اپنا کوئی شعر یاد ہی نہیں آتا۔"

تذکرہ قمر زیدی اور فلم " گلنار" کا ہو رہا تھا اور درمیان میں مظفر نرالا آن کودے۔ قمر زیدی باغ و بہار شخصیت تھے جن کے متعلق شوکت تھانوی مرحوم کہا کرتے تھے کہ یہ باغ ہی باغ ہیں۔ بہار سے ابھی تک محفوظ ہیں۔ مگر قمر زیدی کو دوسروں کی فقرہ بازی کی زیادہ پرواہ نہیں تھی۔ اگر کوئی ان پر فقرہ چست کرتا وہ اس کا بدلہ اس شخص کی نقل اتار کر ادا کر دیا کرتے تھے۔ سوجھتی انہیں بھی خوب تھی۔ نقل تو اصل کے مطابق کرتے ہی تھے مگر اس میں اپنی طرف سے بھی اضافہ کر دیتے تھے۔

قمر زیدی کے بارے میں جب ایک دن انکشاف ہوا کہ وہ کسی کے عشق میں گرفتار ہیں تو سب کو اس لڑکی سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔

"بھئی وہ کون بد نصیب ہے اور اسے تم نے بتایا بھی ہے یا نہیں؟"

پہلے تو وہ شرماتے رہے پھر اعتراف محبت کر لیا۔ معلوم ہوا' وہ ایک معاون اداکارہ شاہانہ کی محبت میں گرفتار ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق شاہانہ بھی ان کو پسند کرتی تھی۔

شاہانہ کے بارے میں سنتے ہی ہر ایک کو اسے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ ہم شاہ نور اسٹوڈیو گئے تو خاص طور پر قمر زیدی سے دریافت کیا کہ شاہانہ کون ہے۔ کہاں ہے؟

انہوں نے شرما کر جواب دیا۔" ابھی سیٹ پر ان کا کام نہیں ہے۔ آؤ تمہیں ان سے ملواتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ہمیں سیٹ سے باہر لے گئے۔ شاہ نور اسٹوڈیو کے درمیانی بڑے لان میں سایہ دار درختوں کی چھاؤں میں سیمنٹ کی ایک بینچ پر شاہانہ اپنی بہن کے ساتھ تشریف فرما تھیں۔ قمر زیدی نے ان سے ہمارا تعارف کرایا اور خوب بڑھا چڑھا کر بتایا کہ ہم کیسے صحافی ہیں۔

شاہانہ درمیانے قد' گہرے سانولے رنگ کی ایک لڑکی تھی۔ناک نقشہ اچھا تھا۔ جسم بھی متناسب تھا۔ چہرے پر سب سے نمایاں اس کی آنکھیں تھیں جو سیاہ اور بہت روشن تھیں۔ ہم نے شاہانہ کو میک اپ کے بغیر دیکھا اور کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ شاہانہ کی بڑی بہن نے ہماری آؤ بھگت کی اور بینچ پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ قمر زیدی صاحب فوراً چائے کا انتظام کرنے کے لیے رخصت ہو گئے۔سچ تو یہ ہے کہ ہم نے قمر زیدی صاحب سے شاہانہ کی جو تعریفیں سنی تھیں ان کے مطابق ہمیں شاہانہ میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی مگر جب شاہانہ نے باتیں شروع کیں تو اس کی دلکشی واضح ہونے لگی۔ وہ ایک خوش ذوق لڑکی تھی۔ مطالعہ بھی خاصا تھا۔ ادب اور شاعری کے بارے میں اس کی معلومات بہت زیادہ تھی اور اس مطالعے کا اثر اس کی گفتگو سے بھی ظاہر ہوتا تھا۔جب تک قمر زیدی ایک گول سی ٹرے میں چائے کی پیالیاں رکھوا کر واپس آئے اس وقت تک ہم شاہانہ کے مداح ہو چکے تھے۔واقعی وہ ایک ذہین اور حاضر جواب لڑکی تھی۔ بات سے بات پیدا کرنا اور فقرے کسنا شاہانہ کے لیے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔اس کی باتیں بہت دلچسپ اور شگفتہ تھیں۔ بات کرنے کا انداز اس سے بھی زیادہ اچھا تھا۔ گفتگو کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی رہتی تھی۔اور آنکھیں تو ہر وقت شرارت سے مسکراتی رہتی تھیں۔اس طرح شاہانہ سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔کچھ دیر بعد شاہانہ کی شوٹنگ کے لیے ضرورت پڑ گئی۔اس کے رخصت ہونے کے بعد قمر زیدی نے ہمیں دیکھا اور پوچھا۔

''کیوں' بھابی پسند آئی؟''

''کون بھابی؟''

''ارے یار سمجھا کرو' بس یہی تمہاری ہونے والی بھابی ہے۔''

ہم نے کہا'' زیدی صاحب' اگر یہ آپ سے شادی کرے گی تو اس کے بارے میں ہماری رائے بدل جائے گی۔''

''کیا مطلب؟'' انہوں نے ہمیں گھورا۔

''مطلب یہ کہ وہ ایک ذہین' صاحب ذوق اور پڑھی لکھی لڑکی ہے۔یوں سمجھو کہ ہر لحاظ سے تمہاری ضد ہے۔''

''بھائی وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ ''

''کرتی ہو گی مگر وہ تم سے شادی نہیں کرے گی۔البتہ خودکشی کر لے گی۔''

قمر زیدی بہت ناراض ہوئے اور ایک دو گھنٹے تک ہم سے روٹھے رہے۔
شاہانہ کا اس فلم میں مختصر سا کردار تھا۔ اداکارہ بھی وہ بہت زیادہ اچھی نہ تھی۔ مگر اس کی شخصیت اور بات چیت میں ایک خاص بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پڑھے لکھے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں میں بہت مقبول تھی۔ ہمیں تو کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ لاہور کے قریباً سبھی صحافی اس کو نہ صرف جانتے تھے بلکہ باقاعدگی سے اس کے گھر جا کر محفل آرائی کرتے تھے۔

ہمارے ایک دوست رشید جاوید بھی تھے۔ یہ ہفت روزہ ''ممتاز'' کے ایڈیٹر اور مالک تھے۔ یہ ایک فلمی پرچہ تھا اور کافی مقبول تھا۔ رشید جاوید ایک بے باک' نڈر اور منہ پھٹ آدمی تھے۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، مضبوط ہاتھ پیر، صورت شکل بھی اچھی تھی۔ ذہین اور باتونی آدمی تھے، ہر وقت ہنستے' ہنساتے رہتے تھے۔ ماہنامہ ''فلم لائٹ'' کے دفتر ہی میں ان سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی اور بہت جلد دوستی ہو گئی جو مرتے دم تک جاری رہی۔ وہ ہمارے حصے دار بھی رہے۔ فلم ''آس'' ہم دونوں نے مشترکہ طور پر بنائی تھی۔ ان کے ساتھ ہم نے بہت وقت گزارا اور بہت اچھا وقت گزارا۔ بے حد مخلص دوست اور انتہائی ایماندار آدمی تھے۔ ان پر یہ مثل صادق آتی تھی کہ نہ ساون سوکھے نہ بھادوں ہرے۔ ہم نے انہیں ہر حال میں ایک جیسا ہی دیکھا۔ بے فکر' خوش مزاج' خوش باش اور انتہائی دلچسپ۔ ان کے بارے میں تفصیلات بیان کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔ فی الحال شاہانہ کے حوالے سے گفتگو ہو گی۔
ہم نے بتایا ہے کہ ہمیں فلم کی کہانی اور ڈائریکٹ کرنے کا بہت شوق تھا۔ ہم کہانیاں سوچتے رہتے تھے لیکن اس سے زیادہ اہمیت فلموں کے نام سوچنے کو دیتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ اصل چیز تو فلم کا نام ہوتا ہے۔ کہانی کا کیا ہے وہ تو لکھ ہی لیں گے۔ ہم جو بھی اچھا سا نام سوچتے وہ رشید جاوید اور شباب کیرانوی کو ضرور بتاتے تھے۔ رشید جاوید ہم سے پہلے ہی شباب کیرانوی کے دوست تھے اور بعد میں ہم تینوں اکثر اکٹھے ہوا کرتے تھے۔
ایک دن ہم منٹگمری روڈ پر رشید جاوید کے دفتر گئے تو وہ کچھ خاموش سے تھے۔ منٹگمری روڈ پر وہ ایک بلڈنگ میں کرایہ دار تھے۔ اوپر کے حصے میں ان کا دفتر تھا اور اسی فلیٹ کے ایک حصے میں ان کی رہائش بھی تھی۔ اس طرح یہ آرام تھا کہ دفتر میں بیٹھے بیٹھے وہ ٹیلی فون کو ٹیپ کر کے گھر میں چائے وغیرہ کا آرڈر دے دیا کرتے تھے اور بہت اچھی چائے پینے

کومل جاتی تھی۔اسی بلڈنگ میں ان کے فلیٹ کے نچلے حصے میں ایک جوتا ساز فیکٹری تھی۔پتا نہیں وہ لوگ کس قسم کے جوتے بنایا کرتے تھے کہ ہر وقت نیچے سے دھماد ھم کی آوازیں ہی آتی رہتی تھیں۔پہلی بار جب دھماد ھم سنی تو ہم گھبرا گئے اور پوچھا کہ یہ کیسی آوازیں ہیں؟

رشید جاوید نے حسب معمول اطمینان سے جواب دیا۔" جوتے بن رہے ہیں۔تم فکر مت کرو۔"

"بھئی یہ کس قسم کے جوتے بن رہے ہیں؟"

"یار سمجھا کرو' تم تو بہت ہی زیادہ بے وقوف آدمی ہو۔جب جوتوں کے تلے اور ایڑیاں ٹھونکتے ہیں تو ایسی آواز پیدا ہوتی ہے۔"

ہم نے کہا" بھائی' یہ صرف ایڑیاں اور تلے ہی ٹھونکتے رہتے ہیں تو باقی جوتے کس وقت بناتے ہیں؟"

"یہ تو میں نے پہلے سوچا ہی نہیں۔" وہ سوچ میں پڑ گئے۔پھر بولے" بھئی یہ بھی کوئی تکنیک ہو گی مگر یہ بات طے ہے کہ یہ لوگ جوتے ہی بناتے ہیں۔بم وغیرہ نہیں بناتے۔"

اس روز بھی جاوید صاحب نے ٹیلی فون ٹیپ کر کے گھر سے بہت اچھی قسم کی چائے منگائی۔بھابی نے کچھ بسکٹ بھی ساتھ رکھ دیے تھے۔ چائے بھی بہت اعلیٰ قسم کی تھی۔

"لو بیٹے عیش کرو۔چائے کے بعد ایک سگریٹ بھی پینا۔یہ چیزیں تمہیں اور کہاں نصیب ہوں گی۔" انہوں نے چائے بناتے ہوئے پیشگی احسانات جتانے شروع کر دیے۔

چائے خاموشی سے پی گئی۔ان کا پیش کیا ہوا سگریٹ بھی ہم نے دو چار منٹ کے اندر پھونک کر ختم کر دیا۔پھر بھی چپ رہے۔

"یار کیا بات ہے۔تم آج چپ چپ سے ہو۔خیر تو ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

ہم نے کہا" جاوید صاحب' ہمیں تین چیزوں کی حسرت ہے۔اگر یہ حسرتیں پوری ہو جائیں تو ہماری زندگی میں انقلاب آجائے۔"

"وہ کیا ہیں۔بیان کرو؟" وہ میز پر پھیلے ہوئے پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئے۔

''ایک تو ہم چاہتے ہیں کہ فلم کی کہانی لکھیں۔ دوسری خواہش یہ ہے کہ فلم ڈائریکٹر بنیں۔ تیسری خواہش یہ ہے کہ کوئی اچھی لڑکی اچانک مل جائے اور ہم اس سے شادی کرلیں۔''

جاوید صاحب نے کچھ دیر سوچا۔ پھر کہا'' کہانی تم آج ہی لکھنا شروع کر دو۔ کوئی بیوقوف آدمی ڈھونڈ لیں گے۔ وہ فلم بناڈالے گا اور وہی تم کو ڈائریکٹر بھی لے لے گا۔ اس لیے کہ ہم واقعی کوئی الو کا پٹھا ہی تلاش کریں گے۔''

ہم نے کہا'' تمہارا مطلب ہے کہ ہم کہانی لکھ سکتے ہیں نہ ہدایت کاری کر سکتے ہیں؟ ''

''کہانی تو تم لکھ سکتے ہو اس لیے کہ رائٹر ہو' مگر تمہیں تکنیک نہیں آتی۔ ڈائریکٹر تم عمر بھر نہیں بن سکتے۔ ''

''وہ کیوں؟'' ہم نے احتجاج کیا۔

''اس لیے کہ تم نے کسی ڈائریکٹر کو اسسٹ نہیں کیا۔ جب تک تم کسی اچھے ڈائریکٹر کے ساتھ کام کر کے مار نہیں کھاؤ گے' ڈائریکٹر نہیں بن سکتے۔''

''خیر یہ بات ہے۔ ڈائریکٹر بننے کے لیے کسی ڈائریکٹر کا اسسٹنٹ بننا ضروری نہیں ہے۔ ان کی جھڑکیاں کھاؤ' ان کے جوتے اٹھاؤ' پان سگریٹ لا کر دو' گھر کا سودا لاؤ، بلکہ ان کے لیے شراب بھی لے کر آؤ۔ اس سے کوئی ڈائریکٹر نہیں بن سکتا۔''

''اس کے بغیر پاکستان میں کوئی ڈائریکٹر بن ہی نہیں سکتا مگر 'خیر' میں تمہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ تم سے بھی بڑے بے وقوف اس وقت فلم انڈسٹری میں ڈائریکٹر بنے ہوئے ہیں تو پھر ہمارا چانس بن سکتا ہے۔ رہی تمہاری تیسری خواہش تو وہ میں ابھی پوری کئے دیتا ہوں۔ چلو اٹھو کھڑے ہو جاؤ۔'' وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''کہاں؟''

''سوالات مت کرو۔ بس چپ چاپ میرے ساتھ چلو۔''

ہم سیڑھیاں اتر کر فلیٹ سے نیچے اترے۔ ان کے فلیٹ کی سیڑھیاں پچھلی طرف تھیں جب کہ جوتا ساز فیکٹری سڑک کے بالمقابل تھی۔

ہم نے کہا'' یار جاوید' ذرا فیکٹری کے اندر جھانک کر دیکھ نہ لیں کہ یہ لوگ جوتے کس طرح بناتے ہیں۔ ''

''سمجھا کرو یار۔ تمہارے لیے بیوی تلاش کرنے جا رہے ہیں اور تم جوتا ساز فیکٹری دیکھ کر بدشگونی کرنا چاہتے ہو۔ یاد رکھو' زندگی بھر بیوی کے جوتے ہی اٹھاتے رہو گے۔''

ہم نے احتیاطاً اپنا ارادہ فوراً ملتوی کر دیا۔

رشید جاوید ہمیں لے کر رائل پارک پہنچ گئے۔ یہاں ایک فلیٹ میں راشن کا دفتر تھا۔

ہم نے پوچھا'' کیا بیویوں کا بھی راشن ہو گیا ہے؟''

بولے'' خاموش رہو۔ اوپر چلو۔''

ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے فلیٹ پر پہنچ گئے۔ جاوید نے دروازے پر دستک دی۔ ایک زنانہ آواز نے کہا۔'' کون ہے' آجاؤ۔''

ہم جاوید کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک صاف ستھرا سادگی سے سجا ہوا فلیٹ تھا۔ سامنے والے کمرے میں چند صوفے اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک صوفے پر شاہانہ کی بہن بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم لوگوں کو دیکھا تو بہت خوش ہوئیں۔

''آج کیسے راستہ بھول پڑے اور انہیں بھی ساتھ لے آئے۔ زہے قسمت۔''

علیک سلیک کے بعد ہم لوگ بیٹھ گئے۔ اندر سے شاہانہ بھی نکل آئیں۔ سادہ سے لباس میں سادگی کا نمونہ بنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور ایک چھوٹے لڑکے سے چائے لانے کو کہا۔ جاوید صاحب نے ہمیں بتایا کہ ابھی شام نہیں ہوئی ہے۔ ورنہ یہاں سارے صحافی' دانشور' شاعر اور ادیب اکٹھے ہوتے ہیں اور خوب بحث مباحثے ہوتے ہیں۔

''واقعی آپ بے وقت آ گئے۔'' شاہانہ نے شوخی سے کہا۔

جاوید صاحب نے کہا'' شاہانہ' تم چپ بیٹھ جاؤ۔ بڑوں کی بات میں چھوٹے نہیں دخل دیتے۔'' پھر وہ شاہانہ کی بہن سے مخاطب ہوئے۔'' آفاقی کو آپ جانتی ہیں؟''

''خوب اچھی طرح۔''

''کیسا لڑکا ہے؟''

''سنا ہے بہت شریف آدمی ہیں۔''

رشید جاوید بولے'' بہت شریف' خاندانی' پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ بر سر روزگار بھی ہے' اخبار میں کام کرتا ہے۔''

''ماشااللہ' ماشااللہ!'' شاہانہ کی بہن نے پان منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا خیال ہے؟''

''کس کے بارے میں؟''

''ارے بھئی شادی کے بارے میں۔ تم سے نہیں شاہانہ سے۔''

ہم پریشان ہو گئے۔'' یار یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

''بدتمیزی کی کیا بات ہے۔ تمہاری تیسری خواہش پوری کر رہا ہوں۔ یہ بھی اچھی لڑکی ہے۔ فلموں میں ترقی کرے گی۔ تم کہانیاں لکھا کرنا' ہدایت کاری کرنا' یہ کام کیا کرے گی۔''

ہمیں بہت غصہ آیا۔'' یہ کیا مذاق ہے؟''

شاہانہ اور اس کی بہن بھی حیران تھیں۔ جاوید صاحب نے کہا'' یہ میرا بہت پیارا دوست ہے۔ صبح سے اداس اور پریشان ہے۔ میں اس کی تین خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہوں۔ سوچتا ہوں پہلے شادی ہو جائے' پھر دوسرے کام بھی ہو جائیں گے۔ بیوی تو اپنی قسمت ساتھ لے کر آتی ہے۔''

شاہانہ نے کہا۔'' اور بدقسمتی بھی''

سب ہنسنے لگے۔ اتنی دیر میں چائے آ گئی اور گپ شپ شروع ہو گئی۔ رفتہ رفتہ اور لوگ بھی آنے لگے۔

جاوید صاحب نے کہا'' دیکھو ابھی زیادہ لوگ نہیں آئے ہیں۔ جلدی سے ہاں یا نہ کر دو تا کہ یہ بات تو ختم ہو۔''

شاہانہ بولیں۔'' جاوید صاحب' جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ کم از کم میں اپنی نئی زندگی شیطانی کام سے شروع نہیں کروں گی۔''

جاوید صاحب نے ہمیں دیکھا اور کہا۔" دیکھو۔اب مجھ سے شکایت نہ کرنا۔ میں نے تو سارا بندوبست کر دیا تھا۔"
اگلے روز ہم نے قمر زیدی کو بتایا کہ شاہانہ کی شادی کی بات چیت چل رہی ہے۔
"چھوڑو' مذاق مت کرو۔"
"ایمان سے' میرے سامنے بات ہوئی تھی۔"
"کھاؤ قسم"!
ہم نے قسم کھالی۔
"کس سے ؟ کون ہے وہ کمینہ۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔"
ہم نے کہا" بلاوجہ ڈریکولا بننے کی کوشش مت کرو۔ خون پینا ہے تو اپنی محبوبہ کا پیو۔" وہ اسی وقت رخصت ہو گئے۔
دوسرے دن ملے تو خاصے پریشان تھے۔" کچھ پتا نہیں چلتا۔ ویسے بات تو ہوئی ہے۔ میں نے اسے بھی قسم دے کر پوچھا تھا۔"
اس طرح قمر زیدی بے چارے کئی دن پریشان رہے۔ شاہانہ کو قمر زیدی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کم از کم رومان کی حد تک۔ ان کی لطیفہ بازی اور نقلیں اتارنا اسے پسند تھیں،اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مگر بعد میں شاہانہ سے ہماری کافی دوستی ہو گئی۔ وہ بہت ذہین' سمجھ دار اور حساس لڑکی تھی۔ اسی لیے فلموں میں کامیاب نہ ہو سکی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ خود بھی اداکارہ بننے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ اس کی کہانی خاصی دل گداز تھی۔ وہ ایک شریف اور اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ جسے وہ اپنی بہن بتاتی تھی وہ دراصل اس کی بہن نہیں تھی' سہیلی اور ہمدرد تھی۔ بعض وجوہات کی بنا پر شاہانہ کو اپنا گھر چھوڑنا پڑا اور اس نے اپنی سہیلی کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ جسے وہ" باجی" کہا کرتی تھی۔ اپنے گھر اور خاندان سے اس نے ہمیشہ کے لیے رابطہ توڑ لیا۔ فلمی دنیا میں بھی وہ زیادہ عرصے نہ رہی۔ جب ہم نے کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا اور فلم ساز بنے تو شاہانہ لاہور کی فلمی دنیا سے رخصت ہو چکی تھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں چلی گئی' مگر اس کے ساتھ گزرے ہوئے دن اور دلچسپ محفلوں کا تذکرہ کافی عرصے تک ہوتا رہا۔
چند سال ہوئے ہم اسلام آباد گئے اور وہاں ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ اسی شام ایک فون موصول ہوا۔

"ہیلو۔"

"آپ آفاقی صاحب بول رہے ہیں؟" ایک سریلی سی آواز نے پوچھا۔

"جی؟"

"مجھے پہچانا؟"

"جی نہیں۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ کوئی دوستوں کو یوں بھولتا ہے۔"

دماغ پر بہت زور ڈالا مگر یاد نہ آیا۔ "آپ خود ہی بتا دیجئے۔"

"میں شاہانہ بول رہی ہوں۔"

"ارے شاہانہ۔ کہاں سے بول رہی ہو؟ میری خبر کہاں سے لگی؟"

"بس مل گئی۔ اچھا خدا حافظ۔" ایک دم فون بند ہو گیا۔

ہم بہت حیران ہوئے۔ شاہانہ کو ہمارے بارے میں کس نے بتایا اور اس نے اچانک فون کیوں بند کر دیا؟

کمرے کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ ہم نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے شاہانہ کھڑی تھی۔ اب لڑکپن کی جگہ پختگی نے لے لی تھی۔ ہم نے جس لڑکی کو دیکھا تھا اب وہ عورت بن چکی تھی۔ ہم حیران دیکھتے رہ گئے۔

"اندر آنے کو نہیں کہیں گے؟"

"کیوں نہیں۔ آؤ۔ مگر تم اتنی جلدی؟"

وہ ہنسنے لگی۔ وہی کھلکھلاتی ہوئی آواز۔ مسکراتی ہوئی چمکدار آنکھیں۔ "گھبرائیں نہیں، میں اسی ہوٹل میں کام کرتی ہوں۔ آپ کے بارے میں مجھے۔۔۔۔۔۔ ریسپشن سے خبر ملی تھی۔"

ہم دونوں کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے مگر درمیان میں ایک طویل زمانہ حائل تھا۔

سب کچھ بدل چکا تھا۔ ہم دونوں ہی کیا، ساری دنیا بدل گئی تھی۔ کچھ دیر ایک دوسرے کے بارے میں معلوم کرتے رہے۔

''باجی ٹھیک ہیں'' اس نے کہا۔ ''بس صحت خراب رہتی ہے۔آپ کا ذکر کرتی ہیں۔ ''

''تمہاری شادی ہو گئی ؟'' ہم نے پوچھا

ایک اداس سی معنی خیز مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی۔ ''چھوڑیں یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔اگلی بار ملیں گے تو سناؤں گی۔اور دیکھیں جب اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ آئیں تو مجھ سے ضرور ملائیں۔بلکہ میرے گھر پر کھانا بھی کھائیں۔اچھا اب میں چلتی ہوں۔نوکری کا معاملہ ہے۔''

شاہانہ چلی گئی مگر اپنے پیچھے یادوں کی ایک برات چھوڑ گئی۔وہ زمانہ یاد آ گیا۔جواب کبھی لوٹ کر نہ آئے گا۔وہ لوگ' وہ کہانیاں' وہ واقعات' آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔کانوں میں جانے والوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔وہ دوست احباب' وہ فن کار' وہ ہنر مند' وہ محفلیں' وہ ماحول' ایک ایک کر کے سب کچھ ایک پرانی فلم کی طرح آنکھوں میں گھومنے لگا۔یہ وہ زمانہ تھا جسے ہم سنہرا دور کہہ سکتے ہیں۔افسوس اس بات کا ہے کہ یہ دوبارہ لوٹ کر نہ آئے گا۔

شاہانہ کا تذکرہ ہم نے اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ پاکستان کی فلمی صنعت میں ایک ایسا دور بھی تھا جب چھوٹے موٹے کردار کرنے والے فن کار بھی ہوش مند' پڑھے لکھے اور باشعور ہوا کرتے تھے۔اب تو ایسی ہوا چلی ہے کہ بڑے بڑوں کو دیکھ کر بھی عبرت ہوتی ہے۔شاہانہ سے وہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ہم اس کے بعد نہ اس ہوٹل میں ٹھہرے اور نہ شاہانہ سے ملاقات کا موقع ملا۔

لاہور کی مال روڈ پر ہر معقول آدمی کا ہر روز کم سے کم ایک اور زیادہ سے زیادہ درجنوں پھیرے لگانا رواج میں داخل تھا۔ہم بھی مال روڈ کے پر سکون اور صاف ستھرے فٹ پاتھوں پر ٹہلا کرتے تھے۔مال روڈ کی دونوں جانب وسیع سبزہ زار تھے اور گھاس کے تختوں پر رنگا رنگ پھول کھلا کرتے تھے۔ فضا میں کثافت کا نام ونشان تک نہ تھا۔نہ سڑکوں پر کاروں کا اور فٹ پاتھوں پر لوگوں کا ہجوم تھا اس لیے مال روڈ پر چہل قدمی کرنا ان دنوں صحیح معنوں میں ایک خوبصورت تفریح تھی۔

ہم نے ایک روز دیکھا کہ مال روڈ پر شیزان ریستوران کے سامنے ایک سرخ رنگ کی خوبصورت چمکتی ہوئی کار کھڑی ہے۔ اس کی چھت کھلی ہوئی تھی۔کار سے ٹیک لگا کر ایک خوبصورت ہیرو ٹائپ آدمی کھڑا تھا۔اس نے سفید پتلون

اور سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ گلے میں اسکارف تھا۔ پیروں میں نہایت نفیس قسم کے جوتے تھے۔اس کے لباس سے بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔اس کے پاس گزرتے ہوئے ہم شیزان میں داخل ہو گئے۔

ہم نے اپنے صحافی دوست سے پوچھا۔'' یہ کون ہے جو ہر روز مال روڈ پر نظر آتا ہے۔''

'' یہ چودھری محمد اسلم ہے۔ بہت پیسے والوں کا بیٹا ہے۔اس کے والد چودھری دین محمد بڑے آدمی ہیں۔مال روڈ پر اور اس کے عقب میں بے حساب زمینیں اور عمارتیں ان کی ملکیت ہیں۔''

''اچھا۔ تو کیا یہ ہر روز ان عمارتوں کا کرایہ وصول کرنے آتا ہے؟''

''ارے نہیں۔بس رئیس ہے' عیش کرتا ہے۔''

ہم نے پوچھا'' یہ پڑھتا وڑھتا کیوں نہیں؟''

جواب ملا۔'' جو پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ایف سی کالج سے گریجویشن کیا ہے۔''

''تو پھر کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟''

وہ ہنسنے لگا۔'' بھائی اسے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے گھر کا رئیس ہے۔ بے فکری۔سنا ہے فلم میں ہیرو بننے کا شوقین ہے۔''

یہ اسلم پرویز سے ہمارا پہلا تعارف تھا۔

اسلم پرویز اس وقت تک اسلم پرویز نہیں بنے تھے۔ محض چودھری اسلم تھے۔ان کے خاندان کے بارے میں آپ سن ہی چکے ہیں۔ یہ سب ملا کر چار بھائی تھے۔اسلم کا ان میں تیسرا نمبر تھا۔ان کا گھرانہ ایک دین دار اور کاروباری گھرانہ تھا۔ اس کے باوجود اس گھر میں دو فن کار پیدا ہو گئے۔ایک اسلم پرویز اور دوسرے ان کے بھائی معین نجمی۔

معین نجمی بھی ایک دراز قد' دبلے پتلے' خوش شکل نوجوان تھے۔اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ان کو مصوری کا شوق تھا چنانچہ آرٹ کی تعلیم و تربیت حاصل کی اور بہت اچھے مصور بن گئے۔اخلاق و عادات کے وہ بھی بہت اچھے تھے۔ خوش لباس بھی تھے۔اب بہت عرصے سے انہیں نہیں دیکھا مگر اس زمانے میں پڑھے لکھے حلقوں اور ریستورانوں میں معین نجمی بھی اکثر نظر آجاتے تھے۔ باقی دو بھائی کاروبار سے وابستہ رہے اس لئے دنیا ان کے بارے میں کچھ نہیں

جانتی۔

اسلم کواداکاری کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ کالج کے زمانے میں ڈراموں میں حصہ لیتے رہے۔ پڑھ لکھ کر فارغ ہوئے تو ہیرو بننے کا سودا سر میں سما گیا۔ وضع دار اور غیور آدمی تھے اس لئے اپنی زبان سے تو کسی سے کہتے نہیں تھے کہ مجھے ہیرو بنالو۔ بس گھوم پھر کر سیشن پریڈ کرتے رہتے تھے۔ خوش لباسی کا اسلم کو ہمیشہ شوق رہا۔ اتنا نفیس لباس پہننے والے فلمی دنیامیں تو کیا باہر کی دنیامیں بھی بہت کم ہوں گے۔ اسلم پرویز کی مرگ ناگہاں کے بعد ایک صحافی نے تو یہ لکھ دیا کہ اسلم پرویزایشیاکے سب سے زیادہ خوش لباس آدمی تھے۔ لباس کی تراش خراش اس کی فٹنگ' اس کا استعمال ' رنگوں کی میچنگ۔ ہر لحاظ سے ان کا لباس بے عیب ہوا کرتا تھا۔ وہ زمانہ باذوق لوگوں کا زمانہ تھا جو زندگی میں ہر اچھی چیز کو پسند کرتے ہیں۔ نگار خانوں' فلمی دفتروں اور فلمی تقاریب میں جسے دیکھئے کسی ٹیلر ماسٹر کا اشتہار بنا نظر آتا تھا۔ پھر یہ لوگ ایک دوسرے کو سراہتے بھی تھے۔ بات نہ بنے تو نکتہ چینی بھی کرتے تھے۔

ہمیں بھی اس زمانے میں خوش لباسی کا بخار چڑھا۔ یوں تو اور لوگ بھی لباس کو پرکھتے تھے مگر اسلم پرویز اور لہری دو ایسے آدمی تھے جنہیں ہم نے کبھی خراب کپڑوں میں نہیں دیکھا اور یہ لباس کے نقاد بھی تھے۔ اپنے حلقہ احباب کے لوگوں کو دیکھتے ہی سب سے پہلے لباس کا جائزہ لیتے تھے۔

''بہت خوب، زبردست سوٹ ہے۔ ٹائی تو باہر کی لگتی ہے؟''

اس زمانے میں باہر کی چیزیں عام نہ تھیں۔

''کیا خوب میچنگ ہے۔ بھئی کمال کر دیا اور رومال کے ساتھ ٹائی کا جواب نہیں ہے۔ سر سے پیر تک لاجواب نظر آرہے ہو۔''

مگر نکتہ چینی بھی ہوا کرتی تھی۔

''بھئی سوٹ تو کمال کا ہے' ہاں' جوتا بھی ٹھیک ہے۔ ٹائی بھی میچ کر رہی ہے۔ اب ذرا موزے چیک کراؤ۔'' ہم پتلون کا پائنچہ اونچا کر دیتے۔

''بس یہاں مار کھا گئے۔ بھئی بات نہیں بنی۔اب پتلون کو نیچے ہی کھسکا کر رکھنا۔موزے نظر نہ آئیں ورنہ کام خراب ہو جائے گا۔''

لباس کے نقاد ہدایت کار اقبال یوسف بھی تھے۔یہ حضرات خود اپنے لباس پر اتنی توجہ نہیں دیتے تھے جتنی کہ دوسروں کے لباس پر نظر رکھتے تھے۔ہمیں جہاں دیکھتے کھڑے ہو کر سرتا پا جائزہ لیتے۔''ٹھیک ہے۔یہ بھی ٹھیک ہے۔ٹائی، رومال' جوتے' ہیٹ' اے ون ہے۔اب ذرا موزے دکھاؤ۔''

ہمیں پتا تھا کہ موزوں کے معاملے میں کوئی گڑ بڑ ضرور نکلے گی۔اس لئے ٹالنے کی کوشش کرتے۔'' یار رہنے دو۔ہر وقت درزی بنے رہتے ہو۔''

''پھر تو ضرور کوئی گڑ بڑ ہے۔'' وہ ہماری پتلون کا پائنچہ کھسکا کر دیکھتے۔''ارے مروادیا بس مور کی طرح پیروں سے مار کھا گئے۔بھائی موزوں سے تمہیں کیا دشمنی ہے؟''

مگر اسلم پرویز کا لباس ہمیشہ بے عیب ہوا کرتا تھا۔کیا مجال ہے جو کوئی ذرا سی بھی غلطی نکال سکے۔

اسلم پرویز نے فلم سازوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو مشہور مزاح نگار شفیق الرحمن کے کردار شیطان کے ایک دوست نے اپنے ہونے والے سسر کے ساتھ کیا تھا۔انہوں نے ایک لڑکی کو پسند کیا اور بقول مصنف اس پر آٹھویں بار عاشق ہو گئے۔یعنی لگاتار آٹھ دن تک اس پر عاشق رہے۔چنانچہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس لڑکی سے تو شادی کرنی ہی پڑے گی۔مگر لڑکی کا باپ سخت معترض تھا۔وہ بڑا افسر تھا اور یہ بے کار۔بہر حال انہوں نے نوکری بھی حاصل کر لی مگر لڑکی حاصل کرنا ٹیڑھی کھیر تھی۔اس کی ترکیب انہوں نے یہ نکالی کہ صبح ہوتے ہی لڑکی کے گھر پہنچ جاتے تھے۔اس کے ابا گھر سے نکلتے تو یہ سلام عرض کرتے۔وہ انہیں نظر انداز کر کے کار میں بیٹھ کر دفتر چلے جاتے تو یہ بھی دفتر جا کر حاضری دیتے۔وہ دفتر سے باہر نکلتے تو یہ موجود۔وہ کلب میں جاتے تو وہاں بھی یہ موجود۔ریس کورس یا سنیما گھر جاتے تو وہاں بھی یہ سائے کی طرح ساتھ لگے رہتے۔یہاں تک کہ ایک دن تنگ آکر انہوں نے پوچھا کہ آخر تم چاہتے کیا ہو؟

انہوں نے جواب دیا''آپ کی فرزندی''!

وہ اس قدر بیزار ہو چکے تھے کہ فوراً شادی کی منظوری دے دی۔

اسلم پرویز نے بھی فلم والوں کے ساتھ یہی ترکیب استعمال کی' لاہور کی مال روڈ پر ہر فلم والا ضرور جاتا تھا۔ وہاں یہ اپنی کار دوڑاتے پھرتے تھے اور ہر روز نت نئے لباس کی نمائش بھی پیش کر دیتے تھے۔ نگار خانے' سنیما گھر' ریستوران' تقریبات' ریس کورس' کلب' ہر جگہ اسلم پرویز کی رسائی میں تھی۔ جہاں دیکھئے اسلم پرویز موجود۔ آخر فلم والوں نے ان کا نوٹس لینا شروع کر دیا۔ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ کون شخص ہے' کیا چاہتا ہے؟ وہ اداکار بن کر تو بعد میں ہٹ ہوئے، اپنے لباس اور ٹھاٹ باٹ کی وجہ سے فلم والوں میں وہ پہلے ہی ہٹ ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے انہیں ہدایت کار منشی دل نے اپنی فلم ""سوہنی"" میں لینے کا ارادہ کیا اور ان کا اسکرین ٹیسٹ لیا۔

منشی دل کے متعلق بھی کچھ جان لیجئے۔ یہ تھیٹر کے زمانے میں مصنف اور ہدایت کار تھے۔ بڑے مشہور اور کامیاب ڈرامے لکھ چکے تھے۔ پہلے زمانے میں فلموں میں لوگ تھیٹر کے راستے سے ہی آیا کرتے تھے۔ خصوصاً لکھنے والے۔ منشی دل بھی فلمی دنیا میں پہنچ گئے۔ بہت کامیاب کہانیاں لکھیں۔ ہدایت کار بنے تو وہ فلمیں بھی ہٹ ہو گئیں۔ اس طرح وہ ایک ممتاز حیثیت اختیار کر گئے۔

ہم نے جب انہیں پہلی بار دیکھا تو وہ درمیانہ عمر اور دوہرے جسم کے معقول آدمی نظر آئے۔ اکثر کھلے پائنچوں کا پاجامہ اور سفید وائل کا کرتہ پہنتے تھے۔ سردیوں کے موسم میں کوٹ پتلون بھی پہن لیا کرتے تھے۔ بہت دلچسپ اور بذلہ سنج تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ باتیں چبا چبا کر بڑے اعتماد کے ساتھ کرتے تھے۔

ایک بار ایس ایم یوسف صاحب نے انہیں اپنے ادارے کی ایک فلم میں ہدایت کار کے طور پر سائن کیا۔ فلم کا نام غالباً ""سرتاج"" تھا اور اس میں دیبا ہیروئن تھیں۔ کبھی کبھی ایس ایم یوسف بھی سیٹ پر چلے جاتے تھے۔ ایک بار گئے تو دیبا پر ایک ڈرامائی منظر فلمایا جا رہا تھا۔ ان کی اداکاری سے یوسف صاحب مطمئن نہ ہوئے دیبا سے کہا کہ سین میں کچھ اور اثر پیدا کرو۔

دیبا نے دوبارہ مکالمے ادا کیے مگر یوسف صاحب مطمئن نہ ہوئے۔

منشی دل چپ چاپ دیکھ رہے تھے۔ غالباً یوسف صاحب کی یہ مداخلت انہیں پسند نہیں آ رہی تھی۔ آخر یوسف

صاحب سے کہنے لگے۔ ’’یوسف صاحب‘ آپ ذرا انہیں خود اداکاری کر کے دکھا دیجئے۔‘‘
دیبا ہنسنے لگیں۔ ’’منشی صاحب‘ مردوں کو تو یہ خود اداکاری کر کے دکھا سکتے ہیں۔ عورتوں کو کیسے دکھائیں گے؟‘‘
منشی صاحب نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ’’تمہیں پتا نہیں یہ تھیٹر میں ہیروئن کا کردار کرتے رہے ہیں۔ ان سے اچھی اداکاری اور کون بتائے گا؟‘‘
یہ حقیقت بھی تھی۔ ایس ایم یوسف نے جب بمبئی میں فلمی زندگی کا آغاز کیا تو اسٹیج پر ہیروئن کے روپ میں آتے تھے۔ اس دور میں یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ تھیٹر میں عموماً مرد ہی عورتوں کے کردار ادا کرتے تھے۔ مگر دیکھنے والوں کو شبہ تک نہ گزرتا تھا۔
منشی صاحب کم بولتے تھے مگر نپی تلی گفتگو کرتے تھے۔ ایک بار یہ ذکر چھڑ گیا کہ فلاں شخص کثرت شراب نوشی کے باعث تباہ و برباد ہو گیا۔
منشی صاحب پہلے تو سنتے رہے۔ پھر کہنے لگے۔ ’’میاں شراب کی وجہ سے کوئی تباہ و برباد نہیں ہوتا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ کثرت شراب نوشی تو بہت سی دوسری خرابیوں سے بچا لیتی ہے۔ دیکھئے نا۔ کوئی شخص زیادہ سے زیادہ کتنی شراب پی لے گا؟ ایک بوتل‘ دو بوتل‘ اس کے بعد بے ہوش ہو جائے گا۔ گویا شراب ہی کا خرچا کرے گا۔ تباہ و برباد ہونے کے لئے اس کے پاس ہوش ہی کہاں ہو گا۔ بھائی، تباہ و برباد کرنے والی چیزیں دوسری ہیں۔ عیاشی‘ رنگین مزاجی‘ جوا، ریس کی لت‘ یہ چیزیں انسان کو تباہ و برباد کرتی ہیں۔ شراب غریب تو ناحق بدنام ہے۔‘‘
منشی دل نے بہت سی کامیاب فلمیں بنائیں اور ایک زمانے میں ان کا سکہ چلتا تھا۔ ان کی فلموں میں سیٹ وغیرہ پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ کئی بار کمروں کی دیواریں ہلتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ گویا لگتا تھا کہ کپڑے سے بنی ہوئی ہیں۔ اسی طرح فرش پر بھی بجلی کے تار پڑے ہوئے نظر آتے تھے۔

کسی نے کہا۔ ’’منشی صاحب‘ آپ سیٹ اور آرائش پر توجہ نہیں دیتے۔‘‘
منشی صاحب پان چباتے ہوئے بولے۔ ’’بھائی، سنیما میں لوگ منشی دل کا ڈراما دیکھنے آتے ہیں۔ سیٹ دیکھنے کی انہیں فرصت ہی نہیں ہوتی۔‘‘

یہ سچ بھی ہے کہ منشی دل کی فلموں کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔انہوں نے بہت سی کامیاب فلمیں بنائی ہیں" حسرت" ان کی بہت اچھی فلم تھی جس میں صبیحہ اور سنتوش کمار کی جوڑی کے ساتھ یوسف خان بھی ایک اہم کردار میں تھے۔ سنتوش صبیحہ اس زمانے میں پورے عروج پر تھے۔یوسف خان کو وہ مقام حاصل نہ تھا مگر مزاج ان کا سپر اسٹاروں جیسا ہی تھا۔ایک بار شوٹنگ کے دوران میں سنتوش کمار نے انہیں دھکا دیا تو وہ گر گئے۔

یوسف خان نے کہا۔" سنتوش صاحب' آپ نے تو سچ مچ ہی دھکا مار دیا۔"

سنتوش نے مسکرا کر کہا۔" یار اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔اس کے بغیر دیکھنے والوں پر اثر نہیں ہوتا۔"

یوسف خان کو یہ بات ناگوار تو لگی مگر پی گئے۔اسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں ایک سین میں انہیں سنتوش کمار کو تھپڑ مارنا تھا۔انہوں نے ریہرسل میں تو جھوٹ موٹ اشاروں سے تھپڑ مارا مگر جب ٹیک ہونے لگی تو پوری طاقت سے جما کر ایسا تھپڑ رسید کیا کہ سنتوش کا منہ پھر گیا اور آواز سے پورا سیٹ گونج اٹھا

سنتوش مضبوط آدمی تھے۔یہ تھپڑ سہہ گئے مگر سیٹ پر سنسنی پھیل گئی۔ہر ایک دم بخود تھا۔

یوسف خان نے مسکرا کر سنتوش کمار سے پوچھا۔" کیوں سنتوش صاحب' حقیقی ایکٹنگ کی تو بات ہی اور ہوتی ہے ؟"

سنتوش بھی مسکرا کر رہ گئے مگر ان کا چہرہ دو دن تک متورم رہا۔

منشی دل نے بعض ایسی فلمیں بھی بنائیں جو مقابلے میں بنائی جا رہی تھیں۔ان کی کہانی اور موضوع ایک ہی تھا۔دونوں فلم سازوں کی خواہش ہوتی تھی کہ پہلے ان کی فلم مکمل ہو جائے۔عموماً یہ وہ فلمیں ہوتی تھیں جن کی کہانی انڈین فلموں سے لی جاتی تھی۔دوسرے لفظوں میں چربہ فلمیں بنانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے فلم سازوں میں مقابلہ شروع ہو جاتا تھا۔بعض اوقات کسی ایک خاص موضوع کو فلمانے پر بھی ضدم ضدّا ہو جاتی تھی۔ ساری فلمی دنیا میں اس بات کا چرچا ہو جاتا تھا۔دونوں فلم ساز دن رات شوٹنگ میں مصروف ہو جاتے تھے اور دونوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ پہلے اس کی فلم ریلیز ہو جائے۔

ایسی ہی ایک فلم " لختِ جگر" تھی۔اس کے فلم ساز آغا جی اے گل اور ہدایت کار لقمان تھے۔اس کے مقابلے میں دوسری فلم جے سی آنند بنا رہے تھے جس کا نام " حمیدہ" تھا۔اس کے ہدایت کار منشی دل تھے۔" حمیدہ " میں سنتوش اور صبیحہ مرکزی کردار تھے۔ جے سی آنند نے ان دونوں کو یکمشت بہت بھاری معاوضہ دے کر دن رات اپنی فلم کی شوٹنگ پر آمادہ کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ سنتوش اور صبیحہ سوتے بھی اسٹوڈیو ہی میں تھے۔دوسرے اداکار بھی وہیں سویا کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں " لختِ جگر" میں نور جہاں ہیروئن تھی۔ سنتوش اس فلم کے ہیرو تھے۔ساری فلم انڈسٹری میں یہ خبر گھوم گئی تھی کہ یہ دونوں فلمیں مقابلے میں بنائی جا رہی ہیں۔جب دونوں فلمیں ریلیز ہوئیں تو" حمیدہ " سپر ہٹ ہو گئی۔" لختِ جگر" نے اتنا اچھا بزنس نہیں کیا تھا حالانکہ اس میں نور جہاں کی اداکاری اور بابا چشتی کی موسیقی بہت اچھی تھی۔اس طرح منشی دل نے یہ مقابلہ جیت لیا۔

ان کا ایک اور مقابلہ انور کمال پاشا کے ساتھ ہوا۔ پاشا صاحب کا اس زمانے میں طوطی بول رہا تھا۔خوش بختی کا یہ عالم تھا کہ مٹی کو بھی ہاتھ لگاتے تھے تو وہ سونا بن جاتی تھی۔ہر فلم ہٹ ہو رہی تھی۔ایسے میں انور کمال پاشا صاحب نے کلاسیکی رومانی داستان " لیلیٰ مجنوں" بنانے کا ارادہ کیا۔ادھر منشی دل بھی" عشق لیلیٰ" کے نام سے یہی کہانی لکھ چکے تھے اور فلم بندی کے لیے پر تول رہے تھے۔اس کے فلم ساز بھی جے سی آنند تھے۔ فلمی دنیا میں ایسی باتیں بھلا کب چھپی رہتی ہیں۔ ہونٹوں نکلی' کوٹھوں چڑھی۔ یہ خبر دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف پھیل گئی۔ ہونا تو یہ چاہتے تھا کہ دونوں فلم سازوں میں سے کوئی ایک اس کہانی کو بنانے کا ارادہ ملتوی کر دیتا مگر توبہ کیجئے کوئی اپنی مونچھ نیچی کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ چنانچہ شروع ہو گیا مقابلہ۔

"عشق لیلیٰ" میں صبیحہ اور سنتوش مرکزی کرداروں میں تھے "لیلیٰ مجنوں" میں انور کمال پاشا نے اسلم پرویز اور بہار کو لیلیٰ مجنوں کے کرداروں میں لیا تھا۔ دیکھا جائے تو دونوں ہیرو مجنوں بننے کے قابل نہ تھے۔ مجنوں تو وہ شخص تھا جو لیلیٰ کے عشق میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ لیلیٰ کی انگلیاں اور مجنوں کی پسلیاں بلاوجہ تو مشہور نہ ہوئی تھیں۔اب ان دونوں فلموں کے مجنوں ماشاءاللہ تندرست اور ہٹے کٹے تھے۔ شوٹنگ فوراً شروع ہو گئی۔اداکاروں اور ہنر مندوں نے نگار خانوں میں شب و روز اپنا ٹھکانا بنا لیا۔ اخباروں میں ہر روز ان دنوں فلموں کی تیاریوں کی خبریں شائع ہوا کرتی

تھیں۔ باقی لوگ دلچسپی سے تماشا دیکھ رہے تھے۔

پاشا صاحب نے فلم کی پبلسٹی کا یہ طریقہ نکالا کہ اونٹ پر عربی لباس میں لیلیٰ مجنوں جیسے کردار بیٹھے ہوتے تھے۔ آگے پیچھے تانگوں اور ریڑھیوں پر فلم کے بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوتے تھے اور لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوتا رہتا تھا مگر جب دونوں فلمیں ایک ہی دن ریلیز ہوئی تو منشی دل کا پلہ بھاری ہو گیا۔ ''عشق لیلیٰ'' سپر ہٹ ہو گئی۔ اس فلم میں بارہ گانے تھے جن میں اسے بعض گانے تو آٹھ منٹ دورانیہ کے بھی تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک گانا ختم ہوتے ہی دوسرا گانا شروع ہو گیا۔ اس فلم کے لئے صفدر نے بہت اچھا میوزک بنایا تھا۔ قتیل شفائی کے لکھے ہوئے گانے بھی بہت خوب تھے۔ اس پر سنتوش اور صبیحہ کی جوڑی۔ فلم بینوں کی تو عید ہو گئی۔ یہ فلم سپر ہٹ ہو گئی۔ اس کے مقابلے میں انور کمال پاشا صاحب کی ''لیلیٰ مجنوں'' کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ نہ ہی اس کے گانے مقبول ہوئے۔ حالانکہ اس کی موسیقی رشید عطرے نے ترتیب دی تھی جنہیں عشق لیلیٰ کے موسیقار صفدر اپنا استاد مانتے تھے۔

یہ دونوں مقابلے جیتنے کے بعد منشی دل کی خود اعتمادی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا لیکن ہم نے ان کے برتاؤ میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں دیکھی۔ وضع دار اور بامروت آدمی تھے۔ جن دنوں مقابلے میں فلمیں بنائی جا رہی تھیں تو ظاہر ہے کہ فلمی دنیا میں خوب گہما گہمی تھی۔ فقرے بازی بھی ہوتی تھی پھر انور کمال پاشا تو فقرے چست کرنے میں ماہر تھے۔ وہ منشی صاحب کے بارے میں جو بھی کہتے تھے وہ ان تک پہنچ جاتا تھا مگر جواب میں انہوں نے کبھی کوئی تلخ و ترش بات نہ کی۔

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ اسلم پرویز کا سب سے پہلے منشی دل نے اپنی فلم ''سوہنی'' کے لئے اسکرین ٹیسٹ لیا تھا۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ کرنے بھی نہ پائے تھے کہ اسلم پرویز کے ستاروں کی گردش میں کچھ تیزی آ گئی اور وہ انور کمال پاشا کی نظروں میں آ گئے۔ نظروں میں تو خیر پہلے بھی تھے' لاہور میں کون سی جگہ تھی جہاں اسلم پرویز ٹپ ٹاپ ہو کر نظر نہیں آتے تھے مگر جب پاشا صاحب کو معلوم ہوا کہ وہ اداکار بننے کے بھی خواہش مند ہیں تو انہوں نے اپنی فلم ''قاتل'' میں انہیں سائیڈ رول کے لئے منتخب کر لیا۔ ''قاتل'' انور کمال پاشا کی بہت ہٹ فلم تھی مگر اس فلم کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ اس میں تین ایسے نئے چہرے پیش کئے گئے تھے جو آگے چل کر فلمی افق پر آفتاب و

ماہتاب بن کر چمکے۔ان میں سے ایک تو اسلم پرویز ہی تھے جنہیں معاون اداکار کے طور پر کاسٹ کیا گیا تھا۔ دوسرے اکمل تھے۔اکمل مشہور و معروف اداکار اجمل کے چھوٹے بھائی تھے۔لمبے تڑنگے 'خوش شکل' گورا رنگ' بڑی بڑی آنکھیں' ستواں ناک' قدرے گھنگریالے بال مگر یہ سب خوبیاں رکھنے کے باوجود بہت پیچھے رہ گئے تھے۔فلمی دنیا میں وہ میک اپ مین کے طور پر داخل ہوئے تھے۔بلکہ میک اپ بوائے کہنا زیادہ مناسب ہو گا اس لئے کہ وہ ان دنوں نوخیز تھے۔وہ چپ چاپ کئی عرصے تک میک اپ مین چارلی کے معاون رہے۔پھر خود بھی میک اپ مین بن گئے دوسروں کے چہروں کو سنوارتے تھے مگر خود اپنی طرف سے بے پروا تھے۔

ایک روز اکمل پر پاشا صاحب کی نظر پڑ گئی۔میک اپ والوں کو عام طور پر کون غور سے دیکھتا ہے۔اور پھر جب سیٹ پر جگمگاتے ہوئے فلمی ستارے موجود ہوں تو میک اپ مین مسلسل موجودگی کے باوجود فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی نظروں سے اوجھل ہی رہتا ہے۔اکمل کا بھی ایسا ہی معاملہ تھا۔یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے سلیمانی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ وہ ہر وقت سیٹ پر موجود رہتے تھے۔اداکاروں کو آئینہ دکھاتے تھے' ان کے نقش و نگار کو سنوارتے تھے مگر پھر بھی وہ ''حاضر غائب'' تھے۔کسی فلم ساز اور ہدایت کار کو نظر نہیں آتے تھے۔

ایک دن مقدر کی سلیمانی ٹوپی کچھ دیر کے لئے ان کے سر سے اتری تو انور کمال پاشا کی ان پر نظر پڑ گئی۔ایک دراز قد، خوش شکل لڑکے کو سامنے دیکھا تو پاشا صاحب نے انہیں اپنے پاس بلایا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''جی اکمل۔'' وہ اس خلاف توقع سوال پر حیران رہ گئے تھے۔

کسی نے بتایا کہ پاشا میاں یہ اداکار اجمل کے چھوٹے بھائی ہیں۔

پاشا صاحب نے ایک لمحہ اکمل کو دیکھا پھر کہا۔

''ایکٹنگ کرو گے؟''

اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں۔اکمل کو اداکاری کا شوق ہو یا نہ ہو' شہرت اور دولت کا شوق ضرور تھا۔وہ دیکھتے تھے کہ یہ دونوں چیزیں اداکاروں کو حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکمل کے دل میں چپکے چپکے اداکار بننے کا شوق پروان چڑھ رہا تھا۔ پاشا صاحب نے دریافت کیا تو اکمل نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی۔پاشا صاحب نے ''قاتل'' میں ایک نہایت مختصر

سا کردار اکمل کو سونپ دیا۔ یہ ایک سپیرا قسم کا شخص تھا۔ اکمل نے جو حلیہ بنا رکھا تھا اس کی وجہ سے اکمل کی اصلی صورت شکل کے بارے میں بھی کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ فلم کی کہانی کے مطابق جب فلم کی ہیروئن کو زہر پلا دیا جاتا ہے اور وہ قریب المرگ ہے تو اکمل کی اس پر نظر پڑ جاتی ہے اور اس فلسفے کی رو سے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے' ہیروئن کو بچانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس سانپ سے ڈسوا دیا جائے۔ اس طرح ہیروئن (صبیحہ) موت کے منہ سے واپس آجاتی ہے۔

فلم تو ہٹ ہو گئی مگر اکمل کا کسی نے نوٹس نہ لیا لیکن پھر ان ہی دنوں تقدیر کی مہربانی سے اکمل کو ایک پنجابی فلم میں ہیرو کا کردار مل گیا۔ اس کا نام '' جبرو'' تھا۔ فقیر صلاح الدین اس کے فلم ساز تھے۔ ان کا تعلق لاہور کی مشہور فقیر فیملی سے تھا۔ ان کے ذہن میں کافی عرصے سے فلم بنانے کا خیال جڑ پکڑ رہا تھا۔ انہوں نے ''جبرو'' کے نام سے اس فلم کا آغاز کر دیا جس کی تمام تر شوٹنگ آؤٹ ڈور میں ہونی تھی۔ اس فلم میں انہوں نے کئی تجربے کیے تھے۔ اکمل ہیرو تھے۔ یہ ان کے لئے ہیرو بننے کا پہلا موقع تھا۔ یاسمین اس میں ہیروئن تھیں۔ وہ بھی پہلی بار ہیروئن کے روپ میں پیش کی گئی تھیں۔ طالش کو اس فلم میں بہت اہم کردار دیا گیا تھا جو بعد میں ان کی پہچان بن گیا۔ اس فلم کے ہدایت کار بھی نئے تھے۔ ان کا نام مظفر بابر تھا۔ فلم کی کہانی سکے دار نے لکھی تھی۔ یہ سکے دار کی پہلی کہانی تھی۔ مختصر یہ کہ ہر لحاظ سے یہ ایک تجرباتی مگر کاروباری فلم تھی۔ یہ ایک ڈاکو کی کہانی تھی۔ ریلیز ہوئی تو کامیاب ہو گئی اور اس طرح فلم سے وابستہ سبھی لوگ کامیابی سے ہمکنار ہو گئے۔

''قاتل'' میں تیسرا نیا چہرہ مسرت نذیر کا تھا۔ وہ ثمینہ کے نام سے متعارف ہوئی تھیں اور بعد ازاں ایک معروف ہیروئن بنیں۔

اس طرح اسلم پرویز فلمی دنیا میں داخل ہو گئے۔

عام طور پر نئے اداکاروں کی مانگ اس وقت ہوتی ہے جب ان کی فلم ریلیز ہو جاتی ہے۔ مگر اسلم پرویز کے ستارے عروج پر تھے۔ اس لیے '' قاتل'' کی نمائش سے پہلے ہی وہ ایک اور فلم کے ہیرو بن گئے۔ اس کے فلم ساز اسلام

شامی تھے۔وہ ایک پنجابی فلم بنا رہے تھے۔نور جہاں کو ہیروئن منتخب کر لیا گیا تھا۔ہیرو کے لیے وہ سنتوش کمار کو سائن کرنا چاہتے تھے۔ان کی تلاش میں اسٹوڈیو گئے تو معلوم ہوا کہ سنتوش ابھی سیٹ پر نہیں آئے ہیں۔سیٹ پر انہوں نے اسلم پرویز کو دیکھا تو سوچ میں پڑ گئے۔انہیں اندازہ ہوا کہ یہ نوجوان تو بنا بنایا ہیرو ہے۔وہ سنتوش کو بھول کر اسلم پرویز کے چکر میں پڑ گئے۔اسلم پرویز کے ساتھ تو وہی معاملہ ہوا کہ آگ لینے جائیں اور پیغمبری مل جائے۔وہ سائیڈ ہیرو بن کر ہی بہت خوش تھے کہ اچانک بیٹھے بٹھائے ہیرو بننے کی آفر ہو گئی۔انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔اس طرح ''قاتل'' کی نمائش سے پہلے ہی پنجابی فلم ''پاٹے خاں'' کی فلم بندی کا آغاز ہو گیا۔اس کے ہدایت کار ایم اے رشید تھے۔'' قاتل'' میں تو اسلم پرویز کا تعارف ہوا تھا' مکمل ملاقات '' پاٹے خاں'' کے ذریعے ہو گئی۔نور جہاں کے ساتھ ان کی جوڑی کو سبھی نے پسند کیا۔بس پھر کیا تھا۔اسلم پرویز سکہ بند ہیرو بن گئے۔''پاٹے خاں'' ہی میں ظریف کو بھی ایک دلچسپ کامیڈی کردار میں پیش کی گیا تھا۔

قسمت کی دیوی جب مہربان ہو جائے تو کامیابیاں قدم قدم پر نچھاور ہوتی ہیں۔اسلم پرویز کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ان کی ایک کے بعد ایک فلم ریلیز ہوتی رہی اور کامیاب ہوتی رہی۔دیکھتے ہی دیکھتے وہ صف اول کے ہیرو بن گئے۔

مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ بیک وقت تیس چالیس فلموں میں کام کر رہے تھے۔اس میں اسلم کے لالچ کو بالکل دخل نہ تھا۔سچ تو یہ ہے کہ اسلم پرویز کو دولت سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔پیسہ تو ان کے پاس پہلے ہی بہت تھا۔وہ تو فن کار بننا چاہتے تھے مگر جب کامیاب ہوئے تو روایت کے مطابق سارے فلم ساز ان پر ٹوٹ پڑے۔ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ ان کی فلم میں کام کریں۔ادھر اسلم پرویز انتہائی شریف' بامروت اور بااخلاق آدمی تھے۔لحاظ ملاحظہ بھی بہت تھا۔کسی کو انکار کرنا تو ان کی سرشت ہی میں نہ تھا۔پھر یہ حال ہو گیا کہ ایک سیٹ پر کسی فلم کی شوٹنگ ختم ہوتی تو وہیں سے دوسرا فلم ساز پکڑ کر اپنے سیٹ پر لے جاتا۔وہاں سے تیسرا فلم ساز اڑا کر لے جاتا۔وہ ہاتھوں ہاتھ لیے جا رہے تھے۔محاورے کے مطابق نہیں بلکہ درحقیقت نہ سونے کا وقت نہ آرام کرنے کی مہلت۔کسی وقت موقع پا کر گھر پہنچ کر سونے کی کوشش کرتے تو وہاں بھی کوئی فلم ساز یا ہدایت کار پہنچ جاتا اور انہیں جگا کر اپنے مصائب کا ایسا نقشہ کھینچتا کہ غریب اسلم پرویز اسی وقت شیو کر کے اور نہا دھو کر نکل کھڑے ہوتے۔اکثر اوقات مسلسل مصروفیت کی وجہ سے

شیو بنانے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی چنانچہ اسٹوڈیو میں ہی شیو بنوا لیتے تھے۔ مسلسل کام نے اسلم پرویز کی صحت اور تروتازگی پر اثر ڈالا تھا۔ ادھر کہانیوں کی یکسانیت اور کرداروں میں کوئی تبدیلی نہ ہونے کی وجہ سے فلم بین اسلم پرویز کو دیکھ دیکھ کر بور ہو رہے تھے۔ مختصر سے عرصے میں وہ ڈیڑھ سو کے قریب فلموں میں کام کر چکے تھے اور ہر فلم میں رومانی ہیرو تھے۔ اسی قسم کے کردار' وہی مکالمے' اسی انداز سے فلمائے ہوئے گانے' کہاں تک دیکھنے والے برداشت کرتے۔ آخر ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

تقدیر جب مہربان ہوتی ہے تو بہانے بن جاتے ہیں' اسی طرح تقدیر جب روٹھتی ہے تو اس کے لئے بھی بہانے بن جاتے ہیں۔ اسلم پرویز کی کامیاب فلموں کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود ہر ہفتے ان کی دو تین نئی فلمیں ریلیز ہو رہی تھیں۔ ایک ہفتے ان کی تین فلمیں نمائش کے لئے پیش کی گئیں اور تینوں فلاپ ہو گئیں۔ تماشائی پہلے ہی تنگ آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بہت شور و غل مچایا۔ کرسیاں توڑ دیں۔ پردے پھاڑ دیے۔ سنیما گھروں میں فلموں کے فوٹو سیٹ میں لگی پرویز کی ساری تصویریں اتار کر پھاڑ دیں۔

خطرہ اب حقیقت بن چکا تھا۔ اسلم پرویز نہ صرف غیر مقبول ہو گئے تھے بلکہ تماشائیوں کے لئے بیزاری کا سبب بن گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فلم سازوں نے انہیں نئی فلموں میں کاسٹ کرنا بند کر دیا۔ جو زیر تکمیل فلمیں بعد میں نمائش کے لئے پیش کی گئیں ان کے فوٹو سیٹوں میں سے اسلم پرویز کی تمام تصویریں نکال دی گئیں۔ یہ غالباً کسی ہیرو کی عدم مقبولیت کا انوکھا واقعہ تھا۔ اس طرح وہ شخص جسے ''سینچری ہیرو'' کہا جاتا تھا بالکل زیرو ہو کر رہ گیا۔

اسلم پرویز نے حالات کے پیش نظر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ وہی کوٹھی جو فلم سازوں اور ہدایت کاروں سے بھری رہتی تھی سنسان ہو کر رہ گئی۔ برے وقت میں کون ساتھ دیتا ہے جو اسلم پرویز کا ساتھ دیتا۔

اسلم پرویز کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید خود کشی کر لیتا یا دماغی توازن کھو بیٹھتا۔ اس قدر مقبولیت کے بعد اتنی نفرت اور بیزاری۔ اتنی پذیرائی اور آؤ بھگت کے بعد یکسر بے رخی اور بے اعتنائی۔ اتنی شہرت کے بعد ایسی بدنامی اور گمنامی؟ ان سے مقابلہ کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس سے کم ناکامیوں پر لوگ ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ ہماری ہی فلمی صنعت میں وحید مراد کی مثال سامنے کی بات ہے۔ ناکامیاں انہیں راس نہ آئیں اور وہ ایک ذہنی مریض بن کر رہ گئے'

مگر اسلم پرویز نے حالات کا بہادری سے مقابلہ کیا۔انہوں نے حقائق کو خندہ پیشانی سے قبول کرلیا۔ مگر وہ کسی احساس کمتری کا شکار نہ ہوئے چونکہ وہ جانتے تھے کہ اس ناکامی میں ان سے زیادہ فلم سازوں کا قصور ہے۔انہوں نے ٹھنڈے دل سے حالات کا تجزیہ کیااور پھر ایک بہت اہم فیصلہ کیا۔انہوں نے فلموں میں ویلن کا کردار قبول کرنے پر رضا مندی کا اظہار کردیا۔یہ سن کر سبھی حیران رہ گئے۔ایک ہیرو جو چند ماہ قبل مقبول ترین ہیرو تھا، ویلن بننے پر کیسے آمادہ ہوگیا؟ یہ اسلم پرویز کی حقیقت پسندی اور خود اعتمادی کی سب سے بڑی دلیل تھی۔

اسلم پرویز کو ویلن بننے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔یہ تجربہ وہ پہلے بھی کر چکے تھے۔ہدایت کار حسن طارق نے اپنی پہلی فلم ''نیند'' میں انہیں ایک ایسے ہیرو کا کردار پیش کیا جو ویلن سے بھی بد تر تھا۔یہ ایک رنگین مزاج' عیاش طبع دولت مند تھا جو حسین لڑکیوں کو دھوکے اور فریب سے اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر بعد میں دھتکار دیتا تھا۔وہ احساسات اور جذبات سے بالکل عاری تھا۔اس فلم کی ہیروئن نور جہاں تھیں۔اس فلم میں وہ کوئلہ چننے والی دوشیزہ تھیں۔ان کی سب سے بڑی کمزوری ''نیند'' تھی۔کہتے ہیں کہ ''نیند'' تو پھانسی کے تختے پر بھی آجاتی ہے۔مگر نور جہاں جاگنے کے لئے نہیں سوتی تھیں۔سونے کے لئے جاگتی تھیں۔ان کی آنکھوں میں ہر وقت نیند کا خمار بھرا رہتا تھا۔اسلم پرویز جیسے رئیس زادے نے جب اس غریب الھڑ لڑکی کو مصروف خواب دیکھا تو ہر قیمت پر حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔پہلے محبت کا جال پھیلایا۔پھر جھوٹی شادی کا ڈھونگ رچایا۔کچھ عرصے بعد جی بھر گیا تو منہ موڑ لیا۔ادھر ہیروئن ایک بچے کی ماں بن گئی تھی لیکن باپ اسے اپنی اولاد تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ایک وقت ایسا بھی آیا جب بیوی کو بلیک میل کرنے کے لئے اسلم پرویز نے معصوم بچے کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینکنے کا ارادہ کیا تو ماں کی ممتا شوہر کی محبت پر حاوی ہوگئی۔ہیروئن نے گولی مار کر اسلم پرویز کو ختم کردیا۔

یہ وہ کردار تھا جو اسلم پرویز کو آفر کیا گیا تھا۔کوئی اور مقبول ہیرو اس کے بارے میں سوچنے کو بھی تیار نہ ہوتا۔ صاف انکار کردیتا مگر اسلم پرویز نے اس فلم میں کام کرنے کی ہامی بھرلی اور بہت اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے حق ادا کردیا مگر وہ اس فلم میں شروع سے آخر تک ویلن ہی نظر آتے تھے۔فلم بینوں نے بھی اسلم کو اس روپ میں بہت پسند کیا۔ اسلم کا یہ تجربہ اس وقت ان کے کام آیا جب وہ زبردستی ہیرو کے مقام سے ہٹا دئے گئے۔

اس زمانے میں بھی ہم نے انہیں دیکھا ہے۔ان میں ذرا سی بھی تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی۔نہ ہی وہ کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہوئے۔اسی طرح ٹھاٹ سے اسٹوڈیو آتے تھے۔ان کی وہی خوش لباسی اور خوش گفتاری تھی۔وہی طور طریقے تھے۔

وہ فلم ساز اور ہدایت کار جو کچھ عرصہ پہلے پروانوں کی طرح ان پر نثار ہوا کرتے تھے۔اب ندامت سے نظریں چرانے لگے تھے مگر اسلم کے لب پر کبھی حرف شکایت نہ آیا۔رفتہ رفتہ اس واقعے کو سب ہی ایک ڈراؤنے خواب کی طرح بھولنے لگے مگر ایک بار پھر حسن طارق ہی اسلم پرویز کو فلموں میں دوسرا جنم دینے کا باعث بن گئے۔انہوں نے اپنی فلم ''شکوہ'' میں ویلن کے کردار کے لئے اسلم پرویز کو آفر دی جو اسلم نے پس وپیش کے بغیر قبول کرلی۔''شکوہ'' ریلیز ہوئی تو ایک نئے اسلم پرویز نے جنم لیا۔اسلم کو ویلن کے طور پر اتنی داد اور پذیرائی ملی کہ پھر وہ زندگی بھر کامیاب ترین ویلن ہی کہلائے۔دیکھا جائے تو چہرے کے تاثرات کے لحاظ سے وہ ہیرو سے زیادہ ویلن لگتے تھے۔ان کا بولنے کا انداز بھی کرخت تھا۔گویا وہ بنے بنائے ویلن تھے مگر جب ایک بار ہیرو کے کردار میں ہٹ ہوگئے تو پھر فلم سازوں کی بھیڑ چال میں پھنس کر رہ گئے۔تقدیر نے انہیں ان کے صحیح مقام پر پہنچادیا تو وہ انگوٹھی میں نگینے کے مانند جگمگانے لگے۔اسلم پرویز جب ہیرو تھے تو آرٹسٹ تھے' مگر جب ویلن بنے تو اداکار بن گئے۔ان کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آ گئیں۔دیکھتے ہی دیکھتے وہ برصغیر کے لاجواب ویلن بن گئے۔بھارت میں پران کو جو حیثیت حاصل تھی وہی پاکستان میں اسلم پرویز نے حاصل کرلی۔ایسا خوبصورت' سجیلا، خوش پوش اور خوش گفتار ویلن بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔
ویسے ہمارا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ فلموں میں ویلن کو بدصورت' بداطوار اور قابل نفرت دکھانا غلط ہے۔جو شخص فلم کی ہیروئن کا طالب ہو اور ہیروئن کو حاصل کرنے کے لئے ہیرو کے مقابلے میں صف آرا ہو جائے،اس کے خوبصورت ہونا ضروری ہے۔ورنہ ہیروئن اس پر کیوں توجہ دے گی؟اسلم پرویز ایک ایسے ہی ویلن تھے جو اپنی شخصیت اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے بعض اوقات ہیرو پر بھی بھاری نظر آتے تھے۔
اسلم پرویز کی فلمی زندگی خاصی طویل ہے۔یوں سمجھئے کہ وہ آخر دم تک اداکار ہی رہے۔جس وقت ان کا ایک حادثے میں انتقال ہوا اس وقت بھی وہ ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں ہی اقبال حسن کے ساتھ لاہور سے باہر گئے ہوئے

تھے۔ان کی کار ایک ویگن سے ٹکرا گئی۔اقبال حسن تو اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ گئے مگر اسلم پرویز چھ دن تک موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا رہے لیکن ایک دو بار آنکھیں کھولنے کے سوا ان میں زندگی کے آثار نہ تھے۔وہ مسلسل بے ہوش رہے۔لاہور کی فلمی دنیا کے لئے۔یہ دوہرا حادثہ تھا اقبال حسن بھی ایک مقبول اور پسندیدہ فن کار تھے۔ اسلم پرویز کی صحت کے لئے دعا کرنے والوں کی کمی نہ تھی مگر ان کی زندگی کے دن ختم ہو چکے تھے۔پرستاروں کی دعائیں کام آئیں نہ ماہر ڈاکٹروں کی مسیحائی' چھ دن بے ہوش رہنے کے بعد وہ انتقال کر گئے۔

اسلم پرویز ایک انتہائی نفیس اور خوش اخلاق انسان تھے۔ تکبر اور بناوٹ کا ان کے مزاج میں شائبہ تک نہ تھا۔ہر ایک سے نہایت شائستگی سے پیش آیا کرتے تھے۔سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ہمیشہ ایک ہی جیسے رہے۔ خوشحالی انہیں ورثے میں ملی تھی۔شرافت اور کشادہ دلی بھی ان کے گھر کی دین تھی۔سب سے بڑی بات ان میں یہ دیکھی کہ ہر حال میں ایک جیسے رہتے تھے۔خوش لباسی ان پر ختم تھی۔اچھی پوشاک ان کی کمزوری تھی۔نہ صرف بہت نفیس لباس پہنتے تھے بلکہ دوسروں کی خوش لباسی کی بھی دل کھول کر داد دیا کرتے تھے۔ کپڑے وہ بہت اہتمام سے سلواتے تھے 1954ء میں انہوں نے مال روڈ کے معروف اور سب سے مہنگے درزی اسماعیل ٹیلرز سے کچھ سوٹ سلوائے تھے۔ان کے ایسے معترف ہوئے کہ پھر تمام عمر ان ہی سے کپڑے سلواتے رہے۔کپڑوں کے ناپ اور آزمائش کے لئے تو سبھی درزی کے پاس جاتے ہیں مگر اسلم پرویز اس کی کٹائی بھی اپنے سامنے ہی کراتے تھے' یہاں تک کہ ایک ایک ٹانکا اپنی نگرانی میں لگواتے تھے۔ ان کا قد و قامت ہر قسم کے لباس کے لئے بہت موزوں تھا۔ہر طرح کا لباس ان پر سج جاتا تھا۔مال روڈ پر جوتوں کی معروف اور مہنگی دکانوں سے جوتے بطور خاص تیار کراتے تھے۔چائنیز' فینن اور گبسن اس زمانے میں اعلیٰ پائے کے جوتوں کے لئے مشہور دکانیں تھیں۔اسلم پرویز وہاں باقاعدگی سے جاتے تھے اور نئے نئے ڈیزائن کے جوتے بڑے اہتمام سے بنواتے تھے۔

ایک بار کسی فلم کے لئے انہوں نے جودھپوری کوٹ اور برجس پہنی۔بہت خوبصورت لگے۔ہم نے کہا'' اسلم صاحب! آج تو بالکل ٹھاکر لگ رہے ہو۔اب آپ کو ٹھاکر ہی کہا کریں گے۔''

وہ ہنسنے لگے اور بولے ''بڑے شوق سے کہئے ٹھاکر۔''

اس کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ جب ملاقات ہوتی تو ہم دونوں ایک دوسرے کو ٹھاکر کہہ کر مخاطب کرتے۔ایک دوسرے کے لباس کی تعریف کرتے۔اسلم پرویز تنگ دل' اور تنگ نظر نہیں تھے۔ہر ایک کی دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ کبھی ان کی زبان سے کسی کی غیبت یا برائی نہیں سنی۔ تعریف میں البتہ بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ خود ان کے گھر میں الماریاں مختلف ملبوسات سے اٹی ہوئی تھیں۔جوتوں، موزوں اور ٹائیوں کی تعداد بھی سینکڑوں بلکہ ہزاروں میں تھی۔

''ٹھاکر' آپ کو یہ سب لباس یاد کیسے رہتے ہیں۔'' ہم پوچھتے۔

وہ ہنسنے لگتے۔ ''ہر لباس خود بیٹھ کر سلوایا ہے۔دل پر لکھا ہوا ہے۔''

اس زمانے میں فلم ساز مالی طور پر اداکاروں کے لئے ملبوسات بنوانے کی حیثیت میں نہیں تھے۔بہت ہوا تو چند لباس سلوا دیے۔ مگر اسلم پرویز ہر فلم میں اپنا ذاتی لباس استعمال کرتے تھے۔حد تو یہ ہے کہ اگر کسی سین میں لباس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو بھی خراب لباس استعمال کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔''جو شخص اچھا لباس پہنتا ہے وہ کسی سین میں بھی خراب لباس استعمال نہیں کر سکتا۔اگر ایک سوٹ خراب ہو جائے تو کوئی پروا نہیں ہے۔''

انور کمال پاشا نے فلم ''قاتل'' میں انہیں نہایت قیمتی اور خوبصورت لباس میں دیکھا تو پروڈکشن والے سے پوچھا ''یہ کپڑے کس نے سلوائے ہیں؟''

پروڈکشن والے نے کہا ''اسلم صاحب کے اپنے ہیں۔''

قیمتی امپورٹیڈ ٹائیاں اور غیر ملکی کپڑے کے سوٹ اور قمیص دیکھ کر پاشا صاحب مرعوب ہو گئے۔اسلم پرویز کا ذوق بھی بہت اچھا تھا۔ ہر چیز چن کر لیتے تھے۔

ہماری فلم ''جاگیر'' میں انہیں ایک دولت مند زمیندار ویلن کا کردار دیا گیا تھا۔ وہ پہلی بار ہماری ذاتی فلم میں کام کر رہے تھے اور اس بات سے بہت خوش تھے۔ہمارا میل ملاپ کافی پرانا تھا مگر اسلم پرویز نے کبھی اشارتاً بھی یہ نہیں کہا کہ انہیں ہم اپنی فلموں میں کیوں کاسٹ نہیں کرتے۔انہوں نے کہانی پڑھی اور اپنے کردار سے بہت خوش ہوئے۔

ہم نے کہا ''ٹھاکر' اس فلم میں سوٹ بوٹ کے علاوہ کچھ جودھپوری اور شکاری قسم کے لباس بھی ہونے چاہئیں۔

بنوانے پڑیں گے۔''

بولے۔''ٹھاکر، آپ کسی وقت میرے گھر آکر دیکھ لیجئے ممکن ہے آپ کے مطلب کی کوئی چیز مل جائے۔''

دوسرے دن ہم گالف روڈ پر ان کی وسیع و عریض کوٹھی پر گئے تو وہ منتظر تھے۔ان کے بیڈروم میں کئی درجن لباس بکھرے پڑے تھے اور ایک سے بڑھ کر ایک۔ ہمیں تو سب ہی بہت پسند آئے۔

ہم نے کہا''ان میں سے چند لباس منتخب کر لیتے ہیں۔''

کہنے لگے ''چند کیوں ؟''

ہم نے کہا''بس کافی ہوں گے' ویسے دل تو چاہتا ہے کہ سارے استعمال کر لیں۔''

بولے'' تو منع کس نے کیا ہے۔ارے ٹھاکر، آپ ایک رئیس اور شوقین آدمی دکھا رہے ہیں' اگر وہ ہر سین میں ایک نیا لباس بھی پہنے تو کوئی حرج نہیں ہے۔''

اس کے بعد وہ فل بوٹ' جوتے اور اسکارف وغیرہ دکھانے لگے۔

ہم نے معاوضے کی بات کرنی چاہی تو ہنسنے لگے۔''ٹھاکر' آپ چائے پئیں۔انگلش بسکٹ کھائیں۔''

اسلم پرویز کو معاوضے کی کبھی پروا نہیں رہی اداکاری ان کا شوق تھا۔پیسے کی ان کے پاس کمی نہیں تھی۔مزید کا لالچ نہ تھا۔جو بھی کوئی دے دیتا' لے لیتے۔

فلمی دنیا میں وہ پرنس کے نام سے مشہور تھے۔واقعی وہ کسی شہزادے سے کم نہ تھے۔

اسلم پرویز جیسے خوبصورت اور پیسے والے آدمی کی زندگی میں حسیناؤں کی کیا کمی ہو سکتی تھی مگر اسلم کی طبیعت اس طرف راغب نہ تھی۔ان کی پوری فلمی زندگی میں صرف دو اسکینڈل مشہور ہوئے اور وہ بھی ان کی ابتدائی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

''چن ماہی'' بہار کی پہلی فلم تھی۔اسلم پرویز اس فلم میں ہیرو تھے۔انور کمال پاشا کی یہ پنجابی فلم بے حد کامیاب ہوئی۔ادھر بہار ایک زندگی سے بھرپور' خوش مزاج اور خوش گو ہیروئن تھیں۔کانونیٹ کی پڑھی ہوئی تھیں۔ انگریزی فر فر بولتی تھیں اور ہنسنے ہنسانے میں کسی سے کم نہ تھیں۔ اسلم پرویز کا نام پہلی بار بہار کے ساتھ وابستہ ہوا۔ مگر

یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ بعد میں دونوں نے دوسری دلچسپیاں تلاش کرلیں اوراس کے بعد اچھے دوستوں کی طرح رہے۔

اسلم پرویز کادوسرااسکینڈل خاور سلطانہ سے منسوب ہوا۔ان کا تعلق سندھ سے تھا۔ گوراچٹار نگ' دلکش چہرہ، متناسب جسم۔وہ بھی پڑھی لکھی تھیں۔انگریزی بہت روانی سے بولتی تھیں۔ محفل کے ادب آداب سے بھی واقف تھیں۔وہ فلموں میں ڈانسر کی حیثیت سے آئی تھیں۔چند فلموں میں ڈانس بھی کیے۔اداکاری کے ان میں جراثیم نہیں تھے مگراپنی پربہار شخصیت کے باعث بہت جلد موضوع گفتگو بن گئیں۔اسلم پرویز سے ملاقات ہوئی تودونوں نے ایک دوسرے کے لئے کشش محسوس کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلم پرویزاور خاور سلطانہ کارومانس فلمی دنیامیں سب سے بڑی خبر بن گیا۔خاور سلطانہ صحیح معنوں میں اسلم پرویز کی کمزوری بن گئی تھیں۔بہت سے لوگوں کاخیال تھا کہ ان دونوں کی شادی ہوگئی ہے۔خیر شادی تونہیں ہوئی تھی مگروہ دونوں ایک دوسرے کاسایہ بن گئے تھے۔ اسلم پرویز اول تو ویسے ہی مرنجان مرنج آدمی تھے۔انکار کرناتوانہوں نے سیکھاہی نہیں تھا۔پھر یہاں توصنف مخالف کا معاملہ تھا اور صنف مخالف بھی خاور سلطانہ جیسی حسین و جمیل' دلنواز لڑکی۔

اسلم پرویز پر جیسے خاور سلطانہ نے جادو کردیا تھا۔وہ ایک معمول کی طرح خاور سلطانہ کے اشاروں پر چلا کرتے تھے۔ ایک ایسامعروف ترین اداکار جوشب وروز شوٹنگ میں مصروف رہتا تھا' خاور سلطانہ کے ایک ٹیلی فون پر بے چین ہو کر کسی بہانے شوٹنگ چھوڑ کر غائب ہو جاتا تھااور فلم ساز ڈھونڈتے ہی رہ جاتے تھے یا کوئی شخص اسلم پرویز کے کان میں کوئی ایسا سحر پھونکتا تھا کہ وہ پیغام سنتے ہی لاپتاہو جاتے تھے۔شاید خاور سلطانہ کو بھی فلم سازوں کو تنگ کرنے اور ان پر اپنی اہمیت جتانے میں لطف آتا تھا۔وہ جب سندھ کے ریگستانوں سے لاہور کے مرغزاروں میں آئی تھیں تو یہ خواب لے کر آئی تھیں کہ فلمی دنیامیں بہت بڑی ہیروئن بن کر راج کریں گی۔مگر وہ ڈانسر کی حد سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ان کی ذاتی دلکشی اور لگاوٹ آمیز شخصیت کی کشش کاہر ایک کواعتراف تھامگران میں اداکارانہ صلاحیتوں کی کمی تھی اس لئے ان کے خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکے مگر جب اس وقت کامعروف ترین ہیروان کی محبت کے سحر میں

گرفتار ہو گیا تو خاور سلطانہ نے اگلے پچھلے بدلے لینے شروع کر دیے۔ جب فلم سازوں کی شوٹنگ کے پروگرام خراب ہونے لگے اور انہیں نقصان سے دوچار ہونا پڑا تو فلمی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔

اسلم پرویز کا رویہ عجیب تھا۔ جب فلم ساز یا ان کے دوست احباب انہیں احساس دلاتے تو وہ بہت ندامت کا اظہار کرتے تھے اور وعدہ کر لیتے تھے کہ آئندہ ایسا نہ ہو گا۔ مگر انہیں تو اپنے اوپر اختیار ہی نہیں رہا تھا۔ وہ ایک سحر زدہ انسان کے مانند ایک پراسرار جادو گرنی کے حصار میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔

ایک بار نیوایورنیو اسٹوڈیو میں ہدایت کار حسن طارق کی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ کسی نے آکر بتایا کہ اسلم پرویز کے لئے فون آیا ہے۔ وہ حسن طارق کو بتا کر ٹیلی فون سننے کے لئے اسٹوڈیو کے آفس میں چلے گئے۔ طارق صاحب نے کچھ دیر تو انتظار کیا پھر ایک اسسٹنٹ کو بھیجا کہ اسلم صاحب کو لے کر آئے۔ شاٹ تیار ہے۔ اسسٹنٹ یہ خبر لے کر آیا کہ اسلم صاحب اسٹوڈیو میں موجود نہیں ہیں۔ کار میں بیٹھ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ طارق صاحب کا خیال تھا کہ غالباً برابر کے باری اسٹوڈیو میں کسی فلم ساز سے بات کرنے چلے گئے ہیں۔ کچھ دیر بعد آجائیں گے۔ وقت گزرتا گیا مگر اسلم پرویز واپس نہ آئے۔ کچھ کارندوں کو باری اور شاہ نور اسٹوڈیو دوڑایا گیا مگر وہاں بھی اسلم پرویز کا پتا نہ تھا۔ گھر پر فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے شوٹنگ پر گئے ہوئے ہیں۔ تنگ آکر حسن طارق نے شوٹنگ میں وقفہ کر دیا۔

تین چار گھنٹے گزر گئے۔ دوسرے اداکار انتظار کرتے کرتے تھک گئے مگر اسلم پرویز لوٹ کر نہ آئے۔ کسی کو علم نہ تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کب واپس آئیں گے۔ رات کو طارق صاحب کو بتایا گیا کہ ان کے لئے فون کال ہے۔ طارق صاحب فون سننے گئے تو دوسری طرف اسلم پرویز بول رہے تھے۔

''اسلم، تم کہاں سے بول رہے ہو؟'' طارق صاحب نے پوچھا۔

''کراچی سے۔''

''کراچی سے؟ یار کیا مذاق ہے۔ فوراً آؤ تمہارا اسیٹ پر انتظار ہو رہا ہے۔''

''طارق صاحب، میں کیسے آسکتا ہوں۔ میں کراچی پہنچ کر آپ کو فون کر رہا ہوں۔ پلیز ناراض نہ ہوں۔ آئی ایم سوری یار۔''

پتا چلا کہ خاور سلطانہ نے لاہور ائر پورٹ سے اسلم پرویز کو فون کیا کہ میں اسی فلائٹ سے کراچی جا رہی ہوں۔ فوراً آ جاؤ۔ اسلم صاحب نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اسی عالم میں اسٹوڈیو سے ائر پورٹ پہنچ گئے اور وہاں سے خاور سلطانہ کے ساتھ کراچی چلے گئے۔

وہ دوسرے دن واپس لوٹے طارق صاحب بہت ناراض تھے مگر اسلم پرویز سے کافی دیر تک ناراض بھی نہ رہ سکتا تھا۔ وہ سامنے آتے تو ان کی معصوم صورت اور معذرت خواہانہ انداز دیکھ کر ہتھیار ڈالنے پڑ جاتے تھے۔ وہ کسی سے نہیں لڑتے تھے۔ کسی بات پر بگڑتے نہیں تھے۔ نہ خود کو حق بجانب ثابت کرتے تھے۔ ان کے پاس ہر شکایت کا صرف ایک ہی جواب تھا۔

''سوری یار۔'' وہ مسکرا کر کہتے اور فلم ساز اور ہدایت کار کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا۔

یہ تو صرف ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح کے واقعات آئے روز پیش آنے لگے تھے۔ اسلم پرویز آؤٹ ڈور میں کسی کی شوٹنگ کر رہے ہیں کہ خاور سلطانہ پہنچ گئیں۔ اسلم پرویز باتیں کرتے ہوئے انہیں کار تک چھوڑنے گئے اور خود بھی غائب ہو گئے۔

اسلم پرویز ہیرو کے طور پر اچانک جو زوال آیا اس کا ایک سبب خاور سلطانہ بھی تھیں۔ ایک فلم ساز نے خود ہم سے کہا۔ ''اسلم پرویز کو فلم سازوں کی بد دعا لگ گئی۔'' پتا نہیں اس میں کتنی سچائی ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اسلم پرویز مصروف ترین اور مقبول ترین ہیرو کے مقام سے اچانک ایسے گرے کہ تماشائی فلم تو کیا' سنیما گھروں کے باہر ان کی تصویر تک دیکھنے کے روادار نہ رہے۔

خاور سلطانہ سے جب کوئی شکایت کرتا تو ایک دل نواز مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل جاتی۔ انہوں نے کبھی کوئی صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ اس بات پر کوئی تبصرہ کیا۔ صرف مسکرا کر خاموش ہو جاتی تھی۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں اپنی اہمیت اور اسلم پرویز جیسے ہیرو پر اپنی جادوئی گرفت کا پوری طرح احساس تھا بلکہ اس پر انہیں فخر بھی تھا جو کسی حد تک بجا بھی تھا۔ اس لئے کہ بطور اداکارہ تو انہیں فلمی صنعت میں کوئی اہمیت حاصل نہ ہو سکی تھی مگر اسلم پرویز کے حوالے سے وہ ایک مرکزی کردار کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔

اسلم پرویز میں ایک عادت یہ تھی وہ اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود اپنے راز کسی کو بتاتے نہیں تھے۔ نہ ہی کھل کر کسی سے بات کرتے تھے۔ فلمی دنیا میں ان کی سب سے یاداللہ تھی۔ ہر ایک سے ملاقات تھی۔ علیک سلیک تھی مگر ایک حد تک۔ اپنی ذاتی زندگی کو وہ بالکل علیحدہ رکھتے تھے۔ ان کے فلمی تعلقات کی حد صرف نگار خانوں تک ہی تھی۔ گھر کی چار دیواری تک کسی کی رسائی نہ تھی۔ وہ کاروباری معاملات کے بارے میں بھی فلم والوں کو اپنے گھر بلانا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قریب ترین لوگوں کو بھی ان کی گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ خاور سلطانہ کے معاملے میں بھی ان کی یہی راز درانہ طبیعت راہ میں رکاوٹ بن گئی تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ خاور سلطانہ کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ اسی لیے جب ان کے اور خاور سلطانہ کے مابین فاصلے پیدا ہونے لگے تو اس کا سبب بھی کوئی نہ جان سکا۔ اتنا سب جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے شیدائی تھے۔ اسلم پرویز کی دیوانگی تو سب پر ظاہر تھی مگر خاور سلطانہ کی وارفتگی بھی کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ جاننے والے کہتے تھے کہ خاور سلطانہ واقعی اسلم پرویز کے ساتھ مخلص اور وفادار ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ خاور سلطانہ جو کہ ایک تتلی کی طرح سوشل حلقوں میں اڑتی پھرتی تھی، اسلم پرویز کی قربت حاصل کرنے کے بعد محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

ان کی دوری کا سبب کیا تھا؟ اس بارے میں کوئی کہتا ہے کہ خاور نے اسلم کے کیرئیر، خاندانی وقار اور گھریلو سکون کی خاطر اپنے آپ کو ان سے دور کر لیا۔ کسی کا کہنا ہے کہ اسلم پرویز کو بذات خود احساس ہو گیا کہ وہ جس راستے پر چل رہے ہیں اس کا انجام کیا ہو گا۔ بہر حال لیلیٰ مجنوں کی یہ جوڑی بچھڑ گئی۔ کچھ عرصے تک اسلم پرویز اکیلے اکیلے، کھوئے کھوئے نظر آئے مگر پھر رفتہ رفتہ معمول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا اور خاور سلطانہ ایک خواب بن کر رہ گئیں۔ اس کے بعد کسی نے ان کی زبان سے خاور سلطانہ کا نام یاذ کر نہ سنا۔

روزنامہ ”آفاق“ کی نوکرانی کا زمانہ جاری تھا۔ صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کی صحبت ہمیں نصیب ہو رہی تھی مگر اس کے ساتھ ہی فلمی نگار خانوں کے پھیرے بھی لگ رہے تھے۔ فلمی شخصیات کے ساتھ ملاقاتیں بڑھ رہی تھیں۔ تعلقات استوار ہو رہے تھے جو ایسے مضبوط ہوئے کہ زندگی بھر قائم رہے۔ فلم کا شوق تو ہمیں تھا ہی مگر نگار خانوں کی آب و ہوا نے اس کو اور ہوا دی۔ ہم اخبار کے دفتر میں بیٹھ کر فلم بنانے کے منصوبے بناتے رہتے۔ اپنی فلموں کے لیے

نت نئے چونکا دینے والے نام منتخب کرتے رہتے۔ مگر ہم نے اپنی اس خواہش کو نشر نہیں کیا تھا۔ جانتے تھے کہ دوستوں کو بتائیں گے تو مذاق کا ہدف بن جائیں گے۔ لیکن پھر بھی کچھ قریبی دوست ایسے ضرور تھے جن سے ہمارا فلموں کے موضوع پر تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا اور ہم نے ان کے سامنے اپنے شوق کا اظہار بھی کر دیا۔ ان ہی میں ایک شباب کیرانوی بھی تھے۔

سب جانتے ہیں کہ شباب کیرانوی نے بعد میں پاکستان کی فلمی صنعت میں بہت بڑا مقام حاصل کیا۔ وہ کہانیاں لکھتے تھے۔ گیت نگار تھے۔ فلمساز اور ہدایت کار تھے۔ اسٹوڈیو کے مالک تھے لیکن جب ان سے ہماری دوستی کا آغاز ہوا تو وہ اس وقت محض صحافی تھے۔ لاہور سے شائع ہونے والی فلمی ماہنامہ ''ڈائریکٹر'' میں جب انہوں نے چودھری فضل حق کے ساتھ ادارت کا معاہدہ کیا تھا تو شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ وہ کسی زمانے میں فلمی صنعت کے ایک اہم اور مضبوط ستون بن جائیں گے۔ مگر قسمت کی گھاتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی خود بخود راہیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ انسان منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کے لیے اسے کوئی خاص کاوش نہیں کرنی پڑتی۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کے پیروں میں پہیئے لگ گئے تھے جو انہیں بہت آسانی سے خود ہی دھکیلتے ہوئے اس جگہ لے آئے جہاں تک پہنچنے کے لیے ہزاروں لوگ زندگی بھر ریاضت کرتے ہیں مگر کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔

شباب کیرانوی ایک مذہبی خیالات رکھنے والے سادہ لوح باپ کے بیٹے تھے۔ وہ خود بھی حافظ قرآن تھے۔ مسجد میں تراویح اور دوسری نمازیں بھی پڑھاتے تھے لیکن اگر انہوں نے کسی چیز کی خواہش کی تھی تو وہ تحریر و تصنیف تھی۔ وہ نثر و نظم دونوں صفات میں مشق سخن کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ فلموں کے گیت نگار بننے کے خواہاں تھے۔ ان کے دوست عکاس اے حمید انہیں اس سلسلے میں کئی فلم سازوں کے پاس لے گئے اور شباب صاحب نے بعض فلموں کے لیے گانے بھی لکھے جن کے بارے میں آج کوئی نہیں جانتا۔ ان کی ابتدائی زندگی کے واقعات کو ان کے بعد والی زندگی کی کامیابیوں نے دھندلا دیا تھا۔ پھر مقدر نے انہیں چودھری فضل حق سے ملا دیا جنہوں نے شباب کیرانوی کو ماہنامہ ''ڈائریکٹر'' کا مدیر بنا دیا۔ یہ ایک فلمی جریدہ تھا اور اس زمانے میں فلموں کے بارے میں محض فلمی پرچوں ہی میں لکھا جاتا تھا۔ دوسرے اخبارات میں فلم کا ذکر تک نہ آتا تھا۔ فلمی پرچوں کی بڑی اہمیت تھی کہ وہ فلم والوں کی پبلسٹی

کاواحد ذریعہ تھے۔ فلمی پرچوں کے دفتروں میں اس زمانے میں فلمی نگار خانوں سے بھی زیادہ رونق اور چہل پہل ہوتی تھی۔ فلمیں تو بس اکادکا بنتی تھیں اس لیے اکثر نگار خانوں میں الو ہی بولتے تھے۔ فلموں میں کام کرنے والوں سے زیادہ تعداد فلم میں کام کرنے کے شوقین اور امیدواروں کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ''ڈائریکٹر'' کے دفتر میں فلم والوں کی ہر وقت آمدورفت رہتی تھی۔ ان حالات میں جب ایک صاحب نے چودھری فضل حق کو یہ مشورہ دیا کہ وہ فلم کیوں نہیں بناتے۔ انہیں تو ہر ایک کا تعاون حاصل ہو جائے گا اور وہ مفت میں فلم بنالیں گے۔

چودھری فضل حق ایک کاروباری ذہن رکھنے والے آدمی تھے۔ یہ تجویز انہیں بے حد پسند آئی اور انہوں نے ''جلن'' کے نام سے ایک فلم کا آغاز کر دیا۔ اس کے مصنف اور فلم ساز شباب کیرانوی بنادیئے گئے۔ اے حمید جو کہ تجربہ کار عکاس بھی تھے اور فلم والوں سے ان کے گہرے یارانے بھی تھے انہیں فلم کا ہدایت کار مقرر کر دیا گیا۔ سیربین لمیٹڈ کے نام سے ایک فلم ساز ادارہ قائم کیا گیا جس کے تحت '' جلن'' بنائی جارہی تھی۔ اس فلم میں گلوکار عنایت حسین بھٹی ہیرو تھے اور ہیروئن کے طور پر ایک نووارد لڑکی نادرہ کو پیش کیا گیا تھا۔

اس وقت تک پاکستان کی فلمی صنعت میں ہیروئنیں تلاش کرنے کے لیے ہیرامنڈی، بازار حسن کا شارٹ کٹ استعمال نہیں ہوتا تھا۔ ''جلن'' میں ظریف کامیڈن تھے اور ویلن کا کردار ایک سرخ و سفید قدآور کشمیری جوان انشا نے ادا کیا تھا۔ یہ صاحب بعد میں خواجہ انشا کے نام سے فلم ساز بھی بنے۔ اداکاری کا انہوں نے دوبارہ پھر کبھی تجربہ نہیں کیا۔ حسن طارق کے وہ دور دراز کے رشتے دار بھی تھے اس لیے انہوں نے طارق صاحب کے ساتھ ہی فلمیں بنائیں۔ ان میں سے ایک فلم '' وحشی'' بھی تھی جس میں کام کرنے کے لیے اس زمانے میں شمیم آرا کو سب سے زیادہ معاوضہ دیا گیا تھا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ فلم ساز نے جب تقسیم کاروں سے معاہدہ کیا تو تحریری طور پر یہ یقین دہانی کرائی کہ شمیم آرا ان کی فلم میں ہیروئن ہوں گی۔ معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد انہوں نے شمیم آرا سے رابطہ قائم کیا تھا۔ شمیم آرا کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ فلم ساز نے اپنے معاہدے میں لکھ کر دے دیا ہے کہ شمیم آرا اس فلم کی ہیروئن ہیں۔ شمیم آرا نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور کام کرنے کا معاوضہ نوے ہزار روپے طلب کیا۔ اس زمانے میں ہیروئن کو تیس پینتیس ہزار روپے ملتے تھے مگر فلم ساز کی مشکل یہ تھی کہ اگر شمیم آرا کو ہیروئن نہ لیتے تو معاہدے کی

خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے۔ شمیم آرا نے تو ایک لاکھ روپیہ طلب کیا تھا مگر بعد میں کہہ سن کر یہ رقم نوے ہزار طے پائی۔ اس طرح شمیم آرا پاکستان کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی ہیروئن بن گئیں۔ بعد میں ان کی دیکھا دیکھی دوسری ہیروئنوں اور ہیروز نے بھی اپنے معاوضوں میں اضافہ کر دیا اور پھر چل سو چل، فلم سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کے معاوضے میں اضافہ ہو گیا۔

خواجہ انشا کئی سال قبل فلم سازی سے تائب ہو چکے ہیں اور ایک ریکروٹنگ ایجنسی چلا رہے ہیں بلکہ اب تو انہوں نے ڈاڑھی بھی رکھ لی ہے اور ان کا چہرہ بہت نورانی ہو گیا ہے۔ یہی خواجہ انشا ''جلن'' میں ویلن تھے۔ محمد علی منھو موسیقار منتخب کئے گئے تھے۔ وہ ایک سادہ دل سازندے تھے۔ بعد میں عرصہ تک میڈم نور جہاں کے زیرِ سایہ رہے۔ شباب کیرانوی کی دوسری فلم ''ٹھنڈی سڑک'' کے موسیقار بھی وہی تھے۔ شباب کیرانوی کی پہلی فلم میں اس زمانے کا ایک بھی معروف اور ممتاز نام نہ تھا۔ ظریف بھی اس وقت تک اتنے شہرت یافتہ نہیں ہوئے تھے۔ کہانی میں بھی اناڑی پن جھلکتا تھا۔ ہدایت کاری بھی بس یوں ہی سی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ فلم بہت بری طرح فلاپ ہو گئی۔ نقصان عظیم کسی کو نہ ہوا مگر شباب صاحب کو فلم سازی کا تجربہ ہو گیا اور فلم سازوں کی فہرست میں ان کا نام بھی شامل ہو گیا۔

اس ناکام تجربے کے بعد چودھری فضل حق اور شباب کیرانوی نے فلم سازی کا خیال ہی ترک کر دیا مگر اسی زمانے میں ایک زمین دار دوست نے اے حمید صاحب کو مجبور کیا کہ فلم بنائیں۔ ان کا نام بابو مجدد تھا۔ بہت ہی سیدھے سادے اور پر خلوص انسان تھے۔ جہاں آج کل سمن آباد کی بستی ہے اس جگہ ان کی زرعی زمین تھی۔ وہاں ہر طرف کھیت لہلہاتے تھے۔ شاہ نور اسٹوڈیو کی طرف جاتے ہوئے ملتان روڈ کے دونوں جانب کھیت ہی نظر آتے تھے۔

بابو مجدد چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔ زیادہ سے زیادہ پچیس تیس ہزار روپیہ فراہم کر سکتے تھے جو اس زمانے کے حساب سے کافی تھا۔ اس لیے کہ بلیک اینڈ وہائٹ فلم ان دنوں ستر سے نوے ہزار تک میں بن جاتی تھی۔ اے حمید صاحب نے بابو مجدد کو شباب صاحب سے ملایا اور انہوں نے ان کا چودھری فضل حق سے تعارف کرایا۔ یہ طے پایا کہ بابو مجدد نقد روپیہ لگائیں گے۔ باقی سرمایہ دیگر ذرائع سے حاصل کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے چار افراد پر مشتمل

ایک فلم کمپنی بنائی گئی جس میں شباب کیرانوی (یعنی چودھری فضل حق)، اے حمید، بابو مجدد اور ہم حصہ دار تھے۔ بابو مجدد کے ایک بھائی صوفی اسحق صاحب بھی عملی طور پر بہت سر گرم تھے۔ بابو جی کو نقد روپیہ لگانا تھا۔ شباب کو پبلسٹی کرنی تھی اور اداکاروں وغیرہ کی ادھار خدمات حاصل کرنی تھیں۔ اے حمید صاحب عکاس و ہدایت کار تھے۔ انہیں شوکت حسین رضوی سے گہرے تعلقات کی بنیاد پر اسٹوڈیو سے ادھار پر کام کرنے کی سہولت حاصل کرنی تھی۔ ہمیں کہانی لکھنی تھی۔ اس کے علاوہ ہیرو ہیروئن وغیرہ کا بھی بندوبست کرنا تھا۔

''السلام و علیکم'' اس نے ہمیں دیکھ کر بڑے ادب سے سلام کیا ''باجی' آپ نے مجھے بلایا ہے؟''

''ہاں''۔

''کوئی کام ہے؟''

''ہاں''۔

''کیا کام ہے؟''

''بیٹھ جاؤ۔''

''لیجئے بیٹھ گئی' اب کیا کروں؟''

''بس چپ چاپ بیٹھی رہو۔''

وہ صوفے پر بیٹھ گئی مگر چند لمحے بعد ہی بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ وہ ایک چلبلی لڑکی تھی اور سکون سے بیٹھنا اس کیلئے بہت مشکل کام تھا۔

''اب کام تو بتائیں نا'' اس نے ٹھنک کر شمیم آرا سے پوچھا۔ شمیم آرا نے جواب دیا ''کام تمہیں آفاقی صاحب بتائیں گے''۔

وہ ہم سے مخاطب ہو گئی ''آفاقی صاحب' بتایئے کیا کام ہے''۔

ہم نے کہا ''اب تم کھڑی ہو جاؤ''۔

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی ''اب کیا کروں؟''

''اب تم کمرے سے باہر چلی جاؤ''۔

''کتنی دیر کیلئے؟''

ہم نے کہا ''اوہو' بھئی نینی تم تو کان کھا لیتی ہو' کچھ دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتیں؟''

''اب تم جا کر اپنی امی سے ایک پان بنوا کر لاؤ''۔

''یہ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔ خواہ مخواہ اٹھک بیٹھک کراتے رہے''۔

وہ بھاگتی ہوئی کمرے سے رخصت ہو گئی۔

شمیم آراء نے مسکراتی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے کہا ''یہ تو بنی بنائی وہی لڑکی ہے۔ معصوم' شوخ' چلبلی اور الھڑ''۔

انہوں نے کہا ''تو پھر انعام میں کوئی ڈنر کھلا دیجئے۔ آپ کا اتنا بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے''۔

پہلے نینی کو ہم نے واقعی اس خیال سے نہیں دیکھا تھا حالانکہ اس کو اکثر دیکھتے تھے۔ عمر' شخصیت' اداکاری ہر اعتبار سے وہ ہمارے کردار کیلئے موزوں تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں جھجک نہیں تھی۔ نینی کو اس کردار کیلئے منتخب کرنے سے پہلے ہم نے کئی دن بہت غور سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کی عادات و سکنات کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ بقول شمیم آرا کے واقعی وہی بات تھی کہ بغل میں بچہ اور شہر میں ڈھنڈورا۔ ہم اس کردار کیلئے اتنے پریشان ہو رہے تھے حالانکہ وہ ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔

ہم فوراً شباب صاحب کے پاس پہنچے اور انہیں یہ خوشخبری سنائی۔

وہ بولے ''ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی وہ تمہاری ہی کہانی کے کردار کیلئے مناسب ہے۔ میں نے اس بچی کو دیکھا ہے مگر میں نے اس کی ماں کو مشورہ دیا تھا کہ اگر اسے فلم میں کام کرنے کا شوق ہے تو ابھی کچھ وقت انتظار کرو۔ اس کی موجودہ عمر کے مطابق کردار عموماً ہماری فلموں میں نہیں ہوتے''۔

اب اللہ تعالیٰ نے ہماری سبھی مشکلیں آسان کر دی تھیں اس لئے ہر طرف سے بے فکر ہو کر ہم نے دوسرے فلم سازوں کی کہانیاں لکھنے کی ہامی بھر لی۔

ہماری فلم کی شوٹنگ کے دن نزدیک آئے تو اس وقت تک ہم نے جمیل کو سارے پاکستان میں متعارف کرادیا تھا۔ اس کی رنگین تصویریں اہم روزناموں کے صفحہ اول پر شائع ہو چکی تھیں۔ اس کے بارے میں مضامین اور انٹرویوز لوگ پڑھتے رہتے تھے۔ وہ شاپنگ کیلئے جاتا تھا تو لوگ اسے پہچان کر گھیر لیتے تھے۔

""آپ ہی ""سزا"" کے ہیرو جمیل ہیں؟""۔

جمیل سے آٹو گراف حاصل کرنے کیلئے بھی لوگ اشتیاق ظاہر کرتے تھے۔ گویا کسی فلم میں کام کئے بغیر ہی جمیل صاحب سٹار بن گئے تھے اور یہی بات جمیل کیلئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ جمیل کے بارے میں ہمیں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اداکاری کا نہیں اداکار بننے کا شوق ہے۔ اداکار ہونے کے جو فوائد ہوتے ہیں وہ ان کا متوالا ہے لیکن ایک اچھا اداکار بننے کیلئے جو محنت کرنی پڑتی ہے اور جس توجہ اور لگن سے کام کرنا پڑتا ہے وہ اس کا قائل نہیں تھا۔ جب وہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں سوئمنگ کرنے کیلئے جاتا اور لوگ پہچان کر اس کے بارے میں سرگوشیاں کرتے اور لڑکیاں راستہ روک کر اس سے آٹو گراف حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کرتیں تو جمیل کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا مگر اس نے نہ تو فلم کے سکرپٹ کو غور سے پڑھنے کی زحمت گوارا کی اور نہ ہی اس کردار کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ہم خود ہی اسکو گھیر کر بیٹھ جاتے اور کہانی کے موضوع اور کرداروں کی نوعیت' ان کے انداز فکر اور ان کی نفسیات کے بارے میں بتانے کی کوشش کرتے تھے مگر صاف ظاہر تھا کہ جمیل کی توجہ کہیں اور تھی۔ جمیل میں اداکاری کی بہت زیادہ صلاحیتیں نہیں تھیں۔ صورت شکل اچھی تھی مگر اس میں بھی کچھ خامیاں تھیں۔ مثلاً اس کی ناک چہرے کے مقابلے میں زیادہ لمبی تھی' اس کی گردن بھی لمبی تھی۔ اس کے چلنے کا انداز دلکش نہیں تھا۔ ہم نے ان خامیوں کے بارے میں اسے بتایا اور انہیں دور کرنے کیلئے مشورے بھی دیئے مگر جمیل نے کچھ حاصل نہیں کیا۔ مجموعی طور پر وہ ایک خوبرو نوجوان تھا مگر اداکاری کیلئے جس فُٹ ورک اور جن تاثرات کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس سے محروم تھا۔ ایک اور کمی یہ تھی کہ جمیل کی آواز میں گہرائی' تاثر اور نشیب و فراز نہیں تھا۔ خصوصاً دھیمی آواز میں بولتے ہوئے اس کی آواز بیٹھ سی جاتی تھی مگر یہ تمام چیزیں ایسی تھیں جن پر قابو پایا جاسکتا تھا۔ ناک کا مسئلہ تو کیمرے کے زاویوں اور روشنیوں سے حل کیا جاسکتا تھا۔ لمبی گردن کو چھپانے کیلئے کالر والی قمیض اور اونچے کالر کے کرتے

کار آمد ثابت ہو سکتے تھے۔ ہم نے اپنی فلم میں اسے حتی الامکان ایسے ہی لباس پہنائے تھے مگر جب ''یہ امن'' اور ''غرناطہ'' میں وہ بغیر کالر کے کرتے میں نظر آیا تو اس کی اونٹ جیسی گردن اور بے ڈھنگی چال نمایاں ہو گئی اور فلم بینوں کو پسند نہ آئی۔ ہم نے اسے کیمرے کے سامنے لانگ شاٹس میں زیادہ چلتے پھرتے ہوئے بھی نہیں دکھایا تھا۔ مکالموں کی ادائیگی کیلئے اسے نچلے سروں میں مکالمے بولنے سے منع کر دیا تھا پھر بھی بعض مناظر میں دھیمی آواز میں مکالمہ بولنا ضروری تھا اور ان ہی جگہوں پر اس کی آواز کی خامی محسوس ہو جاتی تھی۔ یہ سب اپنی جگہ لیکن ہمیں یقین تھا کہ اگر وہ محنت کرے اور اداکاری کے فن کی طرف توجہ دے تو اس کی چھوٹی موٹی خامیاں فلم بینوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گی اور کہانی کے پر زور بہاؤ میں وہ اس کے عیب نظر انداز کر دینگے۔

اکثر بڑے فنکاروں میں آغاز میں بعض خامیاں نمایاں نظر آتی ہیں مگر وہ اس پر رفتہ رفتہ قابو پا لیتے ہیں۔ لمبی ناک ندیم کی بھی کمزوری تھی۔ اس زمانے میں اس کا چہرہ بھی بہت چھوٹا تھا جس کی بناء پر طوطے جیسی ناک اور زیادہ نمایاں ہو جاتی تھی مگر ندیم نے کیمرا مین اور ہدایتکار کے مشوروں پر عمل کیا اور یہ خامی زیادہ نمایاں نہ ہو سکی۔ پھر ندیم نے اپنے چہرے کے تاثرات اور آنکھوں کا بھی استعمال کیا' اس کی آواز بنیادی طور پر بہت دلکش' پُر اثر اور گہرائی لئے ہوئے تھی۔ اس نے چہرے اور آواز کے اُتار چڑھاؤ پر خصوصی توجہ دی۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ پاکستان کی فلمی دنیا میں بہت سے فنکار آئے جو صلاحیتوں اور ظاہری خوبیوں سے بہرہ مند تھے مگر بد قسمتی سے وہ محض فنکار بن کر رہ گئے۔ ان کی اداکاری بہتر ہونے کے بجائے بتدریج خراب ہوتی چلی گئی۔ ایسی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر ندیم پاکستان کا واحد اداکار ہے جس نے ہر آنیوالی فلم میں گذشتہ فلم سے بہتر اداکاری کا مظاہرہ کیا اور اس طرح کا فن نکھرتا چلا گیا۔ کم از کم مرد اداکاروں میں ایسی کوئی اور مثال نہیں ہے۔ محمد علی کو خدا نے کیا کچھ نہیں دیا تھا۔ شکل وصورت' قدو قامت' آواز' چہرے کے تاثرات مگر انہوں نے سٹار بننے کے بعد من مانی شروع کر دی اور ان کی اداکاری روبہ زوال ہی رہی۔ ان کی آغاز کی فلموں کو دیکھ لیجئے اور درمیانی یا آخری فلموں کو دیکھئے تو اندازہ ہو جائیگا کہ محمد علی نے خود اپنے ساتھ اور فلم بینوں کے ساتھ کس قدر ناانصافی برتی۔ وحید مراد کا بھی یہی عالم تھا۔ ''کنیز' ارمان'' اور اس کے بعد کے چند سالوں والا وحید مراد رفتہ رفتہ وقت کی دھند میں غائب ہو گیا۔ اس کی اداکاری میں بہتری کی جگہ ٹھہراؤ اور

یکسانیت پیدا ہو گئی۔ایک جیسے کردار' ایک جیسے بال' ایک جیسالباس' ایک جیسی اداکار۔حالانکہ قدرت نے وحید مراد کو بے پناہ صلاحیتیں عطا کی تھیں۔شاہد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی المیہ پیش آیا۔ندیم نے ان سب کے برعکس خود کو بہتراداکار بنانے کی کوشش جاری رکھی۔اس لئے نہ تو وہ موٹااور بے ڈول ہوااور نہ ہی اس کی اداکاری میں ٹھہراؤاور یکسانیت پیدا ہوئی۔

پہلا مرحلہ کہانی کا تھا۔ہمارے پاس فلموں کے ریڈی میڈ نام موجود تھے مگر کہانی ایک بھی نہ تھی۔جب شباب صاحب نے ہمیں یہ منصوبہ سنایا تو خوشی سے ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔اللہ بیٹھے بٹھائے ہمیں ایسا نادر موقع فراہم کرے گا۔ یہ تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔جوش اور اضطراب کے مارے ایک دو دن تو نیند ہی نہیں آئی۔ادھر شباب صاحب روز دریافت کرتے تھے کہ یار کہانی تو بناؤ۔

جب ذرا سکون حاصل ہوا تو ہم نے کہانیاں سوچنی شروع کر دیں۔ایک مزاحیہ کہانی ہمیں سوجھی تو ہم نے شباب صاحب کو سنائی۔انہیں بھی پسند آئی۔اس کہانی ہیں یہ تجربہ کیا گیا تھا کہ یہ شروع سے آخر تک خالص مزاحیہ کہانی تھی۔سارے کردار مزاحیہ تھے۔یہاں تک کہ کہانی میں جو ٹریجڈی تھی وہ بھی دیکھنے والوں کے لیے کامیڈی تھی۔ اس طرح کی سراسر مزاحیہ فلم پاکستان میں پہلے نہیں بنی تھی۔ہم نے شباب صاحب کو زبانی آئیڈیا سنایا تو وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔پھر انہوں نے دوسرے لوگوں کو یہ کہانی سنائی۔ سبھی کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔گویا کہانی پسند کر لی گئی۔

اس کے بعد ہم نے اس کا منظر نامہ اور پھر مکالمے لکھنے شروع کئے۔اس سے پہلے انگریزی اردو فلمیں دیکھ کر، کتابیں پڑھ کر اور زبانی پوچھ گچھ کے ذریعے ہم نے جو تربیت حاصل کی تھی وہ اس کہانی پر صرف کر دی گئی۔شباب صاحب نے بھی منظر نامے میں مشورے دیئے چونکہ وہ ہم سے سینئر کہانی نویس تھے۔اے حمید صاحب بھی جب ہنسی سے فرصت پاتے تو کہانی میں مفید مشورے پیش کرتے رہتے تھے۔البتہ چودھری فضل حق محض ہنسنے تک محدود رہے۔ انہوں نے کبھی کوئی مشورہ نہیں دیا۔یہ ان کی سمجھ داری کی علامت تھی۔رہ گئے بابو محمد دتو ان کا یہ معاملہ تھا کہ ہاتھی

کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔چار بھائیوں کو جو چیز اچھی لگتی تھی وہ انہیں بھی پسند تھی۔اس اصول کے تحت وہ جب دوسروں کو ہنستے دیکھتے تو خود بھی ہنسنے لگتے تھے۔دوسرے لوگ سنجیدہ ہوتے تو وہ بھی سنجیدہ ہو جاتے تھے۔

کہانی تو تیار ہو گئی۔اس کا نام ''ٹھنڈی سڑک'' رکھا گیا۔اب ہمیں یاد نہیں رہا کہ ''ٹھنڈی سڑک'' نام رکھنے کا کیا سبب تھا مگر کچھ تو ہو گا۔اس طرح پہلا مرحلہ طے ہو گیا۔

اب سب سے اہم مسئلہ اداکاروں کے انتخاب کا تھا۔مگر اس سے پہلے سرمایہ درکار تھا۔بابو محمد دنے بڑی صفائی سے بتادیا کہ فصل آنے پر ہی وہ رقم فراہم کر سکیں گے اس زمانے کے رواج کے مطابق یہ کوئی ان ہونی بات نہیں تھی۔جو سرمایہ کار زمینداری کرتے تھے وہ فصل کے فصل رقم لا کر دیتے رہتے تھے اور فصلوں کے مطابق فلم کی تکمیل ہوتی رہتی تھی۔بعض فلموں میں بہت سے سرمایہ کار ہوتے تھے۔یہ سب دو دو چار چار ہزار روپیہ ادا کر کے شریک فلم ساز بن جاتے تھے۔فصل کے مطابق وہ رقم لے آتے تھے۔اگر فصل خراب ہو گئی تو سمجھئے کہ فلم کی تکمیل بھی کھٹائی میں پڑ گئی۔ہمیں یاد آیا کہ ایک فلم '' ٹھوکر'' میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بارہ چودہ زمیندار فلم ساز تھے۔جب وہ شوٹنگ دیکھنے کے لیے آتے تھے تو سیٹ پر اداکاروں تک کے لیے جگہ نہیں رہتی تھی مگر فلم سازوں کے لیے کرسیاں ڈال دی جاتی تھیں۔ان کی خاطر تواضع بھی ہوتی رہتی تھی۔چائے پان سگریٹ بھی پیش کیے جاتے تھے۔بدقسمتی سے فصلوں کی پیہم خرابی کے باعث یہ فلم دس بارہ سال میں مکمل ہوئی تھی۔بابو محمد دنے صاف گوئی سے کام لیا تھا اس لیے ہم سب مطمئن ہو گئے۔

اس کے بعد سب سے اہم مرحلہ ہیرو اور ہیروئن کے انتخاب کا تھا۔ہم لوگ ''جلن'' والی غلطی دہرانا نہیں چاہتے تھے۔اس لیے یہ سوچا کہ اس فلم میں ممتاز اداکاروں کو کاسٹ کیا جائے۔اسی زمانے میں اتفاق سے فلم اسٹار ریحانہ بمبئی سے لاہور آئی تھیں۔ اس سے پہلے بھی وہ ایک بار اپنی والدہ اور والد کے ہمراہ پاکستان آئی تھیں اور لاہور میں فلیٹیز ہوٹل میں قیام کیا تھا جو اس وقت لاہور کا بہترین ہوٹل تھا۔ان سے ہماری پہلی ملاقات فلیٹیز ہوٹل کے کمرے میں ہوئی تھی۔ہم '' آفاق'' کے فلمی صفحے کے لیے ان سے انٹرویو لینے کے لیے گئے تھے۔فوٹو گرافر کا رواج ہی نہیں تھا۔اس لیے ہم تن تنہا پہنچ گئے۔سب سے پہلے ان کے والد سے ملاقات ہوئی ان کا نام چودھری صاحب تھا۔اس کے علاوہ

کیا تھا یاد نہیں رہا۔ بہت نستعلیق آدمی تھے۔ چھوٹی موہری کا پاجامہ اور کرتہ پہنے ہوئے تھے۔ سفید بال، رنگ گندمی، باتیں بہت سلیقے کی کرتے تھے۔ وہ ہمیں لے کر کمرے کے اندر گئے۔ فلیٹیز ہوٹل میں (آج بھی) کمرے کے دو حصے ہوتے ہیں۔ پچھلا حصہ بیڈ روم سمجھ لیجیے۔ اسی میں باتھ روم کا دروازہ بھی ہوتا ہے۔ اگلا حصہ ڈرائنگ روم سمجھ لیجیے ہمیں ڈرائنگ میں بٹھا دیا گیا۔ ہم چودھری صاحب سے بمبئی کی فلم انڈسٹری کے متعلق اور وہ ہم سے پاکستان کی فلمی صنعت کے متعلق دریافت کرتے رہے۔

ریحانہ کا بھارت فلم انڈسٹری میں بہت بڑا نام اور مقام تھا۔ بڑے بڑے اداکاروں کے ساتھ وہ کام کر چکی تھی اور کئی ہٹ فلموں کی ہیروئن تھیں۔ رنگیلی، سرگم تو ہمیں بھی یاد ہیں۔ وہ کامیڈی فلموں میں کام کرنے کے لیے مشہور تھیں۔ غالباً انہوں نے بمبئی میں مستقبل کے حالات کو بھانپ لیا تھا اور پاکستان منتقل ہونے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ اس لیے وہ حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے یہاں آئی تھیں۔ ویسے بھی ان کا دور عروج گزر چکا تھا۔ اس کے بعد تو نیچے کی طرف ہی سفر درپیش تھا۔ بہر حال اس کے باوجود ان کا بہت بڑا نام تھا۔ پاکستانی انہیں اسکرین پر دیکھنے کے مشتاق تھے۔ اس وقت تک کسی کو علم نہ تھا کہ وہ مستقلاً پاکستان آنا چاہتی ہیں۔

کچھ دیر بعد ان کی والدہ بھی تشریف لے آئیں اور پاندان سنبھال کر پان بنانے بیٹھ گئیں۔ اپنے ہاتھوں سے انہوں نے ایک گلوری بنا کر ہمیں دی اور ہم نے آداب عرض کرنے کے بعد منہ میں رکھ لی۔ ان کی والدہ بھی نہایت شائستہ، وضع دار اور باوقار شخصیت تھیں۔ باتیں بھی بڑے رکھ رکھاؤ سے کرتی تھیں۔ ہم نے ان سے پرانے لکھنؤ کی باتیں شروع کر دیں۔ ہم خود بھی لڑکپن میں لکھنؤ گئے تھے۔ پرانی داستانوں اور کتابوں میں بھی لکھنؤ کا احوال پڑھا تھا۔ لیکن انہوں نے لکھنؤ کے بارے میں بہت سی دلچسپ اور روزمرہ کی باتیں سنائیں جو ہمارے علم میں نہیں تھیں۔

انہوں نے مطلع کیا کہ ریحانہ غسل کر کے ابھی آنے والی ہیں مگر دلچسپ باتوں میں ریحانہ کی زیادہ کمی محسوس نہ ہوئی۔ ریحانہ کمرے میں داخل ہوئی تو بہت سادہ لباس میں تھیں۔ بال بھی پوری طرح خشک نہیں ہوئے تھے۔ میک اپ سے چہرہ محروم تھا۔ اس کے باوجود ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔ روشن مسکراتی ہوئی آنکھیں، مناسب نین نقش، بوٹا سا قد لیکن پرکشش اور دلکش جسم۔ جب انہوں نے باتیں شروع کیں تو اور بھی متاثر کیا۔ وہ بے ساختہ، بے تکلف گفتگو

کرنے کی عادی تھی۔ شگفتہ مزاج اور ہنس مکھ، بات بات پر ہنستی تھیں۔ بعد میں ہم نے جس ریحانہ کو دیکھا اس زمانے کی ریحانہ اس سے یکسر مختلف تھیں۔

سب سے پہلے تو انہوں نے چائے کے لیے دریافت کیا اور پھر ویٹر کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔ پھر کہا ''آفاقی صاحب میرا خیال ہے کہ آپ کو لنچ کھا کر جانا پڑے گا''۔

ہم نے کہا ''وہ کیوں؟''

''اس ہوٹل کی سروس کا یہی عالم ہے۔ ناشتہ منگاؤ تو لنچ کے وقت آتا ہے لنچ کے آرڈر کے لیے ڈنر تک بھوکا رہنا پڑتا ہے اگر صبح غسل کرنا ہو تو گرم پانی کے لیے رات ہی کو آرڈر دینا پڑتا ہے تب کہیں جا کر دوسرے دن دس گیارہ بجے تک گرم پانی نصیب ہوتا ہے''۔

فلیٹیز کی سروس کا ہمیں بھی اندازہ تھا مگر انہوں نے جس دلچسپ انداز میں نقشہ کھینچا تھا وہ ان ہی کا حصہ تھا۔

کچھ دیر بعد ویٹر بھی آ گیا۔ ریحانہ نے اس سے کہا ''دیکھیے، یہ صحافی ہیں انہیں چائے پلانا بھی ضروری ہے۔ اگر ان کے جانے کے بعد چائے لائے تو یہ ہمارے ساتھ تو جو سلوک کریں گے وہ کریں گے ہی مگر ہوٹل والوں کو بھی نہیں بخشیں گے''۔

وہ بولا ''میم صاحب بس گیا اور آیا''۔

''بھئی جب جاؤ گے تو لازمی طور پر آؤ گے بھی۔ مگر کب؟ یہ تو بتا دو''۔

ہم نے بھی ویٹر کو شرمندہ کیا کہ باہر کے لوگوں کے سامنے تو لاج رکھ لیا کرو۔ بہر حال وہ فوراً چلا گیا اور جلد ہی چائے بھی لے آیا۔ چائے گرم نہیں تھی۔

ریحانہ نے کہا ''میری خیال ہے جلدی جلدی میں وہ چائے کا پانی پکانا بھی بھول گیا''۔

اس روز ریحانہ سے کچھ دیر ملاقات رہی جس کا احوال ہم نے ''آفاق'' کے فلمی صفحے پر بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ ان کی ایک تصویر بھی کہیں سے حاصل کر کے اس کا بلاک بنوالیا تھا۔

یہ ریحانہ سے ہماری پہلی ملاقات تھی اور اس وقت ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مستقبل میں ہمارا ان سے کافی عرصے تک قریبی واسطہ رہے گا۔

''ٹھنڈی سڑک'' کے سلسلے میں ہم دوسری بار ریحانہ سے ملاقات کے لیے جا رہے تھے۔ وہ گلبرگ کی ایک کوٹھی میں مقیم تھیں۔ اس بار ان کے ساتھ چودھری صاحب نہیں آئے تھے صرف ان کی والدہ ہمراہ آئی تھیں۔
لاہور کے ایک فلم ساز اور تقسیم کار نے ریحانہ کو گلبرگ کی ایک آراستہ کوٹھی میں ٹھہرانے کا بندوبست کیا تھا۔ وہ انہیں اپنی فلم میں کاسٹ کرنے کے متعلق منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی فلم اسٹوڈیو کا منہ نہ دیکھ سکی۔ لیکن ریحانہ پھر پاکستان ہی کی ہو کر رہ گئیں۔
شام کا وقت تھا۔ ریحانہ سے کوٹھی کے لان میں ملاقات ہوئی۔ پچھلی ملاقات کے بعد سے ان میں بظاہر کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اسی طرح مسکراتی ہوئی آنکھیں، چمکتا ہوا چہرہ، متبسم ہونٹ، باتیں کرنے کا انداز بھی ویسا ہی سادہ، بے تکلف اور دل نشین تھا۔ ہم ان سے پہلے بھی مل چکے تھے۔ ہم نے شباب صاحب، اے حمید صاحب اور چودھری فضل حق صاحب کا بھی ان سے تعارف کرایا۔ چودھری صاحب نے بلاواسطہ انہیں یہ بھی سنا دیا کہ '' ڈائریکٹر'' پاکستان کا بہت اہم اور ممتاز فلمی جریدہ ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ہوشیار باش، اگر ان کے ساتھ کام کرو گی تو خوب پبلسٹی ملے گی وغیرہ وغیرہ۔۔۔ ریحانہ خوش اخلاقی سے گفتگو کرتی رہیں۔ چائے آگئی جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے بنا کر سب کو پیش کی۔
''اچھا تو آپ کیسی فلم بنا رہے ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔
''خالص کامیڈی۔ آپ کے لیے بہت موزوں رہے گی''۔ چودھری صاحب نے کہا
وہ مسکرا کر رہ گئیں '' ہاں مجھے تو سب کامیڈی کی اداکارہ ہی سمجھتے ہیں۔ کبھی رونے دھونے کا موقع ہی نہیں دیا''۔
'' یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ ہمیشہ مسکراتی اور ہنستی ہی رہیں اور وہ بھی فلم ساز کے خرچے پر''۔ اے حمید صاحب نے کہا۔ اے حمید صاحب فلمی دنیا میں '' بھائیا حمید'' کے نام سے مشہور تھے۔ بلکہ عام طور پر انہیں صرف '' بھائیا'' کہا جاتا تھا اور لوگ سمجھ جاتے تھے کہ اس سے مراد بھائیا حمید ہیں۔ وہ حاضر جواب اور دلچسپ آدمی تھے۔ بات سے بات نکالتے تھے اور جب طبیعت میں روانی ہوتی تو بہت ہنساتے تھے۔

فلم کی کہانی سنانے کا مرحلہ بھی آگیا جس کے تصور ہی سے ہم پریشان تھے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کہانی سنانا ہمارے لیے ہمیشہ ایک مسئلہ رہا ہے پھر وہ تو بالکل پہلا موقع تھا اور وہ بھی ایک ہیروئن کے سامنے۔ ظاہر ہے ہم نروس ہو گئے ہم کو پریشان دیکھا تو شباب صاحب فوراً امداد کو آئے اور بولے "میں کہانی سناتا ہوں"۔

ریحانہ نے شرارت سے کہا "کیا آفاقی صاحب کو شرم آتی ہے؟"

اور ہم سچ مچ شرما گئے۔

وہ بولیں "ابھی تو آپ خوب چہک رہے تھے۔ کیا بات ہے کہانی آپ ہی نے لکھی ہے یا شباب صاحب سے لکھوائی ہے؟"

ہم نے کہا "دراصل شباب صاحب بہت اچھی کہانی سناتے ہیں"۔

اب شباب صاحب نے کہانی کا آغاز کیا۔ لیکن آغاز ہی میں پٹری سے اتر گئے۔ یہ ایک خالص مزاحیہ کہانی تھی۔ شباب صاحب کی یہ عادت تھی کہ مزاحیہ باتیں یا لطیفے سناتے تو خود بھی ہنسنے لگتے تھے اور اتنے ہنستے تھے کہ سننے والے کہانی کے بجائے ان کی ہنسی سنتے رہ جاتے تھے۔ بھائیا حمید بھی ہنس ہنس کر دوہرے ہوئے جا رہے تھے صرف ہم اور چودھری فضل حق سنجیدہ صورت بنائے بیٹھے تھے۔

کہانی تو جیسے تیسے ختم ہو گئی۔ ہمیں تو علم تھا۔ ریحانہ کو بھی اٹکل سے اندازہ ہو گیا اس لیے کہ بیشتر حصہ ہنسی کی نذر ہو چکا تھا۔ بہر حال انہوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور بولیں "باقی میں خود پڑھ لوں گی۔ وہ زیادہ مناسب ہو گا"۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کہانی بس تھوڑی بہت ہی ان کی سمجھ میں آئی لیکن انہوں نے بڑی شائستگی سے اس کا اظہار کیا۔ جتنی بھی کہانی ان کے پلے پڑی تھی مجموعی طور پر وہ انہیں پسند آگئی۔ اس کے بعد سب سے نازک مرحلہ سامنے آیا۔ وہ تھا فلم کا معاوضہ۔ ریحانہ بمبئی کی مقبول ہیروئن تھیں۔ بڑے بڑے اداکاروں کے ساتھ کام کر چکی تھیں۔ وہاں فلمیں بھی زیادہ لاگت سے بنا کرتی ہیں۔ اس لیے چودھری فضل حق صاحب نے پہلے تمہید باندھی کہ دیکھئے پاکستان کی انڈسٹری نوزائیدہ ہے۔ مارکیٹ چھوٹی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب ایسی رقم بتائیے کہ جو ہمارے لیے بھی معقول ہو۔

ریحانہ نے کچھ دیر سوچا۔ پھر انہوں نے اپنی دانست میں بہت رعایتی معاوضہ بتا دیا۔ یہ اتنا تھا کہ اتنی رقم میں اس وقت

پاکستان میں ایک فلم بن جایا کرتی تھی لیکن ہم نے ریحانہ پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ غور کرنے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔
راستے میں بھائیا حمید نے کہا" بھئی تم لوگوں کو سانپ کیوں سونگھ گیا تھا اس سے کہہ کر معاوضہ تو کچھ کم کراتے"!
شباب صاحب جل کر بولے "کتنا کم کراتے۔ خواہ مخواہ اپنا مذاق بن جاتا"۔
ویسے ان کا کہنا بھی درست ہی تھا۔
اس طرح ریحانہ ہماری پہلی فلم کی ہیروئن بنتے بنتے رہ گئیں۔
"ریحانہ" کو ہیروئن بنانے کا پروگرام تو کینسل ہو گیا۔ اب سب یہ سوچنے بیٹھ گئے کہ کون سی پاکستانی ہیروئن کو اس فلم میں لیا جائے۔ کافی دیر کی بحث و تمحیص کے بعد قرعہ فال مسرت نذیر کے نام نکلا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسرت نذیر کے والد خواجہ نذیر سے ہماری دوستی تھی اور خود مسرت نذیر سے بھی خاصی بے تکلفی تھی۔ ہمارے ایک اور دوست رشید جاوید کے بھی خواجہ نذیر سے مراسم تھے۔ مسئلہ محض مسرت نذیر کو ہیروئن بنانا ہی نہیں تھا بلکہ ان سے معاوضے میں رعایت کرنا، شوٹنگ کے لیے تاریخیں حاصل کرنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں فلم میں ادھار کام کرنے پر رضامند کرنا تھا۔ اتنی بہت سی توقعات پوری کرنے کے خیال سے ہم بہت پریشان ہوئے مگر پھر شباب صاحب نے کہا کہ فکر نہ کرو میں تمہارے بازو پر تعویذ باندھ دوں گا اس کی برکت سے ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔
ہم نے کہا" وہ تعویذ آپ خود اپنے بازو پر کیوں نہیں باندھتے؟"
بولے" یار سمجھا کرو۔ تعویذ لکھنے والا خود ہی تعویذ پہن لے تو اس میں تاثیر نہیں رہتی۔ بس تم اللہ کا نام لے کر چلے جاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا"۔
اس کے بعد انہوں نے ہمیں شفیق الرحمن کے کردار شیطان کا لطیفہ سنایا جنہوں نے اپنے ایک ناکارہ اور ناکام دوست کو تعویذ پہنا کر کامیاب ترین انسان بنا دیا تھا۔

شباب صاحب نے تعویذ تو نہیں پہنایا مگر ہم نے خواجہ نذیر سے تمام شرائط منوالیں۔ وہ بے حد مخلص اور بامروت آدمی تھے۔ تعلقات کے علاوہ انہیں ہمارے صحافی ہونے کا بھی خیال تھا اور یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ فلم والے ہماری بات پر کان بھی دھرتے ہیں۔ مسرت نذیر کی طرف سے تمام معاملات وہی طے کرتے تھے لیکن اس کے بعد شوٹنگ

کے وقت سیٹ پر ہر گز نہیں جاتے تھے۔البتہ خبر لیتے رہتے تھے۔یہ تمام امور طے کرنے کے بعد وہ ہمیں مسرت نذیر کے پاس لے گئے جو شاہ نور اسٹوڈیو میں غالباً شوکت صاحب کی فلم ''جان بہار'' کے سیٹ پر کام کر رہی تھیں۔
''اچھا تو اب آپ کہانیاں بھی لکھا کریں گے ؟'' مسرت نذیر نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا''کچھ پتہ بھی ہے کہانی کیسے لکھتے ہیں، یہ خبر کی طرح نہیں لکھی جاتی''۔

مسرت نذیر ہوٹنگ کرنے میں ماہر تھیں اور کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنواتی تھیں۔
ہم نے کہا''اتنے بہت سے لوگ کہانیاں لکھتے ہیں ہم بھی لکھ لیں گے''۔
''ٹھیک ہے'' انہوں نے میک اپ کا سامان اور آئینہ ایک طرف رکھ دیا''میری ایک شرط ہے''۔
''وہ کیا؟'' ہم پریشان ہو گئے۔اس لیے کہ تمام شرائط پہلے ہی خواجہ نذیر صاحب سے طے ہو چکی تھیں۔
وہ سنجیدگی سے بولیں ''پہلے آپ مجھے کہانی سنائیں۔پسند آگئی تو کام کروں گی''۔
ہم بہت گھبرائے۔کہانی سنانا ہمارے لیے ہمیشہ ایک مرحلہ رہا ہے اور آج بھی ہے۔ہم نے کہا''کہانی شباب صاحب سنا دیں گے''۔
''کیوں۔کیا آپ کے نام سے شباب صاحب نے لکھی ہے ؟''
ہم نے کہا''بس دونوں نے مل جل کر لکھی ہے''۔
وہ بولیں''میں ساجھے میں لکھی ہوئی کہانی میں کام نہیں کروں گی۔پہلے کہانی کسی ایک رائٹر سے لکھوائیں۔وہ کہانی سنائے پھر میں فلم میں کام کروں گی''۔
خواجہ نذیر مسکرائے۔وہ بہت تیزی سے بولتے تھے اور کئی بار تو ان کی پوری بات ہی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔انہیں معلوم تھا کہ مسرت کے ساتھ ہماری خاصی بے تکلفی ہے جب ہدایت کار لقمان نے انہیں پہلی بار پنجابی فلم ''پتن'' کے لیے ہیروئن چنا تھا اس وقت ہم دن رات لقمان صاحب کے ساتھ ہی لگے رہتے تھے۔اس زمانے سے ہماری مسرت اور ان کے والد کے ساتھ ملاقات تھی۔مسرت نذیر بہت زندہ دل اور ہنس مکھ اداکارہ تھیں۔جب انہوں نے فلم ساز باری ملک کی فلموں میں کام کیا تو وہاں بھی ان سے اکثر ملاقات رہا کرتی تھی چونکہ باری ملک سے بھی ہماری

بہت دوستی تھی۔ان سے ہمارے تعلقات کا یہ عالم تھا کہ ایک بار ہم نے بہت اہم مسئلے پر ان سے انٹرویو کے لیے کہا تو وہ بولے ''یار چھوڑو تم خود ہی لکھ لو''۔

ہم نے انٹرویو لکھ کر ان کے نام سے شائع کر دیا۔اس میں کچھ متنازع باتیں بھی تھیں ان کے ساتھیوں نے شکایت کی کہ یہ تم نے کیا انٹرویو دیا ہے؟

''کون سا انٹرویو؟'' انہوں نے پوچھا۔جب انہیں انٹرویو کے بارے میں بتایا گیا تو بولے ''بھئی ٹھیک ہے۔دیا ہے تو کیا ہوا''۔

''پتا بھی ہے اس میں کیا لکھا ہے؟''

انہوں نے پوچھا ''کیا لکھا ہے؟''

جب انہیں بتایا گیا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔انہوں نے ہمیں فون کر کے شکایت کی کہ یہ کیا انٹرویو لکھ دیا۔ہم نے کہا ''بھائی کم از کم اپنا انٹرویو پڑھ تو لیا کرو۔اتنی کام چوری بھی اچھی نہیں ہوتی''۔

باری صاحب کے اور بھی بہت سے واقعات اور لطیفے ہیں جو ان کے حوالہ سے بیان کیے جائیں گے۔ باری ملک سے خواجہ نذیر اور مسرت نذیر کے بہت گہرے مراسم تھے۔باری صاحب کا ان کے گھر میں آنا جانا تھا۔مسرت نے ان کی دو سپر ہٹ اور یادگار فلموں '' یکے والی'' اور ''ماہی منڈا'' میں کام کیا تھا۔''یار بیلی'' اور '' سہتی'' میں بھی وہی ہیروئن تھیں۔

مسرت نذیر کا مقصد محض ہمیں تنگ کرنا تھا۔جب ہم نے جوابی فقرہ بازی شروع کی تو انہوں نے اپنا رویہ بدل لیا۔اس طرح مسرت نذیر کو ہماری لکھی ہوئی پہلی فلم ''ٹھنڈی سڑک'' کی ہیروئن چن لیا گیا۔

اب دوسراا ہم مسئلہ ہیرو کا تھا۔دراصل پاکستانی اور بھارتی فلموں میں اداکاروں کا انتخاب اوپر سے شروع ہوتا ہے۔سب سے پہلے ہیرو اور ہیروئن کا انتخاب کیا جاتا ہے۔اس کے بعد دوسرے کرداروں کی باری آتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سب سے زیدہ اہمیت ہیرو اور ہیروئن ہی کی ہوتی ہے۔ان ہی کے ناموں سے فلم فروخت ہوتی ہے اور ان ہی کی کشش فلم بینوں کو سنیما گھروں میں کھینچ کر لاتی ہے اور ایک مشکل یہ تھی کہ ہمیں کہانی کے لیے ایسا ہیرو درکار تھا جو واقعی

نوجوان اور کالج کا طالب علم نظر آئے اور کامیڈی کے ساتھ بھی انصاف کر سکے۔ بہت سوچا، عقل دوڑائی مگر کوئی مناسب اداکار سمجھ میں نہ آیا۔

معاً ہمیں کمال کا خیال آیا۔ کمال کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ میرٹھ میں ہم ایک سال ان کے فلیٹ میں رہے تھے۔ وہ ہم سے ایک سال جونیئر تھے مگر بہت بے تکلفی اور دوستی تھی۔ ہمارے ڈراموں میں بھی وہ کام کر چکے تھے۔ کمال کو لڑکپن ہی سے فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ راج کپور اس زمانے میں سپر اسٹار تھے۔ راج کپور کی کمال سے شباہت تھی جب دوستوں نے اس طرف توجہ دلانی شروع کی تو کمال اور زیادہ اداکاری کی طرف مائل ہو گئے۔ راج کپور ویسے بھی ان کا پسندیدہ اداکار اور آئیڈیل تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ راج کپور جیسا حلیہ بنا کر شکلیں بناتے رہتے اور راج کپور کی فلموں کے مکالمے بولتے رہتے تھے۔ وہ جو شاعر نے کہا ہے کہ

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار

اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

دوستوں اور ملنے والوں کی حوصلہ افزائی نے کمال کے شوق کو اور ہوا دی اور انہوں نے بی اے پاس کرنے کے بعد اداکار بننے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ لاہور آئے تھے تو ہم انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ہم نے انہیں لڑکپن میں دیکھا تو اب جو دیکھا تو انہوں نے خوب قد نکال لیا تھا۔ جسم بھی بھر گیا تھا۔ نوکدار مونچھیں ان کے سرخ و سفید چہرے پر بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ ہم نے تعریف کی تو فخریہ انداز میں پوچھا ''کیوں ہیرو لگتا ہوں نا؟''

''بالکل سولہ آنے'' ہم نے تائید کی۔

وہ ہمارے صحافت اور فلم کے پسِ منظر سے واقف تھے۔ کہنے لگے ''سوفی پھر کچھ کرو نا۔''

ہم نے انہیں تسلی دی کہ وقت آنے پر کچھ کریں گے لیکن ہمیں یہ علم نہ تھا کہ ان کے مقدر کا ستارہ اتنی جلدی جگمگائے گا اور خود بخود ان کے لیے ہیرو بننے کی راہیں ہموار ہو جائیں گی۔ کمال اس عرصے میں خالی نہیں بیٹھے تھے۔ راج کپور کی فلمیں بغور اور بار بار دیکھنے کے علاوہ انہوں نے بمبئی کا بھی ایک پھیرا لگا لیا تھا۔ میرٹھ میں وہ جس نادر علی بلڈنگ میں رہتے تھے۔ اس کے مالکوں کے بیٹوں سے ان کی دوستی تھی اور انہوں نے فلم ڈسٹری بیوشن کا دھندہ

شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کے توسط سے کمال بمبئی پہنچ گئے۔ فلمی دنیا میں داخلے کے لیے ان کے پاس سفارشی خط موجود تھا۔ اس لیے فلم سازوں سے ملاقات بھی ہو گئی۔

اب جو ''ٹھنڈی سڑک'' کے لیے ایک نوخیز ہیرو کی ضرورت پیش آئی تو ہم نے شباب صاحب کو کمال کے بارے میں بتایا۔ تصویر وہ ''فلم فیئر'' میں دیکھ ہی چکے تھے۔ انہیں کمال بہت پسند آئے۔ بھائیا حمید نے بھی کمال کے حق میں اپنا ووٹ دے دیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہم نے فوراً کمال کو مطلع کیا اور لاہور پہنچنے کی تاکید کر دی۔ کمال تو اسی انتظار میں تھے فوراً ٹکٹ کٹا کر لاہور آ گئے۔

ہم نے اس بار کمال کو ذرا غور سے دیکھا اور فلم کے کردار کے مطابق جانچا تو وہ نگینے کی طرح موزوں نظر آئے۔ ان کے مزاج اور مسخرے پن سے ہم بخوبی واقف تھے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اس قسم کے کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی صلاحیتیں بھی رکھتے ہیں۔

''کیوں؟ ہیرو لگتا ہوں؟'' انہوں نے ہم سے سوال کیا۔

ہیرو تو وہ واقعی لگتے تھے۔ صورت شکل، قد و قامت، سراپا، اندازِ گفتگو، چال ڈھال۔ ہر اعتبار سے وہ بنے بنائے ہیرو تھے۔

''کہانی تو سناؤ۔ کیسا کیریکٹر ہے۔ مجھے کیا کرنا ہو گا؟'' انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

ہم نے مختصراً انہیں کہانی اور ان کا کردار سنایا جو انہیں فی الفور پسند آ گیا۔

وہ ہمیں ''سوفی'' کہتے ہیں۔ ذرا لاڈ میں آ جائیں تو ''چوفی'' کہنے لگتے ہیں۔ انہیں گھر میں پیار سے بلال کہا جاتا تھا۔ ان کی والدہ پیار سے انہیں ''بلو'' کہا کرتی تھیں۔ جب وہ فلموں میں کمال کے نام سے مشہور ہوئے تو بے تکلف دوست انہیں ''کمو'' کہنے لگے۔

''چوفی بس اب تم جلدی سے فلم شروع کرا دو''۔ انہوں نے ہمارے گلے لگ کر کہا۔ مگر درحقیقت ہم ان کے گلے لگے ہوئے تھے۔ وہ قد میں بھی ہم سے اونچے تھے اور ڈیل ڈول میں بھی زیادہ تھے۔

''بولو راج کپور لگتا ہوں کہ نہیں؟'' انہوں نے راج کپور جیسے چند پوز بنا کر ہمیں دکھائے۔ راج کپور کی شباہت ضرور

تھی مگر ہمیں وہ راج کپور سے زیادہ ہالی ووڈ کے مشہور اداکار ایرل فلن نظر آرہے تھ۔ ہم نے انہیں بتایا تو انہیں یہ آئیڈیا پسند نہیں آیا۔ وہ بچپن ہی سے راج کپور بننے کے خواب دیکھ رہے تھے اس لیے کوئی اور ہیرو بننے کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے خواہ وہ ہالی ووڈ کا البیلا اور طرح دار ہیرو ایرل فلن ہی کیوں نہ ہو۔

کمال کو شباب صاحب سے ملاقات کی بے چینی تھی۔ ہم نے انہیں پاکستان کی فلمی صنعت کے بارے میں مختصر طور پر بتایا۔ پھر شباب صاحب کے متعلق معلومات فراہم کیں اور بہت سی نصیحتیں بھی کیں کہ وہ بچگانہ حرکتوں سے پرہیز کریں۔ کمال کے مزاج سے ہم واقف تھے۔ وہ انتہائی بے تکلفی سے ہر ایک سے بات کرنے لگتے تھے۔ ان کے ایک دوست نے ہمیں یہ قصہ بھی سنایا تھا کہ جب وہ ہدایت کار محبوب سے ملنے کے لیے گئے تو بڑی بے تکلفی سے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ ظاہر ہے کہ محبوب صاحب کو یہ حرکت پسند نہیں آئی۔ ہم نے کمال کو سمجھایا کہ وہ اس قسم کی کوئی حرکت شباب صاحب کے ساتھ نہ کریں اور بات چیت میں بھی احتیاط برتیں۔

''یار تم خواہ مخواہ نصیحتیں کرنے لگے۔ تم کو کسی نے غلط بتایا ہے میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں''۔

ہم نے شباب صاحب کو فون کیا اور کمال کو تانگے میں بٹھا کر کمرشل بلڈنگ پہنچ گئے۔ ''ڈائریکٹر'' کے دفتر میں حسبِ معمول چہل پہل تھی مگر جب کمال ہمارے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تو سب کی نگاہیں ان پر جم کر رہ گئیں۔ وہ ایک خوش رو اور خوب صورت نوجوان تھے۔ دیکھنے والے ان کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ تعارف ہوا تو ہم نے دیکھا کہ شباب صاحب خاصے متاثر ہیں۔ جب کمال نے تکلفانہ انداز میں روانی سے باتیں شروع کیں تو وہ اور بھی خوش ہو گئے۔ بھائیا حمید نے بھی کمال کو تعریفی نظروں سے دیکھا اور ان سے ایک دو مذاق بھی کئے گویا مشکل مرحلہ حل ہو چکا تھا۔ بھائیا حمید کمال کو دوسرے کمرے میں چودھری فضل حق سے ملانے کے لیے لے کر گئے۔ شباب صاحب نے سگریٹ سلگا کر ایک کش لگایا اور ہم سے کہا ''آفاقی نوٹ کر لو۔ یہ لڑکا بہت اچھا ہیرو بنے گا''۔

''یار یہ تو بنا بنایا ہیرو ہے''۔ انہوں نے رازداری سے کہا ''ہماری کیریکٹر میں بالکل فٹ رہے گا''۔

اتنی دیر میں بھائیاحمید دوبارہ تشریف لے آئے۔انہوں نے ایک تازہ پان منہ میں ڈالااور کہا''بھئی یہ ہیرو تم خوب ڈھونڈ کرلائے ہو۔ہم منھو سے کہہ کر ایک راج کپوراور نرگس والا گانا بھی بنوالیں گے''۔

شباب صاحب کو بھی یہ آئیڈیا بہت پسند آیا۔کچھ دیر غور کرنے کے بعدانہوں نے قلم کاغذ سنبھالااور فوراًایک گانالکھ دیا۔

انہوں نے کہاکہ کمال کوراج کپور کے حلیے میں ڈفلی دے کر مسرت نذیر کے ساتھ یہ گاناپکچرائز کریں گے۔اس نئی سچویشن اور گانے کے بولوں سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ بول سناتے ہوئے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

میوزک ڈائریکٹر محمد علی منھوایک مختصر سے مرنجان مرنج نوجوان تھے۔کم بولتے تھےاور جب بولتے تھے تو تھوڑاسا ہکلاتے بھی تھے۔جب شباب صاحب پوراگاناسناچکےاور ہنسی کا سلسلہ رکاتوانہوں نے منھو سے پوچھا''منھو کیساگانا ہے؟''

منھونے کہا''گ۔۔۔گ۔۔۔گاناتواچھاہے مگراب گانوں کی سچویشن نہیں ہے''۔

شباب صاحب بولے''تم سچویشن کی فکرمت کرو۔دھن بناؤ۔سچویشن بنانے والاوہ تمہارے سامنے بیٹھاہے''۔ان کا اشارہ ہماری طرف تھا۔

ہم نے اتنی دیرمیں سچویشن بھی سوچ لی تھی جواسی وقت انہیں سنادی۔سچویشن یہ تھی کہ کمال اپنے باپ سے چھپ کربھاگتاہے۔پکڑنے والے پیچھے لگے ہوئے ہیں وہ ایک تھیٹر میں گھس جاتاہے جہاں مسرت نذیر کالج کے کسی فنکشن کے سلسلے میں آئی ہوئی ہیں۔غرض اس قسم کی کچی پکی سچویشن ہم نے اسی وقت بناکر سنادی جوشباب صاحب کو بہت پسند آئی۔وہ تصور ہی تصور میں اس گانے کو دیکھ کر خوب ہنسے اور ہم سے کہا''آفاقی نوٹ کرلو یہ ہٹ گاناہے''۔

اتنی دیر میں کمال بھی کمرے میں آ گئے تھے۔شباب صاحب نے انہیں بھی گانے کی سچویشن اور بول سنائے۔کمال بھی سن کر بہت خوش ہوئے۔سب سے خوشی کی بات یہ تھی کہ اس گانے میں انہیں راج کپور جیساحلیہ بنانے کاموقع مل رہا تھا۔

شباب صاحب ایک دم گھر بیٹھ گئے۔وہ رونق، چہل پہل، خوش حالی،اہمیت کچھ بھی نہ رہا۔بھائیاحمید کے ذریعے بابو

مجد داور ان کے بھائیوں کو علم ہوا تو وہ شباب صاحب کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ آپ فکر نہ کریں۔آپ پرچہ بھی نکالیں اور فلم بھی بنائیں۔ ہم آپ کو سرمایہ فراہم کریں گے۔انہوں نے محلہ شاہ ابوالمعالی کی گلی سے نکال کر شباب صاحب کو سمن آباد کے جدید فیشن ایبل علاقے میں ایک کوٹھی کرائے پر دلادی۔

یہ کوٹھی مین روڈ پر آغاز ہی میں تھی۔اس کے اگلے حصے میں دفتر تھا اور عقبی حصے میں انکی رہائش تھی۔یہی نہیں بلکہ بابو جی نے ان کے گھر مین کھانے پینے کا سامان اور دودھ، گھی، سبھی کی فراہمی کا بھی بندوبست کر دیا۔

ماہنامہ ''پکچر'' کے نام سے ایک نیا ڈیکلریشن حاصل کیا گیا جس کے ایڈیٹر اور پبلشر شباب کیرانوی تھے۔ ڈائریکٹر کی طرح یہ بھی ایک فلمی جریدہ تھا۔شباب صاحب کے تمام دوستوں نے ان کے ساتھ قلمی تعاون کیا۔خود ہم نے دوسرے سارے کام چھوڑ کر سمن آباد کے دفتر میں ڈیرہ جمالیا اور شب و روز کی محنت سے ایک خوب صورت فلمی ماہنامہ منظر عام پر آگیا۔اس طرح ایک صحافی کی حیثیت سے شباب صاحب کو پھر وہی مقام حاصل ہو گیا جو ڈائریکٹر کے مدیر کی حیثیت سے حاصل تھا۔بلکہ فرق یہ تھا کہ وہ اس پرچے میں ملازم نہیں،اس کے مالک تھے۔

ماہنامہ ''پکچر'' میں ہم نے بہت دلجمعی سے کام کیا بلکہ ابتدائی شماروں کی ترتیب میں زیادہ تر ہمارا ہی دخل رہا۔ہمارے ہاتھ یہ ایک نیا مشغلہ آگیا تھا۔''آفاق'' کے دفتر سے فارغ ہو کر بس میں سوار ہو کر سیدھا سمن آباد کا رخ کرتے اور پھر رات تک وہیں محفل جماتے۔

فلم سازی کے لیے ''سپر ہٹ موویز'' کے نام سے ایک ادارہ قائم ہو چکا تھا جس میں ہم چار حصے دار تھے۔شباب صاحب،اے حمید صاحب، بابو مجد د اور ہم۔ سرمایہ بابو مجد د کو فراہم کرنا تھا۔ہم تینوں ورکنگ پارٹنر تھے۔ پکچر کی اشاعت باقاعدہ ہو چکی تھی اس لیے اب فلم سازی کی طرف پوری توجہ مبذول کر دی گئی۔

جب ڈائریکٹر کے دفتر میں تھے تو شباب صاحب سڑک سوار تھے لیکن سپر ہٹ موویز میں آئے تو ایک چھوڑ دو پرانی کاریں خرید لی گئیں۔ چھوٹی کار تو محض نام کی کار تھی ورنہ ایک اداکار کے الفاظ میں وہ ''ڈسٹ بن'' تھی۔یہ غالباً آٹھ سو روپے میں خریدی گئی تھی۔ دوسری بڑی تھی۔اس کا رنگ سیاہ تھا۔یہ بارہ سو روپے میں خریدی گئی تھی۔

چھوٹی گاڑی کی چھت کھل سکتی تھی اور شاید بند بھی ہو جاتی ہو گی مگر ہم نے ہمیشہ اس کی چھت کھلی ہی دیکھی۔غالباً

چھت کا اوپر والا حصہ پھٹ پھٹا چکا تھا۔اس کار کا تمام انجر پنجر ڈھیلا تھا۔ بڑی مشکل سے اسٹارٹ ہوتی تھی اور جب ایک بار اسٹارٹ ہوتی تھی تو بند ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔اس کار کا نام ''ہوا محل'' رکھ دیا گیا کیونکہ اس میں بلا روک ٹوک ہوا آتی تھی۔اس کی سیٹیں بھی خاصی بوسیدہ تھیں۔اس کو مقفل نہیں کیا جاسکتا تھا۔اس کا فائدہ بھی کیا تھا جب کہ اس کی چھت ہر وقت کھلی رہتی تھی۔اس کے صرف دو دروازے تھے۔اور ان کو کھولنا بھی کچھ آسان نہ تھا اس لیے عموماً اس میں سوار ہونے کے لیے پھلانگ کر اندر جانا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کار کے پرزے بھی یقیناً ہوں گے ورنہ یہ چلتی کیسے؟ پرزے یوں تو پورے تھے مگر ان کی جگہیں بدلی ہوئی تھیں۔ مثلاً گیئر بدلنے کے لیے بریک لگانا پڑتا تھا۔ بریک بہت مشکل سے لگتا تھا۔اس لیے طریقہ یہ تھا کہ جب بریک لگانا ہوتا تو کار میں سوار دو تین حضرات کود کر باہر نکل جاتے اور کار کو زور لگا کر روک لیتے۔اسی لیے اس کار میں کم سے کم کچھ چھ سات مسافر ضرور بٹھائے جاتے تھے۔دن بھر یہ کار مختلف فرائض سر انجام دیتی تھی۔رات کو اسے دفتر کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا تھا اور یہ آس پاس کے کتوں کے لیے بیڈروم کی سہولت فراہم کرتی تھی۔اس کار میں ہارن نہیں تھا۔کسی زمانے میں رہا ہوگا مگر اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا تھا۔ہارن کی ضرورت سواریاں شور مچا کر پوری کر دیا کرتی تھیں۔ ''ہٹو بچو،اے بھائی دیکھ کے یار نظر میں نہیں آرہا کہ کار آرہی ہے۔ہٹ جاؤ،ایک طرف کو ہو جاؤ'' اس قسم کی صدائیں بلند ہوتی رہتی تھیں۔دراصل اس کار کی باڈی اور انجن کا اتنا شور ہوا کرتا تھا کہ کسی ہارن کی ضرورت ہی نہیں تھی۔جب یہ کار سمن آباد کی مین روڈ پر چلتی تھی تو سواریاں تو شور مچاتی ہی رہتی تھیں مگر کار کا شور سن کر آوارہ کتے بھی پیچھے لگ جاتے تھے اور بھونکنا شروع کر دیتے تھے۔کار میں سوار ہر شخص ڈرائیور کو یا ایک دوسرے کو مختلف قسم کی ہدایات جاری کرتا رہتا تھا۔ زور زور سے قہقہے گونجتے تھے۔ کبھی اسے روکنے کے لیے کچھ سواریاں باہر کود کر اسے پکڑ لیتی تھیں۔یہ ایسا تماشا تھا کہ مائیں اپنے روتے ہوئے بچوں کو بہلانے کے لیے کار کی طرف اشارہ کر کے کہا کرتی تھیں ''دیکھو! وہ کیا چیز جا رہی ہے''۔اور بچہ رونا بھول کر تماشا دیکھنے لگتا تھا۔

اس زمانے میں ٹریفک بہت کم،بلکہ برائے نام ہی تھا۔ سمن آباد کی مین روڈ پر ہمارا دفتر تھا۔اس زمانے میں یہاں بہت کم مکانات بنے تھے۔ سڑک بہت کشادہ تھی۔ٹریفک خال خال ہی تھا اس لیے مشق کرنے میں کوئی پرابلم نہیں تھی۔

ایک دن شباب صاحب نے ہم سے کہا ”یار سنو۔ تم ڈرائیو نگ کیوں نہیں سیکھ لیتے ؟“
ہم نے کہا ”بغیر کار کے کیسے سیکھیں ؟“
”یار، یہ ہوا محل جو ہے۔ یہ کس مرض کی دوا ہے۔ اسی پر سیکھ لو، اس کار کا کیا بگڑے گا۔ اس میں خراب ہونے والی کوئی چیز ہی نہیں ہے“۔
ہمیں یہ مشورہ پسند آگیا۔ ویسے بھی یہ کھلی ہوئی کار تھی۔ آس پاس کا منظر بالکل صاف نظر آتا تھا۔ مشکل پڑنے پر ہم فوراً کود کر اپنی جان بچا سکتے تھے چنانچہ ہم نے ڈرائیور اختر سے کہا ہمیں اس کار پر ڈرائیو نگ سکھا دو۔ اختر بھی ایک نوجوان شخص تھا۔ کافی عرصہ تک وہ شباب صاحب کے ساتھ کام کرتا رہا۔ ان کا راز دار اور بھروسے کا آدمی تھا کچھ عرصہ قبل معلوم ہوا کہ اب اس نے پراپرٹی یا کاروں کی خرید و فروخت کا دھندہ شروع کر دیا اور کافی خوشحال ہے۔
اختر نے ہمیں ڈرائیو نگ سکھانے کی ہامی تو بھر لی مگر کہا ”آفاقی صاحب، ڈرائیو نگ تو آپ سیکھ لیجیے مگر پھر آپ کوئی اور کار چلانے ”جوگے“ نہیں رہیں گے“۔
”جوگے کیوں نہیں رہیں گے ؟“ ہم نے پوچھا۔
”اس لیے کہ دوسری کاریں ایسی نہیں ہوتیں یہ اپنی قسم کی ایک ہی کار ہے۔ آپ بھی ایسی ہی کار چلا سکیں گے۔ جس کا ڈھونڈنا مشکل ہے“۔
ہم نے کہا ”ٹھیک ہے ہم ایسی ہی دوسری کار ڈھونڈ لیں گے۔ کم از کم ڈرائیو نگ تو آجائے گی“۔
اس طرح ”ہوا محل“ میں سوار ہو کر ہم نے ڈرائیو نگ کے سبق لینے شروع کر دیئے۔ سمن آباد کی کھلی ہوئی سنسان مین روڈ ہمارے لیے تربیت گاہ تھی۔ کار میں ہمارے ساتھ کئی دوسرے افراد بھی سوار ہو جاتے تھے تاکہ بوقت ضرورت کام آسکیں۔ ہر شخص ہمیں مشورے دیتا رہتا تھا ”آفاقی صاحب، بریک لگائیں گیئر بدلیں۔ کلچ تو دبائیں۔ بائیں موڑ دیں۔ سامنے دیکھ کر۔ تانگا آرہا ہے۔ سائیکل والے کو بچائیں، وغیرہ وغیرہ۔“ اگر کار بے قابو ہونے لگتی تو مختلف لوگ اسے سنبھالتے۔ کوئی گیئر بدلتا کوئی بریک لگاتا، کوئی کلچ دباتا۔ ہم تو صرف اسٹیئر نگ کو سنبھالنے کے گناہ گار ہوتے تھے۔ ڈرائیو نگ سیکھنے کے لیے عموماً دوپہر کا وقت مقرر تھا۔ اس وقت سڑک کے آس پاس رہنے والے

لوگ پہلے ہی سے اپنے اپنے بچوں کو تماشا دیکھنے کے لیے تیار کر دیتے تھے۔ محلے کے کتوں کو تو بس بہانہ ہی کافی تھا۔ ادھر کار اسٹارٹ ہوئی ادھر انہیں نہ جانے کیوں کر خبر ہو جاتی اور ان کے بھونکنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

اس طرح اختر کی مدد سے ہم نے تھوڑی بہت ڈرائیونگ سیکھ لی۔ لیکن یہ صرف سمن آباد تک ہی محدود تھی۔ ایک بار شاہ نور اسٹوڈیو میں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ ہم نے اختر سے کہا کہ چلو ہم ذرا ملتان روڈ پر اپنا ہاتھ صاف کر لیں۔ تھوڑی دور چلتے ہی۔ ملتان روڈ بھی اس وقت خاصی سنسان سڑک تھی۔ اکا دکا بسیں، ٹرک یا تانگے ہی یہاں نظر آتے تھے یا پھر سائیکل سوار، پیدل راہ گیر یا مویشی سامنے آ جاتے تھے۔ ہم اختر اور دوسرے مشیروں کی معیت میں ملتان روڈ پر ٹھوکر نیاز بیگ کی طرف چل پڑے۔ کھلی سڑک دیکھی تو حوصلہ پا کر رفتار بھی تیز کر دی مگر جب سامنے سے ایک دم ٹرک کو آتے ہوئے دیکھا تو گھبرا گئے اور اسٹیئرنگ اس طرح گھمایا کہ کار سڑک سے اتر کر کھیتوں میں چلی گئی۔ اس پر بھی وہ نہ رکی۔ اس زمانے میں یہاں ہر طرف کھیت ہی تھے۔ کچھ دور تو کار خود بخود چلتی رہی پھر ایک نالے پر پہنچ کر خود ہی چند ہچکیاں لیتے ہوئے رک گئی۔ اب جو دیکھا تو کار اس طرح منڈیر پر چڑھ گئی تھی کہ اس کے اگلے پچھلے دو پہیے ایک طرف کو تھے اور دو پہیے دوسری طرف۔ درمیان میں کار معلق تھی۔ ذرا سی حرکت سے بھی توازن بگڑ جاتا تو۔۔۔ کار الٹ سکتی تھی۔ لہٰذا ہر ایک نے دوسرے کو مشورہ دیا کہ خبردار حرکت نہ کرنا۔

کافی دیر بے حس و حرکت بیٹھے رہے مگر پھر سب لوگ باری باری احتیاط سے کار سے کود کر اترے۔ ایک سوال یہ تھا کہ معلق کار کو نالے کی منڈیر پر سے کیسے اتارا جائے؟

آخر دیہاتیوں کی مدد لی گئی جو آس پاس کے کھیتوں سے یہ انوکھا تماشا دیکھنے کے لیے آ گئے تھے۔ پاس کے گاؤں سے موٹے موٹے رسے لائے گئے اور دو بیلوں کی مدد سے کار کو کھینچ کر پہلے کھیتوں میں اتارا گیا اور پھر ملتان روڈ پر پہنچا دیا گیا۔ ہم سب سمجھ رہے تھے کہ اب یہ کار چلے گی نہیں۔ مگر جیسے ہی اسٹارٹ کیا وہ فوراً اسٹارٹ ہو گئی اور یوں چلنے لگی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

ہم نے واپسی پر شباب صاحب کو تمام واقعہ سنایا تو وہ بہت ہنسے اور کہا ”یار ہے کھٹارا، مگر بڑے کام کی چیز ہے“۔

کام کی چیز تو وہ لازمی تھی اس لیے کہ پروڈکشن کے سارے کام دوڑ دوڑ کر کرتی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ چلتی کا نام گاڑی ہے تو یہ بھی صحیح معنوں میں گاڑی ہی تھی۔ جیسی بھی تھی، چلتی ہی رہتی تھی۔

اس واقعے کے بعد ہمارے اعتماد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک روز مسرت نذیر کو ڈانس کی ریہرسل کے لیے ان کے گھر سے لے کر آنا تھا۔ وہ گلبرگ میں رہتی تھیں۔ ان کے گھر کا فون خراب تھا۔ پروڈکشن کی دوسری کار جو نسبتاً اعلیٰ درجے کی تھی، اس وقت موجود نہیں تھی۔ اس لیے اطلاع دینے کے لیے "ہوا محل "ہی استعمال کی جا سکتی تھی۔ شباب صاحب نے اختر سے کہا کہ یہی گاڑی لے جاؤ۔ وہاں سے مسرت اپنی کار میں آجائیں گی۔ ہمیں بھی اختر کے ساتھ ہی جانا تھا۔

دفتر سے باہر نکلتے ہی ہم نے اختر سے کہا "تم ایک طرف کو ہو جاؤ۔ گاڑی ہم چلائیں گے"

اس نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا "سر آپ جانے دیں۔ کافی دور جانا ہے اور اس وقت ٹریفک بھی ہو گا"۔

ہم نے کہا "ہم کھلی سڑکوں سے چلیں گے۔ وحدت روڈ اور نہر والی سڑک بہت کھلی ہوئی ہے۔ گلبرگ تو ہے ہی بہت کھلی جگہ"۔

وہ بے چارہ چپ ہو گیا۔ ہم نے بسم اللہ کر کے ہوا محل کو اسٹارٹ کیا بلکہ اختر سے اسٹارٹ کرایا (کیونکہ اسے ہینڈل مار کر اسٹارٹ کیا جاتا تھا) اور گلبرگ کی طرف چل پڑے۔

اس زمانے میں یہ پندرہ بیس منٹ کا راستہ تھا مگر ہم نے دوگنا وقت لگا دیا۔ آخر اناڑی جو تھے۔ بہت جان جوکھوں کا کام تھا۔ سڑکیں سنسان سہی لیکن ٹریفک تو بہرحال تھا اور ہمارے لیے سامنے سے آنے والا ایک تانگا بھی پریشانی کا باعث بن جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے کسی طرح گلبرگ میں مسرت نذیر کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ وہ گھر پر ہی تھیں مگر کتوں کے بھونکنے کے شور سے چوکنا ہو گئی تھیں۔ اندر جا کر انہیں بتایا گیا کہ ریہرسل کے لیے شاہ نور جانا ہے۔

ان کے والد خواجہ نذیر نے پوچھا "گاڑی لائے ہو؟"

ہم نے کہا "ہاں لائے تو ہیں مگر مسرت کو اپنی ہی کار میں جانا ہو گا"۔

''وہ کیوں؟ کسی اور کی گاڑی ہے؟'' انہوں نے پوچھا ہم نے کہا ''گاڑی تو اپنی ہے مگر بس نام کی گاڑی ہے''۔

خواجہ صاحب نے باہر نکل کر ہماری کار کو دیکھا ''کتنی چھوٹی سی ہے۔ کھلونا لگتی ہے''۔ انہوں نے کہا ''کیا یہ چلتی بھی ہے''۔

ہم نے فخریہ انداز مین کہا ''یہ چل کر ہی یہاں تک آئی ہے۔ اسے ریڑھے پر رکھ کر نہیں لایا گیا''۔

''اسے چلاتا کون ہے؟'' انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

ہم نے بتایا کہ اس کار کو ہم چلا کر لائے ہیں۔ انہوں نے باری باری ہمیں اور کار کو دیکھا اور دیر تک خدا کی قدرت کو یاد کرتے رہے۔ اتنی دیر میں مسرت نذیر بھی تیار ہو کر باہر نکل آئیں۔ انہوں نے ہلکے پیلے رنگ کی کھلی چھت کی چھوٹی سی کار کو دیکھا تو خوش ہو گئیں ''ارے، کتنی خوب صورت کار ہے۔ یہ کس کی ہے؟''

ہم نے کہا ''پروڈکشن کی''۔

''یہ چلتی ہے؟'' انہوں نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہم اسے چلا کر ہی لائے ہیں''۔

''سچی؟ آفاقی صاحب، آپ نے تو کمال کر دیا بس میں تو اسی گاڑی میں جاؤں گی''۔

ہم گھبرا گئے، کہا ''دیکھیں۔ ایک تو یہ گاڑی ایسی ہی ہے۔ دوسرے ابھی ہمارا ہاتھ زیادہ صاف نہیں ہوا ہے''۔

وہ ہنسنے لگیں ''آپ تو ہر وقت ہاتھ صاف کرنے کی فکر میں ہی رہتے ہیں۔ چلئے گاڑی میں بیٹھ کر تو دکھایئے''۔

''دکھایئے، کیا مطلب؟'' ہم نے کہا۔

وہ بولیں ''مطلب یہ کہ آپ بیٹھیں گے تو میں بھی بیٹھ جاؤں گی''۔

ہم نے کہا ''آپ پیچھے بیٹھ جائیں، اختر گاڑی چلائے گا''۔

''بالکل نہیں۔ گاڑی آپ چلائیں گے'۔

ہم نے کہا ''مگر ہم تو اناڑی ہیں۔ بلاوجہ۔۔۔''

انہوں نے دھمکی دی ''دیکھیں، وقت ضائع نہ کریں۔ اگر آپ ڈرائیو نہیں کریں گے تو میں ریہرسل کے لیے نہیں

جاؤں گی''۔

ہم نے کہا'' دیکھیے، اس میں بہت خطرہ ہے۔ یہ کار بس دیکھنے میں ہی کار لگتی ہے ورنہ اس میں کار والی کوئی بات نہیں ہے۔ یوں سمجھئے کہ دوسری کاروں کو عبرت دلانے کے لیے کمپنی نے اسے بنایا ہے''۔

بولیں ''ایسی تاریخی کار میں بیٹھنا بھی ہر ایک کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ چلیے، گاڑی میں بیٹھیے'' یہ کہہ کر وہ کود کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئیں اور بہت خوش ہوئیں۔

ہم بھی کود کر اسٹیئرنگ پر بیٹھ گئے اور ان سے پوچھا ''آپ کو کس نے بتایا کہ اس کار میں کود کر سوار ہوتے ہیں''۔

کہنے لگیں ''کسی نے بھی نہیں بتایا۔ اتنی منی سی تو ہے''۔

ہمارے مشیروں نے بھی چھلانگیں لگا کر پچھلی سیٹ سنبھال لی۔

''چلیں، اسٹارٹ تو کریں'' وہ بے تابی سے بولیں۔ مسرت اس کار کو بچوں کی طرح خوش ہو کر دیکھ رہی تھیں۔

ہم نے اختر کو اشارہ کیا۔ وہ ہینڈل لے کر کار کے سامنے پہنچ گیا اور ہینڈل مارنا شروع کر دیا کبھی کبھی کار کا انجن بول پڑتا تھا لیکن اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔

مسرت نے کہا''اس کے لیے تو بہت ورزش کرنی پڑتی ہے؟''

ہم نے کہا''اسی لیے یہ کار خالی پیٹ ہی چلائی جاتی ہے''۔

کار بڑی مشکل سے اسٹارٹ ہوئی اور پھر چل پڑی۔ بے چارہ اختر پیچھے ہی رہ گیا تھا۔

''ارے ارے، ڈرائیور کو چھوڑے جا رہے ہو'' مسرت نے ہمیں متوجہ کیا۔

''فکر نہ کریں۔ وہ بھی آ جائے گا''۔

اختر بھی کود کر چلتی کار میں سوار ہو گیا۔ کچھ دیر میں ہماری جھجک دور ہو گئی اور ہم نے بڑے اعتماد کے ساتھ کار چلانی شروع کر دی۔

موسم بہت خوش گوار تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ڈرائیونگ کا لطف آ رہا تھا۔ پاس گزرتے ہوئے لوگ اگر مسرت نذیر کو پہچان لیتے تو خوش ہو کر نعرے لگانے لگتے۔ مسرت نذیر ہماری ہوٹنگ میں مصروف تھیں ''آفاقی صاحب۔ آپ تو

کمال کے ڈرائیور ہیں۔ اتنی اسپیڈ سے کار چلاتے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ریسنگ کار میں بیٹھی ہوئی ہوں“۔
ہم یہ سن کر خوش ہو گئے۔
کہنے لگیں ”ارے حد ہو گئی۔ آپ نے ایک سائیکل والے کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ویری گڈ، اب اس پیدل والے کو بھی کراس کر لیں۔ کر لیا؟ آپ نے تو کمال کر دیا۔ کتنی اسپیڈ سے گاڑی چلاتے ہیں آپ“۔
وحدت روڈ پر درپن صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اسٹوڈیو کی طرف سے آ رہے تھے۔ یہ تماشا دیکھا تو رک گئے۔ ہم نے بھی ہاتھ ہلا کر سلام کیا مگر دھیان گاڑی کی طرف لگا ہوا تھا اس لیے کار نہیں رکی۔
مسرت نذیر نے کہا ”آفاقی صاحب، درپن صاحب رک گئے ہیں۔ آپ بھی گاڑی روکئے“۔
ہم نے کہا ”ہم تو روک رہے ہیں مگر گاڑی نہیں رک رہی“۔
ہمارے مشیروں نے فوراً باہر کود کر گاڑی کو روکا۔ درپن صاحب اپنی کار ریورس کر کے لائے۔ کیونکہ ہمیں ریورس کرنی نہیں آتی تھی۔ یہ صورتحال دیکھ کر وہ خوب ہنسے۔ پھر مسرت نذیر سے کہا ”مسرت۔ چلو میں تمہیں اسٹوڈیو پہنچا دیتا ہوں“۔
مسرت نے کہا ”سوری۔ میں اسی گاڑی میں جاؤں گی“۔
”اچھا تو رب راکھا“ یہ کہہ کر درپن صاحب رخصت ہو گئے
ہم نے مسرت سے کہا ”آپ ان کے ساتھ چلی جاتیں تو اچھا تھا۔ ہمیں تو دیر لگے گی“۔
مسکرا کر بولیں ”مگر کبھی نہ کبھی تو ہم اسٹوڈیو پہنچ ہی جائیں گے“۔
ان کا اندازہ واقعی بالکل درست نکلا۔ کیونکہ کچھ دیر بعد ہم اسٹوڈیو پہنچ ہی گئے۔

وہاں شباب صاحب اور ڈانس ڈائریکٹر ماسٹر صدیق بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ اختر اور دوسرے لوگوں نے انہیں ہماری کارگزاری کے بارے میں بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے ”یار آفاقی، نوٹ کر لو۔ تم واقعی کسی دن ڈرائیور بن جاؤ گے“۔
”بن جاؤ گے کیا مطلب“ ہم نے کہا ”بن گئے ہیں۔ ہم اتنی دور جا کر آئے ہیں اور کار بھی لے آئے ہیں“۔

مسرت نذیر نے ہماری ڈرائیونگ کی بہت تعریف کی ''شباب صاحب، بس پرابلم یہ ہے کہ یہ کار بہت تیز چلاتے ہیں۔انہیں ذرا احتیاط کرنی چاہیے۔یہ تو سائیکل والوں سے بھی ریس لگا دیتے ہیں''۔

مسرت جیسی زندہ دل، بے تکلف اور بے دھڑک ہیروئن ہم نے کوئی اور نہیں دیکھی۔دوستوں کی دوست، ہنسی مذاق، لطیفہ بازی، ہوٹنگ ہر چیز میں پیش پیش۔مسرت نذیر کی ایک خوبی یہ تھی کہ یہ مردوں میں مرد بن جاتی تھیں اور عورتوں میں عورت۔عورتیں تو سہیلیاں تھیں ہی مگر مرد بھی ان کی سہیلی تھے۔ہر طرح کے راز لوگ انہیں بتا دیا کرتے تھے اور وہ اکثر تو انہیں دل ہی میں رکھتی تھیں مگر بعض لوگوں کی باتیں چپکے چپکے دوسروں کو بھی بتا دیا کرتی تھیں۔انکا انداز کچھ ایسا تھا کہ عام حالات میں کوئی ان سے ایسا سلوک کر ہی نہیں سکتی جیسا کہ دوسری ہیروئنوں سے کیا جاتا ہے۔رومان وغیرہ کی تو ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔وہ ہر ایک کو چٹکیوں میں اڑا دیا کرتی تھیں۔بہت دلچسپ اور مزے دار ہیروئن تھیں۔جہاں بیٹھتی تھیں رونق لگا دیتی تھیں۔

کمال بھی شاہ نور اسٹوڈیو میں موجود تھے۔شباب صاحب نے نرگس اور راج کپور کے انداز میں جو دوگانا ہنگامی طور پر بنایا تھا اس روز ریہرسل تھی۔کمال نے بلا جھجک ریہرسل میں حصہ لیا۔ان کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ ہر ایک سے یوں گھل مل گئے تھے جیسے کہ سالہا سال سے ان لوگوں کے ساتھ ہی کام کر رہے ہیں نہ انہیں ناچ میں تامل تھا، نہ وہ رومانی سین کرتے ہوئے شرماتے تھے۔کامیڈی تو وہ کرتے ہی بہت اچھی تھے۔بعد میں انہوں نے ڈانس میں بھی اپنا ایک انداز بنا لیا تھا۔

دوگانے کے بول کچھ اس قسم کے تھے

اے میری نرگس آجا

میں بجا رہا ہوں باجا

کمال نے ریہرسل میں اتنی مہارت دکھائی کہ شوق کے مارے مسرت نذیر کے حصے کے بولوں پر بھی ایکشن کرنے لگے۔مسرت نے کہا ''ارے کمال صاحب، یہ تو میرے بول ہیں''۔

بھائیا حمید اور شباب صاحب کچھ دیر ریہرسل دیکھتے رہے، پھر کہا'' کمال تم اچھا کر رہے ہو لیکن ابھی اداکاری کی اور بھی

گنجائش ہے''۔

کمال نے کہا''شباب صاحب۔ فکر نہ کیجئے، باقی اداکاری لباس کرلے گا''۔

''کیا مطلب؟'' انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''مطلب یہ کہ گیٹ اپ اور لباس کا بھی فرق پڑتا ہے۔ جب میں راج کپور جیسا حلیہ بنا کر ایکشن کروں گا تو ساری کسر پوری ہو جائے گی''۔

ہم نے شباب صاحب سے کہا''بات تو درست ہے''۔

بولے''ہاں، بات تو ٹھیک ہے۔ ویسے آفاقی، تمہارا بھانجا بہت سمجھ دار ہے تم نوٹ کر لو، یہ نمبر ون ہیرو بنے گا''۔

بھانجے والا رشتہ سن کر ہم حیران رہ گئے مگر پھر بعد میں پتا چلا کہ کمال نے بتایا تھا کہ ہم ایک رشتے سے ان کے ماموں ہیں اس لیے شباب صاحب ہم سے جب بھی ان کا تذکرہ کرتے تھے تو''تمہارا بھانجا'' کہہ کر ہی کرتے تھے۔

ریہرسل کے بعد بھی مسرت نذیر ہوا محل میں بیٹھ کر ہماری ڈرائیونگ کا مظاہرہ دیکھنے میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ مگر شباب صاحب نے اختر صاحب کے ذریعے دوسری کار میں مسرت کو گھر بھیج دیا۔ ہم شباب صاحب کو کھلی کار میں دفتر واپس لے گئے۔

''ٹھنڈی سڑک'' میں کمال کا کردار ایک کنجوس مگر دولت مند باپ کے نالائق بیٹے کا تھا جس سے اگر باپ نالاں تھے تو بیٹا بھی باپ سے کم عاجز نہ تھا۔ باپ نے کمال کے لیے اپنے ایک دوست کی بیٹی کو منتخب کیا تھا۔ وہ یہ شادی بچپن ہی میں طے کر چکے تھے۔ یہ دوست افریقہ چلے گئے تھے اور اب فلمی صورتحال کچھ یوں تھی کہ وہ واپس آنے والے تھے۔ کمال اس شادی کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں جس لڑکی کو میں نے دیکھا نہیں اور نہ ہی اس سے کبھی ملا ہوں، اس سے شادی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ باپ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ وہ کمال کو گھر سے نکلنے کا حکم دیتے ہیں اور کمال غصے میں گھر سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلے وہ پہلوان دوست (علی بابا) کے گھر پہنچتے ہیں۔ یہ صاحب اپنی دولت مندی اور بیوی پر اپنے رعب کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ کمال کو پتا چلتا ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ بیوی پہلوان کے دوستوں کی شکل تک دیکھنے کی

روادار نہیں ہے۔ کمال یہ سب سن کر خاموشی سے چلے جاتے ہیں۔ ان کی دوسری منزل اداکار ظریف کا گھر ہے۔ ان کے والد بھی انتہائی کنجوس ہیں۔ وہ کچھ عرصے کے لیے شہر سے باہر جاتے ہوئے چند سو روپے بیٹے کے حوالے کرتے ہیں اور انہیں فضول خرچی سے باز رہنے کی نصیحت کر کے چلے جاتے ہیں۔ کمال وہاں پہنچتے ہیں تو ظریف انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ دونوں اپنے والدین کی کنجوسی کا رونا روتے ہیں اور کمال اپنے دوست کے ساتھ رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اباجان جو خرچہ دے کر گئے تھے وہ چند روز ہی میں ختم ہو جاتا ہے تو ظریف یہ سوچ کر کہ والد تو کافی عرصے بعد واپس آئیں گے، گھر کو کرائے پر دینے کا اشتہار اخبار میں شائع کرا دیتے ہیں۔ ادھر کمال کی بچپن کی منگیتر کے والد) سلطان کھوسٹ) افریقہ سے واپس آ گئے ہیں اور انہیں رہنے کے لیے کرائے کے مکان کی ضرورت ہے۔ مسرت نذیر اور ان کی سہیلی نگہت سلطانہ مکان دیکھنے کے لیے جاتی ہیں تو ظریف خود کو گھریلو ملازم ظاہر کرتے ہیں اور ہیروئن کے والد خوش ہو کر مکان کرائے پر لے لیتے ہیں کیونکہ مکان کے ساتھ ہی انہیں دو ملازم بھی دستیاب ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد دلچسپ واقعات رونما ہونے لگتے ہیں۔ کمال ڈرائیور کا روپ دھار لیتے ہیں جب کہ ظریف باورچی اور بیرہ بن جاتے ہیں۔ دونوں حماقتیں اور غلطیاں کرتے رہتے ہیں۔ بہت جلد ان دونوں کی اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے اور ہیرو، ہیروئن کو اور ظریف نگہت سلطانہ کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ زندگی میں سکھ اور اطمینان پیدا ہوتا ہے مگر ایک دن اچانک ظریف کے والد واپس آ جاتے ہیں کرائے دار کے ساتھ ان کا جھگڑا ہوتا ہے اور جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بیٹے نے ان کی غیر موجودگی میں گھر کرائے پر دے دیا ہے تو وہ آگ بگولا ہو کر اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔ ادھر کمال کے والدین اپنے بیٹے کی تلاش میں ہیں۔ کمال ان سے چھپتے پھرتے ہیں اور کہانی میں دلچسپ واقعات پیش آتے ہیں۔

آخر میں سب یکجا ہو جاتے ہیں اور کمال کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس لڑکی سے شادی کرنے سے انکاری تھے دراصل وہی مسرت نذیر ہے۔

یہ کہانی بڑے دلچسپ اور نیچرل انداز میں پیش کی گئی تھی۔ مکالمے روزمرہ کے تھے اور اداکاری بھی ایسی کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ کردار اداکاری کر رہے ہیں۔ قدم قدم پر دلچسپ سچویشنز اور ہنسانے والے بے ساختہ مکالمے تھے ان سب

چیزوں کی آمیزش نے اس فلم کو شروع سے آخر تک ایک شگفتہ کامیڈی میں تبدیل کر دیا تھا۔اداکاری یوں تو سبھی نے بہت اچھی کی تھی مگر کمال اور ظریف کے کردار بے حد انوکھے اور دلچسپ تھے اور ان دونوں نے ان کرداروں کو حقیقت کا رنگ دے دیا تھا۔ظریف بے حد ذہین اور حاضر جواب فن کار تھے۔ان کے سامنے اداکاری کرنا بہت مشکل کام تھا مگر کمال نے بے ساختگی اور اعتماد کے ساتھ کام کیا اور سب کو حیران کر دیا۔

اس فلم کی تیاری کے دوران میں کئی دلچسپ واقعات بھی پیش آئے جنہیں یاد کر کے ہم سب ہنستے رہتے تھے۔سب سے پہلے تو ایک دن نادرہ نے شباب صاحب کو اعتماد میں لے کر یہ اطلاع دی کہ کمال نے ان سے کہا ہے کہ ''نادرہ! مجھے تمہاری ہی جیسی لڑکی کی تلاش تھی، کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟''

نادرہ نے پوچھا''اب میں کیا کروں؟''

شباب صاحب نے جوابی سوال کیا''تم کیا کرنا چاہتی ہو؟''

نادرہ ہنسنے لگی۔وہ ایک تجربہ کار اور جہاندیدہ لڑکی تھی۔بے باک اور بے تکلف بھی تھی۔کمال کی زندگی میں اتنی قریب آجانے والی شاید وہ پہلی لڑکی تھی لیکن نادرہ کے لیے یہ کوئی انوکھی اور نئی بات نہ تھی۔اس نے شباب صاحب کو صاف صاف بتادیا کہ وہ اس معاملے میں قطعی سیریس نہیں ہے۔نہ ہو گی۔

اس کے ہاتھ ایک مشغلہ آگیا۔کمال جیسا ابھرتا ہوا، خوش شکل اور تعلیم یافتہ ہیرو اگر ایک سائڈ ہیروئن اور رقاصہ میں دلچسپی ظاہر کرے تو اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔کمال کی یہ پہلی فلم تھی۔فلم کا ماحول بھی نیا تھا اور اتنے بڑے پیمانے پر آزادانہ صنف مخالف سے میل جول کا بھی پہلا ہی موقع تھا۔ انہوں نے غالباً ایکٹی ویٹی کے طور پر نادرہ سے مکالمہ بولا ہو گا مگر اس کے جواب میں وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ڈراما کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ مذاق ہی مذاق میں دلچسپی اور وقت گزاری کے لیے یہ ایک اچھا شغل تھا۔کمال اسے بھی اپنی ہی طرح سادہ لوح سمجھتے تھے حالانکہ وہ بہت جہاں دیدہ تھی۔اس نے دل لگی کا آغاز کر دیا۔ایک طرف تو وہ کمال کو اپنی محبت کے جال میں پھانس رہی تھی اور دوسری طرف ساری روداد چپکے چپکے شباب صاحب کو سنا دیتی تھی جو ہمیں بتا دیتے تھے۔یہ فرضی رومان بڑے زور و شور سے پروان چڑھ رہا تھا۔

ہم اس سازش میں ہر گز شریک نہ ہوتے اگر کمال اپنا دوست اور معتمد سمجھ کر ہمیں بھی اعتماد میں لے لیتے۔ ہم ان کے بچپن کے دوست تھے۔ کافی وقت ہم دونوں نے ساتھ گزارا تھا۔ بے تکلفی بھی تھی مگر انہوں نے اپنے اس ایڈونچر میں ہمیں اپنا ہمراز بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

نادرہ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت چالیں چل رہی تھی اور بے چارے کمال اس بات سے بے خبر تھے۔ رات کو شوٹنگ ختم ہونے کے بعد عموماً ایک ہی کار استعمال کی جاتی تھی اس لیے کہ ''ہوا محل'' کا بھروسا نہ تھا کہ کب اور کہاں کھڑی ہو جائے۔ بہت سے لوگوں کو تانگوں کے ذریعے گھر پہنچایا جاتا تھا کہ اس زمانے میں یہی واحد ذریعہ نقل و حمل تھا۔ کمال اور نادرہ کو ایک ساتھ ہی تانگے میں بھیجا جاتا تھا اس لیے کہ راہ میں مال روڈ پڑتی تھی جس پر وائی ایم سی اے بلڈنگ میں کمال مقیم تھے۔ پھر نادرہ کو لے کر یہی تانگا گڑھی شاہو چلا جاتا تھا۔

ایک رات نادرہ نے شکایت کی کہ دیکھئے ہمیں اسٹوڈیو اور دفتر میں بات چیت کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملتا اس طرح دوسروں سے چھپ چھپ کر اور سب کے سامنے انجان بن کر ہم کب تک گزارا کریں گے؟

''تو پھر کیا کریں؟''

نادرہ نے کہا ''میں آپ کو اپنے گھر بھی نہیں لے جا سکتی کہ جی بھر کر باتیں کر لیں۔ آپ کے وائی ایم سی اے میں بھی نہیں جا سکتی کہ سب کی نگاہوں میں آ جاؤں گی۔ اخبار والوں کو پتا چل گیا تو بات کا بتنگڑ بنا دیں گے''۔

کمال سوچ میں پڑ گئے، پھر کہا ''کیوں نہ ہم تانگے والے کے گھر چلیں؟''

نادرہ سوچ میں پڑ گئیں۔ یہ ساری گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔

کمال نے تانگے والے سے کہا ''بھائی تانگے والے۔ کیا تم ہمیں اپنے گھر لے جا سکتے ہو؟''

تانگے والا حیران رہ گیا ''اس وقت؟''

''بھی ہمارے پاس باتیں کرنے کی کوئی اور جگہ نہیں ہے''۔

تانگے والے نے کہا ''بابو جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرا تو ایک ہی کمرے کا گھر ہے۔ محلے دار آدمی ہوں، بال بچے بھی ہیں''۔

''تو پھر کیا ہوا؟''

''نہیں جی۔ یہ تو بڑا مشکل کام ہے''۔

تانگے والے نے کچھ دیر بعد کمال کو وائی ایم سی اے بلڈنگ کے سامنے اتار دیا۔

دوسرے دن نادرہ نے یہ داستان شباب صاحب کو سنائی تو حسب معمول ان کا ہنستے ہنستے براحال ہو گیا۔ انہوں نے فوراً ہمیں فون کر کے بلایا اور یہ واقعہ سنایا مگر اس طرح کہ ہنستے زیادہ تھے، بات کم کرتے تھے۔ خصوصاً ''بھائی تانگے والے'' والا حصہ بتانے میں انہوں نے کافی دیر لگا دی۔ پھر ہم سے پوچھا'' تمہیں کمال نے کچھ بتایا ہے؟''

ہم نے لاعلمی ظاہر کی، کہنے لگے ''یار کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس نے ہمیں کانفیڈنس میں نہیں لیا''۔

اس روز سیٹ پر شباب صاحب یہ بات اپنے پیٹ میں نہیں رکھ سکے۔ شوٹنگ کے دوران میں انہوں نے ایک دو لوگوں کو بلاوجہ ''او بھائی تانگے والے'' کہہ کر مخاطب کیا تو کمال کے کان کھڑے ہو گئے، انہوں نے نادرہ سے پوچھا ''یہ کیا بات؟ کہیں شباب صاحب کو خبر تو نہیں ہو گئی؟''

اس نے معصومیت سے کہا ''میں نے تو کچھ نہیں بتایا؟''

''تو پھر انہیں کیسے خبر ہو سکتی ہے؟''

''آپ کو بلاوجہ وہم ہو گیا ہے'' اس نے کمال کو تسلی دی اور وہ مطمئن ہو گئے۔ دو تین روز بعد شباب صاحب نے ہمیں ایک اور دھماکا خیز اطلاع دی۔ نادرہ نے کمال سے کہا ''اس طرح چوروں کی طرح ہم کب تک ملتے رہیں گے۔ شادی کے بغیر اب کام نہیں چلے گا''۔

کمال سوچ میں پڑ گئے۔

نادرہ نے بھولپن سے کہا ''مگر یہ تو بہت مشکل کام ہے ساری دنیا کو خبر ہو جائے گی۔ قاضی کو بلانا پڑے گا۔ نکاح ہو گا، گواہ بھی آئیں گے۔ اس طرح تو راز فاش ہو جائے گا''۔

کمال نے کہا ''اس تمام جھگڑے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اسلام تو بہت حقیقت پسندانہ مذہب ہے۔ نکاح کے لیے قاضی کا موجود ہونا ضرور نہیں ہے۔ میں خود بھی نکاح پڑھا سکتا ہوں''۔

رات کے پچھلے پہر جب شوٹنگ میں وقفہ ہوا تو کمال اور نادرہ شاہ نور اسٹوڈیو کے وسیع لان میں چلے گئے، وہاں جا کر پہلے تو کمال نے خود وضو کیا پھر نادرہ کو وضو کرایا۔ کلمہ پڑھایا اور اس کے بعد نہ جانے کیا کیا پڑھتے رہے۔ اس کے بعد دونوں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور اس طرح یہ شادی سرانجام پا گئی۔

نادرہ نے کہا ''شکر ہے۔ شادی تو ہو گئی۔ مگر کیا اس کے بعد بھی ہم الگ الگ ہی رہیں گے؟''

کمال نے کہا ''تم کہو تو میں تمہارے ساتھ گھر چلوں؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس طرح تو ڈھنڈورہ پٹ جائے گا۔ ایسا کرتے ہیں کہ شوٹنگ کے بعد پہلے میں گھر چلی جاتی ہوں۔ بعد میں آپ آ جائیے گا۔ ہمارا گھر تو آپ نے دیکھا ہی ہے۔ سڑک پر ہے سامنے برآمدہ ہے۔ آپ برآمدے میں آہستہ سے دروازے پر دستک دیں گے تو میں دروازہ کھول دوں گی''۔

شوٹنگ رات گئے تک جاری رہی۔ صبح ہوتے ہی نادرہ تو یہ ترکیب بتا کر اطمینان سے گھر جا کر سو گئیں۔ کمال وہاں پہنچے تو دستک کا کوئی جواب نہ ملا آخر مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

دوسرے دن کمال نادرہ سے سخت ناراض تھے۔ ان کے غصے پر نادرہ ہنس رہی تھی۔ وہ شباب کو تمام رپورٹ دے چکی تھی۔

جب ہنسی ضبط نہ ہو سکی تو شباب صاحب نے کمال کو بتایا کہ یہ محض شرارت تھی اور نادرہ ساری باتیں انہیں بھی بتاتی رہی ہے اس طرح یہ رومانی داستان شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔

اسی فلم کے دوران میں ایک اور داستان نے بھی جنم لیا جس کا شاید ہمارے سوا کسی کو بھی علم نہیں ہے۔ اس کے مرکزی کردار خود شباب کیرانوی تھے۔ یوں تو وہ فلمی صنعت کے ابتدائی ایام تھے۔ بہت کم فلمیں بنا کرتی تھیں۔ فلم والوں کے پاس پیسے کی بھی کمی تھی خوشحالی تو دور کی بات ہے، گزارہ کرنا بھی مشکل تھا۔ ساری فلمی صنعت میں گنتی کے دو چار لوگ ہوں گے جن کے پاس کاریں تھیں باقی سب سڑک سوار تھے۔ لیکن خلوص اور محبت کی کمی نہ تھی۔ مصروفیات کم تھیں اس لیے میل ملاپ کے لیے وقت زیادہ تھا۔ لوگ مل بیٹھنے کے بہانے تلاش کرتے تھے اور بہت اچھا وقت گزرتا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آج جب کہ فلم والوں کے پاس دولت کی فراوانی ہے، آپس میں مل بیٹھنے کا

رواج ہی نہیں رہا ہے۔ میل ملاپ اور سماجی سر گرمیوں کا سلسلہ ۱۹۸۰ء کی دہائی تک خوب زور و شور سے جاری رہا مگر اس کے بعد یہ رسم ہی باقی نہ رہی۔ پھر وہ زمانہ آگیا کہ فلم والوں کے پاس وقت ہی نہ رہا۔ فلم والے ایک دوسرے سے شوٹنگ کے موقعے پر ہی ملتے ہیں، اور وہ بھی انتہائی بھاگ دوڑ کے عالم میں۔ ہر اداکار کو اگلی شوٹنگ پر جانے کی جلدی پڑی رہتی ہے۔ جیسے تیسے ایک شوٹنگ ختم کر کے وہ خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو جاتا ہے۔ بس اب اتنی ہی سوشل ملاقات رہ گئی ہے لیکن ہم نے جب فلمی دنیا میں قدم رکھا تو معاملہ بالکل مختلف تھا۔ دفتروں میں، چائے خانوں میں، گھروں میں، نگار خانوں میں، ہر جگہ لوگ اکٹھے ہو کر گپ شپ اور دیگر مشغلوں میں مصروف رہتے تھے۔ خلوص، محبت اور ہمدردی کی بھی کمی نہیں تھی۔ شاید لالچ اس لیے نہ تھا کہ پیسہ کسی کے پاس بھی نہ تھا۔ مستقبل کے حسین خوابوں کے سوا کوئی سرمایہ نہ تھا۔ اسی لیے اس زمانے کی ملاقاتیں اور تعلقات آج بھی اسی طرح تروتازہ ہیں۔

شباب صاحب صحافی تو تھے ہی مگر وہ شاعر اور ادیب بھی تھے۔ اس وقت تک ان کے دو تین ناول بھی شائع ہو چکے تھے۔ پھر اس زمانے میں ناول پڑھنے کا رواج بھی تھا۔ اس لیے ناول نگار کی حیثیت سے بھی ان کی ایک پہچان تھی۔ فلم ساز بن کر ان کی شہرت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ فلم ساز تو وہ برائے نام ہی تھے مگر فلم ساز بہر حال ہر ایک کے لیے کشش رکھتا تھا۔ بڑے بڑے لوگ فلم سازوں سے ملنے کی خواہش کرتے تھے۔

اسی زمانے میں ایک دن دفتر میں ایک صاحب تشریف لائے۔ تیس بتیس سال کی عمر ہو گی۔ صحت مند، بلند قامت اور خوش شکل آدمی تھے۔ تعلیم یافتہ اور شائستہ بھی تھے۔ بات کرنے کا ڈھنگ بھی جانتے تھے۔ وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں لاہور سے باہر آتے جاتے رہتے تھے مگر ان کا گھر لاہور کے ایک اچھے علاقے میں تھا۔ معلوم ہوا کہ فوج میں تھے مگر ریٹائر منٹ لے لی ہے اور کاروبار سے وابستہ ہیں۔ وہ کافی دیر تک فلموں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ کمال بھی موجود تھے۔ انہوں نے بمبئی کی فلمی صنعت کے بارے میں واقعات سنائے۔ راج کپور، نرگس، دلیپ کمار اور محبوب صاحب وغیرہ کی باتیں سن کر وہ بہت حیران ہوئے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ چائے کا دور بھی چلتا رہا۔ دفتر میں اس وقت ایک گانے کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ زبیدہ خانم گا رہی تھی۔ وہ صاحب بڑے ذوق و شوق سے ان کو سنتے رہے۔ اس فلم یونٹ کا ماحول اور اس سے متعلق سب لوگ انہیں اتنے پسند آئے کہ انہوں نے دوسرے دن ہم

سب کو اپنے گھر چائے پر مدعو کر لیا۔ انکار کا تو دستور ہی نہیں تھا۔ اس لیے دوسرے روز شام کے وقت ہم سب ہوا محل اور کالی گاڑی میں سوار ہو کر ان کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔

فرض کیجئے کہ ان کا نام مسٹر زید تھا۔ ان کی کوٹھی پر پہنچے تو مسٹر زید باہر لان میں ہمارے منتظر تھے۔ کافی وسیع و عریض کوٹھی تھی۔ سلیقے سے سجی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی بیگم سے ملاقات کرائی۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوش شکل، خوش پوش اور ہنس مکھ خاتون تھیں۔ بال ترشے ہوئے تھے۔ ہلکا سا میک اپ بھی کر رکھا تھا جس کی وجہ سے اور دلکش لگ رہی تھیں۔ بات چیت اور رکھ رکھاؤ سے خاندانی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ، روشن خیال خاتون لگتی تھیں۔ ان میں مزاح کی حس بھی بہت اچھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ دیر کے بعد لطیفہ بازی اور ہوٹنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم سب گھل مل گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے عرصہ دراز سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دو بچوں سے بھی ملاقات کرائی۔ بہت پیارے بچے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک خوش حال اور خوش باش گھرانہ تھا۔ بظاہر اللہ کا دیا سبھی کچھ تھا۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ کافی دیر تک ادب، شاعری، فلم اور سیاست سبھی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ مسز زید نے شباب صاحب کو بتایا کہ انہوں نے ان کے ناول پڑھے ہیں ان کی فین ہیں۔ ہم سب نے اس پر شباب صاحب کو مبارک دی کہ چلئے کوئی پڑھی لکھی عورت بھی آپ کی فین ہے۔ چائے اور اس کے ساتھ لوازمات بہت اچھے تھے۔ ہم سب نے دل کھول کر تعریف کی تو مٹر زید اور ان کی بیگم نے اگلے روز ہم سب کو ڈنر پر مدعو کر لیا۔ ہم بتا ہی چکے ہیں کہ اس زمانے میں ہر ایک کے پاس فارغ وقت تھا۔ لوگ مل بیٹھنے کے بہانے تلاش کرتے تھے۔ لٰہذا یہ دعوت فوراً منظور کر لی گئی۔

اگلے روز شام کو ہمارا قافلہ ان کی کوٹھی پر پہنچا تو بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں محفل سجائی گئی۔ کافی کا دور چلتا رہا۔ خشک میوے کھائے گئے۔ دنیا بھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

میز پر بمبئی کے فلمی میگزین بھی رکھے ہوئے تھے۔ شباب صاحب نے ایک پرانے شمارے کے بارے میں دریافت کیا تو مسز زید نے بتایا کہ وہ بھی ان کے پاس موجود ہے۔ وہ فوراً اندر گئیں اور کچھ دیر بعد میگزین لا کر شباب صاحب کے حوالے کر دیا۔

راستے بھر ہم سب اسی خاندان کی خوبیاں بیان کرتے رہے۔ زبیدہ خانم کو مسز زید نے بہن بنالیا تھا۔ وہ ان سے اتنی متاثر تھیں کہ تمام وقت ان کی تعریفیں ہی کرتی رہیں۔ کمال بھی ان کے معترف تھے۔ شباب صاحب بھی متاثر تھے اور خود ہمیں بھی ان لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی۔

دوسرے دن شباب صاحب نے فون کیا "آفاقی۔ جلدی نہیں آسکتے؟"

"کیوں۔ کیا بات ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"آؤ گے تو بتاؤں گا، سن کر حیران رہ جاؤ گے"۔

ہم بھاگم بھاگ دفتر پہنچے تو شباب صاحب کمرے میں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "کل کی ملاقات میں ایک گل کھلا ہے۔ رومانس شروع ہو گیا ہے"۔

ہم حیران رہ گئے "کس کا رومانس۔ کس کے ساتھ؟"

بولے "مسز زید کے ساتھ"۔

ہم نے فوراً کہا "اچھا۔ کمال نے تو بہت پھرتی دکھائی ہے"۔

وہ ہنسنے لگے بولے "یار کمال سے تم خواہ مخواہ بدگمان ہو گئے ہو۔ وہ ایسا آدمی نہیں ہے"۔

"تو پھر؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

انہوں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر دھیمی آواز میں بولے "تمہیں یاد ہے نا کہ مسز زید نے مجھے میگزین دیا تھا"۔

"اس میگزین کے اندر سے یہ خط نکلا ہے" انہوں نے وہ خط ہماری طرف بڑھا دیا۔ ایک رنگین لیٹر ہیڈ پر صاف ستھرے الفاظ میں محبت نامہ رقم تھا۔ لکھنے والی نے سادہ اور مختصر الفاظ میں اظہارِ محبت کر دیا تھا اور ساتھ ہی یہ تحریر کیا تھا کہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو اسی میگزین کے اندر جواب رکھ دیں۔

ہمیں کافی دیر تک تو یقین نہیں آیا کہ ایک خوش و خرم اور مطمئن گھر والی پہلی ملاقات میں ایسی حرکت کر سکتی ہے۔ بظاہر ان کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ شوہر بھی خوب رو، تعلیم یافتہ، شائستہ اور پیسے والا تھا۔ صورت شکل کے

اعتبار سے شباب صاحب کا مسٹر زید سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ایک ایسے شخص کی تعلیم یافتہ بیوی اور دو پیارے پیارے بچوں کی ماں سے یہ توقع کس صورت بھی نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

شباب صاحب نے پوچھا۔"بولو۔اب کیا کیا جائے؟"

ہم نے انہیں بتایا کہ بھائی ہمیں تو یہ مذاق ہی لگتا ہے۔شاید وہ خاتون تمہیں آزمانا چاہتی ہیں۔تم اس چال میں نہ آجانا ورنہ شرمندگی اور بدنامی ہوگی۔

شباب صاحب نے ہمارا مشورہ مان لیا۔رات کو ڈنر پر گئے تو انہوں نے میگزین واپس لوٹادیا جسے مسز زید نے بڑی بے پروائی سے میز پر ڈال دیا۔انہیں یہ ڈر بھی نہ ہوا کہ اگر کسی نے اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا تو کیا ہوگا؟کچھ دیر بعد وہ میگزین اٹھا کر اندر چلی گئیں۔باہر آئیں تو ان کی آنکھوں میں سوال اور چہرے پر حیرت تھی۔ہم کن انکھیوں سے انہیں دیکھتے رہے۔شباب صاحب بالکل انجان بنے رہے۔باتیں حسبِ معمول جاری رہیں،کھانے کے بعد کافی کا دور بھی چلتا رہا۔اس کے بعد مسز زید نے زبیدہ خانم سے گانا سنانے کی فرمائش کردی۔ وہ پہلے تولیت ولعل کرتی رہیں مگر پھر سب کے پرزور اصرار پر شروع ہوگئیں۔ ایک دو گانے سنانے کے بعد انہوں نے ایک انڈین فلم کا گانا چھیڑ دیا جو اس زمانے میں بے حد مقبول ہو رہا تھا۔

بہار آئی کھلی کلیاں ہنسے تارے چلے آؤ
ہمیں جینے نہیں دیتے یہ نظارے چلے آؤ

رات کافی گزر چکی تھی۔ہر طرف سناٹا تھا۔ایسے میں زبیدہ خانم کی خوب صورت پر اثر آواز گونجی تو سب اس کی لطافت میں کھو گئے۔انہوں نے بھی اس قدر ڈوب کر یہ گیت گایا کہ سماں بندھ گیا۔گانا ختم ہوا تو ان کی آواز کا سحر ٹوٹا اور سب اپنے ہوش وحواس میں واپس آئے۔اس گیت اور زبیدہ خانم کی آواز نے ایسا جادو جگایا تھا کہ اس کے بعد محفل کا رنگ نہ جم سکا اور اسی تاثر کو لیے ہوئے ہم سب وہاں سے آگئے۔ مگر رخصت سے پہلے مسز زیڈ نے ایک کتاب شباب صاحب کے حوالے کی اور کہا اس میں ایک افسانہ بہت اچھا ہے۔اس پر فلم بن سکتی ہے۔

افسانے کا تو بہانہ ہی تھا۔ کتاب کے اندر ایک اور رنگین خط رکھا ہوا تھا۔ جس میں انہوں نے جواب نہ دینے کا شکوہ کیا تھا اور اس بات پر دکھ کا اظہار کیا تھا کہ شباب صاحب نے انہیں جواب کے لائق بھی نہ سمجھا۔ شباب صاحب نے احتیاطاً اس کا جواب بھی نہیں دیا۔ دو دن کے بعد مسٹر زید کاروبار کے سلسلے میں لاہور سے باہر گئے تو مسز زیڈ کے ٹیلی فونوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شباب صاحب ہمیں تفصیل سے رپورٹ دے رہے تھے۔ کئی دن گزر گئے تو ایک دن کہنے لگے

''یار آفاقی۔ نوٹ کر لو، یہ عورت سچ مچ محبت کرنے لگی ہے''۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' ہم نے پوچھا۔

''میں بھی کوئی بے وقوف تو نہیں ہوں۔ اصلی اور نقلی میں پہچان کر سکتا ہوں''۔

پھر بھی ہم نے شباب صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ خط و کتابت ہر گز نہ کریں۔ البتہ ٹیلی فون پر باتیں کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس طرح یہ رومان پروان چڑھنے لگے۔ مسز زید کے گھر آمد و رفت بڑھ گئی۔ آئے دن وہ کھانے یا چائے پر مدعو کرتی رہتی تھیں اور رات گئے تک محفل آرائی جاری رہتی تھی۔ کمال بمبئی کے فلمی واقعات سناتے تھے۔ زبیدہ خانم آواز کا جادو جگاتی تھیں۔ ہم لطیفے سناتے تھے۔ شباب صاحب صرف ہنستے رہتے تھے۔ ٹیلی فون پر بات چیت کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن اندر خانہ محبت کی جو کہانی شروع ہو چکی تھی اس کے بارے میں ہمارے سوا کوئی اور نہیں جانتا تھا۔

ہم شباب صاحب سے جو باتیں سنا کرتے تھے ان سے پتا چلتا تھا کہ مسز زید واقعی ان کے عشق میں گرفتار تھیں۔ انہیں شباب صاحب سے کوئی لالچ نہ تھا۔ نہ کوئی مطلب تھا۔ وہ بس ان کی فین تھیں۔ رفتہ رفتہ پیاز کے چھلکوں کی طرح پرت اترنے لگے اور ان کے بہت سے مسائل سامنے آئے۔ مثلاً یہ کہ مسز زید سے ان کی شادی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ ان دونوں کی عادتیں اور مزاج مختلف تھے۔ انہیں اپنے شوہر سے اور بھی بہت سی شکایتیں تھیں۔ جب شباب صاحب یہ ہمیں سناتے تو ہم دونوں بہت دیر تک حیران بیٹھے رہتے۔ ایک تعلیم یافتہ، خوش حال اور خوش باش جوڑا، جو بظاہر ایک آئیڈیل زندگی بسر کر رہا تھا، درحقیقت کس قدر دکھی اور ایک دوسرے سے شاکی تھا۔ ہمیں شباب صاحب کی زبانی تمام تفصیلات کا علم ہوتا رہتا تھا۔ ملاقاتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا جس کی تفصیلات اگلے دن ہمیں بتا دی

جاتی تھیں۔شباب صاحب نے انہیں یہ بھی بتادیا تھا کہ ہم اس معاملے میں ان کے رازدار ہیں۔اس پر مسز زید نے قطعاً اعتراض نہیں کیا بلکہ ہمارے ساتھ ان کے برتاؤ میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہوگئی جس کا ہمارے سوا کسی کو پتا نہ چل سکا۔وہ بہت جانے بوجھے، معنی خیز انداز میں ہمیں مسکرا کر دیکھتی تھیں اور رفتہ رفتہ ہمارے ساتھ زیادہ بے تکلف ہوگئی تھیں۔ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک اس قدر سلجھی ہوئی، سمجھ دار عورت کس راستے پر اندھا دھند دوڑی جارہی ہے۔

ایک دن ہم دونوں بیٹھے اسی موضوع پر بات کررہے تھے کہ ہم نے شباب صاحب سے پوچھا'' کبھی یہ بھی سوچا کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا؟''

''اللہ جانے'' وہ سوچ میں پڑ گئے۔''بھئی میں کیا کروں۔بہتیری کوشش کرتا ہوں۔نظر انداز کرتا ہوں۔کئی بار ملاقات سے گریز بھی کرتا ہوں مگر اس کی دیوانگی تو بڑھتی جارہی ہے۔میں نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں۔اپنی بیوی اور بچوں سے وابستہ ہوں اور انہیں نظر انداز کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔مگر اس کا کہنا ہے کہ میں آپ سے کچھ بھی نہیں مانگتی۔بس مجھے محبت کرنے کی اجازت دے دیں اور مجھے اس نعمت سے محروم نہ رکھیں''۔

دنیا کیسے کیسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔اگر غور کیا جائے اور کریدا جائے تو ہمیں اپنے ارد گرد ہی بے شمار کہانیاں اور انوکھے کردار دستیاب ہوسکتے ہیں۔ہم نے زندگی میں ایسے بے شمار واقعات دیکھے سنے اور ان سے واسطہ بھی پڑا جن کو ناقابل یقین کہا جاسکتا ہے۔مگر وہ سو فیصد درست تھے۔

ایک طرف اندھا عشق تھا، دوسری طرف احتیاط تھی۔ایک دن شباب صاحب کا فون آیا۔بہت گھبرائے ہوئے تھے۔''غضب ہوگیا۔مسٹر زید کو اس بات کا پتا چل گیا''۔

''کیسے؟'' ہم نے پوچھا۔

انہوں نے بتایا کہ اسے کچھ عرصے سے شک ہوگیا تھا۔گھر کے ایک دو افراد کو بھی معلوم ہوگیا تھا۔مسٹر زید نے ٹیلی فون کی نگہداشت شروع کردی اور عشق اور مشک تو ویسے بھی کہاں چھپتے ہیں۔

''اب کیا ہو گا؟'' شباب صاحب بہت پریشان تھے ''وہ بتاتی ہے کہ مسٹر زید بہت خطرناک آدمی ہے۔ وہ غصے اور انتقام میں کچھ بھی کر سکتا ہے''۔

چنانچہ احتیاط میں اضافہ کر دیا گیا۔ شباب صاحب کے ساتھ ہر وقت ڈرائیور اور ایک ملازم رہنے لگا۔ مکان اور دفتر پر بھی دیکھ بھال شروع ہو گئی۔ مسز زید کے فون کرنے پر بھی پابندیاں لگ چکی تھیں اس لیے کافی دنوں تک کوئی بات نہ ہو سکی۔ لیکن واہ ری عورت ذات! جب بھی موقع ملتا تھا وہ ٹیلی فون پر بات کر لیتی تھیں۔ قصہ مختصر یہ کہ مسٹر زید نے مستقل طور پر لاہور چھوڑ دیا اور کسی دوسرے شہر منتقل ہو گئے۔ ٹیلی فون پر پہرہ بٹھا دیا۔ خط و کتاب کے راستے بھی مسدود کر دیئے۔ شباب صاحب پریشان بھی تھے مگر ٹیلی فون کے منتظر بھی رہتے تھے۔ جب ہم دونوں اکیلے بیٹھتے تو وہ کہتے '' یار اس غریب پر کیا بیت رہی ہو گی؟''

ایک دن ہم نے کہا ''سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اس عورت سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے''۔

''ہیں۔؟'' انہوں نے چونک کر ہمیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر دکھ اور شکایت کے تاثرات تھے۔ چند لمحے وہ خاموش ہمیں دیکھتے رہے پھر رفتہ رفتہ ان کے چہرے کے تاثرات میں نرمی آ گئی۔ آنکھوں کی وحشت بھی کم ہو گئی۔ انہوں نے ایک پان کھایا۔ سگریٹ سلگا کر ایک کش لگایا اور کہنے لگے ''واقعی تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ اخلاقی لحاظ سے یہ غلط ہے''۔

وہ کچھ نہیں بولے سر جھکا کر سوچتے رہے۔

سالہا سال گزر گئے۔ مسز زید کی کوئی خبر نہیں ملی۔ کئی سال کے بعد اچانک ایک دن ان کا فون آیا۔ شباب اس وقت تک ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ چکے تھے۔ مسز زید نے انہیں کامیابیوں پر مبارک باد دی۔ نیک خواہشات کا اظہار کیا اور بتایا ''آج سالہا سال کے بعد مجھے فون کرنے کا موقع ملا ہے تو فون کر لیا ہے۔ اس کے بعد خدا جانے موقع ملے یا نہ ملے مجھے یاد رکھنا'' یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں، ان کے شوہر اور بچوں کا کیا حال ہے؟ پھر کچھ پتا نہ لگ سکا۔

''ٹھنڈی سڑک'' کے حوالے سے یہ تذکرہ بھی آ گیا۔ اسے لکھنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ایک طویل عرصہ گزر

جانے کے باوجود ہم اس واقعے کو فراموش نہیں کر سکے ہیں۔اور نہ ہی آج تک یہ سمجھ پائے ہیں کہ کیا واقعی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک بظاہر خوش و خرم گھرانہ اس قدر شکست وریخت کا شکار ہو جائے۔ایسے لوگ جو دیکھنے میں مثالی گھرانہ نظر آتے ہوں نزدیک سے دیکھنے پر ایک دوسرے سے اس قدر متنفر اور بیزار ہوں؟اسی لیے تو غالب نے کہا ہے

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

''ٹھنڈی سڑک'' کی شوٹنگ زور وشور سے جاری تھی۔ہمارا زیادہ تر وقت اب شاہ نور اسٹوڈیوز میں ہی گزرتا تھا۔کچھ تو پہلے ہی لوگوں سے واقفیت تھی۔اب وہ شناسائی اور دوستی میں بدل گئی۔شوکت حسین رضوی سے بھی اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی اور آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔کمال کو ایک نئے ہیرو کی حیثیت میں سبھی نے قبول کر لیا تھا۔اس میں خود کمال کی شخصیت اور عادت کا بھی دخل تھا۔وہ ہر ایک سے بے تکلف ہو جاتے تھے۔پہلی ہی ملاقات میں اس طرح گھل مل جاتے تھے جیسے کہ ہمیشہ سے واقف ہوں۔جو منہ میں آیا کہہ دیا۔جو جی میں آیا کر لیا۔دنیاداری اور مصلحت اندیشی تو ان کے پاس سے چھو کر بھی نہیں گزری تھی ان کی یہ عادت ہمیشہ قائم رہی جس کی وجہ سے انہیں فائدے بھی پہنچے اور نقصان بھی اٹھانے پڑے لیکن ایک بات طے ہے کہ کبھی کسی نے ان پر سازش اور فریب دہی کا الزام نہیں لگایا۔وہ جیسے بھی ہیں، بہر حال ایک کھرے انسان ہیں۔خوبیاں اور خرابیاں تو انسانی سرشت میں داخل ہیں۔

کمال کو اپنی پہلی فلم میں ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جن سے نئے فن کار عموماً دو چار ہوتے ہیں۔اس کی ایک وجہ تو خود شباب صاحب اور ہم تھے۔ظاہر ہے کہ سب کو ہمارا لحاظ تھا اور سب یہی سمجھتے تھے کہ کمال ہمارے بھانجے ہیں۔فلم کے ہدایت کار اور کیمرہ مین بھایا حمید نہ صرف ایک بہت اچھے انسان تھے بلکہ کمال کو پسند بھی کرتے تھے۔رہے دوسرے فن کار تو ان کی طرف سے بھی کمال کو کسی دقت یا پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔مسرت نذیر جو فلم کی ہیروئن تھیں بذات خود ایک بہت اچھی انسان تھیں۔انہوں نے کمال کے ساتھ پوری طرح تعاون کیا اور انہیں کسی قسم کی

مشکل میں نہیں ڈالا۔یونٹ کے دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ظریف نے اس وقت بھی فلمی دنیامیں کافی نام پیدا کر لیا تھا۔ مصروف بھی تھے۔وہ بلا کے ذہین اور حاضر جواب آدمی تھے۔انہیں بر وقت بہت اچھی سوجھتی تھی۔ان کی اداکارانہ صلاحیتوں کی ایک دنیا معترف تھی۔وہ چاہتے تو دوسرے فن کاروں کو آزمائش میں ڈال سکتے تھے مگران کارویہ بہت ہمدردانہ اور دوستانہ تھا۔ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔حالانکہ ذاتی زندگی میں وہ خاصے دکھی تھے۔اس کی تفصیل بھی بیان ہو گی۔ظریف کی مصروفیت بے پناہ تھی۔اس زمانے میں بھی وہ کئی کئی فلموں میں کام کرتے تھے لیکن شراب نے انہیں اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔یہاں تک کہ ایسا وقت بھی آگیا جب وہ ہر وقت مدہوش رہنے لگے۔پاکستان کی فلمی صنعت میں اس زمانے میں فلم سازی ہی بہت کم ہوتی تھی۔ہر کوئی بے کار تھا۔اس کے مقابلے میں ظریف نہ صرف مصروف تھے بلکہ معقول معاوضہ بھی وصول کرتے تھے۔آج کے حساب سے تو وہ عشر عشیر بھی نہ تھا لیکن اسوقت کے اعتبار سے معقول تھا۔اس کے باوجود وہ خوش نہیں تھے۔کوئی دکھ انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ان کے کاندھوں پر اپنے سارے خاندان کا بوجھ تھا جن کی دیکھ بھال اور پرورش ان ہی کی ذمے داری تھی۔انہیں اپنی ذمے داریوں کا احساس بھی تھا لیکن پھر شراب خانہ خراب نے انہیں کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک بار شوٹنگ کے لیے انہیں صبح اسٹوڈیو پہنچنا تھا مگر وہ عموماً تاخیر سے آیا کرتے تھے۔شباب صاحب نے ہمیں یہ ذمے داری سونپی کہ انہیں صبح سویرے جاکر جگائیں اور اسٹوڈیو لے کر آئیں۔ان کے بارے میں یہ سنا تھا کہ وہ رات کو دیر سے سوتے ہیں اور پھر صبح بیدار ہونا مشکل ہوتا ہے۔گھر والے انہیں جگانے سے ہچکچاتے ہیں۔سوچتے ہوں گے کہ تھوڑی بہت نیند تو پوری کر لیں۔

ہم صبح سویرے اختر کے ساتھ ہوا محل میں سوار ہو کر ان کے گھر پہنچ گئے۔ان کا گھر قلعہ گوجر سنگھ میں تھا۔بعد میں جب ان کے بھائی منور ظریف نے عروج حاصل کیا اس وقت بھی اس خاندان کی رہائش اس قدیم طرز کے مکان میں تھی حالانکہ اللہ کا دیا سبھی کچھ تھا۔ایک تنگ سی سڑک پر ان کا مکان تھا۔ہارن کی آواز پر ایک صاحب باہر آئے انہوں نے بتایا کہ ظریف صاحب سو رہے ہیں۔ پتا نہیں کب اٹھیں گے۔ہم نے کہا"انہیں آپ جگا کر ہمارے آنے کی خبر

دے دیں"۔

وہ بولے "جی یہ تو بہت مشکل ہے"۔

ہم نے کہا "تو پھر آپ ہمیں ان کے پاس لے چلیں۔ یہ مشکل ہم خود ہی آسان کر لیں گے"۔

انہوں نے کچھ تامل کیا مگر پھر رضامند ہو گئے۔ مکان کی دوسری منزل پر ظریف کا کمرہ تھا۔ وہ ہمیں لے کر کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ دستک کا کوئی جواب نہیں ملا تو ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ ایک سادہ سا کمرہ تھا۔ کوئی خاص آرائش بھی نہیں تھی۔ ایک چارپائی پر ظریف چادر اوڑھے بے خبر سو رہے تھے۔ امارت اور دولت مندی کی کوئی علامت اس کمرے میں نظر نہیں آئی۔

ہم نے انہیں دو چار بار پھر پکارا۔ پھر ان کا بازو ہلایا تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ سرخ آنکھوں سے ہمیں دیکھا۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا مگر پھر پہچان گئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

علیک سلیک کے بعد ہم نے انہیں بتایا کہ ابھی شوٹنگ کے لیے چلنا پڑے گا۔ آپ جلدی سے ناشتا کر لیں۔

وہ مسکرائے، کہنے لگے "ناشتا تو آپ کریں"۔

ہم نے کہا "ہم تو ناشتا کر کے آئے ہیں"۔

بولے "تو پھر چائے پئیں، میں بھی پیتا ہوں"۔

انہوں نے آواز دے کر ہمارے لیے چائے لانے کو کہا۔ ہمارے لیے چائے کی ایک پیالی آ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی تیار ہو کر آ گئے۔ اب وہ بالکل تروتازہ نظر آ رہے تھے۔

ہم سے کہا "آیئے چلتے ہیں"۔

ہم نے کہا "مگر ناشتا"۔

بولے "ناشتے کی فکر نہ کریں"۔

اسٹوڈیو پہنچے تو شوٹنگ کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ مسرت نذیر، نگہت سلطانہ، سلطان کھوسٹ اور کمال کھانے کی میز پر بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ ظریف کے پہنچتے ہی شوٹنگ شروع ہو گئی اور ظریف دیکھتے ہی دیکھتے ایک مختلف انسان بن

گئے۔ انہیں اپنے کردار میں ڈھل جانے کا ہنر آتا تھا۔ عین وقت پر انہیں ایسے فقرے سوجھتے تھے کہ سین کی خوب صورتی میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ ذہانت اور حاضر جوابی ان پر ختم تھی لیکن نہایت سنجیدہ چہرہ بنا کر مکالمے ادا کرتے تھے کیا مجال جو چہرے پر ذرا سی مسکراہٹ بھی آجائے۔ اس وقت تک کامیڈین کی طرف سے، لکھے ہوئے سین میں اضافہ اور ترمیم کرنے کا رواج نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی ظریف بعض اوقات ایسا فقرہ فی البدیہہ بول دیا کرتے تھے کہ جو انگوٹھی میں نگینے کی طرح لگتا تھا۔ ان کا ذہن ہر وقت فقرے سازی میں مصروف رہتا تھا۔ شوٹنگ کے علاوہ عام زندگی میں بھی ان کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔

اس زمانے میں بھی ان کی صحت ٹھیک نہیں تھی۔ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ شراب کی بوتل ان کی ہر وقت کی ساتھی ہو گئی تھی لیکن ہم نے انہیں کبھی مدہوش یا بہکتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب دیکھا شگفتہ اور تازہ دم ہی دیکھا۔ لیکن اندر ہی اندر انہیں گھن لگ چکا تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے حالانکہ مرنے کی عمر نہ تھی۔ بعد میں یہی کہانی ان کے چھوٹے بھائی منور ظریف کے ساتھ بھی دہرائی گئی۔ انہوں نے بھی جوانی میں موت کو گلے لگایا حالات اور واقعات میں تھوڑا سا فرق تھا مگر انجام وہی تھا۔

نادرہ کے تجربے نے کمال کو خاصا تجربہ کار بنا دیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے کسی لڑکی یا ہیروئن سے دھوکا نہیں کھایا بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہی تھا "مجھے آج تک تم ہی جیسی لڑکی کی تلاش تھی، بولو تم مجھ سے شادی کرو گی؟" ان کا پیٹنٹ فقرہ بلکہ ٹریڈ مارک بن کر رہ گیا۔ عام لوگوں کو اس کا علم نہیں تھا جن اداکاراؤں سے ان کا واسطہ پڑتا تھا وہ اس سے بخوبی واقف تھیں۔ بہت سی ایکٹریسوں کو آج بھی یقین نہیں ہے کہ کمال نے یہ فقرہ ان سے محض رواداری میں یا عادتاً بولا تھا۔ کئی خواتین پر اس فقرے نے بہت غضب ڈھایا۔ بعد میں تو بہت کچھ ہوا لیکن ان کے ابتدائی دور کے حالات کا ہمیں بھی علم ہے۔ کمال میں ایک خوبی) یا خامی؟) یہ بھی ہے کہ وہ بہت زیادہ حساس نہیں ہیں اور کسی بات کو دل سے نہیں لگاتے۔

آگے چل کر ان کی زندگی میں بعض ''معرکے'' بھی پیش آئے لیکن ابتدائی زندگی میں انہوں نے اس پہلو پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ دوستی اور ہنسی مذاق سبھی سے تھا۔ دل لگی کرتے تھے، دل کی لگی سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھا۔ ایک فلم ریلیز ہونے کے بعد دوسرے فلم سازوں نے بھی ان پر توجہ دی۔ حالات کچھ بہتر ہوئے اور پہچان بھی ہو گئی تو وہ وائی ایم سی اے کو چھوڑ کر ایک اور رہائش گاہ میں منتقل ہو گئے اور خاصے عرصے وہیں قیام کیا۔ مین شاہ جمال روڈ پر اس زمانے میں بھی کوٹھیاں تھیں اگرچہ بہت زیادہ نہیں تھیں۔ یہیں ایک کوٹھی کے ایک حصے میں کمال نے ایک پورشن کرائے پر حاصل کر لیا۔ یہ دو کمرے تھے۔ باورچی خانہ اور باتھ روم بھی تھا ایک ڈریسنگ روم بھی تھا کیونکہ یہ ایک کوٹھی کا حصہ تھا اس لیے اس میں داخل ہونے کا راستہ عقب سے تھا۔ گیٹ کے اندر داخل ہونے کے بعد ایک چھوٹا سا لان تھا۔ پھر ایک پتلا سا برآمدہ سمجھ لیجئے۔ اس کے اندر جانے کے لیے دروازہ تھا۔

کمال کے گھر کے سامنے سڑک کے پار ایک بہت بڑی کشادہ کوٹھی تھی۔ اس میں فلم ساز اور ہدایت کار منور ایچ قاسم صاحب رہا کرتے تھے۔ وہ اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو میں حصہ دار بھی تھے۔ غالباً فلم ڈسٹری بیوشن کے کاروبار میں بھی کسی سے ساجھے داری تھی۔ خوش حال، خوش لباس اور خوش گفتار آدمی تھے۔ لاہور کی فلمی دنیا میں ان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کا بہت شہرہ تھا۔

وہ عام طور پر شاہ جی کہلاتے تھے کیونکہ سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ہم نے انہیں چند بار دیکھا ضرور تھا اور سرسری ملاقاتیں بھی ہوئی تھی مگر زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوئی انہیں خلیق اور ملنسار ہی پایا۔ بہت نرمی اور شائستگی سے بات کرتے تھے۔ دراز قد اور اچھے ڈیل ڈول کے شاندار آدمی تھے۔ چہرے کے نقش بھی دلکش تھے مختصر یہ کہ وہ سراپا دلکش اور دلفریب شخصیت کے مالک تھے۔ شاعر تنویر نقوی صاحب جو ہمارے بہت بے تکلف دوست تھے عام طور پر کی قابلیت سے مرعوب یا متاثر نہیں ہوتے تھے مگر منور ایچ قاسم صاحب کے بارے میں وہ بھی اچھے خیالات رکھتے تھے، کہا کرتے تھے کہ اتنے پڑھے لکھے لوگ فلمی دنیا میں بہت کم ہیں مگر فلم بنانا ایک الگ چیز ہے۔ وجہ یہ تھی کہ منور صاحب کبھی کوئی اچھی اور کامیاب فلم نہیں بنا سکے حالانکہ فلم کی تربیت انہوں نے بمبئی میں حاصل کی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد بھی فلمی صنعت سے وابستہ رہے۔ ان کی ایک فلم

''آج کل'' جو غالباً ان کی آخری فلم تھی اس میں ہمارا اور ان کا ساتھ رہا تھا۔

بزرگ کہتے ہیں کہ رشتے تو آسمانوں میں طے ہوتے ہیں۔ آپ لاکھ کوشش کرتے رہیے مگر شادی وہیں ہو گی جہاں قدرت کو منظور ہو گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ انسان اپنے طور پر کوشش نہ کرے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ کمال کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ان کی منور ایچ قاسم صاحب کی صاحبزادی سے منگنی ہوئی تھی کافی عرصے تک یہ منگنی برقرار رہی اور دونوں گھرانے بھی ایک دوسرے کے نزدیک ہو گئے لیکن پھر فلک کج رفتار نے اپنی چال دکھائی اور یہ منگنی ٹوٹ گئی۔ کمال کو اگر غیب ہوتا تو وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور وقت آنے پر اپنی موجودہ بیگم کے ساتھ شادی رچا لیتے۔ مگر کسی کو کیا علم تھا کہ کمال کی شادی فلاں وقت فلاں جگہ ہو گی۔ خود کمال بھی اس سے بے خبر تھے۔ چنانچہ منگنی ٹوٹنے کے بعد انہوں نے نئی چراگاہیں تلاش کرنی شروع کر دیں۔

کمال کے ساتھ قدرت نے بہت فیاضانہ سلوک کیا تھا۔ اچھا خاندان، اچھی تعلیم، اچھا ماحول، فلموں میں ہیروں کے طور پر داخل ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کامیابی کی منزلیں طے کرتے ہوئے کامیاب ہیروز کی صف میں شامل ہو گئے۔ صورت شکل، بات چیت کا ڈھنگ، عادات واطوار سبھی پسندیدہ تھے۔ اس پر شہرت اور کامیابی۔ فلموں میں کامیاب ہوئے تو پیسے بھی کمانے لگے۔ گویا ہر لحاظ سے وہ ایک ایسے کنوارے تھے جس پر ہر کوئی جال پھینکنے کو تیار بیٹھا تھا۔ کمال ایک ہیرو کی حیثیت سے تمام ہتھیاروں سے لیس تھے۔ بلکہ ایک عام پاکستانی ہیرو کے مقابلے میں ان کے پاس خاندانی پسِ منظر اور اعلیٰ تعلیم بھی تھی۔ اس لیے گویا کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔

کمال کے ساتھ ہمارا نوعمری سے ساتھ رہا۔ بعد میں تو اتنا زیادہ ساتھ نہیں رہا لیکن پرانے تعلق اور دوستی کے حوالے سے پیار خلوص اور ہمدردی کا رشتہ ہمیشہ کے لیے قائم ہو گیا۔ ایسے رشتوں میں اکثر ملاقات کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ وقتی ناراضگی اور لڑائی جھگڑے بھی زیادہ دیرپا نہیں ہوتے۔ البتہ دوستی اور تعلق دیرپا اور پائیدار ہوتا ہے۔ ہم نے کمال کو ایک سیدھا سادا اور اچھا انسان پایا۔ عموماً اپنے کام سے کام رکھنے والا، دوسروں سے حسد، غیبت یا سازش ان کے مزاج ہی میں نہیں ہے۔ جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتے ہیں، دل میں میل اور کینہ نہیں رکھتے۔ آپ کی کسی بات کا برا نہیں

مانیں گے۔ پھر آپ سے بھی یہ توقع کریں گے کہ آپ ان کی کسی بات کا، کسی حرکت کا برا نہ مانیں جو کہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔

کمال کے بارے میں ایک بات کا ہمیں یقین رہا ہے وہ یہ کہ انہوں نے کبھی سنجیدگی سے عشق نہیں کیا۔ وقت گزاری کے لیے فلرٹ یا ہلکے پھلکے رومانس کی بات علیحدہ ہے۔ ایک عمر ہوتی ہے جب نوجوانوں کو خود بخود ایسے کام کرنے کی امنگ ہوتی ہے۔ پھر وہ تو جس ماحول میں تھے وہاں رہ کر ایسا نہ کرتے تو حیرت کی بات ہوتی لیکن ان کا کردار ہمیشہ صاف ستھرا رہا۔ انہوں نے کبھی گناہ کرنے کا ارادہ نہیں کیا بلکہ ترغیبات کے باوجود اس سے بچے رہے، ان کی طبیعت میں سنجیدگی کا عنصر بہت کم ہے۔ بہت کم چیزوں کو سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ فلمی رومانوں کے معاملے میں بھی وہ کبھی واقعی سنجیدہ نہیں ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ فریق مخالف سنجیدہ ہو گیا۔ حساب کتاب کرنے میں وہ بہت ماہر ہیں۔ نفع نقصان کا حساب کیے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ تو پھر شادی جیسا اہم کام حساب کتاب کیے بغیر کیسے کر لیتے؟ جہاں تک ہم انہیں جانتے ہیں وہ رومانس اور شادی کے معاملے میں بھی ہمیشہ حساب کتاب کرتے رہے۔ مثلاً اگر محسوس کیا کہ ''دل لگی'' حد سے بڑھنے لگی ہے اور فریقِ مخالف بالکل سنجیدہ ہو گیا ہے تو کمال قلم کاغذ لے کر حساب کرنے بیٹھ گئے۔

اگر یہ شادی ہو گئی تو کیا ہو گا؟ فائدہ کیا ہے؟ اور اگر یہاں شادی نہ کی تو نقصان کیا ہو گا؟
مثال کے طور پر ایک زمانے میں جب وہ ایک ہیروئن کے ساتھ رومانس میں بہت آگے نکل گئے گویا سنجیدہ ہونے لگے تھے تو انہوں نے فوراً حساب کتاب شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک بار ہم سے بھی مشورہ لیا۔
''سوفی۔ کیا خیال ہے تمہارا۔ اگر اس لڑکی سے میں نے شادی کر لی تو کیا ہو گا؟''
''شادی ہو جائے گی اور کیا ہو گا۔ تم دونوں باقاعدہ میاں بیوی بن جاؤ گے''۔
''مگر اس کے بعد؟''
''اس کے بعد بچے ہوں گے''۔

''بس یہی تو مصیبت ہے۔ تم خود ہی سوچو۔ کیا لوگ ان بچوں کو عزت دیں گے۔ انہیں ایکٹریس کے بچے کہیں گے۔ سوسائٹی میں ان کا کیا مقام ہوگا۔ خاندان والے ان کے بارے میں کیا سوچیں گے؟''

ہم چپ رہے۔

بولے ''ان بچوں کو اچھے خاندانوں میں رشتے کیسے ملیں گے؟ ان میں احساسِ کمتری پیدا ہو جائے گا اور پھر ہماری تو آئندہ نسل ہی خراب ہو جائے گی۔ رومانس اور چیز ہے مگر شادی۔۔۔''

وہ سگریٹ سلگا کر سوچ میں پڑ گئے۔

پھر پوچھنے لگے ''تم بولو۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

ہم نے کہا ''وہی جو تمہارا خیال ہے کہ یہ باتیں تو سوچنی پڑیں گی۔ شادی تو ساری زندگی کا معاملہ ہوتا ہے بلکہ نسلاً بعد نسلاً یہ سلسلہ چلتا ہے''۔

وہ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اس موضوع پر ان سے دوبارہ بات نہیں ہوئی۔ کمال برابر والے بیڈ پر پریشان حال بیٹھے ہیں۔ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔ چہرے پر پریشان کے آثار ہیں۔

اقبال یوسف نے گھبرا کر پوچھا ''خیریت تو ہے۔ کیا بات ہے؟''

انہوں نے کہا ''اقبال۔ اس کم بخت نے ہم سے فراڈ کیا ہے''۔

''کس نے؟''

''ماچس والے نے۔ ہر ڈبیا میں چار تیلیاں کم ہیں''۔

''اچھا۔۔۔ مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''یار میں چھ سات بار گن چکا ہوں''۔

اس بات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جو شخص ماچس کی تیلیوں کے معاملے میں اس قدر باریکی سے حساب کتاب کرتا ہوگا وہ ذاتی زندگی اور شادی کے بارے میں کتنا غور و خوض کرتا ہوگا۔

فلمی ہیرو بننے کے بعد کمال کو بہت تیزی سے فلمی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ ہو گئے۔ ان میں ایک پہلو یہ بھی

ہے کہ فلم کا ہیرو نہ صرف فلم بینوں کا بلکہ فلمی اداکاروں کا بھی محبوب نظر بن جاتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے صنف نازک کی توجہ اور عنایات کا مرکز بننا پڑتا ہے اور ان حالات میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ ماحول اور حالات سے متاثر نہ ہو۔ چنانچہ کمال کے ساتھ بھی یہی ماجرا پیش آیا۔ ابتدائی دنوں میں وہ اپنی ساتھی فنکاراؤں سے متاثر ہوا کرتے تھے مگر جب ہیرو بن گئے الٹا ہو گیا۔ ایک چلبلی رقاصہ ہیروئن کے ساتھ ان کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ موضوع سخن بن گئی۔ لیکن اسے محض وقتی رومانس کہا جا سکتا ہے۔

کمال کے ساتھ دوسرا نام شمیم آراء کا منسوب ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ بعض امور پر اختلاف بھی تھا لیکن اس کے باوجود ان کی باہمی دلچسپی اور وابستگی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ کمال نے اس موضوع پر ہم سے کبھی کھل کر بات نہیں کی، نہ ہی ہم نے انہیں کریدا حالانکہ اس رومان کی خبریں لوگوں کی زبانوں سے گزر کر اخبارات کے کالموں تک پہنچ گئی تھیں۔ البتہ ایک بار انہوں نے ہم سے یہ تذکرہ ضرور کیا تھا کہ یار سوفی اگر میں کسی فلمی ایکٹریس سے شادی کر لوں تو میرے بچوں کا مستقبل کیا ہو گا؟ خاندان والے اور معاشرہ انہیں کیا مقام دے گا؟ ہم نے حسب مقدور انہیں مشورہ دیا اور اس کے مختلف پلو دکھائے۔ اس وقت بھی کئی اصحاب نے فلم ایکٹریسوں سے شادی کر لی تھی اور معاشرے میں وہ پہلے والی ناپسندیدگی بھی نہیں تھی۔ لوگ کچھ زیادہ وسیع الخیال ہو گئے تھے۔ پوزیشن، شہرت اور دولت حاصلہو تو ان چیزوں سے چشم پوشی کر لی جاتی تھی۔ لیکن اگر کوئی زیادہ حساس ہو تو اس کے لیے یہ مسئلہ سوہان روح بھی بن جایا کرتا تھا۔ کمال اس معاملے میں کتنے ان کے دل میں کیا ہے؟ یہ صرف وہی جانتے ہیں یا اللہ میاں۔ ہمارے خیال میں کمال ذہنی طور پر سو فیصد شمیم آرا سے شادی کرنے کے لیے خود کو تیار نہیں کر سکے تھے، ادھر شمیم آرا پر اس زمانے میں نانی اماں اور خاندان کی بندشیں بہت زیادہ تھیں جن سے مقابلہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اگر شمیم آرا کو اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کی آزادی حاصل ہوتی (جیسی کہ بعد میں ہوئی) تو شاید ان کی اور کمال کی شادی ہو جاتی۔ ایک بار کمال نے شمیم آرا کو رات کے وقت ان کے گھر سے لے جانے کے لیے وقت بھی دیا تھا مگر وہ حسبِ وعدہ نہ پہنچے اور وہ ساری رات انتظار ہی کرتی رہیں۔ اس بات نے بھی شمیم آرا کو کمال سے بدظن کر دیا۔ بہر حال، یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

کمال کی زندگی میں سب سے زیادہ عرصے تک قیام کرنے والی ہستی رانی تھیں۔ان دونوں نے اس بات کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ابتدائی زمانے میں تو پردہ ڈالتے رہے لیکن بعد میں فلمی صنعت کے لوگوں کو یہی انتظار رہا کہ ان دونوں کی شادی کب ہو گی؟زبانی طور پر دونوں ہی اس کی تردید کرتے رہے لیکن فلم دنیا میں ایسی تردید ایک بے کار اور بے معنی چیز ہوتی ہے۔دونوں کے قریبی دوستوں کو اس حقیقت کا علم تھا۔وہ دونوں فارغ وقت ساتھ ہی گزارتے تھے ایک زمانے میں کمال اور رانی گلبرگ میں ایک دوسرے کے پڑوسی بھی رہے۔ ایک دوسرے کے گھر میں ان کی آزادانہ آمدورفت تھی۔

کمال کی فلم ''جوکر'' کئی سال میں مکمل ہوئی تھی۔سال کے سال اس فلم کی شوٹنگ ہوا کرتی تھی اور کمال کی سالگرہ کے موقع پر تو نہ صرف شوٹنگ ضرور کی جاتی تھی بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ خبریں بھی گرم ہو جاتی تھیں کہ اس موقع پر وہ دونوں شادی کا اعلان کر دیں گے لیکن ۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہماری کمال اور رانی دونوں سے دوستی اور بے تکلفی تھی اس لیے بلا روک ٹوک دونوں کے گھروں میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔اس زمانے میں کمال رانی کے مقابلے میں کہیں زیادہ مصروف اور مقبول تھے اور شوٹنگ کے سلسلے میں اکثر لاہور سے باہر جاتے رہتے تھے۔واپسی پر ان دونوں کی چپقلش ضرور ہوتی تھی۔ایک ایسی ہی جھڑپ کا حال سنئے۔

ایک بار کمال کراچی سے واپس آئے تو ہم اس شام رانی کی کوٹھی میں موجود تھے کہ کمال بھی ٹہلتے ہوئے آ گئے۔رانی کی کوٹھی ان کی کوٹھی کے عقب میں تھی۔درمیان میں صرف ایک گلی نما راستہ حائل تھا۔کمال نے ایک مختصر سی کوٹھی کرائے پر حاصل کر لی تھی اور اسے سلیقے سے سجایا تھا۔ ان دنوں گردونواح میں کچھ اور فلم والے بھی رہائش پذیر تھے۔ مثلاً فلم ساز راشد مختار، موسیقار مصلح الدین احمد (گلوکارہ ناہید نیازی سے مصلح الدین کی شادی کے بعد ناہید نیازی اسی کوٹھی میں دلہن بن کر آئی تھیں۔ (تھوڑے فاصلے پر لیبارٹری انچارج پیارے خان صاحب کی رہائش تھی۔ہمیں یہ آسانی تھی کہ جب اس طرف جاتے تھے تو کئی لوگوں سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔

ہم رانی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ کمال بھی ٹہلتے ہوئے آ گئے مگر بے نیازی کا انداز ہ نمایاں تھا۔ کچھ ناراض سے نظر آرہے تھے۔رانی انہیں دیکھ کر مسکرائیں۔ہمارے دریافت کرنے پر بتایا کہ خفا ہیں۔

''کیا بات ہو گئی ؟'' ہم نے پوچھا۔

رانی نے کہا''دیکھئے آفاقی صاحب میں بھی فلموں میں کام کرتی ہوں۔اکثر اپنی گاڑی استعمال کرتی ہوں لیکن بعض اوقات فلم ساز یا ہدایت کار بھی مجھے ڈراپ کرنے یا لینے آجاتے ہیں۔بس اس بات پر یہ بگڑے ہوئے ہیں''۔

کمال نے کہا۔''شوٹنگ پر جانا اور بات ہے۔مگر دوسری تقریبات میں کسی کے ساتھ کیوں جاتی ہو؟''

رانی بولیں۔''اول تو میں زیادہ تر گھر ہی میں رہتی ہوں۔دوسری بات یہ ہے کہ میں بھی گھر بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتی ہوں َ ظاہر ہے کہ میں کسی پارٹی میں یا فلم دیکھنے اکیلی تو نہیں جاسکتی۔اب آپ ہی فیصلہ کیجئے''۔

ہم نے ان کی تائید میں بیان جاری کر دیا کہ واقعی نہایت معقول بات ہے۔

کمال بولے''ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ گھومنے سے شہرت خراب ہو جاتی ہے۔آئندہ اگر تمہیں کہیں جانا ہو تو آفاقی کے ساتھ چلی جاؤ''۔

ہم بہتیرا، مگرا گر کرتے رہے مگر یہ فیصلہ ہو گیا کہ کمال کی غیر موجودگی میں رانی ہمارے ساتھ جایا کریں گی۔

چند روز کے بعد رانی کا فون آگیا۔''آفاقی صاحب، ریگل سنیما میں بہت اچھی فلم لگی ہوئی ہے آپ نے دیکھی ہے ؟''

''نہیں۔مگر سوچ رہے ہیں''۔

''تو پھر آج رات آخری شو میں چلئے''۔

چھڑے چھانٹ ہونے کی وجہ سے ہم بالکل آزاد تھے۔فوراً ہامی بھر لی۔طے یہ پایا کہ پہلے چینی ڈنر کھائیں گے، پھر فلم دیکھیں گے۔

ہم نے سنیما فون کر کے ایک باکس ریزرو کروانے کی درخواست کی تو معلوم ہوا کہ کوئی باکس خالی نہیں ہے۔مگر منیجر نے مہربانی فرمائی اور پروپرائٹر کا باکس ہمارے نام کر دیا۔

سخت سردی کا موسم تھا جب ہم ٹھٹھرتے ہوئے ٹیکسی میں رانی کے گھر پہنچے۔ان دنوں لاہور میں چینی ریستوران کی

بھر مار نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی لوگوں کو یہ کھانا زیادہ پسند تھا۔ بہت کم لوگ ان ریستورانوں میں جاتے تھے۔ جن میں اکثریت فلم سے تعلق رکھنے والوں کی تھی اس لیے ریستورانوں کے مالک اور عملہ ہمیں اچھی طرح پہچانتا تھا۔

پہلے رانی کے گھر چائے پی گئی۔ پھر ان کی کار میں بیٹھ کر چینی ریستوران پہنچے۔ رانی کے سوتیلے والد اور ان کے مینجر حق صاحب ڈرائیونگ کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ حق صاحب ایک ناقابلِ فراموش کردار تھے۔ جن کا تذکرہ رانی کے ضمن میں بیان ہوگا۔ یوں تو انہیں کسی چیز کا شوق نہیں تھا مگر رانی کا ہر شوق پورا کرنا وہ اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے۔ انہیں نہ چینی کھانا پسند تھا اور نہ ہی انگریزی فلمیں۔ مگر رانی کی دلجوئی کے خیال سے وہ ہمارے ساتھ تھے۔

ریستوران کا مالک حسبِ معمول ہماری راہ میں آنکھیں بچھا رہا تھا۔ عملہ بھی دوڑ دوڑ کر ہماری فرمائشیں پوری کر رہا تھا۔

ہم دونوں نے اپنی پسندیدہ ڈشز منگائیں۔ بے چارے حق صاحب کا تو وہی معاملہ تھا کہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ جو چیز رانی کو پسند تھی وہ انہیں بھی پسند تھی۔ ہم دونوں کھاتے رہے، وہ محض چکھتے رہے۔

بل بمشکل اٹھارہ انیس روپے تھا۔ اس زمانے میں ایک پلیٹ ڈیڑھ سے سوا دو روپے تک کی ہوتی تھی۔ گویا گرین ٹی اور بیروں کو ٹپ دینے کے بعد کل رقم بیس بائیس روپے سے زیادہ نہیں بنی۔ ذرا سوچئے۔ وہ بھی کیسا زمانہ تھا!

سنیما میں پہنچے تو بہت بڑا باکس ہمارا منتظر تھا۔

ہم دونوں اگلے صوفے پر بیٹھ ئے جس پر پانچ افراد بڑی آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔ حق صاحب نے پچھلے صوفے پر نشست جمائی۔ جب تک فلم کا آغاز ہوتا ہم دونوں فلموں کی باتیں کرتے رہے۔ فلم خاصی دلچسپ تھی لیکن ہوٹنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ جس طرح لوگ پاکستانی فلموں اور ہیروئنوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں اس طرح رانی ہالی ووڈ کی ہیروئن کو نشانہ بنا رہی تھیں۔

ہم نے کہا ”بھئی آپ اس سے اتنی جیلس کیوں ہیں۔ اس کے یہاں آنے اور پاکستانی فلموں میں کام کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے“۔

رانی بولیں۔ ”آفاقی صاحب کچھ پتا نہیں ہے۔ فلم والوں پر برا وقت پڑتا ہے تو وہ سب کچھ کر لیتے ہیں۔ اس کی دو چار فلمیں فلاپ ہو گئیں تو ہو سکتا ہے یہ بھی شباب صاحب کی فلموں میں کام کرنے لاہور آ جائے“۔

انٹرول میں ہم نے پلٹ کر دیکھا تو حق صاحب غائب تھے۔

ہم نے حیران ہو کر پوچھا ''یہ حق صاحب کہاں چلے گئے''۔

رانی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''وہ گاڑی میں جا کر سو گئے ہوں گے''۔

''مگر گاڑی میں کیوں یہیں سو جاتے''۔

بولیں ''فلم کی وجہ سے ان کی نینداور ان کے خراٹوں سے ہماری فلم خراب ہو جاتی، اس لیے وہ گاڑی میں جا کر سو جاتے ہیں''۔

فلم ختم ہوئی تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ کڑاکے کی سردی، اس پر لاہور کی بالکل سنسان سڑکیں۔ گاڑی شبنم میں بھیگی ہوئی تھی اور اس کے شیشوں پر کہر اس طرح پڑی ہوئی تھی جیسے کہ برف پڑی ہو۔ ہم نے شیشے پر دستک دی تو حق صاحب کی محتاط آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

ہم نے شیشے پر سے کہر صاف کی تو انہیں ہمارا چہرہ نظر آیا اور وہ فوراً ہوشیار ہو گئے۔ پہلے انہوں نے ہمیں ماڈل ٹاؤن چھوڑا اور پھر گلبرگ روانہ ہوئے۔ جب تک دوسرے دن رانی کا فون نہیں آ گیا۔ ہم ان لوگوں کی طرف سے فکر مند رہے۔ جرائم کا اس زمانے میں لاہور میں نام و نشان تک نہ تھا مگر لاہور کی سنسان، کہر زدہ سڑکوں پر آدھی رات کے وقت کار کے ذریعے سفر کرنا بجائے خود ایک تشویشناک بات تھی۔

اس طرح جب کمال لاہور میں موجود نہ ہوتے تو ہم رانی بیگم کو کمپنی دیا کرتے تھے۔ بعض اوقات ہم کسی مجبوری یا مصروفیت کے باعث عذر کرتے تو وہ ہمیں ٹوک دیا کرتی تھیں۔ ''آفاقی صاحب! آپ نے کمال صاحب سے وعدہ کیا ہے۔ اس معاہدے کی خلاف ورزی نہیں ہونی چاہیے''۔

اور ہم چپ چاپ سر جھکا دیتے۔

کمال اور رانی کی شادی ہو گی یا نہیں ہو گی؟ قیاس آرائیوں کا یہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا یہاں تک کہ ایک روز کمال کی شادی کی خبر آ گئی۔ یہ خبر دوسروں کی طرح رانی نے بھی سنی۔ اس لیے کہ کمال کی شادی ان سے نہیں کسی اور گھریلو لڑکی سے ہوئی تھی۔ اس طرح کمال کی آزادیوں کا دور ختم ہو گیا۔ شادی کے بعد کمال میں کافی نمایاں تبدیلیاں پیدا

ہوئیں۔ وہ ایک ذمہ دار شوہر اور شفیق باپ کے روپ میں نظر آئے۔ بھابی کی وجہ سے ان میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ کسی زمانے میں وہ کنجوس مشہور تھے۔ وہ اسے کفایت شعاری کا نام دیتے تھے۔ شادی کے بعد ان کی کنجوسی اور کفایت شعاری کچھ کم ہو گئی۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ شادی کے بعد کمال کے نام سے کوئی اسکینڈل منسوب نہیں ہوا۔
لاہور کے ایک قدیم محلے مزنگ کی ایک گلی میں ایک غریب گھرانے میں جنم لینے والی لڑکی کا نام اس کے ماں باپ نے ناصرہ رکھا تو پاس پڑوس والے بھی اس کو نہیں جانتے تھے۔ مگر جب مغنیہ مختار بیگم نے اس لڑکی کو اپنی سرپرستی میں لیا اور اسے ''رانی'' کا نام دیا تو دیکھتے ہی دیکھتے سارا پاکستان اس سے واقف ہو گیا۔

ناصرہ کے والدین نہایت معمولی درجے کے لوگ تھے۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو اس کی ماں نے دوسری شادی کرلی تھی۔ سوتیلا باپ رانی کے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوا۔ ہم نے اس قدر بے لوث، مخلص، دیانت دار، سادگی پسند اور بے نیاز کسی اور ہیروئن کے باپ یا سرپرست کو نہیں دیکھا۔ اس کی زندگی کا مقصد محض رانی کی دیکھ بھال اور اسے خوشیاں فراہم کرنا تھا۔ خود اپنی ذات کے لیے اس نے کبھی اتنی سہولت بھی طلب نہیں کی جتنی کہ ایک معتمد ملازم مانگتا ہے۔ فلمی دنیا میں ایسا کوئی دوسرا شخص نہ ہم نے دیکھا، نہ سنا۔ اس شخص کا نام حق صاحب تھا۔
کمسن ناصرہ کی زندگی میں پہلی تبدیلی اس وقت آئی جب وہ مشہور زمانہ گلوکارہ مختار بیگم کی نگاہوں میں آگئی۔ مختار بیگم آغا حشر کے حوالے سے ایک افسانوی شخصیت بن گئی تھیں۔ آغا صاحب نے ان سے باقاعدہ شادی کی تھی یا نہیں، اس بارے میں کوئی مستند ثبوت موجود نہیں ہے۔ مگر انہیں آغا حشر کی زندگی میں اور آغا حشر کو ان کی زندگی میں جو اہمیت حاصل ہوئی وہ ساری دنیا جانتی ہے۔ آغا حشر نے ان کی آنکھوں کے سامنے جان دی تھی اور پھر اپنی باقی زندگی انہوں نے آغا حشر ہی کے نام کر دی تھی۔
مختار بیگم کی گائیکی کا ایک زمانہ معترف تھا۔ ان کی آواز کا جادو تو آغا حشر جیسے شخص کے سر چڑھ کر بھی بولتا تھا۔ وہ خود گلوکاری سے ریٹائر ہوئیں تو انہوں نے اپنی چھوٹی بہن فریدہ خانم کو گلوکاری کی تربیت دی اور فریدہ خانم نے ایسی دھومیں مچائیں کہ ''ملکہ غزل'' کہلائیں۔ بہت سے لوگ فریدہ خانم کو مختار بیگم کی صاحبزادی سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ مختار بیگم کی چھوٹی بہن تھیں۔

مختار بیگم کی تمنا تھی کہ فریدہ خانم کو ایک کامیاب فلمی ہیروئن بنادیں۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے ایک فلم ''سیلاب'' میں اداکاری بھی کی تھی مگر نہ فلم کامیاب ہوئی، نہ فریدہ خانم، پھر انہوں نے ایک دانائی کا فیصلہ کیا اور اداکاری کا خیال ترک کر کے گائیکی پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ فریدہ خانم نے گلوکارہ کے طور پر بہت بلند مقام حاصل کیا اور اس میدان میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

فریدہ خانم کو عروج تک پہنچانے کے بعد مختار بیگم کے شوق نے نسیم بیگم کی شکل میں ایک اور کھلونا تلاش کیا۔ نسیم بیگم کو مختار بیگم نے موسیقی اور گلوکاری کے فن میں بہت کچھ سکھایا۔ نسیم بیگم نے بھی موسیقی کے شعبے میں بہت نام پیدا کیا۔ اگر وہ جوان العمری میں فوت نہ ہوتیں تو فلم اور موسیقی کی دنیا میں ایک لازوال مقام حاصل کر لیتیں۔ پھر بھی اپنی مختصر سی زندگی میں انہوں نے ڈھیر ساری شہرت سمیٹی۔

حسن طارق صاحب اس زمانے میں ایمی مینوالا کے شوہر تھے۔ اس سے پہلے انہوں نے نگہت سلطانہ سے شادی کی تھی جو کچھ عرصے بعد طلاق پر منتج ہوئی۔ ایمی ایک مثالی بیوی تھیں۔ طارق سے عشق کرتی تھیں۔ یہ شادی انہوں نے اپنی فطرت کے خلاف بہت لڑ جھگڑ کر کی تھی۔ طارق کی وہ پرستش کرتی تھیں۔ ان کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔

طارق صاحب کو ان سے کیا شکایتیں تھیں یہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے۔ مگر دو دن بعد ہم نے طارق صاحب کو ٹیلی فون پر رانی سے گفتگو کرتے ہوئے پایا۔ ٹیلی فون کی گفتگو ملاقات پر ختم ہوئی۔ اور بڑھ کر ملاقاتوں کی شکل اختیار کر گئی۔ طارق صاحب نے سرسری انداز میں ذکر تو کیا مگر ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ رانی سے شادی کر لیں گے۔ اس زمانے میں رانی گلبرگ میں کرائے کی کوٹھی میں رہتی تھیں جو کمال کی کوٹھی کے عقب میں تھی۔

طارق صاحب نے رانی کے گھر آنا جانا شروع کیا تو یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ فلمی دنیا میں ایسی باتیں عشق اور مشک کی طرح ہوتی ہیں۔ زیادہ عرصے درپردہ نہیں رہ سکتیں۔ چنانچہ رانی اور طارق صاحب کے میل جول کی داستانیں بھی فلمی حلقوں میں مشہور ہونے لگیں۔ ایمی مینوالا گھر کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ ہمارے سوا فلم کے لوگوں سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ انہوں نے فلم میں اداکاری چھوڑ دی تھی اور تقریبات سے بھی دور ہی رہتی تھیں۔ اس کے باوجود ایمی کے کانوں تک یہ خبر پہنچ گئی۔

ایک دن ہم ان کے پاس گئے تو انہوں نے سادگی سے کہا ”آفاقی صاحب، کیا طارق صاحب رانی سے ملنے جاتے ہیں“۔
یہ سوال اتنا اچانک تھا کہ ہم گھبرا گئے۔ ہم نے کہا۔ ”ہاں، جاتے تو ہیں، دراصل رانی کو فلموں میں کاسٹ جو کر رہے ہیں“۔
انہوں نے افسردگی سے کہا ”آفاقی صاحب مجھے بہلایئے نہیں۔ سچ سچ بتائیں اصل بات کیا ہے“۔
ہم نے انہیں یقین دلانے کے لیے کہا ”دیکھو ایمی! طارق صاحب رانی سے ملتے ضرور ہیں مگر شادی وادی کی باتیں بالکل غلط ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا“۔ اس وقت تک ہمارا واقعی یہی خیال تھا۔
ایمی نے کہا ”فلم کے لیے اسٹوڈیو میں بھی مل سکتے ہیں مگر وہ رانی کے گھر کیوں جاتے ہیں“۔
ہم نے کہا ”ہر روز تو نہیں جاتے“۔
مگر ایمی نے ایک دن ٹیکسی میں سوار ہو کر گلبرگ کا چکر لگایا تو رانی کے گھر کے سامنے حسن طارق صاحب کی کار کھڑی نظر آ گئی۔ اس طرح ایمی اور حسن طارق کے مابین خلیج وسیع ہوتی رہی یہاں تک کہ علیحدگی ہو گئی۔ ایمی کو ہمارا سمجھانا بجھانا بے کار ہو گیا۔ اس لیے کہ دراصل یہ فیصلہ طارق صاحب کا تھا۔ انہوں نے اس بارے میں ہم سے کبھی بات نہیں کی حالانکہ ایمی سے ان کی شادی کے معاملے میں انہوں نے ہمیں پیش پیش رکھا تھا۔ لیکن ان معاملات میں شکوہ شکایت بیکار ہے کیونکہ شاعر نے کہہ دیا ہے کہ ۔
دل کا معاملہ ہے کوئی دل لگی نہیں
طارق صاحب نے نہ تو ایمی سے علیحدگی سے پہلے ہمیں اعتماد میں لیا اور نہ رانی سے شادی کے بارے میں کبھی بات کی۔
ایک دن انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”آفاقی صاحب میں رانی سے شادی کر رہا ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“
ہم نے کہا ”جو کام کرنے کا آپ نے فیصلہ ہی کر لیا ہے اس کے بارے میں کوئی کیا خیال ظاہر کرے۔ ہم تو دعا ہی کر سکتے ہیں“۔
اس طرح حسن طارق صاحب اور رانی کی شادی ہو گئی۔

رانی ان دنوں نیو مسلم ٹاؤن میں اپنی ذاتی کوٹھی میں رہتی تھیں جس کی سجاوٹ بھی بہت اچھی تھی۔ ہم کئی بار وہاں جا چکے تھے۔اس کوٹھی کو پہلی بار ہم نے اس وقت دیکھا تھا جب اپنی ایک فلم میں رانی کو کاسٹ کرنے کے لیے حق صاحب سے بات کی تھی۔ ہم نے ان سے کم سے کم پچاس دن مانگے تو وہ حیران رہ گئے۔ بولے " آفاقی صاحب اتنی ڈیٹوں کا آپ کیا کریں گے ؟"

ہم نے کہا"شوٹنگ کریں گے اور کیا کریں گے ؟"

وہ ہنسنے لگے "آفاقی صاحب۔یقین کیجئے میں کسی اردو فلم کو پندرہ بیس دن سے زیادہ نہیں دیتا۔اور پنجابی فلمیں تو مفت میں پڑ جاتی ہیں۔آٹھ دس دن کی شوٹنگ میں کام ختم ہو جاتا ہے۔اور پیسے کھرے ہو جاتے ہیں۔آپ کے ساتھ خاص مراسم ہیں۔رانی بیگم نے بھی آپ کے لیے خاص طور پر کہا ہے(وہ رانی کو ہمیشہ رانی بیگم ہی کہا کرتے تھے) مگر اتنے زیادہ دن تو میں نہیں دے سکوں گا"۔

ہم نے کہا"تو پھر اس بات کو جانے دیجئے"۔

'ارے۔آپ تو ناراض ہو گئے۔آیئے رانی بیگم کے پاس چل کر بات کر لیتے ہیں"۔

ہم دونوں رانی کی نو تعمیر کوٹھی پہنچ گئے۔وہاں جانے کا یہ ہمارا پہلا اتفاق تھا۔دوسری چیزیں بھی بیش قیمت تھیں۔ لان میں خوبصورت پھول کھلے ہوئے تھے۔" یہ کوٹھی دیکھی آپ نے" حق صاحب نے کہا۔"یہ پنجابی فلموں کی آمدنی سے بنی ہے"۔

حسن طارق سے ملنے کے لیے ہم اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔چند سال گزر گئے تو رانی نے دبی زبان میں ہم سے شکایت کی کہ طارق صاحب گھر میں رہتے ہی نہیں ہیں۔جب رہتے بھی ہیں تو نہ رہنے کے برابر۔دفتر والے کمرے میں کہانی یا میوزک کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔آپ ذرا انہیں سمجھایئے۔

طارق صاحب سے بات ہوئی تو وہ ہنسنے لگے۔"وہ تو پاگل ہے۔میں اسٹوڈیو کے سوا کہاں جاتا ہوں۔اسٹوڈیو یا گھر ؟"

ہم نے کہا" وہ تو ٹھیک ہے۔مگر رانی کا کہنا یہ ہے کہ آپ بیوی اور گھر کے لیے وقت نہیں نکالتے"۔

"ٹھیک ہے۔اب میں جلدی گھر آجایا کروں گا"۔

مگر طارق صاحب اپنا معمول نہیں بدل سکے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ ان میں علیحدگی ہو گئی۔

رانی ایک بار پھر تنہا ہو گئی۔ مگر تھوڑے ہی عرصے بعد یہ خبر ملی کہ رانی نے میاں جاوید قمر سے شادی کر لی ہے۔ میاں جاوید قمر فیصل آباد کے ایک صنعت کار تھے۔ وہاں ایک سنیما گھر کے مالک تھے۔ فلموں سے ان کا تعلق پرانا تھا۔ ''بابر پکچرز'' کے نام سے انہوں نے لاہور میں ایک فلم تقسیم کار ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ حسن طارق صاحب سے ان کا کاروباری واسطہ خاصا پرانا تھا۔ طارق صاحب کی مشہور اور کامیاب فلمیں بھی خریدیں۔ خود اپنی پنجابی فلمیں بھی بنائیں۔ وہ ایک کامیاب انسان تھے۔ شادی شدہ تھے لیکن ان کے بیوی بچے فیصل آباد میں رہتے تھے۔ لاہور میں کچھ وقت کیلئے انہوں نے شاہ جمال کالونی میں ایک کوٹھی کرائے پر لی تھی۔ ہم سے بھی ان کی خاصی بے تکلفی تھی۔ ان کا تفصیلی حال وقت آنے پر بیان ہو گا۔ فی الوقت رانی کے حوالے سے ان کی اور رانی کی شادی کا قصہ سنئے۔

میاں جاوید سے رانی کی شادی کی خبر اسٹوڈیو میں ملی تھی۔ ہمیں بہت حیرت ہوئی۔ رانی کی شادی پر نہیں بلکہ میاں جاوید کے ساتھ شادی پر۔ وہ حسن طارق کے بہت بڑے مداح تھے اور ان کی خوشنودی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ہم نے ہمیشہ انہیں طارق صاحب کے آگے پیچھے پھرتے ہی دیکھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ طارق صاحب ایک کامیاب ترین فلم ساز اور ہدایت کار تھے اور ان کی فلمیں صرف اور صرف میاں جاوید ہی ریلیز کرتے تھے اور دونوں ہاتھوں سے منافع کما رہے تھے۔ رانی کو انہوں نے ہمیشہ بہت عزت دی۔ طارق صاحب کے گھر پر تو وہ چند بار کاروباری سلسلے میں ہی گئے ہوں گے مگر فلموں کے سیٹ پر کبھی کبھار نظر آ جاتے تھے۔ رانی کو وہ میڈم کہہ کر مخاطب کرتے تھے ہمیں تعجب اس بات پر ہوا کہ انہوں نے طارق صاحب کی سابقہ بیوی سے شادی کر لی اور وہ بھی طارق صاحب سے علیحدگی کے بہت کم عرصہ کے بعد۔

دو تین دن کے بعد ہی ہمیں رانی کا ٹیلی فون موصول ہوا۔

''ہیلو آفاقی صاحب کیا حال ہے؟'' ان کی آواز خوشی سے دمک رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ چپکے چپکے شادی کر لی۔ ہمیں بتایا بھی نہیں''۔

وہ ہنسنے لگیں ’’بس موقع ہی نہیں ملا۔ اچھا سنئے۔ میں ایک فلم بنا رہی ہوں‘‘۔

’’واقعی؟‘‘

’’کیوں کیا میں فلم نہیں بنا سکتی؟‘‘

ہم نے کہا ’’کیوں نہیں بنا سکتیں۔ پہلے بھی طارق صاحب کے ساتھ کئی فلمیں بنائی ہیں‘‘۔

وہ ایک لمحے کیلئے خاموش رہ گئیں۔ پھر کہا ’’اچھا سنئے کیا آج رات میرے گھر آ سکتے ہیں؟‘‘

’’کیا شادی کی دعوت ہے؟‘‘ ہم نے چھیڑا۔

وہ اپنی مخصوص بے پرواہنسی ہنسنے لگیں ’’دعوت بھی مل جائے گی۔ آپ آئیں تو سہی، آپ سے کہانی لکھوانی ہے‘‘۔

اسی رات ہم ان کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ کوٹھی وہی تھی۔ چوکیدار بھی وہی تھا۔ ملازم بھی رانی کا پرانا تھا جس نے دروازہ کھول کر ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ سب کچھ وہی تھا۔ صرف طارق صاحب کی تبدیلی عمل میں آئی تھی۔

ملازم چند منٹ بعد واپس آیا۔ ’’میاں صاحب کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میڈم کہتی ہیں آپ اندر آ جائیں‘‘۔

ہم ملازم کے پیچھے بیڈ روم میں پہنچ گئے۔ بہت وسیع و عریض اور خوبصورتی سے سجا ہوا بیڈ روم تھا۔ ہم کئی بار اس کمرے میں بیٹھ کر گپ شپ کر چکے تھے۔ آخری بار طارق صاحب پر پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تو ہم نے اسی کمرے میں ان کی عیادت کی تھی۔ وہ اسی بیڈ پر دراز تھے اور رانی پریشان پریشان گھوم رہی تھیں۔

’’آفاقی صاحب، آپ ہی انہیں سمجھائیں۔ ڈاکٹر نے پرہیز بتایا ہے اور سگریٹ چھوڑنے کو کہا ہے‘‘۔ انہوں نے طارق صاحب کے ہاتھ سے سگریٹ اور ماچس لیتے ہوئے کہا تھا۔

’’ڈاکٹر تو فیس لینے کیلئے اپنی امپارٹنس جتاتے رہتے ہیں‘‘۔ طارق صاحب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا مگر رانی نے انہیں سگریٹ واپس نہیں دیا۔

آج اسی بیڈ پر میاں جاوید قمر تشریف فرما تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے۔

’’آیئے آفاقی صاحب۔ معاف کرنا۔ مجھے بہت تیز بخار ہے‘‘۔ انہوں نے کہا۔

’’شادی کی خوشی میں بخار چڑھ گیا ہے‘‘۔ ہم نے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگے۔ مگر خوشی ان کے روئیں روئیں سے ٹپک رہی تھی۔ رانی بھی مسرور تھیں۔ ہمارے لیے انہوں نے چائے منگائی۔ پھر مجوزہ فلم کے بارے میں باتیں شروع ہو گئیں۔

کچھ دیر بعد ہم چلے آئے۔ رانی ہمیں برآمدے تک رخصت کرنے آئیں۔ کہنے لگیں۔ ''کل میری ایورنیو اسٹوڈیو میں شوٹنگ ہے۔ آپ وہیں آجانا''۔

ایورنیو میں وہ فلم ساز کے دفتر میں میک اپ کرنے میں مصروف تھیں جب ہماری ان سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے تو شادی کا ذکر نہیں چھیڑا مگر وہ خود ہی تفصیل بتانے لگیں۔ ''میاں صاحب کے گھر والے بہت اچھے ہیں۔ ان کی امی نے مجھے بہت پیار کیا اور منہ دکھائی بھی دی''۔

وہ شادی کے فوراً بعد فیصل آباد جا کر میاں صاحب کے گھر والوں سے بھی مل آئی تھیں۔

''ان کے گھر والوں کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے''۔ انہوں نے کہا: ''میں بھی کبھی کبھی فیصل آباد چلی جایا کروں گی''۔

طارق صاحب کی اور ان کی بچی رابعہ نو عمر تھی۔ وہ زیادہ تر نانی کے پاس ہی رہا کرتی تھی جو کوٹھی کے بالائی حصے میں رہتی تھیں۔ بچی کی پرورش کی طرف سے رانی کو مطلق فکر نہیں تھی۔ بلکہ پوچھئے تو ہم نے رابعہ کو بہت کم

فلم کے بارے میں رانی سے اور میاں جاوید سے چند ملاقاتیں ہوئیں لیکن پھر بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ حسن طارق کے بارے میں صرف ایک بار انہوں نے کہا تھا۔ '' آپ تو جانتے ہیں۔ طارق صاحب کو گھر اور گھر والوں کی عادت نہیں ہے۔ میں نے شادی گھر بنانے کیلئے کی تھی۔ ورنہ کیا فائدہ؟! کیوں ٹھیک ہے نا؟ ''انہوں نے پوچھا۔

ہم سر ہلا کر رہ گئے۔ ہمیں احساس تھا کہ اس معاملے میں وہ دونوں ہی تھوڑے تھوڑے صحیح اور تھوڑے تھوڑے غلط تھے۔ مگر قابل ذکر بات یہ تھی کہ ان دونوں سے ہم ملتے رہے لیکن اس موضوع پر کبھی بات نہیں ہوئی۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان دونوں کی زندگی بالکل نارمل تھی۔ غم و افسوس یا پچھتاوے کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی کے وہ تمام سال جو انہوں نے ایک دوسرے کی رفاقت میں گزارے تھے کبھی تھے ہی نہیں۔

میاں جاوید سے ہماری زیادہ بے تکلفی نہیں تھی اس لیے دوبارہ رانی کے گھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اتنا ہمیں علم تھا کہ میاں جاوید اب رانی کے ساتھ اس کی کوٹھی میں رہتے ہیں۔

کافی وقت گزر گیا۔ نہ رانی نے کبھی فون کیا۔ نہ ان سے ملاقات ہوئی۔ رانی کی عادت بھی نرالی تھی۔ کبھی تو سالوں خبر نہیں لیں گی۔ یا پھر فون آئے گا تو ایک سلسلہ ہی شروع ہو جائے گا۔

پھر ایک دن سنا کہ رانی بیمار ہیں۔

ہمارے ایک عزیز میو اسپتال کے البرٹ وکٹر وارڈ میں زیرِ علاج تھے۔ ایک روز ان کی مزاج پرسی کیلئے گئے تو معلوم ہوا کہ رانی بھی نزدیک ہی ایک کمرے میں زیرِ علاج ہیں۔ سوچا مزاج پرسی کر لیں مگر دروازے پر ''ڈسٹرب نہ کریں'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس لیے واپس لوٹ آئے۔

تیسرے دن ہمارے عزیز کے ایک دوست نے بتایا کہ رانی بہت شدید بیمار ہیں۔ انہیں کینسر ہو گیا ہے۔ ہمارا دل دھک سے رہ گیا۔ ہم نے تو انہیں بالکل تندرست اور تروتازہ دیکھا تھا۔ پھر اچانک یہ موذی مرض کیسے ہو گیا؟

تیسرے ہی دن رانی لندن روانہ ہو گئیں۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ ان سے ملاقات کی مہلت ہی نہ ملی۔ ان کے گھر یا اسپتال جاتے ہوئے جھجک ہوتی تھی۔ اب وہ ہمارے دوست کی نہیں، میاں جاوید قمر کی بیوی تھیں۔

لندن سے خبر ملی کہ رانی کا آپریشن کامیاب ہو گیا اور وہ رو بہ صحت ہیں۔ کینسر کا آپریشن تو ہو گیا تھا مگر وہ ایک نئے مرض میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ جسے ''عشق روگ'' کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ خود رانی نے ہمیں یہ داستان سنائی تھی۔

رانی کی زندگی میں ایسے واقعے پیش آئے تھے جیسے کہ عموماً فلمی کہانیوں میں رونما ہوتے ہین۔ مختصر یہ کہ جب وہ بیمار ہوئیں تو ان کے بیان کے مطابق میاں جاوید نے ایک آدھ بار رسمی طور پر خبر لینے کے علاوہ کوئی توجہ نہیں دی۔ یہاں تک کہ اسپتال کا رخ تک نہ کیا۔ رانی کیلئے یہ المناک صدمہ تھا۔ ایک طرف کینسر جیسا جان لیوا مرض، دوسری طرف شوہر کی بے اعتنائی بلکہ بے تعلقی اور بے وفائی۔ کوئی اور عورت ہوتی تو ہمت ہار دیتی مگر رانی نے حوصلہ قائم رکھا۔ میاں جاوید نے تو پلٹ کر خبر تک نہیں لی مگر کچھ سہیلیاں کام آئیں۔ سب سے بڑھ کر حق صاحب نے ہمت بندھائی۔ فوری

طور پر تمام انتظامات مکمل ہو گئے اور رانی لندن روانہ ہو گئیں۔

فضائی سفر میں رانی کو ایک ہمدرد اور غم گسار مل گیا۔ یہ کرکٹر سرفراز نواز تھے۔ انہوں نے نہ صرف دیکھ بھال کی بلکہ لندن پہنچ کر عملی طور پر بھی مدد کی۔ رانی کو اسپتال میں داخل کرانے میں ہاتھ بٹایا۔ اس کی دلجوئی کرتے رہے۔ جب ان کا آپریشن ہوا تو سرفراز نواز اسپتال میں موجود تھے۔ قدرت مہربان تھی اس لیے رانی تیزی سے روبہ صحت ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئیں۔ سرفراز نواز کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ جب تک رانی لندن میں رہیں سرفراز ان کے ساتھ رہے۔ انہیں سیر و تفریح کراتے رہے۔ جب رانی لندن سے لاہور کیلئے پی آئی اے کے طیارے میں سوار ہوئیں تو سرفراز نواز انہیں الوداع کہنے کیلئے ہیتھرو ائرپورٹ پر موجود تھے۔ لندن جاتے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے کیلئے اجنبی تھے۔ غائبانہ طور پر ایک دوسرے سے واقف تھے لیکن پھر بھی ناواقف تھے۔ لیکن جب رانی لاہور کیلئے روانہ ہوئیں تو شادی کے عہد و پیمان ہو چکے تھے۔

رانی نے ہم سے کہا ”میاں صاحب کو تو یہ امید ہی نہیں تھی کہ میں زندہ بچوں گی۔ ان کے خیال میں تو میں چند روز کی مہمان تھی۔ جب صحت مند ہو کر واپس آئی تو انہوں نے ٹیلی فون کیا مگر میں نے جواب میں صرف ایک بات کہی ”ہم دونوں اب ساتھ نہیں رہ سکتے۔ مجھے طلاق چاہیے“۔

میاں صاحب کے پاس یہ مطالبہ مسترد کرنے کیلئے کوئی معقول دلیل نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے چپ چاپ رانی کا مطالبہ مان لیا۔ رانی اور میاں جاوید قمر کے راستے جدا ہو گئے۔ میاں صاحب تو پہلے ہی ایک گھریلو بیوی کے شوہر تھے۔ ان کے بچے بڑے ہو رہے تھے اور ان کے کاروبار میں شریک ہو کر ان کا ہاتھ بھی بٹا رہے تھے۔ مگر رانی ایک بار پھر تنہا ہو گئی۔

رانی لندن سے واپس لوٹیں تو انہیں فون کیا۔ دوسری جانب وہ کھنکتی ہوئی خوش و خرم آواز سنائی دے رہی تھی ”آفاقی صاحب اللہ نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں نے دوسرا جنم لیا ہے“۔

ہم نے کہا ”پہلے جنم کے لوگوں کو پہچانتی ہو؟“

وہ ہنسنے لگیں ”خوب اچھی طرح۔ آپ ابھی آجایئے“۔

رانی کی کوٹھی پر وہی پرانا عملہ موجود تھا۔اندر وہ خوش رنگ شلوار قمیص میں ملبوس،خوشبو میں مہکی ہوئی مسکرا رہی تھیں۔

''کیوں،یقین نہیں آیا کہ میں زندہ ہوں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''بالکل آگیا۔کیونکہ کوئی روح کم از کم میک اپ تو نہیں کر سکتی''۔

رانی نے اپنی بیماری اور علاج کے قصے سنانے شروع کر دیئے۔میاں صاحب سے وہ بہت شاکی تھی ''آفاقی صاحب! کتنے افسوس کی بات ہے،اس شخص نے تو لندن ایک فون تک نہیں کیا۔انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ بس یہ اللہ کو پیاری ہو گئی''۔

ہم نے پوچھا ''مگر یہ سرفراز نواز کی کیا خبریں ہیں؟''

وہ ہنسنے لگیں ''میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ سرفراز نے میری کتنی مدد کی ہے۔ کتنی خدمت کی ہے۔اگر سرفراز وہاں نہ ہوتے تو شاید میں آج آپ کے سامنے نہ ہوتی''۔

ہم رانی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ ہستی کینسر جیسے موذی اور خطرناک مرض کو شکست دے کر آئی ہے۔اور تو اور ان کے چہرے پر بیماری یا کمزوری کے آثار بھی نہیں تھے۔جسم ان کا ہمیشہ کی طرح دبلا پتلا اور متناسب تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' رانی نے چائے بناتے ہوئے پوچھا۔

ہم نے کہا ''یقین نہیں آتا کہ آپ بیمار تھیں۔مجھے تو یہ سب ڈراما ہی لگتا ہے''۔

''کس بات کا؟''

''میاں صاحب سے علیحدہ ہو کر سرفراز سے شادی کرنے کا ڈراما''۔

''آپ بہت چالاک ہیں'' وہ حسبِ معمول مسکراتی رہیں۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں،ان کا فلموں میں اداکاری کا ارادہ بھی تھا۔

''مگر میں اوٹ پٹانگ پنجابی فلموں میں تو کام نہیں کروں گی۔کوئی اچھا سا کردار ملا تو ضرور کروں گی''۔

کچھ دن بعد سرفراز نواز لاہور آ گئے۔ پھر معلوم ہوا کہ ان کی اور رانی کی شادی ہو گئی ہے اور وہ رانی ہی کی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ مگر دوسری کوٹھی میں۔ رانی نے پہلی کوٹھی سے کچھ فاصلے پر، وحدت روڈ پر ایک نہایت شاندار کوٹھی تعمیر کرالی تھی۔ اس کی آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ پیسہ اور ذوق رانی کا تھا اور نگرانی اور تجربہ حق صاحب کا۔

ہمیں کافی عرصے بعد اس کوٹھی میں قدم رکھنے کا موقع ملا۔ رانی نے ہمیں شادی میں بھی نہیں بلایا۔ نہ ہی کبھی ہمارا اس طرف جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سرفراز نواز اور ہم ایک دوسرے کیلئے اجنبی تھے۔ ایک دو بار آمنا سامنا ہونے کے علاوہ ہمارے درمیان کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

کافی عرصہ گزر گیا۔ رانی ایک بار ایورنیو اسٹوڈیو میں ملیں۔ بے حد اسمارٹ، شگفتہ اور خوبصورت نظر آ رہی تھیں۔ وہ باقاعدگی سے ہر سال طبّی معائنہ کرانے کیلئے لندن جاتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وقت تھم گیا ہے۔ رانی کی عمر وہیں منجمد ہو کر رہ گئی ہے۔

سرفراز نواز نے صوبائی انتخابات میں حصہ لیا تو رانی نے ایسے زور شور سے انتخابی مہم چلائی کہ لوگ دیکھتے رہ گئے۔ مزنگ توان کا آبائی محلّہ تھا۔ مگر لاہور کے دوسرے علاقوں میں بھی وہ گھر گھر گئیں۔ دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر داخل ہو گئیں۔ گھریلو عورتیں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی تھیں کہ ان کے سامنے ایکٹریس رانی کھڑی ہے۔ وہ بہت بے تکلفی سے ان میں گھل مل جاتیں۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتیں اور سرفراز کو ووٹ دینے کا وعدہ لیتیں۔

''آپ فکر ہی نہ کریں۔ ہمارا ووٹ تو آپ کا ہو گیا''۔

''مگر اپنے ان کا ووٹ بھی سرفراز صاحب کو دلانا''۔ وہ مسکرا کر کہتیں۔

سرفراز نواز خاصی اکثریت سے انتخاب میں کامیاب ہو کر ایم پی اے بن گئے تو رانی کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ گھر میں سیاست دانوں، بیوروکریٹس اور بڑے لوگوں کا آنا جانا ہو گیا۔ وہ سیاسی اور سرکاری تقاریب میں شرکت کرنے لگیں۔ بڑے لوگوں کی پارٹیوں میں نظر آنے لگیں۔ اس طرح رانی کے ملاقاتیوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا۔ انہیں سیاست کا ایسا مزا پڑا کہ خود بھی سیاست میں حصہ لینے کا پروگرام بنانے لگیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرفراز نواز کی

کامیابی میں رانی کی کوشش اور مقبولیت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وہ اپنے طور پر خود اپنے لیے مہم چلا کر بھی انتخاب جیت سکتی تھیں۔ مگر سیاست رانی کا میدان نہیں تھا۔ بعض انگریزی اخبارات کی صحافی خواتین نے انہیں میگزین نکالنے کا مشورہ دیا تھا اس سلسلے میں انہیں ہماری یاد آگئی۔

ایک دن دفتر میں پیغام ملا کہ ایک خاتون کا فون آیا تھا۔ انہوں نے اپنا نام نہیں بتایا صرف اپنا ٹیلی فون نمبر چھوڑا ہے۔ ہم نے فون کیا تو دوسری طرف رانی بول رہی تھیں۔ پہلے تو شکوہ شکایت کا دور چلا۔ آپ تو بھول ہی گئے۔ کبھی فون تک نہیں کیا وغیرہ وغیرہ۔

''آپ کہئے، کیسے یاد کیا؟'' ہم نے پوچھا۔

''آپ آج شام کو میرے ساتھ چائے پئیں، گھر تو دیکھا ہے نا؟''

''کیوں نہیں۔ خوب اچھی طرح دیکھا ہے''۔

وہ ہنسنے لگیں۔ ''آپ کو پتا بھی ہے۔ میں نئے گھر میں شفٹ ہو گئی ہوں''۔ پھر انہوں نے اپنا پتا بتایا۔ بہت آسان پتا تھا۔ شام کو ہم ان کے گھر گئے۔ بڑا مضبوط اور شاندار دروازہ تھا۔ پہلے ایک چوکیدار آیا پھر دوسرا ملازم آیا پھر اندر سے تیسرا پرانا ملازم نمودار ہوا۔ فوراً گیٹ کھل گیا۔ اندر گئے تو ایک خوبصورت کوٹھی ہمارے سامنے تھی۔ دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ لان بے حد سرسبز اور پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ کوٹھی کے اندر قدم رکھا تو وہاں بھی زیبائش و آرائش بہت خوب تھی۔ دولت اور خوش مذاقی در و دیوار سے ٹپک رہی تھی۔ ملازم نے ہمیں لاؤنج میں لے جا کر بٹھا دیا۔ یہ لاؤنج گنجائش اور سجاوٹ کے اعتبار سے ڈرائنگ روم پر بھی بھاری تھا۔ چند منٹ بعد رانی آف وہائٹ شلوار قمیص میں ملبوس اندر داخل ہوئیں۔ اسی طرح مسکراتی ہوئی۔ دیکھنے میں بھی تندرست اور فٹ لگ رہی تھیں۔

''ادھر ڈرائنگ روم میں سرفراز کے پاس لوگ بیٹھے ہیں، اس لیے میں نے آپ کو لاؤنج میں بلا لیا''۔

ہم نے کہا ''بہت مہربانی۔ ورنہ آپ سرونٹ کوارٹر میں بھی بٹھاتیں تو خوشی سے بیٹھ جاتے''۔

کچھ دیر ایک دوسرے کا احوال پوچھا گیا۔ تھوڑی سی ہوٹنگ ہوئی چائے کی ٹرالی اندر آئی تو وہ موضوع پر آگئیں۔ انہیں ایک میگزین نکالنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ میں نے کہا ''کہ میرے ایڈوائزر تو آفاقی صاحب ہیں۔ ان سے پوچھوں گی''۔

ہم نے کہا ''اچھا ہوا کہ پوچھ لیا۔اب آئندہ نہ پوچھنا''۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ یہ کام آپ کے بس کا نہیں ہے۔ کبھی بھول کر بھی یہ ارادہ نہ کرنا''۔

''ٹھیک ہے'' انہوں نے تفصیل دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔''اچھا! فلم بناؤں کہ نہیں؟سب لوگ کہتے ہیں کہ یہ فلم بنانے کا بہترین موقع ہے''۔

''بالکل نہیں۔یہ حماقت نہ کرنا''۔

''تو پھر کیا کروں؟''

''بھئی آرام سے گھر میں بیٹھو۔بہت کام کیا ہے۔اب آرام کرو، عیش کرو''۔

''اللہ کا بہت فضل ہے۔واقعی اب میں عیش کر رہی ہوں۔اچھا اگر ٹی وی میں اچھا رول مل جائے تو کر لوں؟''

ہم نے کہا''اب اتنی زیادہ سعادت مند بننے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بھئی آپ خود سمجھ دار ہیں۔اپنے سارے فیصلے خود ہی کرتی ہیں''۔

چلتے وقت وہ بولیں ''اچھا۔اب ادھر کا راستہ نہ بھول جانا۔اور بھابھی کو بھی لے کر آنا''۔

اسی زمانے میں ہم نے فیملی میگزین کیلئے رانی اور سرفراز نواز کا فیملی فیچر بنانے کا ارادہ کیا۔

''سرفراز سے پوچھ کر بتاؤں گی۔پتا نہیں وہ تصویر بنوانا پسند کریں یا نہیں؟''

اس ملاقات میں ہماری بیگم اور بچیاں بھی ساتھ تھیں ''ماشاءاللہ۔کتنی بڑی ہو گئی ہیں''۔

ہم نے کہا''اب ذرا اپنی بیٹی کی شکل بھی دکھا دیں''۔

وہ ہنسنے لگیں۔رابعہ نزدیک ہی پرانی کوٹھی میں اپنی نانی کے ساتھ رہتی تھیں۔ نیشنل کالج آف آرٹس کی طالبہ تھی۔ہم نے اسے کافی عرصے کے بعد دیکھا۔وہ تو بالکل بدل گئی تھی۔نہایت شائستہ، سمجھ دار اور سنجیدہ ہو گئی تھی۔

ہم نے کہا''رابعہ کی تصویر بھی بنے گی''۔

''ارے نہیں آفاقی صاحب۔رابعہ کو میں نے اخباروں، فلم اور پبلسٹی سے دور ہی رکھا ہے۔آپ تو جانتے ہیں یہ دنیا

شریفوں کی نہیں اور میں اپنی بیٹی کو شرافت کی زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھانا چاہتی ہوں'' انکی بات سن کر میں حیران ہوا اور سرفراز نواز جو اندر کمرے میں آئے تھے ان کا منہ تکنے لگا۔ رانی میں یہ تبدیلی غالباً انکی وجہ سے تھی۔

ہم نے کہا'' بھئی یہ فیملی فیچر ہے۔ مطلب یہ کہ فیملی کے سارے ممبر اس میں نظر آنے چاہئیں''۔

رانی مان گئیں۔ یہ غالباً سرفراز نواز اور رابعہ کے ساتھ ان کا پہلا انٹرویو تھا۔ یکجا تصویریں بھی پہلی بار ہی شائع ہوئی تھیں۔ سرورق پر ان کی اور سرفراز نواز کی تصویر شائع ہوئی تو سب حیران رہ گئے۔ کافی عرصے بعد لوگوں نے رانی کی تازہ ترین تصاویر دیکھی تھیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے تھے کہ وہ پہلے ہی کی طرح جوان اور شاداب نظر آرہی تھیں۔

''رانی تو اپنی بیٹی کی بہن لگ رہی ہے''۔

جب ہم نے یہ تبصرہ رانی کو سنایا تو وہ بہت خوش ہوئیں۔

رانی نے جب ٹیلی ویژن سیریل میں کام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمیں بھی بتایا، بولیں ''میں آپ کو اسکرپٹ سنواؤں گی''۔

ہم نے کہا''بس رہنے دیں۔ خود ہی فیصلہ کریں اور سیریل کا اسکرپٹ تو ساتھ کے ساتھ ہی لکھا جاتا ہے''۔

انہوں نے ''خواہش'' اور ''فریب'' میں کام کیا تو ان کے مداحوں کو بہت خوش گوار حیرت ہوئی۔ ان کی عمر اور ان کے ساتھ کی ہیروئنیں فلموں میں ماؤں کے کردار کر رہی تھیں۔ بے ڈول اور بدزیب ہو چکی تھیں مگر رانی کی بات ہی اور تھی۔ ان سیریز کے بعد انہوں نے بذاتِ خود ایک ٹیلی ویژن سیریل بنانے کا منصوبہ بنایا۔

ایک دن ان کا فون آیا'' آفاقی صاحب۔ میں اسکرپٹ لکھوانے کراچی جارہی ہوں۔ ایسی سیریل بناؤں گی کہ لوگ یاد رکھیں گے''۔

کراچی جانے سے پہلے ایک رات ان کا فون آیا۔ وہ کسی پارٹی سے بول رہی تھیں ''میں آپ کے گھر گئی تھی مگر وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے؟''

''بھئی آپ بتا کر آتیں تو ہم استقبال کیلئے تیار ملتے''۔

''پرسوں کراچی جارہی ہوں۔اب تو واپس آکر ہی ملاقات ہوگی اور دیکھیں چائنیز کھانا آپ کی طرف ادھار ہے''۔
چائنیز کھانا آج تک ہماری طرف ادھار ہی ہے۔اس لیے کہ رانی کراچی سے زندہ سلامت واپس نہیں آئیں۔وہاں اچانک انہیں معمولی سی تکلیف ہوئی اسپتال میں داخل ہوئیں تو معلوم ہوا کہ کینسر ہے۔اس بار وہ چند دن کے اندر ہی چٹ پٹ ہو گئیں۔یقین نہیں آتا کہ زندگی سے بھرپور ہنستی بولتی ہستی یوں اچانک ہی دنیا سے رخصت ہو گئی ہے۔

رشدی صاحب نے گہرے سرخ اور نیلے رنگ کے گرم کپڑے کا کوٹ پہن رکھا تھا۔اس زمانے میں خواتین عموماً ایسے ہی کپڑے کے اوور کوٹ استعمال کیا کرتی تھیں۔رشدی سامنے والی میز کے سامنے سے گزرے تو کسی نے ان کے کوٹ پر پھبتی کسی۔''بہت خوب،زنانہ کپڑا پہن کر زنانے ہی لگتے ہیں''۔

رشدی صاحب کو ہم نے ہمیشہ صلح کل ہی پایا۔انہیں کبھی کسی سے جھگڑا کرتے ہوئے تو کیا اونچی آواز سے بولتے بھی نہیں دیکھا تھا۔مگر اس روز وہ خدا جانے کس موڈ میں تھے۔ میز کے سامنے رک گئے اور کہنے لگے ''یہ کیا بد تمیزی ہے''۔

ان میں سے ایک تنومند آدمی اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے رشدی صاحب کے کوٹ کا کالر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور کہا''اوئے کیا بکواس کرتا ہے؟''
اتنی دیر میں ہم لوگوں کی توجہ بھی اس طرف چلی گئی۔سب سے پہلے محمد علی بہت تیزی سے میز کی جانب گئے اور جن صاحب نے رشدی کا کالر پکڑا تھا ان کے شانے کو تھپکا وہ مڑے تو محمد علی نے اپنی گرج دار آواز میں پوچھا''کیا بات ہے؟''
بس اتنا پوچھنا ہی قیامت ہو گیا۔دوسرے لمحے ہم نے یہ دیکھا کہ اس شخص نے رشدی کا کالر چھوڑ کر محمد علی کو ایک مکا رسید کر دیا۔ابھی وہ اس اچانک اور غیر متوقع حملے سے سنبھلنے نہیں پائے تھے کہ باقی تینوں حضرات بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور محمد علی پر پل پڑے۔محمد علی ہکا بکا رہ گئے۔ دفاع میں اپنا ہاتھ تک نہ اٹھا سکے۔مگر چار مضبوط ہٹے کٹے لوگوں کے مکوں کی لپیٹ میں رشدی صاحب بھی آ گئے۔

ہم دونوں، یعنی حمایت علی شاعر اور ہم فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کران کی طرف بڑھے۔ اتنی دیر میں ہم نے پہچان لیا کہ حملہ آوروں میں ایک صاحب حسنہ کے شوہر رشید بھٹی بھی ہیں۔ غالباً وہ محمد علی ہی کی تاک میں تھے۔ ہم ان لوگوں کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ محمد علی قالین پر سے اٹھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی ناک سے خون جاری ہو گیا تھا۔ ہوٹل کے سب لوگ دم سادھے دیکھ رہے تھے۔ محمد علی نے سر کو جھٹکا تو خون کے چھینٹے ان کے لباس پر پڑے۔ انہوں نے ایک نظر اپنے خون کو دیکھا اور جوش میں آکر فوراً کھڑے ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان چاروں پر پل پڑے اور ایک فلمی منظر شروع ہو گیا اور ہم نے حقیقی زندگی میں پہلی اور آخری بار محمد علی کو سچ مچ کے ہیرو کی طرح لڑتے ہوئے دیکھا وہ چار تھے اور خوب مضبوط تھے۔ پھر بھی محمد علی ان کے قابو میں نہیں آرہے تھے۔ ہم گھبرا کر آگے بڑھے اور رشید بھٹی کا بازو پکڑ کر کہا" بھٹی صاحب یہ کیا کرتے ہو رک جاؤ"۔

بھٹی صاحب نے پلٹ کر ہمیں دیکھا۔ وہ ہمیں بخوبی جانتے تھے اس وقت جوش اور غصے میں وہ ہماری بھی مرمت کر دیتے تو کچھ بعید نہ تھا۔ مگر ان کی شرافت دیکھئے کہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئے مگر باقی تین حضرات محمد علی کو قابو میں کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ہم نے دوسرے صاحب کے مضبوط بازو کو بڑی مشکل سے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر ان سے کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہو۔ بند کرو یہ تماشا"۔

ان صاحب نے خون آلود نگاہوں سے ہمیں دیکھا۔ پتہ نہیں وہ ہم سے واقف تھے یا نہیں۔ کم از کم ہم تو ان سے ناواقف تھے۔ مگر غنیمت ہے کہ انہوں نے بھی اپنا ہاتھ روک لیا۔ مگر ہم نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ اس اثنا میں رشید بھٹی صاحب دوبارہ محمد علی پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ اب یہ تماشا ہو رہا تھا کہ ہم جس شخص کو روکتے وہ رک جاتا مگر دوسرے تین حضرات مصروف جنگ رہتے۔ حمایت علی شاعر بھی ہماری طرح مرنجان مرنج آدمی ہیں۔ بلکہ ہم سے بھی گئے گزرے ہیں۔ انہوں نے تو اس گھمسان کے رن میں آگے بڑھ کر کسی جنگجو کو روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ البتہ وہ پہلے تو ریستوران سے باہر نکل کر مال روڈ پر پکارتے رہے۔ "پولیس پولیس.... مدد کی ضرورت ہے"۔

مگر اس سناٹے میں ان کی نرم آواز کون سنتا۔ مایوس ہو کر وہ ریستوران کے پچھلے دروازے سے باہر نکلے اور گلی میں جا کر یہی مصرح دہراتے رہے۔ "پولیس۔ پولیس.... مدد کی ضرورت ہے"۔

مگر توبہ کیجئے۔ نہ پولیس آئی۔ نہ ہی کسی محلے والے نے جھانک کر دیکھا۔

ادھر ریستوران کے اندر یہ منظر تھا کہ باقی سارے مہمان بھاگ گئے تھے۔ پہلے تو بیرے، خانسامہ دور کھڑے دیکھتے رہے مگر جب ان تمام لڑنے والوں نے ایک دوسرے کو برتن، گلدان، راکھدان اور کرسیاں اٹھا اٹھا کر مارنی شروع کر دیں تو تمام بیرے بھی دھپ دھپ کرتے ہوئے بھاگے اور باورچی خانے میں پناہ گزین ہو گئے۔ مینجر صاحب اپنی جگہ پر موجود تھے مگر کاؤنٹر کے پیچھے سر جھکائے اور سہمے کھڑے تھ۔ ریستوران کے ہال میں پلیٹیں، چمچے، کانٹے اور دوسرے برتن بڑی فراخدلی سے ادھر سے ادھر پھینکے جا رہے تھے۔ ایک قیامت کا سماں تھا بلکہ کسی فلم کا سماں تھا۔

اس ہنگامے کے دوران میں ہم نے صرف آغاز میں رشدی صاحب کو دیکھا۔ وہ میزوں کے نیچے گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے جا رہے تھے اس کے بعد ان کا خیال نہ رہا۔

محمد علی نے حریفوں کی اکثریت کے باوجود ان کی خوب پٹائی کی۔ آخری منظر یہ تھا کہ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں چھری اور کانٹا سنبھالا ہوا تھا اور حریف دروازے کی طرف پسپا ہو رہے تھے۔ وہ تو ان کا پیچھا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر حمایت صاحب نے اور ہم نے انہیں زبردستی روک دیا۔ وہ اس طرح کہ ان کے ایک بازو سے حمایت علی شاعر لٹک گئے اور دوسرے سے ہم۔ ساتھ میں ہم دونوں انہیں پچکارتے بھی رہے۔

''محمد علی۔ بس کرو۔ جانے دو غصہ تھوک دو'' وغیرہ وغیرہ۔

خدا خدا کر کے محمد علی کا جوش و خروش کم ہوا۔ اب دیکھا تو ان کی ناک سے بہنے والے خون سے ان کا لباس سرخ ہو گیا۔ تھا۔ بال کھڑے ہوئے تھے۔ عجیب حلیہ تھا۔ بس ویسا جیسا کہ فلموں میں جنگ و جدل کے مناظر کے بعد ہیرو کا ہوتا ہے۔

اتنی دیر میں ہوٹل کے بیرے بھی ایک ایک کر کے واپس آ گئے تھے اور حیرانی اور ستائش سے محمد علی کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے حقیقی زندگی میں بھی ایک جنگجو ہیرو کا کردار ادا کر کے سب کا دل موہ لیا تھا۔

''سر جی۔ آپ نے تو کمال کر دیا''۔

مینجر صاحب نے بھی کاؤنٹر کے نیچے سے سر نکالا اور آواز لگائی ''پانی کا گلاس لے کر آؤ۔ بلکہ جگ لے آؤ۔ جلدی کرو''۔

تین چار بیرے ان کے حکم کی تعمیل میں لگ گئے۔ باقی ریستوران میں ٹوٹی پھوٹی پلیٹیں اور برتن سمیٹنے میں مصروف ہو گئے۔ ہم دونوں محمد علی کو سمجھا بجھا کر غسل خانے میں لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ وہ خدا جانے زیرلب کیا کہہ رہے تھے۔ بس اتنا سمجھے کہ ''بزدلوں'' کو برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ ہم نے اور حمایت علی شاعر نے ان کا منہ دھلایا۔ چہرے سے خون صاف کیا۔ ہم تولیے سے ان کا لباس صاف کرتے رہے۔

ابھی ہم غسل خانے سے باہر نکلے تھے کہ یکایک باہر سے پھر بھاگ دوڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے بعد کسی نے کہا ''بھاگو وہ پستول لے کر آئے ہیں''۔

ہم سمجھ گئے کہ کس کا تذکرہ ہے۔ پستول اس زمانے میں اتنی عام چیز نہیں تھی۔ اس وقت تو لوگ چاقو اور خنجر سے ڈر جاتے تھے۔

محمد علی نے منہ دھوتے ہوئے یہ آواز سنی تو جھرجھری لے کر کھڑے ہو گئے اور چلے غسل خانے سے باہر کی طرف۔

ہم دونوں نے انہیں پکڑ لیا۔ ''محمد علی کیا کرتے ہو۔ سنا نہیں وہ پستول لے کر آئے ہیں''۔

''ان کی تو ایسی کی تیسی۔ سمجھتے کیا ہیں'' یہ کہہ کر انہوں نے اپنے دونوں بازو جھٹکے اور ہم دونوں جو محمد علی کے بازوؤں سے لپٹے ہوئے تھے مکھیوں کی طرح دیوار سے جا کر ٹکرائے۔ محمد علی اتنی دیر میں غسل خانے سے باہر نکل گئے تھے۔

ہم دونوں بھی فوراً باہر نکلے۔ ریستوران بالکل خالی پڑا تھا۔ مین دروازے کے سامنے سے چار قد آور آدمی اندر داخل ہو رہے تھ۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔

محمد علی نے چوکنا ہو کر چاروں طرف دیکھا اور پھر تیزی سے باورچی خانے کی طرف لپکے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ ان کے باقی ماندہ تینوں ساتھی بھی ریستوران کے اندر آ گئے تھے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ریستوران کے ایک جانب وہ تھے اور دوسری جانب ہم دونوں، محمد علی غائب ہو چکے تھے۔

ہم نے بڑی سہمی ہوئی آواز میں کہا ''بھٹی صاحب۔ یہ کیا حرکت ہے۔ باز آ جاؤ''۔

مگر وہ سب مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ ہم لپک کر باورچی خانے کی طرف گئے جہاں محمد علی کسی موزوں ہتھیار کی تلاش میں تھے۔

یکایک ان کی نظر سبزی ترکاری یا گوشت کاٹنے والی ایک دس بارہ انچ لمبی چھری پر پڑی اور انہوں نے لپک کر وہ چھری اٹھالی اور چلے باہر کی طرف۔

ہم پھر ان کے بازو سے لٹک گئے۔ ''محمد علی۔ کیا کرتے ہو''!

انہوں نے ایک جھٹکے میں ہمیں دور پھینک دیا اور بالکل فلمی لہجے میں رعب سے بولے ''ہٹ جاؤ''۔

یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف چل دیے۔ ہم ان کے پیچھے دوڑے۔

ریستوران میں کسی امریکی ویسٹرن کاؤبوائے فلم والا سین نظر آرہا تھا۔ یعنی ریستوران کے دروازے کی جانب سے چار خوفناک آدمی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے اور دوسری جانب ہمارا ہیرو لمبی سی چھری ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ ایک حملہ آور کے ہاتھ میں پستول بھی تھا جسے وہ بڑے ڈرامائی انداز میں گھمار ہا تھا۔

ہم نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ حمایت علی شاعر بھی نظر نہ آئے۔ شاید وہ ایک بار پھر ''پولیس۔ پولیس.... مدد کی ضرورت ہے''۔ پکارنے کیلئے پچھلی گلی میں نکل گئے تھے۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اتنا ہم جان گئے کہ نہ تو محمد علی پیچھے ہٹیں گے اور نہ ہی حملہ آور باز آئیں گے۔ یہ تصور کر کے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ وہ محمد علی کو گولی مار دیں گے اور ہم کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ ریستوران کے اوپر والی منزل میں پہنچا جائیں تاکہ یہ دلدوز منظر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پیر کانپ رہے تھ۔ ہم نے دونوں کانوں میں انگلیاں دے رکھی تھیں۔ آنکھیں بند تھیں اور فوری طور پر جو بھی دعائیں یاد آرہی تھیں، پڑھ رہے تھے۔ بس ہر لمحے یہ ڈر تھا کہ کسی بھی لمحے گولی کی آواز آئے گی اور....

چند لمحے بالکل خاموشی طاری رہی۔ ہمارے دل کی دھڑکن کے سوا کوئی اور آواز نہیں تھی۔ کچھ دیر گزر گئی اور گولی کی آواز نہیں سنائی دی تو ہم نے حیران ہو کر آنکھیں کھول دیں۔ چاروں طرف دیکھا پھر سیڑھیاں اتر کر نیچے ہال کی طرف چلے۔

آخری سیڑھی پر پہنچے تو ہمیں ایک عجیب منظر نظر آیا محمد علی وہی لمبی سی چھری ہاتھ میں تھامے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے اور وہ سب حضرات الٹے قدموں دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ ہمارے دکھتے ہی وہ چاروں ریستوران

سے باہر نکلے اور کار میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔

ہم جذباتی ہو کر بے اختیار محمد علی سے لپٹ گئے۔ ان کی نگاہیں بدستور کسی چوکنا شکاری کی طرح دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ یکایک حمایت علی شاعر بھی کہیں سے نمودار ہو گئے۔انہوں نے بتایا کہ وہ" پولیس پولیس" پکارنے باہر گلی میں گئے ہوئے تھے۔

سب سے پہلے مینجر صاحب پانی کا ایک گلاس لیے ہوئے برآمد ہوئے ان کے بعد دوسرے بیرے بھی آ گئے۔ وہ سب کے سب حیرت اور بے یقینی سے محمد علی کو دیکھ رہے تھے۔ہماری طرح انہیں بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک نہتے شخص نے چار حملہ آوروں کو پسپا کر دیا ہے جب کہ ان کے پاس پستول بھی تھا بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ لوگ دراصل محمد علی کو جان سے نہیں مارنا چاہتے تھے۔ محض دھمکا کر اپنے ساتھ لے جانے کے خواہش مند تھے۔تاکہ گھر لے جا کر ان کی خوب ٹھکائی کی جائے۔ مگر محمد علی ان کی توقعات سے زیادہ جری اور بے جگر نکلے۔ان کو یہ پتا چل گیا تھا کہ محمد علی پر شدید مزاحمت کے بغیر قابو نہیں پایا جا سکتا اور اس کوشش میں وہ زخمی بھی ہو سکتے ہیں۔

ہم نے چاروں طرف دیکھا۔رشدی صاحب کا کوئی پتا نشان نہیں تھا۔بیروں سے پوچھا تو انہوں نے بھی لاعلمی ظاہر کر دی۔اب ہم چاہتے تھے کہ وقت ضائع کیے بغیر اپنے ہوٹل واپس پہنچ جائیں چونکہ ڈر تھا کہ وہ لوگ کہیں مزید امداد حاصل کر کے واپس نہ آ جائیں۔ شکر ہے کہ محمد علی صاحب کے دماغ میں بھی یہ بات آ گئی اور وہ رضامند ہو گئے۔

ہم تینوں ریستوران سے باہر نکلے تو سب کے سب مسلح تھے محمد علی کے ہاتھ میں وہی لمبی سی چھری تھی۔حمایت علی شاعر کو باورچی نے ایک بڑا سا کرچھا دے دیا تھا۔ ہمارے لیے وہ لوہے کا ایک بڑا سا ٹکڑا لے آئے تھے۔ مگر ہم دونوں کے ہتھیار بالکل بے کار تھے اس لیے کہ ان کا استعمال ہمارے بس سے باہر تھا۔

اب رات کے دو سوا دو بج گئے تھے۔مال روڈ کا سناٹا کچھ اور بڑھ گیا تھا۔شاید اس میں ہمارا خوف بھی شامل تھا۔پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ہوئے ہم تینوں انڈس ہوٹل پہنچ گئے۔روبینہ ریستوران کے اسٹاف نے ہمارے باہر نکلتے ہی تمام روشنیاں بجھا کر دروازہ لاک کر لیا تھا۔ گویا ان کی طرف سے کسی اخلاقی امداد کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

انڈس ہوٹل کے سامنے دونوں پولیس کانسٹیبل لاٹھیاں اٹھائے کھڑے تھے۔ ہم تینوں کو دیکھا تو پوچھا" سر۔ادھر

سے آوازیں آرہی تھیں۔ کیا کوئی جھگڑا ہو گیا تھا؟""

ہمیں بہت غصہ آیا۔ کہا" بھئی وہاں اتنا ہنگامہ ہوا۔ قتل تک ہونے لگا تھا تم لوگوں نے آکر خبر بھی نہیں لی"۔

بولے" سر جی۔ ہماری ڈیوٹی مال روڈ کی اس سائیڈ پر ہے۔ دوسری سائیڈ پر دوسرا تھانہ لگتا ہے"۔

دوسرے سپاہی نے کہا" ہاں جی، وہ تھانہ سول لائنز کا علاقہ ہے"۔

حمایت علی شاعر نے کہا" اگر وہاں کوئی مر مرا جاتا تو بھی تم اپنے علاقے میں کھڑے تماشا دیکھتے رہتے"۔

اس نے کہا" سر۔ ہم تو ڈیوٹی کے پابند ہیں مگر آپ فکر نہ کریں۔ اس علاقے میں کوئی آئے تو بچ کر نہیں جا سکتا"۔

حمایت صاحب نے کہا" اچھا دیکھو۔ اگر کچھ لوگ کار میں سوار ہو کر آئیں تو انہیں ہوٹل کے اندر مت جانے دینا"۔

"اجی آپ فکر ہی نہ کریں۔ اللہ پر بھروسا رکھیں"۔

واقعی ہمارے ملک میں تو پولیس کا یہی حال ہے۔ اللہ پر ہی بھروسا رکھنا پڑتا ہے۔

ہم نے ہوٹل کے استقبالیہ پر بھی انہیں چوکنا رہنے کی ہدایت کی اور کمرے میں چلے گئے۔

محمد علی صاحب گرم پانی سے غسل کر کے سو گئے۔ ہم دونوں بھی رات کو اسی کمرے میں سوئے۔ صبح کو پتا چلا کہ دو تین بار چند لوگ آئے تھے اور محمد علی سے ملنا چاہتے تھے مگر ہوٹل والوں نے دروازہ لاک کر لیا تھا۔

دوسرے دن ہم سب کو یہ فکر ہوئی کہ آخر احمد رشدی صاحب کہاں غائب ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس ہنگامے میں ریستوران سے باہر نکل گئے تھے۔ خوش قسمتی یہ کہ کچھ فاصلے پر انہیں ایک رکشا بھی مل گیا۔ حالانکہ اتنی رات گئے رکشا کا مل جانا بھی معجزہ ہی تھا۔ ان کی خیریت سے آگاہی کے بعد اطمینان ہو گیا۔

چند روز ہماری رشدی صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک دن کسی فلم کے گانے کی ریہرسل کے سلسلے میں ای ایم آئی کے دفتر گئے تو وہاں رشدی صاحب ناہید نیازی کے والد سرور نیازی صاحب، لقمان صاحب، ناہید نیازی اور مصلح الدین موجود تھے۔ لقمان کی فلم کے کسی دوگانے کی رہرسل ہو رہی تھی رشدی صاحب ہمارے پہنچنے سے پہلے سب کو اس رات کا واقعہ سنا چکے تھے اور حمایت علی شاعر اور ہماری گھبراہٹ کا مبالغہ آمیز نقشہ بھی کھینچ چکے تھے۔ ہمیں دیکھا تو وہ سب مسکرانے لگے۔ آیئے آفاقی صاحب۔

''بھئی بڑے ہنگامے کرنے لگے ہیں آپ''!

رشدی صاحب پر نظر پڑی تو ان کے چہرے پر چوٹ کا نشان نظر آیا۔ غنیمت ہے کہ تمام جھگڑے میں موجود رہنے کے باوجود ہم صحیح سلامت رہے تھے۔

''بھئی رشدی صاحب، آپ اس رات کہاں چلے گئے تھے؟'' ہم نے پوچھا۔

کہنے لگے '' میں ریستوران سے باہر نکلا تو ایک رکشا مل گیا۔ بس گھر چلا گیا''۔

ہم نے کہا ''یار بڑے افسوس کی بات ہے تمہاری وجہ سے جھگڑا ہوا اور تم ہی محمد علی اور ہم سب کو چھوڑ کر بھاگ گئے''!

وہ کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔

لقمان صاحب نے کہا ''یہ تو کہتے ہیں کہ تمہاری اور حمایت علی شاعر کی ڈر کے مارے بری حالت تھی''۔

ہم نے کہا ''انہوں نے ہماری حالت کہاں دیکھ لی۔ یہ تو پہلے ہی رخصت ہو گئے تھے''۔ اس کے بعد ہم نے تفصیل سے اس رات کے ہنگامے کی منظر کشی کی۔ یہ بھی بتایا کہ ہم ریستوران کے بالائی حصے پر کانوں میں انگلیاں دے کر جا بیٹھے تھے اور حمایت علی شاعر ''پولیس پولیس'' پکارنے پچھلی گلی میں چلے گئے تھے۔ سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

رشدی صاحب بھی ہنسنے لگے۔ پھر کہنے لگے ''آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں مجھے وہاں سے جانا نہیں چاہیے تھا۔ مگر میں نے دیکھ لیا تھا کہ آپ کو تو انہوں نے کچھ نہیں کہا مگر میری پٹائی کر دی تھی۔ اگر وہاں ٹھہرتا تو میری شامت آجاتی۔''

احمد رشدی زندہ دل اور ہنس مکھ انسان تھے۔ خراب سے خراب حالات میں بھی ہم نے کبھی انہیں غمگیں یا پریشان نہیں دیکھا۔ حالانکہ مروت اور شرافت کے باعث وہ اپنا معاوضہ وصول نہیں کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ مالی پریشانیوں میں مبتلا رہتے تھے۔

احمد رشدی کو اس وقت اور بھی پریشانی ہوئی جب لاہور میں بننے والی اردو فلموں کی تعداد کم ہو گئی۔ مردانہ گانے فلموں میں کم ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد اور کم ہو گئی تو رشدی صاحب گھبرا گئے۔ وہ گلوکاری کے سوا کچھ اور کام نہیں کر سکتے تھے۔

لاہور کے حالات سے مایوس ہو کر کراچی گئے تو وہاں بھی بے کاری سے واسطہ پڑا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ جب پاکستان میں گلوکاری سے کمانے کا زمانہ آیا تو رشدی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اب تو عجیب عجیب بے تکے اور بے سرے گانے والے ہیں۔ مگر رشدی کی قسمت میں یہ خوشی اور خوشحالی نہیں تھی۔

ایک روز ہم صبح کے وقت اخبار پڑھ رہے تھے کہ اچانک ہماری بیگم کی آواز آئی ''سنئے''

''جی سنائیے''۔

''ٹی وی پر مسعود رانا کا انٹرویو ہو رہا ہے، دیکھیں گے؟''

مسعود رانا کا نام سن کر ہم اخبار سمیٹ کر لاؤنج میں گئے تو دیکھا کہ بیگم صاحبہ سامنے والے صوفے پر نیم دراز ہیں۔ نگاہیں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی ہیں جہاں مسعود رانا بڑے ٹھہرے ٹھہرے پر سکون انداز میں مختلف سوالوں کے جواب دے رہے تھے۔ جب دیکھنے بیٹھے تو ان کی باتیں بہت دلچسپ لگیں۔ ہمارا خیال تھا کہ رسمی سا پھیکا انٹرویو ہو گا مگر مسعود رانا بہت دلچسپ باتیں کر رہے تھے۔ وقفے وقفے سے ان کے مشہور گانے بھی دکھائے جا رہے تھے۔ مجموعی طور پر بہت اچھا پروگرام تھا مگر آٹھ دس منٹ بعد ہی ختم ہو گیا۔

ہم نے شکوہ کیا ''آپ نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا، نہ جانے کب شروع ہوا ہو گا؟''

وہ بولیں ''مجھے تو خود معلوم نہی تھا۔ ٹی وی کھولا تو مسعود رانا باتیں کرتے ہوئے نظر آئے'' پھر انہوں نے ہم کو یاد دلایا ''آپ نے کتنی بار ان کے گھر جانے کا وعدہ کیا ہے مگر ایک بار بھی نہیں گئے''۔

ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اتنا دلچسپ پروگرام ٹی وی والوں نے صبح کی نشریات میں ضائع کر دیا۔ صبح کے وقت ٹی وی دیکھنے کی کسے فرصت ہوتی ہے۔ ہر ایک بھاگ دوڑ میں مصروف ہوتا ہے اگر شام یا رات کے وقت یہی پروگرام پیش کیا جاتا تو بہت سوں کا بھلا ہوتا۔ فلم والوں سے پاکستان ٹی وی والے ایسا سوتیلا سلوک کرتے ہیں اور دعویٰ یہ ہے کہ فلمی صنعت کے ہمدرد ہیں، لطف کی بات یہ ہے کہ فلمی گانوں اور فلمی فن کاروں کی مقبولیت سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے بغیر گزارہ بھی نہیں۔

اس زمانے میں ہر طرف محمد رفیع کی آواز گونجتی تھی۔ مسعود رانا کو سکول کے زمانے میں ہی گلوکار بننے کا شوق چرایا۔

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد مسعود رانا نے حیدر آباد کا رخ کیا۔ وہاں ریڈیو کے چکر کاٹے اور کچھ سکھانے والے بھی میسر آ گئے تو ان کی خوشامد درآمد کر کے موسیقی کی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی۔ ان ہی دنوں شہر کے ایک کالج میں مختلف کالجوں کے مابین گلوکاری کا مقابلہ منعقد ہوا تو مسعود رانا کے دوستوں نے انہیں بھی اس مقابلے میں شریک کرا دیا۔ مختلف کالجوں کے دو درجن کے قریب طلبہ اور طالبات اس مقابلے میں حصہ لے رہے تھے۔
اداکار مصطفی قریشی کی بیگم روبینہ نے بھی اس مقابلے میں حصہ لیا۔ خداداد آواز کے ساتھ انہیں موسیقی سیکھنے کا بھی موقع ملا تھا۔ محمد ایوب کھوڑو اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ ریڈیو پاکستان حیدر آباد کے ریجنل ڈائریکٹر حمید نسیم بھی موجود تھے۔ مسعود رانا کا بیان ہے کہ اس مقابلے میں سب سے اچھا گانے پر پہلا انعام ان کو ملا تھا لیکن لڑکی ہونے کے ناتے یہ انعام روبینہ کو دے دیا گیا اور دوسرا انعام مسعود رانا کے حصے میں آیا۔
سنتوش صاحب جب موڈ میں ہوتے تو کہا کرتے تھے "مولانا، دو بیویوں سے انصاف کرنا آسان نہیں ہے۔ یہ ہم سے پوچھئے، بچوں کے معاملے میں بھی ناپ تول برابر کی رکھی ہے"۔
سنتوش صاحب حسین آدمی تھے۔ پر کشش شخصیت کے مالک تھے۔ پاکستان کے نمبر ون ہیرو تھے۔ بلکہ پاکستان کے اکلوتے ہیرو تھے۔ اس لیے لاکھوں کروڑوں کے منظور نظر تھے۔ یعنی فلمی ہیروئنیں بھی ان کیلئے آہیں بھرا کرتی تھیں۔ دوسروں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ مگر سنتوش صاحب تمام تر بے باکی اور بے تکلفی کے باوجود اس معاملے میں ایک شرمیلے آدمی تھے۔ ہنسی مذاق کی حد تک تو ہر ایک ہیروئن سے ان کی بے تکلفی تھی مگر اس کے آگے حد ادب۔ وہ کسی کے بھی نزدیک نہیں ہوئے نہ ہی ان کا کوئی اسکینڈل بنا۔ پہلا اور آخری اسکینڈل صبیحہ خانم کے ساتھ ہی مشہور ہوا تھا اور ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد سنتوش صاحب نے کسی دوسری خاتون کی طرف کبھی لالچی نگاہ نہیں ڈالی۔ اگر کسی نے پیش قدمی بھی کی تو وہ بوکھلا جاتے تھے۔ فلمی ہیرو تو ایک طرف، ایسا کردار تو عام نوجوانوں میں بھی کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔
سنتوش کمار اور صبیحہ خانم کی پسندیدگی کی مدت تو کافی طویل ہے۔ جب ان کی پہلی شادی ہوئی تو صبیحہ خانم ان کے ساتھ کئی فلموں میں کام کر چکی تھیں اور ان دونوں کی رومانی جوڑی کافی مقبول ہو گئی تھی۔ بعد میں جب بہت زیادہ

ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا تو اور بھی قریب آ گئے۔ یہاں تک کہ شادی ہو گئی۔

سنتوش صاحب کی شادی کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ ہم اس وقت روزنامہ ''آفاق'' سے منسلک تھے۔ ایک دن سنتوش صاحب اور صبیحہ خانم کے رومان کی بھنک ہمارے کانوں میں پڑی۔ دونوں بہت وضع دار اور محتاط تھے اس لیے یہ کہانی عام نہ ہوئی پھر بھی تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا۔ بعض فلمی پرچوں میں اس حوالے سے خبریں بھی شائع ہوئیں مگر ان پر کسی نے سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔ عام لوگوں کو ان دونوں نے اس قسم کی رائے قائم کرنے کا کوئی موقع بھی فراہم نہیں کیا تھا۔

بات اتنی بڑھی کہ شادی ہو گئی۔ اسی زمانے میں ایک فلمی وفد بیرون ملک گیا تو سنتوش صاحب اور صبیحہ خانم بھی اس وفد میں شامل ہو گئے۔ اس زمانے میں یورپ آمدورفت اتنی عام نہیں ہوئی تھی۔ وہاں سے خبریں بھی بہت کم موصول ہوتی تھی۔ پھر بھی ہمیں باوثوق ذرائع سے ان دونوں کی شادی کی اطلاع مل گئی۔ ہم نے یہ خبر شائع کی تو سنتوش اور صبیحہ نے اس کی پر زور تردید کر دی۔

یورپ سے واپسی پر فلیٹیز ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سنتوش صاحب اور وفد کے دوسرے ارکان نے اپنے دورے کے تاثرات بیان کئے اور بتایا کہ اس دورے سے پاکستان کی فلمی صنعت کا ایک نیا امیج بنا ہے۔ آخر میں سوال و جواب کی باری آئی۔ مختلف نمائندے سوالات کرتے رہے۔ آخر میں ہم نے سنتوش صاحب سے پوچھا۔

''سنتوش صاحب، آپ نے اپنی اور صبیحہ خانم کی شادی کی تردید کر دی ہے مگر آپ دونوں نے شادی سے پہلے ہنی مون کیسے منالیا؟''

سنتوش صاحب مسکرائے ''میرے ساتھ تو اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ آغا صاحب بھی تھے۔ تو کیا ہم سب ہنی مون منا رہے تھے؟''

ہم نے کہا ''مگر آپ اور صبیحہ خانم ہوٹل میں ایک ہی کمرے میں قیام کرتے تھے۔ مذہب، اخلاق اور قانون ایک ہی کمرے میں ایک غیر اور مرد کے قیام کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ کس رشتے سے ایسا کرتے تھے؟''

سنتوش صاحب پریشان ہو گئے ”یہ غلط ہے“۔
ہم نے کہا”ایک بار پھر سوچ لیجئے۔ ہمارے پاس گواہ موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ہوٹل کے بل بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں“۔
ہوٹل کے بلوں والی بات ہم نے اپنی طرف سے کہہ دی تھی مگر اس کا اثر یہ ہوا کہ سنتوش صاحب واقعی بوکھلا گئے۔
ایک صحافی نے کہا”سنتوش صاحب، شادی کرنا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔ اگر آپ دونوں نے شادی کرلی ہے تو چھپاتے کیوں ہیں۔ اس کا اعتراف کیجئے تاکہ ہم سب آپ کو مبارک باد پیش کریں“۔
اس طرح سنتوش اور صبیحہ کی شادی کی خبر کی تصدیق ہو گئی۔ یہ ایک دلچسپ اور اہم خبر تھی۔ فلمی صنعت کیلئے بھی اور عام فلم بینوں کیلئے بھی۔ اس لیے کہ صبیحہ سنتوش کی جوڑی اس زمانے میں فلموں کی مقبول ترین جوڑی تھی۔

پریس کانفرنس کے بعد وہ ہمیں ملے اور چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہنے لگے ”مولانا، آپ نے اپنی ”سی آئی ڈی“ باہر تک چھوڑی ہوئی ہے اب یہ بتادیں کہ ایک کمرے میں ٹھہرنے اور بلوں کے بارے میں آپ کو کس نے بتایا؟“
ہم نے کہا”ایک کمرے میں ٹھہرنے کی بات تو ہم نے باتوں باتوں میں معلوم کرلی تھی۔ رہی بلوں کی بات تو وہ ہم نے اپنی طرف سے گھڑلی تھی“۔
ان کی آنکھوں میں شوخی لہرائی، مسکرا کر بولے ”یعنی وہ آپ نے محض اندازے سے ایک شوشہ چھوڑا تھا؟“
ہم نے کہا”جی ہاں۔ اور آپ اس جال میں پھنس گئے“۔

وہ ہنسنے لگے ”بہت خطرناک آدمی ہو۔ خیر، بات تو کچھ نہیں ہے۔ ہم خود ہی اپنی شادی کے بارے میں اعلان کرنے والے تھے مگر آپ نے ذرا جلدی کرادیا“۔
شادی کے بعد انہوں نے باقاعدہ اعلان تو نہیں کیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر کام نہیں کریں گے مگر عملی طور پر یہی صورت تھی۔ سنتوش صاحب تو دوسری ہیروئنوں کے ساتھ کاسٹ کرلیے جاتے تھے مگر صبیحہ خانم کو فلم ساز

عموماً سنتوش صاحب کے ساتھ ہی کاسٹ کرتے تھے۔ ویسے بھی ان کی رومانی جوڑی اس زمانے میں مقبول ترین فلمی جوڑی تھی۔

شادی کا اعلان ہو گیا تو وہ دونوں کھلے بندوں ایک ہی کار میں اسٹوڈیو آنے لگے۔ دوپہر کا کھانا بھی اپنے دفتر میں ایک ساتھ ہی کھاتے تھے۔ سنتوش صاحب دیر سے اٹھنے کے عادی تھے۔ ظاہر ہے رات کو چار پانچ بجے سوتے تو سویرے کیسے اٹھتے۔ صبیحہ بھابی بھی ان کے ساتھ ہی جاگتی رہتی تھیں۔ مہمانوں کی خاطر مدارات ان ہی کے ذمے تھی اور یہ فرض وہ بڑی محبت اور خوبی سے سرانجام دیتی تھیں۔ آخری مہمان کو رخصت کرنے تک وہ میزبانی میں مصروف رہتی تھی۔ صبح کی نماز بھی وہ باقاعدگی سے پڑھتی تھیں۔ اس کے بعد بچوں کے مسائل اور گھر کی ذمے داریاں بھی کچھ وقت لیتی ہوں گی۔ اس کے باوجود وہ صبح دس بجے تازہ دم اور تروتازہ ہو کر سیٹ پر پہنچ جاتی تھیں۔ سنتوش طبعاً آرام پسند تھے۔ رات کو دیر سے سونا اور صبح دیر سے اٹھنا ان کے معمول میں داخل تھا۔ شوٹنگ کا وقت دس بجے مقرر تھا مگر وہ بارہ ایک بجے سے پہلے اسٹوڈیو نہیں پہنچا کرتے تھے۔ جب بے تکلف دوست شکایت کرتے تو ہنس کر کہتے ''یار، تم صبح دس بجے کی شوٹنگ ہی کیوں رکھتے ہو۔ دو بجے کی شفٹ رکھا کرو''۔

''مگر دوسرے آرٹسٹ تو یہ وقت نہیں دے سکتے۔ صرف آپ کی خاطر باقی لوگ اپنے معمول کیسے بدل لیں؟''

مگر اس کوشش میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوئے۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ تو ان کی وجہ سے صبیحہ بھابی بھی دیر سے اسٹوڈیو پہنچتی تھیں مگر پھر فلم سازوں کی پریشانی کو دیکھ کر وہ ان کے بغیر ہی اسٹوڈیو پہنچ جاتی تھیں۔

سنتوش صاحب کے دیر سے اسٹوڈیو پہنچنے کی وجہ سے ہر ایک کو پریشانی اور مشکل پیش آتی تھی مگر برداشت کرتے تھے۔ اول تو سبھی جان گئے تھے کہ ان کا صبح کے وقت شوٹنگ کیلئے پہنچنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ دوسرے وہ جب سیٹ پر آتے تھے تو اپنی خوش مزاجی اور زندہ دلی سے ساری کسر پوری کر دیتے تھے۔ کام کرنے میں انہیں کبھی تامل نہیں ہوا۔ شوق اور توجہ سے کام کرتے تھے۔ ہنستے ہنساتے رہتے تھے جس کی وجہ سے کام تیزی سے ہو جاتا تھا۔

سنتوش صاحب کی تن آسانی اور کاہلی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی دن میں دو شفٹیں نہیں کیں۔ حالانکہ ان کی اتنی مانگ تھی کہ وہ تین شفٹیں بھی کر سکتے تھے اور زیادہ فلموں میں کام کر کے پیسے کما سکتے تھے۔ مگر انہوں نے

کبھی پیسے کا لالچ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے عرصے تک اکلوتے ہیرو اور بعد میں کیریکٹر ایکٹر کے طور پر کام کرنے کے باوجود ان کی فلموں کی تعداد ایک سو سے بھی کم ہے حالانکہ بعد میں آنے والے ہیرو تو تین چار سال کے اندر سینکڑہ پورا کر لیتے تھے۔

سنتوش صاحب من موجی تھے جو دل میں سما جائے بس اسے پورا کر کے ہی دم لیتے تھے۔ ابتدائی زمانے میں فلمیں بہت کم لاگت سے بنتی تھیں اس لیے سب کے معاوضے بھی کم تھے۔ مثلاً کئی سال تک ہیرو کا معاوضہ تین ہزار روپے فی فلم تھا۔ پنجابی فلم کے ہیرو دو ڈھائی ہزار بھی قبول کر لیتے تھے۔ ایک دن سنتوش صاحب کو اچانک خیال آیا کہ تین ہزار روپے تو بہت حقیر معاوضہ ہے۔ اگلے دن ایک فلم ساز انہیں اپنی فلم میں سائن کرنے کے لیے گئے۔

معاوضے کی بات چلی تو سنتوش صاحب نے کہا ''معاوضہ پندرہ ہزار ہو گا''۔

انہوں نے حیران ہو کر دیکھا ''پندرہ ہزار؟ ایک فلم کا معاوضہ؟''

''فی الحال آپ ایک ہی فلم بنا رہے ہیں نا جس کیلئے مجھے کاسٹ کرنا چاہتے ہیں''۔

''جی ہاں''۔

''تو پھر میں آپ کو آئندہ فلموں کا معاوضہ کیوں بتاؤں گا؟''

''مگر سنتوش صاحب یہ تو ممکن ہی نہیں ہے''۔

''آپ کی مرضی''۔

''کیا فلم نہیں کریں گے؟''

''کریں گے مگر پندرہ ہزار لیں گے''۔

یہ صبیحہ خانم سے شادی سے بہت عرصے پہلے کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ فلم ساز واپس لوٹ گئے۔ جس نے بھی سنا حیران رہ گیا۔ تین ساڑھے تین ہزار سے ایک دم پندرہ، ہزار دوستوں اور ہمدردوں نے سمجھایا۔ فلم سازوں نے ڈرایا کہ دوسرے ہیرو اس بات سے فائدہ اٹھائیں گے اور سنتوش صاحب بے کار ہو جائیں گے مگر سنتوش صاحب اپنی ضد پر قائم رہے۔

انہوں نے کہا" مولانا، بے کار ہو جانا، بے گار کرنے سے بہتر ہے۔"
کئی فلم سازوں نے بھی آہستہ آہستہ معاوضے کی رقم میں اضافے کی پیش کش شروع کر دی۔

" پانچ ہزار۔ چلو چھ ہزار ٹھیک ہے او کے ؟"
اور سنتوش صاحب انکار میں سر ہلا دیتے۔
ایک دن جب کسی فلم ساز نے انہیں نو اور دس کی آفر کی تو سنتوش صاحب سچ مچ ناراض ہو گئے " یار کیا مذاق لگا رکھا ہے ؟ میں آرٹسٹ ہوں۔ سبزی ترکاری تو نہیں بیچ رہا جو بھاؤ تاؤ شامل کر دیا"۔
انہوں نے کہا" فلم بھی تو بزنس ہے سنتوش صاحب۔ بھاؤ تو اس میں بھی ہوتا ہے اور کمی بیشی بھی ہوتی رہتی ہے"۔
سنتوش صاحب نے کہا" تو پھر سمجھ لیجئے کہ یہ باٹا والا بھاؤ ہے جس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی"۔
کچھ عرصے گھر بیٹھے رہے آخر فلم سازوں کو ان کی بات ماننی پڑی اور انہیں ایک فلم کا معاوضہ پندرہ ہزار ملنے لگا۔ بعد میں تو اس میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ صبیحہ خانم سے شادی کے بعد ان کی فلمیں اوپر تلے ہٹ ہونے لگیں اور فلم بینوں میں بھی ان کی مقبولیت بڑھ گئی تو ایک دن سنا کہ انہوں نے دونوں کیلئے ایک فلم میں کام کرنے کا معاوضہ نوے ہزار وصول کیا ہے۔ جس نے سنا وہ حیران رہ گیا کہ یہ کیسے ممکن ہے ؟ مگر یہ حقیقت تھی۔ سنتوش اور صبیحہ نے جو عروج دیکھا وہ بہت کم آرٹسٹوں کے حصے میں آیا۔ یہ نوے ہزار معاوضہ انہوں نے 68-1967ء میں وصول کیا تھا۔ ان کی شادی کے اعتراف کا واقعہ تو پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اب ایک اور دلچسپ قصہ بھی سن لیجئے۔

شادی کے بعد سنتوش صاحب اور صبیحہ خانم آؤٹ ڈور شوٹنگ کیلئے مری اور نواحی علاقوں میں گئے۔ وہ بڑا سی کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ اچانک ایک دن صبیحہ خانم کی طبیعت خراب ہو گئی۔ آس پاس آدمی دوڑائے گئے۔ بڑی مشکل سے ایک لیڈی ڈاکٹر دستیاب ہوئیں۔ انہوں نے صبیحہ کا علاج کیا اور ضروری ادویات اور ہدایات بھی دے دیں۔

اتفاق سے یہ لیڈی ڈاکٹر ہمارے ایک دوست کی بیگم کی بہت بے تکلف دوست اور سہیلی تھی۔انہوں نے اپنی اہمیت جتانے کیلئے اپنی سہیلی کو صبیحہ خانم کا علاج کرنے کا قصہ سنایااور ساتھ ہی رازداری میں یہ بھی بتادیا کہ صبیحہ خانم ماں بننے والی ہیں پھر کہا'' مگر دیکھو۔میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ کسی کو یہ بات نہیں بتاؤں گی''۔

جب لیڈی ڈاکٹر کے پیٹ میں یہ بات نہ رہ سکی تو سہیلی اسے کیوں کر ہضم کرتیں۔ ایک دن ہم ان کے گھر گئے تو انہوں نے چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا''آپ کو پتا ہے،میری ایک عزیزی سہیلی صبیحہ کا علاج کر رہی ہے''۔
''اچھا!'' ہم نے اس بات کو کچھ اہمیت نہیں دی۔
''ایک بات بتاؤں مگر وعدہ کریں کہ کسی کو نہیں بتائیں گے؟''
ہم نے وعدہ کر لیا۔انہوں نے ہمیں اعتماد میں لے کر صبیحہ خانم والی خبر سنائی۔
ہم نے کہا''آپ کی سہیلی نے گپ لگائی ہو گی۔لوگ اداکاروں سے اپنی قربت جتانے کیلئے بہت سی من گھڑت باتیں بنا لیتے ہیں''۔
''یہ بات نہیں ہے۔ایمان سے یہ بالکل سچ ہے۔وہ مجھ سے جھوٹ بول ہی نہیں سکتی''۔
ان کے شوہر نے بھی ہمیں یقین دلایا''وہ اس کی بہت پرانی سہیلی ہے۔یہ دونوں ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کرتے۔

دوسرے دن ہم نے اپنے اخبار میں یہ خبر شائع کر دی۔ فلمی صنعت اور فلم سازوں کیلئے یہ ایٹم بم سے کم نہ تھی۔ ہیروئن کے ماں بننے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلم ساز تمام نقصان برداشت کریں۔جب سنتوش صاحب سے اس خبر کی تصدیق کی گئی تو انہوں نے صاف انکار کر دیااور تردید شائع کروادی۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے صحافیوں کی غیر ذمے داری کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں ایک لیکچر بھی پلا دیا۔
دو دن بعد ایک فلمی تقریب میں ملاقات ہوئی تو وہ ہمیں ایک طرف لے گئے'' مولانا،اب آپ بھی افواہیں اڑانے لگے۔آپ سے یہ امید نہیں تھی''۔

ہم نے کہا''سنتوش صاحب، ہمیں بھی آپ سے یہ امید نہیں تھی''۔

وہ شرارت سے ہنسے ''کیا امید نہیں تھی؟''

''یہی کہ آپ جھوٹی تردید کر دیں گے۔ خوشی کی خبر کو جھٹلانا کوئی اچھا شگون تو نہیں ہے''۔

وہ سنجیدہ ہو کر ہمیں دیکھنے لگے۔

''ایمان سے بتایئے، کیا یہ خبر غلط ہے؟''

وہ کچھ دیر تک ہمیں دیکھتے رہے پھر بولے ''مولانا مجھے تو آپ سے ڈر لگنے لگا ہے۔ آپ کہیں جن بھوت یا بدروح تو نہیں ہیں''۔

''آپ کو یہ خیال کیوں ہوا؟''

''بچے والی خبر کا دنیا میں تین آدمیوں کے سوا کسی کو علم نہیں ہے۔ میں، صبیحہ اور لیڈی ڈاکٹر اور وہ لیڈی ڈاکٹر بھی لاہور سے بہت دور رہتی ہے۔ پھر آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا؟''

ہم نے کہا''بس، ہمارے تابع موکل ہمیں ساری خبر پہنچا دیتے ہیں''۔

''پھر بھی کچھ تو پتا چلے؟''

ہم نے انہیں اصلیت بتا دی، ہنسنے لگے، بولے ''واقعی آپ کے قبضے میں موکل ہیں ورنہ یہ خبر خود بخود اتنی آسانی سے آپ کو نہ ملتی'' پھر بولے ''اچھا، اب فی الحال اس بات کو یہیں رہنے دیں۔ نہ آپ خبر کی صداقت پر اصرار کریں اور نہ میں تردید پر زور دوں۔ چار پانچ مہینے بعد خود ہی سب جان جائیں گے''۔

لطیفہ بازی سنتوش صاحب پر ختم تھی۔ بلا کے حاضر جواب تھے اور ایسا فقرہ چست کرتے تھے کہ سننے والا بغلیں جھانکتا رہ جاتا تھا۔

انہیں پان کھانے کی بھی عادت تھی۔ شوٹنگ کے وقت سیٹ پر ہر وقت اور ہر جگہ تو گلدان دستیاب نہیں ہو سکتا۔ ایک بار ان کی شوٹنگ پر گئے۔ گپ شپ چل رہی تھی۔ سنتوش صاحب کو پان کی پیک تھوکنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر کوئی مناسب جگہ نظر نہ آئی تو اٹھ کر سیٹ کے ایک گوشے میں گئے اور قالین کے

کونے پر پچکاری مار کر چلے آئے۔

ہم نے کہا ''سنتوش صاحب، یہ آپ نے کیا کیا۔ ہمیں آپ سے یہ امید نہیں تھی''۔

''میں نے کیا کر دیا؟''

''آپ نے قالین خراب کر دیا''۔

جواب میں وہ مسکرائے اور لطیفہ سنایا۔ آپ بھی سن لیجئے۔

''جاڑوں کا زمانہ تھا، بس میں بہت رش تھا۔ مسافر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے کھڑے تھے ایک صاحب نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے مسافر سے پوچھا ''بس اسٹاپ کب آئے گا؟ مجھے پیک تھوکنی ہے''۔

اس نے جواب دیا ''اسٹاپ بہت دیر میں آئے گا تم سامنے والے کے کوٹ کی جیب میں تھوک دو''۔

وہ پریشان ہو کر بولا ''اگر اسے پتا چل گیا تو؟''

پاس والے نے اطمینان سے کہا ''میں نے آپ کی جیب میں پیک تھوکی تھی تو آپ کو پتا چلا تھا؟''

یہ لطیفہ سنانے کے بعد انہوں نے کہا ''مولانا، یہ قالین کم از کم دس سال سے تو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس کا رنگ سرخ ہے اور زمانے بھر کی مٹی اور گرد اس میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ ان قالینوں کو دھلوانے اور صاف کرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کا رنگ کچھ عجیب سا ہو گیا۔ ہماری پیک ان پھول بوٹوں میں مکس ہو جاتی ہے۔ میں پچھلے دس سال سے ان قالینوں کو اگالدان کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔ آپ کو کبھی پتا چلا؟''

ہم لاجواب ہو کر رہ گئے۔

سنتوش صاحب کا مطالعہ بہت اچھا تھا۔ حالاتِ حاضرہ سے بھی باخبر رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر موضوع پر اردو، انگریزی اور پنجابی میں بلا تکان بولتے تھے اور بہت خوب بولتے تھے۔ اسی لئے وہ ہر جگہ اور ہر قسم کی محفل میں اپنی جگہ بنا لیتے تھے۔ ایک بار طارق عزیز کے نیلام گھر میں سنتوش صاحب نے حصہ لیا اور پہلا انعام جیت کر لے گئے۔ سب نے کہا یہ تو نورا کشتی ہے۔ ایک اداکار کہاں اور جنرل نالج کے ایسے مشکل سوال کہاں؟ مگر ایسی کوئی بات نہ تھی۔ سنتوش صاحب واقعی ان تمام سوالوں کے جواب جانتے تھے اور طارق عزیز نے ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی

تھی۔ پڑھے لکھے اداکار تو ہماری فلمی صنعت میں اور بھی آئے مگر سنتوش صاحب جیسے باخبر اور باعلم بہت کم نظر آئے۔ دراصل ان کے ہنسی مذاق اور لاابالی پن کو دیکھ کر ان کے علم کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ وہ تو فلمی صنعت کے نمائندہ وفد کے ساتھ اعلیٰ سرکاری افسروں سے گفتگو میں انہیں بھی مرعوب اور لاجواب کر دیا کرتے تھے۔ اسی لیے فلمی صنعت کی ہر تحریک میں انہیں بھی شامل کیا جاتا تھا بلکہ پیش پیش رکھا جاتا تھا۔ ایجی ٹیشن کی تحریک کے سلسلے میں لاہور کی فلمی صنعت کے سبھی قابلِ ذکر لوگ جیل بھیج دیے گئے تھے۔ ان میں سنتوش صاحب بھی شامل تھے اور لوگ تو جیل کی سختیوں سے پریشان اور شاکی تھے مگر سنتوش صاحب جو انتہائی آرام طلب تھے، جیل کے ایّام میں سب سے زیادہ بے فکر اور مطمئن رہے۔ اپنی لطیفہ بازی سے وہ سب کا دل بہلاتے رہے اور جب جیل سے باہر آئے تو جیل کے قصے سنا کر ہنساتے رہے۔

پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ سنتوش صاحب کو ہم نے کبھی اداس اور پریشان نہیں دیکھا۔ خدا جانے یہ اتفاق تھا یا واقعی وہ پریشانی اور فکر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ حالانکہ مسائل تو سبھی کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ ان کی زبان سے کبھی حالات کا شکوہ بھی نہیں سنا۔ اس معاملے میں وہ یورپ اور امریکا کے لوگوں کی طرح تھے۔ اگر کوئی پریشان کن مسئلہ چھڑ بھی جاتا تو وہ فوراً موضوع گفتگو بدل دیا کرتے تھے۔

سنتوش صاحب نے اپنے عہد کے اعتبار سے خاصا کمایا مگر کچھ بچا کر نہیں رکھا۔ بچا کر رکھنے کے وہ قائل ہی نہیں تھے۔ اس معاملے میں وہ بے نیاز اور درویش آدمی تھے۔ اول تو ٹھاٹ سے رہتے تھے اس لیے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ نوکر چاکر، انعام و اکرام، گھر کے رئیسانہ اخراجات۔ اس کے علاوہ خاندان والوں کے اخراجات۔ ان کے ہاں جوائنٹ فیملی سسٹم رائج تھا۔ ماں باپ، بہن بھائی سب ایک ہی جگہ رہتے تھے اور ہیڈ آف دی فیملی ہونے کی وجہ سے ان کے کفیل سنتوش صاحب ہی تھے۔ ویسے جب تک ان کے والدہ زندہ رہے، خاندان کے سربراہ وہی رہے مگر اخراجات سنتوش صاحب کے ذمے تھے۔ پروٹوکول یعنی حفظ مراتب کے معاملے میں یہ خاندان پرانی وضع داری پر

عمل پیرا تھا۔ وہی نہیں، اس زمانے میں دوسرے لوگ بھی یہ وضع نبھاتے تھے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ملاحظہ کیجئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد لاہور میں مسلم ٹاؤن کی آبادی فلم والوں سے آباد تھی۔ اس صنعت سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ یہاں رہتے تھے۔ اداکار، ہدایت کر، فلم ساز، مصنف، نغمہ نگار، ہنر مند یہ سبھی قسم کے لوگوں کی آماجگاہ تھی۔ وجہ یہ تھی کہ مکانوں کے کرائے کم تھے۔ دو فلم اسٹوڈیو گردونواح میں ہی واقع تھے جہاں پیدل بھی جا سکتے تھے۔ ان کڑکی کے دنوں میں یہ بھی ایک بڑی سہولت تھی۔

مسلم ٹاؤن میں ایک گلی کے آغاز میں بائیں جانب سنتوش صاحب کا مکان تھا۔ اس گلی کے اندر داخل ہوں تو دائیں جانب تین کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ پہلی کوٹھی میں علاؤالدین، دوسری میں ہدایت کار و فلم ساز لقمان اور تیسری کوٹھی میں نغمہ نگار تنویر نقوی کی رہائش تھی۔ تنویر نقوی صاحب کی کوٹھی کے سامنے والی عمارت میں کسی زمانے میں ساؤنڈ ریکارڈسٹ منڈوڈی رہا کرتے تھے۔ تنویر نقوی کی کوٹھی اس گلی میں آخری عمارت تھی جس کے بعد کھیت اور کھلا میدان تھا۔

جب اتنے نزدیک رہنا ہو تو میل جول بھی ہو جاتا ہے اور گھریلو تعلقات بھی قائم ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے یہ سب ان دنوں پاکستان کی فلمی صنعت کے اہم اور ممتاز لوگ تھے۔ سنتوش کمار، صبیحہ خانم، درپن کو فلمی دنیا میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اسی طرح علاؤالدین اردو اور پنجابی فلموں کے بہت بڑے اداکار تھے۔ ایک زمانے میں ان کے بغیر کوئی فلم مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی ریاض احمد راجو بھی ہدایت کار تھے۔ یہ دونوں اداکار خاندان فلمی دنیا کے ستون سمجھے جاتے تھے۔ سنتوش کمار کے والد داؤد صاحب قریباً گوشہ نشین ہو چکے تھے مگر خاندان میں ان کا کہا حرفِ آخر سمجھا جاتا تھا۔ سنتوش کمار ان کے بعد خاندان کے بڑے تھے جن کے سامنے کوئی آنکھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسی طرح علاؤالدین کے گھر میں ان ہی کا حکم چلتا تھا۔ کسی بھائی کو سرتابی کی مجال نہ تھی۔ باہمی میل جول اپنی جگہ لیکن ہر سطح پر پارٹی بازی اور سیاست بھی چلتی رہتی تھی۔ یار لوگوں نے اپنے مفاد کیلئے علاؤالدین کو سنتوش کمار کا حریف بنا دیا اور سنتوش کمار کے مخالفین نے علاؤالدین کے گھر میں گپ شپ کے دوران میں سنتوش

کے بارے میں ہتک آمیز باتیں کرنی شروع کر دیں۔ جاڑوں کی ایک رات تھی۔ علاؤ الدین کے گھر میں کوئی پارٹی منعقد ہو چکی تھی جس کے بعد علاؤ الدین، تنویر نقوی، آئی اے رحمن اور ہم کچھ مہمانوں کو ڈراپ کرنے گئے تو واپسی میں کافی دیر ہو گئی۔ علاؤالدین کے گھر پر ان کے عزیز دوست ریاض شاہد کے سوا کوئی اور موجود نہیں تھا۔
درپن صاحب کو کسی نے جا کر یہ خبر دی کہ علاؤالدین کے گھر میں کچھ لوگوں نے سنتوش کے بارے میں بہت توہین آمیز باتیں کی ہیں۔ درپن صاحب بھی تاؤ میں آ گئے اور دو تین دوستوں کے ہمراہ علاؤالدین کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں صرف ریاض شاہد ہی ڈرائنگ روم میں نیم خوابی کے عالم میں لیٹے ہوئے تھے۔ درپن نے جب کسی کو نہ پایا تو ریاض شاہد کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور یہ دھمکی دے کر آ گئے کہ علاؤالدین کے گھر میں بیٹھ کر یہ نہ سمجھیں کہ انہیں سنتوش کمار کو برا بھلا کہنے کی کھلی چھٹی ہے۔ اگر آئندہ کسی نے ایسی حرکت کی تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی وغیرہ وغیرہ۔
درپن اینڈ پارٹی اپنے دل کا غبار نکال کر رخصت ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ اور علاؤالدین واپس پہنچے تو دو حضرات نے فوراً علاؤالدین کے سامنے بڑھا چڑھا کر واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ درپن وغیرہ ریاض شاہد کو مار کر اور دھمکیاں دے گئے ہیں۔ علاؤالدین صاحب عام طور پر جوش میں نہیں آتے تھے۔ مگر اس روز جب اپنے عزیز ترین دوست ریاض شاہد کی بے عزتی کا واقعہ سنا اور وہ بھی خود ان کے گھر میں، تو آپے سے باہر ہو گئے اور رات کے بارہ ایک بجے سنتوش کے گھر کی طرف چل پڑے۔ سردی کا موسم اور بارہ ایک کا وقت۔ لاہور ان دنوں بالکل سنسان اور ویران ہو جاتا تھا۔ علاؤالدین صاحب کو ہم لوگوں نے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ غصے میں بھرے ہوئے سنتوش صاحب کے گھر پہنچ گئے اور پکار کر کہا "سنتوش، باہر آؤ، تمہارے بھائی نے میرے گھر میں میرے مہمان کی بے عزتی کی ہے۔ میں یہ ذلت ہرگز برداشت نہیں کروں گی"۔
سنتوش غریب کے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ وہ باہر نکلے اور علاؤالدین کو غصے میں اول فول بکتے دیکھا تو حیران ہو کر پوچھنے لگے کہ کیا معاملہ ہے؟
جواب میں راجو بول پڑے۔

علاؤالدین صاحب کہاں توسنتوش صاحب سے لڑنے کے ارادے سے آئے تھے لیکن چھوٹے بھائی کو سنتوش سے بد تمیزی سے بات کرتے ہوئے دیکھاتواس پر بگڑنے لگے ''تم چپ رہو۔ بڑوں کی بات میں تمہیں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں کوئی تمیز نہیں ہے''۔

اسی وقت درپن صاحب بھی باہر نکل آئے اور ریاض احمد راجو کو للکارنے لگے۔

علاؤالدین نے انہیں ڈانٹا''عشرت، ہوش میں تو ہو۔ میرے سامنے میرے بھائی کو دھمکیاں دے رہے ہو۔ تمہیں میرے گھر کے اندر جا کر میرے مہمان کی بے عزتی کرنے کی جرات کیسے ہوئی؟''

انہوں نے کہا''ان لوگوں نے بھائی جان کی شان میں گستاخی کی تھی۔ اگر آئندہ کسی نے ایسا کیا تو اس کی زبان کھینچ لی جائے گی''۔

سنتوش صاحب نے یہ سن کر درپن کو ڈانٹ دیا''عشرت، تمیز سے بات کرو۔ کیا تمہیں ہوش نہیں ہے کہ سامنے کون کھڑا ہے؟''

اب منظر یہ تھا کہ سنتوش صاحب اور علاؤالدین صاحب اور درپن اور ریاض احمد راجو ایک دوسرے کے سامنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ چند منٹ یہ گھمسان کی لڑائی جاری رہی حتیٰ کہ سنتوش صاحب کے والد داؤد صاحب تک اس ہنگامے کی آواز پہنچ گئی۔ یا کسی نے انہیں اطلاع دے دی۔ وہ اپنی شال سنبھالتے ہوئے باہر نکلے اور سبھی کو پھٹکار کر رکھ دیا۔

''تم لوگوں کو شرم کرنی چاہیئے۔ آدھی رات کے وقت شور مچا رہے ہو۔ نہ چھوٹے بڑے کالحاظ ہے، نہ محلے والوں کے آرام کا خیال ہے''۔

داؤد صاحب کو دیکھتے ہی دونوں پارٹیاں خاموش ہو گئیں۔ انہوں نے پہلے تو سنتوش اور درپن کو ڈانٹ ڈپٹ کر گھر میں جانے کا حکم دیا۔ پھر علاؤالدین کی طرف متوجہ ہوئے ''کیا بات ہے پتر۔ اگر سنتوش یا درپن سے کوئی شکایت تھی تو کیا ہم مر گئے تھے؟ کیا صبح تک انتظار نہیں کر سکتے تھے؟''

علاؤالدین صاحب سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ غصہ اور نشہ سب ہرن ہو گیا۔ ''چاچا جی، وہ عشرت نے میرے مہمان

کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے"۔

"تم نوجوانوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ارے ہم سب کے مہمان ساجھے ہیں۔ ہماری عزت ساجھی ہے۔ سارا محلہ تماشا دیکھ رہا ہے کہ ان بڑے بڑے ایکٹروں کا کیا کیریکٹر ہے۔ آخر شرافت بھی کوئی چیز ہے۔ چلو بھاگو یہاں سے آئندہ پھر کبھی غنڈوں کی طرح چڑھائی نہ کرنا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ اگر کوئی شکایت ہے تو مجھے بتاؤ، میں کان کھینچوں گا ان کے"۔

علاؤالدین صاحب کان دبا کر اپنے گھر چلے گئے۔ دوسرے دن صبح انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ سنتوش کے گھر جا کر داؤد صاحب سے معافی مانگی اور ریاض احمد راجو سے کہا کہ وہ گزشتہ رات کی بدتمیزی کیلئے سنتوش صاحب سے معافی مانگیں۔ داؤد صاحب نے جواب میں سنتوش اور درپن کو علاؤالدین سے معافی مانگنے کا حکم دیا۔ صلح صفائی ہو گئی تو سب نے داؤد صاحب کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا۔ گپ شپ لگائی اور رات گئی، بات گئی۔

سنتوش کمار حقیقت میں حسن اور وجاہت کا پیکر تھے۔ دراز قد، سرخ و سفید رنگت، خوبصورت ناک نقش، متناسب جسم، شوخ آنکھیں۔ اتنے عرصے تک اگر پاکستان کی فلمی دنیا پر حکمرانی کرتے رہے تو آخر کچھ تو سبب تھا۔ اس زمانے میں ان حریف صرف سدھیر تھے مگر وہ "جنگجو ہیرو" مشہور تھے۔ رومانٹک کرداروں سے تو ان کی جان جاتی تھی۔ ایک بار انہوں نے فلم "مرزا غالب" میں غالب کا کردار کیا تو ان کے جو پرستار سدھیر کا نام دیکھ کر سنیما میں پہنچے تھے انہیں بہت مایوسی ہوئی۔ سدھیر کی فلم ہو اور اونچی آواز میں مکالمے نہ ہوں، نہ گولی، نہ گھونسا، نہ مار پیٹ۔ ایک فلم بین نے سنیما گھر سے باہر نکل کر بڑے سوگوار انداز میں کہا "بس جی، کچھ بھی نہیں ہے فلم میں، ایک فائٹ بھی نہیں ہے"۔

ظاہر ہے کہ سدھیر صاحب کا سنتوش کمار صاحب سے کوئی مقابلہ نہ تھا جو رومانی اور معاشرتی کرداروں کیلئے نہایت موزوں تھے۔ میں نے بتایا ہے کہ ان کی آنکھیں باتیں کرتی تھیں۔۔ شوخی اور شرارت کرتی تھیں۔ ان کا چہرہ اتنا زیادہ تاثر نہیں دیتا تھا۔ آواز میں ٹھہراؤ اور مردانہ وقار تھا۔ رومانی مناظر میں وہ اپنی آواز میں بہت متاثر کن صوتی

اثرات پیدا کرنے پر قادر تھے۔ کاش ان کا چہرہ بھی اتنا ہی پر تاثر ہوتا۔

سنتوش کمار نرم گفتار تھے۔ لڑائی جھگڑے سے پرہیز ہی کرتے تھے مگر انہیں غصہ بھی آتا تھا۔ دیکھنے میں نرم و ملائم ضرور تھے مگر دلیر بھی تھے اور جسم بھی مضبوط تھا۔ ایک بار ایک غنڈا ٹائپ کیمرا مین نے ان سے بد تمیزی کی۔ سنتوش صاحب نے ایسا زوردار تھپڑ رسید کیا کہ وہ زمین پر گر گئے اور کئی روز تک چہرہ سوجا رہا۔ بجائے ناراض ہونے کے وہ صاحب سنتوش کمار کے مداح ہو گئے "یار، سنتوش کو ہم "ایویں ای" سمجھتے تھے۔ ان میں تو بڑی جان ہے۔ لوہے فولاد کی طرح ہاتھ ہے اس کا"۔

کردار کی مضبوطی میں بھی وہ ایک مثال تھے۔ زبانی ہنسی مذاق کی بات اور ہے جو وہ چھپ چھپا کر نہیں کرتے تھے لیکن شادی کے بعد انہوں نے کسی دوسری ہیروئن یا کسی بھی لڑکی میں دلچسپی نہیں لی۔

سلیقہ اور نفاست ان پر ختم تھی۔ اگر شوٹنگ نہ ہو تو سفید کرتہ اور کھلے پائنچوں کا سفید پاجامہ پہنتے تھے۔ انہیں رنگین لباس میں کبھی نہیں دیکھا۔ جاڑوں میں پتلون قمیص اور سوئٹر یا سوٹ ان کا پہناوا تھا۔ جامہ زیب انسان تھے اس لیے ہر لباس ان پر سجتا تھا۔ شام ڈھلتے ہی سنتوش صاحب "محفل آرائی" کا اہتمام شروع کر دیتے تھے۔ گھر کی بات اور ہے، اگر اسٹوڈیو کے دفتر میں ہوں تب بھی نفاست اور سلیقے میں کمی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ان کے تمیز دار اور تربیت یافتہ پرانے ملازم کمرے میں ان کیلئے میز سجا دیتے تھے۔ نہایت نفیس فرنچ شیشے کے گلاس۔ خوبصورت پلیٹوں میں کباب، تکے، میوہ، سلاد اور گزک کا دوسرا سامان۔ گلاسوں کے ساتھ نفیس اور خوش رنگ کپڑے کے نیپکین۔ پھولوں سے سجا ہوا گلدان۔

سنتوش صاحب شوٹنگ سے فراغت پا کر غسل کرتے، سفید لباس زیب تن کرتے، ہلکی سی خوشبو لگاتے اور تر و تازہ ہو کر مسکراتے ہوئے آجاتے "اچھا تو مولانا، کیا خبریں ہیں؟"

اس کے ساتھ ہی وہ بڑی نفاست سے خوب صورت گلاس اٹھا کر ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرتے اور شام کی محفل کا آغاز ہو جاتا تھا۔

خواجہ صاحب کو موسیقی پر تو عبور حاصل تھا ہی مگر کہانی اور اسکرین پلے پر بھی دسترس تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک

کہانی پسند نہ ہو وہ موسیقی بنانے کی ہامی بھرتے تھے اور بعد میں مشورے دیتے رہتے تھے۔ وہ ایک وقت میں ایک ہی فلم کی موسیقی بناتے تھے۔ پیسے کا انہیں کوئی لالچ نہ تھا۔ بڑے موڈی آدمی تھے۔ قناعت پسند اور بے نیاز، موسیقی کے میدان میں ان کی مہارت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ان کی موسیقی کا ایک علیحدہ اور منفرد انداز تھا۔ ان کا گانا سنتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ خواجہ خورشید انور کی تخلیق ہے۔

خواجہ صاحب نے نامور کلاسیکل موسیقار ماسٹر توکل حسین سے بھی سالہاسال تک موسیقی کی تعلیم حاصل کی تھی اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے منفرد اندازِ موسیقی کی تخلیق میں ماسٹر توکل حسین کی تعلیم اور ہم نشینی کا بھی دخل ہے۔ جب سہراب مودی صاحب نے ''مرزا غالب'' بنانے کا ارادہ کیا تو اس کی موسیقی ترتیب دینے کیلئے خواجہ خورشید انور ہی کو منتخب کیا تھا۔

خواجہ صاحب رضامند بھی ہو گئے تھے مگر پھر وجوہات کی بنا پر نہ جا سکے۔ وہ ایسے ہی من موجی تھے، لوگ شہرت اور دولت کے پیچھے بھاگتے ہیں مگر خواجہ صاحب صاحب تھے کہ ان سے چھپتے پھرتے تھے۔ ہر کوئی فلم ساز تو ان کے پاس جا کر موسیقی بنوانے کی جرأت ہی نہیں کرتا تھا۔ ساری فلمی صنعت پر ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ حالانکہ ذاتی کار تک سے محروم تھے۔ مگر احترام ایسا کہ غیر موجودگی میں بھی ہر کوئی ادب سے ان کا نام لیتا تھا اور ان کی عظمت اور ہنر مندی کا معترف تھا۔

خواجہ صاحب کے بظاہر پر سکون اور بے تعلق وجود کے اندر ایک آگ سی بھڑکتی رہتی تھی۔ موسیقی کا ایک میدان کارزار تھا جو ان کے ذہن میں برپا رہتا تھا۔ وہ ہر دم موسیقی کی جستجو میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی جوانی کا خاصا حصہ ہریانہ کے علاقے میں بسر کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہریانہ کے لوک موسیقی اور گوالیار گھرانے کا رنگ ان کی موسیقی میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ پنجاب کی لوک موسیقی پر بھی انہیں عبور حاصل تھا اور اس کو وہ نہایت چابک دستی اور خوبی سے اپنی دھنوں میں استعمال کرتے تھے۔ مغربی موسیقی پر بھی انہیں دسترس حاصل تھی مگر وہ اس سے مرعوب نہ تھے۔ اس کے مقابلے میں پاکستانی ثقافت اور موسیقی کو وہ بلند تر سمجھتے تھے۔

موسیقی کی تخلیق میں خواجہ صاحب ایک بے چین اور مضطرب روح کے مانند تھے جو ہر دم بھٹکی رہتی ہے۔ وہ محض

موسیقار ہی نہ تھے، انہیں علم موسیقی کا ماہر اسکالریا" میوزیکالوجسٹ" بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم موسیقاروں نے برصغیر کی موسیقی پر ایسی انمٹ چھاپ چھوڑی ہے جیسی کہ انہوں نے ثبت کی ہے۔ موسیقی، راگ راگنی اور سرتال کے علاوہ انہیں نغمگی یا گیتوں کا بھی مکمل علم تھا۔ گیتوں کیلئے وہ ایسے الفاظ کو ترجیح دیتے تھے جن میں نغمگی اور موسیقی ہوتی تھی۔

خواجہ صاحب نے موسیقی کے مختلف نامور گھرانوں کے بارے میں تفصیلی ریسرچ کی تھی اور انہوں نے ان کا ایک مجموعہ بھی تیار کیا تھا جس میں ۹۰ راگوں کے انترے اور استھائیاں اور مختلف گھرانوں کے انداز یکجا کر دیے گئے ہیں۔ یہ خواجہ صاحب کا ایک یادگار کارنامہ ہے۔ کیسٹوں کے اس مجموعے کا نام انہوں نے " آہنگ خسروی" رکھا ہے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ ایک "راگ مالا" جس کے دس کیسٹ ہیں، ان میں ۹۰ راگوں کی کلاسیکل کمپوزیشن پر مشتمل کیسٹ ہیں۔ اس میں خواجہ صاحب کی آواز میں کمنٹری بھی شامل ہے۔ دوسرے حصے کا نام " گھرانوں کی گائیکی" ہے۔ یہ ۲۰ کیسٹوں پر مشتمل ہے۔ ان میں تمام مشہور گھرانوں کے گانے والوں کی آوازیں اور گانے ریکارڈ کئے گئے ہیں۔ اگر وقت مہلت دیتا تو خواجہ صاحب موسیقی کے حوالے سے بہت بڑا سرمایہ فراہم کر سکتے تھے مگر مشکل یہ ہے کہ سفید پوشی برقرار رکھنے اور ذریعہ معاش کیلئے وہ کام بھی کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں بچا کرتا تھا۔ مالی منفعت کی انہوں نے کبھی پروا نہیں کی، نہ ہی کسی ادارے نے انہیں مناسب سہولتیں اور وسائل فراہم کئے ورنہ وہ بہت عظیم کارنامے سرانجام دے جاتے۔ فلمی موسیقی کے علاوہ کلاسیکی موسیقی کے علم میں بھی ان کی خدمات نادر اور ناقابل فراموش ہو جاتیں۔ پھر بھی وہ جو کچھ کر گئے ہیں وہ بھی دوسرے ہزاروں پر بھاری ہے۔

نخشب صاحب بھی اس زمانے میں فلموں میں گانے لکھنے کے حوالے سے بہت مشہور تھے۔ شوکت حسین رضوی کی فلم "زینت" میں لکھی ہوئی ان کی قوالی سارے ملک میں ہی گائی جاتی تھی اور ایک عالم اس نغمہ کا دیوانہ تھا۔

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کئے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا

ہم دل کو پکڑ کر بیٹھ گئے ہاتھوں سے کلیجا تھام لیا

ان کی شہرت دوسرے گانوں کی وجہ سے بھی تھی۔سنا ہے کہ فلمی ضرورت کے مطابق بہت اچھے بول لکھتے تھے اور خوب ٹھونک بجاکر معاوضہ وصول کرتے تھے۔ چھڑے چھانٹ تھے۔ بمبئی میں ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے جہاں ہر وقت ان کے دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ وہ اچھا کھانے اور کھلانے کے بہت شوقین تھے۔ بذات خود بھی بہت اچھا اور لذیذ کھانا پکاتے تھے اور دوستوں کو کھلا کر بہت خوش ہوتے تھے۔ان کا یہ دستور پاکستان آنے کے بعد بھی قائم رہا۔

بمبئی میں گیت نویسی کرنے کے علاوہ ان کا ایک ذریعہ آمدنی ریس بھی تھی۔ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہمیشہ جیتا کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے خود اپنے ریس کے گھوڑے بھی رکھ لیے تھے۔جوادراصل ان کا مشغلہ بھی تھا اور پیشہ بھی۔ بات بات پر شرط لگایا کرتے تھے اور جیتنے پر فوری رقم وصول کر لیتے تھے۔ ہارنے کی صورت میں بھی فوری ادائیگی کر دیا کرتے تھے۔

فلم ''محل'' میں ان کے لکھے ہوئے گانوں نے بھی بہت دھومیں مچائیں اور انہیں زندہ جاوید کر دیا۔ بعد میں انہوں نے فلمیں بھی بنائیں۔ فلمی کہانیاں بھی لکھیں اور خود ہی ہدایت کاری بھی کی۔ قسمت کے دھنی تھے اس لیے کسی بھی کام میں گھاٹے میں نہ رہے۔ اگر فلم فلاپ ہو گئی تو آمدنی کے دوسرے ذرائع پیدا ہو گئے۔

رشید عطرے) مرحوم) بمبئی میں ان کے بے تکلف دوست تھے۔ان کی رنگین داستانیں بہت مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ نخشب رنگین مزاج اور دل پھینک تھے۔ کوئی بھی پرکشش اور متناسب جسم والی عورت ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ وہ خود بھی جامہ زیب اور خوش رو تھے۔ان کا رنگ تو گہرا سانولہ تھا لیکن ناک نقشہ بہت سجل اور دلکش تھا۔پیشانی پر پڑے ہوئے گھنے بالوں کی لٹیں اور سب سے بڑھ کر ان کا اندازِ تکلم۔ وہ بہت چرب زبان تھے۔ باتیں کرنے پر آتے تو سماں باندھ دیتے لیکن بدزبان بھی کم نہ تھے۔ان کی سب سے بڑی کمزوری ان کی تعلّیاور خودپسندی تھی۔ اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور بلا جھجک دوسروں کے بارے میں دل آزاد ریمارکس دیتے رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے بعض حلقوں میں ان کی مخالفت شروع ہو جاتی تھی جس کی انہیں مطلق پروا نہیں تھی۔

رشید عطرے صاحب بتایا کرتے تھے کہ سڑک پر نخشب صاحب کو کوئی گھاٹن پسند آجاتی تو فوراً اسے اپنی کار میں بٹھا

لیتے۔ گھاٹن محنت کش مرہٹہ عورتوں کو کہتے ہیں جو اپنے گہرے رنگ اور سنگین جسموں کیلئے بہت شہرت رکھتی ہیں۔ مگر یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ جو ہم نے لاہور پہنچنے کے بعد سنیں۔ ایک بار ہم نے سنا کہ نخشب جارچوی صاحب بمبئی سے آئے ہیں۔ لڑکپن کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں فلم وار فلم والوں کا بہت چرچا تھا۔ نخشب صاحب تو پھر شاعر بھی تھے اور ایک نامور مسلمان گیت نگار بھی تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے مسلمان یہ دیکھ کر اور سن کر ہی خوش ہو جایا کرتے تھے کہ بمبئی میں ہندوؤں کے غلبے کے باوجود فلاں فلاں مسلمان فنکار، ہدایت کار یا شاعر کا طوطی بول رہا ہے۔ نخشب صاحب بھی اس حوالے سے ہمارے ہیرو تھے۔ اپنے دوست شہر یار کے ذریعے یہ خبر گروہ کے دوسرے لوگوں تک پہنچ گئی۔ اب سوال یہ تھا کہ نخشب صاحب کو کیسے دیکھا جائے؟ ملاقات کا تو خیر سوال ہی نہیں تھا کہ حفظ مراتب کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔ بہر حال معلوم ہوا کہ نخشب صاحب فلاں وقت کچھ دیر کیلئے نادر علی بلڈنگ بھی آئیں گے۔ ہم سب منتظر ہو کر بیٹھ گئے۔ خدا خدا کر کے نخشب صاحب تشریف لائے۔ وہ میرٹھ میں کسی رئیس کے مہمان تھے۔ اس کی کار میں سوار ہو کر آئے تھے۔ کاریں اس زمانے میں خال خال ہی ہوتی تھیں۔ وہ کار سے اترے اور سامنے والے فلیٹ میں داخل ہوئے تو ہم نے بھی ان کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ چست موری کا سفید لٹھے کا پاجامہ اور سفید ململ کا کرتہ پہنے ہوئے تھے۔ آف وہائٹ شیروانی تھی جس کے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے مگر ایک دوست نے ہمارے کان میں بتایا کہ نخشب صاحب کی شیروانی میں ہیرے کے بٹن لگے ہوئے ہیں۔ خدا جانے یہ سچ تھا یا جھوٹ۔ بٹن البتہ دور سے چمکتے ہوئے نظر آئے۔ ان کی انگلیوں میں بھی قیمتی انگوٹھیاں تھیں۔

"ہیرے کی ہیں" ایک دوست نے مطلع کیا۔

ہم عقیدت اور احترام سے دیکھتے رہ گئے اور نخشب صاحب ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گئے۔ کچھ دیر بعد فلیٹ سے باہر نکل کر کار میں بیٹھے اور رخصت ہو گئے۔ یہ نخشب سے ہماری پہلی ملاقات تھی بشرطیکہ اسے ملاقات کہا جائے۔

ہم پاکستان آگئے تو یہاں فلم "محل" ریلیز ہوئی۔ یوں تو فلم ہی بہت اچھی تھی مگر اس کی موسیقی، گانوں اور مدھو بالا نے تو ایک عالم کو دیوانہ بنا دیا۔ بڑے بڑے جغادری شاعروں اور موسیقاروں کو ہم نے اس فلم کی موسیقی کی تعریف کرتے ہوئے سنا۔ کھیم چندر پرکاش بڑے نامور اور ہنر مند موسیقار تھے۔ نخشب صاحب نے سچویشنز پر ایسے گیت لکھ

دیے کہ امر ہو گئے۔اس پر مدھو بالا کا پراسرار حسن و جمال۔ فلم کیا تھی جادو گری تھی۔ مگر جب ذرا شعور پیدا ہوا تو احساس ہوا کہ اس میں کمال فلم کے مصنف اور ہدایتکار کا بھی تھا۔

کمال امروہوی اس فلم کے مصنف اور ہدایت کار تھے۔اور انہوں نے فلم میں ایک سحر انگیز ماحول پیدا کر دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بمبئی ٹاکیز کی فلموں میں کہانی اور مکالموں میں دوسرے لکھنے والوں کا بھی دخل ہوتا ہے مگر نام کسی ایک مصنف کا دیا جاتا ہے۔ حقیقت جو بھی ہو لیکن کمال امروہوی نے اس کہانی کو پیش کرنے میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ کمال امروہوی، نخشب اور مدھو بالا، تین بڑے مسلمان نام اس فلم سے وابستہ تھے۔ نخشب صاحب یوں تو پہلے بھی نامور تھے مگر ’’محل‘‘ نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔

بمبئی کی فلمی دنیا میں نخشب جارچوی ایک دل پھینک، عاشق مزاج اور منہ پھٹ آدمی کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ شادی انہوں نے نہیں کی تھی پھر معلوم ہوا کہ فلم ’’آن‘‘ کی شہرت یافتہ اداکارہ نادرہ کے ساتھ انہوں نے شادی کرلی ہے۔ یہ شادی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ دراصل انہیں تنہا رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ ایسے بے پرواہ اور کھلنڈرے لوگ شادی کی پابندیاں کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ نادرہ نے نخشب صاحب کی فلم ’’نغمہ‘‘ میں کام بھی کیا تھا۔ انہوں نے ایک اور فلم ’’رفتار‘‘ بھی بنائی تھی مگر نغمہ فلم ساز کی حیثیت سے ان کی پہلی فلم تھی۔ یہ فلم تو کوئی خاص نہیں تھی مگر اپنی موسیقی کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی اور ہٹ قرار پائی۔ اس فلم میں نخشب صاحب نے پہلی بار ایک نئے موسیقار ’’ناشاد‘‘ کو متعارف کرایا جنہوں نے بعد میں بھارت اور پاکستان دونوں جگہ اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ اس فلم میں ناشاد صاحب کی شمولیت کی داستان بھی بہت دلچسپ ہے۔

ہوا یہ کہ نخشب صاحب اپنی اس فلم میں نامور موسیقار نوشاد علی صاحب سے موسیقی بنوانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق، محدود پیمانے پر کام کرتے ہیں۔ انہوں نے معذرت کی تو نخشب صاحب نے اسے توہین جانا اور وقار کا سوال بنالیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اصل چیز تو بول ہوتے ہیں۔ موسیقار سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اپنا یہ دعویٰ درست ثابت کرنے کیلئے انہوں نے ایک نئے موسیقار کو متعارف کرایا۔ شوکت علی طبلہ نواز تھے موسیقی میں کافی دسترس رکھتے تھے۔ خوش الحان بھی تھے۔ نخشب صاحب کی نظر ان پر پڑی اور انہوں نے شوکت علی کو ’’ناشاد‘‘ بنا دیا۔ جب فلم

ریلیز ہوئی تو ناشاد اور نوشاد کے باریک سے فرق کو زیادہ محسوس نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ فلم کی موسیقی بہت اچھی اور دلکش تھی۔ ناشاد صاحب طرز بنانے میں ماہر تھے۔ لہٰذا فلم کے سارے گانے ہٹ ہو گئے۔ اس طرح ایک نئے موسیقار نے جنم لیا۔ ناشاد صاحب نے بمبئی میں نخشب صاحب کی فلموں میں بھی موسیقی دی اور دوسری فلموں میں بھی یہ فرائض سرانجام دیے جن میں ''بارہ دری'' قابل ذکر ہے۔ قسمت مہربان تھی۔ گانے ہٹ ہونے لگے تو ناشاد صاحب بھی بطور موسیقار ہٹ ہو گئے۔

نخشب صاحب نے بمبئی میں آخری فلم ''زندگی یا طوفان'' بنائی تھی۔ اس فلم کے ہدایت کار کے طور پر بھی ان ہی کا نام تھا لیکن جتنے منہ اتنی زبانیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ درحقیقت ہدیات کار اور کوئی تھا۔ بہرحال، یہ فلم بہت پسند کی گئی اور اسی زمانے میں نخشب صاحب اپنے گھوڑے وغیرہ فروخت کر کے پاکستان چلے آئے۔ وہ مجلسی آدمی تھے اور اس لیے وسیع مراسم رکھتے تھے۔ پاکستان میں اس وقت وزیرِ خزانہ ان کے دوست اور مداح تھے۔ بیورو کریسی میں اور بھی باثر دوست موجود تھے۔ چنانچہ پاکستان میں بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندی کے باوجود نخشب صاحب کی فلم یہاں درآمد کر لی گئی۔ فلمی صنعت والوں نے بہت شور مچایا۔ فلم سازوں اور تقسیم کاروں نے بھی احتجاج کیا۔ مگر جسے پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے۔ نخشب صاحب کی بااثر حلقوں تک رسائی تھی اور پاکستان میں یہی ہر مشکل کی کنجی ہے۔ ان کی فلم بڑی دھوم دھام سے پاکستان میں ریلیز ہوئی اور اس نے یہاں بھارت سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔ بس پھر کیا تھا، نخشب صاحب کے دن پھر گئے۔ شہرت اور پیسے کے معاملے میں وہ ہمیشہ خوش نصیب رہے۔ لیکن پاکستان آنے کے بعد تو ایسے بھاگ لگے کہ سارے دلدر دور ہو گئے۔ پیسے کی ریل پیل ہو گئی۔ نخشب صاحب کیلئے نہ کبھی پیسہ کمانا کوئی مسئلہ تھا، نہ خرچ کرنا۔ جس طرح آتا تھا، اسی طرح دونوں ہاتھوں سے لٹاتے تھے۔ نادرہ کے بعد انہوں نے جنم جنم کیلئے کنوارا رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ راجا اندر کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا، اچھی طرح رہنا۔ اچھے لوگوں میں وقت گزارنا، یہی نخشب صاحب کا معمول بن گیا تھا۔

پاکستان میں آنے کے بعد جب پیسہ بھی آ گیا تو سب سے پہلے تو انہوں نے ریس کی طرف توجہ دی۔ قیمتی گھوڑے خریدے اور ریس کے حلقوں میں مقبول ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے فلم سازی اور ہدایت کاری کی طرف توجہ

دی۔ یہاں آکر انہوں نے پہلی فلم ”فانوس“ بنانے کا اعلان کیا اور حسبِ عادت یہ بھی کہا کہ یہاں نہ کوئی ہدایت کار ہے، نہ رائٹر۔ کسی کو فلم بنانی نہیں آتی۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ فلم کیسے بنائی جاتی ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی گویا انہوں نے مقامی فلمی صنعت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ بڑبولا پن تو ایک طرح کی بیماری ہے اور اسے گنبد کی آواز کہا جاتا ہے یعنی کہنے والا جو بھی کہتا ہے اس کی گونج دیر تک باقی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ باتیں بہت سے لوگوں کو ناگوار گزرنے لگی تھیں اور وہ بھی ان کے خلاف باتیں بنانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ مگر نخشب صاحب کو کچھ پروا نہیں تھی۔ دوستوں کے وہ بہت اچھے دوست تھے مگر دشمنوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ دنیا ان کے بارے میں خواہ کچھ بھی کہتی رہے انہوں نے کبھی کان دھرے نہیں سنا۔ وہ تو اپنی ہی آواز سننے کے شوقین تھے۔

فلم ”فانوس“ کا شاندار سیٹ شاہ نور اسٹوڈیو میں تعمیر ہوا تو نخشب صاحب نے فرمایا کہ پاکستان والوں کو کیا پتا کہ سیٹ کیسے لگاتے ہیں اور اسے آراستہ کیسے کرتے ہیں۔ اس سیٹ کیلئے انہوں نے خاص طور پر فانوس بنایا۔ قیمتی صوفے، قالین اور پردے حاصل کئے اور ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی سیٹ پر قدم نہیں رکھ سکتا۔ کسی کو بھلا کیا پڑی تھی کہ ان کے سیٹ پر جاتا۔ مگر نخشب صاحب نے سیٹ کے باہر دو بندوق بردار محافظ تعینات کر دیے۔ اس سے پہلے کسی فلم کے سیٹ کی حفاظت کیلئے مسلح گارڈ مقرر نہیں کیا گیا تھا۔

نخشب صاحب نے اس فلم میں سلمان پیرزادہ کو ہیرو منتخب کیا۔ ہیروئن کے طور پر وہ شمیم آرا کو لینا چاہتے تھے مگر ان کی جہاں دیدہ نانی کو نخشب صاحب کی بدزبانی اور خود پسندی کا علم تھا اس لیے انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے معذرت کر دی۔ انہوں نے اس فلم کیلئے کومل کو ہیروئن منتخب کر لیا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ خود ہی کومل کو اپنی فلم کی ہیروئن منتخب کیا تھا مگر بھری محفل میں خود ہی ان پر ہوٹنگ بھی کرتے رہتے تھے۔ دراصل اپنی بڑائی اور دوسروں کی توہین کرنا نخشب صاحب کا شیوہ تھا اور یہ ایسی بری عادت تھی جو ان کی فطرت بن چکی تھی۔ اسی وجہ سے وہ خدا واسطے کے دشمن اور مخالفت پیدا کر لیتے تھے۔

”فانوس“ کے بارے میں نخشب صاحب کا کہنا تھا کہ یہ زبردست ہٹ فلم ہو گی اور اسے تو پولیس ہی سنیما سے اتارے گی۔ مگر یہ فلم بری طرح فلاپ ہو گئی۔

نخشب صاحب نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ ناکامی کی تمام تر ذمے داری انہوں نے ہیرو اور ہیروئن پر ڈال دی اور دوسری فلم ''میخانہ'' کا آغاز کر دیا۔

اس زمانے میں ریڈیو سیلون ایک مقبول و معروف ذریعہ، تشہیر تھا اور عموماً بھارتی فلموں کی موسیقی نشر کرنے کیلئے مخصوص تھا۔ نخشب صاحب نے پہلی بار اپنی فلم '' میخانہ'' کی پبلسٹی ریڈیو سیلون سے پیش کی اور فلم کے نغمے ہندوستان اور پاکستان میں گونجنے لگے۔ اس فلم کی موسیقی بہت اچھی تھی۔ مگر فلم فلاپ ہو گئی۔ فلم کی بے انتہا پبلسٹی بھی اس کیلئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس لیے کہ لوگوں نے اس سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی تھیں۔

''میخانہ'' فلاپ ہو جانے کے بعد نخشب صاحب نے فلم بنانے کا خیال ہی ترک کر دیا۔ یہ تو ایک طرح سے ان کا شوق اور مشغلہ تھا۔ ذریعہ معاش کیلئے وہ اس کے محتاج نہیں تھے۔ بطور ہدایت کار اور کہانی نویس پاکستان میں انہیں تسلیم نہیں کیا گیا۔ گیت نگار وہ بہت اعلیٰ درجے کے تھے مگر کسی پاکستانی فلم ساز نے ان کو گیت نگاری کی دعوت دینے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ نخشب صاحب نے اس بارے میں کبھی خواہش کا اظہار تک نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ پاکستان کے سبھی فلمی شاعروں، ہدایت کاروں اور موسیقاروں کو خود سے کمتر سمجھتے تھے تو پھر یہاں کی فلم میں گیت نگاری کیسے کرتے۔ مگر قدرت بھی انسانوں کو سبق سکھاتی رہتی ہے۔ پاکستان میں ان کے پاس دولت، شہرت، اثر و رسوخ سبھی کچھ تھا مگر اوپر تلے دو فلموں کے فلاپ ہو جانے کی وجہ سے ان کی شیخیوں میں خود بخود کمی آ گئی تھی۔ اس کے بعد تو وہ قریب قریب گمنام ہی ہو کر رہ گئے اور اپنے قریبی دوستوں تک محدود ہو گئے تھے۔ جب ایک روز اچانک ان کی وفات کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو حیرت ہوئی چونکہ اس سے پہلے ان کی علالت کے بارے میں کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی تھی۔ نئی نسل کے لوگ تو اس وقت تک انہیں بھول ہی چکے تھے۔ آج بھی نخشب جارچوی کا نام سن کر نئی پود کے لوگ سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ انہیں علم ہی نہیں ہے کہ اس شخص نے محض اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر کتنا نام اور کیسا مقام پیدا کیا تھا اور کتنی بھرپور زندگی گزری تھی۔ موت ہی خاکی انسان کا انجام ہے۔ وہ صاحب اولاد نہیں تھے اس لئے اس کا نام چلانے والا بھی کوئی باقی نہیں ہے۔ بھائی بہن اور دوسرے رشتے داروں کا ویسے ہی کبھی نام

نہیں سنا۔اس طرح نخشب جارچوی شہرت کی چار دن کی چاندنی میں دھومیں مچانے کے بعد ہمیشہ کیلئے موت کی تاریک وادی میں گم ہوگئے۔ پاکستان کی فلمی صنعت میں انہوں نے کسی سے بنا کر نہیں رکھی تھی جو انہیں یاد کرتا۔

جن دنوں لقمان صاحب نے پنجابی فلم ”پتن“ کی ہدایت کاری کا آغاز کیا تو سب نے بہت ناک بھوں چڑھائی کہ جو شخص ڈھنگ سے پنجابی زبان بول بھی نہیں سکتا۔ وہ بھلا پنجابی فلم کیسے بنائے گا۔ لقمان صاحب کا کہنا تھا کہ فلم کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ پنجابی، اردو، بنگالی سے کیا ہوتا ہے۔ ہماری اس زمانے میں لقمان صاحب سے بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ عمر، تجربے اور مرتبے میں ہم سے بہت بڑے تھے۔ ابھی ہم نے قرینے سے فلم دیکھنی بھی شروع نہیں کی تھی جب وہ سہراب مودی اور شوکت حسین رضوی جیسے ہدایت کاروں کے معاون تھے۔ خود ساز آدمی تھے۔ گھر سے فلم کے شوق میں بھاگ کر بمبئی پہنچے تھے اور اس زمانے کے کئی لوگوں کی طرح اپنی قابلیت اور محنت کے بل بوتے پر ہدایت کاروں کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔

یہ سچ ہے کہ انہیں پنجابی بولنی نہیں آتی تھی۔ جب ایک دن کسی صحافی نے ان سے یہ بات کہی تو وہ کہنے لگے ”یار سننی تو آتی ہے نا“۔

”مگر آپ مکالمے کیسے سمجھیں گے؟“

کہنے لگے ”مجھے سمجھانے والے لوگ جو ہوں گے۔ وہ مجھے ترجمہ کر کے بتائیں گے“۔

”مگر آپ پنجابی تاثرات کیسے بتائیں گے؟“

”وہ تو خود ہی دیکھ لینا۔ یہ راز کی باتیں ہیں میں اس طرح نہیں بتا سکتا“۔

ایک روز ہم نے بھی بڑی سنجیدگی سے ان سے کہا لقمان صاحب، آپ پنجابی فلم بنانے کھڑے ہو گئے ہیں۔ سب کی نگاہیں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں“۔

کہنے لگے ”فکر نہ کرو، اللہ مالک ہے“۔

اللہ پر لقمان صاحب کا یقین بہت پختہ تھا۔ ہم نے ایک بار لکھا تھا کہ ان میں اور ہدایت کار محبوب خاں میں بہت سی

باتیں مشترک تھیں۔ دونوں نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ محبوب صاحب ان پڑھ تھے جب کہ لقمان صاحب صرف اردو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مگر مطالعہ تھا اور وہ بھی ادب اور شاعری کا۔ دونوں گھر سے بھاگ کر بمبئی پہنچے تھے۔ دونوں رنگین مزاج تھے۔ دونوں کا اللہ پر پختہ یقین تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کا صلہ بھی عطا فرمایا تھا۔

''پتن'' ۵۵۔۱۹۵۴ء کی فلم ہے۔ سنتوش کمار اور صبیحہ خانم کی جوڑی بن چکی تھی اور دونوں ہی محبوب فنکار تھے۔ اس وقت تک پنجابی فلموں میں قتل و غارت اور گنڈاسے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ رومانی اور ہلکے پھلکے موضوعات فلمائے جاتے تھے۔ اس لیے سنتوش کمار اور صبیحہ خانم کو اس فلم کے مرکزی کرداروں کیلئے چنا گیا تھا۔ صبیحہ خانم اپنی مصروفیات کی بنا پر مطلوبہ تاریخیں نہ دے سکیں تو ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ شوٹنگ سر پر آگئی تھی اور ہیروئن کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

ایک دن فلم ساز شیخ لطیف نے بتایا کہ انہوں نے ایک نئی لڑکی دریافت کی ہے۔

شیخ صاحب بہت ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے، کہنے لگے ''آپ اس کو دیکھ تو لیں اور مناسب سمجھیں تو اس کا ٹیسٹ بھی لے لیں۔ فیصلہ بعد میں کیجئے گا''۔

دراصل شیخ لطیف اس لڑکی کو انور کمال پاشا کی فلم ''قاتل'' کیلئے بھی تجویز کر چکے تھے۔ وہ اس فلم کے بھی سرمایہ کار تھے۔ اس کی شوٹنگ بھی پہلے ہوئی تھی مگر ''پتن'' پہلے ریلیز ہوئی اور مسرت نذیر کی پہچان بن گئی۔ قاتل میں وہ سائڈ رول میں تھیں اس لیے فلم ہٹ ہو جانے کے باوجود قاتل کے حوالے سے انہیں زیادہ شہرت اور پذیرائی نہیں ملی۔

بات دراصل یہ تھی کہ شیخ لطیف گڑھی شاہو میں رہتے تھے۔ وہیں خواجہ نذیر صاحب رہتے تھے جو مسرت نذیر کے والد تھے۔ ان کی لکڑیوں کی ٹال تھی۔ بہت معقول اور شریف آدمی تھے۔ مسرت نذیر نے ریڈیو میں گانا شروع کیا تو شیخ لطیف کو بھی ان کی سن گن مل گئی۔ مسرت نذیر کا اداکارہ بننے کا ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی انہیں شوق تھا مگر شیخ لطیف کے اصرار پر خواجہ نذیر مان گئے۔ اس طرح مسرت نذیر کو قاتل اور پھر پتن میں کاسٹ کر لیا گیا۔

مسرت نذیر کو دیکھا تو عین مین بنی بنائی پنجاب کی جٹی نظر آئیں۔ دراز قد، متناسب لیکن دیہاتی سخت جان لڑکیوں جیسا

جسم، خوب صورت چہرہ، دلکش آواز، ہنستی تھیں تو اور بھی اچھی لگتی تھیں۔ لقمان صاحب نے انہیں ٹیسٹ لیے بغیر ہی پاس کر دیا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ شرماتی بہت تھیں۔ اداکاری کا بھی کوئی تجربہ نہیں تھا۔ چنانچہ فلم کے مصنف بابا عالم سیاہ پوش کو انہیں مکالموں کی ادائیگی سکھانے پر مامور کیا گیا۔ مسرت نذیر نے بابا عالم سیاہ پوش سے بہت جلد کام کی باتیں سیکھ لیں۔ بابا عالم سیاہ پوش کی عمر تو اس وقت زیادہ نہیں تھی مگر ان کی عادت تھی کہ ہر ایک کو بیٹا یا بیٹی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کا ایک پاکیزہ اور قابلِ اعتبار امیج بن جاتا تھا۔

''پتن'' کی پہلی شوٹنگ کیلئے لقمان صاحب نے ایک رومانی منظر کا انتخاب کیا۔ مسرت نذیر کو سنتوش کمار کے ساتھ یہ رومانی منظر فلم بند کرانا تھا مگر انہیں اتنی شرم آئی کہ وہ ہاتھوں سے منہ چھپا کر بیٹھ گئیں اور صاف کہہ دیا کہ میں یہ سین نہیں کروں گی۔ جب لقمان صاحب نے زیادہ زور دیا تو وہ رونے لگیں۔ سیٹ پر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ظاہر ہے اگر ہیروئن سیٹ سے غائب ہو جائے اور کہے کہ مجھے رومانی سین کرتے ہوئے شرم آ رہی ہے تو پریشانی کی بات تو ہے۔ لقمان صاحب نے مسرت نذیر کو بہت سمجھایا۔ سنتوش کمار نے بھی سمجھایا کہ یہ سب تو مصنوعی ہے۔ جھوٹ موٹ کی باتیں ہیں۔ ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مگر مسرت نہ مانیں۔ بابا عالم سیاہ پوش کی سبھی بہت عزت کرتے تھے۔ انہوں نے خاص طور پر مسرت نذیر کو ایک لیکچر دیا۔ مسرت گھبرائی گھبرائی سیٹ پر آ تو گئیں مگر توقع نہیں تھی کہ وہ صحیح طریقے پر ایکٹنگ کر لیں گی۔ کچھ سنتوش کمار نے تعاون کیا کچھ ہدایت کار نے اور اس منظر کی فلم بندی کا آغاز ہونے لگا۔ مسرت نزیر نے بڑی مشکل سے رومانٹک مکالمے ادا کیے اور پھر خاموش ہو گئیں۔

''بھی اب کیا ہوا؟'' لقمان صاحب نے پوچھا۔

''مجھے شرم آ رہی ہے۔ آپ ان سب لوگوں کو سیٹ پر سے باہر بھیج دیں''۔

لقمان صاحب ہنسنے لگے ''یہ لوگ نہیں ہیں، یونٹ کے ارکان ہیں۔ ان کے بغیر تو شوٹنگ ہو ہی نہیں سکتی''۔

''تو پھر میں نہیں کروں گی شوٹنگ۔ مجھے تو سنتوش صاحب سے بھی شرم آ رہی ہے''۔

سنتوش صاحب نے کہا ''تم کوشش تو کرو۔ میں آنکھیں بند کر لوں گا۔ تمہیں دیکھوں گا ہی نہین۔ اور یہ سب لوگ بھی آنکھیں موند لیں گے''۔

یہ بات مسرت کی سمجھ میں آگئی۔ خدا خدا کر کے پہلا شاٹ مکمل ہوا تالیاں بجیں۔ مبارک بادیں دی گئیں اور اس طرح پاکستان کی فلمی صنعت کو ایک نئی ہیروئن مل گئی جو آنے والے زمانے میں پاکستان کی صف اول کی اداکارہ بن گئی۔ بعد میں سنتوش صاحب مذاق میں کہا کرتے تھے ''دیکھا مسرت۔ تمہیں کیسا بیوقوف بنایا؟ آخر ہماری باتوں میں آگئیں نا؟''

مسرت کہتی ''بے وقوف تو میں نے سب کو بنایا تھا۔ مجھے شرم ورم کچھ نہیں آرہی تھی۔ بس ایسے ہی پریشان کر رہی تھی''۔

حقیقت یہ تھی کہ مسرت نذیر میں بقول رضا میر صاحب وہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے جو ایک اچھے مرد دوست میں ہونے چاہئیں۔ مثلاً وہ ہر کام میں دوسروں کے ساتھ پیش پیش رہا کرتی تھیں۔ لڑکیوں کی طرح بلاوجہ ناز نخرے بالکل نہیں کرتی تھیں خواتین کے مقابلے میں وہ مردوں کی محفل میں بیٹھنا اور گپ شپ لگانا زیادہ پسند کرتی تھیں۔ لطیفہ بازی اور ہوٹنگ کے معاملے میں کسی سے کم نہیں تھیں۔ دوسروں پر تو فقرے بازی کرتی ہی تھیں۔ مگر خود اپنے آپ پر بھی ہنس لیتی تھیں۔ تھوڑے ہی دن کے اندر مسرت نذیر سارے یونٹ کی پسندیدہ شخصیت بن گئیں۔ کبھی ریکارڈنگ ٹرک میں ساؤنڈ ریکارڈسٹ افضل حسین صاحب اور رضا میر کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی ہیں تو کبھی ایڈیٹنگ روم میں بیٹھی ایڈیٹنگ کے رموز و اسرار کے بارے میں دریافت کر رہی ہیں۔ کیمرے کے پاس پہنچی ہیں تو عکاس رضا میر صاحب سے کیمرے اور فوٹو گرامی کے بارے میں سوال کر رہی ہیں۔ شرارت میں وہ سب کے ساتھ اور شانہ بشانہ ہوتی تھیں۔ دراصل ان میں بے جا جھجک اور خواہ مخواہ کا نخرہ بالکل نہیں تھا۔ جن باتوں پر دوسری خواتین برا مان کر بات چیت کرنا بند کر سکتی تھیں ان کو مسرت انجوائے کرتی تھیں۔ بلکہ جب کوئی ان کی بات پر ناراضگی کا اظہار کرتا تو وہ ہنس کر کہتی تھیں '' آپ تو خواہ مخواہ عورتوں کی طرح برا مان گئے''۔

پتن کی شوٹنگ شاہ نور اسٹوڈیو کے علاوہ مسلم ٹاؤن میں نہر کے سامنے والے اسٹوڈیو میں بھی ہوتی تھی۔ یہ اسٹوڈیو فرخ شاہ صاحب کی ملکیت تھا۔ اس زمانے میں یہاں خوب رونق رہا کرتی تھی۔ فلم سے متعلق زیادہ تر لوگ اس زمانے میں مسلم ٹاؤن اور گردو نواح میں ہی رہتے تھے اس لیے انہیں آمدورفت میں آسانی تھی۔ اسٹوڈیو کے بالکل سامنے

نہر بہہ رہی تھی۔اس لیے دریا کے مناظر اور رومانی مناظر فلمانے کی بھی آسانی تھی۔اگر جنگل کا سین فلمانا ہو تو اسی نہر پر ٹھوکر نیاز بیگ کی طرف تھوڑے آگے نکل جاؤ تو بالکل ویرانہ تھا۔آس پاس کھیت اور درخت تھے۔آدمی نہ آدم زاد، بڑے آرام سے فلم والے شوٹنگ کرنے میں مصروف رہتے تھے اور کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

ایک رات لقمان صاحب کو ''پتن'' کیلئے ایک منظر فلمانا تھا جس میں ہیروئن یعنی مسرت نذیر پانی میں اتر جاتی ہیں۔سخت سردی کا موسم تھا۔رات کا وقت، ہلکی ہلکی کہر بھی چھائی ہوئی تھی۔رات کو آٹھ نو بجے کے قریب نہر پر لائٹیں لگا کر شوٹنگ کا بندوبست کیا گیا۔فلم کی ہیروئن کو لاچا کرتہ پہن کر پانی میں تیرتے ہوئے دکھانا تھا۔سچ تو یہ ہے کہ بہت سے موٹے موٹے گرم کپڑے پہننے کے باوجود کھلی فضا میں، نہر کے کنارے سردی مزاج پوچھ رہی تھی۔ کہاں یہ کہ اس پانی میں اتر کر شوٹنگ بھی کرنی تھی۔

مسرت نذیر نے کہا ''اتنی سردی میں پانی میں جاؤں گی تو مجھے نمونیا ہو جائے گا۔پھر باقی شوٹنگ کیسے ہو گی؟''

لقمان صاحب نے کہا ''تم فکر نہ کرو اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو ہم ڈپلی کیٹ سے کام چلالیں گے۔ہم نے تمہاری ہم شکل ایک اور لڑکی بھی تلاش کر کے رکھی ہے''۔

''اور پانی میں میرا میک اپ جو خراب ہو جائے گا؟'' انہوں نے نکتہ طرازی کی۔

''بھئی تمہیں پانی میں غوطہ لگانے کیلئے تو نہیں کہا جا رہا ہے۔تم اپنا منہ ہر حال میں پانی سے باہر ہی رکھنا''۔

وہ بولیں ''لقمان صاحب، ایمان سے مجھے تیرنا نہیں آتا۔اگر پانی میں بہہ گئی یا ڈوب گئی تو راوی میں جا کر ہی نکلوں گی''۔

''اتنی دور نہیں جانے دیں گے آگے نہر پر ایک پل ہے۔وہاں تمہیں روک لیں گے''۔

مسرت مختلف بہانے کر رہی تھیں اور یونٹ کے تمام لوگ حسبِ توفیق انہیں لاجواب کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

سنتوش صاحب نے کہا ''مسرت ہمت سے کام لو۔شیر بنو شیر''۔

اس کے بعد انہوں نے ''شیر بنو'' والا لطیفہ بھی سنا دیا۔سب نے لطیفے سے لطف اٹھایا۔مسرت نے کہا ''مگر میں شیر

کیسے بن سکتی ہوں۔ میں تو عورت ہوں''۔

''تمہیں عورت کون کہتا ہے؟ مگر خیر پھر بھی تم شیرنی تو بن سکتی ہو، تم ایسا کرو کہ آنکھیں بند کر کے ایک دم پانی میں چھلانگ لگادو۔ جاڑوں میں نہر کا پانی گرم ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد ٹھیک ہو جائے گا''۔

''اور جب پانی سے باہر نکلوں گی تو کیا ہو گا؟''

''تمہارے لیے کمبل اور انگیٹھی کا انتظام ہے۔ اطمینان رکھو، تمہیں بیمار نہیں ہونے دیں گے''۔

''سنتوش صاحب بہت بڑھ چڑھ کر باتیں نہ بنائیں۔ خود بھی ذرا شیر بن کر دکھائیں۔ یہ گرم اوور کوٹ اور مفلر اتار کر ذرا آپ بھی پانی میں جا کر دکھائیں''۔

سنتوش صاحب نے کہا'' بھئی میں تو سمندر میں بھی کود سکتا ہوں۔ مگر اس سین میں میری ضرورت نہیں ہے''۔

مسرت نذیر لقمان صاحب کے سر ہو گئیں کہ اس سین میں سنتوش صاحب کو بھی شامل کر لیں۔ جب ہیروئن پانی میں چھلانگ لگائے تو ہیرو بھی اسے بچانے کیلئے دریا میں کود جائے۔''

''ہاں بھئی، ہو تو سکتا ہے'' لقمان صاحب نے کہا'' ٹھیک ہے۔ ذرا بابا عالم سیاہ پوش کو بلاؤ۔ ابھی سین میں تبدیلی کرا لیتے ہیں''۔

سنتوش صاحب گھبرا گئے ''لقمان صاحب، کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ ایک نادان لڑکی کے کہنے پر سین بدل رہے ہیں۔ اس طرح تو کہانی کا ستیاناس ہو جائے گا''۔

کافی دیر تک یہ گپ شپ جاری رہی۔ اسی دوران میں رضا میر صاحب نے روشنیاں درست کر لیں۔ جب ریہرسل کا وقت آیا تو مسرت نذیر نے بہت شور مچایا اور کہا کہ اتنی سردی میں ریہرسل کی کیا ضرورت ہے۔ بس براہِ راست ٹیک کر لیں۔

''اور جو ری ٹیک ہو گئی تو؟'' رضا میر صاحب نے کہا۔

'' بالکل نہیں ہو گی، اور اگر ہوئی تو میں دوسرا شاٹ دے دوں گی''۔

خدا خدا کر کے منظر کی فلم بندی شروع ہوئی۔ لقمان صاحب کی آواز گونجی۔ ''فل لائٹس، اسٹارٹ کیمرا''۔

"اسٹارٹیڈ" کیمرا اسسٹنٹ نے کہا۔

"ایکشن"۔

اس کے ساتھ ہی ہیروئن نے نہر میں چھلانگ لگادی۔ روشنیوں میں نہائی ہوئی مسرت نذیر نہر کے پانی کے بیچوں بیچ ایک جل پری نظر آرہی تھیں۔

لقمان صاحب نے پکار کر کہا "مسرت، آگے بڑھو"۔

مگر مسرت وہیں کھڑی ہوگئیں بلکہ پانی میں بیٹھ گئیں۔

"ارے ارے، کیا کرتی ہو، آگے بڑھونا"۔

مسرت نے ایک دم قہقہے لگانے شروع کردیے اور پانی کے اندر سمٹ گئی۔

ابھی لقمان صاحب ناراض ہونے کا ارادہ ہی کررہے تھے کہ ایک اسسٹنٹ نے شور مچایا۔

"سر۔ وہ کیا چیز بہہ کر جارہی ہے؟"

معلوم ہوا کہ ہیروئن کا لاچا نہر کے تیز رو پانی میں بہہ گیا ہے۔ غنیمت ہے کہ وہ احتیاجاً اس کے نیچے ایک گرم پاجامہ بھی پہنے ہوئے تھیں۔

"پکڑو، پکڑو، یہ بہہ نہ جائے"۔

بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ ایک دو لڑکوں نے لپک کر چھلانگیں لگادیں۔ اور اسے پکڑنے میں کامیاب ہوگئے۔

مسرت نذیر کے قہقہے رکے تو انہوں نے کہا "مجھے تو باہر نکالیں۔ سردی لگ رہی ہے"۔

اس ہنگامے کے دوران میں لائٹس آن تھیں۔ رضا میر صاحب نے لائٹس آف کرنے کی ہدایت کی۔ فوراً کمبل اور گرم چادریں لائی گئیں اور مسرت نذیر کو نہر سے باہر نکالا گیا۔ اسٹوڈیو کے دفتر میں لے جاکر انہیں گرم انگیٹھی سے گرمی پہنچائی گئی۔ ابلے ہوئے انڈے اور چائے سے تواضع کی گئی۔ چلغوزے اور خشک میوہ پیش کیا گیا۔ ان دنوں سردی کے موسم میں ابلے ہوئے گرم انڈے اور چائے یا کافی کا بہت رواج تھا۔ ابلا ہوا انڈا دو آنے میں ملتا تھا۔ ایک آنے کا چائے کا کپ، اگر دو انڈے بھی کھائیں تو پانچ آنے میں سردی کا سامان بھی ہوجاتا تھا اور پیٹ بھی بھر جاتا تھا۔

اب وہ زمانہ خواب و خیال ہوا، کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔

پٹن کی شوٹنگ کے زمانے کا ایک اور واقعہ بھی یاد آ گیا۔ اسٹوڈیو کے نزدیک ہی ایک کھلے میدان میں بستی کا سیٹ تعمیر کیا گیا تھا۔ چند جھونپڑیاں، چند پکے مکان اور دکانیں۔ چند ریڑھے، کچھ گائیں بھینسیں اور بکریاں۔ آوارہ کتے خود ہی چلے آتے تھے۔ لیجئے بستی کا ماحول تیار ہو گیا۔ وہی سردی کا موسم تھا اور شوٹنگ بھی رات کے وقت ہو رہی تھی۔ کھلے آسمان تلے ساری رات لاہور کی کڑکڑاتی سردی میں شوٹنگ کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ مگر فلم والے بے چارے یہ سب مشکل کام کرتے ہیں اور فلم دیکھنے والوں کو لمحہ بھر کیلئے بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ جو منظر چند لمحے میں ان کی نظروں کے سامنے سے گزر جاتا ہے اسے فلمانے کیلئے اداکاروں اور فلم یونٹ کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ شدید گرمی ہو یا شدید سردی۔ ہر موسم میں دن رات فلم بندی جاری رہتی ہے۔ جون جولائی کی چلچلاتی دھوپ میں ہیروئن بڑے مزے سے ننگے پاؤں محبت بھرا گیت گاتی ہوئی نظر آتی ہے مگر یہ گانا فلماتے وقت اس پر اور یونٹ کے لوگوں پر کیا گزری تھی اس کا فلم دیکھنے والوں کو اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح ٹھٹھراتی ہوئی سردی میں کھلے آسمان کے نیچے پانی میں بھیگتے ہوئے جب گانا فلمایا جاتا ہے تو سارے یونٹ والوں پر تو خیر جو بیتتی ہے وہ بیتتی ہے لیکن غریب ہیروئن کی تو جان پر ہی بن جاتی ہے۔

ایک رات لقمان صاحب کو ''پٹن'' کیلئے ایک منظر فلمانا تھا جس میں ہیروئن یعنی مسرت نذیر پانی میں اتر جاتی ہیں۔ سخت سردی کا موسم تھا۔ رات کا وقت، ہلکی ہلکی کہر بھی چھائی ہوئی تھی۔ رات کو آٹھ نو بجے کے قریب نہر پر لائٹیں لگا کر شوٹنگ کا بندوبست کیا گیا۔ فلم کی ہیروئن کو لاچا کرتہ پہن کر پانی میں تیرتے ہوئے دکھانا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ بہت سے موٹے موٹے گرم کپڑے پہننے کے باوجود کھلی فضا میں، نہر کے کنارے سردی مزاج پوچھ رہی تھی۔ کہاں یہ کہ

پٹن کی شوٹنگ کے زمانے کا ایک اور واقعہ بھی یاد آ گیا۔ اسٹوڈیو کے نزدیک ہی ایک کھلے میدان میں بستی کا سیٹ تعمیر کیا گیا تھا۔ چند جھونپڑیاں، چند پکے مکان اور دکانیں۔ چند ریڑھے، کچھ گائیں بھینسیں اور بکریاں۔ آوارہ کتے خود ہی چلے آتے تھے۔ لیجئے بستی کا ماحول تیار ہو گیا۔ وہی سردی کا موسم تھا اور شوٹنگ بھی رات کے وقت ہو رہی تھی۔ کھلے آسمان تلے ساری رات لاہور کی کڑکڑاتی سردی میں شوٹنگ کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ مگر فلم والے بے چارے

یہ سب مشکل کام کرتے ہیں اور فلم دیکھنے والوں کو لمحہ بھر کیلئے بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ جو منظر چند لمحے میں ان کی نظروں کے سامنے سے گزر جاتا ہے اسے فلمانے کیلئے اداکاروں اور فلم یونٹ کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ شدید گرمی ہو یا شدید سردی۔ ہر موسم میں دن رات فلم بندی جاری رہتی ہے۔ جون جولائی کی چلچلاتی دھوپ میں ہیروئن بڑے مزے سے ننگے پاؤں محبت بھرا گیت گاتی ہوئی نظر آتی ہے مگر یہ گانا فلماتے وقت اس پر اور یونٹ کے لوگوں پر کیا گزری تھی اس کا فلم دیکھنے والوں کو اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح ٹھٹھراتی ہوئی سردی میں کھلے آسمان کے نیچے پانی میں بھیگتے ہوئے جب گانا فلمایا جاتا ہے تو سارے یونٹ والوں پر تو خیر جو بیتتی ہے وہ بیتتی ہے لیکن غریب ہیروئن کی تو جان پر ہی بن جاتی ہے۔

پتن کی شوٹنگ کے زمانے میں دہلی سے مشہور و معروف فلمی ماہنامہ ''شمع'' کے ایڈیٹر ادریس دہلوی صاحب بھی لاہور آ گئے۔ ادریس صاحب کے لقمان صاحب سے بہت اچھے مراسم تھے۔ ہم سے بھی ملاقات ہو گئی۔ ہمارے ہم عمر ہی ہوں گے۔ ان سے خاصی دوستی اور بے تکلفی ہو گئی۔ ادریس صاحب تو فلموں کے متعلق معلومات اکٹھی کرنے کیلئے ہی آتے تھے۔ وہ ''مسافر'' کے نام سے ہر مہینے ''شمع'' میں اپنی روداد بھی لکھتے ہیں اور اس کے لئے ہر جگہ گھوم پھر کر مواد جمع کرتے رہتے ہیں۔

ادریس صاحب شام کو اسٹوڈیو آئے۔ چائے کافی سے ان کی تواضع کی گئی۔ لقمان صاحب نے انہیں رات کی شوٹنگ دیکھنے کی دعوت دی تو وہ رضامند ہو گئے۔ جاڑوں میں لاہور میں پانچ بجے ہی رات ہو جاتی ہے۔ کھلے میدان میں بستی کے سیٹ پر شوٹنگ کا اہتمام شروع ہو گیا۔ انسان اور جانور ہر قسم کے اداکار فراہم کر دیے گئے۔ دوسرے اداکاروں کے علاوہ مسرت نذیر سے بھی ادریس صاحب کی ملاقات کرائی گئی۔ سب نے مسرت کی منت سماجت کی اور درخواست کی خدارا ادریس صاحب کے سامنے ذرا ہیروئن بن کر رہنا۔ ایسا نہ ہو وہ واپس جا کر پاکستانی ہیروئنوں کے بارے میں اچھے تاثرات کا اظہار نہ کریں۔ مسرت نذیر کیلئے تکلف کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور بات چیت کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا مگر انہوں نے اس قدر تکلف اور رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کیا کہ ہم سب حیران رہ گئے۔ سب نے انہیں چپکے چپکے مبارکباد دی کہ شاباش۔ ادریس دہلوی کو بہت اچھا امپریشن دیا ہے۔

سات بجے تو سردی میں اضافہ ہو گیا اور دھند بھی چھانے لگی۔ ادریس صاحب نے واپسی کا ارادہ کیا تو سنتوش صاحب کو شرارت سوجھی۔ انہوں نے مسرت نذیر سے کہا" مسرت۔ اگر تم ادریس دہلوی کو شوٹنگ پر روک لو تو تمہیں مان جائیں"۔

مسرت نذیر نے فوراً کہا" شرط لگائیں"۔

" لگالو شرط"۔

لیجئے، سو سو روپے کی شرط ہو گئی۔

ادریس صاحب ابھی جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ مسرت نذیر انتہائی اخلاق کے ساتھ ہیروئنوں والی مسکراہٹ چہرے پر سجائے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئیں۔ وہ اخلاقاً کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

" بیٹھے بیٹھے تکلف کیوں کرتے ہیں، کافی پئیں گے؟"

" شکریہ"۔ انہوں نے کہا" ابھی کچھ دیر پہلے پی ہے"۔

" تو پھر کیا ہوا۔ سردی کا موسم ہے۔ ابلے ہوئے انڈے اور کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

" آپ کہتی ہیں تو انکار نہیں کر سکتا" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

" شکریہ۔ ابھی آپ کیلئے کافی منگاتی ہوں۔ میں خود بنا کر پلاؤں گی"۔

ادریس صاحب انتظار میں بیٹھ گئے اور مسرت شوٹنگ میں مصروف ہو گئیں۔ مگر ادریس صاحب کی خاطر داری کی طرف سے بھی غافل نہیں تھیں۔

ایک دو گھنٹے اور گزر گئے تو ادریس صاحب پھر واپسی کیلئے پر تولنے لگے۔ مسرت پھر مسکراتی ہوئی ان کے پاس گئیں۔

" ارے ادریس صاحب، آپ بور تو نہیں ہو رہے؟"

" بالکل نہیں۔ مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے، یہ ماحول، گانے کی فلم بندی اور پنجابی میوزک"۔

" شکریہ۔ بمبئی میں آپ کو پنجابی فلموں کی شوٹنگ دیکھنے کا بھلا کب موقع ملتا ہو گا"۔

ادریس صاحب نے کہا" ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں"۔ اور بمبئی کی فلموں اور فنکاروں کے بارے میں باتیں

شروع ہوگئیں۔

سنتوش صاحب نے مسرت کے کان میں کہا ''مسرت۔اب یہ جانے ہی والے ہیں''۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'' مسرت نے بڑے وثوق سے اور اعتماد سے کہا ''جب تک ہماری شوٹنگ ہوتی رہے گی یہ سیٹ پر ہی رہیں گے اور ہمارے ساتھ ہی جائیں گے''۔

''سوچ لو، کہیں شرط ہار نہ جانا''۔

مسرت ایک بار پھر ادریس صاحب کے پاس پہنچ گئیں۔ ''ادریس صاحب، آپ کو تو سردی لگ رہی ہو گی؟''

''نہیں۔زیادہ تو نہیں لگ رہی'' انہوں نے جواب دیا۔

''لاہور کی سردی بہت سخت ہوتی ہے۔اور رات کے وقت آؤٹ ڈور میں تو قلفی جما دیتی ہے''۔یہ کہہ کر انہوں نے اپنی گرم شال ادریس صاحب کو دے دی''۔آپ یہ شال اوڑھ لیں۔ سردی کم ہو جائے گی''۔

ادریس صاحب ''نہیں نہیں'' کہتے رہے مگر مسرت نذیر نے شال ان کے حوالے کر دی جو انہوں نے فوراً ہی اوڑھ لی۔اس طرح بے چارے کو سردی کا مقابلہ کرنے میں آسانی ہو گئی۔

مسرت نے واپس آکر کہا'' اب یہ صبح تک نہیں جائیں گے''۔اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ صبح کے چار بجے تک شوٹنگ جاری رہی۔ مسرت تھوڑی تھوڑی دیر بعد شوٹنگ کے وقفوں میں ادریس صاحب کے پاس جا کر ان سے گپ شپ کرتی رہیں اور ادریس صاحب مزے سے شوٹنگ دیکھتے رہے۔

''آپ کو سردی تو نہیں لگ رہی؟'' وہ ان سے پوچھتیں۔

''جی نہیں۔آپ کی یہ شال بہت گرم ہے''۔

''کشمیری اون کی ہے۔اسے اوڑھ کر تو سخت سردی میں بھی پسینہ آجاتا ہے''۔

ادریس صاحب کہتے ''آپ اپنی شال واپس لے لیجئے۔ایسا نہ ہو آپ کو ٹھنڈ لگ جائے؟''

مسرت مسکرائیں '' بالکل نہیں۔ ہمیں تو عادت ہے۔ میں نے دوسری شال منگالی ہے۔یہ دیکھئے، یہ بھی بہت گرم ہے''۔

صبح چار بجے شوٹنگ پیک اپ ہوئی تو سردی کے مارے سب کانپ رہے تھے۔ ادریس صاحب نے مسرت نذیر کا بہت شکریہ ادا کیا اور ان کی شال انہیں واپس لوٹا دی۔

مسرت نذیر سب سے پہلے اپنی کار میں بیٹھ کر رخصت ہوئیں۔ دوسرے لوگ بھی روانہ ہو گئے۔ لقمان صاحب ادریس صاحب نے مسرت نذیر کا بہت شکریہ ادا کیا اور ان کی شال انہیں واپس لوٹا دی۔

دوسرے دن مسرت حسبِ معمول ہنستی مسکراتی ہوئی شوٹنگ پر آئیں اور آتے ہی سنتوش صاحب کے پاس پہنچ گئیں۔

''سنتوش صاحب، سو روپے نکالیے''۔

''کس بات کے سو روپے؟''

''بھول گئے، رات آپ شرط ہار گئے''۔

''ارے ہاں۔ واقعی مسرت تمہیں مان گئے''۔ انہوں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر مسرت کے حوالے کر دیا۔ سو روپے ان دنوں ایک معقول رقم ہوتی تھی۔ اور پھر یہ تو شرط میں جیتی ہوئی رقم تھی۔ مسرت نذیر نے فخریہ انداز میں سب کو سو روپے کا نوٹ دکھایا اور اس رات سیٹ پر خشک میوے اور پھلوں سے سب کی تواضع کی، یقین کیجئے۔ سو روپے میں سیروں پھل اور میوہ آ گیا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا۔

پتن کی کہانی کے سلسلے میں بابا عالم سیاہ پوش کا ذکر بھی آیا ہے۔ وہ اس فلم کے مصنف اور گیت نگار تھے۔ اتفاق سے اس فلم میں دو ''بابا'' اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک موسیقار بابا جی اے چشتی اور دوسرے مصنف بابا عالم سیاہ پوش۔ چشتی صاحب کو تو سب احتراماً پیارے سے ''بابا'' کہا کرتے تھے مگر بابا عالم سیاہ پوش کے بابا ہونے کے پیچھے ایک داستان ہے۔ بابا چشتی غضب کے ذہین اور بلا کے فنکار تھے۔ موسیقی میں تو وہ ماہر تھے ہی، گیت بھی لکھ لیتے تھے اور نہیں بہت اچھے مکھڑے بروقت سوجھ جاتے تھے۔ پتن کے چند گیتوں کے مکھڑے یعنی استھائیاں بھی ان ہی کی تخلیق کردہ ہیں۔ مگر انہوں نے ان گیتوں پر اپنا نام دینے پر اصرار نہیں کیا۔ گانے پر گیت نگار ہی کا نام دیا جاتا تھا۔ بابا چشتی ایک اچھا گانا بنا کر ہی خوش اور مطمئن ہو جاتے تھے۔ جب وہ اور بابا عالم سیاہ پوش یکجا ہوئے تو لقمان صاحب نے کہا ''لو بھئی، اللہ خیر کرے، ہم تو بابوں میں پھنس گئے''۔

لقمان صاحب خود بھی ایک سینئر ہدایت کار تھے لیکن کوئی مذاق میں ان کی عمر کا تذکرہ چھیڑتا تھا تو سچ مچ ناراض ہو جاتے تھے مگر یار لوگ انہیں چھیڑتے اور ستانے کیلئے بھی "باباجی" کہنے سے باز نہیں آتے تھے۔

باباچشتی کہتے تھے "لقمان صاحب۔ ناراض کیوں ہوتے ہیں یہ لوگ مجھے باباجی کہتے ہیں"۔

لقمان صاحب کہتے "باباجی۔ آپ کی اور بات ہے، آپ تو بزرگ ہیں"۔

"بہت خوب اور آپ تو ابھی بچے ہی ہیں"۔

اس طرح چھیڑ خانی کا سلسلہ جاری رہتا اور ہنستے بولتے کام بھی ہوتا رہتا تھا۔

بابا عالم سیاہ پوش خاموش مسکراتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی موقعے پر کوئی برجستہ فقرہ بھی چست کر دیا کرتے تھے۔

اب ان تینوں میں سے کوئی بھی نہیں رہا۔ پہلے بابا عالم سیاہ پوش پھر باباچشتی اور پھر کچھ عرصہ قبل لقمان صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، خوب لوگ تھے۔

بابا عالم سیاہ پوش کو ہم نے سفید پوش ہی دیکھا۔ شلوار قمیص یا قمیص پتلون زیب تن کرتے تھے۔ گورا رنگ، مسکراتا ہوا گول چہرہ، چمکدار آنکھیں۔ دلکش، نقوش، درمیانہ قد، بھرا ہوا جسم۔ سیاہ گھنے بال، داڑھی مونچھیں صفاچٹ۔ بہت خوش مزاج اور ہنس مکھ آدمی تھے۔ بولتے ہوئے تھوڑا سا ہکلاتے تھے مگر اس طرح کہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ان کا انداز یہ تھا کہ جس لفظ یا فقرے پر اٹے اپنے رخسار پر انگلی مارتے اور روانی سے بولنے لگتے۔ اس طرح ان کے بولنے میں ایک مخصوص دلکشی پیدا ہو جاتی تھی۔ یعنی ایک عیب کو انہوں نے حسن کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ دیکھنے میں صحت مند تو تازہ اور عمر کے کم لگتے تھے۔ نوجوانی میں ایک ہندو حسینہ کے عشق میں ایسے گرفتار ہوئے کہ دنیا کو ترک کر دیا اور فقیری اختیار کر لی۔ سیاہ لباس کو مستقل طور پر اپنا لیا اور بارہ سال تک جوگی بنے رہے۔ اسی نسبت سے وہ بابا سیاہ پوش کہلاتے تھے۔ بارہ سال کے بعد "ترقی پسند مصنف" اور اسٹیج کے ہدایت کار نفیس خلیلی صاحب کے کہنے پر دوبارہ رنگ و بو کی دنیا میں لوٹ آئے تھے۔

نفیس خلیلی وہ شخصیت تھے جنہوں نے عمر صبیحہ خانم کو اپنے اسٹیج ڈرامے "بت شکن" میں پہلی بار اداکاری کا موقع دیا تھا۔

۱۹۴۵ء عالم سیاہ پوش نے مکالمہ نویس اور نغمہ نگار کی حیثیت سے بمبئی میں ایک فلم ساز ادارے چتر بھارتی میں شمولیت کی اور ''بھنور'' ان کی پہلی فلم تھی۔ اس فلم کا مہورت مایہ ناز گلوکار کے ایل سہگل کے ہاتھوں ہوا تھا۔اس فلم کے مصنف احسن رضوی تھے مگر مکالمے اور گیت عالم سیاہ پوش نے لکھتے تھے۔

ان کی دوسری فلم ''کلنک'' تھی۔اس فلم کا پہلا گیت گانے کیلئے ایک سانولی سلونی، دبلی پتلی نووارد لڑکی آئی تو یونٹ کے لوگوں نے پسند نہیں کیا۔ان سب کا خیال تھا کہ شمشاد بیگم جیسی گلوکارہ کے ہوتے ہوئے اس نوآموز لڑکی کے گانے ریکارڈ کرنا دانشمندی نہیں ہے۔لڑکی یہ سن کر اداس اور مایوس ہوگئی مگر فلم ساز راج دیو سوراشٹر اور عالم سیاہ پوش کا ووٹ اس لڑکی کے حق میں تھا۔عالم سیاہ پوش کا کہنا تھا کہ ایک دن یہ لڑکی بہت نام پیدا کرے گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔لتا منگیشکر کا نام آج کون نہیں جانتا؟

عالم سیاہ پوش نے اس لڑکی کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا ''بیٹی! تم لوگوں کی باتوں سے ہمت نہ ہارنا۔اس وقت کا انتظار کرنا جب یہ سب تمہاری پوجا کریں گے''۔

عالم سیاہ پوش کی تجربہ کار اور دوررس نگاہ نے لتا منگیشکر کے اندر چھپا ہوا جوہر تلاش کر لیا تھا۔لتا اتنی متاثر ہوئی کہ انہیں باباجی کہہ کر مخاطب کرنے لگی۔یہاں تک کہ انہیں ''پتاجی'' کہنے لگی۔لتا اس سادہ دل عظیم انسان کو زندگی بھر فراموش نہ کرسکے گی۔

اس زمانے میں ریڈیو سیلون ایک مقبول و معروف ذریعہ، تشہیر تھا اور عموماً بھارتی فلموں کی موسیقی نشر کرنے کیلئے مخصوص تھا۔ نخشب صاحب نے پہلی بار اپنی فلم ''میخانہ'' کی پبلسٹی ریڈیو سیلون سے پیش کی اور فلم کے نغمے ہندوستان اور پاکستان میں گونجنے لگے۔اس فلم کی موسیقی بہت اچھی تھی۔ مگر فلم فلاپ ہوگئی۔ فلم کی بے انتہا پبلسٹی بھی اس کیلئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔اس لیے کہ لوگوں نے اس سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کرلی تھیں۔

''میخانہ'' فلاپ ہوجانے کے بعد نخشب صاحب نے فلم بنانے کا خیال ہی ترک کردیا۔یہ تو ایک طرح سے ان کا شوق اور مشغلہ تھا۔ذریعہ معاش کیلئے وہ اس کے محتاج نہیں تھے۔بطور ہدایت کار اور کہانی نویس پاکستان میں انہیں تسلیم نہیں کیا گیا۔ گیت نگار وہ بہت اعلیٰ درجے کے تھے مگر کسی پاکستانی فلم ساز نے ان کو گیت نگاری کی دعوت دینے کا

خطرہ مول نہیں لیا۔ نخشب صاحب نے اس بارے میں کبھی خواہش کا اظہار تک نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ پاکستان کے سبھی فلمی شاعروں، ہدایت کاروں اور موسیقاروں کو خود سے کمتر سمجھتے تھے تو پھر یہاں کی فلم میں گیت نگاری کیسے کرتے۔

مگر قدرت بھی انسانوں کو سبق سکھاتی رہتی ہے۔ پاکستان میں ان کے پاس دولت، شہرت، اثر ورسوخ سبھی کچھ تھا مگر اوپر تلے دو فلموں کے فلاپ ہو جانے کی وجہ سے ان کی شیخیوں میں خود بخود کمی آگئی تھی۔ اس کے بعد تو وہ قریب قریب گمنام ہی ہو کر رہ گئے اور اپنے قریبی دوستوں تک محدود ہو گئے تھے۔ جب ایک روز اچانک ان کی وفات کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو حیرت ہوئی۔ چونکہ اس سے پہلے ان کی علالت کے بارے میں کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی تھی۔ نئی نسل کے لوگ تو اس وقت تک انہیں بھول ہی چکے تھے۔ آج بھی نخشب جارچوی کا نام سن کر نئی پود کے لوگ سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ انہیں علم ہی نہیں ہے کہ اس شخص نے محض اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر کتنا نام اور کیسا مقام پیدا کیا تھا اور کتنی بھرپور زندگی گزاری تھی۔ موت ہی خاکی انسان کا انجام ہے۔ وہ صاحب اولاد نہیں تھے اس لئے اس کا نام چلانے والا بھی کوئی باقی نہیں ہے۔ بھائی بہن اور دوسرے رشتے داروں کا ویسے ہی کبھی نام نہیں سنا۔ اس طرح نخشب جارچوی شہرت کی چار دن کی چاندنی میں دھومیں مچانے کے بعد ہمیشہ کیلئے موت کی تاریک وادی میں گم ہو گئے۔ پاکستان کی فلمی صنعت میں انہوں نے کسی سے بنا کر نہیں رکھی تھی جو انہیں یاد کرتا۔

جن دنوں لقمان صاحب نے پنجابی فلم ''پتن'' کی ہدایت کاری کا آغاز کیا تو سب نے بہت ناک بھوں چڑھائی کہ جو شخص ڈھنگ سے پنجابی زبان بول بھی نہیں سکتا۔ وہ بھلا پنجابی فلم کیسے بنائے گا۔ لقمان صاحب کا کہنا تھا کہ فلم کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ پنجابی، اردو، بنگالی سے کیا ہوتا ہے۔ ہماری اس زمانے میں لقمان صاحب سے بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ عمر، تجربے اور مرتبے میں ہم سے بہت بڑے تھے۔ ابھی ہم نے قرینے سے فلم دیکھنی بھی شروع نہیں کی تھی جب وہ سہراب مودی اور شوکت حسین رضوی جیسے ہدایت کاروں کے معاون تھے۔ خود ساز آدمی تھے۔ گھر سے فلم کے شوق میں بھاگ کر بمبئی پہنچے تھے اور اس زمانے کے کئی لوگوں کی طرح اپنی قابلیت اور محنت کے بل بوتے پر ہدایت کاروں کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔

یہ سچ ہے کہ انہیں پنجابی بولنی نہیں آتی تھی۔ جب ایک دن کسی صحافی نے ان سے یہ بات کہی تو وہ کہنے لگے ”یار سننی تو آتی ہے نا“۔

”مگر آپ مکالمے کیسے سمجھیں گے؟“

کہنے لگے ”مجھے سمجھانے والے لوگ جو ہوں گے۔ وہ مجھے ترجمہ کر کے بتائیں گے“۔

”مگر آپ پنجابی تاثرات کیسے بتائیں گے؟“

”وہ تو خود ہی دیکھ لینا۔ یہ راز کی باتیں ہیں میں اس طرح نہیں بتا سکتا“۔

ایک روز ہم نے بھی بڑی سنجیدگی سے ان سے کہا لقمان صاحب، آپ پنجابی فلم بنانے کھڑے ہو گئے ہیں۔ سب کی نگاہیں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں“۔

کہنے لگے ”فکر نہ کرو، اللہ مالک ہے“۔

اللہ پر لقمان صاحب کا یقین بہت پختہ تھا۔ ہم نے ایک بار لکھا تھا کہ ان میں اور ہدایت کار محبوب خاں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ محبوب صاحب ان پڑھ تھے جب کہ لقمان صاحب صرف اردو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مگر مطالعہ تھا اور وہ بھی ادب اور شاعری کا۔ دونوں گھر سے بھاگ کر بمبئی پہنچے تھے۔ دونوں رنگین مزاج تھے۔ دونوں کا اللہ پر پختہ یقین تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کا صلہ بھی عطا فرمایا تھا۔

”پتن“ ۵۵۔۱۹۵۴ء کی فلم ہے۔ سنتوش کمار اور صبیحہ خانم کی جوڑی بن چکی تھی اور دونوں ہی محبوب فنکار تھے۔ اس وقت تک پنجابی فلموں میں قتل و غارت اور گنڈاسے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ رومانی اور ہلکے پھلکے موضوعات فلمائے جاتے تھے۔ اس لیے سنتوش کمار اور صبیحہ خانم کو اس فلم کے مرکزی کرداروں کیلئے چنا گیا تھا۔ صبیحہ خانم اپنی مصروفیات کی بنا پر مطلوبہ تاریخیں نہ دے سکیں تو ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ شوٹنگ سر پر آگئی تھی اور ہیروئن کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

ایک دن فلم ساز شیخ لطیف نے بتایا کہ انہوں نے ایک نئی لڑکی دریافت کی ہے۔

شیخ صاحب بہت ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے، کہنے لگے ”آپ اس کو دیکھ تو لیں اور مناسب سمجھیں تو اس کا ٹیسٹ

بھی لے لیں۔ فیصلہ بعد میں کیجئے گا‘‘۔

دراصل شیخ لطیف اس لڑکی کو انور کمال پاشا کی فلم ’’قاتل‘‘ کیلئے بھی تجویز کر چکے تھے۔ وہ اس فلم کے بھی سرمایہ کار تھے۔ اس کی شوٹنگ بھی پہلے ہوئی تھی مگر ’’پتن‘‘ پہلے ریلیز ہوئی اور مسرت نذیر کی پہچان بن گئی۔ قاتل میں وہ سائڈ رول میں تھیں اس لیے فلم ہٹ ہو جانے کے باوجود قاتل کے حوالے سے انہیں زیادہ شہرت اور پذیرائی نہیں ملی۔

بات دراصل یہ تھی کہ شیخ لطیف گڑھی شاہو میں رہتے تھے۔ وہیں خواجہ نذیر صاحب رہتے تھے جو مسرت نذیر کے والد تھے۔ ان کی لکڑیوں کی ٹال تھی۔ بہت معقول اور شریف آدمی تھے۔ مسرت نذیر نے ریڈیو میں گانا شروع کیا تو شیخ لطیف کو بھی ان کی سن گن مل گئی۔ مسرت نذیر کا اداکارہ بننے کا ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی انہیں شوق تھا مگر شیخ لطیف کے اصرار پر خواجہ نذیر مان گئے۔ اس طرح مسرت نذیر کو قاتل اور پھر پتن میں کاسٹ کر لیا گیا۔

مسرت نذیر کو دیکھا تو بنی بنائی پنجاب کی جٹی نظر آئیں۔ دراز قد، متناسب لیکن دیہاتی سخت جان لڑکیوں جیسا جسم، خوب صورت چہرہ، دلکش آواز، ہنستی تھیں تو اور بھی اچھی لگتی تھیں۔ لقمان صاحب نے انہیں ٹیسٹ لیے بغیر ہی پاس کر دیا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ شرماتی بہت تھیں۔ اداکاری کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ چنانچہ فلم کے مصنف بابا عالم سیاہ پوش کو انہیں مکالموں کی ادائیگی سکھانے پر مامور کیا گیا۔ مسرت نذیر نے بابا عالم سیاہ پوش سے بہت جلد کام کی باتیں سیکھ لیں۔ بابا عالم سیاہ پوش کی عمر تو اس وقت زیادہ نہیں تھی مگر ان کی عادت تھی کہ ہر ایک کو بیٹا یا بیٹی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کا ایک پاکیزہ اور قابلِ اعتبار امیج بن جاتا تھا۔

’’پتن‘‘ کی پہلی شوٹنگ کیلئے لقمان صاحب نے ایک رومانی منظر کا انتخاب کیا۔ مسرت نذیر کو سنتوش کمار کے ساتھ یہ رومانی منظر فلم بند کرانا تھا مگر انہیں اتنی شرم آئی کہ وہ ہاتھوں سے منہ چھپا کر بیٹھ گئیں اور صاف کہہ دیا کہ میں یہ سین نہیں کروں گی۔ جب لقمان صاحب نے زیادہ زور دیا تو وہ رونے لگیں۔ سیٹ پر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ظاہر ہے اگر ہیروئن سیٹ سے غائب ہو جائے اور کہے کہ مجھے رومانی سین کرتے ہوئے شرم آ رہی ہے تو پریشانی کی بات تو ہے۔ لقمان صاحب نے مسرت نذیر کو بہت سمجھایا۔ سنتوش کمار نے بھی سمجھایا کہ یہ سب تو مصنوعی ہے۔ جھوٹ موٹ

کی باتیں ہیں۔ ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مگر مسرت نہ مانیں، کہنے لگیں یہ غیرت کا معاملہ ہے۔ بابا عالم سیاہ پوش کی سبھی بہت عزت کرتے تھے۔ انہوں نے خاص طور پر مسرت نذیر کو ایک لیکچر دیا۔ مسرت گھبرائی گھبرائی سیٹ پر آتو گئیں مگر توقع نہیں تھی کہ وہ صحیح طریقے پر ایکٹنگ کر لیں گی۔ کچھ سنتوش کمار نے تعاون کیا کچھ ہدایت کار نے اور اس منظر کی فلم بندی کا آغاز ہونے لگا۔ مسرت نزیر نے بڑی مشکل سے رومانٹک مکالمے ادا کیے اور پھر خاموش ہو گئیں۔

''ابھی اب کیا ہوا؟'' لقمان صاحب نے پوچھا۔

''مجھے شرم آ رہی ہے۔ آپ ان سب لوگوں کو سیٹ پر سے باہر بھیج دیں''۔

لقمان صاحب ہنسنے لگے ''یہ لوگ نہیں ہیں، یونٹ کے ارکان ہیں۔ ان کے بغیر تو شوٹنگ ہو ہی نہیں سکتی''۔

''تو پھر میں نہیں کروں گی شوٹنگ۔ مجھے تو سنتوش صاحب سے بھی شرم آ رہی ہے''۔

سنتوش صاحب نے کہا ''تم کوشش تو کرو۔ میں آنکھیں بند کر لوں گا۔ تمہیں دیکھوں گا ہی نہیں۔ اور یہ سب لوگ بھی آنکھیں موند لیں گے''۔

یہ بات مسرت کی سمجھ میں آ گئی۔ خدا خدا کر کے پہلا شاٹ مکمل ہوا تالیاں بجیں۔ مبارک بادیں دی گئیں اور اس طرح پاکستان کی فلمی صنعت کو ایک نئی ہیروئن مل گئی جو آنے والے زمانے میں پاکستان کی صف اول کی اداکارہ بن گئی۔ بعد میں سنتوش صاحب مذاق میں کہا کرتے تھے ''دیکھا مسرت۔ تمہیں کیسا بیوقوف بنایا؟ آخری ہماری باتوں میں آ گئیں نا؟''

مسرت کہتی ''بے وقوف تو میں نے سب کو بنایا تھا۔ مجھے شرم ورم کچھ نہیں آ رہی تھی۔ بس ایسے ہی پریشان کر رہی تھی''۔

حقیقت یہ تھی کہ مسرت نذیر میں بقول رضا میر صاحب وہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے جو ایک اچھے مرد دوست میں ہونے چاہئیں۔ مثلاً وہ ہر کام میں دوسروں کے ساتھ پیش پیش رہا کرتی تھیں۔ لڑکیوں کی طرح بلا وجہ ناز نخرے بالکل نہیں کرتی تھیں خواتین کے مقابلے میں وہ مردوں کی محفل میں بیٹھنا اور گپ شپ لگانا زیادہ پسند کرتی تھیں۔

لطیفہ بازی اور ہوٹنگ کے معاملے میں کسی سے کم نہیں تھیں۔ دوسروں پر تو فقرے بازی کرتی ہی تھیں۔ مگر خود اپنے آپ پر بھی ہنس لیتی تھیں۔ تھوڑے ہی دن کے اندر مسرت نذیر سارے یونٹ کی پسندیدہ شخصیت بن گیں۔ کبھی ریکارڈنگ ٹرک میں ساؤنڈ ریکارڈسٹ افضل حسین صاحب اور رضا میر کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی ہیں تو کبھی ایڈیٹنگ روم میں بیٹھی ایڈیٹنگ کے رموز و اسرار کے بارے میں دریافت کر رہی ہیں۔ کیمرے کے پاس پہنچی ہیں تو عکاس رضا میر صاحب سے کیمرے اور فوٹو گرامی کے بارے میں سوال کر رہی ہیں۔ ہ شرارت میں سب کے ساتھ اور شانہ بشانہ ہوتی تھیں۔ دراصل ان میں بے جا جھجک اور خواہ مخواہ کا نخرہ بالکل نہیں تھا۔ جن باتوں پر دوسری خواتین برامان کر بات چیت کرنا بند کر سکتی تھیں ان کو مسرت انجوائے کرتی تھیں۔ بلکہ جب کوئی ان کی بات پار ناراضگی کا اظہار کرتا تو وہ ہنس کر کہتی تھیں ”آپ تو خواہ مخواہ عورتوں کی طرح برامان گئے“۔

پتن کی شوٹنگ شاہ نور اسٹوڈیو کے علاوہ مسلم ٹاؤن میں نہر کے سامنے والے اسٹوڈیو میں بھی ہوتی تھی۔ یہ اسٹوڈیو فرخ شاہ صاحب کی ملکیت تھا۔ اس زمانے میں یہاں خوب رونق رہا کرتی تھی۔ فلم سے متعلق زیادہ تر لوگ اس زمانے میں مسلم ٹاؤن اور گردونواح میں ہی رہتے تھے اس لیے انہیں آمدورفت میں آسانی تھی۔ اسٹوڈیو کے بالکل سامنے نہر بہہ رہی تھی۔ اس لیے دریا کے مناظر اور رومانی مناظر فلمانے کی بھی آسانی تھی۔ اگر جنگل کا سین فلمانا ہو تو اسی نہر پر ٹھوکر نیاز بیگ کی طرف تھوڑے آگے نکل جاؤ تو بالکل ویرانہ تھا۔ آس پاس کھیت اور درخت تھے۔ آدمی نہ آدم زاد، بڑے آرام سے فلم والے شوٹنگ کرنے میں مصروف رہتے تھے اور کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

یہ ۱۹۷۸ء کی بات ہے کہ ایک دن ہمیں شباب کیرانوی صاحب نے بتایا کہ ایک نئی لڑکی اداکارہ بننے کیلئے ملتان سے آئی ہے اور علی زیب کے گھر پر چھاؤنی ڈالے پڑی ہے۔

”وہ کیوں؟“ ہم نے پوچھا۔

کہنے لگے ”بس اسے اداکارہ بننے کا شوق ہے۔ علی بھائی اور زیبا کا آج کل ہر طرف چرچا ہے اور اس کا خیال ہے کہ وہی اسے فلموں میں کام دلا سکتے ہیں“۔

اس وقت تک خود شباب صاحب نے بھی انجمن کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کا اصلی نام انجم تھا۔ کم از کم اس نے سب کو یہی

بتایا تھا۔انجم بھی خوب صورت نام ہے لیکن شباب صاحب کو اتنا زیادہ پسند نہیں آیا۔جب انہوں نے انجم کو اپنی فلم میں ہیر وئن بنانے کا فیصلہ کیا تو انجم کا فلمی نام انجمن رکھ دیا گیا۔

انجم سے انجمن بننے کا سفر زیادہ طویل تو نہیں تھا لیکن صبر آزما ضرور تھا۔انجم کا تعلق ملتان کے بازارِ حسن سے تھا۔ کشیدہ قامت، متناسب جسم، چہرے کے دلکش نقوش، بھرے بھرے ہونٹ اور سب سے بڑھ کر نشیلی آنکھیں اس کا سب سے بڑا سرمایہ تھیں۔انجمن ایک دراز قد، دبلی پتلی لڑکی تھی۔اتنی دبلی کہ طویل القامتی کے باعث وہ کچھ عجیب بے ڈول سی لگتی تھی۔اس کی رنگت کھلتی ہوئی گندمی تھی جسے بعد میں صحافیوں نے چمپئی قرار دے دیا تھا۔یہ تو نہیں کہ وہ بنی بنائی ہیر وئن تھی مگر اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک ہیر وئن میں ہونی ضروری ہیں۔اس کی آواز میں ایک خاص کیفیت تھی جیسے کسی کو ہلکا سا زکام ہو جائے لیکن یہ ایک پر کشش اور دلوں میں ہیجان پیدا کرنے والی آواز تھی۔بعد میں جب انجمن سپر اسٹار بنی تو اس کا سراپا اور دلکش چہرے کے علاوہ اس کی آواز نے بھی فلم بینوں پر بہت غضب ڈھایا۔

ہم نے لکھا کہ انجم نے علی زیب کے گھر چھاؤنی ڈالی تھی۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ان کے گھر میں رہتی تھی۔ رہنے کیلئے اس نے لاہور کے شاہی بازار میں ایک مناسب جگہ حاصل کر لی تھی۔اور اپنا دفتر قائم کر لیا تھا۔اس کے گھر والوں کو ان کاموں کا بخوبی علم تھا۔یہی وجہ ہے کہ ملتان سے لاہور پہنچ کر اسے کوئی مالی مشکل پیش نہیں آئی۔اس کے دل میں ہیر وئن بننے کی خواہش جا گزیں تھیں۔اس کے پرستاروں اور دوستوں، سہیلیوں نے اس کے دل میں یہ بات بٹھادی تھی کہ وہ بہت کامیاب ہیر وئن بن سکتی ہے۔چنانچہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کیلئے اس نے محمد علی اور زیبا کی امداد حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ محمد علی اور زیبا اس زمانے میں مقبول ترین فلمی جوڑی تھے۔فلم سازوں اور فلمی حلقوں میں ان کا بہت اثر ورسوخ تھا۔ان کی بات ٹالنا کسی فلم ساز کیلئے آسان نہ تھا۔جب انجم نے اپنے مقصد کے حصول کیلئے علی زیب کا انتخاب کیا تو اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنی سمجھ دار اور ذہین لڑکی تھی اور شطرنج کی بازی جمانے کے ہنر سے آگاہ بھی تھی۔ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انجم نے ہیر وئن بننے کیلئے منصوبہ بندی کی اور آخر کار اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔

جب وہ لاہور پہنچی اور اداکارہ بننے کا ارادہ ظاہر کیا تو فلمی چیلوں اور کوّوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ مشیر بھی دستیاب ہو گئے۔ فلمی پرچوں کے فوٹو گرافروں نے اس کی تصویریں بھی بنانی شروع کر دیں۔ انجم جب انجمن بنی تو اس نے لباس کے معاملے میں کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ بند گلے اور عموماً پوری آستینوں کے کرتے میں نظر آئی۔ مگر انجم نے جب ہیروئن بننے کیلئے ہاتھ پیر مارنے شروع کئے تھے تو فوٹو گرافروں کے اصرار اور اپنی ناتجربہ کاری کے باعث اس نے ایسی تصویریں بھی بنوائیں جو اگر بعد میں شائع ہو جاتیں تو ہلچل مچا دیتیں۔ مگر فلمی دنیا میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہالی ووڈ ہو، بمبئی ہو، یا لاہور۔ جب بھی کوئی لڑکی ہیروئن بننے کی تمنا لے کر آتی ہے تو اسے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور عام طور پر ایسی تصویریں بھی بنوانی پڑتی ہیں جنہیں دیکھ کر بعد میں وہ خود بھی شرما جاتی ہیں۔ ہالی ووڈ کی ساحرہ مارلین مونرو نے تو ایک ایسے ہی پوسٹر کی تصویر کے عوض اداکاری کا رتبہ حاصل کر لیا تھا۔ حالانکہ اس کا معاوضہ اسے محض پچاس ڈالر ملا تھا۔ آج کی کروڑ پتی گلوکارہ، اداکارہ میڈونا نے بھی اس معاملے میں کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بہر حال انجم کی ناتجربہ کاری اور فوٹو گرافروں کی ہوشیاری کے باعث انجم نے خاصی بے باک قسم کی تصویریں بھی بنوائیں مگر غنیمت ہے کہ وہ شائع نہ ہو سکیں۔ شاید اس لئے کہ اس زمانے میں سنسر کی سختیاں بھی تھیں اور اخبار والے کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔

مگر انجم کو کسی تصویر نے نہیں، علی زیب کی سفارش نے شباب کیرانوی تک اور پھر فلمی صنعت کی دہلیز تک پہنچایا تھا۔ محمد علی اور زیبا کے کہنے پر انہوں نے انجم کو اپنے دفتر میں بلایا اور مختصر سے انٹرویو کے بعد یہ رائے قائم کی کہ انجم میں ہیروئن بننے کے جراثیم موجود ہیں۔ شباب صاحب کو پاکستان کی فلمی دنیا میں بے شمار نئے چہرے متعارف کرانے کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ سال میں تین چار فلمیں بناتے تھے اور انہیں ہر وقت اداکاروں کی کمی کی شکایت رہتی تھی۔ نئے اداکار وقت بھی زیادہ دیتے تھے اور معاوضہ بھی کم لیتے تھے۔ اور جب اسٹار بن جاتے تھے تب بھی شباب صاحب کے مرہونِ منت رہنے کی وجہ سے ان سے بہت زیادہ تعاون کرتے تھے۔

شباب صاحب کو انجم کچھ زیادہ ہی بھا گئی۔ انہوں نے چند دن اسے مکالموں کی ادائیگی اور اداکاری کی تربیت دی اور پھر اسے فوراً ایک فلم میں ہیروئن کے طور پر پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انجم کا نام تبدیل کر کے انجمن رکھ دیا گیا۔ شباب

صاحب کے پاس فلمی کہانیوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ایک کہانی ''وعدے کی زنجیر ''ان کے پاس تیار تھی۔انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔انجمن کو پاکستان کے دو سب سے بڑے ہیروز کے ساتھ ہیروئن پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔''وعدے کی زنجیر ''ایک رومانی کہانی تھی۔انجمن کے ساتھ اس فلم میں وحید مراد اور محمد علی جیسے دو سپر اسٹار بیک وقت پیش کئے جا رہے تھے۔یہ وہ زمانہ تھا جب ایک فلم میں ایک سے زیادہ ہیرو رکھنے کا طریقہ رائج نہیں ہوا تھا۔اس لئے ایک نئی ہیروئن کیلئے یہ بہت بڑا اعزاز ہی تھا کہ وہ دو سپر اسٹارز کے مقابلے میں پیش کی جائے۔سبھی کو انجمن پر رشک آیا۔دوسری ہیروئنوں نے حسد بھی کیا ہوگا۔ ایک ہیروئن نے ہم سے کہا''آفاقی صاحب شباب صاحب بھی کمال کرتے ہیں۔وحید مراد اور محمد علی کے مقابلے میں ایک بالکل نئی لڑکی کو ہیروئن بنا دیا اللہ خیر کرے''۔

مگر شباب کیرانوی حسبِ عادت پر اعتماد تھے۔شباب صاحب کی عادت تھی کہ وہ جب بھی کام کرتے بڑے خلوص اور اعتماد کے ساتھ کرتے تھے۔ لوگوں کے اعتراض کے جواب میں انہوں نے کہا''آفاقی نوٹ کر لو۔یہ لڑکی بہت بڑی ہیروئن بنے گی اور سب دیکھتے رہ جائیں گے۔''

ہم نے شباب صاحب کے دوسرے اقوال کی طرح یہ قول بھی نوٹ کر لیا۔

انجمن کو ہم نے پہلی بار شباب اسٹوڈیوز میں ''وعدے کی زنجیر'' کی شوٹنگ کے سلسلے میں دیکھا تھا۔وہ گھاگھرا چولی پہنے ہوئے تھی۔بال اس زمانے کے دستور کے مطابق بنائے تھے۔وحید مراد کے ساتھ آؤٹ ڈور میں ایک سین فلمایا جا رہا تھا۔وحید مراد بہت اعلیٰ درجے کے ایکٹر تھے۔بڑی بے تکلفی اور بے ساختگی سے اداکاری کرتے تھے۔ان کے مقابلے میں کام کرنا کچھ آسان نہ تھا۔مگر انجمن بڑے اعتماد کے ساتھ مکالمے بول رہی تھی۔وہ ذرا بھی ہراساں یا پریشان نظر نہیں آ رہی تھی۔یہ اور بات ہے کہ اس کے چہرے پر تاثرات کی کمی تھی۔

ایک دوست نے شباب صاحب سے کہا''شباب صاحب اس لڑکی کے چہرے پر ایکسپریشن تو ڈالیں''۔

وہ بولے ''میں نے پروڈکشن مینجر کو بازار بھیجا ہے''۔

ہم نے پوچھا''کس لئے ؟''

کہنے لگے ''ایکسپریشن کا ڈبا لانے کیلئے''۔پھر انہوں نے اپنے دوست سے کہا'' بھائی اس لڑکی کا یہ پہلا سین ہے۔اتنے

بڑے یونٹ کے ساتھ اتنے بڑے ہیرو کے مقابلے میں کام کر رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ابھی صبیحہ یا شمیم آرا کی طرح اداکاری نہیں کر سکتی۔ ہر چیز میں کچھ وقت لگتا ہے"۔

انجمن کے کامیاب ہیروئن بننے میں کچھ زیادہ ہی وقت لگ گیا۔ "وعدے کی زنجیر" دو بڑے اداکاروں کی موجودگی کے باوجود کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک نئی ہیروئن کیلئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ عام طور پر اداکاروں کی قسمت کا فیصلہ ان کی پہلی فلم کی کامیابی یا ناکامی ہی کرتی ہے۔ مگر بعض اوقات اس اصول میں تھوڑی تبدیلی بھی دیکھنے میں آتی ہے اور کئی فنکار ابتدائی ناکامیوں کے باوجود آخر کار کامیابی کی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ معدودے چند ہی ہوتے ہیں۔ انجمن کو بھی اس فہرست میں شمار کیا جا سکتا ہے۔
"وعدے کی زنجیر" ایک میوزیکل رومانی فلم تھی مگر انجمن فلم میں اپنے کردار کا بوجھ نہ اٹھا سکی۔ اچھی موسیقی اور دو سپر اسٹار کی بیساکھیاں بھی اسے کھڑا کرنے میں ناکام رہیں۔ دیکھنے والوں کو وہ بہت زیادہ پسند بھی نہیں آئیں۔ مگر یہ غنیمت ہے کہ انہوں نے اسے ناپسند نہیں کیا تھا۔
شباب صاحب کو اپنے انتخاب پر بہت مان تھا۔ انہوں نے "وعدے کی زنجیر" کے بعد انجمن کو دوسری فلم میں پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس بار انجمن کے ساتھ انہوں نے ایک اور سپر اسٹار ندیم کو پیش کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس فلم کا نام "دو راستے" تھا۔ اس فلم کی کاسٹ بھی معمولی نہ تھی۔ ندیم کے ساتھ ایک اور ہیرو شاہد بھی اس فلم میں موجود تھا۔ یہی نہیں ایک اور کامیاب ہیروئن ممتاز بھی اس میں جلوہ گر تھیں۔ یہ دو جوڑوں کی کہانی تھی۔ اس کی بنیاد بھی رومان اور موسیقی پر رکھی گئی تھی۔

"وعدے کی زنجیر" فروری ۱۹۸۹ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اپنے دستور کے مطابق شباب صاحب نے برق رفتاری سے اپنی دوسری فلم مکمل کی اور مئی ۱۹۸۰ء میں اسے نمائش کیلئے پیش کر دیا۔ مگر قسمت کے آگے ایک پیش نہ چلی "دو راستے" بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔
کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار کر بیٹھ جاتا۔ مگر ان صاحب کا نام شباب کیرانوی تھا۔ شباب صاحب اپنے انتخاب بلکہ حسنِ

انتخاب کی یہ بے قدری برداشت نہیں کر سکے۔ انجمن انہیں پسند تھی۔ انہوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اس کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کی تھی۔ اس کی ناکامی انہیں گوارا نہیں تھی۔ اس کی دوسری فلم کے بعد بھی انہوں نے اپنی امیدیں قائم رکھیں۔

انجمن انہیں بنی بنائی ہیروئن نظر آتی تھی۔ پھر وہ کامیاب کیوں نہیں ہوئی؟ یہ جاننے کیلئے انہوں نے تیسری فلم بھی بنا ڈالی۔

یہ ایک کامیڈی تھی۔ اس زمانے میں کامیڈی فلموں کا دور نئے سرے سے شروع ہو رہا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر شباب صاحب نے بھی ایک ہلکی پھلکی فلم بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

"آپ سے کیا پردہ" ایک دلچسپ فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم میں ایک بار پھر محمد علی کو انجمن کے ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا۔ کامیاب مزاحیہ اداکار علی اعجاز، صاعقہ اور ڈانسر عشرت چودھری بھی اس فلم کی کاسٹ میں شامل تھے۔ "آپ سے کیا پردہ" اسی سال میں ریلیز کر دی گئی مگر یہ فلم بھی سپر ہٹ نہ ہو سکی۔ انجمن کو فلم بینوں نے پسند کیا اور نہ ناپسند۔ جو ہیروئن اپنی ابتدائی تین فلموں میں کامیابی حاصل نہ کر سکے اس کا فلمی صنعت میں بھلا کیا مستقبل ہو سکتا ہے؟ مگر یہ انجمن تھی جس کے مقدر میں کاتب تقدیر نے بہت بڑی کامیابیاں اور کامرانیاں لکھ دی تھیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ تقدیر کا لکھا پورا نہ ہوتا۔

کم از کم شباب صاحب انجمن کے بارے میں مایوس ہو گئے تھے یہی وجہ ہے کہ اوپر تلے تین فلموں میں موقع دینے کے بعد انہوں نے انجمن کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ مگر یہ بات خود ان کی سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی کہ آخر پبلک نے انجمن کو ہیروئن کے طور قبول کیوں نہیں کیا؟ حالانکہ وہ بنی بنائی ہیروئن تھی؟

انجمن کیلئے حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ فلم بینوں نے اسے مسترد نہیں کیا تھا۔ اگر فلم ہٹ ہو جائے تو اس کے ساتھ ہر چیز ہٹ ہو جاتی ہے۔ انجمن کی فلمیں ہٹ نہ ہو سکی تھیں مگر انجمن فلاپ بھی نہیں ہوئی تھی۔ دیکھنے والوں کو اس کا دلنواز سراپا اور پرکشش چہرہ اچھا لگا تھا۔ تو پھر کمی کس بات کی تھی؟ اس بار انجمن کو ایک اور بڑے اور تجربہ کار ہدایت کار نے آزمانے کا فیصلہ کیا۔ یہ پرویز ملک تھے۔ پرویز ملک بہت سی کامیاب فلمیں بنا چکے تھے۔ ذہین ہدایتکاروں میں ان

کا شمار ہوتا تھا۔ سوچ سمجھ کر فلمیں بناتے تھے۔ انہوں نے ایک نئی فلم ''رشتہ'' کا آغاز کیا تو انجمن کو بھی اس فلم کی کاسٹ میں شامل کر لیا۔ ''رشتہ'' کوئی معمولی کاسٹ کی فلم نہ تھی۔ سپر اسٹار ندیم اور مقبول ترین ہیروئن شبنم بھی اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ اور بھی کئی بڑے فنکار اس میں جلوہ گر تھے۔ مثلاً صبیحہ خانم، نجمہ محبوب، ساقی، علاؤالدین وغیرہ۔ مگر قدرت کو تو انجمن کو پنجابی فلموں کی مایہ ناز ہیروئن بنانا تھا۔ پھر وہ کسی اردو فلم میں کامیابی سے کیوں کر ہم کنار ہو سکتی تھی؟

''رشتہ'' بھی ہٹ نہ ہو سکی اور وقتی طور پر انجمن کو بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ شاید اس کے اندر ایک مقبول اور کامیاب ہیروئن بننے والی صلاحیتیں اور خوبیاں موجود نہیں ہیں۔ شباب کیرانوی اور پرویز ملک جیسے ہدایتکاروں اور محمد علی، وحید مراد، ندیم اور شاہد جیسے اداکاروں کے ساتھ کام کرنے کے باوجود وہ ایک کامیاب اور مقبول ہیروئن نہیں بن سکی تھی۔ انجمن نے فلموں میں اداکاری تو شروع کر دی تھی مگر اس کے ساتھ ہی اپنے پرانے پیشے کو بھی مکمل طور پر خیر باد نہیں کہا تھا کہ عقل مندی اور مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ محتاط رہے اور اپنے تمام انڈے ایک ہی ٹوکری میں نہ ڈال دے۔ چار فلموں میں وہ قسمت آزمائی کر چکی تھی۔ بڑی بڑی، کامیاب اور مقبول ہیروئنوں کے ہوتے ہوئے کیا کوئی فلم ساز یا ہدایتکار اس کو ایک اور موقع دے گا؟ یہ سوال انجمن کیلئے خاصا پریشان کن تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی خود اعتمادی اور شوق میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ پہلے دن کی طرح پر امید تھی۔

روشن آرا بیگم کا نام ہم نے جب بھی کسی کو لیتے ہوئے سنا انتہائی ادب و احترام کے ساتھ ہی سنا۔ وہ کلاسیکی موسیقی میں نہایت بلند مقام رکھتی تھی اور ابتدائی عمر میں پکے، کانوں سے ہمیں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم کی جگہ ملکہ ترنم نور جہاں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ مگر جب آہستہ آہستہ شعور پیدا ہوا تو روشن آرا بیگم کی قدر و قیمت اور اہمیت کا بھی اندازہ ہوا۔ برصغیر کی کلاسیکی موسیقی میں روشن آرا بیگم ایک بہت بڑا نام اور ہمیشہ رہیں گی۔ ان کی گائیکی میں ایک انفرادیت اور انوکھا پن تھا اور آواز کی نغمگی تو سبحان اللہ۔ ہر راگ پر انہیں عبور حاصل تھا۔ ٹھمری جس سہولت اور ٹھاٹ سے گاتی تھیں دادرا بھی اسی آسانی اور نزاکت سے گا جاتی تھیں۔

روشن آرا بیگم کو ہم نے پہلی بار شاہ نور اسٹوڈیو میں ایک گانے کی صدابندی کے سلسلے میں دیکھا۔ایک دوست نے بڑے پرجوش انداز میں خبر دی کہ نذیر اجمیری صاحب، جو اس زمانے میں نئے نئے بمبئی سے لاہور آئے تھے، فلم ""قسمت"" کیلئے روشن آرا بیگم کی آواز میں ایک گانا ریکارڈ کررہے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں اس وقت تک روشن آرا بیگم کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں اس لے ان کی عظمت اور اہمیت سے بھی ناواقف تھے۔

عیسیٰ غزنوی نے ہمیں اس بات پر بہت ڈانٹا ""بھائی تم تو نرے جاہل کے جاہل رہے۔ کیسے صحافی ہو کہ روشن آرا بیگم کو نہیں جانتے۔جاؤ جاکر ان کے گانے کی ریکارڈنگ سنو۔ایک وقت آئے گا جب تم اس اتفاق پر فخر کرو گے""۔

پھر انہوں نے ہمیں مختصر طور پر روشن آرا بیگم کے بارے میں بتایا۔

فلم "" قسمت"" کے فلم ساز اسماعیل نور صاحب تھے۔یہ بہت بڑے فلم تقسیم کار تھے۔ دراصل پاکستان میں اے۔ آر۔کاردار صاحب کی تمام فلمیں ان ہی کے دفتر سے ریلیز ہوتی تھیں اور بہت زبردست بزنس کرتی تھیں۔نور صاحب کاردار صاحب کے بہنوئی تھے اس لیے کاردار صاحب نے پاکستان میں فلموں کے تمام امور ان ہی کو سونپ دیے تھے۔اسماعیل نور صاحب بہت تعلیم یافتہ اور شائستہ انسان تھے۔ انگریزی بہت اچھی بولتے تھے۔خوش لباس اور خوش بیان تھے۔اس زمانے میں بیرون ملک جو پاکستانی فلم کے وفود جاتے تھے ان میں اسماعیل نور صاحب ہمیشہ شامل ہوتے تھے۔ان کا دفتر بھی بہت شان دار تھا۔اعلیٰ قسم کا فرنیچر خوبصورت قالین، کرسیوں اور صوفوں پر مخمل لگی ہوئی تھی۔ صحافیوں کے ساتھ نور صاحب بہت گھل مل کر رہتے تھے۔انہیں صحافیوں سے تعلقات کی اہمیت اور فائدوں کا بخوبی احساس تھاہمارے ساتھ بھی بہت شفقت اور مہربانی کرتے رہتے تھے۔جب نذیر اجمیری صاحب پاکستان آئے تو اسماعیل نور صاحب نے بھی ایک فلم بنانے کا منصوبہ بنایا۔یہ بھی زمانے کی ستم ظریفی ہی تھی۔ورنہ نور صاحب اس سے پہلے دوسرے فلم ڈسٹری بیوٹرز کے ہم نوا ہو کر پاکستان مین کھلے عام بھارتی فلموں کی درآمد کے حق میں تھے۔مگر جب پاکستان میں فلم سازی شروع ہوئی تو انہوں نے بھی فلم سازی کا منصوبہ بنایا۔

''قسمت '' کی کہانی نذیر اجمیری صاحب نے لکھی تھی۔ وہی اس کے ہدایت کار بھی تھے۔ وہ بہت تجربہ کار اور ہنر مند انسان تھے۔ بھارت میں بمبئی ٹاکیز جیسے ادارے سے وابستہ رہے تھے اور مصنف اور ہدایتکار کے طور پر کئی کامیاب فلمیں بنائی تھیں۔ پاکستان میں ''قسمت'' ان کی دوسری فلم تھی اور خوش قسمتی سے بہت کامیاب ہوئی۔ مسرت نذیر اور سنتوش کمار نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ کہانی کی تھیم یہ تھی کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑھا چڑھا کر اپنایا جائے تو میاں بیوی میں غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور آخر کار طلاق تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ ''قسمت'' کی ہیروئن کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ فرق یہ تھا کہ نذیر اجمیری صاحب نے بڑی ہوشیاری سے تمام کہانی پیش کرنے کے بعد فلم کے آخر میں یہ انکشاف کیا تھا کہ یہ سب کچھ دراصل مسرت نذیر کا خواب تھا۔ خواب میں پیش آنے والے اقعات سے انہوں نے ایسی عبرت حاصل کی کہ اپنا گھر اجڑنے سے بچا لیا۔

عنایت حسین بھٹی کا رجحان ہمیشہ روحانیت اور تصوف کی طرف رہا۔ وہ بہت اچھے قاری بھی تھے۔ مذہب کے بارے میں ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ خاموشی سے فلاحی کام کرنے کے قائل تھے۔ لاہور کے گلاب دیوی ہسپتال میں مریضوں کیلئے وارڈ تعمیر کرانے کے علاوہ انہوں اور بھی کئی اداروں کو مالی امداد دی ہے۔ چپ چاپ مستحق لوگوں کے کام بھی آتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود الگ تھلگ اور فلمی دنیا کے ہنگاموں اور چمک دمک سے دور ہی رہتے تھے۔

عنایت حسین بھٹی کی فلم ''مورنی'' کے سلسلے میں اداکارہ یاسمین کا ذکر بھی آیا ہے۔ یاسمین پاکستانی فلمی صنعت کی ابتدائی فنکاروں میں سے ایک ہیں۔ لگ بھگ سترہ سال تک اداکاری کرنے کے بعد انہوں نے فلمی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی مگر ایک اسٹوڈیو اونر اور ہدایتکار سے شادی کرنے کے باعث وہ آج بھی فلم والوں سے ایک مضبوط رشتے میں بندھی ہوئی ہیں۔ یاسمین آج کل سید شوکت حسین رضوی کی بیگم ہیں۔ یہ ان کی اور شوکت صاحب کی دوسری شادی ہے۔ شوکت صاحب کی پہلی ہنگامہ خیز شادی میڈم نور جہاں سے ہوئی تھی اور بے شمار ہنگامہ خیزیوں کے بعد ختم ہو گئی۔ یاسمین کی پہلی شادی عکاس جعفر شاہ بخاری سے ہوئی تھی جو بعد میں فلمساز اور ہدایتکار بھی بنے۔ جعفر شاہ بخاری سے یاسمین کا ایک بیٹا بھی ہے۔ وہ شوکت حسین رضوی کے دو بیٹوں کی بھی ماں ہیں۔ ان کے سبھی بیٹے اب بہ فضلِ خدا جوان ہو چکے ہیں اور اپنی ذمے داریاں پوری کر رہے ہیں۔

یاسمین ہمیشہ سے یاسمین نہیں تھیں۔ان کا اصلی نام تو ''امینہ'' ہے لیکن جب وہ بمبئی سے پاکستان آئیں اور مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی لکھی ہوئی پنجابی فلم ''بیلی'' میں کام کیا تو منٹو صاحب نے ان کا فلمی نام زرینہ ریشماں رکھ دیا۔اس فلم کے ہدایتکار مسعود پرویز اور موسیقی کار رشید عطرے تھے۔زرینہ ریشماں نے فلم میں معاون اداکارہ کے طور پر کام کیا تھا۔ مگر اس سے پہلے وہ بمبئی میں اے آر کاردار کی سپر ہٹ فلم ''دل لگی'' میں بھی کام کر چکی تھیں جو ۱۹۴۸ء میں بنی تھی۔دل لگی کاردار صاحب کی مشہور فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔اس میوزیکل فلم میں شیام اور ثریا نے مرکزی کردار کئے تھے۔ثریا کے گائے ہوئے نغمے آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔

ہم جب فلمی دنیا سے بطور صحافی وابستہ ہوئے تو اس وقت زرینہ ریشماں یاسمین بن چکی تھیں۔اس زمانے میں فلمی حلقوں میں یہ چہ میگیوئیاں تھیں کہ یاسمین کا تعلق صوبہ مہاراشٹر سے ہے اور وہ مراٹھن ہیں۔دراصل اس تصور کو ان کے قدو قامت اور جسمانی تناسب نے بھی تقویت پہنچائی تھی۔بوٹا سا قد، گندمی رنگ، دلکش نین نقش اور متناسب خوبصورت جسم۔اس جسمانی ساخت کی بدولت ہی ان کے بارے میں یہ تاثر قائم ہوا تھا کہ وہ مراٹھن ہیں حالانکہ وہ پنجابن ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ان کے والد کا تعلق لاہور کے پراچہ خاندان سے تھا۔وہ کاروبار کے سلسلے میں بمبئی چلے گئے تھے۔وہیں امینہ نے جنم لیا اور اسکول میں تعلیم حاصل کی۔وہ دور فلموں سے دیوانگی کی حد تک رغبت کا دور تھا۔ امینہ کو بھی نو عمری سے ہی اداکاری کا شوق تھا۔جب انہیں ''دل لگی'' میں کام کرنے کی پیشکش کی گئی تو ان کے والد نے قدرے پس و پیش کے بعد اجازت دے دی۔لیکن اس کے بعد وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ لاہور چلی آئیں اور پھر یہیں کی ہو کر رہ گئیں۔

امینہ سے وہ زرینہ ریشماں بنیں اور پھر یاسمین کے روپ میں سامنے آئیں۔انہوں نے کئی کامیاب فلموں میں اداکاری کی۔وہ صف اول کی ہیروئن تو نہ بن سکیں مگر اپنی اداکاری کے باعث اچھی ہیروئنوں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا۔پاکستان میں انہوں نے اپنی اداکاری کا آغاز معاون اداکارہ کے طور پر کیا تھا۔ مگر بعد میں ہیروئن بن گئیں اور بہت سی کامیاب فلموں میں نمودار ہوئیں جن میں امانت، زہر عشق، مراد، دیار حبیب، جبرو، معصوم، باغی، بھروسا.... آدمی اور فرشتہ وغیرہ شامل ہیں۔ان کی آخری فلم ''سوکن'' تھی۔ جس کے ہدایتکار معروف موسیقار فیروز نظامی کے بیٹے

عارف نظامی تھے۔اس کے بعد انہوں نے اداکاری ترک کر دی اور گھر گرہستن بن گئیں۔انہوں نے بھابی، للکار، التجا، ہم سفر، سلمیٰ، حقیقت، لخت جگر، قسمت، مرزا صاحبان، انجام، ڈنڈیاں، کالا پانی، نظام لوہار، ماں، بیٹی اور ماں مامتا میں بھی کام کیا تھا۔ انہیں اردو اور پنجابی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا اور وہ بڑے صحیح تلفظ اور لب و لہجے میں اردو اور پنجابی بولتی تھیں۔

ہماری ان سے اس وقت سے یاد اللہ ہے جب وہ زرینہ ریشماں تھیں۔وہ ہنس مکھ، بااخلاق اور اچھی شائستہ اور دلچسپ گفتگو کرنے والی خاتون ہیں۔ادب ذوق بھی ہیں اور مطالعے کی شوقین بھی۔یوں تو ان کے ساتھ اکثر فلموں کے سیٹ پر ملاقات اور بات چیت ہوتی رہتی تھی مگر زیادہ گپ شپ اس زمانے میں ہوئی جب لقمان صاحب کی فلمیں ''آدمی'' اور ''فرشتہ'' شروع ہوئیں تو ہم نے آفاق چھوڑ دیا تھا اور فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے تھے۔لقمان صاحب سے ہماری دوستی پرانی تھی۔''ایاز'' کے زمانے میں بھی ہم ان کی کہانی، مکالموں اور اسکرین پلے سے منتھی رہے مگر ''آدمی'' کے اسکرپٹ کی تیاری میں تو ہم نے باضابطہ حصہ لیا تھا''آدمی'' میں وہ ہیروئن تھیں۔بلکہ ہیروئن تو دراصل ایک ہی تھی یعنی یاسمین۔نیر سلطانہ نے اس میں دوسری ہیروئن یا سائیڈ ہیروئن کا کردار کیا تھا۔اس وقت یاسمین باقاعدہ ہیروئن بن چکی تھیں۔

''آدمی'' کی تیاری اور تکمیل کے سلسلے میں ہمارا زیادہ وقت لقمان کے ساتھ شاہ نور اسٹوڈیو میں گزرتا تھا۔ یاسمین سے بھی شوٹنگ کے سلسلے میں ملاقات رہتی تھی اور خاصی بے تکلفی بھی ہو گئی تھی۔وہ ان دنوں جعفر شاہ بخاری کی بیگم تھیں۔جعفر شاہ سے ابھی ہماری اچھی خاصی ملاقات تھی۔اس طرح ہمیں یاسمین سے ملنے اور بات چیت کرنے کے موقعے ملتے رہے۔

''آدمی'' کی کہانی لقمان صاحب بمبئی سے لے کر آئے تھے۔دلیپ کمار اور ان کے خاندان سے لقمان صاحب کے دیرینہ مراسم تھے۔دلیپ کمار کے بڑے بھائی ایوب خان نے ''کالا آدمی'' کے نام سے ایک فلم بنانے کا اعلان کیا تھا جس کی کہانی بھی انہوں نے خود ہی لکھی تھی۔دلیپ کمار اس کے مرکزی کردار کر رہے تھے۔ایوب خان اچانک انتقال کر گئے تو دلیپ کمار نے یہ منصوبہ ترک کر دیا۔ان ہی دنوں لقمان صاحب بمبئی پہنچے تھے۔انہوں نے ''کالا

آدمی" کی کہانی دلیپ کمار سے حاصل کرلی۔ وہ بمبئی سے واپس آئے تو وہاں کی فلمی صنعت کے بارے میں بیشمار کہانیاں لے کر آئے۔ ان میں زیادہ تر کہانیاں دلیپ کمار کے بارے میں تھیں۔ ان کے تازہ ترین اور گزشتہ رومان "مغل اعظم" کی فلم بندی کے واقعات مدھوبالا کے ساتھ دلیپ کمار کی شادی کے امکانات محبوب صاحب کی آئندہ فلموں کے منصوبے وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے دن وہ ہمارے دفتر تشریف لائے اور اعلان کیا کہ "آفاقی۔ بس تیار ہو جاؤ۔ بمبئی سے بہت اچھی کہانی لے کر آیا ہوں"۔

"کیا چربہ فلم بنانے کا ارادہ ہے؟" ہم نے پوچھا۔

وہ مسکرائے اور ڈانٹ کر بولے "تم مجھے چربہ ساز سمجھتے ہو؟ ارے بھئی یوسف سے وہ کہانی لے آیا ہوں جو وہ خود بنانا چاہتے تھے"۔

یہ اپنی فلم بنانے کے سلسلے میں دلیپ کمار کا پہلا منصوبہ تھا۔ فلم "گنگا جمنا" انہوں نے چند سال بعد بنائی تھی اور محض اپنے حریف راج کپور کو یہ بتانے کیلئے بنائی تھی کہ میاں کسی اور خیال میں نہ رہنا۔ اپنے آپ کو بہت بڑا فلمساز سمجھ بیٹھے ہو۔ لو ہم نے بھی ایک فلم بنائی ہے۔ اب کہو کیا خیال ہے؟

اس زمانے میں حبیب باغ گل بیگم کے علاقے میں ایک معمولی سے دو کمروں کے مکان میں اپنے ایک دوست کے ساتھ رہتے تھے۔ کرایہ دونوں مل کر ادا کرتے تھے جو کہ بمشکل کل تیس پینتیس روپے تھا۔ کبھی کبھی لقمان صاحب سے کہتے کہ گوجرانوالہ سے میری بہن آرہی ہیں۔ اگر آپ اپنی کار مستعار دے دیں تو مہربانی ہوگی۔ ہم سے بھی وہ سفارش کروالیا کرتے تھے۔ اس طرح لقمان صاحب کی کار مع ڈرائیور حبیب کو مل جایا کرتی تھی۔ کچھ عرصے بعد ہمیں یہ حقیقت معلوم ہوگئی اور وہ بھی اتفاقیہ، حبیب کے مکان کے ساتھ والے مکان میں فلم "ٹھنڈی سڑک" کے سرمایہ کار بابو مجدد کے ایک رشتے دار رہا کرتے تھے۔ ایک بار جب حبیب کی بچیاں اور بیوی گوجرانوالہ سے آئیں تو عورتوں کی عادت کے مطابق دیوار پر چڑھ کر باتیں ہوئیں اور پڑوسن کو پتا چلا کہ یہ حبیب کی بچیاں ہیں۔ حبیب اس کے بعد بھی یہ حقیقت چھپاتے رہے۔

کچھ عرصہ بعد انہوں نے اداکارہ نغمہ سے شادی کرلی جو کافی عرصے قائم رہنے کے بعد ختم ہوگئی۔ حبیب کے ابتدائی زمانے کے بہت سے دلچسپ واقعات ہمیں یاد ہیں۔ ہماری ان سے اچھی دوستی تھی مگر جب وہ بڑے اداکار اور فلمساز بنے تو یہ تعلقات برقرار نہ رہ سکے۔ ایک بار تو انہوں نے ہم پر اور ''نگار'' ویکلی کے ایڈیٹر الیاس رشیدی صاحب پر ہتک عزت کا مقدمہ بھی ٹھونک دیا تھا۔ ہم اس زمانے میں ''نگار'' میں لاہور سے ایک فلمی کالم ''علی بابا کی ڈائری'' کے نام سے لکھتے تھے۔ اس کالم میں حبیب پر تنقید کی تو وہ ناراض ہوگئے اور اپنے ایک مجسٹریٹ دوست کے بل بوتے پر ہتک عزت کا دعویٰ کردیا۔ یہ مقدمہ سال ڈیڑھ سال چلتا رہا مگر پیشی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس زمانے میں ہم اپنی پہلی فلم ''کنیز'' پروڈیوس کررہے تھے۔ پہلی ہی پیشی پر ہمارے وکیل نے حبیب کے گواہ اور اداکار سکندر سے ایسے سوالات کیے کہ انہیں پسینہ آگیا اور انہوں نے مزید گواہی دینے سے انکار کردیا۔ وہ ہمارے پاس صلح کی تجویز لے کر آئے اور آخر کار صلح ہوگئی۔ مگر حبیب کی طرف سے ہمارے دل میں جو بال آچکا تھا وہ باقی رہا۔ اس کے بعد ادھر ادھر کبھی ملاقات ہوجاتی تو علیک سلیک ہوجاتی تھی اور بس۔

حبیب کفایت شعاری میں بھی کنجوسی کی حد سے آگے نکل گئے تھے۔ اس زمانے میں کمال بھی نئے نئے فلمی دنیا میں آئے تھے اور حبیب بھی۔ دونوں ہماری ہی لکھی ہوئی فلموں میں جلوہ گر ہوئے اور ہماری ہی کوشش اور سفارش سے ہیرو منتخب ہوئے۔ ''ایاز'' میں حبیب اور کمال نے ایک ساتھ کام بھی کیا تھا۔ کنجوسی کے معاملے میں وہ دونون نہلے پہ دہلا تھے۔ ہم ان دونوں کے بارے میں چپکے چپکے لطیفے بنا کر پھیلا دیتے تھے۔ کبھی کبھی اخبار میں بھی چھاپ دیتے تھے۔ کمال تو ہنس دیتے تھے مگر حبیب کو یہ بات ناگوار گزرتی۔ انہوں نے ہمارے خلاف جو کیس کیا تھا اس کا ایک سبب یہ لطیفہ سازی بھی تھا۔

حبیب ہیرو تو بن گئے مگر کبھی صف اول کے ہیرو نہ بن سکے۔ بعض فلموں میں ہیرو کے باپ کے طور پر اداکاری کرتے رہے۔ ان کی آواز، قد و قامت اور ڈیل ڈول بہت موزوں تھا۔ چہرے پر تاثر بھی تھا مگر اداکاری کی صلاحیتیں کم تھیں۔ ان میں جو عاجزی اور مودبانہ پن تھا وہ ان کی قد و قامت سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ ان کا فٹ ورک بھی اچھا نہیں تھا۔ مگر بہت عرصہ تک فلموں میں چلتے رہے۔ فلمساز بھی بنے اور نہ صرف خوب پیسہ کمایا بلکہ اسے سینت کر بھی

رکھا۔ بہت اخلاق سے جھک کر ملتے تھے بلکہ اس قدر انکسار سے کام لیتے تھے کہ اس میں لجاجت اور خوشامد جھلکنے لگتی تھی۔ ان کا یہی انداز ان کی اداکاری میں بھی کارفرما تھا۔ روپے پیسے کے معاملے میں وہ خاصے محتاط تھے۔ سوشل لائف بہت محدود تھی۔ شاید اس لئے کہ اس میں پیسے کا خرچہ ہوتا ہے۔ اس لئے تقاریب اور پارٹیوں وغیرہ میں آنے جانے سے پرہیز کرتے تھے اور ایک محدود حلقے میں ہی رہتے تھے۔ اگر ان میں اداکارانہ صلاحیت ہوتی تو وہ پاکستان کے صف اول کے اداکاروں میں شامل ہوتے۔ ان کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ ان کے قد و قامت اور آواز کے مقابلے میں ان کی بول چال میں مردانہ پن نہیں تھا۔

"آدمی" میں ان کا ڈبل رول تھا۔ پاکستان میں اس وقت ڈبل رول اور ہم شکل کرداروں والی فلمیں زیادہ نہیں بنی تھیں جس کی ایک وجہ تکنیک کی کمی بھی تھی۔ مگر اس فلم میں عکاس رشید چودھری نے بہت خوبصورتی سے ماسکنگ کی اور حبیب کا دہرا کردار اسکرین پر بھی بہت اچھا لگا۔ یاسمین اس فلم میں ان کی بیوی کا کردار کر رہی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ لقمان صاحب کی ہدایتکاری اور یاسمین کی اداکاری اس فلم کی نمایاں خوبیاں تھیں۔

آغا شورش کاشمیری صحافت، سیاست اور ادب کی دنیا میں ایک مانا ہوا نام ہیں۔ سیاست میں گئے تو نوعمری اور جوانی انگریزوں کے جیل خانوں اور تشدد کی نذر کر دی۔ شاعری کرنے پر آئے تو اس قدر خوب صورت، بامعنی اور برجستہ غزلیں اور نظمیں لکھیں کہ مولانا ظفر علی خان جیسا استاد بھی قائل ہو گیا۔ نثری تحریر میں ان کا ایک منفرد انداز ہے۔ الفاظ ہیں کہ رکنے میں نہیں آتے۔ استعارے، محاورے، کنائے، تلمیحات کا ایک بے قابو دریا ہے کہ طغیانی میں آیا ہوا ہے۔

شورش صاحب کی سمجھ میں نہیں آتا کہ الفاظ کے اس ہجوم میں سے کاغذ پر لکھنے کیلئے کسے لیں اور کسے چھوڑیں۔ ان کی تحریر میں ایسا بانکپن، سادگی، شکوہ اور تاثر ہے کہ آج بھی تازہ محسوس ہوتی ہے۔ صحافت کے میدان میں بھی انہوں نے اپنی آمد سے تہلکہ مچا دیا تھا۔ ان کا ذاتی ہفت روزہ "چٹان" ایک ایسا جریدہ تھا جس کا ہر ایک کو انتظار رہتا تھا۔ اس کے قلم کی زد سے کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکتا تھا۔ بڑی سے بڑی اور بااختیار و بااقتدار ہستیاں بھی ان کی نکتہ چینی سے محفوظ نہیں رہ سکیں۔ وہ ایک نڈر اور بے باک صحافی تھے۔ مقرر ایسے کہ سرِشام تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو فجر کی

نماز تک بولتے رہتے اور مجمع پر ایک سحر طاری کر دیتے تھے کہ کیا مجال جو کوئی اپنی جگہ سے اٹھ جائے۔ان کی تقریریں اور جلسے سننے کیلئے لوگ یوں جاتے تھے جیسے پرانے زمانے میں تھیڑیا بائی اسکوپ دیکھنے کے لئے جاتے تھے یعنی بستر بوریا اور کھانے پینے کا سامان ہمراہ لے جاتے۔ ظاہر ہے کہ رات بھر کی نشست کیلئے ان چیزوں کی ضرورت تو پڑتی ہے۔یہ ممکن نہ تھا کہ آغا شورش کاشمیری کے جلسے میں جائے اور ان کی تقریر ادھوری چھوڑ کر چلا آئے۔یہ سب نظارے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

۱۹۵۲ء کے صوبائی انتخابات کے موقع پر آغا شورش تو جلسوں اور تقریروں میں مصروف ہو گئے اور ''چٹان'' کو بروقت پریس میں پہنچانے کی ذمے داری ہمارے نحیف کاندھوں پر ڈال دی۔ لیکن وہ جہاں کہیں بھی ہوتے اپنا اداریہ اور مستقل کالم '' بوئے گل نالہ دل'' بڑی پابندی کے ساتھ وقت مقررہ پر پہنچا دیتے۔ان دونوں تحریروں کے بغیر ''چٹان'' نامکمل تھا۔ہزاروں قارئین صرف ان کی تحریروں کو پڑھنے اور پھڑکتی ہوئی تنقید سننے کی غرض سے ہفتے بھر دن گنتے رہتے تھے۔ان کی مطبوعہ تحریر کو دیکھئے تو یوں لگتا ہے۔ جیسے نگینے جڑے ہوئے ہیں۔ مگر جب ہم نے پہلی بار ان کی اپنی تحریر دیکھی تو یقین نہیں آیا کہ یہ شورش کی صاحب کی تحریر ہے۔اس قدر بد خط، بڑے بڑے حروف اور زیر زبر کا کوئی خیال ہی نہیں۔ پہلی بار ان کا لکھا ہوا اداریہ ہماری نظر سے گزرا تو ہم کافی دیر تک اسے غور سے دیکھتے اور پڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔

اخباروں میں کام کر کے ہمارا واسطہ بڑے بڑے بد خط لوگوں سے پڑا تھا مگر آغا شورش کی تو شان ہی نرالی تھی۔اس قدر خوب صورت اور جاندار دماغ مگر جسم ایسا کہ کوئی کل سیدھی نظر نہ آتی تھی۔ ہم ان کاغذات کو کافی دیر تک دیکھتے رہے اور سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ یاالٰہی یہ کوئی تعویذ ہے۔ کسی گم شدہ خزانے کا نشان ہے یا کوئی گورکھ دھندا۔اگر دو لفظ بمشکل سمجھ میں آتے تو باقی سطریں گڈ مڈ ہو جاتی تھیں۔ان کے مستقل کاتب بہت ہنسے اور کہا

''آفاقی صاحب۔ شورش صاحب کی تحریر اہلِ حکومت کیلئے تو قیامت بن کر نازل ہوتی ہی ہے مگر ہم کاتبوں پر بھی برق بن کر گرتی ہے۔اس کو پڑھنا اور سمجھنا بڑے دل گردے کی بات ہے''۔

اور پھر ستم یہ کہ ایسی بامحاورہ فارسی کے اشعار سے مزین محاوروں اور استعاروں سے بھرپور تحریر ہوتی تھی کہ آج کل

کے ایم اے اردوو عربی بھی نہ پڑھ پائیں۔ مگر اس زمانے کے کاتبوں کی قابلیت کی داد دینی پڑتی ہے کہ شورش صاحب کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ پڑھ لیتے تھے۔

آغا شورش کی علمیت اور ادبی اہمیت مسلمہ ہے۔ صحافی ایسے کہ بڑے بڑے صاحبِ اقتدار سے بے خوف خطر ٹکرا جاتے تھے اور وہ ان کے قلم کی کاٹ سے گھبراتے تھے۔ یہ مقولہ کہ ''قلم تلوار سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے''۔ آغا شورش جیسے صحافیوں کے ساتھ رخصت ہو گیا ہے۔ آج کے ملاوٹ زدہ دور میں صحافت میں بھی ملاوٹ کا عمل دخل ہو گیا ہے۔

یہ تو ایک علیحدہ داستان ہے اور ایک مفصل تذکرے کی مستحق ہے۔ ذکر یہ ہو رہا تھا کہ آغا شورش کاشمیری جیسا ''باغی'' بازارِ حسن میں کیسے پہنچ گیا؟ دراصل طوائف آغا شورش کیلئے ایک دلچسپ اور تحقیق طلب موضوع تھا۔ وہ طوائف کو معاشرے کے ظلم اور ناانصافی کا نتیجہ خیال کرتے تھے۔ اس بازار میں عورتیں کیوں رہتی ہیں؟ وہ وہاں کیسے پہنچتی ہیں اور ان کے ساتھ معاشرہ کیسا سلوک روا رکھتا ہے؟ ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے کیلئے انہوں نے ایک کتاب لکھنے کا قصد کیا۔ سالہا سال تک معلومات حاصل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ کتاب ''اس بازار میں'' کے نام سے شائع ہوئی اور موضوعِ سخن بن گئی۔

جن دنوں ہم ہفت روزہ ''چٹان'' میں کام کر رہے تھے اسی زمانے میں آغا شورش اس کتاب کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے ایک دوست ابو یوسف قاسمی صاحب تھے۔ عمر میں آغا صاحب سے کم تھے لیکن ان کے بے تکلف دوستوں میں شامل تھے۔ شورش صاحب سے بات چیت سے کم تھی لیکن قاسمی صاحب کے ساتھ رفتہ رفتہ خاصی بے تکلفی پیدا ہو گئی اور ان کے ذریعے ہمیں شورش صاحب کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔

ایک دن ابو یوسف قاسمی سے ہم نے کہا۔ ''آفاقی۔ کل آغا کا ہیرا منڈی جانے کا پروگرام ہے''۔

ہم حیران رہ گئے اور بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگے ''آغا شورش اور ہیرا منڈی؟ لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیسے ممکن ہے؟''

وہ ہنسے اور بولے ''یقین نہیں آیا؟ تو ٹھیک ہے۔ آغا صاحب تمہیں خود ہی اپنے ساتھ لے جا کر تمہارے چودہ طبق روشن

کردیں گے"۔

ہم نے مذاق سمجھ کر بات کو بھلادیا مگر دوسرے دن دوپہر کے وقت آغا صاحب نے ہمیں بلایا اور کہا "آفاقی صاحب۔ آج شام کو آپ میرے ساتھ چلیں گے"۔

"کہاں؟" ہم نے پوچھا۔

"اس بازار میں"۔

ہم حیران رہ گئے "آپ کا مطلب ہے ہیرامنڈی؟"

ہمارے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ ہنسی ضبط نہ کرسکے۔ بولے "اس قدر حیرانی کی کیا ضرورت ہے؟"

ہم نے کہا "شورش صاحب۔ شریفوں کا ہیرامنڈی میں کیا کام؟"

کہنے لگے "مولانا۔ یہ سب شریفوں ہی کا کارنامہ ہے ہیرامنڈی میں کسی کمینے اور غریب آدمی کا تو گزر بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ لڑکیاں شریفوں اور دولت مندوں ہی کی اولادیں تو ہیں"۔

ہم نے کہا "شورش صاحب۔ مگر کسی نے دیکھ لیا تو"....

وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسے "دیکھ لیا تو کوئی آسمان تو نہیں ٹوٹ پڑے گا ۔ارے مولانا آپ اکیلے تو نہیں ہوں گے۔ میں بھی تو آپ کے ساتھ ہوں گا۔ایک دو دوست اور بھی ہوں گے"۔

ہم پریشان ہوگئے اور سوچ میں پڑ گئے۔

انہوں نے کہا "یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بھی بندوں کی نیت دیکھتا ہے۔ ہم وہاں کسی برے ارادے سے تو نہیں جارہے ہیں"۔

پھر انہوں نے بتایا کہ وہ "اس بازار میں" کے عنوان سے طوائفوں کے بارے میں ایک کتاب لکھنے والے ہیں جس کیلئے مواد اکٹھا کرنے کیلئے وہ ہیرامنڈی جائیں گے۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ قاضی شہر بھی آپ سے نہیں پوچھے گا۔ مولانا میری صحبت میں ہوں گے تو بھلا کوئی آپ کی نیت پر شک کرسکتا ہے؟"

بات معقول تھی اس لئے ہم چپ ہو رہے مگر دل میں دھک دھک سی ہونے لگی۔ شام کو ابو یوسف قاسمی بھی آ گئے۔ وہ بہت ہنس مکھ اور فقرہ باز آدمی تھے۔ یہاں تک کہ شورش صاحب کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ حالانکہ وہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ایک اور بزرگ بھی شام کے وقت آیا کرتے تھے۔ ان کا نام یاد نہیں آ رہا مگر آخر میں قاضی لگا ہوا تھا اس لئے "قاضی صاحب" ہی کہلاتے تھے۔ قاضی صاحب کسی زمانے میں "ڈان" دہلی کے سرکولیشن یا اشتہاری شعبے سے بھی منسلک رہ چکے تھے۔ اس زمانے میں لاہور کے معروف انگریزی روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" سے وابستہ تھے۔ معلوم ہوا کہ ہم تینوں شام کو شورش صاحب کے ہمراہ ہیرا منڈی جائیں گے۔

لاہور کی ہیرا منڈی کے بارے میں ہم نے بہت سی کہانیاں سنی تھیں۔ وہاں کی رونق اور چہل پہل، تہذیبی روایات اور رنگین ماحول کے متعلق بھی جانتے تھے مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ ہم خود بھی اس کوچہ رنگین کے سیر بینوں میں شامل ہوں گے۔

ہم نے لکھا ہے کہ ہم "اس بازار" میں زندگی میں پہلی بار آغا شورش کے ساتھ گئے تھے لیکن سچ پوچھئے تو یہ بیان سو فیصد درست نہیں ہے ایک بار ہم پہلے بھی اس کوچے میں جا چکے تھے لیکن کب اور کس طرح؟ یہ بھی سنئے۔

ہم میرٹھ میں غالباً میٹرک کے طالب علم تھے اور شہر سے دور چھاؤنی کے علاقے میں رہتے تھے۔ ہر روز اسکول آنے جانے کے سوا کہیں اور جانے کی ہمیں اجازت نہیں تھی، نہ حاجت۔ ہم جس کوٹھی میں رہتے تھے وہ ستر اسی کنال میں پھیلی ہوئی تھی۔ دو اطراف میں لان اور عقب میں باغ تھے، عقب میں کھیت، جن میں سبزیوں اور کبھی کبھی اجناس کی بھی کاشت ہو جاتی تھی۔ ایک جانب شاگرد پیشہ اور گھوڑوں کے اصطبل تھے۔ شاگرد پیشہ ایک درجن سے زائد کوارٹروں پر مشتمل تھا جس میں ملازم اور ان کے خاندان رہائش پذیر تھے۔ اس زمانے میں ملازم خاندانی اور دیرینہ ہوا کرتے تھے۔ اولاد در اولاد ایک ہی گھر میں کام کرتے رہتے تھے۔ پھر اہم کام کرنے کیلئے ملازم علیحدہ تھے۔ مثلاً باورچی، بیرا ہٹلر، جمعدار یا جمعدارنی۔ صفائی اور جھاڑ پونچھ کرنے والے، ڈرائیور، بازار سے سودا لانے والے۔ باغ کی نگہداشت کرنے والے مالی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب مستقل ملازم تھے اور اپنے خاندان کے ساتھ شاگرد پیشہ میں رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی جس وقت بھی ضرورت پڑ جائے وہ حاضر ہو جاتے تھے۔ گویا کل وقتی ملازم تھے۔

شاگرد پیشے کے ساتھ ہی اصطبل تھا۔میرٹھ کا ریس کورس ہماری کوٹھی سے ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھا۔اس کے گرد ونواح کی تمام کوٹھیوں میں اصطبل تھے۔جب ریس کا موسم شروع ہوتا تو دوسرے شہروں سے گھوڑے میرٹھ منتقل ہو جاتے تھے۔ان کیلئے اصطبلوں کی ضرورت پڑتی تھی اور یہ ضرورت اس علاقے کے کوٹھیوں والے پوری کرتے تھے۔اصطبلوں کا معقول کرایہ مل جاتا تھا۔گھوڑوں کے سائیس اور بعض اوقات ٹرینز بھی ان کے ساتھ ہی رہتے تھے اس لئے ان کیلئے بھی کوارٹرز مہیا کئے جاتے تھے۔یہ امداد باہمی کا ایک طریقہ تھا۔یعنی ریس والوں کا بھی فائدہ تھا اور کوٹھی والوں کا بھی۔ہم نوعمر تھے۔اس لئے کسی ملازم یا بڑے رشتے دار کے بغیر گھر سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔سکول ہمارے گھر سے ڈیڑھ دو میل دور تھا اس ئے شام کو کھیلنے کیلئے وہاں جانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔لہٰذا دوستوں کو یہ دعوت عام تھی کہ وہ شام کے وقت ہمارے گھر آئیں۔ہر قسم کے کھیل کھیلیں۔باغوں میں لگے ہوئے پھلوں کے درختوں پر چڑھ کر امرود، بیر، شہتوت اور آم وغیرہ توڑ توڑ کر کھائیں اور خوب ادھم مچائیں۔ یوں تو یہ بہت اچھا پروگرام تھا مگر مشکل یہ تھی کہ ہم محض اسکول اور گھر تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔کسی ضرورت سے شہر جانا ہوتا تو گھر کا کوئی بڑا فرد یا ملازم ہمراہ ہوتا تھا۔تنہا گھر سے نکلنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ویسے بھی سڑکیں سنسان اور ویران تھیں۔ایسے میں ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ بھی بے حد طویل محسوس ہوتا تھا۔دوسرے لفظوں میں یہ سمجھ لیجئے کہ ہم ایک طرح سے ''بھنورے'' میں پرورش پا رہے تھے۔گھر کے باہر کی دنیا، بازار، سیر گاہیں وغیرہ ہماری رسائی سے باہر تھیں۔کبھی فلم دیکھنے بھی جاتے تو کسی نہ کسی کا ہمارے ساتھ ہونا لازمی امر تھا۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک تو ہم '' باہر کی دنیا'' سے بہت حد تک ناواقف تھے اور دوسرے یہ کہ اس دنیا کو دیکھنے کیلئے ترستے رہتے تھے۔

ایک روز ہمارے ڈرائیور صاحب نے بتایا کہ وہ کچھ خریداری کرنے کی غرض سے گھنٹہ گھر جا رہے ہیں۔یہ شہر کا کاروباری مرکز تھا اور یہاں مختلف بازاروں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ان ڈرائیور صاحب کو منشی جی کہا جاتا تھا۔وجہ یہ تھی کہ ڈرائیونگ تو یہ برائے نام ہی کرتے تھے لیکن ان کا اصل کام حساب کتاب رکھنا تھا۔اب ان کا حلیہ بھی سن لیجئے۔ دبلے پتلے، گنجے، عمر پینتالیس پچاس کے لگ بھگ۔آنکھوں پر باریک فریم کی عینک، سر پر رام پوری ٹوپی، کرتہ پاجامہ اور شیروانی ان کا لباس تھا۔ گرمیوں میں ٹھنڈی اور جاڑوں میں گرم شیروانی استعمال کرتے تھے۔ٹھوڑی پر

ایک مختصر سی چونچ نما داڑھی تھی جسے عرفِ عام میں چگّی داڑھی کہا جاتا ہے۔

منشی صاحب کا بیشتر وقت کوٹھی کے برآمدوں اور شاگرد پیشے میں ہی گزرتا تھا اس لئے ہم بھی جب کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو ادھر ادھر گھومنے لگتے اور کہیں نہ کہیں منشی جی سے سابقہ پڑ جاتا تھا۔ یہ منشی جی بڑے زندہ دل اور رنگین مزاج آدمی تھے۔ باتوں باتوں میں ہمیں تھیٹر، بائی اسکوپ اور طوائفوں کے قصے سناتے رہتے تھے اور ایسا نقشہ کھینچتے تھے کہ ہمارا دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ جب ہم نے دبی زبان سے یہ باتیں بیرے ظفر کو بتائیں تو اس نے کہا "میاں یہ منشی خطرناک آدمی لگتا ہے۔ یہ آپ کو خراب کرنا چاہتا ہے"۔

ہم نے پوچھا "کیسے ؟"

"آپ کو بری بری گندی باتیں سنا کر۔ اس سے آپ ہوشیار رہیے"۔

ظفر کی عمر ہم سے دس بارہ سال زیادہ تھی مگر اس نے پانچ سال کی عمر سے نوکری شروع کر دی تھی۔ محض اردو لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ مگر دنیا بھر کے مسائل اور واقعات سے آگاہ تھا۔ منشی جی کے بارے میں ہم نے اس سے مشورہ کیا لیا کہ وہ خود بھی ہمارے مشیروں میں شامل ہو گیا۔ اور دیکھا جائے تو ہمیں صحیح معنوں میں "بگاڑنے کا فریضہ" ظفر ہی نے سرانجام دیا۔ یعنی معلومات کی حد تک اس نے ہمیں وہ تمام رموز و نکات سمجھا دیے جو کہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ عشق و محبت کی داستانیں سنانے کے علاوہ اس نے ہم کو یہ بھی بتایا کہ سچا عشق کیا ہوتا ہے اور جھوٹا عشق کیسے کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد وہ ہمیں اپنے عشق کی داستانیں بھی سنانے لگا۔ جنہیں سن کر ہم حیران رہ جاتے تھے۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد وہ ہم سے قسم ضرور لیتا تھا کہ یہ ہم کسی اور کو نہیں بتائیں گے۔

منشی جی نے گھنٹہ گھر جانے کی خبر کیا سنائی کہ ہمارا دل مچل گیا۔ ہم نے منشی جی کو اس بات پر رضامند کیا کہ وہ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت حاصل کر لیں۔ اس کے معاوضے میں ہم انہیں آٹھ آنے دینے پر آمادہ ہو گئے۔ آٹھ آنے کا مطالبہ خود ان ہی کا تھا۔ انہوں نے کہا "میاں یہ کام ذرا مشکل ہے بلکہ کافی مشکل ہے۔ اگر آپ میرے پان سگریٹ کا خرچہ دے دیں تو میں جھاڑیں کھانے پر تیار ہو سکتا ہوں"۔

ہم نے کہا "منشی شرم نہیں آتی آپ ہم سے رشوت مانگ رہے ہیں ؟"

''توبہ توبہ'' انہوں نے کان پکڑتے ہوئے کہا''میاں یہ تو معاوضہ ہے۔دیکھئے نا اگر کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو میں ہی پکڑا جاؤں گا''۔

چنانچہ ہم انہیں آٹھ آنے معاوضہ دینے پر آمادہ ہوگئے۔یہ اس وقت کے حساب سے کافی بڑی رقم تھی۔آٹھ آنے میں ایک سگریٹ کی ڈبیا،ایک ماچس ایک پان کے علاوہ ایک پیسٹری اور ایک چائے کی پیالی بھی خریدی جاسکتی تھی اور پھر بھی کچھ بچ رہتا۔پیسٹری چھ پیسے میں اور چائے کی پیالی دو پیسے میں مل جاتی تھی۔ایک درجن کیلے ڈیڑھ دو آنے میں اور پاؤ بھر انگور چار آنے میں خریدے جاسکتے تھے بلکہ اگر کفایت شعار سے کام لیا جاتا تو آٹھ آنے میں ایک جوڑے کا کپڑا خرید سکتے تھے۔

منشی جی نے ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کیلئے خدا جانے کس طرح اجازت حاصل کرلی۔ تھی۔وہ خوشی خوشی ہمارے پاس آئے اور کہا''میاں تیار ہو جایئے آپ کو اجازت مل گئی ہے۔دس منٹ میں گاڑی صاف ہو جائے گی۔آپ اچھے سے کپڑے پہن لیں''۔

''وہ کیوں؟'' ہم نے پوچھا''بھئی اس قمیص اور نیکر میں کیا برائی ہے؟''

''میاں خدا کا خوف کریں۔ہم بازار جارہے ہیں نہ جانے کیسے لوگوں سے ملنا پڑ جائے۔کرتہ پاجامہ اور شیروانی تو پہن لیجئے کم از کم۔بال بھی سنوار لیجئے۔آخر بازار جارہے ہیں''۔

ہم نے کہا''منشی جی اتنی گرمی میں شیروانی ہم نہیں پہنیں گے ہاں پتلون قمیص پہن لیتے ہیں''۔

جب ہم باہر نکلے تو ایک بید کا بنا ہوا ہیٹ بھی ہمارے سر پر رکھا ہوا تھا۔یہ دھوپ اور گرمی سے بچنے کا انتظام تھا۔کار میں ہم منشی جی کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ادھر کار چلی،ادھر منشی جی کی زبان چل پڑی۔انہوں نے پہلے تو یہ بتایا کہ انہیں شہر میں کیا کام کرنے ہیں۔اس کے بعد اطلاع دی کہ میاں ہم ویلی بازار بھی جائیں گے۔ویلی بازاریوں تو ایک عام بازار تھا لیکن اس کی خصوصیت یہ تھی کہ نیچے کی منزل میں دکانیں تھیں مگر اوپر کی منزل میں طوائفیں براجمان نظر آتی تھیں۔اسی لئے شرفا ویلی بازار جاتے ہوئے ہچکچاتے تھے اور اگر چلے بھی جاتے تو نگاہیں نیچی رکھتے تھے۔سرِ شام یہاں کی رونق دوبالا ہو جاتی تھی اس لئے کہ طوائفیں بناؤ سنگار کرکے بالاخانوں کی کھڑکیوں اور بالکونیوں میں تشریف فرما

ہو جاتی تھیں اور نیچے سے گزرنے والوں کو مسکرا مسکرا کر اشارے کرتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ نوجوان لوگ شام کے وقت اس بازار میں جانے کے بہانے تلاش کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی نظر بچا کر اوپر بھی دیکھ لیتے تھے پھر دوسرے دن بڑے فخر کے ساتھ دوستوں کو اپنی روداد سناتے تھے۔

ہم کو ویلی بازار کی اس خوبی کا علم تھا۔ اس کا تذکرہ سن کر ہمارے کان سرخ ہو گئے۔ ہم نے دبی زبان میں پوچھا۔ ”منشی جی۔ ویلی بازار میں آپ کو کیا کام ہے؟“

”بڑے صاحب کا سوٹ لینا ہے۔ پھر کچھ نئے کپڑوں کے ڈیزائن بھی لانے ہیں“۔

اس بازار میں بعض معروف ٹیلر ماسٹروں کی دکانیں بھی تھیں جو بہت مہنگے تھے۔ ان کے پاس سوٹ کا کپڑا بھی موجود رہتا تھا۔ کپڑا پسند کیجئے اور وہیں سوٹ کا آرڈر دے دیجئے۔ ہمارے خالو ابا (جن کے پاس ہم رہتے تھے کیونکہ خالہ نے ہمیں گود لے لیا تھا) عموماً دلّی سے اپنے سوٹ سلوایا کرتے تھے مگر میرٹھ میں ان کی پسندیدہ ٹیلر شاپ ویلی بازار ہی میں تھی مگر وہ خود کبھی وہاں نہیں گئے۔ جب ضرورت پیش آتی ٹیلر ماسٹر کپڑوں کے نمونے لے کر ناپ لینے کیلئے خود حاضر ہو جاتے اور سوٹ سی کر واپس پہنچا دیتے یا کوئی ملازم لے آتا۔ ان کی فٹنگ اتنی اچھی ہوتی تھی کہ ٹرائل کی ضرورت ہی نہیں آتی تھی۔ یہ ادھیڑ عمر کے شیروانی پوش، گنجے سے درزی تھی۔ انہیں یہ فخر حاصل تھا کہ وہ انگریزوں کے بھی سوٹ سلائی کرتے رہے تھے۔

منشی جی ہمیں ٹٹولنے کیلئے ویلی بازار کا بار بار تذکرہ کرتے رہے۔

ہم نے کہا ”ہم دو تین بار وہاں گئے تو ہیں“۔

مسکرا کر پوچھنے لگے ”میاں کبھی اوپر بھی تاک جھانک کی ہے؟“

ہم نے کہا ”منشی جی۔ تاک جھانک اوپر سے نیچے کی جاتی ہے یا برابر والی جگہ میں کی جاتی ہے۔ نیچے سے اوپر دیکھنے کو تاک جھانک نہیں کہتے“۔

وہ ہنسنے لگے ”میاں جاہل آدمی ہوں بس تھوڑا بہت حساب کتاب کر لیتا ہوں۔ آپ کی طرح کتابوں کا کیڑا تو نہیں

ہوں''۔

اس کے بعد منشی جی نے طوائفوں کے قصے چھیڑ دیے۔ وہ کس قدر مہذب اور وضع دار ہوتی ہیں۔ بات چیت کا سلیقہ اور اٹھنے بیٹھنے کا ڈھنگ ان پر ختم ہے۔ پرانے زمانے میں تو رئیسوں کے بیٹوں کو تعلیم و تربیت کیلئے طوائفوں کے گھر بھیجا جاتا تھا۔ یہ باتیں ہم بھی پڑھ اور سن چکے تھے اس لئے چپ رہے۔

منشی جی نے شرارت سے پوچھا ''میاں کیا خیال ہے آپ کو تربیت کیلئے کسی اچھی سی طوائف کے گھر نہ بھیج دیا کریں۔ میں اسکول سے لے جایا کروں گا۔ شام تک واپسی ہو جائے گی''۔

ہم نے کہا ''منشی جی کیسی باتیں کرتے ہو۔ خالہ اماں اور خالو ابا بھلا کب اجازت دیں گے''۔

''مگر آپ کا دل تو چاہتا ہو گا؟'' انہوں نے دریافت کیا۔

''بالکل نہیں۔ ہم نے تو کبھی طوائف دیکھی تک نہیں۔ ان کی برائیاں ہی سنتے ہیں''۔

کہنے لگے ''برائیوں کا کیا ہے۔ اچھائی برائی تو سبھی میں ہوتی ہے۔ مگر میاں بہت سی طوائفیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ میں دلی کے چاوڑی بازار میں جس بائی کے گھر میں کام کرتا تھا وہ تو بس ہیرا تھی ہیرا۔ اخلاق اور تمیز تو اس پر ختم تھی۔ خوب پڑھی لکھی تھی۔ بات بات پر شعر یاد تھے اس کو''۔

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ ''منشی جی۔ آپ طوائف کے پاس ملازم تھے؟''

''اجی نوکری کا تو نام تھا۔ بس میاں اچھی لگتی تھی وہ۔ اور کوئی صورت نہیں نظر آئی تو وہاں ڈرائیوری کی نوکری کر لی۔ گھر سے بھاگ کر گیا تھا۔ گھر والوں نے بھی پھر میری صورت نہیں دیکھی۔ والد صاحب نے عاق کر دیا تھا''۔

ہم حیرت سے انہیں دیکھتے رہے۔

بولے '' میاں سہارنپور کا رہنے والا ہوں۔ والد صاحب کا برتنوں کا کاروبار تھا۔ ایک بار دوستوں کے ساتھ دلّی گیا تو چاوڑی کی سیر کیلئے بھی پہنچ گئے۔ بس میاں نگینہ بائی کو دیکھا تو ہوش ہی اڑ گئے۔ ہم سب دوست چندہ جمع کر کے اس کا گانا سننے گئے تھے۔ میرے دل و دماغ پر تو اس کی صورت ایسی نقش ہوئی کہ دوبارہ کسی بہانے دلّی پہنچ گیا۔ مگر پیسے کم تھے۔ اوپر تو کیا جاتے آس پاس ہی منڈلاتے رہے۔ پڑھائی سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ کوئی ترکیب ملنے کی نظر نہ آئی تو

ان کے گھر میں ڈرائیوری کی درخواست دے دی جو اس کی بدمزاج ماں نے منظور بھی کرلی۔ راز کی بات بتاؤں؟ اصل میں اس کام کیلئے میں نے ایک عامل سے تعویذ لیا تھا ورنہ ہماری ایسی قسمت کہاں کہ نگینہ بائی کے گھر میں ڈرائیور بن جاتا؟'' وہ ٹھنڈی آہ بھر کے خاموش ہو گئے۔ ہم ان کی باقی کہانی خود ہی سمجھ گئے تھے۔ ایسی بہت سی کہانیاں رسالوں اور افسانوں میں پڑھ چکے تھے۔

''منشی جی پھر کیا ہوا؟'' ہم نے پوچھا۔

وہ آہ بھر کر بولے ''بس میاں۔ دو سوا دو سال کے بعد نگینہ بائی ایک رئیس سے شادی کر کے پھر سے اڑ گئی۔ پھر اپنا وہاں کیسے دل لگتا۔ ہم نے بھی بوریا بستر اٹھایا اور ایک کلکٹر صاب کے گھر ملازم ہو گئے۔ اپنے گھر تو واپس جا نہیں سکتے تھے۔ کس منہ سے جاتے اور کیا جواب دیتے؟ بس وہ دن اور آج کا دن۔ ڈرائیور بن کر زندگی گزارتے ہیں۔'' منشی جی ایک دم اداس ہو گئے۔ شاید ان کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے تھے۔ ہمیں وہ اس وقت کسی افسانے یا ناول کا کردار نظر آرہے تھے۔

''منشی جی۔ پھر نگینہ بائی کبھی ملیں آپ کو؟''

''اجی اپنی ایسی قسمت کہاں''۔ ان کی آواز بھرّا گئی۔ ہم نے بھی مصلحتاً خاموشی اختیار کرلی۔

گھنٹا گھر پہنچ کر منشی جی نے ایک جاننے والے کی دکان کے سامنے گاڑی کھڑی کر دی اور ہم دونوں نے پیدل سفر شروع کیا۔ چند دکانوں سے فارغ ہوئے تو ٹیلی ماسٹر کی طرف رخ کیا۔ ویلی بازار پہنچتے ہی ہمارے جسم میں سنسناہٹ سی پیدا ہو گئی۔ موقع پا کر اوپر بھی دیکھنے کی کوشش کی مگر ویرانی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ دن کے وقت بھلا کیا نظر آتا۔ بقول آغا شورش وہاں تو راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔

منشی جی ایک دم سیڑھیاں چڑھنے لگے تو ہم رک گئے۔

''آیئے نا میاں''۔ انہوں نے ہمیں پکارا۔

''منشی جی۔ یہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

وہ ہنسنے لگے ''ٹیلرنگ شاپ اوپر ہے۔ وہ دیکھئے سائن بورڈ''۔

واقعی ٹیلرنگ شاپ کا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ میرٹھ کے ویلی بازار جیسا بازار پھر ہم نے کہیں نہ دیکھا۔ نیچے بازار تھا۔ مختلف قسم کی دکانیں اور اوپر کا حصہ مخلوط تھا۔ یعنی طوائفیں تو تھیں ہی کچھ دکانیں بھی اوپر تھیں۔ مثلاً ٹیلرنگ شاپ۔ کسی کا دفتر۔ وہاں وکیلوں کے دفتر بھی تھے یہ بازار رواداری اور باہمی میل کا عجیب نمونہ تھا۔

ٹیلرنگ شاپ سے فارغ ہو کر ہم دونوں نیچے آئے تو دوپہر ہو گئی تھی۔ گرمی خاصی تھی۔ پسینہ آنے لگا تھا۔ منشی جی نے پوچھا ''گرمی لگ رہی ہے؟''

''ہاں لگ تو رہی ہے؟''

''ٹھیک ہے پھر اس کا بھی انتظام کرتے ہیں''۔

کچھ دور چل کر وہ پھر دکانوں کے درمیان والی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

''یہاں کیا کرنا ہے؟'' ہم نے پوچھا۔

بولے ''ایک واقف کا مکان ہے شربت پی لیں گے''۔

ہم چپ چاپ ان کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ گئے۔ سیڑھیوں کے خاتمے پر ایک بند دروازہ تھا۔ کھٹ کھٹانے پر ایک ملازم نمودار ہوا۔ منشی جی کو دیکھا تو ادب سے سلام کر کے ایک طرف کو ہو گیا۔

''میاں آجایئے''۔ منشی جی نے ہمیں دعوت دی اور ہم ان کے ساتھ ایک سجے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ایک صوفہ اور چند کرسیاں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ فرش پر قالین، دروازوں پر خوش رنگ پردے۔ دیواروں پر تصویریں لگی ہوئی تھیں۔

''میاں آپ بیٹھئے میں ابھی آیا''۔ منشی جی یہ کہہ کر چلے گئے ہم دیوار پر لگی ہوئی تصاویر دیکھنے لگے۔ ایک تصویر میں شیر ہرن کا شکار کرتا ہوا دکھایا گیا تھا۔

اچانک کسی نے ہمارے سر پر سے ہیٹ اتار لیا۔ گھبرا کر ہم پلٹے تو ایک چودہ پندرہ سال عمر کی لڑکی نظر آئی۔ اس نے ہمارا ہیٹ اپنے سر پر رکھ لیا تھا۔ اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ہم نے پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھا تو منشی جی غائب تھے۔

اس وقت لڑکی کے ساتھ ہم کمرے میں اکیلے تھے۔ لڑکی بے تکلف تھی۔ مسکرا کر بولی ''گھبرایئے نہیں تشریف رکھئے''۔

''مگر منشی جی کہاں گئے؟''

''وہ بھی آجائیں گے۔ کیا ان کے بنا ڈرتے ہیں؟'' اس نے شوخی سے پوچھا۔

''نہیں تو''۔ یکایک ہماری بہادری عود کر آئی۔

''تو پھر بیٹھئے۔ فرمایئے کیا پئیں گے؟ شربت یا چائے؟''

''انہیں تو آلینے دیں''۔ ہم نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی آجائیں گے مگر کیا آپ ان کے حکم پر چلتے ہیں؟ ان کے پوچھے بنا شربت تک نہیں پی سکتے؟'' اس نے گردن موڑ کر پوچھا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ لڑکی نو عمر تھی، خوش شکل اور خوش پوش بھی تھی مگر اس کی بے باکی اور بے تکلفی میں ہمیں ایک عجیب سی بات محسوس ہوئی۔ وہ ہمارے برابر صوفے پر ہی بیٹھ گئی۔ ہمارا تنکوں والا ہیٹ اب تک اس کے سر پر رکھا ہوا تھا۔

ہم نے ہاتھ بڑھا کر اپنا ہیٹ اتار لیا ''یہ کیا حرکت تھی۔ ہمارا ہیٹ کیوں اتارا تھا؟'' ہم نے قدرے ناراض ہو کر پوچھا۔

''معافی چاہتی ہوں''۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور شوخ نظروں سے دیکھنے لگی۔

ہمیں یکایک ایک عجیب سی پریشانی نے گھیر لیا۔ چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو ماحول بھی اجنبی سا نظر آیا۔ ایک کونے میں ستار اور طبلہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے برابر ہارمونیم بھی تھا۔ ہمارے برابر بیٹھی ہوئی نو عمر لڑکی بہت بے پروائی سے ہمیں دیکھ دیکھ کر زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ اس کے پاس سے بھینی بھینی سی خوشبو بھی آرہی تھی۔

اچانک ہم پر منکشف ہوا کہ ہم کسی عام گھر میں نہیں تھے۔ یہ کسی طوائف کا بالا خانہ تھا۔ یہ خیال آتے ہی ہم ایک دم کھڑے ہو گئے۔

''کون ہو تم۔ یہاں کیوں آئی ہو؟'' ہم نے ذرا غصے سے پوچھا۔

وہ بدستور صوفے پر بیٹھی مسکراتی رہی۔ پھر بولی ''میرا تو یہ گھر ہے اس لئے آئی ہوں۔ آپ فرمایئے کیسے آئے ہیں؟''

یہ بے باک لہجہ اور بے حجاب گفتگو سننے کے بعد ہمیں یہ جاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ منشی جی ہمیں کسی طوائف کے بالاخانے پرلے آئے ہیں۔ ہم نے غصے سے اس مسکراتی ہوئی لڑکی کو دیکھااور تیزی سے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد بھی ہم چلتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ کار کے پاس پہنچ گئے۔اس زمانے میں کاروں کی چوری کا کوئی تصور نہیں تھااس لئے کاروں کے دروازے لاک نہیں ہوتے تھے۔بلکہ ان میں چابی بھی لگی چھوڑدی جاتی تھی۔ ہم غصے میں بھرے ہوئے تھے۔دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ گئے۔ڈرائیونگ ہمیں آتی نہیں تھی ورنہ اسی وقت گھر پہنچ جاتے۔

کچھ دیر بعد منشی جی کا فکر مند چہرہ دکھائی دیا۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کے چہرے پر اطمینان کے آثار نمودار ہوگئے۔

''ارے میاں آپ کہاں چلے گئے تھے؟ میں تو وہاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہو گیا''۔

ہم نے کوئی جواب نہیں دیا تو منشی جی خاموشی سے سامان پچھلی سیٹ پر رکھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔

واپسی میں بالکل خاموشی طاری رہی۔ ہم ناراض تھے اور منشی جی سہمے ہوئے تھے۔ کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہونے سے پہلے منشی جی نے کار روک دی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے ''میاں جو ہوا اسے معاف کردیں۔ خدا کیلئے گھر میں جاکر نہ بتانا''۔

ہم نے کہا ''ہم آپ کی شکایت کریں گے۔آپ نے بہت بری حرکت کی ہے منشی جی''۔

منشی جی ندامت سے بولے ''شرمندہ ہوں، معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔اللہ کا واسطہ، مجھے معاف کردیجئے''۔ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ہم نے کہا ''ٹھیک ہے اب چلیں''۔

یہ کسی طوائف کے بالاخانے پر قدم رکھنے کا ہمارا پہلا اتفاق تھا۔

بعد میں منشی جی نے ہمیں بتایا کہ جس طرح چور چوری چھوڑنے کے بعد بھی ہیرا پھیری نہیں چھوڑتا اسی طرح منشی جی بھی آنے بہانے طوائفوں کے کوچے میں جاتے رہتے ہیں۔ جس طوائف کے گھر پر وہ ہمیں لے کر گئے تھے اس کا نام چمپا بائی تھا۔ منشی جی اس کے حساب کتاب دیکھا کرتے تھے اور اس کیلئے کوئی معاوضہ وصول نہیں کرتے تھے۔ چمپا

بائی کے اور بہت سے کام بھی منشی جی بلا اجرت کر دیا کرتے تھے۔اس کے بدلے کبھی کبھار کوٹھے پر جا کر اپنا شوق پورا کر لیتے تھے۔

ہم نے پوچھا ''منشی جی وہ لڑکی کون تھی جس نے ہمارا ہیٹ اتار لیا تھا؟''

وہ ہنسنے لگے ''میاں وہ چمپا بائی کی چھوٹی بہن ہے۔ بہت شوخ ہے۔میں چمپا بائی سے کہہ رہا تھا ہمارے میاں بھی ساتھ آئے ہیں۔ان کیلئے شربت بھجوادو۔ ستارہ نے سن لیا اور پہنچ گئی آپ کے پاس۔جب بعد میں چمپا بائی نے اسے ڈانٹا کہ وہ کیوں بڑے کمرے میں پہنچ گئی تھی تو پتا ہے اس نے کیا کہا؟''

''کیا کہا؟''

''کہنے لگی۔میں نے کبھی کوئی لڑکا نہیں دیکھا تھا۔ یہاں تو مرد ہی آتے ہیں۔بس لڑکے کو دیکھنے کے شوق میں چلی گئی تھی۔جب آپ خفا ہو کر چلے آئے تو وہ بہت گھبرائی اور چمپا بائی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کی طرف سے آپ سے معذرت کرلوں''۔

منشی جی یہ سارا قصہ سنانے کے بعد شرارت سے پوچھنے لگے۔

''ویسے میاں سچ سچ بتانا۔وہ لڑکی آپ کو کیسی لگی''۔

''کون لڑکی؟''

''ستارہ اور کون؟''

ہم جھینپ گئے ''ہم نے تو اسے ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں۔آپ پر اور اس پر غصہ تھا اسی لئے تو چلے آئے''۔

منشی جی نے پان کی گلوری منہ میں رکھی اور رازدارانہ انداز میں پوچھنے لگے '' اگر طبیعت چاہے تو بے جھجک مجھے بتادینا میں آپ کو پھر وہاں لے چلوں گا''۔

ہم نے کہا ''منشی۔اگر دوبارہ آپ نے ایسا کہا تو ہم آپ کی شکایت کر دیں گے خالو ابا سے''۔

منشی جی فوراً ہاتھ پیر جوڑنے لگے۔

اب میرٹھ کا اور نوعمری کا ذکر چھڑ گیا ہے تو کیوں نہ کچھ اور بھی بیان ہو جائے۔سچ پوچھئے تو ہم نے ذہنی، نفسیاتی اور

دنیاوی معاملات کا پہلا سبق وہیں سیکھا تھا۔لائبریری میں اس موضوع پر بے شمار کتابیں موجود تھیں۔ ہمارے پاس وقت بھی بہت تھا۔پڑھنے کا شوق بھی تھا اس لئے دن رات کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔علمی،ادبی، معلوماتی، تاریخی، مذہبی، روحانی ہر قسم کی کتابیں ہم نے پڑھ ڈالیں۔ طلسم ہوشربا کی تمام جلدوں کا مطالعہ کر لیا۔اردو ادب، تنقید اور شاعری کے بارے میں وہ سب کچھ پڑھ لیا جو ایم اے کے طلبہ بھی نہیں پڑھتے۔کچھ سمجھے، کچھ نہیں سمجھے مگر پڑھتے چلے گئے۔سیاست کے بارے میں تازہ ترین معلومات بڑوں کی گفتگو سے حاصل ہو جاتی تھی۔اس کے علاوہ" ڈان" اور" اسٹیٹس مین" جیسے انگریزی کے اخبار بھی ڈکشنری کی مدد سے پڑھ لیا کرتے تھے۔

لیکن زندگی کو مختلف رنگوں میں دیکھنے کے ابتدائی سبق بھی ہم نے یہیں پڑھے۔ ہمیں شاگرد پیشے میں جانے کی اجازت نہیں تھی مگر موقع پا کر وہاں پہنچ جاتے تھے اور ان لوگوں کی باتیں سنتے تھے۔وہاں ہر قسم اور ہر مزاج کے لوگ رہا کرتے تھے۔ان کی گھریلو زندگی، ازدواجی زندگی سب ہمارے سامنے کھلی کتاب کی طرح تھی۔پھر ریس کے سیزن میں جوکی، ٹرینر اور سائیس اپنے ساتھ بالکل مختلف کہانیاں لے کر آتے تھے۔ان میں شرابی بھی ہوتے تھے۔ان کے مسائل بھی ہمارے علم میں تھے۔ان کی بیویاں ان کی غیر موجودگی میں کیا کرتی ہیں اور کیوں کرتی ہیں۔اس کی تفصیلات ہمیں ملازمین اور دوسرے لوگوں کے مابین ہونے والی گفتگو سے حاصل ہوتی رہتی تھی۔یہ رنگین کہانیاں ہمارے لئے دلچسپی کا باعث تھیں۔جب پندرہ سال عمر ہوئی تو دوسرے تجربے اور مشاہدے بھی ہونے لگے۔ان کے لئے ایک الگ کتاب درکار ہو گی۔ان خواتین کو مختلف روپ میں دیکھا۔لڑکیاں بالیاں بھی ڈرتے ڈرتے آس پاس منڈلانے لگیں۔ بعض شادی شدہ عورتیں بھی ہمدردی طلب کرنے کے بہانے ہمیں اپنے پاس بلانے لگیں۔اس عمر میں صنف مخالف میں کشش کا آغاز ہوتا ہے لیکن ظفر نے ہمیں اس معاملے میں مفید مشورے دیے۔وہ صنف مخالف کی نفسیات اور عادات سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔اس نے ہمیں جو ایک مشورہ دیا وہ ہمارے ذہن میں اٹک کر رہ گیا اور اس نے ہمیں بہکنے اور بگڑنے سے بچا لیا ورنہ تمام تر اسباب مہیا تھے۔

ظفر نے کہا" میاں آپ کی عمر ایسی ہے کہ عورتوں سے دور ہی رہنا۔یہ آپ کو طرح طرح کے حیلے بہانوں سے پاس بلائیں گی اور پرچانے کی کوشش کریں گی مگر آپ ان کے نزدیک بھی نہ جانا ورنہ زندگی بھر کیلئے اس نشے میں کھوئے

رہیں گے۔آپ تو جانتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کو ایک عورت ہی نے جنت سے نکلوادیا تھا‘‘۔
اس نصیحت نے ہمارے ذہن پر ایسا اثر کیا کہ پھر زندگی بھر ہم اس پر عمل پیرا رہے مگر اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے۔

یہی وجہ ہے کہ ابتدائی عمر ہی میں ہمارے مشاہدے نے ہمیں ایک پختہ ذہن شخص سے بھی دانا بینا بنادیا۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ ظفر نے ہمیں راہب بنادیا تھا۔ وہ خود بھی رومانی مہمات میں مصروف رہتا تھا اور ہمیں تمام تفصیلات سے آگاہ رکھتا تھا۔اس کے تجربات پر مبنی ایک مکمل ناول تحریر کی جاسکتی ہے۔ وہ ہمارا مشیر تھا ’’ظفر۔وہ مالی کی لڑکی ہے نا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میاں جی۔مجھے پڑھادیا کرو‘‘۔
’’ہرگز نہیں۔اس کے قریب بھی نہ جانا‘‘۔
’’مگر وہ تو چھوٹی ہے‘‘۔
’’چھوٹی نہیں، کھوٹی ہے۔آپ نہیں جانتے وہ بڑی حرّافہ ہے‘‘۔
’’ظفر برابر والی کوٹھی میں جو انگریز کیپٹن رہتے ہیں نا۔اس کی لڑکی ڈولی کہتی ہے کہ تمہیں ہارس رائیڈنگ سکھادوں گی‘‘۔
’’وہ آپ کو کہاں ملی تھی؟‘‘ ظفر کے کان کھڑے ہوگئے۔

’’بھئی ہم کوٹھی کی پچھلی دیوار کے نزدیک امرودوں کے درختوں پر چڑھتے رہتے ہیں نا۔وہ گھوڑے پر سوار وہیں سے تو گزرتی ہے۔ کہتی ہے میرے اصطبل میں دو بہت اچھی نسل کے گھوڑے ہیں کسی دن دیکھنے آجاؤ اور میرے ساتھ چائے پیو‘‘۔
’’میاں کہیں ایسا نہ کر بیٹھنا‘‘۔ ظفر نے پریشان ہوکر کہا۔’’وہ عمر میں آپ سے دو سال مگر تجربے میں بیس سال زیادہ ہے۔ان میموں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ بس درختوں پر ہی سے ان سے بات کرنا ٹھیک ہے۔ کہیں نزدیک نہ چلے جانا۔ پھر کہیں کے نہ رہوگے‘‘۔
اس طرح ہر لڑکی کے معاملے میں ہم ظفر کو بتاتے اور وہ ہمیں دور رہنے کا مشورہ دیتے۔

ایک دن ہم نے کہا ''ظفر۔ تم خود تو باز نہیں آتے اور ہمیں نصیحت کرتے رہتے ہو''۔

کہنے لگا ''میاں اسی لئے تو نصیحت کرتا ہوں۔ مجھے کسی نے نصیحت نہیں کی تھی،اس لئے سولہ سال کی عمر میں یہ مزہ پڑ گیا اور پھر ایسا پڑا کہ گھر بار چھوڑا۔ تعلیم چھوڑی شہر چھوڑا،اب دیکھئے نا بیرا بن کر زندگی بسر کر رہا ہوں''۔

''مگر عشق تو ہر روز کرتے ہو''۔

''یہ کوئی تعریف کی بات تو نہیں ہے۔ میاں یہ تو پہلے عادت بنی، پھر بیماری بن گئی۔اسی چسکے نے زندگی برباد کر دی''۔

ظفر معمولی پڑھا لکھا تھا۔ تیس سال کی عمر کا ہو گا، چھوٹا قد، گندمی رنگ مگر تیکھے نقش اور گھونگریالے بال جو اس زمانے میں رومانٹک سمجھے جاتے تھے۔ ہر وقت بنا ٹھنا رہتا تھا۔ باتونی اتنا کہ ایک منٹ میں ہر ایک کو شیشے میں اتار لیتا تھا۔ وہ کئی سال سے ہمارے گھر میں بیرا تھا۔اس کے کسی رشتے دار کا کبھی پتا نشان معلوم نہ ہوا۔ رومانی رشتے البتہ بے شمار تھے۔

ایک دن ظفر کو بازار جانا تھا۔ وہ ہمیں اسکول سے لینے آیا تو وہیں سے ہم دونوں بازار چلے گئے۔اس کے پاس بھی سائیکل تھی اور ہم بھی سائیکل سوار تھے۔اس زمانے میں سائیکل بھی بڑی باوقار سواری تھی۔ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی تھی۔ خوشحال لوگ بھی اپنے بیٹے سے یہی کہتے تھے کہ بیٹا میٹرک پاس کر کے کالج میں جاؤ گے تو تمہیں سائیکل لے دیں گے۔ اور بیٹا اس پر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔

ہمارے اسکول کے عقب میں تاڑی خانہ تھا جہاں نشے باز اکٹھے ہوتے تھے۔ ہم جب بھی اس کے سامنے سے گزرتے عجیب سی بدبو اور بہکے بہکے لوگ ہمارا استقبال کرتے تھے انمیں زیادہ تعداد نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کی تھی جنہیں ''پلےدار'' کہا جاتا ہے۔ یہ پلےدار نشہ کرنے کے باوجود بڑے سچے مسلمان تھے۔ کبھی ہندو مسلم فساد ہوتے تو یہ ہندوؤں کو ناکوں چنے چبوا دیتے تھے۔ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے تھے مگر پیٹ سے پہلے انہیں ''تاڑی'' کا خیال آتا تھا۔

مس ۵۶ء میں شمیم آرا بھی کام کر رہی تھیں مگر اس روز وہ سیٹ پر موجود نہیں تھیں۔ وہ ''کنواری بیوہ'' کی ہیروئن تھیں جو ہم نے نہیں دیکھی تھی۔ ان سے اس وقت تک ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ فلمی پرچوں میں ان کی

تصویریں دیکھی تھیں۔ کراچی میں ان سے ”نگار“ ویکلی کے ایڈیٹر الیاس رشیدی صاحب کے توسط سے ملاقات ہوئی تو انہیں دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ سانولے رنگ کی ایک دبلی پتلی نازک سی لڑکی نہایت سادہ لباس پہنے ہوئے، شرمیلی اتنی کہ نگاہ ملا کر بات تک نہیں کرتی تھیں۔ آواز باریک اور بہت دھیمی، ہنسی ان کے پاس نہیں پھٹکتی تھی۔ بہت ہوا تو آہستہ سے مسکرادیں اور بس۔ ہنسنا یا قہقہہ لگانا تو جیسے ان کے لغت ہی میں نہیں تھا۔ بے حد کم آمیز اور کم گو۔ پہلی ملاقات میں انہوں نے برائے نام ہی گفتگو کی۔ سر جھکائے، نگاہیں نیچی کئے بیٹھی رہیں۔ جب تک کوئی سوال نہ کیا جائے وہ لب کشائی نہیں کرتی تھیں اور اس کے بعد بھی بہت مختصر سا فقرہ ادا کر کے چپ ہو جاتی تھیں۔ ان کی نانی اماں میر محفل تھیں۔ بڑی خود اعتماد اور رکھ رکھاؤ والی خاتون تھیں۔ گفتگو کرنے کا ڈھنگ جانتی تھیں۔ ہر ایک کا مرتبہ اور حیثیت پہچانتی تھیں اور اس کے مطابق برتاؤ کرتی تھیں۔ شمیم آرا سے پوچھے جانے والے بہت سے سوالات کا جواب بھی نانی اماں ہی دیتی رہیں۔

سچ پوچھئے تو شمیم آرا سے پہلی ملاقات نے ہمیں بہت مایوس کیا۔ انہیں دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ فلم ایکٹریس ہیں۔ وہ تو عام گھریلو لڑکیوں سے بھی زیادہ سادہ، خاموش اور شرمیلی تھیں۔ الیاس بھائی نے ان کے بارے میں یہ معلومات فراہم کیں وہ اپنی نانی کے حکم اور اجازت کے بغیر کچھ نہیں کرتیں۔ یہاں تک کہ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں بھی نانی اماں ہی کا حکم چلتا تھا۔ بعد میں جب ان کے گھر میں آمد ورفت ہوئی تو ان باتوں کی تصدیق بھی ہو گئی۔ شمیم آرا کی کوئی ذاتی رائے نہیں تھی۔ وہ شلوار قمیص پہنیں یا ساری باندھیں، نیلا رنگ استعمال کریں یا پیلا، بالوں کا جوڑا باندھیں یا چوٹی گوندھیں۔ سینڈل پہنیں یا چپل استعمال کریں۔ یہ سب فیصلے نانی اماں ہی کرتی تھیں۔ فلم سازوں سے ملاقات بھی وہی طے کرتی تھیں۔ ان کو شوٹنگ کیلئے تاریخیں بھی وہی دیتی تھیں اور ہر شوٹنگ پر شمیم آرا کے ہمراہ نگراں کے طور پر بھی جاتی تھیں۔ وہ شمیم کو ہر وقت اپنی نظروں میں رکھتی تھیں اور شمیم آرا کو بھی اس کا پورا احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کافی عرصے تک شمیم کی اپنی شخصیت پر نانی اماں کی ذات کا پردہ پڑا رہا۔ انہوں نے صحیح معنوں میں اس وقت خوداعتمادی کی پہلی منزل پر قدم رکھا تھا جب اپنی ذاتی فلم ”صاعقہ“ بنائی تھی۔

شمیم کو فلم سازی اور ہدایت کاری کا بہت شوق تھا مگر نانی اماں اس کے حق میں نہیں تھیں۔ جب انہوں نے فلم ساز بننے

کا ارادہ کیا تو نانی نے شدید مخالفت کی۔ سمجھایا بجھایا مگر شمیم آرا نے شاید زندگی میں پہلی بار ضد کی تھی اور وہ اس پر قائم رہیں۔

نانی اماں انہیں فلم ساز بننے کے نقصانات سے آگاہ کرتی رہیں مگر بے سود۔ انہوں نے قریبی ملنے والوں سے درخواست کی کہ شمیم کو سمجھائیں کہ یہ حماقت نہ کریں۔

"آفاقی صاحب کچھ آپ ہی اسے سمجھایئے۔ اب تک ہمارا ہاتھ لینے والا رہا ہے۔ دینے والا نہیں رہا۔ اس میں بہت بکھیڑے ہیں، نہ بابا۔ فلم پروڈیوسر بننا تو ایسے ہے جیسے ٹی بی لگالو"۔

مگر شمیم آرا نے جو فیصلہ کیا تھا اس پر قائم رہیں "صاعقہ" کی بے مثال کامیابی نے انہیں ایک نئی خود اعتمادی سے سرشار کر دیا۔ اس کے بعد ان کی خود اعتمادی کا سفر شروع ہوا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئیں اور نانی اماں کی حیثیت انگلستان کے بادشاہ یا ملکہ جیسی ہو کر رہ گئی۔ یعنی محض انگوٹھا لگانے والی رسمی بادشاہت، ہر قسم کے اختیارات سے محروم۔

شمیم آرا کے گھر دو تین بار جانے کا اتفاق ہوا۔ الیاس رشیدی صاحب ان کے مشیر خاص اور پر موثر تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ الیاس صاحب ہی نے شمیم آرا کو آگے بڑھایا۔ پبلسٹی دی۔ اچھے فلم سازوں سے ملایا اور ہر معاملے میں ان کی مدد کی۔ شمیم آرا اور ان کی نانی اماں بھی ہمیشہ الیاس صاحب کی معترف رہیں اور آج بھی شمیم آرا ان کا نام بے حد عزت و احترام سے لیتی ہیں۔

ہم نے محسوس کیا کہ نانی اماں کو یہ احساس ہو چکا ہے کہ اگر فلموں میں کام کرنا ہے تو شمیم آرا کو کراچی سے لاہور منتقل ہونا پڑے گا۔ ان ہی دنوں الیاس صاحب کے توسط سے شمیم آرا کو انور کمال پاشا جیسے فلمساز اور ہدایتکار کی فلم "انار کلی" میں کام کرنے کا موقع مل گیا اور یہ خاندان مستقل طور پر کراچی سے لاہور منتقل ہو گیا۔ کراچی میں شمیم آرا کے گھر پر جانے اور کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا رہا۔ الیاس رشیدی صاحب، ابراہیم جلیس اور طفیل احمد جمالی بھی ہمراہ ہوتے تھے۔ وہاں خوب گپ بازی ہوتی۔ لطیفے سنائے جاتے، قہقہے لگتے مگر شمیم آرا ایک ہلکی سی مسکراہٹ تک ہی محدود رہتی تھیں۔ الیاس صاحب نے ہمیں بتایا کہ یہ لوگ عنقریب لاہور جانے والے ہیں۔ تم وہاں ان کا خیال رکھنا۔ جب

رات گئے ہم شمیم آرا کے گھر سے واپس لوٹے تو ہم نے بڑے خلوص سے الیاس صاحب سے کہا ''الیاس بھائی۔ یہ لوگ لاہور جا کر کیا کریں گے ؟''

''ارے میاں وہ فلموں میں کام کریں گی اور کیا؟''

ہم نے کہا ''ہمیں تو کامیابی کے امکانات نظر نہیں آتے۔ بلاوجہ اپنا وقت اور پیسہ ہی ضائع کریں گے یہ لوگ''۔

''کیوں! ارے بھئی پاشا صاحب نے اسے ''انار کلی'' میں کاسٹ کر لیا ہے''۔

''تو پھر کیا ہوا؟'' ہم نے کہا ''وہاں مقابلہ بہت سخت ہے۔ یہ شمیم آرا کے بس کی بات نہیں ہے''۔

الیاس صاحب سوچنے لگے۔ پھر بولے ''آفاقی۔ اس لڑکی کو دیوانگی کی حد تک کام کرنے کا شوق ہے۔ سمجھدار بھی ہے''۔

''مگر ہیروئن والی شخصیت نہیں ہے۔ اتنی دبلی پتلی اور مختصر۔ بات تک تو کرنی نہیں آتی۔ اتنی خاموش اور شرمیلی لڑکی بھلا خاک ہیروئن بنے گی''۔

مگر الیاس صاحب کو پورا یقین تھا کہ شمیم آرا فلموں میں ضرور کامیاب ہوگی اور شاید ان سے زیادہ پر یقین خود شمیم آرا تھیں۔ بعد میں شمیم آرا نے اپنی لگن اور محنت سے فلمی دنیا کی سب سے اونچی چوٹی پر قدم رکھ کر اپنی صلاحیتوں کا ثبوت فراہم کر دیا۔ ان کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ایک ایک کر کے سامنے آنے لگیں۔ پہلے انہوں نے اداکاری کا میدان مارا۔ پھر فلم سازی کے میدان کو فتح کیا اور پھر ہدایتکار بنیں تو ایسی کہ مثال قائم کر دی۔ کسی شاعر نے سچ کہا ہے:

کوشش کرے انسان تو کیا کر نہیں سکتا۔

پاکستانی فلمی صنعت کے ابتدائی دور میں جن نوجوانوں نے اپنی ہنر مندی اور صلاحیتوں کی وجہ سے نام اور مقام پیدا کیا ان میں ایک نام خلیل قیصر کا بھی ہے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں ماضی سے رابطہ اور تعلق رکھنے کی روایات ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ بالکل ابتدائی زمانے کی تو بات ہی کیا ہے، درمیانی عہد کے لوگوں کی یادیں بھی دھندلا سی گئی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جو لوگ کسی شعبے میں ممتاز خدمات ادا کر گئے ہیں۔ آنے والی نسلوں کو ان کے کاموں اور کارناموں کے حوالے سے متعارف کرایا جائے لیکن یہاں تو وہ آپا دھاپی اور افراتفری مچی ہوئی ہے کہ ہر ایک کو اپنی

پڑی ہے۔دوسروں کی طرف دیکھنے کی کسی کو فرصت ہے نہ توفیق۔ قومیں اپنی تاریخ کو بہت سنبھال کر رکھتی ہیں اور ان پر فخر کرتی ہیں۔وہ اپنے قابل ذکر فرزندوں کو بھی فراموش نہیں کرتیں۔ مگر ہمارا یہ حال ہے کہ تاریخ وار یخ تو پرانی باتیں ہیں بس ہمیں تو آج ہی سے سروکار ہے اور رہے قابل ذکر لوگ تو انہیں یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔آج کیا ہو رہا ہے یہی ہمارے لئے کافی ہے۔ گزشتہ کل کیا ہو چکا اور آنے والے کل کیا ہونے والا ہے اس کی پروا کس کو ہے؟

۱۹۶۰ء۔۱۹۵۰ء کی دہائی میں جو لوگ ابھر کر سامنے آئے اور پھر آناً فاناً نمایاں ہو گئے ۔ان میں خلیل قیصر بھی ایک قابل ذکر شخصیت ہیں۔ خلیل قیصر کو موسیقی سے لگاؤ تھا۔ فلموں سے بھی دلچسپی تھی۔یہی شوق انہیں راولپنڈی سے کھینچ کر لاہور لے آیا اور انہوں نے اس وقت کے مصروف اور معروف ترین فلم ساز و ہدایت کار انور کمال پاشا کی شاگردی اختیار کر لی۔اس زمانے میں انور کمال پاشا نے فلمی صنعت کو بہت سے مصنف، شاعر،اداکار اور ہدایتکار دیے ہیں۔ان ہدایت کاروں میں خلیل قیصر، حسن طارق،ایس سلیمان، جعفر ملک، آغا حسینی جیسے لوگ شامل ہیں۔
خلیل قیصر نے اولین تربیت تو انور کمال پاشا کے دبستان ہی میں حاصل کی۔ پھر آس پاس دیکھنے بھالنے کا قصد کیا۔ایم ایس ڈار صاحب ایک پرانے ہدایتکار تھے۔ان کی بڑی دلچسپ شخصیت تھی وہ فلم ''سلطنت'' کے ہدایتکار منتخب ہوئے خلیل قیصر نے ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ان کے ساتھ رہنے میں یہ لالچ تھا کہ انہوں نے خلیل قیصر کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے ہدایتکاری کا سارا بوجھ نوجوان خلیل قیصر پر ہی ڈال دیا تھا اور خود کو نگرانی تک محدود کر لیا تھا۔وہ فلم کے سیٹ پر آتے تو تھے مگر محض خانہ پری کیلئے۔ تمام تر ذمے داریاں خلیل قیصر ہی سرانجام دیا کرتے تھے۔اس طرح خلیل قیصر کو ہاتھ صاف کرنے کا بہترین موقع حاصل ہو گیا۔

''سلطنت'' ایک کامیاب فلم تھی جس میں مرکزی کردار سنتوش کمار اور صبیحہ نے ادا کئے تھے۔ فلم والوں کو یہ علم ہو گیا تھا کہ اس فلم میں خلیل قیصر ہی نے نمایاں کارگزاری دکھائی ہے۔ چنانچہ انہیں فلمسازوں نے اپنی آئندہ فلموں کیلئے تلاش کرنا شروع کر دیا۔
فلمساز و اسٹوڈیو اونر ملک باری نے پنجابی فلم '' یار بیلی'' بنائی تو اس کیلئے خلیل قیصر کو ہدایتکار چنا۔''یار بیلی ''کی کاسٹ

میں مسرت نذیر، سدھیر، نیلو اور ظریف نمایاں تھے اور یہ ایک کامیاب اور معیاری پنجابی فلم تھی۔ یہ فلم ۱۹۵۹ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کی وجہ سے خلیل قیصر کو مزید شہرت حاصل ہوگئی۔ مگر جس فلم نے انہیں راتوں رات نمبر اول کا ڈائریکٹر بنادیا وہ ''ناگن'' تھی۔ ''ناگن'' کے مصنف عزیز میرٹھی تھے۔ یہ رتن کمار کے بھائی وزیرِ علی کے ادارے ''فلمز حیات'' نے بنائی تھی اس لئے ''ناگن'' میں رتن کمار کو پہلی بار ایک مکمل اور بالغ نوجوان ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے شہرت یافتہ تھے ان کے والد عباس اجمیری اور بڑے بھائی وزیر علی نے پہلے تو کراچی سے فلمسازی کا آغاز کیا اور پھر لاہور منتقل ہوگئے۔ جب رتن کمار کو اس فلم کا ہیرو چنا گیا تو سبھی نے اعتراض کیا۔ ان کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ باقاعدہ مونچھیں داڑھی بھی نہیں نکلی تھیں اس کے علاوہ ان میں بہت زیادہ نفاست اور نزاکت بھی تھی اور آواز میں بھی مردانہ رعب و دبدبہ نہیں تھا مگر ان کے والد نے سوچا کہ چانس لینے میں کیا حرج ہے۔ اگر کامیابی ہوگئی تو گھر کا ہیرو دستیاب ہو جائے گا۔ اور بعد میں ایسا ہی ہوا۔

''ناگن'' ہیرو کے طور پر رتن کمار کیلئے سنگِ میل ثابت ہوئی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہیرو بن گئے حالانکہ دوسرے فلمسازوں نے انہیں ہیرو کے طور پر کاسٹ نہیں کیا مگر اپنے ادارے کی متعدد فلموں میں ہیرو کے طور پر نمودار ہوئے۔ ''ناگن'' میں رتن کمار کے مقابلے میں ایک نو عمر ہیروئن درکار تھیں۔ نیلو نے ابھی شہرت کی ابتدائی سیڑھی پر قدم رکھا تھا۔ ڈانسر اور معاون اداکارہ کے طور پر بھی ان کا نام ہر طرف پھیل گیا تھا مگر صفِ اول کی ہیروئنوں کی فہرست میں ان کا نام نہیں تھا۔ ''ناگن'' کی ریلیز نے انہیں سپر اسٹار بنادیا اور پھر انہوں نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ اس طرح'' ناگن'' کی کامیابی نے رتن کمار اور نیلو کی ایک نئی رومانی جوڑی کو جنم دیا۔

''ناگن'' کی کہانی ایک تصوراتی دیومالائی قسم کی کہانی تھی۔ اس میں ناگوں کو انسانوں کا روپ اختیار کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ پاکستانی ناظرین کیلئے یہ ایک نئی بات تھی۔ دوسرے یہ کہ خلیل قیصر نے اس کہانی کو بڑی مہارت، حسن اور ہنر مندی سے فلمایا تھا۔ موسیقی بہت عمدہ تھی۔ رتن کمار اور نیلو کے رومانی مناظر اور نیلو کے رقص اس فلم کی جان تھے۔ یوسف خان اس فلم میں ویلن تھے مگر اپنی شخصیت اور اداکاری کی بنا پر ہیرو پر بھاری تھے۔ ان تمام خوبیوں کو خلیل قیصر نے بڑی خوبصورتی سے یکجا کر دیا تھا جس کے نتیجے میں ایک کامیاب اور مقبول فلم نے جنم لیا تھا۔ ''ناگن''

کی ریلیز کے ساتھ ہی نیلو اور رتن کمار تو مقبول جوڑی بن ہی گئے تھے۔اس فلم نے خلیل قیصر کی صلاحیتوں کو بھی بھرپور انداز میں اجاگر کر دیا تھا۔اس طرح ایک بہت اچھا ہدایتکار فلمی دنیا کو میسر آ گیا۔"ناگن" قلیل سرمائے سے شب و روز کام کر کے بنائی گئی تھی۔ فلم کا یونٹ بعض اوقات چھتیس چھتیس گھنٹے تک شب و روز کام کرتا رہا تھا۔ فلم ساز وزیر علی یہ لطیفہ سناتے تھے کہ جس رات" ناگن" کا آخری شاٹ فلمایا گیا تو صبح کے پانچ بج رہے تھے اور ہر شخص گزشتہ ۶۷ گھنٹوں سے مسلسل جاگ رہا تھا۔ جیسے ہی آخری شاٹ فلم بند ہوا، سب مطمئن ہو گئے اور جو جہاں تھا وہیں سو گیا۔ یہاں تک کہ کیمرا مین بھی کیمرے کی ٹرالی پر سر رکھ کر خوابیدہ ہو گیا۔ ہدایت کار کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اس نے "کٹ" کہنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی یا شاید اس میں ہمت ہی نہیں رہی تھی۔

خلیل قیصر نے ہر طرف اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ ہر فلمساز انہیں سائن کرنے کا خواہشمند تھا مگر وہ ایک وقت میں ایک ہی فلم بنانے کے قائل تھے۔ ایک سچے فنکار کے مانند انہیں دولت سے رغبت نہیں تھی۔ بس کام کی لگن اور نئی سے نئی سوچ اور انداز کو متعارف کرانے کی فکر تھی۔اس سلسلے میں انہیں مصنف ریاض شاہد کا ساتھ مل گیا جو سونے پر سہاگہ تھا۔ان دونوں کی ٹیم نے پاکستانی صنعت کو بعض انوکھی اور یادگار فلمیں دی ہیں جن میں کلرک، دوشیزہ، فرنگی اور شہید جیسی فلمیں شامل ہیں۔

فرنگی اور شہید خلیل قیصر کی ذاتی فلمیں تھیں۔ یہ دونوں فلمیں انگریزوں کے خلاف تھیں اس لئے سنسر کرانے میں بھی کافی مشکلات پیش آئیں مگر ان دونوں فلموں کو بے پناہ کامیابی حاصل ہوئی۔ "فرنگی" میں سدھیر کے ساتھ شمیم آرا تھیں اور "شہید" میں اعجاز اور مسرت نذیر کی جوڑی تھی۔اس فلم کی نمایاں خوبی علاؤالدین اور طالش تھے۔

خلیل قیصر نے فلم ساز شوکت شیخ کیلئے "عجب خاں" بھی بنائی جسے بہت سراہا گیا۔

"کلرک" ایک حقیقت پسندانہ موضوع تھا۔اس میں کلرک کی زندگی کا احاطہ کیا گیا تھا۔ خلیل قیصر نے پہلی اور آخری بار اس فلم میں کام کیا تھا۔ وہ اس کے ہیرو تھے۔ ۱۹۶۴ء میں خلیل قیصر کی فلم "حویلی" نمائش پذیر ہوئی۔ موسیقار خواجہ خورشید انور تھے۔ خلیل قیصر کو بذاتِ خود بھی موسیقی کا شعور تھا۔ "فرنگی" میں انہوں نے پہلی بار فیض احمد فیض کی غزل

گلوں میں رنگ بھرے، بادِ نوبہار چلے

چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

شامل کی تھی۔ مہدی حسن کی گائی ہوئی یہ غزل آج بھی خود ان کی پہچان ہے۔ خلیل قیصر نے ''حکومت'' بھی پروڈیوس کی تھی اور فلمساز عطااللہ شاہ ہاشمی کیلئے '' ماں باپ'' بھی بنائی تھی۔ان کی بیشتر فلموں کے موسیقار رشید عطرے تھے۔

خلیل قیصر سے پاکستان کی فلمی صنعت کو بہت بلند توقعات وابستہ تھیں لیکن ایک اچانک حادثے فلمی صنعت کو اپنے ممتاز فرزند سے محروم کر دیا۔ایک دن خلیل قیصر کے قتل کی خبر فلمی حلقوں میں پھیلی اور دوسرے دن اخبارات کی سرخیوں میں نمایاں ہوئی تو سب حیران رہ گئے۔ خلیل قیصر جیسے خالص فنکار اور بے ضرر انسان سے بھلا کس کو دشمنی ہو سکتی تھی؟ یہ ۱۹۶۶ء کا واقعہ ہے ان دنوں قتل و ڈاکے کی وارداتیں زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ اس واقعے نے سارے ملک میں سنسنی پھیلا دی اور فلمی حلقوں میں خوف وہراس کی لہر دوڑ گئی۔ ستم ظریفی یہ کہ خلیل قیصر کے قتل کا معما آج تک حل نہیں ہو سکا ہے۔

خلیل قیصر کے قتل کے بارے میں واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے۔ جس شام وہ لاہور پہنچے تو بیوی بچوں کی فرمائش پر ائرپورٹ سے اترتے ہی تکے کباب لینے بازار چلے گئے۔ واپس آئے تو رات ہو چکی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوئے تو سامنے کے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بیوی نے پریشان ہو کر انہیں اندر جانے سے روکا مگر وہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ چند ہی لمحے بعد ایک آہ کی آواز آئی اور ایک شخص بھاگا ہوا باہر نکل کر سامنے والے میدان میں غائب ہو گیا۔ وہ منہ پر ڈھاٹا باندھے ہوئے تھا۔ خلیل قیصر کی بیوی نے اندر جا کر بجلی جلائی تو خلیل قیصر قالین پر پڑے ہوئے تھے۔ قاتل نے چھرے کے ایک ہی وار سے ان کا جگر چاک کر دیا تھا۔ وہ اسی وقت دم توڑ گئے۔ عام خیال یہی ہے کہ قاتل چور تھا۔ جب خلیل قیصر اچانک گھر میں داخل ہوئے تو اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ باہر نکلنے کے راستے میں خلیل قیصر حائل تھے۔انہوں نے غالباً اسے پکڑنے کی کوشش کی ہو گی،اس نے گھبرا کر ان پر وار کر دیا جو کہ ہلاکت خیز ثابت ہوا۔ وہ اپنی بیوی سے ایک لفظ کہے بغیر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

فلمی صنعت نے ان کا بڑے پیمانے پر سوگ منایا اخبارات میں قتل کا معما حل کرنے کیلئے مطالبے کئے گئے مگر کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ پاکستان کی فلمی صنعت ایک تخلیق کار اور ہنر مند سے محروم ہو گئی۔ ایک بیوی اپنے شوہر سے اور بچے اپنے باپ کے سائے سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دنیا کا کاروبار اور فلمی صنعت کا دھندا اسی طرح چلتا رہا مگر خلیل قیصر کا لہو آج بھی فریاد کناں ہے مگر اب تو وہ زمانہ ہے کہ ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ قتل معمول میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب کسے وقت ہے کہ خلیل قیصر کے خون کا حساب طلب کرے؟ ان کی بیوہ نے کچھ عرصے بعد اپنے دیور سے نکاح کر لیا اور راولپنڈی منتقل ہو گئی۔ اس طرح خلیل قیصر بچوں کو ایک قابل اعتماد سائبان حاصل ہو گیا۔ اب وہ سب بڑے ہو چکے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے ہم نے ''نوائے وقت'' میں خلیل قیصر کے بارے میں ایک مضمون لکھا تو دوسرے دن ایک ٹیلی فون موصول ہوا۔ فون کرنے والا ایک نوجوان تھے۔ اس نے خود کو خلیل قیصر کے بیٹے کی حیثیت سے متعارف کرایا اور بتایا کہ وہ پاکستانی فوج میں میجر ہے۔

اس نے کہا ''انکل۔ آپ کا مضمون پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آپ ابو کے بہت گہرے دوست ہیں اور ان سے نزدیک تھے؟''

ہم نے کہا ''بہت گہرے تو نہیں لیکن دوست ضرور تھے اور ہم نے ان کے ساتھ کافی وقت گزارا ہے''۔

نوجوان نے کہا ''ہمیں تو اپنے والد کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ جیسے لوگوں سے مل کر ان کے بارے میں باتیں کریں اور ان کی شخصیت کے متعلق معلوم کریں''۔

میں نے کہا ''تم جب چاہو بڑے شوق سے گھر آؤ۔ تم سے مل کر مجھے بہت خوشی ہو گی''۔

مگر اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں ہو سکا۔ وہ شاید ایک دو روز کیلئے لاہور آیا تھا غالباً مصروفیت کی بنا پر ملاقات کیلئے نہ آ سکا۔ جن دنوں ہماری خلیل قیصر سے ہر روز ملاقاتیں رہا کرتی تھیں اس وقت یہ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی وہ ایک کہانی بن کر رہ جائیں گے اور ان کے بچے ان کے بارے میں دوسروں سے معلومات حاصل کرتے پھریں گے۔ خلیل قیصر جوان العمری میں ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے ذہن میں بے شمار تخلیقی منصوبے تھے جو ادھورے رہ گئے۔ خلیل قیصر اور ریاض شاہد کی دوستی مثالی اور بے حد پائیدار تھی۔ خلیل کی اکثر فلموں کے مصنف ریاض شاہد ہی تھے۔ دونوں میں بلا کی ذہنی ہم آہنگی تھی اگر خلیل قیصر زندہ رہتے تو یقیناً ریاض شاہد اپنی فلم ''زرقا'' کی ہدایتکاری

ان ہی کو سونپ دیتے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں کے معترف اور مداح تھے۔ ان کے باہمی اشتراک نے کئی یادگار فلموں کو جنم دیا تھا۔

خلیل قیصر سے ہماری ملاقات اکثر اسٹوڈیو میں رہا کرتی تھی۔ ہمارے گہرے دوست اور پارٹنر حسن طارق کے ساتھ ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں کو سراہتے تھے اور بڑے خلوص سے ایک دوسرے کے بہی خواہ تھے۔ اسٹوڈیو میں شام کے وقت جب محفل آرائی ہوتی تو خلیل قیصر، ریاض شاہد، حسن طارق، رشید عطرے اور فلمساز حسن شاہ اس میں ضرور موجود ہوتے تھے۔

خلیل قیصر بہت خوش گلو تھے۔ طبلہ، ہارمونیم اور کئی دوسرے ساز بجا لیتے تھے۔ علاؤالدین صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ ایک گمراہ روح ہے۔ میری طرح گلوکار بننے کے ارادے سے گھر سے نکلا تھا مگر یہ ہدایتکار بن گیا اور میں اداکار۔ اور یہ دیکھئے کہ دونوں نے اپنے اپنے شعبوں میں کس غضب کی کارکردگی دکھائی۔

خلیل قیصر کے ساتھ ہمیں بھی کام کرنے کا اتفاق ہوا مگر کوئی فلم مکمل نہ ہو سکی۔ اسے بھی اتفاق یا بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے۔

ایک مرتبہ ہمارے دوست فلمساز اقبال شہزاد نے ہم سے ایک کہانی لکھوائی جس کا نام ''ایک ہی راستہ'' تھا۔ یہ ایک ڈاکو کی کہانی تھی۔ اقبال شہزاد ان دنوں کراچی میں رہتے تھے۔ وہ خلیل قیصر کو ہدایت کاری سونپنا چاہتے تھے۔ ایک دو بار ہمارا اور خلیل قیصر کا اس سلسلے میں کراچی جانا بھی ہوا مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ مگر ان ملاقاتوں نے ہمیں ایک دوسرے سے اور نزدیک کر دیا۔

فلم ساز وزیر علی نے ''کلرک'' کے بعد فلم بنانے کا ارادہ کیا تو خلیل قیصر کو ہدایتکار چنا۔ ہم سے کہانی کیلئے بات چیت ہوئی۔ اس زمانے میں ریاض شاہد کا بہت شہرہ تھا کہ انہوں نے ''کلرک'' کی کہانی لکھنے کا معاوضہ پانچ ہزار روپے وصول کیا ہے جو اس وقت ایک ریکارڈ تھا۔

خلیل قیصر نے ایک روز ہمیں فون کرکے بلایا اور کہا کہ وزیر علی کی فلم کیلئے میں آپ سے کہانی لکھوانا چاہتا ہوں۔ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ دوسرے دن وزیر علی سے ان کے شاندار دفتر میں ملاقات ہوئی وہ بہت دلچسپ اور

باتونی آدمی تھے۔ لطیفہ بازی کے بعد مطلب کی گفتگو پر آئے۔ ہم نے کہانی کا آئیڈیا سنایا جو انہیں پسند آ گیا۔ سب سے آخر میں معاوضہ کی بات چھڑی۔

ہم نے کہا ''آپ نے ریاض شاہد کو جو معاوضہ دیا ہے ہم اس سے ایک ہزار روپے زیادہ لیں گے''۔

انہوں نے حیرت سے دیکھا ''آفاقی صاحب اتنا معاوضہ تو کسی نے نہیں لیا''۔

ہم نے کہا ''اسی لئے ہم لینا چاہتے ہیں''۔

انہوں نے ہنس کر کہا ''کیا ریاض شاہد سے لگتی ہے آپ کی؟''

ہم نے کہا ''ہرگز نہیں مگر ہر طرف چرچا ہے کہ ریاض شاہد نے کہانی کے معاوضے کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ ہم اس ریکارڈ کو توڑنا چاہتے ہیں''۔

وہ سوچ میں پڑ گئے '' بھائی خدا کا خوف کریں۔ کیوں بے چارے فلم ساز پر ظلم کرتے ہیں''۔

مگر کچھ دیر غور و فکر کے بعد وہ آمادہ ہو گئے۔ ایڈوانس کی رقم بھی مل گئی مگر یہ فلم بھی شروع ہونے سے پہلے ہی رک گئی۔ اسکرین پلے کی حد تک ہی اس پر کام ہوا تھا کہ خلیل قیصر کسی دوسری جگہ مصروف ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد یہی کہانی اقبال شہزاد نے بنائی اور حسن طارق کو ہدایتکار منتخب کیا۔ وزیر علی نے بہت شور مچایا کہ یہ کہانی تو میری ہے۔ میں عدالت میں جاؤں گا کیونکہ میں اس کا ایڈوانس بھی دے چکا ہوں۔

ہم نے ان سے فون پر کہا ''وزیر علی صاحب یہ تو بہت پرانی بات ہے پھر آپ نے فلم کیوں نہیں بنائی تھی؟''

وہ پھر بھی آمادہ فساد ہی رہے تو اقبال شہزاد نے انہیں ایڈوانس کی رقم واپس کر کے یہ مسئلہ حل کر دیا۔

خلیل قیصر کے ساتھ ہمارے ستارے نہیں ملتے تھے یا کسی فقیر کی بددعا تھی کہ ہماری ان کی مشترکہ کوشش کبھی کامیاب نہ ہوئی بلکہ تکمیل تک بھی نہ پہنچی۔

فلمساز شوکت شیخ کیلئے خلیل قیصر نے فلم ''عجب خان'' بنائی تھی جو ایک سپر ہٹ فلم تھی۔ شوکت شیخ ہمارے بھی گہرے دوست تھے۔ بلکہ ان کے گھر میں ہمارا آنا جانا تھا۔ تعلیم یافتہ اور خاندانی آدمی تھے۔ پی آئی اے سے منسلک تھے مگر فلم کے شوق میں نوکری چھوڑ آئے اور فلم ''عجب خان'' بنائی جو بے حد کامیاب رہی۔ شوکت شیخ کے پاس اس

زمانے میں امریکی شیورلے کار تھی حالانکہ اس زمانے میں نوے فیصد فلم ساز کار سے محروم تھے۔ان کی بیگم جگت بھابی تھیں۔بڑی دلچسپ اور شفیق شخصیت تھیں۔ہر وقت ہنستی رہتی تھیں۔ایکٹریسوں سے ملنا جلنا بھی تھا۔حسنہ کو انہوں نے منہ بولی ''بیٹی'' بنا رکھا تھا۔حالانکہ ان کی خود اپنی دو بچیاں بھی تھیں۔حسنہ کو بھی اپنے ڈیڈی اور ممی پر بہت مان تھا۔شوکت صاحب کی بہت بڑی کوٹھی میسن روڈ پر تھی جہاں ہر وقت رونق لگی رہتی تھی۔

''عجب خان'' کے بعد خلیل قیصر نے شوکت شیخ کی دوسری فلم کیلیئے کہانی کی تلاش شروع کی تو ہمارا ایک آئیڈیا انہیں بہت پسند آیا۔یہ ایک ہلکی پھلکی رومانی اور پراسرار کہانی تھی۔اس سے پہلے اس طرز کی فلم پاکستان میں نہیں بنائی گئی تھی۔کہانی پر کام شروع ہوا تو خلیل قیصر کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ طویل ہو گیا۔انہیں کہانی اور اسکرین پلے کا بہت زیادہ شعور تھا۔بہت اچھے مشورے دیا کرتے تھے۔بلاوجہ بحث اور اپنی بات منوانے کا انہیں شوق نہیں تھا۔مال روڈ پر جس جگہ ان دنوں واپڈا کی عمارت ہے یہاں میٹرو ہوٹل کی بہت بڑی عمارت تھی۔اس عمارت کی دوسری منزل میں شوکت شیخ کا دفتر تھا۔خلیل قیصر اور ہم سامنے والے کشادہ برآمدے میں بیٹھ جاتے،سامنے باغ جناح اور مال روڈ کا خوب صورت منظر ہوتا تھا۔سارا دن چائے کافی کا دور چلتا رہتا اور کہانی پر کام بھی جاری رہتا۔اس فلم کا نام '' گیسٹ ہاؤس'' رکھا گیا۔کہانی یہ تھی کہ ایک پہاڑی علاقے میں چند لوگوں نے ایک گیسٹ ہاؤس قائم کیا ہے مگر وہاں مہمانوں کو ٹھہرانا پسند نہیں کرتے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جعلی نوٹ بنانے میں مصروف تھے۔حسنہ اس فلم کی ہیروئن تھیں۔وہ ایک مرحوم سائنسدان کی صاحبزادی تھیں جنہیں جعلی نوٹ بنانے کا گر معلوم تھا چنانچہ جرائم پیشہ لوگ انہیں اغوا کر کے اس پہاڑی گیسٹ ہاؤس میں لے گئے تھے۔فلم کے ہیرو سنتوش کمار ایک سراغرساں تھے اور ان کے دوست لہری ایک اخباری فوٹو گرافر۔اس طرح یہ کہانی آگے چلتی تھی۔اسے مغربی فلموں کے انداز میں فلمانے کا پروگرام تھا اور خلیل قیصر نے اس کے جتنے بھی حصے فلمائے وہ واقعی غیر ملکی معیار کے تھے۔کہانی کی اٹھان اور کرداروں کا انداز بھی عام فلموں سے مختلف تھا۔اور شوکت شیخ نے اس فلم کیلیئے سیٹ بھی مغربی فلموں کے انداز کے لگائے تھے۔اس فلم کی ایک نئے جذبے اور ولولے سے آغاز ہوا تھا۔رشید عطرے کا میوزک بھی بہت خوبصورت تھا اور جو دو گانے فلمائے گئے ان کو خلیل قیصر نے اپنے مخصوص انداز میں فلمایا تھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ خلیل قیصر

کو گانوں کی فلم بندی میں کمال حاصل تھا۔ وہ بالکل نئے اور انوکھے انداز میں گانے فلماتے تھے۔ جس طرح انڈین میں گورو دت نے گانوں کی فلم بندی کا ایک نیا انداز پیش کیا تھا اس طرح پاکستان میں خلیل قیصر نے بھی اس میں جدت اور انفرادیت پیدا کر دی تھی۔ انہیں گانوں کی فلم بندی کے معاملے میں نئی ڈگر کا تخلیق کار سمجھا جاتا تھا۔

''گیسٹ ہاؤس'' کا آغاز جس جوش و خروش اور تیزی کے ساتھ ہوا تھا اس کا انجام اتنا ہی غیر متوقع اور مایوس کن ہوا۔ اس میں دیکھا جائے تو کسی ایک کا بھی قصور نہیں تھا لیکن خدا کو منظور نہ تھا کہ یہ فلم بنتی۔ لہٰذا ایک کے بعد ایک رکاوٹ پیدا ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ یہ فلم ہمیشہ کیلئے رک گئی۔ خلیل قیصر تو دوسری فلموں کی تیاری میں مصروف ہو گئے مگر شوکت شیخ کیلئے یہ دھچکا آنے والی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور وہ دوبارہ اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑے نہ ہو سکے۔

''گیسٹ ہاؤس'' کی مسلسل شوٹنگ کیلئے مال روڈ پر ملکہ اسٹوڈیو میں اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اسٹوڈیو اس زمانے میں زیادہ مصروف نہیں تھا۔ شوکت شیخ ایک ڈیڑھ ماہ کی مسلسل شوٹنگ کے ذریعے یہ فلم کم سے کم وقت میں مکمل کرنا چاہتے تھے جو اس زمانے کے اعتبار سے ایک انوکھی بات تھی۔ ملکہ اسٹوڈیو صرف ''گیسٹ ہاؤس'' کے فلم ساز کیلئے وقف تھا۔ ایک کے بعد ایک سیٹ لگنے والا تھا۔ یہ سہولت کسی اور اسٹوڈیو میں میسر نہیں تھی۔

سنتوش کمار اس کے ہیرو تھے اور حسنہ ہیروئن۔ دونوں کو کہانی بہت پسند آئی تھی اور وہ بڑے ذوق و شوق سے اس کی فلم بندی میں حصہ لینے کیلئے بیتاب تھے۔ سنوش صاحب کی ہمیشہ سے دیر سے اسٹوڈیو پہنچنے کی عادت تھی مگر ''گیسٹ ہاؤس'' کی پہلی شوٹنگ میں وہ نو بجے ہی پہنچ گئے تو سب حیران رہ گئے۔ سنتوش کمار اور صبح نو بجے، حیرت!

خلیل قیصر اسٹوڈیو میں موجود تھے۔ انہوں نے کہا ''سنتوش صاحب اتنے سویرے؟ ابھی تو سیٹ بھی تیار نہیں ہے''۔

وہ بولے ''یار میں چاہتا ہوں کہ شوٹنگ سے پہلے سیٹ پر پہنچ کر اس روز کے مناظر کو سمجھنے کی کوشش کروں۔ یہ مختلف قسم کا ماحول اور کردار ہے۔ میں اس کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہوں''۔

اس کے بعد بھی وہ ہمیشہ دس بجے اسٹوڈیو پہنچ جاتے تھے۔ خلیل قیصر نے ان کی اس تبدیلی پر مومن خان مومن کا یہ شعر سنایا۔

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن

آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

پھر کہا ”مگر شاہ جی! آخری وقت میں مسلمان ہو گئے ہیں“۔

سنتوش صاحب کی عادت تھی کہ سیٹ پر ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ لطیفہ بازی، فقرہ بازی، ادھر ادھر کی کہانیاں اور قصے۔ جتنی دیر تک وہ سیٹ پر موجود رہتے تھے ایک رونق سی لگی رہتی تھی۔ وہ ہر ایک سے بے تکلف تھے۔ سیٹنگ قلی سے لے کر ہیروئن، فلمساز اور ہدایتکار تک ہر ایک سے ان کی چھیڑ چھاڑ جاری رہتی تھی۔

حسنہ ایک بے حد دلچسپ اور رنگین کردار تھیں۔ یوں تو وہ بہت ہنس مکھ تھیں مگر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کب کس بات پر ناراض ہو جائیں گی۔ ان کے مزاج میں لاابالی پن اور بچپن بہت زیادہ تھا۔ گھر میں انہیں بے بی کے روپ میں ہی دیکھا تھا اس لئے آج بھی انہیں بے بی ہی کہتے ہیں حالانکہ وہ بڑے بڑے بچوں کی ماں بن چکی ہیں مگر وہ بالکل مائنڈ نہیں کرتیں۔ وہ بے حد دلچسپ شخصیت ہیں مگر صرف اس وقت تک جب ان کا دماغ نہ پھر جائے اور وہ کس بات پر ناراض ہو جائیں گی یہ کوئی نہیں جانتا۔ ایک بار فلم ”نیلا پربت“ کی شوٹنگ کے دوران میں انہوں نے انڈے کی فرمائش کی۔ اسسٹنٹ فوراً ابلا ہوا انڈا اور کافی لے کر حاضر ہو گیا۔

بے بی بگڑ گئیں ”یہ کیا طریقہ ہے۔ فقیروں کی طرح ایک انڈا لے کر آ گئے۔ ہیروئن کی یہی عزت ہے تمہارے یونٹ میں؟ اٹھا کر لے جاؤ“۔ وہ چیخ کر بولیں تو سب ڈر کر اور منہ چھپا کر بھاگ گئے۔

اسسٹنٹ نے جا کر فلمساز اور ہدایتکار احمد بشیر کو بتایا۔ اس فلم کی شوٹنگ کراچی کے اسٹوڈیو میں ہو رہی تھی۔ احمد بشیر فلم میں درپیش مسائل کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ یہ ان کی پہلی پہلی فلم تھی۔ سرمایہ بھی خود ان کا اور ان کے رشتے داروں کا تھا۔ فلم کا موضوع بھی نفسیاتی اور جنسیاتی تھا۔ دراصل وہ ایک نیا تجربہ کرنا چاہتے تھے مگر عام روش سے ہٹ کر کوئی قدم اٹھائے تو تنقید کا نشانہ بن جاتا ہے۔ ان کا بھی یہی حال تھا۔ ہر ہر سین کی وضاحت کیلئے ہیرو محمد علی، ہیروئن حسنہ اور طالش کو سمجھانا پڑتا تھا تب کہیں جا کر وہ منظر فلمایا جاتا تھا کیونکہ کہانی کی ضروریات قدرے مختلف تھیں اور احمد

بشیر ایک عام ڈگر سے ہٹ کر فلم بنا رہے تھے اس لئے اداکاروں کو ان کی بات سمجھنے میں مشکل پیش آتی تھی خصوصاً حسنہ اکثر بحث کیا کرتی تھیں اور ان کو منانے کیلئے احمد بشیر مختلف طریقے استعمال کرتے تھے۔

اسسٹنٹ نے ایک انڈے کی فراہمی پر حسنہ کی ناراضگی کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا ''بھئی فوراً ایک درجن انڈے ابال کر حسنہ بیگم کے پاس لے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ان کا موڈ خراب ہو جائے، مجھے بہت اہم سین فلمانا ہے''۔

حسنہ میک اپ روم میں بیٹھی ہوئی تھیں کہ اسسٹنٹ ایک درجن ابلے ہوئے انڈے لے کر ان کے پاس پہنچ گئے ''میڈم انڈے''۔

حسنہ نے انڈے اٹھا کر پھینک دیے اور غصے سے چلائیں ''کیا سمجھ رکھا ہے تم لوگوں نے میں کوئی جنات ہوں جو ایک درجن انڈے کھاؤں گی، اتنی بدتمیزی؟''

حسنہ غصے میں بل کھائی ہوئی اٹھیں اور کار میں بیٹھ کر گھر چلی گئیں۔ دوسرے دن فلم ساز نے بڑی مشکل سے انہیں منایا اور شوٹنگ کیلئے آمادہ کیا۔

حسنہ کے ایسے اور بھی بے شمار واقعات ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔ ان پر گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ کی مثل صادق آتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کس وقت، کس بات پر وہ مہربان ہو جائیں اور یکایک کس بات پر قہر و غضب کا نمونہ بن جائیں گی۔ وہ انڈے کیوں کھاتی تھیں، اس کا جواب ہوتا وہ خود کو فٹ رکھنے کے لئے کھاتی ہیں۔

''گیسٹ ہاؤس'' کی فلم بندی میں حسنہ نے بہت دلچسپی سے حصہ لیا۔ ایک تو انہیں فلم کی کہانی اور اپنا کردار بہت پسند آیا تھا۔ دوسرے شوکت شیخ ان کے منہ بولے ''ڈیڈی'' تھے۔ شوکت صاحب کی بیگم بھی اکثر سیٹ پر موجود رہتی تھیں۔ جس کی وجہ سے گھریلو اور اپنائیت کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ ایک کے بعد ایک سیٹ لگتے رہے اور زور شور سے شوٹنگ ہوتی رہی۔ جب رش پرنٹ نکلے تو سبھی نے تعریف کی۔ تقدیر شوکت شیخ پر بہت مہربان تھی۔ فلمی دنیا میں ان کی خوش بختی کے چرچے عام ہو رہے تھے۔ خیال تھا کہ آئندہ مہینے یہ فلم مکمل ہو جائے گی اور بہت کامیاب رہے گی۔ مگر تقدیر کو کروٹ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ایسا ہی شوکت شیخ کے ساتھ بھی ہوا۔

اس زمانے میں فلم والے آپس میں بہت میل جول رکھتے تھے۔ تقریبات اور پارٹیاں ہوتی رہتی تھیں۔ محفلیں سجائی

جاتی تھیں۔خوب رونق رہا کرتی تھی۔ایک ایسی ہی پر رونق تقریب میں شوکت شیخ کی بیگم کی ملاقات شمیم آرا سے ہوگئی اور وہ انہیں ایسی بھائیں کہ انہوں نے شمیم آرا سے تعلقات بڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ شمیم آرا اس وقت بھی اسٹار تھیں۔بے حد مصروف تھیں مگر مسز شوکت کی پارٹیوں میں شریک ہونے کیلئے وہ بھی وقت نکالنے لگیں۔ملاقاتیں بڑھیں تو شمیم آرا نے انہیں اپنے گھر مدعو کیا۔مسز شوکت نے بھی شمیم آرا کو اپنی کوٹھی پر دعوت دی اور بہت اچھی محفل جمی۔مگر شوکت صاحب کچھ پریشان تھے۔ہم نے دریافت کیا تو بولے ''آفاقی ! تم جانتے ہو کہ بے بی (یعنی حسنہ) شمیم آرا کو پسند نہیں کرتی بلکہ اسے اپنا حریف سمجھتی ہے اس کے مزاج سے بھی تم واقف ہو۔ایسا نہ ہو کہ شمیم آرا سے ہمارے تعلقات کی وجہ سے وہ ناراض ہو جائے''۔

ہماری صحافت کے دنوں ہی کا ذکر ہے کہ ہم نے ایورنیو اسٹوڈیو کے دروازے کے باہر ایک متوسط قدو قامت کے مضبوط نوجوان کو دیکھا۔صورت شکل معمولی، لیکن آنکھوں میں بے پناہ چمک اور چہرے پر اعتماد، ہمارا اسٹوڈیوز میں آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔یہ نوجوان کبھی شاہ نور اسٹوڈیو تو کبھی ایورنیو اسٹوڈیوز کے باہر نظر آجاتا تھا۔کبھی توجہ سے دیکھنے یا اس پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ایک ایکسٹرا اداکار یا فائٹر کو غور سے دیکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ یہ گمنام، بے چہرہ لوگ فلمی نگار خانوں میں گھومتے ہی پھرتے ہیں اور پھر سلطان کا تو یہ بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔اس وقت اسے صرف سلطان کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ابھی وہ سلطان راہی نہیں بنا تھا۔اس نے اپنی زندگی کا آغاز ایکسٹرا اور فائٹر کی حیثیت سے کیا تھا۔اس لئے نامور اور دولت مند ہونے کے بعد بھی وہ ایکسٹرا اور فائٹرز کے ساتھ پیار کرتا تھا۔ان ہی کے درمیان رہنا پسند کرتا تھا۔ان ہی کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔آؤٹ ڈور شوٹنگ کے زمانے میں وہ ان ہی لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا تھا۔ان ہی کے ساتھ آرام کے لمحات گزارتا تھا۔یہ وہ لوگ تھے جن کے چہروں میں وہ اپنے ابتدائی جدوجہد کے ایام تلاش کرتا رہتا تھا۔ جنہیں وہ پاکستان کا سب سے بڑا، مقبول اور سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے والا ہونے کے بعد بھی نہیں بھولا تھا۔یہ سلطان بعد میں سلطان راہی کے نام سے پاکستان کی فلمی دنیا میں چھا گیا۔پنجابی فلموں میں اس کی حیثیت شہ رگ جیسی تھی۔اس کے بغیر پنجابی فلم بنانے اور کامیاب کرانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔وہ پنجابی فلموں کا بے تاج سلطان بن چکا تھا۔ایسا وقت بھی آیا جب وہ بیک وقت چالیس پینتالیس فلموں

میں کام کرتا تھا۔ اگر فلمسازوں کا بس چلتا تو اس سے زیادہ فلموں میں بھی اسے کاسٹ کرتے لیکن یہ جسمانی طور پر ممکن نہ تھا۔ وہ چوبیس گھنٹوں میں سے بیس بیس گھنٹے بھی مصروف رہا۔ کبھی مسلسل چوبیس گھنٹے بھی اس نے کام کیا۔ اٹھارہ گھنٹے کام کرنا تو اس کے معمول میں داخل تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں ان گنت فلموں میں کام کرتا تھا۔ ان کے ناموں سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن ان میں سے تمام تر فلموں میں وہ مرکزی کردار ہوا کرتا تھا۔ کرداروں کی نوعیت سے بھی اسے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اس لئے کہ وہ اکثر ایک ہی کردار کرتا رہا۔ نہ وہ اس کردار سے کبھی اکتایا، نہ ہی اس کے پرستار فلم بین اسے ایک ہی کردار میں، ایک ہی قسم کے مکالمے ادا کرتے دیکھ کر اس سے بیزار ہوئے۔ نقاد حیران تھے کہ آخر لوگ اس کی فلمیں دیکھنے جاتے ہی کیوں ہیں جب کہ ہر فلم میں اس کا کردار، لباس، مکالمے، اداکاری کا انداز اور آغاز و انجام قریب قریب ایک ہی جیسا ہوتا تھا مگر ایسا لگتا تھا جیسے اس نے فلم دیکھنے والوں پر جادو کر دیا ہے۔ کوئی سحر پڑھ کر پھونک دیا ہے۔ یا پھر ہپناٹزم کے زور پر انہیں اپنا معمول بنا لیا ہے۔ اس قدر والہانہ عقیدت، ایسی چاہت اور اتنے طویل عرصے تک، کسی اور اداکار کے حصے میں بھلا کہاں آئی ہو گی۔ دنیا کی فلمی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس نے لگ بھگ ۲۸ سال قبل ایک پنجابی فلم ''بابل'' میں مرکزی کردار کر کے جو مقام، مرتبہ اور قبول عام حاصل کیا تھا آخر دم تک اس مقام پر فائز رہا۔ اتنے طویل عرصے تک ہیرو کے مقام کو برقرار رکھنے کی مثالیں تو اور ملکوں میں بھی مل جائیں گی مگر ان اداکاروں کی ہر سال بیس پچیس فلمیں ریلیز نہیں ہوتی تھیں۔ وہ مختلف قسم کے کرداروں اور نت نئے روپ میں فلم بینوں کے سامنے بھیس بدل بدل کر آیا کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی سال میں ایک دو یا زیادہ سے زیادہ تین چار فلموں میں کام کیا ہو گا۔ مگر سلطان راہی ان سے بالکل مختلف اور منفرد ہیرو تھا۔ وہ اتنے لمبے عرصے تک، سالہا سال ایک ہی قسم کے کرداروں میں نمودار ہوتا رہا۔ ان کرداروں میں ناموں کے سوا کوئی اور فرق نہیں تھا۔ بلکہ اکثر اوقات اس کے فلمی نام بھی وہی ہوتے تھے جو اس سے پہلے والی فلموں میں ہوا کرتے تھے۔ کبھی اس کی سال میں بارہ چودہ فلمیں ریلیز ہوتی تھیں تو حیرت ہوتی تھی اس لئے کہ لوگ سال میں اس کی درجنوں فلمیں دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ سال کے گیارہ مہینے شب و روز کام کرتا تھا۔ صبح چھ سات بجے گھر سے نکلتا تھا اور رات کو بارہ ایک اور کبھی دو بجے واپس گھر لوٹتا تھا۔ برسوں اس کا یہی معمول تھا۔ وہ ان اٹھارہ بیس گھنٹوں

میں مسلسل ایک اسٹوڈیو سے دوسرے اسٹوڈیو، ایک سیٹ سے دوسرے سیٹ اور ایک آؤٹ ڈور لوکیشن سے دوسری آؤٹ ڈور لوکیشن تک سفر کرتا رہتا تھا۔ وہ سارے دن سفر کرتا تھا۔ دن رات کام کرتا تھا، اس کی مصروفیات کی تفصیل سن کر لوگ حیران و پریشان ہو جاتے تھے لیکن سلطان راہی ایک ان تھک اداکار تھا۔ وہ انسان کے روپ میں ایک جن تھا۔ گرمی، سردی، برسات، بہار ہو کہ خزاں ہر موسم میں اس کا یہی معمول تھا۔ سال میں ایک ماہ وہ مکمل چھٹی کرتا تھا۔ یہ عموماً مئی یا جون کا مہینہ ہوتا تھا۔ اس ایک مہینے میں وہ بیرون ملک جا کر مکمل آرام کرتا تھا۔ عمرہ کرتا تھا، گھومتا پھرتا تھا۔ ایک جیسے فلمی ملبوسات کی جگہ من پسند مشرقی اور مغربی لباس پہن کر، ہیٹ لگا کر تفریح کرتا تھا۔ اور ایک ماہ کے بعد واپس آ کر پھر اسی مشین کا پرزہ بن کر رہ جاتا تھا۔ کسی نے اسے کبھی تھکا ہوا نہیں دیکھا۔ صبح چھ بجے والی شوٹنگ میں وہ جس قدر تر و تازہ اور شگفتہ مزاج نظر آتا تھا، رات کے بارہ بجے والی شوٹنگ پر بھی وہ اتنا ہی تازہ دم، ہنس مکھ اور زندگی کی حرارت سے بھرپور دکھائی دیتا تھا۔ بدمزاجی، چڑچڑاپن، غصہ، لڑائی جھگڑا، ان میں سے کوئی لفظ اس کی لغت میں نہیں تھا۔ جب دیکھئے ہنستا بولتا نظر آتا تھا۔ فلموں میں انتہائی خونخوار، بدمزاج، غصیل اور تند و خو نظر آنے والا یہ اداکار حقیقی زندگی میں ایک نرم خو، نرم دل اور خوش گفتار انسان تھا۔ کسی نے اسے کبھی کسی کے ساتھ لڑتے جھگڑتے، غصہ کرتے یہاں تک کہ بلند آواز سے بولتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ کئی سال سے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں اس پر کوئی اظہار ناراضگی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی بعض پرانے ہدایتکاروں یا اداکاروں کا موڈ خراب دیکھتا تو وہ فوراً ان سے دیر سے آنے پر معذرت کر لیتا۔ ہنس بول کر انہیں منانے اور خوش کرنے کی کوشش کرتا۔

شوٹنگ پر دیر سے پہنچنے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو مسلسل سفر اور کام میں مصروف رہتا تھا۔ ایک دن میں پانچ چھ اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ فلموں کی شوٹنگ کرنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ پھر نگار خانوں اور لوکیشنز کے مابین طویل فاصلے اور ٹریفک کی ناہمواریاں بھی تاخیر کا سبب بن جاتی تھیں۔ سب جانتے تھے کہ اس تاخیر میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو دم لینے کیلئے بلا ضرورت کہیں رکا بھی نہیں ہے، ستانے کیلئے آدھ گھنٹا کمر سیدھی کرنے کی غرض سے آنکھیں موند کر لیٹا بھی نہیں ہے، پھر بھی وہ لیٹ ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی سیٹ پر موجود لوگوں کا موڈ بگڑ بھی جاتا تھا۔ منہ سے بولنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی وہ ان کے چہروں سے ان کے خیالات پڑھ لیتا تھا۔ سینئر فنکاروں اور

ہدایتکاروں کی وہ بے پناہ عزت کرتا تھا۔انہیں ناراض دیکھ کر پریشان ہو جاتا تھا۔
''السلام علیک آغا جی! میں آگیا ہوں۔پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔اطمینان رکھئے،کام ختم کرکے ہی جاؤں گا''۔

کسی کو سر جی،کسی کو آغا جی،کسی کو میری جان،کسی کو یار جانی کہہ کر وہ روٹھوں کو منالیتا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے سیٹ کا ماحول اور مزاج ہی بدل جاتا تھا۔چند ہی لمحوں بعد وہاں صرف مصروفیت نظر آتی تھی یا پھر سلطان راہی کے قہقہے گونجتے سنائی دیتے تھے۔
سیٹ پر وہ آندھی طوفان کی طرح داخل ہوتا تھا۔وہ ایک سیٹ یا ایک فلم کا لباس پہن کر دوسری فلم کی شوٹنگ پر جانے کا عادی نہ تھا حالانکہ اکثراوقات تو اس کے پاس لباس تبدیل کرنے کا وقت بھی نہیں ہوتا تھا۔مگر وہ کوئی عام آدمی نہیں،سلطان راہی تھا۔سب سے الگ،سب سے مختلف۔اس کا طریقہ کار یہ تھا۔وہ سیٹ پر بھونچال کی طرح داخل ہوتا،دور ہی سے سب کو علیک سلیک کرتا،کسی سے مذاق تو کسی سے چھیڑ خانی کرتا ہوا ڈریسنگ روم یا کسی غیر آباد گوشے کی طرف چلا جاتا۔سیٹ پر داخل ہونے سے پہلے ہی وہ قمیص کے بٹن کھولنے شروع کر دیتا تھا۔اور ڈریس مین کو آواز دیتا''بیٹے،منے،سر جی.... لے آؤ''۔
تین چار منٹ کے اندر وہ لباس تبدیل کرلیتا۔میک اپ والا اتنی دیر میں مونچھیں اور وگ لئے تیار کھڑا ہوتا تھا۔وہ سیٹ کی جانب جاتے ہوئے برق رفتاری سے ہونٹوں کے اوپر مونچھیں لگاتا،سر پر وگ رکھتا،چند لمحوں کیلئے رک کر ساتھ ساتھ چلنے والے میک اپ مین کے ہاتھ سے آئینہ لے کر اس میں اپنا چہرہ دیکھتا۔اگر چہرے پر کسی خاص میک اپ کی ضرورت ہوتی تو وہیں کھڑے کھڑے یا کرسی پر بیٹھ کر میک اپ کراتے ہوئے وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کو پکارتا
''ہاں جی،کیا ڈائیلاگ ہیں؟''
اسسٹنٹ اسے مکالمہ پڑھ کر سناتا وہ دل ہی دل میں یا اونچی آواز میں دہراتا اور آئینے میں میک اپ کو بھی دیکھتا رہتا۔چند منٹ بعد وہ لباس پہن کر میک اپ کرکے کیمرے کے سامنے شوٹنگ کرتا ہوا نظر آتا تھا۔
سلطان راہی نے سالہا سال سے اپنی فلموں کی کہانیاں سننا موقوف کر دیا تھا۔وہ کبھی مکالمہ ساتھ لے جا کر پڑھنے کی

ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔سچ تو یہ ہے کہ اپنی فلموں کی کہانی، مکالمہ اور کردار اسے زبانی یاد ہو گئے تھے۔وہ سالہاسال سے شب و روز چھ سات فلموں میں یہی آواز اور یہی مکالمہ ادا کرتا آیا تھا۔ کہانی پر غور کرنے یا اس کے بارے میں بات چیت کرنے کی نہ اسے فرصت تھی، نہ ضرورت۔وہ جانتا تھا کہ فلمساز اس کے کرداروں اور مکالموں کو ہر گز نہیں بدلیں گے،اس لئے بات کرنا لاحاصل ہے۔کہانی و کردار یا مکالموں میں کوئی جدت یا ندرت کا امکان بھی کم تھا اس لئے اس بارے میں غور کرنا بیکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بس اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ اس طریقہ کار سے مطمئن تھا؟جی نہیں، ہر گز نہیں۔وہ بارہا اپنے فلم سازوں اور کہانی نویسوں سے ہاتھ جوڑ کر منت کر چکا تھا کہ خدارا میرے کردار اور مکالمے بدل دو،وہ اخبارات کے ذریعے پریس کانفرنسوں میں کہہ کہہ کر تھک چکا تھا کہ اس یکسانیت سے میں تنگ آ چکا ہوں۔اس میں کوئی تبدیلی پیدا کرو۔کئی بار وہ اعلان کر چکا تھا کہ آئندہ اس قسم کی فلموں میں کام نہیں کرے گا۔وہ تبدیلی کیلئے ترستا تھا۔مگر فلم سازوں کا خیال تھا کہ لوگ اسے محض ایک ہی قسم کے کرداروں میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔وہ درجنوں ایسی فلموں میں کام کرنے سے انکار کر چکا تھا مگر پھر یہی کام کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

آخر کیوں؟ کیا وہ دولت کا پرستار اور لالچی تھا؟

جی نہیں۔اس سوال کے جواب کے اندر ہی اس شخص کا اصلی کردار موجود ہے۔سلطان راہی فلمی صنعت کو ٹھپ نہیں کرنا چاہتا تھا۔وہ جانتا تھا کہ ایک زمانے تک پاکستان کی فلمی صنعت پنجابی فلموں کے بل پر چلتی رہی ورنہ نگار خانوں میں تالے پڑ جاتے۔ان فلموں سے سینکڑوں ہزاروں لوگوں کا روزگار وابستہ تھا،وہ بے روزگار ہو جاتے۔ان ہی فلموں کی بدولت سنیما گھر،ڈسٹری بیوٹروں کے دفتروں اور نگار خانوں میں رونق تھی۔ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد براہِ راست یا بالواسطہ ان فلموں کے طفیل کام پر لگے ہوئے تھے۔اور ان فلموں کا جسم، جان اور روح صرف اور صرف سلطان راہی تھا۔اس کے بغیر پنجابی فلم بنانے کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔اگر کسی نے ایسا تجربہ بھی کیا تو دو چار کے سوا ہمیشہ منہ کی کھائی۔رزق دینے والا آسمان پر خداوندِ تعالیٰ ہے۔مگر زمین پر فلمی دنیا کے لوگوں کو سلطان راہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ رزق فراہم کرتا رہا تھا۔سلطان راہی کو اس بات کا پوری طرح احساس تھا۔مگر اس نے کبھی اس پر فخر یا ناز نہیں کیا۔

غرور کا لفظ تو اس کی ڈکشنری میں ہی نہیں تھا۔ اس حقیقت کا اسے بخوبی علم تھا اور وہ اپنی اس حیثیت کے باعث اللہ تعالیٰ کا شکر گزار تھا۔ گڑ گڑا گڑ گڑا کر اس کے حضور میں دعائیں کرتا رہتا تھا کہ اے اللہ ! مجھے حوصلہ دے، صحت، دے ہمت دے۔ میرے ذہن کو متوازن رہنے کی توفیق دے۔ یہی وجہ ہے کہ سالہا سال تک فلمی صنعت کا واحد سہارا بنا رہنے کے باوجود وہ غرور سے دور تھا اور عروج کی جانب ہر قدم کے ساتھ اس کا سر عجز و نیاز سے خدا کے حضور جھکتا ہی جاتا تھا۔

سلطان راہی ایسا ہی عجیب و غریب انسان تھا۔ ویسا نہ پہلے کبھی پیدا ہوا نہ شاید آئندہ پیدا ہو گا۔ گنیز بک آف ریکارڈز میں اس کا نام درج ہوا تو پاکستان میں کسی نے اس اعزاز کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ خود سلطان راہی نے بھی اس کا ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس نے اپنی ۲۸، ۲۹ سالہ اداکاری کی زندگی میں ساڑھے سات سو سے زیادہ فلموں میں کام کیا۔ یہ ریکارڈ دنیا میں کون توڑے گا؟ انسان کے روپ میں دوسرا جنات اور اداکار کے روپ میں دوسرا سلطان راہی کہاں سے آئے گا؟ ناممکن !

عہدِ آغاز میں وہ صرف سلطان تھا۔ راہی کا لفظ تو اداکار بننے کے بعد اس کے نام کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ ایک ایکسٹرا یا عام فائٹر محض اپنے نام ہی سے پکارا جاتا ہے۔ اسے بھی سلطان کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اسے اداکار بننے کا شوق نہیں جنون تھا۔ سدھیر اور علاؤالدین اس کے آئیڈیل تھے۔ وہ ان کا پرستار تھا اور ان جیسا بننا چاہتا تھا اس کے جاننے والے اور دوست احباب اس کی اس تمنا پر ہنستے تھے۔ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ صورت نہ شکل، نہ اداکاری کی صلاحیت اور چلے ہیں سدھیر یا علاؤالدین بننے۔ یہ دیوانے کا خواب ہی تو تھا۔ مگر دیوانے ہی خوابوں کو حقیقت میں ڈھال سکتے ہیں۔ فرزانوں سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی۔

سلطان ہر اسٹوڈیو کے آس پاس منڈلاتا رہتا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ ایکسٹرا کا درجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس زمانے میں ایکشن فلمیں زیادہ نہیں بنائی جاتی تھیں مگر سلطان ایک مضبوط جسم کا جفاکش جوان تھا۔ اسے تو کام سے غرض تھی۔ ایکسٹرا کردار نہ سہی فائٹر سہی۔ چنانچہ کبھی کبھی اسے فائٹر کے طور پر بھی کام ملنے لگا۔ اس طرح وہ ایکسٹرا اور فائٹر کا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ساتھ کے بہت سے لوگ ساری زندگی اس پہلی سیڑھی تک

ہی پہنچ سکے اور دوسری سیڑھی پر قدم تک نہ رکھ سکے۔ مگر سلطان کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو سکی۔ وہ آخری سیڑھی تک پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ سیڑھی ختم ہوگئی۔ اس کے آگے آسمان تھا۔ اس نے آسمان کی جانب بھی قدم بڑھا دیا۔ اللہ کی رحمت نے اس کا ہاتھ تھاما اور وہ سیڑھیوں کے بغیر ہی بلندیوں پر چڑھتا چلا گیا۔ ایسی بے مثال کامیابی، ایسی قابلِ رشک مقبولیت، ایسا بلند مقام کسی اور کے حصے میں نہ آیا تھا نہ شاید آسکے گا۔ وہ سب سے بلند، سب سے ارفع ہوگیا۔ ایک خاکی، بے بس انسان اور اتنی بلندی، کہتے ہیں کہ بلندی کے بعد پستی بھی آتی ہے مگر سلطان راہی اس منزل سے ناآشنا رہا۔ جب ایک سنسان ویران ہائی وے پر وہ گولی کا نشانہ بن کر دوسری دنیا کی طرف روانہ ہوا تو آخری سانس تک وہ سب سے بلند اور سپر اسٹار تھا۔ یہاں تک کہ موت کے بعد بھی ہر جگہ اسی کا چرچا رہا۔ اخبارات اس کی تصویروں، خبروں اور حالاتِ زندگی کے واقعات سے بھرے رہے۔ وہ زندگی میں بھی سپر اسٹار تھا اور مر کر بھی سپر اسٹار ہی رہا۔

سلطان کی بلندی کا سفر فلم ''بابل'' سے شروع ہوا تھا۔ اس کے ہدایتکار اقبال کاشمیری تھے۔ ''بابل'' سلطان راہی کو اداکار کی حیثیت سے متعارف کرانے والی پہلی فلم تھی۔ یہ فلم ہٹ ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی سلطان بھی ہٹ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ تاحیات ''ہٹ'' ہی رہا۔ اس کی فلمیں پٹتی رہیں مگر وہ ہر فلم میں ہٹ رہا۔ لوگ سلطان راہی کا نام دیکھ کر سنیما گھروں کا رخ کرتے تھے۔ فلم ہٹ ہو یا فلاپ، وہ سلطان راہی کے گن گاتے ہوئے سنیما گھر سے باہر نکلتے تھے۔ فلم کے پٹ جانے کا الزام انہوں نے کبھی سلطان راہی کو نہیں دیا۔ وہ بدستور ان کا چہیتا، لاڈلا، پسندیدہ فنکار ہی رہا۔ اس لئے نہیں کہ وہ بہت اچھا اداکار تھا بلکہ اس لئے کہ اس پر خدا کا سایہ تھا۔

''بابل'' نے سلطان راہی کو اسٹار بنا دیا تھا۔ سلطان راہی فلم کے ہدایتکار اقبال کاشمیری کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولا۔ اس کی دوسری کامیاب ترین فلم ''بشیرا'' تھی۔ اس فلم کا پوسٹر آج بھی سب کو یاد ہے جس میں خون میں لت پت سلطان راہی ایک ڈانگ تھامے، للکارنے کے انداز میں کھڑا نظر آتا ہے۔ بس یہ روپ سلطان راہی کا مستقل فلمی روپ بن گیا۔

''بشیرا'' کے فلم ساز اور ہدایتکار اسلم ڈار تھے۔ اس فلم نے سلطان راہی کی حیثیت کو مستحکم کر دیا اور وہ سپر اسٹار بن

گیا۔اسلم ڈار کو بھی سلطان راہی نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ وہ تادمِ آخران کا بھی احسان مند رہا۔اس کے بعد سلطان راہی کی مسلسل کامیابیوں کا سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ ختم ہونے میں نہ آیا۔

''بشیرا'' سے وہ سپر اسٹار تو بن گیا تھا مگر ابھی اسے فنکار اور اداکار کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ یہ موقع اسے ہدایتکار حسن عسکری نے فراہم کر دیا''وحشی جٹ'' میں حسن عسکری نے سلطان راہی کو ایک ایسے کردار میں ڈھالا جو اس کا ٹریڈ مارک بن کر رہ گیا۔ یہ فلم احمد ندیم قاسمی صاحب کے شاہکار افسانے ''گنڈاسہ'' سے اخذ کی گئی تھی۔ یہ وہ فلم تھی جس نے سلطان راہی کو اداکاروں کی صف میں کھڑا کر دیا اور پنجابی فلموں میں ''گنڈاسہ'' کا ہتھیار متعارف کرایا۔ یہ ''گنڈاسہ'' اس کے بعد پنجابی فلموں کی لازمی ضرورت اور سلطان راہی کی فلمی پہچان بن گیا۔اس فلم پر بہت لے دے ہوئی تھی۔ سب سے پہلے تو احمد ندیم قاسمی صاحب نے اعتراض کیا کہ ان کی کہانی کو ان کی اجازت کے بغیر فلم کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔ خدا خدا کر کے یہ مسئلہ حل ہوا تو اخبارات کے میں لے دے شروع ہو گئی کہ پنجابی فلموں میں تشدد اور خون خرابے کی طرح ڈالی جا رہی ہے۔ حسن عسکری اور سلطان اس نکتہ چینی کے ہدف تھے۔ عسکری صاحب ذہین اور پڑھے لکھے ہدایتکار ہیں۔انہوں نے اپنی صفائی میں بہت سی دلیلیں پیش کر دیں۔ مگر سلطان راہی خاموش رہا اور آخر تک خاموش ہی رہا۔

''وحشی جٹ'' میں سلطان راہی کو ہر ایک نے بہت اچھا اداکار تسلیم کر لیا۔ یہ بھی ایک انوکھی بات تھی کہ ایک اداکار سپر اسٹار بن چکا تھا مگر اداکارانہ عظمت کا مظاہرہ نہ کر سکا تھا۔اس کی مقبولیت بے پناہ تھی مگر نقادوں کے نزدیک وہ صحیح معنوں میں اداکار نہ تھا۔ لیکن ''وحشی جٹ'' نے سلطان راہی کی اس حیثیت کو بھی منوالیا۔''وحشی جٹ'' نے کامیابی اور مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کئے اور سلطان راہی حسن عسکری کا یہ احسان کبھی نہیں بھولا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تینوں سے سلطان راہی کو شکایتیں بھی پیدا ہوتی رہیں جن سے صرف اس کے قریب ترین لوگ ہی واقف تھے۔انہوں نے دانستہ یا نادانستہ سلطان راہی کے ساتھ زیادتیاں کیں۔ مگر سلطان راہی نے ان کی خدمت سے کبھی منہ نہ موڑا۔ یہ وہ تین ہدایتکار تھے جن کا ایک فون یا پیغام سن کر وہ فوراً ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔

کہانی یا کردار سنانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ صرف یہ اطلاع دیتے تھے کہ ہماری نئی فلم فلاں تاریخ سے شروع ہو رہی ہے۔ تمہاری ڈیٹس درکار ہیں۔

سلطان راہی ان کا حکم سن کر ان کی مطلوبہ تاریخیں کسی نہ کسی طرح فراہم کر دیتا تھا۔ اس کیلئے وہ دوسرے فلمسازوں کو کیوں کر رضامند کرتا تھا اور ان کی ضرورت پوری کرنے کیلئے کس طرح کام کرتا تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔
ڈیٹس فراہم کرنے کے بعد سلطان راہی نے کبھی ان حضرات سے معاوضے کی بات نہیں کی۔ دسرے فلمساز اس کی چند ڈیٹس کیلئے سالہاسال انتظار کرتے، اسے منہ مانگا معاوضہ ادا کرتے مگر اقبال کاشمیری، اسلم ڈار، اور حسن عسکری کیلئے ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ جو چاہے دیتے۔ ان کیلئے سلطان راہی ''حکم کا غلام'' تھا۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا مگر ان کی فلموں میں سلطان راہی کا کردار برائے نام بھی ہوتا تو وہ ان سے شکوہ نہ کرتا۔ ان تینوں حضرات سے بارہا شکایت کا موقع پیدا ہوا مگر اگلی بار بھی وہ ان کے بلاوے پر بھاگا بھاگا چلا جاتا تھا۔ اس کے بے تکلف احباب کہتے ''راہی صاحب یہ لوگ تمہارے ساتھ اتنی زیادتی کرتے ہیں اور تم پھر ان سے تعاون کرتے ہو؟''
جواب میں وہ کہتا ''آغا جی۔ وہ جو چاہیں کریں، مجھے اپنے ضمیر کے مطابق اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ وہ اپنی سی کرتے ہیں اور میں اپنی سی۔ شکوہ شکایت کی کیا بات ہے''۔
احسان ماننے والے فلمی دنیا میں خال خال ہی ہوتے ہیں اور اس حد تک احسان ماننے والے تو شاید ہوتے ہی نہیں ہیں کہ جو آسمان کی بلندیوں تک پہنچ کر بھی اپنے محسنوں کے خاکسار ہوں۔ سلطان راہی کو قدرت نے بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ ان کا یہ انکسار، خاکساری اور خدا کی اطاعت اور اس کے بندوں سے محبت اور خدمت گزاری ہی شاید ان کو ایک فقید المثال اداکار اور فنکار بنانے کے سلسلے میں ان کی سفارش اور ان کا سہارا بن گئیں۔ ان پر ساری زندگی خدا کی رحمت رہی۔ ورنہ کون سوچ سکتا تھا کہ معمولی شکل وصورت اور غیر رومانی چہرہ مہرہ اور لب ولہجہ رکھنے والا یہ نوجوان کبھی پاکستانی فلموں میں ہیرو بن سکے گا۔ برصغیر کی فلموں میں ہیرو کیلئے جو صفات لازمی سمجھی جاتی ہیں سلطان راہی ان سے قطعی محروم تھے۔ چاکلیٹ ہیرو، رومانٹک ہیرو، معاشرتی ہیرو، کامیڈی ہیرو، ڈانسنگ ہیرو، سنگنگ ہیرو۔ ان میں سے کوئی بھی خصوصیت ان میں موجود نہ تھی۔ رومانی سین وہ کرتے ہی نہیں تھے۔ ان کی فلموں میں رومان اور عشق

یک طرفہ ہوتا تھا۔یعنی ہیروئن ہی تمام ذمے داریاں سرانجام دیتی تھی۔وہ اظہار محبت کرتی تھی۔رومانی مکالمے بولتی تھی۔گاتی تھی،ناچتی تھی،ہیرو کو منانے کیلئے سبھی طریقے آزماتی تھی۔اس کے مقابلے میں سلطان راہی کا کردار صرف ہیروئن کو دیکھنا اس کا گانا سن کر آگے بڑھ جانے اوراس کے رقص کے انداز کو کچھ دیر کیلئے ملاحظہ کرنے کے بعد منہ پھیر کر چل دینے تک ہی محدود تھا۔ایک ایسا شخص جو حسین نہ تھا جو ناچنا گانا نہیں جانتا تھا۔جو کامیڈی اور اچھل کود کرنے سے قاصر تھا۔وہ بھلا کسی فلم کا ہیرو کیسے بن سکتا تھا؟سلطان راہی صرف ایکشن ہیرو تھے۔بلند آواز میں ڈرامائی مکالمے ادا کرنااور ایکشن۔یہی ان کی خصوصیات تھیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ان ہی خوبیوں کی بنیاد پرانہیں ایسا ہیرو بنادیا تھاجس کے پرستار اس کو صرف اسی انداز میں دیکھنا پسند کرتے تھے اور پسند ہی نہیں کرتے تھے اس کے عاشق بھی تھے۔وہ سلطان راہی کو بار بار اسی ایک انداز میں دیکھ کر بھی نہیں اکتاتے تھے۔کوئی ماہر نفسیات بھی اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا کہ آخر سات ساڑھے سات سو فلموں میں ایک شخص کو قریب قریب ایک ہی روپ اور ایک ہی انداز میں دیکھ دیکھ کر وہ اس سے اکتاتے کیونکہ نہیں تھے؟یہ بھی ایک عجوبہ ہی کہا جاسکتا ہے یا پھر ایک معجزہ۔سلطان راہی پر اللہ کا سایہ تھا۔اس لئے کہ وہ اس کا ایک سچا بندہ تھا۔اللہ کے حقوق بھی ادا کرتا تھا اور اس کے بندوں کا بھی حق ادا کرتا تھا۔پانچ وقت کا نمازی،تہجد گزار،حاجی،روزہ دار،زکوٰۃ دینے والا،انسانوں کی خدمت سرانجام دینے میں پیش پیش۔نہ صرف خود حج کیا بلکہ گھر کے سارے افراد کو بھی حج کرایا۔عزیزو اقارب،دوست احباب کو بھی حج کرایا اور قرآن کی باقاعدہ تلاوت کرتا تھا۔ کئی مسجدیں تعمیر کرادیں اور اپنی کمائی کا بڑا حصہ مساجد کی تعمیر اور دیکھ بھال پر لگادیا۔ اپنے لئے عالی شان کوٹھیاں تو سبھی فلم اسٹار بناتے ہیں مگر گھر کے اندر مسجد تعمیر کرنے والا وہ غالباًواحد اداکار تھا۔اس مسجد کو سلطان راہی خود اپنے ہاتھوں سے دھوتا اور صاف کرتا تھا۔مسجد کی دیکھ بھال بھی خود ہی کرتا تھا۔مسجد کی صفائی کرتے ہوئے وہ خوش الحانی سے قرآن کی تلاوت کرتا رہتا تھا۔جن لوگوں کو نماز نہیں آتی ان کیلئے سلطان راہی نے خود اپنی آواز میں ایک آڈیو کیسٹ تیار کیا تھا جسے وہ ہزاروں کی تعداد میں رمضان شریف سے پہلے مفت تقسیم کرانے کا ارادہ رکھتا تھا۔رمضان کے فضائل کے بارے میں بھی اس نے ایک کیسٹ تیار کرایا تھا۔بھلا ایسا عجیب و غریب اداکار اور ہیرو کوئی دوسرا ہوگا؟اسی لئے وہ ہر ایک کو حیران کرگیا۔

سلطان راہی نے فنکاری اور اداکاری کا راستہ آسانی سے طے نہیں کیا تھا۔ ایک غریب گھرانے کا برائے نام تعلیم یافتہ لڑکا، اداکاری کیلئے ظاہری لوازمات سے محروم، نہ کوئی سفارش، نہ جان پہچان، مگر راولپنڈی سے وہ اداکار بننے کا عزم لے کر نکلا تھا اور سالہا سال تک نگار خانوں کی خاک چھانتا رہا۔ آخر پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے میں کامیاب ہو گیا اور ایکسٹرا بننے کا شرف حاصل کر لیا۔ ایکشن اس کا پسندیدہ شعبہ تھا۔ اس لئے وہ فائٹر بن گیا۔ شہسواری اور ایکشن ان دونوں شعبوں میں اس نے بہت محنت سے کمال حاصل کیا تھا اور ان ہی کے بل پر وہ ہیرو اور پھر ایک لیجنڈ بن گیا۔ مگر اس سے پہلے اس نے اپنے کیریئر کا آغاز ۱۹۵۵ء میں ایک اسٹیج ڈرامے ''نادر شاہ درانی'' سے کیا تھا۔ پھر فلموں کا رخ کیا تو ایکسٹرا بن گیا۔ فائٹروں کی صف میں شامل ہو گیا۔ بہت ترقی کی تو ویلن بن گیا۔ اسے ایک پنجابی فلم ''جنج'' میں ویلن کے طور پر کاسٹ کیا گیا تھا۔ بہت سے اداکاروں کیلئے یہ ترقی کی آخری منزل ہوتی ہے مگر سلطان راہی نے اس جگہ سے اپنے نئے سفر کا آغاز کیا تھا اور پھر'' بابل ''میں مرکزی کردار ادا کرنے کے بعد وہ سچ مچ ہیرو بن گیا۔ یہ ۱۹۷۱ء کا ذکر ہے۔ اس کے بعد تو فلموں کی قطاریں لگ گئیں۔ کتنی فلمیں گنوائی جائیں۔ ان کی تعداد تو سینکڑوں میں ہے۔ ساڑھے سات سو فلمیں کہنے کو آسان ہے لیکن کوئی دوسرا فنکار یہ لوہے کے چنے نہیں چبا سکے گا۔ سوچئے تو ایک ناممکن سی بات لگتی ہے۔ سلطان راہی کے سوا یہ کارنامہ کسی اور اداکار نے نہ تو پہلے کبھی سرانجام دیا اور نہ آئندہ کبھی سرانجام دے پائے گا۔ اس نے ناممکن کو ممکن بنا کر دکھا دیا۔ فنکاروں کی یادگار فلمیں اور یادگار رول انگلیوں پر گنائے جا سکتے ہیں۔ ایک ہاتھ کی نہ سہی دو ہاتھوں کی انگلیوں پر گن لیجئے تو بہت بڑی بات ہو گی۔ مگر جس شخص نے سینکڑوں فلموں میں سینکڑوں کردار کئے ہوں ان کی گنتی اور فہرست بھلا کون یاد رکھ سکتا ہے؟ ایک سے بڑھ کر ایک کردار ایک سے بڑھ کر ایک فلم ایک سے بڑھ کر ایک مکالمہ ''مولے نوں مولا نہ مارے تو مولا نئیں مردا'' یہی حرف اول تھا اور یہی حرف آخر۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر ویران مسجدوں میں اذان دینے والا کوئی دوسرا اور کون ہو گا؟ سلطان راہی ایک ایسا فنکار تھا جو نماز پڑھتا بھی تھا۔ پڑھاتا بھی تھا۔ کتنے ہی لوگ اسے خوش کرنے کی خاطر اس کے ساتھ نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے تھے۔

جن دنوں ہم نے ایک پنجابی فلم بنانے کا ارادہ کیا تو سلطان راہی سے ہی اس کی ابتدا کی۔ کئی بار سلطان راہی کے گھر

جانے کا اتفاق ہوا۔ کبھی دن میں، کبھی شام میں، کبھی رات کے بارہ ایک بجے ،اس زمانے میں سلطان راہی کے گھر میں مسجد نہیں بنی تھی مگر بالائی منزل کا ایک کمرا نماز اور عبادت کیلئے وقف تھا۔اس کمرے میں ایک طرف قرآن شریف، سیپارے، مذہبی کتابیں، ٹوپیاں، جائے نمازیں رکھی ہوئی تھیں۔اداکاروں کے گھروں میں قیمتی شرابیں، جام و مینا، بار تو دیکھا اور سنا ہوگا کسی اداکار کے گھر میں یہ لوازمات نہ کبھی دیکھے نہ سنے۔ نماز کا وقت ہوتا اور راہی صاحب گھر میں موجود ہوتے تو فوراً نماز کیلئے اس مخصوص کمرے میں پہنچ جاتے۔ملحقہ وسیع وعریض خوبصورت باتھ روم وضو کرنے کیلئے موجود تھا۔اگر کوئی اذان دینے والا ہوتا تو اس سے اذان دینے کی فرمائش کی جاتی ورنہ سلطان راہی خود ہی دے دیتے۔اذان کے بعد نماز پڑھانے کیلئے امامت کا مرحلہ پیش آیا کرتا تھا۔اگر کوئی امامت کا حق دار میسر آجاتا تو یہ مقدس فریضہ اسے سونپ دیا جاتا ورنہ راہی صاحب انکسار سے مسکراتے اور کہتے ”تو پھر میں نماز پڑھا دیتا ہوں۔جو بھی دال دلیا ہے !حاضر ہے“۔

اس سلسلے میں ایک یادگار واقعہ سن لیجئے۔ایک روز ہم راہی صاحب کے گھر گئے ہوئے تھے۔کچھ اور فلمساز، ہدایتکار، اداکار اور رائٹرز بھی موجود تھے۔اسی اثنا میں مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ہم تو نماز پڑھتے ہی ہیں آستینیں چڑھا کر وضو کیلئے باتھ روم میں گھس گئے مگر دیکھا کہ کچھ اور حضرات بھی وضو کرنے کیلئے قطار میں لگے ہوئے تھے۔باقی ماندہ حضرات بھی وضو کرنے کیلئے قطار میں لگے ہوئے ہیں۔باہر نکلے تو باقی ماندہ حضرات بھی پتلونوں کے پائنچے گھٹنوں تک چڑھائے سر پر ٹوپیاں پہنے نماز ادا کرنے کیلئے تیار کھڑے نظر آئے۔اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو ان میں سے بعض شاید نمازیوں میں شمار بھی نہیں کئے جاسکتے۔ممکن ہے عید، بقر عید کی نماز پڑھ لیتے ہوں مگر اس روز سلطان راہی کو خوش کرنے کی خاطر یا شرما حضوری میں صف میں کھڑے ہو گئے۔

ہمارا خیال تھا کہ راہی صاحب ہی امامت کے فرائض سرانجام دیں گے مگر انہوں نے ہماری طرف دیکھا اور بولے ”آفاقی صاحب، آیئے نماز پڑھایئے“۔

ہم نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔اس سے پہلے ہمیں زندگی میں کبھی امامت کی سعادت نصیب نہیں ہوئی تھی۔اس اچانک

فرمائش پر سچ مچ بوکھلا گئے۔

''ارے نہیں راہی صاحب ہم نے کبھی نماز نہیں پڑھائی۔ آپ ہی امامت کیجئے''۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' انہوں نے اصرار کیا۔

''ہم واقعی اس لائق نہیں ہیں''۔ ہم نے معذرت پیش کی۔

''ارے آغا جی۔ بس رہنے دیجئے یہ انکسار، وقت تنگ ہے آیئے نماز پڑھایئے نا''۔

راہی صاحب نے اصرار کیا تو دوسرے حضرات بھی مصر ہو گئے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ امامت کرنے کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور آج یہ فرض ہمیں سونپا جا رہا تھا۔ بار بار معذرت کرنا بھی کچھ اچھا نہیں لگا۔ وہی بات ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا۔ قہر درویش بر جان درویش، ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے۔

نمازیوں کی تعداد بارہ پندرہ سے زیادہ نہیں تھی مگر امامت کے تصور ہی سے ہمارے پیر من من بھر وزنی ہو گئے تھے۔

سلطان راہی نے اقامت کہی اور ہم نے ''اللہ اکبر'' کہہ کر نیت باندھی۔ مقتدیوں نے بھی ہمارے پیچھے نیت باندھ لی۔ رکوع میں جانے کیلئے ہم نے اللہ اکبر کہا اور سب رکوع میں چلے گئے۔ تین بار سبحان ربی اللہ العظیم پڑھ کر رکوع سے اٹھنے کیلئے ''سمع اللہ لمن حمدہ'' کہنے کا وقت آیا تو ہم بھول گئے۔ سارے نمازی ہمارے پیچھے رکوع میں تھے۔ ہم بھی رکوع میں تھے اور ذہن پر زور دینے کے باوجود یاد نہیں آ رہا تھا۔ چند سیکنڈ اسی طرح گزر گئے اور ہم گھبرا گئے۔

نماز پڑھنے والوں کیلئے یہ ایک معمول ہے لیکن پھر بھی ہمیں یاد نہیں آ رہا تھا کہ رکوع سے اٹھ کر سیدھا کھڑے ہونے کیلئے کیا کہیں۔ دس سیکنڈ گزر گئے۔ پندرہ، بیس، تیس سیکنڈ گزرے، یہاں تک کہ ایک منٹ گزر گیا۔ جتنا ذہن پر زور ڈالتے تھے اتنا ہی بھولتے جاتے تھے اور سب کے سب رکوع میں تھے۔ ہم نے سوچا کہ شاید کوئی مقتدی یاد دلا دے۔ لیکن پیچھے کی صف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ ہم جتنا ذہن پر زور دے رہے تھے دماغ سلیٹ کی طرح صاف ہو رہا تھا۔ جوں جوں دیر ہو رہی تھی توں توں ہماری پریشانی اور گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی یکایک دماغ میں ایک بجلی سی کوندی اور ہمیں سمع اللہ یاد آ گیا۔ ہم نے تو خیر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا ہی تھا مگر دوسرے نمازیوں نے بھی اطمینان کی سانس لی۔ نماز ختم ہوئی تو ہم نے شرمندگی سے حاضرین کی طرف دیکھا۔ اور لوگوں کے چہرے پر تو مسکراہٹ تھی مگر

راہی صاحب سنجیدہ شکل بنائے کھڑے تھے۔

ہم نے شکوہ کیا’’اسی لئے کہتے تھے کہ ہم سے امامت نہ کرائیں۔ خیر ہم تو بھولے ہی تھے مگر آپ بھی کچھ نہیں بولے‘‘

وہ ہنسنے لگے ’’کیا آپ واقعی بھول گئے تھے ؟‘‘

ہم نے کہا’’بھولتے نہیں تو دو منٹ تک رکوع میں کیوں جھکے رہتے ؟‘‘

کہنے لگے ’’میں سمجھا شاید آپ جان بوجھ کر ایسا کر رہے ہیں یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ بھول گئے ہوں گے۔ کوئی نماز پڑھنے والا یہ باتیں کیسے بھول سکتا ہے‘‘۔

اس طرح یہ بات رفع دفع ہو گئی۔ مگر ۱۹۸۴ء کو ایک شام کا یہ واقعہ ہمیں عمر بھر یاد رہے گا اور سلطان راہی صاحب کی یاد دلاتا رہے گا۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ سلطان راہی نے ایسے لوگوں کو بھی نماز پڑھنے پر مجبور کر دیا جو عام حالات میں نماز نہیں پڑھتے۔ مسجد کا کوئی بھی کام ہو۔اسے کرنے کیلئے راہی صاحب ہر وقت تیار رہتے تھے۔ایورنیو اسٹوڈیو میں مسجد کی تعمیر کی تحریک سلطان راہی کی جانب سے ہی ہوئی تھی۔ نگار خانوں میں مسجدیں تو ہوتی تھیں مگر عام اور سادہ۔ شاہ نور اسٹوڈیو کے بڑے گیٹ کے سامنے عرصہ دراز تک ایک چبوترہ مسجد کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ یہاں لائٹ مین، قلی، مزدور، چوکیدار اور اسی قسم کے چھوٹے موٹے لوگ نماز پڑھا کرتے تھے جب کوئی ’’بڑا‘‘ آدمی مسجد کا رخ ہی نہ کرے تو مسجد کو بہتر بنانے کا خیال بھلا کسے آئے گا۔ یہ سعادت اللہ تعالیٰ نے سلطان راہی کی قسمت میں لکھ دی تھی۔ نماز تو وہ اس زمانے میں بھی پڑھتے تھے جب ایکسٹرا سلطان تھے مگر اس وقت جھاڑو اٹھا کر مسجد کے چبوترے کی صفائی کرنے کے سوا وہ مسجد کیلئے کچھ اور کرنے سے معذور تھے مگر جب وہ اسٹار اور پھر سپر اسٹار سلطان راہی بنے اور نماز کیلئے اسٹوڈیوز کی مساجد میں جانے لگے تو ان کی دیکھا دیکھی دوسروں کو بھی تحریک ہوئی۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ان سے ڈیٹ لینے یا انہیں خوش کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ ساتھ مسجد میں چلے جایا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض اس طرح واقعی نماز پڑھنے کے عادی ہو گئے اور باقاعدہ نمازی بن گئے۔ ’’بڑے‘‘ آدمی اگر بھلائی کی طرف راغب ہو جائیں تو ان کی دیکھا دیکھی اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے بھی دوسرے لوگ ان کی پیروی کرنے لگتے ہیں اور ایک

بہتر معاشرہ اسی طرح وجود میں آتا ہے۔ وہ پرانی کہاوت آپ نے سنی ہو گی کہ "جیسا راجہ، ویسی پرجا"۔ چھوٹے پیمانے پر سلطان راہی اس کی صداقت کا عملی ثبوت تھے۔

ایورنیو اسٹوڈیوز ہمیشہ سے مصروف ترین اسٹوڈیو رہا ہے۔ زیادہ تر بڑے فلمسازوں کے دفاتر اسی اسٹوڈیو میں تھے اور بڑے بڑے اداکار فلم ساز اس اسٹوڈیو میں شوٹنگ کیا کرتے تھے۔ یہاں بھی ایک جگہ نماز کیلئے مخصوص تھی۔ اسٹوڈیو کے مالک آغا جی اے گل بذات خود پنج وقتہ نمازی تھے مگر اتنے خوبصورت اسٹوڈیو کی تعمیر کے وقت ایک خوب صورت سی مسجد تعمیر کرنے کا خیال انہیں اس وقت نہ آیا اور آتا بھی کیوں۔ کوئی بھی سپر اسٹار یا قابل ذکر شخصیت کو نماز پڑھنے کیلئے مسجد کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ شاندار ائر کنڈیشنڈ کمروں میں جوئے اور شراب کی محفلیں البتہ باقاعدگی سے جما کرتی تھیں۔ آغا صاحب کو ایک مسجد کی ضرورت کا احساس تو پہلے ہی تھا اور انہوں نے اسٹوڈیو کے اندر ہی ایک جگہ اس کیلئے مخصوص بھی کر دی تھی مگر سلطان راہی سپر اسٹار بن کر ابھرے تو انہوں نے اس سلسلے میں آغا صاحب سے درخواست کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اپنے طور پر اس مسجد کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ اپنے فلمی معاوضوں کا ایک حصہ انہوں نے مسجد کی تعمیراتی کاموں کیلئے وقف کر دیا تھا۔ دوسروں نے سنا تو انہوں نے بھی تھوڑی بہت رقم فراہم کرنا شروع کر دی۔ آغا صاحب بھی اس منصوبے میں دلچسپی لینے لگے مگر سلطان راہی کو تو جیسے بخار سا چڑھ گیا تھا۔ جب کبھی ایورنیو اسٹوڈیو جاتے، زیرِ تعمیر مسجد میں جا دھمکتے۔ ان کا کہنا تھا کہ مسجد بہت خوبصورت اور آرام دہ بننی چاہئے۔ اس کیلئے خوبصورت ٹائیلز، شیشے اور لکڑی وغیرہ کی فراہمی بھی انہوں نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ ان کاموں کیلئے روپیہ درکار تھا اور سلطان راہی اس کیلئے حاضر تھے۔ یہ مسجد مکمل ہوئی اور ایسی خوبصورت مسجد بنی کہ جب تک ایورنیو اسٹوڈیو قائم ہے اس وقت تک یہ مسجد قائم رہے گی اور سلطان راہی کی یاد دلاتی رہے گی۔ انہوں نے شیشے کے رنگین ٹکڑوں سے مسجد کو آراستہ کیا تھا۔ شیشے کی آرائش سلطان راہی کا من پسند کام تھا۔ اپنے گھر کی مسجد میں بھی انہوں نے شیشے کے رنگین چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نصب کرائے ہیں۔ ان کا ڈرائنگ روم بھی ایسے ہی شیشوں سے آراستہ ہے۔

ایورنیو اسٹوڈیو کی مسجد کی تعمیر کیلئے سلطان راہی نے دل کھول کر روپیہ دیا۔ ایک بار فلم ساز سے ساٹھ ہزار کی رقم ملی،

انہوں نے وہ فوراً مسجد کیلئے دے دی۔ ہم ایک دن آغا گل کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ سلطان راہی بھی وہیں موجود تھے اور کسی فلم ساز کے منتظر تھے۔ فلم ساز نے آکر انہیں دس ہزار روپے کی رقم ادا کی، راہی صاحب یہ نوٹوں کی گڈی لیتے ہی دفتر سے باہر نکل گئے۔ دفتر کے رنگین شیشے میں سے باہر ایک صاحب ٹہلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

آغا صاحب نے ہم سے کہا ''آفاقی صاحب جانتے ہو باہر کون کھڑا ہے؟''

ہم نے اس آدمی کو غور سے دیکھا ''میں انہیں نہیں جانتا''۔

کہنے لگے ''یہ مسجد کا ٹھیکیدار ہے، راہی باہر جاتے ہی یہ رقم اس کو دے دے گا''۔ اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے سلطان راہی اس شخص کے پاس پہنچے، ان دونوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں اور سلطان نے کوئی چیز ان کے حوالے کر دی۔ ایورنیو اسٹوڈیوز کی مسجد تو انہوں نے بڑے شوق سے خود تعمیر کرائی تھی مگر دوسرے اسٹوڈیوز کی مساجد کیلئے بھی وہ کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے تھے۔

ایک بار وہ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے سلسلے میں مری گئے۔ پہاڑوں میں ایک بلند اور تنہا چوٹی پر ایک چھوٹی سی عمارت کے آثار دیکھے تو انہوں نے پوچھا ''وہ کیا ہے؟''

ایک مقامی شخص نے بتایا کہ وہ ایک مسجد ہے۔ خدا جانے کس بادشاہ یا صوبیدار نے بنوائی تھی مگر اب سالہا سال سے ویران ہے۔ سلطان راہی سوچ میں پڑ گئے۔

ہماری اس پنجابی فلم کا نام ''ظلم دا طوفان'' رکھا گیا تھا۔ ہمیں یہ نام بالکل پسند نہیں تھا۔ بعد میں ایسے واقعات پیش آئے کہ ہمارا اس سے بالکل ہی دل اُکتا گیا۔ شباب کیرانوی صاحب کے دیرینہ پارٹنر آغا غلام محمد کے صاحب زادے آغا ریاض گل کو ہم نے آغا صاحب کی فرمائش پر اپنا پارٹنر بنا لیا تھا۔ مقصد واضح تھا ہم جانتے تھے کہ روزمرّہ کے معاملات چلانا ہمارے بس سے باہر ہوں گے اس لئے ریاض گل جیسے مستعد اور اسمارٹ پارٹنر کا ہونا ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔

سلطان راہی کیلئے ہم نے شوٹنگ کا شیڈول بہت محنت سے بنایا۔ وہ انہیں پسند بھی آیا۔ انہوں نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور ہماری فلم کے لئے ڈیٹس بھی عنایت کر دیں۔ اس شیڈول کے مطابق ہم نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ فی الحال آئندہ آٹھ

مہینے تک کوئی نئی فلم سائن نہ کریں۔ ورنہ سارا شیڈول گڑ بڑ ہو جائے گا۔ کچھ دن بعد ہمیں پتا چلا کہ سلطان راہی نے دو اور فلمیں سائن کرلی ہیں۔ اس کے بعد دو اور فلموں کی خبر اخبار میں پڑھی۔ ان ہی دنوں شوٹنگ کے آغاز کے سلسلے میں ہم ان سے ملنے گئے تو شکایت کی کہ آپ نے پھر نئی فلمین سائن کرلی ہیں۔ اب ہماری ڈیٹس کا کیا ہو گا۔ اس طرح تو سارا شیڈول گڑ بڑ ہو جائے گا۔

وہ بولے ''سر جی آپ اپنی ڈیٹس کی بالکل فکر نہ کریں۔ ان میں کوئی گڑ بڑ نہیں ہو گی''۔

ہم نے کہا'' مگر آپ ان نئی فلموں کی شوٹنگ کس طرح کریں گے، وقت کہاں سے لائیں گے؟ سال میں ۳۶۵ دن سے زیادہ تو ہو نہیں سکتے اور نہ ہی کیلنڈر میں مہینے اور تاریخیں بڑھ سکتی ہیں ان نئی فلموں کی شوٹنگ کب شروع کریں گے؟

''بولے'' ان سب کی تھوڑی تھوڑی شوٹنگ تو میں نے کر دی ہے۔ آگے بھی اللہ مالک ہے''۔ ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ وہ ہنسنے لگے ''آغا جی ناراض نہ ہوں۔ بات یہ ہے کہ ان پروڈیوسروں کی حالت اچھی نہیں تھی۔ ایک سال اور انتظار کرتے تو بالکل فاقے ہو جاتے۔ میں نے پروڈیوسروں سے ایک ایک دو دو گھنٹے مانگ کر ان کا کام شروع کرا دیا۔ اب ان بے چاروں کا میٹر بھی چالو ہو جائے گا۔ کیا حرج ہے اگر کسی کا بھلا ہو جائے''۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

ہم سمجھ گئے کہ یہ شخص لا علاج ہے۔

''ظلم دا طوفان'' کی شوٹنگ شروع ہوئی تو ہم پہلے روز باری اسٹوڈیوز میں سیٹ پر گئے۔ اس کے بعد ایک دو بار کسی مسئلے کو حل کرنے کیلئے تو گئے ورنہ شوٹنگ کے تمام انتظامات آغا ریاض ہی کرتے تھے۔ بڑے آرٹسٹوں کی ڈیٹس کی گڑ بڑ ہو جاتی تھی تو ہم اس مسئلے کو اپنے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ہی حل کر دیتے تھے۔ شوٹنگ کا آغاز موسم گرما میں ہوا تھا اور دو ماہ بعد ہی جون کا مہینہ سر پر آ گیا۔ ویسے بھی اس سال سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ ان ہی دنوں ہم نے سنا کہ سلطان راہی کے باہر جانے کا وقت آ گیا ہے اور وہ ایک مہینے کیلئے ملک سے باہر جا رہے ہیں۔ ہم نے راٹھور صاحب سے کہا کہ وہ ہماری ملاقات کیلئے سلطان راہی سے کوئی وقت لے لیں تاکہ ہم یہ مسئلہ حل کریں۔ انہوں نے فون کر کے بتایا کہ

رات کو گیارہ بجے باری اسٹوڈیو کی عقبی بستی میں آجایئے۔ وہیں ان کی شوٹنگ ہے۔

رات کے گیارہ بجے ہم باری اسٹوڈیو کے عقبی حصے میں پہنچے تو سلطان راہی ایک گوشے میں فائٹرز اور مزدوروں کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے اور تبلیغ بھی کر رہے تھے۔ اس فلم میں وہ ڈاکو کا کردار کر رہے تھے اور سیاہ لباس اور اسی رنگ کی پگڑی باندھے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھا تو اٹھ کر چلے آئے۔

''آغا جی بس دو تین شاٹ ہیں۔ اس کے بعد آپ میرے ساتھ گھر چلئے۔ آپ نے کھانا تو نہیں کھایا؟''

ہم نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''ویری گڈ۔ پھر تو ساتھ ہی کھانا کھائیں گے۔ آپ چائے پیجئے''۔ انہوں نے ہمارے بیٹھنے کیلئے کرسی کا بندوبست کرایا اور پروڈکشن والے کو بلا کر کہا'' انہیں جانتے ہو؟''

اس نے ہمیں غور سے دیکھا۔ اندھیرا ابھی تھا اور وہ ہمیں صورت سے جانتا بھی نہیں تھا''نہیں جی'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

''ارے یہ آفاقی صاحب ہیں۔ کبھی نام سنا ہے؟''

اس نے پھر غور و خوض کیا اور کہنے لگا''شاید سنا تو ہے۔ یہ کیا کام کرتے ہیں؟''

راہی صاحب نے ہماری طرف دیکھا اور ہنسنے لگے۔ پھر بولے''یہ اکبری منڈی میں آڑھتی ہیں۔ چاول، دال کی ضرورت پڑے تو سستی دلا دیں گے۔ اچھا دیکھو، یہ میرے مہمان ہیں۔ انہیں ہر دس پندرہ منٹ کے بعد چائے پلانا تمہاری ذمے داری ہے۔ ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہے''۔ اس نے زور سے ہلا دیا۔

''آغا جی۔ آپ اطمینان سے بیٹھیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف اسے بتا دیں۔ اس سیٹ کو اپنا ہی سیٹ سمجھیں۔ بس میں یوں فارغ ہوا''۔ یہ کہہ کر وہ شارٹ دینے کے لئے چلے گئے۔

انہوں نے سچ کہا تھا۔ دو چار شاٹ ہی فلمائے تھے مگر خاصے لمبے اور مشکل تھے۔ لائٹس آن ہوئیں تو راہی صاحب منہ پر ڈھاٹا باندھ کر، بندوق سنبھالے کیمرے کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور اس کے بعد مار دھاڑ کا وہ سلسلہ شروع ہوا

کہ اللہ دے اور بندہ لے۔پروڈکشن والا لڑکا ہمارا نام تو بھول گیا تھا مگر ہر دس پندرہ منٹ بعد ہمارے پاس آجاتا تھا
''چودھری صاحب چائے منگاؤں؟'' چودھری جی کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ چودھری صاحب پان اور بوتل منگاؤں؟''

اس کی خاطر داری نے ہمیں عاجز کر دیا۔ مگر وہ بھی مجبور تھا۔آخر ہم سلطان راہی کے مہمان تھے جس کو انہوں نے بطورِ خاص پروڈکشن والے کے سپرد کیا تھا۔

شوٹنگ کا سلسلہ رات کے ایک بجے تک جاری رہا۔اس دوران میں راہی صاحب بھی کئی بار ہماری خبر لینے کیلئے آئے۔
''نیند تو نہیں آرہی آغا جی؟ بھوک تو نہیں لگ رہی سر جی؟ بس ابھی چلیں گے''۔اس طرح وہ ہمیں بار بار مسلسل دلاسے دیتے رہے۔

''چلیں سر جی۔آپ اپنی گاڑی میرے پیچھے پیچھے لے آیئے''۔

ہم نے کہا''ہمیں آپ کے گھر کا راستہ معلوم ہے''۔

بولے''یہ بات نہیں ہے۔میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ ہی میرے گھر پہنچیں''۔

ہم لوگ اسٹوڈیو سے نکلے تو ایک بجے سے بھی دس پندرہ منٹ زیادہ ہو گئے تھے۔رات کا وقت تھا اور سڑکیں سنسان تھیں۔دس بارہ منٹ کے اندر ہم ان کے گھر پہنچ گئے۔ان کی کار کے مخصوص ہارن کی آواز سن کر چوکیدار نے آہنی دروازہ کھول دیا۔ان کے اشارے پر ہماری کار بھی اس قلعے کے اندر داخل ہو گئی۔

ان کے پہنچتے ہی کوٹھی کی ساری روشنیاں جل گئیں۔ہر طرف چہل پہل نظر آنے لگی۔یوں لگتا تھا جیسے ابھی شام ہی کا وقت ہے۔لوگ نہ جانے کہاں سے نکل کر آگئے تھے۔راہی صاحب سب سے ملے۔کسی کو سلام کیا، کسی سے مصافحہ کیا، کسی کو گلے لگایا اور پھر ہمیں اپنے ساتھ لے کر اندر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔وہی ڈرائنگ روم تھا اور وہی ڈیکوریشن۔سلطان راہی کی روحانی پیشوا کے گیٹ اپ والی قد آدم تصویر منہ سے بولتی نظر آرہی تھی۔

''لو بھئی کھانا لگاؤ۔بہت دیر ہو گئی ہے۔آفاقی صاحب کیا سوچتے ہوں گے کہ راہی کے کھانے کیلئے رت جگا کرنا پڑتا ہے''۔

فرش پر ہی دستر خوان بچھا دیا گیا۔ پہلے خالی پلیٹیں آئیں۔ مگر پھر گرما گرم کھانا آگیا۔ دال روٹی سادہ سالن اور سلاد۔ یہ سپر اسٹار کا ڈنر تھا جو رات کے ڈیڑھ بجے کھایا جا رہا تھا۔ کھانے میں ان کے عملے کے لوگ بھی شریک تھے۔ کھانے کے بعد سب رخصت ہو گئے چائے آئی تو ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔

''حکم کیجئے آغا جانی''۔ انہوں نے چائے ختم کرنے کے بعد پانوں کی پوٹلی میں سے ایک پان نکال کر اپنے منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایسے تازہ اور شگفتہ لگ رہے تھے جیسے کہ ان کا دن ابھی شروع ہوا ہے حالانکہ شدید گرمی اور دھوپ میں وہ صبح چھ بجے سے رات کے ایک بجے تک مختلف شوٹنگز میں مصروف رہے تھے۔ وہ نہ صرف تروتازہ اور شگفتہ تھے بلکہ زندہ دلی کا مظاہرہ بھی کر رہے تھے۔ بد مزاجی اور چڑچڑا پن سلطان راہی کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔ لڑائی جھگڑا تو دور کی بات، وہ اونچی آواز مین بولتے بھی نہیں تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ یہ وہی شخص ہے جو فلموں میں چیخے چلائے بغیر بات ہی نہیں کرتا اور اتنے زور سے دھاڑتا ہے کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ بھی تھی کہ بارہ چودہ گھنٹے تک مسلسل اونچی آواز میں چیخنے کے باوجود ان کی آواز خراب نہیں ہوئی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اللہ میاں نے میرے جسم میں اسپیشل گلا فٹ کیا ہے۔

ہم نے کہا ''راہی صاحب آپ تو ایک مہینے کیلئے باہر جا رہے ہیں۔ ہمار شوٹنگ کا کیا ہو گا؟''

بولے '' میں نے راٹھور صاحب سے پروگرام طے کر لیا ہے وہ اس مہینے میرے بغیر شوٹنگ کر لیں گے۔ انجمن بیگم کے دو تین گانے ہیں جن میں میری موجودگی ضروری نہیں ہے۔ آؤٹ ڈور میں میرے شاٹس بعد میں بھی لیے جا سکتے ہیں۔ واپس آکر میں سب سے پہلے آپ کی شوٹنگ کر دوں گا''۔

لیجئے ہماری ساری پریشانی انہوں نے ایک لمحے میں دور کر دی۔

انہوں نے ہم سے نیا ریٹ طلب نہیں کیا تھا جس کیلئے ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

''موڈ آف پے منٹ بھی بتا دیجئے''۔ ہم نے کہا۔

وہ پھر ہنسنے لگے '' سر جی! سارے کام میرے سپرد تو نہ کیجئے۔ کوئی چیز آپ خود بھی بتا دیجئے''۔

ہم نے اپنے معمول کے مطابق انہیں ادائیگی کا طریقہ بتایا جس پر انہوں نے فوراً رضامندی کا اظہار کر دیا۔

بعد میں مصطفٰی قریشی سے جو معاملہ پیش آیا وہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ انجمن کی روداد ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں۔ ہماری اس پنجابی فلم کا نام ''ظلم دا طوفان'' رکھا گیا تھا۔ ہمیں یہ نام بالکل پسند نہیں تھا۔ بعد میں ایسے واقعات پیش آئے کہ ہمارا اس سے بالکل ہی دل اُکتا گیا۔ شباب کیرانوی صاحب کے دیرینہ پارٹنر آغا غلام محمد کے صاحب زادے آغا ریاض گل کو ہم نے آغا صاحب کی فرمائش پر اپنا پارٹنر بنالیا تھا۔ مقصد واضح تھا ہم جانتے تھے کہ روزمرّہ کے معاملات چلانا ہمارے بس سے باہر ہوں گے اس لئے ریاض گل جیسے مستعد اور اسمارٹ پارٹنر کا ہونا ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔

سلطان راہی کیلئے ہم نے شوٹنگ کا شیڈول بہت محنت سے بنایا۔ وہ انہیں پسند بھی آیا۔ انہوں نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور ہماری فلم کے لئے ڈیٹس بھی عنایت کردیں۔ اس شیڈول کے مطابق ہم نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ فی الحال آئندہ آٹھ مہینے تک کوئی نئی فلم سائن نہ کریں۔ ورنہ سارا شیڈول گڑبڑ ہو جائے گا۔ کچھ دن بعد ہمیں پتا چلا کہ سلطان راہی نے دو اور فلمیں سائن کرلی ہیں۔ اس کے بعد دو اور فلموں کی خبر اخبار میں پڑھی۔ ان ہی دنوں شوٹنگ کے آغاز کے سلسلے میں ہم ان سے ملنے گئے تو شکایت کی کہ آپ نے پھر نئی فلمیں سائن کرلی ہیں۔ اب ہماری ڈیٹس کا کیا ہوگا۔ اس طرح تو سارا شیڈول گڑبڑ ہو جائے گا۔

وہ بولے ''سر جی آپ اپنی ڈیٹس کی بالکل فکر نہ کریں۔ ان میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی''۔

ہم نے کہا ''مگر آپ ان نئی فلموں کی شوٹنگ کس طرح کریں گے، وقت کہاں سے لائیں گے؟ سال میں 365 دن سے زیادہ تو ہو نہیں سکتے اور نہ ہی کیلنڈر میں مہینے اور تاریخیں بڑھ سکتی ہیں۔ ان نئی فلموں کی شوٹنگ کب شروع کریں گے؟''

بولے'' ان سب کی تھوڑی تھوڑی شوٹنگ تو میں نے کردی ہے۔ آگے بھی اللہ مالک ہے''۔ ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ وہ ہنسنے لگے ''آغا جی ناراض نہ ہوں۔ بات یہ ہے کہ ان پروڈیوسروں کی حالت اچھی نہیں تھی۔ ایک سال اور انتظار کرتے تو بالکل فاقے ہو جاتے۔ میں نے پروڈیوسروں سے ایک ایک دو دو گھنٹے مانگ کر ان کا کام شروع کرادیا۔ اب ان بے چاروں کا میٹر بھی چالو ہو جائے گا۔ کیا حرج ہے اگر کسی کا بھلا ہو جائے''۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

ہم سمجھ گئے کہ یہ شخص لاعلاج ہے۔

ایک روز ہمیں آغا ریاض گل نے فون کر کے بتایا کہ شاہ نور اسٹوڈیو میں ایک بہت بڑا سیٹ لگا ہوا ہے جس پر بہت سے اہم آرٹسٹ کام کر رہے ہیں۔ اس سیٹ پر راہی صاحب کا صرف دو گھنٹے کا کام ہے۔ انہوں نے آنے کا وعدہ بھی کیا تھا مگر نہیں آئے ہر جگہ ڈھونڈ لیا مگر ان کا کوئی پتا نہیں ہے۔ ایک گھنٹہ پہلے وہ شباب اسٹوڈیو میں شوٹنگ کر رہے تھے۔ اب لاپتا ہیں۔ کچھ کیجئے ورنہ بہت نقصان ہو جائے گا۔ ان کی اس وقت کوئی شوٹنگ بھی نہیں ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ راہی صاحب کو کہاں تلاش کریں۔ پھر ہمیں وہ پرانا لطیفہ یاد آیا کہ کسی شخص کا گھوڑا گُم ہو گیا۔ سارے شہر میں تلاش کیا مگر نہ ملا۔ آخر ایک بے وقوف ملازم اسے ڈھونڈ کر لے آیا۔ مالک نے پوچھا ”تم نے یہ گھوڑا کیسے ڈھونڈا اور کہاں سے ڈھونڈا؟“

اس نے جواب دیا ”میں نے سوچا کہ اگر میں گھوڑا ہوتا اور گم ہو جاتا تو کہاں جاتا؟ بس میں اس جگہ چلا گیا۔ یہ گھوڑا وہیں کھڑا ہوا تھا“۔

یہ پرانا لطیفہ سنانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اس روز اسی لطیفے سے ہم نے رہنمائی حاصل کی تھی۔ ہم نے سوچا کہ اگر راہی صاحب کی شوٹنگ نہیں ہے تو وہ دو ہی مقامات پر ہو سکتے ہیں۔ اپنے گھر میں یا ایورنیو اسٹوڈیو میں۔ ایورنیو اسٹوڈیو میں ہر وقت رونق رہتی ہے اور جس کسی کو شوٹنگ سے تھوڑی دیر کی بھی فراغت ملتی ہے تو وہ ایورنیو اسٹوڈیو میں ہی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم کار میں بیٹھے اور ایورنیو اسٹوڈیو پہنچ گئے۔

دن کے بارہ بجے تھے۔ ایورنیو اسٹوڈیو میں دو تین فلموں کی شوٹنگز جاری تھیں معلوم ہوا کہ راہی صاحب اسٹوڈیو میں آئے ہی نہیں ہیں۔ ایک سیٹ پر جاوید فاضل کی فلم ”دہلیز“ یا ”لازوال“ کی شوٹنگ جاری تھی۔ ہم جاوید فاضل کے سیٹ پر پہنچ گئے۔ یہ ایک ماڈرن ڈرائنگ روم کا سیٹ تھا۔ شبنم اور ندیم وہاں موجود تھے اور ایک ڈرامائی سین فلمایا جا رہا تھا۔ جس میں شبنم بے چارے ندیم کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھیں۔ سب سے ملاقات کرنے کے بعد ہم بھی ایک طرف صوفے پر بیٹھ گئے۔ چائے فوراً آ گئی۔ ندیم اور شنم سے تھوڑی سی گپ شپ بھی ہو گئی۔ سبھی ہمیں اسٹوڈیو میں دیکھ کر حیران ہوئے اس لئے کہ ہم نے اسٹوڈیو کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

"کیسے آنا ہوا؟" جاوید فاضل نے ہمارے کان میں سرگوشی "خیریت تو ہے نا؟"

ہم نے بتایا کہ سلطان راہی کا کہیں پتا نہیں چل رہا۔ ہماری فلم کی شوٹنگ رکی ہوئی ہے۔

بولے "راہی صاحب کی تو ایورنیو میں آج کوئی شوٹنگ نہیں ہے۔ آپ اطمینان سے بیٹھئے میں شاٹ لے کر آتا ہوں"۔

ہم صبر کر کے بیٹھے رہے۔ دس پندرہ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اچانک کیا دیکھتے ہیں سلطان راہی سوٹ بوٹ پہنے۔ سر پر فیلٹ ہیٹ لگائے چلے آرہے ہیں۔ ندیم نے دیکھتے ہی پوچھا "راہی صاحب کیا بات ہے آج تو انگریزی ڈریس میں نظر آرہے ہیں۔ کون سی فلم کی شوٹنگ ہے؟"

راہی صاحب ہنسنے لگے "کسی فلم کی شوٹنگ نہیں ہے سر جی۔ کبھی کبھی دل خوش کرنے کیلئے انگریزی لباس پہن کر بھی دیکھ لیتا ہوں"۔

سب سے مل ملا کر وہ آگے بڑھے تو ہم پر نظر پڑی "ارے آپ یہاں؟ آپ تو اپنی فلم کے سیٹ پر بھی کبھی نظر نہیں آئے؟"

ہم نے کہا "اور آپ یہاں کیسے؟ اس فلم میں آپ تو کام نہیں کر رہے"۔

بولے " آفاقی صاحب کبھی کبھی دو چار گھنٹے کی فراغت مل جاتی ہے تو دل پشوری کرنے کیلئے ادھر ادھر گھوم لیتا ہوں مگر آپ کیسے راستہ بھول پڑے؟"

ہم نے کہا "راستہ نہیں بھولے۔ آپ کو تلاش کرتے ہوئے آگئے"۔

"میری تلاش؟ کیا بات ہے خیر تو ہے؟"

ہم نے بتایا کہ شاہ نور اسٹوڈیو میں شوٹنگ جاری ہے اور وہ وعدہ کر کے بھی نہیں پہنچے۔

راہی صاحب پریشان ہو گئے۔ "اوہ مگر انہوں نے کہا تھا کہ شوٹنگ کا پروگرام کنفرم کریں گے۔ انہوں نے کنفرم نہیں کیا تھا اس لئے میں سمجھا کہ شاید میری ضرورت نہیں ہے"۔

ہم نے کہا "آپ کی ضرورت ہے اور شوٹنگ رکی ہوئی ہے۔ فوراً ہمارے ساتھ چلئے"۔

ندیم نے کہا "ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ انہیں چائے تو پی لینے دیجئے"۔ مگر راہی صاحب فوراً اٹھ کھڑے ہو گئے۔

''نہیں بیگ صاحب۔ پہلے کام پھر آرام''۔

ہم دونوں ایورنیو اسٹوڈیو سے نکلے اور شاہ نور اسٹوڈیو پہنچ گئے۔ اسٹوڈیو کے آخری کنارے پر ایک بڑے فلور میں شوٹنگ تھی۔ ہم راہی صاحب کو لے کر وہاں پہنچے تو راہی صاحب کے انتظار میں راٹھور صاحب نے لنچ بریک کرادی تھی۔ سیٹ پر بڑے اداکاروں کے علاوہ درجنوں فائٹر اور ایکسٹرا بھی موجود تھے۔ خاصی چہل پہل تھی۔ کھانے کی خوشبو دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ اس فلم کے سیٹ پر کھانا لذیذ پکتا ہے۔

ہمیں اور راہی صاحب کو دیکھا تو سب خوش ہو گئے اور کھانے کی پیش کش کر دی۔ ہم نے معذرت کر دی کہ مرچ مسالا والا کھانا نہیں کھا سکتے۔

راہی صاحب نے گھڑی دیکھی اور یونس راٹھور صاحب سے کہا ''سرجی آدھے گھنٹے میں کھانا کھلا دیں۔ پھر ڈریس اور مونچھیں منگا دیں۔ میں صرف دو گھنٹے آپ کے پاس ٹھہر سکتا ہوں''۔

ہم نے راٹھور صاحب کی طرف دیکھا تو وہ مسکرانے لگے ''آپ پریشان نہ ہوں۔ اس سیٹ پر راہی صاحب کا کام ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں ہے''۔

ہم تو راہی صاحب کو راٹھور کے حوالے کر کے چلے آئے۔ بعد میں تصدیق ہو گئی کہ راہی صاحب ہمارے سیٹ پر اپنا کام ختم کر کے دو گھنٹے سے پہلے ہی رخصت ہو گئے تھے۔ کسی اور فلم ساز کے سیٹ پر کام کرنے کیلئے۔ وہ سچ ہی کہا کرتے تھے کہ اگر وہ ایک دن میں ایک دو یا صرف تین فلموں کی شوٹنگ کریں گے تو انڈسٹری کیسے چلے گی۔ اتنے بہت سے لوگ برسرِ روزگار کیسے رہیں گے۔ اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں ہے کہ ایک زمانے میں پاکستان کی فلمی صنعت واقعی ''ون مین انڈسٹری'' تھی۔ صرف سلطان راہی کے بل پر دن میں چھ سات فلمیں مکمل ہو کر ریلیز ہو جاتی تھیں۔

راہی صاحب کو پیسے کا لالچ نہیں تھا۔ پیسے کا انہیں کرنا بھی کیا تھا۔ وہ بہت سادہ سی زندگی گزارتے تھے۔ ان کی اور ان کے گھر والوں کی ضرورتیں بھی زیادہ نہیں تھیں۔ قناعت پسند انسان تھے۔ دال روٹی کھا کر بھی گزارہ کر لیتے تھے۔ مگر روزانہ چوبیس گھنٹوں میں اٹھارہ بیس گھنٹے کام کرنے میں ان کی مصلحت یہی تھی کہ فلمیں مسلسل بنتی رہیں، لوگ کام سے لگے رہیں۔ انہوں نے دنیا سے رخصت ہونے کیلئے بھی بہت مناسب وقت کا انتخاب کیا۔ اگر دو چار سال پہلے

یہی حادثہ پیش آیا ہوتا تو فلمی صنعت کا کیا حشر ہوتا؟

گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے اردو فلموں کا ازسرِ نو دور شروع ہوا ہے اور پنجابی فلموں پر فلمساز کا انحصار کم ہو گیا ہے۔اس وقت زیادہ تر فلمساز اردو فلموں کی تیاری میں مصروف ہیں۔اس طرح راہی صاحب کی فلموں کی تعداد میں کمی پیدا ہو چکی ہے۔اس وقت ان کی وفات کا دھچکا فلم انڈسٹری برداشت کر سکتی ہے لیکن گزشتہ دس سالوں کے دوران میں اگر یہی المیہ رونما ہوتا تو صحیح معنوں میں فلمی صنعت کی کمر ٹوٹ جاتی۔اللہ بہت کارساز ہے۔اسے پاکستانی فلمی صنعت میں کام کرنے والوں پر رحم آ گیا۔ورنہ حشر نشر ہو جاتا۔

سلطان راہی میں انسانی خوبیاں زیادہ تھیں۔خامیاں بھی ہوں گی مگر وہ ایسی تھیں کہ کسی کو نظر نہیں آتی تھیں۔وہ انوکھی قسم کے سپر اسٹار تھے۔کسی پرستار نے کراچی سے فون کر کے ملاقات کی خواہش ظاہر کر دی تو راہی صاحب نے اسے اپنا مہمان بنا لیا۔گھر میں رکھ لیا۔لاہور کی سیر کرادی۔اسٹوڈیو میں شوٹنگ دکھانے اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ یہاں تک کہ اپنا بیٹا ہی بنا لیا۔

پرستاروں کے ساتھ ان کا سلوک نہایت مربیانہ تھا۔ہجوم سے وہ کبھی نہیں گھبرائے۔ حالانکہ فلم اسٹار لوگوں کا ہجوم دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔وہ بلا جھجک ہجوم میں چلے جاتے تھے اور انہوں نے بھی کبھی ان کے ساتھ گستاخی یا بدتمیزی نہیں کی۔یہی وجہ ہے کہ ان کے مرنے کے بعد بھی ہزاروں کی تعداد میں پہنچ گئے تھے۔یوں لگتا تھا جیسے راہی کی کوئی نئی فلم ریلیز ہوئی ہے۔موت کی خبر سنتے ہی ہزاروں افراد ان کے گھر پہنچ گئے۔سڑکوں پر ٹریفک رک گیا۔ ان کا جنازہ مقررہ وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی اٹھا دیا گیا ورنہ امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔اس طرح ''قل'' بھی وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی کر دیے گئے۔ اس میں راہی صاحب کے لواحقین کا کوئی قصور نہ تھا۔یہ انتظامیہ کا فیصلہ تھا۔وہ ہنگاموں سے گھبرا گئے تھے۔اگر راہی صاحب کہیں سے آ جاتے تو انہیں ٹوک دیتے،ایسا کرنے سے روک دیتے۔وہ اپنے پرستاروں کو بھلا کیسے مایوس کرتے؟ہزاروں لاکھوں افراد ان کے جنازے میں شریک ہونے سے رہ گئے جن کا انہیں شاید ہمیشہ صدمہ رہے گا۔

سادگی، روزہ، نماز، درسِ قرآن اپنی جگہ مگر راہی صاحب ترکِ دنیا کے قائل بھی نہیں تھے۔ ہنسنا ہنسانا، لطیفے بازی بھی چلتی رہتی تھی۔ کھیل کود میں بھی حصہ لیتے تھے۔ کسی زمانے میں انہیں فٹ بال کھیلنے کا شوق تھا۔ جب فلم انڈسٹری میں کرکٹ نے مقبولیت حاصل کی تو وہ بھی کرکٹ کھیلنے لگے۔ فلم اسٹار میچ میں بڑے اہتمام سے شریک ہوتے تھے۔ یہ بھی کارِ خیر ہی تھا۔ کسی نہ کسی فنڈ کے سلسلے میں میچ کھیلے جاتے تھے۔ ان کے پرستار تو راہی صاحب کو سفید قمیص، سفید پتلون اور سفید شوز میں پہچانتے بھی نہیں تھے۔ فلموں میں ان کا روپ بالکل مختلف ہی نظر آتا تھا۔ یہ بھی ان کی کارآمد مصروفیات تھیں۔ ورنہ وہ وقت ضائع کرنے کے قائل ہی نہیں تھے۔ تاش کھیلنے کا ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ بس کام کے دوران میں خوش گپیوں کیلئے وقت نکال لیا کرتے تھے۔ ان کے پاس وقت ہی کہاں تھا، صبح سے رات کے ایک دو بجے تک شوٹنگ کرنے والے کے پاس فالتو وقت کیسے ہو سکتا تھا۔ اس میں نماز، روزے اور درسِ قرآن کیلئے بھی وقت نکالتے تھے۔ ان کے پاس تو نیند پوری کرنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ سفر کے دوران میں ہی جھپکی لے لیا کرتے تھے یا اونگھ لیتے تھے۔ انہیں اگر کوئی شوق تھا تو پان کھانے کا۔ یہی میری عادت سمجھ لیجئے۔ اسی کو عیاشی سمجھ لیجئے۔ ان کے مشغلے بھی عجیب تھے۔ رمضان میں افطار پارٹیاں بڑے اہتمام سے کیا کرتے تھے۔ کبھی صحافیوں کو روزہ افطار کرا رہے ہیں، کبھی ساتھی اداکاروں کو، کبھی ہنرمندوں کو، کسی جگہ نئی مسجد تعمیر ہوئی ہے تو راہی صاحب کو پہلی اذان اور امامت کیلئے مدعو کیا جاتا تھا۔ وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر اذان دینے پہنچ جاتے تھے۔

سلطان راہی کے شوق اور مشغلے بھی عجیب و غریب ہی تھے۔ اس بار بھی رمضان شریف کیلئے انہوں نے بڑی منصوبہ بندی کی تھی مگر پہلا روزہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔ زندگی میں بھی انہیں جو چاہت اور عزت ملی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ مرنے کے بعد بھی اخباروں کے صفحات ان کی خبروں اور تصویروں سے بھر گئے۔ بڑے بڑے لوگ ان کی تعزیت کیلئے آئے۔ ریفرنس ہوئے۔ تعزیتی جلسے منعقد کئے گئے۔ لوگ انہیں خراجِ عقیدت بھی پیش کرتے تھے۔ اور انہیں یاد کرکے پھوٹ پھوٹ کر روتے بھی تھے۔ وہ زندگی میں بھی عجیب و غریب اور نرالے تھے۔ موت کے بعد بھی مختلف ہی رہے۔ ایسے نیک اور پارسا اداکار سپر اسٹار نہ پہلے کبھی دیکھا نہ بعد میں کبھی دیکھنے کو ملے گا۔ بھارت میں امیتابھ بچن کو بہت مرتبہ حاصل ہوا مگر وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ چاہت اور مقبولیت کا اتنا طویل عرصہ ان کے حصے میں

بھی نہیں آیا۔ سلطان راہی ۲۸،۲۹ سال سے ہیرو چلے آ رہے تھے۔ اور مرے بھی تو ہیرو ہی تھے۔ ان کا ریکارڈ بھلا کون توڑے گا۔ سوچنا بھی ناممکن ہے ساڑھے سات آٹھ سو بلکہ شاید ایک ہزار فلموں میں اداکاری کرڈالی کیونکہ باقاعدہ ریکارڈ کسی نے نہیں رکھا۔

ان کی فلمی جوڑیاں بھی سینکڑوں فلموں تک پہنچ چکی تھیں۔ دنیا میں مقبول ترین جوڑی نے بھی زیادہ سے زیادہ ۲۰، ۲۵ فلموں میں کام کیا ہوگا۔ مگر سلطان راہی تو ''میگا اسٹار'' تھے۔ ان کا ہر انداز بہت بڑا تھا۔ انہوں نے صرف ایک ہیروئن انجمن کے ساتھ سوڈیڑھ سو سے زیادہ فلموں میں کام کیا۔ ایک زمانے میں ہر ریلیز ہونے والی فلم میں سلطان راہی اور انجمن کی جوڑی ہوتی تھی اور یہ سلسلہ سالہا سال تک چلا۔ فلم بین نہ ان سے اکتائے نہ انجمن سے۔ ایسی فلمی جوڑی بھی دنیا میں دوسری نہ ہوگی۔ جب اتنی زیادہ قربت اور ہم نشینی ہو تو باتیں بھی بن جاتی ہیں۔ دبی زبان میں انجمن کے ساتھ ان کے رومان کی کہانی بھی بن گئی۔ سلطان راہی نے سنا تو بہت ہنسے، بولے ''آغا جی۔ جو آدمی صبح چھ بجے رات کے دو بجے تک کام کرے وہ رومان کب کرے گا؟''

''بھئی آپ دونوں ساتھ ہی تو کام کرتے ہیں۔ بیشتر وقت ساتھ ہی رہتے ہیں''۔

کہنے لگے ''یہ رومان تو نہ ہوا فلم کی شوٹنگ ہوگئی۔ فلم یونٹ اور کیمروں کے سامنے تو فلم کا رومان ہی ہو سکتا ہے''۔

ان کے قتل کے چند روز بعد خبر آئی کہ ان کے دیرینہ ساتھی احسن نے بیان میں کہا ہے کہ ان کے مختلف ہیروئنوں سے تعلقات رہے ہیں۔ ان میں انجمن، گوری، شہزادی اور صائمہ وغیرہ کا نام بھی شامل تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ قتل کی تحقیقات سے اس معاملے کا کیا تعلق؟ انجمن نے اس خبر کی پرزور تائید کی اور کہا کہ وہ بہت نیک اور پارسا انسان تھے۔ یہ ان کی کردار کشی ہے۔ دوسری ہیروئنوں نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔ ان کے گھر والے بھی ان کی پاک دامنی کی گواہی دیتے ہیں۔ انجمن کے ریٹائر ہو جانے کے بعد ان کی جوڑی نئی ہیروئن صائمہ کے ساتھ بنی تھی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پنجابی فلموں کے پرستار اپنی ہیروئن کو اونچا، لمبا بھرپور جسم کا مالک دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب انجمن پر موٹاپا چڑھا تو ان کے پرستاروں کے ایک حصے نے ناک بھوں چڑھائی مگر اکثریت نے انہیں سرآنکھوں پر بٹھایا۔ پھر تو یہ حال ہو گیا تھا کہ ان کا جتنا وزن بڑھتا تھا ان کی فلموں کے ہفتے بھی اتنے ہی بڑھ جاتے تھے۔ ایک انجم

ہی پر کیا منحصر ہے، ممتاز کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ رانی، آسیہ جیسی سبک اور نازک ہیروئنیں پنجابی فلم بینوں کو زیادہ نہیں بھائیں۔

سلطان راہی نے پنجابی فلموں کی قریب قریب سبھی ایکٹریسوں کے ساتھ رومانی ہیرو کے طور پر کام کیا تھا۔ ان میں سے بہت سی ان سے عمر میں آدھی ہوں گی۔ وہ اس بات پر ہنسا بھی کرتے تھے مگر فلم ساز باز نہیں آتے تھے ان کے سامنے کی بچیاں بھی دیکھتے ہی دیکھتے ان کی ہیروئنیں بن گئیں۔ وہ آسمان کی طرف دیکھتے اور آہ بھر کر کہتے ''آغا جانی کیسا زمانہ آگیا ہے؟''

سلطان راہی پر فلموں میں تو کوئی غلبہ نہ پاسکا مگر گوجرانوالہ بائی پاس پر کسی نے انہیں ایک ہی گولی ماری اور وہ شخص جو فلموں میں درجنوں گولیاں کھا کر بھی زندہ رہتا تھا، چپکے سے مر گیا۔ ان کی زندگی بھی مثالی تھی اور موت بھی مثال بن گئی۔ وہ جو کچھ بھی تھے جیسے بھی تھے، سب سے الگ اور انوکھے تھے۔ ایسا انسان، ایسا دوست، ایسا شوہر، ایسا باپ، ایسا ہیرو، انسان دوست دوسرا کہاں ملے گا۔ چشمِ فلک منتظر ہی رہے گی شاید!

ہم نے اپنی صحافت کا آغاز ۱۹۵۰ء میں کیا تھا۔ اس زمانے کی صحافت کا کچھ اور ہی انداز تھا۔ نہ اخباروں میں اتنے بہت سے صفحات ہوتے تھے، نہ رنگین ایڈیشن شائع ہوتے تھے اور نہ ہی ڈھیر سارا اسٹاف ہوتا تھا۔ پہلے روزناموں میں کل چھ صفحات ہوتے تھے۔ بعد میں یہ تعداد بڑھ کر آٹھ ہوگئی۔ رات کو پہلے اور آخری صفحات کی کاپی پر صرف دو ایڈیٹر ہوا کرتے تھے ایک نیوز ایڈیٹر اور دوسرا سب ایڈیٹر۔ یہی دونوں سارے کام کرتے تھے۔ خبروں کا ترجمہ، رپورٹر کی خبروں کی ایڈیٹنگ، ریڈیو سے خبریں سن کر مطلب کی خبریں بنانا اور پھر آخر میں کاپی جوڑنا۔ یہ سب ان ہی دو افراد کے ذمے ہوا کرتا تھا۔ رپورٹر ایک یا زیادہ سے زیادہ دو ہوتے تھے۔ پھر چند سال بعد ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا۔ پہلے اور آخری صفحات پر اشتہارات بہت کم ہوتے تھے۔ تصویریں شائع کرنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ دو افراد کتنا کام کرتے تھے؟ کرائم رپورٹر کا اس زمانے میں دستور نہیں تھا۔ لاہور میں ایک ملک ممتاز صاحب تھے جو عدالتی خبریں ہر شام دفاتر میں پہنچا دیا کرتے تھے۔ ان ہی سے کرائم کی خبری بنالی جاتی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ اسی زمانے میں عدالتی رپورٹرز اور کرائم رپورٹرز کا بھی رواج ہوگیا۔ اسپورٹس کی خبریں کم ہوتی تھیں (اردو اخباروں میں) اس

لئے کھیلوں کے رپورٹرز یا کھیلوں پر تبصرہ کرنے والوں کا بھی وجود نہ تھا۔ یہ فرائض بھی اسٹاف کے ارکان کو ہی ادا کرنے پڑتے تھے۔ گویا اس زمانے میں صحافی اور سب ایڈیٹر ہر فن مولا ہوتا تھا۔ ہر مضمون اور ہر موضوع پر اس کو دسترس ہوا کرتی تھی۔ خبریں بنانے سے ایڈیٹوریل لکھنا، ترجمہ کرنا، فکاہیہ کالم لکھنا، سیاست، اسپورٹس، ادب، فلم سب کے بارے میں خبریں فراہم کرنا اور ان پر تبصرہ کرنا اسی کے ذمے تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار روزنامہ ''آفاق'' کے کمرشل رپورٹر صاحب رخصت ہو گئے تو کامرس کا صفحہ بھی ہم ہی مرتب کرتے اور لکھتے تھے۔ اسی لئے اس زمانے کے صحافی کو ''جیک آف آل ٹریڈز، ماسٹر آف نن'' کہا جاتا تھا۔ یعنی سب کچھ تھوڑا تھوڑا جانتے ہیں مکمل عبور اور دسترس کسی چیز پر نہیں ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اسی زمانے میں ہم نے بہت سے لوگوں کو ہر ٹریڈ کا ماسٹر بھی پایا۔ وہ بھی خوب دور تھا۔ لوگوں کو مطالعے اور لکھنے کا شوق تھا۔ پڑھائی کا مطلب محض ڈگری حاصل کرنا نہیں بلکہ علم حاصل کرنا تھا۔ اس زمانے کے بہت سے معروف و ممتاز صحافی تو ڈگریوں سے محروم ہی تھے۔ بمشکل میٹرک پاس ہوں گے مگر ہر عمل و شعبے پر ایسا عبور کہ ماہرین بھی ان کے سامنے طفل مکتب لگتے تھے۔ اب نہ وہ لوگ رہے، نہ وہ دور۔ اب تو میک اپ ہی میک اپ ہے۔ کھرچ کر دیکھیے تو اندر سے ایسا چہرہ نکلتا ہے کہ بس خدا کی پناہ۔

اس تفصیل کا مقصد یہ بات کرنا تھا کہ جب ہم نے صحافت کا آغاز کیا تو ہمیں ہر شعبے سے واقفیت حاصل کرنی پڑی۔ ان ہی میں ایک کھیلوں کا شعبہ بھی تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس زمانے کے نوجوانوں کو ہر چیز سے دلچسپی تھی، ہر چیز کا شوق تھا اس لئے انہیں اضافی کوشش و محنت نہیں کرنی پڑتی تھی مثلاً ادب سے ہر ایک کو لگاؤ تھا، مطالعہ ہر ایک کی عادت تھی۔ اچھی فلمیں بھی دیکھتے تھے اور ان کے بارے میں معلومات رکھتے تھے۔ موسیقی اور اداکاری کے بارے میں بھی جانتے تھے۔ کھیلوں سے نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ خود بھی بہت سے کھیل کھیلتے رہے تھے۔ جب صحافی بن جاتے تھے تو زیادہ توجہ اور محنت سے مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح ''جیک آف آل ٹریڈز'' بن جاتے تھے۔

کرکٹ کا کھیل اس زمانے میں آج کی طرح مقبول و معروف تو نہ تھا لیکن ایک بہت بڑی تعداد اس میں دلچسپی لیتی تھی۔ کرکٹ ٹیسٹ میچوں تک محدود تھی۔ اگر کوئی ٹیم دوسرے ملک کے دورے پر جاتی تھی تو وہاں چند نمائشی میچ

بھی ہو جاتے تھے۔ جو عموماً تین روزہ ہوتے تھے۔ ون ڈے کرکٹ نے ابھی جنم نہیں لیا تھا۔ کرکٹ ویسے بھی ''لارڈز'' کا کھیل تصور کی جاتی تھی۔ عموماً پڑھے لکھے، آسودہ لوگ ہی کرکٹ دیکھنے جاتے تھے۔ ٹیلی ویژن کا وجود نہیں تھا۔ ریڈیو سے بھی ہر میچ کی کمنٹری نشر نہیں کی جاتی تھی۔ اس لئے جسے ضرورت ہو خود ہی میچ دیکھنے جاتا تھا۔ ٹیسٹ میچ کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے۔ صبح سے شام تک میدان میں بیٹھ کر میچ دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ مگر جو خوشحال اور شوقین لوگ تھے وہ چھتریاں، کھانے پینے کا سامان اور تھرموس میں چائے بھر کر گراؤنڈ میں پہنچ جاتے تھے۔ میچ میں سستی آجائے تو تماشائی بھی جمائیں لیتے رہتے تھے یا پھر سو جاتے تھے۔ میچ کے دوران دن میں آپس میں ادھر ادھر کی گفتگو کرنا بد تہذیبی تصور کی جاتی تھی اس لئے سب تماشائی خاموش بت بنے میچ دیکھتے رہتے تھے یا اونگھتے رہتے تھے۔ کھیل میں گرمی پیدا ہوتے ہی سارے میدان میں بجلی کی لہر سی دوڑ جاتی تھی اور صحیح معنوں میں کھیل کا لطف ان ہی مواقع پر آتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ساری محنت وصول ہو جاتی تھی۔

کچھ وقت گزر جاتا ہے مگر شیخ صاحب، کو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ اگر یہ بھید کھل گیا تو ان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ ایک تعلیم یافتہ نوجوان راشد (درپن) ان کے گھر آتا ہے تو وہ خالدہ سے اس کی شادی کا منصوبہ بنا لیتے ہیں۔ راشد بھی خالدہ کو پسند کرنے لگتا ہے۔ وہ اس کی حقیقت سے ناواقف ہے۔ خالدہ اس سے پہلو تہی کرتی ہے مگر بھائی کی دھمکی کے پیشِ نظر راشد کے سامنے سچ نہیں بول سکتی۔

ایک روز شیخ صاحب خالدہ کو راشد سے شادی کرنے کے فیصلے سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہ صاف انکار کر دیتی ہے مگر شیخ صاحب اسے سمجھاتے ہیں کہ خود تمہارا بھلا اسی میں ہے کہ یہ راز، راز ہی رہے۔ شادی کے بعد راشد کو اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں چند سال کیلئے یورپ جانا ہوتا ہے۔ خالدہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے۔ مگر شیخ صاحب اور اس کی بیوی اسے یقین دلا دیتے ہیں کہ گڈو کا وہ ہر طرح خیال رکھیں گے۔ خالدہ ضد کرتی ہے تو شیخ صاحب ایک بار پھر ڈراما بازی کرتے ہیں اور دھمکی دیتے ہیں کہ وہ زہر کھا کر اپنی جان دے دیں گے۔ خالدہ بھابی سے بچے کی دیکھ بھال کے وعدے لیتی ہے، اپنے بچے سے مل کر آنسو بہاتی ہے اور جی بھر کر پیار کرتی ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ پردیس

روانہ ہو جاتی ہے۔ خالدہ کے جاتے ہی شیخ صاحب جو مخیر نیک دل اور غریبوں کے ہمدرد مشہور ہیں، ایک دم نگاہیں بدل لیتے ہیں۔ اب گڈو سے چھٹکارا حاصل کرنے کا بہترین موقع ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جب تک گڈو آس پاس رہے گا ان کے سر پر تلوار لٹکی رہے گی۔ لہٰذا سوچے سمجھے منصوبے کے تحت گڈو کی۔۔۔ پرورش کرنے والی عورت (زینب) سے کہتے ہیں کہ بھئی۔ ہماری بہن کو اس لاوارث بچے سے دلچسپی تھی۔ اب وہ تو شادی کے بعد رخصت ہو گئی ہے۔ اس بچے کا بوجھ ہم ہمیشہ تو نہیں اٹھا سکتے۔

زینب یہ سن کر حیران رہ جاتی ہے اور کہتی ہے ''مگر شیخ صاحب میں تو خود بہت غریب عورت ہوں۔ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پالتی ہوں۔ گڈو کا خرچہ کیسے پورا کروں گی؟''

شیخ صاحب کہتے ہیں ''دیکھو بھئی۔ خدا ترسی اور بات ہے مگر ہم زندگی بھر تو یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ تم کچھ روپے لے لو اور اس کے بعد ہمارا گڈو سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ اگر تم یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتیں تو اسے کسی یتیم خانے میں داخل کرا دو''۔

غریب عورت ان کی شکل دیکھتی رہ جاتی ہے۔ پھر کہتی ہے ''شیخ صاحب میں اسے یتیم خانے میں داخل نہیں کراؤں گی۔ اب تو وہ بھی میرے بچے کی طرح ہے۔ جہاں میرا بچہ پلے گا وہیں گڈو بھی پل جائے گا۔ اپنے پیسے اپنے پاس ہی رکھئے''۔

عورت رخصت ہو جاتی ہے۔ شیخ صاحب کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ وہ یہی چاہتے تھے۔ غریب عورت محنت مزدوری کر کے دونوں بچّوں کو اپنی اولاد کی طرح پالتی ہے۔ گڈو اسے اپنی حقیقی ماں اور اس کے بیٹو علمو (قوی) کو اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ حالانکہ دونوں کے مزاجوں اور عادتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسا شاید خون اور خاندانی پسِ منظر کی وجہ سے ہے۔ گڈو کو پالنے والی عورت زینب اچانک شدید بیمار ہو جاتی ہے۔ اور مرتے ہوئے یہ راز گڈو پر فاش کر دیتی ہے کہ وہ اس کی ماں نہیں ہے۔

گڈو کیلئے یہ ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔ اس پر غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ زینب اس کو بتاتی ہے کہ ایک دولت مند عورت تمہیں میرے پاس لے کر آئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ تم لاوارث ہو۔ اسے تم سے لگاؤ تھا اس لیے کچھ عرصہ

تمہارے اخراجات ادا کرتی رہی۔ مگر جب اس کی شادی ہوگئی تو وہ پردیس چلی گئی اور اس کے بعد اس کے بھائی نے تمہارا خرچہ دینے سے انکار کر دیا۔اس کے باوجود میں نے تمہیں اپنے ہی بچے کی طرح پالا ہے۔ تمہارے اور اپنے بیٹے کے درمیان کبھی کوئی فرق نہیں سمجھا۔اب تم بھی اسے اپنا بھائی ہی سمجھنا۔

زینب یہ راز بتا کر مر جاتی ہے۔ مگر گڈو (جمیل) کیلئے ذہنی عذاب کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہ احساس کہ وہ خدا جانے کس کا بیٹا ہے؟اس کے ماں باپ کون ہیں اور کہاں ہیں؟انہوں نے اس کی پرورش کیوں نہیں کی،دوسروں کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیا؟ان ذہنی الجھنوں کی وجہ سے وہ بے حد حساس اور زود رنج ہو جاتا ہے۔ دنیا اور دنیا والوں کے بارے میں اس کے پاس تلخیوں اور شکایتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ کم گو، سنجیدہ اور اپنی ذات میں سمٹا ہوا بچہ ہے جو پالنے والی ماں کے مرنے کے بعد زندہ رہنے کیلئے محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہے۔ایسے حالات میں تعلیم حاصل کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دونوں بھائی مختلف کام کاج کر کے روٹی کماتے ہیں اور گلیوں میں ہی پرورش پاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ گڈو غلط اور اخلاق سے گرے ہوئے طریقوں کو ناپسند کرتا ہے جب کہ اس کے بھائی کے نزدیک سب جائز ہے۔ گڈو کو تصویریں بنانے کا شوق ہے۔ وہ ایک فلمی پوسٹر بنانے والے پینٹر کا شاگرد ہو جاتا ہے۔ جہاں اسے برائے نام تنخواہ ملتی ہے۔اس کے برعکس علمو بھیک مانگ کر بہت شاندار زندگی گزارتا ہے۔ یہ ایک مزاحیہ اور طنزیہ کردار ہے۔ وہ گڈو کو برا بھلا کہتا رہتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ سارے مہینے محنت کر کے تم جتنا کماتے ہو اتنا تو میں ایک دن میں بھیک مانگ کر کما لیتا ہوں۔ لیکن حد درجہ باہمی پیار اور اخلاص کے باوجود ان دونوں کے مزاجوں کا فرق دور نہ ہو سکا۔

ادھر چند سال کے بعد جب خالدہ اپنے شوہر راشد کے ساتھ وطن واپس آئی تو بے تابی سے بھائی کے پاس پہنچی اور اپنے بچے کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ اپنے جگر گوشے سے مل کر اسے آغوش مادر میں لینے کیلئے ترس رہی تھی۔ مگر بھائی کے پاس بنا بنایا بہانہ تیار تھا۔اس نے سارا الزام زینب پر ڈال دیا اور کہا کہ اچانک ہم سے پیسے لے کر کہیں غائب ہوگئی۔ بہت تلاش کیا مگر کوئی پتا نہیں چل سکا۔ خالدہ نے بہت آہ وزاری کی۔ بھائی کو الزام دیے مگر بے بس تھی۔ صبر کر کے بیٹھ رہی مگر اس کی مامتا کو چین نہ مل سکا۔

وقت گزرتا گیا۔ گڈو اکیس سال کا نوجوان پینٹر بن گیا۔ اس کا بھائی اور دوست قوی اوّل درجے کا بھکاری بن چکا تھا۔ جو سارے دن مختلف بہروپ بدل بدل کر بھیک مانگتا تھا اور شام کو شاندار سوٹ پہن کر بہترین ہوٹلوں میں کھانا کھاتا تھا۔ اس کی انتہائی کوشش کے باوجود گڈو اس کی کمائی میں سے ایک پیسہ بھی لینے کا روادار نہ تھا۔

خالدہ کا شوہر درپن، اس اثنا میں جج بن چکا تھا۔ ان دونوں کی ایک بیٹی (نینی) بھی تھی جو اپنے بھائی کے وجود سے بے خبر تھی۔ جج ایک نیک دل اور شریف النفس آدمی تھا۔ اس نے خالدہ کی ہر طرح دل داری اور ناز برداری کی۔ اور دنیا کی ہر خوشی اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی مگر خالدہ کے دل سے اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کا داغ نہ مٹ سکا۔ وہ ہر وقت اس کی تلاش اور انتظار ہی میں رہتی تھی۔

اتفاقات نے گڈو کو اپنی سوتیلی بہن کے آمنے سامنے کر دیا۔ اس نے ایک روز اسے غنڈوں سے نجات دلا کر اس کے گھر پہنچا دیا۔ باتوں باتوں میں خالدہ کو معلوم ہو گیا کہ گڈو اسی کا گمشدہ بیٹا ہے۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ نور نظر کو گلے لگا لے مگر مجبور تھی۔ اسی رات وہ تصویر خریدنے کے بہانے گڈو کے گھر پہنچ گئی اور اسے بتا دیا کہ وہی اس کی ماں ہے۔ لیکن گڈو کو زمانے نے تلخیوں کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ اس نے ماں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ کیسی بھی مجبوری ہو مگر کوئی ماں اپنے بیٹے کو دنیا کی ٹھوکریں کھانے کیلئے بے رحم زمانے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتی۔ اس نے صاف طور پر خالدہ کو بتا دیا کہ دنیا میں اس کی کوئی ماں نہیں ہے۔ نہ ہی کسی نے اسے جنم دیا ہے۔ وہ ایک خودرو پودا ہے۔

خالدہ نے بہتیری منت سماجت کی۔ پیار سے سمجھایا کہ میں گزرے وقت کی تلافی کر دوں گی مگر گڈو کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ اس نے کہا" کیا آپ میرا کھویا ہوا بچپن واپس دے سکتی ہیں۔ وہ آنسو واپس دے سکتی ہیں جو میں نے ماں کی یاد میں بہائے ہیں۔ وہ دکھ واپس لے سکتی ہیں جو میں آج تک سہتا رہا ہوں"۔

ابھی یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ اسی محلے میں رہنے والی گڈو کی پڑوسن لڑکی تاجی (روزینہ) آ گئی۔ وہ گھر کے سامنے ایک شاندار کار دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔ وہ گڈو سے پیار کرتی تھی مگر کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اکثر اوقات وہ دونوں لڑتے جھگڑتے ہی رہتے تھے۔

تاجی نے گڈو سے پوچھا" یہ بیگم صاحبہ یہاں تم سے کیا لینے آئی ہیں ؟"

" یہ مجھ سے مامتا کی تصویر بنوانے آئی ہیں" گڈو نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

روزینہ نے کہا" تو پھر بنا کر کیوں نہیں دیتے تصویر ؟"

گڈو نے جواب دیا" جو چیز میں نے کبھی دیکھی ہی نہیں اس کی تصویر کیسے بنا سکتا ہوں"۔

پھر اس نے خالدہ سے مخاطب ہو کر کہا" بیگم صاحبہ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی خواہش پوری نہیں کر سکتا"۔

خالدہ غمزدہ، مایوس اور اداس ہو گئی۔ اس کے اندر ایک عظیم تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ خاموش اور کھوئی ہوئی رہنے لگی۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہتا تھا۔ وہ گڈو کی محرومیوں اور دکھوں کیلئے خود کو الزام دیتی تھی۔ شوہر نے یہ تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ اس نے اس کا سبب جاننے کی کوشش کی مگر خالدہ ٹال گئی۔

اس اثناء میں شیخ صاحب شہر کے ممتاز لیڈر بن چکے تھے اور بڑے عجیب حالات میں ان کی اپنے بھانجے سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ خالدہ نے گڈو سے ملنے کے بعد ان سے مل کر انہیں برا بھلا کہا تو انہوں نے بڑی سادگی اور خلوص سے جواب دیا کہ دیکھو خالدہ یہ سب کچھ ہم نے تمہاری ہی بھلائی کیلئے کیا ہے اور حالات آج پہلے سے کہیں زیادہ مخدوش ہیں۔ یہ راز اپنے سینے میں ہی دفن کر دو۔ اگر دنیا کو یہ معلوم ہو گیا تو ذرا سوچو کہ تمہارے شوہر کی کیا عزت باقی رہ جائے گی اور وہ خود تمہارے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا؟ مت بھولو کہ تم ایک جوان بیٹی کی ماں ہو۔ دنیا اس پر انگلیاں اٹھائے گی اور وہ کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گی۔ یاد رکھو۔ اس راز کو فاش کرنے کا نتیجہ ہم سب کی تباہی کے سوا اور کچھ نہ ہو گا اور گڈو کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

شیخ صاحب گڈو سے بھی جا کر ملے اور اس کو مشورہ دیا کہ اپنی ماں، بہن اور خاندان کی بھلائی کی خاطر نہ صرف اپنی زبان بند رکھے بلکہ بہتر ہو گا کہ یہ شہر ہی چھوڑ کر چلا جائے۔ انہوں نے اسے کچھ روپیہ بھی پیش کیا جو گڈو نے شکریئے سے واپس کر دیا اور ان سے وعدہ کر لیا کہ وہ یہ شہر چھوڑ کر چلا جائے گا۔

گڈو آخری بار اپنی بہن اور ماں سے ملنا چاہتا تھا۔ تلخیوں، غموں اور آلام نے اسے زمانے سے باغی ضرور بنا دیا تھا مگر وہ

ایک حسّاس اور جذباتی نوجوان تھا۔ اچانک یوں بہن اور ماں کی ملاقات نے اسے انجانی کسک اور جذبوں سے آشنا کر دیا تھا۔ اب جو بہن اور ماں سے بچھڑنے کا سوال درمیان میں آیا تو وہ اپنے دل پر قابو نہ پا سکا۔

وہ جج صاحب کے گھر گیا تو وہاں ماں موجود نہ تھی۔ صرف بہن تھی اس نے گڈو کو ایک محسن سمجھ کر اس کی خاطر داری کی۔ گھر میں ایک چور گھس آیا تھا۔ فرار ہونے کی کوشش میں وہ گڈو سے ٹکرا گیا۔ دونوں میں ہاتھا پائی ہوئی اور اس کے نتیجے میں چور اپنے خنجر سے خود ہی ہلاک ہو گیا۔ حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے گڈو نے خاندان کو اسکینڈل سے بچانے کیلئے قتل کا الزام اپنے سر لے لیا تھا۔ پولیس کی سر توڑ کوشش کے باوجود اس نے کسی اور سوال کا جواب دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ہر سوال کے جواب میں وہ گم صم تھا۔ جج صاحب بھی اس بات پر بہت حیران تھے کہ گڈو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ وہ اس کے احسان مند تھے اور اس کی ہر ممکن امداد بھی کرنا چاہتے تھے۔ گڈو کے پاس ہر سوال کے جواب میں صرف خاموشی تھی۔

اس کی دوست تاجی اور منہ بولا بھائی علمو اس حقیقت سے واقف ہو چکا تھا کہ گڈو جس لڑکی کی عزت اور جان بچانے کیلئے قتل کا الزام اپنے سر لے رہا ہے وہ اس کی بہن ہے۔ علمو کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر صفائی میں یہ کہا جائے کہ اپنی بہن کی عزت بچانے کی خاطر گڈو نے چور کا مقابلہ کیا تھا اور وہ چور خود اپنے ہی خنجر سے ہلاک ہو گیا تو وہ بچ سکتا تھا۔ مگر گڈو نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اس بارے میں اپنی زبان نہ کھولے۔ جب خالدہ، گڈو سے ملنے گئی اور اس نے کہا کہ وہ عدالت کو بتا کیوں نہیں دیتا کہ اس نے اپنی بہن کی خاطر حفاظت خود اختیاری میں ایسا کیا ہے۔ تو گڈو کے پاس اس کیلئے بھی صرف ایک ہی جواب تھا۔

اس نے کہا ''میں تو آپ لوگوں کیلئے کبھی کا مر چکا ہوں۔ دوبارہ پھانسی چڑھ گیا تو کیا فرق پڑے گا۔ مگر بدنامی کے جس داغ سے محفوظ رہنے کی خاطر آپ نے یہ سب دکھ سہے ہیں اب اس سیاہی کو میں اپنی بہن کے چہرے پر نہیں ملوں گا۔ آپ نے کسی وقت اپنے بھائی کی جان اور عزت بچانے کیلئے میری قربانی دی تھی۔ آج میں اپنی بہن کی جان اور عزت بچانے کیلئے دوبارہ قربان ہو گیا تو کیا فرق پڑے گا؟'' خالدہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ گڈو نے اسے یہ قسم بھی

دے دی تھی کہ وہ کسی صورت میں بھی دیرینہ راز پر سے پردہ نہیں اٹھائے گی۔ خالدہ ایک بار پھر مجبور اور بے بس تھی۔

حالات خدا جانے کیا صورت اختیار کرتے مگر علمو سے نہ رہا گیا اور اس نے جج صاحب کے پاس جا کر انہیں حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ وہ یہ سب کچھ سن کر سناٹے میں آ گئے۔ انہوں نے خالدہ سے شکایت کرتے ہوئے کہا ''خالدہ میں نے تمہیں اپنی شریک حیات بنایا تھا مگر افسوس کہ تم نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ کیا تم مجھے اتنا گراہوا انسان سمجھتی تھی کہ شادی کے وقت اگر مجھے یہ بتا دیتیں کہ تم ایک بچے کی ماں ہو جو تمہارے مرحوم شوہر کی نشانی ہے تو میں تمہاری ہر بات پر لفظ بہ لفظ یقین نہ کرتا اور گڈو کو ایک باپ ہی کا پیار نہ دیتا؟''

مقدمے کی پیروی کے بعد گڈو کی بے گناہی ثابت ہو گئی اور اسے بری کر دیا گیا۔ اس طرح ایک تکلیف دہ اور طویل داستان اختتام کو پہنچی۔ یہ تو صرف ایک اغوا شدہ عورت، اس کے بچے اور اس کے خاندان کی کہانی تھی۔ دوسرے لوگوں پر کیا بیتی اور ان کی کہانیاں کیا ہیں؟ یہ الگ داستان ہے۔

''سزا'' کی اس کہانی کو حقیقت سے قریب رکھنے کیلئے ہم نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ طنز ومزاح کا عنصر بھی اس میں کم نہیں تھا۔ کچھ اور مزاحیہ کردار بھی اس کہانی میں شامل تھے۔ تاجی اور گڈو جس ماحول میں رہتے تھے اسی کے مطابق ان کا سادہ سا رومان دکھایا گیا تھا۔ علمو کے ساتھ صاعقہ (سلویا، یہ ایک عیسائی فنکارہ تھی) کو ایک ڈنگر ڈاکٹر (ساقی) کی بیٹی کے طور پر کاسٹ کیا گیا تھا۔ ناشاد صاحب نے اس فلم کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ نغمات قتیل شفائی صاحب نے لکھے تھے۔ اس فلم کے کئی گانے بہت مقبول ہوئے جن میں سے بعض کی اب بھارتی فلموں میں نقلیں بھی کی گئی ہیں۔

جب بھی چاہیں ایک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ

اور

میرے جوڑے میں گیندے کا پھول

تجھے میں کیسی دیکھوں

اور دوسرے نغمے خاصے پسند کیے گئے۔ موسیقی کے سلسلے میں یہ بتاتے چلیں کہ ہم نے ناشاد صاحب کو موسیقار منتخب کیا تھا۔ ان سے کافی مراسم تھے۔ اس زمانے میں ان کیلئے فلموں کے زیادہ تر گانے تسلیم فاضلی لکھتے تھے۔ ہم قتیل شفائی صاحب سے وعدہ کر چکے تھے۔ ناشاد صاحب سے یہ بات ہوئی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ ان دونوں حضرات کے مابین کشیدگی ہے۔ اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ کام نہیں کرتے۔

ہم نے کہا ''بھائی ہم آپ کی کشیدگی بھی دور کر دیں گے''۔

بولے ''قتیل صاحب کو میوزک کیلئے میرے گھر آنا پڑے گا''۔

ہم نے کہا ''یہ تو کوئی شرط نہیں ہوئی'۔

کہنے لگے ''سن لیجئے میں کسی قیمت پر بھی ان کے گھر جا کر کام نہیں کروں گا''۔

ہم نے قتیل صاحب سے بات کی تو وہ بھی اکڑے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے انہیں گانے لکھنے پر رضامند کیا۔ طے یہ پایا کہ دونوں حضرات ایورنیو اسٹوڈیو میں ہمارے دفتر میں آکر کام کریں گے اور پچھلی تلخیاں فراموش کر دیں گے۔۔۔ ہم جانتے تھے کہ ایک دوسرے کے سامنے آتے ہی برف پگھل جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ ہمارے دفتر میں دونوں صاحبان یکجا ہوئے تو کچھ دیر تو گلے شکوہ ہوتے رہے۔ مگر اس کے بعد دونوں کے دل صاف ہو گئے اور فلم کی موسیقی بنانے کا کام بہت خوش اسلوبی سے ہو گیا۔

''سزا'' کی کہانی تو ہم نے لکھ لی تھی۔ اسکرپٹ تیار تھا اور ہم خود ہی اس کی ہدایت کاری بھی کرنا چاہتے تھے مگر ان ہی دنوں ہم بیمار ہو گئے۔ نواب ہمایوں مرزا صاحب سے ہماری پرانی یاد اللہ تھی۔ خاصی بے تکلفی اور میل جول تھا۔ وہ ہماری مزاج پرسی کیلئے آئے تو کہنے لگے '' آفاقی صاحب! آپ کی تو صحت ٹھیک نہیں ہے۔ چلئے ہم آپ کو اسسٹ کر دیں گے''۔

ہم نے کہا ''مرزا صاحب کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ آپ اتنے بڑے ہدایت کار ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آپ یہ فلم ڈائریکٹ کر دیں مگر ہمارے ساتھ وہ سلوک ہرگز نہ کریں جو دوسرے ہدایت کار عموماً فلم سازوں کے ساتھ روا رکھتے

ہیں ''۔

وہ ہنسنے لگے ''یار کیسی باتیں کرتے ہو۔نہ ہم ڈائریکٹر۔نہ تم فلم ساز۔بس مل جل کر بھائیوں کی طرح کام کرلیں گے ''۔

ہم نے ان سے معاوضہ طے کیااوراسکرپٹ ان کے حوالے کردیا۔تاکہ وہ اس کے بارے میں اپنی ہدایت کارانہ رائے سے مطلع کریں۔

مرزا صاحب کواسکرپٹ اور کہانی کا موضوع بہت پسند آیا۔اس وقت تک ہم فلم کیلئے تمام اداکاروں کاانتخاب کرچکے تھے۔مرزاصاحب نے بھی اس سے اتفاق ظاہر کیا۔معمولی سی تبدیلیوں کی فرمائش کی مگر ہم نے یہ کہہ کر منالیا کہ ہم سب کو زبان دے چکے ہیں۔

یہ ہم پہلے بتاچکے ہیں کہ ''سزا'' کی کہانی تو ہم نے سوچ لی تھی مگراس کیلئے موزوں اداکاروں کاانتخاب شروع ہی سے ایک مسئلہ تھا۔سب سے پہلے مسئلہ تو وہی سوال تھاجو طارق صاحب نے ہم سے دریافت کیا تھاکہ فلم کے ہیرو کیلئے نو عمراداکار کہاں سے لائیں گے ؟اس کے بعد دوسرا مسئلہ ہیرو کی بہن کا تھا۔یہ ہیرو سے کم از کم چار پانچ سال چھوٹی تھی۔ اس عمر کی کوئی اداکارہ اس وقت فلمی دنیامیں دور دور تک نظرنہیں آتی تھی۔ یہ بھی ایک اہم کردار تھا۔اس لڑکی کا معصوم،الھڑاور نوعمر ہونا بہت ضروری تھا۔اس کے بعد دوسرے اداکاروں کا مسئلہ بھی کچھ کم پریشان کن نہ تھا۔گڈو غریبوں کی جس بستی میں رہتا تھاوہاں ایک شوخ وشنگ مگرسیدھی سادی سی غریب لڑکی اسے پسند کرنے لگتی ہے مگر سوائے جھگڑے کے اظہار محبت کا کوئی طریقہ اسے معلوم نہیں ہے۔اگرہیرو کی عمر بیس اکیس سال ہے تو یہ لڑکی عمر میں اس سے بھی کم ہونی چاہئے۔اب ایسی لڑکی کہاں سے لائیں ؟اصل بات یہ تھی کہ ہم ہر طرح اس فلم کوزیادہ سے زیادہ نیچرل بنانا چاہتے تھے۔

ہیرو کے منہ بولے بھائی اور دوست کیلئے ایک اسی کے ہم عمراداکار کی ضرورت تھی۔ اس ایج گروپ کے مزاحیہ اداکار بھی اس وقت فلمی صنعت میں موجود نہیں تھے۔ لہری صاحب اس زمانے میں بہت زوروں پر تھے اور اردو فلموں کیلئے بہترین کامیڈین تصوّر کیے جاتے تھے مگر یہ عمر میں ہیرو سے کہیں زیادہ نظر آتے تھے۔پھر بھی ہم نے لہری صاحب کو ذہن میں رکھ کر یہ کردار لکھااوراس کے مکالمے بھی ایسے تحریر کیے جولہری صاحب کیلئے موزوں ہوں۔

لہری کا کامیڈی اور مکالموں کی ادائیگی کا ایک مخصوص انداز تھا۔ وہ ایکشن یا بھاگ دوڑ کے ذریعے کامیڈی نہیں کرتے تھے۔ ان کیلئے برجستہ، شگفتہ اور مسکراتے ہوئے فقرے بہت ضروری تھے۔ ان کی بڑی عمر کا ہم نے یہ علاج سوچا کہ وہ گڈو کے حقیقی بھائی تو تھے نہیں۔ اس کی منہ بولی ماں کے بیٹے تھے اور بعد میں گڈو کے ساتھ ہی پل کر بڑے ہوئے تھے۔ انہیں اگر گڈو سے پانچ چھ سال بڑا دکھایا جاتا تو کوئی حرج نہ تھا۔ مگر شرط یہ تھی کہ بچپن میں بھی دونوں کی عمروں کا یہی فرق نظر آئے۔ یہ سوچ کر ہم نے لہری صاحب کو اس کردار میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر سب سے پہلا مرحلہ ہیرو کا تھا۔

ہماری خوش قسمتی دیکھئے کہ کچھ عرصہ قبل ڈھاکا کی فلم ''چکوری'' ریلیز ہوئی اور سپر ہٹ ہوگئی۔ اس فلم میں ہیرو اور ہیروئن دونوں بالکل نئے تھے۔ یہ ندیم اور شبانہ کی پہلی فلم تھی۔ ندیم گلوکار بننے کیلئے ڈھاکا گئے تھے مگر قسمت نے انہیں اداکار بنا دیا اور اداکار بھی ایسا کہ پہلی ہی فلم سے راتوں رات سپر اسٹار بن گئے۔ اور ملک کے دونوں حصوں میں ان کی شہرت اور مقبولیت پھیل گئی۔ ندیم اس وقت کے دوسرے ہیروز کے مقابلے میں کم عمر بھی تھے اور قد و قامت اور معصوم چہرے کی وجہ سے کچھ اور بھی نو عمر نظر آتے تھے۔ مگر ان کے ساتھ مسئلہ یہ پیش آیا کہ ''چکوری'' کے فلم ساز اور ہدایت کار احتشام صاحب ان کے اتالیق اور مشیر بن گئے۔ وہ دراصل انہیں مشرقی پاکستان میں اپنی فلموں تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انہیں مغربی پاکستان کی فلمی صنعت کی ہوا لگ گئی تو پھر وہ ان کے کام کے نہیں رہیں گے۔ (چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا) اس لئے وہ ندیم کو مغربی پاکستان کے فلم سازوں اور یہاں کے فلمی ماحول سے ڈراتے رہتے تھے۔

جس طرح مچھلی پانی کے بغیر نہیں رہ سکتی اسی طرح پاکستان کے کسی بھی حصے کا کوئی اداکار اپنے روشن مستقبل کیلئے لاہور آئے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔

ندیم کو مزید بندشوں میں جکڑنے کیلئے احتشام صاحب نے بعد میں ان سے اپنی بیٹی کی شادی بھی کر دی تھی۔ یہ کوئی کاروباری شادی نہیں تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور احتشام صاحب ندیم کو پسند کرتے تھے۔ وہ

خوش اخلاق، تعلیم یافتہ اور مہذب نوجوان تھا اور چکوری کی ریلیز کے بعد صف اول کے اداکاروں کی صف میں آ کھڑا ہوا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ ندیم نے مغربی پاکستان کی فلموں میں بھی کام شروع کر دیا۔ کراچی اور لاہور میں ہماری بھی ان سے ملاقات ہوئی اور ہمیں وہ بہت اچھے لگے۔ دوستی تو نہیں مگر ان سے بہت اچھے مراسم قائم ہو گئے۔ وہ شبنم کے گھر پر یا دوسری فلمی محفلوں میں اکثر مل جایا کرتے تھے اس طرح بے تکلفی بھی ہو گئی۔ یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے جب ہم نے ''سزا'' کی کہانی لکھنی شروع کی تھی۔ ندیم کو دیکھا تو جیسے ہمارے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔ ہم نے انہیں اپنی اس آنے والی فلم کیلئے سائن کرنے کی ٹھان لی۔ اگلی بار ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی تو ہم نے ان سے اپنی فلم کا تذکرہ کیا اور انہوں نے اس میں کام کرنے کی ہامی بھر لی۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہونے میں آٹھ نو ماہ کا عرصہ تھا مگر ہم نے ان سے اسی وقت فلم کی شوٹنگ ڈیٹس طے کر لیں اور اطمینان کا سانس لیا۔۔ کہ ایک بہت بڑا مرحلہ طے ہو گیا۔ ندیم ہر لحاظ سے اس کردار کیلئے بہترین انتخاب تھے۔ خوش شکل، نوخیز، نو عمر، معصوم صورت اور سب سے بڑھ کر یہ بہت اچھے اور سپر ہٹ اداکار۔ معاوضے کی بات زبانی طے ہو گئی اور ہم نے انہیں بتا دیا تھا کہ ایڈوانس دینے کے قائل نہیں ہیں۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہو گی تو وہ جس طرح کہیں گے انہیں ادائیگی کر دی جائے گی۔ ندیم بہت وضع دار اور بامروت انسان ہیں۔ اس وقت کچھ زیادہ ہی بامروت تھے فوراً مان گئے۔

اب ہم نے دوسرے اداکاروں کے انتخاب کی طرف توجہ دی۔ ہیروئن کیلئے ہماری نگاہ روزینہ پر پڑی۔ روزینہ نے اس وقت چند فلموں ہی میں کام کیا تھا۔ لاہور کی ایک فلم میں سائیڈ ہیروئن کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ کراچی کی ایک دو فلموں میں بھی وہ معاون اداکارہ تھیں۔ وہ طبعاً شوخ اور چلبلی تھیں (اب خدا جانے کیسی ہو گئی ہیں۔ یہ لگ بھگ ۲۵ سال پہلے کی بات ہے) صورت شکل، قد و قامت، جسم کا تناسب سبھی کچھ ٹھیک تھا۔ شوخ مسکراتی ہوئی آنکھیں، چغلی کھاتے ہوئے ہونٹ، فتنوں کو جگا دینے والی چال، شریر مسکراہٹ، خدا جانے کسی فلم ساز نے انہیں ہیروئن کی حیثیت میں کاسٹ کیوں نہیں کیا تھا۔ ہم نے انہیں ہیروئن بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ کراچی میں تھیں۔ سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کے گول چکر کے سامنے ایک فلیٹ میں اپنی بڑی بہن راحیلہ اور والدہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کی

والدہ کرسچین تھیں اور وہ بھی ممی کہلاتی تھیں۔ ایمی کی والدہ کے بعد فلمی دنیا میں "ممی" کے نام سے مشہور ہونے والی وہ دوسری ہستی تھیں۔ مگر ایمی کی والدہ کے برعکس وہ کم گو تھیں۔ وہ ہنس مکھ اور محبت اخلاق اور لحاظ والی خاتون تھیں۔ روزینہ اور ممی سے ہماری کئی بار مختلف اسٹوڈیوز میں ملاقات ہو چکی تھی۔ اچھی خاصی بے تکلفی تھی۔

کراچی میں ہم نے فون کیا اور ان کے گھر پہنچ گئے۔ وہ بہت اخلاق سے ملیں۔ ممی بھی شفقت سے پیش آئیں۔ چائے کا دور چلا تو ہم نے موقع پا کر اپنا مدعا بیان کیا۔ انہوں نے پوچھا "ہدایتکار تو حسن طارق صاحب ہوں گے؟"

ہم نے کہا "ضروری نہیں ہے۔ وہ بہت مصروف ہیں۔ اگر فارغ ہوئے تو وہی ہمارے ڈائریکٹر ہوں گے ورنہ ہم خود یا پھر کوئی اور ہدایت کار ہوگا"۔

انہیں ہدایت کار کے بارے میں زیادہ تشویش نہیں تھی۔ یہی کافی تھا کہ ہم اس فلم کے مصنف اور فلم ساز تھے۔ ہماری دو فلمیں پہلے ریلیز ہو چکی تھیں اور کافی دھومیں مچا چکی تھیں اس لیے ہر کوئی ہم پر توجہ دیتا تھا۔ پھر روزینہ کو تو ہم ہیروئن کا چانس دے رہے تھے۔ وہ بلا حیل وحجت مان گئیں۔ معاوضہ بھی طے پا گیا اور ہم نے ان سے ڈیٹس بھی لے لیں۔

ممی نے کہا "ارے مسٹر آفاقی! آٹھ مہینے پہلے آپ ڈیٹ لینے کو مانگتا ہے؟"

ہم نے انہیں بتایا کہ ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس طرح پریشانیوں اور بلاوجہ کی بھاگ دوڑ سے بچ جاتے ہیں۔

انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اگرچہ انہیں یہ بات کچھ عجیب سی لگی بہر طور انہوں نے ایک ڈائری پر یہ ڈیٹس نوٹ کر لیں۔

ہیرو اور ہیروئن کا بنیادی مسئلہ حل ہو گیا تو ہم نے اطمینان کی سانس لی۔ اب لہری صاحب کی باری تھی۔ لہری صاحب اس وقت شادی شدہ تھے مگر ان کے بیوی بچے کراچی میں رہتے تھے۔ لہری صاحب لاہور میں ہمیشہ کنواروں کی طرح اکیلے ہی رہتے۔ بہت زندہ دل، دلچسپ اور باغ و بہار آدمی تھے۔ قدرت ان پر مہربان تھی۔ ان کی فلمیں اوپر تلے ہٹ ہو رہی تھیں۔ مزاحیہ اداکاروں کی قطار میں اپنے منفرد انداز کی وجہ سے وہ سب سے آگے نظر آتے تھے۔ ہمارے مہربانوں میں تھے۔ اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کی خوش لباسی کی تعریف کیا کرتے

تھے۔ عموماً گفتگو کچھ اس طرح کی ہوتی تھی۔

لہری صاحب ''واہ آفاقی بھائی! بہت اچھا سوٹ ہے۔ٹائی کا بھی جواب نہیں ہے۔جچ رہے ہو آج تو''۔

ہم شکریہ ادا کر کے ان کے لباس کی تعریف کرنے میں لگ جاتے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ لہری صاحب فلمی صنعت کے چند خوش لباس لوگوں میں سے ایک تھے۔اصلی زندگی میں بھی وہ سنجیدہ صورت بنا کر بڑی متانت سے فقرے چست کرتے رہتے تھے۔

کبھی وہ تنقید بھی کرتے ''بہت اچھا سوٹ ہے بھائی صاحب۔مگر ٹائی کا مزہ نہیں آیا''۔

ہم کہتے ''کیوں کیا خرابی ہے اس ٹائی میں ؟''

وہ سوچتے پھر کہتے ''ہوں۔ خرابی تو کوئی خاص نہیں ہے مگر کوئی خوبی بھی نہیں ہے۔ڈیزائن غیر سنجیدہ ہے۔زیب نہیں دیتا آپ کو''۔

ہم ٹائی کو دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتے۔

''ویسے رومال بھی اگر آپ اس کے ساتھ میرون کلر کا ہی لگاتے تو کیا بات تھی۔ خیر یہ بھی گزارہ ہے''۔

ہم مزید سوچ میں پڑ جاتے۔

وہ کہتے ''میرے ایک سوٹ کے ساتھ یہ ٹائی ایسے میچ کرتی ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔میں نے بہت ڈھونڈی مگر کم بخت کہیں نہیں ملی''۔

''تو پھر آپ کی ہماری ٹائی پر نظر ہے؟'' ہم پوچھتے۔

''ارے نہیں بھائی! ٹائیاں تو آنی جانی چیز ہیں۔دوستی اور تعلقات کی بڑی اہمیت ہے''۔

اگر اس وقت کہیں سے اقبال یوسف آنکلتے تو وہ فوراً ہم دونوں کے لباس کا ناقدانہ جائزہ لینا شروع کر دیتے۔

پھر کہتے ''ٹھیک ہے۔اچھا اب ذرا پتلون کا پائنچا اٹھا کر موزے دکھاؤ''۔

ہم دونوں فیشن شو کے ماڈل کی طرح انہیں موزے دکھا دیتے۔

''اوں ہوں''۔وہ منہ بنا کر کہتے ''بس یہیں مار کھا گئے۔یار موزوں پر بھی دھیان دیا کرو،ان کا بھی حق ہے تم پر''۔

اس تنقیدی کلب میں اسلم پرویز بھی ایک ممتاز رکن تھے۔ وہ بے حد جامہ زیب اور خوش لباس، خوش اخلاق اور خوش گفتار آدمی تھے۔ وہ داد تو جی کھول کر دیتے تھے مگر نکتہ چینی کے معاملے میں طرح دے جاتے تھے یا پھر بہت نرم الفاظ میں اس طرف توجہ دلا دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں فلمی صنعت میں بہت اچھا اور خوش گوار ماحول تھا۔ لوگ بھی اچھے اور پیارے تھے اس لئے جی لگا رہتا تھا اور وقت بہت اچھا گزرتا تھا۔

ہم نے لہری صاحب کو ٹیلی فون کیا جوان کے ملازم نے سنا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ وہ بڑے اسٹائل میں رہتے تھے۔ ان کے ملازم بھی بہت شائستہ اور تربیت یافتہ تھے۔ ان کی آنکھ کا اشارہ سمجھتے تھے۔ اتنے مؤدب کہ دیکھ کر پرانے انگریزوں کے بٹلر یاد آجاتے تھے۔

ملازم نے ہمارا نام دریافت کیا اور کہا ''پتا نہیں صاحب، دیکھ کر بتاتا ہوں''۔

ہم نے کہا ''بھائی دو کمروں کا تو فلیٹ ہے۔ کہاں دیکھو گے؟ ویسے ہی کیوں نہیں بتا دیتے کہ وہ ہیں یا نہیں؟''

کہا ''ہولڈ کیجئے'' اور فون رکھ کر غائب۔

چند لمحے بعد لہری بھائی کی آواز سنائی دی۔ ملازم نے انہیں بتایا تھا کہ ساقی صاحب کا فون آیا ہے اور وہ غسل خانے سے بھاگے بھاگے چلے آئے تھے۔ ہمارا نام سنا تو بولے ''اس کم بخت نے ساقی صاحب کا نام بتا دیا تو میں غسل چھوڑ کر بھاگا آیا''۔

ہم نے کہا ''ساقی صاحب کے نام کا غسل سے کیا تعلق ہے؟ اور اگر وہ ہمارا نام بتاتا تو کیا آپ غسل چھوڑ کر نہ بھاگے آتے؟''

سنجیدگی سے کہنے لگے ''اس صورت میں کم از کم تولیا ضرور لپیٹ لیتا''۔

ہم نے گھر پر ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ وہ ایک لمحے کیلئے سوچ میں پڑ گئے پھر کہا ''ٹھیک ہے۔ آپ ابھی آجایئے۔ ناشتا میرے ساتھ ہی کیجئے گا''۔

ہم نے کہا ''گیارہ بج رہے ہیں۔ یہ ناشتے کا کون سا وقت ہے۔ ہم تو ناشتا کر چکے ہیں۔

کہنے لگے ''گیارہ بجے کے ناشتے کی اطبا نے بہت خوبیاں بیان کی ہیں۔ بہر حال۔ آپ آتو جائیں۔ جو دال دلیا ہوگا حاضر

کر دوں گا‘‘۔

’’دال دلیا؟‘‘

’’یعنی چائے سگریٹ وغیرہ‘‘۔

وہ ان دنوں گلبرگ کے ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔کچھ دیر بعد ہم وہاں پہنچے تو وہ سوٹ بوٹ پہنے،ٹائی لگائے دلہا بنے بیٹھے تھے۔چائے کا دور چلا۔ہم نے ان کو اپنی فلم کے بارے میں بتایا اور کہا کہ لہری بھائی۔یہ کردار ہم نے خاص طور پر آپ ہی کو ذہن میں رکھ کر لکھا ہے۔

’’ڈیٹس کب چاہیے؟‘‘ انہوں نے پوچھا

ہم نے سات آٹھ ماہ بعد کی تاریخیں بتادیں۔انہوں نے بڑی نفاست سے سامنے رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی کالے رنگ کی خوبصورت ڈائری اٹھائی۔کچھ دیر اس کا مطالعہ کرتے رہے۔ورق الٹتے رہے۔پھر بولے ’’اوہو،آفاقی صاحب!یہ تو بہت مشکل ہے۔یہ ڈیٹس تو پہلے ہی کسی نے لے رکھی ہیں‘‘۔

ہم نے کہا’’ہمارے علاوہ کون سا فلم ساز ہے جو اتنے عرصے پہلے تاریخیں لے لیتا ہے؟‘‘

فرمایا:

فلم سازوں کی کمی نہیں غالب

ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں

پھر کہا’’کیا آپ یہ ڈیٹس تبدیل نہیں کر سکتے؟‘‘

ہم نے کہا’’ہم ندیم اور روزینہ سے یہی تاریخیں لے چکے ہیں۔یہ تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔اچھا آپ یہ بتائیے کہ یہ تاریخیں آپ نے کون سے فلم ساز کو دی ہیں۔ہم خود ہی ان سے بات کرلیں گے‘‘۔

کہنے لگے ’’آفاقی بھائی! یہ غیر اخلاقی حرکت ہو گی۔قطعی غیر کاروباری حرکت ہو گی کہ میں اس فلم ساز پر دباؤ ڈالنے کیلئے آپ کو اس کا نام بتادوں۔آپ فکر نہ کیجئے۔میں کچھ کرتا ہوں۔ آپ کیلئے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا‘‘۔

ہم ان کے ڈائیلاگ چپ چاپ سنتے رہے اور دل ہی دل میں مسکراتے رہے۔

ہم ان کی عادت سے واقف تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ آپ لہری صاحب سے کوئی تاریخ مانگیں اور وہ یہ نہ کہیں کہ وہ تو پہلے ہی بک ہے۔ ایک صاحب نے لطیفہ بنایا تھا کہ اگر آپ لہری سے قیامت کے دن کی تاریخ بھی مانگیں گے تو وہ یہی جواب دیں گے یہ ڈیٹ تو بک ہو چکی ہے۔ دیکھئے کچھ کروں گا۔

آپ پوچھیں گے ''مگر لہری صاحب۔ یہ تو روز قیامت کی تاریخ ہے۔ اس روز کون شوٹنگ کرے گا؟''

وہ جواب دیں گے ''شوٹنگ تو اس روز فرشتے ہی کریں گے۔ مگر پھر وہی ڈیٹ تو آپ بھی لینے آگئے ہیں۔ کسی دوسرے نے بک کر لی تو قیامت ہو گئی''۔

ہمیں معلوم تھا کہ ''اچھا کروں گا'' کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں مطلوبہ تاریخیں مل جائیں گی۔ چنانچہ ہم نے معاوضے کا ذکر چھیڑا۔

وہ بولے ''آپ کو یاد ہے کہ آپ نے مجھے ''کنیز'' میں جو کچھ بھی دیا تھا میں نے چپ چاپ رکھ لیا تھا ''میرا گھر میری جنت'' کے وقت آپ نے جو آفر کی تھی وہ بھی میں نے چپکے سے قبول کر لی مگر یہ کہا تھا کہ اب اگلی فلم میں آپ مجھے میرا منہ مانگا معاوضہ دیں گے''۔

ہم نے سر ہلا دیا'' بالکل یاد ہے۔ اب آپ اپنا معاوضہ بیان کریں''۔

انہوں نے ایک لمبی تمہید باندھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اداکاروں خصوصاً مزحیہ اداکاروں کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ ان کی مقبولیت کا زمانہ مختصر ہوتا ہے۔ بعد میں کوئی انہیں دو ٹکے کو بھی نہیں پوچھتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے کہا'' لہری صاحب! آمدم بر سر مطلب''!

بولے ''بھائی آپ برا نہ مانیں اگر میں آپ کو زیادہ معاوضہ بتاؤں۔ دینا نہ دینا آپ کی مرضی پر ہے۔ تعلقات پر اثر نہیں پڑنا چاہیے''۔

''بتائیں بتائیں'' ہم نے بے تابی سے پوچھا۔

انہوں نے ایک اتنی بڑی رقم بتا دی جو ہمارے قیاس سے دوگنی تھی اور خاصی زیادہ تھی۔

جواب میں ہم نے بھی ایک دلدوز تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ پاکستان میں فلم ساز ہی وہ بدقسمت شخص ہے جو

کامیاب ترین فلم سے بھی زیادہ منافع نہیں کما سکتا۔ سب کچھ بڑے اداکار یا تقسیم کار سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے کہا ''خیر خیر۔ آمدم بر سرِ مطلب''!

ہم نے جواب میں کہا ''لہری بھائی! اگر ہم آپ کو کم معاوضہ بتائیں تو آپ بھی برا نہ مانئے گا قبول کرنا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے''۔

پھر ہم نے انہیں ان کی مانگ سے نصف معاوضے کی پیشکش کر دی۔ انہوں نے بڑے صبر و سکون کے ساتھ سنا اور پھر بولے '' آفاقی صاحب! معافی چاہتا ہوں۔ مگر دیکھئے آپ ناراض نہ ہونا''۔

ہم نے کہا ''ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ ہم بھی معافی چاہتے ہیں اور التماس ہے کہ ناراض نہ ہونا''۔

اس طرح بے خوشگوار ماحول میں یہ ملاقات ختم ہو گئی۔ مگر ہم ایک نئی پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ لہری صاحب کا کردار فلم میں بہت اہم تھا۔ ان کی باکس آفس ویلیو بھی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم نے ان کو سامنے رکھ کر یہ کردار خاص طور پر ان ہی کیلئے لکھا تھا مگر انہوں نے معذرت چاہ لی۔ اب کیا کریں؟

اسی فکر میں ڈوب ہوئے ہم اپنے دوست شباب کیرانوی صاحب کے دفتر پہنچ گئے۔

''کیا بات ہے آفاقی۔ کس سوچ میں ہو؟''

ہم نے انہیں اپنا مسئلہ بتایا تو وہ ہنسنے لگے ''یار تیرا ابھی جواب نہیں ہے۔ یہ کون سا اتنا بڑا مسئلہ ہے''۔

''تو پھر اس کا حل بتائیں''

''بتا دیں گے، سوچ کر بتائیں گے۔ مہلت تو دو۔ لو چائے تو پیو''۔ چائے پیتے پیتے انہیں ایک برین ویو آ گئی۔ کہنے لگے ''سنو آفاقی! تم اس کریکٹر کیلئے قوی کو کیوں نہیں لے لیتے؟''

قوی کو ہم نے ٹی وی ڈراموں میں دیکھا تھا۔ چند فلموں کے سیٹ پر بھی ان سے ملاقات ہوئی۔ انتہائی ملنسار اور خوش اخلاق آدمی تھے۔ ان کی اداکارانہ صلاحیتوں کے بھی ہم قائل تھے مگر مزاحیہ کردار اور وہ بھی لہری صاحب کا متبادل۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

شباب صاحب نے کہا ''آفاقی نوٹ کر لو۔ ایک دن قوی بہت بڑا آرٹسٹ بنے گا۔ کامیڈی بھی وہ اچھی کر سکتا ہے۔

میری فلموں میں کام کر رہا ہے۔ کہو تو بلا لوں۔ بہت اچھا لڑکا ہے“۔

ہم نے کہا ”مگر شباب صاحب ہم نے یہ کردار لہری صاحب کیلئے لکھا ہے“۔

انہوں نے ایک پڑیا میں سے پان نکال کر کھایا۔ سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سنہری لائٹر سے سلگائی پھر کہنے لگے ”یار ایک بات تو بتاؤ۔ یہ مکالمے وغیرہ تم خود ہی لکھتے ہو یا کسی اور سے لکھواتے ہو؟“

ہم نے کہا ”یہ کیا بات ہوئی۔ یہ بات تمہیں نہیں معلوم ہے؟“

بولے ” اگر تم خود ہی لکھتے ہو تو پھر کیا پرابلم ہے۔ بھئی قوی کے مطابق ان میں ترمیم اور ردوبدل کر لو۔ یار تم نئی کاسٹ لے کر فلم بنا رہے ہو۔ لہری کو اتنے پیسے دو گے تو کیسے کام چلے گا“۔

ہم نے فکر مند ہو کر پوچھا ”یار قوی کی کامیڈین کے طور پر کوئی مارکیٹ نہیں ہے۔ لہری کا بڑا نام ہے۔ کافی فرق پڑتا ہے“۔

بولے ” پڑتا تو ہے مگر بجٹ پر بھی کافی فرق پڑتا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ تمہاری فلم میں قوی بھی کامیڈین بن جائے گا۔ وہ بہت اچھا آرٹسٹ ہے۔ آدمی بھی شریف ہے“۔

”ہاں۔ یہ تو ہے“۔ ہم نے کہا ”کتنے پیسے لے لے گا“۔

”یار تم اس سے بات تو کرو۔ پیسوں کا کیا ہے۔ لہری کے مقابلے میں بہت کم لے گا۔ جو بھی دو گے مان جائے گا۔ بہت لحاظ مروت والا آدمی ہے“۔

”پھر بھی؟“

”یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے تم اپنا ذہن تو بناؤ“۔

ہم چند منٹ سوچتے رہے۔ پائپ سلگایا۔ چائے کی ایک اور پیالی پی۔ دل تو نہیں مان رہا تھا مگر لہری صاحب نے معاوضہ بہت زیادہ مانگ لیا تھا اور ان کی جو بات ہمیں اچھی نہیں لگی وہ یہ تھی کہ بڑے آرام سے کہنے لگے ”آفاقی صاحب آپ کے فائدے کی بات ہے۔ اتنے میں بھی آپ نقصان میں نہیں رہیں گے۔ میری مانیں تو مجھے سائن کر کے رکھ لیں۔ آٹھ مہینے بعد یہ ایگری منٹ کسی اور کو بیچ دیں گے تو بھی فائدے میں رہیں گے“۔

ہم نے کہا ''لہری بھائی ! اگر یہی کام کرنا ہو تو کوئی پلاٹ نہ خرید لیں جس کی قیمت لازمی طور پر بڑھتی رہتی ہے''۔

سچ تو یہ ہے کہ لہری بھائی سے ہمیں یہ امید نہ تھی کہ ہمارا اتنا بھی لحاظ نہیں کریں گے۔ان سے تو ہم نے یہی کہا تھا کہ ہم ان کی بات کا بالکل برا نہیں مانیں گے مگر درحقیقت ہمیں ان کی یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔چند منٹ غور کرنے کے بعد ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اس کردار کیلئے قوی بھی موزوں رہیں گے۔اگرچہ لہری والی بات شاید نہ ہو۔

شباب صاحب نے ہماری طرف دیکھا۔ ٹیلی فون اٹھایا اور ہم سے کچھ پوچھے بغیر ہی قوی کو فون ملانے لگے۔کہتے ہیں کہ گہرے دوستوں کے درمیان ٹیلی پیتھی کا رابطہ ہوتا ہے۔ہم نے کئی بار آزمایا اور اس بات کو درست ہی پایا۔

ہمارے وہاں بیٹھے بیٹھے ہی قوی صاحب آ گئے۔ان سے ملاقات تو تھی۔علیک سلیک بھی ہو جاتی تھی مگر بے تکلفی نہیں تھی۔وہ بہت تکلف کرنے والے آدمی ہیں۔بعد میں جب ان سے بہت زیادہ بے تکلفی ہو گئی اور زیادہ ملنا بھی ہوا پھر بھی انہوں نے اپنی وضع نہیں چھوڑی۔ باتیں وہ کم کرتے ہیں۔زیادہ تر دوسروں کی سنتے رہتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں۔بہت خوب آدمی ہیں۔

ہم نے انہیں اپنی کہانی اور ان کے کردار کے بارے میں بتایا۔وہ حسبِ عادت خاموشی اور توجہ سے سنتے رہے۔آخر میں پوچھنے لگے '' شوٹنگ کب کریں گے ؟''

ہم نے بتایا ''آٹھ مہینے بعد''۔

''ٹھیک ہے مجھے ڈیٹس لکھوا دیجئے''۔

ہم نے انہیں ڈیٹس لکھوا دیں۔انہوں نے معاوضے کی بات نہیں کی۔

آخر ہم نے شباب صاحب سے کہا ''معاوضے کا فیصلہ آپ کر دیجئے''۔

شباب صاحب نے ایک رقم بتائی اور پوچھا ''کیوں قوی ! ٹھیک ہے ؟''

قوی صاحب مسکرائے ''جی بالکل ٹھیک ہے''۔

لیجئے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ مگر بات ختم نہیں ہوئی۔لہری صاحب نے یوں تو ایک طرح سے ہمیں جواب ہی دے دیا تھا مگر وہ کردار ان کے دل میں بس گیا تھا۔کچھ عرصے بعد جب ہمایوں مرزا صاحب کو ہم نے اس فلم کی ہدایت کاری

کے فرائض سونپے تو انہیں اداکاروں کے بارے میں بھی بتایا۔

دو دن بعد مرزا صاحب ہم سے ملے اور بولے ”آفاقی صاحب! آپ کامیڈی کیریکٹر کیلئے لہری کو کیوں نہیں لیتے؟“

ہم نے انہیں سارا قصہ سنایا۔

وہ کہنے لگے ”ہم نے لہری سے بات کی ہے۔ وہ آپ کیلئے رعایت کر دے گا“۔

ہم نے کہا ”مگر ہمایوں صاحب! اب تو یہ ممکن نہیں ہے۔ قوی سے بات کر چکے ہیں“۔

”کیا اس سے ایگری منٹ سائن کیا ہے۔ ایڈوانس دیا ہے؟“

”نہیں تو مگر۔۔۔“

”تو پھر کیا پرابلم ہے۔ لہری کو ہم آپ کے بجٹ کے مطابق راضی کر لیں گے“۔

ہم نے کہا ”جو ہونا تھا ہو چکا۔ ہم قوی کو زبان دے چکے ہیں۔ ان سے ڈیٹس لے چکے ہیں۔ اب اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی“۔

ہمایوں مرزا صاحب اس کے بعد بھی ہمیں لہری صاحب کو کاسٹ کرنے کے بارے میں رضامند کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کی دلیلوں میں وزن بھی تھا۔ جب ہم لہری اور قوی کا اس مزاحیہ کردار میں موازنہ کرتے تو پلڑا لہری صاحب کے حق میں جھک جاتا تھا۔ مگر ہم اپنے وعدے پر قائم رہے۔ جب قوی نے شوٹنگ میں حصہ لیا تو ہمارے اندیشے اور وسوسے دور ہو گئے۔ لہری صاحب کو ہم سالہا سال سے مزاحیہ کرداروں میں دیکھتے رہے تھے۔ ان کی اداکاری اور مکالمے بولنے کا انداز ہمارے ذہن میں نقش ہو چکا تھا اس لیے شوٹنگ کے دوران میں بھی ہم دل ہی دل میں پچھتاتے رہے۔ مگر جب رش پرنٹ تیار ہوئے اور قوی صاحب کو اسکرین پر دیکھا تو سیروں خون بڑھ گیا۔ قوی نے یہ کردار بہت خوب اور مہارت سے ادا کیا تھا اور بعد میں فلم بینوں نے بھی انہیں بہت سراہا۔ یہاں تک کہ لہری صاحب نے بھی ہم سے قوی کی اداکاری کی تعریف کی۔ ”سزا“ قوی کی فلمی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی لے کر آئی۔ اس کے بعد انہوں نے اور بھی کئی فلموں میں مزاحیہ اداکاری کی اور دیکھنے والوں سے داد حاصل کی۔

قوی کے ساتھ کام شروع ہوا تو ملاقاتیں بھی بڑھ گئیں۔ ہم اکثرانہیں شوٹنگ کیلئے اپنے ساتھ کار میں لے جایا کرتے تھے۔راستے میں ہر طرح کی گپ شپ ہوتی رہتی تھی۔ہم نے محسوس کیا کہ وہ بات کرنے کے معاملے میں بہت کنجوس واقع ہوئے ہیں۔وہ ان معدودے چند لوگوں میں سے ہیں جنہیں بولنے کے مقابلے میں سننے کا زیادہ شوق ہے۔وہ بڑے صبر وسکون سے گھنٹوں خاموش بیٹھے دوسروں کی باتیں سن سکتے ہیں۔ کبھی مسکرادیں گے۔ کبھی پریشانی یاحیرت کااظہار کریں گے۔ کبھی ”ہوں ہوں“ بھی کرتے رہیں گے کبھی کوئی سوال کردیں گے۔بس بات چیت میں ان کا حصہ صرف اتناہی ہوتاہے۔وہ ایک ہمدرداور مخلص آدمی ہیں۔دوسروں کی مدد کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

”سزا “کی فلم بندی کے دوران میں ہمیں مالی مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا بھی کرناپڑا۔اس کا سبب بھی ہمارے ایک پرانے دوست تھے۔انہوں نے ہمیں یہ تاثر دیا تھا کہ جوں ہی یہ فلم سیٹ پر جائے گی وہ اس کے حقوق کراچی کیلئے خرید لیں گے۔ہم نے تھوڑے بہت سرمائے سے فلم کاآغاز توکردیامگرانہوں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔یہاں تک کہ فلم نصف سے زائد بن گئی اور ہمیں پیسے کی کمی تنگ کرنے لگی۔کئی تقسیم کاروں نے وعدے توکیے تھے مگر فلمی دنیا کے دستور کے مطابق انہیں پورا نہیں کیا۔ایک بار ہم قوی کو شوٹنگ کیلئے اپنی کار میں لے کر جارہے تھے پیسے کی کمی نے ہمیں پریشان کررکھا تھااور ہم حسبِ عادت اونچی آواز میں سوچ رہے تھے۔یعنی اپنی پریشانیاں بیان کررہے تھے۔ اس وقت تک قوی سے ہماری زیادہ بے تکلفی نہیں ہوئی تھی۔وہ اپنی عادت کے مطابق چپ چاپ ہماری کتھا سنتے رہے پھراچانک کہنے لگے ”آفاقی صاحب ! میرے پاس زیادہ پیسے تو نہیں ہیں۔لیکن جو بھی ہیں آپ لے لیجئے اوراپنا کام چلائیے“۔

ہم نے پوچھا ”آپ کے پاس کتنے پیسے ہیں؟“

بولے ”دوڈھائی ہزار توہوں گے۔تھوڑے سے پرائز بونڈ بھی ہیں۔آپ یہ سب لے لیجئے“۔

ہمیں ان پر بہت پیار آیا۔ان کا یہ خلوص اور ہمدردی ہم کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

یہ ۱۹۷۰ء کازمانہ تھا۔جس وقت یہ باتیں ہورہی تھیں ہم اس وقت اسٹوڈیو جانے کیلئے میانی صاحب کے قبرستان کے

درمیانی سڑک سے گزر رہے تھے۔ قوی صاحب اپنی عادت کے مطابق سمٹے سکڑے ہوئے اگلی سیٹ پر ہمارے ساتھ ہی بیٹھے تھے ان کے چہرے کا وہ پر خلوص تاثر اور ان کی آواز کا اپنا پن ہمیں آج بھی اسی دن کی طرح یاد ہے۔

ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا ''قوی صاحب۔ ہمیں تو زیادہ پیسوں کی ضرورت ہے''۔

وہ ایک آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔ پھر بولے ''جو رقم ہے وہ تو لے لیجئے۔ کچھ نہ کچھ کام تو نکل ہی جائے گا''۔

ان کا کہنا بجا تھا۔ اس زمانے میں فلم کی ایک دن کی شوٹنگ کے اخراجات ایک سو روپے میں پورے ہو جاتے تھے۔ یہ ڈھائی ہزار روپیہ ہمارے بہت سے چھوٹے چھوٹے مسائل حل کر سکتا تھا مگر ہم نے شکریے کے ساتھ ان کی پیش کش قبول کرنے سے معذرت کر دی حالانکہ ہم بے حد پریشان تھے۔ جن لوگوں کو رقم دینے کا وعدہ کیا تھا ان کی تاریخیں نزدیک آ رہی تھیں اور ہم نماز کے بعد گڑ گڑا کر اللہ سے دعا کرتے تھے کہ وہ ہمیں وعدے پورے نہ کرنے کی رسوائی سے بچالے۔

اللہ بہت مسبب الاسباب ہے۔ خود ہمارا ذاتی تجربہ اس کا شاہد ہے۔ ان ہی دنوں ایک روز ہم اپنے گھر کی الماری میں پرانے کاغذات تلاش کر رہے تھے۔ کہ ایک لفافے میں پندرہ ہزار روپے کے نئے اور کرارے نوٹوں کی گڈیاں نظر آئیں تو ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یوں لگا جیسے خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ یہ پندرہ ہزار روپے ہماری بہت سے فوری ضرورتیں پوری کر سکتے تھے۔ خوشی کے مارے ہمارے ہاتھ پیر پھول گئے۔ بہت سوچا کہ کیسے یہ رقم کس طرح ان کاغذوں میں آگئی۔ بعد میں یاد آیا کہ فلم ''کنیز'' کے زمانے میں ہم نے یہ نوٹ اپنی دانست میں گم کر دیے تھے اور صبر کر کے بیٹھ رہے تھے۔ اس وقت یہ ہمارے ہاتھ لگتے تو فضول خرچی کی نذر ہو جاتے مگر یہ ایک ایسے نازک مرحلے پر ہمیں دستیاب ہوئے کہ یہ پندرہ ہزار ہمارے لئے بہت بڑی رقم تھی۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ قوی صاحب نے اپنی مفلسی کے باوجود اس وقت ہمیں جس فراخ دلی سے اپنا تمام سرمایہ دینے کی آفر کی تھی اس کی اہمیت ہم ہی جانتے ہیں یا ہمارا دل۔

ماں کے مرکزی کردار کیلئے ہمیں ایسی اداکارہ کی ضرورت تھی جو فلم کے ابتدائی حصے میں جوان اور خوبصورت نظر آئے۔ اداکارانہ صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی یہ ایک مشکل کردار تھا۔ فلم ''کنیز'' میں ہم صبیحہ خانم کو ایک ایسے ہی

کردار میں لے چکے تھے۔ان کے ساتھ ان کے شوہر کا ایک مختصر کردار سنتوش صاحب نے بھی ادا کیا تھااور ''کنیز'' کے اس کردار نے صبیحہ خانم کی اداکاری کا ایک نیااور عظیم روپ فلم بینوں کے سامنے پیش کیا تھا۔'' سزا'' میں بھی ہم ایسے ہی مسئلے سے دوچار تھے۔فرق یہ تھا کہ اس فلم میں شوہر کا کردار آخر تک موجود تھااور ابتدائی حصہ شوخ اور رومانٹک تھا۔ صبیحہ خانم اس وقت تک ایسے کردار کرنے میں ماہر ہو چکی تھیں مگر مشکل یہ تھی کہ انہوں نے ایک ہی انداز کا یہ کردار بے شمار فلموں میں ادا کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے کوئی نیا رنگ و روپ نہیں دے سکتی تھیں۔مگر ہمیں ان کے سوا کوئی دوسری اداکارہ اس کردار کیلئے موزوں نظر نہ آئی۔چنانچہ ہم ایک بار پھر ان کے گھر پہنچ گئے۔مشکل یہ تھی کہ فلم کے ابتدائی حصے میں بھی صبیحہ خانم شگفتہ اور جوان العمر نظر نہیں آسکتی تھیں۔پھر ان کی یہ شرط بھی تھی کہ ان کے ساتھ رومانی کردار سنتوش صاحب کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔یہ بھی ایک سخت پابندی تھی۔لیکن مرتا کیانہ کرتا۔ہم نے کہانی سنا کر انہیں متاثر کر لیااور انہوں نے ہامی بھر لی۔پھر پوچھا''شوہر کا کردار کون کرے گا؟'' ہم سوچ میں پڑ گئے۔پھر کہا'' بھابی۔کہانی آپ نے سن لی ہے۔آپ خود اندازہ لگا سکتی ہیں کہ سنتوش صاحب اس کیلئے موزوں نہیں رہیں گے''۔

مسکرا کر بولیں ''یہ تو صحیح مگر آپ کو شرط تو معلوم ہے؟''

ہم نے کہا''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اس بار کچھ رعایت کر دیں اور کسی دوسرے اداکار کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں''۔

وہ کہنے لگیں ''آفاقی صاحب آپ تو جانتے ہیں کہ فلمی دنیا میں بھیڑ چال ہے۔ اگر ایک بار میں نے ایسا کر لیا تو پھر ہر کوئی اس راہ پر چل پڑے گا۔آپ تو جانتے ہیں کہ مجھے اس طرح کام کرتے ہوئے جھجک ہو گی۔آپ اس کردار کیلئے کوئی اور ایکٹریس کیوں نہیں ڈھونڈ لیتے''!

ہم نے کہا'' آپ ہی بتا دیں کہ اس ''ینگ ٹو اولڈ'' کیریکٹر کیلئے اور کون سی اداکارہ موزوں ہو گی؟''

وہ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر ہنس کر بولیں ''بھئی یہ تو آپ فلمسازوں کا کام ہے۔میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا''۔

مجبوراً ہم نے صبیحہ بھابی اور سنتوش صاحب کو ان دونوں کرداروں کیلئے چن لیا اور زبانی امور طے پا گئے۔

انگریزی کا ایک محاورہ ہے جس کا ترجمہ ہے کہ انسان جو سوچتا ہے اور اللہ اسے مسترد کر دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔

جب ہماری شوٹنگ کا وقت نزدیک آیا تو معلوم ہوا کہ صبیحہ خانم اور سنتوش صاحب سعید ہارون صاحب کی فلم ''لاڈلا'' کی فلم بندی کیلئے کراچی گئے ہوئے ہیں اور کافی دنوں کے بعد ہی واپس آئیں گے۔ ہماری شوٹنگ سر پر آگئی تھی۔ ہم نے پریشان ہو کر سنتوش صاحب کو کراچی ٹیلی فون کیا تو وہ حسبِ معمول مذاق کرنے لگے ''مولانا کچھ صبر کرنا بھی سیکھیں ''لاڈلا'' کی شوٹنگ اٹک کر رہ گئی ہے۔ اسے ختم کیے بغیر ہم دونوں نہیں آسکیں گے''۔

ہم نے کہا ''مگر سنتوش صاحب۔ ہمای تو شوٹنگ ہونے والی ہے''۔

بولے ''آپ فلم ساز ہیں ''سزا'' بنا رہے ہیں۔ فلم دیکھنے والوں کو سزا دینے سے پہلے کچھ سزا آپ خود بھی بھگتیں''۔

ہمارے اصرار پر انہوں نے کہا کہ وہ سعید ہارون صاحب اور ان کے ڈائریکٹر سے بات کر کے یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے حل ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ان کی فلم ختم کیے بغیر ان دونوں کا لاہور آنا مشکل ہے۔

حسبِ معمول ہمارے ہوش اڑ گئے۔ گھبرائے ہوئے شباب صاحب کے پاس پہنچے اور انہیں صورتحال سے آگاہ کیا۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے '' آفاقی تم اس کردار میں نیر سلطانہ کو کیوں نہیں کاسٹ کرتے؟''

ہم نے کہا ''بھائی آپ جانتے ہیں کہ شادی کے بعد انہوں نے اداکاری ترک کر دی ہے۔ اب کیسے مان لیں گی؟''

بولے '' یار بات تو کر کے دیکھو۔ درپن صاحب کی فلمیں فلاپ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ آج کل خاصے پریشان ہیں۔ اور پھر نیر بھابی نے اداکاری نہ کرنے کی قسم تو نہیں کھائی تھی۔ یہ کریکٹر بہت اچھا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ رضامند ہو جائیں''۔

ہم خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے۔

وہ کہنے لگے ''یار تم ہمت تو کرو۔ نوٹ کر لو۔ وہ مان جائیں گی۔ اس طرح میرا کام بھی ہو جائے گا''۔

''وہ کیسے؟''

بولے ”میری فلم ”افسانہ زندگی کا“ میں بھی ایک ایسا کردار ہے جو نیر سلطانہ ہی کرسکتی ہیں۔ وہ تمہاری فلم میں کام کرنے پر آمادہ ہوگئیں تو پھر میری فلم میں بھی کام کرلیں گی“۔

قصہ مختصر یہ کہ ہم اسی روز ٹیلی فون کرکے درپن صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ وہ ان دنوں شاہ جمال میں ایک کوٹھی کے بالائی حصے میں رہتے تھے۔ ان کے دونوں بیٹے بہت چھوٹے تھے اور کمرے میں شرارتیں کرتے پھر رہے تھے۔ ان کے مالی حالات کی خرابی کا ہمیں علم تھا مگر ان کے گھر میں اس کا کوئی اثر نظر نہیں آیا۔ یہ ایک خوشحال اور خوش باش گھر تھا۔ درپن صاحب اور نیر بھابی کی محبت مثالی تھی۔ ہم اسٹوڈیو۔ میں ان دونوں سے ملتے رہے تھے مگر اس گھر میں جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔

درپن صاحب ہمیں آفائی صاحب کہا کرتے تھے، بولے ”آفائی صاحب۔ خدا خیر کرے۔ آج کیسے راستہ بھول پڑے؟“

نیر بھابی نے چائے کا بندوبست کر دیا تھا اور وہ بھی برابر والے صوفے پر بیٹھی شرارت سے مسکرا رہی تھیں۔ یہ شریر مسکراہٹ ہمیشہ ان کے چہرے پر موجود رہتی تھی۔

ہم ان کے گھر تیار ہو کر گئے تھے۔ فوراً حرف مدعا زبان پر لے آئے۔ ”درپن صاحب ہمیں آپ کی بیگم کی ضرورت ہے“۔

وہ مصنوعی حیرت سے بولے ”یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ میری بیوی کی آپ کو کیوں ضرورت پڑ گئی۔ کیا کسی لڑکی سے شادی کیلئے سفارش کرانی ہے؟“

اس وقت تک ہم کنوارے تھے اور ایک دو ہیروئنوں کے ساتھ ہماری بے تکلفی کی وجہ سے فلم انڈسٹری میں اسکینڈلز بھی بن رہے تھے۔

ہم نے کہا ”درپن صاحب! ہم ایک فلم بنا رہے ہیں جس میں مرکزی کردار بھابی نیرّ کر رہی ہیں“۔

حیران ہو کر بولے ”کیا کر رہی ہیں؟ کیا مطلب ہے؟ بھائی یہ تو صرف گھریلو بیوی کا کردار کر رہی ہیں۔ فلموں میں کام نہیں کرتیں“۔

ہم نے انہیں اپنی فلم کی کہانی سنائی۔ نیر بھابی کے کردار کے بارے میں تفصیل سے بتایا پھر سنتوش صاحب اور صبیحہ بھابی کے سلسلے میں درپیش مشکل کا بھی تذکرہ کر دیا۔

''اب آپ کیا چاہتے ہیں؟'' انہوں نے ساری داستان سننے کے بعد پوچھا۔

ہم نے کہا''آپ سمجھ گئے ہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ دیکھئے درپن صاحب۔ ہم ایک مشن پر آئے ہیں اور اسے پورا کیے بغیر نہیں جائیں گے''۔

پہلے تو وہ دونوں راضی ہی نہیں ہو رہے تھے۔ ہم نے منت سماجت، خوشامد، دوستی تعلقات کا واسطہ دیا۔ دھمکیاں بھی دیں کہ ساری زندگی کیلئے تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ دونوں پریشانی سے ہمیں اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

درپن صاحب نے کہا''مگر بھابی اور بھائی جان''۔

ہم نے کہا''بتایا ہے کہ انہوں نے قریباً انکار ہی کر دیا ہے۔ یقین نہیں ہے تو ابھی فون پر تصدیق کر دیتے ہیں''۔ یہ کہہ کر ہم نے فون اٹھا کر کراچی کال بک کرا دی۔

درپن صاحب حیران بیٹھے دیکھتے رہے۔ ''مگر آفاقی صاحب۔۔۔''

ہم نے نیر بھابی سے کہا''بھابی آپ ہی کچھ سفارش کر دیجئے کوئی تو ہمارا ساتھ دے''۔

وہ ہنسنے لگیں''آفاقی صاحب میں اپنے شوہر کے مقابلے میں کسی اور کا ساتھ کیسے دے سکتی ہوں؟ آخر ایک مشرقی عورت ہوں''۔

کراچی کی ٹرنک کال مل گئی تو ہم نے سنتوش صاحب کو جلدی جلدی صورتحال بتائی اور کہا''اب آپ درپن صاحب سے کہہ دیجئے ورنہ یہ نہیں مانیں گے اور ہمارا کباڑا ہو جائے گا'' یہ کہہ کر ہم نے ٹیلی فون کا ریسیور درپن صاحب کے حوالے کر دیا۔

چند ہی منٹ میں یہ مسئلہ حل ہو گیا۔

''اب کیا اعتراض ہے؟'' ہم نے پوچھا۔

وہ کہنے لگے ''بھائی جان کی سفارش کا مطلب یہ تو نہیں ہے میں مان گیا ہوں''۔

ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

نیر بھابی نے کہا ''میں تازہ چائے لے کر آتی ہوں'' اور رخصت ہو گئیں۔

درپن صاحب کو شاید ہم پر ترس آ گیا تھا۔ نرمی سے بولے ''مگر آفاقی صاحب اگر نیر ّ اس فلم میں کام کریں گی تو ایک شرط پر''۔

ہم نے کہا ''منظور، آپ ان کے ساتھ ہوں گے''۔

شاید انہیں توقع نہیں تھی کہ ہم فوراً مان جائیں گے۔ کہنے لگے ''چلئے۔ یہ بھی طے ہو گیا۔ اب ایک بات ہماری بھی مان لیجئے''۔

ہم نے کہا ''آپ کی ساری باتیں تو مان لی ہیں''۔

''وہ تو بھائی چاری کی باتیں تھیں۔ یہ بات میں اداکار کی حیثیت سے کر رہا ہوں''۔

''ارشاد''!

''فلم کے ابتدائی حصے میں آپ نے کچھ رومانی مناظر اور گانا وغیرہ بھی رکھا ہے یا ہم دونوں کی قسمت میں رونا دھونا رہ گیا ہے؟''

''سزا'' میں نیر ّ سلطانہ نے شادی کے طویل عرصے بعد کام کیا تھا اور ہنر مندی سے کام کیا کہ اس کردار کا حق ادا کر دیا۔ کسی زمانے میں انہیں ''ملکہ جذبات'' کا لقب دیا گیا تھا۔ ہم نے جھاڑ پونچھ کر یہ لقب دوبارہ نکال اور انہیں پھر ملکہ جذبات کہنا شروع کر دیا۔ کچھ دن تو وہ سنتی رہیں پھر ایک دن لڑنے پر آمادہ ہو گئیں ''یہ ملکہ جذبات کی کیا رٹ لگا رکھی ہے آپ نے؟''

ہم نے کہا ''آپ کی اداکاری کو دیکھ کر اس کے سوا کوئی دوسرا لقب نہیں سوجھتا۔ اگر یہ پسند نہیں ہے تو ہم کوئی اور خطاب تلاش کریں؟''

وہ ہنسنے لگیں ''باز آجائیں مجھے یکسوئی سے کام کرنے دیں۔ میں ویسے بھی آؤٹ آف پریکٹس ہوں''۔

نیرّ سلطانہ نے اس فلم میں بہت دل لگا کر توجہ سے کام کیا۔اسکرپٹ کی ایک کاپی وہ اپنے ساتھ ہی لے گئی تھیں اور جب کوئی ڈرامائی منظر فلمانے کا موقع آتا تو وہ خود پر یہ موڈ اور کیفیت طاری کر لیتی تھیں۔اس فلم کے ڈرامائی اور المیہ مناظر میں انہوں نے آنسو بہانے کیلئے کبھی گلیسرین کا سہارا نہیں لیا۔کچھ سین ایسے بھی تھے کہ شوٹنگ پر موجود لوگ بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔وہ صحیح معنوں میں ایک عظیم اداکارہ تھیں۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ فلم ''سزا'' کی تمام داستان ہم نے سنادی مگر اس فلم میں ندیم کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ان کے بجائے ایک نئے ہیرو کو ہم نے ''سزا'' میں متعارف کرایا تھا جس کا نام جمیل تھا۔ان کا نام تو دراصل جمال تھا مگر ان ہی دنوں اتفاق سے دلجیت مرزا نے بھی اپنی ایک فلم میں ایک نیا ہیرو پیش کر دیا۔اس کا نام بھی جمال تھا۔ان کے ہیرو کی تصویریں اور خبریں پہلے شائع ہو چکی تھیں۔اس لیے کوئی جھگڑا کرنے کے بجائے ہم نے اپنے ہیرو کا نام بدل کر جمیل کر دیا اور وہ پاکستان کی فلمی دنیا میں اسی نام سے مشہور ہوئے۔

مگر ندیم کی جگہ جمیل کیوں اور کیسے آگئے؟ یہ بھی ایک دکھ بھری داستان ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ساری دنیا میں فلم بنانے والوں کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ہمارے ملک کے فلم سازوں کے حصے میں کاتب تقدیر نے کچھ زیادہ ہی دکھ لکھ دیے ہیں۔اس کی مختلف وجوہات ہیں جن میں سر فہرست اداکاروں کی کمی کا مسئلہ ہے۔ہمارے فلم سازوں کی نصف سے زیادہ پریشانیاں اور مسائل اسی سبب سے جنم لیتے ہیں۔ان کی بے پناہ مصروفیت اور بھاگ دوڑ کی وجہ سے ہدایت کاروں کو اطمینان اور فراغت سے کام کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔یہی وجہ ہے کہ ہماری فلموں کا معیار دوسرے ملکوں کی فلموں کے مقابلے میں کم ہے۔وجہ صاف ظاہر ہے۔بھارت کی فلمی صنعت میں درجنوں ہیرو اور ہیروئن موجود ہیں اور ان کی آمد کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہے۔وہاں فلمیں بھی زیادہ بنائی جاتی ہیں۔مگر جس زمانے میں پاکستان میں ہر سال سو سوا سو سے زائد نہ تھی کیونکہ وہاں دوسری زبانوں میں بھی کافی تعداد میں فلمیں بنائی جاتی ہیں مگر ان فلموں میں کام کرنے کیلئے ان کے پاس ہم سے دس گنا زیادہ اداکار تھے۔اس سے دونوں کا فرق ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

اب ندیم صاحب کی داستان بھی سن لیجئے۔ ہم نے کافی عرصہ پہلے ان سے ''سزا'' کی تاریخیں لی تھیں اور بہت مسرور و مطمئن تھے۔اس کے گرد ہم نے تانے بانے بُن کر دوسرے اداکاروں کا انتخاب کیا تھا مگر اس فلم میں مرکزی کردار ہیرو ہی کا تھا۔ ساری کہانی اسی کے گرد گھومتی تھی۔

جب ہماری فلم کی شوٹنگ میں تھوڑا وقت رہ گیا تو ایک روز شمیم آرا نے ہمیں یہ روح فرسا خبر سنائی کہ سنا آپ نے، بیگ صاحب نے (ندیم کا نام نذیر بیگ ہے اور ان کے قریبی لوگ انہیں بیگ صاحب ہی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں) ان کی اور ہماری دونوں فلموں کی تاریخیں الٹ پلٹ کر دی ہیں اور بعض دوسرے فلم سازوں کو دے دی ہیں۔

ان ہی دنوں فلم ساز اقبال شہزاد نے محمد علی اور ندیم کو اپنی فلم ''بازی'' میں پہلی بار ایک ساتھ پیش کرنے کا اعلان کیا تھا۔اس فلم میں ایک نئی ہیروئن '' نشو'' کو بھی متعارف کرایا جارہا تھا۔اقبال شہزاد سے ہمارے بہت گہرے تعلقات تھے۔ان کی کوئی بات ہم سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔انہوں نے نشو کو چھوٹے موٹے کردار ادا کرنے والی لڑکیوں کے جمگھٹے میں سے چن کر فلم کی ہیروئن بنانے کا فیصلہ کیا تھا اور انہیں پاکستان کے دو بہت بڑے اداکاروں کے ساتھ پیش کرنے کا تجربہ کر رہے تھے۔ نشو کو اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے بات چیت کرنے، لباس پہننے اور میک اپ کرنے کی تربیت کا بطور خاص اہتمام کیا گیا تھا۔انہیں اداکاری اور مکالمے بولنے کا فن سکھانے کیلئے بھی کافی محنت کی جارہی تھی۔ یہ سب باتیں ہمارے علم میں تھیں۔

ایک روز ہمیں شہزاد صاحب نے فون کیا اور خوش خبری سنائی کہ انہوں نے ''بازی'' کیلئے ندیم کو بھی سائن کر لیا ہے اور اس فلم میں محمد علی اور ندیم ایک ساتھ کام کریں گے۔ اس خبر نے فلمی دنیا میں ہلچل مچادی تھی اور اس فلم کی مانگ میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔اسی شام اقبال شہزاد نے ہمیں ساری تفصیل سنادی اور بتایا کہ انہوں نے بطور خاص ڈھاکا جاکر ندیم سے ایگری منٹ سائن کیا ہے اور عنقریب ان کی فلم کی شوٹنگ کا آغاز ہو گا۔ ہم نے انہیں دل کھول کر مبارک باد دی مگر اس وقت ہم کو یہ علم نہیں تھا کہ ندیم نے ہماری فلم کی تاریخیں اقبال شہزاد کو دے دی ہیں۔

شمیم آرا کی زبانی یہ سن کر ہم حیران رہ گئے ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

وہ بولیں ''بس ان کی مرضی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میرے اور چند دوسرے فلمسازوں کے ساتھ بھی انہوں نے یہی

سلوک کیا ہے''۔

اتفاق سے ان دنوں ندیم جو کراچی، لاہور اور ڈھاکا کے چکّروں میں رہتے تھے، لاہور ہی میں تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی شمیم آرا کے دفتر میں آگئے اور اس خبر کی تصدیق ہو گئی۔ ان کا بیان تھا کہ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر انہیں ایسا کرنا پڑا۔ پھر بولے ''مگر آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کو دوسری ڈیٹس دے دوں گا''۔

ہم نے کہا'' مگر آپ نے ہماری اتنے عرصے پہلے سے لی ہوئی ڈیٹس اقبال شہزاد کو کیوں اور کس لیے دے دیں؟''

وہ مسکرائے اور خوش دلی سے بولے ''آفاقی صاحب! شہزاد صاحب نے تو آپ سے بھی پہلے معاہدہ کر رکھا تھا''۔

ہم نے کہا'' بیگ صاحب! اقبال شہزاد نے کب اور کہاں معاہدہ کیا ہے یہ ہمیں معلوم ہے۔ کہئے تو معاوضے کی رقم بھی بتادیں؟''

وہ پریشان سے ہو گئے مگر یقین دلایا کہ وہ بہت جلد ہمیں دوسری تاریخیں دے دیں گے۔ دوسرے ہی دن وہ کراچی جا رہے تھے۔ چند روز کے بعد واپس آنے والے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ لاہور پہنچتے ہی وہ ہمیں نئی تاریخیں بتادیں گے۔ ہمیں ناگوار تو بہت گزرا مگر شمیم آرا نے سمجھایا کہ بعض اوقات حالات کے تحت گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ اب یہ نئی تاریخیں دینے پر آمادہ ہیں تو آپ نئے سرے سے شوٹنگ کا پروگرام بنالیں۔ ہم نے بھی ٹھنڈے دل سے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ لڑائی جھگڑا کرنا بے سود ہے۔ ندیم جو نئی تاریخیں دیں گے ہم ان کے مطابق از سر نو شوٹنگ کا شیڈول بنالیں گے۔ ہماری فلم میں کوئی ایسا مصروف ترین اداکار تو تھا نہیں جس کی وجہ سے مشکل پیش آتی۔

بعد میں ندیم نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا، یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ وہ بہت بامروت، وضع دار، باخلاق اور شریف آدمی ہیں مگر جب وہ لاہور پہنچے تو کوئی ٹیلی فون پیغام ہوٹل پر چھوڑنے کے بعد بھی انہوں نے ہم سے رابطہ کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ ہم جب بھی انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل فون کرتے یہی پیغام ملتا کہ وہ ابھی شوٹنگ پر چلے گئے ہیں ہم ان کیلئے پیغام چھوڑ دیتے۔ ایک شام ہم خود ان کے ہوٹل گئے۔ وہ اس وقت بھی موجود نہیں تھے اس لیے ہم پھر ان کیلئے ایک پیغام لکھ کر چھوڑ آئے اور تاکید کی وہ ہمیں ضرور فون کریں۔ مگر ندیم صاحب کی طرف سے خاموشی کا مظاہرہ جاری رہا۔ اب ہمارے صبر و برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور ہم ان سے سچ مچ ناراض ہو گئے۔ یہ خفگی کافی شدت

اختیار کر گئی۔ ہم تقاریب میں ان سے مخاطب ہوتے، نہ ان کے سلام کا جواب دیتے۔ایک بار شبنم کی سالگرہ کے سلسلے میں ہوٹل میں ایک تقریب کے موقع پر وہ ہمارے پاس آکر بیٹھ گئے اور بولے ''آپ مجھ سے ناراض معلوم ہوتے ہیں''۔

ہم غصے سے ابل رہے تھے مگر محفل کو دیکھ کر خاموش رہے۔

وہ کہنے لگے ''آفاقی صاحب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔میں نے جان بوجھ کر آپ کو تکلیف نہیں پہنچائی ہے''۔

ہم نے آہستہ سے کہا''ندیم صاحب، بہتر ہے کہ اس موضوع پر بات نہ کریں۔ہم نہیں چاہتے کہ شبنم کی سالگرہ کا فنکشن خراب ہو یہ کہہ کر ہم ان کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے''۔

ندیم صاحب تک ہماری ناراضگی اور غصے کی تمام اطلاعات پہنچ رہی تھیں۔انہوں نے چند مشترکہ دوستوں کے ذریعے پیغام بھیجے مگر ہمارا غصہ کم نہیں ہوا۔ان ہی دنوں ڈھاکا سے مشہور فلم ساز، تقسیم کار اور صنعت کار انیس دوسانی صاحب لاہور آئے۔ان سے ہمارے بہت اچھے اور بے تکلفی کے مراسم تھے۔ایک روز انہوں نے ہمیں فون کرکے اپنے ہوٹل پر بلایا۔ ہم وہاں گئے تو وہ غسل خانے میں تھے۔کچھ دیر بعد ندیم بھی وہاں آگئے۔اپنی عادت کے مطابق انہوں نے انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور ہم سے باتیں کرنے لگے۔وہ صورت حال کی وضاحت کرنا چاہتے تھے۔ابھی ہم اندر اندر راونٹ ہی رہے تھے کہ انیس دوسانی صاحب غسل خانے سے نکل کر آگئے۔ماحول کی کشیدگی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے بطور خاص ہم دونوں کو اپنے ہوٹل کے کمرے میں یکجا کرنے کا اہتمام کیا تھا۔

انہوں نے کہا''آفاقی صاحب! چھوڑیے غصہ جانے دیجئے۔ندیم کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے''۔

ہم نے بڑے ضبط سے کام لیا پھر ان سے کہا''دوسانی صاحب! آپ پہلے ہماری روداد سن لیجئے اور پھر جو بھی فیصلہ کریں گے، ہمیں منظور ہوگا''۔

اس کے بعد ہم نے انہیں اوّل تا آخر ساری کہانی سناڈالی۔ ہمیں شکایت یہ تھی کہ ایک تو ندیم نے ہماری شوٹنگ کا شیڈول خراب کر دیا اور ہماری تاریخیں کسی اور کو دے دیں۔پھر معذرت کرنے اور دوسری تاریخیں دینے کے بجائے

ہمارے ٹیلی فون کے جواب میں ایک ٹیلی فون تک نہیں کیا۔ ہم خود ان کے ہوٹل گئے پھر بھی انہوں نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ یہ سب داستان سنانے کے بعد ہم نے کہا'' اب آپ خود ہی انصاف کر دیجئے کہ قصور کس کا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے فلم اسٹار خود کو دوسروں سے افضل اور بالاتر سمجھتے ہیں۔ یہ اگر ہیروہیں تو ہم مصنف اور فلم ساز ہیں۔ ہماری حیثیت ان سے کم نہیں ہے مگر انہوں نے کاروباری اصولوں کا خیال کیا اور نہ ہی اخلاق کے تقاضے نبھائے بات صرف اتنی ہے کہ ہم اب ان کو اپنی حیثیت سے آگاہ کر کے ہی دم لیں گے''۔

ہم اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے تو انیس دوسانی صاحب نے بہت اچھی سی کافی منگائی۔ ندیم صاحب اس دوران میں بالکل خاموش بیٹھے رہے تھے۔

دوسانی صاحب نے ہم سے کہا''آفاقی! ندیم کو اپنی غلطی کا اعتراف اور احساس ہے مگر تم انہیں تلافی کا موقع تو دو۔ تمہیں فون نہ کرنے اور تم سے نہ ملنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کافی عرصے تک ندیم کے پاس کوئی ڈیٹ نہیں ہے۔ اس لیے وہ آپ کا سامنا کرتے ہوئے کترا رہے تھے''۔

کافی دیر بعد ہمارا غصہ کچھ کم ہوا تو ہم نے ندیم صاحب سے کہا''بھائی مانا کہ آپ بہت بڑے ہیرو ہیں مگر رائٹر اور پروڈیوسر کی بھی کوئی اہمیت اور حیثیت ہے۔ ان کی بھی عزت اور انا ہوتی ہے۔ سوچو کہ اگر پروڈیوسر نہ ہو تو ہیرو کہاں ہوگا۔ یہ حقیقت آپ لوگ کیوں بھول جاتے ہیں، ہیرو کی عمر تو مختصر ہوتی ہے مگر رائٹر اور پروڈیوسر ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ آپ لوگ گدھے گھوڑے کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی عادت چھوڑ دیں تو بہتر ہے''۔

گلے شکوے ختم ہوئے تو پھر کافی اور چائے کا دور چلا۔ ندیم نے وعدہ کیا کہ وہ کچھ عرصے بعد ہمیں ڈیٹس دے دیں گے۔

ہم نے کہا''شکریہ مگر ہم اس فلم کو بہت زیادہ دیر تک ملتوی نہیں کر سکتے۔ فی الحال ہم کوئی دوسرا بندوبست کر لیں گے۔ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ فلم ساز کو کسی بھی اداکار کا محتاج نہیں ہونا چاہیے''۔

کہنے کو ہم نے کہہ دیا مگر جب واپسی کیلئے وہاں سے روانہ ہوئے تو یہ خیال ہمیں پریشان کیے ہوئے تھا کہ اپنی فلم کیلئے ایک نوعمر اور نوخیز ہیرو ہم کہاں سے لائیں گے؟ ایسے اداکار کے بغیر اس فلم کو بنانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور پھر

ندیم اس وقت پاکستان کے سپر ہٹ اداکار تھے۔ان کی موجودگی کسی بھی فلم کے وقار اور مانگ میں اضافہ کر سکتی تھی۔ مگر حالات کے تحت ہم ان کے بغیر ہی فلم بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

دراصل یہ ہماری فطرت ہے کہ ہم کسی انسان کی محتاجی برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم ندیم کو یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ ہم صرف ان ہی پر تکیہ نہیں کرتے ہیں۔ ان کے بغیر بھی فلم بنا سکتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی ہم خود اپنے آپ کو بھی یہی احساس دلانا چاہتے تھے ورنہ ہماری خوداعتمادی ختم ہو کر رہ جاتی۔ ہدایت کار حسن طارق کے بغیر فلم بنانے کے فیصلے میں بھی ہمارا یہی جذبہ کارفرما تھا۔اس زمانے میں طارق صاحب کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ بڑے بڑے فلم ساز ان کے گھر کے پھیرے لگاتے رہتے تھے اور کئی فلم ساز تو ان کے بغیر فلم شروع کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ہم خود کو ایسے فلم سازوں کی صف سے باہر رکھنا چاہتے تھے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ اگر حسن طارق دستیاب نہ ہوں تو ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ یا اگر ندیم کی ڈیٹ نہ ملے تو ہم فلم ہی نہ بنائیں۔

سچ پوچھئے تو فلم ''سزا'' ہم نے خود کو اور فلمی دنیا کو یہ احساس دلانے کیلئے بنائی تھی کہ ہم اپنی مرضی سے بھی فلم بنا سکتے ہیں۔ کسی بھی اداکار یا ہدایتکار کی مدد سے فلم بنا سکتے ہیں۔ مگر اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں جن کانٹوں بھرے راستے پر چلنا پڑا اس کی تکلیف خود ہم ہی جانتے ہیں۔

ندیم تو اچانک اللہ کی طرف سے ایک نعمت بن کر سامنے آگئے تھے ورنہ جس وقت ہم نے ''سزا'' کی کہانی لکھنے کا ارادہ کیا تھا اس وقت بھی دور دور تک اس عمر کا کوئی ہیرو یا اداکار دستیاب نہیں تھا۔ نئے اداکاروں کی تلاش اس وقت بہت مشکل کام تھا۔ماڈلنگ اور اداکاری کا اتنا زیادہ رجحان پیدا نہیں ہوا تھا۔جیسا کہ آج ہے۔ خیر اداکار بننے کے خواہش مند بلکہ جنونی تو اس وقت بھی کم نہیں تھے مگر ایک سے ایک کارٹون، ہمارے ہاں فلم سازوں کی ہمیشہ یہ مشکل رہی ہے کہ جن لڑکوں اور لڑکیوں کو اداکاری کا شوق ہوتا ہے وہ اس کیلئے موزوں نہیں ہوتے اور جو موزوں ہوتے ہیں انہیں اداکاری سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور وہ اس کا نام سن کر ہی کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں مگر جب ایک دم ندیم ایک فلم میں سامنے آئے اور کامیاب ہیرو بھی بن گئے تو ہمیں یوں لگا جیسے قدرت بھی ہماری مدد کر رہی ہے۔ لیکن ندیم کا معاملہ گڑبڑ ہو کر رہ گیا۔اب مسئلہ یہ تھا کہ اوّل تو ہم ندیم کا بہت عرصے تک انتظار نہیں کر سکتے تھے دوسرے کچھ

وقت گزرنے کے بعد ان میں بھی پختگی اور پکا پن پیدا ہو جاتا اور وہ اس معصومیت سے محروم ہو جاتے جس کی ہمیں اپنی کہانی کے ہیرو کیلئے ضرورت تھی۔ ندیم کو تو ہم نے ہاتھ سے کھو دیا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ دوسرا اداکار کہاں سے لائیں۔ ہمارے مخلص دوستوں نے مشورہ دیا کہ بھائی اس کہانی کو ہی ملتوی کر دو۔ زیادہ تر لوگ اس کو بنانے کے حق میں ہی نہیں تھے۔ ہماری عادت ہے کہ کسی بھی موضوع کو لکھنے یا بنانے سے پہلے چند ماہر اور مخلص دوستوں سے مشورہ ضرور حاصل کرتے ہیں۔

ڈبلیو زیڈ احمد صاحب ہمارے لیے ہمیشہ ایک محترم اور صاحبِ رائے شخصیت رہے ہیں۔ ہم نے انہیں کہانی کا یہ آئیڈیا سنایا تو انہوں نے اسے پسند تو کیا مگر کچھ زیادہ رغبت اور پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ تقسیم ہند اور فسادات کے گھاؤ ابھی لوگوں کے دلوں میں تازہ ہیں۔ اس موضوع کو فلمانے سے یہ زخم دوبارہ ہرے ہو جائیں گے۔ پھر ان کا بھی یہی خیال تھا کہ اس فلم کیلئے اداکاروں کا انتخاب بہت موزوں اور مناسب ہونا چاہیے۔ ہر ہیرو اور ہر ہیروئن یہ ضرورت پوری نہیں کر سکے گی۔ مگر ہم یہی کہانی بنانے کی دل میں ٹھان چکے تھے۔ کافی مسائل حل ہو گئے تھے۔ اب صرف ہیرو کے انتخاب کا مسئلہ باقی رہ گیا تھا اور یہی بنیادی مسئلہ تھا۔

اخبار والوں نے ہم سے آئندہ فلم کے بارے میں سوال کیا تو ہم نے بتایا کہ ہم اگلی فلم اس موضوع پر بنانا چاہتے ہیں مگر اس کیلئے ہمیں ایک نئے چہرے کی ضرورت ہے جو نو عمر بھی ہو۔ اس زمانے میں اخبارات میں فلمی خبروں اور تصاویر کا اتنا زور و شور نہیں ہوتا تھا لیکن رنگین فلمی تصاویر اور خبریں شائع کرنے کا رواج شروع ہو چکا تھا۔ ہمارا یہ بیان شائع ہوتے ہی ہمارے پاس خطوط اور تصاویر کا ڈھیر لگ گیا۔ یہ سب اداکار بننے کے شوقین تھے مگر ایک سے بڑھ کر ایک نامعقول، بیشتر بالکل جاہل یا چند جماعتیں پڑھے ہوئے تھے۔ ان کی تصویریں دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ کیا یہ خود اپنی تصویریں نہیں دیکھتے۔ ایسی شکل و صورت رکھنے کے باوجود اگر وہ ہیرو بننے کے شوقین تھے تو ان کی ہمت کی داد دیے بغیر چارہ نہ تھا۔

کچھ خطوط ہمیں عام فلم بینوں کی طرف سے بھی موصول ہوئے جن میں طلبہ و طالبات بھی شامل تھیں۔ انہوں نے ہمیں یہ موضوع فلمانے پر شاباش دی تھی مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ خدارا کسی پرانے ہیرو کو اس کردار میں لے کر

اس کہانی کا حلیہ نہ بگاڑ لینا۔ کچھ لوگوں نے ندیم کو کاسٹ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس زمانے میں پڑھے لکھے لوگ خصوصاً طلبہ باقاعدہ فلم بینوں میں شامل تھے اور اس زمانے میں زیرِ تعلیم رہنے والے جو لوگ بعد میں بڑے افسر بن گئے وہ سب فلموں کے حوالے سے ہمیں جانتے تھے۔ آج بھی ایسے بیوروکریٹ ہمیں مل جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ گزشتہ پندرہ بیس سالوں میں یہ رجحان قائم نہ رہ سکا اور رفتہ رفتہ طلبہ اور طالبات نے فلموں سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اس کی وجوہات بھی بہت معقول ہیں اس لیے انہیں الزام نہیں دیا جاسکتا۔ مگر جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس وقت فلم دیکھنا بھی ایک باقاعدہ ضرورت سمجھی جاتی تھی اور تعلیم یافتہ مڈل کلاس طبقہ بہت ذوق و شوق سے فلمیں دیکھتا تھا اور اپنی رائے کا اظہار بھی کرتا تھا۔

یہ رجحان ۱۹۸۰ کی دہائی میں بھی جاری رہا لیکن اس کے آخر میں فلموں کے موضوعات اور معیار کے باعث اس رجحان میں کمی پیدا ہونے لگی تھی۔

جگدیش چند آنند اس وقت بقید حیات تھے۔ وہ پاکستان کے بہت بڑے اور ممتاز تقسیم کار تھے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں وہ سینکڑوں فلمیں ریلیز کر چکے تھے۔ کراچی، لاہور ڈھاکا میں ان کے بہت شاندار اور سرگرم دفاتر تھے۔ پاکستان کی فلمی صنعت کیلئے ان کا وجود بہت اہمیت رکھتا تھا کیونکہ بیشتر پاکستانی فلمیں وہی خریدتے اور ریلیز کرتے تھے۔

جن دنوں ہم ''سزا'' کے منصوبے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے اسی زمانے میں جگدیش صاحب نے ایک فلم بنانے کا اعلان کر دیا۔ یہ ایک تاریخی رومان تھا۔ اس کا نام ''تاج محل'' تجویز کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ شہنشاہ شاہجہاں اور ان کی چہیتی ملکہ ممتاز محل کی کہانی تھی جس کا مقبرہ ''تاج محل'' کی شکل میں آج بھی دنیا کے سامنے موجود ہے اور اسے ایک شہنشاہ کی محبت کی یادگار تصور کیا جاتا ہے۔ ترقی پسندوں کے نظریے سے قطع نظر ''تاج محل'' کو سبھی کی نظروں میں ایک معزز اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ مگر ساحر لدھیانوی نے اس موضوع کو ایک بالکل نئے انداز میں نظم کر کے ملک گیر شہرت حاصل کرلی تھی اور ان کی یہ نظم ہر ایک کی زبان پر تھی۔۔۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر

ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

یہ بالکل نیا اور انوکھا انداز تھا اس لیے ہر طرف اس کا چرچا ہو گیا مگر شکیل بدایونی نے بمبئی میں بنائی جانے والی ایک فلم میں ”تاج محل“ اور شاہجہاں کی روایتی انداز میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ یہ فلم ریلیز ہوئی تو اس کے گانے بہت مقبول ہوئے۔ کے آصف کی عظیم فلم ”مغلِ اعظم“ اس سے پہلے ہی سارے برصغیر میں موضوعِ بحث بن چکی تھی۔ ان ہی دنوں میں کے آصف کے معاون ایس ٹی زیدی صاحب بمبئی سے لاہور تشریف لائے اور انہوں نے یہیں قیام کرنے کا ارادہ کر لیا اس ارادے میں جگدیش صاحب نے ایس ٹی زیدی صاحب کی فلم تاج محل کا ہاتھ تھا۔ جگدیش صاحب نے ایس ٹی زیدی صاحب کی ہنر مندی اور تجربہ کاری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اپنی فلم ”تاج محل“ کی ہدایتکاری کے لئے ان کی خدمات حاصل کر لیں۔ زیدی صاحب کو فلم اور ہدایت کاری کے معاملات میں عبور حاصل تھا۔ ہماری بھی اس زمانے میں ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں جو بعد میں گہرے مراسم میں بدل گئیں۔ زیدی صاحب ایک پڑھے لکھے، ذہین، تجربہ کار اور باصلاحیت ہدایت کار تھے۔ ان کی ہنر مندی نے ہمیں بہت متاثر کیا تھا۔ بعد میں ہم نے انہیں اپنی ایک فلم کی ہدایتکاری بھی سونپی تھی مگر قدرت کو منظور نہ تھا اس لیے یہ فلم خود ہم ہی کو ڈائریکٹ کرنی پڑی۔ یہ قصہ آگے بیان ہو گا۔

ایس ٹی زیدی صاحب ”تاج محل“ کی تیاریوں میں مصروف تھے اور جے سی آنند صاحب کے لاہور کے دفتر میں ان کا ٹھکانا تھا۔ ایورریڈی پکچرز لاہور کے مینجر نسیم الثقلین صاحب سے ہماری پرانی یاد اللہ تھی۔ جب ایم اے خان نے فلم ”سسّی“ بنائی تھی۔ تو نسیم صاحب اس دفتر میں ٹائپسٹ تھے۔ بعد میں اپنی قابلیت اور صلاحیت کی بناپر لاہور آفس کے مینجر بن گئے تھے۔ ہماری ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ بہت باخلاق اور متواضع آدمی تھے۔ لاہور آنے سے پہلے دہلی کے رہنے والے تھے۔ درمیانہ قد، گورا رنگ، دہرا جسم، چہرے پر نوکدار خشخشی داڑی، بہت خوش گفتار اور خوش لباس تھے۔ دوستوں کے دوست، ہر ایک کی مشکل دور کرنے کیلئے ہر وقت کمربستہ، اب اس دفتر میں ہماری دو دلچسپیاں ہو گئی تھیں۔ ایک نسیم الثقلین صاحب تھے تو ہی دوسرے ایس ٹی زیدی صاحب بھی تشریف لے آئے۔ ہم ہفتے میں دو چار بار اس دفتر میں ضرور جاتے تھے۔ نسیم صاحب سے چائے پیتے اور سارے پاکستان کی فلمی خبریں سنتے اور

سناتے۔ اس کے بعد دوسرے کمرے میں ایس ٹی زیدی صاحب کے دفتر میں جا کر ان کا دماغ چاٹا کرتے۔ ""مغلِ اعظم"" کی تیاریوں کے سلسلے میں جو مراحل پیش آئے ان کے بارے میں زیدی صاحب بہت تفصیل سے بتایا کرتے تھے۔

کے آصف کے قصے دلیپ کمار اور مدھو بالا کے رومان اور علیحدگی کی کہانیاں، بمبئی کی فلمی شخصیات کے بارے میں معلومات۔ خواجہ احمد عباس کے کام کرنے کا انداز، محبوب، نوشاد اور بمل رائے کی باتیں۔ راج کپور کے اسکینڈل، جدن بائی کی کہانیاں، مختصر یہ کہ ہماری بات چیت کا ایجنڈا لا محدود ہوتا تھا۔ بس وہ ہمارے سوالات کے جواب میں سناتے رہتے اور ہم سنتے رہتے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ زیدی صاحب بہت باتونی آدمی ہیں۔ جی نہیں، عام طور پر وہ گفتگو کے معاملے میں بہت کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں۔ مگر ہم نے باتوں باتوں میں انہیں اپنی راہ پر لگا لیا تھا۔ ہمارے ساتھ وہ خوب گھل مل کر باتیں کرتے تھے۔ دنیا بھر کی فلموں کے بارے میں زیدی صاحب کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ فلم سازی کے فن پر بھی انہیں دسترس حاصل ہے۔ ناولوں اور پرانی فلموں کی کہانیاں بھی انہیں یاد ہیں۔ ایسے میں گفتگو کے موضوعات کی بھلا کیا کمی ہو سکتی ہے۔

ایک دن ہمارے پاس نسیم الثقلین صاحب کا فون آیا ""آپ آرہے ہیں؟"" انہوں نے پوچھا۔

ہم نے حیران ہو کر کہا ""خیر تو ہے، آج آپ کو یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟""

بولے ""آپ کیلئے ایک نیا ہیرو تلاش کیا ہے۔ بس ایک گھنٹے بعد آجایئے""۔

نسیم صاحب کی عادت تھی کہ دوستوں سے بہت سنجیدہ قسم کے مذاق کیا کرتے تھے۔ ہمیں ان کی بات پر یقین نہیں آیا۔ سوچا گپ شپ کے سلسلے میں بلا رہے ہوں گے۔ بارہ بجے کے قریب ہم ان کے دفتر پہنچے تو وہ اپنے بڑے سے کمرے میں خلافِ معمول تنہا بیٹھے تھے۔

علیک سلیک کے بعد ہم نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا ""کہاں ہے نیا ہیرو؟""

وہ مسکرانے لگے ""بھئی میرے بارے میں کیا خیال ہے؟""

ہم سمجھ گئے کہ نسیم صاحب نے اپنی عادت کے مطابق مذاق کیا ہے۔

انہوں نے ہمارے لیے چائے منگائی اور چپراسی سے کہا ”دیکھو! زیدی صاحب کے کمرے میں جو صاحب بیٹھے ہیں انہیں بھی بلاؤ“۔

چند لمحے بعد ایک دبلا پتلا، دراز قد نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ سرخ و سفید رنگت، براؤن بال، براؤن آنکھیں، کوٹ پتلون میں خاصا اچھا لگ رہا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس کا چہرہ تو سرخ و سفید تھا ہی، اس کے ہونٹ اتنے سرخ تھے جیسے کہ لپ اسٹک لگا رکھی ہو۔

”ان سے ملئے، آفاقی صاحب ہیں“ نسیم صاحب نے ہمارا تعارف کرایا ”اور یہ جمال ہیں، بمبئی سے آئے ہیں اوڈین سنیما والے اختر خاں صاحب کے بھانجے ہیں“۔

اختر صاحب سے بھی ہماری پرانی شناسائی تھی۔ وہ ہالی ووڈ کی فلموں کے لاہور آفس کے انچارج رہ چکے تھے۔ انگریزی فلمیں دکھانے والے بہت اچھے سنیما ”اوڈین“ کے مینجر تھے لیکن ان کے اختیارات مالکوں جیسے تھے۔ سنیما کے مالک سے ان کی بہت بے تکلفی تھی۔ وہ بے چارے تو بس تکلفاً ہی دفتر آ جاتے تھے۔ مختار کل اختر صاحب ہی تھے۔ اختر صاحب کو مطالعے کا بھی بہت شوق تھا۔ انہوں نے امریکا سے انگریزی کتابیں درآمد کرنے کا کاروبار بھی شروع کیا تھا جو آج کل پورے عروج پر ہے۔ اختر صاحب کا تعلق حیدرآباد دکن سے تھا۔ لب و لہجے میں وہی انداز تھا وہ بڑے ہنس مکھ اور لطیفہ باز آدمی ہیں۔ کلاسیکی موسیقی سے انہیں بہت گہری دلچسپی ہے۔ بڑے بڑے استادوں کو گھیر کر اپنے گھر لاتے ہیں اور ساری ساری رات پکے گانوں اور راگ راگنیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ہم نے جمال کو ذرا غور سے دیکھا۔ سب کچھ وہی تھا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ جمال کی ناک قدرے لمبی اور نوک دار تھی جوان کے سرخ و سفید چہرے اور پتلے پتلے سرخ ہونٹوں کی وجہ سے کافی نمایاں تھی۔ یوں سمجھئے لمبی ناک جمال اور ندیم میں مشترک تھی۔ ہم نے دل میں سوچا بھئی یہ بھی خوب رہی۔ ہمیں جو بھی ہیرو ملتا ہے، لمبی ناک والا ہی ملتا ہے۔

ہم نے جمال کو مخاطب کیا ”آپ بمبئی سے کب آئے؟“

جمال نے مختصر سا جواب دے دیا۔

ہم نے دوسرا سوال کیا ''کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟''

وہی مختصر جواب

نسیم الثقلین صاحب مسکرائے اور جمال سے کہنے لگے ''میاں اتنی مختصر بات کیوں کر رہے ہو۔ کھل کر بات کرو۔ وہ تمہاری آواز اور لب ولہجہ سننا چاہتے ہیں''۔

جمال نے اس بار ہمارے سوال کا قدرے لمبا جواب دے دیا۔ ہم غور سے جائزہ لیتے رہے۔ چائے پینے کے بعد جمال رخصت ہو گئے۔

نسیم صاحب نے پوچھا ''کیوں، کیا خیال ہے؟''

ہم نے کہا ''ٹھیک تو ہے مگر۔۔۔''

بولے '' کیا اسکرین ٹیسٹ لینا چاہتے ہیں؟ ایس ٹی زیدی صاحب بھی اپنی اگلی فلم کیلئے ان کا اسکرین ٹیسٹ لینے والے ہیں۔ آپ بھی دیکھ لینا، پھر فیصلہ کرنا''۔

ہم نے کہا ''نسیم صاحب! ہمیں اب ٹیسٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لڑکا ہماری فلم کے کردار کیلئے بالکل مناسب ہے''۔

جمال کی آواز، قدو قامت کے مقابلے میں پتلی تھی۔ آواز میں زیروبم بھی نہ تھا مگر تربیت سے اس کو بہتر بنایا جاسکتا تھا۔ چہرے پر بہت زیادہ تاثر تو نہیں تھا مگر بالکل سپاٹ چہرہ بھی نہیں تھا۔ ہم نے اسی وقت جمال کو ''سزا'' کا ہیرو بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن انہوں نے اپنے اصلی نام کے بجائے جمیل کے نام سے فلم میں کام کیا۔ اس کی وجہ پہلے بتائی جاچکی ہے۔ اول الذکر جمال کو ہم نے بھی دیکھا تھا۔ وہ مضبوط جسم اور مناسب قدو قامت کا نوجوان تھا۔ رنگت سانولی تھی لیکن ناک نقشہ اچھا تھا۔ آواز میں بھی گہرائی تھی۔ لیکن وہ ہماری فلم کے کردار کیلئے مناسب نہ تھا۔ جمال نے دلجیت مرزا کی فلم میں کام کیا۔ یہ فلم تو درمیانہ درجے کی رہی مگر جمال فلم انڈسٹری میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ہم نے نسیم صاحب سے کہا ''نسیم صاحب! آپ ہمارا کانٹریکٹ ٹائپ کرادیجئے۔ ہماری فلم میں جمال کا نام جمیل ہو گا''۔

نسیم صاحب دستاویزات ٹائپ کرنے میں بہت ماہر تھے۔ ان کے اکثر دوست اس قسم کے کام ان ہی کے سپرد کر دیتے

تھے۔انہوں نے اسی وقت اسٹامپ پیپر لانے کیلئے عملے کے ایک کارکن کو روانہ کر دیا۔ جمیل سے ہم نے تین فلموں کیلئے معاہدہ کیا تھا۔ معاہدے میں یہ شرط نمایاں تھی کہ جب تک ''سزا'' ریلیز نہ ہو گی وہ کوئی دوسری فلم سائن نہیں کریں گے اور اس کے بعد بھی ہماری اجازت کے بغیر کسی اور کی فلم میں کام نہیں کریں گے۔

اس طرح ہماری ہیرو کی تلاش ختم ہوئی اور جمیل کو ہماری فلم کا ہیرو منتخب کر لیا گیا۔

یہ وہی جمیل یا جمال ہیں جو بعد میں بمبئی چلے گئے تھے اور بمبئی کی مشہور فلمی ہیروئنوں فرح اور تبو کے والد ہیں۔ان کی ایک بیٹی فرح نے بمبئی کی فلمی دنیا میں دھومیں مچائیں۔آج کل ان کی چھوٹی بیٹی تبو نے بھی اداکاری شروع کر دی۔ مگر ان کے والد جمال (جمیل) فلمی دنیا اور بیوی بچوں کو چھوڑ چکے ہیں۔

یہ بھی ایک عجیب کہانی ہے۔پاکستان میں جمیل کی فلمی سرگرمیوں کی داستان آپ آگے پڑھیں گے۔فی الحال ان کی صاحب زادیوں کے حوالے سے کچھ بیان ہو جائے۔

جب جمیل فلم ''سزا'' میں کام کرنے کیلئے آئے تھے تو وہ شادی شدہ تھے اور شادی بھی عام شادی نہیں بلکہ ''لو میرج'' جو دونوں نے اپنے اپنے خاندانوں کی مخالفت کے باوجود کر لی تھی۔

جمیل ایک خوب رو آدمی تھے۔وہ ایرانی النسل ہیں۔ان کے آباؤاجداد ایران سے آکر ریاست حیدر آباد (دکن) میں آباد ہوئے تھے۔بعد میں وہ بمبئی اور پونا چلے گئے جہاں فلمی مراکز ہیں۔اداکار بننے کا شوق انہیں ابتدائی عمر سے ہی تھا مگر بھارتی فلمی دنیا میں انہیں کامیابی نصیب نہ ہو سکی تو انہوں نے پونا میں ایک ریستوران قائم کر لیا۔اپنی بیوی رضوانہ سے ان کی ملاقات پونا میں ہی ہوئی تھی۔رضوانہ کا خاندان حیدر آباد دکن میں رہائش پذیر تھا جن میں سے بیشتر لوگ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے۔اختر صاحب سے ان کی قدرے دور کی رشتے داری تھی۔گویا جمیل (جمال) اختر صاحب کے بھانجے نہیں تھے۔ان کی بیگم سے اختر صاحب کی رشتے داری تھی۔

اداکاری کا شوق جمیل کو پاکستان لے آیا تھا۔جب وہ لاہور آئے تو ان کی بیٹی فرح کی عمر پانچ سال کے لگ بھگ تھی۔ فرح بہت پیاری بچی تھی۔گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، نازک نقش و نگار، سنہری مائل بال اور بھوری آنکھیں۔وہ شرارت نہیں کرتی تھی، بس خاموشی سے بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتی رہتی تھی۔بچپن میں ہم نے اسے سنجیدہ اور

خاموش ہی دیکھا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ جمیل کو غصہ بہت آتا تھا اور غصے میں وہ بچی کی پٹائی تک کر دیا کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ سہمی سہمی رہتی تھی۔ان کی دوسری بیٹی تبو پاکستان سے واپس جانے کے بعد پیدا ہوئی وہ بھی پیاری شکل کی بچی ہے۔اپنی بہن کی دیکھا دیکھی اس نے بھی اداکاری کا شوق ظاہر کیا تو خود فرح نے اس کی شدید مخالفت کی مگر ماں کی ضد کے آگے ایک نہ چل سکی۔اب تبو بھی بھارتی فلموں میں اداکاری کر رہی ہے۔فرح کے مزاج میں بھی ماں باپ دونوں کے مزاجوں کا پر تو ہے۔سنتے ہیں کہ وہ بھی مغلوب الغضب اور ضدی ہے۔ ضد اسے ماں اور باپ دونوں کی طرف سے ورثے میں ملی ہے۔ جمیل کے گھر کی بربادی میں خود ان کے غصے اور ضد کے علاوہ اس کی بیگم کے غصے اور ضد کا بھی نمایاں ہاتھ ہے۔پاکستان سے واپس جانے کے بعد بھی ان دونوں کے لڑائی جھگڑے حسبِ معمول جاری رہے۔کئی بار علیحدگی بھی ہوئی مگر ہم نے یہ دیکھا تھا کہ غصے اور مستقل لڑائی جھگڑے کے باوجود دونوں ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے تھے اور زیادہ دیر علیحدہ نہیں رہ سکتے تھے۔لاہور کے قیام کے دوران میں بھی رضوانہ لڑ جھگڑ کر چلی جاتی تھیں مگر پھر لوٹ آتی تھیں یا جمیل (جمال) انہیں منا کر لے آتے تھے۔فرح کو اداکارہ بنانے میں ان کی والدہ رضوانہ کی ضد کا بہت دخل تھا۔ جمیل بیٹی کو اداکارہ بنانے کے حق میں نہیں تھے مگر بھارت واپس جانے کے بعد جب بیٹی بڑی ہونے لگی تو ان کا اثر کم ہونے لگا۔ رضوانہ نے فرح کو اداکارہ بنانے کی کوشش شروع کی تو میاں بیوی میں اختلافات شدید ہو گئے یہاں تک کہ پہلے علیحدگی اور پھر طلاق ہو گئی۔اس کے بعد رضوانہ اور فرح کو کھلی چھٹی مل گئی۔

فرح کی شکل وصورت اور بے تکلفی کی داستانیں فلمی دنیا میں عام ہوئیں تو فلم سازوں اور ہدایتکاروں نے گھر کے پھیرے لگانے شروع کر دیے۔باپ کا سایہ سر پر نہیں رہا تھا اور فرح کی سرکش طبیعت پر قابو پانا ان کی والدہ رضوانہ کے بس میں نہیں رہا تھا۔فرح نے فحش گوئی اور بے ہودہ گالم گلوچ کے حوالے سے بھی بہت شہرت پائی بلکہ اس اعتبار سے وہ بمبئی کی فلمی دنیا میں بدنام ہیں۔ بعض مرد حضرات بھی ان سے بات کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ان کی ذاتی زندگی بھی قابلِ فخر نہیں ہے۔ مختلف لوگوں سے ان کے اسکینڈلز عام ہوتے رہے یہاں تک کہ اب انہوں نے مشہور پہلوان اور اداکار دارا سنگھ کے بیٹے سے شادی کر لی ہے جس کے بارے میں ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے

کب یہ رشتہ ٹوٹ جائے۔

کہتے ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ دولت اور شہرت کی جھلک نے تبو کو بھی اداکاری کی طرف مائل کر دیا حالانکہ فرح نے انہیں (غالباً ذاتی تجربات کے پیش نظر) روکنے کی بھی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکیں۔ تبو مزاجاً فرح سے مختلف ہیں۔ مگر فلمی دنیا تو اسکینڈلز کی آماجگاہ ہے اور ان کے نام سے بھی اب نت نئے سکینڈلز منسوب ہونے لگے ہیں۔ فرح تو قابو سے نکل گئی ہیں مگر اب رضوانہ تبو کی سرپرست کے فرائض سرانجام دے رہی ہیں مگر کب تک؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔

جمیل فلم ''سزا'' کے ہیرو کیا بنے انہیں شوٹنگ کا آغاز ہونے سے پہلے ہی پبلسٹی ملنی شروع ہو گئی۔ ہم ایک ایسی فلم بنا رہے تھے جس میں بڑے اور مشہور ہیرو، ہیروئن شامل نہیں تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ دوسرے طریقوں سے اس فلم کا ڈھنڈورا بھی پیٹا جائے۔ چنانچہ ہم نے جمیل کو ذرا بہتر انداز میں روشناس کرانے کیلئے ایک منصوبہ بنایا۔ ان کے بارے میں مضامین، انٹرویوز، تبصرے اور ان کی خوبصورت تصاویر مختلف اخبارات و جرائد میں نظر آنے لگیں۔ نئے چہروں کو بھلا کون اہمیت دیتا ہے اور خاص کر ایسے حالات میں کہ نیا چہرہ مرد ہو۔ اس زمانے میں فلمی اداکاروں اور اداکاراؤں کے بارے میں اخبارات اور رسائل میں اس قدر فراوانی سے پبلسٹی کا دستور بھی نہ تھا۔ جیسا کہ اب ہے۔ پھر بھی ہم نے جمیل کو ان کی پہلی فلم کی شوٹنگ کا آغاز ہونے سے پہلے ہی ہیرو بنا دیا اور سارے ملک میں لوگ ان کو جاننے لگے اور تو اور روزناموں کے سرورق پر ان کی جہازی سائز کی رنگین تصویریں بھی شائع ہو گئیں۔ اس طرح ہر طرف جمیل کا چرچہ ہو گیا۔

اس دوران میں ہم نے جمیل کو اپنا سکرپٹ پڑھنے کو دیا اور انہیں اس کردار کی نفسیات، تاثرات، احساسات اور ذہنی کیفیت سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔ انہیں ہم نے فن اداکاری کے رموز و اسرار نہ صرف خود بتائے بلکہ انہیں اس موقع پر بالی وڈ کے بہت اچھے نقّادوں اور ہنرمندوں کی کتابیں بھی پڑھنے کو دیں۔ ابھی وہ لاہور میں اکیلے ہی تھے کہ ان کی بیگم اور بچی لاہور نہیں پہنچے تھے۔ چند روز وہ ماڈل ٹاؤن میں ہمارے گھر ہی میں رہے پھر جب ان کی بیگم رضوانہ

اور بچی فرح آئے تو ہم نے نزدیک ہی انہیں ایک کوٹھی کا حصہ کرائے پر لے دیا۔
رضوانہ کا ہمارے گھر میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ ہمارے گھر والوں کے علاوہ دوسرے رشتے داروں سے بھی ان کا میل جول ہو گیا۔ رضوانہ ایک خوش شکل' خوش اطوار اور خوش گفتار خاتون تھیں۔ انہوں نے بہت جلد سب کے دل موہ لئے مگر ان سے زیادہ مقبولیت ان کی معصوم اور خوبصورت بچی فرح کے حصے میں آئی۔ اس کی پیاری صورت' بھولی بھالی باتیں اور شرارتیں سبھی کو لبھاتی تھیں۔ وہ شریر تو تھی لیکن بہت تمیز دار بچی تھی۔ ضدی بھی نہیں تھی لیکن یہ بات سب نے نوٹ کی کہ وہ اپنے باپ کے سامنے سہمی سہمی سی رہتی تھی۔ اس کا سبب بھی بہت جلد معلوم ہو گیا۔
جمیل کو بہت غصہ آتا تھا۔ گھر سے باہر تو ہم نے کبھی جمیل کو غصے میں نہیں دیکھا اور نہ ہی ہمارے یا کسی اور کے سامنے کبھی جمیل نے غصے کا اظہار کیا مگر ہمارے گھر والوں نے بتایا کہ گھر کے اندر جمیل کا ایک دوسرا رخ نظر آتا ہے۔ اسے اپنی بیوی سے بہت پیار تھا اور کیوں نہ ہوتا انہوں نے ''لو میرج'' کی تھی۔ اس کے باوجود ان کے گھریلو جھگڑے معمول کی بات تھے۔ رضوانہ بھی تیز مزاج تھیں اور ان میں برداشت اور تحمل کا مادہ بہت کم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر دونوں جھگڑ پڑتے تھے اور نوبت مار پیٹ تک پہنچ جاتی تھی۔ یہ باتیں ہمارے لئے حیرت انگیز تھیں۔ ہماری بہنیں' بھانجیاں اور دوسری خواتین بھی بڑی حیرانی سے یہ تذکرہ کرتی تھیں کہ ان کے گھر میں مار پیٹ بھی ہوتی ہے۔
یہاں تک کہ جن کے گھر میں جمیل ایک حصے میں کرائے دار تھے وہ بھی ایک دن بے حد پریشان پریشان سے ہمارے پاس آئے۔ وہ بہت دھیمے مزاج کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نہایت فاضل اور لکھنے پڑھنے والے بزرگ ہیں۔ جمیل کی بیگم سے ان کی بیگم کا بہت دور دراز کا ایک رشتہ بھی نکل آیا تھا۔
انہوں نے پہلے تو ایک دن ہمیں فون کیا اور کہا ''اگر آپ گھر پر ہیں تو ملنے کیلئے آجاؤں؟''۔
ہم نے کہا ''شرمندہ نہ کیجئے۔ ہم خود آپ کے پاس آرہے ہیں''۔
وہ بولے ''جی نہیں۔ آپ گھر پر ٹھہریئے میں ابھی پہنچ رہا ہوں''۔
ان کی کوٹھی ہمارے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی' وہ ہمارے گھر آیا کرتے تھے اور ہم بھی ان کے گھر جاتے رہتے تھے۔ ان کا علم اور مطالعہ بہت گہرا ہے اور وہ علم و ادب' ثقافت اور تاریخ و سیاست پر بہت سی کتابوں کے مصنف

ہیں۔ بہت قابل قدر اور قابل احترام بزرگ ہیں۔ نہایت مدھم آواز میں شائستگی سے باتیں کرتے ہیں۔ بعض اوقات توان کی آواز اتنی ہلکی اور لہجہ اس قدر نرم ہو جاتا ہے کہ بات سننے اور سمجھنے میں دشواری پیش آجاتی ہے۔ ان کی شکل دیکھ کر ہم بھی پریشان ہو گئے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ رنگ پیلا پڑا ہوا تھا۔

ہم نے گھبرا کر پوچھا ''خیریت تو ہے' طبیعت کیسی ہے آپ کی؟''

بولے ''آفاقی صاحب۔ آپ برا تو نہ مانیں گے اگر ایک بات کہوں؟''

ہماری پریشانی اور بڑھ گئی ''فرمایئے''؟

کہنے لگے ''آپ سے یہ درخواست کرنے آیا ہوں کہ میں آپ کے مہمان کو کرائے دار نہیں رکھ سکتا۔ آپ ان کا کوئی اور بندوبست کر دیں''۔

''بات کیا ہوئی ہے؟'' ہم نے پوچھا۔

وہ ایک دم پھٹ پڑے ''آفاقی صاحب۔ وہ تو عجیب و غریب انسان ہے بلکہ میرے خیال میں تو وہ انسان ہی نہیں ہے''۔

ہم مزید بوکھلا گئے ہوا کیا؟ آخر کچھ تو بتایئے؟''

کہنے لگے ''کیا آپ یقین کرینگے کہ وہ اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھاتا ہے''۔

ہم حیران ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگے۔

''اور تو اور اتنی معصوم پھول سی بچی کو بھی وہ زد و کوب کرتا ہے'' اب وہ قریب قریب رونے والے ہو گئے تھے۔

ہمیں بھی حیرت ہوئی۔ ایک تعلیم یافتہ' خاندانی شخص ایسا کس طرح کر سکتا ہے؟

وہ کہنے لگے ''مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ آپ ان کو کہیں اور شفٹ کر دیں' میں بہت ممنون ہونگا''۔

ہم نے کہا ''آپ مطمئن رہیئے' ہم انہیں سمجھائیں گے''۔

بولے ''آپ ان کا کوئی اور بندوبست ہی کر دیں۔ نوازش ہوگی''۔

ہم نے چائے سے ان کی تواضع کی۔ پھر ان کی توجہ ہٹانے اور دل بہلانے کیلئے سیاست اور علم و ادب کا ذکر چھیڑ دیا۔ بڑی مشکل سے کچھ دیر بعد وہ پُر سکون ہوئے۔ مگر جاتے وقت یاد دہانی کرا گئے ''دیکھئے۔ ان کیلئے آپ کوئی اور گھر دیکھ

لیجئے''۔

وہ تو چلے گئے مگر ہمیں الجھن میں ڈال گئے۔ جمیل کی شخصیت کا ایک انوکھا رخ ہمارے سامنے آیا تھا۔ ہم نے اسے کبھی اونچی آواز میں بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بے حد خلیق' شائستہ اور نرم گفتار تھا۔ بہت اچھے خاندان کا فرد تھا' تعلیم یافتہ تھا' مہذب اور بامروّت تھا تو پھر؟

ہم نے دوسرے ہی دن جمیل سے بات کرنا ضروری سمجھا۔ اس اثناء میں جمیل کے ساتھ ہمارا ایک مخلصانہ تعلق قائم ہو گیا تھا۔ ہم اسے اپنا چھوٹا بھائی ہی سمجھتے تھے۔

جمیل سے دفتر میں ملاقات ہوئی تو ہم نے بغور جائزہ لیا۔ ایک نہایت شائستہ اور نرم خو نوجوان ہمارے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

ہم نے کہا'' جمیل۔۔۔ کیا تمہارا گھر میں بیوی سے جھگڑا ہوا ہے؟''

وہ مسکرانے لگا'' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

ہم نے کہا'' بھائی میاں بیوی میں جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کہتے ہیں میاں بیوی کا جھگڑا ان کے پیار کی علامت ہے''۔

پہلے تو وہ مسکراتا رہا۔ پھر اتنا تسلیم کیا کہ کبھی کبھی رضوانہ سے تکرار ہو جاتی ہے۔ ہمارے کریدنے پر یہ بھی بتایا کہ بعض اوقات ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح بچی کو مار پیٹ کرنے کا بھی انہوں نے اعتراف کر لیا۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ دیکھو بھائی یہ شرفاء کا شیوہ نہیں ہے۔ بیویوں سے اختلافات اور جھگڑے اپنی جگہ لیکن یہ شرافت کے دائرے تک ہی محدود رہیں تو مناسب ہے اور معصوم بچی کو تو کوئی انگلی تک لگانے کی جرات نہیں کرتا۔ ان معصوموں کو مار پیٹ کا نشانہ بنانا کہاں کا انصاف ہے۔ بہر حال یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ ہمیں اس میں دخل دینے کا حق نہیں ہے لیکن اتنا مشورہ ضرور دینگے کہ اگر ایسا کرو گے تو خود ہی بھگتو گے۔ پھر ہم نے انہیں یہ بھی بتایا کہ تم جس مکان میں رہتے ہو اس کے مالک کو تمہارا یہ طرز عمل پسند نہیں ہے۔ اگر اپنی روش نہ بدلی تو تمہیں کوئی دوسرا گھر ڈھونڈنا پڑے گا۔

جمیل نے نہایت سعادت مندی سے ہماری ساری باتیں سنیں اور اظہار ندامت کرتے ہوئے یقین دلایا کہ آئندہ وہ ان مشوروں پر یقیناً عمل کریگا۔ کچھ دن بعد وہ کسی دوسرے گھر میں منتقل ہوگئے۔ باہمی لڑائی جھگڑوں کا سلسلہ بھی جاری رہا اور اب اس گھر کے مالک مکان کو شکایات پیدا ہوگئیں۔

''سزا'' کی تکمیل کے بعد جمیل نے بہت تھوڑا عرصہ لاہور میں گزارا اور پھر واپس انڈیا چلا گیا۔ رضوانہ پہلے ہی ایک بار ناراض ہو کر بچی سمیت انڈیا جاچکی تھیں اور واپس بھی آگئی تھیں۔ ان لوگوں نے لاہور کو خیر باد کہنے کے بعد دوبارہ بمبئی کا رخ کیا۔ پاکستان سے رخصت ہونے کے بعد ہمارا جمیل سے کوئی رابطہ نہ رہا۔ انہوں نے ازراہِ اخلاق ہمیں ایک دوسطری خط لکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی حالانکہ ہم نے انہیں پاکستان کی فلمی صنعت میں ایک موزوں مقام دلانے کیلئے بہت زور لگایا تھا اگر انہوں نے کامیابی حاصل نہ کی تو اس میں ان کی قسمت اور اس سے بڑھ کر خود ان کی عدم صلاحیت اور غیر ذمہ داری کا دخل تھا۔

کافی عرصہ گزر گیا۔ ہمیں بمبئی سے آنے والے ایک دوست نے بتایا کہ تمہارے ہیرو کی بیٹی فرح فلموں میں ہیروئن بن رہی ہے۔ یہ خبر ہمارے لئے حیران کن تھی مگر غیر متوقع نہیں تھی۔ بمبئی واپس جانے کے بعد جمیل کے گھریلو جھگڑوں نے زور پکڑ لیا۔ یہاں تک کہ علیحدگی کی نوبت آگئی۔ اس میں قصور کس کا تھا؟ غالباً دونوں کا۔ جمیل اور رضوانہ دونوں ہی اپنے مزاج اور غصے کے آگے بے بس تھے۔ آئے دن کے جھگڑوں نے رضوانہ کو باغی کر دیا۔ جمیل بمبئی میں کوئی کام حاصل نہ کر سکے' ظاہر ہے کہ ناخوشگوار حالات اور ناکامیوں نے ان کے غصیلے مزاج کو مزید بھڑکا دیا ہوگا۔

رضوانہ کی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی ہیروئن بنے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ رضوانہ شوہر سے علیحدگی کے بعد کسی اور ذریعے سے اپنی دو بیٹیوں کی پرورش نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ تعلیم یافتہ اور ذہین تھیں۔ ملازمت کر کے یا کسی اور طریقے سے اپنا اور بچیوں کا پیٹ پال سکتی تھیں مگر فلمی دنیا کے گلیمر نے ان کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دی تھی۔ فلمی لوگوں سے میل جول اور فلمی حلقوں میں آمد ورفت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ جمیل سے تعلقات کی کشیدگی نے حالات کو مزید خراب کر دیا اور انہوں نے خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ تو ہم نے بھی دیکھا تھا کہ یہ میاں

بیوی دونوں ہی مغلوب الغضب اور ضدی تھے۔ جمیل میں ہزار کمزوریاں سہی لیکن وہ ایک غیر تمند آدمی تھے اور اپنی بیٹیوں کو فلم ایکٹریس بنانے کیلئے کسی بھی قیمت پر آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔ بمبئی میں رضوانہ اور جمیل کے مابین یہ ایک نیا موضوع جنگ چھڑ گیا تھا۔ ادھر لڑکیاں بھی بڑی ہو گئی تھیں۔ فرح کو بچپن ہی سے جمیل نے ضرورت سے زیادہ دبایا تھا اور بہت درشتی کا سلوک کیا تھا۔ وہ بڑی ہوئی تو اس کے مزاج میں ماں اور باپ سے ورثے میں ملی ہوئی ضد اور بغاوت بھی جوان ہو گئی۔ بچپن کی زیادتیوں کے رد عمل نے اتنی شدت سے اپنا اثر دکھایا کہ فرح جیسی نرم و نازک اور خوبصورت لڑکی بالکل ہی باغی ہو گئی۔ اس کے بارے میں بمبئی کی فلمی دنیا میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ حد درجہ بے باک' تند خو' منہ پھٹ اور آزادی پسند ہے۔ کسی کی نہیں سنتی۔ مردوں سے بالکل مرعوب نہیں ہوتی۔ کھلے عام ایسی گفتگو کرتی ہے کہ مرد بھی شرما جائیں۔ گندی گندی گالیاں وہ انتہائی بے تکلفی اور روانی سے دیتی ہے۔ بے تحاشا سگریٹ نوشی کرتی ہے اور صنف مخالف کے ساتھ میل ملاپ میں کوئی حرج نہیں سمجھتی۔ ناخوشگوار گھریلو ماحول نے فرح کی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ جمیل نے بہتیرا زور لگایا مگر بے سود' وہ ماں بیٹیاں اپنے ارادے کو جامۂ عمل پہنانے سے کسی طرح باز نہ آئیں۔ جمیل کے پاس قطع تعلق کے سوا اور کیا چارہ تھا؟ اس نے بوریا بستر سمیٹا اور بمبئی سے ٹرین میں بیٹھ کر حیدر آباد (دکن) پہنچ گیا۔ اس نے اپنی بیوی اور بیٹیوں سے ہر قسم کا تعلق اور رابطہ ختم کر لیا۔ انہیں بھی کون سی پروا تھی اور پھر جب بمبئی کی فلمی دنیا میں پزیرائی بھی ہو رہی ہو اور دولت بھی برس رہی ہو تو پھر جمیل جیسے تند خو اور سخت گیر باپ اور شوہر کو کون یاد رکھتا؟

فرح نے بمبئی کی فلمی دنیا میں بھی ایسے گل کھلائے کہ وہاں کی فلمی دنیا میں بھی بدنام ہو گئی۔ اول تو فلمی دنیا بدنام' اس پر اگر وہ لوگ بھی کسی کو "بدنام" قرار دے دیں تو اس کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فرح نے اپنی مرضی سے دوستیاں قائم کیں اور اپنی خوشی سے قطع کر لیں۔ یہاں تک کہ خوب بدنام ہونے کے بعد شادی کر لی۔ مگر آئے دن کے جھگڑوں کی خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ رشتہ کب تک قائم رہے گا؟

اب یہ سنئے کہ جمیل (جمال) کس حال میں ہیں؟ جمیل نے حیدر آباد (دکن) پہنچ کر روزگار کیلئے بہتیرے ہاتھ پیر مارے مگر کوئی معقول ذریعہ معاش دستیاب نہ ہوا۔ آخر انہوں نے حیدر آباد کے ایک نواحی علاقے میں چھوٹا تنور نما

ریستوران بنا لیا۔ ایک گھریلو عورت سے شادی کرلی اور گمنامی کے عالم میں زندگی گزارنے لگے۔ چند سال قبل فرح کو اپنے باپ کی یاد آئی تو وہ اس کی تلاش میں حیدر آباد پہنچ گئی۔ پتہ معلوم کرکے وہ جمیل کے ریستوران میں پہنچی تو باپ کا بدلہ ہوا حلیہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس نے ایک نیا گھر اور نیا خاندان بنالیا ہے۔ سادہ سی گھریلو بیوی اور چھوٹے بچوں کے ساتھ وہ صبر وشکر کے ساتھ دن گزار رہا ہے۔ فرح نے اسے مالی امداد کی پیشکش بھی کی جسے جمیل نے ٹھکرادیا۔ اپنی نئی ماں اور نئے بہن بھائیوں سے ملاقات کرنے کے بعد فرح بمبئی کی رنگینوں میں واپس پہنچ گئی۔

یہ تو تھا جمیل (جمال) اینڈ فیملی کا احوال۔ اب ذرا فلم ''سزا'' کی روداد بھی سن لیجئے۔

''سزا'' کی کاسٹنگ مکمل ہوچکی تھی۔ ندیم کی جگہ ہم نے جمیل کو تلاش کرلیا تھا۔ فلم کے ہیرو اور ہیروئن کا مسئلہ حل ہوچکا تھا۔ دوسرے مرکزی کردار بھی منتخب کرلئے گئے تھے۔ ان میں سب سے اہم کردار نئیر سلطانہ کو سونپا گیا تھا۔ ان کے شوہر کیلئے درپن صاحب منتخب کئے گئے تھے۔ خالدہ (نئیر سلطانہ) کے بھائی کیلئے ہم نے طالش صاحب کا انتخاب کیا تھا۔ ان کی بیگم تمنا تھیں۔ طالش کا کردار ایک چالاک' موقع پرست اور خود غرض انسان کا تھا جو اپنے ذاتی مفاد کیلئے خون کے رشتوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ ظاہر ہے کہ ان کی بیگم بھی ایک چالاک اور موقع شناس خاتون تھیں۔ ایسی تیزی وطراری کی تمنا بیگم ہی کو اللہ نے عطا فرمائی تھی۔

آغا طالش کو ہم نے ایک دن شاہ نور سٹوڈیو میں جا پکڑا۔ انہوں نے سٹوڈیو کے وسیع وعریض لان کے ایک گوشے میں اپنی چھوٹی سی کٹیا بنا رکھی تھی جسے عام اصطلاح میں ''ڈین'' کہا جاتا تھا۔ اگر ان کی کسی فلم کی شوٹنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ گھر میں پائے جاتے تھے یا اس '' ڈین'' میں۔ کبھی اسے ''ہٹ'' کہا جاتا تھا۔ کبھی کٹیا لیکن عام طور پر یہ '' ڈین'' کے نام ہی سے پہچانی جاتی تھی۔

طالش صاحب بڑے زندہ دل' حاضر جواب' شگفتہ مزاج اور پڑھے لکھے انسان ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ معتدل مزاج اور سمجھ دار ایسے لوگ ہماری فلمی دنیا میں ہمیشہ نایاب رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ فلمی دنیا نے آغا طالش کی ان صلاحیت اور کارکردگی کے اعتبار سے قدر نہیں کی۔ تعریف کے ڈونگرے برسانا اور بات ہے مگر صلاحیتوں کا معاوضہ ادا کرنا بالکل مختلف چیز ہے۔

پاکستان کی فلمی دنیا میں بہت سے لوگ آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ خود آغا طالش کے ساتھی ہم سفر اور بے تکلف دوست علاؤالدین کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے بھی اپنا فلمی سفر ولن اور کریکٹر ایکٹر کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ پھر مرکزی کرداروں میں نظر آنے لگے اور فلموں کے ہیرو بن گئے۔ ان کا معاوضہ بھی چھلانگ لگا کر کہیں سے کہیں پہنچ گیا مگر آغا طالش وہیں کے وہیں رہے۔ جہاں تک ان کی اداکاری کا تعلق ہے' ہماری ذاتی رائے میں ان کے پائے کا دوسرا اداکار پاکستان میں موجود نہ تھا۔ علاؤالدین کی اداکاری کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا جاتا رہا ہے۔ انہیں معاوضہ بھی دل کھول کر ادا کیا گیا مگر طالش کے حصے میں صرف تعریف و توصیف ہی آئی' معاوضہ ان کے قریب قریب جوں کا توں رہا۔ اسے تقدیر کہہ لیجئے یا فلم سازوں کی ستم ظریفی' خود طالش کو ہمیشہ اس بات کا شکوہ رہا۔ ایک بار تو وہ اس قدر برہم اور دلبرداشتہ ہوئے کہ اداکاری ترک کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ یار لوگوں نے بڑی مشکل سے انہیں اس ارادے سے باہر رکھا مگر طالش کی تقدیر میں اللہ نے جتنا معاوضہ لکھ دیا تھا۔ انہیں وہی ملتا رہا البتہ تعریف و ستائش کی کوئی کمی نہ تھی۔ انہیں دیکھ کر قضا و قدر کا فلسفہ عملی طور پر تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

طالش صاحب کی اس ناقدری میں کچھ تو قسمت کا ہاتھ رہا مگر خود طالش صاحب بھی اس کے ذمے دار ہیں۔ شو بزنس اور پی آر یعنی میل جول اور پبلسٹی کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے مگر طالش صاحب ان سے ہمیشہ بیزار ہی رہے۔ میل جول کے بس وہ اس حد تک قائل ہیں کہ ضرورت کے تحت جس سے بھی ملنا ہے سٹوڈیو میں مل لیتے تھے۔ سوشل تعلقات ان کے بے حد محدود رہے ہے۔ دوستوں کا حلقہ اس سے بھی زیادہ محدود' اخبار نویسوں سے ان کے تعلقات نہ ہونے کے برابر سمجھ لیجئے بلکہ اگر اس معاملے میں انہیں آدم بیزار کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ صحافیوں سے وہ بس اخلاقاً ہی ملتے ہیں۔ ذاتی تعلقات کی بات علیحدہ ہے۔ انٹرویو دینے اور تصویریں بنوانے کے وہ سرے سے قائل ہی نہیں ہیں۔ تو پھر ذمے داری کس پر عائد ہو گی؟ وہ منتخب لوگوں اور محدود حلقے سے باہر نکلنے کے عادی ہی نہیں ہیں۔ ہمارے ساتھ ان کے تعلقات دوستانہ اور بے تکلفانہ کہے جا سکتے ہیں۔ بلکہ گھریلو کہہ لیجئے۔ ان کی شادی ہم سے "صدیوں" پہلے ہو گئی تھی اور اس شادی میں ہم بنفس نفیس شریک تھے۔

پشاور ان کی برات گئی تو بہت سے فلم والے اور صحافی اس میں شریک ہوئے۔ ہم بھی ان خوش نصیبوں میں سے ایک

تھے۔مدت دراز کے بعد ہم بھی شادی شدہ کہلائے۔طالش صاحب اوران کی بیگم سے ہماری بیگم کی ملاقاتیں بھی رہیں۔انٹرویوانہوں نے کبھی ہمیں بھی عنایت نہیں فرمایا۔اس سے زیادہ اور کیا کہیں کہ اس موضوع پر ہم اور وہ کبھی متفق نہ ہوپائے۔کچھ عرصے پہلے اسی بات پر ہماری اوران کی ''لڑائی'' تک ہوگئی۔ہم ان سے ناراض ہوگئے' روٹھے رہے۔بول چال بند کردی مگر زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد والا معاملہ رہا۔طالش صاحب انٹرویو کیلئے پھر بھی آمادہ نہ ہوئے۔جو شخص پبلسٹی سے اس طرح دور بھاگتا ہو' شوبزنس میں اس کا توزندہ رہنا ہی ایک معجزہ ہے۔وہ صرف اپنی اعلیٰ اداکاری اوراصول پرستی کی وجہ سے فلمی دنیا میں کام کرتے رہے ہیں ورنہ پبلسٹی کے بغیر شوبزنس میں کیونکر گزارہ ہوسکتا ہے؟

ہم طالش صاحب کے پاس گئے توانہوں نے سب سے پہلے بالائی والی چائے سے خاطر تواضع کی۔

ہم نے انہیں بتایا کہ عنقریب نئی فلم کا آغاز کرنے والے ہیں۔

بولے ''تمہارا ڈائریکٹر توحد سے زیادہ مصروف ہے پہلے اس سے ڈیٹ لے لو اور پھر اداکاروں سے بات کرنا''۔

ہم نے انہیں بتایا کہ حسن طارق صاحب ہمارے ڈائریکٹر نہیں ہیں تو وہ حیران ہوگئے۔

''کیا بات ہے' ناراض ہوگئے؟''

ہم نے بتایا کہ ان کی مصروفیات کے باعث ہم نے فی الحال ان کے بغیر ہی فلم بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ہمایوں مرزا صاحب ہمارے ہدایتکار ہونگے۔طالش صاحب نے عادت کے مطابق کوئی تبصرہ نہیں کیا پھر کہا ''میرے لئے کیا حکم ہے؟اس فلم میں ظالم دادا ہوں یا جابر باپ؟''

ہم نے کہا ''آپ خود غرض اورابن الوقت ماموں ہیں''۔

بولے ''ماشاءاللہ ایک نیا رشتہ ڈھونڈ لیا ہے''۔

ہم نے انہیں مختصر طور پر کہانی اوران کا کردار سنایا۔

''کردار تواچھا ہے'' وہ بولے ''گویا سازشی قسم کا چالاک آدمی ہے اور ہماری بیگم کون ہیں؟''

ہم نے تمنا کے بارے میں بتایا توانہوں نے اس انتخاب کو بھی پسند کیا۔

ہم نے کہا" ایک دو دن میں سکرپٹ آپ کے پاس پہنچا دینگے"۔

وہ چپ چاپ سگریٹ کے کش لگاتے رہے۔

"آغا صاحب، ہمارا خیال ہے کہ اب کچھ پیسوں کی بات ہو جائے"۔

کہنے لگے "بہت اچھا خیال ہے، ہو جائے"۔

ہم نے تمہید باندھی "دراصل یہ فلم ہم نئے اداکاروں کے ساتھ بنا رہے ہیں اور اس کا بجٹ بھی زیادہ نہیں ہے اس لئے ---"

وہ ہنسنے لگے "یار، مطلب کی بات کرو۔ کتنے پیسے رکھے ہیں میرے لئے؟"

ہم نے رقم بتائی، کہنے لگے "ہماری تو قسمت میں ہی یہ رقم لکھ دی گئی ہے۔ باٹا کے جوتوں کی طرح سب نے ایک ہی قیمت مقرر کر دی ہے ہماری"۔

ہم نے کہا" اگر آپ اس میں تبدیلی چاہتے ہیں تو کچھ کم کر دیں؟"

وہ ہمیں گھور کر رہ گئے پھر بولے "شوٹنگ کب سے ہو گی؟"

ہم نے انہیں شوٹنگ کا شیڈول بتایا" بولے "یار تم بھی بس قیامت کے دن کی خبر لاتے ہو۔ بھائی کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک؟ آٹھ مہینے پہلے ڈیٹ لینے آ گئے ہو۔ کوئی عقل کی بات کرو۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ اتنے عرصے تک کون جئے گا، کون مرے گا"!

ان کا ردعمل لہری صاحب سے یکسر مختلف تھا۔

ہم نے کہا" آغا صاحب! زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جینے مرنے کا تو کسی کو علم نہیں ہے۔ آٹھ ماہ تو کیا آٹھ دن یا آٹھ منٹ کی گارنٹی نہیں ہے۔ آپ جینے مرنے کو چھوڑیئے۔ یہ تاریخیں اپنے پاس درج کر لیجئے۔ ظاہر ہے کہ کسی کے مرنے سے دنیا کا کام نہیں رک جاتا۔ اداکار مر جاتے ہیں تو ان کی جگہ دوسرے مل جاتے ہیں"۔

کہنے لگے "وہ تو ٹھیک ہے مگر مجھے تو تمہاری فکر ہے اگر تم نہ رہے تو یہ فلم کیسے بنے گی؟ اس کا بھی کوئی بندوبست کر لو"۔

ہم نے کہا" تو پھر یہ فلم ہی نہیں بنے گی۔ یہ تاریخیں آپ کسی اور فلمساز کو دے دینا۔ اچھا اب ادائیگی کا طریقہ بھی طے

ہو جائے''۔

وہ ہنسنے لگے ''باتیں دھنا سیٹھ جیسی کرتے ہو' جیب میں کوڑی نہیں ہے' رہنے دو یہ تکلف' پتا ہے کہ معاوضہ یکمشت فلم کی ریلیز کے وقت ملے گا۔ کیوں یہی بات ہے نا؟''

''ہاں ہے تو لیکن اگر آپ کسی اور طرح چاہیں تو۔۔۔''

''نہیں میاں' ہم کسی اور طرح نہیں چاہتے۔ اسی طرح چاہتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ تم ہمارے پیسے ہضم نہیں کرو گے اس لئے بہتر ہے کہ اکٹھے دے دینا۔ کسی کام آجائیں گے''۔

اس سے پہلے انہوں نے ہماری پہلی فلم ''کنیز'' میں کام کیا تھا اور معاوضے کی وصولی کا یہی طریقہ طے کیا تھا۔

''اچھا سنو! اس بار تم میرے لئے لباس خود بنوانا۔ میں کہاں تک اپنے کپڑے پہنوں گا''۔

ہم نے کہا ''آغا صاحب پہلے آپ نے ہماری صرف ایک فلم میں کام کیا ہے اور اس کیلئے ہم نے آپ کیلئے کرتے' پاجامے اور شیر وانیاں خود ہی بنوائی تھیں''۔

''میاں' یہ بہت اچھی عادت ہے۔ آئندہ بھی اسی پر کاربند رہنا''۔

ہم نے کہا ''اپنے جوتے تو پہن لو گے یا وہ بھی ہم خریدیں؟''

بولے ''جوتوں کی خیر ہے وہ ہمارے پاس بہت''۔

طالش صاحب سے بات چیت طے ہو جانے کے بعد ہماری فلم کے بیشتر مسائل حل ہو گئے تھے۔ اب صرف ایک اہم کردار باقی رہ گیا تھا اور وہ تھا جمیل کی چھوٹی سوتیلی بہن کا۔ ہم نے اس مسئلے پر دھیان ہی نہیں دیا تھا مگر جب سوچا تو معلوم ہوا کہ یہ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ ہے۔

ہیرو کی چھوٹی بہن کی عمر سولہ سترہ سے زائد نہیں ہونی چاہئے تھی۔ اس عمر کی کوئی لڑکی دور دور تک ہمیں نظر نہیں آئی۔ بہت غور کیا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ چنانچہ ہم ایک بار پھر اپنے مشیر اور دوست شباب کیرانوی کے پاس پہنچ گئے۔

''شباب صاحب ایک مشکل پڑ گئی ہے''۔

بولے ''اللہ سے دعا کرو' وہی مشکلیں آسان کرنے والا ہے''۔

ہم نے کہا'' وہ تو ہے ہی سب کا مشکل کشا۔ مگر فلمی معاملات میں اللہ میاں سے رجوع کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے آپ کے پاس چلے آتے ہیں''۔

کہنے لگے ''دیکھو آفاقی۔ ایک آدھ بار کا مشورہ تو کوئی بات نہیں ہے مگر مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم نے مجھ سے باقاعدہ مشورے لینے شروع کر دیئے ہیں۔ اس کی تو فیس لگے گی۔ آخر ڈاکٹر بھی تو مشورے کی فیس لیتے ہیں''۔

ہم نے کہا'' ہمارے دوست ڈاکٹر ہم سے کوئی فیس نہیں لیتے۔ ویسے بھی دوستوں کا حق ہوتا ہے اپنے دوستوں پر اگر فیس ہی کی بات ہے تو پھر ہم بھی اپنے مشورے کی فیس مقرر کر دینگے''۔

کہنے لگے ''یار تم تو سیریس ہو گئے۔ دوستوں میں عوض معاوضہ' گلہ ندارد۔ ویسے یہی کیا کم ہے کہ تم مشورہ لینے چلے آتے ہو ورنہ آج کل تو کوئی مفت بھی مشورہ نہیں لیتا۔ بچوں کو مشورہ دینے بیٹھو تو منہ بنانے لگتے ہیں۔ نصیحت کو دشمنی سمجھتے ہیں۔ ایسے میں تم جیسے لوگوں کا دم غنیمت ہے جو مشورہ لینے آجاتے ہو۔ فیس دو' نہ دو۔ مشورہ ضرور لیا کرو ' اب بولو' مسئلہ کیا ہے؟''۔

ہم نے مسئلہ بیان کیا۔

کہنے لگے ''میں نے بھی تمہارا اسکرپٹ پڑھا ہے اور یہ سوچ رہا تھا کہ ہیرو کی بہن تم کہاں سے لاؤ گے۔ وہ بے حد اہم کردار نئی قسم کا کردار ہے۔ نوعمر لڑکی ہے' معصوم 'بھولی بھالی شکل کے ساتھ اس کیلئے خوبصورتی بھی لازم ہے۔ اداکارہ بھی اچھی ہو مگر تم نے اس طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی''۔

ہم نے کہا'' دوسرے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ اب اس مسئلے کی باری آئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔ ایسی ہیروئن کہاں سے پیدا کریں''۔

بولے ''پیدا بھی کر لو گے تو آٹھ مہینے بعد وہ تمہارا کردار ادا کرنے کے قابل تو نہیں ہو سکتی۔ اس لئے پیدا کرنے کے چکر میں نہ پڑو' پیدا شدہ لڑکیوں میں تلاش کرو''۔

حسب معمول انہوں نے پیروں تلے گھنٹی کا بٹن دبا کر چائے لانے کی ہدایت کی۔ میز پر رکھے ہوئے سگریٹ کیس اور پائپ دونوں کو چند لمحے دیکھتے رہے پھر پائپ کے حق میں فیصلہ دیا اور پائپ اٹھا کر سلگانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔

ہم نے کہا ''شباب صاحب یا تو آپ پائپ پینا چھوڑ دیں یا پھر ایک پائپ سلگانے والا ملازم رکھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے پرانے زمانے میں لوگ حقہ تازہ کرنے کیلئے خصوصی ملازم رکھا کرتے تھے''۔

مگر وہ سوچ میں گم تھے اس لئے جواب نہ دے پائے۔ کچھ دیر پائپ کا دھواں اڑانے کے بعد فرمانے لگے ''سوچ لیا''۔

ہم نے بے تابی سے پوچھا ''کیا؟ مطلب یہ کہ کوئی لڑکی دھیان میں آئی؟''

کہنے لگو ''واہ۔ تم نے تو یاس یگانہ چنگیزی کا شعر یاد دلا دیا۔

یہ کنارہ چلا کہ ناؤ چلی

کہئے کیا بات دھیان میں آئی

اگر یگانہ چنگیزی تھوڑا سا سنکی نہ ہوتا اور بلا وجہ غالب کی دشمنی پر کمر نہ باندھ لیتا تو اسے بھی عظیم شاعر مان لیا جاتا۔ زبان، کلام، تخیل اور تنوع تو اس شخص پر ختم ہے جسے۔۔۔''

ہم نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''شباب صاحب، ہمیں اپنے فکر پڑی ہوئی ہے اور آپ یگانہ چنگیزی کا ذکر لے بیٹھے''۔

''یہ کیا بد ذوقی ہے۔ یار تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ بلا وجہ اپنی جان ہلکان کر رہے ہو۔ ارے بندہ خدا، ابھی تمہاری فلم شروع ہونے میں آٹھ مہینے باقی ہیں۔ لگ بھگ اتنا عرصہ تو ایک انسان کی تخلیق میں لگ جاتا ہے۔ اسی لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ فکر فردا سے دور ہی رہنا بہتر ہے''۔

ہم نے کہا ''بزرگوں نے تو یہ بھی کہا ہے کہ فلم ہرگز مت بنانا، یہ شیطانی کام ہے''۔

''وہ بھی درست کہا ہے مگر اب تم فلم تو چھوڑنے سے رہے۔ البتہ فکر فردا سے دامن بچا سکتے ہو''۔

اس اثناء میں چائے اور طشتری میں پان آ گئے۔ شباب صاحب نے اپنا پائپ بڑی احتیاط سے ایش ٹرے میں رکھ دیا اور چائے کی طرف متوجہ ہوئے، بولے ''پہلے تو آج کل کی ہیروئن کا جائزہ لو''۔

ہم نے ہیروئنوں کے نام گنوانے شروع کر دیئے۔ان میں سے کوئی ایک بھی ٹین ایجر نہیں لگتی تھی۔ان میں روزینہ سب سے کم عمر تھیں مگر وہ بھی دیکھنے میں سولہ سترہ سال کی نظر نہیں آتی تھیں۔ اس کے علاوہ انہیں ہم نے اپنی فلم کی منتخب کرلیا تھا کہ جمیل کے مقابلے میں کوئی نوعمر ہیروئن ہی موزوں رہ سکتی تھی۔کچھ دیر تک ہم لوگ یہی مشق کرتے رہے۔آخر فیصلہ یہ ہوا کہ نئی لڑکی تلاش کی جائے۔ ہمیں تو اس میں کوئی اعتراض نہ تھا مگر سوال یہ تھا کہ تلاش کہاں کی جائے؟

جملہ معترضہ سمجھ لیجئے۔ بات ہو رہی تھی فلم سزا کیلئے چھوٹی بہن کے کردار کیلئے ایک نوعمر اور الھڑ لڑکی کی تلاش کی ہم اور شباب صاحب کافی دیر تک غور کرتے رہے۔شباب صاحب نے کہا ''لو بھئی تمہارے مسئلے کا حل سمجھ میں آگیا۔

وہ کیا؟'' ہم خوش ہو گئے۔

انہوں نے کہا آرام سے بیٹھ جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ایک نہ ایک دن یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائیگا۔

اور واقعی کچھ دن بعد ہی مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔

شمیم آراء اس زمانے میں سمن آباد مین روڈ پر رہتی تھیں۔ایک دن ہم ان کے گھر گئے تو انہوں نے بتایا کہ اوپر کے حصے میں انہوں نے کرائے دار رکھ لئے ہیں۔

ہم حیران رہ گئے ''کرائے دار رکھنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟''

وہ بولیں ''اوپر کا حصہ ہمارے لئے بے کار ہی تھا۔ ہم سب تو نیچے ہی رہتے ہیں۔اوپر کوئی جاتا ہی نہیں ہے''۔

ان کی نانی نے مزید فرمایا ''یوں کہ ویسے بھی خطرہ لگا رہتا ہے''۔

''خطرہ کیسا؟''

''بھئی خالی گھر تو شیطان کی پناہ گاہ ہوتا ہے۔اوپر کا حصہ ویران' خالی ڈھنڈار پڑا ہوا تھا۔جو کوئی چور آجائے تو؟''

ہم نے کہا ''ماں جی۔خالی گھر میں آکر چور کیا کریگا' بس تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد خالی ہاتھ ہی واپس لوٹ جائیگا' آپ کا کیا بگاڑے گا''۔

بولیں '' آفاقی' کیسی بات کرتے ہو۔سوچو اگر چور وہاں چھپ کر بیٹھ جائے اور رات کو کسی وقت اتر کر نیچے ہمارے

گھر میں آ جائے تو ہم کیا بگاڑ لیں گے ؟''

ہم نے کہا''اور اگر وہ اوپر کے راستے سے آنے کے بجائے براہ راست نیچے سے ہی آ جائے تو آپ اس کا کیا بگاڑ لیں گی ؟''

''بھئی تم تو خواہ مخواہ بحث کرنے لگتے ہو۔ کوئی حرج تو نہیں ہے اگر اوپر کوئی رہنے لگے۔ ان کا بھی بھلا اور ہمارا بھی فائدہ۔ تم تو جانتے ہو' آفتاب اوپر رہنے لگی ہیں''۔

''آفتاب ؟'' ہم سوچ میں پڑ گئے۔

شمیم آراء نے کہا''ارے آفاقی صاحب' آفتاب باجی کو بھول گئے ؟''

اتنی دیر میں آفتاب باجی بذات خود تشریف لے آئیں۔ ہم نے انہیں پہچان لیا۔ آفتاب اختر اور ماہتاب اختر' دو بہنیں ایک زمانے میں لاہور میں بہت مشہور تھیں۔ ان کی والدہ دہلی کی رہنے والی تھیں۔ رکھ رکھاؤ' وضع داری' بول چال' سبھی کچھ دہلی کے شرفاء جیسا۔ ہم آغا شورش کاشمیری کے ہمراہ ایک بار ان کے بالاخانے پر بھی گئے تھے جب ایک بہن بیمار تھیں۔ بہر حال' ہمیں وہ ماحول بہت پسند آیا تھا۔ بچپن میں دہلی کے گھروں میں جو سماں دیکھا تھا وہی دوبارہ دیکھنے کو ملا۔ ان دونوں بہنوں نے بازار حسن سے ایک ہفت روزہ میگزین بھی نکالا تھا اور لاہور کے ادبی حلقوں میں اس کا بہت چرچا تھا۔ یہ 1952-53ء کا ذکر ہے۔ بعد میں سنا کہ دونوں بہنوں نے شادی کر لی اور رخصت ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ دولت منداور بااثر لوگوں سے شادیاں کی تھیں۔ کچھ عرصے ان کا تذکرہ رہا۔ پھر لوگ بھول گئے۔ ہم نے صحافت چھوڑ دی اور فلم کے کوچے میں جا نکلے۔ شمیم آراء پہلے کراچی میں رہتی تھیں اور وہیں ہم سے ان کی ابتدائی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ لاہور آ کر انہوں نے سمن آباد کی کوٹھی میں بسیرا کیا تو اسی زمانے میں ان کی نانی اماں نے ایک بار یہ اطلاع دی کہ آفتاب اختر کی اپنے میاں سے علیحدگی ہو گئی۔ تین بچے ہیں۔ جن کی پرورش اب اسی غریب کے سر پڑ گئی ہے۔ اس طرح آفتاب اختر دوبارہ نمودار ہو گئیں۔ ان سے پہلی بار کراچی میں شمیم آراء کے گھر ہی میں ملاقات کا موقع ملا تھا مگر اب وہ لاہور منتقل ہو گئی تھیں اور شمیم آراء کی کرائے دار تھیں۔ خدا جانے کرائے دار تھیں یا ماں جی نے ازراہ ہمدردی انہیں اپنے گھر میں جگہ دے دی تھی۔ ہم نے کبھی یہ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی۔

آفتاب اختر پر تین بچوں کی پرورش کی ذمہ داری تھی۔ سب سے بڑی ایک لڑکی تھی۔ اس کے بعد لڑکا اور پھر لڑکی۔

بڑی لڑکی کی عمر تیرہ چودہ سال ہو گی۔ یہ ایک شوخ و شریر لڑکی تھی۔ ماں نے بہت اچھی تربیت دی تھی۔ مطالعے کا بھی شوق تھا اور فلم بینی کا بھی۔ گفتگو نہایت شائستہ اور اطوار بھی پسندیدہ۔ ظاہر ہے کہ آفتاب اختر نے اپنی ماں سے جیسی پرورش اور تربیت حاصل کی تھی ویسی ہی تربیت اپنے بچوں کو دے رہی تھی۔ وہ کچھ دیر بیٹھیں اور پھر رخصت ہو گئیں۔ اس سے پہلے شمیم آراء نے ایک بار ہمیں بتایا تھا کہ آفتاب باجی فلموں میں کام کرنا چاہتی ہیں۔ وہ اس وقت پختہ عمر تھیں لیکن ان کی دلکشی اور کشش میں کمی نہیں آئی تھی۔ چہرہ مہرہ، قد و قامت، سبھی کچھ موزوں تھا مگر جوانی ڈھل رہی تھی۔ اس لئے ہم نے مشورہ دیا کہ وہ فلموں میں کام نہ کریں تو بہتر ہو گا۔ انہیں فلم والے کریکٹر ایکٹریس کے طور پر کاسٹ کرینگے جس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ جس کام میں آئندہ ترقی کا کوئی امکان نہ ہو اس کو اپنانے کا فائدہ؟

شمیم آراء نے ہماری یہ رائے ان تک پہنچا دی تھی۔ انہوں نے نہ صرف ہمارا شکریہ ادا کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ اب وہ اس ارادے سے باز آ گئی ہیں۔

شمیم آراء نے کہا "سنا ہے آپ نے ایک نیا ہیرو تلاش کیا ہے، کبھی ہمیں بھی دکھائیں"۔

ہم نے کہا "بھئی وہ ہیرو ہے۔ جب فلم میں کام کرے گا تو سب کو نظر آ جائیگا۔ وقت سے پہلے نمائش لگانے کا کیا فائدہ؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے مگر کیسا ہے، سنا ہے خوبصورت ہے؟"

"خوبصورت نہ ہوتا تو ہیرو کیسے بن جاتا۔ اداکار کیسا ہے یہ کچھ وقت بعد پتہ چلے گا۔

"چلئے آپ کو ہیرو بھی مل گیا اور ہیروئن بھی کوئی پرابلم نہیں رہی"۔

ہم نے کہا "ایک بہت بڑی پرابلم درپیش ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں؟" اس کے بعد ہم نے انہیں اپنی کہانی سنائی اور ایک نوعمر، خوش شکل، معصوم صورت لڑکی کی ضرورت بیان کی۔

وہ ایک دم ہنس پڑیں "آفاقی صاحب اس کو کہتے ہیں بغل میں بچہ اور شہر میں ڈھنڈورا"۔

ہم نے کہا ''ذرا تفصیل سے بیان کریں''۔

کہنے لگیں ''آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آفتاب باجی کی بیٹی نینی کو آپ نے نہیں دیکھا؟''

''دیکھا ہے''۔

''پھر بھی آپ پریشان ہیں۔ نینی کو فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق ہے''۔

''مگر وہ تو ابھی بچی ہے''۔

''آپ کو بھی تو ایک نوعمر لڑکی ہی کی تلاش ہے''۔

''وہ تو ہے'' ہم نے کہا ''مگر بچی بھی نہ ہو۔ ٹین ایجر تو نظر آئے''۔

کہنے لگیں ''بھئی آپ بھی خوب ہیں۔ ٹھہریئے' میں ابھی نینی کو بلاتی ہوں۔ آپ اس بار ذرا غور سے دیکھئے''۔

یہ کہہ کر انہوں نے ملازم کو آواز دی اور اوپر سے نینی کو بلا لانے کی ہدایت کی۔

نینی ہمارے لئے نئی نہیں تھی۔ اس سے پہلے آفتاب جس فلیٹ میں رہتی تھیں ہم وہاں بھی ایک دو بار جا چکے تھے۔ ان کے تینوں بچے بہت تمیزدار تھے۔ نینی کو کتابوں کے مطالعے اور فلموں کا بھی شوق تھا۔ اس لئے اس بارے میں اکثر سوالات کرتی رہتی تھیں۔ ان سے چھوٹا بھائی جاوید دس بارہ سال کی عمر کا تھا۔ چھوٹی بہن کا نام ہم نے ''مکی ماؤس'' رکھ دیا تھا۔ اس لئے کہ اس کی ناک لمبی اور چہرہ لمبوترا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر ہمیں مکی ماؤس کارٹون یاد آ جاتا تھا۔ پہلی بار ہم نے اسے مکی ماؤس کا لقب دیا تو اسے پسند نہیں آیا۔ اس کی امی نے بتایا کہ اسے یہ نام پسند نہیں ہے۔ وہ کہتی ہے آفاقی صاحب سے کہئے کہ کوئی اور اچھا سا نام رکھ دیں مگر کچھ دن بعد بہن بھائیوں نے بھی اسے مکی ماؤس کے نام سے پکارنا شروع کر دیا اور اس طرح یہ نام مقبول ہو گیا۔ ہم کو اس کا اصلی نام یاد نہیں رہا۔ اب بھی ''مکی ماؤس'' کے نام سے جانتے ہیں۔

کچھ دیر بعد نینی کودتی پھاندتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

''سزا'' کی شوٹنگ سے پہلے موسیقی پر کام شروع ہو گیا۔ ناشاد صاحب اور قتیل شفائی صاحب کو ایک گھاٹ پانی پلانے کا سہرا ابھی ہمارے سر رہا اور وہ دونوں تمام اختلافات کو بھلا کر موسیقی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہم نے شوٹنگ کے

انتظامات کی طرف توجہ دی اور تمام اداکاروں کو مطلع کر دیا کہ تین ہفتے بعد شوٹنگ کا آغاز ہو گا۔

روزینہ سے اس دوران میں ہماری لاہور اور کراچی میں ملاقات ہوتی رہی تھی۔ شوٹنگ کے آغاز سے ایک ماہ قبل ہمیں آغا جی اے گل صاحب نے اپنے کمرے میں بلایا اور پوچھا ''تمہاری فلم کی شوٹنگ کب ہو گی؟''

ہم نے انہیں تاریخوں سے آگاہ کر دیا۔

انہوں نے پوچھا ''تمہاری ہیروئن کون ہے؟''

ہم نے جواب دیا ''روزینہ''!

بولے ''مگر آفاقی' روزینہ کی تاریخیں تو ان دنوں میں میرے پاس ہیں اور ان ہی دنوں وہ شباب صاحب کی ایک فلم میں بھی کام کر رہی ہے''۔

ہم نے کہا ''آغا صاحب' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم نے آٹھ ماہ پہلے اس کو سائن کیا تھا''۔

پوچھا ''تم نے اس سے ایگریمنٹ سائن کیا تھا؟''

ہم نے کہا ''ہم نے زندگی میں پہلی بار کسی آرٹسٹ سے ایگری منٹ پر دستخط کرائے تھے ورنہ سب سے زبانی ہی معاملات طے ہو جاتے ہیں۔''

آغا صاحب بڑی شفقت سے بولے ''آفاقی۔ میں نہیں چاہتا کہ تم غلط فہمی میں رہو اور تمہارا نقصان ہو جائے۔ دیکھو' روزینہ نے میرے ساتھ بھی ایگری منٹ سائن کیا ہے اور ان ہی دنوں میں میری شوٹنگ کرنے کی پابند ہے اگر یقین نہ ہو تو اس سے تصدیق کر لو''۔

ہم پریشان ہو گئے۔ اپنے دفتر میں پہنچتے ہی ہم نے کراچی روزینہ کے گھر فون ملوایا۔ کافی دن بعد لائن ملی۔ دوسری طرف ایک زنانہ آواز سنائی دی۔

ہم نے پوچھا ''روزینہ کہاں ہیں؟''

''آپ کون بول رہے ہیں؟''

ہم نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ لاہور سے بول رہے ہیں۔ ''روزینہ تو ڈھاکا گئی ہوئی ہے' ممّی کے ساتھ۔ وہاں سے

لاہور چلی جائیگی۔ شباب صاحب اور آغا گل کی شوٹنگ کیلئے“۔

ہم نے ”مگر یہ تو ہماری ڈیٹس ہیں“۔

بولیں ”مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ آپ روزینہ سے بات کریں“۔

”ان کا ڈھاکا میں کیا نمبر ہے؟“

”پتہ نہیں“۔

ہمیں بہت غصہ آیا۔ ہم نے کہا” اگر آپ کی روزینہ سے فون پر بات ہو تو ہماری طرف سے یہ پیغام دینا کہ اگر اس نے ہماری فلم ”سزا“ کی شوٹنگ نہ کی تو ہم اسے کبھی بھی فلم کی شوٹنگ نہیں کرنے دینگے اور اسے مزہ چکھا دینگے“۔

جواب ملا ”آپ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو عورتوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے؟“۔

ہم نے کہا ”اب ہم آپ کو کیا جواب دیں۔ جب روزینہ لاہور آئیں گی تو انہیں اس کا جواب دے دینگے“ یہ کہہ کر ہم نے فون بند کر دیا۔

غصے اور پریشانی کے مارے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ کچھ دیر بیٹھے سوچتے رہے۔ چائے پی‘ پانی پیا۔ پائپ کے کش لگائے۔ دماغ کچھ ٹھکانے پر آیا تو ہم سیدھے شباب کیرانوی صاحب کے پاس پہنچ گئے۔

”شباب صاحب‘ کیا روزینہ آپ کی فلم میں بھی کام کر رہی ہے؟“۔

”ہاں“۔

”شوٹنگ کب ہے؟“

انہوں نے وہی تاریخ بتا دی جو ہماری شوٹنگ کی تھی۔

”مگر یہ تو ہماری فلم کی تاریخیں ہیں۔ وہ ان دنوں میں ہمارے سوا کسی اور کی شوٹنگ نہیں کر سکتی“۔

شباب صاحب نے ہمارا چہرہ دیکھ کر ہمارے غصے کا اندازہ لگا لیا تھا بولے ”اچھا ‘اچھا۔ یہ مسئلہ بھی حل ہو جائیگا۔ تم چائے پیو“ انہوں نے پیروں تلے گھنٹی کا بٹن دبایا۔

ہم نے کہا ”شباب صاحب آپ ہمارے پرانے دوست ہیں‘ ہمارا ایک مشورہ مان لیں“۔

''ہاں ہاں کہو''۔

''آپ یا تو اپنی فلم کی تاریخیں بدل لیں یا اداکارہ۔ یہ بات ہم آپ کو پہلے سے بتائے دے رہے ہیں تاکہ آپ کا نقصان نہ ہو''۔

''میرا نقصان کیسے ہو گا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ایسے ہو گا کہ روزینہ یا تو ہماری شوٹنگ کرے گی یا پھر کسی کی بھی شوٹنگ نہیں کریگی۔ ہم ہائی کورٹ' سپریم کورٹ تک جائیں گے اور سب کی شوٹنگ بند کرا دینگے۔ سوچ لیجئے'' یہ کہہ کر ہم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ہمیں پکارتے رہ گئے مگر ہم نہ رکے۔

اگلے دن ہم نے سٹوڈیو میں آغا صاحب کو بھی یہ وارننگ دے دی۔

''کیسی باتیں کرتے ہو'' انہوں نے ہماری دھمکی سن کر کہا ''تم کسی کی شوٹنگ کیسے رکوادو گے کبھی ایسا ہوا ہے پہلے؟''

ہم نے کہا ''پہلے تو نہیں ہوا مگر اب ہو جائیگا۔ آغا صاحب' یہ تو زیادتی ہے 'ناانصافی ہے۔ ہم نے اتنے عرصے پہلے تاریخیں حاصل کی ہیں اور کسی اور کی شوٹنگ کر رہی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟''

''مگر اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر وہ بتا دیتی کہ یہ تمہاری ڈیٹس ہیں تو ایسا نہ ہوتا''۔

ہم نے کہا ''اسی لئے ہم اسے سبق سکھانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ ہمارے مہربان ہیں بزرگ ہیں۔ آپ کے ہم پر بہت احسان ہیں مگر روزینہ کی یہ حرکت ہم برداشت نہیں کرینگے''۔

''جب بھی تمہاری فلم شروع ہونے لگتی ہے تم لڑائی جھگڑے شروع کر دیتے ہو۔ اسی لئے تو تمہاری صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ یار کاروبار میں سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے''۔

ہم غصے میں چپ بیٹھے رہے۔ آغا صاحب نے اپنے خاص ملازم کو پکارا اور پشتو میں کہا ''ان کیلئے چائے لاؤ''۔ پھر انہوں نے اپنی دراز سے انگلش بسکٹوں کا ایک ڈبا نکال کر سامنے رکھ دیا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ یہ آغا صاحب کا معمول تھا۔ وہ انتہائی شفیق 'مہربان اور متواضع بزرگ تھے اور ہم پر تو وہ خصوصی مہربانیاں کرتے تھے۔

ہم چائے پی کر اٹھنے لگے تو آغا صاحب نے کہا ''بلاوجہ فکر کیوں کرتے ہو۔ روزینہ لاہور ہی آئیگی اس سے بات کر لینا''۔

دوسرے دن ہم ایک وکیل دوست کے پاس پہنچ گئے۔انہیں سارا قصہ سنایا اور روزینہ کا دستخط شدہ ایگریمنٹ بھی دکھایا۔

''آپ چاہتے کیا ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔

ہم نے کہا''ہم یہ چاہتے ہیں کہ اگر روزینہ ہماری فلم کی شوٹنگ نہ کرے تو اسے کوئی اور شوٹنگ کرنے سے بھی روک دیا جائے۔دیکھو' یہ ہماری عزت کا سوال ہے''۔

وہ ہنسنے لگے ''ایک تو تمہاری عزت کا سوال ہر جگہ پیدا ہو جاتا ہے' ارے یہ تو روزمرہ کی باتیں ہیں''۔

ہم نے کہا''یہ روزمرہ کی باتیں نہیں ہیں۔ہمارے لئے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ہمارا سارا پروگرام الٹ پلٹ ہو جائیگا۔بہت نقصان ہو گا اور مذاق بنے گا سوالگ''۔

وہ کچھ دیر سوچتے رہے' پھر بولے ''ہاتھ بڑھاؤ''۔

ہم نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

انہوں نے ہمارے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا''وعدہ جو تم چاہتے ہو وہی ہو گا''۔

''خرچہ کتنا ہو گا؟'' ہم نے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگے ''بھئی خوب چیز ہیں آپ۔ایک طرف عزت کا سوال ہے اور دوسری طرف خرچہ پوچھ رہے ہیں۔عزت کا تو کوئی مول ہی نہیں ہوتا''۔

ہم نے کہا''وہ تو ٹھیک ہے مگر ہماری اوقات دیکھ کر کام کرنا''۔

''اللہ مالک ہے''۔انہوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا دی۔

ہمارے دوستوں نے یہ خبر ہر طرف پھیلا دی اور کچھ اخباروں میں بھی چھپ گیا کہ ہم روزینہ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے والے ہیں۔جس نے بھی ہم سے تصدیق چاہی ہم نے پرزور الفاظ میں یہی کہا کہ ہم روزینہ کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ وہ پھر کسی اور فلمساز کے ساتھ یہ حرکت نہیں کریگی۔

ہمایوں مرزا صاحب نے ایک دن ہم سے کہا''آفاقی سنو' ہم کوئی اور ہیروئن کیوں نہ سائن کر لیں''!

ہم نے کہا ''مرزا صاحب ' اوّل تو ایسا کرنا غلط ہو گا۔ دوسرے یہ کہ جمیل کے ساتھ کی دوسری ہیروئن اس وقت ہمیں کہاں ملے گی؟''

وہ بولے ''بلاوجہ جھگڑے میں پڑنے سے کیا فائدہ؟''

ہم نے کہا ''یہ وجہ کیا کم ہے کہ اگر ہم نے کوئی قدم نہ اٹھایا پھر بھی ہماری فلم تو رک جائیگی اور جگ ہنسائی ہو گی سو الگ''۔

وہ چپ ہو گئے۔

ہماری شوٹنگ میں چھ سات دن رہ گئے تھے اور ہم نے بڑے اہتمام سے ایورنیو سٹوڈیوز کے بڑے فلور میں غریبوں کی بستی کا ایک سیٹ تعمیر کروانا شروع کر دیا تھا۔ سب اس انتظار میں تھے کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین کیا ہو گا۔

تیسرے دن ہم سٹوڈیوز میں آغا صاحب کے دفتر کے سامنے سے گزرے تو انہوں نے ہمیں بلا لیا ''سنا ہے تمہارا سیٹ لگ رہا ہے؟''۔

جی ہاں ہم نے مختصر جواب دیا۔

وہ پوچھنے لگے ''اگر روزینہ نہ ملی تو تم کیا کرو گے؟''

ہم نے کہا '' آغا جی روزینہ کو ہماری شوٹنگ کرنی پڑے گی۔ اس کے علاوہ بھی سیٹ پر کام ہے''۔

''تمہیں پائے اور نہاری پسند ہیں؟'' انہوں نے اچانک پوچھا۔

''جی بس کھا لیتے ہیں اگر مرچ زیادہ نہ ہو''۔

''اچھا تو آج رات کھانا میرے ساتھ ہی کھانا''۔

رات کو آغا صاحب دس بجے کے قریب سٹوڈیو سے کوٹھی واپس جاتے تھے اور گیارہ بجے کے قریب ڈنر کھاتے تھے۔ ہم گیارہ بجے ان کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ حسب معمول ان کے گھر میں خوب رونق اور چہل پہل تھی۔ آغا صاحب ڈائننگ ہال میں تھے۔ ہمیں بھی وہیں پہنچا دیا گیا۔ بیشتر لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور میز خالی تھی۔

''آؤ آفاقی۔ تم نے دیر لگا دی۔ خیر ' تھوڑا سا کھانا بچ ہی گیا ہے اور تم تو زیادہ کھاتے بھی نہیں ہو'' یہ کہہ کر انہوں نے

ہمیں اپنے برابر والی کرسی پر بٹھالیا۔ فوراً پلیٹیں چُن دی گئیں۔ قابوں میں کھانا گرم ہو کر آگیا اور آغا صاحب اپنے ہاتھ سے نکال نکال کر ہماری پلیٹ میں ڈالنے لگے۔

مرزا صاحب کچھ نہیں بولے مگر ہمیں محسوس ہو گیا تھا کہ انہیں ہماری باتوں سے اتفاق ہے۔ دوسرے دن جمیل شوٹنگ کیلئے آئے تو ہمایوں مرزا صاحب نے انہیں کمرے میں بلایا۔ انہیں اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی اور پھر بزرگ کی حیثیت سے انہیں سمجھایا اور مشورے دیئے۔ ظاہر ہے کہ اس گفتگو کا بہت اچھا اثر پڑا۔ جمیل کا خوف دور ہو گیا اور وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ کام کرنے لگا۔ ہم نے اسے یہ سمجھا دیا تھا کہ وہ شوٹنگ کے دوران میں ہیروئن کے ساتھ زیادہ شیر و شکر ہونے کی کوشش نہ کرے۔ اس طرح بلاوجہ اسکینڈل بن جاتے ہیں جو نئے اداکاروں کے حق میں مناسب نہیں ہوتے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ جمیل نے کم از کم ہمارے اس مشورے پر بڑے خلوص کے ساتھ عمل کیا۔ کاش وہ ہمارے دوسرے مشوروں پر بھی اسی طرح عمل پیرا ہوتا تو پاکستان کی فلمی صنعت میں جگہ بنا لیتا۔

روزینہ ایک چلبلی، شوخ اور ذہین اداکارہ تھیں۔ وہ کرسچین تھیں اور انہوں نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں نسبتاً زیادہ آزادی اور آزاد خیالی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر ماحول میں بے تکلف ہو جاتی تھیں۔ ان کے مزاج میں وہ جھجک نہیں تھی جیسی کہ عموماً مشرقی لڑکیوں میں ہوتی ہے۔ خواہ وہ ایکٹریس ہی کیوں نہ بن جائیں۔ اس سے پہلے لاہور کے اسٹوڈیو میں مختلف فلموں کی شوٹنگ کے سلسلے میں روزینہ سے ہماری ملاقات ہوتی رہی تھی۔ خاص طور پر علی زیب کی فلم کے دوران میں ان سے کافی ملاقاتیں رہیں اور گپ شپ بھی ہونے لگی۔ ان میں سینس آف ہیومر بھی تھا اور ذہانت بھی لیکن شائستگی کا دامن انہوں نے کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ فلم ''سزا'' کے سلسلے میں وہ لاہور میں آکر مقیم ہوئیں تو ظاہر ہے کہ وہ ہماری مہمان تھیں۔ انہیں ہوٹل سے لانے اور واپس پہنچانے کیلئے ہم اپنی کار بھیج دیا کرتے تھے۔ کبھی خود بھی انہیں چھوڑنے چلے جاتے تھے۔ لطیفہ بازی کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ عام طور پر ہیروئنیں ہر ایک کے ساتھ بے تکلف نہیں ہوتیں اس لئے ہمارے بارے میں عموماً غلط فہمیاں جنم لیا کرتی تھیں حالانکہ بات اتنی تھی کہ ہماری دوستی بے لاگ، بے لوث اور بے مطلب ہوا کرتی تھی۔ گپ شپ اور لطیفہ بازی کی وجہ سے بھی کچھ زیادہ ہی بے تکلفی ہو جاتی تھی۔ اس طرح ہیروئنوں سے ہمارا میل جول کچھ زیادہ ہو جاتا تھا۔ اسے

صرف دوستی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ویسے بعض کے معاملے میں اس دوستی میں تھوڑا سا ہلکا رومانی عنصر بھی شامل ہو جاتا تھا مگر ہر ایک کے ساتھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں ہمارے جن ہیروئنوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے وہ زمانے کی تلخیوں اور تبدیلیوں کے باوجود قائم رہے اور آج بھی اسی طرح ملنا جلنا اور بے تکلفی ہے حالانکہ اس اثنا میں پُلوں کے نیچے سے خدا جانے کتنا پانی گزر چکا ہے۔

روزینہ کے ساتھ بھی ہماری دوستی ہوگئی۔ وہ کبھی کبھی ہمارے ساتھ ڈنر کیلئے بھی چلی جاتی تھی۔ انہوں نے کئی حضرات کے بارے میں ہم سے معلومات حاصل کیں جو ہم نے بلاکم وکاست بتادیں تاکہ انہیں ان حضرات کے مزاج، عادات اور فطرت کا اندازہ ہو جائے۔ اس کے بعد تو روزینہ اکثر ہمیں مختلف لوگوں کے قصے سناتی رہتی تھیں۔ فلمی دنیا میں مرد اور عورت دونوں ہی کام کرتے ہیں لیکن اس کا مزاج بھی معاشرے کے دوسرے شعبوں سے مختلف نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایک مشکل یہ ہے کہ اگر عورت الگ تھلگ اور ریزرو رہے تو یار لوگ اسے مغرور اور نک چڑھی کہہ کر مختلف باتیں بنا لیتے ہیں اور اگر وہ ملنا جُلنا، ہنسنا بولنا شروع کرے۔۔۔ تو مرد حضرات پہلی فرصت میں رومان یا عاشقی شروع کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے تعلقات نہ تو قائم ہوتے ہیں اور نہ ہی دیرپا ہوتے ہیں۔ روزینہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ وہ ہر ایک سے بے تکلفی سے باتیں کرتی تھیں تو یار لوگوں نے اس کے غلط معنی لئے اور فوراً عاشق ہوگئے۔ وہ ہمیں اس قسم کے لوگوں کے واقعات سناتی رہتی تھیں۔

ایک دن شوٹنگ ختم ہونے کے بعد ہم ریکارڈنگ ہال میں ایک گانے کی صدابندی کے سلسلے میں مصروف تھے کہ روزینہ آگئیں۔ اس رات انہیں ایک اور فلم ساز کی فلم میں کام کرنا تھا اس لئے وہ بھی شام کو رک گئی تھیں۔ آتے ہی وہ ہمیں بلا کر ایک طرف لے گئیں۔ شرارت ان کی آنکھوں سے ٹپکی پڑ رہی تھی۔

انہوں نے کہا "آفاقی صاحب۔ کیا آپ مجھے آج ڈنر پر لے جاسکتے ہیں؟"

ہم حیران ہوگئے "مگر تمہاری تو شوٹنگ جاری ہے اور ہماری ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔"

بولیں "مگر کھانا تو پھر بھی آپ کھائیں گے اور میں بھی کھاؤں گی۔ ایسا کیجئے کہ نو بجے ڈنر کیلئے وقفہ ہوگا تو آپ میرے سیٹ پر آجایئے اور کہئے کہ بھئی دیر ہو رہی ہے۔ چلو ڈنر تو کھالو۔ میں تھوڑا سا تکلف کروں گی مگر آپ اصرار کر کے

مجھے اپنے ساتھ لے جانا۔''

ہم نے کہا''مگر تمہارے پروڈیو اور ڈائریکٹر۔۔۔''

کہنے لگیں''میرے کھانے سے انہیں کیا سروکار ہے۔یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔پھر آئیں گے نا؟''

ہم نے کہا''دیکھو روزینہ۔کسی مصیبت میں نہ پھنسا دینا۔ان لوگوں کے ساتھ ہمارے بہت اچھے تعلقات ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ہر ایک سے اچھے تعلقات ہیں مگر میں آپ کو کسی سے جھگڑا کرنے کو تو نہیں کہہ رہی۔ کیا بات ہے، آخر آپ اتنے کنجوس کیوں ہوگئے ہیں کہ اپنی فلم کی ہیروئن کو کسی ہوٹل میں ڈنر تک نہیں کھلا سکتے؟''

ہم مان گئے۔غالباً نومبر کا آخر یا دسمبر کا آغاز تھا۔اس سال لاہور میں بارشیں بھی ہوگئی تھیں اور بہت سخت سردی پڑ رہی تھی۔

نو بجے ہم نے اپنے اسسٹنٹ کو مناسب ہدایات دیں اور روزینہ کے سیٹ پر پہنچ گئے۔روزینہ نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ کسی الجھن میں ہیں۔

ہم نے کہا''بھئی تمہارا کھانے کا وقفہ کب ہوگا۔ڈنر کیلئے دیر ہو رہی ہے؟''

یہ سن کر ان کے فلم ساز اور ہدایت کار دونوں کے کان کھڑے ہوئے۔

روزینہ نے کہا''یہ تو آپ ان ہی سے پوچھئے جن کا سیٹ ہے۔میں تو مزدوری کر رہی ہوں۔''

ہم نے فلم ساز سے کہا''آپ کب ڈنر کا وقفہ کریں گے؟''

وہ بولے''کیوں، کیا ہمیں ڈنر کھلانے کا ارادہ ہے؟''

ہم نے کہا''جی نہیں۔اپنی ہیروئن کو ڈنر پر لے جانا ہے۔''

کہنے لگے''آفاقی صاحب۔ہم بھی آپ کے دوست ہیں۔ہمیں بھی لے چلئے۔''

ہم نے کہا''ہیروئن کا حق پہلے ہوتا ہے۔آپ کو پھر کسی دن لے جائیں گے۔''

کھانے کا وقفہ چند منٹ بعد ہو گیا۔ ہم نے روزینہ سے اصرار کیا تو انہوں نے بڑی معصومیت سے اپنے فلم ساز اور ہدایت کار کی طرف دیکھا۔

انہوں نے کہا'' مگر جاؤ گی کہاں ؟''

ہم نے کہا'' انٹر کانٹی نینٹل ۔''

'' اوہو۔ بھئی اس طرح تو بہت دیر ہو جائے گی۔''

ہم نے کہا'' فکر نہ کیجئے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آپ کی ہیروئن کو سیٹ پر پہنچا دیں گے۔''

انہوں نے مجبوراً اجازت دے دی۔ روزینہ نے فوراً اپنا اوور کوٹ پہنا اور ہمارے ساتھ چل پڑیں۔

سیٹ سے باہر نکلے تو ہمیں جاوید فاضل نظر آ گئے۔ وہ اس زمانے میں ایس سلیمان کے اسسٹنٹ تھے۔ ہمارے ساتھ ان کے تعلقات کافی دوستانہ تھے، انہوں نے حفظِ مراتب کو کبھی فراموش نہیں کیا۔

ہم نے روزینہ سے کہا'' جاوید کو بھی ساتھ لے لیں ذرا گپ شپ رہے گی ؟''

'' ہاں ہاں، کیوں نہیں ؟''

اس طرح جاوید فاضل بھی ہمارے ساتھ ہو لئے۔ اس زمانے میں رات کے نو سوا نو بجے لاہور کی سڑکیں بالکل ویران ہو جاتی تھیں۔ پھر یہ تو سردی کا موسم تھا۔ علامہ اقبال ٹاؤن کا ابھی وجود بھی نہیں تھا اس لئے ہم لوگ ملتان روڈ سے ہو کر وحدت روڈ کے راستے مال روڈ پر جایا کرتے تھے۔ یہ راستہ کھلا ہوا تھا۔ ٹریفک بھی کم ہوتا تھا اس لئے یہاں اسّی نوّے میل کی رفتار سے کار چلانا معمول کی بات تھی۔

راستے میں روزینہ نے مختلف فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے لطیفے سنائے اور یہ بھی بتایا کہ مختلف اوقات میں انہوں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کس انداز سے اور کس پیرائے میں کیا۔ انہوں نے ایسی نقالی کی کہ ہم سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

انٹر کان میں کھانا کھایا۔ کافی پی، گپ شپ لگائی۔ کافی دیر ہو گئی تھی اور ہم بار بار روزینہ سے کہہ رہے تھے کہ بھئی اب چلو، تمہارے فلم ساز ناراض ہوں گے مگر وہ جان بوجھ کر دیر لگانا چاہتی تھیں۔

انہوں نے کہا''آپ پروڈیوسر کی فکر نہ کریں۔وہ مجھے کچھ نہیں کہہ سکتے۔البتہ آپ کے ساتھ آنے پر ضرور روٹھ جائیں گے۔''

واپسی پر روزینہ نے فرمائش کردی کہ بندو کا پان بھی کھائیں گی۔پان کی دکان ریگل سینما کے نزدیک تھی اور اس کے پان سارے پاکستان میں مشہور تھے۔ان دنوں جب لاہور رات کو سات آٹھ بجے ہی سو جاتا تھا،رات گئے تک اس پان فروش کی دکان کے آگے کاروں کی قطاریں لگی رہتی تھیں۔ہم نے گھڑی دیکھی۔ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا۔ہم چاہتے تھے کہ مزید تاخیر کے بغیر اسٹوڈیو واپس پہنچ جائیں مگر روزینہ کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ریگل چوک پہنچ کر پان خریدے گئے اور پھر وحدت روڈ کے راستے واپسی ہوئی۔

ہمارے اور پان کے باہمی تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے۔کبھی کبھار ہم پان کھالیا کرتے تھے۔مگر بعض اوقات ایسا پھندا لگتا تھا کہ سانس ہی رک جاتی تھی۔اس بنا پر ہم پان کھانے سے پرہیز کرنے لگے تھے۔مگر اس روز میٹھا پان کھانا پڑا۔واپسی میں ایک بار پر لطیفہ بازی شروع ہوگئی۔

اچانک ہم بہت زور سے ہنسے تو پھندا لگ گیا اور سانس رکنے لگی۔ہم نے گھبرا کا حلق صاف کرنے کی کوشش کی۔روزینہ اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔وہ یہ سمجھیں کہ شاید ہم ہنس رہے ہیں اس لئے انہوں نے بیان جاری رکھا۔مگر جاوید فاضل ہماری اس پرابلم سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ اس وقت پانی کے دو تین گلاس پیئے بغیر یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔جب سانس زیادہ ہی رکنے لگا تو ہم نے ایک دم کار کو سڑک سے موڑ کر وحدت کالونی کے کوارٹرز کی جانب موڑ دیا۔ رات کے گیارہ بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ہر طرف خاموشی،اندھیرا اور سناٹا۔ان کوارٹرز کے سوا آس پاس دور دور تک کوئی مکان، کوٹھی یا آبادی نہیں تھی۔ہم جانتے تھے کہ ان گھروں سے ہی ہمیں پانی مل سکتا ہے اور اگر کچھ دیر یہی حالت رہی تو شاید ہمارا سانس ہمیشہ کیلئے رک جائے گا۔

ایک کوارٹر کے سامنے ہم نے تیزی سے لے جاکر کار روک دی اور کار سے اتر کر باہر نکلے تو پہلی مرتبہ روزینہ کو احساس ہوا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔وہ بھی گھبرا گئیں۔ہر طرف تنہائی،سناٹا اور تاریکی تھی۔ہم نے پہلے تو ہارن بجانے شروع کئے۔رات کے سناٹے میں ہارن کی آواز دور تک گونج رہی تھی۔گھروں میں لوگ گھبرا کر بیدار ہوگئے اور کھڑکیوں

میں سے باہر جھانکنے لگے۔اس زمانے میں چوریاں اور ڈاکے عام نہیں تھے پھر بھی اتنی رات گئے اس طرح کوئی کسی کے گھر نہیں جاتا تھا۔گھر والوں نے بھی اندر سے دیکھا ہو گا کہ ایک کار کھڑی ہے جس کے باہر دو آدمی کھڑے ہیں۔کار کے اندر بیٹھی ہوئی روزینہ بھی اندھیرے کے باعث انہیں مرد ہی نظر آئی ہوں گی۔کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ادھر ہماری حالت غیر ہو رہی تھی۔روزینہ پریشانی کے عالم میں اونچی آواز میں دریافت کر رہی تھیں کہ کیا ہو گیا ہے؟ بولتے کیوں نہیں؟ ہم کیا بولتے۔ہماری تو سانس ہی اٹکی ہوئی تھی۔

جاوید فاضل پریشانی میں سامنے والے کوارٹر کے برآمدے میں پہنچ گئے اور دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔

آخر اندر سے کسی نے جھانکا اور سہمی ہوئی آواز میں پوچھا ”کون ہے، کیا بات ہے؟“

جاوید نے انہیں مختصراً بتایا کہ فوری طور پر پانی کی ضرورت ہے ایک شخص کی زندگی خطرے میں ہے۔

اندر والوں کو خدا جانے یقین آیا کہ نہیں البتہ انہوں نے اندر سے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کی سلاخوں میں سے پانی کا ایک گلاس جاوید کو پکڑا دیا۔وہ دوڑے دوڑے ہمارے پاس آئے۔ہم نے بڑے بڑے گھونٹ لیکر گلاس ختم کر دیا۔تھوڑا بہت افاقہ تو ہوا مگر سانس کی آمد و شُد میں رکاوٹ بدستور تھی۔جاوید بھاگ کر برآمدے میں گئے اور اس بار گھر والوں نے ایک پانی سے بھرا ہوا لوٹا ان کے حوالے کر دیا۔اب روزینہ بھی کار سے باہر نکل کر ہمارے پاس کھڑی ہو گئی تھیں اور تشویش بھری نظروں سے ہماری حالت زار دیکھ رہی تھیں۔کوارٹر والوں نے ایک عورت کو دیکھا تو انہیں قدرے اطمینان ہوا۔برآمدے کی روشنیاں تو جل گئیں مگر دروازے اور کھڑکیاں بدستور بند رہے۔

ہم نے جلدی جلدی دو تین گلاس چڑھائے تو مزید افاقہ ہوا۔سخت سردی کے باوجود ہم پسینے میں ڈوب گئے تھے۔چند لمحے بعد حالت سنبھلی اور ٹھنڈی ہوا چہرے پر لگی تو طبعیت سنبھل گئی۔جاوید فاضل نے لوٹا اور گلاس کوارٹر والوں کے حوالے کیا۔ان کا دلی شکریہ ادا کیا اور کہا ”آپ نے آج ایک قیمتی جان بچالی ہے۔“

یہ کہہ کر اور ان سب لوگوں کو گھروں کے اندر حیران چھوڑ کر ہم لوگ دوبارہ کار میں بیٹھ گئے۔روزینہ کو بہت تشویش تھی اور وہ بار بار دریافت کر رہی تھیں ”آفاقی صاحب، آپ ٹھیک ہیں نا؟ کار تو چلالیں گے نا؟“

ہم نے تنگ آکر کہا ”اگر نہ چلائیں گے تو کیا ساری رات یہیں کھڑے رہیں گے؟ کار چلانی نہ جاوید کو آتی ہے نہ آپ

کو۔ تو پھر کیا دھکے دے کر کار کو اسٹوڈیو لے جائیں گے؟“

واپسی کے سفر میں کچھ دیر تو وہ پریشان اور سہمی سہمی رہیں مگر پھر رفتہ رفتہ نارمل ہو گئیں۔ ”آفاقی صاحب۔ ایکٹنگ میں آپ کا جواب نہیں ہے۔ بھئی واہ! کیا ایکٹنگ کی ہے کہ دلیپ کمار بھی دیکھے تو سوچ میں پڑ جائے۔ کمال ہے، میں تو سچ مچ گھبرا گئی تھی۔“

ہم نے کہا ”تو کیا آپ کے خیال میں ہم ایکٹنگ کر رہے تھے؟“

”اور کیا۔ ورنہ اتنی جلدی ٹھیک ٹھاک کیسے ہو جاتے؟“

ہم لوگ اسٹوڈیو واپس پہنچے تو رات کے بارہ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ یعنی اصولاً دوسرا دن شروع ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے تو ہم روزینہ کے سیٹ پر گئے۔ جاوید کو ہم نے گواہ کے طور پر ہمراہ لے لیا تھا۔

وہاں پروڈیوسر اور ڈائریکٹر سخت ناراض بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے روزینہ نے بولنا شروع کر دیا ”شکر کیجئے کہ آج جان بچ گئی۔“

”کس کی؟“ انہوں نے پوچھا۔

”آفاقی صاحب کی۔ ورنہ یہ تو آج گئے تھے۔ ایمان سے میں تو گھبرا گئی تھی اور دعائیں مانگ رہی تھی کہ یا اللہ کسی کو پان کی موت نہ مارنا۔“

”پان کی موت“!

”ہاں اور کیا۔ انہوں نے پان کھا لیا۔ اس کا پھندا لگ گیا۔ ان کی تو سانس ہی رک گئی تھی۔ پوچھئے جاوید سے۔“

جاوید نے فوراً تصدیق میں زور و شور سے گردن ہلا دی۔

”پھر کیا ہوا؟“

”ہوتا کیا، فوراً یو سی ایچ گئے۔ اگر ڈاکٹر فوراً آکسیجن نہ دیتا تو خدا جانے کیا ہوتا۔ ایمرجنسی میں لے گئے تھے۔ جاوید سے پوچھ لیں۔“

جاوید نے پھر زور و شور سے سر ہلایا ”بالکل۔ ایمان سے۔ اللہ نے دوسری زندگی دی ہے۔“

سب لوگ یہ سن کر پریشان ہو گئے اور ہماری مزاج پُرسی کرنے لگے۔

روزینہ نے کہا ''چھوڑیئے۔ آپ شوٹنگ تو کیجئے۔ پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔''

''اب کیا شوٹنگ ہو گی۔ میرا خیال ہے پیک اپ کر دیتے ہیں۔''

اس طرح روزینہ کی شوٹنگ پیک اپ ہو گئی۔

پروڈیوسر نے کہا ''روزینہ چلئے آپ کو ہوٹل چھوڑ دیتے ہیں۔''

''مجھے آفاقی صاحب چھوڑ دیں گے۔''

ان کی ممی نے کہا ''ارے کاہے کو آفاقی کو تکلیف دیتی ہے۔ ان کی گاڑی چھوڑ آئے گی نا۔''

روزینہ نے کہا ''ممی، آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ میری وجہ سے وہ مرتے مرتے بچے ہیں اور ہم ان سے اتنی ہمدردی بھی نہ کریں؟''

''ارے ہمدردی کیوں نہیں کریں گے۔ جرور کریں گے۔ کیوں آفاقی، تمہیں تکلیف تو نہیں ہو گی نا؟''

دوسرے دن روزینہ نے یہ رپورٹ دی کہ ان کے فلم ساز اور ہدایت کار روٹھے روٹھے سے رہے۔

ہم نے کہا ''مگر تم ایسی حرکتیں کیوں کرتی ہو؟''

معصومیت سے بولیں ''انہیں ستانے کے لئے۔ آفاقی صاحب، وہ لوگ بہت جیلس ہو جاتے ہیں۔''

روزینہ '' سزا'' کی شوٹنگ میں حصہ لینے کیلئے تین بار لاہور آئیں اور سارا کام بہت خوش اسلوبی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ معاہدے کے مطابق جس روز ان کی شوٹنگ ختم ہوئی تھی۔ اس روز ہمیں ان کے معاوضے کی بقایا رقم ادا کر دینی چاہئے تھی۔ ان دنوں ہم شدید مالی بحران سے دوچار تھے۔ جن بڑے تقسیم کاروں نے ہم سے معاہدے کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ مسلسل ٹال مٹول کر رہے تھے۔ اور خود ہمارے اپنے وسائل جواب دے چکے تھے۔ اگر ہمیں آغاز ہی میں علم ہوتا کہ ساری فلم ہمیں اپنے ذاتی وسائل سے بنانی ہو گی تو ہم اس کیلئے کوئی مناسب بندوبست کرتے مگر تقسیم کار ہمیں ''اگلی بار'' کہہ کر ٹرخاتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم دیوالیہ ہو گئے۔

ہر ایک نے اس حساس موضوع پر ایک دلچسپ فلم بنانے پر ہمیں مبارک باد دی۔ طلبہ یونین کے عہدے داروں نے بھی بہت تعریف کی۔

ہم نے ان سے کہا" بھائی ایک طرف آپ تعریف کر رہے ہیں اور دوسری طرف احتجاج کر کے ہماری فلم کی نمائش پر پابندی لگوا رہے ہیں۔"

یونین کے صدر نے کہا" آفاقی صاحب، وہ اور بات تھی۔ لڑکے خالی گھوم رہے تھے۔ انہیں تو احتجاج کرنے کا بہانہ چاہئے تھا۔ ویسے آپ کی فلم بہت اچھی ہے۔"

میٹنگ کیلئے سب اکٹھا ہوئے تو مسعود الرؤف صاحب نے گفتگو کا آغاز کیا اور کہا" آفاقی صاحب نے ایک اچھا موضوع فلمایا ہے۔ طلبہ کو کیا اعتراض ہے؟"

ایک صاحب بولے" اس میں جانوروں کے ڈاکٹر کا مذاق اڑایا گیا ہے۔"

مسعود صاحب نے کہا" اول تو فلم میں جو ڈاکٹر ہے وہ جعلی ڈاکٹر ہے۔ غیر سند یافتہ ہے مگر خود کو ڈاکٹر کہتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس فلم میں تو معاشرے کے مختلف کرداروں پر طنز کیا گیا ہے یہاں تک کہ سیاسی لیڈروں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ طلبہ سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ نئے موضوعات اور نئے خیالات کا خیر مقدم کریں گے مگر اس کے برعکس آپ لوگ تو حوصلہ شکنی کر رہے ہیں۔"

یونین کے صدر صاحب نے ایک مختصر سی تقریر میں طلبہ کے مسائل اور مشکلات بیان فرمائیں پھر کہا" دراصل مسائل کچھ اور ہیں، پھندا آفاقی صاحب کے گلے میں پڑ گیا۔ اب اس کا حل یہ ہے کہ آپ فلم میں سے تھوڑا بہت حصہ خانہ پُری کیلئے کاٹ دیں۔ ہم اپنے ساتھیوں کو مطمئن کر دیں گے۔"

مسعود الرؤف صاحب جلال میں آ گئے بولے" اس میں سے تو ایک انچ بھی نہیں کٹ سکتا۔"

ہم نے عرض کیا" بلاوجہ بات بڑھانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ بلکہ ہمارا نقصان ہو جائے گا۔ طلبہ یونین کے نمائندے جو کہتے ہیں وہ کاٹ دیا جائے تاکہ فلم سینما گھروں میں چل سکے۔"

طلبہ کے کہنے پر خانہ پُری کیلئے چند فٹ مکالمے حذف کر دیئے گئے اور" باہمی اتفاق رائے" کے بعد فلم کو نمائش کی

اجازت ملی گئی۔یونین کے عہدیداروں نے ایک بار پھر ہمیں بہت مبارک باد پیش کی اور ''تکلیف کے لئے'' معذرت کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

ہم نے اس سے پہلے فلموں میں نئے اداکاروں کو کاسٹ کرنے کے نتیجے میں سامنے آنے والی مشکلات کا ذکر کیا تھا۔خود ہمیں نئے چہرے کاسٹ کرنے کی جو ''سزا'' ملی وہ یہ تھی کہ کسی تقسیم کار نے ہماری فلم نہیں خریدی۔جو صاحب بات کرتے وہ اتنے کم پیسے آفر کرتے تھے کہ کراچی سے بطور خاص آنے والے ایک تقسیم کار سے ہمیں کہنا پڑا کہ بھائی، یہ چوری کا مال نہیں ہے، فلم ہے۔ہم تو ایک موقع پر بالکل مایوس ہو گئے تھے کہ یہ فلم کوئی خریدے گا بھی یا نہیں۔لیکن پھر اللہ کی رضا اور تقدیر نے ہماری دست رسی کی۔ہم قضا و قدر کے فلسفے کے بلاوجہ ہی تو قائل نہیں ہوئے۔

اگر اس فلم میں ندیم اور کوئی معروف ہیروئن ہوتی تو ہر تقسیم کار آنکھیں بند کر کے ہمارے پاس دوڑا آتا اور مہنگے داموں فلم کے حقوق حاصل کر لیتا۔بہرحال، جب اوکھلی میں سر دے دیا تو پھر موسلوں کی چوٹ تو کھانی ہی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ فلم تین چوتھائی کے قریب بن گئی تھی مگر ہمارے مطالبات کے پیش نظر خریداری کیلئے کسی نے ہامی نہ بھری تھی۔ہم بظاہر تو بہت مطمئن اور اکڑے ہوئے تھے اور اخباروں، رسالوں میں ہمارے انٹرویو شائع ہو رہے تھے کہ نئے چہرے کاسٹ کر کے ہم بہت خوش ہیں مگر واقعہ یہ تھا کہ ہماری راتوں کی نیندیں اڑ چکی تھیں۔ہر وقت یہی دعا کرتے تھے کہ کسی سے لین دین میں وعدہ خلافی نہ ہو جائے۔جیسے تیسے کام تو چل رہا تھا مگر ہم اللہ میاں سے صرف یہ مہربانی چاہتے تھے کہ ہماری یہ فلم عزت کے ساتھ ریلیز ہو جائے۔منافع ہو یا نہ ہو، آبرو رہ جائے۔

ڈھاکہ کے فلم ساز، تقسیم کار اور صنعت کار انیس دوسانی صاحب کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔جنہوں نے ڈھاکہ سے آ کر ندیم سے ہماری صلح کرائی تھی۔وہ ڈھاکہ کے کروڑپتی تھے۔سینما گھر، دکانیں، فیکٹریاں، کوٹھیاں، بلڈنگیں، اللہ کا دیا سبھی کچھ تھا۔وہ مشرقی پاکستان کے بہت بڑے فلم ساز اور تقسیم کار تھے۔ڈھاکہ کے بڑے بڑے فلم سازوں کو وہی سرمایہ فراہم کرتے تھے۔جوان تھے مگر انتہائی تجربہ کار، بہت دلچسپ اور مزے دار انسان تھے۔

سنتوش کمار صاحب کے خاص دوستوں میں تھے اور جتنے دن بھی وہ لاہور میں قیام کرتے ہر رات ان کا ڈنر کم و بیش سنتوش صاحب کے گھر ہونا لازم تھا۔ہم بھی ان دعوتوں میں کبھی بلائے اور اکثر بن بلائے شریک ہوا کرتے تھے۔

ہماری فلم تین چوتھائی سے زیادہ بن چکی تھی کہ اچانک ایک روز انیس دوسانی صاحب لاہور پہنچے اور ہمیں فون کر کے ہوٹل آنے کی فرمائش کی۔ یہ ان کا معمول تھا۔ ہم اسی شام ان کے ہوٹل پہنچ گئے۔ علیک سلیک اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے ہماری فلم کا حال دریافت کیا۔ ہم نے بتایا کہ تین چوتھائی مکمل ہے اور رش پرنٹ بھی تیار ہو چکے ہیں۔

انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ ڈھاکہ کے علاوہ کراچی اور لاہور میں بھی ڈسٹری بیوشن آفس کھول رہے ہیں اور کراچی کے لئے ''سزا'' خریدنا چاہتے ہیں۔ ڈھاکہ میں ہمارے ایک تقسیم کار برکت صاحب تھے اور اب مرحوم ہو چکے ہیں۔

''تو بسم اللہ کیجئے'' ہم نے فراخ دلی سے انہیں پیش کش کی۔ انہوں نے پوچھا ''آپ کی ڈیمانڈ کیا ہے مگر یہ خیال رہے کہ آپ کی فلم میں کاسٹ نئی ہے۔ ''

ہم نے کہا ''کل صبح پہلے آپ رش پرنٹس دیکھ لیں پھر اس کے بعد بات کریں۔ ''

دوسرے دن دوسانی صاحب نے ایورنیو سٹوڈیو کے سینما ہال میں اطمینان سے بیٹھ کر '' سزا'' کے رش پرنٹس دیکھے۔ اس دوران میں وہ بالکل خاموش بیٹھے رہے مگر سکرین کی طرف سے ان کی نگاہیں اور توجہ ایک بار بھی کسی اور طرف منتقل نہ ہوئیں۔ رش پرنٹس ختم ہوئے تو ہم ان کے ساتھ ہی ان کے ہوٹل چلے گئے۔ راستے میں وہ ہم سے سنتوش صاحب کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ہماری فلم کا ذکر ایک بار بھی ان کی زبان پر نہ آیا۔

ہم نے سوچا کہ شاید انہیں فلم پسند نہیں آئی ہے اس لئے اس تذکرے سے دامن بچا رہے ہیں۔

ہوٹل پہنچ کر ایک بار پھر کافی کا دور چلا۔ اس کے بعد وہ سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئے۔

ہم نے پوچھا ''فلم آپ کو کیسی لگی؟ ''

وہ بے تکلفی سے بولے ''فلم آپ کی اچھی ہے اگر پبلک نے آپ کے ہیرو کو پسند کر لیا تو یہ ہٹ فلم ہو گی۔ ''

ہماری جان میں جان آئی مگر چپ رہے۔

وہ کہنے لگے ''دیکھو آفاقی۔ میں کراچی کے لئے تمہاری فلم لینے میں دلچسپی رکھتا ہوں مگر تمہارا مطالبہ کیا ہے۔ یہ میں نہیں جانتا؟ ''

ہم نے کراچی کے لئے انہیں وہ رقم بتائی جو اس سے پہلے ریلیز ہونے والی ہماری فلم ''میرا گھر میری جنت'' سے بھی زیادہ تھی۔ حالانکہ اس فلم میں صف اوّل کے اداکار شامل تھے اور اس کے ہدایت کار وقت کے کامیاب ترین ڈائریکٹر حسن طارق تھے۔

وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے ''مجھے منظور ہے لیکن ایک شرط ہو گی۔ ''

''وہ کیا؟ ''

بولے'' ایم جی (باقاعدہ طے شدہ) کی رقم آپ کی مرضی کے مطابق ہو گی مگر عام رواج کے برعکس آپ آغاز ہی سے نفع اور نقصان دونوں میں پچاس فیصد کے حصے دار ہوں گے۔ ''

ہم نے فوراً کہا ''منظور ہے ''

وہ مسکرانے لگے پھر کہا'' آپ کی خود اعتمادی دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے ورنہ مغربی پاکستان کے فلم ساز یہ شرط منظور نہیں کرتے۔ وہ منافع میں تو شریک ہونا چاہتے ہیں نقصان میں شریک ہونا پسند نہیں کرتے۔ بہرحال کل میں ایگریمنٹ تیار کر لوں گا۔ آپ کو سائننگ کی رقم بھی مل جائے گی۔

ہم نے اس رات نفل ادا کر کے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے گھر بیٹھے ایک انتہائی معقول ڈسٹری بیوٹر ہمارے پاس بھیج دیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بھی بتاتے چلیں کہ ''سزا'' کراچی میں ریلیز ہوئی اور پہلے ہی ہفتے میں ڈسٹری بیوٹر کی ''ایم جی'' بہت حد تک وصول ہو گئی۔ دوسرے ہفتے میں ''ایم جی'' کی باقی رقم اور پبلسٹی کے اخراجات بھی پورے ہو گئے۔ اس طرح تیسرے ہفتے میں ہی ہمارا حصہ شروع ہو گیا۔ فلم انڈسٹری میں جو بھی یہ بات سنتا تھا حیران ہوتا تھا مگر بہت کم لوگ جانتے تھے کہ ہمارے معاہدے کی نوعیت اور شرائط کیا تھیں۔

انیس دوسانی صاحب سے وصول ہونے والی رقم نے ہماری کافی مشکلات آسان کر دی تھیں مگر پنجاب کا اہم سرکٹ ابھی تک فروخت نہیں ہوا تھا حالانکہ فلم اب تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ کسی بھی ڈسٹری بیوٹر سے معقول شرائط پر بات طے نہ ہو سکی تھی اور ہمیں یہ اندیشہ پیدا ہونے لگا تھا کہ کہیں ہمیں یہ فلم خود ہی ریلیز نہ کرنی پڑ جائے۔ ہم اس پریشانی میں مبتلا تھے کہ تقدیر کی گھنٹیاں ایک بار پھر بجنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک خوشگوار صورت حال پیدا ہو گئی۔

لاہور میں اداکارہ دیبا کی پہلی پنجابی فلم ''پرواہ نئیں اوے'' ریلیز ہوئی تو نہ صرف دیبا نے فرمائش کی کہ ہم یہ فلم ضرور دیکھیں بلکہ فلم کے ہدایت کار افتخار خان نے بھی بطور خاص ہمیں پہلے شو میں مدعو کیا۔(افتخار خان حسن طارق کے اسسٹنٹ رہ چکے ہیں اور ہمارے یونٹ میں بھی کام کر چکے ہیں)

سہ پہر تین بجے کے شو میں انٹرول ہوا تو ہم پائپ اور چائے پینے کی غرض سے باہر نکلے۔سیڑھیوں پر ہمیں شیخ حسن مل گئے۔ شیخ حسن ہمارے پرانے ملنے والے تھے۔پہلے لاہور میں اقبال شہزاد کی فلمیں وہی ریلیز کرتے تھے اور شہزاد کے ساتھ ان کے بہت گہرے مراسم تھے۔کسی زمانے میں ہماری ان سے اکثر ملاقاتیں رہا کرتی تھیں مگر گذشتہ ایک سال سے ہم اپنی مصروفیات کی وجہ سے ان سے دفتر سے ایک بار بھی نہ مل سکے تھے۔

وہ بڑے خلوص سے ملے۔چائے پلانے کے لئے سینما کے ریستوران میں لے گئے۔ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد پوچھنے لگے '' آج کل کیا کر رہے ہیں۔کوئی فلم وِلم نہیں بنا رہے؟ ''

ہم نے انہیں ''سزا'' کے بارے میں بتایا۔

''ارے ہاں۔یاد آیا' کل ہی تو کسی نے مجھے بتایا تھا فلم آپ نے کسی کو دے دی ہے یا اوپن ہے؟ ''

''ابھی تک تو اوپن ہے۔ ''

وہ جوش میں آکر کھڑے ہو گئے' آفاقی صاحب اب کسی سے بات نہیں کرنی ہے آپ کی فلم میں ریلیز کروں گا۔ ''

ہم نے کہا'' یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے مگر شیخ صاحب ایک بات سن لیجئے۔کاسٹ تو نئی ہے مگر فلم کی ایم جی کم نہیں ہو گی۔ ''

انہوں نے کہا'' کل آپ رش پرنٹس تو دکھایئے پھر بات ہو گی۔ ''

رش پرنٹس دیکھ کر شیخ صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ ہمیں لے کر سٹوڈیو سے سیدھے اپنے دفتر پہنچ گئے۔

'' سنئے آفاقی صاحب میں آج کل بہت پھنسا ہوا ہوں۔دو تین پنجابی فلمیں مکمل ہونے والی ہیں۔اس لئے کوئی نیا سودا نہیں کر سکتا مگر آپ کی فلم میرے سوا کوئی اور ریلیز نہیں کرے گا۔ ''

''تو کیا ہم آپ کے فری ہونے کا انتظار کریں؟ یہ تو ممکن نہیں ہے لئے کہ ہماری فلم بالکل تیار ہے۔ ''

وہ بولے ''آپ کی فلم میں اپنے دفتر سے ریلیز کر دیتا ہوں۔ جو بکنگ ہو گی وہ آپ کے حوالے کرتا رہوں گا۔ آپ کی جو مرضی چاہے وہ پانچ سات فیصد کمیشن دے دینا یا نہ دینا۔ مگر یہ فلم مرے دفتر ہی سے ریلیز ہونی چاہئے۔''

یہ بہت اچھی پیشکش تھی حالانکہ اس میں بھی رسک تھا مگر ہم یہ رسک برداشت کرنے کے لئے بالکل تیار تھے۔

دوسرے ہی دن انہوں نے اخبارات میں پبلسٹی شروع کر دی اور مختلف شہروں سے خریدار آنے لگے۔ جو رقم وصول ہوتی وہ ہمارے حوالے کر دیتے۔

چند ہفتے بعد ہی ''سزا'' سارے پاکستان میں نمائش کے لئے پیش کر دی گئی۔ ہمارے سارے خدشات اور پریشانیاں یکدم دور ہو چکی تھیں۔ ہم نے اپنا ہر ایک وعدہ پورا کیا تھا اور کسی کے قرض دار نہیں تھے۔ فلم کی نمائش کے بعد ہمیں اللہ نے عزت بھی دی اور پیسہ بھی ملا۔ ہماری دعائیں بالاآخر رنگ لے آئی تھیں۔ تقدیر کی ایسی کرم فرمائیاں ہم پر اکثر ہوتی رہی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارا اللہ تعالیٰ پر بہت مضبوط ایمان اور یقین ہے۔ وہی عزت و ذلت دینے والا ہے اور وہی نفع و نقصان دیتا ہے۔ یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور پر بھروسا کرنا یا امداد کیلئے کسی کی طرف دیکھنا ہماری سرشت میں داخل نہیں ہے۔

فلم کی شوٹنگ کے دوران میں پیش آنے والا ایک دلچسپ واقعہ اور یاد آگیا ہے وہ بھی سن لیجئے۔

قوی صاحب بہت اچھی اداکاری کر رہے تھے جب بازاروں میں ان کے بھیک مانگنے کے مناظر فلمانے کا وقت آیا تو ہم نے اس کے لئے گلبرگ کی لبرٹی مارکیٹ کا انتخاب کیا۔ وہاں زیادہ ہجوم نہیں ہوتا تھا اور سکون سے شوٹنگ ہو سکتی تھی۔ قوی صاحب گداگر کی گدڑی میں ملبوس دکانوں کے سامنے سے صدائیں لگاتے ہوئے گزرے تو کئی دردمندوں نے انہیں کچھ نہ کچھ دے دیا۔ ان لوگوں کو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اداکار قوی ہیں اور ایک فلم کی شوٹنگ میں حصہ لے رہے ہیں۔

ہم نے کہا ''قوی جن لوگوں نے تمہیں پیسے دیئے ہیں انہیں واپس لوٹا دو۔''

کہنے لگے ''آفاقی صاحب یہ تو میری حقیقی اداکاری کی سند ہے۔ انعام ہے۔ یہ رقم میں واپس نہیں دوں گا بلکہ میں تو سوچ رہا ہوں کہ آپ نے فلم میں میری زبان سے جو فلسفہ بیان کرایا ہے اسی پر عمل شروع کر دوں گا۔''

''یعنی؟'' ہم نے پوچھا۔

''یعنی یہ کہ گداگری سے زیادہ معقول اور فائدہ مند کوئی اور پیشہ نہیں ہے۔ سوچتا ہوں اداکاری میں کیا رکھا ہے کیوں نہ گداگری شروع کردوں ''!

مگر شکر ہے کہ انہوں نے اس ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔

فلم '' سزا'' کی ریلیز سے دو دن پہلے ہم نے لاہور کے گلیکسی سینما میں بہت دھوم دھام سے اپنی فلم کا پریمئر شو کیا۔ فلمی صنعت کے ممتاز افراد' اداکار 'صحافی اور چیدہ چیدہ بیورو کریٹس اس میں مدعو تھے۔ دعوتی کارڈ بہت خوبصورت تھے۔ ان کے ہمراہ پارکنگ کیلئے خوب صورت سٹکرز بھی تھے۔ مقصد یہ تھا کہ محض مدعوئین ہی سینما کے احاطے میں داخل ہوں۔ اس سینما کا پارکنگ لان بہت وسیع تھا۔ اسی کے اندر فوجی بینڈز بھی ترانے بجا رہا تھا۔ سینما کے بیرونی دروازوں پر اور سینما ہال کے دروازوں پر چیکنگ کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود سینکڑوں بن بلائے مہمان سینما ہال کے اندر پہنچ گئے اور وہی افرا تفری مچی جو کہ اب ہمارے قومی کردار کی پہچان بنتی جا رہی ہے۔ یعنی بہت سے معزز مہمانوں کو بیٹھنے کے لئے کرسیاں اور صوفے میسر نہ تھے۔ 1965ء کی جنگ کے ہیرو اور لاہور کے محافظ جنرل سرفراز اور ان کی بیگم اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ ہم نے انہیں لے جا کر بٹھایا۔ مگر سینما ہال کی بدنظمی نے ہمیں پریشان کر دیا اور ہم اپنی عادت کے مطابق پسپا ہو کر ایک گوشے میں پناہ گزین ہو گئے۔ یہ سینما کے مالک کا دفتر تھا۔ جہاں ہمیں منٹ منٹ کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ فلم کا شو ختم ہوا تو ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ کافی دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ اس کے بعد ہر ایک نے ہمیں تلاش کرنا شروع کر دیا۔ مگر ہم پہلے ہی سینما سے رخصت ہو کر اپنے گھر جا چکے تھے۔ تقریب کی کمپیئرنگ کے فرائض ہم اقبال شہزاد کو سونپ آئے تھے۔ انہوں نے کہا بھی کہ یار سوفی دلہا کے بغیر برات اچھی نہیں لگے گی۔ مگر ہم دو پریشانیوں سے بچنا چاہتے تھے۔ ایک تقریر اور دوسری تصویر۔ محفل میں سبھی ہمارے متلاشی تھے۔ جنرل صاحب بھی ہمارا پوچھ رہے تھے مگر ہمارا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ یہ تقریب بے حد کامیاب رہی۔ اگلے روز اخبارات میں اس کی خبریں اور تصویریں شائع ہوئیں مگر ہم کسی ایک تصویر میں بھی شامل نہیں تھے اور ہوتے بھی کیسے ہم تو سینما ہال میں موجود ہی نہ تھے۔

لقمان صاحب سے ہماری دوستی کا کوئی خاص سبب نہیں تھا۔ دوسرے فلم والوں کی طرح ان سے بھی ملاقات رہتی تھی پھر بے تکلفی ہو گئی۔ وہ بزرگ تھے مگر دوست جیسا سلوک کرتے تھے جو ہمیں اچھا لگتا تھا۔ خامیاں کس انسان میں نہیں ہوتیں۔ لقمان صاحب میں بھی تھیں مگر چند خوبیاں بھی تھیں جن کی وجہ سے ہم ان سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ وہ ایک بہت اچھے اور ہنر مند ہدایت کار تھے۔

پاکستان میں شاہدہ کے بعد وہ ایک فلم ''محبوبہ'' کے ہدایت کار بنے۔ یہ فلاپ ہو گئی۔ اس کے بعد دوسرے فلم والوں کی طرح لاہور کی خاک چھانتے اور آئندہ کے لئے منصوبے بناتے رہے۔ اس زمانے میں فلمیں ہی کتنی بنتی تھیں۔ زیادہ تر فلم والے بے کار ہی پھرتے تھے۔

جب انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ ایک پنجابی فلم ''پتن'' کے ہدایت کار منتخب ہوئے ہیں تو ہم حیران رہ گئے۔ دہلی میں پیدا ہوئے، بمبئی میں پروان چڑھے، پنجابی بول نہیں سکتے، پھر پنجابی فلم کیسے بنائیں گے؟ یہی اعتراض دوسرے لوگوں نے بھی کیا تھا۔

لقمان صاحب نے ہمارے سوال کے جواب میں کہا ''یار بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ فلم تو فلم ہوتی ہے۔ اس کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ تکنیک ہوتی ہے۔''

ہم نے کہا ''مگر آپ کو تو پنجابی بولنی نہیں آتی۔ پوری طرح سمجھتے بھی نہیں ہیں۔''

بولے تو پھر کیا ہوا میرا سارا یونٹ پنجابی ہے بابا عالم سیاہ پوش جیسا مصنف میرے ساتھ ہے۔ میرے اسسٹنٹ پنجابی ہیں۔ لب و لہجہ اور تلفظ بتانے والے بہت ہیں۔ اچھا تم بے کار بحث مت کرو۔ اگلے فلم ایڈیشن میں خبر بنا کر لگا دو۔''

یہ 1954-55ء کا ذکر ہے ہم ان دنوں روزنامہ ''آفاق'' میں تھے اور فلم کا صفحہ مرتب کیا کرتے تھے۔ ہم نے خبر بنا کر شائع کر دی۔

اگلے دن لقمان صاحب ہمیں اپنے پروڈیوسر کے پاس لے گئے۔ ان کا نام شیخ لطیف تھا۔ وہ فلم ڈسٹری بیوٹر تھے اور فلم بنانے کے لئے سرمایہ بھی فراہم کرتے تھے۔ بے حد شریف، کم گو اور کم آمیز بلکہ شرمیلے آدمی تھے اس لئے سامنے آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ سمجھدار اور تعلیم یافتہ تھے اس لئے ان کی سوچ عام فلم والوں سے مختلف تھی۔ پہلی ملاقات

ہی میں ہم ان سے بہت متاثر ہوئے۔ بعد میں تعلقات بڑھتے گئے اور ان کی خوبیاں ہم پر عیاں ہوتی رہیں۔ وہ پہلے فلم ساز تھے جنہیں ہم نے زندگی میں پہلی بار کہانی سنائی تھی اور یہ بھی لقمان صاحب اور ظہور الحسن ڈار صاحب کے اصرار پر۔ کہانی سنانے کا ہنر ہمیں نہ اس وقت آتا تھا نہ اب آتا ہے بلکہ ہم تو کہانی پڑھ کر بھی نہیں بنا سکتے۔ بس لکھ کر ہدایت کار کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ پڑھتا ہے یا کسی اور سے پڑھوا کر سنتا ہے تو ہم بھی سنتے رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً پڑھنے والے کی غلطیاں نکالتے رہتے ہیں۔ تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہم نے پہلی کہانی کس طرح سنائی ہو گی۔ مختصراً یہ کہ ابھی کہانی آدھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہم بور ہو گئے۔ سننے والوں کی بوریت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آخر ہم خاموش ہو گئے سب ہماری شکل دیکھ رہے تھے۔

ہم نے کہا ''ہم سنا نہیں سکتے، لکھ کر دے دیں گے۔ ''

اس اعلان پر تمام حاضرین نے اطمینان کا سانس لیا سب کے چہروں پر خوشیاں لوٹ آئیں۔ فوراً چائے کا آرڈر دیا گیا اور دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔ مگر یہ '' پتن'' ریلیز ہونے کے بعد کی باتیں ہیں۔

شیخ لطیف نے ہمیں بتایا کہ فلم کی ہیروئن صبیحہ خانم تھیں مگر کسی وجہ سے اب کوئی اور ہیروئن ہو گی۔ وہ کوئی نئی ہیروئن تلاش کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ انہوں نے تلاش بھی کر لی تھی۔ یہ مسرت نذیر تھیں۔ مسرت نذیر کے بارے میں ہم پہلے ہی کافی تفصیل بیان کر چکے ہیں۔ ان کا تذکرہ آئندہ بھی مناسب مواقع پر ہوتا رہے گا۔ سنتوش کمار اس فلم کے ہیرو تھے۔ وہ حیدر آباد (دکن) میں پلے بڑھے تھے مگر تھے خالص پنجابی، اس لئے دونوں زبانیں مادری زبان کی طرح بولتے تھے۔ ان کے دوسرے بھائیوں کا بھی یہی حال تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جب ہم نے انہیں پہلی مرتبہ روانی سے بامحاورہ ٹھیک پنجابی بولتے پایا تو حیران رہ گئے۔

اس فلم کی کہانی کا مرحلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ بابا عالم سیاہ پوش کہانی اور مکالمے لکھ رہے تھے۔ لقمان صاحب نے ہمیں دعوت دی کہ کل شام ہمارے دفتر آؤ تو تمہیں بابا عالم سیاہ پوش اور بابا چشتی سے ملائیں گے۔

بیک وقت دو باباؤں سے ملاقات کا تصور کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ بابا عالم سیاہ پوش کو ہم دو چار بار دیکھ چکے تھے۔ بابا چشتی سے بھی سٹوڈیو میں سرسری سی ملاقات تھی مگر ان کے گنوں کا ہمیں پوری طرح علم نہ تھا۔ نام ان کا جی اے

چشتی، غلام احمد چشتی ہی تھا مگر وہ غالباً ہوش سنبھالتے ہی بابا چشتی کہلانے لگے تھے۔ بہت کم لوگ انہیں محض چشتی کہہ کر پکارتے تھے ورنہ عموماً بابا چشتی یا صرف بابا کہا جاتا تھا اور سب سمجھ جاتے تھے کہ یہ جی اے چشتی کا تذکرہ ہے۔

فلم والوں کے دفتروں میں ہم جاتے رہتے تھے۔ یہ دفتر نگار خانوں میں تھے مگر پٹن کا دفتر میکلوڈ روڈ پر مانسرور ہوٹل کے ایک کمرے میں تھا۔ یہ علاقہ فلم والوں کی آماجگاہ بلکہ چراگاہ تھا۔ پاکستان کی فلمی صنعت سے متعلق ہر قابل ذکر اور ناقابل ذکر، مشہور اور گمنام، کامیاب اور ناکام شخص یہاں رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں کسی نہ کسی وقت، کسی نہ کسی ریستوران میں ضرور مل جاتا تھا۔ جو ''کچھ'' تھے وہ بھی اور جو ''کچھ'' بننا چاہتے تھے وہ بھی۔ ان میں سے بہت سے آگے چل کر بہت نامور ہوئے لیکن بیشتر گمنامی اور ناکامی کی دھند میں کھو کر رہ گئے۔ اس مشہور و معروف لکشمی چوک پر ہی مانسرور ہوٹل تھا جو کسی زمانے میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں فلمی دفاتر ہی رہ گئے تھے۔ ہوٹل ختم ہو چکا تھا، داستانیں البتہ باقی رہ گئی تھیں کہ کس طرح سر شام یہاں مے خانوں میں جام لنڈھائے جاتے تھے اور نامور فلم والے یہاں قیام کرتے تھے۔ یہ ہوٹل اسی شکل و صورت میں آج بھی موجود ہے۔ وہی سیڑھیاں، وہی برآمدے، وہی کمرے لیکن ویران اور اجاڑ، نہ کوئی تبدیلی نہ کوئی بہتری، کچھ خرابی البتہ نظر آجاتی ہے۔

سیڑھیاں چڑھ کر تیسری منزل پر پہنچے تو آگے چل کر ایک کمرا تھا جس میں دری کا فرش دیوار سے دیوار تک بچھا ہوا تھا ایک طرف طبلے والا بیٹھا تھاپ لگا رہا تھا۔ اس کے سامنے بابا چشتی ہارمونیم لئے بیٹھے تھے اور طرز بنانے میں مصروف تھے۔ چشتی صاحب کی ایک خوبی ہم نے یہ دیکھی کہ ان کے سراپا میں تبدیلی برائے نام ہی دیکھی۔ 1952ء میں انہیں جس طرح دیکھا تھا 1994ء میں بھی کم و بیش ویسا ہی پایا۔ اب ذرا ان کا حلیہ ملاحظہ فرمایئے۔

سیاہ رنگ یعنی واقعی کالا سیاہ، درمیانہ قد، مضبوط جسم، چہرے کا ناک نقشہ موزوں، آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ جس کے شیشوں کی موٹائی میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہا۔ آخری دنوں میں یوں لگتا تھا جیسے عینک میں محدب عدسہ لگوا کر بیٹھے ہیں۔ ہم نے باباجی کو جب دیکھا تو فارغ البال ہی دیکھا۔ ابتدائی زمانے میں سر پر تھوڑے بہت بال تھے۔ البتہ سر کے ارد گرد بالوں کی جھالر سی تھی۔ جس میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔ سر کے درمیانی حصے سے

بال جتنے کم ہوتے رہے آس پاس کی جھالر بڑھتی رہی یہاں تک کہ پٹوں کی صورت اختیار کرلی۔ وہ اپنے بالوں میں مہندی لگاتے تھے۔ اس کے سوا انہیں کوئی سنگار کرتے نہیں دیکھا۔ سر کے بالوں کی جھالر میں انگلیاں پھیر لیتے تھے۔ لیجئے کنگھی ہوگئی۔ خدا جانے وہ سر میں باقاعدگی سے تیل استعمال کرتے تھے یا ان کا سر ہی زیادہ روغنی تھا۔ ہر وقت ان کے چہرے پر ایک چکناہٹ اور چمک سی نظر آتی تھی۔ پان کھانے کے شوقین تھے جس کی وجہ سے دانت سرخ رہتے تھے۔ گرمیوں میں وہ ہمیشہ سفید لباس استعمال کرتے تھے۔ عموماً سفید قمیض اور پتلون یا پھر سفید قمیض شلوار، یہی ان کی خوش لباسی کی ابتدا تھی اور یہی انتہا۔ بابا جی اپنے رنگ اور شکل وصورت کی جانب سے قطعی بے پرواہ اور بے نیاز تھے۔ خدا جانے سچ مچ کے درویش تھے یا انہوں نے خود پر درویشی طاری کرلی تھی۔ وہ آس پاس بکھرے ہوئے حسن و رعنائی سے بھی قطعی بے تعلق تھے۔ ان کے بارے میں کبھی کوئی سیکنڈل نہیں سنا حالانکہ انہوں نے کئی خواتین گلوکاراؤں کو متعارف کرایا اور انہیں مقبولیت کے چبوترے پر بٹھایا۔ انہیں صرف آرام سے غرض تھی۔ باتیں کم کرتے تھے اور بامقصد۔ دوسروں کے بارے میں رائے زنی یا گفتگو انہیں پسند ہی نہیں تھی۔ ہم نے کبھی ان کی زبانی کسی دوسرے موسیقار یا گلوکار کی برائی نہیں سنی۔ اگر کوئی تذکرہ چھیڑ بھی دیتا تھا تو وہ موضوع تبدیل کر دیتے تھے۔ یہ تھے بابا چشتی جو پٹن کے دفتر میں بیٹھے فلم کے گانوں کی دھنیں بنانے میں مصروف تھے۔ بابا جی گیت نگاروں سے بھی کام لیتے تھے مگر وہ خود بھی شاعر تھے۔ کم از کم فلمی شاعری میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے بہت سی فلموں کے گیت لکھے لیکن عموماً شاعر کے طور پر اپنا نام دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ دلکش مکھڑے (یعنی استھائیاں) تو انہوں نے سینکڑوں بنا ڈالے اور نام شاعر کا ہوا۔ وہ قیام پاکستان سے پہلے سے گیت لکھنے اور طرزیں بنانے میں مصروف تھے اور پاکستان بننے کے بعد بھی پاکستان کی فلمی صنعت کو انہوں نے موسیقی کے شعبے میں بہت فراخ دلی اور فراوانی سے بہت کچھ دیا۔

ان کے ہٹ گانوں کی تعداد درجنوں میں نہیں سینکڑوں میں ہوگی۔ انہوں نے کم از کم ڈھائی تین سو فلموں کے لئے موسیقی بنائی اور اپنا نام ہمیشہ کے لئے فلمی تاریخ میں درج کرا گئے۔ انہوں نے لگ بھگ ساٹھ سال تک موسیقی بنائی اور بڑے بڑے معرکے سر کئے لیکن گذشتہ سالوں میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب فلم سازوں نے بابا چشتی سے موسیقی

بنوانی ترک کردی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ نئے موسیقار دھڑا دھڑ ان کی طرزیں دوبارہ اور سہ بارہ ریکارڈ کر کے فلم سازوں کے حوالے کر رہے تھے مگر فلم سازوں کی بھیڑ چال ملاحظہ ہو کہ وہ خود چشتی صاحب سے رجوع نہیں کرتے تھے۔ اس نمبر دو مال کو خوش ہو کر قبول کر رہے تھے۔

بابا جی کو اس بات کا بہت دکھ اور ملال تھا جس شخص نے ساری زندگی سازوں‘ سازندوں‘ سروں اور راگ رانگیوں میں بسر کر دی ہوا گر اسے موسیقی کے میدان سے بالکل بے دخل کر دیا جائے تو اس کی حالت کیا ہو گی؟ جیسے بن جل مچھلی‘ بس یہی باباچشتی کی حالت بھی تھی۔ وہ اکثر نگار خانوں میں نظر آتے تھے اور اس بات کے شاکی تھے کہ آخر فلم ساز ان سے میوزک کیوں نہیں بناتے ہیں۔ ان کے سامنے تو کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں اور ان کی تعریفیں کر کے انہیں ٹال دیتے تھے مگر ان کو اپنی فلم کی موسیقی بنانے کا موقع نہیں دیتے تھے حالانکہ باباچشتی کے پاس موسیقی کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ موجود تھا اور وہ آج کی فلموں میں بھی اپنی موسیقی کا سحر پھونک سکتے تھے مگر فلم سازوں کی بھیڑ چال کا کوئی علاج نہیں تھا۔

ہم کمرے میں ایک طرف جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد زبیدہ خانم آگئیں۔ یہ نئی نئی گلوکارہ تھیں رشید عطرے صاحب نے انہیں موقع دیا تھا اور باباچشتی انہیں سنوارنے میں مصروف تھے۔ باباچشتی کے ذہن کی زرخیزی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے فلم پتن کے لئے تین گانے خود ہی لکھے‘ ان کی طرزیں بنائیں اور ریکارڈ بھی کرا دیئے اور یہ سب کام ایک ہی دن میں ہو گیا۔ چشتی صاحب کے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اس لئے کہ اس سے پہلے انہوں نے نذیر صاحب کی پنجابی فلم ”پھیرے“ کے سارے گیت ایک ہی دن میں لکھے‘ ان کی طرزیں بنائیں اور ریکارڈ کرا دیئے۔ قابل ذکر بات یہ کہ سارے کے سارے گیت ہٹ ہو گئے اور آج بھی گائے جاتے ہیں۔ دنیا کا کوئی اور موسیقار اس کا جواب پیش نہیں کر سکتا۔ ان کا نام تو گینز بک میں درج ہونا چاہئے تھا مگر کون کراتا؟ بابا جی کو اپنے کاموں کی وجہ سے ہوش نہیں تھا دوسروں کو اس کا احساس تھا نہ ضرورت۔

”پتن“ کے دنوں میں ہم نے باباچشتی کو قریب سے دیکھا۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ سب اچھے موسیقار عموماً معصوم بھولے بھالے اور بے ضرر انسان ہوتے ہیں۔ بابا جی بھی ایسے ہی تھے۔ بس اپنے کام سے کام باقی دنیا سے انہیں کچھ

سروکار نہیں تھا۔ یوں تو اور بھی کئی فلموں میں باباچشتی کو موسیقی بناتے ہوئے قریب سے دیکھا لیکن فلم ''لخت جگر'' کے زمانے میں ایک بار پھر پٹن کے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ اس فلم کے ہدایت کار بھی لقمان صاحب تھے اور یہ مقابلے میں بنائی جارہی تھی۔ ان دنوں مقابلہ آرائی کا خاصا رجحان تھا۔ دو فلم ساز ایک ہی موضوع یا ایک ہی کہانی بنانے کھڑے ہو جاتے تھے اور دونوں کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ پہلے اس کی فلم مکمل ہو کر ریلیز ہو۔

''لخت جگر'' کے مقابلے میں ''حمیدہ'' بنائی جارہی تھی جس کے ہدایت کار منشی دل تھے۔ حمیدہ میں صبیحہ اور سنتوش مرکزی کردار ادا کررہے تھے جبکہ لخت جگر میں میڈم نور جہاں ہیروئن تھیں۔ باباچشتی کے ساتھ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ فلم والے انہیں محض پنجابی فلموں کا موسیقار تصور کرتے تھے۔ بابا جی یوں تو کئی بار اردو فلموں میں اپنی موسیقی کالوہا منوا چکے تھے مگر لخت جگر میں انہوں نے ایسی موسیقی بنائی کہ بھارت میں بھی چرچے ہونے لگے۔

باباچشتی میں اگر کوئی بشری کمزوری تھی تو یہ کہ وہ مے نوش تھے۔ اور اپنے بڑے بیٹے سے بہت محبت کرتے تھے۔ دونوں ہی چیزوں نے انہیں تکلیف اور نقصان سے دوچار کیا۔ بیٹا لاڈ میں بگڑ گیا اور شراب خانہ' خراب نے ان کی صحت کو بگاڑ دیا مگر ٹھہریے کون کہتا ہے کہ شراب صحت کو بگاڑ دیتی ہے؟ کم از کم چشتی صاحب کی حد تک یہ مفروضہ درست نہیں ہے۔ وہ ہر شام باقاعدگی سے شراب پیتے تھے اور بہک بھی جاتے تھے مگر صبح سویرے نہا دھو کر تازہ دم کام پر موجود اور کام بھی ایسا کہ صبح سے رات گئے تک جاری رہتا تھا۔ کام کے دوران میں وہ دختر رز کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔ یہ تخلیقی کام تھا مگر باباچشتی کو کبھی تھکا ہوا دیکھا نہ ہی بیمار' چنانچہ کہہ سکتے ہیں کہ شراب کم از کم باباچشتی کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ انہوں نے 26 دسمبر 1994ء کو لاہور میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر 92 سال تھی مگر نہ بیمار تھے نہ معذور۔ عمر کے اعتبار سے کمزور البتہ ہوگئے تھے۔ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ انہیں فلم والوں کی بے اعتنائی اور بے قدری نے مارا اور نہ وہ ابھی مزید 92 سال زندہ رہتے اور ایک سے ایک خوبصورت دھن بنا سکتے تھے۔

بابا جی یوں تو کبھی کسی سے نہ بگڑتے تھے' نہ جھگڑا کرتے تھے۔ مگر جب غصہ آتا تو کسی کا بھی لحاظ نہ کرتے۔

گراموفون کمپنی نے ان کے گانوں کا ریکارڈ بنایا جس نے مقبولیت اور فروخت کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے۔ یہ زبیدہ خانم کی آواز میں گایا ہوا نغمہ تھا۔

واسطہ ای رب دا تُو جاویں وے کبوترا

یہ گانا ایسا مقبول ہوا کہ ہر ایک کی زبان پر یہی نغمہ تھا۔ان دنوں صرف ریڈیو ہی پبلسٹی کا ذریعہ تھا اور ریڈیو پاکستان نے شروع ہی سے پاکستان کی فلمی صنعت کے ساتھ یک طرفہ جنگ شروع کر رکھی تھی۔ پاکستانی فلموں کے گاین یا تو بجائے نہیں جاتے تھے یا پھر چُن چُن کر خراب گانے پیش کئے جاتے تھے ورنہ یہاں فلمی موسیقی کو بہت عروج حاصل ہو جاتا۔ محض ریستورانوں میں ہی ریکارڈ بجائے جاتے تھے یا پھر لوگوں کو گانے زبانی یاد ہو جاتے تھے۔ بابا چشتی نے آغا گل کی فلم ''دلا بھٹی'' کے لئے یہ گانا بنایا تھا۔اسی زمانے میں یہ لطیفہ ہوا کہ ایک رات بابا جی اچانک کسی پیشگی اطلاع کے بغیر عین آخری شو کے وقت میکلوڈ روڈ کے سینما پر پہنچ گئے۔ان کے ڈھیر سارے بچے بھی ان کے ساتھ تھے۔ بابا جی موڈ میں تھے اور ان کی فرمائش تھی کہ سب کو فلم دکھائی جائے۔ فلم اتنی مقبول تھی کہ سینما کے اندر تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ بھلا سولہ سترہ افراد کیسے سما سکتے تھے۔ مگر بابا جی کا اصرار تھا کہ نہیں' ان سب کو ابھی اور اسی وقت فلم دکھاؤ۔ منیجر کی معذرت پر وہ بگڑ گئے اور بولے ''آغا گل کو بلاؤ'' اسی وقت ''

آغا گل فلم ساز تھے اور فلمی صنعت کے بہت بڑے ستون بھی تھے مگر بابا جی نے شور مچا رکھا تھا کہ آغا گل کو اسی وقت بلاؤ ورنہ میں شو نہیں چلنے دوں گا۔ بہت سے لوگ انہیں دیکھ کر اکٹھا ہو گئے اور ایک تماشا لگ گیا۔

بابا جی نے منیجر سے کہا ''ان سب کو سینما میں بٹھاؤ ورنہ میرا میوزک فلم میں سے باہر نکال دو۔ ''

بے چارے منیجر کے لئے کوئی ایک شرط پورا کرنا بھی ممکن نہ تھا۔جب جھگڑا بڑھ گیا تو آغا جی اے گل کو ٹیلی فون کر کے صورت حال سے آگاہ کیا گیا۔

انہوں نے کہا ''دیکھو بھئی' جس طرح بھی ممکن ہو' بابا جی کی فرمائش پوری کرو۔ ''

منیجر نے کئی فلم بینوں کی ذاتی طور پر منت سماجت کی اور ان کی سیٹوں پر بابا جی کے خاندان کو بٹھایا گیا۔

گراموفون کمپنی نے ایک بار رشید عطرے صاحب کے گانوں کی ''گولڈن ڈسک'' بنائی تو بابا جی بگڑ گئے۔ان کا کہنا تھا کہ میرے گانے اتنے ہٹ ہو چکے ہیں مگر مجھے گولڈن ڈسک نہیں دی گئی۔

انہوں نے منیجر سے کہا ''میں نے ایک ہی کبوتر چھوڑا تھا جو آج تک واپس نہیں لوٹا۔ ساری دنیا میں گھومتا پھر رہا ہے اور

تم مجھے گردانتے ہی نہیں ہو۔ ‘‘

اس گانے کے ریکارڈوں سے اس زمانے میں چھ سات لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی تھی۔

بابا چشتی بہت سینئر موسیقار تھے۔ پاکستان کے سبھی موسیقار اور گلوکاران کا احترام کرتے تھے۔ میڈم نور جہاں جو بہت کم ہی کسی کو خاطر میں لاتی ہیں۔ باباجی کے آگے ادب سے کھڑی ہو جاتی تھیں۔ دراصل نور جہاں کا پہلا نغمہ کولمبیا ریکارڈنگ کمپنی کے لئے باباچشتی نے ہی ریکارڈ کرایا تھااس وقت نور جہاں کی عمر مشکل سے نو یادس سال ہو گی۔ اس کے بول تھے ہنستے ہیں ستارے۔

فلم سوہنی مہینوال کے لئے انہوں نے امراؤ ضیا بیگم کی آواز میں ایک کورس بنایا تھا۔ وہ کلاسیکی موسیقی پر یقین رکھتے تھے مگر ہلکے پھلکے اضافوں اور تبدیلیوں کے ساتھ تجربے بھی کرتے رہتے تھے۔ باباچشتی کی موسیقی اور کارکردگی پر نظر ڈالنے سے پہلے بہتر ہو گا کہ ان کی زندگی کے حالات بھی بیان کر دیئے جائیں۔

یہ شخص جو کلاسیکی اور فوک موسیقی کا امام مانا گیا' کسی موسیقار گھرانے سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ وہ 1901ء میں ضلع جالندھر کے قصبہ گوناپور میں پیدا ہوئے تھے۔ چوتھی پانچویں جماعت میں تھے تو نعت گوئی شروع کر دی۔ آواز سریلی تھی اور گھر میں مذہبی ماحول تھا۔ ان کے والد قصبے کی بڑی مسجد کے امام تھے۔ دسویں جماعت میں تھے کہ والد فوت ہو گئے۔ چندماہ بعد والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا اور غلام احمد اور ان کی چھوٹی بہن اس دنیا میں اکیلے رہ گئے۔ اس وقت ان کی عمر سولہ سترہ سال تھی۔ پہلے تو انہوں نے نعت گوئی سیکھی پھر محکمہ آب پاشی میں ملازم ہو گئے۔ کام وام کچھ نہیں تھا۔ بس افسروں کو گانے اور نعتیں سنایا کرتے تھے اور بیس روپیہ ماہانہ تنخواہ پاتے تھے۔

اسی زمانے میں ان کو استادوں اور بڑے موسیقاروں سے ملنے کا موقع ملا تو راگ راگنیاں' ٹھیکے' تانے پلٹے سور سرگم کے گر سیکھے اور فن موسیقی سے واقفیت حاصل کر لی۔ ان کے دفتر کے ہیڈ ڈرافٹسمین کا تبادلہ لاہور ہو گیا تو وہ غلام احمد کو بھی اپنے ہمراہ لاہور لے گئے۔ یہیں ایک صاحب کی وساطت سے انہیں ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔

آغا صاحب بڑے مردم شناس انسان تھے۔انہوں نے غلام احمد کی ظاہری شکل پر کوئی توجہ نہیں دی۔چند سوالات کئے اور مطمئن ہو کر انہیں پچاس روپے ماہوار پر اپنے تھیٹر میں ملازم رکھ لیا۔یہ اس زمانے میں کافی بڑی رقم تھی۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ آغاحشر موسیقی کی دھنیں بھی بنایا کرتے تھے۔خود ہی گیت لکھتے اور خود ہی انہیں موسیقی کے قالب میں ڈھالتے۔ان دنوں مختار بیگم ان کے ساتھ تھیں۔آغاحشر گیت لکھ کر طرزیں بناتے اور مختار بیگم اپنی بے بہا آواز میں نغمہ سرائی کرتیں۔یہ منظر دیکھا تو باباچشتی کو بھی موسیقی بنانے کا شوق پیدا ہو گیا۔انہوں نے اس دور میں آغا حشر سے بہت کچھ حاصل کیا۔آغاحشر کا انتقال ہو گیا تو ان کی کمپنی بند ہو گئی اور باباچشتی بے کار ہو گئے مگر اب انہیں موسیقی کے سوا کسی کام سے سروکار نہ تھا۔نوکری کی تلاش میں لاہور کی ایک ریکارڈنگ کمپنی میں پہنچے تو وہاں استاد جھنڈے خاں جیسے عظیم موسیقار کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔

یہ 1936ء کی بات ہے۔اس کمپنی کا دفتر انارکلی کے علاقے بخشی مارکیٹ میں تھا۔ان دنوں ریکارڈنگ کمپنی میں ان کے ہم عصروں میں بھائی لال محمد اور پنڈت امرناتھ جیسے لوگ بھی موجود تھے۔استاد جھنڈے خاں خرابی صحت کی بنا پر کمپنی سے رخصت ہوئے تو غلام احمد چشتی نے ان کی جگہ سنبھالی۔یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔یہیں سے موسیقار کی حیثیت سے باباچشتی کی زندگی کا تابناک دور شروع ہوا۔

بابا چشتی نے موسیقی میں اپنے کیریئر کا آغاز لاہور سے کیا تھا۔اس وقت کے تمام قابل ذکر گانے والوں کی آوازوں میں انہوں نے نغمے صدابند کئے۔ان میں عنایتی ڈھیروالی (یہ ملکہ ترنم کی پھوپی تھیں) تمنت جہاں' خورشید بیگم وغیرہ شامل تھیں پھر وہ کلکتہ چلے گئے۔ان دنوں میں وہ ایک دن میں سات آٹھ گانے ریکارڈ کرایا کرتے تھے۔

1938ء میں لاہور میں ایک پنجابی فلم ''سوہنی مہینوال'' کا آغاز ہوا تو ہدایت کار آر ایل شوری نے باباچشتی کو کلکتہ سے بلا بھیجا۔وہ یوں بھی کلکتہ میں اداس ہو رہے تھے۔لاہور آنے کا بہانہ ملا تو فوراً چلے آئے۔سوہنی مہینوال کے گیت استاد ہمدم مرحوم نے لکھے تھے جو استاد دامن کے استاد تھے۔اب تو استاد دامن بھی مرحوم ہو چکے ہیں۔اپنے تخلص دامن سے پہلے ''استاد'' کا اضافہ غالباً انہوں نے استاد ہمدم کی پیروی میں ہی کیا ہو گا ورنہ دامن بذات خود ایک اچھا اور بامعنی تخلص ہے۔اس فلم کی ہیروئن الماس بائی اور ہیرو بشیر قوال تھے۔اس فلم کا پہلا گیت جو ریکارڈ کیا گیا وہ یہ تھا۔

چھبی دیاں پُنیاں میں مل مل دھونیاں

ماہی گیا پردیس، میں چھم چھم رونیاں

یہ گیت اس قدر مقبول ہوا کہ لوگوں کو آج بھی یاد ہے۔ یہ بابا چشتی کی پہلی فلم تھی۔ اس کی موسیقی پسند کی گئی مگر فلم ہٹ نہ ہو سکی۔ ابھی اس فلم کے گانوں کی صدائیں گونج ہی رہی تھیں کہ کلکتہ سے ایک فلم ساز جگت نرائن ،اپنی فلم ''چنبے دی کلی'' کے لئے موسیقار کی تلاش میں لاہور آئے اور بابا چشتی کو دوبارہ اپنے ہمراہ کلکتہ لے گئے۔ اس فلم کے گیت ولی صاحب نے لکھے تھے۔ یہ فلم بہت بُری طرح فلاپ ہوئی۔ مگر بابا چشتی کی موسیقی فلاپ نہیں ہوئی۔ وہیں ایک فلم ''پردیسی ڈھولا'' کا آغاز ہوا تو بابا چشتی نے ایک اور موسیقار کے ساتھ مل کر اس کا میوزک تیار کیا۔ اتفاق دیکھئے کہ یہ فلم خاصی کامیاب رہی مگر اس کی موسیقی پسند نہیں کی گئی۔

اب تک بابا چشتی نے صرف پنجابی فلموں ہی کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ ''پردیسی ڈھولا'' ان کی پہلی اردو فلم تھی۔ دوسری فلم ''خاموشی'' تھی جس کی ہیروئن رمولا اور ہیرو گیانی تھے آر سی تلواڑ اس کے ہدایت کار تھے۔ اس فلم کے تمام گیت بھی بابا چشتی نے خود ہی لکھے تھے۔ یہ فلم بھی کامیاب ہوئی اور اس کی موسیقی بھی بہت پسند کی گئی۔ اس کمپنی کی اگلی اردو فلم ''منچلی'' کے گیت نویس اور موسیقار بھی بابا چشتی تھے۔ یہ فلم اور اس کی موسیقی دونوں کامیاب رہے۔ گیتوں کا نمونہ دیکھئے۔

میں بن کے کلی کانٹوں میں پلی

کیوں دل سے اٹھتا ہے شور

آنکھوں سے کوئی پڑھ لے

میرا جو حال ہو سو ہو

اس فلم میں ایک کورس گانا بھی تھا جس میں نمایاں آواز فلم کی ہیروئن رمولا کی تھی اس کے بول تھے۔

سائیکل کی سواری ہے

یہ کچھ عجیب سے بول تھے مگر پسند کئے گئے اور پھر ایک فلم میں فلم کی ہیروئن اور ہیرو پر (ساتھیوں سمیت)

سائیکلوں پر ایک گانا بھی فلمایا گیا جس نے اپنی جدت کی وجہ سے سارے ہندوستان میں کھلبلی مچا دی۔
1944ء میں بابا چشتی نے دو فلموں کی موسیقی دی۔ایک ''کلیاں'' تھی جس کے ہدایتکار اور گیت نگار کیدار شرما تھے مگر یہ فلم بری طرح فلاپ ہوئی حالانکہ کیدار شرما بہت ذہین تخلیق کار تھے۔ تلواڑ پروڈکشن کی فلم ''شکریہ'' کلکتہ میں بنی تھی۔اس فلم کے موسیقار چشتی صاحب تھے۔چند گیت بھی انہوں نے لکھے تھے۔یہ فلم بہت کامیاب ہوئی مگر اس کے ایک گانے پر پابندی عائد کر دی گئی۔اس کے بول تھے۔

نینوں کے تیر چلا گئی

اک شہر کی لونڈیا

اس گانے پر تو پابندی لگ گئی مگر یہ سارے ہندوستان میں ہر ایک کی زبان پر تھا۔اس زمانے میں کالجوں اور سکولوں کے لڑکوں نے لڑکیوں کو دیکھ کر یہ گیت گانا شروع کر دیا اور کئی پکڑے بھی گئے مگر اس فلم اور گیت نے بابا چشتی کو سارے برصغیر میں مشہور کر دیا۔اس فلم کے اور گیت بھی بہت مقبول ہوئے۔ ان میں ایک نیا پن تھا مثلاً۔

ہماری گلی آنا

اچھا جی؟

ہمیں نہ بلانا

اچھا جی

اس سے اگلے سال ان کی دو فلمیں ''البیلی'' اور ''ضد'' ریلیز ہوئیں۔البیلی کامیاب رہی جبکہ ضد فلاپ ہو گئی۔ضد کے تین گانے بہت مشہور ہوئے تھے مگر فلم نہ چل سکی۔اس کے گیت بھی چشتی صاحب ہی نے لکھے تھے۔
اب ایک عجیب بات سنئے۔1946ء میں ایک ایکشن اور مار دھاڑ سے بھرپور فلم ''ہوائی کھٹولا'' ریلیز ہوئی۔ بابا چشتی اس فلم میں تھے مگر نہ موسیقار نہ گیت نگار' اس فلم میں انہوں نے اداکاری کی تھی۔یہ ایک عام سا کردار تھا مگر نہ جانے انہیں کیا سوجھی کہ اداکاری کرنے کھڑے ہو گئے۔یہ انتہائی ناکام فلم تھی اور بطور اداکار بابا چشتی کی پہلی اور آخری فلم تھی۔کلکتہ میں بنائی جانے والی ایک فلم ''یہ ہے زندگی'' کی موسیقی بھی بابا چشتی نے بنائی تھی جو ناکام ہو گئی

تھی۔1948ء میں انہوں نے ایک فلم ''جھوٹی قسمیں'' کی موسیقی ترتیب دی اور چند گانے بھی لکھے مگر یہ بھی فلاپ ہو گئی۔

بابا چشتی نے کبھی بمبئی کا رخ نہیں کیا حالانکہ کئی فلم سازوں نے بلایا۔ پاکستان بننے کے بعد کلکتہ سے لاہور آ گئے اور پھر آخر دم تک یہیں رہے۔ ہدایتکار لقمان کی فلم '' شاہدہ'' پاکستان میں ان کی پہلی فلم تھی۔اس کے بعد تو چل سو چل۔ انہوں نے ڈھائی تین سو فلمیں کیں مگر زیادہ تعداد پنجابی فلموں کی تھی۔ان کے گیت اس فراوانی سے ہٹ ہوتے تھے کہ لوگوں نے انہیں جادوگر کہنا شروع کر دیا تھا۔

بابا چشتی غضب کے ذہین تخلیق کار تھے۔ موسیقی' سُر اور راگ راگنیاں ان کی انگلیوں کی پوروں سے نکلتی تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دنیا میں ہر چیز کو موسیقی کے قالب میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک بار انہوں نے نمونے کے طور پر اخبار کی خبروں کی دھنیں بنا کر سنا دیں۔ وہ اس قدر تیزی سے کام کرتے تھے کہ کیا کوئی کمپیوٹر کرے گا۔ ایک ہی دن میں فلم کے پورے گانے لکھنا طرزیں بنانا اور انہیں ریکارڈ کرنا صرف ان ہی جیسے دیوزاد موسیقار کے بس کی بات تھی۔

بابا چشتی نے بڑے موسیقاروں کا زمانہ دیکھا تھا۔ فلمی موسیقی کے ناخدا آر سی بورال اور پنکج ملک جیسے لوگوں کے مقابلے میں انہوں نے کام کیا تھا اور اپنے آپ کو منوایا تھا۔ ایسے عظیم اور بھاری بھر کم موسیقار اب کہاں نظر آتے ہیں۔ ان کے زمانے کے دوسرے موسیقاروں میں استاد جھنڈے خاں' ماسٹر غلام حیدر' انل بسواس' شیام سندر' کھیم چند پرکاش' فیروز نظامی' رشید عطرے' خورشید انور اور ماسٹر عنایت حسین جیسے لوگوں کے نام آتے ہیں اور بابا چشتی ان سے کسی طرح کم نہ تھے۔ بلکہ ان کے کارنامے اور کام کا معیار اور مقدار بہت زیادہ تھی۔ انہوں نے ریڈیو' تھیٹر اور ٹیلی ویژن غرض ہر شعبے میں کام کیا اور اپنا لوہا منوایا۔ ذرا سوچئے کہ ساٹھ سال کے لگ بھگ جس شخص نے کام کیا ہو اس کے کام سے کتنی نسلوں نے فیض اٹھایا ہو گا۔ وہ نت نئے تجربات کرنے کے قائل تھے۔ بولوں میں بھی اور موسیقی میں بھی' ان کی موسیقی میں نغمگی' رومانیت' سریلا پن بھی ہے اور ردھم بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ردھم کے معاملے میں انہوں نے نت نئے تجربے کئے۔ انہوں نے ہر طرح کے گانے بنائے۔ کلاسیکل' نیم

کلاسیکل، غزل، گیت، فوک موسیقی پر مبنی گیت۔ انہوں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی موسیقی کے انداز کو تبدیل کیا۔ وہ تو فلم ساز ہی ہمت ہار گئے ورنہ بابا چشتی تو آخر دم تک تازہ دم اور تروتازہ تھے۔ ان کی باتوں میں بھی ان کی موسیقی جیسی شگفتگی تھی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ پرانے واقعات تو وہ مزے لے لے کر سنا دیتے تھے مگر خود اپنے بارے میں انہیں کچھ یاد نہیں تھا۔ یہاں تک کہ تاریخ پیدائش تک یاد نہ تھی۔ انہوں نے زندگی بھر کبھی کسی کی شکایت نہیں کی مگر آخری ایام میں فلم سازوں سے شاکی تھے کہ وہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ جب 1992ء میں پاکستان کرکٹ ٹیم ورلڈ کپ جیت کر واپس آئی تو ان کے استقبال کے لئے بابا چشتی نے اردو میں ایک کورس ترتیب دیا تھا جسے لاہور کے ممتاز گلوکاروں نے گایا تھا اور یہ نغمہ بے حد پسند کیا گیا تھا۔ اس طرح شاید وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ان کی تخلیقی صلاحیتیں ختم نہیں ہوئی ہیں مگر فلم سازوں کو پھر بھی یقین نہیں آیا تو ان کا دل ٹوٹ گیا۔ 92 سال کی عمر میں یہ نوخیز ذہن اور نوجوان خیالات رکھنے والا بوڑھا آخر تھک ہار کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ انہیں ساری زندگی کے کاموں نے نہیں تھکایا تھا مگر فلم سازوں کے رویے نے انہیں تھکا مارا۔ المیہ یہ ہے کہ ان کی کوئی پی آر نہ تھی۔ سیلف پبلسٹی کے وہ قائل ہی نہیں تھے۔ ساری زندگی بس کام کی دھن میں لگے نئی سے نئی دھنیں بناتے رہے مگر یہ بھول گئے کہ جب تک کوئی یاد دلانے والا نہ ہو وقت کسی کو یاد نہیں کرتا۔ انہیں کب تک اور کیسے یاد رکھا جائے گا؟ اس کا جواب بھی آنے والا وقت ہی دے گا۔

روزنامہ ''آفاق'' سے وابستگی کے دنوں میں اردو کے منفرد اور یکتا افسانہ نگار سعادت حسن منٹو صاحب سے ملنے اور ان کا قرب حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ منٹو صاحب ہزار داستان آدمی تھے۔ ان کے پاس بیٹھ کر کوئی بور نہیں ہو سکتا تھا۔ نئی سے نئی اور انوکھی سے انوکھی باتیں کرتے چلے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے مجموعے ''گنجے فرشتے'' میں میڈم نور جہاں کے بارے میں جو مضمون تحریر کیا تھا اس میں جگہ بہ جگہ رفیق غزنوی کا بھی تذکرہ تھا۔ ان کی وجاہت، خوبصورتی، ہنرمندی، خوش بختی، بے پروائی اور خصوصاً صنف نازک میں ان کی بے پناہ پذیرائی کے بارے میں منٹو صاحب زبانی واقعات بھی سناتے رہتے تھے۔ جب ہم نے شعور کی وادی میں قدم رکھا تو رفیق غزنوی

صاحب فلمی دنیا سے قریب قریب کنارہ کش ہو چکے تھے۔ کم از کم ہم نے انہیں فلموں میں مصروف کار نہیں دیکھا نہ ہی وہ کسی نگار خانے یا فلم ساز کے دفتر میں نظر آئے۔ مگر ان کا جو نقشہ منٹو صاحب نے کھینچا تھا اس کے باعث ہمیں ان سے ملنے کا اشتیاق ہی رہا۔ آخر ایک بار منٹو صاحب کے فلیٹ میں انہیں اتفاقاً دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس زمانے میں وہ ادھیڑ عمری کے دور میں تھے مگر غضب کے وجیہ پُرکشش اور دلکش انسان تھے۔ بالوں میں چاندی آگئی تھی مگر چہرے کی دلکشی اور ملاحت میں ذرا بھی کمی نہ تھی بلکہ سفید بالوں نے انہیں کچھ اور خوبرو بنا دیا تھا۔ باتیں کرنے کا انداز ایسا کہ بس۔۔۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔۔۔ ہاتھ میں سگار' بند گلے کا بنگالی انداز کرتہ اور کھلے پائنچوں کا سفید پاجامہ' گلے میں سفید اونی مفلر' کسی ریاست کے والی ہی نظر آتے تھے۔ بلکہ تمام والیان ریاست کو بھی ایسی شخصیت کہاں نصیب ہوتی ہے۔ انہوں نے ساری زندگی لاابالی پن میں گزار دی۔ جوانی سے لے کر ادھیڑ عمری تک ہر ایک کی نگاہوں کا مرکز بنے رہے۔ جہاں گئے اس ماحول میں چھا گئے۔ موسیقار ایسے کہ بڑے بڑے استاد ان کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ جوانی کے دنوں میں خود بھی گایا کرتے تھے اور پٹیالہ گھرانے کے مشہور استاد عاشق علی خان کے شاگرد تھے۔ غزل' گیت' ٹھمری' دادرا خیال کبھی کبھی اس طرح گاتے کہ سماں باندھ دیتے مگر پھر بے اعتدالیوں اور بڑھتی ہوئی عمر کے باعث آواز میں بانکپن نہ رہا تو گانا ترک کر دیا۔ اس کے بعد وہ سازوں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے مگر ایسے ہنر مند تھے کہ راگوں کو اپنے اشاروں پر چلاتے تھے۔ راگوں پر اتنا عبور تھا کہ ایک ہی راگ کو مختلف رنگوں میں پیش کرتے مگر اس کے ٹھاٹ میں فرق نہ آنے دیتے۔ فلموں کی موسیقی ترتیب دینے پر آئے تو بھارت کی یادگار فلموں کے موسیقار کے طور پر اپنا نام کندہ کرا گئے۔ انتہائی خوش گفتار اور خوش لباس انسان تھے۔ بولنے پر آتے تو بڑے بڑوں کو سانپ سونگھ جاتا۔ ہم نے منٹو صاحب کے سامنے جس شخص کو بولتے اور چہکتے دیکھا وہ یہی رفیق غزنوی تھے۔ ان کا مطالعہ بہت زیادہ تھا۔ اردو' فارسی' انگریزی' پشتو' پنجابی بڑی روانی سے بولتے تھے۔ الفاظ کا استعمال نہایت برمحل اور موزوں' یوں لگتا تھا جیسے ادب پارے تخلیق کر رہے ہیں۔ بلا کے ذہین تھے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں اشعار انہیں ازبر تھے۔ ان کا ایسا برمحل استعمال کرتے تھے کہ سننے والا پھڑک جاتا تھا۔ وہ منہ پھٹ اور پھکڑ مشہور تھے۔ منٹو صاحب نے بھی ان کا یہی نقشہ پیش کیا تھا مگر انہیں ہر محفل کا رنگ دیکھ کر گفتگو کرنے کا سلیقہ تھا۔ اچھی محفلوں میں کیا مجال جو

ایک بھی ناشائستہ لفظ زبان سے نکل جائے۔ مذاق بھی ایسا شگفتہ اور شائستہ کہ طبعیت خوش ہو جاتی تھی۔ رند خراباتی اور بلا کے بلانوش تھے مگر شراب نے کبھی انہیں آداب محفل سے بے گانہ نہیں ہونے دیا۔ کیا خوب آدمی تھے۔
ہم تو ان کا یہ رنگ دیکھ کر حیران ہی رہ گئے۔ ورنہ ہم نے تو اپنے ذہن میں ان کی جو تصویر بنا رکھی تھی وہ کچھ اور ہی تھی۔ لاہور کے فلمی دیوار و دران کے تذکروں سے یوں آراستہ تھے جیسے کہ لاہور شہر کی دیواریں اشتہاروں سے ہوتی ہیں۔ جب کسی حسین فن کارہ کا تذکرہ ہوتا گفتگو کی تان رفیق غزنوی پر جا کر ٹوٹتی تھی۔ سب سے پہلے ہم نے حسین و جمیل شاہینہ کو وہیں دیکھا وہ فلموں کی ہیروئن تھیں۔ کشیدہ قامت' متناسب جسم' شہد اور دودھ جیسا رنگ' سنہری بال 'غزال جیسی آنکھیں' بس اداکاری سے مار کھا گئی تھیں لیکن اگر خاموش کھڑی ہوں تو ان پر کسی ماہر بت تراش کے بت کا گمان گزرتا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ رفیق غزنوی کی صاحب زادی ہیں۔ بازار حسن کی اکثر دلربا اور خوش ادا لڑکیوں کو رفیق غزنوی کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ وہ اپنے زمانے میں واقعی راجا اِندر تھے۔ بازار حسن میں تو ان کو پوجا جاتا تھا۔ حسن خود بارگاہ میں حاضر ہو جائے تو کون بد ذوق اور پتھر دل ہوگا جو پرہیز کرے گا۔ پھر انہیں تو زہد' پارسائی اور پرہیزگاری کا دعویٰ بھی نہ تھا۔ انہوں نے کسی زمانے میں باری باری ہندوستان کی تین خوبصورت ترین بہنوں سے شادیاں کیں۔ یوں سمجھئے کہ فلم شاہجہاں کی ہیروئن ان کی صاحبزادی تھیں اور سلمیٰ آغا ان کی صاحبزادی گویا رشتے سے سلمیٰ آغا رفیق غزنوی کی نواسی ہیں۔

خواجہ صاحب کو موسیقی پر تو عبور حاصل تھا ہی مگر کہانی اور اسکرین پلے پر بھی دسترس تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک کہانی پسند نہ ہو وہ موسیقی بنانے کی ہامی بھرتے تھے اور بعد میں مشورے دیتے رہتے تھے۔ وہ ایک وقت میں ایک ہی فلم کی موسیقی بناتے تھے۔ پیسے کا انہیں کوئی لالچ نہ تھا۔ بڑے موڈی آدمی تھے۔ قناعت پسند اور بے نیاز، موسیقی کے میدان میں ان کی مہارت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ان کی موسیقی کا ایک علیحدہ اور منفرد انداز تھا۔ ان کا گانا سنتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ خواجہ خورشید انور کی تخلیق ہے۔
خواجہ صاحب نے نامور کلاسیکل موسیقار ماسٹر توکل حسین سے بھی سالہا سال تک موسیقی کی تعلیم حاصل کی تھی اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے منفرد اندازِ موسیقی کی تخلیق میں ماسٹر توکل حسین کی تعلیم اور ہم نشینی کا بھی دخل

ہے۔ جب سہراب مودی صاحب نے ''مرزاغالب'' بنانے کاارادہ کیاتواس کی موسیقی ترتیب دینے کیلئے خواجہ خورشید انور ہی کو منتخب کیا تھا۔

خواجہ صاحب رضامند بھی ہوگئے تھے مگر پھر وجوہات کی بناپر نہ جاسکے۔ وہ ایسے ہی من موجی تھے، لوگ شہرت اور دولت کے پیچھے بھاگتے ہیں مگر خواجہ صاحب صاحب تھے کہ ان سے چھپتے پھرتے تھے۔ ہر کوئی فلم ساز توان کے پاس جاکر موسیقی بنوانے کی جرأت ہی نہیں کرتا تھا۔ ساری فلمی صنعت پران کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ حالانکہ ذاتی کار تک سے محروم تھے۔ مگراحترام ایسا کہ غیر موجودگی میں بھی ہر کوئی ادب سے ان کانام لیتا تھااور ان کی عظمت اور ہنر مندی کامعترف تھا۔

خواجہ صاحب کے بظاہر پر سکون اور بے تعلق وجود کے اندر ایک آگ سی بھڑکتی رہتی تھی۔ موسیقی کاایک میدان کارزار تھاجوان کے ذہن میں برپارہتا تھا۔ وہ ہر دم موسیقی کی جستجو میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی جوانی کاخاصا حصہ ہریانہ کے علاقے میں بسر کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہریانہ کے لوک موسیقی اور گوالیار گھرانے کا رنگ ان کی موسیقی میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ پنجاب کی لوک موسیقی پر بھی انہیں عبور حاصل تھااور اس کو وہ نہایت چابک دستی اور خوبی سے اپنی دھنوں میں استعمال کرتے تھے۔ مغربی موسیقی پر بھی انہیں دسترس حاصل تھی مگر وہ اس سے مرعوب نہ تھے۔ اس کے مقابلے میں پاکستانی ثقافت اور موسیقی کو وہ بلند تر سمجھتے تھے۔

موسیقی کی تخلیق میں خواجہ صاحب ایک بے چین اور مضطرب روح کے مانند تھے جو ہر دم بھٹکی رہتی ہے۔ وہ محض موسیقار ہی نہ تھے، انہیں علم موسیقی کاماہر اسکالر یا''میوزیکالوجسٹ'' بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم موسیقاروں نے برصغیر کی موسیقی پر ایسی انمٹ چھاپ چھوڑی ہے جیسی کہ انہوں نے ثبت کی ہے۔ موسیقی، راگ راگنی اور سرتال کے علاوہ انہیں نغمگی یا گیتوں کا بھی مکمل علم تھا۔ گیتوں کیلئے وہ ایسے الفاظ کو ترجیح دیتے تھے جن میں نغمگی اور موسیقی ہوتی تھی۔

خواجہ صاحب نے موسیقی کے مختلف نامور گھرانوں کے بارے میں تفصیلی ریسرچ کی تھی اور انہوں نے ان کاایک مجموعہ بھی تیار کیا تھا جس میں ۹۰ راگوں کے انترے اور استھائیاں اور مختلف گھرانوں کے انداز یکجا کر دیے گئے ہیں۔

یہ خواجہ صاحب کا ایک یادگار کارنامہ ہے۔ کیسٹوں کے اس مجموعے کا نام انہوں نے ''آہنگ خسروی'' رکھا ہے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ ایک ''راگ مالا'' جس کے دس کیسٹ ہیں، ان میں ۹۰ راگوں کی کلاسیکل کمپوزیشن پر مشتمل کیسٹ ہیں۔ اس میں خواجہ صاحب کی آواز میں کمنٹری بھی شامل ہے۔ دوسرے حصے کا نام ''گھرانوں کی گائیکی'' ہے۔ یہ ۲۰ کیسٹوں پر مشتمل ہے۔ ان میں تمام مشہور گھرانوں کے گانے والوں کی آوازیں اور گانے ریکارڈ کئے گئے ہیں۔ اگر وقت مہلت دیتا تو خواجہ صاحب موسیقی کے حوالے سے بہت بڑا سرمایہ فراہم کر سکتے تھے مگر مشکل یہ ہے کہ سفید پوشی برقرار رکھنے اور ذریعہ معاش کیلئے وہ کام بھی کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں بچا کرتا تھا۔ مالی منفعت کی انہوں نے کبھی پروا نہیں کی، نہ ہی کسی ادارے نے انہیں مناسب سہولتیں اور وسائل فراہم کئے ورنہ وہ بہت عظیم کارنامے سرانجام دے جاتے۔ فلمی موسیقی کے علاوہ کلاسیکی موسیقی کے علم میں بھی ان کی خدمات نادر اور ناقابلِ فراموش ہو جاتیں۔ پھر بھی وہ جو کچھ کر گئے ہیں وہ بھی دوسرے ہزاروں پر بھاری ہے۔

نخشب صاحب بھی اس زمانے میں فلموں میں گانے لکھنے کے حوالے سے بہت مشہور تھے۔ شوکت حسین رضوی کی فلم ''زینت'' میں لکھی ہوئی ان کی قوالی سارے ملک میں ہی گائی جاتی تھی اور ایک عالم اس نغمہ کا دیوانہ تھا۔

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کئے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا
ہم دل کو پکڑ کر بیٹھ گئے ہاتھوں سے کلیجا تھام لیا

ان کی شہرت دوسرے گانوں کی وجہ سے بھی تھی۔ سنا ہے کہ فلمی ضرورت کے مطابق بہت اچھے بول لکھتے تھے اور خوب ٹھونک بجا کر معاوضہ وصول کرتے تھے۔ چھڑے چھانٹ تھے۔ بمبئی میں ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے جہاں ہر وقت ان کے دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ وہ اچھا کھانے اور کھلانے کے بہت شوقین تھے۔ بذات خود بھی بہت اچھا اور لذیذ کھانا پکاتے تھے اور دوستوں کو کھلا کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ان کا یہ دستور پاکستان آنے کے بعد بھی قائم رہا۔ بمبئی میں گیت نویسی کرنے کے علاوہ ان کا ایک ذریعہ آمدنی ریس بھی تھی۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہمیشہ جیتا کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے خود اپنے ریس کے گھوڑے بھی رکھ لیے تھے۔ جو در اصل ان کا مشغلہ بھی تھا اور

پیشہ بھی۔ بات بات پر شرط لگایا کرتے تھے اور جیتنے پر فوری رقم وصول کر لیتے تھے۔ ہارنے کی صورت میں بھی فوری ادائیگی کر دیا کرتے تھے۔

فلم ''محل'' میں ان کے لکھے ہوئے گانوں نے بھی بہت دھومیں مچائیں اور انہیں زندہ جاوید کر دیا۔ بعد میں انہوں نے فلمیں بھی بنائیں۔ فلمی کہانیاں بھی لکھیں اور خود ہی ہدایت کاری بھی کی۔ قسمت کے دھنی تھے اس لیے کسی بھی کام میں گھاٹے میں نہ رہے۔ اگر فلم فلاپ ہو گئی تو آمدنی کے دوسرے ذرائع پیدا ہو گئے۔

رشید عطرے (مرحوم) بمبئی میں ان کے بے تکلف دوست تھے۔ ان کی رنگین داستانیں بہت مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ نخشب رنگین مزاج اور دل پھینک تھے۔ کوئی بھی پرکشش اور متناسب جسم والی عورت ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ وہ خود بھی جامہ زیب اور خوش رو تھے۔ ان کا رنگ تو گہرا سانولہ تھا لیکن ناک نقشہ بہت سجل اور دلکش تھا۔ پیشانی پر پڑے ہوئے گھنے بالوں کی لٹیں اور سب سے بڑھ کر ان کا اندازِ تکلم۔ وہ بہت چرب زبان تھے۔ باتیں کرنے پر آتے تو سماں باندھ دیتے لیکن بدزبان بھی کم نہ تھے۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری ان کی تعلّیا ور خود پسندی تھی۔ اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور بلا جھجک دوسروں کے بارے میں دل آزاد ریمارکس دیتے رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے بعض حلقوں میں ان کی مخالفت شروع ہو جاتی تھی جس کی انہیں مطلق پروا نہیں تھی۔

رشید عطرے صاحب بتایا کرتے تھے کہ سڑک پر نخشب صاحب کو کوئی گھاٹن پسند آجاتی تو فوراً اسے اپنی کار میں بٹھا لیتے۔ گھاٹن محنت کش مرہٹہ عورتوں کو کہتے ہیں جو اپنے گہرے رنگ اور سنگین جسموں کیلئے بہت شہرت رکھتی ہیں۔ مگر یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ جو ہم نے لاہور پہنچنے کے بعد سنیں۔ ایک بار ہم نے سنا کہ نخشب جارچوی صاحب بمبئی سے آئے ہیں۔ لڑکپن کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں فلم وار فلم والوں کا بہت چرچا تھا۔ نخشب صاحب تو پھر شاعر بھی تھے اور ایک نامور مسلمان گیت نگار بھی تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے مسلمان یہ دیکھ کر اور سن کر ہی خوش ہو جایا کرتے تھے کہ بمبئی میں ہندوؤں کے غلبے کے باوجود فلاں فلاں مسلمان فنکار، ہدایت کار یا شاعر کا طوطی بول رہا ہے۔ نخشب صاحب بھی اس حوالے سے ہمارے ہیرو تھے۔ اپنے دوست شہریار کے ذریعے یہ خبر گروہ کے دوسرے

لوگوں تک پہنچ گئی۔اب سوال یہ تھا کہ نخشب صاحب کو کیسے دیکھا جائے؟ ملاقات کا تو خیر سوال ہی نہیں تھا کہ حفظ مراتب کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔ بہر حال معلوم ہوا کہ نخشب صاحب فلاں وقت کچھ دیر کیلئے نادر علی بلڈنگ بھی آئیں گے۔ ہم سب منتظر ہو کر بیٹھ گئے۔ خدا خدا کر کے نخشب صاحب تشریف لائے۔ وہ میرٹھ میں کسی رئیس کے مہمان تھے۔اس کی کار میں سوار ہو کر آئے تھے۔کاریں اس زمانے میں خال خال ہی ہوتی تھیں۔ وہ کار سے اترے اور سامنے والے فلیٹ میں داخل ہوئے تو ہم نے بھی ان کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ چست موری کا سفید لٹھے کا پاجامہ اور سفید ململ کا کرتہ پہنے ہوئے تھے۔آف وہائٹ شیروانی تھی جس کے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے مگر ایک دوست نے ہمارے کان میں بتایا کہ نخشب صاحب کی شیروانی میں ہیرے کے بٹن لگے ہوئے ہیں۔ خدا جانے یہ سچ تھا یا جھوٹ۔ بٹن البتہ دور سے چمکتے ہوئے نظر آئے۔ان کی انگلیوں میں بھی قیمتی انگوٹھیاں تھیں۔

’’ہیرے کی ہیں‘‘ ایک دوست نے مطلع کیا۔

ہم عقیدت اور احترام سے دیکھتے رہ گئے اور نخشب صاحب ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گئے۔ کچھ دیر بعد فلیٹ سے باہر نکل کر کار میں بیٹھے اور رخصت ہو گئے۔ یہ نخشب سے ہماری پہلی ملاقات تھی بشرطیکہ اسے ملاقات کہا جائے۔

ہم پاکستان آ گئے تو یہاں فلم ’’محل‘‘ ریلیز ہوئی۔یوں تو فلم ہی بہت اچھی تھی مگر اس کی موسیقی، گانوں اور مدھو بالا نے تو ایک عالم کو دیوانہ بنا دیا۔ بڑے بڑے جغادری شاعروں اور موسیقاروں کو ہم نے اس فلم کی موسیقی کی تعریف کرتے ہوئے سنا۔ کھیم چندر پرکاش بڑے نامور اور ہنر مند موسیقار تھے۔ نخشب صاحب نے سچویشنز پر ایسے گیت لکھ دیے کہ امر ہو گئے۔اس پر مدھو بالا کا پراسرار حسن و جمال۔ فلم کیا تھی جادو گری تھی۔ مگر جب ذرا شعور پیدا ہوا تو احساس ہوا کہ اس میں کمال فلم کے مصنف اور ہدایتکار کا بھی تھا۔

کمال امروہوی اس فلم کے مصنف اور ہدایت کار تھے۔اور انہوں نے فلم میں ایک سحر انگیز ماحول پیدا کر دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بمبئی ٹاکیز کی فلموں میں کہانی اور مکالموں میں دوسرے لکھنے والوں کا بھی دخل ہوتا ہے مگر نام کسی ایک مصنف کا دیا جاتا ہے۔ حقیقت جو بھی ہو لیکن کمال امروہوی نے اس کہانی کو پیش کرنے میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ کمال امروہوی، نخشب اور مدھو بالا، تین بڑے مسلمان نام اس فلم سے وابستہ تھے۔ نخشب صاحب یوں

توپہلے بھی نامور تھے مگر ''محل'' نے ان کی شہرت میں چار چاند لگادیے۔

بمبئی کی فلمی دنیامیں نخشب جارچوی ایک دل پھینک، عاشق مزاج اور منہ پھٹ آدمی کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ شادی انہوں نے نہیں کی تھی پھر معلوم ہوا کہ فلم ''آن'' کی شہرت یافتہ اداکارہ نادرہ کے ساتھ انہوں نے شادی کرلی ہے۔ یہ شادی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ دراصل انہیں تنہارہنے کی عادت ہوگئی تھی۔ ایسے بے پرواہ اور کھلنڈرے لوگ شادی کی پابندیاں کیسے برداشت کرسکتے ہیں۔ نادرہ نے نخشب صاحب کی فلم ''نغمہ'' میں کام بھی کیا تھا۔ انہوں نے ایک اور فلم ''رفتار'' بھی بنائی تھی مگر نغمہ فلم ساز کی حیثیت سے ان کی پہلی فلم تھی۔ یہ فلم توکوئی خاص نہیں تھی مگر اپنی موسیقی کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی اور ہٹ قرار پائی۔ اس فلم میں نخشب صاحب نے پہلی بار ایک نئے موسیقار ''ناشاد'' کو متعارف کرایا جنہوں نے بعد میں بھارت اور پاکستان دونوں جگہ اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑدیے تھے۔ اس فلم میں ناشاد صاحب کی شمولیت کی داستان بھی بہت دلچسپ ہے۔

ہوا یہ کہ نخشب صاحب اپنی اس فلم میں نامور موسیقار نوشاد علی صاحب سے موسیقی بنوانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق، محدود پیمانے پر کام کرتے ہیں۔ انہوں نے معذرت کی تو نخشب صاحب نے اسے توہین جانااور وقار کا سوال بنالیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اصل چیز تو بول ہوتے ہیں۔ موسیقار سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اپنا یہ دعویٰ درست ثابت کرنے کیلئے انہوں نے ایک نئے موسیقار کو متعارف کرایا۔ شوکت علی طبلہ نواز تھے موسیقی میں کافی دسترس رکھتے تھے۔ خوش الحان بھی تھے۔ نخشب صاحب کی نظران پر پڑی اور انہوں نے شوکت علی کو'' ناشاد'' بنادیا۔ جب فلم ریلیز ہوئی تو ناشاد اور نوشاد کے باریک سے فرق کو زیادہ محسوس نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ فلم کی موسیقی بہت اچھی اور دلکش تھی۔ ناشاد صاحب طرز بنانے میں ماہر تھے۔ لہٰذا فلم کے سارے گانے ہٹ ہوگئے۔ اس طرح ایک نئے موسیقار نے جنم لیا۔ ناشاد صاحب نے بمبئی میں نخشب صاحب کی فلموں میں بھی موسیقی دی اور دوسری فلموں میں بھی یہ فرائض سرانجام دیے جن میں ''بارہ دری'' قابل ذکر ہے۔ قسمت مہربان تھی۔ گانے ہٹ ہونے لگے تو ناشاد صاحب بھی بطور موسیقار ہٹ ہوگئے۔

نخشب صاحب نے بمبئی میں آخری فلم ”زندگی یا طوفان“ بنائی تھی۔اس فلم کے ہدایت کار کے طور پر بھی ان ہی کا نام تھا لیکن جتنے منہ اتنی زبانیں۔لوگ کہتے ہیں کہ درحقیقت ہدیات کار اور کوئی تھا۔ بہرحال، یہ فلم بہت پسند کی گئی اور اسی زمانے میں نخشب صاحب اپنے گھوڑے وغیرہ فروخت کر کے پاکستان چلے آئے۔وہ مجلسی آدمی تھے اور اس لیے وسیع مراسم رکھتے تھے۔پاکستان میں اس وقت وزیرِ خزانہ ان کے دوست اور مداح تھے۔بیورو کریسی میں اور بھی باثر دوست موجود تھے۔چنانچہ پاکستان میں بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندی کے باوجود نخشب صاحب کی فلم یہاں درآمد کر لی گئی۔فلمی صنعت والوں نے بہت شور مچایا۔فلم سازوں اور تقسیم کاروں نے بھی احتجاج کیا۔مگر جسے پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے۔نخشب صاحب کی بااثر حلقوں تک رسائی تھی اور پاکستان میں یہی ہر مشکل کی کنجی ہے۔ان کی فلم بڑی دھوم دھام سے پاکستان میں ریلیز ہوئی اور اس نے یہاں بھارت سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔بس پھر کیا تھا، نخشب صاحب کے دن پھر گئے۔شہرت اور پیسے کے معاملے میں وہ ہمیشہ خوش نصیب رہے۔ لیکن پاکستان آنے کے بعد تو ایسے بھاگ لگے کہ سارے دلدر دور ہو گئے۔پیسے کی ریل پیل ہو گئی۔نخشب صاحب کیلئے نہ کبھی پیسہ کمانا کوئی مسئلہ تھا، نہ خرچ کرنا۔جس طرح آتا تھا، اسی طرح دونوں ہاتھوں سے لٹاتے تھے۔نادرہ کے بعد انہوں نے جنم جنم کیلئے کنوارا رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔راجا اندر کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔اچھا کھانا، اچھا پہننا، اچھی طرح رہنا۔ اچھے لوگوں میں وقت گزارنا، یہی نخشب صاحب کا معمول بن گیا تھا۔

پاکستان میں آنے کے بعد جب پیسہ بھی آ گیا تو سب سے پہلے تو انہوں نے ریس کی طرف توجہ دی۔قیمتی گھوڑے خریدے اور ریس کے حلقوں میں مقبول ہو گئے۔اس کے بعد انہوں نے فلم سازی اور ہدایت کاری کی طرف توجہ دی۔یہاں آکر انہوں نے پہلی فلم ”فانوس“ بنانے کا اعلان کیا اور حسبِ عادت یہ بھی کہا کہ یہاں نہ کوئی ہدایت کار ہے، نہ رائٹر۔کسی کو فلم بنانی نہیں آتی۔میں انہیں بتاؤں گا کہ فلم کیسے بنائی جاتی ہے۔اس اعلان کے ساتھ ہی گویا انہوں نے مقامی فلمی صنعت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔بڑبولا پن تو ایک طرح کی بیماری ہے اور اسے گنبد کی آواز کہا جاتا ہے یعنی کہنے والا جو بھی کہتا ہے اس کی گونج دیر تک باقی رہتی ہے۔ظاہر ہے کہ ان کی یہ باتیں بہت سے لوگوں کو ناگوار گزرنے لگی تھیں اور وہ بھی ان کے خلاف باتیں بنانے میں مصروف ہو گئے تھے۔مگر نخشب صاحب کو کچھ

پر وا نہیں تھی۔ دوستوں کے وہ بہت اچھے دوست تھے مگر دشمنوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ دنیا ان کے بارے میں خواہ کچھ بھی کہتی رہے انہوں نے کبھی کان دھرے نہیں سنا۔ وہ تو اپنی ہی آواز سننے کے شوقین تھے۔

فلم ’’ فانوس‘‘ کا شاندار سیٹ شاہ نور اسٹوڈیو میں تعمیر ہوا تو نخشب صاحب نے فرمایا کہ پاکستان والوں کو کیا پتا کہ سیٹ کیسے لگاتے ہیں اور اسے آراستہ کیسے کرتے ہیں۔ اس سیٹ کیلئے انہوں نے خاص طور پر فانوس بنایا۔ قیمتی صوفے، قالین اور پردے حاصل کئے اور ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی سیٹ پر قدم نہیں رکھ سکتا۔ کسی کو بھلا کیا پڑی تھی کہ ان کے سیٹ پر جاتا۔ مگر نخشب صاحب نے سیٹ کے باہر دو بندوق بردار محافظ تعینات کر دیے۔ اس سے پہلے کسی فلم کے سیٹ کی حفاظت کیلئے مسلح گارڈ مقرر نہیں کیا گیا تھا۔

نخشب صاحب نے اس فلم میں سلمان پیرزادہ کو ہیرو منتخب کیا۔ ہیروئن کے طور پر وہ شمیم آرا کو لینا چاہتے تھے مگر ان کی جہاں دیدہ نانی کو نخشب صاحب کی بدزبانی اور خود پسندی کا علم تھا اس لیے انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے معذرت کر دی۔ انہوں نے اس فلم کیلئے کومل کو ہیروئن منتخب کر لیا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ خود ہی کومل کو اپنی فلم کی ہیروئن منتخب کیا تھا مگر بھری محفل میں خود ہی ان پر ہوٹنگ بھی کرتے رہتے تھے۔ دراصل اپنی بڑائی اور دوسروں کی توہین کرنا نخشب صاحب کا شیوہ تھا اور یہ ایسی بری عادت تھی جو ان کی فطرت بن چکی تھی۔ اسی وجہ سے وہ خدا واسطے کے دشمن اور مخالفت پیدا کر لیتے تھے۔

’’فانوس ‘‘ کے بارے میں نخشب صاحب کا کہنا تھا کہ یہ زبردست ہٹ فلم ہو گی اور اسے تو پولیس ہی سنیما سے اتارے گی۔ مگر یہ فلم بری طرح فلاپ ہو گئی۔

نخشب صاحب نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ ناکامی کی تمام تر ذمے داری انہوں نے ہیرو اور ہیروئن پر ڈال دی اور دوسری فلم ’’میخانہ‘‘ کا آغاز کر دیا۔

اس زمانے میں ریڈیو سیلون ایک مقبول و معروف ذریعہ، تشہیر تھا اور عموماً بھارتی فلموں کی موسیقی نشر کرنے کیلئے مخصوص تھا۔ نخشب صاحب نے پہلی بار اپنی فلم ’’ میخانہ‘‘ کی پبلسٹی ریڈیو سیلون سے پیش کی اور فلم کے نغمے ہندوستان اور پاکستان میں گونجنے لگے۔ اس فلم کی موسیقی بہت اچھی تھی۔ مگر فلم فلاپ ہو گئی۔ فلم کی بے انتہا پبلسٹی بھی اس

کیلئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔اس لیے کہ لوگوں نے اس سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کرلی تھیں۔

''میخانہ'' فلاپ ہوجانے کے بعد نخشب صاحب نے فلم بنانے کاخیال ہی ترک کردیا۔یہ تو ایک طرح سے ان کا شوق اور مشغلہ تھا۔ذریعہ معاش کیلئے وہ اس کے محتاج نہیں تھے۔ بطور ہدایت کاراور کہانی نویس پاکستان میں انہیں تسلیم نہیں کیا گیا۔گیت نگار وہ بہت اعلیٰ درجے کے تھے مگر کسی پاکستانی فلم ساز نے ان کو گیت نگاری کی دعوت دینے کا خطرہ مول نہیں لیا۔نخشب صاحب نے اس بارے میں کبھی خواہش کا اظہار تک نہیں کیا۔ظاہر ہے کہ وہ پاکستان کے سبھی فلمی شاعروں، ہدایت کاروں اور موسیقاروں کو خود سے کمتر سمجھتے تھے تو پھر یہاں کی فلم میں گیت نگاری کیسے کرتے۔

۔۔۔مگر قدرت بھی انسانوں کو سبق سکھاتی رہتی ہے۔پاکستان میں ان کے پاس دولت، شہرت،اثرورسوخ سبھی کچھ تھامگراوپر تلے دوفلموں کے فلاپ ہوجانے کی وجہ سے ان کی شیخیوں میں خودبخود کمی آگئی تھی۔اس کے بعد تو وہ قریب قریب گمنام ہی ہوکر رہ گئےاوراپنے قریبی دوستوں تک محدود ہوگئے تھے۔جب ایک روزاچانک ان کی وفات کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو حیرت ہوئی۔چونکہ اس سے پہلے ان کی علالت کے بارے میں کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی تھی۔نئی نسل کے لوگ تواس وقت تک انہیں بھول ہی چکے تھے۔آج بھی نخشب جارچوی کا نام سن کر نئی پود کے لوگ سوچ میں پڑجاتے ہیں۔انہیں علم ہی نہیں ہے کہ اس شخص نے محض اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر کتنا نام اور کیسا مقام پیدا کیا تھااور کتنی بھرپور زندگی گزاری تھی۔ موت ہی خاکی انسان کا انجام ہے۔وہ صاحب اولاد نہیں تھے اس لئے اس کا نام چلانے والا بھی کوئی باقی نہیں ہے۔بھائی بہن اور دوسرے رشتے داروں کا ویسے ہی کبھی نام نہیں سنا۔اس طرح نخشب جارچوی شہرت کی چاردن کی چاندنی میں دھومیں مچانے کے بعد ہمیشہ کیلئے موت کی تاریک وادی میں گم ہوگئے۔پاکستان کی فلمی صنعت میں انہوں نے کسی سے بنا کر نہیں رکھی تھی جو انہیں یاد کرتا۔

جن دنوں لقمان صاحب نے پنجابی فلم ''پتن'' کی ہدایت کاری کا آغاز کیا تو سب نے بہت ناک بھوں چڑھائی کہ جو شخص ڈھنگ سے پنجابی زبان بول بھی نہیں سکتا۔ وہ بھلا پنجابی فلم کیسے بنائے گا۔لقمان صاحب کا کہنا تھا کہ فلم کی اپنی زبان ہوتی ہے۔پنجابی، اردو، بنگالی سے کیا ہوتا ہے۔ہماری اس زمانے میں لقمان صاحب سے بہت گاڑھی چھنتی

تھی۔ وہ عمر، تجربے اور مرتبے میں ہم سے بہت بڑے تھے۔ ابھی ہم نے قرینے سے فلم دیکھنی بھی شروع نہیں کی تھی جب وہ سہراب مودی اور شوکت حسین رضوی جیسے ہدایت کاروں کے معاون تھے۔ خود ساز آدمی تھے۔ گھر سے فلم کے شوق میں بھاگ کر بمبئی پہنچے تھے اور اس زمانے کے کئی لوگوں کی طرح اپنی قابلیت اور محنت کے بل بوتے پر ہدایت کاروں کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔

یہ سچ ہے کہ انہیں پنجابی بولنی نہیں آتی تھی۔ جب ایک دن کسی صحافی نے ان سے یہ بات کہی تو وہ کہنے لگے "یار سننی تو آتی ہے نا"۔

"مگر آپ مکالمے کیسے سمجھیں گے؟"

کہنے لگے "مجھے سمجھانے والے لوگ جو ہوں گے۔ وہ مجھے ترجمہ کر کے بتائیں گے"۔

"مگر آپ پنجابی تاثرات کیسے بتائیں گے؟"

"وہ تو خود ہی دیکھ لینا۔ یہ راز کی باتیں ہیں میں اس طرح نہیں بتا سکتا"۔

ایک روز ہم نے بھی بڑی سنجیدگی سے ان سے کہا لقمان صاحب، آپ پنجابی فلم بنانے کھڑے ہو گئے ہیں۔ سب کی نگاہیں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں"۔

کہنے لگے "فکر نہ کرو، اللہ مالک ہے"۔

اللہ پر لقمان صاحب کا یقین بہت پختہ تھا۔ ہم نے ایک بار لکھا تھا کہ ان میں اور ہدایت کار محبوب خاں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ محبوب صاحب ان پڑھ تھے جب کہ لقمان صاحب صرف اردو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مگر مطالعہ تھا اور وہ بھی ادب اور شاعری کا۔ دونوں گھر سے بھاگ کر بمبئی پہنچے تھے۔ دونوں رنگین مزاج تھے۔ دونوں کا اللہ پر پختہ یقین تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کا صلہ بھی عطا فرمایا تھا۔

"پتن" ۵۵۔۱۹۵۴ء کی فلم ہے۔ سنتوش کمار اور صبیحہ خانم کی جوڑی بن چکی تھی اور دونوں ہی محبوب فنکار تھے۔ اس وقت تک پنجابی فلموں میں قتل و غارت اور گنڈاسے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ رومانی اور ہلکے پھلکے موضوعات فلمائے جاتے تھے۔ اس لیے سنتوش کمار اور صبیحہ خانم کو اس فلم کے مرکزی کرداروں کیلئے چنا گیا تھا۔ صبیحہ خانم اپنی

مصروفیات کی بناپر مطلوبہ تاریخیں نہ دے سکیں تو ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ شوٹنگ سر پر آگئی تھی اور ہیروئن کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

ایک دن فلم ساز شیخ لطیف نے بتایا کہ انہوں نے ایک نئی لڑکی دریافت کی ہے۔

شیخ صاحب بہت ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے، کہنے لگے ''آپ اس کو دیکھ تو لیں اور مناسب سمجھیں تو اس کا ٹیسٹ بھی لے لیں۔ فیصلہ بعد میں کیجئے گا''۔

دراصل شیخ لطیف اس لڑکی کو انور کمال پاشا کی فلم ''قاتل'' کیلئے بھی تجویز کر چکے تھے۔ وہ اس فلم کے بھی سرمایہ کار تھے۔ اس کی شوٹنگ بھی پہلے ہوئی تھی مگر ''پتن'' پہلے ریلیز ہوئی اور مسرت نذیر کی پہچان بن گئی۔ قاتل میں وہ سائڈ رول میں تھیں اس لیے فلم ہٹ ہو جانے کے باوجود قاتل کے حوالے سے انہیں زیادہ شہرت اور پذیرائی نہیں ملی۔

بات دراصل یہ تھی کہ شیخ لطیف گڑھی شاہو میں رہتے تھے۔ وہیں خواجہ نذیر صاحب رہتے تھے جو مسرت نذیر کے والد تھے۔ ان کی لکڑیوں کی ٹال تھی۔ بہت معقول اور شریف آدمی تھے۔ مسرت نذیر نے ریڈیو میں گانا شروع کیا تو شیخ لطیف کو بھی ان کی سن گن مل گئی۔ مسرت نذیر کا اداکارہ بننے کا ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی انہیں شوق تھا مگر شیخ لطیف کے اصرار پر خواجہ نذیر مان گئے۔ اس طرح مسرت نذیر کو قاتل اور پھر پتن میں کاسٹ کر لیا گیا۔

مسرت نذیر کو دیکھا تو بنی بنائی پنجاب کی جٹی نظر آئیں۔ دراز قد، متناسب لیکن دیہاتی سخت جان لڑکیوں جیسا جسم، خوب صورت چہرہ، دلکش آواز، ہنستی تھیں تو اور بھی اچھی لگتی تھیں۔ لقمان صاحب نے انہیں ٹیسٹ لیے بغیر ہی پاس کر دیا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ شرماتی بہت تھیں۔ اداکاری کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ چنانچہ فلم کے مصنف بابا عالم سیاہ پوش کو انہیں مکالموں کی ادائیگی سکھانے پر مامور کیا گیا۔ مسرت نذیر نے بابا عالم سیاہ پوش سے بہت جلد کام کی باتیں سیکھ لیں۔ بابا عالم سیاہ پوش کی عمر تو اس وقت زیادہ نہیں تھی مگر ان کی عادت تھی کہ ہر ایک کو بیٹا یا بیٹی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کا ایک پاکیزہ اور قابل اعتبار امیج بن جاتا تھا۔

''پتن'' کی پہلی شوٹنگ کیلئے لقمان صاحب نے ایک رومانی منظر کا انتخاب کیا۔ مسرت نذیر کو سنتوش کمار کے ساتھ یہ

رومانی منظر فلم بند کرانا تھا مگر انہیں اتنی شرم آئی کہ وہ ہاتھوں سے منہ چھپا کر بیٹھ گئیں اور صاف کہہ دیا کہ میں یہ سین نہیں کروں گی۔ جب لقمان صاحب نے زیادہ زور دیا تو وہ رونے لگیں۔ سیٹ پر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ظاہر ہے اگر ہیروئن سیٹ سے غائب ہو جائے اور کہے کہ مجھے رومانی سین کرتے ہوئے شرم آ رہی ہے تو پریشانی کی بات تو ہے۔ لقمان صاحب نے مسرت نذیر کو بہت سمجھایا۔ سنتوش کمار نے بھی سمجھایا کہ یہ سب تو مصنوعی ہے۔ جھوٹ موٹ کی باتیں ہیں۔ ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مگر مسرت نہ مانیں۔ بابا عالم سیاہ پوش کی سبھی بہت عزت کرتے تھے۔ انہوں نے خاص طور پر مسرت نذیر کو ایک لیکچر دیا۔ مسرت گھبرائی گھبرائی سیٹ پر آ تو گئیں مگر توقع نہیں تھی کہ وہ صحیح طریقے پر ایکٹنگ کر لیں گی۔ کچھ سنتوش کمار نے تعاون کیا کچھ ہدایت کار نے اور اس منظر کی فلم بندی کا آغاز ہونے لگا۔ مسرت نزیر نے بڑی مشکل سے رومانٹک مکالمے ادا کیے اور پھر خاموش ہو گئیں۔

""ابھی اب کیا ہوا؟"" لقمان صاحب نے پوچھا۔

""مجھے شرم آ رہی ہے۔ آپ ان سب لوگوں کو سیٹ پر سے باہر بھیج دیں""۔

لقمان صاحب ہنسنے لگے ""یہ لوگ نہیں ہیں، یونٹ کے ارکان ہیں۔ ان کے بغیر تو شوٹنگ ہو ہی نہیں سکتی""۔

""تو پھر میں نہیں کروں گی شوٹنگ۔ مجھے تو سنتوش صاحب سے بھی شرم آ رہی ہے""۔

سنتوش صاحب نے کہا ""تم کوشش تو کرو۔ میں آنکھیں بند کر لوں گا۔ تمہیں دیکھوں گا ہی نہیں۔ اور یہ سب لوگ بھی آنکھیں موند لیں گے""۔

یہ بات مسرت کی سمجھ میں آ گئی۔ خدا خدا کر کے پہلا شاٹ مکمل ہوا تالیاں بجیں۔ مبارک بادیں دی گئیں اور اس طرح پاکستان کی فلمی صنعت کو ایک نئی ہیروئن مل گئی جو آنے والے زمانے میں پاکستان کی صف اول کی اداکارہ بن گئی۔ بعد میں سنتوش صاحب مذاق میں کہا کرتے تھے ""دیکھا مسرت۔ تمہیں کیسا بیوقوف بنایا؟ آخری ہماری باتوں میں آ گئیں نا؟""

مسرت کہتی ""بے وقوف تو میں نے سب کو بنایا تھا۔ مجھے شرم ورم کچھ نہیں آ رہی تھی۔ بس ایسے ہی پریشان کر رہی تھی""۔

حقیقت یہ تھی کہ مسرت نذیر میں بقول رضا میر صاحب وہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے جو ایک اچھے مرد دوست میں ہونے چاہئیں۔ مثلاً وہ ہر کام میں دوسروں کے ساتھ پیش پیش رہا کرتی تھیں۔ لڑکیوں کی طرح بلاوجہ ناز نخرے بالکل نہیں کرتی تھیں خواتین کے مقابلے میں وہ مردوں کی محفل میں بیٹھنا اور گپ شپ لگانا زیادہ پسند کرتی تھیں۔ لطیفہ بازی اور ہوٹنگ کے معاملے میں کسی سے کم نہیں تھیں۔ دوسروں پر تو فقرے بازی کرتی ہی تھیں۔ مگر خود اپنے آپ پر بھی ہنس لیتی تھیں۔ تھوڑے ہی دن کے اندر مسرت نذیر سارے یونٹ کی پسندیدہ شخصیت بن گئیں۔ کبھی ریکارڈنگ ٹرک میں ساؤنڈ ریکارڈسٹ افضل حسین صاحب اور رضا میر کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی ہیں تو کبھی ایڈیٹنگ روم میں بیٹھی ایڈیٹنگ کے رموز واسرار کے بارے میں دریافت کر رہی ہیں۔ کیمرے کے پاس پہنچی ہیں تو عکاس رضا میر صاحب سے کیمرے اور فوٹو گرامی کے بارے میں سوال کر رہی ہیں۔ وہ شرارت میں سب کے ساتھ اور شانہ بشانہ ہوتی تھیں۔ دراصل ان میں بے جا جھجک اور خواہ مخواہ کا نخرہ بالکل نہیں تھا۔ جن باتوں پر دوسری خواتین برامان کر بات چیت کرنا بند کر سکتی تھیں ان کو مسرت انجوائے کرتی تھیں۔ بلکہ جب کوئی ان کی بات پر ناراضگی کا اظہار کرتا تو وہ ہنس کر کہتی تھیں ”آپ تو خواہ مخواہ عورتوں کی طرح برامان گئے“۔

پتن کی شوٹنگ کے زمانے کا ایک اور واقعہ بھی یاد آ گیا۔ اسٹوڈیو کے نزدیک ہی ایک کھلے میدان میں بستی کا سیٹ تعمیر کیا گیا تھا۔ چند جھونپڑیاں، چند پکے مکان اور دکانیں۔ چند ریڑھے، کچھ گائیں بھینسیں اور بکریاں۔ آوارہ کتے خود ہی چلے آتے تھے۔ لیجئے بستی کا ماحول تیار ہو گیا۔ وہی سردی کا موسم تھا اور شوٹنگ بھی رات کے وقت ہو رہی تھی۔ کھلے آسمان تلے ساری رات لاہور کی کڑکڑاتی سردی میں شوٹنگ کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ مگر فلم والے بے چارے یہ سب مشکل کام کرتے ہیں اور فلم دیکھنے والوں کو لمحہ بھر کیلئے بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ جو منظر چند لمحے میں ان کی نظروں کے سامنے سے گزر جاتا ہے اسے فلمانے کیلئے اداکاروں اور فلم یونٹ کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ شدید گرمی ہو یا شدید سردی۔ ہر موسم میں دن رات فلم بندی جاری رہتی ہے۔ جون جولائی کی چلچلاتی دھوپ میں ہیروئن بڑے مزے سے ننگے پاؤں محبت بھرا گیت گاتی ہوئی نظر آتی ہے مگر یہ گانا فلماتے وقت اس پر اور یونٹ کے لوگوں پر کیا گزری تھی اس کا فلم دیکھنے والوں کو اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح ٹھٹھراتی ہوئی سردی میں کھلے آسمان کے نیچے پانی

میں بھیگتے ہوئے جب گانا فلمایا جاتا ہے تو سارے یونٹ والوں پر تو خیر جو بیتتی ہے وہ بیتتی ہے لیکن غریب ہیروئن کی تو جان پر ہی بن جاتی ہے۔

پتن کی شوٹنگ کے زمانے میں دہلی سے مشہور و معروف فلمی ماہنامہ ''شمع'' کے ایڈیٹر ادریس دہلوی صاحب بھی لاہور آگئے۔ ادریس صاحب کے لقمان صاحب سے بہت اچھے مراسم تھے۔ ہم سے بھی ملاقات ہو گئی۔ ہمارے ہم عمر ہی ہوں گے۔ ان سے خاصی دوستی اور بے تکلفی ہو گئی۔ ادریس صاحب تو فلموں کے متعلق معلومات اکٹھی کرنے کیلئے ہی آتے تھے۔ وہ ''مسافر'' کے نام سے ہر مہینے ''شمع'' میں اپنی روداد بھی لکھتے ہیں اور اس کے لئے ہر جگہ گھوم پھر کر مواد جمع کرتے رہتے ہیں۔

ادریس صاحب شام کو اسٹوڈیو آئے۔ چائے کافی سے ان کی تواضع کی گئی۔ لقمان صاحب نے انہیں رات کی شوٹنگ دیکھنے کی دعوت دی تو وہ رضامند ہو گئے۔ جاڑوں میں لاہور میں پانچ بجے ہی رات ہو جاتی ہے۔ کھلے میدان میں بستی کے سیٹ پر شوٹنگ کا اہتمام شروع ہو گیا۔ انسان اور جانور ہر قسم کے اداکار فراہم کر دیے گئے۔ دوسرے اداکاروں کے علاوہ مسرت نذیر سے بھی ادریس صاحب کی ملاقات کرائی گئی۔ سب نے مسرت کی منت سماجت کی اور درخواست کی خدارا ادریس صاحب کے سامنے ذرا ہیروئن بن کر رہنا۔ ایسا نہ ہو وہ واپس جا کر پاکستانی ہیروئنوں کے بارے میں اچھے تاثرات کا اظہار نہ کریں۔ مسرت نذیر کیلئے تکلف کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور بات چیت کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا مگر انہوں نے اس قدر تکلف اور رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کیا کہ ہم سب حیران رہ گئے۔ سب نے انہیں چپکے چپکے مبارک باد دی کہ شاباش۔ ادریس دہلوی کو بہت اچھا امپریشن دیا ہے۔

سات بجے تو سردی میں اضافہ ہو گیا اور دھند بھی چھانے لگی۔ ادریس صاحب نے واپسی کا ارادہ کیا تو سنتوش صاحب کو شرارت سوجھی۔ انہوں نے مسرت نذیر سے کہا ''مسرت۔ اگر تم ادریس دہلوی کو شوٹنگ پر روک لو تو تمہیں مان جائیں''۔

مسرت نذیر نے فوراً کہا ''شرط لگائیں''۔

''لگا لو شرط''۔

لیجئے، سو سو روپے کی شرط ہو گئی۔

ادریس صاحب ابھی جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ مسرت نذیر انتہائی اخلاق کے ساتھ ہیروئنوں والی مسکراہٹ چہرے پر سجائے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئیں۔ وہ اخلاقاً کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''بیٹھے بیٹھے تکلف کیوں کرتے ہیں، کافی پئیں گے؟''

''شکریہ''۔ انہوں نے کہا ''ابھی کچھ دیر پہلے پی ہے''۔

''تو پھر کیا ہوا۔ سردی کا موسم ہے۔ ابلے ہوئے انڈے اور کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''آپ کہتی ہیں تو انکار نہیں کر سکتا'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''شکریہ۔ ابھی آپ کیلئے کافی منگاتی ہوں۔ میں خود بنا کر پلاؤں گی''۔

ادریس صاحب انتظار میں بیٹھ گئے اور مسرت شوٹنگ میں مصروف ہو گئیں۔ مگر ادریس صاحب کی خاطر داری کی طرف سے بھی غافل نہیں تھیں۔

ایک دو گھنٹے اور گزر گئے تو ادریس صاحب پھر واپسی کیلئے پر تولنے لگے۔ مسرت پھر مسکراتی ہوئی ان کے پاس گئیں۔

''ارے ادریس صاحب، آپ بور تو نہیں ہو رہے؟''

''بالکل نہیں۔ مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے، یہ ماحول، گانے کی فلم بندی اور پنجابی میوزک''۔

''شکریہ۔ بمبئی میں آپ کو پنجابی فلموں کی شوٹنگ دیکھنے کا بھلا کب موقع ملتا ہو گا''۔

ادریس صاحب نے کہا ''ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں''۔ اور بمبئی کی فلموں اور فنکاروں کے بارے میں باتیں شروع ہو گئیں۔

سنتوش صاحب نے مسرت کے کان میں کہا ''مسرت۔ اب یہ جانے ہی والے ہیں''۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'' مسرت نے بڑے وثوق سے اور اعتماد سے کہا ''جب تک ہماری شوٹنگ ہوتی رہے گی یہ سیٹ پر ہی رہیں گے اور ہمارے ساتھ ہی جائیں گے''۔

''سوچ لو، کہیں شرط ہار نہ جانا''۔

مسرت ایک بار پھر ادریس صاحب کے پاس پہنچ گئیں۔ ''ادریس صاحب، آپ کو تو سردی لگ رہی ہو گی؟''

''نہیں۔ زیادہ تو نہیں لگ رہی'' انہوں نے جواب دیا۔

''لاہور کی سردی بہت سخت ہوتی ہے۔ اور رات کے وقت آؤٹ ڈور میں تو قلفی جما دیتی ہے''۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنی گرم شال ادریس صاحب کو دے دی''۔ آپ یہ شال اوڑھ لیں۔ سردی کم ہو جائے گی''۔

ادریس صاحب ''نہیں نہیں'' کہتے رہے مگر مسرت نذیر نے شال ان کے حوالے کر دی جو انہوں نے فوراً ہی اوڑھ لی۔ اس طرح بے چارے کو سردی کا مقابلہ کرنے میں آسانی ہو گئی۔

مسرت نے واپس آ کر کہا'' اب یہ صبح تک نہیں جائیں گے''۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ صبح کے چار بجے تک شوٹنگ جاری رہی۔ مسرت تھوڑی تھوڑی دیر بعد شوٹنگ کے وقفوں میں ادریس صاحب کے پاس جا کر ان سے گپ شپ کرتی رہیں اور ادریس صاحب مزے سے شوٹنگ دیکھتے رہے۔

''آپ کو سردی تو نہیں لگ رہی؟'' وہ ان سے پوچھتیں۔

''جی نہیں۔ آپ کی یہ شال بہت گرم ہے''۔

''کشمیری اون کی ہے۔ اسے اوڑھ کر تو سخت سردی میں بھی پسینہ آ جاتا ہے''۔

ادریس صاحب کہتے ''آپ اپنی شال واپس لے لیجئے۔ ایسا نہ ہو آپ کو ٹھنڈ لگ جائے؟''

مسرت مسکرائیں'' بالکل نہیں۔ ہمیں تو عادت ہے۔ میں نے دوسری شال منگا لی ہے۔ یہ دیکھئے، یہ بھی بہت گرم ہے''۔

صبح چار بجے شوٹنگ پیک اپ ہوئی تو سردی کے مارے سب کانپ رہے تھے۔ ادریس صاحب نے مسرت نذیر کا بہت شکریہ ادا کیا اور ان کی شال انہیں واپس لوٹا دی۔

مسرت نذیر سب سے پہلے اپنی کار میں بیٹھ کر رخصت ہوئیں۔ دوسرے لوگ بھی روانہ ہو گئے۔ دوسرے دن مسرت حسبِ معمول ہنستی مسکراتی ہوئی شوٹنگ پر آئیں اور آتے ہی سنتوش صاحب کے پاس پہنچ گئیں۔

''سنتوش صاحب، سو روپے نکالیے''۔

''کس بات کے سو روپے؟''

''بھول گئے، رات آپ شرط ہار گئے''۔

''ارے ہاں۔ واقعی مسرت تمہیں مان گئے''۔ انہوں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر مسرت کے حوالے کر دیا۔ سو روپے ان دنوں ایک معقول رقم ہوتی تھی۔ اور پھر یہ تو شرط میں جیتی ہوئی رقم تھی۔ مسرت نذیر نے فخریہ انداز میں سب کو سو روپے کا نوٹ دکھایا اور اس رات سیٹ پر خشک میوے اور پھلوں سے سب کی تواضع کی، یقین کیجئے۔ سو روپے میں سیروں پھل اور میوہ آ گیا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا۔

رضا میر قیام پاکستان کے بعد وہ فلمساز اور ہدایتکار بھی بن گئے۔ ان کی مشہور فلموں میں ''لاکھوں میں ایک'' اور ''ناگ منی'' شامل ہیں۔ ان کی ایک وجۂ شہرت ان کے صاحبزادے آصف رضا میر بھی ہیں جنہوں نے ٹیلی ویژن کے ڈراموں اور پھر فلموں میں بھی اداکاری کی اور نمایاں ہوئے۔ وہ کچھ عرصہ ملک سے باہر رہنے کے بعد واپس آ گئے ہیں اور ٹی وی ڈراموں میں دوبارہ نظر آنے لگے ہیں۔

رضا میر نے بہت سی فلموں کی ہدایتکاری کی پھر ریٹائر ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ کچھ عرصہ پہلے کینیڈا میں انکا انتقال ہو گیا۔ بے حد نفیس اور نستعلیق قسم کے انسان تھے۔ انہوں نے اپنی نجی زندگی خصوصاً مینا کے حوالے سے کبھی لب کشائی نہیں کی مگر ہمارے اوپر ہمیشہ مہربان رہے۔ ہم نے بہت اصرار سے ایک انٹرویو میں ان سے مینا کے بارے میں سوالات کئے تو انہوں نے بہت اختصار کے ساتھ جوابات دیئے۔ اس زمانے میں مینا بقید حیات تھیں۔ رضا صاحب نے مینا کی سادگی اور خلوص کا بطور خاص تذکرہ کیا۔ مینا کی فلموں میں وابستگی اور ان کے اہل خانہ کی ذمہ داریوں کا بھی انہوں نے ذکر کیا۔ یہ بھی بتایا کہ مینا ان کے گھر میں ایک گھریلو بیوی کے طور پر رہنے لگی تھیں مگر یہ زندگی زیادہ عرصے تک انہیں راس نہ آئی۔

رضا میر سے طلاق حاصل کرنے کے بعد مینا قیام پاکستان تک لاہور ہی میں رہیں۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اپنی بہن اور بہنوئی کے ہمراہ بمبئی کا رخ کیا۔ وہ ہدایتکار روپ کے شوری کی فلموں میں کام کر چکی تھیں۔ وہ لاہور سے بمبئی

گئے تو خستہ حالی اور مالی پریشانیوں کا شکار تھے۔ میناان پر مہربان ہو گئیں۔ شوری کا یہ عالم تھا کہ وہ بمبئی کے جس ہوٹل میں مقیم تھے اس کا کرایہ بھی ادا نہیں کر سکتے تھے۔ مینا نے ان کی مالی امداد کی اور ان دونوں نے مل کر پنجابی فلم ''چمن'' بنانے کا اعلان کیا۔ اس وقت مینا اور روپ کے شوری ساتھ ہی رہنے لگے تھے۔ اس طرح ان دونوں میں ایک طویل تعلق کا آغاز ہوا۔

مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد جب مینا نے پاکستان میں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا تو مجبور ہو کر روپ کے شوری اکیلے ہی بمبئی واپس چلے گئے۔ دونوں اس طرح لازم وملزوم بن چکے تھے کہ اس علیحدگی کے بعد بھی وہ مینا شوری ہی کے نام سے پہنچانی گئیں اور یہ ''دُم چھلاّ'' مرتے دم تک ان کے نام کے ساتھ لگا رہا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان دونوں نے سول میرج کر لی تھی۔ کسی کا بیان ہے کہ مینا نے شادی کے لئے ہندو مذہب قبول کر لیا تھا اور بعد میں انہوں نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

روپ کے شوری کے ساتھ مینا کی سنگت نے شوری کو ایک نئی زندگی بخش دی تھی مگر خود مینا نے اس طرح اپنے پیروں پر کلہاڑی مارلی کہ ایک تو انہوں نے خود کو روپ کے شوری کے لئے ہی وقف کر دیا۔ دوسرے یہ کہ ان کی آمدنی روپ کے شوری کے کام آئی۔ جب مینا ان سے علیحدہ ہوئیں تو ان کے پاس مشترکہ فلم سازی سے حاصل ہونے والی آمدنی کا ایک حصّہ بھی نہیں تھا۔ گویا شوری سے علیحدگی کے بعد وہ خالی ہاتھ پاکستان آئی تھیں اور انہیں نئے سرے سے معاشی سفر کا آغاز کرنا تھا۔ حالانکہ اس وقت تک مینا نے جتنا کام کیا تھا اور جتنا روپیہ کمایا تھا اگر اسے سنبھال کر رکھتیں تو ایک صاحب ثروت خاتون ہوتیں لیکن پاکستان آنے کے بعد اپنی رہائش کے لئے ایک ذاتی مکان تک نہ خرید سکیں اور کرائے کے مکانوں میں ساری زندگی گزار دی۔

لاہور میں پنجابی فلم ''رت رنگیلی'' میں مینا اور روپ کے شوری یکجا ہوئے تھے۔ اس رفاقت کا خاتمہ کراچی میں بننے والی فلم ''مس 56'' پر ہوا۔

مینا کراچی میں بنائی جانے والی فلم میں کام کرنے کے لئے بطور خاص کراچی آئی تھیں اس کے فلم ساز جگدیش چندر آنند تھے۔ انہوں نے اپنی دانست میں ہدایتکار اور ہیروئن کی مقبول ترین جوڑی کو اس فلم کے لئے یکجا کیا تھا۔ اسی خیال

سے روپ کے شوری کو اس فلم کی ہدایتکاری کے فرائض سونپے گئے تھے۔ مینا کو ہم نے پہلی بار کراچی کے ایسٹرن فلم اسٹوڈیو میں ''مس 56'' کے سیٹ پر دیکھا تھا۔ وہ ایک زرق برق خوبصورت' چست لباس پہنے ہوئے تھیں اور بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ اس فلم میں ان کا کردار ہلکا پھلکا مزاحیہ انداز کا تھا۔ اس قسم کی فلموں میں انہوں نے اپنی مہارت اور انفرادیت کا لوہا منوایا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ انہوں نے مزاحیہ فلموں میں ہی کام کرنے کو ترجیح دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی سنجیدہ اور ڈرامائی فلموں کی اداکارہ تسلیم نہیں کی گئیں۔ نہ ہی اس کے لئے انہوں نے کبھی کوشش کی۔

روپ کے شوری نے پنجابی فلم ''چمن'' کے بعد اپنی فلم ''رت رنگیلی'' کو دوبارہ ''ایک تھی لڑکی'' کے نام سے اردو میں بنایا۔ اس فلم میں مینا کے ساتھ وقت کے مقبول ہیرو موتی لال نے کام کیا تھا۔ ایک تھی لڑکی بہت کامیاب ہوئی۔ اس فلم کا ایک گانا جس کے بول یہ تھے

لارے لپا لارے لپا لائی رکھدا۔۔۔ اس قدر مقبول ہوا کہ ہر ایک کی زبان پر چڑھ گیا اور آج بھی یہ مقبول گانا ہے۔ یہ گانا مینا شوری پر فلمایا گیا تھا۔ اس کے حوالے سے وہ ''لارا لپا گرل'' کے نام سے مشہور ہو گئیں اور پھر یہ لقب ان کے نام کا حصہ بن کر رہ گیا۔

شوری نے دو اور کامیاب فلمیں بنائیں۔ ''ڈھولک'' کے ہیرو موتی لال تھے جبکہ ''ایک دو تین'' کے ہیرو واجیت تھے۔ کہتے ہیں کہ ''ایک تھی لڑکی'' کی نمائش کے بعد ہی مینا نے کلکتہ جا کر ہندو رسم و رواج کے مطابق شوری سے شادی کر لی تھی اور ہندو مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس کے بعد وہ مینا شوری کہلائیں اور ''شوری'' ہمیشہ کے لئے ان کے نام کا ایک حصہ اور پہچان بن کر رہ گیا۔ مینا کی شوری سے شادی اور مذہب کی تبدیلی فلمی دنیا کے مسلمان فنکاروں اور ہنر مندوں کے علاوہ عام مسلمان کے لئے بھی ایک بڑا صدمہ تھا۔ اس شادی کے بعد مینا کا مسلمانوں سے ہر طرح کا واسطہ ختم ہو گیا۔

1954ء میں وہ اس شادی کے بعد روپ کے شوری کے ساتھ اپنے بہن بھائیوں سے ملنے کے لئے لاہور آئی تھیں مگر ہماری ان سے ملاقات نہ ہو سکی تھی حالانکہ ہم ''آفاق'' کے لئے فلمی صفحہ مرتّب کیا کرتے تھے اور فلمی حلقوں میں

بہت زیادہ آمدورفت تھی۔

''مس 56'' کے سیٹ پر مینا سے سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ ہم چند روز کے لئے کراچی گئے تھے۔ اس لئے تفصیلی گفتگو نہ ہو سکی مگر ہم نہیں جانتے تھے کہ مینا آئندہ کے لئے پاکستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کرلیں گی اور لاہور میں رہائش اختیار کریں گی۔ انہوں نے ہماری فلم ''میرا گھر' میری جنّت'' میں کام بھی کیا۔ ہماری لکھی ہوئی فلموں میں بھی اداکاری کی اور اس طرح ہمیں ان سے ملنے اور بات کرنے کا موقع ملا۔ مینا کو مس 56 کی تکمیل کے دوران ہی میں مختلف پاکستانی فلمسازوں کی طرف سے آفرز کی گئی تھیں۔ انہیں پاکستان کی قومیت بھی حاصل ہو چکی تھی۔ ''مس 56'' کی تکمیل کے بعد مینا نے روپ کے شوری کی منت سماجت کے باوجود بمبئی جانے سے انکار کر دیا اور پاکستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے میں ایک حیثیت جہانگیر خان کو بھی حاصل تھی۔ جہانگیر خان اس زمانے میں محکمہ اطلاعات میں افسر تھے اور کراچی میں تعینات تھے۔ ان کا تذکرہ ہم شباب کیرانوی کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ جہانگیر خان (اداکار شامل خان کے والد) ایک خوبرو اور وجیہہ انسان تھے۔ یہ لاہور کے انگریزی روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں رپورٹر تھے۔ سید شوکت حسین رضوی کی نظر ان پر پڑ گئی اور انہوں نے اپنی فلم ''چن وے'' میں انہیں کاسٹ کر لیا۔ جہانگیر خان صحافت چھوڑ کر فلم سے وابستہ ہو گئے لیکن ''چن وے'' کی کامیابی کے باوجود فلم بینوں نے انہیں قبول نہیں کیا۔ آدمی سمجھ دار تھے انہوں نے ایک ہی تجربے کے بعد اداکاری کو دور سے سلام کیا اور محکمہ تعلقات عامہ میں ملازم ہو گئے۔ ذہین اور محنتی آدمی تھے اس لئے بہت جلد ترقی کر لی۔ ہماری ان سے صحافت ہی کے زمانے میں اچھی یاد اللہ تھی۔ وہ بہت دیانتدار' کٹر محب وطن اور اصول پرست آدمی تھے۔

''مس 56'' کے سیٹ پر ہم جہانگیر خان کو بھی دیکھا اور ان کی جانب مینا کا التفات بھی دیکھا۔ شوٹنگ ختم ہوئی تو ہم سعید ہارون صاحب کے دفتر میں چلے گئے۔ مینا' جہانگیر خان کی کار میں بیٹھ کر ان کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔
کراچی کے صحافی دوستوں نے ہمیں بتایا کہ وہ آج کل ان دونوں کے رومانی مراسم کا چرچا ہے اور سنا ہے کہ مینا' شوری سے علیحدہ ہو کر جہانگیر خان کے ساتھ شادی کرنے والی ہیں۔ اس اطلاع کی تصدیق یا تردید کے لئے جہانگیر تو ہمیں دستیاب نہ ہوئے لیکن کراچی سے موصول ہونے والی خبریں اور اخباری پھلجھڑیاں اس بارے میں کافی دیر تک زیر

بحث رہیں۔ پھر خبر آئی کہ مینا نے روپ کے شوری کے ساتھ واپس جانے سے انکار کر دیا ہے اور وہ ایک مایوس اور ناکام انسان کی حیثیت سے بمبئی چلے گئے ہیں۔ مینا مولانا احتشام الحق تھانوی کے پاس جا کر ہندو مذہب سے تائب ہو گئیں اور دوبارہ مذہب اسلام اختیار کیا۔ ان کا اسلامی نام خورشید جہاں رکھا گیا۔ یار لوگوں نے بتایا کہ جہانگیر خان کی خاطر ہی پاکستان میں قیام پذیر ہوئی ہیں اور ان سے شادی کرنے کے لئے ہی انہوں نے دوبارہ اسلام قبول کیا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جہانگیر خان اور مینا کے مابین رومانوی تعلقات قائم تھے۔ شادی کے وعدے تک نوبت پہنچی تھی یا نہیں؟ یہ ان دونوں کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ جہانگیر خان اس سے صاف انکار کرتے تھے۔ مینا اپنے ذاتی معاملات میں بہت خاموش اور کم گو تھیں۔ اپنے بارے میں بہت کم بات کرتی تھیں۔ ہم نے کافی وقت سیٹ پر ان کے ساتھ گزارا لیکن کبھی ان کی زبان سے کسی سابق شوہر کا شکوہ نہیں سنا۔ آخری زمانے میں جب ان کی صحت اور مالی حالات دونوں ہی خراب ہو چکے تھے اس وقت بھی انہوں نے کبھی اپنے حالات کا رونا نہیں رویا اور نہ ہی اپنی بربادی کے لئے کسی کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ ان کے کردار کا یہ پہلو قابل تعریف ہے۔

روپ کے شوری بمبئی واپس جا کر بھی فلمیں بناتے رہے مگر مینا کے بغیر ان کی کوئی ایک فلم بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی ہی فلم "ایک تھی لڑکی" کو ایک بار پھر "ایک تھی ریٹا" کے نام سے رنگین سینما سکوپ میں بنایا۔ اس کی ہیروئن نوتن کی بیٹی تنوجہ تھی مگر یہ فلم بُری طرح فلاپ ہوئی۔ اس طرح روپ کے شوری بمبئی میں ناکامی اور گمنامی کے دھندلکوں میں غائب ہو گئے۔

مینا نے پاکستان میں ایک بار پھر نئے سرے سے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ چار شادیاں اور بہت سی فلموں میں شہرت ان کے دامن میں تھیں۔ یہ اور بات کہ سرمایہ نہ تھا۔ وہ تو فلم میں کام کرنے کی غرض سے برائے نام سامان ساتھ لے کر بمبئی سے عارضی طور پر کراچی آئی تھیں اس لئے عملاً خالی ہاتھ ہی تھیں۔ گھر بار' روپیہ پیسہ' سازوسامان۔۔۔ سبھی کچھ بمبئی میں تھا جو پھر انہیں نہ مل سکا۔

کہنے کو سب کچھ وہی تھا مگر طویل عرصے کے بعد واپس آئیں تو یہاں دنیا ہی بدل چکی تھی۔ اب وہ مسلمان تھیں لیکن عبوری دور میں انہوں نے ایک غیر مذہب کو اپنا کر زندگی بسر کی تھی۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ جوانی بیت چکی

تھی۔اب وہ پختہ عمری کے دور میں تھیں۔ان کا حسن وجمال اور خوبصورت پیکر قائم تھا لیکن روبہ زوال ---۔ جیسے کہ وہ خود بھی روبہ زوال تھیں۔

جہانگیر خان سے مینا نے شادی کی تھی یا نہیں' اس بارے میں کوئی نہیں جانتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جہانگیر خان سے علیحدگی مینا کے لئے ایک اور صدمہ تھا۔مایوس ہو کر وہ کراچی سے لاہور چلی آئیں اور یہاں انہوں نے انور کمال پاشا کی فلم ''سرفروش'' میں اداکاری کی۔یہ ایک کامیاب فلم تھی مگر خود مینا ڈوبتا سورج بن چکی تھیں۔ فلم ''گل فروش'' کے ہدایتکار ان کے ایک سابق شوہر ظہور راجا تھے۔پاکستان میں انہوں نے بہت سی فلموں میں کام کیا۔آغاز میں ہیروئن کی حیثیت سے اور بعد میں کیریکٹر ایکٹریس کی حیثیت میں۔ان کی آخری فلم ''بہت خوب'' تھی۔ انہوں نے پانچویں شادی اداکار اسد بخاری سے کی تھی۔اسد بخاری تو اسے تسلیم نہیں کرتے لیکن وہ دونوں کافی عرصے تک ساتھ رہے۔اسد بخاری ان کے آخری شوہر یا محبوب تھے۔اس کے بعد وہ عمر کے اس مرحلے میں پہنچ گئی تھیں کہ جذباتی اور رومانی رشتے استوار کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔

مینا کو دنیا داری کبھی نہ آئی' نہ انہوں نے ہوشیاری اور چالاکی سیکھی۔زندگی بھر جذباتی سہارے تلاش کرتی اور دھوکے کھاتی رہیں۔وقت بہت بڑا استاد ہے۔انسان کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے لیکن اس وقت اس علم اور تجربے کے فائدہ اٹھانے کی مہلت باقی نہیں رہی تھی۔

مینا کا ایک المیہ یہ بھی تھا کہ اتنی شادیاں کرنے کے باوجود وہ بے اولاد ہی رہیں۔اس معاملے میں بھی ان کی اور مینا کماری کی تقدیر ایک جیسی تھی۔وہ ڈھلتی جوانی میں پاکستان آئی تھیں۔عمر اور زندگی کا بہترین حصہ وہ گنوا چکی تھیں اور روزِ اوّل کی طرح تہی دست اور تہی دامن تھیں۔نہ ان کے پاس گھر تھا نہ گھر والا۔آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہ تھا' جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی فلموں میں ملنے والے کردار اور معاوضے گھٹتے گئے۔ہم نے انہیں ان کے قیام پاکستان سے قبل کے زمانۂ عروج میں تو نہیں دیکھا مگر ان کے بارے میں سنتے اور پڑھتے رہتے تھے۔وہ ایک بڑی فنکارہ تھیں۔دولت میں کھیلتی تھیں۔شہرت ان کی باندی تھی۔لوگ ان کی خوش قسمتی پر رشک کرتے تھے مگر حقیقت کیا تھی یہ تو خود وہی جانتی تھیں اور انجام کار سامنے بھی آ گئی۔

انہیں آخری عمر میں عمرے کی سعادت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ کراچی کے ایک صاحب ثروت شخص نے ان کے لئے سفرِ آخرت کا یہ سامان فراہم کر دیا تھا۔ آخری زمانہ بیماری اور لاچاری میں گزرا۔ پنجاب کی حکومت نے سرکاری خرچ پر ان کو علاج کی سہولت بھی فراہم کی تھی مگر اس وقت جبکہ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ وہ کینسر کے موذی اور لاعلاج مرض میں مبتلا تھیں۔ 3 ستمبر 1981ء کو لاہور میں نہایت کسمپرسی کے عالم میں انتقال ہو گیا۔ اخبارات نے چند سطریں شائع کر کے انہیں آخری کورتیج دے دی۔ اس کے بعد مینا کا تذکرہ دیکھنے سننے میں نہیں آیا۔ وہ ستمبر 1926ء کو رائیونڈ میں پیدا ہوئی تھیں اور ستمبر 1981ء کو پچپن سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کر گئیں۔ پچپن سال کوئی زیادہ عمر نہیں ہوتی مگر پے در پے صدموں، محرومیوں اور مایوسیوں نے مینا کو وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ اس میں کچھ ہاتھ تقدیر کا اور کچھ خود ان کی بے اعتدالیوں کا بھی تھا۔ چالیس سال کی عمر میں ان پر بڑھاپا برسنے لگا تھا۔

مینا کو ہم نے ایک سیدھی سادی، معصوم عورت پایا۔ ان میں چالاکی نام کو نہ تھی، جو دل میں ہوتا تھا وہی زبان پر لے آتی تھیں۔ قوت فیصلہ کا ان کے پاس نام و نشان تک نہ تھا۔ جذبات کی رو میں بہہ جاتی تھیں اور زندگی بھر کے فیصلے بنا سوچے سمجھے منٹوں میں کر ڈالتی تھیں۔ ان کی نیک دلی کی انتہا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں کو خوشی اور آرام پہنچانے کی تگ و دو میں لگی رہیں۔ اپنے گھر والوں کے بعد انہوں نے اپنے جذباتی رشتوں کو بھی خوش و خُرّم اور خوشحال رکھنے کے لئے جدوجہد کی مگر ان کے کام کوئی بھی نہ آیا۔

ہماری لکھی ہوئی ایک فلم کی شوٹنگ کے دنوں میں انہوں نے شادی اور طلاق کے موضوع پر بھی ہم سے گفتگو کی۔ اس فلم کی کہانی میاں بیوی اور ایک بچے کے گرد گھومتی تھی۔ میاں بیوی جذبات میں آ کر طلاق کا ارادہ کر بیٹھے تھے مگر فلم کے آخر میں بچے نے انہیں پھر یکجا کر دیا۔ یہ فلم اداکارہ دیبا پروڈیوس کر رہی تھیں اور جاوید فاضل اس کے ہدایت کار تھے۔ اتفاق سے یہ فلم مکمل ہونے کے باوجود ریلیز نہ ہو سکی۔ مینا نے اس فلم میں لگائی بجھائی کرنے والی پڑوسن کا کردار ادا کیا تھا جو ہر وقت پڑوسیوں کی سن گن لیتی رہتی ہے۔ لنچ کے بعد ہم ان کے پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ انہوں نے اچانک کہا "آفاقی صاحب یہ آپ نے اچھا کیا کہ ہیرو ہیروئن کو طلاق سے بچا لیا اور ان کا گھر دوبارہ آباد ہو گیا۔"

ہم ابھی کوئی جواب دینے بھی نہیں پائے تھے کہ انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور کہا" مگر ان دونوں کے بیچ میں تو

ایک بچہ بھی تھا۔ اگر بچہ گھر میں ہو تو گھر برباد ہونے سے بچ جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں۔ ان کے اس ایک فقرے میں ان کی ساری زندگی کا نچوڑ موجود تھا۔ وہ ایک چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم سامنے ایک لوہے کی کرسی پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہم نے ان سے پوچھا

"اس فلم کی کہانی تو آپ جانتی ہیں۔ اس کے دونوں طرح کے انجام ہو سکتے ہیں۔ میاں بیوی میں طلاق بھی ہو سکتی ہے اور انہیں صلح صفائی کے بعد دوبارہ یکجا بھی کیا جاسکتا ہے۔ پہلی صورت میں فلم کا انجام المیہ ہوگا۔ دوسری صورت میں طربیہ۔ آپ کے خیال میں اس کا انجام کیا ہونا چاہئے ؟"

انہوں نے کہا "عورتیں تو رونے دھونے والا اینڈ ہی پسند کرتی ہیں۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ہماری عورتیں غم اور الم کو اتنا پسند کیوں کرتی ہیں۔ ان کی اپنی زندگی میں بھی خوشیوں کی کمی ہوتی ہے اور فلموں میں بھی یہ غمناک کہانیاں ہی پسند کرتی ہیں۔ اگر آپ ان دونوں میاں بیوی میں طلاق کرادیں گے اور بچے کو بے آسرا کر دیں گے تو شاید عورتیں اس پر بہت روئیں گی۔ مگر اس انجام کو پسند بھی کریں گی۔ مگر میں نے آپ کی کہانی سے یہ اندازہ لگایا ہے کہ آپ اس کے ذریعے فلم دیکھنے والوں کو ایک پیغام دینا چاہتے ہیں۔ انہیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر میاں بیوی چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظرانداز نہیں کریں گے تو ان کے بیچ کا فاصلہ بڑھتا رہے گا۔ غلط فہمیاں بڑھتی رہیں گی۔ یہاں تک کہ طلاق ہو جائے گی اور اس طرح ایک گھر برباد ہو جائے گا۔ میاں اور بیوی دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ چھوٹے چھوٹے جھگڑوں اور اختلاف کو اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ اس طرح ایک خوشیوں سے بھرپور گھر بن سکتا ہے۔ اسلئے میرے خیال میں تو آپ اس کہانی کا ہیپی اینڈ ہی رکھیں گے تاکہ لوگوں کو ایک راستہ نظر آ جائے۔"

یہ باتیں وہ عورت کر رہی تھی جس نے کبھی شادی کرنے میں دیر لگائی تھی اور نہ ہی طلاق حاصل کرنے میں تامل کیا تھا۔

زمانہ بہت بڑا استاد ہوتا ہے۔ انسان کو خود بخود بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔ جی میں تو آئی کہ ان سے پوچھیں کہ اگر آپ کو اپنی زندگی دوبارہ نئے سرے سے بسر کرنے کا موقع دیا جائے تو آپ پچھلی روش پر چلیں گی یا ان تجربات کی روشنی میں

سبق حاصل کریں گی؟ مگر پھر ہم نے یہ براہ راست ذاتی سوال کرنے سے گریز کیا۔
میناشوری ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھی ہو گئیں۔ ہم نے ان کی مشہور فلمیں دیکھی تھیں جن میں وہ سراپا حسن وشباب نظر آتی تھیں۔ ہم نے جب انہیں پہلی بار کراچی کے سٹوڈیو میں دیکھا تواس وقت بھی ان کی دلکشی اور رعنائی میں زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ انہوں نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کر لیا اور فلموں میں کام کرنے لگیں تو اکثر ان کو مختلف سٹوڈیوز میں مختلف فلموں کے سیٹ پر دیکھتے رہتے تھے۔ وہ فن کارانہ مزاج کی حامل تھیں۔

ایک بار ہدایت کار حسن طارق اپنی ایک فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کیلئے کالام (سوات) گئے۔ مینا بھی کاسٹ میں شامل تھیں۔ وہاں برف باری شروع ہو گئی۔ ایسی سخت سردی تھی کہ دانت بجتے تھے۔ سب لوگ سر شام ہی کمروں میں آتش دانوں کے پاس گھس کر بیٹھ گئے تھے۔ رات کو نو بجے کھانے کا اہتمام شروع ہوا مگر مینا کھانے کیلئے نہیں آئیں۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب حسن طارق صاحب برف باری کا منظر دیکھنے کیلئے اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں پہنچے تو دور ایک ستون کے پاس ایک ہیولا سا نظر آیا۔ نزدیک گئے تو دیکھا کہ مینا خاموش اور تنہا کھڑی سامنے پہاڑوں اور میدانوں پر برف باری کا منظر دیکھ رہی ہیں۔ انہیں طارق صاحب کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ طارق نے انہیں مخاطب کیا اور کہا ”میڈم۔ اتنی سخت سردی اور برف باری میں آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟“
مینا نے چونک کر انہیں دیکھا جیسے کسی خواب سے چونک گئی ہوں۔ پھر کہا ”طارق صاحب آپ پہاڑوں پر برف گرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ درختوں اور پہاڑوں پر پڑنے والی برف کا منظر کتنا خوبصورت ہے۔“
طارق صاحب نے کہا ”واقعی۔ یہ منظر ایک مختلف خوبصورتی لئے ہوئے ہے۔“
وہ کہنے لگیں ”طارق صاحب! ایسے منظر روز روز دیکھنے کو تو نہیں ملتے۔ اللہ جانے اگلی برف باری کے موسم میں ہم کہاں ہوں گے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنی آنکھیں سی لوں تا کہ یہ منظر ہمیشہ کیلئے آنکھوں میں محفوظ ہو جائے۔“
طارق صاحب نے کہا ”میڈم۔ یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لیکن اب اندر گرم کمرے میں چل کر آرام کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو ٹھنڈ لگ جائے اور بیمار ہو جائیں۔“
بولیں ”بیمار تو انسان گھر بیٹھے بیٹھے بھی ہو جاتا ہے۔ ایسے منظر کو دیکھتے ہوئے بیمار ہونے کا افسوس نہیں ہو گا۔“

طارق صاحب نے بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انہیں کمرے میں جانے پر آمادہ کیا۔ انہوں نے یہ واقعہ ہمیں سناتے ہوئے کہا ''آفاقی صاحب! برف باری کی تعریف میں بہت سی باتیں سنی تھیں مگر میڈم مینا نے جس انداز میں اس کا نقشہ کھینچا ہے ایسا پہلے کسی نے محسوس نہیں کیا۔''

ہم بتا رہے تھے کہ مینا ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھی ہو گئی تھیں۔ وہ مختلف فلموں میں ہیروئن کی حیثیت سے کام کرتی رہیں۔ ان کی شگفتگی اور شادابی بھی برقرار تھی مگر کچھ عرصے بعد انہیں ایک فلم کے سیٹ پر دیکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے جوانی کا دم رخصت ہے۔ پھر انہوں نے ہماری فلم ''میرا گھر' میری جنت'' میں محمد علی کی ماں کا کردار کیا۔ اس وقت وہ شاید بالوں کو رنگنے لگی تھیں۔ ہم نے ماں بنانے کیلئے ان کے بالوں میں مصنوعی سفیدی پیدا کر دی۔ اس وقت ان کا جسم موٹاپے کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ بالوں میں سفیدی لگا کر وہ بھاری بھر کم ماں ہی نظر آتی تھیں۔ اس کے باوجود ان کے چہرے کی تازگی بدستور قائم تھی۔

یہ 1969ء کا ذکر ہے۔ اس کے چند سال بعد انہیں سٹوڈیو میں دیکھا تو اب وہ ہیروئن والے دور سے گزر چکی تھیں اور ان کے چہرے اور سراپا پر بڑھاپے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ چند سال بعد وہ اور بھی معمر نظر آنے لگیں۔

آخری دنوں میں جب انہوں نے اداکاری ترک کر دی تھی تو بالوں کو رنگنا بھی بند کر دیا تھا۔ ہم نے بیماری کے عالم میں انہیں دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ ہمارے سامنے ایک بزرگ خاتون بستر پر دراز تھیں۔ بال برف کی طرح سفید' چہرے پر ہلکی سی نقاہت اور بڑھاپے کے آثار۔ چاندی جیسے بالوں کے ساتھ ان کا چہرہ کچھ اور زیادہ معصوم نظر آ رہا تھا۔ اس زمانے میں وہ کبھی کبھی زمانے کی بے رُخی اور حالات کی خرابی کی شکایت زبان پر لے آتی تھیں۔

جن دنوں مینا ہسپتال میں زیر علاج تھیں اس وقت ان کی بھتیجی کے سوا ان کے پاس کوئی نہیں نظر آیا۔ اس بھتیجی کو انہوں نے ہی پالا تھا۔ فلم والے تو پلٹ کر اس طرف کا رخ بھی نہیں کرتے تھے۔ انفرادی طور پر بعض اداکار' ٹی وی آرٹسٹ اور صحافی گاہے بگاہے ان کے پاس چلے جاتے تھے۔ میڈم نور جہاں اور مصطفی قریشی نے ان کی مالی مدد بھی کی۔ اس زمانے میں اگر وہ جاگ رہی ہوتیں یا ہوش میں ہوتیں تو ان کی خواہش ہوتی تھی کہ آنے والا ان کے پاس سے اٹھ کر نہ جائے۔ وہ کسی نہ کسی بہانے اس کو باتوں میں لگائے رکھتی تھیں' دوسروں کی سننے کے بجائے وہ انہیں اپنے

گزرے دنوں کے قصے سنایا کرتی تھیں۔ بیماری اور کمزوری کی وجہ سے اونچی آواز میں نہیں بول سکتی تھیں۔ ویسے بھی وہ دھیمے لہجے اور نرم آواز میں بولنے کی عادی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ یوں بولتی رہتی تھیں جیسے انٹرویو دے رہی ہوں۔ ایسے میں وہ دوسروں کی بات سننے پر توجہ نہیں دیتی تھیں۔ انہیں تو بس اپنی کتھا سنانے سے مطلب تھا۔ شاید اس طرح انہیں ذہنی اور جذباتی سکون حاصل ہوتا ہو۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر بہت افسوس ہوتا تھا۔

اپنی عام زندگی میں مینا ایک دلچسپ خاتون تھیں۔ وہ ہر ایک کے سامنے نہیں کُھلتی تھیں مگر بے تکلف لوگوں کے سامنے خوب باتیں کرتی اور چہکتی تھیں۔ انہیں بے شمار لطیفے یاد تھے اور لطیفے سنانے کا ڈھنگ بھی جانتی تھیں۔ وہ بالکل ان پڑھ تھیں۔ ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ ساری زندگی وہ فلموں کے مکالمے پڑھوا کر سنتی اور یاد کر لیتی تھیں۔ ان کا حافظہ اتنا اچھا تھا کہ تمام مکالمے انہیں یاد رہتے تھے۔ لطیفے بھی انہیں سن کر ہی یاد ہو جاتے تھے۔ لطیفے سنانے کا انداز یہ تھا کہ وہ بذاتِ خود لطیفہ سناتے ہوئے بالکل نہیں ہنستی تھیں۔ بس ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر کھیلتی رہتی تھی۔ دوسرے جب ان کے لطیفوں پر ہنستے تو وہ خود بھی لطف اندوز ہوا کرتی تھیں۔ مگر زندگی کے آخری ایاّم میں انہیں لطیفے سنانے کی مہلت ہی نہ مل سکی تھی۔

آخری زمانے میں انہیں ایک تو اولاد سے محرومی کا شدید احساس تھا اور دوسرا یہ صدمہ تھا کہ کاش وہ شوری کے ساتھ بمبئی چلی جاتیں تو اس انجام سے دوچار نہ ہوتیں۔ یہ بھی ان کی سادگی اور معصومیت کا ایک ثبوت سمجھ لیجئے۔ ورنہ ''کاش'' تو انسان کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ایسے میں صرف پچھتاوے ہی باقی رہ جاتے ہیں۔

ان کے انتقال کے چند ماہ بعد ہمیں ایک خط موصول ہوا۔ خط لکھنے والا مینا کا مدّاح اور پرستار تھا۔ اس نے ہم سے یہ پوچھا تھا کہ مینا کو کس جگہ دفن کیا گیا ہے۔ وہ ان کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنا چاہتا تھا۔

ہم نے اس بارے میں معلومات کیں تو پتہ چلا کہ مینا کی آخری آرام گاہ کے بارے میں کوئی بھی اب یقین سے نہیں جانتا۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ انہیں سپردِ خاک کر دیا گیا تھا۔ ایک بار پھر مرزا غالب یاد آ گئے ۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ہمارے سامنے بھارت سے دو صفِ اوّل کی ہیروئن پاکستان آئی تھیں اور دونوں ہی کی زندگی میں خوشیاں زیادہ عرصے

نہ رہ سکیں۔ مینا کی داستان آپ نے ابھی سنی۔ اللہ اللہ۔ کیا ٹھاٹ تھا جب وہ پہلی بار پاکستان آئی تھیں۔ فلم ساز ان کے آگے بچھے جاتے تھے۔ ان کی اداکاری اور حسن و شباب کے ہر طرف چرچے تھے۔ مگر جب وہ پاکستان میں رہنے لگیں تو خوش قسمتی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ایک ایک کر کے ہر ایک خوشی ان کا ساتھ چھوڑتی چلی گئی یہاں تک کہ وہ عبرت کا نشانہ بن کر رہ گئیں۔

اداکارہ ریحانہ بھی 50 کی دہائی میں پاکستان آئی تھیں اور چند روز قیام کے بعد واپس چلی گئی تھیں۔ ان کا بھی دور عروج تو نہ تھا مگر ہیروئنوں میں ان کا بھی بہت بڑا اور اونچا نام تھا۔ وہ بھی ایک بار آئیں اور لوٹ کر چلی گئیں۔ دوسری بار آئیں تو یہیں بس گئیں۔ فلموں میں کام کیا۔ اقبال شہزاد سے شادی کی اور پھر طلاق بھی ہو گئی۔ دوبارہ تنہا بھٹکنے لگیں۔ وقت نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ انہیں شریفانہ اور آبرومندانہ زندگی کی جستجو تھی۔ اداکاری سے وہ بیزار ہو چکی تھیں مگر مجبور تھیں اسلئے کہ کوئی اور ذریعۂ معاش نہ تھا۔ جو تھوڑی بہت جمع پونجی تھی وہ کام میں لاتی رہیں۔ پھر ایک اور شادی کر لی جو بے جوڑ ہی تھی۔ یہ قربانی بھی انہوں نے پُر سکون گھریلو زندگی کی خاطر دی تھی، ان کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہو سکی مگر انہوں نے دوبارہ گھر سے باہر قدم نہ رکھا۔ دنیاوی لحاظ سے ریحانہ کو بھی ناکامیاں اور مایوسیاں ہی ہاتھ لگیں مگر فرق صرف یہ ہے کہ انہیں قلبی سکون میّسر ہے۔ وہ گوشہ نشین ہو کر اپنے گھر کی چار دیواری میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ آج وہ بھی اکیلی ہیں۔ ماں باپ کا ساتھ چھوٹ گیا۔ شوہر نے بیچ سفر میں چھوڑ دیا۔ اولاد سے وہ بھی محروم ہیں۔ لیکن انہوں نے کافی عرصہ پہلے اللہ سے لو لگا لی ہے۔ عبادت میں وقت گزارتی ہیں۔ ہم سے کوئی پوچھے تو انہوں نے سب کچھ کھو کر زندگی کے آخری دور میں بہت کچھ پا لیا ہے۔ سامان آخرت کا بندوبست کر لیا ہے۔ اللہ بہت کریم اور حلیم ہے۔ ان کے بارے میں کم از کم یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ۔

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

ہم اپنی داستان حیات کچھ عجیب انداز سے بیان کر رہے ہیں۔ بچپن میں آپ نے بھی دادیوں نانیوں کو دیکھا ہو گا۔ رات کے وقت گھر بھر کے بچّے انہیں گھیر کر بیٹھ جاتے تھے اور وہ کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ یہ کہانیاں ہوتی تو بہت دلچسپ تھیں مگر سنانے کا انداز عجیب و غریب ہوتا تھا۔ گھر والوں کو ڈانٹ ڈپٹ، ملازمین کو ہدایات، گھر والوں کو مشورے

اور نصیحت' اگلے دن کیلئے سودا سلف لانے کے سلسلے میں مشورے' یہ سب کچھ کہانی کے دوران میں جاری رہتا تھا۔ یا پھر انہیں نیند کا جھونکا آجاتا تھا تو چند لمحے غوطہ بھی لگا جاتی تھیں۔اب جو کہانی شروع ہوتی تھی تو پہلا تسلسل ہی باقی نہ رہتا تھا۔بس جہاں سے یاد آئی یا جس جگہ سے جی چاہا شروع کر دی۔ سننے والے اس پر احتجاج بھی کرتے تھے۔ مگر نیا سلسلہ جہاں سے شروع ہوتا تھا وہ بھی دلچسپ ہوتا تھا۔ مثلاً بادشاہ زادی کو چھوڑا تو کالے دیو یا لال پری سے شروع کر دیا۔ سننے والوں کو بہر حال کہانی سننے سے سروکار ہوتا تھا۔وہ صبر و شکر کے ساتھ برداشت کر لیتے تھے۔ہماری داستان گوئی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔جہاں سے جی چاہا کہانی کا سلسلہ جوڑ دیا۔

بات دراصل یہ ہے کہ واقعات اور خیالات کا اتنا ہجوم ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ دھکّم پیل کا عالم ہے۔ہر واقعہ چاہتا ہے کہ دوسرے سے آگے نکل جائے۔اس میں ذہن یا حافظے کا کوئی قصور نہیں ہے۔جب باتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں تو بیان کرنے والے کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہے' کیا نہ کہے اور کیسے کہے؟ ہم نے بہت زیادہ طویل زندگی تو نہیں گزاری' پھر بھی اللہ کے فضل سے خاصی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے بچپن کے واقعات بھی یاد ہیں۔وہ ماحول بھی آنکھوں میں گھومتا رہتا ہے۔یوں جیسے کہ فلم دیکھ رہے ہیں۔ ہم جگہ جگہ گھومے ہیں' بے شمار لوگوں سے ملے ہیں۔ہر شخص' ماحول اور واقعے کا ہم نے بہت غور اور تفصیل سے جائزہ لیا اور اسے یاد رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی ایک زندگی میں کئی زندگیاں بسر کی ہیں۔ایک عمر میں کئی عمریں گزار لی ہیں۔اسلئے واقعات کی ترتیب کو پیش نظر رکھنا مشکل ہے۔ پھر یہ بھی سوچتے ہیں کہ اگر تسلسل کے ساتھ حالات زندگی بیان کریں گے تو یکسانیت کی وجہ سے کہیں پڑھنے والے بور نہ ہو جائیں۔ مثلاً بچپن کی داستان لے کر بیٹھ گئے تو اس میں کئی قسطیں گزر جائیں گی۔ اس کے بعد لڑکپن آئے گا۔ پھر نوجوانی اور جوانی کا دور شروع ہو گا۔اس کے بعد ذہنی پختگی کا زمانہ یاد آئے گا۔کوئی ایک شعبہ ہو تو کوئی بات بھی نہیں۔ صحافت' ادب' فلم' معاشرہ' سیاست' ماحولیات۔جائزے' تجزیئے' تاریخ' آپ بیتی' جگ بیتی' شخصیات غرضیکہ ایک شیطان کی آنت ہے کہ کسی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔اسلئے کہیں سے شروع کر کے کہیں ختم کر دیتے ہیں اور پھر ایک نیا سرا پکڑ لیتے ہیں۔

ہم نے اپنی صحافت کے آغاز کے حالات بیان تو کئے ہیں مگر ترتیب نہیں دیئے۔اسلئے خلاصہ پھر بیان کر رہے ہیں۔
ہم نے اپنی صحافت کا آغاز جماعت اسلامی کے سرکاری ترجمان روزنامہ ''تسنیم'' سے کیا تھا۔ حکومت نے اسے بند کر دیا تو ہم آغا شورش کاشمیری کے ہفت روزہ '' چٹان'' سے وابستہ ہوگئے۔اسی دوران میں روزنامہ ''نوائے وقت'' میں بھی کام شروع کر دیا۔اس وقت جناب حمید نظامی ''نوائے وقت'' کے ایڈیٹر اور شیخ حامد محمود صاحب مینجنگ ایڈیٹر تھے۔اس اخبار میں ہم نے بہت کچھ سیکھا۔جب روزنامہ ''آفاق'' کا اجرا ہوا تو ہم اس سے وابستہ ہوگئے۔یہ اخبار پاکستان کے سب سے بڑے اور ممتاز صنعت کار سعید سہگل نے نکالا تھا۔پروفیسر محمد سرور اس کے ایڈیٹر اور میر نور احمد مینجنگ ایڈیٹر تھے۔ سہگل صاحب بڑی بڑی فیکٹریاں تو چلا رہے تھے مگر اخبار کا بوجھ نہ اٹھا سکے اور یہ اخبار بند ہوگیا۔ان کو شکایت تھی کہ یہ مسلسل خسارے میں جا رہا ہے مگر اس کے طفیل انہیں جو اہمیت اور اختیار حاصل تھا اس کو وہ فراموش کر بیٹھے تھے۔میر نور احمد صاحب نے انہیں سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ آپ کے دیگر ادارے منافع کا ڈھیر لگا رہے ہیں' اگر اخبار نقصان میں جا رہا ہے تو حرج کیا ہے۔یہ نقصان آپ انکم ٹیکس سے پورا کر سکتے ہیں۔مگر سہگل صاحب صحافی نہیں تھے 'کھرے صنعت کار تھے جو صرف منافع کے قائل ہوتے ہیں۔اس طرح روزنامہ ''آفاق'' بند ہوگیا اور ہم بے کار ہوگئے۔

امروز' پاکستان ٹائمز اور دوسرے اخبارات و جرائد میں ہم مضامین لکھتے رہتے تھے کیونکہ بطور صحافی ہماری پہچان ہوگئی تھی۔مگر مستقل ملازمت کوئی نہ تھی۔ اسی زمانے میں روزنامہ ''زمیندار'' پر پابندی لگ گئی اور اس کے مالک و مدیر مولانا اختر علی خان قید کر دیئے گئے تو ان کے بڑے صاحبزادے منصور علی خان نے ''آثار'' کے نام سے ایک نیا روزنامہ جاری کیا اور ہم ''آثار'' سے وابستہ ہوگئے۔کچھ عرصہ گزرا تھا کہ مولانا اختر علی خان رہا ہو کر آگئے اور انہوں نے اخبار کے معاملات سنبھال لئے۔''زمیندار'' کا ڈیکلریشن بھی بحال ہونے والا تھا۔ولی عہد یعنی منصور علی خان نے جو کہ عارضی جانشین تھے تخت و تاج اپنے والد کے حوالے کر دیا تو ہمارا وہاں گزارا نہ ہو سکا اور نوکری چھوڑ دی۔

بے کاری کا تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میاں شفیع (م ش) اور ممتاز احمد خان نے اپنے ہفت روزہ ''اقدام'' کی ادارت

ہمیں سونپ دی۔ ہم نے م ش کی زیر نگرانی بڑے زور و شور سے کام کیا۔ کچھ عرصے بعد پنجاب میں قادیانی تحریک چل نکلی۔ "اقدام" نے حکومت کو کھری کھری سنانا شروع کر دیں جس کا نتیجہ "اقدام" پر بندش کی صورت میں بر آمد ہوا۔ ہم ایک مرتبہ پھر بے کار ہو گئے۔

اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ میاں ممتاز دولتانہ کو ایک بار پھر اخبار نکالنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان کے ایک پیروکار کی (جو صنعت کار بھی تھے) سرپرستی میں ایک کمپنی قائم کی گئی۔ چودھری صاحب (غالباً ان کا نام محمد حسین تھا) اس کے چیئرمین تھے۔ روزنامہ "آفاق" دوبارہ اس ادارے کے تحت جاری کیا گیا تو سابقہ "آفاق" کے قریب قریب سبھی لوگ اس سے وابستہ ہو گئے۔ میر نور احمد صاحب بدستور مینجنگ ایڈیٹر تھے۔ ایڈیٹر کے طور پر مولانا غلام رسول مہر کا انتخاب کیا گیا تھا۔ عملے کے باقی ماندہ ارکان کم و بیش پہلے والے ہی تھے۔ مثلاً ظہور عالم شہید (نیوز ایڈیٹر) سردار فضلی (چیف رپورٹر) سید حبیب اللہ اوج (اسسٹنٹ ایڈیٹر) بشیر احمد ارشد (اسسٹنٹ ایڈیٹر) میاں محمد شفیع (م ش) اس دور میں بھی کالم نویس اور چیف رپورٹر تھے۔ اس بار خورشید صاحب بھی رپورٹر کے طور پر "آفاق" سے وابستہ تھے۔ یہ لاہور میں "ڈان" کراچی کے نمائندہ تھے اور بہت تیز و طرار' خطرناک قسم کے رپورٹر سمجھے جاتے تھے۔ یہ لاہور میں بمبئی کے انگریزی فلمی پرچے "فلم فیئر" کے بھی نمائندے تھے مگر فلموں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اسلئے ہم ہی ان کے کام آتے تھے۔ یہ واقعات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

"آفاق" کا یہ دور بھی ہمارے لئے نہایت معلومات افروز' تجرباتی اور ہنگامہ خیز تھا۔ ہم نے صحافیانہ زندگی کے بیشتر تجربے یہیں حاصل کئے۔

1958ء میں مارشل لا نافذ ہوا اور اخبارات پر فوجی حکمرانوں کا عتاب نازل ہوا تو ہم بہت پریشان ہوئے۔ اس طرح کی پابندیاں بلکہ "ذلت" ہمارے نزدیک صحافت کے شایان شان نہ تھی۔ ادھر کمپنی کے مالی حالات بگڑ گئے تھے یا چیئرمین صاحب نے جان بوجھ کر مصلحتاً ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ تنخواہیں دیر سے ملنے لگیں تو ہم نے سٹاف کو جوش دلا کر ایک یونین بنا ڈالی۔ سب نے ہمیں پورے تعاون کا یقین دلایا۔ سبھی ہمارے مہربان اور پرانے مخلص دوست تھے۔ ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں جوشیلی تقریریں کی گئیں اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ جب تک حالات بہتر نہ بنائے جائیں گے تمام

عملہ (کاتبوں سمیت) ہڑتال کرے گا۔

اگلے روز سب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دفتر میں بیٹھ گئے۔ کسی کے سمجھائے نہ سمجھے۔ یہاں تک کہ چیئرمین صاحب کا ٹیلیفون موصول ہو گیا۔ سارے سینئر صحافیوں نے سوچ بچار کر کے ٹیلیفون ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ ہم نے یونین کے فیصلے کے مطابق چیئرمین صاحب کو خوب کھری کھری سنائیں اور صاف بتا دیا کہ جب تک وہ مطالبات تسلیم نہیں کریں گے ہڑتال ختم نہ ہو گی۔ انہیں بہت تاؤ آیا۔ انہوں نے فرمایا ''اگر آپ ان حالات میں کام نہیں کر سکتے تو نوکری چھوڑ کر چلے جائیں۔''

ہم نے جواب دیا'' تو پھر ہمارا استعفیٰ قبول فرمائیں ''

انہوں نے کہا'' شکریہ خدا حافظ ''اور فون بند کر دیا۔

کمرے میں سنّاٹا چھا گیا۔ ہم نے فخریہ انداز میں تمام ساتھیوں کی طرف دیکھا اور مسکرائے کہ دیکھا' کیسا ٹکا سا جواب دیا ہے چیئرمین کو' مگر وہ سب خاموش اور سوچ میں گم تھے۔ ہم اپنے کمرے میں واپس پہنچے تو سمجھانے بجھانے والے آ گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ انتظامیہ بہت حد تک مان گئی ہے۔ باقی باتیں بھی مان لے گی۔ جھگڑا کرنے کا کیا فائدہ؟ تم اپنا استعفیٰ واپس لے لو۔ چیئرمین کو اعتراض نہ ہو گا۔ ہڑتال جاری رکھنا اب بے معنی ہے۔ کافی لوگ بے روزگاری سے ڈرتے ہیں اور ہڑتال ختم کرنے پر آمادہ ہیں۔

ہم نے ان ناصحوں کو دیکھا اور پوچھا'' مگر ان سب نے ہر حال میں ایک رہنے اور ساتھ دینے کا عہد کیا تھا۔ ''

ظہور عالم شہید صاحب (اب مرحوم ہو چکے ہیں) ہمارے بے حد مہربان اور مشفّق تھے۔ انہوں نے پیار سے کہا ''آفاقی ہوش سے کام لو۔ اتنے بہت سے لوگ بے کار ہو گئے تو گزارا کیسے کریں گے؟ ''

ہم نے کہا'' شہید صاحب' یہ بات آپ سب نے پہلے کیوں نہیں سوچی تھی؟ ''

انہوں نے پیار سے ہمارے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا'' آفاقی ابھی تم نوعمر ہو۔ دنیا والوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہو۔ تمہیں ان کا تجربہ نہیں ہے۔ ابھی تو زندگی میں ہر قدم پر تمہیں ایسے اور بھی سمجھوتے کرنے پڑیں گے۔ غصہ تھوک دو چلو۔ کام کرو۔ ''

ہم نے جواب دیا ''شہید صاحب کم از کم میں ان سب واقعات کے بعد کام نہیں کروں گا۔ ''

انہوں نے ہمیں چمکارا ''آفاقی جی نہیں کرتا تو چھٹی کر لو۔ایک دو دن دفتر مت آؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ''

ہم نے شہید صاحب کے محبت بھرے چہرے پر نظر ڈالی۔مایوسیوں کا ایک زوردار ریلا آیا اور ہماری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔انہوں نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا اور پھر پیار سے کہا ''ایسا نہیں کرتے یہ کیسا بچپنا ہے تم تو سمجھدار ہو۔ ''

ہمارے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ان کے پیار کرنے پر باقاعدہ سسکیوں سے اور پھر ہچکیوں سے رونے لگے۔ سارا دفتر ہمارے گرد اکٹھا ہو گیا سبھی ہمیں تسلی دلا سا دے رہے تھے۔پیار کا اظہار کر رہے تھے اور ہم تھے کہ روئے جا رہے تھے۔شہید صاحب نے سچ کہا تھا یہ زندگی کے تلخ حقائق اور دنیا والوں کے بارے میں ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ہم نے پہلی بار لوگوں کو اصولوں اور وعدوں سے پھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ہم آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ان سب کے چہرے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ یہ کیسے لوگ ہیں؟ کس طرح بدل جاتے ہیں اور عہد سے ہٹ جاتے ہیں۔

کافی دیر تک ہم روتے رہے۔مگر کبھی نہ کبھی تو آنسو خشک ہونے ہی تھے۔

شہید صاحب بہت پیار سے ہمارے پاس بیٹھے تھپکتے رہے۔پھر انہوں نے کچھ نوٹ ہماری جیب میں ڈال دیئے اور کہا ''جاؤ۔تم دو چار دن چھٹی کرو۔گھومو پھرو غصہ ٹھنڈا ہونے پر دفتر آجانا۔چیئر مین صاحب سے میں بات کر لوں گا۔ان کی فکر نہ کرو۔ ''

ہم دفتر سے چلے آئے اور پھر ''آفاق'' میں ہم نے کام نہیں کیا۔ایک تو مارشل لا کی پابندیاں اور مجبوریاں' اس پر پہلی پہلی شکست کی ذلّت کا احساس،ہم نے ''آفاق'' ہی کو نہیں صحافت کو بھی خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔فلم کا متبادل راستہ ہمارے سامنے موجود تھا۔

1958ء میں باقاعدہ صحافت کو ترک کیا اور فلمی کوچے میں جا نکلے۔وہاں کی آب و ہوا بدلنے لگی تو پھر اسے بھی الوداع کہہ دیا اور پھر صحافت کی وادی میں جا نکلے۔ہم نے اپنی باقاعدہ صحافت کا دوسرا دور 1990ء میں شروع کیا۔

یعنی 32 سالوں کے طویل وقفے کے بعد۔

فلمی دنیامیں یہ سوچ کر گئے تھے کہ اب ساری زندگی اسی کی نذر کر دیں گے۔ بہت محنت مشقت کی۔ بڑے شوق اور لگن سے کام کیا۔ بہت کچھ پایا' بہت کچھ کھویا' مگر جب حالات کا رنگ دیکھ کر فلمی صنعت کو بھی طویل ریاضت کے بعد خدا حافظ کہنے کا فیصلہ کیا تو ایک بار پھر دل بھر آیا۔ ہم نے تو ساری عمر کے لئے اسی کو اوڑھنا بچھونا بنا لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ فلم کے ہر شعبے کا تجربہ حاصل کیا تھا۔ جب خیال ہوا کہ فلم کے بارے میں تھوڑا بہت جان گئے ہیں تو اس کو بھی خیر باد کہنا پڑا۔ ہماری طرح اور بھی بہت سے ہم عصروں نے بالآخر یہی کیا۔

اسے بد قسمتی ہی کہنا چاہئے کہ ایک عمر جس کام کو جاننے بوجھنے اور سمجھنے میں صرف کی تھی اسی کو خیر باد کہنا پڑ گیا۔ بطور صحافی' کہانی نویس' فلم ساز اور ہدایت کار ہمارا فلمی تجربہ لگ بھگ پچاس سال پر محیط ہے۔ مگر عمر کا یہ طویل حصہ رائیگاں ہی گیا۔ پاکستان کی فلمی صنعت کو بنانے سنوارنے کے جو خواب دیکھے تھے وہ ایک ایک کر کے ٹوٹتے گئے یہاں تک کہ آنکھ کھل گئی اور آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ کیا خواب اتنے طویل اور مسلسل بھی ہوتے ہیں اور کیا کبھی ان کی کوئی تعبیر بھی ہو گی؟

روزنامہ ''آفاق'' پہلے دور میں بند ہوا تو تمام ساتھی تتر بتر ہو گئے۔ یوں کہیے کہ جس کا جہاں سینگ سمایا چلا گیا۔ ہم اس وقت تک بطور صحافی پہچانے جاتے تھے۔ فلمی دنیا سے بھی آمد رفت اور میل ملاپ کی حد تک واسطہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک دو فلمی جرائد کے لئے مضامین وغیرہ بھی لکھے تھے۔ لیکن کوئی باقاعدہ کام نہ تھا اس لئے زیادہ تر وقت لکشمی چوک کے ریستورانوں' چائے خانوں اور قہوہ خانوں میں گزرتا تھا۔ کبھی مال روڈ کا رخ کیا تو کافی ہاؤس پہنچ گئے یا ٹی ہاؤس میں جا بیٹھے۔ یہ سب مقامات اس زمانے میں شاعروں' ادیبوں' عالموں 'دانشوروں اور سیاست دانوں کی زد میں تھے۔ لکشمی چوک میں البتہ فلم والوں کا بھی اضافہ ہو جاتا تھا۔ ایک اور مشغلہ اس زمانے میں دوست احباب کے دفتروں میں جا کر گپ لگانا بھی تھا۔ وہ آج کی طرح مشینی اور صنعتی دور نہ تھا۔ لوگوں کے پاس وقت بھی تھا' پیار اور خلوص بھی تھا۔ بیٹھ کر بات چیت کرنا اور مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرنا بھی اس وقت کی سماجی ضروریات میں شامل تھا۔

ایک روز ہم ٹی ہاؤس سے باہر نکلے ہی تھے کہ اقبال کوثر مل گئے۔اقبال کوثر اچھے قد کاٹھ کے صحت منداور خوش شکل جوان تھے۔صورت سے وہ شاعر کے علاوہ سبھی کچھ لگتے تھے مگران کی اصل وجہ محبوبی شاعری ہی تھی۔ یوں تووہ ریلوے کے محکمے میں ملازم تھے مگرنوکری کاوقت جیسے تیسے گزارنے کے بعدوہ ریلوے ہیڈ کوارٹر یاریلوے سٹیشن سے جو دوڑ لگاتے تو لکشمی چوک پر جاکر دم لیتے۔وہ امرتسر کے رہنے والے تھے اور شاعر بھی تھے۔اس لئے ظاہر ہے کہ امرتسر سے تعلق رکھنے والے سبھی قابل ذکر اصحاب سے ان کی یاد اللہ تھی۔امرتسر والے ان دنوں لاہور میں ہر جگہ پائے جاتے تھے۔جسے دیکھئے معلوم ہوگا کہ امرتسری ہے۔ہمیں توامرتسریوں سے ڈر لگنے لگا تھا۔مگران کے بغیر گزارا بھی نہ تھا۔امرتسر سے آنے والے بہت باصلاحیت' حوصلہ منداور دانش ورلوگ تھے۔زندگی کے ہر شعبے میں امرتسریوں کی آمدروفت تھی یا پھر ان کا قبضہ تھا۔ادبی اور فنی شعبوں پر تووہ چھائے ہوئے تھے۔امرتسر والوں میں ایک خوبی یہ دیکھی کہ وہ اپنے امرتسری ہونے پر برملا فخر کرتے تھے۔اب بھی کرتے ہیں مگر وہ پہلے جیسا جوش و خروش نہیں رہا۔

ہمارے بھی کئی امرتسری مہربان تھے۔سعادت حسن منٹو' ظہیر کاشمیری خالص امرتسری تھے۔سیف الدین سیف صاحب بھی سرتاپا امرتسری تھے۔ظہور الحسن ڈار بھی امرتسری تھے اور ہمارے بہت عزیز دوست تھے۔عمر' دانش اور تجربے میں وہ ہم سے سینئر تھے۔ مگر بہت بے تکلف دوست تھے۔ڈار صاحب بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔

بہت اچھے افسانہ نگار' صحافی اور کالم نگار تھے۔"آنکھیں میری، باقی ان کا" ان کا مقبول ترین کالم تھا جو وہ مختلف اخبارات و جرائد میں وقتاً فوقتاً لکھتے رہے۔متلون مزاج آدمی تھے اس لئے کسی ایک مقام پر زیادہ دیر تک ٹکتے نہیں تھے۔جگہیں ٹھکانے اور پیشے بدلتے رہتے تھے۔کبھی ادبی پرچوں سے وابستہ ہیں تو کبھی تصنیف وتالیف کر رہے ہیں۔ کبھی صحافت کے میدان میں قلم کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں تو کبھی فلمی دنیا میں براجمان ہیں اور کہانی و مکالمے لکھ رہے ہیں۔مگر یہ سب کام ان کے لئے "پارٹ ٹائم" تھے یعنی جز وقتی' ان کی کل وقتی مصروفیت دوستوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا تھی۔ابھی ہم سکول کے طالب علم ہوں گے جب ظہور الحسن ڈار لاہور کے ممتاز ادبی جرائد میں کہانیاں اور افسانے لکھتے تھے اور خوب داد پاتے تھے۔انہوں نے زندگی بھر مختلف قسم کے کام کئے اور اپنی مرضی

کے مطابق زندگی بسر کی۔

انگریزی کی ایک کتاب ''بامبی'' کا انہوں نے اردو میں اس قدر خوبصورت ترجمہ کیا تھا کہ یہ ترجمہ اور یجنل کتاب پر بازی لے گیا تھا۔ الفاظ کا انتخاب' اسلوب' طرز بیان' تحریر کی شگفتگی اور سلاست' بے ساختگی اور سادگی' ان تمام چیزوں نے '' بامبی'' کو ایک بہت خوبصورت تصنیف بنادیا تھا۔ اسے آپ ناول کہہ لیجئے جس کا پس منظر جنگل تھا اور یہ ایک بارہ سنگھے کی آپ بیتی تھی۔ یہ کہانی اس وقت سے شروع ہوتی تھی جب اس بارہ سنگھے نے جنم لیا تھا۔ اس کے بعد عمر کے مختلف مرحلے' تجربات' مشاہدات اور دلی وارداتیں اس حسن کے ساتھ پیش کی گئی تھیں کہ کتاب کو ختم کئے بغیر ہاتھ سے نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ اس بارہ سنگھے کو مصنف نے ایک انسان کی طرح مختلف نفسیاتی' ذہنی اور جذباتی ادوار سے گزارا تھا اور ہر سطر' ہر صفحہ دل پر اثر کرتا تھا۔ پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک اس بارہ سنگھے کی زندگی میں جو نشیب و فراز آئے ان کی ساری روداد بے حد دلچسپ اور دلکش انداز میں پیش کی گئی تھی۔ یہ سب کچھ انسانوں کی زندگی میں بھی پیش آتا ہے۔ صرف ماحول' مقام اور کردار بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ڈار صاحب نے یہ کتاب ہمیں دیتے ہوئے کہا ''آفاقی لو یہ کتاب پڑھو اور کچھ سیکھو۔''

ہم نے کتاب کا فلیپ پڑھا اور پوچھا ''ڈار صاحب اس بارہ سنگھے سے بھلا ہم کیا سیکھیں گے؟''

بولے ''یہ تمہیں کتاب پڑھنے کے بعد پتا چلے گا بیٹے۔ ابھی ہم انسانوں کو جانوروں سے بہت کچھ سیکھنا ہے''۔

ہم کتاب لے کر چلے گئے۔ رات کو پڑھنے بیٹھے تو اس میں ایسے گم ہوئے کہ ختم کر کے ہی دم لیا۔ اس کے بعد دوبارہ ازسرنو مطالعہ شروع کردیا۔

ناول کے کرداروں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہی نہ ہوا کہ یہ تو جانوروں کی کہانی ہے۔ اس میں جانوروں کی زبان اور ماحول میں انسانی نفسیات اور مسائل کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس قدر دلچسپ' سبق آموز اور معنی خیز تحریریں بہت کم پڑھنے کو میسر آتی ہیں۔ بدقسمتی یہ کہ وہ کتاب کوئی ہم سے پڑھنے کے لئے مانگ کرلے گیا اور پھر دوبارہ ہمیں نہ مل سکی۔ اس کا کوئی نسخہ ڈار صاحب کے پاس بھی نہیں تھا۔ دکانوں سے وہ غائب ہوچکی ہے۔ یاد نہیں کہ کس نے شائع کی تھی اور اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع کیا تھا یا نہیں۔ اس کتاب کی کمی ساری زندگی محسوس کرتے

رہیں گے۔ڈار صاحب عجیب و غریب آدمی تھے۔عام طور پر بہت نرم گفتار اور شائستہ تھے لیکن بعض اوقات جب بپھر جاتے تو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ شخص اتنا جارحانہ مزاج کا بھی ہو سکتا ہے۔اس طرح کے چند واقعات ہمیں یاد ہیں۔ان کی آغا شورش کاشمیری سے بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ پھر اختلافات ہو گئے۔یہاں تک کہ لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچ گئی۔اس زمانے میں غنڈے بدمعاش اتنے زیادہ نہیں تھے۔جو بھی تھے وہ پہچانے جاتے تھے اور اپنے علاقوں اور شہروں میں مشہور بھی تھے۔سیاستداں اس زمانے میں بھی غنڈوں اور بدمعاشوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے اور اس کے عوض انہیں پولیس سے تحفظ مہیا کرتے تھے۔ہر بڑے اور مشہور آدمی کے حلقہ اثر میں غنڈوں اور بدمعاشوں کا ایک گروہ بھی ہوتا تھا۔آغا شورش اور ظہور الحسن ڈار کے اختلافات بہت زیادہ خراب ہوئے تو ہم اس زمانے میں ہفت روزہ ''چٹان'' میں آغا شورش کے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ہم دیکھتے کہ دور دراز سے غنڈے اور بدمعاش آکر آغا صاحب کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتے اور ڈار صاحب کے خلاف لڑائی میں اپنی خدمات پیش کرتے۔ہم چپ چاپ سنتے رہتے اور سہمے رہتے۔ ایک دو بار ہم نے ڈار صاحب کو مخبری بھی کی اور انہیں بتایا کہ فلاں غنڈا ان کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا۔

ڈار صاحب اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ مار کر ہنسے اور بولے ''آفاقی یہ سب تماشے ہیں تم فکر نہ کرو۔''

بات دراصل یہ تھی کہ اکثر غنڈے اور بدمعاش دونوں کے حلقہ بگوش تھے اور انہیں اپنی وفاداری اور جان نثاری کا یقین دلاتے رہتے تھے۔ان ہی دنوں ایک بار کافی ہاؤس میں آغا صاحب اور ظہور الحسن ڈار کا آمنا سامنا ہو گیا۔بات تلخ کلامی سے بڑھ کر ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔آغا شورش گفتار کے بہت بڑے غازی تھے مگر ہاتھا پائی ان کا شیوہ نہ تھا۔ڈار صاحب نے دست درازی کی تو وہ اپنے بلند و بالا اور بھاری ڈیل ڈول کے باوجود خاموش کھڑے رہے۔لوگوں نے بڑی مشکل سے ان دونوں کو علیحدہ کیا۔

ڈار صاحب اپنے گھر کی الاٹمنٹ کے سلسلے میں ایک بار محکمہ آبادکاری کے ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے۔ہم بھی ساتھ تھے۔آبادکاری کا ڈپٹی کمشنر اس زمانے میں کافی توپ چیز سمجھا جاتا تھا۔ڈار صاحب اپنی جائز شکایت لے کر ان کے پاس گئے تھے۔انہوں نے پہلے تو کافی دیر تک ہمیں کمرے کے اندر ہی نہیں بلایا۔ جب اندر گئے تو بڑی رکھائی سے پیش

آئے۔ڈار صاحب نے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا تو وہ خالص افسر بن گئے۔ کہنے لگے ''آپ صحافی ہوں گے تو اپنے دفتر میں ہوں گے۔ آپ کو تو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے''۔

بس پھر کیا تھا۔ڈار صاحب ایک دم مارے غصّے کے آپے سے باہر ہو گئے۔ کہا ''آپ نے ابھی میری بدتمیزی دیکھی نہیں ہے اور شکایت کرنے لگے۔''

وہ بولے ''آپ اس سے زیادہ اور کیا بدتمیزی کریں گے؟''

ڈار صاحب کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بولے ''ابھی دیکھ لیجئے میں آپ کو کرسی سے اٹھا کر باہر پھینک دوں گا'' یہ کہہ کر انہوں نے انہیں کھینچ کر کرسی سے اٹھایا اور سچ مچ کمرے سے باہر لے جا کر پھینک دیا۔ دفتر میں ہلچل سی مچ گئی۔ان کا کمرہ فرید کوٹ ہاؤس کی دوسری منزل پر تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دفتری اہلکار اور درخواست گزار سبھی کمرے کے باہر اکٹھے ہو گئے مگر کسی کی جرات نہ پڑی کہ ڈار صاحب کو کچھ کہتا۔وہ آستین چڑھائے کھڑے دہائی دے رہے تھے۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا اور ڈپٹی کمشنر صاحب کو دوبارہ ان کی کرسی پر بٹھایا۔ڈار صاحب انہیں دھمکی دے کر آ گئے کہ اگر اس کے بعد بھی میرا کام نہ ہوا تو اس سے بھی بُرا سلوک کروں گا۔

کچھ دیر بعد جب ان کا غصہ اترا اور چائے وائے پی کر ان کا مزاج خوشگوار ہوا تو ہم نے کہا ''ڈار صاحب یہ شریفوں کا شیوہ تو نہیں ہے۔''

کہنے لگے ''آفاقی شریف سے بڑھ کر کوئی بدمعاش نہیں ہوتا۔ جب شریف بدمعاشی پر اُتر آئے تو بڑے بڑے بدمعاش کانپنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی ہاتھا پائی کرنا بھی ضرور ہوتا ہے۔ تم بھی یہ سبق سیکھ لو۔''

ہم نے کہا ''بھائی آپ ہاتھا پائی کر سکتے ہیں' ہمارے لئے تو یہ گھاٹے کا سودا ہی ہو گا۔ ہم دبلے پتلے' مریل سے آدمی ہیں۔ کسی سے کیا ہاتھا پائی کریں گے؟''

ہنس کر کہنے لگے ''یاد رکھو غصے کی طاقت اضافی ہوتی ہے۔ اگر سچ مچ غصہ آ جائے تو انسان کی طاقت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ کبھی آزما کر دیکھ لینا۔''

ڈار صاحب کی ایک ٹانگ میں ہلکا سا لنگ تھا مگر انہیں اس کا کوئی کامپلیکس نہ تھا۔ ہاتھ پیروں کے مضبوط تھے لیکن

عموماً غصے میں نہیں آتے تھے۔

ایک دن ڈار صاحب سے ملے تو انہوں نے دیکھتے ہی کہا ''اخاہ۔۔۔ یار اچھا ہوا تم آ گئے۔ ایک سلسلے میں ' میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ ''

''اخاہ'' ان کا تکیہ کلام تھا۔ اچھے موڈ میں ہوتے تو ''اخاہ'' ضرور کہتے تھے۔ اقبال کوثر ان کے ہمراہ تھے۔ وہ ہمزاد کے مانند ڈار صاحب کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ وہ بہت اچھے شاعر تھے مگر اس سے زیادہ اچھے شعر شناس اور شاعر پرست تھے۔ حافظہ غضب کا تھا خصوصاً اشعار کے معاملے میں۔ ہر شاعر کا کلام انہیں زبانی یاد تھا۔ اور بڑی خوش الحانی سے سنایا کرتے تھے۔ ڈار صاحب ان سے کہا کرتے تھے کہ اقبال کوثر' اگر تم شاعر نہ ہوتے تو قوال ضرور ہوتے۔

اقبال کوثر اس پر زبردست احتجاج کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قوال کی جگہ گلوکار کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔

ڈار صاحب نے کہا ''آفاقی'' تم آج کل بے کار ہو؟'' ہم نے سر ہلایا۔

''بس تو پھر تمہارے کام کا بندوبست ہو گیا۔ ''

ہم چوکنّا ہو گئے۔

اقبال کوثر ہنسنے لگے۔ بولے ''گھبرایئے مت۔ آپ کے مطلب کا کام ہے۔ ''

ڈار صاحب نے پہلے تو ہمارے لئے چائے کی پیالی منگائی۔ پھر ایک سگریٹ بھی پیش کی۔ ہم اس وقت تک پائپ وغیرہ سے بچے ہوئے تھے۔ دوسروں کی پیش کی ہوئی سگریٹ البتہ پی لیا کرتے تھے۔

اپنی بڑی بڑی پُر اثر آنکھوں سے ڈار صاحب نے ہمیں گھورا اور پھر کہا ''آفاقی' زمیندار اخبار میں کام کرو گے؟ ''

ہم نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ''زمیندار'' کے بارے میں ہماری رائے کا ڈار صاحب کو علم تھا۔ خود ان کی رائے بھی اس سے مختلف نہ تھی۔

روزنامہ '' زمیندار'' کسی زمانے میں برّصغیر کا بہت اہم اور قابل ذکر اخبار تھا۔ اس کے مالک اور مدیر جناب ظفر علی خان کا نام ملک کے چاروں کونوں میں مشہور تھا۔ وہ اعلیٰ پائے کے نثر نگار' بہترین شاعر اور ممتاز صحافی تھے۔ ان کو نظم و نثر دونوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ انتہائی خوبصورت زبان لکھتے تھے اور برجستہ' حسب موقع اور حسب حال

اشعار لکھنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ طنزیہ نظمیں بھی لکھتے تھے اور سیاسی بھی۔ ان کے قلم سے لکھا ہوا ہر حرف معتبر سمجھا جاتا تھا اور سارے ملک میں پھیل جاتا تھا۔ وہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ اس قدر سلیس' رواں اور خوبصورت کرتے تھے کہ اس پر طبع زاد کا گمان گزرتا تھا۔ سیاسی بصیرت اور شعور بھی اس درجہ تھا کہ سارے ہندوستان کے سیاسی زعماء ان کے مشورے کو اہمیت دیتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان اپنی ذات میں ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے۔ ان کا اخبار ''زمیندار'' اس زمانے میں بھی ہندوستان کا سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ تھا اور پاکستان کے قیام کے بعد بھی وہ سب سے زیادہ شائع ہونے والا اخبار تھا۔ مولانا ظفر علی خان کو ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کی صف میں بھی ایک بلند مقام حاصل تھا۔ مختصر یہ کہ وہ ہزار پہلو شخصیت تھے اور ان کی شخصیت کا ہر رخ انوکھا' نرالا اور عظیم تھا۔ طبع کی روانی کا یہ عالم تھا کہ حقے کی نے منہ سے لگائی اور برجستہ اشعار دریا کے مانند زبان سے رواں ہو گئے۔

مولانا ظفر علی خان ایک نادر روزگار اور یکتائے زمانہ شخصیت تھے۔ وہ پرانے وقتوں کے بی اے تھے جب کہ میٹرک تک تعلیم ہی بہت کافی تصوّر کی جاتی تھی۔ اس پر ان کا مطالعہ اس قدر وسیع تھا کہ ہر زبان ان کے گھر کی باندی تھی لیکن بدقسمتی دیکھئے کہ وہ شخص جس کو زبان اور قلم پر مطلق العنان حکمرانی حاصل تھی اس کا اکلوتا بیٹا' اختر علی خان' ان تمام اوصاف سے عاری تھا۔ انہوں نے نہ تو زیادہ تعلیم حاصل کی اور نہ ہی انہیں مطالعے کا شوق تھا۔ غالباً اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے لاڈلے بھی تھے۔ اس لئے انکی تعلیم و تربیت پر زیادہ توجہ نہ دی جا سکی تھی۔ اختر علی خان ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی اپنے والد کے پاسنگ نہ تھے۔ والد کو زبان و بیان اور تحریر پر مکمل دسترس حاصل تھی جب کہ اختر علی خان جب ''زمیندار'' کے ایڈیٹر بنے تو اخبار کے اداریے دوسرے لوگوں کو لکھنے پڑتے تھے۔ نثر کے علاوہ نظم میں بھی وہ قابل ذکر صلاحیتوں کے مالک نہ تھے ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ان کا اپنے والد سے کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ جب تک مولانا ظفر علی خان کے حواس اور اعضا کام کرتے رہے وہی ''زمیندار'' کو چلاتے رہے۔ مگر آخری عمر میں جب بیماریوں نے انہیں گھیرا اور فالج کے مرض نے انہیں ناتواں اور معذور بنا دیا تو وہ صاحبِ فراش ہو گئے اور ''زمیندار'' کی ادارت کا بوجھ ان کے اکلوتے صاحب زادے اختر علی خان پر آن پڑا۔ وقت کے دستور اور رواج کے مطابق وہ بھی مولانا کہلائے اور یہ لفظ ان کے نام کا لازمی حصہ بن کر رہ گیا۔

ایک اور المیّہ یہ بھی تھا کہ مولانا اختر علی خان کے دو صاحب زادوں منصور علی خان اور مسعود علی خان میں سے کسی ایک کو بھی ادب و صحافت اور نظم و نثر پر عبور حاصل نہ تھا۔

مولانا ظفر علی خان اپنے عہد کی ایک بہت ممتاز اور نمایاں شخصیت تھے۔ وہ ایک اعلیٰ مقام اور انتہائی قابل احترام شخصیت تھے۔ اردو صحافت اور علم و ادب سے معمولی دلچسپی رکھنے والا بھی ان کے نام نامی اور کارناموں سے واقف تھا۔ ہم جن دنوں سکول میں پڑھا کرتے تھے اس وقت بھی مولانا ظفر علی خان کے نام اور کام سے واقف تھے اور ان کی عظمت ہم پر پوری طرح واضح تھی۔ جب ہم پاکستان آکر لاہور میں مقیم ہوئے تو لاہور کی قابل دید چیزوں میں مولانا ظفر علی خان کا نام بھی ہماری فہرست میں شامل تھا۔ لیکن کوئی ذریعہ ان سے ملاقات کا نہ تھا۔ ان سے پہلی بار ملاقات کا شرف ہمیں 1951ء میں حاصل ہوا اور اس کا ذریعہ آغا شورش کاشمیری بنے۔ آغا صاحب مولانا ظفر علی خان کے بہت بڑے معتقد تھے اور نظم و نثر اور ایسی شعور و بصیرت کے اعتبار سے انہیں اپنا رہنما تسلیم کرتے تھے۔ ان کا ذکر وہ بہت محبت اور احترام سے کیا کرتے تھے۔ اکثر مولانا کی زندگی کے واقعات بیان کرتے تھے۔ ان کی فی البدیہہ گوئی کے معترف تھے۔ مولانا کے اشعار ان کو از بر تھے۔ یہاں تک کہ ان کے تحریر کردہ اداریے تک آغا شورش کو زبانی یاد تھے۔ ان کے سیاسی اور طنزیہ اشعار وہ اکثر موقع و محل کے لحاظ سے سنایا کرتے تھے۔

ہم ہفت روزہ ''چٹان'' میں کام کر رہے تھے اور مولانا ظفر علی کا تذکرہ اکثر سنا کرتے تھے۔ ایک دن ہم نے آغا صاحب سے عرض کی ''شورش صاحب آپ کبھی مولانا ظفر علی خان سے ملاقات کے لئے نہیں جاتے؟''

انہوں نے کہا ''مولانا ان کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر بھی کبھی کبھی سلام کے لئے خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔''

ہم نے کہا ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اب کی مرتبہ آپ ان کے پاس جائیں تو ہمیں بھی ہمراہ لے چلیں۔''

وہ مسکرائے ''کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہم کل ہی چلیں گے۔ مولانا اختر علی خان سے مجھے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں''۔

دوسرے دن ہم آغا شورش کاشمیری کے ساتھ تانگے میں سوار ہوئے اور ''زمیندار'' کے دفتر کی جانب روانہ ہو گئے۔ حسب دستور آغا صاحب اگلی نشست پر تانگے والے کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ہم پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ''چٹان'' کے دفتر سے ''زمیندار'' کے دفتر کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ موسم سرما کی آمد آمد تھی اور لاہور کا موسم بے

انتہاخوشگوار تھا۔اس زمانے میں لاہور میں نہ تو اتنی زیادہ آبادی تھی' نہ کاروں اور رکشوں کا دھواں اور ماحولیاتی کثافت تھی۔ ہر طرف درختوں کی بہتات تھی۔
فضاصاف شفاف رہتی تھی۔ ہم لوگ پیدل بھی جا سکتے تھے مگر آغاصاحب غالباًپیدل چلنے کے قائل نہ تھے اس لئے مختصر فاصلے پر بھی تانگے کے ذریعے جاتے تھے۔غالباًایک مصلحت یہ بھی ہوگی کہ راہ میں لوگ انہیں پہچان کر گھیر لیتے تھے اور ہر ایک سے مصافحہ و معانقہ کرناپڑتا تھا۔تانگے میں محض سلام اور ہاتھ ہلانے سے کام چل جاتا تھا۔
''زمیندار'' کا دفتر ہم نے پہلے بھی باہر سے دیکھا تھا۔یہ ایک خوشنمادومنزلہ عمارت تھی۔ نچلی منزل پر ایک برآمدہ تھا۔اس کے بعد کمرے تھے۔اندرونی حصے میں سے سیڑھیاں اوپر دوسری منزل کی طرف جاتی تھیں۔عمارت کے زیریں حصے میں اخبار کا دفتر تھا۔ بالائی حصے میں رہائش تھی۔ مولاناظفر علی خان اور مولانااختر علی خان اوپر والی منزل پر رہائش پذیر تھے۔اختر علی خان کے بڑے صاحب زادے منصور علی خان میکلوڈ روڈ' (لکشمی چوک) پر ایک عمارت کے فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔یہ ایک کشادہ اور ہوادار عمارت تھی۔اگلے حصے میں برآمدہ تھا پچھلے میں کھلا صحن تھا۔اوپر کی منزل پر بھی سامنے کی جانب ایک برآمدہ تھا۔مولاناظفر علی خان کبھی لاہور میں اور کبھی کرم آباد میں قیام کرتے تھے جہاں ان کی زمینیں اور حویلی تھی۔دراصل کرم آباد ہی ان کا اصل ٹھکانا تھا۔لاہور میں تو اخباری مصروفیات کے باعث رہناپڑتا تھا۔ پھر بھی چھٹی کے دن یا فرصت پاکر وہ کرم آباد چلے جاتے تھے۔
''زمیندار ''مولانااختر علی خان کی زیرادارت چل رہا تھا۔اخبار کا مولاناظفر علی خان والا معیار تو نہ تھا لیکن پنجاب کے لوگوں کو''زمیندار'' کی عادت پڑگئی تھی۔اس زمانے میں بھی اس کی اشاعت دوسرے تمام اردو اخبارات سے زیادہ تھی۔ اشتہارات کی بھی کمی نہ تھی اس لئے ہن برس رہا تھا۔خوشحالی کا زمانہ تھا۔ اس خاندان پر اللہ کی رحمت تھی۔ زمینیں تھیں' اخبار کی بہت اچھی آمدنی تھی۔اس وقت جب کہ لاہور میں کاریں معدودے چند ہی تھیں اختر علی خان دو کاروں کے مالک تھے۔ان کے بیٹے منصور علی خان اور مسعود علی خان بھی صاحب کار تھے۔بہت اچھاوقت تھا۔
''زمیندار'' کے دفتر پہنچے تو بائیں ہاتھ پر مولانااختر علی خان کا دفتر تھا۔اس کے برابر سے ایک گلی مکان کے عقبی حصے کی طرف جاتی تھی۔ مولانااختر علی خان شورش صاحب کے منتظر تھے۔بہت گرمجوشی اور اخلاق سے ملے۔وہ گہرے

سانولے رنگ کے درمیانہ قد اور بھاری جسم کے مالک تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور ناک بھی عقابی تھی۔ وہ گفتگو کے دوران میں اشعار اور محاورے کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ مثلاً یہ فقرہ ان کا مرغوب فقرہ تھا۔ ''اخبارات کی برادری میں زمیندار کی حیثیت ایسی ہے جیسے بتیس دانتوں کے درمیان ایک زبان'' ایک شعر بھی وہ اکثر سنایا کرتے تھے۔

تو برائے وصل کردن آمدی

نے برائے فصل کردن آمدی

بعد میں جب ہم نے ان کے ساتھ مختصر عرصے کام کیا تو بھی یہی باتیں سننے کو ملیں۔

کارکنوں کے بارے میں وہ اکثر یہ فقرہ دہرایا کرتے تھے۔ ''میرا اصول ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ملنی چاہئے۔'' مگر ہم لوگوں نے اس میں ترمیم کر کے اسے یوں بنالیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری کم از کم خون خشک ہونے سے پہلے ملنی چاہئے۔''

اختر علی خان کھلے پائنچوں کا سفید لٹھے کا پاجاما اور شیروانی پہنے اپنے کشادہ اور خوبصورت کمرے میں تشریف فرما تھے۔ اس زمانے کے رواج کے حساب سے وہ بے حد شاندار دفتر تھا۔ فرش پر قالین، قیمتی فرنیچر، ائرکنڈشنر اور ایک جانب آتش دان میں بہت خوبصورت باہر سے درآمد شدہ برقی ہیٹر، برقی ہیٹر اور ائر کنڈیشن اس زمانے میں بہت نایاب چیزیں تھیں۔ مولانا اختر علی خان الفاظ پر زور دے کر لیکن بہت تیزی سے بولتے تھے۔ شورش صاحب نے ہمارا بھی سرسری تعارف کرایا۔ انہوں نے بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ مصافحے کیلئے ہماری طرف بڑھا دیا۔ ان کا ہاتھ پُر گوشت اور ملائم تھا لیکن اس کو تھامنے کے لئے ہمیں ان کی بڑی سی میز کے گرد چکر کاٹ کر ان کے نزدیک جانا پڑا کیونکہ یہ میز بہت لمبی چوڑی تھی اور سامنے سے ہم ان کا ہاتھ نہیں تھام سکتے تھے۔

ان دونوں میں کچھ دیر مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس دوران میں چائنا کے نہایت قیمتی ٹی سیٹ میں چائے بھی نوش کی گئی۔ جو تمیزدار ملازم اوپر گھر سے لے کر آیا تھا۔

آغا شورش نے مولانا ظفر علی خان کی خیریت دریافت کی اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

اختر علی خان نے بتایا کہ قبلہ والد صاحب کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ بول چال میں بھی دقت پیش آتی ہے۔ انہیں کرم آباد لے گئے تھے مگر وہ اصرار کرکے چند روز کے لئے لاہور تشریف لے آئے ہیں۔ ہم نے محسوس کیا کہ اختر علی خان خاصی مسجع اور مقطع اردو بولتے ہیں اور اپنا مافی الضمیر سادہ اور آسان الفاظ میں بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں۔
کچھ دیر بعد اختر علی خان کی قیادت میں ہم لوگ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے' برآمدے میں مولانا ظفر علی خان ایک آرام دہ کرسی پر نیم دراز تھے۔ برآمدے میں ہلکی پھلکی دھوپ تھی اور وہ دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے اور حرکت کرنے سے معذور تھے۔ یہاں تک کہ گفتگو میں بھی بہت دقت پیش آتی تھی۔ انہوں نے جو تھوڑی بہت گفتگو کی وہ بمشکل ہماری سمجھ میں آئی۔ مگر اختر علی خان بخوبی سمجھ گئے اور انہوں نے ترجمانی کا فرض بھی ادا کیا۔

آغا شورش نے بہت عقیدت سے مولانا ظفر علی خان سے ہاتھ ملایا۔ ان کے اشارے پر ہم نے بھی آگے بڑھ کر بڑی عقیدت اور احترام سے ان کا ناتواں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ان کے کمزور ہاتھ میں ہلکی سی لرزش تھی۔ یہ وہ ہاتھ تھا جس کی تحریروں سے حکمرانوں کے ایوان اور بڑے بڑے لوگوں کے در و بام لرزتے تھے۔ آج اس میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ قلم تھام کر چند حروف ہی لکھ سکتا۔ وہ زبان جو شعلہ و شبنم برسایا کرتی تھی اب اس میں لکنت تھی اور وہ چھوٹا سا فقرہ بھی ادا کرنے کے قابل نہ تھی۔ ایک ملازم نے حُقہ تازہ کرکے مولانا کی کرسی کے نزدیک رکھ دیا۔ مولانا اختر علی خان نے حُقے کی نے اٹھا کر اپنے والد بزرگوار کی جانب بڑھائی۔ انہوں نے ہلکے سے چند کش لئے اور پھر نڈھال سے ہو کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر نیم دراز ہو گئے۔ وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ مطالعہ' تحریر و بیان سبھی سے قاصر تھے۔ آغا شورش کاشمیری مختلف موضوعات پر بولتے رہے اور مولانا ظفر علی خان خاموشی سے سنتے رہے۔ یہ وہ شخص تھا جس کے آگے دوسروں کو بولنے کا یارا نہ تھا۔ مگر آج بیماری نے اسے کمزور' بے بس' معذور اور ناتواں کر دیا تھا۔

ہم ایک جانب کھڑے خاموشی سے مولانا ظفر علی خان کا زرد لیکن خوبصورت چہرہ دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں ایک ویرانی سی تھی۔ زبان خاموش تھی۔ صرف آنکھیں حرکت کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد آغا شورش نے اشارہ کیا کہ

اب رخصت کی اجازت لیتے ہیں۔ان سے پھر مصافحے کا شرف حاصل ہوااور ہم سیڑھیاں اتر کر چلے آئے۔

آغا شورش کاشمیری نے ایک سرد آبھری اور کہا''اللہ اکبر' انسان بھی کتنا بے بس اور لاچار ہوتا ہے۔ ''

یہ ہماری مولانا ظفر علی خان سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ عملی طور پر تو وہ دنیا والوں کیلئے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔جو انسان معمولات زندگی ادا کرنے سے قاصر ہو اس کا محض جسمانی وجود ہی رہتا ہے۔وفات کے بعد خاکی جسم بھی خاک میں مل گیا۔انہیں کرم آباد میں دفن کیا گیا تھا۔

جب ظہور الحسن ڈار صاحب نے ''زمیندار'' میں کام کرنے کا تذکرہ کیا تو ہم چپ چاپ رہ گئے۔

''یار کچھ بول تو سہی' سانپ کیوں سونگھ گیا۔ ''

ہم نے کہا''مگر ڈار صاحب مولانا اختر علی خان کے ساتھ ہمارا کام کرنا بہت مشکل ہے۔ ''

وہ ہنسے اور کہنے لگے ''آفاقی بچے کبھی اخبار بھی پڑھ لیا کرو تاکہ حالات حاضرہ سے باخبر رہ سکو۔یہ تو تم جانتے ہو کہ مولانا اختر علی آج کل جیل میں ہیں اور حکومت نے زمیندار پر پابندی لگادی ہے ''

''ہاں یہ تو پتا ہے مگر پھر۔۔۔ ''

''اب بولنے سے پہلے میری بات سن لو اور پھر سوچ کر بولو۔ ''

''جی فرمایئے۔ ''

''بات یہ ہے کہ مولانا اختر علی خان کے بڑے بیٹے منصور علی خان اب یہ اخبار روزنامہ ''آثار'' کے نام سے نکال رہے ہیں۔اس نام سے ڈکلریشن کا انتظام ہو گیا ہے۔دفتر اور سٹاف موجود ہی ہے۔ منصور علی خان تعلیم یافتہ اور روشن خیال آدمی ہیں اور اپنے والد مولانا اختر علی خان سے بالکل مختلف ہیں۔وہ نئے خیالات کے مالک ہیں اور ایک جدید روزنامہ نکالنا چاہتے ہیں۔اسی لئے انہوں نے بلوایا تھا اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ہم دونوں مل کر اس پرچے کو ایک ماڈرن روزنامہ بنادیں گے۔ ''

ہم نے غور کیا تو بات نہایت معقول تھی۔

ڈار صاحب نے کہا''سوچ کیا رہے ہو۔بولو' تمہاری بردکھائی کرادیں۔یعنی منصور علی خان سے تمہاری ملاقات کرا

دیں؟ "

ہم دونوں تانگے میں سوار ہو کر زمیندار کے دفتر پہنچ گئے۔ مولانا اختر علی خان جیل میں تھے اسلئے ان کا دفتر بند تھا۔ منصور علی خان کا دفتر اندرونی حصے میں تھا اور یہ بھی خوب سجا ہوا اور آراستہ تھا۔ فرق یہ تھا کہ سائز میں چھوٹا تھا اور یہاں آرائش میں نئے انداز کی جھلک نمایاں تھی۔

منصور علی خان نوجوان آدمی تھے۔ کسی حد تک اپنے والد سے مشابہ تھے۔ لیکن ان کا رنگ قدرے صاف تھا۔ گھونگریالے بال' چمکدار دل میں اتر جانے والی نگاہیں 'سوچتے وقت ان کی آنکھوں میں تھوڑا سا بھینگا پن پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ درمیانہ قد و قامت کے جوان آدمی تھے۔ قدرے فربہی کی طرف مائل تھے۔ باتیں بہت دلچسپ کرتے تھے اور دل کھول کر بلند آواز میں قہقہہ لگاتے تھے۔ ہم نے انکی باتوں سے اندازہ لگایا کہ ان میں چالاکی بالکل نہیں تھی۔ سادہ دل اور سادہ لوح آدمی تھے۔ جو دل میں ہوتا تھا وہی زبان پر لے آتے تھے۔ خوش مزاج تھے اور صحیح معنوں میں اپنے اخبار کو جدید رنگ دینے کے خواہش مند بھی تھے۔

ان سے تھوڑی ہی دیر میں اتنی بے تکلفی ہو گئی کہ ہنسی مذاق بھی شروع ہو گیا۔ ڈار صاحب سے وہ پہلے بے تکلف تھے۔ انہوں نے اوپر سے بہت اچھی قسم کی چائے منگا کر بہت اعلیٰ قسم کی قیمتی پیالیوں میں پلائی۔ ساتھ میں بسکٹ اور کیک پیش بھی تھے۔ انہوں نے کہا " دیکھئے ڈار صاحب یہ چائے اور کیک پیس وغیرہ آپ کو آج ہی ملے ہیں۔ آئندہ ان کی توقع نہ رکھئے گا۔ "

"کیا مطلب؟ "

"مطلب یہ کہ آئندہ سامنے والے تنوری ہوٹل سے چائے آیا کرے گی۔ ان کے پاس بسکٹ بھی ہوتے ہیں مگر یہ بات نہ ہو گی۔ میں ہر روز اباجی کے گھر سے چائے منگا کر آپ کو نہیں پلاؤں گا۔ "

تنخواہ وغیرہ طے ہونے کے بعد ہم نے اگلے ہی روز سے "آثار" میں اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔ یہ تنخواہ "آفاق" میں ملنے والی تنخواہ سے کہیں زیادہ تھی۔ کہنے کو ہم جوائنٹ ایڈیٹر تھے اور ڈار صاحب ایڈیٹر لیکن ڈار صاحب ایڈیٹوریل اور ایک کالم لکھنے کے سوا کوئی اور کام نہیں کرتے تھے۔ عملہ ادارت کے انتظامی امور بھی ہمارے ہی ذمے تھے۔ ہمیں

''آفاق'' میں ان کاموں کا تجربہ ہو چکا تھا۔اس لئے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ ڈار صاحب کی طرف سے ہمیں ہر قسم کے فیصلے کرنیکی آزادی تھی۔کوئی مشکل مرحلہ درپیش ہوتا تو منصور علی خان سے رجوع کر لیتے۔منصور صاحب کے پاس اس زمانے میں گہرے سرخ رنگ کی کھلی نیش NASH کار تھی۔سنا ہے کہ سارے پاکستان میں اس طرز کی تین ہی کاریں تھیں۔لاہور کی سڑکیں اس زمانے میں کشادہ اور ٹریفک کے ہجوم سے آزاد تھیں۔اسلئے جب ڈار صاحب اور ہم منصور صاحب کے ساتھ اس شاندار کھلی کار میں بیٹھ کر لاہور کی کھلی سڑکوں پر سے گزرتے تو طبعیت خوش ہو جاتی تھی۔لاہور سے باہر جانا ہوتا۔۔۔تو پھر اس کار کی سواری کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔منصور علی خان کے ساتھ ڈار صاحب اور ہم دو تین بار اس کار میں راولپنڈی اور مری بھی گئے تھے۔منصور صاحب خود ہی ڈرائیونگ کرتے تھے اور بہت خطرناک قسم کے ڈرائیور تھے۔بہت تیزی سے کار چلاتے تھے اور بریک اس وقت تک نہیں لگاتے تھے جب تک اس کے لئے مجبور نہ ہو جائیں۔ یعنی دوسری کار،بس یا گڈے کے بالکل نزدیک پہنچ کر ایک دم پوری قوت سے بریک لگاتے تھے تو آس پاس کی فضا ان کی کار کے ٹائروں کی ''چڑچراہٹ'' سے گونج اٹھتی تھی۔خاص طور پر راولپنڈی آمدروفت کے سلسلے میں ان کی خطرناک ڈرائیونگ سے ہماری روح خشک ہوتی رہتی تھی۔ڈار صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر منصور علی خان کو مولانا اختر علی خان نے اپنے اخبار سے عاق کر دیا تب بھی وہ کسی سرکس کے ''موت کے کنویں'' میں کار چلا کر پیٹ پالتے رہیں گے۔

ایک بار ہم لوگ سیف الدین صاحب کو لانے کیلئے ان کے گھر گئے۔وہ ان دنوں میکلوڈ روڈ پر رہا کرتے تھے۔گھر پر نہ ملے تو انہیں مختلف چائے خانوں میں تلاش کیا گیا۔آخر وہ کافی ہاؤس میں مل گئے۔ڈار صاحب سے ان کی بہت پیار بھری دوستی تھی۔ڈار صاحب انہیں کار میں ساتھ بٹھا کر دفتر لے آئے۔کار منصور علی خان ہی چلا رہے تھے۔سب سے پہلے تو سیف صاحب نے کار کے سرخ رنگ کو بغور دیکھا اور پھر منصور علی خان سے پوچھا ''کیا آپ اشترا کی ذہنیت کے مالک ہیں؟''

وہ حیران ہو گئے ''جی نہیں مگر آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟''

''آپ کی کار کا سرخ رنگ دیکھ کر''

ڈار صاحب نے کہا" سیف صاحب یہ سرمایہ دار کمیونسٹ ہیں۔ "

سیف صاحب بولے " ہمارے حصے میں تو سب ایسے ہی کمیونسٹ آئے ہیں۔ بد قسمتی دیکھئے کہ ہمیں تو کمیونسٹ بھی خالص نہ ملے۔ "

دفتر پہنچ کر انہیں منصور صاحب کے شاندار کمرے میں بٹھایا گیا اور بہت اچھی قسم کی چائے کا آرڈر دیا گیا۔ سیف صاحب ایک کرسی سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔

منصور صاحب نے بڑی سعادت مندی سے پوچھا" سیف صاحب سفر آپ کو کیسا لگا؟ "

وہ ہنسنے لگے " آپ کے ساتھ تو سفر کر کے میں خدا کے نزدیک ہو گیا ہوں۔ موت کو یاد رکھنے کیلئے ہر روز آپ کے ساتھ کار میں سفر کرنا بہت ضروری ہے۔ "

بر سبیل تذکرہ یہ بھی سن لیجئے کہ "آثار" کا یوم دفاع نمبر نکلنے والا تھا۔ اس زمانے میں اخبارات کے سرورق پر نظم شائع کرنے کا رواج تھا۔ ڈار صاحب کی خواہش تھی کہ سیف صاحب پاکستانی افواج کے حوالے سے ایک نظم "آثار" کے سرورق کے لئے لکھ دیں۔ سیف صاحب حسب عادت وعدہ کر لیتے تھے مگر نظم دستیاب نہیں ہو رہی تھی۔

جب یوم دفاع بالکل نزدیک آگیا تو منصور صاحب نے ڈار صاحب سے کہا" ڈار صاحب لاہور میں ایک سے ایک شاعر موجود ہے۔ کسی اور شاعر سے نظم کیوں نہیں لکھوا لیتے"۔

ڈار صاحب نے جواب دیا۔ " منصور صاحب سیف جیسی نظم کوئی دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ "

" مگر کب؟ کیا یوم دفاع کے بعد یہ نظم شائع ہو گی" منصور صاحب نے کہا۔

ڈار صاحب کچھ دیر سوچتے رہے پھر یہ تجویز پیش کی کہ سیف صاحب کو تلاش کر کے لاتے ہیں اور ابھی نظم لکھوا لیتے ہیں۔

سیف صاحب دستیاب تو ہو گئے تھے اور ہمارے ساتھ دفتر بھی آ گئے تھے۔ مگر نظم کا مسئلہ ابھی تک اٹکا ہوا تھا۔

ڈار صاحب کے اشارے پر منصور علی خان تو کوئی عذر پیش کرنے کے بعد رخصت ہو گئے۔ ڈار صاحب نے چپڑاسی کو بھیج کر سگریٹ کا ایک پیٹ اور ماچس منگا کر سیف صاحب کے سامنے رکھ دیا۔

سیف صاحب نے کہا" یار یہ پیکٹ اٹھالو۔ میں بلاوجہ زیادہ سگریٹ پی جاؤں گا۔ "

ڈار صاحب بولے "سیف صاحب فکر نہ کیجئے یہ سگریٹ بہت دیر تک آپ کے کام آئیں گے۔ "

سیف صاحب نے یہ سن کر ڈار صاحب کو دیکھا۔

وہ بولے" سیف صاحب سگریٹ کا پیکٹ آپ کے سامنے ہے۔ چائے ہر دس منٹ کے بعد آپ کی خدمت میں پیش کر دی جائے گی۔ لیکن اب آپ اس کمرے سے اس وقت باہر جاسکیں گے جب نظم مکمل ہو جائے گی۔ "

سیف صاحب نے گھور کر ڈار صاحب کو دیکھا" ڈار یہ کیا مذاق ہے؟ مجھے بہت سے ضروری کام کرنے ہیں۔ "

"یہ بھی تو ایک ضروری کام ہے "

"میں تمہیں کل ہی نظم لکھ کر بھجوادوں گا "

"گستاخی معاف سیف صاحب ہمارے پاس اب گنجائش نہیں ہے۔ ہمارے اوپر رحم کیجئے اور براہ کرم نظم لکھ دیجئے"۔

یہ کہہ کر انہوں نے ہم سے کہا" آفاقی چلو اٹھو یہاں بیٹھ کر سیف صاحب کو ڈسٹرب نہ کرو۔ "

ہم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

سیف صاحب نے کہا" یار کیسی باتیں کرتے ہو۔ کہہ جو دیا میں کل نظم لکھ دوں گا۔ "

"یہ تو آپ کئی دن سے فرما رہے ہیں۔ پلیز سیف صاحب" یہ کہہ کر ڈار صاحب نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

سیف صاحب منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے رہے۔ ہم دونوں کمرے سے باہر آگئے اور ڈار صاحب نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ کمرے کے باہر چپڑاسی کو ایک کرسی پر بٹھادیا اور کہا" دیکھو جب سیف صاحب اندر سے گھنٹی بجائیں تو دروازہ کھول دینا، اگر انہیں چائے کی ضرورت ہو تو اوپر سے بہت اچھی قسم کی چائے لا کر پلانا"۔

ہم دونوں ڈار صاحب کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہم نے کہا" ڈار صاحب' یہ آپ نے بہت غلط حرکت کی ہے "

انہوں نے ہنس کر کہا" غلط صحیح کی بات نہیں ہے یار۔ ہمیں نظم چاہئے "

ہم نے کہا" مگر اس طرح زبردستی مجبور کر کے تو نظم نہیں لکھوائی جاسکتی۔ "

وہ کہنے لگے " فکر نہ کرو۔ اب ان کا موڈ بن جائے گا۔ چپ چاپ بیٹھ کر گھنٹی کا انتظار کرو۔ "

ہم دونوں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ چند لمحے بعد چپڑاسی کمرے میں داخل ہوا۔ ''وہ آپ کو بلا رہے ہیں جی ''

ہم دونوں کشاں کشاں منصور علی خان کے کمرے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سیف صاحب بڑے آرام سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہے ہیں اور ان کے سامنے میز پر چند کاغذ پڑے ہیں۔ ہم دونوں کو دیکھا تو مسکرائے۔ ہم دونوں ان کے سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کہا'' بھئی یہ نظم تو ہو گئی ہے۔ زیادہ طویل نہیں ہے مگر تمہارا کام چل جائے گا۔ ''

یہ نظم اس قدر جوشیلی ولولہ انگیز اور خوب صورت تھی کہ ہم اس کے سحر میں کھو گئے۔ اس پر سیف صاحب کا سنانے کا انداز۔ وہ تحت اللفظ میں شعر سناتے تھے لیکن نہایت سلیقے اور آہنگ کے ساتھ' انہوں نے نظم ختم کی اور ڈار صاحب کی طرف دیکھا'' کیوں بھئی تمہارا کام چل جائیگا؟ ''

''آپ کا جواب نہیں ہے سیف صاحب'' ڈار صاحب نے بڑے پُر خلوص اور جذباتی انداز میں جواب دیا۔

سیف صاحب کی یہ نظم ''آثار'' کے صفحہ اوّل پر پورے صفحے پر رنگین شائع کی گئی اور اس نے دھوم مچا دی۔ بعد میں یہ نظم بی اے اور ایم اے کے نصاب میں بھی شامل کی گئی۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ معرکہ آرا نظم سیف صاحب نے صرف پندرہ بیس منٹ میں تحریر فرمائی تھی۔ اس نظم کا ایک شعر ہمیں اس وقت یاد آ رہا ہے۔

اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اٹھا

تیرے بیٹے' ترے جانباز چلے آتے ہیں

سیف صاحب کے انتقال سے چندماہ قبل جب ہم ان سے انٹرویو کے سلسلے میں ان کے پاس جایا کرتے تھے تو پرانے زمانے کی یادیں بھی تازہ ہو جاتی تھیں۔ ہم نے ان سے ایک دن کہا'' سیف صاحب یاد ہے آپ سے ظہور الحسن ڈار نے ایک بار اخبار کے لئے کیسے نظم لکھوائی تھی؟ ''

سیف صاحب مسکرائے۔ اپنی موہوم سی نوک دار مونچھوں پر انگلی پھیری اور کہا'' آفاقی صاحب اکثر دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ پرانا دور ایک بار پھر لوٹ آئے۔ جو دن گزر گئے وہی ہمارا سرمایہ ہیں۔ ''

یہ تذکرہ تو یوں ہی نکل آیا تھا۔ ہم روزنامہ ''آثار'' کے زمانے کی باتیں کر رہے تھے۔ ''آثار'' کہنے کو ایک پرانا اخبار تھا مگر ہم لوگ اسے ایک نیا روپ دینا چاہتے تھے۔ اس کی کتابت طباعت' لے آؤٹ' خبروں کی ترتیب اور تدوین کے سلسلے میں اسے ''زمیندار'' کے پرانے انداز سے مختلف بنانے کیلئے ہم نے بہت تدابیر سوچیں اور اختیار کیں۔ ''زمیندار'' کے عملے میں اس قدر ضعیف العمر لوگ بھی شامل تھے جن سے بہتر کام کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی مگر منصور علی خان ان کی گزشتہ خدمات کے باعث انہیں بے روزگار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان میں بعض اصحاب نے مولانا ظفر علی خان کے ساتھ بھی کام کیا تھا اور وضع داری کے خیال سے انہیں بدستور عملے میں شامل رکھا گیا تھا۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ بعض حضرات کو پنشن دے دی گئی اور ایک دو کو دوسری ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ اخبار میں نیا اور نوجوان عملہ رکھنا بھی ضروری تھا چنانچہ ایسے نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا جو وقت کا ساتھ دے سکیں۔ ان میں ایک مسعود اشعر بھی تھے۔ یہ ہمارے گہرے اور بے تکلف دوست تھے اور ''زمیندار'' کے دفتر کے نزدیک ہی ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ اسی فلیٹ میں ان کے ساتھ خلیل احمد (جو بعد میں موسیقار بن گئے) یونس راہی (یہ بعد میں فلمی کہانی نویس اور ہدایت کار بن گئے تھے) اور قمر زیدی بھی رہتے تھے۔ قمر زیدی اس زمانے میں سید شوکت حسین رضوی کے اسسٹنٹ تھے۔ یہ فلم ''گلنار'' کی تکمیل کا زمانہ تھا۔ قمر زیدی بہت لطیفہ باز بلکہ مسخرے آدمی تھے۔ چھوٹا قد' جسم موٹا' بالکل گول مٹول تھے۔ نقلیں اتارنے میں ان کا جواب نہ تھا۔ '' گلنار'' کے سیٹ کا ایک ایک واقعہ اداکاری کے ساتھ بیان کرتے تو ہنستے ہنستے ہم لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ یہ قمر زیدی بعد میں کراچی چلے گئے تھے جہاں انہوں نے پاکستان کی سب سے پہلی بیرون ملک بننے والی فلم '' رشتہ ہے پیار کا'' کی ہدایت کاری کی۔ اس میں زیبا اور وحید مراد نے مرکزی کردار ادا کئے تھے۔ سالگرہ جیسی یادگار اور نغمہ بار فلم کے بھی وہی ہدایت کار تھے۔

مسعود اشعر رامپور کے رہنے والے دراز قد گورے چٹے کم گو آدمی تھے۔ رام پور والوں سے جو روایات وابستہ ہیں مسعود اشعر ان سے بالکل برعکس شخصیت کے مالک ہیں۔ نرم گفتار' شائستہ' بااخلاق' خوش مزاج اور بہت اچھے صحافی اور ادیب' رام پور والوں کے بارے میں سنا تھا کہ وہ بات بات پر چاقو نکال لیتے ہیں۔ مسعود اشعر ایسے نرم مزاج

کہ شاید شیو کرنے کے لئے سیفٹی ریزر سوچ سمجھ کر ہاتھ میں لیتے ہوں گے۔ ہماری ان سے دوستی کو لگ بھگ 53سال تک ہو گئے ہیں مگر آج تک کبھی انہیں غصے میں نہیں دیکھا۔ نہایت مرنجان مرنج انسان تھے۔ ظاہر ہے کہ آج بھی ہیں بلکہ شادی کے بعد کچھ زیادہ ہی مرنجان مرنج ہو گئے ہیں۔ ہم لوگوں میں سب سے پہلے ان ہی کی شادی ہوئی تھی۔ ان کی بیگم بھی رام پور کی ہیں مگر دونوں میاں بیوی میں خوش اخلاقی اور نرم گفتاری کا مقابلہ جاری رہتا ہے۔ انہیں دیکھنے کے بعد رام پور والوں کے بارے میں ہماری رائے یکسر تبدیل ہو گئی۔

روزنامہ ''آثار'' میں ہم نے منیر نیازی کو بھی گھسیٹ لیا تھا۔ منیر نیازی دراصل شاعر پیشہ شخص ہیں۔ ہم نے تو زندگی بھر انہیں شاعری کے سوا کوئی اور کام کرتے نہیں دیکھا۔ ایک زمانے میں ''سات رنگ'' کے نام سے ایک خوبصورت ہفت روزہ نکالتے تھے۔ گاہے گاہے طنزیہ اور مزاحیہ کالم بھی لکھتے رہے مگر یہ سب ان کے وقتی شوق یا مشغلے کہہ لیجئے۔ انہوں نے کبھی جم کر کوئی کام نہیں کیا۔ سوائے شاعری کے۔ شاعری میں وہ ایسے جمے کہ ''زمیں جُنبند نہ جُنبد گل محمد'' والا قصہ ہو گیا۔ شاعر وہ اس زمانے میں بھی تھے اور اچھے شاعر تھے مگر ہمارے ہی کیا' کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ وہ شاعری میں ایک منفرد اور اچھوتا مقام حاصل کریں گے۔
منیر نیازی اس زمانے میں منٹگمری میں رہتے تھے جو آج کل ساہیوال ہے۔ ان کا لاہور آنا جانا اور غائب ہو جانا ایک معمول تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کب لاہور سے غائب ہو جائیں گے۔ کنوارے اور تنہا آدمی تھے۔ لاہور میں اپنے دوستوں اور ایک دو کزنز کے ساتھ مقیم رہتے تھے۔ کئی بار انہوں نے کسی دوست کے اشتراک سے مکان بھی کرایہ پر لیا مگر ان کی لااُبالی طبیعت نے زیادہ عرصے اس گھر میں قیام نہ کرنے دیا۔

منیر نیازی سے ہماری ''صحیح'' ملاقات روزنامہ ''آفاق'' کے زمانے میں ہوئی تھی جب ہم اس اخبار کے سنڈے ایڈیشن کے انچارج تھے۔ لاہور کے لکھنے والوں کے لئے اس دور میں روزنامہ ''امروز'' اور روزنامہ ''آفاق'' دو ایسے اخبارات تھے جو معاوضہ ادا کرتے تھے۔ ''امروز'' میں معاوضہ ساڑھے سات روپیہ فی کالم کے حساب سے دیا جاتا تھا اور کالم بھی اس قدر گنجان کہ لکھنے والا لکھتے لکھتے ہلکان ہو جاتا تھا مگر ایک کالم پورا نہ ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں

''آفاق'' میں ہم فی مضمون پندرہ روپے اور فی غزل یا نظم دس روپے معاوضہ پیش کرتے تھے۔ سعادت حسن منٹو صاحب کے لئے 25 روپے فی مضمون کا خصوصی ریٹ تھا۔ وہ سستا زمانہ تھا اور معاوضہ ادا کرنے کا رواج ہی نہ تھا۔ ان حالات میں امروز اور آفاق کا دم غنیمت تھا۔ آج تو ہر کوئی اس معاوضہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس سے زیادہ تو بندہ روزانہ فقیروں کو خیرات کر دیتا ہے لیکن دس پندرہ روپے کی اُس زمانے میں کافی ویلیو تھی۔ یوں اندازہ لگایئے کہ شیزان جیسے ریستوران میں چائے فی کس چھ آنے میں مل جاتی تھی اور چاہیں تو سارے دن بیٹھے پیتے رہیں۔ خوش لباس ویٹر آپ کے اشارے پر ہر مرتبہ گرم چائے لا کر سامنے رکھ دے گا۔ ایک ڈیڑھ روپے گز کا کپڑا قمیض پاجامے کے لئے مل جاتا تھا۔ بہت اچھا جوتا پندرہ روپے میں دستیاب ہو جاتا تھا جو آج کل پندرہ سو روپے میں بھی نہیں ملتا۔ کسی اچھے ریستوران میں ڈیڑھ دو روپے میں بہت اچھا کھانا کھایا جا سکتا تھا۔ تنور نما ہوٹلوں سے تو چھ آٹھ آنے میں پلیٹ سالن ' دو روٹی اور چائے کا ایک خوش ذائقہ کپ لے کر پیٹ بھرا جا سکتا تھا۔ گوشت 'آٹا' گھی' چینی' ہر چیز سستی تھی۔ ماڈل ٹاؤن سے بس میں تین آنے ادا کر کے مال روڈ پہنچ جاتے۔ چپل ڈیڑھ دو روپے میں خریدی جا سکتی تھی۔ ''ایوننگ ان پیرس'' خوشبو کی منی سی خوبصورت شیشی سوا روپے یا ڈیڑھ روپے میں ملتی تھی جسے ہم ایک مہینے تک استعمال کرتے تھے۔ روزانہ اخبار کی قیمت دو آنے تھی۔ بمبئی کا فلمی جریدہ فلم فیئر چھ آنے میں اور لندن کے ٹٹ بٹس اور ویک اینڈ ویکلی جریدے ساڑھے چار چار آنے میں خریدے جاتے تھے۔ غرضیکہ کہاں تک سنیں گے کہاں تک سنائیں۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ بہت سستا زمانہ تھا۔ اتنا سستا کہ آج اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ آج کے بچے یہ باتیں سن سن کر چپکے چپکے ہنستے ہیں اور ایک دوسرے سے سرگوشی میں کہتے ہیں ''گپ لگا رہے ہیں''۔

اس زمانے میں ہماری منیر نیازی سے ادبی جلسوں میں ملاقات ہوئی اور پھر یہ دوستی میں بدل گئی۔ منیر نیازی سدا کے بے پروا' لاابالی' متلون مزاج آدمی ہیں۔ خدا جانے اپنا خرچ کیسے چلاتے تھے۔ غالباً منٹگمری میں ان کی زمینیں تھیں جن سے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی۔ ان کے دوست بھی بے حد مخلص اور جان نثار تھے۔ پھر یہ کہ خود منیر نیازی کی ضرورتیں بہت محدود تھیں۔ منٹگمری سے لاہور کا بس کا کرایہ ہی کتنا تھا۔ چند آنے۔ جب چاہا بس میں بیٹھے اور لاہور پہنچ گئے۔ یہاں مٹر گشت کیا' دوستوں سے ملے' ادبی جلسوں میں شریک ہوئے اور جب جی میں آئی منٹگمری چلے

گئے۔ منیر نیازی کے مالی حالات و وسائل اور ذریعہ آمدنی کے بارے میں نہ ہم نے کبھی پوچھا۔ نہ انہوں نے بتایا۔ لیکن ہم نے انہیں جب بھی دیکھا خوش لباس' صاف شفاف' چمکتا دمکتا اور شگفتہ ہی دیکھا۔ وہ ہر وقت ہنستے رہتے تھے۔ ہنستے نہیں تھے تو فکر مند نظر آتے تھے۔ انہیں ہر چیز کی فکر تھی۔ ملک کی' قوم کی' نوجوانوں کی' ادیبوں کی' سیاست دانوں کی' بعد میں اس فہرست میں فلمی صنعت بھی شامل ہو گئی تھی۔

وہ اپنے ارد گرد کے حالات سے نالاں اور غیر مطمئن بلکہ بیزار سے رہتے تھے۔ لیکن کچھ کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ان کی اسی فکر مندی' بیزاری اور بے بسی نے ان کی شاعری کی بنیاد رکھی اور انہیں اردو کا ایک بالکل نیا نویلا شاعر بنا دیا۔ وہ جب فکر مند ہوتے تو ان کے سرخ و سفید چہرے پر غم و اندوہ کی پرچھائیاں لرزاں نظر آتیں۔ آنکھوں میں تشویش' پریشانی اور غم و اندوہ کے جذبات جھلکنے لگتے۔ وہ اپنے ارد گرد کے حالات اور ماحول سے سخت غیر مطمئن تھے۔ لوگوں کی پریشانیاں اور مصائب انہیں دکھ میں مبتلا رکھتے تھے۔ ظلم اور ظالم کو وہ صفحہ ہستی پر دیکھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ان جذبات و احساسات کا اظہار وہ کبھی کالموں کے ذریعے اور اکثر اپنے اشعار میں کرتے تھے۔ دراصل منیر نیازی کو ان کی شدت احساس نے شاعر بنایا!

ہم یہ بتا رہے تھے کہ منیر نیازی سے ہماری دوستی ہو گئی تو آفاق کے دفتر میں بھی آنے لگے' جہاں انتظار حسین بھی سعادت حسن منٹو بھی آیا کرتے تھے۔ ناصر کاظمی کا پھیرا بھی رہتا تھا۔ اشفاق احمد کے "داستان گو" کا دفتر بھی ہماری سیڑھیوں کے اندر ہی تھا۔ لاہور کے دوسرے شاعر اور ادیب بھی قدم فرماتے رہتے تھے۔

جب وہ پہلی بار دفتر آئے تو چائے پینے اور تھوڑی سی فقرے بازی کے بعد (نیچے والی دکان سے چھ پیسے میں ایک پیالی چائے تین آنے میں ہاف سیٹ آجاتا تھا) انہوں نے ہم سے پوچھا "آفاقی' سنا ہے کہ تم نظم اور غزل کا معاوضہ بھی دیتے ہو؟"

ہم نے کہا "صرف معاوضہ ہی دیتے ہیں"

"کتنا معاوضہ دیتے ہو؟"

ہم نے بتایا "فی مضمون پندرہ روپے اور فی نظم یا غزل دس روپے"

پوچھا ''ہر ایک کو معاوضہ دیتے ہو؟''

''ہر ایک کو تو نہیں، صرف اس کو دیتے ہیں جس کی تحریر شائع ہوتی ہے۔''

''یار اتنے بڑے سیٹھ کا اخبار ہے اور اتنی کنجوسی۔'' پھر خود ہی بولے ''اگر کنجوس نہ ہوتا تو اتنا بڑا سیٹھ کیسے بن جاتا۔''

اگلی بار انہوں نے ہمیں ایک نظم لا کر دی جس کی اشاعت کے بعد انہیں معاوضہ ادا کر دیا گیا۔ ہم نے دیکھا کہ منیر نیازی کو معاوضے یا پیسوں کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ کافی عرصہ تک غائب رہے۔ پھر ایک دن آئے تو ابراہیم جلیس بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ چند روز کے لئے کراچی سے لاہور آئے تھے۔

منیر نیازی نے کہا ''آفاقی دیکھو تمہارے لئے یہ شکرا لے کر آیا ہوں'' یہ منیر نیازی کا مخصوص انداز کلام تھا۔ بعض الفاظ وہ اپنی گفتگو میں اکثر استعمال کیا کرتے تھے۔ جیسے پیوست زدہ، دیمک زدہ، شکرا، بدبودار، سڑانڈ، تعفن زدہ، بدشکل، دہشت ناک، دہشت انگیز، مکروہ، مسخ چہرے، بدبخت وغیرہ۔

''شکرا'' ان کے نزدیک وہ شخص ہے جو دوسروں کے مال پر نظر رکھتا ہے۔ اپنے دوستوں کو وہ محض مذاق میں ایسے خطابات سے نوازتے۔ ''آفاقی۔ یہ شکرا اتنی دور سے آیا ہے لاہور میں اس کی خاطر بھی کرنی چاہئیے۔''

ہم نے کہا ''انہیں کھانا کھلایا جائے؟''

ابراہیم جلیس قہقہہ مار کر ہنسے اور بولے ''ہم تو گرائپ واٹر پینے والے ہیں۔'' بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ اصطلاح وہ شراب کے لئے استعمال کرتے تھے۔

منیر نیازی نے کہا ''اس کو گرائپ واٹر پلانے کے لئے کچھ رقم کی ضرورت ہے مگر اس وقت میرے پاس کوئی نظم یا غزل نہیں ہے۔''

ہم نے کہا آپ یہ دس روپے قبول فرمائیے''

اس طرح منیر نیازی گاہے بگاہے کسی ضرورت کے تحت ہمارے پاس آجاتے تھے۔ کچھ دیر بیٹھ کر ہنستے ہنساتے تھے اور پھر اپنی تحریر دے کر رخصت ہو جاتے تھے۔ ہم ''آثار'' میں پہنچ گئے تو منیر نیازی کا اس طرف بھی پھیرا لگنے لگا۔ مگر یہ خالص دوستانہ اور مخلصانہ وزٹ ہوا کرتی تھیں اس لئے کہ ''آثار'' میں لکھنے والوں کو معاوضہ ادا کرنے

کارواج نہ تھا۔ منیر نیازی کبھی کبھی ادھر آ نکلتے۔ چائے پیتے گپ شپ کرتے اور رخصت ہو جاتے۔

ایک دن ڈار صاحب نے کہا ''آفاقی' یہ منیر نیازی آج کل کیا کرتے ہیں؟''

ہم نے جواب دیا ''پتا نہیں۔''

کہنے لگے ''اس کو بھی ہم ''آثار'' میں کیوں نہ رکھ لیں۔ یہ بھی کام سے لگ جائے گا۔''

ہم نے کہا ''منیر نیازی کا کام میں دل نہیں لگتا۔ شاعر آدمی ہیں۔''

اگلی بار منیر نیازی ہمارے دفتر آئے تو ڈار صاحب نے یہ تجویز ان کے سامنے رکھی اور کہا کہ کیا حرج ہے اگر تم باقاعدہ صحافت شروع کر دو۔

منیر نیازی نے کچھ دیر سوچا اور پھر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ''کام کیا کرنا ہو گا؟''

ہم نے کہا ''کام بھی تلاش کر لیں گے۔ آپ کل صبح دفتر آ جایئے۔''

نیازی صاحب دوسرے دن ٹھیک وقت پر دفتر آ گئے ''اب بتاؤ کیا کرنا ہے؟'' انہوں اس طرح پوچھا جیسے کے دفتر آ کر انہوں نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

ڈار صاحب نے کہا ''پہلے دفتر کے ماحول سے مانوس ہو جاؤ۔ پھر کوئی ڈیوٹی بھی مقرر کر دیں گے۔''

ابراہم جلیس کے ساتھ کچھ دیر گپ شپ رہی۔ لطیفہ بازی اور گپ شپ میں ابراہیم جلیس بادشاہ تھے۔

منیر نیازی دفتر کے ماحول سے کیا مانوس ہوتے۔ وہ ہر وقت ہمارے کمرے میں ہی بیٹھے چائے نوشی اور گپ شپ میں مصروف رہتے تھے۔ آخر ہم نے انہیں یاد دلایا کہ اب وہ سٹاف ممبر ہیں اور انہیں کام کرنا چاہیئے۔ انہیں نیوز روم میں نیوز ایڈیٹر اقبال صدیقی کے سپرد کر دیا گیا۔ اقبال صدیقی اس سے پہلے '' زمیندار'' میں چیف رپورٹر تھے۔ کافی تجربہ کار آدمی تھے۔ اقبال صدیقی ان سے بخوبی واقف تھے۔ علیک سلیک ہوئی۔ کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں پھر اقبال صدیقی نے انہیں چند انگریزی خبریں ترجمے کے لئے دے دیں۔ کافی اہم خبریں تھیں مگر منیر نیازی صاحب نے چند سطروں میں ان کا نچوڑ نکال کر اقبال صدیقی کے حوالے کر دیا۔

اقبال صدیقی نے طویل انگریزی خبر کو دیکھا۔ پھر نیازی صاحب کے چند سطری ترجمے پر نظر ڈالی اور پوچھا "بھائی یہ آپ نے کیا حال کر دیا خبر کا؟"

بولے "اس میں کام کی بات صرف اتنی ہی تھی۔ باقی تو فضول بک بک ہے۔"

صدیقی صاحب نے ہم سے اور ڈار صاحب سے شکایت کی۔ ہم یہ مسئلہ نیازی صاحب کے رو برو لائے تو انہوں نے کہا "یار یہ بے کار خبریں مجھ سے نہیں ہوں گی' میرا دل نہیں لگتا۔'

ہم اور ڈار صاحب سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اب منیر نیازی صاحب کو کیا کام دیا جائے۔ جس میں ان کا دل لگے۔

ڈار صاحب نے کہا "دیکھو بھئی وہ آزاد منش آدمی ہے۔ اس سے پہلے کہیں جم کر کام نہیں کیا۔ پہلے اسے ہلکا پھلکا کام دینا چاہئیے جو زیادہ مشکل بھی نہ ہو۔"

کافی غور و خوص کے بعد طے پایا کہ فی الحال انہیں "ایڈیٹر کے نام خطوط" کا کالم دے دیا جائے۔ انہوں نے شکائتی خطوط پر نظر ڈالی۔ دو چار کی اصلاح کی۔ باقی خطوط ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیئے۔ ان کا خیال تھا کہ سارے خطوط بے معنی اور فضول ہیں۔ اگلی بار انہیں "اضلاع کے نامہ نگاروں" کی خبریں درست کرنے اور ایڈٹ کرنے کی ذمے داری سونپی گئی۔ یہ خبریں انہوں نے کاٹ پیٹ کر پھینک دیں۔ انہیں کوئی ایک خبر بھی پسند نہیں آئی۔

بولے " یار یہ کیا خبریں ہیں۔ بھینس چوری ہو گئی۔ دو پارٹیوں میں لڑائی ہو گئی۔ شادی شدہ چھ بچوں کی ماں آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی۔ نری خرافات ہیں۔ اس پر زبان غلط' املا غلط' ہجے غلط' یہ بکواس چھاپنے کے قابل نہیں۔"

ڈار صاحب نے انہیں بٹھا کر سمجھایا کہ بھائی اخباروں میں تو یہی کچھ چھاپا جاتا ہے۔ ان ہی خبروں اور خطوط کو لوگ شوق سے پڑھتے ہیں۔ تمہیں نہ بیرون ملک کی خبریں پسند ہیں نہ اضلاع کی خبریں اچھی لگتی ہیں۔ خطوط تمہارے نزدیک بے کار اور بے معنی ہیں۔ آخر تمہیں اور کیا کام دیا جائے؟"

کہنے لگے "یہ تو تم سوچو۔ تم ہی مجھ سے کام کرانا چاہتے ہو" یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

ہم دونوں ابھی سوچنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ ہم دونوں کو لکھنے میں مصروف پایا تو اشارے سے اپنی "انگلیاں" دکھا کر دوبارہ غائب ہو گئے۔ اب ہم اس انتظار میں کہ منیر نیازی صاحب باتھ روم سے لوٹ کر

آئیں توان سے کام کے بارے میں تبادلہ خیال کیا جائے مگر منیر نیازی صاحب لاپتا ہو چکے تھے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دفتر سے باہر نکلے تھے اس کے بعد لوٹ کر نہ آئے۔ ایک دن، دو دن، چھ سات دن گزر گئے اور منیر نیازی کا کوئی اتا پتا نہ لگ سکا۔

ایک ہفتے کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ منیر نیازی مسکراتے ہوئے چلے آرہے ہیں "بھئی آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

کہنے لگے "ذرا منٹگمری چلا گیا تھا"

"منٹگمری؟"

کہنے لگے "یار میرا تو کوئی پروگرام نہیں تھا۔ میں دفتر سے باہر نکلا تو میرا کزن مل گیا۔ وہ منٹگمری جا رہا تھا۔ اس نے مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا۔"

اب غور فرمایئے کہ ایسا لاابالی شخص نوکری کیسے کرے گا!

منیر نیازی سے ہماری ملاقات غالباً 1951ء میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں وہ بھی اخباروں کے دفاتر، چائے خانوں اور ادبی محفلوں میں جایا کرتے تھے اور ہم بھی۔ کیونکہ اس وقت یہی دستور تھا۔ اس وقت منیر نیازی محض ایک ابھرتے ہوئے نئے شاعر تھے۔ ان کے ہم عصر اور بھی بہت سے شاعر تھے جنہوں نے آگے چل کر بہت شہرت و امتیاز حاصل کیا۔ اس عہد میں اردو شاعری کے آسمان پر بڑے بڑے آفتاب و ماہتاب چمک دمک دکھا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ کسی نئے شاعر کے لئے شاعری میں مقام بنانا کوئی آسان کام نہ تھا اور پھر منیر نیازی کے لئے شاعری میں مقام بنانا کوئی آسان کام نہ تھا اور پھر منیر نیازی تو ٹھہرے پٹھان۔ صاف گو اور کھرے آدمی۔ جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ جو رائے قائم کرلی وہ بیان کر دیا۔ ان کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ بیزار بیزار سے ہیں۔ اپنے ماحول سے، شاعری سے، حالات سے، ہر ایک سے وبیزار نظر آتے تھے۔ ان کے دوستوں کی تعداد بہت محدود تھی۔ باقی کو وہ گردانتے ہی نہ تھے۔ لوگوں کے بارے میں ریمارکس پاس کرنا اور ان پر نکتہ چینی کرنا ان کا مرغوب مشغلہ تھا۔

دوسرے شعراء کو بھی بہت مشکل سے مانتے تھے۔ اندازہ لگایئے کہ ایک ایسے شخص کے لئے ادب یا کسی بھی شعبے میں تن تنہا آگے بڑھنا اور نام وری حاصل کرنا کتنا دشوار ہوگا۔ وہ کسی ادبی لابی سے بھی متعلق نہیں تھے۔ بس اپنی ذات ہی

میں کھوئے رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ عادات واطوار یار لوگوں کو پسند نہیں تھیں اور ان کے پسند کرنے والوں کے مقابلے میں انہیں ناپسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بہت سے نقاد' شاعر اور ادیب تو انہیں شاعر ہی نہیں مانتے تھے اور منیر نیازی کا یہ رویہ تھا کہ میری بات مانو نہ مانو۔ میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔
ان کے ہمدرد اور مخلص دوست آپس میں اس بات پر اظہار تشویش کرتے رہتے تھے کہ یہ شخص آگے کیوں کر بڑھے گا اور اپنا مقام اور نام کیسے حاصل کرے گا۔ ہر ایک سے بے نیاز اور بے پروا۔ ہر ایک سے خود کو بالاتر سمجھنے والا۔ کسی بھی شعبے اور معاشرے میں ایسے لوگوں کی ترقی کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔

لوگ مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم آغاز ہی سے منیر نیازی کو شاعر مانتے تھے۔ ان کا طرز اظہار' اسلوب' الفاظ کا انتخاب اونشست و برخاست' ان کے خیالات' سبھی چیزیں دوسروں سے مختلف تھیں۔ جیسے کہ وہ بذات خود دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ یہ نہیں کہ بدمزاج اور مغرور تھے۔ وہ بہت شگفتہ مزاج اور فقرے باز تھے۔ خود بھی ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے حالانکہ یہ ان کا اوپری روپ تھا۔ اندر سے وہ ایک بے حد حساس' دکھی' غم خوار و غمگیں اور آس پاس کے حالات اور انسانوں کی مشکلات پر کڑھنے والے انسان تھے۔ ان کے یہ دونوں روپ بیک وقت سامنے آتے رہتے تھے۔ ابھی اداسی اور غم کا دامن تھامے غمگیں بیٹھے ہیں تو کچھ دیر بھی ہنس رہے ہیں۔ فقرے کس رہے ہیں۔ ان کی ہنسی بے اختیاری بھی تھی اور وہ بے ساختہ کھل کھلا کر ہنستے تھے۔ بالکل بچوں کی طرح 'ان کا یہی انداز آج بھی ہے۔ ہمیں تو وہ ہنستے ہوئے اور لطیفے بازی کرتے ہوئے ہی اچھے لگتے تھے اور ہم دونوں کی کوشش ہوا کرتی تھی کہ بیشتر وقت ہنستے ہنساتے رہیں۔ منیر نیازی کا جوانی کا روپ آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ دراز قد' سمارٹ' سرخ و سفید چہرہ' براؤن بال اور مسکراتی ہوئی شوخ آنکھیں۔ جو دکھ کے ذکر پر غم واندوہ میں ڈوب جاتی تھیں۔ منیر نیازی کے دکھ کا احساس ان کے چہرے اور آنکھوں سے ہو جاتا تھا۔ جب ہنستے تو یوں لگتا جیسے اس چہرے اور آنکھوں پر کبھی دکھ اور تکلیف کے سائے پڑے ہی نہ ہوں۔ آج بھی ان کا یہی عالم ہے۔
منیر نیازی تو اب اس دنیا میں نہیں لیکن اسکی یادیں ہیں کہ آج بھی ذہن پر حملہ آور ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ وہ شخص واقعی

سب کواداس کر گیا ہے۔۔۔دنیامیں اکثرایساہوتاہے کہ کسی ایک شخص کے بزم سے اٹھ جانے سے دنیااداس ہوجاتی ہے۔۔۔لیکن یہ بھی اسی دنیاکارنگ ڈھنگ ہے کہ کسی کے چلے جانے کے باوجود دنیاکاکاروبار چلتارہتاہے۔

دراصل منیر نیازی سے ہماری دوستی کی بنیاد جن بھوت' چڑیلیں اور آسیب بنے تھے۔ہم دونوں بیٹھے اپنے بچپن کے واقعات سنارہے تھے۔تو معلوم ہواکہ کم از کم بھوت پریت ہم دونوں میں قدر مشترک ہیں۔پھر پرانی روایات کا تذکرہ چھڑ گیا۔ پرانی حویلیاں' کھنڈرات' بے در و بام کی یادگاریں' بڑی بوڑھیوں کی داستان گوئی' بڑی بڑی حویلیوں کی بھائیں بھائیں۔اونچے اونچے درختوں کی سائیں سائیں۔دوپہر کا سنّاٹا' جاڑوں کی اداس شامیں' پرانے لوگوں کے طور طریقے۔۔۔ یہ سب ہمارے پسندیدہ اور مشترکہ موضوعات نکلے۔

ہم جب بھی اکٹھے ہوتے دیر تک بیٹھے بچپن کے دنوں کی باتیں کرتے رہتے۔جب ہم اپنے اپنے حصے کے بھوت پریت کے واقعات ختم کر بیٹھے تو ہماری دوستی اور انڈرسٹینڈنگ کا آغاز ہوگیا۔ بچپن کا منیر نیازی پر بہت گہرااثر ہے۔اس کی شاعری شدّتِ احساس اور گہرے مشاہدے کی شاعری ہے۔اس پر اس کا مخصوص انداز بیان۔وہ ایسی چیزوں کے بارے میں شعر کہتاہے جنہیں دوسرے عموماً نظرانداز کردیتے ہیں اور پھر ان کے بارے میں اس کے اظہار کا طریقہ دوسروں سے قطعی مختلف ہوتاہے۔

ہم نے اپنے ملنے والے اور بے تکلف لوگوں میں دو ایسے آدمی دیکھے جنہوں نے اپنے بچپن کی یادوں اور اس ماحول کو فراموش نہیں کیا۔ایک منیر نیازی اور دوسرے انتظار حسین۔دونوں نے اپنی اپنی جگہ شاعری اور افسانہ نگاری میں بہت نام پیدا کیااور اپنے نئے اسلوب اور طرز کے موجد کہلائے۔ مگر منیر نیازی نے ماضی کو یاد ضرور رکھا مگر پس منظر کے طور پر۔جب کہ انتظار حسین نے خود کو انہی یادوں کے حصار میں قید کرلیا۔وہ زیادہ تر بیتے دنوں کا ماتم کرتے رہے ۔منیر نیازی بیتے دنوں کو یاد ضرور کرتے لیکن ان کے کھونے کا نوحہ نہیں کرتے تھے۔ان کو گم گشتہ جنت کا احساس تو تھا لیکن وہ اس کے پانے کی جستجو میں نہیں لگارہتاتھا۔وہ حقیقت پسند تھااور یہ سمجھتاتھاکہ گئے ہوئے دن واپس لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

انتظار حسین کے مانند وہ ہجرت کو یاد کرتا تھا مگر نئی بستیاں بسانے کا بھی آرزومند تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک جنگجو پٹھان تھا۔ ہارنے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ لڑ کر جان دینے کا قائل تھا۔

منیر نیازی نے ساری زندگی شاعری کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں کیا تھا۔ یہی اس کا اوڑھنا بچھونا رہا اور یہی ذریعہ معاش۔ اب تو منیر نیازی مرحوم ہو چکے مگر انکی مقبولیت آج بھی قائم ہے، اس کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔ منیر نیازی نے اس سے پہلے بھی شاعری کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ وہ کچھ عرصے فلموں سے بھی وابستہ رہے مگر یہ عرصہ بہت کم ہے۔

منیر نیازی نے فلمی دنیا کو کبھی پسند نہیں کیا۔ یہی حال فلمی دنیا کا بھی ہے۔ یعنی ناپسندیدگی دوطرفہ تھا۔ نیازی صاحب کو فلم والوں کی بیشتر باتیں ناپسند تھیں جن کا وہ کھلم کھلا اظہار کرتے رہتے تھے۔

فلم سے منیر نیازی کا تعلق زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ منیر نیازی کی غزلوں کی طرف موسیقار حسن لطیف للک نے سب کو متوجہ کیا اور منیر نیازی کی غزلوں کو بڑے سلیقے سے پیش کیا۔ نیازی صاحب کو یہ تو گوارا ہی نہیں تھا کہ کہانی کی سچویشن سنتے اور پھر موسیقار کی طرز کے مطابق گیت یا غزل لکھتے۔ اتنا صبر اور اتنی برداشت اگر ان میں ہوتی تو منیر نیازی کیسے بن جاتے۔ البتہ فلم والوں نے ان کی حسب حال غزلوں کو ڈھونڈا اور انہیں طرزوں کے سانچے میں ڈھالا تو وہ بہت مقبول گانے بن گئے۔

سچ پوچھیئے تو منیر نیازی کی شاعری کو ان کے دوسرے ملنے والوں کی طرح شروع شروع میں ہم نے بھی زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ نیازی صاحب کا یہ حال کہ کبھی اپنی شاعری کا تذکرہ تک زبان پر نہیں لائے۔ شاعر تو لوگوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ اپنا کلام سنائیں اور نیازی صاحب اس معاملے میں بالکل گم صم ہیں۔ وہ دوستوں کی محفلوں میں بیٹھ کر اپنے اشعار سنانے کے عادی نہیں تھے۔ بلکہ اگر فرمائش بھی کی جائے تو ٹال دیتے۔ اس زمانے میں ان کی شعر گوئی کی رفتار بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ باہمی ملاقاتوں میں وہ شاعری سے زیادہ دوسرے موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے تو پھر ان کی شاعری کو۔۔۔ سیریس انداز میں لینے کا کوئی معقول طریقہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو اللہ بخشے حسن لطیف ملک کو جس نے منیر نیازی کو سب سے پہلے فلم والوں کے سامنے جھاڑ پونچھ کر پیش کیا اور جب ان کی غزلیں

تحتُ اللفظ اور پھر ترنم یا موسیقی کے ساتھ سنائیں تو سننے والے توجہ دینے پر مجبور ہو گئے۔

جس نے مرے دل کو درد دیا

اُس شکل کو میں نے بُھلایا نہیں

اور پھر

کیسے کیسے لوگ ہمارے دل کو جلانے آجاتے ہیں

ایسی غزلیں تھیں کہ جب حسن لطیف نے ادیبوں' شاعروں اور فلم والوں کی نجی محفلوں میں سنائیں تو سب ہی داد دینے پر مجبور ہو گئے۔ حسن لطیف للک کی آواز میں سوز بہت زیادہ تھا۔ سُریلے بھی تھے اور آواز بھاری اور رچاؤ لئے ہوئے تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ حسن لطیف کی زبانی منیر نیازی اور دوسرے شاعروں کا جو کلام ہم نے سنا وہ آج بھی کانوں میں گونج رہا ہے۔ بعد میں مہدی حسن جیسے گائیکوں نے بھی ان غزلوں کو گایا مگر ہمارے کانوں میں آج بھی حسن لطیف کی آواز ہی رس گھول رہی ہے۔

اُن دنوں شام اور رات کو اکثر مختلف لوگوں کے گھروں پر مجلس آرائی ہوا کرتی تھی جس میں بے تکلف دوست احباب' شاعر' ادیب' صحافی اور فلم والے شریک ہوا کرتے تھے۔ ایسا ہی ایک حلقہ تنویر نقوی صاحب اور علاؤالدین صاحب کے گھروں میں بھی موجود تھا۔ فلم ساز و ہدایت کار لقمان کے گھر پر بھی لوگ اکٹھے ہوتے۔ تنویر نقوی' علاؤ الدین' ریاض شاہد' رشید عطرے 'طالش' آئی اے رحمان' خلیل قیصر' رضا میر جیسے لوگوں کی یہ مجلس آرائی معمول میں داخل تھی۔ حسن لطیف نے زیادہ تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی مگر ادب اور شعر کا ذوق بہت اعلیٰ پایا تھا۔ شاعروں ادیبوں کی صُحبت میں رہنے کی وجہ سے اس ذوق کو مزید جلا ملی۔ اچھا شعر اور اچھی دُھن یا اچھا راگ حسن لطیف کی کمزوری تھی۔ بلکہ ہر اچھی چیز ان کی کمزوری تھی۔ کسی کو خوش رنگ' اچھے تراش خراش کے لباس میں دیکھا تو جھٹ تعریف کر دی۔

''آفاقی صاحب' آپ فان کلر کا سوٹ پہن کر بس سے اُترے تو میرا جی خوش ہو گیا۔ سلائی بھی بہت اچھی ہے۔ کہاں سے سلوایا ہے؟'' ان کا کہا ہوا فقرہ آج بھی ہمارے حافظے میں محفوظ ہے۔ وہ ہر اچھی چیز کی دل کھول کر تعریف

کرتے تھے۔ خود بھی موسیقار تھے مگر دوسروں کی طرزوں کو بھی خوب سراہتے اور داد دیا کرتے تھے۔
حسن لطیف للک نے منیر نیازی کی غزلیں اس کثرت سے سنائیں کہ خلیل قیصر اور ریاض شاہد ان کا نوٹس لینے پر مجبور ہو گئے۔
مذکورہ بالا دونوں غزلوں کو حسن لطیف ہی نے دھنوں میں ڈھالا ہے۔ ان کی ایک پسندیدہ غزل یہ بھی تھی۔
اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو
خوب لہک لہک کر گاتے اور مزہ لیتے تھے' یہ غزل خلیل قیصر نے اپنی فلم ''شہید'' میں استعمال کی۔ اس کے موسیقار عطرے تھے۔ بڑے ہنرمند موسیقار تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ حسن لطیف نے اس غزل کی جو طرز بنائی تھی' رشید عطرے بھی اس کے آس پاس ہی رہے۔ بات یہ ہے کہ اس کے سوا بھرپور شدت اور رچاؤ پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ سوز و گداز کی جو کیفیت اس غزل میں ہے حسن لطیف نے دھن بھی ویسی ہی بنائی تھی۔ مجبوراً رشید عطرے کو بھی اسے اپنانا پڑا۔ یہ نہیں کہ عطرے صاحب بذاتِ خود کوئی موزوں دُھن نہیں بنا سکے تھے، وہ تو اس وقت بھی مانے ہوئے موسیقار تھے۔ یہ ان کی بڑائی تھی کہ حسن لطیف للک کی طرز سے استفادہ کیا اور حسن لطیف للک کی عظمت دیکھئیے کہ کبھی اس طرز پر اپنا حق نہ جتایا اور نہ ہی کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کیا۔ یہ بات صرف ان افراد تک ہی محدود تھی جنہوں نے خود حسن لطیف کی زبان سے یہ غزل سنی تھی۔
کیسے کیسے لوگ ہمارے دل کو جلانے آجاتے ہیں۔
ایک بھرپور طرح دار غزل ہے۔ اس میں ایک عجیب ہمہ گیری اور کیفیت ہے۔ حسن لطیف کی زبان میں گائی ہوئی یہ غزل اور اس کی طرز آج بھی ہمیں حرف بہ حرف یاد ہے۔ غزل کے ابتدائی اشعار اس طرح ہیں۔

کیسے کیسے لوگ ہمارے دل کو جلانے آجاتے ہیں
اپنے اپنے غم کے فسانے ہمیں سنانے آجاتے ہیں
اُن کے بنا میں جی نہیں سکتا اس بے درد زمانے میں
میری یہ مجبوری مجھ کو یاد دلانے آجاتے ہیں

حسن لطیف نے ایسی دُھن بنائی کہ ایک ایک لفظ کے تاثر اور مفہوم کا حق ادا کر دیا۔ منیر نیازی نے بعد میں ''کلیات منیر'' میں یہ غزل تبدیلی کے ساتھ شامل کی ہے۔ مثلاً کلیات میں یہ شعر اس طرح ہے۔

جب بھی گھر کی چھت پر جائیں ناز دکھانے آجاتے ہیں

کیسے کیسے لوگ ہمارے جی کو جلانے آجاتے ہیں

شاید منیر نیازی کو پچھلی غزل اچھی نہیں لگی ہو گی جو انہوں نے اس میں تبدیلی ضروری سمجھی اور اشعار کو نیا جامہ پہنا دیا مگر ہمیں حسن لطیف والی غزل ہی آج بھی پسند ہے اور یاد بھی ہے۔

ایک دن تنویر نقوی صاحب کے گھر گئے تو محفل سجی ہوئی تھی۔ فلم وادب کی دنیا کے بڑے بڑے لوگ شریک محفل تھے۔ کھانے کے بعد حسب معمول حسن لطیف ملک ہار مونیم سنبھال کر بیٹھ گئے اور ایک غزل چھیڑ دی۔

جس نے مرے دل کو درد دیا

اُس شکل کو میں نے بُھلایا نہیں

ایک تو غزل کے اشعار' اس پر حسن لطیف کی ادائیگی اور الفاظ کی ترتیب۔ ایک سماں بندھ گیا۔ ہر کوئی پوچھنے لگا کہ کس کی غزل ہے؟ حسن لطیف نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر جواب دیا ''منیر نیازی کی''

اس طرح منیر نیازی کی ایک اور غزل فلمی حلقوں میں متعارف ہوئی اور پھر ایک فلم میں بھی پیش کی گئی۔

حسن لطیف للک ایک خوش شکل' خوش پوش اور خوش ذوق انسان تھے۔ تنویر نقوی اور علاؤالدین' ریاض شاہد' طالش کی محفلوں میں اکثر بلکہ ہمیشہ نظر آیا کرتے تھے۔ بہت منکسر المزاج انسان تھے۔ دھن بنانے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ آرکسٹرا پر اتنا عبور نہ تھا۔ اتنے مشہور معروف موسیقاروں کو اس فن میں مہارت کہاں تھی؟ یہ کام عموماً سازندے ہی کیا کرتے تھے۔ اس دور میں سازندے بھی ایسے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینے۔ ان میں سے کئی موسیقار بن گئے اور خوب نام کمایا۔ تصدّق حسین' رحمان ورما' نذیر علی' طافو جیسے نام یاد آرہے ہیں۔ باقی بھی اپنے ایسے ہنرمند اور ماہر فن تھے کہ اساتذہ میں شمار ہوتا تھا۔

حسن لطیف کے انکسار اور خاموشی نے فلم والوں کو ان کی طرف متوجہ نہیں کیا ورنہ بڑے نامور موسیقار ہوتے۔ انہوں نے پاکستان کی ابتدائی فلموں میں بھی موسیقی دی تھی۔ بڑے بے لوث آدمی تھے۔ ہر ایک کے ساتھ مخلص اور ہر اچھی چیز کی کھل کر داد دینے والے۔ شاید اسی لئے زمانے نے ان کی قرارِ واقعی قدر نہ کی۔ اگر وہ گلوکاری بھی کرتے تو آواز کا خوب جادو جگاتے اور بڑے گلوکاروں کی صف ّمیں نظر آتے مگر وہ بس دوستوں کی محفلوں اور من پسند لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ ''سسرال'' اور ''شِکوہ ''میں ان کی موسیقی بالکل علیحدہ انداز کی ہے۔ منیر نیازی کو تیزی سے مقبول کرانے میں حسن لطیف للک کا نمایاں ہاتھ ہے۔ اردو شاعری کی روایت ہے کہ شعراء کی عظمت اور مقبولیت کا فیصلہ گانے والیاں کرتی ہیں۔ ذوق' غالب' داغ اور دوسرے شعراء کا کلام بھی گانے والیوں اور گلوکاروں کی زبان پر پہنچا تو مقبول عام ہوا۔ ورنہ اس زمانے میں نہ تو ادبی رسائل تھے نہ ٹیلی وژن اور ویڈیو۔ مشاعرے بھی بہت کم منعقد ہوا کرتے تھے جن میں چیدہ اور چنیدہ ہستیاں ہی شریک ہوا کرتی تھیں۔ مگر سارے برّ صغیر کے طول و عرض میں شاعروں کی غزلیں اور کلام گانے والوں اور گانے والیوں کے ذریعے ہی پہنچا تھا۔

ہمیں یاد ہے، پاکستان بننے کے بعد ہم پہلی بار آغا شورش صاحب کے ساتھ بالا خانے پر گئے تو گانے والی نے فوراً آغا شورش کاشمیری سے اجازت طلب کی اور ان کی غزل پیش کر دی۔ عبدالحمید عدم کی غزلیں بھی کوٹھوں پر بے حد مقبول تھیں۔ انہیں دیکھتے اور پہچانتے ہی وہ ان کی غزل چھیڑ دیا کرتی تھیں ورنہ وہ خود فرمائش کر کے گانے پر مجبور کر دیتے تھے۔ منیر نیازی کا کلام بھی فلموں کے ذریعے پہلے پہل مقبول عام کی دہلیز تک پہنچا تھا۔ حالانکہ اس میں وہ بھڑک' شوخی اور سجاوٹ نہیں ہے جو کہ گانے والوں کو مرغوب ہوتی ہے اور ان کے سامعین کو مسحور کر دیتی ہے۔ وہ تو پھڑکتی ہوئی چیز کی فرمائش کرتے ہیں۔ منیر نیازی کی غزلیں پھڑکتی ہوئی نہیں ہیں البتہ سنجیدہ اور باذوق لوگوں کے لئے ان میں بہت دلکشی اور جاذبیّت ہے۔

ہمارے اور منیر نیازی کے درمیان جن بھوت اور بچپن کی داستانوں کے علاوہ ایک قدر مشترک خوشبو بھی رہی ہے۔ منیر نیازی کو ہم نے عموماً سادہ لباس پہنے دیکھا لیکن صاف شفّاف اور اچھی تراش کا۔ گرمیوں میں وہ سفید رنگ کے قمیض پتلون یا شلوار قمیض کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر بہت جامہ زیب آدمی تھے۔ ان کا سراپا اور شخصیت ہر لباس میں سجتا۔

خوشبوان کی بھی کمزوری تھی۔اُس زمانے میں یہ غنیمت تھا کہ خوشبو آج کی طرح ہوش رُبا حد تک مہنگی نہ تھی۔فرانس سے امپورٹ کی ہوئی ننھی منی سی ”ایوننگ اِن پیرس“ کی شیشی ڈیڑھ روپے میں آجاتی تھی۔ہم دونوں بیڈن روڈ کی ایک دکان سے یہ شیشی خرید کو پتلون کی سامنے کی ریزگاری والی چھوٹی جیب میں رکھ لیتے تھے۔بوقت ضرورت منہ ہاتھ دھو کر انگلی کی مدد سے یہ خوشبو کپڑوں پر لگا لیتے تھے۔سب پوچھتے رہ جاتے کہ یار کون سی خوشبو لگائی ہے۔ بڑے غضب کی ہے۔خوشبوئیں' خصوصاً مغربی خوشبوئیں اس وقت اتنی عام نہ ہوئی تھیں۔چند معروف نام تھے۔اس کے آگے معلومات نہ ہوتی تھیں۔یہ ڈیڑھ روپے کی شیشی ہم دونوں بہت سینت کر رکھتے تھے اور بڑی کفایت شعاری سے دس پندرہ دن چلا لیتے تھے۔

خوشبو کے ذکر پر یاد آیا کہ عطر کی خوشبو بھی اس وقت تک متروک یا آؤٹ آف ڈیٹ نہیں ہوئی تھی۔لوگ عطر بھی استعمال کرتے تھے۔عطر خس 'عطر چنبیلی' عطر گلاب کی چھوٹی شیشی دس بارہ آنے میں دستیاب ہو جاتی تھی۔ یہ مغربی خوشبو کے مقابلے میں زیادہ دیر تک چل جاتی تھی۔

جن دنوں ہم ”آثار“ میں کام کر رہے تھے تو ایک عطر فروش اپنی صندوقچی لے کر دفتر میں آ گئے۔خاصا گہرا کالا رنگ مگر ناک نقشہ بہت سجل' بڑی بڑی آنکھیں جن میں سُرمہ بڑے انہماک سے لگاتے تھے۔کُھلی موری کا پاجامہ اور کھلا کلی دار کرتہ پہنے تھے۔سر پہ کپڑے کی ٹوپی' کندھے پر رومال' پہلی بار دفتر میں داخل ہوئے تو سارا دفتر مہک اٹھا۔ سب ہی چونک پڑے کہ یہ خوشبو کہاں سے آئی۔ اتنے میں عطر فروش بھی بنفس نفیس تشریف لے آئے۔چپڑاسی بڑے احترام سے انہیں لے کر آیا۔انہوں نے بڑی لچھّے دار تقریر فرمائی اور عطر کی خوبیاں بیان کرنے کے بعد پٹاری کھول کر بیٹھ گئے۔ان کا یہ دستور تھا کہ ہر خوشبو انگلی میں لگا کر اپنے ہاتھ پر لگاتے اور سونگھا دیتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ ان کی ذات مختلف عطریات کی کاک ٹیل بنی رہتی تھی۔ جس طرف سے نکل جاتے تھے کوچہ و بازار اور دفتر مہک اٹھتے تھے اور کافی دیر تک مہکتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنا نام صوفی محمود یا اسی طرح کا بتایا تھا۔ہمیں صرف صوفی صاحب یاد رہا۔ہماری عمر اس وقت انیس بیس سال رہی ہو گی۔وہ دوگنی عمر کے تھے مگر صحت منداور بھاری جسم کے مالک تھے۔نہ نہ کرتے ہوئے بھی انہوں نے چند شیشیاں ہمارے ہاتھ فروخت کر دیں۔شمامتہ العنبر' اماں کی پسندیدہ خوشبو

تھی۔ ہم نے گھر جا کر اماں کی خدمت میں دو شیشیاں تحفہ پیش کیں اور ان کی دعائیں لیں۔ اس کے بعد اماں کی فرمائش بھی شامل ہو گئی اور ہم ان کے مستقل گاہک بن گئے۔ منیر نیازی صاحب نے بھی ان سے عطر خریدے۔ مشکل یہ ہے کہ سفید لباس پر عطرے کے رنگ کا داغ پڑ جاتا ہے شاید آج کل عطر کے متروک ہونے کا ایک یہ سبب بھی ہے۔

ہم ''آثار'' چھوڑ کر چلے آئے۔ ظہور الحسن ڈار صاحب نے بھی اسے خیر باد کہہ دیا تھا۔ انہوں نے اپنا ہفت روزہ ''ایشیاء'' نکال لیا۔ کچھ دنوں بعد ''آفاق'' دوبارہ نکلا تو ہم وہاں پہنچ گئے۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ عطر والے صوفی صاحب چلے آرہے ہیں۔ ہم نے عطر خریدا تو دوسرے حضرات بھی آگئے۔ اس کے بعد تو صوفی صاحب نے جیسے گھر ہی دیکھ لیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چلے آتے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ ہمیں اب جدید پرفیوم کا مزہ پڑ گیا تھا پھر بھی صوفی صاحب سے کچھ شیشاں عطر کی خرید لیتے تھے مگر کہاں تک خریدتے۔ لوگوں کو تحفے میں دینے لگے مگر عطر کا دور لد گیا تھا۔ یہ تحفہ بھی بے حیثیت ہو کر رہ گیا۔ مگر صوفی صاحب کا دل رکھنا تھا۔ منیر نیازی تو کبھی کبھی قابو میں آ جاتے تھے۔ اے حمید بھی مشکل ہی سے پکڑے جاتے تھے مگر انتظار حسین صاحب اور ہم ان کے مستقل اور آسان شکار تھے۔ گھڑے کی مچھلی سمجھ لیجئیے۔ جب چاہا پکڑ لیا۔ صوفی صاحب باذوق اور دلچسپ آدمی تھے۔ پرانے لوگوں کے بے شمار واقعات اور ہزاروں اشعار نوک زبان پر تھے۔ ہم بھی کام چھوڑ کر ان کے ساتھ باتوں میں لگ جاتے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا عطر کی مانگ کم ہوتی گئی۔ صوفی صاحب کو اس کے سوا کوئی ہنر نہ آتا تھا۔ کئی بار دبی زبان سے انہوں نے حالات کی تنگی کی طرف اشارہ کیا۔ ہم سے جہاں تک بن پڑتا تھا عطر خرید لیا کرتے تھے مگر اس کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

''آفاق'' سے کنارہ کش ہو کر ہم فلمی کوچے میں چلے گئے اور صوفی صاحب بھی قصہ پارینہ ہو گئے۔

ایک دن انتظار حسین صاحب اور ضیاء الاسلام انصاری سے ملنے کے لئے ''مشرق'' کے دفتر میں گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ صوفی صاحب براجمان ہیں۔ اب ان کے بالوں اور داڑھی میں سفیدی غالب آگئی تھی۔ وہ خضاب کی جگہ بالوں اور داڑھی پر مہندی لگایا کرتے تھے۔ ہمیں دیکھا تو خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ بڑے خلوص سے بغل گیر ہوئے۔ حال احوال پوچھتے رہے اور دعائیں دیتے رہے۔ پھر پوچھا'' آفاقی صاحب' آپ کے فلم والوں کو خوشبو کا

شوق نہیں ہے؟“

ہم نے کہا”صوفی صاحب وہ پرفیوم استعمال کرتے ہیں“

بولے ”آپ ایک بار مجھے ملادیجئیے ساری ہیر وئنیں عطر کی خریدار ہو جائیں گی۔ یہ بتایئے آپ کا دفتر کہاں ہے؟“

انتظار حسین نے اشارہ کیا کہ ہر گز نہ بتانا ورنہ مارے جاؤ گے۔ان دنوں ہمارا کوئی ایک دفتر تو تھا نہیں۔ جس کی کہانی لکھی بس وہی دفتر ہو گیا۔ صوفی صاحب سے چار چھ عطر کی شیشیاں خرید کر ہی چھٹکارا ملا۔ان میں سے کچھ ہم نے امّاں کو دے دیں۔ مگر صوفی صاحب کا اصرار تھا کہ کسی ہیر وئن کو بھی یہ عطر دیجئیے گا۔ آپ ہی کا کلمہ پڑھنے لگے گی۔ خیر ‘ ہم نے اس مشورے پر تو عمل نہیں کیا مگر پھر یہ معمول ہو گیا کہ جب کبھی ”مشرق“ کے دفتر میں صوفی صاحب سے ملاقات ہوتی تھی، عطر کی شیشیاں ضرور خریدنی پڑتی تھیں۔

دیکھتے دیکھتے صوفی صاحب بوڑھے ہو گئے۔ ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر ہو گئی۔ قویٰ مضمحل ہو گئے مگر وہی حلیہ اور وہی کرکراتی ہوئی آواز۔ کافی عرصے بعد ایک بار ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اولاد کوئی ہے نہیں۔ آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں بلکہ ان میں موتیا اُتر آیا ہے۔ کاروبار بھی مندہ ہے۔ ہم نے ان سے نہ صرف عطر خریدا بلکہ انہیں کچھ رقم بھی پیش کی۔ انتظار صاحب بھی انہیں ہر ملاقات پر کچھ نذر کر دیا کرتے تھے۔ وہ بیمار بھی رہنے لگے تھے مگر جب بھی موقع ملتا ”مشرق“ کے دفتر ضرور آتے تھے۔ ایک بار ہم وہاں گئے ہوئے تھے تو انہیں بہت کمزور اور بیمار پایا۔ ہم نے ان کا پتا لے لیا اور ہر ماہ ایک رقم انہیں ارسال کرنے لگے۔ غالباً انتظار حسین بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ ایک روز ایک جوان العمر شخص ہمیں تلاش کرتا ہوا آیا اور صوفی صاحب کا پیغام دیا کہ وہ بہت بیمار ہیں۔ کوئی سہارا نہیں۔ محلے دار تھوڑی بہت مدد کر دیتے ہیں۔ آپ کو سلام کہا ہے اور دعا میں یاد رکھنے کی درخواست کی ہے۔

یہ سن کر ہم بہت دیر تک اداس رہے۔ پھر اس نوجوان کو کچھ رقم دی۔ اس نے بتایا کہ صوفی صاحب اب کسی اور گھر میں رہتے ہیں خود کرایہ ادا نہیں کر سکتے۔ ان کا پتا بدلتا رہتا ہے۔ نوجوان نے ہمیں اپنا پتا بتا دیا اور باقاعدگی سے ہر ماہ صوفی صاحب کو رقم بھیجتے رہے۔ ہم ایک بار انتظار حسین صاحب سے ملاقات میں صوفی صاحب کا ذکر آیا تو وہ بولے ”یار آفاقی۔ ہمیں تصدیق تو کرنی چاہیئے کہ یہ رقم واقعی صوفی صاحب کو ملتی بھی ہے یا نہیں؟“

ہم نے کہا”انتظار صاحب‘ اللہ بہتر جانتا ہے۔انہیں جا کر تلاش کرنا بھی ایک مرحلہ ہے۔وہ نوجوان دیکھنے میں تو ایماندار اور مخلص لگتا ہے۔“

کچھ وقت اور گزر گیا۔ایک دن ہمیں نامانوس سی تحریر میں ایک لفافہ موصول ہوا۔کھول کو پڑھا تو ٹوٹے پھوٹے حروف میں چند سطور لکھی تھیں۔یہ خط اسی نوجوان کی جانب سے تھا۔اس نے اطلاع دی کہ صوفی صاحب عطر والے کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپ کو یاد کر رہے تھے۔

اللہ صوفی صاحب کو غریقِ رحمت کرے۔ہم نے چند مختصر لمحات کے سوا کبھی انہیں آزردہ نہیں دیکھا۔جب ذرا رنجیدہ ہونے لگتے تو فوراً داغ یا ذوق کا ذکر چھیڑ دیا کرتے تھے اور وہ ان کے اشعار میں کھو جاتے تھے۔قدیم شعراء کے کلام کے وہ حافظ تھے۔انہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر گلستاں ‘بوستاں‘ فسانہ عجائب‘ فسانہ آزاد اور طلسم ہوشربا جیسی کتابیں نہ صرف پڑھ چکے تھے بلکہ ان کے اقتباسات بھی سنایا کرتے تھے۔ان کی وفات کے بعد انتظار حسین صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ صوفی صاحب کے انتقال کی خبر انہیں بھی خط کے ذریعے موصول ہو گئی تھی۔بہت دیر تک ہم مرحوم کی باتیں کرتے رہے۔وہ ایک ہنر مند اور کاریگر آدمی تھے۔عطر بنانے میں مہارت رکھتے تھے۔مگر نئے زمانے کی پرفیومز کا ریلا آیا تو نہ ان کے عطر رہے‘ نہ صوفی صاحب‘ رہے نام اللہ کا۔

منیر نیازی کے ذکر سے صوفی صاحب کے تذکرے پر پہنچ گئے۔انسان کے خیالات پر کسی کا پہرا نہیں ہو سکتا اور ان کی رسائی فلک تک ہوتی ہے۔نہ کوئی روک ٹوک نہ فاصلے کی دقت۔ایک لمحے میں اشہبِ خیال یورپ سے افریقہ اور جاپان سے امریکا جا پہنچتا ہے۔یہ اللہ کی ایک ایسی نعمت ہے جس پر کوئی حکومت نہ تو پابندی لگا سکتی ہے اور نہ کوئی ٹیکس عائد کر سکتی ہے۔جن لوگوں کی زندگی میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔خیال آرائی کے طفیل وہ کچھ اچھا وقت گزار لیتے ہیں۔اللہ کی کن کن نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے؟

خیر باتیں ہو رہی تھیں منیر نیازی کی،ہم نے ان میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں دیکھی تھی۔سوائے عمر کے۔بال سفید

ہو گئے تھے مگر چہرہ ویسا ہی سرخ و سفید تھا۔ باتوں میں بھی وہی کاٹ اور طنطنہ تھا۔خیال کی پرواز میں بھی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی تھی حالانکہ صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔چند سال پہلے ان کی بیگم وفات پا گئیں۔ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ منیر نیازی نے دوسری شادی کر لی۔ایک تنہا شخص توجہ اور دیکھ بھال کا محتاج ہوتا ہے۔اگر وہ یہ نہ کرتا تو کیا کرتا؟

اب ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ہماری ''فیملی میگزین'' کی ٹیم منیر نیازی صاحب کی بیگم سے انٹرویو لینے گئی تو نیازی صاحب بھی وہیں تشریف فرما تھے۔انٹرویو کا عنوان تھا ''بیگم کی زبانی'' بڑے لوگوں کی بیگمات کا اپنے معروف شوہروں کے بارے میں کیا خیال ہے اور بطور شوہر وہ کیسے ہیں؟اس فیچر کا یہی لب لباب ہے۔بیگم نے منیر نیازی کی گھریلو زندگی کے بہت سے دلچسپ پہلو بیان کئے۔پھر ایک دلچسپ بات بھی سنائی۔کہنے لگیں'' مجھ سے شادی کے بعد منیر نیازی صاحب نے گھر میں بہت سی چیزیں تبدیل کر دیں۔صوفہ' کرسیاں' پردے 'قالین' ان کے کہنے پر پبلشر نے سبھی کچھ مہیا کر دیا۔مگر میں نے دیکھا کہ ہر چیز سیکنڈ ہینڈ ہے۔مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے نیازی صاحب سے کہا'' کیا میری قسمت میں سب سیکنڈ ہینڈ چیزیں ہی لکھی ہیں؟''

نیازی صاحب نے فوراً اپنے پبلشر کو فون کیا اور کہا کہ فوراً یہ سامان بدل کر نیا سامان فراہم کیجئے۔

نیازی صاحب کی پہلی بیگم سے تو ہمیں شرف ملاقات حاصل نہیں ہوا تھا۔مگر ان دونوں کی گھریلو زندگی بے حد خوشگوار تھی مگر اولاد سے محروم ہے۔

چند سال پہلے ہم اپنی بیگم کے ہمراہ نیازی صاحب کے گھر گئے تو انہوں نے بڑے شوق اور اہتمام سے اپنا مختصر سا باغیچہ اور لائبریری دکھائی۔نئی بیگم نے چائے پانی سے تواضع کی۔وہ ایک سیدھی سادی خاتون ہیں۔شعر فہم تو نہیں ہیں مگر شاعر کو سمجھتی ہیں۔وہ فکر سخن یا تحریری کاموں میں مصروف ہوتے تو مطلق ڈسٹرب نہیں کرتیں۔وہ کہتی ہیں کہ میں سنتی ہوں کہ نیازی صاحب بہت بڑے اور مشہور شاعر ہیں۔لاکھوں لوگ ان کے مدّاح ہیں۔مجھے ایک نامور اور بڑے شخص کی بیوی ہونے پر فخر ہے۔مگر میرے لئے تو وہ صرف ایک بہت اچھے مہربان اور عظیم شوہر ہیں۔نیازی صاحب اولاد سے محروم رہے۔مگر شاعری کی درجنوں کتابیں ہی ان کی اولاد کا درجہ رکھتی ہیں۔

یہ داستان محض یادوں کے سہارے لکھی جارہی ہے اسلئے غلطیوں اور بھول جانے کا امکان بھی نظرانداز نہیں کیا جاتا۔ فلم ’’سزا‘‘ کے تذکرے میں ہم نے مال روڈ کے پان فروش کا ذکر کیا تھا۔ بے خیالی میں ان کا نام بندوخاں لکھ گئے حالانکہ جب سے ہم لاہور آئے ہیں‘ اسی پان کی دکان سے ہمارا واسطہ پڑا ہے۔ اب تو سالہا سال سے وہاں سے کچھ نہیں خریدا لیکن اس کے سامنے سے اکثر گزر ہوتا رہتا ہے۔ ان صاحب کا نام مولا بخش تھا اور ان کی شہرت چار دانگ عالم میں تھی۔ آج بھی لاہور کے رہنے والوں کے علاوہ جو کوئی لاہور آتا اس شہر کی دیگر یادگاروں کے ساتھ ساتھ انہیں مولا بخش کی دکان پر لے جاکر پان ضرور کھلایا جاتا ہے۔ آج بھی ہر وقت اس دکان کے سامنے کاروں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ مولا بخش کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے بیٹے اب یہ دکان سنبھالتے ہیں اور بہت خوش بھی ہیں۔ سنا ہے کہ اس دکان کی بدولت وہ صاحب جائیداد بھی ہیں اور دوسرے کاروبار بھی کرتے ہیں۔ جس زمانے میں ہمارا مولا بخش کی دکان سے پہلے پہل تعارف ہوا تھا تو وہاں کاروں کا گزر بہت کم تھا۔ کاریں شہر میں تھیں ہی کتنی۔ البتہ سائیکل سوار‘ تانگے سوار اور پیدل حضرات کا یہاں ہر وقت جمگھٹا رہتا تھا۔ یہ دکان دراصل مال روڈ اور لارنس روڈ کے اتصال پر ہے۔ یوں سمجھئے کہ لارنس روڈ‘ مال روڈ اور ٹمپل روڈ (اب حمید نظامی روڈ) جہاں ملتی ہیں اس تکون پر مولا بخش کی دکان واقع ہے۔ اب یہاں نئی عمارتیں اور پلازا بھی تعمیر ہو چکے ہیں مگر مولا بخش کی دکان اپنی جگہ بدستور موجود ہے۔ کسی زمانے میں یہاں بس سٹاپ تھا۔ آج جہاں فیصل مسجد ہے وہاں گھاس کا تختہ ہوا کرتا تھا۔ بس کے انتظار میں لوگ یہاں کھڑے رہتے تھے۔ تانگے والے بھی منڈلاتے رہتے تھے۔ یہاں سگریٹ اور پان خریدنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔

’’سزا‘‘ کا احوال پڑھنے کے بعد کئی حضرات نے اس غلطی کی طرف ہماری توجہ دلائی۔ ملتان سے ایک نوجوان خاص طور پر لاہور آئے اور بندو پان فروش کی دکان تلاش کرتے رہے۔ پھر انہوں نے گھر آکر ہمیں بتایا کہ صاحب وہاں تو بندو نامی کسی پان فروش کی دکان نہیں ہے۔ ہم نے معذرت کی اور تصحیح کردی۔

اداکارہ روزینہ کے بارے میں ہم نے لکھا تھا‘ کافی عرصے سے ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ ایک مہربان خاص طور پر ہم سے ملنے کیلئے لاہور آئے اور ہمیں روزینہ کے بارے میں خاصی افسردہ کرنے والی خبریں سنائیں۔ انہوں نے بتایا کہ روزینہ نے اداکاری ترک کردی تھی اور ساؤنڈ ریکارڈسٹ رفعت

قریشی سے شادی کرلی تھی۔ رفعت قریشی صاحب کے مالی حالات خراب ہو گئے تھے۔ پھر ایک طویل بیماری کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان دونوں کی اولاد میں ایک بیٹی ہے جس کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اسلام آباد یا راولپنڈی میں رہتی ہے۔ روزینہ بدستور کراچی میں مقیم ہیں لیکن خاصے ناگفتہ بہ حالات ہیں۔ ان ہی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ سندھی مسلم سوسائٹی والے جس فلیٹ میں ہم نے روزینہ سے فلم سائن کرنے کیلئے ملاقات کی تھی، روزینہ کی ممّی نے وہ فلیٹ فروخت کر دیا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق ممّی، روزینہ کی حقیقی والدہ نہیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ روزینہ کو اپنی کمائی میں سے کچھ بھی نہ ملا یہاں تک کہ فلیٹ کی فروخت سے بھی انہیں کچھ نہ دیا گیا۔

یہ بات کہ ممّی روزینہ کی حقیقی والدہ نہیں ہیں ہم نے بھی سنی تھی مگر کبھی تصدیق نہیں کی۔ ان صاحب نے بتایا کہ اب روزینہ گمنامی اور بے سروسامانی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

اس تحریر کے کچھ عرصے بعد ایک دن ہمیں دفتر میں ایک ٹیلی فون موصول ہوا۔ آواز زنانہ تھی۔ انہوں نے کہا
"پہچانئے میں کون ہوں؟"۔

ہم نے کہا "آواز تو سنی ہوئی لگتی ہے لیکن یاد نہیں"۔

انہوں نے بتایا کہ وہ روزینہ ہیں۔ بہت خوشی ہوئی۔ کچھ دیر تک ایک دوسرے کے بارے میں معلومات کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ان کی ہنسی میں وہی پرانی کھنک تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک اخبار میں کام کرتی ہیں۔ فون نمبر بھی بتایا تھا جو ہم سے گم ہو گیا۔ ان کی صاحب زادی پچھلے دنوں (2007ء) میں ٹی وی ڈراموں میں کام کرتی نظر آئیں۔ اسکے بعد ان سے رابطہ نہ ہو سکا۔ لیکن ان کے فون سے بے شمار پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔

پاکستان کی فلمی صنعت میں تعلیم یافتہ لوگوں کی ہمیشہ کمی رہی ہے لیکن یہ حال بھی نہ تھا جو آج دیکھنے میں آ رہا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کا فلمی صنعت میں داخلہ ہی ممنوع کر دیا گیا ہے۔ ابتدائی دور میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ فلمی دنیا میں زیادہ نہیں تھے لیکن پھر بھی ہر شعبے میں تعلیم یافتہ، ذہین اور باشعور لوگ پائے جاتے تھے۔ ایسے عالم فاضل بھی تھے جنہیں مختلف علوم پر دسترس حاصل تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بعض لوگ فلمی صنعت میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے اسباب مختلف ہیں اور ایسے پڑھے لکھے ہنرمند لوگوں کا تذکرہ آپ اس

داستاں میں جگہ جگہ پڑھتے رہیں گے۔ منور ایچ قاسم صاحب کا ذکر ہم سیّد کمال کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ بہت معزز اور قابل خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فلمساز اور ہدایتکار تھے۔ بہت اچھے ایڈیٹر بھی تھے مگر ان کا انداز فکر فلمی صنعت اور فلمسازی کیلئے موزوں نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی ذاتی' خاندانی خوبیوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود پاکستان کی فلمی صنعت کو فیض نہ پہنچا سکے۔ ہم نے ان کے ساتھ ایک فلم میں بطور مصنف کام کیا تھا جس کی روداد تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے۔ افسوس کہ یہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔

منور ایچ قاسم صاحب نے بطور ہدایت کار اور فلم ساز کوئی ایک کامیابی بھی حاصل نہ کی۔ بعد میں وہ فلمسازی اور ہدایتکاری سے تائب ہو کر دوسرے کاروبار میں لگ گئے تھے اور بالآخر پاکستان سے ہجرت کر کے انگلستان چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کی صاحبزادی آغا حسن عابدی کی بیگم تھیں۔ آغا حسن عابدی نے بینکاری کے حوالے سے بڑی دھومیں مچائیں۔ قابل رشک کامیابیاں حاصل کیں اور ان کا قائم کردہ بنک بی سی سی آئی ایک زمانے میں عالمی معیار کا بنک تھا اور دنیا بھر میں اس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن پھر یہ فلک بوس ادارہ ریت کی دیوار کی طرح زمیں بوس ہو گیا اور دنیا بھر میں سکینڈل بن گیا۔ خیر وہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

ہم نے بطور صحافی فلمی دنیا سے تعارف حاصل کیا تو یہاں کچھ اور بھی نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات موجود تھے۔ ان میں سے کچھ نے ناموری اور کامیابیاں حاصل کیں۔ کچھ ناکامی سے دوچار ہوئے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔ پاکستان کی فلمی صنعت میں اکثریت معقول حد تک تعلیم یافتہ لوگوں کی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ہنر مندوں کے ساتھ کام کر کے اعلیٰ تجربہ حاصل کیا تھا اور انہیں کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں۔ پڑھے لکھے حضرات کو ایک تو اپنے تعلیم یافتہ ہونے پر ناز تھا اور وہ احساس برتری میں مبتلا تھے۔ دوسروں کو وہ خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے اور اپنے خیالات اور مفروضوں کو فلموں میں ٹھونسنے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا لیکن پھر بھی انہوں نے سبق حاصل نہ کیا یہاں تک کہ گمنامی کی دھند میں غائب ہو گئے۔ اس زمانے میں زیادہ تر تعلیم یافتہ حضرات ناکام ثابت ہوئے تھے جس کی وجہ سے کم اور بے پڑھے لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل گیا تھا۔ فلم والے عام طور پر کہا کرتے تھے کہ پڑھے لکھوں سے تو اللہ ہی بچائے۔ انہوں نے فلمی صنعت کو بھاری نقصان کے سوا

کچھ نہیں دیا۔ کسی حد تک یہ بات درست بھی تھی۔ ان حضرات کی مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے تعلیم یافتہ لوگ نکو بن کر رہ گئے تھے اور کامیاب حضرات ان پر پھبتیاں کستے رہتے تھے۔ ادھر تعلیم یافتہ طبقے میں یہ رد عمل تھا کہ ہماری فلمی دنیا تو جاہلوں ہی کو راس آتی ہے۔ پڑھے لکھوں کی اس میں گنجائش نہیں ہے۔ حالانکہ یہ دونوں نظریے غلط اور خلاف حقیقت تھے۔ محض اعلیٰ تعلیم ناکافی ہے جب تک کہ متعلقہ کام کے بارے میں معلومات اور تجربہ حاصل نہ ہو۔ اسی طرح کم تعلیم یافتہ ہونا بھی فلمی دنیا میں کامیابی کی سند نہیں ہے۔ یہاں ان لوگوں کی کامیابی کا اوسط تعلیم یافتہ لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ بہر حال یہ مسئلہ ہر زمانے میں فلمی صنعت میں موجود رہا ہے اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، تعلیم یافتہ ہونا فلمی دنیا کیلئے ایک منفی علامت تصوّر کیا جاتا تھا۔

ابتدائی زمانے میں جو پڑھے لکھے حضرات تھے ان میں منور ایچ قاسم، افضل جہانگیر اور مرتضٰی جیلانی سر فہرست تھے اور بد قسمتی دیکھئے کہ ان میں سے کسی نے کامیابی حاصل نہیں کی۔ یہ بھی نہیں ہے کہ انہوں نے بہت اعلیٰ درجے کی فلمیں بنائی تھیں جو عوام میں مقبول نہ ہو سکیں۔ ان کی فلمیں کسی بھی طبقے کو پسند نہ آئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سراسر بنانے والوں کا قصور تھا۔ لیکن ان گنت تعلیم یافتہ لوگ بھی اس صنعت سے وابستہ تھے۔ ڈبلیو زیڈ احمد، خورشید انور، مسعود پرویز، راشد مختار، اقبال شہزاد کے علاوہ بے شمار اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد مختلف شعبوں سے وابستہ رہے ہیں۔

مرتضٰی جیلانی صاحب عربی میں ایم اے تھے۔ انتہائی معقول، شائستہ اور سمجھ دار آدمی تھے۔ باتیں بہت اچھی طرح کرتے تھے اور اپنی قابلیت سے کم از کم ان پڑھوں کو بہت زیادہ مرعوب کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اس زمانے میں ناکامی کے باوجود کئی فلمیں بنانے کا موقع ملا۔ اچھے سرمایہ کار اور فلمساز ان کے حصے میں آئے۔ انہوں نے زیادہ سرمائے سے فلمیں بنائیں پھر بھی ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ وہ آج کل زرعی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔

افضل جہانگیر صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ رہا۔ وہ بھی بہت نستعلیق آدمی تھے۔ ہم نے انہیں جاڑوں میں ہمیشہ شیروانی پہنے دیکھا جس کے بٹن نیچے سے اوپر تک بند ہوتے تھے۔ کھُلے پائنچوں کا پاجامہ یا علی گڑھ پاجامہ پہنتے تھے۔ گرمیوں میں پتلون قمیض پہنا کرتے تھے۔ کم گو تھے۔ انہیں بھی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ افضل جہانگیر صاحب نے فلم "بت تراش" بنائی تھی جس میں منورما اور پران مرکزی کردار تھے۔ جی ہاں مشہور انڈین ویلن پران

پاکستان بننے کے بعد ابتدائی زمانے میں لاہور ہی میں موجود تھے۔ ان کی دوسری فلم ''شرارے'' تھی جس میں راگنی' ہمالیہ والا' ایس گل اور صبیحہ خانم نے کام کیا تھا۔اس فلم کی ہیروئن صبیحہ تھیں۔یہ بھی ناکام ہو گئی تھی۔

خادم محی الدین صاحب نے پاکستان آکر پہلی فلم ''شعلہ'' بنائی تھی۔جس میں انڈیا سے آئے ہوئے ہیرو مسعود' ارشاد اور آشاپوسلے نے کام کیا تھا۔ارشاد سے آپ کسی اور خیال میں نہ رہیئے گا۔یہ ایک اداکارہ تھیں اور چند ابتدائی فلموں میں انہوں نے ہیروئن کے طور پر بھی کام کیا تھا۔افضل جہانگیر صاحب کی فلم ''بت تراش'' میں منورما کے ساتھ ارشاد نے بھی ایک اہم کردار کیا تھا۔منورما ایک شوخ وشنگ اداکارہ تھیں۔قیام پاکستان سے قبل بھی لاہور کی فلموں میں انہوں نے کام کیا تھا اور چلبلے کرداروں کیلئے پسند کی جاتی تھیں۔

خادم محی الدین صاحب کی دوسری فلم ''آواز'' تھی جس میں گلشن آرا' سنتوش کمار' شاہ نواز اور مجید صاحب نے کام کیا تھا۔مجید صاحب بمبئی میں بھی کریکٹر ایکٹر کے طور پر کام کرتے رہے اور پاکستان کی چند فلموں میں بھی انہوں نے کام کیا۔بھاری جسم' بڑی بڑی آنکھوں اور دلکش نقوش کی وجہ سے بہت بارعب اور بھلے لگتے تھے۔ان کی آواز قدرے بیٹھی ہوئی تھی مگر پھر یہی ان کی ایک خصوصیت بن گئی۔کافی عرصہ قبل ان کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔

خادم محی الدین کی دونوں فلمیں ناکام رہیں مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری۔پاکستان میں ان کی تیسری فلم ''خزاں کے بعد'' تھی جو ان کی آخری فلم ثابت ہوئی۔شمیم' سدھیر' آشاپوسلے اور علاؤالدین نے اس میں کام کیا تھا۔

خادم صاحب انتہائی خلیق' شریف النفس اور مرنجان مرنج آدمی تھے۔ کہانی اور سکرین پلے بہت اچھا لکھتے ہیں۔ عرصہ دراز تک اعجاز درانی کے ادارے سے وابستہ رہے۔اردو انگریزی دونوں زبانوں پر انہیں عبور حاصل ہے۔

مرتضیٰ جیلانی صاحب نے آغوش' تیرے بغیر اور نذرانہ بنائیں مگر کوئی ایک بھی کامیاب نہ ہوئی۔یہ تینوں حضرات نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے ہنر مند تھے۔ان کی فلموں کی ناکامی کا سبب ہمارے نزدیک یہ تھا کہ ان کی عقل ودانش اور عام لوگوں کے ذوق کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ تھا۔اگر یہ عوام کی ضروریات کو سمجھ کر ان کی ذہنی سطح کے مطابق تفریحی فلمیں بنانے کی کوشش کرتے تو ایک مشترکہ راہ تلاش کی جاسکتی تھی۔مگر انہوں نے عوام کو کم علم اور بدذوق تصوّر کر کے انہیں اپنی ذہنی سطح کے مطابق فلمیں دیکھنے پر مجبور کیا۔ظاہر ہے کہ کمرشل فلموں میں اس زور اور

زبردستی کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ کمرشل فلم تو عام لوگوں میں قبول عام حاصل کر کے ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ جب تک ان کے ذوق اور ذہنی معیار کو پیش نظر نہ رکھا جائے کوئی فلم کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ ناکام یا فلاپ اسی فلم کو کہا جاتا ہے جسے عام فلم بین پسند نہیں کرتے۔ ان کی پسند کو خاطر میں نہ لا کر جو فلم بنائی جائے گی وہ بھلا کامیاب کیسے ہو گی؟ اور اگر کامیاب نہیں ہو گی تو فلم ساز آئندہ فلم کیسے بنائے گا؟

دنیا بھر میں اور خود برّصغیر میں بہت سے تعلیم یافتہ' ذہین اور باشعور لوگوں نے عوام کی ضرورت اور اپنے اعلیٰ ذوق کے مابین اشتراک کی راہ نکال لی اور بہت اچھی اور معیاری فلمیں بنائیں جنہیں ہر طبقے کے فلم بینوں نے پسند کیا۔ یہی وہ طریقہ ہے جو کسی بھی فلم کو معیاری اور کامیاب ہونے کی سند دے سکتا تھا۔

1950ء کی دہائی میں ایک اداکار انور بیگ بھی تھے۔ بہت پڑھے لکھے اور ذہین آدمی تھے۔ مگر نہ اداکاری کے میدان میں کامیاب ہوئے اور نہ ہدایت کاری میں کوئی مقام حاصل کیا۔ انہوں نے بھی ایک فلم ""بے گناہ"" بنائی تھی جس میں وہ خود ہیرو اور نیّر سلطانہ ہیروئن تھیں۔ یہ فلم ناکام ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی انور بیگ بھی فلمی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اس زمانے میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ تقسیم کار اسماعیل نور صاحب بھی تھے۔ بہت پڑھے لکھے اور ذہین آدمی تھے۔ وہ دراصل اے آر کاردار صاحب کے بہنوئی تھے اور لاہور میں رہتے تھے۔ ہندوستان سے کاردار صاحب کی جو فلمیں پاکستان میں درآمد ہوتی تھیں وہ سب اسماعیل نور صاحب ہی ریلیز کرتے تھے۔ اس ادارے کا نام بھی کاردار پکچرز تھا۔ اسماعیل نور ایک روشن خیال اور فہمیدہ آدمی تھے۔ رکھ رکھاؤ' لباس' شخصیت ہر اعتبار سے متاثر کن تھے۔ اے آر کاردار کی تمام ہٹ فلمیں ان ہی کے تقسیم کار آفس سے ریلیز ہوتی تھیں اسلئے پیسے کی بھی فراوانی تھی۔ اس وقت ان کا شمار پاکستان کے ممتاز ترین تقسیم کاروں میں ہوتا تھا۔ بیرونی ملکوں کے دوروں پر بھیجے جانے والے فلمی وفود میں وہ لازماً شامل ہوتے تھے۔ کئی بار انہوں نے فلمی وفد کی قیادت بھی کی۔ جب مصنف و ہدایتکار نذیر اجمیری صاحب بمبئی سے پاکستان آئے تو اسماعیل نور صاحب نے ان سے ایک فلم ""قسمت"" بنوائی تھی جس میں مرکزی کردار صبیحہ' سنتوش اور ایم اسماعیل صاحب نے سرانجام دیئے تھے۔ اس کی موسیقی فیروز نظامی نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم بہت

کامیاب رہی تھی۔ کاردار صاحب کی درآمد شدہ فلموں سے بھی کروڑوں کی آمدنی تھی۔ کاردار صاحب کا پروگرام یہ تھا کہ پاکستان میں جمع شدہ اس پیسے کو یہیں فلم سازی اور دوسرے کاموں پر صرف کریں گے مگر اسماعیل نور صاحب نے انہیں ایک پیسہ بھی نہ دیا جس کی وجہ سے کاردار صاحب کی مالی پریشانیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ کافی عرصہ قبل اسماعیل نور صاحب فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ قبل ان کے انتقال کی خبر آئی تو بہت سے نووارد فلم والے تو ان کے نام سے واقف نہ تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے سالہا سال پاکستان کی فلمی صنعت اور تجارت پر حکمرانی کی تھی۔ ان کا دفتر بہت شاندار تھا۔ آرام دہ کرسیوں پر مخمل لگی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی خوش پوش اور بہت خوش گفتار آدمی تھے۔ انگریزی بہت اچھی بولتے اور لکھتے تھے اسی لئے فلمی برادری کی نمائندگی میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔ انہوں نے کاردار صاحب کی فلموں سے بے شمار دولت کمائی لیکن افسوس کہ وہ کاردار صاحب کے کام نہ آئی۔

اے آر کاردار برصغیر کے نام ور اور بے حد کامیاب فلم ساز و ہدایتکار تھے۔ انہوں نے فلمی زندگی کا آغاز لاہور سے کیا تھا۔ لاہور میں دریائے راوی کے کنارے پہلا فلم سٹوڈیو بھی انہوں نے ہی ایم اسماعیل صاحب کے تعاون سے قائم کیا تھا۔ ایم اسماعیل ان کے بچپن کے دوست اور پینٹر تھے۔ بعد میں بہت اچھے اداکار بھی بنے۔ کاردار صاحب لاہور سے کلکتہ جا کر پنجابی فلمیں بنانے لگے۔ لاہور میں پہلی بولتی ہوئی پنجابی فلم بنانے کا اعزاز بھی کاردار صاحب ہی کو حاصل ہے۔ کلکتہ میں بھی کاردار صاحب کی فلموں کو کامیابی حاصل نہ ہوئی تو وہ بمبئی چلے گئے جہاں کامیابیاں اور کامرانیاں ان کے قدم چومنے کی منتظر تھیں۔ ایک زمانے میں وہ انڈیا کے عظیم ترین فلم سازوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ فلم ساز و ہدایت کار محبوب خاں کے ہم زلف بھی تھے۔ سردار اختر اور بہار اختر دو بہنیں تھیں۔ سردار اختر نے محبوب صاحب کی فلموں میں ہیروئن کا کردار بھی ادا کیا تھا۔ بعد میں وہ محبوب صاحب کی بیگم بن گئیں۔ ان کی بہن بہار اختر کی کاردار صاحب سے شادی ہو گئی۔ اس طرح یہ دونوں ہم زلف عرصہ دراز تک بمبئی کی فلمی صنعت کے روح رواں رہے اور ان کی بیگمات نے بھی شہزادیوں جیسی زندگی بسر کی۔ لیکن سردار اختر اور بہار اختر دونوں ہی بے اولاد تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ محبوب صاحب اور کاردار صاحب کی پہلی بیویوں کی اولاد نے ان کی جانشینی سنبھالی۔

اے آر کاردار کی وجہ سے یہ خاندان برّصغیر میں کافی نمایاں ہو گیا تھا۔ کاردار صاحب کے والد لاہور کے رہنے والے

تھے اور ان کی تین بیگمات تھیں۔ ایک بیوی کی اولاد میں سے اے آر کاردار کی ایک بیٹی تھیں جو فلم ساز و ہدایت کار اشفاق ملک کی والدہ تھیں۔ اس طرح اشفاق ملک' اے آر کاردار کے نواسے تھے۔ دوسری بیگم کی اولاد میں اکرم کاردار تھے۔ جو ان دنوں فلمی حلقوں میں خوب جانے پہچانے جاتے تھے۔ تیسری بیگم کی اولاد میں سے بیٹا نصرت کاردار اور دو بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے ایک بیٹی سے اسماعیل نور صاحب کی شادی ہوئی تھی۔ اے جے کاردار جنہوں نے ''جاگو ہوا سویرا'' بنا کر عالمی شہرت حاصل کی تھی' کاردار صاحب کے بھانجے تھے۔ اب یہ خاندان فلمی دنیا سے غائب ہو چکا ہے۔ کسی زمانے میں ہندوستان اور پاکستان میں ان کا طوطی بولتا تھا۔

نصرت کاردار تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔ بہت خوش مذاق اور شائستہ آدمی تھے۔ بمبئی گئے تو اے آر کاردار نے انہیں اپنی فلم ''درد'' میں ہیرو بنایا۔ کاردار صاحب کی اُس زمانے میں سبھی فلمیں ہٹ ہو جاتی تھیں۔ ''درد'' سپر ہٹ فلم تھی مگر نصرت کاردار کو فلم بینوں نے پسند نہیں کیا اور وہ لاہور چلے آئے۔ یہاں آکر بھی انہوں نے کئی فلموں میں ویلن اور دوسرے سائیڈ کیریکٹر کئے مگر مقبول نہ ہو سکے۔ یوں تو وہ بہت زندہ دل اور باتونی تھے مگر کیمرے کے سامنے پہنچ کر لکڑی کے مجسمے کی طرح بن جاتے تھے۔ یعنی اکڑے ہوئے اور ہر طرح کے تاثر سے عاری۔ کرکٹ کے بہت اچھے کھلاڑی تھے اور فلم کرکٹ ٹیم میں انہیں ہمیشہ نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ ہم سے بھی ان کی خاصی یاد اللہ اور بے تکلفی رہی۔ خوش لباس اور خوش بیان تھے۔ جس محفل میں پہنچ جاتے اس میں جان ڈال دیا کرتے تھے مگر افسوس کہ اداکار کے طور پر کامیاب نہ ہو سکے۔ انہیں زمانے اور پاکستان کی فلمی صنعت سے بہت شکوہ رہا کہ انہوں نے نصرت کاردار کی قدر نہیں کی۔ ہم سے کہا کرتے تھے کہ آفاقی' تم دیکھ لینا۔ اچھا رول مل گیا تو ایک دن میں بہت بڑا ہیرو بن جاؤں گا۔

ہم نے کہا ''نصرت بھائی۔ وہ دن کب آئے گا۔ جوانی ڈھل چکی' ہیرو کیسے بنیں گے؟''

بولے'' جاہلوں جیسی باتیں مت کرو۔ ہالی وڈ کی فلموں میں نہیں دیکھتے کہ بڑی عمر کے اداکاروں ہی کو فوقیت حاصل ہے۔ وہ پچاس پچپن کی عمر میں بھی مقبول ہیرو ہیں۔''

ہم نے کہا'' مگر وہ بڑھاپے میں تو مقبول نہیں ہوئے ہیں۔ وہ تو ابتدا ہی سے مقبول ہیں۔''

ہنس کر کہنے لگے'' میں ایک نیا ریکارڈ قائم کروں گا۔''

بہت سمجھ دار آدمی تھے مگر اس معاملے میں انہیں واقعی یقین تھا کہ ایک روز وہ بہت مقبول ہیرو بن جائیں گے۔ ان کے بارے میں بھی فلمی دنیا میں ان کے دوستوں نے یہ لطیفہ بنایا تھا کہ نصرت کاردار بھی عجیب ہیں۔ اگر ساکت تصویر بنائی جائے تو حرکت کرنے لگتے ہیں اور مووی فلم کے کیمرے کے سامنے ساکت ہو جاتے ہیں۔

آغا سلیم رضا نے ایک بار ان سے کہا ''نصرت۔ میری مانو تو تم کیمرے بدل لو۔''

''کیا مطلب؟'' انہوں نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ مووی کیمرے سے سٹل تصویر بنوایا کرو اور سٹل کیمرے مووی کیلئے استعمال کیا کرو۔''

یوں تو ہمایوں مرزا بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ فلم ساز و ہدایت کار تھے۔ انہوں نے آرکیٹیکچر کی ڈگری حاصل کی اور پھر شوق انہیں فلمی کوچے میں لے آیا۔ انہوں نے فلم سازی کا آغاز کراچی سے کیا تھا اور ان کی پہلی فلم ''انتخاب'' تھی۔ اس فلم میں انہوں نے نیّر سلطانہ کو پہلی بار متعارف کرایا تھا۔ یہ ایک بہت بڑے سرمایہ دار ادارے کی فلم تھی۔ حسین بیگ محمد اس وقت کراچی کے عمارتیں تعمیر کرنے والوں میں سر فہرست تھے۔ فہمیدہ اور پڑھے لکھے آدمی تھے مگر فلم سازی میں مار کھا گئے۔ ہمایوں مرزا نے بعد میں اس ناکامی کی تلافی کر دی اور ''راز'' ''ڈاکو کی لڑکی'' اور ''آگ کا دریا'' جیسی عمدہ اور کامیاب فلمیں بنائی تھیں۔

لاہور میں اس زمانے میں بڑے بڑے ہنر مند' فن کار موجود تھے اور ان میں ہر ایک مخصوص خوبیوں کا حامل تھا۔ ایسے ہی ایک بزرگ اختر نواز بھی تھے۔ اختر نواز صاحب کو ہم نے پہلی بار نشاط سینما کے منیجر کی حیثیت میں دیکھا تھا۔ سرخ و سفید رنگت' دراز قد' متناسب جسم' بڑی بڑی آنکھیں۔ ان کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز ان کی ناک تھی۔

ہم نے ایک دوست سے تذکرہ کیا تو بولے ''ہونی بھی چاہئے۔ تم کو معلوم نہیں کہ اختر نواز صاحب بڑی اونچی ناک والے ہیں۔''

بعد میں ان کے بارے میں تفصیلات کا علم ہوا تو اس دوست کے تبصرے کی صداقت پر حرف بحرف ایمان لانا پڑا۔ ایک تو ہوتے ہیں حسّاس لوگ لیکن اختر نواز صاحب حد سے زیادہ حسّاس اور غیرت مند تھے۔ اردو محاورے کے

مطابق وہ واقعی ناک پر مکھّی تک نہیں بیٹھنے دیتے تھے حالانکہ کافی بڑی ناک تھی۔ایک آدھ مکھّی کے بیٹھنے سے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

اختر نواز صاحب خوش لباس اور جامہ زیب آدمی تھے۔ گرمیوں میں ان کا لباس سفید پتلون اور قمیض یا سفید قمیض شلوار تھا۔ سردیوں میں سوٹ بوٹ میں نظر آتے تھے۔ٹائی بہت کم استعمال کرتے تھے۔ لاہور کے کسی اچھے سینما کا منیجر ہونا اس زمانے میں بڑے افتخار کی بات تھی اور شہر کے بڑے بڑے لوگوں اور اعلیٰ افسروں تک سینما منیجر کی رسائی ہوتی تھی۔ اختر نواز صاحب یوں تو خالص اور ''انتہائی'' پٹھان آدمی تھے لیکن حسن اخلاق اور آؤ بھگت کے معاملے میں لکھنؤ والے لگتے تھے۔اردو کھڑی بولتے تھے۔انگریزی پر انہیں عبور حاصل تھا۔ہم تو انہیں ایک خوش اخلاق اور خوش پوش سینما منیجر ہی سمجھتے تھے مگر رفتہ رفتہ جب ان کی شخصیت ہم پر کھلی تو ہم ان کے معتقد ہو گئے۔بعد میں بھی ان سے اکثر واسطہ پڑتا رہا۔وہ ہمارے گہرے' بے تکلف' دوست' فلم ساز و ہدایت کار ثناءاللہ گنڈاپور کے خُسر بن گئے تھے۔ ثناءاللہ گنڈاپور ابتدا میں ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کے اسسٹنٹ تھے اور وہیں ہماری ان سے یاد اللہ اور پھر دوستی ہوئی تھی۔ وہ بھی خالص پٹھان ہیں۔اونچے' گورے چِٹّے' بے تکلف اور پٹھانوں کی طرح مخلص مگر انتہا سے زیادہ حسّاس' مکھّی وہ بھی اپنی ناک پر نہیں بیٹھنے دیتے اور اس معاملے میں اپنے خُسر (اب وہ مرحوم ہو چکے ہیں) کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں۔ ثناءاللہ خاں نے فلموں کی ہدایت کاری بھی کی اور پھر نیف ڈیک کا ادارہ وجود میں آیا تو اس سے وابستہ ہو گئے۔وہ لاہور آفس کے انچارج تھے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

ہماری چھوٹی بیٹی پارو بچپن ہی سے ثناءاللہ خاں گنڈاپور سے متعارف رہی مگر وہ ان کا نام اور شناخت یاد نہیں رکھ سکتی۔اگر ان کا فون آئے یا کہیں ملاقات ہو تو پارو ہمیں اس طرح اطلاع دیتی ہے ''پاپا! وہ آپ کے دوست کا فون آیا تھا۔''

''کون سے دوست ؟''

''وہی جو گورے اور لمبے ہیں۔ باتیں بہت کرتے ہیں۔''

''یہ کیا پہچان ہوئی' نام بتاؤ نا۔''

''ان کا نام ہمیں یاد نہیں رہتا۔ وہی گنڈاسے والے۔''

اور ہم سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ثنااللہ گنڈاپور کا تذکرہ ہے۔
ان سے پہلے خُسر کا ذکر سن لیجئے۔
اختر نواز صاحب کے بارے میں جب ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ابتدائی زمانے کی بولتی فلموں کے ہیرو تھے تو ہم بہت مرعوب ہوئے۔اب ذرا ان کے ٹھاٹ باٹ کا اندازہ لگایئے۔1931ء میں (یعنی ہماری پیدائش سے بھی پہلے) لاہور کے ایک فلم ساز حکیم رام پرشاد نے لاہور میں دو بولتی فلموں کا آغاز کیا تھا۔ایک فلم کیلئے اختر نواز صاحب کو ہیرو کا کردار کرنے کیلئے بطور خاص بمبئی سے بلایا گیا۔بولتی فلمیں اس زمانے میں عجوبہ ہی تھیں۔بلکہ اس زمانے میں تو متحرک فلمیں ہی عجوبہ سمجھی جاتی تھیں۔لوگ حیران ہوتے تھے کہ سامنے پردے پہ انسانوں کی تصویریں ناچ رہی ہیں' گا رہی ہیں۔اس کے بعد جب بولتی فلموں کا زمانہ آیا تو دیکھنے والوں کے ہوش ہی اڑ گئے۔

لاہور میں حکیم رام پرشاد نے دو فلموں کا آغاز کیا تھا۔ایک کا نام ''ہیر رانجھا'' تھا اور اس کے ہدایت کار اے آر کاردار تھے۔کاردار صاحب کا تذکرہ اس سے پہلے بھی آچکا ہے۔حکیم رام پرشاد کی دوسری فلم کا نام ''گوپی چند'' تھا۔اس فلم میں ہیرو کا کردار اختر نواز کو سونپا گیا تھا اور انہیں بطور خاص کام کرنے کیلئے بڑے اہتمام سے بمبئی سے بلایا گیا تھا کیونکہ وہ ایک بڑے اداکار تھے۔گوپی چند میں اختر نواز صاحب کے ساتھ نرگس کی والدہ جدن بائی ہیروئن تھیں۔اس سے آپ اختر نواز صاحب کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔اس فلم میں اس زمانے کے ایک اور مقبول اداکار ڈاکٹر سونی بھی کام کر رہے تھے۔
اختر نواز بمبئی سے لاہور پہنچے تو ہر ایک کی نگاہ میں آ گئے۔ ان کی چھب ہی نرالی تھی۔اس زمانے میں وہ کالی پتلون کے ساتھ سفید قمیض پہنتے تھے اور کالی بو لگاتے تھے جس کی وجہ سے دور ہی سے منفرد نظر آتے تھے۔یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور میں گنتی کی موٹر کاریں تھیں۔
پرانے لوگ بتاتے ہیں کہ اختر نواز کے پاس ایک ٹو سیٹر اوپن چھت کی گاڑی تھی۔جب وہ اس کھلی گاڑی میں سوار ہو کر مال روڈ سے گزرتے تو راستہ چلتے لوگ مڑ مڑ کر انہیں دیکھنے لگتے۔کچھ ایسا ہی منظر 1952-53ء میں ہم نے اسلم پرویز کا بھی دیکھا تھا۔وہ اپنی سرخ رنگ کی سپورٹس کار میں مال روڈ سے گزرتے تھے تو ہر نگاہ ان پر مرکوز ہو جاتی

تھی۔

فلم ''گوپی چند'' کے زمانے کا ذکر ہے کہ اختر نواز صاحب تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے مال روڈ پر جا رہے تھے کہ جی پی او کے نزدیک ایک شخص ان کی کار کے نیچے آگیا حالانکہ ان دنوں مال روڈ پر ٹریفک بھی خال خال ہی تھی۔ مگر ہونی ہو کر رہی۔ اختر نواز اس حادثے سے گھبرا گئے۔ یہ بھی نہ دیکھا کہ زخمی کی حالت کیسی ہے۔ اتنا جانتے تھے کہ انگریزوں کی حکومت ہے جو سختی سے قانون پر عمل درآمد کراتی ہے۔ وہ اتنے گھبرائے کہ گرفتاری سے بچنے کے لئے فلم ادھوری چھوڑ کر اسی دن کلکتہ روانہ ہو گئے۔ دستور کے مطابق انہیں وہاں بھی کسی سٹوڈیو سے وابستہ ہونا تھا چنانچہ بالی ووڈ سٹوڈیو میں ملازم ہو گئے۔ سیٹھ رام کرنانی اس ادارے کے مالک تھے۔ وہ سیاہ رنگ کے مریل سے گجراتی سیٹھ تھے مگر دولت منداتنے کہ جھوٹ بھی بولتے تو سچ لگتا تھا۔ وہ اس وقت کے کروڑ پتی تھے اور ''فلمی کنگ'' کہے جاتے تھے۔ کجّن بائی پر فریفتہ تھے مگر وہ انہیں جُل دے کر نکل جاتی تھی۔

کلکتہ کے ویکلی ''چونچ'' کے ایڈیٹر عنایت دہلوی بہت بااثر آدمی تھے۔ فلمی دنیا میں ان کا سکہ چلتا تھا ان ہی دنوں وہ ایک نازک سی حسین و جمیل لڑکی کو لے کر سیٹھ کرنانی کے پاس گئے اور اسے فلموں میں کاسٹ کرنے کی سفارش کی۔ سیٹھ کرنانی کجن بائی پر مہربان تھے' وہ ان کی ملازم تھیں اور عموماً وہی ان کی فلموں میں ہیروئن ہوا کرتی تھیں مگر عنایت دہلوی کی سفارش بھی بہت بھاری بھر کم تھی اور ٹالی نہ جاسکتی تھی اس لئے اس نوخیز حسینہ کو بھی سٹوڈیو میں ملازم رکھ لیا گیا۔ یہ لڑکی نسیم بانو تھی۔ مستقبل کی پری چہرہ فلمی ہیروئن اور دلیپ کمار کی بیگم سائرہ بانو کی والدہ۔ سب کا خیال تھا کہ یہ لڑکی اپنے حُسن کے بل بوتے پر بہت ترقی کرے گی۔

بالی ووڈ سٹوڈیو کی آئندہ فلم کا نام ''اللہ کی تلوار'' تھا۔ اس فلم میں نسیم بانو کو اختر نواز کے ساتھ ہیروئن کے طور پر کاسٹ کیا گیا۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی تو افواہیں بھی پھیلنے لگیں جو کہ شو بزنس کی زندگی کا ہمیشہ ایک لازمی حصہ رہی ہیں۔ سیٹھ کرنانی بذات خود تو کجن بائی سے عشق کرتے تھے اور اس کا شہرہ عام تھا مگر اپنے عملے کے معاملے میں بہت سخت گیر اور اصول پرست تھے۔ انہیں شکایت ملی کہ ان کی فلم کے ہیرو اختر نواز اور ہیروئن نسیم بانو ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اختر نواز اس قسم کے آدمی نہیں تھے مگر سیٹھ کرنانی کو فکر پڑ گئی۔ انہوں نے ایک دن اختر نواز صاحب کو اپنے دفتر بلایا اور باز پُرس کی۔ بجائے اس کے کہ وہ صفائی پیش کرتے اختر نواز ناراض ہو گئے اور کہا ”سیٹھ آپ نے میری توہین کی ہے‘ میں آپ کی فلم میں کام نہیں کروں گا۔“

یہ کہہ کر وہ سٹوڈیو سے رخصت ہو گئے۔ جب یہ خبر نسیم بانو کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے بھی احتجاجاً اس فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا اور نوکری کو لات مار کر بمبئی کا رخ کیا۔

سیٹھ کرنانی یہ گستاخی کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ بارسوخ آدمی تھے۔ انہوں نے کلکتہ کے تمام فلم سٹوڈیوز کے دروازے اختر نواز پر بند کرا دیئے اور یہ پیغام بھیجا کہ اگر تم معذرت کر کے واپس نہیں آؤ گے تو میں تمہیں کسی فلم میں کام نہیں کرنے دوں گا۔

اختر نواز کا پٹھانی خون جوش میں آ گیا۔ انہوں نے جواب کہلوایا۔ ”سیٹھ میں دودھ بیچ لوں گا مگر تمہاری نوکری نہیں کروں گا۔“

اختر نواز نے اپنا یہ قول سچا کر دکھایا۔ انہوں نے ایک بھینس خریدی اور اس کا دودھ بیچنا شروع کر دیا۔ طریقہ یہ تھا کہ وہ صبح صبح اٹھ کر نیکر اور بنیان پہن کر خود ہی بھینس کا دودھ دوہتے اور خود ہی فروخت کرنے بیٹھ جاتے۔ کلکتہ میں تو اودھم مچ گیا۔ وہ ہیرو کے طور پر بہت اچھی طرح جانے جاتے تھے۔ جس نے بھی سنا کہ اختر نواز نے دودھ بیچنا شروع کر دیا ہے وہ حیران رہ گیا۔ اخبار والوں نے بھی حاشیہ آرائی کی۔ ویسے بھی جنگ کا زمانہ تھا۔ ہر چیز کی مانگ تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اختر نواز صاحب کا دھندہ چل نکلا۔ حوصلہ افزائی ہوئی تو انہوں نے چالیس بھینسیں خرید کر ملٹری کو دودھ سپلائی کرنا شروع کر دیا اور اچھا خاصا منافع کمایا۔ کوئی اور شخص ہوتا تو موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے کاروبار کو مزید فروغ دیتا مگر یہ اختر نواز تھے۔ دودھ فروشی ان کے مزاج کو راس نہیں آ رہی تھی۔

ایک روز بل وصول کرنے کے لئے فوجی دفتر میں گئے تو وہاں ایک انگریز افسر آیا ہوا تھا۔ اختر نواز خود بھی دیکھنے میں انگریز ہی لگتے تھے۔ اس پر انگریزی بھی بہت اچھی بولتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ 1920ء میں انہوں نے گریجویشن کیا تھا اور انگریزی میں دسترس تھی۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فلمی صنعت کے ابتدائی دور میں فلموں سے

وابستہ لوگ کتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔اس زمانے میں تو گھر میں یا مدرسے میں گلستان بوستان پڑھنا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔کوئی مڈل تک پڑھ لے تو تعلیم یافتہ کہلاتا تھا اور میٹرک پاس کرنا تو بہت بڑا کارنامہ خیال کیا جاتا تھا مگر اس زمانے میں بھی گریجوایٹ اس صنعت سے وابستہ تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

انگریز افسر نے اختر نواز کو دیکھا تو پہلے انہیں بھی انگریز ہی سمجھا۔بول چال سے پتا چلا کہ انگریزی میں بھی خوب رواں ہیں۔وہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔بات چیت کے دوران میں پوچھا کہ بھائی اتنے معقول اور تعلیم یافتہ ہو کر دودھ کیوں بیچ رہے ہو؟

اختر نواز نے اپنی داستان کہہ سنائی۔

انگریز اتنا متاثر ہوا کہ انہیں کلکتہ کے سب سے بڑے اور بہترین سینما ''میٹرو ''کا جنرل منیجر بنا دیا۔یہ سینما وہ تھا جس میں صوبے کے وزیر اعلیٰ سے لے کر گورنر اور چیف سیکرٹری اور ان کے اہل خانہ بھی آیا کرتے تھے۔یہ نوکری کیا تھی بادشاہت تھی' ہر بڑے آدمی سے واقفیت اور تعلقات۔ہر ایک سے شناسائی 'کلکتہ کا کون سا قابل ذکر شخص تھا جس سے اختر نواز کی ملاقات اور دوستی نہ تھی۔ان کا اخلاق اور طرز گفتگو بھی متاثر کن تھا۔جو ایک بار ملتا تھا وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔اس پر ان کی پٹھان بیک گراؤنڈ بھی ایک اثاثہ تھی۔ غیوّر پٹھانوں کو سبھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے یہاں تک کہ انگریز بھی دل سے ان کی عزت کرتے تھے۔

اختر نواز صاحب کے شب و روز بڑے ٹھاٹ سے گزر رہے تھے۔مسلم لیگ کی تحریک کا آغاز ہوا تو انہوں نے بھی بساط بھر اس تحریک میں حصہ لیا۔وہ کلکتہ میں قیام پذیر ضرور تھے مگر ان کا سارا خاندان پشاور میں تھا۔ملازمت کے دوران میں گھر والوں و رشتے داروں سے ملنے کے لئے پشاور جاتے رہتے تھے۔

پاکستان کا قیام عمل میں آیا' تو اختر نواز کی رگ پٹھانی و مسلمانی و مسلم لیگی پھڑک اٹھی۔انہوں نے فوراً پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔اس زمانے میں کلکتہ سے لاہور یا کراچی پہنچنا آسان نہ تھا۔ ٹکٹ ہی نہیں ملتے تھے۔ٹرینوں میں لوگ سامان کی بوریوں کے مانند بھر کر سفر کرتے تھے اور جان و مال کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔مگر اختر نواز فیصلہ کر چکے تھے۔انہوں نے بطور خاص ایک ہوائی جہاز چارٹر کیا اور کلکتہ سے لاہور پہنچ گئے۔ان کے ٹھاٹ باٹ اور شاہانہ مزاج کا

صرف اسی ایک واقعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اختر نواز صاحب کلکتہ سے لاہور پہنچے تو یہاں افراتفری کا عالم تھا۔ مہاجرین کے تباہ حال قافلے سر چھپانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ فلمی صنعت کا تو نام و نشان تک باقی نہیں رہا تھا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ پاکستان میں فلم سازی کا سلسلہ کب اور کیسے شروع ہو گا؟ مگر اختر نواز صاحب کو اللہ نے بہت باعزت اور معقول روزگار فراہم کرنے کا بندوبست کر دیا۔ ہوا یہ کہ امجد حسین صاحب بھی کلکتہ سے لاہور آ گئے۔ یہ وہاں نیو تھیٹرز جیسے ادارے کے ڈائریکٹر اور پارٹنر تھے۔ ان کی کلکتہ ہی سے اختر نواز صاحب کے ساتھ دوستی تھی۔ لاہور میں وہ نشاط سینما کے مالک تھے۔

انہوں نے اختر نواز صاحب کو اس سینما کا جنرل مینجر مقرر کر دیا۔ اختر نواز صاحب نے نشاط سنیما کا نظم و نسق ایسے سنبھالا کہ فلم بینوں کو تربیت دینے اور تہذیب سکھانے کے لئے ہاتھ میں ڈنڈا سنبھال کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ جب تک قطار سیدھی نہ بن جاتی، بکنگ کی کھڑکی سے ٹکٹوں کی فروخت شروع نہیں ہو سکتی تھی۔ اس ''زبردستی'' کی وجہ سے نشاط سنیما میں جانے والے لوگ قطار بنانے لگے اور نظم و نسق کے عادی ہو گئے۔

کچھ عرصے بعد کراچی میں صدر کے خوب صورت علاقے میں ریکس سینما تعمیر ہوا تو اختر نواز صاحب کو اس حسین ترین سینما کا جنرل مینجر مقرر کیا گیا۔ وہ اس سینما میں سیاہ و سفید کے مالک تھے اور بہت خوبی سے کاروبار چلا رہے تھے۔ اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کی وجہ سے اختر نواز صاحب نے اس ملازمت پر لات مار دی اور لاہور چلے آئے۔

اختر نواز صاحب کی عادت تھی کہ وہ بازار سے کھانا منگوا کر نہیں کھاتے تھے۔ اپنی چائے اور کھانا خود ہی بناتے تھے۔ ایک روز دوپہر کے وقت گوشت بھون رہے تھے کہ اچانک ریکس سینما کے مالک آ گئے۔ انہوں نے جنرل مینجر کو گوشت بھونتے ہوئے دیکھا تو ناراض ہو گئے اور اختر نواز سے کہا کہ آئندہ آپ سینما میں گوشت نہ بھونئے گا۔ جواب میں اختر نواز صاحب نے اپنا استعفیٰ ان کے حوالے کر دیا اور بوریا بستر سنبھال کر لاہور آ گئے۔

آغا جی اے گل پاکستان کی فلمی صنعت اور ٹریڈ کی ممتاز ترین شخصیت تھے اور اختر نواز صاحب کے مرتبے اور صلاحیتوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے ایورنیو سٹوڈیو نیا نیا تعمیر کیا تھا۔ آغا صاحب کے اصرار پر اختر نواز

صاحب نے ایورنیو سٹوڈیوز کے جنرل منیجر کا عہدہ سنبھال لیا۔ جن لوگوں نے اس دور کے ایورنیو سٹوڈیو کو دیکھا ہے وہ اس کی خوبصورتی کو آج بھی یاد کرتے ہیں۔ ایک تو عمارت بالکل نئی اور خوبصورت تھی۔ دوسرے آغا جی اے گل نے بڑے شوق سے یہ سٹوڈیو بنوایا تھا اور اسے پاکستان کا بہترین سٹوڈیو بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اختر نواز صاحب کے تعاون سے انہوں نے ایورنیو کو ایک مثالی سٹوڈیو بنا دیا تھا۔ نظم و نسق اور حُسن و دلکشی کے اعتبار سے اس کی کوئی مثال نہ تھی۔ اختر نواز صاحب ہاتھ میں چھڑی تھامے ہر وقت سٹوڈیو میں گھومتے رہتے تھے اور اس کی سجاوٹ میں کوئی کمی برداشت نہیں کرتے تھے۔ فلم ساز 'کارکن' مالک سبھی مطمئن اور خوش تھے پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ خان صاحب کی ناک پر مکھّی بیٹھ گئی۔

اس زمانے میں پاکستان کا دورہ کرنے والے غیر ملکی سربراہ جب لاہور آتے تھے تو ایورنیو سٹوڈیوز بھی انہیں بڑے اہتمام سے دکھایا جاتا تھا۔ فلمی صنعت کے ممتاز افراد اکٹھے ہوتے تھے اور مہمان کی چائے یا کھانے سے تواضع کی جاتی تھی۔ ترکی کے صدر جلال بایار لاہور آئے تو ان کے اعزاز میں آغا جی اے گل نے ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا۔ خوبرو ہیرو' حسین و طرح دار ہیروئنیں 'ہدایتکار' فلم ساز اور فلموں سے وابستہ دوسرے قابل ذکر اشخاص بھی اس تقریب میں موجود تھے۔ صدر جلال بایار پاکستان کے ہیروز سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ سنتوش کمار' درپن' اسلم پرویز' سدھیر' یوسف خان اور کمال کو دیکھ کر انہوں نے یہ ریمارکس دیئے کہ پاکستان کے ہیرو یہاں کی ہیروئنوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ ہیرو حضرات کافی عرصے تک اس فقرے کو سند کے طور پر استعمال کرتے اور ہیروئنوں پر فقرے بازی کرتے رہتے تھے۔

اس تقریب میں شہر کے معززین اور اعلیٰ افسروں کے علاوہ آغا صاحب کی بیگم بھی موجود تھیں۔ اختر نواز خان سفید قمیض' سیاہ پتلون پہنے' سیاہ رنگ کی بو لگائے دیکھ بھال میں مصروف تھے اور نمایاں نظر آرہے تھے۔ آغا صاحب کی بیگم نے مخاطب کرنے کے لئے ""شش"" کی آواز نکالی اور انہیں پاس بلایا۔ اختر نواز صاحب کی رگ پٹھانی جوش میں آ گئی۔ غصے کے مارے آگ بگولا ہو گئے۔ اگلے دن آغا گل اپنے ہیڈ آفس میں پہنچے تو ان کی میز پر اختر نواز صاحب کا

استعفی پڑا ہوا تھا۔ آغا صاحب خود بھی پٹھان تھے اور بڑے وضع دار آدمی تھے۔ اختر نواز کی خودداری سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر اختر نواز صاحب سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ نہ ہی انہیں منانے کی کوشش کی۔ ان کا استعفیٰ تو منظور کر لیا مگر اسی روز انہیں اپنے ہیڈ آفس میں جنرل مینجر کے عہدے پر فائز کر دیا۔ اختر نواز کے لئے ایک علیحدہ کمرے کا بندوبست کیا گیا اور تمام دفتری امور ان کو سونپ دیئے گئے۔ اختر نواز صاحب نے بھی اپنے فرائض بڑی خوبی سے سرانجام دیئے۔ آخری عمر میں چار فٹ اونچی دیوار سے گرنے کی وجہ سے ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ کافی عرصے ان کی ٹانگ پلاسٹر میں رہی مگر آغا گل کی طرف سے تنخواہ کی ادائیگی میں ناغہ نہیں ہوا۔ اختر نواز صاحب جیسے ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوئے' چھڑی سنبھال کر پلاسٹر سمیت دفتر میں آنے لگے۔ بعد میں پلاسٹر تو اتر گیا تھا مگر وہ باقاعدگی سے چھڑی لے کر دفتر آتے تھے اویہ معمول زندگی بھر قائم رہا۔ وہ انگریزی خط و کتابت میں مہارت رکھتے تھے۔ کاروباری سوجھ بوجھ کے بھی مالک تھے۔ آخری عمر میں بھی اپنے کمرے میں بیٹھے اخبار کا مطالعہ کرتے یا کھانستے کھنکارتے رہتے۔ دفتر میں حاضری انہوں نے مرتے دم تک نہیں چھوڑی۔ وہ جانتے تھے کہ آغا گل انہیں گھر بیٹھے تنخواہ دیتے رہیں گے اور یہ ان کی پٹھانی غیرت کو گوارا نہ تھا۔ اس لئے آغا صاحب کے کہنے کے باوجود باقاعدگی سے دفتر آتے رہے حالانکہ ان کے فرائض بہت کم ہو گئے تھے۔

اختر نواز صاحب سے ہماری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ نشاط سینما لاہور کے مینجر تھے۔ یہ بہت اچھا سینما تھا۔ بھارتی فلمیں اس زمانے میں سینما گھروں میں دکھائی جاتی تھیں اور یہ سینما فلموں کے انتخاب کے سلسلے میں مشہور تھا۔ ہم صحافی بھی تھے اور فلم بینی کے رسیا بھی۔ سینما ٹکٹ کی قیمت برائے نام تھی مگر کئی بار دو چار روپے بھی جیب میں نہیں ہوتے تھے اور ہم شیر زماں پان فروش سے پیسے ادھار لے کر فلمیں دیکھتے اور دوستوں کو دکھاتے تھے۔ اختر نواز صاحب تعلیم یافتہ اور باشعور آدمی تھے۔ صحافیوں کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھے اس لئے ہم سے بہت اخلاق اور شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ہمارے ساتھ تو ٹکٹ حاصل کرنے میں رعایت کرتے ہی تھے مگر ہمارے ساتھیوں کو بھی ٹکٹ دے دیا کرتے تھے۔ مفت فلم دیکھنے کی نہ کبھی ہم نے کوشش کی اور نہ ہی انہوں نے اس کی پیشکش کی۔ جب وہ ریکس سنیما (کراچی) کے مینجر ہوئے تو وہاں بھی ان سے ملاقاتیں رہیں لیکن ایورنیو سٹوڈیو کے زمانے میں تو ان سے

بہت زیادہ ملاقاتوں کا موقع ملتا رہا۔ وہ خالص اور کھرے پٹھان تھے مگر ہمارے ساتھ مہربانی کرتے تھے اور ہماری ضد سے بھی صرف نظر کر لیتے تھے۔

وہ ایورنیو پکچرز کے ہیڈ آفس پہنچے تو وہاں بھی ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ ہم جب بھی آغا صاحب سے ملنے کے لئے ایبٹ روڈ کے اس دفتر میں جاتے تھے تو اختر نواز صاحب سے صاحب سلامت ضرور ہوتی تھی۔

ایک دن ہم وہاں پہنچے تو چپراسی نے بطور خاص پیغام دیا کہ اختر نواز صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کے کمرے میں گئے تو چھڑی لئے بیٹھے تھے اور ایک موٹی سی فائل سامنے کھلی رکھی تھی۔ وہ ایک فلم کا سکرپٹ لکھ رہے تھے اور ہماری رائے لینے کے خواہش مند تھے۔ ہم نے پاکستان میں پہلی بار کسی فلم کا سکرپٹ نہایت مفصّل اور خوبصوتی کے ساتھ انگریزی میں ٹائپ شدہ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ خان صاحب اردو میں تو لکھ نہیں سکتے تھے۔ انگریزی پر انہیں عبور حاصل تھا اس لئے انگریزی میں سکرپٹ لکھ ڈالا' یہاں تک کہ مکالمے اور گانوں کے بول تک انگریزی میں تھے۔

ہم نے کہا ''خان صاحب' کیا انگریزی فلم بنا رہے ہیں؟''

بولے ''شرارت مت کرو' یہ فلم اردو میں ہو گی۔''

''مگر مکالمے تو انگریزی میں ہیں۔''

کہنے لگے ''آپ کو کس لئے بلایا ہے؟ اس لئے کہ اس مفہوم کو اردو میں لکھ دیں۔''

ہم نے پوچھا ''اور گانے؟''

ہنسنے لگے اور کہا ''تم جانتے ہو کہ گانے شاعر ہی لکھ سکتا ہے۔ میں نے تو صرف سچویشن کے موڈ کے مطابق گانوں کا مفہوم لکھا ہے۔ بول تو شاعر ہی لکھے گا۔'' پھر پوچھا ''تم شاعری کرتے ہو؟''

ہم نے عرض کیا ''کرتے تو نہیں۔ آپ کہیں گے تو وہ بھی کر لیں گے۔''

کہنے لگے ''صرف وہی کام کرنا جو تم جانتے ہو۔''

ہم نے کہا ''آپ حکم دیں گے تو شاعری بھی سیکھ لیں گے۔''

ہنسنے لگے ”میں اناڑی شاعر سے گیت نہیں لکھواؤں گا۔“

انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ یہ سکرپٹ مکمل ہو جائے گا تو نظر ثانی کرنے کے بعد ہمارے حوالے کر دیں گے۔ مگر وہ سکرپٹ مکمل نہ ہو سکا۔

افسوس کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئی اور اختر نواز صاحب یہ نوکری بھی چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ یہ تو ان کی پرانی عادت تھی اس بار فرق یہ تھا کہ وہ دنیا ہی سے رخصت ہو گئے تھے۔

اختر نواز صاحب کے بارے میں لوگ بہت کم جانتے ہیں۔ اگر کوئی باقاعدہ فلمی ریکارڈ مرتّب کیا جائے تو اختر نواز صاحب کا نام نمایاں ہوگا۔ انہوں نے گریجویشن کرنے کے بعد فلمی صنعت کا رخ کیا تھا۔ حالانکہ بڑی سے بڑی سرکاری ملازمت کر سکتے تھے۔ 1923ء سے 1931ء تک وہ خاموش فلموں میں ہیرو کے طور پر نمودار ہوتے رہے اور وقت کی ممتاز ترین ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا اور بہت مقبولیت حاصل کی۔ مردانہ وجاہت اور دلکشی کے باعث کئی ہیروئنیں ان کی طرف ملتفت بھی ہوئیں مگر خان صاحب کی پٹھانیت راہ میں حائل رہی۔ فلمی ہیروئن کے ساتھ اپنا نام وابستہ کرنا وہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے بمبئی کی امپیریل فلم کمپنی سے اداکاری کا آغاز کیا تھا۔ اس کے بعد کولہاپور سینے ٹون نامی فلم ساز ادارے سے وابستہ ہو گئے۔

اختر نواز صاحب نرے ہیرو ہی نہ تھے انہوں نے کئی فلموں کی ہدایتکاری بھی کی تھی۔ وہ اپنے بارے میں زیادہ گفتگو نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی باتوں باتوں میں اپنی جوانی کے دنوں کے قصّے سناتے تھے۔ ان کا فلمی پس منظر جاننے کے بعد ہم نے بارہا انہیں کریدا اور اس زمانے کے واقعات بیان کرنے پر اکسایا مگر وہ ہنس کر خاموش ہو جاتے تھے۔ ثناءاللہ خان گنڈاپور سے ان کی صاحب زادی ہما کی شادی ہوئی تو ہم بھی خاص طور پر اس میں مدعو تھے۔ ثنااللہ خان ہمارے گہرے دوست تھے مگر اختر نواز صاحب نے ہم سے کہا تھا کہ یاد رکھو' تم لڑکی والوں کی طرف سے شادی میں شرکت کرو گے۔

سمن آباد میں شادی سادگی سے ہوئی البتہ کھانے پر بہت زور دیا گیا تھا۔ فلمی صنعت کے قریباً سبھی قابل ذکر افراد موجود تھے۔

ثناءاللہ خان نے دلہا ہونے کے باوجود ہمیں یاد دلایا ''آفاقی تم میری طرف سے مہمان ہو' ٹھیک ہے نا؟''

''بالکل'' ہم نے جواب دیا۔

اختر نواز صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور لوگوں سے کہا ''آفاقی میری طرف سے شریک ہوا ہے۔ یہ میرا' ثناءاللہ سے پہلے کا واقف ہے۔ کیوں نا؟'' انہوں نے ہم سے تصدیق چاہی۔

دو مُلاؤں میں مرغی حرام والی کہاوت تو آپ نے بھی سنی ہو گی مگر دو پٹھانوں میں مہمان کی مشکل کا علم نہ ہو گا۔ اختر نواز صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ پٹھان تھے اس لئے روشن خیال بھی تھے۔ ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا مگر لڑکیوں کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ ثناءاللہ خان گنڈا پور کی بیگم ہما بھی ایم اے پاس ہیں۔ بعد میں انہوں نے بنک میں ملازمت کر لی۔ ہم نے انہیں روز اوّل ہی بتا دیا تھا کہ آپ کے بینک میں ایک اکاؤنٹ نہیں کھولیں گے کیونکہ اس کے دیوالیہ ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ ایک تو خاتون اوپر سے پٹھان۔ جب وہ بینک کی وائس پریذیڈنٹ ہو گئیں تو ایک دن ہم سے کہا ''اب تو اپنا اکاؤنٹ ہمارے بینک میں کھول سکتے ہیں۔ دیکھو تو اتنے عرصے کے بعد بھی یہ بینک چل رہا ہے۔''

ہم نے کہا ''بھابھی بینک اور دل کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ جانے کب بند ہو جائے۔''

ہم اپنی فلم ''سزا'' کی روداد بیان کر چکے ہیں۔ یہ ہماری بنائی ہوئی تیسری فلم تھی۔ اصولاً تو ہمیں پہلی فلم سے بسم اللہ کرنی چاہئیے مگر پہلے عرض کر چکے ہیں کہ یہ داستان ترتیب وار بیان نہیں کی جا رہی ہے اور شاید یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ واقعات' خیالات اور شخصیات کا اس قدر ہجوم ہے کہ دماغ میں افراتفری کا عالم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے چھوڑیں اور کہاں سے شروع کریں۔ بات میں سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور داستان کی داستان بھی جاری رہتی ہے۔ پھر بھی مناسب ہے کہ ہم اپنی پہلی فلم کی کہانی بھی بیان کر دیں۔ یہ فلم سازی میں ہماری پہلی پہلی کوشش تھی اس لئے اس میں مشکلات بھی زیادہ پیش آئی تھیں۔ بطور فلم ساز ہماری اوّلین فلم ''کنیز'' تھی۔ مگر سب سے پہلے تو یہ سنئے کہ آخر ہم نے فلم سازی کا آغاز کیوں کیا بلکہ یہ کہ اچھی خاصی صحافت چھوڑ کر فلم کی وادی میں کیوں نکل گئے؟

جب 1958ء میں پہلا مارشل لاء نافذ ہوا تو چند روز کے اندر ہی ہمیں بدلے ہوئے حالات اور ناسازگار ماحول کا احساس ہو گیا تھا۔ اس ضمن میں کچھ واقعات ہم پہلے تحریر بھی کر چکے ہیں۔ ہم نے صحافت کا پیشہ اختیار ہی اس لئے کیا

تھا کہ یہ ہمارا پسندیدہ شعبہ تھا اور یہاں ہمیں عزت نفس اور ہر طرح کی آزادی حاصل تھی مگر مارشل لاء لگتے ہی ہمیں جمہوریت اور مارشل لا کا فرق معلوم ہو گیا۔ یہ بات علیحدہ ہے کہ کافی وقت گزارنے کے بعد اب ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ جمہوریت میں بھی مارشل لا کے طور طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔" نوائے وقت" کے مدیر اور اپنے سابق باس جناب حمید نظامی صاحب سے ہماری مارشل لا کا اعلان ہوتے ہی ملاقات ہوئی تھی۔ ہم خاص طور پر گھبرائے ہوئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور انہوں نے اس شام اپنی ٹمپل روڈ والی کوٹھی کے سادہ ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر حالات پر جو تبصرہ فرمایا تھا وہ آج بھی ہمیں لفظ بہ لفظ یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس روز وہ بے حد دل برداشتہ اور مغموم تھے اور خلاف عادت سوچ میں گم تھے۔

ہم نے پوچھا" نظامی صاحب۔ آپ کے خیال میں اب کیا ہو گا؟"

نظامی صاحب نے کہا" مجھے ڈر ہے کہ کہیں پاکستان بھی مشرق وسطیٰ کا ایک ملک بن کر نہ رہ جائے جہاں آئے دن فوجی انقلابات برپا ہوتے رہتے ہیں اور حکومتوں کے تختے الٹ جاتے ہیں" پھر انہوں نے انگریزی میں کہا۔

"This is the beginning of the end"

مزید ستم یہ ہوا کہ ان ہی دنوں ہماری "آفاق" کے چیئر مین صاحب سے ٹیلی فون پر جھڑپ ہو گئی۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر آپ یہاں کے حالات سے مطمئن نہیں تو بخوشی نوکری چھوڑ کر چلے جائیں۔

ہم نے عرض کیا" ہم آج ہی چلے جائیں گے بشرطیکہ آپ ہمارے واجبات ادا کر دیں۔"

ظہور عالم شہید صاحب اور دوسرے ساتھیوں نے بہت سمجھایا بجھایا مگر ہم نے صرف " آفاق" ہی سے نہیں بلکہ صحافت ہی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

یہ فیصلہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اس وقت ہمیں صحافت سے وابستہ ہوئے لگ بھگ آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور اس دوران میں ہم نے محسوس کیا تھا کہ شوق اپنی جگہ مگر حالات صحافت کا پیشہ اختیار کرنے کے لئے سازگار نہیں ہیں۔ اس زمانے میں صحافیوں کی تنخواہیں بہت کم تھیں۔ پروفیسر سرور جیسے دانشور اور لائق و فائق ایڈیٹر کو پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی۔ دوسروں کا بھی درجہ بدرجہ ایسا ہی حال تھا۔ ہمارے علم کے مطابق سب سے

زیادہ تنخواہ جو اردو اخبار کے کسی ایڈیٹر کو دی جاتی تھی وہ ایک ہزار روپے ماہوار سے زیادہ نہ تھی اور ان بزرگوں میں مولانا غلام رسول مہر اور مولانا چراغ حسن حسرت جیسے جیّد ایڈیٹر بھی شامل تھے۔
ہمیں دولت کمانے کا کبھی شوق نہیں رہا مگر عزت اور آسائش کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تمنا تھی جو ان حالات میں پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اردو اخبارات کی تعداد بہت محدود تھی۔ نوائے وقت' امروز 'احسان' زمیندار اور مغربی پاکستان' لاہور کے ممتاز اخبارات تھے۔ لیکن ان سب کا ماحول' حالات اور پس منظر مختلف تھا۔ ''امروز'' میں بائیں بازو کے ترقی پسندوں ہی کو داخلہ مل سکتا تھا۔ ''زمیندار'' کا دقیانوسی ماحول ہمارے لئے ناسازگار تھا۔ احسان اور مغربی پاکستان اپنے مالی حالات کی وجہ سے نامساعد حالات سے دوچار تھے۔ لے دے کر صرف ''نوائے وقت'' ہی ایک ایسا روزنامہ تھا جس میں ہمارا گزارا ہو سکتا تھا لیکن ضروری نہ تھا کہ جس وقت ہمیں نوکری کی ضرورت ہو تو وہاں گنجائش بھی موجود ہو۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہم روزنامہ آفاق میں اسسٹنٹ ایڈیٹر اور روزنامہ ''آثار'' میں جوائنٹ ایڈیٹر کے طور پر فرائض سرانجام دے چکے تھے اور اس کے بعد کسی جونیئر حیثیت میں کام کرنا ہمارے لئے دشوار تھا۔ گویا روزنامہ ''آفاق'' ہی بظاہر ہماری جائے پناہ تھا مگر اس کے مالکوں سے بھی ہم ناخوش ہو چکے تھے۔ یہ مسئلہ بھی درپیش تھا کہ ہم بذات خود کہیں نوکری تلاش کرنے کے لئے نہیں جا سکتے تھے۔ گویا کسی روزنامے میں ہماری گنجائش ہی نہ تھی۔ اس پر ستم یہ کہ مارشل لاء نافذ ہو گیا اور اس نے ہمیں صحافت کے مستقبل سے مزید بددل کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا بجا ہو گا کہ ہمیں صحافت میں اپنے لئے روشن مستقبل نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے باوجود ہم نے اپنی عادت کے مطابق جوش میں آ کر روزنامہ ''آفاق'' کو خیر باد کہہ دیا اور گھر بیٹھ گئے۔
صحافت کے سوا ہمیں کچھ نہیں آتا تھا لیکن چند سال سے فلمی صنعت میں ہماری آمدروفت تھی اور یہ بھی ہمارا پسندیدہ کام تھا۔ گزشتہ دو تین سالوں میں نہ صرف ہماری فلمی صنعت کے ہر بلند و پست فرد سے واقفیت اور بے تکلفی ہو چکی تھی بلکہ ہم نے کہانی نویسی بھی سیکھ لی تھی۔ ہماری تصنیف کردہ پہلی فلم ''ٹھنڈی سڑک 1956 ''ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہم نے فلم ساز ہدایت کار لقمان کے ساتھ کافی وقت گزارا تھا۔ فلمی کہانی کے سلسلے میں بحثوں میں

حصہ لیا تھا۔ فلم سازی کے مختلف مراحل ہماری نظروں سے گزر چکے تھے۔پہلے تو ہم اعزازی حیثیت سے سکرپٹ کی تیاری میں حصہ لیتے رہے مگر پھر ظہورالحسن ڈار صاحب کی تجویز پر لقمان صاحب نے ہمیں باقاعدہ کہانی کے شعبے میں شامل کر لیا۔ مرزا ادیب اور ظہورالحسن ڈار ان کے ریگولر مصنف تھے۔ مگر فلم ''ایاز'' میں انہوں نے پہلی بار ہم سے باقاعدہ کچھ مکالمے لکھوائے۔ سکرین پلے کی تیاری میں بھی ہم نے سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔اس کارکردگی کے پیش نظر انہوں نے ہمیں پروموٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور ان کی آئندہ فلم ''آدمی'' کے سکرپٹ کی تیاری میں ہمیں باقاعدہ شریک کر لیا گیا۔اس فلم کے لکھنے والوں میں بھی میرزا ادیب اور ظہورالحسن ڈار صاحبان شامل تھے لیکن کچھ وقت کے بعد وہ دونوں حضرات کنارہ کش ہو گئے اور کہانی نویسی کا تمام بوجھ ہمارے ناتواں کاندھوں پر آ گیا۔

''آدمی'' کی تکمیل کے زمانے میں ہمارے اعتماد میں مزید اضافہ ہو گیا۔ سعادت حسن منٹو اور ڈبلیو زیڈ احمد جیسے ہنر مندوں سے بھی ہم نے سکرپٹ لکھنے کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ حاصل کیا تھا۔ لقمان صاحب کی صحبت میں عملی طور پر بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا اور ہم سنجیدگی سے کہانی نویسی کا پیشہ اختیار کرنے کے بارے میں سوچنے لگے۔ مگر اخبار کی مصروفیات راہ میں حائل تھیں۔ معمول یہ تھا کہ ہم ''آفاق'' کے کاموں سے فراغت پا کر سیدھے فلم سٹوڈیو کا رخ کرتے تھے اور رات گئے تک فلمی مصروفیات میں مشغول رہتے تھے۔ ہماری جان پہچان اور بے تکلفی قریب قریب سبھی کے ساتھ ہو چکی تھی اور ہم نے سبھی سے کچھ نہ کچھ فیض بھی حاصل کیا تھا۔ یہ وہ پس منظر تھا جب ہم ''آفاق'' کی ملازمت چھوڑ کر گھر بیٹھ گئے۔

ہر ایک نے ہمیں سمجھایا کہ بھائی کیوں بے کار ضد کرتے ہو۔ واپس آ جاؤ مگر ہم نے کافی غور و خوض کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ صحافت کا میدان اب ہمارے لئے تنگ ہو چکا ہے۔ اس لئے نئی جولان گاہوں کی طرف نکل جانا چاہیئے۔ فلم کا اعزاز ہمیں صحافت کا نعم البدل نظر آیا اور ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اب فلمی صنعت میں قسمت آزمائی کریں گے۔

فلم کا پیشہ اختیار کرنا بھی اس زمانے میں کچھ آسان نہ تھا۔ فلم سازی بہت ہو رہی تھی۔ سرمائے اور وسائل کی کمی تھی۔ کہانی لکھنے والوں کو بہت کم معاوضے دیئے جاتے تھے بلکہ اکثر و بیشتر تو انہیں سرے سے معاوضہ ہی نہیں دیا جاتا تھا۔ جس فلم ساز کی جتنی توفیق تھی اور داؤ چلتا تھا وہ کہانی نویس کی اتنی ہی رقم ہضم کر لیا تھا اور وہ غریب منہ تکتا رہ جاتا تھا۔

دوسری پرابلم یہ تھی کہ اخبار کی ملازمت میں تو ہمیں ہر ماہ ایک مقررہ رقم مل جاتی تھی۔ کہانی نویس بننے کے بعد ماہ بہ ماہ باقاعدہ آمدنی کا حصول ممکن نہ تھا۔ پھر یہ کہ ہمیں معاوضہ طلب کرنے کی عادت نہ تھی۔ تقاضا تو دور کی بات ہے۔ مگر صحافت چھوڑنے کے بعد فلمی صنعت کے سوا ہمارے پاس سر چھپانے کی کوئی دوسری جگہ نہ تھی۔

ہمارے ''آفاق'' سے مستعفی ہونے کی خبر سب کو معلوم ہو چکی تھی۔ فلم سازوں' ہدایتکاروں اور اداکاروں کے ساتھ ہم پہلے بھی گھوما کرتے تھے۔ اب اس کے لئے زیادہ وقت اور فراغت میسر تھی۔ ہمارے صحافی دوست ہمیں جب بھی دیکھتے تھے ہم انہیں کسی کار سے برآمد ہوتے یا اس میں سوار ہوتے ہی نظر آتے تھے۔ یا پھر فلمی نگار خانوں' شاندار ریستورانوں اور اعلیٰ پیمانے کے ہوٹلوں میں نظر آتے تھے۔ خوش لباسی ہماری عادت تھی اس پر یہ شان و شوکت' نتیجہ یہ کہ آغاز میں کچھ دن تو ہمارے صحافی دوست ہم سے اظہار ہمدردی کرتے رہے اور مشورہ دیتے رہے کہ واپس آجاؤ مگر جب ہمارا ٹھاٹ باٹ دیکھا تو ہم پر رشک کرنے لگے۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے سے کہنا شروع کر دیا کہ ''بھائی آفاقی کے تو مزے ہی مزے ہیں۔ خوب پیسے کما رہا ہے۔'' جب ان خیالات کا انہوں نے ہمارے سامنے اظہار کیا تو ہمارا یہ ارادہ عزم میں تبدیل ہو گیا کہ اب عزت کا سوال پیدا ہو گیا ہے اور ہمیں چاہئیے کہ فلموں کی دنیا میں قسمت آزمائی کریں۔ لیکن ہزاروں اندیشے ہمیں سہانے کے لئے آن موجود ہوتے تھے۔ پھر بھی ہم مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس فیصلے پر ڈٹ گئے اور تہیّہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے۔ اب اس وقت تک صحافت کے کوچے کا رخ نہیں کریں گے جب تک فلمی دنیا میں کچھ کر کے نہ دکھا دیں۔

اُدھر مشکل یہ تھی کہ ہم فلم والوں کو اپنی زبان سے یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ ہم نے صحافت ترک کر دی ہے اور آپ لوگ ہمیں کام دیں۔ گویا عجیب بے سروسامانی کا عالم تھا۔ بعض جریدوں میں مضامین لکھ کر جو تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی وہ ہمارے ماہانہ اخراجات کے لئے ناکافی تھی۔ ہر مہینے ہم اماں کو ایک مقررہ رقم گھریلو اخراجات کے لئے باقاعدگی سے دیا کرتے تھے جس میں کبھی ناغہ نہیں ہوا تھا لیکن اب ہمیں یہ فکر پڑ گئی کہ اگر معقول اور باقاعدہ آمدنی نہیں ہوئی تو ہم اپنے ذمّے داری کس طرح پوری کریں گے؟ اسی دوران میں ہمیں کراچی اور لاہور کے بعد جرائد میں لکھنے کی پیش کی گئی۔ کچھ رقم ہم نے پس انداز کر رکھی تھی۔ اس طرح ہمیں کم از کم یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ ہم دو تین ماہ

تک اپنے ذمے داریاں پوری کر سکیں گے۔ مستقبل کے لئے مال و متاع جمع کرنے کا ہمیں کبھی شوق نہیں رہا۔یہی وجہ ہے کہ جو بھی آمدنی ہوتی تھی اسے ہم بے دریغ خرچ کر دیتے تھے اور آئندہ کے لئے یہ سوچتے تھے کہ بھئی ہماری محدود سی تو ضرورتیں ہیں، اللہ دے گا اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی ہمیں مایوس نہیں کیا اور ہماری مطلوبہ ضروریات پوری ہوتی رہیں اور آج تک ہو رہی ہیں۔

کہانی نویسی کے سلسلے میں ہم کو کن مشکلات اور مسائل سے دوچار ہونا پڑا وہ ایک علیحدہ داستان ہے جس کا بیان پھر کبھی ہو گا۔ قصہ مختصر یہ کہ دو تین سال میں ہم باقاعدہ کہانیاں اور مکالمے لکھنے والوں کی صف میں شامل ہوئے۔ معاوضہ وصول کرنے اور تقاضا کرنے کا ڈھنگ ہمیں کبھی نہیں آیا۔یہی وجہ ہے کہ کہانی نویس اور بعد میں فلم ساز کی حیثیت سے بہت سے لوگوں نے حسب استطاعت ہمارے پیسے مار لئے۔ ہم وضع داری نبھاتے رہے اور آج تک نبھا رہے ہیں۔ان لوگوں سے آج بھی ہمارا میل جول ہے۔ فلمی صنعت میں حالات خاصے دگرگوں تھے۔ فلمیں بننا تو شروع ہو گئی تھیں مگر بہت کم بجٹ میں بنائی جاتی تھیں اس لئے سپر سٹارز کے سوا دوسرے سبھی لوگوں کے معاوضے بہت کم تھے۔ خاص طور پر کہانی نویس کو اس معاملے میں سب سے کم اہمیت دی جاتی تھی۔ آج بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ کہانی نویسوں کے لئے نہ پہلے کبھی معاوضے کا معیار مقرر تھا اور نہ ہی آج ہے۔ ہر کہانی لکھنے والا اپنی قابلیت، ہمّت اور اہمیت کے لحاظ سے معاوضہ وصول کرتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ فلم ساز گفتگو کا آغاز یہاں سے کرتے ہیں کہ جی کہانی ہی فلم کی بنیاد ہوتی ہے۔ ہم بہت آہستہ روی سے اس میدان میں گامزن ہوئے تھے لیکن اتنے گرے پڑے بھی نہیں تھے کہ بہت کم معاوضہ قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

معاوضے سے زیادہ ہمیں عزت نفس کا پاس تھا جو خدا کا شکر ہے کہ ہم نے کبھی نہیں گنوائی۔ ہماری لکھی ہوئی بعض فلموں نے اوسط درجے کی کامیابی حاصل کی، کچھ ناکام رہیں جس میں سراسر ہمارا ہی قصور نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ فلمی صنعت میں ہمارے متعلق یہ رائے قائم کر لی گئی کہ ہم کامیڈی اور ہلکے پھلکے رومانی سین ہی اچھے لکھتے ہیں جبکہ ڈرامائی مناظر میں اتنے کامیاب نہیں ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہماری فلموں میں تھیٹریکل انداز کے مکالمے لکھنے کا انداز بہت مقبول تھا جن میں نفس مضمون سے زیادہ پُر شوکت الفاظ اور غیر ضروری لفاظی پر زور دیا جاتا تھا۔ سٹیج کا یہ

انداز ہمیں پسند نہیں تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ مکالمے کہانی کے کردار کے مطابق لکھے جائیں' ایسا نہیں ہونا چاہئیے کہ ہر کردار خواہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو' ایک ہی جیسی زبان بولتا نظر آئے۔

پاکستانی فلموں میں بھاری بھرکم پُرشوکت وپُرشکوہ مکالمے بہت پسند کئے جاتے تھے۔ انور کمال پاشا اپنے مکالموں کی وجہ سے بے حد مقبول تھے اوران کی فلموں میں مکالموں پر تماشائی باقاعدہ واہ واہ کرتے یا تالیاں بجا کر داد دیا کرتے تھے۔ان کے بعد ریاض شاہد نے الفاظ کی جادوگری دکھائی اور بے حد مقبولیت اور عروج حاصل کیا۔ریاض شاہد کا انداز تحریر اس قدر مقبول ہوگیا کہ پاکستان کے سبھی لکھنے والوں نے وہی انداز اپنالیا۔ فلم ساز اور ہدایتکار بھی اسی طرز کے مکالموں کو ترجیح دیا کرتے تھے اور لکھنے والوں سے فرمائش کرتے تھے کہ اسی طرح کے مکالمے لکھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کراچی سے لاہور تک ہر لکھنے والے نے کم و بیش وہی انداز اپنالیا۔ لیکن ریاض شاہد جیسے پُرمعنی اور پُرمغز مکالمے لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ بہر حال سب اسی رنگ میں رنگے گئے تھے۔ صرف ڈھاکا کی فلمیں اس سے محفوظ تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ ڈھاکا کے بنگالی فن کاروں کو اردو پر دسترس حاصل نہیں تھی۔ اکثر تو صحیح اردو بول ہی نہیں سکتے تھے۔اس لئے ان کے لئے سادہ اور آسان مکالمے لکھنے پڑتے تھے۔وہاں کے لکھنے والے بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ادیب تھے۔ وہ تھیٹر اور سٹیج سے متاثر نہیں تھے اس لئے ڈھاکا میں تیار ہونے والی فلموں کے مکالموں کا انداز مغربی پاکستان کی فلموں سے یکسر مختلف تھا۔

ہم سے بھی کچھ فلم سازوں نے ریاض شاہد کے انداز میں مکالمے لکھنے کی فرمائش کی لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ کوشش کے باوجود ہم ایسے مکالمے لکھنے سے قاصر رہے۔ہمارا عام فہم' برجستہ اور سادہ انداز بھی لوگوں کو قدرے مختلف لگا تو پسند آنے لگا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب فلم ساز اور ہدایتکار ہمارے پاس یہ فرمائش لے کر آتے تھے کہ فلم کا سکرپٹ آپ لکھ دیجئیے مگر ڈرامائی مکالمے ریاض شاہد سے لکھوائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ شرط ہمیں منظور نہ تھی۔ ریاض شاہد سے ہماری گہری دوستی تھی۔ ہنسی مذاق بھی تھا۔ ہدایتکار حسن طارق ہم دونوں کے مشترکہ دوست تھے۔ ریاض شاہد سے ان کی دوستی زیادہ پرانی تھی۔ ان کی کچھ فلموں میں ایسا ضرور ہوا کہ کچھ حصّے انہوں نے ہم سے لکھوائے اور کچھ ریاض شاہد سے لکھوائے۔ طارق صاحب کا معاملہ ایسا تھا کہ ان سے نہ تو ہم دونوں لڑ سکتے تھے

اور نہ ہی ان کے لئے کام کرنے سے انکار کر سکتے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ ہم نے کہانی اور مکالمہ نویس کے طور پر فلمی صنعت میں اپنی جگہ بنالی اور اپنے روشن مستقبل کے بارے میں کچھ پُر امید نظر آنے لگے۔

نجم نقوی صاحب بمبئی سے لاہور تشریف لائے تو آغا جی اے گل نے ان کو ہدایت کار کے طور پر سائن کیا اور یکے بعد دیگرے کئی فلمیں بنانے کا پروگرام بنایا۔ نجم نقوی صاحب نے پاکستان آکر پہلی فلم کی ہدایتکاری کراچی میں دی تھی۔ یہ فلم بہت مشہو ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ بری طرح فلاپ ہوئی تھی۔ پاکستان کا ہر فلم بین اس کا نام جانتا ہے۔ دیکھی شاید کسی نے نہ ہو۔ اس فلم کا نام ''کنواری بیوہ'' تھا اور اس کی وجۂ شہرت شمیم آراء تھیں۔ نجم نقوی نے شمیم آراء کو پہلی بار ہیروئن منتخب کیا تھا مگر یہ فلم بھی ناکام رہی اور شمیم آرا بھی۔ کچھ عرصے بعد جب شمیم آرا نے قسمت اور اپنی محنت وصلاحیت کے بل بوتے پر اداکاری میں نام پیدا کیا تو اس فلم کا خوب چرچا ہوا۔ شمیم آرا نے بہت نام اور پیسہ کمایا مگر یہ بات ان کے حق میں کہنی پڑے گی کہ وہ ہمیشہ نجم نقوی صاحب کو اپنا استاد تسلیم کرتی رہیں اور ان کی بے پناہ عزت کرتی رہیں۔ نجم نقوی صاحب کی وفات پر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئیں اور کئی دن تک بے حد مغموم اور سوگوار رہیں۔ آج کے زمانے میں محسنوں اور استادوں کی پذیرائی کرنے والے ایسے شاگرد خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ شاید ان ہی خوبیوں کی وجہ سے شمیم آراء کو اللہ تعالیٰ نے بھاگ لگائے۔

نجم نقوی صاحب قیام پاکستان سے پہلے علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ بڑے افسر بن سکتے تھے۔ مگر فلمی دنیا کا رخ کیا اور بمبئی جا کر ٹھہرے۔ وہاں انہوں نے کئی کامیاب فلمیں بنائیں اور نام پیدا کیا۔ بے حد شریف' خلیق اور ملنسار آدمی تھے۔ انتہائی منکسر المزاج تھے۔ ان کا لباس عموماً علی گڑھ کٹ چوڑے پانچوں کا پاجامہ کرتہ اور شیروانی یا پتلون اور قمیض تھا۔ کلین شیو تھے اور ان کی شرافت کی داستانیں ان سے پہلے ہمارے پاس لاہور پہنچ گئی تھیں۔ موسیقار رشید عطرے صاحب بمبئی میں ان کے بے تکلیف دوستوں میں شامل تھے۔ نخشب جارچوی سے بھی ان کی گہری دوستی تھی۔ نخشب صاحب رنگین مزاج بلکہ عاشق مزاج تھے جب کہ نجم نقوی صاحب انتہائی سادہ اور خشک مزاج۔ زندگی میں صرف ایک ہی شادی کی اور پھر کسی اور کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ شادی سے پہلے بھی ان کی یہی شہرت تھی۔ رشید عطرے صاحب ان کے اور نخشب صاحب کے بہت دلچسپ قصّے سنایا کرتے تھے۔ پھر جب ہماری ڈبلیو زیڈ

احمد صاحب سے ملاقات بڑھی تو انہوں نے بھی نجم نقوی صاحب کا تذکرہ کیا۔احمد صاحب نے پونا میں اپنی ایک فلم ''پرتھوی راج سنجوگتا'' کی ہدایتکاری کے لئے انہیں سائن کیا تھا اور 1944ء میں انہیں پانچ ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب احمد صاحب نے اپنے شالیمار فلم سٹوڈیوز میں ہندوستان کے قریب سبھی قابل ذکر ادیبوں اور شاعروں کو ملازم رکھ لیا تھا۔

نجم صاحب سے ہماری بھی لاہور میں ملاقات ہوئی۔ بہت زندہ دل اور وضع دار آدمی تھے۔ علی گڑھ کا رنگ ان پر نمایاں نظر آتا تھا۔ لیکن بہت سیدھے سادھے بھی تھے۔ کوئی بھی انہیں باتوں میں لگا سکتا تھا۔ لاہور کے ایورنیو فلم سٹوڈیوز میں ہماری اکثر ان سے علیک سلیک ہو جاتی تھی اور وہ بہت شفقت اور التفات کرتے تھے۔

یہ 1962ء کا ذکر ہے۔ ایک دن ہمیں نغمہ نگار تنویر نقوی صاحب نے یہ اطلاع دی کہ آغا جی اے گل نے ایک سال میں چھ فلمیں بنانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے کئی ہدایتکار سائن کئے ہیں۔ لیکن کہانی نویس کے طور پر صرف تمہیں منتخب کیا گیا ہے۔ پہلی فلم کے ہدایت کار نجم نقوی صاحب ہوں گے۔

آغا صاحب سے ہماری پرانی یاد اللہ تھی۔ بہت شفیق اور خلیق بزرگ تھے۔ ہم سے مذاق بھی کر لیا کرتے تھے۔ صحافت کے آغاز کے زمانے سے ہی ہماری ان سے ملاقات تھی۔ وہ پاکستان میں فلمی صنعت کے بے تاج بادشاہ کہلاتے تھے۔ ملک کے بلکہ ایشیا کے سب سے خوبصورت اور جدید ترین فلم سٹوڈیو کے مالک تھے۔ فلم ساز' تقسیم کار تھے اور سینما گھروں کے مالک بھی تھے۔ پاکستان کی فلمی دنیا میں ان کا سکّہ چلتا تھا۔ بڑے سے بڑا اداکار اور ہدایتکار ان کی خوشنودی حاصل کرنے کا خواہاں رہتا تھا۔ سجّاد گل اور شہزاد گل جو آج کل فلم سازی کر رہے ہیں اور ایورنیو سٹوڈیو بھی چلا رہے ہیں، ان ہی کے بیٹے ہیں۔ ان کی پہلی بیوی کے بڑے صاحب زادے آغا ریاض گل امریکا سے فلم سازی کی ڈگری لے کر آئے تھے اور کئی سال تک ایورنیو سٹوڈیوز کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے رہے تھے۔ ہم سے بھی ان کی گہری دوستی ہو گئی تھی جو آج بھی قائم ہے۔ اس داستان میں ان کا تذکرہ بھی آئے گا۔

تنویر صاحب کی سنائی ہوئی خبر بہت خوش آئند تھی۔ آغا جی اے گل کی فلموں کے لئے لکھنا افتخار کا باعث تھا۔ لیکن آغا صاحب کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ پیسے کم دیتے ہیں۔

دوسرے دن تنویر نقوی صاحب ہمیں لے کر لکشمی چوک پر آغا صاحب کے دفتر میں پہنچ گئے۔اس دفتر میں ہماری اکثر آمدورفت رہا کرتی تھی بلکہ آغا صاحب نے ازراہ نوازش ہمیں اپنی کوٹھی پر آنے کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔ لیکن کاروبار کے سلسلے میں ہم اس روز پہلی بار آغا گل کے پاس حاضر ہوئے تھے۔

تنویر نقوی صاحب ہمیں ساتھ لے کہ نیچے عمارت کے تہ خانے میں گئے جہاں آغا صاحب کے فلم سازی کے دفاتر تھے۔اوپر والی منزل میں ان کا ڈسٹری بیوشن آفس اور ایورنیو پکچرز کا ہیڈ آفس تھا۔ سمجھ لیجئیے کہ یہ پاکستان کی فلمی صنعت کا اعصابی مرکز تھا۔سٹوڈیو کے معاملات وہیں طے پاتے تھے جہاں آغا صاحب نے فلم پروڈکشن کا نہایت شاندار دفتر بنایا تھا۔اس خانے میں نجم نقوی صاحب سے ہماری ملاقات ہوئی۔انہوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ ہم اور وہ ساتھ کام کریں گے۔حالانکہ یہ تو ہمارے لئے باعث اعزاز تھا۔ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد انہوں نے ایک پتلی سی طالب علموں والی کاپی ہمارے سامنے رکھ دی اور بولے۔

"یہ کہانی کا مختصر سکرین پلے ہے۔آپ اسے پڑھ لیجئیے۔جب کام شروع ہو گا تو اس کے بارے میں ڈسکس کریں گے۔"

ہم نے چند منٹ میں سکرین پلے پڑھ لیا۔اچھی دلچسپ ہلکی پھلکی کمرشل کہانی تھی۔ہمیں بعض جگہوں پر اعتراض تھا مگر سوچا کہ باقاعدہ کام شروع ہو گا تو نجم صاحب سے بات کریں گے۔

انہوں نے کہا کہ "کیوں میاں۔دال دلیا پسند آیا؟ بھئی میں کہانی نویس تو نہیں ہوں۔بس ایسے ہی ایک لائن بنالی ہے۔اس میں رنگ تو تم ہی بھرو گے۔"

ہم نے مختصر الفاظ میں اپنے رائے بیان کی اور خیال ظاہر کیا کہ سکرین پلے کی مدد سے کامیاب فلم بنائی جاسکتی ہے۔ نجم نقوی یہ سن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔بولے "تو پھر آؤ آغا صاحب کے پاس چلتے ہیں تاکہ دوسرے معاملات بھی طے ہو جائیں۔"

سیڑھیاں چڑھ کر ہم گراؤنڈ فلور میں واقع آغا صاحب کے خوبصورت اور کشادہ دفتر میں گئے۔وہاں حسب معمول کئی فلم والے موجود تھے۔ان سے فراغت ہوئی تو آغا صاحب نے جنرل مینجر صاحب اور چپراسی کو ہدایت کی کہ اب کوئی

اندر نہ آئے۔

آغا صاحب کم گو تھے مگر ہمارے ساتھ شوخی اور مذاق کا مظاہرہ کر لیا کرتے تھے۔ کہنے لگے " آفاق، تم تو چائے پینے اور انگلش بسکٹ کھانے ہی آتے ہو۔ مگر آج پہلے کام بعد میں چائے۔ کیا خیال ہے؟؟

ہم نے کہا" آغا صاحب۔ چائے بسکٹ اور کیک تو اکثر ملتے رہتے ہیں۔ آج کام کی بات کر لیتے ہیں۔ پھر چائے تو مل ہی جائے گی۔"

انہوں نے پوچھا" تم نے سکرین پلے پڑھ لیا کیا خیال ہے؟"

ہم نے بتایا کہ اچھی دلچسپ کہانی ہے۔ اس کے بعد کہانی کے اہم کرداروں کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ شمیم آراء اور سنتوش کمار کو مرکزی کرداروں میں کام لینے کا خیال ظاہر کیا گیا۔ دوسرے اہم کرداروں کے بارے میں بھی بات چیت ہوئی اور آغا صاحب مختلف اداکاروں کے بارے میں ہمارے رائے دریافت کرتے رہے۔ اس کہانی میں چھ سات سین پر مشتمل ایک اہم کردار تھا جس کے لئے نجم نقوی صاحب ہمالیہ والا کو کاسٹ کرنے کے حق میں تھے۔ "مگر ہمالیہ والا تو اتنا چھوٹا رول نہیں کرے گا" آغا صاحب نے کہا۔

نجم نقوی صاحب نے کہا" آغا صاحب اسے مہمان اداکار بنالیں گے تو راضی ہو جائے گا۔ مگر اس کے لئے کم از کم آٹھ دس ہزار روپے دینے پڑیں گے۔"

آغا صاحب نے یہ تجویز بھی منظور کر لی۔ نغمات لکھنے کیلئے تنویر نقوی صاحب موجود ہی تھے۔ موسیقار کے طور پر رشید عطرے صاحب کے نام پر فیصلہ ہو گیا۔ یہ سب باتیں ہو گئیں مگر ہم سے بات طے کرنا رہ گئی تھی۔ آغا صاحب کا یہ دفتر کافی وسیع اور کشادہ تھا مگر وہ کاروباری بات کرنے کیلئے اکثر اپنے کمرے سے نکل کر باہر پچھلے صحن میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ ان کی کاروباری بات چیت چند منٹ سے زیادہ طویل نہیں ہوتی تھی۔ اکثر تو ایک دو منٹ میں ہی فیصلہ کر لیتے تھے۔ انہوں نے اپنے ملازم کو "چائے روڑا" یعنی چائے لانے کا آرڈر دیا اور کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے" آفاق، ذرا ایک منٹ کو ادھر آؤ۔"

بغلی دروازے سے ہم ان کے پیچھے پیچھے باہر صحن میں چلے گئے۔ وہاں ایک سائیکل کھڑی تھی۔ آس پاس کوئی شخص نہ تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ اب آغا صاحب معاوضے کی بات کریں گے اور عادت کے مطابق ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

مختصر سے عقبی صحن میں پہنچتے ہی آغا صاحب کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بولے ''بولو تم پیسے کتنے لو گے ؟''

ہم بوکھلا گئے۔ یہ موضوع ہمیشہ ہمارے لئے پریشان کن رہا ہے اور پیسوں کی بات کرتے ہوئے ہمیں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے بلکہ شرم سی آتی ہے۔

''بولو!'' انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

ہم نے نگاہیں جھکا کر کہا ''آغا صاحب۔ آپ ہی بتایئے''

جواب میں آغا صاحب نے خلاف عادت مختصر سی تقریر کر دی۔ انہوں نے کہا ''دیکھو آفاقی۔ میں نے سنا ہے کہ تم اچھا لکھتے ہو۔ نئے آئے ہو اس لئے تمہارے پاس نئے خیالات ہیں۔ میں نے سال میں چھ فلمیں بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یعنی ہر دو ماہ بعد ایک فلم۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ سب فلمیں تم ہی لکھو۔''

ہم نے دبی زبان میں کہا ''شکریہ آغا صاحب''

پوچھا ''تو پھر بولو۔ ایک فلم کے کتنے پیسے لو گے ؟''

ہم پھر شرما گئے۔ کہا ''آغا صاحب آپ ہی بتا دیجئے۔''

اس کے جواب میں آغا صاحب نے پھر ایک مختصر سی تقریر کر دی۔ کہنے لگے ''آفاقی۔ میں نے کئی رائٹرز سے کام کرایا ہے۔ فلاں رائٹر کو میں نے اٹھارہ سو معاوضہ دیا تھا۔ فلاں کو پندرہ سو دیئے تھے۔ فلاں رائٹر کتنا بڑا اور مشہور ہے۔ اسے میں نے دو ہزار روپے دیئے تھے۔ صرف رحیم گل کو میں نے ساڑھے تین ہزار روپے ایک فلم کا معاوضہ دیا تھا مگر اس کی وجہ کچھ اور تھی۔''

ہم خاموش ان کا منہ دیکھتے رہے۔ آغا صاحب نظریں جھکا کر کاروبار کی بات کرنے کے عادی تھے۔ اس وقت بھی انہوں نے نگاہیں نیچی کیں اور کہنے لگے ''تم نوجوان اور فریش ہو۔ تمہارے خیالات بھی فریش ہیں۔ میں تمہیں ویسے بھی پسند کرتا ہوں۔ بس میں تمہیں فلم لکھنے کا معاوضہ تین ہزار روپے دوں گا۔ ٹھیک ہے؟''

ہم نے کہا"آغا صاحب۔ یہ تو بہت کم ہے۔"

بولے"آفاقی۔ اتنے پیسے میں نے پہلے کسی رائٹر کو نہیں دیئے اور بات یہ ہے کہ ابھی تمہارا بھاؤ بھی نہیں کھلا ہے۔"

ہم نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا"جی؟"

"بات یہ ہے کہ جب ریس میں کوئی گھوڑا وِن کرتا ہے تو اوپر اسکرین پر اسکا بھاؤ لکھ دیا جاتا ہے۔ تمہاری ابھی تک کوئی بھی فلم ہٹ نہیں ہوئی ہے اس لئے فلم انڈسٹری میں بھاؤ نہیں کھلا ہے۔ جب فلم ہٹ ہو گی تب اور بات ہو گی۔"

ہماری آغا صاحب سے کافی بے تکلفی تھی۔ معاوضے کی بات کا قصّہ الگ ہے لیکن دوسرے موضوعات پر ہم ان سے کھل کر بات کر سکتے تھے۔ اس لئے ہم نے کہا"آغا صاحب، ہم اس طرح سوچتے ہیں کہ آپ کی فلم ساڑھے تین چار لاکھ روپے میں بنے گی۔ اس میں رائٹر کا کتنا حصہ ہے؟ آپ کچھ دیر پہلے ہمالیہ والا کو چند سین کے عوض آٹھ دس ہزار روپے معاوضہ دینے پر آمادہ ہو گئے تھے حالانکہ وہ ہمارے لکھے ہوئے تھوڑے سے ڈائیلاگ ہی بولیں گے۔ مگر جو رائٹر پورا اسکرپٹ لکھے گا اس کو صرف تین ہزار؟"

آغا صاحب تھوڑے مسکرائے"یار تم بحث بہت زیادہ کرتے ہو۔ آرٹسٹ کی بات اور ہوتی ہے اور پھر تمہارا بھاؤ۔۔۔"

ہم نے کہا"معاف کیجئے آغا صاحب۔ ابھی آپ نے جن رائٹرز کا نام لیا ہے ان سب کا بھاؤ کھل چکا ہے۔ ایک صاحب کی تین چار فلمیں سپر ہٹ ہو چکی ہیں۔ دوسرے کی بھی کئی فلمیں ہٹ ہیں۔ مگر ان کا بھاؤ نہیں کھلا۔ جب کسی ہیرو یا ہیروئن کی فلم ہٹ ہوتی ہے تو آپ کے بقول اس کا بھاؤ کھل جاتا ہے۔ مگر کئی ہٹ فلموں کے رائٹرز کا بھاؤ کیوں نہیں کُھلتا۔"

آغا صاحب خلاف عادت کافی طویل گفتگو کر چکے تھے اور مزید مذاکرات کیلئے تیار نہ تھے۔ بولے" یار تمہاری عقل کہاں چلی گئی ہے؟ سنا ہے تم تیز لکھتے ہو۔ تم سال میں چھ فلمیں لکھو گے۔ یعنی اٹھارہ ہزار روپے کماؤ گے۔ ایک سال میں اٹھارہ ہزار کم آمدنی تو نہیں ہے۔ تم اور کیا چاہتے ہو؟"

ہم نے کہا"آغا جی۔ ہمیں تو بہت شرم آ رہی ہے کہ رائٹر کا بھاؤ ایک معمولی ڈانسر کے بھاؤ سے بھی کم ہے۔"

"شرم کو چھوڑو۔ بولو ہاں کہ ناں؟"

ہم نے جی کڑا کر کہا" دیکھئے نا آغا صاحب، آپ تو"

انہوں نے بے چینی سے ہماری بات کاٹ دی" ٹھیک ہے۔ آؤ اندر چلیں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے اور ہم ان کے پیچھے دوبارہ ان کے دفتر میں داخل ہو گئے۔ ہمارے پہنچتے ہی ملازم نے شیشے کی ٹاپ والی بڑی میز پر خوب صورت قیمتی پیالیوں میں چائے لا کر رکھ دی۔ انگلش بسکٹ (جو اس زمانے میں نایاب تھے) اور شیزان کا کیک بھی موجود تھا۔

چائے کا دور چلا اور اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ کچھ دیر بعد ہم اٹھ کر کھڑے ہو گئے" اچھا آغا صاحب اجازت دیجئے" یہ کہہ کر ہم نے وہ پتلی سی کاپی نجم نقوی صاحب کے سامنے رکھ دی اور دفتر سے باہر نکل گئے۔ نجم نقوی صاحب کی حیرت زدہ آواز ہمارا پیچھا کرتی رہی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ سارے معاملات طے پا چکے ہیں مگر کاپی ان کے حوالے کرنے پر وہ واقعی حیران رہ گئے تھے۔

ہم دفتر سے باہر نکلے اور کُھلی فضا میں ایک لمبی سانس لے کر یہ سوچتے ہوئے چل پڑے کہ ہم نے آج جو حرکت کی ہے وہ غلط ہے یا درست؟ اتنے بڑے آدمی کی اتنی اچھی پیشکش مسترد کر کے ہم نے حماقت تو نہیں کر دی؟ اتنی دیر میں نجم نقوی صاحب تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے آ گئے۔

" میاں کیا بات ہے؟"

ہم نے کہا" بس۔ معاوضے پر تصفیہ نہیں ہو سکا۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے" جیسی اللہ کی مرضی۔ میرا خیال تھا کہ تم ہی میرے ساتھ کام کرو گے، خیر۔"

وہ ہمارا کندھا تھپک کر واپس لوٹ گئے۔

اس رات ہم بہت دیر تک بستر میں لیٹے سوچتے رہے کہ بھائی آخر تم چاہتے کیا ہو؟ اخبار نویسی تو تم چھوڑ ہی چکے ہو حالانکہ کئی سال وہاں صرف کئے ہیں۔ اب اتنے بڑے فلم ساز کی آفر بھی مسترد کر دی۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اس زمانے میں رائٹر کو تین ہزار روپے معاوضہ شاذ و نادر ہی ملتا تھا اور پھر سال میں چھ فلمیں مل رہی تھیں۔ یعنی اٹھارہ ہزار نقد جو کہ اس زمانے میں ایک معقول رقم تھی۔ آغا گل جیسے فلم ساز اور نجم نقوی جیسے ہدایت کار کے ساتھ کام

کر کے ہماری شہرت اور وقار میں بھی خاصا اضافہ ہو سکتا تھا۔اس کے باوجود حماقت کر آئے۔
مگر ہم نے ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیا تو ایک اور ہی شکل ذہن میں ابھرنے لگی۔ یہ تو ہم پہلے جان چکے تھے کہ کارکن صحافی کبھی خوشحال نہیں ہو سکتا۔اب ہم پر یہ راز منکشف ہوا تھا کہ رائٹر کی حیثیت سے بھی ہم کبھی خوشی کا منہ نہیں دیکھ سکیں گے۔ تو پھر کیا کریں؟ صحافت کی طرح فلمی صنعت کو بھی خیر باد کہہ دیں؟اس کے بعد ہمارا ٹھکانا کہاں ہو گا۔ ساری زندگی میں صرف دو ہی کام تو سیکھے ہیں۔ان ہی سے کنارہ کش ہو گئے تو کریں گے کیا؟ ہمیں تو کوئی اور کام آتا ہی نہیں ہے۔
یکایک خیال آیا۔اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ فلم ساز بن جاؤ۔خود ہی کہانی لکھو اور خود ہی فلم بناؤ۔ قسمت میں ہو گا تو منافع بھی مل جائے گا۔
مگر سرمایہ کہاں سے آئے گا؟
سرمایہ اس زمانے میں فلم سازی کیلئے بنیادی مسئلہ نہیں تھا۔اوّل تو یہ کہ فلموں کی لاگت ہی بہت کم تھی۔دوسرے یہ کہ بڑے اداکار کئی فلموں میں ادھار پر کام کر لیتے تھے۔ فلم مکمل ہونے کے بعد انہیں معاوضہ ادا کر دیا جاتا تھا۔ اسٹوڈیو کی خدمات بھی ادھار پر حاصل ہو جاتی تھیں بلکہ خام فلم بھی اسٹوڈیو کے مالک ادھار پر فراہم کر دیا کرتے تھے۔ مگر یہ رعایت صرف بھروسے کے لوگوں کو حاصل تھی۔ جن کی کاروباری ساکھ بھی اہم ہو اور فلمی دنیا میں ان کا نام بھی ہو۔ ورنہ ڈھیروں سرمایہ لے کر آنے والے نوواردوں سے بھی فلم کے لوگ سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔
اس رات ہمیں بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ ہم کہانی نویس کے طور پر کام ہی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہمارا مدّعا صرف یہ تھا کہ اگر ہم خود اپنی فلمیں بنائیں گے تو اپنی پسند کے موضوعات پر اسکرپٹ لکھیں گے اور اپنی مرضی کے مطابق انہیں فلمائیں گے تو اس طرح ایک تو ہم دوسرے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے محتاج ہو کر نہیں رہ جائیں گے دوسرے یہ کہ کامیابی کی صورت میں ہمیں مجبوراً ہر ایک کی کہانیاں لکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی اور ہم کو چوائس کی آزادی ہو گی۔ ایسا نہیں ہو گا کہ پیٹ بھرنے کیلئے ہم ہر ایک کی بات ماننے پر مجبور ہو جائیں۔
دوسرے دن ہم صبح اٹھے تو اپنی ذاتی فلم بنانے کا عزم کر چکے تھے۔ ہمارے پاس ایک کہانی کا آئیڈیا اور اسکرین پلے

موجود تھا جو ہمیں بے حد پسند تھی مگر کوئی فلم ساز اس کو خریدنے پر آمادہ نہیں تھا۔ سب سے پہلے تو ہم نے اپنے دوست ہدایت کار حسن طارق کو یہ کہانی سنائی۔ وہ اس زمانے میں ''شکوہ'' بنانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ''شکوہ'' کی کہانی انہیں کافی عرصے سے اکسا رہی تھی اس لئے انہوں نے پہلے اسے فلمانے کا فیصلہ کر لیا۔

اقبال شہزاد ان دنوں کراچی میں رہتے تھے اور خلیل قیصر کو انہوں نے ایک فلم کی ہدایت کاری کیلئے سائن کیا تھا۔ ہم نے یہی کہانی اپنے دوست اقبال شہزاد کے حوالے کر دی۔ وہ اسے لے کر کراچی چلے گئے۔ وہاں سے ان کا فون آیا کہ سوفی صاحب۔ کہانی تو ٹھیک ہے مگر اس میں تفریح کا پہلو زیادہ نہیں ہے۔ انہوں نے لاہور آ کر وہ کہانی ہمیں لوٹا دی۔ جب ہم نے کہا کہ اپنے ڈائریکٹر کی بھی رائے لے لو تو انہوں نے یہ اسکرین پلے خلیل قیصر کو پڑھنے کیلئے دے دیا۔

خلیل قیصر نے دو دن بعد مخصوص انداز میں اپنے سر کے بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے ہم سے کہا ''یار آفاقی صاحب۔ کہانی تو اچھی ہے مگر یہ سوشل ٹائپ کی کہانی ہے۔ یہ میرا ٹائپ نہیں ہے۔ کوئی انقلابی موضوع ہو تو بتاؤ۔'' لیجئے۔ ایک اور ہدایت کار نے اس کو مسترد کر دیا۔

چوہدری محمد رفیع بمبئی سے آئے ہوئے ایک ہدایت کار تھے۔ تعلیم یافتہ اور نہایت شائستہ بزرگ تھے۔ وہ آج کی خاتون سیاسی رہنما مہناز رفیع کے والد تھے۔ اسی زمانے میں مہناز رفیع نے ایم، اے کرنے کے بعد ٹی وی ڈراموں میں کام کیا اور بہت داد سمیٹی تھی۔ چوہدری رفیع صاحب کو کسی نے ہدایت کار سائن کیا تو انہوں نے ہم سے فرمائش کی کہ ''عورت'' کے موضوع پر کوئی اچھی سی کہانی ان کیلئے لکھ دیں۔ ہم نے فوراً اپنا اسکرین پلے نکالا اور جھاڑ پونچھ کر چوہدری صاحب کے حوالے کر دیا۔ چوہدری رفیع نہایت وضع دار اور لحاظ والے انسان تھے۔ دو تین دن تو خاموشی رہی۔ پھر ایک روز ہم شاہ نوا سٹوڈیو گئے تو چوہدری صاحب نے بڑی لمبی تمہید باندھی۔ اس کا لب لباب یہ تھا کہ ہماری کہانی ''عورت'' کے موضوع سے انصاف نہیں کرتی۔

انہوں نے کہا ''کوئی اور اچھی سی کہانی لکھ دیجئے نا۔''

چوہدری صاحب اس زمانے میں شاہ نور اسٹوڈیو کے جنرل منیجر بھی تھے۔ ہم نے خاموشی سے اپنے کاغذات سنبھالے

اور وعدہ کیا کہ ان کیلئے کوئی اور کہانی سوچیں گے۔

یہ اسکرین پلے ہم نے کچھ اور فلم سازوں کو بھی پڑھنے کیلئے دیا تھااور اس کے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کر دیا تھا مگر کسی کو یہ کہانی پسند نہ آئی۔

اسی دوران میں حسن طارق صاحب کی فلم ''شکوہ'' ہٹ ہوگئی۔اس فلم کا اسکرین پلے ہم نے لکھا تھا۔مکالمے ساجھے کے تھے۔یعنی ہم نے اور ریاض شاہد نے مل کر لکھے تھے۔ چند ماہ گزرنے کے بعد ہم نے ایک دن حسن طارق کو یاد دلایا کہ ہمارے پاس ایک کہانی رکھی ہوئی ہے۔وہ اسے کیوں نہیں بنا لیتے۔

طارق صاحب نے وہ اسکرین پلے دوبارہ ہم سے لے لیااور بہت غور سے پڑھنے کے بعد بولے ''آفاقی صاحب، یہ کہانی ''شکوہ'' سے ملتی جلتی ہے۔ابھی ہم نے ''شکوہ'' بنائی ہے۔دوبارہ اس قسم کی فلم بنانا مناسب نہ ہوگا۔اور پھر یہ کہانی '' شکوہ'' کی کہانی کے مقابلے میں ہلکی ہے۔''

اس روز ہم نے جی میں ٹھان لی تھی کہ اب ہم خود ہی اس کہانی کا مکمل اسکرپٹ لکھیں گے اور اسے خود ہی پروڈیوس کریں گے۔چنانچہ ہم اس کہانی کا اسکرپٹ لکھنے میں مصروف ہوگئے۔اس کے بعض حصے اس قدر جذباتی اور حسرت انگیز تھے کہ لکھتے لکھتے ہمارا دل بھر آتا تھا۔سین لکھتے وقت اکثر ہم یوں محسوس کرتے ہیں جیسے کہ یہ منظر ہمارے سامنے موجود ہے۔اس لئے جذباتی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ماں ہمیشہ سے کمزور پہلو ہے۔اس کہانی میں ماں اور بیٹیوں کے سین لکھتے ہوئے بعض اوقات ہمارا جی بھر آتا تھا۔ہماری آنکھوں سے آنسو تو بہت مشکل سے نکلتے ہیں مگر دل بھاری ہو جاتا ہےاور یہ غم والم کا موڈ کئی گھنٹے تک طاری رہتا ہے۔یہ کہانی لکھتے ہوئے بھی ہم اکثر ویسے ہی تجربات سے گزرے۔ہلکے پھلکے مناظر ہمیں مسرور بھی کر دیتے تھے۔لیکن المیہ مناظر کا اثر بہت دیر تک رہا کرتا تھا۔ اس طرح روتے ہنستے ہم نے یہ اسکرپٹ مکمل کیا۔دوچار دن اس کو میز کی دراز میں رکھنے کے بعد دوبارہ اس کا مطالعہ کیااور نظر ثانی کی۔بعض جگہ اضافہ کیا۔کچھ حصے حذف کر دیئے۔دوبارہ اسکرپٹ پڑھتے ہوئے بھی ہم بعض اوقات بہت غمگیں اور دکھی ہوگئے۔غرضیکہ یہ ایک عجیب تجربہ تھا۔ہمیں نہ کسی ہدایت کار کی رائے لینے کی ضرورت پیش آئی تھی اور نہ فلم ساز یا یونٹ کے دوسرے حضرات نے قیمتی مشوروں سے نوازا تھا۔یہ خالصتاً ہمارا اپنا اسکرپٹ تھا۔ہر قسم کی

ملاوٹ سے پاک، ہر طرح کے دباؤ سے آزاد۔

اسکرپٹ پر نظرثانی کرتے ہی ہم حسن طارق صاحب کے پاس جا دھمکے۔ طارق صاحب بہت عجیب و غریب شخصیت تھے۔ انتہائی سادہ اور صاف گو بلکہ منہ پھٹ۔ اپنی رائے کا اظہار کرنے پر آتے تو کسی کا لحاظ نہ کرتے تھے۔ بہت اعلیٰ پائے کے ہنرمند تھے۔ کہانی، اسکرین پلے اور مکالموں کا انہیں بہت زیادہ شعور تھا۔ افسانوی اور شعری ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ ادیبوں، صحافیوں، شاعروں اور فن کاروں کی محفلوں میں نوعمری ہی سے بیٹھتے رہے تھے۔ فلم کا انہیں دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ بعد میں جب کامیاب ہدایت کار بن گئے تو فلم ہی انکا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس کے سوا انہیں کسی اور چیز کا ہوش ہی نہ تھا۔ عمر بھر ان کی یہی عادت رہی۔ انہوں نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز فلم ''مسکراہٹ'' کا اسکرین پلے اور مکالمے لکھ کر کیا تھا۔ اس فلم کے ہدایت کار این ای اختر تھے۔ پھر وہ سیف الدین صاحب کی فلم ''باپ کا گناہ'' میں جعفر ملک صاحب کے اسسٹنٹ رہے۔ کہانی اور اسکرپٹ کے بارے میں ان کی رائے عموماً جامع اور صائب ہوتی تھی۔ لیکن ہر شخص کی ذاتی پسند اور ناپسند ہوتی ہے اور ترجیحات مختلف ہوتی ہیں۔ جن معدودے چند ہدایت کاروں کے بارے میں ہماری رائے ہے کہ انہیں کہانی اور مکالموں کا اچھا شعور ہے ان میں حسن طارق بھی شامل تھے۔ کبھی کبھی وہ کہانی پر بات چیت کے دوران میں روانی میں ایسے خوب صورت اور برمحل فقرے بول جاتے تھے جو ہم فوراً نوٹ کر لیا کرتے تھے اور انہیں کسی تبدیلی کے بغیر ہی اسکرپٹ میں شامل کر لیتے تھے۔

اس جان کاری کے پیشِ نظر جب وہ کسی کہانی کے بارے میں ہم سے اتفاق نہیں کرتے تھے تو ہم واقعی سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ اگر ان کی رائے کو درست سمجھتے تو اپنا خیال بدل لیتے لیکن اگر اپنی رائے کی درستی پر بھروسا ہوتا تو اس پر قائم رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے دو تین بار ہماری مذکورہ کہانی کو فلمانے میں پس و پیش کیا تو ہمیں بہت غصّہ آیا اور مایوسی بھی ہوئی۔ مگر یہ کہانی ہمیں بے حد پسند تھی اور یقین تھا کہ اس پر ایک اچھی فلم بنائی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہم نے بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

اسکرپٹ مکمل ہوا تو ہم اس وقت تک فلم کا کوئی نام تجویز نہیں کر سکے تھے۔ بعض کہانی نویس اسکرپٹ لکھنے سے پہلے ہی فلم کا اچھا سا نام تجویز کر لیتے ہیں۔ ہماری پرابلم یہ ہے کہ ہم کہانی مکمل ہونے کے بعد بھی کوئی موزوں نام سوچنے

میں کافی وقت لگا دیتے ہیں مگر طارق صاحب کو فلم کے موزوں اور خوب صورت نام فوراً سوجھتے تھے۔
طارق صاحب نے سویرے سویرے ہمیں اپنے گھر میں دیکھا تو مسکرائے۔ سمجھ گئے کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ وہ بھی جس روز علی الصبح ہمارے گھر آ جاتے تھے تو ہم کو بھی یہی خیال گزرتا تھا کہ ہو نہ ہو کوئی خاص بات ضرور ہے اور اکثر ایسا ہی ہوتا بھی تھا۔
چائے کا دور چلنے کے بعد ہم نے اپنے اسکرپٹ کا لفافہ نکالا اور طارق صاحب کے سپرد کر دیا۔
''یہ کیا ہے آفاقی صاحب'' انہوں نے پلندہ دیکھ کر پوچھا۔
ہم نے کہا ''طارق صاحب۔ ہم نے اسی کہانی کا مکمل اور تفصیلی اسکرپٹ لکھا ہے۔ آپ اسے پڑھنے کے بعد اپنی رائے دیجئے۔ اسے ہم خود پروڈیوس کریں گے۔ آپ اتنا بتا دیں کہ کیا اس کی ڈائریکشن دیں گے؟''
وہ مسکرائے ''آپ بھی اس کہانی کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے''
ہم نے کہا ''اگر یہ اسکرپٹ بھی آپ کو پسند نہ آیا تو پھر ہم اس کہانی کو فراموش کر دیں گے۔''
دوسرے دن ابھی ہم سوئے پڑے تھے کہ طارق صاحب کی کار کا ہارن گونجنے لگا۔ نوکر نے انہیں بٹھایا اور حسب معمول چائے پیش کر دی مگر وہ بار بار کہہ رہے تھے '' آفاقی صاحب کو جگا دو۔''
ہم جھٹ پٹ منہ ہاتھ دھو کر پہنچے تو وہ صوفے پر نیم دراز سگریٹ پی رہے تھے۔ ہمیں دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گئے اور ایک شریر مسکراہٹ ان کے چہرے اور آنکھوں میں نمودار ہوئی۔ کہنے لگے ''آفاقی صاحب۔ یہ تو کلاس چیز ہے۔ بہت اچھی کہانی ہے۔''
ہم نے کہا ''ہم تو کب سے آپ سے کہہ رہے ہیں مگر آپ مانتے ہی نہیں۔''
بولے '' آپ کا خیال ٹھیک تھا۔ میں اسے اس قدر تفصیل کے ساتھ اپنے تخیل میں نہیں بسا سکا تھا۔ یہ تو واقعی بہت اچھی کہانی ہے۔ اسے فوراً شروع کر دینا چاہئے۔''
ان دنوں میں بھی وہ کافی مصروف ہدایت کار تھے۔ یہ 1963ء کی بات ہے۔ انہوں نے پوچھا ''کیا آپ اسے خود پروڈیوس کرنا چاہتے ہیں؟''

''جی ہاں''!

''بہت اچھی فلم بنے گی۔ شروع کب کر رہے ہیں؟''

ہم نے کہا''ایک صاحب ہمارے ساتھ پارٹنر شپ کر رہے ہیں اور وہ چالیس ہزار روپیہ بھی لگائیں گے۔ کسی بات میں دخل نہیں دیں گے بلکہ وہ تو یہاں رہتے بھی نہیں ہیں۔ حیدر آباد میں ان کا پلاسٹک کا کارخانہ ہے۔''

''بس تو بسم اللہ کر دیجئے۔'' انہوں نے مضطرب ہو کر ایک نئی سگریٹ سلگائی''اور ہاں۔اس کا نام کیا رکھا ہے؟''

ہم نے کہا''نام تو ابھی سوچا ہی نہیں۔''

کہنے لگے ''مجبور'' کیسا نام رہے گا؟''

ہمیں یہ نام بہت پسند آیا۔ چنانچہ اس فلم کا نام ''مجبور'' منتخب کیا گیا۔

اگلے چند روز میں اداکاروں کے بارے میں غور وخوض شروع ہو گیا۔طارق صاحب دو مرکزی کرداروں کیلئے کمال اور حبیب کے حق میں تھے ''کنیز'' کے مرکزی کردار کیلئے موزوں ترین اداکارہ صبیحہ خانم تھیں لیکن وہ اداکاری سے کنارہ کش ہو چکی تھیں۔ ہمارے سامنے دوسری چوائس یاسمین تھیں۔ فلم کے دوسرے کرداروں کیلئے بھی کچھ فن کاروں کا انتخاب کر لیا گیا اور ہم نے اداکاروں سے مذاکرات بھی شروع کر دیئے۔

کمال نے ہماری توقع سے کہیں زیادہ معاوضہ طلب کیا حالانکہ وہ ہمارے بچپن کے دوست تھے۔ ہم ہی نے انہیں فلمی دنیا میں متعارف کرایا تھا اور جب انہوں نے اپنی فلم ''جوکر'' کا اعلان کیا اور ہمیں رائٹر بننے کا شرف بخشا تو معاوضے کے بارے میں ہم سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ نہ ہم نے کوئی سوال کیا۔ یہ فلم چار پانچ سال میں جا کر مکمل ہوئی اور ہم اسے حسب ضرورت تبدیل کرتے اور لکھتے رہے۔ پیسوں کا تذکرہ ہی درمیان میں نہ آیا۔ فلم کی ریلیز کے وقت انہوں نے ایک چیک ہماری جیب میں ڈال دیا اور کہا'' سوفی۔اسے معاوضہ مت سمجھنا۔ یہ بس ٹوکن ہے۔ یار مجھے اس فلم میں کافی نقصان ہوا ہے۔''

حالانکہ ہم جانتے تھے کہ یہ درست نہیں ہے۔ مگر ہم نے کوئی عُذر نہیں کیا۔ان کی فرمائش تھی کہ ان کی موجودگی میں ہم چیک کو بند ہی رہنے دیں۔ وہ چائے پی کر رخصت ہو گئے تو ہم نے بڑے اشتیاق سے چیک پر نظر ڈالی۔ یہ پانچ سو

روپے کا چیک تھا جو ہماری کہانی نویسی کا کل معاوضہ تھا۔ اس وقت تک ہم کہانی نویس کی حیثیت سے پہچانے بھی جاتے تھے اور اس سے کہیں زیادہ معاوضہ لیا کرتے تھے۔ مگر ''حساب دوستاں در دل'' کے مطابق ہم نے پھر کبھی اس موضوع پر ان سے بات نہیں کی۔

اب ہم اپنی پہلی فلم کیلئے ان سے بات کر رہے تھے اور معاوضے کا فیصلہ پہلے ہی کرنا چاہتے تھے تو انہوں نے بڑی بے تکلفی سے کہا ''تمہیں تو پتا ہے کہ آج کل میں ''اتنا'' معاوضہ لیتا ہوں اور پانچ ہزار ایڈوانس ہے۔''

ہم نے کہا ''یہ بتاؤ کہ ہم سے کتنا معاوضہ لو گے؟''

ہنس کر بولے ''یار تم سے کوئی بزنس تو نہیں کروں گا۔ چلو تم پانچ سو کم دے دینا۔''

ہم نے کہا ''یار شرم کرو، یہ تو بہت زیادہ ہے۔''

''چلو پانچ سو اور کم کر دو''

ہم نے کہا ''سوچیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم ایڈوانس نہیں دیں گے۔ تھوڑی رقم فلم بننے کے دوران میں دیں گے اور بیلنس ریلیز پر۔''

وہ سر کھجانے لگے ''یار میں ایسا کرتا تو نہیں ہوں اس لئے کہ پروڈیوسروں کا کوئی بھروسا نہیں ہے مگر تمہاری بات اور ہے۔ تمہارے ساتھ رعایت کر دوں گا۔''

ہم چلے آئے مگر ان کے اس کاروباری رویّے کا ہمیں بہت دکھ ہوا۔ کم از کم کمال سے ہمیں یہ امید نہ تھی۔ حبیب صاحب سے ہماری یاد اللہ بہت پرانی تھی۔ جب لقمان صاحب نے اپنی تاریخی فلم ''ایاز'' کیلئے انہیں منتخب کیا تھا اس وقت سے ہماری ان سے ملاقات تھی۔ کافی میل جول تھا۔ ہم نے اخباروں میں انہیں پبلسٹی بھی دی تھی۔ بے شمار دن اور راتیں ہم نے ایک ساتھ گزاری تھیں۔

وہ بالکل نئے اداکار تھے اور نئے اداکاروں کے ساتھ فلمی دنیا کافی بے اعتنائی برتتی ہے۔ مگر ہم نے ہر موقع پر ان کا ساتھ دیا تھا۔ پھر وہ کامیاب ہیرو بن گئے اور اس کے بعد فلم ساز۔ وہ بہت بااخلاق آدمی ہیں۔ باتیں بھی بہت میٹھی کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو کمال نے کیا تھا۔ بولے '' آفاقی صاحب۔ آپ سے میں

کاروبار تو نہیں کروں گا۔ آپ جو مناسب سمجھیں دے دیجئے گا۔"

"پھر بھی۔ رقم کا فیصلہ ہو جائے تو بہتر ہے۔"

وہ ہنسنے لگے "جلدی کیا ہے۔ جب فلم شروع ہو گی تو وہ بھی ہو جائے گا۔ مگر آپ اسے مسئلہ نہ بنائیں۔"

ہم نے کہا "ہم ایڈوانس رقم نہیں دیں گے اور معاوضہ فلم مکمل ہونے پر ادا کریں گے۔"

"فکر کیوں کرتے ہیں۔ مجھے آپ پر بھروسا ہے۔"

اداکار حبیب کے اس روّیے نے ہمیں بہت متاثر کیا۔

حسن طارق صاحب حبیب کے انتخاب سے زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ دراصل ہمیں بھی یہ انتخاب زیادہ موزوں نہیں لگا تھا مگر دوسرے دستیاب ہیرو بالکل ہی ناموزوں تھے۔ مثلاً سنتوش کمار، درپن، سدھیر، یوسف خاں ان کرداروں کیلئے عمر کے اعتبار سے مناسب نہیں تھے۔ لے دے کے کمال اور حبیب ہی نظر آتے تھے حالانکہ ہمارے خیال میں وہ بھی کرداروں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے تھے۔ مگر کوئی اور چارہ نہ تھا۔

یاسمین سے ہماری پرانی ملاقات اور بے تکلفی تھی۔ انہوں نے لقمان صاحب کی فلموں میں بھی کام کیا تھا جن سے ہم بھی وابستہ رہے اور اس زمانے میں فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں ہمارا کافی وقت ساتھ گزرتا تھا۔ وہ ادب دوست، خوش گفتار اور خوش مزاج خاتون ہیں۔ مزاح کا ذوق بھی ہے۔ شعر و ادب سے آگاہی رکھتی ہیں اس لئے ان سے گاڑھی چھنتی تھی۔

ہماری یاسمین سے اس وقت سے ملاقات تھی جب وہ کیمرا مین جعفر شاہ بخاری کی بیگم تھیں۔ جعفر شاہ پاکستان کے بہترین کیمرامینوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ بعد میں وہ فلم ساز اور ہدایت کار بھی بنے اور بہت اچھی فلمیں بنائیں فلم "بھروسا" کے فلم ساز اور ہدایت کار جعفر شاہ ہی تھے۔ اس فلم سے ریاض شاہد کہانی نویس اور مکالمہ نگار کی حیثیت سے نمایاں ہو کر سامنے آئے اور پھر انہوں نے پیچھے پلٹ کر نہ دیکھا۔ اس اعتبار سے ریاض شاہد کو فلمی صنعت کے سامنے پیش کرنے کا کریڈٹ جعفر شاہ بخاری کو جاتا ہے ان دونوں کی اولاد میں ایک بیٹا ناصر بخاری ہیں جو آج کل انگلستان میں ہیں۔ وہاں انہوں نے ایک انگریز لڑکی سے شادی کی۔ چار بچوں کے باپ بنے اور پھر میاں بیوی میں

علیحد گی ہو گئی۔

جعفر شاہ بخاری کے ساتھ یاسمین کا ساتھ کافی طویل رہا مگر پھر انہوں نے جعفر شاہ بخاری سے طلاق حاصل کرلی اور کچھ عرصے بعد سیّد شوکت حسین رضوی سے شادی کرلی۔ وہ اب دو بیٹوں کی ماں ہیں۔ یہ دونوں اب شاہ نوراسٹوڈیو میں شوکت صاحب کے حصّے کا انتظام سنبھالتے ہیں۔

یاسمین کا نام پہلے زرینہ ریشماں تھا۔ وہ بمبئی میں بھی کچھ عرصے فلمی صنعت سے وابستہ رہیں۔ پھر پاکستان آنے کے بعد کئی فلموں میں اداکاری کی۔ پہلے وہ معاون اداکاروں کے طور پر کام کرتی رہیں۔ پھر ہیروئن بن گئیں۔ ہیروئن کی حیثیت سے ان کی پہلی فلم پنجابی میں تھی۔ اس کا نام ''جبرو'' تھااور اس میں ہیرو کے طور پر پہلی بار اکمل کو پیش کیا گیا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس فلم میں سبھی اہم لوگ پہلی بار ذمّے داریاں نبھارہے تھے۔ اس کے ہدایت کار مظفر طاہر تھے۔ مصنّف سکےدار تھے۔ ہیرو اکمل اور ہیروئن یاسمین تھیں۔ ویلن اور کامیڈین کے روپ میں طالش کو پیش کیا گیا تھا۔ اس کے فلم ساز فقیر صلاح الدین کا تعلق لاہور کی معروف فقیر فیملی سے تھا۔ ''جبرو'' بے حد کامیاب ثابت ہوئی۔ اس طرح یونٹ کے سبھی لوگوں نے شہرت اور مرتبہ حاصل کیا۔

یاسمین کا قد چھوٹا تھا مگر چہرے مہرے اور جسم کی ساخت کے اعتبار سے ان کا شمار بہت معیاری ایکٹریسوں میں کیا گیا لیکن وہ صفِ اوّل میں نمایاں نہ ہو سکیں۔ حقیقی زندگی میں وہ بہت سنجیدہ اور ہنسنے ہنسانے سے پرہیز کرنے والی ہستی نظر آتی ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ بہت زندہ دل اور ہنس مکھ ہیں۔ اچھے اور شائستہ مذاق اور شعرو شاعری کو پسند کرتی ہیں۔ لیکن آغاز ہی سے ان پر المیہ اداکارہ کا ٹھپا لگ گیا اس لئے وہ فلمی روایات کے مطابق ایسے ہی کرداروں کیلئے وقف ہو کر رہ گئیں۔ حالانکہ وہ ہر طرح کے کردار یکساں مہارت سے ادا کرسکتی ہیں۔

ہم یاسمین سے ملے اور انہیں یہ اطلاع دی کہ ہم فلم ساز بننے والے ہیں۔ انہوں نے ہمیں نہ صرف مبارک باد دی بلکہ فوراً ہمارا منہ بھی میٹھا کرادیا۔ ہم انہیں کہانی کے بارے میں بتاتے رہے جو انہیں بہت پسند آئی۔ انہوں نے کسی شرط کے بغیر ہی ہمیں فلم کیلئے تاریخیں دینے کا وعدہ کرلیا۔ معاوضہ وغیرہ کی بات وہ گول ہی کر گئیں اور کہا کہ آپ کی پہلی فلم ہے۔ معاوضے کا کیا ہے، وہ تو آپ دے ہی دیں گے۔ ان کے اس رویّے سے ہماری بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس

فلم میں ایک اہم کردار ان کے شوہر کا بھی تھا جو شادی کے دو سال بعد ہی حادثے میں ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس کردار کیلئے ہم مناسب اداکار کی تلاش میں تھے۔ پھر سوچا کہ یہ ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ کسی بھی بڑے اور مقبول اداکار کو مہمان اداکار کے طور پر کاسٹ کر لیں گے۔ فلم میں ایک اور اہم کردار نوخیز ہیروئن کا بھی تھا۔ اس لڑکی میں کہانی کے دونوں ہیرو دلچسپی رکھتے تھے۔ زیبا اس زمانے میں اُبھرتی ہوئی اداکارہ تھیں۔

فضل کریم فضلی صاحب نے کراچی میں اپنی پہلی فلم ''چراغ جلتا رہا'' بنائی تو اس میں خود فضلی صاحب سمیت سبھی قابل ذکر لوگ نئے تھے۔ فضلی صاحب سبطین فضلی صاحب کے سب سے بڑے بھائی تھے۔ ادیب، شاعر اور بہت سینئر آئی سی ایس افسر تھے۔ بہت اعلیٰ اور ذمے دار عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انہیں یکایک فلم بنانے کی سوجھی اور انہوں نے ''چراغ جلتا رہا'' کا آغاز کر دیا۔ اس فلم کی کہانی اور نغمے ان ہی کے تحریر کردہ تھے۔ فلم ساز اور ہدایت کار بھی وہی تھے۔ ان کی خود اعتمادی دیکھئے کہ انہوں نے الف سے یے تک سبھی نئے لوگ اپنے یونٹ میں شامل کئے حالانکہ خود بھی اس میدان میں نووارد تھے۔ زیبا، دیبا، محمد علی اور کمال ایرانی کے علاوہ کئی دوسرے اداکاروں نے اس فلم میں پہلی بار کام کیا تھا۔

''چراغ جلتا رہا'' ایک مقصدی اور اصلاحی فلم تھی۔ کراچی میں تو یہ بہت کامیاب ہوئی لیکن پنجاب میں اسے وہ پذیرائی نہ مل سکی۔ پھر بھی اسے کامیاب ہی کہا جا سکتا ہے۔ حکومت نے اس فلم کا تفریحی ٹیکس بھی معاف کر دیا تھا اور فضلی صاحب کو ایک صاف ستھری فلم بنانے پر بہت سراہا گیا تھا۔ اس فلم میں ایک دبلی پتلی، نازک، دھان پان سی نوعمر خوبصورت لڑکی کو انہوں نے ہیروئن کے طور پر منتخب کیا تھا جس کا نام شاہین تھا مگر فضلی صاحب نے فلم کیلئے اسے زیبا کا نام دیا۔ زیبا نے اس فلم کے بعد فلمی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا اور صف اوّل کی ہیروئن بن گئی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان عارف کو ہیرو کے طور پر متعارف کرایا گیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اس فلم کے بعد فلمی اُفق سے غائب ہو گئے حالانکہ ان کے دوسرے رفیقوں نے نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ اس میں ان کی شخصیت اور اداکارانہ عدم صلاحیت کا بھی دخل تھا۔ دیبا کو بھی اس فلم میں پہلی بار ایک اہم کردار سونپا گیا۔ آگے چل کر وہ بھی ایک کامیاب اور مقبول ہیروئن بن گئیں۔ محمد علی اس فلم کے ویلن تھے مگر اپنی وجاہت اور کارکردگی کی بناء پر بے حد پسند کئے گئے۔ ''چراغ

جلتا رہا‘‘ کے بعد وہ چند فلموں میں ولین کے طور پر جلوہ گر ہوئے۔ پھر انہیں ایکشن ہیرو بنایا گیا۔ اس روپ میں بھی فلم بینوں نے انہیں بہت پسند کیا۔ پھر وہ باقاعدہ رومانی ہیرو بھی بن گئے اور عرصۂ دراز تک پاکستان کی فلمی صنعت پر راج کرتے رہے۔ جب ہم نے ’’ مجبور‘‘ کا آغاز کیا تو محمد علی کراچی میں ہی مقیم تھے۔

محمد علی کا تعلق بھارت کی ریاست رامپور سے ہے جہاں ان کا خاندان مدت سے آباد تھا اور علم و فضل کی دولت سے مالا مال تھا۔ ان کے والد بھی ایک عالم اور مذہبی شخصیت تھے۔ پاکستان آنے کے بعد اس خاندان نے حیدر آباد سندھ کو اپنا دوسرا وطن بنایا اور محمد علی نے اسی شہر میں پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی۔ نقل وطن کے بعد مالی حالت بہت زیادہ اچھی نہیں تھی اس لئے ایک متوّسط طبقے کے فرزند کے طور پر انہوں نے پرورش حاصل کی۔ حالات کی گردش نے اعلیٰ تعلیم سے محروم ہی رکھا اور وہ ریڈیو میں آڈیشن دینے کیلئے پہنچ گئے۔ محمد علی کی آواز ہمیشہ ان کا سب سے قیمتی اثاثہ رہی ہے۔ بھرپور‘ متاثر کن اور دل کی گہرائی میں اُتر جانے والی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت جلد ریڈیو کے اچھے فنکاروں میں شمار ہونے لگے۔ اسی دوران میں ان کی ملاقات حمایت علی شاعر سے ہوئی جو ان کے بڑے بھائی ارشاد علی کے دوست تھے۔ قدیم وضع داری کے دستور کے مطابق محمد علی نے بہت بڑا اداکار بن جانے کے بعد بھی رشتوں اور تعلقات کا پوری طرح بھرم رکھا۔ حمایت علی شاعر کو وہ ایک بڑے بھائی کی طرح ہی احترام دیتے رہے۔ حمایت صاحب نے ان کی فلموں کے لئے گیت بھی لکھے اور جب انہوں نے اپنی ذاتی فلم بنائی تو محمد علی اور زیبا نے اس میں کام کیا اور ان کے ساتھ ہر طرح تعاون کیا۔ مصنف ذاکر حسین سے بھی محمد علی کی ریڈیو ہی کے زمانے سے شناسائی تھی اور ان کا بھی وہ ہمیشہ احترام کرتے رہے۔ حیدر آباد ہی میں ان کی ملاقات مصطفیٰ قریشی سے بھی ہوئی تھی۔ مصطفیٰ قریشی کی بیگم روبینہ قریشی سے بھی محمد علی اسی زمانے سے واقف تھے بلکہ انہوں نے روبینہ قریشی کو منہ بولی بہن بنایا ہوا تھا۔ اس طرح اس زمانے کے سبھی لکھنے والوں‘ شاعروں اور فنکاروں سے محمد علی کی شناسائی پیدا ہوئی جو کبھی زمانے کے نشیب و فراز سے متاثر نہ ہو سکی۔

محمد علی کی ابتدائی زندگی ایک معمولی نوجوان کی طرح گزری ہے۔ بعد میں جب وہ سُپر سٹار بن گئے تب بھی اپنے پرانے ملنے والوں سے اسی خلوص اور اپنائیت سے ملتے رہے جس طرح بے سروسامانی کے دنوں میں ملا کرتے تھے۔

حیدر آباد کی سڑکوں پر پیدل گھومنا یا بسوں میں سفر کرنا ان کیلئے کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے بڑا اور مشہور معروف آدمی بننے کے بعد وہ پردہ پوشی کرنے کی ضرورت سمجھتے۔ اداکار بننے کے بعد ابتدائی زمانے میں وہ اپنے ماضی کے بارے میں مہر بہ لب رہے لیکن پھر جب اعتماد کی دولت سے مالا مال ہوئے تو انہوں نے اس کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی حالانکہ مفلسی کے وہ دن ان کیلئے محض ڈراونا خواب ہی بن کر رہ گئے تھے۔ ان کے والد محترم کی دعاؤں کا ثمر تھا یا خود ان کی خوبیوں اور نیکیوں کا صلہ کہ جب ایک بار انہوں نے دولت و شہرت اور مقبولیت کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو پھر آخری سیڑھی پر پہنچ کر ہی دم لیا اور خوش حالی، شہرت اور مقبولیت سے اللہ نے انہیں پھر کبھی محروم نہ کیا۔

زیڈ اے بخاری (ذوالفقار علی بخاری صاحب) اس زمانے میں ریڈیو پاکستان کے مختار مطلق تھے۔ وہ انتہائی ہنر مند، قابل اور مردم شناس آدمی تھے۔ زبان کے تلفظ اور الفاظ کی نشست و برخاست کو وہ بہت اہمیت دیتے تھے۔ نہایت خوش مزاج اور حاضر جواب انسان تھے۔ محفلوں کی جان تھے اور اپنی ذات میں خود بھی ایک انجمن تھے۔ بہت اعلیٰ درجے کے شاعر، اچھے نثر نگار اور نقاد اور براڈ کاسٹنگ کے حوالے سے تو سارے برصغیر میں انہیں یکتا سمجھا جاتا تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ وہ پطرس بخاری کے چھوٹے بھائی تھے جن کا نام احمد شاہ بخاری تھا مگر پطرس بخاری کے نام سے ادبی حلقوں میں زندہ جاوید ہو گئے۔ یہ دونوں بھائی آفتاب اور ماہتاب کے مانند تھے۔ پطرس بخاری، ماہر تعلیم تھے۔ بھلے دنوں میں گورنمنٹ کالج لاہور جیسے عظیم الشان تعلیمی ادارے کے پرنسپل رہے۔ بعد میں سفارت کاری کی اور اقوام متحدہ میں پاکستان کے مندوب کی حیثیت سے بہت سے کارنامے سرانجام دیئے۔ جہاں احمد شاہ پطرس بخاری کی شہرت ختم ہوتی تھی وہاں سے ذوالفقار علی بخاری کی شہرت و عظمت کا آغاز ہوتا تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے مختلف شعبوں میں مختلف حوالوں سے بہت نام پیدا کیا اور جس میدان میں بھی قدم رکھا اس میں نئی روایات قائم کر کے ہی دم لیا۔ ذوالفقار علی بخاری صاحب کافی عرصے تک ریڈیو پاکستان کے کرتا دھرتا اور حاکم اعلیٰ رہے۔ آواز میں گھن گرج تھی۔ زبان و کلام پر مکمل عبور حاصل تھا۔ حالانکہ اہل زبان نہ تھے مگر اہل زبانوں پر بھاری تھے۔ دراز قد سانولا رنگ، ہلکے گھونگھریالے بال، کلین شیو، ان کے چہرے پر سب سے نمایاں ان کی خلاف معمولی موٹی موٹی بھوئیں تھیں جن کے بارے میں ایک بار شوکت تھانوی صاحب نے کہا تھا" آنکھوں کے اوپر

مونچھیں لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور نہ جانے خود کو کیا سمجھتے ہیں۔ ‘‘

بخاری صاحب ہمہ صفت شخصیت تھے لیکن علم موسیقی زبان و ادب شعر و علم اور تلفظ پر انہیں خاص طور پر مکمل عبور حاصل تھا۔ انتہائی خوب صورت، سلیس، شائستہ اور رواں گفتگو کرتے تھے اور بات بات میں مزاح پیدا کرنا ان کی ایک نمایاں خوبی تھی۔ شعر کی ادائیگی کے معاملے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ تحت اللّفظ میں مرثیہ انتہائی دلگداز اور پر اثر انداز میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے زندگی کے آخری زمانے میں اپنی خود نوشت سوانح بھی شائع کرائی تھی جو اس عہد کی مکمل تاریخ ہے۔ اس کا نام بھی ’’سر گزشت‘‘ ہے۔ اب تو ایسی شخصیات نے جنم لینا ہی بند کر دیا ہے بقول میر تقی میر۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

بخاری صاحب کی محفلیں اور صحبتیں آج بھی نگاہوں اور سماعتوں میں تازہ ہیں۔ خوش قسمتی سے ہمیں یہ فخر و اعزاز حاصل ہے کہ ان نادر روزگار ہستیوں کی محفلیں دیکھی ہیں، ان میں شرکت کی ہے اور ان سے فیض اٹھایا ہے۔

جب محمد علی سٹار بننے کے بعد لاہور میں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے تو ذوالفقار علی شاہ بخاری جب بھی لاہور آتے ان ہی کے مہمان رہتے۔ محمد علی ان کی خاطر مدارت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرتے۔ ہر طرح ان کی دلبستگی اور دلچسپی کا سامان فراہم کرتے۔ اس زمانے میں محمد علی کے پُر شکوہ مکان میں شعر و ادب اور موسیقی کی مجلسیں آراستہ ہوتیں جن میں شہر کے سبھی قابل ذکر لوگ شریک ہوتے۔ جوش ملیح آبادی، ذوالفقار علی بخاری، صوفی غلام مصطفی تبسم ،فیض احمد فیض , قتیل شفائی، سیف الدین سیف، شباب کیرانوی، خواجہ خورشید انور، رشید عطرے، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، غرضیکہ ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے اہل فن ان محفلوں میں شریک ہوتے اور ان محفلوں کی رنگین یادیں شرکاء کے ذہنوں پر نقش ہو جاتیں۔

دیکھئے محمد علی کا نام لیتے ہی بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ مقصود صرف یہ بتانا تھا کہ جب محمد علی کی آواز بخاری صاحب کے کانوں میں پڑی تو وہ اپنی عادت کے مطابق اس گوہر قابل کو تراش خراش کر انمول نگینہ بنانے پر تُل گئے۔ بخاری

صاحب نے محمد علی کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور ان کی ذہنی، علمی اور فنی تربیت کا آغاز کیا۔ محمد علی کو انہوں نے اپنا بیٹا بنالیا تھا اور محمد علی نے بھی ساری زندگی اس رشتے کو نبھایا۔

فضل کریم فضلی نے فلم ''چراغ جلتا رہا'' بنانے کا ارادہ کیا تو ان کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ اس سے پہلے کبھی فلم سٹوڈیو کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ نہ کیمرا اور لیبارٹری کی شکل دیکھی تھی مگر پیشہ ور دقیانوسی لوگوں کی جگہ ہر شعبے میں نئے لوگوں کو تلاش کر کے اپنے ڈھنگ سے سکرین پر روشناس کرایا۔ ان کی فلم کی تمام تر کاسٹ بالکل نئے نوآموز اور نووارد فن کاروں پر مشتمل تھی۔ یہی لوگ آگے چل کر پاکستان کے فلمی اُفق پر چاند ستارے بن کر جگمگائے اور ایک دو کو چھوڑ کر سبھی نے اپنے اپنے شعبوں میں بڑا نام پیدا کیا۔
محمد علی بھی فضلی صاحب کے پاس انٹرویو کے لئے گئے تھے۔ انہوں نے انہیں دیکھا اور مکالموں کی ادائیگی کے بعد فلم کے لئے منتخب کر لیا۔ اس فلم میں محمد علی نے ویلن کا کردار کیا تھا لیکن اس طرح کہ فلم دیکھنے والے ہیرو کو بھول گئے۔

''چراغ جلتا رہا'' ایک تجرباتی فلم تھی۔ موضوع کے اعتبار سے یہ اصلاحی اور قدرے خشک تھی۔ نوآموز لوگوں کے کام میں پختگی بھی نہ تھی مگر اس کے باوجود اس فلم نے درمیانے درجے کا بزنس کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان کی فلمی صنعت کو بے بہا فن کار عطا کئے۔ محمد علی ایک دراز قد، سرخ و سفید رنگت اور دلکش نقوش رکھنے والے نوجوان تھے۔ چھریرا جسم، آواز ایسی کہ ہزاروں میں پہچانی جائے۔ تلفظ انتہائی عمدہ، مکالموں کی ادائیگی بے داغ اور پُر اثر۔ پہلی فلم کی نمائش کے بعد ہی فلم سازان پر توجہ دینے کیلئے مجبور ہو گئے۔ مگر آواز، بول چال اور صورت شکل کے اعتبار سے انہیں ویلن کے کردار کے لئے موزوں سمجھا گیا۔ اس میں کچھ دخل ہمارے فلم سازوں کی بھیڑ چال کا بھی تھا جو مکھّی پہ مکھّی مارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہم نے فلم ''چراغ جلتا رہا'' میں محمد علی کو دیکھا تھا اور ان کی اداکاری سے متاثر بھی ہوئے تھے بعد میں کراچی گئے تو وہاں ایسٹرن فلم سٹوڈیو میں محمد علی سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ جن فلموں کی شوٹنگ میں مصروف تھے ان سب میں وہ ویلن کے طور پر پیش کئے جا رہے تھے۔ ملاقات ہوئی تو ہم نے حقیقی زندگی میں انہیں زیادہ جاذب نظر، دلکش اور پُرکشش پایا۔ وہ بے حد متواضع وضع دار بامروت اور بااخلاق

تھے۔ یہ خوبیاں آج کل عنقا ہو چکی ہیں۔ ان کی شخصیت میں بے پناہ اپنائیت بے تکلفی اور خلوص تھا مگر ہماری فلم کی کہانی میں دراصل ویلن کا کردار ہی نہیں تھا۔ یہ حقیقی دو بھائیوں کی کہانی تھی۔ محض ماحول اور پرورش نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے مختلف بنا دیا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ آپس میں سگے بھائی ہیں۔ دونوں ساتھ پڑھتے تھے اور دوست تھے۔ دونوں اپنی ایک کلاس فیلو سے بہت زیادہ بے تکلف تھے۔ یہ تینوں عموماً یکجا ہوتے تھے۔ ان میں دوستی کا رشتہ قائم تھا لیکن لڑکی ان میں سے ایک کو (چھوٹے بھائی) کو پسند کرتی تھی اور اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی حالانکہ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں دوست خوبرو اور نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔
جب امیر زادے کو یہ علم ہوا کہ ہیروئن اس کو نظر انداز کر کے ایک معمولی سے لڑکے سے پیار کرتی ہے تو اس کی خاندانی آن بان اور ذاتی انّا مجروح ہو گئی اور وہ یکایک ویلن جیسی حرکتیں کرنے لگا۔ لیکن وہ کسی طور بھی روایتی ویلن نہیں تھا۔ محض حالات اور واقعات نے اسے ویلن کے روپ میں ڈھال دیا تھا۔ اس اعتبار سے ہماری فلم میں کوئی بھی ویلن نہ تھا۔ ہمیں دونوں کرداروں کے لئے ہیرو کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ''مجبور'' میں بیک وقت کمال اور حبیب کا انتخاب کیا تھا۔
حبیب بڑے بھائی کے کردار کیلئے اور کمال چھوٹے بھائی کے (کھلنڈرے اور شوخ و شریر) کردار کے لئے چنے گئے تھے۔ ہم نے مجبوراً ان دونوں اداکاروں کا انتخاب تو کر لیا تھا مگر ہمارا دل نہیں مانتا تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی کالج کے طالب علم کے کردار میں موزوں نہ تھا۔ ان کے چہروں میں بھولا پن اور معصومیت کے بجائے پختگی تھی۔ لیکن اس زمانے میں ان دونوں کے سوا کوئی اور اداکار ان کرداروں کے لئے موزوں نظر نہیں آیا۔
ہمارے دوست اور فلم کے ہدایت حسن طارق بھی ہمارے ہم خیال تھے مگر لاچار تھے۔ بات یہ ہے کہ اوّل تو اس زمانے میں (بلکہ آج کل بھی) نئے موزوں چہروں کی دستیابی کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے علاوہ ہم ایک بے زر اور بے سروسامان نئے فلم ساز تھے۔ اگر نئے اداکاروں کو اپنی فلم کے لئے منتخب کرتے تو فلم بنانے کیلئے سرمایہ کہاں سے لاتے ؟۔ کوئی ڈسٹری بیوٹر نئے اداکاروں کی فلم خریدنے کے لئے تیار نہ ہوتا۔
ان ہی دنوں ہم کراچی گئے تو محمد علی صاحب سے بھی ملے۔ گپ شپ بھی رہی اور انہوں نے ہمیں بحیثیت انسان بھی

متاثر کیا لیکن اس وقت ہمارے وہم وگمان بھی نہ تھا کہ ہماری پہلی فلم میں محمد علی کام کریں گے۔شاید محمد علی نے بھی یہ نہ سوچا ہو گا۔

ماں کے مرکزی کردار کے لئے ہم نے یاسمین کا انتخاب کر لیا تھا مگر نوخیز رومانی ہیروئن کے لئے بھی ایک اداکارہ کی ضرورت تھی۔زیبا کی پہلی فلم کے ریلیز ہوتے ہی وہ سب کی نگاہوں میں آچکی تھیں اور انہیں کراچی کی چند فلموں میں ہیروئن منتخب بھی کر لیا گیا تھا۔وحید مراد کی بطور فلم ساز پہلی فلم ''ہیرا اور پتھر'' میں زیبا کو وحید مراد کے ساتھ ہیروئن منتخب کیا گیا تھا۔اس کے ہدایت کار پرویز ملک تھے۔ان کی بھی ہدایت کار کی حیثیت سے یہ پہلی فلم تھی۔وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد امریکہ سے فلم تکنیک کے علوم کی ڈگری لے کر آئے تھے۔اسی فلم سے وحید مراد اور پرویز ملک کی طویل رفاقت اور دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ کچھ عرصے بعد مصنف و نغمہ نگار مسرور انور اور موسیقار سہیل رعنا بھی اس ٹیم میں شامل ہو گئے تھے اور ان لوگوں نے پاکستان کی فلمی صنعت کو بہت سی کامیاب اور معیاری فلمیں دی تھیں۔''چراغ جلتا رہا'' کے ہیرو تو پھر گمنام ہی ہو کر رہ گئے۔دوسرے فنکاروں نے فرداً فرداً نام اور مقام حاصل کیا لیکن زیبا ان میں سب سے زیادہ کامیاب نکلیں۔ان کے گھر کے سامنے فلم سازوں نے ڈیرا جما لیا۔پہلے کراچی کے فلم سازوں نے ان کی خدمات حاصل کیں۔ اس کے بعد لاہور کے فلم ساز اور ہدایت کار بھی ان کے معترف ہو گئے اور زیبا کو لاہور کی فلموں میں بھی کاسٹ کر لیا گیا۔

ہم جب ''مجبور'' بنانے کا ارادہ لے کر کراچی پہنچے تو وہاں ہفت روزہ ''نگار'' کے مدیر الیاس رشیدی صاحب کے ہمراہ حسب دستور ایسٹرن سٹوڈیو کا پھیرا بھی لگا یا جہاں ہماری زیبا سے ملاقات ہوئی۔

الیاس بھائی زیبا سے بہت متاثر تھے۔یوں تو وہ سبھی نئے فن کاروں کی سرپرستی فرماتے تھے لیکن کراچی کے فنکاروں کو وہ بطور خاص پبلسٹی دیتے تھے۔ہر نیا فنکار ان کے کثیر الاشاعت اور باا ثر فلمی جریدے میں پبلسٹی پاتا تھا۔شمیم آرا ''کنواری بیوہ'' کی ہیروئن بن کر سامنے آئیں تو الیاس صاحب نے ان کی پذیرائی کی اور ہاتھوں ہاتھ لیا۔ان کی تصاویر اور ان کے بارے میں خبریں اور مضامین شائع کئے۔زبانی طور پر بھی فلم سازوں سے ان کی سفارش کی اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ شمیم آرا بہت باصلاحیت اور ذہین اداکارہ ہیں۔

شمیم آراء سے ہماری پہلی ملاقات الیاس رشیدی صاحب ہی کے توسط سے ہوئی تھی اور انہوں نے ہم سے فرمائش کی تھی کہ لاہور کے اخبارات میں شمیم آراء کی پبلسٹی کریں اور فلم سازوں سے بھی ان کی سفارش کریں کیونکہ وہ صحیح معنوں میں اس کی مستحق ہیں۔

''چراغ جلتا رہا'' کی نمائش کے بعد ہم کراچی پہنچے تو الیاس بھائی ایک نئی فنکارہ کو متعارف کرانے کے لئے اپنی پٹاری کھولے بیٹھے تھے اور ہر ایک کو یقین دلانے کی کوشش میں مصروف تھے کہ زیبا درحقیقت ایک بہت اچھی فنکارہ ہیں اور مناسب موقع ملنے پر وہ پاکستان کی صف اوّل کی ہیروئن بن جائیں گی۔ ہم نے جب انہیں ذاتی فلم بنانے کے بارے میں بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ اس وقت تک ہم نے '' مجبور'' بنانے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولے '' یار آفاقی'' چھوڑو کس جھگڑے میں پڑنے لگے ہو۔ یہ تمہارے بس کا کام نہیں ہے۔ ''

''کیوں نہیں ہے ؟'' ہم نے پوچھا'' ایک سے بڑھ کر ایک نالائق فلم بنا رہا ہے تو پھر ہم کیوں نہ بنائیں۔ ''

کہنے لگے '' لیکن تم ان میں ایک اور نالائق کا اضافہ کرنا چاہتے ہو۔ ''

ہم نے ناراضگی سے پوچھا'' تو کیا آپ ہمیں واقعی اتنا نالائق سمجھتے ہیں ؟''

بولے'' لائق یا نالائق کی بات نہیں ہے۔ تم صحافی اور کہانی نویس ہو۔ آرام سے اپنا کام کرتے رہو۔ فلم سازی تو کانٹوں بھرا تاج ہے ''

مگر جب ہم اپنے ارادے پر اڑے رہے تو وہ بھی سنجیدہ ہو گئے۔ ہم نے انہیں اپنی کہانی کے بارے میں بتایا۔ پھر کہا کہ حسن طارق کو ہم ہدایت کار لیں گے ۔ خلیل احمد اس فلم کی موسیقی بنائیں گے۔ نامور اداکار اس کی کاسٹ میں شامل ہوں گے۔ ہم نے انہیں یاسمین، حبیب اور کمال کے بارے میں بھی بتایا۔

''تو کیا یاسمین کی جوڑی کمال اور حبیب کے ساتھ بناؤ گے، سوچ لو ''

ہم نے کہا'' یاسمین تو ان دونوں کی ماں کا کردار کریں گی۔ نوجوان ہیروئن کوئی اور ہو گی۔ ''

وہ ایک دم چوکنّا ہو گئے'' سنو یار تم زیبا کو ہیروئن کیوں نہیں لے لیتے، بہت اچھی رہے گی۔ ''

''ہاں ٹھیک ہے'' ہم نے نیم دلی سے کہا'' مگر الیاس بھائی ہمیں نامور ہیروئن چاہیئے تا کہ ہماری فلم جلد بک ہو جائے۔

"

کہنے لگے "یار زیبا بہت اچھی ایکٹریس ہے تم دیکھ لینا ایک دم "شوں" کر کے اوپر جائے گی۔ "

ہم نے کہا "جب جائے گی تو دیکھا جائے گا۔ ابھی تو اس کا کوئی نام نہیں ہے اور نہ ہی اس کی مانگ ہے۔ "

"لڑکے ! جلدی سے کڑک چائے لاؤ" انہوں نے ملازم کو آواز دی۔ پھر ہم سے کہنے لگے " خیر یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے۔ ویسے یہ لڑکی بہت جلدی آگے نکل جائے گی۔ صورت شکل بھی اچھی ہے۔ لب و لہجہ اور تلفّظ بھی بہت اچھا ہے۔ ایکٹنگ بھی کر لیتی ہے، مگر خیر تم اپنے معاملات کو دیکھ لو اور جو مناسب سمجھو وہی کرو۔ "

شام کو ہم ان کے ساتھ ایسٹرن سٹوڈیوز پہنچے تو وہاں زیبا اور ان کی والدہ لالی جی سے بھی ملاقات ہو گئی۔ زیبا دھان پان نازک اندام گوری چِٹّی نو عمر لڑکی تھیں۔ بہت ہنس مُکھ اور حاضر جواب۔۔۔ تھوڑی ہی دیر میں گپ شپ اور لطیفے بازی شروع ہو گئی۔ ان کی والدہ لالی جی ان ہی کی طرح دبلی پتلی اور کشیدہ قامت تھیں لیکن ان کا رنگ گندمی تھا۔ وہ بھی بہت خوش اخلاق اور شگفتہ مزاج نکلیں۔ گفتگو میں برابر شریک رہتی تھیں اور لطیفوں پر بے ساختہ ہنستی تھیں۔

ہمارے ساتھ تو پہلی ہی ملاقات میں زیبا اور لالی جی دونوں بے تکلف ہو گئیں۔ الیاس صاحب نے ان سے ہمارا تفصیلی تعارف کرایا اور پھر کہا " جب تم لاہور جاؤ گی تو آفاقی صاحب تمہارا ہر طرح خیال رکھیں گے۔ "

زیبا نے کہا "پھر تو ہمیں بھی کراچی میں آفاقی صاحب کا خیال رکھنا چاہئے۔ "

"وہ کس طرح؟ "

"آپ انہیں رات کے کھانے پر لے آیئے کیوں آفاقی صاحب آئیں گے نا؟ "

ہم نے الیاس صاحب کی طرف دیکھا اور ہامی بھر لی۔ زیبا کسی فلم کی شوٹنگ میں مصروف تھیں۔ ان سے رخصت ہو کر ہم سٹوڈیو کی چھت پر سٹوڈیو کے مالک سعید ہارون صاحب کے دفتر میں چلے گئے۔

سعید ہارون انتہائی دلچسپ اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ یوسف ہارون اور محمود ہارون جیسے نامور لوگوں کے سب سے چھوٹے بھائی اور سر عبداللہ ہارون کے صاحب زادے خاندانی رئیس تھے۔ تعلیم یافتہ تھے مگر انتہائی معصوم اور سادہ۔۔۔ غریبوں کے لئے ان کے دل میں صحیح معنوں میں پیار اور گداز تھا۔ سعید صاحب سے ہماری اچھی خاصی

بے تکلفی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ الیاس رشیدی صاحب سے ان کی دانت کاٹی دوستی تھی۔ سعید صاحب کی بیگم کو الیاس صاحب نے بہن بنا رکھا تھا۔ ہر صبح الیاس صاحب کے گھر سعید ہارون کا ٹیلی فون ضرور آتا تھا۔ الیاس صاحب سے ہمارا بہت میل جول اور دوستانہ تھا۔ اس طرح سعید ہارون صاحب سے بھی ہماری یاد اللہ ہو گئی۔

سعید صاحب میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ کراچی کے عاشق تھے۔ اور کراچی کی ہر چیز کو دوسروں سے بہتر اور برتر ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

ہم ان کے ائر کنڈیشنڈ دفتر میں پہنچے تو انہوں نے سلام کے جواب میں اپنی کراری آواز میں کہا "آ گئے لاہور والے آ گئے۔ اب تو الیاس بھائی کو ہوش نہیں رہے گا۔ لاہور والوں کو دیکھتے ہی یہ کراچی والوں کو بھول جاتے ہیں۔ "

الیاس صاحب ہنسنے لگے "بھئی لاہور والے ہمارے مہمان ہوتے ہیں ان کی خاطر تو کرنی ہی پڑتی ہے۔"

"خاطر تو کرو مگر خوشامد کیوں کرتے ہو۔ الیاس بھائی' کراچی کی فلم انڈسٹری کو بناؤ۔ کراچی کی انڈسٹری لاہور سے بڑھ کر ہو سکتی ہے مگر یہاں تو جو بھی تھوڑا اونچا اٹھتا ہے لاہور کا ٹکٹ کٹا کر چلا جاتا ہے۔ کیوں آفاقی صاحب تمہارے لاہور کی فلم انڈسٹری کا کیا حشر ہو گا اگر کراچی والے وہاں سے واپس آ جائیں؟"

ہم نے مناسب الفاظ میں کراچی والوں کو خراج تحسین پیش کیا اور سعید صاحب خوش ہو گئے۔

"بولو کیا پیو گے؟ چائے یا کافی؟ بسکٹ بھی کھاؤ گے یا کیک منگاؤں۔ "

الیاس صاحب ہنسنے لگے "اب تم خود لاہور والوں کی خوشامد کیوں کر رہے ہو؟ "

"ارے یہ تو ہمارے مہمان ہیں۔ مہمان کے لئے تو ہماری جان بھی حاضر ہے کیوں نا آفاقی؟"

ہم نے کہا "فی الحال تو چائے پر گزارہ کر لیں گے۔ آپ کی جان سے زیادہ اس وقت ہمیں چائے کی ضرورت ہے۔ "

سعید صاحب کو اچانک یاد آیا اور وہ بولے " کیوں آفاقی تمہارے لاہور کی ہیروئنیں تو بہت پریشان ہوں گی۔ سنا ہے ان کی راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔"

"وہ کیوں؟" ہم نے پوچھا

''ارے کراچی نے پھر ایک نئی ہیروئن پیش کی ہے۔ بولو زیبا کا کوئی جواب ہے تمہارے لاہور میں ؟''

''کون زیبا'' ہم نے معصومیت سے پوچھا۔

''ارے زیبا کو نہیں جانتے؟ کیسے جرنلسٹ ہو۔ اے ون ہیروئین ہے۔ تم دیکھ لینا لاہور کی سب ہیروئنوں سے آگے نکل جائے گی۔ یہ تمہاری مسرت و سرت' رانی پانی سب منہ دیکھتی رہ جائیں گی۔''

ہم نے انہیں چھیڑا ''سعید صاحب صبیحہ کا کوئی جواب ہے آپ کے پاس؟ ''

وہ سٹپٹا گئے ''ٹھیک ہے صبیحہ کے علاوہ اور کیا ہے تمہارے پاس۔ ارے ہم نے تمہیں نیّر سلطانہ دے دی ہے۔ پھر رانی بھی تو کراچی سے ہی گئی ہے۔'' پھر انہوں نے الیاس صاحب کو مخاطب کیا ''الیاس بھائی زیبا کو کراچی سے لاہور مت جانے دینا۔ ہمیں کراچی کی انڈسٹری کے لئے بھی تو آرٹسٹوں کی ضرورت ہے۔ ''

الیاس صاحب نے کہا ''سعید سیٹھ آرٹسٹ بے چارے کراچی میں رہ کر کیا کریں گے۔ پہلے یہاں فلم انڈسٹری تو بناؤ۔ پروڈیوسروں کو سہولتیں دو گے تو وہ لاہور چھوڑ کر کراچی آجائیں گے۔ ''

یہ سعید صاحب کا کمزور پہلو تھا۔ بولے ''ساری سہولتیں تو دیتے ہیں انہیں۔ بس فلم ہی تو ادھار نہیں دیتے خیر الیاس بھائی میرا ایک کام کر دو۔ زیبا سے میری ایک فلم سائن کرا دو۔ ''

''تم خود کر لو ''

''بھئی آپ اس کے انچارج ہیں۔ گاڈ فادر بنے بیٹھے ہیں۔ آپ کی ہر بات وہ مانتی ہے۔ کراچی کے فلم سازوں کے ساتھ تو اسے خاص رعایت کرنی چاہیئے۔ وہ بھی تو کراچی کی ہے۔ کراچی والوں کا اس پر پہلا حق ہے۔ ''

اس پر الیاس بھائی نے ہمیں ایک لطیفہ سنایا جو ہمیں آج بھی لفظ بہ لفظ یاد ہے۔

ہوا یہ کہ سعید ہارون دو فلموں کے لئے زیبا سے معاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے الیاس بھائی کی خدمات حاصل کی گئیں اور زیبا اوران کی والدہ کو لے کر سعید صاحب کے دفتر میں پہنچ گئے۔ سعید صاحب نے ان کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور بہت غور سے زیبا کو دیکھتے رہے۔ یہ حقیقی زندگی میں ان کی زیبا سے پہلی ملاقات تھی۔

زیبا کو انہوں نے اپنی دو فلموں میں کام کرنے کی پیش کش کی جو انہوں نے منظور کرلی۔ جب معاہدے کی بات شروع ہوئی تو لالی جی نے ایک فلم کا معاوضہ دس ہزار روپے طلب کیا۔

''دس ہزار!'' سعید صاحب نے حیران ہو کر پوچھا ''مگر آپ نے فلاں فلمساز کی فلم پانچ ہزار میں سائن کی ہے ''

لالی جی نے اطمینان سے جواب دیا ''سعید صاحب فلم کا معاوضہ تو آپ سے بھی پانچ ہزار ہی لوں گی۔ ''

''تو پھر باقی پانچ ہزار''؟

''پانچ ہزار گھورنے کا معاوضہ ''

سعید صاحب نے حیرت سے لالی جی کو اور پھر الیاس رشیدی صاحب کو دیکھا۔

لالی جی بولیں ''سعید صاحب جب سے زیبا کمرے میں آئی ہے۔ آپ اسے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ کی فلم میں کام کیا تو آپ تو میری بچی کو گھور گھور کر آدھا کر دیں گے۔ اس لئے پانچ ہزار روپے فلم میں کام کرنے کا معاوضہ ہے اور پانچ ہزار گھورنے کا۔ ''

یہ لطیفہ سننے کے بعد سعید صاحب نے صفائی پیش کی ''ارے بھئی کسی نئی لڑکی کو ہیروئن سائن کروں گا تو دیکھ بھال نہیں کروں گا؟ اس کا اچھی طرح جائزہ نہیں لوں گا؟ آفاقی، بات یہ ہے کہ الیاس صاحب نے ابھی سے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو الزبتھ ٹیلر سمجھنے لگی ہے۔''

اسی رات ہم الیاس صاحب کے ساتھ موٹر رکشا میں سوار ہو کر ناظم آباد میں زیبا کے گھر پہنچ گئے۔ وہ ایک کرائے کے مکان کے بالائی حصے میں رہتی تھیں۔ گھر کو سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کی سجاوٹ سادہ مگر خوب صورت تھی۔ ان کے گھر گئے تو محسوس ہی نہیں ہوا کہ ہم کسی فلم آرٹسٹ کے گھر میں آئے ہیں۔ زیبا سادہ لباس میں میک اپ کے بغیر ہمارے سامنے آکر بیٹھ گئیں۔ ان کی والدہ لالی جی بھی کچھ دیر بعد تشریف لے آئیں۔ ان کی ایک کزن بھی اس زمانے میں ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ کھانے کا اہتمام ان ہی کی ذمہ داری تھا۔ زیبا کبھی کبھی اٹھ کر ایک پھیرا باورچی خانے کا لگا لیتی تھی جب وہ چوتھی بار کچن سے ہو کر آئیں تو ہم نے پوچھا '' کیا گل گیا؟ ''

انہوں نے بے خیالی میں پوچھا ''کیا؟ ''

ہم نے کہا ’’گوشت ‘‘

وہ ہنسنے لگیں ’’گوشت تو گل گیا مگر دال گلنی مشکل ہے۔ ‘‘

ہم اسی وقت جان گئے کہ زیبا کو اردو زبان سے پوری طرح واقفیت ہے اور وہ حاضر جواب بھی ہیں۔

زیبا بے حد شگفتہ مزاج‘ حاضر جواب اور فقرہ باز نکلیں۔ الیاس رشیدی صاحب کے علاوہ طفیل احمد جمالی صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ جمالی صاحب اس زمانے میں ’’ انجام‘‘ کراچی کے ایڈیٹر تھے۔ بے حد ذہین‘ پڑھے لکھے اور باشعور انسان تھے۔ شاعر بھی بے بدل‘ نثر پر بھی انہیں پوری طرح عبور حاصل تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حد سے زیادہ حاضر جواب اور فقرے بازی میں طاق‘ وہ جوانی ہی میں وفات پا گئے لیکن جب تک زندہ رہے اپنی قابلیت اور ذہانت کے چراغ جلائے رکھے۔ وہ الیاس رشیدی صاحب کے قریبی اور بے تکلّف دوستوں میں تھے۔ جب کبھی ہم کراچی جاتے تو وہ اور ابراہیم جلیس صاحب بھی ہر روز ہی ’’نگار‘‘ کے دفتر میں پائے جاتے۔ الیاس بھائی اپنے کام کاج اور مختلف لوگوں کو ڈانٹنے میں مصروف رہتے اور ہم لوگ گپ شپ اور لطیفہ بازی میں لگے رہتے۔ جب شام کو وہ دفتر سے فراغت پاتے تو ہم سب کسی تقریب کا رخ کرتے یا پھر ہم جس ہوٹل میں قیام پذیر ہوتے تھے۔ وہاں محفل جم جاتی جو رات گئے تک جاری رہتی۔ صحافی‘ فلم والے اور دوسرے لوگ بھی اکٹّھے ہو جاتے تھے۔ لاہور سے کراچی آئے ہوئے حضرات کراچی کے صحافی‘ ادیب اور شاعر فلم سے تعلق رکھنے والے مختلف شعبوں سے وابستہ اصحاب اور بے تکلّف دوست یکجا ہوتے تو بہت پُر لطف محفلیں آراستہ ہوا کرتی تھیں۔ وہ بھی خوب دن تھے۔ اب تو شاید وہ زمانے کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ زمانہ آگے کی طرف گامزن ہوتا ہے اسے کیا پڑی ہے کہ پیچھے کی طرف لوٹ جائے، ہماری آپ کی خواہش سے کیا ہوتا ہے۔

جمالی صاحب بہت ہنسوڑ اور دلچسپ آدمی تھے۔ بڑے بڑے شوخ گفتار اور حاضر جواب لوگوں کو لاجواب کر دیا کرتے تھے اور کیوں نہ ہوتا۔ ایک تو ذہن رسا‘ دوسرے مطالعہ‘ تیسرے علماو ادباء کی صحبتیں۔ ابراہیم جلیس اور ابن انشاء جیسے لوگوں سے دن رات کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ انہیں دو آتشہ تو ہونا ہی تھا۔ جمالی صاحب نے ایک دو فلموں کے مکالمے اور چند فلموں کے گانے بھی لکھے مگر طبعیت میں لاابالی پن تھا۔ کسی قسم کی پابندی یا روک ٹوک وہ پسند نہیں کرتے

تھے۔ کاہل بھی تھے، ضرورت سے زیادہ کام کرنے کو وقت کا زیاں خیال کرتے تھے۔ سادہ باعزت زندگی گزارنے کے لئے جتنا کچھ ضروری تھا اس کے حصول کے بعد وہ پیسہ کمانے کی ہر کوشش کو فضول سمجھتے تھے۔ نہایت مخلص، بے ریا اور بے لوث انسان تھے۔ کسی کو تکلیف اور دکھ میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ شاید ان کے بھی کچھ مسائل ہوں گے مگر انہیں دیکھ کر یہ گمان ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے انہیں کبھی اداس اور متفکّر نہیں دیکھا۔ جب دیکھا قہقہے لگاتے اور لطیفے سناتے ہوئے دیکھا۔ ہنسنا ہنسانا ہی ان کا معمول تھا۔ شاید اس زمانے میں یہ بھی ایک رواج تھا۔

جمالی صاحب کے دو اصول ایسے تھے جن پر وہ بڑی سختی سے عمل پیرا تھے۔ وہ سفید قمیض یا بوشرٹ کے سوا کسی رنگ کی قمیض زیب تن کرنا خلاف وضع خیال کرتے تھے۔ گرمی ہو یا سردی ہم نے ان کے جسم پر سفید قمیض ہی دیکھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد رنگین قمیض کیوں پہنتے ہیں۔ رنگین لباس تو خواتین ہی کو زیب دیتا ہے اور پھر سفید رنگ میں جو وقار، سادگی اور شان ہے وہ کسی اور رنگ میں کہاں۔

ہم نے کہا "مگر جمالی صاحب سفید تو کوئی رنگ ہی نہیں ہوتا۔"

بولے "یار سنی سنائی باتوں پر قابلیت نہ جھاڑا کرو۔ سفید بھی تو ایک رنگ ہی ہے۔ سفید رنگ کی دیوار، سفید رنگ کا لباس، جس طرح سیاہ بھی ایک رنگ ہے۔ اگر آپ کو کمرے میں سفید رنگ کرانا ہو تو کیا کہیں گے یہی نا کہ سفید رنگ کر دو۔"

"جی نہیں صرف اتنا کہیں گے کہ سفیدی کر دو"

"سفیدی تو ایک اصطلاح ہے" وہ کہاں ہار ماننے والے تھے "اگر آپ کو چونے والی سفیدی کے علاوہ سفید پینٹ کرانا ہو تو کیا کہیں گے۔ یہی نا کہ کمرے میں سفید رنگ کا پینٹ کر دو۔"

"جی نہیں ہم یہ کہیں گے کہ کمرے میں سفید پینٹ کر دو۔"

"یار کج بحثی تو تم پر ختم ہے۔" وہ ہنسنے لگے۔

"اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے" ہم پوچھتے

"خیر ہماری تو یہ پہچان ہے۔"

جمالی صاحب کے ساتھ نوک جھونک ہر وقت جاری رہتی تھی۔

ذکر زیبا کا ہو رہا تھا۔ زیبا کی گفتگو سن کر ہم سب بہت حیران ہوئے۔ انہیں زبان و بیان پر پوری طرح عبور حاصل تھا۔

جمالی صاحب کہاں ہار ماننے والے تھے کہنے لگے بھئی کیوں نہ ہو ''آخر اہل زبان ہے۔ ''

زیبا نے بھولے پن سے پوچھا ''آپ کی مراد ہے یوپی یا دہلی کی رہنے والی ہوں؟ ''

''اور کیا؟ تمہاری زبان ہی یہ چغلی کھا رہی ہے۔ ''

زیبا بولی ''جمالی صاحب معاف کیجئے چغلیوں پر بھروسا نہ کیا کیجئے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے میری والدہ پٹیالہ کی رہنے والی ہیں۔ ''

ہم سب حیران رہ گئے ''بھئی کمال ہے سکّھوں کی سرزمین میں رہ کر اتنی اچھی اردو؟ ''

''یہ میں نے کراچی میں آپ جیسے اہل زبان لوگوں سے سیکھی ہے۔ ''

لالی جی اس نوک جھونک پر ہنستی رہیں۔ وہ کم بولتی تھیں۔ زیادہ تر سنتی اور ہنستی ہی رہتی تھیں۔ ایک بار ابراہیم جلیس نے ان سے کہا تھا ''لالی جی ایمان سے آپ بہت بڑی فنکارہ ہیں۔ ''

وہ حیرت سے کہنے لگیں ''میں کب فنکارہ ہوں۔ آرٹسٹ تو میری بیٹی ہے۔ ''

جلیس صاحب نے کہا ''اگر آپ نہ ہوتیں تو یہ بیٹی کہاں سے آتی؟ ''

پھر انہوں نے ایک لطیفہ سنایا کہ ہالی ووڈ کی ایک بہت شاندار تقریب میں ایک نقّاد کا تعارف بہت بڑی فنکارہ سے کرایا گیا۔ '' یہ بہت بڑی آرٹسٹ ہیں۔ جنہوں نے فلاں فلم میں آسکر ایوارڈ حاصل کیا''۔

نقّاد نے فنکارہ سے ہاتھ ملایا۔

''اور ان سے ملئے یہ ان سے بھی بڑی آرٹسٹ ہیں۔'' اس بار ان کا تعارف ایک بڑی عمر کی خاتون سے کرایا گیا۔

پوچھا گیا ''انہوں نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے؟ ''

جواب ملا ''انہوں نے آسکر حاصل کرنے والی آرٹسٹ کو جنم دیا ہے۔ ان کے بغیر وہ کہاں ہوتیں؟''

زیبا سے سرسری ملاقات تو سٹوڈیو میں بھی ہوئی تھی مگر ان کے گھر پر قدرے تفصیل سے گفتگو ہوئی تو ان کے جوہر ہم پر کھل گئے۔

ویسے تو اس زمانے میں مرد اور خاتون فنکارائیں عموماً پڑھی لکھی (ڈگری یافتہ نہیں) صاحب ذوق' بااخلاق' شگفتہ مزاج اور حاضر جواب ہوتی تھیں مگر زیبا نے پہلی ہی تفصیلی ملاقات میں ہمیں قائل کر لیا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ ان میں بناوٹ یا تصنّع نام کو نہ تھا۔ بلا کم و کاست' ہر ایک کے بارے میں بیان جاری کر رہی تھیں۔ نہ مصلحت کا خیال' نہ دنیاداری کی پروا' یہ خوبی ان میں آج بھی موجود ہے بلکہ اب تو عمر کے ساتھ اور بھی پختہ ہو گئی ہے۔
ہم نے بہت سے فنکاروں کو قریب سے دیکھا۔ پاس رہے' ساتھ اکٹھّے بیٹھے۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خوبی پائی مگر زیبا کی خوبی یہ دیکھی کہ وہ صاف دل اور صاف گو ہیں۔ بلکہ ''صاف چہرہ'' بھی ہیں۔ وہ اس طرح کہ ان کے تاثرات اور دلی جذبات فوراً ان کے چہرے پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ اگر خوش ہیں تو خوشی کا چہرے سے اظہار ہو رہا ہے اگر ناراض ہیں تو ایک نظر میں پتہ چل جاتا ہے کہ خفا ہیں۔ اگر کوئی شخص پسند ہے تو خوب گھل مل کر باتیں ہوں گی اور چہرے سے بھی اس کا اظہار ہو گا۔ اگر کوئی ناپسند ہے تو زیبا کا چہرہ اس بات کی چغلی کھائے گا۔ اوّل تو وہ ناپسندیدہ لوگوں سے بات ہی کرنا پسند نہیں کرتیں۔ محفل میں سب موجود ہیں مگر زیبا کے لئے وہ ہستی غیر موجود ہے۔ اگر اخلاقاً یا ضرورتاً بات بھی کریں گی تو رسمی اور ضرورت کے مطابق۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس لحاظ سے ہم روز اوّل ہی سے زیبا کے قدردان ہیں۔ آج جبکہ منافقت اور دوغلا پن ہمارے معاشرے میں جڑیں پکڑ چکا ہے زیبا میں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ منافقت ان کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ اگر کسی کی دوست ہیں تو دوست ہیں، ہر طرح مدد کرنے کو تیار اور کمربستہ۔ اگر دوست نہیں ہیں تو اس کی مخالف ہیں۔ کسی قیمت پر سمجھوتا نہیں کریں گی۔

زیبا کی یہ عادت اچھی بھی ہے لیکن بعض اوقات پرابلم بن جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی چند بار ایسی پرابلم پیدا ہوئی۔ ہم ناراض بھی ہوئے بول چال بھی بند رہی مگر زیبا اپنی خو نہ چھوڑ سکیں۔ ناراضگی کے باوجود دوستی اپنی جگہ قائم رہی اور بول چال شروع ہونے کے بعد سلسلہ پھر وہیں سے جُڑ گیا جیسے کہ کبھی لڑائی ہوئی ہی نہ تھی۔ دیکھا جائے تو بہت

بچکانہ سی بات ہے لیکن داناؤں نے کہہ دیا ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک چھوٹا سا بچہ چھپا ہوا ہے۔ کچھ بزرگ اس بچے کو ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کرا دیتے ہیں مگر بعض نے اس بچےّ کو آزادی دے رکھی ہے کہ بھئی کبھی کبھی کھیل کود بھی کر لیا کرو۔ شرارت بھی کر لیا کرو۔

زیبا کے گھر میں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ ایک سے بڑھ کر ایک لطیفہ باز ، پھبتی باز اور حاضر جواب بندہ وہاں موجود تھا۔ ان میں مزاح کی حس بھی تھی اور اچھے مذاق اور لطیفوں پر داد بھی مل رہی تھی تو پھر وہی معاملہ ہوا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ کھانا بہت مزے دار تھا۔

ابراہیم جلیس صاحب نے کہا " بھئی آپ پٹیالہ والوں کا کھانا بہت اچھا ہوتا ہے۔"

جواب میں لالی جی نے کہا " مگر یہ تو دلّی کے کھانے ہیں۔"

وہ بولے " آپ بھی خوب چیز ہیں۔ پٹیالہ کو دلّی میں غلط ملط کر دیا ہے۔ "

وہ کہنے لگیں " ہم تو پٹیالہ سے بہت عرصہ پہلے آ گئے تھے"

" بس آپ نے یہی عقلمندی کا کام کیا۔ "

زیبا کی ایک کزن بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کی ہم عمر ہی ہوں گی۔ اس وقت نام ذہن سے نکل گیا۔ یہ کھانا دراصل ان ہی کے زیر اہتمام پکایا گیا تھا۔ جمالی صاحب کو معلوم ہوا تو وہ بار بار ان کی تعریف کرتے رہے " بھئی آپ کا کھانا بہت اچھا ہے۔ فلاں چیز کا جواب ہی نہیں ہے "

آخر زیبا سے نہ رہا گیا، بولیں " جمالی صاحب میز بان تو میں ہوں کچھ مجھ سے بھی کہیں۔ "

وہ بولے " آپ سے کیا کہیں، سوائے شکریے کے، حق بہ حقدار رسید، لالی جی نے خود ہی تو بتایا ہے کہ یہ کھانا انہوں نے بنایا ہے؟ "

کھانا تو بہت لذیذ تھا مگر انتظار کے باوجود میٹھا دستر خوان پر نہیں آیا۔ آخر ہم سے نہ رہا گیا ہم نے پوچھا " لالی جی کیا آپ کے پٹیالہ میں مٹھاس کا رواج نہیں ہے؟ "

زیبا نے جواب دیا " فکر نہ کریں۔ میٹھا بھی کھلاؤں گی اور پان بھی۔ "

کھانے کے بعد رات گئے ہم سب کاروں میں سوار ہو کر آئس کریم کھانے کے لئے پہنچ گئے۔ایکسلیئر ہوٹل سے آگے ایک گوشے میں آئس کریم کی دکان تھی۔ یہاں ڈبل روٹی کے ٹوسٹ نما ٹکڑوں جیسی آئس کریم بنائی جاتی تھی اور بے حد مزے دار تھی۔اس سے پہلے ہمیں اس دکان کا علم نہ تھا بعد میں سالہا سال تک وہاں جا کر آئس کریم کھاتے رہے۔ اب تو بہت عرصے سے جانا نہیں ہوا۔خدا جانے وہ دکان اب بھی قائم ہے یا حوادث زمانہ کی نذر ہو گئی۔زیبا ابھی زیادہ مصروف نہیں ہوئی تھیں اس لئے فنکارہ کے طور پر انہیں کسی نے نہ سمجھا اور آزادی سے گپ شپ کرتی رہیں۔اس کے بعد بھی ایک دو بار وہ فرمائش پر ہمیں آئس کریم کھلانے کیلئے اسی دکان پر لے گئیں مگر اس وقت وہ مشہور ہو چکی تھیں اس لئے برقع پہن کر کار میں بیٹھتی تھیں۔

زیبا کے گھر پر بات چیت کے دوران لالی جی اور زیبا ہم سے شمیم آراء کے بارے میں بھی دریافت کرتی رہیں۔ شمیم آرا ان سے پہلے فلمی دنیا میں داخل ہوئی تھیں اور اس وقت شہرت بھی حاصل کر چکی تھیں۔ہم نے سادگی سے اپنی رائے ظاہر کر دی اور شمیم آرا کے اخلاق اور اداکاری کی تعریف بھی کر دی۔الیاس بھائی ہمیں گھورتے اور اشارے کرتے رہے مگر ہم نے دھیان نہ دیا۔ایک بار جب ہم نے شمیم آراء کی صلاحیتوں کے بارے میں ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی تو الیاس صاحب نے ہمارا پیر کچلنے کی کوشش بھی کی مگر ہم نے پھر بھی توجّہ نہ دی۔

جب ہم اپنے ہوٹل پہنچے تو الیاس بھائی نے زیبا سے کہا ”بس مجھے بھی یہیں ڈراپ کر دو۔“

ہم حیران تھے کہ اتنی رات گئے یہ حضرت اپنے گھر کیوں نہیں جا رہے۔

جوں ہی زیبا کی کار ہم دونوں کو چھوڑ کر رخصت ہوئی الیاس صاحب نے ہمارے لتّے لینے شروع کر دیئے۔

”میاں تم بھی عجیب آدمی ہو“

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا ”کیوں“

بولے ”بھائی شمیم آرا کی اتنی زیادہ تعریف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

ہم نے کہا ”یہ کیا بات ہوئی۔انہوں نے ہماری رائے پوچھی تھی ہم نے بتا دی۔“

کہنے لگے ”بھائی ان میں تو آگ پانی کا بیر ہے۔ شمیم آرا کی تعریف انہیں پسند نہیں آتی وہ تو تمہارا لحاظ کر لیا ورنہ بحث

شروع ہو جاتی۔ ‘‘

وہ دن اور آج کا دن۔ شمیم آرا سے زیبا کی ناپسندیدگی کبھی ختم نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں بعض اوقات خاصی ناخوشگوار صورت حال بھی پیدا ہو گئی جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔

اس زمانے میں شمیم آرا کراچی سے لاہور منتقل ہو چکی تھی اور سمن آباد کی ایک کوٹھی میں کرائے پر رہا کرتی تھیں۔ ہم نے کئی بار زیبا سے دریافت بھی کیا کہ بھئی شمیم آرا سے آپ کی کیا لڑائی ہے اور اس کا سبب کیا ہے مگر وہ ہمیشہ ٹال گئیں۔ ان کا جواب تھا ’’لڑائی کیسی۔ اس بے چاری نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ میری تو کوئی لڑائی نہیں ہے۔ ‘‘

’’پھر بھی؟‘‘ ہم پوچھتے۔

’’آفاقی۔ تمہیں وہم ہو گیا ہے اس کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ ‘‘

زیبا سے ہماری ملاقاتیں اور میل جول بڑھتا رہا۔ ہم جب بھی کراچی جاتے تو عموماً ان سے بھی ملاقات ضرور کرتے تھے۔ اس وقت تک ہم نے انہیں اپنی پہلی فلم میں کاسٹ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا۔

ایک دن ہم اپنی فلم کے بارے میں الیاس صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا ’’نو عمر ہیروئن کے لئے تم نے کون سی ایکٹریس کو منتخب کیا ہے؟ ‘‘

ہم نے جواب دیا ’’ابھی تو سوچ رہے ہیں ‘‘

کہنے لگے ’’زیبا کو کیوں نہیں لے لیتے؟ ‘‘

ہم نے کہا ’’ایک تو زیبا ابھی مشہور ہیروئن نہیں بنی ہیں۔ دوسرے یہ کہ فلم سازوں نے بھاری معاوضے دے کر ان کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ ہم اتنے پیسے نہیں دے سکتے اگر زیادہ معاوضہ دینا ہی ہے تو کسی نامور ہیروئن کو کیوں نہ کاسٹ کریں۔ ‘‘

الیاس بھائی بولے ’’آفاقی یار دیکھو یہ بہت بڑی ہیروئن بن جائے گی۔ میری مانو تو زیبا کو رومانٹک ہیروئن کے رول میں لے لو۔ ‘‘

ہم نے کہا ’’الیاس بھائی آپ بھی جس فن کار کو شہرت دیتے ہیں بس اسی کے گن گانے شروع کر دیتے ہیں۔ آپ آج

کل زیبا پر مہربان ہیں پہلے شمیم آرا کی تعریفیں کرتے رہتے تھے۔ ‘‘

’’دیکھ لینا، اچھے مواقع ملیں گے تو وہ اور بھی اونچی ہو جائے گی۔ ‘‘

ہم سوچ میں پڑ گئے۔ الیاس بھائی کی یہ بات درست تھی کہ زیبا ابھرتی ہوئی ہیروئن تھیں۔ ان کا چرچا بھی ہونے لگا تھا۔ فلم سازان کے پیچھے بھی لگ گئے تھے۔ لیکن اس وقت تک وہ بڑی ہیروئن نہیں بنی تھیں۔ ان کی چند فلمیں زیر تکمیل تھیں اور الیاس بھائی کا کہنا تھا کہ ان کی نمائش کے بعد زیبا بہت بڑی ہیروئن بن جائیں گی۔ ہم لاہور واپس پہنچے تو اس بارے میں اپنے ہدایت کار حسن طارق صاحب سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بھی الیاس رشیدی صاحب کے خیال سے اتفاق ظاہر کیا تو ہم نے زیبا سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلی بار کراچی گئے اور زیبا نے کھانے پر مدعو کیا تو ہم نے یہ موقع غنیمت جانا۔ الیاس بھائی پیٹ کے اتنے ہلکے ہیں کہ انہوں نے پہلے ہی یہ اطلاع انہیں پہنچا دی تھی۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو ہم نے لالی جی سے کہا ’’لالی جی ہم ایک فلم بنانے والے ہیں آپ کی بیٹی کو اس میں کاسٹ کرنا چاہتے ہیں۔ ‘‘

’’تو پھر کرو کس نے روکا ہے ؟‘‘

’’روکا تو کسی نے نہیں ہے بشرطیکہ آپ نہ روک دیں۔ ‘‘

’لو بھلا میں کیوں روکوں گی ؟‘‘ انہوں نے سوال کیا۔

ہم نے کہا ’’جب ہم دوسروں کے مقابلے میں کم معاوضہ پیش کریں گے تو کیا آپ نہ روکیں گی ؟‘‘

وہ بولیں ’’دیکھو آفاقی ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں ان معاملات میں دخل نہیں دیتی۔ وہ خود بہت سمجھدار ہے تم زیبا ہی سے بات کیوں نہیں کرتے ؟ ‘‘

لالی جی کی یہ بات بھی درست تھی۔ ہم نے انہیں کبھی زیبا کے فلمی معاملات میں مداخلت کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ نگراں اور سرپرست ضرور تھیں مگر کاروباری بات چیت اور آخری فیصلہ خود زیبا ہی کا ہوا کرتا تھا۔ ڈیٹس وغیرہ دینے کی ذمہ داری معاوضہ طے کرنے کا فریضہ وہی سرانجام دیتی رہیں بلکہ ہم نے تو یہ بھی محسوس کیا کہ لالی جی نے زیبا کو ہر

معاملے میں کھلی آزادی دے رکھی تھی۔ وہ بعض معاملات میں انہیں مشورہ ضرور دے دیا کرتی تھیں مگر انہوں نے کبھی ان سے اپنی بات منوانے کی کوشش نہیں کی۔ آخری فیصلہ خود زیبا ہی کا ہوتا تھا۔ زیبا آغاز ہی سے فہمیدہ، معاملہ فہم اور خود اعتمادی سے مالا مال ہیں۔ غلطیاں تو ہر انسان سے سرزد ہو جاتی ہیں مگر زیبا کے اکثر فیصلے درست اور مناسب ثابت ہوئے۔

اس اثناء میں زیبا بھی آ گئیں، بولیں ''سب سے الگ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ ''

ہم نے کہا ''آپ کی برائیاں ہو رہی ہیں۔ ''

وہ ہنسنے لگیں ''یہ تو ٹھیک ہے' دونوں ہی میرے دشمن بیٹھے ہیں۔ ''

لالی جی نے ہم سے کہا ''آفاقی تو اب تم خود ہی بات کر لو۔ ''

زیبا نے ہمیں سنجیدہ پایا تو خود بھی سنجیدہ ہو گئیں۔ سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر بولیں۔ کیا بات ہے آفاقی خیریت تو ہے۔

''خیریت کہاں؟ ''

''کچھ بتاؤ گے بھی'' وہ پریشان ہو گئیں۔

ہم نے کہا ''ہم ایک فلم بنانے کا ارادہ کر رہے ہیں''

''لو میں تو ڈر ہی گئی تھی، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ ''

ہم نے کہا ''تم کبھی خود فلم بناؤ تو تمہیں فلم ساز کی پریشانی کا علم ہو۔ ''

کہنے لگیں ''میں تو ابھی تک ڈھنگ کی ہیروئن بھی نہیں بنی ہوں۔ پروڈیوسر تو بہت دور کی بات ہے۔ ''

ہم نے کہا ''تم جس رفتار سے منزلیں طے کر رہی ہو اس سے لگتا ہے کہ وہ مرحلہ بھی دور نہیں ہے ''

''شروع ہو گئی خوشامد'' وہ مسکرانے لگیں '' اب بتاؤ۔ ''

''بھئی اپنی فلم میں تمہیں ہیروئن بنانا چاہتے ہیں سوچا کہ تم اُبھرتی ہوئی فنکارہ ہو کیوں نہ تمہاری زندگی سنوار دیں۔ ''

''بڑی مہربانی ہے، آپ کی فلم کب شروع ہو گی؟''

''ابھی تو پروگرام بنا رہے ہیں۔ جب شروع ہو گی تو پہلے سے بتا دیں گے۔ ''

کہنے لگیں ''اللہ رحم کرے فلم انڈسٹری پر۔ اب تمہارے جیسے لوگ بھی فلم پروڈیوسر بن رہے ہیں۔''

ہم نے جواب دیا ''تمہارے جیسی ہیروئن بن گئی ہیں تو پھر رحم ہی رحم ہے اللہ کا۔ ''

لالی جی چپ چاپ بیٹھی مسکراتی رہیں۔

ہم نے کہا ''اب یہ بھی بتا دیں کہ آپ ہماری فلم میں کام کرنے کا معاوضہ کیا لیں گی۔؟ ''

کہنے لگیں ''معاوضہ کا کیا ہے وہ بھی طے ہو جائیگا تم فلم تو شروع کرو۔ ''

ہم نے کہا ''دیکھو بھئی جس طرح دوسرے فلم سازوں سے مطالبے کرتی ہو اس طرح ہم سے نہ کرنا ہم غریب رائٹر ہیں۔

سنجیدگی سے کہنے لگیں ''دیکھو آفاقی، فلم بنانا تو غریبوں کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ اگر اتنی حیثیت نہیں ہے تو فلم بنانے کا خیال چھوڑ دو۔ ''

ہم سمجھ گئے کہ ہماری ٹانگ کھینچ رہی ہیں اس لئے کہا ''ہمارے ملک کی فلم انڈسٹری میں آج جتنے بھی بڑے بڑے لوگ ہیں یہ سب غریب ہی تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غریبوں کو یہ کام بہت راس آتا ہے۔ ''

کہنے لگیں ''بھئی سوچ لو، ہمارا کام تو مشورہ دینا ہے۔ ہر شخص کو اپنی بساط اور اوقات کے مطابق ہی کام کرنا چاہئے۔ ''

اس طرح کی باتیں تو بہت دیر تک ہوتی رہیں مگر یہ طے پا گیا کہ زیبا ہماری فلم میں کام کریں گی۔

ہمارے ایک شناسا تھے جو حیدر آباد سندھ سے آیا کرتے تھے۔ انہیں فلم پروڈیوسر بننے کا بہت شوق تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ جب عملی طور پر فلم بنانا شروع کریں گے تو ان ہی سے سرمایہ کاری کی بات کریں گے۔ اب ہماری فلم کے سلسلے میں سبھی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ سکرپٹ تیار تھا، ہدایت کار مل چکا تھا۔ موسیقار سے بات طے ہو گئی تھی۔ نغمہ نگار بھی منتخب کر لیا گیا تھا۔ اداکاروں کا انتخاب بھی ہو چکا تھا اب لے دے کے فلم کا مہورت اور پھر اس کے بعد باقاعدہ شوٹنگ کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔

ہم تمام معاملات سے حسن طارق صاحب کو پوری طرح باخبر رکھتے تھے اور وہ وقتاً فوقتاً ہمیں قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے رہتے تھے۔ جب ہم نے انہیں مطلّع کیا کہ تمام کام مکمل ہو چکے ہیں تو وہ بولے ''بس تو پھر ایک شاندار قسم کا مہورت کر ڈالیئے۔''

ہم نے حیرت سے ان کا چہرہ دیکھا۔'' طارق صاحب مہورت کے تو آپ قائل ہی نہیں ہیں اور ہم بھی اسے بلاوجہ کی ظاہر داری اور فضول خرچی سمجھتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے پاس کل سرمایہ پانچ ہزار روپے موجود ہے۔ اب اگر مہورت پر پیسہ خرچ کر دیا تو فلم بنانے کے لئے کیا بچے گا۔ وہی مثل ہے کہ گنجی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا۔''

وہ ہنسنے لگے بولے '' یہ تو قابل اعتراض مکالمہ بول دیا ہے آپ نے۔ فلم میں نہ رکھ دینا سنسر والے کاٹ دیں گے، مگر میں آپ کو شاندار مہورت کرنے کا مشورہ ضرور دوں گا۔ اس طرح ساری انڈسٹری اور ٹریڈ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ نے فلم شروع کی ہے۔ فلم کا چرچا ہو جائے گا تو ڈسٹری بیوٹرز بھی متوجہ ہوں گے۔ یہ کاروباری گر ہے۔''

ہم نے کہا'' طارق صاحب یہ تو فضول خرچی ہے۔ ''

کہنے لگے '' فضول خرچی نہیں فلم ڈسٹری بیوٹرز کیلئے ایک جال ہے۔ ویسے آپ جو مناسب سمجھیں کیجئے۔ ''

ہم یوں تو ذاتی یا اپنے حوالے سے کسی پبلسٹی کے قائل نہیں ہیں مگر کاروباری ضرورت کے تحت ہم نے اخبار والوں کو یہ خبر دے دی کہ ہم بھی فلم بنانے والے ہیں۔ اس زمانے میں مختصر سی تو انڈسٹری تھی۔ ہر ایک کو علم ہو گیا۔ بہی خواہوں نے مبارک بادیں دینی شروع کر دیں۔ داناؤں نے سمجھانا شروع کر دیا کہ بھائی کیوں شامت آئی ہے تمہاری۔ یہ تو بڑی مصیبت کا کام ہے بڑے بڑوں کے چھکّے چھوٹ جاتے ہیں۔

ہم نے کہا'' بھائی یہ کام آخر دوسرے لوگ بھی تو کر رہے ہیں، ہم تو ان سے زیادہ جانتے ہیں۔ ''کہا'' مگر وہ جو کچھ کرتے ہیں آپ نہیں کر پائیں گے۔ وہ تو وقت پڑنے پر خوشامد کر لیتے ہیں، ضرورت محسوس کریں تو دھمکی بھی دے ڈالتے ہیں۔ اداکاروں وغیرہ سے جھوٹے وعدے کرتے ہیں، لوگوں کے پیسے ہضم کر لیتے ہیں۔ دو دو ماہ چپراسیوں تک کی تنخواہ نہیں دیتے۔ فلم کی ریلیز کے وقت عین وقت پر فلم ڈسٹری بیوٹر کو یہ خبر سناتے ہیں کہ فلم کا بجٹ بہت بڑھ گیا ہے اس لئے آپ کو ایگری منٹ کی رقم سے زیادہ دینا ہو گا وغیرہ وغیرہ۔''

ہم نے کہا''جب اوکھلی میں سر دے دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔اب تو جو بھی ہو گی دیکھی جائے گی۔''

ہمارے حیدر آباد والے شناسا نے کراچی کے اخباروں میں یہ خبر پڑھی تو اگلے ہی روز ان کا فون آگیا''آفاقی صاحب ہمیں منع کرتے ہیں اور خود فلم بنا رہے ہیں یہ تو کوئی انصاف نہیں ہے۔''

ہم نے کہا''یہ باتیں فون پر کرنے کی نہیں ہیں۔آپ لاہور کب آرہے ہیں؟''

بولے''جب آپ کہیں گے پہنچ جائیں گے۔''

ہم نے کہا''جب لاہور کا دورہ کریں تو ہم سے ضرور مل لیں۔''

وہ تیسرے ہی دن اچانک آن دھمکے''اب بتائیے کیا قصہ ہے؟''

ہم انہیں اپنی مالی حالت سے آگاہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔اس لئے انہیں بتایا''دیکھو بھائی ہم نے تھوڑے بہت سرمائے سے فلم شروع کر دی ہے آگے اللہ مالک ہے۔''

کہنے لگے''آپ کے تو سبھی جاننے والے ہیں۔ہر ایک آپ کے ساتھ تعاون کرے گا۔فلم سٹار' سٹوڈیو اونر' سنگر' پھر آپ کا ڈائریکٹر اور میوزک ڈائریکٹر بھی اچھے ہیں۔فلم ڈسٹری بیوٹروں سے بھی آپ کی دوستی ہے۔ادھر آپ فلم شروع کریں گے ادھر خریدنے والے آجائیں گے۔فٹافٹ فلم مکمل ہو جائے گی۔''

ہم نے کہا''آپ کے منہ میں گھی شکر۔مگر یہ تو محض اندازے ہیں۔بعض اوقات سب اندازے دھرے رہ جاتے ہیں۔

کہنے لگے''دیکھئے آپ مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کریں آپ فلم بنا رہے ہیں تو مجھے بھی شامل کریں ورنہ میں ریل گاڑی کے نیچے آکر خودکشی کر لوں گا۔''

''بھئی یہ تو بڑی بے رحمی ہو گی۔کوئی آسان سا طریقہ سوچیں۔''

کہنے لگے''کراچی کی محمدی بلڈنگ کی چھت سے چھلانگ لگا کر مر جاؤں گا۔''

اس وقت تک یہ کراچی کی بلند ترین عمارت تھی۔

ہم نے کہا''دیکھئے شیخ صاحب آپ ہمیں مہورت کرنے دیجئے اس کے بعد آپ سے بھی بات کر لیں گے۔''

کہنے لگے ”بعد میں کیا بات کرنی ہے۔ جو کہنا ہے ابھی کہہ دیں۔ سچّی بات یہ ہے کہ میں پچاس ہزار روپیہ لگا سکتا ہوں۔ آپ مجھے بھی حصہ دار بنا لیجئے۔“

ہم نے کہا ”بھائی جان، فلموں میں اکثر نقصان بھی ہو جاتا ہے پھر آپ کی رقم کا کون ذمہّ دار ہو گا؟“

”حصّے دار کا مطلب سمجھتے ہیں نا؟ نفع اور نقصان دونوں میں شریک، مجھے آپ پر بھروسا ہے۔ بس مجھ سے رقم لے لیں اور بینک میں رکھ دیں۔ اس کے بعد جیسی اللہ کی مرضی۔“

ہم نے ان سے غور کرنے کیلئے ایک روز کا وقت مانگا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم ان کی رقم لیتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ یہ تو امانت کا معاملہ ہے۔ نقصان ہو گیا تو کیا منہ دکھائیں گے۔ مگر طارق صاحب پھر ناصح بن کر سامنے آ گئے۔

”آفاقی صاحب جب وہ خود کہہ رہا ہے کہ نفع نقصان دونوں میں وہ شریک ہے تو پھر سوچنے کی کیا بات ہے۔ میری مانیں تو اس کی بات مان لیں۔ پچاس ہزار کافی بڑی رقم ہے۔ آپ تو ان پیسوں میں فلم مکمل کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں آپ اپنی فلم اونے پونے فروخت کرنے کے لئے مجبور بھی نہیں ہوں گے۔ اپنی شرطوں پر اطمینان سے ڈسٹری بیوٹرز سے سودا طے کرنا۔“

اللہ بخشے طارق صاحب بہت مخلص اور بے لوث دوست تھے۔ دوستوں کی بھلائی میں خوش ہونے والے۔ ان کا بھلا چاہنے والے۔ ان کا مشورہ بالکل درست تھا۔ ہمارا بھی یہی خیال تھا مگر ہم کو اخلاقی تائید کی ضرورت تھی۔ سو وہ ہمیں مل گئی۔ اس زمانے میں بلیک اینڈ وائٹ فلم عموماً سوا دو لاکھ یا ڈھائی لاکھ روپے میں بن جاتی تھی۔ اگر کفایت شعاری سے کام لیا جاتا تو نقصان کا سوال ہی نہیں تھا۔ پھر ہمیں ہر ایک کا تعاون بھی حاصل تھا۔ ہم تو پانچ ہزار کے بل بوتے پر فلم بنانے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ پچاس ہزار تو اس لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔

دوسرے دن ہم نے طارق صاحب کو اطلاع دی کہ ہم نے مہورت کے کارڈ چھپنے کو دے دیے ہیں۔ ایورنیو سٹوڈیوز میں فلم کا شاندار مہورت کریں گے۔ ساری انڈسٹری اور ٹریڈ کو بلائیں گے۔ مٹھائی تقسیم کریں دھوم دھام سے فلم کا آغاز کریں گے۔

وہ بہت خوش ہوئے کہا ”اور ہار پھول؟“

ہم نے کہا" طارق صاحب یہ تو اچھا طریقہ ہے "

کہنے لگے" مولانا اس کے بغیر تو مہورت ہی مکمل نہیں ہوتا، خیر یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں میں اپنے اسسٹنٹ سے منگالوں گا۔

ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً مہورت کا بندوبست کر لیا۔ لاہور کی فلمی دنیا میں ہلچل سی مچ گئی۔ کوئی خوش تھا' کوئی فکر مند' کوئی چپکے چپکے ہمارا مذاق اڑا رہا تھا کہ لو بھئی اب یہ صاحب بھی پروڈیوسر بن گئے ہیں۔

اس اثناء میں زیبا ایک دو فلموں کی شوٹنگ کیلئے لاہور پہنچ گئی تھیں۔ سبھی اداکاروں اور ایکٹریسوں سے ہماری اچھی ملاقات تھی سب نے ہمیں مبارک باد دی اور وعدہ کیا کہ ہمارے مہورت میں ضرور آئیں گے۔

مگر اس کے ساتھ ہی شکوے شکایت کا ایک لامتناہی دفتر بھی کھل گیا۔ جسے دیکھئے ہم سے شکایت کر رہا ہے کہ ہمیں اپنی فلم میں کیوں نہیں رکھا۔ ہر موسیقار کا منہ پھولا ہوا ہے۔ اداکار اپنی جگہ بگڑے ہوئے ہیں۔ ہر گلوکار کی فرمائش ہے کہ اس سے گانے ضرور لیں ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ ہم نے سمجھایا کہ بھائی' ایک فلم میں بھلا کتنے لوگ کام کر سکتے ہیں؟ صبر سے کام لو اور ہمارے حق میں دعائے خیر کرو۔ آئندہ بھی فلمیں بنانے کے قابل ہوئے تو باری باری سبھی دوستوں کو خوش کر دیں گے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ معاوضے یا روپے پیسے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ نہ لالچ تھا۔ بس ہر ایک کی خواہش تھی کہ ایک دوست پہلی فلم بنا رہا ہے تو اس میں اس کا حصّہ کیوں نہ ہو۔ ہم ہر ایک کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے کہ بھائی صبر کرو۔ آخر ایک فلم میں کتنے ڈائریکٹر' کتنے میوزک ڈائریکٹر' کتنے ہیرو' کتنی ہیروئنیں' کتنے اداکار' کتنے گلوکار' کتنے نغمہ نگار' کتنے ہنرمند کام کر سکتے ہیں۔ مگر ہر ایک کا منہ پھولا ہوا تھا۔ جسے دیکھئے ترچھی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ منہ اٹھائے پاس سے گزر گیا ہے۔ نہ دعا نہ سلام۔

ہم نے طارق صاحب سے کہا" طارق صاحب۔ ہم تو فلم بنانے کا اعلان کر کے پچھتا رہے ہیں' اب کیا کریں؟ "

وہ بولے" صبر کریں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کے ہر ایک سے تعلّقات ہیں۔ دوستی ہے' مراسم

ہیں' بے تکلفی ہے۔ ہر ایک آپ پر اپنا حق سمجھتا ہے۔"

اور تو اور ہمیں اسٹوڈیو اونرز کی ناراضی کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔

ایک دن شباب کیرانوی ہم سے کہنے لگے "آفاقی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ شوکت صاحب سے تمہارے پرانے تعلقات ہیں۔ تم نے وہیں سے اپنی فلمی زندگی کا آغاز کیا ہے مگر فلم تم ایورنیو اسٹوڈیو میں بنارہے ہو۔ شوکت صاحب کیا سوچیں گے؟"

ہم نے کہا "شباب صاحب' آپ کو معلوم ہے کہ شوکت صاحب اگر اسٹوڈیو کے کرائے کا اُدھار کر بھی لیں تو فلم اُدھار نہیں دیتے۔ آغاز صاحب کے اسٹوڈیو میں ہمیں یہ سہولت مل جائے گی۔"

کہنے لگے "ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر تم شوکت صاحب سے کہتے تو شاید وہ یہ بندوبست بھی کر دیتے۔"

ہم نے کہا "جب ان کا یہ دستور ہی نہیں ہے تو بلاوجہ مطالبے کرنے سے فائدہ؟ اور دیکھیں' آپ کبھی باتوں میں شوکت صاحب پر یہ صورتِ حال واضح کر دیں۔"

چلئے' شوکت حسین رضوی صاحب کی طرف سے تو ہمیں اطمینان ہو گیا مگر ملک غلام باری کا کیا ہوگا؟ باری صاحب ہمارے بہت پرانے شناسا بلکہ دوست تھے۔ ان کے ساتھ بہت بے تکلّفی بھی رہی۔ ان کی حکایتیں' داستانیں اور مہم جوئی کی کہانیاں ہم خدا جانے کب سے سن رہے تھے۔ انہوں نے ایورنیو اسٹوڈیو کے عقب میں اپنے اسٹوڈیو کے لئے زمین خریدی تو خاص طور پر مجھ سے کہا "آفاقی۔ میں نے جان بوجھ کر آغا گل کے اسٹوڈیو کے برابر میں اپنے اسٹوڈیو کے لئے زمین خریدی ہے۔"

"اس میں کیا مصلحت ہے؟" ہم نے پوچھا۔

ہنس کر کہنے لگے "یار مجھے ان پیسے والوں نے بہت ذلیل کیا ہے۔ میں بے مایہ اور غریب تھا تو یہ مجھے اپنے برابر میں بٹھانا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اب اللہ نے مجھے ان کے برابر کا بنادیا ہے تو میں انہیں کیوں خدا کی قدرت کا تماشا نہ دکھاؤں۔ میں نے آغا کے اسٹوڈیو کے ساتھ زمین لی ہے اور میں اپنے بچوں کو وصیّت کر جاؤں گا کہ میرے بعد بھی آغا صاحب کے بچّوں کے ساتھ مقابلہ جاری رکھیں۔"

باری صاحب بہت زیادہ حسّاس آدمی تھے۔اپنے برے وقتوں کی ہر بات ان کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ایک تو وہ تھے ہی پیٹ کے ہلکے اور باتونی۔دوسرے ہمارے ساتھ اکثر طویل ملاقاتیں رہتی تھیں۔اپنا کون سا قصہ ہے جو ہمیں انہوں نے نہیں سنایا۔کاروباری یہاں تک کہ ذاتی واقعات بھی سناڈالے۔ان کے معاشقے' رومان' کاروباری معرکے' حسینوں کو فتح کرنے کی داستانیں۔سبھی کچھ ہمارے علم میں تھا۔

انہوں نے باری اسٹوڈیوز کا سنگ بنیاد رکھا تو ہم سے کہنے لگے۔''آفاقی۔آج کل کی اولاد کا بھی عجیب حال ہے ''

''کیوں۔کیاہوا؟'' ہم نے پوچھا۔

ہنس کر کہنے لگے ''جب اسٹوڈیو کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد اس کے نام کا سائن بورڈ لگایا گیا تو پتا ہے راحیل نے کیا کہا؟ ''

''کیا؟ ''

''مجھ سے کہنے لگا۔ڈیڈی' کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ باری اسٹوڈیو سے پہلے آپ '' راحیل'' کا اضافہ کر دیں۔اس طرح راحیل باری اسٹوڈیو ہو جائے گا۔ ''

ان کے بڑے بیٹے راحیل کی عمر اس وقت مشکل سے سات آٹھ سال ہو گی۔

ہم نے کہا''تو پھر اضافہ کرا دیتے۔حرج کیا ہے؟ ''

کہنے لگے ''یار ان بچّوں کو بھی تو معلوم ہو کہ پیسہ کتنی محنت سے کمایا جاتا ہے اور عزّت حاصل کرنے کے لئے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔میں نے اسے کہہ دیا کہ بیٹا' میری زندگی میں تو ایسا نہیں ہو سکتا۔تم خود اگر اپنی محنت سے نیا اسٹوڈیو بناؤ گے تو اس کا راحیل باری اسٹوڈیو رکھ دینا۔ ''

باری اسٹوڈیو کی تعمیر شروع ہوئی تو باری صاحب شام ہوتے ہی لکشمی چوک والے دفتر سے اسٹوڈیو پہنچ جاتے تھے۔ شاہ نور اسٹوڈیو اور ایورنیو اسٹوڈیوز بھی آس پاس تھے۔ہم پیدل ہی سب جگہ گھومتے پھرتے تھے۔باری صاحب اپنے دفتر کے سامنے باہر لان میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے اور ہر آنے جانے والے سے علیک سلیک کرتے رہتے تھے۔ کچھ تو سلام کر کے دور ہی سے گزر جاتے۔زیادہ بے تکلف حضرات کو وہ پکار کر بلا لیتے۔ان کی اس محفل کو ہم نے دربار کا نام دیا تھا۔آج کے نغمہ نگار خواجہ پرویز اس وقت نغمہ نگار نہیں بنے تھے مگر فلم والوں سے گہرا میل جول تھا۔

غضب کے لطیفہ باز اور فقرہ باز تھے۔ ہم دونوں نے باری صاحب کی محفل کو دربار کا نام دیا اور انہیں مہابلی کا خطاب عنایت کر دیا۔

''مہابلی کس لئے ؟'' انہوں نے پوچھا۔

ہم نے بتایا ''شہنشاہ اکبر کو مہابلی کہا جاتا تھا۔ آپ بھی فلمی دنیا کے شہنشاہ سے کم تو نہیں ہیں۔ ''

خواجہ پرویز نے کہا'' مگر کنجوسی میں پورے بنئے ہیں۔ باری صاحب۔ اتنا بڑا اسٹوڈیو بنا رہے ہیں تو پھر دل بھی بڑا کیجئے۔ ذرا شوکت صاحب کو دیکھئے۔ آغا صاحب کو دیکھئے' کیسی دریا دلی سے پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ ''

اس طرح کہہ سن کر ہم باری صاحب کو سخاوت پر اُکساتے رہتے تھے اور وہ بھی لاگے باندھے قدرے سخاوت پر آمادہ ہو گئے تھے۔

ہم اسی دن باری صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ان کا رنگ ویسے ہی سرخ و سفید تھا۔ کسی بات پر ناراض ہوتے یا غصّہ آتا تو چہرہ لال بھبوکا ہو جاتا تھا۔ وہ اپنا غصّہ چھپانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئے۔ سب سے پہلے تو ان کا چہرہ اور کان سرخ ہو جاتے تھے۔ بہت ضبط کرتے مگر چُپ نہ رہ سکتے تو زبانی اظہار ناراضگی شروع کر دیتے۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ وہ غصّے کا اظہار کریں۔

ہم نے کہا'' کیا بات ہے باری صاحب۔ ناراض لگتے ہیں ؟'' بس پھر کیا تھا۔ باری صاحب تو ساون کے بادلوں کی طرح برسنے لگے۔

کافی دیر شکوہ شکایت کرتے رہے۔ جب ستانے کے لئے رُکے تو ہم نے کہا'' باری صاحب۔ یہ تو صرف مہورت ہے۔ جب فلم کی شوٹنگ ہو گی تو تب ناراض ہونے کا موقع ہو گا۔ ''

ان کا غصّہ ایک دم پچاس فیصد رہ گیا'' فلم میرے اسٹوڈیو میں ہی بناؤ گے نا؟ ''

ہم نے کہا'' دراصل آغا صاحب ہمیں بہت سہولتیں اور مراعات دے رہے ہیں جو آپ اپنے فلم سازوں کو نہیں دیتے۔ ''

کہنے لگے '' ادھار اسٹوڈیو دے دوں گا۔ کہو گے تو خام فلم بھی ادھار دے دوں گا۔''

''کرائے میں بھی رعایت کردیں گے؟'' ہم نے پوچھا۔

''ہاں ہاں' کردیں گے۔ ''

''اور کمیشن کتنا لیں گے۔سنا ہے آپ بہت منافع لیتے ہیں۔ ''

''وہ بات بھی ہو جائے گی۔ ''

ہم نے کہا''بس تو پھر شوٹنگ شروع کرنے سے پہلے آپ سے بات ہو گی۔ مگر یہ بتائیں کہ مہورت پر تو آئیں گے نا؟ ''

بولے''آجاؤں گا آجاؤں گا۔اگر تم گھٹیا ہو تو کیا میں بھی گھٹیا بن جاؤں گا۔ ''

شوکت صاحب کے پاس ہم خود مہورت کارڈ لے کر گئے۔

پوچھا''کاہے کا دعوت نامہ ہے؟ ''

ہم نے کہا''شوکت صاحب۔ہماری فلم کا مہورت ہے۔''

ایورنیو اسٹوڈیو میں۔''انہوں نے کارڈ کو دیکھا۔

''اچھّا اچھّا' مبارک ہو۔ ''

''شوکت صاحب' آپ کو ضرور آنا ہے۔ ''

''کیوں نہیں میاں آئیں گے۔تاریخ کون سی ہے؟ ''

ہم نے کہا''کارڈ پر درج ہے اور ہم ایک دن پہلے آپ کو یاد دہانی بھی کرادیں گے۔ ''

شوکت صاحب شکایت کا حرف تک زبان پر نہ لائے۔ ممکن ہے شباب صاحب نے ہماری پوزیشن واضح کردی ہو۔

مہورت کے دن ہم بہت مصروف رہے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ مہمانوں کی آمد شروع ہوئی تو ہال بھر گیا مگر مہمان تھے کہ اُمڈے چلے آرہے تھے۔ جسے دیکھئے مبارک باد دینے چلا آرہا ہے۔ سبھی آئے لیکن اگر نہ آئیں تو زیبا۔ کئی ہیروئنوں نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا''آفاقی صاحب۔ کیا آپ کی ہیروئن کراچی گئی ہوئی ہیں؟ ''

رخسانہ نے کہا''آفاقی صاحب۔ ہمیں تو آپ نے فلم میں رکھا ہی نہیں پھر بھی آپ کی خوشی میں شریک ہونے کے لئے آگئے۔آپ کی ہیروئن نے تو آپ کو لفٹ ہی نہیں دی۔ ''

زیبا کی غیر موجودگی کو ہم نے بھی محسوس کیا۔ کم و بیش فلمی صنعت کے سبھی لوگ موجود تھے پھر زیبا کیوں غیر حاضر تھیں؟ ہمیں بہت افسوس ہوا اور غصّہ بھی آیا۔

مہورت بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ مٹھائی تقسیم ہوئی۔ طارق صاحب کے اسسٹنٹ نے پھولوں اور ہاروں کا بندوبست کیا تھا۔ ہار پہنائے گئے۔ یہ تو خیر ٹھیک تھا مگر پوز بنا کر تصویریں بنانے کا وقت آیا تو ہمیں بہت پریشانی ہوئی مگر کوئی مفر نہ تھا۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ اس موقع پر ہمارے ساتھ یادگار تصویر بنوائے۔ چائے کافی کا دور چلتا رہا جس کے لئے ہم نے خصوصی طور پر اہتمام کیا تھا۔ ہمارے سبھی جاننے والے' دوست احباب' شناسا' واقف کار موجود تھے اور واقعی بہت خوش تھے۔ وہ ایسا ہی زمانہ تھا۔ لوگ خلوص اور محبت سے ملتے تھے۔ ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوتے تھے۔ رات گئے تک یہ ہنگامہ رہا۔ خوب رونق اور چہل پہل تھی۔ یہ ہماری زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔ گھر پہنچے تو بہت سے ٹیلی فونی پیغامات ہمارے منتظر تھے۔ حیدرآباد سے شیخ صاحب نے بذریعہ تار مبارک باد کا پیغام ارسال کیا تھا اور ہمیں یاد دہانی کرائی تھی کہ اپنا وعدہ نہ بھولیں۔

دوسرے دن ہم نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ ہماری کل پونجی میں سے سوا تین ہزار روپے خرچ ہو گئے تھے۔ اس میں گلوکارہ کا معاوضہ' سازندوں کا معاوضہ۔ دعوت ناموں اور لفافوں کا خرچہ۔ مٹھائی' چائے کافی کے اخراجات اور چھوٹے موٹے لوگوں کو ادائیگی کے اخراجات بھی شامل تھے۔ صرف اسٹوڈیو کا کرایہ ادھار تھا۔ باقی سب نقد ادا کر دیا گیا تھا۔

ہمارے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ہم نے اگلے روز پریشان ہو کر طارق صاحب سے کہا" طارق صاحب۔ ہمارے سوا تین ہزار روپے خرچ ہو گئے ہیں۔ صرف پونے دو ہزار باقی بچے ہیں۔ کیا اتنے سرمائے سے فلم بن جائے گی؟ "
وہ ہنسنے لگے "آفاقی صاحب۔ حوصلہ رکھئے۔ مہورت ہو گیا ہے۔ کراچی سے ڈھاکا تک سب کو خبر لگ گئی ہے۔ ڈسٹری بیوٹر آئیں گے تو سرمایہ بھی آجائے گا۔ "

مگر کوئی ڈسٹری بیوٹر نہ آیا۔ معلومات سب نے حاصل کی تھیں مگر شاید اس انتظار میں تھے کہ فلم کی شوٹنگ کا آغاز ہو گا تو بات چیت کریں گے۔ مگر شوٹنگ کا آغاز کیسے ہو؟ لاکھ سستا زمانہ سہی مگر پونے دو ہزار روپے سے فلم کی شوٹنگ کیسے

ہو سکتی تھی؟

دوسرے دن ہمیں زیبا کا ٹیلی فون موصول ہوا۔ بہت مبارک باد دے رہی تھیں۔ ہم غصّے کے مارے صرف ہوں ہاں کرتے رہے۔

"کیا ہوں ہاں لگا رکھی ہے۔ بولتے کیوں نہیں؟"

"کیا بولیں، ضرورت ہی کیا ہے؟"

"آفاقی، کیا تم ناراض ہو؟" انہوں نے سادگی سے پوچھا۔

ہمارے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ "بھئی آپ کو کیا۔ آپ نے تو مہورت میں آنے کی تکلیف ہی گوارا نہیں فرمائی۔"

"آفاقی۔ ایمان سے میں مجبور تھی۔ بتاؤں گی تو شکایت دور ہو جائے گی۔"

ہم نے کہا "بھئی آپ بہت بڑی ہیروئن بن گئی ہیں۔ ساری انڈسٹری وہاں موجود تھی اگر نہیں تھی تو ہماری فلم کی ہیروئن۔"

ہم نے کافی دیر تک غصّے کا اظہار کیا۔ وہ بہت صبر اور تحمل کے ساتھ سنتی رہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید ہماری دلیلوں سے قائل ہو گئی ہیں مگر آخر میں وہ تنگ آ کر بولیں "تمہارا تو دماغ ہی خراب ہے۔ کسی دوسرے کی بات ہی نہیں سنتے۔"

ہم نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کے بعد کچھ اور کہنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔

اگلے روز ہم باری اسٹوڈیوز گئے تو باری صاحب نے ہماری خوب ہُوٹنگ کی۔ انہوں نے دور ہی سے ہمیں دیکھ کر پکارا "غریب پروڈیوسر آ گیا۔"

ہم نزدیک جا کر بیٹھ گئے۔

وہ کہنے لگے "میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا کہ بھائی فلم بنانا غریبوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے زیبا کو ایڈوانس بھی دیا تھا یا نہیں؟"

ہم نے کہا "یہ ہمارے کاروباری راز ہیں۔"

کہنے لگے ''جو کہ ساری دنیا جانتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے زیبا کو ایک روپیہ بھی ایڈوانس یا سائننگ کا نہیں دیا ہے۔ فلموں میں تعلقات سے کام نہیں چلتا۔ پیسہ چلتا ہے' پیسہ ''!

ہم خاموش رہے' وہ کہنے لگے ''اچھّا۔ تم چائے پی کر اپنا غم غلط کرو۔ ویسے مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ ''

ہم نے کہا'' باری صاحب' اور سب تو ٹھیک ہے مگر آپ محاورے کا غلط استعمال نہ کیجئے۔ ''

''مجھے محاورے مت سکھاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے اسے ہیروئن بنا کر فلم کا مہورت کیا اور وہ پہلے ہی دن غائب ہو گئی۔ میں نے تو سنا ہے کہ وہ تمہاری فلم میں کام ہی نہیں کرے گی۔ ''

کہاں تک سنتے آخر ہم بھی بول پڑے ''نہیں کرے گی تو نہ کرے۔ پاکستان میں اور بھی بہت سی ہیروئنیں موجود ہیں۔ ''

وہ ہنسنے لگے ''یار تُو تو گرمی کھا گیا۔ خیر خیر' بیٹھ کر ٹھنڈا پیو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے دوست' ابھی تو ابتدائے عشق ہے اور تم گھبرا گئے ہو۔ ''

اس روز ہم رات کو دیر تک سوچتے رہے کہ کہیں فلم ساز بن کر ہم نے غلطی تو نہیں کر دی۔ ظاہر ہے کہ سرمائے کے بغیر فلم نہیں بن سکتی۔ ہم اپنے تعلقات کے بارے میں بلاوجہ خوش فہمیوں کا شکار ہیں۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ فلم اور پولیس والے کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ ابھی تو زیبا کا معاملہ ہے۔ آگے چل کر اور خدا جانے کون کون سے صدمے سہنے پڑیں گے۔

ہم ایورنیو اسٹوڈیو میں ایک فلم کے سیٹ پر گئے تو وہاں زیبا موجود تھیں۔ ہم نظریں بچا کر گزرنے لگے تو انہوں نے کہا ''آفاقی۔ کیا تم نے مجھے اپنی فلم میں سے کٹ کر کے دوسری ہیروئن سائن کر لی ہے؟ ''

ہم نے کہا'' آپ کو ہم نے اپنی فلم میں سائن ہی کب کیا تھا۔ اگر سائن کیا ہوتا اور پیشگی رقم دی ہوتی تو آپ ہمارے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتیں۔ ''

''میں نے کیا سلوک کیا' کیا کوئی بیمار نہیں ہوتا؟ ''

ہم نے کہا'' اگر ہم نے پیشگی رقم دی ہوتی تو بیمار بھی نہ ہوتیں۔ ہم سب سمجھتے ہیں۔ ''

'' کیا خاک سمجھتے ہیں؟ آپ تو بے وقوف ہیں اوّل نمبر کے۔ ''

'' اور سنئے' ایک تو ہمیں دکھ پہنچایا اوپر سے بھرے سیٹ پر بے وقوف نمبر اوّل کہہ دیا۔'' ہم نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس لڑکی کو اپنی فلم میں ہرگز نہیں رکھیں گے۔ ایک دوست نے ہمیں سمجھایا کہ کیوں بلاوجہ جذباتی ہو رہے ہو۔ کیا ہوا اگر زیبا مہورت میں نہیں آئی۔ ہزار کام ہو سکتے ہیں۔ تم نے بلاوجہ یہ بات اپنے اعصاب پر سوار کر لی ہے۔ یار فلم بنانے چلے ہو تو حوصلہ بھی پیدا کرو۔

ہمارے پاس کل سرمایہ پونے دو ہزار کے قریب رہ گیا تھا۔ سوچا کہ شیخ صاحب کو حیدر آباد فون کر کے پچاس ہزار روپیہ بھیجنے کا کہا جائے اور پھر شوٹنگ کا پروگرام بنایا جائے۔ ہم نے حیدر آباد کے لئے ٹرنک کال ملائی۔ ٹرنک کال کا ملنا بھی ان دنوں بائی چانس ہی تھا۔ ملی ملی' نہ ملی نہ ملی۔

ٹرنک کال ملانے کا مطلب یہ تھا کہ آپ گئے دین دنیا سے۔ کال بک کرا کے بیٹھے ہوئے ہیں مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا۔ قسمت سے اگر دو چار گھنٹے میں مل گئی تو خوش قسمتی ہے ورنہ اگلے دن تک ٹیلی فون کے پاس بیٹھے انتظار کرتے رہئے۔

دو دن ہم حیدر آباد ٹیلی فون ملانے کی کوشش کرتے رہے۔ ایکسچینج والوں سے بھی جھگڑے کرتے رہے۔ آخر تیسرے دن کال مل گئی۔ دوسری طرف شیخ صاحب بول رہے تھے۔'' السلام علیکم شیخ صاحب۔ دو دن سے ٹرنک کال ملا رہے ہیں۔ شکر ہے مل گئی۔ ''

ادھر سے آواز آئی'' یہ آپ کی نہیں' میری ٹرنک کال ہے۔ میں بھی چار دن سے فون ملا رہا ہوں۔ اگر آج بھی نہ ملتی تو تار دے دیتا۔''

ہم نے کہا'' پہلے آپ بات کر لیجئے' پھر ہم آپ کو اپنی سنائیں گے۔ ''

بولے '' آفاقی صاحب۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ نادم ہوں مگر مجھے معاف کر دیجئے۔ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ''

ہم حیران رہ گئے ''کیا ہو گیا۔ کس بات پر شرمندہ ہو رہے ہیں؟ ''
بولے ''میری فیکٹری میں آتش زدگی ہو گئی ہے۔ ''
ہم پریشان ہو گئے ''زیادہ نقصان تو نہیں ہوا؟ ''
''نقصان تو بہت ہوا ہے۔ میری تو انشورنس بھی ختم ہو چکی تھی۔ میں بہت پریشان ہوں۔ ''
ہم نے مناسب الفاظ میں ان سے فیکٹری کی تعزیّت کی۔
وہ پوچھنے لگے ''آپ نے کب شوٹنگ کا پروگرام بنایا ہے؟'' ہم نے کہا ''بس آپ جلدی سے پیسے بھیج دیں تو پروگرام بھی بن جائے گا۔ ''
کہنے لگے ''آفاقی صاحب۔ ناراض نہ ہوں۔ میں فی الحال پیسے نہیں بھیج سکوں گا۔ ''
ہم پر تو جیسے بم گر گیا۔ آواز ہی گُم ہو گئی۔
وہ بولے ''یقین کیجئے میں بے حد شرمندہ ہوں۔ اسی لئے میں کہہ رہا تھا کہ آپ پیسے لے کر اپنے پاس رکھ لیجئے۔ اب تو میں پھنس گیا ہوں۔ کم سے کم آٹھ دس مہینے تک کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ اپنا شوٹنگ کا پروگرام آگے بڑھا دیجئے۔ ''
ہم نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا پھر کہا ''شیخ صاحب۔ ہم نے زندگی میں پہلی بار فلم شروع کی ہے۔ دھوم دھام سے مہورت کیا ہے۔ اب اگر شوٹنگ نہ کی تو لوگ مذاق اڑائیں گے کہ یہ بھی صرف مہورت کر کے بیٹھ جانے والوں میں سے ہیں۔ فلمی دنیا میں ایسے لوگوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ہماری تو ساکھ ہی ختم ہو جائے گی۔ ''
''میں بہت شرمندہ ہوں'' انہوں نے پھر وہی ریکارڈ لگا دیا۔
''شرمندہ ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ اپنے حالات ٹھیک کیجئے۔ ہم کوئی اور بندوبست کرتے ہیں۔ ''
''ارے نہیں۔ فلم تو آپ کے ساتھ میں ہی بناؤں گا۔ کچھ عرصہ رُک جایئے۔ ''
''شیخ صاحب' آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ ہماری عزّت کا سوال ہے۔ سب ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ ٹھیک ہے' اگلی بار آپ کے ساتھ فلم بنالیں گے۔ مجھے آپ سے بہت ہمدردی ہے' یقین کیجئے۔ ''
''میں بہت شرمندہ ہوں'' انہوں نے پھر وہی گردان شروع کر دی۔ شکر ہے کہ کال کا وقت ختم ہو گیا تھا ورنہ وہ خدا

جانے اور کتنی بار یہی الفاظ دہراتے۔

فون خاموش ہو گیا تو ہم سوچ میں پڑ گئے۔ایک تو زیبا کے مہورت میں نہ آنے کی وجہ سے ہی لوگ ہمارا مذاق اُڑاتے رہے تھے۔اب اگر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ فلمی دنیا میں یہ بھی ایک معمول ہے کہ نئے نئے لوگ تھوڑا بہت سرمایہ لے کر آتے ہیں۔زور و شور سے مہورت کرتے ہیں۔ تھوڑا بہت کام بھی کر لیتے ہیں اور اس کے بعد لاپتا ہو جاتے ہیں۔ایسے فلم سازوں کو فلم والے''موسمی پرندے'' کہا کرتے ہیں۔ہم اپنے نام پر یہ ٹھپّا نہیں لگوانا چاہتے تھے۔ تو پھر کیا کریں؟

ہمارے تعلقات' بے تکلفی اور دوستی ہمیشہ ہر طرح کے لوگوں سے رہی ہے مگر مشکل یہ ہے کہ ہم نے کبھی کسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ دوسرے البتہ ہم سے فائدہ اٹھاتے رہے۔اور پھر کسی سے پیسے مانگنے کا تو ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ ہم تو خود اپنے پیسے مانگتے ہوئے جھجکتے ہیں۔اُدھار کیسے مانگتے؟ مگر یہ معاملہ بے حد سنگین تھا۔اگر فلم کی شوٹنگ شروع نہ ہوئی تو ہمارے بارے میں لوگوں کی رائے خراب ہو جائے گی۔ ہم تمسخر کا نشانہ بن جائیں گے۔ مگر سرمایہ آئے کہاں سے؟ یہ تو ہمیں احساس تھا کہ ہماری شوٹنگ شروع ہو گی تو ڈسٹری بیوٹرز بھی آ جائیں گے مگر شوٹنگ کیسے ہو؟ پونے دو ہزار جیب میں رکھ کر فلم بنانے چل کھڑے ہوئے۔ واقعی حماقت کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے؟

اس داستان کو مختصر کرنا ہی بہتر ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہم سے جو بھی پوچھتا کہ فلم کب شروع ہو رہی ہے تو ہم ٹال دیتے کہ بس۔طارق صاحب فارغ ہوں گے تو شوٹنگ شروع ہو جائے گی۔ مگر ہم سوچ سوچ کر تھک چکے تھے کہ شوٹنگ کے لئے سرمایہ کہاں سے لائیں؟ ایک دن بہت غور و فکر کرنے کے بعد ہم شباب کیرانوی صاحب کے پاس چلے گئے۔وہ ہمارے بہت پرانے دوست اور ہم راز تھے۔ ہماری صورت دیکھتے ہی پوچھا'' یار آفاقی تم شوٹنگ کب کر رہے ہو؟ '' دفتر میں اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔اس لیے ہم نے بات ٹال دی۔ جب ہم دونوں ہی رہ گئے تو ہم نے جی کڑا کر کے تمہید باندھی۔

''یار شباب صاحب' ہم تو مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ ''

وہ چوکنّا ہو گئے ''کیسی مشکل؟ ''

ہم نے مختصراً انہیں حالات سے آگاہ کیا۔

''تو پھر اب کیا کرو گے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ سنو۔ یار تم کسی سے ہمیں قرضہ دلا دو۔ لاہور میں ایسے لوگ بھی ہیں اور ایک صاحب شیخ نتّھا تو تمہارے بہت قریبی دوست ہیں۔''

''وہ تو تمہیں بھی جانتے ہیں۔''

''جانتے تو ہیں مگر کبھی واسطہ نہیں پڑا ہے ان سے۔ تم تو ان سے قرض لیتے رہے ہو۔ وہ جس طرح چاہیں اپنا اطمینان کر لیں۔ ہمیں امید ہے کہ چند دن کی شوٹنگ کے بعد ہی ہماری فلم بِک جائے گی۔''

شباب صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ پیروں تلے گھنٹی کا بٹن دبا کر چائے اور پان منگایا۔ پھر سگریٹ' سگار اور پائپ تینوں میں سے پائپ کا انتخاب کر کے تمباکو نوشی شروع کر دی۔

''لو۔ تم بھی تمباکو لے لو۔''

ہم نے کہا ''ہمارے پاس اپنا تمباکو ہے۔''

ہم دونوں کچھ دیر چائے اور پائپ پیتے رہے۔ پھر ہم انہیں شیخ نتّھا سے بات کرنے کی تاکید کر کے چلے آئے۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہ بعض لوگوں کو پچاس ساٹھ ہزار تک قرض دے دیا کرتے تھے۔ بعض اوقات اس سے زیادہ بھی دے دیتے تھے۔ ہمیں تو صرف پچاس ہزار کی ضرورت تھی۔

دوسرے دن ہم شباب صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ وہ ہمیں لے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے جہاں کھانا کھایا جاتا تھا۔

بولے ''یار آفاقی۔ میں نے شیخ صاحب سے بات کی تھی مگر ان کی ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا؟'' ہم نے پوچھا۔

''وہ صرف ان فلم سازوں کو قرض دیتے ہیں جو شاہ نور اسٹوڈیوز میں اپنی فلم بناتے ہیں۔ دراصل انہیں شوکت صاحب پر پورا بھروسا ہے کہ وہاں ان کی رقم ڈوبے گی نہیں۔ آغا صاحب اور ملک باری تو کبھی کبھی فلم ساز کے حق میں

ہمدردی بھی دکھادیتے ہیں۔اس لئے شیخ صاحب شاہ نور اسٹوڈیو میں فلم بنانے والی پارٹی کے سوا کسی کو قرضہ نہیں دیتے۔تم اپنی فلم شاہ نور میں کیوں نہیں بنا لیتے "

ہم نے کہا"شباب صاحب۔آپ کیسی باتیں کررہے ہیں؟ایورنیو اسٹوڈیو میں ہم نے اس کا مہورت کیا ہے۔آغا صاحب سے اس بارے میں بات چیت کی ہے اور انہوں نے ہمیں کافی مراعات بھی دی ہیں۔اب اچانک ہم شاہ نور میں فلم بنائیں گے تو لوگ کیا سوچیں گے اور ہم آغا صاحب کو کیا جواب دیں گے؟ "

"لوگ کچھ نہیں سوچیں گے۔ تھوڑے دن بعد بھول ہی جائیں گے۔ "

"اور آغا صاحب؟"

"ان سے تم خود بات کرکے اپنی پرابلم بتادو۔ "

"یہ نہیں ہوسکتا۔یہ تو بڑی شرم کی بات ہے کہ پہلی پہلی فلم شروع کی اور زبان یا معاہدے کا کوئی پاس ہی نہ کریں۔ "

"تو پھر کچھ مہینے رُک جاؤ۔ "

"وہ اور بھی بُری بات ہے۔ہمارا تو سب مذاق اُڑائیں گے کہ شوباز آدمی ہے۔ہم اسی لیے مہورت کرنے کے حق میں نہیں تھے۔بلاوجہ مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔ "

شباب صاحب ہمدردی سے ہمیں دیکھتے رہے۔

"سنو۔تم شیخ صاحب کو ہماری ضمانت دو۔وہ تمہاری بات مان لیں گے۔ "

شباب صاحب بولے"میں نے تو خود ہمیشہ انہیں شاہ نور اسٹوڈیو کا لیٹر ہی دے کر قرضہ لیا ہے۔بلاوجہ بات کھونے سے کیا فائدہ؟ "

ہم گھر پہنچے تو حد درجہ مایوس اور غمگیں تھے۔نہ کسی سے بات کی نہ کھانا کھایا۔خاموشی سے اوپر جاکر لیٹ گئے۔ ساری رات نیند نہیں آئی۔کس قدر بے عزّتی کی بات ہے کہ ہر ایک سے تعلقات ہیں۔ مراسم ہیں۔بے تکلّفی ہے۔ شان وشوکت سے مہورت کیا ہے اور فلم کی شوٹنگ شروع نہیں ہوپائی۔مہورت کرکے رہ گئے۔ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

چند روزاسی ادھیڑبن میں رہے۔ خود کو مجرم سمجھ کر نفرین کرتے رہے۔ لوگ سچ ہی کہتے تھے۔ ہمیں خواہ مخواہ فلم پروڈیوسر بننے کی کیا سوجھی تھی۔ روپے کے بغیر بھلا کون فلم بنا سکتا ہے۔ ہم تو یوں ہی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ وہی مثل ہے کہ جیب میں نہیں دانے، امّاں چلیں بُھنانے۔ انسان کو اپنے حالات اور وسائل کے مطابق ہی کام کرنا چاہئے۔ چند روز اس طرح اداسی اور مایوسی کا شکار رہے۔ پھر رفتہ رفتہ دل کو ڈھارس دی کہ اگر ایک در بند ہوتا ہے تو اللہ میاں سینکڑوں در کھول دیتا ہے۔ ہم سے بھی گئے گزرے لوگ فلمیں بنا لیتے ہیں تو پھر ہم کیوں نہیں بنا سکتے؟ اس طرح ہم نے خود کو تسلّی دی مگر عملی طور پر مسئلے کا کوئی حل نظر نہ آیا۔ جب کوئی پوچھتا کہ شوٹنگ کیوں شروع نہیں کرتے تو ہم مختلف بہانے بنا دیتے۔ طارق صاحب مصروف ہیں۔ ایکٹر ڈیٹ نہیں دے رہے۔ خود ہم نے بھی ایک نئی کہانی پر کام شروع کر دیا تھا اس لئے یہ بھی ایک معقول بہانہ تھا کہ یہ اسکرپٹ مکمل کرنے کے بعد یکسوئی سے شوٹنگ کریں گے۔ لوگوں کو ان پر کتنا اعتبار آتا تھا۔ یہ ہم نہیں جانتے مگر دل ہی دل میں یہ احساس تھا کہ یہ سب تو جھوٹی تسلّیاں ہیں۔ ہو نہ ہو سب جانتے ہیں کہ ہمارے پاس سرمائے کا بندوبست نہیں ہے۔ حسن طارق صاحب کو ہم نے اعتماد میں لے کر تمام صورتِ حال بتا دی تھی۔

انہوں نے کہا ”آفاقی صاحب۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ میں آج کل بہت مصروف ہوں۔ جب تک آپ کی فلم شروع ہو گی، میں بھی فارغ ہو جاؤں گا۔ “

زیبا سے ہماری ناراضگی ختم ہو گئی تھی۔ ہمیں ان کی وضاحت پر یقین آ گیا تھا۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، زیبا کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا اور وہ باقاعدہ ہیروئنوں کی صف میں شامل ہو گئی تھیں۔ جب ان سے ملاقات ہوتی تو وہ کہتیں ” دیکھو آفاقی۔ میں تمہیں صاف بتا رہی ہوں۔ شوٹنگ سے کم از کم دو مہینے پہلے مجھ سے ڈیٹ کی بات طے کر لینا ورنہ مشکل ہو جائے گی اور تم پھر ناراض ہو جاؤ گے۔ “

لیجئے۔ اللہ نے ہمیں بیٹھے بٹھائے ایک اور بہانہ دے دیا تھا کہ بھئی کیا کریں۔ زیبا اس قدر مصروف ہو گئی ہیں کہ ڈیٹس ملنی دشوار ہیں۔ کمال جب کبھی ہم سے ملتے، یاد دلاتے رہتے تھے کہ ان کا معاوضہ کتنا بڑھ گیا ہے۔

”سُوفی۔ آج کل میں اتنا معاوضہ لے رہا ہوں۔ سن لو۔ پرانے معاوضے پر کام نہیں کروں گا۔ “ ”ہمارے لئے رعایت تو

کرو گے نا؟ ''

''کیوں نہیں۔ تم پانچ سو کم دے دینا۔ ''

اور ہمارا دل جل کر کباب ہو جاتا تھا۔ کسی اور آرٹسٹ نے ہمیں معاوضوں کے اضافے کی خبر نہیں سنائی تھی۔

ہماری فلم کے محاذ پر تو خاموشی تھی مگر دریں اثنا اور بھی کئی واقعات رونما ہو چکے تھے۔ پہلے تو زیبا کے پہلی بار لاہور آنے کی روداد سنئے۔

کڑاکے کی سردیوں کے دن تھے جب ہمیں رات کو بارہ بجے کراچی سے الیاس رشیدی صاحب کا ٹیلی فون موصول ہوا۔ ہم لحاف میں گھسے ہوئے پڑھ رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز نے چونکا دیا۔ کراچی سے ایک شناسا آپریٹر صاحب بول رہے تھے۔ فلم والوں سے آپریٹروں کو بہت دلچسپی تھی اور وہ بہت سی مشکلیں آسان کر دیتے تھے۔ مثلاً وقت بے وقت کراچی والوں کی کال ملا دیتے تھے اور اگر فرمائش کی جائے تو اس کال میں کچھ اور حضرات کی کالیں بھی بیک وقت شامل کر دیتے تھے۔ مثلاً ہم لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں ہیں۔ الیاس صاحب کراچی میں ہیں۔ اقبال شہزاد صاحب پی ای سی ایچ ایس کراچی میں ہیں۔ آپریٹر صاحب نے ہم تینوں کی لائنیں ملا دیں اور ہم سب نے آپس میں باتیں شروع کر دیں۔ کئی بار تو اسی کال میں کچھ اور حضرات بھی شامل ہو جاتے تھے۔

آپریٹر صاحب تھوڑے وقفے کے بعد معذرت خواہ ہو کر مداخلت کرتے اور پوچھتے۔ اور کسی کو تو نہیں ملانا ہے سر؟ ''

''ارے نہیں بھئی۔ تین ہی نے کنفیوژن پھیلا رکھا ہے۔ یہاں کوئی جلسہ عام تو نہیں ہو رہا ''

درمیان میں آپریٹر کی آواز آتی ''السلام علیکم سر۔ ''

''وعلیکم السلام۔ بھئی یہ سلام کرنے کا کون سا وقت ہے؟۔''

رات کے بارہ ایک بج رہے ہیں۔ ''

''سر۔ میڈم زیبا کا فون نمبر ملا دوں ابھی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اماں رہنے دو۔ آدھی رات کے وقت انہیں جگاؤ گے؟ ''

آپریٹر کی آواز سے مایوسی ظاہر تھی۔ ''آپ کی مرضی سر۔ ورنہ ابھی آپ تینوں کی بات کرا دیتا آپس میں۔ ''

الیاس صاحب نے ہمیں بتایا کہ زیبا پہلی بار لالہ جی کے ساتھ لاہور پہنچ گئی ہیں۔ نخشب صاحب کی مہمان ہیں۔ان سے ملکر انکا خیال رکھنا‘‘۔

ہم نے پوچھا ’’الیاس بھائی۔ان کا فون نمبر تو لکھوادیں۔ ‘‘

’’کن کا؟ ‘‘

’’ارے بھئی نخشب صاحب کا ورنہ ہم زیبا کا پتا کیسے لگائیں گے۔ ‘‘

’’ذرا صبر کرو۔ابھی بتاتا ہوں‘‘ یہ کہہ کر وہ ریسیور رکھ کر غائب ہو گئے۔کچھ دیر بعد ان کی آواز آئی ’’لکھو۔ مگر دیکھو بھائی۔ کہیں اسی وقت فون نہ کر دینا ‘‘

انہوں نے ہمیں ایک فون نمبر لکھوادیا۔

ہم نے بگڑ کر کہا ’’الیاس بھائی۔آپ ہمیں پاگل سمجھتے ہیں جو ہم اتنی رات گئے انہیں فون کرکے جگائیں گے۔ ‘‘

وہ بولے ’’میاں اتنی رات گئے ہم دونوں بھی تو باتیں کر رہے ہیں۔اچھّا اب تم سو جاؤ۔ صبح زیبا کی خبر ضرور لے لینا۔ مگر دیکھو۔ گیارہ بارہ بجے سے پہلے فون نہ کرنا‘‘ یہ کہہ کر انہوں نے اللہ حافظ کہے بغیر فون بند کر دیا۔ ہم نے بھی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔اتنی دیر تک لحاف سے باہر رہنے کی وجہ سے ہمارا ایک ہاتھ بالکل سن ہو گیا تھا۔لاہور میں غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ لحاف کو اچھی طرح لپیٹ کر ہم دبک کر لیٹ گئے اور دوبارہ کتاب اُٹھالی۔ ابھی دو ہی سطریں پڑھی ہوں گی کہ پھر فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔

’’ہیلو۔معاف کیجئے سر۔بات ختم ہو گئی؟‘‘ یہ آپریٹر تھا۔ہم نے کہا۔

’’بات ہو رہی ہوتی تو آپ سن نہ رہے ہوتے۔ ‘‘

وہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے ’’بالکل نہیں سر۔ہم کسی کی باتیں نہیں سنتے ہیں، ویسے حکم دیں تو میڈم کا نمبر ملادوں؟ ‘‘

’’تمہیں کیسے معلوم ہوا؟‘‘ ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

’’سر ابھی تو الیاس صاحب نے آپ کو لکھوایا ہے۔میں نے بھی احتیاطاً نوٹ کر لیا۔ہو سکتا ہے کسی وقت ضرورت پڑ جائے۔ ‘‘

ہم نے کہا ”انہیں ان کے حال پر رہنے دو اور ہمیں اپنے۔ “

وہ بھانپ گئے کہ ہم ناراض ہیں ”سوری سر۔ معافی چاہتا ہوں“ کہہ کر انہوں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

دوسرے دن گیارہ بجے ہم نے اس نمبر پر فون کیا۔

”ہیلو‘ جی سر؟ “

ایک مردانہ کرخت آواز نے جواب دیا۔ سوچا کہ کم از کم یہ نخشب صاحب کی آواز تو ہو نہیں سکتی۔ پھر بھی پوچھ لیا

”آپ کون بول رہے ہیں؟ “

”اساں نوکر بول ریاں نے۔ “

”نخشب صاحب ہیں؟ “

”وہ تو باہر چلے گئے ہیں جناب جی۔ “

”اچھا سنو۔ کیا یہاں کراچی سے مہمان آئے ہوئے ہیں؟ “

”مہمان شمان تو کوئی نہیں ہے جناب۔ دو زنانیاں آئیاں نے۔ “

”انہیں فون دے دو“ ہم نے بڑے رُعب سے کہا۔

چند لمحے بعد زیبا کی ہلکی سی آواز سنائی دی ”ہیلو؟ “

ہم نے کہا ”ہم آفاقی بول رہے ہیں۔ “

زیبا کی آواز میں اچانک گھن گرج کی کیفیت پیدا ہو گئی

”ارے آفاقی۔ تم کہاں ہو؟ “

”ہم تو لاہور میں ہی رہتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم کہاں ہو؟ “

”ہمیں نخشب صاحب نے بلایا تھا فلم کے لئے۔ تم یہاں آ سکتے ہو؟ “

”میں تو آ سکتا ہوں، آپ کیوں نہیں آ جاتیں؟ “

”لیکن نخشب صاحب کا آرڈر نہیں ہے۔ “

''کیا تم انڈر اریسٹ ہو؟'' ہم نے پوچھا۔

''ایسا ہی سمجھ لو'' ان کی آواز خاصی سہمی ہوئی تھی ''ہمیں تو فون کرنے اور سننے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ پتا نہیں نوکر نے تمہارا فون کیسے ملا دیا؟''

ان کی آواز اور لب و لہجے سے ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ خاصی پریشان ہیں۔

''اچھا بھئی۔ کوٹھی کا نمبر تو بتاؤ۔ ہم ابھی آ رہے ہیں۔''

انہوں نے ہمیں سول لائنز کی ایک کوٹھی کا نمبر بتا دیا ''کتنی دیر میں آ رہے ہو؟''

''بس سمجھو کہ آ گئے ہیں۔ خدا حافظ''

کار تو ہمارے پاس تھی نہیں۔ موٹر سائیکل بھی نہیں تھی۔ ایک تو ہم موٹر سائیکل چلانے سے ڈرتے تھے' پھر اتنی استطاعت بھی نہیں تھی کہ موٹر سائیکل یا اسکوٹر خرید لیتے۔ دراصل ہم ایک ہلکی پھلکی نازک سی موٹر سائیکل کی تلاش میں تھے۔ ہر ایک کو سمجھاتے رہتے تھے کہ ہمیں کس قسم کی نازک اندام اور سبک موٹر سائیکل کی ضرورت ہے کیونکہ بھاری بھر کم موٹر سائیکل چلانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ ایک روز ہم نے یہی فرمائش رشید جاوید سے کی۔

رشید جاوید صاحب کافی دیر تک موٹر سائیکل کے ناک نقشہ کا بیان سنتے رہے۔ پھر کہا'' تمہیں موٹر سائیکل چلانی ہے یا اٹھا کر لے جانی ہے؟''

''بھئی چلانی ہے۔ اٹھا کر کون لے جاتا ہے اتنی بھاری موٹر سائیکل۔''

بولے ''تو پھر تمہیں اعتراض کیا ہے۔ یار موٹر سائیکل تو لڑکیاں تک چلا لیتی ہیں۔ کیا تم ان سے بھی زیادہ نازک ہو؟''

ہم نے کہا ''بعض سے''

کہنے لگے ''بہتر ہو کہ تم سائیکل میں ایک چھوٹی سی موٹر فٹ کرا لو۔ یا پھر تین پہیّوں والی سائیکل خرید لو، بہت ہلکی پھلکی ہوتی ہے اور اس کے لئے لائسنس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

قصہ کوتاہ یہ کہ ہمارے پاس نہ کار تھی اور نہ موٹر سائیکل۔ گھر سے تیار ہو کر باہر نکلے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک ٹیکسی مل گئی جو ان دنوں لاہور میں نئی نئی متعارف ہوئی تھی اور معجزہ یہ ہے کہ میٹر کے حساب سے چلتی تھی۔ یعنی میٹر ٹھیک

کام کرتے تھے۔ ٹیکسی والے کو سول لائنز میں سڑک کا نام اور کوٹھی کا نمبر تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔
''لیجئے جی۔آپ کی کوٹھی آگئی۔ ''
سامنے ایک وسیع و عریض لان کے درمیان ایک خوبصورت سی کوٹھی بنی ہوئی تھی۔ سامنے برآمدہ پیچھے برآمدہ۔ دونوں جانب سر سبز لان۔ درخت بھی کافی تھے۔ دور دور تک کوئی ذی نفس نظر نہیں آیا۔ باہر سے تو غیر آباد ہی لگتی تھی۔ بہر حال ٹیکسی والے کو دو یا پونے دو روپے کرایہ دے کر (اب تو خواب و خیال ہی لگتا ہے)۔

ذرا غور فرمایئے ماڈل ٹاؤن سے مال روڈ پر سول لائنز تک کا یہ کرایہ بنا تھا (ہم ویران سے برآمدے میں جا کر کھڑے ہو گئے)۔ کافی دیر تک کھنکارے' کھانسے۔ پھر دروازے پر دستک دی۔ ایک جانب برقی گھنٹی کا بٹن نظر آیا تو گھنٹی بجا دی۔ گھنٹی اتنی زور سے بجی کہ ہم خود ہی اچھل پڑے۔ یا شاید سنسان ماحول میں یہ آواز اچانک گونجی تو بہت زیادہ محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد درمیانی دروازہ کھلا اور ایک اجتماعی بیرا' خانساماں' چوکیدار قسم کا ملازم نمودار ہوا۔ اجلے کپڑے پہنے ہوا تھا۔ دیکھنے میں میر پور کا یا پھر سرحد کا لگتا تھا۔ ہمارے سوٹ بوٹ کو دیکھ کر کچھ رُعب میں آ گیا۔
''صاحب تو اس وقت نہیں ہے صاحب جی۔ ''
''دروازہ کھولو۔ ہمیں میڈم سے ملنا ہے'' ہم نے بڑے رُعب سے کہا اور اس کو سوچنے کا موقع دیئے بغیر اندر داخل ہو گئے۔ وہ مرعوب ہو کر ہمارے پیچھے چلنے لگا۔ یہ تو ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ کوٹھی میں کوئی اور موجود نہیں ہے۔
ملازم نے ہمیں ایک سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

''ابھی میم صاحب کو بولتا ہوں'' یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔ چند لمحے بعد زیبا نے پردے کے پیچھے سے جھانکا۔ وہ بے شمار گرم کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ ان سب کے اوپر ایک کمبل بھی اوڑھ رکھا تھا پھر بھی سردی سے کانپ رہی تھیں۔
''ارے آفاقی تم۔ السّلام علیکم۔ کیا حال ہے؟'' وہ ایک صوفے پر سارا سامان سنبھال کر بیٹھ گئیں۔
''ہم تو ٹھیک ہیں۔ آپ سنایئے؟ ''
کہنے لگیں ''بھئی یہاں تو سردی بہت ہے۔ برا حال ہو گیا ہے'' وہ باقاعدہ کانپ رہی تھیں۔

''لالی جی کہاں ہیں؟'' ہم نے پوچھا۔

''ادھر بیڈ روم میں ہیں۔ ہیٹر کے سامنے بیٹھی ہیں۔ آؤ تم بھی وہیں آ جاؤ۔ ''

ہم ان کے ساتھ چل پڑے۔ بیڈ روم میں لالی جی بیڈ پر دو تین لحافوں اور کمبلوں میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھیں۔ صرف ان کی عینک نظر آ رہی تھی ورنہ ہم تو انہیں پہچان بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ بھی مسرور ہو گئیں۔ زیبا بھی دوبارہ بیڈ پر مزید کمبلوں اور لحافوں کے اندر سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ اب باتیں شروع ہوئیں۔ وہ کچھ سہمی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ دبی زبان میں انہوں نے ہمیں بتایا کہ نخشب صاحب نے فون کر کے ایک فلم کے لئے بات کرنے کے سلسلے میں مدعو کیا تھا مگر اب ان کی شرطیں بہت ہیں۔ سب سے بڑھ کر تو یہ کہ وہ ان کی دو فلموں کے سوا کسی اور فلم میں کام نہیں کریں گی۔ ان کی مہمان رہیں گی اور ان کی اجازت کے بغیر کسی سے نہیں ملیں گی۔ معاوضہ بھی انہوں نے بہت کم بتایا تھا۔ جب سے وہ لوگ لاہور آئے تھے عملاً قید خانے میں تھے۔ نہ کسی کو فون کر سکتے تھے نہ کہیں جا سکتے تھے۔ وہ ایس ایم یوسف صاحب سے بات کرنے کی خواہش مند تھیں جنہوں نے زیبا کو ایک فلم میں کام کرنے کی پیشکش کی تھی مگر نخشب صاحب کی طرف سے اجازت نہیں تھی۔ ایک تو یہ سب' اوپر سے سخت سردی۔

''آفاقی۔ تم ہی مشورہ دو' اب ہم کیا کریں'' لالی جی نے لحاف سرکا کر ہم سے پوچھا۔

اتنی دیر میں ملازم چائے لے آیا۔ بسکٹ بھی تھے۔ چائے دانی پر ٹکوزی رکھی ہوئی تھی۔ برتن بھی قیمتی تھے۔ یعنی سب کچھ سلیقے کا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ دونوں خاموش ہو گئیں۔

ملازم کے جانے کے بعد ہم نے پوچھا ''بھئی آپ نے لاہور بھی دیکھا یا نہیں؟ ''

لالی جی نے کہا ''لاہور خاک دیکھتے۔ ایک تو قید' اوپر سے سردی۔ بھئی تمہارے لاہور میں تو ہماری آئس کریم بن گئی ہے ایمان سے۔ ''

ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ سارے لحاف' کمبل' گدے' رضائیاں وغیرہ اتار کر پھینک دیں۔ ہاتھ منہ دھو کر آئیں اور ڈھنگ سے بیٹھ کر چائے پئیں۔ سردی خود ہی بھاگ جائے گی۔ اس کے بعد ہمارے ساتھ لاہور دیکھنے کے لئے چلیں۔

""مگر نخشب صاحب""!

ہم نے کہا"دیکھو بھائی۔ تم ان کی چوری کر کے تو نہیں بھاگی ہو۔ نہ ان کی دین دار ہو۔ اپنی مرضی کی مالک ہو۔ چلو اُٹھو۔ ہم ٹیکسی منگاتے ہیں۔ "

ہماری یہ بات اُن کی سمجھ میں آگئی۔ وہ دونوں تیار ہونے میں مصروف ہو گئیں اور ہم نے کمرے میں لگی' ملازم کو بلانے والی گھنٹی بجادی۔

""یس سر جی؟"" وہ جن کی طرح نمودار ہو گیا۔

حمایت علی شاعران دنوں کراچی میں رہتے تھے۔ نام ہی کے نہیں' کام کے بھی شاعر تھے۔ بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ' معقول اور شائستہ انسان تھے۔ نوجوان ہی کہنا چاہئے۔ سانولی رنگت' لمبے بال جنہیں وہ ہر وقت انگلیوں کی مدد سے سمیٹ کر پیچھے کی جانب کرتے رہتے تھے۔ بول چال نہایت دلکش' شاعر بھی بہت اچھے اور نامور تھے۔ خلیل احمد کو کراچی میں ایک فلم ساز نے اپنی فلم میں موسیقی ترتیب دینے کیلئے بلایا تو حمایت علی شاعر سے ان کا واسطہ پڑ گیا۔ ان دونوں کے اشتراک سے بہت اچھے نغمات نے جنم لیا۔ مثلاً

کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو
خدا کرے کسی دل کا قرار بن کے رہو

اور ان کی اس غزل نے تو قیامت ہی ڈھادی تھی جس کی خلیل احمد نے نہایت سادہ لیکن خوبصورت دھن بنائی تھی۔

ہر قدم پر ایک نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ
کس لئے کیجئے کسی گم گشتہ جنت کی تلاش
جب کہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

شاعران کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ

ٹھوکریں کھا کر تو، سنتے ہیں، سنبھل جاتے ہیں لوگ

میڈم نور جہاں کی آواز نے ایسا سحر طاری کیا کہ دھن اور بولوں کے امتزاج سے ایک یادگار نغمہ وجود میں آ گیا۔

بر سبیل تذکرہ یہ بھی سن لیجئے کہ یہ گیت اس زمانے میں ہر ایک کی زبان پر تھا۔ جسے دیکھئے گا رہا ہے یا گنگنا رہا ہے۔ اداکارہ طلعت صدیقی کراچی سے لاہور آئیں تو ایک نجی محفل میں انہوں نے بھی یہ غزل گائی اور خوب گائی۔ بلکہ حق ادا کر دیا۔ حمایت صاحب بھی موجود تھے اور چند اور احباب بھی تھے۔ سماں بندھ گیا۔ ہمیں تو پہلی بار طلعت صدیقی کی اس خوبی کا علم ہوا کہ اداکاری کے ساتھ ساتھ وہ گلوکاری کے میدان میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے گلوکاری کو کبھی نہیں اپنایا۔ کافی عرصے بعد ان کی بیٹی عارفہ صدیقی نے اداکارہ کے طور پر فلمی دنیا میں قدم رکھا تھا مگر پھر گلوکاری کو اپنا لیا۔ موسیقی اور راگ و سُر سے ان کی شفتگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی عمر سے کہیں زیادہ عمر کے ایک ماہر موسیقی کو اپنے شوہر کی حیثیت سے منتخب کیا۔ ریڈیو پاکستان سے تعلق رکھنے والے استاد نذر حسین سے انہوں نے شادی کی تو سبھی حیران رہ گئے۔ پہلے تو کسی کو یقین ہی نہ آیا۔ عارفہ اور ان کی والدہ طلعت صدیقی نے بھی شوبزنس کے دستور کے مطابق اس خبر کی پرزور تردید کر دی۔ عارفہ نے تو ایک بیان میں یہاں تک کہا کہ وہ میرے استاد اور عمر میں میرے باپ کے برابر ہیں۔ کسی نے یقین کیا۔ کسی نے یقین نہیں کیا لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب عارفہ کے گھر میں ڈاکہ پڑا تو یہ راز طشت از بام ہو گیا اور اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ استاد ان کے شوہر ہیں۔ دیکھئے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ بات حمایت علی شاعر کے تذکرے سے شروع ہوئی تھی۔

حمایت صاحب جب کراچی سے لاہور آئے تو ہم سے بھی ملاقات ہوئی اور فوراً مراسم قائم ہو گئے۔ اکثر محفلیں جما کرتی تھیں پھر جب ہم نے فلم کا آغاز کیا اور خلیل احمد کو موسیقار کے طور پر منتخب کیا تو انہوں نے نغمہ نگاری کیلئے حمایت علی شاعر کا نام تجویز کیا۔ اس لئے کہ وہ ان کے ساتھ کام کرتے رہے تھے اور ان دونوں کے اشتراک سے بہت اچھے نغمات وجود میں آئے تھے۔ شاعر اور موسیقار بھی عموماً ایک ٹیم کی حیثیت سے ہی کام کرتے ہیں۔ اور اس کے نتائج بھی بہت اچھے برآمد ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب خلیل احمد نے حمایت علی شاعر کا نام تجویز کیا تو ہم نے بھی اس

سے اتفاق کر لیا۔

حمایت علی شاعر نے کراچی کی ایک فلم ''آنچل'' کے لئے بہت اچھے نغمات تحریر کئے تھے۔ خلیل ہی اس کے موسیقار تھے اور اس فلم کی موسیقی بہت مقبول ہوئی تھی۔

''مجبور'' کا مہورت بہت دھوم دھام سے سرانجام پایا تھا۔ ہر چند کہ ہم اس کے قائل نہیں ہیں اور بعد کی فلموں میں ہم نے کبھی افتتاحی تقریب کا اہتمام نہیں کیا۔ مگر '' مجبور'' کے سلسلے میں یہ ہماری کاروباری ضرورت تھی۔

دوستوں نے اور خود ہدایت کار حسن طارق نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ اس طرح فلمی دنیا میں چرچا ہو جائے گا۔ اور تقسیم کار اس فلم کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ ہمیں تقسیم کاروں کی توجہ کی اشد ضرورت تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے پاس کل جمع پونجی مبلغ پانچ ہزار نقد تھی۔ وہ کتنا ہی سستا زمانہ سہی مگر پانچ ہزار کے سرمائے سے ایک مکمل فیچر فلم بنانے کیلئے نکل کھڑا ہونا کسی طرح بھی ایک معقول حرکت اور دانشمندی نہیں تھی۔ صرف ہمارے چند قریب ترین دوستوں ہی کو ہماری مالی حالت کا علم تھا اور انہوں نے ہمیں سمجھا بجھا کر اس ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش بھی کی مگر ہمارے سر پر تو فلم بنانے کا بھوت سوار تھا۔ ہم نے سوچ لیا تھا کہ ہر قیمت پر فلم بنا کر رہیں گے۔ اس کیلئے ہم نے منصوبہ بندی بھی کی تھی۔ منصوبہ بندی یہ تھی کہ ہم اداکاروں سے ادھار کام کرالیں گے اور فلم کی تکمیل پر انہیں معاوضہ ادا کریں گے۔ دوسرے لوگ بھی اسی بنا پر ہم سے تعاون کریں گے۔ فلم کی شوٹنگ کا آغاز ہو گا تو بہت جلد کوئی اچھا تقسیم کار اس طرف توجہ دے گا اور ہماری فلم کے حقوقِ تقسیم حاصل کر لے گا۔ اس طرح اس کی طرف سے موصول ہونے والی قسطوں سے ہم اداکاروں اور دوسرے لوگوں کو ادائیگی کرتے رہیں گے اور روزمرہ کے اخراجات پورے کریں گے۔ اس زمانے میں پاکستان کی فلمی مارکیٹ تین سرکٹ پر مشتمل تھی۔ پہلا پنجاب اور صوبہ سرحد دوسرا کراچی سندھ بلوچستان اور تیسرا سرکٹ مشرقی پاکستان کا تھا۔

ان دنوں پاکستان میں رنگین فلم بنانے کا کسی نے سوچا تک نہ تھا' تمام فلمیں بلیک اینڈ وائٹ بنتی تھیں۔ ایک اوسط درجے کی فلم کی لاگت سوا دو لاکھ سے ڈھائی لاکھ تک ہوتی تھی۔ تینوں سرکٹ سے لگ بھگ اتنی ہی رقم وصول ہو جاتی تھی۔ اگر فلم اور فلم ساز و ہدایت کار کی شہرت اچھی ہو تو زیادہ رقم بھی حاصل ہو جاتی تھی۔ فلم سازی کے دوران

میں اگر سلیقے اور کفایت شعاری سے کام لیا جائے تو فلم کی ڈلیوری دیتے وقت فلم ساز پچاس ساٹھ ہزار یا اس سے کچھ زیادہ رقم بچا لیتا تھا۔ جہاں تک فلم کی نمائش کے بعد تقسیم کاروں سے منافع میں سے حصہ ملنے کا تعلق ہے تو وہ محض دیوانے کا خواب ہی تھا کیونکہ قریب قریب سب ہی تقسیم کار عذر پیش کر دیتے تھے کہ فلم کا بزنس اچھا نہیں ہے۔ منافع تو ایک طرف انہیں کافی نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔ اس لئے فلم ساز کے حصے میں کچھ نہیں آتا تھا۔ جو فلمیں سلور جوبلی اور گولڈن جوبلی مناتی تھیں۔ ان کے بارے میں تقسیم کار یہی رونا روتا رہتا تھا کہ صاحب کیا کریں۔ نقصان ہو گیا۔ گویا فلم ساز ڈلیوری کے وقت جو کچھ وصول کر لیتا تھا وہی اس کا حصہ تھا۔ بالائی تقسیم کار کے حصے میں آتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کئی کئی سپر ہٹ فلمیں بنانے والے فلم ساز سڑک سوار نظر آتے تھے جبکہ تقسیم کاروں کے ٹھاٹ باٹ' شاندار کوٹھیاں اور قیمتی کاریں' آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتے تھے۔ جس صنعت میں صنعت کار کے حصے میں کچھ نہ آئے اور تقسیم کار یا نمائش کار ہی منافع کماتا رہے اس کی بنیادیں کیوں کر مستحکم ہو سکتی ہیں؟ پاکستان کی فلمی صنعت کی زبوں حالی کا سب سے بڑا سبب یہی تھا اور اسی وجہ سے فلم ساز تو آتے جاتے رہتے تھے یا اگر کوئی سخت جان فلم ساز ہوتا تو وہ رو پیٹ کر اپنا کام چلاتا رہتا تھا مگر تقسیم کاروں اور سنیما کے مالکوں کی چاندی تھی یعنی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔

ہم نے ''قرضے'' پر فلم بنانے کا جو منصوبہ بنایا تھا۔ وہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے پیچھے ہماری لگن اور ارادہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ ہمیں اپنی ذات پر اور خدا پر یقین تھا کہ ہم یہ فلم ضرور مکمل کر لیں گے، جہاں تک ''ادھار'' پر کام کرنے کا تعلق ہے' ہر فلم ساز کو یہ سہولت حاصل نہیں ہوتی تھی کہ اداکار فلم کے خاتمے پر ادائیگی کے وعدے پر یقین کر کے فلم میں کام کریں۔ مگر ہمارے تعلقات اور دوسروں کے بھروسے کی بنیاد پر ہم نے یہ بیڑا اٹھا لیا تھا۔

اسٹوڈیو کے مالک سے بھی یہ طے تھا کہ وہ اپنا تمام بل فلم کی ڈلیوری کے وقت وصول کریں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ شوٹنگ کے لئے تمام تر خام مال بھی ادھار ہی فراہم کریں گے۔ اسٹوڈیو کے مالک یہ رعایت صرف ان ہی فلم سازوں کو دیا کرتے تھے جن پر انہیں مکمل اعتماد ہو کہ وہ فلم مکمل کر لیں گے اور تقسیم کار ان کی فلم خرید بھی لیں گے۔ ورنہ کون

اپنا سرمایہ خطرے میں ڈالتا ہے۔اس لحاظ سے پانچ ہزار روپے کا سرمایہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ہمارے بعض دوستوں نے ہمیں اس حماقت سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔

''فرض کرو تمہاری فلم کسی نے نہیں خریدی تو پھر کیا کرو گے ؟''

''کوئی کیوں نہیں خریدیں گے'' ہم بحث کرتے ''اتنی اچھی کہانی ہے۔ہدایت کار بھی اچھا ہے۔ہم نے اداکار بھی وقت کی ڈیمانڈ کے مطابق چنے ہیں''۔

''یار کچھ عقل کی بات کرو' پانچ ہزار کتنے دن چلیں گے۔اداکاروں نے ادھار کر بھی لیا تو روزمرّہ کے اخراجات کیسے پورے کرو گے ؟اسٹاف کی تنخواہیں' آمدورفت کا کرایہ' شوٹنگ کے دوران میں کھانا' چائے ہنر مندوں کی تنخواہیں اور معاوضے' سینکڑوں اخراجات ہوتے ہیں''۔

''اللہ مالک ہے'' ہم جواب دیتے۔

''یار تم تو صرف ہاتھ پیروں سے فلم بنانا چاہتے ہو۔یہ کہاں ممکن ہے ؟''

ہم کہتے ''ہاتھ پیروں سے نہیں' دماغ سے''۔

''دماغ لوگوں کو تنخواہیں تو نہیں دے سکتا۔اگر فلم رک گئی تو کیا کرو گے ؟''۔

''اللہ مالک ہے'' ہمارا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

''بھائی یہ تو درویش ہو گیا ہے۔ارے میاں فلم سازی میں درویشی نہیں چلتی۔چلو مان لیا کہ اسٹوڈیو اونر اپنا بل تم سے آخر میں وصول کرے گا مگر خام فلم کہاں سے لاؤ گے ؟''

''اللہ مالک ہے'' اور اس طرح بات ختم ہو جاتی تھی۔

ہم نے حیدر آباد والے شیخ صاحب کے کہنے پر چند ماہ بعد فلم کی شوٹنگ شروع کرنے کی تجویز مسترد کر دی تھی۔ دراصل ہمارا خیال تھا کہ اگر ہم نے مہورت کے بعد فلم کا باقاعدہ کام شروع نہ کیا تو بہت جگ ہنسائی ہو گی۔مگر قدرت نے ہمیں یہ سبق سکھایا کہ بنے بنائے کام کو جھوٹی انا کی خاطر خراب کر دینا دانشمندی نہیں ہے۔

''مجبور'' کے مہورت کے بعد کئی ماہ تک ہماری کوشش کے باوجود اس فلم کی شوٹنگ کا آغاز نہ ہو سکا۔ادھر ادھر سے

سرمایہ حاصل کرنے کی ہماری ہر کوشش ناکام ہوئی تھی اور ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بس ہماری قسمت میں بھی دوسرے موسمی فلم سازوں کے مانند مہورت کر لینے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ چند ہفتے اور چند مہینوں تک تو ہم بہت مضطرب اور سرمایہ حاصل کرنے کیلئے کوشاں رہے مگر پھر رفتہ رفتہ صبر سا آ گیا۔

''مجبور'' ہمارے احساس پر ایک پھانس کی طرح چبھ کر رہ گئی تھی۔ جس میں کبھی کبھی تو بہت زیادہ کسک اور کھٹک محسوس ہوتی تھی۔ مگر ہم رفتہ رفتہ اس خلش کے عادی بھی ہو گئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں نے بھی اب ہم سے یہ دریافت کرنا بند کر دیا تھا کہ فلم کی شوٹنگ کب شروع ہو گی۔ یہ ہمارے لئے ایک اطمینان بخش بات تھی ورنہ یہ سوال تو ہماری چڑ بن کر رہ گیا تھا۔

ہم نے پہلے بھی لکھا ہے اب پھر اس کا اعادہ کر رہے ہیں کہ ہماری زندگی میں کئی بار ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے ہم تقدیر کے قائل ہو گئے۔ تدبیر اپنی جگہ لیکن ہمارا تجربہ ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر ہر تدبیر، دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ اس کی منشاء کے بغیر تو پتّا تک حرکت نہیں کرتا مگر انسان کی عقل یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اللہ کی مرضی کیا ہے اور کب اور کیسے اس کے حق میں ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں کو مسلسل کوشش اور تدبیر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر ہر کسی کو یہ علم ہو جائے کہ آئندہ کے لئے کاتبِ تقدیر نے اس کیلئے کیا لکھ دیا ہے اور اس کی خوش قسمتی یا بد قسمتی کا دور کب ختم ہو گا تو پھر انسان کی زندگی تو بے مقصد اور بے کیف ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ ہم کبھی کبھی سوچتے تھے کہ ہم نے حیدر آباد والے واقف کار کی پیشکش ٹھکرا کر نہ صرف کفرانِ نعمت کیا ہے بلکہ اس مخلص اور مہربان کو بھی تکلیف پہنچائی ہے۔ اسے فیکٹری میں آگ لگ جانے کی وجہ سے پہلے ہی نقصان پہنچ چکا تھا۔ بجائے اس کے کہ ہم اس کی دلجوئی کرتے ہم نے اس کا دل بالکل ہی توڑ دیا اور اسے بیچ منجدھار ہی چھوڑ دیا۔ شاید اس کی سزا ہمیں یہ ملی کہ سارے تعلقات اور اثر و رسوخ کے باوجود ہم اپنی فلم کی شوٹنگ شروع کرنے کے قابل نہ ہو سکے تھے۔ حالانکہ ہمیں اپنے تئیں بڑا زعم تھا۔

تجربے نے ہمیں یہ بھی سکھایا ہے کہ اگر آپ راضی بہ رضا ہیں اور نیّت بھی ٹھیک ہے تو پھر اپنے معاملات کو اللہ کے سپرد کر دینا چاہئے۔ وہ جو کرے گا بہتر ہی کرے گا۔ بظاہر آپ کو جو خرابی نظر آ رہی ہے کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ

آپ کیلئے ایک نعمت اور رحمت ثابت ہو گی۔ ہر کام کیلئے ایک وقت مقرّر ہے۔ مقرّرہ وقت کے بغیر آپ چاہے کچھ کر لیں، کچھ بھی نہیں ہو گا۔

دس بارہ ماہ گزر گئے اور فلم ''مجبور'' ہمارے لئے ایک تلخ یاد سی بن کر رہ گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک مستقل احساسِ شکست بھی۔ اس عرصے میں فلمی دنیا میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ زیبا ایک مقبول ہیروئن بن گئی تھیں۔ محمد علی ویلن اور ایکشن ہیرو کی حیثیت سے جانے پہچانے جا چکے تھے اور فلمی دنیا میں ان کا ایک اچھّا امیج بن گیا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ محمد علی کی شکل میں فلمی صنعت کو ایک اچھّا ویلن مل گیا ہے۔ انہوں نے تلوار باز ہیرو کے کردار بھی کئے اور پسند کئے گئے۔ مگر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جنگجو ہیرو تو شاید بن جائیں مگر رومانٹک ہیرو کے طور پر فلم بین انہیں کبھی پسند نہیں کریں گے۔

ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا اداکار بھی فلمی اُفق پر نمودار ہو چکا تھا۔ یہ وحید مراد تھے۔ وحید مراد نے سنتوش کمار کی فلم ''دامن'' اور ایس ایم یوسف صاحب کی فلم ''اولاد'' میں مختصر سے کردار ادا کئے جن میں انہیں پسند کیا گیا تھا۔ اس تجربے سے حوصلہ بڑھا تو انہوں نے کراچی میں اپنی ذاتی فلم ''ہیرا اور پتھّر'' کا آغاز کر دیا۔ اس فلم میں انہوں نے زیبا کو ہیروئن منتخب کیا۔ تمام فلم کراچی اور اس کے گردونواح میں ہی فلمائی گئی تھی۔ پرویز ملک اس کے ہدایت کار تھے۔

''ہیرا اور پتھّر'' کراچی میں تو بہت مقبول ہوئی لیکن پنجاب کے شہروں میں اسے اتنی زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی پھر بھی زیبا اور وحید مراد نئے ہیرو اور ہیروئن کے طور پر کچھ اور نمایاں ہو گئے۔ اس تجربے سے وحید مراد کو بہت حوصلہ ہوا اور انہوں نے ایک اور فلم بنانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

دیکھئے تقدیر بعض اوقات کس طرح چالیں چلتی ہے اور انسانوں کو نادانستہ طور پر اسی کردار میں ڈھال دیتی ہے جو اللہ نے اس کیلئے مخصوص کر دیا ہے۔ جب اللہ کا حکم ہوتا ہے تو خود بخود راہیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن اس کے برعکس جب تقدیر بگڑنے پر آتی ہے تو اس کیلئے بھی قدرت بہانے پیدا کر دیتی ہے اور پھر انسان کا کیریئر صحت، شہرت و مقبولیت اور دولت مندی کا بظاہر مستحکم اور سربہ فلک محل ریت کی دیوار کی طرح زمین بوس ہو جاتا ہے۔ وحید مراد ہی کی مثال

کو لیجئے۔ وحید مراد کراچی کے ممتاز فلم تقسیم کار نثار مراد صاحب کی اکلوتی اولاد تھے۔ رنگ گہرا سانولا لیکن ناک نقشہ قدو قامت ڈیل ڈول اور بات کرنے کا انداز ایسا کہ ہر ایک نگاہ کا مرکز بن کر رہ جاتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے وہ ایک ذہین قابل اور مقبول طالب علم تھے۔ دوستوں کے حلقے میں محبوب' گھر میں والدین کی آنکھوں کا تارا' منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ اس پر ذہانت اور سوجھ بوجھ بھی کم نہ تھی۔ باتیں کرنے اور دوسروں کو متاثّر کرنے کا ڈھنگ جانتے تھے۔ خوش مزاج 'زندہ دل اور دلچسپ شخصیت تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اپنے حلقے میں اور کراچی کے متموّل لوگوں کے دائرے میں انہیں ایک امتیازی مقام حاصل ہو گیا۔ انہوں نے انگریزی ادب میں امتیازی نمبروں سے ایم اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ جب تک زیر تعلیم رہے' انہوں نے اپنے والد کے کاروباری معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں لی مگر ان کا ذہن کاروباری تھا۔ ذہین اور فہمیدہ نوجوان تھے۔ اس لئے بہت جلد انہیں فلمی صنعت کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہو گئیں۔ فلمی کاروبار کے سلسلے میں اُن کے والد نثار مراد صاحب کا مختلف فلمی تقاریب میں آنا جانا اور ملنا رہتا تھا۔ اس زمانے میں طالب علموں اور نوجوانوں کو فلم سے کافی دلچسپی ہوا کرتی تھی۔ شاید اس لئے بھی کہ یہ واحد شائستہ سستی اور عمدہ تفریح تھی۔ اردو' انگریزی فلمیں دیکھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا پھر وحید تو ایک فلمی تقسیم کار کے فرزند تھے۔ ان کو بہت جلد اس صنعت اور کاروبار کے بارے میں معلومات حاصل ہو گئیں۔ فلموں کا گلیمر اور چمک دمک بھی ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ ان کا فلم ساز اور تقسیم کار کا پیشہ اختیار کرنے کا ارادہ تو تھا مگر ایکٹر بننے کے بارے میں غالباً انہوں نے کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا مگر تقدیر دور کھڑی مسکرا رہی تھی۔

وحید مراد کے ہیرو بننے کی داستان بھی دلچسپ ہے۔

سنتوش کمار کی فیملی اس زمانے میں عروج پر تھی۔ سنتوش کمار اور ان کی بیگم صبیحہ خانم پاکستان کے مقبول ترین سپر اسٹار تھے۔ سنتوش کے بھائی درپن بھی بہت کامیاب اور پاپولر ہیرو تھے۔ سنتوش کے چھوٹے بھائی ایس سلیمان نے اوائل عمری میں ہدایت کار کی حیثیت سے بہت ناموری اور کامیابی حاصل کی۔ یہ ایک شائستہ اور خوش خلق گھرانہ تھا۔ فلمی صنعت میں ہر ایک سے ان کا میل جول تھا۔

نثار مراد صاحب کے ساتھ بھی سنتوش فیملی کے گھریلو تعلقات تھے۔ درپن سے نثار مراد اور ان کی بیگم کے بہت گہرے مراسم تھے۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب درپن صاحب کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں کراچی آتے تو نثار مراد صاحب ہی کے گھر میں قیام کرتے تھے۔اس طرح وحید مراد کو فلم والوں سے شیر وشکر ہونے کے مواقع زیادہ ملنے لگے۔

ویسے بھی نثار مراد صاحب بہت سوشل قسم کی شخصیت تھے۔خاص طور پر فلم کے حوالے سے۔یہ ممکن ہی نہ تھا کہ لاہور سے کوئی قابل ذکر فلمی ہستی کراچی آئے اور نثار مراد اسے اپنے گھر کھانے کی دعوت پر مدعو نہ کریں۔ایسے مواقع پر کراچی کے قابل ذکر فلمی لوگ بھی محفلوں میں شریک ہو جاتے تھے۔رفتہ رفتہ سنتوش کے خاندان خصوصاً درپن صاحب کے ساتھ نثار مراد صاحب کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے تھے۔

ان ہی دنوں وحید مراد فارغ التحصّیل ہوئے اور انہوں نے باضابطہ طور پر فلمی صنعت میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی فلم میں ہیرو کے طور پر درپن صاحب ہی کا انتخاب کیا۔مگر جب فلم کی شوٹنگ کا آغاز ہوا اور کاروباری طور پر واسطہ پڑا تو انہیں محسوس ہوا کہ فلم کا ہیرو ایک مخصوص اور نمایاں حیثیت کا مالک ہوتا ہے اور وہ بہر صورت فلم ساز کو تنگ ضرور کرتا ہے۔یا کم از کم ہر فلم ساز یہ بات محسوس ضرور کرتا ہے کہ مراسم اور تعلقات اپنی جگہ لیکن اداکار سے جب کسی فلم کے حوالے سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ ایک بدلا ہوا انسان لگتا ہے۔اس میں کچھ حقیقت بھی ہے اور کچھ اندازے کا بھی دخل ہے۔لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر فلم میں ہیرو اور ہیروئن کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اس کے مزاج اور موڈ پر ہر چیز کا دارومدار ہوتا ہے۔پھر یہ بھی سچ ہے کہ بعض اداکاروں کا رویّہ ایسا ہوتا ہے جس سے فلم ساز یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ تعاون نہیں کر رہا' تعلقات کا لحاظ نہیں کر رہا اور اس کے ساتھ بھی وہی ناروا سلوک کر رہا ہے جو دوسرے فلم سازوں کے ساتھ روا رکھتا ہے۔

اللہ بخشے درپن صاحب کے بارے میں عموماً فلم سازوں کو یہ شکایت رہتی تھی کہ جب اداکار کے طور پر ان سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ کسی کے ساتھ رو رعایت نہیں برتتے اور فلم ساز کے ساتھ تعاون نہیں کرتے۔اس کی مشکلات اور نقصان کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔درپن صاحب کے پاس اعتراض کے جواب میں عذر موجود تھے لیکن یہ بھی

حقیقت ہے کہ بہت سے دوسرے بڑے اداکار فلم سازوں کو جو مراعات دے دیا کرتے تھے۔ درپن صاحب ایسا نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ایک کو ان سے شکایت ہی رہتی تھی۔

اداکاروں کے بارے میں فلمی دنیا میں یہ بات بھی مشہور ہے۔ ''چہرے پر چونا لگانے والا کسی سے مروّت یا لحاظ نہیں کرتا'' چونے سے مراد میک اپ ہوتا ہے۔

خیر یہ تو بر سبیل تذکرہ تھا۔ ذکر وحید مراد صاحب کا ہو رہا تھا۔ جب انہوں نے 1961ء میں اپنی ذاتی فلم ''انسان بدلتا ہے'' کراچی میں بنانی شروع کی تو ظاہر ہے کہ اس میں درپن صاحب ہی ہیرو لئے گئے مگر جیسے جیسے فلم کی تکمیل کے مراحل طے ہوتے رہے۔ وحید مراد نے یہ محسوس کیا کہ درپن صاحب تمام تعلقات اور خلوص کو بالائے طاق رکھ کر ان کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں برت رہے بلکہ شکایت کے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ اس فلم کی ہیروئن شمیم آرا تھیں۔ ہدایت کاری کے فرائض منوّر رشید نے سرانجام دیئے تھے۔ جو کرکٹر ہارون رشید کے بھائی تھے۔ ظفر رشید اس کے موسیقار تھے۔

یہ فلم تو مکمل ہو گئی، ریلیز ہوئی اور خاصی کامیاب بھی رہی مگر وحید مراد کے ذہن پر یہ بات نقش ہو کر رہ گئی کہ اگر فلم سازی کا پیشہ اختیار کرنا ہے تو اس سلسلے میں خود کفیل ہونا بہت ضروری ہے۔ یعنی ہر قابل ذکر شخص اپنے قابو میں ہو۔ ان کی ذہانت اور کاروباری سوجھ بوجھ نے بہت جلد ایک منصوبہ مرتّب کیا جس پر انہوں نے عملدر آمد بھی شروع کر دیا۔ ان کے دوست احباب اور گھر والے انہیں ہو بہو' بنا بنایا ہیرو کہا کرتے تھے۔ فلم کی ریلیز کے بعد انہوں نے مشورہ دیا کہ بھئی تم خود ہیرو کیوں نہیں بن جاتے۔ اداکاروں کے جھگڑے سے بھی نجات مل جائے گی۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت انہوں نے اداکاری کو سنجیدگی کے ساتھ اپنانے کا فیصلہ کیا۔

فلم ''دامن'' اور ''اولاد'' کے تجربات نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔ ایس ایم یوسف اور قدیر غوری جیسے ہدایت کاروں کی زیر نگرانی کام کر کے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ جب ''ہیرا اور پتھّر'' میں انہوں نے ہیرو کے طور پر کام کیا تو اس کے پیچھے یہی نظریہ کارفرما تھا کہ فلم ساز کو حتی الامکان اہم اور قابل ذکر لوگوں کی محتاجی سے نجات حاصل کرنی

چاہئے۔ ''ہیرا اور پتھر'' نے وحید مراد کو بطور ہیرو خود اعتمادی اور سوجھ بوجھ کی دولت سے مالا مال کیا اور انہوں نے اداکاری کے سمندر میں کودپڑنے کا حتمی فیصلہ کیا۔ فلم ''ارمان'' اسی خواب کی تعبیر تھی اور وحید مراد نے ایک ہوشیار کاروباری کی طرح اس منصوبے کا آغاز کیا تھا۔ ''ہیرا اور پتھر'' کے بعد خود اپنی ذات پر بھی ان کا بھروسہ پختہ ہو گیا تھا اور زیبا میں بھی انہیں ایک کامیاب ہیروئن بننے کے امکانات نظر آ گئے تھے۔ وہ ایک فہمیدہ اور دوربین آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے مستقبل کو تعمیر کرنے کے لئے ایک طویل المیاد پروگرام مرتّب کیا۔ جس کا پہلا مرحلہ '' ارمان'' تھی۔ اس فلم میں وہ خود ہیرو تھے۔ زیبا سے ان کے بہت اچھے دوستانہ اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔ وہ نئی اُبھرتی ہوئی ہیروئن تھیں۔ لہٰذا ہیروئن بھی ان کے قبضۂ قدرت سے باہر نہ تھی۔

کسی بھی فلم میں ہدایت کار بھی کلیدی حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔ اس کام کے لئے ان کی نظر انتخاب پرویز ملک پر پڑی تھی۔ پرویز ملک ان کے زمانہ طالب علمی کے دوست تھے۔ وہ امریکہ سے فلم سازی اور ہدایت کاری کی باقاعدگی ڈگری لے کر آئے تھے اور فلم بنانے کے لئے کیمرہ وغیرہ بھی لے آئے تھے۔ گویا فلم سازی کا ضروری اور بنیادی اکیوپمنٹ بھی موجود تھا۔ ان دونوں میں ذہنی ہم آہنگی بھی تھی۔ اس طرح ان کا ہدایت کار بھی وحید مراد کی مٹھّی میں تھا۔

وحید اور پرویز ملک کی ٹیم ایک مثالی ٹیم ثابت ہوتی، اگر وحید مراد محض ایک کاروباری بن کر پرویز ملک اور یونٹ کے دوسرے لوگوں کے ساتھ برتاؤ نہ کرتے بلکہ انہیں رفیق کار کا درجہ دیتے اور منافع میں بھی انہیں معقول حصّہ یا معاوضہ دیتے تو یہ پاکستان میں ایک مثالی تجربہ ہوتا۔ مگر وحید مراد کی خالص کاروباری اپروچ نے بالآخر ان کی کامیاب' حوصلہ منداور باصلاحیت ٹیم کو پارہ پارہ کر دیا۔ یہ ہماری ذاتی رائے ہے لیکن دیکھی بھالی اور سمجھی بوجھی۔۔۔ وحید مراد کو اس سے اتفّاق نہ تھا اور ان کے مدّاح بھی اس سے متفق نہیں رہے۔ لیکن حقیقت یہی تھی۔ وحید مراد ایک بے مثال فن کار تھے لیکن انکے اندر ایک خالص اور بے مروّت کاروباری شخص بھی چھپا بیٹھا تھا۔ ذاتی مفاد کو اوّلیت دینے کا یہ خود غرض کاروباری انداز فکر ہی آخر کار وحید مراد کے زوال کا سبب بنا۔ نہ شراب نہ عورتیں صرف یہ سوچ انہیں لے بیٹھی۔ یہ بھی ہمارا ذاتی تجربہ ہے۔

یہ واقعات بیان کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اپنی پہلی فلم کے لئے ہم نے اداکاروں کے سلسلے میں جو تبدیلیاں کر دی تھیں ان کا سبب اور جواز سامنے آ جائے۔اس طویل داستان کو بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ہم نے جب دوبارہ اپنی فلم کا عملی طور پر آغاز کیا تو اس وقت فلمی دنیا کی بساط کا نقشہ کیا تھا اور کون کون سے مہرے کس کس خانے میں تھے۔ہماری فلم کے آغاز میں جو تاخیر ہوئی اس کی وجہ سے آنے والے چندماہ میں نوخیز اداکاروں کی ایک نئی کھیپ سامنے آ گئی تھی۔یہ سپر سٹار تو نہ تھے لیکن سٹار بننے کی صلاحیتوں سے مالامال تھے اور زیبا تو اس اثناء میں ایک سٹار بن چکی تھیں جن کا مستقبل بے حد تابناک نظر آ رہا تھا۔اس پیش گوئی سے فلمی دنیا کے سبھی داناؤں کو اتفاق تھا۔ادھر تقدیر کچھ نئی چالیں چل رہی تھی اور ہماری قسمت کے ستاروں میں کچھ جنبش پیدا ہونے لگی تھی۔

ایک روز شام کے وقت ہم حسب معمول ایورنیو سٹوڈیوز پہنچے تو سٹوڈیو کے مالک آغا جی اے گل صاحب سامنے گول فوارّے پر موجود تھے۔آغا صاحب کی عادت تھی کہ جب اپنے کمرے میں بیٹھنے سے اُکتا جاتے تو لان میں خوبصورت فوارّے پر آ کر کھڑے ہو جاتے۔ٹہلتے اور آنے جانے والوں سے بات چیت بھی کرتے۔ان کے پِتّے کا ایک اہم آپریشن ہو چکا تھا جس کے نتیجے میں وہ اپنے پِتّے سے محروم ہو گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے انہیں ایک خاص قسم کی ورزش کرنے کا مشورہ دیا تھا جس پر وہ تندہی سے عمل پیرا تھے۔اپنے کمرے میں بھی وہ اکثر کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے اور کرسی کے ارد گرد مخصوص انداز میں حرکت کرتے رہتے۔یہی ان کی ورزش تھی۔فوارّے کے گول چکرّ پر کھڑے ہو کر بھی وہ ٹہلتے ہوئے یہی ورزش کرتے رہتے۔اکثر دیکھنے والوں کو محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ آغا صاحب دراصل ایکسر سائز کر رہے ہیں۔یہ ورزش کرتے ہوئے وہ گپ شپ اور کاروباری مذاکرات بھی کرتے رہتے تھے۔

آغا صاحب نے گول چکرّ پہ نصب خوبصورت آہنی جنگلے سے ٹیک لگا کر آہستہ سے اوپر نیچے ہوتے ہوئے (یہ ان کی ایکسر سائز تھی) ہم سے کہا "دیکھو آفاقی میں تمہارے بارے میں جانتا ہوں کہ تم پر اپنے خاندان کا بوجھ ہے۔بہت ذمہ داریاں ہیں۔یہ سن کر مجھے خوشی ہوتی ہے کہ تم یہ ذمہ داریاں بہت اچھی طرح نبھا رہے ہو۔تم سیلف میڈ انسان ہو۔یہ بھی بہت اچھی بات ہے۔"

ہم خاموش رہے۔ظاہر ہے اپنی تعریف سن کر شریف آدمی کچھ شرمندہ سے ہو جاتے ہیں۔اب تک آغا صاحب

ہمارے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ان کی نظریں ہماری نظروں سے متصادم تھیں۔ مگر پھر اچانک انہوں نے اپنی نگاہیں جھکالیں۔ان کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ کوئی اہم یا کاروباری بات نظر سے نظر ملا کر نہیں کرتے تھے۔ کہنے لگے ''مجھے سنتوش نے بتایا ہے کہ تمہاری کہانی بہت اچھی ہے۔ تمہارا ڈائریکٹر بھی اچھّا ہے۔کاسٹ پر مجھے تھوڑا اعتراض ہے مگر خیر۔جو تم مناسب سمجھو۔میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ایک کارکن ہو۔رائٹر ہو تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔اگر دوسروں کے پیسے سے فلم بناؤ گے تو وہ تمہاری کھال اتار لیں گے۔ڈسٹری بیوٹرز تمہاری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اونے پونے تمہاری فلم خریدیں گے۔اس طرح فلم بنانے سے کیا فائدہ؟''

آغا صاحب نے بات جاری رکھی ''میں تمہیں ایک پروپوزل دے رہا ہوں۔ سوچ لو۔ پھر جواب دے دینا۔پروپوزل یہ ہے کہ تمہاری فلم پر جو خرچہ ہو گا وہ میں تمہیں دیتا رہوں گا۔اداکاروں' میوزک والوں اور پروڈکشن کے اخراجات جیسے جیسے کام آگے چلے تم مجھ سے لیتے رہو۔ہاں ڈائریکٹر یا رائٹر کو اس عرصے میں معاوضہ نہیں دوں گا۔اس کے سوا دوسرے تمام اخراجات میرے ذمہ ہوں گے۔ تم اطمینان سے فلم بناؤ۔جب مکمل ہو جائے گی تو ڈسٹری بیوٹر سے اپنی شرائط منوالینا۔ کیوں کیا خیال ہے؟ ''

ہم نے کہا ''بہت اچھّا خیال ہے آغا صاحب'' ہمارے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

آغا صاحب بولے ''اس کے عوض میں تم سے تمام بزنس پر پندرہ فیصد کمیشن لوں گا۔ ''

''کہاں کے بزنس پر؟'' ہم نے پوچھا'' پنجاب اور کراچی کے؟ ''

''نہیں ساری دنیا میں یہ فلم جو بزنس کرے گی اس پر میرا کمیشن پندرہ فیصد ہو گا۔ پاکستان میں' باہر کے ملکوں میں ہر قسم کے بزنس پر یہی ریٹ ہو گا۔''

ہماری تو سمجھ میں ہی کچھ نہیں آرہا تھا کہ اس اچانک اور غیر متوقع پیشکش کے جواب میں کیا کہیں؟

وہ کہنے لگے ''خلیل قیصر سے میں نے ان ہی شرائط پر ایگریمنٹ کیا ہے۔اس سے میں بیس فیصد کمیشن لے رہا ہوں۔ مگر تم سے پندرہ فیصد لوں گا۔ ''

خلیل قیصر ان دنوں فلم ''شہید'' بنا رہے تھے۔

آغا صاحب کی اس محبت بھری مخلصانہ پیشکش نے ہمیں واقعی بوکھلا دیا تھا۔ان کی باتیں سن کر ہمارا دل بھر آیا کہ وہ کتنے مہربان اور شفیق ہیں۔ کتنے اچھے اور ہمدرد انسان ہیں۔ان کی شخصیت کا یہ پہلو ہم پر پہلی بار منکشف ہوا تھا۔

آغا صاحب ہماری ذہنی الجھن کو بھانپ گئے۔ مسکرا کر کہنے لگے۔"تم اچھی طرح سوچ لو، طارق سے بھی مشورہ کر لو۔ وہ تمہارا ڈائریکٹر بھی ہے اور دوست بھی۔جب فلم شروع کرنا چاہو مجھے بتا دینا۔"

"شکریہ آغا صاحب" ہم نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو روکا مگر شاید آواز پھر بھی بھرا گئی تھی۔

ہم آغا صاحب کے پاس سے چند سیڑھیاں اتر کر گول چکّر سے نیچے کھڑے ہو گئے۔ ساری دنیا' فضا' ماحول' لان' باغ' پھول' فوارے' روشنیاں زمین آسمان سب کے سب ہمیں بدلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ دُھند چھٹ سی گئی تھی۔ہر طرف روشنی اور اجالا تھا۔رنگ تھے روشنیاں تھیں۔دل کے اندر گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔خوشی کے مارے ہنسنے کو جی چاہ رہا تھا مگر دل تھا کہ بھرا آ رہا تھا۔چند لمحے ہم اسی کیفیت میں مبتلا رہے۔اس دوران میں ہمارے پاس سے کون گزرا۔کس نے ہمیں مخاطب کیا۔کس نے فقرہ چست کیا۔کس نے ہم سے مصافحہ کیا؟ ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ہم تو جیسے بادلوں میں اڑ رہے تھے۔آسمانوں پر سفر کر رہے تھے۔وہی مثل تھی کہ بن مانگے ملے موتی' مانگے ملے نہ بھیک' یعنی ذرا غور فرمائیے کہ ہم جب فلم بنانے کے لئے سرمایہ حاصل کرنے کے سلسلے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے تو ہر کوشش ناکام ثابت ہو رہی تھی اور اب جب کہ وہ بات ہی ذہن میں نہ تھی تو آغا گل جیسی ہستی نے بذاتِ خود ہمیں ایک خصوصی پیشکش کر دی تھی جو بظاہر ہمارے لئے بہترین اور مثالی صورت تھی۔

کچھ دیر بعد جب ہمارے حواس واپس آئے تو ہم نے خوشی سے چھلانگ ماری اور حسن طارق کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

پہلے تو انہیں سٹوڈیوز میں تلاش کیا۔پھر مختلف دفتروں اور گھروں میں فون کر کے دریافت کیا۔آخر میں معلوم ہوا کہ وہ نگہت سلطانہ کی کوٹھی پر تشریف فرما ہیں۔

ہم نے فوراً فون کر کے پوچھا"طارق صاحب آپ کہاں ہیں؟"

وہ حیران رہ گئے ''آفاقی صاحب کیا بات ہے۔ طبعیت تو ٹھیک ہے آپ کی؟ ''

''جی بالکل بس آپ وہیں رہیے ہم آرہے ہیں۔ ''

باہر نکل کر ہم نے ایک ٹیکسی حاصل کی اور گلبرگ پہنچ گئے۔ طارق صاحب ہمیں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ ''آفاقی صاحب خیریت تو ہے؟ ''

ہم نے کہا'' طارق صاحب ہمارا کام بن گیا ہے ''

''کون سا کام''

''فلم والا ''

ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اتنی دیر میں نگہت سلطانہ بھی آگئیں۔ ''ارے آفاقی اچانک بے وقت چاند کیسے نکل آیا۔ '' ان سے ہماری نوک جھونک جاری رہتی تھی مگر اس وقت ہم فارغ نہیں تھے۔ ہم نے کہا جلدی سے چائے کا بندوبست کر دیں اور تھوڑی دیر اس طرف نہ آئیں۔

انہوں نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا اور پھر گردن ہلا کر رخصت ہو گئیں۔

ہم نے طارق صاحب کو مختصر اور موزوں الفاظ میں آغا صاحب کی گفتگو اور پیشکش سے آگاہ کیا اور پھر پوچھا'' کیوں طارق صاحب بہترین پرپوزل ہے کہ نہیں؟ ''

طارق صاحب اطمینان سے سنتے رہے تھے کچھ دیر سوچا ایک سگریٹ سلگائی چند کش لئے اور پھر بولے ''آفاقی صاحب بہت اچھی پرپوزل ہے مگر اس میں دو خرابیاں ہیں ''

''وہ کیا؟'' ہم نے پوچھا

''ایک تو یہ کہ آغا صاحب آپ کو یک مشت رقم نہیں دیں گے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ ہر روز کے اخراجات کے لئے سو روپے دیتے ہیں۔ جن لوگوں کو معاوضے کے حساب میں رقم دینا ہو وہ فہرست آغا صاحب کے دفتر کو دی جاتی ہے اور وہ لوگ آرٹسٹوں اور ٹیکنیشنز کو پھیرے لگواتے ہیں۔ اب آپ خود سوچئے کہ ان لوگوں سے کام تو ہم لیں گے مگر پیسوں کی ادائیگی کے لئے انہیں دوسرے دفتر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے۔ اس طرح کام کرنے والوں میں بددلی

پیدا ہو جاتی ہے۔ ‘‘

ہمیں بھی آغا صاحب کے دفتر کا یہ دستور معلوم تھا کہ وہاں بل وصول کرنے والوں کو چکّر لگانے پڑتے ہیں۔

’’اور؟‘‘ ہم نے پوچھا

’’دوسرے یہ کہ فلم کے تمام بزنس پہ وہ پندرہ فیصد کمیشن لیں گے۔ڈسٹری بیوٹر جو دے گا اس پر بھی۔آپ نے حساب لگایا ہے کہ یہ کتنی رقم بن جائے گی اور آپ کے پلے کیا پڑے گا؟ ‘‘

ہم نے سرسری سماعت کے بعد فوراً کہا’’مگر طارق صاحب اس کے سوا کوئی اور طریقہ بھی تو نہیں ہے فلم بنانے کا۔ ہمارے پاس ہے ہی کیا۔اس طرح ڈسٹری بیوٹر کے ہاتھ اونے پونے فلم نہیں بیچنی پڑے گی۔ایک بار یہ مشکل اٹھا لیں گے۔اگلی بار اپنی سہولت کے مطابق بندوبست کریں گے۔ ‘‘

طارق صاحب کچھ دیر سوچتے رہے پھر کہا’’آپ مجھے سوچنے دیں، کل جواب دوں گا۔ ‘‘

نگہت سلطانہ چائے اور بسکٹ لئے منتظر تھیں۔

اس رات ہم جب گھر لوٹے تو بے حد مسرور اور مطمئن تھے۔

طارق صاحب چاہے جو بھی مشورہ دیں کم از کم ہمارے فلم ساز بننے کا منصوبہ تو پایہ تکمیل تک پہنچتا نظر آنے لگا تھا۔

وہ رات ہم نے جاگتی آنکھوں سے گزاری۔ علی الصبح کار کے ہارن کی آواز نے چونکا دیا۔طارق صاحب ہمارے گھر اچانک آن دھمکے تھے۔ہم نے چائے وغیرہ کے لئے کہا۔وغیرہ سے مراد ناشتا۔

طارق صاحب تمہید کے بغیر بولے’’آفاقی صاحب میں نے بہت سوچا ہے مگر میرا خیال وہی ہے جو کل بتا چکا ہوں۔اس کے علاوہ یہ بھی سوچئے کہ فلم کے خاتمے تک مجھے ڈائریکشن کا اور آپ کو کہانی کا معاوضہ نہیں ملے گا۔پروڈکشن کے لئے آپ دوسرے کام چھوڑ کر جو وقت نکالیں گے اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں ہے۔خیر آغا صاحب نے آپ پر بہت مہربانی کی ہے وہ تو کسی کے ساتھ ایسی رعایت کرتے ہی نہیں ہیں۔مگر ہر پہلو پر سوچنا بھی آپ کا فرض ہے۔ ‘‘

’’تو پھر کیا کریں؟‘‘ ہم نے کہا’’فلم بنانے کا کوئی اور طریقہ ہمارے ذہن میں نہیں ہے۔پیسوں کے بغیر فلم کیسے بن سکتی ہے؟ ‘‘

انہوں نے سگریٹ کے چند کش لئے اور پُر خیال انداز میں بولے ’’آپ اگر برا نہ مانیں تو میں ایک بات کہوں؟ ‘‘

’’یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں جو جی میں آئے کہیے ‘‘

کہنے لگے ’’آفاقی صاحب آپ مناسب سمجھیں تو ہم دونوں مل کر یہ فلم بنالیں؟ ‘‘

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا ’’طارق صاحب ہم دونوں مل کر ہی تو یہ فلم بنا رہے ہیں۔ ‘‘

کہنے لگے ’’ میرا مطلب ہے ہم دونوں فلم ساز اور حصّے دار ہو جائیں؟ ‘‘

’’بہت خوب مگر سرمایہ ‘‘

بولے ’’ میرے پاس گلبرگ میں ایک پلاٹ ہے۔اسے بیچ کر دس ہزار روپے مل جائیں گے۔ میری بہن تو بہت مخالفت کر رہی ہے مگر میں نے سوچا ہے کہ اسے بیچ کر ہم دونوں یہ فلم بنائیں۔دس ہزار میرے پاس ہیں۔پونے دو ہزار آپ کے پاس ہیں۔ فلم کی شوٹنگ شروع کر لیں گے۔ تھوڑے بہت اور بھی ڈال دیں گے۔کافی کام بھی ختم ہو جائے گا۔مجھے یقین ہے کہ فلم کے سیٹ پر جاتے ہی ہماری فلم بک جائے گی۔کیوں کیا خیال ہے؟ ‘‘

ہم نے کہا ’’مگر آپ کو پلاٹ بیچنا پڑے گا۔ ‘‘

وہ ہنسنے لگے ’’پلاٹ کا کیا ہے پھر خرید لیں گے۔اللہ مالک ہے۔ ‘‘

ہم نے فوراً ہامی بھر لی۔ بر سبیل تذکرہ یہ بھی سن لیجئے کہ اس پلاٹ کو وہ دوبارہ نہیں خرید سکے۔اس کی قیمت آج کل دو ڈھائی کروڑ روپے ہے اور طارق صاحب دوبارہ اس پلاٹ کو نہیں خرید سکے۔اس میں ان کی بے پروائی اور درویش مزاجی کا زیادہ ہاتھ تھا۔

ہم نے کہا ’’مگر طارق صاحب آغا صاحب نے اتنی محبت اور مہربانی سے جو آفر دی تھی اس کا کیا کریں؟ ‘‘

بولے ’’ ارے وہ کچھ دن میں خود ہی بھول جائیں گے۔انہوں نے کسی اپنے مقصد سے تو یہ آفر نہیں دی ہے۔وہ محض آپ کی ہیلپ کرنا چاہتے ہیں۔مناسب سمجھیں تو آپ انہیں بتادیں ‘‘

دوسرے دن ہم آغا صاحب کے پاس پہنچ گئے۔وہ اکیلے ہی بیٹھے تھے۔’’آؤ آفاقی سناؤ کیا خبر ہے؟ ‘‘

ہم نے جھوٹی سچّی فلمی خبریں ان کے گوش گزار کرنے کے بعد کہا ’’آغا صاحب آپ نے جو کل پروپوزل دیا تھا اس کے

بارے میں کچھ کہنا ہے۔ “

”ہاں ہاں کہو “

ہم نے کہا”ہم نے طارق صاحب سے مشورہ کیا تھا وہ ہمارے ساتھ مل کر فلم بنانے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ تھوڑے سے پیسے ان کے پاس بھی ہیں۔ “

آغا صاحب بولے” یہ تو بہت اچھی بات ہے۔وہ فلم کا ڈائریکٹر ہے، تمہارا دوست بھی ہے۔فلم میں اس کا بزنس انٹریسٹ ہو گا تو زیادہ شوق اور محنت سے کام کرے گا، مگر دیکھو ڈسٹری بیوٹر سے ذرا سوچ سمجھ کر سودا کرنا۔کوئی اور کام ہو تو مجھے بتا دینا۔ “

یہ کہہ کر انہوں نے پشتو میں اپنے مخصوص چپڑاسی کو پکارا”بوستان چائے کیک روڑا“ یعنی چائے اور کیک لاؤ۔

ہماری آنکھوں میں پھر نمی آگئی۔آغا صاحب بعد میں بھی ہمیشہ ہمارے ساتھ بہت مہربانی اور شفقت بھرا سلوک کرتے رہے جس کا ذکر مناسب مقامات پر ہوتا رہے گا۔

دوسرے دن سے ہماری فلم پر عملاً کام شروع ہو گیا۔

طارق صاحب اور ہم سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔انہوں نے دوبارہ سکرپٹ بہت غور سے پڑھا۔پھر بولے” آفاقی صاحب یہ بہت اچھّا سکرپٹ ہے صبیحہ بھابھی کا کردار تو بہت ہی جاندار ہے۔ “

”صبیحہ بھابھی؟“ ہم حیران رہ گئے۔”ہماری فلم میں تو میڈم یاسمین ہیں۔ “

وہ مسکرائے”آفاقی صاحب یاسمین بہت اچھی ایکٹریس ہیں مگر یقین کریں صبیحہ خانم اس کردار کو لافانی بنا دیں گی “

ہم نے کہا”مگر طارق صاحب یاسمین کو کیسے جواب دیں گے۔اور پھر صبیحہ خانم نے تو گزشتہ ایک سال سے فلموں میں کام کرنا ہی بند کر دیا ہے “

طارق صاحب بولے” یاسمین کو تو ہم منالیں گے،دیکھئے آفاقی صاحب کہانی کے معاملے میں ہر گز سمجھوتا نہیں کرنا چاہئے۔اس معاملے میں کسی کا لحاظ کرنا فلم کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔مجھے پتا ہے کہ آپ یاسمین کو سمجھا لیں گے۔ “

''اچھا''ہم نے بے صبری سے کہا''مگر صبیحہ بھابھی تو پہلے ہی انکار کر چکی ہیں۔ہم نے سنتوش صاحب سے بھی بات کی تھی مگر وہ کہتے ہیں کہ اب وہ خاتونِ خانہ بن چکی ہیں۔ فلموں میں کام نہیں کریں گی۔''

طارق صاحب پھر معنی خیز انداز میں مسکرائے۔''انہیں کہنے دیجئے ہمیں اپنی کہنی چاہئے۔کل صبح صبیحہ بھابھی کے پاس چلتے ہیں مگر آپ آج ہی یاسمین سے بات کر لیجئے۔''

ہم نے کہا''اگر صبیحہ نے انکار کر دیا تو؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'' طارق صاحب نے پورے وثوق اور اعتماد سے کہا''جب ہم نے سوچ ہی لیا ہے کہ وہ کام کریں گی تو پھر وہ کام کریں گی۔اگر مگر کا کیا سوال ہے۔انکار ہم ہرگز نہیں سنیں گے۔''

طارق صاحب کی اس بات اور پُراعتماد لہجے نے ہمارے جسم میں ایک لہر سی دوڑا دی۔واقعی ٹھیک تو ہے جب ''نہ'' سننی ہی نہیں تو ان کے کام ''نہ'' کرنے کا کیا سوال ہے۔چاہے کچھ ہو جائے۔انہیں ہماری فلم میں کام کرنا ہی پڑے گا۔ہم یہ سوچ کر ایک دم پُرعزم ہو گئے۔

طارق صاحب نے اس روز ہمیں ایک ایسا سبق سکھا دیا جس پر آئندہ بھی ہم زندگی بھر عمل کرتے رہے۔انگریزی کہاوت کے مطابق انہوں نے کہا تھا۔

NEVER TAKE NO FOR AN ANSWER

یعنی کسی سوال کے جواب میں انکار قبول ہی نہ کرو۔

دوسرے دن جب ہم دونوں سنتوش صاحب کی کوٹھی کی جانب جا رہے تھے تو ایک نیا عزم ہمارا ہم سفر تھا۔میڈیم یاسمین سے ہم گزشتہ رات ہی معذرت اور بات کر چکے تھے اور انہوں نے نہایت خندہ پیشانی اور وسیع الظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے ہماری بات مان بھی لی تھی۔یعنی طارق بن زیاد کی طرح ہم نے بھی اپنی ساری کشتیاں جلا دی تھیں اور بہر صورت فتح اور کامیابی ہی ہماری منزل تھی۔

حسن طارق صاحب کے پاس آف وائٹ رنگ کی ویگن تھی۔اس وقت تک وہ ایک کامیاب ہدایت کار بن چکے تھے۔ بلکہ فلمساز بھی بن گئے تھے۔وہ اور خلیل قیصر بے تکلف دوست تھے اور اُس زمانے میں پاکستان کی فلمی دنیا میں ان

دونوں کا سِکّہ چلتا تھا۔ یہ مقام ان دونوں نے بڑی محنت اور مُشقّت کے بعد حاصل کیا تھا۔ اس کامیابی کا آغاز کب اور کیسے ہوا تھا، یہ ہم آپ کو بتادیں گے مگر وقت آنے پر۔

حسن طارق نے اُس زمانے کے حساب سے معقول پیسے کمائے تھے مگر پیسہ خرچ کرنے بلکہ لٹانے کے معاملے میں بڑے شیر تھے۔ پیسہ آنے سے پہلے ہی وہ اسے خرچ کر دیتے تھے۔ یعنی جس آمدنی کی توقعّ ہے اس حساب میں سامان خرید لیا۔ سیر وسفر کرلیا، تاش کھیل کر ہار گئے اور جب پیسہ ملا تو ہاتھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

تب وہ بیزاری سے کہتے ''آفاقی صاحب یہ تو نری بیگار ہی ہے، اتنی محنت کی اور ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔''

ہم کہتے ''طارق صاحب' ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی آپ نے خرچ کر دیا تو پھر شکوہ کیسا؟ ''

''کچھ نہیں بکواس ہے سب۔ میں تو کہتا ہوں کہ بلاوجہ کی جان ماری ہے۔''

پیسہ خرچ کرنے کے معاملے میں وہ حاتم طائی تھے۔ کسی دوست نے مانگا اور اگر پاس ہوا تو بے دریغ دے دیا۔ وہ واپس کرے یا نہ کرے' یہ اس کا ایمان جانے' مجال ہے جو طارق صاحب واپس مانگ لیں۔ اگر کبھی بہت زیادہ تنگی ہو جاتی تو شکایت کرتے ''آفاقی صاحب دیکھا آپ نے فلاں صاحب نے اتنا پیسہ لیا تھا۔ اب مجھے ضرورت ہے مگر لوٹانے کا نام نہیں لیتے۔ ''

''بھئی آپ تقاضا کیوں نہیں کرتے؟ ''

''اچھا نہیں لگتا۔ انہیں خود ہی احساس ہونا چاہئے۔ آخر وہ میرے دوست بھی ہیں اور آج کل تو ان کے پاس پیسے بھی ہیں۔''

ہم تجویز پیش کرتے ''تو پھر ہم بات کریں اُن سے؟ ''

''ارے نہیں'' وہ گھبرا جاتے ''برا لگتا ہے، وہ بھی کیا سوچیں گے کہ انہوں نے ضرورت کے وقت پیسہ لیا اور میں نے اس کا ڈھنڈورا پیٹ دیا۔ آپ کے سوا کسی اور کو میں نے بتایا تک نہیں ہے۔ ''

''مگر طارق صاحب اگر انہیں خیال نہیں آتا تو۔ ''

وہ ہنسنے لگتے ''آجائے گا کبھی تو آجائے گا''۔ پھر مذاق میں کہتے ''آفاقی صاحب بھئی آپ بڑے ساہوکار ٹائپ آدمی

ہیں۔ میں نے انہیں قرضہ سمجھ کر تھوڑا ہی دیا تھا۔ بس دوست کے کام آنے کا خیال تھا۔ ''

''مگر وہ تو آپ کے کام نہیں آ رہے'' ہم جل کر کہتے۔

وہ شرارت آمیز انداز میں مسکراتے ''یہ بتایئے کہ آپ نے کتنے لوگوں سے اپنے واجبات وصول کرنے کیلئے تقاضا کیا ہے؟ ''

ہم لاجواب ہو کر بغلیں جھانکنے لگتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم دونوں میں بظاہر بہت زیادہ دوستی تھی۔ گہری دوستی کے باوجود لحاظ اور تکلّف کا ایک پردہ ہمیشہ ہمارے درمیان ضرور قائم رہتا۔ وہ خاصے پھکّڑ آدمی تھے۔

''اوئے توئے'' سے بات کر لیتے تھے۔ بے تکلّف دوستوں کے ساتھ گالیوں کا تبادلہ بھی ہو جاتا تھا مگر ہم دونوں کے مابین ایک خاموش معاہدہ خود بخود سائن ہو گیا تھا۔ انہوں نے ہمیں بہت کم ''آفاقی کہا'' ہوگا۔ آفاقی صاحب ہی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ہماری غیر موجودگی میں بھی ہمارے تذکرے میں نام کے ساتھ ''صاحب'' ضرور لگاتے تھے۔ تُوتڑاق کا بھی آپس میں کوئی سوال نہ تھا۔ جب دیکھو ''آپ جناب آیئے بیٹھئے کھایئے قسم کی گفتگو ہی ہوتی تھی۔ ہم تو خیر عموماً ہر ایک سے ''آپ جناب'' اور ''صاحب'' ہی کہہ کر بات کیا کرتے تھے۔ جو لوگ ہمیں بے تکلّفی میں تم یا محض نام لے کر مخاطب کرتے تھے اور حد سے زیادہ بے تکلّف تھے ان سے بھی ہم صاحب اور آپ جناب ہی کرتے تھے۔ کچھ عادت سی بن گئی تھی کہ کوشش کے باوجود چھوٹوں کو بھی '' تم'' کہہ کر مخاطب نہیں کیا جاتا۔ ویسے جب سے ''بزرگ'' ہوگئے ہیں اپنے چھوٹوں کو بڑی احتیاط سے اور کوشش سے ''تم'' کہہ دیتے ہیں۔ طارق صاحب کو ہم نے ہمیشہ طارق صاحب ہی کہا۔ کبھی محض طارق نہیں کہا۔ ان کی خوبی دیکھئے کہ ترنگ کے عالم میں بھی ہمیں آفاقی صاحب اور آپ ہی کہتے رہے۔ ایک بار ہماری غیر موجودگی میں کسی اختلافی مسئلے پر یار لوگوں نے محفل خاص میں انہیں ہمارے خلاف خوب بھڑکانے کی کوشش کی۔ اشتعال دلایا۔ طارق صاحب میں کسی کیلئے برداشت کہاں تھی۔ ایک دم بھڑک اٹھتے تھے۔ مگر ہمارے بارے میں وہ صرف اتنا کہہ کر چپ ہو جاتے تھے۔ '' آفاقی صاحب کی اپنی رائے ہے وہ سوچ سمجھ کر ہی رائے قائم کرتے ہیں۔ ''

اوراس طرح بات ہی ختم ہو کر رہ جاتی تھی۔

ہمارے مقابلے میں ان کی ریاض شاہد اور خلیل قیصر سے بہت زیادہ بے تکلّفی تھی۔ ہر قسم کا مذاق گالم گلوچ فقرے بازی روا سمجھی جاتی تھی۔ وہ لوگ شام کی محفلوں کے ہم جلیس بھی تھے۔ ہم تو کچھ دیر بیٹھ کر اور کوکاکولا، چائے، کافی پی کر رخصت ہو جاتے تھے۔ ان کی مخصوص محفلیں ان ہی دوستوں کے ساتھ جما کرتی تھیں۔ مگر ہمیں ہمیشہ یہ برتری اور احساس رہا کہ طارق صاحب ہم سے اور ہم ان سے بہت قریب ہیں۔ دل کی بہت سی باتیں جو وہ کسی اور سے نہیں کرتے تھے ہم سے کر لیا کرتے تھے مگر ایک خاص حد میں رہ کر، اب اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ ان کا ہر سیریس قسم کا رومانس جو شادی پر ختم ہوا۔ آغاز سے انجام تک ہماری آنکھوں کے سامنے ہی پروان چڑھا تھا۔ نہ ریاض شاہد کو علم تھا نہ خلیل قیصر یا کسی اور کو۔۔۔ ہم ہی ان کے ہمراز اور مشیر تھے۔

ایمی مینوالا سے طارق صاحب کا آغاز محبت جو مذاق سے شروع ہوا تھا بڑھ کر شادی تک پہنچ گیا۔ یہ ہمارے نہ صرف علم میں تھا بلکہ اس میں ہماری کوششوں کو بھی دخل تھا۔ پھر جب علیحدگی ہوئی تو وہ اسباب بھی ہماری آنکھوں نے دیکھے۔

اسی طرح رانی سے ایک دن ہمارے سامنے انہوں نے ٹیلی فون پر بات کی جو ذرا لمبی ہو گئی۔ بات مذاق سے شروع ہوئی تھی مگر اتنی سیریس ہو گئی کہ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی وہ رانی سے قریب تر ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد بھی ہم ان دونوں کے دوست اور ہم راز تھے مگر ایک کے راز یا بھید کی دوسرے کو بھنک تک نہ ہونے دی۔ پھر تلخیاں سایہ فگن ہوئیں۔ دونوں کے مسائل شکایات ہمارے سامنے تھے۔ یہاں تک کہ دونوں میں طلاق ہو گئی۔ طارق صاحب نے اس موضوع پر بہت کم ہی لب کشائی کی مگر رانی ہم سے اکثر یکایک پوچھ بیٹھتی تھیں۔

”دیکھئے نا آفاقی صاحب۔ اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے نا۔ سب کچھ تو آپ کے سامنے ہے۔“

وہ کسی حد تک درست بھی تھیں کسی حد تک غلط بھی تھیں۔ طارق صاحب بھی صحیح بھی تھے اور غلط بھی۔ ہم تو اپنی رائے ظاہر کر دیا کرتے تھے۔ جواب میں وہ دونوں ہی چپ سادھ لیتے، کیسے لوگ تھے؟ کیسا زمانہ تھا؟ اب تو وہ دونوں

ہی نہیں رہے۔ کہانیاں اور باتیں رہ گئی ہیں۔ مگر ہمارے ذہن اور دل سے یہ کبھی نہ مٹ سکیں گے۔ شاعر ٹھیک ہی تو کہتے ہیں دل سے بڑا قبرستان اور کہاں ہو گا۔ اس میں انسانوں کی یادیں دفن ہو جاتی ہیں۔ ہر ایک پر کتبے لگے ہوئے ہیں۔ سب اپنی یادوں اور کتبوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ فاتحہ خوانی کے لئے کہیں آنے جانے کی حاجت بھی نہیں ہے۔ خیال آیا اور دعا کرلی۔ فاتحہ پڑھ لی جیسے کہ شاعر نے کہا ہے۔

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار

جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

ہمیں تو یاروں دوستوں کی تصویریں دیکھنے کیلئے گردن جھکانے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ نہ آنکھیں بند کرنے کی محتاجی ہے۔ کھلی آنکھوں، بھری محفلوں میں بیٹھے بیٹھے اس قبرستان میں جا پہنچتے ہیں۔ ان کی باتیں یاد کر کے ہنستے بھی ہیں غمگیں بھی ہو جاتے ہیں۔ آس پاس والوں کو خبر تک نہیں ہوتی اور ہم قبرستانوں کے چکّر کاٹ کر واپس بھی آ جاتے ہیں۔ مگر جو وقت بھی گزرا حاصل زندگی گزرا۔ جو لوگ بھی ملے ایک قیمتی سرمایہ تھے۔ کمزوریاں ہر ایک میں ہوتی ہیں مگر ان میں تو خوبیاں بھی بے بہا تھیں۔ تب ہی تو یاد رہ گئے۔ سالہا سال ساتھ رہا، یہ اب کیسے ٹوٹ جائیگا دیکھئے حفیظ جالندھری یاد آ گئے۔

نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں، اب تو واقعی نصف صدی ہونے کو آئی ہے۔

طارق صاحب کی فاکس ویگن کہاں سے کہاں لے کر پہنچ گئی۔ ہم تو صبیحہ خانم اور سنتوش کمار کے گھر جا رہے تھے۔ صبیحہ خانم سے سنتوش کمار کی شادی ہونے کے بعد بھی صبیحہ شاہ جمال روڈ پر واقع اپنی ذاتی کوٹھی میں ہی رہتی تھیں۔ سنتوش صاحب اپنے سارے خاندان اور پہلی بیگم کے ساتھ مسلم ٹاؤن کی وسیع و عریض کوٹھی میں رہتے تھے۔ کافی عرصے بعد انہوں نے اپنی مسلم ٹاؤن والی کوٹھی میں اضافہ کیا۔ نئی تزئین و تعمیر کی تو صبیحہ خانم اپنی شاہ جمال روڈ والی کوٹھی کو خیر باد کہہ کر مسلم ٹاؤن میں جا آباد ہوئیں۔ یہاں دونوں بیگمات ایک ساتھ ہی رہتی تھیں۔ بالکل بہنوں کے مانند۔ دلوں کا حال تو خدا جانتا ہے مگر ایسا میل جول، ایسا سلوک، ایسی محبت اور بے تکلّفی ہم نے سوکنوں میں نہیں دیکھی۔ اور چند ماہ یا چند برس کی بات نہیں ہے۔ مرتے دم تک یہ وضع داری اور خلوص قائم رہا۔

اس روز طارق صاحب صبح سویرے ہی ہمارے پاس ماڈل ٹاؤن آ گئے تھے۔ صبح سویرے سے ہماری مراد ہے نو ساڑھے نو بجے، بات یہ ہے کہ طارق صاحب کی رندی اور شب بیداری اپنی جگہ مگر وہ سحر خیز تھے۔ خدا جانے وہ کیوں کر اتنے سویرے ہی بیدار ہو جاتے تھے جبکہ ہمیں دس بجے بھی جھنجوڑ جھنجوڑ کر اٹھایا جاتا تھا۔ وہ تو ناشتا کر کے آئے تھے، ہمیں امّاں ہر روز ناشتا اپنی ذاتی نگرانی میں اس طرح کراتی تھیں جیسے کہ یہ دنیا میں ہمارا آخری ناشتا ہو اور اس کے بعد شاید ہمارے ناشتا کرنے کی نوبت ہی نہیں آئیگی۔ پراٹھے، ٹوسٹ، مکھن، انڈا، دلیا، کیک، مٹھائی، پھل، دودھ، چائے، شہد، ملائی، جام، سیب کا مربّا اور نہ جانے کیا کیا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ تمام چیزیں ہمارے پیٹ میں انڈیل دیں۔ ساتھ ساتھ ان کی نصیحتیں بھی چلتی رہتی تھیں۔

''دیکھو بیٹا۔ طبیب کہتے ہیں کہ ناشتا خوب اچھا کرنا چاہیے اور تم کو تو خدا جانے پھر کب کھانے کا ہوش آئے گا۔ لو یہ کیک کھاؤ۔ ''

''مگر امّاں، ناشتے میں کیک کی کیا تُک ہے؟'' ہم احتجاج کرتے۔

''بیٹا شام کی چائے پر تو تم ہوتے نہیں ہو پھر اور کس وقت کھاؤ گے؟ اور دیکھو یہ مٹھائی فلاں کے گھر سے آئی ہے، میں نے دودھ میں کھجوریں بھی بھگو کر رکھی ہیں۔ تمہیں پسند ہیں نا۔ رات کو یہ سوّیاں بنائی تھیں۔''

''امّاں یہ ناشتا ہے یا کھانا بلکہ کسی کا ولیمہ ''

''زیادہ باتیں مت بناؤ یہ لو ٹھنڈا دودھ ہے۔''

''مگر چائے۔''

''ارے چائے تو سارے دن پیتے ہی رہتے ہو۔ اپنا دل جلاتے ہو پھر جاتے وقت چائے بھی پی لینا۔ یہ تربوز۔۔۔''

''میرے اللہ یہ تربوز کھانے کا کون سا وقت ہے۔ ''

''موسم کا پھل ہے۔ ویسے تو سہ پہر کو کھاتے ہیں۔ نہ پیٹ خالی ہو، نہ بھرا ہو مگر سہ پہر کو تمہارا کب قدم آتا ہے گھر میں۔ ''

خیر ہم نے تو ناشتا لنچ اور ڈنر سب کچھ کر لیا۔ شام کی چائے اور سہ پہر کے پھل بھی ایڈوانس میں کھا لئے۔ چائے اور

دودھ بھی پی لیا۔ لسّی کے گلاس کو ہاتھ نہ لگا سکتے جس کا امّاں کو شکوہ ہی رہا۔

طارق صاحب کو چائے کی دو پیالیاں پیش کی گئیں۔ کھانے کا انہیں شوق ہی نہیں تھا۔ صرف لنچ کے وقت ہی شوق سے کھاتے تھے، ورنہ ڈنر بس یوں ہی ٹرخا دیتے تھے۔

چائے سے فارغ ہو کر انہوں نے سگریٹ سلگائی ہم نے ان کی سگریٹ کی پیشکش شکریے کے ساتھ واپس کر دی۔ گھر میں ہم کسی قسم کی تمباکو نوشی نہیں کرتے تھے' یہ بھی نہیں ہے کہ امّاں کو ہماری پائپ نوشی اور سگار نوشی کا علم نہیں تھا مگر نہ کبھی انہوں نے اس کا تذکرہ کیا نہ ہم نے گھر کی حدود کے اندر یہ گستاخی کی۔ گھر کے اندر ہمیں جیسے صبر سا آ جاتا تھا۔ تمباکو نوشی کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ امّاں کے بعد بچّیاں تمباکو نوشی کی راہ میں رکاوٹ بنی رہیں۔ وہی اصول بچیوں کے سلسلے میں بھی اپنایا گیا جو امّاں کے معاملے میں تھا۔ البتہ کبھی کبھار کسی بے تکلّف دوست کے اصرار پر کمرے کا دروازہ بند کر کے ڈرتے ڈرتے چند کش لگا لیتے تھے کہ کہیں نادیہ یا پارو کی نظر نہ پڑ جائے۔

ہم نے کہا "طارق صاحب اب چلیں؟ "

وہ ہنسنے لگے " آفاقی صاحب صبر کریں ابھی سے کہاں چلیں۔"

"کیوں صبیحہ بھابھی کے پاس نہیں جانا؟"

"مولانا تو ابھی سو رہے ہوں گے، گیارہ بجے سے پہلے تو انہیں صور پھونک کر بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ آیئے ذرا فلم کے متعلق کچھ بات کر لیں۔"

مولانا سے ان کی مراد سنتوش صاحب تھے وہ بھی موڈ میں دوسروں کو مولانا کہتے تھے۔ اس لئے جواب میں یہی سنتے بھی تھے۔ طارق صاحب نے سنجیدگی سے کہانی کے بارے میں بات چیت شروع کر دی۔

"دیکھیں پہلے تو اس کا نام بدل دیں" انہوں نے مشورہ دیا۔

"مگر طارق صاحب "مجبور" کے نام سے ہم نے مہورت کیا تھا اور یہ نام کہانی کے مطابق بھی ہے۔ "

"اسی میں فائدہ ہے، اب آپ کا بندوبست بھی بدل گیا اور کاسٹ بھی بدل جائے گی۔ لوگ سمجھیں کہ یہ کوئی نئی کہانی ہے۔"

یہ آئیڈیا ہمیں بہت پسند آیا۔اس طرح یہ شرمندگی نہیں ہوگی کہ ہم نے مہورت کرنے کے بعد وہ فلم نہیں بنائی۔ لوگ یہی سمجھیں گے کہ کسی وجہ سے ارادہ ہی بدل دیا۔

''اس کا نام ''کنیز'' ٹھیک رہے گا۔دیکھئے نا' آپ کی تھیم یہ ہے کہ جاگیردارانہ نظام میں طبقاتی امتیاز اور نسلی و خاندانی غرور کے آگے ہر چیز کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ضرورت کے وقت یہی لوگ پیر کی جوتی کو سر پر رکھ لیتے ہیں مگر وقت نکلنے کے بعد خاندانی وقار انہیں یاد آجاتا ہے اور پھر ایک کنیز زادی ہی تو ہے جس نے ایک بہت بڑے نواب کے غرور اور پندار کو خاک میں ملا کر رکھ دیا۔جیت اسی کی ہوئی۔نواب کی نوابی دھری کی دھری رہ گئی۔''

بات درست تھی۔''مجبور'' اس کہانی کا بالواسطہ نام تھا مگر ''کنیز'' براہ راست اور بلاواسطہ نام تھا۔ڈائریکٹ اور دو ٹوک۔۔۔طارق صاحب کو اکثر بہت اچھی،سوجھتی تھی۔خاص طور پر فلموں کے نام وہ بہت اچھے منتخب کرتے تھے جبکہ ہم کہانی مکمل،کرنے کے بعد بھی نام سوچتے رہ جاتے تھے۔ چنانچہ اس طرح بیٹھے بٹھائے فلم ''مجبور'' کا نام بدل کر ''کنیز'' ہو گیا۔

انہوں نے سکرپٹ کے صفحات الٹ پلٹ کئے۔کچھ غور کیا اور پھر بولے'' آفاقی صاحب سچ بتائیں آپ نے دونوں بھائیوں کی جو کاسٹنگ کی ہے کیا اس سے آپ مطمئن ہیں؟''

ہم نے کہا''مطمئن تو نہیں ہیں مگر اور چارہ بھی کیا ہے۔نو عمر اور نو خیز اداکار ہم کہاں سے لائیں؟ہم نے تو نئے لوگ بھی تلاش کرنے کی کوشش کی مگر کام نہیں بنا۔''

''تو پھر کوئی نہ کوئی صورت خود بخود نکل آئے گی اس لئے کہ یہ کاسٹنگ مجھے بھی مناسب نہیں لگ رہی۔نو عمر ہیروئن کے لئے آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''ہمارے خیال میں تو زیبا مناسب ہیں۔دراصل اس کہانی میں زیادہ بوجھ ماں،دادا اور بھائیوں پر ہے۔ہیروئن سجاوٹ اور رنگینی پیدا کرنے کیلئے ہوگی۔ ''

''اوکے'' انہوں نے فوراً اتفاق رائے کا اظہار کر دیا۔''زیبا بہت تیزی سے آگے بڑھی ہے۔اب تو ہیروئن ہے اور پاپولر بھی ہے۔ آپ نے پیسوں کی بات کی ہے زیبا سے؟ ''

''ابھی تو نہیں مگر کر لیں گے۔ ''

''یہ ڈیپارٹمنٹ آپکا ہے ''

ہم دوسرے کرداروں کے بارے میں بھی باتیں کرتے رہے۔اس دوران میں ایک بار پھر چائے پی گئی۔ یہاں تک کہ گیارہ بج گئے۔

''آیئے اب چلتے ہیں'' وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

گاڑی شاہ جمال روڈ کی جانب چل پڑی۔اسی سڑک پر سیّد کمال' منور ایچ قاسم اور کسی زمانے میں راگنی بھی رہا کرتی تھیں۔اس زمانے میں وہ میاں اسلم کی بیگم تھیں۔ہم نے ان سے اسی کوٹھی میں انٹرویو کیا تھا جس کی روداد بیان کر چکے ہیں۔

سنتوش صاحب کی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے ایک لمحے کے لئے بھی ہمیں یہ خیال نہیں آیا کہ اگر صبیحہ خانم رضامند نہ ہوئیں تو کیا ہو گا؟ ہمیں یقین تھا کہ ہم انہیں منالیں گے حالانکہ وہ اداکاری ترک کر بیٹھی تھیں۔

کوٹھی کے گیٹ میں سے چوکیدار نے جھانک کر دیکھا اور پہچان کر دروازہ کھول دیا۔

ہم برآمدے میں داخل ہوئے تو سامنے ہی سنتوش صاحب بیٹھے نظر آ گئے۔ایک چھوٹی میز ان کے سامنے رکھی تھی جس پر گول آئینہ رکھا ہوا تھا۔وہ شیو کرنے کیلئے چہرے پر برش کی مدد سے سفید جھاگ بنانے میں مصروف تھے۔ ہم دونوں کو دیکھا تو بے ساختہ ہنسنے لگے۔

''سویرے سویرے یہ ہنسوں کا جوڑا کدھر آ نکلا۔ ''

''سنتوش صاحب آپ تو آج منہ اندھیرے ہی جاگ گئے صبح گیارہ بجے شیو بنا رہے ہیں۔ خیر تو ہے'' ہم نے پوچھا۔

''مولانا انکم ٹیکس کا معاملہ ہے۔یار ہم تو ان ہی لوگوں کے لئے کماتے ہیں شاید۔ میں تو پروڈیوسروں سے کہہ دوں گا کہ میاں انکم ٹیکس والوں کو ہی میک اپ کرا لیا کرو یہ کہاں کا انصاف ہے۔کمائے کوئی اڑائے کوئی۔''

سنتوش صاحب بہت دلچسپ اور زندہ دل آدمی تھے۔بے حد شائستہ' تعلیم یافتہ اور بااخلاق، ایک زمانہ تھا جب وہ پاکستان کے اکلوتے ہیرو قرار دیئے جاتے تھے۔ان کی مقبولیت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔کوئی اچھی فلم ان کے بغیر مکمل

نہیں سمجھی جاتی تھی اور مزے کی بات یہ ہے کہ اردو فلموں میں توراج کرتے ہی تھے پنجابی فلموں میں بھی مقبول تھے اور ان کی اکثر پنجابی فلمیں سُپر ہٹ ہوئی تھیں۔

پنجابی فلموں کے بے تاج بادشاہ سدھیر کہلاتے تھے۔اُس زمانے میں ایکشن فلموں کی ضرورت تھے۔لہذا سدھیر نے جنگجو ہیرو کا لقب پایا تو یہ ان کا حق تھا۔وہ صحیح معنوں میں عوام کے پسندیدہ ہیرو تھے۔لیکن اُس دور میں پنجابی فلمیں محض مار دھاڑ اور جنگ وجدل تک ہی محدود نہ تھیں۔معاشرتی، رومانی، مزاحیہ ہر طرح کی فلمیں بنائی جاتی تھیں اور سبھی کامیاب ہوتی تھیں۔

سنتوش صاحب پنجابی کی رومانی میوزیکل اور معاشرتی فلموں میں کام کرتے تھے۔ان کی کامیابی پنجابی فلموں کی بھی ایک لمبی قطار ہے جو ''چن وے'' سے شروع ہو کر خود اُن کی اور صبیحہ خانم کی بنائی ہوئی فلموں تک جا پہنچتی ہے۔کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سنتوش کمار نے حقیقتاً پاکستان کی فلمی دنیا پر طویل عرصے تک حکمرانی کی۔نمایاں بات یہ تھی کہ وہ کیونکہ تعلیم یافتہ اور مہذّب انسان تھے اسلئے سوشل اور سرکاری حلقوں میں بھی ان کی پذیرائی ہوتی تھی۔ان کے مقابلے میں دوسرے فن کار جھجک یا احساس کمتری کے باعث ایسی محفلوں میں شریک نہیں ہوتے تھے اور فلمی دنیا یا سٹوڈیو کی چار دیواری تک ہی محدود رہتے تھے۔ان تمام خوبیوں اور امتیاز کے باوجود سنتوش میں تصنّع یا بناوٹ نام کو نہ تھی۔ہر ایک سے بے تکلیف اور خلوص کے ساتھ ملتے تھے۔جب انتہائی عروج پر تھے اس وقت بھی ان کا وہی انداز اور برتاؤ تھا جو آخری دنوں میں بھی رہا۔عروج وزوال سے ان پر کوئی فرق نہ پڑا۔وہ بہت خوش لباس تھے اور بڑے سٹائلش انداز میں زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اس کے باوجود ان کی سادگی اور سادہ دلی نمایاں نظر آتی تھی۔غرور کا تو ان میں نام ونشان تک نہ تھا اور نہ ہی دوسروں کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے تھے جس سے کسی کی سُبکی یا توہین کا پہلو نکلتا ہو۔ایسے طرح دار اور وضع دار لوگ اب کہاں۔ان کے پاسنگ بھی کوئی دیکھنے میں نہیں آتا۔

ان کی سادگی کا نمونہ یہ بھی تھا کہ کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھے شیو بنا رہے تھے۔جھاگ سے تمام چہرہ بھرا ہوا تھا ۔فوم کا ان دنوں رواج نہ تھا۔شیونگ کریم ہی استعمال کی جاتی تھی اور اُسے برش کی مدد سے بہت دیر تو چہرے پر رگڑنا

پڑتا تھاتب کہیں جا کر اچھی اور آسان شیو ہو سکتی تھی۔

سنتوش صاحب نے شیونگ ریزر سنبھال کر شیو کا آغاز کیا اور ہم سے کہا ”مولانا آپ دونوں اس وقت کہاں اور کیسے؟ یہ تو شرفا کی ملاقات کا وقت نہیں ہے۔ “

ہم نے کہا ”سنتوش صاحب یہ بزنس وزٹ ہے یعنی کاروباری ملاقات۔ “

بولے ”اتنی انگریزی تو میں بھی سمجھتا ہوں کیا ہوا جو عثمانیہ یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہوں۔ “

”وہ تو اردو میڈیم یونیورسٹی تھی جس کا اصل نام جامعہ عثمانیہ ہے، سنا ہے وہاں مولوی پڑھا کرتے تھے“۔ ہم نے چھیڑا۔

سنتوش صاحب خوش دلی سے قہقہہ مار کر ہنسے، پھر کہا ”مولانا یہ بات کسی پڑھے لکھے کے سامنے نہ کہہ دینا۔ بڑی شرمندگی ہو گی۔ “

ہم نے کہا ”اسی لئے آپ کے سامنے کہی ہے “

سنتوش صاحب پھر ہنسنے لگے۔ ”یہ فقرہ بازی کا میچ کب تک جاری رہے گا؟ بھائی مطلب کی بات کیجئے مجھے جانے کی جلدی ہے۔ “

طارق صاحب نے کہا ”سنتوش صاحب‘ آپ کو آفاقی صاحب کی فلم کی کہانی کا علم تو ہے نا؟ “

بولے ”علم تو ہے مگر تفصیل سے نہیں سنی “

”اب یہ فلم ہم دونوں مل کر بنا رہے ہیں“ طارق نے بتایا۔

”بہت خوب اللہ رحم کرے فلمی دنیا پر۔“

ہم نے کہا ”اس میں ایک مہمان اداکار کا کردار آپ کیلئے ہے۔ “

”سبحان اللہ بھئی اچھی ذاتی فلم بنا رہے ہو۔ بسم اللہ ہی غلط کر دی۔ مجھے مہمان داری کا شوق نہیں ہے۔ کوئی اور ڈھونڈ لیجئے۔ “

ہم نے کہا ”خیر یہ بحث تو بعد میں ہو جائے گی اس وقت آپ جلدی میں ہیں۔ مختصر یہ کہ اس کہانی میں مرکزی کردار

صبیحہ بھابھی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ "

"صبیحہ نے تو فلموں میں کام کرنا ہی چھوڑ رکھا ہے۔ "

"دیکھیں، سنتوش صاحب اگر انہوں نے کام نہیں کیا تو یہ فلم ہی نہیں بنے گی۔ "

"یہ دھمکی ہے؟ "

"جی نہیں حقیقت ہے اور آپ کو ہماری سفارش کرنی پڑے گی۔ "

بولے" دیکھئے مولانا وہ میری بیوی ضرور ہے اور ایک تابعدار بیوی ہے۔ مگر گھر کی حد تک۔ اس کی اداکاری میں میرا کوئی دخل نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس معاملے میں کسی کی سنتی ہے۔ "

"ہم تو سفارش کے لئے کہہ رہے ہیں۔ حکم دینے کے لئے تو نہیں کہا۔ "

"مشکل ہے مولانا بلکہ ناممکن ہے"

ہم نے کہا" آج پتا چل گیا کہ آپ کا کتنا رعب ہے "!

وہ ہنسنے لگے" دانہ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان تِلوں میں تیل نہیں ہے۔ ایسا کریں کہ آپ خود ہی صبیحہ سے بات کر لیں۔ "

طارق صاحب بولے "سنتوش صاحب! آپ اس معاملے میں بالکل غیر جانبدار رہیں بلکہ ہو سکے تو ہماری وکالت بھی کر دیں۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ بھیک مانگنے آئے ہو۔ "

ہم نے کہا" بھیک ہی سمجھ کر ہماری جھولی میں ڈال دیجئے۔ "

"کیا مطلب اپنی بیوی آپ کی جھولی میں ڈال دوں۔ کوئی عقل کی بات کیجئے۔ "

"اچھا اب آپ ہمیں بیگم صاحبہ سے ملا دیجئے۔ آپ کا کام ختم ہو گیا۔ "

"یار بڑے بے دید لوگ ہو۔ خیر' صبیحہ سے بات کر کے دیکھ لو" وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس دوران میں انہوں نے شیو مکمل کر لیا تھا۔ ہم تو ان کی تیزی اور پھرتی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سیفٹی ریزر ایک طرف سے جو پھیرا تو دوسری

طرف تک لے گئے۔ دو چار ہاتھ میں شیو مکمل ہو گیا۔ ہم تو کافی دیر تک ریزر گھستے رہتے تھے اس لئے ان کی اس مہارت پر حیران رہ گئے۔ ان سے اظہار کیا تو بولے

''مولانا مجھ میں اور آپ میں بہت فرق ہے۔ ''

''یعنی آپ اداکار ہیں اور ہم رائٹر!'' ہم نے پوچھا۔

''جی نہیں میرا چہرہ گول اور پُر گوشت ہے ریزر بہت آسانی سے رواں ہو جاتا ہے۔ آپ کا چہرہ دبلا پتلا ہے۔ ریزر کو شیو کرنے کے لئے بال تلاش بھی کرنے پڑتے ہیں۔ بس یہی فرق ہے۔ آپ ٹھہریں میں صبیحہ کو بھیجتا ہوں۔''

ہم نے کہا ''سنتوش صاحب باادب باملاحظہ ہوشیار ''

''کیا مطلب؟ ''

''مطلب یہ کہ ہم اس وقت پروڈیوسر بن کر آئے ہیں ہماری عزّت کیجئے۔ اس طرح برآمدے میں بیٹھ کر بزنس ٹاک نہیں ہو سکتی۔''

''کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ ہر ایک کو عزّت راس نہیں آتی۔ اسی لئے بعض لوگ زبردستی عزّت کراتے ہیں۔ اچھّا خیر آپ اندر ڈرائنگ روم میں تشریف لے آیئے۔ ''

''شکریہ! ''ہم دونوں ان کے ساتھ چل پڑے۔

انہوں نے عزیز کو آواز دی۔ عزیز ان کا قابل اعتماد گھریلو ملازم تھا۔ جس زمانے میں نوکروں کی ریل پیل تھی اس وقت بھی عزیز ملازموں کا داروغہ تھا۔ ہر کام کے لئے عزیز کو ہی آواز دی جاتی تھی۔ آگے وہ خود ہی متعلقہ لوگوں کو پیغام پہنچا کر کام کرا لیتا تھا۔ اس زمانے میں لڑکا سا تھا۔ بوڑھا ہو کر بھی ان ہی کے گھر میں رہا۔ حالات بدل گئے۔ سنتوش صاحب دنیا میں نہ رہے مگر عزیز نے اپنی مالکہ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ وہ آغاز میں بھی صبیحہ خانم کے ساتھ میک اپ باکس اور ناشتے دان سنبھال کر سٹوڈیو آتا تھا اور کئے گزرے دنوں میں بھی یہ فریضہ وہی سرانجام دیتا تھا۔ اب خدا جانے کہاں ہے اس لئے کہ اب تو عرصہ دراز سے صبیحہ خانم بھی نظر نہیں آئی ہیں مگر کسی زمانے میں وہ سائے کی طرح صبیحہ اور سنتوش کے ساتھ رہتا تھا۔

عزیز کسی کونے کھدرے سے نمودار ہو گیا" جی شاہ جی؟ "

" دیکھو بیگم صاحبہ کو بتاؤ کہ غریب غربا آئے ہیں اور ان بے چاروں کیلئے کچھ کھانے پینے کا بھی بندوبست کر دو۔ "

" جی بہتر ہے سر " عزیز زیر لب مسکرایا۔

" ان سے کہنا کہ انہیں ضروری بات کرنی ہے۔ زیادہ انتظار نہ کرائیں۔" پھر وہ ہم لوگوں سے مخاطب ہوئے " سر آپ لوگ تشریف رکھئے مجھے غسل کی اجازت دیجئے۔ " یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گئے۔

صبیحہ خانم کچھ دیر بعد ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے عزیز ٹرالی گھسیٹ کر لا رہا تھا جس میں چائے کا سامان تھا۔ علیک سلیک کے بعد وہ مسکرائیں " عزیز نے بتایا ہے کہ آپ کو کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ "

" جی تشریف رکھئے "

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ " فرمایئے "

ہم دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

وہ بولیں " وہ ضروری بات ایک ساتھ کرنی ہے یا باری باری۔ "

طارق صاحب نے کہا " آپ تو جانتی ہیں کہ آفاقی صاحب ایک فلم بنا رہے ہیں۔ "

" ہاں میں بھی اس کے مہورت میں گئی تھی کیا وہ مکمل ہو گئی؟ "

" ابھی تو شروع بھی نہیں ہوئی، آپ کے بغیر کیسے مکمل ہو سکتی ہے "

" میرے بغیر؟ " وہ مسکرائیں " اس فلم سے میرا کیا تعلق؟ "

" آپ اس میں مرکزی کردار کر رہی ہیں۔ یقین کیجئے یہ آپ کی زندگی کا یادگار کردار ہو گا۔ لوگ " شکوہ " کو بھول جائیں گے۔ "

" واقعی! " انہوں نے چائے کی پیالی ہمارے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ " مگر آپ تو جانتے ہیں کہ میں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ "

ہم نے کہا " مگر آپ ایک نئی فلم " دامن " میں کام کر رہی ہیں۔ "

''وہ تو گھر کی فلم ہے''

ہم نے کہا''یہ بھی گھر کی فلم ہے۔ ہماری فلم میں آپ کو اپنے گھر جیسا ماحول ہی ملے گا۔''

''اللہ نہ کرے جو میرے گھر کا ماحول فلم کے سیٹ جیسا ہو۔'' وہ شرارت سے مسکرائیں۔

''مطلب یہ ہے کہ سب اپنے ہی لوگ نظر آئیں گے، آپ کو غیریت اور بے گانگی کا احساس نہ ہو گا۔''

''مگر میں تو اب کام ہی نہیں کرتی۔ آپ کوئی اور آرٹسٹ رکھ لیں۔''

''تو پھر ''دامن'' میں بھی کوئی اور آرٹسٹ رکھ لیں۔''

''اوہو۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟''

''اچھا یوں کریں کہ آپ کہانی تو سن لیں پسند نہ آئے تو بے شک کام نہ کریں۔''

اتنی دیر میں سنتوش صاحب بھی آ گئے۔ بولے ''کہانی ضرور سنیں اور آفاقی صاحب سے سنیں۔ ان کی سنائی ہوئی کہانی پسند ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

ہم نے کہا''سنتوش صاحب آپ نے ہماری سفارش کرنے کا وعدہ کیا تھا پورس کے ہاتھی نہ بنیں۔''

''میں کچھ نہیں بولتا۔ آپ لوگ جانیں آپ کا کام جانے۔ مجھے بس ایک چائے کی پیالی مل جائے۔''سنتوش صاحب جلدی میں تھے اس لئے چائے پی کر رخصت ہو گئے۔ جاتے جاتے ہم لوگوں سے کہہ گئے ''کئے جاؤ کوشش میرے دوستو''!

طارق صاحب نے کہانی کا خلاصہ سنایا تو صبیحہ خانم کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

''کیوں بھابھی کیسی کہانی ہے؟''

''کہانی تو بہت اچھی ہے اور کریکٹر بھی بہت اچھا ہے ایسے کریکٹر بار بار نہیں ملتے۔''

''اسی لئے تو آپ کے پاس آئے ہیں۔''

کافی دیر بحث مباحثہ جاری رہا۔ طارق صاحب نے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر آپ نے کل تک رضامندی کا اظہار نہ کیا تو بہت بُرا ہو گا۔

''کیا ہو گا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں بس ہم یہ فلم ہی نہیں بنائیں گے۔''

ایک بار پھر بحث اور مذاکرات شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ سنتوش صاحب واپس لوٹ آئے۔'' ارے آپ لوگ ابھی تک گئے نہیں۔ شاید کھانا کھائے بغیر نہیں جائیں گے۔''

ہم نے کہا''سنتوش صاحب جب تک یہ ہامی نہیں بھریں گی اس وقت تک ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔''

وہ بولے ''صبیحہ'' ان کے لئے بوریا بستر کا بندوبست کر دو۔ مہمانوں والا کمرا تو خالی نہیں ہے نوکروں کا ایک کوارٹر خالی ہے وہاں چارپائیاں ڈلوادو ان کیلئے۔'' پھر وہ ہم سے مخاطب ہوئے ''کوئی کپڑا لتّا بھی ساتھ لائے ہیں یا تن کے جوڑے میں آئے ہیں؟''

''سنتوش صاحب' مذاق نہ کیجئے یہ بہت سیریس بات ہے۔ ہم زندگی میں پہلی فلم بنارہے ہیں۔ بھابھی سے پہلی بار کوئی فرمائش کی ہے۔''

انہوں نے کہا''مگر یہ تو سوچیں کہ جب دوسرے اپنی فلموں کے لئے کہیں گے تو ہم انہیں کیا جواب دیں گے؟''

''یہی کہ ایسا کریکٹر ہو گا تو صبیحہ کام کریں گی۔''

وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔''انکم ٹیکس والوں سے تو جان چھوٹ گئی مگر آپ لوگوں سے چھٹتی نظر نہیں آتی۔''

صبیحہ خانم نے کہا'' ان کی کہانی اچھی ہے اور کریکٹر تو ایک چیلنج ہے۔''

''تو پھر آپ یہ کریں گی نا؟''

سنتوش صاحب نے کہا''اب انہیں سوچنے کا موقع تو دیں''

''کل تک سوچ لیں ورنہ۔۔۔''

''ورنہ کیا؟''

''ورنہ آپ کے دروازے پر بھوک ہڑتال کر دیں گے۔'' ہم نے کہا

وہ ہنسنے لگے ''آپ لوگ تو انشورنش ایجنٹ بن جائیں، بہت کامیاب رہیں گے۔''

ہم ان کی کوٹھی سے باہر نکلے تو بہت پُر امید تھے۔ ہم نے کار میں سٹوڈیو جاتے ہوئے پوچھا "طارق صاحب۔ آپ کا کیا خیال ہے صبیحہ بھابھی راضی ہو جائیں گی۔"

"ہنڈرڈ پر سنٹ۔ وہ آرٹسٹ ہیں۔ یہ کریکٹر وہ ہر گز نہیں چھوڑیں گی۔"

دوسرے دن صبیحہ خانم نے فلم میں کام کرنے کی ہامی بھر لی۔ ہم دونوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ ہم نے کہا "سنتوش صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ"

"شکریہ کس بات کا؟" وہ بولے "میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا"۔

ہم نے کہا "غنیمت ہے کہ مخالفت نہیں کی۔"

اس طرح یہ مہم سر ہو گئی۔

سنتوش صاحب نے ہم سے کہا "مولانا مجھے کہانی کب سنا رہے ہیں؟"

ہم نے کہا "جب چاہیں سن لیں۔"

"کل باری سٹوڈیوز میں میرے دفتر میں وقت رکھ لیں۔ لنچ میرے ساتھ ہی کریں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے" ہم نے اخلاقاً کہا۔

"آپ کو تو نہیں مجھے تو ضرورت ہے، بھوکوں کو کھانا کھلا کر ثواب ملتا ہے۔"

دوسرے دن ہم سنتوش پروڈکشنز کے دفتر میں تھے۔ لنچ کے بعد سنتوش صاحب نیم دراز ہو گئے۔ چائے سگریٹ کا دور چلا اور پھر انہوں نے کہا " کافی وقت ضائع کر لیا اب کہانی بھی سنا دیں۔"

ہم نے طارق صاحب کی طرف دیکھا۔

"آپ ہی سنائیں" انہوں نے مشورہ دیا۔

ہم سوچ میں پڑ گئے۔

سنتوش صاحب پوچھنے لگے "کہانی آپ ہی نے لکھی ہے نا؟ تو پھر سنانے میں کیا رکاوٹ ہے رائٹر لوگ کہانی زیادہ اچھی طرح سناتے ہیں مگر ذرا تفصیل سے۔"

ہم نے کہانی سنانا شروع کی ہمیں کہانی سنانے کا ڈھنگ کبھی نہیں آیا بلکہ ہم تو لکھا ہوا اسکرپٹ بذاتِ خود پڑھ کر بھی نہیں سناتے۔ ڈائریکٹر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ خود ہی پڑھ لیتا ہے یا کسی سے پڑھوا کر سن لیتا ہے۔ اس کے بعد جو تبادلہ خیالات کرنا ہو وہ ہو جاتا ہے۔

کمرے میں ہم تینوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ سنتوش صاحب سے کوئی تکلّف بھی نہیں تھا۔ نہ رسمی ماحول تھا۔ پھر بھی ہم نے کہانی سناتے ہوئے غوطے کھانے شروع کر دیئے۔ کبھی کوئی سین بھول جاتے کبھی کوئی اہم واقعہ یاد نہ رہتا اور طارق صاحب لقمہ دیتے۔ سنتوش صاحب پہلے تو سیدھے بیٹھے ہوئے تھے پھر نیم دراز ہو گئے یہاں تک کہ دیوان پر لیٹ گئے۔ ہم نے طارق صاحب کی طرف دیکھا تو وہ خاموش بے تعلقی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ادھر کہانی تھی کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہم کہتے سوری اس سے پہلے ہم یہ بتانا تو بھول ہی گئے۔ یہاں تک کہ سنتوش صاحب کہنے لگے ''حیرت کی بات تو یہ ہے کہ آپ نے اتنی کہانی بھی کیسے یاد رکھی۔ سبھی کیوں نہ بھول گئے۔''

سچ تو یہ ہے کہ ہم خود بھی کہانی سناتے سناتے بور ہو چکے تھے۔ تنگ آ کر ہم نے طارق صاحب سے مدد طلب کی۔

''طارق صاحب آپ کیوں نہیں سنا دیتے پلیز۔''

سنتوش صاحب نے چائے کا آرڈر دیا اور پھر بڑی سنجیدگی سے پوچھا ''آفاقی صاحب یہ کہانی واقعی آپ نے لکھی ہے یا کسی اور سے لکھوائی ہے؟''

ہم نے کہا ''خود ہی لکھی ہے''

بولے ''کافی عرصے پہلے آپ نے آئیڈیا سنایا تھا تو بہت اچھّا تھا۔ اب سکرپٹ لکھنے کے بعد مفصل کہانی سنا رہے ہیں تو نیند آنے لگی ہے یہ کیا معاملہ ہے؟''

''معاملہ یہ ہے کہ ہم رائٹر ہیں یعنی مصنّف داستان گو نہیں ہیں۔'' وہ لاجواب ہو گئے۔

چائے کے بعد طارق صاحب نے نئے سرے سے کہانی سنائی اور اتنی اچھی طرح سنائی کہ خود ہمیں بھی بہت اچھی لگی۔ سنتوش صاحب نے ہم سے کہا ''آپ کیلئے میرا ایک مشورہ ہے بلکہ نصیحت سمجھ لیجئے۔''

''ارشاد ! ''ہم ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''آئندہ بھول کر بھی کسی کو کہانی نہ سنایئے گا ورنہ بے روزگار ہو جائیں گے۔''

فلم کے آغاز میں سنتوش صاحب کا کردار تھا جس کے بعد وہ کار کے حادثے میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔

کہانی سننے کے بعد انہوں نے سگریٹ سلگائی اور مخصوص انداز میں مٹھّی میں دبا کر کش لگانے لگے پھر سنجیدگی سے کہنے لگے '' کہانی تو بہت اچھی ہے مگر مجھے اتنی جلدی مار دیا۔ ''

ہم نے سنجیدگی سے کہا''اسی لئے تو اتنی اچھی ہے۔''

''کیا مطلب'' انہوں نے ہمیں گھورا۔

ہم نے کہا''سنتوش صاحب آپ کے مرنے کے بعد ہی تو اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔ اگر آپ زندہ رہیں گے تو یہ کہانی کیسے چلے گی؟''

''یہ بات تو ہے !'' وہ مان گئے ''بڑے استاد ہو۔ نامعقول بات پر بھی قائل کر لیتے ہو۔ ''

''آپ کی خدمت میں کیا نذرانہ پیش کیا جائے۔ ''

بولے ''نذرانہ نہیں' جرمانہ اتنے چھوٹے سے کام پر تو جرمانہ ہی ہو سکتا ہے۔ ''

بہرحال ہم نے انہیں مہمان اداکار کے طور پر ایک رقم بتائی اور ساتھ ہی ایک تقریر بھی شروع کر دی ''دراصل یہ معاوضہ نہیں ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ ایک گفٹ ہے بات یہ ہے کہ۔۔۔ ''

انہوں نے بات کاٹ دی ''مولانا ! باقی تقریر رہنے دیجئے آپ جو کہتے ہیں بالکل بجا کہہ رہے ہیں۔ ''

''گویا آپ کو منظور ہے ''

''اب اسٹامپ لکھوائیں گے یا قاضی کو بلانا پڑے گا؟''

''چلئے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ ''

ہم نے دوبارہ تقریر چھیڑ دی۔ ''صبیحہ بھابھی کا معاوضہ۔۔۔ ''

انہوں نے ہماری بات کاٹ دی ''میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ وہ جانیں اور آپ جانیں۔ خود ان ہی سے بات

کرلیں۔‘‘ اسی رات ہم دوبارہ صبیحہ خانم کے گھر جا دھمکے۔

ہم سارے راستے طارق صاحب سے کہتے رہے کہ ان سے پیسوں کی بات وہ طے کریں اور وہ ہم سے کہتے رہے کہ پروڈیوسر آپ ہیں اس لئے یہ آپ ہی کی ذمہّ داری ہے۔

کوٹھی پر پہنچ کر جب صبیحہ خانم ڈرائنگ روم میں آئیں تو طارق صاحب بیڈ روم میں سنتوش صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ جاتے جاتے ہمیں اشارہ کر گئے کہ بات کرلیجئے۔

صبیحہ خانم نے ہم سے کہا’’ آپ یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہیں۔‘‘

’’آپ کے انتظار میں ‘‘

’’میرے انتظار میں‘‘ وہ حیران ہو کر بولیں۔

’’جی وہ دراصل مالی معاملات تو ابھی طے ہی نہیں ہوئے۔ ‘‘

’’اچھّا اچھّا‘‘ وہ ہنسنے لگیں۔

ہم نے بات چھیڑی’’ دیکھئے یہ ہماری پہلی پہلی فلم ہے اس لئے آپ ہمارے ساتھ کچھ لحاظ کریں۔‘‘

’’کیا میں آپ کا لحاظ نہیں کرتی۔ اتنی عزّت تو کرتی ہوں۔ ‘‘

’’ہمارا مطلب یہ ہے کہ پیسوں کے معاملے میں۔ ‘‘

طارق صاحب دوسری طرف چلے تو گئے تھے مگر ان سے نہ رہا گیا تو اٹھ کر وہیں چلے آئے۔ اب مشکل یہ تھی کہ رقم نہ وہ بتا رہی تھیں اور نہ ہم بتا رہے تھے۔ طارق صاحب نے اپنی طرف سے ایک رقم بتائی جو انہوں نے منظور کرلی۔ یہ رقم اتنی تھی کہ ہماری فلم کے دونوں ہیروز اور ایک ہیروئن کا معاوضہ ملا کر بھی اس سے کم تھا۔ ہم تلملا کر رہ گئے۔

واپسی پر ہم خاموش سے تھے۔

’’کیوں ٹھیک ہو گیا نا؟‘‘ طارق صاحب نے پوچھا۔

’’ٹھیک تو ہے مگر یہ تو بہت زیادہ ہے۔ ‘‘

وہ بولے’’ آفاقی صاحب آپ کو تو معلوم ہے کہ جب ہیروئن تھیں تو وہ کتنا معاوضہ لیا کرتی تھیں۔ دنیا کے دوسرے

ملکوں میں تو کریکٹر کرنے پر بھی بڑے فن کاروں کا معاوضہ کم نہیں ہوتا مگر ہمارے ہاں حساب ہی الٹا ہے۔ سینئر اور تجربہ کار فن کاروں کو نئے آنے والے ہیرو اور ہیروئن کے مقابلے میں کم معاوضہ دیا جاتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا معاوضہ کم ہوتا جاتا ہے۔''

ہم چپ رہے۔ان کی بات بالکل درست تھی۔

وہ جوش میں آکر بولے۔'' صبیحہ بہت بڑی آرٹسٹ ہے۔انڈیا میں بھی اس کے مقابلے کی آرٹسٹ نہیں ہے۔ یہ کریکٹر صبیحہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔انہوں نے ہمارا بہت لحاظ کیا ہے ورنہ وہ جو بھی کہتیں وہ کم تھا۔''

حسن طارق میں یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ فنکاروں کے قدردان تھے۔ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ انہیں سبھی کچھ دے دیں لیکن ہماری فلموں کے پاکستانی فلم ساز فن کار ایسے بھی تھے جن کے مقام کی مناسبت سے وہ بدرجہا زیادہ معاوضے کے حق دار تھے۔

اب ہماری فلم '' مجبور'' کا نام ''کنیز'' ہو چکا تھا اور اس میں اب صبیحہ خانم مرکزی کردار سرانجام دے رہی تھیں۔ صبیحہ خانم کے راضی ہونے کے بعد ہمارے دل پر سے جیسے ایک بہت بھاری بوجھ ہٹ گیا۔یہ ایک ایسا کارنامہ تھا کہ جس نے بھی سنا حیران رہ گیا۔وہ کئی فلم سازوں کے پُرزور اصرار کے باوجود صاف جواب دے چکی تھیں مگر ہم تو جیسے بقول سنتوش صاحب ''بیری کی جھاڑی کی طرح'' ان کے پیچھے پڑ گئے تھے۔اور بالآخر انہیں منا کر ہی دم لیا۔

شاعر کا یہ کہنا' ہمارے لئے بالکل درست ثابت ہوا تھا کہ ہمّت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ محمد علی صاحب کی فلم ''چراغ جلتا رہا'' کی نمائش کے بعد انہیں ویلن کے طور پر کراچی کی فلموں میں کردار ملنے لگے تھے' وجہ وہی بھیڑ چال تھی۔وہ اپنی پہلی فلم میں ویلن کے طور پر کاسٹ کئے گئے تھے۔اس لئے ان پر ویلن کا ٹھپّا لگ گیا جو کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتا جا رہا تھا۔کچھ عرصے کے بعد محمد علی کراچی سے لاہور آئے تو جس نے انہیں دیکھا ان کا مدّاح ہو گیا۔ صورت' شکل' دراز قامت' چال ڈھال' انداز و اطوار' آواز اور لب ولہجہ کی وجہ سے وہ ہر جگہ نمایاں تھے۔ سرخ و سفید رنگت' گفتگو کا شائستہ اور دلکش انداز' خوش لباس' بنے بنائے ہیرو تھے۔مردانہ وجاہت ان پر ختم تھی لیکن ان کی شخصیت میں چاکلیٹ ہیرو والی کوئی بات نہ تھی۔جس نے دیکھا اور ان سے ملا یہی فیصلہ دیا کہ محمد

علی کی شکل میں پاکستان کی فلمی صنعت کو ایک بہت اچھّا ویلن مل گیا ہے۔ حالانکہ ان کی شخصیت میں ایسا مردانہ وقار اور بانکپن تھا کہ وہ ہیرو پر بھی حاوی نظر آتے تھے۔

لاہور میں محمد علی نے "انڈس ہوٹل" میں قیام کیا۔ مال روڈ پر واقع اس ہوٹل کا نام پہلے انفسٹن ہوٹل تھا اور یہ قیام پاکستان سے پہلے بھی لاہور کا ایک اچھا ہوٹل سمجھا جاتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد الیاس رشیدی صاحب لاہور آتے تو وہ بھی اسی ہوٹل میں قیام کرتے تھے۔ اوّل تو اس زمانے میں سبھی ہوٹلوں کے کرائے معقول اور بہت کم تھے لیکن انفسٹن ہوٹل اپنے جائے وقوع، کرایوں کی معقولیت اور سروس وغیرہ کے اعتبار سے بہت ہی مناسب تھا۔ لاہور کے مرکز میں واقع ہونے کیوجہ سے آمدورفت میں بھی کوئی مشکل نہ تھی۔ یہاں ٹرانسپورٹ بہت آسانی سے دستیاب ہو جاتی تھی پھر یہ کہ لاہور کے دل مال روڈ کی زینت تھا۔ اس میں کمروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی اس لئے زیادہ ہجوم بھی نہیں تھا۔ کچھ عرصے بعد اسے از سرنو تعمیر و مرمت کے بعد انڈس ہوٹل کا نام دیا گیا تو یہ بالکل نیا بن گیا۔ کمرے آرام دہ اور روشن تھے۔ نچلی منزل پر ڈائننگ ہال تھا اور یہیں ایک کونے میں بار بھی تھا۔ شراب کے بار اس زمانے میں ہر ہوٹل اور کلب کے ساتھ نتھّی ہوتے تھے اور "معزّزین" وہاں بڑے ٹھاٹ سے بیٹھ کر مے نوشی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ پابندی بھی نہیں تھی کہ محض ہوٹل میں قیام کرنے والے ہی "بار" سے مستفیض ہو سکتے ہیں، ہر ایک کے لئے صلائے عام تھی۔

اس زمانے کا لاہور بھی پرانی وضع کا پابند تھا ابھی لاہور میں پلازے اور اونچی اونچی عمارتیں بننی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ مال روڈ اور میکلوڈ روڈ کے کونے پر ٹیلی فون ایکسچینج کی ایک بلند عمارت تعمیر ہوئی تھی۔ نیشنل بنک کی عمارت ابھی زیر غور تھی۔ مال روڈ صحیح معنوں میں "ٹھنڈی سڑک" تھی۔ سڑک کے دونوں طرف صاف ستھرے فٹ پاتھ اس کے بعد گھاس کے تختے جو موسم گل میں پھولوں سے بھی سجائے جاتے تھے، ہم جیسے لوگ ان گھاس کے قطعات پر دوستوں کے ساتھ بیٹھے مال روڈ کی سیر دیکھتے اور گپ شپ کرتے رہتے تھے۔ یہ بھی ایک تفریح تھی۔ فٹ پاتھوں پر سے ہر قسم کے لوگ گزرتے رہتے تھے۔ یہاں گھومنا، سیر کرنا یا محض گشت ہی لگا لینا بھی ایک کلچرل سرگرمی تھی۔ ادیب، شاعر، فن کار، صنعت کار، فلم والے، صحافی، سیاستدان کون تھا جو رات اور دن میں کسی وقت بھی یہاں

نظر نہ آئے۔ بڑے بڑے دانش ور جن سے ویسے ملاقات کی ہمت ہی نہ پڑتی تھی یہاں چھڑی ہاتھ میں لئے یا کسی دوست کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے ہوئے نظر آجاتے تھے۔ ہم جیسے نو آموز لوگ ادب سے سلام کرتے' وہ بڑی خوش خلقی سے احوال دریافت کرتے اس طرح کچھ دوران کے ہم قدم ہونے کا موقع اور شرف حاصل ہو جاتا تھا اس سے فائدہ اٹھا کر ہم کوئی سوال بھی کر لیتے تھے یا پھر ملاقات کا وقت لے لیا کرتے تھے۔ لیجئے ایک بہت مشکل مرحلہ مال روڈ پہ نہایت آسانی اور خوش اسلوبی سے حل ہو جاتا تھا۔

مال روڈ پر واقع ریستوران لاہور کا دل تھے۔ کون سی قابل ذکر ہستی تھی جو یہاں نظر نہ آجاتی تھی۔ مختلف اصحاب کے مختلف ٹھکانے تھے نوجوان لوگ تہذیب اور علم سیکھنے کے لئے کافی ہاؤس' ٹی ہاؤس' عرب ہوٹل' کیفے اورینٹ' انڈس ریستوران' لارڈز' شیزان اور میٹرو وغیرہ میں جا کر ایک طرف بیٹھ جاتے اور ان بڑے لوگوں کی باتیں سنا کرتے۔ موقع پر جرأت پا کر کوئی سوال بھی کر ڈالتے۔ انفسٹن ہوٹل ہی کے باہر والے گھاس کے تختے پر ایک شام ہم اور الیاس رشیدی صاحب بیٹھے ہوئے تھے جب انہوں نے یہ دھماکہ خیز انکشاف فرمایا تھا کہ اعجاز اور نور جہاں کی شادی ہو گئی ہے۔ ان دنوں نہ کاروں کا ہجوم' دھواں اور شور تھا' نہ ٹریفک کا اژدھام' زندگی بڑے سلیقے اور قرینے سے مال روڈ پر سے گزرتی رہتی تھی۔ اسی مال روڈ کے سابق انفسٹن اور حالیہ انڈس ہوٹل میں کراچی سے آ کر محمد علی نے ایک نمبر کمرا حاصل کیا اور کافی عرصے اس میں رہتے رہے۔ ان دنوں ان کی کراچی اور لاہور کے درمیان میں آمد و رفت لگی رہتی تھی مگر وہ جب بھی لاہور آتے ان کے لئے انڈس ہوٹل کا ایک نمبر کا کمرا فراہم کر دیا جاتا تھا۔ گویا لاہور میں وہ آغاز ہی سے ''ایک نمبری'' تھے۔ محمد علی کچھ وقت سمن آباد میں ایس ایم یوسف صاحب کے پارٹنر فلم ساز سردار فیروز کی کوٹھی پر بھی رہے تھے۔ لاہور میں سردار فیروز بھی چھڑے تھے اور محمد علی بھی، دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ خدا جانے سردار فیروز کسی پیلی ٹیکسی کے مالک تھے یا انہوں نے مستقل طور پر ٹیکسی حاصل کر رکھی تھی۔ یہ ٹیکسی سردار صاحب کی کوٹھی پر ہی کھڑی رہتی تھی۔ ہم نے اسی پیلی ٹیکسی میں محمد علی صاحب کو ڈرائیو کرتے اور لاہور کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ ان دنوں وہ اتنے معروف نہیں تھے کہ دیکھنے والے انہیں پہچان جاتے لیکن ایک خوش پوش جوان رعنا کو پیلی ٹیکسی کے ڈرائیور کے روپ میں دیکھ کر لوگ حیران ضرور ہوتے تھے۔ یہ

ٹیکسی ڈرائیور کسی کے اشارے پر نہیں رکتا تھا اور نہ ہی کوئی سواری بٹھاتا تھا۔ اس کا میٹر بھی کپڑے سے ڈھکا رہتا تھا۔
محمد علی لاہور آئے، ہم نے انہیں دیکھا اور انہوں نے ہمیں فتح کر لیا۔ جلد ہی ہمارے مراسم استوار ہو گئے۔ ہم لاہور اور یہاں کی فلمی دنیا کے ''رازداں'' تھے۔ اس لئے وہ مختلف لوگوں اور اداروں کے بارے میں ہم سے دریافت کرتے رہتے تھے اور ہم حسب توفیق انہیں سچّائی سے ہر ایک کے بارے میں معلومات فراہم کرتے رہے۔ یہ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ خود ان کی نظر بھی بہت گہری اور شعور کافی پختہ تھا۔ ہر شخص کے بارے میں وہ بہت جلد رائے قائم کر لیتے تھے۔ حالانکہ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ محمد علی کو شروع ہی سے ہم نے ایک ایسا شخص پایا جو اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں بہت محتاط رہتا ہے۔ ان کے دل میں کیا ہے؟ وہ کسی کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟ ان کی رائے کیا ہے؟ یہ کوئی نہیں جان سکا۔ اس لحاظ سے انہیں ایک ''پُراسرار'' اور گہرا آدمی کہا جا سکتا ہے۔
محمد علی کو فلم ساز و ہدایت کار ریاض نے اپنی فلم ''غدار'' میں 'دو میں سے ایک ہیرو کے کردار کے لئے سائن کیا تو انہیں لاہور آنے اور یہاں قیام کرنے کا ایک معقول بہانہ مل گیا۔ دوسرے ہیرو سدھیر تھے، یہ تو وہ جان ہی گئے تھے کہ اگر پاکستان کی فلمی دنیا میں کامیابی حاصل کرنی ہے تو لاہور ہی اس کے لئے مناسب جگہ ہے۔ کراچی سے جو بھی ابھرتا تھا وہ کچھ وقت کے بعد لاہور کا رخ کرتا تھا۔ محمد علی نے بھی ایسا ہی کیا، لیکن ایک محتاط اور فہمیدہ شخص کے طور پر اولاً اولاً انہوں نے کراچی کو بھی خیر باد نہیں کہا۔ گویا اب ان کے دونوں کشتیوں میں پیر تھے۔
آغاز میں انہیں لاہور میں فلمیں تو نہیں ملیں البتہ ملاقاتی، دوست اور مدّاح ڈھیروں مل گئے۔ ان کے کمرے میں ہر وقت یار لوگوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ خوش دلی سے میز بانی کرتے تھے۔ کافی اور چائے تو خیر ہر وقت ہی چلتی تھی۔ لنچ کا وقت ہے تو کھانا، ڈنر کا وقت ہے تو ڈنر اور سر شام ہی '' محفل''۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بہت سے لوگ ان کی میز بانی اور شرافت سے فائدہ اٹھا کر اتنے بے تکلّف ہو گئے کہ ان کی غیر موجودگی میں بھی کمرے میں براجمان رہتے تھے۔ مزے سے لیٹے ہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ٹیلی فون کر رہے ہیں ، محمد علی کے حساب میں خود بھی کھا پی رہے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ اپنے دوستوں کو بھی بے تکلفی سے وہاں مدعو کر رہے ہیں۔
ایک دن اتفّاق سے ہم دونوں کمرے میں اکیلے تھے۔ ہم نے شکایت کی '' بھائی، آپ کے کمرے میں ہر وقت لوگ

بھرے رہتے ہیں ہر ایک کے لئے دعوت عام ہے۔‘‘

بولے ’’آفاقی یہ تو میرے لئے بڑی خوشی اور اعزاز کی بات ہے کہ لاہور والوں نے مجھے اپنالیا ہے۔ کس قدر بے تکلفی اور خلوص سے ملتے ہیں۔ ہر وقت دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے‘‘

ہم نے کہا ’’معاف کرنا یہ سب ضرورت منداور شکاری ہیں انہیں ایسے ’’شکار‘‘ کی ہمیشہ تلاش رہتی ہے‘‘

’’کیا مطلب ؟‘‘ انہوں نے بھویں چڑھا کر پوچھا۔

ہم نے کہا ’’مطلب یہ کہ پہلے اس کے جواب میں ایک لطیفہ سن لیجئے۔ قیام پاکستان سے پہلے لکھنو میں ایک نواب صاحب رہا کرتے تھے۔ ظاہر ہے خاندانی نواب تھے اس لئے شاہ خرچ بھی تھے۔ داد و عیش کرتے تھے۔ لوگوں کی امداد اور سرپرستی ان کا شیوہ تھا۔ ایک پہلوان صاحب بھی ان کی فیاضی کے طفیل پرورش پا رہے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد نواب صاحب بھی ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں قیام کیا۔ وہ اپنے ہمراہ بہت کچھ لے کر آئے تھے۔ اس لئے عیش و آرام سے رہنے لگے مگر پرانی محفلوں اور وقتوں کو یاد کرتے تھے۔

ایک دن نوکر نے اطلاع دی کہ حضور فلاں پہلوان صاحب ملاقات کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ لکھنو میں بھی آپ کے حاشیہ نشینوں میں تھے۔

نواب صاحب خوشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ فوراً اٹھ کر ڈرائنگ روم میں گئے۔ پہلوان صاحب تسلیمات بجالائے۔ ان کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد نواب صاحب نے پوچھا ’’اب یہاں ذریعہ معاش کیا ہے ؟‘‘

انہوں نے عرض کیا ’’حضور آپ ہی کے در پر پڑا رہوں گا۔ کوئی کوٹھری عنایت کر دیں گے تو بیوی بچّوں کے ہمراہ سر چھپالوں گا اور ہم آپ کے اقبال کو دعائیں دیا کریں گے‘‘

نواب صاحب نے فوراً ان کی رہائش وغیرہ کے لئے احکامات صادر کئے اور کہا کہ بے فکر ہو کر رہو کھاؤ پیو‘ عیش کرو‘ بال بچوں کو بھی لے آؤ۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تمہارے پاس نہ میرا اپتا تھا نہ نشان‘ اتنے بڑے ملک میں اتنا بڑا شہر کراچی ہے‘ تم میرے گھر تک کیسے پہنچ گئے ؟‘‘

پہلوان صاحب نے سادگی سے عرض کیا ’’سرکار مجھے تو کوئی مشکل ہی پیش نہیں آئی۔ ریلوے سٹیشن پر ٹرین سے

اترتے ہی میں نے پوچھا کہ بھائی میاں' یہاں بگڑے رئیسوں کا ڈیرا کہاں ہے؟ بس انہوں نے سرکار کا پتا بتا دیا''
محمد علی صاحب یہ حکایت سن کر مسکرائے۔ پھر سوچ میں پڑ گئے اس کے بعد بولے ''تمہارا مطلب ہے کہ۔۔۔''
ہم نے بات کاٹ کر کہا'' جی ہاں ہمارا وہی مطلب ہے جو آپ سمجھے ہیں۔ بھائی یہ لوگ آپ کی محبت میں یہاں نہیں آتے۔ اپنی ضرورت سے آتے ہیں، کھاتے ہیں' آرام کرتے ہیں' بہترین انگریزی شراب سے شوق فرماتے ہیں۔ نہ کوئی فکر نہ فاقہ 'ایسا دوسرا انہیں اور کون ملے گا؟''
وہ سنجیدہ ہو گئے ''مگر یہ سب میرے مہمان ہیں''
ہم نے کہا'' یہ مہمان نہیں ڈیرے دار ہیں۔ آپ ذرا اپنا ہاتھ روک لیں ہوٹل والوں کو ہدایت کریں کہ آپ کی غیر موجودگی میں کوئی کمرے میں نہ آئے سوائے آپ کی خصوصی ہدایت کے۔ کچھ دن شام کے وقت کمرے میں غیر حاضر رہیں۔ آپ کے پاس کون سا قارون کا خزانہ ہے نہ ہی کسی ریاست یا جاگیر کے نواب ہیں''
محمد علی سمجھ تو گئے کچھ محتاط بھی ہو گئے مگر پھر بھی ''ڈیرے داروں'' کی خاطر مدارت سے باز نہ آئے۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی مہمانداری کرانے سے باز نہیں آئے۔

محمد علی کے بارے میں ہمیں معلوم تھا کہ وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں مالدار آدمی نہیں ہیں بلکہ پاکستان پہنچ کر تو خاصے نامساعد حالات کا شکار رہے۔ مگر ان کی شاہ خرچی اور فیاضی دیکھ کر سب ہی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے تھے۔ اس وقت تک وہ ''سٹار'' نہیں بنے تھے۔ آمدنی کا کوئی بڑا ذریعہ بھی نہیں تھا۔ سستا زمانہ سہی مگر پھر بھی خدا جانے وہ ان اخراجات کے لئے پیسہ کہاں سے لاتے تھے؟
اس سلسلے میں ایک لطیفہ اور سن لیجئے۔
لکشمی چوک پر ایک باربر شاپ تھی۔ ہم 1951ء سے اسی دکان سے کٹنگ کراتے تھے۔ (حجامت کراتے تھے صحیح لفظ ہے) یہ دکان صاف ستھری تھی۔ اس کے مالک اس وقت جوان تھے۔ انہوں نے چار پانچ کارندے بھی رکھ چھوڑے تھے مگر اوّل روز سے ہمارے بال وہی تراشتے تھے۔ وقت گزرتا رہا ان کی دکان بھی اچھی اور پھر بہت اچھی ہو گئی۔ ہمارے حالات بھی بہتر ہو گئے۔ پہلے ہم صحافی تھے پھر فلم سٹوری رائٹر بنے یہاں تک کہ پروڈیوسر بن گئے۔

کسی وقت پیدل گھوما کرتے تھے یا بسوں میں سفر کرتے تھے پھر رکشا اور ٹیکسی میں بیٹھنے لگے یہاں تک کہ کار سوار ہو گئے۔

اُس زمانے میں جن لوگوں کے پاس پیسے آجاتے تھے ان میں سے اکثر لکشمی چوک چھوڑ کر مال روڈ کے فیشن ایبل باربرز کی دکان کارخ کر لیتے تھے مگر ہم نے ماسٹر جی کو نہ چھوڑا۔ دو تین بار تجربے کے لئے بعض دوستوں کے ساتھ مال روڈ اور ہال روڈ کے بڑے دکانداروں کے پاس بھی گئے جہاں اس زمانے میں سات آٹھ روپے کٹنگ کا ریٹ تھا ۔وہ شیمپو بھی کرتے تھے۔ وہاں ماحول بھی بہت خوب صورت اور رومانٹک ہوتا تھا مگر ہم نے ماسٹر جی والی بات کہیں نہ پائی۔ وہ ہمیشہ بذات خود ہماری کٹنگ بڑے اہتمام، توجہ اور پیار سے کیا کرتے تھے۔ کسی شاگرد کو ہمارے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ ہاں جس روز ماسٹر جی دکان سے غائب ہوں اور ہمیں جلدی ہوتی تھی تو ان کے کسی ہونہار شاگرد سے حجامت کرا لیتے تھے۔ اس دکان میں ہم شیمپو بھی کراتے تھے اور تمام چیزوں کے عوض پہلے بارہ آنے' پھر ڈیڑھ روپیہ اور آخر میں تین روپے دیا کرتے تھے۔ ماسٹر جی نے ہم سے کبھی ریٹ بڑھانے کو نہیں کہا، البتہ ان کی دکان میں ایک بلیک بورڈ پر ریٹ لکھ دیئے جاتے تھے اور ہم اس کے مطابق خود ہی بلا کہے سنے ریٹ میں اضافہ کر دیتے تھے۔ شروع میں چار آنے اور بعد میں آٹھ آنے ٹپ بھی دیتے تھے لیکن صرف شاگردوں کو' ماسٹر جی آخر دکان کے مالک تھے۔ انہیں ٹپ دینا پروٹوکول کے خلاف تھا وہ خود بھی بہت بے نیاز تھے۔ کافی عرصے کے بعد تو وہ صحیح معنوں میں خلیفہ بن گئے تھے۔ دکان میں ایک طرف بینچ پر بیٹھے نماز پڑھتے رہتے یا آنے جانے والوں سے باتیں کیا کرتے۔

اس دکان میں حمّام بھی تھا اور بہت سے لوگ محض غسل کی غرض سے بھی آیا کرتے تھے۔ ماسٹر جی ان کے لئے گرم اور ٹھنڈے پانی کا اہتمام کراتے' پہلے پانی کی حرارت بذات خود چیک کرتے اور پھر گاہک کو نہانے کی اجازت دیتے۔ جب انہوں نے دکان کو ''ماڈرن کٹنگ سیلون'' میں تبدیل کیا تو ہر چیز جدید زمانے کے مطابق ہو گئی۔ اوپر نیچے ہونے والی کرسیاں' خوبصورت آئینے' سامنے واش بیسن جس میں شیمپو کیا جاتا تھا۔ ہر طرح کا شیمپو ماسٹر جی کی دکان میں موجود ہوتا تھا۔ وہ خود بھی ایک شیمپو تیار کرتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ اس کے استعمال سے بال نہیں جھڑتے مگر

ہمارے لئے وہ ہماری پسند کا شیمپو الگ سے خرید کر لا کر رکھ دیتے تھے۔ ہمارے جاتے ہی تازہ دھلے ہوئے تولئے بڑے اہتمام سے نکالے جاتے۔ بالکل اجالا سفید براق کڑکڑاتا ہوا کپڑا ہماری گردن کے ارد گرد باندھا جاتا پھر ماسٹر جی بڑے غور و خوض کے ساتھ ہمارے بال مختلف قینچیوں کی مدد سے کاٹتے تھے۔ کالر کے اندر روئی بھی رکھ دیتے تھے۔ یہ سب اہتمام اس دکان میں صرف ہمارے ہی لئے ہوتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ ماڈرن تقاضے ہیں اور اگر ہم نے ماڈرن دکانوں کا رخ نہیں کیا تو وہ اسی دکان میں ہمیں جدید ترین سروس کیوں نہ فراہم کریں؟ انہیں ہماری نازک مزاجی اور نفاست طبع کا بھی بخوبی علم اور احساس تھا۔ اس لئے ہر طرح ہمیں مطمئن اور خوش رکھنا چاہتے تھے۔

شیمپو کے لئے دوسرا تولیا استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک گھٹنوں پر بچھایا جاتا اور دوسرے چھوٹے تولئے سے ہمارا سر اس طرح لپیٹ کر خشک کرتے کہ کیا مجال جو ایک چھینٹ یا بوند بھی لباس پر پڑ جائے۔ شیمپو کرنے کے بعد جب وہ ہمارا سر دھوتے تو عکس کرنے میں کبھی پانی زیادہ ٹھنڈا ہو جاتا تھا اور کبھی زیادہ گرم۔ ہمارے سر کی حرکت سے وہ جان لیتے تھے کہ پانی ہمارے مطلب کا نہیں ہے۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے یہ طریقہ نکالا کہ دو جگ بھر کر پانی پہلے ہی تیار کرا لیتے تھے۔ ہم پانی میں انگلی ڈال کر چیک کرتے اور منظوری دیتے۔ پھر ان کا ایک شاگرد جگ سے پانی ڈالتا رہتا اور ماسٹر جی سر دھونے کا فریضہ سرانجام دیتے۔ شیمپو سے پہلے وہ چند منٹ زیتون کے تیل سے ہمارے سر کی مالش بھی کرتے تھے اور ایسی مہارت سے مالش کرتے کہ ہماری آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔ جب ایسا وی آئی پی برتاؤ کیا جا رہا ہو تو اس دکان کو چھوڑ کر ہم بھلا کہاں جا سکتے تھے؟ پھر یہاں سیاست، فلم، ادب اور صحافت پر جو تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا وہ الگ۔۔۔ لگ بھگ ہم پچیس تیس سال تک بطور خاص لکشمی چوک پر ان سے کٹنگ کرانے کے لئے جاتے رہے۔ پھر لاہور کا ٹریفک حد سے زیادہ پر ہجوم اور بے ہنگم ہو گیا اور ہم نے کسی اور کام کے سلسلے میں لکشمی چوک کا رخ کرنا ہی بالکل بند کر دیا تو ماسٹر جی کی دکان کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ مگر اس عرصے میں ماسٹر جی اور ہم دونوں کے بال سفید ہو گئے تھے۔

ماسٹر جی کے بچے جوان ہو گئے۔ دو لڑکے باہر چلے گئے، ایک جرمنی میں تھا، دوسرا پیرس میں، ہم جب کبھی ملک سے باہر جا کر واپس آتے اور ماسٹر جی کو معلوم ہوتا تو بڑے اشتیاق سے پوچھتے ''آفاقی صاحب وہاں پیرس میں میرے

بیٹے سے ملاقات ہوئی تھی؟''

جیسے کہ پیرس کوئی گاؤں تھا جہاں پہنچتے ہی ان کے بیٹے سے ملاقات ہونا لازم تھا۔ ہم ماسٹر جی کی سادگی کا خیال کر کے بات ٹال دیتے تھے ''بس ماسٹر جی کیا بتائیں وقت بہت کم تھا اور مصروفیت اتنی زیادہ کہ کسی سے ملنے ملانے کا ہوش ہی نہیں تھا۔''

''آفاقی صاحب کبھی وقت نکال کر جائیں آپ کی بڑی خدمت کرے گا میرا بیٹا بڑا سعادت مند ہے''

ماسٹر جی کا نام ہم نے کبھی نہیں پوچھا۔ نہ انہوں نے بتایا۔ ہمارے سامنے کبھی کسی نے انہیں نام لے کر مخاطب بھی نہیں کیا۔ شاگرد بھی ''استاد جی'' ہی کہا کرتے تھے تمام گاہکوں کے لئے وہ ''ماسٹر جی'' تھے غضب کے باتونی تھے اور ہر موضوع پر یوں بے تکان بولتے تھے کہ عقل حیران رہ جاتی تھی۔ ہم سر جھکائے بیٹھے ''ہوں ہاں'' کرتے رہتے تھے۔ ماسٹر جی کچھ دیر کے بعد اپنی قینچی روک لیتے اور سامنے آکر کھڑے ہو جاتے اور کہتے ''لیجئے اب آپ بول لیجئے'' یہ گویا بات چیت کا وقفہ ہوتا تھا۔

ماسٹر جی یکطرفہ اظہار خیال کے قائل نہ تھے دوسرے کو بھی بولنے کا پورا موقع دیتے تھے۔ اب تو سالہا سال گزر گئے ہیں کبھی ادھر سے گزر ہوتا بھی ہے تو ان کی دکان پر دور سے ایک نظر ضرور ڈال لیتے ہیں اب وہاں نہ پارکنگ کے لئے جگہ ہے اور نہ ہی کاروں' بسوں اور ویگنوں والے رکنے کی مہلت دیتے ہیں۔ اکثر سوچا کہ خاص طور پر ماسٹر جی سے ملاقات کے لئے جائیں اور ایک آدھ حجامت بنوا لیں مگر زمانہ رکنے ہی نہیں دیتا۔ خدا جانے اب وہ کس حال میں ہیں۔

لیجئے محمد علی کے ذکر سے ''ماسٹر جی'' کا تذکرہ نکل آیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ جب محمد علی ابتدا میں لاہور آئے اور انڈس ہوٹل کے کمرا نمبر ایک میں انہوں نے ڈیرا جمایا تو حجامت کرانے کے لئے انہیں باربر کی ضرورت پیش آئی۔

ہوٹل کا ہر بیرا ان کی خدمت بجالا کر فخر محسوس کرتا تھا۔ ایسی بات بھی نہیں ہے کہ وہ بڑے مشہور و معروف فلم سٹار بن گئے تھے دراصل ان کا رکھ رکھاؤ اور رئیسانہ آن بان سے ہر کوئی متاثر ہو جاتا تھا۔ جن دنوں دو چار آنے کی ٹپ کافی خیال کی جاتی تھی وہ جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکال کر ٹپ دے دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہر بیرا ان کے اشاروں پر چلتا تھا ہوٹل کا ایک موٹا سا نوجوان بیرا اُن کا خصوصی بیرا بن گیا تھا۔ ایک بار اس کی ڈیوٹی کسی اور منزل پر لگا

دی گئی۔

وہ ایک دو روز نظر نہ پڑا تو محمد علی صاحب نے حاضر خدمت بیرے سے دریافت کیا۔اس نے اس کے تبادلے کی اطلاع دی اور محمد علی صاحب نے فون اٹھا کر منیجر سے ملایا۔ ''دیکھیئے میں محمد علی بول رہا ہوں۔ آپ نے غلام علی کو کہیں اور لگا دیا ہے اس کی ڈیوٹی اسی فلور پر لگا دیں پلیز''

منیجر بھی ان کا مدّاح تھا۔ فوراً حکم کی تعمیل کر دی۔ جو بیرا ایک دو روز ان کی خدمت میں رہا تھا اس کی مایوسی دیکھی تو محمد علی نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر اس کے حوالے کیا اور کہا ''میرے لئے سگریٹ تم ہی لایا کرو'' مطلب یہ کہ اس بہانے اسے بھی ٹپ ملتی رہے۔

ان کے طور طریقے ہی ایسے تھے کہ سارے ہوٹل کے ملازمین میں چرچا ہو گیا۔ غلام علی نے محمد علی کی فرمائش پر ان کی کٹنگ کے لئے ماسٹر جی کی دکان سے رجوع کیا۔ ایک دو بار تو ماسٹر جی خود ہوٹل گئے مگر پھر اپنے شاگرد خاص رحمن کو محمد علی کی خدمت پر مامور کر دیا۔

ایک بار ہم دکان پر کٹنگ کرانے گئے تو ماسٹر جی شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ رحمن نے موقع غنیمت جانا اور اپنا گاہک کسی اور کے حوالے کر کے فوراً ہمیں اپنی خدمت میں پیش کر دیا۔ ہم بھی اخلاقاً سر جھکا کر بیٹھ گئے اب جو رحمن نے باتیں شروع کیں تو پچھلی ساری کسر پوری کر دی۔ فلم اور سیاست کا کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک رحمن نے پوچھا ''آفاقی'' صاحب کیا محمد علی بہت رئیس آدمی ہے؟''

ہم نے پوچھا ''کیوں؟ تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟''

بولا ''آفاقی صاحب میں ان کی کٹنگ کرنے جاتا ہوں تو بیس روپے نکال کر دیتے ہیں بڑا شاہ دل بندہ ہے''

ہم نے کہا ''ہاں وہ دل کا بھی رئیس ہے''

بزرگوں سے سنا تھا کہ جو شخص جتنا خرچ کرتا ہے اللہ اسی حساب سے اس کو دیتا ہے۔ محمد علی کو دیکھ کر اس کہاوت پر یقین آ جاتا ہے۔ محمد علی کو ہم نے جب سے دیکھا بے دریغ پیسہ لٹاتے دیکھا۔ قدرت محمد علی سے بھی زیادہ فیاض ہے۔ لوگ سمجھتے تھے یہ شخص سب کچھ لٹا کر فقیر ہو جائے گا مگر اللہ نے اسے اتنا دیا کہ لٹانے سے بھی کوئی کمی نہ ہوئی بلکہ

اس کی دولت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ محمد علی نے جب سے فلمی دنیا میں قدم رکھا ہے کسی میدان میں ناکامی کا منہ نہیں دیکھا اور پیسہ، تو ایسا ٹوٹ کر برسا کہ ڈوب گیا میخانہ بھی۔ معاف کیجئے مصرع میں تحریف کرلی ہے۔ مصرح یوں ہے۔۔

ایسا ٹوٹ کے برسا بادل ڈوب گیا میخانہ بھی

مطلب یہ کہ پیسے کی محمد علی کو پھر کبھی کمی نہ ہوئی حالانکہ یہ شخص پیسے کا سخت دشمن ہے۔

ہم نے محمد علی کی بات چیت سنی' چال ڈھال دیکھی طور طریقوں کا جائزہ لیا تو احساس ہوا کہ ارے یہ شخص تو ہماری فلم ''کنیز'' کے کردار کے لئے اتنا فٹ ہے جیسے کہ انگوٹھی میں نگینہ' وہ اپنے نواب اور جاگیر دار دادا کے محل میں پلتا ہے، دادا سے تفاخر' غرور' آن بان اور سوچنے کا انداز بھی سیکھ لیتا ہے۔ دیکھنے میں بھی نوابزادہ لگتا ہے ہم نے پہلے اس کردار کے لئے حبیب کا انتخاب کیا تھا مگر حبیب اپنے قدو قامت کے باوجود رئیسانہ شان سے محروم تھے۔ محمد علی تو جیسے کہ بنے بنائے نواب زادے تھے۔ خوب رو' خوش اطوار' چال ڈھال' آواز' نشست و برخاست سب رئیسانہ ،ادھر حبیب صاحب ایک بات پر ہم سے ناراض بھی ہوگئے اور بعد میں مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ گئی۔ یہ داستان پھر کبھی بیان ہوگی۔ ہمیں تو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ ہماری فلم میں رکاوٹ ہی اس لئے پیدا ہوئی تھی کہ ہم محمد علی کو اس کردار میں کاسٹ کریں۔ اللہ کی مصلحت کوئی انسان کہاں جان سکتا ہے ہم جس رکاوٹ کو مصیبت سمجھ رہے تھے وہ ہمارے لئے راحت اور کامیابی کا ذریعہ بن گئی۔

ہم نے محمد علی کا چند روز بغور جائزہ لیا اور پھر ایک دن ہم دونوں کمرے میں اکیلے بیٹھے تھے تو ہم نے اپنی فلم کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

''اس میں ایک کردار تمہیں بہت سوٹ کرتا ہے''

وہ ہنسنے لگے'' چھوڑو یار تمہاری تو کاسٹ مکمل ہے''

''ہاں ہے تو'' ہم نے کہا'' مگر ہم سوچ رہے ہیں کہ اب اس میں تبدیلی کرنی پڑے گی''

محمد علی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا موضوع تبدیل کردیا۔

اگلے روز ہم نے طارق صاحب سے یہ تذکرہ کیا تو وہ کہنے لگے'' آفاقی صاحب میں بھی یہی سوچ رہا تھا مگر آپ نے تو

کسی اور کو سائن کیا ہوا ہے۔''

ہم نے کہا''خیر سائن تو نہیں کیا صرف بات کی تھی اور اب ہمارے درمیان میں کچھ کشیدگی بھی پیدا ہو گئی ہے''

ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔''تو کیا آپ آرٹسٹ بدل لیں گے ؟''

''بدلنا ہی پڑے گا'' ہم نے کہا۔

''تو پھر محمد علی سے بات کر لیں میری طرف سے ڈن سمجھیں''

ہم نے محمد علی سے بات کی۔انہیں مختصراً کہانی بھی سنائی وہ میں اپنے کردار کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔پھر بولے''مگر آفاقی یہ تو ویلن کا کردار ہے ؟''

ہم نے کہا''ویلن نہیں ہے بہت اچھا کردار ہے اور آخر میں جا کر تو وہ ساری ہمدردیاں سمیٹ لیتا ہے''

''یار سوچ لو دراصل میں نے اب ویلن کا کریکٹر قبول کرنا بند کر دیا ہے۔شباب صاحب نے اپنی تین فلموں میں مجھے ہیرو سائن کیا ہے''

ہم نے کہا''مگر یہ ویلن نہیں ہے اور پھر بہت اچھا اور جاندار کردار ہے۔ تمہیں بہت سوٹ کرے گا بلکہ تمہارے سوا کسی اور کو اس کریکٹر میں کاسٹ کرنا حماقت ہو گی۔''

وہ چپ ہو گئے۔ہم بھی چپ ہو گئے۔

غلام علی چائے لے آیا اور ہم دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔کچھ دیر بعد انہوں نے یکایک ہماری طرف دیکھا اور مسکرائے''کیا خفا ہو گئے ؟''

''نہیں تو'' ہم نے نیم دلی سے جواب دیا''مگر محمد علی صاحب' یہ آپ کی زیادتی ہے' ناانصافی ہے''

''اس طرح کہ آپ بعض فلموں میں خالص ویلن کا کردار قبول کر چکے ہیں پھر ہماری فلم میں اعتراض کیوں ہے جبکہ یہ دو ہیروز کی کہانی ہے۔یہ کردار آپ کی شخصیت کے مطابق ہے''

وہ مسکرانے لگے''ناراض کیوں ہوتے ہو میں نے انکار تو نہیں کیا مگر چھوٹا بھائی کون ہو گا۔''

ہم نے کہا''کمال''!

کمال سے محمد علی کی بہت اچھی دوستی اور بے تکلفی ہو چکی تھی مگر ہمارا جواب سن کر وہ ایک بار پھر چپ ہو گئے۔

”کیوں؟ کیا خیال ہے؟“ ہم نے پوچھا۔

بولے ” کمال بہت اچھا ایکٹر ہے۔ شوخ و شریر کردار بہت خوبی سے کرتا ہے مگر کیا فلم دیکھنے والے اسے میرے چھوٹے بھائی کے کردار میں قبول کرلیں گے“

ہم نے کہا”آپ دونوں بھائیوں کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں ہے“

”یہ بات نہیں ہے دراصل کمال کو لوگ کئی سال سے سکرین پر دیکھ رہے ہیں ان کی نظروں میں وہ مجھ سے سینئر ہے، بس یہ سوچ لو ویسے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے؟“

ہم نے کہا”خیر اس بارے میں بھی سوچیں گے یہ بتائیں ہم سے معاوضہ کیا لیں گے؟“

وہ پھر مسکرانے لگے ”یہ بات چھوڑو‘ ڈیٹس کی بات کرو شوٹنگ کب سٹارٹ کر رہے ہو؟“

ہم نے کہا”وہ بھی ہو جائے گی مگر پیسوں کی بات پہلے طے ہو جانی چاہئے۔“

کہنے لگے ”زیادہ سیٹھ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یار کہہ جو دیا ہو جائے گی یہ بات چھوڑو“

ہم نے دل ہی دل میں سوچا کہ بلاوجہ بحث کرنے سے کیا فائدہ۔ دوسرے لوگوں سے جو معاوضہ لے رہے ہیں ہم سے اس سے زیادہ تو لینے سے رہے اس طرح ہماری فلم کی کاسٹ میں محمد علی شامل ہو گئے۔

طارق صاحب کو ہم نے فوراً مطلع کر دیا۔ وہ خوش ہو گئے۔ ”آفاقی صاحب یہ بہت اچھا ہو گیا ہے یہ بالکل صحیح انتخاب ہے اس کریکٹر کے لئے محمد علی سے زیادہ موزوں کوئی اور اداکار ہو ہی نہیں سکتا“

ہم نے دوسرے ہی دن سنتوش کمار اور صبیحہ بھابی کو بھی یہ اطلاع پہنچادی۔ انہوں نے اس وقت تک محمد علی کے ساتھ کسی فلم میں کام نہیں کیا تھا مگر محمد علی کو دیکھ چکے تھے۔ ان سے مل بھی چکے تھے۔

ہم نے صبیحہ خانم سے کہا”بھابی محمد علی آپ کا بڑا بیٹا ہو گا“

”اور چھوٹا کون ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

ہم نے کہا”کیا زمانہ آگیا ہے ماں باپ کا بھی خون سفید ہو گیا ہے اپنے بیٹے کے بارے میں ہم سے پوچھ رہے ہیں“

سنتوش صاحب نے مٹھی بنا کر سگریٹ کا ایک کش لگایا اور بولے ”مولانا آخر ماں باپ ہیں۔ ہمیں بھی اپنی اولاد کے بارے میں پوچھنے کا حق ہے۔ ویسے مجھے لگتا ہے کہ جیسے آپ ہمارے دوسرے بیٹے کو بھی بدل دیں گے“

ہم نے کہا ”صبر کیجئے اللہ کے کاموں میں کسی کا دخل نہیں ہوتا“

”کنیز“ کے لئے قریب قریب سب ہی اداکاروں کا انتخاب ہو چکا تھا۔ صرف ایک چھوٹے بھائی کا کردار باقی رہ گیا تھا۔ اس کردار کے لئے ہم نے ”مجبور“ میں کمال سے بات کی تھی لیکن اب جب کہ کاسٹ میں کافی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ عمر کے لحاظ سے کمال اپنے بڑے بھائی محمد علی سے چھوٹے نظر نہیں آئیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت وہ ایک مشہور و معروف اداکار تھے۔ مقبول بھی تھے خصوصاً ہلکے پھلکے کرداروں میں اس وقت ان کا مدّ مقابل کوئی اور نہ تھا۔ ”کنیز“ میں چھوٹے بھائی کا کردار بھی ایک شوخ‘ شریر‘ نوجوان اور نو عمر لڑکے کا تھا جو اپنی غربت کے باوجود کسی قسم کے احساس کمتری کا شکار نہیں تھا اور ایک مسرور و مطمئن زندگی گزار رہا تھا جس کا کریڈٹ اس کی ماں کو جاتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی نہایت سوچ سمجھ کر بڑے محتاط انداز میں پرورش کی تھی۔ دراصل اس بچے کی بہتر تعلیم و تربیت کو ماں نے اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا تھا۔ اسے جب اس کے جاگیر دار سسر نے شوہر کی اچانک وفات کے بعد یہ کہہ کر حویلی سے نکال دیا تھا کہ وہ اپنے پوتے پر ایک کنیز زادی کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیں گے تو وہ اپنے سسر کو یہ چیلنج دے کر آئی تھی کہ میں اپنے ہونے والے بیٹے پر کسی رئیس یا جاگیر دار کا ٹھپّا بھی نہیں لگنے دوں گی مگر اس کی اعلیٰ تعلیم و تربیّت کر کے اس کو ایک بڑا آدمی بنا کر دکھاؤں گی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اس کا بیٹا ایک بلند حوصلہ اور پُر عزم نوجوان تھا۔ اس کی شوخی اور شرارت سے قطع نظر ڈرامائی مناظر میں اس سے سنجیدہ اور پر اثر اداکاری کی توقعّ کی جاتی تھی۔ ہم یہ ہی سوچ رہے تھے کہ کیا کمال فلم میں محمد علی کے چھوٹے بھائی نظر آئیں گے اور ڈرامائی مناظر میں اپنے کردار کے ساتھ انصاف بھی کر سکیں گے یا نہیں؟ لیکن کمال کے سوا کوئی اور موزوں اداکار اس کردار کے لئے ہمیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

ان ہی دنوں وحید مراد فلمی افق پر نمودار ہوئے۔ انہوں نے ایس ایم یوسف صاحب کی فلم ”اولاد“ میں ایک مختصر کردار کیا تھا۔ سنتوش صاحب نے اپنی فلم ” دامن“ میں بھی انہیں ایک ماڈرن نوجوان کے کردار میں منتخب کیا تھا۔ وہ

اس اثنا میں اپنی ذاتی فلم ''ہیرا اور پتھر'' میں زیبا کے بالمقابل ہیرو کے طور پر پسند کئے جا چکے تھے۔ اس فلم کی کامیابی نے ان میں ایک نئی خود اعتمادی پیدا کر دی تھی اور وہ ''ارمان'' کے نام سے ایک رومانی فلم کا آغاز کر چکے تھے۔
دامن 1963 میں نمائش کے لئے پیش کی جا چکی تھی۔ اس فلم میں وحید مراد کا کردار مختصر تو تھا لیکن فلم بینوں نے انہیں پسند کیا تھا اور یاد رکھا تھا۔ وہ ایک خوش رو' دراز قد' چھریرے بدن اور سانولی رنگت والے نوجوان تھے۔ چہرے کے نقوش بہت دل کش تھے۔ خاص طور پر ان کی بڑی بڑی شریر مگر اداس آنکھیں ان کے چہرے پر بہت نمایاں تھیں۔ ان کے بالوں کا ایک مخصوص انداز تھا جو ایک جانب پیشانی کو ڈھانپے رکھتا تھا۔ جب وہ سپر سٹار تھے تو ان کے بالوں کا یہ انداز اس قدر مقبول ہوا کہ ہر نوجوان ان جیسے بال بنانے لگا۔ ان کی چال میں ایک لاابالی پن اور ردھم تھا جس نے نئی نسل کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ ہلکے پھلکے رومانی کرداروں اور رقص کرنے میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں پاکستان کی فلمی صنعت کا پہلا رقص کرنے والا ہیرو کہا جا سکتا ہے۔ فلمی ضرورت کے مطابق ڈانس تو دوسرے اداکار بھی کر لیتے تھے مگر وحید مراد کے ڈانس میں برق جیسی پھرتی اور پارے جیسی بے قراری تھی۔ اس سے پہلے پاکستانی فلموں میں ہیرو کے رقص نہیں ہوتے تھے۔ سدھیر اور سنتوش کمار نے کبھی رقص نہیں کیا۔ درپن کا بھی یہ ہی حال تھا۔ یوسف خان اور حبیب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ ہیرو کا صرف اتنا کام تھا کہ جب ہیروئن رقص کرے تو وہ کسی درخت یا دروازے کا سہارا لے کر کھڑا ہو جائے یا گھاس کا تنکا چبانے لگے۔

پاکستان کے پہلے ڈانسنگ ہیرو کمال تھے۔ وہ نئی نسل کے ہیرو تھے۔ انڈیا میں شمی کپور وغیرہ نے جس جدید رقص کو اپنایا اس قسم کے کرداروں میں کمال کے سوا کوئی اور موزوں نظر نہ آیا لیکن جب وحید مراد ماڈرن رقص کرتے ہوئے سکرین پر جلوہ گر ہوئے تو نوجوان نسل ان کی پرستار ہو گئی۔ ''دامن'' کی نمائش 1963ء میں ہوئی تھی یہ ایک انتہائی کامیاب فلم تھی۔ اس میں وحید مراد کا کردار مرکزی نہ تھا مگر نیلو کے ساتھ ان کی جوڑی بنائی گئی تھی۔ ان دونوں نے ماڈرن تہذیب کے نمائندہ نوجوانوں کے روپ میں بہت اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا حالانکہ ان کرداروں کو فلم کے آخر میں سمیٹا نہیں گیا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ نامکمل کردار تھے۔ یہ مسئلہ حل کرنے کے لئے فلم کے اختتام پر کہانی کے مصنف حسرت لکھنوی صاحب سکرین پر دکھائے جاتے ہیں۔ ان سے نیلو کے کردار کے بارے میں سوال کیا جاتا

ہے کہ اس کا اور وحید مراد کا کیا انجام ہوا؟ جواب میں وہ مسکرا کر کہتے ہیں ''یہ آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے''
اس ناتمام کردار کے باوجود نیلو اور وحید مراد فلم بینوں کو پسند آئے۔ نیلو تو خیر پہلے ہی دلوں کی دھڑکن بن چکی تھیں۔ رقص اور جدید کرداروں میں انہوں نے ایک نیا انداز روشناس کرایا تھا اور اسی لئے وہ ''سیکس کوئن'' کہلاتی تھیں وحید مراد نے اپنی ذاتی فلم ''ہیرا اور پتھر'' بنائی اور زیبا کے ساتھ مرکزی کردار میں پسند کئے گئے۔ ''دامن'' میں وہ ایک دولت مند مغرب پسند نوجوان تھے مگر ''ہیرا اور پتھر'' میں انہوں نے نچلے طبقے کے ایک نوجوان کا کردار کیا اور خوب کیا۔ اس فلم میں گدھا گاڑیوں کی ریس بھی تھی جس میں وحید مراد ایک گدھا گاڑی چلاتے ہوئے نظر آئے اور بہت پسند کئے گئے۔

''دامن'' کی شوٹنگ میں حصہ لینے کے لئے وحید مراد لاہور آیا کرتے تھے اور سٹوڈیو میں ان کی آمد و رفت کی وجہ سے لاہور کے فلمی حلقوں میں بھی ان کا میل جول ہو گیا تھا۔ وہ ایک دولت مند باپ کے اکلوتے' اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خوب رو بیٹے تھے۔ ان کے والد نثار مراد کا شمار پاکستان کے ممتاز فلم ڈسٹری بیوٹرز میں ہوتا تھا۔ ان کا تعلق تو سیالکوٹ سے تھا لیکن انہوں نے کراچی کو اپنا مرکز بنالیا تھا اور وہیں بہت دولت اور شہرت حاصل کی۔ وہ ایک خوش اخلاق اور متواضع انسان تھے۔ سوشل حلقوں میں گردش کرتے تھے۔ ان کی کوٹھی پر آئے دن معززین اور فلم والوں کی دعوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب تک وحید مراد کا فلمی دنیا سے عملی تعلق پیدا نہیں ہوا تھا اور وہ محض طالب علم تھے۔ وہ فلم والوں سے زیادہ ربط وضبط نہیں رکھتے تھے۔ لیکن فلمی دنیا سے وابستہ ہونے کے بعد وہ بے تکلفی سے فلمی حلقوں میں پائے جانے لگے۔ انہوں نے انگریزی میں ایم اے کیا تھا اور بہت اچھی انگریزی بولتے تھے۔ ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔ ظاہر ہے کہ بہت جلد گھل مل گئے۔

''دامن'' کی تکمیل کے دوران ان کا لاہور میں آنا جانا رہا اور ملنے جلنے کے بھی زیادہ مواقع ملے۔ ہماری ان سے ملاقات تو کراچی میں ہوئی تھی لیکن جب وہ لاہور آنے لگے تو پھر ملاقات بھی زیادہ ہو گئی لیکن بے تکلف ہونے کے باوجود انہوں نے ایک رکھ رکھاؤ اور رسمی فاصلہ برقرار رکھا۔ سنتوش صاحب کی فیملی سے ان کے خاندان کا بہت گہرا میل جول تھا ''دامن'' کے زمانے میں وہ سنتوش صاحب کے گھر پر منعقد ہونے والی پُر تکلّف ''(کھانے پینے کے اعتبار

سے) مگر انتہائی بے تکلّف (ماحول اور گپ شپ کے اعتبار سے) دعوتوں میں بھی ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ بات چیت بھی ہوئی مگر ہم ایک دوسرے سے زیادہ قریب اور بے تکلف نہ ہو سکے اور یہ صورت حال آخر تک قائم رہی حالانکہ خاصے اچھے مراسم ہو گئے تھے۔

صبیحہ خانم کو ''کنیز'' کا سکرپٹ پڑھنے کے لئے دے دیا گیا تھا۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہی تھی کہ ہم ڈھنگ سے کہانی سنانا جانتے ہی نہیں تھے' دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ ان کے کردار کی اہمیت اور مرکزیت کے پیش نظر طارق صاحب کا خیال تھا کہ صبیحہ خانم کو تفصیل سے فلم کا سکرپٹ پڑھنے اور اپنے کردار کی گہرائیوں کو سمجھنے کا موقع مل جائے۔ ہم نے فلم کا سکرپٹ صبیحہ بھابی کو پیش کیا تو سنتوش صاحب نے بہت اطمینان کا اظہار کیا اور کہا''مولانا یہ آپ نے بہت عقل مندی کی ہے ورنہ اگر آپ زبانی فلم کی کہانی سناتے تو شاید صبیحہ فلم کی کہانی سن کر کام کرنے سے ہی انکار کر دیتیں''

ہم بُرا مان گئے اور کہا''سنتوش صاحب اب ایسی بھی بات نہیں ہے''

کہنے لگے ''ٹھیک ہے تو پھر سنا کر دیکھ لیجئے''

ظاہر ہے کہ ہم نے یہ چیلنج قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ ہی مصلحت کا تقاضا تھا۔

سکرپٹ پڑھنے کے بعد صبیحہ خانم سے ہم اور طارق صاحب ملے تو انہوں نے پہلا سوال یہ کیا''آپ نے چھوٹے بیٹے کے لئے کون سے اداکار کو کاسٹ کیا ہے؟''

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور طارق صاحب نے کہا''کمال کے بارے میں سوچا ہے''

وہ بولیں ''آپ ویدو کو کیوں نہیں لیتے؟''

''ویدو؟'' ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

ہنس کر کہنے لگیں ''میرا مطلب ہے وحید مراد' وحید بہت اچھا لڑکا ہے' ہماری فلم ''دامن'' میں اس نے بہت اچھّا کام کیا ہے''

''ہاں کام تو اچھّا کیا ہے''

بولیں ''عمر کے لحاظ سے بھی مناسب رہے گا' محمد علی کا چھوٹا بھائی لگے گا، غریب طبیعت اور مسکین'' یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگیں۔

''بھابی ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

بولیں'' بھئی فلم میں اس کی غریبی کا خیال آگیا تھا۔ فلم والے بھی خوب بہروپ بناتے ہیں امیر کو فقیر بنانا اور غریب کو امیر بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہے''

طارق صاحب اور ہم اس تجویز کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگے۔

ان ہی دنوں ہم دونوں ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں کراچی گئے اور حسب معمول میٹروپول ہوٹل میں قیام کیا۔ میٹروپول فلم والوں کا پسندیدہ ہوٹل تھا۔ سب ہی وہاں ٹھہرتے تھے۔ کچھ لوگ ہی تھے جو بیچ لگژری میں ٹھہرتے تھے ورنہ لاہور جانے والے ہر فلم والے کو میٹروپول ہوٹل میں تلاش کر لیجئے۔

نور الدین اس زمانے میں اقبال شہزاد کے ساتھ تھے اور ان کی پروڈکشن کے انچارج تھے۔ فلمی دنیا میں وہ ''انکل نور الدین'' مشہور تھے بلکہ صرف انکل کہنا ہی کافی تھا۔ سب سمجھ جاتے تھے کہ مراد نورالدین کیسٹ سے ہے۔ بعد میں وہ اقبال یوسف سے بھی وابستہ رہے۔ اپنی ذاتی فلمیں بھی بنائیں اور کئی ممتاز فلم سازوں کے ساتھ کام کیا۔ ہماری ان سے فلمی ''بنجارن'' کے زمانے سے بے تکلفی تھی جب حسن طارق اس فلم کی ہدایت کاری کے سلسلے میں کراچی میں مقیم تھے اور اقبال شہزاد کی کوٹھی میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ خدا جانے ان کو پہلی بار ''انکل'' کا نام کس ستم ظریف نے دیا تھا۔ غالباً اقبال شہزاد نے ان کے بزرگانہ مشوروں کے پیش نظر انہیں ''انکل'' کہنا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ اس وقت بھی بے تکلف سمارٹ اور سانولے نوجوان تھے مگر یہ لقب اس قدر مقبول ہوا کہ ان کی پہچان بن گیا۔ فلمی ہیروئین، فلم ساز، ہدایتکار، تقسیم کار سب ہی انہیں ''انکل'' کہا کرتے تھے۔ اقبال یوسف کہتے تھے کہ انکل کو شاید آنٹی بھی انکل ہی کہتی ہوں گی۔

شروع شروع میں تو انہوں نے اس پر احتجاج کیا خصوصاً اس وقت جب کہ ان کی ایک گرل فرینڈ نے بھی انہیں بے خیالی میں ''انکل'' کہنا شروع کر دیا' مگر بعد میں گویا انہیں صبر آگیا تھا۔ گرل فرینڈ پیار سے انہیں انکل کہتی تو وہ مائینڈ

نہ کرتے، وہ جگت انکل بن چکے تھے اور اس پر ناراض بھی نہیں ہوتے تھے۔

انکل نورالدین میمن برادری سے تعلق رکھتے تھے مگر بذات خود ایک ماڈرن آدمی تھے۔ ہم نے انہیں کوٹ پتلون کے سوا کبھی کسی اور لباس میں نہیں دیکھا۔ بہت ہوا تو رات کے وقت سلیپنگ سوٹ پہن لیا لیکن قمیض پاجامہ' واسکٹ یا شیروانی انہوں نے کبھی زیب تن نہیں فرمائی۔ کم سے کم ہم نے انہیں اس لباس میں کبھی نہیں دیکھا۔ نہ ہی انہوں نے کبھی سر پر میمن برادری کی مخصوص ٹوپی پہنی۔ ان کے بڑے بھائی ضیاء الدین کیسٹ روزنامہ ''ڈان'' سے وابستہ رہے۔ اس ادارے کے لئے انہوں نے بڑی گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ انکل نورالدین کی زندگی کا بیشتر حصہ فلمی دنیا میں گزرا تھا مگر آخری چند سالوں میں وہ بھی فلمی ماحول سے برگشتہ ہو کر '' خلیج ٹائمز'' کے تجارتی نمائندے بن گئے تھے اور اسی حیثیت میں کراچی میں وفات پا گئے۔

انکل نورالدین کا تفصیلی ذکر بھی کیا جائے گا۔ بہت دلچسپ' زندہ دل اور مجلسی انسان تھے۔ کون تھا جس سے وہ بے تکلّف نہ تھے۔ کاروباری معاملات میں ہر کوئی ان سے مشورہ لیتا تھا اور وہ بڑے خلوص سے کسی معاوضے کے بغیر مشورے پیش کرتے رہتے تھے۔ دوستوں کے دوست تھے' دشمن ان کا کوئی نہیں تھا' کم از کم ہمارے علم میں نہیں ہے، وہ ایک بے ضرر انسان تھے۔ لوگوں کو فائدہ پہنچانے میں ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ حالانکہ بہت کفایت شعار آدمی تھے کاروباری جو ٹھہرے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ انکل نورالدین سے حسن طارق صاحب کی اور ہماری فلم ''بنجارن'' کے زمانے سے دوستی تھی جب وہ اس فلم کے پروڈکشن انچارج تھے۔ اس زمانے کے دلچسپ واقعات بھی وقت آنے پر سنائے جائیں گے۔

کراچی جائیں اور انکل ملاقات کے لئے نہ آئیں یہ کیسے ممکن تھا۔ کراچی میں روایت کے مطابق انکل نورالدین نے ہمیں ٹیلی فون کیا، پھر ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ وہ کراچی کی فلمی دنیا کے بارے میں تازہ ترین خبریں اور افواہیں سناتے رہے۔ تازہ ترین لطیفوں سے آگاہ کیا۔ کراچی کی فلمی کاروباری رپورٹ سے مطلع کیا۔ اس کے بعد انہوں نے لاہور کا حال احوال پوچھا۔ انکل کا ایک لطیفہ مستقل تھا، وہ جب بھی ہم سے کراچی میں ملتے تھے فرمائش کیا کرتے تھے کہ ایک پاس عنایت کر دیجئے۔

''کیسا پاس؟'' ہم دریافت کرتے۔

''کسی ہیروئن سے ملاقات کرنے کا، سنا ہے کہ آپ کی چٹ کے بغیر لاہور کی کوئی ہیروئن کراچی والوں سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی''

یہ ایک مستقل مذاق تھا جو وہ ساری زندگی کرتے رہے اور ہم ہر بار بے خیالی میں پوچھ بیٹھتے تھے۔۔۔ ''کس چیز کا پاس؟''

کہنے لگے ''اب تو زیبا بھی لاہور کی ہو گئی ہے اب تو اس کے لئے بھی آپ سے پاس لینا پڑے گا۔ ہم کراچی والوں کی بڑی مشکل ہے''

ہماری فلم کی بات چل نکلی تو انہوں نے کاسٹ کے بارے میں دریافت کیا۔ انکل کے نثار مراد صاحب کی فیملی سے بہت اچھے روابط تھے، پہلے تو انہوں نے مطلّع کیا کہ نثار صاحب کراچی کے لئے ''کنیز'' کے حقوق تقسیم خریدنے کے خواہش مند ہیں، اس کے بعد دریافت کیا'' محمد علی کے علاوہ آپ نے اور کون سا ہیرو سائن کیا ہے سنا ہے کہ آپ کی فلم میں دو ہیرو ہیں۔''

ہم نے بتایا'' دو نہیں تین''

بولے ''ٹھیک ہے ایک تو سنتوش صاحب ہیں دوسرے محمد علی اور تیسرا ہیرو کون ہے؟''

ہم نے کہا'' ابھی زیر غور ہے''

بولے ''وحید مراد کو کیوں نہیں سائن کر لیتے؟''

ہم سمجھ گئے کہ وہ نثار مراد صاحب اور وحید مراد کی جانب سے یہ تجویز لے کر آئے ہیں۔

طارق صاحب نے کہا'' انکل ابھی ہم نے کوئی فیصلہ نہیں کیا''

کہنے لگے ''اولاد'' آپ نے دیکھی ہو گی ''دامن'' میں بھی وحید مراد کا بہت اچھّا کام ہے۔ آپ کہیں تو ''ہیرا اور پتھر'' کا شو بھی آپ کے لئے ارینج کر دیں؟''

طارق صاحب نے کہا'' وہ کریکٹر وحید کے لئے موزوں تو ہے مگر انکل کراچی لاہور کا قصہ ہے''

''کراچی میں رہنے والے آرٹسٹ کو خاص طور پر لاہور بلانا پڑتا ہے۔ انہیں ہوائی جہاز کا ٹکٹ دینا پڑتا ہے۔ ہوٹل میں ٹھہرانا پڑتا ہے اور پھر اگر شوٹنگ میں گڑبڑ ہو جائے اور مزید ڈیٹ کی ضرورت پڑ جائے تو ان سے وقت لینا مشکل ہو جاتا ہے''

''اس کی آپ فکر نہ کیجئے'' انکل نے کہا ''وحید خود اپنے خرچ پر لاہور آئیں گے رہنا سہنا ان ہی کے ذمّے ہو گا''

''انکل چکّر بازی مت کرو'' ہم نے کہا ''ظاہر ہے کہ یہ خرچہ وہ معاوضے میں شامل کر لیں گے ہمیں کیا فائدہ ہو گا''

انکل مسکرانے لگے ''آپ تو بڑے کاروباری ہو گئے ہیں۔ آپ معاوضے کی بات تو کریں جو آپ کو سوٹ کرے وہی کر لیں''

طارق صاحب نے کہا ''فی الحال تو آپ چائے پئیں اور ہمیں سوچنے کا موقع دیں''

انکل نے نثار مراد صاحب کی طرف سے ہمیں رات کے ڈنر کا دعوت نامہ بھی پہنچا دیا۔ نثار صاحب کے گھر پر ڈنر کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ بڑے متواضع انسان تھے اور لاہور سے جانے والے فلم والوں کی خاطر داری ضرور کرتے تھے۔

رات کو نثار صاحب کی وسیع و عریض کوٹھی کے کشادہ خوبصورت لان میں محفل سجی اس محفل میں پہلی بار وحید مراد بھی شریک تھے۔ اس سے پہلے وہ نثار صاحب کی دعوتوں میں نظر نہیں آتے تھے۔

وحید مراد' نثار مراد کے اکلوتے اور انتہائی لاڈلے بیٹے تھے۔ ماں باپ دونوں ان کے عاشق تھے۔ ان کی والدہ تو جیسے وحید کا نام لے کر ہی جیتی تھیں۔ ان کی گفتگو میں نوّے فیصد وحید مراد کا تذکرہ ہوتا تھا۔ ''ویدو نے یہ کہا ویدو نے وہ کہا ویدو اب ایسا کرنے والا ہے۔ ویدو کا آئندہ پروگرام یہ ہے ویدو کے لئے لڑکیوں کے اتنے فون آتے ہیں کہ میں تو تنگ آجاتی ہوں''

وحید مراد کو گھر والے قریبی دوست احباب '' ویدو'' کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ایسے ہونہار اور لائق فرزند تھے کہ واقعی والدین کے لئے ایسی اولاد مایۂ ناز ہوتی ہے۔ تعلیم میں ہمیشہ بہت اچھے رہے۔ عادت و اطوار انتہائی شائستہ، بے حد مقبول اور پسندیدہ' ذہین' باصلاحیت صورت شکل میں ایسے کہ گندمی رنگت کے باوجود لڑکیاں انہیں ''کرشن

مرادی‘‘ اوراس قسم کے رومانٹک القاب سے توازتی تھیں۔والدین کو تو جیسے ان سے عشق تھا،ان جیسے لاڈلے بیٹے ہم نے پاکستان کی فلمی صنعت میں صرف دو ہی دیکھے ہیں ایک وحید مراد اور دوسرے انور کمال پاشا۔

انور کمال پاشا حکیم احمد شجاع کے صاحبزادے تھے۔اکلوتے تو نہ تھے لیکن بیٹے ایک ہی تھے۔ ان کے والد بھی ان کا ہی دم بھرتے تھے۔ان کی ہر بات بھی ’’پاشامیاں‘‘ سے شروع ہوکر ’’پاشامیاں‘‘ پر ہی ختم ہوتی تھی۔حکیم احمد شجاع بہ ذات خود بڑے عالم فاضل اور نامی گرامی آدمی تھے۔قلم کے دھنی تھے۔ان کی تحریریں آج بھی ادب میں ایک اعلیٰ مقام کی حامل ہیں۔انور کمال پاشا کو بھی اللہ نے سب ہی چیزوں سے نوازا تھا۔بہت نامور خاندان‘ معروف اور خوش حال باپ۔۔۔وہ بہ ذات خود بڑے ذہین اور باصلاحیت تھے۔انہوں نے بھی ایم اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ ادب ان کا مرغوب موضوع تھا۔لکھنے کا ہنر انہوں نے والد گرامی سے ورثے میں پایا تھا۔صورت شکل کے معاملے میں بھی لاکھوں‘ ہزاروں میں ایک تھے۔گورا رنگ‘ دراز قد‘ دل کش نقش ونگار‘ تحریر اور تقریر دونوں پر عبور رکھتے تھے۔قسمت ان پر بھی ابتدا ہی سے مہربان تھی۔ایم اے کرنے کے بعد کسٹم میں ملازمت کرلی۔اگر اسی محکمے سے وابستہ رہتے تو اعلیٰ ترین عہدے یعنی کمشنر کا درجہ تو ضرور حاصل کرلیتے مگر ان کا رجحان فلم کی طرف تھا۔ باپ نے بھی رکاوٹ نہ ڈالی۔انہوں نے مصنّف‘ ہدایتکار کی حیثیت سے فلمی زندگی کا آغاز کیا اور کامیابیوں نے قدم چومے۔بعد میں فلم ساز اور تقسیم کار بھی بن گئے تھے۔پاکستان کی فلمی صنعت کے لئے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔طویل عرصے تک وہ پاکستان کی فلمی صنعت پر بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے راج کرتے رہے۔ان کا نام فلمی صنعت میں ضرب المثل بن گیا تھا۔

انور کمال پاشا تحریر کے بادشاہ تھے۔ان کے لکھے ہوئے مکالموں پر فلم بین سینما گھر میں باقاعدہ بلند آواز سے داد دیا کرتے تھے‘ ان کی کہانیاں بے حد پسند کی جاتی تھیں۔ہدایتکار اور فلمساز کے طور پر انہیں فلمی صنعت کے ’’مردِ اوّل‘‘ کی حیثیت حاصل ہے۔

پاشاصاحب کے والد کو بھی ان سے بے پناہ عشق تھا۔’’پاشامیاں پاشامیاں‘‘ کہتے ہوئے ان کی زبان نہیں تھکتی تھی۔انور کمال پاشا نے بھی پاکستان کی فلمی صنعت میں ایسا عروج پایا کہ نہ ان سے پہلے کسی کو ملا اور نہ ہی بعد میں کوئی

حاصل کر پائے گا۔ والدین کے بے پناہ لاڈ اور پیار نے انہیں کسی حد تک خود سر اور خود پسند ضرور بنا دیا تھا مگر ان کی بے پناہ خداداد صلاحیتوں سے انکار ممکن نہیں ہے۔ المناک بات یہ ہے کہ وحید مراد اور انور کمال پاشا دونوں کا انجام ایسا شاندار نہ تھا جیسا آغاز تھا۔ دونوں کو ناکامیوں' مایوسیوں اور محرومیوں کا منہ دیکھنا پڑا جس کے وہ عادی نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ''بُرے دنوں'' کو نہ سنبھال سکے' یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

وحید مراد کے اچھا اداکار ہونے میں کوئی کلام نہ تھا۔ ہماری فلم کے کردار کیلئے بھی وہ بہت موزوں تھے۔ دو چار دن ہم اس بارے میں مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ وحید مراد بھی اس دوران میں چند بار ہوٹل آئے۔ وحید مراد میں احساس کمتری نہ تھا۔ جب وہ پورے عروج پر تھے' اس وقت بھی فلمسازوں اور ہدایتکاروں سے کسی اچھے کردار کیلئے بات کرنے میں نہیں ہچکچاتے تھے۔ ''کنیز'' کے سلسلے میں بھی انہوں نے یہ بات نہیں چھپائی کہ وہ اس کردار کو اپنانے کے خواہشمند ہیں' حالانکہ اس زمانے میں وہ خود '' ارمان'' بنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے اور ویسے بھی انہیں اپنی زبان سے اداکاری کی خواہش کا اظہار کرنے کی حاجت نہ تھی مگر وہ ایک بے تکلّف آدمی تھے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ سنا ہے کہ آپ کی فلم میں یہ بہت اچھّا کردار ہے' میں یہ کردار ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ یہ وحید مراد کی عادت تھی مگر جب زوال پذیر ہونے کے بعد وہ کسی فلمساز یا ہدایتکار سے کہتے تھے کہ مجھے بھی کوئی اچھا کردار دیجئے تو لوگ سمجھتے تھے کہ ناکامیوں نے وحید مراد کو اس نوبت تک پہنچا دیا ہے' حالانکہ عروج و زوال سے اس بات کا کوئی تعلق نہ تھا۔

کراچی سے جب طارق صاحب اور ہم واپس آئے تو وحید مراد ہماری فلم کی کاسٹ میں شامل ہو چکے تھے۔ انہوں نے ہماری ہر شرط تسلیم کر لی تھی۔ معاہدے کے مطابق وہ تین بار خود اپنے خرچ پر لاہور آئے اور اپنے قیام و طعام کا خرچ اٹھانے کے پابند تھے۔ اگر اس کے بعد ہم انہیں بلاتے تو اس کا خرچ فلمساز کے ذمّے تھا۔ معاوضے کی کل رقم سات ہزار روپے تھی۔ مانا کہ وہ سستا زمانہ تھا' اداکاروں کے معاوضے بھی زیادہ نہ تھے مگر اس کے باوجود آمد و رفت اور ہوٹل کے اخراجات سمیت یہ بہت کم رقم تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وحید مراد ہر قیمت پر یہ کردار کرنے کے خواہش مند تھے اس لئے انہوں نے اس بات کو اپنی اَنا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ اس سے وحید مراد کی بصیرت اور دور اندیشی کا اندازہ لگایا

جا سکتا ہے۔ آج کے اداکار جو ایک فلم کی کامیابی کے بعد ہی زمین پر قدم نہیں رکھتے اور اچھے یا بُرے کردار سے قطع نظر محض معاوضوں کو پیش نظر رکھتے ہیں انہیں وحید مراد جیسی سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہئے۔ زیادہ معاوضے کے لالچ میں وہ نہ تو کہانی اور کردار پر دھیان دیتے ہیں نہ ہی فلم ساز اور ہدایتکار کے تجربے اور پس منظر کو اہمیت دیتے ہیں۔ اداکاری کی طرف توّجہ دینے کا ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ جو اداکار لگاتار ہر مہینے ایک فلم مکمل کرائے گا وہ اداکاری کی طرف بھلا کیسے توّجہ دے سکتا ہے؟ ان کے نزدیک سب ہی فلم ساز اور ہدایتکار ایک جیسے ہیں۔ انہیں تو صرف معاوضے سے سروکار ہے۔ انہیں چاہئے کہ وہ وحید مراد کی مثال سے سبق حاصل کریں۔

''کنیز'' کی تمام ابتدائی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اداکاروں سے تاریخیں حاصل کرنے کے بعد شوٹنگ کے انتظامات شروع کر دیئے گئے۔ لاہور میں زیبا سے سٹوڈیو میں ملاقات ہوئی تو وہ بہت گرمجوشی سے ملیں۔ کہنے لگیں ''آفاقی تم نے بہت عقلمندی کی ہے کہ وحید کو اپنی فلم میں کاسٹ کر لیا''۔

ہم نے کہا ''عقلمندی کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا شکریہ''۔

بولیں ''اب مجھ سے بھی ڈیٹس لے لو۔ میں بہت مصروف ہو گئی ہوں۔ بعد میں شکایت نہ کرنا''۔

ہم نے کہا'' جو ہیروئن فلم کے مہورت میں آنے کے لئے وقت نہیں نکال سکتی وہ پوری فلم کے لئے وقت کیسے نکالے گی''۔

''اچھّا۔ زیادہ فالتو بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم تو اونٹ کی طرح کینہ پرور ہو۔ اس بات کو ختم کر دو۔ میں اور وحید کئی فلموں میں ایک ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ہم دونوں سے ڈیٹس لیتے وقت یہ خیال رکھنا' ایسا نہ ہو کہ ایک سے ڈیٹ لے لو اور دوسرا مصروف ہو۔ تمہیں تو ویسے بھی جھگڑنے کے لئے بہانہ ہی چاہئے''۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے زیبا ایک مقبول ہیروئن بن گئی تھیں۔ انہیں کئی فلموں میں بہت اچھے فلم سازوں نے سائن کر لیا تھا۔ انہوں نے گلبرگ کالونی میں ایک کوٹھی بھی کرائے پر حاصل کر لی تھی کیوں کہ فلمی مصروفیات کی وجہ سے انہیں زیادہ وقت لاہور میں رہنا پڑتا تھا لیکن کراچی کی کچھ فلموں میں بھی وہ کام کر رہی تھیں۔

اس لئے کراچی کا پھیرا بھی لگتا رہتا تھا۔آؤٹ ڈور شوٹنگ کے سلسلے میں انہیں مری' سوات اور ایبٹ آباد بھی جانا پڑتا تھا۔اس سے پہلے وہ شوٹنگ کے لئے لاہور آتی تھیں تو انڈس ہوٹل میں قیام کرتی تھیں۔

اس زمانے میں محمد علی بھی انڈس ہوٹل میں ہی مقیم تھے۔کچھ وقت کمال بھی اسی ہوٹل میں مقیم رہے۔ان تینوں کی وجہ سے انڈس ہوٹل میں ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی۔ہر وقت فلم سازوں' ہدایتکاروں اور اداکاروں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔زیبا لاہور کی کئی فلموں میں کام کر رہی تھیں۔رتن کمار کے بھائی وزیر علی نے ان دنوں لاہور کا سکرین اینڈ ساؤنڈ سٹوڈیو کرائے پر حاصل کر کے وہاں ایک شاندار پروڈکشن آفس بنایا تھا۔''ناگن'' کی کامیابی کے بعد وہ ایک کامیاب فلم ساز بن چکے تھے۔فلمز حیات کے نام سے انہوں نے لاہور میں فلم ساز اور تقسیم کار ادارہ قائم کر لیا تھا اور ممتاز فلم سازوں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا۔''ناگن'' کی بے پناہ کامیابی کے بعد رتن کمار اور نیلو کی فلمی جوڑی بہت مقبول ہوئی تھی اور فلمز حیات نے اپنی فلموں میں رتن کمار اور نیلو کو مستقل طور پر رومانی جوڑی بنا لیا تھا۔نیلو کے ساتھ رتن کمار کے رومانی تعلقات کا بھی چرچا تھا۔فلمز حیات کی فلموں میں نیلو کی موجودگی ایک لازمی امر تھا۔یوں تو وہ دوسرے اداکاروں اور فلم سازوں کے ساتھ بھی کام کر رہی تھیں لیکن رتن کمار کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دیتی تھیں۔

اُدھر رتن کمار کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ وہ ہر قسم کے کرداروں کے لئے موزوں نہ تھے۔عام طور پر وہ فلمز حیات کی فلموں میں ہی کام کرتے تھے اور ان کی ہیروئن ہر بار نیلو ہی ہوا کرتی تھیں۔ان دونوں کی چند فلمیں فلاپ ہوئیں تو فلمز حیات والوں کو بھی یہ فکر پڑ گئی کہ رتن کمار کے ساتھ کسی اور ہیروئن کی جوڑی بھی بنائی جائے۔ایک اور مصلحت یہ بھی تھی کہ ایک طویل عرصے شیر و شکر رہنے کے بعد رتن کمار اور نیلو کے باہمی تعلقات میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔
رتن کمار کے بڑے بھائی وزیر علی ایک ذہین اور ہوشیار کاروباری فلم ساز تھے۔انہوں نے آنے والے واقعات کی پیش بندی کے لئے رتن کمار کو دوسری ہیروئنوں کے ساتھ کاسٹ کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔اس سے پہلے انہیں یہ آسانی تھی کہ ہیرو اور ہیروئن دونوں قریباً گھر کے ہی تھے اس لئے انہیں کاسٹنگ کی پرابلم پیش نہیں آتی

تھی۔ لیکن نیلو کے نہ ہونے کی صورت میں کون سی ہیروئن کو رتن کمار کے ساتھ پیش کیا جائے جسے فلم بین بھی پسند کرلیں؟ یہ بھی ان کے لئے ایک اہم اور سنگین مسئلہ تھا۔

رتن کمار نے بھارت میں چائلڈ سٹار کے طور پر بہت شہرت حاصل کی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد بھی وہ نوعمر لڑکوں کے کردار ہی کرتے رہے مگر جب ان کے چہرے پر سبزے کا آغاز ہوا اور وہ جوانی کی حدود میں داخل ہونے لگے تو وزیر علی سوچ میں پڑ گئے۔ اس سے پہلے ان کی فلموں کا دارومدار رتن کمار پر تھا۔ وہی ان میں مرکزی کردار ہوا کرتے تھے۔ مگر اب وہ عمر کے اس حصّے میں تھے جہاں نہ وہ لڑکے بالے تھے اور نہ جوان۔ رتن کمار کی شخصیت میں نزاکت اور قدرے نسائیت بھی تھی۔ آواز میں بھی بھاری پن نہ تھا۔ مختصر یہ کہ انہیں ہیرو کے طور پر کاسٹ کرنا ممکن نہ تھا۔

وزیر علی نے جب ''ناگن'' بنائی تو اس فلم میں ایک بہت بڑا جوا کھیلا۔ انہوں نے رتن کمار اور نیلو کو ہیرو اور ہیروئن کے کرداروں میں پیش کیا جو کہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اس فلم میں یوسف خان ویلن تھے۔ وہ ایک خوب رو اور مردانہ وجاہت سے مالامال شخصیت تھے۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ رتن کمار کو ہیرو کے روپ میں کاسٹ کرنے کی غلطی نہ کریں۔ ان کی جگہ یوسف خان کو ہیرو بنادیں۔ مگر وزیر علی بہت دور کی سوچ رہے تھے۔ انہوں نے ایک داؤ لگایا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ رتن کمار کو ہیرو کے طور پر قبول کرلیا جائے تو پھر ان کا ایک بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا اور وہ کسی دوسرے ہیرو کے محتاج نہ رہیں گے۔

''ناگن'' ایک خیالی کہانی تھی جس میں نیلو اور رتن کمار کو سانپوں کے ایک جوڑے کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ کہانی یہ تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں اور فلم کے اختتام تک ایک دوسرے کو تلاش کرتے رہتے ہیں۔ دیومالائی تصوّر کے مطابق وہ دونوں انسانوں کا روپ اختیار کر چکے ہیں اور جب چاہیں دوبارہ ناگوں کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ ایک بہت بڑا سپیرا (ساقی صاحب) ان کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے کیونکہ اسے یقین ہے کہ یہ دونوں ایک سو سالہ زندگی گزارنے کے بعد نہ صرف انسانی روپ اختیار کر سکتے ہیں بلکہ ان پر قابو پانے کے بعد وہ ان سے ''منکا'' بھی حاصل کر سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ انتہائی دولت منداور بااختیار حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔

یہ ایک دلچسپ کہانی تھی۔ خیال تھا کہ یہ صرف بچّوں کو پسند آئے گی مگر مصنف عزیز میرٹھی نے اس میں مختلف موڑ

دے کر بہت زیادہ دلچسپی اور سسپنس پیدا کر دیا تھا۔ خلیل قیصر کی بطور ہدایت کار یہ پہلی فلم تھی۔ انہوں نے اس فلم میں نیلو کو انتہائی دلکش اور ہیجان خیز انداز میں پیش کیا تھا۔ خصوصاً نیلو کے رقص اتنی خوبصورتی اور رعنائی سے فلمائے کہ دیکھنے والوں کے ہوش اڑ گئے۔ رتن کمار نے بھی اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔

یوسف خان کہنے کو ویلن تھے مگر انہوں نے بہت خوبی سے یہ کردار ادا کیا تھا۔ راج کمار کے روپ میں وہ بہت اچھے لگے۔ انہوں نے اس فلم میں شمشیر زنی کا اتنا اچھا مظاہرہ کیا کہ بہت سے بھارتی اداکاروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

رقص اور موسیقی اس فلم کی نمایاں خوبیاں تھیں۔ وزیر علی نے ''ناگن'' کے لئے بہت اچھے سیٹ لگائے تھے اور خلیل قیصر نے اس کہانی کو بے حد خوبصورت اور پرکشش انداز میں فلمایا تھا۔ ان سب خوبیوں کی وجہ سے ''ناگن'' ایک سپر ہٹ فلم بن گئی اور اس طرح رتن کمار اور نیلو کی فلمی جوڑی نے جنم لیا تھا۔

یہ جوڑی کافی عرصے مقبول رہی مگر پھر ان کی فلمیں ناکام ہونے لگیں۔ دوسری طرف باہمی تعلقات میں بھی فرق آ گیا۔ مگر وزیر علی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ رتن کمار کی کسی اور ہیروئن کے ساتھ جوڑی نہیں بن سکتی تھی۔ وہ دوسری ہیروئنوں کے مقابلے میں کمسن نظر آتے تھے۔ شمیم آرا' نیّر سلطانہ' یاسمین 'صبیحہ خانم' مسرت نذیر' رانی' سینئر فنکارائیں تھیں۔ ان کے ساتھ رتن کمار کو ہیرو کے کردار میں ہضم کرنا فلم بینوں کیلئے بہت مشکل تھا کیونکہ ان میں سے کئی ہیروئنوں کی فلموں میں وہ نو عمر لڑکے کا کردار کر چکے تھے۔

اس مسئلے کو زیبا کی آمد نے حل کر دیا۔ زیبا نسبتاً نو عمر تھیں۔ نئی تھیں۔ دیکھنے میں تروتازہ لگتی تھیں۔ انہوں نے رتن کمار کے ساتھ کسی فلم میں کام بھی نہیں کیا تھا۔ نازک اندام ہونے کی وجہ سے وہ رتن کمار کے ساتھ موزوں ہیروئن بن سکتی تھیں۔ زیبا میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان کے چہرے پر بھولپن اور معصومیت نظر آتی تھی۔ چنانچہ زیبا جب ایک نئی ہیروئن بن کر ابھریں تو وزیر علی نے اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کر لیا اور رتن کمار کے ساتھ زیبا کی جوڑی بنانے کا فیصلہ کیا۔

جن دنوں زیبا انڈس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھیں اس زمانے میں وزیر علی بڑے پیمانے پر ایک کاسٹیوم فلم بنانے کا منصوبہ بنا رہے تھے، جس کا نام ''سمیرا'' تھا۔ انڈس ہوٹل میں وہ اور رتن کمار بھی زیبا سے بات چیت کرنے کے لئے

آتے رہتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ زیبا کے کمرے میں محمد علی، کمال، رتن کمار بیک وقت اکٹھے ہو گئے۔ کچھ اور فلم ساز بھی حاضر ہو جاتے تھے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اس زمانے میں فلم والوں میں باہمی یگانگت اور بے تکلّفی کی فضا موجود تھی۔ جہاں چند فلمی ہستیاں اکٹھی ہو جاتی تھیں۔ گپ شپ اور لطیفہ بازی شروع ہو جاتی تھی۔ زیبا کے ہوٹل کا کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ جب یہ سب اس کمرے میں اکٹھے ہو جاتے تھے تو ایک رونق سی لگ جاتی تھی اور ہوٹل والوں کی عید ہو جاتی تھی۔ ہر بیرا باری باری کسی بہانے اس کمرے میں ضرور حاضری دیتا تھا۔ منیجر بھی کوئی ضروری بات دریافت کرنے کے بہانے چلا آتا تھا۔ ہوٹل کے نیچے بھی شوقین مدّاحوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔

ہم ایک دن محمد علی کے کمرے میں گئے تو راستے ہی میں ان کے مخصوص بیرے نے اطلاع دے دی کہ وہ میڈم زیبا کے کمرے میں ہیں۔ کمال صاحب بھی وہیں ہیں اور رتن کمار بھی آئے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم بھی اسی کمرے میں چلے گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ زیبا سنگار میز کے آگے بیٹھی میک اپ کر رہی ہیں۔ لالی جی ایک طرف بیڈ پر بیٹھی ہنس رہی ہیں۔ چاروں طرف مجمع سا لگا ہوا ہے اور فقرے بازی اور لطیفہ بازی کا سلسلہ جاری ہے۔ زیبا کا چہرہ تو سنگار میز کے آئینے کی طرف تھا مگر وہ ایسے زاویے سے بیٹھی ہوئی تھیں کہ ہر شخص انہیں آئینے میں نظر آ رہا تھا اور وہ بھی ہر شخص کو نظر آ رہی تھیں۔ ہر ایک کو وہ برابر یکساں توّجہ اور اہمیت دے رہی تھیں۔ موقع پا کر خود بھی ایک آدھ فقرہ کس دیتی تھیں جس پر لالی جی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی تھیں۔

ہمیں دیکھا تو لالی جی نے گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور فخریہ انداز میں کہا ''آؤ آفاقی، دیکھو زیبا کیسے چومکھی لڑ رہی ہے۔

زیبا نے آئینے میں قدرے ترچھا ہو کر ہمارا عکس بھی دیکھ لیا اور بولیں ''دیکھو آفاقی، میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ مجھے شوٹنگ پر جانا ہے۔''

''شاید یہ سب آپ کو شوٹنگ پر لے جانے کے لئے آئے ہیں؟'' ہم نے پوچھا۔

''بھئی شوٹنگ تو وزیر علی صاحب کی ہے رتن کمار اس فلم کے ہیرو ہیں۔ ''

''اور یہ دونوں؟''ہم نے کمال اور محمد علی کی طرف اشارہ کیا۔

بولیں ''یہ میرے ہمسایے ہیں ہم لوگ ''ہوٹل میٹ'' ہیں نا۔ ''

ہم بھی مجمع میں شامل ہوگئے۔اس وقت کمال سب کی توجّہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ دستور یہ تھا کہ ہر روز کسی ایک کو مذاق کا ہدف بنالیا جاتا تھااور سب ہاتھ دھو کراس کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔اس روز کمال کی کفایت شعاری یا کنجوسی موضوع گفتگو تھی۔ان کا کہنا تھاکہ میں کنجوس ہر گز نہیں ہوں۔ہاں فضول خرچی پسند نہیں کرتا۔اس لئے آپ لوگ مجھے کفایت شعار کہہ سکتے ہیں۔

اتنی دیر میں بیرا ٹرے میں سگریٹ کاایک پیکٹ اور ماچس لے کر آیااور کمال کے سامنے ٹرے پیش کردی۔کمال نے جیب سے دس روپے کاایک نوٹ نکال کرٹرے میں رکھاہی تھاکہ زیبانے بیرے سے کہا'' باقی پیسے تم رکھ لو۔''

کمال کی صورت دیدنی تھی۔اس زمانے میں گولڈلیف کاپیکٹ سوادو یاڈھائی روپے میں آتاتھا۔ماچس دو آنے یاچھ پیسے کی۔اتنی سی خدمت کے بدلے سات روپے کی ٹپ غیر معمولی تو تھی ہی مگر کمال کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

بیرے نے جوں ہی ''مہربانی میڈم'' کہہ کر دس روپے کانوٹ اپنی جیب میں رکھا، کمال نے اسے گھور کر دیکھااور کہا

''باقی پیسے لے کر آؤ۔''

بیرے نے سہم کر سر ہلادیالیکن فریاد بھری نظروں سے زیبا کو دیکھا۔

زیبا نے آئینے میں تھوڑاسازاویہ بدل کر کمال کو گھورااور بولیں'' کچھ شرم کرو،اتنے بڑے ہیرو ہو۔'' پھر پلٹ کر بیرے سے مخاطب ہوئیں۔'' کوئی بات نہیں تم باقی پیسے رکھ لو شاباش۔''

بیرے نے خوش ہو کر دانت نکال دیئے اور رخصت ہو گیا۔کمال پہلو بدل کر رہ گئے۔

ایک تو کمرے میں اتنے بہت سے لوگوں کی موجود گی،اس پر ہیروئن کی فرمائش بلکہ حکم۔کوئی اور ہوتاتوزہر کا یہ گھونٹ چپ چاپ پی کر رہ جاتا۔مگر وہ کمال تھے۔چند لمحے بے چینی سے بیٹھے رہے پھر تیزی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔'' میں ابھی آتاہوں''۔

وہ باہر جانے لگے تو محمد علی نے شرارت سے کہا'' یار ایک سگریٹ تو پلا جاؤ۔ ''
کمال نے سگریٹ کا پیکٹ ان کی طرف بڑھا دیا۔ محمد علی نے ایک سگریٹ نکالی۔ کمال جانے لگے تو زیبا نے پھر آئینے میں سے جھانک کر دیکھا اور بولیں'' یہ کہاں کا اخلاق ہے دوسروں سے بھی تو صلاح کر لو۔ ''
کمال نے ایک لمحہ تامل ّ کیا اور تین چار ہاتھ بیک وقت ان کی جانب پھیل گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانچ سگریٹوں کا صفایا ہو گیا۔ وہ پیکٹ بند کر کے جانے لگے تو زیبا نے کہا''کمال کیا آفاقی سے کوئی ناراضگی ہے اس بے چارے کو بھی سگریٹ پلا دو۔ ''
''وہ سگریٹ نہیں پیتا'' یہ کہہ کر کمال نے سگریٹ کا پیکٹ جیب میں ڈالا اور تیزی سے رخصت ہو گئے۔
محمد علی نے کہا'' پتا ہے کیا؟ اب یہ وہاں جا کر بیرے سے پیسے واپس لے لے گا۔ ''
رتن کمار بولے'' ارے نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ''
زیبا نے یہ فرض ہمیں سونپ دیا۔'' آفاقی تم ذرا جا کر دیکھو۔ کمال صاحب بیرے سے بقایا تو واپس نہیں لے رہے۔''
ہاؤس کی متفقہ فرمائش پر ہم فوراً چل پڑے۔ عین اس وقت ہم گرین روم کے سامنے پہنچے جب کمال بیرے سے پیسے واپس لے کر اپنی جیب میں رکھ رہے تھے اور وہ دبی زبان سے کہہ رہا تھا'' سر جی میڈم نے کہا تھا۔''
کمال بولے'' ارے وہ تو مذاق کر رہی تھی۔ لو تم یہ رکھ لو۔'' انہوں نے کچھ ریزگاری بیرے کے ہاتھ پر رکھ دی۔
ہم ذرا تیزی سے پلٹ کر زیبا کے کمرے میں پہنچ گئے اور چشم دید واقعات کی رپورٹ پیش کر دی۔ کچھ دیر بعد کمال سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔
زیبا نے کہا'' بیرے سے پیسے واپس لے آئے؟ ''
کمال ہنسنے لگے۔'' کیسی باتیں کرتی ہو۔ مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ ''
زیبا نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا اور بولیں'' ہمارے پاس چشم دید گواہ موجود ہے۔ ''
کمال کھسیانے ہو گئے۔'' یہ بھی کوئی مذاق ہے۔ سگریٹ کا پیکٹ لانے پر ساڑھے سات روپے کی ٹپ۔''
وزیر علی بولے'' اگر میڈم مجھ سے کہتیں تو میں ستر روپے ٹپ دے دیتا۔ ''

کمال نے کہا ''بھائی یہ خون پسینے کی کمائی ہے۔ ہم اداکار ہیں۔ فلم ساز اور ڈسٹری بیوٹر نہیں ہیں۔ ''

سب لوگ کمرے سے رخصت ہو گئے تو ہم نے لالی جی سے کہا ''لالی جی آپ کی بیٹی کو مان گئے ہم تو۔''

وہ ہنسنے لگیں ''کیوں بھئی کیا کر دیا ہے میری بیٹی نے ؟''

ہم نے کہا ''اتنے چھوٹے سے کمرے میں تین ہیرو اور تین پروڈیوسر بیٹھے ہوں اور ان میں سے ہر ایک یہ ہی سمجھے کہ میں ہی مہمان خصوصی ہوں اور ہنسی خوشی مطمئن ہو کر رخصت ہو جائے۔ یہ کمال ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتا۔'' واقعی زیبا کے علاوہ یہ فن کسی کو نہیں آتا تھا۔

لالی اور زیبا بے اختیار ہنسنے لگیں۔

کچھ عرصے بعد انڈس کی رونق اجڑ گئی۔ محمد علی گلبرگ کی ایک چھوٹی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ زیبا نے بھی گلبرگ میں ایک کوٹھی کرائے پر حاصل کر لی۔

انہوں نے وزیر علی کی فلم ''سمیرا'' میں کام شروع کر دیا تھا۔ یہ ایک کاسٹیوم فلم تھی اور قدیم مصر کے پس منظر میں بنائی گئی تھی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ اس طرح زیبا اور رتن کمار کی جوڑی بنانے کی کوشش ناکام ہو گئی۔

ہم نے محمد علی، وحید مراد اور زیبا کو جب اپنی فلم میں کاسٹ کیا تھا تو وہ ابھی سپر سٹار نہیں بنے تھے۔ زیبا کا شمار ہیروئنوں میں ضرور ہونے لگا تھا۔ وحید مراد اور محمد علی کی فلمیں بھی زیر تکمیل تھیں۔ ہماری شوٹنگ کی نوبت آئی تو وہ تینوں اہم اداکار بن چکے تھے اور بہت زیادہ مصروف ہو گئے تھے۔ کبھی کراچی میں شوٹنگ ہے تو کبھی لاہور میں۔ کبھی اسلام آباد، مری اور سوات میں فلم بندی کی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ تینوں کی مختلف فلموں کی شوٹنگ مختلف اوقات میں ہوتی تھی۔ کبھی ایک دستیاب ہوتا تو باقی دو فن کار نہ ملتے۔ کبھی دو ملتے تو ایک کی کمی کی وجہ سے شوٹنگ ملتوی ہو جاتی۔ مگر یہ تو شوٹنگ کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے آغاز کا احوال سن لیجئے۔

محمد علی، وحید مراد اور زیبا تینوں کا تعلق کراچی سے تھا اور وہ تینوں قریب قریب ایک ہی وقت میں فلمی صنعت میں داخل ہوئے تھے اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ بیک وقت ہی وہ تینوں سپر سٹار بھی بن گئے۔ ان کی عمروں میں بھی زیادہ فرق نہ تھا لیکن مزاج بہت مختلف تھے۔ زیبا نے فلمی کیریئر کا آغاز محمد علی کے ساتھ کیا تھا مگر پھر وحید مراد کے ساتھ

ایک فلم میں ہیروئن بن کر کامیابی حاصل کرچکی تھیں۔

محمد علی کی شخصیت میں ایک قسم کی متانت اور رکھ رکھاؤ تھا۔ وہ بہت زیادہ حساس اور زود رنج بھی تھے۔اس کے علاوہ زیبا کے لئے وہ اپنے دل میں ایک نرم و نازک گوشہ بھی رکھتے تھے مگر کیوں کہ رکھ رکھاؤ اور وضع داری کے قائل تھے اس لئے اظہار کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ زیبا کو ان کے احساسات کا بہ خوبی علم تھا مگر وہ جان بوجھ کر انجان بنی ہوئی تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ دانستہ طور پر ایسی شرارتیں اور باتیں کرتی رہتی تھیں جن کی وجہ سے محمد علی کا دل جل کر رہ جاتا تھا۔ یہ ایک پراسرار جذباتی مسئلہ تھا جس کا ہر ایک کو علم نہ تھا اور نہ ہی احساس۔ محمد علی صاحب بظاہر زیبا سے بے تعلق اور بے پرواہ نظر آتے تھے مگر معاملہ اس کے برعکس تھا۔ زیبا سے وہ کسی بات پر ناراض ہو کر منہ پُھلا لیتے تھے اور دونوں میں بات چیت بند ہو جاتی تھی۔ زیبا تو اپنی عادت کے مطابق بلاواسطہ مذاق اور چھیڑ خانی کرتی رہتی تھیں مگر محمد علی سچ مچ بگڑ جاتے تھے۔

اب منظر یہ ہے کہ محمد علی صاحب زیبا سے ناراض ہیں۔ زیبا کی باری سٹوڈیو میں شوٹنگ ہو رہی ہے اور محمد علی صاحب باری ملک کے کمرے میں تشریف فرما ہیں۔ گاہے گاہے زیبا کے میک اپ روم یا سیٹ کے سامنے سے بھی بیگانوں کی طرح گزر جاتے ہیں اور زیبا کی طرف مُطلق توجہ نہیں دیتے۔ اگر کوئی مخاطب کر کے سیٹ پر بلا لیتا ہے تو زیبا کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں مگر زیبا فقرے بازی اور چھیڑ خانی سے باز نہیں آتیں۔ بظاہر وہ بھی محمد علی سے مخاطب نہیں ہیں مگر سب کچھ ان ہی کے سامنے کہہ رہی ہیں۔ محمد علی کو مزید ستانے کیلئے وہ دوسرے لوگوں سے ہنسی مذاق بھی کرتی رہتی تھیں جو محمد علی کو ہرگز گوارا نہ تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم محمد علی کے بھی دوست تھے اور زیبا سے بھی دوستی اور بے تکلفی تھی۔ کچھ ہی عرصے میں ہماری زیبا سے اتنی گہری دوستی ہو گئی کہ ہم ان کے رازداں بھی بن گئے۔ وہ ہر ایک خبر ہمیں بلاتکلّف سنا دیا کرتی تھیں مگر یہ وعدہ لے کر کہ ہم اپنے تک ہی رکھیں گے۔ اکثر ہیروئنوں سے ہمارے اسی قسم کے مراسم تھے۔ کئی لوگ چھیڑنے کے لئے ہمیں ہیروئنوں کی سہیلی بھی کہا کرتے تھے۔ ہم سیٹ پر یا کسی محفل میں پہنچے اور کسی نے کہا ”لو بھئی آ گئی تمہاری سہیلی ،،

دراصل بات یہ ہے کہ ہم کسی ہیروئن سے اپنے کسی مطلب کیلئے نہیں ملتے تھے جو کچھ ہم سے بن پڑتا تھا ان کے لئے کرتے تھے۔اگر وہ ہم سے ذاتی یا کاروباری معاملات میں مشورہ طلب کرتیں تو ہم بڑے خلوص سے اپنی دانست میں بالکل صحیح رہنمائی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔یہ ہی وجہ ہے کہ وہ ہم پر اعتماد کرتی تھیں۔اکثر ہیروئنوں کے گھریلو اور خاندانی معاملات میں بھی ہم سے مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔گویا ہمارے ان سے خصوصی مراسم تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیں اعتماد میں لے کر ساری باتیں بلا کم و کاست بتادیا کرتی تھیں اور ہم نے کبھی ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔ زیبا اور محمد علی کے معاملے میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ محمد علی تو اپنا راز اپنے ہی تک محدود رکھنے کے قائل تھے۔انہوں نے زیبا کے بارے میں ہم سے کبھی کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی ہم نے کبھی اس موضوع پر لب کشائی کی۔ لیکن زیبا کی بات اور تھی۔وہ ملاقات ہونے پر زمانے بھر کی خبریں ہمارے گوش گزار کردیا کرتی تھیں اور ہم تازہ ترین صورت حال سے باخبر رہتے تھے۔مثلاً کون سا فلم ساز ان میں دلچسپی لے رہا ہے کون سا سٹوڈیو اونر ان پر مہربان ہے۔کون سا ہیرو کس قسم کے خیالات کا مظاہرہ کررہا ہے۔ کون سا ہدایت کار یا فلم ساز انہیں اپنی فلم میں کاسٹ کرنے اور ان سے رعایت حاصل کرنے کے لئے ان سے تعلقات بڑھا رہا ہے۔کون سی ہیروئن ان کی مخلص سہیلی ہے اور کون سی ہیروئن بظاہر سہیلی ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود ان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے وغیرہ وغیرہ۔

محمد علی کا معاملہ یہ تھا کہ وہ اپنا بھرم بھی قائم رکھنا چاہتے تھے۔اور یہ خواہش بھی رکھتے تھے کہ زیبا نہ صرف ان کے احساسات کا پاس کریں بلکہ بذات خود اس کا احساس کریں' اس کے برعکس زیبا کو یہ ضد تھی کہ جو ان کے دل میں ہے آخر وہ اسے زبان پر کیوں نہیں لے آتے؟

یہ ""سیاسی صورت حال"" تھی جب ہماری فلم ""کنیز"" کی فلم بندی کا آغاز ہوا۔اس وقت محمد علی اور وحید مراد دونوں ابھرتے ہوئے فنکار تھے۔زیبا' وحید مراد کے ساتھ کئی فلموں میں کام کررہی تھیں۔وہ ان کے پروڈیوسر بھی تھے اور ہیرو بھی۔

اس کے مقابلے میں محمد علی کے ساتھ انہوں نے پہلی فلم ''چراغ جلتا رہا'' کے بعد کام نہیں کیا تھا۔ وحید مراد ایک ہنس مکھ، خوش مزاج اور بے تکلف آدمی تھے۔ خاص طور پر اپنی ہیروئنوں کے ساتھ بہت بے تکلّف ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زیبا کے ساتھ خاصی بے تکلفی تھی۔ محمد علی کو کام کے سلسلے میں زیبا کے ساتھ ملنے جلنے کا زیادہ موقع نہیں ملتا تھا۔ اس کے علاوہ محمد علی بہت لئے دیئے رہتے تھے۔ زیبا کے ساتھ وحید مراد کی بے تکلیف محمد علی کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ زیبا کو اس بات کا احساس تھا کہ محمد علی ان باتوں پر کُڑھتے ہیں۔ محمد علی کی برہمی کے پیش نظر وہ جان بوجھ کر وحید مراد کے ساتھ ہنستی بولتی رہتی تھیں اور محمد علی غصے میں اونٹتے رہتے تھے۔ یہ وہ پس منظر اور ماحول تھا جب ہماری فلم ''کنیز'' کا آغاز ہوا۔

''کنیز'' کی شوٹنگ کے لئے وحید مراد خاص طور پر کراچی سے لاہور آئے۔ محمد علی اور زیبا ان دنوں لاہور ہی میں مقیم تھے۔ دونوں اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ گویا اس وقت تک یہ دونوں فنکار ''لاہوری'' ہو چکے تھے۔ وحید مراد لاہور پہنچ کر ایورنیو سٹوڈیو میں آ کر ہمارے دفتر میں کچھ دیر بیٹھے اور گپ شپ کرتے رہے۔ ایورنیو سٹوڈیوز میں فلم سازوں کے دفاتر بہت ماڈرن اور آرام دہ تھے۔ یہاں ملبوسات اور سامان رکھنے کے لئے سٹور بھی تھے اور غسل خانے بھی تھے۔ دیکھا جائے تو یہ فلیٹ کی صورت میں تھے۔ ہر فلم ساز اپنی ضرورت کے مطابق ان کمروں میں لکڑی کی پارٹیشن لگا کر اپنے دفتر کو سجا لیا کرتا تھا۔ سٹوڈیو میں ٹیلی فون ایکسچینج کی سہولت بھی موجود تھی اور ہر کمرے میں ٹیلی فون تھا۔ بعض فلم سازوں نے براہ راست اپنا ذاتی ٹیلیفون بھی لگا رکھا تھا۔ مختصر یہ کہ ایورنیو سٹوڈیو اس زمانے میں ایک روشن، صاف ستھرا اور نہایت ماڈرن سٹوڈیو تھا۔ بیش تر فلم ساز ہدایت کار اور ہنر مند بھی ذہین اور تعلیم یافتہ تھے جس کی وجہ سے یہاں بہت خوشگوار اور تخلیقی ماحول قائم ہو گیا تھا۔

ہم نے وحید مراد سے پوچھا کہ وہ کون سے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں تاکہ شوٹنگ کے لئے انہیں سٹوڈیو لانے کا بندوبست کیا جائے مگر وہ اپنے کسی عزیز یا دوست کے گھر میں ٹھہرے تھے۔ انہوں نے کہا وہ ٹیکسی کے ذریعے خود ہی سٹوڈیو پہنچ جایا کریں گے۔

''کنیز'' کے لئے ایک بڑے فلور میں ایک غریب گھر کا سیٹ تعمیر کیا جا رہا تھا۔ یہ صبیحہ خانم اور وحید مراد کا گھر تھا۔ دو

کمروں، صحن اور باورچی خانے کے علاوہ گھر کے باہر ایک گلی بھی بنائی گئی تھی۔ کیونکہ ایک دو مناظر میں محمد علی اپنی کار لے کر اپنے دوست کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ حقیقی ماحول پیدا کرنے کی غرض سے گھر کا بیرونی حصہ بھی تعمیر کیا گیا تھا۔
شوٹنگ شروع ہونے میں ابھی دو دن تھے اگلے روز طارق صاحب نے محمد علی، زیبا اور وحید مراد پر مشتمل ایک فوٹو سیشن رکھا تھا جس میں ان تینوں کی کچھ تصاویر بنانی تھیں۔ ایک تصویر میں زیبا کو وحید مراد اور محمد علی کے درمیان کھڑا ہوا دکھانا تھا۔ یہ تینوں کالج میں کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے دوست بھی ہیں۔ ان تینوں کی یہ ہنستی ہوئی تصویر فریم میں لگوا کر وحید مراد کے گھر میں رکھنی تھی تاکہ ان کی باہمی قربت اور دوستی واضح ہو جائے۔
ظاہر ہے کہ یہ ایک ہنستی مسکراتی خوش و خرّم دوستوں کی تصویر ہونی چاہئے تھی کیونکہ کہانی کے پیچ و خم میں اس تصویر کو بھی ایک اہمیت حاصل تھی۔ طارق صاحب نے فلم کے کیمرہ مین کامران مرزا کو بطور خاص بلایا تھا کہ وہ اپنی نگرانی میں لائٹس کرائیں اور سٹل فوٹو گرافر کو ضروری ہدایات اور مدد فراہم کریں۔
دوسرے دن ہم سیٹ پر پہنچے تو وہاں ابھی تک ٹھونکا ٹھانکی ہو رہی تھی۔ دروازے اور کھڑکیاں لگائی جا رہی تھیں۔ کھڑکیوں میں شیشے نصب کئے جا رہے تھے۔ ایک طرف آرٹ ڈائریکٹر کی نگرانی میں کمروں کے در و دیوار پر رنگ کیا جا رہا تھا۔ گھر کو پرانا اور غریبانہ رنگ دینے کے لئے دروازوں اور دیواروں پر بڑے اہتمام سے خاص طور پر دھبّے لگائے جا رہے تھے۔ فلور کے ایک حصے میں یہ سرگرمیاں جاری تھیں اور دوسرے حصے میں ایک جانب کامران مرزا روشنیاں درست جگہوں پر نصب کرا رہے تھے۔
انہوں نے ہمیں دیکھا تو فوراً پکار کر کہا ''اوہو آفاقی صاحب آپ بڑے اچھے موقع پر آئے ہیں۔''
''کیا ہماری ضرورت پیش آگئی ہے'' ہم نے پوچھا۔
''بہت سخت ضرورت ہے، آیئے ادھر آجایئے۔'' انہوں نے ہمیں روشنیوں کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا اور آواز لگائی ''فل لائٹس''
اچانک سیٹ کا وہ حصّہ روشنی سے معمور ہو گیا۔
کامران مرزا ہمارا ہاتھ پکڑ کر کیمرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر اسحاق اکرام کو

بھی بلا کر وہیں ہمارے برابر کھڑا کر لیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ہم نے پوچھا

''تصویر بنانے کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ فکر نہ کیجئے آپ ذرا ادھر کو ہو جایئے۔'' ہم ان کے کہنے کے مطابق کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے روشنی کا جائزہ لیا پھر ہمیں دیکھا اور غیر مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ انہوں نے لائٹس کو پھر اِدھر اُدھر کرنے کے بعد دوبارہ ہمارا جائزہ لیا اور کہا ''بس اب بالکل حرکت نہ کیجئے ساکت ہو جائیں۔''

''بھئی کیا بات ہے'' آخر ہم نے تنگ آ کر پوچھا۔

''بگڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چہرے پر مسکراہٹ رکھیے اور ہاں آپ کو ہم دونوں کے درمیان میں کھڑا ہونا ہے۔''

''وہ کس لئے؟''

''اس لئے کہ آپ اس وقت زیبا خانم ہیں۔ میں وحید مراد اور یہ محمد علی، ہم سٹل فوٹو کی تیاری کر رہے ہیں۔''

انہوں نے ہمیں زیبا کے ڈپلی کیٹ کے طور پر کیمرے کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ ہم انہیں برا بھلا کہتے ہوئے سیٹ سے باہر چلے گئے۔ ہمیں شوٹنگ کے سلسلے میں کچھ اور ضروری انتظامات بھی کرنے تھے۔ اس سیٹ پر حقیقی گھریلو ماحول پیدا کرنے کی غرض سے چھوٹی موٹی گھریلو چیزیں بھی منگائی تھیں تاکہ سیٹ پر حقیقی مکان کا گمان ہونے لگے۔ ہمیں سیٹ سے باہر جاتے دیکھا تو کامران مرزا نے کہا ''جا رہے ہیں؟ کوئی بات نہیں۔ ہم دوسری زیبا بیگم کا بندوبست کر لیں گے۔''

ہم اسٹوڈیو آفس میں جا کر ضروری بات چیت میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر بعد اپنے دفتر میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ محمد علی، زیبا اور وحید مراد تینوں آ گئے ہیں اور طارق صاحب کے ساتھ تصویر بنوانے کے لئے سیٹ پر گئے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کافی پی جائے۔ ابھی کافی کی پیالی ختم نہیں ہونے پائی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور محمد علی اندر داخل ہوئے۔ ان کے چہرے سے برہمی ظاہر تھی۔ نہ علیک سلیک، نہ سلام دعا، آتے ہی ایک صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ غصّے میں ہیں۔

ہم اس انتظار میں رہے کہ وہ کچھ بولیں مگر وہ بالکل خاموش ہو گئے۔

پوچھا۔ ’’کافی پینی ہے؟‘‘

انہوں نے زبان سے جواب دینے کے بجائے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی ناخوش گوار بات ہو گئی ہے ورنہ وہ کبھی بد مزاجی نہیں کرتے تھے۔

’’کیا ہوا۔ کوئی پرابلم ہے؟‘‘ ہم نے پوچھا۔

’’نہیں‘‘ انہوں نے غصّے میں مختصر سا جواب دیا۔

ہم اُٹھ کر ان کے پاس جا بیٹھے ’’آخر بات کیا ہے۔ کچھ بتاؤ بھی؟‘‘

’’رہنے دو یار۔ کسی چیز کی تمیز ہی نہیں ہے۔ آخر کوئی طریقہ ہونا چاہئے۔‘‘ انہوں نے مزید برہمی کا اظہار کیا۔

ہم نے چپراسی کو بلا کر ان کے لئے پانی اور کافی لانے کے لئے کہا اور خود اٹھ کر یہ جاننے کے لئے سیٹ کی طرف چل دیئے کہ آخر معاملہ کیا ہے۔

اسٹوڈیو کی خوبصورت روش سے گزر کر ہم درمیانی فوارے تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ سامنے فلور کی طرف سے طارق صاحب آتے ہوئے نظر پڑے۔ ہمیں دیکھا تو وہ ہمارے پاس ہی چلے آئے۔ وہ پریشان اور فکر مند نظر آ رہے تھے۔

ہم نے پوچھا ’’طارق صاحب کیا بات ہے۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی؟‘‘

بولے ’’آفاقی صاحب۔ ان لوگوں میں تو ایک دوسرے کے لئے برداشت ہی نہیں ہے۔‘‘

’’مگر ہوا کیا؟‘‘

’’بس جھگڑا ہو گیا۔ ناراض ہو کر سیٹ سے چلے گئے۔‘‘

ہم نے کہا ’’محمد علی ہمارے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ آپ ان کے پاس جائیں۔ زیبا اور وحید مراد کہاں ہیں؟‘‘

’’وہ دونوں وہیں سیٹ پر ہیں مگر فوٹو سیشن تو آج نہیں ہو سکتا۔‘‘

ہم نے کہا ’’آپ دفتر میں جا کر محمد علی صاحب کو روکیں۔ ہم ابھی سیٹ پر سے ہو کر آتے ہیں۔‘‘

لیجئے۔ اسے کہتے ہیں سر منڈاتے ہی اولے پڑے یعنی ہماری فلم کا ابھی آغاز بھی نہیں ہوا اور اداکاروں کے لڑائی جھگڑے

شروع ہو گئے۔

ہم سیٹ پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک پرانی سی چارپائی پر زیبا بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان کے سامنے ایک پرانی سی لکڑی کی کرسی پر وحید مراد تشریف فرما ہیں۔ کیمرہ مین کامران مرزا دوسرے کونے میں کھڑے اسٹل فوٹو گرافر کے ساتھ دبی آواز میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ ہمیں دیکھا تو وہ تیزی سے ہماری طرف بڑھے۔

''کامران صاحب، کیا ہوا؟' یہ قصّہ کیا ہے؟''

انہوں نے زیبا اور وحید مراد کی طرف دیکھا اور بولے ''ان سے پوچھ لیجئے۔''

وحید مراد ہمیں دیکھ کر کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور ان کے چہرے پر سنجیدگی تھی مگر زیبا مسکرا رہی تھی۔

زیبا نے ہم سے کہا ''آیئے پروڈیوسر صاحب۔ آپ ہی کی کمی باقی تھی۔''

ہم نے پوچھا ''محمد علی سیٹ سے کیوں چلے گئے؟''

زیبا نے جواب دیا ''دماغ کی خرابی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ غصّہ تو ان کی ناک پر دھرا رہتا ہے۔ بات بے بات ناراض ہوتے رہتے ہیں۔''

''مگر کوئی وجہ تو ہو گی؟''

''ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ چاہے وحید مراد سے پوچھ لو۔''

ہم نے وحید مراد کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ اپ سیٹ نظر آ رہے تھے۔

''بھئی ہوا کیا ہے۔ آخر معلوم تو ہو؟''

وحید مراد نے بے بسی سے کندھے اچکائے اور بولے ''ہوا تو کچھ بھی نہیں۔ ہم دونوں یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ محمد علی صاحب باہر سے آئے۔ کامران صاحب نے ہم تینوں کو پوزیشن سمجھائی اور کیمرے کے سامنے کھڑے ہونے کو کہا۔ طارق صاحب ہمیں تصویر کا بیک گراؤنڈ سمجھا رہے تھے کہ اچانک محمد علی صاحب ''یہ کیا طریقہ ہے'' کہہ کر باہر چلے گئے۔ طارق صاحب نے انہیں آواز دے کر روکنے کی کوشش بھی کی مگر وہ نہ رُکے اور سیدھے باہر چلے گئے۔''

ہم نے حیران ہو کر وحید مراد کی طرف دیکھا "یہ کیا بات ہوئی۔"

انہوں نے معصومیت سے جواب دیا۔ "یہی تو میں حیران ہوں۔"

ہم نے پھر زیبا کی طرف دیکھا۔ اب وہ قدرے سیریس نظر آ رہی تھیں۔

"دیکھو آفاقی وحید نے بالکل ٹھیک کہا ہے، ہم نے ان سے کچھ بھی نہیں کہا ہم تو آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ طارق صاحب نے ہمیں بلایا تو ہم اپنی پوزیشن میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ محمد علی اور وحید مراد بھی میرے دونوں طرف آ کر کھڑے ہو گئے اور کامران صاحب لائٹس چیک کرنے لگے۔ طارق صاحب نے مجھے بتایا کہ آپ تینوں آپس میں بہت اچھے دوست ہیں اور اس وقت خوش گوار موڈ میں ہیں۔ آپ ہنستے ہوئے ان دونوں کے بازو میں باز وڈالیں اور کیمرے کی طرف دیکھیں۔ میں نے وحید کے بازو میں بازو ڈال دیا اور پھر جب محمد علی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے یک دم میرا ہاتھ جھٹک دیا اور بڑبڑاتے ہوئے غصے میں سیٹ سے باہر چلے گئے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اگر میرا یقین نہیں ہے تو کامران صاحب سے پوچھ لو۔"

ہم نے کامران مرزا کی طرف دیکھا وہ بھی کچھ پریشان سے نظر آ رہے تھے۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے کہا "مجھے تو کچھ پتا نہیں کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ میں تو لائٹس درست کر رہا تھا میری توجہ کیمرے کی طرف تھی۔ جب میں نے اس طرف دیکھا تو محمد علی صاحب ناراض ہو کر سیٹ سے باہر جا رہے تھے۔ طارق صاحب نے انہیں آواز بھی دی مگر وہ ان سنی کر کے چلے گئے"۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس جھگڑے میں کسی کی طرفداری نہیں کرنا چاہتے تھے۔"

ہم نے پوچھا "ہم یہی تو پوچھ رہے ہیں کہ محمد علی کس بات پر ناراض ہو گئے؟"

وہ بولے "یہ تو میں نہیں جانتا۔ میرا دھیان اس وقت کسی اور طرف تھا۔"

ان تینوں کے بیانات کے بعد سیٹ پر موجود لائٹ مین' اسسٹنٹ کیمرا مین' فوٹو گرافر اور سیٹنگ قلیوں سے دریافت کرنا بے سود تھا۔

وحید مراد نے پوچھا کیا "محمد علی صاحب چلے گئے"

ہم نے کہا "گئے تو نہیں لیکن اگر صحیح بات معلوم نہ ہوئی اور ان کی شکایت دور نہ کی گئی تو شاید چلے ہی جائیں گے۔ آپ

لوگوں کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

"مگر ہم نے کیا کیا ہے؟" زیبا نے احتجاج کیا۔

ہم نے کہا "کچھ نہ کچھ تو ضرور کیا ہے"

زیبا کے چہرے پر ایک بار پھر شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے وہ بڑی صفائی سے چھپانے میں کامیاب ہو گئیں۔

ہم نے زیبا سے کہا "دیکھیں یہ ہماری پہلی فلم کا پہلا پہلا کام ہے۔ آپ لوگوں کو کچھ ہمارا بھی خیال کرنا چاہیے۔ "

وحید تو خاموش رہے مگر زیبا نے کہا "بھئی میری تو خود سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیوں ہوا؟ آپ کے ہیرو صاحب کے دل کا حال کوئی نہیں جانتا۔ تمہارے تو دوست ہیں۔ خود ہی جا کر پوچھ لو۔ اگر میرا قصور نکلا تو جو چور کی سزا وہ میری۔"

کامران مرزا ہمارے پاس آ کر کہنے لگے۔ "آفاقی صاحب سیٹ پر کام رکا ہوا ہے۔ کل ہمیں شوٹنگ بھی کرنی ہے۔ اگر آج سیٹ تیار نہ ہوا تو شوٹنگ کیوں کر ہو گی؟ جلدی فیصلہ کیجئے اور اگر تصویریں بنوانی ہیں تو بنوا لیجئے۔"

ہم نے کہا "آپ تو جانتے ہیں کہ یہ تصویر سیٹ پر رکھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔"

"تو پھر محمد علی صاحب کو بلائیے تا کہ کام ختم ہو جائے۔ میں نے لائٹس وغیرہ سب تیار کر رکھی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے کا کام ہے۔ "

زیبا نے یہ سن کر منہ بنالیا اور بولیں "ٹھیک ہے۔ آپ تصویر بنوانے کا بندوبست کریں مجھے شوٹنگ پر بھی جانا ہے۔"

ہم نے زیبا اور وحید مراد سے کہا کہ وہ فی الحال سیٹ پر ہی موجود رہیں۔ ہم محمد علی صاحب کو جا کر لاتے ہیں۔

اپنے دفتر میں پہنچے تو عجب غمگیں اور سوگوار منظر تھا۔ ایک صوفے پر محمد علی روٹھے ہوئے بیٹھے تھے دوسرے صوفے پر طارق صاحب اُداس بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہمیں دیکھا تو طارق صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے ہمارا خیر مقدم کیا۔

ہم محمد علی کے پاس جا کر بیٹھ گئے "آخر بات کیا ہوئی ہے کس بات پر ناراض ہو گئے۔ کچھ معلوم تو ہو۔ "

وہ برہمی سے بولے۔ ''آفاقی صاحب میں اس طرح کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ ''

''مثلاً کس طرح؟'' ہم نے پوچھا۔

وہ کچھ لاجواب سے ہوگئے پھر بولے ''سیٹ پر کام کرنے کا سنجیدہ ماحول ہونا چاہیے۔ آپ طارق صاحب سے پوچھ لیجئے وہ لوگ تو کام کو بھی مذاق ہی سمجھتے ہیں۔ ''

ہم نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا ''بھائی فی الحال یہ بات جانے دو۔ اب چل کر تصویریں بنوالو۔ کل ہمیں سیٹ پر اس تصویر کی ضرورت ہے۔ ''

ان کے چہرے کی کشیدگی کچھ کم ہونے لگی تھی۔ ہم نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھانے کی کوشش کی اور کہا ''زیادہ وقت نہیں ہے۔ بیس پچّیس منٹ کی بات ہے پھر اس کے بعد زیبا کو شوٹنگ کے لئے بھی جانا ہے۔''

''میں نے کسی کی شوٹنگ کا ذمہ تو نہیں لے رکھا ہے'' وہ ایک بار پھر بھڑک اٹھے۔

''مگر ہماری شوٹنگ کا ذمہ تو لیا ہے نا۔ اگر یہ تصویر نہ بنی تو کل ہماری شوٹنگ نہ ہوسکے گی۔ چلو اب غصّہ تھوک دو۔ سیٹ پر انتظار ہو رہا ہے۔ ''

محمد علی قدرے پس و پیش کے بعد اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

ہم نے طارق صاحب کی طرف دیکھا جو سگریٹ سلگا رہے تھے ''آیئے طارق صاحب ''!

طارق صاحب بہت بے دلی سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور زبان سے کوئی ایک لفظ بھی نکالے بغیر ہمارے ساتھ چل پڑے۔

یہ مختصر سا قافلہ دوبارہ سیٹ پر پہنچا تو زیبا بدستور چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی کامران مرزا سے باتیں کر رہی تھیں۔ وحید مراد بدستور کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر کامران مرزا کے چہرے پر اطمینان بخش مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ فوراً مستعدی سے کیمرے کے پاس پہنچ گئے۔

''چلو بھئی لائٹس آن کرو ایک ریہرسل کریں گے۔ ''

یہ آواز ان کے منہ سے نکلتے ہی ایک دم جیسے کسی جادوئی عمل سے تمام سیٹ روشن ہوگیا۔

طارق صاحب نے محمد علی زیبا اور وحید مراد کو مقررہ جگہ پر کھڑا کر دیا۔ وہ تینوں ایک لائن میں کھڑے ہو گئے اور طارق صاحب کے اشارے پر وحید مراد نے زیبا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا مگر محمد علی صاحب بدستور پتھر کے مجسمے کی مانند بے حس و حرکت کھڑے رہے۔

طارق صاحب کی آواز بلند ہوئی ''محمد علی، زیبا کا ہاتھ پکڑ لو۔''

مگر محمد علی بدستور زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد بنے رہے۔

وحید مراد اور زیبا نے کن انکھیوں سے طارق صاحب کو اور پھر ہمیں دیکھا۔ مطلب یہ کہ خود ہی دیکھ لیجئے۔ ہمارا کوئی دوش نہیں ہے۔ طارق صاحب نے زیبا سے مخاطب ہو کر کہا ''زیبا بیگم آپ ہی محمد علی کا ہاتھ پکڑ لیجئے۔''

زیبا نے ذرا جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھا دیا اور محمد علی کا بازو تھام لیا مگر اس طرح تصویر میں وہ تاثر پیدا نہیں ہو سکتا تھا جو مطلوب تھا۔ وحید مراد کے بازو میں اپنا بازو ڈالا تھا تو محمد علی کے بازو میں بھی اسی طرح بے تکلفی سے بازو ڈال کر کھڑا ہونا ضروری تھا مگر محمد علی صاحب کے تعاون کے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔

طارق صاحب نے کہا ''محمد علی، لائٹس آن ہیں۔ آپ تینوں دوستانہ انداز میں بازو میں بازو ڈال کر کھڑے ہوں تاکہ تصویر اتاری جائے۔''

محمد علی نے زیبا اور وحید مراد کی طرف دیکھے بغیر اپنا بازو دوستانہ انداز میں زیبا کے بازو میں ڈال دیا اور ہم سب نے اطمینان کی سانس لی۔ تینوں کے چہروں میں مسکراہٹ تھی۔ فوٹو گرافر نے چند تصاویر بنائیں اور طارق صاحب نے مطمئن ہو کر پیک اپ کہا اور روشنیاں ایک دم بجھ گئیں۔ محمد علی نے اپنا بازو زیبا کے بازو سے نکالا اور بے تعلقی سے سیٹ سے باہر چلے گئے۔

طارق صاحب نے کامران مرزا سے پوچھا ''کیوں کامران، تصویر تو ٹھیک بن جائے گی نا؟''

''بالکل ٹھیک بنے گی۔ مگر علی صاحب کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ نہیں تھی وہ تو کیمرا مین اپنے پاس سے نہیں ڈال سکتا۔''

طارق صاحب نے ہمیں دیکھا تو ہم نے کہا ''پھر بھی تصویر ٹھیک بن گئی ہے۔ آخری دو تصویروں میں محمد علی مسکرا رہے

تھے۔ ''

وحید مراد نے ایک لمبی سی سانس لی اور طارق صاحب سے پوچھا ''اب ہمیں جانے کی اجازت ہے؟ ''

طارق صاحب نے کہا' تھینک یو وحید، کل صبح دس بجے پہنچ جانا، تمہارا اڈریس کل تیار ملے گا۔ ''

''اور مجھے کل کیا کرنا ہے؟'' زیبا نے پوچھا

''کل آپ کا کام نہیں ہے۔ ہماری طرف سے آپ آرام کریں۔''

''تھینک یو'' زیبا نے مسکرا کر کہا ''او کے آفاقی خدا حافظ'' اور سیٹ سے باہر چلی گئیں۔

سیاہ ساڑھی میں ملبوس وہ بہت سمارٹ لگ رہی تھیں۔ فلم میں وحید مراد ایک غریب نوجوان ہیں مگر اس وقت وہ بھی محمد علی کی طرح سوٹ اور ٹائی میں تھے اور بہت اچھے لگ رہے تھے۔

سیٹ پر مزدوروں اور ترکھانوں نے دوبارہ کام شروع کر دیا تھا اور وہ ٹھک ٹھک کی آوازوں سے گونجنے لگا۔

ہم سیٹ کے کاموں اور ضروری سامان کی فراہمی کا جائزہ لینے کے بعد اپنے دفتر میں داخل ہوئے تو طارق صاحب بیٹھے ہوئے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ چپڑاسی نے چائے کی پیالی لا کر رکھی اور کمرے سے رخصت ہو گیا۔

''شکر ہے تصویر تو ٹھیک بن گئی'' ہم نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

طارق صاحب کہنے لگے ''آفاقی صاحب' اس طرح کیسے کام چلے گا؟ ''

ہم نے ان کی طرف دیکھا۔

طارق صاحب بولے ''ایک تصویر بنانے میں اتنی پرابلم پیش آئی ہے۔ ابھی تو پوری فلم بنانی ہے۔ ان لوگوں کا یہی رویّہ رہا تو شوٹنگ کیسے ہو گی اور فلم کیوں کر مکمل ہو گی۔ یہ تو بہت لمبا کام ہے۔ ''

ہم نے کہا'' ان لوگوں میں ذرا بچپنا ہے۔ ''

''مگر فلم بنانا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔'' طارق صاحب نے سنجیدگی سے کہا ''آفاقی صاحب آپ ان لوگوں سے سیریسلی بات کیجئے، مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہمیں کاسٹ بدلنی پڑے گی۔ ''

ہم نے گھبرا کران کی طرف دیکھا''کل ہماری شوٹنگ شروع ہو رہی ہے اور اس سیٹ پر کافی کام کرنا ہے۔اتنی جلدی آرٹسٹ کیسے بدلیں گے اور دوسرے آرٹسٹوں کی ڈیٹس کیسے ملیں گی۔؟''

''مگران تینوں کا جو روّیہ ہے اس کو دیکھتے ہوئے آنے والے واقعات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کی آپس میں نہیں بنے گی اور سارا ملبہ ہمارے اوپر پڑ جائے گا۔میرا دل کہتا ہے کہ ہمیں کاسٹ میں تبدیلیاں ضرور کرنی پڑیں یا تو زیبا اور وحید مراد کو بدلیں اور یا پھر محمد علی کو،اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔''

ہم سوچ میں پڑ گئے۔

طارق صاحب نے کہا''آپ ان تینوں سے بالکل کھل کر بات کر لیجئے۔''

ہم نے تجویز پیش کی'' آپ کیوں نہیں بات کرتے۔''

انہوں نے کہا'' آپ کے زیبا اور محمد علی سے زیادہ اچھے تعلقات ہیں۔آپ بے تکلفی سے ان سے بات کر سکتے ہیں۔ وہ آپ کا لحاظ بھی کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر طارق صاحب سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔

ہم نے غور کیا تو طارق صاحب کا مشورہ بالکل درست پایا۔یہ تو محض ایک تصویر اور چند منٹ کا معاملہ تھا۔ہم نے سمجھا بجھا کر یہ مسئلہ حل کر لیا تھا مگر فلم کی شوٹنگ شروع ہونے کے بعد ہر سین اور ہر شاٹ سے پہلے یہ کارروائی ممکن نہ تھی۔ اب کیا کرنا چاہیے اتنے کم وقت میں نئے فن کار دستیاب نہیں ہو سکتے۔ہمارے لئے محمد علی اور زیبا دونوں میں سے کسی ایک کو بھی فارغ کرنا ہمارے بس میں نہیں تھا۔ہم اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ کامران مرزا آ گئے۔

''دیکھ لیا آفاقی صاحب،پروڈیوسر کی جان کو کتنے مسائل چمٹے رہتے ہیں۔''

ہم نے کہا'' کامران صاحب آپ تو وہاں موجود تھے اب سچ سچ بتایئے کہ واقعہ کیا ہوا تھا۔محمد علی ناراض کیوں ہو گئے تھے اور اس میں زیادتی کس کی تھی؟''

انہوں نے کہا'' اگر اتنا مشکل کام کرانا ہے تو پہلے کافی منگائیں۔'' ہم نے چپڑاسی کو کافی بنانے کے لئے کہا اور ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئے۔

کامران مرزا نے قریب قریب وہی کہانی سنائی جو زیبا اور وحید مراد نے ہمیں سنائی تھی۔

ہم نے کہا ’’مگر اس میں تو کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ محمد علی ناراض ہوتے۔‘‘
وہ کہنے لگے ’’بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔ مگر کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہوگی ورنہ محمد علی کو یہ سچویشن پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟‘‘
یہ دلیل بھی معقول تھی۔ جتنی دیر کامران کافی پیتے رہے ہم اپنے دماغ پر زور ڈال کر سوچتے رہے کہ دراصل بنیادی مسئلہ کیا ہو سکتا ہے اور اس کو حل کیسے کیا جائے گا۔ لیکن جب تک مسئلے کی نوعیت ہی کا علم نہ ہو تو اس کا حل کیونکر تلاش کیا جا سکتا ہے۔
کافی غور و خوض کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اصل مسئلہ زیبا اور محمد علی کے درمیان میں ہے۔ وحید مراد صرف ’’سپورٹنگ کاسٹ‘‘ ہیں۔ بہرحال، حقیقت کچھ بھی ہو یہ مسئلہ حل کئے بغیر ہماری فلم کی شوٹنگ التوا میں پڑ سکتی تھی۔

دیکھا جائے تو ’’کنیز‘‘ ہمارے خوابوں کی تعبیر تھی۔ جس طرح پہلی اولاد بہت لاڈلی اور پیاری ہوتی ہے اسی طرح کنیز بھی ہماری پہلی پہلی ’’اللہ آمین‘‘ کی فلم تھی۔ ہم نے اس پر اپنے مستقبل کی عمارت استوار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ کافی غور و خوض کے بعد ہم نے اس کی کہانی تحریر کی تھی اور پھر اسے فلم کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے بہت پاپڑ بیلے تھے۔ یہ ہمارے خوابوں کی خوب صورت تعبیر بھی بن سکتی تھی اور ایک ڈراؤنے خواب میں بھی ڈھل سکتی تھی۔ ہم نے تہیّہ کر رکھا تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے ہم ’’کنیز‘‘ کو بنا کر ہی دم لیں گے۔ طارق صاحب کا یہ مشورہ ہمیں سو فیصد درست معلوم ہوا تھا کہ ہمیں محمد علی اور زیبا سے صاف اور واضح الفاظ میں بات کرنی چاہئے اور اگر وہ تعاون کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو فلم کی کاسٹ میں تبدیلی کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔
ہم نے دو ٹوک بات کرنے کے لئے پہلے زیبا کی کوٹھی کا رخ کیا۔ لالی جی نے حسب معمول بہت خندہ پیشانی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ زیبا اندر مصروف تھیں اسلئے ہمیں کچھ دیر لالی جی کے ساتھ بھی تبادلہ خیال کرنے کا موقع مل گیا۔
ہمیں پریشان اور سنجیدہ دیکھ کر وہ فکر مند ہو گئیں۔ ’’آفاقی کیا بات ہے، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟‘‘

''ابھی تک تو ٹھیک ہے'' ہم نے جواب دیا

وہ غور سے ہمارا چہرہ دیکھنے لگیں ''کیا کسی سے لڑ کر آئے ہو؟''

''جی نہیں'' ہم نے جواب دیا ''لڑنے آئے ہیں ''

''مجھ سے ؟ ''

''آپ کی صاحب زادی سے۔ ''

اب وہ بھی سیریس ہو گئی تھیں۔ '' بھئی بتاؤ گے بھی یا پہیلیاں ہی بجھواتے رہو گے۔ ''

ہمارے جواب دینے سے پہلے زیبا کمرے میں داخل ہو گئیں

''اوہو۔ پروڈیوسر صاحب آئے ہیں'' وہ مسکرائیں ''کہیے باس کیا پیئیں گے ؟ ''

''تم سے لڑنے آئے ہیں'' لالی جی نے انہیں مطّلع کیا '' آرام سے بیٹھ کر ان کی بات سنو۔ ''

زیبا سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''اب کیا ہو گیا؟'' انہوں نے پوچھا۔

ہم نے کہا ''دیکھو ہم زندگی میں پہلی فلم بنا رہے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ ہماری آخری فلم بھی ہو۔ ''

''اللہ نہ کرے'' لالی جی بول پڑیں۔

''بشر طیکہ یہ مکمل ہو جائے۔۔۔'' ہم نے فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا ''۔۔۔ ورنہ یہ نہ تو ہماری پہلی فلم ہو گی اور نہ ہی آخری۔ ''

''مکمل کیوں نہیں ہو گی۔'' زیبا نے جواب دیا ''شروع ہوئی ہے تو ختم بھی ہو گی۔ ''

''شروع کہاں ہوئی ہے۔'' ہم نے کہا ''ابھی تو ایک تصویر ہی بنی ہے اور پرابلم پیدا ہو گئی۔ شوٹنگ کیسے ہو گی۔ ''

زیبا نے پہلے تو ملازم کو چائے لانے کے لئے کہا، پھر ہم سے مخاطب ہوئیں '' بھئی تم دنیا میں انوکھی فلم تو نہیں بنا رہے۔ جیسے سب کی فلموں کی شوٹنگ ہوتی ہے اسی طرح تمہاری بھی ہو جائے گی۔ یہ ڈرامے بازی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ''

ہم نے سنجیدگی سے کہا"مذاق چھوڑو، ہم سیریسلی بات کرنے آئے ہیں۔ ہم فلم بنا رہے ہیں۔ سراغ رسانی کا ادارہ نہیں بنا رہے کہ یہی کھوج لگاتے رہیں کہ ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے سے ناراض کیوں ہوگئے اور اس کا ذمہ دار کون ہے۔ اس لمبی تفصیل کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہم صرف ایک بات دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ محمد علی کے ساتھ فلم میں کام کرنا چاہتی ہیں یا نہیں۔"

انہوں نے کہا۔ لو اور سنو، بھئی میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کے سوچنے کی بات ہے۔

"لیکن جب تک اداکاروں میں انڈرسٹینڈنگ اور میل جول نہ ہو' وہ ذرا ذرا سی بات پر بچّوں کی طرح خفا ہوتے رہیں۔ جھگڑتے رہیں' اس وقت تک کوئی فلم ساز فلم کیسے بنا سکتا ہے؟"

لالی جی نے پوچھا"کچھ مجھے بھی تو بتاؤ آخر بات کیا ہے"

"یہ اپنی بیٹی سے پوچھئے پہلے ہی دن انہوں نے محمد علی کو ناراض کر دیا اور وہ تصویر بنوانے کے بجائے سیٹ سے باہر چلے گئے۔

زیبا نے تیزی سے کہا"سارا الزام مجھ پر نہ ڈالو، میں نے کسی کو ناراض نہیں کیا اور نہ ہی میں نے ہر ایک کا موڈ ٹھیک کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔"

"آپ نے تو صرف موڈ خراب کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے" ہم نے کہا"بہر حال ہم بحث کرنے نہیں آئے ہیں۔ صرف یہ پوچھنے آئے ہیں کہ اگر آپ دونوں میں اسی طرح کھٹ پٹ ہوتی رہی تو فلم نہیں بن سکتی۔"

"یہ تم محمد علی صاحب کو بتاؤ اور ان ہی سے پوچھو وجہ"

"ان سے بھی پوچھیں گے' پہلے آپ فرمائیں؟"

"میں کیا فرماؤں؟"

"یہی کہ میری فلم میں کام کرنا چاہتی ہیں کہ نہیں اور محمد علی کے ساتھ کام کرنا ہے یا نہیں؟"

زیبا ہنسنے لگیں۔

ہم نے کہا ”دیکھو زیبا۔ ہم پہلے ہی کافی پریشان ہیں‘ ہمارے لئے ایک اور پرابلم پیدا نہ کرو۔ اس طرح تو کام نہیں ہو سکتا۔“

زیبا چند لمحے ہمیں دیکھتی رہیں پھر بولیں ”میرا کوئی قصور نہیں ہے مگر پھر بھی آئندہ تمہیں میری طرف سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔“

”شکایت ہمیں نہیں‘ محمد علی کو ہوئی ہے“ ہم نے کہا۔

”میری طرف سے انہیں بھی کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ بس؟ اگر وہ بلاوجہ ہی خفا ہو جائیں تو وہ بات الگ ہے۔“ انہوں نے کہا۔

کچھ دیر بعد کشیدگی ختم ہوئی تو اس موضوع پر زیادہ‘ بے تکلّفی سے بات چیت ہوئی۔ ہمارا یہ اندازہ بالکل درست نکلا کہ تصویر بنواتے وقت زیبا نے مذاق میں وحید مراد پر کوئی ایسا فقرہ کسا جو دراصل محمد علی صاحب کو سنانے کیلئے بولا گیا تھا۔ وہ ان سے پہلے ہی ناراض تھے۔ اس بات سے مزید ناراض ہو گئے۔ ہمارے سمجھانے پر زیبا نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ جان بوجھ کر انہیں تنگ نہیں کریں گی۔ پھر کہا ”لیکن دیکھو اگر کوئی خود ہی تنگ ہو جائے تو مجھے الزام نہ دینا۔“

زیبا کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد ہم محمد علی صاحب کے پاس پہنچے اور یہی موضوع چھیڑ دیا۔

انہوں نے کہا ”بھئی آفاقی میں کیا کروں۔ دوسروں کو بھی سنجیدہ ہو کر کام کرنا چاہیے۔“

ہم نے کہا ”دوسروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ بھئی ہر ایک کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اگر کوئی آپس میں ہنسی مذاق کرتا ہے تو آپ کو کیا۔ اگر اتنے ہی زود رنج رہے تو ہماری فلم تو بننے سے رہی۔ ہم اس وقت یہی پوچھنے آئے ہیں۔ طارق صاحب بھی کافی پریشان ہیں۔ اگر سیٹ پر اداکاروں میں بات بات پر کشیدگی پیدا ہونے لگے تو ڈائریکٹر اپنا کام کیسے کرے گا؟“

”مگر میں نے تو کچھ نہیں کیا؟“

ہم نے کہا ”بھائی زیبا کی تو عادت ہے ہنسی مذاق کرنے کی۔ آپ چڑ جاتے ہیں تو وہ آپ کو اور زیادہ چڑاتی ہیں۔ اب وہ تو اپنی عادت بدلنے سے رہیں۔“

وہ بولے ”میری بھی عادت ہے کہ سیٹ پر فالتو بات پسند نہیں کرتا۔ “

ہم نے کہا”اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم فلم کی کاسٹ بدل دیں؟ “

”کیا مطلب؟ “

’مطلب صاف ہے۔ایسی صورت میں ہم اور طارق صاحب ہر روز آپ لوگوں کی صلح صفائی کرانے سے تو رہے۔یہ مسئلہ تو اسی وقت حل ہو سکتا ہے جب یا تو اس فلم میں زیبا نہ ہوں یا پھر آپ نہ ہوں۔ “

”ٹھیک ہے، مجھے کٹ کر دو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے“ وہ برہمی سے بولے۔

ہم نے کہا”محمد علی صاحب یہ ہماری پہلی فلم ہے۔اس طرح تو بسم اللہ ہی غلط ہو جائے گی۔اگر ہمارے دوست ہی تعاون نہیں کریں گے تو دوسروں سے کیا توقّع رکھی جاسکتی ہے۔اب عین وقت پر ہمیں دوسرے آرٹسٹ تو ملیں گے نہیں۔اس کا یہی علاج ہے کہ ہم فلم ہی نہ بنائیں یا اسے ملتوی کر دیں۔ “

”ارے نہ نہ“

وہ پریشان ہو گئے۔چندا کیسی باتیں کرتے ہو۔یار تمہاری فلم نہ بنے‘ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ “

”اگر آپ لوگوں کا تعاون حاصل نہ ہوا تو یہی ہو گا۔ “

”ارے نہیں۔فضول باتیں مت کرو۔تم کل سے شوٹنگ کرو۔ “

”اور اگر دوبارہ بچّوں کی طرح لڑائی جھگڑا شروع ہو گیا تو کیا ہو گا؟“ ہم نے پوچھا۔

وہ ہنس پڑے۔”آفاقی تم فکر نہ کرو۔میری طرف سے تمہیں کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ مجھے خفا ہونا ہو گا تو کسی اور فلم کے سیٹ پر ہو جایا کروں گا۔ “

”مگر پھر بھی اثر تو ہماری فلم پر بھی پڑے گا۔ “

”مگر تم انہیں بھی تو منع کرو۔ “

”کیا منع کروں۔۔۔؟کہ وہ ہنسی مذاق نہ کریں؟یہ پابندی تو بہت مشکل ہے۔ “

محمد علی کچھ لاجواب ہو گئے۔

ہم نے پوچھا'' سنئے آپ کا وحید مراد سے تو کوئی جھگڑا نہیں ہے نا؟ ''

'' بالکل نہیں۔ یار وہ بہت اچھا ایکٹر ہے۔ پڑھا لکھا' بااخلاق آدمی ہے۔ بس مجھے اس کی چال پسند نہیں ہے۔ ''

'' یہ تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ بھی آپ کی چال پر اعتراض کر سکتا ہے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا سٹائل ہوتا ہے۔ ''

محمد علی بے ساختہ ہنسنے لگے۔ '' مگر بھائی مردوں کی چال میں مردانہ سٹائل ہونا چاہیے۔''

'' یہ آپ کا خیال ہے، اوروں کو تو وحید مراد کی چال میں بہت دلکشی نظر آتی ہے، اور پھر کسی کی چال پر تو حکومت بھی پابندی نہیں لگا سکتی۔ ''

'' ہاں یہ تو ہے'' وہ مان گئے۔

'' تو پھر ہم طارق صاحب سے کہہ دیں کہ آئندہ آپ لوگوں کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہو گی؟ ''

طارق صاحب کو ہم نے بڑی مشکل سے یقین دلایا اور وہ وقتی طور پر مطمئن ہو گئے۔

دوسرے دن ''کنیز'' کے سیٹ پر پہلی شوٹنگ تھی۔ یہ وحید مراد' صبیحہ خانم کے گھر کا سیٹ تھا۔ صبیحہ ایک غریب اور بے سہارا عورت ہیں۔ محنت مزدوری کر کے اپنے بیٹے کو تعلیم دلا رہی ہیں۔ اس روز زیبا کو ذرا دیر سے سیٹ پر آنا تھا اس لئے طارق صاحب نے وحید مراد' صبیحہ خانم اور محمد علی کے چند سین فلمانے کا پروگرام بنایا تھا۔ منظر یہ تھا کہ وحید مراد کمرے میں کھڑے شیو بنا رہے ہیں کہ باہر سے کار کے ہارن کی آواز آتی ہے اور وہ چہرے پر لگا ہوا صابن کا جھاگ تولیے سے پونچھتے ہوئے دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ باہر محمد علی اپنی کار میں بیٹھے مسلسل ہارن بجا رہے ہیں۔ وحید کو دیکھ کر شور مچاتے ہیں '' اتنی دیر ہو گئی اور تم تیار نہیں ہوئے۔''

وحید مراد اُن سے کہتے ہیں '' تم اندر تو آؤ۔ امی نے بہت اچھی چائے بنائی ہے۔ میں اتنی دیر میں تیار ہو کر آتا ہوں۔''

محمد علی کار سے باہر نکلتے ہیں۔ گھر میں داخل ہو کر صبیحہ خانم کو سلام کرتے ہیں۔ وہ انہیں دعائیں دیتی ہیں۔ اس سین میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ محمد علی اور وحید مراد کلاس فیلو ہیں۔ بہت گہرے اور بے تکلف دوست ہیں اور محمد علی کبھی کبھی وحید مراد کے گھر آتے رہتے ہیں جہاں صبیحہ خانم ان سے بے حد پیار اور شفقت آمیز سلوک کرتی ہیں۔ محمد علی ایک دولت مند جاگیردار (طالش) کے بے حد لاڈلے پوتے ہیں اور در حقیقت صبیحہ ہی کے بیٹے ہیں جنہیں بچپن ہی میں

دادا نے چھین لیا تھا مگر اس حقیقت کا ان میں سے کسی کو علم نہیں ہے۔ وہ تعلیم کی غرض سے اس شہر میں آئے ہیں اور ایک شاندار کوٹھی میں رہتے ہیں۔ ایک مالدار جاگیر دار ہونے کی حیثیت سے کار 'ملازم' شاندار فرنیچر سبھی کچھ موجود ہے۔ توّانا نہ مزاج رکھنے کے باوجود ان کی وحید سے دانت کاٹی دوستی ہے۔ زیبا بھی ان دونوں کی کلاس فیلو ہیں اور شہر کے ایک خوش حال اور اعلیٰ خاندانی شخص کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ اگرچہ ان تینوں میں گہری دوستی ہے اور وہ عموماً اکٹھّے نظر آتے ہیں لیکن محمد علی یہ نہیں جانتے کہ زیبا اور وحید مراد ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ وحید کی ماں کی حیثیت سے صبیحہ خانم بھی اس سے لاعلم ہیں۔ ان کے گھر میں زیبا بھی آتی رہتی ہیں اور ان سے بہت بے تکلف ہیں۔

گزشتہ روز رات گئے تک اس سیٹ کی تیاری ہوتی رہی تھی۔ تمام ضروری گھریلو سامان سجادیا گیا تھا اور ہم مطمئن ہو کر دفتر میں بیٹھے تھے۔ شوٹنگ شروع ہونے پر ہمارا کام ختم ہو چکا تھا اور اب طارق صاحب کی باری تھی۔ وہ صبح سویرے ہی سے سیٹ پر موجود تھے اور فلم بندی کے انتظامات کر رہے تھے۔ صبیحہ خانم سیٹ پر پہنچ چکی تھیں۔ وحید مراد اپنا لباس تبدیل کرنے کے بعد سادہ سوتی کرتہ اور تنگ موری کا پاجامہ پہن چکے تھے اور ہمارے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ''علی صاحب ابھی تک نہیں آئے؟'' انہوں نے ہم سے پوچھا۔

''فی الحال آپ کا اور صبیحہ بھابھی کا کام ہے۔ وہ کچھ دیر بعد آئیں گے۔''

وحید مراد نے چائے ختم کرنے کے بعد پیالی میز پر رکھی۔ کرسی پر پڑا ہوا تولیہ اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا اور ہم سے پوچھا۔

''اس لباس میں کیسا لگ رہا ہوں؟''

''بہت اچھے'' ہم نے جواب دیا۔ ''مگر اب آپ سیٹ پر تشریف لے جائیں۔''

وہ ہنستے ہوئے رخصت ہو گئے۔ ہم بھی اُٹھ کر سیٹ پر جانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ وحید مراد دوبارہ ہنستے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

ہم نے انہیں حیرت سے دیکھا ''سیٹ پر نہیں گئے؟''

بولے ''آپ نے گیٹ پر جو چوکیدار بٹھایا ہے وہ مجھے اندر نہیں جانے دیتا۔''

ہم سمجھے کہ مذاق کر رہے ہیں مگر انہوں نے بتایا کہ واقعی چوکیدار انہیں شوٹنگ دیکھنے کا شوقین سمجھ رہا ہے اس لئے

سیٹ پر جانے کی اجازت نہیں دے رہا۔

ہم نے کہا ”وہ آپ کو پہچانتا نہیں ہوگا۔آپ نے بتایا کیوں نہیں کہ آپ کون ہیں؟ “

کہنے لگے ”میں نے تو اس سے کہا تھا کہ بھئی ہم اس فلم کے ہیرو ہیں مگر اس نے کہا ”جاؤ بھائی‘ اپنا کام کرو۔ یہاں ایسے ہیرو بہت آتے ہیں“ میں نے کہا کہ اندر سے طارق صاحب یا یونٹ کے کسی آدمی کو بلا دو تو وہ ناراض ہو گیا اور کہا ”جاؤ بھائی ہمارا مغز مت کھاؤ۔ ہم کسی کا نوکر نہیں ہے کہ تمہارے لئے ڈائریکٹر کو بلاتا پھرے۔“ یہ قصّہ سنا کر انہوں نے کہا ”اس کے بعد میں واپس نہ آتا تو اور کیا کرتا۔اب آپ میرے ساتھ چل کر چوکیدار سے سفارش کر دیں۔ “

ہم نے وحید مراد پر ایک نگاہ ڈالی۔ وہ سادہ سا سفید کرتہ پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ پیروں میں ربڑ کی ہوائی چپل تھی۔ کندھے پر ایک چھوٹا سا تولیہ پڑا ہوا تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک معمولی سے عام لڑکے نظر آ رہے تھے۔ اس وقت تک لوگ وحید مراد کے چہرے سے مانوس نہیں ہوئے تھے اس لئے اگر چوکیدار دھوکا کھا گیا تو حیرت کی بات نہ تھی۔

ہم نے کہا ”چوکیدار بھی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔آپ ہیرو تو نظر نہیں آتے۔ “

”اچھّا آپ بھی یہی کہہ رہے ہیں؟“ انہوں نے شکوہ کیا۔ ہم نے کہا ”مگر ہو بہو ہماری فلم کا کردار لگ رہے ہیں اور یہی کسی اداکار کا کمال ہے کہ وہ اپنے کردار کے روپ میں ڈھل جائے۔ “

”اس کا مطلب یہ ہے کہ میں امتحان میں پاس ہو گیا؟“ وہ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے بولے۔

سیٹ سٹوڈیو کے دوسرے کنارے پر تھا۔ ہم دونوں دروازے پر پہنچے تو سیٹنگ والے نے جو دروازے پر متعین تھا بڑے زور و شور سے سلام کیا۔

ہم نے پوچھا ”تم نے ہمارے ہیرو صاحب کو سیٹ پر جانے سے کیوں روک دیا؟ “

وہ پریشان سا ہو گیا ”میں نے تو نہیں روکا سر “

وحید مراد مذاق کے موڈ میں تھے بولے ”یار‘ جھوٹ کیوں بول رہے ہو۔ روکا تو تھا۔ “

سیٹنگ والے نے انہیں غور سے دیکھا اور بولا ”اوئے‘ تم پھر آ گئے ہو؟ “

ہم نے کہا ”تمیز سے بات کرو‘ یہ وحید مراد صاحب ہیں۔ ہماری فلم کے نئے ہیرو‘ کراچی سے آئے ہیں۔ “

''جی!'' حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں ''سر جی' معاف کر دیں میں آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ ''

''کوئی بات نہیں'' وحید مراد نے مسکرا کر کہا ''اب تو اندر جانے کی اجازت ہے نا؟ ''

''کیوں شرمندہ کرتے ہیں جناب!'' وہ واقعی شرمندہ نظر آنے لگا۔

ہم نے کہا ''انہیں اچھی طرح پہچان لو اور دوسرے لوگوں کو بھی بتا دو۔ ''

''فکر ہی نہ کریں سر۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔'' پھر وہ وحید مراد سے مخاطب ہو کر بولا ''غلطی ہو گئی سر' مجھے معاف کر دیں۔ ''

وحید مراد نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور کہا ''شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ تمہارا قصور نہیں ہے۔ ''

وحید مراد کا یہ واقعہ ہمیں آج بھی روزِ اوّل کی طرح یاد ہے اور ان کا یہ فقرہ کہ ''شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے'' اس وقت بھی ہمارے کانوں میں گونج رہا ہے۔ یہ واقعہ ہم نے کسی مبالغے کے بغیر بیان کیا ہے اور بعد میں جب زیبا اور دوسرے لوگوں کو سنایا تو سب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ زیبا کو تو وحید پر ہوٹنگ کرنے کا ایک اچھا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ کون جانتا تھا کہ یہ سانولا سلونا نوجوان فلمی دنیا میں ایک دن اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل کرے گا کہ پاکستان کا بچہ بچہ اس کا صورت شناسا ہو جائے گا۔ وہ پاکستان کا سب سے مقبول رومانٹک ہیرو اور بہت بڑا فلم ساز بن جائے گا۔ نئی نسل کے نوجوان اس کے لباس' چال ڈھال' اندازِ گفتگو اور بالوں کے سٹائل کی نقل کیا کریں گے اور وہ سُپر سٹار کی حیثیت اختیار کرنے کے بعد فلم بینوں کے دلوں میں ایک مستقل جگہ حاصل کر لے گا۔

وحید مراد' محمد علی اور زیبا اس زمانے میں شہرت اور عظمت کی دہلیز پر کھڑے اندر داخل ہونے کے لئے دروازہ کھٹ کھٹا رہے تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب اسی ایورنیو سٹوڈیوز میں ان تینوں کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا اور جدھر سے وہ گزر جاتے تھے ہر ایک ان کی راہ میں آنکھیں بچھاتا تھا۔ ان تینوں نے صحیح معنوں میں پاکستان کی فلمی دنیا پر سالہا سال تک راج کیا اور ایسے نقش چھوڑ گئے جو آج بھی تابندہ ہیں۔

پہلے دن شوٹنگ بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ شروع ہوئی۔ محمد علی کو دوپہر کے بعد آنا تھا اسلئے طارق صاحب نے ماں بیٹوں صبیحہ خانم اور وحید مراد کے سین فلمانے شروع کر دیئے۔ صبیحہ بھابی وحید مراد سے بے تکلف تھیں۔ وہ

ان کی فلم میں کام کرنے کے علاوہ ویسے بھی اس گھرانے سے بہت مانوس تھے۔ صبیحہ بھابی وحید کو بیٹا ہی خیال کرتی تھیں۔ وحید مراد کو فلم کی کہانی کا علم تھا اور اپنے اور محمد علی کے کرداروں کی گہرائی اور اہمیت سے بھی بخوبی واقف تھے۔

براہ راست ان دونوں میں کوئی کشمکش اور مقابلہ آرائی نہ تھی مگر فن کارانہ چپقلش بہر حال موجود تھی۔ دونوں کو احساس تھا کہ وہ ایک اچھی کہانی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں اور فلم دیکھنے والے ان دونوں کی اداکاری کا موازنہ کریں گے۔ دونوں فلمی صنعت میں نووارد تھے اور اعلیٰ ترین مقام حاصل کرنے کے خواہاں۔ محمد علی خواہ وحید مراد کے بارے میں زیبا کے ستانے پر کسی بھی رائے کا اظہار کرتے ہوں' اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ وحید کی صلاحیتوں کے معترف تھے اور چند سال بعد کھلم کھلا بھی اپنے ان خیالات کا اظہار کرنے لگے تھے۔ انہوں نے وحید مراد کی ہر فلم دیکھی تھی اور وحید کو فن کارانہ کسوٹی پر پرکھا تھا۔ دوسری جانب محمد علی کے بارے میں عام تاثر ولن کا ضرور تھا مگر وحید ایک پڑھے لکھے' ذہین اور فہمیدہ انسان تھے۔ محمد علی کی اداکاری اور وجاہت سے بھرپور شخصیت کی سحر کاری ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھی۔ محمد علی کی آواز میں جو گھن گرج تھی اور انہیں مکالموں کی ادائیگی پر جس طرح عبور حاصل تھا وحید اس سے بھی آگاہ تھے۔

''کنیز'' کی کہانی میں انہیں پہلی بار محمد علی کے ساتھ ایک اہم کردار کرنے کا موقع مل رہا تھا اور وہ اسے ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ اس زمانے میں اداکار محض شہرت اور دولت ہی کیلئے کام نہیں کرتے تھے وہ فن کارانہ عظمت بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں اگر مقابلہ سخت تھا تو فن کاروں میں عزم و حوصلے کی بھی کمی نہیں تھی۔ ہر کوئی اپنی فن کاری اور انفرادیت کا لوہا منوانا چاہتا تھا۔ ہیروز ہی پر منحصر نہیں' ہیروئنوں کی صفوں میں بھی اسی طرح کی کشمکش اور مقابلہ آرائی کا جذبہ کار فرما نظر آتا تھا۔ ہر ہیروئن اپنا مخصوص اور منفرد انداز منوانا چاہتی تھی۔ اگر مسرت نذیر ہیروئن تھیں تو صبیحہ بھی پہلے ہی سکرین کی فرسٹ لیڈی کا لقب حاصل کر چکی تھیں چنانچہ مسرت اس لقب کو چھیننے کیلئے پوری توجہ اور لگن سے کام کر رہی تھیں۔ شمیم آرا' دیبا' نیّر سلطانہ' رانی' بہار اپنے اپنے انداز میں اداکاری کا جادو جگا رہی تھیں اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں کھونا

چاہتی تھیں۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں محمد علی اور وحید مراد نے فلمی دنیا میں آنکھ کھولی تھی اور وہ بیک وقت ان تمام اداکاروں کو چیلنج کرنے کا عزم رکھتے تھے جنہوں نے فلمی صنعت میں مضبوط اور اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔ دونوں نے اس فلم کا سکرپٹ بغور پڑھا تھا۔ ہم سے اور طارق صاحب سے کرداروں کی نوعیت' عادات واطوار' نفسیات اور پس منظر کے بارے میں تفصیلی بات چیت کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب شوٹنگ میں حصہ لینے کیلئے سیٹ پر آئے تو وہ دونوں اپنے کرداروں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ہر مکالمہ انہیں یاد تھا اور ہر منظر کی ڈرامائی اہمیت ان کے علم میں تھی۔ شوٹنگ کے دوران میں بھی وہ دونوں اپنے کرداروں کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے اور اداکارانہ چشمک کا مظاہرہ کرنے سے بھی باز نہیں رہتے تھے۔ ان کو ہم نے نکتہ چینی اور اعتراض کرنے کی پوری آزادی دی تھی اور ان کے ہر سوال کا اطمینان بخش جواب دیا تھا۔ پھر بھی اداکار تو اداکار ہی ہوتا ہے۔ ہر اداکار ''خود غرض'' ہوتا ہے۔ کہانی کے مجموعی تاثّر کے بجائے اسے محض اپنے کردار کی فکر پڑی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اداکار' ہدایت کار بنتا ہے تو وہ کہانی اور فلم کے دوسرے کرداروں میں باہمی توازن قائم رکھنے میں کامیاب نہیں رہتا کیونکہ وہ ڈائریکٹر یا کہانی نویس کے ذہن سے نہیں سوچتا بلکہ اداکار بن کر سوچتا ہے۔

''کنیز'' کے کلائمکس کی فلم بندی کا قصہ ہمیں یاد آرہا ہے۔ یہ فلم مختلف وجوہات کی بنا پر کافی لیٹ ہوگئی تھی۔ شوٹنگ کا سلسلہ تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ اس کا تذکرہ آپ آگے پڑھیں گے۔ تمام مرحلے طے ہو چکے تھے۔ فلم کے کلائمکس کے بعد کا ایک مختصر لیکن اہم سین فلمانا باقی رہ گیا تھا۔ فلم کی شوٹنگ کے دوران میں وحید اور محمد علی دونوں کو سچویشن کے اعتبار سے اپنی اپنی اداکاری کا مظاہرہ کرنے کا بھرپور موقع ملا تھا۔ کسی سین میں اگر محمد علی بڑھ چڑھ کر بولے تھے تو دوسرے سین میں وحید مراد نے محمد علی کو مہر بہ لب کر دیا تھا۔ فلم کا یہ قریب قریب آخری سین تھا۔ صورتحال یہ ہے کہ اب محمد علی اور وحید مراد دونوں کو علم ہو چکا ہے کہ وہ دونوں بھائی ہیں۔ ایک ہی باپ اور ماں کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے اور صبیحہ خانم ان کی ماں ہیں۔ وحید کو اس حقیقت کا محمد علی سے پہلے علم ہو چکا تھا اور بڑے بھائی کے ساتھ ان کے برتاؤ میں رشتے اور رتبے کے حساب سے تبدیلی آگئی تھی لیکن محمد علی کو بہت دیر سے یہ

حقیقت معلوم ہوئی تھی۔اس دوران میں وہ اپنے خاندانی غرور اور امارت کی شان میں چُور تھے۔اپنے چھوٹے بھائی کو بُرا بھلا کہنے کے علاوہ اس کی شادی کے معاملے میں بھی رکاوٹ پیدا کر چکے تھے۔یہی نہیں' وہ اپنی ماں کو بھی ان جانے میں ذلیل و خوار کر چکے تھے۔ لیکن فلم کے کلائمکس کے منظر میں جب صبیحہ خانم عین ان کی شادی کے وقت محفل میں پہنچ کر یہ اعلان کرتی ہیں کہ " وہ محمد علی کی ماں ہیں اور اگر زیبا کی شادی وحید مراد سے محض اس بنا پر نہ کی گئی تھی کہ وہ ایک کنیز زادی کے بیٹے ہیں تو پھر یہی جرم محمد علی کا بھی ہے۔وہ بھی ایک کنیز زادی کے بیٹے ہیں۔میرے بیٹے ہیں"۔نواب صاحب (آغا طالش) صبیحہ کو پہچان گئے تھے مگر صاف مکر گئے اور انہوں نے اپنی بہو کو پہچاننے سے ہی انکار کر دیا مگر ایک پرانے خاندانی ڈاکٹر (ساقی) نے صبیحہ کے حق میں گواہی دے کر محمد علی کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ صبیحہ ہی ان کی ماں ہیں۔

نواب صاحب اپنے پوتے پر جان چھڑکتے تھے۔اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتے تھے۔ اسے ماں کی باتوں سے پگھلتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے اس کو پرچانے کی بہت کوشش کی مگر محمد علی نے بھری محفل میں اپنی ماں کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا اور نواب صاحب کے روکنے' محبت کے واسطے دینے اور منّت سماجت کرنے کے باوجود اپنی ماں کا ہاتھ تھام لیا اور سب کچھ چھوڑ کر ماں کے ساتھ چلے گئے۔

نواب صاحب نے پہلے تو محبت کے واسطے دیئے اور آخر میں تنگ آکر دھمکی دے دی کہ وہ اس عورت کے ساتھ گئے تو وہ انہیں اپنی جائیداد اور وراثت سے عاق کر دیں گے۔

اس کے باوجود محمد علی باز نہ آئے۔جاتے ہوئے انہوں نے صرف اتنا کہا"نواب صاحب! یہ عورت میری ماں ہے۔ اس کی خاطر میں آپ کی جائیداد تو کیا' ساری دنیا چھوڑ سکتا ہوں۔"

پھر انہوں نے صبیحہ سے مخاطب ہو کر کہا"آیئے امی۔"

صبیحہ خانم نے اس موقع پر زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔

اس سے پہلے ہی وہ بہت کچھ بول چکی تھیں اور ایسا بولی تھیں کہ اہل محفل ہی نہیں' سینما میں بیٹھے ہوئے فلم بینوں کے دلوں کی حرکت بھی ساکت ہو گئی تھی۔جاتے ہوئے انہوں نے صرف ایک نظر اپنے ہارے ہوئے سسر کی جانب

ڈالی۔اس نگاہ میں ماں کی فتح کا غرور بھی تھا اور بیٹے کی اپنائیت کا افتخار بھی۔ زندگی بھر کی کٹھنائیوں کے بعد یہ ایک لمحہ میّسر آیا تھا' جب انہیں اپنی محنت اور ریاضت کا صلہ ملا تھا۔انہوں نے نواب صاحب کی حویلی سے نکالے جانے پر رخصت ہوتے وقت انہیں چیلنج کیا تھا کہ وہ اپنے دوسرے بیٹے پر کسی نواب کے نام کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیں گی مگر اسے ایک بہت بڑا آدمی بنا کر دکھا دیں گی۔اس سین میں صبیحہ خانم کی اداکاری لازوال تھی اور طارق صاحب نے اس ایک خاموش کلوزاپ میں فلم کی ساری کہانی اور تھیم کو سمیٹ کر رکھ دیا تھا۔

ماں اپنے بیٹے کو لے کر چلی گئی اور نواب صاحب اپنے زخم چاٹتے رہ گئے۔صبیحہ محمد علی کو ساتھ لے کر اپنے غریبانہ گھر میں پہنچیں جہاں ان کا چھوٹا بیٹا وحید مراد ان تمام ڈرامائی واقعات سے بے خبر غمگیں اور دل شکستہ بیٹھا ہوا تھا۔

وہ فاتحانہ انداز میں کمرے میں داخل ہوئیں اور کہا"دیکھ بیٹا۔میں تیرے لئے کیا لے کر آئی ہوں؟میں تیرے بھائی کو لے آئی ہوں۔"

وحید نے سر اٹھا کر بے یقینی سے دیکھا تو محمد علی دولہا کے زرق برق لباس میں 'دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔

طارق صاحب نے محمد علی کی ساری ندامت اور پشیمانی صرف ایک کلوزاپ میں سمو کر رکھ دی تھی جب محمد علی نے خاموش شرمندہ نگاہوں سے وحید مراد کی جانب دیکھا۔ماں کے چہرے پر اگر فاتحانہ مسرت اور ماں کا جلال تھا تو بڑے بھائی کے چہرے پر حزن وملال' غم و اندوہ' احساس ندامت اور پچھتاوا صاف دیکھا جاسکتا تھا۔

کلائمیکس کے سین میں صبیحہ خانم کا وہ کلوزاپ اور اس مختصر سے سین میں محمد علی کا یہ خاموش کلوزاپ کہانی کا حاصل تھا۔

وحید کو تو پہلے ہی علم تھا۔دونوں بھائی بے اختیار بغل گیر ہوئے تو کیمرہ پھر صبیحہ خانم کے خاموش کلوزاپ پر چلا گیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر چہرے پر ملکوتی مسکراہٹ تھی۔انہوں نے تشکر بھری نگاہوں سے آسمان کو دیکھا اور دعا کیلئے صرف ہاتھ اٹھا کر رہ گئیں۔

محمد علی نے چھوٹے بھائی کے سامنے اظہار ندامت کرنا چاہا تو وحید مراد نے انہیں روک دیا اور کہا" بھیا! کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔میں خود بھی تو انجانے میں آپ کو دکھ پہنچاتا رہا ہوں۔"

یہ ایک مختصر سین تھا لیکن اسے آپ ''حاصلِ فلم'' کہہ سکتے ہیں۔

ایک معمولی سے فرنیچر سے محروم چھوٹے سے کمرے میں وحید مراد ایک کھری چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ غریبانہ ماحول کا عکاس کمرہ ہر قسم کی آرائش سے محروم ہے لیکن صبیحہ اور محمد علی کے اندر داخل ہوتے ہی یوں لگا جیسے کہ کمرہ رنگ و نور سے معمور ہو گیا ہے۔

سین کی فلم بندی شروع ہونے سے پہلے جب ہم اس سیٹ پر پہنچے تو وحید مراد اور حسن طارق صاحب بات چیت میں مصروف تھے۔ ہمیں دیکھ کر طارق صاحب مسکرائے اور بولے ''آفاقی صاحب! وحید کا کہنا ہے کہ اس سین میں انہیں کچھ کہنے اور کرنے کا موقع نہیں مل رہا۔ اب آپ انہیں سمجھایئے۔''

ہم چارپائی کے سامنے والی لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گئے اور وحید مراد کی طرف دیکھا۔ وہ خاصے سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے ''آفاقی صاحب! میں طارق صاحب سے یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے بھی اس سین میں کچھ کہنا چاہئے۔ یہ سین تو سراسر محمد علی صاحب کا ہے۔''

ہم نے کہا ''یہ تو سچویشن کا تقاضا ہے۔''

بولے ''پھر بھی۔ میرے حصّے میں تو صرف ایک مکالمہ ہی آیا ہے۔ مجھے بھی کچھ بولنا تو چاہئے۔''

ہم نے کہا ''مثلاً آپ اس سین میں کیا کہیں گے؟''

اس جوابی سوال سے وہ سٹپٹا سے گئے' پھر کہا ''آپ رائٹر ہیں۔ یہ تو آپ بہتر سمجھتے ہیں۔''

ہم نے کہا ''ہم جو سمجھتے تھے وہ ہم نے لکھ دیا۔ آپ بھی پڑھے لکھے اداکار ہیں۔ آپ مشورہ دیجئے کہ اس موقع پر آپ کو کیا کہنا چاہئے؟''

انہوں نے چند لمحے سوچا پھر بے بسی سے ہماری طرف دیکھا۔

ہم نے کہا ''دیکھئے وحید' ہم نے اپنی دانست میں کہانی اور تمام کرداروں سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ یہ مختصر سین کہانی کو نقطۂ اختتام تک پہنچانے کیلئے رکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے مختلف مواقع پر آپ بھی خوب بول چکے ہیں اور محمد علی بھی بولنے کا حق ادا کر چکے ہیں۔ اس سے پہلے والے سین میں صبیحہ بھابی نے بھی مکالمے بولنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ سب

کچھ تو ہو چکا ہے' کہا جا چکا ہے اور دکھایا جا چکا ہے۔ آپ نے بھی انجانے میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ بہت کچھ کیا ہے۔ بہت کچھ کہا ہے۔ آپ بھائی کی محبت میں اپنی محبت اور اپنی منگیتر سے بھی دستبردار ہو چکے ہیں۔ اب اگر بڑے بھائی کو حقیقت کا علم ہو چکا ہے اور اس نے اسے تسلیم کر کے اپنی زیادتیوں کی تلافی کرنے کا اعلان کر کے اپنی ماں اور بھائی کو اپنا لیا ہے۔ دادا کی جائیداد کو ٹھوکر مار دی ہے۔ اپنی انا پرستی اور راج ہٹ سے باز آ چکا ہے اور اپنے ہاتھ سے زیبا کے ساتھ آپ کی شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے تو اس موقع پر آپ کے کہنے کیلئے باقی کیا رہ جاتا ہے؟ آپ سوچ کر ہمیں بتایئے۔ ہم اسے مکالموں کی شکل دے دیں گے۔"

وحید نے کچھ سوچا پھر مسکرائے اور بولے "آپ سے کون جیت سکتا ہے۔ آخر رائٹر ہیں نا"

ہم نے پوچھا "اب تو سین سے مطمئن ہو نا؟"

انہوں نے مسکرا کر گردن ہلا دی اور اس سین کی فلم بندی بڑی خوش اسلوبی سے مکمل ہو گئی۔

آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ یہ عجیب شخص ہے۔ ابھی فلم کے آغاز کا تذکرہ کر رہا تھا اور اچانک فلم کے آخری سین کا احوال بیان کرنے لگا۔ ہم پہلے سیٹ کی فلم بندی کا ذکر کر رہے تھے۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس سیٹ پر کئی روز تک شوٹنگ جاری رہی اور اس دوران میں محمد علی' زیبا اور وحید مراد تینوں یکجا بھی ہوئے' کامران مرزا اور طارق صاحب کو یہ دھڑکا بھی لگا رہا کہ دیکھئے کب بد مزگی کا آغاز ہوتا ہے مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ ایک تو محمد علی اور زیبا دونوں نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہمارے سیٹ پر بلاوجہ کے جھگڑوں سے پرہیز کریں گے۔ دوسرے یہ سبھی فن کار صبیحہ خانم کا بے حد احترام کرتے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی شفقت اور محبت بھرے برتاؤ سے ان تینوں کا دل موہ لیا تھا اور سیٹ پر ایک گھریلو سا ماحول پیدا ہو گیا تھا جس میں صبیحہ خانم کو سچ مچ گھر کی خاتون سربراہ کی حیثیت حاصل تھی۔

اس سیٹ پر کئی ڈرامائی اور سنجیدہ سین فلمائے گئے۔ یہ ایک ہیرو اور اس کی ماں کے گھر کا سیٹ تھا۔ ظاہر ہے کہ صبیحہ خانم کو کہانی میں مرکزی حیثیت حاصل تھی اور جہاں وہ رہتی تھیں اسی جگہ بیشتر واقعات کو رونما ہونا تھا۔ مثلاً ایک وہ سین جب وحید دوڑے ہوئے ماں کو پکارتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں اور انہیں گود میں اٹھا کر چکّر دینا شروع کر

دیتے ہیں۔

وہ پیار بھری ڈانٹ پلاتی ہیں ''ارے ارے چھوڑ' کیا کر رہا ہے۔ میں گر جاؤں گی۔''

وحید انہیں زمین پر کھڑا کر کے کہتے ہیں ''امی! میں پاس ہو گیا ہوں۔''

صبیحہ تشکّر بھری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتی ہیں اور ان کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے ہیں۔ پھر وہ بیٹے کو پیار کرتی ہیں اور شاباش دیتی ہیں۔ جب وہ وحید کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتی ہیں تو وحید مراد ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چومنے لگتے ہیں مگر پھر اچانک ان کے کھردرے' محنت کش ہاتھوں کو دیکھ کر غمزدہ ہو جاتے ہیں۔

صبیحہ کہتی ہیں ''بیٹا! یہ ہاتھ اس بات کے گواہ ہیں کہ تیری ماں نے تیری پرورش کیلئے کسی کا احسان نہیں اٹھایا۔ خود محنت مزدوری کر کے تجھے پالا ہے۔''

وحید کہتے ہیں ''بس امی! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب میں آگے نہیں پڑھوں گا۔''

صبیحہ اچانک حیران ہو کر انہیں دیکھتی ہیں ''یہ کیا کہہ رہا ہے؟''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں امی۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اب میں آپ کو کام نہیں کرنے دوں گا۔ میں پڑھائی چھوڑ دوں گا۔ نوکری کروں گا' محنت کروں گا مگر اب آپ کو کام نہیں کرنے دوں گا۔''

صبیحہ غصّے سے اس کو دیکھتی ہیں ''بڑا ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ مجھ سے بھی بڑا ہو گیا ہے۔ ماں سے گستاخی کرنے لگا ہے۔''

وحید ایک دم شرمندہ ہو کر ماں کے ہاتھ تھام لیتے ہیں اور گلوگیر آواز میں کہتے ہیں ''میرا یہ مطلب نہیں امی۔ آپ کی حکم عدولی کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

ایک اور ڈرامائی سین میں ہیروئن کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر محمد علی' وحید مراد کو طعنہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں ''میں اپنے سے کم تر لوگوں کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتا'' پھر وہ وحید کو بتاتے ہیں کہ وہ ایک کنیز زادی کا بیٹا ہے۔

وحید غصّے سے بے قابو ہو کر محمد علی کا گریبان پکڑ لیتے ہیں اور دانت پیس کر کہتے ہیں ''اگر میری ماں کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو میں جان سے مار دوں گا۔''

محمد علی زہر خند کے ساتھ جواب دیتے ہیں ”پہلے جا کر اپنی ماں سے پوچھو اور وہ جو بھی جواب دے وہ ہمیں بھی بتا دینا۔“
وحید غصّے میں بپھرے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ زیبا انہیں پکارتی رہ جاتی ہیں اور ان کے پیچھے جانا چاہتی ہیں مگر ان کے والد (ادیب) انہیں روک دیتے ہیں ”تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“
وہ تڑپ کر بے بسی سے دیکھتی ہیں اور بھاگتی ہوئی رخصت ہو جاتی ہیں۔ محمد علی کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ہے۔
وحید غصّے میں بھرے ہوئے اپنے گھر پہنچتے ہیں اور ماں کو بتاتے ہیں کہ محمد علی نے ان کے ساتھ کیا توہین آمیز سلوک کیا ہے۔ وہ محمد علی کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ صبیحہ بالآخر یہ اعتراف کر لیتی ہیں مگر بیٹے کے سامنے یہ وضاحت بھی کرتی ہیں کہ وہ خود بھی ایک نواب کا بیٹا ہے جس نے صبیحہ سے باقاعدہ شادی کی تھی مگر شوہر کی آنکھ بند ہوتے ہی اونچی حویلی والوں نے دھکّے دے کر باہر نکال دیا۔ وہ روتے ہوئے بتاتی ہیں کہ انہوں نے میرا بیٹا بھی مجھ سے چھین لیا جس کا مجھے کوئی علم نہیں ہے کہ اب وہ کہاں ہے۔ کس حال میں ہے؟
وحید ماں سے پُر عزم لہجے میں کہتے ہیں ”امی مجھے فخر ہے کہ آپ میری ماں ہیں۔ دنیا والے چاہے کچھ کہیں‘ میرے لئے آپ ماں ہی رہیں گی۔“
صبیحہ جو آج تک اس تصوّر سے سہمی ہوئی ہیں کہ حقیقت کا علم ہونے پر بیٹے کا کیا ردّ عمل ہو گا فیصلہ کن انداز میں کہتی ہیں ”دنیا والے کچھ بھی کہتے پھریں۔ اگر تُو مجھے ماں کہتا ہے تو پھر مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ کسی کی پروا نہیں ہے۔“
ایک اور منظر میں وحید غصّے میں بھرے ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں اور کوئی ہتھیار تلاش کرنے لگتے ہیں۔ صبیحہ گھبرا کر دیکھتی ہیں اور روکنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وحید ایک چھرا نکال کر جانے لگتے ہیں۔ ماں انہیں پکڑ لیتی ہے۔
وحید کہتے ہیں ” امی مجھے نہ روکیں۔ آج میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“
”کسے؟“ وہ پریشان ہو کر دریافت کرتی ہیں۔
”اس نے آج آپ کو گالی دی ہے۔ میں اس کا خون کر دوں گا۔“
صبیحہ وحید کو روک لیتی ہیں ”کس کا ذکر کر رہا ہے؟“

''وہی نواب زادہ۔نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟اپنے خون پر بہت ناز ہے۔آج میں اس کو اسی کے خون میں نہلا دوں گا۔''

صبیحہ بے اختیار وحید کے منہ پر تھپڑ مارتی ہیں اور روتے ہوئے کہتی ہیں ''اختر! وہ تیرا بڑا بھائی ہے۔میرا بیٹا ہے۔''

وحید کا تاثر انتہائی بھرپور ہے۔وہ بے یقینی' یقین' بے بسی اور اچانک صدمے کے اثر سے ساکت رہ جاتے ہیں اور زیرلب کہتے ہیں۔''میرا بھائی! وہ میرا بھائی ہے؟''

کچھ اور سین بھی ایسے ہیں جنہیں فن کاروں نے غیر فانی بنادیا ہے۔ ایک سین میں جب محمد علی (انور) وحید کے گھر آتے ہیں اور صبیحہ انہیں پیار سے بیٹا کہتی ہیں تو وہ جذباتی ہو جاتے ہیں۔انہیں ہوش سنبھالنے پر یہ بتایا گیا ہے کہ تمہارے ماں باپ مرچکے ہیں اور وہ ماں کی محبت کو ترسے ہوئے ہیں۔

وہ صبیحہ سے کہتے ہیں ''آپ کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی ماں یاد آجاتی ہیں۔''

صبیحہ محبت سے پوچھتی ہیں ''کہاں ہیں تمہاری ماں؟''

وہ خاموشی سے آسمان کی طرف دیکھتے ہیں ''وہاں'' پھر بھیگی ہوئی آواز میں کہتے ہیں ''میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔''

صبیحہ اچانک اداس ہو جاتی ہیں۔آخر وہ بھی ایک بچھڑے ہوئے بیٹے کی ماں ہیں۔

محمد علی بے ساختہ پوچھتے ہیں ''کیا میں آپ کو ماں کہہ سکتا ہوں؟''

وہ پیار بھرے لہجے میں کہتی ہیں ''کیوں نہیں' میں بھی تو تمہاری ماں کی طرح ہوں۔''

ماحول انتہائی غمگیں ہو چکا ہے کہ اچانک وحید اپنی طبیعت کے مطابق شرارت سے بول پڑتے ہیں ''لو بھئی' تم نے تو ہماری امی پر بھی قبضہ جمالیا۔''

سب اچانک ہنس پڑتے ہیں اور ماحول ایک بار پھر پُر مسرت ہو جاتا ہے۔

اس فلم کے مناظر میں ہم نے بالکل حقیقی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ گھروں کی آرائش' ملبوسات' سادہ اور بے ساختہ مکالمے' بالکل روزمرّہ جیسی اداکاری اور پھر اداکاروں نے بھی اپنے کرداروں اور کہانی کے ساتھ پورا انصاف کیا تھا۔اس میں ہم نے بہت سے ایسے سین بھی دکھائے تھے جنہیں دیکھ کر فلم بین سوچنے لگتے تھے کہ یہ سب

کچھ انہوں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

فلم کے رومانٹک سین ہلکے پھلکے اور سادہ تھے۔ مثلاً ایک روز زیبا وحید مراد کے گھر آتی ہیں تو صحن میں صبیحہ خانم دری بچھائے دھوپ میں بیٹھی ہیں اور لحاف سی رہی ہیں۔ وحید ایک مونڈھے پر پاس ہی بیٹھے ہیں۔

سلام دعا کے بعد زیبا دری پر صبیحہ خانم کے پاس ہی بیٹھ جاتی ہیں اور انہیں سوئی دھاگے سے لحاف میں ڈورے ڈالتے ہوئے دیکھ کر پیشکش کرتی ہیں ''لایئے خالہ جان! میں ڈال دوں ڈورے۔''

وحید معنی خیز انداز میں بول پڑتے ہیں ''جی بس رہنے دیں۔ آپ نے پہلے جو ڈورے ڈالے تھے وہی کافی مضبوط تھے۔ اب تک چل رہے ہیں۔''

زیبا ان کے ذو معنی فقرے کا مطلب سمجھ جاتی ہیں اور کہتی ہیں ''دیکھئے خالہ جان۔''

صبیحہ انہیں تادیب کرتی ہیں ''اختر۔ کیوں تنگ کر رہا ہے اس کو۔''

وحید فوراً بات بنا دیتے ہیں ''میں نے کیا کہا ہے امی؟ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ انہوں نے پچھلے سال لحاف میں جو ڈورے ڈالے تھے۔۔۔''

صبیحہ گھورتی ہیں ''بس بس۔ رہنے دو' میں سب سمجھتی ہوں'' پھر اٹھتے ہوئے کہتی ہیں ''تم بیٹھو بیٹی' میں تمہارے لئے چائے بناتی ہوں۔''

زیبا کہتی ہیں ''آپ بیٹھئے خالہ جان۔ میں چائے بنا دیتی ہوں۔''

وحید کہتے ہیں ''ارے جانے دو جانے دو۔ تم نہیں جانتیں' ہماری امی کتنی اچھی چائے بناتی ہیں۔''

صبیحہ مسکراتی ہوئی اٹھ کر جاتی ہیں ''بس ہونے لگی خوشامد۔''

وحید ان کے باورچی خانے میں جانے کا انتظار کرتے ہیں اور پھر جلدی سے زیبا کے پاس دری پر بیٹھ جاتے ہیں اور دبی زبان میں کہتے ہیں ''اچھا' پہلے ہماری امی پر قبضہ جمایا اب گھر پر قبضہ جمانے کا ارادہ ہے۔''

زیبا اونچی آواز میں پکارتی ہیں ''خالہ جان۔۔۔''!

وحید فوراً اٹھ کر مونڈھے پر بیٹھ جاتے ہیں ''ارے بابا۔۔۔ رہنے دو۔ کیوں شکایت لگاتی ہو۔''

اس قسم کے مناظر کی وجہ سے دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ فلم نہیں دیکھ رہے بلکہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حقیقت میں دیکھ رہے ہیں۔

محمد علی کی شاندار کوٹھی کے مناظر بھی بہت دلچسپ اور ڈرامائی تھے۔

اس سیٹ پر چند ڈرامائی مناظر بھی فلمائے گئے تھے۔ مثلاً ایک منظر وہ ہے جب صبیحہ کو معلوم ہوتا ہے کہ محمد علی اپنے دوست سے ناراض ہو گئے ہیں اسلئے ان کے گھر نہیں آئے۔ وحید ان کے خفا ہونے کی وجہ سے بہت اداس ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح انہیں منائیں۔ محمد علی کی ناراضی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دادا کو بتایا تھا کہ وہ ان کیلئے بہو پسند کر چکے ہیں۔ دادا جان لڑکی کے خاندان کے بارے میں دریافت کرتے ہیں اور پھر مطمئن ہو کر پوتے کیلئے زیبا کا رشتہ طلب کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ محمد علی یہ خوشخبری زیبا کو سناتے ہیں کہ دادا حضور تمہارے ڈیڈی سے ملنے کیلئے تمہارے گھر آئیں گے۔ ہماری شادی کی بات کرنے کیلئے۔

زیبا پہلے تو مذاق سمجھ کر ہنسنے لگتی ہیں مگر پھر محمد علی سنجیدہ نظر آتے ہیں تو وہ انہیں صاف صاف بتا دیتی ہیں کہ وہ محمد علی (انور) کو پسند ضرور کرتی ہیں مگر محض دوست سمجھ کر۔

وہ کہتی ہیں ”تم سے شادی کے بارے میں تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔“

”تو اب سوچ لو“ محمد علی شوخی سے کہتے ہیں۔

مگر زیبا بے حد سنجیدہ اور پریشان ہیں۔ آخر محمد علی کے اصرار پر وہ بتا دیتی ہیں کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہیں۔

محمد علی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آتا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی لڑکی ان پر کسی اور کو ترجیح دے سکتی ہے۔

ان کا نوابی جاہ و جلال ایک دم پوری شان سے عود کر آتا ہے اور وہ برہمی سے پوچھتے ہیں ”کون ہے وہ جسے تم ہم پر فوقیت دے رہی ہو؟“

زیبا جواب دیتی ہیں ”اختر“۔

محمد علی بے یقینی سے چونک کر زیبا کو دیکھتے ہیں ”کیا؟ اختر! تم اس دو ٹکے کے معمولی آدمی کو ہم پر فوقیت دے رہی ہو؟“

زیبا جواب دیتی ہیں "یہ مت بھولو کہ وہ دو ٹکے کا معمولی آدمی تمہارا بہترین دوست ہے۔"

"یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم نے اس کی حیثیت دیکھے بغیر اس کو منہ لگایا ورنہ وہ اس قابل نہیں کہ ہم اسے اپنے پاس بھی بٹھائیں۔ کان کھول کر سن لو۔ تمہیں مجھ سے شادی کرنی پڑے گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔"

وحید مراد کو پتہ چلتا ہے کہ محمد علی زیبا سے کسی بات پر ناراض ہیں تو وہ حسب معمول بے تکلفی سے ان کی کوٹھی پر چلے جاتے ہیں۔ محمد علی اپنے ڈرائنگ روم میں تینوں کی تصویر کے سامنے کھڑے ہیں۔ زیبا کی باتیں ان پر اوور لیپ ہو رہی ہیں۔ وہ غصے میں آ کر تینوں کی فریم شدہ تصویر کو سائیڈ بورڈ پر سے اٹھا کر پھینک دیتے ہیں۔ تصویر فرش پر پھسلتی ہوئی جاتی ہے۔ اسی وقت وحید کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ تصویر ان کے قدموں میں پہنچ جاتی ہے۔ وہ فرش پر سے تصویر کو اٹھا کر دیکھتے ہیں جس کے شیشے میں بال پڑ چکا ہے۔

محمد علی انہیں غصّے سے گھور رہے ہیں' پوچھتے ہیں "تمہیں بلا اجازت میرے گھر میں داخل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

وحید حیران رہ جاتے ہیں پھر یہ سمجھ کر کہ شاید وہ مذاق کر رہے ہیں پرانی بے تکلفی سے ان کی طرف بڑھتے ہیں مگر محمد علی بُرا بھلا کہہ کر انہیں گھر سے نکل جانے کو کہتے ہیں۔ وہ ہکّا بکّا دیکھتے رہ جاتے ہیں اور بالآخر ان کے گھر سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا اور صبیحہ خانم کا وہ سین ہے جس میں وحید اپنی ماں کو بتاتے ہیں کہ نہ جانے انور مجھ سے کیوں بگڑ بیٹھا ہے۔ صبیحہ خانم کہتی ہیں کہ میں خود جا کر اسے منالاؤں گی۔

صبیحہ محمد علی کے گھر پہنچتی ہیں تو وہ موجود نہیں ہیں۔ ان کے ملازم سے وہ دریافت کرتی ہیں اور پھر اپنا تعارف کراتی ہیں کہ میں اختر کی ماں ہوں۔ ملازم نواب صاحب کے خاندان کا دیرینہ نمک خوار ہے۔ اس نے صبیحہ خانم کو بہو کے روپ میں حویلی میں داخل ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور پھر شوہر کے مرنے کے بعد کنیز زادی ہونے کے جرم میں انہیں حویلی سے نکلتے ہوئے بھی دیکھ چکا ہے۔ وہ صبیحہ خانم کو پہچان جاتا ہے۔ صبیحہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر چاروں طرف کا جائزہ لیتی ہیں اور ان کی نظریں بڑے نواب صاحب کی تصویر پر جا کر اٹک جاتی ہیں۔ وہ حیران ہو کر تصویر کو دیکھتی ہیں۔ ان کے دریافت کرنے پر ملازم بتاتا ہے کہ وہ انور میاں کے دادا حضور کی تصویر ہے۔ صبیحہ کو اپنے کانوں

اور آنکھوں پر یقین نہیں آتا' ان پر پہلی بار یہ انکشاف ہوتا ہے کہ انور ان کا اپنا بیٹا ہے۔ وہ بے اختیار انور کی تصویر اٹھا کر سینے سے لگا لیتی ہیں۔ خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات میں ان کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہیں۔

''انور۔۔۔ میرا بیٹا ہے۔۔۔ میرا بیٹا''!

کار کے ہارن کی آواز آتی ہے۔ صبیحہ آنسو پونچھ کر اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہیں اور تصویر کو دوبارہ میز پر رکھ کر بے تابی سے دروازے کی طرف نگاہیں جما دیتی ہیں جہاں سے ان کا بچھڑا ہوا بیٹا اندر داخل ہونے والا ہے۔ وہ اپنے بے قابو ممتا بھرے دل کو قابو میں کرنے کیلئے دونوں ہاتھوں سے کلیجا تھام لیتی ہیں اور مجسّم انتظار بن کر دروازے کی طرف قدم بڑھاتی ہیں۔ اسی وقت محمد علی نوابانہ شان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ سیاہ شیروانی اور سفید چُست موری کے پاجامے میں ملبوس وہ ایک شہزادہ لگ رہے ہیں۔

ماں کی نگاہیں ان کی بلائیں لیتی ہیں مگر وہ صبیحہ کو اچانک اپنے ڈرائنگ روم میں دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور غصّے کو ضبط کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے سامنے ان کے مفلس رقیب کی ماں کھڑی ہے جس کا بیٹا ان کی نوابانہ شان میں گستاخی کا مرتکب ہوا ہے۔

صبیحہ چند لمحے ایک عجیب کیفیت میں مبتلا کھڑی انہیں تک رہی ہیں پھر ''بیٹا!'' کہہ کر بے اختیار ان کی طرف بڑھتی ہیں۔

محمد علی کے اندر سویا ہوا مغرور' بے رحم اور خود غرض نواب پوری طرح جاگ اٹھتا ہے۔ وہ ایک دم پھٹ پڑتے ہیں

''خبردار بڑھیا! ہم ہر ایرے غیرے کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ ہمیں بیٹا کہہ کر پکارے۔''

صبیحہ ساکت کھڑی رہ جاتی ہے۔ محمد علی انہیں اور ان کے بیٹے کو جی بھر کر بُرا بھلا کہتے ہیں۔ ''وہ ہماری دوستی کے قابل نہیں ہے۔ جاؤ' چلی جاؤ یہاں سے۔ آج ہم نے تمہارے بیٹے کو اس کی اصلیت بتا دی ہے۔''

صبیحہ خانم کا عجب عالم ہے۔ ایک طویل عرصے کے بعد بچھڑا ہوا بیٹا ملا بھی تو ان حالات میں۔ وہ سانپ کے مانند اپنی کینچلی بدل چکا ہے۔ ان کی نگاہیں انور کے روپ میں اپنے مغرور اور بے رحم خُسر کو سامنے کھڑا پاتی ہیں۔ دادا کی صحبت اور تربیت نے اس کے بیٹے کو ایک خالص اور سنگدل نواب کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔

طارق صاحب نے فلم میں محمد علی کا پہلا منظر یہی رکھا تھا تاکہ وہ صبیحہ خانم کے سامنے اداکاری کا تجربہ کر سکیں۔ چیف اسسٹنٹ اسحاق اکرام اس بات سے کچھ پریشان تھے۔

وہ ہمارے پاس آئے اور بولے ''آفاقی صاحب' شروع میں محمد علی کا کوئی ہلکا پھلکا سین فلمانا چاہئے۔ایک نئے ایکٹر کو اس مشکل سین میں صبیحہ خانم کے سامنے کھڑا کرنا تو ایسے ہی ہے جیسے انہیں شیر کے پنجرے میں پھینک دیا جائے۔''

ہم نے ان کی پریشانی دیکھ کر کہا ''بھئی آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں' طارق صاحب کو محمد علی کی صلاحیتوں کا اندازہ ہے۔اس طرح وہ ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔''

وہ بولے ''یہ تو ان کو بوکھلانے والی بات ہے۔خود اعتمادی کیسے پیدا ہو گی؟آپ کو معلوم ہے کہ اس سیٹ پر محمد علی کی شوٹنگ دیکھنے کیلئے کئی فلمساز اور ہدایتکار آئیں گے۔ اگر محمد علی ایک بار بھی گھبرا گئے تو پھر کام خراب ہو جائے گا۔''

اسحاق اکرام کا کہنا بھی درست تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ محمد علی کی شخصیت اور اداکاری کو جانچنے کیلئے کئی حضرات نے سیٹ پر آنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ریاض شاہد' شریف نیّر صاحب' رضا میر یہاں تک کہ ایس ایم یوسف صاحب کی آمد کا بھی امکان تھا۔ادھر سنتوش صاحب اور درپن صاحب بھی اطلاع دے چکے تھے کہ وہ ہمارے سیٹ پر آکر کافی پئیں گے۔۔۔اور نئے ہیرو کی اداکاری ''ملاحظہ ''کریں گے۔

ہم نے سنتوش صاحب سے کہا ''بے چارے کو نروس کرنے کا ارادہ ہے کیا؟''

مسکرانے لگے ''آفاقی صاحب ! وہ نروس ہونے والی چیز نہیں ہے۔آپ دیکھ لینا۔وہ بہت اوپر جائے گا۔''

یہ ایک سپُر سٹار کی جانب سے محمد علی کیلئے بہت بڑا سرٹیفکیٹ تھا۔

ابھی شوٹنگ شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ ہم برابر والے دفتر میں گئے جہاں زیبا میک اپ کر رہی تھیں۔وہ کسی اور فلم کی شوٹنگ کی تیاری میں مصروف تھیں۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائیں اور بولیں ''آفاقی ! سنا ہے آج تمہارے سیٹ پر بہت ہنگامہ ہے۔''

ہم نے کہا ''ہنگامہ کیسا۔آج تو صرف صبیحہ بھابی اور محمد علی صاحب ہی کا کام ہے۔''

''یہی تو دیکھنا ہے کہ علی صاحب صبیحہ بھابی کا کیسے مقابلہ کرتے ہیں۔''

ہم نے کہا'' بھئی مقابلے کا کیا سوال ہے۔ کوئی جنگ یا باکسنگ کا مقابلہ تو نہیں ہے۔ فلم کی شوٹنگ ہے۔ اور پھر صبیحہ اور محمد علی کا کیا مقابلہ وہ عورت' وہ مرد۔ وہ بہت منجھی ہوئی ایکٹریس اور محمد علی ایک نئے اُبھرتے ہوئے اداکار۔''

انہوں نے لپ سٹک لگاتے ہوئے کہا'' آج میں بھی تمہاری شوٹنگ دیکھنے آؤں گی۔ کافی تیار رکھنا۔''

''شکریہ'' ہم نے فوراً جواب دیا'' آپ یہ مہربانی نہ ہی فرمائیں۔''

'' کیا مطلب ہے تمہارا؟ اتنی بد اخلاقی؟ پروڈیوسر بن کر تم تو تہذیب اور اخلاق کو بھی بھول گئے۔ کوئی آنے والے مہمانوں سے ایسا بھی کہتا ہے'' انہوں نے ایک تقریر کر ڈالی۔

''اوّل تو آپ مہمان کہاں ہیں۔ اس فلم کی ہیروئن ہیں۔ دوسرے یہ کہ آج بہت اہم سین فلمایا جا رہا ہے۔ صبیحہ بھابی اور محمد علی کا پہلا اور بہت ڈرامیٹک سین ہو رہا ہے۔ آپ اگر آج سیٹ سے دور ہی رہیں تو بہتر ہو گا''

''ٹھیک ہے۔ آئندہ میں کبھی تمہارے سیٹ پر قدم بھی نہیں رکھوں گی'' وہ ناراض ہو گئیں۔

''سوائے اپنی شوٹنگ کے'' ہم نے انہیں یاد دلایا'' یہ نہ بھولیں کہ آپ اس فلم میں کام بھی کر رہی ہیں۔''

''ہونہہ'' انہوں نے غصّے سے کہا'' کیا زمانہ آگیا ہے۔ لوگوں میں لحاظ ہی نہیں رہا۔''

ہم اُٹھ کر اپنے دفتر میں چلے گئے جہاں محمد علی شوٹنگ کیلئے تیار ہو کر بیٹھے تھے اور کافی پی رہے تھے۔

''آفاقی۔ تم تو سیٹ پر آؤ گے نا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں آئیں گے'' ہم نے کہا۔

''تم میرے ساتھ ہی چلنا۔ سیٹ پر جاننے والے بھی تو ہونے چاہئیں۔''

سیٹ پر ہم دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ ہم نے پائپ سلگا لیا اور محمد علی اپنی سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرنے لگے۔ ان کا ایک ملازم اس وقت بھی ہر وقت ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ یہ ایک وفادار نوجوان تھا جس کا نام تو خدا جانے کیا تھا مگر محمد علی اسے ''سولجر'' کہہ کر بلاتے تھے۔

انہوں نے گردن موڑ کر ایک طرف کھڑے ہوئے سولجر کو دیکھا جو لپک کر ان کے نزدیک پہنچ گیا۔

''سگریٹ لاؤ'' محمد علی نے حکم دیا۔

سولجر نے نزدیک ہی کھڑے ہوئے پروڈکشن منیجر رحیم سے کہا ''رحیم صاحب محمد علی صاحب کیلئے سگریٹ کا پیکٹ لانا ہے۔''

رحیم کو معلوم تھا کہ ہم نے عام دستور کے برعکس اپنی فلم میں کام کرنے والوں کو سگریٹ نہ دینے کا اصول بنایا تھا۔ چنانچہ سولجر کی بات اس نے ان سنی کر دی۔ اگر سامنے ہی محمد علی اور ہم دونوں موجود نہ ہوتے تو شاید وہ سولجر کو اس اصول سے آگاہ بھی کر دیتا مگر موقع محل کے پیش نظر اس نے انجان بن جانا ہی مناسب سمجھا۔

محمد علی صاحب نے دیکھا کہ سولجر ابھی تک سیٹ پر ہی موجود ہے۔ انہوں نے اس سے دوبارہ کہا ''سولجر۔۔۔ سگریٹ!'' سولجر نے دوبارہ رحیم کو مخاطب کیا ''رحیم صاحب! محمد علی صاحب سگریٹ مانگ رہے ہیں۔''

محمد علی نے برہمی سے سولجر کو ڈانٹا ''رحیم صاحب کا کیا تعلق ہے۔ میں نے تمہیں سگریٹ لانے کو کہا ہے۔ فوراً لے کر آؤ۔''

سولجر کان دبا کر چپکے سے رخصت ہو گیا۔

سولجر محمد علی صاحب کے ساتھ کراچی سے آیا تھا اور ان کا ملازم خاص تھا۔ اس نے لاہور آکر یہ دیکھا تھا کہ اداکاروں بلکہ اداکاراؤں کے نگرانوں تک کو فلم ساز کے حساب میں سگریٹ فراہم کئے جاتے ہیں لیکن وہ محمد علی کے مزاج سے زیادہ شناسانہ تھا۔ محمد علی نے کبھی فلم سازوں سے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کیلئے سہولت طلب نہیں کی۔ آغاز میں بھی ان کی یہی عادت تھی۔ سُپر سٹار بننے کے بعد تو ظاہر ہے کہ وہ فلم ساز کی طرف سے اپنی ذاتی ضرورت پوری کرنے کے بالکل روادار نہیں تھے بلکہ خود اپنی جیب سے بے دریغ خرچ کر دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بیرونی ملکوں میں جا کر بھی انہوں نے اپنا یہ رویّہ نہ چھوڑا۔

سولجر بھاگم بھاگ سگریٹ کا پیکٹ لے کر آیا اور جیب سے لائٹر نکال کر محمد علی صاحب کی سگریٹ سلگانے کے بعد دوبارہ سیٹ پر ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ محمد علی کی اضطرابی کیفیت سے ہم بے خبر نہیں تھے۔ طارق صاحب سیٹ پر لائٹنگ کرانے میں مصروف تھے اور کسی بھی لمحے سین کی ریہرسل شروع ہونے والی تھی۔

کیمرہ مین کامران مرزا نے طارق صاحب کو مطلع کیا کہ وہ تیار ہیں تو طارق صاحب نے اسحاق کو ہدایت کی کہ صبیحہ

بھابی اور محمد علی کو بلائیں۔ صبیحہ خانم سیٹ کے دوسرے کونے میں ایک صوفے پر بیٹھی اطمینان سے سوئٹر بُننے میں مصروف تھیں۔ اسحاق کے مطلع کرنے پر اون کا گولا اور سلائیاں رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ محمد علی نے بھی طارق صاحب کی آواز سن لی تھی۔ انہوں نے بے چینی سے سگریٹ کے چند کش لگائے اور آس پاس ایش ٹرے تلاش کرنے کیلئے نظریں دوڑائیں ،فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور وہ اس پر سگریٹ پھینکنا نہیں چاہتے تھے۔ سو لجر لپک کر آیا اور اس نے ان کے ہاتھ سے سگریٹ لے لی۔ ہم بڑے صوفے پر محمد علی کے برابر ہی بیٹھے تھے۔

محمد علی نے اپنی ہتھیلیوں کی طرف دیکھا اور کہا ''آفاقی ! دیکھو میرے ہاتھ پسینے سے بھیگ رہے ہیں'' یہ کہہ کر انہوں نے ہمارا ہاتھ تھاما تو پتہ چلا کہ واقعی ان کے ہاتھ پسینے میں شرابور تھے۔

ہم نے تشویش سے ان کی طرف دیکھا ''طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

وہ بولے ''ہاں ہاں۔ بالکل ٹھیک ہوں'' یہ کہہ کر وہ مسکرائے اور شوٹنگ کیلئے کیمرے کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ سیٹ مہمانوں سے بھرا ہوا تھا جن میں زیادہ تر فلمی شخصیات تھیں۔ طارق صاحب نے ''سائیلنٹ پلیز'' کہا اور سیٹ پر خاموشی چھا گئی۔

محمد علی اپنے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور سامنے صبیحہ خانم کو دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئے۔ صبیحہ خانم نے انہیں دیکھا اور اپنے ممتا کے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ان کی طرف بڑھیں۔

''بیٹا''!

ابھی ان کا فقرہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ محمد علی کی بارعب آواز سیٹ پر گونجی اور سب لوگ ساکت دیکھتے رہ گئے۔

محمد علی نے اپنے مکالمے بالکل صحیح اور مؤثر انداز میں ادا کئے تھے۔ طارق صاحب نے ''کٹ'' کہا۔ ایک لمحہ سیٹ پر خاموشی رہی اور پھر سیٹ تالیوں سے گونج اٹھا۔

محمد علی اپنے امتحان میں سرخرو ہو گئے تھے اور تو اور صبیحہ بھابی نے بھی محمد علی کو اتنا اچھا شاٹ فلم بند کرانے پر مبارکباد دی اور محمد علی کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا۔

محمد علی ہمارے پاس آئے تو ان کی آواز ابھی تک فرط جذبات سے لرز رہی تھی۔ ''کیوں آفاقی ! شاٹ کیا ہوا؟''

''بہت اچھا۔ دیکھا نہیں سیٹ پر موجود سب لوگوں نے تالیاں بجا کر داد دی ہے۔ ایسا عام طور پر تو نہیں ہوتا۔'' واقعی طارق صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس مشکل ڈرامائی سین کی فلم بندی نے محمد علی میں بے انتہا خود اعتمادی پیدا کر دی اور پھر انہیں کسی مرحلے پر بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

محمد علی اور زیبا نے ہم سے ''گڑبڑ'' نہ کرنے کا وعدہ تو کر لیا تھا اور اس پر دونوں عمل پیرا بھی تھے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ ان کے مابین مکمل '' سیز فائر'' ہو گیا تھا۔ زیبا اپنی چھیڑ چھاڑ کی عادت سے باز نہیں آتی تھیں اور محمد علی اپنی ناراض ہونے کی عادت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ لٰہذا ان دونوں کے تعلقات اکثر کشیدہ ہی رہا کرتے تھے۔ مستقل لڑائی بھی نہیں تھی مگر مکمل صلح بھی نہ تھی۔ محمد علی کس بات پر اور کس وقت برہم ہو جائیں گے یہ کوئی نہیں جان سکتا تھا لیکن جب زیبا کے ساتھ ان کی بات چیت میں انتہائی تکلف پیدا ہو جاتا تھا یا بالکل ہی بات چیت بند ہو جاتی تھی تو ہمیں معلوم ہو جاتا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ یہ سلسلہ ''کنیز'' کے اختتام تک جاری رہا اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس فلم کی تکمیل میں خلاف توقع بہت دیر لگ گئی۔ اس فلم کی شوٹنگ کا پہلا مرحلہ ختم ہونے کے کچھ عرصے بعد ہی یہ تینوں فن کار بے حد مصروف اور مقبول ہو گئے۔ کبھی کراچی میں شوٹنگ ہو رہی ہے' کبھی لاہور میں' تو کبھی ایبٹ آباد میں۔

دیکھتے ہی دیکھتے تینوں فن کار شہرت کی بلندی پر پہنچ گئے۔ ان کے معاوضوں میں بھی اضافہ ہو گیا اور مصروفیات میں بھی۔ ہماری شوٹنگ کا شیڈول ایک بار خراب ہوا تو پھر بگڑتا ہی چلا گیا۔ جو ڈیٹس تینوں آرٹسٹوں کی ایک ساتھ حاصل کی تھیں وہ ختم ہو گئیں اور پھر انہیں یکجا کرنا بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ ادھر صبیحہ خانم کے بارے میں اچانک خبر ملی کہ وہ ماں بننے والی ہیں۔ خبر تو خوشی کی تھی مگر فلم ساز کی حیثیت سے ہمارے لئے انتہائی پریشان کن ثابت ہوئی۔ ہم نے اور طارق صاحب نے یہ پروگرام بنایا کہ صبیحہ خانم کا اہم کام جلد سے جلد ختم کر لیا جائے۔ مگر دوسرے آرٹسٹوں کی یکجا ڈیٹس کیوں کر حاصل کی جائیں؟ بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ ان دنوں محمد علی کی فلم ''آگ کا دریا'' شروع ہونے والی تھی اور اس فلم کیلئے انہیں ایک طویل عرصے کیلئے ہدایت کار ہمایوں مرزا اور دوسرے آرٹسٹوں کے ہمراہ سندھ جانا تھا۔ یہ ایک ڈاکو کی کہانی تھی۔ جس کو ہمایوں مرزا صاحب نے اصل مقامات پر ہی فلمانے کا پروگرام بنایا تھا مگر یہ

ہمارے لئے خطرے کا سگنل تھا۔ ظاہر ہے کہ لاہور میں رہ کر محمد علی ہمارے سیٹ کیلئے بھی وقتاً فوقتاً کچھ وقت نکال سکتے تھے مگر سندھ جانے کے بعد تو ان کا ہاتھ آنا ہی ناممکن تھا۔ چنانچہ ہم نے اس سلسلے میں محمد علی‘ ان کے ہدایت کار ہمایوں مرزا اور فلم ساز ابراہیم وہرا صاحب سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ شکر ہے کہ وحید مراد کا اس سیٹ پر کام نہیں تھا اور زیبا کا بھی برائے نام ہی کام تھا۔ لیکن اچانک محمد علی کی ڈیٹس ملنا بہت دشوار تھا۔ ہمایوں صاحب نے ہم سے وعدہ کر لیا۔ محمد علی نے بھی یقین دلایا کہ دو تین دن ضرور نکال دیں گے۔

ان ہی دنوں وہ لاہور میں ایک کاسٹیوم فلم ”ہزار داستان“ کی شوٹنگ میں بھی مصروف تھے جو تکمیل کے آخری مراحل میں تھی۔ اس کے ہدایت کار عزیز میرٹھی بھی ان ہی دنوں میں محمد علی سے کچھ وقت لینا چاہتے تھے۔ یہ مرحلہ کس طرح حل ہوا۔ یہ ہم ہی جانتے ہیں۔
محمد علی صاحب نے کہا کہ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے مگر ہمایوں مرزا اور ابراہیم وہرا نہیں مانتے۔ ان سے بات کی تو ان کا کہنا تھا کہ محمد علی بذات خود بُرا نہیں بننا چاہتے مگر انہوں نے ہم سے کہا ہے کہ کسی اور فلم کو ڈیٹ نہ دیں ورنہ وہ یہ کمی پوری نہ کر سکیں گے۔ تنگ آ کر ہم نے کراچی فون کر کے ابراہیم وہرا صاحب سے جھگڑا شروع کر دیا۔ وہ اتنے پریشان ہوئے کہ ہوائی جہاز میں سوار ہو کر اگلے ہی دن لاہور پہنچ گئے۔ ان کا مسئلہ اپنی جگہ اہم تھا۔ ہم نے محمد علی ہمایوں مرزا اور ابراہیم وہرا صاحب کو ایک ساتھ جمع کیا اور بالآخر محمد علی کا وقت لینے میں کامیاب ہو گئے۔
یہ شادی کا سین تھا۔ اس کیلئے بہت معزز اور معقول ایکسٹرا بھی ہونے ضروری تھے کیونکہ پھٹیچر قسم کے ایکسٹرا ماحول کو بگاڑ دیتے تھے۔ لاہور کی فلمی دنیا کے لوگوں کو ہم نے اس مقصد کیلئے اکٹھا کیا۔ ہدایت کار ایس سلیمان، محمد جاوید فاضل، سید نور (یہ اس وقت اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے) اور کئی ہدایت کار۔ کیمرہ مین اور فلم ایڈیٹروں کو پکڑ کر ہم نے سیٹ پر بٹھا دیا۔ اس وقت یہ حال تھا کہ جو خوش لباس شخص ایورنیو سٹوڈیو میں داخل ہوتا تھا ہم اسے گھیر گھار کر اپنے سیٹ پر لے جا کر مہمانوں کی حیثیت سے بٹھا دیتے تھے۔ ”کنیز“ کیلئے کالج کے مناظر میں بھی ہم نے ایسا ہی کیا تھا۔ غور سے دیکھئے تو ان میں آپ کو لہری، احمد رشدی، سلیمان، مسعود رانا اور کئی دوسرے ممتاز لوگ نظر آ جائیں گے۔
جس روز اس سیٹ پر شوٹنگ کا آغاز ہوا ایورنیو میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ دو تین دن شب و روز کام کر کے سیٹ مکمل

کیا گیا تھا اور اسے سجایا گیا تھا۔ مہمانوں کو اکٹھا کرنا ایک الگ مسئلہ تھا۔ شادی کیلئے ہار پھول بھی لائے گئے تھے۔ خدا خدا کر کے دن کے بارہ بجے شوٹنگ کا آغاز ہوا تو محمد علی غائب تھے۔ ان کی ہر طرف ڈھنڈیا پڑ گئی مگر ان کا کوئی پتا نشان نہ ملا، ہم بہت پریشان ہوئے۔ طارق صاحب بے چینی سے سیٹ پر سگریٹ پی رہے تھے۔ صبیحہ خانم ایک طرف تشریف فرما تھیں۔ آغا طالش پورے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ گھنی داڑھی اور سر پر خصوصی وگ لگائے ایک صوفے پر بیٹھے پان کھا رہے تھے۔

فلم کے جن لوگوں کو مہمانوں کے طور پر لا کر قالینوں اور صوفوں پر بٹھایا گیا تھا انہوں نے الگ جان کھا رکھی تھی کہ جلدی کام ختم کر کے ہمیں فارغ کیا جائے۔ ہمارے کام کا حرج ہو رہا ہے۔ سب سے زیادہ شور ایس سلیمان نے مچایا تھا۔ وہ بار بار چائے، پان، سگریٹ، کوکا کولا وغیرہ کی فرمائشیں کر رہے تھے اور ہم مجبوراً ان کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہے تھے۔ طارق صاحب بار بار گھڑی کی طرف دیکھتے اور پھر ہم سے کہتے ”آفاقی صاحب۔ محمد علی ابھی تک غائب ہے۔ سیٹ کیسے ختم ہو گا؟“

ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سا الہ دین کا جن پکڑ لائیں جس کی مدد سے محمد علی کو تلاش کیا جائے۔

سٹاف کے لوگوں کو ان کی تلاش کے سلسلے میں ہدایات دینے کیلئے ہم اپنے سیٹ سے باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ محمد علی صاحب سامنے سے چلے آ رہے ہیں۔ مگر اس حلئے میں کہ قدیم یونانی لباس پہن رکھا ہے۔ سر پر سکندر اعظم کے زمانے کا آہنی خود ہے اور ہاتھ میں تلوار۔

انہیں دیکھتے ہی اسسٹنٹ ڈائریکٹر افتخار خان نے نعرہ بلند کیا ”آفاقی صاحب وہ دیکھئے محمد علی۔“

افتخار خان کچھ عرصے بعد ڈائریکٹر بن گئے تھے۔ انہوں نے کئی اردو، پنجابی فلمیں ڈائریکٹ کیں۔ چند سال قبل ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ قد اور عمر میں سب سے چھوٹے تھے اس لئے انہیں محمد علی کی تلاش میں سب سے زیادہ دوڑایا جا رہا تھا۔ پہلے تو ہم پہچانے نہیں۔ پھر غور سے دیکھا تو محمد علی صاحب ہماری ہی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ ہم بے تابی سے ان کی طرف بڑھے ”بھئی کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ہماری شوٹنگ رکی ہوئی ہے۔“ وہ بولے ”میں تو برابر والے سیٹ پر ”ہزار داستان“ کی شوٹنگ کر رہا تھا۔ میں نے طارق صاحب کو بتا دیا تھا کہ وہ صبح سویرے اپنی شوٹنگ شروع

کریں گے۔آپ کو جس وقت بھی ضرورت ہو مجھے برابر والے سیٹ پر سے بلالیں۔''

ہم نے کہا'' طارق صاحب شاید بھول ہی گئے۔اب آپ جلدی سے جا کر اپنا حلیہ اور لباس تبدیل کریں۔شاٹ بالکل تیار ہے۔''

چند منٹ بعد محمد علی دولہا بن کر آ گئے اور ہماری شوٹنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ ایک مشکل اور ڈرامائی سین تھا۔خدا خدا کر کے سین ختم ہوا تو محمد علی دوبارہ یونانی سپاہی بننے کیلئے چلے گئے اور ہاتھ میں تلوار سنبھال کر'' ہزار داستان'' کے سیٹ پر پہنچ گئے۔اس فلم میں بھی تھوڑا سا کام باقی رہ گیا تھا اور محمد علی نہیں چاہتے تھے کہ ان کے سندھ چلے جانے کی وجہ سے'' ہزار داستان'' کا چند گھنٹوں کا کام طویل عرصے تک رکا رہے۔''ہزار داستان'' کی شوٹنگ ختم ہوئی تو وہ ہمارے لئے بالکل فارغ تھے۔انہوں نے تلوار، خود، آہنی زرہ بکتر اور چمڑے کے تسمے دار یونانی جوتے اتار کر ڈریس مین کے حوالے کئے اور ایک بار پھر دولہا بن کر ہمارے سیٹ پر پہنچ گئے۔اس سیٹ پر کام زیادہ تو نہیں تھا مگر کافی محنت طلب تھا۔ہر شاٹ میں دیر لگتی تھی۔اب مہمانوں کی یہ مشکل تھی کہ وہ شوٹنگ کے درمیان میں سے اٹھ کر نہیں جا سکتے تھے۔خدا جانے کس وقت کس زاویے سے شاٹ فلمایا جائے اور پس منظر میں بیٹھے ہوئے مہمان فریم میں نظر ہی نہ آئیں۔یہ بھی سچ ہے کہ ان میں سے کئی لوگ اپنے کام چھوڑ کر ہمارے سیٹ پر ایکسٹرا بننے کیلئے آ گئے تھے۔ہم تو اس مصیبت سے بچنے کیلئے سیٹ پر سے چلے آئے اور اپنے دفتر میں جا بیٹھے۔

پروڈکشن منیجر رحیم ہمارے پاس آیا۔وہ مسکرا رہا تھا ہم جانتے تھے کہ اس کی مسکراہٹ خطرے سے خالی نہیں ہوتی یا وہ ایڈوانس طلب کرتا ہے یا کوئی فرمائش کرتا ہے یا کوئی خرچے والی بات ہمارے گوش گزار کرتا ہے۔اس کے سوا وہ کبھی نہیں مسکراتا تھا۔''آفاقی صاحب وہ سلیمان صاحب ہیں نا۔وہ سگریٹ مانگ رہے ہیں۔''

ہم نے بے خیالی میں کہا''تو انہیں ایک سگریٹ کسی سے لے کر دے دو۔''

بولا''سر وہ سگریٹ کا پیکٹ مانگ رہے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ہم آرٹسٹ ہیں۔''

ہم بھڑک اٹھے''تم نے انہیں بتایا نہیں کہ ہم تو ہیرو کو بھی سگریٹ کا پیکٹ کمپنی کے خرچ پر نہیں دیتے۔وہ تو محض ایکسٹرا ہیں۔''

وہ سر کھجاتے ہوئے کہنے لگا ”اور دوسرے لوگ بھی سگریٹ سگریٹ کر رہے ہیں، میں کیا کروں۔“

تو ہم نے کہا ”جا کر کہہ دو کہ ہم نہیں ملے۔“

وہ بولا ”تو پھر وہ طارق صاحب سے مانگ لیں گے اور آپ تو ان کی عادت جانتے ہیں وہ کسی کو منع نہیں کریں گے۔“

رحیم نے واقعی بڑے پتے کی بات کی تھی۔

”تو پھر کیا کریں؟“

”میں تو کہتا ہوں کہ سلیمان صاحب کو سگریٹ دے دیں۔ دوسروں کو وہ خود ہی چپ کرا دیں گے“ اس نے مشورہ دیا۔

”ٹھیک ہے“ ہم نے کہا ”انہیں سگریٹ کا پیکٹ لا دو، مگر دیکھو۔ انہیں بتا دینا کہ زیادہ سگریٹ نہ پیئیں۔ یہ پیکٹ شوٹنگ پیک اپ ہونے تک چلانا ہے۔“

وہ مسکراتا اور سر کھجاتا ہوا رخصت ہو گیا۔

خدا خدا کر کے یہ سیٹ ختم ہوا اور ہماری جان میں جان آئی۔ مگر صبیحہ خانم چار پانچ مہینے کیلئے غائب ہو چکی تھی۔ اس لئے ہماری عرصے پہلے حاصل کی ہوئی تمام آرٹسٹوں کی تاریخیں گڑبڑ ہو گئی تھیں۔

ہم نے فلم کا تین چوتھائی سے زیادہ حصہ، ابتدائی چھ ماہ میں مکمل کر لیا تھا۔ باقی ماندہ کام ختم کرنے میں ہمیں تیرہ مہینے لگ گئے۔ اور ایک گانے کی فلم بندی تو ہمارے گلے میں ہڈی بن کر پھنس گئی تھی۔ یہ ہماری فلم میں ایک نئی قسم کی گانے کی سچویشن تھی جس کیلئے حمایت علی شاعر نے بہت اچھا گانا لکھا تھا۔ خلیل احمد نے احمد رشدی کی آواز میں اس کی بہت اچھی طرز بنائی تھی۔ سچویشن یہ تھی کہ وحید مراد کالج سے باہر نکل رہے ہیں کہ اچانک کار کے ہارن کی آواز آتی ہے۔ سامنے محمد علی اپنی کار میں بیٹھے ہیں۔ وحید کو دیکھ کر کہتے ہیں ”آ جاؤ۔ میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔“

ابھی وحید جواب دینے بھی نہیں پاتے کہ ایک نئے ہارن کی آواز سن کر چونکتے ہیں۔ دوسرے راستے پر زیبا کی کار کھڑی ہے۔ زیبا، وحید سے کہتی ہیں کہ آ جاؤ۔ میں تمہیں گھر ڈراپ کر دوں گی۔

محمد علی صاحب کے نوابانہ مزاج اور ذہنیت کو فلم میں چھوٹے چھوٹے سینوں میں بھی اجاگر کیا گیا تھا۔ ان کا نوابی جوش

مارتا ہے اور وہ کہتے ہیں ''اختر میرے ساتھ جائیگا جناب میں نے اسے پہلے دعوت دی ہے۔''

زیبا کہتی ہیں ''جناب۔ میں ان سے صبح ہی کہہ چکی ہوں کہ شام کو تمہیں میں ڈراپ کر دوں گی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔اختر میرے ساتھ جائے گا۔ کیوں اختر؟''

''جی نہیں جناب۔اختر میرے ساتھ جائے گا۔ کیوں اختر؟ اختر بے چارہ دونوں کاروں کے درمیان میں سینڈوچ بنا کھڑا دونوں کو دیکھ رہا ہے۔ ''بھئی یہ فیصلہ آپ لوگ آپس ہی میں کریں۔ مجھے بیچ میں نہ گھسیٹیں۔''

اس طرح محمد علی اس بات کو انا کا سوال اور زیبا اصول کا مسئلہ بنا لیتی ہیں۔

وحید مراد یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ ٹاس کر لیتے ہیں۔ جس کے حق میں فیصلہ ہو گا میں اس کی کار میں بیٹھ جاؤں گا۔ مگر دونوں میں سے کوئی ان کی بات نہیں مانتا۔

وہ تنگ آ کر کہتے ہیں ''بھئی میں کب تک آپ دونوں ملاؤں کے بیچ میں مرغی بن کر کھڑا رہوں۔ مجھے معاف کیجئے۔ میں پیدل ہی چلا جاؤں گا۔''

یہ کہہ کر وہ سڑک پر پیدل ہی چل پڑتے ہیں۔ان کے ایک طرف محمد علی کار میں سوار گزر رہے ہیں اور دوسری جانب زیبا کی کار ہے۔ وحید مراد عاجز آ کر گانا شروع کرتے ہیں جس کے بول یہ ہیں۔

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

اور مجھ غریب جان کے اوپر بنی ہوئی

گانے کے انتروں میں وہ اپنی مصیبت بیان کرتے ہیں کہ اگر ان کی نہ مانوں تو یہ روٹھ جائیں گے اور اگر ان کی بات ٹھکرا دوں تو وہ خفا ہو جائیں گی۔ مگر وہ دونوں اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔ایک طرف تریا ہٹ ہے تو دوسری طرف راج ہٹ۔ یہ گانا مختلف سڑکوں پر فلمایا گیا۔اس وقت لاہور میں ٹریفک بہت کم تھا لیکن فلم کی شوٹنگ کی خبر سن کر ایک ہجوم اکٹھا ہو جایا کرتا تھا۔اس لئے گلبرگ کے کم آباد دور دراز علاقوں کی سڑکوں پر شوٹنگ کی گئی۔ قذافی سٹیڈیم کے نزدیک گلبرگ کے گول چکر پر کافی شوٹنگ ہو سکتی تھی مگر یہیں آ کر گاڑی اٹک گئی۔ یہ گانا کافی طویل تھا اس لئے کبھی بادل آ جاتے تو کبھی بارش ہو جاتی۔ کبھی آرٹسٹ دوپہر کے وقت پہنچتے تو کچھ دیر بعد ہی اندھیرا چھا جاتا اور شوٹنگ

پیک اپ کرنی پڑتی۔اس گانے میں تینوں آرٹسٹوں کی موجودگی ضروری تھی اوران تینوں کودوسرے فلم سازوں سے مانگ مانگ کریکجا کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔وہ بے چارے توہر طرح تعاون کررہے تھے مگر قانون قدرت کے آگے بے بس تھے۔

گلبرگ میں سٹیڈیم کے نزدیک والے گول چکر پر گانے کی شوٹنگ شروع ہوئی تو پھر یہ سلسلہ درازہی ہوتا چلا گیا۔ چند شاٹس کے بعد ہی شوٹنگ پیک اپ ہو جاتی تھی۔ کبھی کسی کواپنی دوسری شوٹنگ کیلئے جاناہوتا تھاتو کبھی کوئی کراچی یااسلام آباد جانے کیلئے ائرپورٹ کی جانب بھاگتا تھا۔پرانے دور میں فلمی تیکنیک کے پیش نظر لباس اور مقامات کا تسلسل قائم رکھنالازم تھا۔آج کے زمانے کی طرح نہیں کہ کسی شاٹ میں کوئی جگہ اور لباس نظرآرہاہے تودوسرے شاٹ میں سب کچھ بدلا ہوا ہے۔اس وقت کے فلم بین بھی ان معمولی غلطیوں کو نظرانداز نہیں کرتے تھے۔یہاں تک کہ ہیروئن کے کانوں کے بُندے اور ہیرو کی ٹائی کاڈیزائن بھی بہت غور سے دیکھتے تھے اوراگر ذرا سا بھی فرق نظر آئے توسینما کے اندر بیٹھے بیٹھے ہی شور مچانا شروع کردیتے تھے۔

سٹیڈیم کا گول چکرایک نسبتاً غیر آباد مقام تھا۔آس پاس کوٹھیاں بھی زیادہ نہیں تھیں۔اس مقام پر خدا جھوٹ نہ بلوائے توہم لوگ ایک درجن مرتبہ شوٹنگ کیلئے گئے ہوں گے۔ کبھی سردی کاموسم ہے،تو کبھی چلچلاتی ہوئی دھوپ ہے۔ کبھی برسات کامہینہ ہے۔ادھر شوٹنگ شروع ہوئی اور ادھر بادلوں نے برسنا شروع کردیااور سارایونٹ سامان سمیٹ کررخصت ہوگیا۔ آس پاس کی کوٹھیوں والے بھی جیسے ہماری شوٹنگ سے مانوس ہوگئے تھے۔جب پلے بیک مشین پر یہ گاناریہرسل کیلئے شروع ہوتاتوسب کو خبر ہو جاتی تھی کہ وہی فلم والے پھر آگئے ہیں۔بچے تالیاں بجاتے اور کتے بھونکتے ہوئے باہر نکل آتے۔لڑکیاں بالیاں دور ہی دور سے اپنے پسندیدہ فن کاروں کودیکھنے کیلئے جھانکنے لگتیں۔ کچھ من چلے اور حوصلہ مند لڑکیاں آٹو گراف لینے یا بات چیت کرنے کیلئے بھی پہنچ جاتیں۔کوٹھیوں والے کرسیاں اور ٹھنڈا پانی لا کررکھ دیتے۔کچھ دیر بعد آرٹسٹوں کوچائے کی پیشکش بھی ہو جاتی۔یہ سلسلہ مہینوں تک جاری رہامگر یہ گانا تھاکہ کسی طرح ختم ہونے کانام نہ لیتا تھا۔اس کی وجہ سے نہ صرف اخراجات میں اضافہ ہورہاتھابلکہ فلم کی ریلیز بھی لیٹ ہوتی چلی جارہی تھی۔

ان ہی دنوں محمد علی نے فلم ساز محسن شیرازی کی فلم ''جان پہچان'' میں کام شروع کیا۔ جس کے ہدایت کار فرید احمد تھے۔ یہاں تک تو غنیمت تھا مگر اس فلم میں ہیروئن ایران سے لائی گئی تھی۔ اس حسینہ کا نام شاہ پار تھا۔ پاکستانی شاہ پارہ کہتے تھے۔ یہ ماڈرن، تیز طرار۔۔۔ اور گوری چٹی خوبصورت خاتون تھیں۔ اس فلم کی شوٹنگ رات کے وقت شاہی قلعے میں بھی کی گئی اور شوٹنگ کا یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ ان ہی دنوں محمد علی اور شاہ پارہ کے رومانس کی افواہیں بھی جنم لینے لگیں۔ وہ غیر ملک سے آئی تھیں۔ فارسی اور انگریزی بولتی تھیں۔ لاہور میں کافی عرصے مقیم رہیں۔ محمد علی کنوارے تھے۔ مشہور و معروف ہیرو بن چکے تھے۔ خوب رو اور وجیہہ تھے۔ یار لوگوں کو اس افواہ پر یقین بھی آ گیا۔ ادھر زیبا اور محمد علی کو آپس میں روٹھنے اور ناراض ہونے کا ایک اور معقول بہانہ ہاتھ آ گیا۔ خیریت گزری کہ ہماری فلم کا بیشتر کام ختم ہو چکا تھا مگر پھر بھی چند چھوٹے سیٹوں پر فلم بندی ہونی تھی۔

اس گانے کی شوٹنگ کیلئے ایک مرتبہ ہم نے کراچی سے ایس ایم یوسف سے التجا کر کے زیبا کو ادھار لیا۔ کراچی ہی کے ایک پروڈیوسر سے وحید مراد کو مانگا محمد علی شب و روز مختلف فلموں کی شوٹنگ میں مصروف تھے مگر انہوں نے محسن شیرازی اور فرید احمد سے ہماری خاطر ایک دن مانگ لیا۔ سخت گرمی کے دن تھے۔ سورج نکلتے ہی دھوپ چمک اٹھتی تھی۔ یہ طے پایا کہ زیبا اور وحید رات کی فلائٹ سے آئیں گے۔ محمد علی رات چار پانچ بجے اپنی شوٹنگ ختم کر کے لوکیشن پر پہنچ جائیں گے۔ اور صبح سات بجے گانے کی فلم بندی شروع کر دی جائیگی۔ اللہ نے چاہا تو اس روز سارا گانا فلمایا جائے گا۔ ہم لوگوں نے تو بہت اچھا پروگرام بنایا تھا مگر اللہ کو منظور نہ تھا۔

کراچی سے زیبا کا فون آ گیا کہ ان کی فلائٹ مس ہو گئی ہے اب وہ صبح سات بجے کی فلائٹ سے لاہور پہنچیں گی۔ وحید مراد رات ہی کو لاہور پہنچ گئے تھے۔ محمد علی صاحب لاہور ہی میں موجود تھے۔ ہم نے صبح سویرے کی شوٹنگ کے انتظامات مکمل کر لئے۔

سارا یونٹ مستعد اور کمر بستہ تھا لیکن ساڑھے سات بجے ہمیں لالی جی نے فون کر کے بتایا کہ زیبا کی طبعیت خراب ہو گئی ہے ''آفاقی یقین کرو۔ اسے تو کراچی سے آنا ہی نہیں چاہئے تھا مگر بیماری کے باوجود وہ لاہور پہنچ گئی۔ مگر بہت تیز بخار ہے۔''

ہم سر پکڑ کر رہ گئے۔ رحیم سٹوڈیو پہنچ کر انتظامات میں مصروف تھا۔ ہم نے اسے فون کر کے شوٹنگ کینسل ہونے کی خبر دی اور کہا کہ وہ تمام متعلقہ لوگوں کو بھی مطلع کرے۔ ہم جیسے تیسے ناشتہ کر کے زیبا کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ زیبا نے بہانہ بنایا ہے اس لئے ہم بہت غصے میں تھے۔ کوٹھی کے برآمدے میں لالی جی کو پریشان بیٹھے دیکھا تو ماتھا ٹھنکا۔

''زیبا کہاں ہیں؟'' ہم نے دریافت کیا۔

''ادھر ڈرائنگ روم ہی میں ہے۔ آجاؤ۔''

ہم اندر گئے تو زیبا ایک دیوان پر چادر اوڑھے لیٹی ہوئی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی بے اختیار ہنسنے لگیں۔

لالی جی گھبرا گئیں ''ڈاکٹر کو بلاؤ بخار سے کہیں اس کے دماغ پر تو اثر نہیں ہو گیا۔''

ہم بھی پریشان ہو گئے۔

زیبا نے لالی جی کو تسلی دی '' رہنے دیں لالی جی۔ میں ٹھیک ہوں'' اور یہ کہہ کر پھر ہنسنے لگیں۔

ہم نے تشویش بھری نظروں سے لالی جی کی طرف دیکھا مگر زیبا نے ہماری غلط فہمی دور کر دی۔ کہنے لگیں ''بھئی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دماغ خراب نہیں ہوا ہے میرا۔''

''تو پھر ہنسنے کی کیا ضرورت ہے؟'' ہم نے پوچھا۔

''تمہیں دیکھ کر ہنسی آگئی'' انہوں نے سادگی سے جواب دیا۔

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا ''ہم کوئی کارٹون ہیں۔ لطیفہ ہیں۔ ہمارے سر پر سینگ اُگ آئے ہیں کہ ہمیں دیکھ کر ہنسنے لگیں؟''

بولیں '' آفاقی۔ اس بات پر ہنس رہی ہوں کہ تمہاری شوٹنگ پھر کینسل ہو گئی۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے مگر تم کو یقین نہیں آیا ہو گا۔''

ان کا کہنا صحیح تھا۔ جب تک ان کا ٹمپریچر نہیں دیکھ لیا ہمیں واقعی یقین نہیں آیا تھا۔

کہنے لگیں ''تم چائے پیو گے یا شربت؟ ناشتا تو کر کے آئے ہو گے؟''

ہم نے کہا ”ہماری فکر مت کرو ڈاکٹر کو بلا کر علاج کراؤ۔ آج کی شوٹنگ بھی کینسل ہو گئی۔“

ہم کچھ دیر بیٹھے ان کی مزاج پرسی کرتے رہے۔ پھر سٹوڈیو فون کر کے حالات معلوم کئے۔ پتا چلا کہ رحیم نے سب کو شوٹنگ کینسل ہونے کی اطلاع دے دی ہے صرف محمد علی صاحب کو خبر نہیں دی جاسکی۔

”وہ کیوں؟“

”سر جی۔ ان کی شوٹنگ تو صبح پیک اپ ہو گئی تھی۔ وہ اپنی کوٹھی پر بھی نہیں پہنچے۔ میں انہیں کہاں خبر کرتا۔“

ہم پریشان ہو کر زیبا کے گھر سے نکلے۔ سوچا کہ آخر محمد علی کہاں ہوں گے؟ ٹیکسی والے سے کہا کہ قذافی سٹیڈیم کی طرف چلے۔

قذافی سٹیڈیم کے گول چکّر کے آس پاس گھاس کے تختے تھے۔ ایک طرف ہمیں محمد علی کی کار کھڑی نظر آگئی۔ پاس جا کر دیکھا تو کار میں کوئی نہ تھا۔ چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو ایک جانب گھنے درختوں کے سائے میں محمد علی اپنی کار کی پچھلی بڑی سیٹ بچھائے، سفید براق کرتہ پاجامہ پہنے سو رہے تھے۔ شیو بنا کر آئے تھے۔ رات بھر کی شوٹنگ سے تھکے ہوئے تھے۔ انتظار کرتے ہوئے سو گئے ہوں گے۔

ہم نے انہیں آوازیں دیں پھر جھنجھوڑا تو وہ گھبرا کر بیدار ہو گئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

”ارے آفاقی۔ تم۔ معاف کرنا میری آنکھ لگ گئی تھی۔ مگر میں بالکل تیار ہوں۔ ڈریس مین کو بلا کر کنٹی نیوٹی کا لباس منگوا دو اور شوٹنگ شروع کرو۔“

ان کا کہنا بھی صحیح تھا۔ میک اپ وغیرہ تو وہ کرتے ہی نہیں تھے۔ بس ڈریس پہنا اور شوٹنگ کیلئے تیاّر۔

انہوں نے آنکھیں مل کر لمبی سی جمائی لی اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ بولے ” یار۔ بہت سخت نیند آ رہی تھی۔ ڈرائیور کو میں نے گھر بھیج دیا تھا۔ بس محسن شیرازی کے گھر جا کر شیو بنائی۔ لباس بدلا اور یہاں آکر کار میں سے سیٹ نکال کر سو گیا۔“

یکایک ان کی آس پاس نگاہ پڑی تو ان کی انگڑائی درمیان میں ہی رہ گئی۔

”باقی لوگ کہاں ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

ہم نے کہا ”شوٹنگ کینسل ہو گئی ہے۔“

”وہ کیوں۔ کیا وحید نہیں آئے؟“

”وحید تو رات ہی پہنچ گئے تھے“ ہم نے جواب دیا۔

”سمجھ گیا“ وہ بولے ”زیبا بیگم غوطہ دے گئیں؟“

ہم نے کہا ”زیبا بھی لاہور پہنچ چکی ہیں مگر اچانک بیمار ہو گئی ہیں۔“

”ارے چندا۔ یہ سب بہانے ہیں۔ ہم تو ساری رات شوٹنگ کرنے کے بعد بھی چلے آئے۔ اب دیکھو دھوپ کتنی تیز ہو چکی ہے مگر میں بے خبر سوتا رہا۔ کتنی گہری نیند ہو گی۔ پھر بھی شوٹنگ کیلئے تیار ہیں۔ ارے بے کار کے بہانے ہیں ”وہ ناراض ہونے کا ارادہ کرنے لگے۔

ہم نے انہیں یقین دلایا ”بھئی ہم خود زیبا کی کوٹھی پر ہو آئے ہیں، انہیں بہت تیز بخار ہے۔“

وہ ایک دم فکر مند ہو گئے ”تیز بخار ہے؟ مگر بات کیا ہے؟“

ہم نے کہا ”گلا خراب ہے۔ دن رات کی شوٹنگ سے بھی تھکن ہو گئی ہو گی۔“

”ہاں یہ بات تو ہے“ وہ فوراً مان گئے۔ ”یار ہم ہٹے کٹے سخت جان مرد ہو کر تھک جاتے ہیں۔ وہ تو پھر نازک سی لڑکی ہے، تم خود دیکھ کر آئے ہو؟“ انہوں نے تصدیق چاہی۔

”اور کیا۔ وہیں سے تو آ رہے ہیں۔ سب کو رحیم نے اطلاع دے دی۔ بس آپ ہی رہ گئے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ آپ یہاں لوکیشن پر آ کر سو رہے ہیں۔“

”بھائی میں نے سوچا کہ وہیں کے وہیں شوٹنگ کیلئے دستیاب ہو جاؤں گا اور تھوڑی بہت نیند بھی لے لوں گا۔ آفاقی تم اپنی ہیروئن کو سمجھاؤ۔“

”کیا سمجھائیں؟“ ہم نے پوچھا۔

”یہی کہ اتنا کام نہ کرے۔ صحت زیادہ قیمتی چیز ہے۔ پیسے کا لالچ بہت بُری چیز ہے۔“

لیجئے۔ ابھی زیبا پر بگڑنے کے بہانے تلاش کر رہے تھے اور اب یکایک اظہار ہمدردی فرمانے لگے۔

''اچھا۔ میں تو چلتا ہوں سٹوڈیو'' وہ زمین پر سے کار کی سیٹ اٹھاتے ہوئے بولے۔ ''سٹوڈیو کیوں؟''
''جان پہچان کی شوٹنگ جو ہے۔ میں نے تو تمہاری خاطر ان سے اجازت لی تھی مگر تمہاری ہیروئن کی نزاکت نے تمہاری شوٹنگ بھی کینسل کرادی۔''
حیرت کی بات یہ ہے کہ دن رات شوٹنگ میں مصروف رہنے کے باوجود وہ بالکل شگفتہ اور تروتازہ نظر آرہے تھے۔ یکایک انہیں کچھ خیال آگیا اور وہ ناراضگی سے کہنے لگے ''مگر تمہاری پروڈکشن بہت خراب ہے۔ مجھے شوٹنگ کینسل کرنے کی خبر تک نہیں دی۔ اگر تم نہ آتے تو میں شام تک یہیں سوتا رہتا۔''
ہم نے کہا'' بھائی بتایا تو ہے کہ پروڈکشن والے کو خیال ہی نہ آیا کہ ہیرو صاحب یہاں سڑک پر سو رہے ہوں گے۔ اور پھر دھوپ اتنی تیز ہو رہی ہے کہ دس پندرہ منٹ بعد سونا ممکن نہ رہتا۔''
اس طرح یہ گانا پھر مکمل نہ ہو سکا۔
ہم یہ سوچ کر بہت بے چین ہوگئے کہ اب ایک بار پھر سارے آرٹسٹوں کو اکٹھا کرنے کیلئے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔
ایک دن ہم نے سنجیدگی سے طارق صاحب سے کہا'' طارق صاحب یہ گانا تو ایک مصیبت بن گیا ہے۔ کیوں نہ اسے فلم میں سے نکال ہی دیں۔''
طارق صاحب مسکرانے لگے ''آفاقی صاحب بس ہمّت ہار گئے؟''
''تو اور کیا کریں۔ اسے تو کسی فقیر کی بد دعا لگ گئی ہے۔''
بولے ''مگر یہ بالکل نئی سچویشن ہے۔ گانا بھی بہت اچھّا ہے۔ جہاں اتنا انتظار کیا ہے تھوڑا اور سہی۔''
طارق صاحب کا خیال بالکل درست تھا۔ یہ گانا ہماری فلم کی نمایاں امتیازی خوبیوں میں سے ایک تھا۔ فلم دیکھنے والوں نے اسے بہت پسند کیا اور داد دی۔ مگر اس کو مکمل کرنے میں مزید چار پانچ شفٹیں لگ گئیں۔ آخر شوٹنگ کیلئے ہم لوگ قذافی سٹیڈیم کے سامنے والی سڑک پر پہنچ گئے تھے۔ گانے کے آخری بول فلمائے جا رہے تھے۔ موسم بالکل ٹھیک تھا۔ ہم سب بہت خوش تھے۔ اچانک ایک طرف سے سیاہ بادل اٹھا، ہوا کے تیز جھکڑ چلنے شروع ہوگئے۔
طارق صاحب نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا اور پریشان ہو کر بولے ''بہت شدید آندھی آرہی ہے۔ شوٹنگ پیک

اپ۔ فٹافٹ سامان سمیٹو۔"

مگر آناً فاناً ئیں آندھی نے ہم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور آندھی بھی ایسی کہ خدا کی پناہ۔ بڑی مشکل سے کیمرا اور دوسرا قیمتی سامان سمیٹا اور ہم سب نے سٹیڈیم کی عمارت میں پناہ لی۔

گانا پھر بھی مکمل نہ ہو سکا تھا۔

چند روز بعد پھر محمد علی اور وحید مراد کی ڈیٹ مل گئی مگر زیبا مری میں تھیں اور ان کا آنا ممکن نہ تھا۔

ہم نے کہا" طارق صاحب۔ زیبا کو تو کار کے اندر ہی بیٹھا رہنا تھا۔ ان کے کلوز اپ شاٹ تو آپ پہلے ہی لے چکے ہیں۔"

طارق صاحب ہمارا مطلب سمجھ گئے "آپ کا مطلب ہے کہ کمبائنڈ شاٹ میں زیبا کا ڈپلی کیٹ استعمال کر لیں؟"

"اور کیا؟"

"مگر اتنی جلدی میں ڈپلی کیٹ کہاں سے ملے گا؟"

پھر طارق صاحب نے خود ہی یہ مسئلہ حل بھی کر لیا۔ ہمارے پروڈکشن منیجر رحیم کو ساری پہنا کر کار میں بٹھا دیا گیا اور اس طرح کمبائنڈ لانگ شاٹس فلمائے گئے۔ مگر گانے کے ختم ہونے کے بعد والا آخری شاٹ پھر بھی رہ گیا۔ چند روز کے بعد ایورنیو سٹوڈیو میں محمد علی، وحید اور زیبا تینوں کی مختلف فلموں کی شوٹنگ تھی۔ طارق صاحب نے فوراً شوٹنگ کا فیصلہ کیا۔ کاریں منگوائی گئیں۔ ڈریس تیار ہی تھے۔ گانا ختم ہونے کے بعد آخری شاٹ یہ تھا، وحید مراد دونوں کاروں کے درمیان میں پیدل چل چل کر تھک چکے تھے اور تنگ آکر سڑک پر سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

آخر زیبا کو ان پر ترس آ گیا۔ انہوں نے محمد علی سے کہا" اچھا بابا۔ بے چارے کی کب تک پریڈ کراؤ گے۔ تم ہی اپنی کار میں لے جاؤ۔"

محمد علی نے فاتحانہ انداز میں انہیں دیکھا اور قہقہہ لگا کر بولے "آخر ہار مان گئیں نا۔ بس۔ اب تم ہی اختر کو لفٹ دے دو" یہ کہا اور اپنی کار لے کر چلتے بنے۔

فلم کے تمام مکالمے ہم محض اپنی یادداشت کے بل پر تحریر کر رہے ہیں۔ اگر تھوڑا بہت فرق ہو تو اس کیلئے در گزر کر دیجئے گا۔

"کنیز" کی شوٹنگ کے دوران میں کچھ اور بھی سخت مقام آئے تھے۔ مگر فلم انڈسٹری کے پرانے بھیدی ہم کو یہ کہہ کر دلاسا دے رہے تھے کہ فکر نہ کرو۔ یہ پرانی روایت ہے کہ جس فلم کی شوٹنگ میں بہت زیادہ رکاوٹیں پیش آتی ہیں وہ ضرور ہٹ ہو جاتی ہے۔ طارق صاحب۔ لقمان صاحب، شریف نیئر صاحب اور دوسرے جہاں دیدہ لوگوں نے بھی اس خیال کی تصدیق کی اور ہمارے دل کو قدرے قرار سا آ گیا۔

ایک سیٹ پر محمد علی اور زیبا کی ایک روز کی شوٹنگ ہونی تھی۔ یہ زیبا کے بیڈ روم کا سیٹ تھا۔ منظر یہ فلمانا تھا کہ محمد علی خوشی خوشی زیبا کو یہ اطلاع دینے کیلئے ان کے گھر جاتے ہیں کہ دادا حضور مان گئے ہیں اور وہ خود تمہارے ڈیڈی سے ملنے کیلئے تمہارے گھر آئیں گے۔

"کیا مان گئے ہیں؟" زیبا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ارے بھئی میری اور تمہاری شادی کی بات" محمد علی نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔ اس سین میں زیبا انہیں بتا دیتی ہیں کہ وہ محمد علی کو محض اچھّا دوست سمجھتی ہیں۔ ان سے شادی کرنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ "تو اب سوچو" انہوں نے شوخی سے مشورہ دیا۔

زیبا آخر کار یہ راز اگل دیتی ہیں کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہیں۔

"کون ہے وہ؟" محمد علی کو پھر بھی یقین نہیں آتا۔ وہ سمجھتے ہیں زیبا انہیں ستانے کیلئے یہ بات کر رہی ہیں۔

"اختر!" زیبا کا یہ انکشاف سنتے ہی محمد علی آگ بگولہ ہو جاتے ہیں "اختر۔ وہ معمولی آدمی تم اسے مجھ پر فوقیت دے رہی ہو؟"

"یہ مت بھولو کہ وہ معمولی آدمی تمہارا بہترین دوست ہے۔"

"یہ ہماری غلطی تھی۔ وہ اس عزت افزائی کا مستحق نہیں تھا۔"

محمد علی، زیبا کو واشگاف الفاظ میں بتا دیتے ہیں کہ "تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہی پڑے گی۔ آج تک میں نے جو بھی فرمائش کی ہے دادا حضور نے وہ چیز ہر قیمت پر مجھے خرید کر دی ہے۔"

"مگر میں انسان ہوں" زیبا غصّے سے جواب دیتی ہیں۔

''دادا حضور کہتے ہیں کہ انسان سب سے کم قیمت پر بکتے ہیں۔'' بہر حال غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہوئے محمد علی رخصت ہو جاتے ہیں۔اور زیبا کے ڈیڈی (ادیب) نواب صاحب کی آمد پر یہ رشتہ منظور کر لیتے ہیں۔اس لئے کہ وحید مراد کے بارے میں محمد علی یہ انکشاف کرتے ہیں کہ وہ ایک کنیز زادی کے بیٹے ہیں۔

زیبا اس شادی کیلئے رضامند نہیں ہیں مگر باپ کے آگے لاچار ہیں۔ان کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔اس صورتحال میں وہ اپنے بیڈ روم کی چار دیواری میں مقید ہیں اور رات کے وقت وہ یہ گانا گاتی ہیں جوان پر اور وحید پر مختلف مقامات پر فلمایا گیا ہے۔وحید مراد کیلئے احمد رشدی نے آواز فراہم کی تھی۔اور زیبا کا گانا مالا کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ حمایت صاحب نے اس گانے کیلئے بہت اچھے بول لکھے تھے۔

جب رات ڈھلی تم یاد آئے

ہم دور چلے آئے اس یاد کے سائے سائے

اب یہ سنئے کہ جن دنوں یہ سین اور گانا فلمایا گیا اس زمانے میں زیبا اور محمد علی کے درمیان میں سخت ناراضگی اور کشیدگی تھی حتیٰ کہ ان دونوں میں بات چیت تک بند تھی۔سیٹ پر دونوں شوٹنگ کیلئے آتے تو فلم کے مکالموں کے سوا ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کرتے۔کیمرے کے سامنے اپنے اپنے مکالمے بول کر دور جا کر بیٹھ جاتے تھے۔

طارق صاحب زیبا اور محمد علی کا مذکورہ بالا سین فلمانے سے پہلے بہت فکر مند تھے۔''آفاقی صاحب۔یہ سین کیسے ہوگا۔ ان دونوں میں تو بات چیت ہی نہیں ہے۔'' ہمیں فوراً ایک معقول بات سوجھ گئی۔ ہم نے کہا'' طارق صاحب اتفاق سے یہ سین ہی لڑائی جھگڑے اور دھمکیوں والا ہے۔ان دونوں کی باہمی ناراضی حسب حال ہو جائے گی۔''

یہ بات ان کے دل کو لگی۔پھر بولے''مگر سین کے شروع میں تو محمد علی بہت اچھے موڈ میں ہیں۔''

ہم نے کہا'' چند ڈائیلاگ ہی تو ہیں۔وہ اتنے اچھے آرٹسٹ ہیں۔اتنی اداکاری تو کر ہی لیں گے۔اس کے آگے تو لڑائی جھگڑا اور دھمکیاں ہی ہیں۔''

ہم نے محمد علی صاحب کو شوٹنگ سے پہلے ہی سمجھانے کی کوشش کی کہ بھائی۔یہ بہت اہم سین ہے۔اس کے ساتھ

ضرور انصاف کرنا۔

وہ بولے ''مجھے سین کی اہمیت کا اندازہ ہے۔ یار کہہ جو دیا کہ سین بہت اچھّا ہو جائے گا۔''

زیبا بیگم سے کچھ کہنے کی حاجت ہی نہیں تھی۔ سین کے آغاز میں سچویشن کے مطابق وہ گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھیں اور اس کے بعد تو وہ خود بھی آتش فشاں بن چکی تھیں۔ اس لئے ان کی ناراضی ہمارے سین کے مطابق تھی۔

پھر بھی شوٹنگ سے پہلے سیٹ پر خاصا کشیدہ ماحول تھا۔ سبھی کو ان دونوں کی باہمی رنجش کا احساس تھا۔ مگر سین بہت اچھّا اور طارق صاحب کی منشا کے مطابق فلما لیا گیا۔ صرف اتنا تھا کہ ہر شاٹ کے بعد دونوں فن کار منہ پھلا کر دو مختلف سمتوں میں جا کر بیٹھ جاتے تھے۔

اب اس سیٹ پر گانے کا وہ حصّہ رہ گیا تھا جو تنہا زیبا پر فلمایا جانا تھا۔ ہم نے زیبا کیلئے شب خوابی کا لباس جاپانی کمونو کے انداز کا تیار کرایا تھا۔ یہ چائنا سلک سے بنایا گیا تھا اور اس پر چینی جاپانی سٹائل کے بڑے بڑے پھول بنے ہوئے تھے۔

سین کی فلم بندی ختم ہوئی تو سہ پہر کا وقت ہو چکا تھا۔ گانے کی شوٹنگ رات کو دس گیارہ بجے تک ہونی تھی۔ بیڈ روم کا محدود سیٹ تھا جس پر زیبا کے حصّے کا گانا بہت آسانی سے فلمایا جا سکتا تھا۔

ہم اطمینان سے اپنے دفتر میں بیٹھے چائے سے شغل کر رہے تھے کہ حسن طارق صاحب اندر آئے۔ پریشانی اور الجھن کے تاثرات ان کے چہرے پر صاف نظر آ رہے تھے۔

''آفاقی صاحب۔ زیبا بیگم نے وہ نائٹ سوٹ ناپسند کر دیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ دوسرا نائٹ سوٹ ہو گا تو وہ گانا فلم بند کرائیں گی۔''

''ناپسند کیوں کر دیا ہے۔ اتنا اچھّا اور قیمتی لباس ہے'' ہم نے کہا

''یہ بات آپ خود ہی اپنی ہیروئن کو جا کر سمجھا دیجئے'' وہ یہ کہہ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

''وہ ہیں کہاں؟'' ہم نے پوچھا۔

''میک اپ روم میں۔''

ہم زیبا سے ملاقات کرنے کیلئے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ میک اپ میں مصروف تھیں، ہماری شکل دیکھتے ہی بولنا شروع کر دیا ''آفاقی کچھ خدا کا خوف کرو۔''

''کیوں۔ کیا ہو گیا؟'' ہم نے پوچھا۔

''تم نے یہ ڈریس بنوایا ہے۔ اتنا ڈھیلا اور گھٹیا!'' ہم ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''تھوڑی عقل بھی استعمال کر لیا کیجئے۔ بھئی یہ ڈانسنگ ڈریس نہیں ہے، نائٹ سوٹ ہے۔ اتنا بھی نہیں جانتیں کہ سوتے وقت ڈھیلا ڈھالا لباس ہی پہنا جاتا ہے۔ چُست کپڑے پہن کر کون سوتا ہے؟'' ہم نے فوراً عُذر پیش کر دیا۔

''فلموں کی ہیروئنیں اتنا ڈھیلا لباس پہن کر گانا نہیں گاتیں۔'' انہوں نے جوابی حملہ کر دیا۔

ہم نے آرام سے بیٹھ کر پائپ جلایا اور ڈریس ماسٹر کو طلب کیا ''ماسٹر جی۔ وہ ڈریس کہاں ہے؟''

''ابھی لایا سر جی'' ماسٹر جی فوراً ڈریس لینے چلے گئے۔

زیبا نے کہا ''آفاقی۔ میں سیریسلی کہہ رہی ہوں۔ یقین کرو، یہ ڈریس کسی کام کا نہیں ہے۔ اتنی کنجوسی بھی اچھی نہیں ہے۔ کوئی اچھا سا نائٹ ڈریس بنواؤ۔''

''مگر اب اتنا وقت نہیں ہے۔ اس کے بعد نہ تو آپ کی ڈیٹ ہے اور نہ ہی سٹوڈیو کی بُکنگ مل سکتی ہے۔''

اتنی دیر میں ماسٹر جی بھاگم بھاگ ڈریس لے کر وہیں آ گئے۔

''اس ڈریس میں کیا خرابی ہے؟'' ہم نے اپنے دلائل شروع کئے ''اتنا قیمتی چائنا سلک کپڑا ہے۔ ہم نے خاص طور پر جاپانی سٹائل کا لباس تیار کرایا ہے۔''

زیبا ہنسنے لگیں ''خدا کا خوف کرو، یہ لباس ہے؟ اور وہ بھی گانا پکچرائز کرانے کیلئے؟''

ڈریس ماسٹر نے لباس کھول کر مختلف زاویوں سے دکھانا شروع کر دیا۔ صرف پہن کر نہیں دکھایا اور ہر طرح اپنے اوپر لٹکا کر اس کی نمائش کر دی۔

''بھئی تم چاہے ناراض ہو جاؤ مگر یہ ڈریس پہن کر ہرگز گانا پکچرائز نہیں کراؤں گی'' زیبا نے ہمیں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

ہم نے بہت ٹھنڈے دل سے کام لیا اور اپنا غصہ پائپ کی طرف منتقل کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ پھر اپنے

ہوش و حواس پر قابو پانے کے بعد ہم نے بہت میٹھے لہجے میں کہا" دیکھو یہ تو ہم بتا ہی چکے ہیں کہ ہر صورت میں ہمارے پاس یہ گانا پکچرائز کرنے کیلئے صرف آج ہی کی ڈیٹ ہے۔اگر یہ آج نہ مکمل ہوا تو پھر بہت دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ سوچ لیں۔اگر ہمارا نقصان ہی کرنا ہے تو اور بات ہے۔"

ان پر کوئی اثر نہ ہوا، بولیں" ڈائیلاگ بولنے کی کوشش نہ کرو، پروڈیوسر بنے ہو تو اپنا دل بھی بڑا کرو۔"

"کیسے دل بڑا کریں؟" ہم نے پوچھا" ذرا اس کی ترکیب بھی بتائیں؟"

کہنے لگیں" نیا ڈریس سلوانے کیلئے وقت نہیں ہے تو کیا ہوا۔ بازار میں دکانوں پر ایک سے ایک بڑھیا نائٹ سوٹ مل جاتا ہے۔"

خیال رہے کہ یہ واقعہ 1965ء کے ابتدائی ماہ کا ہے۔اس زمانے میں نہ تو لاہور میں فیشن ایبل ملبوسات کے سٹور تھے اور نہ ہی باہر کے ملبوسات آسانی سے دستیاب ہو سکتے تھے۔ہم نے کہا" جناب یہ نہ بھولئے کہ آج چھٹی کا دن ہے اور لاہور میں جو بھی اس قسم کی دو چار دکانیں ہیں وہ بھی بند ہیں۔"

"خیر اب ایسی بات بھی نہیں ہے" انہوں نے ہمارا عُذر تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔" ابھی چلو میرے ساتھ۔اسی وقت میں تمہیں جتنے چاہو نائٹ سوٹ دلوا دیتی ہوں۔اطمینان رکھو تم سے پٹرول کا خرچ بھی نہیں لوں گی۔"

ہم فوراً آمادہ ہو گئے" چلو۔ ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔" وہ جاتی سردیوں کی سہ پہر تھی۔ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا مگر بہر حال شام ہو گئی تھی۔

زیبا نے ہمیں اپنی کار میں بٹھایا اور سب سے پہلے گلبرگ کا رخ کیا۔وہاں تمام دکانیں بند تھیں۔مال روڈ پر گئے۔ انار کلی کا چکر لگایا مگر کوئی دکان کھلی ہوئی نہ ملی۔ ہمیں اچانک خیال آیا کہ لکشمی چوک پر ایک ایسا سٹور ہے جو اتوار کے روز بھی کھلا رہتا ہے۔

ہم نے کہا" ایک سٹور شاید کھلا ہو۔ مگر وہ لکشمی چوک پر ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا" وہ بولیں" وہیں چلتے ہیں۔"

ہم نے کہا" مگر وہاں کافی رش ہوتا ہے۔اتوار کا دن ہے۔ سنیماؤں کے شوز پر بہت لوگ آتے ہیں۔ ویسے بھی وہ فلم والوں کا علاقہ ہے۔ کسی نے پہچان لیا تو مشکل ہو جائے گی۔"

وہ مسکرانے لگیں" اب بہانے نہ بناؤ۔ میں نے برقع جو پہن رکھا ہے۔ کوئی مجھے کیسے پہچان لے گا؟"

بات تو معقول تھی۔ ہم نے فوراً مان لی" ٹھیک ہے۔ تو پھر لکشمی چوک کی طرف چلتے ہیں۔"

ٹریفک اس زمانے میں برائے نام ہی ہوتا تھا۔ چند منٹ میں ہم لکشمی چوک پہنچ گئے۔ زیبا نے سٹور کے سامنے اپنی کار روک دی۔ ہم سٹور کے اندر گئے۔ مالک اور سیلزمین بھی ہم کو بہت اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ ہم اکثر اس دکان سے ٹائیاں، پرفیومز، تمباکو، رومال وغیرہ خریدا کرتے تھے۔ علیک سلیک کے بعد ہم نے کہا" آپ کے پاس لیڈیز نائٹ سوٹ ہوں گے؟"

انہوں نے کہا ہمارے سامنے چند ڈبے لا کر رکھ دیئے۔ سب ہی سوتی کپڑے سے بنے ہوئے تھے۔

ہم نے کہا" بھائی ذرا اچھی قسم کے ریشمی نائٹ سوٹ دکھاؤ۔"

" سر ریشمی تو نہیں ہیں۔ اس وقت تو بس یہی ہیں۔"

ہم نے باہر کار کے پاس جا کر زیبا کو مطلع کیا تو وہ بولیں" تمہاری تو قسمت ہی بہت اچھی ہے۔ ان کے پاس کوئی ریشمی اور مہنگا نائٹ سوٹ ہی نہیں ہے۔ مگر مجھے دکھا تو دو۔"

ہم نے کہا" دکان کے اندر چل کر دیکھ لو۔"

" نہ بابا میں کار سے نہیں اتروں گی۔ ان سے کہنا یہیں لا کر دکھا دیں۔"

ہم دوبارہ دکان میں چلے گئے اور وہ۔۔۔ آٹھ دس ڈبے اٹھا کر لے آئے۔ زیبا نے نقاب سرکا کر نائٹ سوٹ دیکھنے شروع کر دیئے۔ اگرچہ وہ برقع پہنے ہوئے تھیں اس کے باوجود ہم چاہتے تھے کہ جتنی جلد ممکن ہو وہاں سے رخصت ہو جائیں۔ ہم مزید ڈبّے لینے کیلئے دکان میں چلے گئے۔ سیلزمین کو ہم اس ڈر سے ساتھ لے کر نہیں آئے کہ کہیں وہ زیبا کو پہچان نہ لے۔ اب جو ہم دوسری بار چند ڈبے لے کر کار میں بیٹھے تو ہمیں محسوس ہوا کہ کار کے آس پاس لوگ اکٹھے ہونے شروع ہو گئے ہیں۔

ہم نے زیبا سے کہا'' بھئی جلدی کریں۔ایسانہ ہو کہ یہاں مجمع لگ جائے۔''

انہوں نے بھی خطرہ محسوس کر لیا تھا۔ویسے بھی کوئی نائٹ سوٹ کام کا نہیں تھا۔ ہم نے تمام ڈبے دوبارہ سمیٹے اور دکان میں چلے گئے۔ایک سیلزمین بھی ڈبے واپس لے جانے کیلئے ہماری مدد کرنے کے خیال سے کار کے پاس پہنچ گیا۔ اتنی دیر میں کار کے گرد لوگوں کا جمگھٹا لگ گیا تھا۔ جیسے ہی ہم نے کار میں بیٹھ کر آخری ڈبے سیلزمین کے حوالے کئے، لوگوں کی آوازیں ہمارے کان میں پڑنے لگیں جو سرگوشی میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے''زیبا۔زیبا ہے یہ تو۔ شرط لگالو زیبا ہے۔''

خدا جانے انہوں نے یہ راز کیسے پالیا تھا۔

ہم نے گھبرا کر زیبا سے کہا''فوراً کار سٹارٹ کر کے بھاگنا چاہئے۔''

زیبا نے کار کو گیئر میں ڈالا اور تیزی سے چل پڑیں۔اب لوگ واقعی انہیں پہچان گئے تھے اور کچھ دور تک کار کے پیچھے بھی بھاگے مگر کار بہت تیزی سے حرکت میں آچکی تھی۔لکشمی چوک کے علاقے سے باہر نکل کر ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور شکر کیا کہ ابھی سنیماؤں کے شو ختم نہیں ہوئے تھے ورنہ لکشمی چوک پر لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی تھی۔

سٹوڈیو پہنچ کر دوبارہ وہی مسئلہ زیر بحث آگیا۔

زیبا بار بار اس نائٹ سوٹ کے ڈھیلے ہونے کا شکوہ کر رہی تھیں اور ہم انہیں یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ بہت قیمتی لباس ہے جو ہم نے بطور خاص جاپانی سٹائل میں تیار کرایا ہے اور وہ ڈھیلا ہی ہوتا ہے۔

ہم نے کہا''ایک بار یہ لباس پہن کر تو دیکھنا چاہیئے۔''

وہ مجبوراً لباس لے کر چلی گئیں۔زیب تن کر کے واپس آئیں تو لباس خاصا دلکش لگ رہا تھا۔انہوں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر مختلف زاویوں سے لباس کا جائزہ لیا۔اسے جسم پر لپیٹ کر دیکھا۔

ہمیں فوراً ایک ترکیب سوجھی۔ہم نے کہا''آپ کو اس کے ڈھیلے ہونے پر اعتراض ہے نا۔ہم ابھی اس کا علاج کر دیتے

ہیں۔‘‘

یہ کہہ کر ہم نے ڈریس ماسٹر کو بلایا’’ماسٹر جی۔اس ڈریس کو ٹائٹ کرنے میں آپ کتنی دیر لگائیں گے؟‘‘

ماسٹر جی بولے’’سر جی۔دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔‘‘

’’تو پھر اسے ٹائٹ کرلائیں‘‘ ماسٹر جی رخصت ہوئے تو ہم نے زیبا کو مشورہ دیا کہ ہم سیٹ پر چل کر اچھی سی کافی بنوا کر پیتے ہیں۔ساتھ میں چلغوزے اور خشک میوہ بھی منگالیں گے۔خدا جانے وہ نیکی کے موڈ میں تھیں یا ہماری باتوں میں آ گئی تھیں۔ہمارے ساتھ بیڈ روم کے سیٹ کی طرف چل پڑیں۔

کافی آئی تو اس کے ساتھ ہی طارق صاحب بھی دفتر سے اٹھ کر چلے آئے۔

’’کیوں آفاقی صاحب۔کیا فیصلہ ہوا؟‘‘

ہم نے کہا’’بازار جا کر نائٹ سوٹ تلاش کر آئے ہیں مگر کوئی کام کا لباس نہیں ملا۔زیبا خود ہمارے ساتھ جا کر دیکھ آئی ہیں۔‘‘

’’تو پھر؟اب کیا ہوگا؟‘‘

ہم نے کہا’’انہیں صرف اس کے ڈھیلے ہونے پر اعتراض ہے۔ماسٹر جی ابھی اسے ٹائٹ کر کے لے آئیں گے اور آپ شوٹنگ شروع کر دیں گے۔‘‘

زیبا نے کافی بناتے ہوئے ہمیں گھور کر دیکھا اور بولیں’’اگر ڈریس مجھے پسند نہیں آیا تو ہرگز شوٹنگ نہیں کروں گی۔کان کھول کر سن لو۔‘‘

طارق صاحب نے پریشان ہو کر ہماری طرف دیکھا۔ہم نے کہا’’بھئی ڈریس پسند کیسے نہیں آئے گا۔اتنی قیمتی اور نایاب چائنا سلک کا نائٹ ڈریس ہے۔ہم نے خود ایک انگریزی میگزین میں سے اس کا ڈیزائن تلاش کیا ہے۔ہالی ووڈ کی کسی ہیروئن کو بھی ایسا نائٹ سوٹ نصیب نہیں ہوگا۔‘‘

’’اچھا بس رہنے دو‘‘ زیبا نے کافی کی پیالی رکھتے ہوئے کہا’’سیلز مین یا انشورنس ایجنٹ بننے کی کوشش مت کرو۔‘‘

ہم نے کہا’’ہمیں اپنی ہیروئن کے ذوق پر پورا بھروسا ہے،طارق صاحب۔زیبا کو یہ لباس ضرور پسند آئے گا۔‘‘

زیبا کی تجویز پر ہم نے ڈریس ماسٹر سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ نائٹ سوٹ کے اگلے حصے پر جو بڑے بڑے کپڑے کے پھول لگے ہوئے ہیں ان میں بھی کمی کر دے۔

ڈریس ماسٹر نائٹ سوٹ کو ٹھیک کر کے لے آیا تھا۔ زیبا نے ڈریس روم میں جا کر یہ لباس زیب تن کیا اور باہر نکلیں تو ڈریس ماسٹر نے اور ہم نے لباس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیئے۔ اس میں کچھ زیادہ مبالغہ بھی نہیں تھا۔ وہ لباس ٹائٹ ہونے کے بعد واقعی اور زیادہ دیدہ زیب ہو گیا تھا۔ زیبا پس و پیش کے عالم میں تھیں۔ انہوں نے طارق صاحب کی طرف دیکھا اور پوچھا "طارق صاحب! آپ کا کیا خیال ہے؟"

طارق صاحب بغور جائزہ لینے کے بعد بولے "میرے خیال میں تو اچھا لگ رہا ہے۔"

ہم نے کہا "بس تو آپ شوٹنگ شروع کریں۔ پہلے ہی کافی وقت ضائع ہو چکا ہے۔"

زیبا اس لباس سے سو فیصد متفق نہ تھیں مگر ہماری مجبوری اور پریشانی کا بھی خیال تھا اور پھر ڈریس بھی کافی بہتر ہو گیا تھا اس لئے رضامند ہو گئیں۔

اس گانے کی شوٹنگ رات کو بارہ بجے تک جاری رہی۔

زیبا بار بار گھڑی دیکھ رہی تھیں "یہ گانا کب ختم ہو گا، مجھے صبح کی فلائٹ سے جانا بھی ہے۔"

خدا خدا کر کے بارہ بجے کے قریب گانا مکمل ہو گیا، زیبا تو ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر وہ لباس پہنے پہنے ہی رخصت ہو گئیں۔ جاتے جاتے ڈریس ماسٹر سے کہہ گئیں کہ اگلے دن یہ ڈریس میری کوٹھی سے لے لینا۔ شوٹنگ پیک اپ کرنے کے بعد بھی طارق صاحب، کامران مرزا اور ہم سیٹ ہی پر چائے پینے بیٹھ گئے۔

کامران مرزا نے تعریفی نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور کہا "آفاقی صاحب! آج تو آپ کو مان گئے۔"

"کس طرح؟"

"آپ نے ہیروئن کو خوب شیشے میں اتارا ورنہ شوٹنگ کینسل ہو جاتی۔"

ہم نے کہا "کامران صاحب! ہم نے غلط تو نہیں کہا تھا۔ اتنے اچھے گانے کو ہم خراب لباس کی وجہ سے برباد تو نہیں کر سکتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ نائٹ سوٹ فلم میں بہت اچھا لگے گا۔"

کامران نے کہا" یہ تو میں بھی مانتا ہوں۔ ٹائٹ ہونے کے بعد اس کی خوبصورتی اور بڑھ گئی۔"

طارق صاحب خاموشی سے چائے پینے میں مصروف تھے۔ ان کا چہرہ دیکھ کر ہم بتا سکتے تھے کہ وہ گانے کی فلم بندی سے پوری طرح مطمئن ہیں۔ انہوں نے چیف اسسٹنٹ اسحاق کو بلایا اور کہا" اسحاق" گانے کا نیگیٹو کل ہی ڈویلپ کرا کے فوراً رش پرنٹ نکلوالو اور اصغر سے کہو کہ اسے ایڈٹ کر کے پرسوں مجھے دکھائے۔ وحید والا پورشن بھی اس میں شامل کر کے گانے کو مکمل کر دے۔"

لیبارٹری میں اتنی جلدی کام نہیں ہوا کرتے تھے مگر لیبارٹری انچارج پیارے خان سے ہماری بہت اچھی یاد اللہ تھی۔ وہ ہم پر بہت مہربان تھے اور ہماری فرمائشیں پوری کر دیا کرتے تھے۔

تیسرے دن یہ گانا ایڈٹ ہو کر تیار تھا۔ رات گئے ہم لوگوں نے اسکرین پر دیکھا تو واقعی دل خوش ہو گیا۔ گانے کے بول۔ دُھن۔ فلم بندی۔ ماحول۔ وحید مراد اور زیبا کی اداکاری اور طارق صاحب کی ہدایت کاری سب چیزوں نے مل کر اسے ایک خوبصورت گانے میں ڈھال دیا تھا۔ تین چار روز بعد زیبا سے اسٹوڈیو میں ملاقات ہوئی تو ہم نے انہیں گانا دیکھنے کی دعوت دی۔

"دیکھو آفاقی! میری مانو تو یہ گانا فلم کی ریلیز سے پہلے کسی کو نہ دکھانا۔ تم نے مجھے جو نائٹ ڈریس پہنایا ہے میں اس میں فقیرنی نظر آؤں گی۔"

ہم نے کہا" مگر بعض فقیرنیاں اچھی بھی تو لگتی ہیں۔ اللہ نے شکل وصورت دی ہو تو لباس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"گانا ایڈٹ ہو چکا ہے۔ دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" اس روز ریکارڈنگ ہال میں کسی فلم کے گانے کی صدابندی ہو رہی تھی۔ دوپہر کو لنچ کا وقفہ ہوا تو ہم نے اس کے فلم ساز سے کہہ کر گانا اسکرین کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔

عام طور پر زیر تکمیل فلم کے گانے دوسرے لوگوں کو نہیں دکھائے جاتے مگر مجبوری تھی۔ ہال میں گانے کی صدابندی کے سلسلہ میں جو لوگ موجود تھے، انہیں باہر بھی نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ گانا دیکھنے کی خبر سنی تو سارے سازندے اکٹھے ہو گئے۔

ہال میں اندھیرا چھا گیا اور اسکرین پر گانا شروع ہو گیا۔

گانا ختم ہونے کے بعد جیسے ہی روشنی ہوئی سازندوں نے ”واہ واہ“ کا شور مچا دیا۔ خیر۔ سازندوں کی تو یہ عادت ہے مگر جب ساؤنڈ ریکارڈسٹ، فلم ساز اور دوسری فلم کے میوزک ڈائریکٹر نے بھی گانے کی تعریف کی تو زیبا کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

فلمساز نے ہم سے پوچھا ”آفاقی صاحب! یہ ڈریس آپ نے خود بنوایا ہے یا ہانگ کانگ سے منگوایا ہے؟“

”کیسا ہے؟“ ہم نے سوال کیا۔

”اے ون چیز ہے“ انہوں نے تعریفی انداز میں کہا۔

ہم نے زیبا کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا ”یہ ڈریس ہم نے بنکاک سے منگایا ہے، خالص چائنا سلک ہے اور کافی مہنگا ہے۔“

زیبا نے ہمیں گھور کر دیکھا۔

فلم ساز بولے ”اگر کوئی جاننے والا ہو تو مجھے بھی ایک ایسا نائٹ سوٹ منگا دیجئے۔ قیمت کی کوئی بات نہیں ہے۔“

زیبا اب سو فیصد مطمئن اور مسرور نظر آ رہی تھیں۔

اس فلم میں کالج کا ماحول بھی پیش کیا گیا تھا جس میں ہم نے کوشش کی تھی کہ مبالغہ آمیز اور مصنوعی نہ لگے۔ پکنک کے مناظر بھی تھے جو باغ جناح میں فلمائے گئے تھے۔ پہلے تو باغ جناح میں شوٹنگ کی اجازت حاصل کرنا ہی دشوار تھا۔ بڑی مشکل سے ہم نے محکمہ زراعت سے یہ اجازت حاصل کی۔ انتظامیہ نے ہمیں وارننگ دی کہ اگر باغ میں پھولوں اور پودوں کو کوئی نقصان پہنچا تو اس کا ہرجانہ ہم کو ہی ادا کرنا ہو گا۔

باغ جناح کے بالائی حصے میں پکنک کا منظر اور گانے کا ایک حصّہ فلمایا جانا تھا۔ اس سین میں محمد علی، زیبا، وحید مراد کے علاوہ کالج کے کچھ اور طلباء اور طالبات بھی موجود تھے۔ موسم بہت خوشگوار اور ٹھنڈا تھا۔ ایک روز پہلے بارش ہو چکی تھی جس کی وجہ سے درخت، گھاس اور پودے دُھلے دھلائے نظر آ رہے تھے۔ نیلے آسمان پر کہیں کہیں سفید بادلوں کے ٹکڑے تیرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ دھوپ خوب تیزی سے چمک رہی تھی۔ گویا شوٹنگ کے لئے نہایت موزوں دن تھا۔

طارق صاحب بہت خوش تھے۔ کامران مرزا بھی بار بار آسمان کی طرف دیکھتے اور موسم کی خوشگواری پر مسّرت کا اظہار کرتے تھے۔

شوٹنگ کا آغاز ہوا اور لڑکے لڑکیوں کے ایک دو پکنک کے مناظر بڑے اطمینان سے فلمائے گئے۔ اس کے بعد گانے کی فلم بندی کا آغاز ہوا۔ جوں ہی پلے بیک مشین کی آواز گونجی آس پاس کے لوگوں کو خبر ہوگئی کہ لو بھئی۔ یہاں تو کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ دن کا وقت تھا۔ باغ میں سیر کرنے والے عموماً اس وقت نظر نہیں آتے لیکن شوٹنگ کی اطلاع پھیلتے ہی در و دیوار سے تماشائی نکل آئے۔ بقول کامران مرزا کے یوں لگتا تھا جیسے درختوں اور پودوں میں سے انسان پیدا ہونے لگے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہجوم اکٹّھا ہو گیا۔

ہم نے حفاظت اور لوگوں کو دور رکھنے کی غرض سے پولیس کا بندوبست بھی کیا تھا مگر اتنے بڑے باغ میں ہر طرف سے اوپر جانے کے راستے موجود تھے یہاں تو پولیس کا پورا حفاظتی دستہ بھی لوگوں کو نہیں روک سکتا تھا۔ ہم نے یونٹ کے لوگوں کو اوپر چڑھنے والی پگڈنڈیوں پہ کھڑا کر دیا مگر صاحب توبہ کیجئے۔ لوگوں کا یہ عالم تھا کہ وہ ''زیبا۔ وحید مراد۔ محمد علی'' کے نعرے لگا رہے تھے اور اپنے دوست احباب کو مطلع کرنے کے لئے دوڑے جا رہے تھے۔ طارق صاحب نے گھبرا کر ہم سے کہا ''آفاقی صاحب! اب کیا ہو گا، بہت سے لوگ تو اپنے دوستوں کو بلانے کے لئے گئے ہیں۔''

ہم نے کہا ''یہی ہو سکتا ہے کہ جلدی جلدی یہاں شوٹنگ ختم کر کے واپس چلیں۔''

وہ بولے ''گانے کی شوٹنگ ہے۔ مختلف شاٹس مختلف مقامات پر فلمانے ہیں۔ یہ کام جلدی جلدی تو نہیں ہو سکتا۔''

شوٹنگ پہاڑی کی چوٹی پر ہو رہی تھی جب کہ ہمارا جنریٹر نیچے رکھا ہوا تھا جہاں سے کیمرے وغیرہ کے لئے موٹے موٹے بجلی کے تار اوپر پہنچائے گئے تھے۔ تماشائیوں کا ہجوم بڑھا تو بجلی کے اسٹاف کو جنریٹر اور تاروں کی حفاظت کرنا دوبھر ہو گیا۔ ابھی گانے کا ایک بول بھی نہیں فلمایا جا سکا تھا کہ پہاڑی کے ارد گرد شوٹنگ دیکھنے والوں کے سروں کی فصل اُگ آئی۔ جس طرف فریم بنایا جاتا، کچھ تماشائی کھڑے اور اوپر چڑھتے ہوئے نظر آ جاتے۔

طارق صاحب نے ناراض ہو کر ایک لڑکے کو بہت بُرا بھلا کہا اور بھگا دیا۔ وہ کوئی جوشیلا تھا۔ اس نے پتّھر اٹھا کر مارنے شروع کر دیئے۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے تماشائیوں نے بھی پتّھر اٹھا اٹھا کر پھینکے۔ وہ تو غنیمت تھا کہ باغ میں پتّھروں کی کمی تھی ورنہ یونٹ کے کئی لوگ زخمی ہو جاتے۔

محمد علی صاحب نے پہلے تو لوگوں کو محبت سے سمجھانے کی کوشش کی اور پھر ڈانٹنا شروع کر دیا۔ وحید مراد نے زیبا سے کہا" اگر آپ چاہیں تو یہ طوفان تھم سکتا ہے کیونکہ یہ سب آپ کے درشن کرنے آئے ہیں"

زیبا نے ایک نظر ہجوم کو دیکھا اور تنک کر بولیں" تم چاہتے ہو میں زندہ واپس نہ آؤں"

پبلک کے پاس بھی معقول جواب موجود تھا۔ انہوں نے جواب میں نعرے لگانے شروع کر دیئے اور جو بھی ان کے ہاتھ آیا وہ اٹھا اٹھا کر اداکاروں کی طرف پھینکنے لگے۔ کئی لوگوں نے تو پودے، پھولوں سمیت اکھاڑ کر میزائل کی طرح استعمال کئے۔

کامران مرزا نے محمد علی سے کہا" علی صاحب، پبلک پھول نچھاور کر رہی ہے۔"

محمد علی نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور کہا" بھاگو۔۔۔ یہ تو پوری فوج آ رہی ہے۔"

اداکاروں نے بھاگ کر کاروں میں پناہ لی اور رخصت ہو گئے۔ اداکاروں کے جاتے ہی مجمع بھی چھٹ گیا۔

دوسرے دن باغ کے انچارج نے دس ہزار روپے کا بل ہمیں بھیج دیا۔

"بھئی یہ کیسا بل ہے" ہم نے رحیم سے پوچھا" باغ کا کرایہ ایک ہزار روپیہ ہم پہلے ہی ادا کر چکے ہیں۔"

وہ بولا" یہ نقصان کا ہرجانہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پودوں اور پھولوں کا لاکھوں روپے کا نقصان ہوا ہے مگر آپ کے ساتھ انہوں نے خاص رعایت کر دی ہے۔"

ہم نے کہہ سن کر یہ رقم پانچ ہزار روپے کرالی۔ اس زمانے میں پانچ ہزار کی چپت بھی کوئی معمولی بات نہ تھی مگر مجبوری تھی۔

فلم کا یہ گانا تو ہمارے لئے مصیبت بن گیا تھا لیکن دوسرے تمام گانے بہت آرام سے فلمائے گئے۔ ہاں۔۔۔ ایک اور گانا بھی پرابلم بنا لیکن یہ پرابلم مختلف قسم کی تھی۔ صبیحہ خانم کی سنتوش کمار سے شادی ہو جاتی ہے اور وہ دونوں ایک

بچّے (انور) کے والدین بن جاتے ہیں۔ یہ وہی انور ہے جو بڑا ہو کر محمد علی بن گیا تھا اور نواب صاحب نے اس کا نام خورشید رکھ دیا تھا۔

نواب صاحب نے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی ایک کنیز زادی سے مجبوراً کر تو دی تھی مگر وہ ذہنی طور پر اسے کبھی قبول نہیں کر سکے تھے۔ یہاں تک کہ جب ان کے رشتے دار اور خاندانی ڈاکٹر انہیں پوتے کی پیدائش کی مبارکباد دیتا ہے تو وہ پہلے تو بے اختیار مارے خوشی کے کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں مگر پھر بیزاری اور نفرت سے کہتے ہیں ''نہیں۔۔۔وہ ہمارا پوتا نہیں ہو سکتا۔'' اس سے پہلے وہ پوتے کی آمد کے شوق میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ اضطرابی طور پر چلم کے بغیر ہی حقہ پی رہے تھے۔

پوتے کی پیدائش کے بعد بہو (صبیحہ) کا خیال تھا کہ شاید نواب صاحب پوتے کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا رویّہ تبدیل کر لیں گے مگر وہ نواب ہی کیا جو اپنی ذہنیت اور سوچ کو بدل لے۔ دادا ابا ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھے۔ بہو اور پوتا حویلی کے بالائی حصے میں رہتے تھے اور بہو کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ نچلی منزل پر نواب صاحب کے سامنے بھی نظر آئے مگر پوتا اوپر کی منزل پر ہو اور دادا اس کو دیکھنے تک کا روادار نہ ہو؟ یہ کیسے ممکن تھا۔ چند روز بعد محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر نواب صاحب، چوروں کی طرح، کشاں کشاں اوپر کی منزل میں پہنچتے ہیں، چاروں طرف دیکھ کر یہ اطمینان کرتے ہیں کہ بہو یا بیٹا تو سامنے نہیں ہیں اور پھر دبے پاؤں اس کمرے میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں ان کا پوتا پالنے میں لیٹا ہوا ہے۔ پوتے کو دیکھ کر خون جوش مارتا ہے اور نواب صاحب اسے بے اختیار گود میں اٹھا لیتے ہیں۔

صبیحہ خانم اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوتے یہ منظر دیکھتی ہیں تو ٹھٹک کر رہ جاتی ہیں، خوش ہو کر مسکراتی ہیں اور پھر واپس لوٹ جاتی ہیں تاکہ دادا جان اپنے پوتے کو جی بھر کر پیار کر لیں۔ اس کے بعد بہو اور سسر میں ایک خاموش سمجھوتا ہو جاتا ہے۔ دادا ابا موقع پا کر پوتے کو دیکھنے کے لئے اوپر جاتے ہیں تو بہو ادھر ادھر کھسک جاتی ہے۔ ذرا جھجک کم ہوتی ہے تو دادا ابا پوتے کو اپنے پاس بھی بلوا لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ بچّوں کی طرح کھیلتے ہیں، گھوڑا بن کر اسے اپنی پیٹھ پر سواری کراتے ہیں اور صبیحہ خوشی اور اطمینان کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ سب دیکھتی ہیں اور سوچتی ہیں کہ بالآخر نفرت کی دیوار گر ہی گئی۔ پوتے کی محبّت کے سامنے یہ ریت کی دیوار کی طرح بیٹھ گئی۔

پوتا تین سال کا ہو جاتا ہے۔اس اثناء میں صبیحہ کے شوہر سلیم (سنتوش کمار) کی ذہنی کیفیت بہت بہتر ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ قریب قریب نارمل ہو جاتے ہیں، انہیں اپنی بیوی اور بچےّ سے بے پناہ پیار ہے۔ایک روز جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ صبیحہ کا پاؤں پھر بھاری ہو گیا ہے تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔دونوں میاں بیوی یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اگر لڑکا پیدا ہوا تو اس کا نام اختر رکھیں گے۔

انور کی تیسری سالگرہ کے موقع پر حویلی کو دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے۔بچےّ کی سالگرہ میں شرکت کے لئے بہت سے بچوّں کو مدعو کیا گیا ہے۔سنتوش بیٹے کی سالگرہ کا کیک لانے کے لئے بذات خود جاتے ہیں، یہاں بچوّں کی محفل سجی ہوئی ہے اور صبیحہ خانم نے دنیا بھر کے کھلونوں کا ڈھیر لگا رکھا ہے۔وہ بیٹے اور ننھے مہمانوں کو خوش کرنے کے لئے ایک گیت بھی گاتی ہیں، سارا ماحول خوشی سے معمور ہے۔

اس سیٹ پر بچوّں کو اکٹھا کرنا بھی ہمارے لئے ایک مسئلہ بن گیا۔ہماری اور طارق صاحب کی خواہش تھی کہ کرائے پر بچےّ نہ بلائے جائیں بلکہ بہت خوبصورت، صحت مند، شوخ و شریر اور خوش لباس بچوّں کو اکٹھا کیا جائے۔اس مقصد کے لئے ہم نے نہ صرف اپنے دوستوں اور جاننے والوں کو کئی روز پہلے دعوت دے دی تھی بلکہ اس وقت کے دو تین بہت اعلیٰ درجے کے اسکولوں میں جا کر پرنسپل سے ملاقات کر کے ان کی معرفت ننھے اور پیارے پیارے بچوّں کو مدعو کیا تھا۔اسکول والوں نے ہمارے ساتھ پورا تعاون کیا، والدین بھی رضامند ہو گئے، اپنی اپنی ٹیچرز کی نگرانی میں صبح ہی سے خوبصورت اور معصوم مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

بچوّں کو پہلے تو اسٹوڈیو کے ریکارڈنگ ہال اور لان میں بٹھایا گیا جہاں انہوں نے بھاگ دوڑ اور کود پھاند شروع کر دی اور اتنا اودھم مچایا کہ خود ان کی ٹیچرز بھی عاجز آ گئیں اور بے بسی سے ہمارے تعاون کی طلب گار ہوئیں۔

ہم اس صورتحال کے لئے پہلے ہی سے تیار تھے۔ایک تو ہم نے بھالو کا تماشا دکھانے والے کا بندوبست کیا تھا پھر ایک جادوگر صاحب کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں۔بھالو کا تماشا تو سیٹ سے باہر مہمانوں کے لئے تھا مگر جادوگر کو سیٹ پہ بھی اپنا شو پیش کرنا تھا، ابھی سیٹ تیار نہیں ہوا تھا، اس کی آرائش جاری تھی۔ان حالات میں شریر بچوّں کی اس فوج کو سیٹ پر لے جانے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا چنانچہ پہلے تو اسٹوڈیو کے سامنے بھالو کا تماشا ہوا اور پھر اسٹوڈیو کے

لان میں جادو گر صاحب نے اپنی شعبدہ بازی کا مظاہرہ کیا۔ مگر بچّے بہت کم سن تھے، بہت سے شعبدے ان کی سمجھ سے باہر تھے اس لئے انہوں نے گڑبڑ شروع کر دی۔ ایک بچّے نے جادو گر کی پاسنگ شو جیسی فیلٹ ہیٹ، لمبے کالے کوٹ اور نوکدار مونچھوں کو دیکھ کر ''کارٹون'' کا نعرہ بلند کیا۔ بس پھر کیا تھا سب نے ''انکل کارٹون'' کا شور مچا دیا۔ اب جادو گر صاحب انہیں بہتیرا بہلانے کی کوشش کر رہے ہیں، منہ سے گولے برآمد کر رہے ہیں مگر بچّوں کی محفل میں ان کا رنگ اکھڑ چکا تھا۔ مجبوراً انہیں شکریئے اور معاوضے کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ بھالو والا بھی جا چکا تھا۔ اب شیطانوں کا یہ لشکر تھا اور ہم یعنی ہمارا یونٹ۔

ہم ڈھیر ساری ٹافیاں اور لیمن ڈراپس بچّوں کے لئے خرید کر لائے تھے۔ سوچا تھا کہ جب کافی دیر ہو جائے گی اور وہ بور ہونے لگیں گے تو ٹافیوں سے ان کو بہلایا جائے گا مگر ان کی سر گرمیاں خطرے کی حدوں کو چھونے لگی تھیں لہٰذا انہیں ٹافیاں تقسیم کر دی گئیں۔ انہوں نے کچھ دیر تو بہت تمیز تہذیب کا مظاہرہ کیا پھر آپس میں چھینا جھپٹی شروع کر دی۔ لڑکوں نے لڑکیوں سے ٹافیاں چھین لیں اور انہوں نے رو رو کر اسٹوڈیو کو سر پر اٹھا لیا۔ مجبوراً انہیں بہلانے کو مزید ٹافیاں بانٹی گئیں۔ اب ان بچّوں کو سیٹ پر پہنچا دیا گیا تھا اور گانے کی فلم بندی شروع ہو چکی تھی مگر بچّے بھلا کہاں قابو میں آتے ہیں۔ انہوں نے میز پر رکھے ہوئے قیمتی کھلونوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ اب مشکل یہ تھی کہ بچے زیادہ تھے اور کھلونے کم۔ یہ کھلونے ہم مال روڈ پر کمرشل مارکیٹ کی ایک بڑی دکان سے لائے تھے۔ اس زمانے میں امپورٹڈ کھلونے عموماً دستیاب نہیں ہوتے تھے، صرف یہی دکان فروخت کرتی تھی اور وہ بہت مہنگے تھے، ہم ان کھلونوں کو ٹوٹ پھوٹ سے بھی بچانا چاہتے تھے اور سارا اسٹاف ان کی حفاظت پر مامور تھا۔ یکایک ایک بچّے نے صبیحہ خانم کے پاس جا کر چھنگلیا دکھائی اور کہا ''مس۔۔۔ باتھ روم؟''!

صبیحہ خانم کو بے اختیار ہنسی آ گئی، شوٹنگ شروع ہو چکی تھی مگر شوٹنگ روک کر بچے کو باتھ روم جانے کی اجازت دے دی گئی۔ پھر کیا تھا، ہر بچے نے انگلی دکھانی شروع کر دی اور سیٹ ''مس۔۔۔ باتھ روم؟!'' کے شور سے گونج اٹھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ مختلف دفاتر میں باتھ روم تو تھے مگر تمام دفتر کھلے ہوئے نہیں تھے۔ بچّے باتھ روموں کی تلاش میں

سارے اسٹوڈیو میں بکھر گئے۔انہوں نے لان میں فواروں کے پاس کھیلنا شروع کر دیا۔کوئی سیڑھیوں پر سے پھسل رہا ہے،کوئی فوارے کے حوض میں نہانے کی کوشش میں مصروف ہے۔

طارق صاحب نے کہا ''ان سب کو گھیر کر لاؤ۔یہ تو اپنے کپڑے خراب کر لیں گے۔''

کافی دیر کے بعد بچّوں کو اکٹھا کیا گیا۔ٹیچرز نے گنتی کی تو تین بچے کم تھے۔ اب ان کی تلاش شروع کر دی گئی،وہ باہر مٹھائی والے کی دکان پر پائے گئے۔

دوپہر کا کھانا بھی ایک مرحلہ تھا،ہم بچّوں کو ٹافیاں بانٹ بانٹ کر تھک گئے تھے اور ٹافیاں بھی ختم ہو گئی تھیں۔طارق صاحب نے یہ ترکیب سوچی کہ بچّوں کے ساتھ کمبائنڈ شاٹس جلدی جلدی کسی طرح فلمائے اور پھر شیطانوں کے اس گروہ کو شکریے کے ساتھ فارغ کر دیا۔باقی شوٹنگ صبیحہ خانم اور ان کے بچّے کے ساتھ کی گئی۔

یہ محمد علی کا بچپن تھا۔اس شوٹنگ میں جن بچّوں نے حصّہ لیا تھا وہ سب اب بڑے ہو گئے ہیں،ان کی شادیاں ہو چکی ہیں۔خود بھی ماں باپ بن چکے ہیں مگر کنیز کی اس شوٹنگ کی یادیں آج بھی ان کے ذہن میں کلبلاتی رہتی ہیں۔ گزشتہ سالوں میں ہمیں کئی خواتین نے روکا اور مخاطب کیا ''انکل ! آپ نے مجھے پہچانا۔''

اب انکل ہیں کہ انہیں سر سے پیر تک غور سے دیکھ رہے ہیں اور یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

''میرا نام پپّی ہے''!

''پپی؟ ''!ہم نے بہتیرا دماغ پر زور ڈالا۔صرف ایک پپّی ہمیں یاد آئیں جو شباب کیرانوی کی صاحب زادی تھیں۔ انہوں نے بھی شباب صاحب کی ایک فلم میں چار پانچ سالہ بچی کے طور پر حصہ لیا تھا مگر پپی کو ہم خوب اچھی طرح جانتے ہیں تو پھر یہ کون پپی ہیں۔

''انکل ! میں نے آپ کی فلم ''کنیز'' میں سالگرہ کی شوٹنگ میں حصہ لیا تھا'' آخر انہوں نے خود بھید کھول دیا۔

''اچھا تم وہی ہو جو حوض میں گرنے والی تھیں اور جس نے تیس چالیس ٹافیاں کھائی تھیں؟'' ہمیں یاد آ گیا۔

وہ ہنسنے لگیں ''آپ نے خوب پہچانا مگر دیکھئے حوض میں گرنے والی بات میرے ہزبینڈ کے سامنے نہ کیجئے،ان سے ملیے،یہ میرے ہزبینڈ ہیں۔ڈاکٹر ہیں اور یہ میرے دو شریر بچے'' انہوں نے اپنی پوری فیملی سے تعارف کرا دیا۔

اس طرح اور بھی کئی حضرات اور خواتین ہم سے ملتے رہتے ہیں۔ ابھی چند روز پہلے ہی ایک عزیز نے فون کر کے فرمائش کی کہ ''کنیز کا ویڈیو ہو تو مجھے بھی دیجئے۔ یہ کہاں سے ملے گا، میری بیٹی جرمنی میں ہے، اس نے سالگرہ کے گانے میں حصہ لیا تھا، میں اس کو بھیجنا چاہتا ہوں۔ ''

ماڈل ٹاؤن کے ایک اسکول کے پرنسپل صاحب تو ہر چند سال کے بعد ہمارے پاس چند نام لے کر آجاتے تھے کہ ان کی تصویریں درکار ہیں۔ ان کے ماں باپ نے مانگی ہیں اور ہم ہر بار انہیں سمجھاتے تھے کہ شوٹنگ میں حصہ لینے والے بچّوں کی تصویریں نہیں بنائی گئی تھیں۔

اس سالگرہ والے سین کے آخر میں ہی اچانک خبر آتی ہے کہ سنتوش کمار کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔ خوشی کا گھر ماتم کدے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ طارق صاحب نے موت کی اس خبر کو اُجاگر کرنے کے لیے جہاں مختلف انداز سے تاثر پیدا کیا تھا وہیں ایک یہ بھی تھا کہ آرائش کے لئے سجے ہوئے غبارے اچانک پھوٹنے لگتے ہیں۔ اس شاٹ کے ختم ہوتے ہی سیٹ پر موجود رہے سہے بچّوں نے رونا شروع کر دیا تھا۔ پوچھا بھئی کیا بات ہے؟

روتے ہوئے بولے ''دیکھئے! انہوں نے ہمارے غبارے پھوڑ دیئے''!

چنانچہ باقی ماندہ غبارے انہیں دے دیئے گئے تاکہ ان کا غم غلط ہو۔ یاد آیا اس شوٹنگ کے لئے ہم نے بلا مبالغہ ہزاروں غبارے منگوائے تھے۔ غباروں میں گیس بھرنے والے کو بھی اسٹوڈیو میں ہی بلا لیا گیا تھا۔ ہر بچے کی فرمائش تھی کہ اسے بھی غبارے دیئے جائیں چنانچہ انہیں بھی غبارے ہوا بھر بھر کر دیئے گئے۔ آج سے 45-40 سال پہلے غبارے بچوں کی دلچسپی کا بہت بڑا سامان تھے۔ اب تو وہ ہوائی جہاز سے کم کسی کھلونے سے مطمئن نہیں ہوتے ہیں۔

کنیز کے بارے میں ایک اور دلچسپ بات بھی بتا دینا ضروری ہے۔ اس فلم میں اس وقت کے کئی ممتاز فن کاروں نے ایک ایک دو دو تین پر مشتمل کرداروں میں مہمان اداکاروں کے طور پر کام کیا تھا۔ پاکستان کی کسی اور فلم میں اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد اتنے بہت سے بڑے اداکار یکجا کئے گئے۔ مثال کے طور پر سنتوش کمار جیسے فنکار نے اس فلم میں نوابزادہ سلیم کا مختصر سا کردار ادا کیا تھا۔ خاندانی ڈاکٹر کے کردار میں ساقی صاحب تھے۔ یہ وہی ڈاکٹر ہے جس نے انور کی شادی کے موقع پر گواہی دی تھی کہ انور صبیحہ خانم ہی کا بیٹا ہے۔ صبیحہ خانم کی ماں کے کردار میں صابرہ سلطانہ

تھیں۔یہ بہ مشکل چار مناظر پر مشتمل کردار تھااور مزے کی بات یہ ہے کہ صابرہ سلطانہ اس زمانے میں فلموں میں ہیروئن کا کردار ادا کرتی تھیں۔

اسلم پرویزاس وقت کے ہیرو تھے۔اس فلم میں دو سین کاایک کردار تھا۔یہ وہ شخص ہے جس کے گھر میں صبیحہ خانم حویلی سے نکالے جانے کے بعد ملازمت کرتی ہیں اور وہ بدنیت اور بد نظر ہو جاتاہے تو وہ اسے تھپڑ مار کر نوکری چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔

اس کردار کے لئے کوئی بھی چھوٹے کردار کرنے والاایکٹر مل سکتا تھا،سیٹ تیار ہو گیا۔طارق صاحب نے دیکھ کر پسند کیا پھر ہم سے بولے ''آفاقی صاحب! اس کیریکٹر کے لئے کسے لیاجائے؟ ''

ہم نے کہا''اسٹوڈیو میں درجنوں اداکار گھومتے پھرتے ہیں جو بہت اچھے ایکٹر ہیں۔''

شرارت انگیز مسکراہٹ سے بولے ''اس کیریکٹر کے لئے اسلم پرویز نہیں مل سکتا؟''

ہم نے چونک کرانہیں دیکھا''طارق صاحب! اسلم پرویز ہیرو ہے۔دو سین کاولن کے انداز کا یہ کردار وہ کیوں کرے گا؟''

''آپ کوشش تو کریں۔وہ بولے۔''

ہم نے پریشان ہو کر کہا''مگر یہ تو زیادتی ہو گی۔اس کیریکٹر کے لئے اسلم پرویز سے بات کرتے ہوئے ہمیں شرم آئے گی۔''

مگر طارق صاحب کہاں ماننے والے تھے۔

کچھ دیر بعد ہی اسلم پرویز اسٹوڈیو میں نظر آئے۔ہمیشہ کی طرح خوش لباس۔خوش گفتار۔خوش اطوار۔

''ٹھاکر! آپ کی شوٹنگ کیسے چل رہی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

ہم نے کہا''بالکل ٹھیک چل رہی ہے۔''

بولے ''کوئی بات نہیں ٹھاکر۔۔۔آپ کی فلم میں ہمارے لئے کوئی کام نہیں ہے۔''

ہم نے کہا''اسلم صاحب! یقین کیجئے،کہانی کے مطابق کوئی گنجائش نہیں تھی ورنہ۔۔۔''

کہنے لگے ''آپ کی پہلی فلم میں ہم نہ ہوں۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ ہمیں تو اگر آپ کہیں کونے میں کھڑا کر دیتے تو بھی خوش ہو جاتے۔''

ہم نے جھجکتے ہوئے کہا ''رسمی بات کر رہے ہیں یا سچ کہہ رہے ہیں؟''

''آزما کر دیکھ لیجئے۔''

ہم نے ہمّت کر کے کہا ''کل ایک سیٹ پر صبیحہ خانم کے ساتھ دو سین کا کردار کر لیں؟''

''کیا کیریکٹر ہے؟'' انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

ہم نے انہیں بتا دیا کہ ایک بدقماش پیسے والے کا کردار ہے۔

انہوں نے ایک لمحے سوچا پھر مسکرائے ''کیا واقعی۔۔۔آپ مجھ سے یہ کیریکٹر کرانا چاہتے ہیں؟''

ہم نے کہا ''اگر کر دیں گے تو ہم بھی یاد رکھیں گے۔''

''اوکے'' وہ بولے ''کل شوٹنگ کس وقت ہے؟''

''صبح دس بجے۔''

''اوہو۔۔۔کل تو میری ایک اور شوٹنگ بھی ہے۔''

ہم نے جلدی سے کہا ''تو پھر ہم رات کو رکھ لیتے ہیں۔ تھوڑی سی دیر کا تو کام ہے۔''

وہ اپنے خصوصی دلنواز انداز میں ہنسے اور بولے ''ارے نہیں آفاقی صاحب! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، آپ کی شوٹنگ صبح ہو گی، میں دوسری شوٹنگ رات کو رکھوا لوں گا۔''

ہم ان کی شکل دیکھتے رہ گئے۔ اس قدر اعلیٰ ظرف انسان کم ہی ہوتے ہیں اور اتفاق سے ان کم کم لوگوں ہی سے ہمارا واسطہ پڑتا رہا، اللہ انہیں جنّت نصیب کرے۔ وہ کسی پس و پیش کے بغیر ہی مان گئے تھے۔

''ڈریس کیا ہو گا؟'' انہوں نے پوچھا۔

ہم ابھی تک بے یقینی کے عالم میں تھے۔ چونک کر کہا ''ایک تو سوٹ ہو گا جب آپ دفتر جا رہے ہیں۔ دوسرا نائٹ گاؤن اور سلیپنگ سوٹ۔''

بولے" امیر آدمی ہے نا؟ ٹھیک ہے۔ میرے پاس بہت اچھے نائٹ گاؤن ہیں۔ کل صبح دس بجے پہنچ جاؤں گا مگر دیکھئے وعدے کے مطابق دوپہر تک فارغ کر دیجئے گا۔"

ہم فوراً اپنے کمرے میں طارق صاحب کو مطلّع کرنے کے لئے دوڑے دوڑے گئے۔ وہ پروڈکشن منیجر سے مخاطب تھے

"رحیم! وہ لمبے قد والا لڑکا ہے نا۔ وہی جو فلموں میں ڈاکٹر بنتا ہے اس کو صبح بلالو۔"

ہم نے کہا" طارق صاحب! اس رول کے لئے تو آپ نے اسلم پرویز کا کہا ہے۔"

وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

ہم نے بتایا" اسلم صاحب سے بات ہو گئی ہے۔ وہ صبح دس بجے پہنچ جائیں گے۔"

طارق صاحب ہمیں تکتے ہی رہ گئے۔

لہری صاحب اس زمانے میں بھی بڑے اور مقبول کامیڈین تھے وہ بھی خوش لباس اداکاروں میں تھے۔

"آفاقی بھائی! آپ کی پہلی فلم ہو اور اس میں ہم نہ ہوں" انہوں نے بڑے خلوص سے محبت بھرا شکوہ کیا۔

"یقین کیجئے لہری بھائی! کہانی میں آپ کے لائق کوئی کامیڈی کردار ہی نہیں ہے۔"

"ارے آپ تو رائٹر ہیں، آپ کے لئے کیریکٹر نکالنا اور ڈالنا کون سا مشکل ہے۔"

ہم نے کہا" کالج کے سینوں میں ایک کردار بن سکتا ہے مگر چند سین ہی ہوں گے۔"

وہ بولے" تو پھر کیا ہوا۔ اگلی فلم میں اس کی کمی پوری کر دیجئے گا۔"

اس طرح لہری صاحب کے کردار نے جنم لیا۔ کالج کے مناظر میں ان کے لئے دلچسپ کردار کی گنجائش نکال لی۔ یہ محمد علی اور وحید کا کلاس فیلو ہے۔ بات بات پر شرط لگاتا ہے اور اس طرح کہ کسی سے ہارنے پر شرط ہے تو کسی سے جیتنے پر یعنی نقصان سے بالکل محفوظ۔

اسد جعفری کو بھی اسی طرح کالج کے مناظر میں پیش کر دیا۔ اقبال یوسف اور ایس سلیمان بھی کلاس فیلوز میں شامل تھے۔

اے شاہ شکارپوری برّصغیر کے بہت نامور کامیڈین تھے۔ مصنّف' فلم ساز اور ہدایت کار بھی تھے۔ اگلے دن سٹوڈیو

کے لان ہی میں کالج کے مناظر کی فلم بندی ہونے والی تھی۔ یکایک ہمیں شکارپوری نظر آ گئے۔ ہم نے ادب سے سلام کیا۔ وہ احوال دریافت کرنے والے بہت شفیق اور مہربان بزرگ تھے۔ بھاری جسم ' چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ اور انتہائی بھولا پن۔

طارق صاحب کو ہمیشہ وقت پر ہی سوجھتی تھی۔ ہمیں ایک طرف لے جا کر کہنے لگے "آفاقی صاحب وہ پروفیسر کا کریکٹر ہے نا۔ اس کیلئے آپ نے کسے سوچا ہے "

ہم نے کہا" طارق صاحب وہ تو ایک ہی سین کا کردار ہے۔ کوئی بھی نیا لڑکا کر لے گا۔ "

ان کی آنکھوں میں شرارت بھری چمک اُبھری "آفاقی صاحب مزہ آجائے اگر اے شاہ کو راضی کر لیں۔ "

ہم نے ایک لمحہ سوچا پھر اے شاہ صاحب کے پاس حاضر ہو گئے۔

"ہماری فلم میں تبرّک کے طور پر ایک سین کر دیجئے" ہم نے تمہید باندھی تھی۔

"صرف ایک سین؟ "

ہم نے کہا"تبرّک جو ہوا "

وہ ہنسنے لگے۔ ہنستے تھے تو ان کا پیٹ بھی ہنسنے لگتا تھا۔ کہنے لگے "آپ نے اتنی سادگی اور اپنائیت سے کہا ہے کہ انکار ممکن نہیں۔ "

ہماری خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔

"کل دن کو یہیں شوٹنگ ہے آپ کالج کے پروفیسر ہیں اور اس سین میں صرف چند مکالمے ہیں اور بہت سے ایکسپریشنز "

"بہتر ہے حاضر ہو جاؤنگا" انہوں نے بزرگانہ وقار سے کہا۔ کیسے کیسے لوگ تھے غالب کا شعر ہر بار یاد آجاتا ہے۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یہ چھوٹا سا دلچسپ سین بھی "کنیز" کو سجانے کا سبب بن گیا۔ مگر طارق صاحب کی فرمائش تھیں کہ بڑھتی ہی جارہی تھیں۔

ایک سین میں کسی خاتون کی ضرورت تھی۔ ہم سے بولے ''آفاقی صاحب ایک بات مانیں گے؟ ''

ہم سمجھ گئے کہ کوئی اور فرمائش کریں گے۔

کہنے لگے ''اس سین کے لئے نبیلہ نہیں مل سکتی؟ ''

نبیلہ اس وقت تک صرف ایس ایم یوسف صاحب کی فلموں میں کام کرنے کی پابند تھیں۔ وہ بالکل نئی نئی فلمی دنیا میں آئی تھیں۔ ہم سے دو چار بار آمنا سامنا تو ہوا تھا اور انہوں نے خوش اخلاقی سے بات بھی کرلی تھی مگر اس سے زیادہ تعلقات نہ تھے۔ اب سوچتے ہیں تو خود پر حیرت بھی ہوتی ہے۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا جب مشکل سے مشکل اور بڑے سے بڑا کام بھی آسان لگتا تھا۔

طارق صاحب کے منہ سے بات نکلی اور ہم فکر میں پڑ گئے۔ انہیں بھی ہماری اس کمزوری کا علم تھا کہ ان کا صرف ایک بار کہہ دینا ہی کافی ہے۔ وہ بات ہمارے ذہن میں اٹک کر رہ جائے گی۔ جان نہ پہچان مگر اس شام ہم سمن آباد میں نبیلہ کے گھر پہنچ گئے۔ ملازم کو بتایا کہ میڈم سے کہو آفاقی صاحب آئے ہیں۔

اس نے اندر پیغام پہنچایا اور پھر ہمیں ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھادیا ''سر جی۔۔۔ چائے لاؤں یا ٹھنڈا؟ ''

ہم نے کہا ''بس بیگم صاحبہ کو بلاؤ۔ ''

چند لمحے بعد نبیلہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں مگر ٹھٹک کر رہ گئیں۔ چہرے کی مسکراہٹ بھی منجمد ہو کر رہ گئی۔ ہم احتراماً کھڑے ہو گئے'' السلام علیکم ''

''وعلیکم السلام'' انہوں نے جواب دیا۔ پھر بولیں ''معاف کیجئے گا۔ سلام تو مجھے کرنا چاہیے تھا مگر میں کچھ گھبرا گئی۔ ''

''ڈر تو نہیں گئیں۔؟'' ہم نے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگیں ''آپ کا تو مجھے خیال ہی نہیں تھا۔ میں سمجھی ساقی صاحب آئے ہیں۔ آپ کہاں اور ہم کہاں؟ ''

باتیں بنانا انہیں خوب آتی تھیں حالانکہ فلمی صنعت میں نووارد تھیں مگر مزاج میں بناوٹ یا تکلف نام کو نہیں تھا۔

انہوں نے ملازم کو چائے لانے کے لئے کہا پھر ہماری طرف متوجہ ہو گئیں۔ ہم نے مناسب اور مختصر لفظوں میں انہیں صورت حاصل سے آگاہ کیا۔ سین کی نوعیت بیان کی اور درخواست کی کہ وہ یہ مختصر سا کام کردیں۔

وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر بولیں "آفاقی صاحب آپ شاید جانتے ہوں گے کہ مجھے یوسف صاحب نے سائن کر رکھا ہے اور ان کی اجازت کے بغیر میں کسی اور فلم میں کام نہیں کر سکتی۔ انہوں نے مجھے چانس دیا ہے وہ یہ بات نہیں مانیں گے۔"

ہم نے کہا "مگر یہ تو صرف ایک سین میں مہمان اداکارہ کا کام ہے۔"

کہنے لگیں "یہ تو اور بھی قابل اعتراض بات ہے کہ ان کی نئی دریافت کسی فلم میں ایکسٹرا کے طور پر کام کرے۔"

ہم چپ رہ گئے۔ کیا جواب دیتے۔ ان کی بات نہایت معقول تھی۔

وہ کہنے لگیں "آپ یوسف صاحب سے خود بات کر لیجئے۔ آپ کو وہ انکار نہیں کریں گے۔"

ہم نے کہا "یہ کام آپ خود ہی کیوں نہیں کر لیتیں"

"میری تو وہ ہرگز نہیں مانیں گے بلکہ ناراض ہو جائیں گے۔"

چائے آگئی اور انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ فلمی صنعت کے بارے میں اپنے تاثرات اور تجربات بیان کئے۔ نبیلہ نے بعد میں کئی اردو اور پنجابی فلموں میں ممتاز کردار کئے۔ وہ بھرپور جسم کی ایک پُرکشش اداکارہ تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں بھرے بھرے ہونٹ' دلکش نقوش' مکالموں کی ادائیگی بھی بہت اچھی طرح کرتی تھیں۔ ہم نے رُخصت کی اجازت چاہی۔

"آپ شاید ناراض ہو گئے؟" انہوں نے ہمیں رخصت کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو"

"تو پھر یوسف صاحب سے بات کریں گے؟" انہوں نے پوچھا۔

ہم نے کہا "بات کرنے سے کیا فائدہ۔ آپ کا خیال ٹھیک ہی ہے وہ اجازت نہیں دیں گے۔"

مگر ہم باہر نکلنے لگے تو انہوں نے کہا "اچھا ایسا کیجئے۔ آپ کل صبح مجھے فون کر سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔۔۔" ہم نے ان کا فون نمبر نوٹ کیا اور آ گئے۔ سوچا کہ محض ہمارا دل رکھنے کے لئے انہوں نے اخلاقاً ٹرخا دیا ہے۔

دوسرے دن ہم نے انہیں فون کیا"آفاقی صاحب آپ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔"ان کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"یوسف صاحب نے منع کر دیا نا؟" ہم نے پوچھا۔

"یوسف صاحب نے اجازت دے دی ہے" انہوں نے اطلاع دی اور ہمیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

اس شام ہم نے طارق صاحب سے کہا"طارق صاحب آپ نے کہا تھا نا نبیلہ سے بات کرنے کیلئے؟" وہ اس وقت تاش کی بازی میں کھوئے ہوئے تھے۔کہنے لگے "آفاقی صاحب میں نے رحیم سے کہہ دیا ہے وہ کوئی بندوبست کر دے گا۔ "

ہم نے کہا"ہم نے نبیلہ سے بات کی تھی۔ "

انہوں نے بے خیالی میں کہا"میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا۔یوسف صاحب اسے پرمیشن نہیں دیں گے۔ "

ہم نے کہا"مگر انہوں نے پرمیشن دے دی ہے۔ "

طارق صاحب نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا"کیا اس سین کے لئے نبیلہ مل جائے گی؟ "

"بالکل مل جائے گی۔مگر شوٹنگ شام کو رکھنی پڑے گی۔" وہ خوش ہو گئے

"شوٹنگ کا کیا ہے۔کسی وقت بھی رکھ لیں گے ایک ہی تو سین ہے۔ "

نبیلہ نے اپنا وعدہ نبھا دیا۔ان کا یہ ایک سین "کنیز" میں موجود ہے۔شوٹنگ کیلئے ہمارے کہنے پر وہ ایک قیمتی ساڑھی پہن کر آئی تھیں۔جب ہم نے ٹیلی فون پر انہیں بتایا کہ فلم میں وہ ایک خوشحال خاتون ہیں۔کوئی سا بھی لباس استعمال کر سکتی ہیں تو انہوں نے پوچھا"ساڑھی چل جائے گی نا؟ "

ہم نے جواب دیا" بالکل چل جائے گی مگر ذرا خوبصورت ہو۔ "

ریسور میں ان کی ہنستی ہوئی آواز سنائی دی" میں جو بھی ساڑھی پہنوں گی وہ خود بخود خوبصورت ہو جائے گی۔ "

وہ ایک خوش مزاج اور زندہ دل خاتون تھیں۔فلمی دنیا میں انہوں نے بہت جلد ایک امتیازی مقام بھی حاصل کر لیا تھا۔لیکن منشیات کی لعنت نے ان کے جسم کو گھن لگا دیا تھا اور بالآخر وہ اسی ایندھن کی نذر ہو گئیں۔ان کی موت کو جواں مرگی ہی کہا جا سکتا ہے۔ہمارے ساتھ یہ ان کا پہلا اور آخری کام تھا۔ انہوں نے ہماری کسی اور فلم میں کام نہیں

کیا مگر جب بھی کہیں ملتی تھیں تو بہت خوش دلی سے ملتی تھیں۔ایسی ہنس مکھ ہستی ایسے المناک طریقے پر صفحہ ہستی سے مٹ جائے ؟یقین نہیں آتا مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔

''کنیز '' کے چند رومانی مناظر اور ایک گانا' چھانگا مانگا میں بھی فلمایا گیا تھا۔ ان دنوں وہاں مصنوعی جھیل اور جاپانی طرز کی عمارت نئی نئی بنی تھی۔اس لوکیشن پر صرف وحید مراد اور زیبا کا کام تھا۔

1964ء میں جاپانی کار'' بلیو برڈ'' پاکستان میں بالکل نئی متعارف ہوئی تھی۔ یہ چھوٹے سائز کی خوبصورت کار زیبا نے خرید لی۔ ہمیں بھی بہت پسند تھی مگر کار ڈیلرز نے اسے فیل کر دیا اور اس کے بارے میں مشہور کر دیا کہہ کر مضبوط نہیں ہے اور اس کے فالتو پرزے مشکل سے ملتے ہیں۔ لیکن در حقیقت میں یہ ایک مضبوط کار تھی۔ آج بھی کبھی کبھی نظر آجاتی ہے۔ ہم بنکاک گئے تو وہاں اسے ٹیکسی کے طور پر چلتے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

پروگرام یہ تھا کہ فلمی یونٹ اور سامان صبح سویرے ہی بھیج دیا جائے گا۔اداکار اور ہدایت کار دس بجے تک بذریعہ کار پہنچ جائیں گے۔لاہور سے چھانگا مانگا کا فاصلہ ساٹھ پینسٹھ میل کے لگ بھگ ہو گا۔ہمارا پروگرام طارق صاحب کی کار میں سفر کرنے کا تھا مگر شام ہی کو زیبا نے ہمیں اطلاع دی کہ لالی جی کی طبعیت ٹھیک نہیں ہے۔

ہم پریشان ہو گئے۔الٰہی خیر، کہیں ہماری شوٹنگ ہی ملتوی نہ ہو جائے۔''تو پھر ؟ ''

کہنے لگیں'' کل صبح ان کی جگہ تم میرے ساتھ چلنا۔ ''

''یعنی ہمیں لالی جی کے فرائض سر انجام دینے ہوں گے ؟'' ہم نے وضاحت چاہی۔

'' کبھی عقل بھی استعمال کر لیا کرو'' انہوں نے ہمیں مشورہ دیا۔ مطلب یہ ہے کہ تم میرے ساتھ میری گاڑی میں چلنا ''

''اور کون ہو گا؟''ہم نے پوچھا''ڈرائیور ''

''ڈرائیور تو میں خود ہوں گی میری ڈرائیونگ دیکھی ہے نا؟''

''اللہ خیر کرے چھانگا مانگا تو بہت دور ہے اتنا لمبا سفر اور وہ بھی ہائی وے پر۔ ایک اناڑی ڈرائیور کے ساتھ ؟شکریہ بابا ہم تو طارق صاحب کے ساتھ چلے جائیں گے۔''

''کل شوٹنگ کرنی ہے یا نہیں؟'' انہوں نے ہمیں دھمکی دی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ''ہم نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے''۔اللہ مالک ہے زندگی اور موت تو اسی کے ہاتھ میں ہے'' یہ کہہ کر ہم چل پڑے۔

''بیٹھو کہاں جارہے ہو؟''

ہم نے کہا''انشورنس کرانے ''

صبح ہم لوگ سٹوڈیو میں اکٹھے ہوئے تو معلوم ہوا کہ عکاس کامران،ان کے ایک اسسٹنٹ اسحاق اکرام' ساؤنڈ ریکارڈسٹ اور وحید مراد بھی جانے والوں میں شامل ہیں،لوگ زیادہ تھے طارق صاحب کی فوکسی میں اتنے لوگ آرام سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔طارق صاحب نے اسحاق سے کہا'' اسحاق دیکھو باہر کوئی ٹیکسی والا ہوگا۔ ''

سٹوڈیو کے باہر ایسے ٹیکسی والے دستیاب ہو جاتے تھے جو محض فلم والوں کے لئے ہی وقف تھے۔یہ پرائیویٹ ٹیکسی ہوتی تھی سائز میں بڑی مگر خاصی پرانی۔اسحاق اکرام فوراً اپنے مشن پر روانہ ہوگئے۔

چپڑاسی نے آکر خبر دی کہ میڈم زیبا آگئی ہیں۔

طارق صاحب نے کہا''آفاقی صاحب ذرا آپ جا کر پتا تو کیجئے وہ میک اپ کر کے آئی ہیں کہ نہیں۔ایسا نہ ہو یہاں میک اپ کرنے بیٹھ جائیں۔ ''

زیبا کی ہمیشہ سے یہ عادت ہے کہ وہ دیر سے بیدار ہوتی تھیں،اطمینان سے میک اپ کرتیں اور سویرے سویرے شوٹنگ پر نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ مگر ہم نے گزشتہ رات ان سے پُرزور اپیل کی تھی کہ صبح آٹھ بجے تک ضرور میک اپ کر کے آجائیں۔کافی لمبا سفر کرنا ہے اور موسم کے ابر آلود ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔زیبا بیگم نے وعدہ بھی کر لیا تھا اور ہم نے یہ حساب لگایا تھا کہ اگر وہ میک اپ کر کے دس بجے تک بھی سٹوڈیو پہنچ جائیں تو غنیمت ہوگا مگر وہ نو بجے ہی پہنچ گئی تھیں۔ظاہر ہے کہ میک اپ کے بغیر ہی آئی ہوں گی۔

وہ ریاض گل کے کمرے میں موجود تھیں۔سامنے میک اپ باکس کھلا رکھا تھا۔ایک میک اپ والا آئینہ لئے سامنے کھڑا تھا۔ہیئر ڈریسر بھی کمربستہ تھا۔

''کم از کم میک اپ تو کر کے آتیں۔'' ہم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''نہ سلام نہ دعا، آتے ہی جھگڑا شروع کر دیا اخلاق بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔''

''ہم نے کہا بھی تھا کہ پلیز میک اپ کر کے آیئے گا مگر ہیروئن جو ہوئیں۔''

''اللہ نے آنکھیں دی ہیں تو دیکھ کیوں نہیں لیتے۔ میک اپ کر کے آئی ہوں۔ صرف بال بنوانے ہیں۔ ہیئر ڈریسر کو میں نے یہیں آنے کو کہہ دیا تھا۔ دس منٹ میں بال بن جائیں گے۔''

دیکھا تو واقعی درست نکلا ''سوری''

''بجائے احسان ماننے کے شکایت شروع کر دی'' انہوں نے شکوہ کیا۔

''احسان کس بات کا؟''

''اتنے سویرے تمہاری شوٹنگ پر پہنچ گئی ہوں دوسرے پروڈیوسروں سے جا کر پوچھو کتنے بجے ان کی شوٹنگ پر آتی ہوں۔'' بے چارے'' ہم نے اظہار ہمدردی کیا۔

وہ ہنسنے لگیں ''آفاقی تم بہت ڈھیٹ ہو۔''

وحید مراد بھی ٹہلتے ہوئے وہیں آ گئے۔

''کمال ہے۔ آج تو ریکارڈ ہی ٹوٹ گیا'' انہوں نے حیرت کا اظہار کیا۔

طارق صاحب کو صبر کہاں ہوتا وہ بھی کمرے میں آ گئے مگر زیبا کو تیار دیکھا تو ان کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

انہوں نے ہم سے کہا ''میرا خیال ہے کہ ہم لوگ چلتے ہیں۔ آپ زیبا بیگم کے ساتھ آ جایئے گا۔''

ہم نے کہا'' آپ کی گاڑی میں جگہ کم ہے۔ وحید صاحب کو بھی ہم ہی ساتھ لے آتے ہیں۔''

طارق صاحب کے رخصت ہونے کے پندرہ منٹ بعد زیبا بھی تیار ہو گئیں۔ ہم لوگ گاڑی میں بیٹھنے کیلئے سٹوڈیو سے باہر نکلے۔

''ڈرائیور کہاں ہے؟'' وحید مراد نے چاروں طرف تلاش کیا۔

''میں جو ہوں ڈرائیور'' زیبا نے جواب دیا۔

''نہ بابا ہمارا تو انشورنس بھی نہیں ہوا۔ سوری آفاقی صاحب آپ چلایئے گاڑی۔''

ہم نے کہا ''ہمیں تو ڈرائیونگ نہیں آتی۔''

''تو پھر خادم چلائے گا'' وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے ''چابی کہاں ہے؟''

زیبا نے انہیں گھورا مگر چابی ان کے حوالے کر دی۔

ہیئر ڈریسر کو بھی ساتھ جانا تھا اس لئے ہم نے زیبا کو اگلی سیٹ پر بٹھا دیا اور خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

وحید نے کہا ''ٹھیک ہے راستے میں بال بھی بنواتے جایئے گا یہ بھی آسانی ہے۔''

بلیو برڈ ایک چھوٹی سی کار تھی۔

وحید مراد نے اس میں بیٹھتے وقت تو یوں ظاہر کیا جیسے کہ اس میں سوار ہونا ان کے لئے بہت مشکل ہے۔

''اتنی بڑی ہیروئن ہو اور اتنی چھوٹی سی کار؟ کار تو اچھی رکھو'' انہوں نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے زیبا کو مشورہ دیا۔

زیبا نے فوراً ہی حملہ کیا ''مجھے شو بازی کا شوق نہیں ہے' تمہاری طرح۔''

''شو بازی کیوں نہ کریں۔ شو بزنس میں جو ہیں۔''

ملتان روڈ پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ وحید مراد نے سٹوڈیو سے باہر نکلتے ہی کار کی رفتار تیز کر دی۔ راستے میں جو بھی کار انہیں نظر آتی وہ اس سے آگے نکلنے کیلیۓ رفتار تیز کر دیتے تھے۔

ہم نے کہا ''بھائی ذرا آرام سے چلائیں۔ آپ نے ہر ایک سے ریس لگانی شروع کر دی ہے''

''بس ڈرائیوروں کی یہ عادت ہوتی ہے'' زیبا نے آرام سے تبصرہ کیا۔

سفر باتوں میں بہت دلچسپی سے گزرا۔ سوائے اس کے کہ وحید مراد کی ڈرائیونگ کی وجہ سے جان پر بنی ہوئی تھی اور وہ ہم لوگوں کو ڈرانے کے لئے عجیب عجیب حرکتیں کر رہے تھے۔

مثلاً زیبا نے کہا ''کار دوڑ رہی ہے یا اڑ رہی ہے؟''

وحید نے فوراً گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی ''اڑا کر بھی دکھادوں گا۔ یہ لیجئے دیکھئے کیسے اڑاتا ہوں۔'' انہوں نے سٹیرنگ چھوڑ کر دونوں بازو اوپر اٹھا لئے اور پرندوں کے پروں کی طرح لہرانے لگے۔ ہم تو ڈرتے رہے مگر زیبا بیگم کا

ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔" وحید خدا کا خوف کرو سامنے دیکھو گاڑی بے قابو ہو جائے گی۔ "
خدا خدا کر کے ہم لوگ چھانگا مانگا پہنچے۔ جھیل کے کنارے طارق صاحب نے شوٹنگ کا بندوبست کر لیا تھا اور ہیرو اور ہیروئن کے منتظر تھے۔ ہمارا تو خیال تھا کہ چھانگا مانگا جنگل ہو گا مگر وہاں تو جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ کچی مگر دو رویہ درختوں سے سجی ہوئی سڑکیں۔ خوشنما جھیل' اس کے کنارے رنگین کھلونوں جیسی جاپانی عمارت۔' وہاں ایک چھوٹی ریل گاڑی بھی تھی جس پر طارق صاحب نے گانے کے کچھ شاٹس لئے۔
موسم بہت خوش گوار تھا۔ نیلے آسمان پر بادلوں کی ٹکڑیاں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ شوٹنگ کیلئے موزوں ترین دن تھا۔ گانے کی فلم بندی کے دوران میں جب بھی ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے تو ہم پریشان ہو جاتے تھے۔ سنسر ان دنوں کافی سخت تھا اور ہمیں سنسر کی فکر پڑی ہوئی تھی۔

آج کل تو سنسر والوں نے بالکل کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ ایک زمانے میں تو ہیرو اور ہیروئن اور ایک دوسرے کو چھو بھی لیتے تھے تو قیامت آجاتی تھی اور سنسر کی قینچی کتر کتر چلنی شروع ہو جاتی تھی۔
جھیل پر ایک چھوٹی سی پلیا بنی ہوئی تھی۔ طارق صاحب گانے کا ایک بول فلما رہے تھے۔ اور ہم سنسر کی نگاہ سے شوٹنگ کا جائزہ لے رہے تھے۔
جیسے ہی گاتے ہوئے وحید مراد نے زیبا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا ہمارے کان کھڑے ہو گئے۔
"طارق صاحب کچھ سنسر کا تو خیال کیجئے "
"آفاقی صاحب اس میں کیا حرج ہے۔ زیبا کے ہاتھ پر ہاتھ ہی تو رکھا ہے وحید نے" طارق صاحب نے کہا۔
"آپ کو سنسر کی بہت فکر پڑی ہوئی ہے۔" کامران مرزا نے طعنہ مارا۔
زیبا نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بول پڑیں "لالی جی کی جگہ جو آئے ہیں" سب ہنس پڑے۔
کامران مرزا نے ہمیں بہت زیادہ فکر مند دیکھا تو کہا "آپ پریشان نہ ہوں" ہم نے سنسر کا بندوبست کر لیا ہے"

'وہ کس طرح؟ "

"بادلوں کے بہت سے شاٹس لے لئے ہیں۔ احتیاطاً"۔

ان دنوں سنسر زدہ حصوں میں بادلوں اور پھولوں کے شاٹس ڈال دیئے جاتے تھے اور کسی بھی فلم میں بادلوں کے شاٹس کی تعداد دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان دنوں سنسر سخت ہے یا نرم؟ ہماری فلم تو نہایت شریفانہ اور شائستہ تھی۔ ہیرو اور ہیروئن کا لپٹنا چمٹنا تو دور کی بات ہے ایک دوسرے کے نزدیک بھی نہیں آتے تھے۔ مگر اس گانے میں ہمیں بادلوں کے چار پانچ شاٹس لگانے پڑے تھے۔

واپسی میں ہم نے تو وحید مراد کی ڈرائیونگ سے بچنے کے لئے زیبا کی کار میں بیٹھنے سے صاف انکار کر دیا مگر وحید مراد حسن طارق صاحب کی کار میں جا رہے تھے۔ زیبا نے وہاں سے چلتے وقت ہم سے کہا "آفاقی سیدھی طرح میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ "

"اتنا رعب ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟" ہم نے احتجاج کیا۔

"یہ نہ بھولو کہ تم اس وقت لالی جی کے ڈپلی کیٹ ہو۔ تم مجھے گاڑی میں اکیلا کیسے چھوڑ سکتے ہو۔" انہوں نے فوراً دلیل پیش کر دی۔ کیونکہ بات نہایت معقول تھی اس لئے ہم کان دبا کر چپکے سے ان کی کار میں بیٹھ گئے۔ پچھلی سیٹ ہیئر ڈریسر اور اسحاق اکرام نے سنبھال لی۔ پروگرام یہ تھا کہ سب گاڑیاں ایک ساتھ ہی چلیں گی مگر زیبا تو جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھیں۔ چھانگا مانگا کے جنگل کا علاقہ ختم ہوتے ہی زیبا نے ایکسی لیٹر پر پیر رکھا اور اس تیزی سے گاڑی دوڑائی جیسے کہ کسی فلم کے لئے چیز نگ کا سین فلمایا جا رہا ہے یا ہمارے تعاقب میں ڈاکو لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے بہتیرا سمجھایا کہ اس قدر تیز رفتاری کی کیا ضرورت ہے مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ چھانگا مانگا جاتے ہوئے وحید مراد نے جس رفتار سے کار دوڑائی تھی زیبا کی ڈرائیونگ کی رفتار بھی اس سے کم نہ تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی ہو گی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ وحید مراد کی طرح سٹیرنگ سے دونوں ہاتھ اٹھا کر ڈرائیونگ کا مظاہرہ نہیں کر رہی تھیں۔ ڈر کے مارے ہم جاتے ہوئے جتنے پریشان تھے واپس لاہور آتے ہوئے اس سے کچھ کم سہمے ہوئے نہیں تھے۔

ہم تو آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔ شُکر ہے کہ اس زمانے میں ملتان روڈ پر زیادہ ٹریفک نہیں ہوتی تھی مگر پھر بھی بسیں

ٹرک اور کچھ کاریں تو سڑک پر چلتی ہی رہتی تھیں۔

یوں تو ہم نے آنکھیں بند کرلی تھیں مگر گاہے بگاہے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھ لیتے تھے۔ کسی تیز رفتار بس یا ٹرک کو دیکھ کر ہم شور مچا دیتے۔

''احتیاط سے سنبھال کے، سامنے سے بس آرہی ہے۔ دیکھو سامنے سے ٹرک آرہا ہے۔ ارے بھئی اس بس سے ضرور بچا لینا۔ بہت تیزی سے آرہی ہے۔''

مگر ہماری یہ فریاد رائیگاں ہی تھی۔ زیبا بیگم تو جیسے کانوں میں روئی ٹھونس کر ڈرائیونگ کے لئے نکلی تھیں۔ جب ہم بہت زیادہ شور مچاتے تو وہ تنگ آکر کہتیں ''شور نہ مچاؤ۔ مجھے بھی بس نظر آرہی ہے۔ زیادہ شور کروگے تو حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔''

اور ہم سہم کر چپ ہو جاتے۔ کچھ دیر بعد ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہمارے شور و غل کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ نقصان البتہ ہو سکتا تھا۔ مثلاً یہی کہ یہ نہ ہو وہ پریشان ہو کر سچ مچ کسی بس یا ٹرک کے درمیان میں سے کار نکالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ تنگ آکر ہم نے آنکھیں بند کرلیں اور شور مچانے کے بجائے دعائیں پڑھنی شروع کردیں۔ انسان نے تو ہماری فریاد پہ دھیان نہیں دیا تھا۔ مجبور ہو کر ہم نے اللہ میاں سے لو لگائی تھی۔

کچھ دیر تک کار پرواز کرتی رہی۔ یہ اتنی چھوٹی سی کار تھی کہ تیز رفتاری کے عالم میں جب کسی بس یا ٹرک کے پاس سے گزرتی تھی تو ہوا کے دباؤ کی وجہ سے خود ہی ڈولنے لگتی تھی۔ اوّل تو ہمیں یہی حیرت تھی کہ اتنی چھوٹی سی کار اتنی تیز کیوں کر دوڑ سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ڈرائیور کی مہارت پر ہمیں اعتماد نہ تھا۔ اب سوائے شُترمرغ کی طرح ریت میں منہ دبا کر بیٹھے رہنے کے کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ ہم مضبوطی سے دونوں آنکھیں بند کرکے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر میں ہمیں غنودگی سی آگئی۔ خدا جانے گاڑی کے ہچکولوں کی وجہ سے نشہ ہو گیا تھا یا نروس بریک ڈاؤن ہونے والا تھا۔

کچھ دیر بعد ہمیں زیبا کی آواز سنائی دی۔ ''آفاقی کیا سو گئے؟'' ہم واقعی سوتے بن گئے۔

انہوں نے کہا ''بھئی دیکھو۔ اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔ اگر تم میری ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر سوؤگے تو مجھے بھی نیند آجائیگی۔ یہ میری عادت ہے۔''

ہم نے ڈر کر آنکھیں کھول دیں۔

وہ ہنسنے لگیں" بھئی بہت ڈرپوک ہو۔ تم تو ذرا سی دھمکی سے ڈر گئے؟"

ہم نے کہا" ہم سچ مچ سو گئے تھے۔ نیند میں دیکھ رہے تھے کہ ہم ایک کار میں جا رہے ہیں جس کا ڈرائیور کوئی انجان آدمی ہے۔ وہ بار بار دانت نکال کر ہماری طرف دیکھتا ہے اور پوچھتا پھر کیا خیال ہے ٹکرا دوں گاڑی؟ ہم چیخنا چاہتے ہیں مگر آواز منہ سے نہیں نکلتی۔"

وہ بولیں" یہ تمہارا وہم ہے کہ آواز نہیں نکل رہی تھی۔ تم تو چلاّ رہے تھے کہ بچاؤ بچاؤ گاڑی روکو۔"

"واقعی" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یقین نہ ہو تو اسحاق اور ہیر ڈریسر متین سے پوچھ لو۔"

اسحاق اکرام تو بے فکری سے سو گئے تھے مگر متین جاگ رہے تھے۔ انہوں نے فوراً زیبا کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

متین چھوٹے قد کے ایک گورے اور گول مٹول سے آدمی تھے۔ بہت دلچسپ اور باتونی۔ ایک زمانہ تھا جب پاکستان کی تمام اہم فلمی ہیروئنوں کے بال وہی بنایا کرتے تھے مگر پھر بعض ہیروئنوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ متین ان کے راز ان کی ہم عصر ہیروئن کو بتا دیتے ہیں اسلئے انہوں نے متین کی جگہ دوسرے ہیئر ڈریسروں کی خدمات حاصل کر لیں۔

اس میں شک بھی نہیں ہے کہ متین ہر ہیروئن سے اس کی مطلب کی بات کرتے تھے اور اس سے جو بھی راز حاصل کرتے تھے وہ پہلی فرصت میں دوسری ہیروئن کو بتا دیا کرتے تھے مگر اس سے پہلے ہیروئن سے یہ قسم ضرور لے لیتے تھے کہ وہ کسی کے سامنے ان کا نام نہیں لیں گی لیکن کیا کیا جائے کہ ہیروئن پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں اور اپنا پیٹ ہلکا کرنے کے لئے وہ اس راز کو عام کرنے سے باز بھی نہیں رہتی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ ان کے باہمی تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جاتی تھی۔ درمیان والے ادھر کی ادھر لگانے بجھانے سے باز نہیں آتے تھے اور پھر باقاعدہ جنگ شروع ہو جاتی تھی۔ اگر وہ متین کو اس بات کا الزام دیتی تھیں تو وہ فوراً مکر جاتے تھے اور قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا لیتے تھے کہ اس میں ان کا کوئی قصور اور ہاتھ نہیں ہے۔

متین سے ہماری خاصی بے تکلفی تھی۔ وجہ یہ کہ وہ ہیروئنوں کے ہیئر ڈریسر تھے اور ہمارا ہیروئنوں کے پاس آنا جانا لگا رہتا تھا، جہاں ہماری ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ متین فرصت کے وقت ہمارے دفتر میں آ کر ہمیں دوسری ہیروئنوں کی خبریں بھی سنا دیا کرتے تھے۔

ہم نے ایک بار متین سے پوچھا ''بھئی تم قرآن پر جھوٹی قسم کھا لیتے ہو؟ ''

بولے ''ایمان سے بالکل نہیں آفاقی صاحب ہیئر ڈریسر ہوں تو کیا ہوا مسلمان تو ہوں۔ ''

ہم نے کہا'' یار چھوڑو یہ باتیں تم نے کئی بار ہمارے سامنے پنج سورہ شریف پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی قسمیں کھائی ہیں۔''

انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر رازداری سے بولے ''آفاقی صاحب قسم کھائیں کہ میں آپ کو جو بات بتاؤں گا وہ آپ کسی اور کو نہیں بتائیں گے ؟۔ ''

ہم نے قسم کھانے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ زور دیتے رہے اور ہم انکار کرتے رہے۔

آخر وہ کہنے لگے '' مجھے پتا ہے کہ آپ بہت شریف اور زبان کے پکے ہیں۔ آپ وعدہ کر لیں کہ کبھی میری یہ بات کسی اور کو نہیں بتائیں گے۔ ''

''ہو سکتا ہے'' ہم نے جواب دیا۔

متین نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا اور پھر سرگوشی میں ہم سے پوچھا'' میں جس پنج سورہ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہوں وہ کس کا ہوتا ہے ؟''

ہم نے جواب دیا''تمہارا اپنا ''

بولے ''بس یہی تو راز ہے۔ دیکھئے وہ میں ابھی آپ کو بتائے دیتا ہوں۔'' انہوں نے اپنے بریف کیس کا تالا کھولا اور اس میں سے بڑے احترام کے ساتھ پنج سورہ شریف باہر نکالا اسے چوما آنکھوں سے لگایا پھر اس کا جزدان اتارنے لگے۔

ہم نے کہا'' دیکھو متین ہم نے کہہ دیا ہے کہ ہم تم سے کوئی وعدہ نہیں کریں گے۔ نہ ہی تمہاری رازداری کی قسم کھائیں گے۔ تم ہمارے سامنے پنج سورہ شریف کی بے حرمتی نہ کرو۔ تم نے اسے اٹھانے سے پہلے نہ اپنے ہاتھ پاک کئے نہ وضو کیا۔ یہ بھی کتنی بُری بات ہے کہ تم نے اس مقدّس کتاب کو اپنے بریف کیس میں رکھ چھوڑا ہے۔ یہ بریف

کیس تو تم ہر جگہ رکھ دیتے ہو۔‘‘

وہ بولے ’’ آپ ناراض نہ ہوں صبر سے کام لیں۔دل میں حوصلہ پیدا کریں۔ابھی میں آپ کی تسلی کر دیتا ہوں۔‘‘

یہ کہہ کرانہوں نے پنج سورہ شریف جزدان میں سے نکال کر آنکھوں سے لگایا چوما اور پھر ہمارے حوالے کر دیا۔ہم نے کھول کر دیکھا تو وہ بہت پرانے فلمی گانوں کی ایک آنے والی کتابوں کا پلندہ تھا۔

ہم نے حیرانی سے متین کی طرف دیکھا ’’یہ کیا ہے؟‘‘

بولے ’’سر یہ میری مجبوری ہے۔میں تو تھالی کا بینگن ہوں۔کسی بھی ہیروئن کو ناراض نہیں کر سکتا۔اللہ میاں نے تو جان بچانے کے لئے حرام کھانے کی اجازت بھی دے رکھی ہے۔یہ میرے روزگار کا مسئلہ ہے یہی کام کرکے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔جس ہیروئن کی بات نہ مانوں تو وہی ناراض ہو جائے گی۔بہت سوچ سمجھ کر میں نے یہ ترکیب نکالی ہے۔اس طرح ہر ایک کو میری بات کا یقین بھی ہو جاتا ہے اور میرا ایمان بھی خراب نہیں ہوتا۔‘‘

ہم نے کہا ’’متین یہ گناہ ہے بلکہ گناہ کبیرہ۔‘‘

کہنے لگے ’’آفاقی صاحب میں نے مسجد کے مولوی صاحب سے پوچھ لیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ مجبوری کی صورت میں یہ جائز ہے۔ان سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ان کی بیگم کیلئے کبھی پرفیوم بھی دے دیتا ہوں۔‘‘

ہم نے پوچھا ’’مگر تمہاری مجبوری کیا ہے؟تمہاری تو گڑھی شاہو میں ایک دکان بھی ہے۔آرام سے روٹی کھا سکتے ہو۔‘‘

بولے ’’ سر وہ تو ہوائی رزق ہے۔کبھی ٹھیک چلتی ہے کبھی مندا ہو جاتا ہے۔اگر اس پر بھروسا ہوتا تو ہیروئنوں کی چُغلیاں کیوں کرتا اور ان کی ایک دوسرے سے غیبت کیوں کرتا۔کیا بتاؤں حق حلال کی کمائی سے بال بچّے پالنا اتنا ہی مشکل کام ہے سر جتنا کہ فلم ہٹ کرانا۔‘‘

ہم نے آپ کو بتایا تو ہے کہ وہ انتہا درجے کے باتونی آدمی تھے۔ہر بیماری کا علاج اور ٹوٹکے انہیں معلوم تھے۔ہر دوائی کی تاثیر سے واقف تھے۔بہت سے فلم والے تو ان ہی کی تجویز کردہ دوائیں استعمال کیا کرتے تھے۔

خیر متین تو بقول ان کے روزگار کی وجہ سے مجبور ہو گئے تھے مگر ہیروئنوں کو قسمیں کھانے کی کیا مجبوری تھی۔ہم نے ایک بار یہی سوال ایک بہت بڑی ہیروئن سے بھی کیا تھا کہ ’’آپ بڑے آرام سے متین کے سامنے قسمیں کھالیتی

ہیں کیا یہ گناہ نہیں ہے؟"

بولیں "آپ نے کبھی میری قسم پر غور نہیں کیا۔ میں قسم بھی تو متین کے سر کی کھاتی ہوں۔ اپنے سر کی تو نہیں کھاتی۔"

ہم نے انہیں ایک اور ہیروئن کا قصّہ سنایا جو ہر بات پر اپنی امی کے سر کی قسم کھالیا کرتی تھیں۔ شباب صاحب نے ایک بار ہم سے کہا تھا کہ یار آفاقی، اس کو تو اللہ میاں نے ماں قسمیں کھانے کیلئے ہی دی ہے شاید۔
اس روز تو خدا خدا کر کے ہم چھانگا مانگا سے بخیریت لاہور پہنچ گئے مگر اس کے بعد عہد کیا کہ زیبا خانم کی ڈرائیونگ میں ہائی وے پر کبھی سفر نہیں کریں گے۔

ہم تو جیسے اب طارق صاحب کے معمول بن گئے تھے۔ وہ جس چیز کی فرمائش کرتے ہم اسے حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگ جاتے تھے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے کرداروں کیلئے بھی بڑے اداکاروں کی خدمات حاصل کرنے کی فرمائش کی جو ہم نے پوری کر دی۔ یہ ایک انوکھا تجربہ تھا جسے ہم زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ انہوں نے ہمارے اندر اس جذبے کی روح پھونک دی تھی کہ انسان اگر کوشش کرے تو اس کیلئے کوئی کام ناممکن نہیں ہے۔

"کنیز" میں نواب زادہ مطلبی دوستوں کے کہنے پر وہ ایک بار گانا سننے کیلئے طوائف کے بالا خانے پر پہنچ جاتا ہے حالانکہ وہ یہ بات پسند نہیں کرتا مگر لہری صاحب اسے باور کراتے ہیں کہ ارے یہی تو نوابوں کی شان اور روایات ہیں۔ اس ایک منظر میں رقص کرنے کیلئے ایمی مینی والا جیسی رقاصہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ان سے ہمارے بہت اچھے مراسم تھے۔ اس لئے انہوں نے ہماری فرمائش پوری کر دی۔ طارق صاحب اس منظر میں ایک مجرا پیش کرنا چاہتے تھے۔ گانے لکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک شاعر اور گیت نویس موجود تھے مگر طارق صاحب کو ایک دن بہت دور کی سوجھی۔ نسیم بیگم (مرحومہ) کی گائی ہوئی اور آغا حشر کی لکھی ہوئی ایک غزل اس زمانے میں بہت مشہور تھی۔ نسیم بیگم محفلوں میں یہ غزل گایا کرتی تھیں۔ اور سماں باندھ دیتی تھیں۔ غزل یہ تھی۔
غیر کی باتوں کا آخر اعتبار آ ہی گیا

میری جانب سے ترے دل میں غبار آہی گیا
ہم نے سوچا تھا کہ پھر اس سے نہ بولیں گے کبھی
بے وفا جب سامنے آیا تو پیار آگیا
تو نہ آیا اے وفا دشمن تو کیا ہم مر گئے
چار دن تڑپے مگر آخر قرار آگیا

یہ غزل بہت پھڑکتی ہوئی تھی۔ نسیم بیگم کی آواز نے کچھ اور جادو جگا دیا تھا۔ نسیم بیگم کی تربیت مشہور مغنّیہ مختار بیگم نے کی تھی جو فریدہ خانم کی بہن بھی تھیں۔ مختار بیگم آغا حشر کی محبوبہ کی حیثیت سے سالہا سال تک بلکہ آخر دم تک آغا صاحب کے ساتھ رہی تھیں۔ اپنے زمانے میں وہ اسٹیج کی معروف اداکارہ رہی تھیں اور گائیکی میں بھی بہت نام پیدا کیا تھا۔ ان کے حُسن و جمال کا کسی زمانے میں سارے ہندوستان میں شُہرہ تھا۔ جہاں تک ہمارے علم میں تھا اس غزل کی طرز بھی مختار بیگم ہی نے بنائی تھی۔

طارق صاحب اور ہم اسٹوڈیو جا رہے تھے "کنیز" کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی اور کئی مراحل تکمیل پا چکے تھے مگر مسائل ختم نہیں ہوئے تھے بلکہ ہر قدم پر ایک نیا مسئلہ پیدا ہو جاتا تھا۔

طارق صاحب یکایک بولے "آفاقی صاحب۔ طوائف کے مجرے کیلئے آغا حشر کی غزل کیوں نہ لے لیں۔ نسیم بیگم نے کیسی گائی ہے"۔

یہ غزل ہمیں بھی بے حد پسند تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اسے فلم میں شامل کرنے کیلئے قانونی نہ سہی اخلاقی طور پر مختار بیگم سے اجازت حاصل کرنی ضروری تھی۔

مختار بیگم اس زمانے میں لاہور ہی میں تھیں۔ زیادہ وقت وہ کراچی میں رہتی تھیں مگر فریدہ خانم کے پاس آکر بھی قیام کر لیتی تھیں۔ طارق صاحب نے کہا تھا ہم کیسے نہ مانتے۔

ہم نے کہا "اس معاملے میں مختار بیگم سے اجازت لینی پڑے گی"۔

بولے "تو پھر کیا ہوا۔ لے لیں گے۔ وہ ہمیں منع تو نہیں کریں گی"۔

اسٹوڈیو پہنچ کر ہم نے فریدہ خانم کی کوٹھی کا فون نمبر تلاش کیا اور ان کا نمبر ملایا۔ فریدہ خانم سے اچھی طرح شناسائی تھی۔ مختار بیگم سے بھی کراچی اور لاہور میں ملاقات ہوتی رہی تھی۔ نہایت خوش اخلاقی اور شائستگی سے ملتی تھیں۔ ہم بھی ان کی عظمت سے متاثر اور مرعوب تھے۔

فریدہ خانم کو ہم نے فون پر بتایا کہ مختار بیگم سے طارق صاحب اور ہم ملنا چاہتے ہیں۔ کوئی وقت طے کر کے بتا دیجئے۔ مختار بیگم کو ان کے قریبی لوگ ''بی بی'' کہہ کر پکارتے تھے۔ فریدہ خانم نے کہا'' میں بی بی سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گی''۔

بجائے ملاقات کا وقت دینے کے بی بی نے ہمیں رات کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ ہم نے بہتیرا پہلو بچایا کہ اس تکلّف کی ضرورت تو نہیں ہے مگر فریدہ خانم نے ٹیلی فون کا ریسیور مختار بیگم کے ہاتھ میں دیدیا۔

''میاں مجھے بہت خوشی ہوگی اگر آپ اور طارق صاحب میرے غریب خانے پر کھانا تناول فرمائیں''۔

ہم نے کہا'' دیکھئے۔ اس تکلّف کو رہنے دیجئے''۔

مگر بی بی کہاں ماننے والی تھیں '' تکلّف کچھ نہیں، جو بھی دال روٹی ہوگی حاضر ہے۔ میں کل رات منتظر رہوں گی''۔

ہم نے طارق صاحب کو بتایا تو بولے ''کیا حرج ہے۔ وہ بہت وضع دار عورت ہیں۔ آپ کنفرم کر دیجئے''۔

اس طرح دوسرے دن شام ڈھلے ہم دونوں گلبرگ کالونی میں فریدہ خانم کی شان دار کوٹھی پر پہنچ گئے۔

جاڑوں کا موسم تھا۔ سرِ شام ہی اندھیرا ہو جاتا تھا۔ ایک مؤدب ملازم نے ہمیں ایک خوبصورتی سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ فوراً ہی مختار بیگم اور فریدہ خانم بھی تشریف لے آئیں۔ ہم نے چند سال بعد بی بی کو دیکھا تھا۔ ساٹھ سے اوپر عمر ہوگی لیکن ان کی شخصیت کی سحر انگیزی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ سرخ و سفید رنگت، کرتہ شلوار پر قیمتی گرم دوشالہ۔ پیروں میں سلیم شاہی جوتی۔ قدیم تہذیب کا نمونہ لگ رہی تھیں۔ جب بولیں تو جیسے منہ سے پھول جھڑنے لگے۔ نہایت شُستہ اور شائستہ گفتگو۔ نرم و ملائم لہجہ، بات کرنے کا انداز انتہائی مہذّب، فریدہ خانم ساڑھی میں ملبوس تھیں۔ گفتگو شروع ہوئی تو علم و ادب، شعر و شاعری سے ہوتی ہوئی فلموں تک پہنچ گئی۔ کھانے کی میز پر پہنچے تو انواع و اقسام کے پُر تکلف کھانے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

''دو مہمانوں کیلیئے اس قدر اہتمام؟'' اللہ اللہ۔ اور پھر ہر چیز کھلانے پر مصر۔ کوئی کہاں تک کھائے لیکن ان کا اصرار دم نہیں لینے دیتا تھا۔ کھانا بیحد لذیذ تھا۔ اس کے دوران میں وہ پرانے قصے سناتی رہیں' آغا حشر مرحوم کے زمانے کی محفلوں کی یادیں تازہ کرتی رہیں۔

کھانے کے بعد بھی ڈرائنگ روم میں کافی کا دور چلا۔ گفتگو کے موضوعات کی کوئی کمی نہیں تھی۔ خدا جانے وقت کب گزر گیا۔ گھڑی دیکھی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اس زمانے میں تو سردیوں میں ساڑھے آٹھ بجے ہی لاہور میں سناٹا ہو جاتا تھا۔ سڑکیں سنسان ،گلی کوچے ویران۔ دکانیں بند۔ لوگ گھروں میں دبکے ہوئے بیشتر تو سو بھی جاتے تھے۔

ہم نے طارق صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہمیں اشارہ کیا کہ بہت دیر ہو گئی ہے اور مطلب کی بات اب تک زبان پر نہیں آئی ہے۔ ہم نے گفتگو کو سمیٹا اور مدعا بیان کیا۔

وہ بولیں ''میرے لئے تو سعادت اور خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اس غزل کو اپنی فلم کیلیئے منتخب کیا۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اس کی طرز بھی میں نے خود ہی بنائی ہے۔ چھیمی (نسیم بیگم) نے بہت اچھی گائی ہے لیکن میں چاہوں گی کہ آپ کی فلم کیلیئے فریدہ یہ غزل گائیں۔ اس سے کہیں اچھی گائیں گی ''

ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ فریدہ خانم کی گائیکی میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے مگر مشکل یہ تھی کہ ہم نسیم بیگم سے وعدہ کر چکے تھے کہ یہ غزل ان ہی کی آواز میں ریکارڈ کی جائیگی۔ ہمارے وہم و گمان تک میں نہ تھا کہ مختار بیگم ایسی فرمائش کر دیں گی۔

مختار بیگم بولیں ''کیوں فریدہ' نسیم کی گائی ہوئی غزل گانے میں تمہیں اعتراض تو نہیں ہو گا؟ ''

''بی بی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ یہ ہمارے مہمان ہیں۔ ہمارے گھر تشریف لائے ہیں اور پھر آپ کا حکم ہو تو کیسے انکار کر سکتی ہوں ''

مختار بیگم نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا'' آپ ریکارڈنگ کا پروگرام بنا کر فریدہ کو بتا دیجئے گا۔ ابھی تو میں بھی لاہور ہی میں ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے ریکارڈنگ ہوئی تو میں ضرور شرکت کروں گی ''

لیجئے۔ انہوں نے ہمارے لئے ایک اور مشکل پیدا کر دی۔

ہم نے بڑی مشکل سے ہمّت کرتے ہوئے کہا’’نسیم بیگم نے یہ غزل بہت اچھی گائی ہے ‘‘

وہ بولیں ’’واقعی اچھی گائی ہے۔ بڑی ہونہار بچّی ہے مگر ہے تو بچّی۔فریدہ اس میں چار چاند لگادے گی ‘‘

اس کے آگے کچھ کہنے کا ہمیں حوصلہ نہ ہوا۔

ساڑھے بارہ بجے کے قریب ان کی کوٹھی سے رخصت ہوئے تو وہ دونوں برآمدے تک رخصت کرنے آئیں اور تاکید کی کہ جب چاہیں تشریف لائیں۔آپ کا اپنا گھر ہے اور ریکارڈنگ کے پروگرام سے مطلع کردیں۔

جاڑے کا موسم اور رات کے ساڑھے بارہ بجے کا عمل۔گلبرگ پر بھوتوں کی بستی کا گمان گزرتا تھا۔اتنی رات گئے سواری ملنے کا کیا سوال تھا۔طارق صاحب ہمیں ماڈل ٹاؤن چھوڑنے کیلئے چل پڑے۔

راستے میں کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ہم دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔انہوں نے گاڑی چلاتے ہوئے سگریٹ سلگائی اور اپنی مخصوص مسکراہٹ سے ہمیں دیکھا’’آفاقی صاحب! یہ تو کچھ اور معاملہ ہوگیا‘ اب کیا کریں؟ ‘‘

ہم نے کہا’’کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ان کے سامنے انکار کرنے کی ہمت بھی نہیں ہورہی تھی ‘‘

مسکراکر بولے ’’اتنا اچھّا کھانا کھانے کے بعد ان کی پیشکش کو ٹھکرانا تو نمک حرامی ہوگی ‘‘

ہم نے کہا’’طارق صاحب! ہم لوگ بھی جلد بازی کرجاتے ہیں۔نسیم بیگم سے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ یہ غزل ہم ان ہی سے گوائیں گے؟ ‘‘

کہنے لگے ’’آفاقی صاحب! اس نے بہت اچھی گائی ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے یہ غزل ہی اس کی آواز میں سنی ہے۔مجھے کیا پتا تھا کہ فریدہ خانم یہ غزل گانے پر آمادہ ہوجائیں گی۔وہ بہت بڑی گانے والی ہیں۔نسیم کی گائی ہوئی غزل گائیں گی‘ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا ‘‘

ہم نے کہا’’مختار بیگم ٹھیک کہتی ہیں۔فریدہ خانم گائیں گی تو بات ہی کچھ اور ہوگی۔مگر نسیم کو کیا جواب دیں گے۔اسے کیسے انکار کریں گے؟ ‘‘

’’سوال ہی نہیں پیدا ہوتا‘‘ طارق صاحب نے کہا’’آپ ایسا کیجئے کہ کل فون پر بی بی کو صورتحال بتادیجئے۔میں نہیں

سمجھتا کہ وہ پھر بھی انکار کریں گی "

ہم نے کہا" طارق صاحب' ہر مشکل کام آپ ہمارے ذمّے ڈال دیتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے۔ بی بی اور فریدہ خانم سے کل آپ خود بات کریں"

طارق صاحب نے بڑے اطمینان سے ہمیں دیکھا اور پھر کہا" مجھے معلوم ہے کہ آپ ڈھنگ سے بات کریں گے تو انہیں یہ محسوس بھی نہیں ہوگا کہ ان کی پیشکش کو ٹھکرایا جارہا ہے۔ ورنہ ذرا سوچئے کہ مختار بیگم اور فریدہ خانم خود ہی کسی فلم کیلئے گانے کی پیشکش کریں تو فلم ساز تو سر کے بل کھڑے ہو جائیں "

ہم نے کہا" فی الحال تو ہم ہی سر کے بل کھڑے ہیں "

وہ ہنسنے لگے۔ پھر بولے" پھر ایسا کرتے ہیں کہ اس غزل ہی کو ڈراپ کر دیتے ہیں۔ ان سے کوئی بہانہ کر دیں گے۔ کوئی اور غزل رکھ لیتے ہیں مگر یہ غزل ہے بہت اچھی۔ دل میں جاکر لگتی ہے "

" ٹھیک ہے" ہم نے مری ہوئی آواز میں کہا" کل ہم ہی ان سے بات کرلیں گے۔ مشکل کام ہے مگر کچھ بھی ہو وہ لوگ غزل کی اجازت دینے سے انکار نہیں کریں گے"

دوسرے دن ہم نے تمام جرأت اکٹھی کرکے فون کیا اور فریدہ خانم کو بتایا کہ دراصل ہم اس غزل کی نسیم بیگم کی آواز میں ریہرسل بھی کر چکے ہیں۔ ہم تو واقعی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آپ اس غزل کو گانے پر آمادہ ہو جائیں گی۔ اب نسیم بیگم کو تبدیل کرنا بھی مناسب نہ ہوگا۔

انہوں نے فوراً بی بی سے مشورہ کیا۔ انہوں نے فون کا ریسیور سنبھالا اور علیک سلیک کے بعد فرمایا" آفاقی صاحب! چھیمی کی آپ فکر نہ کیجئے۔ وہ تو گھر کی بچّی ہے۔ اسے میں کہہ دوں گی مگر میں چاہتی ہوں کہ آپ کی فلم میں آغا صاحب کی غزل فریدہ گائے گی' سجادے گی "

" اللہ اللہ" اس قدر بے لوث ہو کر وہ ہمیں دعوت دے رہی تھیں اور ہم اپنی ہی کشمکش میں مبتلا تھے۔ چُپ رہ گئے۔

" کیا بات ہے' آپ چُپ کیوں ہو گئے ؟ "

ہم نے کہا" دراصل یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ریہرسل کرانے کے بعد کسی سنگر کو بدل دیا جائے "ریہرسل وغیرہ ہم نے بالکل نہیں کرائی تھی۔ محض بہانہ تھا کیونکہ انہیں صاف صاف الفاظ میں کہنے کی ہمّت نہیں پڑرہی تھی۔

اب ذرا ان کی اعلیٰ ظرفی ملاحظہ فرمایئے۔ بولیں "آفاقی صاحب! آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ آپ نے اسے زبان دی ہے تو ضرور نبھائیں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے۔ چاہیں تو فریدہ کی آواز حاضر ہے چاہیں تو نسیم بیگم سے گوائیں۔ یہ غزل اب آپ کی ہے "

ہم نے طارق صاحب کو اطلاع دیدی۔ وہ اپنے مخصوص شرارت آمیز انداز میں مسکرائے اور بولے "آفاقی صاحب! ویسے آپ نے بڑی زیادتی کی ہے۔ مختار بیگم اور فریدہ خانم کے ساتھ "

ہم نے کہا" یہ زیادتی ہم نے کی نہیں' ہم سے کروائی گئی ہے "

وہ ہنس کر خاموش ہو گئے اور نسیم بیگم نے ای ایم آئی کے دفتر میں گانے کی ریہرسل شروع کردی۔ موسیقار خلیل اس طرز میں تبدیلی کرنے کے بارے میں غور فرما رہے تھے کہ ہم نے انہیں روک دیا اور کہا کہ بھائی! یہ غزل بالکل اسی طرح ریکارڈ کرلیں۔

"ارے بھئی' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کسی اور کی طرز میں کیسے اپنالوں؟ "

ہم نے کہا" یہ طرز جس نے بنائی ہے اس نے ہمیں اجازت بھی دیدی ہے "

بولے "مگر فلم میں تو موسیقار کی حیثیت سے ہمارا نام ہوگا۔ یہ تو بددیانتی ہو جائیگی "

ہم نے انہیں سمجھایا "خلیل خاں' بددیانتی اس وقت شروع ہوتی جب آپ بتائے بغیر ہی اسے اپنا لیتے۔ یہ طرز آغا حشر کے زمانے کی ہے بلکہ یہ غزل ان ہی کی ترتیب دی ہوئی ہے یہ تو تبرّک ہے "

بولے "تو پھر اس تبرّک پر آغا حشر ہی کا نام دیدیں "

ہم نے کہا" اگر تم کہو گے تو ایسا کرلیں گے۔ اب تم غزل ریکارڈ کرو' چار دن بعد شوٹنگ ہے "

نسیم بیگم نے جی جان سے یہ غزل گائی۔ ان دنوں یہ دستور تھا کہ پہلے کئی روز ای ایم آئی کے دفتر میں موسیقار اور سنگرز گانے کی ریہرسل کرتے تھے پھر ہدایت کار جا کر سنتا تھا۔ مشورے دیتا تھا اور گانے کو منظور کرتا تھا۔ اس کے بعد عام

سازندے باقاعدہ آرکسٹرا کے ساتھ تین بار گانے کی ریہرسل کرتے تھے تب کہیں جا کر سٹوڈیو میں گانا ریکارڈ کرنے کی نوبت آتی تھی۔ آج کل کا دستور یہ نہیں ہے۔ اب یہ ہوتا ہے کہ موسیقار اور نغمہ نگار بیٹھے طرز بنا رہے ہیں۔ اگر ہدایتکار کو فرصت ہوئی تو وہ سن لے گا ورنہ سب ٹھیک ہے۔ اس کے بعد گلوکار کی ایک ریہرسل ہوتی ہے اور پھر سٹوڈیو میں سازندے ایک ریہرسل کرتے ہیں اور وہیں کے وہیں گانا ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔ گویا باوا آدم ہی نرالا ہے۔

نسیم بیگم بہت ہی خوش اخلاق اور ہنس مکھ خاتون تھیں۔ صورت شکل بیحد معمولی' سانولا رنگ' ناک نقشہ بھی ٹھیک' جسم بھاری' قد چھوٹا مگر انہیں اپنے موٹاپے یا صورت شکل کے بارے میں کوئی احساسِ کمتری نہیں تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ خوبصورتی اور بدصورتی کے احساس سے بے نیاز تھیں۔ وہ ایک ہنس مکھ اور خوش مزاج گلوکارہ تھیں جن میں انکساری بہت زیادہ تھی۔ بیحد سادگی پسند تھیں۔ میں نے کبھی لپ اسٹک کے سوا انہیں کوئی دوسرا میک اپ استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کے لباس اور عادات واطوار میں بھی بیحد سادگی تھی۔ مختصر یہ کہ انہیں دیکھ کر اور ان کے پاس بیٹھ کر یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک معروف گلوکارہ اور مغنیّہ ہیں۔ کلاسیکل گائیکی پر بھی انہیں عبور حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے فلمی کیریئر کے آغاز میں میڈم نور جہاں کے گائے ہوئے کئی مقبول نغمے بھی گائے لیکن کچھ عرصے بعد گلوکاری میں ان کا ایک منفرد مقام بن گیا تھا۔ ان کے گائے ہوئے کئی نغمے بیحد پسند کئے گئے تھے۔

ہم نے جب ''کنیز'' بنائی تو اس وقت پاکستان میں فلموں پر زیادہ لاگت نہیں آتی تھی۔ اداکاروں' گلوکاروں اور دوسرے لوگوں کا معاوضہ بھی فلموں کے بجٹ کے مطابق ہی ہوا کرتا تھا۔ مالا جیسی گلوکارہ اس زمانے میں ایک نغمے کا معاوضہ پانچ سے سات سو روپے تک لیا کرتی تھیں۔ دوسرے گلوکار بھی تین چار سو سے پانچ چھ سو روپے تک معاوضہ لیتے تھے۔ مہدی حسن ابھی فلمی اُفق پر نئے نئے ابھرے تھے مگر ان کا معاوضہ ایک ہزار فی گانا تھا۔ نسیم بیگم سے ہم نے یہ غزل ریکارڈ کرائی تو ان سے پہلے معاوضے کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ پہلے تو انہوں نے بہت ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا پھر بتایا کہ وہ بارہ سو روپے فی گانا معاوضہ لیتی ہیں جو کہ ایک حقیقت تھی۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ ہم نے محض ان سے اپنا وعدہ نبھانے کی خاطر فریدہ خانم کی آواز میں گانا ریکارڈ کرنے سے پہلو تہی کی ہے۔ یوں بھی وہ بہت لحاظ

ملاحظے والی عورت تھیں۔ ہم ان کی بات سن کر خاموش ہو گئے۔ مطلب یہ تھا کہ جو آپ کہتی ہیں' وہی ہو گا۔
انہوں نے ایک لمحہ توّقف کیا پھر بولیں ''مگر آپ سے میں ایک ہزار روپے لونگی ''
ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ مقرّرہ تاریخوں پر وہ گراموفون کمپنی کے ہیڈ آفس میں ریہرسل کیلئے با قاعدگی سے آتی رہیں۔ گانے کی صدابندی ایورنیو سٹوڈیوز میں کی گئی تھی۔ان دنوں سازندوں نے بعض نادہندہ فلم سازوں سے تنگ آ کر یہ اصول بنایا تھا کہ ہر گانے کی ریکارڈنگ سے پہلے معاوضہ نقد وصول کر لیا جائیگا لیکن ہمارے ساتھ اس اصول کو نہیں برتا گیا۔ گانے کی ریکارڈنگ کے بعد سازندوں کے منتظم مسٹر میکنزی بل بنا کر میوزک ڈائریکٹر کے حوالے کر دیتے تھے۔ وہ اسے چیک کر کے اس کی تصدیق کر کے پروڈکشن منیجر کو دے دیا کرتے تھے اور اگلے دن ہم چیک یا کیش کے ذریعے اس کی ادائیگی کر دیتے تھے۔ وائلن اور کئی ساز بجانے والے سازندے کرسچن یا اینگلو انڈین تھے۔اس وقت تک فلمی صنعت میں اچھی اور خوش شکل ایکسٹرا لڑکیاں بھی زیادہ تر کرسچین ہی تھیں۔ یہ سب لوگ مہذّب اور پڑھے لکھے ہوتے تھے۔ انگریزی بولتے تھے۔ کوٹ پتلون اور اسکرٹ پہنتے تھے۔ سازندوں میں انہیں سربراہ کی حیثیت حاصل تھی۔ باقی سازندے عموماً کم پڑھے لکھے یا ان پڑھ تھے اس لئے حساب کتاب اور کاروباری بات چیت کیلئے وہ کرسچین سازندوں پر انحصار کرتے تھے۔ان میں سے کئی سازندے بڑے ہوٹلوں اور ریستورانوں میں بھی ساز بجاتے رہے تھے اور آرکسٹرا پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا۔ جب موسیقار میوزک کی نوٹیشن کراتا تھا تو یہ فرض بھی کرسچین سازندے ہی سرانجام دیا کرتے تھے کیونکہ انگریزی میں موسیقی کو نوٹ کر لینا ایک علیحدہ ہنر ہے جس سے دیسی سازندے واقف نہ تھے۔
آغا حشر کی غزل تھی اور نسیم بیگم کی آواز۔ ظاہر ہے کہ سٹوڈیو میں اس کا چرچا ہو گیا اور ریکارڈنگ ہال مہمانوں سے لبریز ہو گیا تھا۔ نسیم بیگم نے بھی خوب ڈوب کر گایا۔ گانے کی صدابندی ختم ہوئی تو رحیم ہمارے پاس نسیم بیگم کا بل لے کر آ گیا۔ ہم نے اس کی ادائیگی کر دی۔ کچھ دیر بعد رحیم دوبارہ مسکراتا ہوا نمودار ہوا۔
''اب کیا بات ہے؟'' ہم نے پوچھا۔
بولا ''صاحب جی! نسیم بیگم دو سو روپے اور مانگ رہی ہیں ''

''وہ کیوں ؟'' ہم حیران رہ گئے'' بھئی انہوں نے خود ہی تو ایک ہزار روپے معاوضہ طے کیا ہے ''

''اس نے کہا ''معاوضے کی بات نہیں ہے۔دو سو روپے وہ پٹرول کا خرچہ مانگ رہی ہیں ''

''پٹرول کا خرچ دو سو روپے ؟'' ہم مزید حیران ہو گئے۔اس زمانے میں شاید پونے دو روپے یا دو روپے فی گیلن (لیٹر کا اس وقت حساب نہیں تھا) پٹرول ملتا تھا۔ ہمارے گانے کی ریہرسل اور صدابندی پر آمدورفت میں ان کا دو گیلن پٹرول بھی خرچ نہیں ہوا ہو گا۔

ہم نے رحیم سے کہا'' رحیم ! ان کو بتادو کہ ہم کسی کو پٹرول کا خرچہ نہیں دیتے ''

''میں نے تو بتادیا ہے جی مگر وہ کہتی ہیں کہ آفاقی صاحب سے جا کر بات کرلو ''

ہم نے کہا'' تم اس بات کو فی الحال گول کر دو ''

نہ جانے رحیم نے کس طرح بات کو گول کیا مگر تیسرے دن رحیم پھر مسکراتا ہوا آ گیا۔

''صاحب جی ! وہ نسیم بیگم ملی تھیں۔دو سو روپے مانگ رہی ہیں ''

ہم نے بدمزاجی سے کہا'' بھئی کہہ دو کہ ہم نہیں دیں گے۔تم کسی بہانے انہیں ٹال دو ''

''کیا ان سے کہوں کہ آپ سے بات کرلیں ؟ ''

''ہرگز نہیں'' ہم نے ڈانٹ دیا'' ہم سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ''

چند روز گزر گئے۔ایک دفعہ ہم ایورنیو سٹوڈیو سے شارٹ کٹ کے راستے باری سٹوڈیو پہنچے تو نسیم بیگم اپنی کار میں ہمارے برابر سے گزریں۔انہوں نے فوراً کار رکوائی اور ڈرائیور کار پیچھے لے آیا۔پچھلی کھڑکی سے نسیم بیگم کا گول مٹول مسکراتا ہوا چہرہ جھانک رہا تھا۔انہوں نے بڑی گرمجوشی سے سلام کیا۔ بال بچّوں کی خیریت دریافت کی حالانکہ اس وقت ہم کنوارے تھے اور انہیں کئی بار بتا چکے تھے مگر وہ ہر بار بال بچّے کی خیریت ضرور پوچھتی تھیں۔

پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔''آفاقی صاحب ! ایک چھوٹا سا بل نکلتا ہے آپ کی طرف ''

ہم پٹرول والی بات بھول چکے تھے۔ حیران ہو کر پوچھا'' کیا آپ کو ابھی تک گانے کا بل نہیں ملا؟ ''

کہنے لگیں'' وہ تو مل گیا ہے مگر پٹرول کا بل ابھی تک نہیں ملا۔شاید پروڈکشن والے نے آپ کو بتایا ہی نہیں ''

ہم نے دیکھا کہ اب نوبت براہِ راست گفتگو تک پہنچ گئی ہے یا تو ہم اس قصّے سے بے خبر بن جائیں اور چپکے سے بل ادا کر دیں یا پھر اخلاقی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے صاف صاف بات کر لیں۔ ہم نے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا اور کہا ''چھوڑیں نسیم پٹرول کا بل۔ ریہرسلوں اور ریکارڈنگ میں آپ کا پانچ روپے کا پٹرول بھی خرچ نہیں ہوا ہوگا ''

وہ مسکراتے ہوئے بولیں ''مگر آفاقی صاحب ! میں سب پروڈیوسروں سے دو سو روپے پٹرول کا بل لیتی ہوں ''

ہم نے بات کو ہنسی میں ٹالنا چاہا ''یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ تم اتنی بڑی گلوکارہ ہو۔ اتنے بہت سے پیسے کماتی ہو۔ پٹرول کا بل لیتے ہوئے اچھی لگو گی ؟ ''

نسیم بیگم چٹان کی طرح اپنے مؤقف پر ڈٹی ہوئی تھیں۔ بولیں '' آفاقی صاحب ! میرے گھر کا اور باورچی خانے کا خرچ تو پٹرول کے بل سے ہی چلتا ہے ''

''اور گانوں کے پیسوں کا کیا کرتی ہو ؟ ''

وہ باقاعدہ ہنسنے لگیں اور مخصوص بے تکلفانہ لہجے میں بولیں ''وہ جمع کرتی ہوں' عورت ہوں نا ! ''

اس کے بعد مزید بات چیت کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی اس لئے ہم نے پسپائی میں ہی عافیت جانی اور کہا ''اچھّا' ہم رحیم سے کہہ دیں گے' بل آپ کو پہنچ جائے گا ''

''بہت شکریہ'' انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کہاں جا رہے ہیں آپ ؟ آپ کو کہیں چھوڑ دوں ؟ ''

ہم نے کہا ''ہمیں بس ہمارے حال پر ہی چھوڑ دیں تو مہربانی ہو گی ''

وہ بے ساختہ بچّوں کی طرح ہنس پڑیں۔ ''آپ کی مرضی، اور بال بچّے تو ٹھیک ہیں نا؟'' انہوں نے بڑے خلوص سے پوچھا۔

''ہاں ہاں۔۔۔ بالکل ٹھیک ہیں ''

نسیم بیگم اپنی راہ پر چلی گئیں اور ہم نے باری سٹوڈیوز کے فلور کا رُخ کیا جہاں آغا طالش کسی فلم کی شوٹنگ کر رہے تھے۔

نسیم بیگم بعد ازاں ایک بچّے کو جنم دیتے ہوئے وفات پا گئیں۔ انتقال کے وقت ان کی عمر بمشکل 35-36 سال ہو گی

اور صحت تو قابلِ رشک تھی، جو شخص ہر وقت ہنستا رہے اس کی تندرستی کا کیا ٹھکانا! مگر موت پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ تندرست اور بیمار سب کو یہ ایک ہی لاٹھی سے ہانکتی ہے۔

اس روز باری سٹوڈیو میں داخل ہوئے تو سامنے ہی باری ملک تعمیرات کا جائزہ لیتے ہوئے نظر آ گئے۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے دوسری طرح رُخ کر لیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہم سے خفا ہیں کہ ہم نے اپنی فلم کی شوٹنگ ایورنیو سٹوڈیو میں کیوں شروع کر دی ہے؟

ہم ان کے پاس ہی چلے گئے ''تسلیمات عرض ہے مہابلی۔ ظلِ الٰہی ''

انہوں نے سُرخ چہرہ ہماری طرف موڑا اور کہا ''آفاقی! مجھ سے مذاق کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے میرے ساتھ دوستی نہیں نبھائی ہے ''

ہم نے کہا ''باری صاحب' اگر جان کی امان پائیں تو کچھ ہم بھی عرض کریں ''

بولے ''بولو ''!

''اس طرح نہیں' آپ کے کمرے میں چل کر ''

''ٹھیک ہے' آؤ'' انہوں نے متعلقہ لوگوں کو ضروری ہدایات دیں اور اپنے دفتر کی طرف ہو لئے۔ ''کہو' کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ بدستور ناراض تھے۔

ہم نے کہا ''اتنے بڑے دربار میں آئے ہیں کچھ خاطر مدارت' مشروبات وفواکہات لازم ہیں'' ''کتنی بار کہا ہے کہ میرے ساتھ آسان اردو بولا کرو ''

ہم نے کہا ''مطلب یہ کہ کوکا کولا وغیرہ یا چائے کی پیالی بھی ہو تو ماحول خوشگوار ہو جاتا ہے۔ معاف کرنا۔ ویسے تو آپ آغا صاحب سے ہر بات میں مقابلہ کرتے ہیں مگر خاطر داری اور فیاضی میں ان سے کوئی مقابلہ نہیں ہے ''

انہوں نے گھنٹی بجائی اور چپراسی کو کوکا کولا لانے کا حکم دیا۔

ہم نے کہا ''باری صاحب' ہم کئی دن سے آپ کے پاس آنا چاہ رہے ہیں مگر مصروفیات کی وجہ سے نہ آ سکے۔ آپ کی

خفگی کا ہمیں علم ہو چکا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کی خفگی بے جا اور شکایت بے معنی ہے "

"وہ کس طرح؟ "

"آپ کو ہم سے شکایت کیا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

بولے "تم میرے دوست ہو اور اپنی فلم کسی اور سٹوڈیو میں بنا رہے ہو "

ہم نے کہا "باری صاحب! آپ تو خود کاروباری آدمی ہیں۔ بزنس کی مصلحتوں کو سمجھتے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ کاروبار میں دوستی اور دوستی میں کاروبار نہیں چلتا "

"آغا صاحب نے تمہیں کیا سہولت اور مراعات دی ہیں جو میں نہیں دے سکتا؟ "

ہم نے کہا "یہ بزنس سیکرٹ ہے لیکن سہولت اور مراعات دی ہیں تب ہی تو ہم وہاں شوٹنگ کرا رہے ہیں "

بولے "یہ شرارت تمہارے ڈائریکٹر کی ہے۔ وہ آغا صاحب کا خاص بندہ ہے "

حسن طارق سے ان کے اس وقت تک مراسم نہیں تھے۔ وہ ایور نیو سٹوڈیو میں اپنی فلمیں بناتے تھے اس لئے باری صاحب ان سے بھی ناراض تھے۔

ہم نے کہا "ڈائریکٹر بیچارے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان کا دل اور حوصلہ بڑا ہونا چاہئے۔ دوستی اور خود غرضی میں فرق رکھنا چاہئے "

"کیا کہہ رہے ہو تم؟ میں خود غرض ہوں؟ "

ہم نے بھی صاف گوئی اختیار کر لی "ایسا ہی لگ رہا ہے۔ اگر آپ واقعی ہمارے دوست ہیں تو آپ کو ہمارے فلم ساز بننے پر خوشی ہونی چاہئے تھی مگر آپ ہم سے ناراض ہیں کیوں کہ ہم نے آپ کے سٹوڈیو میں فلم نہیں بنائی۔ یہ کیسی دوستی ہے؟ "

ان کا منہ سُرخ ہو گیا۔ "آفاقی! دوستی کا تقاضا تھا کہ تم میرے سٹوڈیو میں فلم بناتے' میری شکایت بجا ہے "

"جی نہیں۔۔۔ آپ کی شکایت بے جا ہے۔ یہ دوستی نہیں' خود غرضی ہے۔ آپ ہماری ایک بات کا جواب دیجئے۔ آپ فلم سٹوڈیو اونر ہیں۔ فلم ڈسٹری بیوٹر ہیں اور ہم ایک رائٹر۔ آپ نے اتنی فلمیں بنائیں مگر کبھی ہم سے کہانی نہیں

لکھوائی۔ ظاہر ہے کوئی کاروباری مصلحت ہو گی مگر ہم نے تو آپ سے کبھی شکایت نہیں کی۔ نہ آپ سے ناراض ہوئے بلکہ آپ کی فلموں کی کامیابی پر خوش ہوتے ہیں۔ آپ کو کھلے دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ ہر طرح آپ کے کام آتے ہیں۔ اگر دوستی کا یہی تقاضا ہے تو آپ نے ہم سے کہانیاں کیوں نہیں لکھوائیں۔ ہمیں فلم ساز بننے کا موقع کیوں نہیں دیا؟ ہمیں سہولتوں کی پیشکش کیوں نہیں کی؟ اب ہم نے کسی طرح فلم شروع کر دی ہے تو آپ کو شکایت پیدا ہو گئی ہے کہ ہم آپ کے سٹوڈیو میں فلم کیوں نہیں بنا رہے ہیں۔ باری صاحب، بڑے افسوس کی بات ہے۔ یہ تو کوئی انصاف نہیں ہے"!

باری صاحب خاموش ہو گئے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ لاجواب ہو گئے ہیں۔ کچھ دیر بعد بولے "مجھ سے تم نے کہا تو ہوتا"

ہم نے کہا "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اور پھر ہم دوستوں سے کاروباری یا مالی فائدہ اٹھانے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہمارے خیال میں دوستی اور کاروبار کو ہمیشہ الگ ہی رکھنا چاہئے ورنہ نہ تو دوستی رہتی ہے اور نہ کاروبار"

باری صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

ہم نے کہا "ہم نے آج تک آپس میں کوئی بزنس نہیں کیا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم آئندہ بھی دوست ہی رہیں" یہ کہہ کر ہم کھڑے ہو گئے۔

"بیٹھو یار، چائے پی کر جانا"

"ہمیں طالش صاحب سے ضروری بات کرنی ہے۔ وہ چلے نہ جائیں" شکر ہے کہ اس کے بعد باری صاحب کی ناراضگی بھی دور ہو گئی اور شکایت بھی۔ آج تک ہمارے ویسے ہی بے لوث اور مخلصانہ تعلقات قائم ہیں۔

ہم آغا طالش کی تلاش میں ان کی فلم کے سیٹ پر پہنچ گئے۔ وہ کوٹ پتلون پہنے کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھا تو مسکرائے "دیکھا، ان لوگوں نے مجھے کتنے اچھے کپڑے پہنائے ہیں۔ ایک تم ہو کہ ایک جوڑا کرتہ پاجامہ بنوا کر مطمئن ہو گئے ہو۔ سر پہ وگ لگوا دی۔ چہرے پہ گھنی داڑھی چپکا دی، میرا تو منہ ہی اکڑ جاتا ہے"

ہم نے کہا "اتنا بڑا نواب بنا دیا ہے۔ حویلی، رعب داب، نوکر چاکر"

''خوب سمجھتا ہوں۔ ہر ایک کریکٹر سے مجھے بُرا بھلا کہلواتے ہو' جو اٹھتا ہے نواب صاحب کی بے عزتی کر دیتا ہے ''
ہم نے کہا ''نواب صاحب بھی دوسروں کی بہت بے عزتی کر چکے ہیں' اب ان کی باری ہے۔ آغا جی۔ زمانہ بدل رہا ہے ''

وہ ہنسنے لگے ''میاں تم سے باتوں میں کون جیت سکتا ہے۔ ڈائیلاگ رائٹر ہو۔ کہو کیسے آئے ہو' ظاہر ہے کوئی کام ہو گا ''
ہم نے انہیں بتایا کہ ایک سیٹ پر چند گھنٹوں کیلئے انکی ضرورت پڑ گئی ہے۔

''میاں اپنی اوقات میں رہو۔ میرا مطلب ہے کہ اپنی ڈیٹس میں رہو۔ میں نے کسی اور کیلئے تمہاری شوٹنگ خراب کی ہے جو تم دوسروں کا کام خراب کرنے آ گئے ہو؟ ''

ہم نے عرض کیا ''آغا صاحب! دوسروں کا کام تو بہتر ہو جائیگا ''

پوچھا ''اچھا! وہ کیسے؟ ''

ہم نے کہا ''وہ ایسے کہ آپ کا کام فلم میں جتنا کم ہو گا فلم کی بہتری میں اتنا ہی اضافہ ہو گا ''

وہ ہنسنے لگے ''باز آ جاؤ آفاقی' ورنہ وہی شعر سب کو سنا دوں گا ''

انہوں نے ہمارے لئے ایک شعر موزوں کیا تھا جو وہ اچھے موڈ میں سنایا کرتے تھے۔ وزن تک درست نہ تھا اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے شعر ''ناموزوں'' کیا تھا۔

آغا طالش اداکار تو بہت اعلیٰ پائے کے تھے ہی' انسان بھی بہت اچھے تھے۔ صاف گو' اصول پسند اور کام سے کام رکھنے والے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی بڑے آرٹسٹ کو شوٹنگ کیلئے بلایا جائے اور دوسرے آرٹسٹوں کا کام ختم کرنے کی غرض سے ان کی شوٹنگ نہ کی جائے تو وہ بہت بگڑتے ہیں۔ بار بار ڈائریکٹر سے پوچھتے ہیں کہ ہمارا کام کب ہو گا۔ کام نہیں تھا تو ہمیں بلایا کیوں تھا؟ پروڈیوسر سے جھگڑتے رہتے ہیں کہ خواہ مخواہ بلا کر بٹھا لیا ہے' ہمارا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ بہت کم آرٹسٹ ایسے دیکھے جن میں یہ عادت نہیں ہے۔ آغا طالش بھی ان ہی میں سے ایک تھے۔ وہ صبح ٹھیک وقت پر سٹوڈیو پہنچ کر میک اپ کر کے اور لباس پہن کر تیار ہو جاتے۔ اب شام تک آپ ان کی طرف سے بے فکر ہو جائیں' وہ آپ کو مطلع کر دیں گے کہ وہ کہاں ہوں گے اور بس۔ اگر شام کو انہیں بتایا جائے کہ آج آپ کا کام ہی

نہ ہو سکا کل صبح آئیے گا تو وہ خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے گھر چلے جاتے ہیں۔ شکایت کا ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لاتے۔

آغا طالش کا کہنا تھا کہ ہم نے پروڈیوسر کو جو ڈیٹ دی ہے اسے اختیار ہے کہ اسے استعمال کرے یا نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ وہ بلاوجہ تو آرٹسٹوں کو بلا کر نہیں بٹھاتا۔ یقیناً کوئی مجبوری یا مصلحت ہوتی ہوگی۔ ایسی صحت مندانہ سوچ بہت کم آرٹسٹوں کی ہوتی ہے۔ وحید مراد میں بھی یہی خوبی تھی جن دنوں وہ انتہائی عروج پر تھے اور بیحد مصروف تھے اس وقت بھی ٹھیک وقت پر شوٹنگ کیلئے پہنچتے تھے اور ہدایتکار سے کبھی تقاضا نہیں کرتے تھے کہ میرا کام کب ہوگا؟

یوں تو فلم بنانا ہر جگہ اور ہر ملک ہی میں مشکل کام ہے لیکن پاکستان میں اس کی مشکلات فزوں تر ہیں اور سب سے بڑھ کر دردسر اداکار ہوتے ہیں۔ جو اداکار باکس آفس پر جتنا بڑا ہوگا وہ فلم ساز کے لئے اتنا ہی بڑا دردسر ہوگا۔ جب سے ہم نے فلمی دنیا میں آمدورفت شروع کی ہے اس وقت ہی سے یہ رواج دیکھ رہے ہیں۔ زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ فلمی دنیا میں بھی بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں مگر یہ رواج اور روایت جوں کی توں ہے۔ صرف اداکاروں کے نام بدلتے رہتے ہیں۔ ان کے پیدا کردہ مسائل ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ آج بھی سپر سٹارز سے فلم رائٹروں کو ویسی ہی شکایات ہیں جیسی کہ 1951ء میں تھیں۔ فرق یہ ہے کہ اس وقت سنتوش کمار اور صبیحہ خانم' سدھیر لالہ اور مسرت نذیر تھے۔۔۔۔ اور یہ مسئلہ صرف پاکستان ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہمارے ہمسایہ ملک بھارت میں بھی ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ وہاں بھی بڑے اداکار فلم سازوں کے لئے مسائل پیدا کرتے رہتے ہیں اور تو اور فلم سازی کے ہیڈ کوارٹر اور انتہائی منظّم اور قاعدے قرینے کے ملک امریکہ کے ہالی ووڈ میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ وہاں بھی بڑے اداکار دیر سے سیٹ پر آتے تھے۔ نخرے کرتے تھے۔ فلم سازوں کے اخراجات کا بوجھ بڑھاتے تھے۔ دنیا کی معروف ترین گلیمرس اداکارہ مارلین منرو اتنی تاخیر سے شوٹنگ پر آیا کرتی تھی کہ ساتھی اداکار فلم ساز اور ہدایت کار اپنے بال نوچا کرتے تھے۔ مارلین منرو جب فلم ''مس فٹ'' میں ہالی ووڈ کے معروف ترین لیجنڈ کلارک گیبل کے ساتھ کام کیا تو اس کے مسلسل تاخیر سے آنے پر کلارک گیبل کو اس قدر شدید ذہنی اور روحانی کوفت ہوتی تھی کہ بالآخر وہ فلم کی تکمیل کے

دوران ہی میں ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔اس کی بیوی نے کھلم کھلا اخبارات میں بیان دیا کہ کلارک گیبل کے ہارٹ اٹیک اور موت کی ذمہ دار مارلین منرو ہے۔

ہالی ووڈ کے دوسرے بڑے اداکاروں کا بھی یہی معاملہ ہے۔اگر کہیں بد قسمتی سے ایک فلم میں دو یا تین بڑے اداکار یک جا ہو گئے تو سمجھیے کہ فلم ساز کی شامت ہی آ گئی۔ایلزبتھ ٹیلر روم میں فلم ''کلوپیٹرا'' کی شوٹنگ چھوڑ کر اس لئے واپس چلی گئی تھی کہ فلم ساز اس کے بچوں ان کی آیاؤں ایلزبتھ ٹیلر کے ذاتی ملازموں اور 6 کتّوں کیلئے اس کی حسب خواہش مناسب رہائش کا بندوبست نہیں کر سکا تھا۔ایلزبتھ ٹیلر نے یہ بھی نہ سوچا کہ ہالی ووڈ کی اس فلم کا یونٹ روم جیسے مہنگے شہر میں مقیم ہے جہاں پر ہر روز لاکھوں کا خرچہ ہو رہا تھا۔

اسی طرح ''کلوپیٹرا'' کے جولیس سیزر برطانوی اداکار ریکس ہیری سن جب لندن سے روم پہنچے (کافی تاخیر سے) اور پہلے دن شوٹنگ کے لئے گئے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کیلئے ایلزبتھ ٹیلر جیسا خصوصی میک اپ روم موجود نہیں ہے۔ ریکس ہیری سن اسی وقت کار میں بیٹھ کر اپنے فائیو سٹار ہوٹل پہنچے' وہاں سے ائر پورٹ گئے اور سیدھے لندن واپس پہنچ گئے۔بے چارے فلم ساز کا لاکھوں کا نقصان ہو گیا اس لئے کہ شوٹنگ رک گئی تھی۔ان کے لئے خاطر خواہ میک اپ روم کا بندوبست کیا گیا تب وہ واپس روم تشریف لائے۔اسی فلم کی طویل شوٹنگ کے دوران میں فلم کی ہیروئن ایلزبتھ ٹیلر کا مشہور برطانوی اداکار رچرڈ برٹن کے ساتھ معاشقہ زور و شور سے جاری تھا۔یہ دونوں ہی شادی شدہ تھے مگر نہ تو ایلزبتھ ٹیلر کے شوہر سنگر اداکار ایڈی فشر روم میں تھے اور نہ ہی رچرڈ برٹن کی بیگم سیبل۔چنانچہ دونوں کو کھلی چھٹی تھی۔اس معاشقے میں ان کی مصروفیات کے باعث کئی بار شوٹنگ میں تعطل ہوتا رہا اور فلم ساز کو مالی چپت پڑتی رہی۔اس قسم کے حالات کے نتیجے میں اس فلم کی لاگت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ کئی بینک اور انشورنس کمپنیوں کا دیوالیہ نکل گیا تھا۔اس قسم کی بے شمار داستانیں سنائی جا سکتی ہیں۔

اس تذکرے سے مقصود یہ بتانا تھا کہ فلمی دنیا میں ممتاز اور بڑے اداکار ہمیشہ درد سر بن جاتے ہیں۔مگر ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ جب ہم نے پہلی فلم ''کنیز'' بنائی تو کسی اداکار کی طرف سے کوئی مشکل پیش نہیں آئی بلکہ ہر ایک نے حد سے زیادہ تعاون کیا۔

سنتوش اور صبیحہ تو اس وقت بھی سُپر سٹار تھے۔ محمد علی، زیبا اور وحید مراد نئے تھے مگر ہماری فلم کی تکمیل کے دوران ہی میں سُپر سٹار بن چکے تھے اور اتنے مصروف ہوگئے تھے کہ واقعی سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔ ہر ایک کے پاس کئی کئی فلمیں تھیں۔ کبھی کراچی، کبھی لاہور اور کبھی مری میں شوٹنگ ہوتی رہتی تھی اور یہ لوگ مسلسل ہوائی سفر میں رہتے تھے۔ اس کے باوجود اپنے اداکاروں کی طرف سے ہمیں دانستہ طور پر کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ پھر بھی ہم پریشان رہتے تھے اور اپنے اداکاروں سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ فلم ''کنیز'' میں ایک ایک سین کے کرداروں کے لئے بھی ہم نے اس وقت کے بڑے سٹارز سے کام کرنے کی درخواست کی اور ہر ایک نے ہماری بات مان لی۔ یہاں تک کہ معاوضے کے طور پر ایک پیسہ بھی لینے کے روادار نہ ہوئے۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ فلمی صنعت میں ہم شیطان کی طرح جانے جاتے تھے۔ ہر ایک سے ہمارے تعلقات تھے۔ بے تکلفی تھی۔ ہنسی مذاق تھا۔ ہو سکتا ہے وہ یہ سوچتے ہوں کہ اس کی پہلی فلم ہے چلو کچھ لحاظ کرلو۔ بہر حال سبب جو بھی رہا ہو۔ اداکاروں کا تعاون اور اللہ کی مہربانی ہمارے شامل حال رہی۔ کسی نے بھی تو ہمیں انکار نہیں کیا بلکہ خوشی خوشی ہماری خواہش کے مطابق کام کیا اور کبھی اس کے جواب میں کچھ طلب نہیں کیا۔

صابرہ سلطانہ اس زمانے کی ہیروئن تھیں۔ خوش شکل، خوش ادا، خوش گفتار، دراز قد، گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، ایک تعلیم یافتہ اور شریف گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ انہیں شعر و ادب کا ذوق بھی تھا بلکہ شاعری سے بھی شوق فرماتی تھیں۔ ان کے والد بھی ادب ذوق انسان تھے۔ انتہائی نفیس اور مرنجان مرنج تھے۔ ان کی والدہ ہمیشہ ساڑھی زیب تن کیا کرتی تھیں۔ صابرہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں۔ جب وہ شوٹنگ پر آتی تھیں تو والد اور والدہ دونوں ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ یہ ایک نیا دستور تھا۔ خاتون اداکاراؤں کے ساتھ ایک نگران کی موجودگی تو لازمی ہوتی تھی مگر یہاں تو ایک چھوڑ دو نگران تھے لیکن بہت جلد فلم سازوں کو اندازہ ہو گیا کہ صابرہ کے والدین انتہائی شریف اور معقول لوگ ہیں۔ ان دونوں کے ہمراہ آنے کا سبب یہ تھا کہ ان میں سے کوئی ایک گھر پر بالکل تنہا رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ویسے بھی صابرہ ان کی لاڈلی بیٹی تھیں اور ان دونوں میں سے کوئی انہیں زیادہ عرصے تک آنکھوں سے اوجھل دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔

''کنیز'' میں صبیحہ خانم کی ماں کا کردار خاصا اہم تھا مگر صرف ابتدائی حصے میں چار پانچ سین پر مشتمل تھا۔اس کردار کے لئے ہمیں ایک بہت اچھی اداکارہ کی ضرورت تھی مگر اتنے مختصر کردار کے لئے کوئی اچھی اداکارہ کیوں کر رضامند ہو سکتی تھی؟

حسن طارق صاحب کو اس معاملے میں ہمیشہ دور کی سوجھتی تھی۔ابھی شوٹنگ شروع ہونے میں چند روز باقی تھے اور ہم دونوں اس سوچ میں تھے کہ صبیحہ خانم کی ماں کا کردار کسے سونپا جائے۔ایک روز ہم اور طارق صاحب سٹوڈیو جا رہے تھے اور طارق صاحب کار چلاتے ہوئے حسب معمول رننگ کمنٹری میں مصروف تھے۔ان کی عادت تھی کہ کار چلاتے ہوئے سامنے کے واقعات پر تبصرہ کرتے رہتے تھے۔مثلاً

''او' مار دیا۔یہ تو غلط ہاتھ پر آرہا ہے ''

''یہ سڑک تو لگتا ہے بچّے دیتی ہے۔کتنے بچے ایک دم کہیں سے نکل کر سامنے آجاتے ہیں۔ ''

''یہ بس والا تو لگتا ہے نشے میں ہے ''

''او تانگے والے بھائی کیوں گھوڑے کو مروانے لگا ہے۔ ''

اس طرح کے تبصرے کرتے کرتے اچانک انہوں نے کہا

''آفاقی صاحب' صابرہ سلطانہ اس کیریکٹر میں کیسی رہے گی؟ ''

''کس کیریکٹر میں؟'' ہم نے پوچھا۔

''صبیحہ بھابھی کی ماں کے کردار میں۔ان دونوں کی شکل بھی آپس میں ملتی ہے اور وہ سچ مچ کسی نواب کی بیوی ہی لگے گی۔ویسے بھی بہت گریس فل ہے۔ ''

ہم پریشان ہو گئے ''مگر طارق صاحب وہ ہیروئن ہے۔صبیحہ بھابھی کی ماں کیوں بنے گی؟ ''

''ہیروئن تو ہے مگر صبیحہ کی ماں بننا بھی تو ایک بڑی بات ہے۔لوگ یاد کریں گے۔ ''

ہم خاموش ہو گئے۔سوچ رہے تھے کہ یہ بات صابرہ سے کیسے کی جائے۔صابرہ سے ہمارے اچھے مراسم تھے۔اس کے گھر میں آنا جانا بھی تھا۔ان کے والدین بھی ہمارے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے۔صابرہ سلطانہ نے جب سے سنا

تھا کہ ہم بھی فلم بنا رہے ہیں تو انہوں نے فوراً ہم سے فرمائش کر دی کہ انہیں بھی فلم میں ضرور رکھا جائے۔ وہی نہیں فلمی صنعت کے سب ہی اداکاروں کو ہم سے یہی توقع تھی کہ ہم انہیں اپنی پہلی فلم میں ضرور رکھیں گے۔ مگر ایک فلم میں کتنے کردار ہو سکتے ہیں اور فلمی دنیا کے سارے اداکاروں کا ایک فلم میں کام کرنا کیوں کر ممکن ہے؟ یہی وجہ ہے کہ بیشتر اداکاروں کو ہم سے شکایت ہو گئی تھی اور وہ ہم سے ناراض ہو گئے تھے۔ بڑی مشکل سے ہم نے انہیں سمجھا بجھا کر منایا تھا کہ بھئی یار زندہ' صحبت باقی' زندگی رہی اور فلمیں بناتے رہے تو ان کی باری بھی آ جائے گی۔ ہماری یہ دلیل کارگر ہوئی اور ہم نے سب کو منا لیا۔

مگر یہ بات کچھ عجیب سی لگی کہ ہم صابرہ سلطانہ سے فرمائش کریں کہ وہ ہماری فلم میں صبیحہ خانم کی ماں کا مختصر سا کردار کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ مگر نہ جانے کیا نفسیاتی مسئلہ تھا کہ ہم طارق صاحب کی کوئی بات ٹالتے ہی نہیں تھے۔ وہ تو ایک بار کہہ کر چپ ہو جاتے تھے مگر ہم اس تگ ودو میں لگ جاتے تھے کہ ان کی فرمائش کیسے پوری کی جائے؟

اسی شام ہم سمن آباد میں صابرہ سلطانہ کے گھر پہنچ گئے۔

وہ بڑے میدان کے سامنے ایک مکان کی بالائی منزل پر رہتی تھیں۔ اس گھر میں ہم نے کئی بار چائے پی تھی۔ کھانا کھایا تھا۔ شعر و شاعری کی باتیں کی تھیں۔ ہمارے شاعر دوست عالم تاب تشنہ اس زمانے میں لاہور اومنی بس کے بڑے افسر تھے۔ وہ میرٹھ میں ہمارے سکول فیلو اور سیّد کمال کے کلاس فیلو رہے تھے۔ ہمیں تو یاد نہ تھا مگر جب انہوں نے تفصیل بتائی تو یاد آ گیا۔ کمال بھی اس زمانے میں لاہور ہی میں مقیم تھے اور ہیرو تھے۔ دراصل وہی عالم تاب کے کلاس فیلو اور دوست تھے مگر کچھ عرصے بعد عالم تاب تشنہ ہمارے ساتھ شیر و شکر ہو گئے۔ کمال سے ان کی بس نام کی دوستی رہ گئی تھی۔

عالم تاب تشنہ چپکے چپکے شاعری کرتے تھے۔ بڑے اور مشہور شاعر تو وہ کئی سال بعد کراچی جا کر بنے تھے۔ اس زمانے میں ہم ان کی شاعری کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ وہ کہتے " یار سوفی' کسی فلم کے گانے لکھوا لو مجھ سے۔ "

ہم کہتے "بھائی آپ بسیں چلائیں۔ شاعری آپ کے بس کا روگ نہیں ہے"

یار فلموں میں شاعری کی ضرورت کب ہوتی ہے۔ بس تک بندی ہوتی ہے۔ میں تو پھر شاعر ہوں کہو گے تو تک بندی بھی کر دوں گا۔

تشنہ کی فلمی دنیا میں کچھ اور لوگوں سے بھی ملاقات تھی اور انہوں نے چند فلموں کے گانے بھی لکھے تھے۔ 1970ء کی دہائی میں وہ کراچی چلے گئے تھے اور پھر وہیں رہے اور وہیں ایک دن اچانک مشاعرے سے واپس آکر رات کو ہارٹ فیل ہونے سے انتقال کر گئے۔ بہت دلچسپ ذہین اور دوستوں کے دوست تھے۔

عالم تاب ایک بار ہمارے ساتھ صابرہ سلطانہ کے گھر گئے وہاں شعر و شاعری ہوتی رہی۔ صابرہ سلطانہ نے فوراً اپنا کلام لا کر تشنہ صاحب کے سپرد کر دیا اور انہوں نے اصلاح بھی شروع کر دی۔

صابرہ سلطانہ کے والد خود بھی فکر سخن کرتے تھے۔ بیٹی کے شوق و ذوق سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے تشنہ صاحب سے درخواست کی کہ وہ صابرہ کو اپنی شاگردی میں لے لیں اور اس کے کلام کی اصلاح کر دیا کریں۔ تشنہ کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس طرح صابرہ سلطانہ نے شاعری میں عالم تاب تشنہ کی شاگردی اختیار کر لی۔

پہلے تو ہم نے سوچا کہ عالم تاب سے مشورہ کریں اور انہیں درمیان میں ڈالیں کہ صابرہ سے یہ تذکرہ چھیڑ کر دیکھیں۔ مگر عالم تاب نے فون پر ہماری بات سنتے ہی زوردار قہقہہ لگایا اور بولے ''سوفی تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ یار صابرہ کو صبیحہ کی ماں بناتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئے گی''۔

''بالکل نہیں''

''تو پھر تم خود ہی بات کر لو''

''بھائی استاد کا بڑا حق ہے'' ہم نے کہا اور وہ بڑے وضعدار لوگ ہیں۔ تمہاری بات ہرگز نہیں ٹالیں گے''

''بات تو وہ تمہاری بھی نہیں ٹالیں گے۔ ہاں اگر اسے ہیروئن بنانا ہو تو کہو' میں بات کر لیتا ہوں۔''

ہم نے ان کی شان میں ایک چھوٹا سا قصیدہ عرض کیا اور پھر فیصلہ کیا کہ خود ہی صابرہ سے بات کر لیں۔ زیادہ سے زیادہ معذرت ہی کر لیں گی نا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' ہم نے ان کے گھر جاتے ہی پوچھا

''مابدولت آرام فرمارہے ہیں۔آج کوئی شوٹنگ نہیں ہے'' ان کے والداور والدہ بھی ڈرائنگ روم میں آ گئے تو ہماری ہمّت بالکل ہی جواب دے گئی۔

صابرہ نے کہا''مابدولت آپ سب کیلئے چائے بنا کرلاتے ہیں اتنے میں آپ ابو سے باتیں کیجئے۔''

چائے بھی پی لی مگر ہماری ہمت نہیں پڑی۔سوچا چھوڑو۔جانے دو کوئی ضروری ہے کہ صابرہ سلطانہ ہی یہ کردار کریں۔کوئی اور کیریکٹرایکٹریس تلاش کرلیں گے۔ مگر پھر خیال آیا کہ صابرہ اس کردار میں بہت اچھی لگیں گی۔ واقعی وہ اور صبیحہ ماں بیٹیاں نظر آئیں گی۔

صابرہ ہمیں باہر تک رخصت کرنے آئیں تو ہم نے موقع پاکر کہا''صابرہ آپ سے ایک فرمائش کرنی تھی۔''

''فرمائش؟ کیسی فرمائش؟''

''ہماری فلم میں صبیحہ خانم کی ماں کا کردار ہم چاہتے ہیں کہ آپ کریں۔''

''صبیحہ خانم کی ماں کا؟'' مگر وہ تو خود محمد علی اور وحید مراد کی ماں ہیں۔''

''مگران کی بھی تو کوئی ماں ضرور ہوگی۔ورنہ وہ دنیا میں کیسے آتیں!'' ہم نے کہا۔

وہ بولیں''یعنی محمد علی اور وحید مراد کی نانی؟''

ہم نے کہا''فلم کے آغاز میں ہی یہ چار پانچ سین کا کردار ہے مگر بہت جاندار کردار ہے۔کوئی چھوٹی موٹی اداکارہ اس کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتی۔''

ہمارا خیال یہ تھا کہ وہ فوراً ٹکا سا جواب دے دیں گی مگر ہم حیران رہ گئے جب انہوں نے کہا''آپ ذرا مجھے کہانی تو سنائیں''

'ابھی سن لیں'' ہم الٹے پاؤں واپس ان کے گھر میں چلے گئے۔مختصر الفاظ میں ہم نے انہیں کہانی کا خلاصہ اوران کے کردار کی نوعیت کے بارے میں بتایا۔

وہ سن کر سوچ میں پڑ گئیں۔پھر بولیں''کردار تو بہت اچھا ہے مگر آفاقی صاحب لوگ کیا کہیں گے اوراگر میں ایک بار صبیحہ خانم کی ماں اور محمد علی اور وحید مراد کی نانی بن گئی تو پھر سب فلم ساز مجھے بوڑھی عورت کے کردار میں ہی لیا

کریں گے۔"

ہم نے کہا"آپ غور کرلیں کوئی زبردستی تو نہیں ہے۔ "

انہوں نے کہا"مابدولت کو سوچنے کا موقع تو دیں "

ہم نے کہا"سوچ لیں مگر یہ بلاوجہ کا تکلف ہوگا۔ "

دوسرے دن ہم ناشتا کر رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔دوسری جانب صابرہ سلطانہ بول رہی تھیں۔

"آفاقی صاحب! آپ کی شوٹنگ کب ہے؟ "

ہم نے انہیں بتایا۔انہوں نے چند لمحے کے توقف کے بعد کہا

"ٹھیک ہے آپ دودن پہلے مجھے پھر یاددلادیجئے گا۔ "

ہم مارے خوشی کے ان کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گئے۔

سٹوڈیو جاتے ہی ہم نے طارق صاحب کو یہ خوشخبری سنائی تو وہ حیران رہ گئے۔وہ تو یہ تجویز دے کر بھول ہی گئے تھے۔جب ہم نے اس کی تصدیق کردی تو انہیں خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی۔

"صابرہ مان گئیں؟" انہوں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"بالکل "!

"کمال ہے!" پھر وہ ہنس کر کہنے لگے۔" آپ پتا نہیں کیا پڑھ کر پھونکتے ہیں کہ کوئی آرٹسٹ آپ کی بات ہی نہیں ٹالتا "اس طرح صابرہ سلطانہ نے ہماری فلم "کنیز" میں ایک مختصر سا کردار ادا کیا اور نہایت عمدگی سے ادا کیا۔سفید بالوں اور ہلکے سے میک اپ کے بعد وہ پرانے زمانے کی ایک نواب بیگم ہی لگتی تھیں اور صبیحہ بھابھی کے ساتھ ان کی مشابہت اتنی زیادہ تھی کہ ہماری اماں نے جب فلم دیکھی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ واقعی وہ دونوں ماں بیٹی ہی لگتی ہیں۔کیا وہ سچ مچ میں آپس میں رشتے دار ہیں؟

صابرہ نے اپنے کردار کے ساتھ واقعی انصاف کیا تھا۔

اسلم پروز کو بھی ہم نے دو سین کے کردار کے لئے منتخب کیا تھا۔ وہ اس زمانے میں ہیرو تھے مگر ''شکوہ'' میں ویلن کا کردار کر کے بھی خوب داد سمیٹ چکے تھے۔

اسلم پرویز اتنے بامروّت، بااخلاق اور مخلص انسان تھے کہ فوراً مان گئے۔ اب ذرا ملاحظہ کیجئے کہ فلم میں ان کا کردار کیا تھا۔ جب صبیحہ خانم شوہر کی موت کے بعد سسر کی حویلی سے نکال دی جاتی ہیں اور ان کی ماں بھی اس صدمے سے جاں بحق ہو جاتی ہے تو وہ گھروں میں نوکری کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں تاکہ عزت آبرو کی روٹی کھا سکیں مگر وہ جہاں بھی جاتی ہیں اپنی صورت اور شکل اور جوان عمری کی وجہ سے ''میلی آنکھ'' سے دیکھنے والوں سے محفوظ رہنے کی خاطر نوکری چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ پھر ایک دن وہ اسلم پرویز کی کوٹھی پر پہنچ جاتی ہیں جہاں ان کی بیگم صبیحہ خانم کو گھریلو ملازمہ کے طور پر رکھ لیتی ہیں۔ اسلم پرویز صاحب بیگم کی غیر موجودگی میں موقع غنیمت سمجھ کر دست درازی کی کوشش کرتے ہیں تو صبیحہ خانم نہ صرف ملازمت کو ٹھوکر مار دیتی ہیں بلکہ اسلم پرویز کے چہرے پر طمانچہ بھی رسید کر دیتی ہیں۔ ان کی بیگم جب گھر واپس آتی ہیں تو اپنے شوہر کو الزام دینے کے بجائے صبیحہ خانم ہی کو برا بھلا کہہ کر گھر سے نکال دیتی ہیں۔

یہ کردار دو سین پر مشتمل تھا اور وہ بھی ایک اوباش فطرت مرد کا۔ اسلم پرویز اس وقت تک ہیرو کے طور پر مشہور تھے مگر انہوں نے کسی پس و پیش کے بغیر ہی یہ کردار قبول کر لیا۔ شوٹنگ کے لئے آئے تو سین کی ڈیمانڈ کے مطابق قیمتی نائٹ سوٹ، ریشمی نائٹ گاؤن اور بیڈروم سلیپر بھی ہمراہ لے آئے۔

شوٹنگ ختم ہوئی تو ان کے لئے روایت کے مطابق کافی منگوائی گئی۔ انہوں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے ہم سے کہا ''ٹھاکر! اور سب تو ٹھیک ہے مگر آپ نے یہ طمانچہ کس خوشی میں لگوا دیا۔ بھائی ویلن بنا دینا ہی کافی تھا مگر آپ نے تو جگ ہنسائی کا پورا سامان کر دیا۔ ''

ہم نے کہا ''ٹھاکر (ہم دونوں اچھے موڈ میں ایک دوسرے کو ٹھاکر ہی کہا کرتے تھے) بات دراصل یہ ہے کہ جب انسان کسی حرکت پر ذلیل ہو تو اسے اچھی طرح ذلیل ہونا چاہیے۔ ورنہ سچویشن موثر نہیں ہوتی''

وہ ہنسنے لگے "ٹھیک ہے آپ نے اپنی سچویشن میں اثر پیدا کرنے کیلئے ہمیں ہیروئن سے پٹوادیا۔ بس اسی بات کا افسوس رہے گا۔" یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ کئی فلموں میں صبیحہ خانم کے ساتھ ہیرو کا کردار کرتے آ رہے تھے۔ مگر ہم نے انہیں ویلن بنا کر صبیحہ کے سامنے لا کھڑا کیا۔

اسلم پرویز کی خوبیوں کا کیا بیان کریں۔ بعد میں تو وہ صرف ویلن ہی بن کر رہ گئے تھے اور اس روپ میں بے حد کامیاب اور مقبول ہوئے۔ مگر ان کی ذاتی شرافت اور بے شمار خوبیوں پر اس کا کوئی اثر نہ پڑ سکا۔ ویسے ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ عام طور پر فلموں میں جو اداکار کامیاب ویلن کہلاتے ہیں ذاتی زندگی میں انتہائی شریف اور نیک ہوتے ہیں۔ ہم نے کم و بیش سب ویلن ایسے ہی پائے۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ہماری فلم میں کردار بہت زیادہ تھے (چھوٹے موٹے کردار ملا کر) لیکن ہمارے بے تکلّف اداکار دوستوں کی تعداد ان سے بھی کہیں زیادہ تھی اور پھر ہر اداکار ہر قسم کے کرداروں کیلئے موزوں بھی نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ بیشتر اداکار دوست اس فلم میں کام نہیں کر سکے۔ مگر ان سب کی دعائیں اور نیک خواہشات ہمارے ساتھ تھیں۔ ہم نے عام رواج کے برعکس اپنی فلم کے سیٹ پر کافی کا اہتمام بھی کیا تھا ہمارے سٹوڈیو آفس میں بھی عمدہ کافی اور چائے دستیاب تھی جس کی وجہ سے دفتر کے سامنے برآمدے میں بہت سے اداکار حضرات کرسیوں پر تشریف فرما' کافی نوش کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ کئی حضرات کے چپڑاسی یہ فرمائش لے کر آتے تھے کہ صاحب نے یا میڈم نے کافی منگوائی ہے۔ ہم ان سے لاکھ کہتے کہ بھئی یہ فلم کا دفتر ہے کافی ہاؤس تو نہیں ہے مگر کسی کے کان پر جوں نہ رینگتی۔

فلم کی شوٹنگ خدا خدا کر کے مکمل ہوئی۔ سچ پوچھئے تو آخری گانا ہمارے لئے سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن کر رہ گیا تھا۔ خدا جانے کسی فقیر کی بددعا تھی یا کسی نے نظر لگا دی تھی۔ یہ گانا کسی طرح مکمل ہونے میں نہیں آتا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ گانا مکمل ہوا اور ہم نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو شوٹنگ کا مرحلہ تو ختم ہوا۔ ہر کام خوش اسلوبی سے سرانجام پایا تھا۔ نمایاں اداکاروں سے ہم نے معاوضہ ادا کرنے کے سلسلے میں ایک طریقہ کار طے کر لیا تھا اگر لوگوں کو فلم مکمل ہونے کے بعد بلکہ ریلیز ہوتے وقت ہی بقایا رقم ادا کی گئی۔ صرف سنتوش صاحب اور صبیحہ خانم دو ایسے فن کار تھے

جنہیں ہم نے معاہدے کے مطابق، ان کا کام ختم ہوتے ہی پورا معاوضہ ادا کر دیا تھا۔
آغا طالش سے یہ طے پایا تھا کہ فلم ختم ہونے پر ہی انہیں تمام معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ ہم نے ان سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ دیکھئے آغا صاحب! تکمیل کے دوران میں آپ ہم سے اداکاروں والا سلوک نہ کرنا اور ہرگز ایک پیسہ بھی نہ طلب کرنا۔ آغا طالش نے اپنا وعدہ پوری طرح نبھایا۔ صرف ایک بار ایسا ہوا کہ ان کا سیکرٹری ہمارے پاس ایک چٹ لے کر آیا جس میں انہوں نے لکھا تھا۔
"آفاقی! پوّے کو بھیج رہا ہوں ایک سو روپیہ دے دو"
پوّے کا اصلی نام ہم بھول گئے مگر پستہ قد ہونے کی وجہ سے آغا طالش نے انہیں پوّے (یعنی ایک پاؤ) کا خطاب دیا تھا اور پھر وہ اسی نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ یہ بڑے مزیدار آدمی تھے۔ آنکھوں میں سُرمہ، بالوں میں تیل، ان کا بیان تھا کہ رقص میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ انہیں کلاسیکل موسیقی جاننے کا بھی دعویٰ تھا۔ مگر آغا طالش کے ایسے مرید ہوئے کہ بقیہ زندگی ان کی صحبت میں ہی گزار دی۔ بہت مخلص اور درد مند آدمی تھے۔ کون تھے کہاں سے آئے تھے اس بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔
ہم نے آغا صاحب کی فرمائش کے مطابق پوّے صاحب کو ایک سو روپیہ ادا کر دیا۔ ایک سو روپے کا نوٹ اس زمانے میں کافی اہمیت رکھتا تھا۔ (یہ 1964ء کا تذکرہ ہے) اس کی قوت خرید کا اندازہ یوں لگایئے کہ ایک دن کی شوٹنگ کے اخراجات زیادہ سے زیادہ پچھتر یا سو روپے ہوتے تھے۔ یہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ ان میں سارے یونٹ کے لئے دوپہر کا کھانا۔ دن بھر کی چائے۔ سٹاف کے لئے کنوینس بل (دو روپے فی اسسٹنٹ) شامل تھا۔ ضروری ٹرانسپورٹ کا خرچہ بھی اسی میں شامل سمجھ لیجئے۔ ہم جو کافی بنواتے تھے اس کے لئے دس پندرہ روپے مزید خرچہ سمجھ لیجئے۔ سستا زمانہ تھا۔ آج تو سننے اور پڑھنے والوں کو بھی ان باتوں پر یقین نہیں آئیگا۔
ہمارے سٹوڈیو کے آفس میں شوٹنگ کے دنوں کے علاوہ بھی دفتر ہی میں چائے اور کافی بنانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اچھی سگریٹ کا پیکٹ غالباً پونے دو روپے کا تھا۔ دن بھر کیلئے ایک سیر چینی منگوائی جاتی تھی۔ ہم دو تین روز کے بعد اخراجات پر ایک نظر ڈال لیا کرتے تھے۔ ایک دن ہم سے ملازم نے کہا "صاحب جی! چینی ختم ہو گئی ہے۔"

''وہ کیسے ؟'' ہم حیران رہ گئے ''ابھی دو چار دن پہلے ہی تو پانچ سیر چینی منگوائی تھی۔ ''

وہ بولا 'صاحب جی ! چینی کا خرچ بھی تو بہت زیادہ ہے۔ سارے دن بلکہ رات گئے سب چائے اور کافی پیتے رہتے ہیں۔ ''

ہم کو شک ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ پوچھا ''شوٹنگ نہ ہو تو سارے دن میں کتنی پیالیاں بنائی جاتی ہیں۔''

بولا '' بیس سے کم نہیں بنتیں۔ ''

ہم نے بازار سے ایک سیر چینی منگوائی، سامنے میز پر رکھی اور کہا چائے کا چمچہ لے آؤ۔ وہ حیران تو ہوا مگر چلا گیا۔

ہم نے کہا ''دیکھو سب تو دو چمچے چینی استعمال نہیں کرتے اور نہ ہی یہ روز بیس پیالیاں بنائی جاتی ہیں۔ مگر پھر بھی فرض کر لیا جائے کہ بیس پیالیاں بنائی جاتی ہیں اور ہر پیالی میں دو چمچے چینی ڈالی جاتی ہے تو سارے دن میں چالیس چمچے چینی خرچ ہو گی۔ اب تم اس چینی سے چالیس چمچے نکالو۔''

اس نے ایسا ہی کیا اس کے باوجود چینی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

وہ شرمندہ ہو گیا بولا ''سر جی میرا خیال ہے چوہے کھا جاتے ہیں۔''

اس پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آیا جو ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔

ایک صاحب کا ملازم بہت بے ایمان اور چور تھا۔ ایک دن وہ پانچ سیر چینی لے کر آئے۔ تیسرے دن چینی ختم ہو گئی۔ بہت حیران ہوئے۔ نوکر سے پوچھا تو وہ سوچ سوچ کر بولا ''میاں صاحب یہاں تو میرے اور بلی کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ لگتا ہے کہ بلی کھا گئی ہے۔''

آقا نے کہا'' بلی کو پکڑ کر لاؤ اور وزن کرو ''

بڑی مشکل سے بلی پر قابو پایا اور اسے تولا گیا تو اس کا وزن پورا پانچ سیر تھا۔

نوکر نے کہا ''دیکھ لیا آپ نے ساری چینی بلی کھا گئی ہے۔ اب تو چینی کا پتا چل گیا نا؟ ''

مالک حیران ہو کر بولا ''ٹھیک ہے چینی تو مل گئی مگر سوال یہ ہے کہ بلی کہاں گئی۔ ''

ہم ابھی یہ ناپ تول کر ہی رہے تھے کہ طارق صاحب بھی آ گئے۔ میز پر چینی اور چمچہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ ہم

نے انہیں سارا ماجرا سنایا تو وہ ہنسنے لگے۔ ’’ارے آفاقی صاحب! فلم ساز کا دل بہت بڑا ہونا چاہیے۔ پانچ دس ہزار کا نقصان تو بھلا ہی دینا چاہیے۔ آپ بھی کیا چینی کا حساب کرنے بیٹھ گئے۔‘‘

وہ ہمیشہ ہمیں یہی نصیحت کرتے تھے مگر ہم ہر وقت حساب کتاب میں لگے رہتے تھے کسی دن شوٹنگ کینسل ہو گئی تو بیٹھے حساب کر رہے ہیں کہ کتنے روپے ضائع ہو گئے۔ مگر یہ سب دو چار مہینے تک ہی رہا۔ پھر تو رفتہ رفتہ ہمیں صبر آ گیا اور یہ احساس ہوا کہ واقعی طارق صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ فلم ساز اگر پیسوں کا حساب کرنے بیٹھ جائے تو کام رُک جاتا ہے جب کہ فلم کا قصّہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ کتنا ہی خرچہ ہو جائے وقت مقررّہ پر مطلوبہ کام ہو جانا چاہیے۔ ورنہ بہت زیادہ نقصان ہو جاتا ہے۔ طارق صاحب کہا کرتے تھے ’’آفاقی صاحب! فلم ساز کا دل جواری کے دل کی طرح بڑا ہونا چاہیے۔ جو شخص نقصان برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا اسے فلم ساز بننا ہی نہیں چاہیے۔‘‘

تجربے نے بتا دیا کہ ان کی بات سولہ آنے صحیح تھی۔ ’’کنیز‘‘ کی تکمیل تک ہم پکّے فلم ساز بن چکے تھے۔ یعنی چند سو یا چند ہزار کا نقصان ہو جاتا تو پیشانی پر شکن تک نہیں آتی تھی۔ کوئی لکھ پتی کروڑ پتی بھی اس خندہ پیشانی اور حوصلے سے نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ جس طرح کی فلم ساز کر لیتا ہے۔ حالانکہ جیب خالی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے کروڑ پتی لوگ بھی فلم ساز بننے کے لئے فلمی صنعت میں آئے مگر ایک فلم بنا کر حوصلہ ہار گئے اور کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔ اگر فیاضی اور نقصان برداشت کرنے کا حوصلہ اور کھلے دل سے پیسہ خرچ کرنے کی عادت اپنانی ہے تو فلم ساز بن جایئے ،ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے‘ ایک فلم کے بعد یا تو میدان چھوڑ جائیں گے یا پھر ہمیشہ کے لئے اس میدان میں ڈٹ جائیں گے۔ نفع ہو یا نقصان، کہتے ہیں جو شخص ایک بار فلم ساز بن جائے وہ پھر کوئی دوسرا کام کرنے ’’جوگا‘‘ نہیں رہتا۔

فلم سازی میں ہم نے یہ سب سیکھا کہ کون سا کام کس طرح ہوتا ہے۔ اس کا کھوج لگانا چاہیے ورنہ آپ ہمیشہ دوسروں کے دست نگر ہی رہیں گے اور وہ آپ کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر آپ کو دونوں ہاتھوں سے لوٹیں گے۔

فلمی دنیا میں یہ خیال عام تھا کہ سستی اور اچھی فلم ایک اچھے پروڈکشن کنٹرولر کے بغیر نہیں بنائی جا سکتی۔ ہم نے فلم کا آغاز کیا تو پروڈکشن کی ذمہ داری رحیم کے سپرد کی گئی۔ طارق صاحب کا کہنا تھا کہ یہ بہت کام کا آدمی ہے۔ آدھی رات

کو بھی سیٹ پر کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے تو رحیم حاضر کر دیتا ہے۔ تجربے سے ثابت ہوا کہ یہ بات درست بھی تھی۔ مثلاً رات کو نو بجے ایک غریب گھر کے لئے باورچی خانے کا سامان اور چارپائی مع بستر درکار ہے تو رحیم جواب میں "اوکے سر" کہہ کر غائب ہو جائے گا۔ کچھ دیر بعد وہ سب چیزیں سیٹ پر موجود ہوں گی۔ رحیم کی اس خوبی سے ہم بھی بہت مرعوب ہو گئے۔ مگر جب حساب چیک کرنے بیٹھے تو دیکھا کہ کئی اخراجات بہت زیادہ اور غیر ضروری ہیں۔ ہمارے اکاؤنٹنٹ ای۔ ایم۔ آئی گراموفون کمپنی کے بابو فضل تھے جو فلمی دنیا میں "بابو جی" کے نام سے مشہور تھے۔ وہ ہماری بے پروائی سے تنگ تھے اور ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ صاحب جی! حساب کتاب کی طرف دھیان دیجئے۔ یہ بھی ضروری کام ہے۔ ان کے بار بار کہنے پر ہم نے اخراجات کا حساب چیک کرنا شروع کر دیا تو رحیم کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ جب ہم نے سوال کیا تو اس نے عذر پیش کیا کہ میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اس لئے فرصت ملنے پر کسی کو حساب لکھواتا ہوں۔ کئی بار کئی اخراجات بھول بھی جاتا ہوں۔ ہم نے اپنے ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے سپرد یہ ذمہ داری کر دی کہ وہ ہر روز کی شوٹنگ کا حساب اس رات یا اگلی صبح لکھ دیا کرے۔ مگر اکثر ہمیں کئی روز تک حساب ہی نہیں ملتا تھا اور جب ملتا تو غلط، ایک روز ہم رحیم پر بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ بھئی اس طرح کام نہیں چلے گا۔

وہ بولا "سر جی! پھر آپ پہلی تاریخ کو کسی اور پروڈکشن والے کا انتظام کر لیں اور مجھے فارغ کر دیں۔"

ہمیں بہت غصّہ آیا۔ ہم نے کہا "تو پھر تو آج ہی بابو جی کے پاس جا کر اپنا حساب کر لو۔ پہلی کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

یہ غیر متوقع جواب سن کر وہ حیران رہ گیا۔ پھر کہا "آفاقی صاحب میں طارق صاحب کا پرانا نمک خوار ہوں۔ آپ کا بھی نمک کھایا ہے۔ یہ نہیں چاہوں گا کہ آپ کا نقصان ہو۔ جب تک دوسرا انتظام نہ ہو میں کام کرنے کو تیار ہوں۔"

ہم نے کہا "رحیم! یہ دھمکی آمیز سلوک ہمیں کسی قیمت پر بھی قبول نہیں ہے۔ اب تم چلے ہی جاؤ تو بہتر ہے۔ ہم کام چلا لیں گے۔"

رحیم کے جانے کے بعد احساس ہوا کہ ہم نے غصّے میں ایک غلط فیصلہ کر دیا ہے۔ دوسرے دن شوٹنگ تھی اس کے لئے ڈیکوریشن کا سامان اور دوسری چیزیں کہاں سے آئیں گی؟ واقعی غصّہ حرام ہے اس سے نقصان کے سوا کچھ حاصل

نہیں ہوتا۔

ہم یہ سوچ رہے تھے کہ سیٹ پر شوٹنگ کے لئے فرنیچر فراہم کرنے والے حاجی صاحب آ گئے۔ ہمیں پریشان دیکھ کر سبب پوچھا ہم نے بتایا تو ہنسنے لگے۔

بولے " آفاقی صاحب ! سیٹ پر ڈیکوریشن کی ہر چیز تو ہم فراہم کرتے ہیں۔ پروڈکشن والا تو بس ہمیں فہرست دے دیا کرتا ہے۔ سیٹ پر سامان آپ کے اسسٹنٹ چیک کرتے ہیں۔ پھر مشکل کیا ہے ؟ "

"واقعی ؟" ہم حیران رہ گئے "مگر حاجی صاحب' یہ تو اپرات، بیلن، غریبانہ برتن، بستر، ٹین کے صندوق وغیرہ کہاں سے آئیں گے ؟ "

"فہرست دے دیجئے۔ سٹوڈیو کے سامنے سڑک کی دوسری طرف ان لوگوں کے گھر ہیں۔ دیہاتیوں کے مکان بھی ہیں۔ وہ آدھے گھنٹے میں ساری چیزیں سیٹ پر پہنچا دے گا۔ "

ہم نے ایسا ہی کیا اور تمام چیزیں ایک گھنٹے کے اندر سیٹ پر موجود تھیں۔ ان لوگوں نے بتایا کہ صرف پندرہ منٹ کے نوٹس پر وہ اس طرح کا سامان فراہم کر دیتے ہیں۔ لیجئے ہم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے تھے۔ جسے ہم بہت بڑا مسئلہ سمجھ رہے تھے۔ وہ یوں پلک جھپکنے میں حل ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے اس طرف مزید توجہ دی تو معلوم ہوا کہ پروڈکشن جسے فلم ساز ایک مصیبت سمجھتے ہیں بے حد آسان کام ہے۔ آپ کو صرف یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کون سی چیز کہاں سے آتی ہے اور کون فراہم کرتا ہے۔

چند دن بعد رحیم ہمارے پاس دوبارہ آ گیا۔ بہت معذرت کی اور یقین دلایا کہ آئندہ کوئی گڑ بڑ نہیں کرے گا۔

ہم نے کہا "دیکھو رحیم۔ تھوڑا بہت نقصان یا زیادہ خرچ کوئی بات نہیں ہے۔ مگر یہ اصولاً غلط ہے۔ اگر ہر روز تیس چالیس روپے فالتو خرچ ہو جائیں تو سال کے بعد فلم کے بجٹ پر ہزاروں کا فرق پڑ جائے گا۔ (اس زمانے میں فلمیں عموماً ڈھائی لاکھ روپے میں مکمل ہو جاتی تھیں) اور پھر جانتے بوجھتے بے وقوف بننا ہمیں کسی صورت منظور نہیں ہے۔ تمہیں اگر ضرورت ہے تو ہم سے کہو مگر ہمارے ساتھ بے ایمانی مت کرو۔ "

رحیم نے عہد کیا کہ آئندہ ایسا نہیں کرے گا اور اس عہد کی پاسداری بھی کی۔

ہر مہینے وہ ایڈوانس مانگ لیتا تھا جو تنخواہ سے وضع نہیں ہوتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر ہم اسے تنخواہ کے علاوہ بھی رقم دے دیا کرتے تھے۔ اس طرح ہمارے درمیان ایک شریفانہ معاہدے طے پا گیا جو بعد میں بھی قائم رہا۔

رحیم کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ وہ جنوبی ہندوستان سے تعلق رکھتا تھا۔ دبلا پتلا سیاہ رنگ مگر بے حد ذہین اور سمجھدار، کوئی زبان لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا مگر حافظہ غضب کا تھا۔

حسن طارق صاحب کہا کرتے تھے کہ رحیم تو مجھے ورثے میں ملا ہے۔ ہوا یہ کہ پہلے رحیم نے سیف الدین سیف کے گھر میں کام کیا۔ پھر انہوں نے طارق صاحب کی پروڈکشن میں رکھوا دیا۔

رحیم ہر قسم کا کام کر سکتا تھا۔ مثلاً رات کو بارہ بجے طارق صاحب نے اندر چابیاں رکھ کر کار لاک کر دی، کار وہیں چھوڑ دی اور رحیم کو آکر بتایا کہ فلاں جگہ گاڑی کھڑی ہے۔ لاہور اس زمانے میں رات کو آٹھ بجے ہی سنسان اور ویران ہو جاتا تھا۔ نہ آدم ' نہ آدم زاد نہ کسی قسم کی سواری دستیاب تھی۔

مگر کچھ دیر بعد ہی رحیم کار لے کر پہنچ جاتا تھا۔ یہ کارنامہ وہ کس طرح سرانجام دیتا تھا یہ کوئی نہیں جان سکا۔ یہ حقیقت ہے کہ رحیم کو صرف کام بتا دینا کافی تھا۔ تکمیل تک پہنچانا اس کا ذمہ ہوتا۔ وہ ڈرائیور تھا، مکینک تھا ' باورچی تھا۔ ہر قسم کا گھریلو کام کر لیتا تھا۔ پروڈکشن منیجر سے ترقی کر کے وہ آخری زمانے میں اقبال شہزاد صاحب اور شباب کیرانوی کے سٹوڈیوز میں منیجر کے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ طارق صاحب کہا کرتے تھے کہ آفاقی رحیم کے قبضے میں جنّ ہے مگر ہمارا خیال یہ تھا کہ یہ بذات خود جنّ ہے۔

خوش حالی آئی تو ایک سچے مسلمان کی طرح رحیم نے دوسری شادی بھی کر لی جو فلموں میں کام کرنے والی خاتون تھی۔ دو گھروں کا خرچہ اٹھانا مشکل تھا۔ پھر دوسری بیگم کی فرمائشیں فریج، ٹی وی، ملبوسات، ان پریشانیوں نے رحیم کی صحت کو گھن لگا دیا تھا۔ ایک دن سنا کہ ہر وقت ہنسنے والا شخص مر گیا ہے۔ بہت دکھ ہوا' جیسا بھی تھا وہ بہت ہنر مند اور گُنی آدمی تھا۔ گھریلو ملازم اور ڈرائیور اور باورچی سے ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر ترقی کر کے وہ پروڈکشن منیجر اور پھر سٹوڈیو منیجر کے عہدے تک پہنچ گیا تھا حالانکہ بالکل ان پڑھ تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ عشق کے چکر میں پڑ کر

دوسری شادی نہ کرتا تو ایک مطمئن اور آسودہ زندگی گزارتا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہر مشکل ہی ''اگر'' سے شروع ہوتی ہے۔

یہ تفصیل بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہمیں ہر کام کا کھوج لگانے کی عادت ہے۔ جو بھی کرتے ہیں اس کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب ہم فلمی صحافی بنے اور سٹوڈیو جانا شروع کیا تو فلم سازی کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے ہم سکرین پلے لکھنے کے سلسلے میں سعادت منٹو صاحب سے لے کر ڈبلیو زیڈ احمد صاحب تک سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان میں اور بھی بہت سے حضرات تھے جن سے ہم یہ ہنر سیکھنے کی کوشش کرتے رہے اور جب لقمان صاحب سے دوستی ہوئی اور ان کے سکرپٹ کی تیاری کے سلسلے میں ہنر مندوں کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا تو ہم نے اس بارے میں اور بھی بہت سی گر کی باتیں جان لیں یہاں تک کہ خود بھی سکرین پلے اور مکالمے لکھنے لگے۔

فلمی دنیا میں ہم گئے تو اس کے ہر شعبے کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے صحافی تھے تو اس کے تمام پہلوؤں سے واقف ہو گئے تھے اور صحافت سے تعلق رکھنے والا کوئی کام ایسا نہیں تھا جو ہم نے خود عملی طور پر نہ کیا ہو۔ فلم کے سکرپٹ لکھنے بیٹھے تو فلم سازی کے دوسرے مراحل اور مسائل کو دیکھا 'سنا اور غور کیا۔ معلومات حاصل کیں۔ یہاں تک کہ ان مسائل سے بھی آگاہ ہو گئے۔ ہماری یہ بُری یا اچھی عادت ہمارے لئے دردِ سر بھی ہے مگر ایک خداداد نعمت بھی ہے۔ اس عادت کی بدولت ہی ہم بعض شعبوں کے بارے میں بُری بھلی معلومات حاصل کر سکے ہیں۔ ہم فلم ساز بنے تو اس شعبے کے رموز سے بخوبی واقف تھے۔ ہدایت کاروں کو بھی دیکھا تھا اور فلم سازوں کو بھی۔ پروڈکشن کنٹرولر سے بھی واسطہ پڑتا جارہا تھا اور سوالات کر کر کے ہم ان سے بہت کچھ سیکھ چکے تھے۔ یہ سب کچھ بطور فلم ساز ہمارے لئے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ اپنے ہدایت کار حسن طارق کیلئے ہم نے صرف ہدایت کاری ہی کی ذمے داریاں چھوڑی تھیں باقی سارے کام ہم خود کر لیتے تھے۔ جو نہیں جانتے تھے وہ جاننے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ فلم ڈسٹری بیوشن اور ایگزی بیشن کے مسائل سے بھی آگاہ ہو گئے۔ یہ سچ ہے کہ ہم نے زندگی میں دو چار کام ہی

کئے ہیں مگر یہ اطمینان ہے کہ ان کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے اور ان کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان معاملات میں کوئی ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتا۔ یہ تمام معلومات ہماری انگلیوں پر ہیں۔

فلم ”کنیز“ کی شوٹنگ خدا خدا کر کے ختم ہوئی۔ اس کی تکمیل کے دوران میں ہزار طرح کے مسائل اور مراحل کا سامنا کرنا پڑا مگر خدا کا شکر ہے کہ سرمایے کے بغیر' عزت و آبرو کے ساتھ فلم مکمل کر لی۔ کچھ اداکاروں کو ہم نے حسب معاہدہ پے منٹ کر دی تھی۔ باقی پیسے فلم کی نمائش کے وقت دے دیئے۔ وحید مراد کو حسب وعدہ پوری رقم ادا کر دی گئی تھی جب کہ زیبا اور محمد علی سے اُدھار کیا تھا۔ مگر طے شدہ پروگرام کے مطابق انہیں بھی ادائیگی کر دی گئی۔ طالش صاحب نمایاں اداکاروں میں واحد اداکار تھے جنہیں فلم کی تکمیل کے دوران میں ہم نے صرف ایک سو روپیہ ادا کیا تھا اور وہ بھی کاپی میں درج نہیں کیا تھا۔ اس خیال سے کہ اس رقم کا ہماری دانست میں ان کے معاوضے سے کوئی تعلق نہ تھا۔

فلم کی ریلیز سے دو دن پہلے جب ڈسٹری بیوٹر حضرات نے فلم کے پرنٹ وصول کر کے ہمیں بقایا رقم ادا کی تو ہم فوراً سب کا بقایا حساب چکانے میں مصروف ہو گئے۔ سب سے آخر میں آغا طالش کے پاس پہنچے۔ وہ حسبِ معمول شاہ نور سٹوڈیو میں تشریف فرما تھے۔

”کیوں میاں۔ اب کس لئے آئے ہو؟“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا ”اب تو تمہاری فلم مکمل ہو چکی ہے۔ دو دن بعد ریلیز ہو رہی ہے۔“

ہم نے کہا ”آغا صاحب ہم کام کے بغیر بھی آ سکتے ہیں۔“

”کیوں نہیں' جم جم آؤ۔ بیٹھو۔ چائے پیو بالائی والی۔“ پھر انہوں نے آواز دی ”پوّے۔ آفاقی صاحب کے لئے عمدہ چائے اور حقّے کا تمبا کو لے کر آؤ۔“

”حقّے کا تمبا کو کس لئے؟“ ہم نے پوچھا۔

”بھئی چرس تو ہمارے پاس ہے نہیں کہ سگار سے خاطر کریں۔ چِلم بھر کر پلا دیں گے۔“

”شکریہ۔ ہمارے پاس اپنا ذاتی پائپ موجود ہے۔“

''تو پھر چائے پر ہی گزارہ کر لو۔ چلو پوّے۔ بالائی والی چائے۔''

پوّے صاحب دانت نکالتے ہوئے رخصت ہو گئے تو ہم نے جیب سے دس ہزار روپے کی ایک گڈی نکالی اور طالش صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ انہوں نے حیران ہو کر دیکھا اور بولے ''یہ کیا ہے؟''

''آپ کی امانت۔ آج ہماری فلم کی ڈیلیوری ہو گئی ہے پیسے ملے تو آپ کا حصہ لے کر آ گئے۔''

انہوں نے نوٹوں کو دیکھا۔ پھر ہمیں دیکھا اور خوش ہو کر گلے سے لگا لیا ''بھئی آفاقی! تم تو بڑے کام کے آدمی نکلے۔ مانگے بغیر ہی معاوضہ لے کر آ گئے اور وہ بھی اکٹّھا دس ہزار۔ نہ قسط باندھی نہ پریشانی اور نقصان بتا کر رعایت کرائی۔ بھائی تم کامیاب فلمساز نہیں بن سکتے۔ خدا کرے تمہاری فلم کامیابی کے جھنڈے گاڑ دے۔ بہت بہت شکریہ۔ یہ اکٹّھی رقم اب کسی کام آ جائے گی۔''

ہم نے کہا ''آغا جی۔ شکریہ آپ کا ادا کرنا چاہیئے جس نے ہم پر بھروسہ کیا اور اُدھار کر لیا۔''

انہوں نے گڈّی میں سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر ہماری طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا؟'' ہم نے پوچھا۔

''بھول گئے؟ ارے بھئی تم سے ایک بار سو روپے منگائے تھے پوّے کے ہاتھ۔''

ہم نے کہا ''ارے طالش صاحب۔ چھوڑیئے۔''

''کیوں بھئی۔ کس حساب میں؟''

ہم نے کہا ''حسابِ دوستاں در دل۔ وہ دوستی تھی۔''

خوش ہو کر بولے ''بھائی تم تو واقعی معقول آدمی ہو۔ پوّے دیکھو۔ آفاقی صاحب کے لئے دو کپ چائے لے کر آنا۔ بالائی والی۔''

مگر فلم کی نمائش سے پہلے کے حوادث بھی سُن لیجئے جن کے بغیر یہ داستان نامکمل رہ جائے گی۔ یہ ایک علیحدہ دکھ بھری کہانی ہے۔

فلم کی شوٹنگ مکمل ہو گئی اور رش پرنٹس نکالے گئے۔ جس کسی نے یہ رش دیکھے پسندیدگی کا اظہار کیا اور ہماری فلم کی

شہرت ساری فلم انڈسٹری میں پھیل گئی۔اب ہر تقسیم کار کی خواہش تھی کہ وہ زیادہ رقم دے کر ’’کنیز‘‘ کے حقوقِ تقسیم حاصل کر لے حالانکہ یہ حقوق ہم آغاز ہی میں دے چکے تھے۔ کراچی ’سندھ‘ بلوچستان کے سرکٹ کے لئے وحید مراد کے والد نثار مراد صاحب نے یہ فلم خرید لی تھی۔ پنجاب کے سرکٹ کے لئے یہ فلم پنجاب پکچرز نے حاصل کی تھی۔ تیسرا سرکٹ مشرقی پاکستان کا تھا جس کے لئے برکت بھائی تقسیم کار تھے۔ برکت بھائی غالباً میمن تھے اور مشرقی پاکستان میں بزنس کرتے تھے۔ پھر انہوں نے فلم کی تقسیم کاری کا دھندا بھی شروع کر دیا اور ہماری پہلی فلم خریدنے لاہور پہنچ گئے۔ چالیس سال کے لگ بھگ عمر تھی۔ ہنس مکھ اور خوش مزاج آدمی تھے۔ سانولا رنگ‘ مناسب نقش و نگار‘ درمیانہ قد‘ بعد میں تو ان سے دوستی ہو گئی تھی۔ جب تک ہم فلمیں بناتے رہے اور مشرقی پاکستان قائم رہا وہی ہمارے تقسیم کار تھے حالانکہ بعد میں ڈھاکہ کے بڑے بڑے تقسیم کار بھی فلمیں خریدنے کے خواہش مند تھے مگر ہمارا اور برکت بھائی کا ساتھ قائم رہا۔ طریقۂ کار یہ تھا کہ ہم فلم شروع کرتے تو برکت بھائی کو ٹرنک کال کر کے بتا دیتے۔

’’ٹھیک ہے آفاقی صاحب۔ بس سودا ہو گیا۔ لاہور آ کر سائن کر لوں گا۔‘‘

’’مگر آپ نے نہ فلم کا نام پوچھا۔ نہ کاسٹ اور نہ ہدایتکار کا نام۔‘‘

’’آفاقی بھائی۔ آپ کی فلم ہے۔ آپ بنا رہے ہیں بس یہی کافی ہے۔‘‘

’’مگر برکت بھائی۔ ایم جی کی رقم بڑھانی پڑے گی۔‘‘ ہم کہتے۔

وہ ہنس کر کہتے ’’بڑھا لیں، مجھے پتا ہے کہ آپ میرے ساتھ زیادتی نہیں کریں گے۔ جیسے کہیں گے کر لیں گے۔‘‘

لاہور آ کر وہ ہمیں ایڈوانس کی رقم دے دیا کرتے تھے۔ بقایا رقم ریلیز کے وقت ادا کر دیتے تھے۔ بڑی سہولت اور عمدگی سے کام چل رہا تھا۔ ان کے ساتھ ایسا تعلق قائم ہو گیا تھا کہ جب ہم نے فلم ’’سزا‘‘ کا آغاز کیا تو ڈر تھا کہ نئے اداکاروں کی فلم خریدنے میں بہت کم تقسیم کار دلچسپی لیں گے اور مشرقی پاکستان والے تو اونے پونے دام ہی لگائیں گے۔

ہم نے برکت بھائی کو فون کر کے اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے۔اگلے مہینے لاہور آ کر سائن کر لوں گا۔''

''مگر اس میں کاسٹ نئی ہے۔'' ہم نے بتایا۔

''آپ تو پرانے ہیں نا۔''

''مگر ایم جی ہم ''میرا گھر میری جنّت'' سے زیادہ لیں گے۔''

''بات کر لیں گے۔''

''اس کے ڈائریکٹر طارق صاحب نہیں ہیں۔''

''ارے۔وہ کیوں۔آپ کی تو اتنی گہری دوستی ہے۔''

''بس۔وہ ذرا زیادہ مصروف ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔بس فلم میری ہو گئی۔'' انہوں نے کوئی اور بات ہی نہیں کی۔

کراچی کے لئے ''سزا'' کے حقوق انیس دوسانی صاحب نے خریدے تھے جس کی روداد ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ان سے بھی ہماری خاصی دوستی تھی۔وہ مشرقی پاکستان کے سرکردہ فلم ساز' تقسیم کار اور نمائش کار تھے۔کراچی میں انہوں نے نیا نیا دفتر کھولا تھا مگر ڈھاکا میں وہ پرانے تقسیم کار تھے۔ہم نے ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ مشرقی پاکستان کے لئے ہمارے تقسیم کار برکت بھائی ہیں۔آپ کراچی اور پنجاب کی بات کر لیں۔انہوں نے ہماری اس وضع داری کو سراہا اور کراچی کے لئے فلم خرید لی۔

برکت بھائی بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ تھوڑے رنگین مزاج بھی تھے۔لاہور آتے تو رونق لگ جاتی تھی مگر ہماری ان سے ملاقات دن کے اوقات ہی میں ہوتی تھی۔ان کے رات کے مشاغل میں ہم شریک نہیں ہوتے تھے۔ ان کی عادت یہ تھی کہ جب تک دو پیالی چائے اور سگریٹ نہیں پی لیتے تھے ٹائیلٹ سے فراغت نہیں پا سکتے تھے۔ہم صبح ہوٹل پہنچتے تو ان کے ساتھ ہی چائے کی دو پیالیاں نوش کرتے۔پھر وہ سگریٹ سلگاتے۔کمرے میں ٹہلتے جاتے اور گپ شپ کرتے رہتے۔دوسری سگریٹ ختم کر کے کہتے ''اوکے۔میں تیار ہو کر آتا ہوں آپ اتنی دیر اخبار پڑھئے۔'' وہ ہمیں ڈھاکہ مدعو کرتے رہتے تھے مگر ان دنوں وہاں جانے کا موقع نہ مل سکا۔انہوں نے ڈھاکہ میں پوش علاقے

میں بنگلہ بنایا تھا جس کے تہ خانے میں ان کا (بقول ان کے) شاندار بار تھا۔ وہاں شام پڑتے ہی محفل آرائی شروع ہو جاتی تھی۔ فلم کے علاوہ بھی ان کا دوسرا کاروبار تھا۔ دولت مند آدمی تھے۔ مگر جب مشرقی پاکستان سے لُٹ پٹ کر آئے تو تن کے کپڑوں کے سوا کچھ پاس نہ تھا۔ وہ کراچی میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ ہاں بچوں کے ساتھ کہیں سر چھپا کر بیٹھے تھے۔ ایک بار لاہور آئے تو ملاقات ہوئی۔ خاصے جھٹک گئے تھے۔ وہ ازسرِ نو زندگی شروع کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے مگر ایک بار بھی حالات کا شکوہ ان کی زبان سے نہیں سُنا۔

کچھ عرصے بعد سنا کہ برکت بھائی کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ایک پرانا تعلق ٹوٹ گیا۔ خدا جانے کہاں رہتے تھے۔ کیا کام کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد بال بچے کس حال میں ہیں؟ مگر برکت بھائی کا خلوص اور وضعداری ہمیشہ یاد رہے گی۔ وہ بھی انقلابِ زمانہ کی نذر ہو گئے۔

پنجاب کے حقوق ’’ پنجاب پکچرز ‘‘ نے حاصل کئے تھے۔ لاہور میں جب درگاہ داتا صاحب کو قومی تحویل میں لیا گیا تو اس دربار سے وابستہ مجاور حضرات اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے محروم ہو گئے۔ کئی حضرات نے فلمی صنعت کا رُخ کیا۔ بعض فلمساز بنے۔ بعض تقسیم کار بن گئے۔ ہمارے ڈسٹری بیوٹرز بھی داتا صاحب کے مجاور تھے۔ یہ دو حصّے دار تھے۔ میاں ذوالفقار اور میاں خادم حسین۔ دونوں قریب قریب ہم عمر تھے۔ رائل پارک میں انہوں نے تقسیم کاری کا شاندار دفتر بنایا تو دونوں پارٹنر ایک ہی میز پر بیٹھا کرتے تھے۔ بہت پیار‘ خلوص اور ایکا تھا دونوں میں حالانکہ مزاجوں میں قدرے فرق تھا۔ میاں ذوالفقار بھاری جسم کے سرخ و سفید رنگت کے تھے۔ ہر وقت ہنستے رہتے تھے۔ ان کا چہرہ قندھاری انار کے مانند سُرخ تھا۔ تندرست آدمی تھے۔

میاں خادم حسین عمر میں چند سال کم ہوں گے مگر وہ بھی ہنس مکھ اور زندہ دل تھے۔ دراز قد اور چھریرے جسم کے مالک تھے۔ رنگ سانولا تھا مگر خوش شکل انسان تھے۔ ہم نے ان جیسے دیانت دار اور امانت دار تقسیم کار پھر نہیں دیکھے۔ ان سے معاہدے کے مطابق قسطوں کی ادائیگی کا جو طریقہ طے ہو چکا تھا اس میں کبھی بھی مشکل پیش نہیں آئی بلکہ اگر اچانک مشکل پڑ جاتی اور رقم کی ضرورت پیش آجاتی تو طارق صاحب ان دونوں سے رجوع کرتے۔

وہ کہتے ''طارق صاحب ! ایگریمنٹ سے زیادہ پیسے لے چکے ہیں آپ۔''

''میاں ضرورت پڑ گئی ہے تو کیا کریں۔ کام بھی ضروری ہے ورنہ کام اٹک جائے گا۔''

''آپ کے دوسرے ڈسٹری بیوٹر بھی تو ہیں۔'' وہ دلیل پیش کرتے۔

''میاں' یہ بات چھوڑو۔ بس پیسے کا بندوبست کر دو۔''

وہ سوچ میں پڑ جاتے۔ دونوں ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشی کرتے۔ بعض اوقات باہمی مشورہ کرنے کے لئے پچھلے کیبن میں چلے جاتے۔ ہم چائے پیتے رہتے تھے۔

ہم طارق صاحب سے کہتے ''طارق صاحب۔ انہوں نے اپنی پوزیشن بتا دی ہے۔ ان کے لئے پیسے کا بندوبست کرنا مشکل لگتا ہے۔''

''یہ بڑے پہنچے ہوئے لوگ ہیں۔'' طارق صاحب بڑے اعتماد سے کہتے ''کچھ نہ کچھ بندوبست کر ہی لیں گے۔''

دونوں '' میاں'' برآمد ہوتے اور کہتے ''ٹھیک ہے۔ کچھ کرنا پڑے گا۔ مگر یہ کوئی انصاف نہیں ہے۔''

ہم کہتے ''میاں ! انصاف تو دنیا سے اٹھ ہی گیا ہے شاید۔''

وہ دونوں ہنسنے لگتے، پھر وہ نہ جانے کہاں کہاں سے پیسے اکٹھے کر کے ہمیں لا دیتے تھے۔ بعض اوقات تو سینماؤں سے بھی ایک ایک اور دو دو روپے کے نوٹ لے آتے اور ہمارے سامنے میز پر ڈھیر لگا کر کہتے۔'' آفاقی صاحب گن لیں۔''

''چھوڑیں میاں صاحب۔ ہمیں آپ پر بھروسہ ہے۔'' اور ہم وہ پوٹلی اٹھا کر لے آتے۔

جب '' کنیز'' کے بیک گراؤنڈ موسیقی کی ریکارڈنگ شروع ہوئی تو حسب معمول ہمارے پاس پیسے بھی نہیں تھے۔ البتہ میاں ذوالفقار نے وعدہ کیا تھا کہ چھ ستمبر کو ہمیں دس ہزار روپے کی قسط دے دیں گے۔ چنانچہ ہم نے سازندوں سے کہہ دیا کہ آپ کو سات ستمبر کو پیسے مل جائیں گے۔ انہیں بھی ہماری زبان پر بھروسہ تھا اس لئے مان گئے۔

موسیقار خلیل احمد دھنیں تو بناتے ہی تھے مگر بیک گراؤنڈ موسیقی کے تو وہ ماہر تھے۔ اکثر موسیقار بار بار فلم دیکھتے تھے۔ اسسٹنٹ کو نوٹ کراتے تھے پھر ٹکڑوں میں ریکارڈ کرتے تھے۔ اس کام میں کئی دن لگ جاتے تھے۔ مگر خلیل

میاں کا ڈھنگ کچھ اور ہے۔ وہ ایک دن اکیلے بیٹھ کر فلم دیکھتے ہیں اور نوٹ کر لیتے ہیں۔ جب ریکارڈنگ شروع ہوتی ہے تو وہ دوسرے موسیقاروں کی طرح فلم کے مناظر چلا کر بیک گراؤنڈ موسیقی ریکارڈ نہیں کرتے تھے بلکہ پھر وہ سرے سے فلم دیکھتے ہی نہیں تھے بس موسیقی بنا کر ریکارڈ کراتے رہتے ہیں جو عین منظر کے مطابق ہوتی تھی۔ اس طرح وقت بھی بچتا تھا اور پیسہ بھی۔ یہ ان کی نوٹیشن کا کمال تھا۔ پاکستان میں بہت کم موسیقار یہ ہنر جانتے ہیں۔

بیک گراؤنڈ موسیقی کی ریکارڈنگ مکمل ہو گئی تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو۔ ایک اور مرحلہ طے ہوا۔ اب سکھ کا سانس لینا نصیب ہو گا۔۔۔ مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

چھ ستمبر 65ء کی صبح طلوع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی یہ روح فرسا خبر بھی سارے ملک میں پھیل گئی کہ بھارتی فوجوں نے رات کے اندھیرے میں پاکستان کی سرحدوں پر حملہ کر دیا ہے اور بھارتی فوجیں باٹا پور تک پہنچ چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ریڈیو سے صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خاں کی آواز گونجی جس نے ساری قوم کے دلوں کو گرما دیا۔

''میرے عزیز ہم وطنو!''۔

یہ تقریر اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے اور اس جنگ کے نتیجے میں پاکستانی افواج اور پاکستانی قوم نے جس پامردی اور اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا وہ بھی اب ایک داستان پارینہ بن چکی ہے۔

بھارتی فوج کے حملے کے ساتھ ہی افواہیں بھی گرم ہونے لگیں، ''بھارتی فوجیں نہر تک آپہنچی ہیں۔ لاہور خطرے میں ہے شہر کے دفاع کا کوئی مناسب بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے بھارتی افواج کی پیش قدمی بلا روک ٹوک جاری ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اس خبر کا پہلا ردّعمل یہ تھا کہ لوگوں نے خوراک اور پیسے کا ذخیرہ کرنا شروع کر دیا۔ لاہور سے بہت سے لوگوں نے غیر یقینی حالات کی بناء پر نقل مکانی کا ارادہ کیا اور مختلف ذرائع آمد و رفت کے ذریعے رخصت ہونے لگے۔ لوگ بینکوں پر ٹوٹ پڑے اور اپنا سرمایہ نکلوانے لگے۔ یہاں تک کہ بینک خالی ہو گئے اور نقد روپیہ ختم ہو گیا۔ ایک عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ دفتر کاروبار بند تھے جسے دیکھئے وہ خوف و ہراس کے عالم میں تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے جو حوصلہ مند تھے وہ تو اپنی جگہ جمے ہوئے تھے مگر افواہوں سے متاثر ہونے والے لوگ بے یقینی کے عالم میں

محفوظ مقامات پر جانے کی فکر میں تھے۔ حالاں کہ بہت جلد انہیں معلوم ہو گیا کہ اوّل تو بھارتی فوج کی کامیابیوں کی خبریں غلط ہیں اور دوسرے یہ کہ پاکستان کا قریب قریب ہر شہر بھارتی حملوں کی زد میں ہے۔ دو چار دن بعد حالات واضح ہوئے اور پاکستانی فوجوں کی بہادری اور حوصلہ مندی کی داستانیں عام ہوئیں تو لوگوں کا رویّہ ہی بدل گیا لیکن ہم آپ کو چھ ستمبر کی اپنی داستان سنا رہے ہیں کہ اہل پاکستان پر تو جو بیتی سو بیتی مگر ہم پر کیا بیتی؟۔

اُس زمانے میں ماڈل ٹاؤن ایک نواحی آبادی ہی تھی جہاں تک شہر کی گہما گہمی اور ہنگاموں کی صرف خبریں ہی جاتی تھیں۔ ورنہ شہر کے بر عکس یہ ایک الگ تھلگ اور پُر سکون علاقہ تھا۔ اب بھی ہے، لیکن آبادی اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ لاہور شہر سکڑ گیا ہے اور ماڈل ٹاؤن بھی اب شہر کے ہنگاموں کا ایک حصہ بن چکا ہے۔

اُس روز ہم گھر سے نکلے تو ماڈل ٹاؤن کی سڑکیں حسب معمول سنسان تھیں۔ اُس زمانے میں گاڑیاں ہی کتنی تھیں۔ لے دے کر ماڈل ٹاؤن بس سروس پر گزارہ تھا۔ ٹیکسی ناپید تھی۔ موٹر رکشا بھی قسمت ہی سے ملتا تھا اس لئے بس پر ہی گزارہ کرنا پڑتا تھا۔

بس آنے میں کچھ زیادہ ہی دیر لگ گئی۔ بس میں سوار ہوئے تو ماڈل ٹاؤن والوں کو جنگ اور بھارتی حملے کی زیادہ تفصیل سے خبر نہیں تھی۔ صرف ڈرائیور اور کنڈیکٹر کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ شاید بھارتی فوجوں نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے اور سنا ہے کہ واہگہ بارڈر پر لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ خبر تشویش ناک تھی مگر کیوں کہ تصدیق شدہ نہیں تھی اس لئے سننے والے زیادہ فکر مند نہیں تھے بلکہ بڑے آرام سے تبصرے اور قیاس آرائیاں کرتے رہے کہ بھئی یہ تو کسی نے افواہ چھوڑی ہے۔ ورنہ سرحد پر جنگ ہو رہی ہے اور لاہور میں نہ دھماکہ سنائی دے نہ فوجوں کی نقل و حرکت دکھائی دے۔ یقیناً یہ ہوائی کسی دشمن کے ایجنٹ نے اڑائی ہے۔ اس سے پہلے رن کچھ کے میدان میں پاکستانی فوج بھارتی جیالوں کی درگت بنا چکی تھی اور بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری یہ فرما چکے تھے کہ اگر پاکستان باز نہ آیا تو ہم اپنی پسند کا محاذ کھولیں گے۔ اس کے باوجود کسی کو یقین نہیں تھا کہ بھارت بین الاقوامی سرحدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے لاہور پر حملہ آور ہو جائے گا۔ فیروز پور روڈ نہر کے پل تک تو علاقہ سنسان تھا مگر اچھرہ موڑ کے بس اسٹاپ سے جو حضرات بس میں سوار ہوئے وہ سخت ہراساں نظر آئے۔ چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

پوچھا ''بھئی خیر تو ہے۔ کیا ہوا''۔

بولے۔ '' آپ کو خبر نہیں جو خیر پوچھ رہے ہیں ؟ ارے بھائی بھارت نے واہگہ پر حملہ کر دیا ہے اور سنا ہے کہ اس کی فوجیں باٹا پور تک آ گئی ہیں۔''

یہ سن کر تو سب کے ہوش اڑ گئے۔

مزنگ چونگی کے اسٹاپ پر پہنچے تو مزید تازہ خبریں موصول ہو گئیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ پاکستان کی فوج کو تو خبر ہی نہیں تھی۔ بھارتی فوجی بڑے اطمینان سے باٹا پور تک چلے آئے اور سڑکوں پر گھومتے رہے۔ کوئی نہ پہچانا کہ وہ بھارتی ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر تمام خبریں پریشان کن تھیں۔

جب ہم مال روڈ پر پہنچے تو خود اپنی آنکھوں سے افراتفری دیکھ لی۔ دکانیں بند تھیں یا بند ہو رہی تھیں۔ سڑکوں پر ایک مارا ماری کا عالم تھا۔ بینکوں کے سامنے وہ منظر تھا جو کسی نئی فلم کی ریلیز کے موقع پر سینماؤں پر نظر آتا ہے۔ آدمی پر آدمی چڑھا ہوا تھا۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ سب سے پہلے اندر جا کر چیک کیش کرا لے یا لاکر میں سے مال وزیور نکال لائے۔ ایک قیامت کا سماں تھا۔

اب یقین آ گیا کہ یہ افواہ نہیں ہے۔ سچّی خبر ہے۔

میکلوڈ روڈ اور لکشمی چوک پر کچھ زیادہ ہی ہجوم نظر آیا۔ بہت سے فلمی دفاتر بند تھے۔ تھوڑے بہت کھلے تھے مگر وہ بھی بند ہونے والے تھے۔ لاہور دشمن کی فوجوں کی زد میں تھا۔ لاہور والے جنگ کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری سامان اکٹھّا کر رہے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آئندہ کیا ہو گا۔

ہم پنجاب پکچرز کے دفتر میں پہنچے تو شکر ہے کہ وہ کھلا ہوا تھا مگر ایک ہنگامہ بپا تھا۔ دونوں میاں حضرات اپنی میز پر دائیں بائیں تشریف فرما تھے۔ کمرے میں ایک ہجوم اکٹھا تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی ہانک رہا تھا۔ تازہ ترین خبریں اور قیاس آرائیاں سنا رہا تھا۔ اندازے لگا رہا تھا۔ یہ فلمی لوگوں کا احتجاج تھا جو لاہور پر حملے کی خبر سن کر اپنے کام مکمل کرنے کے لئے گھروں سے نکلے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ بہت سے لوگ تو فوراً ہی لاہور سے نکل گئے۔ دکانوں میں کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا۔ بینکوں میں کیش ختم ہو گیا۔ اب چیک کیش نہیں ہو رہے۔ جب تک اسٹیٹ بنک سے مزید کیش نہ

آئے بینک ادائیگی کیسے کریں؟ادھر اسٹیٹ بنک پر بہت بڑا ہجوم تھا۔

میاں ذوالفقار نے ہمیں دیکھا تو پوچھا" ارے آفاقی صاحب! آپ گئے نہیں؟"۔

ہم نے پوچھا" کہاں؟"

بولے" کہیں بھی۔ بہت سے لوگ لاہور سے جارہے ہیں"۔

ہم نے پوچھا" اور آپ کیوں نہیں گئے؟"

بولے" کہاں جائیں؟ ہر طرف اللہ کی زمین ہے۔ جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔ لاہور ہمارا شہر ہے، داتا دربار ہمارا محافظ ہے، ہمارا جینا مرنا تو لاہور ہی میں ہوگا۔"

کچھ اور حضرات نے بھی ایسے ہی عزائم کا اظہار کیا تو ہماری کچھ ڈھارس بندھی کہ سب ہی نے حوصلہ نہیں ہارا ہے۔ غازی اور مجاہدین بھی موجود ہیں اور زیادہ تعداد میں ہیں۔

ہر کوئی اپنی داستانیں سنانے میں مصروف تھا اور ہم دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ آج چھ ستمبر ہے۔ میاں سے سازندوں کا بل وصول کرنا تھا مگر اس افراتفری کے عالم میں اس کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہاں تو ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ میاں سے بات کر کے اپنی بات کھونے کا کیا فائدہ؟ مگر سازندوں سے کیا ہوا وعدہ کیسے پورا ہوگا؟ کچھ اور لوگوں کو بھی ہم نے پیسے ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا اب یہ وعدے پورے نہیں ہوں گے؟۔

کمرے میں ایک شور قیامت برپا تھا۔ ہر ایک شخص بلند ترین آواز میں اپنی اپنی سنانے میں مصروف تھا۔

میاں ذوالفقار نے ہمیں مسکرا کر دیکھا اور بولے" نواب صاحب! آج چائے نہیں مل سکے گی۔ معافی چاہتا ہوں چپراسی غائب ہے۔"

یہ دونوں میاں ہمیں نواب صاحب کہا کرتے تھے خدا جانے کیوں؟ایک بار ہم نے وجہ دریافت کی تو بولے بس آپ کو دیکھ کر نواب صاحب کہنے کو جی چاہتا ہے۔

ہم نے کہا" پھر ہم بھی آپ کو سیٹھ صاحب کہا کریں گے"۔

ہنس کر بولے" وہ آپ کا حق ہے"!

ہمیں پریشان دیکھا تو میاں ذوالفقار اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا" نواب صاحب! ادھر کمرے میں آ جایئے"۔

یہ کیبن ان کا ریٹائرنگ روم تھا۔ یہی ڈائننگ ہال تھا۔ یہی میٹنگ روم تھا۔ یہی کاروباری راز و نیاز کا مرکز تھا۔

ہم ان کے پیچھے پیچھے اندر چلے گئے۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

ہمیں پاس بٹھالیا اور کہنے لگے۔" آپ نے کیا بندوبست کیا ہے؟ جائیں گے یا لاہور میں رہیں گے؟"۔

ہم نے کہا" میاں ہمارا جینا مرنا بھی یہیں ہے۔ تقدیر سے بچ کر کون بھاگ سکتا ہے۔ لاہور کہاں بھاگے گا؟۔"

وہ مسکرانے لگے" خوش رہو، دل خوش کر دیا۔ گھر میں کھانے پینے کا کیا انتظام ہے؟ "

" یہ تو گھر والوں کو معلوم ہوگا۔ مگر میاں صاحب آپ نے آج سازندوں کو رقم دینے کا جو وعدہ کیا تھا وہ تو پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ "

کہنے لگے" آفاقی صاحب! اس ناگہانی آفت میں کوئی کسی کو ادائیگی نہیں کر رہا ہے۔ ایک روپیہ ہو یا ایک لاکھ روپیہ' سب ہی نے انکار کر دیا ہے۔ "

ہم نے کہا" بات بھی ٹھیک ہے حالات ہی ایسے ہیں "

میاں ذوالفقار نے میز کی دراز سے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر ہمارے حوالے کی اور بولے" یہ دس ہزار ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ گھر میں آپ کے پاس بالکل کیش نہیں ہوگا۔ آپ فی الحال کسی کو بھی پے منٹ کرنے کی نہ سوچیں۔ یہ دس ہزار سنبھال کر اپنے پاس رکھیں خدا جانے کیا ہوگا۔ آپ کو اپنے پاس ہر وقت کیش رکھنا چاہیے۔"

ہم حیران ہو کر ان کی صورت دیکھ رہے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس روز کوئی کسی کو ایک پیسہ بھی دینے کا روادار نہ تھا۔ یہاں تک کہ بینکوں تک نے ادائیگی سے انکار کر دیا تھا اور میاں ذوالفقار مانگے بنا ہمیں دس ہزار روپے دے رہے تھے۔

وہ کہنے لگے" یہ اپنے بریف کیس میں رکھ لیجئے کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دیجئے کہ میں نے آپ کو کچھ دیا ہے۔ اس وقت ہر شخص کو پیسے کی ضرورت ہے اور دیکھئے۔ فی الحال کسی کو ان پیسوں میں سے پے منٹ نہ کیجئے گا۔ یہ رقم اپنے پاس ہی

رکھئے تاکہ وقت بے وقت ضرورت پڑے تو کام آجائے۔"

ہم نے کہا"مگر میاں صاحب! ہم نے لوگوں سے وعدہ کیا ہے۔"

"یہ ہنگامی حالات ہیں اس وقت نفسا نفسی کا عالم ہے۔اللہ خیر رکھے تو اپنے وعدے بھی پورے کر لیجئے گا۔"

لکشمی چوک سے اٹھ کر ہم مال روڈ پر گراموفون کمپنی کے دفتر میں پہنچ گئے۔سارا دفتر اور بڑے بڑے ہال بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔نہ آدمی نہ آدم زاد مگر سارے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

اکاونٹنٹ کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ بابو جی اکیلے بیٹھے ہیں۔ہمیں دیکھا تو حیران رہ گئے۔

"ارے آفاقی صاحب! آپ کہاں گھوم رہے ہیں۔"

ہم نے پوچھا"بابو جی آپ کے دفتر والے کہاں گئے؟"

بولے" صاحب جی' گھروں سے ہی نہیں آئے۔ایک دو گھبرائے ہوئے آئے تھے پیسے مانگ رہے تھے مگر آج کے دن پیسے کہاں؟ہوں بھی تو کون دیتا ہے ہر ایک کو ضرورت ہے۔"

ہم نے کہا"بابو جی سازندے بھی نہیں آئے؟آج انہیں بھی بل۔۔۔لینے آنا تھا۔"

وہ ہنسنے لگے۔" آفاقی صاحب آپ بھی بادشاہ آدمی ہیں،ہر ایک کو اپنی پڑی ہے بل کون لینے آئے گا۔"

ہم نے جیب سے نوٹوں کی گڈّی نکالی"بابو جی' آپ ذرا بل تو نکالئے"

بابو جی حیران تو ہوئے مگر بل نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔پانچ ہزار کچھ سو کا بل تھا۔ہم نے انہیں نوٹ گن کر دیئے" بابو جی آپ تو شام تک یہاں ہیں نا؟"

"ہاں جی میں تو ڈیوٹی پر ہوں"

"تو پھر جو بھی سازندہ آجائے اسے ادائیگی کر دینا اور جو نہ آئے اس کے گھر جا کر اس کی رقم پہنچا دینا۔ آپ کو تو سب کے گھروں کا پتا ہے۔"

وہ بولے"وہ تو ہے مگر کئی سازندے تو لاہور ہی میں نہیں ہیں چلے گئے ہیں۔"

''جو ہیں انہیں رقم ضرور پہنچا دینا بابو جی۔ان لوگوں کے پاس کبھی نقد روپیہ نہیں ہوتا۔روز کی کمائی روز کھا جاتے ہیں۔انہیں ضرورت ہو گی۔ ''

بابو جی ہماری اس قسم کی حرکتوں کی وجہ سے ہمیں بادشاہ آدمی کہا کرتے تھے بولے ''اب آپ چائے پی کر ہی جانا''

''کہاں ہے چائے'' ہم نے پوچھا ''کون بنائے گا، چپڑاسی تک تو نظر نہیں آرہا۔''

بولے ''میں خود بناؤں گا تھوڑی دیر بیٹھئے کچھ بتایئے اب کیا ہو گا؟ ''

ہم نے کہا ''یہ تو خدا ہی جانتا ہے ''

چائے پی کر کچھ دیر بعد ہم رخصت ہوئے۔مال روڈ کا ایک چکّر لگایا۔دکانیں اور اکثر ریستوران بند تھے۔سڑکیں اُجاڑ اور ویران۔واپس گھر لوٹ گئے۔اگلے دن بابو جی نے فون پر بتایا کہ پورے دن میں تین سازندے آئے تھے۔یہ لوگ بابو جی سے قرضہ بھی لیا کرتے تھے۔وہ ان سے قرض مانگنے آئے تھے۔جب انہوں نے بل کی رقم دی تو وہ حیران رہ گئے۔بہت دعائیں دیں۔شام کو بابو جی نے ہر سازندے کے گھر پہنچ کر اور جو لوگ لاہور میں موجود تھے انہیں ادائیگی کر دی۔ اسی رات لاہور میں پہلا بلیک آؤٹ ہوا۔سول ڈیفنس کے رضاکار سڑکوں پر گشت کرنے لگے۔ہر طرف خاموشی اور اندھیرا تھا۔لوگ گھروں میں دُبکے بیٹھے تھے۔ دروازے کھڑکیوں پر پردے اور سیاہ کاغذ لگا لئے گئے تھے۔عموماً لالٹین لیمپ یا موم بتی سے کام چلایا جا رہا تھا۔پھر دھماکے اور ہوائی جہازوں کے زنّاٹے شروع ہو گئے۔جن کے پاس فون تھے وہ تازہ ترین خبروں کے لئے اخباروں کے دفاتر میں یا اپنے دوستوں کو فون کر کے حالات پوچھنے لگے۔

صرف پہلا دن افرا تفری کا تھا، پھر تو لاہور کی جیسے کایا ہی پلٹ گئی۔ عجیب جوش اور جذبے کا عالم تھا۔یار لوگ ''لڑائی'' دیکھنے کی غرض سے کاروں' ٹانگوں ریڑھیوں سائیکلوں پر سوار ہو کر پیدل ہی بارڈر کی طرف جانے لگے۔فوجیوں نے بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر واپس لوٹایا۔ہر کوئی کھانا' مٹھائی' ہار پھول لے کر سرحدوں کیطرف چل پڑا۔فوجی ٹرک یا قافلے گزرتے تو لوگ فوجیوں اور فوجی عوام کو دیکھ کر نعرے لگاتے اور انگلیوں سے فتح کے نشان بناتے۔جگہ جگہ فوجیوں کو روک کر ان کی خاطر داری کی کوشش کی جاتی وہ کہتے ''بھائیو! ہمیں محاذ پر پہنچنا ہے اس وقت معافی دو''۔

وہ سب خاک دھول میں اٹے ہوئے اور چند روز کے بعد تو تھکے ماندے نظر آتے تھے مگر ہر وقت مسکراتے ہوئے چاق وچوبند ۔اس کے بعد فضائی حملوں اور فضائی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔لاہور کے زندہ دل جنگی جہازوں کی ''ڈاگ فائٹ'' دیکھنے کے لئے سڑکوں اور چھتوں پر پہنچ جاتے اور ''بوکاٹا'' کے نعرے لگاتے یا نعرہ تکبیر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے ماحول کو گرمادیتے تھے۔فوجی کمان نے اپیلیں کرنی شروع کر دیں کہ لوگ فضائی حملوں اور ڈاگ فائٹ کے دوران میں کھلی جگہوں پر نہ نکلیں۔اس طرح پاکستانی پائلٹ عوام کو محفوظ کرنے کے خیال سے بعض اوقات بے بس ہو جاتے ہیں۔دن کو ہنگامے راتوں کو کرفیو اور بلیک آؤٹ،گھروں کے اندر ریڈیو دن رات خبریں اور ترانے سنا رہا تھا۔لوگ اکٹھے ہو کر بیٹھتے، کھاتے پیتے،تاش اور شطرنج وغیرہ سے دل بہلاتے اور ایک دوسرے سے جنگی خبریں دریافت کرتے رہتے تھے۔کچھ دن بعد تو اس ماحول سے انسیت سی ہو گئی۔کئی دن کے بعد جب بلیک آؤٹ ختم ہونے کا اعلان ہوا تو تیز روشنی سے آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اور یہ روشنی اب بُری لگنے لگی۔

رات کے وقت بموں کے دھماکے ہوتے تو لوگ چھتوں پر چڑھ کر دیکھنے کی کوشش کرتے کہ بم کہاں گرے ہیں۔آگ کہاں لگی ہے؟

ایک روز اتنا زوردار دھماکہ ہوا کہ لاہور لرز کر رہ گیا اور زمین کانپنے لگی۔ رات کا وقت تھا۔سب حیران کہ خدایا' یہ کیسا دھماکہ ہے؟ایک دوسرے سے استفسار شروع کر دیا۔

ہمارے پڑوسی رانا صاحب کا فون آیا''آفاقی صاحب یہ آواز سنی آپ نے،یہ کیسا دھماکہ ہے؟

بعد میں معلوم ہوا کہ محاذ پر'' رانی توپ'' چلائی جا رہی ہے جس کا گولہ بیس میل تک جاتا ہے پھر زمین کو تو کانپنا ہی تھا۔

خدا خدا کر کے جنگ بندی ہوئی۔بلیک آؤٹ تو ختم ہو گیا مگر کرفیو بدستور نافذ تھا اور لوگوں نے اپنے اپنے معمول کے کام دھندے شروع کر دیئے تھے۔ہم بھی سٹوڈیو پہنچ گئے بیک گراؤنڈ میوزک کی ریکارڈنگ تو ہو گئی تھی مگر مکسنگ باقی تھی۔معلوم ہوا کہ رات کی شفٹ میّسر ہے۔مگر جنگ زدہ ماحول میں راتوں کو کام کے لئے کون گھر سے نکلے؟ مشکل یہ تھی کہ اگر یہ بُکنگ ضائع ہو جاتی ہے تو پھر ہمیں بہت لمبے عرصے انتظار کرنا پڑتا۔لہٰذا مکسنگ کا فیصلہ کر لیا

گیا۔ کارکنوں کے لئے خصوصی کرفیو پاس بنوائے گئے۔ آسمان پر ہوائی جہاز پرواز کرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی جیٹ طیارے دھماکے بھی کردیتے تھے۔ ہوائی جہازوں کی چھاؤں میں ہماری فلم کی مکسنگ ہورہی تھی اور چندروز کے اندر مکمل بھی ہوگئی مگر لطیفے بھی ہوتے رہے۔ ایک بار ساؤنڈ اسسٹنٹ اور طارق صاحب کے اسسٹنٹ کرفیو پاس گھر بھول آئے اور فوج والے انہیں پکڑ کرلے گئے۔ لوگوں نے ایک بار پھر افواہوں کا بازار گرم کردیا۔ آئے دن انڈین کمانڈوز کے چھاتوں کے ذریعے اترنے کی خبریں مشہور ہونے لگیں۔ پاکستانی کمانڈوز بھی بھارتی سرحدوں کے اندر اتارے جا رہے تھے۔ بھارتی ریڈیو بھی باقاعدگی سے سنا جاتا تھا حالانکہ ان کی ڈینگوں پر کسی کو بھروسا نہ تھا۔ چندروز کے اندر ہی سب کو ہندی الفاظ یاد ہوگئے اور یار لوگوں نے انہیں گفتگو میں استعمال کرنا شروع کردیا۔

''کیوں بھئی، آج سموار داتا کیا کہتا ہے؟''

''رکھشا منتری نے آج کیا بیان دیا ہے؟''

مِکسنگ کے بعد جب فلم کا پہلا پرنٹ نکالا گیا تو ہم سب فلم سے بہت مطمئن تھے۔ جس نے بھی یہ پرنٹ دیکھا پسند کیا لیکن اب ایک نیا مسئلہ ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ جنگ کے بعد غیر ملکی زرمبادلہ بچانے کی خاطر حکومت نے فلم کی لمبائی پر پابندی عائد کردی تھی۔ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ آئندہ کسی فلم کی طوالت بارہ ہزار فٹ سے زیادہ ہوگی تو اسے سنسر سرٹیفکیٹ نہیں دیا جائے گا۔ پاکستان میں عموماً چودہ پندرہ ہزار فٹ لمبی فلمیں بنائی جاتی ہیں۔

انڈیا کی فلموں کی طوالت تو سترہ ہزار فٹ سے بھی زیادہ ہوجاتی ہے اور پھر یہ پابندی کیونکہ دیر میں عائد کی گئی تھی اس لئے فلم سازوں نے پرانی لمبائی کے حساب سے فلموں کے سکرپٹ تیار کئے تھے اور اسی حساب سے انہیں فلمایا بھی تھا۔ اب اچانک کسی تیار فلم کی لمبائی میں دو تین ہزار فٹ کی کمی کردینا بہت مشکل اور پریشان کن مسئلہ تھا۔ فلم سازوں نے اس فیصلے کے خلاف بہت شور مچایا۔ حکومت کو مشورہ دیا کہ جو فلمیں بن چکی ہیں انہیں اس اصول سے مبرّا کردیا جائے ورنہ بہت نقصان ہوگا۔ مگر بیوروکریٹس جس انداز سے کام کرتے ہیں وہ سب کو معلوم ہے۔ کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ حکومت کا کہنا تھا کہ آپ لوگوں کی ساری باتیں سر آنکھوں پر مگر پرنالہ وہیں رہے گا۔

''کنیز'' کی لمبائی ساڑھے چودہ ہزار فٹ کے لگ بھگ تھی۔ یہ کہانی دو نسلوں پر محیط تھی اور انسانی جذبات اور نفسیات

کواجا گر کرنے کی غرض سے فلم کو ٹریٹمنٹ ایسا دیا تھا جس کی وجہ سے کسی بھی جگہ سے اسے کاٹ کر چھوٹا کرنا فلم کے ربط اور تسلسل کو خراب کرنے کے برابر تھا۔ کئی فلم سازوں نے چپ چاپ یہ اصول برداشت کر لیا اور اپنی فلموں کی لمبائی چھوٹی کر لی مگر ہمارے لئے یہ ممکن نہ تھا۔

غلام نبی میمن صاحب ان دنوں مغربی پاکستان کے وزیر اطلاعات تھے اور یہ محکمہ ان ہی کے ماتحت تھا۔ ہماری وزیروں، سفیروں اور سیاست دانوں سے ملاقات ہی نہ تھی مگر اس مشکل کو وہی حل کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے اپنے ایک دوست عالم علی سیّد کی مدد حاصل کی کہ وہ میمن صاحب سے ہماری ملاقات کا جلد سے جلد بندوبست کرا دیں۔ عالم علی سیّد صحافی بھی تھے اور پرانے مسلم لیگی بھی۔ وہ مسلم لیگ کے دفتر میں اہم عہدوں پر کام بھی کر چکے تھے۔ اس لئے مسلم لیگی حلقوں میں ان کی ہر ایک سے شناسائی تھی اور ہر کوئی ان کی بات مانتا تھا۔ وہ درویش صفت انسان تھے ورنہ اپنے تعلقات کی بدولت لاکھوں کروڑوں کما سکتے تھے۔ وہ دوسروں کے جائز کام تو کراتے رہے مگر خود ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہے اور ایک پرانی کوئیکلی (چھوٹی موٹر سائیکل) کے سوا کوئی دوسری سواری انہیں زندگی بھر نصیب نہ ہوئی۔ آخری دور میں تو اس سے بھی محروم ہو گئے۔

ہم نے انہیں فون کیا "عالم علی میمن صاحب سے میل ملاقات ہے؟"

"بہت اچھی طرح، کیا بات ہے؟"

ہم نے انہیں مسئلہ بتایا، کہنے لگے "میمن صاحب جیسے ہی لاہور آئیں گے تمہاری ملاقات ہو جائیگی۔"

چند روز بعد میمن صاحب لاہور آ گئے مگر ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ بے حد مصروف تھے سیکرٹریٹ والے دفتر میں کب آئیں گے یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ درجنوں بلکہ سینکڑوں لوگ ان کے منتظر رہتے تھے مگر ملاقات کی نوبت نہیں آتی تھی۔

ایک دن عالم علی سیّد ہمیں پنجاب سیکرٹریٹ لے گئے۔ میمن صاحب کے دفتر کے ساتھ ان کے پی اے کا کمرہ تھا۔ انہوں نے عالم علی سیّد کی اور ہماری بہت خاطر مدارت کی۔ چائے، کافی، بسکٹ، کیک، سگریٹ، پان ہر چیز حاضر کر دی سوائے میمن صاحب کے۔

''بھئی تمہارے منسٹر صاحب کب آئیں گے ؟ ''

''اللہ جانے سر' یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتے۔آپ کچھ دیر بیٹھئے انتظار کر لیجئے۔ ''

ہم نے کہا''اگر وہ آ بھی گئے تو بے شمار ملاقاتی ان کے منتظر ہیں ہم کیسے ملیں گے''

وہ بولے''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے ''

ہم اٹھ کر سیکر ٹریٹ میں دوسرے شناساؤں سے ملنے چلے گئے۔جہاں بھی جاتے وہاں سے فون کر کے پی اے صاحب کو مطلع کر دیتے کہ ہم فلاں جگہ بیٹھے ہیں۔

جاڑوں کا بہت خوب صورت موسم تھا۔پھول کھلے ہوئے تھے۔ہوا میں خنکی اور تازگی تھی مگر ہم ان چیزوں سے لطف اندوز نہیں ہو رہے تھے۔ڈھائی تین بجے معلوم ہوا کہ میمن صاحب آ گئے ہیں۔عالم علی سیّد اور ہم لپک جھپک ان کے دفتر کی طرف چلے۔وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ اپنے دفتر سے نکل کر کار کی طرف جا رہے ہیں اور لوگوں کا ایک جلوس ان کے ہمراہ ہے۔یہ سب ضرورت مند حضرات تھے' ہماری طرح۔

عالم علی نے کہا''آؤ جلدی چل کر مل لو ''

ہم نے کہا''بھائی یہ ملنے کا کون سا طریقہ ہے ہم انہیں بتائیں گے کیا اور ان کی سمجھ میں کیا آئے گا۔ ''

''یار چلو تو'' وہ بولے''ملنا ضروری ہے۔''

ہم نے اس مرگ انبوہ میں شریک ہونے سے صاف انکار کر دیا۔عالم علی ہمیں بُرا بھلا کہتے ہوئے تیزی سے میمن صاحب کی کار کی جانب بڑھے۔وہ کار میں بیٹھنے ہی والے تھے کہ عالم علی سیّد نے انہیں جا لیا۔وہ بہت خندہ پیشانی سے ملے۔ عالم صاحب نے ان سے کچھ کہا اور ہماری طرف اشارہ کیا۔میمن صاحب نے بھی ہمیں کافی فاصلے پر کھڑے دیکھا پھر عالم علی سیّد سے کچھ کہا اور کار میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔

''لو بھئی بات ایسی ہے کہ اس وقت تو وہ گورنر ہاؤس جا رہے ہیں۔میٹنگ ہے،ہمیں کل بارہ بجے کا وقت دیا ہے۔ ''

''رات کا یا دن کا؟'' ہم نے پوچھا

"یار تمہاری عقل کہاں چرنے گئی ہے۔ بندۂ خدا رات کو گیارہ بجے کون وزیر اپنے دفتر میں بیٹھتا ہے؟"

ہم نے کہا" ہم سوچ رہے تھے کہ ہو سکتا ہے انہوں نے گھر بلایا ہو، کھانا کھلانا چاہتے ہوں۔"

وہ ہنسنے لگے "گھر تو وہ خود بھی کھانے کے وقت نہیں پہنچتے۔ ہمیں کیا کھانا کھلائیں گے۔ بس کل ان کو گیارہ بجے یہاں آنا ہے۔"

دوسرے دن گیارہ بجے وہاں پہنچے تو پھر ملاقات کے خواہش مندوں کا ایک ہجوم ان کا منتظر تھا۔ گیلری میں' برآمدوں میں' باہر صحن میں ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔

ہم عالم علی کی بدولت سیدھے پی اے کے کمرے میں پہنچ گئے جہاں ہمیں بڑی عزّت کے ساتھ کرسیوں پر بٹھایا گیا۔ چائے منگوائی گئی اور پی اے صاحب نے بتایا کہ بس ایک میٹنگ جاری ہے۔ اس کے ختم ہوتے ہی آپ اندر جائیں گے۔

اب میٹنگ ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ ایک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ اس دوران میں پی اے صاحب بار بار صاحب کے کمرے میں آتے جاتے رہے۔

ہم نے کہا" یار عالم علی' دیکھ لی تمہاری اہمیت' انہوں نے تو تمہیں گھاس ہی نہیں ڈالی۔"

وہ بولے "گھاس کیوں ڈالیں گے ہم کوئی گھوڑے ہیں؟ ہمارے لئے کھانے پینے کا دوسرا سامان ہو گا۔"

"ہمارا خیال ہے کہ عزّت کے ساتھ واپس چلو۔ ہم کوئی اور راہ تلاش کرتے ہیں۔"

انہوں نے کہا" ارے نہیں یار۔ اب آئے ہیں تو مل کر ہی جائیں گے۔"

ساڑھے بارہ بجے کے قریب پی اے صاحب پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ دوڑے دوڑے آئے اور اطلاع دی کہ منسٹر صاحب یاد فرما رہے ہیں۔

میمن صاحب کا تعلق سندھ سے تھا۔ بھاری جسم' سانولی رنگت' نہایت خلیق اور متواضع انسان تھے۔ سندھی لب و لہجے میں بولتے تھے۔ فوراً انہوں نے کافی کا آرڈر دے دیا۔ عالم علی نے بہتیرا کہا کہ میمن صاحب باہر بہت ہجوم ہے رہنے دیں مگر نہ مانے کہا" سیّد صاحب' مچھلی بغیر پانی کے اور لیڈر بغیر ہجوم کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ تو ہماری روزمرّہ

کی غذا سمجھ لیجئے۔ ‘‘

انہوں نے پی اے کو ہدایت فرمادی کہ فی الحال کوئی کمرے میں نہ آئے اور انتہائی ضروری فون کے سوا کال بھی نہ ملائی جائے ۔اس کے بعد وہ ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

’’فرمائیں سائیں‘ خدمت بتائیں؟ ‘‘

عالم علی نے ہمیں اشارہ کیا اور ہم نے اپنی مشکل کم سے کم الفاظ میں بیان کر دی۔

وہ بہت غور سے سنتے رہے۔اس دوران میں کافی آگئی۔اس کا سلسلہ بھی چلا۔ہم خاموش ہوئے تو وہ بولے ’’سائیں، فارن کرنسی کی بہت زیادہ کمی ہے۔اگر آپ کو چھوٹ دی تو دوسرے بھی مانگیں گے کوئی اور خدمت بتائیں کوئی اور حکم کریں۔ ‘‘

عالم علی سیّد ہنس کر بولے ’’میمن صاحب پھر آپ کوئی اور عذر کر دیں گے آخر لیڈر رہیں ‘‘

وہ ہنسنے لگے ’’آپ نے مائنڈ کر لیا شاید۔ سیّد صاحب یہ کام کافی مشکل ہے لیکن پھر بھی میں آپ کی فائل سیکرٹری سے منگا کر دیکھوں گا اور ان سے بات بھی کروں گا۔آپ کل بارہ بجے تشریف لے آؤ۔‘‘

ہم ان کے کمرے سے باہر نکلے تو وہاں ایک ہجوم عاشقانِ جمع تھا۔سب ہی ہمیں رشک و حسد سے دیکھ رہے تھے۔یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہمارا وہی حساب تھا کہ کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا‘ پھر بھی آٹھ آنے کا بل ہوا۔

ہم نے کہا ’’سیّد صاحب‘ ان تلوں میں تیل نہیں ہے میمن صاحب نے ہمیں ٹرخادیا ہے سائیں۔ ‘‘

’’ارے نہیں یار۔وہ بہت مخلص اور پیارے انسان ہیں۔جو ان کے بس میں ہو گا ضرور کریں گے۔کل تمہارا کام بن جائے گا ۔

’’تمہیں کیسے معلوم ہوا؟‘‘ ہم نے پوچھا

بولے ’’میں نے استخارہ نکالا ہے یہ دیکھو‘‘ انہوں نے جیب سے ایک چھوٹی سی تسبیح نکال کر ہمیں دکھادی۔

’’دکھاؤ ذرا۔اس میں تو دانے بھی پورے نہیں ہیں شاید ‘‘

’’یار استخارہ نکالنے کیلئے کافی ہیں۔تم دیکھ لینا کل ‘‘

دوسرے دن ٹھیک بارہ بجے ہم میمن صاحب کے کمرے میں تھے۔

''سائیں یہ آپ کی فائل رہی یہ آپ کا مسئلہ رہا یہ آپ کی درخواست رہی ''

انہوں نے فائل کھول کر دکھائی۔

عالم علی سیّد بولے ''مگر فیصلہ کیا رہا؟ ''

وہ ہنسنے لگے ''دیکھئے میں آپ کے سامنے سیکرٹری سے بات کرتاہوں تاکہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں نے آپ کو ٹرخادیا ہے'' یہ کہہ کرانہوں نے پی اے کو سیکرٹری سے فون ملانے کی ہدایت کی۔

''سائیں چائے یاکافی کیا چلے گا؟'' انہوں نے پوچھا

''بڑی مہربانی' بس اجازت نامہ مل جائے تو چلے گا'' سیّد صاحب نے جواب دیا۔

فون کی گھنٹی بجی۔لائن پر سیکرٹری صاحب دوسرے طرف تھے۔میمن صاحب نے بڑے اچھےّ الفاظ ار مناسب دلیلوں کے ساتھ ان کو ہمارا مسئلہ بتایااور پھر چپ ہو کر سنتے رہے۔

پھر بولے ''سائیں یہ ہمارے بڑے پرانے ساتھی ہیں۔ان کیلئے تو کوئی راہ نکالو۔ ''

جواب میں پھر وہ سنتے رہے اور فون بند کر دیا۔

ہم دونوں کی طرف دیکھ کر وہ مسکرائے مگر یہ معذرت خواہانہ مسکراہٹ تھی۔

بولے ''سائیں بڑی مشکل ہے،انہوں نے معذرت کی ہے،وہ بھی اوپر کے احکامات کی وجہ سے مجبور ہیں۔ ''

یہ کہہ کرانہوں نے ہماری فائل پی اے کے حوالے کر دی کہ واپس دے آؤ۔ہم سے پھر چائے کافی کے لئے پوچھا مگر ہم شکریہ ادا کر کے چلے آئے۔

''دیکھاتم نے'' سیّد صاحب باہر نکل کر بولے ''کتنا شریف آدمی ہے ؟ ''

ہم نے کہا''مگر ہمارا کام تو نہیں ہوانا ''

''یاراس کے بس کی بات نہیں ہے،اب تو تمہیں اوپر سے سفارش کرانی پڑے گی۔ ''

''مثلاًایوّب خان سے ؟'' ہم نے پوچھا

وہ ہنسنے لگے ''صبر کرو، اللہ مالک ہے، ابھی تو چلو۔''

ہم نے کہا ''تم جاؤ ہم تو سیکرٹری سے مل کر ہی آئیں گے۔''

کہنے لگے ''کیا بات کرتے ہو۔ جب منسٹر کچھ نہیں کر سکتا تو سیکرٹری کیا کرے گا؟ اس کا جواب سن تو لیا تم نے؟ ''

ہم نے کہا'' بھائی کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ اگر ان سے بھی کام نہ بنا تو سیکشن آفیسر یا چپڑاسی سے ملیں گے۔ ہمارے ملک میں چھوٹے لوگ ہی بڑے بڑے کام کرا سکتے ہیں۔''

''تمہاری مرضی۔ سیکرٹری اطلاعات مسعود الروف ہے بالکل صاحب آدمی ہے، ایک نہیں سنے گا۔ اللہ سمجھے ان افسروں سے۔ ''

انہوں نے دعائے خیر کے ساتھ رخصت طلب کی۔

''اچھا وہ تسبیح تو دیتے جاؤ'' ہم نے کہا

بولے ''یار وہ تسبیح تھوڑی ہی تھی۔ مصنوعی موتیوں کا ہار تھا۔ میری بھانجی نے جیب میں ڈال دیا تھا۔ خیر تم جاؤ اللہ مالک ہے ''

ہم نے پائپ کے چند کش لگائے۔ ٹھنڈی ہوا میں لمبی لمبی سانسیں بھریں اور گورنر اور چیف سیکرٹری کے دفتر کے عقب میں واقع سیکرٹری اطلاعات کے دفتر میں پہنچ گئے۔ وہاں بھی پہلے ایک پی اے صاحب سے واسطہ پڑا۔ یہ دفتر زیادہ پُرسکون منظم اور ڈھنگ کا لگا۔ ظاہر ہے یہاں عوام کا ہجوم اور ضرورت مندوں کا شور نہیں تھا۔ صاحب لوگوں سے عوام ویسے ہی دور بھاگتے ہیں۔ پی اے نے ہمیں دیکھا، ہم نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ خاصے نک چڑھے آدمی تھے دبلے پتلے، صورت ہی سے بدمزاجی ٹپک رہی تھی۔

''جی فرمایئے ''

''مسعود الرؤف صاحب اندر ہیں؟'' ہم نے پوچھا۔

اب وہ ذرا سٹپٹائے کہ ہو نہ ہو کوئی صاحب کا جاننے والا ہے۔ جو سیکرٹری صاحب کہنے کے بجائے ان کا نام لے کر دریافت کر رہا ہے۔

وہ تھوڑے سے مودب ہو گئے ’’جی صاحب ہیں تو۔۔۔‘‘
’’ان سے کہئے کہ علی سفیان آفاقی ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ ‘‘
پوچھنے لگے ’’ کیا آپ کی ملاقات کا وقت مقّرر ہے ؟ ‘‘
ہم نے کہا’’ اگر وقت مقّرر ہوتا تو ہم آپ سے یہ کیوں پوچھتے کہ وہ اندر موجود ہیں یا نہیں۔ ‘‘
وہ کچھ اور سٹپٹا گئے بولے ’’ سر آپ کارڈ دے دیجئے، میں اندر بھجوا دوں گا۔‘‘
ہم نے کہا’’ کارڈ تو اس وقت ہمارے پاس نہیں ہے۔‘‘
پوچھنے لگے ’’ کیا نام بتایا آپ نے ؟ ‘‘
ہم نے ایک پرچی پر اپنا نام لکھ کر پرچی ان کے سامنے رکھ دی۔ انہوں نے سر کھجایا (اپنا)۔ کچھ سوچا۔ پھر ڈرتے ڈرتے ٹیلی فون اٹھا کر مسعود الرؤف صاحب سے بات کی۔ ’’سر، یہ کوئی آفاقی صاحب آئے ہیں۔ کہتے ہیں ملاقات کا وقت نہیں لیا ہے مگر ملنا چاہتے ہیں۔ ‘‘
جواب سننے کے بعد انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے ’’آیئے میرے ساتھ۔‘‘

وہ ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر کھڑے ہو گئے اور ہم دل ہی دل میں نصرُ من اللہ و فتح قریب پڑھتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ یہ کمرہ وزیر کے کمرے سے قدرے کشادہ تھا۔ نیم تاریکی میں ایک بڑی سی میز پر لیمپ کی روشنی میں ایک صاحب بیٹھے کچھ کاغذات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کمرے کی نیم تاریکی سے ہماری آنکھیں مانوس ہوئیں تو وہ صاحب بھی نظر آ گئے جن کا نام مسعود الرؤف تھا اور جو اس زمانے میں مغربی پاکستان کے سیکرٹری اطلاعات تھے۔

مسعود الرؤف صاحب کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ بہت خوش اخلاقی سے ہاتھ ملایا اور بیٹھنے کے لئے کہا۔ ہم لمبی چوڑی میز کے دوسری جانب ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ ایک دراز قد خوب صورت آدمی تھے۔ عمر 35 اور 40 کے درمیان ہو گی مگر چہرے سے شگفتگی کا اظہار ہوتا تھا۔ بال غالباً تھوڑے گھونگریالے تھے۔
مسعود الرؤف صاحب نے بڑی اپنائیت سے ہماری مزاج پرسی کی پھر بتایا کہ جن دنوں وہ گورنمنٹ کالج میں پڑھتے

تھے تو ہمارے مضامین پڑھتے رہتے تھے۔ پھر انہوں نے ہماری لکھی ہوئی کچھ فلمیں بھی دیکھی تھیں۔ غائبانہ طور پر ہم سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے چائے یا کافی کے لئے دریافت کیا مگر ہم نے معذرت کر دی کہ ابھی کچھ دیر پہلے پی کر آئے ہیں۔

ان کی دوستانہ اور خوش گوار گفتگو کی وجہ سے کمرے کا ماحول خاصا سازگار ہو گیا تھا۔ انہوں نے موسم 'صحافت' سیاست اور ادب کے بارے میں کچھ باتیں کیں پھر انہیں یاد آیا کہ ہم کسی کام سے ان کے پاس آئے ہیں۔

''کہئے کیسے آنا ہوا؟'' انہوں نے پوچھا

ہم نے فوراً اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔ نہایت مختصر الفاظ میں انہیں بتایا کہ فلم مکمل ہونے کے بعد عین وقت پر اس کو دو ڈھائی ہزار فٹ کاٹ دینا بہت مشکل ہے۔ اس طرح تو فلم کا حلیہ ہی بگڑ جائے گا۔

وہ مسکرائے اور شائستگی سے بولے ''ہماری فلموں میں تو یہ پرابلم ہی نہیں ہوتی۔ جہاں سے چاہے نکال دیجئے، دیکھنے والوں کو کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ''

ہم نے کہا ''ہاں بعض فلموں میں ایسا ہوتا ہے مگر ہماری کہانی مربوط ہے۔ اس میں کاٹ چھانٹ کرنا بہت مشکل ہو گا۔''

''کیا کہانی ہے آپ کی؟'' انہوں نے پوچھا۔

ہم نے مختصراً کہانی سنائی۔ کرداروں اور ان کی نفسیات کے بارے میں بتایا پھر ہم نے یہ بھی کہا کہ اگر خام فلم پر خرچہ بچانا ہی مقصود ہے تو دراصل فلم نیگیٹو کے استعمال پر پابندی ہونی چاہیے۔ وہ مہنگا بھی ہوتا ہے اور اگر ساٹھ ستر ہزار فٹ نیگیٹو استعمال کرنے کے بعد فلم کی لمبائی صرف بارہ ہزار فٹ مقرّر کر دی جائے تو بھی اس سے سراسر نقصان ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

وہ بڑے صبر و تحمل سے ہمارے خیالات سنتے رہے۔

پھر وہ بولے ''آپ کی فلم کی فائل ابھی ابھی میرے پاس آئی ہے'' یہ کہہ کر انہوں نے ایک طرف سے فائل نکال کر اپنے سامنے رکھ لی اور پوچھا ''اب مسئلہ کیا ہے؟ ''

ہم نے کہا ''وہی فلم کی طوالت کا مسئلہ ہے بارہ ہزار فٹ میں یہ کہانی نہیں سمیٹی جا سکتی۔ اس کی لمبائی میں اضافہ کرنے

کی اجازت دی جائے۔ ‘‘

انہوں نے ایک نظر فائل پر ڈالی پھر پوچھا’’ مثلاً کتنی لمبائی ہو تو آپ کی فلم بے ربط نہیں ہو گی ؟ ‘‘

ہم نے کہا’’ کم از کم ساڑھے چودہ ہزار فٹ تو ہونی چاہیے۔‘‘

انہوں نے قلمدان میں سے قلم نکالا اور فائل پر کچھ لکھ دیا۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر مسکرائے ’’ لیجئے یہ تو ہو گیا ،میرے لائق کوئی اور خدمت ؟ ‘‘

ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس روز ہمیں ایک وزیر اور ایک سیکرٹری کی قوت اور اختیارات کے فرق کا اندازہ ہوا۔

مسعود الرؤف صاحب نہایت شائستہ اور پڑھے لکھے انسان تھے۔اس کے بعد ان سے ایک آدھ بار ہی کسی محفل میں ملاقات ہوئی جو علیک سلیک اور مزاج پرسی تک محدود رہی مگر ان سے مل کر بہت اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ بہت پرانے شناسا ہیں اور ہماری مدد کرنے میں قطعی پس و پیش نہیں کریں گے۔ ان کی اس خوبی کا مظاہرہ چند سال بعد ہماری فلم ’’سزا‘‘ کی ریلیز کے وقت ہم نے دیکھا جب فیصل آباد کے طلبا نے اس فلم میں حیوانات کے ڈاکٹروں کی بے عزّتی کرنے کا الزام لگا کر سارے پنجاب میں اس کی نمائش پر پابندی عائد کرا دی تھی۔ہم بھاگے بھاگے کراچی سے لاہور پہنچے (مگر پیدل نہیں بذریعہ ہوائی جہاز) مسعود الرؤف صاحب اس زمانے میں بھی غالباً سیکرٹری اطلاعات یا سیکرٹری محکمہ قانون تھے۔اس میں مسعود الرؤف صاحب بھی شامل تھے۔فلم کو دیکھ کر فیصلہ کرنے کے لئے سرکاری افسروں کی ایک کمیٹی بنادی گئی تھی۔ فلم دیکھنے کے بعد انہوں نے طلبا کے قائدین سے پوچھا ’’اس میں کون سی قابل اعتراض بات ہے ؟ ‘‘

’’سر اس میں ڈاکٹر کا مذاق اڑایا گیا ہے ؟ ‘‘

وہ بولے ’’ اوّل تو فلم میں اس شخص کو جعلی ڈاکٹر دکھایا گیا ہے۔اس لئے ڈاکٹروں کی توہین کا پہلو نہیں نکلتا۔دوسرے یہ کہ اس فلم میں سیاستدانوں اور معاشرے کے دوسرے شعبوں کو بھی طنز و مزاح کا نشانہ بنایا گیا ہے۔میرے خیال میں تو اس پر پابندی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ‘‘

پینل کے دوسرے اراکین نے بھی ان سے اتفاق رائے کیا۔ سٹوڈنٹس لیڈروں کا کہنا تھا کہ فلم میں سے خواہ برائے نام چند فٹ ہی سہی مگر کچھ حصّہ ضرور حذف کر دیا جائے ورنہ ہم واپس جا کر اپنی یونین کو کیا منہ دکھائیں گے۔

مسعود الرؤف صاحب تو ایک فٹ بھی حذف کرنے کے مخالف تھے مگر ہم نے اتمام حجت کی خاطر چند فٹ فلم حذف کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی اور اس طرح فلم پر سے فوری طور پر پابندی ہٹالی گئی۔

مسعود الرؤف صاحب کی شرافت اور اعلیٰ ظرفی کے ہم ایک بار پھر قائل ہوگئے۔ کاش ان جیسے معقول بیوروکریٹ ہمارے ملک میں کچھ اور بھی ہوتے تو حالات مختلف ہوتے۔ کسی تعارف، ذاتی شناسائی، تعلقات یا سفارش کے بغیر انہوں نے دونوں مرتبہ ہمارے نقطہ نظر کی پذیرائی کی تھی۔

اس رات عالم علی سیّد صاحب کا فون آیا۔ وہ بے چارے بہت شرمندہ اور شرمسار تھے۔ کہنے لگے ''سنو آفاقی۔ میں نے تمہارا کام کرانے کے لئے ایک اور ذریعہ تلاش کر لیا ہے۔ ''

ہم نے کہا'' سیّد صاحب شکریہ مگر اب اس کی ضرورت نہیں ہے ہمارا کام ہو چکا ہے۔ ''

''ارے وہ کیسے ؟'' وہ حیران رہ گئے۔

ہم نے بتایا کہ سیکرٹری اطلاعات مسعود الرؤف صاحب نے ہماری فلم کی لمبائی میں اضافے کی اجازت دے دی ہے۔

بولے ''یار وہ بڑا نڈر آدمی ہے۔ بے خوف افسر ہے۔ ''

ہم نے کہا''تم تو وزیروں کے چکّر میں تھے۔ ''

بولے ''واقعی غلط خیال تھا۔ اصل حکومت تو بیوروکریٹس کی ہے۔ ''

آغا جی اے گل مرحوم کی رنگین فلم ''نائلہ'' بھی ہماری فلم ''کنیز'' کے ساتھ ہی ریلیز ہونے والی تھی مگر انہیں بھی فلم کی لمبائی کا مسئلہ درپیش تھا۔ انہوں نے ہی ہمیں یہ بتایا تھا کہ ایک ہوائی سفر میں کسی سیکرٹری نے انہیں اس پابندی کی اطلاع دی تھی پھر انہوں نے ہم سے پوچھا'' تم اپنی فلم کی لمبائی برقرار رکھنے کے لئے کیا کرو گے ؟ ''

ہم نے کہا''جو آپ کریں گے 'دیکھئے نا آغا صاحب' آپ ہمارے بزرگ اور رہنما ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اپنے ساتھ آپ ہمارا کام بھی کرا دیں گے۔ ''

آغا صاحب کے مراسم بہت دور تک تھے اور پاکستان میں اس ذریعے سے بڑے بڑے بند دروازے کھل جاتے ہیں لیکن ہم نے ان سے پہلے ہی اپنی فلم کی لمبائی بڑھوالی تھی۔

شام کو ایورنیو سٹوڈیو گئے تو آغا صاحب کے ملازم خصوصی بوستان خان وارد ہو گئے۔ ''آفاقی صاحب' آپ کو آغا صاحب یاد کرتا ہے ''

آغا صاحب نے '' چپے روڑا'' کا آرڈر دینے کے بعد ہم سے کہا'' یار سنا ہے تم نے کام کرالیا ہے۔ ہمیں بھی بتاؤ ''

ہم نے انہیں بتادیا کہ ہمیں سیکرٹری اطلاعات نے اجازت دی ہے۔

''نائلہ '' صحیح معنوں میں پاکستان کی پہلی رنگین فلم تھی جس کے ہدایت کار شریف نیّر صاحب تھے۔ آغا صاحب کے لئے بھلا یہ کون سا مشکل کام تھا۔ انہوں نے بھی اجازت حاصل کرلی اور ''کنیز'' اور ''نائلہ'' ایک ساتھ ہی ریلیز ہوئیں اور دونوں نے بہت زبردست کامیابی حاصل کی۔

فلم کی ریلیز سے پہلے ایک اور پریشانی پیدا ہو گئی۔ پرنٹس بنانے کیلئے بازار میں پوزیٹو موجود نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ بحری جہاز کے ذریعے سٹاک آرہا ہے۔

ہم نے کہا'' مگر ہماری فلم کی ریلیز کیلئے اتنا لمبا انتظار نہیں کیا جاسکتا۔ ''

انہوں نے کہا'' تو پھر آپ بذریعہ ہوائی جہاز پوزیٹو منگا لیجئے۔ مگر اس طرح زائد اخراجات آپ ہی کو برداشت کرنے ہوں گے۔ ''

سب نے ہمیں مشورہ دیا کہ تمہیں یہ زائد اخراجات برداشت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ڈسٹری بیوٹرز مقررہ وقت پر فلم ریلیز کرنا چاہتے ہیں تو یہ اخراجات وہ خود برداشت کریں ورنہ پھر ریلیز ملتوی کردیں۔ ہماری خواہش تھی کہ ہماری پہلی کوشش جلد سے جلد سینماؤں تک پہنچے اور ہم ڈسٹری بیوٹرز سے اضافی رقم طلب کرنا بھی اصولاً غلط سمجھتے تھے۔ لہٰذا ''کنیز'' کے پرنٹ بنانے کے لئے جو پوزیٹو بذریعہ ہوائی جہاز منگایا گیا اس کے اخراجات بھی ہمارے گلے پڑ گئے حالانکہ ہم تقسیم کاروں سے کہتے تو وہ انکار نہ کرتے۔

ریلیز سے پہلے ہم نے فلم ''کنیز'' کے ایک پریس شو کا اہتمام کیا جس میں لاہور کی سرکردہ فلمی شخصیات کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ فلم دیکھنے والوں نے اسے بہت پسند کیا۔ سب سے قابل قدر داد ڈبلیو زیڈ احمد صاحب نے دی۔ وہ اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ اس شو میں شریک ہوئے تھے۔ فلم ختم ہونے کے بعد انہوں نے ہمیں مبارک باد دی اور کہا ''آپ کی یہ فلم ضرور کامیاب ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں دیکھنے والوں کی توقعات کے برعکس واقعات رونما ہوتے ہیں۔ فلم دیکھتے ہوئے کئی جگہ میں نے سوچا کہ اب کہانی یہ موڑ لے گی مگر آپ نے کہانی کو دوسرا ہی موڑ دے دیا۔ اس طرح فلم میں مزید دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ ''

حسن طارق صاحب اس سے پہلے ''نیند'' اور ''شکوہ'' جیسی فلمیں بنا کر اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کرا چکے تھے۔ ''کنیز'' نے بطور ہدایت کار ان کے قد و قامت میں مزید اضافہ کر دیا۔ طارق صاحب نے اس فلم کو بہت شوق اور انہماک سے بنایا تھا اور اعلیٰ ترین ہدایت کاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہر منظر میں انہوں نے اس کے منظر کے مطابق ماحول پیدا کیا تھا۔ اداکاروں کو اس انداز میں پیش کیا تھا کہ وہ جیتے جاگتے کردار محسوس ہوتے تھے۔ اس فلم میں ٹچز بھی تھے اور ہر سچویشن کے مطابق ماحول بھی تھا۔ انہوں نے کہانی اور کرداروں کی چھوٹی سے چھوٹی نفسیات کو بھی پیش نظر رکھا تھا۔ کہانی پر ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ فلم بینوں کو اپنے ساتھ لے کر چلتے تھے۔ کبھی ہنساتے کبھی رلاتے کبھی انہیں سوچنے پر مجبور کر دیتے۔

ہنسانے اور رُلانے پر ہمیں ایک اہم بات یاد آگئی۔ ہماری سب سے پہلی تحریر کردہ کہانی ''ٹھنڈی سڑک'' تھی۔ اس فلم کی کہانی میں ہم نے یہ تجربہ کیا تھا کہ یہ آخر تک خالص اور سراسر مزاحیہ فلم تھی۔ اگر کرداروں کو دیکھا جائے تو مصیبت بھی پڑتی تھی یا وہ غمگیں اور اداس ہوتے تھے فلم والوں کے لئے پھر بھی یہ مزاحیہ سچویشن تھی۔ اس سے پہلے ایسی فلم بنانے کا تجربہ نہیں کیا گیا تھا اور یہ ضروری تھا کہ کہانی میں ہنسی اور غم دونوں کا امتزاج ہو۔ ڈرامائی کے مناظر کے بغیر کوئی فلم مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ شباب کیرانوی صاحب نے سوچا کہ لوگ فلم تو محض تفریح کے لئے دیکھتے ہیں اگر انہیں صرف ہنسنے کا سامان فراہم کیا جائے تو وہ یقیناً اسے پسند کریں گے۔ جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو ہم سینما میں پہنچ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے ۔ فلم شروع ہوئی ادھر تماشائیوں کے قہقہے شروع ہو گئے۔ اس میں کوئی

مبالغہ نہیں ہے کہ بہت سے لوگ ہنستے ہنستے کرسیوں سے گر بھی گئے۔ ہنسی اور قہقہے تھے جن کی آوازوں سے سینما ہال گونج رہا تھا۔

ہم بہت خوش تھے کہ ہماری پہلی کہانی دیکھنے والوں کو اس قدر پسند آئی ہے۔ فلم کا شو ختم ہوا اور تماشائی سینما گھر سے باہر نکلے، ہم بھی ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ حسب معمول باکس آفس میں تماشائیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔

لاہور میں یہ رواج ہے جب تماشائی فلم کا پہلا شو دیکھ کر سینما سے باہر آتے ہیں تو قطار میں کھڑے ہوئے لوگ ان سے فلم کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ کیسی ہے؟ اگر وہ جواب میں کہیں بہت عمدہ، بہت اعلیٰ تو پھر یار لوگ کھڑکی پر ٹوٹ پڑتے ہیں لیکن اگر اندر سے باہر آنے والے ناک بھوں چڑائیں یا ''ڈبّا'' کی آوازیں لگائیں تو قطاروں میں کھڑے ہوئے لوگ ایک دم یوں غائب ہو جاتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

''ٹھنڈی سڑک'' دیکھ کر باہر والوں نے ''ڈبّا'' کی آواز تو نہیں لگائی مگر اتنا کہا ''بس ہنسی ہی ہنسی ہے، اسٹوری وسٹوری کچھ نہیں ہے۔ ''

نتیجہ یہی ہوا کہ ''ٹھنڈی سڑک'' سپر ہٹ نہ ہو سکی اور ہمیں تجربہ کار ماہرین فلم نے سمجھایا کہ برخوردار جب تک فلم میں مرچ مسالے اور خاص طور پر رونا پیٹنا نہ ہو پبلک کے دل پر ہاتھ نہیں پڑتا اور فلم سُپر ہٹ نہیں ہوتی۔

شباب صاحب نے یہ مشورہ اپنی گرہ میں باندھ لیا تھا اور انہوں نے ایسی دردناک گھریلو اور ڈرامائی فلمیں بنانی شروع کر دیں جس سے کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں۔

''کنیز'' کے پہلے شو پر ہم خاموشی سے اپنے ایک دوست شوکت شیخ صاحب کے ساتھ سینما ہال میں جا کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ وہ ایم ایم آئی کے چیف انجینئر تھے۔ بعد میں شالیمار کمپنی کے ڈائریکٹر بن گئے تھے۔ طارق صاحب کی یہ عادت تھی وہ کبھی اپنی فلم کا پہلا شو سینما میں نہیں دیکھتے تھے کیونکہ بہت سے لوگ جذباتی ہیجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ٹینشن تو ہمیں بھی ہوتی تھی مگر ہم بذات خود فلم بینوں کا ردّ عمل دیکھنا چاہتے تھے۔

''کنیز کا شو شروع ہوا اور کچھ دیر بعد سینما ہال میں سنّاٹا چھا گیا۔ اس کہانی کا آغاز ہی ڈرامائی تھا۔ ابھی ریل چل رہی تھی کہ سینما ہال میں عورتوں کی سسکیوں کی آوازیں گونجنے لگیں اور کچھ دیر بعد انہوں نے آنسو پونچھنے شروع کر دیئے۔

ہمارے دوست شوکت شیخ نے چپکے سے ہم سے کہا "مبارک ہو رومال نکل آئے ہیں "

ان کا یہ فقرہ ہمیں آج بھی یاد ہے۔ یہ بات ہم نے بھی اپنی گرہ سے مضبوطی سے باندھ لی کہ جب تک رونا دھونا شامل نہ ہو ہمارے ہاں فلم سُپر ہٹ نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ اس دور کی باتیں ہیں جب خواتین کی بہت بڑی تعداد فلمیں دیکھنے سینماؤں میں آتی تھی۔ اب مختلف وجوہات اور خصوصاً سینما گھروں کے غیر صحت مندانہ ماحول کی وجہ سے خواتین سینما گھروں کا کم ہی رخ کرتی ہیں اور یہ " مردانہ " تفریح بن کر رہ گئی ہے۔ پنجابی فلموں میں تو بعض اوقات سینما ہال میں دس بارہ خواتین بھی موجود نہیں ہوتی تھیں۔ تماشائی آزادی سے فقرے کستے، بڑھکیں مارتے، آوازیں لگاتے اور بھنگڑے ڈالتے تھے۔ ایسے ماحول میں عورتیں بھلا کیسے آسکتی ہیں؟ کچھ عرصے بعد پاکستان میں مزاحیہ فلموں کا دور شروع ہوا تو رنگیلا' ننھا اور منوّر ظریف جیسے مزاحیہ اداکاروں کے ناموں کا ڈنکا بجنے لگا مگر یہ دور بھی زیادہ عرصے قائم نہ رہا۔ پنجابی ایکشن فلموں نے ایک بار پھر لوگوں اور فلم سازوں کی توجّہ اپنی طرف مبذول کیں۔ ان فلموں میں رقص' گانے اور ایکشن کے مناظر بہت اچھے ہوتے تھے۔ ڈرامائی مناظر بھی ہوتے تھے مگر قتل وخون میں ڈوبے ہوئے۔ رومان اور مزاح کو ان فلموں میں سے خارج ہی کر دیا گیا تھا۔ فلم بینوں کو اس کی کمی بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

کامیاب فلم کا بنیادی فارمولا آج بھی وہی ہے جس میں روزِ اوّل کی طرح جذبات واحساسات اور ڈرامے کا عنصر بھی ہو۔ رومان بھی ہو۔ مزاج' ناچ گانا بھی ہو' ان سب چیزوں کو ایک خاص تناسب سے پیش کیا جائے تو وہی ایک کامیاب فلم کہلاتی ہے اور ایسی فلمیں ہر دور اور ہر زمانے میں دیکھنے والوں کو پسند آتی ہیں۔

"کنیز" کی نمائش کے بعد ہمیں یہ اطمینان ہو گیا کہ ہم نے جس مقصد کیلئے فلم سازی شروع کی تھی بالآخر وہ ہم نے حاصل کر لیا۔ کنیز نے ایک کہانی نویس کی حیثیت سے ہماری حیثیت متعیّن کر دی۔ اس سے پہلے ہم نے ہلکی پھلکی کہانیاں لکھی تھیں۔ فلم سازوں کا خیال تھا کہ ہم صرف کامیڈی اچھی لکھ سکتے ہیں۔ اس لئے وہ ہم سے کامیڈی لکھوانے پر اصرار کرتے تھے۔ ڈرامائی اور سنجیدہ کہانیوں کیلئے وہ ریاض شاہد سے رجوع کرتے تھے لیکن کنیز نے ان پر یہ واضح کر دیا کہ ہم بھی ڈرامائی کہانیاں اور مکالمے لکھ سکتے ہیں اور بھاری بھرکم' پُر شوکت الفاظ کا استعمال کئے بغیر

بھی پُر اثر اور ڈرامائی کہانیاں اور مکالمے لکھے جا سکتے ہیں۔ یہ کہانی ہم نے اپنی پسند سے اور اپنی خواہش کے مطابق لکھی تھی۔ اس کا ایک ایک منظر اور مکالمہ ہم نے کسی کے مشورے اور مداخلت کے بغیر خود ہی تحریر کیا تھا۔ طارق صاحب نے اس کہانی کو ہو بہو سیلولائیڈ پر بڑی مہارت سے منتقل کر دیا تھا لیکن اس سے پہلے انہوں نے کہانی کا بغور مطالعہ کیا تھا اراس کی روح اور کرداروں کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ ایک ہدایت کار اور کہانی نویس جس طرح باہمی میل جول سے کام کر سکتے ہیں۔ یہ فلم اس کی مثال تھی اور اس نے ہمارے اس خیال کی تصدیق کر دی تھی کہ اگر کہانی نویس اور ہدایت کار میں ہم آہنگی ہو اور ہدایت کار کہانی کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اسے اسی انداز سے سکرین پر پیش کر دے جس مفہوم میں وہ لکھی گئی ہے تو ایک بہت اچھی فلم تخلیق کی جا سکتی ہے۔ ساری دنیا میں اچھی فلمیں اسی طرح بنائی جاتی ہیں۔ ہالی ووڈ کے بڑے بڑے ہدایت کار بھی لکھے ہوئے سکرپٹ کو فلم کا جامہ پہناتے تھے۔ ہمارے اکثر ہدایت کاروں کی طرح کہانی اور مکالموں میں اپنی پسند کے مطابق تبدیلیاں کرانے پر زور نہیں دیتے تھے۔ پاکستان میں اچھی فلمیں نہ بننے کی بنیادی وجہ یہی بیماری ہے۔ اس نظریے کی بعد میں بھی بارہا تصدیق ہوئی جس کا تذکرہ ہم مناسب موقع پر کریں گے۔

لطیفے کی بات یہ ہے کہ ''کنیز'' کے سُپر ہٹ ہوتے ہی ہر فلم ساز اور ہدایت کار نے ہم سے شکوہ کرنا شروع کر دیا۔

''آفاقی بڑے افسوس کی بات ہے اچھی کہانیاں اپنے لئے رکھ لیتے ہو ہمیں بھی ایسی کہانی کیوں نہیں دی؟''

ہم نے انہیں بتایا'' بھائی آپ میں سے ہر ایک خود اپنی ایک کہانی لے کر آتا ہے اور اس کو اپنی مرضی اور پسند کے مطابق لکھوانا چاہتا ہے۔ آپ کہانی نویس کو ایک منشی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اس کی سنائی ہوئی کوئی کہانی آپ کو پسند نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ یا تو ہو بہو غیر ملکی فلموں کے چربے بناتے ہیں یا ان کے اچھے حصے اپنی فلم میں شامل کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ہمارا یہ تجربہ ہے کہ فلم کی کہانی ''غریب کی جورو'' کی طرح ہوتی ہے۔ فلم سے تعلق رکھنے والا ہر شخص اس میں دخل اندازی کرنا اور مشورے دینا اپنا فرض جانتا ہے۔ کوئی دوسرا شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں اس طرح دخل اندازی کی جاتی ہو۔ ہدایت کار تو خیر مختار مطلق ہوتا ہے۔ کہانی میں ٹانگ اڑانا وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ فلم ساز کیونکہ سرمایہ فراہم کرتا ہے اس لئے اس کا حق بھی فائق ہے۔ مگر یہ فہرست صرف یہیں آکر ختم

نہیں ہو جاتی۔ موسیقار کیمرہ مین' اسسٹنٹ، پروڈکشن والا، تقسیم کار یہاں تک کہ فلم ساز کے دوست احباب اور اہل خاندان بھی کہانی میں تبدیلیاں کرانے کے لئے اپنے مشورے پیش کرتے رہتے ہیں اور ان پر عمل درآمد کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اب ان حالات میں کہانی نویس کیا کرے اور اچھی کہانی اور سکرپٹ کیوں کر لکھا جائے؟

ہم نے شکایت کرنے والے کئی فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو یاد دلایا کہ ہماری یہ کہانی سکرین پلے کی صورت میں ان کے مطالعے کے لئے پیش کی گئی تھی مگر کسی کو پسند نہ آئی۔ خلیل قیصر' اقبال شہزاد' رفیع چودھری، شوکت حسین رضوی۔۔۔ ہر ایک کو ہم نے یہ کہانی سنائی مگر انہوں نے فرمایا" ٹھیک ہے مگر کوئی اور سناؤ "
یہاں تک کہ حسن طارق جو ہمارے بہت گہرے دوست تھے اور جنہیں ہم کہانی اور سکرپٹ کی سب سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھنے والے ہدایت کاروں میں شمار کرتے ہیں۔ وہ بھی "کنیز" کو بنانے میں پش و پیش سے کام لیتے رہے۔ اس کہانی کی فلم بنانے کو ہم نے اپنی ضد بنالیا تھا اسی لئے جب طارق صاحب نے مختصر سکرین پلے پڑھنے کے بعد بھی لیت و لعل سے کام لیا اور کہا کہ۔۔۔ "ہاں کہانی تو اچھی ہے مگر "شکوہ" سے ملتی جلتی ہے۔ ان دونوں فلموں کے درمیان میں کچھ وقفہ ہونا چاہیے۔ تو ہم نے دل میں ٹھان لی کہ چاہے کچھ ہو جائے ہم اس کہانی کی فلم ضرور بنائیں گے خواہ خود ہی ہم کو فلم ساز کیوں نہ بننا پڑے ۔ چنانچہ ہم نے دو تین مہینے دوسرے تمام کام چھوڑ کر مال روڈ پر اپنے مستعار لئے ہوئے دفتر میں بیٹھ کر یہ سکرپٹ مکمل کیا پھر اس پر نظر ثانی کی اور جب سکرپٹ ہمارے خیال میں مکمل ہو گیا تو اسے خود ہی فلمانے کا ارادہ کر لیا۔ حسن طارق ہمارے دوست بھی تھے اور ہم ان کی صلاحیتوں کے بھی قائل تھے۔ اس لئے ہم نے ان سے کہا کہ ہم جو فلم بنا رہے ہیں وہ اس کی ہدایت کاری کر دیں۔ طارق صاحب یہ سکرپٹ لے کر چلے گئے اور دوسرے دن جوش میں بھرے ہوئے آئے اور ہم سے کہا" آفاقی صاحب اس سکرپٹ کو تو فوراً بنانا چاہیے"

ہم نے فلم بنانے کے لئے جو بندوبست کیا تھا وہ گڑبڑ ہو گیا تھا اور فلم شروع ہونے میں کافی دیر لگ گئی پھر اس کی تکمیل میں بھی کافی عرصہ لگا مگر آخر کار فلم مکمل ہو کر ریلیز ہو گئی اور ہمارا ایک خواب پورا ہو گیا۔
مزے کی بات یہ ہے کہ کنیز کی کامیابی کے بعد بھی کسی فلم ساز کو ہماری کوئی کہانی پسند نہ آئی۔ ہر کوئی اپنا آئیڈیا اور

کہانی لے کر ہمارے پاس آتا تھا۔

''کنیز'' اس سال کی بہترین فلم قرار پائی۔اس کے اداکار بہترین اداکار اور کہانی نویس وہدایت کار' بہترین کہانی نویس اور ہدایت کار ٹھہرے۔ مگر فلم کے آغاز میں وحید مراد' محمد علی کے درمیان جو ''پھڈّا'' ہوا تھا وہ آخر تک قائم رہا۔

''کنیز'' کی نمائش سے پہلے ہی وحید مراد اور محمد علی مقبول سُپر سٹار بن چکے تھے۔کنیز نے ان کی اس حیثیت کی تصدیق کر دی۔ مگر انعام دینے والے ججوں کے لئے یہ مسئلہ دردسر بن گیا کہ اس فلم میں ہیرو کا ایوارڈ کسے دیا جائے؟ دونوں فنکاروں نے بہت اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا اور اپنے کرداروں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا تھا۔دونوں ہی اپنے اپنے کرداروں میں نگینے کے مانند جڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ہی کے کردار موزوں ترین تھے۔کوئی وسرا اداکاران کرداروں کے ساتھ اس طرح انصاف نہیں کر سکتا تھا مگر سوال یہ تھا کہ فلم کا ہیرو کون ہے؟یعنی بہترین اداکار کون ہے اور بہترین معاون اداکار کون ہے؟

ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ عموماً فلم کے رومانی ہیرو کو ہی بہترین اداکار کے انعام کا مستحق سمجھا جاتا ہے حالانکہ دنیا بھر میں (بھارت کو چھوڑ کر) بہترین اداکار وہ ہوتا ہے جس کو کہانی میں مرکزی حیثیت حاصل ہو۔

سب سے پہلے ''نگار'' ایوارڈ کا اعلان کیا گیا۔اس ایوارڈ کو پاکستان کی فلمی دنیا میں آسکر جیسی اہمیت حاصل تھی۔پہلے قارئین ہر شعبے میں تین بہترین فنکاروں کا انتخاب کرتے تھے اور پھر ججوں کی کمیٹی ان میں سے کسی ایک کو بہترین قرار دیتی تھی۔یعنی اس میں پبلک کی پسند بھی شامل تھی اور اہل رائے کی رائے بھی ملحوظ خاطر رکھی جاتی تھی۔

''نگار'' ایوارڈ میں وحید مراد کو بہترین اداکار اور محمد علی کو بہترین معاون اداکار چُنا گیا تھا۔محمد علی کا مزاج برہم ہو گیا۔ ان کا اور ان کے مدّاحوں کا خیال تھا کہ فلم کا مرکزی کردار انہوں نے ادا کیا ہے۔اس لئے انہیں مرکزی اداکار تصوّر کیا جانا چاہیے لیکن وحید مراد کے طرفداروں کی دلیل یہ تھی کہ فلم میں ہیروئن وحید مراد سے محبت کرتی ہے اس لئے مرکزی اور رومانی ہیرو وحید مراد ہیں۔ہم سے جس نے پوچھا ہم نے یہی خیال ظاہر کیا کہ بھئی کہانی کا مرکزی کردار تو محمد علی ہیں اور ان ہی کے گرد کہانی گھومتی ہے۔(صبیحہ خانم کے بعد) انہیں اداکاری کا موقع بھی خوب ملا ہے جس کو انہوں نے بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔ مگر رواج اور روایت کے مطابق وحید مراد کو رومانی ہیرو ہونے کی وجہ سے بہترین

اداکار کا انعام دے دیا گیا۔ محمد علی صاحب کو یہ فیصلہ پسند نہیں آیا اور وہ معاون اداکار کا ایوارڈ لینے کے لئے بھی نہیں گئے۔ بعض دوسرے اداکاروں نے بہترین اداکار محمد علی کو اور بہترین معاون اداکار وحید مراد کو ٹھہرایا تھا۔
صبیحہ خانم جیسی عظیم فنکارہ بھی اسی روایت کی بھینٹ چڑھ گئی تھیں۔ وہ اس فلم اور اس کہانی کی روح رواں تھیں اور ان ہی کے گرد فلم کی کہانی گھومتی تھی۔ انہوں نے یہ کردار اس قدر خوبصورتی سے ادا کیا تھا کہ شاید۔ اس قسم کی اداکاری کے سلسلے میں انہوں نے ایک نیا معیار قائم کیا تھا۔ اس کے بعد کی فلموں میں بھی انہوں نے ماں کا کردار بہت خوبصورتی سے نبھایا تھا مگر ''کنیز'' کے کردار کو اوّلیت حاصل ہونے کی وجہ سے اس میں نیا پن اور تازگی تھی۔ بعد میں وہ اسی کو مختلف انداز میں پیش کرتی رہیں۔ البتہ جب انہیں قدرے مختلف کردار ملے مثلاً ''اک گناہ اور سہی'' میں کرسچین عورت کا انوکھا کردار تو۔۔۔ انہوں نے اداکاری کا ایک اور نیا معیار قائم کیا۔ مگر ستم ظریفی یہ دیکھئے کہ کنیز میں صبیحہ خانم کو بہترین اداکارہ کا نہیں بلکہ بہترین کریکٹر ایکٹریس کا ایوارڈ دیا گیا۔ اس سال کا کوئی ایسا ایوارڈ نہ تھا جو صبیحہ خانم کو نہ پیش کیا گیا ہو۔ بلاشبہ وہ برّصغیر کی بے مثال اور اپنی طرز کی منفرد فنکارہ ہیں۔
بہترین اداکار کا ایوارڈ نہ ملنے پر محمد علی ہم سے بھی خفا رہے۔ ہم نے کہا کہ بھائی ہمارا کیا قصور ہے۔ نہ ہم نے ووٹ دیا نہ ہم ججوں کی کمیٹی میں شامل تھے۔ نہ کسی نے ہم سے مشورہ لیا۔ اب اگر ججوں نے آپ کو ہیرو کے بجائے ویلن تصوّر کر لیا تو اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں ہے۔
خلیل احمد نے ہماری فلم کی موسیقی بہت دل لگا کر بنائی تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے سنتوش صاحب کی ذاتی فلم ''دامن'' کی موسیقی بھی ترتیب دی تھی۔ جس کے گانے بہت مقبول ہوئے۔ میڈم نورجہاں کا گایا ہوا ایک گانا تو اتنا مقبول ہوا کہ آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔

نہ چھڑا سکو گے دامن' نہ نظر بچا سکو گے۔

جو میں دل کی بات کہہ دوں' تو کہیں نہ جا سکو گے۔

خلیل اچھے موسیقار تھے۔ انہوں نے کئی فلموں میں بہت اچھی موسیقی ترتیب دی اور شہرت حاصل کی لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ ان کے کام میں تسلسل نہیں ہے۔ کبھی بہت اچھی موسیقی بنائیں گے کبھی اوسط درجے کی، پھر بھی ان

کے کئی گانے بہت پسند کئے گئے لیکن جہاں تک ہمیں یاد ہے انہیں کبھی بہترین موسیقار کے لئے کوئی بھی ایوارڈ نہیں دیا گیا۔ شاید اس لئے کہ اس زمانے میں مقابلہ بہت سخت تھا اس لئے کہ ان کی کسی فلم کے تمام گانے کبھی ہٹ نہیں ہوئے۔ ایک وجہ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ وہ میل ملاپ یعنی پی آر کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ ملنے والوں کا ایک مخصوص حلقہ ہے جس میں آمد روفت رکھتے تھے۔ ہر ایک سے بے تکلّف بھی نہیں ہوتے تھے۔

خلیل احمد سے ہماری دوستی بہت پرانی تھی۔ ''کنیز'' شروع کرنے سے لگ بھگ دس بارہ سال پہلے ہی ہماری ملاقات ہو چکی تھی اور خاصی بے تکلّفی رہی۔ ہم بتا چکے ہیں کہ وہ گلوکار بھی رہے ہیں۔ میڈم نور جہاں کے ساتھ انہوں نے ایک دوگانا بھی گایا جو کہ بڑے امتیاز کی بات ہے۔ اس زمانے میں میڈم کا عروج تھا۔ ان کے ساتھ گانے کا تصوّر ہی عام گانے والوں کے لئے ایک خواب تھا۔ میڈم اور خلیل احمد کا ایک دوگانا '' گلنار'' کے لئے ریکارڈ کیا گیا اور پسند بھی کیا گیا۔ مگر خلیل کی زیادہ توجہ تخلیق کی طرف تھی۔ گلوکاری پر انہوں نے زیادہ توجہ نہیں دی اور موسیقار بننے نکل کھڑے ہوئے۔ دیکھا جائے تو ان میں موسیقار بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ مغربی اور مشرقی موسیقی سے بخوبی واقف تھے۔ راگ راگنیوں کے ساتھ ساتھ برّصغیر کے ہر ایک علاقے کے لوک گیت انہیں زبانی یاد تھے۔ جنوبی ہند، بنگال، یوپی، پنجاب ہر جگہ کی لوک موسیقی اور طرزیں انہیں یاد تھیں۔ پس منظر موسیقی کا ہنر بھی جانتے جس پر عموماً موسیقار عبور نہیں رکھتے پھر بھی ہمارے خیال میں انہیں وہ مقام نہ ملا جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس میں خود ان کا بھی قصور ہے۔ انہوں نے لگن اور والہانہ پن سے اس شعبے کو اپنایا ہی نہیں۔ محض شوق اور پیشہ ہی سمجھتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ محنت کرنے والے کئی موسیقار ان سے آگے نکل گئے۔ ذرا یاد کیجئے انہوں نے کیسے کیسے گیت بنائے ہیں۔

تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا

انشا جی اٹھو اب کوچ کرو

میں نے تو پریت نبھائی سانوریا رے نکلا تو ہرجائی

ہونٹوں پہ کبھی ان کے میرا نام بھی آئے

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے

موسم بدلا رت گدرائی اہل جنوں بے باک ہوئے

کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو

ہر قدم پر اک نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ

نہ چھڑا سکو گے دامن نہ نظر بچا سکو گے

خلیل کو برصغیر کے سبھی علاقوں کی لوک موسیقی کیوں کر یاد ہو گئی؟ اس کی بھی ایک وجہ ہے ذرا سنئے ان کے والد پنجاب کے رہنے والے تھے۔ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ شادی ایک نیپالی خاتون سے کی۔ پیشہ سپہ گری تھا۔ وہ فوج میں میجر تھے اور ان کے ساتھ ساتھ خلیل میاں بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں کی سیر کرتے تھے۔

خلیل ڈھاکہ گئے تو بنگال کے حُسن کے اسیر ہو گئے۔ وہاں انہوں نے پہلی بار ریڈیو سے موسیقی کے پروگرام شروع کئے۔ خلیل کو موسیقی کا شوق تھا اور انہوں نے اس علم کی تعلیم و تربیت بھی حاصل کی مگر سکہ بند اور خاندانی گائیکوں اور استادوں سے دور ہی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیشہ ور موسیقی والوں اور خلیل احمد میں کبھی نہیں بنی اور ان کے تعاون کے بغیر کم از کم فلمی دنیا میں کام مشکل ہی سے چلتا ہے۔

جب توقعات کے مطابق کامیابی اور تحسین نہ ملے تو فنکار دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔ خلیل احمد کا بھی یہی حال تھا۔ ان کے لب و لہجے اور الفاظ میں تلخی سی گھل گئی۔ وہ ہر ایک سے شاکی ہو گئے۔ فلمی دنیا سے کبھی کے بے تعلق ہو گئے، صرف ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ان کا ناتا رہ گیا تھا۔

ہماری فلم کے نغمات حمایت علی شاعر نے لکھے تھے۔ یہ حضرت محض نام ہی کے شاعر نہیں ہیں۔ صحیح معنوں میں شاعر ہیں اور بہت ممتاز شاعر ہیں۔ فلموں سے وابستہ ہونے سے پہلے ادبی دنیا میں بھی انہیں بطور شاعر اور نقّاد بہت بلند مقام حاصل تھا۔ اتفاقاً فلمی دنیا میں آ گئے اور انہیں فلمی صنعت میں لانے کی ذمہ داری خلیل احمد پر ہے۔ حمایت صاحب کئی سال تک سندھ یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ صاحب علم و ہنر بھی ہیں اور صاحب قلم بھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اخلاق، تہذیب اور شائستگی کا نمونہ ہیں۔ گہرا سانولا رنگ، تیکھا بلکہ پُرکشش ناک نقشہ، گھنے بال جو پیشانی پر جھولتے رہتے

ہیں اور وہ انہیں مسلسل پیچھے ہٹاتے رہتے ہیں۔ متوسط قد' مناسب قد و قامت' گفتگو نہایت شائستہ اور پُر اثر، لب و لہجہ دلکش' یہ ہیں حمایت علی شاعر' ہماری ان سے پہلی ملاقات کراچی میں ہوئی تھی۔ ان دنوں یہ غالباً حیدر آباد یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے مگر باقاعدگی سے کراچی آمد و رفت رہتی تھی۔ ادبی حلقوں میں جانے پہچانے تھے۔ شاگردوں اور مداحوں کا ایک حلقہ بھی رکھتے تھے اور شاعرانہ چشمکوں سے بھی دامن نہیں بچاتے تھے۔ خیر اس میں کیا شکوہ، شاعروں' ادیبوں کی اپنی دنیا' اپنے مسائل اور اپنی جنگیں ہوتی ہیں۔ حمایت صاحب لاکھ شریف اور مرنجان مرنج سہی شاعرانہ جھڑپوں میں کسی سے کم نہیں ہیں۔

حمایت صاحب اپنی علمی و ادبی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ بے نیاز اور قناعت پسند آدمی ہیں۔ بس اپنی دنیا میں مگن رہنے کے عادی' مگر ایک دن موسیقار خلیل احمد ان کے پاس جا پہنچے۔ حمایت صاحب کی ایک نظم ان کی نگاہ سے گزری تھی۔ وہ کراچی کے ایک فلم ساز فرید صاحب کے لئے فلم ''آنچل'' کی موسیقی بنا رہے تھے۔ یہ نظم انہیں بہت پسند آئی۔ ڈھونڈتے ہوئے حمایت علی شاعر تک پہنچ گئے اور کہا کہ آپ کی ایک نظم فلم ''آنچل'' میں استعمال کرنا چاہتا ہوں۔

''کون سی نظم''

''تجھ کو معلوم نہیں' تجھ کو بھلا کیا معلوم''

''اوہ۔ مگر آپ کی فلموں میں تو گانوں کی مخصوص سچویشن ہوتی ہے جس پر خصوصی طور پر گانا لکھوایا جاتا ہے''

خلیل نے کہا ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعض غزلیں اور نظمیں فلموں کی سچویشن کے مطابق ہوتی ہیں تو انہیں بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ آپ کو کیا اعتراض ہے؟''

حمایت صاحب بولے ''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے سوائے اس کے کہ فلمی ضرورتوں کے تحت میری نظم کا حلیہ نہ بگاڑا جائے۔''

خلیل ہنسنے لگے۔ کہا ''آپ آیئے میں اس کی جو طرز بناؤں گا وہ خود بھی سنئے اور پسند کیجئے''

اس طرح حمایت صاحب کا فلمی دنیا سے واسطہ پڑا۔ اتفاق سے ان کا پہلا واسطہ ہی معقول اور پڑھے لکھے لوگوں سے پڑا تھا۔ پھر خلیل نے اس نظم کی جو سادہ مگر پُر اثر دھن بنائی تھی وہ بھی انہیں پسند آگئی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں نظم کو جس فیاضی سے خلیل احمد نے فلموں میں رواج دیا اور حمایت صاحب نے جو خوب صورت نظمیں فلموں کیلئے عطا کیں وہ ایک نئی روایت کی بنیاد بن گیا۔ بھارت میں ساحر لدھیانوی یہی تجربہ کر چکے تھے۔ ان کی بعض مطبوعہ نظمیں بھی بہت اچھے فلمی گانوں میں ڈھل گئیں۔ اسی طرح پاکستان میں خلیل اور حمایت صاحب کی ٹیم نے اس تجربے کو رواج دیا اور بھی شعرا کے مطبوعہ کلام کو فلموں میں استعمال کیا گیا ہے۔ سیف الدین سیف، قتیل شفائی، حبیب جالب، منیر نیازی اور فیض صاحب کی نظمیں اور غزلیں نہایت خوب صورتی سے فلموں میں استعمال کی گئیں اور غیر فانی فلمی نغموں کے طور پر محفوظ ہو چکی ہیں۔ مگر حمایت علی شاعر نے اس کے بعد بھی فلموں کے لئے نظموں ہی کو زیادہ آزمایا۔ انہوں نے فلموں کے لئے نغمات بھی لکھے ادبی اور شاعرانہ کسوٹی پر بھی کھرے اترتے ہیں۔ حمایت کی یہ نظم احمد رشدی نے گائی تھی اور خوب گائی تھی۔ شاید ہم یہ بتانا بھول گئے ہیں کہ احمد رشدی کو فلمی گلوکار کی حیثیت سے سب سے پہلے خلیل احمد ہی نے دریافت کیا تھا۔ احمد رشدی کا گایا ہوا گانا۔

کھٹّی کڑھی میں مکھّی پڑی

ہائے میری میّا

حمایت علی شاعر ہی کا لکھا ہوا ہے۔ حیدر آباد دکن کا مخصوص کھٹ مٹھا پن اس گانے میں نمایاں ہے۔

فلم ''آنچل'' نے اوسط درجے کی کامیابی حاصل کی تھی مگر اس نے خلیل احمد اور حمایت علی شاعر کی ٹیم کو جنم دیا اور اس کے بعد بھی یہ دونوں ساتھ کام کرتے رہے۔ اس طرح حمایت صاحب فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے اور لگ بھگ دس سال یہ تعلق نبھایا۔ اس دوران میں انہوں نے گیت بھی لکھے، فلموں کی کہانیاں اور مکالمے بھی لکھے فلم سازی بھی کی یہاں تک کہ ہدایت کاری کا مزہ بھی چکھ لیا۔

حمایت علی شاعر کے پہلے ہی نغمے کو اس سال کا بہترین فلمی نغمہ قرار دے کر نگار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ نگار ایوارڈ پاکستان کی فلمی دنیا کا ایک معتبر اور معروف ایوارڈ تھا اس گیت کے بول تھے۔

کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو

خدا کرے کسی دل کا قرار بن کے رہو

یہ نظم پہلے گلوکار سلیم رضا نے گائی تھی مگر فلم ''آنچل'' کے لئے احمد رشدی کی آواز میں صدابندی کی گئی۔ دونوں گلوکاروں نے اپنا اپنا حق ادا کر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ سلیم رضا اور احمد رشدی جیسی میٹھی اور سریلی آوازیں فلمی دنیا میں بہت کم سننے میں آئی ہیں۔

اس طرح حمایت علی شاعر ''فلمی'' ہو گئے۔ سنتوش کمار نے اپنی فلم ''دامن'' کا آغاز کیا تو موسیقار خلیل احمد اور نغمہ نگار حمایت علی شاعر کی ٹیم کو استعمال کیا اور اس فلم کے گانے بھی بہت پسند کئے گئے۔ میڈم نور جہاں کا گایا ہوا گانا۔

نہ چھڑا سکو گے دامن نہ نظر بچا سکو گے

جو میں دل کی بات کہہ دوں تو کہیں نہ جا سکو گے

اس سال کا بہترین فلمی نغمہ قرار پایا۔ حمایت علی کو ایک اور ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ دونوں فلموں کی موسیقی خلیل احمد نے مرتب کی تھی اور دونوں ہی مرتبہ وہ خود ایوارڈ سے محروم رہے۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔

حمایت صاحب ''دامن'' کے گانے لکھنے کے سلسلے میں لاہور آئے تو ہم سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ وہ بہت باذوق اور دلچسپ انسان ہیں۔ حس مزاح بھی ہے مگر زیادہ تر سنتے ہیں۔ بولنے میں فضول خرچی سے پرہیز کرتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ کوئی علمی و ادبی موضوع زیر بحث ہو۔ اس زمانے میں ہم نے ''کنیز'' کی منصوبہ بندی کی تھی اور خلیل احمد موسیقار تھے۔ پھر حمایت علی شاعر کیوں نہ نغمہ نگار ہوتے؟ حمایت علی شاعر نے جن فلموں کے لئے نغمات لکھے ان میں آنچل، کنیز، دامن، میرے محبوب، خاموش رہو اور لوری قابل ذکر ہیں۔ فلم ''نائلہ'' کے لئے انہوں نے صرف ایک ہی نغمہ تحریر کیا تھا جس کے بول یہ ہیں۔ یہ گانا مسعود رانا اور مالا کی آوازوں میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔

کوئی پروانہ ادھر آئے تو کچھ بات بنے

اس فلم کے باقی تمام نغمات قتیل شفائی صاحب کے لکھے ہوئے ہیں۔

حمایت علی شاعر کو فلمی دنیا میں شہرت بھی ملی اور عزت بھی۔ معاوضہ بھی معقول تھا۔ لوگ بھی ہم مذاق اور ان کے

مطلب کے تھے۔ فلم والوں سے بہت جلد گھل مل گئے۔ اداکار محمد علی کا اس زمانے میں بہت عروج تھا۔ محمد علی کے بڑے بھائی ارشاد صاحب حمایت صاحب کے دوست تھے۔ اس حوالے سے محمد علی انہیں بہت تعظیم دیا کرتے تھے۔

فلموں اور فلم والوں سے وہ ایسے شیر و شکر ہوئے کہ فلم سازی پر کمر باندھ لی ''لوری'' ان کی پہلی فلم تھی جس کے ہدایت کار ایس سلیمان اور مرکزی اداکار محمد علی اور زیبا تھے۔ اس فلم کا سکرپٹ بھی خود ان ہی کا لکھا ہوا تھا اور یہ پاکستان کی معیاری اور کامیاب فلموں میں شمار ہوتی ہے۔ جب پہلی ہی فلم سے کامیابی اور واہ واہ ملی تو حمایت علی شاعر نے ''گڑیا'' کا آغاز کر دیا۔ لیکن کوشش اور محنت کے باوجود ان کی یہ فلم مکمل ہو کر ریلیز نہ ہو سکی۔ انہوں نے ''کہاں ہے منزل تیری'' کے نام سے بھی ایک فلم شروع کی تھی مگر وہ بھی نامکمل رہی حالانکہ ''گڑیا'' کے تو ریکارڈ بھی ریلیز کر دیئے گئے تھے اور بہت پسند کئے گئے تھے۔ جب ابتدائی کامیابیوں اور کامرانیوں کا نشہ اترا اور فلمی دنیا کی تلخ حقیقتوں سے پالا پڑا تو حمایت صاحب گھبرا گئے۔ رفتہ رفتہ وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ فلمی دنیا ان کی منزل نہیں ہو سکتی۔ اس طرح انہوں نے بوریا بستر سمیٹا اور لاہور سے کراچی روانہ ہو گئے۔ پھر وہی علم و ادب تھا اور حمایت علی شاعر۔ فلم سے کنارہ کش ہوئے تو ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ تدریسی شعبہ بھی اپنا لیا۔ شاعری تو اوڑھنا بچھونا تھا ہی۔ اس طرح فلمی دنیا ایک باصلاحیت' ذہین' تعلیم یافتہ اور خوبصورت شاعر سے محروم ہو گئی۔ مگر ادب کا دامن بھر گیا۔ ان کے کلام کے مجموعے شائع ہوئے۔ طویل نظموں پر مبنی کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کی کئی نثری کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ منظوم ڈرامے لکھے اور شاعری میں نت نئے تجربے کئے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''آگ میں پھول'' تھا جس پر 1959ء میں انہیں صدارتی ایوارڈ دیا گیا تھا۔ 1984ء میں ان کی ایک اور تصنیف ''مٹی کا قرض'' پر انہیں رائٹرز گلڈ کا ادبی انعام پیش کیا گیا تھا۔

حمایت علی شاعر ایک جانے اور مانے ہوئے شاعر ادیب اور نقّاد ہیں۔ مشاعروں میں بھی ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں یہاں تک کہ بیرونی ممالک کے مشاعروں میں بھی اصرار سے بلائے جاتے ہیں۔

ایک بار ہم کینیڈا میں تھے جب پاکستان سے شاعروں کا ایک وفد وہاں پہنچا۔ جمیل الدین عالی' صہبا اختر' ضمیر جعفری

اور حمایت علی شاعر اس میں شامل تھے۔ ہماری مشاعرہ گاہ میں ان سے ملاقات ہوئی۔ کافی عرصے بعد ملے تھے اسلئے بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ دوسرے دن ہم اپنی کار لے کر ان کے ہوٹل پہنچ گئے۔ ان کے پاس وقت بہت کم تھا مگر ہم نے حسب استطاعت انہیں ٹورنٹو کا شہر دکھادیا۔ اس شہر میں ہم دو تین ماہ سے مقیم تھے اور اس سے بخوبی روشناس ہوچکے تھے۔ حمایت صاحب فقرہ بازی کا لطف تو لیتے ہیں مگر خود اس سے ذرا پرہیز ہی کرتے ہیں۔ خاموش مسکرانے اور بالوں کی لٹیں سنوارنے میں لگے رہتے ہیں۔ بالوں کو سنوارنے کا یہ دلکش انداز ہم نے ان میں دیکھا یا پھر ہدایت کار خلیل قیصر میں۔ ان دونوں کی شخصیت میں اس انداز نے مزید کشش پیدا کردی تھی۔

حمایت علی شاعر اپنا کلام سنانے کے معاملے میں کافی کنجوس ہیں۔ دوستوں کی نجی محفلوں میں فرمائش اور اصرار کے باوجود شاعری سے پرہیز کرتے ہیں۔ اسی زمانے میں ایک بار جب فلم ساز راشد مختار فلم ''عندلیب'' بنارہے تھے تو ان کے گھر پر رات کے کھانے کے بعد محفل آراستہ ہوئی۔ سرور بارہ بنکوی اور حمایت علی شاعر بھی موجود تھے۔ اس روز یہ دونوں قابو میں آگئے اور پھر جب شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہوا تو رات گئے تک جاری رہا۔ ویسی رات پھر دوبارہ نہیں آئی اور نہ ہی ویسی محفل اور وہ لوگ یکجا ہوئے۔

حمایت علی شاعر کا ایک اور لطیفہ بھی ہمیں یاد ہے۔ باری سٹوڈیوز میں ان کی فلم ''لوری'' کے لئے ایک لوری صدابند کی جارہی تھی۔ ہمارا ٹھکانا یوں تو ایورنیو سٹوڈیو میں تھا مگر ان دونوں نگار خانوں کے درمیان میں فاصلہ ہی کتنا ہے۔ عقب سے نکلو اور ایک منٹ میں دوسرے نگار خانے پہنچ جاؤ۔ اس لئے مٹر گشت جاری رہتا تھا۔ '' لوری'' حمایت علی شاعر کی بطور فلم ساز پہلی فلم تھی اس لئے ہم بھی بطور خاص ان کے گانے کی ریکارڈنگ میں پہنچ گئے۔ لوری کی صدابندی شروع ہوچکی تھی۔

ہم ریکارڈنگ روم کے پاس پہنچے تو سرخ بتّی روشن ہوچکی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ ریکارڈنگ شروع ہوچکی ہے۔ کوئی اندر نہ آئے۔ ہم ہال کے باہر انتظار کرنے لگے۔ گانے کی آواز باہر بھی آرہی تھی۔ بہت اچھی لوری تھی گانے کی پہلی ٹیک ختم ہوئی اور سرخ بتّی بجھی تو ہم اندر پہنچ گئے۔ حسب معمول پہلے تو وہاں پر موجود تمام حضرات کے ساتھ فقرہ بازی ہوئی۔ احمد رشدی' ایس سلیمان' خلیل احمد سب ہی موجود تھے۔ ہمیں فلم کی کہانی حمایت صاحب

پہلے ہی سنا چکے تھے۔ یہ ایک بچّے کی کہانی ہے جو اپنی ماں سے محروم ہو جاتا ہے۔ طلعت صدیقی نے اس فلم میں سنتوش کمار کی بیگم اور بچے کی ماں کا کردار کیا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ محمد علی صاحب' سنتوش کمار کے بہت لاڈلے چھوٹے بھائی ہیں اور زیبا، محمد علی کی بھابھی یعنی طلعت صدیقی کی لاڈلی بہن ہیں۔ وہ اپنی بہن کے گھر مہمان آتی رہتی ہیں اور وہ اور محمد علی ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں۔ مگر طلعت صدیقی بے خبر ہیں۔ طلعت صدیقی اچانک موت کی آغوش میں پہنچ جاتی ہیں۔ مگر اپنے بچے کی جانب سے بے حد فکر مند ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ وہ سوتیلی ماں کی بد سلوکی کا نشانہ بنے چنانچہ وہ بستر مرگ پر اپنی بہن سے یہ وعدہ لیتی ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد وہ سنتوش کمار سے شادی کر لیں گی۔ ان کی موت کے بعد زیبا سنتوش کمار سے شادی کر لیتی ہیں۔ محمد علی اس بات پر بہت ناراض ہیں وہ بچّے کو بھی خالہ سے بد ظن کر دیتے ہیں اور جس بچّے کی خاطر زیبا نے اپنے پیار کی قربانی دے کر سنتوش سے شادی کی تھی وہی ان سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

طلعت صدیقی جب زندہ تھیں تو اپنے بیٹے کو ایک لوری سنایا کرتی تھیں۔ اس وقت اسی گانے کی صدابندی جاری تھی۔ ہم نے جب گانے کے بول سنے تو حیران رہ گئے۔ ماں بیٹے کو دعائیں دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ تو دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ یہ دعا لڑکیوں اور خصوصاً بیاہی عورتوں کو دی جاتی ہے۔ لڑکے ذات کو یہ دعا دینا کہ بیٹا تو دودھوں نہائے پوتوں پھلے سراسر غلط ہے۔ لیکن یہ غلطی سرزد ہو رہی تھی اور بہت سے اہل ذوق اور تعلیم یافتہ لوگوں کے ہوتے ہوئے سرزد ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب گانا لکھا جاتا ہے تو موسیقار اور ہدایتکار سنتا ہے۔ فلم ساز اور دوسرے لوگ بھی سنتے ہیں۔ پھر اس کی ریہرسل ہوتی ہیں اور بار بار ان بولوں کی تکرار ہوتی ہے۔ اس کے بعد گلوکارہ اس کو سنتی' یاد کرتی اور گاتی ہے۔ تب کہیں جا کر صدابندی کی نوبت آتی ہے مگر ان تمام مراحل سے گزرنے کے باوجود یہ معمولی سی غلطی کسی کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔

ہم حمایت صاحب کو ایک طرف لے گئے اور کہا ''حمایت صاحب! آپ اس بچّے کے دشمن کیوں ہو گئے ہیں؟ ''

وہ حیران ہو کر پوچھنے لگے ''کون سے بچے کے؟ ''

''یہی جو آپ کی فلم کا کردار ہے ''

"کیوں بھئی کیا ہوا؟" انہوں نے پوچھا

"آپ کیوں چاہتے ہیں کہ اس غریب کی جنس بدل جائے اور وہ بڑا ہو کر مرد سے عورت بن جائے۔"

"بالکل نہیں چاہتا۔ آپ کو کس نے بتایا؟"

ہم نے کہا "آپ کے گیت کے بولوں نے"

پھر ہم نے ان سے عرض کیا کہ حضرت اس محاورے کا مطلب یہ ہے کہ جس لڑکی کی شادی ہو رہی ہے وہ اولاد نرینہ کو جنم دے اور اللہ اسے شیر خوار کو پلانے کے لئے دودھ عنایت فرمائے۔ لیکن آپ ایک ماں کی زبانی ایک بیٹے کو یہ دعا دلوا رہے ہیں۔

حمایت صاحب نے سر پکڑ کر کہا "حد ہو گئی اتنی فاش غلطی۔ کسی کا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔"

حقیقت یہ ہے کہ فلم سازی کے دوران میں بعض اوقات نہایت موٹی موٹی باتیں بھی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں اور کبھی کبھی تو فلم کی نمائش کے بعد ہی کوئی ان کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے تب غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

ہم نے ہمیشہ اپنی فلموں میں غلطیوں سے محفوظ رہنے کی کوشش کی ہے مگر اس کے باوجود خطا ہو جاتی ہے۔ ہر ایک کی نظر میں یہ غلطی نہیں آتی مگر کوئی نہ کوئی اس کی طرف توّجہ مبذول کرا دیتا ہے۔ فلم "کنیز" میں ایک پان فروش صاحب نے اس قسم کی ایک غلطی کی طرف متوّجہ کرایا تھا۔ ہماری فلم نمائش پذیر ہو چکی تھی اور سُپر ہٹ ہو گئی تھی۔ نقّاد اور فلم بین تعریفیں بھی کر رہے تھے اور ہم بے حد خوش تھے۔ ایک دن گھر سے نکل کر ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے تھے کہ نکڑّ والی دکان کے مرزا صاحب نے ہم کو سلام کیا۔ پان پیش کیا (وہ ہمیں پان مفت پیش کرتے تھے) اور پھر بولے "آفاقی صاحب فلم تو آپ نے بہت اچھی بنائی ہے مگر ایک غلطی ہو گئی ہے"

"وہ کیا؟" ہم نے پوچھا۔

اس نے کہا "صبیحہ کو آپ نے بے حد غریب عورت دکھایا ہے۔ جو چکی پیس کر گزارہ کرتی ہے مگر ساری وہ نائیلون کی پہنتی ہے۔ آپ نے اسے کوئی سُوتی ساری کیوں نہیں پہنائی؟"

مرزا صاحب کا اعتراض بالکل درست تھا مگر ہم نے فوراً عذر پیش کر دیا اور کہا "مرزا صاحب! نائیلون کی ساری کی

قیمت تیس پنتیس روپے تو ہوتی ہے مگر اسے بار بار دھونے میں آسانی رہتی ہے اور استری کا جھنجھٹ بھی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ زیادہ دیر تک چلتی ہے۔ ''

مرزا صاحب نے اپنا کان کھجایا اور بولے ''آفاقی صاحب ذرا یہ تو بتایئے کہ آپ کی کہانی کس زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس زمانے میں نائیلون کا کپڑا ہوتا کہاں تھا۔ یہ تو حال میں آیا ہے۔ ''

ہم دم بخود رہ گئے۔ پھر کہا ''مرزا صاحب دراصل فلموں میں کپڑے کی اصلیت کا پتا ہی نہیں چلتا۔ اس کپڑے کی فال اچھی ہوتی ہے اگر سوتی ساری ہوتی تو پھولی پھولی کچھ عجیب سی لگتی۔ ''

مرزا صاحب ''ہوں'' کر کے چپ ہو گئے مگر صاف ظاہر تھا کہ ہماری دلیل سے قائل نہیں ہوئے تھے۔

بعض اوقات زبان و بیان کی غلطیاں بھی عام فلم بین بتا دیتے ہیں اور ایسی نکتہ چینی کرتے ہیں کہ کیا کوئی نقّاد کرے گا۔

''کنیز'' کی تکمیل اور ریلیز کے بعد ہماری کامیابیوں کے سفر کا آغاز ہو گیا تھا اور کوئی ہوتا تو فلموں کا تانتا باندھ دیتا مگر ہم بتا چکے ہیں کہ فلم سازی کے معاملے میں ہم کاہل واقع ہوئے تھے۔ اس فلم کی تکمیل کے سلسلے میں جن مراحل سے گزرے تھے اس کے بعد فوری طور پر دوبارہ اس مشکل میں کودنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ہم نے فلم سازی جس مقصد کے لئے شروع کی تھی اللہ کے فضل و کرم سے اس میں کامیاب ہو گئے تھے' مطلب یہ کہ ہم نہ صرف کہانی نویس کے طور پر خود کو منوانے میں کامیاب ہو گئے تھے بلکہ اب ہم کو یہ مجبوری بھی نہیں رہی تھی کہ فلم ساز اپنی شرائط پر ہم سے من مانی کرائے اور ہماری مرضی اور پسند کے خلاف کام کرائے۔ اس وقت ہماری عمر 31 سال تھی۔

کچھ عرصے تک ہم آرام اور سیر و تفریح کرتے رہے۔ کبھی کراچی' کبھی اسلام آباد اور کبھی مری۔ اس دوران میں ہم دوسری فلم کی کہانی کے بارے میں بھی سوچتے رہے۔ ابھی سوچ بچار ہی کر رہے تھے کہ اچانک ہم السر کے حملے کی زد میں آ گئے۔ شدید بیمار ہو کر ہسپتال پہنچ گئے اور پھر ایک ڈیڑھ سال تک ہسپتال آنے جانے اور آرام کرنے میں مصروف رہے۔ اس طرح ''کنیز'' کے بعد ہماری دوسری فلم قدرت کی مصلحتوں کے باعث بن ہی نہ سکی۔ اس بیماری کا قصّہ ہم آگے بیان کریں گے۔ اس دوران میں پنجاب پکچرز کے دونوں ''میاؤں'' پر کیا گزری وہ بھی سن لیجئے۔ میاں ذوالفقار بہت صحت مند اور سرخ و سفید آدمی تھے مگر اچانک ہائی بلڈ پریشر اور دل کے عارضے میں مبتلا ہو گئے۔

ہم بیمار تھے تو وہ اور میاں خادم حسین ہسپتال میں آ کر ہماری عیادت کرتے رہتے تھے۔جب وہ بیمار ہوئے تو ہمیں خبر ہی نہ ہوئی کیونکہ ہم خود بیماریوں اور ہسپتالوں کے چکروں میں پھنسے ہوئے تھے۔خدا خدا کر کے ہم سال ڈیڑھ سال بعد تندرست ہوئے تو دوسری فلم بنانے کی سوچی۔

اسی زمانے میں مشرقی پاکستان کی فلم ''چندا'' اور ''تلاش'' کی نمائش ہوئی اور ان دونوں فلموں نے بالکل نئی کاسٹ کے باوجود بے حد کامیابی حاصل کی تو ہمیں یہ خیال سوجھا کہ کیوں نہ یہاں بھی نئے اداکاروں کو لے کر ایک اچھی، رومانی فلم بنائی جائے۔اس طرح نہ تو مصروف آرٹسٹوں کی ڈیٹس کے جھگڑے ہوں گے اور نہ ہی بلاوجہ کے اخراجات یکسوئی سے ایک اچھی فلم تخلیق کی جاسکے گی۔

ہمارے اچانک بیمار پڑنے سے پہلے بڑے بڑے تقسیم کار ہماری آئندہ فلم کو خریدنے کے خواہش مند تھے لیکن ہم ڈیڑھ دو سال کے لئے غوطہ لگا گئے۔اب یہ نیا خیال سوجھا تو ہم سب سے پہلے پنجاب پکچرز کے دفتر میں پہنچے۔دیکھا کہ میز کے سامنے ایک حصے پر میاں خادم جلوہ افروز ہیں۔میاں ذوالفقار نظر نہیں آئے۔ معلوم ہوا کہ وہ کافی بیمار رہے ہیں۔اب روبہ صحت ہیں مگر دفتر کم ہی آتے ہیں۔آرام کر رہے ہیں۔ہم نے ان کی مزاج پرسی کے لئے ان کے گھر جانے کا ارادہ کیا مگر بتایا گیا کہ وہ تبدیلی آب و ہوا کے لئے مری گئے ہوئے ہیں۔ چند روز بعد ہم بھی مری پہنچ گئے۔

اس وقت تک ہم کنوارے تھے۔ظاہر ہے اکیلے ہی مری جایا کرتے تھے۔پُرسکون اور الگ تھلگ سے ہوٹل ''سیسل'' میں ٹھہرتے تھے۔کتابیں پڑھتے اور کاہلی سے دھوپ میں بیٹھے رہتے۔لنچ اور شام کی چائے کے بعد مال روڈ کا ایک چکّر لگاتے اور پھر ہوٹل میں پناگزیں ہو جاتے۔ایک دن مال روڈ پر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میاں ذوالفقار ایک موٹی سی چھڑی تھامے چلے آ رہے ہیں۔

ہم بھی اپنی پتلی سی چھڑی تھامے ان کے پاس پہنچ گئے۔اتنے طویل عرصے بعد ملاقات ہوئی تو ہم دونوں کو بہت خوشی ہوئی۔ایک ریستوران میں جا بیٹھے اور اِدھر اُدھر کے قصّے شروع ہو گئے۔میاں صاحب کچھ جھٹک سے گئے تھے چہرے پر سُرخی کی جگہ زردی کھنڈ گئی تھی۔ قہقہوں میں بھی وہ پہلے جیسا زور و شور نہ تھا مگر زندہ دلی میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔

کچھ دیر ہم انہیں ہنسانے کی کوشش کرتے رہے پھر انہوں نے ہماری اور ہم نے ان کی بیماری کے دنوں کی تفصیل دریافت کی۔ آئندہ پروگراموں کے بارے میں پوچھا۔

ہم نے انہیں بتایا'' ہم بالکل نئی کاسٹ کی ایک فلم بنانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سارے مغربی پاکستان کے لئے یہ فلم آپ خرید لیں۔''

میاں صاحب اداسی سے مسکرائے اور بولے ''آفاقی صاحب میری صحت دیکھ رہے ہیں؟ شوگر، بلڈ پریشر اور دل کا مریض ہوں۔''

ہم نے کہا'' تو پھر کیا ہوا، بیماری اپنی جگہ ہے اور فلم اپنی جگہ۔''

بے دلی سے بولے ''ٹھیک ہو گیا تو پھر آپ کے ساتھ کام ضرور کروں گا''

ان کے ایک گہرے دوست رفیع ٹھیکیدار بھی ان کے ہمراہ تھے۔ کہنے لگے ''میاں کیسی مایوسی کی باتیں کرتے ہو۔ آفاقی کو دیکھو اتنی لمبی اور خطرناک بیماری اٹھائی ہے ابھی تک کتنا کمزور ہے، پھر بھی آئندہ کے منصوبے سوچ رہا ہے۔ آپ تو اللہ کے فضل سے بالکل صحت مند ہیں پھر بھی مایوس ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ آفاقی کے ساتھ فلم شروع کر دو۔''

میاں صاحب اداسی سے مسکرائے اور بولے ''ٹھیک ہے۔ تھوڑے دن بعد سوچ لیں گے۔''

کچھ دیر بیٹھے گپ شپ کی اور رخصت ہو گئے۔ تھوڑے عرصے بعد ایک دن خبر ملی کہ میاں ذوالفقار اچانک انتقال کر گئے۔ دیکھنے میں تو ایسے نہیں لگتے تھے خدا جانے انہوں نے ہمت ہار دی تھی یا موت کی پرچھائیاں پہلے ہی انہیں نظر آنے لگی تھیں؟ اللہ مغفرت کرے بہت اچھے انسان تھے۔

ان ہی دنوں مری میں ناول نگار رشید اختر ندوی صاحب سے بھی ملاقات ہو گئی۔ وہ شیروانی اور تنگ موری کا پاجامہ پہنے مال روڈ پر نظر آئے تو ہم ان سے نظر بچا کر نکلنے لگے مگر وہ خود ہی ہمارے پاس آ گئے۔ ہم ''آفاق'' کے زمانے کا ایک واقعہ پہلے بیان کر چکے ہیں جب رشید اختر ندوی صاحب اپنے ایک ناول کا مسوّدہ ہمارے ادبی ایڈیشن میں شائع کرانے کی غرض سے آئے تھے اور ظہور عالم شہید صاحب نے انہیں ہمارے پاس بھیجا تھا۔ اس وقت ہماری کرسی پر

اے حمید بیٹھے ہوئے تھے اور مذاق کے موڈ میں تھے۔ رشید اختر ندوی صاحب سے بالمشافہ ملاقات بھی نہ تھی۔ انہوں نے خود کو آفاقی اور ہمیں اے حمید کہہ کر ان سے متعارف کرایا۔ کچھ عرصے بعد ان پر یہ راز فاش ہو گیا اور رشید اختر ندوی صاحب برہمی سے اپنا مسوّدہ لے کر چلے گئے تھے۔

اس وقت کے بعد ہماری یہ اُن سے پہلی ملاقات تھی۔ درمیان میں نو دس سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ ہم تو انہیں فوراً پہچان گئے مگر ان کا حافظہ بھی غضب کا تھا۔ وہ بھی ہمیں پہچان گئے اور بذات خود ہمارے پاس چلے آئے۔ خدا جانے وہ ہماری اس گستاخی یا شرارت کو فراموش کر چکے تھے یا ان کی عالی ظرفی اور کشادہ دلی تھی کہ ہمیں معاف کر دیا تھا۔ وہ بڑی شفقت اور خلوص سے ملے۔

پوچھا ''آپ غالباً آفاقی صاحب ہیں۔''

''جی ہاں'' ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

''آپ موسم کے بغیر یہاں کیسے۔۔۔ اور کچھ کمزور بھی لگ رہے ہیں۔'' ہم نے اپنی طویل بیماری کے بارے میں بتایا تو وہ پریشان ہو گئے۔ دیر تک کُرید کُرید کر پوچھتے رہے اور حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ریستوران میں لے گئے اور چائے پلائی پھر ہمیں اپنے گھر کا پتہ نشان بتایا اور مدعو کیا۔ وہ سال کے چھ مہینے مری میں گزارتے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ بہت مقبول ناول نگار تھے۔ وہ ان معدودے چند خوش نصیب لکھنے والوں میں تھے جو محض ناول نگاری سے روزی حاصل کرتے رہے اور خوش حال زندگی بسر کی۔ ہم نے معذرت کر لی کیونکہ دوسرے دن مری سے ہماری واپسی تھی مگر انہوں نے بڑے خلوص سے دعوت دی کہ آئندہ مری آنا ہو تو میرے مہمان بن کر قیام کریں۔

اللہ اللہ، کیسے عظیم بزرگ تھے۔ اللہ میاں نے اب ایسے انسان پیدا کرنے بند کیوں کر دیئے ہیں؟

مشرقی پاکستان کی فلم ''تلاش'' کی نمائش کے ساتھ ہی ایک نئی ہیروئن نے سارے پاکستان کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیا۔ یہ شبنم تھیں، ان کا نام تو جھرنا تھا، اس نام سے ڈھاکا کی چند بنگالی فلموں میں کام بھی کیا اور یہ فلمیں کامیاب بھی ہوئیں۔ اس سے متاثر ہو کر بلکہ حوصلہ پا کر فلم ساز و ہدایت کار احتشام نے ایک اردو فلم ''تلاش'' بنانے کا فیصلہ کیا اور اس میں شبنم کو ہیروئن کے طور پر پیش کیا۔ ''تلاش'' شبنم کی پہلی اردو فلم تھی اور اس قدر کامیاب ہوئی کہ مشرق و

مغرب میں اس نے نئے ریکارڈ قائم کر دیئے۔ کراچی سے خیبر اور ڈھاکا سے چٹا گانگ تک ہر جگہ اس فلم نے کامیابی حاصل کی اور شبنم ایک نئی ہیروئن کے طور پر سامنے آئیں۔ شبنم کی مقبولیت اور تازگی کو دیکھ کر مغربی پاکستان کے بہت سے فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے بھی انہیں اپنی فلموں میں کاسٹ کرنے کا قصد کیا اور اس غرض سے ڈھاکا میں ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر مطلب براری نہ ہوئی۔ معلوم ہوا کہ شبنم کو مغربی پاکستان کی فلمی صنعت کے بارے میں خوف زدہ کر دیا گیا ہے کہ وہاں تو غنڈوں اور بد معاشوں کا راج ہے، کوئی عورت اس ماحول میں کام نہیں کر سکتی۔

مشرقی پاکستان میں فلمیں بہت کم لاگت سے بنائی جاتی تھیں۔ اردو فلموں کے اخراجات بھی زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ نئے نئے اداکار متعارف کرائے جاتے تھے جس کی وجہ سے اخراجات اور بھی کم ہو جاتے تھے۔ شبنم کو ایک اردو فلم میں کام کرنے کا موقع مل رہا تھا اس لئے وہ بہت کم معاوضے پر بھی کام کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں ایک بہت بڑی مارکیٹ میّسر آنے والی تھی۔ اس لالچ میں انہوں نے فلم ساز کا برائے نام معاوضہ بھی قبول کر لیا۔ یہ فلم ہٹ ہو گئی تو فلمی دستور کے مطابق وہ اچانک سُپر اسٹار بن گئیں۔ ڈھاکا میں بھی ان کی مانگ میں اضافہ ہو گیا اور مغربی پاکستان کے فلم ساز بھی ان کے طلب گار ہو گئے۔ بیس ہزار روپے اس زمانے میں بہت زیادہ معاوضہ سمجھا جاتا تھا۔ فلم سازوں نے شبنم کو ایک فلم کے لئے بیس ہزار روپے کی پیشکش بھی کر دی مگر شبنم اتنی سہمی ہوئی تھیں کہ پھر بھی مغربی پاکستان کی فلموں میں کام کرنے پر راضی نہ ہوئیں۔

چند مہم جُو فلم ساز کراچی اور لاہور سے بذات خود ڈھاکا پہنچے اور شبنم سے ملنے کی کوشش کی۔ ڈھاکا کے فلم سازوں کو بخوبی یہ علم تھا کہ اگر شبنم ایک بار کراچی یا لاہور پہنچ گئیں تو پھر ڈھاکا واپس آنے کا نام نہیں لیں گی۔ مغربی پاکستان میں بڑے اور معروف فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے ساتھ زیادہ معاوضے پر کام کرنے کے بعد ڈھاکا کی فلموں میں ان کے لئے کوئی کشش باقی نہ رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مغربی پاکستان کے فلمی ماحول کے بارے میں ایسی خبریں مشہور کر دی تھیں جن کی وجہ سے خواتین فن کار تو کیا مرد بھی مغربی پاکستان کا رُخ کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ دیکھا جائے تو ڈھاکا کے فلم ساز اس میں حق بجانب بھی تھے۔ بڑی مشکل سے وہ کسی اداکار یا اداکارہ کو دریافت کر کے

فلموں میں پیش کرتے تھے اور وہ بہتر مستقبل کی خاطر مغربی پاکستان کا ہو کر رہ جاتا تھا۔ کراچی والوں کو یہی شکایت لاہور سے بھی تھی کہ وہ اداکار اور گلوکار تلاش کرتے ہیں اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ کراچی سے لاہور کا ٹکٹ کٹا لیتے ہیں، مگر لاہور والے بھی اپنی جگہ حق بجانب ہیں۔ لاہور ہمیشہ سے فلمی صنعت کا مرکز رہا ہے یہاں بہت زیادہ فلمیں بنائی جاتی ہیں جن کے لئے زیادہ فن کاروں کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن یہاں اداکاروں اور اداکاراؤں کی ہمیشہ قلت رہی ہے۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ صف اوّل کے ایک درجن یا نصف درجن فن کار دستیاب ہوں، ایک وقت میں صف اوّل کے تین ہیرو اور تین ہیروئنوں سے زیادہ انہیں کبھی نصیب نہ ہوئے۔ اُدھر ہر فلم ساز کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ مقبول ترین فن کاروں کی خدمات سے فائدہ اٹھائے۔ یہی وجہ ہے کہ مٹھّی بھر اداکار منہ مانگے معاوضے وصول کرتے رہتے ہیں اور اپنی شرائط منواتے ہیں۔

ہم نے اپنی نئی فلم کی منصوبہ بندی شروع کی تو ایک دن حسن طارق صاحب نے ہم سے کہا ”آفاقی صاحب اگر ہم اپنی نئی فلم کے لئے شبنم کو کاسٹ کر لیں تو کیسا رہے ؟“

ہم نے کہا ”مگر شبنم تو مغربی پاکستان آنے کے لئے تیّار نہیں ہے۔“

کہنے لگے ”نہ جانے کس قسم کے لوگ شبنم کو سائن کرنے کے لئے گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم جائیں گے تو شبنم مان جائے گی۔“

میاں خادم حسین بھی اس تجویز میں پیش پیش تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس وقت اگر شبنم کو لے کر فلم بنائی جائے تو فلم بینوں کو اس میں بہت زیادہ دلچسپی ہو گی۔

ہم نے دوسرے دن ڈھاکا کے لئے ٹرنک کال ملائی۔ وہاں چند جاننے والوں سے رابطہ قائم کیا اور شبنم کا ٹیلی فون نمبر دریافت کیا۔ ہمارے پرانے کرم فرما اور دوست اے مجید صاحب بھی ان دنوں ڈھاکا میں بزنس کرتے تھے اور عطاءاللہ شاہ ہاشمی صاحب بھی ڈھاکا گئے ہوئے تھے۔ مجید صاحب لاہور پہنچے تو انہوں نے بتایا کہ شبنم کا فون نمبر دستیاب نہیں ہے۔ وہ مغربی پاکستان کی فلموں میں کام کرنے کے لئے تیار بھی نہیں ہو گی۔ اگر آپ لوگ جانا چاہتے ہیں تو جا کر قسمت آزمائی کر لیجئے۔ ان کا دفتر ڈھاکا کے ایک خوب صورت کاروباری علاقے میں تھا۔ انہوں نے یہ پیشکش کر دی

کہ آپ وہاں میرے دفتر میں قیام بھی کر سکتے ہیں۔ مجید صاحب خود بھی جب ڈھاکا جاتے تھے تو اسی دفتر میں قیام کرتے تھے۔

ہم نے طارق صاحب کے ساتھ ڈھاکا جانے کا پروگرام بنالیا۔ میاں خادم حسین بھی ہمارے ساتھ جانے کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ ڈھاکا کے لئے تین فضائی ٹکٹ بک کرلئے گئے اور ایک روز ہم تینوں ڈھاکا روانہ ہو گئے۔

ہم اس سے پہلے بھی ایک بار ڈھاکا جاچکے تھے۔ طارق صاحب کے ساتھ یہ ہمارا دوسرا دورہ تھا۔ پہلی مرتبہ فلم اسٹار کرکٹ میچ کے سلسلے میں ہم مغربی پاکستان کے سب ہی ممتاز فن کاروں کی معیّت میں گروپ منیجر بن کر ڈھاکا گئے تھے۔ پاکستان فلم پروڈیوسر ایسوسی ایشن کے صدر عطاء اللہ شاہ ہاشمی صاحب اور سیکرٹری عزیز احمد صاحب ہمراہ تھے۔ عزیز صاحب عمر میں ہم سے بڑے تھے مگر بے حد بے تکلّف دوست تھے۔ ہر ایک سے شفقت کا برتاؤ کرتے تھے اور ہم پر بھی مہربان تھے۔ ان دنوں لاہور اور کراچی میں جتنے بھی قابل ذکر فن کار تھے وہ سب اس کرکٹ میچ میں شریک ہونے کی غرض سے ڈھاکا گئے تھے۔ مشرقی پاکستان سیلاب زدگان کی امداد کے لئے ڈھاکا اور چٹاگانگ میں یہ فلم اسٹار کرکٹ میچ کھیلے گئے تھے اور بہت کامیاب رہے تھے۔ ڈھاکا والوں نے مغربی پاکستان کے مقبول فن کاروں کو پہلی بار دیکھا تھا اور ہوائی اڈّے پر مشتاقانِ دید کا اتنا ہجوم تھا کہ عمارت کے شیشے ٹوٹ گئے اور چھت بیٹھ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ یہ روداد ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

طارق صاحب نے کافی ہوائی سفر کئے مگر ہوائی جہاز میں سوار ہونے سے ہمیشہ ڈرتے رہے۔ اداکار نذر اور موسیقار روبن گھوش کی طرح وہ اتنا بھی نہیں ڈرتے تھے کہ ہوش وحواس ہی اڑ جائیں مگر تمام سفر کے دوران میں پریشان رہتے تھے۔ اس کا علاج انہوں نے یہ دریافت کیا تھا کہ ہوائی جہاز میں بیٹھتے ہی سونے کا بندوبست کر لیتے تھے۔ اس روز میاں خادم بھی ہمراہ تھے اس لئے ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ وقت گزارنے کے لئے تاش کھیلا جائے۔ ان دونوں نے تاش سنبھالے اور ہم نے میگزینوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ عملے نے چائے کافی سے مدارت شروع کر دی۔ پرواز بہت ہموار تھی اس لئے کچھ دیر بعد ہی ان دونوں کا ڈر دور ہو گیا۔

میاں خادم بولے ''لوگ خواہ مخواہ ڈرتے ہیں، ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کیا ہو جاتا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں ہوا، اب خود ہی

دیکھ لیجئے۔ کہیں محسوس بھی ہو رہا ہے کہ ہم ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہیں؟ یوں لگ رہا ہے جیسے گھر میں آرام سے بیٹھے ہیں۔"

طارق صاحب نے کہا" میاں، یہ ہوائی جہاز ہے اس کی چال کبھی بے ڈھنگی بھی ہو جاتی ہے۔"

وہ بولے" بیکار کی باتیں ہیں۔ ہوائی جہاز کوئی آفت تو نہیں ہے۔ ساری دنیا ہوائی جہاز میں سفر کرتی ہے کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

"اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔" طارق صاحب نے کہا" اب ذرا چال کی طرف دھیان دو۔"

کچھ دیر بعد کھانا آ گیا۔ ابھی ائر ہوسٹس مسافروں کے سامنے کھانا رکھنے میں مصروف ہی تھی کہ ہوائی جہاز میں ہلکی سی لرزش محسوس ہوئی۔

طارق صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔" یہ کیا ہو رہا ہے"؟

میاں بولے" طارق صاحب۔ ہوائی جہاز ہے۔ چل رہا ہے۔ کوئی کھڑا ہوا تو نہیں ہے تھوڑی بہت حرکت تو کرے گا۔"

چند لمحے بعد یہ حرکت کچھ زیادہ ہو گئی، ہوائی جہاز نے کانپنا شروع کر دیا اور پھر اوپر نیچے ہونے لگا اب تو میاں خادم بھی گھبرا گئے۔

" یہ کیا ہونے لگا؟"

دراصل ہوائی جہاز ائر پاکٹ میں آ گیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے جھٹکے بڑھ گئے۔ ہوائی جہاز کبھی نیچے کو جاتا کبھی اوپر کی طرف جاتا۔ یکایک ہوائی جہاز ٹیڑھا ہو گیا سامان اور مسافر سب الٹ پلٹ ہو گئے۔ چیخوں، آہوں، دعاؤں اور قرآن کریم کی آیتوں کی آوازوں سے سارا ہوائی جہاز گونجنے لگا۔ بچّوں نے رونا اور عورتوں نے فریاد کرنا شروع کر دیا۔ سبھی گھبرائے ہوئے تھے ہم بھی خوفزدہ اور سہمے بیٹھے تھے۔

ہماری سامنے والی سیٹ پر ایک موٹے تازے صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر پہلے ائر ہوسٹس ان سے درخواست کر چکی تھی کہ جناب سیٹ بلٹ باندھ لیجئے احتیاطاً مگر انہوں نے کوئی پروانہ کی۔ وہ چلی گئی تو ہم سے بولے" خواہ مخواہ رعب جماتی ہیں۔ سیٹ بیلٹ باندھنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے بلاوجہ کی پابندی ہے۔"

ہوائی جہاز نے بمپنگ کا آغاز کیا تو اعلان ہوا کہ اپنی اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لیجئے اور سگریٹ نوشی بند کر دیجئے۔

ہمارے سامنے والے مسافر نے پھر بھی سیٹ بیلٹ باندھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ دراصل بعض لوگوں کی نفسیات ایسی ہوتی ہے کہ وہ ہر اصول، ضابطے اور ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ان کی پابندی کو کسر شان سمجھتے ہیں۔ جب ہوائی جہاز نے دو چار بڑے بڑے غوطے لگائے اور پھر ایک دم الٹ پلٹ ہوا تو یہ صاحب اپنی سیٹ سے نکل کر پہلے تو سیٹوں کے درمیان میں پھنس گئے اور پھر لڑھکتے ہوئے کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ ہوائی جہاز میں حشر کا سا سماں تھا۔ اوپر سے کچھ سامان بھی مسافروں پر گرا تھا اور نیچے رکھا ہوا سامان بھی جھٹکوں اور ہچکولوں کی وجہ سے ادھر سے ادھر لڑھکتا پھر رہا تھا۔ سبھی مسافر سہمے ہوئے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے تھے یہاں تک کہ عملے کے ارکان بھی سیٹ بیلٹس باندھ کر بیٹھ گئے تھے۔ اب ان صاحب کو سہارا دیتا تو کون؟ سب چپ چاپ اپنی نشستوں پر بیٹھے ان کے لڑھکنے کا تماشا دیکھتے رہے۔

خود ان کا یہ حال تھا کہ کوشش کے باوجود سنبھل نہیں سکتے تھے۔ ان کے منہ سے کوئی آواز بھی برآمد نہیں ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد جب ہوائی جہاز قابو میں آیا اور اس کی حرکت میں کمی پیدا ہوئی تو عملے کے ارکان نے بڑھ کر ان صاحب کو اٹھا کر ان کی سیٹ پر بٹھایا۔ ان کی سانس پھولی ہوئی تھی چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جب حالات معمول پر آئے تو انہیں طبّی امداد فراہم کی گئی۔ ویسے تو وہ بھلے چنگے تھے مگر سہمے ہوئے تھے۔ اس دن ہمیں معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز کے سفر کے دوران میں سیٹ بیلٹ باندھنا کیوں ضروری ہے۔

طارق صاحب اور میاں خادم کا بھی بُرا حال تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے بیٹھے تھے۔ ہم نے اپنی سیٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ اس مختصر سے عرصے میں مسافروں پر کیا بیت گئی یہ وہی جانتے ہیں۔

میاں خادم بولے "میں تو اب کبھی ہوائی جہاز میں نہیں بیٹھوں گا، اسی طرح تو ہوائی جہاز گر جاتے ہیں۔"

"پھر واپس کیسے جائیں گے؟" ہم نے پوچھا "یا وہیں آباد ہونے کا ارادہ ہے؟"

کہنے لگے "ٹرین کے راستے واپس جاؤں گا، ورنہ آپ ڈھاکا میں پہنچتے ہی پانی کے جہاز سے میری سیٹ بک کرا دیں۔"

ہم نے کہا”میاں ہوائی جہاز کی گڑ بڑ تو کچھ دیر ہی رہتی ہے لیکن بحری جہاز میں کئی دن تک مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے سوچ لو۔“

انہوں نے سوچا اور اپنا ارادہ بدل دیا۔

ڈھاکا ائرپورٹ سے ٹیکسی میں سوار ہوئے اور مجید صاحب کے دفتر پہنچ گئے۔یہ کئی منزلہ عمارت تھی جس کی چھت پر چند کمرے بنے ہوئے تھے باقی صحن خالی تھا۔ مجید صاحب کے بنگالی ملازم نے ہمارا خیر مقدم کیا۔وہ کافی اچھی اردو بولتا تھا۔موٹے موٹے کتابی الفاظ استعمال کرنے کا بہت زیادہ شوقین تھا۔مثلاً اس نے چائے پیش کرتے ہوئے ہم سے کہا”آپ نے امیر خانے پہ قدم رنجہ کیا۔ آپ کا بڑا مہربانی ہے صاحب!“ اس سے آپ اس کی مہارت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ڈھاکا میں چند بنگالی کرم فرما تھے مگر ہر ایک کو اس معاملے میں ملوث نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے ایک نہایت معتمد دوست کی خدمات حاصل کی گئیں۔وہ بنگلہ اخبار میں صحافی تھے اور فلمی دنیا سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔

”آپ کیسے آیا لوگ؟“ انہوں نے پوچھا۔

ہم نے انہیں صورت حال بتائی۔وہ پہلے ایک بار لاہور اور کراچی کا دورہ کر چکے تھے اور اسی زمانے میں ہماری ان سے شناسائی ہوئی تھی۔

انہوں نے ہماری ساری کتھا سنی پھر جواب میں کہا” ہم آپ کو ادھر سوبنم کے پاس برابر لے جائے گا،وہ کیا بولے گا یہ آپ کا قسمت“!

اس طرح انہوں نے خود کو بری الذّمہ کر لیا اور ساری ذُمہ داری ہماری قسمت پر تھوپ دی۔وہ چائے پینے کے بعد رُخصت ہوگئے۔کافی دیر کے بعد ان کا فون آیا اور انہوں نے بتایا کہ سوبنم سے ان کی بات ہوگئی ہے وہ بالکل ”ایگری“ نہیں ہے مگر شام کو آپ میرے ساتھ اُدھر چلیں گا۔

دن بھر ہم ڈھاکا کی سڑکوں پر گھومتے رہے اور رکشے کی سیر کی۔ڈھاکا کا موسم بہت بے اعتبار ہے۔ چند منٹ بعد بارش ختم اور بادل بھی غائب، حبس تو وہاں بھی ہوتا ہے مگر ہماری طرح کا نہیں ہوتا۔ برسات میں موسم خاصا خوشگوار رہتا

ہے۔ ہم لاہور کراچی کی بارشوں کے عادی تھے کہ جو بارش شروع ہوتی ہے تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ سڑکیں نہریں اور دریا بن جاتی ہیں چلنا پھرنا دوبھر ہے۔ ڈھاکا میں بارش جزووقتی ہوتی ہے یعنی فوراً اور بند بھی فوراً ہو جاتی ہے اور کیا مجال جو سڑکوں پر پانی کھڑا ہو جائے۔ لوگ بارش میں بھی اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ یوں ہی گھومتے پھرتے ہیں بہت ہوا تو چھتری کھول کر پھرنے لگے۔

شبنم کے پاس لے جانے کے لئے وہی صحافی دوست آگئے اور رکشاؤں میں سوار ہو کر ہم چاروں شبنم کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک اچھے رہائشی علاقے میں ایک سرسبز و شاداب بنگلے کے سامنے رکشے سے اُترے۔ کافی اچھّا بنگلہ تھا۔ آس پاس گھنے درخت اور سبزہ، یہ تو خیر ڈھاکا میں ہر جگہ ہوتا ہے۔ ہم کوٹھی کے مختصر سے برآمدے کی طرف بڑھے تو بنگالی دوست نے روک لیا۔

”اِدھر نہیں، اُدھر“

جہاں برآمدہ ختم ہوتا تھا وہاں ایک موٹر گیراج تھا۔ اس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ معلوم ہوا یہ شبنم کا گھر ہے۔ بہت حیران ہوئے اتنی بڑی ہیروئن اور گیراج میں رہائش پذیر ہے؟

وہ صاحب اندر گئے کچھ دیر بعد واپس آئے تو ایک مضبوط جسم کے صحت مند صاحب ان کے ہمراہ تھے۔ ہم سمجھے شاید شبنم کے بھائی ہوں گے مگر پتہ چلا کہ ان کے پتاجی ہیں۔ اسکے بعد سالہا سال گزرنے کے بعد بھی ہم نے انہیں ویسا ہی صحت مند اور مضبوط پایا تھا۔ فرق یہ تھا کہ بالوں میں سفیدی آگئی تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے تھے بلکہ اردو کو توڑتے تھے۔ ان ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کی مدد سے آپ خود ہی مفہوم اخذ کرلیں۔

گیراج کے اندر داخل ہوئے تو سامنے ایک پردہ نظر آیا۔ اگلا حصہ ڈرائنگ روم تھا اور پچھلے حصے میں بیڈروم بنایا گیا تھا ۔ بہت مختصر سی جگہ تھی مگر سلیقے سے آراستہ کی گئی تھی۔ فرنیچر مونڈھوں پر مشتمل تھا۔ درمیان میں ایک میز تھی جس پر گلدان سجا ہوا تھا۔ ایک خاتون خاموشی سے پردہ اٹھا کر باہر آئیں اور بالکل خاموش باہر نکل گئیں۔ صحافی دوست نے بتایا کہ یہ سوبنم کی مودر ہیں۔

شبنم کے والد صاحب چھوٹے مونڈھے پر بیٹھ گئے ہم سب کے لئے اس مختصر سی جگہ میں گنجائش نہیں تھی پھر بھی گھس

گھسا کر بیٹھ ہی گئے۔

صحافی دوست نے ابتدائی بات کرلی تھی۔اب صرف جواب کاانتظار تھا۔شبنم کی مدر کچھ دیر بعد پھر گیراج میں داخل ہوئیں ان کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی جس میں چائے کی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔یہ پیالیاں انہوں نے خاموشی سے میز پر رکھ دیں اور چُپ چاپ دوبارہ پردے کے پیچھے چلی گئیں۔

ہم نے چائے کاایک گھونٹ ہی بھرا ہو گا کہ شبنم اسی پردے کے پیچھے سے بر آمد ہوئیں۔وہ ایک شوخ رنگ کی سوتی ساڑھی پہنے ہوئے تھیں۔چہرے پر برائے نام میک اپ تھا مگر اچھی لگ رہی تھیں۔ان کی پیشانی پر گہرے سرخ رنگ کی بندیا تھی۔سب سے نمایاں ان کی بڑی بڑی سحر انگیز آنکھیں اور لمبے لمبے سیاہ گھنے بال تھے جو ان کے گھٹنوں تک پہنچے ہوئے تھے۔

انہوں نے مسکرا کر ہم لوگوں کو دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ بولیں۔کمرے میں ان کے بیٹھنے کی گنجائش نہ تھی اس لئے ان کے والد نے ان کے لئے اپنا مونڈھا خالی کر دیا۔وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھ گئیں۔حال چال پوچھا تو جواب میں وہ مسکراتی رہیں ''ٹھیک ہے'' کے سوا کوئی اور بات انہوں نے نہیں کی۔دراصل اس وقت تک خود شبنم بھی روانی سے اردو نہیں بول سکتی تھیں۔اس سے پہلے تو وہ اردو سمجھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ اب انہوں نے اتنی ترقی کرلی تھی کہ آسان اردو میں بات کی جائے تو سمجھ لیتی تھیں۔

صحافی دوست نے بنگالی میں ان سے بات چیت کا آغاز کیا۔ گفتگو میں زیادہ حصّہ ان کے والد ہی لیتے رہے۔شبنم خاموش بیٹھی رہیں۔ہم یہ سوچتے رہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان ایک ہی ملک کے دو حصّے ہیں مگر یہ عالم ہے کہ دونوں صوبوں کے لوگ براہ راست ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کر سکتے۔ہم بنگالی نہیں جانتے تھے اور وہ اردو سے نابلد تھیں۔دیکھا جائے تو دونوں ہی قصوروار تھے۔

صحافی دوست نے ان مذاکرات میں مترجم کے فرائض سر انجام دیئے۔اس تمام گفتگو کا حاصل وہی تھا جو ہم لاہور میں جان چکے تھے۔ کوشش کے باوجود شبنم مغربی پاکستان کی فلموں میں کام کرنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ان کے والد نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ یہاں آکر فلم بنائیں تو شبنم اس فلم میں ضرور کام کریں گی۔ظاہر ہے کہ یہ ہمارے لئے

ممکن نہ تھا کہ سارے یونٹ اور اداکاروں کو مشرقی پاکستان لے جا کر وہاں فلم کی شوٹنگ کرتے،اس طرح یہ مذاکرات ناکام ہو گئے۔

رخصت کے وقت شبنم نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا اور ان کے والد باہر تک ہم لوگوں کو رخصت کرنے آئے۔

ہمارا مشن ناکام ہو گیا اور ہم تینوں ڈھاکا سے بے نیل و مرام لوٹ آئے۔اسی شام کو ڈھاکا کے فلم اسوڈیو کا ایک چکر لگایا ،واقف کاروں اور ناواقف کاروں سے ملاقات کی۔واقعی وہاں کا ماحول لاہور کے نگار خانوں سے بالکل مختلف تھا۔

ایک تو وہاں زیادہ گہما گہمی نہیں تھی۔کاروں کا نام تک نہ تھا۔فلم کے ہیرو اور ہیروئنیں بھی سائیکل رکشا یا ہاتھ سے کھینچنے والی رکشا میں سوار ہو کر اسٹوڈیو آتے تھے۔بالکل سادہ لباس ہیروئن،میک اپ صرف شوٹنگ کے وقت استعمال کرتی تھیں۔ایک فرق یہ محسوس کیا کہ وہاں کی فلمی صنعت کے ہر شعبے میں پڑھے لکھے اور شریف گھرانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے جس کی وجہ سے ماحول میں شائستگی اور سادگی تھی۔سب لوگ آپس میں کسی تصنّع یا بناوٹ کے بغیر بے تکلفی سے بات چیت کرتے تھے اور ہمارے نگار خانوں کے برعکس وہاں کے اسٹوڈیو کا ماحول کسی کالج یا درسگاہ جیسا تھا۔سیٹ پر نظم و نسق بھی دیکھنے میں آیا۔ہر کوئی خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔سب سے نمایاں فرق یہ تھا کہ بڑے سے بڑا فن کار بھی مقررہ وقت پر اسٹوڈیو پہنچ جاتا تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ اگر نو بجے صبح شوٹنگ کا وقت ہے تو نو بجے تک تمام لوگ اسٹوڈیو میں موجود نہ ہوں۔

ہم لوگوں کا سب سے تعارف کرایا گیا۔قریب قریب وہ سبھی طارق صاحب سے اور ہم سے واقف تھے۔کچھ لوگ بہت اچھی اردو بولتے تھے۔باقی نے انگریزی میں بات چیت کی۔

واپس لوٹتے ہوئے ہم نے کہا" کتنا اچھا اور سادہ ماحول ہے"!

میاں خادم بولے"آفاقی صاحب مجھے تو گھبراہٹ ہونے لگی تھی،یہ اسٹوڈیو ہے یا انجمن حمایت اسلام کالج،آرٹسٹ تک کو پہنچانا مشکل ہے ایسے کیسے کام چلے گا۔"

مگر کام خوب چلا اور ایسا چلا کہ اب تک چل رہا ہے حالانکہ اب مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہو کر بنگلہ دیش بن چکا ہے۔

ہم اس سے پہلے بھی دو بار مشرقی پاکستان جا چکے تھے مگر فلم سازی کے سلسلے میں یہ ہمارا" پہلا حملہ" تھا جو کامیابی

سے پسپا کر دیا گیا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ بعد میں شبنم مغربی پاکستان آ ہی گئیں اور معروف ترین ہیروئن قرار پائیں۔ انہوں نے ہماری فلموں میں بھی کام کیا اور ان کے ساتھ ملک سے باہر بھی بہت اچھا وقت گزارا جس کی یادیں ہمیشہ قائم رہیں گی۔

واپسی کا ٹکٹ بک کرانے سے پہلے۔ ہم نے میاں خادم سے پوچھا "میاں صاحب آپ کے لئے بحری جہاز کا ٹکٹ منگا دیں؟"

بولے " چھوڑیں جی! اتنا لمبا سفر اور وہ بھی سمندر میں ہوائی جہاز سے، وقت تو کم لگتا ہے۔ جو ہوتا ہے چٹ پٹ ہو جاتا ہے۔ بس اب آپ ایک کام ضرور کر دیں۔"

"وہ کیا" ہم نے پوچھا۔

"ہوائی جہاز میں بیٹھنے سے پہلے مجھے بے ہوشی کا انجیکشن لگوا دیں۔"

مگر واپسی کا سفر بخیر وعافیت گزر گیا۔ میاں خادم کچھ عرصے بعد فلمی صنعت سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ کافی عرصے تک ان کی کوئی خبر نہ ملی پھر ایک دن معلوم ہوا کہ وہ لاہور کارپوریشن میں ٹھیکیدار ہو گئے ہیں۔ ہم نے انہیں فون کیا تو خوش ہو گئے کہا "میں اس وقت مصروف ہوں آپ تکلیف کر کے تشریف لے آئیں۔"

ہم فوراً کارپوریشن کے دفتر پہنچ گئے۔ وہاں ٹھیکیداروں کا مجمع تھا۔ ایک ہنگامہ برپا تھا تلاش کرتے ہوئے اندر پہنچے مگر میاں خادم کہیں نظر نہ آئے۔ ایک صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کہا "وہ سامنے بیٹھے ہیں۔"

سامنے ایک باریش صاحب نظر آئے۔ سر پر ٹوپی، شلوار قمیض اور شیروانی میں ملبوس کسی مولوی کا گمان گزرتا تھا۔ یہی میاں خادم تھے۔ بڑے تپاک سے ملے، گلے لگایا پھر کام چھوڑ کر بطور خاص چلائے پلانے کے لئے ایک قریبی ریستوران لے گئے، کافی دیر تک پرانے زمانے اور پرانے لوگوں کی یاد کرتے رہے۔

ہم نے پوچھا "میاں، آپ کو یہ کیا سوجھی؟ کہاں فلمی دنیا اور کہاں یہ ٹھیکیداری! یہ کیسا انقلاب ہے؟"

بولے " آفاقی صاحب! انقلاب ہی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ پہلے میں داتا دربار کا مجاور تھا پھر فلم ڈسٹری بیوٹر بن گیا، میرے لئے تو وہ بھی نئی دنیا تھی ۔اب یہ ایک نئی دنیا ہے۔ ابھی اور کتنی دنیائیں دیکھنی ہیں۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے۔"

اس کے بعد میاں خادم سے ملاقات نہ ہو سکی شاید اس لئے کہ ہم دونوں ہی مختلف دنیاؤں کے باسی تھے۔
شاید اسی کا نام دنیا ہے۔؟
کچھ عرصہ پہلے ایک میگزین میں معروف شاعر ساغر نظامی کے بارے میں مضمون پڑھا تو بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔مزے کی بات یہ ہے کہ ہم ساغر نظامی صاحب سے کبھی نہیں ملے لیکن یوں لگتا تھا جیسے ہم انہیں بہت قریب سے جانتے ہیں۔ ہم جن دنوں میرٹھ میں پڑھتے تھے اور نادر علی بلڈنگ میں کمال کے گھر میں رہا کرتے تھے اُس زمانے میں ہماری دوستی ساغر نظامی صاحب کے سارے خاندان سے ہو گئی۔ ساغر صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی شہریار ہمارے ہم جماعت تھے۔ شہریار جن دنوں نویں دسویں جماعت میں زیر تعلیم تھے،اسی زمانے میں ان کا حُلیہ خالص شاعروں جیسا تھا۔ گھونگریالے بال،ایک خاص انداز سے سلجھے ہوئے۔ سانولا رنگ، دلکش ناک نقشہ، آنکھوں میں گہرے رنگ کی عینک لگاتے تھے۔ جس کا سبب بعد میں یہ معلوم کہ ان کی ایک آنکھ میں نقص تھا جسے چھُپانے کیلئے گہرے شیشوں کی عینک استعمال کیا کرتے تھے۔وہ ہمیشہ سفید کرتے اور پاجامے میں ملبوس رہتے تھے۔ ان کی ہر ادا اور ہر انداز شاعروں جیسا تھا۔ ہنسی مذاق بہت کم کرتے تھے۔اور وہ بھی بے تکلّف محفل میں، ورنہ مسکرانا بھی گناہ جانتے تھے۔ان کے چہرے اور بُشرے پر ہر وقت سنجیدگی اور متانت چھائی رہتی تھی۔ سفید ململ کا کُرتہ اور تنگ موری کا پاجامہ ان کا روزمرّہ کا لباس تھا۔ سکول جاتے تو شیروانی زیب تن کر لیتے تھے۔ جاڑوں میں سیاہ شیروانی، پیروں میں سلیم شاہی جوتا اور سر پر ٹوپی۔ ہلکی ہلکی مونچھیں۔ ملائم لہجے میں گفتگو، یہ تھے شہریار صاحب۔

اس حُلیے اور رویّے کے کلاس فیلو سے بھلا کوئی کس طرح بے تکلّف ہو جائے؟ لیکن ادب اور شاعری کے حوالے سے ہماری ملاقات ہو گئی۔ پھر یہ اچھی خاصی دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ شہریار تو دور ہی سے شاعر نظر آتے تھے۔ بلکہ ہمارے ایک کلاس فیلو اور دوست جلیل خاں کہا کرتے تھے کہ انہیں دیکھ کر تو اندھا بھی بتا سکتا ہے کہ یہ شاعر ہیں۔ جلیل خاں بے فکرے اور پھکڑ قسم کے آدمی تھے۔ ہمارے تو بہت جاں نثار اور بے تکلّف دوست تھے مگر ایک ہی بلڈنگ میں نزدیکی فلیٹوں میں رہنے کے باوجود ان کی شہریار سے دوستی نہیں ہو سکی۔ البتہ ان کے بڑے بھائیوں ملاحت یار خاں اور صباحت یار خاں سے ان کی خاصی گاڑی چھنتی تھی۔ ان میں صباحت تو خود بھی لطیفہ باز اور بے

تکلّف قسم کے آدمی واقع ہوئے تھے۔ ہم لوگوں سے سینئر تھے لیکن ہنسی مذاق اور بات چیت میں کوئی تفریق روا نہیں رکھتے تھے۔ ملاحت یار خاں ان دونوں سے بڑے تھے۔ خاصے اچھے طالب علم تھے۔ سنجیدہ ضرور تھے مگر ایسے بھی نہیں کہ ہر وقت سنجیدگی کا نقاب ہی اوڑھے رہیں۔ اس اعتبار سے شہر یار خاں ان تینوں میں قدرے مختلف تھے۔

ان تینوں کی ایک پہچان یہ تھی کہ وہ ساغر نظامی کے بھائی تھے۔ ساغر نظامی اُس زمانے میں اردو شاعری میں ایک بڑا نام تھے۔ ان کا کلام نوجوانوں کو بہت مرغوب تھا۔ نظم اور غزّل دونوں میں رواں تھے۔ وہ دور نظم کا دور تھا۔ جدید اور ترقّی پسند خیالات نظم میں پیش کئے جاتے تھے۔ امیری غریبی کا بہت کثرت سے بیان ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ روحانیت کا بھی دور دورہ تھا۔ ملاحت اور صباحت میں وہ شاعرانہ خُوبُو نہیں تھی جو شہر یار میں تھی۔ حالانکہ دونوں سے چھوٹے تھے مگر الگ تھلگ اور لیے دیے رہتے تھے۔ وہ ساغر نظامی کا بھائی کہلانے میں بہت فخر محسوس کرتے تھے۔ شاعر وہ تھے یا نہیں اس کا تو ہمیں علم نہیں لیکن ساغر نظامی کا کلام سنانے کے حوالے سے ان کی بہت شہرت تھی۔ کالج کے اجتماعات میں، مشاعروں میں اور ادبی محفلوں میں انہیں بڑے اہتمام سے بلایا جاتا تھا۔ وہ بھی شاعرانہ کرّوفر کے ساتھ شریک محفل ہوا کرتے تھے اور ساغر نظامی صاحب کا کلام بہت خوب صورت ترنّم سے سنایا کرتے تھے۔
دوسروں کا شاعرانہ کلام پڑھتے پڑھتے خود بھی شاعر بن جانے کا واقعہ ہم نے اپنی آنکھوں سے شہر یار کے سوا کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ پہلی بار ہم نے انہیں بڑے خوب صورت ترنّم کے ساتھ ساغر صاحب کی یہ نظم سناتے ہوئے پایا۔
سر دا انگلی اپنے مفلس باپ کی پکڑے ہوئے
رو رہا ہے ایک بچّہ اک دوکاں کے سامنے
یہ نظم دراصل ایک مفلس اور بے بس باپ اور اس کے معصوم بچّے کے جذبات کی تصویر کشی تھی۔ بچّہ باپ سے کسی کھلونے کیلئے ضد کر رہا ہے۔ اور باپ کی جیب میں پائی بھی نہیں ہے۔ یہ دردناک نظم خاصی مؤثر تھی۔ اس پر شہر یار کا ترنّم، سماں بندھ جاتا تھا۔ ہم نے اکثر محفلوں میں شہر یار کو یہی نظم سناتے ہوئے پایا۔ ایک بار تو ہمیں شبہ ہونے لگا کہ شاید انہیں ساغر نظامی کی کوئی دوسری نظم یاد ہی نہیں ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ انہوں نے اور بھی اپنے مطلب کی کچھ نظمیں یاد کر رکھی تھیں اور مناسب مواقع پر سناتے رہتے تھے۔ سامعین سے داد وہ یوں سمیٹتے تھے جیسے کہ خود ان کا اپنا

ہی کلام ہو۔

ساغر نظامی صاحب کے بارے میں ان کے بھائیوں سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ کبھی وہ بمبئی میں ہوتے، کبھی دہلی میں۔ ادبی حلقوں میں تو ان کی آؤ بھگت تھی ہی، قلمی اور سیاسی حلقوں میں بھی خوب پذیرائی ہوتی تھی۔ سنا تھا کہ وہ پنڈت نہرو کے بہت قریب ہیں۔ جو بعد میں ہندوستان کے وزیر اعظم بن گئے تھے۔ وہ بہت باذوق اور ادب دوست انسان تھے۔ شاعروں اور فن کاروں سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ جوش ملیح آبادی بھی ان کے بے تکلّف اور قریبی دوستوں میں سے تھے۔ اس حوالے سے بھی ساغر نظامی کا چرچا رہتا تھا جو عموماً ان کے بھائیوں کی زبانی ہوا کرتا تھا۔

ہم نے ساغر نظامی صاحب کو کبھی نہیں دیکھا۔ بس ان کے بھائیوں کی زبانی ان کی باتیں اور بڑائیاں ہی سنتے رہے لیکن یہ بیان اتنی کثرت سے ہوا کرتا تھا کہ یوں لگنے لگا جیسے کہ ہم انہیں برسوں سے جانتے ہیں۔ روزانہ ان سے ملتے ہیں اور ان کی کوئی بات ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔

وہ جو کہتے ہیں کہ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔ شہریار کے معاملے میں یہ کہاوت بالکل صحیح نظر آتی تھی اور بعد میں حرف بحرف سچ ثابت ہوئی۔

1947ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو ہم میرٹھ میں تھے۔ ہندوستان آزاد ہو گیا اور پنڈت جواہر لال نہرو پہلے وزیر اعظم بن گئے تو ساغر برادرز میں کانگریس کا چرچا کچھ زیادہ ہو گیا۔ ملاحت یار خاں اور صباحت یار خاں تو مسلم لیگی تھے مگر شہریار پر اپنے برادر اکبر کا اثر بہت زیادہ تھا۔ اس زمانے میں کسی مسلمان کا مسلم لیگی نہ ہونا بجائے خود ایک مسئلہ تھا اور پھر کانگریس کی حمایت اور مسلم لیگ کی مخالفت میں زبان کھولنا تو اور بھی بڑا مسئلہ تھا۔ اس لئے شہریار بھی اپنے خیالات کا فراوانی سے اظہار نہیں کیا کرتے تھے مگر وہ دل سے کانگریس کے حامی تھے۔

آزادی کے بعد ساغر صاحب نے مختلف مقامات تبدیل کئے۔ کبھی فلموں میں مکالمے اور گانے لکھنے بمبئی پہنچے تو کبھی کسی کارِ خاص کے سلسلے میں دہلی چلے گئے۔ اس دوران میں ہم پاکستان چلے آئے۔ ساغر برادرز سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر پتا چلا کہ شہریار بی اے کرنے کے بعد دہلی چلے گئے تھے اور آل انڈیا ریڈیو کے سرکاری ترجمان

''آواز'' کے نائب مدیر بن گئے تھے۔ ہمارے مشترکہ دوست پاکستان سے میرٹھ جاتے یا میرٹھ سے پاکستان آتے تو سب کا احوال بیان کرتے تھے۔ شہر یار کے بارے میں یہی سنا کہ ان کی شادی ہوگئی ہے اور اب وہ بذاتِ خود آزاد اور خود مختار شاعر بن گئے ہیں۔ ان کا سانولا سلونا، شائستہ چہرہ آنکھوں میں گھوم جاتا تھا۔ ان کی خیریت اور ترقی کی خبریں سن کر خوشی ہوا کرتی تھی۔ پھر چند سال قبل معلوم ہوا کہ شہر یار کا انتقال ہو گیا۔ وہ کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔

وہ تو ہندوستان ہی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ مگر ان کے بھائی صباحت یار خاں سے ایک بار ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ کراچی میں کوئی ورکشاپ چلاتے تھے۔ ان کا ایک خط بھی آیا جس کا ہم نے بڑے خلوص سے جواب دیا۔ مگر ارادے اور وعدے کے باوجود ملاقات نہ ہو سکی۔ سنا تھا کہ ملاحت یار خاں بھی پاکستان آگئے تھے۔ انڈیا میں پنڈت نہرو نے ساغر نظامی کو ایک مخصوص کام سونپا تھا۔ وہ وفات پا گئے تو ان کی بیٹی اندرا گاندھی نے ساغر صاحب کو کانگریس کی منظوم تاریخ لکھنے پر مامور کر دیا تھا۔ وہ یہ کام سرانجام دینے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ عمر کافی ہو چکی تھی۔ صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ اس طرح ہمارا ان کا غائبانہ تعلق ختم ہو گیا۔

میرٹھ میں نادر علی بلڈنگ ایک خوبصورت اور ماڈرن تین منزلہ عمارت تھی اور ایسی شاہراہ پر واقع تھی جو دہلی سے مسوری اور شملہ وغیرہ جاتی تھی۔ اس سڑک پر کافی دور تک کوئی جدید عمارت نظر نہیں آتی تھی۔ اس لئے جو بھی غیر ملکی سیّاح دہلی سے شملہ یا مسوری جاتے تھے وہ کسی ریستوران کی تلاش میں نادر علی بلڈنگ میں بھی آجاتے تھے۔ یہ تو ایک رہائشی عمارت تھی۔ کوئی ریستوران وغیرہ نہیں تھا۔ مگر ایک بار ہم نے اور کمال نے اپنے ڈرائنگ روم میں غیر ملکی سیّاحوں کو چائے پلا کر ان سے پیسے وصول کرنے شروع کر دیئے تھے اور برآمدے کے باہر بڑے حروف میں ''رائل کیفے'' بھی لکھ دیا تھا مگر بعد میں جب انکم ٹیکس والے تلاش کرتے ہوئے آگئے تو راتوں رات یہ عبارت مٹادی گئی ورنہ مصیبت میں پڑ جاتے۔ یہ تذکرہ تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ کمال کی والدہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ گھر کے اندر سے جو چائے اور بسکٹ باہر مہمانوں کیلئے بھیجے جا رہے ہیں ہم لوگ ان کی قیمت بھی وصول کر رہے ہیں۔

نادر علی بلڈ نگ میں ہمارے ہم جماعت اور تھوڑے سے فرق کے ساتھ ہم عمر نوجوانوں کی خاصی تعداد رہائش پذیر تھی۔ بازو میں فیض عام انٹر کالج تھا جس کی اس بلڈ نگ سے دیوار ملی ہوئی تھی۔ کالج سے آتے جاتے ہوئے بھی لڑکے بلڈ نگ کے وسیع اور کشادہ خوبصورت برآمدوں میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔اور مختلف قسم کی شرارتیں سوچا کرتے تھے۔ بلڈ نگ کے سامنے ایک کشادہ میدان تھا جو بھینسالی گراؤنڈ کہلاتا تھا۔اس کی دوسری جانب ایک ہندّو سکول تھا۔ایک بار معلوم ہوا کہ ایک بیل گاڑی میں سکول کے لئے لڈّو لے جائے جارہے ہیں۔نادر علی بلڈ نگ کے چار پانچ لڑکے فوراًاپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ان کے عقب میں دو تین درجن دوسرے حضرات بھی منصوبے کے مطابق پہنچ گئے تھے۔ مسلمان لڑکے دور سے پہچانے جاتے تھے۔ خصوصاً فیض عام کالج کے شیروانی پوش طلبہ۔

صباحت یار خاں کی قیادت میں تین لڑکوں نے بیل گاڑی والے سے مٹھائی کے بارے میں باتیں کرنی شروع کر دیں اور چکھنے کے بہانے ایک دولڈّو اٹھالئے۔ وہ جلال میں آگیا۔ان لوگوں کو خوب بُرا بھلا کہا اور اعلان کر دیا کہ یہ لڈّو اب ہندوؤں کیلئے ناپاک ہو گئے ہیں۔ان کے کھانے کے قابل نہیں رہے۔

صباحت یار خاں نے کہا۔ ''تو پھر دیکھتے کیا ہو، یہ لڈّو بازار میں لُٹا دو۔''

دکان دار نے غصّے میں آ کر چار لڈّو اٹھا کر پھینکے مگر منصوبے کے مطابق عقب میں آنے والے دستے نے سارے لڈّو لوٹ لئے اور بھاگ کر نادر علی بلڈ نگ میں پہنچ گئے۔ بات بڑھ گئی۔ ہندّو سکول کے لڑکے بھی جمگھٹے لگا کر آ گئے اور نوبت ہندو مسلم فساد تک پہنچ گئی۔ مگر عین وقت پر پولیس اور مجسٹریٹ نے معاملہ رفع دفع کر دیا۔اس قسم کی شرارتیں اکثر ہوا کرتی تھیں اور ساغر برادرز بھی ان میں شریک ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ شہر یار بھی اپنی تمام تر متانت کے باوجود پیش پیش رہا کرتے تھے۔

ایک بار مغرب کے وقت ہم لوگ بلڈ نگ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور ہر گزرنے والی کار کو روکنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ ایک بڑی سی کار میں یوپی کے چیف منسٹر گزرے۔انہیں روک لیا گیا۔ڈرائیور نے کار روک لی تو معلوم ہوا کہ یہ تو جھنڈے والی کار ہے۔اس کے ساتھ ہی ہم لوگوں کو چیف منسٹر کی شکل بھی نظر آ گئی۔

ڈرائیور نے پوچھا''کیا بات ہے ؟''

کوئی اور بات نہ سوجھی تو کہا۔ ''آپ کے پاس ماچس ہو گی؟'' اور بھاگ کھڑے ہوئے۔
چیف منسٹر نے بھی اس حرکت کو لڑکوں کی شرارت سمجھ کر ٹال دیا ورنہ کافی گڑبڑ ہو جاتی۔

اس قسم کی حرکتیں نادر علی بلڈنگ کے نوجوانوں کا گروہ اکثر کرتا رہتا تھا۔ کبھی ڈرامے ہو رہے ہیں تو کبھی ادبی محفلوں کے پروگرام بنائے جا رہے ہیں۔ فیض عام کالج کے نزدیک ہی ایک ''تاڑی خانہ'' تھا۔ تاڑی ایک سستا نشہ ہوتا ہے اس لئے غریبوں اور مزدور پیشہ لوگوں کا پسندیدہ مشروب ہے۔ اس میں بدبو کافی ہوتی ہے لیکن پینے والوں کیلئے تو وہی عطر اور مشک ہے۔ البتہ دوسرے لوگوں کیلئے اسے برداشت کرنا کارِ دارد ہے۔ تاڑی خانے میں عام طور پر مسلمان مزدور ہی زیادہ تعداد میں جایا کرتے تھے۔ ان محنت کش لوگوں کو پلے دار کہا جاتا تھا۔ پلےداروں کا یہ دستور تھا کہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصّہ تاڑی کی نذر کر دیا کرتے تھے۔ بعض لوگ تو جو کچھ کماتے تھے تاڑی خانے میں لے کر حاضر ہو جاتے تھے۔
صباحت یار خاں کو ایک دن کیا سوجھی کہ تاڑی خانے کے دروازے کے پاس سے گزرتے ہوئے ''آگ آگ'' کا نعرہ مار دیا۔ اس کے بعد تو جس کسی نے بھی سنا وہ ''آگ آگ'' چلاتا ہوا جدھر کو منہ اٹھا اس طرف دوڑ پڑا۔ بھگدڑ مچ گئی اور تاڑی خانہ ویران ہو گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ آگ واگ کچھ نہیں تھی۔ بس یوں ہی ایک شرارت تھی۔
پلےدار پکے مسلمان اور کٹّر پاکستانی تھے۔ ان میں سے اکثر کو تو پاکستان کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا سوائے اس کے کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہو گا جس میں مسلمانوں کی حکومت ہو گی۔ ان بے چاروں نے کبھی پاکستان آنے کے بارے میں سوچا بھی نہ ہو گا اور نہ ہی پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اس طرف کا رخ کیا۔ ان کا جذبہ اور خلوص بے لوث تھا۔ پاکستان کے نام پر وہ مارنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے اور ہندوؤں کے ساتھ بحث مباحثے میں اکثر سر پھٹول تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔
امروز ' پاکستان ٹائمز اور دوسرے اخبارات و جرائد میں ہم مضامین لکھتے رہتے تھے کیونکہ بطور صحافی ہماری پہچان ہو گئی تھی۔ مگر مستقل ملازمت کوئی نہ تھی۔ اسی زمانے میں روزنامہ ''زمیندار'' پر پابندی لگ گئی اور اس کے مالک و مدیر مولانا اختر علی خان قید کر دیئے گئے تو ان کے بڑے صاحبزادے منصور علی خان نے ''آثار'' کے نام سے ایک نیا

روزنامہ جاری کیااور ہم ''آثار'' سے وابستہ ہوگئے۔کچھ عرصہ گزرا تھا کہ مولانا اختر علی خان رہا ہو کر آ گئے اور انہوں نے اخبار کے معاملات سنبھال لئے۔''زمیندار'' کا ڈیکلریشن بھی بحال ہونے والا تھا۔ولی عہد یعنی منصور علی خان نے جو کہ عارضی جانشین تھے تخت وتاج اپنے والد کے حوالے کر دیا تو ہمارا وہاں گزارانہ ہو سکا اور نوکری چھوڑ دی۔

بے کاری کا تھوڑا ہی عرصہ گزارا تھا کہ میاں شفیع (م ش (اور ممتاز احمد خان نے اپنے ہفت روزہ ''اقدام'' کی ادارت ہمیں سونپ دی۔ہم نے م ش کی زیر نگرانی بڑے زور و شور سے کام کیا۔کچھ عرصے بعد پنجاب میں قادیانی تحریک چل نکلی۔''اقدام'' نے حکومت کو کھری کھری سنانا شروع کر دیں جس کا نتیجہ ''اقدام'' پر بندش کی صورت میں بر آمد ہوا۔ہم ایک مرتبہ پھر بے کار ہوگئے۔

اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ میاں ممتاز دولتانہ کو ایک بار پھر اخبار نکالنے کا شوق پیدا ہوا۔ان کے ایک پیروکار کی (جو صنعت کار بھی تھے) سرپرستی میں ایک کمپنی قائم کی گئی۔چودھری صاحب (غالباًان کا نام محمد حسین تھا) اس کے چیئر مین تھے۔روزنامہ ''آفاق'' دوبارہ اس ادارے کے تحت جاری کیا گیا تو سابقہ ''آفاق'' کے قریب قریب سبھی لوگ اس سے وابستہ ہو گئے۔میر نور احمد صاحب بدستور مینجنگ ایڈیٹر تھے۔ایڈیٹر کے طور پر مولانا غلام رسول مہر کا انتخاب کیا گیا تھا۔عملے کے باقی ماندہ ارکان کم و بیش پہلے والے ہی تھے۔مثلاً ظہور عالم شہید (نیوز ایڈیٹر) سردار فضلی) چیف رپورٹر) سید حبیب اللہ اوج (اسسٹنٹ ایڈیٹر) بشیر احمد ارشد (اسسٹنٹ ایڈیٹر) میاں محمد شفیع (م ش) اس دور میں بھی کالم نویس اور چیف رپورٹر تھے۔اس بار خورشید صاحب بھی رپورٹر کے طور پر ''آفاق'' سے وابستہ تھے۔یہ لاہور میں ''ڈان'' کراچی کے نمائندہ تھے اور بہت تیز وطرار' خطرناک قسم کے رپورٹر سمجھے جاتے تھے۔یہ لاہور میں بمبئی کے انگریزی فلمی پرچے ''فلم فیئر'' کے بھی نمائندے تھے مگر فلموں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اسلئے ہم ہی ان کے کام آتے تھے۔یہ واقعات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

''آفاق ''کا یہ دور بھی ہمارے لئے نہایت معلومات افروز' تجرباتی اور ہنگامہ خیز تھا۔ہم نے صحافیانہ زندگی کے بیشتر تجربے یہیں حاصل کئے۔

1958ء میں مارشل لانافذ ہوااور اخبارات پر فوجی حکمرانوں کا عتاب نازل ہواتو ہم بہت پریشان ہوئے۔اس طرح کی پابندیاں بلکہ ''ذلت'' ہمارے نزدیک صحافت کے شایان شان نہ تھی۔ادھر کمپنی کے مالی حالات بگڑ گئے تھے یا چیئرمین صاحب نے جان بوجھ کر مصلحتاًہاتھ کھینچ لیا تھا۔ تنخواہیں دیر سے ملنے لگیں تو ہم نے سٹاف کو جوش دلا کر ایک یونین بناڈالی۔سب نے ہمیں پورے تعاون کا یقین دلایا۔ سبھی ہمارے مہربان اور پرانے مخلص دوست تھے۔ایک جلسہ منعقد ہواجس میں جوشیلی تقریریں کی گئیں اور یہ فیصلہ کیاگیاکہ جب تک حالات بہتر نہ بنائے جائیں گے تمام عملہ (کاتبوں سمیت) ہڑتال کرے گا۔

اگلے روز سب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دفتر میں بیٹھ گئے۔ کسی کے سمجھائے نہ سمجھے۔یہاں تک کہ چیئرمین صاحب کا ٹیلیفون موصول ہوگیا۔سارے سینئر صحافیوں نے سوچ بچار کرکے ٹیلیفون ہمارے ہاتھ میں تھمادیا۔ہم نے یونین کے فیصلے کے مطابق چیئرمین صاحب کو خوب کھری کھری سنائیں اور صاف بتادیا کہ جب تک وہ مطالبات تسلیم نہیں کریں گے ہڑتال ختم نہ ہوگی۔انہیں بہت تاؤ آیا۔انہوں نے فرمایا''اگر آپ ان حالات میں کام نہیں کرسکتے تو نوکری چھوڑ کر چلے جائیں۔''

ہم نے جواب دیا'' تو پھر ہمارااستعفیٰ قبول فرمائیں ''

انہوں نے کہا''شکریہ خداحافظ''اور فون بند کردیا۔

کمرے میں سنّاٹاچھاگیا۔ہم نے فخریہ انداز میں تمام ساتھیوں کی طرف دیکھااور مسکرائے کہ دیکھا' کیساٹکاساجواب دیاہے چیئرمین کو' مگر وہ سب خاموش اور سوچ میں گم تھے۔ہم اپنے کمرے میں واپس پہنچے تو سمجھانے بجھانے والے آگئے۔ان کا کہنا تھا کہ انتظامیہ بہت حد تک مان گئی ہے۔باقی باتیں بھی مان لے گی۔جھگڑاکرنے کا کیافائدہ؟تم اپنا استعفیٰ واپس لے لو۔چیئرمین کو اعتراض نہ ہوگا۔ہڑتال جاری رکھنااب بے معنی ہے۔کافی لوگ بے روزگاری سے ڈرتے ہیں اور ہڑتال ختم کرنے پر آمادہ ہیں۔

ہم نے ان ناصحوں کو دیکھااور پوچھا''مگران سب نے ہر حال میں ایک رہنے اور ساتھ دینے کا عہد کیا تھا۔''

ظہور عالم شہید صاحب(اب مرحوم ہوچکے ہیں) ہمارے بے حد مہربان اور مشفّق تھے۔ انہوں نے پیار سے کہا

''آفاقی ہوش سے کام لو۔ اتنے بہت سے لوگ بے کار ہو گئے تو گزارا کیسے کریں گے؟ ''
ہم نے کہا ''شہید صاحب' یہ بات آپ سب نے پہلے کیوں نہیں سوچی تھی؟ ''
انہوں نے پیار سے ہمارے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''آفاقی ابھی تم نو عمر ہو۔ دنیا والوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہو۔ تمہیں ان کا تجربہ نہیں ہے۔ ابھی تو زندگی میں ہر قدم پر تمہیں ایسے اور بھی سمجھوتے کرنے پڑیں گے۔ غصہ تھوک دو چلو۔ کام کرو۔ ''
ہم نے جواب دیا ''شہید صاحب کم از کم میں ان سب واقعات کے بعد کام نہیں کروں گا۔ ''
انہوں نے ہمیں چمکارا ''آفاقی جی نہیں کرتا تو چھٹی کر لو۔ ایک دو دن دفتر مت آؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ''
ہم نے شہید صاحب کے محبت بھرے چہرے پر نظر ڈالی۔ مایوسیوں کا ایک زوردار ریلا آیا اور ہماری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا اور پھر پیار سے کہا ''ایسا نہیں کرتے یہ کیسا بچپنا ہے تم تو سمجھدار ہو
ہمارے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ ان کے پیار کرنے پر باقاعدہ سسکیوں سے اور پھر ہچکیوں سے رونے لگے۔ سارا دفتر ہمارے گرد اکٹھا ہو گیا سبھی ہمیں تسلی دلاسا دے رہے تھے۔ پیار کا اظہار کر رہے تھے اور ہم تھے کہ روئے جا رہے تھے۔ شہید صاحب نے سچ کہا تھا یہ زندگی کے تلخ حقائق اور دنیا والوں کے بارے میں ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ ہم نے پہلی بار لوگوں کو اصولوں اور وعدوں سے پھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہم آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ان سب کے چہرے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ یہ کیسے لوگ ہیں؟ کس طرح بدل جاتے ہیں اور عہد سے ہٹ جاتے ہیں۔

کافی دیر تک ہم روتے رہے۔ مگر کبھی نہ کبھی تو آنسو خشک ہونے ہی تھے۔
شہید صاحب بہت پیار سے ہمارے پاس بیٹھے تھپکتے رہے۔ پھر انہوں نے کچھ نوٹ ہماری جیب میں ڈال دیئے اور کہا ''جاؤ۔ تم دو چار دن چھٹی کرو۔ گھومو پھرو غصہ ٹھنڈا ہونے پر دفتر آ جانا۔ چیئرمین صاحب سے میں بات کر لوں گا۔ ان کی فکر نہ کرو۔ ''

ہم دفتر سے چلے آئے اور پھر ''آفاق'' میں ہم نے کام نہیں کیا۔ایک تو مارشل لا کی پابندیاں اور مجبوریاں' اس پر پہلی پہلی شکست کی ذلّت کا احساس، ہم نے ''آفاق'' ہی کو نہیں صحافت کو بھی خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ فلم کا متبادل راستہ ہمارے سامنے موجود تھا۔اگرچہ یہ مقدس نہیں تھا لیکن اب ہم کیا کرتے، صحافت کے تقدس کو چاٹنا تو نہیں تھا، فلم کی دنیا کنجر خانہ کہلاتی ہے لیکن اس میں ہر گز ایسے لوگوں کی بھرمار نہیں ، بڑے شریف اور خاندانی لوگوں کا بھی یہ پیشہ ہے۔

1958ء میں باقاعدہ صحافت کو ترک کیا اور فلمی کوچے میں جا نکلے۔وہاں کی آب وہوا بدلنے لگی تو پھر اسے بھی الوداع کہہ دیا اور پھر صحافت کی وادی میں جا نکلے۔ہم نے اپنی باقاعدہ صحافت کا دوسرا دور 1990ء میں شروع کیا۔ یعنی 32 سالوں کے طویل وقفے کے بعد۔

فلمی دنیا میں یہ سوچ کر گئے تھے کہ اب ساری زندگی اسی کی نذر کر دیں گے۔بہت محنت مشقت کی۔ بڑے شوق اور لگن سے کام کیا۔ بہت کچھ پایا' بہت کچھ کھویا' مگر جب حالات کا رنگ دیکھ کر فلمی صنعت کو بھی طویل ریاضت کے بعد خدا حافظ کہنے کا فیصلہ کیا تو ایک بار پھر دل بھر آیا۔ہم نے تو ساری عمر کے لئے اسی کو اوڑھنا بچھونا بنا لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ فلم کے ہر شعبے کا تجربہ حاصل کیا تھا۔جب خیال ہوا کہ فلم کے بارے میں تھوڑا بہت جان گئے ہیں تو اس کو بھی خیر باد کہنا پڑا۔ ہماری طرح اور بھی بہت سے ہم عصروں نے بالآخر یہی کیا۔

اسے بد قسمتی ہی کہنا چاہئے کہ ایک عمر جس کام کو جاننے بوجھنے اور سمجھنے میں صرف کی تھی اسی کو خیر باد کہنا پڑ گیا۔بطور صحافی' کہانی نویس' فلم ساز اور ہدایت کار ہمارا فلمی تجربہ لگ بھگ پچاس سال پر محیط ہے۔ مگر عمر کا یہ طویل حصہ رائیگاں ہی گیا۔ پاکستان کی فلمی صنعت کو بنانے سنوارنے کے جو خواب دیکھے تھے وہ ایک ایک کر کے ٹوٹتے گئے یہاں تک کہ آنکھ کھل گئی اور آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔کیا خواب اتنے طویل اور مسلسل بھی ہوتے ہیں اور کیا کبھی ان کی کوئی تعبیر بھی ہو گی؟

روزنامہ ''آفاق'' پہلے دور میں بند ہوا تو تمام ساتھی تتر بتر ہو گئے۔یوں کہیے کہ جس کا جہاں سینگ سمایا چلا گیا۔ہم اس

وقت تک بطور صحافی پہچانے جاتے تھے۔ فلمی دنیا سے بھی آمدورفت اور میل ملاپ کی حد تک واسطہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک دو فلمی جرائد کے لئے مضامین وغیرہ بھی لکھے تھے۔ لیکن کوئی باقاعدہ کام نہ تھا اس لئے زیادہ تر وقت لکشمی چوک کے ریستورانوں‘ چائے خانوں اور قہوہ خانوں میں گزرتا تھا۔ کبھی مال روڈ کا رخ کیا تو کافی ہاؤس پہنچ گئے یا ٹی ہاؤس میں جا بیٹھے۔ یہ سب مقامات اس زمانے میں شاعروں‘ ادیبوں‘ عالموں‘ دانشوروں اور سیاست دانوں کی زد میں تھے۔ لکشمی چوک میں البتہ فلم والوں کا بھی اضافہ ہو جاتا تھا۔ ایک اور مشغلہ اس زمانے میں دوست احباب کے دفتروں میں جا کر گپ لگانا بھی تھا۔ وہ آج کی طرح مشینی اور صنعتی دور نہ تھا۔ لوگوں کے پاس وقت بھی تھا‘ پیار اور خلوص بھی تھا۔ بیٹھ کر بات چیت کرنا اور مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرنا بھی اس وقت کی سماجی ضروریات میں شامل تھا۔

ایک روز ہم ٹی ہاؤس سے باہر نکلے ہی تھے کہ اقبال کوثر مل گئے۔ اقبال کوثر اچھے قد کاٹھ کے صحت منداور خوش شکل جوان تھے۔ صورت سے وہ شاعر کے علاوہ سبھی کچھ لگتے تھے مگر ان کی اصل وجہ محبوبی شاعری ہی تھی۔ یوں تو وہ ریلوے کے محکمے میں ملازم تھے مگر نوکری کا وقت جیسے تیسے گزارنے کے بعد وہ ریلوے ہیڈ کوارٹر یا ریلوے سٹیشن سے جو دوڑ لگاتے تو لکشمی چوک پر جا کر دم لیتے۔ وہ امرتسر کے رہنے والے تھے اور شاعر بھی تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ امرتسر سے تعلق رکھنے والے سبھی قابل ذکر اصحاب سے ان کی یاد اللہ تھی۔ امرتسر والے ان دنوں لاہور میں ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ جسے دیکھئے معلوم ہو گا کہ امرتسری ہے۔ ہمیں تو امرتسریوں سے ڈر لگنے لگا تھا۔ مگر ان کے بغیر گزارا بھی نہ تھا۔ امرتسر سے آنے والے بہت باصلاحیت‘ حوصلہ منداور دانش ور لوگ تھے۔ زندگی کے ہر شعبے میں امرتسریوں کی آمدورفت تھی یا پھر ان کا قبضہ تھا۔ ادبی اور فنی شعبوں پر تو وہ چھائے ہوئے تھے۔ امرتسر والوں میں ایک خوبی یہ دیکھی کہ وہ اپنے امرتسری ہونے پر برملا فخر کرتے تھے۔ اب بھی کرتے ہیں مگر وہ پہلے جیسا جوش و خروش نہیں رہا۔

ہمارے بھی کئی امرتسری مہربان تھے۔ سعادت حسن منٹو‘ ظہیر کاشمیری خالص امرتسری تھے۔ سیف الدین سیف صاحب بھی سرتاپا امرتسری تھے۔ ظہور الحسن ڈار بھی امرتسری تھے اور ہمارے بہت عزیز دوست تھے۔ عمر‘ دانش اور تجربے میں وہ ہم سے سینئر تھے۔ مگر بہت بے تکلف دوست تھے۔ ڈار صاحب بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔

بہت اچھے افسانہ نگار، صحافی اور کالم نگار تھے۔ ''آنکھیں میری، باقی ان کا'' ان کا مقبول ترین کالم تھا جو وہ مختلف اخبارات و جرائد میں وقتاً فوقتاً لکھتے رہے۔ متلون مزاج آدمی تھے اس لئے کسی ایک مقام پر زیادہ دیر تک ٹکتے نہیں تھے۔ جگہیں ٹھکانے اور پیشے بدلتے رہتے تھے۔ کبھی ادبی پرچوں سے وابستہ ہیں تو کبھی تصنیف و تالیف کر رہے ہیں۔ کبھی صحافت کے میدان میں قلم کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں تو کبھی فلمی دنیا میں براجمان ہیں اور کہانی و مکالمے لکھ رہے ہیں۔ مگر یہ سب کام ان کے لئے ''پارٹ ٹائم'' تھے یعنی جز وقتی۔ ان کی کل وقتی مصروفیت دوستوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا تھی۔ ابھی ہم سکول کے طالب علم ہوں گے جب ظہور الحسن ڈار لاہور کے ممتاز ادبی جرائد میں کہانیاں اور افسانے لکھتے تھے اور خوب داد پاتے تھے۔ انہوں نے زندگی بھر مختلف قسم کے کام کئے اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کی۔

انگریزی کی ایک کتاب ''بامبی'' کا انہوں نے اردو میں اس قدر خوبصورت ترجمہ کیا تھا کہ یہ ترجمہ اوریجنل کتاب پر بازی لے گیا تھا۔ الفاظ کا انتخاب، اسلوب، طرز بیان، تحریر کی شگفتگی اور سلاست، بے ساختگی اور سادگی، ان تمام چیزوں نے ''بامبی'' کو ایک بہت خوبصورت تصنیف بنا دیا تھا۔ اسے آپ ناول کہہ لیجئے جس کا پس منظر جنگل تھا اور یہ ایک بارہ سنگھے کی آپ بیتی تھی۔ یہ کہانی اس وقت سے شروع ہوتی تھی جب اس بارہ سنگھے نے جنم لیا تھا۔ اس کے بعد عمر کے مختلف مرحلے، تجربات، مشاہدات اور دلی وارداتیں اس حسن کے ساتھ پیش کی گئی تھیں کہ کتاب کو ختم کئے بغیر ہاتھ سے نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اس بارہ سنگھے کو مصنف نے ایک انسان کی طرح مختلف نفسیاتی، ذہنی اور جذباتی ادوار سے گزارا تھا اور ہر سطر، ہر صفحہ دل پر اثر کرتا تھا۔ پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک اس بارہ سنگھے کی زندگی میں جو نشیب و فراز آئے ان کی ساری روداد بے حد دلچسپ اور دلکش انداز میں پیش کی گئی تھی۔ یہ سب کچھ انسانوں کی زندگی میں بھی پیش آتا ہے۔ صرف ماحول، مقام اور کردار بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ڈار صاحب نے یہ کتاب ہمیں دیتے ہوئے کہا ''آفاقی لو یہ کتاب پڑھو اور کچھ سیکھو۔''

ہم نے کتاب کا فلیپ پڑھا اور پوچھا ''ڈار صاحب اس بارہ سنگھے سے بھلا ہم کیا سیکھیں گے؟''

بولے ''یہ تمہیں کتاب پڑھنے کے بعد پتا چلے گا بیٹے۔ ابھی ہم انسانوں کو جانوروں سے بہت کچھ سیکھنا ہے''۔

ہم کتاب لے کر چلے گئے۔ رات کو پڑھنے بیٹھے تو اس میں ایسے گم ہوئے کہ ختم کر کے ہی دم لیا۔ اس کے بعد دوبارہ از سر نو مطالعہ شروع کر دیا۔

ناول کے کرداروں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہی نہ ہوا کہ یہ تو جانوروں کی کہانی ہے۔ اس میں جانوروں کی زبان اور ماحول میں انسانی نفسیات اور مسائل کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس قدر دلچسپ' سبق آموز اور معنی خیز تحریریں بہت کم پڑھنے کو میسر آتی ہیں۔ بد قسمتی یہ کہ وہ کتاب کوئی ہم سے پڑھنے کے لئے مانگ کر لے گیا اور پھر دوبارہ ہمیں نہ مل سکی۔ اس کا کوئی نسخہ ڈار صاحب کے پاس بھی نہیں تھا۔ دکانوں سے وہ غائب ہو چکی ہے۔ یاد نہیں کہ کس نے شائع کی تھی اور اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع کیا تھا یا نہیں۔ اس کتاب کی کمی ساری زندگی محسوس کرتے رہیں گے۔ ڈار صاحب عجیب و غریب آدمی تھے۔ عام طور پر بہت نرم گفتار اور شائستہ تھے لیکن بعض اوقات جب بپھر جاتے تو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ شخص اتنا جارحانہ مزاج کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح کے چند واقعات ہمیں یاد ہیں۔ ان کی آغا شورش کاشمیری سے بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ پھر اختلافات ہو گئے۔ یہاں تک کہ لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچ گئی۔ اس زمانے میں غنڈے بد معاش اتنے زیادہ نہیں تھے۔ جو بھی تھے وہ پہچانے جاتے تھے اور اپنے علاقوں اور شہروں میں مشہور بھی تھے۔ سیاستداں اس زمانے میں بھی غنڈوں اور بد معاشوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے اور اس کے عوض انہیں پولیس سے تحفظ مہیا کرتے تھے۔ ہر بڑے اور مشہور آدمی کے حلقہ اثر میں غنڈوں اور بد معاشوں کا ایک گروہ بھی ہوتا تھا۔ آغا شورش اور ظہور الحسن ڈار کے اختلافات بہت زیادہ خراب ہوئے تو ہم اس زمانے میں ہفت روزہ "چٹان" میں آغا شورش کے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ ہم دیکھتے کہ دور دراز سے غنڈے اور بد معاش آ کر آغا صاحب کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتے اور ڈار صاحب کے خلاف لڑائی میں اپنی خدمات پیش کرتے۔ ہم چپ چاپ سنتے رہتے اور سہمے رہتے۔ ایک دوبار ہم نے ڈار صاحب کو مخبری بھی کی اور انہیں بتایا کہ فلاں غنڈا ان کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا۔

ڈار صاحب اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ مار کر ہنسے اور بولے "آفاقی یہ سب تماشے ہیں تم فکر نہ کرو۔"

بات دراصل یہ تھی کہ اکثر غنڈے اور بد معاش دونوں کے حلقہ بگوش تھے اور انہیں اپنی وفاداری اور جان نثاری کا

یقین دلاتے رہتے تھے۔ان ہی دنوں ایک بار کافی ہاؤس میں آغا صاحب اور ظہور الحسن ڈار کا آمنا سامنا ہو گیا۔ بات تلخ کلامی سے بڑھ کر ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ آغا شورش گفتار کے بہت بڑے غازی تھے مگر ہاتھا پائی ان کا شیوہ نہ تھا۔ڈار صاحب نے دست درازی کی تو وہ اپنے بلند و بالا اور بھاری ڈیل ڈول کے باوجود خاموش کھڑے رہے۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے ان دونوں کو علیحدہ کیا۔

ڈار صاحب اپنے گھر کی الاٹمنٹ کے سلسلے میں ایک بار محکمہ آبادکاری کے ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے۔ ہم بھی ساتھ تھے۔ آبادکاری کا ڈپٹی کمشنر اس زمانے میں کافی توپ چیز سمجھا جاتا تھا۔ڈار صاحب اپنی جائز شکایت لے کر ان کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے پہلے تو کافی دیر تک ہمیں کمرے کے اندر ہی نہیں بلایا۔جب اندر گئے تو بڑی رکھائی سے پیش آئے۔ڈار صاحب نے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا تو وہ خالص افسر بن گئے۔ کہنے لگے ''آپ صحافی ہوں گے تو اپنے دفتر میں ہوں گے۔ آپ کو تو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے''۔

بس پھر کیا تھا۔ ڈار صاحب ایک دم مارے غصّے کے آپے سے باہر ہو گئے۔ کہا ''آپ نے ابھی میری بدتمیزی دیکھی نہیں ہے اور شکایت کرنے لگے۔ ''

وہ بولے ''آپ اس سے زیادہ اور کیا بدتمیزی کریں گے ؟ ''

ڈار صاحب کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بولے ''ابھی دیکھ لیجئے میں آپ کو کرسی سے اٹھا کر باہر پھینک دوں گا'' یہ کہہ کر انہوں نے انہیں کھینچ کر کرسی سے اٹھایا اور سچ مچ کمرے سے باہر لے جا کر پھینک دیا۔ دفتر میں ہلچل سی مچ گئی۔ان کا کمرہ فرید کوٹ ہاؤس کی دوسری منزل پر تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دفتری اہلکار اور درخواست گزار سبھی کمرے کے باہر اکٹھے ہو گئے مگر کسی کی جرات نہ پڑی کہ ڈار صاحب کو کچھ کہتا۔ وہ آستین چڑھائے کھڑے دہائی دے رہے تھے۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا اور ڈپٹی کمشنر صاحب کو دوبارہ ان کی کرسی پر بٹھایا۔ ڈار صاحب انہیں دھمکی دے کر آ گئے کہ اگر اس کے بعد بھی میرا کام نہ ہوا تو اس سے بھی بُرا سلوک کروں گا۔

کچھ دیر بعد جب ان کا غصہ اترا اور چائے وائے پی کر ان کا مزاج خوشگوار ہوا تو ہم نے کہا ''ڈار صاحب یہ شریفوں کا شیوہ تو نہیں ہے۔ ''

کہنے لگے ''آفاقی شریف سے بڑھ کر کوئی بد معاش نہیں ہوتا۔ جب شریف بد معاشی پر اُتر آئے تو بڑے بڑے بد معاش کانپنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی ہاتھا پائی کرنا بھی ضرور ہوتا ہے۔ تم بھی یہ سبق سیکھ لو۔''

ہم نے کہا ''بھائی آپ ہاتھا پائی کر سکتے ہیں' ہمارے لئے تو یہ گھاٹے کا سودا ہی ہو گا۔ ہم دبلے پتلے' مریل سے آدمی ہیں۔ کسی سے کیا ہاتھا پائی کریں گے؟''

ہنس کر کہنے لگے ''یاد رکھو غصے کی طاقت اضافی ہوتی ہے۔ اگر سچ مچ غصہ آجائے تو انسان کی طاقت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ کبھی آزما کر دیکھ لینا۔''

ڈار صاحب کی ایک ٹانگ میں ہلکا سا لنگ تھا مگر انہیں اس کا کوئی کامپلیکس نہ تھا۔ ہاتھ پیروں کے مضبوط تھے لیکن عموماً غصے میں نہیں آتے تھے۔

ایک دن ڈار صاحب سے ملے تو انہوں نے دیکھتے ہی کہا ''اخاہ.... یار اچھا ہوا تم آگئے۔ ایک سلسلے میں 'میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

''اخاہ'' ان کا تکیہ کلام تھا۔ اچھے موڈ میں ہوتے تو ''اخاہ'' ضرور کہتے تھے۔ اقبال کوثر ان کے ہمراہ تھے۔ وہ ہمزاد کے مانند ڈار صاحب کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ وہ بہت اچھے شاعر تھے مگر اس سے زیادہ اچھے شعر شناس اور شاعر پرست تھے۔ حافظہ غضب کا تھا خصوصاً اشعار کے معاملے میں۔ ہر شاعر کا کلام انہیں زبانی یاد تھا۔ اور بڑی خوش الحانی سے سنایا کرتے تھے۔ ڈار صاحب ان سے کہا کرتے تھے کہ اقبال کوثر' اگر تم شاعر نہ ہوتے تو قوال ضرور ہوتے۔ اقبال کوثر اس پر زبردست احتجاج کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قوال کی جگہ گلوکار کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔

ڈار صاحب نے کہا ''آفاقی'' تم آج کل بے کار ہو؟'' ہم نے سر ہلایا۔

''بس تو پھر تمہارے کام کا بندوبست ہو گیا۔''

ہم چوکنّا ہو گئے۔ اقبال کوثر ہنسنے لگے۔ بولے ''گھبرایئے مت۔ آپ کے مطلب کا کام ہے۔''

ڈار صاحب نے پہلے تو ہمارے لئے چائے کی پیالی منگائی۔ پھر ایک سگریٹ بھی پیش کی۔ ہم اس وقت تک پائپ وغیرہ سے بچے ہوئے تھے۔ دوسروں کی پیش کی ہوئی سگریٹ البتہ پی لیا کرتے تھے۔

اپنی بڑی بڑی پُر اثر آنکھوں سے ڈار صاحب نے ہمیں گھورا اور پھر کہا ''آفاقی' زمیندار اخبار میں کام کرو گے ؟ ''
ہم نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ''زمیندار'' کے بارے میں ہماری رائے کا ڈار صاحب کو علم تھا۔ خود ان کی رائے بھی اس سے مختلف نہ تھی۔

روزنامہ '' زمیندار'' کسی زمانے میں برّصغیر کا بہت اہم اور قابل ذکر اخبار تھا۔ اس کے مالک اور مدیر جناب ظفر علی خان کا نام ملک کے چاروں کونوں میں مشہور تھا۔ وہ اعلیٰ پائے کے نثر نگار' بہترین شاعر اور ممتاز صحافی تھے۔ ان کو نظم و نثر دونوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ انتہائی خوبصورت زبان لکھتے تھے اور برجستہ' حسب موقع اور حسب حال اشعار لکھنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ طنزیہ نظمیں بھی لکھتے تھے اور سیاسی بھی۔ ان کے قلم سے لکھا ہوا ہر حرف معتبر سمجھا جاتا تھا اور سارے ملک میں پھیل جاتا تھا۔ وہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ اس قدر سلیس' رواں اور خوبصورت کرتے تھے کہ اس پر طبع زاد کا گمان گزرتا تھا۔ سیاسی بصیرت اور شعور بھی اس درجہ تھا کہ سارے ہندوستان کے سیاسی زعماء ان کے مشورے کو اہمیت دیتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان اپنی ذات میں ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے۔ ان کا اخبار ''زمیندار'' اس زمانے میں بھی ہندوستان کا سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ تھا اور پاکستان کے قیام کے بعد بھی وہ سب سے زیادہ شائع ہونے والا اخبار تھا۔ مولانا ظفر علی خان کو ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کی صف میں بھی ایک بلند مقام حاصل تھا۔ مختصر یہ کہ وہ ہزار پہلو شخصیت تھے اور ان کی شخصیت کا ہر رخ انوکھا' نرالا اور عظیم تھا۔ طبع کی روانی کا یہ عالم تھا کہ حقے کی نے منہ سے لگائی اور برجستہ اشعار دریا کے مانند زبان سے رواں ہو گئے۔

مولانا ظفر علی خان ایک نادر روزگار اور یکتائے زمانہ شخصیت تھے۔ وہ پرانے وقتوں کے بی اے تھے جب کہ میٹرک تک تعلیم ہی بہت کافی تصوّر کی جاتی تھی۔ اس پر ان کا مطالعہ اس قدر وسیع تھا کہ ہر زبان ان کے گھر کی باندی تھی لیکن بدقسمتی دیکھئے کہ وہ شخص جس کو زبان اور قلم پر مطلق العنان حکمرانی حاصل تھی اس کا اکلوتا بیٹا' اختر علی خان' ان تمام اوصاف سے عاری تھا۔ انہوں نے نہ تو زیادہ تعلیم حاصل کی اور نہ ہی انہیں مطالعے کا شوق تھا۔ غالباً اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے لاڈلے بھی تھے۔ اس لئے انکی تعلیم و تربیت پر زیادہ توجہ نہ دی جا سکی تھی۔ اختر علی خان ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی اپنے والد کے پاسنگ نہ تھے۔ والد کو زبان و بیان اور تحریر پر مکمل دسترس حاصل تھی

جب کہ اختر علی خان جب ''زمیندار'' کے ایڈیٹر بنے تو اخبار کے اداریے دوسرے لوگوں کو لکھنے پڑتے تھے۔ نثر کے علاوہ نظم میں بھی وہ قابل ذکر صلاحیتوں کے مالک نہ تھے ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ان کا اپنے والد سے کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ جب تک مولانا ظفر علی خان کے حواس اور اعضا کام کرتے رہے وہی ''زمیندار'' کو چلاتے رہے۔ مگر آخری عمر میں جب بیماریوں نے انہیں گھیرا اور فالج کے مرض نے انہیں ناتواں اور معذور بنا دیا تو وہ صاحبِ فراش ہو گئے اور ''زمیندار'' کی ادارت کا بوجھ ان کے اکلوتے صاحب زادے اختر علی خان پر آن پڑا۔ وقت کے دستور اور رواج کے مطابق وہ بھی مولانا کہلائے اور یہ لفظ ان کے نام کا لازمی حصہ بن کر رہ گیا۔

ایک اور المیّہ یہ بھی تھا کہ مولانا اختر علی خان کے دو صاحب زادوں منصور علی خان اور مسعود علی خان میں سے کسی ایک کو بھی ادب و صحافت اور نظم و نثر پر عبور حاصل نہ تھا۔

مولانا ظفر علی خان اپنے عہد کی ایک بہت ممتاز اور نمایاں شخصیت تھے۔ وہ ایک اعلیٰ مقام اور انتہائی قابل احترام شخصیت تھے۔ اردو صحافت اور علم و ادب سے معمولی دلچسپی رکھنے والا بھی ان کے نام نامی اور کارناموں سے واقف تھا۔ ہم جن دنوں سکول میں پڑھا کرتے تھے اس وقت بھی مولانا ظفر علی خان کے نام اور کام سے واقف تھے اور ان کی عظمت ہم پر پوری طرح واضح تھی۔ جب ہم پاکستان آ کر لاہور میں مقیم ہوئے تو لاہور کی قابل دید چیزوں میں مولانا ظفر علی خان کا نام بھی ہماری فہرست میں شامل تھا۔ لیکن کوئی ذریعہ ان سے ملاقات کا نہ تھا۔ ان سے پہلی بار ملاقات کا شرف ہمیں 1951ء میں حاصل ہوا اور اس کا ذریعہ آغا شورش کاشمیری بنے۔ آغا صاحب مولانا ظفر علی خان کے بہت بڑے معتقد تھے اور نظم و نثر اور ایسی شعور و بصیرت کے اعتبار سے انہیں اپنا رہنما تسلیم کرتے تھے۔ ان کا ذکر وہ بہت محبت اور احترام سے کیا کرتے تھے۔ اکثر مولانا کی زندگی کے واقعات بیان کرتے تھے۔ ان کی فی البدیہہ گوئی کے معترف تھے۔ مولانا کے اشعار ان کو از بر تھے۔ یہاں تک کہ ان کے تحریر کردہ اداریے تک آغا شورش کو زبانی یاد تھے۔ ان کے سیاسی اور طنزیہ اشعار وہ اکثر موقع و محل کے لحاظ سے سنایا کرتے تھے۔

ہم ہفت روزہ ''چٹان'' میں کام کر رہے تھے اور مولانا ظفر علی کا تذکرہ اکثر سنا کرتے تھے۔ ایک دن ہم نے آغا صاحب سے عرض کی ''شورش صاحب آپ کبھی مولانا ظفر علی خان سے ملاقات کے لئے نہیں جاتے؟''

انہوں نے کہا ”مولانا ان کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر بھی کبھی کبھی سلام کے لئے خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ “
ہم نے کہا ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اب کی مرتبہ آپ ان کے پاس جائیں تو ہمیں بھی ہمراہ لے چلیں۔ “
وہ مسکرائے ”کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہم کل ہی چلیں گے۔ مولانا اختر علی خان سے مجھے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں“۔
دوسرے دن ہم آغا شورش کاشمیری کے ساتھ تانگے میں سوار ہوئے اور ”زمیندار“ کے دفتر کی جانب روانہ ہو گئے۔ حسب دستور آغا صاحب اگلی نشست پر تانگے والے کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ہم پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ”چٹان“ کے دفتر سے ” زمیندار“ کے دفتر کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ موسم سرما کی آمد آمد تھی اور لاہور کا موسم بے انتہا خوشگوار تھا۔ اس زمانے میں لاہور میں نہ تو اتنی زیادہ آبادی تھی‘ نہ کاروں اور رکشوں کا دھواں اور ماحولیاتی کثافت تھی۔ ہر طرف درختوں کی بہتات تھی۔
فضا صاف شفاف رہتی تھی۔ ہم لوگ پیدل بھی جا سکتے تھے مگر آغا صاحب غالباً پیدل چلنے کے قائل نہ تھے اس لئے مختصر فاصلے پر بھی تانگے کے ذریعے جاتے تھے۔ غالباً ایک مصلحت یہ بھی ہو گی کہ راہ میں لوگ انہیں پہچان کر گھیر لیتے تھے اور ہر ایک سے مصافحہ و معانقہ کرنا پڑتا تھا۔ تانگے میں محض سلام اور ہاتھ ہلانے سے کام چل جاتا تھا۔

”زمیندار“ کا دفتر ہم نے پہلے بھی باہر سے دیکھا تھا۔ یہ ایک خوشنما دو منزلہ عمارت تھی۔ نچلی منزل پر ایک برآمدہ تھا۔ اس کے بعد کمرے تھے۔ اندرونی حصے میں سے سیڑھیاں اوپر دوسری منزل کی طرف جاتی تھیں۔ عمارت کے زیریں حصے میں اخبار کا دفتر تھا۔ بالائی حصے میں رہائش تھی۔ مولانا ظفر علی خان اور مولانا اختر علی خان اوپر والی منزل پر رہائش پذیر تھے۔ اختر علی خان کے بڑے صاحب زادے منصور علی خان میکلوڈ روڈ‘ (لکشمی چوک) پر ایک عمارت کے فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔ یہ ایک کشادہ اور ہوادار عمارت تھی۔ اگلے حصے میں برآمدہ تھا پچھلے میں کھلا صحن تھا۔ اوپر کی منزل پر بھی سامنے کی جانب ایک برآمدہ تھا۔ مولانا ظفر علی خان کبھی لاہور میں اور کبھی کرم آباد میں قیام کرتے تھے جہاں ان کی زمینیں اور حویلی تھی۔ دراصل کرم آباد ہی ان کا اصل ٹھکانا تھا۔ لاہور میں تو اخباری مصروفیات کے باعث رہنا پڑتا تھا۔ پھر بھی چھٹی کے دن یا فرصت پا کر وہ کرم آباد چلے جاتے تھے۔
”زمیندار “مولانا اختر علی خان کی زیر ادارت چل رہا تھا۔ اخبار کا مولانا ظفر علی خان والا معیار تو نہ تھا لیکن پنجاب کے

لوگوں کو ''زمیندار'' کی عادت پڑ گئی تھی۔اس زمانے میں بھی اس کی اشاعت دوسرے تمام اردو اخبارات سے زیادہ تھی۔ اشتہارات کی بھی کمی نہ تھی اس لئے ہن برس رہا تھا۔خوشحالی کا زمانہ تھا۔ اس خاندان پر اللہ کی رحمت تھی۔ زمینیں تھیں' اخبار کی بہت اچھی آمدنی تھی۔اس وقت جب کہ لاہور میں کاریں معدودے چند ہی تھیں اختر علی خان دو کاروں کے مالک تھے۔ان کے بیٹے منصور علی خان اور مسعود علی خان بھی صاحب کار تھے۔بہت اچھا وقت تھا۔

''زمیندار'' کے دفتر پہنچے تو بائیں ہاتھ پر مولانا اختر علی خان کا دفتر تھا۔اس کے برابر سے ایک گلی مکان کے عقبی حصے کی طرف جاتی تھی۔ مولانا اختر علی خان شورش صاحب کے منتظر تھے۔بہت گرمجوشی اور اخلاق سے ملے۔وہ گہرے سانولے رنگ کے درمیانہ قد اور بھاری جسم کے مالک تھے۔آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور ناک بھی عقابی تھی۔وہ گفتگو کے دوران میں اشعار اور محاورے کثرت سے استعمال کرتے تھے۔مثلاً یہ فقرہ ان کا مرغوب فقرہ تھا۔''اخبارات کی برادری میں زمیندار کی حیثیت ایسی ہے جیسے بتیس دانتوں کے درمیان ایک زبان'' ایک شعر بھی وہ اکثر سنایا کرتے تھے۔

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

بعد میں جب ہم نے ان کے ساتھ مختصر عرصے کام کیا تو بھی یہی باتیں سننے کو ملیں۔

کارکنوں کے بارے میں وہ اکثر یہ فقرہ دہرایا کرتے تھے۔''میرا اصول ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ملنی چاہئے۔'' مگر ہم لوگوں نے اس میں ترمیم کرکے اسے یوں بنالیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری کم از کم خون خشک ہونے سے پہلے ملنی چاہئے۔ ''

اختر علی خان کھلے پائنچوں کا سفید لٹھے کا پاجاما اور شیروانی پہنے اپنے کشادہ اور خوبصورت کمرے میں تشریف فرما تھے۔ اس زمانے کے رواج کے حساب سے وہ بے حد شاندار دفتر تھا۔فرش پر قالین' قیمتی فرنیچر' ائرکنڈیشنر اور ایک جانب آتش دان میں بہت خوبصورت باہر سے درآمد شدہ برقی ہیٹر' برقی ہیٹر اور ائر کنڈیشنر اس زمانے میں بہت نایاب چیزیں تھیں۔ مولانا اختر علی خان الفاظ پر زور دے کر لیکن بہت تیزی سے بولتے تھے۔شورش صاحب نے ہمارا بھی

سرسری تعارف کرایا۔انہوں نے بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ مصافحے کیلئے ہماری طرف بڑھادیا۔ ان کا ہاتھ پُر گوشت اور ملائم تھالیکن اس کو تھامنے کے لئے ہمیں ان کی بڑی سی میز کے گرد چکر کاٹ کران کے نزدیک جانا پڑا کیونکہ یہ میز بہت لمبی چوڑی تھی اور سامنے سے ہم ان کا ہاتھ نہیں تھام سکتے تھے۔

ان دونوں میں کچھ دیر مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔اس دوران میں چائنا کے نہایت قیمتی ٹی سیٹ میں چائے بھی نوش کی گئی۔جو تمیز دار ملازم اوپر گھر سے لے کر آیا تھا۔

آغا شورش نے مولانا ظفر علی خان کی خیریت دریافت کی اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

اختر علی خان نے بتایا کہ قبلہ والد صاحب کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔بول چال میں بھی دقت پیش آتی ہے۔انہیں کرم آباد لے گئے تھے مگر وہ اصرار کرکے چندروز کے لئے لاہور تشریف لے آئے ہیں۔ہم نے محسوس کیا کہ اختر علی خان خاصی مسجع اور مقطع اردو بولتے ہیں اور اپنا مافی الضمیر سادہ اور آسان الفاظ میں بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

کچھ دیر بعد اختر علی خان کی قیادت میں ہم لوگ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے' برآمدے میں مولانا ظفر علی خان ایک آرام دہ کرسی پر نیم دراز تھے۔برآمدے میں ہلکی پھلکی دھوپ تھی اور وہ دھوپ سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ان پر فالج کا حملہ ہوچکا تھا۔جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے اور حرکت کرنے سے معذور تھے۔یہاں تک کہ گفتگو میں بھی بہت دقت پیش آتی تھی۔انہوں نے جو تھوڑی بہت گفتگو کی وہ بمشکل ہماری سمجھ میں آئی۔ مگر اختر علی خان بخوبی سمجھ گئے اور انہوں نے ترجمانی کا فرض بھی ادا کیا۔

آغا شورش نے بہت عقیدت سے مولانا ظفر علی خان سے ہاتھ ملایا۔ان کے اشارے پر ہم نے بھی آگے بڑھ کر بڑی عقیدت اور احترام سے ان کا ناتواں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ان کے کمزور ہاتھ میں ہلکی سی لرزش تھی۔یہ وہ ہاتھ تھا جس کی تحریروں سے حکمرانوں کے ایوان اور بڑے بڑے لوگوں کے در و بام لرزتے تھے۔آج اس میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ قلم تھام کر چند حروف ہی لکھ سکتا۔وہ زبان جو شعلہ و شبنم برسایا کرتی تھی اب اس میں لکنت تھی اور وہ چھوٹا سا فقرہ بھی ادا کرنے کے قابل نہ تھی۔ایک ملازم نے حُقہ تازہ کرکے مولانا کی کرسی کے نزدیک رکھ دیا۔مولانا اختر علی خان نے حُقے کی نے اٹھا کر اپنے والد بزرگوار کی جانب بڑھائی۔انہوں نے ہلکے سے چند کش لئے اور پھر

نڈھال سے ہو کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر نیم دراز ہو گئے۔ وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ مطالعہ' تحریر و بیان سبھی سے قاصر تھے۔ آغا شورش کاشمیری مختلف موضوعات پر بولتے رہے اور مولانا ظفر علی خان خاموشی سے سنتے رہے۔ یہ وہ شخص تھا جس کے آگے دوسروں کو بولنے کا یارانہ تھا۔ مگر آج بیماری نے اسے کمزور' بے بس' معذور اور ناتواں کر دیا تھا۔

ہم ایک جانب کھڑے خاموشی سے مولانا ظفر علی خان کا زرد لیکن خوبصورت چہرہ دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں ایک ویرانی سی تھی۔ زبان خاموش تھی۔ صرف آنکھیں حرکت کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد آغا شورش نے اشارہ کیا کہ اب رخصت کی اجازت لیتے ہیں۔ ان سے پھر مصافحے کا شرف حاصل ہوا اور ہم سیڑھیاں اتر کر چلے آئے۔

آغا شورش کاشمیری نے ایک سرد آہ بھری اور کہا ''اللہ اکبر' انسان بھی کتنا بے بس اور لاچار ہوتا ہے۔ ''

یہ ہماری مولانا ظفر علی خان سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ عملی طور پر تو وہ دنیا والوں کیلئے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ جو انسان معمولات زندگی ادا کرنے سے قاصر ہو اس کا محض جسمانی وجود ہی رہتا ہے۔ وفات کے بعد خاکی جسم بھی خاک میں مل گیا۔ انہیں کرم آباد میں دفن کیا گیا تھا۔

جب ظہور الحسن ڈار صاحب نے ''زمیندار'' میں کام کرنے کا تذکرہ کیا تو ہم چپ چاپ رہ گئے۔

''یار کچھ بول تو سہی' سانپ کیوں سونگھ گیا۔ ''

ہم نے کہا ''مگر ڈار صاحب مولانا اختر علی خان کے ساتھ ہمارا کام کرنا بہت مشکل ہے۔ ''

وہ ہنسے اور کہنے لگے ''آفاقی بچے کبھی اخبار بھی پڑھ لیا کرو تاکہ حالات حاضرہ سے باخبر رہ سکو۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ مولانا اختر علی آج کل جیل میں ہیں اور حکومت نے زمیندار پر پابندی لگا دی ہے ''

''ہاں یہ تو پتا ہے مگر پھر۔۔۔ ''

''اب بولنے سے پہلے میری بات سن لو اور پھر سوچ کر بولو۔ ''

''جی فرمائیے۔ ''

''بات یہ ہے کہ مولانا اختر علی خان کے بڑے بیٹے منصور علی خان اب یہ اخبار روزنامہ ''آثار'' کے نام سے نکال

رہے ہیں۔اس نام سے ڈکلریشن کا انتظام ہو گیا ہے۔دفتر اور سٹاف موجود ہی ہے۔ منصور علی خان تعلیم یافتہ اور روشن خیال آدمی ہیں اور اپنے والد مولانا اختر علی خان سے بالکل مختلف ہیں۔وہ نئے خیالات کے مالک ہیں اور ایک جدید روزنامہ نکالنا چاہتے ہیں۔اسی لئے انہوں نے بلوایا تھا اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ہم دونوں مل کر اس پرچے کو ایک ماڈرن روزنامہ بنادیں گے۔ "

ہم نے غور کیا تو بات نہایت معقول تھی۔

ڈار صاحب نے کہا "سوچ کیا رہے ہو۔بولو' تمہاری بر دکھائی کرادیں۔یعنی منصور علی خان سے تمہاری ملاقات کرا دیں؟ "ہم دونوں تانگے میں سوار ہو کر زمیندار کے دفتر پہنچ گئے۔مولانا اختر علی خان جیل میں تھے اسلئے ان کا دفتر بند تھا۔منصور علی خان کا دفتر اندرونی حصے میں تھا اور یہ بھی خوب سجا ہوا اور آراستہ تھا۔فرق یہ تھا کہ سائز میں چھوٹا تھا اور یہاں آرائش میں نئے انداز کی جھلک نمایاں تھی۔

منصور علی خان نوجوان آدمی تھے۔کسی حد تک اپنے والد سے مشابہ تھے۔لیکن ان کا رنگ قدرے صاف تھا۔ گھونگریالے بال' چمکدار دل میں اتر جانے والی نگاہیں 'سوچتے وقت ان کی آنکھوں میں تھوڑا سا بھینگا پن پیدا ہو جاتا تھا۔وہ درمیانہ قدو قامت کے جوان آدمی تھے۔قدرے فربہی کی طرف مائل تھے۔باتیں بہت دلچسپ کرتے تھے اور دل کھول کر بلند آواز میں قہقہہ لگاتے تھے۔ہم نے انکی باتوں سے اندازہ لگایا کہ ان میں چالاکی بالکل نہیں تھی۔ سادہ دل اور سادہ لوح آدمی تھے۔جو دل میں ہوتا تھا وہی زبان پر لے آتے تھے۔خوش مزاج تھے اور صحیح معنوں میں اپنے اخبار کو جدید رنگ دینے کے خواہش مند بھی تھے۔

ان سے تھوڑی ہی دیر میں اتنی بے تکلفی ہو گئی کہ ہنسی مذاق بھی شروع ہو گیا۔ڈار صاحب سے وہ پہلے بے تکلف تھے۔ انہوں نے اوپر سے بہت اچھی قسم کی چائے منگا کر بہت اعلیٰ قسم کی قیمتی پیالیوں میں پلائی۔ساتھ میں بسکٹ اور کیک پیش بھی تھے۔انہوں نے کہا "دیکھئے ڈار صاحب یہ چائے اور کیک پیس وغیرہ آپ کو آج ہی ملے ہیں۔آئندہ ان کی توقع نہ رکھئے گا۔ "

"کیا مطلب؟ "

''مطلب یہ کہ آئندہ سامنے والے تنوری ہوٹل سے چائے آیا کرے گی۔ان کے پاس بسکٹ بھی ہوتے ہیں مگر یہ بات نہ ہوگی۔میں ہر روز اباجی کے گھر سے چائے منگا کر آپ کو نہیں پلاؤں گا۔ ''

تنخواہ وغیرہ طے ہونے کے بعد ہم نے اگلے ہی روز سے ''آثار'' میں اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔یہ تنخواہ ''آفاق'' میں ملنے والی تنخواہ سے کہیں زیادہ تھی۔

کہنے کو ہم جوائنٹ ایڈیٹر تھے اور ڈار صاحب ایڈیٹر لیکن ڈار صاحب ایڈیٹوریل اور ایک کالم لکھنے کے سوا کوئی اور کام نہیں کرتے تھے۔عملہ ادارت کے انتظامی امور بھی ہمارے ہی ذمے تھے۔ہمیں ''آفاق'' میں ان کاموں کا تجربہ ہو چکا تھا۔اس لئے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ڈار صاحب کی طرف سے ہمیں ہر قسم کے فیصلے کرنیکی آزادی تھی۔کوئی مشکل مرحلہ درپیش ہوتا تو منصور علی خان سے رجوع کر لیتے۔ منصور صاحب کے پاس اس زمانے میں گہرے سرخ رنگ کی کھلی نیش NASH کار تھی۔ سنا ہے کہ سارے پاکستان میں اس طرز کی تین ہی کاریں تھیں۔لاہور کی سڑکیں اس زمانے میں کشادہ اور ٹریفک کے ہجوم سے آزاد تھیں۔اسلئے جب ڈار صاحب اور ہم منصور صاحب کے ساتھ اس شاندار کھلی کار میں بیٹھ کر لاہور کی کھلی سڑکوں پر سے گزرتے تو طبعیت خوش ہو جاتی تھی۔لاہور سے باہر جانا ہو تا۔۔تو پھر اس کار کی سواری کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔

منصور علی خان کے ساتھ ڈار صاحب اور ہم دو تین بار اس کار میں راولپنڈی اور مری بھی گئے تھے۔منصور صاحب خود ہی ڈرائیونگ کرتے تھے اور بہت خطرناک قسم کے ڈرائیور تھے۔بہت تیزی سے کار چلاتے تھے اور بریک اس وقت تک نہیں لگاتے تھے جب تک اس کے لئے مجبور نہ ہو جائیں۔یعنی دوسری کار،بس یا گڈے کے بالکل نزدیک پہنچ کر ایک دم پوری قوت سے بریک لگاتے تھے تو آس پاس کی فضا ان کی کار کے ٹائروں کی ''چڑچراہٹ'' سے گونج اٹھتی تھی۔خاص طور پر راولپنڈی آمدرفت کے سلسلے میں ان کی خطرناک ڈرائیونگ سے ہماری روح خشک ہوتی رہتی تھی۔ڈار صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر منصور علی خان کو مولانا اختر علی خان نے اپنے اخبار سے عاق کر دیا تب بھی وہ کسی سرکس کے ''موت کے کنویں'' میں کار چلا کر پیٹ پالتے رہیں گے۔

ایک بار ہم لوگ سیف الدین صاحب کولانے کیلیئے ان کے گھر گئے۔ وہ ان دنوں میکلوڈ روڈ پر رہا کرتے تھے۔ گھر پر نہ ملے تو انہیں مختلف چائے خانوں میں تلاش کیا گیا۔ آخر وہ کافی ہاؤس میں مل گئے۔ ڈار صاحب سے ان کی بہت پیار بھری دوستی تھی۔ ڈار صاحب انہیں کار میں ساتھ بٹھا کر دفتر لے آئے۔ کار منصور علی خان ہی چلا رہے تھے۔ سب سے پہلے تو سیف صاحب نے کار کے سرخ رنگ کو بغور دیکھا اور پھر منصور علی خان سے پوچھا "کیا آپ اشترا کی ذہنیت کے مالک ہیں؟ "

وہ حیران ہو گئے "جی نہیں مگر آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟ "

"آپ کی کار کا سرخ رنگ دیکھ کر "

ڈار صاحب نے کہا "سیف صاحب یہ سرمایہ دار کمیونسٹ ہیں۔ "

سیف صاحب بولے "ہمارے حصے میں تو سب ایسے ہی کمیونسٹ آئے ہیں۔ بدقسمتی دیکھئے کہ ہمیں تو کمیونسٹ بھی خالص نہ ملے۔ "

دفتر پہنچ کر انہیں منصور صاحب کے شاندار کمرے میں بٹھایا گیا اور بہت اچھی قسم کی چائے کا آرڈر دیا گیا۔ سیف صاحب ایک کرسی سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔

منصور صاحب نے بڑی سعادت مندی سے پوچھا "سیف صاحب سفر آپ کو کیسا لگا؟ "

وہ ہنسنے لگے "آپ کے ساتھ تو سفر کر کے میں خدا کے نزدیک ہو گیا ہوں۔ موت کو یاد رکھنے کیلیئے ہر روز آپ کے ساتھ کار میں سفر کرنا بہت ضروری ہے۔ "

برسبیل تذکرہ یہ بھی سن لیجیئے کہ "آثار" کا یوم دفاع نمبر نکلنے والا تھا۔ اس زمانے میں اخبارات کے سرورق پر نظم شائع کرنے کا رواج تھا۔ ڈار صاحب کی خواہش تھی کہ سیف صاحب پاکستانی افواج کے حوالے سے ایک نظم "آثار" کے سرورق کے لئے لکھ دیں۔ سیف صاحب حسب عادت وعدہ کر لیتے تھے مگر نظم دستیاب نہیں ہو رہی تھی۔ جب یوم دفاع بالکل نزدیک آ گیا تو منصور صاحب نے ڈار صاحب سے کہا "ڈار صاحب لاہور میں ایک سے ایک شاعر موجود ہے۔ کسی اور شاعر سے نظم کیوں نہیں لکھوا لیتے"۔

ڈار صاحب نے جواب دیا۔ ''منصور صاحب سیف جیسی نظم کوئی دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ ''

''مگر کب؟ کیا یوم دفاع کے بعد یہ نظم شائع ہوگی'' منصور صاحب نے کہا۔

ڈار صاحب کچھ دیر سوچتے رہے پھر یہ تجویز پیش کی کہ سیف صاحب کو تلاش کرکے لاتے ہیں اور ابھی نظم لکھوا لیتے ہیں۔

سیف صاحب دستیاب تو ہو گئے تھے اور ہمارے ساتھ دفتر بھی آ گئے تھے۔ مگر نظم کا مسئلہ ابھی تک اٹکا ہوا تھا۔

ڈار صاحب کے اشارے پر منصور علی خان تو کوئی عذر پیش کرنے کے بعد رخصت ہو گئے۔ ڈار صاحب نے چپڑاسی کو بھیج کر سگریٹ کا ایک پیکٹ اور ماچس منگا کر سیف صاحب کے سامنے رکھ دیا۔

سیف صاحب نے کہا'' یار یہ پیکٹ اٹھالو۔ میں بلاوجہ زیادہ سگریٹ پی جاؤں گا۔ ''

ڈار صاحب بولے ''سیف صاحب فکر نہ کیجئے یہ سگریٹ بہت دیر تک آپ کے کام آئیں گے۔ ''

سیف صاحب نے یہ سن کر ڈار صاحب کو دیکھا۔

وہ بولے '' سیف صاحب سگریٹ کا پیکٹ آپ کے سامنے ہے۔ چائے ہر دس منٹ کے بعد آپ کی خدمت میں پیش کر دی جائے گی۔ لیکن اب آپ اس کمرے سے اس وقت باہر جا سکیں گے جب نظم مکمل ہو جائے گی۔ ''

سیف صاحب نے گھور کر ڈار صاحب کو دیکھا'' ڈار یہ کیا مذاق ہے؟ مجھے بہت سے ضروری کام کرنے ہیں۔ ''

''یہ بھی تو ایک ضروری کام ہے ''

''میں تمہیں کل ہی نظم لکھ کر بھجوا دوں گا ''

''گستاخی معاف سیف صاحب ہمارے پاس اب گنجائش نہیں ہے۔ ہمارے اوپر رحم کیجئے اور براہ کرم نظم لکھ دیجئے''۔

یہ کہہ کر انہوں نے ہم سے کہا'' آفاقی چلو اٹھو یہاں بیٹھ کر سیف صاحب کو ڈسٹرب نہ کرو۔ ''

ہم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

سیف صاحب نے کہا'' یار کیسی باتیں کرتے ہو۔ کہہ جو دیا میں کل نظم لکھ دوں گا۔ ''

''یہ تو آپ کئی دن سے فرما رہے ہیں۔ پلیز سیف صاحب'' یہ کہہ کر ڈار صاحب نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

سیف صاحب منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے رہے۔ ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے اور ڈار صاحب نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ کمرے کے باہر چپڑاسی کو ایک کرسی پر بٹھا دیا اور کہا ''دیکھو جب سیف صاحب اندر سے گھنٹی بجائیں تو دروازہ کھول دینا، اگر انہیں چائے کی ضرورت ہو تو اوپر سے بہت اچھی قسم کی چائے لا کر پلانا''۔

ہم دونوں ڈار صاحب کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہم نے کہا ''ڈار صاحب' یہ آپ نے بہت غلط حرکت کی ہے ''

انہوں نے ہنس کر کہا ''غلط صحیح کی بات نہیں ہے یار۔ ہمیں نظم چاہئے ''

ہم نے کہا ''مگر اس طرح زبردستی مجبور کر کے تو نظم نہیں لکھوائی جا سکتی۔ ''

وہ کہنے لگے ''فکر نہ کرو۔ اب ان کا موڈ بن جائے گا۔ چپ چاپ بیٹھ کر گھنٹی کا انتظار کرو۔ ''

ہم دونوں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ چند لمحے بعد چپڑاسی کمرے میں داخل ہوا۔ ''وہ آپ کو بلا رہے ہیں جی ''

ہم دونوں کشاں کشاں منصور علی خان کے کمرے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سیف صاحب بڑے آرام سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہے ہیں اور ان کے سامنے میز پر چند کاغذ پڑے ہیں۔ ہم دونوں کو دیکھا تو مسکرائے۔ ہم دونوں ان کے سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کہا ''بھئی یہ نظم تو ہو گئی ہے۔ زیادہ طویل نہیں ہے مگر تمہارا کام چل جائے گا۔ ''

یہ نظم اس قدر جوشیلی ولولہ انگیز اور خوب صورت تھی کہ ہم اس کے سحر میں کھو گئے۔ اس پر سیف صاحب کا سنانے کا انداز۔ وہ تحت اللفظ میں شعر سناتے تھے لیکن نہایت سلیقے اور آہنگ کے ساتھ' انہوں نے نظم ختم کی اور ڈار صاحب کی طرف دیکھا ''کیوں بھئی تمہارا کام چل جائیگا؟ ''

''آپ کا جواب نہیں ہے سیف صاحب'' ڈار صاحب نے بڑے پُر خلوص اور جذباتی انداز میں جواب دیا۔

سیف صاحب کی یہ نظم ''آثار'' کے صفحہ اوّل پر پورے صفحے پر رنگین شائع کی گئی اور اس نے دھوم مچا دی۔ بعد میں یہ نظم بی اے اور ایم اے کے نصاب میں بھی شامل کی گئی۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ معرکہ آرا نظم سیف صاحب نے صرف پندرہ بیس منٹ میں تحریر فرمائی تھی۔ اس نظم کا ایک شعر ہمیں اس وقت یاد آ رہا ہے۔

اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اٹھا

تیرے بیٹے، ترے جانباز چلے آتے ہیں

سیف صاحب کے انتقال سے چندماہ قبل جب ہم ان سے انٹرویو کے سلسلے میں اُن کے پاس جایا کرتے تھے تو پرانے زمانے کی یادیں بھی تازہ ہو جاتی تھیں۔ ہم نے ان سے ایک دن کہا ”سیف صاحب یاد ہے آپ سے ظہور الحسن ڈار نے ایک بار اخبار کے لئے کیسے نظم لکھوائی تھی؟ “

سیف صاحب مسکرائے۔ اپنی موہوم سی نوک دار مونچھوں پر انگلی پھیری اور کہا ”آفاقی صاحب اکثر دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ پرانا دور ایک بار پھر لوٹ آئے۔ جو دن گزر گئے وہی ہمارا سرمایہ ہیں۔ “

یہ تذکرہ تو یوں ہی نکل آیا تھا۔ ہم روزنامہ ”آثار“ کے زمانے کی باتیں کر رہے تھے۔ ”آثار“ کہنے کو ایک پرانا اخبار تھا مگر ہم لوگ اسے ایک نیا روپ دینا چاہتے تھے۔ اس کی کتابت طباعت، لے آؤٹ، خبروں کی ترتیب اور تدوین کے سلسلے میں اسے ”زمیندار“ کے پرانے انداز سے مختلف بنانے کیلئے ہم نے بہت تدابیر سوچیں اور اختیار کیں۔ ”زمیندار“ کے عملے میں اس قدر ضعیف العمر لوگ بھی شامل تھے جن سے بہتر کام کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی مگر منصور علی خان ان کی گزشتہ خدمات کے باعث انہیں بے روزگار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان میں بعض اصحاب نے مولانا ظفر علی خان کے ساتھ بھی کام کیا تھا اور وضع داری کے خیال سے انہیں بدستور عملے میں شامل رکھا گیا تھا۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ بعض حضرات کو پنشن دے دی گئی اور ایک دو کو دوسری ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ اخبار میں نیا اور نوجوان عملہ رکھنا بھی ضروری تھا چنانچہ ایسے نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا جو وقت کا ساتھ دے سکیں۔ ان میں ایک مسعود اشعر بھی تھے۔ یہ ہمارے گہرے اور بے تکلف دوست تھے اور ”زمیندار“ کے دفتر کے نزدیک ہی ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ اسی فلیٹ میں ان کے ساتھ خلیل احمد (جو بعد میں موسیقار بن گئے) یونس راہی (یہ بعد میں فلمی کہانی نویس اور ہدایت کار بن گئے تھے) اور قمر زیدی بھی رہتے تھے۔ قمر زیدی اس زمانے میں سید شوکت حسین رضوی کے اسسٹنٹ تھے۔ یہ فلم ”گلنار“ کی تکمیل کا زمانہ تھا۔ قمر زیدی بہت لطیفہ باز بلکہ مسخرے آدمی تھے۔ چھوٹا قد، جسم موٹا، بالکل گول مٹول تھے۔ نقلیں اتارنے میں ان کا جواب نہ تھا۔ ” گلنار“ کے سیٹ کا ایک ایک واقعہ

اداکاری کے ساتھ بیان کرتے تو ہنستے ہنستے ہم لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ یہ قمر زیدی بعد میں کراچی چلے گئے تھے جہاں انہوں نے پاکستان کی سب سے پہلی بیرون ملک بننے والی فلم ''رشتہ ہے پیار کا'' کی ہدایت کاری کی۔ اس میں زیبا اور وحید مراد نے مرکزی کردار ادا کئے تھے۔ سالگرہ جیسی یادگار اور نغمہ بار فلم کے بھی وہی ہدایت کار تھے۔

مسعود اشعر رامپور کے رہنے والے دراز قد گورے چٹے کم گو آدمی تھے۔ رام پور والوں سے جو روایات وابستہ ہیں مسعود اشعر ان سے بالکل برعکس شخصیت کے مالک ہیں۔ نرم گفتار' شائستہ' بااخلاق' خوش مزاج اور بہت اچھے صحافی اور ادیب' رام پور والوں کے بارے میں سنا تھا کہ وہ بات بات پر چاقو نکال لیتے ہیں۔ مسعود اشعر ایسے نرم مزاج کہ شاید شیو کرنے کے لئے سیفٹی ریزر سوچ سمجھ کر ہاتھ میں لیتے ہوں گے۔ ہماری ان سے دوستی کو لگ بھگ 53 سال تک ہوگئے ہیں مگر آج تک کبھی انہیں غصے میں نہیں دیکھا۔ نہایت مرنجان مرنج انسان تھے۔ ظاہر ہے کہ آج بھی ہیں بلکہ شادی کے بعد کچھ زیادہ ہی مرنجان مرنج ہوگئے ہیں۔ ہم لوگوں میں سب سے پہلے ان ہی کی شادی ہوئی تھی۔ ان کی بیگم بھی رام پور کی ہیں مگر دونوں میاں بیوی میں خوش اخلاقی اور نرم گفتاری کا مقابلہ جاری رہتا ہے۔ انہیں دیکھنے کے بعد رام پور والوں کے بارے میں ہماری رائے یکسر تبدیل ہوگئی۔

روزنامہ ''آثار'' میں ہم نے منیر نیازی کو بھی گھسیٹ لیا تھا۔ منیر نیازی دراصل شاعر پیشہ شخص ہیں۔ ہم نے تو زندگی بھر انہیں شاعری کے سوا کوئی اور کام کرتے نہیں دیکھا۔ ایک زمانے میں ''سات رنگ'' کے نام سے ایک خوبصورت ہفت روزہ نکالتے تھے۔ گاہے گاہے طنزیہ اور مزاحیہ کالم بھی لکھتے رہے مگر یہ سب ان کے وقتی شوق یا مشغلے کہہ لیجئے۔ انہوں نے کبھی جم کر کوئی کام نہیں کیا۔ سوائے شاعری کے۔ شاعری میں وہ ایسے جمے کہ ''زمیں جُنبند نہ جُنبد گل محمد'' والا قصہ ہو گیا۔ شاعر وہ اس زمانے میں بھی تھے اور اچھے شاعر تھے مگر ہمارے ہی کیا 'کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ وہ شاعری میں ایک منفرد اور اچھوتا مقام حاصل کریں گے۔

منیر نیازی اس زمانے میں منٹگمری میں رہتے تھے جو آج کل ساہیوال ہے۔ ان کا لاہور آنا جانا اور غائب ہو جانا ایک معمول تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کب لاہور سے غائب ہو جائیں گے۔ کنوارے اور تنہا آدمی تھے۔ لاہور میں اپنے

دوستوں اور ایک دو کزنز کے ساتھ مقیم رہتے تھے۔ کئی بار انہوں نے کسی دوست کے اشتراک سے مکان بھی کرایہ پر لیا مگر ان کی لاأبالی طبیعت نے زیادہ عرصے اس گھر میں قیام نہ کرنے دیا۔

منیر نیازی سے ہماری ''صحیح'' ملاقات روزنامہ ''آفاق'' کے زمانے میں ہوئی تھی جب ہم اس اخبار کے سنڈے ایڈیشن کے انچارج تھے۔ لاہور کے لکھنے والوں کے لئے اس دور میں روزنامہ ''امروز'' اور روزنامہ ''آفاق'' دو ایسے اخبارات تھے جو معاوضہ ادا کرتے تھے۔ ''امروز'' میں معاوضہ ساڑھے سات روپیہ فی کالم کے حساب سے دیا جاتا تھا اور کالم بھی اس قدر گنجان کہ لکھنے والا لکھتے لکھتے ہلکان ہو جاتا تھا مگر ایک کالم پورا نہ ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں ''آفاق'' میں ہم فی مضمون پندرہ روپے اور فی غزل یا نظم دس روپے معاوضہ پیش کرتے تھے۔ سعادت حسن منٹو صاحب کے لئے 25 روپے فی مضمون کا خصوصی ریٹ تھا۔ وہ سستا زمانہ تھا اور معاوضہ ادا کرنے کا رواج ہی نہ تھا۔ ان حالات میں امروز اور آفاق کا دم غنیمت تھا۔ دس پندرہ روپے کی اس زمانے میں کافی ویلیو تھی۔ یوں اندازہ لگایئے کہ شیزان جیسے ریستوران میں چائے فی کس چھ آنے میں مل جاتی تھی اور چاہیں تو سارے دن بیٹھے پیتے رہیں۔ خوش لباس ویٹر آپ کے اشارے پر ہر مرتبہ گرم چائے لا کر سامنے رکھ دے گا۔ ایک ڈیڑھ روپے گز کا کپڑا قمیض پاجامے کے لئے مل جاتا تھا۔ بہت اچھا جوتا پندرہ روپے میں دستیاب ہو جاتا تھا جو آج کل پندرہ سو روپے میں بھی نہیں ملتا۔ کسی اچھے ریستوران میں ڈیڑھ دو روپے میں بہت اچھا کھانا کھایا جاسکتا تھا۔ تنور نما ہوٹلوں سے تو چھ آٹھ آنے میں پلیٹ سالن، دو روٹی اور چائے کا ایک خوش ذائقہ کپ لے کر پیٹ بھرا جاسکتا تھا۔ گوشت، آٹا، گھی، چینی، ہر چیز سستی تھی۔ ماڈل ٹاؤن سے بس میں تین آنے ادا کر کے مال روڈ پہنچ جاتے۔ چپل ڈیڑھ دو روپے میں خریدی جاسکتی تھی۔ ''ایوننگ ان پیرس'' خوشبو کی منی سی خوبصورت شیشی سوا روپے یا ڈیڑھ روپے میں ملتی تھی جسے ہم ایک مہینے تک استعمال کرتے تھے۔ روزانہ اخبار کی قیمت دو آنے تھی۔ بمبئی کا فلمی جریدہ فلم فیئر چھ آنے میں اور لندن کے ٹٹ بٹس اور ویک اینڈ ویکلی جریدے ساڑھے چار چار آنے میں خریدے جاتے تھے۔ غرضیکہ کہاں تک سنیں گے کہاں تک سنائیں۔

قصہ مختصر یہ کہ وہ بہت سستا زمانہ تھا۔ اتنا سستا کہ آج اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ آج کے بچے یہ

باتیں سن سن کر چپکے چپکے ہنستے ہیں اور ایک دوسرے سے سرگوشی میں کہتے ہیں "گپ لگا رہے ہیں"۔

اس زمانے میں ہماری منیر نیازی سے ادبی جلسوں میں ملاقات ہوئی اور پھر یہ دوستی میں بدل گئی۔ منیر نیازی سدا کے بے پروا، لاابالی، متلون مزاج آدمی ہیں۔ خدا جانے اپنا خرچ کیسے چلاتے تھے۔ غالباً منٹگمری میں ان کی زمینیں تھیں جن سے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی۔ ان کے دوست بھی بے حد مخلص اور جان نثار تھے۔ پھر یہ کہ خود منیر نیازی کی ضرورتیں بہت محدود تھیں۔ منٹگمری سے لاہور کا بس کا کرایہ ہی کتنا تھا۔ چند آنے۔ جب چاہا بس میں بیٹھے اور لاہور پہنچ گئے۔ یہاں مٹر گشت کیا، دوستوں سے ملے، ادبی جلسوں میں شریک ہوئے اور جب جی میں آئی منٹگمری چلے گئے۔ منیر نیازی کے مالی حالات ووسائل اور ذریعہ آمدنی کے بارے میں نہ ہم نے کبھی پوچھا۔ نہ انہوں نے بتایا۔ لیکن ہم نے انہیں جب بھی دیکھا خوش لباس، صاف شفاف، چمکتا دمکتا اور شگفتہ ہی دیکھا۔ وہ ہر وقت ہنستے رہتے تھے۔ ہنستے نہیں تھے تو فکر مند نظر آتے تھے۔ انہیں ہر چیز کی فکر تھی۔ ملک کی، قوم کی، نوجوانوں کی، ادیبوں کی، سیاست دانوں کی، بعد میں اس فہرست میں فلمی صنعت بھی شامل ہو گئی تھی۔

وہ اپنے ارد گرد کے حالات سے نالاں اور غیر مطمئن بلکہ بیزار سے رہتے تھے۔ لیکن کچھ کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ان کی اسی فکر مندی، بیزاری اور بے بسی نے ان کی شاعری کی بنیاد رکھی اور انہیں اردو کا ایک بالکل نیا نویلا شاعر بنا دیا۔ وہ جب فکر مند ہوتے تو ان کے سرخ و سفید چہرے پر غم واندوہ کی پرچھائیاں لرزاں نظر آتیں۔ آنکھوں میں تشویش، پریشانی اور غم واندوہ کے جذبات جھلکنے لگتے۔ وہ اپنے ارد گرد کے حالات اور ماحول سے سخت غیر مطمئن تھے۔ لوگوں کی پریشانیاں اور مصائب انہیں دکھ میں مبتلا رکھتے تھے۔ ظلم اور ظالم کو وہ صفحہ ہستی پر دیکھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ان جذبات واحساسات کا اظہار وہ کبھی کالموں کے ذریعے اور اکثر اپنے اشعار میں کرتے تھے۔ دراصل منیر نیازی کو ان کی شدت احساس نے شاعر بنایا!

ہم یہ بتا رہے تھے کہ منیر نیازی سے ہماری دوستی ہو گئی تو آفاق کے دفتر میں بھی آنے لگے، جہاں انتظار حسین بھی سعادت حسن منٹو بھی آیا کرتے تھے۔ ناصر کاظمی کا پھیرا بھی رہتا تھا۔ اشفاق احمد کے " داستان گو" کا دفتر بھی ہماری سیڑھیوں کے اندر ہی تھا۔ لاہور کے دوسرے شاعر اور ادیب بھی قدم فرماتے رہتے تھے۔

جب وہ پہلی بار دفتر آئے تو چائے پینے اور تھوڑی سی فقرے بازی کے بعد (نیچے والی دکان سے چھ پیسے میں ایک پیالی چائے تین آنے میں ہاف سیٹ آجاتا تھا) انہوں نے ہم سے پوچھا " آفاقی' سنا ہے کہ تم نظم اور غزل کا معاوضہ بھی دیتے ہو؟"

ہم نے کہا "صرف معاوضہ ہی دیتے ہیں"

"کتنا معاوضہ دیتے ہو؟"

ہم نے بتایا "فی مضمون پندرہ روپے اور فی نظم یا غزل دس روپے"

پوچھا "ہر ایک کو معاوضہ دیتے ہو؟"

"ہر ایک کو تو نہیں' صرف اس کو دیتے ہیں جس کی تحریر شائع ہوتی ہے۔"

"یار اتنے بڑے سیٹھ کا اخبار ہے اور اتنی کنجوسی۔" پھر خود ہی بولے "اگر کنجوس نہ ہوتا تو اتنا بڑا سیٹھ کیسے بن جاتا۔"

اگلی بار انہوں نے ہمیں ایک نظم لا کر دی جس کی اشاعت کے بعد انہیں معاوضہ ادا کر دیا گیا۔ ہم نے دیکھا کہ منیر نیازی کو معاوضے یا پیسوں کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ کافی عرصہ تک غائب رہے۔ پھر ایک دن آئے تو ابراہیم جلیس بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ چند روز کے لئے کراچی سے لاہور آئے تھے۔

منیر نیازی نے کہا "آفاقی دیکھو تمہارے لئے یہ شکرا لے کر آیا ہوں" یہ منیر نیازی کا مخصوص انداز کلام تھا۔ بعض الفاظ وہ اپنی گفتگو میں اکثر استعمال کیا کرتے تھے۔ جیسے پیوست زدہ' دیمک زدہ' شکرا' بدبودار' سڑانڈ' تعفن زدہ ' بدشکل' دہشت ناک' دہشت انگیز' مکروہ' مسخ چہرے' بدبخت وغیرہ۔

"شکرا" ان کے نزدیک وہ شخص ہے جو دوسروں کے مال پر نظر رکھتا ہے۔ اپنے دوستوں کو وہ محض مذاق میں ایسے خطابات سے نوازتے۔ "آفاقی۔ یہ شکرا اتنی دور سے آیا ہے لاہور میں اس کی خاطر بھی کرنی چاہئیے۔"

ہم نے کہا "انہیں کھانا کھلایا جائے؟"

ابراہیم جلیس قہقہہ مار کر ہنسے اور بولے "ہم تو گرائپ واٹر پینے والے ہیں۔" بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ اصطلاح وہ شراب کے لئے استعمال کرتے تھے۔

منیر نیازی نے کہا"اس کو گرائپ واٹر پلانے کے لئے کچھ رقم کی ضرورت ہے مگراس وقت میرے پاس کوئی نظم یا غزل نہیں ہے۔"

ہم نے کہاآپ یہ دس روپے قبول فرمائیے"

اس طرح منیر نیازی گاہے بگاہے کسی ضرورت کے تحت ہمارے پاس آجاتے تھے۔کچھ دیر بیٹھ کرہنستے ہنساتے تھے اور پھراپنی تحریر دے کررخصت ہو جاتے تھے۔ ہم "آثار" میں پہنچ گئے تومنیر نیازی کااس طرف بھی پھیرا لگنے لگا۔مگر یہ خالص دوستانہ اور مخلصانہ وزٹ ہواکرتی تھیں اس لئے کہ "آثار" میں لکھنے والوں کو معاوضہ ادا کرنے کارواج نہ تھا۔منیر نیازی کبھی کبھی ادھر آ نکلتے۔چائے پیتے گپ شپ کرتے اور رخصت ہو جاتے۔

ایک دن ڈار صاحب نے کہا"آفاقی' یہ منیر نیازی آج کل کیا کرتے ہیں؟"

ہم نے جواب دیا"پتا نہیں۔"

کہنے لگے "اس کو بھی ہم "آثار" میں کیوں نہ رکھ لیں۔یہ بھی کام سے لگ جائے گا۔"

ہم نے کہا"منیر نیازی کاکام میں دل نہیں لگتا۔شاعر آدمی ہیں۔"

اگلی بار منیر نیازی ہمارے دفتر آئے توڈار صاحب نے یہ تجویزان کے سامنے رکھی اور کہاکہ کیاحرج ہےاگرتم باقاعدہ صحافت شروع کردو۔

منیر نیازی نے کچھ دیر سوچااور پھر رضامندی کااظہار کر دیا۔"کام کیا کرناہو گا؟"

ہم نے کہا"کام بھی تلاش کرلیں گے۔آپ کل صبح دفتر آجائیے۔"

نیازی صاحب دوسرے دن ٹھیک وقت پر دفتر آ گئے "اب بتاؤ کیا کرنا ہے؟" انہوں اس طرح پوچھا جیسے کے دفتر آ کرانہوں نے ہم پر بہت بڑااحسان کیاہے۔

ڈار صاحب نے کہا"پہلے دفتر کے ماحول سے مانوس ہو جاؤ۔پھر کوئی ڈیوٹی بھی مقرر کر دیں گے۔"

ابراہیم جلیس کے ساتھ کچھ دیر گپ شپ رہی۔لطیفہ بازی اور گپ شپ میں ابراہیم جلیس بادشاہ تھے۔

منیر نیازی دفتر کے ماحول سے کیا مانوس ہوتے۔ وہ ہر وقت ہمارے کمرے میں ہی بیٹھے چائے نوشی اور گپ شپ میں مصروف رہتے تھے۔ آخر ہم نے انہیں یاد دلایا کہ اب وہ سٹاف ممبر ہیں اور انہیں کام کرنا چاہئیے۔ انہیں نیوز روم میں نیوز ایڈیٹر اقبال صدیقی کے سپرد کر دیا گیا۔ اقبال صدیقی اس سے پہلے ''زمیندار'' میں چیف رپورٹر تھے۔ کافی تجربہ کار آدمی تھے۔ اقبال صدیقی ان سے بخوبی واقف تھے۔ علیک سلیک ہوئی۔ کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں پھر اقبال صدیقی نے انہیں چند انگریزی خبریں ترجمے کے لئے دے دیں۔ کافی اہم خبریں تھیں مگر منیر نیازی صاحب نے چند سطروں میں ان کا نچوڑ نکال کر اقبال صدیقی کے حوالے کر دیا۔

اقبال صدیقی نے طویل انگریزی خبر کو دیکھا۔ پھر نیازی صاحب کے چند سطری ترجمے پر نظر ڈالی اور پوچھا ''بھائی یہ آپ نے کیا حال کر دیا خبر کا؟''

بولے ''اس میں کام کی بات صرف اتنی ہی تھی۔ باقی تو فضول بک بک ہے۔''

صدیقی صاحب نے ہم سے اور ڈار صاحب سے شکایت کی۔ ہم یہ مسئلہ نیازی صاحب کے روبرو لائے تو انہوں نے کہا ''یار یہ بے کار خبریں مجھ سے نہیں ہوں گی، میرا دل نہیں لگتا۔''

ہم اور ڈار صاحب سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اب منیر نیازی صاحب کو کیا کام دیا جائے۔ جس میں ان کا دل لگے۔

ڈار صاحب نے کہا ''دیکھو بھئی وہ آزاد منش آدمی ہے۔ اس سے پہلے کہیں جم کر کام نہیں کیا۔ پہلے اسے ہلکا پھلکا کام دینا چاہئیے جو زیادہ مشکل بھی نہ ہو۔''

کافی غور وخوص کے بعد طے پایا کہ فی الحال انہیں ''ایڈیٹر کے نام خطوط'' کا کالم دے دیا جائے۔ انہوں نے شکائتی خطوط پر نظر ڈالی۔ دو چار کی اصلاح کی۔ باقی خطوط ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیئے۔ ان کا خیال تھا کہ سارے خطوط بے معنی اور فضول ہیں۔ اگلی بار انہیں ''اضلاع کے نامہ نگاروں'' کی خبریں درست کرنے اور ایڈٹ کرنے کی ذمے داری سونپی گئی۔ یہ خبریں انہوں نے کاٹ پیٹ کر پھینک دیں۔ انہیں کوئی ایک خبر بھی پسند نہیں آئی۔

بولے '' یار یہ کیا خبریں ہیں۔ بھینس چوری ہو گئی۔ دو پارٹیوں میں لڑائی ہو گئی۔ شادی شدہ چھ بچوں کی ماں آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی۔ نری خرافات ہیں۔ اس پر زبان غلط، املا غلط، ہجے غلط، یہ بکواس چھاپنے کے قابل نہیں۔''

ڈار صاحب نے انہیں بٹھا کر سمجھایا کہ بھائی اخباروں میں تو یہی کچھ چھاپا جاتا ہے۔ ان ہی خبروں اور خطوط کو لوگ شوق سے پڑھتے ہیں۔ تمہیں نہ بیرون ملک کی خبریں پسند ہیں نہ اضلاع کی خبریں اچھی لگتی ہیں۔ خطوط تمہارے نزدیک بے کار اور بے معنی ہیں۔ آخر تمہیں اور کیا کام دیا جائے؟"

کہنے لگے "یہ تو تم سوچو۔ تم ہی مجھ سے کام کرانا چاہتے ہو" یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

ہم دونوں ابھی سوچنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ ہم دونوں کو لکھنے میں مصروف پایا تو اشارے سے اپنی "انگلیاں" دکھا کر دوبارہ غائب ہو گئے۔ اب ہم اس انتظار میں کہ منیر نیازی صاحب باتھ روم سے لوٹ کر آئیں تو ان سے کام کے بارے میں تبادلہ خیال کیا جائے مگر منیر نیازی صاحب لاپتا ہو چکے تھے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دفتر سے باہر نکلے تھے اس کے بعد لوٹ کر نہ آئے۔ ایک دن' دو دن' چھ سات دن گزر گئے اور منیر نیازی کا کوئی اتا پتا نہ لگ سکا۔ ایک ہفتے کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ منیر نیازی مسکراتے ہوئے چلے آرہے ہیں "بھئی آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

کہنے لگے "ذرا منٹگمری چلا گیا تھا"

"منٹگمری؟"

کہنے لگے "یار میرا تو کوئی پروگرام نہیں تھا۔ میں دفتر سے باہر نکلا تو میرا کزن مل گیا۔ وہ منٹگمری جا رہا تھا۔ اس نے مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا۔" اب غور فرمائیے کہ ایسا لاابالی شخص نوکری کیسے کرے گا!

منیر نیازی سے ہماری ملاقات غالباً 1951ء میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں وہ بھی اخباروں کے دفاتر' چائے خانوں اور ادبی محفلوں میں جایا کرتے تھے اور ہم بھی۔ کیونکہ اس وقت یہی دستور تھا۔ اس وقت منیر نیازی محض ایک ابھرتے ہوئے نئے شاعر تھے۔ ان کے ہم عصر اور بھی بہت سے شاعر تھے جنہوں نے آگے چل کر بہت شہرت و امتیاز حاصل کیا۔ اس عہد میں اردو شاعری کے آسمان پر بڑے بڑے آفتاب و ماہتاب چمک دمک دکھا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ کسی نئے شاعر کے لئے شاعری میں مقام بنانا کوئی آسان کام نہ تھا اور پھر منیر نیازی کے لئے شاعری میں مقام بنانا کوئی آسان کام نہ تھا اور پھر منیر نیازی تو ٹھہرے پٹھان۔ صاف گو اور کھرے آدمی۔ جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ جو

رائے قائم کرلی وہ بیان کر دیا۔ان کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ بیزار بیزار سے ہیں۔ اپنے ماحول سے' شاعری سے' حالات سے' ہر ایک سے وہ بیزار نظر آتے تھے۔ان کے دوستوں کی تعداد بہت محدود تھی۔باقی کو وہ گردانتے ہی نہ تھے۔لوگوں کے بارے میں ریمارکس پاس کرنا اور ان پر نکتہ چینی کرنا ان کا مرغوب مشغلہ تھا۔

دوسرے شعراء کو بھی بہت مشکل سے مانتے تھے۔اندازہ لگایئے کہ ایک ایسے شخص کے لئے ادب یا کسی بھی شعبے میں تن تنہا آگے بڑھنا اور نام وری حاصل کرنا کتنا دشوار ہو گا۔وہ کسی ادبی لابی سے بھی متعلق نہیں تھے۔بس اپنی ذات ہی میں کھوئے رہتے تھے۔ظاہر ہے کہ ان کی یہ عادات واطوار یار لوگوں کو پسند نہیں تھیں اور ان کے پسند کرنے والوں کے مقابلے میں انہیں ناپسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔بہت سے نقاد' شاعر اور ادیب تو انہیں شاعر ہی نہیں مانتے تھے اور منیر نیازی کا یہ رویہ تھا کہ میری بات مانو نہ مانو۔میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ان کے ہمدرد اور مخلص دوست آپس میں اس بات پر اظہار تشویش کرتے رہتے تھے کہ یہ شخص آگے کیوں کر بڑھے گا اور اپنا مقام اور نام کیسے حاصل کرے گا۔ہر ایک سے بے نیاز اور بے پروا۔ہر ایک سے خود کو بالاتر سمجھنے والا۔کسی بھی شعبے اور معاشرے میں ایسے لوگوں کی ترقی کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔

لوگ مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم آغاز ہی سے منیر نیازی کو شاعر مانتے تھے۔ان کا طرز اظہار' اسلوب' الفاظ کا انتخاب اور نشست و برخاست' ان کے خیالات' سبھی چیزیں دوسروں سے مختلف تھیں۔جیسے کہ وہ بذات خود دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔یہ نہیں کہ بدمزاج اور مغرور تھے۔وہ بہت شگفتہ مزاج اور فقرے باز تھے۔خود بھی ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے حالانکہ یہ ان کا اوپری روپ تھا۔اندر سے وہ ایک بے حد حساس' دکھی' غم خوار و غمگیں اور آس پاس کے حالات اور انسانوں کی مشکلات پر کڑھنے والے انسان تھے۔ان کے یہ دونوں روپ بیک وقت سامنے آتے رہتے تھے۔ابھی اداسی اور غم کا دامن تھامے غمگیں بیٹھے ہیں تو کچھ دیر بھی ہنس رہے ہیں۔ فقرے کس رہے ہیں۔ان کی ہنسی بے اختیاری بھی تھی اور وہ بے ساختہ کھل کھلا کر ہنستے تھے۔بالکل بچوں کی طرح' ان کا یہی انداز آج بھی ہے۔ہمیں تو وہ ہنستے ہوئے اور لطیفے بازی کرتے ہوئے ہی اچھے لگتے تھے اور ہم دونوں کی کوشش ہوا کرتی تھی کہ بیشتر وقت ہنستے ہنساتے رہیں۔منیر نیازی کا جوانی کا روپ آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

دراز قد' سمارٹ' سرخ وسفید چہرہ' براؤن بال اور مسکراتی ہوئی شوخ آنکھیں۔جو دکھ کے ذکر پر غم واندوہ میں ڈوب جاتی تھیں۔منیر نیازی کے دکھ کا احساس ان کے چہرے اور آنکھوں سے ہو جاتا تھا۔جب ہنستے تو یوں لگتا جیسے اس چہرے اور آنکھوں پر کبھی دکھ اور تکلیف کے سائے پڑے ہی نہ ہوں۔آج بھی ان کا یہی عالم ہے۔

منیر نیازی تو اب اس دنیا میں نہیں لیکن اسکی یادیں ہیں کہ آج بھی ذہن پر حملہ آور ہوتی ہیں۔۔۔۔۔۔وہ شخص واقعی سب کو اداس کر گیا ہے ۔۔۔دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کے بزم سے اٹھ جانے سے دنیا اداس ہو جاتی ہے۔۔۔لیکن یہ بھی اسی دنیا کا رنگ ڈھنگ ہے کہ کسی کے چلے جانے کے باوجود دنیا کا کاروبار چلتا رہتا ہے۔

دراصل منیر نیازی سے ہماری دوستی کی بنیاد جن بھوت' چڑیلیں اور آسیب بنے تھے۔ہم دونوں بیٹھے اپنے بچپن کے واقعات سنا رہے تھے۔تو معلوم ہوا کہ کم از کم بھوت پریت ہم دونوں میں قدر مشترک ہیں۔پھر پرانی روایات کا تذکرہ چھڑ گیا۔پرانی حویلیاں' کھنڈرات' بے در و بام کی یادگاریں' بڑی بوڑھیوں کی داستان گوئی 'بڑی بڑی حویلیوں کی بھائیں بھائیں۔اونچے اونچے درختوں کی سائیں سائیں۔ دوپہر کا سنّاٹا' جاڑوں کی اداس شامیں' پرانے لوگوں کے طور طریقے۔۔۔یہ سب ہمارے پسندیدہ اور مشترکہ موضوعات نکلے۔

ہم جب بھی اکٹھے ہوتے دیر تک بیٹھے بچپن کے دنوں کی باتیں کرتے رہتے۔جب ہم اپنے اپنے حصے کے بھوت پریت کے واقعات ختم کر بیٹھے تو ہماری دوستی اور انڈرسٹینڈنگ کا آغاز ہو گیا۔ بچپن کا منیر نیازی پر بہت گہرا اثر ہے۔اس کی شاعری شدّتِ احساس اور گہرے مشاہدے کی شاعری ہے۔اس پر اس کا مخصوص انداز بیان۔وہ ایسی چیزوں کے بارے میں شعر کہتا ہے جنہیں دوسرے عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں اور پھر ان کے بارے میں اس کے اظہار کا طریقہ دوسروں سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔

ہم نے اپنے ملنے والے اور بے تکلف لوگوں میں دو ایسے آدمی دیکھے جنہوں نے اپنے بچپن کی یادوں اور اس ماحول کو فراموش نہیں کیا۔ایک منیر نیازی اور دوسرے انتظار حسین۔دونوں نے اپنی اپنی جگہ شاعری اور افسانہ نگاری میں بہت نام پیدا کیا اور اپنے نئے اسلوب اور طرز کے موجد کہلائے۔مگر منیر نیازی نے ماضی کو یاد ضرور رکھا مگر پس منظر کے طور پر۔جب کہ انتظار حسین نے خود کو انہی یادوں کے حصار میں قید کر لیا۔وہ زیادہ تر بیتے دنوں کا ماتم کرتے رہے

۔منیر نیازی بیتے دنوں کو یاد ضرور کرتے لیکن ان کے کھونے کا نوحہ نہیں کرتے تھے۔ان کو گم گشتہ جنت کا احساس تو تھا لیکن وہ اس کے پانے کی جستجو میں نہیں لگا رہتا تھا۔وہ حقیقت پسند تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ گئے ہوئے دن واپس لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

انتظار حسین کے مانند وہ ہجرت کو یاد کرتا تھا مگر نئی بستیاں بسانے کا بھی آرزو مند تھا۔شاید اس لئے کہ وہ ایک جنگجو پٹھان تھا۔ہارنے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔لڑ کر جان دینے کا قائل تھا۔

منیر نیازی نے ساری زندگی شاعری کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں کیا تھا۔یہی اس کا اوڑھنا بچھونا رہا اور یہی ذریعہ معاش۔اب تو منیر نیازی مرحوم ہو چکے مگر انکی مقبولیت آج بھی قائم ہے،اس کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔

منیر نیازی نے اس سے پہلے بھی شاعری کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ وہ کچھ عرصے فلموں سے بھی وابستہ رہے مگر یہ عرصہ بہت کم ہے۔

منیر نیازی نے فلمی دنیا کو کبھی پسند نہیں کیا۔یہی حال فلمی دنیا کا بھی ہے۔یعنی ناپسندیدگی دوطرفہ تھا۔نیازی صاحب کو فلم والوں کی بیشتر باتیں ناپسند تھیں جن کا وہ کھلم کھلا اظہار کرتے رہتے تھے۔

فلم سے منیر نیازی کا تعلق زیادہ عرصہ نہیں رہا۔منیر نیازی کی غزلوں کی طرف موسیقار حسن لطیف للک نے سب کو متوجہ کیا اور منیر نیازی کی غزلوں کو بڑے سلیقے سے پیش کیا۔ نیازی صاحب کو یہ تو گوارا ہی نہیں تھا کہ کہانی کی سچویشن سنتے اور پھر موسیقار کی طرز کے مطابق گیت یا غزل لکھتے،انہیں تو فلمی گانوں میں کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔اتنا صبر اور اتنی برداشت اگر ان میں ہوتی تو منیر نیازی کیسے بن جاتے۔البتہ فلم والوں نے ان کی حسب حال غزلوں کو ڈھونڈا اور انہیں طرزوں کے سانچے میں ڈھالا تو وہ بہت مقبول گانے بن گئے۔

سچ پوچھئیے تو منیر نیازی کی شاعری کو ان کے دوسرے ملنے والوں کی طرح شروع شروع میں ہم نے بھی زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔نیازی صاحب کا یہ حال کہ کبھی اپنی شاعری کا تذکرہ تک زبان پر نہیں لائے۔شاعر تو لوگوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ اپنا کلام سنائیں اور نیازی صاحب اس معاملے میں بالکل گم صم ہیں۔وہ دوستوں کی محفلوں میں بیٹھ کر اپنے اشعار سنانے کے عادی نہیں تھے۔ بلکہ اگر فرمائش بھی کی جائے تو ٹال دیتے۔اس زمانے میں ان کی

شعر گوئی کی رفتار بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ باہمی ملاقاتوں میں وہ شاعری سے زیادہ دوسرے موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے تو پھر ان کی شاعری کو۔۔۔ سیریس انداز میں لینے کا کوئی معقول طریقہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو اللہ بخشے حسن لطیف للک کو جس نے منیر نیازی کو سب سے پہلے فلم والوں کے سامنے جھاڑ پونچھ کر پیش کیا اور جب ان کی غزلیں تحتُ اللفظ اور پھر ترنم یا موسیقی کے ساتھ سنائیں تو سننے والے توجہ دینے پر مجبور ہو گئے۔

جس نے مرے دل کو درد دیا
اُس شکل کو میں نے بُھلایا نہیں

اور پھر

کیسے کیسے لوگ ہمارے دل کو جلانے آجاتے ہیں

ایسی غزلیں تھیں کہ جب حسن لطیف نے ادیبوں' شاعروں اور فلم والوں کی نجی محفلوں میں سنائیں تو سب ہی داد دینے پر مجبور ہو گئے۔ حسن لطیف کی آواز میں سوز بہت زیادہ تھا۔ سُریلے بھی تھے اور آواز بھاری اور رچاؤ لئے ہوئے تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ حسن لطیف کی زبانی منیر نیازی اور دوسرے شاعروں کا جو کلام ہم نے سنا وہ آج بھی کانوں میں گونج رہا ہے۔ بعد میں مہدی حسن جیسے گائیکوں نے بھی ان غزلوں کو گایا مگر ہمارے کانوں میں آج بھی حسن لطیف کی آواز ہی رس گھول رہی ہے۔

اُن دنوں شام اور رات کو اکثر مختلف لوگوں کے گھروں پر مجلس آرائی ہوا کرتی تھی جس میں بے تکلف دوست احباب' شاعر' ادیب' صحافی اور فلم والے شریک ہوا کرتے تھے۔ ایسا ہی ایک حلقہ تنویر نقوی صاحب اور علاؤ الدین صاحب کے گھروں میں بھی موجود تھا۔ فلم ساز و ہدایت کار لقمان کے گھر پر بھی لوگ اکٹھے ہوتے۔ تنویر نقوی' علاؤ الدین' ریاض شاہد' رشید عطرے' طالش' آئی اے رحمان' خلیل قیصر' رضا میر جیسے لوگوں کی یہ مجلس آرائی معمول میں داخل تھی۔ حسن لطیف نے زیادہ تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی مگر ادب اور شعر کا ذوق بہت اعلیٰ پایا تھا۔ شاعروں ادیبوں کی صُحبت میں رہنے کی وجہ سے اس ذوق کو مزید جلا ملی۔ اچھا شعر اور اچھی دُھن یا اچھا راگ حسن لطیف کی کمزوری تھی۔ بلکہ ہر اچھی چیز ان کی کمزوری تھی۔ کسی کو خوش رنگ' اچھے تراش خراش کے لباس میں

دیکھا تو جھٹ تعریف کر دی۔

''آفاقی صاحب' آپ فان کلر کا سوٹ پہن کر بس سے اُترے تو میرا جی خوش ہو گیا۔ سلائی بھی بہت اچھی ہے۔ کہاں سے سلوایا ہے؟'' ان کا کہا ہوا فقرہ آج بھی ہمارے حافظے میں محفوظ ہے۔ وہ ہر اچھی چیز کی دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ خود بھی موسیقار تھے مگر دوسروں کی طرزوں کو بھی خوب سراہتے اور داد دیا کرتے تھے۔

حسن لطیف للک نے منیر نیازی کی غزلیں اس کثرت سے سنائیں کہ خلیل قیصر اور ریاض شاہد ان کا نوٹس لینے پر مجبور ہو گئے۔

مذکورہ بالا دونوں غزلوں کو حسن لطیف ہی نے دھنوں میں ڈھالا ہے۔ان کی ایک پسندیدہ غزل یہ بھی تھی۔

اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو

خوب لہک لہک کر گاتے اور مزہ لیتے تھے' یہ غزل خلیل قیصر نے اپنی فلم ''شہید''میں استعمال کی۔اس کے موسیقار عطرے تھے۔ بڑے ہنرمند موسیقار تھے۔یہ بھی حقیقت ہے کہ حسن لطیف نے اس غزل کی جو طرز بنائی تھی' رشید عطرے بھی اس کے آس پاس ہی رہے۔ بات یہ ہے کہ اس کے سوا بھرپور شدت اور رچاؤ پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ سوز و گداز کی جو کیفیت اس غزل میں ہے حسن لطیف نے دھن بھی ویسی ہی بنائی تھی۔ مجبوراً رشید عطرے کو بھی اسے اپنانا پڑا۔ یہ نہیں کہ عطرے صاحب بذاتِ خود کوئی موزوں دُھن نہیں بنا سکے تھے، وہ تو اس وقت بھی مانے ہوئے موسیقار تھے۔ یہ ان کی بڑائی تھی کہ حسن لطیف کی طرز سے استفادہ کیا اور حسن لطیف کی عظمت دیکھئیے کہ کبھی اس طرز پر اپنا حق نہ جتایا اور نہ ہی کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کیا۔ یہ بات صرف ان افراد تک ہی محدود تھی جنہوں نے خود حسن لطیف کی زبان سے یہ غزل سنی تھی۔

کیسے کیسے لوگ ہمارے دل کو جلانے آجاتے ہیں۔

ایک بھرپور طرح دار غزل ہے۔اس میں ایک عجیب ہمہ گیری اور کیفیت ہے۔ حسن لطیف کی زبان میں گائی ہوئی یہ غزل اور اس کی طرز آج بھی ہمیں حرف بہ حرف یاد ہے۔ غزل کے ابتدائی اشعار اس طرح ہیں۔

کیسے کیسے لوگ ہمارے دل کو جلانے آجاتے ہیں

اپنے اپنے غم کے فسانے ہمیں سنانے آجاتے ہیں
اُن کے بنامیں جی نہیں سکتااس بے درد زمانے میں
میری یہ مجبوری مجھ کو یاد دلانے آجاتے ہیں
حسن لطیف نے ایسی دُھن بنائی کہ ایک ایک لفظ کے تاثراور مفہوم کا حق ادا کر دیا۔ منیر نیازی نے بعد میں ''کلیات منیر'' میں یہ غزل تبدیلی کے ساتھ شامل کی ہے۔ ہم اس پر حیران ہوئے کہ انہوں نے یہ تبدیلی کیوں کی؟ کیا انہیں پہلے شعر ناپسند تھے؟ مثلاً کلیات میں یہ شعر اس طرح ہے۔
جب بھی گھر کی چھت پر جائیں ناز دکھانے آجاتے ہیں
کیسے کیسے لوگ ہمارے جی کو جلانے آجاتے ہیں
شاید منیر نیازی کو پچھلی غزل اچھی نہیں لگی ہو گی جو انہوں نے اس میں تبدیلی ضروری سمجھی اور اشعار کو نیا جامہ پہنادیا مگر ہمیں حسن لطیف والی غزل ہی آج بھی پسند ہے اور یاد بھی ہے۔

ایک دن تنویر نقوی صاحب کے گھر گئے تو محفل سجی ہوئی تھی۔ فلم وادب کی دنیا کے بڑے بڑے لوگ شریک محفل تھے۔ کھانے کے بعد حسب معمول حسن لطیف للک ہارمونیم سنبھال کر بیٹھ گئے اور ایک غزل چھیڑ دی۔
جس نے مرے دل کو درد دیا
اُس شکل کو میں نے بُھلایا نہیں
ایک تو غزل کے اشعار' اس پر حسن لطیف کی ادائیگی اور الفاظ کی ترتیب۔ ایک سماں بندھ گیا۔ ہر کوئی پوچھنے لگا کہ کس کی غزل ہے؟ حسن لطیف نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر جواب دیا ''منیر نیازی کی''
اس طرح منیر نیازی کی ایک اور غزل فلمی حلقوں میں متعارف ہوئی اور پھر ایک فلم میں بھی پیش کی گئی۔
حسن لطیف للک ایک خوش شکل' خوش پوش اور خوش ذوق انسان تھے۔ تنویر نقوی اور علاؤالدین' ریاض شاہد' طالش کی محفلوں میں اکثر بلکہ ہمیشہ نظر آیا کرتے تھے۔ بہت منکسر المزاج انسان تھے۔ دھن بنانے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ آرکسٹرا پر اتنا عبور نہ تھا۔ اتنے مشہور معروف موسیقاروں کو اس فن میں مہارت کہاں تھی؟ یہ کام عموماً

سازندے ہی کیا کرتے تھے۔اس دور میں سازندے بھی ایسے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینے۔ان میں سے کئی موسیقار بن گئے اور خوب نام کمایا۔ تصدّق حسین، رحمان ورما، نذیر علی، طافو جیسے نام یاد آرہے ہیں۔ باقی بھی اپنے ایسے ہنرمند اور ماہر فن تھے کہ اساتذہ میں شمار ہوتا تھا۔

حسن لطیف کے انکسار اور خاموشی نے فلم والوں کو ان کی طرف متوجہ نہیں کیا ورنہ بڑے نامور موسیقار ہوتے۔انہوں نے پاکستان کی ابتدائی فلموں میں بھی موسیقی دی تھی۔ بڑے بے لوث آدمی تھے۔ ہر ایک کے ساتھ مخلص اور ہر اچھی چیز کی کھل کر داد دینے والے۔ شاید اسی لئے زمانے نے ان کی قرارِ واقعی قدر نہ کی۔اگر وہ گلوکاری بھی کرتے تو آواز کا خوب جادو جگاتے اور بڑے گلوکاروں کی صفّ میں نظر آتے مگر وہ بس دوستوں کی محفلوں اور من پسند لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ ''سسرال'' اور ''شکوہ'' میں ان کی موسیقی بالکل علیحدہ انداز کی ہے۔ منیر نیازی کو تیزی سے مقبول کرانے میں حسن لطیف للک کا نمایاں ہاتھ ہے۔اردو شاعری کی روایت ہے کہ شعراء کی عظمت اور مقبولیت کا فیصلہ گانے والیاں کرتی ہیں۔ ذوق، غالب، داغ اور دوسرے شعراء کا کلام بھی گانے والیوں اور گلوکاروں کی زبان پر پہنچا تو مقبول عام ہوا۔ ورنہ اس زمانے میں نہ تو ادبی رسائل تھے نہ ٹیلی وژن اور ویڈیو۔ مشاعرے بھی بہت کم منعقد ہوا کرتے تھے جن میں چیدہ اور چنیدہ ہستیاں ہی شریک ہوا کرتی تھیں۔ مگر سارے برّصغیر کے طول وعرض میں شاعروں کی غزلیں اور کلام گانے والوں اور گانے والیوں کے ذریعے ہی پہنچا تھا۔

ہمیں یاد ہے، پاکستان بننے کے بعد ہم پہلی بار آغا شورش صاحب کے ساتھ بالاخانے پر گئے تو گانے والی نے فوراً آغا شورش کاشمیری سے اجازت طلب کی اور ان کی غزل پیش کردی۔ عبدالحمید عدم کی غزلیں بھی کوٹھوں پر بے حد مقبول تھیں۔ انہیں دیکھتے اور پہچانتے ہی وہ ان کی غزل چھیڑ دیا کرتی تھیں ورنہ وہ خود فرمائش کرکے گانے پر مجبور کر دیتے تھے۔ منیر نیازی کا کلام بھی فلموں کے ذریعے پہلے پہل مقبول عام کی دہلیز تک پہنچا تھا۔ حالانکہ اس میں وہ بھڑک، شوخی اور سجاوٹ نہیں ہے جو کہ گانے والوں کو مرغوب ہوتی ہے اور ان کے سامعین کو مسحور کر دیتی ہے۔ وہ تو بھڑکتی ہوئی چیز کی فرمائش کرتے ہیں۔ منیر نیازی کی غزلیں بھڑکتی ہوئی نہیں ہیں البتہ سنجیدہ اور باذوق لوگوں کے

لئے ان میں بہت دلکشی اور جاذبیّت ہے۔

ہمارے اور منیر نیازی کے درمیان جن بھوت اور بچپن کی داستانوں کے علاوہ ایک قدر مشترک خوشبو بھی رہی ہے۔ منیر نیازی کو ہم نے عموماً سادہ لباس پہنے دیکھا لیکن صاف شفّاف اور اچھی تراش کا۔ گرمیوں میں وہ سفید رنگ کے قمیض پتلون یا شلوار قمیض کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر بہت جامہ زیب آدمی تھے۔ان کا سراپا اور شخصیت ہر لباس میں سجتا ۔خوشبو ان کی بھی کمزوری تھی شراب کی طرح۔اُس زمانے میں یہ غنیمت تھا کہ خوشبو آج کی طرح ہوش رُبا حد تک مہنگی نہ تھی۔ فرانس سے امپورٹ کی ہوئی ننھی منی سی ''ایوننگ اِن پیرس'' کی شیشی ڈیڑھ روپے میں آجاتی تھی۔ ہم دونوں بیڈن روڈ کی ایک دکان سے یہ شیشی خرید کو پتلون کی سامنے کی ریزگاری والی چھوٹی جیب میں رکھ لیتے تھے۔ بوقت ضرورت منہ ہاتھ دھو کر انگلی کی مدد سے یہ خوشبو کپڑوں پر لگا لیتے تھے۔سب پوچھتے رہ جاتے کہ یار کون سی خوشبو لگائی ہے۔ بڑے غضب کی ہے۔خوشبوئیں' خصوصاً مغربی خوشبوئیں اس وقت اتنی عام نہ ہوئی تھیں۔چند معروف نام تھے۔اس کے آگے معلومات نہ ہوتی تھیں۔یہ ڈیڑھ روپے کی شیشی ہم دونوں بہت سینت کر رکھتے تھے اور بڑی کفایت شعاری سے دس پندرہ دن چلا لیتے تھے۔

خوشبو کے ذکر پر یاد آیا کہ عطر کی خوشبو بھی اس وقت تک متروک یا آؤٹ آف ڈیٹ نہیں ہوئی تھی۔لوگ عطر بھی استعمال کرتے تھے۔عطر خس' عطر چنبیلی' عطر گلاب کی چھوٹی شیشی دس بارہ آنے میں دستیاب ہو جاتی تھی۔یہ مغربی خوشبو کے مقابلے میں زیادہ دیر تک چل جاتی تھی۔

جن دنوں ہم ''آثار'' میں کام کر رہے تھے تو ایک عطر فروش اپنی صندوقچی لے کر دفتر میں آگئے۔خاصا گہرا کالا رنگ مگر ناک نقشہ بہت سجل' بڑی بڑی آنکھیں جن میں سُرمہ بڑے انہاک سے لگاتے تھے۔کُھلی موری کا پاجامہ اور کھلا کلی دار کرتہ پہنے تھے۔سر پہ کپڑے کی ٹوپی' کندھے پر رومال' پہلی بار دفتر میں داخل ہوئے تو سارا دفتر مہک اٹھا۔ سب ہی چونک پڑے کہ یہ خوشبو کہاں سے آئی۔اتنے میں عطر فروش بھی بنفس نفیس تشریف لے آئے۔ چپڑاسی بڑے احترام سے انہیں لے کر آیا۔انہوں نے بڑی لچھّے دار تقریر فرمائی اور عطر کی خوبیاں بیان کرنے کے بعد پٹاری کھول کر بیٹھ گئے۔ان کا یہ دستور تھا کہ ہر خوشبو انگلی میں لگا کر اپنے ہاتھ پر لگاتے اور سونگھا دیتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ

ان کی ذات مختلف عطریات کی کاک ٹیل بنی رہتی تھی۔ جس طرف سے نکل جاتے تھے کوچہ و بازار اور دفتر مہک اٹھتے تھے اور کافی دیر تک مہکتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنا نام صوفی محمود یا اسی طرح کا بتایا تھا۔ ہمیں صرف صوفی صاحب یاد رہا۔ ہماری عمر اس وقت انیس بیس سال رہی ہو گی۔ وہ دوگنی عمر کے تھے مگر صحت مند اور بھاری جسم کے مالک تھے۔ نہ نہ کرتے ہوئے بھی انہوں نے چند شیشیاں ہمارے ہاتھ فروخت کر دیں۔ شمامتہ العنبر' اماں کی پسندیدہ خوشبو تھی۔ ہم نے گھر جا کر اماں کی خدمت میں دو شیشیاں تحفہ پیش کیں اور ان کی دعائیں لیں۔ اس کے بعد اماں کی فرمائش بھی شامل ہو گئی اور ہم ان کے مستقل گاہک بن گئے۔ منیر نیازی صاحب نے بھی ان سے عطر خریدے۔ مشکل یہ ہے کہ سفید لباس پر عطرے کے رنگ کا داغ پڑ جاتا ہے شاید آج کل عطر کے متروک ہونے کا ایک یہ سبب بھی ہے۔

ہم ''آثار'' چھوڑ کر چلے آئے۔ ظہور الحسن ڈار صاحب نے بھی اسے خیر باد کہہ دیا تھا۔ انہوں نے اپنا ہفت روزہ ''ایشیاء'' نکال لیا۔ کچھ دنوں بعد ''آفاق'' دوبارہ نکلا تو ہم وہاں پہنچ گئے۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ عطر والے صوفی صاحب چلے آرہے ہیں۔ ہم نے عطر خریدا تو دوسرے حضرات بھی آ گئے۔ اس کے بعد تو صوفی صاحب نے جیسے گھر ہی دیکھ لیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چلے آتے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ ہمیں اب جدید پرفیوم کا مزہ پڑ گیا تھا پھر بھی صوفی صاحب سے کچھ شیشیاں عطر کی خرید لیتے تھے مگر کہاں تک خریدتے۔ لوگوں کو تحفے میں دینے لگے مگر عطر کا دور لد گیا تھا۔ یہ تحفہ بھی بے حیثیت ہو کر رہ گیا۔ مگر صوفی صاحب کا دل رکھنا تھا۔ منیر نیازی تو کبھی کبھی قابو میں آ جاتے تھے۔ اے حمید بھی مشکل ہی سے پکڑے جاتے تھے مگر انتظار حسین صاحب اور ہم ان کے مستقل اور آسان شکار تھے۔ گھڑے کی مچھلی سمجھ لیجئیے۔ جب چاہا پکڑ لیا۔ صوفی صاحب باذوق اور دلچسپ آدمی تھے۔ پرانے لوگوں کے بے شمار واقعات اور ہزاروں اشعار نوک زبان پر تھے۔ ہم بھی کام چھوڑ کر ان کے ساتھ باتوں میں لگ جاتے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا عطر کی مانگ کم ہوتی گئی۔ صوفی صاحب کو اس کے سوا کوئی ہنر نہ آتا تھا۔ کئی بار دبی زبان سے انہوں نے حالات کی تنگی کی طرف اشارہ کیا۔ ہم سے جہاں تک بن پڑتا تھا عطر خرید لیا کرتے تھے مگر اس کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

''آفاق'' سے کنارہ کش ہو کر ہم فلمی کوچے میں چلے گئے اور صوفی صاحب بھی قصہ پارینہ ہو گئے۔

ایک دن انتظار حسین صاحب اور ضیاء الاسلام انصاری سے ملنے کے لئے ''مشرق'' کے دفتر میں گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ صوفی صاحب براجمان ہیں۔ اب ان کے بالوں اور داڑھی میں سفیدی غالب آ گئی تھی۔ وہ خضاب کی جگہ بالوں اور داڑھی پر مہندی لگایا کرتے تھے۔ ہمیں دیکھا تو خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ بڑے خلوص سے بغل گیر ہوئے۔ حال احوال پوچھتے رہے اور دعائیں دیتے رہے۔ پھر پوچھا'' آفاقی صاحب' آپ کے فلم والوں کو خوشبو کا شوق نہیں ہے؟''

ہم نے کہا''صوفی صاحب وہ پرفیوم استعمال کرتے ہیں''

بولے''آپ ایک بار مجھے ملا دیجئیے ساری ہیروئنیں عطر کی خریدار ہو جائیں گی۔ یہ بتایئے آپ کا دفتر کہاں ہے؟''

انتظار حسین نے اشارہ کیا کہ ہرگز نہ بتانا ورنہ مارے جاؤ گے۔ ان دنوں ہمارا کوئی ایک دفتر تو تھا نہیں۔ جس کی کہانی لکھی بس وہی دفتر ہو گیا۔ صوفی صاحب سے چار چھ عطر کی شیشیاں خرید کر ہی چھٹکارا ملا۔ ان میں سے کچھ ہم نے امّاں کو دے دیں۔ مگر صوفی صاحب کا اصرار تھا کہ کسی ہیروئن کو بھی یہ عطر دیجئیے گا۔ آپ ہی کا کلمہ پڑھنے لگے گی۔ خیر' ہم نے اس مشورے پر تو عمل نہیں کیا مگر پھر یہ معمول ہو گیا کہ جب کبھی ''مشرق'' کے دفتر میں صوفی صاحب سے ملاقات ہوتی تھی، عطر کی شیشیاں ضرور خریدنی پڑتی تھیں۔

دیکھتے دیکھتے صوفی صاحب بوڑھے ہو گئے۔ ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر ہو گئی۔ قویٰ مضحل ہو گئے مگر وہی حلیہ اور وہی کرکراتی ہوئی آواز۔ کافی عرصے بعد ایک بار ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اولاد کوئی ہے نہیں۔ آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں بلکہ ان میں موتیا اُتر آیا ہے۔ کاروبار بھی مندہ ہے۔ ہم نے ان سے نہ صرف عطر خریدا بلکہ انہیں کچھ رقم بھی پیش کی۔ انتظار صاحب بھی انہیں ہر ملاقات پر کچھ نذر کر دیا کرتے تھے۔ وہ بیمار بھی رہنے لگے تھے مگر جب بھی موقع ملتا ''مشرق'' کے دفتر ضرور آتے تھے۔ ایک بار ہم وہاں گئے ہوئے تھے تو انہیں بہت کمزور اور بیمار پایا۔ ہم نے ان کا پتا لے لیا اور ہر ماہ ایک رقم انہیں ارسال کرنے لگے۔ غالباً انتظار حسین بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ ایک روز ایک جوان العمر شخص ہمیں تلاش کرتا ہوا آیا اور صوفی صاحب کا پیغام دیا کہ وہ بہت بیمار ہیں۔ کوئی سہارا نہیں۔ محلے دار تھوڑی بہت مدد کر دیتے ہیں۔ آپ کو سلام کہا ہے اور دعاؤں میں یاد رکھنے کی درخواست کی ہے۔

یہ سن کر ہم بہت دیر تک اداس رہے۔ پھر اس نوجوان کو کچھ رقم دی ۔اس نے بتایا کہ صوفی صاحب اب کسی اور گھر میں رہتے ہیں خود کرایہ ادا نہیں کر سکتے۔ان کا پتا بدلتا رہتا ہے۔نوجوان نے ہمیں اپنا پتا بتادیا اور باقاعدگی سے ہر ماہ صوفی صاحب کو رقم بھیجتے رہے۔ ہم ایک بار انتظار حسین صاحب سے ملاقات میں صوفی صاحب کا ذکر آیا تو وہ بولے ''یار آفاقی۔ ہمیں تصدیق تو کرنی چاہیئے کہ یہ رقم واقعی صوفی صاحب کو ملتی بھی ہے یا نہیں؟''

ہم نے کہا''انتظار صاحب' اللہ بہتر جانتا ہے۔انہیں جاکر تلاش کرنا بھی ایک مرحلہ ہے۔ وہ نوجوان دیکھنے میں تو ایماندار اور مخلص لگتا ہے۔''

کچھ وقت اور گزر گیا۔ایک دن ہمیں ناموس سی تحریر میں ایک لفافہ موصول ہوا۔ کھول کو پڑھا تو ٹوٹے پھوٹے حروف میں چند سطور لکھی تھیں۔ یہ خط اسی نوجوان کی جانب سے تھا۔اس نے اطلاع دی کہ صوفی صاحب عطر والے کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپ کو یاد کر رہے تھے۔

اللہ صوفی صاحب کو غریقِ رحمت کرے۔ ہم نے چند مختصر لمحات کے سوا کبھی انہیں آزردہ نہیں دیکھا۔ جب ذرا رنجیدہ ہونے لگتے تو فوراً داغ یا ذوق کا ذکر چھیڑ دیا کرتے تھے اور وہ ان کے اشعار میں کھو جاتے تھے۔ قدیم شعراء کے کلام کے وہ حافظ تھے۔انہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر گلستاں' بوستاں' فسانہ عجائب' فسانہ آزاد اور طلسم ہوشربا جیسی کتابیں نہ صرف پڑھ چکے تھے بلکہ ان کے اقتباسات بھی سنایا کرتے تھے۔ان کی وفات کے بعد انتظار حسین صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ صوفی صاحب کے انتقال کی خبر انہیں بھی خط کے ذریعے موصول ہو گئی تھی۔ بہت دیر تک ہم مرحوم کی باتیں کرتے رہے۔ وہ ایک ہنر منداور کاریگر آدمی تھے۔ عطر بنانے میں مہارت رکھتے تھے۔ مگر نئے زمانے کی پرفیومز کا ریلا آیا تو نہ ان کے عطر رہے' نہ صوفی صاحب' رہے نام اللہ کا۔

منیر نیازی کے ذکر سے صوفی صاحب کے تذکرے پر پہنچ گئے۔انسان کے خیالات پر کسی کا پہرا نہیں ہو سکتا اور ان کی رسائی فلک تک ہوتی ہے۔ نہ کوئی روک ٹوک نہ فاصلے کی دقت۔ایک لمحے میں اشہبِ خیال یورپ سے افریقہ اور

جاپان سے امریکا جا پہنچتا ہے۔ یہ اللہ کی ایک ایسی نعمت ہے جس پر کوئی حکومت نہ تو پابندی لگا سکتی ہے اور نہ کوئی ٹیکس عائد کر سکتی ہے۔ جن لوگوں کی زندگی میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ خیال آرائی کے طفیل وہ کچھ اچھا وقت گزار لیتے ہیں۔ اللہ کی کن کن نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے؟

خیر باتیں ہو رہی تھیں منیر نیازی کی، ہم نے ان میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں دیکھی تھی۔ سوائے عمر کے۔ بال سفید ہو گئے تھے مگر چہرہ ویسا ہی سرخ و سفید تھا۔ باتوں میں بھی وہی کاٹ اور طنطنہ تھا۔ خیال کی پرواز میں بھی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی تھی حالانکہ صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ چند سال پہلے ان کی بیگم وفات پا گئیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ منیر نیازی نے دوسری شادی کر لی۔ ایک تنہا شخص توجہ اور دیکھ بھال کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ نہ کرتا تو کیا کرتا؟

اب ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ ہماری ''فیملی میگزین'' کی ٹیم منیر نیازی صاحب کی بیگم سے انٹرویو لینے گئی تو نیازی صاحب بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ انٹرویو کا عنوان تھا ''بیگم کی زبانی'' بڑے لوگوں کی بیگمات کا اپنے معروف شوہروں کے بارے میں کیا خیال ہے اور بطور شوہر وہ کیسے ہیں؟ اس فیچر کا یہی لب لباب ہے۔ بیگم نے منیر نیازی کی گھریلو زندگی کے بہت سے دلچسپ پہلو بیان کئے۔ پھر ایک دلچسپ بات بھی سنائی۔ کہنے لگیں کہ مجھ سے شادی کے بعد منیر نیازی صاحب نے گھر میں بہت سی چیزیں تبدیل کر دیں۔ صوفہ' کرسیاں' پردے' قالین' ان کے کہنے پر پبلشر نے سبھی کچھ مہیا کر دیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ ہر چیز سیکنڈ ہینڈ ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے نیازی صاحب سے کہا'' کیا میری قسمت میں سب سیکنڈ ہینڈ چیزیں ہی لکھی ہیں؟''

نیازی صاحب نے فوراً اپنے پبلشر کو فون کیا اور کہا کہ فوراً یہ سامان بدل کر نیا سامان فراہم کیجئے۔

نیازی صاحب کی پہلی بیگم سے تو ہمیں شرف ملاقات حاصل نہیں ہوا تھا۔ مگر ان دونوں کی گھریلو زندگی بے حد خوشگوار تھی مگر اولاد سے محروم ہے۔

چند سال پہلے ہم اپنی بیگم کے ہمراہ نیازی صاحب کے گھر گئے تو انہوں نے بڑے شوق اور اہتمام سے اپنا مختصر سا باغیچہ اور لائبریری دکھائی۔ نئی بیگم نے چائے پانی سے تواضع کی۔ وہ ایک سیدھی سادی خاتون ہیں۔ شعر فہم تو نہیں ہیں مگر

شاعر کو سمجھتی ہیں۔ وہ فکر سخن یا تحریری کاموں میں مصروف ہوتے تو مطلق ڈسٹرب نہیں کرتیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں سنتی ہوں کہ نیازی صاحب بہت بڑے اور مشہور شاعر ہیں۔ لاکھوں لوگ ان کے مدّاح ہیں۔ مجھے ایک نامور اور بڑے شخص کی بیوی ہونے پر فخر ہے۔ مگر میرے لئے تو وہ صرف ایک بہت اچھے مہربان اور عظیم شوہر ہیں۔ نیازی صاحب اولاد سے محروم رہے۔ مگر شاعری کی درجنوں کتابیں ہی ان کی اولاد کا درجہ رکھتی ہیں۔

یہ داستان محض یادوں کے سہارے لکھی جارہی ہے اسلئے غلطیوں اور بھول جانے کا امکان بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ فلم ''سزا'' کے تذکرے میں ہم نے مال روڈ کے پان فروش کا ذکر کیا تھا۔ بے خیالی میں ان کا نام بندو خاں لکھ گئے حالانکہ جب سے ہم لاہور آئے ہیں' اسی پان کی دکان سے ہمارا واسطہ پڑا ہے۔ اب تو سالہا سال سے وہاں سے کچھ نہیں خریدا لیکن اس کے سامنے سے اکثر گزر ہوتا رہتا ہے۔ ان صاحب کا نام مولا بخش تھا اور ان کی شہرت چار دانگ عالم میں تھی۔ آج بھی لاہور کے رہنے والوں کے علاوہ جو کوئی لاہور آتا اس شہر کی دیگر یادگاروں کے ساتھ ساتھ انہیں مولا بخش کی دکان پر لے جا کر پان ضرور کھلایا جاتا ہے۔ آج بھی ہر وقت اس دکان کے سامنے کاروں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ مولا بخش کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے بیٹے اب یہ دکان سنبھالتے ہیں اور بہت خوش بھی ہیں۔ سنا ہے کہ اس دکان کی بدولت وہ صاحب جائیداد بھی ہیں اور دوسرے کاروبار بھی کرتے ہیں۔ جس زمانے میں ہمارا مولا بخش کی دکان سے پہلے پہل تعارف ہوا تھا تو وہاں کاروں کا گزر بہت کم تھا۔ کاریں شہر میں تھیں ہی کتنی۔ البتہ سائیکل سوار' تانگے سوار اور پیدل حضرات کا یہاں ہر وقت جمگھٹا رہتا تھا۔ یہ دکان دراصل مال روڈ اور لارنس روڈ کے اتصال پر ہے۔ یوں سمجھئے کہ لارنس روڈ' مال روڈ اور ٹمپل روڈ (اب حمید نظامی روڈ) جہاں ملتی ہیں اس تکون پر مولا بخش کی دکان واقع ہے۔ اب یہاں نئی عمارتیں اور پلازا بھی تعمیر ہو چکے ہیں مگر مولا بخش کی دکان اپنی جگہ بدستور موجود ہے۔ کسی زمانے میں یہاں بس سٹاپ تھا۔ آج جہاں فیصل مسجد ہے وہاں گھاس کا تختہ ہوا کرتا تھا۔ بس کے انتظار میں لوگ یہاں کھڑے رہتے تھے۔ تانگے والے بھی منڈلاتے رہتے تھے۔ یہاں سگریٹ اور پان خریدنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔

''سزا'' کا احوال پڑھنے کے بعد کئی حضرات نے اس غلطی کی طرف ہماری توجہ دلائی۔ ملتان سے ایک نوجوان خاص طور پر لاہور آئے اور بندو پان فروش کی دکان تلاش کرتے رہے۔ پھر انہوں نے گھر آکر ہمیں بتایا کہ صاحب وہاں تو

بندو نامی کسی پان فروش کی دکان نہیں ہے۔ ہم نے معذرت کی اور تصحیح کر دی۔

اداکارہ روزینہ کے بارے میں ہم نے لکھا تھا' کافی عرصے سے ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ ایک مہربان خاص طور پر ہم سے ملنے کیلئے لاہور آئے اور ہمیں روزینہ کے بارے میں خاصی افسردہ کرنے والی خبریں سنائیں۔ انہوں نے بتایا کہ روزینہ نے اداکاری ترک کر دی تھی اور ساؤنڈ ریکارڈسٹ رفعت قریشی سے شادی کر لی تھی۔ رفعت قریشی صاحب کے مالی حالات خراب ہو گئے تھے۔ پھر ایک طویل بیماری کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان دونوں کی اولاد میں ایک بیٹی ہے جس کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اسلام آباد یا راولپنڈی میں رہتی ہے۔ روبینہ بدستور کراچی میں مقیم ہیں لیکن خاصے ناگفتہ بہ حالات ہیں۔ ان ہی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ سندھی مسلم سوسائٹی والے جس فلیٹ میں ہم نے روزینہ سے فلم سائن کرنے کیلئے ملاقات کی تھی 'روزینہ کی ممّی نے وہ فلیٹ فروخت کر دیا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق ممّی 'روزینہ کی حقیقی والدہ نہیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ روزینہ کو اپنی کمائی میں سے کچھ بھی نہ ملا یہاں تک کہ فلیٹ کی فروخت سے بھی انہیں کچھ نہ دیا گیا۔

یہ بات کہ ممّی روزینہ کی حقیقی والدہ نہیں ہیں ہم نے بھی سنی تھی مگر کبھی تصدیق نہیں کی۔ ان صاحب نے بتایا کہ اب روزینہ گمنامی اور بے سروسامانی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

اس تحریر کے کچھ عرصے بعد ایک دن ہمیں دفتر میں ایک ٹیلی فون موصول ہوا۔ آواز زنانہ تھی۔ انہوں نے کہا "پہچانیئے میں کون ہوں؟"۔

ہم نے کہا "آواز تو سنی ہوئی لگتی ہے لیکن یاد نہیں"۔

انہوں نے بتایا کہ وہ روزینہ ہیں۔ بہت خوشی ہوئی۔ کچھ دیر تک ایک دوسرے کے بارے میں معلومات کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ان کی ہنسی میں وہی پرانی کھنک تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک اخبار میں کام کرتی ہیں۔ فون نمبر بھی بتایا تھا جو ہم سے گم ہو گیا۔ ان کی صاحبزادی پچھلے دنوں (2007ء) میں ٹی وی ڈراموں میں کام کرتی نظر آئیں۔ اسکے بعد ان سے رابطہ نہ ہو سکا۔ لیکن ان کے فون سے بے شمار پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔

پاکستان کی فلمی صنعت میں تعلیم یافتہ لوگوں کی ہمیشہ کمی رہی ہے لیکن یہ حال بھی نہ تھا جو آج دیکھنے میں آرہا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کا فلمی صنعت میں داخلہ ہی ممنوع کر دیا گیا ہے۔ابتدائی دور میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ فلمی دنیا میں زیادہ نہیں تھے لیکن پھر بھی ہر شعبے میں تعلیم یافتہ' ذہین اور باشعور لوگ پائے جاتے تھے۔ایسے عالم فاضل بھی تھے جنہیں مختلف علوم پر دسترس حاصل تھی۔یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بعض لوگ فلمی صنعت میں کامیاب نہ ہوسکے۔اس کے اسباب مختلف ہیں اور ایسے پڑھے لکھے ہنر مند لوگوں کا تذکرہ آپ اس داستاں میں جگہ جگہ پڑھتے رہیں گے۔ منور ایچ قاسم صاحب کا ذکر ہم سیّد کمال کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔بہت معزز اور قابل خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فلمساز اور ہدایتکار تھے۔بہت اچھے ایڈیٹر بھی تھے مگر ان کا انداز فکر فلمی صنعت اور فلمسازی کیلئے موزوں نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی ذاتی' خاندانی خوبیوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود پاکستان کی فلمی صنعت کو فیض نہ پہنچا سکے۔ ہم نے ان کے ساتھ ایک فلم میں بطور مصنف کام کیا تھا جس کی روداد تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے۔افسوس کہ یہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی۔ منور ایچ قاسم صاحب نے بطور ہدایت کار اور فلم ساز کوئی ایک کامیابی بھی حاصل نہ کی۔ بعد میں وہ فلمسازی اور ہدایتکاری سے تائب ہو کر دوسرے کاروبار میں لگ گئے تھے اور بالآخر پاکستان سے ہجرت کر کے انگلستان چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ان کی صاحبزادی آغا حسن عابدی کی بیگم تھیں۔

آغا حسن عابدی نے بینکاری کے حوالے سے بڑی دھومیں مچائیں۔ قابل رشک کامیابیاں حاصل کیں اور ان کا قائم کردہ بنک بی سی سی آئی ایک زمانے میں عالمی معیار کا بنک تھا اور دنیا بھر میں اس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن پھر یہ فلک بوس ادارہ ریت کی دیوار کی طرح زمیں بوس ہوگیا اور دنیا بھر میں سکینڈل بن گیا۔ خیر وہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

ہم نے بطور صحافی فلمی دنیا سے تعارف حاصل کیا تو یہاں کچھ اور بھی نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات موجود تھے۔ان میں سے کچھ نے ناموری اور کامیابیاں حاصل کیں۔ کچھ ناکامی سے دوچار ہوئے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔ پاکستان کی فلمی صنعت میں اکثریت معقول حد تک تعلیم یافتہ لوگوں کی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ہنر مندوں کے ساتھ

کام کر کے اعلیٰ تجربہ حاصل کیا تھا اور انہیں کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں۔ پڑھے لکھے حضرات کو ایک تو اپنے تعلیم یافتہ ہونے پر ناز تھا اور وہ احساس برتری میں مبتلا تھے۔ دوسروں کو وہ خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے اور اپنے خیالات اور مفروضوں کو فلموں میں ٹھونسنے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا لیکن پھر بھی انہوں نے سبق حاصل نہ کیا یہاں تک کہ گمنامی کی دھند میں غائب ہو گئے۔ اس زمانے میں زیادہ تر تعلیم یافتہ حضرات ناکام ثابت ہوئے تھے جس کی وجہ سے کم اور بے پڑھے لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل گیا تھا۔ فلم والے عام طور پر کہا کرتے تھے کہ پڑھے لکھوں سے تو اللہ ہی بچائے۔ انہوں نے فلمی صنعت کو بھاری نقصان کے سوا کچھ نہیں دیا۔ کسی حد تک یہ بات درست بھی تھی۔ ان حضرات کی مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے تعلیم یافتہ لوگ نکو بن کر رہ گئے تھے اور کامیاب حضرات ان پر پھبتیاں کستے رہتے تھے۔ ادھر تعلیم یافتہ طبقے میں یہ رد عمل تھا کہ ہماری فلمی دنیا تو جاہلوں ہی کو راس آتی ہے۔ پڑھے لکھوں کی اس میں گنجائش نہیں ہے۔ حالانکہ یہ دونوں نظریے غلط اور خلاف حقیقت تھے۔ محض اعلیٰ تعلیم ناکافی ہے جب تک کہ متعلقہ کام کے بارے میں معلومات اور تجربہ حاصل نہ ہو۔ اسی طرح کم تعلیم یافتہ ہونا بھی فلمی دنیا میں کامیابی کی سند نہیں ہے۔ یہاں ان لوگوں کی کامیابی کا اوسط تعلیم یافتہ لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ بہر حال یہ مسئلہ ہر زمانے میں فلمی صنعت میں موجود رہا ہے اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، تعلیم یافتہ ہونا فلمی دنیا کیلئے ایک منفی علامت تصوّر کیا جاتا تھا۔

ابتدائی زمانے میں جو پڑھے لکھے حضرات تھے ان میں منور ایچ قاسم، افضل جہانگیر اور مرتضیٰ جیلانی سر فہرست تھے اور بد قسمتی دیکھئے کہ ان میں سے کسی نے کامیابی حاصل نہیں کی۔ یہ بھی نہیں ہے کہ انہوں نے بہت اعلیٰ درجے کی فلمیں بنائی تھیں جو عوام میں مقبول نہ ہو سکیں۔ ان کی فلمیں کسی بھی طبقے کو پسند نہ آئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سراسر بنانے والوں کا قصور تھا۔ لیکن ان گنت تعلیم یافتہ لوگ بھی اس صنعت سے وابستہ تھے۔ ڈبلیو زیڈ احمد، خورشید انور، مسعود پرویز، راشد مختار، اقبال شہزاد کے علاوہ بے شمار اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد مختلف شعبوں سے وابستہ رہے ہیں۔

مرتضیٰ جیلانی صاحب عربی میں ایم اے تھے۔ انتہائی معقول، شائستہ اور سمجھ دار آدمی تھے۔ باتیں بہت اچھی طرح کرتے تھے اور اپنی قابلیت سے کم از کم ان پڑھوں کو بہت زیادہ مرعوب کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اس زمانے

میں ناکامی کے باوجود کئی فلمیں بنانے کا موقع ملا۔ اچھے سرمایہ کار اور فلمساز ان کے حصے میں آئے۔ انہوں نے زیادہ سرمائے سے فلمیں بنائیں پھر بھی ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ وہ آج کل زرعی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔

افضل جہانگیر صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ رہا۔ وہ بھی بہت نستعلیق آدمی تھے۔ ہم نے انہیں جاڑوں میں ہمیشہ شیروانی پہنے دیکھا جس کے بٹن نیچے سے اوپر تک بند ہوتے تھے۔ کُھلے پائنچوں کا پاجامہ یا علی گڑھ پاجامہ پہنتے تھے۔ گرمیوں میں پتلون قمیض پہنا کرتے تھے۔ کم گو تھے۔ انہیں بھی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ افضل جہانگیر صاحب نے فلم ''بت تراش'' بنائی تھی جس میں منورما اور پران مرکزی کردار تھے۔ جی ہاں مشہور انڈین ویلن پران پاکستان بننے کے بعد ابتدائی زمانے میں لاہور ہی میں موجود تھے۔ ان کی دوسری فلم ''شرارے'' تھی جس میں راگنی' ہمالیہ والا' ایس گل اور صبیحہ خانم نے کام کیا تھا۔ اس فلم کی ہیروئن صبیحہ تھیں۔ یہ بھی ناکام ہوگئی تھی۔

خادم محی الدین صاحب نے پاکستان آکر پہلی فلم ''شعلہ'' بنائی تھی۔ جس میں انڈیا سے آئے ہوئے ہیرو مسعود' ارشاد اور آشا پوسلے نے کام کیا تھا۔ ارشاد سے آپ کسی اور خیال میں نہ رہیئے گا۔ یہ ایک اداکارہ تھیں اور چند ابتدائی فلموں میں انہوں نے ہیروئن کے طور پر بھی کام کیا تھا۔ افضل جہانگیر صاحب کی فلم ''بت تراش'' میں منورما کے ساتھ ارشاد نے بھی ایک اہم کردار کیا تھا۔ منورما ایک شوخ وشنگ اداکارہ تھیں۔ قیام پاکستان سے قبل بھی لاہور کی فلموں میں انہوں نے کام کیا تھا اور چلبلے کرداروں کیلئے پسند کی جاتی تھیں۔

خادم محی الدین صاحب کی دوسری فلم ''آواز'' تھی جس میں گلشن آرا' سنتوش کمار' شاہنواز اور مجید صاحب نے کام کیا تھا۔ مجید صاحب بمبئی میں بھی کریکٹر ایکٹر کے طور پر کام کرتے رہے اور پاکستان کی چند فلموں میں بھی انہوں نے کام کیا۔ بھاری جسم' بڑی بڑی آنکھوں اور دلکش نقوش کی وجہ سے بہت بارعب اور بھلے لگتے تھے۔ ان کی آواز قدرے بیٹھی ہوئی تھی مگر پھر یہی ان کی ایک خصوصیت بن گئی۔ کافی عرصہ قبل ان کا کراچی میں انتقال ہوگیا۔

خادم محی الدین کی دونوں فلمیں ناکام رہیں مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ پاکستان میں ان کی تیسری فلم ''خزاں کے بعد'' تھی جو ان کی آخری فلم ثابت ہوئی۔ شمیؔ' سدھیر' آشا پوسلے اور علاؤالدین نے اس میں کام کیا تھا۔

خادم صاحب انتہائی خلیق' شریف النفس اور مرنجان مرنج آدمی تھے۔ کہانی اور سکرین پلے بہت اچھا لکھتے ہیں۔

عرصہ دراز تک اعجاز درانی کے ادارے سے وابستہ رہے۔ اردو انگریزی دونوں زبانوں پر انہیں عبور حاصل ہے۔

مرتضیٰ جیلانی صاحب نے آغوش' تیرے بغیر اور نذرانہ بنائیں مگر کوئی ایک بھی کامیاب نہ ہوئی۔ یہ تینوں حضرات نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے ہنر مند تھے۔ ان کی فلموں کی ناکامی کا سبب ہمارے نزدیک یہ تھا کہ ان کی عقل و دانش اور عام لوگوں کے ذوق کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ تھا۔ اگر یہ عوام کی ضروریات کو سمجھ کر ان کی ذہنی سطح کے مطابق تفریحی فلمیں بنانے کی کوشش کرتے تو ایک مشترکہ راہ تلاش کی جاسکتی تھی۔ مگر انہوں نے عوام کو کم علم اور بد ذوق تصوّر کر کے انہیں اپنی ذہنی سطح کے مطابق فلمیں دیکھنے پر مجبور کیا۔ ظاہر ہے کہ کمرشل فلموں میں اس زور اور زبردستی کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ کمرشل فلم تو عام لوگوں میں قبول عام حاصل کر کے ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ جب تک ان کے ذوق اور ذہنی معیار کو پیش نظر نہ رکھا جائے کوئی فلم کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ ناکام یا فلاپ اسی فلم کو کہا جاتا ہے جسے عام فلم بین پسند نہیں کرتے۔ ان کی پسند کو خاطر میں نہ لا کر جو فلم بنائی جائے گی وہ بھلا کامیاب کیسے ہو گی؟ اور اگر کامیاب نہیں ہو گی تو فلم ساز آئندہ فلم کیسے بنائے گا؟

دنیا بھر میں اور خود برّصغیر میں بہت سے تعلیم یافتہ' ذہین اور باشعور لوگوں نے عوام کی ضرورت اور اپنے اعلیٰ ذوق کے مابین اشتراک کی راہ نکال لی اور بہت اچھی اور معیاری فلمیں بنائیں جنہیں ہر طبقے کے فلم بینوں نے پسند کیا۔ یہی وہ طریقہ ہے جو کسی بھی فلم کو معیاری اور کامیاب ہونے کی سند دے سکتا تھا۔

1950ء کی دہائی میں ایک اداکار انور بیگ بھی تھے۔ بہت پڑھے لکھے اور ذہین آدمی تھے۔ مگر نہ اداکاری کے میدان میں کامیاب ہوئے اور نہ ہدایت کاری میں کوئی مقام حاصل کیا۔ انہوں نے بھی ایک فلم ''بے گناہ'' بنائی تھی جس میں وہ خود ہیرو اور نیّر سلطانہ ہیروئن تھیں۔ یہ فلم ناکام ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی انور بیگ بھی فلمی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اس زمانے میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ تقسیم کار اسماعیل نور صاحب بھی تھے۔ بہت پڑھے لکھے اور ذہین آدمی تھے۔ وہ دراصل اے آر کاردار صاحب کے بہنوئی تھے اور لاہور میں رہتے تھے۔ ہندوستان سے کاردار صاحب کی جو فلمیں پاکستان میں درآمد ہوتی تھیں وہ سب اسماعیل نور صاحب ہی ریلیز کرتے تھے۔ اس ادارے کا نام بھی کاردار پکچرز تھا۔

اسماعیل نور ایک روشن خیال اور فہمیدہ آدمی تھے۔ رکھ رکھاؤ' لباس 'شخصیت ہر اعتبار سے متاثر کن تھے۔ اے آر کاردار کی تمام ہٹ فلمیں ان ہی کے تقسیم کار آفس سے ریلیز ہوتی تھیں اسلئے پیسے کی بھی فراوانی تھی۔ اس وقت ان کا شمار پاکستان کے ممتاز ترین تقسیم کاروں میں ہوتا تھا۔ بیرونی ملکوں کے دوروں پر بھیجے جانے والے فلمی وفود میں وہ لازماً شامل ہوتے تھے۔ کئی بار انہوں نے فلمی وفد کی قیادت بھی کی۔ جب مصنف و ہدایتکار نذیر اجمیری صاحب بمبئی سے پاکستان آئے تو اسماعیل نور صاحب نے ان سے ایک فلم ''قسمت'' بنوائی تھی جس میں مرکزی کردار صبیحہ' سنتوش اور ایم اسماعیل صاحب نے سرانجام دیئے تھے۔ اس کی موسیقی فیروز نظامی نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم بہت کامیاب رہی تھی۔ کاردار صاحب کی درآمد شدہ فلموں سے بھی کروڑوں کی آمدنی تھی۔ کاردار صاحب کا پروگرام یہ تھا کہ پاکستان میں جمع شدہ اس پیسے کو یہیں فلم سازی اور دوسرے کاموں پر صرف کریں گے مگر اسماعیل نور صاحب نے انہیں ایک پیسہ بھی نہ دیا جس کی وجہ سے کاردار صاحب کی مالی پریشانیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ کافی عرصہ قبل اسماعیل نور صاحب فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ قبل ان کے انتقال کی خبر آئی تو بہت سے نووارد فلم والے تو ان کے نام سے واقف نہ تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے سالہا سال پاکستان کی فلمی صنعت اور تجارت پر حکمرانی کی تھی۔ ان کا دفتر بہت شاندار تھا۔ آرام دہ کرسیوں پر مخمل لگی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی خوش پوش اور بہت خوش گفتار آدمی تھے۔ انگریزی بہت اچھی بولتے اور لکھتے تھے اسی لئے فلمی برادری کی نمائندگی میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔ انہوں نے کاردار صاحب کی فلموں سے بے شمار دولت کمائی لیکن افسوس کہ وہ کاردار صاحب کے کام نہ آئی۔

اے آر کاردار برصغیر کے نام ور اور بے حد کامیاب فلم ساز و ہدایتکار تھے۔ انہوں نے فلمی زندگی کا آغاز لاہور سے کیا تھا۔ لاہور میں دریائے راوی کے کنارے پہلا فلم سٹوڈیو بھی انہوں نے ہی ایم اسماعیل صاحب کے تعاون سے قائم کیا تھا۔ ایم اسماعیل ان کے بچپن کے دوست اور پینٹر تھے۔ بعد میں بہت اچھے اداکار بھی بنے۔ کاردار صاحب لاہور سے کلکتہ جا کر پنجابی فلمیں بنانے لگے۔ لاہور میں پہلی بولتی ہوئی پنجابی فلم بنانے کا اعزاز بھی کاردار صاحب ہی کو حاصل ہے۔ کلکتہ میں بھی کاردار صاحب کی فلموں کو کامیابی حاصل نہ ہوئی تو وہ بمبئی چلے گئے جہاں کامیابیاں اور کامرانیاں ان کے قدم چومنے کی منتظر تھیں۔ ایک زمانے میں وہ انڈیا کے عظیم ترین فلم سازوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ فلم

سازوہدایت کار محبوب خاں کے ہم زلف بھی تھے۔ سرداراختر اور بہاراختر دو بہنیں تھیں۔ سرداراختر نے محبوب صاحب کی فلموں میں ہیروئن کا کردار بھی ادا کیا تھا۔ بعد میں وہ محبوب صاحب کی بیگم بن گئیں۔ ان کی بہن بہاراختر کی کاردار صاحب سے شادی ہوگئی۔ اس طرح یہ دونوں ہم زلف عرصہ دراز تک بمبئی کی فلمی صنعت کے روح رواں رہے اوران کی بیگمات نے بھی شہزادیوں جیسی زندگی بسر کی۔ لیکن سرداراختراور بہاراختر دونوں ہی بے اولاد تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ محبوب صاحب اور کاردار صاحب کی پہلی بیویوں کی اولاد نے ان کی جانشینی سنبھالی۔

اے آر کاردار کی وجہ سے یہ خاندان برّصغیر میں کافی نمایاں ہوگیا تھا۔ کاردار صاحب کے والد لاہور کے رہنے والے تھے اوران کی تین بیگمات تھیں۔ ایک بیوی کی اولاد میں سے اے آر کاردار کی ایک بیٹی تھیں جو فلم سازوہدایت کار اشفاق ملک کی والدہ تھیں۔ اس طرح اشفاق ملک 'اے آر کاردار کے نواسے تھے۔ دوسری بیگم کی اولاد میں اکرم کاردار تھے۔ جوان دنوں فلمی حلقوں میں خوب جانے پہچانے جاتے تھے۔ تیسری بیگم کی اولاد میں سے بیٹا نصرت کاردار اور دوبیٹیاں تھیں۔ ان میں سے ایک بیٹی سے اسماعیل نور صاحب کی شادی ہوئی تھی۔ اے جے کاردار جنہوں نے ''جاگو ہوا سویرا'' بناکر عالمی شہرت حاصل کی تھی' کاردار صاحب کے بھانجے تھے۔ اب یہ خاندان فلمی دنیا سے غائب ہوچکا ہے۔ کسی زمانے میں ہندوستان اور پاکستان میں ان کا طوطی بولتا تھا۔

نصرت کاردار تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔ بہت خوش مذاق اور شائستہ آدمی تھے۔ بمبئی گئے تو اے آر کاردار نے انہیں اپنی فلم ''درد'' میں ہیرو بنایا۔ کاردار صاحب کی اُس زمانے میں سبھی فلمیں ہٹ ہو جاتی تھیں۔ ''درد'' سپرہٹ فلم تھی مگر نصرت کاردار کو فلم بینوں نے پسند نہیں کیا اور وہ لاہور چلے آئے۔ یہاں آکر بھی انہوں نے کئی فلموں میں ویلن اور دوسرے سائیڈ کیریکٹر کئے مگر مقبول نہ ہوسکے۔ یوں تو وہ بہت زندہ دل اور باتونی تھے مگر کیمرے کے سامنے پہنچ کر لکڑی کے مجسمے کی طرح بن جاتے تھے۔ یعنی اکڑے ہوئے اور ہر طرح کے تاثر سے عاری۔ کرکٹ کے بہت اچھے کھلاڑی تھے اور فلم کرکٹ ٹیم میں انہیں ہمیشہ نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ ہم سے بھی ان کی خاصی یاداللہ اور بے تکلفی رہی۔ خوش لباس اور خوش بیان تھے۔ جس محفل میں پہنچ جاتے اس میں جان ڈال دیا کرتے تھے مگر افسوس کہ اداکار کے طور پر کامیاب نہ ہوسکے۔ انہیں زمانے اور پاکستان کی فلمی صنعت سے بہت شکوہ رہا کہ انہوں نے نصرت کاردار کی

قدر نہیں کی۔ ہم سے کہا کرتے تھے کہ آفاقی' تم دیکھ لینا۔ اچھا رول مل گیا تو ایک دن میں بہت بڑا ہیرو بن جاؤں گا۔
ہم نے کہا ''نصرت بھائی۔ وہ دن کب آئے گا۔ جوانی ڈھل چکی' ہیرو کیسے بنیں گے؟''
بولے '' جاہلوں جیسی باتیں مت کرو۔ ہالی وڈ کی فلموں میں نہیں دیکھتے کہ بڑی عمر کے اداکاروں ہی کو فوقیت حاصل ہے۔ وہ پچاس پچپن کی عمر میں بھی مقبول ہیرو ہیں۔''
ہم نے کہا ''مگر وہ بڑھاپے میں تو مقبول نہیں ہوئے ہیں۔ وہ تو ابتدا ہی سے مقبول ہیں۔''
ہنس کر کہنے لگے ''میں ایک نیا ریکارڈ قائم کروں گا۔''
بہت سمجھ دار آدمی تھے مگر اس معاملے میں انہیں واقعی یقین تھا کہ ایک روز وہ بہت مقبول ہیرو بن جائیں گے۔ ان کے بارے میں بھی فلمی دنیا میں ان کے دوستوں نے یہ لطیفہ بنایا تھا کہ نصرت کاردار بھی عجیب ہیں۔ اگر ساکت تصویر بنائی جائے تو حرکت کرنے لگتے ہیں اور مووی فلم کے کیمرے کے سامنے ساکت ہو جاتے ہیں۔
آغا سلیم رضا نے ایک بار ان سے کہا ''نصرت۔ میری مانو تو تم کیمرے بدل لو۔''
''کیا مطلب؟'' انہوں نے پوچھا۔
''مطلب یہ کہ مووی کیمرے سے سٹل تصویر بنوایا کرو اور سٹل کیمرے مووی کیلئے استعمال کیا کرو۔''
یوں تو ہمایوں مرزا بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ فلم ساز و ہدایت کار تھے۔ انہوں نے آرکیٹیکچر کی ڈگری حاصل کی اور پھر شوق انہیں فلمی کوچے میں لے آیا۔ انہوں نے فلم سازی کا آغاز کراچی سے کیا تھا اور ان کی پہلی فلم ''انتخاب'' تھی۔ اس فلم میں انہوں نے نیّر سلطانہ کو پہلی بار متعارف کرایا تھا۔ یہ ایک بہت بڑے سرمایہ دار ادارے کی فلم تھی۔ حسین بیگ محمد اس وقت کراچی کے عمارتیں تعمیر کرنے والوں میں سر فہرست تھے۔ فہمیدہ اور پڑھے لکھے آدمی تھے مگر فلم سازی میں مار کھا گئے۔ ہمایوں مرزا نے بعد میں اس ناکامی کی تلافی کر دی اور ''راز'' ''ڈاکو کی لڑکی'' اور ''آگ کا دریا'' جیسی عمدہ اور کامیاب فلمیں بنائی تھیں۔
لاہور میں اس زمانے میں بڑے بڑے ہنرمند' فن کار موجود تھے اور ان میں ہر ایک مخصوص خوبیوں کا حامل تھا۔ ایسے ہی ایک بزرگ اختر نواز بھی تھے۔ اختر نواز صاحب کو ہم نے پہلی بار نشاط سینما کے منیجر کی حیثیت میں دیکھا تھا۔

سرخ و سفید رنگت‘ دراز قد‘ متناسب جسم‘ بڑی بڑی آنکھیں۔ان کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز ان کی ناک تھی۔

ہم نے ایک دوست سے تذکرہ کیا تو بولے ”ہونی بھی چاہئے۔تم کو معلوم نہیں کہ اختر نواز صاحب بڑی اونچی ناک والے ہیں۔“

بعد میں ان کے بارے میں تفصیلات کا علم ہوا تو اس دوست کے تبصرے کی صداقت پر حرف بحرف ایمان لانا پڑا۔ ایک تو ہوتے ہیں حسّاس لوگ لیکن اختر نواز صاحب حد سے زیادہ حسّاس اور غیرت مند تھے۔اردو محاورے کے مطابق وہ واقعی ناک پر مکھّی تک نہیں بیٹھنے دیتے تھے حالانکہ کافی بڑی ناک تھی۔ایک آدھ مکھّی کے بیٹھنے سے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

اختر نواز صاحب خوش لباس اور جامہ زیب آدمی تھے۔گرمیوں میں ان کا لباس سفید پتلون اور قمیض یا سفید قمیض شلوار تھا۔سردیوں میں سوٹ بوٹ میں نظر آتے تھے۔ٹائی بہت کم استعمال کرتے تھے۔لاہور کے کسی اچھے سینما کا منیجر ہونا اس زمانے میں بڑے افتخار کی بات تھی اور شہر کے بڑے بڑے لوگوں اور اعلیٰ افسروں تک سینما منیجر کی رسائی ہوتی تھی۔اختر نواز صاحب یوں تو خالص اور ”انتہائی“ پٹھان آدمی تھے لیکن حسنِ اخلاق اور آؤ بھگت کے معاملے میں لکھنؤ والے لگتے تھے۔اردو کھڑی بولتے تھے۔انگریزی پر انہیں عبور حاصل تھا۔ہم تو انہیں ایک خوش اخلاق اور خوش پوش سینما منیجر ہی سمجھتے تھے مگر رفتہ رفتہ جب ان کی شخصیت ہم پر کھلی تو ہم ان کے معتقد ہو گئے۔بعد میں بھی ان سے اکثر واسطہ پڑتا رہا۔وہ ہمارے گہرے‘ بے تکلف ‘دوست‘ فلم ساز و ہدایت کار ثنااللہ گنڈاپور کے خُسر بن گئے تھے۔

ثنااللہ گنڈاپور ابتدا میں ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کے اسسٹنٹ تھے اور وہیں ہماری ان سے یاد اللہ اور پھر دوستی ہوئی تھی۔ وہ بھی خالص پٹھان ہیں۔اونچے‘ گورے چِٹّے‘ بے تکلف اور پٹھانوں کی طرح مخلص مگر انتہا سے زیادہ حسّاس‘ مکھّی وہ بھی اپنی ناک پر نہیں بیٹھنے دیتے اور اس معاملے میں اپنے خُسر (اب وہ مرحوم ہو چکے ہیں (کے نقشِ قدم پر چلنے

والے ہیں۔ ثنااللہ خاں نے فلموں کی ہدایت کاری بھی کی اور پھر نیف ڈیک کا ادارہ وجود میں آیا تو اس سے وابستہ ہو گئے۔ وہ لاہور آفس کے انچارج تھے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ہماری چھوٹی بیٹی پارو بچپن ہی سے ثنااللہ خاں گنڈاپور سے متعارف رہی مگر وہ ان کا نام اور شناخت یاد نہیں رکھ سکتی۔ اگر ان کا فون آئے یا کہیں ملاقات ہو تو پارو ہمیں اس طرح اطلاع دیتی ہے ''پاپا! وہ آپ کے دوست کا فون آیا تھا۔''

''کون سے دوست؟''

''وہی جو گورے اور لمبے ہیں۔ باتیں بہت کرتے ہیں۔''

''یہ کیا پہچان ہوئی' نام بتاؤ نا۔''

''ان کا نام ہمیں یاد نہیں رہتا۔ وہی گنڈاسے والے۔''

اور ہم سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ثنااللہ گنڈاپور کا تذکرہ ہے۔

ان سے پہلے خُسر کا ذکر سن لیجئے۔

اختر نواز صاحب کے بارے میں جب ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ابتدائی زمانے کی بولتی فلموں کے ہیرو تھے تو ہم بہت مرعوب ہوئے۔ اب ذرا ان کے ٹھاٹ باٹ کا اندازہ لگایئے۔ 1931ء میں (یعنی ہماری پیدائش سے بھی پہلے) لاہور کے ایک فلم ساز حکیم رام پرشاد نے لاہور میں دو بولتی فلموں کا آغاز کیا تھا۔ ایک فلم کیلئے اختر نواز صاحب کو ہیرو کا کردار کرنے کیلئے بطور خاص بمبئی سے بلایا گیا۔ بولتی فلمیں اس زمانے میں عجوبہ ہی تھیں۔ بلکہ اس زمانے میں تو متحرک فلمیں ہی عجوبہ سمجھی جاتی تھیں۔ لوگ حیران ہوتے تھے کہ سامنے پردے پہ انسانوں کی تصویریں ناچ رہی ہیں' گا رہی ہیں۔ اس کے بعد جب بولتی فلموں کا زمانہ آیا تو دیکھنے والوں کے ہوش ہی اڑ گئے۔

لاہور میں حکیم رام پرشاد نے دو فلموں کا آغاز کیا تھا۔ ایک کا نام ''ہیر رانجھا'' تھا اور اس کے ہدایت کار اے آر کاردار تھے۔ کاردار صاحب کا تذکرہ اس سے پہلے بھی آ چکا ہے۔ حکیم رام پرشاد کی دوسری فلم کا نام ''گوپی چند'' تھا۔ اس فلم میں ہیرو کا کردار اختر نواز کو سونپا گیا تھا اور انہیں بطور خاص کام کرنے کیلئے بڑے اہتمام سے بمبئی سے بلایا گیا تھا کیونکہ وہ ایک بڑے اداکار تھے۔ گوپی چند میں اختر نواز صاحب کے ساتھ نرگس کی والدہ جدن بائی ہیروئن تھیں۔ اس سے

آپ اختر نواز صاحب کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔اس فلم میں اس زمانے کے ایک اور مقبول اداکار ڈاکٹر سونی بھی کام کر رہے تھے۔

اختر نواز بمبئی سے لاہور پہنچے تو ہر ایک کی نگاہ میں آ گئے۔ان کی چھب ہی نرالی تھی۔اس زمانے میں وہ کالی پتلون کے ساتھ سفید قمیض پہنتے تھے اور کالی بو لگاتے تھے جس کی وجہ سے دور ہی سے منفرد نظر آتے تھے۔یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور میں گنتی کی موٹر کاریں تھیں۔

پرانے لوگ بتاتے ہیں کہ اختر نواز کے پاس ایک ٹو سیٹر اوپن چھت کی گاڑی تھی۔جب وہ اس کھلی گاڑی میں سوار ہو کر مال روڈ سے گزرتے تو راستہ چلتے لوگ مڑ مڑ کر انہیں دیکھنے لگتے۔کچھ ایسا ہی منظر 1952-53ء میں ہم نے اسلم پرویز کا بھی دیکھا تھا۔وہ اپنی سرخ رنگ کی سپورٹس کار میں مال روڈ سے گزرتے تھے تو ہر نگاہ ان پر مرکوز ہو جاتی تھی۔

فلم ''گوپی چند'' کے زمانے کا ذکر ہے کہ اختر نواز صاحب تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے مال روڈ پر جا رہے تھے کہ جی پی او کے نزدیک ایک شخص ان کی کار کے نیچے آ گیا حالانکہ ان دنوں مال روڈ پر ٹریفک بھی خال خال ہی تھی۔مگر ہونی ہو کر رہی۔اختر نواز اس حادثے سے گھبرا گئے۔یہ بھی نہ دیکھا کہ زخمی کی حالت کیسی ہے۔اتنا جانتے تھے کہ انگریزوں کی حکومت ہے جو سختی سے قانون پر عمل درآمد کراتی ہے۔وہ اتنے گھبرائے کہ گرفتاری سے بچنے کے لئے فلم ادھوری چھوڑ کر اسی دن کلکتہ روانہ ہو گئے۔دستور کے مطابق انہیں وہاں بھی کسی سٹوڈیو سے وابستہ ہونا تھا چنانچہ بالی ووڈ سٹوڈیو میں ملازم ہو گئے۔سیٹھ رام کرنانی اس ادارے کے مالک تھے۔وہ سیاہ رنگ کے مریل سے گجراتی سیٹھ تھے مگر دولت مند اتنے کہ جھوٹ بھی بولتے تو سچ لگتا تھا۔ وہ اس وقت کے کروڑ پتی تھی اور ''فلمی کنگ'' کہے جاتے تھے۔کجّن بائی پر فریفتہ تھے مگر وہ انہیں جُل دے کر نکل جاتی تھی۔

کلکتہ کے ویکلی'' چونچ'' کے ایڈیٹر عنایت دہلوی بہت بااثر آدمی تھے۔فلمی دنیا میں ان کا سکہ چلتا تھا ان ہی دنوں وہ ایک نازک سی حسین و جمیل لڑکی کو لے کر سیٹھ کرنانی کے پاس گئے اور اسے فلموں میں کاسٹ کرنے کی سفارش کی۔ سیٹھ کرنانی کجن بائی پر مہربان تھے' وہ ان کی ملازم تھیں اور عموماً وہی ان کی فلموں میں ہیروئن ہوا کرتی تھیں مگر

عنایت دہلوی کی سفارش بھی بہت بھاری بھر کم تھی اور ٹالی نہ جاسکتی تھی اس لئے اس نوخیز حسینہ کو بھی سٹوڈیو میں ملازم رکھ لیا گیا۔ یہ لڑکی نسیم بانو تھی۔ مستقبل کی پری چہرہ فلمی ہیروئن اور دلیپ کمار کی بیگم سائرہ بانو کی والدہ۔ سب کا خیال تھا کہ یہ لڑکی اپنے حُسن کے بل بوتے پر بہت ترقی کرے گی۔

بالی ووڈ سٹوڈیو کی آئندہ فلم کا نام ''اللہ کی تلوار'' تھا۔ اس فلم میں نسیم بانو کو اختر نواز کے ساتھ ہیروئن کے طور پر کاسٹ کیا گیا۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی تو افواہیں بھی پھیلنے لگیں جو کہ شوبزنس کی زندگی کا ہمیشہ ایک لازمی حصہ رہی ہیں۔ سیٹھ کرنانی بذات خود تو کجن بائی سے عشق کرتے تھے اور اس کا شہرہ عام تھا مگر اپنے عملے کے معاملے میں بہت سخت گیر اور اصول پرست تھے۔ انہیں شکایت ملی کہ ان کی فلم کے ہیرو اختر نواز اور ہیروئن نسیم بانو ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اختر نواز اس قسم کے آدمی نہیں تھے مگر سیٹھ کرنانی کو فکر پڑ گئی۔ انہوں نے ایک دن اختر نواز صاحب کو اپنے دفتر بلایا اور باز پُرس کی۔ بجائے اس کے کہ وہ صفائی پیش کرتے اختر نواز ناراض ہو گئے اور کہا ''سیٹھ آپ نے میری توہین کی ہے' میں آپ کی فلم میں کام نہیں کروں گا۔''

یہ کہہ کر وہ سٹوڈیو سے رخصت ہو گئے۔ جب یہ خبر نسیم بانو کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے بھی احتجاجاً اس فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا اور نوکری کو لات مار کر بمبئی کا رخ کیا۔

سیٹھ کرنانی یہ گستاخی کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ بارسوخ آدمی تھے۔ انہوں نے کلکتہ کے تمام فلم سٹوڈیوز کے دروازے اختر نواز پر بند کرا دیئے اور یہ پیغام بھیجا کہ اگر تم معذرت کر کے واپس نہیں آؤ گے تو میں تمہیں کسی فلم میں کام نہیں کرنے دوں گا۔

اختر نواز کا پٹھانی خون جوش میں آ گیا۔ انہوں نے جواب کہلوایا۔ ''سیٹھ میں دودھ بیچ لوں گا مگر تمہاری نوکری نہیں کروں گا۔''

اختر نواز نے اپنا یہ قول سچا کر دکھایا۔ انہوں نے ایک بھینس خریدی اور اس کا دودھ بیچنا شروع کر دیا۔ طریقہ یہ تھا کہ وہ صبح صبح اٹھ کر نیکر اور بنیان پہن کر خود ہی بھینس کا دودھ دوہتے اور خود ہی فروخت کرنے بیٹھ جاتے۔ کلکتہ میں تو

اودھم مچ گیا۔ وہ ہیرو کے طور پر بہت اچھی طرح جانے جاتے تھے۔ جس نے بھی سنا کہ اختر نواز نے دودھ بیچنا شروع کر دیا ہے وہ حیران رہ گیا۔ اخبار والوں نے بھی حاشیہ آرائی کی۔ ویسے بھی جنگ کا زمانہ تھا۔ ہر چیز کی مانگ تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اختر نواز صاحب کا دھندہ چل نکلا۔ حوصلہ افزائی ہوئی تو انہوں نے چالیس بھینسیں خرید کر ملٹری کو دودھ سپلائی کرنا شروع کر دیا اور اچھا خاصا منافع کمایا۔ کوئی اور شخص ہوتا تو موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے کاروبار کو مزید فروغ دیتا مگر یہ اختر نواز تھے۔ دودھ فروشی ان کے مزاج کو راس نہیں آرہی تھی۔

ایک روز بل وصول کرنے کے لئے فوجی دفتر میں گئے تو وہاں ایک انگریز افسر آیا ہوا تھا۔ اختر نواز خود بھی دیکھنے میں انگریز ہی لگتے تھے۔ اس پر انگریزی بھی بہت اچھی بولتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ 1920ء میں انہوں نے گریجویشن کیا تھا اور انگریزی میں دسترس تھی۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فلمی صنعت کے ابتدائی دور میں فلموں سے وابستہ لوگ کتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ اس زمانے میں تو گھر میں یا مدرسے میں گلستان بوستان پڑھنا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ کوئی مڈل تک پڑھ لے تو تعلیم یافتہ کہلاتا تھا اور میٹرک پاس کرنا تو بہت بڑا کارنامہ خیال کیا جاتا تھا مگر اس زمانے میں بھی گریجوایٹ اس صنعت سے وابستہ تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

انگریز افسر نے اختر نواز کو دیکھا تو پہلے انہیں بھی انگریز ہی سمجھا۔ بول چال سے پتا چلا کہ انگریزی میں بھی خوب رواں ہیں۔ وہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ بات چیت کے دوران میں پوچھا کہ بھائی اتنے معقول اور تعلیم یافتہ ہو کر دودھ کیوں بیچ رہے ہو؟

اختر نواز نے اپنی داستان کہہ سنائی۔

انگریز اتنا متاثر ہوا کہ انہیں کلکتہ کے سب سے بڑے اور بہترین سینما ''میٹرو'' کا جنرل منیجر بنا دیا۔ یہ سینما وہ تھا جس میں صوبے کے وزیر اعلیٰ سے لے کر گورنر اور چیف سیکرٹری اور ان کے اہل خانہ بھی آیا کرتے تھے۔ یہ نوکری کیا تھی بادشاہت تھی' ہر بڑے آدمی سے واقفیت اور تعلقات۔ ہر ایک سے شناسائی 'کلکتہ کا کون سا قابل ذکر شخص تھا جس سے اختر نواز کی ملاقات اور دوستی نہ تھی۔ ان کا اخلاق اور طرز گفتگو بھی متاثر کن تھا۔ جو ایک بار ملتا تھا وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ اس پر ان کی پٹھان بیک گراؤنڈ بھی ایک اثاثہ تھی۔ غیوّر پٹھانوں کو سبھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے

یہاں تک کہ انگریز بھی دل سے ان کی عزت کرتے تھے۔

اختر نواز صاحب کے شب و روز بڑے ٹھاٹ سے گزر رہے تھے۔ مسلم لیگ کی تحریک کا آغاز ہوا تو انہوں نے بھی بساط بھر اس تحریک میں حصہ لیا۔ وہ کلکتہ میں قیام پذیر ضرور تھے مگر ان کا سارا خاندان پشاور میں تھا۔ ملازمت کے دوران میں گھر والوں و رشتے داروں سے ملنے کے لئے پشاور جاتے رہتے تھے۔

پاکستان کا قیام عمل میں آیا' تو اختر نواز کی رگ پٹھانی و مسلمانی و مسلم لیگی پھڑک اٹھی۔ انہوں نے فوراً پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس زمانے میں کلکتہ سے لاہور یا کراچی پہنچنا آسان نہ تھا۔ ٹکٹ ہی نہیں ملتے تھے۔ ٹرینوں میں لوگ سامان کی بوریوں کے مانند بھر کر سفر کرتے تھے اور جان و مال کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ مگر اختر نواز فیصلہ کر چکے تھے۔ انہوں نے بطور خاص ایک ہوائی جہاز چارٹر کیا اور کلکتہ سے لاہور پہنچ گئے۔ ان کے ٹھاٹ باٹ اور شاہانہ مزاج کا صرف اسی ایک واقعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اختر نواز صاحب کلکتہ سے لاہور پہنچے تو یہاں افراتفری کا عالم تھا۔ مہاجرین کے تباہ حال قافلے سر چھپانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ فلمی صنعت کا تو نام و نشان تک باقی نہیں رہا تھا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ پاکستان میں فلم سازی کا سلسلہ کب اور کیسے شروع ہو گا؟ مگر اختر نواز صاحب کو اللہ نے بہت باعزت اور معقول روزگار فراہم کرنے کا بندوبست کر دیا۔ ہوا یہ کہ امجد حسین صاحب بھی کلکتہ سے لاہور آ گئے۔ یہ وہاں نیو تھیٹرز جیسے ادارے کے ڈائریکٹر اور پارٹنر تھے۔ ان کی کلکتہ ہی سے اختر نواز صاحب کے ساتھ دوستی تھی۔ لاہور میں وہ نشاط سینما کے مالک تھے۔

انہوں نے اختر نواز صاحب کو اس سینما کا جنرل مینجر مقرر کر دیا۔ اختر نواز صاحب نے نشاط سنیما کا نظم و نسق ایسے سنبھالا کہ فلم بینوں کو تربیت دینے اور تہذیب سکھانے کے لئے ہاتھ میں ڈنڈا سنبھال کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ جب تک قطار سیدھی نہ بن جاتی' بکنگ کی کھڑکی سے ٹکٹوں کی فروخت شروع نہیں ہو سکتی تھی۔ اس ''زبردستی'' کی وجہ سے نشاط سنیما میں جانے والے لوگ قطار بنانے لگے اور نظم و نسق کے عادی ہو گئے۔

کچھ عرصے بعد کراچی میں صدر کے خوب صورت علاقے میں ریکس سینما تعمیر ہوا تو اختر نواز صاحب کو اس حسین ترین سینما کا جنرل مینجر مقرر کیا گیا۔ وہ اس سینما میں سیاہ و سفید کے مالک تھے اور بہت خوبی سے کاروبار چلا رہے تھے۔

اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کی وجہ سے اختر نواز صاحب نے اس ملازمت پر لات ماردی اور لاہور چلے آئے۔

اختر نواز صاحب کی عادت تھی کہ وہ بازار سے کھانا منگوا کر نہیں کھاتے تھے۔ اپنی چائے اور کھانا خود ہی بناتے تھے۔ ایک روز دوپہر کے وقت گوشت بھون رہے تھے کہ اچانک ریکس سینما کے مالک آگئے۔ انہوں نے جنرل مینجر کو گوشت بھونتے ہوئے دیکھا تو ناراض ہو گئے اور اختر نواز سے کہا کہ آئندہ آپ سینما میں گوشت نہ بھونئے گا۔ جواب میں اختر نواز صاحب نے اپنا استعفیٰ ان کے حوالے کر دیا اور بوریا بستر سنبھال کر لاہور آگئے۔
آغا جی اے گل پاکستان کی فلمی صنعت اور ٹریڈ کی ممتاز ترین شخصیت تھے اور اختر نواز صاحب کے مرتبے اور صلاحیتوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے ایورنیو سٹوڈیو نیا نیا تعمیر کیا تھا۔ آغا صاحب کے اصرار پر اختر نواز صاحب نے ایورنیو سٹوڈیوز کے جنرل مینجر کا عہدہ سنبھال لیا۔ جن لوگوں نے اس دور کے ایورنیو سٹوڈیو کو دیکھا ہے وہ اس کی خوبصورتی کو آج بھی یاد کرتے ہیں۔ ایک تو عمارت بالکل نئی اور خوبصورت تھی۔ دوسرے آغا جی اے گل نے بڑے شوق سے یہ سٹوڈیو بنوایا تھا اور اسے پاکستان کا بہترین سٹوڈیو بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اختر نواز صاحب کے تعاون سے انہوں نے ایورنیو کو ایک مثالی سٹوڈیو بنا دیا تھا۔ نظم ونسق اور حُسن ودلکشی کے اعتبار سے اس کی کوئی مثال نہ تھی۔ اختر نواز صاحب ہاتھ میں چھڑی تھامے ہر وقت سٹوڈیو میں گھومتے رہتے تھے اور اس کی سجاوٹ میں کوئی کمی برداشت نہیں کرتے تھے۔ فلم ساز' کارکن' مالک سبھی مطمئن اور خوش تھے پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ خان صاحب کی ناک پر مکھّی بیٹھ گئی۔

اس زمانے میں پاکستان کا دورہ کرنے والے غیر ملکی سربراہ جب لاہور آتے تھے تو ایورنیو سٹوڈیوز بھی انہیں بڑے اہتمام سے دکھایا جاتا تھا۔ فلمی صنعت کے ممتاز افراد اکٹھے ہوتے تھے اور مہمان کی چائے یا کھانے سے تواضع کی جاتی تھی۔ ترکی کے صدر جلال بایار لاہور آئے تو ان کے اعزاز میں آغا جی اے گل نے ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا۔ خوبرو ہیرو' حسین وطرح دار ہیروئنیں' ہدایتکار' فلم ساز اور فلموں سے وابستہ دوسرے قابل ذکر اشخاص بھی اس

تقریب میں موجود تھے۔ صدر جلال بایار پاکستان کے ہیروز سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ سنتوش کمار' درپن' اسلم پرویز' سدھیر' یوسف خان اور کمال کو دیکھ کر انہوں نے یہ ریمارکس دیئے کہ پاکستان کے ہیرو یہاں کی ہیروئنوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ ہیرو حضرات کافی عرصے تک اس فقرے کو سند کے طور پر استعمال کرتے اور ہیروئنوں پر فقرے بازی کرتے رہتے تھے۔

اس تقریب میں شہر کے معززین اور اعلی افسروں کے علاوہ آغا صاحب کی بیگم بھی موجود تھیں۔ اختر نواز خان سفید قمیض' سیاہ پتلون پہنے' سیاہ رنگ کی بو لگائے دیکھ بھال میں مصروف تھے اور نمایاں نظر آ رہے تھے۔ آغا صاحب کی بیگم نے مخاطب کرنے کے لئے "شش" کی آواز نکالی اور انہیں پاس بلایا۔ اختر نواز صاحب کی رگ پٹھانی جوش میں آ گئی۔ غصے کے مارے آگ بگولا ہو گئے۔ اگلے دن آغا گل اپنے ہیڈ آفس میں پہنچے تو ان کی میز پر اختر نواز صاحب کا استعفی پڑا ہوا تھا۔ آغا صاحب خود بھی پٹھان تھے اور بڑے وضع دار آدمی تھے۔ اختر نواز کی خودداری سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر اختر نواز صاحب سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ نہ ہی انہیں منانے کی کوشش کی۔ ان کا استعفٰی تو منظور کر لیا مگر اسی روز انہیں اپنے ہیڈ آفس میں جنرل مینجر کے عہدے پر فائز کر دیا۔ اختر نواز کے لئے ایک علیحدہ کمرے کا بندوبست کیا گیا اور تمام دفتری امور ان کو سونپ دیئے گئے۔ اختر نواز صاحب نے بھی اپنے فرائض بڑی خوبی سے سرانجام دیئے۔ آخری عمر میں چار فٹ اونچی دیوار سے گرنے کی وجہ سے ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ کافی عرصے ان کی ٹانگ پلاسٹر میں رہی مگر آغا گل کی طرف سے تنخواہ کی ادائیگی میں ناغہ نہیں ہوا۔ اختر نواز صاحب جیسے ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوئے' چھڑی سنبھال کر پلاسٹر سمیت دفتر میں آنے لگے۔ بعد میں پلاسٹر تو اتر گیا تھا مگر وہ باقاعدگی سے چھڑی لے کر دفتر آتے تھے اور یہ معمول زندگی بھر قائم رہا۔ وہ انگریزی خط و کتابت میں مہارت رکھتے تھے۔ کاروباری سوجھ بوجھ کے بھی مالک تھے۔ آخری عمر میں بھی اپنے کمرے میں بیٹھے اخبار کا مطالعہ کرتے یا کھانستے کھنکارتے رہتے۔ دفتر میں حاضری انہوں نے مرتے دم تک نہیں چھوڑی۔ وہ جانتے تھے کہ آغا گل انہیں گھر بیٹھے تنخواہ دیتے رہیں گے اور یہ ان کی پٹھانی غیرت کو گوارا نہ تھا۔ اس لئے آغا صاحب کے کہنے کے باوجود باقاعدگی سے دفتر آتے رہے حالانکہ ان کے فرائض بہت کم ہو گئے تھے۔

اختر نواز صاحب سے ہماری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ نشاط سینما لاہور کے مینجر تھے۔ یہ بہت اچھا سینما تھا۔ بھارتی فلمیں اس زمانے میں سینما گھروں میں دکھائی جاتی تھیں اور یہ سینما فلموں کے انتخاب کے سلسلے میں مشہور تھا۔ ہم صحافی بھی تھے اور فلم بینی کے رسیا بھی۔ سینما ٹکٹ کی قیمت برائے نام تھی مگر کئی بار دو چار روپے بھی جیب میں نہیں ہوتے تھے اور ہم شیر زماں پان فروش سے پیسے ادھار لے کر فلمیں دیکھتے اور دوستوں کو دکھاتے تھے۔ اختر نواز صاحب تعلیم یافتہ اور باشعور آدمی تھے۔ صحافیوں کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھے اس لئے ہم سے بہت اخلاق اور شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ہمارے ساتھ تو ٹکٹ حاصل کرنے میں رعایت کرتے ہی تھے مگر ہمارے ساتھیوں کو بھی ٹکٹ دے دیا کرتے تھے۔ مفت فلم دیکھنے کی نہ کبھی ہم نے کوشش کی اور نہ ہی انہوں نے اس کی پیشکش کی۔ جب وہ ریکس سنیما (کراچی) کے مینجر ہوئے تو وہاں بھی ان سے ملاقاتیں رہیں لیکن ایورنیو سٹوڈیو کے زمانے میں تو ان سے بہت زیادہ ملاقاتوں کا موقع ملتا رہا۔ وہ خالص اور کھرے پٹھان تھے مگر ہمارے ساتھ مہربانی کرتے تھے اور ہماری ضد سے بھی صرف نظر کر لیتے تھے۔

وہ ایورنیو پکچرز کے ہیڈ آفس پہنچے تو وہاں بھی ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ ہم جب بھی آغا صاحب سے ملنے کے لئے ایبٹ روڈ کے اس دفتر میں جاتے تھے تو اختر نواز صاحب سے صاحب سلامت ضرور ہوتی تھی۔

ایک دن ہم وہاں پہنچے تو چپراسی نے بطور خاص پیغام دیا کہ اختر نواز صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کے کمرے میں گئے تو چھڑی لئے بیٹھے تھے اور ایک موٹی سی فائل سامنے کھلی رکھی تھی۔ وہ ایک فلم کا سکرپٹ لکھ رہے تھے اور ہماری رائے لینے کے خواہش مند تھے۔ ہم نے پاکستان میں پہلی بار کسی فلم کا سکرپٹ نہایت مفصّل اور خوبصوتی کے ساتھ انگریزی میں ٹائپ شدہ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ خان صاحب اردو میں تو لکھ نہیں سکتے تھے۔ انگریزی پر انہیں عبور حاصل تھا اس لئے انگریزی میں سکرپٹ لکھ ڈالا' یہاں تک کہ مکالمے اور گانوں کے بول تک انگریزی میں تھے۔

ہم نے کہا ''خان صاحب' کیا انگریزی فلم بنا رہے ہیں؟''

بولے ''شرارت مت کرو' یہ فلم اردو میں ہوگی۔''

''مگر مکالمے تو انگریزی میں ہیں۔''

کہنے لگے ''آپ کو کس لئے بلایا ہے؟اس لئے کہ اس مفہوم کو اردو میں لکھ دیں۔''

ہم نے پوچھا''اور گانے؟''

ہنسنے لگے اور کہا''تم جانتے ہو کہ گانے شاعر ہی لکھ سکتا ہے۔میں نے تو صرف سچویشن کے موڈ کے مطابق گانوں کا مفہوم لکھا ہے۔بول تو شاعر ہی لکھے گا۔ ''پھر پوچھا''تم شاعری کرتے ہو؟''

ہم نے عرض کیا''کرتے تو نہیں۔آپ کہیں گے تو وہ بھی کرلیں گے۔''

کہنے لگے ''صرف وہی کام کرنا جو تم جانتے ہو۔''

ہم نے کہا''آپ حکم دیں گے تو شاعری بھی سیکھ لیں گے۔''

ہنسنے لگے ''میں اناڑی شاعر سے گیت نہیں لکھواؤں گا۔''

انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ یہ سکرپٹ مکمل ہو جائے گا تو نظرثانی کرنے کے بعد ہمارے حوالے کردیں گے۔مگر وہ سکرپٹ مکمل نہ ہو سکا۔

افسوس کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئی اور اختر نواز صاحب یہ نوکری بھی چھوڑ کر رخصت ہوگئے۔یہ تو ان کی پرانی عادت تھی اس بار فرق یہ تھا کہ وہ دنیا ہی سے رخصت ہو گئے تھے۔

اختر نواز صاحب کے بارے میں لوگ بہت کم جانتے ہیں۔اگر کوئی باقاعدہ فلمی ریکارڈ مرتّب کیا جائے تو اختر نواز صاحب کا نام نمایاں ہوگا۔انہوں نے گریجویشن کرنے کے بعد فلمی صنعت کا رخ کیا تھا۔حالانکہ بڑی سے بڑی سرکاری ملازمت کر سکتے تھے۔1923ء سے 1931ء تک وہ خاموش فلموں میں ہیرو کے طور پر نمودار ہوتے رہے اور وقت کی ممتاز ترین ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا اور بہت مقبولیت حاصل کی۔مردانہ وجاہت اور دلکشی کے باعث کئی ہیروئنیں ان کی طرف ملتفت بھی ہوئیں مگر خان صاحب کی پٹھانیت راہ میں حائل رہی۔فلمی ہیروئن کے ساتھ اپنا نام وابستہ کرنا وہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے بمبئی کی امپیریل فلم کمپنی سے اداکاری کا آغاز کیا تھا۔اس کے بعد کولہاپور سینے ٹون نامی فلم ساز ادارے سے وابستہ ہو گئے۔

اختر نواز صاحب نرے ہیرو ہی نہ تھے انہوں نے کئی فلموں کی ہدایتکاری بھی کی تھی۔ وہ اپنے بارے میں زیادہ گفتگو نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی باتوں باتوں میں اپنی جوانی کے دنوں کے قصّے سناتے تھے۔ ان کا فلمی پس منظر جاننے کے بعد ہم نے بارہا انہیں کریدا اور اس زمانے کے واقعات بیان کرنے پر اکسایا مگر وہ ہنس کر خاموش ہو جاتے تھے۔ ثناءاللہ خان گنڈاپور سے ان کی صاحب زادی ہما کی شادی ہوئی تو ہم بھی خاص طور پر اس میں مدعو تھے۔ ثنااللہ خان ہمارے گہرے دوست تھے مگر اختر نواز صاحب نے ہم سے کہا تھا کہ یاد رکھو' تم لڑکی والوں کی طرف سے شادی میں شرکت کرو گے۔

سمن آباد میں شادی سادگی سے ہوئی البتہ کھانے پر بہت زور دیا گیا تھا۔ فلمی صنعت کے قریباً سبھی قابل ذکر افراد موجود تھے۔

ثناءاللہ خان نے دلہا ہونے کے باوجود ہمیں یاد دلایا ''آفاقی تم میری طرف سے مہمان ہو' ٹھیک ہے نا؟''

''بالکل'' ہم نے جواب دیا۔

اختر نواز صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور لوگوں سے کہا ''آفاقی میری طرف سے شریک ہوا ہے۔ یہ میرا' ثناءاللہ سے پہلے کا واقف ہے۔ کیوں نا؟'' انہوں نے ہم سے تصدیق چاہی۔

دو مُلاؤں میں مرغی حرام والی کہاوت تو آپ نے بھی سنی ہو گی مگر دو پٹھانوں میں مہمان کی مشکل کا علم نہ ہو گا۔ اختر نواز صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ پٹھان تھے اس لئے روشن خیال بھی تھے۔ ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا مگر لڑکیوں کو انہوں نے اعلی تعلیم دلوائی تھی۔ ثناءاللہ خان گنڈاپور کی بیگم ہما بھی ایم اے پاس ہیں۔ بعد میں انہوں نے بنک میں ملازمت کر لی۔ ہم نے انہیں روز اوّل ہی بتا دیا تھا کہ آپ کے بینک میں ایک اکاؤنٹ نہیں کھولیں گے کیونکہ اس کے دیوالیہ ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ ایک تو خاتون اوپر سے پٹھان۔ جب وہ بینک کی وائس پریذیڈنٹ ہو گئیں تو ایک دن ہم سے کہا ''اب تو اپنا اکاؤنٹ ہمارے بینک میں کھول سکتے ہیں۔ دیکھو تو اتنے عرصے کے بعد بھی یہ بینک چل رہا ہے۔''

ہم نے کہا ''بھابھی بینک اور دل کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ جانے کب بند ہو جائے۔''

ہم اپنی فلم ''سزا'' کی روداد بیان کر چکے ہیں۔ یہ ہماری بنائی ہوئی تیسری فلم تھی۔ اصولاً تو ہمیں پہلی فلم سے بسم اللہ

کرنی چاہئیے مگر پہلے عرض کر چکے ہیں کہ یہ داستان ترتیب وار بیان نہیں کی جارہی ہے اور شاید یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ واقعات' خیالات اور شخصیات کا اس قدر ہجوم ہے کہ دماغ میں افراتفری کا عالم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے چھوڑیں اور کہاں سے شروع کریں۔ بات میں سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور داستان کی داستان بھی جاری رہتی ہے۔ پھر بھی مناسب ہے کہ ہم اپنی پہلی فلم کی کہانی بھی بیان کر دیں۔ یہ فلم سازی میں ہماری پہلی پہلی کوشش تھی اس لئے اس میں مشکلات بھی زیادہ پیش آئی تھیں۔ بطور فلم ساز ہماری اوّلین فلم ''کنیز'' تھی۔ مگر سب سے پہلے تو یہ سنئے کہ آخر ہم نے فلم سازی کا آغاز کیوں کیا بلکہ یہ کہ اچھی خاصی صحافت چھوڑ کر فلم کی وادی میں کیوں نکل گئے؟

جب 1958ء میں پہلا مارشل لاء نافذ ہوا تو چند روز کے اندر ہی ہمیں بدلے ہوئے حالات اور ناسازگار ماحول کا احساس ہو گیا تھا۔ اس ضمن میں کچھ واقعات ہم پہلے تحریر بھی کر چکے ہیں۔ ہم نے صحافت کا پیشہ اختیار ہی اس لئے کیا تھا کہ یہ ہمارا پسندیدہ شعبہ تھا اور یہاں ہمیں عزت نفس اور ہر طرح کی آزادی حاصل تھی مگر مارشل لاء لگتے ہی ہمیں جمہوریت اور مارشل لا کا فرق معلوم ہو گیا۔ یہ بات علیحدہ ہے کہ کافی وقت گزارنے کے بعد اب ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ جمہوریت میں بھی مارشل لا کے طور طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ ''نوائے وقت'' کے مدیر اور اپنے سابق باس جناب حمید نظامی صاحب سے ہماری مارشل لا کا اعلان ہوتے ہی ملاقات ہوئی تھی۔ ہم خاص طور پر گھبرائے ہوئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور انہوں نے اس شام اپنی ٹمپل روڈ والی کوٹھی کے سادہ ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر حالات پر جو تبصرہ فرمایا تھا وہ آج بھی ہمیں لفظ بہ لفظ یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس روز وہ بے حد دل برداشتہ اور مغموم تھے اور خلاف عادت سوچ میں گم تھے۔

ہم نے پوچھا ''نظامی صاحب۔ آپ کے خیال میں اب کیا ہو گا؟''

نظامی صاحب نے کہا ''مجھے ڈر ہے کہ کہیں پاکستان بھی مشرق وسطیٰ کا ایک ملک بن کر نہ رہ جائے جہاں آئے دن فوجی انقلابات برپا ہوتے رہتے ہیں اور حکومتوں کے تختے الٹ جاتے ہیں'' پھر انہوں نے انگریزی میں کہا۔

"This is the beginning of the end"

مزید ستم یہ ہوا کہ ان ہی دنوں ہماری ''آفاق'' کے چیئرمین صاحب سے ٹیلی فون پر جھڑپ ہو گئی۔ انہوں نے فرمایا

کہ اگر آپ یہاں کے حالات سے مطمئن نہیں تو بخوشی نوکری چھوڑ کر چلے جائیں۔

ہم نے عرض کیا ’’ہم آج ہی چلے جائیں گے بشرطیکہ آپ ہمارے واجبات ادا کر دیں۔‘‘

ظہور عالم شہید صاحب اور دوسرے ساتھیوں نے بہت سمجھایا بجھایا مگر ہم نے صرف ’’آفاق‘‘ ہی سے نہیں بلکہ صحافت ہی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ یہ فیصلہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اس وقت ہمیں صحافت سے وابستہ ہوئے لگ بھگ آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور اس دوران میں ہم نے محسوس کیا تھا کہ شوق اپنی جگہ مگر حالات صحافت کا پیشہ اختیار کرنے کے لئے سازگار نہیں ہیں۔ اس زمانے میں صحافیوں کی تنخواہیں بہت کم تھیں۔ پروفیسر سرور جیسے دانشور اور لائق و فائق ایڈیٹر کو پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی۔ دوسروں کا بھی درجہ بدرجہ ایسا ہی حال تھا۔ ہمارے علم کے مطابق سب سے زیادہ تنخواہ جو اردو اخبار کے کسی ایڈیٹر کو دی جاتی تھی وہ ایک ہزار روپے ماہوار سے زیادہ نہ تھی اور ان بزرگوں میں مولانا غلام رسول مہر اور مولانا چراغ حسن حسرت جیسے جیّد ایڈیٹر بھی شامل تھے۔

ہمیں دولت کمانے کا کبھی شوق نہیں رہا مگر عزت اور آسائش کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تمنا تھی جو ان حالات میں پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اردو اخبارات کی تعداد بہت محدود تھی۔ نوائے وقت، امروز، احسان، زمیندار اور مغربی پاکستان، لاہور کے ممتاز اخبارات تھے۔ لیکن ان سب کا ماحول، حالات اور پس منظر مختلف تھا۔ ’’امروز‘‘ میں بائیں بازو کے ترقی پسندوں ہی کو داخلہ مل سکتا تھا۔ ’’زمیندار‘‘ کا دقیانوسی ماحول ہمارے لئے ناسازگار تھا۔ احسان اور مغربی پاکستان اپنے مالی حالات کی وجہ سے نامساعد حالات سے دوچار تھے۔ لے دے کر صرف ’’نوائے وقت‘‘ ہی ایک ایسا روزنامہ تھا جس میں ہمارا گزارا ہو سکتا تھا لیکن ضروری نہ تھا کہ جس وقت ہمیں نوکری کی ضرورت ہو تو وہاں گنجائش بھی موجود ہو۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہم روزنامہ آفاق میں اسسٹنٹ ایڈیٹر اور روزنامہ ’’آثار‘‘ میں جوائنٹ ایڈیٹر کے طور پر فرائض سرانجام دے چکے تھے اور اس کے بعد کسی جونیئر حیثیت میں کام کرنا ہمارے لئے دشوار تھا۔ گویا روزنامہ ’’آفاق‘‘ ہی بظاہر ہماری جائے پناہ تھا مگر اس کے مالکوں سے بھی ہم ناخوش ہو چکے تھے۔

یہ مسئلہ بھی درپیش تھا کہ ہم بذات خود کہیں نوکری تلاش کرنے کے لئے نہیں جاسکتے تھے۔ گویا کسی روزنامے میں ہماری گنجائش ہی نہ تھی۔ اس پر ستم یہ کہ مارشل لاء نافذ ہو گیا اور اس نے ہمیں صحافت کے مستقبل سے مزید بددل کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہمیں صحافت میں اپنے لئے روشن مستقبل نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے باوجود ہم نے اپنی عادت کے مطابق جوش میں آکر روزنامہ ''آفاق'' کو خیرباد کہہ دیا اور گھر بیٹھ گئے۔

صحافت کے سوا ہمیں کچھ نہیں آتا تھا لیکن چند سال سے فلمی صنعت میں ہماری آمدورفت تھی اور یہ بھی ہمارا پسندیدہ کام تھا۔ گزشتہ دو تین سالوں میں نہ صرف ہماری فلمی صنعت کے ہر بلند و پست فرد سے واقفیت اور بے تکلفی ہو چکی تھی بلکہ ہم نے کہانی نویسی بھی سیکھ لی تھی۔ ہماری تصنیف کردہ پہلی فلم ''ٹھنڈی سڑک'' 1956ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہم نے فلم ساز ہدایت کار لقمان کے ساتھ کافی وقت گزارا تھا۔ فلمی کہانی کے سلسلے میں بحثوں میں حصہ لیا تھا۔ فلم سازی کے مختلف مراحل ہماری نظروں سے گزر چکے تھے۔ پہلے تو ہم اعزازی حیثیت سے سکرپٹ کی تیاری میں حصہ لیتے رہے مگر پھر ظہور الحسن ڈار صاحب کی تجویز پر لقمان صاحب نے ہمیں باقاعدہ کہانی کے شعبے میں شامل کر لیا۔ مرزا ادیب اور ظہور الحسن ڈار ان کے ریگولر مصنف تھے۔ مگر فلم ''ایاز'' میں انہوں نے پہلی بار ہم سے باقاعدہ کچھ مکالمے لکھوائے۔ سکرین پلے کی تیاری میں بھی ہم نے سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ اس کارکردگی کے پیش نظر انہوں نے ہمیں پروموٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور ان کی آئندہ فلم ''آدمی'' کے سکرپٹ کی تیاری میں ہمیں باقاعدہ شریک کر لیا گیا۔ اس فلم کے لکھنے والوں میں بھی میرزا ادیب اور ظہور الحسن ڈار صاحبان شامل تھے لیکن کچھ وقت کے بعد وہ دونوں حضرات کنارہ کش ہو گئے اور کہانی نویسی کا تمام بوجھ ہمارے ناتواں کاندھوں پر آ گیا۔

''آدمی'' کی تکمیل کے زمانے میں ہمارے اعتماد میں مزید اضافہ ہو گیا۔ سعادت حسن منٹو اور ڈبلیو زیڈ احمد جیسے ہنرمندوں سے بھی ہم نے سکرپٹ لکھنے کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ حاصل کیا تھا۔ لقمان صاحب کی صحبت میں عملی طور پر بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا اور ہم سنجیدگی سے کہانی نویسی کا پیشہ اختیار کرنے کے بارے میں سوچنے لگے۔ مگر اخبار کی مصروفیات راہ میں حائل تھیں۔ معمول یہ تھا کہ ہم ''آفاق'' کے کاموں سے فراغت پا کر سیدھے فلم سٹوڈیو کا رخ کرتے تھے اور رات گئے تک فلمی مصروفیات میں مشغول رہتے تھے۔ ہماری جان پہچان اور بے تکلفی قریب قریب

سبھی کے ساتھ ہو چکی تھی اور ہم نے سبھی سے کچھ نہ کچھ فیض بھی حاصل کیا تھا۔ یہ وہ پس منظر تھا جب ہم ''آفاق'' کی ملازمت چھوڑ کر گھر بیٹھ گئے۔

ہر ایک نے ہمیں سمجھایا کہ بھائی کیوں بے کار ضد کرتے ہو۔ واپس آجاؤ مگر ہم نے کافی غور و خوض کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ صحافت کا میدان اب ہمارے لئے تنگ ہو چکا ہے۔ اس لئے نئی جولان گاہوں کی طرف نکل جانا چاہئیے۔ فلم کا اعزاز ہمیں صحافت کا نعم البدل نظر آیا اور ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اب فلمی صنعت میں قسمت آزمائی کریں گے۔

فلم کا پیشہ اختیار کرنا بھی اس زمانے میں کچھ آسان نہ تھا۔ فلم سازی بہت ہو رہی تھی۔ سرمائے اور وسائل کی کمی تھی۔ کہانی لکھنے والوں کو بہت کم معاوضے دیئے جاتے تھے بلکہ اکثر و بیشتر تو انہیں سرے سے معاوضہ ہی نہیں دیا جاتا تھا۔ جس فلم ساز کی جتنی توفیق تھی اور داؤ چلتا تھا وہ کہانی نویس کی اتنی ہی رقم ہضم کر لیا تھا اور وہ غریب منہ تکتا رہ جاتا تھا۔ دوسری پرابلم یہ تھی کہ اخبار کی ملازمت میں تو ہمیں ہر ماہ ایک مقررہ رقم مل جاتی تھی۔ کہانی نویس بننے کے بعد ماہ بہ ماہ باقاعدہ آمدنی کا حصول ممکن نہ تھا۔ پھر یہ کہ ہمیں معاوضہ طلب کرنے کی عادت نہ تھی۔ تقاضا تو دور کی بات ہے۔ مگر صحافت چھوڑنے کے بعد فلمی صنعت کے سوا ہمارے پاس سر چھپانے کی کوئی دوسری جگہ نہ تھی۔

ہمارے ''آفاق'' سے مستعفی ہونے کی خبر سب کو معلوم ہو چکی تھی۔ فلم سازوں' ہدایتکاروں اور اداکاروں کے ساتھ ہم پہلے بھی گھوما کرتے تھے۔ اب اس کے لئے زیادہ وقت اور فراغت میسر تھی۔ ہمارے صحافی دوست ہمیں جب بھی دیکھتے تھے ہم انہیں کسی کار سے برآمد ہوتے یا اس میں سوار ہوتے ہی نظر آتے تھے۔ یا پھر فلمی نگار خانوں' شاندار ریستورانوں اور اعلیٰ پیمانے کے ہوٹلوں میں نظر آتے تھے۔ خوش لباسی ہماری عادت تھی اس پر یہ شان و شوکت' نتیجہ یہ کہ آغاز میں کچھ دن تو ہمارے صحافی دوست ہم سے اظہار ہمدردی کرتے رہے اور مشورہ دیتے رہے کہ واپس آجاؤ مگر جب ہمارا ٹھاٹ باٹ دیکھا تو ہم پر رشک کرنے لگے۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے سے کہنا شروع کر دیا کہ ''بھائی آفاقی کے تو مزے ہی مزے ہیں۔ خوب پیسے کما رہا ہے۔'' جب ان خیالات کا انہوں نے ہمارے سامنے اظہار کیا تو ہمارا یہ ارادہ عزم میں تبدیل ہو گیا کہ اب عزت کا سوال پیدا ہو گیا ہے اور ہمیں چاہئیے کہ فلموں کی دنیا میں قسمت آزمائی کریں۔ لیکن ہزاروں اندیشے ہمیں سہانے کے لئے آن موجود ہوتے تھے۔ پھر بھی ہم مرتا کیا نہ کرتا کے

مصداق اس فیصلے پر ڈٹ گئے اور تہیّہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے۔ اب اس وقت تک صحافت کے کوچے کا رخ نہیں کریں گے جب تک فلمی دنیا میں کچھ کر کے نہ دکھا دیں۔

اُدھر مشکل یہ تھی کہ ہم فلم والوں کو اپنی زبان سے یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ ہم نے صحافت ترک کر دی ہے اور آپ لوگ ہمیں کام دیں۔ گویا عجیب بے سروسامانی کا عالم تھا۔ بعض جریدوں میں مضامین لکھ کر جو تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی وہ ہمارے ماہانہ اخراجات کے لئے ناکافی تھی۔ ہر مہینے ہم اماں کو ایک مقررہ رقم گھریلو اخراجات کے لئے باقاعدگی سے دیا کرتے تھے جس میں کبھی ناغہ نہیں ہوا تھا لیکن اب ہمیں یہ فکر پڑ گئی کہ اگر معقول اور باقاعدہ آمدنی نہیں ہوئی تو ہم اپنے ذمّے داری کس طرح پوری کریں گے؟ اسی دوران میں ہمیں کراچی اور لاہور کے بعد جرائد میں لکھنے کی پیش کی گئی۔ کچھ رقم ہم نے پس انداز کر رکھی تھی۔ اس طرح ہمیں کم از کم یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ ہم دو تین ماہ تک اپنے ذمے داریاں پوری کر سکیں گے۔ مستقبل کے لئے مال و متاع جمع کرنے کا ہمیں کبھی شوق نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جو بھی آمدنی ہوتی تھی اسے ہم بے دریغ خرچ کر دیتے تھے اور آئندہ کے لئے یہ سوچتے تھے کہ بھئی ہماری محدود سی تو ضرورتیں ہیں، اللہ دے گا اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی ہمیں مایوس نہیں کیا اور ہماری مطلوبہ ضروریات پوری ہوتی رہیں اور آج تک ہو رہی ہیں۔

کہانی نویسی کے سلسلے میں ہم کو کن مشکلات اور مسائل سے دوچار ہونا پڑا وہ ایک علیحدہ داستان ہے جس کا بیان پھر کبھی ہو گا۔ قصہ مختصر یہ کہ دو تین سال میں ہم باقاعدہ کہانیاں اور مکالمے لکھنے والوں کی صف میں شامل ہوئے۔ معاوضہ وصول کرنے اور تقاضا کرنے کا ڈھنگ ہمیں کبھی نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ کہانی نویس اور بعد میں فلم ساز کی حیثیت سے بہت سے لوگوں نے حسب استطاعت ہمارے پیسے مار لئے۔ ہم وضع داری نبھاتے رہے اور آج تک نبھا رہے ہیں۔ ان لوگوں سے آج بھی ہمارا میل جول ہے۔ فلمی صنعت میں حالات خاصے دگرگوں تھے۔ فلمیں بننا تو شروع ہو گئی تھیں مگر بہت کم بجٹ میں بنائی جاتی تھیں اس لئے سپر سٹارز کے سوا دوسرے سبھی لوگوں کے معاوضے بہت کم تھے۔ خاص طور پر کہانی نویس کو اس معاملے میں سب سے کم اہمیت دی جاتی تھی۔ آج بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ کہانی نویسوں کے لئے نہ پہلے کبھی معاوضے کا معیار مقرر تھا اور نہ ہی آج ہے۔ ہر کہانی لکھنے والا اپنی قابلیت، ہمّت اور

اہمیت کے لحاظ سے معاوضہ وصول کرتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ فلم ساز گفتگو کا آغاز یہاں سے کرتے ہیں کہ جی کہانی ہی فلم کی بنیاد ہوتی ہے۔

ہم بہت آہستہ روی سے اس میدان میں گامزن ہوئے تھے لیکن اتنے گرے پڑے بھی نہیں تھے کہ بہت کم معاوضہ قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

معاوضے سے زیادہ ہمیں عزت نفس کا پاس تھا جو خدا کا شکر ہے کہ ہم نے کبھی نہیں گنوائی۔ ہماری لکھی ہوئی بعض فلموں نے اوسط درجے کی کامیابی حاصل کی' کچھ ناکام رہیں جس میں سراسر ہمارا ہی قصور نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ فلمی صنعت میں ہمارے متعلق یہ رائے قائم کرلی گئی کہ ہم کامیڈی اور ہلکے پھلکے رومانی سین ہی اچھے لکھتے ہیں جبکہ ڈرامائی مناظر میں اتنے کامیاب نہیں ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہماری فلموں میں تھیٹریکل انداز کے مکالمے لکھنے کا انداز بہت مقبول تھا جن میں نفس مضمون سے زیادہ پُر شوکت الفاظ اور غیر ضروری لفاظی پر زور دیا جاتا تھا۔ سٹیج کا یہ انداز ہمیں پسند نہیں تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ مکالمے کہانی کے کردار کے مطابق لکھے جائیں' ایسا نہیں ہونا چاہئیے کہ ہر کردار خواہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو' ایک ہی جیسی زبان بولتا نظر آئے۔

پاکستانی فلموں میں بھاری بھرکم پُر شوکت و پُر شکوہ مکالمے بہت پسند کئے جاتے تھے۔ انور کمال پاشا اپنے مکالموں کی وجہ سے بے حد مقبول تھے اور ان کی فلموں میں مکالموں پر تماشائی باقاعدہ واہ واہ کرتے یا تالیاں بجا کر داد دیا کرتے تھے۔ ان کے بعد ریاض شاہد نے الفاظ کی جادوگری دکھائی اور بے حد مقبولیت اور عروج حاصل کیا۔ ریاض شاہد کا انداز تحریر اس قدر مقبول ہو گیا کہ پاکستان کے سبھی لکھنے والوں نے وہی انداز اپنا لیا۔ فلم ساز اور ہدایتکار بھی اسی طرز کے مکالموں کو ترجیح دیا کرتے تھے اور لکھنے والوں سے فرمائش کرتے تھے کہ اسی طرح کے مکالمے لکھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کراچی سے لاہور تک ہر لکھنے والے نے کم و بیش وہی انداز اپنا لیا۔ لیکن ریاض شاہد جیسے پُر معنی اور پُر مغز مکالمے لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ بہر حال سب اسی رنگ میں رنگے گئے تھے۔ صرف ڈھاکا کی فلمیں اس سے محفوظ تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ ڈھاکا کے بنگالی فن کاروں کو اردو پر دسترس حاصل نہیں تھی۔ اکثر تو صحیح اردو بول ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے ان کے لئے سادہ اور آسان مکالمے لکھنے پڑتے تھے۔ وہاں کے لکھنے والے بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ادیب

تھے۔وہ تھیڑاور سٹیج سے متاثر نہیں تھے اس لئے ڈھاکا میں تیار ہونے والی فلموں کے مکالموں کا انداز مغربی پاکستان کی فلموں سے یکسر مختلف تھا۔

ہم سے بھی کچھ فلم سازوں نے ریاض شاہد کے انداز میں مکالمے لکھنے کی فرمائش کی لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔کوشش کے باوجود ہم ایسے مکالمے لکھنے سے قاصر رہے۔ہمارا عام فہم ‘برجستہ اور سادہ انداز بھی لوگوں کو قدرے مختلف لگا تو پسند آنے لگا۔پھر ایک وقت ایسا آیا جب فلم ساز اور ہدایتکار ہمارے پاس یہ فرمائش لے کر آتے تھے کہ فلم کا سکرپٹ آپ لکھ دیجئیے مگر ڈرامائی مکالمے ریاض شاہد سے لکھوائیں گے۔ظاہر ہے کہ یہ شرط ہمیں منظور نہ تھی۔ریاض شاہد سے ہماری گہری دوستی تھی۔ہنسی مذاق بھی تھا۔ہدایتکار حسن طارق ہم دونوں کے مشترکہ دوست تھے۔ریاض شاہد سے ان کی دوستی زیادہ پرانی تھی۔ان کی کچھ فلموں میں ایسا ضرور ہوا کہ کچھ حصّے انہوں نے ہم سے لکھوائے اور کچھ ریاض شاہد سے لکھوائے۔طارق صاحب کا معاملہ ایسا تھا کہ ان سے نہ تو ہم دونوں لڑ سکتے تھے اور نہ ہی ان کے لئے کام کرنے سے انکار کر سکتے تھے۔مگر آہستہ آہستہ ہم نے کہانی اور مکالمہ نویس کے طور پر فلمی صنعت میں اپنی جگہ بنالی اور اپنے روشن مستقبل کے بارے میں کچھ پُر امید نظر آنے لگے۔

نجم نقوی صاحب بمبئی سے لاہور تشریف لائے تو آغا جی اے گل نے ان کو ہدایت کار کے طور پر سائن کیا اور یکے بعد دیگرے کئی فلمیں بنانے کا پروگرام بنایا۔نجم نقوی صاحب نے پاکستان آکر پہلی فلم کی ہدایتکاری کراچی میں دی تھی۔یہ فلم بہت مشہو ہوئی۔یہ اور بات ہے کہ بری طرح فلاپ ہوئی تھی۔پاکستان کا ہر فلم بین اس کا نام جانتا ہے۔دیکھی شاید کسی نے نہ ہو۔اس فلم کا نام ’’کنواری بیوہ ‘‘ تھا اور اس کی وجۂ شہرت شمیم آراء تھیں۔نجم نقوی نے شمیم آراء کو پہلی بار ہیروئن منتخب کیا تھا مگر یہ فلم بھی ناکام رہی اور شمیم آرا بھی۔کچھ عرصے بعد جب شمیم آرا نے قسمت اور اپنی محنت وصلاحیت کے بل بوتے پر اداکاری میں نام پیدا کیا تو اس فلم کا خوب چرچا ہوا۔شمیم آرا نے بہت نام اور پیسہ کمایا مگر یہ بات ان کے حق میں کہنی پڑے گی کہ وہ ہمیشہ نجم نقوی صاحب کو اپنا استاد تسلیم کرتی رہیں اور ان کی بے پناہ عزت کرتی رہیں۔نجم نقوی صاحب کی وفات پر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئیں اور کئی دن تک بے حد مغموم اور سوگوار

رہیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ وہ میرے محسن تھے، آج کے زمانے میں محسنوں اور استادوں کی پذیرائی کرنے والے ایسے شاگرد خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ شاید ان ہی خوبیوں کی وجہ سے شمیم آراء کو اللہ تعالیٰ نے بھاگ لگائے۔

نجم نقوی صاحب قیام پاکستان سے پہلے علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ بڑے افسر بن سکتے تھے۔ مگر فلمی دنیا کا رخ کیا اور بمبئی جا کر ٹھہرے۔ وہاں انہوں نے کئی کامیاب فلمیں بنائیں اور نام پیدا کیا۔ بے حد شریف' خلیق اور ملنسار آدمی تھے۔ انتہائی منکسر المزاج تھے۔ ان کا لباس عموماً علی گڑھ کٹ چوڑے پانچوں کا پاجامہ کرتہ اور شیروانی یا پتلون اور قمیض تھا۔ کلین شیو تھے اور ان کی شرافت کی داستانیں ان سے پہلے ہمارے پاس لاہور پہنچ گئی تھیں۔ موسیقار رشید عطرے صاحب بمبئی میں ان کے بے تکلیف دوستوں میں شامل تھے۔ نخشب جارچوی سے بھی ان کی گہری دوستی تھی۔ نخشب صاحب رنگین مزاج بلکہ عاشق مزاج تھے جب کہ نجم نقوی صاحب انتہائی سادہ اور خشک مزاج۔ زندگی میں صرف ایک ہی شادی کی اور پھر کسی اور کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ شادی سے پہلے بھی ان کی یہی شہرت تھی۔ رشید عطرے صاحب ان کے اور نخشب صاحب کے بہت دلچسپ قصّے سنایا کرتے تھے۔ پھر جب ہماری ڈبلیو زیڈ احمد صاحب سے ملاقات بڑھی تو انہوں نے بھی نجم نقوی صاحب کا تذکرہ کیا۔

احمد صاحب نے پونا میں اپنی ایک فلم ''پرتھوی راج سنجوگتا'' کی ہدایتکاری کے لئے انہیں سائن کیا تھا اور 1944ء میں انہیں پانچ ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب احمد صاحب نے اپنے شالیمار فلم سٹوڈیوز میں ہندوستان کے قریب قریب سبھی قابل ذکر ادیبوں اور شاعروں کو ملازم رکھ لیا تھا۔

نجم صاحب سے ہماری بھی لاہور میں ملاقات ہوئی۔ بہت زندہ دل اور وضع دار آدمی تھے۔ علی گڑھ کا رنگ ان پر نمایاں نظر آتا تھا۔ لیکن بہت سیدھے سادھے بھی تھے۔ کوئی بھی انہیں باتوں میں لگا سکتا تھا۔ لاہور کے ایورنیو فلم سٹوڈیوز میں ہماری اکثر ان سے علیک سلیک ہو جاتی تھی اور وہ بہت شفقت اور التفات کرتے تھے۔

یہ 1962ء کا ذکر ہے۔ ایک دن ہمیں نغمہ نگار تنویر نقوی صاحب نے یہ اطلاع دی کہ آغا جی اے گل نے ایک سال میں چھ فلمیں بنانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے کئی ہدایتکار سائن کئے ہیں۔ لیکن کہانی نویس کے طور پر صرف تمہیں منتخب کیا گیا ہے۔ پہلی فلم کے ہدایت کار نجم نقوی صاحب ہوں گے۔

آغا صاحب سے ہماری پرانی یاد اللہ تھی۔ بہت شفیق اور خلیق بزرگ تھے۔ ہم سے مذاق بھی کر لیا کرتے تھے۔ صحافت کے آغاز کے زمانے سے ہی ہماری ان سے ملاقات تھی۔ وہ پاکستان میں فلمی صنعت کے بے تاج بادشاہ کہلاتے تھے۔ ملک کے بلکہ ایشیا کے سب سے خوبصورت اور جدید ترین فلم سٹوڈیو کے مالک تھے۔ فلم ساز' تقسیم کار تھے اور سینما گھروں کے مالک بھی تھے۔ پاکستان کی فلمی دنیا میں ان کا سکّہ چلتا تھا۔ بڑے سے بڑا اداکار اور ہدایتکار ان کی خوشنودی حاصل کرنے کا خواہاں رہتا تھا۔ سجاد گل اور شہزاد گل جو آج کل فلم سازی کر رہے ہیں اور ایورنیو سٹوڈیو بھی چلا رہے ہیں، ان ہی کے بیٹے ہیں۔ ان کی پہلی بیوی کے بڑے صاحب زادے آغا ریاض گل امریکا سے فلم سازی کی ڈگری لے کر آئے تھے اور کئی سال تک ایورنیو سٹوڈیوز کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے رہے تھے۔ ہم سے بھی ان کی گہری دوستی ہو گئی تھی جو آج بھی قائم ہے۔ اس داستان میں ان کا تذکرہ بھی آئے گا۔

تنویر صاحب کی سنائی ہوئی خبر بہت خوش آئند تھی۔ آغا جی اے گل کی فلموں کے لئے لکھنا افتخار کا باعث تھا۔ لیکن آغا صاحب کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ پیسے کم دیتے ہیں۔

دوسرے دن تنویر نقوی صاحب ہمیں لے کر لکشمی چوک پر آغا صاحب کے دفتر میں پہنچ گئے۔ اس دفتر میں ہماری اکثر آمدورفت رہا کرتی تھی بلکہ آغا صاحب نے ازراہ نوازش ہمیں اپنی کوٹھی پر آنے کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔ لیکن کاروبار کے سلسلے میں ہم اس روز پہلی بار آغا گل کے پاس حاضر ہوئے تھے۔

تنویر نقوی صاحب ہمیں ساتھ لے کہ نیچے عمارت کے تہ خانے میں گئے جہاں آغا صاحب کے فلم سازی کے دفاتر تھے۔ اوپر والی منزل میں ان کا ڈسٹری بیوشن آفس اور ایورنیو پکچرز کا ہیڈ آفس تھا۔ سمجھ لیجئیے کہ یہ پاکستان کی فلمی صنعت کا اعصابی مرکز تھا۔ سٹوڈیو کے معاملات وہیں طے پاتے تھے جہاں آغا صاحب نے فلم پروڈکشن کا نہایت شاندار دفتر بنایا تھا۔ اس خانے میں نجم نقوی صاحب سے ہماری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ ہم اور وہ ساتھ کام کریں گے۔ حالانکہ یہ تو ہمارے لئے باعث اعزاز تھا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد انہوں نے ایک پتلی سی طالب علموں والی کاپی ہمارے سامنے رکھ دی اور بولے۔

''یہ کہانی کا مختصر سکرین پلے ہے۔ آپ اسے پڑھ لیجئیے۔ جب کام شروع ہو گا تو اس کے بارے میں ڈسکس کریں

گے۔''

ہم نے چند منٹ منٹ میں سکرین پلے پڑھ لیا۔اچھی دلچسپ ہلکی پھلکی کمرشل کہانی تھی۔ ہمیں بعض جگہوں پر اعتراض تھا مگر سوچا کہ باقاعدہ کام شروع ہو گا تو نجم صاحب سے بات کریں گے۔

انہوں نے کہا کہ ''کیوں میاں۔دال دلیا پسند آیا؟ بھئی میں کہانی نویس تو نہیں ہوں۔بس ایسے ہی ایک لائن بنالی ہے۔ اس میں رنگ تو تم ہی بھرو گے۔''

ہم نے مختصر الفاظ میں اپنے رائے بیان کی اور خیال ظاہر کیا کہ سکرین پلے کی مدد سے کامیاب فلم بنائی جاسکتی ہے۔ نجم نقوی یہ سن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔بولے ''تو پھر آؤ آغا صاحب کے پاس چلتے ہیں تاکہ دوسرے معاملات بھی طے ہو جائیں۔''

سیڑھیاں چڑھ کر ہم گراؤنڈ فلور میں واقع آغا صاحب کے خوبصورت اور کشادہ دفتر میں گئے۔وہاں حسب معمول کئی فلم والے موجود تھے۔ان سے فراغت ہوئی تو آغا صاحب نے جنرل مینجر صاحب اور چپراسی کو ہدایت کی کہ اب کوئی اندر نہ آئے۔ آغا صاحب کم گو تھے مگر ہمارے ساتھ شوخی اور مذاق کا مظاہرہ کرلیا کرتے تھے۔کہنے لگے '' آفاقی' تم تو چائے پینے اور انگلش بسکٹ کھانے ہی آتے ہو۔مگر آج پہلے کام بعد میں چائے۔کیا خیال ہے؟

ہم نے کہا'' آغا صاحب۔چائے بسکٹ اور کیک تو اکثر ملتے رہتے ہیں۔آج کام کی بات کر لیتے ہیں۔پھر چائے تو مل ہی جائے گی۔''

انہوں نے پوچھا ''تم نے سکرین پلے پڑھ لیا کیا خیال ہے؟''

ہم نے بتایا کہ اچھی دلچسپ کہانی ہے۔اس کے بعد کہانی کے اہم کرداروں کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ شمیم آراء اور سنتوش کمار کو مرکزی کرداروں میں کام لینے کا خیال ظاہر کیا گیا۔دوسرے اہم کرداروں کے بارے میں بھی بات چیت ہوئی اور آغا صاحب مختلف اداکاروں کے بارے میں ہمارے رائے دریافت کرتے رہے۔ اس کہانی میں چھ سات سین پر مشتمل ایک اہم کردار تھا جس کے لئے نجم نقوی صاحب ہمالیہ والا کو کاسٹ کرنے کے حق میں تھے۔

''مگر ہمالیہ والا تو اتنا چھوٹا رول نہیں کرے گا'' آغا صاحب نے کہا۔

نجم نقوی صاحب نے کہا" آغا صاحب اسے مہمان اداکار بنالیں گے تو راضی ہو جائے گا۔ مگر اس کے لئے کم از کم آٹھ دس ہزار روپے دینے پڑیں گے۔"

آغا صاحب نے یہ تجویز بھی منظور کرلی۔ نغمات لکھنے کیلئے تنویر نقوی صاحب موجود ہی تھے۔ موسیقار کے طور پر رشید عطرے صاحب کے نام پر فیصلہ ہو گیا۔ یہ سب باتیں ہو گئیں مگر ہم سے بات طے کرنا رہ گئی تھی۔ آغا صاحب کا یہ دفتر کافی وسیع اور کشادہ تھا مگر وہ کاروباری بات کرنے کیلئے اکثر اپنے کمرے سے نکل کر باہر پچھلے صحن میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ ان کی کاروباری بات چیت چند منٹ سے زیادہ طویل نہیں ہوتی تھی۔ اکثر تو ایک دو منٹ میں ہی فیصلہ کر لیتے تھے

انہوں نے اپنے ملازم کو" چائے روڑا" یعنی چائے لانے کا آرڈر دیا اور کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے" آفاقی، ذرا ایک منٹ کو ادھر آؤ۔"

بغلی دروازے سے ہم ان کے پیچھے پیچھے باہر صحن میں چلے گئے۔ وہاں ایک سائیکل کھڑی تھی۔ آس پاس کوئی شخص نہ تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ اب آغا صاحب معاوضے کی بات کریں گے اور عادت کے مطابق ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

مختصر سے عقبی صحن میں پہنچتے ہی آغا صاحب کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بولے" بولو تم پیسے کتنے لو گے؟"

ہم بوکھلا گئے۔ یہ موضوع ہمیشہ ہمارے لئے پریشان کن رہا ہے اور پیسوں کی بات کرتے ہوئے ہمیں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے بلکہ شرم سی آتی ہے۔

" بولو!" انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

ہم نے نگاہیں جھکا کر کہا" آغا صاحب۔ آپ ہی بتایئے"

جواب میں آغا صاحب نے خلاف عادت مختصر سی تقریر کر دی۔ انہوں نے کہا" دیکھو آفاقی۔ میں نے سنا ہے کہ تم اچھا لکھتے ہو۔ نئے آئے ہو اس لئے تمہارے پاس نئے خیالات ہیں۔ میں نے سال میں چھ فلمیں بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یعنی ہر دو ماہ بعد ایک فلم۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ سب فلمیں تم ہی لکھو۔"

ہم نے دبی زبان میں کہا ''شکریہ آغا صاحب''

پوچھا ''تو پھر بولو۔ایک فلم کے کتنے پیسے لو گے ؟''

ہم پھر شرما گئے۔کہا ''آغا صاحب آپ ہی بتا دیجئے۔''

اس کے جواب میں آغا صاحب نے پھر ایک مختصر سی تقریر کر دی۔کہنے لگے ''آفاقی۔میں نے کئی رائٹرز سے کام کرایا ہے۔فلاں رائٹر کو میں نے اٹھارہ سو معاوضہ دیا تھا۔فلاں کو پندرہ سو دیئے تھے۔فلاں رائٹر کتنا بڑا اور مشہور ہے۔ اسے میں نے دو ہزار روپے دیئے تھے۔صرف رحیم گل کو میں نے ساڑھے تین ہزار روپے ایک فلم کا معاوضہ دیا تھا مگر اس کی وجہ کچھ اور تھی۔''

ہم خاموش ان کا منہ دیکھتے رہے۔آغا صاحب نظریں جھکا کر کاروبار کی بات کرنے کے عادی تھے۔اس وقت بھی انہوں نے نگاہیں نیچی کیں اور کہنے لگے ''تم نوجوان اور فریش ہو۔تمہارے خیالات بھی فریش ہیں۔میں تمہیں ویسے بھی پسند کرتا ہوں۔بس میں تمہیں فلم لکھنے کا معاوضہ تین ہزار روپے دوں گا۔ٹھیک ہے ؟''

ہم نے کہا ''آغا صاحب۔یہ تو بہت کم ہے۔''

بولے ''آفاقی۔اتنے پیسے میں نے پہلے کسی رائٹر کو نہیں دیئے اور بات یہ ہے کہ ابھی تمہارا بھاؤ بھی نہیں کھلا ہے۔''

ہم نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا ''جی ؟''

''بات یہ ہے کہ جب ریس میں کوئی گھوڑا اِن کرتا ہے تو اوپر اسکرین پر اسکا بھاؤ لکھ دیا جاتا ہے۔تمہاری ابھی تک کوئی بھی فلم ہٹ نہیں ہوئی ہے اس لئے فلم انڈسٹری میں بھاؤ نہیں کھلا ہے۔جب فلم ہٹ ہو گی تب اور بات ہو گی۔''

ہماری آغا صاحب سے کافی بے تکلفی تھی۔معاوضے کی بات کا قصّہ الگ ہے لیکن دوسرے موضوعات پر ہم ان سے کھل کر بات کر سکتے تھے۔اس لئے ہم نے کہا ''آغا صاحب، ہم اس طرح سوچتے ہیں کہ آپ کی فلم ساڑھے تین چار لاکھ روپے میں بنے گی۔اس میں رائٹر کا کتنا حصہ ہے ؟ آپ کچھ دیر پہلے ہمالیہ والا کو چند سین کے عوض آٹھ دس ہزار روپے معاوضہ دینے پر آمادہ ہو گئے تھے حالانکہ وہ ہمارے لکھے ہوئے تھوڑے سے ڈائیلاگ ہی بولیں گے۔مگر جو رائٹر پورا اسکرپٹ لکھے گا اس کو صرف تین ہزار ؟''

آغا صاحب تھوڑے مسکرائے "یار تم بحث بہت زیادہ کرتے ہو۔ آرٹسٹ کی بات اور ہوتی ہے اور پھر تمہارا بھاؤ۔۔۔"

ہم نے کہا "معاف کیجئے آغا صاحب۔ ابھی آپ نے جن رائٹرز کا نام لیا ہے ان سب کا بھاؤ کھل چکا ہے۔ ایک صاحب کی تین چار فلمیں سپر ہٹ ہو چکی ہیں۔ دوسرے کی بھی کئی فلمیں ہٹ ہیں۔ مگر ان کا بھاؤ نہیں کھلا۔ جب کسی ہیرو یا ہیروئن کی فلم ہٹ ہوتی ہے تو آپ کے بقول اس کا بھاؤ کھل جاتا ہے۔ مگر کئی ہٹ فلموں کے رائٹرز کا بھاؤ کیوں نہیں کُھلتا۔"

آغا صاحب خلاف عادت کافی طویل گفتگو کر چکے تھے اور مزید مذاکرات کیلئے تیار نہ تھے۔ بولے "یار تمہاری عقل کہاں چلی گئی ہے؟ سنا ہے تم تیز لکھتے ہو۔ تم سال میں چھ فلمیں لکھو گے۔ یعنی اٹھارہ ہزار روپے کماؤ گے۔ ایک سال میں اٹھارہ ہزار کم آمدنی تو نہیں ہے۔ تم اور کیا چاہتے ہو؟"

ہم نے کہا "آغا جی۔ ہمیں تو بہت شرم آرہی ہے کہ رائٹر کا بھاؤ ایک معمولی ڈانسر کے بھاؤ سے بھی کم ہے۔"

"شرم کو چھوڑو۔ بولو ہاں کہ ناں؟"

ہم نے جی کڑا کر کہا "دیکھئے نا آغا صاحب، آپ تو"

انہوں نے بے چینی سے ہماری بات کاٹ دی "ٹھیک ہے۔ آؤ اندر چلیں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے اور ہم ان کے پیچھے دوبارہ ان کے دفتر میں داخل ہو گئے۔ ہمارے پہنچتے ہی ملازم نے شیشے کی ٹاپ والی بڑی میز پر خوب صورت قیمتی پیالیوں میں چائے لا کر رکھ دی۔ انگلش بسکٹ (جو اس زمانے میں نایاب تھے) اور شیزان کا کیک بھی موجود تھا۔

چائے کا دور چلا اور اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ کچھ دیر بعد ہم اٹھ کر کھڑے ہو گئے "اچھا آغا صاحب اجازت دیجئے" یہ کہہ کر ہم نے وہ پتلی سی کاپی نجم نقوی صاحب کے سامنے رکھ دی اور دفتر سے باہر نکل گئے۔ نجم نقوی صاحب کی حیرت زدہ آواز ہمارا پیچھا کرتی رہی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ سارے معاملات طے پا چکے ہیں مگر کاپی ان کے حوالے کرنے پر وہ واقعی حیران رہ گئے تھے۔

ہم دفتر سے باہر نکلے اور کُھلی فضا میں ایک لمبی سانس لے کر یہ سوچتے ہوئے چل پڑے کہ ہم نے آج جو حرکت کی

ہے وہ غلط ہے یا درست ؟اتنے بڑے آدمی کی اتنی اچھی پیشکش مسترد کر کے ہم نے حماقت تو نہیں کر دی ؟اتنی دیر میں نجم نقوی صاحب تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے آ گئے۔

''میاں کیا بات ہے ؟''

ہم نے کہا''بس۔ معاوضے پر تصفیہ نہیں ہو سکا۔''

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے ''جیسی اللہ کی مرضی۔ میرا خیال تھا کہ تم ہی میرے ساتھ کام کرو گے ، خیر۔''

وہ ہمارا کندھا تھپک کر واپس لوٹ گئے۔

اس رات ہم بہت دیر تک بستر میں لیٹے سوچتے رہے کہ بھائی آخر تم چاہتے کیا ہو؟ اخبار نویسی تو تم چھوڑ ہی چکے ہو حالانکہ کئی سال وہاں صرف کئے ہیں۔اب اتنے بڑے فلم ساز کی آفر بھی مسترد کر دی۔انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اس زمانے میں رائٹر کو تین ہزار روپے معاوضہ شاذ و نادر ہی ملتا تھا اور پھر سال میں چھ فلمیں مل رہی تھیں۔یعنی اٹھارہ ہزار نقد جو کہ اس زمانے میں ایک معقول رقم تھی۔ آغا گل جیسے فلم ساز اور نجم نقوی جیسے ہدایت کار کے ساتھ کام کر کے ہماری شہرت اور وقار میں بھی خاصا اضافہ ہو سکتا تھا۔اس کے باوجود حماقت کر آئے۔

مگر ہم نے ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیا تو ایک اور ہی شکل ذہن میں ابھرنے لگی۔ یہ تو ہم پہلے جان چکے تھے کہ کارکن صحافی کبھی خوشحال نہیں ہو سکتا۔اب ہم پر یہ راز منکشف ہوا تھا کہ رائٹر کی حیثیت سے بھی ہم کبھی خوشی کا منہ نہیں دیکھ سکیں گے۔ تو پھر کیا کریں؟ صحافت کی طرح فلمی صنعت کو بھی خیر باد کہہ دیں؟اس کے بعد ہمارا ٹھکانا کہاں ہو گا۔ ساری زندگی میں صرف دو ہی کام تو سیکھے ہیں۔ان ہی سے کنارہ کش ہو گئے تو کریں گے کیا؟ ہمیں تو کوئی اور کام آتا ہی نہیں ہے۔

یکایک خیال آیا۔اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ فلم ساز بن جاؤ۔ خود ہی کہانی لکھو اور خود ہی فلم بناؤ۔ قسمت میں ہو گا تو منافع بھی مل جائے گا۔

مگر سرمایہ کہاں سے آئے گا؟

سرمایہ اس زمانے میں فلم سازی کیلئے بنیادی مسئلہ نہیں تھا۔اوّل تو یہ کہ فلموں کی لاگت ہی بہت کم تھی۔ دوسرے یہ

کہ بڑے اداکار کئی فلموں میں ادھار پر کام کر لیتے تھے۔ فلم مکمل ہونے کے بعد انہیں معاوضہ ادا کر دیا جاتا تھا۔ اسٹوڈیو کی خدمات بھی ادھار پر حاصل ہو جاتی تھیں بلکہ خام فلم بھی اسٹوڈیو کے مالک ادھار پر فراہم کر دیا کرتے تھے۔ مگر یہ رعایت صرف بھروسے کے لوگوں کو حاصل تھی۔ جن کی کاروباری ساکھ بھی اہم ہو اور فلمی دنیا میں ان کا نام بھی ہو۔ ورنہ ڈھیروں سرمایہ لے کر آنے والے نوواردوں سے بھی فلم کے لوگ سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔

اس رات ہمیں بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ ہم کہانی نویس کے طور پر کام ہی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہمارا مدّعا صرف یہ تھا کہ اگر ہم خود اپنی فلمیں بنائیں گے تو اپنی پسند کے موضوعات پر اسکرپٹ لکھیں گے اور اپنی مرضی کے مطابق انہیں فلمائیں گے تو اس طرح ایک تو ہم دوسرے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے محتاج ہو کر نہیں رہ جائیں گے دوسرے یہ کہ کامیابی کی صورت میں ہمیں مجبوراً ہر ایک کی کہانیاں لکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی اور ہم کو چوائس کی آزادی ہو گی۔ ایسا نہیں ہو گا کہ پیٹ بھرنے کیلئے ہم ہر ایک کی بات ماننے پر مجبور ہو جائیں۔

دوسرے دن ہم صبح اٹھے تو اپنی ذاتی فلم بنانے کا عزم کر چکے تھے۔ ہمارے پاس ایک کہانی کا آئیڈیا اور اسکرین پلے موجود تھا جو ہمیں بے حد پسند تھی مگر کوئی فلم ساز اس کو خریدنے پر آمادہ نہیں تھا۔ سب سے پہلے تو ہم نے اپنے دوست ہدایت کار حسن طارق کو یہ کہانی سنائی۔ وہ اس زمانے میں ''شکوہ'' بنانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ''شکوہ'' کی کہانی انہیں کافی عرصے سے اکسا رہی تھی اس لئے انہوں نے پہلے اسے فلمانے کا فیصلہ کر لیا۔

اقبال شہزاد ان دنوں کراچی میں رہتے تھے اور خلیل قیصر کو انہوں نے ایک فلم کی ہدایت کاری کیلئے سائن کیا تھا۔ ہم نے یہی کہانی اپنے دوست اقبال شہزاد کے حوالے کر دی۔ وہ اسے لے کر کراچی چلے گئے۔ وہاں سے ان کا فون آیا کہ صوفی صاحب۔ کہانی تو ٹھیک ہے مگر اس میں تفریح کا پہلو زیادہ نہیں ہے۔ انہوں نے لاہور آ کر وہ کہانی ہمیں لوٹا دی۔ جب ہم نے کہا کہ اپنے ڈائریکٹر کی بھی رائے لے لو تو انہوں نے یہ اسکرین پلے خلیل قیصر کو پڑھنے کیلئے دے دیا۔ خلیل قیصر نے دو دن بعد مخصوص انداز میں اپنے سر کے بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے ہم سے کہا ''یار آفاقی صاحب۔ کہانی تو اچھی ہے مگر یہ سوشل ٹائپ کی کہانی ہے۔ یہ میرا ٹائپ نہیں ہے۔ کوئی انقلابی موضوع ہو تو بتاؤ۔'' لیجئے۔ ایک اور ہدایت کار نے اس کو مسترد کر دیا۔

چوہدری محمد رفیع بمبئی سے آئے ہوئے ایک ہدایت کار تھے۔ تعلیم یافتہ اور نہایت شائستہ بزرگ تھے۔ وہ آج کی خاتون سیاسی رہنما مہناز رفیع کے والد تھے۔ اسی زمانے میں مہناز رفیع نے ایم ،اے کرنے کے بعد ٹی وی ڈراموں میں کام کیا اور بہت داد سمیٹی تھی۔ چوہدری رفیع صاحب کو کسی نے ہدایت کار سائن کیا تو انہوں نے ہم سے فرمائش کی کہ ''عورت'' کے موضوع پر کوئی اچھی سی کہانی ان کیلئے لکھ دیں۔ ہم نے فوراً اپنا اسکرین پلے نکالا اور جھاڑ پونچھ کر چوہدری صاحب کے حوالے کر دیا۔ چوہدری رفیع نہایت وضع دار اور لحاظ والے انسان تھے۔ دو تین دن تو خاموشی رہی۔ پھر ایک روز ہم شاہ نو اسٹوڈیو گئے تو چوہدری صاحب نے بڑی لمبی تمہید باندھی۔ اس کا لب لباب یہ تھا کہ ہماری کہانی ''عورت'' کے موضوع سے انصاف نہیں کرتی۔

انہوں نے کہا ''کوئی اور اچھی سی کہانی لکھ دیجئے نا۔''

چوہدری صاحب اس زمانے میں شاہ نور اسٹوڈیو کے جنرل منیجر بھی تھے۔ ہم نے خاموشی سے اپنے کاغذات سنبھالے اور وعدہ کیا کہ ان کیلئے کوئی اور کہانی سوچیں گے۔

یہ اسکرین پلے ہم نے کچھ اور فلم سازوں کو بھی پڑھنے کیلئے دیا تھا اور اس کے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کر دیا تھا مگر کسی کو یہ کہانی پسند نہ آئی۔

اسی دوران میں حسن طارق صاحب کی فلم ''شکوہ'' ہٹ ہو گئی۔ اس فلم کا اسکرین پلے ہم نے لکھا تھا۔ مکالمے ساجھے کے تھے۔ یعنی ہم نے اور ریاض شاہد نے مل کر لکھے تھے۔ چند ماہ گزرنے کے بعد ہم نے ایک دن حسن طارق کو یاد دلایا کہ ہمارے پاس ایک کہانی رکھی ہوئی ہے۔ وہ اسے کیوں نہیں بنا لیتے۔

طارق صاحب نے وہ اسکرین پلے دوبارہ ہم سے لے لیا اور بہت غور سے پڑھنے کے بعد بولے ''آفاقی صاحب، یہ کہانی ''شکوہ'' سے ملتی جلتی ہے۔ ابھی ہم نے ''شکوہ'' بنائی ہے۔ دوبارہ اس قسم کی فلم بنانا مناسب نہ ہوگا۔ اور پھر یہ کہانی '' شکوہ'' کی کہانی کے مقابلے میں ہلکی ہے۔''

اس روز ہم نے جی میں ٹھان لی تھی کہ اب ہم خود ہی اس کہانی کا مکمل اسکرپٹ لکھیں گے اور اسے خود ہی پروڈیوس کریں گے۔ چنانچہ ہم اس کہانی کا اسکرپٹ لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس کے بعض حصے اس قدر جذباتی اور حسرت

انگیز تھے کہ لکھتے لکھتے ہمارا دل بھر آتا تھا۔ سین لکھتے وقت اکثر ہم یوں محسوس کرتے ہیں جیسے کہ یہ منظر ہمارے سامنے موجود ہے۔اس لئے جذباتی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ماں ہمیشہ سے کمزور پہلو ہے۔اس کہانی میں ماں اور بیٹیوں کے سین لکھتے ہوئے بعض اوقات ہمارا جی بھر آتا تھا۔ہماری آنکھوں سے آنسو تو بہت مشکل سے نکلتے ہیں مگر دل بھاری ہو جاتا ہے اور یہ غم والم کا موڈ کئی گھنٹے تک طاری رہتا ہے۔یہ کہانی لکھتے ہوئے بھی ہم اکثر ویسے ہی تجربات سے گزرے۔ہلکے پھلکے مناظر ہمیں مسرور بھی کر دیتے تھے۔لیکن المیہ مناظر کا اثر بہت دیر تک رہا کرتا تھا۔ اس طرح روتے ہنستے ہم نے یہ اسکرپٹ مکمل کیا۔دو چار دن اس کو میز کی دراز میں رکھنے کے بعد دوبارہ اس کا مطالعہ کیا اور نظر ثانی کی۔بعض جگہ اضافہ کیا۔کچھ حصے حذف کر دیئے۔دوبارہ اسکرپٹ پڑھتے ہوئے بھی ہم بعض اوقات بہت غمگیں اور دکھی ہو گئے۔غرضیکہ یہ ایک عجیب تجربہ تھا۔ہمیں نہ کسی ہدایت کار کی رائے لینے کی ضرورت پیش آئی تھی اور نہ فلم ساز یا یونٹ کے دوسرے حضرات نے قیمتی مشوروں سے نوازا تھا۔یہ خالصتاً ہمارا اپنا اسکرپٹ تھا۔ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک،ہر طرح کے دباؤ سے آزاد۔

اسکرپٹ پر نظر ثانی کرتے ہی ہم حسن طارق صاحب کے پاس جا دھمکے۔طارق صاحب بہت عجیب و غریب شخصیت تھے۔انتہائی سادہ اور صاف گو بلکہ منہ پھٹ۔اپنی رائے کا اظہار کرنے پر آتے تو کسی کا لحاظ نہ کرتے تھے۔بہت اعلیٰ پائے کے ہنرمند تھے۔کہانی، اسکرین پلے اور مکالموں کا انہیں بہت زیادہ شعور تھا۔افسانوی اور شعری ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ادیبوں، صحافیوں، شاعروں اور فن کاروں کی محفلوں میں نوعمری ہی سے بیٹھتے رہے تھے۔فلم کا انہیں دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ بعد میں جب کامیاب ہدایت کار بن گئے تو فلم ہی انکا اوڑھنا بچھونا تھا۔اس کے سوا انہیں کسی اور چیز کا ہوش ہی نہ تھا۔عمر بھر ان کی یہی عادت رہی۔ انہوں نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز فلم ''مسکراہٹ'' کا اسکرین پلے اور مکالمے لکھ کر کیا تھا۔اس فلم کے ہدایت کار این ای اختر تھے۔پھر وہ سیف الدین صاحب کی فلم ''باپ کا گناہ'' میں جعفر ملک صاحب کے اسسٹنٹ رہے۔کہانی اور اسکرپٹ کے بارے میں ان کی رائے عموماً جامع اور صائب ہوتی تھی۔لیکن ہر شخص کی ذاتی پسند اور ناپسند ہوتی ہے اور ترجیحات مختلف ہوتی ہیں۔جن معدودے چند ہدایت کاروں کے بارے میں ہماری رائے ہے کہ انہیں کہانی اور مکالموں کا اچھا شعور ہے ان میں حسن طارق بھی

شامل تھے۔ کبھی کبھی وہ کہانی پر بات چیت کے دوران میں روانی میں ایسے خوب صورت اور بر محل فقرے بول جاتے تھے جو ہم فوراً نوٹ کر لیا کرتے تھے اور انہیں کسی تبدیلی کے بغیر ہی اسکرپٹ میں شامل کر لیتے تھے۔

اس جان کاری کے پیش نظر جب وہ کسی کہانی کے بارے میں ہم سے اتفاق نہیں کرتے تھے تو ہم واقعی سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ اگر ان کی رائے کو درست سمجھتے تو اپنا خیال بدل لیتے لیکن اگر اپنی رائے کی درستی پر بھروسا ہوتا تو اس پر قائم رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے دو تین بار ہماری مذکورہ کہانی کو فلمانے میں پس و پیش کیا تو ہمیں بہت غصّہ آیا اور مایوسی بھی ہوئی۔ مگر یہ کہانی ہمیں بے حد پسند تھی اور یقین تھا کہ اس پر ایک اچھی فلم بنائی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہم نے بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

اسکرپٹ مکمل ہوا تو ہم اس وقت تک فلم کا کوئی نام تجویز نہیں کر سکے تھے۔ بعض کہانی نویس اسکرپٹ لکھنے سے پہلے ہی فلم کا اچھا سا نام تجویز کر لیتے ہیں۔ ہماری پرابلم یہ ہے کہ ہم کہانی مکمل ہونے کے بعد بھی کوئی موزوں نام سوچنے میں کافی وقت لگا دیتے ہیں مگر طارق صاحب کو فلم کے موزوں اور خوب صورت نام فوراً سوجھتے تھے۔

طارق صاحب نے سویرے سویرے ہمیں اپنے گھر میں دیکھا تو مسکرائے۔ سمجھ گئے کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ وہ بھی جس روز علی الصبح ہمارے گھر آ جاتے تھے تو ہم کو بھی یہی خیال گزرتا تھا کہ ہو نہ ہو کوئی خاص بات ضرور ہے اور اکثر ایسا ہی ہوتا بھی تھا۔

چائے کا دور چلنے کے بعد ہم نے اپنے اسکرپٹ کا لفافہ نکالا اور طارق صاحب کے سپرد کر دیا۔

''یہ کیا ہے آفاقی صاحب'' انہوں نے پلندہ دیکھ کر پوچھا۔

ہم نے کہا ''طارق صاحب۔ ہم نے اسی کہانی کا مکمل اور تفصیلی اسکرپٹ لکھا ہے۔ آپ اسے پڑھنے کے بعد اپنی رائے دیجئے۔ اسے ہم خود پروڈیوس کریں گے۔ آپ اتنا بتا دیں کہ کیا اس کی ڈائریکشن دیں گے؟''

وہ مسکرائے ''آپ بھی اس کہانی کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے''

ہم نے کہا ''اگر یہ اسکرپٹ بھی آپ کو پسند نہ آیا تو پھر ہم اس کہانی کو فراموش کر دیں گے۔''

دوسرے دن ابھی ہم سوئے پڑے تھے کہ طارق صاحب کی کار کا ہارن گونجنے لگا۔ نوکر نے انہیں بٹھایا اور حسب

معمول چائے پیش کر دی مگر وہ بار بار کہہ رہے تھے " آفاقی صاحب کو جگادو۔"
ہم جھٹ پٹ منہ ہاتھ دھو کر پہنچے تو وہ صوفے پر نیم دراز سگریٹ پی رہے تھے۔ ہمیں دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گئے اور ایک شریر مسکراہٹ ان کے چہرے اور آنکھوں میں نمودار ہوئی۔ کہنے لگے "آفاقی صاحب۔ یہ تو کلاس چیز ہے۔ بہت اچھی کہانی ہے۔"
ہم نے کہا "ہم تو کب سے آپ سے کہہ رہے ہیں مگر آپ مانتے ہی نہیں۔"
بولے " آپ کا خیال ٹھیک تھا۔ میں اسے اس قدر تفصیل کے ساتھ اپنے تخیل میں نہیں بسا سکا تھا۔ یہ تو واقعی بہت اچھی کہانی ہے۔ اسے فوراً شروع کر دینا چاہئے۔"
ان دنوں میں بھی وہ کافی مصروف ہدایت کار تھے۔ یہ 1963ء کی بات ہے۔ انہوں نے پوچھا "کیا آپ اسے خود پروڈیوس کرنا چاہتے ہیں؟"
"جی ہاں"!
"بہت اچھی فلم بنے گی۔ شروع کب کر رہے ہیں؟"
ہم نے کہا "ایک صاحب ہمارے ساتھ پارٹنر شپ کر رہے ہیں اور وہ چالیس ہزار روپیہ بھی لگائیں گے۔ کسی بات میں دخل نہیں دیں گے بلکہ وہ تو یہاں رہتے بھی نہیں ہیں۔ حیدر آباد میں ان کا پلاسٹک کا کارخانہ ہے۔"
"بس تو بسم اللہ کر دیجئے۔" انہوں نے مضطرب ہو کر ایک نئی سگریٹ سلگائی "اور ہاں۔ اس کا نام کیا رکھا ہے؟"
ہم نے کہا "نام تو ابھی سوچا ہی نہیں۔"
کہنے لگے "مجبور" کیسا نام رہے گا؟"
ہمیں یہ نام بہت پسند آیا۔ چنانچہ اس فلم کا نام "مجبور" منتخب کیا گیا۔

اگلے چند روز میں اداکاروں کے بارے میں غور و خوض شروع ہو گیا۔ طارق صاحب دو مرکزی کرداروں کیلئے کمال اور حبیب کے حق میں تھے "کنیز" کے مرکزی کردار کیلئے موزوں ترین اداکارہ صبیحہ خانم تھیں لیکن وہ اداکاری سے کنارہ کش ہو چکی تھیں۔ ہمارے سامنے دوسری چوائس یاسمین تھیں۔ فلم کے دوسرے کرداروں کیلئے بھی کچھ فن

کاروں کا انتخاب کر لیا گیا اور ہم نے اداکاروں سے مذاکرات بھی شروع کر دیئے۔
کمال نے ہماری توقع سے کہیں زیادہ معاوضہ طلب کیا حالانکہ وہ ہمارے بچپن کے دوست تھے۔ ہم ہی نے انہیں فلمی دنیا میں متعارف کرایا تھا اور جب انہوں نے اپنی فلم ''جوکر'' کا اعلان کیا اور ہمیں رائٹر بننے کا شرف بخشا تو معاوضے کے بارے میں ہم سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ نہ ہم نے کوئی سوال کیا۔ یہ فلم چار پانچ سال میں جا کر مکمل ہوئی اور ہم اسے حسب ضرورت تبدیل کرتے اور لکھتے رہے۔ پیسوں کا تذکرہ ہی درمیان میں نہ آیا۔ فلم کی ریلیز کے وقت انہوں نے ایک چیک ہماری جیب میں ڈال دیا اور کہا ''سوفی۔ اسے معاوضہ مت سمجھنا۔ یہ بس ٹوکن ہے۔ یار مجھے اس فلم میں کافی نقصان ہوا ہے۔''

حالانکہ ہم جانتے تھے کہ یہ درست نہیں ہے۔ مگر ہم نے کوئی عُذر نہیں کیا۔ ان کی فرمائش تھی کہ ان کی موجودگی میں ہم چیک کو بند ہی رہنے دیں۔ وہ چائے پی کر رخصت ہو گئے تو ہم نے بڑے اشتیاق سے چیک پر نظر ڈالی۔ یہ پانچ سو روپے کا چیک تھا جو ہماری کہانی نویسی کا کل معاوضہ تھا۔ اس وقت تک ہم کہانی نویس کی حیثیت سے پہچانے بھی جاتے تھے اور اس سے کہیں زیادہ معاوضہ لیا کرتے تھے۔ مگر ''حسابِ دوستاں دردِل'' کے مطابق ہم نے پھر کبھی اس موضوع پر ان سے بات نہیں کی۔
اب ہم اپنی پہلی فلم کیلئے ان سے بات کر رہے تھے اور معاوضے کا فیصلہ پہلے ہی کرنا چاہتے تھے تو انہوں نے بڑی بے تکلفی سے کہا'' تمہیں تو پتا ہے کہ آج کل میں ''اتنا'' معاوضہ لیتا ہوں اور پانچ ہزار ایڈوانس ہے۔''
ہم نے کہا'' یہ بتاؤ کہ ہم سے کتنا معاوضہ لو گے؟''
ہنس کر بولے '' یار تم سے کوئی بزنس تو نہیں کروں گا۔ چلو تم پانچ سو کم دے دینا۔''
ہم نے کہا'' یار شرم کرو، یہ تو بہت زیادہ ہے۔''
''چلو پانچ سو اور کم کر دو''
ہم نے کہا'' سوچیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم ایڈوانس نہیں دیں گے۔ تھوڑی رقم فلم بننے کے دوران میں دیں گے اور بیلنس ریلیز پر۔''

وہ سر کھجانے لگے ”یار میں ایسا کرتا تو نہیں ہوں اس لئے کہ پروڈیوسروں کا کوئی بھروسا نہیں ہے مگر تمہاری بات اور ہے۔ تمہارے ساتھ رعایت کر دوں گا۔“

ہم چلے آئے مگر ان کے اس کاروباری روّیے کا ہمیں بہت دکھ ہوا۔ کم از کم کمال سے ہمیں یہ امید نہ تھی۔ حبیب صاحب سے ہماری یاداللہ بہت پرانی تھی۔ جب لقمان صاحب نے اپنی تاریخی فلم ”ایاز“ کیلئے انہیں منتخب کیا تھا اس وقت سے ہماری ان سے ملاقات تھی۔ کافی میل جول تھا۔ ہم نے اخباروں میں انہیں پبلسٹی بھی دی تھی۔ بے شمار دن اور راتیں ہم نے ایک ساتھ گزاری تھیں۔ وہ بالکل نئے اداکار تھے اور نئے اداکاروں کے ساتھ فلمی دنیا کافی بے اعتنائی برتتی ہے۔ مگر ہم نے ہر موقع پر ان کا ساتھ دیا تھا۔ پھر وہ کامیاب ہیرو بن گئے اور اس کے بعد فلم ساز۔ وہ بہت بااخلاق آدمی ہیں۔ باتیں بھی بہت میٹھی کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو کمال نے کیا تھا۔

بولے ” آفاقی صاحب۔ آپ سے میں کاروبار تو نہیں کروں گا۔ آپ جو مناسب سمجھیں دے دیجئے گا۔“

”پھر بھی۔ رقم کا فیصلہ ہو جائے تو بہتر ہے۔“

وہ ہنسنے لگے ”جلدی کیا ہے۔ جب فلم شروع ہو گی تو وہ بھی ہو جائے گا۔ مگر آپ اسے مسئلہ نہ بنائیں۔“

ہم نے کہا ”ہم ایڈوانس رقم نہیں دیں گے اور معاوضہ فلم مکمل ہونے پر ادا کریں گے۔“

”فکر کیوں کرتے ہیں۔ مجھے آپ پر بھروسا ہے۔“

اداکار حبیب کے اس روّیے نے ہمیں بہت متاثر کیا۔

حسن طارق صاحب حبیب کے انتخاب سے زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ دراصل ہمیں بھی یہ انتخاب زیادہ موزوں نہیں لگا تھا مگر دوسرے دستیاب ہیرو بالکل ہی ناموزوں تھے۔ مثلاً سنتوش کمار، درپن، سدھیر، یوسف خاں ان کرداروں کیلئے عمر کے اعتبار سے مناسب نہیں تھے۔ لے دے کے کمال اور حبیب ہی نظر آتے تھے حالانکہ ہمارے خیال میں وہ بھی کرداروں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے تھے۔ مگر کوئی اور چارہ نہ تھا۔

یاسمین سے ہماری پرانی ملاقات اور بے تکلفی تھی۔ انہوں نے لقمان صاحب کی فلموں میں بھی کام کیا تھا جن سے ہم بھی وابستہ رہے اور اس زمانے میں فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں ہمارا کافی وقت ساتھ گزرتا تھا۔ وہ ادب دوست، خوش

گفتار اور خوش مزاج خاتون ہیں۔ مزاح کا ذوق بھی ہے۔ شعر و ادب سے آگاہی رکھتی ہیں اس لئے ان سے گاڑھی چھنتی تھی۔

ہماری یاسمین سے اس وقت سے ملاقات تھی جب وہ کیمرا مین جعفر شاہ بخاری کی بیگم تھیں۔ جعفر شاہ پاکستان کے بہترین کیمرا مینوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ بعد میں وہ فلم ساز اور ہدایت کار بھی بنے اور بہت اچھی فلمیں بنائیں فلم ''بھروسا'' کے فلم ساز اور ہدایت کار جعفر شاہ ہی تھے۔ اس فلم سے ریاض شاہد کہانی نویس اور مکالمہ نگار کی حیثیت سے نمایاں ہو کر سامنے آئے اور پھر انہوں نے پیچھے پلٹ کر نہ دیکھا۔ اس اعتبار سے ریاض شاہد کو فلمی صنعت کے سامنے پیش کرنے کا کریڈٹ جعفر شاہ بخاری کو جاتا ہے ان دونوں کی اولاد میں ایک بیٹا ناصر بخاری ہیں جو آج کل انگلستان میں ہیں۔ وہاں انہوں نے ایک انگریز لڑکی سے شادی کی۔ چار بچوں کے باپ بنے اور پھر میاں بیوی میں علیحدگی ہو گئی۔

جعفر شاہ بخاری کے ساتھ یاسمین کا ساتھ کافی طویل رہا مگر پھر انہوں نے جعفر شاہ بخاری سے طلاق حاصل کر لی اور کچھ عرصے بعد سیّد شوکت حسین رضوی سے شادی کر لی۔ وہ اب دو بیٹوں کی ماں ہیں۔ یہ دونوں اب شاہ نور اسٹوڈیو میں شوکت صاحب کے حصّے کا انتظام سنبھالتے ہیں۔

یاسمین کا نام پہلے زرینہ ریشماں تھا۔ وہ بمبئی میں بھی کچھ عرصے فلمی صنعت سے وابستہ رہیں۔ پھر پاکستان آنے کے بعد کئی فلموں میں اداکاری کی۔ پہلے وہ معاون اداکاروں کے طور پر کام کرتی رہیں۔ پھر ہیروئن بن گئیں۔ ہیروئن کی حیثیت سے ان کی پہلی فلم پنجابی میں تھی۔ اس کا نام ''جبرو'' تھا اور اس میں ہیرو کے طور پر پہلی بار اکمل کو پیش کیا گیا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس فلم میں سبھی اہم لوگ پہلی بار ذمّے داریاں نبھا رہے تھے۔ اس کے ہدایت کار مظفر طاہر تھے۔ مصنّف سکے دار تھے۔ ہیرو اکمل اور ہیروئن یاسمین تھیں۔ ویلن اور کامیڈین کے روپ میں طالش کو پیش کیا گیا تھا۔ اس کے فلم ساز فقیر صلاح الدین کا تعلق لاہور کی معروف فقیر فیملی سے تھا۔ ''جبرو'' بے حد کامیاب ثابت ہوئی۔ اس طرح یونٹ کے سبھی لوگوں نے شہرت اور مرتبہ حاصل کیا۔

یاسمین کا قد چھوٹا تھا مگر اللہ نے اسکے بدلے اسے اور بہت کچھ دیا تھا۔ چہرے مہرے اور جسم کی ساخت کے اعتبار سے

ان کا شمار بہت معیاری ایکٹریسوں میں کیا گیا لیکن وہ صفِ اوّل میں نمایاں نہ ہو سکیں۔ حقیقی زندگی میں وہ بہت سنجیدہ اور ہنسنے ہنسانے سے پرہیز کرنے والی ہستی نظر آتی ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ بہت زندہ دل اور ہنس مکھ ہیں۔ اچھے اور شائستہ مذاق اور شعر و شاعری کو پسند کرتی ہیں۔ لیکن آغاز ہی سے ان پر المیہ اداکارہ کا ٹھپا لگ گیا اس لئے وہ فلمی روایات کے مطابق ایسے ہی کرداروں کیلئے وقف ہو کر رہ گئیں۔ حالانکہ وہ ہر طرح کے کردار یکساں مہارت سے ادا کر سکتی ہیں۔

ہم یاسمین سے ملے اور انہیں یہ اطلاع دی کہ ہم فلم ساز بننے والے ہیں۔ انہوں نے ہمیں نہ صرف مبارک باد دی بلکہ فوراً ہمارا منہ بھی میٹھا کرا دیا۔ ہم انہیں کہانی کے بارے میں بتاتے رہے جو انہیں بہت پسند آئی۔ انہوں نے کسی شرط کے بغیر ہی ہمیں فلم کیلئے تاریخیں دینے کا وعدہ کر لیا۔ معاوضہ وغیرہ کی بات وہ گول ہی کر گئیں اور کہا کہ آپ کی پہلی فلم ہے۔ معاوضے کا کیا ہے، وہ تو آپ دے ہی دیں گے۔ ان کے اس رویّے سے ہماری بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس فلم میں ایک اہم کردار ان کے شوہر کا بھی تھا جو شادی کے دو سال بعد ہی حادثے میں ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس کردار کیلئے ہم مناسب اداکار کی تلاش میں تھے۔ پھر سوچا کہ یہ ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ کسی بھی بڑے اور مقبول اداکار کو مہمان اداکار کے طور پر کاسٹ کر لیں گے۔ فلم میں ایک اور اہم کردار نوخیز ہیروئن کا بھی تھا۔ اس لڑکی میں کہانی کے دونوں ہیرو دلچسپی رکھتے تھے۔ زیبا اس زمانے میں اُبھرتی ہوئی اداکارہ تھیں۔

فضل کریم فضلی صاحب نے کراچی میں اپنی پہلی فلم ''چراغ جلتا رہا'' بنائی تو اس میں خود فضلی صاحب سمیت سبھی قابل ذکر لوگ نئے تھے۔ فضلی صاحب سبطین فضلی صاحب کے سب سے بڑے بھائی تھے۔ ادیب، شاعر اور بہت سینئر آئی سی ایس افسر تھے۔ بہت اعلیٰ اور ذمے دار عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انہیں یکایک فلم بنانے کی سوجھی اور انہوں نے ''چراغ جلتا رہا'' کا آغاز کر دیا۔ اس فلم کی کہانی اور نغمے ان ہی کے تحریر کردہ تھے۔ فلم ساز اور ہدایت کار بھی وہی تھے۔ ان کی خود اعتمادی دیکھئے کہ انہوں نے الف سے یے تک سبھی نئے لوگ اپنے یونٹ میں شامل کئے حالانکہ خود بھی اس میدان میں نووارد تھے۔ زیبا، دیبا، محمد علی اور کمال ایرانی کے علاوہ کئی دوسرے اداکاروں نے اس فلم میں پہلی بار کام کیا تھا۔

''چراغ جلتارہا'' ایک مقصدی اوراصلاحی فلم تھی۔ کراچی میں تو یہ بہت کامیاب ہوئی لیکن پنجاب میں اسے وہ پذیرائی نہ مل سکی۔ پھر بھی اسے کامیاب ہی کہا جاسکتا ہے۔ حکومت نے اس فلم کا تفریحی ٹیکس بھی معاف کر دیا تھا اور فضلی صاحب کوایک صاف ستھری فلم بنانے پر بہت سراہا گیا تھا۔اس فلم میں ایک دبلی پتلی، نازک، دھان پان سی نوعمر خوبصورت لڑکی کوانہوں نے ہیروئن کے طور پر منتخب کیا تھا جس کا نام شاہین تھا مگر فضلی صاحب نے فلم کیلئے اسے زیبا کا نام دیا۔ زیبا نے اس فلم کے بعد فلمی دنیا میں تہلکہ مچادیا تھا اور صف اوّل کی ہیروئن بن گئی تھیں۔ان کے ساتھ ایک نوجوان عارف کو ہیرو کے طور پر متعارف کرایا گیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اس فلم کے بعد فلمی اُفق سے غائب ہوگئے حالانکہ ان کے دوسرے رفیقوں نے نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ اس میں ان کی شخصیت اور اداکارانہ عدم صلاحیت کا بھی دخل تھا۔ دیبا کو بھی اس فلم میں پہلی بار ایک اہم کردار سونپا گیا۔آگے چل کر وہ بھی ایک کامیاب اور مقبول ہیروئن بن گئیں۔ محمد علی اس فلم کے ویلن تھے مگر اپنی وجاہت اور کارکردگی کی بناء پر بے حد پسند کئے گئے۔ ''چراغ جلتارہا'' کے بعد وہ چند فلموں میں ویلن کے طور پر جلوہ گر ہوئے۔ پھر انہیں ایکشن ہیرو بنایا گیا۔اس روپ میں بھی فلم بینوں نے انہیں بہت پسند کیا۔ پھر وہ باقاعدہ رومانی ہیرو بھی بن گئے اور عرصۂ دراز تک پاکستان کی فلمی صنعت پر راج کرتے رہے۔ جب ہم نے ''مجبور'' کا آغاز کیا تو محمد علی کراچی میں ہی مقیم تھے۔

محمد علی کا تعلق بھارت کی ریاست رامپور سے ہے جہاں ان کا خاندان مدت سے آباد تھا اور علم وفضل کی دولت سے مالا مال تھا۔ان کے والد بھی ایک عالم اور مذہبی شخصیت تھے۔ پاکستان آنے کے بعد اس خاندان نے حیدر آباد سندھ کو اپنا دوسرا وطن بنایا اور محمد علی نے اسی شہر میں پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی۔ نقل وطن کے بعد مالی حالت بہت زیادہ اچھی نہیں تھی اس لئے ایک متوّسط طبقے کے فرزند کے طور پر انہوں نے پرورش حاصل کی۔ حالات کی گردش نے اعلیٰ تعلیم سے محروم ہی رکھا اور وہ ریڈیو میں آڈیشن دینے کیلئے پہنچ گئے۔ محمد علی کی آواز ہمیشہ ان کا سب سے قیمتی اثاثہ رہی ہے۔ بھرپور' متاثر کن اور دل کی گہرائی میں اُتر جانے والی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت جلد ریڈیو کے اچھے فنکاروں میں شمار ہونے لگے۔اسی دوران میں ان کی ملاقات حمایت علی شاعر سے ہوئی جو ان کے بڑے بھائی ارشاد علی کے دوست تھے۔ قدیم وضع داری کے دستور کے مطابق محمد علی نے بہت بڑا اداکار بن جانے کے بعد بھی رشتوں اور تعلقات کا

پوری طرح بھرم رکھا۔ حمایت علی شاعر کو وہ ایک بڑے بھائی کی طرح ہی احترام دیتے رہے۔ حمایت صاحب نے ان کی فلموں کے لئے گیت بھی لکھے اور جب انہوں نے اپنی ذاتی فلم بنائی تو محمد علی اور زیبا نے اس میں کام کیا اور ان کے ساتھ ہر طرح تعاون کیا۔ مصنف ذاکر حسین سے بھی محمد علی کی ریڈیو ہی کے زمانے سے شناسائی تھی اور ان کا بھی وہ ہمیشہ احترام کرتے رہے۔ حیدر آباد ہی میں ان کی ملاقات مصطفیٰ قریشی سے بھی ہوئی تھی۔ مصطفیٰ قریشی کی بیگم روبینہ قریشی سے بھی محمد علی اسی زمانے سے واقف تھے بلکہ انہوں نے روبینہ قریشی کو منہ بولی بہن بنایا ہوا تھا۔ اس طرح اس زمانے کے سبھی لکھنے والوں' شاعروں اور فنکاروں سے محمد علی کی شناسائی پیدا ہوئی جو کبھی زمانے کے نشیب و فراز سے متاثر نہ ہو سکی۔

محمد علی کی ابتدائی زندگی ایک معمولی نوجوان کی طرح گزری ہے۔ بعد میں جب وہ سُپر سٹار بن گئے تب بھی اپنے پرانے ملنے والوں سے اسی خلوص اور اپنائیت سے ملتے رہے جس طرح بے سروسامانی کے دنوں میں ملا کرتے تھے۔ حیدر آباد کی سڑکوں پر پیدل گھومنا یا بسوں میں سفر کرنا ان کیلئے کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے بڑا اور مشہور معروف آدمی بننے کے بعد وہ پردہ پوشی کرنے کی ضرورت سمجھتے۔ اداکار بننے کے بعد ابتدائی زمانے میں وہ اپنے ماضی کے بارے میں مہر بہ لب رہے لیکن پھر جب اعتماد کی دولت سے مالا مال ہوئے تو انہوں نے اس کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی حالانکہ مفلسی کے وہ دن ان کیلئے محض ڈراونا خواب ہی بن کر رہ گئے تھے۔ ان کے والد محترم کی دعاؤں کا ثمر تھا یا خود ان کی خوبیوں اور نیکیوں کا صلہ کہ جب ایک بار انہوں نے دولت و شہرت اور مقبولیت کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو پھر آخری سیڑھی پر پہنچ کر ہی دم لیا اور خوش حالی' شہرت اور مقبولیت سے اللہ نے انہیں پھر کبھی محروم نہ کیا۔

زیڈ اے بخاری (ذوالفقار علی بخاری صاحب) اس زمانے میں ریڈیو پاکستان کے مختار مطلق تھے۔ وہ انتہائی ہنر مند' قابل اور مردم شناس آدمی تھے۔ زبان کے تلفظ اور الفاظ کی نشست و برخاست کو وہ بہت اہمیت دیتے تھے۔ نہایت خوش مزاج اور حاضر جواب انسان تھے۔ محفلوں کی جان تھے اور اپنی ذات میں خود بھی ایک انجمن تھے۔ بہت اعلیٰ درجے کے شاعر' اچھے نثر نگار اور نقاد اور براڈ کاسٹنگ کے حوالے سے تو سارے برصغیر میں انہیں یکتا سمجھا جاتا تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ وہ پطرس بخاری کے چھوٹے بھائی تھے جن کا نام احمد شاہ بخاری تھا مگر پطرس بخاری

کے نام سے ادبی حلقوں میں زندہ جاوید ہو گئے۔ یہ دونوں بھائی آفتاب اور ماہتاب کے مانند تھے۔ پطرس بخاری' ماہر تعلیم تھے۔ بھلے دنوں میں گورنمنٹ کالج لاہور جیسے عظیم الشان تعلیمی ادارے کے پرنسپل رہے۔ بعد میں سفارت کاری کی اور اقوام متحدہ میں پاکستان کے مندوب کی حیثیت سے بہت سے کارنامے سرانجام دیئے۔ جہاں احمد شاہ پطرس بخاری کی شہرت ختم ہوتی تھی وہاں سے ذوالفقار علی بخاری کی شہرت و عظمت کا آغاز ہوتا تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے مختلف شعبوں میں مختلف حوالوں سے بہت نام پیدا کیا اور جس میدان میں بھی قدم رکھا اس میں نئی روایات قائم کرکے ہی دم لیا۔ ذوالفقار علی بخاری صاحب کافی عرصے تک ریڈیو پاکستان کے کرتا دھرتا اور حاکم اعلیٰ رہے۔ آواز میں گھن گرج تھی۔ زبان و کلام پر مکمل عبور حاصل تھا۔ حالانکہ اہل زبان نہ تھے مگر اہل زبانوں پر بھاری تھے۔ دراز قد سانولا رنگ' ہلکے گھونگھریالے بال' کلین شیو' ان کے چہرے پر سب سے نمایاں ان کی خلاف معمولی موٹی موٹی بھوئیں تھیں جن کے بارے میں ایک بار شوکت تھانوی صاحب نے کہا تھا " آنکھوں کے اوپر مونچھیں لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور نہ جانے خود کو کیا سمجھتے ہیں۔"

بخاری صاحب ہمہ صفت شخصیت تھے لیکن علم موسیقی زبان و ادب شعر و علم اور تلفظ پر انہیں خاص طور پر مکمل عبور حاصل تھا۔ انتہائی خوب صورت' سلیس' شائستہ اور رواں گفتگو کرتے تھے اور بات بات میں مزاح پیدا کرنا ان کی ایک نمایاں خوبی تھی۔ شعر کی ادائیگی کے معاملے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ تحت اللّفظ میں مرثیہ انتہائی دلگداز اور پراثر انداز میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے زندگی کے آخری زمانے میں اپنی خود نوشت سوانح بھی شائع کرائی تھی جو اس عہد کی مکمل تاریخ ہے۔ اس کا نام بھی "سرگزشت" ہے۔ اب تو ایسی شخصیات نے جنم لینا ہی بند کر دیا ہے۔

بخاری صاحب کی محفلیں اور صحبتیں آج بھی نگاہوں اور سماعتوں میں تازہ ہیں۔ خوش قسمتی سے ہمیں یہ فخر و اعزاز حاصل ہے کہ ان نادر روزگار ہستیوں کی محفلیں دیکھی ہیں، ان میں شرکت کی ہے اور ان سے فیض اٹھایا ہے۔

جب محمد علی سٹار بننے کے بعد لاہور میں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے تو ذوالفقار علی شاہ بخاری جب بھی لاہور آتے ان ہی کے مہمان رہتے۔ محمد علی ان کی خاطر مدارت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے۔ ہر طرح ان کی دلبستگی اور دلچسپی کا سامان فراہم کرتے۔ اس زمانے میں محمد علی کے پُرشکوہ مکان میں شعر و ادب اور موسیقی کی مجلسیں آراستہ

ہو تیں جن میں شہر کے سبھی قابل ذکر لوگ شریک ہوتے۔ جوش ملیح آبادی ‘ذوالفقار علی بخاری‘ صوفی غلام مصطفی تبسم‘ فیض احمد فیض قتیل شفائی‘ سیف الدین سیف‘ شباب کیرانوی‘ خواجہ خورشید انور‘ رشید عطرے‘ احمد ندیم قاسمی ‘اشفاق احمد‘ غرضیکہ ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے اہل فن ان محفلوں میں شریک ہوتے اور ان محفلوں کی رنگین یادیں شرکاء کے ذہنوں پر نقش ہو جاتیں۔

دیکھئے محمد علی کا نام لیتے ہی بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ مقصود صرف یہ بتانا تھا کہ جب محمد علی کی آواز بخاری صاحب کے کانوں میں پڑی تو وہ اپنی عادت کے مطابق اس گوہر قابل کو تراش خراش کر انمول نگینہ بنانے پر تُل گئے۔ بخاری صاحب نے محمد علی کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور ان کی ذہنی‘ علمی اور فنی تربیت کا آغاز کیا۔ محمد علی کو انہوں نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور محمد علی نے بھی ساری زندگی اس رشتے کو نبھایا۔

فضل کریم فضلی نے فلم ’’چراغ جلتا رہا‘‘ بنانے کا ارادہ کیا تو ان کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ اس سے پہلے کبھی فلم سٹوڈیو کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ نہ کیمرا اور لیبارٹری کی شکل دیکھی تھی مگر پیشہ ور دقیانوسی لوگوں کی جگہ ہر شعبے میں نئے لوگوں کو تلاش کر کے اپنے ڈھنگ سے سکرین پر روشناس کرایا۔ ان کی فلم کی تمام ترکاسٹ بالکل نئے نو آموز اور نووارد فن کاروں پر مشتمل تھی۔ یہی لوگ آگے چل کر پاکستان کے فلمی اُفق پر چاند ستارے بن کر جگمگائے اور ایک دو کو چھوڑ کر سبھی نے اپنے اپنے شعبوں میں بڑا نام پیدا کیا۔

محمد علی بھی فضلی صاحب کے پاس انٹرویو کے لئے گئے تھے۔ انہوں نے انہیں دیکھا اور مکالموں کی ادائیگی کے بعد فلم کے لئے منتخب کر لیا۔ اس فلم میں محمد علی نے ویلن کا کردار کیا تھا لیکن اس طرح کہ فلم دیکھنے والے ہیرو کو بھول گئے۔ ’’چراغ جلتا رہا‘‘ ایک تجرباتی فلم تھی۔ موضوع کے اعتبار سے یہ اصلاحی اور قدرے خشک تھی۔ نو آموز لوگوں کے کام میں پختگی بھی نہ تھی مگر اس کے باوجود اس فلم نے درمیانے درجے کا بزنس کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان کی فلمی صنعت کو بے بہا فن کار عطا کئے۔

محمد علی ایک دراز قد‘ سرخ و سفید رنگت اور دلکش نقوش رکھنے والے نوجوان تھے۔ چھریرا جسم‘ آواز ایسی کہ ہزاروں میں پہچانی جائے۔ تلفظ انتہائی عمدہ، مکالموں کی ادائیگی بے داغ اور پُر اثر۔ پہلی فلم کی نمائش کے بعد ہی فلم

سازان پر توجہ دینے کیلئے مجبور ہوگئے۔ مگر آواز‘ بول چال اور صورت شکل کے اعتبار سے انہیں ویلن کے کردار کے لئے موزوں سمجھا گیا۔ اس میں کچھ دخل ہمارے فلم سازوں کی بھیڑ چال کا بھی تھا جو مّکھی پہ مّکھی مارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہم نے فلم ’’چراغ جلتا رہا‘‘ میں محمد علی کو دیکھا تھا اور ان کی اداکاری سے متاثر بھی ہوئے تھے بعد میں کراچی گئے تو وہاں ایسٹرن فلم سٹوڈیو میں محمد علی سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ جن فلموں کی شوٹنگ میں مصروف تھے ان سب میں وہ ویلن کے طور پر پیش کئے جا رہے تھے۔ ملاقات ہوئی تو ہم نے حقیقی زندگی میں انہیں زیادہ جاذب نظر‘ دلکش اور پُرکشش پایا۔ وہ بے حد متواضع وضع دار بامروت اور بااخلاق تھے۔ یہ خوبیاں آج کل عنقا ہو چکی ہیں۔ ان کی شخصیت میں بے پناہ اپنائیت بے تکلفی اور خلوص تھا مگر ہماری فلم کی کہانی میں دراصل ویلن کا کردار ہی نہیں تھا۔ یہ حقیقی دو بھائیوں کی کہانی تھی۔ محض ماحول اور پرورش نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے مختلف بنا دیا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ آپس میں سگے بھائی ہیں۔ دونوں ساتھ پڑھتے تھے اور دوست تھے۔ دونوں اپنی ایک کلاس فیلو سے بہت زیادہ بے تکلف تھے۔ یہ تینوں عموماً یکجا ہوتے تھے۔ ان میں دوستی کا رشتہ قائم تھا لیکن لڑکی ان میں سے ایک کو (چھوٹے بھائی) کو پسند کرتی تھی اور اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی حالانکہ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں دوست خوبرو اور نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔ جب امیر زادے کو یہ علم ہوا کہ ہیروئن اس کو نظر انداز کرکے ایک معمولی سے لڑکے سے پیار کرتی ہے تو اس کی خاندانی آن بان اور ذاتی انا مجروح ہو گئی اور وہ یکایک ویلن جیسی حرکتیں کرنے لگا۔ لیکن وہ کسی طور بھی روایتی ویلن نہیں تھا۔ محض حالات اور واقعات نے اسے ویلن کے روپ میں ڈھال دیا تھا۔ اس اعتبار سے ہماری فلم میں کوئی بھی ویلن نہ تھا۔ ہمیں دونوں کرداروں کے لئے ہیرو کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ’’مجبور‘‘ میں بیک وقت کمال اور حبیب کا انتخاب کیا تھا۔

حبیب بڑے بھائی کے کردار کیلئے اور کمال چھوٹے بھائی کے (کھلنڈرے اور شوخ و شریر) کردار کے لئے چنے گئے تھے۔ ہم نے مجبوراً ان دونوں اداکاروں کا انتخاب تو کر لیا تھا مگر ہمارا دل نہیں مانتا تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی کالج کے طالب علم کے کردار میں موزوں نہ تھا۔ ان کے چہروں میں بھولا پن اور معصومیت کے بجائے پختگی تھی۔ لیکن اس زمانے میں ان دونوں کے سوا کوئی اور اداکار ان کرداروں کے لئے موزوں نظر نہیں آیا۔

ہمارے دوست اور فلم کے ہدایت حسن طارق بھی ہمارے ہم خیال تھے مگر لاچار تھے۔ بات یہ ہے کہ اوّل تو اس زمانے میں (بلکہ آج کل بھی) نئے موزوں چہروں کی دستیابی کوئی آسان کام نہ تھا۔اس کے علاوہ ہم ایک بے زر اور بے سروسامان نئے فلم ساز تھے۔ اگر نئے اداکاروں کو اپنی فلم کے لئے منتخب کرتے تو فلم بنانے کیلئے سرمایہ کہاں سے لاتے ؟۔ کوئی ڈسٹری بیوٹر نئے اداکاروں کی فلم خریدنے کے لئے تیار نہ ہوتا۔

ان ہی دنوں ہم کراچی گئے تو محمد علی صاحب سے بھی ملے۔گپ شپ بھی رہی اور انہوں نے ہمیں بحیثیت انسان بھی متاثر کیا لیکن اس وقت ہمارے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ہماری پہلی فلم میں محمد علی کام کریں گے۔ شاید محمد علی نے بھی یہ نہ سوچا ہو گا۔

ماں کے مرکزی کردار کے لئے ہم نے یاسمین کا انتخاب کر لیا تھا مگر نوخیز رومانی ہیروئن کے لئے بھی ایک اداکارہ کی ضرورت تھی۔ زیبا کی پہلی فلم کے ریلیز ہوتے ہی وہ سب کی نگاہوں میں آچکی تھیں اور انہیں کراچی کی چند فلموں میں ہیروئن منتخب بھی کر لیا گیا تھا۔ وحید مراد کی بطور فلم ساز پہلی فلم ''ہیرا اور پتھر'' میں زیبا کو وحید مراد کے ساتھ ہیروئن منتخب کیا گیا تھا۔ اس کے ہدایت کار پرویز ملک تھے۔ان کی بھی ہدایت کار کی حیثیت سے یہ پہلی فلم تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد امریکہ سے فلم تکنیک کے علوم کی ڈگری لے کر آئے تھے۔ اسی فلم سے وحید مراد اور پرویز ملک کی طویل رفاقت اور دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ کچھ عرصے بعد مصنف و نغمہ نگار مسرور انور اور موسیقار سہیل رعنا بھی اس ٹیم میں شامل ہو گئے تھے اور ان لوگوں نے پاکستان کی فلمی صنعت کو بہت سی کامیاب اور معیاری فلمیں دی تھیں۔

''چراغ جلتا رہا'' کے ہیرو تو پھر گمنام ہی ہو کر رہ گئے۔ دوسرے فنکاروں نے فرداً فرداً نام اور مقام حاصل کیا لیکن زیبا ان میں سب سے زیادہ کامیاب نکلیں۔ ان کے گھر کے سامنے فلم سازوں نے ڈیرا جما لیا۔ پہلے کراچی کے فلم سازوں نے ان کی خدمات حاصل کیں۔ اس کے بعد لاہور کے فلم ساز اور ہدایت کار بھی ان کے معترف ہو گئے اور زیبا کو لاہور کی فلموں میں بھی کاسٹ کر لیا گیا۔

ہم جب ''مجبور'' بنانے کا ارادہ لے کر کراچی پہنچے تو وہاں ہفت روزہ ''نگار'' کے مدیر الیاس رشیدی صاحب کے

ہمراہ حسب دستور ایسٹرن سٹوڈیو کا پھیرا بھی لگایا جہاں ہماری زیبا سے ملاقات ہوئی۔
الیاس بھائی زیبا سے بہت متاثر تھے۔یوں تو وہ سبھی نئے فن کاروں کی سرپرستی فرماتے تھے لیکن کراچی کے فنکاروں کو وہ بطور خاص پبلسٹی دیتے تھے۔ہر نیا فنکار ان کے کثیر الاشاعت اور بااثر فلمی جریدے میں پبلسٹی پاتا تھا۔ شمیم آرا ''کنواری بیوہ'' کی ہیروئن بن کر سامنے آئیں تو الیاس صاحب نے ان کی پذیرائی کی اور ہاتھوں ہاتھ لیا۔ان کی تصاویر اور ان کے بارے میں خبریں اور مضامین شائع کئے۔زبانی طور پر بھی فلم سازوں سے ان کی سفارش کی اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ شمیم آرا بہت باصلاحیت اور ذہین اداکارہ ہیں۔
شمیم آراء سے ہماری پہلی ملاقات الیاس رشیدی صاحب ہی کے توسط سے ہوئی تھی اور انہوں نے ہم سے فرمائش کی تھی کہ لاہور کے اخبارات میں شمیم آراء کی پبلسٹی کریں اور فلم سازوں سے بھی ان کی سفارش کریں کیونکہ وہ صحیح معنوں میں اس کی مستحق ہیں۔
''چراغ جلتا رہا'' کی نمائش کے بعد ہم کراچی پہنچے تو الیاس بھائی ایک نئی فنکارہ کو متعارف کرانے کے لئے اپنی پٹاری کھولے بیٹھے تھے اور ہر ایک کو یقین دلانے کی کوشش میں مصروف تھے کہ زیبا درحقیقت ایک بہت اچھی فنکارہ ہیں اور مناسب موقع ملنے پر وہ پاکستان کی صف اوّل کی ہیروئن بن جائیں گی۔ہم نے جب انہیں ذاتی فلم بنانے کے بارے میں بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔اس وقت تک ہم نے '' مجبور'' بنانے کا اعلان نہیں کیا تھا۔کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولے '' یار آفاقی'' چھوڑو کس جھگڑے میں پڑنے لگے ہو۔یہ تمہارے بس کا کام نہیں ہے۔ ''
''کیوں نہیں ہے ؟'' ہم نے پوچھا ''ایک سے بڑھ کر ایک نالائق فلم بنا رہا ہے تو پھر ہم کیوں نہ بنائیں۔ ''
کہنے لگے '' لیکن تم ان میں ایک اور نالائق کا اضافہ کرنا چاہتے ہو۔ ''
ہم نے ناراضگی سے پوچھا ''تو کیا آپ ہمیں واقعی اتنا نالائق سمجھتے ہیں ؟ ''
بولے ''لائق یا نالائق کی بات نہیں ہے۔تم صحافی اور کہانی نویس ہو۔آرام سے اپنا کام کرتے رہو۔فلم سازی تو کانٹوں بھرا تاج ہے ''
مگر جب ہم اپنے ارادے پر اڑے رہے تو وہ بھی سنجیدہ ہو گئے۔ہم نے انہیں اپنی کہانی کے بارے میں بتایا۔پھر کہا کہ

حسن طارق کو ہم ہدایت کار لیں گے ۔ خلیل احمد اس فلم کی موسیقی بنائیں گے۔نامور اداکار اس کی کاسٹ میں شامل ہوں گے۔ہم نے انہیں یاسمین، حبیب اور کمال کے بارے میں بھی بتایا۔

''تو کیا یاسمین کی جوڑی کمال اور حبیب کے ساتھ بناؤ گے، سوچ لو ''

ہم نے کہا''یاسمین تو ان دونوں کی ماں کا کردار کریں گی۔نوجوان ہیروئن کوئی اور ہو گی۔ ''

وہ ایک دم چوکنّا ہو گئے''سنو یار تم زیبا کو ہیروئن کیوں نہیں لے لیتے،بہت اچھی رہے گی۔ ''

''ہاں ٹھیک ہے'' ہم نے نیم دلی سے کہا''مگر الیاس بھائی ہمیں نامور ہیروئن چاہئے تاکہ ہماری فلم جلد بک ہو جائے۔ ''

کہنے لگے''یار زیبا بہت اچھی ایکٹریس ہے تم دیکھ لینا ایک دم''شوں'' کرکے اوپر جائے گی۔ ''

ہم نے کہا''جب جائے گی تو دیکھا جائے گا۔ابھی تو اس کا کوئی نام نہیں ہے اور نہ ہی اس کی مانگ ہے۔ ''

''لڑکے ! جلدی سے کڑک چائے لاؤ'' انہوں نے ملازم کو آواز دی۔پھر ہم سے کہنے لگے'' خیر یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے۔ویسے یہ لڑکی بہت جلدی آگے نکل جائے گی۔ صورت شکل بھی اچھی ہے۔لب ولہجہ اور تلفّظ بھی بہت اچھا ہے۔ایکٹنگ بھی کر لیتی ہے،مگر خیر تم اپنے معاملات کو دیکھ لو اور جو مناسب سمجھو وہی کرو۔ ''

شام کو ہم ان کے ساتھ ایسٹرن سٹوڈیوز پہنچے تو وہاں زیبا اور ان کی والدہ لالی جی سے بھی ملاقات ہو گئی۔زیبا دھان پان نازک اندام گوری چِٹّی نوعمر لڑکی تھیں۔بہت ہنس مکھ اور حاضر جواب۔۔۔ تھوڑی ہی دیر میں گپ شپ اور لطیفے بازی شروع ہو گئی۔ان کی والدہ لالی جی ان ہی کی طرح دبلی پتلی اور کشیدہ قامت تھیں لیکن ان کا رنگ گندمی تھا۔وہ بھی بہت خوش اخلاق اور شگفتہ مزاج نکلیں۔گفتگو میں برابر شریک رہتی تھیں اور لطیفوں پر بے ساختہ ہنستی تھیں۔

ہمارے ساتھ تو پہلی ہی ملاقات میں زیبا اور لالی جی دونوں بے تکلف ہو گئیں۔الیاس صاحب نے ان سے ہمارا تفصیلی تعارف کرایا اور پھر کہا '' جب تم لاہور جاؤ گی تو آفاقی صاحب تمہارا ہر طرح خیال رکھیں گے۔ ''

زیبا نے کہا''پھر تو ہمیں بھی کراچی میں آفاقی صاحب کا خیال رکھنا چاہئے۔ ''

''وہ کس طرح؟ ''

''آپ نہیں رات کے کھانے پر لے آیئے کیوں آفاقی صاحب آئیں گے نا؟ ''
ہم نے الیاس صاحب کی طرف دیکھا اور ہامی بھر لی۔ زیبا کسی فلم کی شوٹنگ میں مصروف تھیں۔ ان سے رخصت ہو کر ہم سٹوڈیو کی چھت پر سٹوڈیو کے مالک سعید ہارون صاحب کے دفتر میں چلے گئے۔

سعید ہارون انتہائی دلچسپ اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ یوسف ہارون اور محمود ہارون جیسے نامور لوگوں کے سب سے چھوٹے بھائی اور سر عبداللہ ہارون کے صاحب زادے خاندانی رئیس تھے۔ تعلیم یافتہ تھے مگر انتہائی معصوم اور سادہ۔۔۔ غریبوں کے لئے ان کے دل میں صحیح معنوں میں پیار اور گداز تھا۔ سعید صاحب سے ہماری اچھی خاصی بے تکلفی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ الیاس رشیدی صاحب سے ان کی دانت کاٹی دوستی تھی۔ سعید صاحب کی بیگم کو الیاس صاحب نے بہن بنا رکھا تھا۔ ہر صبح الیاس صاحب کے گھر سعید ہارون کا ٹیلی فون ضرور آتا تھا۔ الیاس صاحب سے ہمارا بہت میل جول اور دوستانہ تھا۔ اس طرح سعید ہارون صاحب سے بھی ہماری یاد اللہ ہو گئی۔
سعید صاحب میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ کراچی کے عاشق تھے۔ اور کراچی کی ہر چیز کو دوسروں سے بہتر اور برتر ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔
ہم ان کے ائر کنڈیشنڈ دفتر میں پہنچے تو انہوں نے سلام کے جواب میں اپنی کراری آواز میں کہا'' آ گئے لاہور والے آ گئے۔ اب تو الیاس بھائی کو ہوش نہیں رہے گا۔ لاہور والوں کو دیکھتے ہی یہ کراچی والوں کو بھول جاتے ہیں۔''

الیاس صاحب ہنسنے لگے '' بھئی لاہور والے ہمارے مہمان ہوتے ہیں ان کی خاطر تو کرنی ہی پڑتی ہے۔''
''خاطر تو کرو مگر خوشامد کیوں کرتے ہو۔ الیاس بھائی' کراچی کی فلم انڈسٹری کو بناؤ۔ کراچی کی انڈسٹری لاہور سے بڑھ کر ہو سکتی ہے مگر یہاں تو جو بھی تھوڑا اونچا اٹھتا ہے لاہور کا ٹکٹ کٹا کر چلا جاتا ہے۔ کیوں آفاقی صاحب تمہارے لاہور کی فلم انڈسٹری کا کیا حشر ہو گا اگر کراچی والے وہاں سے واپس آ جائیں؟''
ہم نے مناسب الفاظ میں کراچی والوں کو خراج تحسین پیش کیا اور سعید صاحب خوش ہو گئے۔
''بولو کیا پیو گے؟ چائے یا کافی؟ بسکٹ بھی کھاؤ گے یا کیک منگاؤں۔ ''

الیاس صاحب ہنسنے لگے ''اب تم خود لاہور والوں کی خوشامد کیوں کر رہے ہو؟ ''

''ارے یہ تو ہمارے مہمان ہیں۔ مہمان کے لئے تو ہماری جان بھی حاضر ہے کیوں نا آفاقی؟''

ہم نے کہا ''فی الحال تو چائے پر گزارہ کرلیں گے۔ آپ کی جان سے زیادہ اس وقت ہمیں چائے کی ضرورت ہے۔ ''

سعید صاحب کو اچانک یاد آیا اور وہ بولے '' کیوں آفاقی تمہارے لاہور کی ہیروئنیں تو بہت پریشان ہوں گی۔ سنا ہے ان کی راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔''

''وہ کیوں؟'' ہم نے پوچھا

''ارے کراچی نے پھر ایک نئی ہیروئن پیش کی ہے۔ بولو زیبا کا کوئی جواب ہے تمہارے لاہور میں؟''

''کون زیبا'' ہم نے معصومیت سے پوچھا۔

''ارے زیبا کو نہیں جانتے؟ کیسے جرنلسٹ ہو۔ اے ون ہیروئین ہے۔ تم دیکھ لینا لاہور کی سب ہیروئنوں سے آگے نکل جائے گی۔ یہ تمہاری مسرت و سرت' رانی پانی سب منہ دیکھتی رہ جائیں گی۔''

ہم نے انہیں چھیڑا ''سعید صاحب صبیحہ کا کوئی جواب ہے آپ کے پاس؟ ''

وہ سٹپٹا گئے ''ٹھیک ہے صبیحہ کے علاوہ اور کیا ہے تمہارے پاس۔ ارے ہم نے تمہیں نیّر سلطانہ دے دی ہے۔ پھر رانی بھی تو کراچی سے ہی گئی ہے۔'' پھر انہوں نے الیاس صاحب کو مخاطب کیا ''الیاس بھائی زیبا کو کراچی سے لاہور مت جانے دینا۔ ہمیں کراچی کی انڈسٹری کے لئے بھی تو آرٹسٹوں کی ضرورت ہے۔ ''

الیاس صاحب نے کہا ''سعید سیٹھ آرٹسٹ بے چارے کراچی میں رہ کر کیا کریں گے۔ پہلے یہاں فلم انڈسٹری تو بناؤ۔ پروڈیوسروں کو سہولتیں دو گے تو وہ لاہور چھوڑ کر کراچی آجائیں گے۔ ''

یہ سعید صاحب کا کمزور پہلو تھا۔ بولے ''ساری سہولتیں تو دیتے ہیں انہیں۔ بس فلم ہی تو ادھار نہیں دیتے خیر الیاس بھائی میرا ایک کام کردو۔ زیبا سے میری ایک فلم سائن کرادو۔ ''

''تم خود کرلو ''

''بھئی آپ اس کے انچارج ہیں۔ گاڈ فادر بنے بیٹھے ہیں۔ آپ کی ہر بات وہ مانتی ہے۔ کراچی کے فلم سازوں کے ساتھ

تواسے خاص رعایت کرنی چاہئے۔ وہ بھی تو کراچی کی ہے۔ کراچی والوں کا اس پر پہلا حق ہے۔ ‘‘

اس پر الیاس بھائی نے ہمیں ایک لطیفہ سنایا جو ہمیں آج بھی لفظ بہ لفظ یاد ہے۔

ہوا یہ کہ سعید ہارون دو فلموں کے لئے زیبا سے معاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے الیاس بھائی کی خدمات حاصل کی گئیں اور زیبا اور ان کی والدہ کو لے کر سعید صاحب کے دفتر میں پہنچ گئے۔ سعید صاحب نے ان کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور بہت غور سے زیبا کو دیکھتے رہے۔ یہ حقیقی زندگی میں ان کی زیبا سے پہلی ملاقات تھی۔

زیبا کو انہوں نے اپنی دو فلموں میں کام کرنے کی پیش کش کی جو انہوں نے منظور کر لی۔ جب معاہدے کی بات شروع ہوئی تو لالی جی نے ایک فلم کا معاوضہ دس ہزار روپے طلب کیا۔

’’دس ہزار!‘‘ سعید صاحب نے حیران ہو کر پوچھا ’’مگر آپ نے فلاں فلمساز کی فلم پانچ ہزار میں سائن کی ہے ‘‘

لالی جی نے اطمینان سے جواب دیا ’’سعید صاحب فلم کا معاوضہ تو آپ سے بھی پانچ ہزار ہی لوں گی۔ ‘‘

’’تو پھر باقی پانچ ہزار‘‘؟

’’پانچ ہزار گھورنے کا معاوضہ ‘‘

سعید صاحب نے حیرت سے لالی جی کو اور پھر الیاس رشیدی صاحب کو دیکھا۔

لالی جی بولیں ’’سعید صاحب جب سے زیبا کمرے میں آئی ہے۔ آپ اسے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ کی فلم میں کام کیا تو آپ تو میری بچی کو گھور گھور کر آدھا کر دیں گے۔ اس لئے پانچ ہزار روپے فلم میں کام کرنے کا معاوضہ ہے اور پانچ ہزار گھورنے کا۔ ‘‘

یہ لطیفہ سننے کے بعد سعید صاحب نے صفائی پیش کی ’’ارے بھئی کسی نئی لڑکی کو ہیروئن سائن کروں گا تو دیکھ بھال نہیں کروں گا؟ اس کا اچھی طرح جائزہ نہیں لوں گا؟ آفاقی، بات یہ ہے کہ الیاس صاحب نے ابھی سے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو الزبتھ ٹیلر سمجھنے لگی ہے۔‘‘

اسی رات ہم الیاس صاحب کے ساتھ موٹر رکشا میں سوار ہو کر ناظم آباد میں زیبا کے گھر پہنچ گئے۔ وہ ایک کرائے کے

مکان کے بالائی حصے میں رہتی تھیں۔گھر کو سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کی سجاوٹ سادہ مگر خوب صورت تھی۔ان کے گھر گئے تو محسوس ہی نہیں ہوا کہ ہم کسی فلم آرٹسٹ کے گھر یہاں آئے ہیں۔زیبا سادہ لباس میں میک اپ کے بغیر ہمارے سامنے آکر بیٹھ گئیں۔ان کی والدہ لالی جی بھی کچھ دیر بعد تشریف لے آئیں۔ان کی ایک کزن بھی اس زمانے میں ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔کھانے کا اہتمام ان ہی کی ذمہ داری تھا۔زیبا کبھی کبھی اٹھ کر ایک پھیرا باورچی خانے کا لگالیتی تھی جب وہ چوتھی بار کچن سے ہو کر آئیں تو ہم نے پوچھا ''کیا گل گیا؟ ''

انہوں نے بے خیالی میں پوچھا''کیا؟ ''

ہم نے کہا''گوشت ''

وہ ہنسنے لگیں ''گوشت تو گل گیا مگر دال گلنی مشکل ہے۔ ''

ہم اسی وقت جان گئے کہ زیبا کو اردو زبان سے پوری طرح واقفیت ہے اور وہ حاضر جواب بھی ہیں۔

زیبا بے حد شگفتہ مزاج' حاضر جواب اور فقرہ باز نکلیں۔الیاس رشیدی صاحب کے علاوہ طفیل احمد جمالی صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔جمالی صاحب اس زمانے میں '' انجام'' کراچی کے ایڈیٹر تھے۔بے حد ذہین' پڑھے لکھے اور باشعور انسان تھے۔شاعر بھی بے بدل' نثر پر بھی انہیں پوری طرح عبور حاصل تھا۔سب سے بڑھ کر یہ کہ حد سے زیادہ حاضر جواب اور فقرے بازی میں طاق' وہ جوانی ہی میں وفات پاگئے لیکن جب تک زندہ رہے اپنی قابلیت اور ذہانت کے چراغ جلائے رکھے۔وہ الیاس رشیدی صاحب کے قریبی اور بے تکلّف دوستوں میں تھے۔جب کبھی ہم کراچی جاتے تو وہ اور ابراہیم جلیس صاحب بھی ہر روز ہی''نگار'' کے دفتر میں پائے جاتے۔الیاس بھائی اپنے کام کاج اور مختلف لوگوں کو ڈانٹنے میں مصروف رہتے اور ہم لوگ گپ شپ اور لطیفہ بازی میں لگے رہتے۔جب شام کو وہ دفتر سے فراغت پاتے تو ہم سب کسی تقریب کا رخ کرتے یا پھر ہم جس ہوٹل میں قیام پذیر ہوتے تھے۔وہاں محفل جم جاتی جو رات گئے تک جاری رہتی۔ صحافی' فلم والے اور دوسرے لوگ بھی اکٹّھے ہو جاتے تھے۔لاہور سے کراچی آئے ہوئے حضرات کراچی کے صحافی' ادیب اور شاعر فلم سے تعلق رکھنے والے مختلف شعبوں سے وابستہ اصحاب اور بے تکلّف دوست یکجا ہوتے تو بہت پُر لطف محفلیں آراستہ ہوا کرتی تھیں۔وہ بھی خوب دن تھے۔اب تو شاید وہ

زمانے کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ زمانہ آگے کی طرف گامزن ہوتا ہے اسے کیا پڑی ہے کہ پیچھے کی طرف لوٹ جائے، ہماری آپ کی خواہش سے کیا ہوتا ہے۔

جمالی صاحب بہت ہنسوڑ اور دلچسپ آدمی تھے۔ بڑے بڑے شوخ گفتار اور حاضر جواب لوگوں کو لاجواب کر دیا کرتے تھے اور کیوں نہ ہوتا۔ ایک تو ذہن رسا' دوسرے مطالعہ' تیسرے علماو ادباء کی صحبتیں۔ ابراہیم جلیس اور ابن انشاء جیسے لوگوں سے دن رات کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ انہیں دو آتشہ تو ہونا ہی تھا۔ جمالی صاحب نے ایک دو فلموں کے مکالمے اور چند فلموں کے گانے بھی لکھے مگر طبعیت میں لاابالی پن تھا۔ کسی قسم کی پابندی یا روک ٹوک وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ کاہل بھی تھے، ضرورت سے زیادہ کام کرنے کو وقت کا زیاں خیال کرتے تھے۔ سادہ باعزت زندگی گزارنے کے لئے جتنا کچھ ضروری تھا اس کے حصول کے بعد وہ پیسہ کمانے کی ہر کوشش کو فضول سمجھتے تھے۔ نہایت مخلص' بے ریا اور بے لوث انسان تھے۔ کسی کو تکلیف اور دکھ میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ شاید ان کے بھی کچھ مسائل ہوں گے مگر انہیں دیکھ کر یہ گمان ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے انہیں کبھی اداس اور متفکّر نہیں دیکھا۔ جب دیکھا قہقہے لگاتے اور لطیفے سناتے ہوئے دیکھا۔ ہنسنا ہنسانا ہی ان کا معمول تھا۔ شاید اس زمانے میں یہ بھی ایک رواج تھا۔

جمالی صاحب کے دو اصول ایسے تھے جن پر وہ بڑی سختی سے عمل پیرا تھے۔ وہ سفید قمیض یا بوشرٹ کے سوا کسی رنگ کی قمیض زیب تن کرنا خلاف وضع خیال کرتے تھے۔ گرمی ہو یا سردی ہم نے ان کے جسم پر سفید قمیض ہی دیکھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد رنگین قمیض کیوں پہنتے ہیں۔ رنگین لباس تو خواتین ہی کو زیب دیتا ہے اور پھر سفید رنگ میں جو وقار' سادگی اور شان ہے وہ کسی اور رنگ میں کہاں۔

ہم نے کہا" مگر جمالی صاحب سفید تو کوئی رنگ ہی نہیں ہوتا۔ "

بولے" یار سنی سنائی باتوں پر قابلیت نہ جھاڑا کرو۔ سفید بھی تو ایک رنگ ہی ہے۔ سفید رنگ کی دیوار' سفید رنگ کا لباس' جس طرح سیاہ بھی ایک رنگ ہے۔ اگر آپ کو کمرے میں سفید رنگ کرانا ہو تو کیا کہیں گے یہی نا کہ سفید رنگ کردو۔"

"جی نہیں صرف اتنا کہیں گے کہ سفیدی کردو "

''سفیدی تو ایک اصطلاح ہے'' وہ کہاں ہار ماننے والے تھے ''اگر آپ کو چونے والی سفیدی کے علاوہ سفید پینٹ کرانا ہو تو کیا کہیں گے۔ یہی نا کہ کمرے میں سفید رنگ کا پینٹ کردو۔

'جی نہیں ہم یہ کہیں گے کہ کمرے میں سفید پینٹ کردو۔''

''یار کج بحثی تو تم پر ختم ہے۔'' وہ ہنسنے لگے۔

''اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے'' ہم پوچھتے

''خیر ہماری تو یہ پہچان ہے۔ ''

جمالی صاحب کے ساتھ نوک جھونک ہر وقت جاری رہتی تھی۔

ذکر زیبا کا ہو رہا تھا۔ زیبا کی گفتگو سن کر ہم سب بہت حیران ہوئے۔ انہیں زبان و بیان پر پوری طرح عبور حاصل تھا۔

جمالی صاحب کہاں ہار ماننے والے تھے کہنے لگے بھئی کیوں نہ ہو ''آخر اہل زبان ہے۔ ''

زیبا نے بھولے پن سے پوچھا ''آپ کی مراد ہے یوپی یا دہلی کی رہنے والی ہوں؟ ''

''اور کیا؟ تمہاری زبان ہی یہ چغلی کھا رہی ہے۔ ''

زیبا بولی ''جمالی صاحب معاف کیجئے چغلیوں پر بھروسا نہ کیا کیجئے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے میری والدہ پٹیالہ کی رہنے والی ہیں۔ ''

ہم سب حیران رہ گئے ''بھئی کمال ہے سکّھوں کی سرزمین میں رہ کر اتنی اچھی اردو؟ ''

''یہ میں نے کراچی میں آپ جیسے اہل زبان لوگوں سے سیکھی ہے۔ ''

لالی جی اس نوک جھونک پر ہنستی رہیں۔ وہ کم بولتی تھیں۔ زیادہ تر سنتی اور ہنستی ہی رہتی تھیں۔ ایک بار ابراہیم جلیس نے ان سے کہا تھا ''لالی جی ایمان سے آپ بہت بڑی فنکارہ ہیں۔ ''

وہ حیرت سے کہنے لگیں ''میں کب فنکارہ ہوں۔ آرٹسٹ تو میری بیٹی ہے۔ ''

جلیس صاحب نے کہا ''اگر آپ نہ ہوتیں تو یہ بیٹی کہاں سے آتی؟ ''

پھر انہوں نے ایک لطیفہ سنایا کہ ہالی ووڈ کی ایک بہت شاندار تقریب میں ایک نقّاد کا تعارف بہت بڑی فنکارہ سے کرایا

گیا۔'' یہ بہت بڑی آرٹسٹ ہیں۔ جنہوں نے فلاں فلم میں آسکر ایوارڈ حاصل کیا''۔

نقّاد نے فنکارہ سے ہاتھ ملایا۔

''اوران سے ملئے یہ ان سے بھی بڑی آرٹسٹ ہیں۔'' اس باران کا تعارف ایک بڑی عمر کی خاتون سے کرایا گیا۔

پوچھا گیا''انہوں نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے؟ ''

جواب ملا''انہوں نے آسکر حاصل کرنے والی آرٹسٹ کو جنم دیا ہے۔ان کے بغیر وہ کہاں ہوتیں؟''

زیبا سے سرسری ملاقات تو سٹوڈیو میں بھی ہوئی تھی مگر ان کے گھر پر قدرے تفصیل سے گفتگو ہوئی تو ان کے جوہر ہم پر کھل گئے۔ویسے تو اس زمانے میں مرد اور خاتون فنکارائیں عموماً پڑھی لکھی (ڈگری یافتہ نہیں) صاحب ذوق ' بااخلاق ' شگفتہ مزاج اور حاضر جواب ہوتی تھیں مگر زیبا نے پہلی ہی تفصیلی ملاقات میں ہمیں قائل کر لیا۔ایک خاص بات یہ تھی کہ ان میں بناوٹ یا تصنّع نام کو نہ تھا۔بلا کم و کاست ' ہر ایک کے بارے میں بیان جاری کر رہی تھیں۔نہ مصلحت کا خیال' نہ دنیاداری کی پروا' یہ خوبی ان میں آج بھی موجود ہے بلکہ اب تو عمر کے ساتھ اور بھی پختہ ہو گئی ہے۔

ہم نے بہت سے فنکاروں کو قریب سے دیکھا۔پاس رہے' ساتھ اکٹھّے بیٹھے۔ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خوبی پائی مگر زیبا کی خوبی یہ دیکھی کہ وہ صاف دل اور صاف گو ہیں۔بلکہ ''صاف چہرہ '' بھی ہیں۔وہ اس طرح کہ ان کے تاثرات اور دلی جذبات فوراًان کے چہرے پر نمودار ہو جاتے ہیں۔اگر خوش ہیں تو خوشی کا چہرے سے اظہار ہو رہا ہے اگر ناراض ہیں تو ایک نظر میں پتہ چل جاتا ہے کہ خفا ہیں۔اگر کوئی شخص پسند ہے تو خوب گھل مل کر باتیں ہوں گی اور چہرے سے بھی اس کا اظہار ہو گا۔اگر کوئی ناپسند ہے تو زیبا کا چہرہ اس بات کی چغلی کھائے گا۔اوّل تو وہ ناپسندیدہ لوگوں سے بات ہی کرنا پسند نہیں کرتیں۔محفل میں سب موجود ہیں مگر زیبا کے لئے وہ ہستی غیر موجود ہے۔اگر اخلاقاً یا ضرورتاً بات بھی کریں گی تو رسمی اور ضرورت کے مطابق۔بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔اس لحاظ سے ہم روز اوّل ہی سے زیبا کے قدردان ہیں۔آج جبکہ منافقت اور دوغلاپن ہمارے معاشرے میں جڑیں پکڑ چکا ہے زیبا میں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ منافقت ان کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔اگر کسی کی دوست ہیں تو دوست ہیں، ہر طرح مدد کرنے کو تیار

اور کمربستہ۔ اگر دوست نہیں ہیں تو اس کی مخالف ہیں۔ کسی قیمت پر سمجھوتا نہیں کریں گی۔
زیبا کی یہ عادت اچھی بھی ہے لیکن بعض اوقات پرابلم بن جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی چند بار ایسی پرابلم پیدا ہوئی۔ ہم ناراض بھی ہوئے بول چال بھی بند رہی مگر زیبا اپنی خو نہ چھوڑ سکیں۔ ناراضگی کے باوجود دوستی اپنی جگہ قائم رہی اور بول چال شروع ہونے کے بعد سلسلہ پھر وہیں سے جُڑ گیا جیسے کہ کبھی لڑائی ہوئی ہی نہ تھی۔ دیکھا جائے تو بہت بچکانہ سی بات ہے لیکن داناؤں نے کہہ دیا ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک چھوٹا سا بچہ چھپا ہوا ہے۔ کچھ بزرگ اس بچے کو ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کرا دیتے ہیں مگر بعض نے اس بچّے کو آزادی دے رکھی ہے کہ بھئی کبھی کھیل کود بھی کر لیا کرو۔ شرارت بھی کر لیا کرو۔
زیبا کے گھر میں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ ایک سے بڑھ کر ایک لطیفہ باز' پھبتی باز اور حاضر جواب بندہ وہاں موجود تھا۔ ان میں مزاح کی حس بھی تھی اور اچھے مذاق اور لطیفوں پر داد بھی مل رہی تھی تو پھر وہی معاملہ ہوا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ کھانا بہت مزے دار تھا۔
ابراہیم جلیس صاحب نے کہا" بھئی آپ پٹیالہ والوں کا کھانا بہت اچھا ہوتا ہے۔"
جواب میں لالی جی نے کہا" مگر یہ تو دلّی کے کھانے ہیں۔"
وہ بولے" آپ بھی خوب چیز ہیں۔ پٹیالہ کو دلّی میں غلط ملط کر دیا ہے۔ "
وہ کہنے لگیں" ہم تو پٹیالہ سے بہت عرصہ پہلے آ گئے تھے "
"بس آپ نے یہی عقلمندی کا کام کیا۔ "
زیبا کی ایک کزن بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کی ہم عمر ہی ہوں گی۔ اس وقت نام ذہن سے نکل گیا۔ یہ کھانا دراصل ان ہی کے زیر اہتمام پکایا گیا تھا۔ جمالی صاحب کو معلوم ہوا تو وہ بار بار ان کی تعریف کرتے رہے" بھئی آپ کا کھانا بہت اچھا ہے۔ فلاں چیز کا جواب ہی نہیں ہے "
آخر زیبا سے نہ رہا گیا، بولیں" جمالی صاحب میزبان تو میں ہوں کچھ مجھ سے بھی کہیں۔ "
وہ بولے" آپ سے کیا کہیں، سوائے شکریے کے، حق بہ حقدار رسید، لالی جی نے خود ہی تو بتایا ہے کہ یہ کھانا انہوں نے

بنایا ہے؟ ''

کھانا تو بہت لذیذ تھا مگر انتظار کے باوجود میٹھا دستر خوان پر نہیں آیا۔ آخر ہم سے نہ رہا گیا ہم نے پوچھا'' لالی جی کیا آپ کے پٹیالہ میں مٹھاس کا رواج نہیں ہے؟ ''

زیبا نے جواب دیا'' فکر نہ کریں۔ میٹھا بھی کھلاؤں گی اور پان بھی۔ ''

کھانے کے بعد رات گئے ہم سب کاروں میں سوار ہو کر آئس کریم کھانے کے لئے پہنچ گئے۔ ایکسلیئر ہوٹل سے آگے ایک گوشے میں آئس کریم کی دکان تھی۔ یہاں ڈبل روٹی کے ٹوسٹ نما ٹکڑوں جیسی آئس کریم بنائی جاتی تھی اور بے حد مزے دار تھی۔ اس سے پہلے ہمیں اس دکان کا علم نہ تھا بعد میں سالہا سال تک وہاں جا کر آئس کریم کھاتے رہے۔ اب تو بہت عرصے سے جانا نہیں ہوا۔ خدا جانے وہ دکان اب بھی قائم ہے یا حوادث زمانہ کی نذر ہو گئی۔ زیبا ابھی زیادہ مصروف نہیں ہوئی تھیں اس لئے فنکارہ کے طور پر انہیں کسی نے نہ سمجھا اور آزادی سے گپ شپ کرتی رہیں۔ اس کے بعد بھی ایک دو بار وہ فرمائش پر ہمیں آئس کریم کھلانے کیلئے اسی دکان پر لے گئیں مگر اس وقت وہ مشہور ہو چکی تھیں اس لئے برقع پہن کر کار میں بیٹھتی تھیں۔

زیبا کے گھر پر بات چیت کے دوران لالی جی اور زیبا ہم سے شمیم آراء کے بارے میں بھی دریافت کرتی رہیں۔ شمیم آرا ان سے پہلے فلمی دنیا میں داخل ہوئی تھیں اور اس وقت شہرت بھی حاصل کر چکی تھیں۔ ہم نے سادگی سے اپنی رائے ظاہر کر دی اور شمیم آرا کے اخلاق اور اداکاری کی تعریف بھی کر دی۔ الیاس بھائی ہمیں گھورتے اور اشارے کرتے رہے مگر ہم نے دھیان نہ دیا۔ ایک بار جب ہم نے شمیم آراء کی صلاحیتوں کے بارے میں ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی تو الیاس صاحب نے ہمارا پیر کچلنے کی کوشش بھی کی مگر ہم نے پھر بھی توجّہ نہ دی۔

جب ہم اپنے ہوٹل پہنچے تو الیاس بھائی نے زیبا سے کہا'' بس مجھے بھی یہیں ڈراپ کر دو۔ ''

ہم حیران تھے کہ اتنی رات گئے یہ حضرت اپنے گھر کیوں نہیں جا رہے۔

جوں ہی زیبا کی کار ہم دونوں کو چھوڑ کر رخصت ہوئی الیاس صاحب نے ہمارے لتّے لینے شروع کر دیئے۔

'' میاں تم بھی عجیب آدمی ہو ''

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا ''کیوں ''

بولے ''بھائی شمیم آرا کی اتنی زیادہ تعریف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

ہم نے کہا'' یہ کیا بات ہوئی۔انہوں نے ہماری رائے پوچھی تھی ہم نے بتادی۔''

کہنے لگے ''بھائی ان میں تو آگ پانی کا بیر ہے۔ شمیم آرا کی تعریف انہیں پسند نہیں آتی وہ تو تمہارا لحاظ کر لیا ورنہ بحث شروع ہو جاتی۔ ''

وہ دن اور آج کا دن۔ شمیم آرا سے زیبا کی ناپسندیدگی کبھی ختم نہیں ہوئی۔اس سلسلے میں بعض اوقات خاصی ناخوشگوار صورت حال بھی پیدا ہو گئی جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔

اس زمانے میں شمیم آرا کراچی سے لاہور منتقل ہو چکی تھی اور سمن آباد کی ایک کوٹھی میں کرائے پر رہا کرتی تھیں۔ ہم نے کئی بار زیبا سے دریافت بھی کیا کہ بھئی شمیم آرا سے آپ کی کیا لڑائی ہے اور اس کا سبب کیا ہے مگر وہ ہمیشہ ٹال گئیں۔ان کا جواب تھا''لڑائی کیسی۔اس بے چاری نے میرا کیا بگاڑا ہے۔میری تو کوئی لڑائی نہیں ہے۔ ''

''پھر بھی؟'' ہم پوچھتے۔

''آفاقی۔ تمہیں وہم ہو گیا ہے اس کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ ''

زیبا سے ہماری ملاقاتیں اور میل جول بڑھتا رہا۔ہم جب بھی کراچی جاتے تو عموماً ان سے بھی ملاقات ضرور کرتے تھے۔اس وقت تک ہم نے انہیں اپنی پہلی فلم میں کاسٹ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا۔

ایک دن ہم اپنی فلم کے بارے میں الیاس صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔انہوں نے پوچھا''نوعمر ہیروئن کے لئے تم نے کون سی ایکٹریس کو منتخب کیا ہے؟ ''

ہم نے جواب دیا''ابھی تو سوچ رہے ہیں ''

کہنے لگے ''زیبا کو کیوں نہیں لے لیتے؟ ''

ہم نے کہا''ایک تو زیبا ابھی مشہور ہیروئن نہیں بنی ہیں۔ دوسرے یہ کہ فلم سازوں نے بھاری معاوضے دے کر ان کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ ہم اتنے پیسے نہیں دے سکتے اگر زیادہ معاوضہ دینا ہی ہے تو کسی نامور ہیروئن کو کیوں نہ کاسٹ

کریں۔

الیاس بھائی بولے۔آفاقی یار دیکھو یہ بہت بڑی ہیروئن بن جائے گی میری مانو تو زیبا کو رومانٹک ہیروئن کے رول میں لے لو۔

ہم نے کہا"الیاس بھائی آپ بھی جس فن کار کو شہرت دیتے ہیں بس اسی کے گن گانے شروع کر دیتے ہیں۔آپ آج کل زیبا پر مہربان ہیں پہلے شمیم آرا کی تعریفیں کرتے رہتے تھے۔"

"دیکھ لینا،اچھے مواقع ملیں گے تو وہ اور بھی اونچی ہو جائے گی۔"

ہم سوچ میں پڑ گئے۔الیاس بھائی کی یہ بات درست تھی کہ زیبا ابھرتی ہوئی ہیروئن تھیں۔ان کا چرچا بھی ہونے لگا تھا۔فلم سازان کے پیچھے بھی لگ گئے تھے۔لیکن اس وقت تک وہ بڑی ہیروئن نہیں بنی تھیں۔ان کی چند فلمیں زیر تکمیل تھیں اور الیاس بھائی کا کہنا تھا کہ ان کی نمائش کے بعد زیبا بہت بڑی ہیروئن بن جائیں گی۔ہم لاہور واپس پہنچے تو اس بارے میں اپنے ہدایت کار حسن طارق صاحب سے مشورہ کیا۔انہوں نے بھی الیاس رشیدی صاحب کے خیال سے اتفاق ظاہر کیا تو ہم نے زیبا سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلی بار کراچی گئے اور زیبا نے کھانے پر مدعو کیا تو ہم نے یہ موقع غنیمت جانا۔ الیاس بھائی پیٹ کے اتنے ہلکے ہیں کہ انہوں نے پہلے ہی یہ اطلاع انہیں پہنچادی تھی۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو ہم نے لالی جی سے کہا"لالی جی ہم ایک فلم بنانے والے ہیں آپ کی بیٹی کو اس میں کاسٹ کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو پھر کرو کس نے روکا ہے؟"

"روکا تو کسی نے نہیں ہے بشر طیکہ آپ نہ روک دیں۔"

"لو بھلا میں کیوں روکوں گی؟" انہوں نے سوال کیا۔

ہم نے کہا"جب ہم دوسروں کے مقابلے میں کم معاوضہ پیش کریں گے تو کیا آپ نہ روکیں گی؟"

وہ بولیں"دیکھو آفاقی ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں ان معاملات میں دخل نہیں دیتی۔وہ خود بہت سمجھدار ہے تم

زیبا ہی سے بات کیوں نہیں کرتے؟ ''

لالی جی کی یہ بات بھی درست تھی۔ ہم نے انہیں کبھی زیبا کے فلمی معاملات میں مداخلت کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ نگراں اور سرپرست ضرور تھیں مگر کاروباری بات چیت اور آخری فیصلہ خود زیبا ہی کا ہوا کرتا تھا۔ ڈیٹس وغیرہ دینے کی ذمہ داری معاوضہ طے کرنے کا فریضہ وہی سرانجام دیتی رہیں بلکہ ہم نے تو یہ بھی محسوس کیا کہ لالی جی نے زیبا کو ہر معاملے میں کھلی آزادی دے رکھی تھی۔ وہ بعض معاملات میں انہیں مشورہ ضرر دے دیا کرتی تھیں مگر انہوں نے کبھی ان سے اپنی بات منوانے کی کوشش نہیں کی۔ آخری فیصلہ خود زیبا ہی کا ہوتا تھا۔ زیبا آغاز ہی سے فہمیدہ، معاملہ فہم اور خود اعتمادی سے مالامال ہیں۔ غلطیاں تو ہر انسان سے سرزد ہو جاتی ہیں مگر زیبا کے اکثر فیصلے درست اور مناسب ثابت ہوئے۔

اس اثناء میں زیبا بھی آ گئیں، بولیں ''سب سے الگ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ ''

ہم نے کہا'' آپ کی برائیاں ہو رہی ہیں۔ ''

وہ ہنسنے لگیں '' یہ تو ٹھیک ہے' دونوں ہی میرے دشمن بیٹھے ہیں۔''

لالی جی نے ہم سے کہا'' آفاقی تو اب تم خود ہی بات کر لو۔ ''

زیبا نے ہمیں سنجیدہ پایا تو خود بھی سنجیدہ ہو گئیں۔ سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر بولیں '' کیا بات ہے آفاقی خیریت تو ہے۔

'' خیریت کہاں؟ ''

'' کچھ بتاؤ گے بھی '' وہ پریشان ہو گئیں۔

ہم نے کہا'' ہم ایک فلم بنانے کا ارادہ کر رہے ہیں ''

'' لو میں تو ڈر ہی گئی تھی، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ ''

ہم نے کہا'' تم کبھی خود فلم بناؤ تو تمہیں فلم ساز کی پریشانی کا علم ہو۔ ''

کہنے لگیں '' میں تو ابھی تک ڈھنگ کی ہیروئن بھی نہیں بنی ہوں۔ پروڈیوسر تو بہت دور کی بات ہے۔ ''

ہم نے کہا'' تم جس رفتار سے منزلیں طے کر رہی ہو اس سے لگتا ہے کہ وہ مرحلہ بھی دور نہیں ہے ''

'' شروع ہو گئی خوشامد'' وہ مسکرانے لگیں'' اب بتاؤ۔ ''

'' بھئی اپنی فلم میں تمہیں ہیروئن بنانا چاہتے ہیں سوچا کہ تم اُبھرتی ہوئی فنکارہ ہو کیوں نہ تمہاری زندگی سنوار دیں۔ ''

'' بڑی مہربانی ہے، آپ کی فلم کب شروع ہو گی؟''

'' ابھی تو پروگرام بنا رہے ہیں۔ جب شروع ہو گی تو پہلے سے بتا دیں گے۔ ''

کہنے لگیں'' اللہ رحم کرے فلم انڈسٹری پر۔ اب تمہارے جیسے لوگ بھی فلم پروڈیوسر بن رہے ہیں۔''

ہم نے جواب دیا'' تمہارے جیسی ہیروئن بن گئی ہیں تو پھر رحم ہی رحم ہے اللہ کا۔ ''

لالی جی چپ چاپ بیٹھی مسکراتی رہیں۔

ہم نے کہا'' اب یہ بھی بتا دیں کہ آپ ہماری فلم میں کام کرنے کا معاوضہ کیا لیں گی۔؟ ''

کہنے لگیں'' معاوضہ کا کیا ہے وہ بھی طے ہو جائیگا تم فلم تو شروع کرو۔ ''

ہم نے کہا'' دیکھو بھئی جس طرح دوسرے فلم سازوں سے مطالبے کرتی ہو اس طرح ہم سے نہ کرنا ہم غریب رائٹر ہیں۔''

سنجیدگی سے کہنے لگیں'' دیکھو آفاقی، فلم بنانا تو غریبوں کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ اگر اتنی حیثیت نہیں ہے تو فلم بنانے کا خیال چھوڑ دو۔ ''

ہم سمجھ گئے کہ ہماری ٹانگ کھینچ رہی ہیں اس لئے کہا'' ہمارے ملک کی فلم انڈسٹری ییں آج جتنے بھی بڑے بڑے لوگ ہیں یہ سب غریب ہی تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غریبوں کو یہ کام بہت راس آتا ہے۔ ''

کہنے لگیں'' بھئی سوچ لو، ہمارا کام تو مشورہ دینا ہے۔ ہر شخص کو اپنی بساط اور اوقات کے مطابق ہی کام کرنا چاہئے۔ ''

اس طرح کی باتیں تو بہت دیر تک ہوتی رہیں مگر یہ طے پا گیا کہ زیبا ہماری فلم میں کام کریں گی۔

ہمارے ایک شناسا تھے جو حیدر آباد سندھ سے آیا کرتے تھے۔ انہیں فلم پروڈیوسر بننے کا بہت شوق تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ جب عملی طور پر فلم بنانا شروع کریں گے تو ان ہی سے سرمایہ کاری کی بات کریں گے۔ اب ہماری فلم کے سلسلے میں

سبھی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ سکرپٹ تیار تھا، ہدایت کار مل چکا تھا۔ موسیقار سے بات طے ہو گئی تھی۔ نغمہ نگار بھی منتخب کر لیا گیا تھا۔ اداکاروں کا انتخاب بھی ہو چکا تھا اب لے دے کے فلم کا مہورت اور پھر اس کے بعد باقاعدہ شوٹنگ کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔ ہم تمام معاملات سے حسن طارق صاحب کو پوری طرح باخبر رکھتے تھے اور وہ وقتاً فوقتاً ہمیں قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے رہتے تھے۔ جب ہم نے انہیں مطّلع کیا کہ تمام کام مکمل ہو چکے ہیں تو وہ بولے ''بس تو پھر ایک شاندار قسم کا مہورت کر ڈالئے۔

ہم نے حیرت سے ان کا چہرہ دیکھا۔'' طارق صاحب مہورت کے تو آپ قائل ہی نہیں ہیں اور ہم بھی اسے بلاوجہ کی ظاہر داری اور فضول خرچی سمجھتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے پاس کل سرمایہ پانچ ہزار روپے موجود ہے۔ اب اگر مہورت پر پیسہ خرچ کر دیا تو فلم بنانے کے لئے کیا بچے گا۔ وہی مثل ہے کہ گنجی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا۔ ''

وہ ہنسنے لگے بولے'' یہ تو قابل اعتراض مکالمہ بول دیا ہے آپ نے۔ فلم میں نہ رکھ دینا سنسر والے کاٹ دیں گے، مگر میں آپ کو شاندار مہورت کرنے کا مشورہ ضرور دوں گا۔ اس طرح ساری انڈسٹری اور ٹریڈ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ نے فلم شروع کی ہے۔ فلم کا چرچا ہو جائے گا تو ڈسٹری بیوٹرز بھی متوجہ ہوں گے۔ یہ کاروباری گر ہے۔''

ہم نے کہا'' طارق صاحب یہ تو فضول خرچی ہے۔ ''

کہنے لگے'' فضول خرچی نہیں فلم ڈسٹری بیوٹرز کیلئے ایک جال ہے۔ ویسے آپ جو مناسب سمجھیں کیجئے۔ ''

ہم یوں تو ذاتی یا اپنے حوالے سے کسی پبلسٹی کے قائل نہیں ہیں مگر کاروباری ضرورت کے تحت ہم نے اخبار والوں کو یہ خبر دے دی کہ ہم بھی فلم بنانے والے ہیں۔ اس زمانے میں مختصر سی تو انڈسٹری تھی۔ ہر ایک کو علم ہو گیا۔ بہی خواہوں نے مبارک بادیں دینی شروع کر دیں۔ داناؤں نے سمجھانا شروع کر دیا کہ بھائی کیوں شامت آئی ہے تمہاری۔ یہ تو بڑی مصیبت کا کام ہے بڑے بڑوں کے چھکّے چھوٹ جاتے ہیں۔

ہم نے کہا'' بھائی یہ کام آخر دوسرے لوگ بھی تو کر رہے ہیں، ہم تو ان سے زیادہ جانتے ہیں۔ ''

کہا'' مگر وہ جو کچھ کرتے ہیں آپ نہیں کر پائیں گے۔ وہ تو وقت پڑنے پر خوشامد کر لیتے ہیں، ضرورت محسوس کریں تو دھمکی بھی دے ڈالتے ہیں۔ اداکاروں وغیرہ سے جھوٹے وعدے کرتے ہیں، لوگوں کے پیسے ہضم کر لیتے ہیں۔ دو دو

ماہ چپراسیوں تک کی تنخواہ نہیں دیتے۔ فلم کی ریلیز کے وقت عین وقت پر فلم ڈسٹری بیوٹر کو یہ خبر سناتے ہیں کہ فلم کا بجٹ بہت بڑھ گیا ہے اس لئے آپ کو ایگری منٹ کی رقم سے زیادہ دینا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔"

ہم نے کہا"جب اوکھلی میں سر دے دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔ اب تو جو بھی ہوگی دیکھی جائے گی۔"

ہمارے حیدر آباد والے شناسا نے کراچی کے اخباروں میں یہ خبر پڑھی تو اگلے ہی روز ان کا فون آگیا" آفاقی صاحب ہمیں منع کرتے ہیں اور خود فلم بنا رہے ہیں یہ تو کوئی انصاف نہیں ہے۔ "

ہم نے کہا" یہ باتیں فون پر کرنے کی نہیں ہیں۔ آپ لاہور کب آرہے ہیں؟ "

بولے" جب آپ کہیں گے پہنچ جائیں گے۔ "

ہم نے کہا" جب لاہور کا دورہ کریں تو ہم سے ضرور مل لیں۔ "

وہ تیسرے ہی دن اچانک آن دھمکے" اب بتایئے کیا قصہ ہے؟ "

ہم انہیں اپنی مالی حالت سے آگاہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہیں بتایا" دیکھو بھائی ہم نے تھوڑے بہت سرمائے سے فلم شروع کر دی ہے آگے اللہ مالک ہے۔ "

کہنے لگے" آپ کے تو سبھی جاننے والے ہیں۔ ہر ایک آپ کے ساتھ تعاون کرے گا۔ فلم سٹار، سٹوڈیو اونر، سنگر، پھر آپ کا ڈائریکٹر اور میوزک ڈائریکٹر بھی اچھے ہیں۔ فلم ڈسٹری بیوٹروں سے بھی آپ کی دوستی ہے۔ ادھر آپ فلم شروع کریں گے ادھر خریدنے والے آجائیں گے۔ فٹافٹ فلم مکمل ہو جائے گی۔ "

ہم نے کہا" آپ کے منہ میں گھی شکر۔ مگر یہ تو محض اندازے ہیں۔ بعض اوقات سب اندازے دھرے رہ جاتے ہیں۔ "

کہنے لگے" دیکھئے آپ مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کریں آپ فلم بنا رہے ہیں تو مجھے بھی شامل کریں ورنہ میں ریل گاڑی کے نیچے آکر خودکشی کرلوں گا۔ "

" بھئی یہ تو بڑی بے رحمی ہوگی۔ کوئی آسان سا طریقہ سوچیں۔ "

کہنے لگے" کراچی کی محمدی بلڈنگ کی چھت سے چھلانگ لگا کر مر جاؤں گا۔ "

اس وقت تک یہ کراچی کی بلند ترین عمارت تھی۔

ہم نے کہا ”دیکھئے شیخ صاحب آپ ہمیں مہورت کرنے دیجئے اس کے بعد آپ سے بھی بات کرلیں گے۔ “

کہنے لگے ”بعد میں کیا بات کرنی ہے۔ جو کہنا ہے ابھی کہہ دیں۔ سچّی بات یہ ہے کہ میں پچاس ہزار روپیہ لگا سکتا ہوں۔ آپ مجھے بھی حصہ دار بنا لیجئے۔ “

ہم نے کہا ”بھائی جان، فلموں میں اکثر نقصان بھی ہو جاتا ہے پھر آپ کی رقم کا کون ذمہّ دار ہوگا؟ “

”حصّے دار کا مطلب سمجھتے ہیں نا؟ نفع اور نقصان دونوں میں شریک، مجھے آپ پر بھروسا ہے۔ بس مجھ سے رقم لے لیں اور بینک میں رکھ دیں۔ اس کے بعد جیسی اللہ کی مرضی۔ “

ہم نے ان سے غور کرنے کیلئے ایک روز کا وقت مانگا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم ان کی رقم لیتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ یہ تو امانت کا معاملہ ہے۔ نقصان ہو گیا تو کیا منہ دکھائیں گے۔ مگر طارق صاحب پھر ناصح بن کر سامنے آ گئے۔

”آفاقی صاحب جب وہ خود کہہ رہا ہے کہ نفع نقصان دونوں میں وہ شریک ہے تو پھر سوچنے کی کیا بات ہے۔ میری مانیں تو اس کی بات مان لیں۔ پچاس ہزار کافی بڑی رقم ہے۔ آپ تو ان پیسوں میں فلم مکمل کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں آپ اپنی فلم اونے پونے فروخت کرنے کے لئے مجبور بھی نہیں ہوں گے۔ اپنی شرطوں پر اطمینان سے ڈسٹری بیوٹرز سے سودا طے کرنا۔ “

اللہ بخشے طارق صاحب بہت مخلص اور بے لوث دوست تھے۔ دوستوں کی بھلائی میں خوش ہونے والے۔ ان کا بھلا چاہنے والے۔ ان کا مشورہ بالکل درست تھا۔ ہمارا بھی یہی خیال تھا مگر ہم کو اخلاقی تائید کی ضرورت تھی۔ سو وہ ہمیں مل گئی۔ اس زمانے میں بلیک اینڈ وائٹ فلم عموماً سوا دو لاکھ یا ڈھائی لاکھ روپے میں بن جاتی تھی۔ اگر کفایت شعاری سے کام لیا جاتا تو نقصان کا سوال ہی نہیں تھا۔ پھر ہمیں ہر ایک کا تعاون بھی حاصل تھا۔ ہم تو پانچ ہزار کے بل بوتے پر فلم بنانے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ پچاس ہزار تو اس لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔

دوسرے دن ہم نے طارق صاحب کو اطلاع دی کہ ہم نے مہورت کے کارڈ چھپنے کو دے دیے ہیں۔ ایورنیو سٹوڈیوز میں فلم کا شاندار مہورت کریں گے۔ ساری انڈسٹری اور ٹریڈ کو بلائیں گے۔ مٹھائی تقسیم کریں دھوم دھام سے فلم کا

آغاز کریں گے۔

وہ بہت خوش ہوئے کہا"اور ہار پھول؟"

ہم نے کہا"طارق صاحب یہ تو اوچھا طریقہ ہے "

کہنے لگے"مولانا اس کے بغیر تو مہورت ہی مکمل نہیں ہوتا، خیر یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں میں اپنے اسسٹنٹ سے منگالوں گا۔"

ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً مہورت کا بندوبست کر لیا۔ لاہور کی فلمی دنیا میں ہلچل سی مچ گئی۔ کوئی خوش تھا' کوئی فکر مند' کوئی چپکے چپکے ہمارا مذاق اڑا رہا تھا کہ لو بھئی اب یہ صاحب بھی پروڈیوسر بن گئے ہیں۔

س اثناء میں زیبا ایک دو فلموں کی شوٹنگ کیلئے لاہور پہنچ گئی تھیں۔ سبھی اداکاروں اور ایکٹریسوں سے ہماری اچھی ملاقات تھی سب نے ہمیں مبارک باد دی اور وعدہ کیا کہ ہمارے مہورت میں ضرور آئیں گے۔

مگر اس کے ساتھ ہی شکوے شکایت کا ایک لامتناہی دفتر بھی کھل گیا۔ جسے دیکھئے ہم سے شکایت کر رہا ہے کہ ہمیں اپنی فلم میں کیوں نہیں رکھا۔ ہر موسیقار کا منہ پھولا ہوا ہے۔ اداکار اپنی جگہ بگڑے ہوئے ہیں۔ ہر گلوکار کی فرمائش ہے کہ اس سے گانے ضرور لیں ورنہ اچھا نہ ہو گا۔ تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ ہم نے سمجھایا کہ بھائی' ایک فلم میں بھلا کتنے لوگ کام کر سکتے ہیں؟ صبر سے کام لو اور ہمارے حق میں دعائے خیر کرو۔ آئندہ بھی فلمیں بنانے کے قابل ہوئے تو باری باری سبھی دوستوں کو خوش کر دیں گے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ معاوضے یا روپے پیسے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ نہ لالچ تھا۔ بس ہر ایک کی خواہش تھی کہ ایک دوست پہلی فلم بنا رہا ہے تو اس میں اس کا حصّہ کیوں نہ ہو۔ ہم ہر ایک کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے کہ بھائی صبر کرو۔ آخر ایک فلم میں کتنے ڈائریکٹر' کتنے میوزک ڈائریکٹر' کتنے ہیرو' کتنی ہیروئنیں' کتنے اداکار' کتنے گلوکار' کتنے نغمہ نگار' کتنے ہنر مند کام کر سکتے ہیں۔ مگر ہر ایک کا منہ پھولا ہوا تھا۔ جسے دیکھئے ترچھی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ منہ اٹھائے پاس سے گزر گیا ہے۔ نہ دعا نہ سلام۔

ہم نے طارق صاحب سے کہا ”طارق صاحب۔ ہم تو فلم بنانے کا اعلان کر کے پچھتا رہے ہیں‘ اب کیا کریں؟ “
وہ بولے ”صبر کریں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کے ہر ایک سے تعلقات ہیں۔ دوستی ہے‘ مراسم ہیں‘ بے تکلفی ہے۔ ہر ایک آپ پر اپنا حق سمجھتا ہے۔ “
اور تو اور ہمیں اسٹوڈیو اونرز کی ناراضی کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔
ایک دن شباب کیرانوی ہم سے کہنے لگے ”آفاقی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ شوکت صاحب سے تمہارے پرانے تعلقات ہیں۔ تم نے وہیں سے اپنی فلمی زندگی کا آغاز کیا ہے مگر فلم تم ایورنیو اسٹوڈیو میں بنا رہے ہو۔ شوکت صاحب کیا سوچیں گے؟ “
ہم نے کہا ”شباب صاحب‘ آپ کو معلوم ہے کہ شوکت صاحب اگر اسٹوڈیو کے کرائے کا اُدھار کر بھی لیں تو فلم اُدھار نہیں دیتے۔ آغا صاحب کے اسٹوڈیو میں ہمیں یہ سہولت مل جائے گی۔ “
کہنے لگے ”ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر تم شوکت صاحب سے کہتے تو شاید وہ یہ بندوبست بھی کر دیتے۔ “
ہم نے کہا ”جب ان کا یہ دستور ہی نہیں ہے تو بلاوجہ مطالبے کرنے سے فائدہ؟ اور دیکھیں‘ آپ کبھی باتوں باتوں میں شوکت صاحب پر یہ صورتِ حال واضح کر دیں۔ “
چلئے‘ شوکت حسین رضوی صاحب کی طرف سے تو ہمیں اطمینان ہو گیا مگر ملک غلام باری کا کیا ہو گا؟ باری صاحب ہمارے بہت پرانے شناسا بلکہ دوست تھے۔ ان کے ساتھ بہت بے تکلّفی بھی رہی۔ ان کی حکایتیں‘ داستانیں اور مہم جوئی کی کہانیاں ہم خدا جانے کب سے سن رہے تھے۔ انہوں نے ایورنیو اسٹوڈیو کے عقب میں اپنے اسٹوڈیو کے لئے زمین خریدی تو خاص طور پر مجھ سے کہا ”آفاقی۔ میں نے جان بوجھ کر آغا گل کے اسٹوڈیو کے برابر میں اپنے اسٹوڈیو کے لئے زمین خریدی ہے۔“ ”اس میں کیا مصلحت ہے؟“ ہم نے پوچھا۔
ہنس کر کہنے لگے ”یار مجھے ان پیسے والوں نے بہت ذلیل کیا ہے۔ میں بے مایہ اور غریب تھا تو یہ مجھے اپنے برابر میں بٹھانا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اب اللہ نے مجھے ان کے برابر کا بنا دیا ہے تو میں انہیں کیوں خدا کی قدرت کا تماشا نہ دکھاؤں۔ میں نے آغا کے اسٹوڈیو کے ساتھ زمین لی ہے اور میں اپنے بچوں کو وصیّت کر جاؤں گا کہ میرے بعد بھی آغا

صاحب کے بچّوں کے ساتھ مقابلہ جاری رکھیں۔"

باری صاحب بہت زیادہ حسّاس آدمی تھے۔اپنے برے وقتوں کی ہر بات ان کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ایک تو وہ تھے ہی پیٹ کے ہلکے اور باتونی۔دوسرے ہمارے ساتھ اکثر طویل ملاقاتیں رہتی تھیں۔اپنا کون سا قصہ ہے جو ہمیں انہوں نے نہیں سنایا۔کاروباری یہاں تک کہ ذاتی واقعات بھی سناڈالے۔ان کے معاشقے' رومان' کاروباری معرکے' حسینوں کو فتح کرنے کی داستانیں۔سبھی کچھ ہمارے علم میں تھا۔

انہوں نے باری اسٹوڈیوز کا سنگ بنیاد رکھا تو ہم سے کہنے لگے۔"آفاقی۔آج کل کی اولاد کا بھی عجیب حال ہے"

"کیوں۔کیا ہوا؟" ہم نے پوچھا۔

ہنس کر کہنے لگے "جب اسٹوڈیو کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد اس کے نام کا سائن بورڈ لگایا گیا تو پتا ہے راحیل نے کیا کہا؟"

"کیا؟"

"مجھ سے کہنے لگا۔ڈیڈی' کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ باری اسٹوڈیو سے پہلے آپ "راحیل" کا اضافہ کر دیں۔اس طرح راحیل باری اسٹوڈیو ہو جائے گا۔"

ان کے بڑے بیٹے راحیل کی عمر اس وقت مشکل سے سات آٹھ سال ہو گی۔

ہم نے کہا "تو پھر اضافہ کرا دیتے۔حرج کیا ہے؟"

کہنے لگے "یار ان بچّوں کو بھی تو معلوم ہو کہ پیسہ کتنی محنت سے کمایا جاتا ہے اور عزّت حاصل کرنے کے لئے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔میں نے اسے کہہ دیا کہ بیٹا' میری زندگی میں تو ایسا نہیں ہو سکتا۔تم خود اگر اپنی محنت سے نیا اسٹوڈیو بناؤ گے تو اس کا راحیل باری اسٹوڈیو رکھ دینا۔"

باری اسٹوڈیو کی تعمیر شروع ہوئی تو باری صاحب شام ہوتے ہی لکشمی چوک والے دفتر سے اسٹوڈیو پہنچ جاتے تھے۔شاہ نور اسٹوڈیو اور ایورنیو اسٹوڈیوز بھی آس پاس تھے۔ہم پیدل ہی سب جگہ گھومتے پھرتے تھے۔باری صاحب اپنے دفتر کے سامنے باہر لان میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے اور ہر آنے جانے والے سے علیک سلیک کرتے رہتے تھے۔کچھ تو سلام کر کے دور ہی سے گزر جاتے۔زیادہ بے تکلف حضرات کو وہ پکار کر بلا لیتے۔ان کی اس محفل کو ہم نے

دربار کانام دیا تھا۔ آج کے نغمہ نگار خواجہ پرویز اس وقت نغمہ نگار نہیں بنے تھے مگر فلم والوں سے گہرا میل جول تھا۔ غضب کے لطیفہ باز اور فقرہ باز تھے۔ ہم دونوں نے باری صاحب کی محفل کو دربار کا نام دیا اور انہیں مہابلی کا خطاب عنایت کر دیا۔

''مہابلی کس لئے ؟'' انہوں نے پوچھا۔

ہم نے بتایا''شہنشاہ اکبر کو مہابلی کہا جاتا تھا۔ آپ بھی فلمی دنیا کے شہنشاہ سے کم تو نہیں ہیں۔ ''

خواجہ پرویز نے کہا''مگر کنجوسی میں پورے بنئے ہیں۔ باری صاحب۔ اتنا بڑا اسٹوڈیو بنا رہے ہیں تو پھر دل بھی بڑا کیجئے۔ ذرا شوکت صاحب کو دیکھئے۔ آغا صاحب کو دیکھئے' کیسی دریا دلی سے پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ ''

اس طرح کہہ سن کر ہم باری صاحب کو سخاوت پر اُکساتے رہتے تھے اور وہ بھی لاگے باندھے قدرے سخاوت پر آمادہ ہو گئے تھے۔

ایک دن خواجہ پرویز نے کہا''مہابلی۔ دربار تو آپ نے سجا لیا ہے مگر درباریوں کو نہ جاگیر' نہ خلعت' نہ خطاب' نہ عتاب۔ بادشاہ ایسے تو نہیں ہوتے۔ اصلی مہابلی کے دربار میں تو''نورتن'' تھے۔ آپ کے دربار میں کیا ہے ؟ ''

باری صاحب تنگ آ کر بولے''وہ تو بڑے قابل لوگ تھے۔ تم لوگوں میں کون سی قابلیت ہے ؟ ''

ہم نے کہا'' باری صاحب۔ ایسا تو نہ کہئے۔ ہم قابل نہیں ہیں تو نہ سہی مگر لطیفے سنا کر آپ کو ہنساتے رہتے ہیں' یہ کیا کم ہے ؟

ان کا دریائے سخاوت جوش میں آ گیا' فرمایا''ٹھیک ہے۔ تو پھر تم دونوں کو بھی ہم خطاب عطا کرتے ہیں۔ ایک کو بیربل اور دوسرے کو مُلا دوپیازہ۔ اب یہ فیصلہ تم آپس میں کر لو کہ بیربل کون ہو گا اور مُلا دوپیازہ کون ہے ؟؟ ''

یہ فیصلہ کبھی نہ ہو سکا کہ ہم دونوں میں سے بیربل کون ہے اور مُلا دوپیازہ کون ہے لیکن مہابلی تو ظاہر ہے کہ باری صاحب ہی تھے۔ وہ جب کسی خاتون پر مہربان ہوتے تو ہم فوراً اسے جودھا بائی کا خطاب دے دیا کرتے تھے۔ یہ خطاب باری باری مختلف خواتین کو عطا کیا گیا۔ وہ مہارانی جودھا بائی بن بھی گئیں اور اس عہدے سے معزول بھی کر دی گئیں مگر خود انہیں کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ یہ سب کچھ ہم تینوں کے درمیان ہی رہتا تھا۔

باری صاحب نے ہمارا خوب صورت دعوت نامہ دیکھا تو سخت برہم ہوئے۔انہوں نے خواجہ پرویز سے کہا'' یار' یہ آفاقی تو بہت غلط آدمی نکلا۔ ''

خواجہ پرویز نے فوراً مشورہ دیا''بس تو پھر اس سے منصب اور خطاب چھین لیا جائے۔ ''

باری صاحب بولے'' یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔دیکھو اب اس نے فلم شروع کی ہے تو ایورنیو اسٹوڈیو میں فلم بنارہا ہے۔کتنی غلط حرکت ہے ''

خواجہ پرویز نے ہمیں فوراً بتادیا کہ مہابلی سخت برہم ہیں۔ایسا نہ ہو فوج کشی کردیں۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ آپ خود ہی چپکے سے ہاتھ باندھ کر دربار میں حاضر ہو جائیں۔

ہم اسی دن باری صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ان کا رنگ ویسے ہی سرخ و سفید تھا۔ کسی بات پر ناراض ہوتے یا غصہ آتا تو چہرہ لال بھبوکا ہو جاتا تھا۔وہ اپنا غصہ چھپانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئے۔سب سے پہلے تو ان کا چہرہ اور کان سرخ ہو جاتے تھے۔بہت ضبط کرتے مگر چپ نہ رہ سکتے تو زبانی اظہار ناراضگی شروع کر دیتے۔ہم اس انتظار میں تھے کہ وہ غصے کا اظہار کریں۔

ہم نے کہا''کیا بات ہے باری صاحب۔ناراض لگتے ہیں؟'' بس پھر کیا تھا۔باری صاحب تو ساون کے بادلوں کی طرح برسنے لگے۔

کافی دیر شکوہ شکایت کرتے رہے۔جب ستانے کے لئے رُکے تو ہم نے کہا'' باری صاحب۔یہ تو صرف مہورت ہے۔جب فلم کی شوٹنگ ہو گی تو وہ ناراض ہونے کا موقع ہو گا۔ ''

ان کا غصہ ایک دم پچاس فیصد رہ گیا'' فلم میرے اسٹوڈیو میں ہی بناؤ گے نا؟ ''

ہم نے کہا'' دراصل آغا صاحب ہمیں بہت سہولتیں اور مراعات دے رہے ہیں جو آپ اپنے فلم سازوں کو نہیں دیتے۔ ''

کہنے لگے ''ادھار اسٹوڈیو دے دوں گا۔ کہو گے تو را میٹریل بھی ادھار دے دوں گا۔ ''

''کرائے میں بھی رعایت کر دیں گے؟'' ہم نے پوچھا۔

''ہاں ہاں' کر دیں گے۔ ''

''اور کمیشن کتنا لیں گے۔سنا ہے آپ بہت منافع لیتے ہیں۔ ''

''وہ بات بھی ہو جائے گی۔ ''

ہم نے کہا''بس تو پھر شوٹنگ شروع کرنے سے پہلے آپ سے بات ہو گی۔ مگر یہ بتائیں کہ مہورت پر تو آئیں گے نا؟ ''

بولے''آجاؤں گا آجاؤں گا۔اگر تم گھٹیا ہو تو کیا میں بھی گھٹیا بن جاؤں گا۔ ''

شوکت صاحب کے پاس ہم خود مہورت کارڈ لے کر گئے۔

پوچھا''کاہے کا دعوت نامہ ہے؟ ''

ہم نے کہا''شوکت صاحب۔ ہماری فلم کا مہورت ہے۔

ایورنیو اسٹوڈیو میں۔ ''

''اچھا اچھا' مبارک ہو۔ ''

''شوکت صاحب' آپ کو ضرور آنا ہے۔ ''

''کیوں نہیں میاں آئیں گے۔تاریخ کون سی ہے؟ ''

ہم نے کہا''کارڈ پر درج ہے اور ہم ایک دن پہلے آپ کو یاد دہانی بھی کرادیں گے۔ ''

شوکت صاحب شکایت کا حرف تک زبان پر نہ لائے۔ ممکن ہے شباب صاحب نے ہماری پوزیشن واضح کر دی ہو۔

مہورت کے دن ہم بہت مصروف رہے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ مہمانوں کی آمد شروع ہوئی تو ہال بھر گیا مگر مہمان تھے کہ اُمڈے چلے آرہے تھے۔ جسے دیکھئے مبارک باد دینے چلا آرہا ہے۔ سبھی آئے لیکن اگر نہ آئیں تو زیبا۔ کئی ہیروئنوں نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا''آفاقی صاحب۔ کیا آپ کی ہیروئن کراچی گئی ہوئی ہیں؟ ''

رخسانہ نے کہا''آفاقی صاحب۔ ہمیں تو آپ نے فلم میں رکھا ہی نہیں پھر بھی آپ کی خوشی میں شریک ہونے کے لئے آگئے۔آپ کی ہیروئن نے تو آپ کو لفٹ ہی نہیں دی۔ ''

زیبا کی غیر موجودگی کو ہم نے بھی محسوس کیا۔ کم و بیش فلمی صنعت کے سبھی لوگ موجود تھے پھر زیبا کیوں غیر حاضر

تھیں؟ ہمیں بہت افسوس ہوااور غصہ بھی آیا۔

مہورت بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ مٹھائی تقسیم ہوئی۔ طارق صاحب کے اسسٹنٹ نے پھولوں اور ہاروں کا بندوبست کیا تھا۔ ہار پہنائے گئے۔ یہ تو خیر ٹھیک تھا مگر پوز بنا کر تصویریں بنانے کا وقت آیا تو ہمیں بہت پریشانی ہوئی مگر کوئی مفر نہ تھا۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ اس موقعہ پر ہمارے ساتھ یادگار تصویر بنوائے۔ چائے کافی کا دور چلتا رہا جس کے لئے ہم نے خصوصی طور پر اہتمام کیا تھا۔ ہمارے سبھی جاننے والے 'دوست احباب' شناسا' واقف کار موجود تھے اور واقعی بہت خوش تھے۔ وہ ایسا ہی زمانہ تھا۔ لوگ خلوص اور محبت سے ملتے تھے۔ ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوتے تھے۔ رات گئے تک یہ ہنگامہ رہا۔ خوب رونق اور چہل پہل تھی۔ یہ ہماری زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔ گھر پہنچے تو بہت سے ٹیلی فونی پیغامات ہمارے منتظر تھے۔ حیدرآباد سے شیخ صاحب نے بذریعہ تار مبارک باد کا پیغام ارسال کیا تھا اور ہمیں یاددہانی کرائی تھی کہ اپنا وعدہ نہ بھولیں۔

دوسرے دن ہم نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ ہماری کل پونجی میں سے سوا تین ہزار روپے خرچ ہو گئے تھے۔ اس میں گلوکارہ کا معاوضہ' سازندوں کا معاوضہ۔ دعوت ناموں اور لفافوں کا خرچہ۔ مٹھائی' چائے کافی کے اخراجات اور چھوٹے موٹے لوگوں کو ادائیگی کے اخراجات بھی شامل تھے۔ صرف اسٹوڈیو کا کرایہ ادھار تھا۔ باقی سب نقد ادا کر دیا گیا تھا۔

ہمارے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ہم نے اگلے روز پریشان ہو کر طارق صاحب سے کہا ''طارق صاحب۔ ہمارے سوا تین ہزار روپے خرچ ہو گئے ہیں۔ صرف پونے دو ہزار باقی بچے ہیں۔ کیا اتنے سرمائے سے فلم بن جائے گی؟ ''

وہ ہنسنے لگے ''آفاقی صاحب۔ حوصلہ رکھئے۔ مہورت ہو گیا ہے۔ کراچی سے ڈھاکا تک سب کو خبر لگ گئی ہے۔ ڈسٹری بیوٹر آئیں گے تو سرمایہ بھی آجائے گا۔ ''

مگر کوئی ڈسٹری بیوٹر نہ آتا۔ معلومات سب نے حاصل کی تھیں مگر شاید اس انتظار میں تھے کہ فلم کی شوٹنگ کا آغاز ہو گا تو بات چیت کریں گے۔ مگر شوٹنگ کا آغاز کیسے ہو؟ لاکھ سستا زمانہ سہی مگر پونے دو ہزار روپے سے فلم کی شوٹنگ کیسے ہو سکتی تھی؟

دوسرے دن ہمیں زیبا خانم کا ٹیلی فون موصول ہوا۔ بہت مبارک باد دے رہی تھیں۔ ہم غصے کے مارے صرف ہوں ہاں کرتے رہے۔

''کیا ہوں ہاں لگا رکھی ہے۔ بولتے کیوں نہیں؟ ''

''کیا بولیں، ضرورت ہی کیا ہے؟ ''

''آفاقی، کیا تم ناراض ہو؟'' انہوں نے سادگی سے پوچھا۔

ہمارے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ''بھئی آپ کو کیا۔ آپ نے تو مہورت میں آنے کی تکلیف ہی گوارا نہیں فرمائی۔''

''آفاقی۔ ایمان سے میں مجبور تھی۔ بتاؤں گی تو شکایت دور ہو جائے گی۔ ''

ہم نے کہا ''بھئی آپ بہت بڑی ہیروئن بن گئی ہیں۔ ساری انڈسٹری وہاں موجود تھی اگر نہیں تھی تو ہماری فلم کی ہیروئن۔ ''ہم نے کافی دیر تک غصے کا اظہار کیا۔ وہ بہت صبر اور تحمل کے ساتھ سنتی رہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید ہماری دلیلوں سے قائل ہو گئی ہیں مگر آخر میں وہ تنگ آکر بولیں ''تمہارا تو دماغ ہی خراب ہے۔ کسی دوسرے کی بات ہی نہیں سنتے۔ ''

ہم نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کے بعد کچھ اور کہنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔

اگلے روز ہم باری اسٹوڈیوز گئے تو باری صاحب نے ہماری خوب ہُوٹنگ کی۔ انہوں نے دور ہی سے ہمیں دیکھ کر پکارا ''غریب پروڈیوسر آگیا۔ ''

ہم نزدیک جا کر بیٹھ گئے۔

وہ کہنے لگے ''میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا کہ بھائی فلم بنانا غریبوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے زیبا کو ایڈوانس بھی دیا تھا یا نہیں؟ ''

ہم نے کہا ''یہ ہمارے کاروباری راز ہیں۔ ''

کہنے لگے ''جو کہ ساری دنیا جانتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے زیبا کو ایک روپیہ بھی ایڈوانس یا سائننگ کا نہیں دیا ہے۔ فلموں میں تعلقات سے کام نہیں چلتا۔ پیسہ چلتا ہے، پیسہ''!

ہم خاموش رہے' وہ کہنے لگے ''اچھا۔ تم چائے پی کر اپنا غم غلط کرو۔ ویسے مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ ''

ہم نے کہا'' باری صاحب' اور سب تو ٹھیک ہے مگر آپ محاورے کا غلط استعمال نہ کیجئے۔ ''

''مجھے محاورے مت سکھاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے اسے ہیروئن بنا کر فلم کا مہورت کیا اور وہ پہلے ہی دن غائب ہو گئی۔ میں نے تو سنا ہے کہ وہ تمہاری فلم میں کام ہی نہیں کرے گی۔ ''

کہاں تک سنتے آخر ہم بھی بول پڑے ''نہیں کرے گی تو نہ کرے۔ پاکستان میں اور بھی بہت سی ہیروئنیں موجود ہیں۔ ''

وہ ہنسنے لگے ''یار تو تو گرمی کھا گیا۔ خیر خیر' بیٹھ کر ٹھنڈا پیو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے دوست' ابھی تو ابتدائے عشق ہے اور تم گھبرا گئے ہو۔ ''

اس روز ہم رات کو دیر تک سوچتے رہے کہ کہیں فلم ساز بن کر ہم نے غلطی تو نہیں کر دی۔ ظاہر ہے کہ سرمائے کے بغیر فلم نہیں بن سکتی۔ ہم اپنے تعلقات کے بارے میں بلاوجہ خوش فہمیوں کا شکار ہیں۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ فلم اور پولیس والے کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ ابھی تو زیبا کا معاملہ ہے۔ آگے چل کر اور خدا جانے کون کون سے صدمے سہنے پڑیں گے۔ ہم ایورنیو اسٹوڈیو میں ایک فلم کے سیٹ پر گئے تو وہاں زیبا موجود تھیں۔ ہم نظریں بچا کر گزرنے لگے تو انہوں نے کہا

''آفاقی۔ کیا تم نے مجھے اپنی فلم میں سے کٹ کر کے دوسری ہیروئن سائن کر لی ہے؟ ''

ہم نے کہا'' آپ کو ہم نے اپنی فلم میں سائن ہی کب کیا تھا۔ اگر سائن کیا ہوتا اور پیشگی رقم دی ہوتی تو آپ ہمارے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتیں۔ ''

''میں نے کیا سلوک کیا' کیا کوئی بیمار نہیں ہوتا؟ ''

ہم نے کہا'' اگر ہم نے پیشگی رقم دی ہوتی تو بیمار بھی نہ ہوتیں۔ ہم سب سمجھتے ہیں۔ ''

''کیا خاک سمجھتے ہیں؟ آپ تو بے وقوف ہیں اوّل نمبر کے۔ سمجھتے ہی نہیں عورتیں بیمار پڑ سکتی ہیں'' انہوں نے جس

انداز میں بات کی دوسرے سب کھکھلا کر ہنس دیئے، ہمارا منہ سرخ ہو گیا۔
اور سنئے' ایک تو ہمیں دکھ پہنچایا اوپر سے بھرے سیٹ پر بے وقوف نمبر اوّل کہہ دیا۔ ہم نے بڑی شرمندگی محسوس کی۔ ہم نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس لڑکی کو اپنی فلم میں ہر گز نہیں رکھیں گے اور نہ ہی اسکو دوسروں کی فلموں میں کاسٹ ہونے دیں گے، ہمارے اندر کا صحافی بھڑک اٹھا۔ جس نے ہمارا ارادہ سنا وہ الٹا خفا ہوا کہ فلمی دنیا میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ تمہیں زیبا سے کوئی انتقام نہیں لینا چاہئے۔ ایک دوست نے ہمیں سمجھایا کہ کیوں بلاوجہ جذباتی ہو رہے ہو۔ کیا ہوا۔ اگر زیبا مہورت میں نہیں آئی۔ ہزار کام ہو سکتے ہیں۔ تم نے بلاوجہ یہ بات اپنے اعصاب پر سوار کر لی ہے۔ یار فلم بنانے چلے ہو تو حوصلہ بھی پیدا کرو۔

ہمارے پاس کل سرمایہ پونے دو ہزار کے قریب رہ گیا تھا۔ سوچا کہ شیخ صاحب کو حیدر آباد فون کر کے پچاس ہزار روپیہ بھیجنے کا کہا جائے اور پھر شوٹنگ کا پروگرام بنایا جائے۔ ہم نے حیدر آباد کے لئے ٹرنک کال ملائی۔ ٹرنک کال کا ملنا بھی ان دنوں بائی چانس ہی تھا۔ ملی ملی' نہ ملی نہ ملی۔
ٹرنک کال ملانے کا مطلب یہ تھا کہ آپ گئے دین دنیا سے۔ کال بک کرا کے بیٹھے ہوئے ہیں مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا۔ قسمت سے اگر دو چار گھنٹے میں مل گئی تو خوش قسمتی ہے ورنہ اگلے دن تک ٹیلی فون کے پاس بیٹھے انتظار کرتے رہئے۔
دو دن ہم حیدر آباد ٹیلی فون ملانے کی کوشش کرتے رہے۔ ایکسچینج والوں سے بھی جھگڑے کرتے رہے۔ آخر تیسرے دن کال مل گئی۔ دوسری طرف شیخ صاحب بول رہے تھے۔ " السلام علیکم شیخ صاحب۔ دو دن سے ٹرنک کال ملا رہے ہیں۔ شکر ہے مل گئی۔ "

ادھر سے آواز آئی " یہ آپ کی نہیں' میری ٹرنک کال ہے۔ میں بھی چار دن سے فون ملا رہا ہوں۔ اگر آج بھی نہ ملتی تو تار دے دیتا۔ "
ہم نے کہا " پہلے آپ بات کر لیجئے' پھر ہم آپ کو اپنی سنائیں گے۔ "

بولے ''آفاقی صاحب۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ نادم ہوں مگر مجھے معاف کر دیجئے۔ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ''

ہم حیران رہ گئے ''کیا ہو گیا۔ کس بات پر شرمندہ ہو رہے ہیں؟ ''

بولے ''میری فیکٹری میں آتش زدگی ہو گئی ہے۔ ''

ہم پریشان ہو گئے ''زیادہ نقصان تو نہیں ہوا؟ ''

''نقصان تو بہت ہوا ہے۔ میری تو انشورنس بھی ختم ہو چکی تھی۔ میں بہت پریشان ہوں۔ ''

ہم نے مناسب الفاظ میں ان سے فیکٹری کی تعزیت کی۔

وہ پوچھنے لگے ''آپ نے کب شوٹنگ کا پروگرام بنایا ہے؟'' ہم نے کہا ''بس آپ جلدی سے پیسے بھیج دیں تو پروگرام بھی بن جائے گا۔ ''

کہنے لگے ''آفاقی صاحب۔ ناراض نہ ہوں۔ میں فی الحال پیسے نہیں بھیج سکوں گا۔ ''

ہم پر تو جیسے بم گر گیا۔ آواز ہی گم ہو گئی۔

بوہ بولے ''یقین کیجئے میں بے حد شرمندہ ہوں۔ اسی لئے میں کہہ رہا تھا کہ آپ پیسے لے کر اپنے پاس رکھ لیجئے۔ اب تو میں پھنس گیا ہوں۔ کم سے کم آٹھ دس مہینے تک کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ اپنا شوٹنگ کا پروگرام آگے بڑھا دیجئے۔ ''

ہم نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا پھر کہا ''شیخ صاحب۔ ہم نے زندگی میں پہلی بار فلم شروع کی ہے۔ دھوم دھام سے مہورت کیا ہے۔ اب اگر شوٹنگ نہ کی تو لوگ مذاق اڑائیں گے کہ یہ بھی صرف مہورت کر کے بیٹھ جانے والوں میں سے ہیں۔ فلمی دنیا میں ایسے لوگوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ہماری تو ساکھ ہی ختم ہو جائے گی۔ ''

''میں بہت شرمندہ ہوں'' انہوں نے پھر وہی ریکارڈ لگا دی۔

''شرمندہ ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ اپنے حالات ٹھیک کیجئے۔ ہم کوئی اور بندوبست کرتے ہیں۔ ''

''ارے نہیں۔ فلم تو آپ کے ساتھ میں ہی بناؤں گا۔ کچھ عرصہ رُک جایئے۔ ''

''شیخ صاحب' آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔ سب ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ ٹھیک ہے' اگلی بار آپ کے ساتھ فلم بنا لیں گے۔ مجھے آپ سے بہت ہمدردی ہے' یقین کیجئے۔ ''

''میں بہت شرمندہ ہوں'' انہوں نے پھروہی گردان شروع کردی۔ شکر ہے کہ کال کا وقت ختم ہو گیا تھا ورنہ وہ خدا جانے اور کتنی بار یہی الفاظ دہراتے۔

فون خاموش ہو گیا تو ہم سوچ میں پڑ گئے۔ ایک تو زیبا کے مہورت میں نہ آنے کی وجہ سے ہی لوگ ہمارا مذاق اُڑاتے رہے تھے۔ اب اگر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ فلمی دنیا میں یہ بھی ایک معمول ہے کہ نئے نئے لوگ تھوڑا بہت سرمایہ لے کر آتے ہیں۔ زور و شور سے مہورت کرتے ہیں۔ تھوڑا بہت کام بھی کر لیتے ہیں اور اس کے بعد لاپتا ہو جاتے ہیں۔ ایسے فلم سازوں کو فلم والے ''وسمی پرندے'' کہا کرتے ہیں۔ ہم اپنے نام پر یہ ٹھپا نہیں لگوانا چاہتے تھے۔ تو پھر کیا کریں؟

ہمارے تعلقات' بے تکلفی اور دوستی ہمیشہ ہر طرح کے لوگوں سے رہی ہے مگر مشکل یہ ہے کہ ہم نے کبھی کسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ دوسرے البتہ ہم سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اور پھر کسی سے پیسے مانگنے کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہم تو خود اپنے پیسے مانگتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ ادھار کیسے مانگتے؟ مگر یہ معاملہ بے حد سنگین تھا۔ اگر فلم کی شوٹنگ شروع نہ ہوئی تو ہمارے بارے میں لوگوں کی رائے خراب ہو جائے گی۔ ہم تمسخر کا نشانہ بن جائیں گے۔ مگر سرمایہ آئے کہاں سے؟ یہ تو ہمیں احساس تھا کہ ہماری شوٹنگ شروع ہو گی تو ڈسٹری بیوٹر بھی آ جائیں گے مگر شوٹنگ کیسے ہو؟ پونے دو ہزار جیب میں رکھ کر فلم بنانے چل کھڑے ہوئے۔ واقعی حماقت کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے؟

اس داستان کو مختصر کرنا ہی بہتر ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہم سے جو بھی پوچھتا کہ فلم کب شروع ہو رہی ہے تو ہم ٹال دیتے کہ بس۔ طارق صاحب فارغ ہوں گے تو وٹنگ شروع ہو جائے گی۔ مگر ہم سوچ سوچ کر تھک چکے تھے کہ شوٹنگ کے لئے سرمایہ کہاں سے لائیں؟ ایک دن بہت غور و فکر کرنے کے بعد ہم شباب کیرانوی صاحب کے پاس چلے گئے۔ وہ ہمارے بہت پرانے دوست اور ہم راز تھے۔ ہماری صورت دیکھتے ہی پوچھا ''یار آفاقی تم شوٹنگ کب کر رہے ہو؟ ''

دفتر میں اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ اس لیے ہم نے بات ٹال دی۔ جب ہم دونوں ہی رہ گئے تو ہم نے جی کڑا کر کے تمہید باندھی۔

''یار شباب صاحب' ہم تو مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ ''

وہ چوکنا ہو گئے ”کیسی مشکل؟“

ہم نے مختصراً انہیں حالات سے آگاہ کیا۔

”تو پھر اب کیا کرو گے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ سنو۔ یار تم کسی سے ہمیں قرضہ دلا دو۔ لاہور میں ایسے لوگ بھی ہیں اور ایک صاحب شیخ نتھا تو تمہارے بہت قریبی دوست ہیں۔“

”وہ تو تمہیں بھی جانتے ہیں۔“

”جانتے تو ہیں مگر کبھی واسطہ نہیں پڑا ہے ان سے۔ تم تو ان سے قرض لیتے رہے ہو۔ وہ جس طرح چاہیں اپنا اطمینان کر لیں۔ ہمیں امید ہے کہ چند دن کی شوٹنگ کے بعد ہی ہماری فلم بِک جائے گی۔“

شباب صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ پیروں تلے گھنٹی کا بٹن دبا کر چائے اور پان منگایا۔ پھر سگریٹ‘ سگار اور پائپ تینوں میں سے پائپ کا انتخاب کر کے تمبا کو نوشی شروع کر دی۔

”لو۔ تم بھی تمبا کو لے لو۔“

ہم نے کہا ”ہمارے پاس اپنا تمبا کو ہے۔“

ہم دونوں کچھ دیر چائے اور پائپ پیتے رہے۔ پھر ہم انہیں شیخ نتھا سے بات کرنے کی تاکید کر کے چلے آئے۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہ بعض لوگوں کو پچاس ساٹھ ہزار تک قرض دے دیا کرتے تھے۔ بعض اوقات اس سے زیادہ بھی دے دیتے تھے۔ ہمیں تو صرف پچاس ہزار کی ضرورت تھی۔

دوسرے دن ہم شباب صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ وہ ہمیں لے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے جہاں کھانا کھایا جاتا تھا۔

بولے ”یار آفاقی۔ میں نے شیخ صاحب سے بات کی تھی مگر ان کی ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“ ہم نے پوچھا۔

”وہ صرف ان فلم سازوں کو قرض دیتے ہیں جو شاہ نور اسٹوڈیوز میں اپنی فلم بناتے ہیں۔ دراصل انہیں شوکت

صاحب پر پورا بھروسا ہے کہ وہاں ان کی رقم ڈوبے گی نہیں۔ آغا صاحب اور ملک باری تو کبھی کبھی فلم ساز کے حق میں ہمدردی بھی دکھا دیتے ہیں۔ اس لئے شیخ صاحب شاہ نور اسٹوڈیو میں فلم بنانے والی پارٹی کے سوا کسی کو قرضہ نہیں دیتے۔ تم اپنی فلم شاہ نور میں کیوں نہیں بنا لیتے "

ہم نے کہا" شباب صاحب۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ ایورنیو اسٹوڈیو میں ہم نے اس کا مہورت کیا ہے۔ آغا صاحب سے اس بارے میں بات چیت کی ہے اور انہوں نے ہمیں کافی مراعات بھی دی ہیں۔ اب اچانک ہم شاہ نور میں فلم بنائیں گے تو لوگ کیا سوچیں گے اور ہم آغا صاحب کو کیا جواب دیں گے؟، یہ بڑی شرم کی بات ہو گی۔ "

"شرم کیسی؟ لوگ کچھ نہیں سوچیں گے۔ تھوڑے دن بعد بھول ہی جائیں گے۔ "

"اور آغا صاحب؟" "ان سے تم خود بات کر کے اپنی پرابلم بتا دو۔ "

"یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو بڑی شرم کی بات ہے کہ پہلی پہلی فلم شروع کی اور زبان یا معاہدے کا کوئی پاس ہی نہ کریں۔ "

"تو پھر کچھ مہینے رُک جاؤ۔ "

"وہ اور بھی بُری بات ہے۔ ہمارا تو سب مذاق اُڑائیں گے کہ شو باز آدمی ہے۔ ہم اسی لیے مہورت کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ بلاوجہ مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ "

شباب صاحب ہمدردی سے ہمیں دیکھتے رہے۔

"سنو۔ تم شیخ صاحب کو ہماری ضمانت دو۔ وہ تمہاری بات مان لیں گے۔ "

شباب صاحب بولے "میں نے تو خود ہمیشہ انہیں شاہ نور اسٹوڈیو کا لیٹر ہی دے کر قرضہ لیا ہے۔ بلاوجہ بات کھونے سے کیا فائدہ؟ "

ہم گھر پہنچے تو حد درجہ مایوس اور غمگیں تھے۔ نہ کسی سے بات کی نہ کھانا کھایا۔ خاموشی سے اوپر جا کر لیٹ گئے۔ ساری رات نیند نہیں آئی۔ کس قدر بے عزتی کی بات ہے کہ ہر ایک سے تعلقات ہیں۔ مراسم ہیں۔ بے تکلفی ہے۔ شان و شوکت سے مہورت کیا ہے اور فلم کی شوٹنگ شروع نہیں ہو پائی۔ مہورت کر کے رہ گئے۔ ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

چند روز اسی ادھیڑ بن میں رہے۔ خود کو مجرم سمجھ کر نفرین کرتے رہے۔ لوگ سچ ہی کہتے تھے۔ ہمیں خواہ مخواہ فلم پروڈیوسر بننے کی کیا سوجھی تھی۔ روپے کے بغیر بھلا کون فلم بنا سکتا ہے۔ ہم تو یوں ہی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ وہی مثل ہے کہ جیب میں نہیں دانے۔ اماں چلیں بھنانے۔ انسان کو اپنے حالات اور وسائل کے مطابق ہی کام کرنا چاہئے۔ چند روز اس طرح اداسی اور مایوسی کا شکار رہے۔ پھر رفتہ رفتہ دل کو ڈھارس دی کہ اگر ایک در بند ہوتا ہے تو اللہ میاں سینکڑوں در کھول دیتا ہے۔ ہم سے بھی گئے گزرے لوگ فلمیں بنا لیتے ہیں تو پھر ہم کیوں نہیں بنا سکتے ؟اس طرح ہم نے خود کو تسلی دی مگر عملی طور پر مسئلے کا کوئی حل نظر نہ آیا۔ جب کوئی پوچھتا کہ شوٹنگ کیوں شروع نہیں کرتے تو ہم مختلف بہانے بنا دیتے۔ طارق صاحب مصروف ہیں۔ ایکٹر ڈیٹ نہیں دے رہے۔ خود ہم نے بھی ایک نئی کہانی پر کام شروع کر دیا تھا اس لئے یہ بھی ایک معقول بہانہ تھا کہ یہ اسکرپٹ مکمل کرنے کے بعد یکسوئی سے شوٹنگ کریں گے۔ لوگوں کو ان پر کتنا اعتبار آتا تھا یہ ہم نہیں جانتے مگر دل ہی دل میں یہ احساس تھا کہ یہ سب تو جھوٹی تسلیاں ہیں۔ ہو نہ ہو سب جانتے ہیں کہ ہمارے پاس سرمائے کا بندوبست نہیں ہے۔ حسن طارق صاحب کو ہم نے اعتماد میں لے کر تمام صورتِ حال بتا دی تھی۔

انہوں نے کہا" آفاقی صاحب۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ میں آج کل بہت مصروف ہوں۔ جب تک آپ کی فلم شروع ہو گی، میں بھی فارغ ہو جاؤں گا۔ "

زیبا سے ہماری ناراضگی ختم ہو گئی تھی۔ ہمیں ان کی وضاحت پر یقین آ گیا تھا۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، زیبا کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا اور وہ باقاعدہ ہیروئنوں کی صف میں شامل ہو گئی تھیں۔ جب ان سے ملاقات ہوتی تو وہ کہتی" دیکھو آفاقی۔ میں تمہیں صاف بتا رہی ہوں۔ شوٹنگ سے کم از کم دو مہینے پہلے مجھ سے ڈیٹ کی بات طے کر لینا ورنہ مشکل ہو جائے گی اور تم پھر ناراض ہو جاؤ گے۔ "

لیجئے۔ اللہ نے ہمیں بیٹھے بٹھائے ایک اور بہانہ دے دیا تھا کہ بھئی کیا کریں۔ زیبا اس قدر مصروف ہو گئی ہیں کہ ڈیٹس ملنی دشوار ہے۔ کمال جب کبھی ہم سے ملتے، یاد دلاتے رہتے تھے کہ ان کا معاوضہ کتنا بڑھ گیا ہے۔

"سُوفی۔ آج کل میں اتنا معاوضہ لے رہا ہوں۔ سن لو۔ پرانے معاوضے پر کام نہیں کروں گا۔ "

''ہمارے لئے رعایت تو کرو گے نا؟ ''

''کیوں نہیں۔ تم پانچ سو کم دے دینا۔ ''

اور ہمارا دل جل کر کباب ہو جاتا تھا۔ کسی اور آرٹسٹ نے ہمیں معاوضوں کے اضافے کی خبر نہیں سنائی تھی۔

ہماری فلم کے محاذ پر تو خاموشی تھی مگر دریں اثنا اور بھی کئی واقعات رونما ہو چکے تھے۔ پہلے تو زیبا کے پہلی بار لاہور آنے کی روداد سنئے۔

کڑاکے کی سردیوں کے دن تھے جب ہمیں رات کو بارہ بجے کراچی سے الیاس رشیدی صاحب کا ٹیلی فون موصول ہوا۔ ہم لحاف میں گھسے ہوئے پڑھ رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز نے چونکا دیا۔ کراچی سے ایک شناسا آپریٹر صاحب بول رہے تھے۔ فلم والوں سے آپریٹروں کو بہت دلچسپی تھی اور وہ بہت سی مشکلیں آسان کر دیتے تھے۔ مثلاً وقت بے وقت کراچی والوں کی کال ملا دیتے تھے اور اگر فرمائش کی جائے تو اس کال میں کچھ اور حضرات کی کالیں بھی بیک وقت شامل کر دیتے تھے۔ مثلاً ہم لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں ہیں۔ الیاس صاحب کراچی میں میکلوڈ روڈ کے گردونواح میں ہیں۔ اقبال شہزاد صاحب پی ای سی ایچ ایس میں ہیں۔ آپریٹر صاحب نے ہم تینوں کی لائنیں ملا دیں اور ہم سب نے آپس میں باتیں شروع کر دیں۔ کئی بار تو اسی کال میں کچھ اور حضرات بھی شامل ہو جاتے تھے۔

آپریٹر صاحب تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد معذرت خواہ ہو کر مداخلت کرتے اور پوچھتے۔ ''اور کسی کو تو نہیں ملانا ہے سر؟ ''

''ارے نہیں بھئی۔ تین ہی نے کنفیوژن پھیلا رکھا ہے۔ یہاں کوئی جلسہ عام تو نہیں ہو رہا ''

درمیان میں آپریٹر کی آواز آئی ''السلام علیکم سر۔ ''

''وعلیکم السلام۔ بھئی یہ سلام کرنے کا کون سا وقت ہے۔

رات کے بارہ ایک بج رہے ہیں۔ ''

''سر۔ میڈم زیبا کا فون نمبر ملا دوں ابھی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اماں رہنے دو۔ آدھی رات کے وقت انہیں جگاؤ گے؟ ''

آپریٹر کی آواز سے مایوسی ظاہر تھی۔ ''آپ کی مرضی سر۔
ورنہ ابھی آپ تینوں کی بات کرا دیتا آپس میں۔ ''
ہم نے پوچھا ''الیاس بھائی۔ ان کا فون نمبر تو لکھوا دیں۔ ''
''کن کا؟ ''
''ارے بھئی نخشب صاحب کا ورنہ ہم زیبا کا پتا کیسے لگائیں گے۔ ''
''ذرا صبر کرو۔ ابھی بتاتا ہوں'' یہ کہہ کر وہ ریسیور رکھ کر غائب ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ان کی آواز آئی ''لکھو۔ مگر دیکھو بھائی۔ کہیں اس وقت فون نہ کر دینا ''
انہوں نے ہمیں ایک فون نمبر لکھوا دیا۔
ہم نے بگڑ کر کہا ''الیاس بھائی۔ آپ ہمیں پاگل سمجھتے ہیں جو ہم اتنی رات گئے انہیں فون کر کے جگائیں گے۔ ''
وہ بولے ''میاں اتنی رات گئے ہم دونوں بھی تو باتیں کر رہے ہیں۔ اچھا اب تم سو جاؤ۔ صبح زیبا کی خبر ضرور لے لینا۔ مگر دیکھو۔ گیارہ بارہ بجے سے پہلے فون نہ کرنا'' یہ کہہ کر انہوں نے اللہ حافظ کہے بغیر فون بند کر دیا۔ ہم نے بھی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اتنی دیر تک لحاف سے باہر رہنے کی وجہ سے ہمارا ایک ہاتھ بالکل سن ہو گیا تھا۔ لاہور میں غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ لحاف کو اچھی طرح لپیٹ کر ہم دبک کر لیٹ گئے اور دوبارہ کتاب اُٹھالی۔ ابھی دو ہی سطریں پڑھی ہوں گی کہ پھر فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔
''ہیلو۔ معاف کیجئے سر۔ بات ختم ہو گئی؟'' یہ آپریٹر تھا۔ ہم نے کہا۔
''بات ہو رہی ہوتی تو آپ سن نہ رہے ہوتے۔ ''
وہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے ''بالکل نہیں سر۔ ہم کسی کی باتیں نہیں سنتے ہیں ویسے حکم دیں تو میڈم کا نمبر ملا دوں؟ ''
''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔
''سر ابھی تو الیاس صاحب نے آپ کو لکھوایا ہے۔ میں نے بھی احتیاطاً نوٹ کر لیا۔ ہو سکتا ہے کسی وقت ضرورت پڑ جائے۔ ''ہم نے کہا ''انہیں ان کے حال پر رہنے دو اور ہمیں اپنے۔ ''

وہ بھانپ گئے کہ ہم ناراض ہیں ''سوری سر۔ معافی چاہتا ہوں'' کہہ کر انہوں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

سردی نے ناک میں دم کر دیا تھا۔ ذرا سا بھی لحاف کا کونا سرک جاتا تھا تو سرد ہوا سارے جسم کو لرزا دیتی تھی۔ سوچا کیوں نہ لحاف لپیٹ کر سو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔

دوسرے دن گیارہ بجے ہم نے اس نمبر پر فون کیا۔

''ہیلو' جی سر؟''

ایک مردانہ کرخت آواز نے جواب دیا۔ سوچا کہ کم از کم یہ نخشب صاحب کی آواز تو ہو نہیں سکتی۔ پھر بھی پوچھ لیا

''آپ کون بول رہے ہیں؟''

''اساں نوکر بول ریاں نے۔''

''نخشب صاحب ہیں؟''

''وہ تو باہر چلے گئے ہیں جناب جی۔''

''اچھا سنو۔ کیا یہاں کراچی سے مہمان آئے ہوئے ہیں؟''

''مہمان شمان تو کوئی نہیں ہے جناب۔ دو زنانیاں آئیاں نے۔''

''انہیں فون دے دو'' ہم نے بڑے رُعب سے کہا۔

چند لمحے بعد زیبا کی ہلکی سی آواز سنائی دی ''ہیلو؟''

ہم نے کہا ''ہم آفاقی بول رہے ہیں۔''

زیبا کی آواز میں اچانک گھن گرج کی کیفیت پیدا ہو گئی

''ارے آفاقی۔ تم کہاں ہو؟''

''ہم تو لاہور میں ہی رہتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم کہاں ہو؟''

''ہمیں نخشب صاحب نے بلایا تھا فلم کے لئے۔ تم یہاں آ سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں آ سکتے؟''

''لیکن نخشب صاحب کا آرڈر نہیں ہے۔ ''

''کیا تم انڈر اریسٹ ہو؟'' ہم نے پوچھا۔

''ایسا ہی سمجھ لو'' ان کی آواز خاصی سہمی ہوئی تھی ''ہمیں تو فون کرنے اور سننے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ پتا نہیں نوکر نے تمہارا فون کیسے ملا دیا؟ ''

ان کی آواز اور لب ولہجے سے ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ خاصی پریشان ہیں۔

''اچھا بھئی۔ کوٹھی کا نمبر تو بتاؤ۔ ہم ابھی آ رہے ہیں۔ ''

انہوں نے ہمیں سول لائنز کی ایک کوٹھی کا نمبر بتا دیا ''کتنی دیر میں آ رہے ہو؟ ''

''بس سمجھو کہ آ گئے ہیں۔ خدا حافظ ''

کار تو ہمارے پاس تھی نہیں۔ موٹر سائیکل بھی نہیں تھی۔ ایک تو ہم موٹر سائیکل چلانے سے ڈرتے تھے' دوسرے اتین استطاعت بھی نہیں تھی کہ موٹر سائیکل یا اسکوٹر خرید لیتے۔ دراصل ہم ایک ہلکی پھلکی نازک سی موٹر سائیکل کی تلاش میں تھے۔ ہر ایک کو سمجھاتے رہتے تھے کہ ہمیں کس قسم کی نازک اندام اور سبک موٹر سائیکل کی ضرورت ہے کیونکہ بھاری بھر کم موٹر سائیکل چلانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

ہمارے دوست رشید جاوید صاحب کافی دیر تک موٹر سائیکل کے ناک نقشہ کا بیان سنتے رہے۔ پھر کہا ''تمہیں موٹر سائیکل چلانی ہے یا اٹھا کر لے جانی ہے؟ ''

''بھئی چلانی ہے۔ اٹھا کر کون لے جاتا ہے اتنی بھاری موٹر سائیکل۔ ''

بولے ''تو پھر تمہیں اعتراض کیا ہے۔ یار موٹر سائیکل تو لڑکیاں تک چلا لیتی ہیں۔ کیا تم ان سے بھی زیادہ نازک ہو؟ ''

ہم نے کہا ''بعض سے ''

کہنے لگے ''بہتر ہو کہ تم سائیکل میں ایک چھوٹی سی موٹر فٹ کرا لو۔ یا پھر تین پہیوں والی سائیکل خرید لو بہت ہلکی پھلکی ہوتی ہے اور اس کے لئے لائسنس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ''

قصہ کوتاہ یہ کہ ہمارے پاس نہ کار تھی اور نہ موٹر سائیکل۔ گھر سے تیار ہو کر باہر نکلے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک ٹیکسی مل گئی جو ان دنوں لاہور میں نئی نئی متعارف ہوئی تھی اور معجزہ یہ ہے کہ میٹر کے حساب سے چلتی تھی۔ یعنی میٹر ٹھیک کام کرتے تھے۔ ٹیکسی والے کو سول لائنز میں سڑک کا نام اور کوٹھی کا نمبر تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

"لیجئے جی۔ آپ کی کوٹھی آگئی۔"

سامنے ایک وسیع و عریض لان کے درمیان ایک خوبصورت سی کوٹھی بنی ہوئی تھی۔ سامنے برآمدہ پیچھے برآمدہ۔ دونوں جانب سرسبز لان۔ درخت بھی کافی تھے۔ دور دور تک کوئی ذی نفس نظر نہیں آیا۔ باہر سے تو غیر آباد ہی لگتی تھی۔ بہر حال ٹیکسی والے کو دو یا پونے دو روپے کرایہ دے کر (اب تو خواب و خیال ہی لگتا ہے۔ ذرا غور فرمائیے ماڈل ٹاؤن سے مال روڈ پر سول لائنز تک کا یہ کرایہ بنا تھا) ہم ویران سے برآمدے میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ کافی دیر تک کھنکارے 'کھانسے۔ پھر دروازے پر دستک دی۔ ایک جانب برقی گھنٹی کا بٹن نظر آیا تو گھنٹی بجا دی۔ گھنٹی اتنی زور سے بجی کہ ہم خود ہی اچھل پڑے۔ یا شاید سنسان ماحول میں یہ آواز اچانک گونجی تو بہت زیادہ محسوس ہوئی۔

کچھ دیر بعد درمیانی دروازہ کھلا اور ایک اجتماعی بیرا' خانساماں' چوکیدار قسم کا ملازم نمودار ہوا۔ اجلے کپڑے پہنے ہوا تھا۔ دیکھنے میں میرپور کا یا پھر سرحد کا لگتا تھا۔ ہمارے سوٹ بوٹ کو دیکھ کر کچھ رُعب میں آگیا۔ "صاحب تو اس وقت نہیں ہے صاحب جی۔"

"دروازہ کھولو۔ ہمیں میڈم سے ملنا ہے" ہم نے بڑے رُعب سے کہا اور اس کو سوچنے کا موقع دیئے بغیر اندر داخل ہو گئے۔ وہ مرعوب ہو کر ہمارے پیچھے چلنے لگا۔ یہ تو ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ کوٹھی میں کوئی اور موجود نہیں ہے۔

ملازم نے ہمیں ایک سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

"ابھی میم صاحب کو بولتا ہوں" یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔ چند لمحے بعد زیبا نے پردے کے پیچھے سے جھانکا۔ وہ بے شمار گرم کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ ان سب کے اوپر ایک کمبل بھی اوڑھ رکھا تھا پھر بھی سردی سے کانپ رہی تھیں۔

"ارے آفاقی تم۔ السلام علیکم۔ کیا حال ہے؟" وہ ایک صوفے پر سارا سامان سنبھال کر بیٹھ گئیں۔

"ہم تو ٹھیک ہیں۔ آپ سنائیے؟"

کہنے لگیں ''بھئی یہاں تو سردی بہت ہے۔ براحال ہو گیا ہے'' وہ باقاعدہ کانپ رہی تھیں۔

''لالی جی کہاں ہیں؟'' ہم نے پوچھا۔

''ادھر بیڈروم میں ہیں۔ ہیٹر کے سامنے بیٹھی ہیں۔ آؤ تم بھی وہیں آجاؤ۔ ''

ہم ان کے ساتھ چل پڑے۔ بیڈروم میں لالی جی بیڈ پر دو تین لحافوں اور کمبلوں میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھیں۔ صرف ان کی عینک نظر آرہی تھی ورنہ ہم تو انہیں پہچان بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ بھی مسرور ہو گئیں۔ زیبا بھی دوبارہ بیڈ پر مزید کمبلوں اور لحافوں کے اندر سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ اب باتیں شروع ہوئیں۔ وہ کچھ سہمی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ دبی زبان میں انہوں نے ہمیں بتایا کہ نخشب صاحب نے فون کر کے ایک فلم کے لئے بات کرنے کے سلسلے میں مدعو کیا تھا مگر اب ان کی شرطیں بہت ہیں۔ سب سے بڑھ کر تو یہ کہ وہ ان کی دو فلموں کے سوا کسی اور فلم میں کام نہیں کریں گی۔ ان کی مہمان رہیں گی اور ان کی اجازت کے بغیر کسی سے نہیں ملیں گی۔ معاوضہ بھی انہوں نے بہت کم بتایا تھا۔ جب سے وہ لوگ لاہور آئے تھے عملاً قید خانے میں تھے۔ نہ کسی کو فون کر سکتے تھے نہ کہیں جا سکتے تھے۔ وہ ایس ایم یوسف صاحب سے بات کرنے کی خواہش مند تھیں جنہوں نے زیبا کو ایک فلم میں کام کرنے کی پیشکش کی تھی مگر نخشب صاحب کی طرف سے اجازت نہیں تھی۔ ایک تو یہ سب' اوپر سے سخت سردی۔

''آفاقی۔ تم ہی مشورہ دو' اب ہم کیا کریں'' لالی جی نے لحاف سرکا کر ہم سے پوچھا۔

اتنی دیر میں ملازم چائے لے آیا۔ بسکٹ بھی تھے۔ چائے دانی پر ٹکوزی رکھی ہوئی تھی۔ برتن بھی قیمتی تھے۔ یعنی سب کچھ سلیقے کا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ دونوں خاموش ہو گئیں۔

ملازم کے جانے کے بعد ہم نے پوچھا ''بھئی آپ نے لاہور بھی دیکھا یا نہیں؟ ''

لالی جی نے کہا ''لاہور خاک دیکھتے۔ ایک تو قید' اوپر سے سردی۔ بھئی تمہارے لاہور میں تو ہماری آئس کریم بن گئی ہے۔

ایمان سے۔ ''

ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ سارے لحاف' کمبل' گدے' رضائیاں وغیرہ اتار کر پھینک دیں۔ ہاتھ منہ دھو کر آئیں

اور ڈھنگ سے بیٹھ کر چائے پئیں۔ سردی خود ہی بھاگ جائے گی۔اس کے بعد ہمارے ساتھ لاہور دیکھنے کے لئے چلیں۔

''مگر نخشب صاحب ''!

ہم نے کہا''دیکھو بھائی۔تم ان کی چوری کر کے تو نہیں بھاگی ہو۔نہ ان کی دین دار ہو۔اپنی مرضی کی مالک ہو۔چلو اُٹھو۔ہم ٹیکسی منگاتے ہیں۔ ''

ہمارے یہ بات اُن کی مجھ میں آگئی۔وہ دونوں تیار ہونے میں مصروف ہو گئیں اور ہم نے کمرے میں لگی' ملازم کو بلانے والی گھنٹی بجادی۔

''یس سر جی؟'' وہ ایک درچراغ کے جن کی طرح نمودار ہو گیا۔

ہم نے کہا''ایک ٹیکسی لادو۔ ''

''ٹیکسی؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کیا ٹیکسی نہیں دیکھی کبھی؟ ''

''کیوں نہیں جی۔ ''

''تو پھر جلدی سے ایک ٹیکسی لے کر آؤ۔ میم صاحب ہمارے ساتھ باہر جا رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں آجائیں گی۔ ''

وہ پھر ہمارے رعب میں آگیا''کیا کھانا باہر کھائیں گی؟ ''

ہم نے رُعب سے کہا''کھانا تو اندر ہی کھائیں گی۔تم انتظار کرنا اور سنو۔ نخشب صاحب کب واپس آئیں گے؟ ''

بولا''صاحب جی۔وہ تو رات کو لوٹیں گے۔ ''

''ٹھیک ہے۔تم ٹیکسی لاؤ۔ ''

وہ تیزی سے رخصت ہو گیا۔

ہم نے ایس ایم یوسف صاحب کو فون نمبر ملایا۔وہ ان دنوں فیروزپور روڈ پر واقع اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو میں اپنی فلم کی ایڈیٹنگ میں مصروف تھے۔ان سے زیبا کی بات کرائی۔پھر انہوں نے ہم سے بھی بات کی اور کہا''آفاقی صاحب۔

ان لوگوں کو نخشب صاحب نے کراچی سے بلایا ہے اس لئے ان کا مجھ سے ملنا مناسب نہیں ہو گا۔ یہ کراچی پہنچ جائیں گی تو میں دوبارہ ان سے رابطہ کرلوں گا۔‘‘ نہایت معقول بات تھی۔ یوسف صاحب بہت بااخلاق‘ شریف اور وضع دار انسان تھے۔

ٹیکسی آگئی اور ہم نے مال روڈ اور نہر وغیرہ کا ایک چکر لگوا کر زیبا اور لالی جی کو لاہور دکھادیا۔ راستے بھر انہیں سمجھاتے رہے کہ وہ نخشب صاحب کا رُعب نہ مانیں۔ ان سے مضبوطی سے بات کریں۔ ہم دوبارہ فون کریں گے انہوں نے کہا کہ ہم الیاس صاحب کو بھی ان کی روداد سے آگاہ کردیں کچھ دیر بعد ہم نے انہیں واپس کوٹھی پر چھوڑا اور رخصت طلب کی۔ لالی جی نے پوچھا ’’اگر نخشب صاحب پوچھیں کہ کون آیا تھا تو انہیں کیا بتائیں؟ ‘‘

ہم نے کہا ’’ہمارا نام بتائیں۔ کہہ دیں کہ انہیں معلوم ہوا تھا تو وہ ملنے چلے آئے تھے۔ ‘‘

ہم نے ٹیلی فون پر الیاس بھائی کو ساری کتھا سنائی تو وہ بہت حیران ہوئے۔ بعد میں شاید انہوں نے زیبا سے فون پر بات بھی کی تھی اور نخشب صاحب کو بھی سمجھادیا کہ فی الحال زیبا کراچی کی ایک فلم میں مصروف ہیں۔ اس کے ختم ہونے کے بعد نخشب سے بات کریں گی۔

اب ذرا نخشب صاحب کا بھی سن لیجئے۔ رشید عطرے صاحب بتایا کرتے تھے کہ سڑک پر نخشب صاحب کو کوئی گھاٹن پسند آجاتی تو فوراً اسے اپنی کار میں بٹھا لیتے۔ گھاٹن محنت کش مرہٹہ عورتوں کو کہتے ہیں جو اپنے گہرے رنگ اور سنگین سراپا کیلئے بہت شہرت رکھتی ہیں۔

مگر یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ جو ہم نے لاہور پہنچنے کے بعد سنیں۔ تذکرہ دراصل میرٹھ سے شروع ہوا تھا۔ ایک بار ہم نے سنا کہ نخشب جارچوی صاحب بمبئی سے آئے ہوئے ہیں۔ لڑکپن کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں فلم اور فلم والوں کا بہت چرچا تھا۔ نخشب صاحب تو پھر شاعر بھی تھے اور ایک نامور مسلمان گیت نگار بھی تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے مسلمان یہ دیکھ کر اور سن کر ہی خوش ہو جایا کرتے تھے کہ بمبئی میں ہندوؤں کے غلبے کے باوجود فلاں فلاں مسلمان فن کار، ہدایت کار یا شاعر کا طوطی بول رہا ہے۔ نخشب صاحب بھی اسی حوالے سے ہمارے ہیرو تھے۔ شہریار کے ذریعے یہ خبر گروہ کے دوسرے لوگوں تک پہنچ گئی۔ اب سوال یہ تھا کہ نخشب صاحب کو کیسے دیکھا جائے؟ ملاقات کا

تو خیر سوال ہی نہیں تھا کہ حفظ مراتب کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔ بہر حال معلوم ہوا کہ نخشب صاحب فلاں وقت کچھ دیر کیلئے نادر علی بلڈنگ بھی آئیں گے۔ ہم سب منتظر ہو کر بیٹھ گئے۔ خدا خدا کر کے نخشب صاحب تشریف لائے۔ وہ میرٹھ میں کسی رئیس کے مہمان تھے۔ اس کی کار میں سوار ہو کر آئے تھے۔ کاریں اس زمانے میں خال خال ہی ہوتی تھیں۔ وہ کار سے اترے اور سامنے والے فلیٹ میں داخل ہوئے تو ہم نے بھی ان کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ چست موری کا سفید لٹھے کا پاجامہ اور سفید ململ کا کُرتہ پہنے ہوئے تھے۔ آف وہائٹ شیروانی تھی جس کے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے مگر ایک دوست نے ہمارے کان میں بتایا کہ نخشب صاحب کی شیروانی میں ہیرے کے بٹن لگے ہوئے ہیں۔ خدا جانے یہ سچ تھا یا جھوٹ۔ بٹن البتہ دور سے چمکتے ہوئے نظر آئے۔ ان کی انگلیوں میں بھی قیمتی انگوٹھیاں تھیں۔

''ہیرے کی ہیں'' ایک دوست نے مطلع کیا۔

ہم عقیدت اور احترام سے دیکھتے رہ گئے اور نخشب صاحب ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گئے۔ کچھ دیر بعد فلیٹ سے باہر نکل کر کار میں بیٹھے اور رخصت ہو گئے۔ یہ نخشب سے ہماری پہلی ملاقات تھی بشرطیکہ اسے ملاقات کہا جائے۔

ہم پاکستان آگئے تو یہاں فلم ''محل'' ریلیز ہوئی۔ یوں تو فلم ہی بہت اچھی تھی مگر اس کی موسیقی، گانوں اور مدھو بالا نے تو ایک عالم کو دیوانہ بنا دیا۔ بڑے بڑے جغادری شاعروں اور موسیقاروں کو ہم نے اس فلم کی موسیقی کی تعریف کرتے ہوئے سنا۔ کھیم چندر پرکاش بڑے نامور اور ہنر مند موسیقار تھے۔ نخشب صاحب نے سچویشنز پر ایسے گیت لکھ دیئے کہ امر ہو گئے۔ اس پر مدھو بالا کا پُراسرار حُسن و جمال۔ فلم کیا تھی جادو گری تھی۔ مگر جب ذرا شعور پیدا ہوا تو احساس ہوا کہ اس میں کمال فلم کے مصنّف اور ہدایت کار کا بھی تھا۔

کمال امروہوی اس فلم کے مصنّف اور ہدایت کار تھے۔ اور انہوں نے فلم میں ایک سحر انگیز ماحول پیدا کر دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بمبئی ٹاکیز کی فلموں میں کہانی اور مکالموں میں دوسرے لکھنے والوں کا بھی دخل ہوتا ہے مگر نام کسی ایک مصنّف کا دیا جاتا ہے۔ حقیقت جو بھی ہو لیکن کمال امروہوی نے اس کہانی کو پیش کرنے میں بڑی مہارت کا ثبوت

دیا تھا۔ کمال امروہوی، نخشب اور مدھو بالا، تین بڑے مسلمان نام اس فلم سے وابستہ تھے۔ نخشب صاحب یوں تو پہلے بھی نامور تھے مگر ''محل'' نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔

بمبئی کی فلمی دنیا میں نخشب جارچوی ایک دل پھینک، عاشق مزاج اور منہ پھٹ آدمی کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ شادی انہوں نے نہیں کی تھی۔ پھر معلوم ہوا کہ فلم ''آن'' کی شہرت یافتہ اداکارہ نادرہ کے ساتھ انہوں نے شادی کرلی ہے۔ یہ شادی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ دراصل انہیں تنہا رہنے کی عادت ہوگئی تھی۔ ایسے بے پروا اور کھلنڈرے لوگ شادی کی پابندیاں کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟۔ نادرہ نے نخشب صاحب کی فلم ''نغمہ'' میں کام بھی کیا تھا۔ انہوں نے ایک اور فلم '' رفتار'' بھی بنائی تھی نغمہ فلم ساز کی حیثیت سے ان کی پہلی فلم تھی۔ یہ فلم تو کوئی خاص نہیں تھی مگر اپنی موسیقی کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی اور ہٹ قرار پائی۔ اس فلم میں نخشب صاحب نے پہلی بار ایک نئے موسیقار ''ناشاد'' کو متعارف کرایا جنہوں نے بعد میں بھارت اور پاکستان دونوں جگہ اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ اس فلم میں ناشاد صاحب کی شمولیت کی داستان بھی بہت دلچسپ ہے۔

ہوا یہ کہ نخشب صاحب اپنی اس فلم میں نامور موسیقار نوشاد علی صاحب سے موسیقی بنوانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق، محدود پیمانے پر کام کرتے تھے۔ انہوں نے معذرت کی تو نخشب صاحب نے اسے توہین جانا اور وقار کا سوال بنا لیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اصل چیز تو بول ہوتے ہیں۔ موسیقار سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اپنا یہ دعویٰ درست ثابت کرنے کیلئے انہوں نے ایک نئے موسیقار کو متعارف کرایا۔ شوکت علی طبلہ نواز تھے۔ موسیقی میں کافی دسترس رکھتے تھے۔ خوش الحان بھی تھے۔ نخشب صاحب کی نظر ان پر پڑی اور انہوں نے شوکت علی کو '' ناشاد'' بنا دیا۔ جب فلم ریلیز ہوئی تو ناشاد اور نوشاد کے باریک سے فرق کو زیادہ محسوس نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ فلم کی موسیقی بہت اچھی اور دلکش تھی۔ ناشاد صاحب طرز بنانے میں ماہر تھے۔ لہٰذا فلم کے سارے گانے ہٹ ہوگئے۔ اس طرح ایک نئے موسیقار نے جنم لیا۔ ناشاد صاحب نے بمبئی میں نخشب صاحب کی فلموں میں بھی موسیقی دی اور دوسری فلموں میں بھی یہ فرائض سرانجام دیئے جن میں ''بارہ دری'' قابل ذکر ہے۔ قسمت مہربان تھی۔ گانے ہٹ ہونے لگے تو

ناشاد صاحب بھی بطور موسیقار ہٹ ہوگئے۔

نخشب صاحب نے بمبئی میں آخری فلم ''زندگی یا طوفان'' بنائی تھی۔اس فلم کے ہدایت کار کے طور پر بھی ان ہی کا نام تھا لیکن جتنے منہ اتنی باتیں۔لوگ کہتے ہیں کہ درحقیقت ہدایت کار کوئی اور تھا۔بہر حال، یہ فلم بہت پسند کی گئی اور اسی زمانے میں نخشب صاحب اپنے گھوڑے وغیرہ فروخت کرکے پاکستان چلے آئے۔وہ مجلسی آدمی تھے اور اس لئے وسیع مراسم رکھتے تھے۔پاکستان میں اس وقت وزیرِ خزانہ ان کے دوست اور مدّاح تھے۔بیوروکریسی میں اور بھی بااثر دوست موجود تھے۔چنانچہ پاکستان میں بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندی کے باوجود نخشب صاحب کی فلم یہاں درآمد کرلی گئی۔فلمی صنعت والوں نے بہت شور مچایا۔فلم سازوں اور تقسیم کاروں نے بھی احتجاج کیا۔''مگر جسے پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے'۔ نخشب صاحب کی بااثر حلقوں تک رسائی تھی اور پاکستان میں یہی ہر مشکل کی کُنجی ہے۔ان کی فلم بڑی دھوم دھام سے پاکستان میں ریلیز ہوئی اور اس نے یہاں بھارت سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔بس پھر کیا تھا، نخشب صاحب کے دن پھر گئے۔شہرت اور پیسے کے معاملے میں وہ ہمیشہ خوش نصیب رہے۔لیکن پاکستان آنے کے بعد تو ایسے بھاگ لگے کہ سارے دلدر دور ہوگئے۔پیسے کی ریل پیل ہوگئی۔

نخشب صاحب کیلئے نہ کبھی پیسہ کمانا کوئی مسئلہ تھا، نہ خرچ کرنا۔جس طرح آتا تھا،اسی طرح دونوں ہاتھوں سے لُٹاتے تھے۔نادرہ کے بعد انہوں نے جنم جنم کے لئے کنوارا رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔راجا اِندر کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ اچھّا کھانا، اچھّا پہننا، اچھی طرح رہنا۔اچھے لوگوں میں وقت گزارنا، یہی نخشب صاحب کا معمول بن گیا تھا۔

پاکستان میں آنے کے بعد جب پیسہ بھی آگیا تو سب سے پہلے تو انہوں نے ریس کی طرف توجہ دی۔قیمتی گھوڑے خریدے اور ریس کے حلقوں میں مقبول ہوگئے۔اس کے بعد انہوں نے فلم سازی اور ہدایت کاری کی طرف توجّہ دی۔یہاں آکر انہوں نے پہلی فلم '' فانوس'' بنانے کا اعلان کیا اور حسبِ عادت یہ بھی کہا کہ یہاں نہ کوئی ہدایت کار ہے، نہ رائٹر۔کسی کو فلم بنانی نہیں آتی۔میں انہیں بتاؤں گا کہ فلم کیسے بنائی جاتی ہے۔اس اعلان کے ساتھ ہی گویا انہوں نے مقامی فلمی صنعت کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔بڑبولا پن تو ایک طرح کی بیماری ہے اور اسے گنبد کی آواز کہا جاتا ہے یعنی کہنے والا جو بھی کہتا ہے اس کی گونج دیر تک باقی رہتی ہے۔ظاہر ہے کہ ان کی یہ باتیں بہت سے لوگوں

کو ناگوار گزرنے لگی تھیں اور وہ بھی ان کے خلاف باتیں بنانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ مگر نخشب صاحب کو کچھ پروا نہیں تھی۔ دوستوں کے وہ بہت اچھے دوست تھے مگر دشمنوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ دنیا ان کے بارے میں خواہ کچھ بھی کہتی رہے انہوں نے کبھی کان دھر کر نہیں سنا۔ وہ تو بس اپنی ہی آواز سننے کے شوقین تھے۔
فلم ''فانوس'' کا شاندار سیٹ شاہ نور سٹوڈیو میں تعمیر ہوا تو نخشب صاحب نے فرمایا کہ پاکستان والوں کو کیا پتا کہ سیٹ کیسے لگاتے ہیں اور اسے آراستہ کیسے کرتے ہیں۔ اس سیٹ کیلئے انہوں نے خاص طور پر فانوس بنوایا۔ قیمتی صوفے، قالین اور پردے حاصل کئے اور ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی سیٹ پر قدم نہیں رکھ سکتا۔ کسی کو بھلا کیا پڑی تھی کہ ان کے سیٹ پر جاتا۔ مگر نخشب صاحب نے سیٹ کے باہر دو بندوق بردار محافظ تعینات کر دیئے۔ اس سے پہلے کسی فلم کے سیٹ کی حفاظت کیلئے مسلح گارڈ مقرر نہیں کیا گیا تھا۔

نخشب صاحب نے اس فلم میں سلمان پیرزادہ کو ہیرو منتخب کیا۔ ہیروئن کے طور پر وہ شمیم آرا کو لینا چاہتے تھے مگر ان کی جہاں دیدہ نانی کو نخشب صاحب کی بدزبانی اور خودپسندی کا علم تھا اس لئے انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے معذرت پیش کر دی۔ انہوں نے اس فلم کیلئے کومل کو ہیروئن منتخب کر لیا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ خود ہی کومل کو اپنی فلم کی ہیروئین منتخب کیا تھا مگر بھری محفل میں خود ہی ان پر ہوٹنگ بھی کرتے رہتے تھے۔ دراصل اپنی بڑائی اور دوسروں کی توہین کرنا نخشب صاحب کا شیوہ تھا اور یہ ایسی بری عادت تھی جو ان کی فطرت بن چکی تھی۔ اسی وجہ سے وہ خداواسطے کے دشمن اور مخالف پیدا کر لیتے تھے۔
''فانوس'' کے بارے میں نخشب صاحب کا کہنا تھا کہ یہ زبردست ہٹ فلم ہو گی اور اسے تو پولیس ہی سنیما سے اتارے گی۔ مگر یہ فلم بری طرح فلاپ ہو گئی۔
نخشب صاحب نے پھر بھی ہمّت نہ ہاری۔ ناکامی کی تمام تر ذمّے داری انہوں نے ہیرو اور ہیروئن پر ڈال دی اور دوسری فلم ''میخانہ'' کا آغاز کر دیا۔
اس زمانے میں ریڈیو سیلون ایک مقبول و معروف ذریعۂ تشہیر تھا اور عموماً بھارتی فلموں کی موسیقی نشر کرنے کیلئے مخصوص تھا۔ نخشب صاحب نے پہلی بار اپنی فلم ''میخانہ'' کی پبلسٹی ریڈیو سیلون سے پیش کی اور فلم کے نغمے

ہندوستان اور پاکستان گونجنے لگے۔اس فلم کی موسیقی بہت اچھی تھی۔ مگر فلم فلاپ ہوگئی۔فلم کی بے انتہا پبلسٹی بھی اس کیلئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔اس لئے کہ لوگوں نے اس سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کرلی تھیں۔''میخانہ'' فلاپ ہوجانے کے بعد نخشب صاحب نے فلم بنانے کا خیال ہی ترک کردیا۔یہ تو ایک طرح سے ان کا شوق اور مشغلہ تھا۔ ذریعۂ معاش کیلئے وہ اس کے محتاج نہیں تھے۔بطور ہدایت کار اور کہانی نویس پاکستان میں انہیں تسلیم نہیں کیا گیا۔گیت نگار وہ بہت اعلیٰ درجے کے تھے مگر کسی پاکستانی فلم ساز نے ان کو گیت نگاری کی دعوت دینے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ نخشب صاحب نے بھی اس بارے میں کبھی خواہش کا اظہار تک نہیں کیا۔ظاہر ہے کہ وہ پاکستان کے سبھی فلمی شاعروں،ہدایت کاروں اور موسیقاروں کو خود سے کمتر سمجھتے تھے تو پھر یہاں کی فلم میں گیت نگاری کیسے کرتے۔ مگر قدرت بھی انسانوں کو سبق سکھاتی رہتی ہے۔پاکستان میں ان کے پاس دولت،شہرت،اثر ورسوخ سبھی کچھ تھا مگر اوپر تلے دو فلموں کے فلاپ ہوجانے کی وجہ سے ان کی شیخیوں میں خود بخود کمی آگئی تھی۔اس کے بعد تو وہ قریب قریب گمنام ہی ہوکر رہ گئے اور اپنے قریبی دوستوں تک محدود ہوگئے تھے۔جب ایک روز اچانک ان کی وفات کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو حیرت ہوئی چونکہ اس سے پہلے ان کی علالت کے بارے میں کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی تھی۔نئی نسل کے لوگ تو اس وقت تک انہیں بھول ہی چکے تھے۔آج بھی نخشب جارچوی کا نام سن کر نئی پود کے لوگ سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔انہیں علم ہی نہیں ہے کہ اس شخص نے محض اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر کتنا نام اور کیسا مقام پیدا کیا تھا اور کتنی بھرپور زندگی گزاری تھی۔بالآخر موت ہی خاکی انسان کا انجام ہے۔وہ صاحب اولاد نہیں تھے اس لئے ان کا نام چلانے والا بھی کوئی باقی نہیں ہے۔بھائی بہن اور دوسرے رشتے داروں کا ویسے ہی کبھی نام نہیں سنا۔اس طرح نخشب جارچوی شہرت کی چار دن کی چاندنی میں دھومیں مچانے کے بعد ہمیشہ کیلئے موت کی تاریک وادی میں گم ہوگئے۔پاکستان کی فلمی صنعت میں انہوں نے کسی سے بنا کر نہیں رکھی تھی جو انہیں یاد کرتا۔اس طرح وہ فلمی دنیا کی حد تک نامعلوم اور غیر موجود ہوکر رہ گئے۔

آغا جی اے گل کی رنگین فلم ''نائلہ'' اور ''کنیز'' آگے پیچھے ہی ریلیز ہوئی تھیں۔وہ صحیح معنوں میں مغربی پاکستان کی پہلی رنگین فلم تھی ورنہ درحقیقت پاکستان کی پہلی رنگین فلم ''سنگم'' تھی جو ڈھاکا میں فلم ساز اور ہدایت کار

ظہیر ریحان نے بنائی تھی۔ یہ فلم اوسط درجے کی ثابت ہوئی۔ زیادہ ہلچل نہ پیدا کر سکی تھی لیکن یہ ریکارڈ پر ہے کہ پاکستان کی پہلی فلم مغربی پاکستان کے کسی نامور اور ممتاز فلم ساز اور ہدایت کار کو بنانے کی توفیق نہ ہو سکی تھی۔ یہ سہرا مشرقی پاکستان کے ایک حوصلہ منداور منچلے نوجوان کے سر بندھا۔

ظہیر ریحان ایک تعلیم یافتہ اور بے حد ذہین ہدایت کار تھے۔ پہلے انہوں نے بنگلہ فلمیں بنا کر نام پیدا کیا پھر اردو فلم کی طرف آئے تو رنگین فلم بنا ڈالی حالانکہ ڈھاکا کے فلم سازوں کے وسائل نہایت محدود تھے۔ ظہیر ریحان کا شمار بنگلہ کے ممتاز اور کامیاب ہدایت کاروں میں ہوتا تھا۔ وہ مصنّف بھی تھے۔ وہاں کے فلمی حلقوں میں بہت معروف اور مقبول تھے۔ سانولا رنگ، بڑی بڑی چمک دار آنکھیں، متناسب نازک نقشہ، درمیانہ قد۔ انگریزی اور بنگلہ دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ اردو بھی اچھی خاصی جانتے تھے۔ ان کا شمار انتہائی پسندیدہ لوگوں میں ہوتا تھا۔ بہت اچھی باتیں کرتے تھے۔ ان کی شادی ڈھاکا کی ممتاز فلمی ہیروئن سمیتا سے ہوئی تھی۔ یہ محبت کی شادی تھی۔ مشرقی پاکستان کے ماحول میں ایسی شادیاں کسی حیرت کا باعث نہیں بنتی تھیں۔ سمیتا نے بعد میں چند اردو فلموں میں بھی کام کیا۔ ایک فلم کے سلسلے میں لاہور بھی آئی تھیں۔ ہمایوں مرزا صاحب کی فلم ''دھوپ چھاؤں'' کی بھی ہیروئن تھیں۔ گداز جسم کی اداکارہ، گندمی رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، پُرکشش جسم، چہرہ گول تھا۔ اداکاری میں بہت زیادہ اچھی نہیں تھیں اسی لئے اردو فلموں میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

ظہیر ریحان کی ایک شہرت یہ بھی تھی کہ وہ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اپنی سالی ببیتا کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ ببیتا عموماً اپنی بہن کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ ایک بار ان کے ہمراہ لاہور بھی آئی تھیں۔ ہم نے ان کا اپنے بہنوئی سے محبّت کا قصہ ڈھاکا میں بھی سنا تھا اور لاہور میں بھی اس داستان کا چرچا پہنچ گیا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ سمیتا کو اس کا علم تھا اس کے باوجود ببیتا ان کے ساتھ ہی مقیم رہیں۔ ببیتا کو ظہیر ریحان نے ہیروئن بنانے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ اپنی بہن کے مقابلے میں زیادہ جاذب نظر اور پُرکشش تھیں لیکن اداکاری کے معاملے میں بہن سے بھی گئی گزری نکلیں اور ظہیر ریحان کی پیار بھری توجہ بھی انہیں ایک کامیاب ہیروئن نہ بنا سکی۔

اُس زمانے میں ڈھاکا اور کلکتہ کے درمیان میں آمد و رفت زیادہ مشکل نہ تھی اور مشرقی پاکستان سے لوگ اکثر کلکتہ چلے

جایا کرتے تھے۔ببیتا کلکتہ گئیں تو وہاں فلمی دنیا میں بھی پھیرا لگایا۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ بنگالی فلم ساز ہدایت کار ستیہ جیت رائے اس وقت عالمی شہرت یافتہ تھے اور دنیا کے دس عظیم تخلیقی ہدایت کاروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ظہیر ریحان نے ستیہ جیت رائے کے پاؤں چھوئے اور کہا'' ببیتا میں بڑا ٹیلنٹ ہے،بس آپ ایک بار اس پر نظر ڈال لیں''

ان کی نظر ببیتا پر پڑی تو وہ انہیں اپنی ایک فلم کے مرکزی کردار کیلئے نہایت موزوں لگیں۔انہوں نے ببیتا کو اپنی فلم ''دیوی'' میں کاسٹ کرلیا۔یہ خبر نہ صرف ہندوستان اور پاکستان بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں کیلئے بھی دلچسپی کا باعث تھی۔ستیہ جیت رئے جیسے ہدایت کار کا کسی کو اپنی فلم کیلئے ہیروئن چُن لینا ایک اہم خبر تھی۔ہندوستان کی بڑی بڑی ہیروئنیں ان کی فلم میں کام کرنے کی حسرت رکھتی تھیں اور بنگال کی تو ہر ہیروئن ان کی فلم میں کسی معاوضے کے بغیر کام کرنے کیلئے تیار تھی۔اس لئے کہ ان کی فلم میں کام کرکے عالمی شہرت اور بے پناہ تعریف و توصیف حاصل ہوسکتی تھی۔پھر ستیہ جیت رائے کی ہدایت کاری میں کام کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔مگر یہ اعزاز ایک نسبتاً گم اداکارہ ببیتا جیسی لڑکی میں ستیہ جیت رائے جیسے اہل نظر کو کیا خاص بات نظر آگئی؟ ستیہ جیت رائے نے ببیتا سے ایسا کام لیا اور ایسے کردار میں پیش کیا کہ دنیا معترف ہوگئی۔ببیتا نے اس فلم میں زیادہ تر خاموش تاثرات سے کام لیا تھا اور ان کی بھولی صورت اور حسین کٹورا جیسی آنکھوں کے ذریعے ستیہ جیت رائے نے وہ مکالمے ادا کرائے تھے کہ دیکھنے والے ششدر رہ گئے۔عالمی پیمانے پر ببیتا کو ''دیوی'' میں عالمگیر شہرت اور توصیف ملی اور بس یہی ببیتا کے کیریئر کی معراج تھی۔

خیر یہ واقعہ تو بر سبیل تذکرہ آگیا تھا۔ ظہیر ریحان کی بعد میں اپنی بیوی سے علیحدگی ہوگئی تھی اور ببیتا کے ساتھ ان کی شادی کی خبریں گرم تھیں۔مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود دونوں بہنیں باہم شیر و شکر تھیں اور ایک ساتھ ہی رہتی تھیں۔ عجیب رشتہ اور نرالا تعلق تھا۔

ظہیر ریحان کی شادی ببیتا سے ہو ہی جاتی اگر تقدیر درمیان میں نہ آجاتی۔ مشرقی پاکستان ہنگاموں اور فسادات کے شعلوں میں جلنے لگا اور بنگلہ دیش کی تحریک نے بھائی بھائی میں نفرت اور دشمنی پیدا کردی۔ڈھاکا میں قتلِ عام،غارت

گری اور بربادی کا رقص جاری تھا۔ ظہیر ریحان ایک کشادہ دل اور کشادہ ذہن کے آدمی تھے۔ وہ بہاری مسلمانوں کی خبر لینے ان کی مخصوص بستی میں پہنچ گئے اور پھر واپس نہ آئے۔ ان کی لاش تک دستیاب نہ ہوئی۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان کا انجام کیا ہوا۔ وہ کسی جنونی بنگالی ہجوم کے ہاتھوں ہلاک ہوئے یا بہاریوں اور پاکستانیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ بہر حال اس کے بعد ان کا کوئی پتا نہیں چلا اور یہ ذہین اور تخلیقی ذہن رکھنے والا باصلاحیت شخص جوانی کے عالم میں ہی اپنے خالق تک پہنچ گیا۔ وہ بذات خود ہر قسم کے تعصّب سے پاک تھے پھر بھی متعصّب ہنگاموں کی نذر ہو گئے مگر اپنی مختصر سی زندگی بھی انہوں نے بھرپور اور انتہائی ہنگامہ خیز گزاری۔

یہ تو خیر جملۂ معترضہ سمجھ لیجئے۔ ہم ""نائلہ"" کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اس فلم نے بڑی دھومیں مچائی تھیں۔ ماسٹر عنایت حسین کی موسیقی، قتیل شفائی کے نغمات، سنتوش کمار، شمیم آرا اور درپن کی اداکاری۔ شریف نیئر صاحب کی ہدایت کاری، نبی احمد صاحب کی فوٹو گرافی، پیارے خاں کی رنگین پرنٹ بنانے کے سلسلے میں ہنر کاری، ان سب چیزوں نے مل جل کر ""نائلہ"" کو پاکستان کی ایک یادگار فلم بنا دیا تھا مگر قابل ذکر بات یہ ہے کہ نائلہ اور کنیز دونوں فلمیں بیک وقت بے حد مقبول اور کامیاب ثابت ہوئیں حالانکہ ایک فلم رنگین رومانی اور نغماتی تو دوسری بلیک اینڈ وائٹ میں بنائی ہوئی ایک معاشرتی اور ڈرامائی فلم تھی لیکن ایک ہی وقت میں ریلیز ہونے کے باوجود دونوں فلمیں سُپر ہٹ ہوئی تھیں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر فلم اچھی ہو تو فلم بین ضرور دیکھتے ہیں۔ یہ عُذر کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی فلم کامیابی سے ہم کنار ہو سکتی ہے، بارہا غلط ثابت ہو چکا ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ بیک وقت تین چار فلمیں نمائش کیلئے پیش کی گئی ہیں اور سب ہی باکس آفس پر حد درجہ کامیاب رہی ہیں۔

ہمارے اعتماد میں جس چیز نے بہت زیادہ اضافہ کر دیا تھا وہ یہ تھی کہ ""نائلہ"" بہت بڑے ناموں کی، بڑے سرمائے سے تیار ہونے والی مغربی پاکستان کی سب سے پہلی مکمل رنگین فلم تھی اور اسے تخلیق کرنے والوں میں اس وقت کے بہت بڑے بڑے نام شامل تھے۔ اس کے مقابلے میں ہم ایک نئے فلم ساز تھے۔ ہمارے اداکار بھی ""نائلہ"" کے فن کاروں کے مقابلے میں نئے اور ابھرتے ہوئے لوگ تھے جنہوں نے بہت جلد دوسرے تمام فنکاروں کو گہنا دیا اور یہ

تینوں نام (محمد علی، وحید مراد اور زیبا) پاکستان کی فلمی صنعت میں ایک نئی روایت کے بانی اور ایک نئے انداز اداکاری کے موجد قرار پائے لیکن جب ہم نے ''کنیز'' کا آغاز کیا تھا اس وقت یہ تینوں نئے تھے۔

یہ ہم بتا چکے ہیں کہ آغا گل صاحب نے ہمیں ایک روز بڑی ہمدردی اور خلوص سے مشورہ دیا تھا کہ محمد علی کو ہیرو کے رول میں کاسٹ نہ کریں اس کی جگہ درپن کو لے لیں۔ ہمیں فلمی دوست یہ بھی بتاتے رہتے تھے کہ ''بھائی کامیاب فلم بنانی ہے تو بڑے اور معروف اداکاروں کو کاسٹ میں شامل کرو۔''
دیکھا جائے تو یہ درست ہے۔ فلمی دنیا کا یہی دستور ہے۔ کمرشل فلمیں بنانے کا فارمولا ساری دنیا میں یہی ہے مگر جب اللہ تعالیٰ کی مہربانی نصیب ہو جائے تو گمنام لوگ بھی راتوں رات سُپر اسٹار بن جاتے ہیں اور پھر انسان کو اللہ کے بعد خود اپنی صلاحیّت اور محنت پر بھروسا رکھنا چاہیئے۔ ''کنیز'' کی کامیابی نے ہمارے اس خیال کو پختہ کر دیا تھا کہ بڑے ناموں اور بڑے لوگوں کا سہارا لینا ضروری نہیں ہے۔ اس اعتماد کی بدولت ہم نے بعد میں بھی ساری زندگی اسی روش کو اپنایا اور بڑے ناموں اور معروف لوگوں کے محتاج نہ ہوئے۔ فلم ہو یا صحافت یا کوئی اور شعبہ۔ ہم اسی طرزِ عمل پر کاربند رہے اور خدا کے فضل سے کامیاب بھی رہے۔ یہ تذکرہ آگے بھی متعلقہ کاموں کے حوالے سے آتا رہے گا۔

محمد علی اور زیبا کی جھڑپوں کا احوال ہم بیان کر چکے ہیں لیکن جو لوگ اس طرح ایک دوسرے سے برسرِپیکار تھے آخر یک جان دو قالب کیوں اور کیسے ہو گئے کہ انہوں نے شادی کر کے ساری فلمی دنیا کو حیران کر دیا اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دوسری بہت سی فلمی شادیوں کی طرح یہ شادی عارضی بھی ثابت نہ ہوئی اور ایک مثالی، پائیدار شادی قرار پائی۔ یہ کہاوت کہ بیویاں اپنا مقدّر اپنے ہمراہ لے کر آتی ہیں سو فیصد تو اس شادی پر صادق نہیں آتی اس لئے کہ شادی سے پہلے بھی محمد علی سُپر اسٹار اور خوش حال تھے لیکن شادی کے بعد ان کی فضول خرچیوں پر زیبا بیگم نے بریک لگا دیا۔ ان کی بے نظم اور بے ربط زندگی کو باقاعدہ بنا دیا۔ ہر موقع پر ان کی مشیر اور دوست کی ذمہ داری ادا کی اور انہیں گھریلو ذمہ داریوں سے یکسر آزاد کر دیا۔ اوّل تو فلم والوں کو یقین ہی نہیں تھا کہ کبھی آگ اور پانی، یعنی زیبا اور محمد علی، شادی کر کے یکجا بھی ہوں گے۔ جب شادی کی خبر آئی تو فلمی نجومیوں اور پنڈتوں نے پیش گوئیاں شروع کر دیں کہ یہ شادی

بہت مختصر عرصے تک باقی رہے گی۔اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ مگر یہ سب اندارے اور قیاس آرائیاں بالکل غلط ثابت ہو گئیں۔ یار لوگ ان کی علیحدگی کیلئے دن گنتے رہے اور ان کی شادی کامیابی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ محمد علی اور زیبا کی شادی کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ مناسب ہو کہ اس داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے ہم اس کا مختصر اًتذکرہ کر دیں۔

محمد علی اگر زیبا سے ناراض رہتے تھے اور لڑتے، جھگڑتے رہتے تھے تو دراصل یہ ان کی بے پناہ محبت کا ہی ایک انداز تھا۔ادھر زیبا انہیں تنگ اور پریشان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں بلکہ ایسے مواقع تلاش کرتی رہتی تھیں تو یہ بھی پیار کا ایک انداز ہی تھا۔خود زیبا کو اس چھپی ہوئی محبت کا بخوبی احساس اور ادراک تھا یا نہیں، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر ان کی تمام شوخی اور شرارت کے باوجود صرف محمد علی ہی ایسے فرد تھے جو مسلسل اور مستقل ان کا ہدف بنے رہے۔انہوں نے اور بھی کئی ہیروز کے ساتھ کام کیا۔وہ ہر ایک سے بے تکلّف بھی تھیں مگر کسی ایک ہیرو کو انہوں نے اس طرح مسلسل ہدف نہیں بنایا اور نہ ہی دوسروں کو وہ ہمیشہ تنگ کرتی تھیں۔ یہ غیر شعوری طور پر اظہار محبت تھا جس کا اعتراف وہ خود بھی نہیں کرتی تھیں یا شاید کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ انہیں محمد علی کی وجاہت، شجاعت اور شخصیت کے علاوہ ان کے عادات واطوار بھی پسند تھے مگر ان کے ناراض ہو جانے اور بھڑک جانے کی عادت سے غالباًوہ خائف تھیں۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سنجیدگی سے محمد علی کے بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

زیبا اور محمد علی کی جھڑپیں ''کنیز'' مکمل ہونے کے بعد بھی جاری رہی تھیں۔روٹھنے اور من جانے کا سلسلہ بھی جاری تھا کہ ایک بالکل فلمی اور ڈرامائی واقعہ رونما ہو گیا۔

مال روڈ پر جاوداں اسٹوڈیو میں فلم ساز عزیزاللہ حسن کی فلم ''پاکیزہ'' کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ زیبا فلم کے سیٹ پر کام کر رہی تھیں اور محمد علی بھی اسٹوڈیو میں موجود تھے۔عزیزاللہ نے ان دنوں یہ اسٹوڈیو ٹھیکے پر لے رکھا تھا۔وہ ایک خوبرو، تعلیم یافتہ، مہذّب اور خاندانی آدمی تھے۔بہت خوش لباس اور خوش گفتار بھی تھے۔دولت مند بھی تھے مگر اس کے باوجود کنوارے تھے۔بے تکلّف اور خوش مزاج انسان تھے اس لئے ہر ایک سے ان کے مراسم تھے۔ فلمی

ہیر وئنوں سے بھی ان کی ملاقات تھی جوان کے گھر پر منعقد ہونے والی تقاریب میں اکثر شریک ہوتی رہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف اوقات میں مختلف ہیر وئنوں کے ساتھ ان کے رومان کی خبریں یا افواہیں گرم ہوتی رہتی تھیں حالانکہ ان میں کوئی صداقت نہ تھی۔ زیبا بھی عادت کے مطابق ان پر فقرے کستی رہتی تھیں اور گپ شپ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مگر جس وقت محمد علی سامنے موجود ہوں تو وہ جان بوجھ کر انہیں ستانے کیلئے، اپنے جملوں میں شدت پیدا کر دیا کرتی تھیں۔

اس روز بھی یہی ہوا تھا اور محمد علی بے حد تپے ہوئے تھے۔ گلابی موسم کا زمانہ تھا اور لاہور میں پھولوں کا موسم تھا۔ شام کے سات ساڑھے سات بجے تھے جب ہم فلم ساز اور اسٹوڈیو اونر ملک باری کے ساتھ جاوداں اسٹوڈیو پہنچے۔ باری صاحب کو عزیز اللہ حسن سے کوئی بات کرنی تھی۔ ہم محض مٹر گشت کی خاطر ان کے ہمراہ تھے۔ سیٹ پر گئے تو زیبا موجود تھیں۔ زیبا کسی جگہ موجود ہوں اور فوری طور پر ہوٹنگ اور فقرے بازی نہ کریں، یہ ممکن ہی نہ تھا۔ چنانچہ نوک جھونک شروع ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ہم اسٹوڈیو کے بیرونی آفس میں ٹیلی فون کرنے کیلئے گئے تو کال کے سلسلے میں کافی دیر وہاں انتظار کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد دفتر سے باہر نکلے تو بڑے گیٹ کے سامنے ڈرائیو وے پر، چند لوگوں کو کھڑے دیکھا۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ نیم تاریکی میں محمد علی، زیبا، باری ملک اور عزیز اللہ حسن کو ہم پہچان گئے۔ سوچا کہ یقیناً کوئی دلچسپ گفتگو ہو رہی ہو گی اس لئے بے تابی سے ان لوگوں کی طرف بڑھے۔ اچانک ایک طمانچے کی آواز فضا میں گونجی، پھر ہم نے زیبا کو مڑ کر تیزی سے اندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

ہم سے مخاطب ہوئے بغیر وہ تیزی سے گزر کر چلی گئیں۔ اب صرف تین حضرات باقی رہ گئے تھے۔ باری ملک صاحب سنّاٹے کے عالم میں تھے جب کہ عزیز اللہ حسن محمد علی کا بازو تھامے انہیں نرم آواز میں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر وہ بازو تھام کر محمد علی کو اپنے آفس کی طرف لے گئے۔ ملک باری ہکّا بکّا وہیں کھڑے رہ گئے۔

ہم نے پاس جا کر پوچھا "باری صاحب، کیا ہوا؟"

وہ بولے "بس یار۔ بلاوجہ بات بڑھ گئی۔ محمد علی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

''کیسا نہیں کرنا چاہئے تھا؟'' ہم نے پوچھا ''کیا کر دیا محمد علی نے؟''

بولے ''زیبا کو تھپّڑ مار دیا۔ عجیب بندہ ہے۔ یار غصّے میں بھی انسان کو عورت مرد کی تمیز کرنی چاہئے۔''

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا پھر پلٹ کر محمد علی کی تلاش میں جانے کا ارادہ کیا مگر باری ملک نے ہمیں روک لیا۔

کہنے لگے ''آفاقی یہ ان کا آپس کا جھگڑا ہے۔ ہمیں بلاوجہ مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔ آؤ چلیں۔''

یہ کہہ کر وہ گیٹ کی طرف بڑھے جس کے باہر ان کی کار کھڑی ہوئی تھی۔

ہم خاموشی سے ان کے ہمراہ چل پڑے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، یہاں تک کہ ہونٹ تک سرخ تھے جب وہ غصّے یا پریشانی میں مبتلا ہوتے تو ان کے گورے چہرے پر شفق سی کھل جایا کرتی تھی۔

ان کی کار میں بیٹھ کر جب انہوں نے کار اسٹارٹ کر دی مگر پھر بھی خاموش ہی رہے تو ہمیں اندازہ ہوا کہ یقیناً کوئی گڑبڑ ہے ورنہ ملک باری کی رننگ کمنٹری اب تک شروع ہو جاتی۔

ہم نے پوچھا۔ ''باری صاحب، آخر بتاتے کیوں نہیں کیا بات ہے۔ آخر ہوا کیا ہے؟''

''کچھ نہیں ہوا۔ محمد علی کا دماغ بہت گرم ہے۔ اسے اپنے غصّے پر قابو رکھنا چاہئے۔''

بعد میں انہوں نے جو کچھ بیان کیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ عزیز اللہ حسن اور محمد علی کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ زیبا اسٹوڈیو سے باہر جانے کیلئے اس طرف سے گزریں اور ان لوگوں کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں۔ آثار بتا رہے تھے کہ ان کے اور محمد علی کے مابین حسب معمول کشیدگی موجود ہے۔ محمد علی کی کسی بات پر زیبا نے کوئی تلخ بات کی جس پر مشتعل ہو کر محمد علی نے بے اختیار طمانچہ رسید کیا۔ زیبا کیلئے ہی نہیں، دوسرے لوگوں کیلئے بھی یہ ایک خلاف توقّع حرکت تھی جس نے سب کو ششدر کر دیا۔ زیبا کیلئے یہ توہین ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے شعلہ بار نگاہوں سے محمد علی طرف دیکھا اور تیزی سے واپس اپنے میک اپ روم کی طرف چلی گئیں۔

محمد علی کی عادت اور فطرت کے پیش نظر یہ بات ناقابل یقین تھی کہ وہ کسی خاتون پر ہاتھ اٹھائیں گے اور وہ بھی زیبا پر۔ وہ فطری طور پر انتہائی وضع دار اور شریف آدمی ہیں۔ ہر عورت کا احترام کرتے ہیں۔ ہر خاتون سے مؤدب ہو کر

بات کرتے ہیں۔وہ کسی خاتون کو سختی سے مخاطب کرنے کے عادی بھی نہیں ہیں۔کہاں یہ کہ انہوں نے بھرے اسٹوڈیو میں زیبا کو طمانچہ رسید کر دیا۔اگر ہم خود اس واقعہ کے عینی شاہد نہ ہوتے تو شاید اس بات پر ہر گز یقین نہ کرتے۔

اس واقعہ نے زیبا کو آگ بگولا کر دیا۔سب سے زیادہ تکلیف انہیں اس بات سے ہوئی کہ ملک باری اور عزیز اللہ حسن جیسے شناسا لوگوں کی موجودگی میں یہ واقعہ پیش آیا تھا مگر کسی کو یہ جرأت اور توفیق نہ ہوئی کہ محمد علی کا ہاتھ پکڑ لیتا یا زیبا کی حمایت میں محمد علی سے اُلجھ پڑتا۔اس واقعہ نے زیبا کے ذہن میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔محمد علی نے جو گستاخی کی تھی زیبا اسے معاف یا در گزر کرنے پر آمادہ نہ تھیں۔انہیں یہ احساس ہوا تھا کہ محمد علی کو اس گستاخی کا مزہ چکھانے کیلئے کسی مضبوط اور جرأت مند شخص کی حمایت حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔انہوں نے فلمی دنیا میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں کہ کوئی ایسا جی دار اور سر پھرا نظر آئے جو زیبا کی حمایت میں محمد علی کے سامنے سینہ سپر ہو جائے اور محمد علی سے انکی توہین کا بدلہ لے سکے۔

پاکستان کی فلمی صنعت میں اس سے پہلے جس ہیرو کو جنگ جو ہیرو کا لقب حاصل تھا وہ سدھیر تھے۔خالص پٹھان،اعلیٰ خاندان،خوش شکل،خوش اطوار،اعلیٰ درجے کے شکاری اور نشانہ باز۔شائستگی اور خوش اخلاقی ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں لیکن مزاج کے خلاف کوئی بات ہو جائے تو پل بھر میں آگ بگولا۔ فلمی دنیا میں سدھیر کو ہمیشہ احترام اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا گیا۔کسی نے کبھی ان کی پٹھانیت کو للکارنے کی جرأت نہیں کی۔ سدھیر نے اداکار،فلم ساز،ہدایت کار ہر حیثیت سے کام کیا اور نیک نامی اور شہرت کمائی۔لگ بھگ چالیس برس پہلے انہوں نے اپنے زمانے کی سُپر اسٹار ''شمی'' سے شادی کر لی تھی جو تادم آخر قائم رہی۔وہ بہت اچھی گھریلو زندگی بسر کر تے رہے۔کسی زمانے میں شمی اور صبیحہ ہی دو پاکستانی فلمی صنعت کی چوٹی کی ہیروئنیں تھیں جن میں سے ایک کو سدھیر صاحب نے اپنی بیگم بنالیا تھا اور وہ اداکاری ترک کر کے گھر داری ہی میں خوش تھیں۔سالہا سال کے بعد انہوں نے صرف ایک ہی فلم میں اداکاری کی تھی،یہ سدھیر صاحب کی ذاتی فلم ''ساحل'' تھی۔ جس کے ہیرو،فلم ساز اور ہدایت کار خود سدھیر ہی تھے۔اس کے بعد پھر کسی نے شمی کو کہیں نہ دیکھا۔یہاں تک کہ وہ تقاریب میں بھی

نظر نہیں آئیں۔

یہ وہ سدھیر صاحب تھے جن پر زیبا کی نگاہ انتخاب تھی اور انہیں یہ محسوس ہوا تھا کہ سارے پاکستان میں صرف سدھیر ہی ایسے شخص ہیں جو محمد علی سے زیبا کی توہین کا بدلہ لے سکتے ہیں۔

اس شام کے واقعہ کے بارے میں زیبا نے اپنے منہ پر قفل لگا لیا تھا مگر ان کا ذہن اپنی خفیہ سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ وہ سدھیر کے ساتھ فلموں میں کام بھی کر رہی تھیں۔ اسی دوران میں ان دونوں کے مابین گہرے مراسم اور پھر انڈرسٹینڈنگ پیدا ہو گئی اور پھر ایک دن سب یہ جان کر حیران رہ گئے کہ زیبا نے سدھیر سے شادی کر لی ہے۔ زیبا نے یہ بم دراصل محمد علی پر پھینکا تھا لیکن ساری فلم انڈسٹری میں اس کا دھماکا سنا گیا اور اس کی لرزش محسوس کی گئی۔ زیبا ان دنوں ایک نہایت مصروف ہیروئن تھیں۔ کئی فلموں میں کام کر رہی تھیں اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اداکاری سے کنارہ کش ہو جائیں۔ غالباً انہوں نے شادی کے وقت یہ وعدہ بھی نہیں کیا تھا کہ وہ فلموں میں اداکاری ترک کر دیں گی مگر سدھیر صاحب کے چاہنے والوں کو بخوبی علم تھا کہ بالآخر زیبا کو سدھیر کی بیگم بننے کے بعد فلمی سرگرمیوں کو خیر باد کہنا ہوگا۔

محمد علی پر اس خبر نے کیا اثر کیا؟ یہ کوئی نہ جان سکا۔ اس لئے کہ انہوں نے اس موضوع پر کبھی کسی کے سامنے لب کشائی نہیں کی۔ وہ بالکل خاموش تھے۔ پہلے سے کہیں زیادہ سنجیدہ ہو گئے تھے اور فلموں میں زیادہ انہماک سے کام کرنے لگے تھے۔ ان کی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے اگر وہ چوبیس گھنٹوں میں سے بارہ گھنٹے کام کرتے تھے تو اب ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ صبح سات بجے سے رات کے بارہ ایک بجے تک مصروف رہیں۔ گویا۔ ع

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

والی بات تھی۔ انہوں نے پاکستان کی فلمی صنعت میں صبح سات بجے سے دس بجے تک ایک نئی شفٹ ایجاد کی تھی۔ اس سے پہلے فلموں کی شوٹنگ صبح دس بجے سے شروع ہو کر زیادہ سے زیادہ رات کے دس بجے تک جاری رہا کرتی تھی لیکن محمد علی نے فلم سازوں کو ایک نئی راہ سجھائی۔ انہوں نے صبح سات بجے سے دن کے دس بجے تک ایک نئی شفٹ دریافت کر لی جسے ''ٹیڈی شفٹ'' کا نام دیا گیا۔ اس زمانے میں ٹیڈی پتلون، ٹیڈی زنانہ قمیض یہاں تک کہ ٹیڈی

جوتوں تک کا فیشن ہو گیا تھا۔ مختصر، چست اور کم سے کم کپڑے کے استعمال سے تیار ہونے والے لباس کو ''ٹیڈی'' کا نام دیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس مختصر سی شفٹ کو ''ٹیڈی شفٹ'' کہا جاتا تھا۔

سردی ہو یا گرمی، محمد علی صبح سات بجے تیار ہو کر شوٹنگ کے لئے اسٹوڈیو پہنچ جاتے تھے حالانکہ عام طور پر فلمی ہیرو اور ہیروئنیں دس بجے کی شفٹ پر بھی گیارہ بارہ بجے پہنچ جائیں تو فلم ساز خوش قسمتی تصوّر کرتے تھے۔ رات کو وہ دس بجے کے بعد بھی بارہ ایک بجے تک شوٹنگ میں مصروف رہنا چاہتے تھے۔ دوسرے ساتھی اداکار تنگ تھے مگر محمد علی کی مثال سامنے تھی۔ ہر فلم ساز کا یہی کہنا تھا کہ جب محمد علی صبح سات بجے سے رات کے ایک بجے تک شوٹنگ کر سکتے ہیں تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟ اس دلیل کے آگے کسی کو جواب نہیں سوجھتا تھا۔ اس طرح محمد علی نے علی الصبح سات بجے سے رات کے بارہ ایک بجے تک کام کرنے کی روایت کی داغ بیل ڈالی تھی۔

بہت کم لوگ یہ اندازہ کر سکتے تھے کہ محمد علی خود کو کیوں ہمہ وقت مصروف رکھنا چاہتے ہیں۔ رات کو بارہ ایک بجے گھر پہنچنے کے بعد بھی وہ سونا نہیں چاہتے تھے۔ نیند کو جیسے ان سے دشمنی ہو گئی تھی۔ خدا جانے رات کے پچھلے پہر وہ کس وقت سوتے تھے اور منہ اندھیرے اٹھ کر شہسواری یا واک کیلئے نکل جاتے تھے۔ وہ خود کو مصروفیات کے سمندر میں غرق کر دینا چاہتے تھے۔

اُدھر زیبا کی بھی سن لیجئے۔

زیبا نے سدھیر سے شادی کر لی تو کچھ عرصے بعد انہیں احساس ہوا کہ سدھیر ایک خاص ڈسپلن کے عادی ہیں۔ ان کی بیوی ہوتے ہوئے زیبا پر کچھ پابندیاں عائد ہو گئی تھیں۔ وہ جب بھی شوٹنگ کیلئے اسٹوڈیو جاتی تھیں ایک چوکنّا اور مُستعد ملازم ان کے ہمراہ ہوتا تھا جو ان کے ملنے جلنے والوں پر نظر رکھتا تھا۔ خود زیبا بھی سیٹ پر بہت لیے دیے رہنے لگی تھیں۔ کہاں تو وہ ہر دم چہکنے والی زیبا جن کی موجودگی سے سیٹ پر رونق سی لگ جاتی تھی۔ جو ہنسنے ہنسانے، باتیں کرنے اور فقرے چُست کرنے میں ماہر تھیں اور کہاں یہ زیبا جو سنجیدگی کا نمونہ بن گئی تھیں۔ بلا ضرورت کسی سے بات نہیں کرتی تھیں۔ دوسرے لوگ بھی بہت محتاط ہو گئے تھے۔ آخر وہ لالہ سدھیر کی بیگم تھیں۔ ہر ایک کو علم تھا کہ سدھیر

صاحب ان معاملات میں پرانی قدروں کے قائل ہیں۔اس لئے دوسرے لوگ بھی زیبا کے ساتھ ایک احترام آمیز فاصلہ رکھنے لگے تھے۔

ایک دن ہم کسی فلم کے سیٹ پر گئے تو زیبا وہاں موجود تھیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ مسکرائیں۔وہ شاٹ دے کر فارغ ہوئیں تو ہم حسب عادت ان کے پاس چلے گئے۔دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کیں مگر جواب میں نہ کوئی فقرہ چست کیا گیا،نہ ان کی کھنکتی ہوئی ہنسی کی آواز سنائی دی۔وہ خاصی سنجیدہ اور متین نظر آئیں۔پھر وہ شاٹ دینے کیلئے کیمرے کے سامنے پہنچ گئیں۔اس کے بعد بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر پہلے والی زیبا اور اس زیبا میں ہمیں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوا۔

ایک روز وہ ایورنیو اسٹوڈیو میں ہمیں ملیں اور سیٹ پر جاتے ہوئے ہمارے پاس سے گزریں تو ہم بھی علیک سلیک کرنے کے بعد ان کے ہمراہ چلنے لگے۔

سیٹ پر داخل ہونے سے پہلے انہوں نے ہم سے کہا"آفاقی۔کسی وقت مجھ سے مل لینا۔"

کچھ دیر کے بعد ہم ان کے سیٹ پر پہنچے تو وہ قدرے فارغ تھیں اور ایک طرف صوفے پر تشریف فرما تھیں۔ہمارے لئے انہوں نے اپنے ملازم سے کافی لانے کو کہا۔ اس کے جانے کے بعد ہم ان سے باتیں کرنے لگے مگر یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کھوئی کھوئی سی ہیں۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر رُک جاتی ہیں۔اس زمانے میں ہر شخص ان سے نہایت سنجیدگی سے بات کرتا تھا۔بلاضرورت ان کے پاس بھی نہیں پھٹکتا تھا۔ہماری شہرت یہ تھی کہ سبھی سے ملاقات اور بے تکلّفی تھی اور ہم ایک معقول اور بے ضرر شہرت رکھتے تھے۔اس لئے نہ تو ہمیں ان سے ملتے ہوئے کوئی جھجک محسوس ہوئی اور نہ ہی انہوں نے ہم سے زیادہ تکلّف برتا۔اس دوران میں سدھیر صاحب بھی سیٹ پر چلے آئے۔ان سے بھی گپ شپ ہوتی رہی اور ہم نے کچھ لطیفے بھی عرض کر دیئے۔زیبا بہت عرصے بعد کسی سیٹ پر کھلکھلا کر ہنستی ہوئی نظر آئیں۔سدھیر صاحب نے بھی انجوائے کیا۔

ہم سیٹ پر سے چلے آئے مگر ہمیں محسوس ہوا کہ زیبا یہ انتہائی اہم قدم اٹھانے کے بعد خوش نہیں ہیں۔وہ ایک آزاد پنچھی کے مانند زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں مگر اب انہیں معاشرتی بندھنوں کے پنجرے میں بند کر دیا گیا تھا۔یہ

طرز زندگی ان کیلئے یکسر مختلف اور انوکھا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود اس سے مانوس اور نئے طور طریقوں کی عادی نہیں ہو سکی تھیں۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ سدھیر صاحب ان کا خیال نہیں رکھتے تھے یا ان سے محبت نہیں کرتے تھے۔ اپنی عادت اور معمول کے برعکس وہ اکثر ان کا لنچ لے کر اسٹوڈیو چلے آتے تھے۔ جب تک زیبا گلبرگ میں اپنی کوٹھی میں مقیم رہیں ہم جب بھی وہاں گئے سدھیر صاحب کو ان کی خاطر مدارت میں مصروف پایا مگر یہ سب کچھ زیبا کو خوشی اور اطمینان نہ دے سکا تھا۔

ہمیں کسی فلم کے سلسلے میں بیرون ملک جانا پڑا۔ واپس کراچی پہنچے اور حسب معمول الیاس رشیدی صاحب سے ملاقات کیلئے ان کے دفتر پہنچے تو وہاں کافی عرصے بعد زیبا کے بھائی سے ملاقات ہوئی۔ اس سے پہلے الیاس بھائی اور زیبا کے مابین تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ سدھیر صاحب کے ساتھ زیبا کی شادی سے پہلے کا قصّہ ہے مگر اس وقت زیبا اور سدھیر ایک دوسرے کے کافی نزدیک ہو چکے تھے۔ ''ہفت روزہ نگار'' میں زیبا کے بارے میں ایک خبر کی اشاعت پر زیبا کا مزاج برہم ہو گیا اور بات بڑھ گئی۔ اس میں سدھیر بھی ملوّث ہو گئے اور الیاس رشیدی صاحب کو یہ احساس ہوا کہ وہ سدھیر صاحب کی شہ پر ان کے ساتھ جھگڑا بڑھا رہی ہیں۔ بہر حال، یہ ایک افسوس ناک واقعہ تھا جس کی صدائے بازگشت تمام فلمی صنعت میں سنی گئی تھی۔ اس واقعے کے بعد زیبا اور الیاس بھائی کے مابین بول چال بند ہو گئی اور تعلقات بالکل منقطع ہو گئے۔ اب جو ہم نے زیبا کے بھائی کو الیاس صاحب کے دفتر میں دیکھا تو کچھ حیرت بھی ہوئی۔ وہ بے حد غمگیں اور پریشان نظر آ رہے تھے اور الیاس صاحب کو بتا رہے تھے کہ زیبا کی حالت بہت نازک ہے۔ وہ ایک پرائیویٹ کلینک میں زیر علاج ہے اور آپ سے ملنا چاہتی ہے۔

الیاس صاحب نے گول مول وعدہ کر لیا۔ بعد میں ہم نے اور دوسرے دوستوں نے انہیں سمجھایا کہ اگر زیبا کی طبیعت واقعی خراب ہے اور وہ گزشتہ واقعات پر اظہار ندامت کرنے کی خواہش مند ہے تو انہیں ضرور ملاقات کر لینی چاہئے۔ زیبا کی شدید بیماری کی خبر نے الیاس صاحب کو بھی کافی پریشان کر دیا تھا۔

کچھ دیر بعد زیبا کی والدہ لالی جی کا ٹیلی فون آ گیا۔ وہ اسپتال سے بات کر رہی تھیں۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں الیاس صاحب کو زیبا کی علالت کے بارے میں بتایا اور پھر اصرار کیا کہ وہ غصّہ تھوک دیں اور فوری طور پر اسپتال

آجائیں۔اس ٹیلی فون نے الیاس صاحب کا رہا سہا غصہ بھی ختم کر دیا۔

وہ ہمیں اپنے ساتھ لے کر اسی وقت اسپتال پہنچ گئے۔ایم اے جناح روڈ پر ایک مہنگا پرائیویٹ کلینک تھا۔دوسری منزل پر پہنچے تو گیلری میں ہی لالی جی مل گئیں۔وہ انتہائی پریشان اور غم زدہ نظر آ رہی تھیں۔ہم دونوں کو دیکھا تو آنسو ضبط نہ کر سکیں ۔ جب انہوں نے زیبا کی شدید علالت اور کمزوری کے بارے میں قدرے تفصیل سے بتایا تو ہم بھی سچ مچ پریشان ہو گئے۔

زیبا کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ بیڈ پر ایک ہڈّیوں کا ڈھانچہ دراز ہے۔وہ بے حد کمزور اور لاغر ہو گئی تھیں۔ آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں، چہرہ بے رونق تھا۔ہم تو ان کی حالت دیکھ کر واقعی گھبرا گئے۔الیاس صاحب بھی اپنا غصّہ اور شکوہ بھول گئے۔انہیں اس حال میں دیکھنے کا ابتدائی صدمہ کم ہوا تو ہم نے ان کا حوصلہ بڑھانے کیلئے گپ شپ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ایک دو لطیفے سنائے،وہ پہلے مسکرائیں اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگیں مگر ایک دم ان کی سانس پھول گئی اور انہوں نے کھانسنا شروع کر دیا۔ ہم سب گھبرا گئے۔نرس کمرے میں ہی موجود تھی اس نے فوراً ان کا سر اور کمر سہلائی اور دوائی پلائی۔ لالی جی ہمیں اشارے سے بلا کر کمرے سے باہر لے گئیں اور بولیں ’’آفاقی ! زیادہ نہ ہنساؤ۔اس میں تو ہنسنے کی طاقت بھی نہیں ہے۔‘‘

لالی جی نے بتایا کہ بظاہر کوئی تشویش ناک بیماری نہیں ہے مگر کمزوری بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ ہے۔کوئی صدمہ ہے جو اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔انہوں نے یہ بھی بتایا کہ زیبا لاہور سے واپس آنے کے بعد دوبارہ اس گھر میں جانے پر رضامند نہیں ہے۔اسپتال میں اس روز ہمیں سدھیر صاحب بھی نظر نہیں آئے۔نہ ہی ان کا ذکر آیا۔یہ سب چیزیں اس بات کی نشاندہی کرتی تھیں کہ زیبا اور سدھیر کی زندگی ایک اہم موڑ پر پہنچ چکی ہے اور زیبا نے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں کوئی نیا فیصلہ کر لیا ہے۔

دوسرے دن ہم کراچی سے لاہور چلے آئے مگر ٹیلی فون پر الیاس صاحب سے رابطہ رہا۔معلوم ہوا کہ زیبا بتدریج روبہ صحت ہو رہی ہیں۔کچھ دن بعد وہ کلینک سے اپنے گھر منتقل ہو گئیں اور رفتہ رفتہ بالکل ٹھیک ہو گئیں۔ کچھ عرصے بعد وہ لاہور آئیں تو بہت حد تک ان کی پہلے والی صحت بحال ہو چکی تھی۔چہرے کی رونق اور تازگی کے ساتھ ساتھ ان کی

خاموشی اور سنجیدگی میں بھی کمی پیدا ہو چکی تھی اور پہلے جیسی گپ شپ اور شوخیاں ان کا معمول بن گئی تھیں۔اسی زمانے میں یہ خبر آئی کہ زیبا اور سدھیر میں طلاق ہو گئی ہے۔ اس طرح زیبا کی زندگی کا یہ باب ختم ہو گیا۔
انہوں نے دوبارہ فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا اور فلموں کی بھرمار ہو گئی۔کئی فلموں میں وہ محمد علی کے ساتھ ہیروئن کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ان کی فلمی جوڑی پاکستان کی سب سے مقبول فلمی جوڑی بن گئی تھی مگر دیکھنے والوں نے ان دونوں کے باہمی تعلقات میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں دیکھی۔وہ بلاضرورت ایک دوسرے سے مخاطب نہیں ہوتے تھے۔نہ ہی انہیں فلم کے سیٹ کے علاوہ، کبھی یک جا دیکھا گیا۔ محمد علی ابھی تک کنوارے تھے اور بظاہر زیبا کا بھی شادی کے بندھن میں دوبارہ بندھنے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آتا تھا مگر اندر ہی اندر ایک کھچڑی پک رہی تھی جس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔

ایک دن یہ خبر سب کو حیران کر گئی کہ محمد علی اور زیبا کی شادی ہو گئی ہے۔وہ دونوں انتہائی خوش و خرّم اور مطمئن نظر آتے رہے۔دونوں کی جوڑی نے مثال قائم کر دی۔محمد علی تادم آخر زیبا کی محبت کا دم بھرتے رہے۔بے پناہ محبت رہی دونوں میں۔محمد علی نے کچھ دن بعد ماڈل ٹاؤن کے علاقے میں ایک پرانی طرز کی شاندار کوٹھی کرائے پر حاصل کر لی ہے جس میں وسیع اور سرسبز لان تھا۔پھلوں کے درخت تھے۔رنگ برنگے پھولوں سے یہ وسیع و عریض کوٹھی بھری پڑی تھی۔کوٹھی کے اندر زیبا کی نگرانی میں نہایت سلیقے سے آرائش کی گئی تھی۔یہ شادی دونوں کیلئے نہایت مبارک و مفید ثابت ہوئی تھی۔ان دونوں کی فلمیں بے پناہ کامیابیوں سے ہم کنار ہو رہی تھیں۔پھر انہوں نے علی زیب پروڈکشنز کے نام سے ایک فلم ساز ادارہ بنا لیا اور ان کی پہلی فلم ''آگ'' سُپر ہٹ ہو گئی۔
ماڈل ٹاؤن میں ان کی کوٹھی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی تھی۔کبھی جوش ملیح آبادی کے اعزاز میں محفلیں آراستہ ہو رہی ہیں اور لاہور کے ہر شعبوں سے تعلق رکھنے والے خوش ذوق لوگ ان میں موجود ہیں۔کبھی موسیقی کی مجلس سجی ہوئی ہے۔شاعر،ادیب، مفکّر، فن کار،دانش ور، صحافی،بیوروکریٹس کون سا ممتاز شخص تھا جو علی زیب کے دعوت ناموں کا منتظر نہیں رہتا تھا۔گرمیوں کی شاموں اور سردیوں کی صبحوں میں کشادہ لان میں کرسیاں لگ جاتیں اور محفل آرائی شروع ہو جاتی۔کوٹھی کی چھت پر ایک خوب صورت اور وسیع ٹیرس تھا۔گرمیوں میں رات

کے وقت وہاں نشست جما کرتی تھی۔ہر طرف سے رات کی رانی، موتیا اور چنبیلی کی خوشبو کی لپٹیں سب کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیا کرتی تھیں۔آموں کے تناور درختوں کی شاخیں ٹیرس پر لمبی پھیلی ہوئی تھیں۔ہاتھ بڑھائیں اور آم توڑلیں۔ذوالفقار علی بخاری، صوفی مصطفےٰ تبسم، سیف الدین سیف جیسے سرکردہ شعرا کے علاوہ کئی نئی پود کے شعرا، ادیب، صحافی بھی اکثر اس کوٹھی میں نظر آتے تھے۔

محمد علی اور زیبا کی زندگی کا ایک حسین دور شروع ہو چکا تھا۔اس دوران میں اس سفر میں کچھ نشیب و فراز بھی آئے مگر سفر جاری رہا۔ان دونوں کا تذکرہ آئندہ بھی مناسب مواقع پر ہوتا رہے گا۔

پاکستان کی فلمی صنعت کو جن لوگوں نے دنیا بھر میں اعزاز و افتخار بخشا، ان میں ایک نام موسیقار غلام حیدر کا بھی ہے۔ ان کی ہنرمندی اور مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں عفوانِ شباب ہی میں مسٹر غلام حیدر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔یہ ان کی بے پناہ صلاحیتوں اور تخلیقی کارناموں کا سب سے نمایاں ثبوت ہے۔لفظ ''ماسٹر'' بعد میں ان کے نام کا ایک لازمی حصّہ بن گیا اور جب تک ماسٹر غلام حیدر نہ کہا جائے کوئی نہیں پہچانتا کہ یہ کس کا تذکرہ ہو رہا ہے۔انہیں اختصار کے طور پر ''ماسٹر جی'' کہا جاتا تھا۔جس طرح جی اے چشتی صاحب کو ''بابا جی'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ماسٹر غلام حیدر وہ نام ہے جس نے ایک زمانے میں ہمالیہ سے راس کماری تک سارے برصغیر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ہندوستان کے تمام گوشوں میں ماسٹر غلام حیدر کے بنائے ہوئے گیت گائے جاتے تھے اور ان کی دُھنیں گنگنائی جاتی تھیں۔ذرا غور فرمایئے کہ جدید ذرائع ابلاغ کی عدم موجودگی کے باوجود ماسٹر غلام حیدر کے نغمے ملک کے دور دراز علاقوں تک پھیل گئے تھے اور ایک زمانہ ان کی عظمت کا قائل ہو گیا تھا۔ریڈیو اور گراموفون ریکارڈ ہی اس زمانے میں موسیقی کو لوگوں تک پہنچانے کے ذریعے تھے۔گراموفون ملک کی کثیر آبادی کی استطاعت سے باہر تھا۔ ریڈیو کا بھی یہی عالم تھا۔ٹرانسسٹرز کا دور ابھی شروع نہیں ہوا تھا اور ریڈیو بہت کم گھروں میں تھا۔اس کے باوجود ماسٹر غلام حیدر کے نغمات دور دور تک گونجتے تھے اور ہر شخص ان کی مہارت اور کاریگری کا معترف تھا۔وہ موسیقار جو کسی دوسرے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، وہ بھی ماسٹر غلام حیدر کی بڑائی کا اعتراف کرنے پر مجبور تھے۔

موسیقار خواجہ خورشید انور بہت کم ہی کسی کو گردانتے تھے۔حد تو یہ ہے کہ وہ موسیقار نوشاد کا بھی سرسری طور پر ہی

تذکرہ کرتے تھے لیکن انہوں نے ایک بار ماسٹر غلام حیدر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔

''یہ عظیم فن کار آندھی کی طرح آیا اور سیلاب کی مانند پھیل گیا اور انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔''

ماسٹر غلام حیدر کی داستان بھی اتفاقات کا مجموعہ ہے۔ یہ شخص جس نے ایک عظیم موسیقار کے طور پر شہرت حاصل کی، ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ بعض حضرات نے ان کی جائے پیدائش امرتسر کو ٹھہرایا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ غلام حیدر نے 1906ء میں حیدرآباد سندھ میں جنم لیا تھا۔

ان کے والد کا تعلق امرتسر (پنجاب) سے تھا لیکن وہ ملازمت اور کاروبار کے سلسلے میں حیدرآباد میں مقیم تھے۔ دراصل ماسٹر غلام حیدر کے دادا امرتسر سے نقل مکانی کر کے حیدرآباد سندھ پہنچے تھے چنانچہ غلام حیدر کے والد نے بھی حیدرآباد ہی میں جنم لیا تھا اور ماسٹر غلام حیدر بھی وہیں پیدا ہوئے تھے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ماسٹر غلام حیدر کسی دندان ساز کی ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد گئے تھے۔ یہ بھی خلافِ حقیقت ہے۔ دراصل ماسٹر غلام حیدر کے والد دندان سازی کے شعبے سے متعلق تھے۔ اس لئے ہوش سنبھالنے کے بعد غلام حیدر نے بھی والد صاحب کے ساتھ وہی کام شروع کر دیا مگر ذاتی رجحان موسیقی کی جانب تھا اس لئے موسیقی اور راگ راگنیوں کے علاوہ انہوں نے طبلہ اور ہارمونیم بجانے کی تربیت بھی حاصل کی تھی اور دونوں سازوں کو بجانے میں مہارت حاصل کر لی تھی۔

ماسٹر غلام حیدر کو گانے کا بھی شوق تھا۔ ان کی آواز بھاری تھی۔ وہ خوش گلو اور سُریلے تھے لیکن زیادہ توجہ انہوں نے طبلے اور ہارمونیم کی جانب مبذول کی تھی۔ بعد میں پیانو بھی سیکھا اور وہ اپنی دُھنیں پیانو پر بیٹھ کر ہی بنایا کرتے تھے۔ انہوں نے ممتاز سندھی استاد بی بے خاں کی شاگردی اختیار کی تھی۔ طبعی رجحان کے باعث بہت جلد وہ والد کے پیشے سے تنگ آ گئے اور استاد بی بے خاں کے ساتھ تھیٹریکل کمپنیوں سے وابستہ ہو گئے۔ یہ لوگ گاؤں گاؤں گھومتے تھے اور تھیٹر دکھاتے تھے۔ استاد بی بے خاں اور غلام حیدر بھی تھیٹر کے ساتھ تھے۔ غلام حیدر باجا بجاتے تھے۔ کبھی کبھی گا بھی لیتے تھے مگر انہوں نے سندھ کے دیہات تک ہی اپنی سرگرمیاں محدود رکھی تھیں۔ والد کے انتقال کے بعد انہوں نے موسیقی کے شُغل کیلئے سندھ میں میدان تنگ پایا تو پنجاب کا رُخ کیا۔ لاہور پہنچ کر غلام حیدر جینو تھیٹریکل

کمپنی سے وابستہ ہوگئے۔اس کمپنی کا دفتر بیڈن روڈ پر تھا۔کچھ عرصے بعد وہ کولمبیا ریکارڈنگ کمپنی سے وابستہ ہوگئے۔ ان کا دفتر بخشی مارکیٹ میں تھا۔یہ معلومات سعید ملک صاحب نے ہمیں فراہم کی تھیں۔سعید ملک کو بچپن ہی سے موسیقی کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔استادوں کی صحبت میں رہے اور باقاعدہ سازوآواز اور راگ راگنیوں کی تربیت حاصل کی۔خود بھی ریاض کرتے تھے۔وہ اپنے شوق بلکہ دیوانگی کی وجہ سے موسیقاروں اور اس فن کے ماہرین کی محفلوں میں ہی زیادہ وقت بسر کرتے تھے۔استاد سردار خاں کی باقاعدہ شاگردی بھی اختیار کی تھی جو اپنے فن میں یکتا تھے۔سعید ملک صاحب نے بھی معاش کی خاطر غیر ملکی کمپنیوں میں ملازمت کی لیکن موسیقی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔وہ موسیقی کے مختلف شعبوں کے بارے میں انگریزی اخبارات میں مضامین اور کالم لکھتے تھے اور اس ہنر میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔سعید ملک صاحب نے موسیقی اور موسیقاروں کے بارے میں گہری چھان بین کی۔بہت سے استادوں کی صحبت میں بھی رہے اور بڑے بڑے ماہرین فن سے استفادہ کیا جس کی وجہ سے اس بارے میں ان کی معلومات بالکل درست اور حقائق پر مبنی ہیں۔وہ ماسٹر غلام حیدر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ماسٹر غلام حیدر انتہائی رعب اور کلے، ٹھلّے کے آدمی تھے۔رنگ تو سیاہ تھا لیکن شخصیت میں کشش اور بلا کا رعب داب تھا۔سعید ملک صاحب نے بتایا کہ میں ماسٹر جی کی صحبت میں سہا ہوا اور خوف زدہ رہتا تھا۔کچھ تو ان کی عمر کم تھی اور کچھ یہ کہ ماسٹر جی کی شخصیت بہت بارعب تھی۔ان کی موجودگی میں بڑے بڑے فن کاروں کی سٹّی گم ہو جاتی تھی۔سعید ملک صاحب نے کہا کہ ایسا رعب انہوں نے صرف دو ہی موسیقاروں میں دیکھا۔ایک ماسٹر غلام حیدر تھے اور دوسرے خواجہ خورشید انور۔ بڑے نامور گانے والے اور سازندے بھی ان دونوں کے سامنے مؤدب رہتے تھے اور ان کے حکم سے سرتابی کی کسی میں مجال نہ تھی۔

ماسٹر غلام حیدر خوش گُلو بھی تھے مگر زیادہ ریاض طبلہ اور ہارمونیم جیسے سازوں کیلئے کیا۔ایک وقت ایسا بھی آیا جب موسیقی اور طبلہ ہارمونیم کے سوا انہیں زندگی میں کسی اور چیز کا ہوش ہی نہ رہا تھا۔

وہ زمانہ میرٹ کی قدردانی کا تھا۔کسی سفارش کے بغیر خداداد صلاحیتوں کی بنا پر انہیں ایک گراموفون ریکارڈ تیار کرنے والی کمپنی میں ملازمت ملی تو جیسے ان کی دلی مراد بر آئی۔لاہور میں کئی گراموفون کمپنیاں اس زمانے میں مصروف کار

تھیں۔ نوجوان غلام حیدر نے اپنی کمپنی کیلئے کچھ ایسی دھنیں بنائیں کہ جو عوام و خواص دونوں میں بے پناہ مقبول ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ماسٹر غلام حیدر بن گئے اور ہر طرف ان کا چرچا ہو گیا۔اُمراضیا بیگم کی آواز میں انہوں نے ایک نعت ریکارڈ کی جو چشم زدن میں سارے ملک میں مقبول ہو گئی۔ کیا ہندو، مسلمان، ہر کوئی اس نعت کو پڑھتا پھرتا تھا اور سر دھنتا تھا۔

پیغام صبا لائی ہے سرکارِ نبی ﷺ سے

آیا ہے بلاوا مجھے دربارِ نبی ﷺ سے

یہ نعت آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔ نہایت آسان طرز، عام فہم اور دل میں اتر جانے والے الفاظ، امراضیا بیگم کی پُردرد آواز اور اس پر ماسٹر غلام حیدر کی دلوں میں اُتر جانے والی کمپوزیشن۔ بس پھر کیا تھا، یہاں سے وہاں تک اس نعت کی دھوم مچ گئی۔ اس سے پہلے بھی ان کے بنائے ہوئے چند اردو اور پنجابی نغمے بہت مقبول ہوئے تھے مگر اس نعت کی وجہ سے ان کا نام ہر ایک زبان تک پہنچ گیا۔ وہ کافی عرصے تک امراضیا بیگم کی محبت میں گرفتار رہے بعد میں پھر انہوں نے گلوکارہ امراضیا بیگم سے شادی کر لی تھی اور ساری عمر بہت اچھی، خوش و خرّم اور کامیاب ازدواجی زندگی بسر کی۔ ماسٹر جی کی ایک اور بیوی بھی تھیں جو وہابی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس نعت نے ایسی برکت پیدا کی کہ ماسٹر غلام حیدر پر شہرت اور ترقیوں کا دروازہ کھل گیا۔

اس کے کچھ عرصے بعد شمشاد بیگم کی آواز میں ان کی ترتیب دی ہوئی ایک نظم نے تہلکہ مچا دیا۔

اک بار پھر کہو ذرا

کہ میری ساری کائنات

تیری اک نگاہ پر نثار ہے

ماسٹر جی کی شُہرت خوشبو کی طرح پھیلی تو فلم سازوں کے کانوں تک بھی ان کا نام اور کام پہنچ گیا۔ سیّد امتیاز علی تاج نے ''سورگ کی سیڑھی'' (جنت کی سیڑھی) کے نام سے فلم بنائی تو موسیقی ترتیب دینے کیلئے ماسٹر غلام حیدر کا انتخاب کیا۔ یہ فلم لاہور میں بنائی جانے والی ابتدائی اردو فلموں میں سے ایک تھی۔ گراموفون کمپنی میں ماسٹر جی کے موزوں

کئے ہوئے بہت سے پنجابی نغمے بھی بہت مقبول ہوئے تھے مگر اُردو نغموں کی شہرت بھی کم نہ تھی۔ ''سورگ کی سیڑھی'' ماسٹر غلام حیدر کو کامیابی کی منزل تک نہ پہنچا سکی کیونکہ یہ فلم کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

صحیح معنوں میں ماسٹر غلام حیدر کی شہرت کا آغاز لاہور کے فلم ساز سیٹھ دل سکھ پنچولی کی پنجابی فلم ''گل بکاؤلی'' سے ہوا تھا۔اتفاق یا حُسن اتفاق سے ایک نئی اور نو عمر گلوکارہ، بے بی نور جہاں نے بھی اس فلم سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔آگے چل کر بے مثال مغنیّہ کے طور پر انہوں نے ساری دنیا کو اپنی آواز اور گائیکی سے مسحور کرلیا۔یہ ملکہ ترنم نور جہاں کی پہلی فلم تھی جس میں انہیں نہایت کم عمری میں ماسٹر غلام حیدر جیسے موسیقار کی زیر ہدایت گانے کا موقع ملا اور انہوں نے حق ادا کر دیا۔نور جہاں کا گایا ہوا نغمہ۔۔۔''شالا جوانیاں مانے''۔اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے گراموفون ریکارڈ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگے۔اس کے ساتھ ہی ماسٹر غلام حیدر اور نئی گلوکارہ کی شہرت دیکھتے ہی دیکھتے آسمان تک پہنچ گئی۔

ماسٹر غلام حیدر کی دوسری پنجابی فلم ''یملا جٹ'' تھی۔پہلی فلم کی طرح اس فلم کے گیت بھی ولی صاحب نے لکھے تھے اور نغمات بے بی نور جہاں کی آواز میں تھے۔اس فلم کے سبھی گانے مقبول ہوئے جن میں سے تین کے بول اس وقت یاد آرہے ہیں۔

1-کنکاں دیاں فصلاں پکیاں نے

2-آسجنا دونوئیں مل کے چلئے

3-بابل میں بلہاری وے۔

4-چل پنڈ نوں چلئے

فلم'' یملا جٹ'' اور اس کے نغمات نے سارے شمالی ہندوستان کو دیوانہ بنادیا تھا۔

''خزانچی ''وہ فلم تھی جس نے صحیح معنوں میں ماسٹر غلام حیدر کی عظمت کا سکّہ بٹھادیا تھا۔یوں تو اس فلم کے سبھی گانے ہٹ تھے مگر یہ دو گانے سپر ہٹ ہو کر سارے ملک میں پھیل گئے تھے۔

ساون کے نظارے ہیں آہا آہا۔

کلیوں کی آنکھوں میں۔ مستانہ اشارے ہیں

لوٹ گئی پاپن اندھیاری

''خزانچی کے گانے ولی صاحب اوران کے چھوٹے بھائی ناظم پانی پتی نے لکھے تھے۔

فلم'' خزانچی'' نے لاہور کی فلمی صنعت کو بمبئی کی فلمی صنعت کے برابرلا کھڑا کیا تھا۔اگلی فلم''چوہدری'' ماسٹر غلام حیدر کی کامیاب پنجابی فلم تھی۔اس فلم میں بے بی نور جہاں تھیں اور ظاہر ہے کہ کئی گانے بھی ان ہی کی آواز میں ریکارڈ کئے گئے تھے مگر جب ماسٹر غلام حیدر اور نور جہاں ایک بار پھر فلم'' خاندان'' میں یکجاہوئے تو برّصغیر کی فلموں میں ایک نئی تاریخ رقم ہوگئی۔''خاندان'' کی ہدایت کاری کیلئے ایک نوجوان اور ذہین فلم ایڈیٹر کو بطور خاص ڈائریکشن کیلئے کلکتہ سے بلایا گیا تھا۔یہ شوکت حسین رضوی تھے'' خاندان'' کی کہانی سیّد امتیاز علی تاج نے لکھی تھی اور گانے ولی صاحب نے لکھے تھے۔یہ فلم اس قدر کامیاب ہوئی کہ سبھی حیران رہ گئے۔اس سے پہلے فلموں میں بے بی نور جہاں نے کام تو کیا تھا مگر نوعمری کے باعث وہ ہیروئن نہیں بن پائی تھیں۔''خاندان'' میں انہیں پہلی بار ہیروئن کے طور پر منتخب کیا گیا۔اگرچہ ان کا نام اب بھی''بے بی نور جہاں'' تھا۔اس فلم کی مقبولیت نے ہر ایک کو حیرت زدہ کردیا۔کوئی فلم اتنی کامیاب بھی ہوسکتی ہے اور کسی فلم کے سب کے سب گانے اس طرح زبان زدعام و خاص ہوسکتے ہیں''خاندان'' اس کا جیتا جاگتا ثبوت تھی۔اب ذرااس فلم کے گانے یاد کیجئے شاید آج بھی یہ ٹاپ کے گانوں میں گونج رہے ہوں۔

1-تو کون سی بدلی میں میرے چاند ہے آجا

2-آگیا مورے باغ کا مالی

3-میری امی کا راج بھلا

4-میرے من کا پنچھی

5-میرے لئے جہان میں،چین ہے نہ قرار ہے

6-پی لے پی لے مورے راجہ

7-اُڑ جا پنچھی کالی کالی آنکھوں والے

لفظ ''پنچھی'' کی تکرار سے آپ نہ گھبرائیں۔اس زمانے کے فلمی گیتوں میں پنچھی، پپیہا، ساجن، مورے راجہ جیسے الفاظ عموماً استعمال کئے جاتے تھے اور بہت پسند بھی کئے جاتے تھے۔

ماسٹر غلام حیدر کی ماسٹری محض یہ نہیں تھی کہ انہوں نے سُپر ہٹ اور مقبول عام دھنیں بنائی تھیں بلکہ انہوں نے طرزوں کی بناوٹ اور راگ راگنیوں کے استعمال میں جس جدّت، سلیقہ اور ہنرمندی کا مظاہرہ کیا تھا دراصل وہ حیران کن تھا۔ بڑے بڑے موسیقار ان کی کمپوزیشن سُن کر ان کی ہنرمندی اور کاریگری کا لوہا ماننے پر مجبور ہو گئے تھے۔

اس کے بعد تو گویا ماسٹر جی اور کامیابی لازم وملزوم بن کر رہ گئے تھے۔ کسی بھی فلم میں موسیقار کی حیثیت سے ان کا نام اس بات کی ضمانت تھا کہ اس کے تمام گانے سُپر ہٹ ہوں گے۔

ماسٹر غلام حیدر کی کامیابیوں نے انہیں محبوبیت اور مقبولیت کے اس درجے تک پہنچا دیا تھا جہاں فلمی حلقوں کے علاوہ معاشرتی اور سرکاری حلقے بھی ان کی عزت و تکریم کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔لاہور کی اہم تقریبات میں انہیں وی۔آئی۔پی کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا تھا۔ سرکاری تقریبات میں ماسٹر غلام حیدر ایک مقبول شخصیت تصوّر کئے جاتے تھے۔ سر سکندر حیات اس زمانے میں پنجاب کے چیف منسٹر تھے۔انہوں نے اپنے بیٹے شوکت حیات کی شادی کی تقریب میں ماسٹر غلام حیدر کو بطور خاص مدعو کیا تھا اور انتہائی معزّز مہمانوں سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ ماسٹر غلام حیدر ہیں جنہوں نے اپنی سحر انگیز موسیقی سے عوام وخواص کے دلوں کو موہ لیا ہے اور پنجاب کے نام کو بلند کر دیا ہے۔انہوں نے کلکتہ اور بمبئی کے موسیقاروں کو نئی راہیں دکھائی ہیں۔''

ہم نے یہ تذکرہ سعید ملک صاحب سے کیا تو انہوں نے بتایا کہ اس تقریب کا دعوت نامہ ان کے پاس محفوظ ہے۔

''زمیندار'' اور ''پونجی'' ماسٹر غلام حیدر کی اگلی کامیاب فلمیں تھیں۔ ''زمیندار'' کے چند مقبول گانے یہ ہیں۔

چھوٹا سا سنسار ہمارا

مرے حال پہ بے بسی رو رہی ہے

دنیا میں غریبوں کو آرام نہیں ملتا

ارمان تڑپتے ہیں، پہلو میں تیرے آ کے

اردو فلم ''پونجی'' کے نغمات بہزاد لکھنوی اور شوکت تھانوی نے لکھے تھے۔ فلمی شاعر ڈی این مدھوک کے لکھے ہوئے نغمے بھی اس فلم میں شامل تھے۔

اے ماتا اب جاگ اٹھے ہیں

شیشے کے نہیں ٹکڑے

اب کوئی ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑے

گاڑی والے، دوپٹہ اڑا جائے رے

ماسٹر غلام حیدر نہایت خود دار اور عزت نفس کی پاس داری کرنے والے وضع دار انسان تھے۔ کسی بات پر فلم ساز سیٹھ دل سکھ پنچولی سے وہ ناراض ہو گئے اور انہوں نے پنچولی پکچرز سے علیحدگی اختیار کرلی۔

اب وہ شُہرت اور بلندی کے اس مرتبے پر تھے کہ بمبئی کے بڑے بڑے فلم ساز اور ہدایت کار بھی ان کی خدمات حاصل کرنے کے تمنائی بن چکے تھے۔ محبوب خاں نے اپنی تاریخی فلم ''ہمایوں'' بڑی دھوم دھام سے شروع کی تو اس کی موسیقی مرتّب کرنے کیلئے ماسٹر غلام حیدر کو بمبئی آنے کی دعوت دی اور بے حد اصرار کیا۔ ہدایت کار محبوب صحیح معنوں میں محبوبیت کے درجے پر فائز تھے اور فلمی صنعت سے وابستہ بڑے بڑے نامور لوگ ان کے ساتھ کام کرنا باعث افتخار جانتے تھے۔ وہ نہ صرف ماسٹر جی کو مدعو کر رہے تھے بلکہ انہیں منہ مانگا معاوضہ بھی دینے کو تیار تھے۔ ماسٹر جی نے محبوب خاں کی دعوت منظور کرلی اور بمبئی جانے کی تیّاریوں میں مصروف ہو گئے، مگر بمبئی جانے سے پیش تر انہوں نے فلم ساز عطاءاللہ شاہ ہاشمی کی فلم ''بھائی'' کی موسیقی بنائی۔ اس فلم کے گیت شاطر غزنوی نے لکھے تھے۔ یہ فلم تو کامیاب نہ ہو سکی مگر اس کے گانے بہت مقبول ہوئے۔ مثلاً۔

1- تاروں بھری راتیں

2- دنیا کی یہ خوشی ہے

فلم ’’ بھائی‘‘ میں ماسٹر غلام حیدر نے ایک نئی گلوکارہ نسیم اختر کو متعارف کرایا تھا جو اداکارہ سردار اختر اور بہار اختر کی چھوٹی بہن تھیں۔ یہ وہی بہنیں ہیں جن میں سے ایک سردار اختر محبوب خاں کی بیگم بنیں اور دوسری بہن، بہار اختر نے فلم ساز ہدایت کار کاردار سے شادی کی اور گھرداری سنبھال کر فلموں سے بے تعلق ہو گئی تھیں۔

جب ماسٹر غلام حیدر لاہور سے بمبئی پہنچے تو وہاں کے فلمی حلقوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ہر بڑا فلم ساز ان کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش میں تھا۔ ان کا نہایت شان دار استقبال کیا گیا۔ بمبئی کے انگریزی، اردو، گجراتی اور مرہٹی اخبارات و جرائد نے بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ ان کی آمد کی خبریں شائع کیں اور بمبئی کے موسیقار جوق در جوق ان سے ملاقات کیلئے پہنچے۔

ہدایت کار محبوب کی فلم ’ ’ہمایوں ‘‘، بمبئی میں ان کی پہلی فلم تھی۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ ایک تاریخی فلم تھی۔ محبوب صاحب ہالی ووڈ کی فلموں خصوصاً سیسل بی ڈی ملز کی پُر شوکت فلموں سے متاثر ہو کر اسی پیمانے پر ایک ہندوستانی فلم بنانے کے خواہاں تھے ۔ ’’ہمایوں‘‘ ان کے اسی خواب کی تعبیر تھی جس میں انہوں نے اپنی ہنرمندی کے تمام رنگ بھر دیئے تھے۔ اس کی نمائش کے بعد جب وہ اس فلم کے پرنٹ لے کر ہالی ووڈ گئے تو سیسل بی ڈی ملز سے بھی ملاقات کی اور اس عظیم ہدایت کار کو ’’ ہمایوں‘‘ دکھائی۔ سیسل بی ڈی ملز یہ فلم دیکھ کر حیران رہ گئے کہ انڈیا میں بھی اس معیار اور اس پائے کی فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ ہالی ووڈ کے اخبارات نے محبوب صاحب کو ’’ہندوستان کا سیسل بی ڈی ملز‘‘ کا لقب دیا تھا جو کہ صحیح معنوں میں ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

فلم ’’ ہمایوں‘‘ کیلئے محبوب صاحب نے ماسٹر غلام حیدر کو موسیقی مرتّب کرنے کیلئے ایک لاکھ روپیہ معاوضہ ادا کیا تھا۔ آج کے زمانے میں ایک لاکھ کی کوئی وقعت نہیں ہے مگر اس زمانے میں ایک لاکھ روپیہ آج کل کے ایک کروڑ روپے کے برابر سمجھ لیجئے۔ جب پولیس کے سپاہی کی تنخواہ تین روپے ماہوار اور کلرک کی تنخواہ چار پانچ روپے ماہوار ہو تو ایک لاکھ کی وقعت کا خود ہی اندازہ لگا لیجئے۔

ماسٹر غلام حیدر نے بمبئی میں کسی بھی فلم کا معاوضہ 75 ہزار یا ایک لاکھ سے کم وصول نہیں کیا جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔

ان کے لاہور چلے آنے کے بعد موسیقار نوشاد نے بھی کسی بھی فلم کا ایک لاکھ روپیہ وصول کرنے کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ماسٹر جی کی طرح نوشاد بھی ایک وقت میں ایک ہی فلم کی موسیقی بناتے تھے مگر فرق یہ ہے کہ نوشاد نے اپنے پیسے کو سنبھال کر رکھا۔ جائیدادوں اور کاروبار میں سرمایہ کاری کی اور اسی وجہ سے وہ پُرآسائش اور مطمئن زندگی بسر کرتے رہے جب کہ ماسٹر غلام حیدر کی کمائی خدا جانے کہاں چلی گئی۔ وہ جب لاہور میں تھے تو موہنی روڈ پر کرائے کے مکان میں رہتے تھے حالانکہ اس وقت بھی وہ کافی پیسہ کماتے تھے اور لاہور میں ایک وسیع اور کشادہ مکان خرید لینا ان کیلئے معمولی بات تھی۔ بمبئی میں بھی وہ کرائے کے فلیٹ میں ہی رہے۔ پاکستان واپس آکر انہوں نے شیرانوالہ گیٹ کے باہر اپنا ذاتی مکان بنالیا تھا۔ یہ مکان آج بھی موجود ہے۔اس کے سوا ان کے پاس کچھ نہ تھا۔لاہور میں اپنی زندگی کے آخری دن بھی انہوں نے مالی طور پر بے فکری سے نہیں گزارے۔ان کے بعد اہل خاندان کو بھی خاصی مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا حالانکہ اس زمانے کے لاکھوں روپے کی کمائی سے وہ لاہور یا بمبئی میں بڑی بڑی جاگیریں اور زمینیں خرید سکتے تھے۔

یہ ذکر نکلا ہے تو ان کے خاندان کا ذکر بھی سن لیجئے۔ سعید ملک صاحب نے بتایا کہ ان کی پہلی بیوی سے دو بیٹے ضمیر حیدر اور پرویز حیدر قطعی نکمّے اور ناکارہ تھے۔ان دونوں سے سعید ملک صاحب کی ملاقات رہی ہے۔ یہ دونوں عُسرت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ماسٹر جی کی دوسری بیگم امراضیا بیگم سے دو بیٹے ہیں جن میں سے ایک فوج میں بریگیڈئر اور دوسرا بھی فوجی افسر ہے۔افسوس ناک بات یہ ہے کہ دنیائے موسیقی کے اس نابغۂ روزگار شخص کی اولاد کو موسیقی سے قطعی دلچسپی نہیں ہے یہاں تک کہ امراضیا بیگم جیسی گلوکارہ اور ماسٹر غلام حیدر جیسے عظیم موسیقار کے بچے بھی موسیقی سے بیگانہ ہیں۔ قدرت کیسے کیسے عجائبات دکھاتی ہے۔

بمبئی میں ’’ہمایوں‘‘ کی موسیقی بنانے کے دوران ہی میں ماسٹر جی پر فلم سازوں کی یلغار ہو گئی اور بڑے بڑے نامور فلم ساز اور ہدایت کار ان کی خدمات حاصل کرنے کے آرزومند تھے۔ماسٹر جی کے پرانے دوست ولی صاحب بھی ان دنوں بمبئی میں ہی مقیم تھے۔ جب کسی فلم ساز کی دعوت ماسٹر جی نے منظور نہ کی تو ادارہ فلم ساز کے ایم ڈی رائے بہادر چونی لال نے ولی صاحب کے ذریعے ماسٹر جی کو سفارش پہنچائی کہ وہ اپنی فلم ’’چل چل رہے نوجوان‘‘ میں ماسٹر غلام

حیدر کو موسیقار کی حیثیت سے لینا چاہتے ہیں۔اس فلم میں اشوک کمار اور نسیم بانو مرکزی کردار ادا کر رہے تھے۔
ماسٹر غلام حیدر نے اس فلم کی موسیقی بنانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔کے۔آصف کی بہت بڑی کاسٹ کی فلم ’’ پھول‘‘ کی موسیقی کیلئے بھی انہوں نے معاہدہ کر لیا۔ان دونوں فلموں کی موسیقی بہت اچھی تھی۔دیکھتے ہی دیکھنے ماسٹر غلام حیدر بمبئی میں مصروف ترین موسیقار بن ہو گئے۔انہوں نے اس دوران میں جو فلمیں سائن کیں ان میں سہراب مودی کی ’’شمع‘‘ کاروان فلمز کی ’’کنیز‘‘، جاگیر دار کی تاریخی فلم ’’ بیرم خاں‘‘ ایم صادق کی ’’جگ بیتی‘‘ ولی صاحب کی ’’پدمنی‘‘ فلمستان کی ’’ شہید‘‘(اس میں دلیپ کمار اور کامنی کوشل نے یادگار کردار کئے تھے) بمبئی ٹاکیز کی ’’مجبور‘‘ قابل ذکر ہیں۔

اس زمانے میں ماسٹر غلام حیدر نے جو یادگار نغمات تخلیق کئے ان کی فہرست بہت طویل ہے۔

اک تیرا سہارا

دل ٹھنڈی ہوا ہیں

گوری چلی پیا کے دیس

ہم غریبوں کا بھی پورا کبھی ارمان۔۔۔

خدایا تیری ہے خدائی

ہدایت کار ایم صادق کی فلم ’’جگ بیتی‘‘ کی موسیقی بھی بہت اچھی تھی۔خصوصاً یہ گانے۔

گلشن پہ ہے بہار

کوئی جاگے کوئی سوئے

ہم کو بھول نہ جانا

بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی

ٹوٹے دل کے تار، کون سنے یہ پکار

ڈولی میں ہو کے سوار، میں تو بابل کے گھر سے چلی۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ''جگ بیتی'' ناکام فلم تھی مگراس کے گانے سب کے سب سُپر ہٹ تھے۔یہی ماسٹر غلام حیدر کی ہنرمندی کا ثبوت تھا''جگ بیتی'' کے نغمات ناظم پانی پتی اور شمس لکھنوی نے لکھے تھے۔

فضلی صاحب نے اپنی فلم '' مہندی'' کا آغاز کیاتو موسیقار کے طور پر ماسٹر غلام حیدر ہی کا انتخاب کیا''مہندی'' کے گیت مجروح سلطان پوری اور ساغر نظامی جیسے عظیم شاعروں نے لکھے تھے۔یہ ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی جس کے یہ گیت آج بھی یادگار ہیں

چاند رات آئی

اب دل میں ہے

سہراب مودی کی فلم ''منجدھار'' کی موسیقی بھی ماسٹر غلام حیدر نے ترتیب دی تھی۔اس فلم میں کچھ گانے موسیقار گیان دت نے بھی بنائے تھے۔خورشید اور سریندر اس فلم کے مرکزی کردار تھے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ فلم ہٹ نہیں ہوئی مگر ماسٹر جی کا میوزک بے حد کامیاب رہا۔خصوصاً یہ دو نغمے تو قیامت ڈھا گئے۔

آج مورے ساجن کے گھر

میرا چاند آگیا میرے دوارے

ماسٹر غلام حیدر نے بمبئی میں بہت سے گلوکاروں کی آوازوں میں گانے صدابند کئے جن میں شمشاد بیگم، گیتا رائے، راج کماری، محمد رفیع، کشور کمار اور لتا منگیشکر قابل ذکر ہیں۔لتا منگیشکر کی دریافت کا سہرا بھی ماسٹر غلام حیدر کے سر ہے۔ لتا منگیشکر جو آگے چل کر گیتوں کی رانی کہلائی اور جس کے آگے انڈیا کی کسی گلوکارہ کی آواز کا چراغ نہ جل سکا، ماسٹر غلام حیدر ہی کی نگاہ انتخاب کی ممنون ہے۔اگر ماسٹر غلام حیدر نے اسے فلم ''مجبور'' میں ضد کر کے گلوکارہ کے طور پر نہ چُنا ہوتا تو شاید وہ گمنام ہی رہتی۔لتا دو مسلمان موسیقاروں کا احسان کبھی نہ بھول سکے گی۔ایک ماسٹر غلام حیدر جنہوں نے اسے دریافت کیا اور دوسرے نوشاد جنہوں نے فلم ''انداز'' میں اس کی آواز کا انتخاب کر کے اسے ایک بالکل نئی زندگی بخش دی تھی۔

لتا منگیشکر اس زمانے میں کورس میں شامل تھی۔ماسٹر جی فلم ''شہید'' کی موسیقی بنا رہے تھے۔انہوں نے ایک دبلی

پتلی کالی سی لڑکی کو دیکھا جو کورس کی آوازوں میں آواز ملا رہی تھی مگر اس کی آواز کا لوچ اور مٹھاس دوسروں سے منفرد تھا۔اس کی سُریلی آواز نے ماسٹر جی کو بہت متاثر کیا۔انہوں نے لتا سے تو کچھ نہ کہا مگر اپنے ذہن میں اس کا نام محفوظ رکھا۔کچھ عرصے بعد بمبئی ٹاکیز کی مشہور فلم ""مجبور"" کی موسیقی بنانے کا فرض ماسٹر جی کو سونپا گیا تو انہوں نے اس فلم کی ہیروئن کی آواز کیلئے لتا منگیشکر کا انتخاب کیا۔اس سے پہلے خزانچی، پونجی اور زمیندار میں وہ شمشاد بیگم سے گانے گواتے رہے تھے۔فلم "" خاندان"" میں بھی ہیروئن نور جہاں کے علاوہ دوسری آواز شمشاد بیگم ہی کی تھی۔

""مجبور"" کیلئے لتا کا انتخاب اس کی زندگی کا سب سے اہم اور سنہری موڑ ثابت ہوا تھا۔ناظم پانی پتی نے اس فلم کے نغمات تحریر کئے تھے۔ماسٹر جی نے جب لتا کو اپنے گانے کی ریہرسل کیلئے بلایا تو اسے یقین نہیں آیا۔وہ ماسٹر جی کے حضور میں ریہرسل کیلئے پہنچی تو ان کی رعب دار شخصیت سے اتنی مرعوب ہوئی کہ کچھ دیر تک تو اس کی آواز ہی نہ نکل سکی۔ماسٹر جی اور دوسرے سازندوں کی ہمت افزائی کے بعد اس نے حوصلہ پیدا کرکے ماسٹر جی کے بنائے ہوئے نغمے کی ریہرسل شروع کی۔ بمبئی ٹاکیز کے چیئرمین ساوک واچا اور ڈائریکٹر اشوک کمار کو لتا کی آواز پر اعتراض تھا۔ان کا خیال تھا کہ لتا کی پتلی سی آواز اس فلم کی ہیروئن منوّر سلطانہ کیلئے موزوں نہیں ہے۔اس کیلئے شمشاد بیگم جیسی آواز کی ضرورت ہے۔جب انہوں نے ماسٹر جی کے سامنے اپنے خیال کا اظہار کیا تو ان کے چہرے پر ناگواری کا تاثر پھیل گیا۔

انہوں نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا"" مگر میں نے اس لڑکی کا انتخاب کیا ہے اور اسے ریہرسل کیلئے بلایا ہے۔""
اشوک کمار نے کہا""لیکن ماسٹر جی۔اس کی آواز۔۔۔""
ماسٹر جی کی غُصّیلی بھاری آواز نے اشوک کمار کا فقرہ نامکمل رہنے دیا۔انہوں نے غُصّے سے کہا"" آوازوں کا قصّہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔یہ میرا کام ہے آپ کا نہیں۔""
ساوک واچا نے ماسٹر جی کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور بولے ""ٹھیک ہے۔آپ موسیقی کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں تو پھر کوئی دوسرا میوزک ڈائریکٹر تلاش کرلیجئے۔""
یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف چلے مگر اشوک کمار نے انہیں روک لیا"" ماسٹر جی۔ ہمارا یہ مطلب نہیں تھا۔آپ خواہ مخواہ

ناراض ہو گئے۔ آپ چاہے جس سے گانا لیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

مگر ماسٹر جی کا مزاج برہم ہو چکا تھا۔ وہ کمرے سے باہر چلے گئے اور اپنے اسسٹنٹ سے مخاطب ہو کر کہا ''بمبئی ٹاکیز کے نام دس ہزار کا چیک کاٹ کر انہیں دے دو۔ یہ لوگ لتا کی قدر نہیں جانتے۔ ایک وقت آئے گا جب یہ لڑکی اپنی آواز سے شعلے برسائے گی اور موسیقی کی دنیا میں سورج کی طرح چمکے گی۔ اس وقت انہیں ماسٹر جی کی یاد آئے گی۔''

ماسٹر جی کا رویہ دیکھ کر اشوک کمار بڑبڑائے کہ یہ مسلمان تو لچک دار نہیں کیسے چلے گا ان کے ساتھ کام۔۔

ماسٹر جی اگلے دن دس ہزار کا چیک واپس لوٹانے کی غرض سے بمبئی ٹاکیز کے دفتر میں گئے تو اشوک کمار اور ساوک واچا دونوں نے انہیں راضی کرنے کی کوشش کی اور کہا۔۔۔ ''ماسٹر جی آپ تو یوں ہی بُرا مان گئے۔ ہم نے کب کہا ہے کہ لتا'' مجبور'' کے گانے نہیں گائے گی۔ آپ کا انتخاب بالکل درست ہے ''مجبور'' کے گانے لتا ہی گائے گی۔''

اس طرح ماسٹر جی کا غُصّہ ٹھنڈا ہوا تو انہوں نے '' مجبور'' کیلئے گانوں کی صدابندی کا آغاز کیا۔ اپنا پہلا گانا گانے کیلئے لتا کو صبح نو بجے سے رات کے تین بجے تک انتظار کرنا پڑا تھا کیونکہ ماسٹر جی کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ دُھن بنانے بیٹھ جاتے تھے اور جب تک اس سے مطمئن نہیں ہوتے تھے، ریہرسل شروع نہیں کرتے تھے۔ اس دوران میں گلوکار، خواہ وہ کوئی بھی ہو، منتظر بیٹھا رہتا تھا کہ نہ جانے کب ماسٹر جی کو گلوکار کی ضرورت پیش آجائے۔ اس طرح لتا نے ''مجبور'' کیلئے گانے گائے اور ساری فلمی صنعت کی نظروں اور ملک بھر کے لوگوں کے کانوں میں سما گئی۔ لتا آج بھی ماسٹر غلام حیدر کی ممنونیت کا اظہار کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ ان کا احترام کرتی رہی اور جب اسے معلوم ہوا کہ ماسٹر جی لاہور میں نامساعد حالات کا شکار ہیں تو اس نے انہیں بمبئی بلانے کیلئے بہت زور لگایا مگر ماسٹر غلام حیدر کی غیرت نے خود اپنی ہی دریافت کردہ گلوکارہ کا ممنون احسان ہونا گوارا نہ کیا۔

''مجبور'' کیلئے گائے ہوئے لتا کے گانوں نے حشر برپا کر دیا تھا۔

1-اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں، انگریزی چھورا چلا گیا

2-دل میرا توڑا، مجھے کہیں کا نہ چھوڑا تیرے پیار نے

3-پیا ملنے کو آ۔۔۔

اس فلم کے سدا بہار گانے تھے جو ناظم پانی پتی نے لکھے تھے۔ نذیر اجمیری اس فلم کے مصنّف اور ہدایت کار تھے۔
فلم ''شہید'' میں بھی ماسٹر جی کے گانوں نے دھوم مچادی تھی یہ گانا تو آج بھی انڈیا کے قومی ترانے کے طور پر بجایا جاتا ہے۔

وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہو

پکارتے ہیں یہ زمین و آسماں شہید ہو

بمبئ میں فلم ''برسات کی ایک رات'' کا آغاز ہوا تو اس کے موسیقار بھی ماسٹر غلام حیدر تھے۔ فلم ''لاہور'' کی موسیقی بھی وہی ترتیب دے رہے تھے۔ یہ فلم قیام پاکستان کے بعد مکمل ہوئی تھی۔ بمبئ میں ماسٹر جی نے جس آخری فلم کی موسیقی دی تھی وہ ''کنیز'' تھی۔ ''کنیز'' کا قصّہ یہ ہے کہ اس فلم کا آغاز لاہور میں ہوا تھا۔ شیام اور منوّر سلطانہ اس فلم میں رومانی جوڑی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اس کے فلم ساز عطااللہ شاہ ہاشمی تھے۔ قیام پاکستان کی وجہ سے فلم کے اداکار بمبئ چلے گئے اور فلم بندی رک گئی۔ یہ اداکار لاہور آنے کیلئے تیار نہیں تھے اس لئے عطااللہ ہاشمی نے باقی ماندہ فلم بندی بمبئ جا کر کی۔ یہ فلم پہلے لاہور میں ''تہذیب'' کے نام سے شروع کی گئ تھی بعد میں اس کا نام تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے گیت شاطر غزنوی اور حسرت لکھنوی نے لکھے تھے اور کرشن کمار اس کے ہدایت کار تھے۔ وہ لاہور آ گئے تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد ان کا نام خورشید رکھا گیا تھا۔ اس فلم کیلئے ماسٹر جی نے دو گانے ریکارڈ کرائے تھے۔

1-تو امیروں کا خدا ہے

2-او بھولنے والے

ان دونوں کی گلوکارہ زینت بیگم (اداکارہ زینت نہیں) تھیں۔

بمبئ میں رہتے ہوئے ماسٹر جی نے ولی صاحب کی دو فلموں ''پدمنی اور پُتلی'' کی موسیقی بھی بنائی تھی۔ اس فلم کے یہ دو گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔

1-او بے درد تیرے درد کو

2-بس میں کر کے بے بس

آخرالذکر گانا زہرہ بائی نے اور پہلا گانا لتا نے گایا تھا۔ فلم ''پُتلی'' میں گیتا دت کا گایا ہوا ایک نغمہ بھی بہت مقبول ہوا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد ماسٹر جی حبّ الوطنی کے جذبے سے مجبور ہو کر لاہور چلے آئے جہاں انہوں نے ہدایت کار لقمان کی فلم ''شاہدہ'' کیلئے دوگانے ریکارڈ کرائے۔ جی اے چشتی نے بھی ''شاہدہ'' کی موسیقی میں حصّہ لیا تھا۔ اس کے گیت نگار قتیل شفائی اور حکیم احمد شجاع پاشا تھے۔ یہ وہی فلم ہے جس کے بارے میں ہدایت کار لقمان کا دعویٰ تھا کہ یہ پاکستان کی پہلی فلم ہے۔

پاکستان کی فلمی صنعت کے حالات ان دنوں بہت دگرگوں تھے۔ یہاں ہر چیز کی کمی تھی۔ فلمیں برائے نام بن رہی تھیں اور وہ بھی بے حد سستے داموں اور غیر معیاری۔ اچھی آوازوں کی بھی کمی تھی۔ نور جہاں پاکستان آگئی تھیں مگر ان کا معاوضہ ادا کرنے کی کسی فلم ساز میں سکت نہ تھی۔ خود ماسٹر جی کا بھی یہی حال تھا۔ فلم سازان کے پاس جاتے ہوئے جھجکتے تھے۔ ایک فلم ساز نے ان سے اپنی فلم کا میوزک بنانے کی درخواست کی تو بات معاوضے تک جا پہنچی۔

ماسٹر جی نے کہا ''آپ تو جانتے ہیں کہ میں بمبئی میں ایک فلم کا معاوضہ 75 ہزار اور ایک لاکھ لیا کرتا تھا۔''

فلم ساز نے کہا ''گستاخی معاف ماسٹر جی۔ یہاں ابھی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ہم تو پوری فلم ڈیڑھ لاکھ میں مکمل کر لیتے ہیں۔''

ایک اور فلم ساز نے بڑی ہمّت کی تو ماسٹر جی کو 25 ہزار روپے معاوضہ پیش کر دیا۔ اس کے بعد یہ معاوضہ اور کم ہو گیا۔

ماسٹر جی مالی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ ادھر فلمی صنعت کے حالات خراب تھے۔ ان باتوں نے ماسٹر جی کے حسّاس ذہن پر بہت اثر مرتّب کیا اور وہ دل برداشتہ ہو کر ایک حد تک گوشہ نشین ہو گئے۔ انہوں نے پاکستان آکر بہت کم فلموں کی موسیقی بنائی جن میں ''بے قرار'' بھی شامل ہے۔ نذیر اجمیری اور ایس گل نے مل کر یہ فلم بنائی تھی۔ اس کے ہیرو ایس گل اور ہیروئن راگنی تھیں۔ اس فلم کے سارے گانے ہٹ ہوئے تھے اور آج بھی ہر ایک کو یاد ہیں حالانکہ فلم فلاپ ہو گئی تھی۔ اس کے مشہور گیت یہ ہیں۔

1-ارمان لٹے دل ٹوٹ گیا (گلوکارہ منوّر سلطانہ)

2-الفت بھری نظر کے اشارے بدل گئے (گلوکارہ منوّر سلطانہ اور علی بخش ظہور)

3-بے درد زمانے سے (گلوکارہ پکھراج پپو)

4-کوئی جا کے ان سے (گلوکارہ منوّر سلطانہ)

5-بھول نہ جانا او پردیسیا۔(گلوکارہ منوّر سلطانہ)

6-دل کو لگا کے کہیں ٹھوکر نہ کھانا (گلوکارہ منوّر سلطانہ اور علی بخش ظہور)

یہ گیت آج بھی روزِ اوّل کی طرح تازہ اور خوب صورت لگتے ہیں حالانکہ ریکارڈنگ کا معیار اچھّا نہ تھا۔نہ آوازیں اتنی اچھی تھیں۔البتہ طفیل ہوشیار پوری کے گیت بہت اچھے تھے اور ماسٹر جی کا میوزک تو سبحان اللہ۔

عطااللہ ہاشمی کی فلم ''اکیلی'' ناکام ہوگئی مگر یہ گانے آج بھی زندہ ہیں۔

1-آئے خوشی کے زمانے

2-اک مورنی۔چھائی گھٹا گھنگھورنی۔

انور کمال پاشا کی فلم ''غلام'' کیلئے ماسٹر جی نے موسیقی بنائی تھی۔یہ فلم بھی کامیاب رہی تھی اور ماسٹر جی کی موسیقی بھی بہت اچھی تھی۔

اسی زمانے میں ایس فضلی نے جو پاکستان آگئے تھے ''اندھی محبّت'' کا آغاز کیا اور ماسٹر جی کو موسیقار کی ذمہ داریاں سونپ دیں مگر یہ فلم مکمل نہ ہو سکی۔ شوکت حسین رضوی کی فلم ''گُلنار'' کیلئے ماسٹر جی نے بہت اچھی دُھنیں بنائی تھیں۔شاید اس لئے کہ فلم ''خاندان'' بعد ماسٹر جی اور نور جہاں دوسری بار یک جا ہوئے تھے۔''گلنار'' کی موسیقی اب کلاسیکی شمار کی جاتی ہے اور نور جہاں نے بھی ماسٹر جی کی دُھنوں کا حق ادا کر دیا تھا۔اب ذرا یہ گانے یاد کیجئے۔

1-بچپن کی یادگارو، میں تم کو ڈھونڈتی ہوں۔تم بھی مجھے پکارو

2-گلہ ہے آسماں والے

3-وہ چل دیئے ہیں دل کو تسلّی دیئے بغیر

4-برباد ہے دل، ویراں ہے نظر

سیّد امتیاز علی تاج اس فلم کے مصنّف اور ہدایت کار تھے۔ سنتوش کمار اور نور جہاں مرکزی کرداروں میں تھے۔
شوکت تھانوی نے بھی اس فلم میں ایک کردار ادا کیا تھا۔ اس کے باوجود یہ فلم فلاپ ہو گئی۔
فضلی صاحب کی فلم لکھنوی صرف دو گانوں کی صدابندی کے بعد رک گئی تھی اور ""گلنار"" کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ ان حالات اور مالی پریشانیوں اور تفکّرات نے ماسٹر غلام حیدر کا دل توڑ دیا۔ انہوں نے ان خبروں کا بہت گہرا اثر لیا اور دل کے عارضے میں مبتلا ہو گئے۔ وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے یا پھر فلم سازوں نے ان کو بھلا دیا تھا۔ لتا نے بمبئی سے بارہا خصوصی پیغام بھیج کر انہیں بمبئی بلانے کی کوشش کی۔ سچ تو یہ ہے کہ بمبئی کے دوسرے فلم ساز بھی ماسٹر جی کے لئے ترس رہے تھے مگر ان کی خودداری اور غیرت نے دوبارہ انڈیا جانا گوارا نہ کیا۔
""گُلنار"" کی نمائش کے تین ماہ بعد 9 اور 10 نومبر 1954ء کی شب لاہور میں اس عظیم موسیقار کا انتقال ہو گیا۔
مقامی فلمی صنعت نے ان کی موت کا بہت سوگ منایا مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ دنیا سے مایوس اور محروم انسان کے طور پر رخصت ہوئے۔ افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی طرح وہ بھی پاکستان آنے کے بعد خراب حالات کا شکار ہو گئے تھے اور ناقدریٔ زمانہ کے شاکی تھے مگر جذبہ حب الوطنی میں دونوں سرشار تھے اور انہوں نے تقاضوں اور منتوّں کے باوجود دوبارہ بمبئی کا رخ نہیں کیا۔
یوں تو ماسٹر جی کی آخری فلم "" گُلنار"" تھی مگر ان کی موت کے بعد فلم ""خانہ بدوش"" نمائش پذیر ہوئی۔ یہ فلم تقسیم ہند سے قبل لاہور میں شروع ہوئی تھی مگر قیام پاکستان کے سات سال بعد جیسے تیسے مکمل ہونے کے بعد ریلیز ہوئی اور بہت بُری طرح فلاپ ہوئی شکر ہے کہ ماسٹر جی ناکامی کا یہ آخری صدمہ سہنے کیلئے دنیا میں موجود نہیں تھے۔
ماسٹر غلام حیدر کا فلمی کیریئر بیس سالوں پر محیط ہے اور اس دوران میں انہوں نے دنیا سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا تھا۔ ان کے سدا بہار نغمے رہتی دنیا تک ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ بمبئی سے پاکستان آنے والے دو فنکار ایسے ہیں جن کی جدائی کا غم بمبئی کے فلم ساز اور موسیقاروں کو ایک عرصہ دراز تک رہا تھا۔ ان میں سے ایک نور جہاں تھیں اور دوسرے ماسٹر غلام حیدر۔
ماسٹر غلام حیدر کی دھنوں میں کلاسیکی راگ راگنیوں کی مٹھاس اور سُریلا پن تھا۔ انہوں نے اپنے نغموں میں ایرانی '

عربی، مصری دُھنوں کی آمیزش بھی کی اور لاجواب نغمے پیش کئے۔ پنجاب کی موسیقی کا رنگ ان کے فن کی عمارت میں ستون کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کی بنائی ہوئی جادو اثر دُھنیں واقعی سننے والوں پر جادو کر دیتی تھیں۔

ہم نے ماسٹر غلام حیدر کو چند بار ہی دیکھا ہے۔ یہ ہماری صحافت کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ''آفاق'' میں فلمی صفحہ شائع ہونے لگا تھا اور ہماری نگار خانوں میں آمدورفت بھی شروع ہو چکی تھی۔ فلم والوں سے مراسم ہو چکے تھے۔ ایس گل صاحب کی فلم ''بے قرار'' کے دنوں میں ہم ان کے مال روڈ کے پچھواڑے والی گلی کے دفتر میں جایا کرتے تھے۔ وہاں ہم نے ماسٹر غلام حیدر کو بھی دیکھا۔ وہ اچھے ڈیل ڈول کے خاصے بارعب آدمی تھے۔ ان کی بھاری آواز میں دبدبہ تھا حالانکہ وہ خود بھی گانے گاتے رہے تھے، موزوں گلوکار دستیاب نہ ہونے کی صورت میں۔ انہوں نے اپنے چند گانے خود ہی گائے تھے اور وہ پسند بھی کئے گئے تھے۔

فلم ''گُلنار'' کی فلم بندی کے زمانے میں شاہ نور اسٹوڈیوز میں ہماری آمدورفت شروع ہو چکی تھی جہاں ساؤنڈ ٹرک میں بیٹھے ہوئے ماسٹر جی گانے ریکارڈ کرایا کرتے تھے۔ جس شخص نے مثالی حالات میں بے پناہ وسائل اور کئی سہولتوں کے ساتھ کام کیا ہو، اس کیلئے یہ بے سروسامانی یقیناً تکلیف کا باعث ہو گی۔

ماسٹر جی کے ہمراہ چار سازندے لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے۔ سعید ملک صاحب نے بتایا کہ ان چار میں لال محمد عرف بھائی لال۔ فتح علی خاں، ماسٹر سوہنی خاں اور ماسٹر منظور شامل تھے۔ ماسٹر منظور طبلہ بجانے کے ماہر تھے اور طبلے کی آواز سے موسیقی کے انوکھے انداز پیش کرنے پر قادر تھے۔ سوہنی خاں کلارنٹ بجانے کے ماہر تھے۔ بھائی لال باجا بجانے میں ایکسپرٹ تھے اور سوہنی خاں کا کلارنٹ بجانے میں کوئی ثانی نہ تھا۔ یہ چاروں صحیح معنوں میں فن کار اور اپنے اپنے سازوں کے بادشاہ تھے۔ ماسٹر جی کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ کمرے میں بیٹھ جاتے اور ماسٹر منظور کو بھیرویں یا کوئی اور راگ چھیڑنے کیلئے کہتے۔ ماسٹر منظور بھیرویں کے راگوں میں طبلہ شروع کرتے تو رفتہ رفتہ دوسرے سازندے بھی مختلف انداز پیش کرنے میں یک جا ہو جاتے تھے۔ ماسٹر جی ان تمام کیفیتوں کو سنتے اور ان کا ذہن اپنے مطلب کے ٹکڑوں کو یک جا کرتا رہتا تھا۔ جب مختلف حصے ان کے ذہن میں سمو جاتے تو وہ انہیں خاموش ہونے کا اشارہ کرتے۔ اور دھن بنانے بیٹھ جاتے تھے۔

سعید ملک صاحب کا بیان ہے کہ ماسٹر منظور کو طبلہ بجانے پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ طبلہ خود بھی گاتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ماسٹر جی پیانو پر بیٹھ کر دھن بناتے تھے۔جب تک مکھڑا تیار نہ ہو جاتا وہ اپنے ساتھی سازندوں کے ساتھ مختلف تجربات کرنے میں مصروف رہتے تھے۔وہ کبھی تو دُھن تیار کر کے بعد میں بول لکھواتے تھے اور کبھی بولوں کے مطابق دھن بناتے تھے۔ان کا دستور یہ تھا کہ طرز بنانے کے بعد گلوکار یا گلوکارہ کے ساتھ بارہ یا پندرہ دن تک ریہرسل کرتے تھے اور جب تک گلوکاری اور سازوں کی سنگت سے مطمئن نہ ہوتے ، ریہرسل جاری رہتی تھی۔ موسیقاروں میں یہ انداز صرف ماسٹر غلام حیدر اور خواجہ خورشید انور ہی کا تھا۔یہ دونوں کچے پکے کام کے قائل نہیں تھے۔ بڑے بڑے گلوکار اور سازندے بھی ان کے سامنے دم نہیں مار سکتے تھے۔ریہرسل سے مطمئن ہونے کے بعد ہی صدابندی کا مرحلہ آتا تھا۔ماسٹر جی کے یہ چار سازندے ہمیشہ ان کے ہمراہ رہے۔وہ بمبئی گئے تو یہ چاروں ان کے ساتھ تھے۔ لاہور میں بھی وہ ماسٹر جی کے ہمراہ تھے۔ماسٹر جی کے گانوں میں طبلہ ،ڈھولک اور گھڑا ضرور شامل ہوتے تھے۔وہ پرانے کلاسیکی میوزک کے قائل تھے اور راگ راگنیوں سے کبھی باہر نہیں نکلتے تھے۔ایسے مایہ ناز تخلیق کار بار بار جنم نہیں لیتے۔افسوس ہم نے ان کی قدر نہ کی۔

موسیقاروں کا ذکر چل نکلا تو ہمیں موسیقار ناشاد یاد آ گئے۔ہماری پہلی فلم ''کنیز'' میں خلیل احمد موسیقار تھے۔ دوسری فلم کی موسیقی ایم اشرف نے بنائی تھی۔دوسری فلم '' میرا گھر میری جنت'' کا تذکرہ ابھی نہیں ہوا ہے لیکن ہماری تیسری فلم '' سزا'' کا تفصیلی بیان آ چکا ہے۔''سزا'' کے موسیقار ناشاد صاحب تھے اور بڑی معرکہ آرائی کے بعد یہ مرحلہ طے ہوا تھا۔بات یہ تھی کہ ہم ناشاد صاحب سے وعدہ کر چکے تھے کہ اگلی فلم میں وہی ہمارے موسیقار ہوں گے۔یہی وعدہ ہم نے قتیل شفائی صاحب سے بھی کر لیا تھا۔کافی وقت گزر چکا تھا۔اس اثناء میں ناشاد صاحب کو تسلیم فاضلی جیسے نغمہ نگار دستیاب ہو گئے تھے جن سے ان کے مراسم بھی بہت گہرے ہو گئے اور ایک زمانے میں یہ خیال تھا کہ ناشاد صاحب انہیں اپنا داماد بنانے کی خواہش مند ہیں۔ادھر قتیل شفائی اور ناشاد صاحب میں کھٹ پٹ ہو گئی تھی اور دونوں حضرات اپنی اپنی انا کے خول میں بند ہو کر بیٹھ گئے تھے۔جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کام نہیں کریں گے۔ہم نے بمشکل دونوں حضرات کو منایا اور اپنے دفتر میں یک جا کر دیا۔جس کے نتیجے میں۔

جب بھی چاہیں ایک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ
جیسا نغمہ تخلیق ہو کر سامنے آیا تھا۔

ناشاد صاحب بہت اچھے موسیقار تھے۔ خاص طور پر دھن بنانے میں انہیں کمال حاصل تھا البتہ آرکسٹرا کے اہتمام میں وہ اتنے پرفیکٹ نہیں تھے۔ ان کی دھنیں سادہ پُراثر اور دل میں اتر جانے والی ہوتی تھیں کیونکہ وہ راگ راگنیوں کو اپنے گانوں کی بنیاد بناتے تھے۔ لوک موسیقی سے بھی مدد لیتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی موسیقی خالص دیسی اور مشرقی ہوتی تھی۔ وہ سنگت کیلئے ساز بھی زیادہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ رشید عطرے صاحب کی طرح بہت جلد دھن بنا لیا کرتے تھے اور دھن بھی ایسی کہ سنتے ہی دل میں اتر جائے اور بھلائے نہ بھولے۔

ناشاد صاحب کا اصلی نام شوکت علی تھا۔ وہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ لباس' چال ڈھال' بول چال میں آخر وقت تک دلی والے ہی رہے۔ چوڑے پائنچوں کا پاجامہ' کلی دار کھلا کرتہ۔ پیر میں چپل یا پمپ شوز یہ ان کا عمومی لباس تھا۔ بال گھنے تھے جو اکثر بکھرے رہتے تھے۔ شیو بھی بناتے تھے مگر اکثر داڑھی بڑھی رہتی تھی یعنی اکثر دو چار دن شیو کرنے کا غوطہ مار جاتے تھے۔

فلموں میں بطور موسیقار شوکت علی کی آمد کی داستان بھی بہت دلچسپ اور عجیب ہے۔ ایک زمانے میں وہ ماسٹر غلام حیدر کے ساتھ ساز بجایا کرتے تھے اور سارنگی نواز تھے بلکہ اچھے سارنگی نواز تھے۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ ماسٹر غلام حیدر جیسے موسیقار ان کو سارنگی بجانے کیلئے ساتھ رکھتے تھے۔ ماسٹر غلام حیدر کی صحبت میں رہ کر ہی انہیں موسیقی ترتیب دینے کا شوق پیدا ہوا تھا مگر ماسٹر جی سے کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ انہیں سب سے پہلے موسیقار بنانے کا سہرا اداکار شیخ مختار کے سر ہے۔ یہ وہی شیخ مختار ہیں جنہوں نے محبوب صاحب کی فلم ''ایک ہی راستہ'' میں اداکاری کر کے اپنا لوہا منوالیا تھا اور دیو قامت ہونے کے باوجود راتوں رات سُپر اسٹار بن گئے تھے۔ انہوں نے بمبئی میں اپنی فلم ''ٹوٹے تارے'' شروع کی تو موسیقار کے طور پر شوکت علی کا انتخاب کیا۔ ناشاد صاحب نے اپنی پہلی فلم کی موسیقی

شوکت دہلوی کے نام سے بنائی تھی۔ یہ فلم تو اوسط درجے کی ثابت ہوئی مگر شوکت دہلوی کی موسیقی کا رنگ سننے والوں کو پسند آیا۔ شیخ مختار نے دوسری فلم ''دادا'' بنائی تو اس کے موسیقار بھی شوکت دہلوی ہی تھے۔ شیخ مختار اور شوکت میں ایک مشترکہ رشتہ یہ بھی تھا کہ دونوں دہلی کے رہنے والے تھے۔ ''ٹوٹے تارے'' غالباً 1948-49ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ان دونوں فلموں کی موسیقی اچھی تھی مگر پھر بھی کوئی چرچا نہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں بمبئی میں بڑے بڑے دیو قامت اور مایہ ناز موسیقار موسیقی کا جادو جگا رہے تھے۔ کیسے کیسے نام تھے کہ جیسے موسیقی کے آفتاب اور ماہتاب زمین پر اتر آئے تھے۔ وہ انڈین فلمی صنعت میں موسیقی کا سنہرا دور تھا۔ ایسے میں ایک اوسط درجے کی فلم کے موسیقار کی بھلا کیا آؤ بھگت ہو سکتی تھی۔

شوکت دہلوی کی قسمت کا تارا ''ٹوٹے تارے'' سے تو نہیں چمکا تھا مگر یہ اعزاز نخشب جارچوی کے حصّے میں آیا۔ شاعر اور فلمی نغمہ نگار نخشب نے بمبئی میں فلم سازی کا آغاز کیا اور ''نغمہ'' بنانے کا فیصلہ کیا تو اس فلم کی موسیقی بنوانے کیلئے نوشاد صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ نوشاد صاحب ان دنوں مصروف تھے۔ وہ ہمیشہ ایک وقت میں ایک ہی فلم کی موسقی بنانے کے اصول پر کاربند رہے ہیں۔ ان کی معذرت نخشب صاحب کو بہت ناگوار گزری وہ خود کو بہت بڑا شاعر اور نغمہ نگار خیال کرتے تھے۔ ان میں خود پسندی بھی بہت زیادہ تھی۔ نوشاد کے انکار نے انہیں برہم کر دیا۔

انہوں نے اپنی فلم کیلئے ایک نئے موسیقار کا انتخاب کیا کیونکہ انہیں زعم تھا کہ ان کے لکھے ہوئے گیت کوئی بھی موسیقار ہٹ کرا سکتا ہے۔ مشکل یہ تھی کہ کسی نامور موسیقار سے ان کی بنتی نہیں تھی۔ نئے لوگوں میں ان کی نظر انتخاب شوکت دہلوی پر پڑی۔ شوکت دہلوی بھی نوشاد کی طرح راگ راگنیوں اور دیسی دھنوں کے قائل تھے۔ نخشب صاحب نے شوکت دہلوی کو اپنی فلم کا موسیقار چُن لیا۔ ان دونوں میں تھوڑی سی بے تکلفی بھی تھی۔ نخشب صاحب نے دوسرا کام یہ کیا کہ شوکت دہلوی کا فلمی نام ''ناشاد' رکھ دیا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ اوّل تو وہ نوشاد کو نیچا دکھانا چاہتے تھے ' دوسرے نوشاد اور ناشاد کے معمولی فرق سے وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ انہوں نے شوکت علی دہلوی کو نوشاد کے مقابلے میں استعمال کرنے کی سوچی تھی مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ ناشاد ایک دن خود اپنی پہچان بن جائیں گے اور بہت نام پیدا کریں گے۔

''نغمہ'' کی موسیقی بنانے پر ناشاد نے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دیں۔ نخشب نے بھی مقابلہ آرائی کے پیش نظر جان توڑ کر گانے لکھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ''نغمہ'' سُپر ہٹ فلم ثابت ہوئی اور اس کی موسیقی بھی حد درجہ پسند کی گئی۔ خاص طور پر شمشاد بیگم کا گایا ہوا ایک نغمہ تو آفت ڈھا گیا۔ اس کے بول یہ تھے۔

بڑی مشکل سے دل کی بے قراری کو قرار آیا

کہ جس ظالم نے تڑپایا اسی پہ ہم کو پیار آیا

نہایت سادہ دھن' پر اثر الفاظ' تھوڑے سے ساز۔ ان سب چیزوں نے مل کر ''نغمہ'' کی موسیقی کو بے حد مقبول کر دیا تھا۔ ناشاد کی طرزیں بہت میٹھی' سریلی اور سادہ تھیں۔ صحیح معنوں میں یہ ناشاد کی پہلی کامیابی تھی بلکہ دیکھا جائے تو ناشاد کا فلمی جنم ہی اس فلم سے ہوا تھا ورنہ پہلے تو وہ شوکت دہلوی تھے۔

نخشب صاحب نوشاد کو نیچا تو نہ دکھا سکے مگر انہوں نے ناشاد کی مدد سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ نوشاد صاحب کی موسیقی کے محتاج نہیں ہیں۔

نخشب صاحب کی دوسری فلم ''رفتار'' تھی۔ یہ بھی کامیاب رہی اور موسیقی کے اعتبار سے بہت پسند کی گئی۔ گویا اب ناشاد صاحب کا کام بطور موسیقار مستند ہو گیا تھا۔ ناشاد نے بعد میں دوسرے فلم سازوں کے ساتھ بھی کام کیا اور داد حاصل کی۔ ان کی فلم ''بارہ دری'' میں قریباً ایک درجن گانے تھے اور سب کے سب ہٹ تھے۔ ان کی ایک اور فلم ''بڑا بھائی'' کی موسیقی نے بھی بڑی دھومیں مچائیں۔ نخشب صاحب کی تیسری فلم ''زندگی یا طوفان'' تھی۔ یہ دراصل ''امراؤ جان ادا'' کی کہانی پر مبنی تھی۔ یہ فلم تو کامیاب تھی ہی مگر ناشاد کو مستحکم اور بہت بلند کر دیا تھا۔ بمبئی جہاں وقت کے بڑے بڑے نامور اور عظیم موسیقار مصروف کار تھے' ایک نئے نوجوان موسیقار کیلئے اپنا سکّہ ہی جما دینا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس فلم کے بعد ناشاد بمبئی کی فلمی صنعت میں ایک مستند اور معتبر موسیقار بن گئے تھے۔

نخشب صاحب ''زندگی اور طوفان'' کے پرنٹ لے کر پاکستان پہنچ گئے۔ یہاں تو بھارتی فلموں کی نمائش بھی ممنوع تھی مگر نخشب صاحب کے ہاتھ بہت لمبے تھے ان کے تعلقّات اعلیٰ حلقوں میں بہت وسیع تھے۔ پاکستان میں شعیب الٰہی اس وقت وزیر خزانہ تھے اور وہ نخشب صاحب کے دوست اور مدّاح تھے۔ اس طرح اثر ورسوخ استعمال کر کے

نخشب صاحب نے فلم " زندگی اور طوفان " پاکستان میں درآمد کرلی۔ بھارت میں تو یہ فلم زیادہ کامیاب نہیں ہوئی تھی مگر پاکستان میں اس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے اور نخشب صاحب کا کلِہ بھی مضبوط ہو گیا۔ پاکستانی فلمی صنعت نے اس کی فلم کی نمائش کے خلاف بہت احتجاج کیا تھا مگر کسی کی ایک نہ چلی اور نخشب صاحب اس فلم کی نمائش کے ساتھ ہی دولت مند بھی ہو گئے۔ ان کے دن پھر گئے تھے اس لئے تمام پرانے شوق تازہ ہو گئے۔ ریس کے گھوڑے بھی دوڑنے لگے اور شاعری بھی ہونے لگی۔ اب فلم سازی کی کسر باقی رہ گئی تھی سو انہوں نے فلم " فانوس " بنانے کا اعلان کر کے یہ بھی پوری کر دی۔ " فانوس " کے لئے نخشب صاحب نے بہت پبلسٹی کی۔ شاندار سیٹ لگوایا جس پر بہت بڑے سائز کا " فانوس " لٹکایا گیا تھا۔ یہ فانوس خاص طور پر آرڈر دے کر بنوایا گیا تھا۔ نخشب صاحب کا بیان تھا کہ اس پر لاکھوں روپے لاگت آئی ہے۔ بیش قیمت صوفے، قیمتی قالین اور دوسرا سامان آرائش بھی اس سیٹ کی زینت تھا۔ اس فلم کی موسیقی بنانے کیلئے انہوں نے اپنے بمبئی کے دوست رشید عطرے کی خدمات حاصل کیں۔ جو پاکستان میں نامور موسیقار بن چکے تھے۔ ابھی تین گانے ہی بنائے گئے تھے کہ نخشب صاحب کی لاف زنی اور مسلسل مداخلت سے تنگ آکر عطرے صاحب اس فلم سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس فلم کے باقی گانے سیف چغتائی صاحب نے مرتّب کئے تھے۔ اس فلم کی موسیقی تو اچھی تھی مگر اس کے سوا کوئی چیز کام کی نہ تھی۔ ایک دوسرے درجے کی ہیروئن کومل اور عثمان پیرزادہ کے بڑے بھائی سلمان پیرزادہ اس فلم کے مرکزی کردار تھے۔ سلمان خاص طور پر لندن سے بلائے گئے تھے۔ کہانی اور ہدایت کاری بھی لوگوں کو پسند نہ آئی جس کی وجہ سے یہ فلم فلاپ ہو گئی۔ نخشب صاحب یہ شیخی بگھارتے تھے کہ ان کی فلم کو تو پولیس ہی سنیماؤں سے اتارے گی مگر پولیس کو زحمت کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ انور کمال پاشا صاحب نے اس پہ یہ فقرہ کسا تھا کہ نخشب صاحب کو سنیماؤں میں تماشائیوں کو لانے کیلئے پولیس کی مدد حاصل کرنی چاہیئے۔

نخشب صاحب بہت دلچسپ اور انوکھے قسم کے آدمی تھے۔ شاعر بہت اچھے تھے ان کی خامی صرف شیخیاں تھیں۔ وہ دوسروں کا مذاق اڑانے میں ماہر تھے۔ جب ان کی فلم فلاپ ہوئی تو دوسروں کو بھی زبان طعن دراز کرنے کا موقع مل گیا۔

''فانوس'' کی ناکامی کے بعد نخشب صاحب کو ناشاد کی یاد آئی جو اس وقت تک بمبئی میں تھے اور فلموں کی ہٹ موسیقی بنارہے تھے۔''بارہ دری'' کے بارہ کے بارہ گانوں کے سپر ہٹ ہو جانے کے بعد ناشاد بھی ایک معروف نام بن چکے تھے۔ناشاد صاحب کا مستقبل بھارت میں کافی درخشاں نظر آنے لگا تھا۔
ایسے میں ہمدم دیرینہ' نخشب صاحب کا پیغام پہنچا۔نخشب صاحب چرب زبانی میں ماہر تھے۔ایک لمحے میں بڑے بڑے مخالف کو شیشے میں اتار لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔انہوں نے شوکت علی ناشاد کو ایسی پٹّی پڑھائی' پاکستان آنے کے اتنے فوائد بتائے اور یہاں کے روشن مستقبل کے بارے میں ایسے سہانے خواب دکھائے کہ ناشاد صاحب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بمبئی سے لاہور پہنچ گئے۔وہ تو یوں بھی سیدھے سادے آدمی تھے۔انہیں شیشے میں اتارنا کون سا مشکل کام تھا۔

پاکستان میں ناشاد کا نام ان کی موسیقی کے حوالے سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔نخشب صاحب نے پاکستان میں دوسری فلم ''میخانہ'' بنانے کا اعلان کیا جس کی موسیقی ناشاد صاحب کو سونپی گئی۔اس فلم کی بڑی دھواں دھار پبلسٹی کی گئی۔ریڈیو سیلون اس زمانے میں تمام برّصغیر میں سُنا جاتا تھا اور بھارتی فلموں کے گانوں کو مقبول بنانے کا بہت بڑا ذریعہ تھا۔کسی پاکستانی فلم کے گانے اس سے پہلے سیلون سے نشر نہیں ہوئے تھے کیونکہ یہ ایک مہنگا سودا تھا۔نخشب صاحب کے لئے سستا کیا اور مہنگا کیا۔وہ طبعاً جواری تھے۔ایک منٹ میں شراط لگا کر ہار جیت کر لیتے تھے۔انہوں نے اپنی فلم ''میخانہ'' کی موسیقی کا پروگرام باقاعدہ طور پر ریڈیو سیلون سے نشر کرانا شروع کر دیا۔
''میخانہ'' بھی نخشب صاحب کی خود پسندی اور تکبّر کی نذر ہو گئی اور فلاپ ٹھہری مگر ناشاد کی موسیقی لاجواب تھی۔اس نئے موسیقار نے ہر ایک کو چونکا کر رکھ دیا۔جس نے اس فلم کے نغمے سنے انہیں گنگنائے یا پسند کئے بغیر نہ رہ سکا۔اس میں کچھ ہاتھ نخشب صاحب کی شاعری کا بھی تھا۔شاعر کی حیثیت سے نخشب صاحب کی مہارت سے انکار کرنا بہت مشکل ہے۔خصوصاً فلمی شاعری کے حوالے سے نخشب وہ شاعر تھا جس نے محض شاعری کی بدولت دنیا میں سب کچھ حاصل کر لیا تھا۔دولت شہرت' مرتبہ' بے انتہا بارسوخ اور اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز دوست احباب، فلمی شاعری میں نخشب کا مقام ہمیشہ منفرد اور یادگار رہے گا۔بہتر ہوتا اگر وہ شاعری تک ہی محدود رہتے اور اپنی فلموں کی

کہانی اور ہدایت کاری کیلئے کسی اور کی خدمات حاصل کرتے مگر نخشب کی انا یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ خود کو ہر فن مولا سمجھتے تھے اور کسی دوسرے کو اپنے سامنے پُر کاہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔

''میخانہ'' فلاپ ہوگئی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ زیادہ فلاپ ''فانوس'' تھی یا ''میخانہ'' ۔ یہ فلم 1964ء میں نمائش کیلئے پیش کی گئی تھی۔ اس سال ''میخانہ'' کی موسیقی کو بے حد مقبولِ عام حاصل ہوا۔ یہ پاکستان میں بطور موسیقار ناشاد کا پہلا دھماکہ تھا۔ اس کے بعد ناشاد نے یکے بعد دیگرے کئی فلموں میں بہت اچھا میوزک بنا کر اپنی ساکھ بنالی۔

ناشاد صاحب نے پاکستان میں لگ بھگ پچاس سے زائد فلموں میں موسیقی ترتیب دی ہے جن میں زیادہ تعداد کامیاب فلموں کی ہے۔ ناشاد صاحب کی ایک خوبی یہ تھی کہ ناکام فلموں میں بھی ان کی موسقی ہٹ ہو جاتی تھی۔ یہ اعزاز بہت کم موسیقاروں کو حاصل ہوتا ہے۔

''میخانہ'' کے بعد ناشاد صاحب نے کراچی کی ایک فلم ''ہم دونوں'' کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ کراچی کی فلم ''پھر صبح ہوگئی'' کی موسیقی بھی انہوں نے ہی بنائی تھی۔ ''ہم دونوں'' اس لحاظ سے یادگار فلم ہے کہ اس میں ناشاد صاحب نے ایک نوعمر سانولی سلونی' خوش شکل بنگالی لڑکی رونا لیلیٰ کو گلوکارہ کے طور پر متعارف کرایا تھا اور رونا لیلیٰ کا گایا ہوا پہلا ہی گانا سُپر ہٹ ہو گیا تھا۔

''دیّا رے دیّا کانٹا چبھا

کانٹا چبھا پاؤں میں''

یہ گانا یوپی کی لوک موسیقی کے انداز میں بنایا گیا تھا۔ طرز بہت سادہ اور خوبصورت تھی مگر کمپوزیشن کی طرح رونا کی آواز بھی انتہائی پُرکشش تھی۔ وہ اس وقت کی تمام گلوکاراؤں سے مختلف اور انوکھی تھی۔ اس آواز میں درد' سوز ' شوخی اور جذبات کی آمیزش تھی۔ رونا لیلیٰ نے بعد میں پاکستان کی فلمی موسیقی میں بہت نام پیدا کیا تھا۔

بنگلہ دیش کے قیام کے موقع پر اگر وہ اپنی خوشی سے ڈھاکہ نہ چلی جاتیں تو آج بھی پاکستان میں گانے گاتی نظر آتیں۔ پاکستان والوں نے ان سے بہت محبّت کی۔ انہیں بہت شہرت' دولت اور عروج عطا کیا تھا۔ اس کا احساس انہیں یہاں

سے جانے کے بعد ہوا۔ڈھاکہ میں وہ کبھی خود کو فٹ نہ کر سکیں۔انہوں نے بمبئ میں جا کر بھی قسمت آزمائی کرنی چاہی مگر وہاں لتا منگیشکر ان کے سامنے کوہِ گراں بنی کھڑی تھیں۔یہ حقیقت ہے کہ بمبئ کے موسیقاروں اور فلم سازوں نے رونا لیلیٰ کی آواز کو بہت سراہا تھا اور اسے ایک خوبصورت اور منفرد آواز قرار دیا تھا مگر لتا سے ٹکرّ لینے کی کسی میں جرات نہ تھی۔لتا بمبئ میں فلمی دنیا کی بے تاج ملکہ تھی۔اس کی مرضی کے خلاف سرتابی کرنے کی کسی میں تاب اور مجال نہ تھی چنانچہ وہاں رونا لیلیٰ کا چراغ نہ جل سکا اور رونا لیلیٰ بے نیل ومرام بمبئ سے واپس لوٹ گئیں۔بعد میں بنگلہ دیش اور بیرونی ملکوں میں موسیقی کی تقاریب میں شرکت کرنے لگیں۔چند بار پاکستان بھی آئی تھیں۔مزیدار بات یہ ہے کہ وہ تمام عمر دنیا بھر میں اسٹیج پر وہی نغمے گاتی رہیں جو انہوں نے پاکستانی فلموں میں گائے تھے اور جن سے انہیں شہرت حاصل ہوئی تھی۔چند سال قبل انہوں نے لندن میں ایک انگریز سے شادی کر لی تھی۔ماڈرن تو وہ اس زمانے میں بھی تھیں۔ترشے ہوئے بال مناسب میک اپ اور فیشن کے مطابق لباس لیکن مشرقی حیا کا دامن انہوں نے ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا۔رفتہ رفتہ وقت نے انہیں بیباک اور مزید فیشن ایبل بنا دیا۔انگریز شوہر اس کا زندہ ثبوت ہے۔ اب وہ قدرے فربہ اندام ہو گئی ہیں مگر چہرے کی دلکشی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔ہماری فلموں میں بھی انہوں نے گانے گائے تھے "آس" میں ان کے گائے ہوئے گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔

رونا لیلیٰ تو خیر ناشاد صاحب کی دریافت تھیں۔انہوں نے پاکستان کے سبھی گلوکاروں کی آوازوں میں گانے ریکارڈ کئے اور خوب ریکارڈ کئے۔

ناشاد صاحب کا موسیقی بنانے کا انداز بھی عجیب تھا۔وہ ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے تھے۔کوئی سُر چھیڑتے اور گنگنانے لگتے۔دیکھتے ہی دیکھتے مکھڑے کی طرز تیار ہو جاتی۔ہم نے انہیں دس منٹ کے اندر بھی طرز بناتے ہوئے دیکھا ہے جو بہت سُپر ہٹ ہو گئی۔سُروں اور راگ راگنیوں پر ناشاد کو عبور حاصل تھا۔شعر وشاعری سے بھی واقفیت تھی کیونکہ بہت اچھے شعرا کی محفلوں میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔کبھی کبھی وہ خود بھی گانوں کے اچھے مکھڑے بنا لیتے تھے۔ان جیسا اور کوئی نہیں دیکھا سنا جسے یہ کمال حاصل تھا۔ڈمی بول تو اکثر بنا ہی لیتے تھے بعد میں نغمہ نگار اس کو اچھے شعروں میں ڈھال دیتا تھا۔

ناشاد صاحب بہت سُریلے تھے، ان کی آواز میں سوز اور مٹھاس تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جو طرز وہ خود گا کر سناتے تھے۔ ریکارڈ ہونے کے بعد اس میں وہ خوبصورتی محسوس نہیں ہوتی تھی حالانکہ اس زمانے میں بہت بڑے اور نامور گلوکار پاکستان کی فلمی صنعت کو میسر تھے۔ میڈم نور جہاں' مہدی حسن' استاد امانت علی خاں' فریدہ خانم 'اقبال بانو' ثریا خانم' رونا لیلیٰ' نیرہ نور' مالا' اخلاق احمد' مجیب عالم' احمد رشید' مسعود رانا' سلیم رضا' غلام علی گلوکاروں کی ایک کہکشاں تھی کہ جگمگا رہی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک گلوکار فلمی گانوں کے لئے موجود تھا۔ وہ پاکستان کی فلمی موسیقی کا گولڈن دور تھا۔ موسیقار' گلوکار' نغمہ نگار' ہدایت کار' مصنّف' اداکار سب اپنی اپنی جگہ انگوٹھی میں نگینوں کی طرح جُڑے ہوئے تھے مگر میری وہ بات اس کے باوجود اپنی جگہ ہے کہ ناشاد صاحب جب گا کر طرز سناتے تھے' اس میں جو لطف اور سُرور ملتا تھا' وہ گانا ریکارڈ ہونے کے بعد محسوس نہ ہوتا تھا۔ خدا جانے اس کا سبب کیا تھا لیکن یہ شکایت اس زمانے میں ہر اچھے موسیقار کو تھی کہ گانے کی کوالٹی ریکارڈنگ کے بعد کم ہو جاتی ہے۔ شاید اس میں لگن کی کمی اور بے توجہی اور بے پروائی کا بھی دخل تھا۔ گلوکاروں اور موسیقاروں کی مصروفیات بے پناہ ہو گئی تھیں۔ ریہرسل کے لئے نہ گانے والوں کے پاس وقت تھا' نہ سازندوں کے پاس تو پھر مکمل ریہرسلوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ناشاد صاحب بہت سادہ اور معصوم آدمی تھے۔ ہر ایک کی باتوں میں آ جاتے تھے۔ کسی کی بُرائی یا غیبت میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ بس اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ طرز تو وہ منٹوں میں بنا لیتے تھے مگر اگلے روز جب آتے تو اسے بھول کر مختلف طرز سنانے لگتے۔

''ارے ناشاد صاحب یہ وہ طرز نہیں ہے جو کل سنائی تھی''۔

''وہی تو ہے بھئی آپ خوامخواہ مجھے نہ بوکھلائیں۔''

کافی اصرار کے بعد وہ مختلف طرزیں گا کر سناتے اور پھر اوریجنل طرز بھی دستیاب ہو جاتی تھی۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے دو چار انداز میں طرز سنائی اور کوئی اور انداز پسند آ گیا۔ ہزار بار کہا کہ ناشاد صاحب ایک ٹیپ ریکارڈر ہی خرید لو۔ ساری طرزیں محفوظ ہو جائیں گی اور آنے والے وقت کے لئے بھی یادگار بن جائیں گی۔

وہ کہتے ''ارے یار ٹیپ ویپ سب بے کار چیزیں ہیں۔اللہ میاں کا بنایا ہوا ٹیپ سب سے اچھا ہے۔دماغ ہے۔آواز ہے اور کیا چاہئے''۔

ناشاد صاحب ویسے تو بڑے مرنجان مرنج آدمی تھے۔منکسر مزاج بھی تھے مگر گانے کے معاملے میں بڑے بڑوں کو بلا تامل ٹوک دیتے تھے۔ایک بار ہماری ایک فلم کے گانے کی ریکارڈنگ میں مہدی حسن گا رہے تھے وہ بار بار جگہیں بھول جاتے تھے۔

ناشاد صاحب ریکارڈسٹ کے پاس سے اٹھ کر آئے اور مہدی حسن سے کہا''خان صاحب کچھ کام کی طرف بھی دھیان لگایا کرو''۔مہدی حسن بڑے نفیس انسان تھے،ایک تاثر تو ان کے چہرے پر آیا لیکن پھر وہ ہنسنے لگے ''سارا دھیان اسی طرف ہے۔ناشاد صاحب۔

''خاک دھیان ہے،ادائیگی صحیح نہیں کر رہے ہو۔جگہیں غلط لے رہے ہو'' ۔

پھر وہیں کھڑے کھڑے انہوں نے گانا گا کر سنایا اور مہدی حسن سر ہلانے لگے '' ٹھیک کہا آپ نے اب غلطی نہیں ہو گی۔

''میاں دو چار بار دہرا تو لو۔پروڈیوسر کا مال پانی ہو رہا ہے''۔

ناشاد صاحب کو فلم ساز کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔وہ فالتو سازندے گانے میں شامل نہیں کرتے تھے اور نہ ہی بلا وجہ ریکاڈنگ میں زیادہ دیر لگاتے تھے۔وہ وہمی نہیں تھے۔جیسے ہی ایک ٹیک سے مطمئن ہوتے اسے ''اوکے'' کر دیتے اور ریکارڈنگ پیک اپ،ورنہ کئی موسیقار تو کسی طرح مطمئن ہی نہیں ہوتے تھے۔

ناشاد صاحب کی موسیقی کی بنیاد لے اور سُر پر ہوتی تھی۔وہ راگوں پر مبنی سادہ آسان طرزیں بناتے تھے جنہیں گانا دشوار نہیں تھا اور سمجھنا بھی آسان تھا۔ ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی طرز بنانے کے بعد گانے والے کی آواز کو کھینچ تان کر اس پر منڈھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ گلوکار کی آواز کی رسائی کے مطابق طرز بناتے تھے۔بعض گلوکارائیں اونچے سُروں میں زیادہ اچھا نہیں گا سکتی تھیں۔ان کی آواز بگڑ جاتی تھی مگر موسیقار کا اصرار ہوتا تھا کہ گلوکار اتنے ہی اونچے سُروں میں گائے جو اس نے بنائے ہیں مگر ناشاد صاحب کی یہ امتیازی خوبی تھی کہ وہ آواز کے

مطابق طرز بناتے تھے۔ ملکہ ترنم نور جہاں کی آواز میں انہوں نے انتہائی مدّھم اور دھیمے سُروں میں نغمے ریکارڈ کئے ہیں جو کانوں میں رس گھول دیتے ہیں۔ اس طرح مالا کیلئے انہوں نے ایسے سُر لگائے کہ وہ سہولت اور عمدگی سے گا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گانوں میں آوازیں زیادہ بھلی لگتی ہیں۔ ان کی دُھنوں میں میلوڈی' راگ اور سُر کی مٹھاس شامل ہوتی ہے۔ طرزیں وہ تھوک کے حساب سے بناتے تھے اور ایک گانے کی اتنی طرزیں بنا لیتے تھے کہ خود بھی انتخاب کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ البتہ آرکسٹرا کے اہتمام میں وہ اتنے ہنرمند نہیں تھے۔ ان کے بڑے بیٹے واجد علی ناشاد نے بی اے کرنے کے بعد ناشاد صاحب کی معیّت میں کام کرنا شروع کیا تو ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ واجد نئے زمانے کا نوجوان تھا جو مغربی پوپ میوزک سے بھی واقف تھا اور اسے طرزوں میں سمونے کا کا خواہش مند بھی رہتا تھا۔ وہ ناشاد صاحب کا چیف اسسٹنٹ بھی تھا۔ اب ہوتا یہ تھا کہ ناشاد صاحب نے ایک طرز بنا کر پسند کرائی۔ گھر گئے تو واجد نے ریہرسل کے وقت اس میں اپنی پسند کے مطابق ذرا سی تبدیلی کر دی۔ ناشاد صاحب تو بھولنے کے عادی تھے۔ سوچ میں پڑ جاتے تو واجد کہتے ''ابّا یہ ایسے ہی تھا''۔

اگلے دن ابّا طرز سناتے تو وہ کچھ اور ہی بن جاتی تھی۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ بڑی مشکل سے ہم نے گنگنا کر ناشاد صاحب کو طرز یاد دلائی تو وہ بیٹے پر بگڑنے لگے ''ہاں۔ یہ ٹھیک ہے نا۔ یار تم مجھے کیوں گمراہ کرتے رہتے ہو''۔

ہم نے واجد کو بھی سمجھایا کہ ''بھائی یہ آدھا تیتر' آدھا بٹیر نہ کرو۔ تمہارے ابّا کا انگ دیسی ہے۔ تم اس میں مغرب کا تڑکا لگانے کی کوشش مت کیا کرو۔ اس طرح طرز خراب ہو جاتی ہے''۔

ناشاد صاحب ایک بار ہم سے کہنے لگے ''آفاقی صاحب واجد کو کوئی فلم تو دلاؤ، بہت اچھّا لڑکا ہے''۔

ہم نے کہا ''آپ اپنی کوئی فلم واجد کو کیوں نہیں دے دیتے؟ ''

بولے ''بھائی فلم پروڈیوسر نہیں مانتے''۔

''تو پھر ایسا کریں کہ خود میوزک بنا کر اس پر واجد کا نام دے دیں''۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے بھئی۔ میں اپنا کریڈٹ کسی اور کو کیوں دے دوں؟ ''

''ناشاد صاحب۔ یہ کوئی اور نہیں۔ آپ کا بیٹا ہے۔ ولی عہد ہے''۔

ناشاد صاحب ہنس کر چپ ہو گئے مگر واجد نے یہ بات پلّے باندھ لی۔ گھر جا کر اس نے یہ تجویز والدہ کے سامنے پیش کر دی اور وہ بیٹے کی وکالت کرنے لگیں۔

دوسرے دن ناشاد صاحب ملے تو کہنے لگے ''بھئی آپ بہت فسادی آدمی ہیں''۔

''کیوں۔ کیا ہوا؟''

''ارے میاں گھر میں جھگڑا کرادیا'' پھر انہوں نے سارا واقعہ سنایا۔

''ٹھیک تو کہتی ہیں آپ کی بیگم۔ ناشاد صاحب بیٹے کی خاطر آپ یہ قربانی نہیں دے سکتے؟''

بولے ''نہیں۔ یہ فن کا معاملہ ہے''۔

آغاز کے دنوں میں ناشاد صاحب کراچی کی چند فلموں کی موسیقی کیلئے وہاں گئے تھے کہ شوکت حسین رضوی صاحب نے اپنی فلم ''عاشق'' کی موسیقی بنانے کیلئے انہیں بلالیا۔ لاہور میں انہوں نے ''جلوہ'' کی موسیقی بھی بنائی تھی ''سالگرہ'' سپر ہٹ فلم تھی جس میں شیون رضوی کے گیتوں نے سونے پر سہاگے کا کام دیا تھا۔

''لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے
یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے''

اس فلم کا یادگار گانا تھا۔ دوسرے گانے بھی بہت اچھے تھے۔ ناشاد صاحب کی ابتدائی سبھی فلموں کا میوزک قیامت خیز تھا اور فلمیں بھی زبردست کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھیں۔

ناہید، تم ملے پیار ملا، سالگرہ، افسانہ، آگ، پھول اور پتھر، چاند سورج، رم جھم، افشاں، یہ سب کی سب انتہائی کامیاب فلمیں تھیں۔ سلیمان کی الزام، اقبال یوسف کی ''ہل اسٹیشن'' ہمایوں مرزا کی ''خاک اور خون'' فرید احمد کی ''بندگی'' ایم صادق کی ''بہارو پھول برساؤ'' راکھن کی ''سہرے کے پھول'' شمیم آراء کی ''سہاگ'' اور ''قرض'' شوکت حسین رضوی کی ''دلہن رانی'' لقمان کی ''پرچھائیں'' اس کے علاوہ زینت، غلام، آبرو، سزا، دنیا گول ہے، ایمان دار، ساجن رنگ رنگیلا، شکوہ، گمراہ، پالکی، ایثار، نیکی بدی، پرستش، تیری صورت میری

آنکھیں، محبت مر نہیں سکتی، مِلن، آپ سے کیا پردہ، ضمیر، آزمائش، بدنام، وقت، انسانیت، چکّر باز، دیدار، محبوب، میرا مستانہ یہ سب کی سب ناشاد کی بہترین نغمہ بار فلمیں ہیں۔

پرستش ان کی ذاتی فلم تھی جو کامیاب نہ ہو سکی مگر اس کے بعد وہ ایک اور فلم بنانے کھڑے ہو گئے۔ دونوں فلموں میں انہوں نے گھاٹا اٹھایا اور ساری کمائی ضائع کر دی۔

ناشاد صاحب کثیر العیال آدمی تھے۔ چودہ یا پندرہ بچّوں کے والد تھے۔ ایک دن گنڈا پور صاحب نے تو پوچھ ہی لیا

"ناشاد صاحب۔ آپ کی بیویاں کتنی ہیں؟"

ناشاد صاحب بُرا مان گئے "ارے میاں شریف لوگ ہیں۔ ایک ہی بیوی پر گزارہ کرتے ہیں، آپ کی طرح آوارہ نہیں"

ہدایت کار ثناءاللہ خان گنڈا پور تھوڑے سے کھسیانے ہوئے لیکن ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دی اور یہ لطیفہ بنا لیا کہ ناشاد صاحب کو اپنے بچّوں کے نام تک صحیح طرح یاد نہیں ہیں۔

"ارے میاں کیوں بکواس کرتے ہو۔ سب یاد ہیں"

"اچھا۔ تو پھر ترتیب وار اپنے سارے بچّوں کے نام سنا دیں تو یہ سو روپیہ کا نوٹ آپ کا ہو گیا ورنہ آپ سے سو روپیہ لوں گا۔

ناشاد صاحب محبّت سے نام گنوانے لگے۔ "واجد، ماجد، مکو" اس کے بعد وہ سوچ میں پڑ گئے۔

ثناءاللہ خان نے کہا "بس بس سو روپیہ نکال کر رکھ دیں۔ آپ شرط ہار گئے ہیں۔"

"شرط کس نے لگائی تھی۔ ارے میاں شرط لگانا تو حرام ہوتا ہے۔"

ان کا ایک اور لطیفہ بھی مشہور تھا۔ لوگ اسکو انجوائے کرتے۔ ناشاد صاحب نے کار خریدی تو گھر لے گئے۔ گلی میں کار دیکھی تو بہت سے بچّے اکٹھّے ہو گئے۔ کوئی اس پر چڑھ رہا ہے کوئی ہاتھ لگا رہا ہے کوئی اس کے اندر گھسنے کی کوشش میں ہے۔ ناشاد صاحب بہت ناراض ہوئے "ارے بھئی سب اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ کوئی میری گاڑی کو ہاتھ نہ لگائے۔ چلو۔ بھاگو۔" انہوں نے سب بچّوں کو بھاگنے کیلئے ڈانٹا تو ایک بولا "ابّا میں تو آپ کا بچّہ ہوں"

دوسرے نے کہا ''ابّا میں بھی آپ کا بچّہ ہوں۔ ''

تیسرا بولا ''ابّا میں بھی۔ ''

معلوم ہوا کہ سبھی ان کے بچّے تھے۔

یار لوگوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ ناشاد صاحب نے بچّوں کے نمبر مقرر کر دیئے ہیں اور ناموں کے بجائے انہیں نمبر سے پکارتے ہیں۔

ناشاد صاحب انگریزی نہیں جانتے تھے مگر انگریزی کے الفاظ استعمال کرنے کے شوقین تھے۔ایک بار کسی فلم ساز نے کہا ''ناشاد صاحب آپ اچھّا لباس کیوں نہیں پہنتے۔ ٹھاٹ باٹ سے رہا کیجیئے۔ سہیل رعنا کو دیکھا ہے۔ کتنا اچھّا لباس پہنتا ہے

ناشاد صاحب بولے ''ارے بھئی' سہیل رعنا کا اور ہمارا کیا مقابلہ۔ وہ ٹھہرا بیچلر آدمی۔ بس ایک بیوی اور دو بچّے۔ ہمیں تو اللہ نے بہت سے بچّے دے رکھے ہیں۔ ''

یہ بیچلر والا لطیفہ اتنا مشہور ہوا کہ ناشاد صاحب اس کی تردید کرتے کرتے تھک گئے۔ ''ایمان سے بالکل جھوٹ ہے۔ بکواس ہے، ویسے ہی کسی نے گھڑی ہے یہ بات۔ ''

ایک بار ہم ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وطن واپس آئے تو ناشاد صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔ بے حد قلق ہوا۔ اللہ مغفرت کرے۔ بہت اچھے اور معصوم آدمی تھے۔ ایسے لوگ اب کہاں؟

موسیقار ناشاد نے پاکستان آکر جن فلموں کی موسیقی مرتّب کر کے بہت نام پیدا کیا ان میں ایک ''سالگرہ'' بھی تھی۔ قمر زیدی اس کے ہدایت کار تھے۔ یہ وہی قمر زیدی تھے جو ہماری صحافتی زندگی کے بالکل آغاز میں ہمیں ملے تھے۔ میکلوڈ روڈ پر ایک مکان کی دوسری منزل پر خلیل احمد (جو اس وقت میوزک ڈائریکٹر نہیں تھے) مسعود اشعر جواب معروف ادیب اور صحافی ہیں) اور قمر زیدی رہا کرتے تھے۔ خلیل ایک انگریزی کمپنی میں ملازم تھے۔ مگر موسیقی کے شیدائی تھے اور راگ راگنیوں کی پوری تعلیم و تربیت حاصل کر چکے تھے۔ اس وقت وہ گلوکار بننے کے شوقین تھے اور اتفاق دیکھئے کہ انہوں نے فلم ''گلنار'' میں ملکہ ترنم نور جہاں کے ساتھ ایک دوگانا بھی گایا تھا جو بڑے

اعزاز کی بات تھی اور اب بھی ہے۔ یونس راہی جو بعد میں مشہور فلمی مصنّف اور ہدایت کار بن گئے تھے' وہ بھی اس گھر میں آتے جاتے رہتے تھے۔ قمر زیدی واحد آدمی تھے جن کا فلموں سے براہ راستہ واسطہ تھا۔ وہ ''گلنار'' میں سیّد امتیاز علی تاج کے اسسٹنٹ تھے۔ وہ چھوٹے قد کے گول مٹول سے آدمی تھے۔ بے حد مسخرے اور لطیفے ان کی زبان سے برستے رہتے تھے۔ نقلیں کرنے میں بھی ماہر تھے۔ ہدایت کار کی معاونت تو وہ کم کرتے تھے سب کو نقلیں دکھا کر اور لطیفے سنا کر خوش رکھتے تھے۔ ہم سب ان سے کہا کرتے تھے کہ بھائی کیوں بلاوجہ اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کر رہے ہو۔ کامیڈین بن جاؤ تو مزے میں رہو گے مگر انہیں ہدایت کار بننے کا خبط تھا جس کا ہم سب مذاق اڑایا کرتے تھے۔ دراصل ان جیسا غیر سنجیدہ آدمی جو کسی معاملے میں بھی کبھی سنجیدہ نہ ہوتا تھا اور بقول مسعود اشعر کے موٹی عقل کا مالک تھا وہ بھلا ہدایت کار کیسے بن سکتا تھا؟۔ یہ بات اور ہے کہ کچھ عرصے بعد ہم نے ان سے بھی زیادہ موٹی عقل والوں کو کامیاب ہدایت کار بنتے ہوئے دیکھا اور سوچا کہ یہ دن بھی دیکھنا تھا۔

قمر زیدی ''گلنار'' کی ریلیز کے بعد کراچی چلے گئے تھے جہاں ان کے اہل خاندان آباد تھے۔ ان کا تعلق یوپی سے تھا یعنی اہل زبان تھے۔ خلیل احمد کہا کرتے تھے کہ اس شخص کو دنیا میں کچھ بھی سیکھنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ اردو ہوش سنبھالتے ہی کانوں میں پڑی اسلئے اہل زبان ٹھہرے۔ دوسرا کوئی ہنر نہ انہوں نے سیکھا اور نہ ہی انہیں آیا۔ قمر زیدی یہ سن کر بھی ہنستے رہتے اور خلیل کی نقلیں کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ کراچی جا کر ہم لوگوں سے ان کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ ہم نے فلمی صحافت کا آغاز کر دیا اور فلمی دنیا سے تعلق پیدا ہو گیا۔ سنا کہ وہ کراچی میں کسی ڈائریکٹر کے اسسٹنٹ ہیں۔ ہم سب سوچتے کہ یہ شخص بلاوجہ وقت ضائع کر رہا ہے۔

جب فلمی دنیا میں ہماری مصروفیات بڑھ گئیں تو ان دنوں خبر ملی کہ قمر زیدی کراچی میں ایک فلم کے ہدایت کاری کر رہے ہیں۔ انہوں نے یورپ اور مڈل ایسٹ جا کر ایک فلم کی شوٹنگ کر ڈالی جو اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ وہ بیرون ملک کسی پاکستانی فلم کی شوٹنگ کرنے والے پہلے ہدایت کار تھے۔ فلم کا نام تھا ''یہ رشتہ ہے پیار کا'' اور اس میں وحید مراد اور زیبا نے مرکزی کردار ادا کئے تھے۔ یہ فلم تو کامیاب نہ ہوئی مگر قمر زیدی کا نام ہو گیا۔ ''سالگرہ'' بھی ایک بہت بڑی پارٹی کی فلم تھی۔ ہم لوگ حیران تھے کہ قمر زیدی جیسا سادہ لوح' موٹی عقل کا شخص اتنے بڑے بڑے

سرمایہ داروں کو کس طرح شیشے میں اتار لیتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں چند ہی فلمیں ڈائریکٹ کی ہیں اور سب کے فلم ساز کروڑپتی لوگ تھے۔ جو شخص ہر طرح کی چالاکی اور لفاظی کی صلاحیت سے محروم تھا وہ اتنی موٹی آسامی کیسے پھنسالیتا تھا؟ یہ راز کبھی ہم دوستوں پر نہ کھلا۔

قمر زیدی نے ''سالگرہ'' جیسی فلم شروع کردی جس میں اس وقت کے سُپر سٹار کام کر رہے تھے۔ وحید مراد' شمیم آرا مرکزی کرداروں میں تھے۔ طارق عزیز بھی ایک اہم کردار میں کاسٹ کئے گئے تھے۔ سب لوگ مذاق اڑاتے تھے کہ خدا جانے قمر زیدی کیا بنا رہے ہیں جس کا نہ سر ہے نہ پیر۔ شمیم آرا اور وحید مراد ایک دوسرے سے مذاق میں کہا کرتے تھے کہ بھئی سالگرہ ریلیز ہونے والی ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ ہم اس موقع پر پاکستان سے باہر چلے جائیں ورنہ بہت بُرا بھلا سننا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے گندے انڈے اور ٹماٹر بھی پڑ جائیں۔ گویا اس فلم کے بارے میں سبھی لوگ مایوس تھے۔ مگر جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو اپنے دور کی کامیاب ترین فلم کہلائی اور اس نے مقبولیت کے بہت سے پہلے ریکارڈ توڑ دیئے۔

اس فلم کے موسیقار ناشاد اور نغمہ نگار شیون رضوی تھے۔ سچ پوچھئے تو پاکستان کے عام لوگوں نے اس سے پہلے شیون رضوی کا نام ہی نہیں سنا تھا۔ سب ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ یہ شیون رضوی کون صاحب ہیں؟ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ ان کا حدود اربعہ کیا ہے؟ مگر یہ سب تسلیم کرتے تھے کہ شیون رضوی نے فلم ''سالگرہ'' کے گانے بہت اچھے اور بر محل لکھے ہیں۔ ہر نغمہ سچویشن کے مطابق بلکہ سچویشن کی صحیح ترجمانی اور وضاحت کرتا ہے۔ یہ پاکستان میں شیون رضوی کی پہلی فلم تھی جس میں انہوں نے سب کو جھنجوڑ کر اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ ہر طرف اسی فلم کے گانوں کا چرچا تھا۔

ناشاد صاحب لاہور آئے تو ہم نے ان سے پوچھا کہ حضرت یہ شیون رضوی کون صاحب ہیں؟

وہ حیران ہو کر بولے ''ارے میاں کیا بات کر رہے ہو۔ تم کیسے صحافی ہو کہ شیون رضوی کو نہیں جانتے''!

ہم نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیا تو انہوں نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا وہ واقعی ہماری لاعلمی کا ثبوت تھا۔ یہ 1968ء کا ذکر ہے کہ شیون رضوی صاحب پاکستان آئے تھے۔ مگر اس سے پہلے وہ بمبئی کی فلمی دنیا میں بہت غلغلہ برپا کر چکے تھے۔ بمبئی میں سیّد شوکت حسین رضوی کی فلم ''زینت'' جس نے سارے ہندوستان کو دیوانہ کر دیا تھا اس کے کچھ گیت بھی شیون رضوی نے لکھے تھے۔

آندھیاں غم کی یوں چلیں

باغ اُجڑ کے رہ گیا

اور بلبلو مت رو یہاں آنسو بہانا ہے منع

شیون صاحب ہی کے لکھے ہوئے تھے اور ہر ایک زبان پر تھے۔

فلم ''سالگرہ'' میں شیون صاحب کے یہ نغمے تو جیسے امر ہو کر رہ گئے ہیں۔

1۔زلف کو تیری بہاروں کا سلام آیا ہے۔

یہ نغمہ مہدی حسن کی آواز میں ناشاد صاحب نے اپنی موسیقی میں بے حد خوبصورتی سے موزوں کیا تھا۔

2۔میری زندگی ہے نغمہ' میری زندگی ترانہ

3۔لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے

یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے

ان کے آخر الذکر دونوں نغموں کو ملکہ ترنم نے اپنی آواز کا سحر پھونک کر لازوال بنا دیا تھا۔

شیون رضوی صاحب کے بارے میں مزید کھوج لگائی اور جب وہ لاہور آئے تو ان سے بھی معلومات حاصل کیں تو اپنی کم علمی پر ماتم کرنے کو جی چاہا۔

شیون رضوی فلمی نغمہ نگاری میں ایک بہت اہم اور ممتاز نام ہے۔ وہ ابتدائی بولنے والی فلموں کے زمانے سے ہی فلمی گانے لکھ رہے تھے۔ اس حساب سے تو بہت بڑی عمر کے تھے لیکن دیکھنے میں ادھیڑ عمر ہی لگتے تھے۔ درمیانہ قد' دبلا پتلا ڈیل ڈول' سانولا رنگ' گھنے بال جن میں کہیں کہیں سفیدی چمک رہی تھی۔ ناک نقشہ موزوں' گفتگو نہایت

شائستہ اور ادبی رنگ لئے ہوئے۔ بات کرتے یا ہنستے تھے تو اپنا ہاتھ مٹھّی بنا کر اپنے منہ کے آگے رکھ لیتے تھے۔ایک دوست کہتے تھے۔ شیون صاحب ہر وقت مائیکروفون ہاتھ میں تھامے رہتے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے صحیح تھا کہ ان کا منہ پر ہاتھ رکھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی مائیکروفون تھامے خطاب کر رہا ہے۔ یہ شیون صاحب کی دیرینہ عادت تھی۔ پان کھانے کے شوقین تھے اور غالباً یہی ان کا واحد شوق تھا۔ شاعری تو خیر ان کا اوڑھنا بچھونا ہی تھی۔ شعر و شاعری اور ادبی گفتگو ان کے مشاغل تھے فلموں سے پرانا رشتہ تھا اور وہ فلمی دنیا کے ماحول سے بہت پرانے زمانے سے واقف اور مانوس تھے۔

بولتی فلموں کا دور شروع ہوتے ہی انہوں نے فلمی نغمے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔اس لحاظ سے وہ فلمی دنیا میں آنے والے سب سے پہلے نغمہ نگار تھے۔ زخمی کانپوری صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ باقی تمام چھوٹے بڑے نغمہ نگار فلمی دنیا میں شیون رضوی کے بعد وارد ہوئے تھے۔

جب فلموں میں بولنے کا رواج نہ تھا اس وقت گراموفون کمپنیوں کا دور تھا۔ غزلیں اور قوّالیاں اس زمانے میں بہت مقبول ہوا کرتی تھیں۔ فیاض ہاشمی صاحب بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اُس زمانے میں گراموفون کمپنیوں کے لئے بہت سی قوّالیاں لکھی تھیں جو بے حد پسند کی گئیں۔

بولتی فلموں کا دور آیا تو مکالموں کے ساتھ گانوں کی بھی ضرورت پیش آئی۔ شیون صاحب نے بھی فلمی گیت لکھنے شروع کر دیئے۔ شاعر تھے۔ ان کیلئے فلمی گیت لکھنا کون سا مشکل کام تھا۔ وہ بہت ذہین و زود نویس تھے۔ ان کی سب سے پہلی فلم کا نام ''زندہ لاش'' تھا۔ اس دور میں لکھنے والوں میں بیشتر تک بند شاعر اور بے تکے منشی نما رائٹر ہوتے تھے۔ شیون صاحب اپنے ساتھ شاعری کا تحفہ لے کر آئے تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ شعرا گیتوں میں ہندی الفاظ بہت فراوانی سے استعمال کیا کرتے تھے۔ مگر شیون صاحب نے ایک نئے انداز کو رواج دیا۔ انہوں نے غزل نما قوّالیاں لکھیں جن میں عربی فارسی کے خوبصورت اور مترنّم الفاظ استعمال کئے۔ اس طرح انہوں نے اپنے لئے ایک نیا اسلوب اور انداز وضع کر لیا جسے بہت پسند کیا گیا۔

ماسٹر غلام حیدر نے بمبئی میں فضلی برادران کی فلم ''شمع'' میں موسیقی بنائی تھی تو شیون صاحب کا لکھا ہوا یہ گیت

سپر ہٹ ہو گیا تھا۔

گوری چلی پیا کے دیس

شوکت حسین رضوی کی یادگار فلم ''زینت'' میں ان کے دو نغمات کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ان نغموں نے سارے ملک کو پاگل کر دیا تھا۔''زینت'' اس زمانے کی انتہائی سپر ہٹ فلم تھی۔انہوں نے بمبئی کی اور بھی کئی فلموں میں نغمات تحریر کئے جو مقبول بھی ہوئے۔وہ دراصل درویش صفت آدمی تھے۔شراب و کباب کی محفلوں کے عادی نہ تھے۔نہ خوشامد کر سکتے تھے اور نہ ہی فلمی رواج کے مطابق میل جول بڑھانے کے انداز جانتے تھے۔ان کی واحد خصوصیت ان کی شاعری تھی۔اس لئے سب سے الگ تھلگ رہنے کے باوجود انہیں اچھے فلم سازوں کی فلموں میں گانے لکھنے کا موقع ملتا رہتا تھا اور وہ گیت دُھن اور آواز کی آمیزش سے خوبصورت نغمے تخلیق کرتے رہتے تھے۔

ایس مکرجی کی فلم ''ایک مسافر ایک حسینہ'' میں مجروح سلطان پوری کے نغمات بھی تھے مگر شیون رضوی کا لکھا ہوا یہ گیت بھی سُپر ہٹ ہوا تھا۔

ہم کو تمہارے عشق نے کیا کیا بنا دیا

یہ گیت محمد رفیع نے اپنی میٹھی اور سُریلی آواز کی بدولت حسین تر بنا دیا تھا۔محبوب صاحب کی پرانی کلاسیکی فلم ''الہلال'' میں بھی انہوں نے ایک قوّالی لکھی تھی جو اسماعیل آزاد قوّال نے گائی تھی اور بہت داد سمیٹی تھی۔

ہمیں تو لوٹ لیا مل کے حُسن والوں نے

گورے گورے گالوں نے' کالے کالے بالوں نے

مختصر یہ کہ وہ کبھی کسی ایک موسیقار سے وابستہ نہیں ہوئے۔سبھی کے ساتھ کام کیا اور شاعری کا لوہا منوایا۔بھارت میں ان کی اور بھی کئی سُپر ہٹ فلمیں اور مقبول گانے ہیں جن کی فہرست طویل ہے۔

شیون صاحب 1968ء میں پاکستان آئے تھے۔یہاں انہوں نے جس پہلی فلم کے لئے گانا لکھا وہ ''سالگرہ'' تھی۔ دوسری فلم ایم صادق کی لاہور میں بننے والی ''بہارو پھول برساؤ'' تھی۔اس کے موسیقار بھی ناشاد تھے۔یہ فلم صادق بابو خود مکمل نہ کرا سکے تھے اور ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے تھے۔بعد میں حسن طارق نے اس کو

مکمل کیا تھا۔اس فلم میں شیون رضوی کے لکھے ہوئے یہ نغمات کون بھول سکتا ہے۔

1۔میرے دل کی ہے آواز کہ بچھڑا یار ملے گا(مسعود رانا)

2۔او چندا رے چندا' میں کیسے کہوں (ملکہ ترنم نور جہاں)

3۔یہ گھر میرا گلشن ہے' گلشن کا خدا حافظ (ملکہ ترنم نور جہاں)

پاکستان میں انہوں نے پالکی' رم جھم اور '' سہرے کے پھول'' کے گیت بھی لکھے۔

کراچی سے وہ لاہور آئے تو پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔بہت وضع دار اور نستعلیق قسم کے آدمی تھے۔سر کے بالوں میں مہندی لگاتے تھے۔آنکھوں میں سُرمہ 'ڈاڑھی مونچھ صفاچٹ تھی۔سمارٹ اور کم عمر نظر آتے تھے۔ہمارے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی تو خاصی بے تکلّفی ہو گئی حالانکہ عمر میں فرق تھا لیکن نہ تو ان کی شخصیت سے ظاہر ہوتا تھا اور نہ ان کی باتوں سے اس کا اظہار ہوتا تھا۔گپ شپ شروع ہوتی تو دیر تک شعر و شاعری' فلم' موسیقی' ادب اور سیاست کا سلسلہ چلتا رہتا۔وہ بہت سوچ سمجھ کر کسی کے بارے میں رائے ظاہر کرتے تھے۔ دوسرے نغمہ نگاروں اور ہم عصروں کا نام ادب اور احترام سے لیا کرتے تھے۔ان کی عادت تھی کہ اپنی بات۔۔۔''حضور'' سے شروع کرتے تھے۔یہ عادت مصنّف و ہدایت کار عرش لکھنوی کی بھی تھی۔ان کا فقرہ بھی ''حضور'' کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے، شیون رضوی شہرت کی چکا چوند سے گریز کرتے جس سے وہ بھرے میلے میں تنہا ہو گئے تھے۔

شیون صاحب سے بے تکلفی ہوئی تو انہوں نے پرانے زمانے کی کہانیاں بھی سنائیں۔انہوں نے اپنی زندگی کا ایک عجیب واقعہ بھی سنایا تھا۔وہ ہمیں پوری طرح تو یاد نہیں ہے مگر جتنا یاد ہے وہ یہ تھا کہ ایک بار ریلوے سٹیشن پر وہ اپنے بیوی بچّوں سے بچھڑ گئے اور کافی عرصے تک کوئی خبر نہ ملی۔پھر انہوں نے ایک اور شادی کر لی۔دوسری شادی کے کچھ عرصے بعد انہیں پہلی بیوی کا پتہ نشان بھی مل گیا اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ہم نے اس کہانی کی تصحیح اور تصدیق کرنے کیلئے کچھ اور لوگوں سے بھی استفسار کیا مگر کوئی نہ بتا سکا۔یہ کہانی انہوں نے ہمارے دوست اور پارٹنر رشید جاوید صاحب کے دفتر میں ان کی موجودگی میں سنائی تھی۔اب جاوید صاحب بھی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ان کے پرانے

دوست ناشاد صاحب بھی رخصت ہو چکے ہیں۔ غرضیکہ ان کے ساتھ کا کوئی رفیق و ہم راز باقی نہیں رہا۔ تصدیق کریں تو کس سے؟

شیون صاحب بذات خود بہت چھوٹی موئی سے آدمی تھے۔ انکسار طبعیت میں اتنا تھا کہ خود اپنے بارے میں بات کرنے سے گریز کرتے تھے۔
ایک دن شیون صاحب ایورنیو سٹوڈیو میں ملے تو فوراً ہاتھ پکڑ کر ہمارے دفتر میں لے گئے۔ انہوں نے یہ خوشخبری سنائی کہ وہ فلم ساز بن گئے ہیں۔ اپنی فلم کی ہدایت کاری بھی خود ہی کریں گے مصنّف اور نغمہ نگار بھی خود ہی ہوں گے۔

"کیوں حضور۔ کیا خیال ہے آپ کا؟" انہوں نے ہم سے پوچھا۔
ہم نے عرض کیا "حضور جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟"
"فرمائیے فرمائیے "
"حضور یہ کام آپ کے بس کا نہیں ہے۔ کہانی تو آپ لکھ لیں گے، گانے لکھنا آپ کیلئے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ مگر فلم سازی اور ہدایت کاری بے حد مشکل اور جھگڑے والا کام ہے اور آپ بہت شریف آدمی ہیں۔ "
"بولے "کیا آپ شریف نہیں ہیں؟ "
ہمارے منہ سے بے ساختہ نکلا "ہیں تو "
بولے "آپ بھی تو فلم ساز اور ہدایت کار ہیں "
ہم نے کہا "شیون صاحب' اب ہم اتنے شریف بھی نہیں ہیں۔ وقت پڑنے پر غصّہ بھی کر لیتے ہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے کیلئے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ آپ یہ سب کام نہیں کرتے۔ آپ کو تو ہم نے کبھی غصّے میں دیکھا ہی نہیں۔ پھر کیسے کام چلے گا؟ "
بولے "اللہ مالک ہے "
"مگر پیسے کہاں سے لائیں گے اور فلم کی ڈسٹری بیوشن کا مسئلہ کیسے حل کریں گے۔ "

وہ اپنے منہ کے سامنے مٹھی رکھ کر بولے ''جگدیش صاحب نے فلم خرید لی ہے۔ وہی قسطوں میں پیسے دیں گے اور وہی تقسیم کار ہوں گے۔ ''

اب ہم کیا بولتے۔ چُپ ہو رہے مگر دل ہی دل میں دعا کرتے رہے کہ اللہ اس شریف آدمی کی عزّت رکھ لے۔

کسی نے بھی شیون صاحب کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ وہ ایورنیو سٹوڈیو میں اپنی فلم کے سلسلے میں چپ چاپ مصروف رہتے تھے۔ شوٹنگ بھی ہو رہی تھی۔ فلم کا نام انہوں نے اپنے ایک مقبول گانے سے لیا تھا۔ ''میری زندگی ہے نغمہ'' اس فلم کی موسیقی بنانے کے لئے انہوں نے نثار بزمی صاحب کی خدمات حاصل کی تھیں۔ سنگیتا' صاعقہ' رنگیلا اور اسلم پرویز اس میں اہم اداکار تھے۔ فلم کی کہانی بھی ہلکی پھلکی سی تھی۔ کامیڈی فلموں کا زمانہ تھا۔ موسیقی بہت اچھی تھی پھر بھی کسی کو شیون رضوی صاحب سے بحیثیت ہدایت کار و مصنّف زیادہ توقعات نہ تھیں۔

فلم ریلیز ہوئی اور ہٹ ہو گئی۔ سب حیران رہ گئے۔ سوائے شیون رضوی صاحب کے۔ انہیں خود پر بلا کا اعتماد تھا۔ اس فلم نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ اس کے نغمات اور موسیقی بہت عمدہ تھی۔ مہدی حسن کا گایا ہوا ایک گانا تو زبان زد خاص و عام ہو گیا تھا۔

اک حُسن کی دیوی سے مجھے پیار ہوا تھا

دل اُس کی محبت میں گرفتار ہوا تھا

خدا جانے اس فلم کی کامیابی سے شیون رضوی صاحب کو کچھ مالی فائدہ بھی حاصل ہوا یا نہیں اس لئے کہ بظاہر ان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ ویسا ہی سادہ لباس' یعنی کوٹ پتلون' پتلون قمیض یا سفید کُرتہ اور چوڑی موری کا پاجامہ' ذاتی کار تک نظر نہ آئی۔ مگر اس کامیابی کے بعد شیون صاحب کے بارے میں لوگ سنجیدہ ہو گئے تھے۔ خود شیون صاحب بھی اپنے بارے میں کچھ اور سنجیدہ ہو گئے اور ایک نئی فلم بنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

دوسری فلم کا نام بھی انہوں نے شاعرانہ رکھا۔ ''بات پہنچی تیری جوانی تک ''

مگر یہ جوانی شیون صاحب کو راس نہ آئی۔ فلم بنانے کی ترکیب آئی تو فلم فلاپ ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود ایک چکّر میں پڑ گئے۔ تیسری فلم بنانے کیلئے انہوں نے بہت کوشش کی۔ بھاگ دوڑ کی' سکیمیں بنائیں۔ اس کا نام تھا'' نغمات

کی رات“ مگر کوئی اس کے بارے میں سنجیدہ نہ تھا۔ یہ فلم ادھوری ہی رہی مکمل نہ ہو سکی۔

شیون صاحب کچھ دن تو پریشان اور افسردہ نظر آئے مگر پھر نارمل ہو گئے اور وہی معمولات جاری ہو گئے۔ سٹوڈیو کی سیر‘ دوستوں کے گھروں میں جانے کا دستور‘ دوستوں سے مختلف موضوعات پر گپ شپ اور آئندہ فلم بنانے کے منصوبے‘ فلم سازی اور ہدایت کاری میں وہ اتنے الجھ گئے تھے کہ کئی فلموں کے گیت لکھنے سے معذرت کر لی۔ پھر جب فلمی دنیا پر بُرا وقت آیا تو بے کاری اور بے روزگاری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شیون صاحب بھی اس کی زد میں آ گئے مگر ان کے معمول اور رکھ رکھاؤ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ ان کے مالی حالات کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ کم از کم ہم تو نہیں جانتے تھے۔

وہ کہاں جاتے ہیں‘ کہاں رہتے ہیں‘ کیسے رہتے ہیں۔ نہ انہوں نے کبھی بتایا نہ ہم نے پوچھا۔ بس ان سے سٹوڈیو‘ دفتروں ریستورانوں اور سڑکوں پر ہی ملاقات ہوا کرتی تھی۔

کچھ عرصے تک شیون صاحب نظر نہیں آئے تو ہمیں کچھ کرید سی ہوئی۔ کچھ لوگوں سے پوچھا مگر کوئی جانتا تو بتاتا۔ وہ ایک پُراسرار قسم کی شخصیت تھے۔ ان کی ذات کے بارے میں حالات پر پردہ ہی پڑا ہوا تھا۔

ایک دن معلوم ہوا کہ شیون صاحب اپنے بیٹے کے پاس اسلام آباد چلے گئے ہیں۔ یہ بیٹا ایک معزز سرکاری افسر تھا۔ اس کے بعد اخبار میں خبر شائع ہوئی کہ شیون رضوی پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ انتقال کر گئے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

وہ جس طرح لاہور میں اچانک‘ چپکے سے نمودار ہوئے تھے‘ اسی طرح ایک دن اچانک‘ چپکے سے غائب ہو گئے۔ ان سے ملاقات بہت زیادہ نہیں رہی مگر پھر بھی اکثر یاد آتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کے اہل خاندان اور اولاد سے کسی کا رابطہ نہ تھا۔ انہوں نے اپنا کلام کس حال میں اور کس کے پاس چھوڑا۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ ایک صاحب طرز‘ غزل گو شاعر تھے۔ کم از کم ایک مجموعہ کلام تو ہوتا۔ وہ تو اتنی تیزی سے لکھتے تھے کہ ان کے پاس کلام کی کوئی کمی نہ تھی۔ پھر بھی نہ کوئی مجموعہ‘ نہ کوئی دیوان‘ انہوں نے فلمی نغموں کے سوا کچھ بھی نہیں چھوڑا۔

''کنیز'' کی نمائش کے بعد ہم نے کچھ دن آرام کیا۔ یعنی مری' اسلام آباد' کراچی کی سیر و سیاحت کرتے رہے۔ فلم نے ہمیں ذہنی اور جسمانی طور پر کافی تھکا دیا تھا۔ یوں بھی ہم اس قسم کے کاموں میں کاہل واقع ہوئے ہیں۔ ہر کوئی پوچھتا تھا کہ اگلی فلم کب شروع کریں گے تو ہم کوئی معقول جواب دے کر ٹال دیتے تھے۔ کئی مہینے گزر گئے تو ایک دن طارق صاحب نے بھی ہم سے کہا ''آفاقی صاحب' اگلی فلم کی کہانی تو سوچیں۔''

ہم نے کہا ''سوچ رہے ہیں''۔

اس سوچ بچار کے درمیان ہم دوسری دلچسپیوں میں بھی مصروف رہے۔ گورنمنٹ کالج میں کلاسیکی عالمی فلموں کا میلہ ہوا تو وہاں باقاعدگی سے جاتے رہے۔ امریکی محکمہ اطلاعات کی لائبریری میں جا کر یادگار پرانی فلموں کے سکرین پلے پڑھتے رہے۔ مال روڈ اور اس پر واقع روایتی ریستورانوں کی محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔ دوستوں کے گھروں اور دفتروں کے علاوہ نگار خانوں میں بھی باقاعدگی سے حاضری دیتے رہے۔

یہ 60 ء کی دہائی کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں دنیا بھر میں حقیقت پسند اور زندگی سے قریب فلموں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اٹلی میں ''بائیسکل تھیف'' اور ''بٹر رائس'' جیسی فلمیں بنائی گئی تھیں جنہوں نے دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کی تھی اور ان کی دیکھا دیکھی نیو ریئل ازم (NEO REALISM) کی لہر نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بھارت میں ستیہ جیت رئے نے ''پاتھر پنچلی'' جیسی فلم بنا کر دنیا کو خراج تحسین حاصل کیا تھا اور ان کی پیروی میں مغربی بنگال میں نوجوان اور حقیقت پسند فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی ایک نئی کھیپ پیدا ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ بمبئی کی کمرشل دنیا میں بھی ہلچل پیدا ہو گئی اور وہاں بمل رائے نے ''دو بیگہ زمین'' اور راج کپور نے '' بوٹ پالش'' جیسی فلمیں بنا ڈالیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہم پاکستانی اس وقت تک جوش میں نہیں آتے جب تک کہ بھارت کی طرف سے کوئی للکار یا چیلنج وصول نہ ہو۔ یہ انڈین اور پاکستانی قوموں کی نفسیات ہے۔ دنیا کی کسی بھی کرکٹ ٹیم یا ہاکی ٹیم سے اگر ہار جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں رو دھو کر چپ ہو جاتے ہیں۔ لیکن بھارت کا پاکستان سے یا پاکستانی ٹیم کا بھارت سے ہار جانا ایک قومی المیّہ بن جاتا ہے جس کا ہارنے والے ملک میں باقاعدہ سوگ منایا جاتا ہے۔

جب نیو ریئل ازم کی لہر بھارت تک پہنچ گئی تو پاکستان کے نوجوان اور تعلیم یافتہ لوگوں نے بھی سوچنا شروع کر دیا کہ

ہمارے ملک میں بھی حقیقت پسندانہ اور زندگی کی عکاسی کرنے والی فلمیں بنانی چاہئیں۔ڈاکٹر اعجاز میر' احمد بشیر' حمید اختر' ریاض شاہد اور شمیم اشرف ملک وغیرہ نے اس انداز سے سوچنا شروع کیا تو باقاعدہ مباحثوں اور مذاکروں کا دور شروع ہو گیا۔اسی تحریک سے متاثر ہو کر احمد بشیر نے ''نیلا پربت'' جیسی فلم بنائی تھی جس کی کہانی نفسیات داں ادیب ممتاز مفتی کے فلسفے سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ان ہی دنوں مظفر طاہر نے ''کالے لوگ'' بنائی۔حمید اختر کی فلم '' دور ہے سُکھ کا گاؤں'' بھی اس سلسلے کی ایک کڑی سمجھ لیجئے۔لیکن یہ سب فلمیں نیم پختہ تجربات سمجھ لیجئے۔ بات یہ تھی کہ اس قسم کی فلمیں بنانے کیلئے جس ذہنی اور تکنیکی پختگی' شعور اور کمٹمنٹ کی ضرورت تھی وہ مفقود تھا۔ دراصل یہ ایک جذباتی سی مہم تھی جسے یار لوگوں نے نام پیدا کرنے' کچھ مختلف نظر آنے اور بین الاقوامی پیمانے پر شہرت حاصل کرنے کے شوق میں اپنا لیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اس انداز میں بنائی جانے والی کوئی ایک فلم بھی نہ تو عوام کو پسند آئی اور نہ ہی نقّادوں کے معیار پر پوری اتری۔ حد تو یہ ہے کہ بمبئی میں ''ہم لوگ'' جیسی انقلاب آفریں فلم بنانے کے بعد جب مصنف وہدایت کار ضیاء سرحدی پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے اسی انداز میں فلم بنانے کا آغاز کیا۔ان کی پہلی فلم ''راہ گزر'' کے ساتھ وہی معاملہ پیش آیا جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔یعنی نہ تو یہ فلم کمرشل تھی اور نہ ہی حقیقت آمیز آرٹ فلم تھی۔صبیحہ اور اسلم پرویز اس میں مرکزی کردار تھے لیکن بہت سی خوبیوں کے باوجود یہ ایک بے ربط اور بے مقصد فلم بن کر رہ گئی تھی۔ضیاء صاحب نے دوسری فلم ''آخر شب'' کے نام سے شروع کی لیکن بدقسمتی سے یہ پایہ تکمیل تک ہی نہ پہنچ سکی اور ادھوری رہ گئی۔اس فلم میں طالش اور اسد جعفری بھی نمایاں کرداروں میں تھے۔اگر مکمل ہو جاتی تو یہ فلم ''راہ گزر'' کے مقابلے میں کہیں بہتر ہوتی۔حسن طارق اور شمیم اشرف ملک کی فلم '' نیند'' اور ریاض شاہد کی ''سسرال'' بھی فلموں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی ہی کوششیں کی جاسکتی ہیں۔

جس شخص نے اس شعبے میں بہت سنجیدگی اور لگن سے کام کیا اور اس کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت اپنایا اس کا نام اے جے کاردار تھا۔اے جے کاردار (اختر کاردار) پاکستان کے اداکار نصرت کاردار کے چھوٹے بھائی تھے۔بمبئی کے اے آر کاردار کے بھانجے تھے اور بمبئی میں کافی وقت وہ اے آر کاردار کے ساتھ رہ چکے تھے۔ان کا رجحان ہدایت

کاری کی طرف تھا۔اداکاری سے انہیں ذرا بھی رُغبت نہیں تھی۔ وہ ہدایت کاری اور فلم سازی کی تربیت حاصل کرنے کی غرض سے انگلینڈ بھی گئے تھے۔ مختصر یہ کہ انہوں نے ایک رئیلسٹک (REALISTIC) فلم بنانے کیلئے پوری طرح تیاری کی تھی۔ وہ لندن میں بھی فلمی صنعت سے وابستہ رہے اور بہت کچھ سیکھا۔انہوں نے اسی دوران میں ایک بہت معقول سرمایہ کار بھی تلاش کر لیا جس کا نام نعمان تاثیر تھا۔ اختر کاردار اے جے کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ہم نے ان کے بڑے بھائی نصرت کاردار کے سوا کسی اور کو انہیں اختر کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے نہیں دیکھا یا سنا۔

اے جے نے نعمان تاثیر کو یہ سمجھا دیا تھا کہ اگر بین الاقوامی پیمانے پر اس قسم کی فلم بنائی جائے تو خواہ ملک کے اندر تجارتی انداز میں کاروبار نہ ہو' عالمی سطح پر بہت شہرت اور مقبولیت حاصل کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے ستیہ جیت رے کا حوالہ دیا تو نعمان تاثیر کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور وہ پیسہ لگانے کیلئے تیار ہو گئے۔

تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر اے جے کاردار پاکستان آئے اور عملی تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنر مند تھے اسلئے انہیں بہت اچھے لوگوں کا تعاون حاصل ہو گیا۔ یہاں تک کہ فیض احمد فیض اس فلم کیلئے سکرین پلے' مکالمے اور گانے لکھنے پر آمادہ ہو گئے جو کہ ایک اہم نکتہ اور نمایاں امتیاز تھا۔ پاکستان کی فلم دنیا کے دوسرے تعلیم یافتہ اور ترقی پسند لوگوں کی تائید اور حمایت بھی اے جے کو حاصل ہو گئی۔

اس فلم کا نام ''جاگو ہوا سویرا'' تھا اور اس کی شوٹنگ کے لئے مشرقی پاکستان کی سرسبز اور حسین سرزمین کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اے جے کاردار اس فلم کیلئے کیمرا مین لندن سے لے کر آئے تھے۔ ان کا نام مارشل تھا (پورا نام اس وقت یاد نہیں آرہا) مارشل بہت اچھے عکّاس اور بے تکلف قسم کے آدمی تھے۔ کم از کم ایک انگریز سے اس سادگی اور بے تکلفی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی جس کا مظاہرہ مارشل کرتے تھے۔ اے جے کاردار انگلستان سے فلم سازی کے لئے ضروری ساز و سامان بھی لے کر آئے تھے جو نہایت جدید اور اعلیٰ درجے کا تھا۔ انہوں نے مشرقی پاکستان میں فلم ''جاگو ہوا سویرا'' بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ بنائی تھی۔ فلم مکمل ہوئی۔ توقع کے عین مطابق عالمی پیمانے پر اسے بہت سراہا گیا۔ یہ پہلی پاکستانی فلم تھی جو بین الاقوامی فلمی میلوں میں پیش کی گئی تھی اور اسے اعزازات و انعامات

سے بھی نوازا گیا تھا۔ گویا ’’جاگو ہوا سویرا ‘‘ کو بین الاقوامی فلمی دنیا میں پاکستان کا پہلا تعارف سمجھ لیجئے۔ پاکستان میں بھی اس کی نمائش ہوئی تھی اور توقع کے مطابق یہ فلاپ ہوگئی تھی۔ مگر یہ کوئی خلاف معمول بات نہ تھی۔ دنیا بھر میں ایسی فلموں کے ساتھ تفریحی فلمیں دیکھنے والے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ سوئیڈن میں برگ مین کی فلموں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ بھارت میں ستیہ جیت رے کی کوئی فلم ایک ہفتہ بھی نہ چل سکی تھی حالانکہ ان دونوں کی فلمیں دنیا بھر میں انعامات بٹورتی رہی تھیں۔ چنانچہ اے جے کاردار کی ’’جاگو ہوا سویرا‘‘ کی مقامی سینماؤں پر ناکامی بھی کوئی خلاف توقع بات نہ تھی۔ اس فلم کے اداکاروں میں تمر برن‘ ترپتی مترا ‘زورین اور انیس شامل تھے۔ لاہور کی فلمی دنیا کی رقاصہ رخشی نے بھی اس میں کام کیا تھا۔ انیس وہی صاحب ہیں جو بعد میں عطاالرحمن خان کے نام سے بطور اداکار ہدایت کار مصنف موسیقار اور فلم ساز مشہور ہوئے۔ انہوں نے اردو میں فلم ’’سراج الدولہ‘‘ بنائی تھی۔ بنگالی فلموں میں ان کا بہت بڑا نام اور مقام ہے۔ خوش قسمتی سے وہ ہمارے بہت مخلص اور گہرے دوست رہے ہیں۔
رخشی فلموں کی معروف ڈانسر تھیں اور انہیں اس زمانے میں پاکستانی فلمی صنعت میں وہی حیثیت حاصل تھی جو ککو کو بھارتی فلموں میں حاصل تھی۔ یعنی ان کا رقص ہر فلم کی لازمی ضرورت سمجھا جاتا تھا۔ وہ کرسچن تھیں۔ خوبصورت اور تعلیم یافتہ تھیں۔ فلموں سے کنارہ کش ہونے کے بعد انہوں نے لاہور کا پہلا بوتیک ’’ فینٹاسیا‘‘ کے نام سے قائم کیا تھا جو فلم والوں میں بہت مقبول ہوگیا تھا۔ ہماری کئی فلموں کیلئے ہیروئنوں کے ملبوسات انہوں نے ہی ڈیزائن کئے تھے۔

’’جاگو ہوا سویرا‘‘ کے تجربے سے حوصلہ پاکر اے جے کاردار نے مزید بین الاقوامی شہرت اور اعزاز سمیٹنے کی فکر کی اور دوسری فلم شروع کردی مگر مختلف النوع وجوہات کی بنا پر یہ مکمل نہ ہوسکی۔

اے جے کاردار نے بعد میں ’’ قسم اس وقت کی‘‘ کے نام سے ہوا بازوں کی کہانی بھی بنائی تھی۔ اس فلم کی تیاری میں پاکستانی فضائیہ کا تعاون بھی شامل تھا۔ سہیل رعنا اس کے موسیقار تھے۔ شبنم اور طارق عزیز نے مرکزی کردار کئے تھے۔

مشرقی پاکستان کی ہیروئن روزی اور کراچی کی اداکارہ روزینہ نے اس فلم میں رومانی کردار ادا کئے تھے۔اس فلم کو اچھے وسائل کے ساتھ بنایا گیا تھا مگر اس کے ساتھ بھی وہی المیہ ہوا کہ نہ یہ عوام میں مقبول ہوئی اور نہ ہی نقادوں کی نگاہوں میں جچی۔ یہ صرف ریکارڈ کی چیز بن کر رہ گئی ہے۔

اے جے کاردار اس کے بعد پاکستان میں نظر نہیں آئے۔ ''قسم اس وقت کی'' اگر کامیاب ہو جاتی تو شاید اے جے کاردار دوبارہ فلمی دنیا میں ''ان'' ہو جاتے مگر ایسا نہ ہوا اور وہ فلمی افق سے غائب ہو گئے۔اس کے بعد نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئے' کیا کرتے ہیں اور کس حال میں ہیں۔ایک زمانہ تھا کہ ان کا نام اور تذکرہ پاکستان میں ہر ایک زبان پر تھا۔ اب یہ عالم ہے کہ ان کا نام سن کر لوگ پوچھتے ہیں۔

''کون کاردار؟''

یہ بھی زمانے کی ستم ظریفی ہے۔

اے جے کاردار جن دنوں لاہور میں مقیم تھے (ان کا ہیڈ کوارٹر یہی تھا) انہوں نے ترقی پسند تعلیم یافتہ حلقوں میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔

نئ نسل کے لوگ جوق در جوق ان سے ملتے۔ طلبہ اور طالبات ان سے تبادلہ خیالات کرتے اور نتائج اخذ کرتے۔ روایتی فلم والے تو اے جے کاردار کے نام ہی سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے مگر تعلیم یافتہ اور کچھ جاننے کے خواہش مند اس بہانے اکٹھے ہو کر فلموں کے حال اور مستقبل کے بارے میں بات چیت کر لیا کرتے تھے۔اے جے کاردار نے جب نئی پود میں یہ شوق دیکھا تو چند ہم خیال دوستوں کے ساتھ مل کر لاہور میں ''فلم انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان'' قائم کر لی۔ فلم انسٹی ٹیوٹ کا دفتر مال روڈ پر' فیروز سنز والی بلڈنگ میں' کوڈک فلمز کے اوپر والی منزل میں تھا۔دراصل یہ لاہور میں اے جے کاردار کا دفتر بھی تھا اور رہائش گاہ بھی تھی۔اس کا سامنے والا بڑا ہال انہوں نے ''فلم انسٹی ٹیوٹ'' کیلئے آراستہ کر دیا تھا۔اس ادارے کے زیر اہتمام کئی محفلیں سجیں اور لاہور کے صحافیوں' نقادوں اور فلم سے وابستہ نئے خیالات کے مالک لوگوں کو ایک ٹھکانا نصیب ہو گیا۔اگر فیض صاحب لاہور میں موجود ہوتے تو کبھی کبھار یہاں بھی آ جاتے تھے۔آئی اے رحمن' حمید اختر' احمد بشیر' شمیم اشرف ملک اور زورین جیسے لوگ بھی یہاں

آتے رہتے تھے۔ ہمارا تو جیسے روزانہ کا پھیرا تھا۔

ان دنوں ہم نے مال روڈ پر ایک دفتر میں ڈیرا جمار کھا تھا۔ ''کنیز'' کی کہانی ہم نے اسی دفتر میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ بعد میں اور بھی کئی کہانیاں اسی خفیہ پناہ گاہ میں بیٹھ کر لکھیں۔ چند قریبی دوستوں کے سوا کسی کو ہمارے اس دفتر کا علم نہ تھا۔ یہ دفتر ''فلم انسٹی ٹیوٹ'' سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ ہم اکثر وہاں چلے جاتے تھے۔ ویسے بھی وہاں آنے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ یاروں کے لئے صلائے عام تھی۔ بہت اچھی قسم کی چائے اور کافی مل جاتی تھی۔ کاردار صاحب لاہور میں موجود ہوں یا نہ ہوں چند لوگوں کا یہ مستقل ٹھکانا تھا۔

''فلم انسٹی ٹیوٹ'' نے ایک دو بار دنیا بھر کی کلاسیکی فلموں کا میلہ منعقد کیا۔ اس کے علاوہ یہاں مذاکرے اور مباحثے بھی ہوئے۔ مگر ہمیں یہ ایک ''فلمی بیٹھک'' یا ''چوپال'' کی حیثیت سے یاد ہے۔

دنیا میں سینما کے نئے رجحانات' فلم سازی کے بدلتے ہوئے انداز' دنیا بھر کی فلمیں۔ فلم ساز' ہدایت کار اور اداکار وہاں زیر بحث آتے تھے۔ اے جے کاردار نے وہاں ہالی ووڈ' لندن اور فرانس کے معروف فلمی جرائد کی فراہمی کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ ہم جیسوں کی تو موج تھی۔

کاردار ایک دراز قد' سمارٹ اور خوبرو آدمی تھے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ' مناسب ناک نقشہ' گھنے بال جن میں سفید تار جھلملانے لگے تھے۔ باتیں بہت اچھی کرتے تھے۔ فلم اور عالمی سینما کی تحریکوں کے بارے میں ان کی معلومات بہت زیادہ اور تازہ ترین تھیں۔ اس طرح یہ فلم انسٹی ٹیوٹ کاردار کی بدولت ایک نعمت سے کم نہ تھا۔ گرمیاں ہوں یا سردیاں' یہاں کافی کا دور چلتا رہتا تھا۔ صرف چپراسی کو آرڈر دینے کی دیر ہوتی تھی۔ وہ بھی سب کو پہچان گیا تھا۔ ''فلم انسٹی ٹیوٹ'' کی ایک انتظامیہ بھی تھی اور ایک بجٹ بھی ہوتا تھا۔ اس کے لئے باہمی طور پر چندہ اکٹھا کر لیا جاتا تھا ورنہ جس کی جیب میں پیسہ ہو وہ بلا تکلف نکال کر خرچے کیلئے دے دیا کرتا تھا۔

جن دنوں اے جے کاردار اور عکّاس مارشل لاہور میں ہوتے تھے' اس زمانے میں مباحثوں میں کچھ زیادہ گرمی پیدا ہو جاتی تھی۔ مارشل بہت عمدہ کیمرا مین تھا۔ ہم حیران تھے کہ سب کچھ چھوڑ کر وہ کاردار کے ساتھ کیوں لگ گیا ہے۔ مشکل حالات میں' نامانوس ماحول میں کام کرتا ہے۔ آخر سبب کیا ہے۔ اس کا سبب ہمیں آئی رحمن صاحب نے بتایا۔

انگلستان میں عکاسوں کی یونین کا رکن بننے کیلئے ضروری ہے کہ کسی ممتاز بین الاقوامی یا قومی فلم ساز کے ساتھ کچھ عرصہ کام کیا جائے۔ مارشل صاحب اس لئے اے جے کاردار کے ساتھ لگ گئے تھے کچھ عرصے بعد دونوں میں دوستی ہو گئی اور مارشل کو بھی پاکستان کے لوگ اور ماحول پسند آ گیا تھا۔

فلم انسٹی ٹیوٹ کا دفتر بالائی منزل پر تھا۔ اے سی وغیرہ کا نام ونشان تک نہ تھا اس لئے اچھی خاصی گرمی محسوس ہوتی تھی۔ گرمیوں کے موسم میں مارشل صاحب کپڑے اتار کر صرف جینز یا بنیان اور جانگیا زیب تن کر کے ننگے فرش پر' سر کے نیچے اخبارات کا بنڈل رکھ کر لیٹ جاتے تھے، وہیں لیٹے لیٹے گفتگو میں حصہ لیا کرتے' نیند آتی تو سو جاتے۔ آنکھ کھلتی تو پھر وہیں لیٹے لیٹے گفتگو اور بحث میں شامل ہو جاتے۔ دیسی وہسکی ان کی پسندیدہ شراب تھی۔ اسی طرح نان کباب ان کی کمزوری تھے۔ بیڈن روڈ سے نان کباب منگا کر کھاتے۔ سیاہ کافی کے دو مگ پیتے اور فرش پر دراز ہو کر سو جاتے۔ عجیب ملنگ قسم کے آدمی تھے۔ پاکستانی فلموں' موسیقی اور ادب سے اس کو بہت دلچسپی تھی۔ ایک دن ہم نے پوچھا کہ فرش پر چادر یا بستر کیوں نہیں بچھاتے ہو تو جواب دیا۔

''ننگا فرش ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اس پر سونے کا مزہ ہی الگ ہے۔''

فلم انسٹی ٹیوٹ بھی اے جے کاردار کے رخصت ہوتے ہی اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ اس طرح لاہور کے فلمی شیدائیوں کا ایک ٹھکانا ختم ہو گیا۔ اس جگہ بیٹھ کر باتیں کر کے اور دستیاب فلمی لٹریچر پڑھ کر بہت سے لوگوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اس کے بعد تو پھر کسی کو اس قسم کا مفید ادارہ قائم کرنے کا خیال ہی نہ آیا اور اب تو خیر نفسا نفسی کا عالم ہے۔ کہاں کا عالمی سینما اور کیسا فلم انسٹی ٹیوٹ۔

فلم انسٹی ٹیوٹ کے نیچے ''کوڈک'' کا دفتر تھا۔ اس زمانے میں ''کوڈک'' ہی وہ ادارہ تھا جو فلم سازوں کو خام فلم فراہم کرتا تھا۔ اکثر مختلف وجوہات کی بنا پر خام فلم کی قلت پیدا ہو جاتی تھی تو ''بلیک'' کرنے والوں کے پو بارہ ہو جاتے تھے۔ کئی فلم سٹوڈیوز کے مالک اور بڑے فلم ساز مختلف فلموں کے نام پر خام فلم کا کوٹہ حاصل کر لیتے تھے اور پھر بلیک مارکیٹ میں فروخت کرتے تھے۔ اس طرح لاکھوں کماتے تھے۔

''کوڈک'' ایک برٹش ادارہ ہے۔اس کے دفتر کا ٹھاٹ باٹ اور رکھ رکھا¶ بھی خالص انگریزی تھا۔ انگریز جنرل منیجر بھی انگلستان سے آتا تھا۔یہ دفتر قیام پاکستان سے پہلے کا تھا اور یہاں کا ماحول باوقار اور شاندار تھا۔

ان ہی دنوں ہم نے بھی ایک فلم کے لئے خام فلم کی درخواست دی تھی۔اس دفتر میں بیشتر عملہ پاکستانی تھا۔مسٹر علی بہت پرانے اہلکار تھے اور ہمارے بے تکلّف دوست بھی تھے۔ہم نے ان سے پوچھا کہ ہماری درخواست کا کیا ہوا تو انہوں نے فائل دیکھ کر بتایا کہ تمہاری درخواست گُم ہو گئی ہے۔اس کا مطلب یہ تھا کہ خام فلم حاصل کرنے میں ہمیں کچھ وقت لگے گا کیونکہ فلم ''پہلے آؤ۔پہلے پاؤ'' کی بنیاد پر دی جاتی تھی۔ہم علی صاحب سے بہت جھگڑے۔اوپر فلم انسٹیٹیوٹ کے دفتر میں جا کر ہم نے ایک اور درخواست ٹائپ کرائی اور رجسٹری کے ذریعے ''کوڈک'' کو ارسال کر دی۔اس میں ہم نے اپنی پہلی درخواست کا بھی حوالہ دیا تھا۔
کوڈک والوں نے اس کی رسید تک نہ دی تو ہم نے یکے بعد دیگرے دو اور درخواستیں رجسٹری کر کے ارسال کر دیں اور پھر ایک دن علی صاحب کے پاس پہنچ گئے کہ ہمیں خام فلم دی جائے۔ہم نے انہیں یہ بھی بتایا کہ ہمارے خطوط کے جواب میں آپ کے دفتر نے کوئی جواب نہ دیکر گویا تسلیم کر لیا کہ ہماری پہلی درخواست کافی عرصہ پہلے موصول ہوئی تھی۔اس لئے اب ہماری باری ہے۔فلم نہ ملی تو ہم بہت جھگڑا کریں گے۔

علی صاحب یہ سن کر گھبرا گئے کہ واقعی بُرے پھنسے۔انہوں نے ہمیں چائے پلائی۔ پھر کہا کہ ''دیکھو آفاقی۔یہ میری غلطی ہے۔تم بات کو نہ بڑھاؤ'' مگر ہم مصِر تھے کہ ہماری ملاقات اپنے جنرل منیجر سے کراؤ۔اس زمانے میں مسٹر ایف موس جنرل منیجر تھے۔وہ خالص انگریز تھے۔لکڑی کی کشادہ' خوبصورت سیڑھیاں دفتر کے بیچوں بیچ سے اوپر جاتی تھیں۔ان سیڑھیوں پر قالین بچھا ہوا تھا جس کی وجہ سے یہ دفتر کسی فلم کا سیٹ معلوم ہوتا تھا۔اوپر کی منزل پر مسٹر موس کا کمرا تھا۔
''کوڈک'' کے دفتر کے اندر جانا بھی اجازت کے بغیر ممکن نہ تھا اور مسٹر موس سے کسی فلم ساز کا ملنا تو جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔عموماً پاکستانی سٹاف ہی فلم سازوں سے نمٹ لیا کرتا تھا۔

اس روز ہمارا اصرار تھا کہ ہم مسٹر موس سے ضرور ملیں گے۔ان سے ہم ایک مرتبہ باری سٹوڈیو میں ملک باری صاحب کے دفتر میں مل چکے تھے۔ باری صاحب ہمیں یہ بھی بتا چکے تھے کہ وہ انہیں پاکستانی ماحول دکھانے کیلئے ہیرا منڈی لے گئے تھے جہاں کا ماحول اور ناچ گانا موس صاحب کو بہت پسند آیا تھا۔

ابھی ہم بحث کر ہی رہے تھے کہ ایک گرجدار آواز سنائی دی۔کوئی صاحب ٹھیٹ پنجابی میں ''کوڈک'' کو اور جنرل منیجر کو گالیاں دے رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ وہ اس ادارے اور موس صاحب کے ساتھ کیسا نازیبا سلوک کریں گے۔

دفتر کے خاموش ماحول میں ایک دم ہلچل پیدا ہو گئی۔سب گھبرا گئے کیونکہ وہاں تو سب سرگوشی میں ہی بات کرتے تھے۔

ہم نے دیکھا تو یہ لاہور بلکہ پنجاب کے نامور بدمعاش اچھّا پہلوان تھے۔وہ شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔اب وہ فلم ساز بھی بن چکے تھے اور خام فلم دستیاب نہ ہونے پر کوڈک اور اس کے جنرل منیجر سے بہت ناراض تھے۔ہماری بھی ان سے سلام دعا تھی۔کہنے کو وہ غُنڈے اور بہت سورما تھے مگر شریفوں کے ساتھ انتہائی شرافت اور انکسار کے ساتھ ملتے تھے۔

ہم ان کے پاس گئے اور پوچھا ''پہلوان صاحب کیا ہو گیا؟''

انہوں نے شکایات کا دفتر کھول دیا۔ٹیپ کا بند یہ تھا کہ وہ نہ تو کوڈک کو بخشیں گے اور نہ ہی جنرل منیجر کو۔ علی نے ہم سے منّت کی کہ یار ان کو توٹالو۔ میرا وعدہ ہے کہ اگلے ہفتے انہیں خام فلم مل جائے گی۔

ہم اچھّا پہلوان کو ایک طرف لے گئے اور ان سے کہا ''پہلوان جی۔آپ خواہ مخواہ ناراض نہ ہوں۔ مسٹر موس سے ہمارے گہرے تعلقات ہیں۔اگلے ہفتے آپ کو فلم کا کوٹہ مل جائے گا۔''

انہوں نے بے اعتباری سے ہمیں دیکھا اور سرگوشی میں (جو سارے دفتر میں سنی گئی) ہم سے پوچھا ''آفاقی صاحب' آپ سچ کہہ رہے ہیں؟''

ہم نے انہیں یقین دلایا تو وہ ہم سے گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ مگر جاتے جاتے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر

کر یہ کہہ گئے کہ اگر آفاقی صاحب کا وعدہ پورا نہ ہوا تو ''کوڈک'' کے دفتر کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکیں گے۔

ان کے جانے کے بعد علی نے اطمینان کا سانس لیا۔

ہم نے کہا ''اب ہماری ملاقات مسٹر موس سے کرادو۔ ہم پہلوان جی کی طرح جانے والے نہیں ہیں۔''

مجبور ہو کر علی صاحب نے فون پر مسٹر موس سے بات کی۔ ہمارے بارے میں کچھ تعارفی کلمات کہے اور ملاقات پر اصرار کا ذکر کیا۔ مسٹر موس نے ہمیں طلب کر لیا۔

سیڑھیاں چڑھ کر ہم ان کے شاندار کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ وہ بڑی سی میز کی دوسری جانب بیٹھے انتہائی خوبصورت اور نازک پیالی میں چائے پی رہے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھے' نہ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ظاہر ہے کہ چائے کی پیشکش کا تو سوال ہی نہیں تھا حالانکہ یہ ایٹی کیٹ کے خلاف تھا۔ ہمیں ان کی یہ بات بہت بُری لگی۔

''کہئے۔ آپ کی کیا پرابلم ہے؟'' انہوں نے انگریزی میں پوچھا۔

ہم نے مختصراً اپنی پرابلم بیان کر دی اور بتایا کہ آپ کا دفتر خام فلم کی بلیک کر رہا ہے۔

انہوں نے مسٹر علی کو بلایا اور حساب کتاب دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ علی صاحب نے ایک طالب علموں والی کاپی ان کے سامنے رکھ دی جس میں خام فلم دینے کا حساب درج تھا۔ اس کو دیکھ کر وہ بولے ''آپ کی باری ابھی نہیں آئی''

ہم نے کہا ''ہماری درخواست بہت پرانی ہے۔''

وہ بولے ''ہو گی۔ مگر آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔''

ہم نے کہا ''یہ نہیں ہو گا۔ آپ ہمیں خام فلم دیں گے ورنہ ہم آپ پر مقدمہ کر دیں گے۔''

وہ بولے ''شوق سے کیجئے۔''

اس طرح ملاقات ختم ہو گئی۔

ہم کو بہت بُرا لگا چنانچہ ہم نے انگریزی اور اردو اخبارات میں ایڈیٹر کے نام خطوط لکھنے شروع کر دیئے کہ ''کوڈک'' برٹش کمپنی ہے مگر بلیک کر رہی ہے اور خام فلم کا حساب کتاب باقاعدہ رجسٹروں میں رکھنے کے بجائے ایک کاپی میں لکھ رکھا ہے تاکہ بے ایمانی کی جاسکے۔

ان خطوط کے تراشے ہم نے ہیڈ آفس کو بھجوانے شروع کر دیئے۔اب مسٹر موس گھبرا اُٹھے۔
ایک دن باری ملک نے ہمیں فون کر کے بلایا اور کہا'' آفاقی۔ تم کوڈک کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟''
ہم نے کہا'' اس لئے کہ وہ بلیک میں ملوث ہے اور پاکستانی فلم سازوں کے ساتھ ان لوگوں کا سلوک توہین آمیز ہے۔''
بولے ''تم نے بہت گڑ بڑ کر لی۔اب چپ ہو جاؤ۔ تم کوڈک کا یا مسٹر موس کا کیا بگاڑ لو گے ؟ تم ایک مکّھی ہو اور وہ ہاتھی۔''
ہم نے کہا'' باری صاحب۔ مکّھی تو کیا مچھّر بھی ہاتھی کو ہلاک کر سکتا ہے اور یاد رکھئے۔ ہمارے پاس مسٹر موس کے خلاف دستاویزات بھی موجود ہیں۔ وہ ہیرا منڈی جا کر شراب پیتے اور ڈانس دیکھتے رہے ہیں اور رشوتیں لے کر خام فلم جاری کرتے رہے ہیں۔''
باری صاحب یہ بھول ہی گئے تھے کہ یہ واقعہ خود انہوں نے ہمیں سنایا تھا۔ مگر جب ہم نے کہا کہ ہمارے پاس ہیرا منڈی کی تصویریں بھی ہیں تو وہ سچ مچ پریشان ہو گئے ''تصویریں تمہیں کہاں سے ملیں؟''
''بس۔ مل گئیں۔''
''یار چھوڑو۔ جانے دو' تمہیں خام فلم چاہئے نا۔ مل جائے گی۔''
ہم نے کہا''جب تک مسٹر موس ہم سے معافی نہیں مانگیں گے ہم ہر گز انہیں معاف نہیں کریں گے۔''
اس طرح یہ گفتگو ختم ہو گئی۔
ان ہی دنوں برطانوی فوجوں نے مصر پر حملہ کر دیا۔لاہور میں اسرائیل اور انگریزی حکومت کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے۔
لاہور میں ایک سٹوڈنٹ لیڈر سردار صادق ہوا کرتے تھے۔ وہ سٹوڈنٹ نہ رہے مگر پھر بھی لیڈر ہی رہے۔ سردار صادق بہت دلچسپ آدمی تھے۔ دوستوں کے دوست۔ جلسے جلوسوں کے ماہر۔انہوں نے ہمارا مسئلہ سنا تو بولے '' آفاقی صاحب۔ موس کو یہودی کہہ کر جلوس میں اس کے خلاف نعرے لگوا دوں؟''
ہم نے کہا''ضرور۔۔۔ بڑے شوق سے۔''

چنانچہ اس شام مال روڈ پر بہت بڑا جوشیلا جلوس نکالا گیا اور جب جلوس کوڈک کے دفتر کے پاس پہنچا تو ''کوڈک ہائے ہائے۔ یہودی جنرل منیجر ہائے ہائے'' کے نعرے لگ گئے۔ کچھ مظاہرین نے دفتر پر پتھر بھی پھینکے۔ لاہور کی تاریخ میں کسی کاروباری ادارے کے خلاف یہ پہلا جلوس تھا جس میں نفرت اور اشتعال انگیز نعرے لگوانے کے اسباب پیدا کرنے میں ہمارا ہاتھ تھا۔ آپ بتائیے ہم ان سے اور کیسے نبٹ سکتے تھے۔

دو دن بعد معلوم ہوا کہ ہیڈ آفس نے مسٹر موس کو واپس بلا لیا ہے اور مسٹر علی نے ہمیں فون کر کے بتایا ''بھائی۔ جب ضرورت ہو' خام فلم لے لینا۔ ہماری خدمات حاضر ہیں۔''

خاصا ہنگامہ رہا۔ دلچسپی اور گرما گرمی بھی رہی۔ مگر یہ بھی ایک یادگار تجربہ تھا۔

مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنے ہوئے اب سالہا سال ہونے کو آئے ہیں۔ مگر جب وہ مشرقی پاکستان تھا اس وقت بھی ہم تین چار بار وہاں آ گئے تھے۔ مشرقی پاکستان سے اوّل تو ہمیں جذباتی لگاؤ تھا۔ یہ وہ سرزمین تھی جہاں سے پاکستان کی تحریک کو سب سے زیادہ تائید و حمایت حاصل ہوئی۔ متحدہ ہندوستان میں پاکستان کی تحریک کا زیادہ زور، عوامی پیمانے پر، ان علاقوں میں تھا جنہیں کسی صورت بھی پاکستان میں شامل نہیں ہونا تھا۔ یوپی، دہلی، بمبئی، وسط ہند، بہار، حیدرآباد یہ وہ علاقے تھے جہاں کے مسلمانوں نے پاکستان کی تحریک کے آغاز ہی سے اپنی خدمات اور وفاداریاں قائداعظمؒ کو سونپ دی تھیں۔

یہ مسلمان اقلیت کے علاقے تھے۔ یہ بھی ایک ستم ظریفی ہے کہ جن علاقوں میں پاکستان قائم ہوا تھا وہاں صورتِ حال قدرے مختلف تھی۔ پنجاب سب سے بڑا اور مسلمان اکثریت کا صوبہ تھا۔ یہاں کے مسلمانوں میں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کا چرچا بھی بہت تھا مگر یہاں مسلم لیگ کی حکومت نہیں تھی۔ اس صوبے پر ہمیشہ جاگیردار اور وڈیرے سایہ فگن رہے ہیں۔ یہ مفاد پرست لوگ ہیں۔ ان پر وہی مثل صادق آتی ہے کہ جہاں دیکھی توا پرات، وہیں گزاری ساری رات، جدھر فائدہ دیکھا، بے پیندے کے لوٹے کے مانند بس اس طرف لڑھک گئے۔ عام مسلمان تو مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کے ساتھ تھے مگر حکمراں طبقہ انگریزوں اور کانگریس کے اشاروں پر چلتا تھا۔ سر خضر حیات ٹوانہ، سر سکندر حیات جیسے لوگ یونینسٹ پارٹی بنا کر بیٹھے ہوئے تھے اور تحریک پاکستان کی راہ میں ہر طرح روڑے

اٹکا رہے تھے۔

سندھ میں مسلم لیگ کا زور تھا مگر وہاں بھی ہندوؤں اور کانگریس کا اثر تھا۔ یہ صوبہ ہمیشہ سے پاکستان کا حامی رہا ہے مگر یہاں بھی مسلم لیگ کو بہت زیادہ اکثریت کے ساتھ حمایت حاصل نہ تھی۔ بلوچستان میں صورتِ حال ''نیمے دروں نیمے بروں'' والی تھی۔ صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خان سرحدی گاندھی بنے بیٹھے تھے۔ یہ وہ صوبہ ہے جہاں یہ معلوم کرنے کے لیے ریفرنڈم کرانے کی نوبت آگئی تھی کہ وہاں کے لوگ پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا انڈیا کے ساتھ۔ اس سے وہاں کانگریس کے اثر و رسوخ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سرحدی عوام کی اکثریت نے ریفرنڈم میں پاکستان کے حق میں رائے دیکر ہمیشہ کے لئے یہ جھگڑا نمٹا دیا۔ یہ اور بات ہے کہ خان عبدالغفار خان کبھی دل سے پاکستان کے حامی نہ بن سکے اور قیام پاکستان کے بعد بھی یہ ''پرابلم صوبہ'' رہا۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو بنگال میں صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ بنگال میں ہندو کلچر کا اثر بہت زیادہ رہا ہے۔ ٹیگور تمام بنگالیوں کا محبوب شاعر ہے۔ وہاں ہندو دانش وروں اور سیاست دانوں نے ہندو مت کے حق میں فضا سازگار بنا رکھی تھی۔ صنعت و تجارت، کلچر، صحافت ہر جگہ ہندو چھائے ہوئے تھے۔ وہ تعلیمی، سماجی اور مالی اعتبار سے مسلمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ترقی یافتہ تھے اس لیے مسلمان غیر شعوری طور پر ہندوؤں سے بہت متاثر تھے۔ اس کے باوجود جب پاکستان کی تحریک کا آغاز ہوا تو بنگالی مسلمانوں نے بہت جوش و خروش کے ساتھ تحریک پاکستان کا ساتھ دیا۔ وہ صوبہ ہے جہاں مسلم لیگی حکومت تھی اور ہندوؤں کا تمام اثر و رسوخ مسلمانوں کو پاکستان کا مخالف بنانے میں ناکام رہا تھا۔ یہ وہ سچّے اور پکّے مسلمان تھے جو غُربت، تعلیمی پسماندگی اور ہر لحاظ سے پیچھے ہونے کے باوجود ہندوؤں کے دام میں نہیں آئے تھے۔ مگر المیہ دیکھئے کہ قیام پاکستان کے بعد یہ صورتِ حال یکسر تبدیل ہوگئی۔ مغربی پاکستان کی سیاسی قیادت کی کارکردگی ملاحظہ کیجئے کہ اس نے بہت مختصر عرصے میں بنگالی مسلمانوں کو پاکستان سے برگشتہ اور شاکی کر دیا۔ وہ لوگ جو تمام خطرات مول لیکر بھی ہندوؤں سے نبرد آزما ہو گئے تھے اور ''پاکستان پاکستان'' پکارتے تھے۔ جب پاکستان بنا تو ان کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک روا رکھا گیا۔ ان کی کوئی ایک شکایت ہو تو بیان کی جائے۔

مغربی پاکستان کے لیڈروں کی خود غرضی، مفاد پرستی اور بے بصیرتی کے باعث وہ رفتہ رفتہ ہم سے دور ہوتے چلے گئے۔ جلتی پر تیل ڈالنے کے لیے مشرقی پاکستان کے ہندو اور بھارتی سرکار کے کارندے سر گرم عمل تھے۔ ادھر مغربی پاکستان کے لیڈر آنکھوں پر پٹّی باندھے اور منہ میں گھنگیناں ڈالے بیٹھے تھے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا وہ ساری دنیا نے دیکھا۔ ایک درد مند لیڈر نے صحیح کہا ہے کہ مغربی پاکستان والوں نے مشرقی پاکستان کو مار مار کر جدا کر دیا۔ ہم نے خود یہ منظر دیکھا ہے۔

مولوی فضل حق بنگال کے ممتاز مسلم لیگی لیڈر تھے۔ وہ صحیح معنوں میں عوامی لیڈر تھے۔ عام لوگوں کی طرح رہتے تھے۔ ان ہی کی زبان بولتے تھے۔ ان ہی جیسا لباس پہنتے تھے۔ صوبے کے وزیر اعلیٰ تھے مگر کسی قسم کا پروٹوکول نہیں تھا۔ ان کے گھر کے دروازے ہر ایک کے لئے چوپٹ کھلے رہتے تھے۔ دروازے پر نہ محافظ نہ چوکیدار' بندوق تو دور کی بات ہے' کوئی ڈنڈے بردار محافظ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ جس کا جی چاہتا تھا بلا تکلّف منہ اٹھا کر ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو جاتا تھا۔ جہاں شیر بنگال مولوی فضل حق لنگی اور بنیان پہنے فرش پر بیٹھے نظر آتے تھے۔ جو بھی آتا تھا وہ ان کے پاس زانو سے زانو ملا کر بیٹھ جاتا تھا۔ اپنا مسئلہ بیان کرتا تھا۔ نہ تحریری درخواست کی ضرورت پڑتی تھی' نہ کاغذ اور فائل درکار تھی۔ مولوی صاحب وہیں بیٹھے بیٹھے سائل کی شکایت سنتے تھے اور ملزم کو وہیں طلب کر لیتے تھے۔ اس حُسن سلوک سے مسلمان اور ہندو سب یکساں فیض یاب ہوتے تھے۔ جب لیڈر ایسا ہو تو عوام اس پر فدا کیوں نہ ہوں؟ بنگالی لیڈروں کا یہ انداز اور طریقہ آج بھی کار فرما نظر آتا ہے۔ سادگی اور بے تکلفی ان کا طرّہ امتیاز ہے۔ کسی محفل میں چلے جائیں تو یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون وزیر ہے اور کون عوام؟

ڈھاکہ میں جب فلم سازی کا آغاز ہوا تو شروع شروع میں بنگالی فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ وہاں سٹوڈیو اور دوسری سہولتیں نہیں تھیں اس لئے فلم ساز اور ہدایت کار مغربی پاکستان بلکہ لاہور آکر سارا کام کر لیتے تھے اور فلم مکمل کر کے واپس ڈھاکہ چلے جاتے تھے۔ بعد میں تکنیکی تربیت حاصل کرنے کی غرض سے بھی مشرقی پاکستان کے لوگ لاہور اور کراچی آنے لگے۔ احتشام صاحب بھی ان ہی دنوں پہلی بار مغربی پاکستان آئے تھے۔ سانولے سلونے خوش شکل آدمی تھے۔ حد درجہ باتونی' تعلیم یافتہ اور ذہین بھی تھے۔ فلم سازی کا بہت شوق تھا۔ انہیں قریبی دوست احباب

''کیپٹن رحمان'' کہا کرتے تھے۔ یہ بعد میں بہت بڑے فلم ساز وہدایت کار اور اداکار ندیم کے خُسر بھی بنے۔ اُس زمانے میں مقامی فلمی حلقوں میں وہ کیپٹن کے نام سے بہت مقبول تھے۔ ہنس مکھ' زندہ دل' حاضر جواب اور ذہین آدمی تھے۔ انگریزی اور اردو بھی اچھی بولتے تھے۔ دوست بنانے کا گر بھی جانتے تھے۔ اس طرح وہ لاہور کے فلمی حلقوں میں بہت جلد پہچانے جانے لگے۔

ان کی طرح مشرقی پاکستان سے اور لوگ بھی فلم سازی' ہدایت کاری' ہنرمندی اور شاعری سیکھنے کی غرض سے لاہور' کراچی آتے رہتے تھے مگر مغربی پاکستان والے عموماً احساس برتری یا دوسرے لفظوں میں احساسِ کمتری میں مبتلا تھے، اس لئے انہیں خود اپنے مقابلے میں نوآموز، ناتجربہ کار اور پسماندہ خیال کرتے تھے۔

اُس زمانے میں مشرقی پاکستان کے فلمی فنکاروں اور ہنرمندوں کا ایک وفد مغربی پاکستان کے دورے پر آیا تو پہلی بار ہمیں مشرقی پاکستان کے فن کاروں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ڈھاکہ کی تمام ممتاز ہیروئنیں' ہیروز' فلم ساز' ہدایت کار اور ہنرمند اس وفد میں شامل تھے۔ مغربی پاکستان والوں کے لئے مشرقی پاکستان کے فنکار ایک عجوبہ ہی تھے اس لئے کہ اس زمانے میں مغربی پاکستان کی اردو فلمیں تو مشرقی پاکستان میں ریلیز ہوا کرتی تھیں اور بے حد مقبول بھی تھیں' مگر بنگلہ فلمیں مغربی پاکستان میں نمائش کے لئے پیش نہیں کی جاتی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ یہاں بنگلہ زبان سمجھنے والے برائے نام تھے۔ پھر وہاں کی فلمیں تکنیک اور فلمی اداکاروں کے لحاظ سے زیادہ کشش نہیں رکھتی تھیں اس لئے یہاں بنگلہ فلمیں ریلیز کرنا سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ حکومتی ادارے اس معاملے میں مدد کرتے اور جیسے تیسے یہاں بنگالی فلموں کی نمائش کا اہتمام ضرور کرتے۔ اس طرح دونوں بازوؤں کے عوام کے مابین یگانگت اور شناسائی کا رشتہ پیدا ہو سکتا تھا۔ مگر ہمارے حکمرانوں اور سرکاری اداروں نے کبھی اس طرف توجہ ہی نہیں دی اور دونوں صوبوں کے عوام کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کی کوشش ہی نہیں کی۔

مشرقی پاکستان میں اُس زمانے میں انڈین فلمیں درآمد ہوا کرتی تھیں مگر ایک محدود تعداد میں۔ یہ بھی ستم ظریفی ہی تھی کہ ایک ہی ملک کے دو حصّوں اور دو صوبوں کے لئے قانون الگ الگ تھا۔ مغربی پاکستان میں بھارتی فلموں کی

درآمد پر پابندیاں تھیں مگر اکلاڈ کا بھارتی فلمیں مشرقی پاکستان میں درآمد کیں جاتی تھیں اور بہت کامیاب ہوتی تھیں۔ اسی طرح ڈھاکہ میں کلکتہ کی فلمیں بھی نمائش کے لئے پیش کی جاتی تھیں اور بے حد مقبولیت حاصل کرتی تھیں۔ ہم 1960ء کے اوّلین حصّے میں ڈھاکہ گئے تو وہاں ایک اردو (جسے وہ ہندی کہتے تھے) فلم اور ایک بنگلہ فلم سینما گھروں میں چل رہی تھی اور خوب رش لے رہی تھی۔ بنگلہ فلم کے ہدایت کار شیام بینگل تھے۔ ہم سے ڈھاکہ میں کئی بنگالی دوستوں نے ان کی بہت تعریف کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ شیام بینگل دراصل ستیہ جیت رے سے بھی زیادہ بلند پایہ فلم ساز اور ہدایت کار ہیں۔ انہیں مقبولیت اور داد بھی خوب ملی مگر ستیہ جیت رے کو بین الاقوامی حلقوں میں جو عظمت حاصل تھی وہ شیام بینگل کے حصّے میں نہیں آئی۔ ان کی بنائی ہوئی فلم جو ہم نے ڈھاکہ کے ایک سینما میں دیکھی تھی، انڈین بنگال میں بھی بے حد مقبول ہوئی تھی اور ڈھاکہ میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب ہم نے یہ فلم دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو یہ پچیسویں ہفتے میں چل رہی تھی مگر تمام شو فُل جارہے تھے اور ٹکٹ بہت مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ بلیک مارکیٹ کرنے والوں کے خوب مزے تھے۔ اس کا نام ''ایکے میکے تارا'' یا اسی قسم کا تھا۔ جو بھی تھا مگر اس کے آخر میں لفظ ''تارا'' ضرور آتا تھا۔ ہمارے لئے بطور خاص اہتمام کیا گیا۔ ہم نے اس سے پہلے کوئی بنگلہ فلم نہیں دیکھی تھی اس کی مقبولیت کی داستانیں سنیں تو سوچا کہ ایک سُپر ہٹ بنگلہ فلم دیکھنے کا تجربہ بھی ضرور کرلینا چاہیے۔

یہ سینما' جہاں اس فلم کی نمائش جاری تھی' ڈھاکہ کا بہت اچھا سینما گھر تھا۔ سب سے پہلے تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک ہٹ فلم کے سینما پر بھی وہ دھکّم پیل' دھینگا مُشتی اور ہنگامہ نہیں تھا جو ہمارے مغربی پاکستان ' خصوصاً لاہور کے سینماؤں کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور آج بھی ہے۔ لوگ بڑے سکون سے پیدل' سائیکلوں پر یا بہت زیادہ متموّل گھرانے بائیسکل رکشا پر سوار ہو کر جوق در جوق آرہے تھے۔ خاموشی سے ٹکٹ خریدتے اور اطمینان سے اندر جا کر بیٹھ جاتے۔ نہ شور و غل' نہ ہنگامہ آرائی' نہ آوازیں اور سیٹیاں۔ فلم شروع ہوئی تو دیکھا کہ یہ ایک انتہائی غریب گھرانے کی کہانی تھی۔ لوئر مڈل کلاس کا ہیرو' نہایت سادہ' آنکھوں پر عینک لگائے' گلیمر نام کو نہیں' کرتہ دھوتی اور چپّل پہنے ہوئے۔۔۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ شاید اس کے سارے خاندان میں کبھی کسی نے رومان نہ کیا ہوگا۔ ان صاحب کا

رومان بھی نہایت سادہ اور شریفانہ تھا۔ رومانی مناظر ایسے تھے جیسے کاروباری گفتگو ہو رہی ہو۔
ہماری سمجھ میں مکالمے تو نہیں آئے مگر کہانی سے بات چیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ہیروئن بھی سادہ سی تھی۔ فیشن زدہ ملبوسات اور میک اپ سے عاری۔ سادہ سی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اس فلم میں گانے برائے نام ہی تھے۔ نہ کسی کامیڈین نے زبردستی ہنسانے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود سارے ہال میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ اچھے فقرے پر لوگ ہنس پڑتے اور پھر سنجیدگی سے فلم دیکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ یہ دراصل ملازمت کرنے والی ایک لڑکی کی کہانی تھی جو اپنے ماں باپ، چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کی کفالت کرتی تھی۔ باپ ریٹائرڈ ہو چکا تھا۔ جوان بہن زیر تعلیم تھی۔ جوان بھائی نکمّا تھا۔ اسے بس موسیقی کا شوق تھا۔ سارے گھر کا بوجھ ہیروئن کے کندھوں پر تھا۔
ہیرو صاحب بھی کسی دفتر میں معمولی سے ملازم یا کلرک تھے۔ وہ ہیروئن پر زور دے رہے تھے کہ اب انہیں شادی کر لینی چاہیے مگر اس کا کہنا تھا کہ پھر میرے گھر کے اخراجات کون سنبھالے گا؟ اس اثناء میں ایک اور گڑبڑ یہ ہو گئی کہ ہیرو صاحب کا گھر میں آنا جانا تھا اس لئے چھوٹی بہن نے بھی ان کو پسند کر لیا۔ بڑی بہن نے یہ دیکھا تو اپنے پیار سے کنارہ کش ہو گئی اور بہن کی خوشنودی کی خاطر ہیرو سے کہا کہ تم اس سے شادی کر لو۔ وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔ میں تو مجبوریوں کی بنا پر شادی کر ہی نہیں سکتی۔
اس قسم کی سنجیدہ کہانیاں پاکستانی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ انہیں حیرانی ہو گی کہ بنگالیوں کا فلمی ٹیسٹ تو بہت برا ہے۔ وہ کیسے اسطرح کی بور فلمیں دیکھ لیتے ہیں۔ اس فلم میں اداکاری اور ہدایت کاری کا معیار بہت اعلیٰ تھا۔ ساری کہانی بڑی سادگی سے 'حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔ نہ بھاری بھرکم ڈرامائی مکالمے تھے 'نہ اچھلتے کودتے رومانی مناظر' مگر تماشائیوں پر سحر سا طاری تھا۔
ہمیں بھی فلم بہت اچھی لگی۔ یہ بات الگ ہے کہ اگر اردو میں ہوتی تو ہمارے ہاں ایک ہفتے بھی نہ چلتی۔ ہم نے اپنے بنگالی دوست سے پوچھا" بھئی۔ جو تماشائی اس قدر سنجیدہ اور خیال افروز فلمیں دیکھتے ہیں وہ ہماری کمرشل فلمیں کیسے پسند کرتے ہیں؟""

وہ بولے ''ان کا معیار الگ الگ ہے۔ بنگلہ میں ایسی ہی حقیقت پسندانہ فلمیں دیکھنا چاہتے ہیں مگر اردو میں اچھل کود، ناچ گانا اور رومانس پسند کرتے ہیں'' کچھ عرصے بعد بنگالی تماشائیوں کا معیار بھی تبدیل ہو گیا اور اب تو وہ بنگلہ زبان میں بھی ایکشن، مار پیٹ، ہنگامہ، ڈراما اور اُچھل کود ہی پسند کرتے ہیں لیکن تیس چالیس سال پہلے حالات بالکل مختلف تھے۔

مشرقی پاکستان میں بنائی ہوئی بنگلہ فلمیں بھی اس وقت نہایت سادہ اور شائستہ ہوا کرتی تھیں اور ایسی ہی فلمیں مقبول بھی ہوتی تھیں۔ فلم ''جاگو ہوا سویرا'' میں کام کرنے والے ایک اداکار انیس کا ہم نے پہلے تذکرہ کیا تھا۔ ان صاحب کا اصل نام خان عطاالرحمان تھا۔ انہوں نے بنگلہ فلموں میں اسی نام سے کام کیا۔ ان کی بنگلہ زبان میں بنائی ہوئی فلم ''سات بھائی چمپا'' جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ ایک لڑکی چمپا کی کہانی تھی جو سات بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ سادہ سی یہ فلم سُپر ہٹ ہو گئی تھی۔ ان دنوں مشرقی پاکستان میں کوئی ڈھنگ کا سٹوڈیو نہ تھا۔ نہ کوئی گلوکار اور موسیقار تھا۔ نہ ہی سازندے تھے۔ تکنیکی اعتبار سے بھی کوئی سہولت نہ تھی اس لیے وہاں کے فلم سازان ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مغربی پاکستان، خصوصاً لاہور آیا کرتے تھے۔ کافی عرصے تک ڈھاکا کی فلموں کی موسیقی کی صدابندی لاہور میں ہوتی رہی۔ خان عطاالرحمن جنہیں بعد میں مشرقی پاکستان میں بڑی شہرت اور عزّت حاصل ہوئی، اپنی فلم کے گانوں کی ریکارڈنگ اور بعد میں فلم کی پرنٹنگ کے سلسلے میں لاہور آئے تو ان سے کافی ملاقات رہی، جو بعد میں گہری دوستی میں بدل گئی تھی۔ احتشام نے بھی فلم ساز اور ہدایت کار کے طور پر بہت نام پیدا کیا۔ وہ بھی کافی عرصہ لاہور اور کراچی میں رہے اور فلمسازی کے رموز سے آگاہی حاصل کرتے رہے۔ قریبی حلقوں میں وہ کیپٹن رحمان یا کیپٹن کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی ایک وجۂ شہرت یہ بھی ہے کہ وہ سپر سٹار ندیم کے خسر ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی مستفیض نے بھی کئی کامیاب اور عمدہ فلمیں بنائیں اور شہرت حاصل کی۔

ابتدائی زمانے میں تو مشرقی پاکستان یہاں کے لوگوں کے لیے ایک خواب و خیال کی سرزمین ہی تھا جسے معدودے چند لوگوں کے سوا کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اپنے وطن کے دوسرے نہایت اہم حصّے کے بارے میں مغربی پاکستان والے کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ بس سنی سنائی داستانیں اور واقعات ہی ان تک پہنچتے تھے۔ کہنے کو مشرقی پاکستان کو سنہرے

ریشے کی سرزمین کہا جاتا تھا۔ عام تصوّر تھا کہ وہ ایک زرخیز اور گھنے جنگلوں سے بھرا ہوا علاقہ ہے جن میں جنگلی جانور، خوفناک درندے اور ہاتھی دندناتے پھرتے ہیں۔ وہاں ندّیوں نالوں کی فراوانی ہے۔ بارش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ رقص اور موسیقی ان کے کلچر اور مزاج میں داخل ہے۔ زلفِ بنگال اور سحرِ بنگال کے حوالے سے بھی بہت سی داستانیں مشہور تھیں لیکن مشرقی پاکستان درحقیقت کیا ہے، کیسا ہے، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

مشرقی پاکستان میں فلم سازی کا آغاز بنگلہ زبان کی فلموں سے ہوا تھا۔ جس طرح مغربی پاکستان کے لوگ بنگالی سے نابلد تھے۔ اسی طرح مشرقی پاکستان والے بھی عام طور پر اردو نہیں جانتے تھے۔ بڑے شہروں میں بھی اردو سمجھ تو لی جاتی تھی مگر بولنے والے بہت تھوڑے تھے۔ دیہات اور اندرونی علاقوں میں تو اردو بس تھوڑی بہت ہی سمجھی جاتی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ بنگلہ ایک ترقّی یافتہ زبان ہے۔ وہاں ہندو بہت ترقّی یافتہ اور تعلیم یافتہ تھے۔ بنگلہ زبان پر بھی ان ہی کا تسلّط تھا۔ اس زبان میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کی کثرت تھی۔ بنگلہ رسم الخط بھی اردو، عربی اور فارسی سے مختلف ہوتا ہے۔ ہندو اکثریت میں تو نہ تھے مگر ہر لحاظ سے چھائے ہوئے تھے اور ان کا کلچر اور رسم و رواج ہر طرف نظر آتے تھے۔ پاکستان کی تحریک میں بنگال کے مسلمان پیش پیش تھے۔ وہ اردو کو مسلمانوں کی زبان اور بعد میں پاکستان کی قومی زبان بھی تصوّر کرتے تھے اور بڑے شوق سے اردو پڑھتے، سیکھتے اردو بولتے تھے۔ مگر جب انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی اپنی زبان کو نظرانداز کر کے اردو ان پر زبردستی ٹھونسی جا رہی ہے اور ہندوؤں نے بھی انہیں بھڑکایا تو ان کے دلوں میں ایک احتجاجی اور کچھ عرصے بعد مزاحمتی جذبہ پیدا ہو گیا۔

مغربی پاکستان کے حکمرانوں کی زبردستی اور یہاں کے لوگوں کی بے خبری اور بے پروائی، اس پر ہندوؤں کا پروپیگنڈا، نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں رفتہ رفتہ، غیر محسوس طریقے پر برگشتہ کر دیا گیا۔

خیر۔ یہ تو ایک علیحدہ داستان ہے۔ اگرچہ انتہائی اہم اور دردناک داستان بھی ہے جس کی وجہ سے ہمارے ملک کے دو حصّے ہو گئے۔ غلطیاں دونوں جانب سے سرزد ہوئیں، زیادتیاں بھی دونوں ہی طرف سے ہوئیں، مگر آغاز مغربی پاکستان کی جانب سے ہوا تھا اور پھر حالات کو سنوارنے کے بجائے بگاڑنے میں بھی ہمارے ہی لیڈروں اور حکمرانوں کی کرم فرمائی رہی ہے۔

ذکر یہ ہورہا تھا کہ پاکستان کے دونوں حصّے ایک دوسرے سے دور اور دونوں میں آباد لوگ ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر تھے۔ یہی بے خبری آگے چل کر بہت سی بد نصیبیوں کا سبب بن گئی۔ جب خبر آئی کہ ڈھاکہ میں بھی فلمیں بننے لگی ہیں تو مغربی پاکستان کے لوگوں کو مسرّت آمیز حیرت ہوئی۔ وہاں فلم سازی کا آغاز بنگلہ زبان کی فلموں سے ہوا تھا۔ فلم سازوں کے پاس سرمایہ بہت کم تھا، وسائل اور سہولتوں کی بھی کمی تھی، وہ بہت کم سرمائے سے، محدود سہولتوں کے ساتھ فلمیں بناتے تھے اور مغربی پاکستان کی اردو فلموں سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے بنگلہ زبان کی فلموں سے آغاز کیا۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ یہ بُری بھلی، جیسی بھی فلمیں تھیں، ان کی اپنی زبان کی فلمیں تھیں اور خود ان کے شہر میں بنائی گئی تھیں اس لیے ان فلموں کو مقبولیت اور کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

مغربی پاکستان تک محض خبریں ہی پہنچی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں بنی ہوئی فلمیں کسی نے نہیں دیکھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مشرقی پاکستان کا فلمی وفد مغربی پاکستان کے دورے پر آیا تو یہاں عام لوگ وہاں کے فن کاروں اور ہنرِمندوں کے نام تک سے واقف نہیں تھے۔ فلمی حلقوں کی جانب سے اس وفد کی پذیرائی کی گئی۔ تقریبات بھی منعقد ہوئیں۔ ان تقریبات میں ہم نے پہلی بار بنگالی فن کاروں کو دیکھا۔ شبنم وہاں ہیروئن بن چکی تھیں مگر انہیں دیکھ کر ہمیں بہت مایوسی ہوئی۔ گہرا سانولا رنگ، سیاہ بال گھٹنوں سے بھی زیادہ لمبے، دُبلی پتلی۔ سادہ سے تیل لگے ہوئے بال، سادہ سی سوتی ساڑھی، ان کے چہرے میں سب سے زیادہ پُرکشش چیز ان کی آنکھیں تھیں۔ ان کا یہ حال تھا کہ وہ بولنا تو کجا اردو سمجھتی تک نہیں تھیں۔ بیشتر دوسرے فن کاروں کا بھی یہی حال تھا۔ ان سے اردو میں باتیں کرو تو وہ حیرانی سے منہ تکتے رہ جاتے تھے۔

گویا باہمی رابطے کا ذریعہ صرف انگریزی زبان ہی تھی۔ یہ وفد لاہور کے علاوہ کراچی بھی گیا۔ لاہور اور کراچی کے فلم والوں سے میل ملاقات ہوئی تو کسی حد تک ایک دوسرے کو جاننے کا موقع ملا۔ مگر مشرقی پاکستان کے فن کاروں اور ہنرمندوں کے ساتھ مغربی پاکستان کے فلم والوں کا قریب قریب وہی رویّہ تھا جو اہم، فیشن ایبل، ترقی یافتہ لوگوں کا اپنے غریب اور پسماندہ رشتے داروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ لوگ ان سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہتے تھے۔

''دیکھو۔ یہ بے چارے کتنی مشکل سے فلمیں بناتے ہیں، بالکل اناڑی ہیں۔ پیسے بھی نہیں ہیں۔ اس لیے تو ایسی خراب فلمیں بناتے ہیں۔''

مگر یہی ''بے چارے'' رفتہ رفتہ جب اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے تو ان کے فنکاروں اور ہنر مندوں کی مہارت اور ان کی بنائی ہوئی فلموں کے اعلیٰ معیار کو سب نے مان لیا ہے۔

ہمیں مشرقی پاکستان جانے کا اتفاق 1959ء میں ہوا تھا جب ہمارے دوست اے مجید صاحب نے مشرقی پاکستان کے پس منظر میں ایک فلم بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ حسن طارق صاحب اس فلم کے ہدایت کار تھے۔ ہم نے کہانی اور مکالمے لکھے تھے۔ مجید صاحب سے ہمارے بہت گہرے تعلقات تھے۔ ان کے گھر میں آنا جانا بھی تھا۔ حسن طارق صاحب سے بھی ان کی دوستی تھی۔ طارق صاحب لاہور میں اپنی پہلی فلم ''نیند'' بنا چکے تھے۔ اس پر انہیں داد تحسین تو بہت زیادہ ملی تھی مگر اس کے بعد کافی عرصے تک انہیں کسی نے دوسری فلم بنانے کیلئے سائن نہیں کیا تھا۔

مجید صاحب کے چھوٹے بھائی اے حمید اس زمانے میں مشرقی پاکستان میں کسٹمز کلکٹر تھے۔ یہ بہت توپ قسم کا عہدہ ہوتا ہے مگر حمید صاحب محض بیوروکریٹ ہی نہیں تھے۔ فنونِ لطیفہ سے انہیں بہت گہری دلچسپی تھی۔ انہیں ادب، شاعری، موسیقی، فلم سے بھی گہرا شغف تھا اور فنکاروں کی دل سے قدر و منزلت کرتے تھے۔ خود بھی گاتے اور مختلف ساز بجالیتے تھے۔ بہت مزیدار آدمی تھے۔ انگریزی، اردو، پنجابی، بنگالی ہر زبان میں بے تکان گفتگو کرتے تھے۔ حاضر جواب اور شگفتہ بیان بھی تھے اور حسِ مزاح بھی ان میں بہت زیادہ تھی۔

ان سے ہماری ملاقات مجید صاحب کے توسّط سے ہوئی تھی۔ وہ لاہور آتے تو اکثر مجید صاحب ہی کے گھر میں قیام کرتے تھے جہاں ہماری بھی آمدورفت تھی۔ مجید صاحب بذاتِ خود بھی مشرقی پاکستان میں پٹ سن سے متعلق کوئی کاروبار کرتے تھے اور اس سلسلے میں ان کا ڈھاکہ آمدورفت رہتی تھی۔

ڈھاکہ اس زمانے میں ''سمندر پار دیس'' سمجھا جاتا تھا۔ خشکی کا کوئی براہِ راست اور آسان راستہ نہ تھا۔ بحری جہاز سے سفر کرنے میں بہت زیادہ وقت لگتا تھا۔ لے دیکر ایک ہوائی جہاز ہی رہ گیا تھا جو آمدورفت کا موزوں و مناسب ذریعہ تھا۔ جب مجید صاحب نے ہمیں اور حسن طارق صاحب کو ایک دن اپنے مال روڈ والے کشادہ، دو منزلہ فلیٹ کے

ڈرائنگ روم میں دوپہر کے کھانے کے بعد کافی اور مشرقی پاکستان کے سگاروں سے تواضع کرتے ہوئے، اپنا فلم سازی کا منصوبہ سنایا۔

مجید صاحب کا یہ کشادہ فلیٹ مال روڈ پر چڑیا گھر کے بالکل سامنے تھا۔ مال روڈ اس زمانے میں واقعی مال روڈ اور جنّت نگاہ تھا۔ سامنے باغ جناح اور چڑیا گھر کا سر سبز و خوبصورت حصّہ نظر آتا رہتا تھا۔ بارش کے موسم میں اس کا منظر ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ جاڑوں میں موسلا دھار بلکہ دھواں دھار بارش میں ہم مال روڈ اور فٹ پاتھوں پر پانی میں بھیگتے ہوئے، پیروں سے پانی اڑاتے تو لطف آجاتا تھا۔ بعد میں مجید صاحب کے گھر جا کر گیلے کپڑے اتار کر مجید صاحب کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن کر آگ کے سامنے بیٹھ جاتے۔ خشک میوے، کافی، چائے اور سگار کا دور چلتا، ایسی آئیڈیل زندگی پھر کبھی نصیب نہیں ہوئی۔

مشرقی پاکستان میں تمام فلم بنانے کا تصوّر ہی انتہائی پُر جوش تھا۔ مجید صاحب کا خیال تھا کہ سُندر بن کے مشہور زمانہ جنگلات میں یہ فلم بنائی جائے تاکہ اصلی ماحول نظر آئے۔ اس فلم میں ہاتھی پکڑنے کا طریقہ ''کھیدا'' بھی دکھایا جائے۔

مجید صاحب کی یہ بات سُن کر ہمیں ایسا لگا جیسے یہ ہماری زندگی کا ایک انوکھا اور نادر موقع ہے جس سے ہمیں پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہئے۔ مشرقی پاکستان کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سُن رکھا تھا مگر جب مجید صاحب نے اطمینان سے بیٹھ کر ہمیں تفصیلات سے آگاہ کیا تو ہمارے جوش اور ولولے کی کوئی حد نہ رہی۔ ایسے ماحول میں فلم بنانا واقعی ایک عجیب و غریب تجربہ تھا طارق صاحب بھی اس خیال سے بے حد ایکسائیٹڈ ہو گئے۔

ہم نے پہلے تو مشرقی پاکستان کے بارے میں، خصوصاً سُندر بن کے جنگلات کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں، پھر یہ دیکھا کہ ہاتھی پکڑنے کا کیا طریقہ ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جنگلوں میں لوگوں کو علم ہوتا ہے کہ ہاتھی کس راستے سے گزرتے ہیں۔ ہاتھی جنگل میں کسی ایک جگہ نہیں رہتے۔ وہ مستقل نقل مکانی کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے حرکت میں رہتے ہیں۔ حضرت انسان ان کی فطرت سے اور تمام عادات سے واقف ہوتے ہیں اور ان سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کمزور و نحیف دبلا پتلا آدمی بالآخر ہاتھی جیسے گرانڈیل جانور پر قابو پالیتا ہے۔ اسے پکڑتا ہے

اور پھر سدھا کر، تربیت دے کر اسے اپنے اشاروں پر چلاتا ہے۔ اگر انسان میں عقل نہ ہو تو کہاں ہاتھی اور کہاں انسان؟

ہاتھی کُنبے کی صورت میں رہتے ہیں۔ یعنی ان کی باقاعدہ فیملی لائف ہوتی ہے۔ افسوس کہ انسان جیسے جیسے ترّقی کر رہا ہے۔ وہ فیملی سے دور بھاگ رہا ہے۔ مگر مقام شُکر ہے کہ ہاتھی نے صدیاں گزرنے کے باوجود ترّقی نہیں کی ہے۔ وہیں کا وہیں ہے۔ اس لئے اب بھی فیملی لائف گزارتا ہے۔

ہاتھی قافلے کی صورت میں سفر کرتے ہیں اور عموماً ایک ہی راستے سے گزرتے ہیں جسے انگریزی میں ''ایلیفنٹ واک'' کہتے ہیں۔ بس انسان ہاتھیوں کی اس اصول پسندی اور باقاعدگی سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ ہاتھیوں کی نقل مکانی کا زمانہ شروع ہونے سے پہلے جنگل میں ان کی گزرگاہ پر بڑے بڑے گڑھے کھود کر ان کو گھاس پھوس' پودوں اور چٹائیوں وغیرہ سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ پھر یار لوگ ڈھول' ٹین کے خالی ڈبّے اور اسی قسم کی شور پیدا کرنے والی چیزیں اٹھا کر نکل کھڑے ہوتے ہیں اور اتنا شور مچاتے ہیں کہ سارا جنگل گونج اٹھتا ہے۔ ہاتھی اس شور و غل سے گھبرا کر سکون کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ہاتھی پکڑنے کے اس طریقے کو ''کھیدا'' کہا جاتا ہے۔ کھیدا کرنے والے یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہاتھیوں کا قافلہ اسی راستے سے گزرے جہاں ان کو پھانسنے کے لئے گڑھے کھودے گئے ہیں۔ بے انتہا شور و غل سے گھبرا کر ہاتھی اسی گزرگاہ پر چل پڑتے ہیں اور گڑھوں میں گر جاتے ہیں۔ ان میں ہاتھی بھی ہوتے ہیں، ہتھنی بھی ہوتی ہے اور بچّے بھی ہوتے ہیں۔ ہاتھی یوں تو بہت طاقتور اور بڑے ڈیل ڈول والا جانور ہے مگر بے چارہ گڑھے میں سے باہر نکلنا نہیں جانتا۔ دس بارہ فٹ کی گہرائی سے بھی وہ چڑھ کر باہر نہیں آسکتا۔ شور مچاتا ہے سر پٹختا ہے مگر بے بس ہے۔ کئی دن گزر جاتے ہیں ہیں۔ بھوک اور پیاس سے نڈھال ہونے کے بعد اس کی سرکشی اور غصّہ بتدریج کم ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ ''اللہ میاں کی گائے'' بن جاتا ہے۔ انتہائی لاغر اور کمزور۔ بھوک اور پیاس سے نڈھال اور قطعی بے بس۔ اس وقت انہیں موٹے موٹے رَسّوں اور لوہے کی زنجیروں کی مدد سے ان گڑھوں سے باہر نکالا جاتا ہے۔ اور چاروں اطراف کھونٹے ٹھونک کر باندھ دیا جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ انہیں خوراک اور پانی دیا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ انہیں مسخّر کر لیا جاتا ہے۔

ہم نے اس فلم کے لئے جو کہانی بنائی اس کا ہیرو زندہ جنگلی جانور پکڑ کر ملک سے باہر بھیجنے کا کاروبار کرتا تھا۔ یہ علاؤ الدین صاحب تھے۔ ایک ان کا دوست تھا جو حد سے زیادہ ڈرپوک تھا لیکن دوست کی یاری اور محبت سے مجبور تھا اس لئے جنگل ہی میں رہتا تھا۔ یہ کردار نذر صاحب نے کیا تھا۔ گھنے جنگل ہی میں ایک شخص رہتا تھا جو دراصل اپنے دشمنوں سے چھپنے کے لئے جنگل میں جا گھسا تھا۔ وہ اپنی کمسن بیٹی کو بھی ساتھ ہی لے گیا تھا اور پھر یہ جنگل ہی ان کا مستقل ٹھکانا بن گیا۔ یہ لڑکی جنگل ہی میں پل کر جوان ہوئی تھی اور اس نے بابا کے سوا کوئی دوسرا مرد نہیں دیکھا۔ اس کو دنیا والوں کی نظروں سے بچا کر رکھا تھا اس لئے وہ اپنے بابا کے سوا کسی انسان سے نہیں ملی تھی۔ وہ ایک سادہ لوح' بھولی بھالی 'معصوم نوجوان لڑکی تھی جو زندگی کی حقیقتوں سے بہت دور تھی۔ یہ کردار نیلو کو سونپا گیا تھا۔ ان کے باپ کا کردار اجمل صاحب کو دیا گیا۔ اس جنگل میں ایک جنگلی قبیلہ بھی آباد تھا۔ ان میں ایک مضبوط اور بہادر نوجوان نے جب سارنگا (نیلو) کو دیکھا تو اسے حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ جنگلی اور وحشی کا یہ کردار ساون نے ادا کیا تھا۔ ساون نے اس وقت تک ایکسٹرا کے طور پر ہی کام کیا تھا۔ وہ مضبوط اور قد آور تھے اور جنگلی لباس میں سچ مچ جنگلی ہی نظر آتے تھے۔ ان کو پہلی بار کسی فلم میں ویلن کا اہم کردار سونپا گیا تھا۔ کچھ بعد وہ پاکستان کی فلمی دنیا کے بہت معروف اور مصروف ویلن بن گئے تھے۔ پنجابی میں توان کے بغیر فلم بنانے کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ مرحلہ مختلف اداکاروں کی زندگی میں آیا اور آج بھی ایسے اداکار موجود ہیں۔

اس فلم کا نام ہم نے ''جنگلی'' تجویز کیا۔ یہ جنگل کی کہانی تھی۔ علاؤ الدین اور نذر کے علاوہ سبھی کردار جنگلی تھے۔ جنگل میں رہتے رہتے اور جنگلی جانوروں کے ساتھ زندگی بسر کر کے یہ بھی جنگلی ہی بن چکے تھے۔ نیلو ایک جنگلی خوفزدہ ہرنی کی طرح تھیں۔ جنگلی لباس اور کردار میں انہوں نے بہت غضب ڈھایا تھا۔

مجید صاحب نے حقیقی ماحول پیدا کرنے کے لئے نہ صرف فلم کے تمام سیٹ بیچ جنگل میں لگوائے تھے بلکہ سب کے رہنے سہنے کے لئے بھی وہیں جھونپڑیاں تعمیر کرا دی تھیں۔ بجلی دور دور تک نہ تھی اس لئے بڑے بڑے طاقتور جنریٹرز کا بندوبست کیا تھا۔ جنگلی جانوروں کو رکھنے کے لئے لکڑی اور لوہے کے بڑے بڑے جنگلے بنوائے تھے جن میں شیر'

چیتے' بندر وغیرہ بند کئے گئے تھے۔

فلم کی شوٹنگ کے لئے بیشتر اداکار اتنی دور جانے پر آمادہ نہ تھے۔کامیڈین نذر کی ایک دنیا پرستار تھی۔ان کے بغیر اس زمانے میں کوئی فلم مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مگر ان کی یہ حالت تھی کہ ہوائی سفر کے نام سے ہی جان نکلتی تھی۔ کراچی وہ ٹرین سے جایا کرتے تھے۔مری اور راولپنڈی جانے کے لئے اپنی ذاتی وین استعمال کرتے تھے جس میں سونے' اٹھنے' بیٹھنے' کھانے پینے اور پکانے کا سامنا موجود رہتا تھا۔

نذر صاحب کی تین بیگمات تھیں۔وہ مساوات کے قائل تھے۔اس لئے لاہور سے باہر جاتے تو باری باری ہر بیوی کو ہمراہ لے جاتے۔ اس طرح کسی بیوی کو شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا۔یہ تینوں بیگمات ایک ہی گھر میں بڑے سلوک اور محبت سے رہا کرتی تھیں۔سب کے بچّے بھی اس گھر میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔

بعض حوالوں سے نذر صاحب واقعی بڑے عجیب آدمی تھے۔انہوں نے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے جو اصول بنائے تھے ساری زندگی بڑی سختی سے ان پر قائم رہے۔

نذر صاحب ہوائی سفر سے خوف زدہ تھے اور ان کی جملہ بیگمات کا بھی یہی عالم تھا۔اوّل تو وہ سمندر پار یعنی مشرقی پاکستان جانے پر ہی آمادہ نہ تھے۔ بڑی مشکل سے انہیں آمادہ کیا گیا مگر وہ یہ بات نہیں جانتے تھے کہ وہاں انہیں گھنے جنگل کے بیچوں بیچ رہنا پڑے گا۔وہ سب سے آخر میں لاہور سے ڈھاکا روانہ ہوئے۔اس وقت ہفتے میں چند بار لاہور سے ڈھاکا فلائٹ چلا کرتی تھی۔فلم کا یونٹ پہلے روانہ ہو چکا تھا۔نذر صاحب کو بہر صورت' ہوائی جہاز پر سوار کرانے کی ذُمہ داری ہمارے نحیف کاندھوں پر تھی۔اس وقت ہم "آفاق" میں کام کرتے تھے اور فلمی کہانیاں بھی لکھنے لگے تھے اس لئے ہماری بات سبھی سن لیتے تھے۔

وہ منظر آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے جب نذر صاحب ہوائی سفر کے لئے ائرپورٹ پر پہنچے تھے۔جب تک فلائٹ کا اعلان نہ ہو گیا' وہ اپنی وین میں ہی بیٹھے دعا درود میں مصروف رہے۔ان کی بیگمات اور متعدد بچّے بھی ہمراہ تھے۔ان کے بازو امام ضامنوں سے بھرے ہوئے تھے۔بیگمات نے ڈھیروں منّتیں مان رکھی تھیں۔جن میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔جب وہ ہوائی جہاز کی طرف روانہ ہوئے تو آہ وفغاں کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔بیویاں اور بچّے تو

رو ہی رہے تھے، خود نذر صاحب بھی ہچکیوں سے رو رہے تھے۔ جیسے فلم کی شوٹنگ پر نہیں، جنگ پر جا رہے ہوں۔ نیلو کی دلیری اور بے خوفی کے سبھی قائل ہو گئے۔ پھر نیلو کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ ابھی سکّہ بند ہیروئن بھی نہیں بنی تھیں۔ اس فلم میں ان کا کردار انوکھا تھا۔ اس پر ان کا قیامت خیز رقص۔ طارق صاحب نے انہیں کردار کی نوعیت بہت تفصیل سے سمجھا دی تھی اور نیلو نے اس کو نبھاتے ہوئے حق ادا کر دیا تھا۔ معصوم، بھولی بھالی مگر ایک چلتی پھرتی قیامت۔ سُندر بن دیکھنے کا تو سبھی کو شوق تھا مگر جب جیپوں کے طویل سفر کے بعد گنجان اور سنسان جنگل میں پہنچے تو ماحول کے حُسن سے قطع نظر سب ہی کچھ خوف زدہ ہو گئے۔ مشرقی پاکستان کے سائیکلون اور طوفان باد و باراں کا تذکرہ سبھی نے سُن رکھا تھا۔ جنگل بے حد خوبصورت تھا مگر یہ بھی معلوم تھا کہ یہاں جنگلی درندے یوں گھومتے پھرتے ہیں جیسے شہر میں آوارہ کتّے اور بِلّیاں، خوفناک سانپ، ڈراؤنے بچھّو بھی اس جنگل کے مستقل باسی تھے۔

ایک دو روز تو سب کی جان پر بنی رہی مگر پھر جب خوف کم ہوا تو جنگل کے حُسن اور قدرت کی صنّاعی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ نذر صاحب کے سوا ہر ایک نے اس ماحول کو پسند کیا۔

شوٹنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو جنگل میں نیلو کے مناظر فلمائے گئے۔ پھر علاؤالدین صاحب اور نذر صاحب کے مزاحیہ سین تھے۔ نذر صاحب کا ہر قدم پر ڈر کے مارے بُرا حال تھا۔ ایک بار جنگلیوں نے ان دونوں کو پکڑ لیا۔ ہوا یہ کہ انہوں نے زمین کے اندر ہی اندر جنگل تک جانے کے لئے ایک سرنگ کھودی جس کا دوسرا سرا جنگلی قبیلے کے سردار کے جھونپڑے میں جا نکلا اور دونوں پکڑے گئے۔ جنگلیوں کا رہن سہن ان کے رسم و رواج اور تہواروں کو بھی اس فلم میں پیش کیا گیا۔ ہاتھی پکڑنے کا منظر فلم کا کلائمکس تھا۔ ویلن جوشِ رقابت میں ایک روز تمام محبوس جنگلی درندوں کو آزاد کر کے کیمپ میں آگ لگا دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ ویلن جب بھاگتا ہے تو اس راہ پر پہنچ جاتا ہے جہاں ''کھیدا'' ہو رہا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ہاتھیوں کے پیروں تلے کچل کر ہلاک ہو جاتا ہے۔

اس فلم کا بیشتر حصہ مکمل ہو چکا تھا مگر کچھ ایسی رکاوٹیں پیش آئیں کہ یہ کبھی مکمل ہو کر نمائش پذیر نہ ہو سکی۔ اس کے مناظر اور گانے رش پرنٹس کی صورت میں جس نے بھی دیکھے حیران رہ گیا۔ افسوس کہ کوشش کے باوجود یہ فلم مکمل ہو کر فلم بینوں کے سامنے پیش نہ کی جا سکی ورنہ اپنے انداز کی ایک منفرد فلم ہوتی۔

اس فلم کی شوٹنگ کی راہ میں کئی بار رکاوٹ پیدا ہوئی۔ کبھی کوئی آرٹسٹ بیمار ہو گیا۔ کبھی جنریٹر خراب ہو گئے۔ کبھی آرٹسٹوں کی تاریخیں بھی ختم ہو گئیں۔ تین چار قسطوں میں اسے فلمایا گیا پھر بھی ادھوری رہی۔ پھر ڈھاکا فلم ڈویلپمنٹ کارپوریشن سے مجید صاحب کا تنازع ہو گیا تو اس کا باقی ماندہ حصہ چھانگامانگا کے جنگلات میں فلمانے کا پروگرام بنا اور کچھ شوٹنگ بھی کر لی گئی مگر فلم پھر بھی مکمل نہ ہو سکی۔

جنگل کے کیمپ میں درندوں اور حشرات الارض نے تو پریشان کیا ہی تھا مگر ایک روز ایسا غضب ناک طوفان آیا کہ جھونپڑیوں کی چھتیں اڑ گئیں۔ بڑے بڑے تناور درخت سے اکھڑ گئے۔ بارش اتنی موسلادھار کہ خدا کی پناہ۔ اس پر بجلی کے کڑاکے۔ کئی بار مختلف مقامات پر بجلی گری۔ خدا جانے کس طرح سب نے اللہ اللہ کر کے اور سجدوں میں گر کر وہ طوفان گزارا۔ بے چارے نذر صاحب پر کیا بیتی ہو گی اور اُن کا کیا حال ہوا ہو گا۔ ان تمام مصائب کو جھیلنے کے بعد اگر مکمل ہو کر نمائش کے لئے پیش کر دی جاتی تو ساری پریشانیاں' دُکھ اور شکایات دور ہو جاتیں مگر اللہ کو یہ منظور نہ تھا اور اس کی رضا کے آگے کون دم مار سکتا ہے؟

مشرقی پاکستان ہم کئی بار گئے اور پھر جب وہ بنگلہ دیش بن گیا تب بھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ ہر بار ہمیں ایک نیا تجربہ ہوا۔ مشرقی پاکستان کے سفر کئی بار کئے جن کی یادیں زندگی بھر ہمارے ساتھ رہیں گی۔

مشرقی پاکستان میں جب فلم سازی کا آغاز ہوا تو حکومت کو خیال آیا کہ فلمی صنعت کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک ''فلم فیکٹ فائنڈنگ'' کمیٹی قائم کی گئی۔ بڑے بڑے دانشور بیوروکریٹ اس کمیٹی میں شامل تھے۔ انہوں نے بڑی تحقیق اور تلاش کے بعد فلمی صنعت کے بارے میں اپنی سفارشات پیش کیں مگر یہ رپورٹ گرد و غبار میں دب کر رہ گئی۔ شاید متعلقہ ذُمّے دار لوگوں نے کبھی اس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی لیکن مشرقی پاکستان کے تعلیم یافتہ لوگوں نے اصرار کیا کہ وہاں فلمی صنعت کے قیام کے لئے مناسب اقدامات کئے جائیں۔ مجبور ہو کر حکومت نے ایک منصوبہ بنایا جس کے تحت مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں میں ''فلم ڈویلپمنٹ کارپوریشن'' کے نام سے ادارے قائم کرنے کی تجویز سامنے آئی۔ یہ کارپوریشن سرکاری ادارہ تھی جو فلم اسٹوڈیو کے قیام سے لے کر فلم سازی کے تمام شعبوں کی نگرانی پر مامور کی گئی تھی۔ مغربی پاکستان میں تو یار لوگوں نے

اس منصوبے کو اٹھا کر طاق نسیاں پر رکھ دیا مگر مشرقی پاکستان کے پُر جوش لوگوں نے حکومت کی جان کھا لی۔ لہٰذا وہاں فلم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ خیر الکبیر صاحب اس کے مینجنگ ڈائریکٹر اور نذیر احمد صاحب اس کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ یہ دونوں حضرات اعلیٰ تعلیم یافتہ اور فلم کی تکنیک اور امور سے بخوبی واقف تھے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں کے فلمی حالات بھی جانتے تھے۔

نذیر احمد صاحب نے بیرون ملک فلم کے مختلف شعبوں میں تربیت بھی حاصل کی تھی۔ ڈھاکا میں اس کارپوریشن نے سب سے پہلے تو ایک اسٹوڈیو قائم کیا جو اب ایک نہایت اعلیٰ درجے کا جدید ترین نگار خانہ بن چکا ہے۔ فلم سازوں کو مالی اور تکنیکی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ جدید ترین کیمرے اور دوسرے آلات درآمد کئے گئے اور اعلیٰ تربیت حاصل کرنے کے لئے تعلیم یافتہ افراد کو یورپ اور امریکہ بھیجا گیا۔ مشرقی پاکستان کی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہاں تعلیم یافتہ‘ ذہین اور تخلیق کار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں بہت جلد‘ مضبوط بنیادوں پر فلمی صنعت قائم ہو گئی۔ مختلف لوگوں نے فلم سازی میں تجربات کئے اور بہت اچھی اور کامیاب فلمیں بنائیں۔

نذیر احمد صاحب سے ہماری ملاقات لاہور میں ہو چکی تھی۔ وہ انتہائی قابل اور باصلاحیت آدمی تھے۔ اس وقت ان کی عمر 34-35 سال کے لگ بھگ ہو گی مگر دنیا دیکھ چکے تھے۔ خوش شکل آدمی تھے اور بہت اچھی باتیں کرتے تھے۔ کارپوریشن کے مینجنگ ڈائریکٹر خیرُ الکبیر صاحب بھی جوان العمر تھے۔ سانولا رنگ‘ بڑی بڑی آنکھیں‘ دُبلا پتلا جسم‘ قد بھی زیادہ اونچا نہیں تھا۔ سیاہ مونچھیں ان کے چہرے پر بہت بھلی لگتی تھیں جبکہ نذیر احمد داڑھی مونچھ دونوں سے آزاد تھے۔ خیرُ الکبیر صاحب نے اپنی بیگم سے بھی ملاقات کرائی۔ وہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور ڈھاکا میں ایک بہت اچھّا انگلش میڈیم اسکول چلا رہی تھیں۔ مگر اوّلین ملاقات کے وقت ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کچھ عرصے بعد اس اسکول کے لئے ہمیں ایک خدمت سرانجام دینی پڑے گی۔

خوبرو اداکار اعجاز اور میڈم نور جہاں کی شادی بہت خاموشی سے ہوئی تھی۔ یہ اسکینڈل تو عام تھا مگر دونوں پُر زور تردید کر رہے تھے۔ واقفان حال کا کہنا تھا کہ دیکھ لینا۔ ایک دن یہ شادی ہو کر رہے گی۔ جب ہمارے کانوں تک

باوثوق ذرائع سے' یہ خبر پہنچی تو ہم نے اپنے بے تکلّف دوست اعجاز سے تصدیق چاہی۔ وہ صاف مکر گئے۔ بہت صفائیاں پیش کیں مگر پھر ایک یہ افواہ حقیقت میں بدل گیا۔ اعجاز اور نور جہاں کی شادی کا راز احتیاط کے باوجود فاش ہو گیا تو دونوں کو ماننتے ہی بنی۔ یار لوگوں نے بہت کچھ تبصرے کئے۔ جتنے منہ' اتنی باتیں لیکن ان دونوں کی باہمی محبت اور گھریلو زندگی دیکھ کر سارے اندیشے دور ہو گئے تھے۔ نور جہاں نے اعجاز کی خواہش پر فلموں میں اداکاری ترک کر دی تھی۔

انہوں نے اعجاز سے کہا"جو جی' موسیقی میری جان ہے' میری روح ہے۔ میں دنیا چھوڑ سکتی ہوں گانے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی لیکن اگر تم کہو گے تو میں گانا بھی چھوڑ دوں گی۔ اب یہ تم پر منحصر ہے۔"

اعجاز نے یہ سُن کر ان کے جذبے کو خلوصِ دل سے سراہا اور انہیں گلوکاری کی اجازت دے دی۔ اس طرح ان دونوں کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ نور جہاں کو دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ ملکۂ ترنم' برّصغیر کی عظیم ترین فنکارہ' اسکرین کی رانی' نور جہاں ہیں۔ گلبرگ میں ان کی کوٹھی پر ایک خالص گھریلو گھر کا گمان ہوتا تھا۔ جہاں نور جہاں سادہ لباس پہنے' سارے کام خود کرتی یا کراتی تھیں۔ اعجاز کی پسند کے کھانے خود اپنے ہاتھ سے پکاتی تھیں اور واقعی لاجواب پکاتی تھیں۔ ان کے ہاتھ کی بھنی ہوئی مرغی جیسا ذائقہ ہم نے پھر کبھی نہیں چکھا۔ وہ پانچوں وقت کی نماز ادا کرتی تھیں۔ روزے رکھتی تھیں۔ پابندی سے قرآن شریف کی تلاوت کرتی تھیں۔ سب عام گھریلو عورتیں بھی ایسی مکمل نہیں ہوتیں جیسی کہ نور جہاں بن چکی تھیں۔ یہ نور جہاں کا ایک بالکل نیا اور انوکھا روپ تھا۔ ہم اعجاز کے دوست تھے اس لئے ان کے گھر جاتے رہتے تھے۔ اور یہ سب انقلابات ہمارے چشم دید ہیں۔ ان ہی دنوں ایک روز اے مجید صاحب نے ہمیں بتایا کہ ڈھاکا سے حمید کا فون آیا ہے۔ وہ آپ سے ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔"

اسی رات حمید صاحب نے ہمارے گھر پر فون کیا اور کہا کہ خیرُالکبیر صاحب کی بیگم اپنے سکول کے لئے فنڈ جمع کرنے کی غرض سے ڈھاکہ میں ایک پروگرام پیش کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ملکۂ ترنم نور جہاں اور رقص کی رانی نیلو اس امدادی پروگرام میں شرکت کریں اور عنداللہ ماجور ہوں۔

ہم نے انہیں کہا"بھائی۔ میڈم نور جہاں ایسی تقریبات میں نغمہ سرا نہیں ہوتیں۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔"

وہ بولے ''یار تم کوشش کرو گے تو یہ مشکل آسان ہو جائے گی۔ یہ تو ثواب کا کام ہے۔ میڈم سے میری جانب سے بھی گزارش کرو۔ مجید سے بھی کہلواؤ۔''

مجید صاحب اور ان کی بیگم ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے کہ یہ کام ضرور ہونا چاہئے۔ میڈم سے تو براہ راست بات کرنے کی ہمّت نہ ہوئی کیونکہ وہ من موجی شخصیت ہیں۔ گھڑی میں تولہ' گھڑی میں ماشہ' ایک بار انکار کر دیا تو پھر یہ اقرار میں نہیں بدل سکتا۔ اس لئے ہم نے اعجاز درّانی سے بات کی۔

وہ بولے ''آفاقی۔ تم جانتے ہو کہ وہ ایسے فنکشنز میں نہیں گاتیں۔''

ہم نے کہا ''مگر یہ تو ایک خصوصی تقریب ہے۔ ان لوگوں نے بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ دعوت دی ہے' اس طرح مشرقی پاکستان کے لوگوں میں خیر سگالی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ تم کوشش کرو گے تو بھابی مان جائیں گی۔''

پہلا مرحلہ تو اعجاز کو منانے کا تھا۔ ہم نے اتنی جان کھائی کہ وہ تنگ آ گئے۔

''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے یار۔ میں بات کروں گا۔''

''بات نہیں کرو گے' رضامند کرو گے۔''

اعجاز کا جادو ان دنوں میڈم نور جہاں کے سر چڑھ کر بولتا تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ اعجاز کہیں اور وہ نہ مانیں۔ جب اعجاز نے ہمیں یہ خوشخبری سنائی تو ہم نے کہا۔

''دیکھا۔ ہم نہ کہتے تھے کہ وہ تمہاری کوئی بات نہیں ٹالیں گی۔''

ہم نے یہ خبر فوراً مجید صاحب تک پہنچائی۔ انہوں نے اسی وقت چٹاگانگ کے لیے ٹرنک کال بُک کرا دی جہاں حمید صاحب کا ہیڈ آفس تھا۔

انہیں پہلے تو یقین ہی نہ آیا پھر انہوں نے فوراً یہ اطلاع خیر ُالکبیر صاحب کے گوش گزار کر دی۔ انہوں نے اپنی بیگم تک پہنچائی جنہوں نے فوراً اس پروگرام کی تفصیلات طے کرنی شروع کر دی۔

یہ مشکل مرحلہ تو طے ہو چکا تھا۔ اب نیلو کو رضامند کرنے کا مسئلہ تھا۔ ہم نے نیلو سے بات کی۔ وہ تو رضامند تھیں مگر

انہوں نے اپنی امی کو رضامند کرنے کی شرط رکھ دی۔ وہ ایک سادہ لوح خاتون تھیں۔ ہمارے ساتھ خاصا میل ملاپ تھا اور ہمارے بارے میں ان کی رائے بھی اچھی تھی۔ نیلو اس زمانے میں بہت مصروف ہیروئن بن چکی تھیں۔ رتن کمار کے ساتھ ان کی فلم ''ناگن'' حددرجہ مقبول ہوئی تھی اور نیلو سُپر اسٹار کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں بھی ان کا چرچا تھا۔ ''ناگن'' کی کامیابی کے بعد وہ رتن کمار کے بھائی سیّد وزیر علی کی فلموں کی لازمی ضرورت بن چکی تھیں اور اسی زمانے میں یہ خبریں بھی گرم تھیں کہ وہ اور رتن کمار ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔

نیلو کی والدہ رضامند ہو گئیں تو ہم نے خوشی خوشی جا کر یہ نوید نیلو کو سنادی۔ نیلو مسکرائیں، کچھ سوچا پھر پوچھا ''میڈم نورجہاں کے ساتھ کون جارہا ہے؟''

''اعجاز۔''

''تو پھر میرے ساتھ رتن کمار کو جانا چاہیے کیونکہ آج کل ہماری فلمی جوڑی بہت مقبول ہے۔ سکول والوں کو بھی اس سے فائدہ ہوگا۔''

ہم نے عرض کیا ''مگر اعجاز تو اس لیے ہمراہ جارہے ہیں کہ وہ میڈم کے شوہر ہیں۔''

مگر نیلو اصرار کرنے لگیں بلکہ انہوں نے یہ شرط لگادی کہ وہ اس صورت میں ڈھاکا جائیں گی جب رتن کمار کو بھی مدعو کیا جائے۔

ہم نے متعلقہ لوگوں تک ان کا یہ مطالبہ پہنچادیا۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ان سے کلیئرنس حاصل کرنے کے بعد ہم نے رتن کمار سے بات کی۔

رتن کمار ایک شائستہ، تعلیم یافتہ اور خوش مزاج نوجوان تھے مگر وہ اپنے والد عباس اجمیری صاحب کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔

کہنے لگے ''آفاقی صاحب۔ آپ ڈیڈی سے بات کرلیجئے۔''

ہم نے کہا'' بھائی تم لڑکا ذات ہو۔ ڈیڈی سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے اور انہیں بھلا کیا اعتراض ہوگا۔''

''پھر بھی۔ میں ان کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ آپ ان سے بات تو کریں'' ہمیں غصّہ تو بہت آیا مگر مصلحتاً پی گئے۔

عبّاس اجمیری صاحب بذاتِ خود ایک وضع دار اور شفیق بزرگ تھے۔ انہوں نے رتن کمار پر بچپن ہی سے بہت توّجہ دی تھی اور ان ہی کی جدوجہد کے باعث بمبئی میں رتن کمار کو انتہائی شہرت یافتہ چائلڈ سٹار بننے کا موقع ملا تھا۔ وہ رتن کمار سے بہت محبت کرتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ بڑے ہو کر بھی رتن کمار ان ہی کے ساتھ ایک کمرے میں سوتے تھے۔ کوئی اپنی لڑکی کی بھی کیا نگہداشت کرتا ہوگا جس طرح کہ عبّاس صاحب، رتن کی نگرانی کرتے تھے۔

عباس اجمیری صاحب مان تو گئے مگر یہ شرط رکھ دی کہ وہ بھی رتن کمار کے ساتھ جائیں گے اس لیے ان کے ٹکٹ اور بعام و قیام کا بھی بندوبست کیا جائے۔

ہم نے کہا ''عباس صاحب۔ یہ پروگرام فنڈ کے لیے مرتّب کیا جا رہا ہے اس لیے وہ لوگ کم سے کم اخراجات کرنا چاہتے ہیں اور پھر کچھ اچھّا بھی نہیں لگتا کہ ان سے ایک اور ٹکٹ اور قیام کا مطالبہ کیا جائے۔''

بولے ''میاں۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ آخر میڈم نور جہاں کے ساتھ بھی تو اعجاز صاحب اور نیلو کے ساتھ ان کی والدہ جا رہی ہیں۔''

ہم نے کہا ''وہ تو خواتین ہیں۔ ان کے ہمراہ ایک نگراں کا ہونا معمول بن چکا ہے۔''

انہوں نے پان کی گلوری منہ میں ڈالی اور مسکرائے پھر بولے ''مگر میرے بغیر رتن جائے گا نہیں۔ وہ میرے ساتھ رہنے کا عادی ہے۔ میرے بغیر وہ کچھ بھی نہیں کرتا۔''

''یہاں تک کہ لڑکیوں رومانس کے لیے بھی آپ سے اجازت لے لی ہے؟'' ہم نے کہا

فاتحانہ انداز میں بولے ''بالکل۔ جتنا بھی رومانس ہوا ہے وہ میرے علم میں ہے۔ اس کی کوئی بات مجھ سے چُھپی ہوئی نہیں ہے۔ ہر بات مجھے بتاتا ہے اور ہر قدم اٹھانے سے پہلے میری اشیرواد لیتا ہے'' پھر وہ مسکرائے ''نہایت سعادت مند لڑکا ہے۔ مجھ سے پوچھے بغیر کسی سے عشق نہیں لڑاتا''

''ماشاءاللہ، کیسے والد ہیں یہ'' ہم نے دل ہی دل میں کہا اور چائے پی کر چلے آئے۔

ہماری خواہش یہ تھی کہ عباس صاحب خود اپنے خرچ پر ڈھاکا جائیں تو مناسب ہوگا۔اس زمانے میں ان کا فلم ساز ادارہ ''فلمز حیات'' پورے عروج پر تھا۔ فلم سازی اور تقسیم کاری کا سلسلہ جاری تھا۔ ''ناگن'' کی کامیابی نے ان کی دھاک بٹھا دی تھی۔ خوشحالی کا دور دورہ تھا۔اس زمانے میں ہر فلم ساز کے پاس کار نہیں ہوتی تھی مگر ان کے گھر میں تین نئی اور قیمتی کاریں تھیں۔ مختلف کہانی نویس، موسیقار اور ہدایت کار ان کے لیے کام کر رہے تھے۔ وہ اس خاندان کا سنہرا دور تھا۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔ان کی فلموں کے خصوصی شو میں ان کا سارا خاندان موجود ہوتا تھا جنہیں دیکھ کر بہت دل خوش ہوتا تھا۔ فارغ البال' مسکراتے ہوئے چہرے۔ زیورات میں لدی ہوئی خواتین، نوکر چاکر، خدمت گار، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ اگر وہ اپنے ذاتی خرچ پر ڈھاکا چلے جاتے بلکہ رتن کمار کے اخراجات بھی خود اپنی جیب سے ادا کر دیتے تو ان کے لیے معمولی بات تھی اور اس بات کا میزبانوں پر بہت خوشگوار اثر ہوتا۔ مگر عباس صاحب نے ہماری یہ تجویز مسترد کر دی اور بولے ''بھائی آپ کا کیا جاتا ہے۔ آخر وہ لوگ کافی رقم اکٹھی کریں گے۔ اگر تھوڑا سا خرچ کر دیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی؟''

ہم نے یہ بات حمید صاحب اور خیرُالکبیر صاحب تک پہنچا دی۔ وہ لوگ میڈم نور جہاں کی شرکت کی خبر سے اس قدر خوش تھے کہ اس کے بعد ہر شرط منظور کرنے پر آمادہ تھے۔ان کے لیے تو میڈم نور جہاں کی رضامندی ہی سب سے بڑا انعام تھی۔ میڈم نور جہاں کی وہاں پوجا کی جاتی تھی۔

میڈم نور جہاں اپنے مخصوص سازندوں کے بغیر کوئی پروگرام نہیں کرتی تھیں۔ان کے استاد اور چار سازندے ہر گانے میں لازماً موجود ہوتے تھے۔

انہوں نے ہم سے بھی سازندوں کے بارے میں کہا مگر ہم نے کہا'' بھابھی وہ لوگ زیر بار ہو جائیں گے۔ مقصد تو زیادہ سے زیادہ رقم جمع کرنا ہے۔''

وہ بولیں '' مگر میں تو دوسرے سازندوں کے ساتھ گا ہی نہیں سکتی۔ خاص طور پر ہارمونیم والا تو میرا مزاج شناس ہونا ہی چاہیے۔

ہم نے کہا’’ڈھاکا میں بڑے بڑے اُستاد پڑے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا۔‘‘

اعجاز نے بھی ہماری تائید کر دی اس طرح یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ ڈھاکا میں تمام پروگرام مرتّب ہو چکا تھا۔ مجید صاحب نے ہم سے کہا’’آفاقی صاحب۔ آپ بھی جانے کے لئے تیار ہو جایئے۔ آپ کا ٹکٹ بھی آ رہا ہے۔‘‘

’’ہماری کیا ضرورت ہے۔ آرٹسٹ موجود ہیں۔‘‘

وہ بولے’’ان لوگوں کو سنبھالنے اور ان کے مسائل حل کرنے کے لیے آپ کا جانا ضروری ہے۔ یہ سب موڈی لوگ ہیں۔ ایسا نہ ہو وہاں عین وقت پر کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے اور سارا پروگرام ہی خطرے میں پڑ جائے۔‘‘

اس طرح ہم بھی اس قافلے میں منیجر کے طور پر شامل ہو گئے۔

ڈھاکا کا ائرپورٹ اُس زمانے میں ایک سادہ سی عمارت میں واقع تھا۔ آس پاس دور دور تک ہریالی اور سبزہ زار کا منظر نہایت خوشگوار تھا۔ یہ شہر سے کافی فاصلے پر تھا۔ ایک سڑک بل کھاتی، مڑتی مڑاتی، مختلف علاقوں سے گزرتی تھی اور سیدھی (یعنی توڑ موڑ کے ساتھ) شاہ باغ ہوٹل پہنچ کر دم لیتی تھی جو اُس زمانے میں ڈھاکا کا بہترین ہوٹل تھا۔ راستے میں ناریل اور بانس کے درخت، کیلے کے درخت اور دوسرے سرسبز اور قد آور درختوں کی بہار دیکھنے کے لائق تھی۔ سڑک بعض جگہ چھوٹے چھوٹے تالابوں کے پاس سے گزرتی تھی۔ انہیں بنگالی زبان میں ’’پوکر‘‘ کہتے ہیں۔ دراصل یہ گڈھے تھے جن میں بارش کا پانی اکٹھا ہو جاتا تھا۔ اس میں مچھلیاں یا تو خود بخود ہی پیدا ہو جاتی تھیں یا پھر کوئی اور ان میں دو تین مچھلیاں لا کر چھوڑ دیتا تھا۔ کچھ عرصے بعد یہ مچھلیاں دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی ہوئی سینکڑوں ہزاروں کی تعداد تک پہنچ جاتی تھیں۔ یہ پوکر آس پاس کے بچّوں کی تفریح گاہ بھی تھے۔ وہ اس میں غوطے لگاتے اور تیراکی کرتے تھے۔ بڑے بوڑھے جال یا بنسی ڈال کر بیٹھ جاتے اور مچھلیاں پکڑتے رہتے تھے جو ان کے لیے خوراک کا مفت بندوبست بھی تھا۔ عورتیں ان کے ارد گرد جمع ہو کر گپ شپ کرتیں۔ کپڑے دھوتیں یا پھر پینے کے لیے برتن بھر بھر کر یہ پانی لے جاتی تھیں۔ گویا یہ ’’پوکر‘‘ یا ’’پھوکر‘‘ کثیر المقاصد تھا اور اس کے بنانے پر ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہوتا تھا۔ گڑھے قدرتی تھے یا لوگ مٹّی کھودنے کی غرض سے یہ گڑھے بنا دیتے تھے۔ بارش آسمان سے برس جاتی تھی۔ لیجئے ’’پوکر‘‘ تیار ہے۔

یہ پتلی سی پختہ سڑک بل کھاتی ہوئی مختلف دھان کے کھیتوں، باغوں اور سبزہ زاروں کے درمیان سے گزرتی تھی۔ اس میں بعض اوقات تو اتنے زیادہ موڑ آجاتے تھے کہ دل گھبرا جاتا تھا۔ جب جنرل اعظم خان مشرقی پاکستان کے گورنر بنے تو انہوں نے اپنے خلوص اور خدمت سے لوگوں کا دل جیت لیا۔ وہ آج بھی جنرل اعظم خان کو یاد کرتے ہیں۔ کاش پاکستان کو جنرل اعظم جیسا مخلص، ان تھک اور دیانت دار حکمراں نصیب ہو جاتا تو نہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہوتا اور نہ ہی ہمارے ملک کا یہ حال ہوتا۔ جن دنوں جنرل اعظم خان مشرقی پاکستان کے گورنر تھے اسی زمانے میں انگلستان کی ملکہ الزبتھ پاکستان کے دورے پر آنیوالی تھیں۔ انہیں مشرقی پاکستان کا دورہ بھی کرنا تھا۔ جنرل صاحب کو خیال گزرا کہ ائرپورٹ سے جو ٹیڑھی میڑھی سڑک گورنمنٹ ہاؤس اور شاہ باغ ہوٹل تک جاتی ہے اُسے کشادہ، بالکل سیدھی اور دو رویہ ہونا چاہیے۔ ملکہ کے آنے میں چھ ہفتے کا وقت تھا۔ انہوں نے متعلقہ افسروں کی ایک میٹنگ طلب کی اور ان سے کہا کہ ملکہ کی آمد کے موقع پر یہ سڑک کشادہ، دو رویہ اور بالکل سیدھی ہو جانی چاہیے۔

افسروں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر کہا "صاب۔ یہ کیسے ہونے کو مانگتا۔ اتنے تھوڑے ٹائم میں یہ کام بالکول نہیں ہونے سکتا۔"

جنرل صاحب نے فرمایا "دیکھو بھائی۔ نہیں ہونے سکتا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم فوجی آدمی ہیں۔ صرف ٹارگٹ مقرر کر کے اسے حاصل کر لیتے ہیں۔ کیسے ہونے سکتا اور ہونے سکتا یا نہ ہونے سکتا، ہماری کتابوں میں نہیں ہے۔"

جنرل صاحب نے سڑک کا تخمینہ بنوایا۔ نقشہ تیار کرایا اور دوسرے دن انجینئرز اور پی ڈبلیو ڈی کے محکمے کو حکم دیا کہ ایک مہینے کے اندر یہ سڑک گورنمنٹ ہاؤس اور شاہ باغ ہوٹل تک مکمل ہو جانی چاہیے۔ دو رویہ سڑک کے درمیان میں گھاس کے تختے بھی ہوں اور سڑک کے آس پاس خوبصورت درخت، پودے اور پھول بھی نظر آئیں۔

جنرل اعظم میں ایک قائدانہ خوبی یہ تھی کہ وہ دوسروں کو بخوشی کام کرنے پر آمادہ کر لیا کرتے تھے۔ اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ خود جنرل صاحب بھی خاکی نیکر اور خاکی قمیض پہنے، سر پر ہیٹ رکھے وہاں کھڑے رہتے تھے یا پھر مستقل چکّر لگاتے رہتے تھے۔ دن رات کام جاری تھا۔

ہم بھی ایک بار ان ہی دنوں میں ڈھاکا گئے۔ ائرپورٹ سے شام ڈھلے ہوٹل شاہ باغ کی طرف چلے تو راستے میں سڑک

تعمیر ہوتے دیکھی۔ رات کا وقت تھا اور لاتعداد مزدور گیس کے ہنڈے جلائے ان کی روشنی میں سڑک کی تعمیر میں مصروف تھے۔ ہمارے پوچھنے پر بتایا گیا کہ یہ سڑک ایک ماہ کے اندر مکمل کرنی ہے۔ جنرل صاحب کا حکم ہے۔

ایک ماہ بعد جب ملکہ انگلستان ڈھاکا کے ائرپورٹ پر ہوائی جہاز سے باہر نکلیں اور سلامی وغیرہ لینے کے بعد گورنمنٹ ہاؤس کے لیے روانہ ہوئیں تو یہ دورویہ سڑک بالکل ناک کی سیدھ میں ہوٹل شاہ باغ اور گورنمنٹ ہاؤس تک جاتی تھی۔ اس کے درمیان والی پٹّی پر گھاس اور پھول اُگے ہوئے تھے۔ کوئی بھی نہیں جان سکتا تھا کہ ایک ڈیڑھ ماہ پہلے یہ سڑک کس قسم کی تھی۔ جنرل اعظم نے اس معاملے میں بھی جادو کر دکھایا تھا۔
ہم ڈھاکا ائرپورٹ پر ہوائی جہاز سے باہر نکلے تو جان میں جان آئی۔ راستے میں ائرپوکٹس کی وجہ سے جہاز خوب اُتھل پُتھل ہوتا رہا تھا۔ ہم ضبط کر کے بہادر بنے بیٹھے رہے مگر اندر ہی اندر ڈر کے مارے بُرا حال تھا۔ ڈھاکا ائرپورٹ پر اُترے تو جان میں جان آئی۔

میڈم نورجہاں اور نیلو کے ڈھاکا پہنچنے کی خبر عام نہیں کی گئی تھی۔ محض مخصوص لوگوں تک ہی محدود تھی۔ سکول کی انتظامیہ اور ایف ڈی سی کے چند اعلیٰ حکام کے سوا دوسرے اس سے بے خبر ہی تھے۔ مگر خیرالکبیر صاحب کا یہ خیال بالکل غلط ثابت ہو گیا۔ جب ڈھاکا ائرپورٹ پر لوگوں کا ایک ہجوم استقبال کے لیے موجود پایا۔ ان میں فلمی صنعت کے ممتاز لوگ، صحافی، تاجر، صنعتکار اور موسیقی سے تعلق رکھنے والے دوسرے حضرات بھی شامل تھے۔ خیرالکبیر، نذیر احمد اور حمید صاحب اس بے پناہ ہجوم کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ مگر وہاں مجمع کو قابو میں کرنے کے لیے پولیس بھی موجود تھی۔ ائرپورٹ پر ہوائی جہاز سے باہر نکلتے ہی سب سے پہلے تو ائرپورٹ کے عملے سے واسطہ پڑا۔ یہ سب خواتین و حضرات اپنے فرائض کو بھول کر فن کاروں کو دیکھنے اور ان سے آٹوگراف حاصل کرنے کے چکر میں لگ گئے۔ آٹوگراف بُک تو بہت کم لوگوں کے پاس تھی۔ کچھ لوگوں نے کپڑوں پر، رومالوں پر، کاغذات پر، نوٹوں پر اور ٹکٹوں پر بھی آٹوگراف حاصل کر لیے۔ جس کے پاس کچھ بھی نہ تھا وہ قلم سنبھالے، ہاتھ پھیلائے سامنے کھڑا تھا کہ میڈم جی۔ میرے ہاتھ پر آٹوگراف دے دیں۔ دیوانگی اور والہانہ پن کا ایک عجیب مظاہرہ تھا۔ پولیس اور سکیورٹی والے بڑی

مشکل سے ہم لوگوں کو لیکر ائیر پورٹ کے باہر پہنچے جہاں بے شمار کاریں قطار اندر قطار کھڑی ہوئی تھیں۔ ہر کار والا بڑے خلوص اور اعتماد سے دعوت دے رہا تھا کہ اس کار میں بیٹھ جایئے مگر نذیر احمد صاحب بلند آواز میں شور مچاتے پھر رہے تھے کہ کسی کار میں نہ بیٹھنا۔ آپ لوگوں کے لیے کاریں دوسری جانب کھڑی ہیں۔ ہم سب یکجا کھڑے تھے مگر ہجوم کا ایک ریلا آیا اور ہم سب بکھر کر رہ گئے۔ زیادہ پریشانی فن کاروں کی طرف سے تھی۔ عباس اجمیری صاحب اپنے بیٹے رتن کمار کی انگلی پکڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں صرف رتن کی انگوٹھی رہ گئی۔ رتن کمار اپنے سالم ہاتھ اور اپنے پورے جسم سمیت غائب ہو چکا تھا۔ خیر الکبیر صاحب فوراً بھاگے، کچھ کارندے بھی دوڑائے۔ کچھ فاصلے پر ایک کار میں رتن کمار صاحب بڑے مزے سے کار میں ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ انہیں زبردستی کار سے اتارا گیا۔ کار والا کہہ رہا تھا کہ یہ میرے ساتھ جائیں گے۔ خود ان ہی سے پوچھ لو۔ اُدھر خیر الکبیر صاحب ان کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر کھینچ رہے تھے۔ رتن کمار کی تلاش میں ہاہاکار مچ گئی تھی مگر بے چارے عباس اجمیری کا کسی کو خیال نہ تھا۔ کافی دیر کے بعد وہ ایک سٹیشن ویگن میں بیٹھے پائے گئے جو مسافروں کو شہر کے ٹرمینل لے جانے پر مامور تھی۔

نور جہاں اور اعجاز بہت مضبوطی سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ ان دونوں کی محبت کا اس زمانے میں یہی انداز تھا کہ جہاں کہیں بیٹھتے، ایک دوسرے کے بازو میں بازو ڈال کر یا ہاتھ تھام کر بیٹھتے تھے۔ گھر ہو، سٹوڈیو ہو یا کوئی اور جگہ، ان کا یہ انداز کبھی نہیں بدلتا تھا۔ یار لوگ کہتے تھے "میڈم نے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے کہ کہیں بھاگ نہ جائے۔"

لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں ان دونوں کی محبت دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ میڈم نور جہاں جب اعجاز کی طرف دیکھتی تھیں تو ان کی آنکھوں سے اُلفت اور پیار اُبلتا ہوا نظر آتا تھا۔ ان کے دیکھنے ہی سے ان کے دلی جذبات کا اظہار ہو جاتا تھا۔ یہ بھی مبالغہ نہیں ہے کہ وقتی طور پر میڈم نور جہاں نے ممکن ہے، زندگی کے مختلف مراحل میں بعض لوگوں کو پسند کیا ہو۔ ان سے محبت بھی کی ہو۔ مگر جہاں تک اعجاز کا تعلق ہے، ہمارے خیال میں انہوں نے اعجاز سے عشق کیا تھا۔ وہ اس کی بات مانتیں اور جس حد تک اس کی خواہشات کا احترام کرتیں، یہ سب اعجاز سے ان کے عشق کا ثبوت تھا۔ غالباً انہوں نے زندگی میں پہلی بار عشق کیا تھا۔ جو اُن کا پہلا اور

آخری عشق تھا۔اس عشق نے انہیں بہت ستایا۔رسوا کیا۔اپنے وقار اور آن کو قربان کرنے پر مجبور کیا۔اس عشق سے پھر انہیں زندگی بھر چھٹکارا نہیں مل سکا۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ میڈم نور جہاں نے زندگی میں کبھی کسی کی منّت سماجت نہیں کی۔ کسی کی من مانی تسلیم نہیں کی۔اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات تسلیم نہیں کی بلکہ واقعات گواہ ہیں کہ اعجاز کے معاملے میں ان کے تمام اصول دھرے کے دھرے رہ گئے۔تمام دفاعی حصار ایک ایک کرکے ٹوٹ گئے۔انہوں نے ادکارہ فردوس کے ساتھ اعجاز کا کھلے عام رومان دیکھا اور برداشت کیا۔اعجاز نے ان کی مرضی کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔جب اعجاز نے پنجابی فلم 'ہیر رانجھا '' بنائی تو میڈم نور جہاں یہ اعلان کر چکی تھیں کہ وہ کسی ایسی فلم کے لیے گانا نہیں گائیں گی۔ان کے اس فیصلے سے فلمی دنیا میں کھلبلی مچ گئی کیونکہ فردوس اس زمانے میں پنجابی فلموں کی چوٹی کی اداکارہ تھیں اور نور جہاں کی آواز کے بغیر کسی پنجابی فلم کی موسیقی مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔

فردوس واحد اداکارہ ہے جس نے نور جہاں کی ناراضگی، قہر، نفرت، بائیکاٹ، سبھی کچھ سہہ لیا اور پھر بھی فلمی دنیا میں چٹان کی طرح اپنے مقام پر جمی رہی۔اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ وہ غضب کی فن کارہ اور پنجابی فلموں کے تماشائیوں کی راج دلاری تھی۔دوسرا سبب غالباً یہ تھا کہ اسے اس پیار کی جنگ میں اعجاز کی حمایت حاصل تھی جو ہر حالت میں اس کے شانہ بشانہ کھڑے رہنے کا اعلان کر چکا تھا۔کوئی اور ہوتا تو میڈم کے قہر و غضب کا نشانہ بن کر خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتا۔مگر وہ اعجاز تھا۔جس کے لیے نور جہاں کے دل میں عشق کا گوشہ موجود تھا۔ساری فلمی تاریخ میں فردوس کی مثال ایک واحد مثال ہے جو نور جہاں کی نفرت اور مخالفت کے باوجود فلموں میں کام کرتی رہی اور مقبول رہی۔ورنہ بڑے بڑے فنکار، سٹوڈیو اونر اور موسیقار نور جہاں کی خفگی کی نظر دیکھ کر ہی لرز جاتے تھے۔نور جہاں نے کتنے ہی لوگوں کے مقدّر اور مستقبل کا فیصلہ کر دیا تھا مگر فردوس کے آگے نور جہاں نے ہار مان لی۔

نور جہاں اعلان کر چکی تھیں کہ وہ فردوس کے لیے کسی فلم میں اپنی آواز مستعار نہیں دیں گی۔''ہیر رانجھا'' کی ہیروئن فردوس تھی جو نور جہاں کے شوہر اور دلبر اعجاز کے ساتھ ہیروئن کا کردار کر رہی تھی۔اعجاز کو نور جہاں کی ضدّی طبیعت کا علم تھا اس لیے ''ہیر رانجھا'' کے گانوں کی صدابندی کے لیے مالا کی خدمات حاصل کی گئیں۔یہ معاملہ ایسا تھا جس میں اعجاز اور نور جہاں کے قریب ترین دوست احباب بھی مداخلت نہیں کر سکتے تھے۔یہ ان دونوں

کا انتہائی ذاتی اور جذباتی مسئلہ تھا۔اس لیے کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس موضوع پر نور جہاں سے بات کرتا۔
اعجاز نے مالا کو گلوکاری کے لیے طلب کیا تو وہ غریب کانپ کر رہ گئی۔ سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کون مول لے سکتا ہے۔ پاکستان کی فلمی صنعت میں رہنے والی کوئی ہستی نور جہاں کے غیظ و غضب کی تاب کہاں لا سکتی تھی۔مالا نے لرزہ براندام ہو کر معافی چاہی مگر دوسری طرف اعجاز فلم ساز تھا۔اس سے بڑھ کر یہ کہ خواجہ خورشید انور اس فلم کے موسیقار تھے۔ان کے بلاوے پر نہ حاضر ہونے کی جرأت اور گستاخی بھلا کون کر سکتا تھا۔؟

مالا غریب کی دونوں طرح مشکل تھی۔نہ جائے رفتن،نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا۔اس نے نور جہاں کے حضور میں حاضر ہو کر دست بستہ معافی مانگی اور اپنی مشکل بیان کی۔نور جہاں اپنے ذاتی معاملات میں کسی دوسرے کی مداخلت گستاخی تصوّر کرتی تھیں۔

اس لئے مالا سے کہا ''خواجہ خورشید انور بڑے مہان موسیقار ہیں۔انہوں نے بلایا ہے تو کیوں نہیں جاؤ گی۔مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔''
پھر بھی مالا کا دل نہیں مان رہا تھا۔
جس روز ایورنیو سٹوڈیوز میں فلم ''ہیر رانجھا'' کے لیے پہلے گانے کی صدابندی شروع ہونے والی تھی۔موسیقار، سازندے گلوکارہ مالا سبھی تیار تھے کہ اچانک نور جہاں کی کار سٹوڈیو کے باہر آ کر رُکی۔یہ خبر سٹوڈیو میں فوراً پھیل گئی اور سب دَم سادھ کر رہ گئے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔
نور جہاں اپنی خوش رنگ،بے داغ،نہایت خوبصورتی کے ساتھ بندھی ہوئی ساڑی میں ملبوس خراماں خراماں سٹوڈیو میں داخل ہوئیں تو مالا کی روح خشک ہو گئی۔

نور جہاں نے ریکارڈنگ روم میں پہنچ کر چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر مالا کو رخصت ہو جانے کا اشارہ کیا۔مالا کی تو جیسے زندگی بھر کی دعائیں قبول ہو گئیں۔وہ جھٹ پٹ کار میں سوار ہوئی اور سٹوڈیو سے رخصت ہو گئی۔
نور جہاں مسکراتی ہوئی ریکارڈنگ ہال میں داخل ہوئیں۔خواجہ خورشید انور کو سلام کیا اور کہا ''خورشید صاحب

''ہیر رانجھا'' کے گانے میں گا رہی ہوں۔''

اس طرح نور جہاں نے اپنی زندگی کی عظیم ترین شکست تسلیم کرلی۔ صرف اعجاز کے عشق کی خاطر۔

اس کے بعد بھی معاملات نے بہت طول کھینچا مگر اعجاز کے ساتھ نور جہاں نے کوئی گستاخی یا نازیبا حرکت نہیں کی۔ لوگ کہتے ہیں اس لیے کہ وہ اعجاز کے بچّوں کی ماں تھیں۔

مگر یہ دلیل سیّد شوکت حسین رضوی کے معاملے میں بالکل الٹی نظر آتی ہے۔ وہ بھی نور جہاں کے بچّوں کے باپ تھے اور نور جہاں ان کے بچّوں کی ماں تھیں۔ مگر جب ان دونوں کے مابین جنگ شروع ہوئی تو معاملہ زبانی دشنام اور الزام تراشی سے لیکر عدالتوں تک پہنچ گیا۔ نور جہاں نے شوکت صاحب کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی تھی۔

اعجاز کے معاملے میں ایک ادا جو غالباً نور جہاں کو پسند آگئی ہوگی یہ تھی کہ نجی محفل ہو یا منظر عام ہو۔ اعجاز نے کبھی نور جہاں اور اپنے باہمی اختلافات کے بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اعجاز کا کوئی قریب ترین دوست بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ کسی غیر محتاط وقت میں کبھی اعجاز نے اپنے اور نور جہاں کے تعلقات کو موضوعِ بحث بنایا ہو یا نور جہاں کے بارے میں کوئی تبصرہ کیا ہو۔ اگر نور جہاں نے اعجاز کے ساتھ عشق کے تقاضے نبھائے تو اعجاز نے بھی شرافت اور شائستگی کے اصولوں کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ بہر حال ان دونوں کی علیحدگی اور طلاق ایک افسوسناک واقعہ تھا۔ ان کے قریبی لوگوں کے لیے تو یہ ایک المناک سانحہ سمجھ لیجئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت اچھّا ہوتا۔ جس طرح کہ سیّد شوکت حسین رضوی کے ساتھ علیحدگی اور اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات رونما نہ ہوتے تو کتنا اچھّا ہوتا؟ مگر یہ سب انسانی خواہشات ہیں۔ حقائق اور واقعات پر کسی کا بس نہیں ہوتا۔

تذکرہ ڈھاکا ائرپورٹ کا ہو رہا تھا اور اشہبِ خیال کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ڈھاکا ائرپورٹ کے ہنگامے میں اعجاز اور نور جہاں بڑے مطمئن پُرسکون اور مسرور نظر آرہے تھے۔ انہیں ہجوم نے دھکّے نہیں لگائے تھے، وہ نور جہاں کا مقام پہچانتے تھے۔ عالمِ بے خودی میں بھی انہیں نور جہاں کی عظمت اور شخصیت کا احساس تھا۔ چند لوگوں نے ان دونوں کے گرد حصار بنالیا اور بڑے آرام سے ایک بڑی سی قیمتی کار میں لے جاکر بٹھا دیا۔

اب نیلو کی تلاش شروع ہوئی۔ نیلو بیگم اپنی والدہ کے ہمراہ تھیں۔ ہجوم نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر خوش

ہورہے تھے۔ آوازیں کس رہے تھے، داد و تحسین پیش کررہے تھے مگر تمیز و تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ خیر الکبیر صاحب اپنے رضاکاروں کے ساتھ تلاش کرتے ہوئے اس گوشے میں بھی پہنچ گئے اور نیلو اوران کی والدہ کو بڑی حفاظت سے لے جا کر کار میں بٹھا دیا۔ ہم پہلے ہی اعجاز کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس طرح یہ مختصر سا قافلہ ہوٹل شاہ باغ کی طرف روانہ ہو گیا۔

فلمی شخصیتوں کی آمد اور موجودگی بھی خوشبو کی طرح ہوتی ہے کہ چھپائے نہیں چھپتی۔ خدا جانے آس پاس کے لوگوں کو ان کی آمد کی خبر کیسے ہو جاتی ہے؟

ہوٹل شاہ باغ کے دروازے کے باہر اور آس پاس بھی مشتاقانِ دید کا مجمع تھا۔ نہ جانے کب سے وہ اپنے من پسند فن کاروں کو دیکھنے کی آس میں وہاں کھڑے تھے۔ کاروں میں سوار فن کاروں کو دیکھا تو زور زور سے تالیاں بجائیں۔

ہوٹل کے اندر داخل ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا کیونکہ گیٹ پر بھاری پہرا تھا۔

ہوٹل کے اندر بھی ڈھاکا کے خوشحال اور بااثر لوگ اور ان کے اہل خانہ موجود تھے۔ مگر وہ دور دور سے ہی دیکھتے رہے۔ نزدیک آنے کی اجازت نہ دی گئی۔ ہوٹل کی دوسری منزل پر ہم لوگوں کو چار کمرے ایک ہی قطار میں دیئے گئے تھے۔ ایک میں اعجاز، نور جہاں، دوسرے کمرے میں رتن کمار اور ان کے والد عباس اجمیری صاحب۔ تیسرے کمرے میں نیلو بیگم اور ان کی والدہ۔ چوتھا کمرہ ہمارے حصے میں آیا۔

ابھی ہم منہ ہاتھ دھو کر صوفے پر بیٹھے ہی تھے کہ وزیٹرز کی آمد شروع ہو گئی۔ پہلے نیلو ٹہلتی ہوئی آئیں۔ دروازہ کھٹکھٹایا

''اندر آجاؤ۔''

اجازت ملنے سے پہلے وہ کمرے میں آگئیں۔ چاروں طرف کا جائزہ لیا پھر بولیں ''اچھا کمرہ ہے۔ ویسا ہی ہے جیسا ہمارا کمرہ ہے۔''

ہم نے عرض کی ''ہوٹلوں میں سارے کمرے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر برابر والے کمرے۔''

''ٹھیک ہے'' وہ مسکرائیں ''آپ اکیلے ہیں۔ دیکھئے۔ ڈرنا نہیں۔ کوئی بات ہو تو آواز دے لینا۔ ساتھ والا کمرہ ہمارا ہے۔''

"شکریہ۔"

وہ رخصت ہوئیں تو رتن کمار ٹہلتے ہوئے آ گئے "بھئی واہ۔ آفاقی صاحب بڑا زوردار کمرہ ہے۔ آپ کا تو؟" وہ بولے۔

"زور والی کیا بات ہے اس کمرے میں؟" ہم نے پوچھا۔

بولے "مطلب یہ کہ بالکل اکیلے۔ کوئی پابندی ہی نہیں ہے۔ جو چاہے کریں۔ جب مرضی میں آئے سوئیں، جب چاہیں جاگیں۔"

"یہ تو ہے" ہم نے تسلیم کیا۔

"میں ساتھ والے کمرے میں ہوں۔ کوئی بات ہو تو بلا لینا۔"

"کس طرح؟" ہم نے پوچھا۔

"ارے بھئی یہ ٹیلی فون جو ہے نا۔ یہ ہمارے کمرے تک بھی چلا جاتا ہے۔ بس ہمارے کمرے کا نمبر گھما دینا۔"

"مگر ہم آپ کو بلائیں گے کیوں؟ کیا بات ایسی ہو گی کہ آپ کو بلانے کی ضرورت پیش آئے گی؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے "ہزار باتیں ہوتی ہیں یار' سمجھا کرو" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

چند لمحے بعد نیلو بیگم کی والدہ سُست روی سے چلتی ہوئی کمرے کے دروازے میں نمودار ہوئیں۔ وہ بھاری جسم کی' معصوم شکل خاتون تھیں۔ خود کو بہت ہوشیار سمجھتی تھیں۔ مگر بہت سادہ لوح تھیں۔

"آفاقی صاحب۔ تمہارا یہ کمرہ ہے؟" انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔

"جی ہاں۔ اندر آ جائیں۔"

وہ اندر آ گئیں "چنگا اے" انہوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا "ہمارا بھی ایسا ہی ہے بس"

"بیٹھیں۔ چائے منگاؤں؟"

"چائے کا کیا ہے وہ تو اُس کمرے میں بھی آ جائے گی۔ ہوٹل جو ہوا" وہ بھی رخصت ہو گئیں۔

کافی دیر کے بعد اعجاز اور نور جہاں مطالعاتی دورے پر نکلے۔ انہوں نے ہوٹل کی گیلری کا پورا چکّر لگایا۔ آس پاس کے مناظر اور ماحول کا جائزہ لیا۔ دوسرے کمروں کے نمبر دیکھے اور پھر ہمارے کمرے کے دروازے پر آ گئے۔

''ارے یار تم یہاں اکیلے کیا کر رہے ہو؟''

ہم نے کہا ''ہم اکیلے ہی آئے ہیں۔''

وہ مسکرائے ''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ادھر آجاؤ۔ ہمارے کمرے میں۔ ابھی مسز خیر الکبیر کا فون آیا تھا۔ وہ آنے والی ہیں۔''

ان کا کمرہ بھی ویسا ہی تھا مگر کچھ زیادہ بڑا اور بھرا بھرا الگ رہا تھا۔ کمرے میں بڑے بڑے لذیذ کیلوں کے گچھے لٹکے ہوئے تھے

''کیلے کھاؤ۔ یہاں بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میں تو چار پانچ کھا چکا ہوں'' ہم نے بھی دو کیلے کھائے۔ واقعی نہایت مزیدار تھے اور سائز اتنا بڑا کہ اصولاً تو یہ ایک دو کیلے کھانے سے پیٹ بھر جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ پیٹ کے اندر جا کر گھل جاتے ہیں۔ جب تک ہم لوگ ڈھاکا میں رہے خوب کیلے اور اناناس کھائے۔ ایک دن ہمارا اور اعجاز کا کیلے کھانے کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ مقابلہ یہ تھا کہ کون سب سے جلدی اور سب سے زیادہ کیلے کھاتا ہے۔

ریفری کے فرائض میڈم نور جہاں سر انجام دے رہی تھیں۔ ہم دونوں نے جھپٹ جھپٹ کر کیلے کھانے شروع کر دیئے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ڈیڑھ ڈیڑھ درجن تو کھا ہی لیے ہوں گے۔ یہ مقابلہ ٹیکنکل پوائنٹ پر ہم نے جیت لیا اس لیے کہ ریفری (میڈم) نے اعجاز کے ہاتھ سے کیلے چھین لیے اور کہا ''بس بس۔ بہت ہو گئی۔ اس طرح تو آپ دونوں بیمار پڑ جائیں گے۔''

ہوٹل میں آنیوالی تمام ٹیلی فون کالیں پہلے ہمارے کمرے میں آتی تھیں۔ ملنے کے خواہش مندوں کو ہم معقول بہانہ بنا کر یا عدیم الفُرصتی کا عُذر کر کے ٹال دیتے تھے۔ پریس اور فلم والوں کو بھی مناسب اور معقول جواب دیکر مطمئن کر دیا کرتے تھے۔ اسی شام خیر الکبیر صاحب، ان کی مسز، حمید صاحب اور کئی دوسرے لوگ چلے آئے۔ پہلا پروگرام اگلے روز شام کو ہونا تھا۔ اس کے لیے گانوں کا انتخاب کرنا اور پھر ان کی ریہرسل بھی ایک مسئلہ تھا۔ نیلو اپنے ڈانس کا میوزک ہمراہ لے گئی تھیں۔ انہیں ریہرسل کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ قدرت نے رِدھم اور رَقص کی لے ان کے جسم کے اندر ہی رکھ دی ہے۔ اِدھر میوزک چلا اور اُدھر نیلو کے لوچدار جسم نے ڈولنا اور بل کھانا شروع کر دیا۔ مسئلہ تو میڈم نور جہاں کا تھا۔

مسئلہ نہیں۔ مسائل کہیے۔ پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ کبھی یوں کسی تقریب میں براہِ راست نہیں گاتی تھیں۔ بڑی مشکل سے اعجاز کی بدولت رضامند ہوئی تھیں مگر کہے جارہی تھیں کہ اللہ خیر کرے۔ مجھے عادت نہیں ہے۔ دوسرے لوگ مسلسل تسلی دے رہے تھے کہ میڈم فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

دوسرا مسئلہ سازندوں کا تھا۔ ہارمونیم، طبلہ، وائلن، بنسری، سارنگی کون بجائے گا؟

مشرقی پاکستان کے بڑے بڑے موسیقار بھی عقیدت کے مارے آئے ہوئے تھے۔ وہ میڈم کو یقین دلا رہے تھے کہ انہوں نے بہت اچھے سازندوں کا بندوبست کیا ہے۔ آپ مطمئن رہیے۔ کچھ دیر بعد سازندے بھی آگئے۔ طبلہ، سارنگی، بنسری، وائلن، ڈھولک یہ تو خیر غنیمت تھے حالانکہ میڈم ان سے مطمئن نظر نہیں آرہی تھیں پھر بھی بقول ان کے ''کام چلانے کے لائق تھے'' مگر سب سے بڑا مسئلہ ہارمونیم بجانے کا تھا۔ ہارمونیم کے بغیر ریہرسل ممکن نہ تھی اور میڈم صرف ایک ہی ہارمونیم نواز کی سنگت میں گانے کی عادی تھیں جو اس وقت لاہور میں تھا۔ جب دو تین ہارمونیم نواز پیش کئے گئے اور سب کے سب فیل ہو گئے تو میڈم نے بڑے اطمینان سے کہا یوں تو کام نہیں چلے گا بھائی جان کچھ کرنا پڑے گا

''کیا کریں میڈم جی؟'' سب نے ایک آواز ہو کر پوچھا۔

''میرے باجے والے استاد جی کو لاہور سے بلانا پڑے گا۔''

سب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ لاہور سے ڈھاکا کے لیے آئندہ دو دن تک کوئی فلائٹ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ کچھ دوسری مشکلات بھی تھیں۔ ابھی کچھ لوگ بولنے ہی والے تھے کہ میڈم نے فیصلہ سنا دیا ''باجے کے بغیر تو میں گا ہی نہیں سکتی بھائی جان'' انہوں نے بڑی معصومیت سے کہا۔

کمرے میں کافی لوگ موجود تھے مگر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ چند لمحے سب خاموش رہے۔ میڈم نور جہاں سے بھلا کون بحث کرے۔ اچانک ایک جوان عمر کے دراز قد' گھونگریالے بالوں والے بنگالی صاحب نے آگے بڑھ کر ہارمونیم سنبھال لیا اور انگریزی میں بولے۔

”لیٹ می ٹرائی“!

یہ کہہ کر انہوں نے سُر چھیڑے۔ میڈم جو بیزاری سے بیٹھی ہوئی تھیں ایک دم ان کے چہرے پر کچھ دلچسپی کے آثار پیدا ہو گئے۔ چند منٹ بعد ہار مونیم بجانے والے کی کارکردگی پر وہ خاصی خوش نظر آنے لگیں اور بولیں۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ آئیں ریہرسل کرتے ہیں۔“

ریہرسل شروع ہو گئی۔ میڈم کی سحر انگیز آواز نے سارے ماحول کو جادو کی نگری بنا دیا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک گانے کی ریہرسل کرتی تھیں اور ساتھ ہی ہار مونیم بجانے والے اور طبلہ نواز کی حوصلہ افزائی بھی کرتی جا رہی تھیں جو ملکہ ترنم نور جہاں کی داد پا کر پھولے نہیں سما رہے تھے۔

کچھ دیر بعد ریہرسل کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ادھر حمید صاحب اور نذیر صاحب کُھسر پُھسر کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ”بہت اچھّا ہار مونیم بجانے والا ہے۔ ریڈیو ڈھاکا سے مل جائے گا۔“ میڈم نور جہاں کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو وہ چوکنّا ہو گئیں۔

”نہیں بس باجے والے تو یہی ہوں گے“ انہوں نے کہا۔ سب لوگ پریشان ہو گئے۔

میڈم ان صاحب کی طرف متوّجہ ہوئیں جنہوں نے ہار مونیم بجایا تھا ”آپ بہت اچھّا ہار مونیم بجاتے ہیں۔ آپ کا نام کیا ہے؟“

خوشی سے ان کا چہرہ گُلنار ہو گیا۔ ”آپ کی بہت مہربانی میڈیم جی۔ آپ نے میرا دل بڑھا دیا ہے۔ میرا نام سمر داس ہے۔“ ”سمر داس جی۔ بس اب آپ ہی میرے ساتھ ہار مونیم بجائیں گے۔“

سمر داس کے چہرے سے خوشی ایک دم غائب ہو گئی۔ انہوں نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا۔ اے حمید صاحب نے اشارہ کیا اور ہمیں کمرے سے باہر لے گئے۔

”آفاقی .... میڈم کو سمجھاؤ بھائی۔ یہ سمر داس بہت بڑا موسیقار ہے۔ اسپین اور اٹلی میں میوزک کا ٹیچر اور ریڈیو کا کمپوزر رہ چکا ہے۔ یہ کیسے فنکشن میں ہار مونیم بجا سکتا ہے۔“

ہم نے کہا ”میڈم کو سمجھانا بہت مشکل ہے۔ جو بات ایک بار ان کے منہ سے نکل جائے وہ پتّھر کی لکیر ہو جاتی ہے۔“

''مگر یار ذرا سوچو تو۔ سمرداس اتنا بڑا آدمی ہے۔ وہ بھلا ہارمونیم لے کر بیٹھے گا۔ یہاں تو خیر اس نے عقیدت اور شوق میں بجادیا مگر ہال میں تو وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گا۔ تم ذرا سمجھاؤ خاتون کو۔''

ہم نے کہا''سوری۔ رانگ نمبر۔ اعجاز سے بات کرو۔ شاید''....

حمید صاحب کچھ دیر بعد اعجاز کو گھیر کر لے آئے اور مسئلہ بیان کیا۔ اعجاز نے کہا''حمید صاحب انہیں جس ہارمونیم والے کے ساتھ کی عادت ہے وہ اس کے بغیر گاتی ہی نہیں ہیں۔ موڈ اچھا تھا جو مان گئیں۔ اب یہ صاحب مل گئے ہیں تو ان سے باجا بجوائیں۔''

حمید صاحب نے انہیں سمرداس صاحب کے بارے میں بتایا اور کہا''یار وہ بہت بڑا موسیقار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی ہے۔''اعجاز نے کہا''تو پھر کیا ہوا۔ نورجہاں کے گانے کے ساتھ ہارمونیم بجانا بھی تو کوئی معمولی بات نہیں ہے۔''

ہم نے بھی کہا''حمید صاحب واقعی۔ یہ اعزاز سے کم نہیں ہے۔ وہ کبھی اپنے بچّوں کو بتائے گا کہ اس نے نورجہاں کے لئے ہارمونیم بجایا تھا۔''

حمید صاحب کچھ دیر بعد سمرداس کو بھی بلا لائے۔ وہ واقعی تعلیم یافتہ اور نہایت شائستہ شخص تھا۔ جب مسئلہ بیان کیا گیا تو سمرداس نے بلا تامل کہا''ایسا بات نہیں ہے حمید صاحب۔ میڈم جی کے ساتھ ہارمونیم بجانا ہمارے لئے بہت بڑا آنر ہے۔ بات یہ ہے کہ آج کل میری مسز بیمار ہے۔ مجھے شام ہوتے ہی ان کی وجہ سے گھر جانا پڑتا ہے۔ لیکن میں دو دن یہ کام کرلوں گا۔''

حمید صاحب نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ کہنے لگے''شکریہ کیسا۔ شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہئے جس کی وجہ سے میڈم نورجہاں جیسی ہستی کے ساتھ مجھے کسی فنکشن میں ہارمونیم بجانے کا موقع مل رہا ہے۔''

سمرداس مشرقی اور مغربی دونوں جگہ کی موسیقی پر عبور رکھتے تھے۔ آواز بھی اچھی اور سُریلی تھی۔ کئی ساز بجانے کا ہنر جانتے تھے۔

نیلو کو ان کے کمرے میں ڈانس کی ریہرسل کرادی گئی تھی۔ اوّل تو نیلو کو ریہرسل کی ضرورت ہی نہیں تھی مگر پھر بھی حمید صاحب کو فکر پڑی ہوئی تھی کہیں فنکشن میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔

میڈم نور جہاں کا موڈ اب کافی بہتر ہو گیا تھا۔
رات کے دس گیارہ بج رہے تھے اور ہوٹل کا سارا عملہ میڈم کو ڈنر کھلانے کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ حمید صاحب وغیرہ سب رخصت ہو گئے اب صرف ہم تینوں کمرے میں رہ گئے تھے۔ منیجر نے ایک بار پھر آکر دریافت کیا کہ کیا ڈنر لگا دیا جائے؟ ایک دم سب کی بُھوک چمک اٹھی اور کھانے کے لئے ڈائننگ ہال کی طرف چل پڑے۔
ہوٹل شاہ باغ ان دنوں ڈھاکہ کا بہترین ہوٹل تھا اور واقعی بہت خوبصورت اور صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ برآمدے اور گیلریاں شیشے کی مانند چمکتے تھے۔ کمرے' ہال، باغ بھی دیکھنے کے قابل تھے۔ بہت اچھّا ماحول تھا اور آس پاس کا منظر بھی دلفریب تھا۔

چند گیلریوں اور برآمدوں سے گزر کر ہم تینوں ڈائننگ ہال میں پہنچے تو وہاں ایک دم چہل پہل اور زندگی پیدا ہو گئی۔ وہ ہال جو چند لمحے پہلے خالی تھا' سنسان اور ویران نظر آرہا تھا۔ ایک دم وہاں بہت سے لوگ نمودار ہو گئے۔ منیجر صاحب بنفس نفیس موجود تھے۔ آخر میڈم نور جہاں کے لئے ڈنر کا بندوبست کرنا تھا۔ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ ویٹرز بھی اچانک حرکت میں آ گئے تھے۔ جن ویٹرز کی ڈیوٹی نہیں تھی وہ بھی آس پاس منڈلا رہے تھے۔ ڈنر کا وقت کافی دیر پہلے ختم ہو چکا تھا پھر بھی سارا ہال سجا ہوا تھا۔ ایک درمیانی میز پر ہم لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ کھانے کا آرڈر دیتے ہی پھر سرگرمی پیدا ہو گئی۔ کوئی سلاد لا رہا ہے۔ کوئی پانی کے گلاس اور کوئی نمک دانی لا رہا ہے۔ کوئی رنگین نیپکین لئے چلے آرہا ہے۔ ہر کوئی اس کوشش میں تھا کہ اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرے اور میڈم نور جہاں کی اس پر نظر پڑ جائے تاکہ وہ انہیں سلام کر کے اپنی دیرینہ آرزو پوری کرے۔

کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ چِکن' کباب اور قورمہ خاص طور پر قابل تعریف تھے۔ میڈم نے بے حد پسندیدگی کا اظہار کیا اور پوچھا "یہ کھانا کس نے پکایا ہے؟"
"ایک بہت پرانا باورچی ہے میڈم۔"
"انہیں ذرا بلائیں۔ میں ان کی تعریف کروں گی۔" میڈم نے کہا۔ ایک بار پھر فوراً ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ لوگ بھاگے

بھاگے گئے۔ منیجر صاحب بذات خود بھی چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر' دُبلا پتلا سا آدمی میڈم کے حضور میں دانت نکالے کھڑا تھا۔

''سلام میڈم جی۔''

''وعلیکم السلام۔ بابا جی آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟'' میڈم نے پوچھا۔

''میڈم جی میں ادھر ہی ڈھاکا میں پیدا ہوا تھا۔''

''آپ بہت اچھّا کھانا بناتے ہیں۔ اب ہم جب تک یہاں رہیں گے آپ ہی ہمارے لئے کھانا پکایا کرنا۔''

''جرور میڈم جی۔ بڑی بڑی مہربانی۔'' بابا جی کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔

میڈم نے اپنے پرس میں نے ایک نوٹ نکال کر بابا جی کی نذر کیا۔

''بابا جی یہ آپ کا انعام ہے۔ آپ بڑے کاریگر ہیں۔''

''بڑی مہربانی میڈم جی'' بابا جی نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میڈم جی آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں؟''

''ہاں ہاں۔ کہئے کیا بات ہے۔''

''میڈم جی، مجھے آپ کے گیت بہت اچھے لگتے ہیں۔ اللہ کی مہربانی ہے کہ آپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ آپ کا گانا سننے کی دل میں بڑی آرزو ہے۔''

''تو پھر آپ بھی کل گانا سننے کے لئے وہاں آجانا۔''

''ایسا کیسے ہونے سکتا ہے میڈم جی۔ اُدھر تو بہت زیادہ پیسوں کا ٹکٹ ہے۔ ہم تو گریب لوگ ہیں۔ میری گھروالی کو بھی بہت شوق ہے آپ کا گانا سننے کا۔''

میڈم کا دریائے سخاوت اس وقت جوش میں آیا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا ''ٹھیک ہے بابا جی' کل رات کو کھانے کے بعد ہم آپ سب کو گانا سنائیں گے۔ آپ سب کے بیوی بچّوں کو بھی۔ ٹھیک ہے نا؟''

بابا جی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ''آپ ہم سب کو اِدھر گانا سنائیں گے میڈم؟''

''ہاں ٹھیک ہے میڈم جی'' ہال میں موجود عملے کے تمام لوگ جیسے خوابوں کے جزیروں میں پہنچ گئے تھے۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو برآمدے سے گزرتے ہوئے میڈم کو اندازہ ہوا کہ باہر موسم بہت خوشگوار ہے۔ یہ ڈھاکا میں سردی کا موسم تھا لیکن ہم لوگوں کے لئے بے حد خوشگوار تھا۔ ہوا میں ہلکی سی خُنکی تھی اور فضا میں سبزے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

میڈم نے کہا ''چلو۔ باہر چل کر ٹہلتے ہیں۔ ''

اعجاز نے گھڑی کی طرف دیکھا ''کافی رات ہو گئی ہے۔''

''اچھا ہے نا۔ اس وقت کوئی ہمیں پہچانے گا بھی نہیں۔ ''

ہم تینوں ہوٹل شاہ باغ کے لان میں اور پھر گیٹ سے باہر نکل کر سڑک پر ٹہلنے لگے۔ دور سے ایک ہاتھ رکشا والے نے ہم لوگوں کو دیکھا تو فوراً رکشہ کھینچتا ہوا بھاگا چلا آیا۔

''رکشہ میں بیٹھیں؟'' میڈم نے بچّوں کی طرح اعجاز سے پوچھا۔ ''میں کبھی ایسے رکشا میں نہیں بیٹھی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ رکشا میں سیر کریں۔''

''آئیں۔ آپ بھی آجائیں'' میڈم نے رکشا میں سوار ہوتے ہوئے اعجاز سے کہا۔

''ارے نہیں۔ دیکھا نہیں' یہ بیچارہ خود ہی رکشا کھینچتا ہے۔ ''

رکشا والا بول پڑا ''کوئی بات نہیں ہے صاحب۔ ہم تو بڑے موٹے موٹے آدمیوں کو بھی بٹھالیتا ہے۔ آپ تو بہت ہلکے ہیں۔ آجایئے آجایئے۔ ''

اعجاز بھی رکشا میں سوار ہو گئے۔

''کدھر کو چلنا ہے صاب؟''

''کدھر کو نہیں بس ہمیں آس پاس تھوڑا سا گھمادو'' اعجاز نے کہا تو رکشا والے کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ اتنی سی دیر کے لئے اسے چار چھ آنے سے زیادہ ملنے کی امید نہ تھی۔ مگر وہ فوراً رواں ہو گیا۔

تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد رکشا واپس آگیا۔ میڈم اور اعجاز رکشا سے اُترے تو ہوٹل کے چوکیداروں اور دوسرے ملازموں کا ایک مجمع لگا ہوا تھا جو ان دونوں کو ہاتھ رکشا میں سوار دیکھ کر حیران ہو رہے تھے مگر خوش بھی تھے۔

رکشا سے اُتر کر اعجاز نے دس روپے کا ایک نوٹ رکشا والے کو دیا تو وہ کہنے لگا ''اپنے پاس بھان نہیں ہے صاب۔''

''یہ سب تم رکھ لو'' اعجاز نے کہا اور ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ رکشا والا خوشی اور بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھتا رہ گیا۔

دوسرے دن صبح ناشتا کرنے کے بعد ہم اپنے کمرے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ رتن کمار چلے آئے۔

انہوں نے کہا ''خوب رکشا کی سیر ہو رہی ہے آج کل۔''

''میڈم نور جہاں کو بہت شوق تھا۔''

''میڈم کو یہاں لوگ بہت پسند کرتے ہیں بلکہ ان سے عقیدت رکھتے ہیں۔ ہوٹل میں صبح ہر بیرے کی زبان پر ان کا ہی چرچا تھا۔

'کیوں نہ ہو بھائی' نور جہاں بار بار تو نہیں پیدا ہوتی'' ہم نے کہا۔

''اچھا۔ کافی تو منگائیں'' انہوں نے فرمائش کی۔ ''کیا تم نے ناشتا نہیں کیا؟'' ہم نے پوچھا۔

''ناشتا تو کیا مگر چائے کے ساتھ۔ کافی کو جی چاہ رہا ہے۔ ''

ہم نے فون پر کافی کا آرڈر دے دیا۔

رتن کہنے لگے ''آفاقی صاحب مجھے اسٹیج پر کیا کرنا ہے۔ مجھے تو ناچ گانا بھی نہیں آتا۔''

ہم نے کہا ''تو پھر کیوں چلے آئے؟''

''سمجھا کریں'' وہ مسکرائے ''یہ فرمائشی پروگرام ہے۔''

ابھی کافی آنے نہیں پائی تھی کہ نیلو بھی آ گئیں۔

''امّی اور ڈیڈی پرانے زمانے کی فلموں کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں ادھر آ گئی۔''

''بہت اچھا کیا'' ہم نے کہا ''کافی منگائیں؟ ''

''اگر آپ دونوں پئیں گے تو میں بھی ضرور پیوں گی۔'' وہ بے تکلّفی سے بولیں۔ ہم نے فون پر ایک اور کافی کا آرڈر دینے کا ارادہ کیا مگر نیلو نے روک دیا ''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' ہم تینوں اسی میں سے پی لیں گے۔''

کافی پی کر ہم آگے پیچھے ملنے والی آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگے اور وہ دونوں آپس میں باتوں میں لگ گئے۔

رتن نے کہا ''آفاقی صاحب آپ سمجھ لیجئے ہم لوگ یہاں ہیں ہی نہیں۔ آپ اپنا اخبار پڑھئے' ہم اپنی باتیں کریں گے۔''

''ہم بھی سمجھ لیں گے کہ آپ یہاں نہیں ہیں۔''

کافی پی کر بھی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔

نیلو نے کہا ''اب ہمیں چلنا چاہئے۔ ان لوگوں کی پرانی فلموں کی باتیں ختم ہونے والی ہوں گی۔''

رتن کمار کے والد عباس اجمیری اداکاری کے بہت شوقین تھے۔ وہ خاموش فلموں کے زمانے میں اسٹیج پر کام بھی کیا کرتے تھے۔ پرانے زمانے کی بہت سی دلچسپ باتیں انہیں یاد تھیں۔ جب کبھی وہ پرانے زمانے کے اسٹیج اور فلموں کے قصے سناتے تو سبھی شوق اور دلچسپی سے سننے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

شام کو ڈھاکا کے ایک بہت بڑے سنیما گھر میں یہ پروگرام پیش کیا گیا تو مہنگے ٹکٹوں کے باوجود ہال کے اندر لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے جنہیں ٹکٹ نہ مل سکا وہ ہال کے باہر والے باغ میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ منتظمین نے ان شائقین کے لئے سنیما کے باہر لاؤڈ اسپیکر نصب کرا دیے تھے تاکہ دور دور تک کے لوگ موسیقی اور نغمات سُن سکیں۔ اسٹیج پر رتن کمار اور اعجاز نے آکر حاضرین سے خطاب کیا۔ پھر نیلو نے رقص پیش کئے اور آخر میں میڈم نور جہاں نے آواز کا جادو جگایا۔ حاضرین پر تو جیسے سحر ساطاری ہو گیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میڈم کا گانا ختم ہی نہ ہو مگر رات کو ساڑھے نو بجے کے قریب یہ پروگرام ختم کر دیا گیا۔

سنیما ہال میں اے حمید صاحب بھی موجود تھے۔ کچھ دیر وہ ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے ''آفاقی۔ گورنر ہاؤس میں آج کچھ غیر ملکی مہمانوں کے اعزاز میں ڈنر ہے۔ گورنر صاحب کی درخواست ہے کہ اعجاز' میڈم نور جہاں اس میں ضرور شرکت کریں۔''

ہم نے کہا ''ہم میڈم سے دریافت کر کے آپ کو بتائیں گے۔''

ہوٹل جاتے ہوئے راستے میں ہم نے نور جہاں تک یہ دعوت نامہ پہنچادیا۔ وہ بولیں " میں وہاں کیسے جاسکتی ہوں۔ آپ کو یاد نہیں۔ میں نے آج ہوٹل کے اسٹاف والوں کو گانا سنانے کا وعدہ کیا ہے۔ "

ہمیں واقعی یاد نہیں رہا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر ہم نے یہ پیغام حمید صاحب تک پہنچادیا۔

حمید صاحب بولے "آفاقی۔ یہ گورنر کی دعوت ہے۔ دوسرا اپائنٹ منٹ منسوخ کیا جاسکتا ہے۔"

ہم نے کہا "حمید صاحب ہم میڈم کو جانتے ہیں۔ وہ یہ اپائنٹ منٹ کسی کی خاطر بھی منسوخ نہیں کریں گی۔"

"معلوم تو ہو ان کا اپائنٹ منٹ کس کے ساتھ ہے؟ "

ہم نے کہا "ہوٹل کے اسٹاف کے ساتھ۔"

حمید صاحب پہلے تو حیران ہو کر ہمارا چہرہ دیکھنے لگے۔ پھر ہنس پڑے۔ "یار کیسی باتیں کرتے ہو۔ وہاں غیر ملکی آئے ہوئے ہیں۔ گورنر نے بذات خود دعوت دی ہے اور نور جہاں کے انتظار میں ابھی سب بھوکے بیٹھے ہیں۔ "

ہم نے کہا "آپ خود ہی میڈم سے بات کر لیجئے"۔

حمید صاحب کو اپنی قوتِ گفتار پر بہت ناز تھا۔ فوراً میڈم کے پاس چلے گئے۔

میڈم نے ان کی ساری گفتگو سننے کے بعد فرمایا "مگر بھائی جان۔ میں نے ہوٹل کے اسٹاف سے وعدہ کیا ہوا ہے۔ وہ کل رات سے انتظار کر رہے ہیں"۔

حمید صاحب نے کہا " میڈم یہ وعدہ آپ کل بھی پورا کر سکتی ہیں"۔

میڈم مسکرائیں " حمید صاحب' یہ آپ اس لئے کہہ رہے ہیں کہ وہ غریب لوگ ہیں۔ اس لئے ان کے ساتھ کئے ہوئے وعدے کی کوئی اہمیت نہیں ہے"۔

حمید صاحب سٹپٹا گئے " ارے نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے"۔

میڈم نور جہاں نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا وہ ہمیں آج بھی یاد ہے۔

انہوں نے کہا" اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کل رات کوئی اور بہت اہم آدمی مجھے دعوت نہیں دے گا۔ اس کی خاطر مجھے کل پھر اپنا وعدہ توڑنا پڑے گا۔ نہیں۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ گورنر صاحب سے آپ شکریے کے ساتھ میری

جانب سے معذرت کر لیجئے''۔

حمید صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے جواب میں کیا کہیں۔ انہوں نے فون پر گورنر ہاؤس رابطہ کر کے یہ پیغام پہنچادیا۔ جواب میں گورنر صاحب کے ملٹری سیکرٹری نے کہا'' گورنر صاحب بذات خود میڈم نور جہاں سے بات کرنا چاہتے ہیں'' میڈم نے ٹیلی فون پر یہی جواب گورنر صاحب کو بھی دیا۔ وہ بے چارے ہکّا بکّا رہ گئے مگر پھر انہوں نے اصرار نہیں کیا۔

حمید صاحب کا کچھ سال پہلے کراچی میں انتقال ہوا ہے وہ اس واقعے کے گواہ تھے۔ اعجاز تو خدا کے فضل سے زندہ ہیں۔

میڈم نور جہاں کے کردار کا یہ انوکھا پہلو تھا جو ہمارے سامنے آیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک من موجی اور مضطرب فن کارہ تھیں۔ وہ اپنے خیالات کی رو کے مطابق فیصلے کرنے کی عادی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی بار وہ عقل و ذہن کے مشورے نامنظور کر کے دل کے فیصلے قبول کر لیتی تھیں۔

سمرداس پروگرام کی کامیابی اور مقبولیت سے بہت خوش تھے۔ ان کے بارے میں اسٹیج پر اعلان کیا گیا تھا کہ وہ میڈم نور جہاں کی سنگت میں ہارمونیم بجائیں گے اور حاضرین نے اس کا بہت خوشی اور گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔

ہوٹل پہنچ کر انہوں نے پروگرام کی کامیابی پر میڈم کو بہت مبارکباد دی اور پھر رخصت کی اجازت چاہی۔

نور جہاں نے کہا'' ارے نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے اتنی مہربانی کی ہے اور اس پروگرام کی کامیابی میں آپ کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ آپ ہمارے ساتھ کھانا کھائے بغیر نہیں جائیں گے''۔

انہوں نے معذرت چاہی تو میڈم نے کہا'' دراصل ابھی ہمیں ایک اور پروگرام بھی کرنا ہے''۔

''ایک اور پروگرام؟''۔ وہ حیران رہ گئے۔

''جی ہوٹل کے اسٹاف اور ان کے گھر والوں کے لئے۔ میں نے کل ان سے وعدہ کیا تھا''۔

سمرداس حیرت سے میڈم نور جہاں کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ پھر کہا تو عقیدت میں ڈوبی ہوئی آواز میں اتنا کہا'' میڈم آپ بہت مہان ہیں۔ بہت بڑی آرٹسٹ ہیں''۔

سمرداس کو اپنی بیوی کی علالت کے باعث فوراً گھر پہنچنا تھا مگر میڈم کی فرمائش پر رک گئے۔ خیر الکبیر صاحب' ان کی

بیگم، نذیر احمد صاحب اور ان کی بیگم بھی موجود تھے۔ ہم سب لوگوں نے کچھ دیر بعد ڈائننگ ہال کا رخ کیا، معلوم ہوا کہ نیلو اور رتن کمار وغیرہ ڈنر کھا کر اپنے کمروں میں جا چکے ہیں۔

ڈائننگ ہال میں پہنچے تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ہال کے صرف ایک گوشے میں کھانے کی ایک میز لگی ہوئی تھی۔ باقی تمام جگہ سے کھانے کی میزیں ہٹادی گئی تھیں۔ اسٹیج کیلئے ایک جگہ چھوڑ دی گئی تھی جس پر قالین بچھے ہوئے تھے اور طبلہ، ہارمونیم وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ سارے ہال میں اسٹیج کے رُخ پر سینکڑوں کرسیاں بچھادی گئی تھیں۔

میڈم اس انتظام سے بہت خوش ہوئیں۔ کھانا آج گزشتہ روز سے بھی زیادہ لذیذ تھا۔ پکانے والوں نے اپنی ہنر مندی کے ساتھ ساتھ اس میں پیار اور عقیدت کی آمیزش بھی کر دی تھی۔ شاید اس لئے اس کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ کئی بیرے سروس کیلئے حاضر تھے اور دوڑ دوڑ کر باورچی خانے سے تازہ تازہ روٹیاں لے کر آرہے تھے۔ کھانے کے بعد میڈم نے ایک بار پھر پکانے والوں کی بہت تعریف اور حوصلہ افزائی کی۔ چیف باورچی صاحب کو بلا کر خاص طور پر ان کی تعریف کی گئی۔ مارے خوشی کے الفاظ اس کے منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔

"میڈم جی۔ آپ بہت بڑی آرٹسٹ ہیں۔ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے ہمارا پکایا ہوا کھانا پسند کیا ہے"۔

میڈم نے جواب دیا۔ "آپ خود بھی بہت بڑے آرٹسٹ ہیں باباجی۔ آپ نے بہت اچھّا کھانا پکایا ہے۔ ہم نے بڑی بڑی جگہوں پر کھانا کھایا ہے مگر ایسا مزیدار کھانا کہیں نہیں کھایا"۔ تشکّر اور خوشی سے باباجی کی آواز بھر آگئی۔ "ہم نے آج بڑے پیار سے دل لگا کر پکایا ہے میڈم"۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میڈم نے اسٹیج کا رُخ کیا جہاں ساز سجے ہوئے تھے۔ قیمتی قالینوں پر گاؤ تکیے اور کُشن بھی رکھے ہوئے تھے، دو مائیکروفون بھی تھے۔ فرشی نشست کا بندوبست کیا گیا تھا۔

میڈم کو یہ سب کچھ بہت اچھّا لگا لیکن جب وہ اسٹیج تک پہنچیں تو دیکھا کہ اچانک چاروں طرف سے خوش لباس لوگ ہال میں داخل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہال کی ساری کُرسیاں پُر ہو گئیں۔

بات یہ ہوئی کہ ہوٹل کی انتظامیہ نے اپنے خصوصی جاننے والوں کو اس پروگرام میں مدعو کر لیا تھا۔ خوش پوش، خوش حال مرد، قیمتی زرق برق ساڑھیوں، میک اپ اور زیورات میں لدی ہوئی بیگمات، مسکراتی ہوئی میڈم کی

جانب دیکھ رہی تھیں اور خود ان کی زبانی' ان کے سامنے بیٹھ کر ان کے نغمات سننے کی زندگی بھر کی حسرت پوری کرنے کی امیدوار تھیں۔

میڈم کے چہرے پر غُصّے کے آثار نمودار ہو گئے۔انہوں نے پوچھا'' یہ کون لوگ ہیں؟''

مینجر نے آگے بڑھ کر لجاجت سے کہا'' یہ شہر کے معزز اور ممتاز لوگوں کی فیملیز ہیں میڈم''۔

''یہاں انہیں کس نے بلایا ہے؟''۔ میڈم نے ناراضگی سے پوچھا۔

''جی۔۔۔جی۔۔۔وہ۔۔۔میں۔۔۔''۔ مینجر گڑبڑا گیا۔

میڈم کا موڈ ایک دم بگڑ چکا تھا۔

''آپ نے کس سے پوچھ کر انہیں یہاں بلایا ہے۔ میں نے تو ہوٹل کے اسٹاف کو گانا سنانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ تو مجھے کہیں نظر نہیں آرہے۔ مہربانی فرما کر آپ سب سے کہئے کہ یہاں سے چلے جائیں''۔

''جی؟'' مینجر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔'' مگر میڈم۔۔۔''۔

''یہ میرے مہمان نہیں ہیں اور نہ ہی میں نے انہیں بلایا ہے''۔

پھر وہ حیران و پریشان کرسی نشینوں سے براہ راست مخاطب ہو کر بولیں'' دیکھئے مجھے افسوس ہے کہ آپ کو غلط بتایا گیا ہے۔ آپ لوگ مہربانی فرما کر ہال خالی کر دیں پلیز''۔

چند لمحے تو خاموشی رہی پھر سب لوگ سمجھ گئے کہ میڈم نور جہاں جو کہہ رہی ہیں اسے منوا کر بھی رہیں گی۔ غُصّے اور شرمندگی سے ڈھاکا کی ہائی سوسائٹی کے خاندانوں کے رنگ اڑ گئے مگر میڈم نور جہاں کی بات ماننے بغیر چارہ نہ تھا۔

ایک ایک کر کے تمام مہمان ہال سے رخصت ہو گئے اور تمام کرسیاں خالی ہو گئیں تو میڈم نے بلند آواز سے کہا

''اسٹاف کے لوگ کہاں ہیں؟''

برآمدوں اور راہداریوں میں چھپے بیٹھے ہوئے عملے کے لوگ سامنے آ گئے۔ ان میں باورچی' بیرے' صفائی کرنے والے' چوکیدار' سکیورٹی والے ٹیلی فون آپریٹر سبھی شامل تھے۔ چیف باورچی سب میں پیش پیش نظر آرہے تھے۔

''آپ لوگ کرسیوں پر بیٹھئے اور اپنے گھر والوں کو بھی بلا لیجئے''۔

میڈم کو پہلے ہی علم تھا کہ ہوٹل اسٹاف کے گھر والے بھی اسی احاطے میں واقع کوارٹرز میں رہتے ہیں۔
کچھ دیر بعد ہال کی تمام کرسیاں بھر گئیں۔ہال کی بیرونی بڑی کھڑکیاں کھول دی گئی تھیں۔جن عورتوں اور بچّوں کو کرسیوں پر جگہ نہ مل سکی وہ کھڑکیوں میں کھڑے ہوگئے۔ہر ایک کا چہرہ خوشی اور فخر سے دمک رہا تھا۔زرق برق لباسوں کی جگہ اب پرانے اور سادہ لباسوں نے لے لی تھی مگر ہال کی رونق اور روشنی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔
میڈم نے قالین پر جگہ سنبھالی۔ہم لوگ بھی گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر قالینوں پر بیٹھ گئے۔سازندوں نے اپنے اپنے ساز سنبھالے۔سمرداس نے ہارمونیم کے سُر چھیڑے اور انگریزی میں مجھ سے کہا" مسٹر آفاقی۔ایسی عورت دنیا میں کوئی اور نہیں ہو گی۔مجھے پورا یقین ہے" شی از ریئلی گریٹ"۔
میڈم نور جہاں اس روز بہت اچھے موڈ میں تھیں۔ اس سے پہلے وہ کبھی اسٹیج پر گانے کیلئے نہیں گئی تھیں مگر ان کی پہلی پرفارمنس ہی بے حد کامیاب رہی تھی۔مسٹر خیر الکبیر اور نذیر احمد نے بعد میں ہمیں بتایا کہ میڈم نور جہاں کی بنفس نفیس اسٹیج پر گانے کی اطلاع پا کر کلکتہ اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کے لوگ بھی بطور خاص ڈھاکہ پہنچے تھے اور تواور چند حضرات تو بمبئی سے بھی ڈھاکہ پہنچ گئے تھے۔ڈھاکہ ریڈیو سے میڈم کے گانے کا پروگرام نشر کیا جارہا تھا جو مشرقی پاکستان کے علاوہ مغربی بنگال کے سامعین نے بھی اسی قدر دلچسپی اور انہاک سے سنا تھا۔

میڈم کو ان باتوں کی کوئی خبر نہ تھی۔ان کا موڈ خود بخود ہی بہت اچھّا ہو گیا تھا۔میڈم کے موڈ کے بارے میں کبھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔پل میں تولا' پل میں ماشہ والا محاورہ شاید ان کے لئے بنایا گیا ہے۔ایک منٹ میں وہ خوش اخلاقی اور خوش مزاجی کا پیکر بنی ہوتی تھیں مگر دوسرے ہی لمحے ان کا مزاج برہم ہو جاتا۔ بعض اوقات وہ بڑی سے بڑی بات کا بھی بُرا نہیں مانتی تھیں لیکن کبھی معمولی سی بات بھی ان کے مزاج پر گراں گزر جاتی اور وہ سخت برہم ہو جاتیں۔جن لوگوں نے انہیں مختلف ادوار میں دیکھا ہے وہ ان باتوں کے شاہد ہیں۔
سمرداس صاحب نے ہارمونیم سنبھالا اور میڈم نے باباجی سے دریافت کیا" باباجی بولئے کون سا گانا سناؤں؟"
باباجی نے فوراً فلم "انمول گھڑی" کے ایک گانے کی فرمائش کری اور میڈم نغمہ سرا ہو گئیں۔
آواز دے کہاں ہے؟

دنیا میری جواں ہے

سننے والوں پر سحر ساطاری ہو گیا۔ گانا ختم ہو گیا مگر چند لمحے بالکل خاموشی طاری رہی۔

جب آواز کا جادو کم ہوا تو دوسرے نغمے کا آغاز ہو گیا۔ میڈم ہر ایک سے فرمائش دریافت کر رہی تھیں اور نئے پرانے سبھی گانے سنا رہی تھیں۔ وقت گزرنے کا نہ میڈم کو احساس تھا اور نہ ہی سننے والوں کو۔ ہوٹل کا عملہ تھوڑی دیر بعد گرم چائے اور کافی لا کر قالینوں پر رکھ رہا تھا۔ مگر چائے یا کافی پینے کا ہوش کس کو تھا۔ وہ رات خود ہماری یادداشت میں بھی کندہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ایسا ماحول' ایسا سماں اور ایسا موقع زندگی میں پھر کبھی نصیب نہیں ہوا اور نہ ہو گا۔

نور جہاں تمام نغمے اس قدر وارفتگی کے عالم میں سنا رہی تھیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ سالہا سال پہلے جب یہ نغمہ پہلی بار گایا گیا تھا' اس وقت انہوں نے اچھّا گایا تھا یا اس وقت بہتر گا رہی ہیں۔ نغمات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ مسلسل جاری تھا۔ اس دوران میں میڈم ہنسی مذاق اور فقرے بازی بھی کرتی جا رہی تھیں۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ حاضر جوابی میں میڈم نور جہاں کسی سے کم نہیں تھیں۔ موقع پا کر فقرہ بھی ایسا کہتیں کہ سننے والا خود بھی لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

میڈم نے بابا جی سے پوچھا" بابا اب بتاؤ کون سا گانا سناؤں؟ میرا کون سا گانا آپ کو سب سے اچھّا لگتا ہے۔ "

بابا جی تو اس روز ساتویں آسمان پر تھے۔ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو اس شام میڈم نور جہاں نے جو شرف بخشا تھا وہ غالباً شاہ ایران اور دوسرے سربراہان مملکت کے حصّے میں بھی نہ آیا ہو گا۔

بابا جی بولے" میڈم جی۔ ہم کو تو آپ کا سارا گانا اچھّا لگتا ہے۔ "

" پھر بھی۔ کوئی تو گانا ہو گا جو سب سے اچھّا لگتا ہو گا؟ "

بابا جی سوچ میں پڑ گئے اور یاد کر کے بولے" ہاں یاد آ گیا۔ میڈم جی وہ گانا سناؤ۔

" جا نہیں سکتا کبھی' شیشے میں بال آیا ہوا۔ "

اس وقت ہم بہت چھوٹا تھا جب آپ کا یہ گانا سنا تھا پر آج بھی یاد ہے۔ "

کوئی اور وقت ہوتا تو عمر کے اس اشارے پر میڈم کا مزاج برہم ہو جاتا۔ کوئی انہیں زیادہ عمر کا کہے یہ انہیں کبھی پسند

نہیں آیا اور کئی بار تو وہ اس تذکرے پر باقاعدہ ناراض بھی ہو جاتی تھیں۔ مگر اس روز ''در گزر'' کی رات تھی۔ میڈم نے سات خون معاف کر رکھے تھے۔

ہم سب نے باباجی کی اس سادہ لوح غلطی کا احساس کر کے دم سادھ لیا کہ دیکھئے میڈم اس پر کس طرح غصّے کا اظہار کرتی ہیں۔ مگر میڈم باباجی کی یہ بات سن کر ہنس پڑیں۔

''باباجب یہ گانا گایا تھا اس وقت میں بھی بہت چھوٹی تھی۔''

بابا جی سر ہلا کر بولے ''ہاں ہاں ہم کو سب معلوم ہے۔آپ نے آٹھ برس کی عمر میں گانا شروع کیا تھا۔ میڈم جی۔ آپ تو بے بی تھے نا اُس ٹائم'' باباجی نے بہت محبت سے کہا اور میڈم ان کی معصومیت بھری تعریف پر پھر ہنس پڑیں۔

باباجی کی فرمائش پر میڈم نے یہ گیت چھیڑ دیا۔

کس طرح بھولے گا دل تیرا خیال آیا ہوا
جا نہیں سکتا کبھی، شیشے میں بال آیا ہوا

انہوں نے اس طرح ڈوب کر گایا کہ محفل میں سنّاٹا چھا گیا۔رات کے بارہ بجے ایک بجا دو بج گئے مگر نہ میڈم گاتے ہوئے تھک رہی تھیں اور نہ ہی سننے والے سیر اب ہو رہے تھے۔ایک کے بعد ایک ماضی کا ورق الٹتا رہا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انہیں اپنے بے شمار گانے تفصیل کے ساتھ لفظ بہ لفظ یاد تھے۔ طرز اور لے میں بھی ذرا سی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان کے گلے میں کوئی کیسٹ لگا ہوا ہے جو بٹن دباتے ہی آن ہو جاتا ہے۔

ایسی محفل، ایسا سماں، ایسا ماحول ہو تو پھر وقت کا دھیان کس کو رہتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ بیرے گرم چائے اور کافی لا کر رکھ دیتے مگر نہ گانے والی کو ہوش تھا نہ سننے والوں کو۔ چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو جاتی اور کوئی ہاتھ نہ لگاتا۔ کچھ دیر بعد فرض شناس بیرے پھر گرم چائے لا کر رکھ دیتے۔

اس رات میڈم جس موڈ میں تھیں شاید اس سے پہلے خود ان پر بھی طاری نہ ہوا ہو گا۔ شاید وہ تمام رات بھی اسی طرح بیٹھی نغمے سناتی رہتیں مگر زبان کی ایک چھوٹی سی لغزش نے سب پر پانی پھیر دیا۔

رات تین بجے کے قریب میڈم سانس لینے کے لئے رُکیں اور سٹاف کے لوگوں نے فوراً چائے کی پیالی بنا کر ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ میڈم کو یکا یک خیال آیا کہ مسٹر سمرداس اور سازندے مسلسل کھائے پئے بغیر ساز بجانے میں مصروف رہے ہیں۔ انہوں نے سب سے معذرت کی۔ خاص طور پر مسٹر سمرداس سے۔

''معاف کیجئے گا بھائی جان' مجھے کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ میں تو مزے سے گاتی رہی مگر آپ لوگ تو بجاتے بجاتے تھک گئے ہوں گے۔ ''

سمرداس بولے ''میڈم آپ سامنے بیٹھ کر گا رہی ہوں تو کون تھک سکتا ہے؟ ''

''مہربانی ہے آپ کی۔ لیجئے چائے کافی پیجئے'' میڈم کے موڈ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ چائے کا دور محض انٹرول ہے اور وقفے کے بعد وہ دوبارہ نغمہ سرائی کا ارادہ رکھتی ہیں۔

اچانک بابا جی نے میڈم سے مخاطب ہو کر کہا ''میڈم جی۔ آپ سے ایک درخواست کرنی ہے۔ ''

''ہاں ہاں بابا جی کہیے کیا بات ہے؟ ''

''میڈم جی آپ تو بہت اچھی ہیں۔ دیوی ہیں۔ آپ نے ہم سب کی بات مان کر ہمارا دل رکھ لیا ہے۔ اگر آپ میڈم نیلو سے کہیں کہ کل وہ مہربانی کریں اور ڈانس کریں تو ہم سب بہت خوش ہوں گے۔ ''

میڈم کے مسکراتے ہوئے چہرے کا رنگ ایک دم متغیّر ہو گیا۔ ناگواری اور غصّے کا ایک بادل سا ان کے چہرے پر چھا گیا۔ ہم سب سمجھ گئے کہ اب کوئی دھماکہ ہونے والا ہے۔

میڈم نے چائے کی پیالی قالین پر پٹخ دی اور غصّے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے برتنوں کی ٹرے کو ایک ٹھوکر رسید کی۔ جوتی پہنی اور بابا سے مخاطب ہو کر بولیں ''یہ فرمائش آپ خود نیلو سے کرنا مجھے سفارش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ''

یہ کہا اور تیزی سے چل پڑیں۔ سب لوگ ہکّا بکّا دیکھتے رہ گئے۔ اتنی رنگین اور خوبصورت محفل کا ایک لخت اور بدمزہ انجام کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ سبھی حیران رہ گئے تھے۔

سمرداس نے ہم سے انگریزی میں پوچھا ''بابا نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی پھر میڈم ناراض کیوں ہو گئیں؟ ''

ہم انہیں کیا جواب دیتے مگر میڈم کی ناراضگی کا سبب جانتے تھے۔ میڈم کے لئے اس سے بڑی توہین اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ سامنے بیٹھی نغمے سنا رہی ہوں اور سننے والوں کا دھیان کسی اور فن کار کی طرف چلا جائے۔ ان کی موسیقی کا دریا موج زن ہو اور سننے والے کسی اور کے فن کا تصوّر بھی دل میں لے آئیں ! نیلو نے تو اپنے ڈانس کا مظاہرہ نہیں کیا مگر بابا جی اور ان کے ساتھیوں نے میڈم کی خصوصی توّجہ حاصل کرنے کے بعد بلاوجہ ان کی ناراضی مول لے لی تھی۔

دوسرے دن بھی میڈم کی طبعیت میں الجھاؤ تھا مگر شام تک موڈ درست ہو گیا اور وہ پروگرام پیش کرنے کیلئے ہال سنیما میں پہنچ گئیں۔

خیر الکبیر صاحب کی خواہش تھی کہ ممکن ہو تو اس پروگرام میں مزید ایک دن کا اضافہ کر دیا جائے مگر میڈم نے نرمی سے معذرت کر دی۔ اگر رات والا ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آتا تو شاید میڈم ایک اور شام بھی اپنے نغموں کا جادو جگانے پر آمادہ ہو جاتیں۔ مسز خیر الکبیر اور دوسرے لوگوں نے بہت سی تقریبات کا اہتمام کیا تھا مگر وقت کی کمی کے باعث سارے پروگرام دھرے کے دھرے رہ گئے اور ہم سب واپس لوٹ آئے۔

واپسی کے وقت میڈم کا موڈ بالکل ٹھیک تھا۔ رات کھانے کے بعد انہوں نے چیف باورچی بابا جی کو پھر بلایا۔ ان کی بہت تعریف کی اور فرمائشی کھانے پکانے پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے باورچی خانے اور ہوٹل کے دوسرے عملے کے لئے انعام بھی دیا۔ بابا جی منہ سے تو کچھ نہ بولے۔ بس بار بار اپنے آنسو پونچھتے رہے۔

ہم نے مشرقی پاکستان کا ایک سفر مغربی پاکستان کے فلمی ستاروں کے ہمراہ بھی کیا تھا۔ یہ سب لوگ سیلاب زدگان کی امداد کے لئے فنڈ جمع کرنے کے سلسلے میں ایک ہوائی جہاز میں سوار ہو کر ڈھاکہ گئے تھے' مغربی پاکستان کے سبھی ممتاز اور قابل ذکر اداکار اور ایکٹریس اس سفر میں شریک تھے۔ راستے میں سفر بہت دلچسپ گزرا۔ آغا طالش اور لہری صاحب کی کمپیئرنگ اور رننگ کمنٹری کی وجہ سے ہوائی سفر کا خوف بھی دلوں سے دور ہو گیا تھا۔ عام طور پر الٰہ آباد کے اوپر سے گزرتے ہوئے ہوائی جہازوں کو ائرپاکٹس سے دوچار ہونا پڑتا تھا مگر اس روز یہ بھی نہ ہوا حالانکہ کپتان نے جب اعلان کیا کہ اب ہمارا الٰہ آباد پر سے گزر رہا ہے تو ہم توقّع کر رہے تھے کہ اب جھٹکے اور اتّھل پتّھل شروع ہو جائے گی مگر پرواز بالکل ہموار تھی۔

لہری صاحب نے اعلان کیا ''خواتین و حضرات کسی ہوشیار پاکٹ مار نے پہلے ہی جیب کاٹ لی تھی اس لئے ہمارا ہوائی جہاز ائر پاکٹس میں پھنسنے سے بچ گیا۔ مبارک ہو۔ ''

ڈھاکہ ائرپورٹ پر قیامت کا سماں تھا۔ پہلی بار مغربی پاکستان کے مقبول ستارے ڈھاکہ پہنچے تھے اس لئے مشتاقان دید کی بہت بڑی تعداد ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ائرپورٹ پر موجود تھی۔ رن وے کے سوا ہر جگہ انسانوں کے سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ ائرپورٹ کی عمارت کی حفاظت کا بہت سخت انتظام کیا گیا تھا۔ مگر ہجوم سے بلڈنگ کے دروازے کھڑکیاں اور شیشے ٹوٹ گئے۔ ہزاروں افراد عمارت کی چھت پر چڑھ گئے جس کی وجہ سے چھت گرنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس دورے کا اہتمام پاکستان فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن نے کیا تھا۔

ہوٹل کے اندر تو کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا مگر ارد گرد کی سڑکوں پر بے شمار پرستار شب و روز اس انتظار میں کھڑے رہتے تھے کہ کمرے سے نکلتے ہوئے یا بالکونی سے گزرتے ہوئے کسی آرٹسٹ کی ایک جھلک ہی نظر آجائے۔ مغربی پاکستان کے فلمی ستاروں سے مشرقی پاکستان کے لوگوں کی وابستگی اور وارفتگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ مختلف تقاریب میں بھی اس محبت کا مظاہرہ ہوتا رہا۔

دوسرے دن کرکٹ میچ تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے تمام فلم سٹارز پر مشتمل دو ٹیمیں بنادی گئی تھیں۔ کرکٹ گراؤنڈ تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا جو اپنے اتنے بہت سے من پسند فلم سٹاروں کو ایک ساتھ اور ایک جگہ پاکر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ موقع پاکر آٹو گراف لینے والے بھی گھیر لیتے تھے۔ اس دورے میں پتا چلا کہ سب سے زیادہ مقبول عوامی فنکار کامیڈین نذر تھے ان کے گرد اتنا زیادہ ہجوم رہتا تھا کہ صبیحہ ' مسرّت نذیر ' سنتوش کمار اور سدھیر بھی رشک کرتے تھے۔

ان کی فلم ''سسّی'' نے مشرقی پاکستان میں کامیابی اور مقبولیت کا نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اس فلم کے دوسرے سٹارز صبیحہ ' سنتوش ' آغا سلیم رضا وغیرہ بھی حد درجہ مقبول تھے۔

کرکٹ میچ کیا تھا بس شغل ہی تھا۔ کرکٹ کے تمام اصول اور ضابطے فلمی ستاروں نے بالائے طاق رکھ دیئے تھے۔ نذر صاحب چھ بار آؤٹ ہونے کے باوجود پبلک کے پُرزور اصرار پر وکٹ پر جمے کھڑے رہے تو مجبوراً امپائر نصرت کاردار

کی ہدایت پر چار پانچ اداکارانہیں زبردستی اٹھا کر میدان سے باہر لے گئے۔ تماشائیوں کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہو گیا۔ دوسرے کامیڈین بھی الٹے بیٹ اور سر پر گارڈ باندھ کر کھیلے۔ خواتین نے زمین پر لڑھکا کر بولنگ کی اور کئی وکٹیں لے لیں۔ جب دھوپ کی تمازت کی وجہ سے خواتین کے میک اپ پگھل کر بہہ گئے تو تماشائیوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ اصلی گورا کون ہے اور کون فلموں میں میک اپ کا محتاج ہے۔

نذر صاحب کی بولنگ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جب ان کی کوئی بھی گیند کھلاڑی سے دو تین گز سے کم فاصلے تک نہ پہنچ سکی تو وہ گیند لے کر خود ہی بیٹسمین کی طرف بھاگے۔ وہ ڈر کر ایک طرف کو ہو گیا اور انہوں نے سامنے کھڑے ہو کر گیند وکٹوں میں مار دی۔ امپائر نے بیٹسمین کو آؤٹ قرار دے دیا۔ خواتین کیلئے یہ رعایت تھی کہ تین بار آؤٹ ہونے کے باوجود انہیں ایک موقع اور دیا جاتا تھا تا کہ وہ رن بنا لیں مگر کوئی لیڈی اس رعایت کے باوجود رنز بنا سکی۔

یہ فلم سٹار کرکٹ میچ بے حد کامیاب رہا۔ دوسرے دن مقامی تقریبات میں حصّہ لینے کا دن تھا۔ تیسرے دن سب لوگ ہوائی جہاز میں سوار ہو کر چٹاگانگ چلے گئے اور وہاں بھی کرکٹ میچ کھیلا۔ شام کو سمندر کے ساحل کی سیر کی۔ چٹاگانگ کے نزدیک کاکس بازار کا ساحل دنیا کا خوبصورت ترین قدرتی ساحل تسلیم کیا جاتا ہے۔ چٹاگانگ کی خوبصورتی کا کیا ٹھکانا۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے۔ اس لئے آب و ہوا بھی بہتر ہے اور نشیب و فراز میں تعمیر ہونے والی عمارتوں کی وجہ سے اس کے حُسن میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔ ڈھاکہ میں فلم سٹار مختلف مقامات پر گھومے۔ گھوڑوں کی ریس بھی دیکھی اور چھوٹے چھوٹے قد کے گھوڑے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

کمال کہنے لگے ''کمال ہے یار۔ اتنے چھوٹے چھوٹے گھوڑے ہیں پھر بھی دوڑتے ہیں ''

ساقی صاحب بولے ''اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ آخر ہیں تو گھوڑے اور گھوڑوں کا کام ہی دوڑنا ہوتا ہے۔ ''

اس سفر کی تفصیلی روداد کے لئے ایک علیحدہ دفتر چاہیے۔ وفد کے ارکان کو مقامی سٹوڈیو کی سیر بھی کرائی گئی۔ سٹوڈیو میں ایک چائے پارٹی کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ ملک کے دونوں حصّوں کے فن کار اس تقریب میں پہلی بار کافی دیر تک اکٹھّے رہے اور آپس میں تبادلۂ خیال بھی کیا۔ کاش اس قسم کے دورے کثرت سے ہوتے تو مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگوں کو نزدیک کرنے کے مواقع ملتے رہتے۔ مشرقی پاکستان کے فلم سازوں کی سادگی اور وقت کی پابندی دیکھ کر

مغربی پاکستان کے فنکار حیران رہ گئے۔ سادہ لباس‘ نہ میک اپ نہ زیورات ‘سائیکل رکشا میں سوار ہو کر سٹوڈیو آجاتے تھے۔ صبح نو بجے حاضر اور شوٹنگ کیلیئے تیار۔۔۔نہ کوئی نخرہ نہ شرط اور نہ فرمائش ڈائریکٹر کی وہاں بہت عزّت تھی۔ کیا مجال جو کوئی آرٹسٹ اس کی حکم عدولی کرے۔ ڈائریکٹر سیٹ پر آتا تھا تو بڑے بڑے سٹار احتراماً کھڑے ہو جاتے تھے۔

قاضی ظہیر بھی مشرقی پاکستان کے ایک کامیاب ڈائریکٹر تھے۔ ایک بار فلم کی ہیروئن ایک گھنٹے لیٹ پہنچی تو وہ سیٹ چھوڑ کر چلے گئے اور فلم ساز سے کہا کہ مجھے دوسری ہیروئن کا بندوبست کر دیں۔
ہیروئن نے بہت منّت سماجت کی۔ دیر سے آنے کی وجوہات بیان کیں مگر فلم ساز اپنے ہدایت کار کے حکم کا پابند تھا۔ اس فلم میں دوسری ہیروئن کو کاسٹ کر لیا گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دیر سے آنے والی ہیروئن کی شہرت خراب ہو گئی تو دوسرے فلم ساز۔ بھی اسے فلم میں کاسٹ کرنے سے کترانے لگے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی ساکھ اور شہرت کو بحال کیا۔

ہم مغربی پاکستان کے فلم والوں کو تو یہ خیالی داستانیں ہی لگتی تھیں کیونکہ یہاں کا فلمی ماحول ‘دستور اور طور طریقے اس سے قطعی مختلف تھے۔ بڑے اداکاروں کے نخرے ان کی ناز برداری اور ان کی ہر قسم کے قواعد اور ضابطوں سے آزادی یہاں معمول میں داخل رہی ہے لیکن مشرقی پاکستان میں حالات بالکل مختلف تھے۔ دیر سے سیٹ پر پہنچنا یا ہدایت کار کا حکم نہ ماننا وہاں ایک انہونی بات سمجھی جاتی تھی جب کہ یہاں یہ معمول میں داخل تھا۔ مشرقی پاکستان سے جو آرٹسٹ لاہور اور کراچی میں آکر کام کرتے تھے کچھ عرصے بعد وہ بھی یہیں کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔
ہمیں یاد ہے کہ 1971ء میں عام انتخابات کے موقع پر مشرقی پاکستان سے اداکار فلم ساز ہدایت کار مصنّف و موسیقار خان عطاالرحمن ڈھاکہ سے چند روز کیلیئے لاہور آئے۔ وہ اداکارہ شبنم کی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ صبح ہم ان سے ملنے گئے۔ سرور بارہ بنکوی صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں اردو فلموں کی ترّقی اور فروغ میں سرور صاحب کا کتنا نمایاں حصّہ ہے۔ وہ مصنّف بھی تھے‘ شاعر بھی تھے اور بہت قابل اور ہنر مند ہدایت کار بھی تھے۔

ڈھاکہ کے اداکاروں، خصوصاً ہیروئنوں کو اردو بالکل نہیں آتی تھی چنانچہ اس مقصد کے لئے سرور بارہ بنکوی صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ سرور صاحب اس زمانے میں نوجوان اور خوش رو آدمی تھے۔ بہت اچھے شاعر تو تھے ہی مگر خوش گلو بھی تھے۔ ترنّم سے کلام سناتے تو سماں بندھ جاتا تھا۔ وہ انتہائی شائستہ اور بلند اخلاق انسان تھے۔ ڈھاکہ کی ہیروئنوں کو اردو، خصوصاً اردو تلفّظ اور لب ولہجہ سکھانے کا فرض سرور صاحب کو سونپا گیا تھا۔ شبنم نے جب اردو فلموں میں اداکاری شروع کی تو اردو بولنا تو کیا سمجھ بھی نہیں سکتی تھیں مگر انہوں نے اپنی محنت اور لگن سے یہ مرحلہ طے کرلیا۔ سرور صاحب ان کے بھی استاد تھے اور شبنم نے ہمیشہ سرور صاحب کو استاد کا درجہ اور احترام دیا۔ جن دنوں سرور صاحب کا گھر لاہور میں نہیں تھا اور وہ لاہور آتے تھے تو شبنم بڑے اصرار سے انہیں اپنے گھر مہمان رکھتی تھیں۔ مشرقی پاکستان سے آنے والے اکثر فن کاروں کی میزبانی کا شرف شبنم اور روبن گھوش حاصل کرتے تھے۔

سرور صاحب بھی شبنم کو لاہور کی ہیروئنوں جیسے طور طریقے اختیار کرنے پر ٹوکا کرتے تھے۔ اس روز شبنم کی کوٹھی پر پہنچے تو ناشتے کا دوسرا دور چل رہا تھا۔ روبن گھوش، عطاء الرحمن خان اور سرور بارہ بنکوی بیٹھے کافی پی رہے تھے اور گپ شپ میں مصروف تھے۔ ہم بھی اس محفل میں شریک ہوگئے۔ خان عطاء الرحمن کو مختلف دفاتر میں کچھ کام تھے۔ سرور صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ آفاقی صاحب کی خدمات حاصل کرو۔ اس معاملے میں یہ بہت مفید ثابت ہوں گے۔

ہم نے ان سے مسائل دریافت کئے اور ان کے سبھی کام ایک ہی دن میں کرانے کی ذمہ داری قبول کرلی۔

سرور صاحب سے سب کلام سنانے کی فرمائش کررہے تھے، وہ جان بچانے کے لئے یہ عُذر پیش کررہے تھے کہ اگر روبن باجے کے ساتھ گائیں گے تو وہ کلام سنائیں گے۔

روبن گھوش خاموشی سے اٹھے اور دوسرے کمرے سے ہارمونیم اٹھالائے۔ اب سرور صاحب کیلئے کوئی بہانہ باقی نہیں رہا تھا، اس لئے انہوں نے غزل خوانی شروع کر دی۔ روبن بہت اچھے موسیقار ہیں مگر شاعری زیادہ نہیں سمجھتے۔ مشکل الفاظ کے معنی پوچھتے رہتے ہیں لیکن خان عطاء الرحمن کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ اردو سے بخوبی واقف تھے۔

انگریزی، اردو، بنگالی تینوں زبانیں جانتے تھے، ان کا اردو تلفّظ اور شین قاف بھی بالکل درست تھا۔ صاحب ذوق آدمی تھے۔ اچھے شعر اور اچھے فقرے کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔ موسیقی کے رسیا تھے اور اچھی موسیقی خواہ کسی نے بنائی ہو۔ اس کی تعریف کرنے میں بُخل سے کام نہیں لیتے۔

ایک بار رشید عطرے صاحب فلم ''سوال'' کے لئے ایک نغمہ بنا رہے تھے اور میڈم نور جہاں اس کی ریہرسل میں مصروف تھیں۔ خان عطاء الرحمن ان دنوں اپنی کسی فلم کے سلسلے میں لاہور آئے ہوئے تھے اور گراموفون کمپنی میں موجود تھے۔ میڈم کی آواز سنی تو کھنچے چلے آئے۔ گانے کے بول تھے۔

لٹ اُلجھی سلجھا جا رے بالم

میں نہ لگاؤں گی ہاتھ رے

عطرے صاحب نے کمال کی دھن بنائی تھی اور میڈم نور جہاں غضب کی ادائیگی کر رہی تھیں۔ عطاء الرحمن چپ چاپ پیچھے کھڑے ہو گئے اور مسحوریت کے عالم میں سنتے رہے۔ کسی کی ان پر نظر نہ پڑی۔ جب تک گانے کی ریہرسل جاری رہی وہ اسی جگہ کھڑے رہے۔ ریہرسل ختم ہوئی تو آگے بڑھ کر سب سے ملے۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے رشید عطرے صاحب کا ہاتھ پکڑا اور کہا ''عطرے صاحب آپ نے بہت خوبصورت گانا بنایا ہے۔ ''

پھر میڈم کی طرف مخاطب ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے۔ ''میڈم کو تو میں بس سلام ہی کر سکتا ہوں۔ ''

وہ بذات خود نامور موسیقار تھے مگر بلا تامل دوسروں کے اچھے کام کا اعتراف کر لیا۔

ابھی ہم لوگ اس شغل میں مصروف تھے کہ شبنم اندر کمرے سے باہر نکلیں اور سب کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہونے لگیں۔

''جھرنا۔ کہاں جا رہی ہو؟'' عطاء الرحمن نے پوچھا۔

انہوں نے جواب دیا ''میری شوٹنگ ہے دادا۔ شام کو آجاؤں گی۔ ''

عطاء الرحمن نے حیران ہو کر دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا اور بولے '' ساڑھے دس بجے ہیں۔ تم اس وقت شوٹنگ پر جا رہی ہو؟ اتنی لیٹ؟ ''

شبنم جھینپ سی گئیں۔ پھر بولیں ''دادا یہاں سب اس سے بھی زیادہ دیر میں آتے ہیں۔ ''

عطاء الرحمن نے کہا'' بڑے افسوس کی بات ہے۔ شبنم تم بھی یہاں کے رنگ میں رنگ گئی ہو۔ دوسرے چاہے کچھ بھی کریں۔ تمہیں تو اپنا اصول یاد رکھنا چاہیے۔ یہ سب کیا سوچتے ہوں گے کہ ہم نے ڈھاکہ میں تمہاری صحیح تربیت نہیں کی'' ''! سوری دادا'' شبنم نے نظریں جھکا کر کہا اور چُپکے سے باہر نکل گئیں۔

عطاءالرحمن ان کے جانے کے بعد روبن گھوش سے مخاطب ہوگئے'' بڑے افسوس کی بات ہے روبن تم نے بھی اسے منع نہیں کیا۔ ''

روبن چپ ہو رہے ورنہ ان کے پاس بھی یہی معقول جواب تھا کہ یہاں سب اس طرح کرتے ہیں۔

یہ تذکرہ تو یوں ہی نکل آیا۔ ہم اپنے سفر ڈھاکہ کی روداد بیان کر رہے تھے۔ اس سفر کے دوران میں اور بھی کئی دلچسپ واقعات پیش آئے جو ہمیشہ یاد رہیں گے۔

ایک دن اداکار ہمالیہ والا نے ہمارے پاس سو سو روپے کے دو نوٹ رکھوائے اور کہا'' آفاقی یہ تم رکھ لو۔ پھر تم سے لے لوں گا

ہم نے کہا'' واپس لینے ہیں تو دیتے کیوں ہو؟ ''

بولے'' یار میرے پاس ہوں تو خرچ ہو جائیں گے۔ تم بھروسے کے آدمی ہو رکھ لو''

ہم نے ان کے دو سو روپے رکھ لئے۔ رات کو ایک ڈنر میں جانا تھا جہاں ہمالیہ صاحب مگن ہوگئے اور ترنگ کے عالم میں بھول گئے کہ نوٹ ہمارے پاس رکھوائے ہیں۔ ہوٹل واپس آنے کے بعد وہ مختلف لوگوں کے کمروں میں جا کر اپنے نوٹ تلاش کرتے رہے اور کمروں کی تلاشی لیتے رہے۔

ہم اور سیّد کمال دونوں ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ روشنی بجھا کر ابھی سونے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ہمالیہ والا دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئے اور الماریوں' میزوں کی درازوں کی تلاشی میں مصروف ہوگئے۔

کمال نے حیران ہو کر پوچھا'' یہ کیا کر رہے ہیں؟ ''

ہم نے کہا'' شاید اپنے نوٹ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ''

ہمالیہ والا چلے گئے تو ہم نے انہیں یہ قصّہ سنایا۔

وہ کہنے لگے ''یار وہ بھول ہی گئے ہیں تو دو سو روپے تم ضبط کر لو۔ ''

چند لمحے بعد ہمالیہ صاحب دوبارہ اسی عالم میں کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ صرف انڈرویئر اور بنیان پہنے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہم دونوں پھر سوتے بن گئے۔ وہ دبے پاؤں الماری کی طرف گئے۔ الماری میں لٹکے ہوئے کپڑوں کی تلاشی لی اور پھر ہمارے سرہانے کی طرف بڑھے تو کمال نے اچانک روشنی جلادی۔

ہمالیہ صاحب بوکھلا گئے۔

کمال نے انجان بن کر پوچھا ''ارے ہمالیہ صاحب آپ؟ کیا بات ہے خیریت تو ہے نا؟ ''

انہوں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر آہستہ سے کہا ''میرے دو سو روپے گم ہو گئے ہیں کسی کو مت بتانا۔ ''

''مگر آپ ہمارے کمرے میں کیوں آئے ہیں؟ ''

''یوں ہی بس روپے تلاش کرنے چلا آیا ''

کمال نے کہا ''ہمالیہ صاحب نوٹ آپ کے وہاں گم ہوئے' تلاش کرنے آپ یہاں آ گئے۔ وہ نوٹ ہمارے کمرے میں کیسے آ سکتے ہیں؟ ''

وہ کہنے لگے '' چپ کرو یار کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے، خیر کوئی بات نہیں، تم چُپ چاپ سو جاؤ شاباش اور دیکھو کسی کو بتانا مت اوکے؟ ''

''اوکے'' وہ کمرے سے چلے گئے۔

ہم نے کہا ''ہمارا خیال ہے کہ انہیں دو سو روپے واپس کر دیں۔ ''

بولے ''بالکل نہیں۔ انہیں ساری رات تلاش کرنے دو سب کو تنگ کرنے دو۔ ''

صبح ناشتے کی میز پر سب اکٹّھے تھے اور ہر کوئی عطاءاللہ شاہ سے شکایت کر رہا تھا کہ ہمالیہ والا نے ساری رات ہمیں پریشان کیا ہے۔ سونے نہیں دیا۔ عطاءاللہ شاہ صاحب کو ہم سارا قصّہ سنا چکے تھے۔

انہوں نے بالکل انجان بن کر ہمالیہ والا سے پوچھا ''کیوں بھئی ہمالیہ صاحب، یہ سب آپ کی شکایت کر رہے ہیں کہ آپ نے رات انہیں سونے نہیں دیا۔ ''

وہ بولے ''شاہ جی میں خود بھی تو جاگتا رہا ہوں ''

شاہ صاحب نے پوچھا ''تو کیا آپ کی رقم مل گئی؟ ''

''جی نہیں ابھی تک تو نہیں ملی۔ ''

شاہ صاحب نے کہا ''اس کا مطلب یہ ہے کہ آج پھر آپ ساری رات ہر ایک کمرے کی تلاشی لیں گے؟، آپ نے تو پورے ہوٹل میں ہمیں شرمندہ کر دیا ہے، پورے وفد کا سر شرم سے جھک گیا ہے ''

ہمالیہ والے بگڑ کر بولے ''تو میں کیا کروں، میرے پیسے گم ہو گئے ہیں اور میں تلاش بھی نہ کروں ''

شاہ صاحب بولے ''تو کیا پیسے ننگے ہو کر تلاش کرنے تھے؟ اس میں ہم لوگوں کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ سب لوگ چندہ کر کے آپ کی رقم پوری کر دیں۔ اسی میں سب کا بھلا ہے۔''

''کوئی بات نہیں شاہ جی پیسے کا کیا ہے، ہاتھ کا میل ہوتا ہے۔ ''

ناشتے کے بعد ہم نے ایک طرف لے جا کر دو سو روپے ان کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ انہوں نے نوٹوں کو دیکھا پھر ہمیں دیکھا اور انہیں فوراً یاد آ گیا۔ ''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتا دیا تھا؟'' انہوں نے ناراض ہو کر پوچھا۔

''آپ نے پوچھا ہوتا تو بتاتے۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ آپ بھول جائیں گے اور پھر سارے ہوٹل میں تلاش کرتے رہیں گے۔ ''

مشرقی پاکستان کا ذکر چل نکلا ہے تو کچھ وہاں کی فلمی صنعت کا بھی بیان ہو جائے۔ قیام پاکستان کے بعد ڈھاکہ میں اہم فلم تقسیم کاروں کے دفاتر قائم ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے تقسیم کاری کا مرکز کلکتہ تھا۔ ڈھاکہ میں فلم سازی کا کوئی تصوّر ہی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ کلکتہ کے فلم ساز اپنی شوٹنگ کے لئے بھی ڈھاکہ کا رخ نہیں کرتے تھے۔ ڈھاکہ کا ایک تاریخی شہر ضرور تھا مگر کلکتہ کے نزدیک ہونے کی وجہ سے ترّقی کا سارا زور کلکتہ شہر پر ہی رہا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد کلکتہ سے سٹار فلمز کے مالک افتخار عالم نے ڈھاکہ کا رخ کیا۔اس وقت کے عام رجحان کے مطابق ان کے بڑے بھائی کلکتہ ہی میں مقیم رہے اور وہاں دفتر چلاتے رہے۔افتخار عالم صاحب نے ''سٹار فلمز'' کے نام سے ڈھاکہ میں جو دفتر قائم کیا تھااس کا بیشتر انحصار مغربی بنگال اور بھارتی فلموں کی درآمد پر ہی تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کافی عرصے تک پاکستانی فلموں پر کوئی دھیان نہ دیا۔جب بھارت سے فلموں کی درآمد پر پابندی عائد ہوگئی اور مغربی پاکستان میں صنعت فلم سازی نے ترّقی کی تو مجبور ہو کر انہوں نے پاکستانی فلموں کی طرف بھی توجہ دی لیکن بد قسمتی سے ان کا زیادہ تر رجحان بلکہ ہمدردیاں بھارتی فلموں سے ہی وابستہ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ جب پاکستان میں بھارتی فلموں کی بندش کے سلسلے میں ڈھاکہ میں منعقد ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس میں اس وقت کے وزیر قانون نے ایک بل پیش کیا تو افتخار عالم صاحب اور ان کی ہم نوا بھارتی فلموں کی لابی نے ہر طرح اسے ناکام بنانے کی کوشش کی۔ ارکان اسمبلی اور ان کی بیگمات کو کلکتہ کی سیر کرائی گئی۔وہاں ہر ایک کو دو دو چار چار ہزار روپے کی شاپنگ کرائی گئی اور دوسرے تحائف بھی پیش کئے گئے۔یہ لوگ صاحبِ زر اور صاحبِ اثر تھے۔ انہیں ہندوؤں کی تائید بھی حاصل تھی۔پیسے خرچ کرنے کی استطاعت بھی رکھتے تھے۔اس لئے انہوں نے بھارتی فلموں پر پابندی کے بل کو روکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔آخر یہ ان کے منافع اور کاروبار کا مسئلہ تھا۔بہر حال صدر ایوّب خان کی ذاتی دلچسپی اور وزیر قانون خورشید صاحب کی مخلصانہ کوششوں سے یہ بل قانون میں بدل گیا تو مجبوراً بھارتی فلموں کے دوسرے تقسیم کاروں نے بھی پاکستانی فلموں کی خریداری میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔

کلکتہ سے محدود پیمانے پر بھارتی فلمیں کافی عرصے تک درآمد ہوتی رہیں اور سٹار فلمز والوں کی کوشش رہی کہ پاکستانی فلم ساز بھارتی فلموں کے چربے بناتے رہیں۔وہ جن فلم سازوں کی فلموں کے حقوق خریدتے تھے انہیں بھارتی فلموں کے سکرپٹ اور کہانیاں بھی فراہم کر دیا کرتے تھے۔بہر حال رفتہ رفتہ بھارتی فلموں کی درآمد کا سلسلہ ختم ہوا تو لامحالہ مغربی پاکستان سے اردو فلموں کے حقوق خریدنے کے رجحان میں اضافہ ہو گیا۔
مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان کی فلموں کی کافی مانگ تھی مگر وہاں فلم سازی کے لئے کسی بھی قسم کی سہولت سرے

سے موجود ہی نہیں تھی۔اس کے باوجود چند سر پھروں نے فلم سازی کی طرف توجہ دی اور تمام تر مشکلات اور سرمائے کی کمی کے باوجود بنگلہ زبان میں فلمیں بننے کا بیڑا اٹھایا۔

اس سلسلے میں کوئی باقاعدہ ریکارڈ تو موجود نہیں ہے کیونکہ مشرقی پاکستان کے معاملے میں بے تعلقی کے باعث وہاں کی صنعت فلم سازی کے بارے میں بھی یہاں کسی نے معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے ڈھاکہ میں بنائی جانے والی پہلی بنگالی زبان کی فلم ""مُکھومُکوش"" تھی۔ یہ فلم 1958ء میں بنائی گئی تھی۔اس کے فلم ساز اور ہدایت کار قاضی ظہیر تھے جنہیں ڈھاکہ کی فلمی صنعت کا بانی کہا جاسکتا ہے۔ قاضی ظہیر بعد میں بھی فلمیں بناتے رہے تھے اور انہوں نے اردو فلمیں بھی بنائی تھیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مہذّب اور شائستہ آدمی تھے۔
ڈھاکہ کی صنعت میں ان کا حد درجہ احترام کیا جاتا تھا۔ یہ فلم کامیاب ہوئی تو دوسروں کو بھی حوصلہ پڑا۔ دوسری بنگلہ فلم ""آکاش ارمتی"" 1959ء میں بنائی گئی۔ اسی سال ایک اور بنگلہ فلم ""ماتر پہاڑ"" بھی بنی۔ان سب فلموں میں منافع حاصل ہوا تو دوسرے حضرات بھی فلم سازی کے میدان میں کود پڑے۔

احتشام نے اپنی پہلی فلم ""اے دیش تُمھار امار"" (یہ ملک میرا اور تمہارا ہے (بنائی جو کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔احتشام فلم سازی کی مزید تربیت لینے کے لئے مغربی پاکستان میں بھی آکر رہے اور ممتاز فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے ساتھ ملتے رہے۔ یہ اُس زمانے میں کیپٹن رحمان کے نام سے جانے جاتے تھے۔ انہوں نے فلم سازی اور ہدایت کاری میں بہت نام پیدا کیا۔اداکار ندیم کو ہیرو اور بعد میں اپنا داماد بنانے والے بھی یہی حضرت ہیں۔
ندیم کو گلوکاری کا شوق تھا۔ وہ کراچی میں رہتے تھے اور نذیر بیگ کے نام سے جانے جاتے تھے۔گلوکاری ان کا خواب تھا۔احتشام صاحب نے فلم ""چکوری"" کے ہیرو "" اعظم"" کی کسی حرکت سے ناراض ہو کر ان کی جگہ نذیر بیگ کو فلم کا ہیرو منتخب کرلیا اور انہیں ندیم کے نام سے متعارف کرایا۔ایک لحاظ سے یہ لوّ میرج تھی۔احتشام کے چھوٹے بھائی مستفیض نے بھی کئی کامیاب فلمیں بنائیں اور ہدایت کاری بھی کی۔ ہم جانتے ہیں کہ ندیم کو جب گلوکاری سے اداکاری کی جانب آنا پڑا تو یہ کتنا مشکل کام تھا ان کے لئے۔ وہ اداکار نہیں بننا چاہتے تھے۔ لیکن احتشام صاحب نے انہیں قائل

کرلیا۔ڈھاکہ کی صنعت فلم سازی کے لئے ان دونوں بھائیوں کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ مستفیض نے بھی بنگلہ‘ اردو دونوں زبانوں میں فلمیں بنائیں۔بنگالی فلمیں بہت کم سرمائے سے بنائی جاتی تھیں۔
کامیابی سے حوصلہ پاکر فلم سازوں نے بہتر پروڈکشن کی طرف توّجہ دی اوراس مقصد کے لئے لاہور کارخ کیا۔لاہور میں بنگالی فلموں کے گانوں کی ریکارڈنگ ہوا کرتی تھی‘ بعد میں اردو فلم سازوں نے بھی یہی طریقہ اپنایااور کافی عرصے تک گانوں کی صدابندی اور فلموں کی پرنٹنگ لاہور میں ہوتی رہی۔رفتہ رفتہ ڈھاکہ سٹوڈیو کے قیام کے بعد وہاں دوسری سہولتیں بھی فراہم ہوگئیں۔گلوکار ‘موسیقار‘ سازندے‘ ساؤنڈریکارڈسٹ‘ ایڈیٹر سبھی کچھ وہاں دستیاب ہونے لگا توڈھاکہ کے فلم سازوں نے مغربی پاکستان کارخ کرنا چھوڑدیااور فلم سازی کے معاملات میں خود کفیل ہوگئے۔
ڈھاکہ میں ابتدائی زمانے میں بنائی جانے والی بنگالی فلموں میں ’’راجو بائی بوکے‘‘ اور’’ گھُھوُروشنی‘‘ بھی قابل ذکر ہیں۔
جیسا کہ اوپر بیان کیا گیاہے مشرقی پاکستان میں بنائی جانے والی سب سے پہلی فلم ’’مُکھومُکوش‘‘ تھی۔اس کا مطلب ہے ’’مصنوعی چہرہ‘‘ اس کے فلم ساز عبدالجبار خان تھے۔جبار صاحب بھی بڑے مہم جوانسان تھے۔انہوں نے صرف ایک ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے یہ فلم تیار کی تھی۔اس میں تکنیکی خامیوں کی کمی نہیں تھی مگراس کے باوجود مشرقی پاکستان کے لوگوں نے اپنی سرزمین پر بنائی جانے والی پہلی بنگالی فلم کا پُرجوش خیر مقدم کیا جس سے دوسرے لوگ بھی فلم سازی کی طرف مائل ہوگئے۔کچھ عرصے بعد مشرقی پاکستان میں ایف ڈی سی فلم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کاقیام عمل میں آیا۔اس کے زیراہتمام فلم سازی کے بنیادی لوازمات فراہم کردیئے گئےاور فلم سازوں کو سرمایہ فراہم کرنے کا طریقہ بھی رائج کیا گیاجو آج بھی موجود ہے۔اس زمانے میں ایک بلیک اینڈ وائٹ فلم بنانے کے لئے فلم ساز کو75 ہزارروپے نقد قرضے کے طورپر دیئے جاتے تھے۔سٹوڈیو کی سہولتیں اور خام فلم بھی ایف ڈی سی فراہم کرتی تھی۔
فلم کانیگیٹوایف ڈی سی کی تحویل میں رہتا تھاجس کی بناپر فلم ساز کو دیا ہواسرمایہ محفوظ ہوجاتا تھا۔فلم کی ریلیز کے موقع پردو فیصد سُود وصول کرنے کے بعد فلم کے پرنٹ فلم ساز کے حوالے کردیئے جاتے تھے۔یہ کارپوریشن فلم

تقسیم کاروں اور فلم سازوں کے مابین معاہدے اور شرائط کی بھی نگرانی کرتی تھی اور یہ بھی نگرانی کرتی تھی کہ سینما گھروں کے مالک کرایوں میں بے جا اور غیر ضروری اضافہ نہ کر سکیں۔

یہ انتہائی مفید اور فلمی صنعت کے لئے بے حد سازگار صورت حال تھی جس پر آج بھی عمل کیا جاتا ہے۔ ان دنوں ایک بلیک اینڈ وائٹ فلم پر سوا لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ روپے تک لاگت آتی تھی۔ اس لئے فلم ساز کو فراہم کئے جانے والا سرمایہ بہت معقول تھا۔ آگے چل کر فلموں کی لاگت میں اضافہ ہو گیا اور رنگین فلمیں بھی بننی شروع ہو گئیں چنانچہ قرضے کی رقم میں بھی اسی مناسبت سے اضافہ کر دیا گیا۔

ہمیں 1987ء میں بھی بنگلہ دیش جانے کا ملا۔ پرانے دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور عطاء الرحمن خان نے ہمیں ایف ڈی سی کے سٹوڈیو کی بھی سیر کرائی (اب وہ مرحوم ہو چکے ہیں)۔ اس وقت یہ کئی منزلہ خوبصورت عمارت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ سٹوڈیو میں جدید ترین سہولتیں، ایڈیٹنگ کا جدید ترین ساز و سامان اور رنگین کمپیوٹر کے ذریعے استعمال کی جانے والی لیبارٹری بھی موجود تھی۔ پاکستان کے فلم ساز آج بھی ان سہولتوں سے محروم ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ اس وقت ایک رنگین فلم بارہ سے پندرہ لاکھ ٹکے میں بن جاتی تھی۔ ایک ٹکا ان دنوں آٹھ آنے کے برابر تھا۔ فلم ساز کو پانچ لاکھ ٹکہ نقد قرضہ دیا جاتا تھا۔ دوسری تمام سہولتیں اور مراعات حسب سابق تھیں۔ بلیک اینڈ وائٹ فلم کے لئے دو لاکھ ٹکا قرضہ دیا جاتا تھا۔ ان فلموں پر سات آٹھ لاکھ ٹکا لاگت آتی تھی۔ اس لئے یہ معقول رقم تھی۔ ایف ڈی سی کے ایم ڈی ایک ریٹائرڈ کرنل تھے۔ یہ دراز قد اور خوبرو آدمی تھے۔ فوج کی تعلیم انہوں نے کاکول اکیڈمی سے حاصل کی تھی اس لئے بہت اچھی اردو بولتے تھے۔

انہوں نے بتایا کہ فلم کارپوریشن کی وجہ سے فلمی صنعت کو بھی فائدہ ہے اور حکومت کو بھی۔ آغاز میں یہ کارپوریشن دو لاکھ روپے کی لاگت سے قائم کی گئی تھی۔ 1987ء میں اس کے اثاثے 25 کروڑ سے بھی زائد تھے اور یہ منافع میں چل رہی تھی۔ کارپوریشن فلم سازوں، تقسیم کاروں اور سینما والوں کے باہمی تنازعات اور مسائل حل کرنے میں بھی مدد دیتی تھی۔ سینما والوں کو اجازت کے بغیر کرایوں میں اضافہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی طرح تقسیم

کاروں کو بھی فلم سازوں کی حق تلفی اور لوٹ کھسوٹ کا حق نہیں تھا۔ ہماری موجودگی میں بھی سینما گھروں کے کرایوں میں مجوزہ اضافے کے مسئلے پر ایک میٹنگ منعقد ہوئی تھی۔ جس میں فلم ساز، تقسیم کار اور سینما والوں کی انجمنوں کے نمائندے شامل تھے۔ تینوں وفود نے اپنے اپنے مسائل پیش کئے اور دلائل دیئے۔ کارپوریشن کے مینجنگ ڈائریکٹر اس میٹنگ کی صدارت کر رہے تھے۔ تینوں فریقوں کی بات سننے کے بعد انہوں نے جو فیصلہ کیا اس کی پابندی تینوں فریقوں کے لئے لازمی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ فلم کارپوریشن کو نظرانداز یا ناراض کرنے کے بعد وہاں کوئی شخص فلمی کاروبار نہیں چلا سکتا تھا۔

یہ سسٹم ہمیں بہت پسند آیا۔ پاکستان واپس آکر ہم نے اس زمانے میں نیف ڈیک کے ایم ڈی آغا ناصر صاحب کو رپورٹ دی اور کہا کہ نیف ڈیک کو بھی ان ہی خطوط پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اس وقت کے وزیر اطلاعات و ثقافت سے بھی ہم نے اس مسئلے پر بات چیت کی۔ یہاں تک کہ تحریری طور پر ایک رپورٹ بنا کر صدر ضیاء الحق کو بھی ارسال کر دی جس میں کہا گیا تھا کہ حکومت ان اصولوں کو اپنا لے جن کی داغ بیل پاکستانی حکومت نے ہی ڈالی تھی اور منصوبے کے تحت اس قسم کی کارپوریشنیں بیک وقت مشرقی اور مغربی پاکستان میں قائم کی۔ مگر مشرقی پاکستان والوں نے اس پر عمل شروع کر دیا جب کہ مغربی پاکستانی کی فلم صنعت اس سے محروم ہی رہی اور آج تک محروم ہے۔ ہماری اس تگ ودو کا حسب توقع کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور نیف ڈیک ان ہی بے ڈھنگے خطوط پر چلتی رہی جن سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔

ایف ڈی سی کی پانچ منزلہ خوبصورت اور جدید ترین عمارت دیکھ کر ہم بہت متاثر ہوئے۔ ایک طرف ایڈیٹنگ روم تھے جو مغرب کے معیار کے مطابق مکمل ائر کنڈیشنڈ تھے اور وہاں ویسی ہی احتیاط برتی جاتی تھی جیسی کہ یورپی ملکوں کے ایڈیٹنگ رومز میں ہوتی ہے۔ لیبارٹری دیکھ کر تو سچ مچ ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ جدید ترین رنگین لیبارٹری بھی ہر طرح سے مغربی معیار کے مطابق تھی۔ ہر کام کمپیوٹر کے ذریعے ہو رہا تھا اور بہت سُرعت کے ساتھ' بہتر نتائج برآمد ہو رہے تھے۔ سٹوڈیو کا ایک فلور مکمل ائر کنڈیشنڈ تھا۔ آلات جدید ترین تھے۔ ایسے کیمرے، ٹرالی اور ڈولی آج تک پاکستانی نگار خانوں کو نصیب نہیں ہو سکی ہے۔ ساؤنڈ ریکارڈنگ کے لئے بھی بہترین اور جدید ترین طریقہ کار تھا۔

ہمیں خوشی بھی ہوئی رشک بھی آیا اور عبرت بھی حاصل ہوئی۔ یہ وہ منصوبہ تھا جو مغربی پاکستان میں پروان چڑھا تھا لیکن اس پر عمل مشرقی پاکستان اور اب بنگلہ دیش میں ہوا۔ ہم کاغذی منصوبے کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے۔

بھٹّو صاحب کے دور میں بہت تیر مارا تو نیشنل فلم ڈویلپمنٹ کارپوریشن (نیف ڈیک) بنادی گئی جو بذات خود سفید ہاتھی بلکہ پورس کا ہاتھی ثابت ہوئی۔ اس سے نہ حکومت کو فائدہ پہنچا نہ فلمی صنعت کو۔ کروڑوں روپے کا نقصان البتہ قومی خزانے کو برداشت کرنا پڑا۔ نگران حکومت کے قیام سے پہلے یہ عالم تھا کہ عملے کے ارکان کو تنخواہیں دینا بھی دوبھر تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ اس ادارے کو ختم کیا جا رہا ہے۔ کافی عرصہ قبل یہ ادارہ ختم ہو چکا ہے۔

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا

ہم محوِ نالۂ جرس کارواں رہے

بات یہ ہو رہی تھی کہ چند سر پھرے اور دل جلے افراد نے مشرقی پاکستان میں بڑی جدوجہد کی، پُر خلوص کام کیا اس لئے آج بنگلہ دیش کی فلمی صنعت مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم ہے۔

ڈھاکہ میں بنگالی فلموں کی کامیابی کے بعد اردو فلموں کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کی پہلی اردو فلم ''چندا'' تھی جو 1962ء میں تیار ہوئی تھی۔ اس نے مغربی پاکستان میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ دراصل مشرقی پاکستان کے فلم ساز نئے موضوعات ' سیدھے سادے انداز میں فلماتے تھے۔ اداکار بھی نئے ہوتے تھے۔ ماحول اور پیشکش کا طریقہ بھی سادہ اور پُراثر ہوتا تھا جو مغربی پاکستان کے فلم بینوں کو بھی پسند آتا تھا اور وہاں بے حد کم لاگت سے بنائی جانے والی فلمیں یہاں بے پناہ کامیابی اور دولت حاصل کرتی تھیں۔ مشرقی پاکستان کی دوسری اردو فلم ''تلاش'' تھی۔ ''چندا'' میں شبنم اور رحمان پہلی بار مغربی پاکستان میں متعارف ہوئے تھے۔ اس کی موسیقی دلکش تھی۔ اداکار' ہدایت کار ' موسیقار سبھی نئے تھے پھر بھی اس نے سارے پاکستان میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔

فلم ''چکوری'' کے فلم ساز و ہدایت کار احتشام تھے۔ اس فلم میں انہوں نے شبنم اور رحمان کا سہارا لینے کے بجائے دو بالکل نئے چہرے پیش کئے تھے۔ یہ ندیم اور شبانہ تھے۔ چندا' تلاش اور چکوری تینوں سُپر ہٹ فلمیں ثابت ہوئیں۔ مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے مقابلے میں فلمی صنعت سے وابستہ بیشتر لوگ تعلیم یافتہ' ذہین اور اچھا خاندانی

پس منظر رکھتے تھے۔ ان میں صحافی مصنّف' شاعر' دانشوراور دوسرے ممتاز شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد شامل تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہاں فلمی صنعت مضبوط اور صحت مند بنیادوں پر قائم ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے قابل ذکر ترقّی کرلی۔اس کے بعد تو مشرقی پاکستان کے فلم سازوں میں اس قدر خود اعتمادی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ زیادہ تعداد میں اردو فلمیں بنانے لگے اور انہیں مغربی پاکستان کی نسبتاً پرانی تجربہ کار اور ترقّی یافتہ فلموں کا کوئی ڈر نہیں رہا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ پاکستان کی پہلی رنگین فلم اور پاکستان کی پہلی سینما سکوپ فلم بنانے کا اعزاز ڈھاکہ کی فلمی صنعت کو حاصل ہوا تھا۔1964ءمیں ظہیر ریحان نے پاکستان کی پہلی رنگین فلم بنائی تھی جس کا نام ''سنگم '' تھا۔اس وقت تک مغربی پاکستان میں صحیح معنوں میں کوئی مکمل رنگین فلم نہیں بنائی جاسکی تھی۔آغا جی اے گل اور ہدایت کار شریف نیّر کی فلم '' نائلہ '' ''سنگم '' کے بعد ریلیز ہوئی تھی۔ظہیر ریحان ہی کو پاکستان کی پہلی سینما سکوپ فلم ''جلتے سورج کے نیچے'' بنانے کا بھی امتیاز حاصل ہوا تھا۔مشرقی پاکستان کے ذہین اور حوصلہ مند لوگوں نے فلم کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام حاصل کرلیا تھا اور ان میں سے بہت سے لوگ مغربی پاکستان میں آکر فلمیں بنانے لگے تھے۔فلم ساز ہدایت کار' موسیقار' گلوکار' ایڈیٹر 'اداکار' سبھی شعبوں میں مشرقی پاکستان کے لوگوں نے نمایاں کامیابیاں حاصل کیں اور نام پید کیا۔ان میں نذرالاسلام' روبن گھوش' مصلح الدین' گلوکار بشیر احمد' مصطفی' شاعر اختر یوسف' اداکار رحمان' اداکارہ شبنم کے نام نمایاں ہیں۔ڈھاکہ میں تعلیم یافتہ افراد نے فلم کے مختلف شعبوں میں بہت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔احتشام' مستفیض' عطاءالرحمن' سُبھاش دتہ 'بے بی اسلام' فتح لوہانی' قاضی ظہیر' ظہیر ریحان' نذرالاسلام جیسے افراد نے مختلف شعبوں سے ممتاز حیثیت حاصل کی اور ان کی کارکردگی کو ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔ڈھاکہ کی فلمی صنعت میں سبھی اداکار تعلیم یافتہ اور اچھے متوسط خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں رحمان' خان عطا' ہارون' عظیم' خلیل ،مصطفی' سُبھاش دتہ' انور حسین' اکبر وغیرہ صف اوّل کے اداکار تھے۔ ایکٹریسوں میں شبنم' سلطانہ زمان' شبانہ' سجاتا' سبیتا' کابوری' چترا 'روزی' نسیمہ خان' ریشماں' انورہ' مایا ہزاری' رانی سرکار نے بہت شہرت حاصل کی۔

ظہیر ریحان بہت ذہین اور تعلیم یافتہ مصنف اور ہدایت کار تھے۔ انہیں مغربی پاکستان میں رہنے کا موقع نصیب نہیں

ہوا لیکن نذرالاسلام جیسے لوگوں نے لاہور آکر بہت اچھی فلمیں بنائیں۔ڈھاکہ میں انہوں نے فلم "کاجل" اور "پیسہ" بنائی تھی۔وہ بنیادی طور پر فلم ایڈیٹر تھے مگر جب ہدایت کاری کی طرف مائل ہوئے تو بہت اچھے اور ممتاز ہدایت کاروں کی صف میں شامل ہو گئے۔پاکستان میں انہوں نے آئینہ' احساس' بندش' زندگی' لوّ اسٹوری 'نہیں ابھی نہیں' جیسی کامیاب اور یادگار فلمیں بنا کر شہرت حاصل کی۔

ڈھاکہ کے فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے بھی بہت اچھی اردو فلمیں بنائیں چکوری 'تلاش' چندا' اِیندھن' بَندھن' سَنگم' تنہا' آخری سٹیشن' بھیّا' نواب سراج الدولہ' مِلن' دَرشن' "چھوٹے صاحب" نے مغربی پاکستان میں بھی بہت کامیابی حاصل کی۔

مشرقی پاکستان کے فلم والے ہر اعتبار سے مغربی پاکستان والوں سے مختلف تھے۔ تعلیم نے انہیں روشن خیال اور منکسر المزاج بنا دیا تھا۔وہ نئے خیالات پیش کرنے' یا نئے تجربات سے بالکل نہیں گھبراتے تھے اور اس بنا پر نمایاں کامیابیاں حاصل کرتے تھے۔وہاں کے نگار خانوں میں نظم وضبط اور تہذیب و تمدن کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔وہاں بیشتر ایکٹریس تعلیم یافتہ اور متوسط گھرانوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بے جا ناز نخروں اور تصنّع کی عادی نہیں تھیں۔نگار خانے پر کسی درس گاہ کا گمان گزرتا تھا جہاں چھوٹے بڑے کا احترام اور ڈسپلن دیکھنے کو ملتا تھا۔اداکار اور اداکارائیں سادہ لباس پہن کر سائیکل رکشا یا سائیکل پر سوار ہو کر سٹوڈیو آتے تھے اور وقت کی پابندی کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔عام زندگی میں وہاں کی ایکٹریس بھاری میک اپ استعمال نہیں کرتی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی فلمی صنعت مالی اعتبار سے بھی مستحکم اور مضبوط ہو گئی تھی۔ان کی فلموں میں سادگی اور تازگی کا عنصر غالب تھا' نتیجہ یہ ہوا کہ سقوط مشرقی پاکستان سے پہلے وہاں کی فلمی صنعت پائیدار اور صحت مند بنیادوں پر مستحکم ہو چکی تھی۔بنگلہ دیش بن جانے کے بعد بھی ان کی ترقّی کا سفر جاری رہا۔جب وہاں اردو فلموں کی تیاری کا دور شروع ہوا تو کہانی نویس اور نغمہ نگاروں کی حیثیت سے ممتاز شعرا اور ادیبوں کی تلاش کی گئی۔منشی قسم کے اَن پڑھ لوگوں سے مدد نہیں لی گئی۔سرور بارہ بنکوی' اختر یوسف' نقی' مصطفی جیسے مستند ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔

مشرقی پاکستان والوں کو سیاسی اور اقتصادی شعبوں میں مغربی پاکستان سے بہت شکایات تھیں۔ یہی شکایات فلمی صنعت کے لوگوں کو بھی تھیں اور کافی حد تک درست اور بجا بھی تھیں۔ آغاز میں مشرقی پاکستان کی فلمیں غیر معیاری تھیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ان کے معیار میں نمایاں اضافہ ہوا۔ فلم سازی کی رفتار بھی کافی حد تک بڑھ گئی۔ بنگلہ فلموں کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی فلمیں بھی تیار ہونے لگیں۔ رنگین اور سینما سکوپ فلمیں بھی بنائی گئیں۔ مگر اس کے باوجود انہیں شکایت رہی کہ مغربی پاکستان کے فلم ساز انہیں کمتر اور پسماندہ تصوّر کرتے ہیں۔ اس میں کچھ صداقت بھی تھی۔ یہ دراصل مغربی یا مشرقی پاکستان کا مسئلہ نہ تھا بلکہ بد قسمتی سے یہاں کی فلمی صنعت سے وابستہ لوگ خود کو بہت ارفع اور بلند تر سمجھتے تھے' وہ بھلا مشرقی پاکستان کی نوزائیدہ صنعت کو کیا خاطر میں لاتے۔ مشرقی پاکستان میں جب بھی کوئی فلمی میلہ یا فلمی تقریب منعقد ہوتی تھی وہ مغربی پاکستان کے فلم والوں کو ضرور مدعو کرتے تھے۔ یہاں سے بہت کم لوگ ان دعوت ناموں کو قبول کرتے تھے۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان میں اس قسم کی فلمی تقریبات میں مشرقی پاکستانیوں کو مدعو کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ یہاں کے فلمی لوگ اپنے حال میں مگن اور برتری کے احساس میں مبتلا تھے۔

جب بین الاقوامی فلمی میلوں میں پاکستانی فلمیں بھیجنے کا موقع آیا تو اس معاملے میں بھی بنگالیوں کو ہمیشہ شکایت ہی رہی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسے میلوں میں مشرقی پاکستان کی فلم کیوں شامل نہیں کی جاتی جب کہ وہاں کی فلموں کا معیار بھی کم نہیں ہے۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرقی پاکستان کی فلموں کے موضوعات بہتر اور تازگی بخش ہوتے تھے۔ پاکستان میں جب صدارتی فلم ایوارڈ کا آغاز کیا گیا تو مشرقی پاکستان کی فلم ''آسیہ'' اور ''کانچر دیال'' نے یہ ایوارڈ حاصل کیا تھا جس سے ثابت ہوا کہ وہاں کی فلموں کا معیار بلند تھا۔ مشرقی پاکستان کی ایک اور بنگلہ فلم ''شوتورنگ'' نے بھی کئی بین الاقوامی ایوارڈز حاصل کئے تھے۔

اس کے برعکس بھارت کی جانب سے بین الاقوامی فلمی میلوں میں بنگلہ اور دیگر علاقائی زبانوں کی اچھی فلمیں بھی پیش کی جاتی تھیں اور وہ ایوارڈ بھی حاصل کرتی تھیں۔ مشرقی پاکستان کے فلم سازوں کا کہنا تھا کہ پاکستان کی طرف سے بنگلہ فلمیں عالمی فلمی میلوں میں کیوں نہیں بھیجی جاتیں۔ ان کی شکایات بجا تھیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس میں

تعصّب کا کوئی دخل نہ تھا۔ ہمارے ملک کے مختلف شعبوں میں پارٹی بازی، جانب داری اور ناانصافی کا جو چلن رہا ہے اس کی بنا پر انصاف اور میرٹ کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا۔ یہی جذبہ اور طریقہ فلمی صنعت کے معاملات میں بھی کارفرما تھا۔ انہیں کوئی سمجھاتا کہ خود مغربی پاکستان کی بہت سی معیاری اور ممتاز فلمیں بھی عالمی میلوں میں شرکت کیلئے منتخب نہیں کی جاتی تھیں کیونکہ وہ برسراقتدار گروپ کے فلم سازوں سے تعلق نہیں رکھتی تھیں۔

اے جے کاردار کی فلم ''جاگو ہوا سویرا'' جس نے بہت سے بین الاقوامی اعزازات حاصل کئے تھے وہ بھی تکنیکی اعتبار سے مشرقی پاکستان ہی کی فلم تھی اور اسی حیثیت سے رجسٹر کی گئی تھی۔ اے جے کاردار کی دوسری فلم (Human of happiness دور ہے سُکھ کا گاؤں) بھی مشرقی پاکستان ہی میں فلم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کی جانب سے تیار کی جارہی تھی اور اس نے فلم کے لئے سرمایہ بھی فراہم کیا تھا۔ بدقسمتی سے یہ فلم سازش کا شکار ہونے کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکی حالانکہ اس کے تیار شدہ حصّے کے بارے میں دیکھنے والوں کا خیال تھا کہ یہ ہر اعتبار سے ''جاگو ہوا سویرا'' سے بہتر ہوتی۔

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی فلمی صنعت میں ایک اور نمایاں فرق یہ بھی تھا کہ وہاں سرکار دربار میں فلم والوں کو ایک ممتاز اور قابل عزت مقام حاصل تھا۔ جبکہ یہاں بیوروکریٹ اور حکمران طبقہ عام طور پر فلم والوں کو حقیر سمجھتے تھے اور انہیں معزز شہریوں کی صف میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ جن چند فلم والوں نے عزّت اور احترام حاصل کیا تھا وہ ان کی ذات کے باعث تھا نہ کہ پیشے کی وجہ سے انہیں محترم سمجھا جاتا تھا۔

مشرقی پاکستان کے لوگوں نے مغربی پاکستان کے ہنر مندوں اور تجربہ کار افراد سے تربیت حاصل کرنے اور سیکھنے میں کبھی تکلّف یا جھجک سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے مغربی پاکستان والوں کے تجربے اور ہنر مندی سے پورا فائدہ اٹھایا اور پھر اس تربیت کو تازہ اور نئے خیالات کو فلمانے کیلئے استعمال کیا جس کا بہت خوشگوار نتیجہ برآمد ہوا اور انہوں نے منفرد انداز کی فلمیں بنائیں۔ مشرقی پاکستان کے فلم ساز مجموعی طور پر مغربی پاکستانی فلم سازوں کے مقابلے میں مالی اعتبار سے زیادہ مستحکم اور خوشحال ہیں۔

یہ سلسلہ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد بھی جاری ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں فلمی ٹریڈ میں بہت زیادہ

دھاندلی اور بددیانتی کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ تقسیم کار کامیاب فلم کی آمدنی میں سے فلم ساز کا حصہ اس کو پہنچا دیتا ہے۔ وہاں سینما والے فلم سازوں اور تقسیم کاروں کی کھال نہیں اتارتے۔ اس میں کچھ دخل خود فلم سازوں کی سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی کا بھی ہے اور پھر ایف ڈی سی بھی ان کے حقوق کی نگہبانی کرتا ہے اور یہ خیال رکھتا ہے کہ کوئی ایک شعبہ بھی دوسرے کے ساتھ ناانصافی نہ کرنے پائے۔ فلمی صنعت کے تین شعبے بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ فلم ساز تقسیم کار اور نمائش کار۔۔۔ یعنی سینما والے ہمارے ملک میں ہمیشہ یہ رواج رہا ہے کہ تقسیم کار اور نمائش کار مل کر فلم ساز کا استحصال کرتے ہیں اور اس کا حق نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں تقسیم کار اور سینماؤں کے مالک دولت میں کھیلتے ہیں جب کہ فلم ساز تہی دست اور کنگال رہتے ہیں۔ ان کی کامیاب فلموں کو بھی تقسیم کار اور سینما والوں کی ملی بھگت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کئی کامیاب فلموں کے فلم ساز بھی سڑک سوار نظر آتے ہیں۔ صنعت کار یا مینوفیکچر رہی کسی صنعت کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ اگر وہی خوشحال نہ ہوگا تو پھر اس صنعت میں خوشحالی اور بہتری کیسے آسکتی ہے؟ پاکستان میں صرف وہی فلم ساز منافع کما سکے جنہوں نے خود ہی تقسیم کار ادارے بھی قائم کر لئے تھے۔ ہر خوشحال فلم ساز کی خوشحالی کا راز یہی ہے۔ مگر ہر فلم ساز تو اتنا سرمایہ دار نہیں ہوتا کہ محض ذاتی وسائل سے فلم مکمل کر لے اور خود ہی اسے ریلیز کرنے کی استطاعت بھی رکھتا ہو۔ یہی پاکستان کی فلمی صنعت کا بنیادی المیہ رہا ہے اور آج بھی یہی طریقہ کار فرما ہے۔ جو لوگ سرمایہ لے کر آتے ہیں ان کے پاس علم تجربہ' صلاحیت اور ذہانت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی پسند کی فلمیں بناتے ہیں اور خود ہی انہیں ریلیز کرتے ہیں۔ فلم کامیاب ہونے کی صورت ہے وہ خوب منافع کماتے ہیں کیونکہ خود ہی تقسیم کار بھی ہوتے ہیں۔ جن کے پاس سرمایہ ہے وہ تجربہ ذہانت اور علم سے محروم ہیں اور جو لوگ ان صلاحیتوں سے نوازے گئے ہیں ان کی جیب خالی ہے۔ محض زرخیز ذہن کی مدد سے فلم نہیں بنائی جاسکتی اور نہ ہی محض سرمایہ اچھی فلم سازی کا ضامن ہو سکتا ہے۔

مشرقی پاکستان اور پھر بنگلہ دیش جانے کا ہمیں کئی بار اتفاق ہوا۔ ایسے دو تین مواقع کی روداد ہم بیان بھی کر چکے ہیں لیکن یہ داستان ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ آئندہ بھی مختلف حوالوں سے ڈھاکہ اور بنگلہ دیش کے واقعات بیان کرتے رہیں گے۔ اب تو وہاں بہت سے نئے سینما گھر اور ہوٹل بھی بن گئے ہیں مگر ایک زمانے میں تمام ڈھاکہ میں صرف نو

سینما گھر تھے اور ایک شاہ باغ ہوٹل ہی بہت اچھا ہوٹل تھا۔ یہ خوبصورت ' معیاری اور بے حد مصروف ہوٹل تھا۔ کمروں کے ایک جانب گیلری یا برآمدہ تھا اور دوسری جانب چھوٹی سی بالکونی تھی۔
ڈھاکہ کی بارش اور طوفان بہت قیامت خیز ہوتے ہیں۔ کئی بار ہمیں بھی ان حوادث سے دوچار ہونے کا موقع ملا۔ کبھی لطف اندوز ہوئے اور کبھی جان پر بن گئی۔ ایک بار شاہ باغ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ فلم سٹار رانی بھی اسی ہوٹل میں مقیم تھیں۔ رات کو اچانک موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ پانی پہلے بالکونی میں اکٹھا ہوا اور پھر کمروں کے اندر پہنچ گیا۔ رانی کی اچانک آنکھ کھلی تو یوں لگا جیسے کہ ان کا بیڈ پانی کی لہروں پر تیر رہا ہے۔ وہ اسے خواب سمجھیں مگر کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ کمرے کا سامان پانی میں تیر رہا تھا۔ وہ گھبرا کر بالکونی میں جانے لگیں تو کمرے میں ایک ایک فٹ پانی کھڑا تھا۔ ٹیلی فون کو ہاتھ لگایا تو وہ ڈیڈ تھا۔ لائٹ جلائی تو اس میں سے پانی نکلنے لگا۔ خدا خدا کر کے وہ رات کٹی تو رانی نے کانوں کو ہاتھ لگائے کہ کبھی برسات کے موسم میں ڈھاکہ کا رخ نہیں کریں گی۔

مشرقی پاکستان کے موسم غیر یقینی تو نہیں ہوتے تھے مگر اچانک تبدیل ضرور ہو جاتے تھے۔ ابھی دھوپ ہے ابھی بارش شروع ہو گئی۔ پھر ایک دم دوبارہ دھوپ نکل آئی۔ سردی وہاں برائے نام ہی ہوتی ہے۔ وہاں کے لوگ کا مزاج بھی موسموں جیسا ہی ہے۔ مگر سمجھدار اور عاقل لوگ موسموں کے ساتھ بخوبی سمجھوتا کر لیتے ہیں اور پھر خوش اور مطمئن رہتے ہیں لیکن ہمارے حکمرانوں اور سیاستدانوں نے ایسی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان' بنگلہ دیش بن گیا۔ وہاں کے موسم تو اب بھی وہی ہیں فرق صرف یہ ہے کہ اب وہ ہمارے موسم نہیں رہے۔ کاش ہم نے موسموں کو سمجھا ہوتا۔ بنگلہ دیش کی فلمی صنعت بھی اب ہماری صنعت نہیں رہی لیکن ان لوگوں کی ترقّی کی خبر سے آج بھی ویسی ہی خوشی ہوتی ہے آخر وہ ہمارے بھائی ہیں۔ الگ گھر بنا لیا تو کیا ہوا۔

کوڈک کے جنرل مینجر سے پنجہ آزمائی اور انہیں نیچا دکھانے کے نتیجے میں ہماری فلمی صنعت میں خوب واہ واہ ہوئی۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کوڈک اس زمانے میں بہت معقول خام فلم تھی۔ یہ دنیا بھر کا مانا ہوا بہت بڑا ادارہ تھا۔ کوڈک کی

فلم استعمال کرنا ساری دنیا کے فلم ساز باعث افتخار سمجھتے تھے۔اس وقت تک نہ تو گیورٹ کی فلم کو پذیرائی حاصل ہوئی تھی اور نہ ہی جاپانی خام فلم فیوجی نے مقبولیت حاصل کی تھی۔ جاپان نے جب فیوجی کے نام سے خام فلم بنانی شروع کی تو آغاز میں کسی نے بھی اسے اہمیت نہیں دی مگر رفتہ رفتہ یہ اندازہ ہوا کہ جاپانیوں نے کوڈک اور اس کی رنگین خام فلم ''ایسٹ مین کلر'' کے فارمولا کے مطابق ہی یہ خام فلم بنائی ہے۔بس تھوڑی بہت تبدیلی کر لی تا کہ کاپی رائٹ کا الزام عائد نہ ہو۔رفتہ رفتہ فیوجی فلم اس قدر مقبول ہوئی کہ پہلے سے استعمال کی جانی والی فلم گیورٹ سے بھی بازی لے گئی۔یہاں تک کہ رفتہ رفتہ کوڈک کا بستر بوریا گول ہو گیا۔اس کی ایک وجہ کوڈک کی قیمتیں بھی تھیں جو گیورٹ اور فیوجی سے کہیں زیادہ تھیں۔فیوجی نے معیار بھی بہتر دیا اور قیمت بھی کم تھی۔ فلموں کی بڑھتی ہوئی لاگت کو روکنے کیلیئے فلم سازوں نے کوڈک سے منہ موڑ لیا۔اس طرح گیورٹ اور فیوجی فلم کا پاکستان میں عام رواج ہو گیا۔یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد پاکستانی فلم ساز ''کوڈک'' کا نام تک بھول گئے۔

جاپانیوں نے کیمرے کے معاملے میں بھی یہی چالاکی برتی تھی،مچل کا کیمرہ دنیا بھر میں سند سمجھا جاتا تھا اور ظاہر ہے کہ بہت مہنگا تھا۔جاپانیوں نے اس کے مقابلے میں ''سکی'' کے نام سے ایک مووی کیمرا بنا کر بازار میں پیش کر دیا۔اس میں بھی بیشتر فارمولا مچل کا ہی استعمال کیا گیا تھا،معیار قریب قریب وہی تھا مگر قیمت میں نمایاں فرق تھا۔چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ''سکی'' کیمرا بھی پاکستان میں مقبول ہو گیا۔

جاپان والوں نے اپنی مصنوعات کا آغاز دوسروں کی نقلیں کر کے ہی کیا تھا۔یہ گھٹیا مال ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ جاپانی مصنوعات اور اشیا کو کمتر سمجھا جاتا تھا۔یہ پائیدار بھی نہیں ہوتی تھیں لیکن نقل کرتے کرتے جاپان والے ٹیکنالوجی سے بخوبی واقف ہو گئے اور پھر تو انہوں نے ساری دنیا میں برقی آلات،کمپیوٹرز اور دوسری مصنوعات میں امریکہ اور یورپ تک کو پیچھے چھوڑ دیا۔

یہ ہمارے سامنے کی باتیں ہیں۔افراد ہی نہیں،قوم بھی محنت لگن اور خلوص دل کے ساتھ کوشش کریں تو ترقّی کے مدارج طے کر سکتی ہیں،جاپان کی مثال ایک زندہ مثال ہے۔کئی سال کے بعد کوریا اور تائیوان نے بھی یہی کارنامہ کر دکھایا ہے اور اب چین والے ساری دنیا کو اپنی سحر کاریوں سے مسحور کر رہے ہیں۔یہ سب پسماندہ اور غریب قومیں

تھیں مگر دیکھتے ہی دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گئیں اور ہم اور بھی پیچھے جا پڑے۔
دیکھئے بات ہو رہی تھی کوڈک کی اور ہم کہاں جا پہنچے۔ سچ تو یہ ہے کہ کوڈک کے جنرل منیجر کو زک پہنچانے کی وجہ سے ہمارے اندر کچھ اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ فلمی صنعت میں ہماری شہرت ''جھگڑالو'' شخص کی حیثیت سے ہو گئی تھی اور لوگ کہتے تھے کہ بھائی، اس سے نہ الجھیں بڑا ''رپھڑی بندہ'' ہے۔ اس بدنامی نے ہمیں نقصان کے بجائے فائدہ ہی پہنچایا۔
جنرل منیجر موس کی لندن طلبی کے فوراً بعد ہم نے ملک باری صاحب کو فون کیا اور ملاقات کیلئے وقت مانگا۔ وہ ہنسنے لگے ''آفاقی تیرا دماغ صحیح ہے۔ اپائنٹمنٹ کی کیا ضرورت ہے۔ جب چاہے آ جاؤ''

ہم نے جاتے ہی کہا ''باری صاحب اب بولئے۔ مکھّی بڑی یا ہا تھی؟''
وہ اپنی بات بھول گئے تھے کہنے لگے ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''
ہم نے کہا ''وہ آپ کے دوست کوڈک کے جنرل منیجر تو آپ کے بقول ہا تھی تھے، اپنا بستر باندھ کر لندن چلے گئے ہیں۔ یاد ہے، آپ نے ہمیں طعنہ دیا تھا؟''
بولے ''تم اوّل نمبر کے بلیک میلر ہو۔ یہ شریفوں کا کام تو نہیں ہے، اچھّا یہ بتاؤ کیا پیو گے چائے یا ٹھنڈا؟''
ہم نے چائے کی فرمائش کر دی۔
وہ باتوں باتوں میں کہنے لگے ''یار وہ تصویریں کہاں ہیں؟''
''کون سی تصویریں؟'' ہم نے پوچھا۔
''تم نے کہا تھا کہ تمہارے پاس تصویریں ہیں''۔
ہم نے کہا'' باری صاحب محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے، تصویر وصویر کچھ نہیں تھی بس زبانی پبلسٹی تھی''۔
وہ بے چینی سے دیکھنے لگے '' مگر تمہیں اس کے ہیرا منڈی جانے کا کس نے بتایا تھا؟''
''خود آپ ہی نے بتایا تھا۔ بھئی آپ کے پیٹ میں کوئی بات رہ نہیں سکتی''۔
وہ پہلے تو حیران ہوئے اور مسکرانے لگے پھر بولے '' بلک میلر اخبار نویس، تمہیں شرم آنی چاہئے۔ ایک مہمان انگریز

کے ساتھ تم نے ایسی گھٹیا حرکت کی ہے''۔

ہم نے کہا'' یہ مہمان انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے پردے میں تجارت کرنے کیلئے ہندوستان آیا تھااور پھر مالک بن بیٹھا۔ اس کے مقابلے میں یہ توکچھ بھی نہیں''۔

''ہر معاملے میں سیاست مت بگھارا کرو۔اور یہ بتاؤ تم نے کوڈک کے خلاف یہودی ہونے کے نعرے کیسے لگوائے تھے؟

''بھئی پیسے خرچ کئے تھے ورنہ کون نعرے لگاتا ہے''۔

انہیں یقین آگیا کہنے لگے ''آفاقی۔تم تو بڑے کمینے آدمی ہواور خطرناک بھی ہو''۔

ہم نے کہا'' باری صاحب۔یہ کہاں کاانصاف ہے کہ اگر کوئی ناانصافی اور حق تلفی کے خلاف قدم اٹھائے تو وہ کمینہ لیکن جولوگ جعلی فلموں کے نام پر لاکھوں کمائیں وہ شریف؟''

''اچھازیادہ باتیں مت بناؤاور چائے پیو۔تم سے تواب ہوشیار رہناپڑے گا''۔

مگر اس کے باوجود وہ ہم سے اپنا کوئی راز نہیں چھپا سکے۔ان کے پیٹ میں درد ہونے لگتا تھا۔فون کر کر کے بلاتے تھے اور پیٹ کا بوجھ ہلکا کرتے تھے۔ان کی یہ حالت تھی کہ دوسروں کا توکیا،خوداپناراز بھی چھپانہیں رکھ سکتے تھے۔

''کوڈک'' کے واقعے سے پہلے ایک اور واقعہ بھی رونماہوچکا تھا جس کی وجہ سے ہمارے جھگڑالوپن کو شہرت ملی تھی۔

ہوا یہ کہ جب فلم ''کنیز'' کی ریلیز کے بعد کچھ پیسے آئے تو مسلمانوں کی روایت کے مطابق ہم فیاّضی کے ساتھ اخراجات کرنے لگے۔جن کا پروگرام ہم پیسے وصول ہونے سے پہلے ہی بنا چکے تھے۔اس شیڈول میں ایک نئی کار خریدناسرفہرست تھا۔

اطالوی کار ''فیئٹ'' اُن دنوں پاکستان میں کافی مقبول تھی۔فیئٹ ایک نامور کارسازادارہ تھا(اب بھی ہے مگر پاکستان میں اب اس کی کار کی درآمد نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے) پاکستان میں جاپانی کاریں مقبول ہونے سے پہلے انگریزی، جرمن اوراطالوی کاریں ہی پسند کی جاتی تھیں لہذاہمیں بھی دوستوں نے مشورہ دیا کہ آنکھیں بند کر کے فیئٹ کار خرید

لو۔

فیئٹ کار شاندار دفتر الفلاح بلڈنگ میں قائم تھا۔لاہور میں پلازا سنیما والے چوک پر فیئٹ کی ایک بہت بڑی ورکشاپ بھی تھی جس کے سپر وائزر تھے تو پاکستانی مگر خود کو مسولینی کا جانشین خیال کرتے تھے۔ سوٹ بوٹ،ٹائی سر پر فلیٹ ہیٹ، منہ میں پائپ، جوان آدمی تھے اور اپنے کام میں ماہر بھی تھے۔ان کے ماتحت درجنوں کاریگر کام کرتے تھے۔ ہم نے فیئٹ کار خریدنے کیلئے معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ چھوٹی فیئٹ کار کی قیمت تیرہ ہزار چند سو روپے ہے۔ اب تو ہمیں خود بھی یقین نہیں آتا، آج کی نسل کو بھلا کیا یقین آئے گا مگر یہ بالکل درست بات ہے کہ تیرہ ساڑھے تیرہ ہزار میں آپ شوروم سے بالکل برانڈ نیو اپنی پسند کی کار حاصل کر لیجئے۔

اداکار محمد حنیف آزاد صاحب کاروں کے معاملے میں بہت باخبر اور ہنر مند سمجھے جاتے تھے۔انہوں نے مشورہ دیا'' میاں، کراچی سے گاڑی خریدو، دو ڈھائی سو روپے کم قیمت میں پڑے گی''۔

ہم نے کہا'' مگر وہاں سے ٹرین کے ذریعے لانے پر بھی تو دو ڈھائی سو روپے خرچ ہوں گے''۔

''ارے میاں ٹرین کے چکر میں مت پڑو۔ آرام سے بائی کار سفر کرو۔راستے میں سیر و تفریح کرو۔ جہاں جی چاہے رک جاؤ۔

خیال تو اچھا تھا مگر سوال یہ تھا کہ ہم تو تھے بالکل اناڑی اتنے لمبے سفر میں کار کون چلائے گا؟

وہ بولے ''ارے میاں۔ کیا ہم مر گئے ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ڈرائیور بن کر آجائیں گے۔آخر قائداعظم کے ڈرائیور رہے ہیں آپ کے لئے تو بڑے اعزاز کی بات ہو گی''۔

ہم نے کہا''ہم نے منٹو صاحب کا وہ مضمون پڑھا ہے۔آپ جیسے ڈرائیور ہیں وہ ہم خوب جانتے ہیں''۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسے'' ارے میاں وہ تو زمانۂ جاہلیت کی باتیں ہیں اب تو اللہ کے فضل سے ماہر ہوں۔آنکھیں بند کر کے کار چلاتا ہوں''۔

''پھر تو ہمیں معاف ہی رکھئے''۔

مگر محمد حنیف آزاد کوئی ارادہ کر لیں اور پھر اس سے باز بھی آجائیں، یہ ممکن نہیں تھا۔

قصہ کوتاہ، ہم بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچے۔ میٹروپول ہوٹل میں ٹھہرے۔ دوستوں سے ملاقاتیں کیں۔ فیٹ کار خریدی اور لاہور واپس آنے کیلئے پابہ رکاب ہو گئے۔

''آزاد صاحب پھر کب چل رہے ہیں ہمارے ساتھ لاہور؟''

''ارے صاحب۔ ایک غریب فلم ساز کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ بیچ میں چھوڑ دی تو وہ مر جائے گا، غریب اور بد دعائیں دے گا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں کثیرالعیال آدمی ہوں۔ کسی کو بد دعاؤں کا موقع نہیں دے سکتا اور پھر ابھی آپ کو کم از کم چار پانچ سو میل بہت آہستہ رفتار سے کار چلانی ہے۔ آپ کراچی میں گھومیں پھریں اور عیش کریں۔ اتنے میں بھی شوٹنگ سے فارغ ہو جاؤں گا''۔

ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ فوراً اس پروگرام پر عمل شروع کر دیا اور خوب اپنا ہاتھ صاف کیا۔ چمچماتی ہوئی نئی کار میں بیٹھنے اور اسے چلانے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے اور یہ تو ہماری اپنی کمائی کی، پہلی پہلی ذاتی کار تھی۔ ان دنوں ہم تھے، ہمارے دوست تھے اور کراچی کی سڑکیں۔ کراچی میں ان دنوں صحیح معنوں میں میٹروپولیٹن شہر تھا۔ انتہائی صاف ستھرا، روشن خوبصورت اور قائدے قانون کا پابند۔ وہاں کی ٹریفک پولیس کو دیکھ کر ہمیں رشک آتا تھا۔

گاڑی چار سو میل چل چکی تو ہم نے پھر الیاس بھائی کے توّسط سے آزاد صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ وہ دوسرے ہی دن ہفت روزہ نگار کے دفتر میں تشریف لے آئے۔ ہماری بات انہوں نے بڑی توجّہ سے سنی۔ پان کی ایک گلوری کّلے میں دبائی اور بولے ''آفاقی میاں۔ بھائی آپ کو کیا وحشت ہے؟ ارے میاں کراچی چھوڑ کر جانے والا شہر نہیں، رہنے والا شہر ہے''۔

الیاس بھائی نے ہم سے کہا '' دراصل آزاد صاحب کو اچانک ایک اور فلم ساز کی شوٹنگ کرنی پڑ رہی ہے جو انہیں نقد معاوضہ دے رہا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ یا تو تم ایک ہفتے اور کراچی میں رک جاؤ یا پھر ڈرائیونگ کے لئے کوئی اور بندوبست کر لو''۔

کراچی میں ای ایم آئی گراموفون کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر راشد لطیف صاحب ہمارے بہت گہرے دوست تھے۔ انہوں نے بعد میں شالیمار ریکارڈنگ کمپنی بنائی۔ بے نظیر حکومت میں سیکرٹری اطلاعات بھی رہے۔ پولکا آئس کریم

بھی ان ہی بھائیوں کی تخلیق ہے۔ راشد لطیف صاحب سے ہماری دوستی اقبال شہزاد کے ذریعے ہوئی تھی۔ ان دونوں کا میدان ایک ہی تھا اس لئے خوب گاڑھی چھنتی تھی، راشد صاحب موسیقی کے دلدادہ اور فن کاروں کے بڑے قدردان تھے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پاکستان میں گلوکاروں، موسیقاروں اور نغمہ نگاروں کیلئے کاپی رائٹ قانون بھی ان ہی کی کوششوں سے بنایا گیا ہے۔

راشد صاحب بہت اچھے بلکہ مثالی انسان ہیں مگر ان میں ایک خرابی یہ ہے کہ وہ ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں پچیس گھنٹے مصروف رہا کریں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ بھی ان ہی کی طرح کام کرتے رہیں۔ ان کی اس عادت کی وجہ سے ان کے ماتحت بے حد نالاں رہتے ہیں۔ دوست احباب بور ہوتے رہتے ہیں، گھر والے بھی عاجز رہتے ہیں۔

راشد صاحب نے پاکستان میں موسیقی کی ترویج و ترقی میں بہت نمایاں حصّہ لیا۔ وہ ایک انجینئر ہیں لیکن ان کا دماغ بھی انجینئرنگ کا ایک شاہکار ہے۔ ٹیکنکل معاملات میں ان کا دماغ کمپیوٹر سے بھی زیادہ تیزی سے چلتا ہے اس کے باوجود نہ صرف باذوق ہیں بلکہ ہنسنے ہنسانے کا شوق و ذوق بھی رکھتے ہیں۔ وہ اگر لطیفہ پسند کرنے والے نہ ہوتے تو شاید ہم سے اتنی گہری دوستی نہ ہوتی۔ خود تو وہ لطیفے نہیں سناتے مگر سُن کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ بہر حال ان کا پہلا شوق ”کام، کام اور کام“ ہے۔

ہماری ان سے دوستی کراچی میں ہوئی تھی جو لاہور سے ہوتی ہوئی ڈھاکہ تک پہنچ گئی۔ ہم جب بھی کہیں جاتے تھے وہ ہمیں مل جاتے تھے۔ مثلاً ہم اسلام آباد گئے تو وہ اچانک ہوٹل میں مل گئے اور خوب گپ شپ رہی۔ ہم فلم اسٹاروں کے ساتھ ڈھاکہ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ راشد صاحب بھی ہوٹل شاہ باغ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کے ایک دوست ابو سیٹھ بھی وہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ کاروباری آدمی تھے مگر بے حد لطیفہ باز۔ ہم انہیں اردو میں لطیفے سناتے اور وہ انگریزی میں لطیفے سناتے۔ پھر ہم سب اردو میں خوب ہنستے۔ اقبال شہزاد بھی وہیں موجود تھے اس لئے خوب محفل سجتی تھی۔

راشد صاحب کو اقبال شہزاد نے ”انتہائی شریف اور بے کار“ شخص کا خطاب دیا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ وہ نہ تو گوشت

اور مچھلی مرغی کھاتے تھے۔نہ سگریٹ پیتے تھے۔شراب کو کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔کافی اور چائے البتہ کبھی کبھی پی لیتے تھے حالانکہ وہ انگلستان میں پڑھے تھے اور کافی عرصے ای ایم آئی کمپنی کی ملازمت کے سلسلے میں لندن میں مقیم رہے تھے۔اقبال شہزاد کہتے تھے کہ اس شخص کی زندگی میں کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔رومانس سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔لڑکیوں کو یوں دیکھتے تھے جیسے وہ گراموفون ریکارڈ ہوں بلکہ گراموفون ریکارڈوں سے انہیں زیادہ دلچسپی تھی۔صنف مخالف سے وہ دور ہی رہنا پسند کرتے تھے۔شہزاد صاحب کا بیان تھا کہ وہ لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں خیر انہیں شرماتے ہوئے تو ہم نے نہیں دیکھا البتہ یہ ضرور دیکھا کہ خواتین کو وہ مطلق خاطر میں نہیں لاتے تھے۔عجیب وغریب آدمی تھے حالانکہ بے حد مہذّب، بااخلاق اور وضع دار تھے۔نوجوانی میں کسی شخص میں یہ صفّات پیدا ہو جائیں تو اسے ولی ہی کہا جا سکتا ہے۔

ایک دن اچانک کراچی سے اقبال شہزاد کا فون آیا اور انہوں نے حسب عادت دو چار فلک شگاف قہقہے لگانے کے بعد فرمایا" سوفی(وہ ہمیں اسی گھریلو نام سے پکارتے تھے) یار انقلاب آگیا"۔

ہم نے پوچھا" کیوں۔کیا ہوا؟"

بولے" راشد نے شادی کرلی ہے"۔

ہم تو ہکّا بکّا رہ گئے۔کہاں راشد لطیف اور کہاں شادی؟ان دنوں ہمارا کراچی آنا جانا لگا رہتا تھا۔چند روز بعد کراچی گئے تو اقبال شہزاد کے ہمراہ راشد صاحب کے فلیٹ پر بھی گئے۔اقبال شہزاد صاحب نے راستے ہیں چلتے چلتے ہمیں کافی معلومات فراہم کردیں۔راشد صاحب نے ایک بنگالی خاتون سے شادی کی تھی جو مشرقی پاکستان کے ایک بڑے کسٹم آفیسر کی صاحب زادی تھیں۔نہایت ماڈرن تھیں۔انگلستان میں کافی عرصہ رہ چکی تھیں۔اردو واجبی جانتی تھیں۔ بنگلہ تھوڑی بہت البتہ انگریزی فر فر بولتی تھیں۔ان کا مزاج اور عادات و اطوار بھی انگریزوں جیسے تھے۔شہزاد صاحب نے ہمیں وارننگ دے دی کہ وہ راشد کے دوستوں کو پسند نہیں کرتیں۔خاصی سرد مہری سے پیش آتی ہیں اس لئے تم بے تکلّف ہونے کی کوشش نہ کرنا۔راشد صاحب کے اکثر دوستوں نے ان کے گھر آمدو رفت کم کردی ہے۔کچھ نے تو بالکل ہی بند کردی ہے۔

یہ معلومات ہمارے لئے خاصی روح فرسا تھیں مگر سوچا کہ جو ہو، سو ہو۔ راشد صاحب کی نئی بیگم سے ملنا لازم ہے۔ اس وقت اقبال شہزاد فلم اسٹار ریحانہ سے شادی کر چکے تھے۔ راشد صاحب بھی شادی شدہ ہو گئے تھے ہماری شادی اس کے کئی سال بعد ہوئی۔ یعنی اس وقت ہم محض کنوارے تھے۔ شہزاد صاحب نے ہمیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ راشد کے کنوارے دوستوں کو توان کی بیگم برداشت ہی نہیں کر سکتیں۔ لیجئے۔ یہ سن کر ہمارا دل مزید بیٹھنے لگا۔

راشد صاحب بڑے شاندار ماڈرن بنگلے میں رہتے تھے۔ کے ڈی اے کی بستی ان دنوں نئی نئی آباد ہوئی تھی اور نہایت فیشن ایبل اور خوبصورت آبادی تھی۔ وہاں راشد صاحب نے ایک دو منزلہ بنگلا تعمیر کرایا تھا۔ بہت خوبصورت اور جدید۔ انتہائی خور بصورت فرنیچر سے آراستہ، اس کی خصوصیت یہ تھی کہ نچلے حصے میں تین بیڈ روم، ڈرائنگ، ڈائننگ اور کچھ تھا۔ اوپر کی منزل پر بھی یہی کچھ تھا۔ دونوں منزل کا فرنیچر، پردے اور قالین بھی ایک ہی جیسے تھے۔ یوں سمجھئے کہ ''جڑواں'' منزلیں تھیں۔ ہو بہو ایک جیسی، فرق صرف یہ تھا کہ نچلی منزل کے ارد گرد خوبصورت لان تھا اور اندر داخل ہونے کیلئے گیٹ تھا۔ ظاہر ہے کہ اوپر کی منزل پر یہ چیزیں فراہم نہیں کی جاسکتی تھیں۔

راشد صاحب اپنی بیگم روزی کے ساتھ اوپر کی منزل پر قیام فرما تھے۔ نچلی منزل خالی تھی، کوئی دوست یار شتے دار کراچی آتا تھا تو وہ اس میں قیام کرتا تھا۔ مگر یہ سنا کہ شادی کے بعد سے اب یہ منزل خالی ہی پڑی رہتی ہے کیونکہ لوگوں کی آمد ورفت نہیں رہی ہے۔

ہمیں نچلی منزل پر بٹھایا گیا اور راشد صاحب نے فون کر کے (دونوں منزلوں میں فون الگ الگ تھے) روزی کو ہمارے اور شہزاد صاحب کے آنے کی اطلاع دیدی۔ ہم لوگ حسب معمول اپنی باتوں اور لطیفہ بازی میں مصروف ہو گئے۔ سچ پوچھئے تو ہم بھول ہی گئے تھے کہ راشد صاحب کی شادی ہو چکی ہے اور ان کی بیگم یہ فالتو باتیں سخت ناپسند کرتی ہیں۔

کچھ دیر بعد روزی اوپر سے تشریف لائیں تو ہم انہیں دیکھتے رہ گئے۔ ہمارا خیال تھا وہ حسن بنگال اور زلف بنگال کی مالک ہوں گی۔ سانولی رنگت ہو گی مگر ہمارے سامنے بوٹے سے قد کی ایک نہایت گوری چٹّی مسکراتی ہوئی خاتون کھڑی ہوئی تھیں۔ گلابی رنگ کی ساری میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بنگالنوں کی طرح بڑی بڑی تھیں مگر

زلفیں جدید فیشن کے مطابق ترشی ہوئی۔ ہمیں بڑی مایوسی اور ذہن کو جھٹکا لگا۔ راشد کا شوبز کی دنیا میں نام تھا لیکن اسکا یہ کام دیکھ کر مایوسی ہوئی۔

راشد صاحب نے ان سے ہمارا تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ وہ پہلے بھی ان کی زبانی ہمارے بارے میں سنتی رہی ہیں اس لئے خاصے مانوس انداز میں ملیں۔ پہلے انگریزی میں بات چیت کا آغاز کیا پھر اردو بولنے لگیں۔ ہم نے بھی اردو میں خوب لن ترانی کی۔ کبھی کبھی انگریزی کے الفاظ بھی بول لیتے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہم پر کوئی رعب نہیں پڑا بلکہ وہ بہت اپنی اپنی سی لگیں چنانچہ ہم نے بے تکلّفی سے اِدھر اُدھر کی ہانکنی شروع کر دی۔ دو چار معیاری قسم کے لطیفے بھی سنا دیئے لیکن انگریزی لطیفے بھی سنائے۔ وہ بہت خوش ہوئیں فوراً بیرے کو کافی وغیرہ لانے کیلئے کہا۔ ہمیں رات کے کھانے کی دعوت دی اور کہا کہ "آفاقی، تمہارا سینس آف ہیومر انگریزوں جیسا ہے۔"

راشد صاحب نے کہا "آفاقی صاحب۔ آپ کو بہت بڑا اعزاز مل چکا ہے۔ میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں"۔

شہزاد صاحب نے بھی ہمیں شرف قبولیت حاصل ہونے پر مبارکباد پیش کی۔ وہ بھی روزی سے خاصے بے تکلّف تھے۔ اس طرح یہ روزی کی پسندیدہ محفل تھی۔

راشد صاحب انہیں روزی کہتے تھے، شہزاد صاحب بھی روزی کہہ کر مخاطب کرتے تھے مگر ہمیں روزی کہنا کچھ عجیب سا لگا۔ اس لئے ہم نے انہیں بھابی کہنا شروع کر دیا۔ آغاز میں تو وہ کچھ ہچکچائیں مگر پھر اس کی عادی ہو گئیں۔ بعد میں راشد صاحب نے ہمیں یہ خوش خبری سنائی کہ روزی کہتی ہے کہ آفاقی کی زبان سے " بھابی" کا لفظ بہت اچھّا لگتا ہے۔

یہ ہمارے لئے خصوصی سرٹیفکیٹ تھا۔ گویا انگریزی محاورے کے مطابق ہم روزی کی گُڈ بکس میں آ گئے تھے۔ یہ اعزاز ہمیں ہمیشہ حاصل رہا۔

انہوں نے ہم سے پوچھا "تم ٹھہرے کہاں ہو؟" ہم نے ہوٹل میٹروپول کا نام لیا تو وہ بگڑ گئیں "بالکل نہیں۔ تم اپنا سامان لے کر فوراً یہاں آ جاؤ اور آئندہ بھی جب کبھی کراچی آؤ تو یہیں قیام کرنا"۔

ان کا گھر نسبتاً ائرپورٹ سے نزدیک تھا اس لئے یہ بندوبست ہمیں بہت مناسب لگا مگر ہم نے ازراہ تکلف کہا" رہنے

دیجئے آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی"۔

وہ ہنسنے لگیں "تکلیف کیسی۔آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں بھی راشد کے دفتر میں ڈائریکٹر ہوں۔ہم دونوں صبح ساتھ ہی دفتر جاتے ہیں اور رات کو واپس لوٹتے ہیں۔اس کے بعد رات کا کھانا کسی ہوٹل، کلب یا دوست کے گھر کھاتے ہیں۔ہمارے گھر میں صرف ناشتا فراہم کیا جاتا ہے۔باورچی کوئی نہیں ہے۔جس دن گھر پر کھانا ہو، میں خود ہی پکاتی ہوں۔بیرا اور دوسرا ملازم صرف ناشتا اور چائے کافی بنا سکتے ہیں۔تمہارے بارے میں سنا ہے کہ صبح جا کر رات کو بہت دیر سے آتے ہو۔ ناشتا یہاں کر لینا، لنچ اور ڈنر باہر کرتے رہنا۔کسی دن ہمارے ساتھ کھانے کا پروگرام ہوگا تو وہ بات الگ ہے"۔

اس طرح انہوں نے ہمارے لئے اصول وضوابط مقرر کر دیئے۔چوکیدار چوبیس گھنٹے موجود رہتا تھا۔اس کے بعد ہمارا یہ معمول رہا کہ اچانک کراچی پہنچ کر سیدھے ان کے گھر پہنچ جاتے تھے۔چوکیدار دروازہ کھولتا تھا۔بیرا سامان اٹھا کر ایک بیڈ روم میں رکھ دیتا تھا۔چائے کافی پیش کرتا تھا اور ہم ٹیکسی لے کر نکل جاتے تھے۔کہیں سے راشد صاحب کو فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دیتے تھے۔روزی سے ہیلو ہیلو کرتے تھے، بتاتے تھے کہ کراچی میں کتنے روز قیام کریں گے۔

روزی کہتی تھیں۔" دیکھو ایک روز ہمارے ساتھ ڈنر ضرور کرنا۔پروگرام پھر بنالیں گے۔" ہم رات گئے واپس لوٹتے تھے تو راشد صاحب اور روزی سو چکے ہوتے تھے۔صبح سویرے وہ دفتر جاتے تو ہم سو رہے ہوتے تھے۔ نو دس بجے اٹھ کر ہم ناشتا کرتے۔اتنی دیر میں راشد صاحب کا یا روزی کا دفتر سے فون آجاتا تھا۔مزاج پُرسی اور مختصر باتوں کے بعد ٹیلی فون بند ہو جاتا تھا۔موقع پا کر ہم ایک دو لطیفے بھی سنا دیتے تھے۔اس طرح ہم جتنے دن بھی ان کے گھر میں رہتے ٹیلی فون کے ذریعے ہی ہماری ملاقات ہوتی تھی۔ حالانکہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ہماری واپسی سے پہلے کسی ایک رات راشد صاحب اور روزی ہمیں کسی ہوٹل، ریستوران یا کلب میں لے جا کر ڈنر کھلاتے تھے اور اگلے دن ان کے گھر سے رخصت ہوتے وقت ہم انہیں فون کے ذریعے خدا حافظ کہہ کر لاہور واپس آجاتے تھے۔اکثر وہ ہمارے لئے کار بھی بھیج دیتے تھے۔ اتوار کے روز ہم صبح کا ناشتا ان دونوں کے ساتھ کرتے تھے۔کافی دیر گپ شپ کرتے

تھے۔اس کے بعد وہ اپنے پروگراموں میں مصروف ہو جاتے اور ہم اپنے کاموں کیلئے گھر سے رخصت ہو جاتے۔دو چار بار انہوں نے خصوصی طور پر چھوٹی سی ڈنر پارٹی کا بھی اہتمام کیا جس میں منتخب لوگ ہی شرکت کرتے تھے۔

کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔اس کے بعد راشد صاحب کا تبادلہ لندن ہو گیا۔اس سے پہلے وہ کچھ عرصے بنکاک میں بھی تعینات رہے مگر لندن،روزی کی پسندیدہ جگہ تھی۔راشد صاحب کو لندن کے ہیڈ آفس میں ایک مستقل عہدہ پیش کیا گیا مگر راشد صاحب نے انکار کر دیا۔وہ پاکستان میں رہنا چاہتے تھے جب کہ روزی ہر قیمت پر انگلستان میں رہنے کی خواہش مند تھیں۔اس مسئلے پر میاں بیوی میں کافی بحث ہوئی اور یہیں سے اختلافات کا آغاز ہوا۔روزی کی ضد تھی کہ انگلستان میں ہی رہنا بہتر ہو گا مگر راشد صاحب نے جوان کی ہر بات مان لیتے تھے، مطالبہ منظور نہیں کیا۔
اس دوران میں ہماری بھی شادی ہو گئی۔1974 ءمیں ہم اپنی بیگم لبنیٰ کے ساتھ انگلستان گئے تو ان دونوں راشد صاحب لندن ہی میں مقیم تھے۔چند روز لندن میں رہ کر ہم برمنگھم چلے گئے۔اس دورے میں شباب کیرانوی اور رشید جاوید بھی ہمارے ساتھ تھے۔اس لئے ہم لوگوں کا پروگرام مشترکہ رہتا تھا مگر راشد صاحب کا اصرار تھا کہ ہم ایک دو دن ان کے پاس بھی قیام کریں۔

ان کے اصرار پر ہم دونوں ایک دفعہ برمنگھم سے ٹرین میں سوار ہوئے،لندن پہنچے اور ان کے فلیٹ پر حاضر ہو گئے۔یہ فلیٹ ریجنٹس پارک کے سامنے نہایت خوبصورت علاقے میں تھا اور بہت آرام دہ تھا۔یہ صرف ایک بیڈ روم اور ڈرائنگ روم پر مشتمل تھا۔ہمارے لئے ڈرائنگ روم میں سونے کا بندوبست کیا گیا اور وہ دن ہم سب نے انتہائی پُر لطف گپ شپ میں گزارے۔لبنیٰ سے یہ روزی کی پہلی ملاقات تھی مگر وہ دونوں جلد ہی گھل مل گئیں۔
اسی دوران میں ان کے لندن مستقل قیام کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔دونوں نے اپنا اپنا موٴقف پیش کیا۔روزی کے خیال میں راشد صاحب کو یہ ایک نادر موقع مل رہا تھا۔مگر راشد صاحب لندن میں مستقل قیام کے تصوّر ہی سے بیزار تھے۔ ہم ان دونوں کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔لبنیٰ غیر جانبدار تھیں۔آخر میں ہم نے بھی پاکستان ہی میں رہنے کے خیال کی تائید کر دی۔

روزی نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا اور کہا ''آفاقی۔ تم بھی''!

ہم نے کہا'' بھئی ہم تو ہر قیمت پر پاکستان ہی میں رہنے کے قائل ہیں۔ ہر پاکستانی کو پاکستان میں رہنا چاہئے۔ اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے''۔

روزی کو ہماری بات پسند نہیں آئی۔ ان کا خیال تھا کہ راشد صاحب کے کیریئر کیلئے یہ بہت اچھّا موقع تھا۔ ترّقی کے وسیع امکانات تھے۔ وہ لوگ مستقل طور پر لندن میں رہ سکتے تھے۔ مگر راشد صاحب پاکستان سے باہر کسی قیمت پر بھی نہیں رہنا چاہتے تھے۔ ان کے ذہن میں بے شمار منصوبے تھے جن میں سے کچھ پر انہوں نے بعد میں عمل درآمد بھی کیا۔

اس فلیٹ کی بالکونی سے ریجنٹس پارک کے پھولوں سے لدے ہوئے سبزہ زاروں کا منظر قابل دید تھا۔ یہ فلیٹ لندن کے بہترین علاقے میں تھا۔ آس پاس ہر قسم کی سہولت موجود تھی۔ محض ٹیلی فون کرنے سے ضرورت کی ہر چیز گھر بیٹھے مل جاتی تھی۔ یہ فلیٹ کرائے کا تھا مگر روزی کا خیال تھا کہ اسی علاقے میں تین بیڈ رومز کا ایک اچھّا فلیٹ خرید کر رہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ ان دونوں کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ روزی کی سوچ انگریزوں جیسی تھی جب کہ راشد صاحب خالص دیسی مزاج کے مالک تھے۔

دو روز کے بعد ہم نے رخصت طلب کی اور برمنگھم چلے گئے۔ راشد صاحب ہی کے توّسط سے ہمیں یوروٹرین کے ٹکٹ بھی مل گئے تھے بذریعہ ٹرین یورپ کی سیاحت کرنے کے بعد واپس لندن پہنچے تو معلوم ہوا کہ راشد صاحب نے برٹش کمپنی کی پیشکش مسترد کر دی ہے اور پاکستان واپس جانے کی تیّاریاں کر رہے ہیں۔

راشد صاحب دوبارہ کراچی پہنچ کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے مگر روزی لندن میں ہی مقیم رہیں۔ راشد صاحب نے شالیمار ریکارڈنگ کمپنی بنا ڈالی جس کے ہم بھی ایک ڈائریکٹر تھے۔ اس کا ہیڈ آفس اسلام آباد میں تھا۔ روزی چند بار لندن سے آئیں مگر پھر واپس لوٹ گئیں۔

کچھ عرصہ بعد راشد صاحب اور روزی میں طلاق ہو گئی۔ راشد صاحب نے چند سال بعد اقبال شہزاد کی بھانجی سے شادی کر لی۔ یہ وہی خاتون تھیں جنہوں نے شہزاد صاحب کی فلم بیٹی میں کمسن بچی کا مرکزی کردار کیا تھا۔ یہ دونوں دو

پیاری پیاری بچیوں کے والدین بھی بن گئے۔ یہ لڑکیاں اب بڑی ہو چکی ہیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکی ہیں۔
راشد صاحب اپنی عادت کے مطابق مختلف کاموں اور منصوبوں میں مصروف رہتے ہیں اور گھر والوں کو آج بھی ان سے عدیم الفرصتی اور گھر کے لوگوں کو مناسب وقت نہ دینے کی شکایت ہے۔
راشد صاحب کو ہم نے کبھی دولت، شہرت یا اقتدار کے پیچھے بھاگتے تو کیا ان چیزوں کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی نہیں دیکھا لیکن اللہ نے یہ سب چیزیں انہیں بڑی فراوانی سے عنایت کی ہیں۔
1987ء کے بعد بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت بنی تو کچھ دن بعد اخبار میں پڑھا کہ راشد لطیف کو وفاقی سیکرٹری اطلاعات مقرر کر دیا گیا ہے۔ ہمیں یقین نہیں آیا۔ کہاں راشد صاحب اور کہاں سرکاری ملازمت اور محکمہ اطلاعات کی سیکرٹری شپ مگر تفصیل پڑھی تو معلوم ہوا کہ یہ سچ مچ اپنے ہی راشد صاحب ہیں۔
ہم نے انہیں کراچی فون کیا تو وہاں سے اسلام آباد کا فون نمبر دیا گیا۔ راشد صاحب نہ شالیمار کے دفتر میں تھے اور نہ ہی سیکرٹری اطلاعات کے دفتر میں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ان سے ملاقات یا رابطہ مشکل ہے۔ البتہ رات کو بارہ ایک بجے گھر پر فون کرو تو ہو سکتا ہے مل جائیں۔ انہوں نے شالیمار فیکٹری کے اندر ہی اپنے لئے رہائش گاہ تعمیر کر لی تھی اور سرکاری ملازم ہونے کے بعد بھی وہیں رہا کرتے تھے۔
رات کو ایک بجے وہ اپنے گھر پر مل گئے۔ وہی سادہ الفاظ اور نرم گفتگو۔
ہم نے کہا ”سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو مبارکباد دیں یا آپ سے ہمدردی کا اظہار کر دیں“۔
وہ ہنسنے لگے۔ ہم نے کہا ”مگر اچانک یہ سب کیسے ہو گیا۔ کہاں آپ کہاں سیاست اور صحافت؟“
بولے ”ملیں گے تو بتاؤں گا“۔

ہم اسلام آباد گئے تو تمام دن وہ کہیں بھی دستیاب نہ ہو سکے۔ شام کو سات بجے سیکرٹریٹ میں ان سے فون پر بات ہوئی۔
”ارے آپ کب آئے؟ آج رات کھانا میرے ساتھ ہی کھائیں“۔
پوچھا ”کتنے بجے اور کہاں؟“
”میرے گیسٹ ہاؤس میں۔ میں گھر پہنچتے ہی آپ کو فون کر لوں گا“۔

رات کے گیارہ بجے پھر بارہ بج گئے مگر راشد صاحب کا فون نہیں آیا۔ساڑھے بارہ بجے ہم نے فون کیا تو مل گئے۔اسی وقت گھر میں داخل ہوئے تھے۔

''آجایئے کھانے کا وقت ہو گیا ہے''۔

ہم اپنے بھائی عمران کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔جہاں سے شالیمار فیکٹری کا تین منٹ کا راستہ ہے۔

دیکھا تو راشد صاحب سوٹ پہنے، بالکل تروتازہ بیٹھے ہیں۔لگتا تھا جیسے ابھی باہر جانے کیلئے تیار ہوئے ہیں۔اس خدا کے بندے کو ہم نے کبھی تھکا ہوا یا مایوس نہیں دیکھا۔

''بھئی یہ آپ کو کیا سوجھی! یہ آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔سرکاری محکمے کو آپ کیسے سدھار لیں گے۔یہ تو جنم جنم کے بگڑے ہوئے لوگ ہیں''۔

وہ نرمی سے مسکرائے ''کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں ہے''۔

مگر چند ماہ شب و روز سخت،ان تھک محنت کے بعد انہیں یہ اندازہ ہوا کہ وہ جس مشین کا پُرزہ بن گئے ہیں اس کے تمام پرزے بگڑے ہوئے ہیں۔اسی دوران میں وہ بیمار بھی ہو گئے۔یہ ایک عجیب بات تھی۔راشد صاحب اور بیماری؟ ہم نے تو یہی دیکھا تھا کہ ان کے پاس بیمار ہونے کی فرصت نہیں ہوتی۔بیمار ہو کر وہ کراچی چلے گئے۔وزیراعظم بے نظیر بھٹو فون کر کے ان کی مزاج پرسی کرتی رہیں۔چند دن بعد وہ ٹھیک ہو کر اسلام آباد جا پہنچے اور پھر وہی شب و روز کی مصروفیات۔مگر شاید رفتہ رفتہ ان کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ اپنا وقت ہی ضائع کر رہے ہیں۔آخر وفاقی سیکرٹری کا عہدہ چھوڑ کر دوبارہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

راشد صاحب کی شرافت اور وضع داری ضرب المثل ہے۔ یہی دیکھ لیجئے کہ انتہائی مصروفیات کے باوجود وہ اگر چند گھنٹے کیلئے بھی لاہور آئیں تو ہم سے ملاقات کرنے ضرور آتے ہیں۔ورنہ ٹیلی فون ضرور کرتے ہیں۔ہر ایک سے اس قدر محبّت اور انکساری سے ملتے ہیں کہ وہ شرمندہ ہو جاتا ہے۔ہم نے کبھی انہیں بلند آواز سے بات کرتے، بگڑتے یا غصّہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔نہ کبھی وہ تھکتے ہیں۔نہ مایوس اور بیزار ہوتے ہیں عجیب و غریب آدمی ہیں۔راشد صاحب

امرت دھارا قسم کے آدمی ہیں۔ کوئی مسئلہ ہو، مشکل ہو، مشورہ لینا ہو، راشد صاحب کے پاس ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ کم از کم ہمارا تو یہی تجربہ ہے۔

جب آزاد صاحب کی طرف سے ہم مایوس ہو گئے تو سوچا کہ کار کو ٹرین یا ٹرک پر لاد کر لاہور بھیج دیں اور خود ہوائی جہاز سے چلے جائیں۔ اسی شام راشد صاحب سے ملنے ان کی فیکٹری گئے۔ کافی خوش ہوئے اور کچھ دیر گپ شپ کی۔ یہ بھی ان کی ایک خوبی ہے کہ اس قدر مصروفیات کے باوجود ملاقات کے لئے جب بھی جاؤ وہ بڑے اطمینان سے سارے کام چھوڑ کر متوجہ ہو جاتے ہیں جیسے کہ انہیں کوئی کام ہی نہیں ہے۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ اب ہم لاہور جا رہے ہیں۔

"کیا کار میں بیٹھ کر؟" انہوں نے پوچھا۔

ہم نے کہا "کار ٹرین یا ٹرک سے آ جائے گی"۔

راشد صاحب بولے "ارے ہاں یاد آیا تحسین صاحب کو بھی تو لاہور جانا ہے۔ کیوں نہ آپ دونوں بذریعہ کار ہی لاہور چلے جائیں۔ سفر بھی اچھا کٹ جائے گا اور راستے میں سندھ کی سیر بھی ہو جائے گی"۔

تحسین صاحب غالباً فیکٹری منیجر تھے۔ بتیس پینتیس سال کی عمر ہو گی لمبے تڑنگے، صحت مند وجیہہ اور بارعب آدمی تھے۔ شاندار مونچھیں جن کی وجہ سے وہ فوجی افسر نظر آتے تھے۔ دلچسپ اور زندہ دل انسان تھے۔ فیکٹری میں اور راشد صاحب کے گھر پر ان سے کئی بار ملاقات ہو چکی تھی۔

تحسین صاحب کو بلایا گیا اور صورت حال بتائی گئی وہ فوراً تیار ہو گئے۔ ہم نے پوچھا "تحسین صاحب۔ سنا ہے کافی خراب سڑکیں اور خطرناک راستہ ہے۔ آپ کو کچھ تجربہ بھی ہے؟"

بولے "کئی بار بائی روڈ لاہور جا چکا ہوں۔ بس اندرون سندھ شام کے بعد سفر نہیں کرنا چاہئے باقی سب خیریت ہے۔ سڑک ذرا تنگ ہے۔ ٹرک اور بس والے بھی کافی تنگ کرتے ہیں لیکن سفر کافی دلچسپ ہے۔ آرام آرام سے چلیں گے۔ راستے میں ایک رات کوٹ اڈو اور ایک رات ملتان رکیں گے اور تیسرے دن رات لاہور۔ کیوں کیا خیال

ہے ؟‘‘

ہم سوچ میں پڑ گئے پھر یہی فیصلہ کیا کہ کار کے ذریعے ہی چلتے ہیں یہ تجربہ بھی کر لیں۔

اگلے روز صبح نو بجے ہم اپنی نئی فیئٹ کار میں سوار ہو کر تحسین صاحب کے ہمراہ لاہور روانہ ہو گئے۔ ہم نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ توقع نہ رکھیں کہ ہم ہائی وے پہ گاڑی چلائیں گے۔ ساری ڈرائیونگ آپ ہی کو کرنی ہو گی۔

’’آپ فکر ہی نہ کریں‘‘ وہ مسکرا کر بولے ’’آپ کو خیریت سے لاہور پہنچا دونگا‘‘۔

’’انشاء اللہ‘‘۔ ہم نے بہت زور شور سے کہا۔

کراچی سے حیدر آباد تک سڑک کشادہ اور بہت اچھی تھی۔ اس کے بعد مشکلات کا آغاز ہو گیا۔ پتلی سڑک، دونوں جانب سے کچی جس پر بسوں اور ٹرکوں کی مسلسل آمدو رفت کی وجہ سے گڑھے پڑ گئے تھے۔ ٹرک اور بس والوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ کسی کو راستہ نہیں دیں گے۔ جگہ جگہ کچے میں گاڑی اتارنی پڑتی تھی اور گڑھوں کی وجہ سے ہم اُچھل پڑتے تھے۔

ہم نے مشورہ دیا ’’تحسین صاحب ذرا آرام سے چلیں تو بہتر نہ ہو گا‘‘؟

بولے ’’بہت بہتر ہو گا مگر لاہور پہنچنے میں ایک ہفتہ لگ جائے گا‘‘۔

یہ سُن کر ہم خاموش ہو گئے۔ راستہ مزے مزے میں گزرتا رہا۔ تحسین صاحب بھی اوّل نمبر کے باتونی تھے۔ باہر کے ملکوں میں بھی ہو آئے تھے۔ اِدھر اُدھر کے قصّے سناتے رہے۔ بُش شرٹ اور خاکی پتلون پہن کر انہوں نے سر پر پی کیپ پہن لی تھی جس کی وجہ سے وہ سچ مچ کوئی فوجی افسر ہی نظر آتے تھے۔ ان کی بارعب شخصیت کا یہ فائدہ ہوا کہ سامنے سے آنے والے بس اور ٹرک ڈرائیوران کے بارعب اشارے پر ہمیں راستہ دے دیتے تھے۔

شام ہو چکی تھی اور اندھیرا اپھیل گیا تھا جب ہم کوٹ اڈّو کے ڈاک بنگلے پر پہنچے۔

’’لیجئے۔ کوٹ اڈّو آ گیا؟‘‘ انہوں نے اطلاع دی۔

’’کہاں ہے ؟‘‘

’’شہر نہیں ہے یہ ڈاک بنگلا ہے۔ قصبے کو جانے کیلئے کچھ اور وقت لگتا ہے‘‘۔

ڈاک بنگلہ کافی صاف ستھرا اور درختوں میں گھرا ہوا تھا مگر بالکل ویران اور پُراسرار لگ رہا تھا۔ کافی دیر تک ہارن بجاتے رہے جواب میں خاموشی۔

"کس کو بلا رہے ہیں؟" ہم نے تنگ آکر پوچھا۔

وہ بولے "چوکیدار کو۔ ہر ڈاک بنگلے میں ایک چوکیدار ہوتا ہے یہ کہاں مر گیا؟"

کچھ دیر بعد پچھلی جانب سے ایک شخص نمودار ہوا، چھ ساڑھے چھ فٹ کا قد، خوفناک چہرہ۔ اس سے بھی زیادہ ڈراؤنی مونچھیں۔ بھاری بھرکم، سر پر پگڑی اور ہاتھ میں بندوق، تاریکی میں اس شخص کو دیکھ کر ہم تو ڈر ہی گئے۔

آتے ہی اس نے گونج دار آواز میں ڈانٹ کر پوچھا "کون ہے کس لئے آئے ہو با باشناخت کراؤ"۔

اس زمانے میں بھی اندرون سندھ کا علاقہ ڈاکوؤں کی سرگرمیوں کیلئے بدنام تھا۔ ہمایوں مرزا صاحب کی فلم "آگ کا دریا" میں ہم نے اسی شکل وصورت اور حلئے کے ڈاکو دیکھے تھے۔

تحسین صاحب نے بارعب انداز میں کہا "کون ہو تم؟ بندوق لے کر کیوں پھر رہے ہو۔ اس کا لائسنس دکھاؤ"

جواب میں وہ سراپا انکسار بن گیا۔ پہلے تو اس نے ایک سلیوٹ مارا پھر بولا "سلام سائیں۔ ہم تو ڈاک بنگلے کے چوکیدار ہیں۔ ادھر ڈاکو شاکو بہت پھرتے رہتے ہیں اس لئے گورنمنٹ نے حفاظت کیلئے ہمیں بندوق دیدی ہے، لائسنس ہے ہمارے پاس"۔

"چوکیدار ہو؟" تحسین صاحب نے رعب سے کہا "ٹھیک ہے تو پھر ڈاک بنگلا کھولو اور ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ جلدی جلدی"۔

چوکیدار نے فوراً حکم کی تعمیل کر دی اور سارے کام کر دیئے۔ ڈاک بنگلا خاصا معقول اور آرام دہ تھا۔ دو بیڈ روم، ایک ڈرائنگ روم، ایک ڈائننگ روم، اچھا خاصا فرنیچر تھا۔

"کھانے میں کیا بناؤں سائیں؟" چوکیدار نے پوچھا۔

"بھئی جو تمہیں بنانا آتا ہے وہ بناؤ"۔

"مرغی بنا دوں یا آملیٹ اور پراٹھے؟"

ہم نے آملیٹ کے حق میں رائے دی کہ جلد تیار ہو جائے گا۔ بھوک سے بُرا حال تھا۔
ہم غسل کر کے تازہ دم ہوئے تھے کہ چوکیدار آملیٹ اور پراٹھے لے کر آ گیا۔ گڑ کی چائے بہت مزیدار تھی۔ راستے کی تکان دور ہو گئی۔
جب ذرا دم میں دم آیا تو تحسین صاحب نے سگریٹ سلگا لیا۔ چوکیدار بھی اپنے کاموں سے فارغ ہو کر آ گیا اور قالین پر بیٹھ گیا۔ ''سائیں۔ آپ تو جی دار فوجی لگتے ہو ورنہ ادھر تو رات کے وقت بڑے بڑے شیر دل لوگ بھی سفر نہیں کرتے۔''
''کیوں سفر نہیں کرتے؟''
''ڈاکو لوٹ لیتے ہیں۔ سڑک پر تو اور بھی زیادہ خطرہ ہے۔ ادھر ڈاک بنگلے میں رات کے وقت کوئی نہیں آتا۔ سورج کی روشنی میں ہی آ جاتے ہیں''۔
ہم نے پریشان ہو کر تحسین صاحب کو دیکھا مگر وہ بالکل مطمئن تھے۔
''ہم ڈاکو سے نہیں ڈرتے۔ بھرا ہوا ریوالور ہمارے ساتھ ہے۔ بڑا اسلحہ ہمارے پاس''۔
''بے شک ہو گا سائیں۔ اس لئے تو اس طرح بے خوفی سے گھومتے ہو۔ آپ حکم دو۔ کب تک رہنے کا ارادہ ہے؟''
''کل صبح ناشتے کے بعد جانا ہے''۔
''اللہ سائیں مالک ہے'' چوکیدار نے رخصت کی اجازت طلب کی اور رخصت ہو گیا۔ جاتے جاتے کہنے لگا۔ ''سائیں فکر نہ کرو۔ ہم رات کو چوکیداری کریں گے پھر بھی آپ ہوشیار سونا۔ ریوالور تیار رکھنا۔ ادھر کچھ پتا نہیں ہوتا''۔
تحسین صاحب کہنے لگے ''بھئی ہوشیار کیسے سوئیں گے؟ کیا جاگتے رہیں؟ آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟''
''آپ کے چاکر ہیں سائیں۔ آپ بے شک بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ بالکل فکر اور تردد مت کرو۔ دو چار ڈاکو اپنا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ پر دیکھو۔ اگر گولیوں کی ''تڑ تڑ'' سنائی دے تو زیادہ ہوشیار ہو جانا۔ ریوالور اور ہتھیار پاس ہو تو ڈر کس بات کا؟''
''ٹھیک ہے مگر تم رات کو پہرے میں غفلت نہ کرنا''۔

''اللہ حافظ سائیں۔ زندگی رہی تو صبح ملاقات ہوگی''۔ یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گیا۔

''بھئی یہاں تو بہت خطرہ ہے'' ہم نے پریشانی سے کہا ''یہ کہاں پھنس گئے ہیں؟''

''اب تو پھنس ہی گئے ہیں۔ اللہ مالک ہے''۔

سونے کیلئے لیٹ گئے تو نیند نہیں آئی۔

اچانک باہر آہٹ سنائی دی۔ ہم دونوں چوکنّا ہو کر اٹھ بیٹھے۔ کسی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تو خطرے کا احساس ہوا۔ ہم نے گھبرا کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

دروازہ پھر کسی نے زور زور سے کھٹ کھٹایا اور پھر چوکیدار کی آواز آئی ''کیا سو گئے سائیں؟''

''چوکیدار یہ تم ہو؟''

''جی سائیں''۔

''کیا بات ہے خیر تو ہے؟''

''بالکل خیر ہے سائیں''۔

''تو پھر دروازہ کیوں کھٹکھٹا رہے ہو؟''

''سائیں پوچھنا تھا ناشتہ کس وقت کریں گے؟''

''لاحول ولا قوۃ کس قدر ہونّق انسان ہے۔ آدھی رات کو جگا کر ناشتے کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔''

''کیا خیال ہے ڈانٹ دوں اس کو؟'' ہم نے پوچھا۔

''ارے نہیں۔ وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے'' پھر چوکیدار سے کہا ''صبح چھ بجے جگا دینا''۔

''چھ بجے انڈا پراٹھا تیار ملے گا سائیں'' اس نے مطلّع کیا پھر جاتے جاتے پکار کر بولا ''اگر رات کے وقت کوئی دروازہ کھٹکھٹائے تو بالکل مت کھولنا سائیں۔ ڈاکو لوگ اسی طرح کرتے ہیں۔ بے شک گولی چلا دینا۔ میں صبح چھ بجے سے پہلے نہیں آؤں گا۔ اللہ حافظ۔!

چوکیدار یہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔ صبح چھ بجے تک کا وقت ہم نے سوتے جاگتے ہی گزارا۔

ٹھیک چھ بجے چوکیدار دروازے پر موجود تھا۔ ''اٹھو سائیں چوکیدار آ گیا۔ ناشتا لے کر آیا ہوں''۔

''عجب نالائق آدمی ہے۔ منہ ہاتھ دھونے کی مہلت تو دی ہوتی'' ہم نے کہا پھر پوچھا ''دروازہ کون کھولے گا؟''

''میں کھولوں گا؟'' ہمارے ساتھی نے مضبوط آواز میں کہا۔

''چوکیدار کے بھیس میں کوئی ڈاکو ہی نہ ہو'' ہم نے رائے ظاہر کی۔

''ڈاکو ہوتا تو ناشتے کی بات نہ کرتا'' انہوں نے حکیمانہ جواب دیا۔

دروازہ کھولا تو چوکیدار ٹرے میں آملیٹ پراٹھے اور چائے لئے کھڑا تھا۔

''سلام سائیں۔ آپ ناشتا کرو، میں گاڑی صاف کر دیتا ہوں'' یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گیا۔

ہم نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا جو مسکرا رہے تھے۔

بولے '' ابھی تو آنکھ کھلی ہے۔ نہ منہ دھویا۔ نہ شیو بنایا۔ نہ لباس تبدیل کیا اور یہ اللہ کا بندہ ناشتا بنا کر لے آیا''۔

ہم نے کہا ''بھئی یہ تو ہمارا قصور ہے۔ ہم ہی نے تو کہا تھا کہ صبح چھ بجے جگا دینا۔''

بولے۔ ''بھائی اس اللہ کے بندے کو صرف جگانے کے لئے کہا تھا۔ ناشتا تیار کر کے لے آنے کیلئے کس نے کہا تھا۔''

''خیر'' ہم نے کہا ''اب یا تو اسی حالت میں ناشتا کر لیجئے ورنہ ٹھنڈا ناشتا کرنا پڑے گا''۔

اتنی دیر میں چوکیدار پھر بندوق کندھے سے لٹکائے آ گیا تھا۔ شاید اس نے ہماری گفتگو سن لی تھی۔ کہنے لگا۔ ''سائیں آپ فکرمند کیوں ہوتے ہو۔ میں آپ کو دوبارہ گرم گرم ناشتا بنا دوں گا۔''

''اور اس ناشتے کا کیا کرو گے؟'' ہم نے پوچھا۔

''اسے میں خود کھا لوں گا''۔

اس طرح یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ ہم رخصت ہونے لگے تو چوکیدار کو بیس روپے دیئے، اس میں رات کا کھانا، چائے، ناشتا اور اس کی سروس سبھی کچھ شامل تھا۔ سستا زمانہ تھا۔ اس نے خوش ہو کر پیسے لئے اور ڈھیر ساری دعائیں دینے کے بعد بتایا ہمارے آنے سے قبل ایک روز ایک فیملی حیدر آباد جانے کیلئے ڈاک بنگلے پر آئی تو ڈاکوؤں نے انہیں لوٹ لیا۔ ان

کی گاڑی بھی چھین کر لے گئے تھے۔ میں نے رات آپ کو نہیں بتایا کہ آپ ڈر ہی نہ جائیں۔

ہم نے پوچھا۔ ''جب ڈاکو آئے تو تم کہاں تھے؟''

بولا ''سائیں مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی میں اپنی سسرال چلا گیا تھا''۔

تحسین صاحب کہنے لگے ''تم سے' اس سے بھی بڑی غلطی یہ ہوئی کہ تم نے شادی کرلی''۔

وہ دانت نکال کر بولا ''سائیں بات تو آپ سولہ آنے ٹھیک کہتے ہو''۔

کوٹ اڈّو سے پھر وہی مشکلات کا سفر شروع ہوا۔ ٹرک اور بس والوں نے زندگی وبال کردی۔ بعض اوقات تو ہم واقعی حادثے کا شکار ہوتے ہوتے رہ گئے۔ سامنے سے آنے والے ڈرائیور تو تحسین صاحب کی بارعب شخصیت کے رعب میں آجاتے تھے۔ مگر ہمارے عقب سے آنے والے ٹرک اور بس ڈرائیور ہمیں بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ فیئٹ ایک مختصر سی کار تھی۔ جب کوئی ٹرک یا بس پاس سے گزرتی تو ساری گاڑی کانپ کر رہ جاتی تھی۔ ہم صبر وضبط سے بیٹھے وہ تمام آیات اور دعائیں پڑھتے رہے جو ہمیں اس وقت یاد آئیں۔ ایک بار تحسین صاحب کی گفتگو کا سیلاب قدرے کم ہوا اور ہمیں نیند کا جھونکا سا آگیا۔ بس اسی وقت عقب سے آنے والی ایک جہازی بس نہایت تیزی سے ہمارے برابر سے، ہماری کار سے رگڑ کھاتی ہوئی گزری اور سنبھالنے کے باوجود ہماری کار بڑی زور سے کچے میں پہنچ کر بند ہوگئی۔ بس والے نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور ہم دونوں کچھ دیر کار میں چپ چاپ سہمے ہوئے بیٹھے رہے۔

رفتہ رفتہ ہوش ٹھکانے آئے تو سب سے پہلے تو خود اپنے آپ کو اور پھر ایک دوسرے کو ٹٹول کر دیکھا کہ ہاتھ پیر، کان اور ناک سلامت بھی ہے یا نہیں۔ شُکر ہے کہ ہر چیز سلامت تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ اس کے بعد کار کا جائزہ لیا گیا۔ تیز رفتار بس اسٹیئرنگ کی جانب سے چھیلتی ہوئی گزری تھی۔ اس کی باڈی پر تو شاید خراش بھی نہ پڑی ہوگی مگر ہماری کار کی یہ سائیڈ اُدھڑ کر رہ گئی تھی۔ اگلے دروازے کا ہینڈل ٹوٹ کر کہیں جا گرا تھا۔ اگر بس کا فاصلہ قدرے کم ہوتا تو کار کا کچومر ہی نکل جاتا۔ تحسین صاحب نے باہر نکلنے کیلئے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ جم کر رہ گیا تھا۔ مجبوراً وہ دوسری جانب سے باہر نکلے۔ کار کا سامنے کا اور عقب کا حصہ بالکل محفوظ تھا۔ صرف ایک سائیڈ رگڑ کھانے کی وجہ

سے زخمی ہوگئی تھی۔ بلکہ قدرے پچک بھی گئی تھی۔

ہم نے پوچھا ''اب کیا ہوگا؟''

وہ چہک کو بولے ''جو منظور خدا ہوگا''۔

کار کو اسٹارٹ کرنا چاہا تو وہ گڑ گڑا کر رہ گئی۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ چاروں طرف ریگستانی صحرا اور ویرانہ تھا۔ دور دور تک نہ سبزہ نہ درخت، نہ آبادی، پانی کا نام ونشان تک نہیں۔ کھانے پینے کا ہمارے پاس کوئی بندوبست نہ تھا۔ ایسی حالت میں اس سنسان، ویران اور خطرناک مقام پر ہم کیوں کر رہتے اور اگر نہ رہتے تو کہاں جاتے کیسے جاتے۔

تحسین صاحب بولے ''کسی ٹرک یا بس کو روک کر قریبی قصبے میں چلے جائیں اور مکینک کو لے آئیں''۔

ہم نے کہا'' تحسین صاحب۔ آپ کی تجویز لائق تحسین ہے مگر یہ بتایئے کہ ہم کہاں جائیں گے اور کار کو کس کے آسرے پر چھوڑ کر جائیں گے۔ یہاں توڈاکو معمولی چیزیں بھی نہیں چھوڑتے اس نئی کار کو کیسے چھوڑیں گے؟ دوسری بات یہ ہے کہ اس علاقے کے قصبوں کا حال آپ دیکھتے آئے ہیں۔ اوّل تو کافی فاصلے کے بعد آبادی نظر آتی ہے اور وہ بھی برائے نام۔ ایسی جگہوں پر موٹر مکینک یا ورکشاپ کے دستیاب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

بولے ''تو پھر کیا کریں۔ کار کو دھکا لگا کر لے چلیں''۔

چونکہ پانی ہمارے پاس نہ تھا اس لئے ہمیں پیاس بھی لگنا شروع ہوگئی۔ گرمی خاصی تھی۔ ان حالات میں پانی کے بغیر گزارا مشکل تھا۔ کھانے کا سامان بھی موجود نہ تھا۔ تحسین صاحب کو ان چیزوں کی پروا نہیں تھی۔ ان کا بیان تھا کہ وہ اونٹ کیطرح کھانا پینا محفوظ کر لیتے ہیں۔ البتہ سگریٹ ختم ہونے والے تھے۔ انہیں یہ فکر تھی کہ اگر سگریٹ ختم ہو گئے تو کیا ہوگا؟

''کچھ دیر سگریٹ نہ پینا'' ہم نے کہا۔

بولے ''سگریٹ کے بغیر میں ڈرائیونگ نہیں کر سکتا۔ نیند آنے لگتی ہے۔ یہ تو واقعی مشکل ہوگئی''۔

آس پاس کوئی بڑا سایہ دار درخت بھی نہیں تھا اس لئے ہم دونوں کار ہی میں بیٹھ کر ''اچھے وقتوں'' کا انتظار کرنے لگے۔ وقفے وقفے کے بعد ایک دو بسیں یا ٹرک تیزی سے گزرے مگر انہوں نے ہماری طرف توجہ ہی نہیں دی۔

آخر ہم بیچ سڑک پر جا کھڑے ہوئے۔ ایک بس والا تو اس تیزی سے چڑھا آیا جیسے کہ ہمیں کچل ہی دے گا۔ مجبوراً ایک طرف کود کر جان بچانی پڑی۔

ہم نے کہا ''یہ ترکیب تو بہت خطرناک ہے''۔

تحسین صاحب بولے ''بڑے بڑے پتھر یا درخت سڑک پر رکھنے سے کام بن جائے گا'' مگر مشکل یہ تھی کہ دور دور تک ریت اور مٹی کے سوا پتھر کا نام ونشان نہ تھا۔ درخت سائے کے لئے دستیاب نہ تھا تو رکاوٹ ڈالنے کیلئے کہاں سے لاتے؟ کافی دیر بعد ایک ٹرک لہراتا جھومتا ہوا آتا نظر آیا۔ وہ مخالف سمت جا رہا تھا۔ ہم دونوں نے بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر اشارے دینے شروع کر دیئے یہاں تک کہ وہ رک گیا۔ ایک خوفناک صورت ڈرائیور اور دوسرا خوفناک ترین صورت کنڈیکٹر اس میں سوار تھے۔ ہم نے دل میں سوچا کہ لے بھائی۔ یہ ہمیں ضرور لوٹ لیں گے۔

''کیا معاملہ ہے سائیں؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

تحسین صاحب نے رعب دار انداز میں انہیں مختصر تمام واقعہ سنایا۔

''میرے لئے کیا حکم ہے سائیں؟'' اس نے پوری داستان سننے کے بعد پوچھا۔ اس سوال کا جواب ہم نے سوچا ہی نہ تھا۔

ہم نے کہا ''ذرا انجن کو دیکھو۔ اگر گاڑی اسٹارٹ ہو جائے تو اچھا ہے'' ۔

وہ بولا ''یہ تو ضروری امر ہے سائیں۔ ورنہ رات ہو گئی تو نہ آپ رہیں گے نہ یہ گاڑی''۔

''وہ کیوں؟''

''اس لئے کہ رات کو یہاں ڈاکو راج ہوتا ہے کوئی اسلحہ شسلہ بھی ہے آپ کے پاس....''۔

''ہمارے انکار سے پہلے ہی تحسین صاحب بول پڑے۔ فوجی ریوالور ہے اور بھی اسلحہ ہے''۔

وہ کچھ مرعوب ہو گیا ''سلام سائیں۔ آپ تو فوجی سائیں لگتے ہو۔ خیر یہ اچھا ہے۔ ہمارے لئے حکم کرو۔ ہم آپ کو کیا کریں؟''

اس نے ہمارے کہنے پر انجن کو بغور دیکھا''۔ ''نیا گاڑی ہے سائیں سب ٹھیک ہے''۔

''مگر یہ اسٹارٹ نہیں ہو رہی''۔

''اللہ سائیں بہتر جانتا ہے۔ ہم تو مکینک بھی نہیں ہیں۔ گاڑی اسٹارٹ اور بند کرنے کے سوا کچھ نہیں جانتے''۔

اس کے بعد وہ جواب طلب نظروں سے ہمیں دیکھنے لگے۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ''۔ تحسین صاحب رعب سے بولے۔

وہ دونوں سلام کر کے اپنے راستے پر ہو لئے۔

ہم نے کہا۔ ''تحسین صاحب ہو سکتا ہے یہ آگے جا کر اپنے ساتھیوں یا ڈاکوؤں کو ہمارے بارے میں بتا دے۔ پھر کیا ہو گا؟''

تحسین صاحب کا توکل آج بھی ہمیں یاد ہے، کہنے لگے۔ ''آفاقی صاحب جو مسئلہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا اس کے بارے میں سوچنے کا فائدہ؟ فی الحال تو اس کار کی فکر کیجئے''۔

''فکر تو کر رہے ہیں۔ مارے فکر کے ہمیں تو بھوک اور پیاس بھی لگنے لگی ہے''۔

انہوں نے انگریزی میں نہ جانے کس کو برُا بھلا کہا اور پھر گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اب شام ڈھلنے لگی تھی۔ خدا جانے اگلی آبادی کتنی دور تھی اور ہمارا کیا حشر ہونے والا تھا مگر تحسین صاحب مطمئن تھے انہوں نے سگریٹ کا پیکٹ کھول کر دیکھا۔ چار ہی سگریٹ باقی رہ گئے تھے۔ ایک انہوں نے ہمیں پیش کر دیا۔ ایک اپنے ہونٹوں میں دبایا۔ ہم نے بہتیرا کہا بھی کہ آپ کے لئے مشکل ہو جائے گا۔ مگر انہوں نے بہت اصرار کر کے ہمارا سگریٹ سلگایا اور بولے ''سگریٹ پینے سے اعصاب مضبوط اور ذہن تازہ ہو جاتا ہے''۔

ہم نے سگریٹ پھونک کر ختم کیا تو پیاس کچھ زیادہ ہو گئی۔ حلق بالکل خشک ہو کر رہ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک ٹوٹی پھوٹی بس نمودار ہوئی جو اسی طرف جا رہی تھی جدھر ہمیں جانا تھا۔ ہم نے روکنے کی کوشش کی مگر وہ پہلے ہی رک گئی تھی۔ سامنے ٹوٹے ہوئے شیشے میں ڈرائیور کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے وہ ہم سے اشاروں میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اتنی دیر میں بس کے اندر سے دو لمبے تڑنگے دیہاتی نما آدمی برآمد ہوئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ چہرہ اور حلیہ ان کا بھی ڈاکوؤں جیسا ہی تھا مگر اب ہمیں صبر سا آچلا تھا کہ یہاں تو سبھی اسی صورت شکل کے ہوتے ہیں۔

ایک شخص نے سلام کر کے پوچھا ''کوئی گڑ بڑ ہو گئی ہے سائیں ؟''

تحسین صاحب نے مختصر طور پر روداد بیان کر دی۔

ان دونوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''آپ سرکاری افسر ہیں ؟''

ہم دونوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ یہ ہمیں بعد میں احساس ہوا کہ خود کو فوجی افسر ظاہر نہ کر کے تحسین صاحب نے بڑی دانائی سے کام لیا تھا۔

''آپ کیا کام کرتے ہو سائیں ؟'' دوسرے نے گونج دار آواز میں پوچھا۔

ہم نے کہا'' ہم تو فلمیں بناتے ہیں اور یہ گانوں کے ریکارڈ بناتے ہیں''۔

اس نے دلچسپی سے ہمیں دیکھا ''کیا فلم بناتے ہو سائیں ؟''

ہم نے فوراً ''کنیز'' کا نام لیا۔

وہ بولا '' یہ بھی کوئی فلم ہے سائیں''

''اور کیا۔ ہم نے بنائی ہے''۔

''آپ اس کے مالک ہو ؟''

''اور کیا؟''

ان دونوں نے پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''فلم آگ کا دریا'' کس نے بنائی ہے سائیں ؟''

ہم نے بتایا'' وہ بھی ہمارے دوست نے بنائی ہے۔ ہمایوں مرزا نام ہے ان کا''۔

کہنے لگا'' بڑی بڑھیا فلم ہے سائیں۔ آپ کا دوست بڑا قابل شخص ہے''۔

تحسین صاحب نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کے ساتھی نے سوال کیا ''آپ سائیں محمد علی اور سائیں ساقی کو

جانتے ہو؟''

''وہ بھی ہمارے دوست ہیں؟''

''ان سے ملو تو ہمارا اسلام بولنا''۔'' کیا تم زیبا کو جانتے ہو؟'' ان میں سے ایک ڈاکو نے معنی خیز انداز میں پوچھا

''ہاں جانتے اور اچھی طرح جانتے ہیں'' ہم نے اندازہ لگا لیا وہ اسکی پسندیدہ اداکارہ ہے۔

''اچھا....'' اس نے کہا'' اسکو بھی ہمارا اسلام بولنا۔اب تم جاؤ۔ہم نے تمہیں زیبا کے صدقے چھوڑا۔اسے ہمارا سلام بولنا ''

''''جی ضرور سلام دیں گے''

اس اثنامیں بس کی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی حالانکہ بس مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔وہ سب خاموش اور ساکت بیٹھے تھے جیسے پتھر کے مجسمے ہوں۔

تحسین صاحب نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور کہا''اگر گاڑی کے انجن کے بارے میں کچھ جانتے ہو تو ذرا انجن چیک کر دو''۔

وہ دونوں کنارے کھڑی ہوئی گاڑی کے نزدیک گئے۔بونٹ اٹھا کر انجن دیکھا''بالکل نئی گاڑی ہے سائیں''۔

''ہاں۔مگر حادثے کے بعد اسٹارٹ نہیں ہو رہی''۔

''چابی کدھر ہے؟''

''گاڑی میں لگی ہے۔''

ان میں سے ایک گاڑی میں بیٹھ گیا۔کار کو نیوٹرل گیئر میں ڈالا اور چابی گھما دی۔گاڑی کا انجن فوراً اسٹارٹ ہو گیا۔ہم دونوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''یہ تو بالکل درست ہے سائیں'' یہ کہہ کر اس نے کار بند کر دی۔

''ارے ارے۔یہ کیا کر دیا۔بھائی کیا معلوم یہ دوبارہ اسٹارٹ ہو گی یا نہیں؟''

''کیوں نہیں ہو گی سائیں یہ دیکھو'' اس نے دوبارہ چابی گھمائی اور انجن پھر چالو ہو گیا۔

''خود بخود یہ کیسے ٹھیک ہو گئی ؟'' ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اللہ کی مرضی سائیں'' یہ کہہ کر وہ کار سے باہر نکل آیا۔

''اب آپ اللہ کا نام لے کر جاؤ۔ سائیں محمد علی اور ساقی کو ہمارا اسلام دینا مت بھولنا''

وہ دونوں اپنی بندوقیں سنبھال کر دوبارہ بس میں سوار ہو گئے۔ اور بس روانہ ہو گئی۔

''بھئی کمال ہو گیا۔ اس شخص کے ہاتھ میں تو جادو ہے'' تحسین صاحب نے کہا۔

''جلدی سے چل پڑیں ایسا نہ ہو جادو کا اثر ختم ہو جائے''

گاڑی کچے میں سے خاک اڑاتی ہوئی باہر نکلی اور یوں آرام سے چل پڑی جیسے کہ کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ صرف ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے لئے مخالف سمت سے سوار ہونا پڑتا تھا۔

رات گئے ہم ملتان پہنچ گئے۔ رات کو وہیں قیام کیا اور دوسرے دن لاہور میں تھے۔

تحسین صاحب اور ہم سارے راستے سوچتے رہے کہ آخر وہ دونوں کون تھے۔ لاہور کی حدود میں داخل ہوتے ہی ہمیں اچانک خیال آیا اور ہم نے کہا ''تحسین وہ ڈاکو تھے۔''

'ڈاکو؟' وہ ہنسنے لگے ''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟''

ہم نے کہا ''وہ سو فیصد ڈاکو تھے۔ آپ نے دیکھا نہیں بس میں مسافر کیسے سہمے ہوئے بیٹھے تھے اور بس کا ڈرائیور ہمیں اشاروں میں کچھ بتانے کی کوشش بھی کر رہا تھا''۔

تحسین صاحب بولے ''آپ کہانی نویس ہیں۔ ہر چیز میں کہانی تلاش کر لیتے ہیں۔ اگر وہ ڈاکو ہوتے تو ہمیں بھی لوٹ لیتے۔ ہمیں تو انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا''۔

ہم نے کہا فلم ''آگ کا دریا'' نے ہمیں بچا لیا ہے۔ ''ہم نے ان دونوں کا سلام ساقی صاحب اور محمد علی صاحب کو پہنچایا اور نہ ہی اس واقعے کا کسی اور سے ذکر کیا۔ لاہور پہنچ کر تحسین صاحب دوسرے ہی روز بذریعہ ہوائی جہاز واپس کراچی روانہ ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد اچانک راشد لطیف صاحب نے کراچی سے ٹیلی فون کر کے ہمیں بتایا کہ تحسین صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ ہم بے یقینی سے بیٹھے رہ گئے۔ اس قدر تندرست ہنس مکھ اور زندگی سے بھرپور انسان اور عین جوانی

میں ایک دم وفات پا جائے؟یقین تو نہیں آتا تھا مگر یہ حقیقت تھی مگران کے ساتھ گزارا ہوا یہ سفر ہمیں نہیں بھولے گا۔

لاہور میں ہم نے فیئٹ کمپنی کی ورکشاپ میں جا کر کار دکھائی۔ سپروائزر صاحب نے بغور جائزہ لینے کے بعد تین چار ہزار کا نسخہ بتا دیا۔ ''نئی کار کی قیمت تیرہ ساڑھے تیرہ ہزار اور معمولی مرمّت کے لئے تین چار ہزار کا خرچہ؟''
بولے'' دیکھئے ہمیں اس کی ایک سائیڈ میں بہت سی چیزیں نئی لگانی ہوں گی۔ آپ کی مرضی ہے سوچ لیجئے۔ ورنہ کسی اور ورکشاپ سے کرا لیجئے۔''
ہم نے الفلاح بلڈنگ میں آفس سے رابطہ کیا تو مینجر صاحب بے حد خوش اخلاق اور ہمدرد نکلے۔ انہوں نے اپنے اختیارات کام میں لاتے ہوئے چند سو روپے میں یہ کام کرا دیا۔ ہم نے محسوس کیا کہ سپروائزر صاحب کو یہ بات پسند نہیں آئی مگر مجبور تھے کندھے ہلا کر رہ گئے۔
کار کی مرمت تو ہو گئی اور ہم ایک برانڈ نیو کار کے مالک بھی بن گئے جو اس زمانے میں ایک عام بات نہ تھی مگر کار نے ہمیں مختلف قسم کی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔
دو چار دن کے بعد یہ کار کسی نہ کسی خرابی کے باعث ورکشاپ میں پہنچ جاتی تھی۔
آخر ایک دن ہمارے ڈرائیور یاسین خاں نے ہم سے کہا۔
''صاحب جی۔ ایسی نئی کار لینے سے کیا فائدہ۔ ہر روز کوئی چھوٹی موٹی خرابی نکل آتی ہے۔ نئی کار کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک دو سال تک ورکشاپ کا منہ ہی نہ دیکھنا پڑے مگر ہماری گاڑی تو ورکشاپ اس طرح جاتی ہے جیسے بیویاں میکے جاتی ہیں''۔
یہ مثال ہمیں پسند آئی اور اس کا اعتراض بھی دل کو لگ گیا۔ اسی دوران میں ہمیں کچھ اور لوگ بھی ملے جنہوں نے فیئٹ کار خریدی تھی اور ایسے ہی مسائل سے دوچار تھے۔ ہم خود بھی ورکشاپ کے چکّر لگا لگا کر تنگ آ گئے تھے۔ اس پر سپروائزر صاحب کا افسرانہ طرز عمل اور بھی کھلتا تھا۔
ایک بار ہم درستی کے سلسلے میں ورکشاپ پہنچے تو سپروائزر صاحب کا موڈ بے حد خراب تھا۔ ہماری شکایت سن کر وہ بگڑ

گئے۔

''آپ لوگ بھی خوب ہیں۔ یہ کار سارے یورپ میں چلتی ہے اور خوب چلتی ہے۔ آپ جب دیکھئے ورکشاپ آجاتے ہیں۔ ہم نے فروخت کے بعد سروس کا ذمہ تو لیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر روز کوئی پُرزہ بدلیں۔ آئندہ آپ سے بل چارج کیا جائے گا''۔

ہم نے کہا''کار بھی آپ کے سامنے ہے اور خرابی بھی۔ یورپ میں کاریں اچھی ہوتی ہیں یا چلانے والے، یہ ہم نہیں جانتے مگر ہم یہ تھرڈ کلاس کار خرید کر پچھتا رہے ہیں۔ اچھا تھا کہ ہم کوئی سیکنڈ ہینڈ کار خرید لیتے''۔

''دنیا کی مانی ہوئی کار کو آپ تھرڈ کلاس کہہ رہے ہیں؟'' وہ بگڑ گئے۔ ''یہ اٹلی کا افتخار ہے''۔

ہم نے کہا'' اٹلی والے تو اوّل نمبر کے چور اور جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ کار بھی انہوں نے ویسی ہی بنائی ہے''۔

''دیکھئے۔ بہت ہو چکی۔ آپ توہین کر رہے ہیں''۔

''کس کی؟''

''میری۔۔۔میری کار کمپنی کی''۔

ہم نے کہا''اس کا آسان حل یہ ہے کہ آپ ہماری یہ کار تبدیل کر دیں۔ ہم مرمّت کرا کرا کر تھک چکے ہیں۔ کمپنی سے کہہ کر ہمیں کوئی اچھی سی تندرست کار دلا دیں''۔

بولے۔'' کیسی ان ہونی باتیں کر رہے ہیں آپ، کسی اور کو اتنی شکایات نہیں ہیں جتنی کہ آپ لے کر آجاتے ہیں۔''

ہم نے کہا''سبھی شاکی ہیں مگر صبر کرتے ہیں۔ بہر حال آپ ہماری تجویز پر غور کریں''۔

بولے ''وہ تو بعد میں ہو گا۔ پہلے آپ یہ بل ادا کر دیں''۔

''مگر یہ تو کمپنی کی طرف سے سروس میں شامل ہے''۔

''جی نہیں۔ سروس بہت ہو چکی۔ اب آپ کو بل ادا کرنا ہو گا''۔

یاسین خان چپ چاپ سن رہا تھا۔ اچانک بول پڑا''واہ صاحب۔ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔ اتنی خراب گاڑی ہمارے صاحب کے ہاتھ بیچ دی اب بل بھی مانگتے ہو؟''

سپر وائزر صاحب کے منہ سے پائپ گر گیا۔ وہ غصّے سے بے قابو ہو کر بولا ''یو باسٹرڈ۔۔۔ہاؤ ڈیئر یو۔۔۔؟''

ابھی وہ فقرہ مکمل نہیں کرنے پائے تھے کہ یاسین خاں نے آگے بڑھ کر ان کی گردن پکڑ لی اور غضب ناک ہو کر بولا ''گالی دیتا ہے؟ ہمیں انگریزی میں گالی دیتا ہے؟ ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا''۔

اس کا ارادہ تو یہی تھا مگر ہم نے اسے روک دیا اور ڈانٹ کر باہر جانے کو کہا۔ صاحب کے دم میں دم آیا تو کھانستے ہوئے بولے ''اس جنگلی کو تو میں اندر کروادوں گا۔ سمجھتا کیا ہو گا''

انہوں نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ہم نے کہا''سول لائنز پولیس سٹیشن بالکل سامنے ہے۔ فون کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے اسے گالی دی تھی اس پر اس نے آپ کا گلا دبا دیا۔ حساب برابر ہو گیا۔ تھانے پولیس کے چکّر میں پڑیں گے تو پچھتائیں گے۔ اٹلی سے کوئی آپ کی ضمانت دینے بھی نہیں آئے گا۔ آپ شاید ہمیں اچھی طرح جانتے نہیں ہیں''۔

وہ بولے ''مجھے ضرورت بھی نہیں ہے۔ آئندہ آپ کو جو بات کرنی ہو وہ ورکشاپ مینجر سے کریں اور مرمّت کا بل بھی ادا کریں''۔

ہم نے کہا''یہ آپ بہت زیادتی کر رہے ہیں۔ آپ ایسا کریں کہ یہ کار ہم سے واپس لے لیں۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے''۔

بولے ''میں سیکنڈ ہینڈ کاروں کا بزنس نہیں کرتا''۔

''مگر ہمیں تو آپ نے سیکنڈ ہینڈ کار ہی بیچی ہے''۔

بولے۔ ''آپ نے کبھی اچھی کار رکھی ہو تو پتا چلے آپ اچھی کار کی قدر کیسے کر سکتے ہیں۔''

ہم ناراض ہو کر چلے آئے مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔

یاسین خان نے مشورہ دیا''صاحب جی۔ اس دیسی انگریز کو ہرگز مت چھوڑنا۔ ان لوگوں نے اندھی مچائی ہوئی ہے''۔

پاکستان ٹائمز کے دفتر میں دوستوں سے ملنے گئے تو وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے بھی نئی فیئٹ کار خریدی تھی اور اس کے نقائص سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ اس سے بڑھ کر وہ ورکشاپ سپر وائزر کے رویے سے نالاں

تھے۔ یکایک بیٹھے بیٹھے ہمارے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور نہایت معقول اور مؤثر تدبیر ہمارے ذہن میں آگئی۔
ہم نے وہیں بیٹھے بیٹھے ''پاکستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر کی ڈاک کے کالم کے لئے فیٹ کار کی شکایات کے حوالے سے ایک خط لکھا اور آئی اے رحمن صاحب کے حوالے کر دیا۔ تیسرے دن یہ خط پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا تو دوسرے لوگوں کو بھی حوصلہ ہوا اور انہوں نے بھی شکایتی مراسلات لکھنے شروع کر دیئے۔ ہم نے اسی طرح کا ایک خط ''امروز'' اور ''نوائے وقت'' میں بھی چھپوا دیا۔ لوگ تو جیسے بھرے بیٹھے تھے۔ ان سب نے اپنے اپنے تلخ تجربات بیان کرنے شروع کر دیئے۔ ہم نے ان تمام خطوط کو یکجا کیا اور فیئٹ کمپنی کے ہیڈ آفس پوسٹ کر دیا۔ یار لوگوں نے تو جیسے اگلی پچھلی ساری کسر نکالنے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ ایک صاحب نے یہاں تک لکھ دیا کہ نئی فیئٹ کار خریدنے سے بہتر ہے کہ آپ گدھا گاڑی خرید لیجئے۔ کم از کم مرّمت کی مصیبت سے تو نجات مل جائے گی۔ سبھی خطوط میں ورکشاپ سپروائزر کے طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔

جب ہمارا پہلا خط شائع ہوا تھا تو ہم نے بطور خاص ورکشاپ سپروائزر کو فون کر کے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی۔
انہوں نے کہا ''آفاقی صاحب آپ کس خیال میں ہیں۔ فئٹ ایک بین الاقوامی کمپنی ہے ایسے مراسلات اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے''۔
ہم نے کہا ''آپ بھول رہے ہیں۔ ایسے مراسلات فیئٹ کی ساکھ کو خراب کر سکتے ہیں۔ آپ جس ورکشاپ پر ناز کرتے ہیں وہ کباڑ خانے میں بدل سکتی ہے''۔
بعض اوقات منہ سے نکلی ہوئی بات حرف بحرف درست ثابت ہوتی ہے۔ فیئٹ کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ فیئٹ کی ساکھ بگڑنے لگی۔ ادھر جاپانی کاروں کی درآمد شروع ہو گئی اور کچھ عرصے بعد پاکستان میں فیئٹ کار آثار قدیمہ بن کر رہ گئی۔ لارنس روڈ اور کوئنز روڈ کے جس نکڑ پر فیئٹ کی وسیع و عریض ورکشاپ قائم تھی کچھ عرصے بعد وہ بند ہو گئی۔ اب وہاں دوسری عمارتیں سر اٹھائے کھڑی ہیں اور کسی کو یاد بھی نہیں کہ کسی زمانے میں یہاں بہت بڑی اور جدید موٹر ورکشاپ تھی۔

ہیڈ آفس میں اخباری تراشوں کا انبار لگ گیا تو فیئٹ کے اعلیٰ حکام کو بھی فکر پڑ گئی۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ ادارے اس قسم کی خراب پبلسٹی کے مضمرات سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔

ایک دن ہمیں جنرل مینجر صاحب کا فون موصول ہوا۔

''آپ آج سہ پہر میرے ساتھ چائے پئیں تو بہت خوشی ہوگی''۔

یہ نہایت شائستہ اور خوش اخلاق انسان تھے۔ ہمیں ان کا نام یاد نہیں رہا۔ عثمانی ربّانی یا اس قسم کا نام تھا۔ کراچی سے تشریف لائے تھے۔ ہم سے غائبانہ طور پر واقف بھی تھے۔ چائے نوشی کے بعد وہ حرف مدعا زبان پر لائے اور کہا

''آپ نے ہمارے کمپنی کے خلاف مہم کیوں شروع کر دی ہے؟''

ہم نے انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا۔ پھر فیئٹ کاروں کے نقائص بیان کرنے کے بعد ورکشاپ سپروائزر صاحب کی بداخلاقی کی تفصیل بتائی۔

وہ بولے ''ان صاحب کا تبادلہ کر دیا جائے گا۔ آپ کو میری طرف سے پیشکش ہے کہ اپنی اس کار کے عوض بالکل نئی کار لے لیں''۔

ہم نے کہا ''ہمیں تو معاف ہی رکھئے۔ آپ کی کار ہم نے یہ مہم شروع کرنے سے پہلے ہی فروخت کر دی تھی۔ کچھ نقصان ضرور اٹھانا پڑا مگر ذہنی سکون حاصل ہو گیا ہے''۔

پہلے سپروائزر صاحب گئے۔ پھر ورکشاپ رخصت ہوئی۔ اس کے بعد الفلاح کا آفس بھی بند ہو گیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب لوگوں کو اس کار کا نام ہی نامانوس سا لگنے لگا۔ یہ سچ ہے کہ جو کاریں پاکستان میں درآمد ہو رہی تھیں ان کا معیار اچھّا نہ تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ جاپانی کاروں کا ایسا سیلاب آیا کہ انگلینڈ، جرمنی، فرانس اور اٹلی کی معروف اور مقبول کاریں بھی رفتہ رفتہ قصّہ پارینہ بن گئیں۔ ہمارا اس تمام عمل میں کوئی دخل نہ تھا سوائے اس کے کہ ہم نے شکایتی مراسلات کی مہم کا آغاز کیا تھا۔

اس زمانے میں پاکستان میں جاپان کی بلیو برڈ، مزدا اور پھر ٹیوٹا کاریں آنی شروع ہو گئی تھیں مگر ان کی رپورٹ کچھ اچھی نہیں تھی۔ کار ڈیلر سے مشورہ کرو تو جواب ملتا تھا ''ارے صاحب جاپانی کاریں تو کھلونا ہوتی ہیں۔ جاپانی مال میں نہ

کوالٹی ہوتی ہے نہ معیار، کار وہی اچھی ہوتی ہے جو مار کھا سکے۔ مورس اس معاملے میں سب سے اچھی گاڑی ہے۔ جاپانی کار کی ری سیل ویلیو نہیں ہے''۔

ہمارے ایک دوست نے مشورہ دیا'' یاران کی باتوں میں نہ آجانا۔ یہ تو لکیر کے فقیر ہیں۔ تم نے ٹیوٹا کار دیکھی ہے؟ کتنی خوبصورت، کشادہ اور مضبوط گاڑی ہے، چلانے کا لطف آجاتا ہے۔ میری مانو تو وہی خرید لو۔''

چنانچہ ہم نے ایک نئی ٹیوٹا کار خرید لی۔ شوروم سے یہ چودہ ہزار روپیہ میں مل جاتی تھی مگر اس کے لئے تین ماہ انتظار کرنا پڑتا تھا۔ دو سو روپے زائد ادا کرنے پر فوری طور پر مل جاتی تھی۔ ہمیں انتظار کی تاب کہاں تھی۔ اس لئے فوری طور پر چودہ ہزار۔۔۔ دو سو روپے ادا کر کے ہم ایک برانڈ نیو ٹیوٹا کار کے مالک بن گئے۔ آج تو خود ہمیں بھی یہ خواب کی سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مگر اس وقت یہ حقیقت ہوا کرتی تھی۔ یہ 1966-67ء کا ذکر ہے۔ پھر تو جاپانی کاریں پاکستان میں اتنی مقبول ہوئیں کہ دوسرے ملکوں کی بنی ہوئی کاروں کو لوگ بھول ہی گئے۔ پاکستان میں ہی نہیں، ہم دنیا کے جس ملک میں بھی گئے وہاں جاپانی کاروں کو ہی رواں دواں دیکھا۔ انگلستان اور امریکہ میں تو ان کی بہتات ہے۔ ہم نے جس ماڈل کی ٹیوٹا کار خریدی تھی اس ماڈل کی کاریں آج بھی سڑکوں پر بھاگتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ رہی فیئٹ اور مورس جو اس زمانے کی مقبول ترین موٹر کاریں تھیں۔ اب یہ آنکھ کا سُرمہ بن چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اچھّا اور بُرا وقت انسانوں ہی پر نہیں کاروں پر بھی آتا ہے۔

باقاعدہ گانا تو ہمیں کبھی نہیں آیا اور نہ ہی ڈھنگ سے سُر اور تال یا لے کی تربیت حاصل کی مگر بچپن ہی سے کانوں میں کمپیوٹر لگا ہوا ہے۔ اگر کوئی گانا ذرا سا بھی سُر سے باہر ہو تو ہمارے کانوں کو پتہ چل جاتا ہے۔ گانے سے ہمیں ہوش سنبھالنے کے بعد ہی سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ لوری تو خیر بچّوں کا کھیل ہے' ہمیں دوسرے گانے بھی اچھے لگتے تھے۔ ان دنوں میں ریڈیو اتنا عام نہیں تھا۔ ٹیلیویژن اور کیسٹ کا تصوّر تک نہیں تھا۔ موسیقی سننے کا بہترین ذریعہ ''منہ زبانی'' تھا۔ یعنی کوئی گانا کسی کو پسند آجاتا تو وہ گنگنانا اور گانا شروع کر دیتا۔ اس کی زبان سے سن کر دوسرے کو یاد ہو جاتا اور وہ بھی موقع بے موقع گانے لگتا۔ اس طرح یہ گانا متعدّی مرض کی طرح ہر طرف پھیل جاتا تھا۔ ریڈیو بہت کم گھروں میں تھا اور وہ بھی اکثر خبریں سننے کیلئے استعمال ہوتا تھا۔ موسیقی اور گانے سننے کی بچّوں اور نوجوانوں کو

اجازت نہیں دی تھی۔ ہم بتا چکے ہیں کہ رات گئے ہم اور ہماری بڑی بہن انیسہ آپا کس طرح لاؤنج کی روشنیاں بجھا کر ریڈیو کے بالکل نزدیک بیٹھ کر موسیقی اور فرمائشی گانے سنا کرتے تھے۔ فقیروں کا دم بہت غنیمت تھا جو ہر مقبول گانا بھی بھیک مانگنے کیلئے گاتے تھے۔ جو گانا فقیر گائے سمجھ لیجئے کہ یہ ہٹ ہو گیا ہے۔ انڈیا میں بھی یہی پیمانہ کام کرتا ہے۔ گانے کی مقبولیت جانچنے کا ایک اور ذریعہ سڑکوں پر سے گزرنے والے ہوتے تھے۔ سائیکل پر' تانگے میں 'ریڑھے پر یہاں تک کہ پیدل چلتے ہوئے بھی لوگ باآواز بلند لہک لہک کر تازہ ترین ''ہٹ پریڈ'' پیش کیا کرتے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک تو ہوتا نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ گانے والا تو اپنی دُھن میں مگن گاتا ہوا گزر جاتا تھا اور اپنے پیچھے موسیقی کی لہریں چھوڑ جاتا تھا۔ پھر یہ گانا دوسرے سننے والے بھی گاتے اور دوسروں کو سناتے۔

بڑے لوگ بتاتے ہیں کہ ہم ابھی پالنے میں تھے کہ گانا سن کر گردن یا پیر ہلانے لگتے تھے۔ واللہ اعلم۔ اس لحاظ سے تو ہمیں بذات خود بہت اچھّا گلوکار یا موسیقار ہونا چاہئے تھا مگر کبھی ہمّت نہ پڑ سکی۔ بس اکیلے گنگنا لیتے تھے۔ کوئی گانے والا سُر سے باہر ہوتا تو ہمیں فوراً علم ہو جاتا تھا۔ یہ تو معلوم نہیں تھا کہ سُر کیا ہوتا ہے۔ مگر اتنا پتہ ضرور چل جاتا تھا کہ گانے میں کوئی غلطی ضرور ہے۔ بہر حال یہ چیزیں بھی خداداد ہوتی ہیں۔ اگر اللہ نے یہ علم زیادہ دیا ہوتا تو ہم بھی آج موسیقار یا گلوکار ہوتے۔

ابھی بچّے ہی تھے کہ ہمارے کانوں نے ایک نہایت سُریلی اور نغمگیں آواز سنی اور مزہ یہ کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کا نام بھی شامل تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا گانا ممنوع نہیں ہو سکتا تھا اسلئے ہم بھی جب کبھی موقع ملتا تو لہک لہک کر خود بھی گاتے تھے۔

پیغام صبا لائی ہے دربار نبی سے
آیا ہے بلاوا مجھے سرکار نبی سے

یہ اتنی خوبصورت آواز تھی کہ ہمارے رگ وپے میں بس گئی۔ وہ دن اور آج کا دن 'یہ آواز ہمارے ذہن اور کانوں سے نکلتی ہی نہیں ہے۔ یہ تو ہمیں بہت عرصے بعد معلوم ہوا کہ یہ نعت شمشاد بیگم نے گائی ہے اور اس کے لکھنے والے

ولی صاحب ہیں۔ شمشاد بیگم کو دیکھنے اور ان سے ملنے کی ہمیں ہمیشہ آرزو رہی مگر یہ پوری نہ ہو سکی۔ البتہ ولی صاحب سے لاہور میں شرف نیاز حاصل ہوا اور ایورنیو سٹوڈیوز میں ملاقاتوں کا موقع بھی ملا۔ ولی صاحب کچھ دیر سے' بمبئی سے آئے تھے مگر ان کا نام اس سے پہلے ہی ہم سن چکے تھے۔ بڑے گنوں والے آدمی تھے۔ شاعر' ادیب' پنجابی' اردو دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ فلمی گیت لکھتے تو ایسے کہ لوگوں کے کان پکڑوا دیتے۔ فلمیں بھی بنائیں اور ڈائریکٹ بھی کیں۔ ولی صاحب نے لاہور آکر بھی فلمیں بنائی تھیں۔ بیشتر پنجابی فلمیں تھیں۔ ان سے ہم اس لئے بھی مرعوب تھے کہ وہ اپنے عہد کی مقبول ترین سُپر سٹار ممتاز شانتی کے شوہر بھی تھے۔ ممتاز شانتی کی فلم ''قسمت '' کئی سال تک کلکتہ کے ایک سینما میں چلی تھی اور یہ ریکارڈ پھر کوئی اور فلم نہ توڑ سکی۔ ولی صاحب سے شادی کے بعد انہوں نے فلمی دنیا کو خیر باد کہہ دیا اور اس طرح کہ جیسے دنیا ہی کو خیر باد کہہ دیا۔ اس کے بعد وہ کسی فلمی یا غیر فلمی تقریب میں نہیں دیکھی گئیں۔ کسی نے ان کی جھلک دیکھنا تو کیا آواز تک نہ سنی۔ بس گھر گرہستی اور چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ ایسی ہستیاں بھی فلمی دنیا سے وابستہ رہی ہیں۔

جب کچھ شعور آیا تو معلوم ہوا کہ ہماری پسندیدہ نعت شمشاد بیگم کی گائی ہوئی ہے۔ شمشاد بیگم کا کسی زمانے میں بہت شُہرہ تھا۔ یہ نعت 1932ء میں ریکارڈ کی گئی تھی۔ یعنی ہماری پیدائش سے ایک سال قبل اور جب ہم نے ہوش سنبھالا' نوعمری' نوجوانی اور پھر جوانی کے آنگن میں داخل ہوئے تو اس وقت بھی شمشاد بیگم کی خوبصورت آواز برّصغیر میں گونج رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہم پاکستان آگئے مگر اس دل میں اُتر جانے والی آواز نے یہاں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ یہ نعت ولی صاحب نے لکھی تھی جو اس زمانے میں بھی نامور شاعر اور ادیب تھے۔ انہوں نے گراموفون کمپنیوں کیلئے مختلف ناقابل فراموش نغمات لکھے تھے۔ آغا جی اے گل سے ان کی بہت دوستی تھی بلکہ گاڑھی چھنتی تھی۔ جب انہوں نے فلمیں بنانا ترک کر دیا تھا' اس کے بعد بھی اکثر شام کے وقت ایورنیو سٹوڈیوز میں آکر آغا صاحب کے کمرے میں بیٹھتے تھے اور زمانے بھر کے موضوعات پر باتیں کرتے تھے۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اتنی بڑی عمر کے ہیں۔ صحت بہت اچھی تھی۔ مضبوط جسم اور خوش مزاج آدمی تھے۔ گفتگو کا سلیقہ بھی رکھتے تھے۔ اردو پنجابی دونوں زبانیں بہت اچھے اور میٹھے انداز میں بولتے تھے۔ ان کی زبان سے ہم نے کبھی خود ان کی

بڑائی تو کیا پرانے دنوں کا کوئی قصہ تک نہیں سنا۔ عام طور پر لوگ اپنے عروج کے زمانے کے واقعات کسی نہ کسی بہانے یا موقع و محل کے مطابق سناتے رہتے ہیں مگر ولی صاحب کے مزاج میں انکسار بہت زیادہ تھا۔ اتنے عظیم انسان اور اس قدر سادہ اور اپنے بارے میں چپ چاپ ! حیرت کی بات ہے۔

ہم شمشاد بیگم کی آواز کے دلدادہ تھے بلکہ ان کے نادیدہ پرستار تھے۔ دیکھا جائے تو ہم پیدائش سے پہلے ہی ان کے مدّاح تھے کیونکہ ہماری پسندیدہ نعت انہوں نے ہماری پیدائش سے ایک سال پہلے ریکارڈ کرائی تھی۔ شعور کی عمر میں داخل ہوئے اور فلموں سے دلچسپی پیدا ہوئی تو ہم نے شمشاد بیگم کے بارے میں بہت کرید کی مگر معلوم ہوا کہ وہ ایک گوشہ نشین اور خاموشی پسند خاتون ہیں۔ نہ کسی میگزین میں ان کا چرچا دیکھا' نہ کوئی سکینڈل ان سے منسوب ہوا۔ یہاں تک کہ ان کے بارے میں اس کے سوا کوئی دوسری خبر تک نہیں پڑھی کہ فلاں گیت شمشاد بیگم نے گایا ہے اور بس۔

شمشاد بیگم کے ابتدائی دور کا ایک اور گانا بھی ہمیں بہت اچھّا لگا تھا۔

اک بار پھر کہو ذرا

کہ میری ساری کائنات

تیری اک نگاہ پر

نثار ہے۔

یہ ایک سدا بہار گیت ہے جو انہوں نے ریڈیو پر بھی گایا تھا۔ اس سے پہلے یہ ریکارڈنگ کمپنی کے توسط سے ریلیز ہوا تھا۔ جن دنوں شمشاد بیگم نے نعت ریکارڈ کرائی تھی اس وقت وہ بہت کم عمر تھیں لیکن آواز کی پختگی اور گائیکی کا انداز ایسا ہے کہ سننے والے کو گمان تک نہیں گزرتا کہ یہ نعت کسی بارہ سالہ لڑکی نے گائی ہے۔

اس پُراسرار ہستی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو ہمیں بہت کچھ معلوم ہوا۔

شمشاد بیگم 1920ء میں لاہور میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا بچپن بھی لاہور میں ہی گزرا۔ اس زمانے میں لاہور میں بھی ریڈیو سٹیشن قائم ہو چکا تھا۔ وہ بارہ سال کی تھیں جب انہوں نے ولی صاحب کی تحریر کردہ یہ نعت ریڈیو لاہور سے گائی۔ یہ نعت اس قدر مقبول ہوئی کہ ہندوستان بھر میں کشمیر سے لے کر راس کماری تک یہ آواز گونجنے لگی اور شمشاد

بیگم نے مقبولیت کے ایسے جھنڈے گاڑے جو نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے تک پوری شان و شوکت سے لہراتے رہے۔

شمشاد بیگم کا گانے والوں میں شُہرہ ہوا تو ماسٹر غلام حیدر نے اپنی فلم ''یملا جٹ'' کیلئے ان کی آواز میں ایک گانا ریکارڈ کیا۔ ماسٹر غلام حیدر اس وقت لاہور میں تھے اور شُہرت کے زینے طے کر رہے تھے۔ یہ ایک پنجابی فلم تھی جس کیلئے شمشاد بیگم کا گایا ہوا گیت بے حد مقبول ہوا۔ ماسٹر غلام حیدر کو یہ آواز اس قدر پسند آئی کہ اپنی اگلی فلموں ''خزانچی اور پونجی'' کے نغمے بھی انہوں نے شمشاد بیگم ہی کی آواز میں ریکارڈ کئے۔ ''خزانچی'' 1941ء میں اور ''پونجی'' 1942ء میں بنائی گئی تھی۔ یہ دونوں اپنی موسیقی کی وجہ سے سُپر ہٹ فلمیں تھیں۔ 1943ء میں ''خاندان'' ریلیز ہوئی۔ یہ فلم نور جہاں اور شوکت حسین رضوی کی پہلی مشترکہ فلم تھی اور کئی اعتبار سے ایک یادگار فلم تھی۔ اس کے موسیقار بھی ماسٹر غلام حیدر ہی تھے۔ ''خاندان'' نور جہاں کے گانوں کی وجہ سے شناخت کی جاتی ہے۔ وہی پہلی بار اس فلم میں ہیروئن کے روپ میں جلوہ گر ہوئی تھیں اسلئے اس فلم کے بیشتر گانے بھی ان ہی کی آواز میں ریکارڈ کئے گئے تھے اور آج بھی تر و تازہ ہیں لیکن اس فلم میں ایک گانا شمشاد بیگم نے بھی گایا تھا جو بے حد پسند کیا گیا۔

پی لے پی لے مورے راجا، دوزخ سے کیا ڈرنا

1944ء میں فلم ''شیریں فرہاد'' ریلیز ہوئی۔ اس کے موسیقار رشید عطرے تھے بلکہ یہ موسیقار کی حیثیت سے رشید عطرے صاحب کی پہلی فلم تھی۔ اس فلم میں شمشاد بیگم کے گائے ہوئے دو گیت بے حد پسند کئے گئے۔

شمشاد بیگم کی شُہرت خوشبو کی طرح ملک کے گوشے گوشے میں پھیل چکی تھی اسلئے یہ کیوں کر ممکن تھا کہ انہیں بمبئی سے بلاوا نہ آتا۔ بمبئی میں موسیقار رفیق غزنوی نے ان کی آواز میں گانے ریکارڈ کئے۔ یہ فلم ''بیرم خان'' تھی۔ ان ہی دنوں ماسٹر غلام حیدر بھی کشاں کشاں بمبئی پہنچ چکے تھے اور محبوب صاحب کی تاریخی فلم ''ہمایوں'' کی موسیقی بنا رہے تھے۔ ماسٹر غلام حیدر نے فلم '' ہمایوں'' میں بھی شمشاد بیگم کی آواز میں گانے ریکارڈ کئے جو بہت مقبول ہوئے۔ سبطین فضلی کی دو فلموں ''مہندی'' اور ''شمع'' میں بھی شمشاد بیگم کی آواز نے جادو جگایا تھا۔ ان دونوں

فلموں کے موسیقار بھی ماسٹر غلام حیدر تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ماسٹر غلام حیدر کو شمشاد بیگم کی کھنکتی ہوئی، سُریلی اور جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز اتنی پسند تھی کہ وہ عموماً شمشاد بیگم ہی کی آواز میں گانے ریکارڈ کرنا پسند کرتے تھے۔

میں ”انمول گھڑی“ کی نمائش ہوئی۔ محبوب صاحب کی یہ فلم بھی یادگار رومانی فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کے موسیقار نوشاد تھے اور ہیروئن نور جہاں۔ ظاہر ہے کہ بیشتر گانے نور جہاں کے ہی گائے ہوئے تھے مگر نوشاد صاحب نے ایک دوگانا شمشاد بیگم اور زہرہ بائی انبالہ والی کی آوازوں میں بھی صدابند کیا تھا۔ یہ گیت تنویر نقوی کا لکھا ہوا تھا۔ بول شاید آج بھی آپ کو یاد ہوں گے۔

اڑن کھٹولے پہ اڑ جاؤں

تیرے ہاتھ نہ آؤں

نوشاد صاحب کو بھی شمشاد بیگم کی آواز بھا گئی۔ فلم ”شاہجہاں“ میں انہوں نے مجروح سلطان پوری کا لکھا ہوا یہ گیت شمشاد بیگم ہی سے گوایا تھا جو آج بھی روزِ اوّل کے مانند سدا بہار ہے۔

جب اس نے گیسو بکھرائے

بادل آیا جھوم کے

اس کی موسیقی میں نوشاد صاحب نے ایسے سُر سمیٹ دیئے تھے اور شمشاد بیگم نے اس گیت کو ایسے والہانہ انداز میں گایا تھا سننے والے جھوم اُٹھتے تھے۔ چنانچہ شمشاد بیگم نوشاد صاحب کی بھی پسندیدہ گلوکارہ بن گئیں۔ اس کے بعد نوشاد صاحب کی کئی یادگار فلموں میں شمشاد بیگم نے لازوال نغمے گائے جنہیں نوشاد کی موسیقی اور شمشاد بیگم کی آواز نے مل کر مسحور کن بنا دیا تھا۔ انوکھی ادا، درد، میلہ، چاندنی رات، دیدار، دلاری، انداز، بابل، آن اور بیجو باورا جیسی نغمہ بار فلموں میں نوشاد صاحب اور شمشاد بیگم کا ساتھ رہا۔ ان فلموں کے نغمے ناقابل فراموش حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ان کے سُپر ہٹ نغموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ تمام نغمے اب فلمی موسیقی کی تاریخ کا حصّہ بن چکے ہیں۔ ”مدر انڈیا“ میں بھی نوشاد نے شمشاد بیگم کی آواز کو استعمال کیا تھا۔

1947ء کے بعد کا دور ہندوستان کی فلمی دنیا میں لتا منگیشکر کا دور کہلایا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود نوشاد اور بعض

دوسرے نامور موسیقار شمشاد بیگم کی آواز کو نہیں بھولے تھے ''مغل اعظم'' میں بھی شمشاد بیگم کے گانے شامل تھے۔اس فلم میں انہوں نے لتا' شمشاد بیگم اور دوسری آوازوں میں دو قوّالیاں ریکارڈ کی تھیں اور یہ دونوں ہی قوالیاں اس فلم کی موسیقی کی جان تھیں۔

1-تری محفل میں قسمت آزما کے ہم بھی دیکھیں گے

2-جب رات ہو ایسی متوالی پھر صبح کا عالم کیا ہو گا

یوں شمشاد بیگم کی دلآویز آواز کو اور موسیقاروں نے بھی بہت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے لیکن نوشاد نے اس آواز کو جس خوبصورتی' نزاکت' سلیقے اور مہارت کے ساتھ استعمال کیا وہ کسی دوسرے موسیقار کے حصّے میں نہیں آیا۔ شمشاد بیگم نے پنجابی فلموں میں بھی بہت خوبصورت گانے گائے ہیں۔پنجابی ان کی مادری زبان تھی۔ فلم ''بھنگڑا'' اور ''ڈھولک'' میں شمشاد بیگم کے گائے ہوئے گیت آج بھی سدا بہار حیثیت رکھتے ہیں۔موسیقار ایس ڈی برمن نے بھی اپنی کئی فلموں میں شمشاد بیگم کی آواز کو بہت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔

شمشاد بیگم کی آواز میں ایک والہانہ پن ہے۔ عجیب سی کیفیت ہے۔جذبات بھرے ارمانوں کی سُلگتی ہوئی آمیزش ہے۔ان جیسی آواز کسی دوسری گلوکارہ کے حصّے میں نہیں آئی۔یہی وجہ ہے کہ ان کا گایا ہوا گیت علیحدہ سے پہچانا جاتا ہے۔ انہوں نے المیّہ' طربیہ اور رومانی ہر قسم کے گیت گائے ہیں اور اپنی آواز کے سوز کی مدد سے المیّہ گانوں میں درد' دکھ اور محرومی کے جذبات و تاثرات سمو دیئے ہیں۔وہ مشکل سے مشکل گانا بہت آسانی سے گا سکتی تھیں اور کوئی سُر ایسا نہیں ہے جہاں تک ان کی آواز کی رسائی نہ ہو۔ان کی آواز منفرد اور مختلف کیفیات کی حامل ہے اور وہ اس آواز کو گانے کی نوعیّت اور سچویشن کے اعتبار سے انتہائی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں۔کوئی بھی گانا ان کی پہنچ سے دور نہیں ہے۔اپنے کیریئر کے آخری دور میں وہ موسیقاروں کی سرد مہری اور بے پروائی کا نشانہ بن گئیں حالانکہ ان کی آواز کی کھنک اور بانکپن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی لیکن شو بزنس میں مقبولیت کا دور ہمیشہ نہیں رہتا۔پھر بھی شمشاد بیگم کے گائے ہوئے گیت برّصغیر کی فلمی موسیقی کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش حصّہ بن چکے ہیں۔انہیں کسی زمانے میں ''نغمات کی بیگم'' کا لقب دیا گیا تھا۔ایک عالم ان کی آواز کا دیوانہ تھا۔یہی حالت گلوکاری کے شعبے میں

بھی تھی۔ نور جہاں، ثریا، لتا منگیشکر، آشا بوسلے، گیتادت، زہرہ بائی انبالہ والی، امیر بائی کرناٹکی اور خورشید۔ کیسی کیسی آوازیں تھیں مگر جو بات شمشاد بیگم کی آواز میں تھی یہ بات کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ شمشاد بیگم کا گانا سُن کر ہمارے تصوّر میں ایک انتہائی ملیح، بڑی بڑی آنکھوں، دراز قد اور لمبے گیسوؤں والی خاتون کا ہیولا آجاتا تھا۔ یہ حلئے تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ ہر گانے کی گائیکی مختلف، ادائیگی کا انداز جدا، آواز کا استعمال علیحدہ، ظاہر ہے کہ ہر گانے کے ساتھ ایک نئی شکل خیال میں آتی تھی۔ ہوش سنبھال کر گانا سننے کی سمجھ پیدا ہوئی تو ہم شمشاد بیگم کی آواز کے پرستار تھے۔ وہ دن اور آج کا دن۔ ان کے بارے میں ہماری عقیدت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ایک دوست نے ہمیں پرانی گانے والیوں اور گانے والوں کے انٹرویوز پر مشتمل ایک ویڈیو کیسٹ دیا تو اس میں شمشاد بیگم کا انٹرویو بھی شامل تھا۔ ان کے ساتھ ہماری عقیدت کو کم و بیش نصف صدی گزر چکی تھی۔ ظاہر ہے اب جو شمشاد بیگم کو دیکھا تو وہ آج کی شمشاد بیگم ہیں مگر ہم انہیں دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے ایک بزرگ خاتون، سادہ سی سوتی ساری میں ملبوس کھڑی ہوئی تھیں۔ پھر جب انہوں نے اپنی گلوکاری اور اپنے عہد کی موسیقی کے بارے میں لب کشائی کی توان کی آواز میں اور ان کے گانوں والی آواز میں زمین آسمان کا فرق تھا مگر جب انہوں نے سادہ انداز میں بولنا شروع کیا تو ہم سنتے ہی رہ گئے۔ بالکل سادہ، عام فہم، آسان الفاظ، سیدھا سادہ طرز بیان، انکسار اتنا کہ اپنے بارے میں کچھ کہنے کو آمادہ ہی نہیں تھیں۔ انٹرویو کرنے والے نے بہت کریدا تو بہت محتاط انداز میں اُس زمانے کی موسیقی، موسیقاروں اور گلوکاروں کے بارے میں اظہار خیال کیا مگر اس طرح کہ خود اپنی تعریف کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا اور نہ ہی کسی دوسرے کی دل شکنی ہوئی۔ اللہ اللہ کیسی وضع دار اور اعلیٰ ظرف ہستیاں تھیں۔ خدا جانے اللہ میاں کے کارخانے میں اب ایسے لوگوں کی پروڈکشن کیوں بند ہو گئی ہے۔

پرانی آوازوں اور بچپن کے آئیڈیلز کا ذکر چل نکلا ہے۔ اس ضمن میں ایک اور خاتون بھی تذکرے کی مستحق ہے۔ یہ سب ہمارے بچپن اور نو عمری کے پسندیدہ لوگ ہیں۔ آج کل کے بچّوں اور نو عمروں کے ہیرو ہیروئن ہوتے تو ہیں مگر وہ کچھ اور قسم کے لوگ ہوتے ہیں یا پھر ہوتے ہی نہیں۔ ہمارے وقتوں کے لوگ بچپن ہی سے اپنے ہیرو یا ہیروئنیں تلاش کر لیتے تھے اور پھر ساری عمران بُتوں کی پرستش کرتے رہتے تھے۔

اب سنئے ایک اور مغنیّہ کی کہانی۔

ان کا نام تھا اختری بائی فیض آبادی۔ بعد میں یہ بیگم اختر ہو گئیں۔ ہمارا بے خبری کا یہ عالم کہ اس تبدیلی کا علم ہی کافی عرصے تک نہیں ہوا اور ہم حیران ہوتے تھے کہ یاالٰہی یہ کون خاتون گانے والی ہیں جن کی آواز ہو بہو اختری بائی فیض آبادی جیسی ہے۔ نام بھی کسی حد تک مشترک ہے۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ یہ وہی محترمہ ہیں۔ ان کے بیگم اختر بننے کی وجہ یہ تھی کہ جب انہوں نے بیرسٹر اشتیاق احمد عباسی سے شادی کی تو "بائی" کا لفظ ان کے نام سے خارج ہو گیا اور اس طرح کہ پھر کبھی کسی نے انہیں بیگم اختر کے سوا کسی اور نام سے نہ پکارا۔ قدر دانی کا دور تھا۔ فن کاروں کو مشاقانِ فن سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ انہیں عزّت' احترام اور مکمل پروٹوکول دیتے تھے۔ انہوں نے کبھی اخباروں یا ٹیلیویژن اور ریڈیو کے ذریعے اعلان بھی نہیں کیا تھا کہ " ہر خاص و عام کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ میں نے اب اپنا نام بدل کر بیگم اختر رکھ لیا ہے اسلئے آئندہ مجھے اسی نام سے پکارا جائے۔"

مگر ان کا جو احترام اور ان سے جذبۂ عقیدت کی جو شدّت تھی اس کے باعث قدر دانوں نے آپ ہی آپ انہیں بہ یک زبان و قلم بیگم اختر کہنا شروع کر دیا۔

اختری بائی نے 1914ء میں فیض آباد میں جنم لیا تھا۔ یعنی ہماری پیدائش سے لگ بھگ انیس سال پیشتر۔ آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ یہ شخص بھی عجیب ہے۔ گڑے مردے اکھاڑنے میں لگا ہوا ہے۔ مگر یہ وہ مردے ہیں جن کے بارے میں غالب فرما گئے ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بیگم اختر کو اللہ نے آواز کے ساتھ پیاری پیاری شکل و صورت سے بھی نوازا تھا۔ وہ ایک دلکش اور پُرکشش ہستی تھیں۔ ان کی خوبصورتی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ اُس زمانے کی معروف ہستیوں میں صرف ان ہی کو یہ شرف حاصل ہوا تھا کہ انہوں نے فلموں میں بھی اداکاری کی اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ وہ ایسا دور تھا جب میک اپ اور عکّاسی کے فن نے اتنی زیادہ ترقّی نہیں کی تھی کہ معمولی شکل کو بھی پری کی صورت میں سکرین پر پیش کیا جائے۔ اس وقت

کی ہیروئنیں واقعی خوب رواور ماہ جبین ہوتی تھیں۔اختری بائی فیض آبادی(ان کانام ہمیشہ مکمل ہی لیاجاتا تھا۔ہم نے کبھی محض اختری یااختری بائی کے نام سے ان کاذکر نہیں سنا) نے یوں توگلوکارہ کی حیثیت سے بھی سارے برّصغیر میں شہرت اور مقبولیت کے جھنڈے گاڑدیئے تھے مگران کی شہرت اور ہر دلعزیزی کاایک سبب یہ بھی تھاکہ اس دور کی معروف گانے والیوں میں یہ شرف صرف ان ہی کوحاصل ہواتھاکہ انہوں نے فلموں میں جلوہ گرہوکر اداکاری بھی کی تھی۔"ایک دن کی بادشاہت" محبوب صاحب کی مشہور زمانہ فلم " روٹی" "ممتاز بیگم" اور" نصیب کا چکّر"وہ فلمیں ہیں جن میں انہوں نے اداکاری کامظاہرہ کیاتھااوران میں سے بعض فلمیں توانتہائی مقبول ہوئی تھیں۔ "روٹی" وہ فلم ہے جس کے موسیقار انیل بسواس تھے۔محبوب صاحب نے ان کی خواہش اور فرمائش پرہی "روٹی" میں اداکاری کیلیئے اختری فیض آبادی کوبلوایاتھا۔ظاہر ہے کہ گیت بھی ان ہی کی آواز میں ریکارڈ کیئے گئے تھے۔ان کی غزلیں توزبان زدعام تھیں ہی لیکن انہوں نے فلموں کیلیئے بھی گلوکاری کی تھی۔دانہ پانی' احسان اور جل ساگر میں انہوں نے پلے بیک گانے گائے تھے۔اس امتیاز کے باعث ان کی شہرت سب سے زیادہ تھی اور صحیح معنوں میں بچّہ بچّہ ان کے نام سے واقف تھا۔

بیگم اختری غزل گانے میں منفرداور مخصوص حیثیت رکھتی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسی غزل بہت کم گانے والوں نے گائی ہے۔اس پر آواز کانکھار' بانکپن اور تیکھاپن۔اس میں اگر فن کی آمیزش کردی جائے تو بیگم اختر کی گلوکاری کا نقشہ سامنے آجاتاہے۔

یوں سمجھئے کہ اُدھریورپ میں 1914ء کی پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی اورادھر فیض آباد میں اختری بائی نے جنم لیا۔ آواز کی خصوصیات کو پہچاننے والوں نے اوائل عمرہی میں بھانپ لیاتھاچنانچہ انہیں اعلیٰ تربیّت دینے کی طرف توّجہ دی گئی۔پٹیالہ گھرانا کے معروف استاد عطامحمد خاں ان کے پہلے استاد تھے۔اس کے بعد انہوں نے کیرانہ گھرانے کے استاد عبدالوحید خاں سے بھی تعلیم اور تربیت حاصل کی۔اس طرح برّصغیر کے دومشہور معروف مستند گھرانوں کی گائیکی سے انہوں نے فیض حاصل کیاتھا۔آوازاور گائیکی کاشُہرہ ہواتو کلکتہ کے فلمسازانہیں لے اُڑے۔پھر بمبئی کے فلم سازوں نے بھی ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایامگریہ سلسلہ انہیں پسند نہیں آیااور وہ فلمی دنیا کو چھوڑچھاڑ کرواپس لکھنؤ

چلی گئیں۔ان کی یادگار غزلوں کے ریکارڈ اسی زمانے میں تیار کئے گئے تھے۔

اسی زمانے میں رسولن بائی کی گائیکی کا بھی بہت چرچا تھا۔ایک اور گلوکارہ سدھیش وری دیوی نے بھی اس میدان میں بڑا نام پیدا کیا تھا لیکن جاننے والوں کی رائے میں رسولن بائی کی آواز اگر پرانی برانڈی تھی اور سدھیش وری دیوی کی آواز میں ملکوتی حُسن تھا تو بیگم اختر کی آواز میں ایک ان جانی سی جذباتیت اور بہکا دینے والی کیفیّت تھی۔ وہ کسی کوشش یا محنت کے بغیر گاتی تھیں۔ سُن کر یوں لگتا تھا جیسے غزل گانا ان کیلئے سہل ترین کام ہے۔ وہ نہ تو زور لگاتی تھیں اور نہ ہی ان کی آواز سے کسی مشقّت کا اظہار ہوتا تھا۔ غزل ایک دریا کی طرح بہتی ہوئی ان کی زبان سے نکلتی تھی اور یہ بہاؤ سننے والوں کو بھی اپنے ساتھ ہی بہا کر لے جاتا تھا۔

بیگم اختر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے غزل کو استادوں کی مشکل پسندی کے چُنگل سے آزاد کرادیا تھا اور یہ محض کلاسیکی فن تک محدود نہیں رہی تھی۔انہیں گائیکی کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی مکمل عبور حاصل تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کا تلفّظ اور غزل کی ادائیگی دوسروں سے بالکل مختلف تھی۔ پھر وہ گاتے ہوئے بالکل سنجیدہ اور متین رہتی تھیں اس کے باوجود شاعری کے تمام رموز اور کیفیات سننے والوں تک پہنچادیتی تھیں جو روایتی پکے گانے والوں کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اپنے عہد کی دوسری گانے والیوں کے مقابلے میں زیادہ مقبول اور پسندیدہ تھیں۔اس دور میں سدھیش وری دیوی، رسولن بائی اور موتی بائی بھی غزل گاتی تھیں مگر بیگم اختر کا انداز ہی جدا تھا۔دوسری فنکارائیں ٹُھمری گاتی تھیں جبکہ بیگم اختر کسی ایک میدان میں محدود نہ تھیں۔نوشاد صاحب کے خیال میں بیگم اختر کا سٹائل ترنّم جیسا تھا جس میں سرگم، تانوں اور پلٹوں کی گنجائش نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ سامعین کے کانوں، ذہنوں اور دلوں تک رسائی حاصل کر لیتی تھیں۔ مہدی حسن وہ گلوکار اور فنکار ہیں جنہوں نے غزل کی گائیکی کو ایک نئی جہت اور نیا اسلوب بخشا ہے لیکن بیگم اختر یہ کارنامہ ان سے پہلے ہی ادا کر چکی تھیں۔ وہ ٹُھمری اور دادرے تک محدود نہ تھیں۔ بیگم اختر نے 30 اکتوبر 1974ء کو احمد آباد میں وفات پائی اور غزل کو بے آسرا چھوڑ گئیں۔ مہدی حسن نے البتہ اس فن کو آسرا دیا اور جہاں بیگم اختر نے چھوڑا تھا وہیں سے اس کو تھام لیا۔

ہمارے ملک میں تو فنکاروں کو سراہنے‘ ان کی خدمات کا اعتراف کرنے اور ان کے کاموں کو محفوظ رکھنے کا کوئی طریقہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ ہمارے ہاں یہ سوچ ہی نہیں ہے لیکن بھارت میں فن کاروں کو خراج تحسین پیش کرنے اور ان کی خدمات کو ہمیشہ کیلئے محفوظ رکھنے کی رسم اب عام ہو چکی ہے۔ پرانے فن کاروں کے کاموں کو یکجا کیا جارہا ہے۔ ان کے حالات زندگی کتابوں اور ویڈیو کیسٹوں میں اکٹّھے کئے جارہے ہیں تاکہ آنے والی نسلوں تک یہ ورثہ پہنچایا جاسکے۔

بھارت میں بیگم اختر کے مدّاحوں نے ان کو خراج تحسین وعقیدت پیش کرنے کی غرض سے ایک دستاویزی فلم بنائی ہے جس کی طوالت 27 منٹ ہے۔ اس کے ساتھ ہی انڈیا کے فلمز ڈویژن نے بھی بیگم اختر کی زندگی ہی میں بیس منٹ پر محیط ایک دستاویزی فلم بنائی تھی۔ ان دونوں فلموں کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو بیگم اختر کی زندگی اور فن کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ کسی زمانے میں اختر بائی فیض آبادی کے ایک پرستار کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے فیض آباد کے تمام در و دیوار پر ”ہائے اختری“ لکھ دیا تھا۔ اس شخص کا نام دیوانہ حشمت تھا۔

یہ دیوانہ تو اپنی دیوانگی کے عالم میں خدا جانے کہاں سے کہاں نکل گیا مگر ایس کالی داس نامی ایک عقیدت مند نے اپنی دستاویزی فلم کا نام ہی ”ہائے اختری۔۔۔ بیگم اختر کی یاد میں“ رکھا ہے۔ اس فلم کے آغاز میں بیگم اختر کی پُرسوز مدھ بھری آواز میں بہزاد لکھنوی کی اس غزل کے اشعار سننے میں آتے ہیں جسے انہوں نے گھر گھر پہنچادیا تھا۔

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنادے۔

کیمرا پہلے تو دیواروں پر لکھے ہوئے ”ہائے اختری“ کے نعرے دکھاتا ہے جبکہ پس منظر میں یہ غزل گونج رہی ہے۔ چند دیواریں دکھانے کے بعد سکرین پر ایک فقیر نظر آتا ہے جو بڑے عقیدت مندانہ انداز میں کہہ رہا ہے کہ اختری بائی جیسی طوائف کبھی پیدا نہیں ہوئی۔

ایس کالی داس اس فلم کے مصنّف‘ فلم ساز اور ہدایت کار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی دستاویزی فلم میں اختری بائی کی گائیکی پر اتنی توجّہ نہیں دی ہے جتنی کہ ان کی رنگارنگ شخصیت کو اہمیت دی ہے۔

انہوں نے کہا ”میری فلم بیگم اختر کا ایک نفسیاتی روپ ہے۔ انہوں نے ایک عزّت دار خاتون بننے کے لیے جو جدوجہد

کی اس میں ان کی اس خواہش کا اظہار نظر آتا ہے۔ان کی خواہش تھی کہ شریف اور معزّز بیگمات جیسی عزت حاصل کریں لیکن طوائف والی آزادی کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔میں نے یہ فلم کسی سنگیت یا ڈراما اکیڈمی کے لیے نہیں بنائی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس میں اختری بائی کی گائیکی اور موسیقی پر زیادہ دھیان نہیں دیا گیا۔یہ فلم دراصل میں نے ایک کمرشل ٹی وی ادارے کے لیے بنائی ہے۔اس لیے ان کی شخصیت کے روپ اُجاگر کیے ہیں۔''

اس دستاویزی فلم میں بیگم اختر کے رشتے دار ،قریبی واقف کار اور شناسا ان کے بارے میں اپنے خیالات اور تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کی پیدائش' ابتدائی تعلیم و تربیت کا بھی اس میں نقشہ پیش کیا گیا۔وہ کس طرح کلکتہ اور پھر بمبئی گئیں مگر مایوس ہو کر دوبارہ لکھنؤ لوٹ آئیں۔اس کی وجوہات اور اسباب انہوں نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیے ہیں۔

ایس کالی داس نے اس فلم کے بارے میں یہ وضاحت کی ہے کہ یہ اختری بائی کی سوانح حیات نہیں ہے بلکہ یہ ایک نفسیاتی تجزیہ ہے جس میں یہ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بیگم اختر کس قسم کی ذہنی کیفیات کی حامل تھیں۔وہ نفسیاتی طور پر ایک باعزت حیثیت حاصل کرنے کی خواہاں تھیں جبکہ وہ اس آزادی سے بھی دستبردار نہیں ہونا چاہتی تھیں جو ایک آزاد خیال شوبز گرل کو حاصل ہوتی ہے۔

اس دستاویزی فلم میں سب سے زیادہ دلچسپ حصّہ وہ ہے جس میں بیگم اختر کی نہایت قریبی اور رازدار سہیلی بیگم سعیدہ رضا نے اپنے واقعات بیان کیے ہیں۔درحقیقت بیگم سعیدہ رضا ہی کی کوششوں کی بدولت بیرسٹر اشتیاق احمد سے اختری بائی کی شادی ہوئی تھی جس کے بعد بیگم سعیدہ رضا کے بقول وہ اختری بائی سے بیگم اختر بننے کے بعد ایک مطمئن اور پُر سکون زندگی بسر کرنے لگی تھیں۔ان کی پرانی دلی خواہش پوری ہو گئی تھی اور انہوں نے معاشرے میں ایک معزز حیثیت حاصل کر لی تھی۔اس کے ساتھ ہی بطورِ فن کارہ بھی انہوں نے اپنا مقام نہیں کھویا تھا۔وہ شادی کے بعد بھی نغمہ سرا رہیں اور فن کی داد سمیٹتی رہیں۔غالباً یہی بیگم اختر کی زندگی کی معراج اور آرزوؤں کی تکمیل تھی۔

بیگم سعیدہ نے یہ بات بھی بتائی کہ اختری بچپن ہی سے جھوٹ بولنے میں استاد تھیں اور اس صفائی سے جھوٹ بولتی تھیں کہ ہر ایک کو یقین آجاتا تھا۔ان کی بہن شمیم بیگم اور شاگرد شانتی ہیرانند نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ وہ افیون کی

عادی تھیں۔ان کے طبلہ نواز منّے خاں اور سنگت کرنے والی شیلا دھر نے بھی دلچسپ واقعات سنائے اور بتایا کہ ایک بار جب انہوں نے نواب رام پور سے علیحدگی کا فیصلہ کیا تھا تو اس سے پہلے بڑی ہوشیاری سے ایک سترہ لڑیوں کا ڈائمنڈ کا ہار کس طرح بطور تحفہ ان سے حاصل کیا تھا۔ان کی ہم عصر اور معروف مغنیّہ ملکہ پکھراج نے بھی بیگم اختر کی گائیکی اور شخصیّت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ فقرہ ہے۔۔۔"وہ کمینی نہیں تھی۔"

بیگم اختر کے سوانح نگار سلیم قدوائی کا بیان ہے کہ وہ ہمیشہ خود کو تنہا محسوس کرتی تھیں اور سچے پیار کے لیے ترستی تھیں۔لیکن تھی دبنگ۔کہا جا سکتا ہے کہ وہ جس ماحول اور پیشے سے وابستہ تھیں اس میں سچّا پیار کس طرح پا سکتی تھیں اور پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ سچّا پیار حاصل کرنے کے لیے سچّا پیار کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

فلم ساز کالی داس کا کہنا ہے کہ بیگم اختر کی گائیکی اور نغمگی کے بارے میں انہوں نے بہت زیادہ مواد حاصل کر لیا تھا مگر ایک مختصر سی دستاویزی فلم میں اس کو سمیٹنا ممکن نہ تھا۔کالی داس نے بیگم اختر کی گائیکی کی ایک خصوصیت یہ بتائی کہ غزل کا مطلع دراصل آنے والے اشعار کا تعارف ہوتا ہے مگر بیگم اختر کا انداز یہ تھا کہ وہ مطلع (یا مکھڑے) کو نامکمل رہنے دیتی تھیں اور اگلے شعر میں اس کو مکمل کرتی تھیں۔یہ ان کا مخصوص اور منفرد اندازِ ادائیگی تھا۔

کالی داس نے بیگم اختر کے بارے میں جتنی بھی ویڈیو ٹیپ ریکارڈ کی تھی اس کا بہت زیادہ غیر استعمال شدہ حصّہ انہوں نے لکھنؤ کی سنگیت ناٹک اکیڈمی کے حوالے کر دیا ہے تاکہ آئندہ کام آسکے۔

بیگم اختر نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں موسیقی کی محفلوں میں شرکت ترک کر دی تھی۔اپنی جانشین کے طور پر انہوں نے اپنی ایک شاگرد مدھورانی کو متعارف کرایا تھا۔مدھورانی کا کہنا ہے کہ یوں تو بیگم اختر کی خدمات بہت زیادہ ہیں مگر ان کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ انہوں نے محفلوں میں غزل کو بھی کلاسیکل موسیقی کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کیا۔اس سے پہلے باذوق لوگوں کی محفلوں میں کلاسیکی موسیقار اور سازندے ہی داد حاصل کرتے تھے مگر بیگم اختر نے غزلوں کے ذریعے اہلِ فن اور قدردانوں کی داد سمیٹی اور غزل سرائی کو ایک معزز حیثیت دلائی۔

یہ عجیب بات ہے کہ گلوکاروں کو روشناس کرانے میں ریڈیو ہمیشہ ایک موثر ذریعہ رہا ہے۔خیر پچھلے زمانے کے بارے میں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت ریڈیو ہی واحد موثر ذریعہ ابلاغ تھا مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ جدید عہد میں بھی ریڈیو

نے اپنی یہ روایت برقرار رکھی ہے۔اوروں کو تو چھوڑیے پاکستان کی ایک انتہائی مقبول اور خوبرو گلوکارہ ناہید اختر کی مثال دیکھ لیجئے۔ بیگم اختر اور ناہید اختر میں کئی باتیں مشترک ہیں۔سب سے پہلے تو نام ہی دیکھ لیجئے۔وہ پہلے اختری تھیں بعد میں شوہر کے حوالے سے بیگم اختر بن گئیں۔ ناہید کو اختر کا نام اپنے والد کے حوالے سے ملا۔فرق یہ تھا کہ اختری نے فیض آباد میں جنم لیا اور ناہید نے ملتان میں۔صورت شکل، چھب اور آن بان کے اعتبار سے دونوں ہی امتیازی شخصیت کی مالک تھیں۔شادی دونوں نے کرلی تھی مگر بیگم اختر شادی کے بعد بھی کافی عرصے تک غزل سرا رہیں جب کہ ناہید اختر اچانک بلکہ پُراسرار انداز میں گُم ہو گئیں۔عرصہ دراز کے انتظار کے بعد ملیں بھی تو دوبارہ گُم ہو جانے کے لئے۔

خوش گلو، خوش شکل، خوش اخلاق اور خوش گفتار....ان کے نام کے ساتھ چاہے جتنی بار ''خوش'' لگا لیجئے اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا مگر کیا وہ خوش نصیب بھی رہیں؟اس بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔رائے تو اس وقت قائم کی جائے کہ جب کسی کے بارے میں علم ہو۔ناہید اختر تو آسمان سے ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح اچانک غائب ہو گئیں۔کئی سال کے بعد ان کی سُن گن ملی مگر شکل کسی نے نہیں دیکھی۔ حالانکہ ان کے پرستار سالہا سال تک ان کے انتظار ہی میں رہے۔ سُنا ہے کہ ناموں کا بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے۔بیگم اختر ستارہ بن کر چمکیں اور موسیقی کے اُفق کو جگمگا گئیں۔ناہید اختر بھی ناگہاں ایک ستارے کی طرح نمودار ہوئیں اسطرح کہ گلوکاراؤں کی کہکشاں میں سب سے زیادہ آب وتاب حاصل کرلی۔پھر اچانک ستارے کی طرح ہی کہیں گُم ہو گئیں۔

ناہید جس شہر میں پیدا ہوئیں اس سرزمین میں ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم، خان صاحب سلامت علی، نزاکت علی، اقبال بانو اور ثریا ملتانیکر جیسے عظیم فنکاروں نے بھی جنم لیا ہے۔

عام تاثر کے برعکس ناہید اختر کا تعلق کسی گانے والے گھرانے یا ماحول سے نہیں تھا۔ان کے والد متوّسط خاندان سے تعلق رکھتے تھے جن کا پیشہ خیّاطی (درزی) تھا۔ان کی شریف النفسی کے ہم خود بھی شاہد ہیں۔بے حد وضع دار منکسر المزاج بااخلاق اور رکھ رکھاؤ والے....ان کے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی بیٹی ایک روز موسیقی اور فلم کی دنیا میں دھوم مچادے گی۔

ناہید نے ہوش سنبھالا تو دستور کے مطابق انہیں بھی سکول میں داخل کر دیا گیا۔انہیں بچپن ہی سے گانے کا شوق تھا۔ گھریلو تقاریب اور محفلوں میں بچپن ہی سے وہ گایا کرتی تھیں۔ نعت خوانی اور اپنے زمانے کے مقبول فلمی گانے بہت شوق سے گاتی تھیں۔ سہیلیاں ان کی آواز سن کر چھیڑا کرتی تھیں کہ تمہیں تو اداکارہ اور گلوکارہ بننا چاہیے۔ان کے والد نے بھی ان کی حوصلہ شکنی نہیں کی بلکہ بیٹی کے شوق کو جِلا دینے کی کوشش کی۔ابھی وہ سکول کی طالبہ ہی تھیں کہ انہیں ملتان ریڈیو سے ہلکی پھلکی موسیقی کے پروگرام میں حصّہ لینے کا موقع مل گیا۔ناہید نے محض فلمی گانوں تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا تھا بلکہ اپنے والد کے تعاون سے باقاعدہ موسیقی کی تربیت بھی حاصل کی تھی۔ریڈیو سے نشر کیا جانے والا ان کا پہلا گانا راگ ملہار میں تھا جسے پسند کیا گیا۔اس کے بعد تو انہیں ملتان ریڈیو کی گلوکاراؤں میں ایک مستقل حیثیت حاصل ہوگئی۔ان کی آواز میں چمک دمک تھی،اس کے ساتھ ہی ایک خاص قسم کی کشش اور انگیخت بھی تھی جسے بیان نہیں کیا جا سکتا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔جس نے بھی یہ آواز سنی یہی پیش گوئی کی کہ یہ لڑکی بہت نام پیدا کرے گی۔جب بیٹی کے شوق اور مقبولیت کو دیکھا تو ان کے والد محمد اختر نے ان کے لئے باقاعدہ ایک استاد کا بندوبست کر دیا۔استاد عبدالباری خان چار سال تک انہیں موسیقی کے رموز اور اسرار سکھاتے رہے جس کے بعد وہ انتقال کر گئے مگر اسی عرصے میں انہوں نے ناہید کو ایک مقبول گلوکارہ کے طور پر ابھرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ناہید اختر نے ان کی وفات کے بعد استاد سلامت علی خان سے بھی تعلیم اور تربیت حاصل کی تھی۔کلاسیکی موسیقی میں ایسے استادوں کی تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ ناہید ہر قسم کے گانے بڑی آسانی اور خوبی سے گا سکتی تھیں۔ان کی شہرت ملتان ریڈیو تک ہی محدود نہ رہی بلکہ لاہور پھر اسلام آباد تک پہنچ گئی جہاں سے انہوں نے موسیقی کے کئی پروگراموں میں حصّہ لیا اور داد سمیٹی۔

ناہید کو ٹی وی سکرین پر متعارف کرانے کا سہرا گلوکار طفیل نیازی مرحوم کے سر ہے۔اس زمانے میں وہ راولپنڈی اسلام آباد ٹیلی ویژن سے ''لوک تماشا'' کے نام سے ایک پروگرام پیش کرتے تھے۔ناہید کی بھولی بھالی شکل،سادگی اور آواز کی خوبصورتی دیکھ کر ٹی وی کے دوسرے مراکز سے بھی ان کے پروگرام پیش کئے جانے لگے۔اس طرح وہ ریڈیو کی دنیا سے نکل کر ٹیلی ویژن تک پہنچ گئیں۔

فلم والے نئی آوازوں اور نئے چہروں کو اپنانے کے معاملے میں کافی کنجوس واقع ہوئے ہیں۔ دراصل یہ لوگ اپنی ہی دنیا میں محدود رہتے ہیں اس لئے نئے تجربات کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ ہماری فلمی دنیا میں نئے لوگوں کی تلاش کے لئے نہ تو ایجنٹ ہوتے ہیں اور نہ ہی ایسے ادارے ہیں جو باصلاحیت لوگوں کو متعارف کرائیں مگر جو خوش نصیب ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح فلمی دنیا کے بند دروازوں کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ناہید اختر کا شمار بھی ایسے ہی خوش نصیبوں میں ہوتا ہے۔

موسیقار ایم اشرف ہر زمانے میں ایک مصروف اور پسندیدہ فلمی موسیقار رہے ہیں۔ انہوں نے ناہید کی آواز سنی تو اپنی زیر تکمیل فلم ''ننّھا فرشتہ'' کے لئے ان کی آواز میں ان کا پہلا فلمی گانا ریکارڈ کیا۔ اس فلم کے پروڈیوسر نورالدین اور ہدایت کار کے خورشید تھے۔ یہ فلم 1974ء میں نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی مگر اس کی نمائش سے پہلے ہی ناہید کی دلکش آواز کی بازگشت فلمی نگار خانوں تک پہنچ گئی تھی۔ ناہید نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے فلمی سفر تین سال کے اندر ہی طے کر لیا۔

ناہید اختر نے اس دور میں مقبولیت حاصل کی جب رونا لیلیٰ، نیّرہ نور، مہناز، میڈم نور جہاں، مالا اور اقبال بیگم جیسی ہستیاں فلموں کے لئے گانے گایا کرتی تھیں۔ بہت جلد ناہید نے اپنا مقام بنالیا۔ انہوں نے خواجہ خورشید انور، رشید عطرے، ناشاد اور نثار بزمی جیسے موسیقاروں کے لئے نغمے ریکارڈ کرائے۔ ان کے کچھ گانے سُپر ہٹ گانوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ وہ ٹیلی ویژن کے لئے بھی گاتی رہیں اور ان کے یہ گانے بھی مقبول عام ہوئے۔ اس کے بعد تو فلم ٹیلی ویژن سٹیج ہر جگہ ان کی پذیرائی ہونے لگی۔ ناہید کو اللہ نے حُسن و جمال کی دولت سے بھی نوازا تھا اور گاتے ہوئے وہ موزوں تاثرات بھی دیتی تھیں اس لئے فلم سازوں نے انہیں ہیروئن بننے کی پیشکش بھی کر دی مگر انہوں نے اداکاری میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔

ناہید نے گلوکارہ کے طور پر کئی ایوارڈز حاصل کئے اور ان کے متعدد گانوں نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔ انہوں نے ملی نغمے اور قومی ترانے بھی گائے۔ جدید مغربی انداز کے نغمے بھی ریکارڈ کرائے۔ مگر ان کا ذاتی رجحان کلاسیکل اور نیم کلاسیکل کی طرف رہا۔ ناہید کو شعر و شاعری کا شوق بھی ہے اور شاعروں کے دیوان اور مجموعے ہمیشہ ان کے زیر

مطالعہ رہے۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ قبل انہیں دہلی میں منعقد ہونے والی عالمی اردو کانفرنس میں شاعرہ کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔اس کانفرنس میں اردو کے نامور اور ممتاز شعرا نے حصّہ لیا تھا۔موسیقار نوشاد اور اداکار دلیپ کمار بھی اس کے شرکا میں شامل تھے۔ ایسی ایسی کانفرنس میں بطور شاعر پاکستان کی نمائندگی کرنے کا امتیازی اعزاز ناہید اختر کے حصّے میں آیا۔عالمی کانفرنس کے شرکا خصوصاً موسیقار نوشاد اور دلیپ کمار نے ان کی بہت تعریف اور حوصلہ افزائی کی۔ناہید اختر کی آواز میں جو چمک، کھنک، نغمگی اور مخصوص کیفیت ہے وہ انہیں دوسری گلوکاراؤں سے نمایاں کرتی ہے۔ان کی آواز بے شمار گانے والیوں میں سب سے الگ پہچانی جاتی ہے۔

ناہید اختر کے کیریئر کا خاتمہ بالکل اچانک، غیر متوقع بلکہ پُراسرار انداز میں ہوا۔انہوں نے اچانک گانوں کی ریکارڈنگ میں حصّہ لینا بند کر دیا۔اس کی وجہ ان کی طبیعت کی ناسازی بیان کی گئی مگر جب یہ بہانہ پرانا ہو گیا تو یار لوگوں کو تشویش پیدا ہو گئی۔اس زمانے میں وہ گلوکارہ کی حیثیت سے پورے عروج پر تھیں۔تقاریب اور نجی محفلوں میں بھی ان کی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ ایسے میں اچانک غیر حاضر ہو جانا ہر ایک کیلئے اچنبھے کی بات تھی۔پہلے قیاس آرائیاں شروع ہوئیں۔اس کے بعد افواہوں نے جنم لیا۔کسی نے کہا کہ وہ شادی کر کے گھر بیٹھ گئی ہیں۔کسی نے کہا کہ شادی کے مسئلے پر ان کے اپنے گھر والوں سے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اور وہ ضد کر کے بیٹھ گئی ہیں کہ جب تک ان کی بات نہ مانی جائے گی وہ گانے نہیں گائیں گی۔عروج کے عہد میں یہ بے اعتنائی ایک عجیب اور انہونی سی بات لگی۔ان کے والد نے بھی اس معاملے میں پُراسرار خاموشی اختیار کر لی تھی۔لوگ ان کے منتظر ہی رہے اور ان کی آمد کے انتظار میں گھڑیاں گنتے رہے۔ان کے حوالے سے مختلف خبریں شائع ہوتی رہیں جن میں بتایا گیا تھا کہ وہ عنقریب گلوکاری کا آغاز کر دیں گی مگر ایسا نہ ہوا۔پھر معلوم ہوا کہ انہوں نے ملتان کے ایک جاگیر دار اور بڑے سیاستدان سے شادی کر لی ہے۔

وقت گزرتا گیا مگر ناہید اختر کی واپسی کی امید ان کے پرستاروں اور فلمی حلقوں میں ختم نہ ہوئی۔پانچ سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر گیا تو یہ خبر آئی کہ ناہید اختر اس تعلق کو ختم کر کے دوبارہ گلوکاری کے میدان میں آ رہی ہیں۔اس خبر سے ان کے منتظروں کو بہت خوشی ہوئی۔سوکھے دھانوں پانی پڑا اور امید کی فصل پھر لہلہانے لگی مگر ناہید اختر منظر عام پر نہ

آئیں۔

پھر خبر آئی کہ انہوں نے ایک صحافی آصف علی پوتا سے شادی کرلی ہے۔ یہ صاحب پہلے ہی سے شادی شدہ ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ دراصل ناہید اختر اس صحافی کی محبت میں گرفتار تھیں اور اس سے شادی کی خواہاں تھیں مگر حالات کے جبر نے انہیں جاگیردار سے شادی کرنے پر مجبور کر دیا۔ ناہید اختر کی اس شادی میں شوبزنس کے کسی فرد نے شرکت نہیں کی۔ سنا کہ قریب ترین لوگوں کے سوا اس نجی تقریب میں کوئی اور شریک نہ تھا۔ یعنی پھر وہی پُراسرار کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کے بعد یہ خبر آئی کہ ناہید اختر اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون منانے کے لئے بیرون ملک جا رہی ہیں۔ ناہید سے ملنے یا انہیں دیکھنے کا موقع تو کسی کو نہیں ملا مگر ان کے شوہر نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ اگر ناہید اختر دوبارہ گلوکاری کرنا چاہتی ہیں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ وہ بڑی خوشی سے گا سکتی ہیں۔ اس انٹرویو کے بعد یہ امید دوبارہ تازہ ہو گئی کہ ناہید اختر ایک بار پھر اپنی آواز کا جادو جگائیں گی۔ مگر۔

اے بسا آرزو خاک شدہ

وہ دن اور آج کا دن۔ ناہید اختر آج بھی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں اور خالص گھریلو زندگی بسر کر رہی ہیں۔

ناہید اختر کو ہم نے بھی دیکھا اور گاتے ہوئے بھی سنا۔ جب وہ اپنا پہلا گانا ریکارڈ کرانے کے لئے ایورنیو اسٹوڈیو میں داخل ہوئیں تو ہم بھی نئی آواز کی جستجو میں وہاں پہنچ گئے۔ ہماری طرح اور بھی کئی فلم ساز اور موسیقی کے شائق وہاں موجود تھے۔ ایک دُبلی پتلی، دھان پان سی نازک نوعمر لڑکی ہماری آنکھوں کے سامنے تھی۔ کتابی چہرہ، گورا رنگ، سیاہ بال، ناک نقشہ بہت مناسب، متوّسط قد، بڑی بڑی متاثّر کرنے والی آنکھیں جو خاموشی میں بھی کلام کرنے پر قادر تھیں۔ اس شرمیلی لجاتی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر کسی کو بھی یہ گمان نہ تھا کہ موسیقی کی دنیا میں یہ کوئی دھماکہ کرے گی۔ مگر جیسے ہی ناہید نے نغمہ چھیڑا سب کے کان کھڑے ہوگئے۔ بول تھے۔۔۔

دل، دیوانہ دل

طرز مناسب تھی، سازوں کی ترتیب بھی اچّھی تھی مگر سب سے نمایاں چیز ناہید کی کھنکھتی ہوئی، لگی لگی آواز تھی۔ جیسے ہنڈیا لگ جاتی ہے۔ یا نزلے زکام، کھانسی کی وجہ سے بعض اوقات آواز لگ جاتی ہے۔ ناہید کی آواز میں بھی یہی

کیفیت تھی جو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ موسیقار ایم اشرف حسب معمول مسکراتے ہوئے کبھی میوزک ہال میں تو کبھی ریکارڈنگ کے کمرے میں آمدورفت میں مصروف تھے۔ان کی مسکراہٹ اور خوش مزاجی نے کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔لگ بھگ تیس سال سے تو ہم بھی انہیں دیکھ رہے ہیں۔ مگر اس شخص کو کبھی ناراض یا غصّے میں نہیں دیکھا۔ جب دیکھا مسکراتے ہی دیکھا۔ان میں اور دوسرے موسیقاروں میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ایم اشرف کے شوق اور لگن میں کبھی کمی نہیں آئی۔ فلم سازوں کے ساتھ تعاون اور شوق و لگن ان کی عادت ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ بطور موسیقار سلور جوبلی منا چکے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ مگر آج بھی مقبول اور کامیاب موسیقار ہیں۔

فلم ساز انکل نورالدین نے ہم سے پوچھا"آفاقی صاحب۔ کیا خیال ہے ؟"

ہم نے تعریف میں سر ہلا دیا۔

ایک صاحب نے تبصرہ کیا"آواز تو اچّھی ہے مگر لڑکی کی صحت کمزور ہے۔ دم نہیں ہے۔ اونچے سُروں تک نہیں جا سکے گی۔"

مگر اس کمزور لڑکی نے انتہائی اونچے سُروں تک بھی نغمے گائے اور ان سے پورا انصاف کیا۔

ناہید اختر سے ہماری بھی ملاقات رہی مگر کام کی حد تک۔ انہوں نے ہمارے ساتھ برائے نام ہی کام کیا۔ لیکن اسٹوڈیوز میں آمنا سامنا ہوتا رہتا تھا۔ان کے مزاج میں سنجیدگی، متانت اور وقار بہت زیادہ تھا۔ فلمی معمول کے مطابق ہم نے انہیں بے تکلّفی اور بے باکی سے لوگوں سے باتیں کرتے اور ہنستے بولتے نہیں دیکھا۔ گفتگو کے معاملے میں وہ خاصی کنجوس واقع ہوئی تھیں۔ فلمی ماحول میں ہمیشہ لئے دیے رہتی تھیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خود کو ارزاں نہیں کیا اور نہ ہی دوسروں کو بے تکلّف ہونے کا موقع دیا۔ اس رکھ رکھاؤ میں بہت زیادہ دخل ان کے والد محمد اختر صاحب کا بھی تھا۔ وہ نہایت بااخلاق، بااصول اور معتدل مزاج انسان تھے۔انہوں نے حفظ مراتب کا ہمیشہ خیال رکھا۔ دوسروں کی عزّت بھی کی اور اپنی عزّت بھی کرائی۔

فلموں میں تو ہمارا ناہید سے رابطہ واسطہ نہیں پڑا مگر جن دنوں ہم ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی سے وابستہ تھے اس زمانے میں اچانک ناہید اختر کی ضرورت پیش آگئی۔ ہوا یہ ہے کہ ہمارے ایک بہت بڑے کلائنٹ اپنے نئے صابن کو متعارف کرانے کے سلسلے میں ایک تقریب منعقد کرنا چاہتے تھے جس میں گانے کا پروگرام بھی شامل تھا۔ ہمیں فلمی دنیا سے براہ راست تعلق توڑے ہوئے ایک زمانہ گزر چکا تھا اور اس کوچے میں گزر تک نہ تھا مگر قرعۂ فال ہمارے نام پڑا کہ اس تقریب میں کمپیئرنگ کے لئے معین اختر کو مدعو کیا جائے اور موسیقی کے لئے ناہید اختر کی خدمات حاصل کی جائیں۔ یہ دونوں اس وقت تقاریب اور اسٹیج شوز کی وجہ سے بے حد مصروف فن کار تھے۔ عرصۂ دراز سے معین اختر سے واسطہ تک نہ پڑا تھا۔ ہم نے کراچی فون کر کے بات کی تو وہ انتہائی مصروفیات کے باوجود رضامند ہو گئے معاوضے میں بھی لحاظ نہ کیا مگر یہ شرط رکھی کہ اگر ایک تقریب کے بارے میں دو دن کے اندر تصدیق نہ ہوئی تو وہ آ سکیں گے۔ ورنہ معذرت۔ دو دن بعد پتہ چلا کہ ان کی وہ تقریب کنفرم ہو گئی ہے۔ کوئی اور نام ذہن میں نہیں آ رہا تھا پھر ٹی وی اسٹار شکیل کا خیال آ گیا۔ ان سے رابطہ کیا تو وہ مقرّرہ تاریخ پر ایک دن کے لئے لاہور آنے پر آمادہ ہو گئے۔

اب ناہید اختر کا مرحلہ پیش آیا۔ انہیں تلاش کر کے ان کے والد سے فون پر بات کی تو وہ بے حد اخلاق سے پیش آئے۔ پوچھا ”آفاقی صاحب کیسے یاد کیا۔ کوئی خدمت؟“

ہم نے کہا ”خدمت بھی ضرور بتائیں گے مگر یہ بات آمنے سامنے ہونی چاہئے۔“ اسی شام وہ ہمارے دفتر آ گئے۔ بہت دیر تک پرانے دنوں کی باتیں یاد کر کے اداس ہوتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اب تو فلم کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ عجیب عجیب لوگ، عجیب و غریب باتیں اور نرالے طور طریقے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے بھی اپنی فلمی مصروفیات کو محدود کر کے ٹیلی ویژن اور تقاریب کو زیادہ وقت دینا شروع کر دیا ہے۔

ہم حرف مدعا زبان پر لائے۔

”آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں۔ یہ بتایئے کہ تقریب کی تاریخ کیا ہے؟“ ہم نے تاریخ بتائی تو انہوں نے فوراً جیب سے ڈائری نکال کر دیکھی پھر بولے۔ ”اسی روز فیصل آباد میں ایک تقریب ہے۔ میں نے کنفرم تو نہیں کیا ہے مگر بات قریب قریب طے ہو چکی ہیں۔ لیکن آپ نے اتنے عرصے بعد یاد کیا ہے تو مجھے ایک دن کی مہلت دیجئے میں کل شام

تک کنفرم کر سکوں گا۔‘‘

دوسرے دن انہوں نے آکر تاریخ کنفرم کر دی۔

اب معاوضے کا مرحلہ تھا۔ کہنے لگے ’’آپ تو جانتے ہیں کہ آج کل تقاریب اور اسٹیج شو میں کتنا معاوضہ ملتا ہے۔ ‘‘

ہم نے کہا’’ہم واقعی نہیں جانتے۔ البتہ معین اختر سے بات کرنے کے بعد کچھ اندازہ ضرور ہوا ہے۔ مگر آپ فرمائیں۔‘‘

وہ کافی دیر پس و پیش کرتے رہے۔ پھر بتایا کہ جو تقریب میں نے کینسل کی ہے اس کے لئے اتنا معاوضہ طے پایا تھا۔

ہم نے کہا’’اختر صاحب۔ یہ تو ہمارے بجٹ سے بہت زیادہ ہے۔ ‘‘

وہ مسکرانے لگے ’’تو پھر آپ جو مناسب سمجھیں مجھے منظور ہو گا۔‘‘

سچ پوچھئے تو اختر صاحب کے ساتھ یہ ہمارا پہلا واسطہ تھا مگر ان کی اعلیٰ ظرفی اور وضع داری نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ ہم نے ایک رقم بتائی اور انہوں نے فوراً سر ہلا دیا مگر اتنا ضرور کہا کہ دیکھئے یہ پروگرام ملتوی یا کینسل نہ ہو ورنہ میرا بہت نقصان ہو جائے گا۔ تقریب کی شام کھانے کے بعد انٹر کانٹی نینٹل کے وسیع ہال میں محفل سجی۔

شکیل صاحب اسٹیج پر موجود تھے۔ ناہید اختر کے سازندے بھی حاضر تھے۔ مگر ناہید دیر سے آئی تھیں۔ اس لئے اوپر ایک کمرے میں کھانا کھا رہی تھیں۔ لوگوں کو بوریت سے محفوظ رکھنے کے لئے اِدھر اُدھر کے پروگرام شروع کر دیے گئے۔ کئی مقامی فن کاروں کو مدعو کیا گیا تھا مگر اہل محفل کو ناہید اختر کا انتظار تھا۔ ناہید ہال میں داخل ہوئیں تو ایک دم سنّاٹا چھا گیا اور اس کے بعد تالیوں کا ایسا شور مچا کہ خدا کی پناہ۔ دو تین نو وارد شوقیہ گلوکاروں کے بعد ناہید اسٹیج پر آئیں تو ہم نے پہلی بار انہیں کسی اسٹیج شو میں فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اسٹیج پر وہ شرماتی لجاتی ہوئی لڑکی نہیں تھی بلکہ ہماری نگاہوں کے سامنے ایک پُر اعتماد فن کارہ اپنی آواز کا جادو جگا رہی تھی۔ انہیں حاضرین محفل کے ذوق کا بھی اندازہ تھا اس لئے ہر ایک کی پسند کے مطابق نغمے سنا رہی تھیں۔ انہیں محفل کو سجانے اور مسحور کرنے کا گُر آ گیا تھا۔

جیسے جیسے رات بھیگتی رہی، ناہید کی آواز میں نکھار آتا رہا یہاں تک کہ رات کے دو بج گئے۔ نہ تو سامعین اٹھنے کے لئے تیار تھے اور نہ ہی ناہید اختر کو باذوق سامعین کی محفل سے رخصت ہونے کی جلدی تھی۔

یہ ناہید اختر سے ہماری آخری ملاقات تھی۔ رفتہ رفتہ ان کی شخصیت میں ایک انوکھی کشش اور دلکشی پیدا ہو گئی تھیں۔

گائیکی پر بھی انہوں نے کافی حد تک عبور حاصل کر لیا تھا۔ انہوں نے پشتو اور پنجابی زبان میں بھی گیت گائے اور داد حاصل کی۔ نیم کلاسیکل ہو، مغربی ہو، لوگ دھن ہو یا امیر خسرو کی کافی۔ انہوں نے سبھی کے ساتھ پورا انصاف کیا۔
(چھاپ تلک سب چھین لی رے توسے نیناں ملائی کے)
یہ ایسا نغمہ ہے جسے اور بھی کئی گلوکاراؤں نے گایا ہے مگر ناہید اختر نے اس پر اجارہ داری حاصل کی۔ یہ گانا اتنا مقبول ہوا کہ ٹیلی ویژن والے جب کسی پروگرام میں جان پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ناہید اختر کا یہ نغمہ سنا دیتے ہیں۔ انہوں نے ہر قسم کے گیت اور نغمے گائے ہیں اور کئی ایوارڈز بھی حاصل کئے ہیں۔ مثلاً ان گانوں کو ذرا یاد کیجئے۔

(اللہ ہی اللہ کیا کرو دُکھ نہ کسی کو دیا کرو

جو دنیا کا مالک ہے نام اسی کا لیا کرو

پرویز ملک کی فلم ''پہچان'' کے اس گانے کا تاثّر اور پاکیزگی اپنی مثال آپ ہے۔
فلم شمع میں ان کا یہ نغمہ بھی یادگار ہے اور اس کی گائیکی پر انہیں بہترین گلوکارہ کے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔
کسی مہرباں نے آ کے مری زندگی بنا دی

اس کے علاوہ

ساون کے گیت جھوم کے آئے

ون وے ٹکٹ

دیکھا نہ تھا کبھی ہم نے یہ سماں

لال میری پت رکھیو

کبھی کبھی جانے کیا ہو جاتا ہے

جان من جان من بولو نہ

آتی ہے پون، جاتی ہے پون

زندہ رہے تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا

پیار کا ناتا ٹوٹے نہ کبھی۔

یا پھر یہ ملی نغمہ۔۔۔

ہمارا پرچم

یہ پیارا پرچم

یہ پرچموں میں عظیم پرچم

عطائے ربِ کریم پرچم

اور بھی کتنے ہی نغمے ایسے ہیں جنہیں ناہید اختر کی آواز نے امر بنا دیا ہے۔

اب جب کہ ناہید اختر ایک داستانِ پارینہ بن چکی ہیں۔ ان کی آواز آج بھی زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ وہ ان معدودے چند فنکاروں میں سے ایک ہیں جو عین عروج کے زمانے میں بھرا میلہ چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔

پاکستان کی فلمی دنیا میں کئی گلوکارائیں ایسی بھی ہیں جو مقبولیت حاصل کرنے کے بعد اچانک فلمی صنعت کو خیر باد کہہ کر رخصت ہو گئیں۔ مثلاً آئرن پروین۔ ساٹھ کی دہائی میں یہ ایک اُبھرتی ہوئی کر سچن گلوکارہ تھیں۔ ہماری فلم سزا میں بھی انہوں نے ایک مزاحیہ گیت گایا تھا مگر پھر غائب ہو گئیں۔ شاید اس وجہ سے کہ انہیں زیادہ مقبولیت اور پذیرائی نہ مل سکی۔

رونا لیلیٰ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد پاکستان سے چلی گئی تھیں لیکن نہ تو بنگلہ دیش کی فلمی صنعت میں اور نہ ہی بھارتی فلم انڈسٹری میں وہ کوئی نمایاں نام پیدا کر سکیں۔ بمبئی جا کر انہوں نے قسمت آزمائی کی تھی اور کچھ موسیقاروں کو ان کی آواز پسند بھی آئی تھی مگر لتا منگیشکر سے دشمنی مول لے کر کوئی فلم ساز یا موسیقار انہیں گلوکاری کا موقع دینے پر آمادہ نہ ہو سکا۔ وہ بیرونی ملکوں کے پروگراموں میں حصّہ لیتی ہیں۔ بنگلہ دیش کی فلمی صنعت نے ان کی خدمات کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ آج بھی وہی نغمے گا کر داد و تحسین اور روزی حاصل کر رہی ہیں جو انہوں نے پاکستان میں گائے تھے۔ پاکستانی موسیقاروں کے ترتیب دیئے ہوئے نغمات ہی نے انہیں بطورِ گلوکارہ زندہ رکھا ہے۔ ناشاد، نثار بزمی، ماسٹر عبداللہ، روبن گھوش وغیرہ نے ان کی آواز کا جس خوبصورتی سے استعمال کیا تھا، اس طرح پاکستان

چھوڑنے کے بعد کسی اور موسیقار نے انہیں نہیں نکھارا۔ وہ دو بار پاکستان بھی آچکی ہیں اور ٹیلی وژن پروگراموں میں حصّہ لیتی رہی ہیں مگر ان کے موسیقی کے سرمائے میں کوئی اضافہ دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا۔ بمبئی کے موسیقاروں کو بھی انہوں نے پاکستانی نغموں کی مدد سے ہی متاثر کیا تھا لیکن ستم ظریفی دیکھئے کہ جس ملک نے انہیں عزت، شہرت اور دولت دی انہوں نے اسی سے بیوفائی کی۔

نیّرہ نور ایک اور گلوکارہ ہیں جو اپنی مرضی سے گاتی ہیں۔ دراصل انہوں نے گلوکاری کو کبھی بھی پیشہ نہیں بنایا۔ موسیقی اور گلوکاری ان کا شوق اور مشغلہ ہے، اللہ نے بہت خوبصورت آواز سے نوازا ہے۔ موسیقی کے رموز سے بھی واقف ہیں اور بولوں کی ادائیگی پر مکمل عبور رکھتی ہیں۔ ان کی آواز میں معصومیت، تاثر اور مٹھاس ہے۔ انہیں فلمی صنعت میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا اور ان کے کئی نغمے بے حد مقبول بھی ہوئے مگر وہ فلمی دنیا سے وابستہ نہ رہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ ٹیلی ویژن کو آج بھی ترجیح دیتی ہیں۔ لیکن ان کی غیر موجودگی پاکستانی فلمی موسیقی کے لیے سراسر نقصان ہے۔

زبیدہ خانم نے پچّاس کی دہائی میں فلمی موسیقی میں بہت دُھومیں مچائی تھیں اور ان کے گائے ہوئے نغمے آج بھی بے حد مقبول ہیں۔ ان کی آواز کا سوز و گداز، تاثر اور ادائیگی کی نفاست نے انہیں بہت جلد مقبول اور معروف گلوکارہ بنا دیا تھا۔ پنجابی ان کی مادری زبان ہے۔ اس لیے پنجابی گانوں میں وہ کیفیت پیدا کر دیتی ہیں لیکن اردو نغموں میں بھی ان کا تلفظ اور ادائیگی قابلِ تعریف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آتے ہی فلمی موسیقی پر چھا گئی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چوٹی پر پہنچ گئی تھیں۔ عکاس و فلم ساز ریاض بخاری سے شادی کرنے کے بعد وہ گلوکاری سے کنارہ کش ہو گئیں، یہاں تک کہ فلمی تقاریب میں بھی کبھی نظر نہیں آئیں۔ انہوں نے بھی زمانۂ عروج میں گلوکاری ترک کی تھی جس کی کمی بہت عرصے تک محسوس کی گئی۔ وہ انتہائی خوش و خرّم اور مطمئن گھریلو زندگی گزار رہی ہیں۔ بچے جوان اور صاحب اولاد ہو چکے ہیں۔

عکاس فیصل بخاری ان ہی کے فرزند ہیں جنہوں نے کئی فلموں اور ٹیلی ویژن کے سلسلہ وار ڈراموں کی بہت خوبصورت عکاسی کر کے نام پیدا کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک لحاظ سے یہ فن اور ہنر مندی انہوں نے ورثے میں پائی

ہے۔ان کے تایا جعفر شاہ بخاری پاکستان کے مایہ نازعکّاس، فلم ساز اور ہدایت کار رہے ہیں۔
زبیدہ خانم فلمی صنعت سے زیرِ تکمیل فلموں میں اپنا کام مکمل کرنے کے بعد رخصت ہوئی تھیں۔اس کے بعد فلم سازوں اور موسیقاروں نے بہتیری کوشش کی کہ انہیں گلوکاری کی طرف راغب کیا جائے، گلوکاروں کے معاوضوں میں بھی نمایاں اضافہ ہو گیا مگر زبیدہ خانم کسی لالچ میں نہیں آئیں اور انہوں نے اپنے گھر کی دہلیز سے باہر قدم نہیں رکھا۔

پچاّس کی دہائی میں ایک گلوکارہ کوثر پروین بھی تھیں جو اداکارہ آشا پوسلے کی چھوٹی بہن تھیں۔ابتدائی زمانے کی فلموں میں ان کے گانے ہر فلم میں شامل ہوا کرتے تھے مگر پھر وہ جوان العمری ہی میں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

فلم ''کنیز'' کی نمائش کو کافی عرصہ گزر چکا تھا اور ہر ایک ہم سے پوچھ رہا تھا کہ اب آئندہ پروگرام کیا ہے۔فلم بنانا ہمارے لیے کامیاب تجربہ ثابت ہوا تھا۔فلم کی تکمیل کے دوران میں جو تلخیاں اور پریشانیاں پیش آئی تھیں ان میں زیادہ تر دخل ہماری طبیعت کو بھی تھا۔ہم ہر کام وقت مقررہ پر اور اپنے پروگرام اور پسند کے مطابق کرنا چاہتے تھے۔ لوگ تو ہمارے جذبات کا خیال رکھ لیتے تھے اور حتی الامکان ہمارے ساتھ تعاون کرتے رہے تھے مگر قدرت کی ستم ظریفیوں کے سامنے انسان بے بس ہوتا ہے۔فلم کی تکمیل میں جتنی دیر ہوتی رہی' ہماری ذہنی کشیدگی' پریشانی اور گھبراہٹ میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا رہا۔اس زمانے میں ہماری سگار نوشی' پائپ نوشی 'چائے نوشی اور کافی نوشی میں بھی بہت اضافہ ہو گیا تھا۔وقت بے وقت سونا 'بے وقت کھانا اور جو مل گیا وہی کھا لینا ہمارے معمول میں داخل رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کا اکثر ہوش نہ رہتا یا پھر چار پانچ بجے کھایا جاتا اور جو بھی مل جاتا' کھا لیتے تھے مگر عموماً ہوٹل اور بازار کا چٹ پٹا 'مسالے دار اور مرچوں والا کھانا اور نان ہی دستیاب ہوتے تھے۔سارے دن تمباکو نوشی اور چائے نوشی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔رات کا کھانا عموماً بارہ ایک بجے تک کھانا بھی روز کا دستور بن گیا تھا۔رات گئے سونا اور صبح دیر سے اٹھنا یا پھر پروگرام اور شوٹنگ کے مطابق علی الصبح بیدار ہو کر بھاگ دوڑ میں مصروف ہو جانا بھی صحت پر اثر انداز ہوتا جا رہا تھا۔صرف صبح کا ناشتہ تھا جو ہماری امّاں (اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے) زبردستی بڑے اہتمام سے ہمیں کرایا کرتی تھیں اور اس ناشتے میں دنیا کی ہر چیز میز پر موجود ہوتی تھی۔ٹوسٹ' انڈے یا

آملیٹ' پراٹھے' بھنی ہوئی کلیجی' لہسن کی چٹنی' دیسی گھی' دلیا' پھل' کھجوریں' دودھ' چائے' جوس' کیک' پیسٹری 'غرضیکہ کھانے کی کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو ناشتے کی میز پر موجود نہ ہو۔ جتنی دیر ہم ناشتا کرتے' امّاں سامنے والی کرسی پر بیٹھی نگرانی کرتی رہتی تھیں اور ملازموں اور گھر والوں کو مختلف مزید چیزیں لانے کی ہدایات جاری کرنے میں مصروف رہتی تھی۔ ہر چیز اصرار کر کے ہمیں کھلاتی تھیں یہاں تک کہ ہم رونکھے ہو جاتے تھے۔

''امّاں' کچھ ترس کھائیں۔ یہ ناشتا ہے یا دن بھر کا کھانا۔ انسان ایک وقت میں کیا کچھ اور کتنا کچھ کھا سکتا ہے''!

''بھئی اس کے بعد تم کہاں کھاؤ گے اور کون سا وقت پر کھالو گے۔ لو کھاؤ۔''

''مگر ان سب چیزوں کا ناشتے سے کیا تعلق ہے۔ صبح صبح یہ سب کیسے کھالوں؟''

''تو پھر اور کون سا وقت ہے جو تمہیں کھلاؤں۔ اس کے بعد تو اللہ جانے کس وقت واپس لوٹو گے۔ دن بھر نہ جانے کیا کیا الابلا کھاتے رہو گے۔ کھاؤ گے بھی یا نہیں۔ بازار کا کھانا' نان کباب' کبھی دن کا کھانا شام کو پانچ بجے۔ کبھی رات کا کھانا بارہ ایک بجے۔ یہ کہاں کا دستور ہے۔ بیٹا اس طرح تمہاری صحت کیسے قائم رہ سکتی ہے۔ نہ وقت پر کھانا' نہ سونا' نہ ڈھنگ کا گھریلو کھانا 'بس اب تم چُپکے سے کھالو اور دیکھو' یہ کیک ضرور کھالینا۔ تمہاری بھانجی کی سالگرہ کا ہے۔''

''مگر امّاں۔ ناشتے میں کیک کون کھاتا ہے؟''

''بیٹا ! دن کو گیارہ بجے ناشتا بھی کون کرتا ہے اور پھر رات کو بارہ ایک یا دو بجے تک کون باہر رہتا ہے۔ بھئی تمہارا تو ہر کام بے ڈھنگا ہے۔ چائے سے پہلے یہ دودھ ضرور پی لو۔''

''مگر امّاں۔'' ہم رونکھے ہو جاتے ''ایک وقت میں یہ سب کچھ' اچھا دودھ ہم رات کو پی لیں گے۔''

''رات کو ایک بجے تم دودھ کہاں پیؤ گے۔ سب جانتی ہوں۔''

یہ امّاں کا پیار اور ممتا تھی جو ہمیں ناشتے کے وقت آئندہ چوبیس گھنٹے کے کھانے کے لیے ہر چیز کھلا دینے پر مصر تھی۔

''ذرا شکل تو دیکھو۔ بھئی اس طرح تو جنّات بھی ہوں تو بیمار پڑ جائیں۔ تمہاری صحت بھلا خاک ٹھیک رہے گی۔ جانتی ہوں۔ جب تک بیمار نہیں پڑو گے' تم گھر میں کہاں ٹکو گے؟''

یہ بے ڈھنگے معمولات بظاہر تو ہم پر اثر انداز نہیں ہو رہے تھے مگر گیس' تیزابیت اور معدے کی دوسری خرابیاں اکثر ہم پر اثر انداز ہونے لگی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم لوٹ پوٹ کر چند دوائیاں کھانے کے بعد ٹھیک ہو جاتے تھے لیکن اندر ہی اندر ہم آنے والی بیماریوں کی پرورش کر رہے تھے۔

فلم کی پریشانیوں' پیسہ دینے والوں کی وعدہ خلافیاں' پیسہ لینے والوں کی خاموش نگاہوں کی چُبھن' راتوں کی جگائی' اس پر طرہ یہ کہ اس زمانے میں ہمارے ایک بڑے بھائی' علی نعمان شدید بیمار پڑ گئے۔ یہ ترتیب میں اوپر سے چوتھے نمبر پر تھے۔ ان کی صحت بچپن ہی سے خراب رہا کرتی تھی۔ خاص طور پر سانس کی تکلیف نے انہیں کہیں کا نہ رکھا تھا۔ اس پر ہر وقت چائے نوشی اور سگریٹ نوشی۔ خراب صحت کی بنا پر سکول سے چھٹیاں کرتے رہے 'امتحانات سے غیر حاضر ہوتے رہے یہاں تک کہ میٹرک بڑی مشکل سے کیا۔ اس کے بعد کچھ تو ان کی صحت نے اور کچھ خود انہوں نے مزید پڑھنے سے انکار کر دیا۔ کام کاج کی عادت نہیں تھی۔ ویسے دنیا کے ہر شخص کے کام آتے تھے مگر کیا مجال جو خود کوئی کام دھندا کر لیں۔ دوستوں کی محفلیں تھیں اور وہ تھے۔ کبھی جی میں آئی تو ریستورانوں میں منیجر بن گئے اور ریستوران کا دیوالہ نکل گیا۔ کیوں کہ رشتے داروں' دوست احباب اور جاننے والوں سے بل ہی وصول نہیں کرتے تھے۔ نئی دلّی کے فیشن ایبل ریستورانوں میں بھی کام کیا مگر زیادہ عرصے نہ چل سکے۔ نوکری چھوڑتے یا نوکری سے نکالے جاتے تو مالک کو بُرا بھلا کہتے ہوئے گھر آ جاتے۔

''ارے بہت گھٹیا ذہنیت کا مالک ہے وہ شخص۔ نہ مروّت' نہ اخلاق اور اس کی نگاہوں میں تو کوئی لحاظ ہی نہیں ہے۔'' ہمارے سب سے بڑے بھائی اشفاق کہتے ''اپنی غلطی نہیں مانتے۔ دوسروں کو الزام دیے جاتے ہو۔ وہ کہتا ہے کہ تم نے دیوالیہ نکال دیا ہے اس کا۔''

''میں نے اس کا کیا نقصان کیا ہے؟ کون سی بے ایمانی یا ہیرا پھیری کی ہے؟ ایک ایک پیسے کا حساب موجود ہے۔''

''وہ کہتا ہے کہ ہر روز درجنوں لوگوں کو مفت کھلاتے پلاتے تھے۔''

وہ صفائی پیش کرتے ''لو اور سنو۔ امّاں۔ اب تم خود ہی انصاف کرو۔ بھئی فلاں رشتے دار بیوی بچّوں کے ساتھ آ گئے' فلاں سالہا سال سے جان پہچان ہے۔ اب ان سے کیسے پیسے وصول کر لوں؟ اخلاق' مروّت اور شرافت بھی آخر کوئی

چیز ہے۔

''مگر وہ اس شخص کا کاروبار ہے' تمہارا ذاتی بزنس تو نہیں ہے کہ حلوائی کی دکان پر دادا جی کی فاتحہ دینے لگے۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں اپنی تنخواہ چھوڑ آیا ہوں۔ باقی جو رقم نکلے گی وہ بھی ایک ایک پائی چکا دوں گا۔ ایسے بدلحاظ آدمی کے ساتھ میرا گزارہ نہیں ہو سکتا۔''

پاکستان بن گیا۔ ہم سب کے ساتھ نعمان بھائی بھی آ گئے۔ سب نے کچھ نہ کچھ کیا مگر نعمان بھائی کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ اب وہ سگریٹ کے بجائے بیڑی پینے لگے تھے اور سانس کے ساتھ اب کھانسی کی شکایت بھی بڑھ گئی تھی۔ ایک آدھ کام یہاں آ کر بھی کیا مگر پھر چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ گئے اور باغ بانی میں مصروف ہو گئے۔

کوٹھی کے ساتھ بہت بڑا لان اور پہلو میں چار کنال زمین پر پھیلا ہوا باغ تھا۔ انہوں نے باغ کا انتظام سنبھال لیا۔ ایک مالی کتنے کام آ سکتا تھا۔ سارے دن نعمان بھائی ہی باغبانی میں جان مارتے رہتے تھے۔ آم' جامن' امرود اور نہ جانے کون کون سے پھلوں کے پودے لگائے۔ جو درخت پہلے سے موجود تھا ان کی از سر نو ترتیب کی گئی۔ دنیا بھر کے موسمی پھول' قسم قسم کے گلاب نعمان بھائی ڈھونڈ کر لاتے تھے۔

''یہ دیکھو۔ کالا گلاب۔''

ہم کہتے ''مگر ایسا گلاب تو پہلے بھی ہمارے لان میں ہے۔''

''تم تو گھامڑ ہو بالکل۔ تمہیں تو سبزیوں اور پھولوں کا فرق نہیں معلوم ہے۔ گلاب کو کیا پہچانو گے۔ ارے بھئی' یہ بالکل مختلف قسم کا گلاب ہے۔'' پھر وہ اس گلاب کی تاریخ اور شجرہ بیان کرنے لگتے تھے۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو کم از کم چالیس قسم کے گلاب انہوں نے باغ میں لگا دیے تھے۔ سارے دن ان کی کاٹ چھانٹ میں لگے رہتے تھے۔ اب کھرپا تھا اور نعمان بھائی۔

مشہور نرسری والوں سے ان کی دوستی ہو گئی تھی۔ گھنٹوں پھولوں اور پودوں کے بارے میں ان کے ساتھ تبادلۂ خیالات کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور سارا دن چائے اور بیڑی سگریٹ کا دور بھی چلتا رہتا تھا۔ یہ دونوں چیزیں ترک کرنے

پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں تھے۔ سرزنش' ڈانٹ ڈپٹ' پیار سے سمجھانا سبھی بیکار تھا یہاں تک کہ اماں اور آکا میاں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

''ارے بھئی کرنے دو جوان کا دل چاہے۔ دل تو لگا رہتا ہے نا۔''

آکا بھائی کہتے ''مگر امّاں۔ سارے دن سردی' گرم' دھول مٹی میں لگا رہتا ہے۔ صحت پہلے ہی خراب ہے۔''

''بھئی خوش تو ہے۔ اسے مگن رہنے دو۔''

اب نعمان بھائی نے اپنی ضرورت بیان کرنے اور کسی ضرورت کے لیے پیسے طلب کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بیمار ہوتے تو چپ چاپ بستر میں پڑے رہتے۔ ساری ساری رات کھانسا کرتے' سب گھر والے پریشان تھے مگر امّاں کی بے چینی سب سے زیادہ تھی۔ بُرا بھلا کہہ کر خاموش ہو جاتی تھیں مگر نعمان بھائی پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ کئی کئی دن بیمار رہنے کے بعد ذرا بھی تندرست ہوتے تو پھر کھرپا سنبھال کر مالی کے ساتھ باغ میں مصروف ہو جاتے۔ صحت پہلے ہی خراب تھی۔ اب بالکل کھوکھلے ہو گئے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے مگر چائے اور بیڑی کی طلب اور استعمال میں کمی ہوئی اور نہ ہی کوئی پرہیز کیا۔ تھوڑے دن دوائی کھاتے اور پھر چھوڑ دیتے۔ بیڈن روڈ پر ڈاکٹر اقبال اور ان کے بھائیوں سے دوستی ہو گئی تھی۔ باغ بانی سے جو وقت بچ رہتا وہ ان کی دوائیوں کی دکان پر صرف کر دیتے تھے۔ امّاں اس پر بہت خوش تھیں ''شکر ہے اس بہانے علاج تو کرا لیتا ہے نا۔''

پھر آکا بھائی ایک دن خبر لائے کہ علاج ولاج کچھ نہیں ہوتا۔ اِدھر اُدھر کی گپ شپ ہی ہوتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی تو خود ان کے شاکی ہیں۔ میں گیا تو شکایتوں کا پلندہ لے کر بیٹھ گئے کہ بد پرہیزی کرتے رہتے ہیں۔ علاج نہیں کراتے۔ دوائی نہیں کھاتے۔ لیجیئے علاج کا بھانڈا یوں پھوٹ گیا۔

ڈاکٹر اقبال اور ان کے اہل خانہ سے ہم لوگوں کے پرانے مراسم تھے۔ ان کے والد کے ساتھ ہمارے والد' آکا میاں کی نشست رہا کرتی تھی۔ بیٹوں کے ساتھ نعمان بھائی اور سلطان بھائی (بہن بھائیوں میں یہ چھٹے نمبر پر تھے) کی گاڑھی چھنتی تھی۔ امّاں مستقل ڈاکٹر اقبال کے زیر علاج تھیں۔ وہ ان دنوں ماڈل ٹاؤن ہی میں رہتے تھے۔ امّاں ٹیلی فون اپنے بیڈ پر لیے بیٹھی رہتی تھی۔ ذرا سی شکایت پیدا ہوئی اور ڈاکٹر اقبال کو فون کھڑکا دیا۔

''ہیلو ڈاکٹر صاحب۔۔۔السلام علیکم۔بس ڈاکٹر صاحب اللہ کا فضل ہے۔ مگر۔۔۔'' اس کے بعد وہ اپنی بیماری کی تفصیل بیان کرنے بیٹھ جاتیں جس کی تان اس فقرے پر ٹوٹتی تھی ''ڈاکٹر صاحب! آپ جاتے ہوئے مجھے دیکھتے جائیں۔''

اور ڈاکٹر صاحب دس منٹ بعد موجود۔ وہ امّاں کا حال سنتے۔ نعمان بھائی کے بارے میں شکایات سنتے۔ مناسب مختصر جواب دیتے اور یہ کہہ کر رخصت ہو جاتے۔

''ٹھیک ہے امّاں! نعمان صاحب کے ہاتھ دوائی بھیج دوں گا۔''

نعمان بھائی کا تو وہاں پر روز کا آنا جانا تھا۔ امّاں ڈاکٹر اقبال کی معتقد تھیں اور کہتی تھیں۔ ''اللہ رکھے نمازی اور پرہیز گار آدمی ہیں۔ تب ہی تو اللہ نے ہاتھ میں شفا رکھی ہے اور اخلاق دیکھو کہ ایک فون پر چلے آتے ہیں۔''

جہاں تک شفا کا تعلق ہے' امّاں کو ڈاکٹر اقبال کے علاج سے کبھی مکمل شفا حاصل نہ ہوتی۔ تیسوں دن اور بارہ مہینے علاج جاری رہتا تھا۔ ایک ایک وقت میں دس دس گولیاں حلق سے اتارنا بذات خود ایک مسئلہ تھا۔ امّاں پانی کا جگ لے کر بیٹھ جاتی تھیں اور وقفے وقفے سے ایک ایک گولی اور کیپسول کھاتی رہتی تھیں۔ پھر کہتیں ''لو۔ میرا پیٹ ہی بھر گیا۔ کھانا کیسے کھاؤں گی؟''

امّاں کو یہ راز بھی معلوم نہیں تھا کہ مہینے کے بعد جب ڈاکٹر صاحب کا بل نعمان بھائی لے کر آتے تو اس میں ان کے وزٹ کی فیس بھی شامل ہوتی تھی۔ پہلی بار ہم نے بل دیکھا تو ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے حسب عادت نہایت خوش اخلاقی سے بات کی۔ مزاج پوچھا۔ کام کاج کے بارے میں دریافت کیا۔

ہم نے کہا ''ڈاکٹر صاحب! آپ نے ہر بار امّاں کو دیکھنے کی فیس بھی بل میں درج کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہمارا گھر راستے ہی میں تو ہے۔ ذرا کی ذرا آپ رک جاتے ہیں تو امّاں خوش ہو جاتی ہیں۔ بس ان کی نفسیاتی تسلی کے لیے آپ کو تکلیف دی جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب رسان سے مسکرائے اور نرم لہجے میں بولے ''آفاقی صاحب! جب میں ڈاکٹر بنا تھا تو میرے استاد نے مجھے نصیحت کی تھی کہ دیکھو کبھی کسی کو مفت مشورہ نہ دینا۔ فیس ضرور لینا ورنہ تمہارے مشورے اور دوائی کی کوئی قدر نہ

ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں وزٹ کی فیس ضرور وصول کرتا ہوں۔ اب دیکھیے نا۔ دس روپے تو کوئی فیس نہیں ہے گھر پر جا کر دیکھنے کی۔"

ڈاکٹر صاحب کی منطق نے ہمیں لاجواب کر دیا۔ حالانکہ چالیس سال پہلے دس روپے فیس بھی کچھ کم نہ تھی۔ بہر حال ہم سب نے یہ فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر صاحب کے بل اور فیس کے بارے میں اماں کو ہر گز نہ بتایا جائے۔ چنانچہ اماں اسی خیال میں رہیں کہ ڈاکٹر صاحب ان کے ایک فون پر گھر پہنچ جاتے ہیں۔ رہا فائدہ تو وہ بس یوں ہی چلتا تھا۔ علاج کا سلسلہ مسلسل جاری تھا مگر نقصان یہ تھا کہ اماں تھوڑے دن بعد دوائی چھوڑ دیتی تھیں۔

ہمیں پتا چلتا تو شکایت کرتے "اماں۔ دوائی کیوں نہیں کھائی؟"

"ارے بھئی کہاں تک ریوڑیوں کی طرح گولیاں کھائے جاؤں۔ دوائیوں کا خرچہ بلاوجہ تم پر پڑ رہا ہے۔"

ان کا دوائی ترک کر دینا ہمیں بہت گراں گزرتا تھا۔ ایک تو وہ دوائی کھانے کی ویسے ہی چور تھیں' اس پر گولیوں کی بہتات۔ بس بہانہ ہی چاہیے تھا دوائی سے پیچھا چھڑانے کے لیے۔

تنگ آ کر ہم نے انہیں سمجھانا شروع کر دیا "اماں کیوں نہ کسی اور ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ ان کے علاج سے تو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔"

وہ کہتیں "ارے نہیں بھئی' اتنا فائدہ تو ہے۔ ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں اللہ کے فضل سے۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو گا اس عمر میں اور پھر ڈاکٹر اقبال میرے مزاج سے واقف ہیں۔"

ہم انہیں سمجھاتے "اماں' ڈاکٹری علاج میں مزاج 'طبیعت وغیرہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ حکمت تھوڑی ہے کہ مزاج' طبیعت اور نبض کے مطابق دوائی دی جائے۔"

مگر اماں قائل نہیں ہوتی تھیں۔

"تو پھر دوائی تو نہ چھوڑا کریں۔"

"ارے بھئی۔ اتنی ڈھیر ساری گولیاں کہاں تک کھاؤں؟ دن میں تین بار تیس گولیاں کھاتی ہوں اور ان کے ساتھ دس گلاس پانی پیتی ہوں۔ بھوک ہی اڑ جاتی ہے۔"

خدا خدا کر کے ہم نے ایک بہت اچھے ڈاکٹر کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ان سے تعلق بھی نکال لیا کہ وہ ہمارے کن رشتے داروں کے واقف ہیں اور کتنے اچھے معالج ہیں۔یہ ڈاکٹر اسد الرحمن تھے۔اس وقت نوجوان تھے۔ تشخیص کے تو وہ ماہر تھے۔مریض کی شکل دیکھ کر مرض بتادیتے اور دو تین دن میں مریض لوٹ پوٹ کر تندرست ہو جاتا، ہم تو ان کے ایسے مرید ہوئے کہ سالہا سال ان ہی سے رجوع کرتے رہے۔یوں تو سالہا سال سے ہومیو پیتھک علاج کا سلسلہ جاری رہا لیکن اگر کبھی ایلو پیتھک ڈاکٹروں کی نوبت آجائے تو لاہور میں صرف دو بلکہ تین ہی ڈاکٹر ہیں جن کے سوا چوتھا ڈاکٹر نہیں سوجھتا۔ان ڈاکٹروں کے بارے میں پھر کبھی بیان ہو گا۔اس وقت تذکرہ ڈاکٹر اسد کا ہو رہا ہے۔

ہم ڈاکٹر اسد الرحمن کے پاس پہنچ گئے۔امّاں کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور انہیں لے کر گھر پہنچ گئے۔ڈاکٹر اسد الرحمن کی نرم خوئی اور نرم گفتاری سے ہی امّاں پگھل گئیں۔پھر جب انہوں نے بتایا کہ ہمارے کون کون سے رشتے داروں سے ان کا تعلق اور واسطہ رہا ہے تو امّاں کچھ اور متاثر ہو گئیں اور انہیں آزمانے کا ایک موقع دینے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

ڈاکٹر اسد الرحمن نے ان کا بغور معائنہ کیا۔پوری توجہ سے ان کا حال سنا۔پرانے نسخے دیکھے جن کا انبار لگ گیا تھا۔پھر مسکرائے اور بولے ”امّاں فکر نہ کریں ‘انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مگر ڈاکٹر صاحب‘ زیادہ گولیاں اور کڑوی دوا نہ دیجئے گا کہ حلق سے اترنا مشکل ہو جائے۔“

ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا ”امّاں ! اللہ پر بھروسا رکھیے۔“ پھر ایک شربت لکھ دیا جس کا نام غالباً ”بیکوزائم“ تھا ”دن میں تین بار ایک ایک بڑا چمچہ کھانے سے آدھے گھنٹے پہلے استعمال کر لیا کریں۔“

امّاں بولیں ”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب اور دوائی یا۔۔۔“

”یہی آپ کی دوائی ہے۔اللہ نے چاہا تو بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“

امّاں حیران رہ گئیں ”بس؟ ڈاکٹر صاحب سوچ لیجئے۔“

’’سوچ لیا ہے امّاں۔ آپ اللہ کا نام لے کر شروع تو کریں۔‘‘

ڈاکٹر صاحب رخصت ہو گئے۔ امّاں ان کے حُسنِ اخلاق‘ گفتگو اور شرافت سے بہت متاثر ہوئیں لیکن اب انہیں یہ شکایت تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے انہیں کوئی دوائی تو دی ہی نہیں۔ علاج کیا خاک ہو گا۔

بڑی مشکل سے سب گھر والوں نے امّاں کو سمجھایا کہ کچھ دن استعمال کر کے دیکھ لیں۔ ورنہ ڈاکٹر اقبال تو موجود ہی ہیں۔ امّاں نے نیم دلی سے شربت کا استعمال شروع کر دیا۔ شربت لذیذ تھا۔ اس کے ساتھ پانی کا پورا جگ پینے کی ضرورت بھی نہیں تھی اس لیے امّاں کو یہ علاج پسند آ گیا۔

چند روز کے اندر ہی اماں کی صحت ٹھیک ہونے لگی جسم میں توانائی بھی آ گئی۔ بھوک بھی لگنے لگی۔ نیند بھی آنے لگی۔ بس پھر کیا تھا۔ امّاں تو ڈاکٹر اسدالرحمن کی معتقد ہو گئیں۔ اب وہ ہر روز اپنا حال بیان کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو فون کر دیا کرتی تھیں۔ خود ڈاکٹر صاحب نے بھی چند روز تک مزاج پرسی کی رسم نبھائی۔

’’ہیلو ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم‘ مزاج شریف؟ جی میں کافی ٹھیک ہوں مگر۔۔۔‘‘ اب امّاں ڈاکٹر اسدالرحمن کو فون گھمایا کرتی تھیں اور ان ہی کے گُن گاتی تھیں۔

’’اللہ زندگی دے۔ بس ایک دوائی دیتے ہیں اور فائدہ ہو جاتا ہے۔ غضب کی شفا ہے ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں پھر وہ پرانے حکیموں کے قصّے سنانے میں لگتیں‘‘۔ امّاں جب تک زندہ رہیں ڈاکٹر اسد ہی کے زیرِ علاج رہیں۔ آخری چند مہینوں میں بیماری سے گھبرا کر ڈاکٹر بدلنے کی خواہش کرتی تھیں مگر چند روز بعد پھر ڈاکٹر اسد ہی سے رابطہ کر لیتی تھیں۔

لیجیے تذکرہ نعمان بھائی کا تھا اور بات کہیں سے کہیں نکل گئی۔ نعمان بھائی کی صحت روز بہ روز خراب ہوتی جا رہی تھی مگر ان کے معمولات میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ ساری رات کھانستے رہتے تھے‘ سانس کی تکلیف سے بے حال رہتے مگر صبح ذرا بھی طبیعت بحال ہوتی تو کھرپا اور بیڑیوں کا بنڈل سنبھال کر باغ میں پہنچ جاتے۔ باغ بانی میں مصروف ہو کر وہ اپنی بیماریاں بھول جاتے تھے اسی لیے امّاں نے انہیں روک ٹوک کرنا چھوڑ دیا تھا۔ کہا کرتی تھیں ’’کھرپا اور مٹّی ہی تو اس کا علاج ہے۔ ان کے ساتھ رہ کر ہی یہ تندرست رہتا ہے۔‘‘ یہ 1963ء کا ذکر ہے۔

نعمان بھائی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ کئی دن بستر میں لیٹے رہے۔ باغ کا رُخ بھی نہیں کیا۔البتہ مالی کو بلا کر ضروری ہدایات دیتے رہتے تھے۔ان کے معالج بھی ڈاکٹر اقبال ہی تھے۔جب بیماری نے طول کھینچا تو دوسرے ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔کینسر اس زمانے میں اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ڈاکٹروں کو بھی تشخیص کرنے میں دیر لگ جاتی تھی۔اِدھر نعمان بھائی انجان ڈاکٹروں اور ہسپتال کے نام سے گھبرا جاتے تھے اسی لیے ان کی بیماری اندر ہی اندر بڑھتی رہی۔وہ یہی کہتے رہے کہ اب بہتر ہیں۔

ایک دن امّاں نے دیکھا کہ انہیں کینو کی قاش کھانے میں دِقّت پیش آرہی ہے۔انہوں نے پوچھا ''کھاتے کیوں نہیں؟''

بولے ''کھایا نہیں جارہا۔''

اس سے پہلے وہ ٹھوس غذا نہیں کھا سکتے تھے۔یہی کہتے تھے کہ گلا خراب ہے۔ٹھیک ہو جائے گا۔کسی اور ڈاکٹر کو دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔

امّاں نے بہت شور مچایا کہ کسی اور ڈاکٹر کو دکھایا جائے مگر نعمان بھائی کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے۔ہم فلم کی مصروفیات اور پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے مگر گھر کی ساری ذمّے داری بھی اٹھانی پڑ رہی تھی۔نعمان بھائی اگر سنتے تھے تو صرف ہماری۔امّاں اور بہنوں کو تو وہ یوں ہی باتوں میں بہلا دیتے تھے۔

چند روز بعد اچانک انکشاف ہوا کہ دودھ اور جوس بھی نعمان بھائی کے حلق سے نہیں اُترتا۔امّاں نے فوراً گھبرا کر ہمیں فون کیا اور بتایا کہ گزشتہ تین دن سے یہی کیفیت ہے مگر وہ چُھپاتے رہے ہیں۔اس عرصے میں پانی، چائے اور دودھ کا ایک قطرہ بھی ان کے حلق سے نیچے نہیں گیا۔

یہ سُن کر ہمارے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔کوئی شخص دو تین دن سے بالکل بھوکا پیاسا ہے اور وہ بھی ہمارا بھائی۔یہ تصوّر ہی انتہائی روح فرسا تھا۔ہم سارے کام چھوڑ کر ٹیکسی لے کر گھر بھاگے۔دیکھا تو نعمان بھائی بڑے اطمینان سے بیٹھے ہیں۔گھر والوں کی پریشانی ان کے مقابلے میں ہزار گنا تھی مگر وہ بالکل پُر سکون تھے۔

ہم نے فوراً مختلف ڈاکٹروں کو فون کیا جنہوں نے مشورہ دیا کہ ان کو ہسپتال لے جانا ضروری ہے تاکہ ان کے حلق میں ٹیوب ڈال کر غذا پہنچائی جاسکے۔نعمان بھائی ہسپتال جانے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے مگر امّاں کی ڈانٹ ڈپٹ اور گھر

والوں کی منّت سماجت کے آگے ہار گئے۔ سب نے انہیں سمجھایا کہ یوں بھوکے پیاسے کب تک بیٹھے رہو گے۔
بولے ''دوائی تو کھا رہا ہوں۔ ٹھیک ہو جاؤں گا۔''
شام کا وقت تھا۔ کار ہمارے پاس تھی نہیں۔ ٹیکسی نام کی چیز اس زمانے میں بڑی مشکل سے ملتی تھی۔ تانگے پر انہیں اتنی دور (آٹھ نو میل پر میو ہسپتال) لے جانا ایک مسئلہ تھا۔ خدا خدا کر کے فلیٹیز ہوٹل سے ایک پرائیویٹ ٹیکسی دستیاب ہوئی اور ہم انہیں لے کر ہسپتال چل پڑے۔ وہ تو مطمئن تھے مگر ہمارے ہاتھ پیر پھولے ہوئے تھے۔ جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ کئی دن سے ایک قطرہ تک ان کے پیٹ میں نہیں گیا تھا۔ سوچ سوچ کر ہمارا دل بھر آتا تھا۔

میو ہسپتال کے پاس ہی ''پاکستان ٹائمز'' کا دفتر تھا۔ ہم نے اپنے دوست آئی اے رحمان صاحب کو فون پر سارا مسئلہ بتا دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ دفتر سے اٹھ کر میو ہسپتال کے سرجیکل وارڈ میں پہنچ جائیں گے اور وہیں ہمارا انتظار کریں گے۔ ہم ہسپتال پہنچے تو وہ موجود تھے۔ ہمارے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ انہوں نے بہت تسلی دی مگر ساتھ ہی یہ اطلاع دے دی کہ آج جمعرات ہے۔ سرجن دستیاب نہیں ہے۔
ہم نے کہا ''انہیں گھر سے بلایا جائے۔''
معلوم ہوا کہ وہ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ کوئی دوسرا ڈاکٹر بھی ایسا نہیں ہے کہ جو یہ کام کر سکے۔
ہم نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ہسپتال کے نوجوان ڈاکٹر اور نرسیں اکٹھے ہو گئے اور ہمیں سمجھانے لگے۔

''آپ لوگوں کو احساس ہی نہیں ہے کہ ایک شخص دو تین دن سے بالکل بھوکا پیاسا ہے۔ ایک قطرہ پانی بھی نہیں پی سکا ہے۔ اب آئندہ مزید چوبیس گھنٹے کیسے زندہ رہے گا؟''
ہمارا شور و غل، چیخ و پکار سب بے کار گیا۔ رحمان صاحب نے ہمیں بہت محبت اور ہمدردی کے ساتھ سمجھایا کہ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ پرسوں صبح سویرے یہ آپریشن ہو جائے گا۔ ہم نعمان بھائی کو لے کر گھر آ گئے مگر مسلسل اذّیت میں مبتلا رہے۔ نعمان بھائی بالکل مطمئن اور پُرسکون نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے فرمائش کر کے ایک بیڑی بھی نوش کی مگر ہمارے ذہن میں ایک تلاطم برپا تھا۔ ایک شخص دو تین روز سے بھوکا اور پیاسا تھا اور ابھی آئندہ چوبیس

گھنٹے بھی پانی کی ایک بوند تک سے محروم رہے گا۔ یہ تصوّر ہی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔ نعمان بھائی کو گھر چھوڑ کر ہم سٹوڈیوز چلے گئے مگر مسلسل عذاب میں رہے۔ کھانا پینا ہمیں گناہ سا لگتا تھا۔ یہ سب ہمارے ذہن پر مسلّط تھا مگر اسٹوڈیو میں کسی کو علم نہ تھا۔ اپنی نجی اور گھریلو باتوں کو ہم دوسروں تک پہنچانے کے کبھی قائل نہیں رہے۔

ہفتے کے روز پھر ہم نعمان بھائی کو لے کر میو ہسپتال پہنچ گئے۔ آئی اے رحمان پہلے ہی وہاں موجود تھے اور متعلقہ سرجن بھی منتظر تھے۔ بہت اچھے انسان تھے۔ وہ تمام احوال سن چکے تھے اس لیے سب سے پہلے تو انہوں نے ہم سے معذرت کی اور پھر قرآنی آیات کے حوالے سے یہ بتایا کہ رزق اللہ کے اختیار میں ہے۔ اس کی رضا نہ ہو تو رزق کا ایک دانہ اور پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں مل سکتا۔ وہ فوراً نعمان بھائی کو لے کر آپریشن تھیٹر میں چلے گئے۔ نعمان بھائی نے ہمارا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ان کا اصرار تھا کہ ہم بھی آپریشن تھیٹر میں موجود رہیں۔ ہم نے بے بسی سے ڈاکٹر اور رحمان صاحب کی طرف دیکھا۔ ہم تو کسی کو انجکشن لگتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مرغی ذبح ہوتے ہوئے دیکھنا ہمارے بس سے باہر تھا۔ کہاں یہ کہ اپنے بھائی کی سرجری کا نظارہ کرتے۔ ہمارے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ جسم پسینے میں ڈوب گیا اور بے ہوش ہونے کے قریب ہوگئے ۔ مریض کی وہ حالت نہ تھی جو ہماری تھی۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے رحمان صاحب سے کہا کہ ہمیں باہر بھیج دیا جائے۔ ہم خاموشی سے آپریشن تھیٹر کے باہر چلے گئے۔ دل بھر آیا اور ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

رحمان صاحب ہمارے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ انہوں نے ہمدردی سے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلّی دینے کی کوشش کی اور ہماری سسکیاں نکلنے لگیں۔ بڑی مشکل سے ہم نے خود کو روکا ورنہ ہچکیاں بھی شروع ہونے والی تھیں۔

رحمان صاحب کو اللہ خوش رکھے۔ انہوں نے ہمارا ہاتھ تھام کر ایک کرسی پر بٹھادیا۔ کچھ دیر بعد ہمارے دل کا غبار آنسوؤں کے راستے نکل گیا تو انہوں نے ہمیں سمجھایا کہ انسان کو مضبوط ہونا چاہیے۔ زندگی میں آدمی کو ہر قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے لیے خود کو تیاّر کرنا بہت ضروری ہے۔

انہوں نے کہا" دل سبھی کا ایک جیسا ہوتا ہے مگر حالات اسے سخت اور مضبوط بنادیتے ہیں۔ مجھے دیکھئے۔ قیام پاکستان کے وقت فسادات میں بہت سے قریبی رشتے داروں کو ان ہاتھوں سے گمنام قبروں میں دفن کیا ہے۔ پاکستان آتے

ہوئے حملہ آوروں نے قتل وغارت کیا تو اور بھی کئی عزیز شہید اور زخمی ہو گئے۔ نہ کوئی ان کی نماز پڑھانے والا تھا' نہ غسل دینے والا تھا۔ یہاں تک کہ قبریں بھی خود ہم ہی نے اپنے ہاتھوں سے کھودیں۔ بھائی ہمّت رکھیئے۔ حوصلہ رکھیئے۔ دل مضبوط کیجئے۔ ابھی تو نہ جانے اور کن حالات سے گزرنا ہے۔ اگر آپ ہی حوصلہ ہار جائیں گے تو گھر والوں کو تسلّی کون دے گا؟"

رحمان صاحب کافی دیر تک ہمیں سمجھاتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں آپریشن تھیٹر کے اندر جانا چاہیے۔ ان کی باتوں نے ہمیں بہت سہارا دیا۔ ان کی یہ نصیحت بعد میں بھی ہر مشکل وقت میں ہمیں یاد آجاتی ہے۔

ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر آپریشن تھیٹر کے اندر گئے۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے انتظار میں تھے۔ ہمیں دیکھ کر بولے "آگئے۔ تو پھر شروع کرتے ہیں۔"

ہم نے بہادر بننے کی بہت کوشش کی مگر شاید چہرہ ہماری دلی کیفیت کی چُغلی کھا رہا تھا۔

نعمان بھائی نے اشارے سے ہمیں اپنے پاس بلایا۔ ہم ڈرتے ڈرتے آہستگی سے ان کے پاس چلے گئے تو انہوں نے ہمارا ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگایا اور پھر بہت نحیف آواز میں بولے "تم باہر چلے جاؤ۔ یہ لوگ میرے پاس موجود ہیں۔"

جی تو نہیں چاہتا تھا مگر وہاں ٹھہرنے کی تاب بھی نہ تھی۔ انہوں نے دوبارہ ہمارا ہاتھ زور سے دبایا اور باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ہم سر جھکا کر مجرموں کی طرح آپریشن تھیٹر سے باہر چلے گئے اور رحمان صاحب کی موجودگی میں ضروری کارروائی عمل میں لائی گئی۔ ہم باہر بیٹھے دعائیں کرتے رہے۔

کچھ دیر بعد رحمان صاحب باہر آئے اور ہمیں اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ آپریشن ہو چکا تھا۔ ایک ربر کی نالی سوراخ کر کے نعمان بھائی کے پیٹ میں ڈال دی گئی تھی۔ عموماً یہ نالی حلق میں ڈالی جاتی ہے مگر ڈاکٹر صاحب کو عین وقت پر خیال آیا کہ نالی پیٹ میں ڈالی جائے۔ یہ طریقہ ہر لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ اوّل تو دیکھنے والوں کو حلق کا سوراخ اور اس میں لگی ہوئی نالی نظر نہیں آتی دوسرے یہ کہ غذا براہ راست معدے میں پہنچ جاتی ہے۔ نعمان بھائی بڑی ہمت والے تھے۔ کچھ دن بعد خود ہی دودھ چائے' سوپ اور ساگودانہ وغیرہ اپنے ہاتھ سے نالی کی قیف میں ڈال لیا کرتے تھے۔

باتیں بھی کرتے جاتے' بیڑی کے کش بھی لگاتے رہتے اور اپنا پیٹ بھی بھرتے جاتے۔ واقعی نعمان بھائی بڑے حوصلہ مند آدمی تھے۔

کینسر اس زمانے میں بہت عام بیماری نہیں تھی اس لیے اس کی تشخیص اور علاج کا بھی زیادہ بندوبست نہ تھا۔ اسی زمانے میں لاہور کے میو ہسپتال میں کینسر کے سلسلے میں ضروری آلات نصب کیے گئے اور تھراپی کا اہتمام کیا گیا۔ ایک سپیشلسٹ ڈاکٹر بھی امریکہ سے تعلیم اور تربیت لے کر آ گئے۔ ان کا نام اس وقت ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا غالباً ڈاکٹر مسعود تھا۔ بہت خوش اخلاق اور شائستہ انسان تھے۔ ہمیں معلوم ہوا تو ان سے رابطہ قائم کیا۔ ان ہی دنوں اقبال شہزاد سے تذکرہ ہوا تو انہوں نے بتایا کہ وہ ان کے پرانے کلاس فیلو اور بے تکلّف دوست ہیں۔ ہم یہ پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ اقبال شہزاد بھی عجیب و غریب آدمی تھے۔ وہ سات بھائی اور چار بہنیں تھے۔ سبھی مقامی کالجوں اور یونیورسٹی میں پڑھے تھے۔ ان کا خاندان بھی کافی بڑا تھا۔ پھر رشتے داریاں بھی تھیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر شخص ان کا واقف نکل آتا تھا۔ کچھ لوگ ان کے محلّے دار یا بچپن کے لنگوٹیے ہوتے تھے۔ جان پہچان تو ان کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ انہوں نے ہمیں اپنی کار میں بٹھایا اور میو ہسپتال میں خصوصی کینسر کے شعبے میں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب سے علیک سلیک اور بے تکلّفانہ گفتگو کے بعد ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی گئی پھر شہزاد صاحب نے انہیں ہمیں اپنے ساتھ لانے کا مقصد بیان کیا۔

ڈاکٹر صاحب فوراً سنجیدہ ہو گئے۔ تفصیل سے نعمان بھائی کی بیماری اور رپورٹس کے بارے میں دریافت کیا پھر مشورہ دیا کہ انہیں چند روز کے لیے ہسپتال میں داخل کر دیا جائے تاکہ پوری طرح ٹیسٹ اور چیک اپ کر لیا جائے۔ انہوں نے ہمیں بڑی ہمدردی سے تسلی دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ''بھائی آفاقی صاحب'' زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ ہوتی ہے۔ کینسر ایک موذی مرض ہے۔ اس کا اگر بالکل آغاز میں پتا چل جائے تو قابو پایا جا سکتا ہے ورنہ اس کی جڑیں بہت دور دور تک پہنچ جاتی ہیں''۔

ہم نے پوچھا ''ڈاکٹر صاحب! کیا یہ علاج یا آپریشن سے ٹھیک ہو جائیں گے؟''

انہوں نے کہا ''یہ تو چیک اپ کے بعد ہی بتایا جا سکتا ہے۔''

اب نعمان بھائی کو ہسپتال میں داخل کرنے کا مسئلہ تھا۔ وہ ہسپتال کے نام ہی سے بھڑک اٹھتے تھے۔ امّاں نے بھی یہ تجویز سنی تو فکر مند ہو گئیں۔

"بیٹا! کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے نا؟"

ہم نے انہیں مرض کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا صرف یہ کہا کہ وہ بہت اچھےاور تجربہ کار ڈاکٹر ہیں۔ اقبال شہزاد کے بچپن کے دوست بھی ہیں۔ وہ نعمان بھائی کا خاص خیال رکھیں گے۔ جب تک چھان بین نہ کرلی جائے صحیح علاج کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم نے اقبال شہزاد سے انہیں فون بھی کرا دیا۔ شہزاد صاحب تو شیشے میں اتارنے کے معاملے پر بڑے فن کار تھے۔ انہوں نے امّاں کو بھی قائل کر لیااور نعمان بھائی کو بھی ہسپتال میں داخل ہونے پر آمادہ کر لیا۔

دوسرے دن نعمان بھائی میو ہسپتال میں داخل کر دیئے گئے اور ان کے ٹیسٹ شروع ہو گئے۔

ہم اپنی تمام مصروفیات اور پریشانیوں کے باوجود ہر روز ہسپتال جاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے پوچھ گچھ کرتے تھے اور نعمان بھائی کو تسلی دیتے تھے۔ کبھی کبھی شام کے وقت بھی چکّر لگا لیتے تھے۔

ڈاکٹر مسعود نے اپنی تحقیقات کے بعد ہمیں بتایا کہ وہ گلے کے کینسر میں مبتلا ہیں، ہمارے تو ہاتھ پاؤں سُن ہو گئے اور ہم وہیں بیٹھ گئے۔ یہ مرض ہی ایسا مہلک ہے کہ نام سُن کر دل بیٹھ جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہماری حالت دیکھی تو دلاسا دیا۔ کافی پلائی' بہت دیر تک زندگی اور موت کا فلسفہ سمجھاتے رہے۔ وہ خدا جانے کیا کیا باتیں کرتے رہے مگر ہمارا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ رہ رہ کر نعمان بھائی کی زندگی کے واقعات ایک فلم کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ دیکھا جائے تو انہیں زندگی نے کچھ بھی نہیں دیا تھا۔ ہوش بھی نہ سنبھالا تھا کہ دمے اور سانس کی بیماری کا شکار ہو گئے۔ شاید انہیں اپنی صحت کے اور زندگی کے انجام کا آغاز ہی میں علم ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان چیزوں سے قطعی بے پروا اور بے تعلق ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایسی دلچسپیوں میں کبھی حصّہ نہیں لیا جو عام طور پر لڑکوں بالوں کی توجہ کا مرکز ہوتی ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے بہت پیچھے رہ گئے۔ انہوں نے اپنی دنیا ہی سب سے الگ تھلگ بنالی تھی اور اسی میں مگن ہو گئے۔ جوان ہوئے تو انہیں تعلیم سے بے رُخی' عدم دلچسپی اور سب سے پھسڈّی رہ جانے کے طعنے ملنے لگے مگر انہوں نے کبھی ان پر کان نہیں دھرا۔

وہ ہر ایک سے بے نیاز اپنی دنیا میں خوش و خرّم تھے۔ ہمارے والد (آکا میاں) کو ان سے بہت محبت تھی۔ اُنہوں نے اِنہیں کبھی سرزنش نہیں کی۔ ان کی مذّمت کرنے کے سلسلے میں دوسروں کی ہم نوائی نہیں کی بلکہ وہ اکثر ان کی طرف داری ہی کرتے تھے۔ شاید وہ نعمان بھائی کی مجبوریوں اور نفسیات سے واقف ہو گئے تھے۔ امّاں نے بھی کبھی نعمان بھائی کو نہیں ڈانٹا۔ نہ کسی بات پر انہیں برا بھلا کہا۔ دوسرے ان کی برائیاں کرتے تو وہ خاموش ہو جاتیں یا پھر ٹھنڈی آہ بھر کر کہتیں "اللہ کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔"

نعمان بھائی کی مجبوریاں اور محرومیاں ایک ایک کر کے ہمارے ذہن کے پردہ فلم پر چلتی رہیں۔ ہمارا دل بھر آیا اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ ڈاکٹر مسعود نے ہمیں بڑے پیار اور رسان سے سمجھانے کی کوشش کی۔ لوگ ہمدردی کے الفاظ کے سوا دوسروں کو اور دے بھی کیا سکتے ہیں؟

کچھ دیر بعد ہوش ٹھکانے آئے تو ہم نے بھرّائی ہوئی آواز میں ان سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب! کیا آپریشن سے یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

انہوں نے کہا "دیکھیے۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے تو میرا جواب یہی ہو گا کہ ان کا آپریشن ہونا چاہیے مگر ایک دوست اور بھائی کی حیثیت سے میں آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ ان کی بیماری کافی بڑھ چکی ہے۔ آپریشن سے سوائے اخراجات اور مریض کی تکلیف میں اضافے کے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ میں آپ کو آپریشن کرانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

"تو پھر؟"

"ان کی تھراپی کریں گے۔ انشاء اللہ اس سے فائدہ ہو گا۔"

کچھ دن تو وہ ہسپتال ہی میں رہے پھر ڈاکٹر صاحب کے مشورے پر ہم انہیں گھر لے آئے کیونکہ وہ ہسپتال میں خوش نہیں تھے۔ حالانکہ انہوں نے وہاں نت نئی دلچسپیاں ڈھونڈلی تھیں۔ ہر ایک سے ان کی دوستی ہو گئی تھی.... سارا دن گپ شپ رہتی تھی مگر وہ گھر جانے کے لیے بے چین تھے۔ ان کی بیڑی نوشی پر ڈاکٹر صاحب نے پابندی عائد کر دی تھی مگر جب ان کی بے چینی دیکھی تو یہ پابندی ہٹا دی۔

ہم نے حیران ہو کر پوچھا" مگر ڈاکٹر صاحب"....

ڈاکٹر صاحب بولے" دیکھیے آفاقی صاحب ! انہیں جو نقصان پہنچنا تھا وہ پہنچ چکا ہے۔ اگر دو چار بیڑیاں پینے سے انہیں خوشی اور سکون حاصل ہوتا ہے تو کیا حرج ہے"!

ڈاکٹر مسعود کا تجزیہ بہت حقیقت پسندانہ تھا۔

خدا جانے نعمان بھائی کو اپنی بیماری کی نوعیت اور سنگینی کا علم تھا یا نہیں۔ کم از کم ہم نے تو انہیں بھنک تک نہیں پڑنے دی تھی۔ امّاں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا مگر وہ بہت ذہین اور حسّاس تھے۔ ہسپتال میں یقیناً انہیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہو گا مگر انہوں نے ہم پر یا کسی اور پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس راز کو انہوں نے اپنی دانست میں خود اپنی ذات تک ہی محدود رکھا تھا۔ علاج ہوتا رہا۔ تھراپی کا سلسلہ بھی وقتاً فوقتاً جاری رہا مگر نعمان بھائی کی صحت گرتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ ہڈّیوں کی مالا بن کر رہ گئے مگر کبھی نہ کوئی شکوہ نہ شکایت۔ حالانکہ ان کے پاس شکایتوں کی کیا کمی تھی۔ زندگی نے انہیں دیا ہی کیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تو بچپن سے بھی محروم رہے تھے مگر کیا مجال جو حالات کا رونا روتے ہوئے نظر آئیں۔ وہ ہر حال میں راضی بہ رضا تھے۔ نہ کبھی کسی کو جان بوجھ کر دکھ پہنچایا۔ نہ تکلیف دی۔ نہ نقصان پہنچایا۔ حتی الامکان دوسروں کے کام ہی آتے رہے۔ درویش اور کیسے ہوتے ہیں؟

امّاں انہیں دیکھ دیکھ کر کُڑھتی تھیں۔ چپکے چپکے رویا کرتی تھیں۔ انہوں نے ہر طرح کی پابندی ختم کر دی تھی۔ سگریٹ' بیڑی' چائے' یہی تو ان کی ضرورتیں تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ وہ جو مانگے دے دیا کرو۔ جو جی میں آئے کرنے دو۔ اس معاملے میں امّاں اور اسپیشلسٹ ڈاکٹر کی تشخیص ایک ہی تھی۔

اِدھر یہ گھریلو پریشانیاں تھیں' اُدھر فلم کی مصروفیات اور الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں مگر صبح اسٹوڈیو جاتے ہوئے اور رات کو گھر واپس لوٹنے پر ہم نعمان بھائی کے پاس ضرور جایا کرتے تھے۔ خواہ رات کے دو ہی کیوں نہ بج جائیں۔ وہ بھی انتظار میں رہتے تھے۔ جاگتے رہتے تھے۔ بار بار وقت پوچھتے تھے۔ پھر کہتے" بھئی بہت دیر ہو گئی۔ امّاں تم بھی اسے کچھ نہیں کہتیں۔ اس طرح صحت کیسے ٹھیک رہے گی؟"

مگر انہوں نے خود کبھی ہم سے کچھ نہیں کہا۔

گُھلتے گُھلتے نعمان بھائی ایک دن چپ چاپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جواں مرگی ہی کہنا چاہیے، اس لیے کہ ان کی عمر اس وقت چالیس بیالیس سے زیادہ نہیں تھی۔ امّاں کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا۔ بس وہ چُپ چاپ رہ گئی تھیں۔ اسٹوڈیو میں کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی اور ہم نعمان بھائی کو سپردِ خاک کر آئے۔ ان کی بیماری کا عرصہ کافی طویل تھا اور اس نے ذہنی طور پر ہمیں ہلکان کر دیا تھا۔

اس سے کم و بیش ایک سال پہلے آکا میاں بھی کئی مہینے بیمار رہنے کے بعد دنیا سے رُخصت ہو گئے تھے۔ سچ پوچھیے تو باشعور ہونے کے بعد ہمارے قریب ترین رشتے داروں میں آکا میاں کے انتقال کا صدمہ ہمارے لیے اوّلین صدمہ تھا۔ اس کے ایک سال بعد نعمان بھائی کی طویل بیماری اور پھر وفات کا غم اٹھانا پڑا۔

آکا میاں کی بیماری نے بھی ہمیں بہت پریشان کیے رکھا تھا۔ نعمان بھائی کو تو تکلیف نہیں تھی پھر وہ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے مگر آکا میاں نے بہت تکلیف اٹھائی۔ تکلیف کا سبب یہ تھا کہ ایک بار ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہوئے ٹیکسی کو حادثہ پیش آگیا تھا اور جھٹکے سے ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس عمر میں آپریشن مزید پریشانی اور تکلیف کا سبب بن جاتا اس لیے ڈاکٹروں نے دوائیوں کے ذریعے علاج جاری رکھا مگر تکلیف میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ جہاں تک ممکن تھا وہ تکلیف برداشت کرتے تھے مگر وہ برداشت سے باہر بھی ہو جاتی تھی۔ پھر آکا میاں کسی نئے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے لیے کہتے۔ حکیم، ڈاکٹر، ہومیو پیتھک، تعویز، گنڈے، سبھی کچھ آزما کر دیکھ لیا تھا مگر کوئی فائدہ نہ تھا۔ پھر بھی ان کی خوشی پوری کرنے کے لیے وہ جس معالج کا نام لیتے اس کا علاج شروع کر دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ کئی مہینے تک جاری رہا۔ ان کی تکلیف اور بے چینی ہم سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ہر روز صبح جانے سے پہلے ہم ڈرتے ڈرتے ان کے کمرے میں جا کر مزاج پرسی کرتے تو وہ کسی نئے علاج کی فرمائش کر دیتے تھے۔ رات گئے ہم گھر لوٹتے تو آکا میاں ہمارے انتظار میں جاگ رہے ہوتے تھے۔ بار بار ہمارے بارے میں دریافت کرتے اور گھڑی دیکھتے رہتے۔

ہم رات گئے چوروں کی طرح گھر میں قدم رکھتے۔ امّاں سے حال احوال پوچھتے اور ہماری کوشش یہی ہوتی تھی کہ آکا میاں کے کمرے میں نہ جائیں۔ ان کی اذیّت ہم سے دیکھی نہیں جاتی تھی مگر امّاں کا اصرار ہوتا تھا کہ ان سے جا کر

ضرور ملیں۔

"وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر جا کر نہیں ملو گے تو رات بھر جاگتے رہیں گے۔"

ہم پوچھتے "امّاں۔ انہیں زیادہ تکلیف تو نہیں ہے؟"

"تکلیف تو ہے بیٹا۔ مگر تم اپنا دل مضبوط کرو۔ ہم عورتیں ہو کر سب کچھ برداشت کرتے ہیں۔ تم تو پھر مرد ہو۔"

آکا میاں کی تکلیف اور بیماری بڑھتی رہی۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا درد کم کرنے والی گولیوں اور انجکشنوں کے سوا ان کے پاس کوئی اور علاج نہ تھا۔ ان کا اثر بھی ایک دو گھنٹے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے مگر اب تک بیمار کو تکلیف سے نجات دلانے کے لیے کوئی موثر دوا ایجاد نہیں کر سکی ہے۔

ان ہی دنوں سعید ہارون صاحب کی نئی فلم کے لیے نئے چہرے تلاش کرنے کے لیے بمبئی جانے کا پروگرام بنایا گیا۔ ہدایت کار جاوید ہاشمی بھی ہمارے ساتھ جا رہے تھے کیونکہ بمبئی کے فلمی حلقوں میں ان کے وسیع ذاتی تعلقات تھے۔ انڈیا کا ویزا بہت مشکل سے ملتا تھا مگر سعید ہارون صاحب نے یہ مشکل بھی آسان کرلی۔ ٹکٹ بن گئے۔ تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں مگر ہمارا دل نہیں مانتا تھا۔ کئی ہفتوں سے آکا میاں کی بیماری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ انہوں نے ہمارے جانے کے بارے میں سنا تو پوچھا "کتنے دن کے لیے جائیں گے؟"

امّاں نے کہا "ایک ہفتہ تو لگ ہی جائے گا۔"

آکا میاں چُپ ہو گئے۔ رات کو ہم گھر پہنچے تو انہوں نے ہمیں اپنے کمرے میں بلایا اور کہا "بھئی میرا حال تو ایک ہی جیسا ہے۔ تم میری وجہ سے اپنی روانگی ملتوی نہ کرنا۔ اللہ نے چاہا تو ہفتہ دس دن بعد آ ہی جاؤ گے۔"

مگر اس رات ہمیں نیند نہیں آئی۔ کافی بے چینی رہی۔ صبح ہم نے سعید ہارون صاحب کو کراچی فون کر کے بتادیا کہ اپنے والد کی علالت کے باعث ہم ان کے ہمراہ نہ جا سکیں گے۔ مجبوراً وہ اور جاوید ہاشمی صاحب بمبئی چلے گئے اور وہاں سے اداکارہ صوفیہ بانو کو تلاش کر کے لے آئے مگر ان کی واپسی سے پہلے ہی ایک دن آکا میاں کا انتقال ہو گیا۔ ہم نے اللہ کا شُکر ادا کیا کہ عین وقت پر بمبئی جانے کا پروگرام منسوخ کر دیا تھا ورنہ عمر بھر پچھتاوا ہی رہتا۔

اوپر تلے ان دو صدمات نے ہمارے ڈپریشن اور ٹینشن میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔ ایک طرف فلم کی مصروفیات اور

پریشانیوں ، کبھی ڈسٹری بیوٹر قسط نہیں بھیج رہا ہے مگر پیسے لینے والوں سے ہم نے ایک مقررہ تاریخ تک ادائیگی کرنے کا وعدہ کرلیا ہے۔ وعدہ تو ہر قیمت پورا کرنا ہے لہٰذا اس کے لیے تگ ودو اور ذہنی الجھن کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ کبھی موسم خراب ہونے کی وجہ سے عین وقت پر شوٹنگ ملتوی ہو گئی ہے۔مالی نقصان کے علاوہ اداکاروں کی مزید تاریخیں حاصل کرنا ایک مسئلہ ہے۔ کبھی بیک وقت تمام اداکاروں کو یکجا کرنا دوبھر ہو رہا ہے۔اگر سب چیزیں موجود ہیں تو اچانک موسم خراب ہو گیا ہے اور ساری محنت پر پانی پھر گیا ہے۔ کبھی تمام اداکار بمشکل اکٹھّے دستیاب ہو گئے ہیں تو شوٹنگ سے پہلے اچانک کوئی فنکار بیمار ہو گیا ہے اور شوٹنگ ملتوی کرنی پڑتی ہے۔ کبھی اسٹوڈیو میں وقت پر سیٹ تعمیر نہیں ہو سکا ہے مگر ہمیں ایک مقررہ تاریخ کو بہر حال شوٹنگ مکمل کرنی ہے۔ کبھی اسٹوڈیو میں کیمرا خراب ہونے کی وجہ سے کام رُک گیا ہے تو کبھی لیبارٹری میں فلم نیگیٹو خراب ہو گیا ہے اور بنی بنائی فلم غارت ہو گئی ہے۔

ایک طرف یہ تمام الجھنیں اور پریشانیاں تو دوسری طرف گھر میں شدید بیماریوں کی وجّہ سے سخت ذہنی عذاب اور اذیّت سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ان تمام چیزوں نے آہستہ آہستہ ہمارے ذہن کو پراگندہ کر دیا تھا۔ہر وقت ذہنی تفکّرات اور پریشانیاں۔اس پر طرّہ یہ کہ کھانے ’پینے‘ سونے اور بیدار ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔

ناشتا تو ہم اپنے گھر سے کر کے نکلتے تھے اور اس میں بہت بڑا ہاتھ امّاں کی محبت کا تھا مگر اس کے بعد کچھ پتا نہیں کہ دوپہر کا کھانا کب کھائیں گے اور کیا کھائیں گے۔ بازار کا کھانا تکّے کباب اور بے انتہا مرچوں اور مسالوں والے کھانے وقت بے وقت کھاتے رہتے۔ سارا دن چائے اور کافی کا دور چلتا تھا۔سگار اور پائپ ہر وقت چوسنی کی طرح ہمارے منہ سے لگے رہتے تھے۔درمیانی وقت میں مسلسل سگریٹ نوشی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

مختصر یہ کہ کوئی بے اعتدالی اور بے تُکی حرکت ایسی نہ تھی کہ جو ہم سے سرزد نہیں ہو رہی تھی اور یہ سلسلہ چند ہفتے یا چند مہینے نہیں‘ سالوں تک جاری رہا۔گیس اور تیزابیت کے ہم پہلے ہی مریض تھے اور کئی سال قبل ڈاکٹروں نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ اگر اپنی سلامتی چاہتے ہو تو وقت پر کھانا کھاؤ۔چائے کافی سارے دن میں دو تین پیالی سے زیادہ نہ استعمال کرو۔ سگریٹ پائپ اور سگار سے مستقل پرہیز کرو۔ خالی معدے میں چائے کا استعمال ہرگز نہ کرو۔ مرچ مسالا، بازار کے کھانے، تکّے کباب سے ہمیشہ کے لیے توبہ کرلو، وقت پر جاگو‘ وقت پر سوجاؤ‘ وقت پر کھانا کھاؤ‘

ان ہدایات کی روشنی میں ان سردار جی کا وہ لطیفہ یاد آتا تھا جنہیں ڈاکٹر نے مرچ مسالا' مرغن کھانے' چائے کافی' شراب وغیرہ سے مکمل پرہیز کرنے کا مشورہ دیا تھا اور کہا تھا کہ بصورتِ دیگر زندہ نہیں رہو گے۔

سردار جی اطمینان سے سنتے رہے پھر فرمایا "ان سب چیزوں کو چھوڑنے کے بعد زندہ رہنے کا فائدہ کیا ہو گا۔ایسی زندگی سے تو مرنا اچھا ہے۔"

خیر۔ہم نے اپنے ڈاکٹروں کو یہ جواب تو نہیں دیا تھا مگر ان کے کسی مشورے پر کان بھی نہیں دھرا تھا۔یہ سب بے اعتدالیاں تو تھیں ہی' اس پر فلم کی پریشانیوں نے ہمارے ذہن کو مزید پراگندہ کر دیا تھا۔ڈاکٹروں نے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ اگر صحت اور تندرستی مطلوب ہے تو ذہنی پریشانی سے دور رہو اور کوئی ایسا کام نہ کرو جس کی وجہ سے ٹینشن یا ذہنی پریشانی ہو مگر ہم اس ہدایت کی بھی خلاف ورزی کر رہے تھے اور ہزار پریشانیوں کی ایک پریشانی یعنی فلمسازی کی مصیبت اپنے گلے میں ڈال بیٹھے تھے۔ ان سب چیزوں کا جو نتیجہ برآمد ہوا اس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں اور شاید ساری عمر بھگتتے رہیں گے۔اب ہمارا یہ عالم ہے کہ کسی کو ذرا بھی بیمار دیکھتے ہیں تو نصیحتوں اور مشوروں کا دریا بہا دیتے ہیں یہاں تک کہ سننے والا عاجز آتا ہے اور سوچتا ہے کہ خدا جانے اس شخص کا اس میں کیا فائدہ ہے کہ پیچھے ہی پڑ گیا ہے حالانکہ ہمارا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہوتا۔ہم تو صرف یہ سوچتے ہیں کہ بے پروائی میں اس شخص کا بھی کہیں وہ انجام نہ ہو جو ہمارا ہو چکا ہے۔

"کنیز" کی تکمیل کے بعد ہم نے کافی عرصے عیش و آرام کیا مگر کہاں تک بے کار ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے۔سب نے ہمیں طعنے دینے شروع کر دیے تھے کہ بھئی اب کب تک کام نہیں کرو گے۔ایک کامیاب فلم کے فوراً بعد فلم شروع کر دینا ہی دانشمندی ہے۔اس کامیابی سے تمہیں فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔کوئی اور ہوتا تو اب تک دو تین فلمیں بیک وقت شروع کر چکا

ہوتا جو اچھے داموں فروخت بھی ہو جاتیں۔کاروبار کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔آخر دنیا والوں کی باتوں سے تنگ آکر ہم نے اگلی فلم کے لیے کہانی سوچنی شروع کر دی۔

شباب کیرانوی صاحب کا مشورہ تھا کہ ''کنیز'' ہی کی ٹائپ ایک کہانی بناؤ اور اس کامیابی سے فائدہ اٹھاؤ مگر ہم اس کے حق میں نہ تھے کہ اپنی ایک کامیابی کو تھام کر بیٹھ جائے اور اس دائرے سے باہر ہی نہ نکلے۔ ہمارا خیال تھا کہ ایک کامیاب فلم کے بعد اسی انداز کی فلمیں بناتے رہنا عجیب بے تُکی سی بات ہے اور بنانے والے کی ذہنی مفلسی کو ظاہر کرتی ہے۔ بات تو تب ہے کہ مکّھی پر مکّھی مارنے کے بجائے ہر بار ایک مختلف قسم کی کہانی فلمائی جائے۔ ہم اس خیال کے پیش نظر مختلف کہانیوں کے تانے بانے بُن رہے تھے لیکن کوئی آئیڈیا دل کو نہیں لگ رہا تھا۔ اُدھر حسن طارق صاحب کے تقاضے جاری تھے کہ آفاقی صاحب جلدی سے سبجیکٹ تیار کیجیے تاکہ نئی فلم کا آغاز کیا جائے۔

اس دوران کئی فلمساز ہم سے کہانی لکھوانے کے خواہش مند ہوئے اور ہم نے اس عرصے میں ایک دو سکرپٹ بھی لکھے تھے مگر خود اپنے لیے ہمیں کوئی مناسب کہانی دستیاب نہ ہو سکی تھی۔

اُدھر فلم ڈسٹری بیوٹرز میں اس مسئلے پر شرطیں لگ رہی تھیں کہ ہم اپنی اگلی فلم کے حقوق اپنے پرانے تقسیم کاروں کو ہی دیں گے یا کسی اور کو؟

ایک روز ہم حسب معمول صبح دس بجے بیدار ہوئے۔ گیارہ بجے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچے تو وہاں حسب معمول امّاں پہلے ہی منتظر تھیں۔ ناشتے کی میز انواع و اقسام کے کھانوں سے بھری ہوئی تھی جس کی تفصیل ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ امّاں کی کوشش تھی کہ ہم سبھی کچھ چٹ کر جائیں۔ ان کے اصرار پر ہم پراٹھا' آملیٹ' سبزی' ہنٹر بیف' ملائی' دہی' شہد' پھل' کھجوریں اور حلوا کھا چکے تھے۔ اب ان کا اصرار تھا کہ وہ کیک بھی ضرور چکھیں جو گزشتہ روز چائے کے وقت منگایا گیا تھا مگر ہم غیر حاضر ہونے کی وجہ سے نہ کھا سکے تھے۔ ابھی چائے اور دودھ بھی ہمارے منتظر تھے جس میں ڈالنے کے لیے امّاں نے اوولٹین اور ہاٹ چاکلیٹ سامنے میز پر رکھ دیا تھا۔ اِدھر ہمارا یہ حال تھا کہ ہمارا پیٹ پھٹنے کے قریب تھا۔ یہ ہر روز کا معمول تھا۔ ناشتا ایک ایسی چیز تھا جو ہمیں لامحالہ گھر پر ہی کرنا پڑتا تھا اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر امّاں کی کوشش ہوتی تھی کہ لنچ اور ڈنر تک کے حصّے کی تمام خوراک ہمیں کھلا دی جائے کیونکہ بقول ان کے صرف ناشتا ہی ہم گھر پر ان کی نگرانی میں کرتے تھے۔ سارے دن یا تو بھوکے رہتے تھے یا الابلا کھا کر گزارہ کرتے تھے۔ خدا خدا کر کے ہم چائے کی ایک پیالی اور دودھ کا ایک گلاس ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

امّاں ہمیں دودھ کا ایک اور گلاس پلانا چاہتی تھیں۔ان کا کہنا تھا کہ چائے تو ہم تمام دن پیتے ہی رہتے ہیں۔ صبح ناشتے میں توہمیں دو تین گلاس دودھ پینا چاہیے۔ان دنوں ہماری صحت بہت اچھی تھی۔ گیس اور معدے میں جلن کے سوا ہمیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔وزن بھی مناسب تھا یعنی 136 پاؤنڈ کے قریب۔ہمارا پیٹ بھی کسی حد تک پیٹ نظر آنے لگا تھا جسے دیکھ دیکھ کر ہم بہت خوش ہوا کرتے تھے کہ اب کچھ دن بعد ہم بھی دوسروں کی طرح اپنے پیٹ پر پیٹی باندھنے کے لائق ہو جائیں گے۔صحت مندی کی علامت کے طور پر ہمارا رنگ بھی اُجلا اور سرخی مائل ہو گیا تھا۔ہم اپنے آپ کو تندرست وتوانا محسوس کرتے تھے اور شب وروز کام کرنے کے باوجود تھکن نام کی چیز سے بے خبر تھے۔ یہ سب تو تھا مگر امّاں کا خیال یہ تھا کہ رات دن کی محنت' شب بیداری' بے وقت کھانے' سونے جاگنے اور ہوٹلوں کے فضول کھانے کھا کر ہماری صحت خراب ہوگئی ہے۔رنگ پیلا پڑ گیا ہے۔چہرہ اُتر گیا ہے اور ہم مہینوں کے بیمار نظر آنے لگے ہیں۔حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی مگر ''ماؤں'' کے سوچنے کا انداز دوسروں سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ہر شخص جو دنیا میں آتا ہے اس کا واسطہ ماں سے ضرور پڑتا ہے اور وہ بخوبی جانتا ہے کہ یہ اللہ نے کس قسم کی مخلوق بنائی ہے۔

جاڑوں کا موسم تھا۔ہم سوٹ بوٹ پہن کر گھر سے باہر نکلنے کے لیے تیار تھے اور بقول امّاں کے اب رات ہی کو کسی وقت گھر لوٹنے کا پروگرام تھا۔ہمارے اس معمول کو وہ ایک ہی فقرے میں یوں بیان کرتی تھیں کہ بیٹا تمہاری تو وہی مثال ہے کہ صبح کی نکلی دیا سلائی' رات کو گھر میں آئی۔ڈرائیور نے ہمارا بریف کیس کار میں رکھ دیا تھا اور اس سے پہلے چپکے سے یہ بھی چیک کر لیا تھا کہ سگار' پائپ اور تمباکو وغیرہ اس میں موجود ہے۔ ہماری تمباکو نوشی امّاں سے ''خفیہ'' تھی۔کم از کم ہم یہی سمجھتے تھے کیوں کہ ہم کبھی گھر کی چار دیواری کے اندر تمباکو نوشی نہیں کرتے تھے۔امّاں کو اس کا علم تھا یا نہیں' ہمیں کبھی پتا نہ چل سکا مگر انہوں نے کبھی یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ انہیں ہماری تمباکو نوشی کا علم ہے۔ غالباً وہ جان بوجھ کر انجان بن گئی تھیں۔

امّاں سے رُخصت ہو کر ہم باہر نکلنے لگے تو طبیعت کچھ کسل مند سی لگی۔اچانک اتنی سستی سوار ہوئی کہ کچھ دیر لیٹنے کو جی چاہنے لگا۔ہم امّاں کے پاس جا کر لیٹے تو انہوں نے تشویشناک انداز میں دیکھا اور پوچھا ''کیا بات ہے۔طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟''

"ہاں امّاں۔ بالکل ٹھیک ہے۔بس ذرا سُستی سی آگئی ہے۔"

وہ کہنے لگیں "بیٹا! دن رات کام کرو گے تو یہی ہو گا۔ مشین تک کو آرام نہ دیا جائے تو وہ خراب ہو جاتی ہے۔ تم تو گوشت و پوست کے بنے ہوئے انسان ہو۔"

اظہارِ ناراضگی کے باوجود وہ خوش تھیں کہ اس بہانے ہم کچھ دیر اور ان کے پاس رُک جائیں گے۔

کچھ دیر بعد ہمیں متلی محسوس ہونے لگی اور گھبراہٹ سی طاری ہو گئی۔امّاں نے فوراًالائچی اور پان کھلایا مگر طبیعت کی بے چینی کم نہ ہوئی تو ہم نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے کہ ہمیں اُلٹی آنے والی ہے۔ ہم غسل خانے کی طرف لپکے تو امّاں پریشان ہو کر ہمارے پیچھے پیچھے چلی آئیں۔فوراًہی ہمیں ایک الٹی آئی مگر یہ خون کی الٹی تھی۔گاڑھا گاڑھا سُرخ خون دیکھ کر ہم گھبرا گئے۔

"امّاں۔۔۔خون"!

"خون!" اماں نے گھبرا کر پوچھا اور تیزی سے غسل خانے میں پہنچ گئیں۔

"اللہ خیر۔یہ کیا ہوا؟" انہوں نے پریشان ہو کر کہا۔

جواب دینے کے بجائے ہم مزید الٹیاں کرنے میں مصروف ہو گئے۔یکے بعد دیگرے خون کی چھ الٹیاں ہوئیں تو نہ صرف غسل خانے کا بیسن بھر گیا بلکہ فرش بھی گلنار ہو گیا اور خون کے چھینٹے ہمارے لباس کو بھی رنگین کر گئے۔

اتنی مقدار میں اپنا خون دیکھ کر ہم واقعی بوکھلا گئے۔چکّر سے آنے لگے۔شاید یہ نفسیاتی اثر تھا ورنہ فوری طور پر خون خارج ہونے سے یک لخت اتنی کمزوری تو نہیں ہوتی کہ انسان بے ہوش ہو جائے۔ہم تو شاید سنبھل جاتے مگر امّاں کا سفید چہرہ' کانپتے ہوئے لب اور اشک بھری آنکھیں دیکھ کر ہماری ہمت بھی جواب دے گئی۔آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھایا اور پھر کچھ پتا نہیں کہ کیا ہوا۔

ہوش آیا تو ہم غسل خانے کے فرش پر دراز تھے۔امّاں کی آوازیں ہمارے کانوں میں گونج رہی تھیں جو ہمیں پکار رہی تھیں اور ساتھ ہی نوکروں کو آواز دے کر فوراًڈاکٹر کو فون کرنے کی ہدایت دے رہی تھیں۔اس وقت گھر میں نوکروں کے سوا کوئی اور مرد موجود نہ تھا۔بعد میں معلوم ہوا کہ ہم چار پانچ منٹ تک بے ہوش رہے تھے۔

ڈاکٹر اکرم ماڈل ٹاؤن میں سب سے اچھے اور ہر دل عزیز ڈاکٹر تھے۔ بے حد خوش اخلاق اور ہنس مکھ آدمی تھے۔ ان کے ہاتھ میں شفا بھی تھی اس لیے سارے ماڈل ٹاؤن میں وہ مشہور تھے۔ بچّوں کو بہلانے کے لیے انہوں نے باقاعدہ ٹافیوں اور لیمن ڈراپس کا بندوبست کر رکھا تھا اسی لیے بچّے بہت شوق سے ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر اکرم ریٹائرڈ فوجی میجر تھے۔ جب ہم نے پہلی بار انہیں دیکھا تو وہ سانولے سلونے جوان رعنا تھے۔ گفتگو بہت شائستگی اور نرمی سے کرتے تھے۔ مسکراہٹ ہر وقت ان کے چہرے پر کھیلتی رہتی تھی۔ ہمیشہ صاف ستھرے اور خوش لباس رہتے تھے۔ انہوں نے ساری زندگی شادی نہیں کی۔ کنوارے ہی رہے۔ ان کی والدہ ان کے ساتھ رہا کرتی تھیں اور انہیں ساری دنیا میں سب سے زیادہ محبت اپنی والدہ ہی سے تھی۔ ان کی وسیع و عریض کوٹھی کا ایک مختصر حصّہ کلینک کے طور پر مخصوص تھا۔ باقی میں وہ اور ان کی والدہ رہتے تھے۔ ایک سیاہ رنگ کا لمبا چوڑا کتّا ہمیشہ ان کا رفیق رہا۔ یہ کتّا خاموشی سے کوٹھی کے برآمدے میں لیٹا رہتا تھا۔ آنے جانے والوں کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ خدا جانے رات کے وقت وہ چوکیداری کے فرائض سرانجام دیتا تھا یا نہیں لیکن دن کے وقت تو ہم نے اسے ہمیشہ خاموش اور سوتا ہوا ہی پایا۔ کئی بار تو ہمیں یہ شبہ ہوا کہ کہیں وہ گونگا تو نہیں ہے۔

ڈاکٹر اکرم کا یہ دستور تھا کہ وہ صرف دن ہی کے وقت دستیاب ہوتے تھے۔ سہ پہر کے بعد ڈاکٹر اکرم کو تلاش کرنا کارِ دارد تھا۔ وہ شام کے وقت کبھی اپنے گھر میں موجود نہیں ہوتے تھے بلکہ دوست احباب کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے باہر چلے جاتے تھے۔

ڈاکٹر اکرم کی ایک خوبی اور بھی تھی۔ جس طرح ان کا کتّا کبھی تبدیل نہیں ہوا اسی طرح ان کا کمپاؤنڈر بھی ہمیشہ ایک ہی رہا۔ کمپاؤنڈر کا نام عجب خاں تھا۔ ڈاکٹر صاحب مریض کا حال سن کر نسخہ لکھتے اور پھر پکارتے ''عجیب خان!'' ساتھ والے کمرے سے عجب خاں برآمد ہو جاتا تھا۔ وہ خاموشی سے نسخہ اٹھا کر لے جاتا اور دوائی بنا کر ڈاکٹر صاحب کے سامنے رکھ دیتا تھا۔

ہمیں ڈاکٹر صاحب کے پاس جاتے ہوئے سالہا سال گزر گئے مگر ان کا کمپاؤنڈر عجب خاں ہی رہا۔ ایک بار ہم نے ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ عجب خاں کچھ بدلا بدلا نظر آ رہا ہے۔ دوبارہ بغور دیکھا تو اس کا لباس اور حُلیہ ہی نہیں، شکل و

صورت اور قد و قامت بھی بدلی ہوئی دیکھی۔

ہم نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا ''ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کا عجب خان کچھ بدلا ہوا نظر نہیں آ رہا؟''

وہ مسکرائے اور بولے '' بالکل۔''

پوچھا '' مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ یہ وہ عجیب خاں نہیں ہے۔ پچھلے بیس سالوں میں کئی کمپاؤنڈر بدل چکے ہیں مگر ہر ایک کا نام میں عجب خاں ہی رکھ دیتا ہوں۔''

ہم حیران رہ گئے ''اس کی کوئی خاص وجہ ہے یا کوئی ٹوٹکا ہے؟''

ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور کہا'' بات یہ ہے کہ جب میں نے پہلا کمپاؤنڈر رکھا تھا تو اس کا نام کافی مشکل تھا۔ فوج میں ہمارے ساتھ ایک لڑکا ہوتا تھا جس کا نام عجب خاں تھا۔ یہ نام میری زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ بس میں نے کمپاؤنڈر کو بھی عجب خاں کہنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد تو یہ نام ایسا زبان پر چڑھا کر جو کوئی بھی کمپاؤنڈر آتا ہے میں اسے عجب خاں ہی پکارتا ہوں۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ میرے پرانے مریض بھی خوش رہتے ہیں۔''

ڈاکٹر اکرم کی تشخیص بہت اچھی تھی۔ چالیس پچاس سال پہلے ٹیسٹ اور چیک اپ کا رواج نہ تھا۔ نہ ہی اسپیشلسٹ ہوتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ ان دنوں سارے لاہور شہر میں تین چار سے زیادہ اسپیشلسٹ نہیں تھے۔ اسپیشلسٹ کی فیس تیس روپے تھی جو بہت زیادہ تصوّر کی جاتی تھی اور بہت کم لوگ ہی ہمّت کر کے اسپیشلسٹ سے رجوع کرتے تھے۔ آج کی طرح نہیں کہ ہر روز سینکڑوں مریض اسپیشلسٹ کے پاس بیٹھے رہتے ہیں اور اس کے کلینک پر کسی ہسپتال کا گمان گزرتا ہے۔ اسپیشلسٹ بھی محض مریض کو شکل دکھانے کے عوض تین چار سو یا پانچ سو فیس وصول کر لیتے ہیں اور رات کو ایک دو بجے تک مریض بھگتاتے رہتے ہیں۔

ہم بتا رہے تھے کہ ٹیسٹ وغیرہ کا ان دنوں رواج نہ تھا۔ خون کا ٹیسٹ کرانے کی فیس دو روپے ہوا کرتی تھی۔ بعد میں رفتہ رفتہ اس میں اضافہ ہو گیا مگر گوالمنڈی میں یاسین لیبارٹری کے یاسین صاحب جب تک زندہ رہے دو روپے ہی وصول کرتے رہے۔ بلڈ ٹیسٹ کی رپورٹ کے ساتھ وہ سورہ یٰسین کا ایک پمفلٹ اور ہدایات کا ایک پلندہ بھی مریض

کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ کم از کم ہمیں تو انہوں نے کبھی چائے پلائے بغیر نہیں چھوڑا تھا۔ اس زمانے میں جنرل پریکٹس کرنے والے یا فیملی ڈاکٹر ہی سب کچھ ہوتا تھا۔ جب ڈاکٹر صاحب کو گھر میں بلایا جاتا تھا تو سارا گھر قطار لگا کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور وہ باری باری سب کو دیکھتے‘ مشورہ دیتے اور نسخہ لکھ دیتے تھے۔ گھر بلانے کی فیس پانچ یا زیادہ سے زیادہ دس روپے ہوتی تھی جس میں سارا گھر بُھگت جاتا تھا۔ یہ ڈاکٹر ہر فن مولا ہوتے تھے۔ دانت ‘منہ‘ آنکھیں‘ گلا کھانسی، داد۔ چنبل‘ پیچش‘ ٹائی فائیڈ‘ خسرہ ہر قسم کے مرض کا علاج کرتے تھے۔ گلے کی خرابی کے لیے عموماً روئی کی پھریری بنا کر تھروٹ پینٹ لگا دیا جاتا تھا۔ چند لمحے ابکائیاں آتی تھیں مگر مریض تندرست ہو جاتا تھا۔ نہ اینٹی بائیوٹک نہ ٹیسٹ اور دوسری مصیبتیں‘ اس طرح عام بیماریوں کے لیے عموماً مکسچر بنا کر دیا جاتا تھا۔ یوں تو یہ بے مزہ اور کڑوی دوا ہوتی تھی مگر بے حد سستی اور انتہائی فائدہ مند تھی۔

ڈاکٹر اکرم بھی ٹیسٹ کرائے بغیر ہی مرض تشخیص کر دیا کرتے تھے اور دوسرے ہی دن مریض تندرست ہو جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب دنیا بدلی تو ڈاکٹر اکرم بھی بدل گئے۔ رفتہ رفتہ ان کی دوائیوں کی قیمت میں اضافہ ہونے لگا۔ پھر انہوں نے ایک لیبارٹری بھی قائم کر لی۔ ہر مریض کا ٹیسٹ وہیں لے لیا کرتے تھے اور مریض کو یہ اطمینان ہوتا تھا کہ بلاوجہ کسی اور لیبارٹری میں جانے سے محفوظ رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا فائدہ الگ تھا۔ یعنی دونوں فریق فائدے میں رہتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر اکرم ایک مہنگے ڈاکٹر بن گئے۔ ان کے پاس جانے والوں کو اکثر ٹیسٹ وغیرہ کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ کمپاؤنڈر البتہ ان کا وہی عجب خاں رہا اور کتّا بھی وہی جو خاموشی سے برآمدے یا کمرے میں پڑا سوتا رہتا تھا۔

ایک دن ہم نے پوچھا ’’ڈاکٹر صاحب۔ آپ کا کتّا ہر وقت سوتا ہی رہتا ہے۔ یہ کبھی جاگتا بھی ہے کہ نہیں؟‘‘

مسکرا کر بولے ’’رات بھر جاگتا ہے اسی لیے دن میں سوتا ہے۔‘‘

ہم نے کہا ’’مگر ایسی بھی کیا نیند کہ ہم نے اسے کبھی سر اٹھاتے‘ کھاتے پیتے یا جماہی لیتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ کہیں آپ اسے سلیپنگ پلز وغیرہ تو نہیں کھلاتے؟‘‘

ڈاکٹر صاحب مسکرا کر خاموش ہو رہے۔یعنی یہ کہ آپ جو مطلب چاہیں نکال لیں۔

ہمیں خون کی اُلٹیاں کرتے دیکھا تو امّاں نے فوراً ڈاکٹر اکرم کو فون کر دیا اور مطمئن ہو گئیں کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ڈاکٹر اکرم پر ماڈل ٹاؤن والے بھروسا ہی اتنا کرتے تھے کہ انہیں دیکھتے ہی آدھی بیماری غائب ہو جاتی تھی۔

ڈاکٹر اکرم اور ہمارے ہمسائے رانا صفدر بیگ قریب قریب ایک ساتھ ہی گھر میں داخل ہوئے۔رانا صاحب کی کوٹھی اور ہماری کوٹھی کا پچھلا حصّہ ساتھ ہی ملا ہوا تھا۔رانا صاحب اور ان کے اہل خانہ سے ہم سب کے بہت اچھے تعلقات تھے۔جب امّاں پچھلے صحن میں بیٹھا کرتی تھیں تو رانا صاحب کی ننھی بچّیاں سیڑھی لگا کر دیوار پر چڑھ جاتیں اور ہمارے گھر والوں سے معصوم سی باتیں کیا کرتیں۔ہمارے گھر کے بچّے بھی ایسا ہی کرتے تھے۔یہ سیڑھی خواتین بھی استعمال کر لیا کرتی تھیں اور اس طرح باہمی گپ شپ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

امّاں کے کہنے پر کسی ملازم نے پچھواڑے سے آواز دے کر رانا صاحب کو مطلّع کر دیا تھا کہ صاحب کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔امّاں کہتی ہیں فوراً آ جائیے۔

رانا صاحب بھی ہماری امّاں کو امّاں ہی کہا کرتے تھے۔بلکہ وہ تو جگت امّاں تھیں۔ہماری اچانک بیماری کی خبر سنی تو وہ بھی گھبرا کر فوراً چلے آئے۔جب ہمیں اس حال میں دیکھا تو مزید گھبرا گئے۔ڈاکٹر اکرم نے ہم سے چند سوالات کیے اور فوراً یہ رائے ظاہر کی کہ آپ کا السر پھٹ گیا ہے۔

''السر؟'' ہم نے حیران ہو کر کہا ''ہمیں تو السر کی تکلیف نہیں ہے۔''

وہ بولے ''یہ آپ کا خیال ہے۔میں بھی سو فیصد یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر میرا اندازہ یہی ہے۔خون روکنے کے لیے میں آپ کو ایک انجکشن لگا دیتا ہوں مگر آپ بلا تاخیر ہسپتال چلے جائیے۔''

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے بیگ میں سے انجکشن اور سرنج نکالی اور فوری طور پر ایک انجکشن ہمارے بازو میں بھونک دیا۔

امّاں کو علم نہیں تھا کہ السر کیا بیماری ہوتی ہے۔انہوں نے بس ہمیں گاڑھے خون کی اُلٹیاں کرتے ہوئے دیکھا تھا اور حواس باختہ ہو گئی تھیں۔سچ پوچھئے تو اس وقت تک خود ہمیں بھی السر کے بارے میں بہت زیادہ معلومات نہ تھیں۔اتنا سنا تھا کہ یہ ایک خطرناک مرض ہوتا ہے اور ڈاکٹر عموماً اس کے مریضوں کا آپریشن کرتے ہوئے گھبراتے ہیں

کیونکہ اس زمانے میں السر کے مریضوں کے صرف 25 فیصد آپریشن ہی کامیاب ہوتے تھے۔ باقی 75 فیصد اللہ کو پیارے ہو جاتے تھے۔

امّاں نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ اتنے خوفناک مرض کا نام لے دیا آپ نے۔ کچھ خدا کا خوف تو کیا ہوتا۔"

حالات کی سنگینی کے باوجود ڈاکٹر اکرم کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ انہوں نے کہا" امّاں۔ ڈاکٹر کا تو کام ہی مریضوں کو ان کی بیماریوں کے بارے میں بتانا ہوتا ہے اور یہ السر اتنا خوفناک مرض تو نہیں ہوتا۔۔۔ یہ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"شُکر ہے۔" امّاں نے اطمینان کی سانس لی "اب آپ نے ڈاکٹروں والی بات کی ہے مگر ڈاکٹر صاحب۔ اتنا بہت سا خون کہاں سے آیا ہے؟"

"یہ تو چیک اپ کرنے کے بعد ہی معلوم ہو گا۔ انہیں فوراً ہسپتال لے جانا چاہیے۔"

امّاں نے فوراً اپنا بُرقع اٹھایا اور بولیں "ڈاکٹر صاحب جلدی کیجئے۔ فوراً ہسپتال لے چلیئے۔"

ڈاکٹر صاحب نے انہیں سمجھایا کہ آپ فی الحال نہ جائیں۔ خواہ مخواہ پریشان ہوں گی اور ہسپتال والوں کو بھی پریشان کریں گی۔

رانا صاحب بولے "امّاں۔ ڈاکٹر صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔ آپ کو فوراً اطلاع کر دوں گا۔"

امّاں کو بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر روکا گیا۔ ہمارا سوٹ خون میں بھیگ چکا تھا مگر لباس تبدیل کرنے کا وقت اور موقع نہیں تھا اس لیے کوٹ اُتارنے پر اکتفا کیا گیا۔ رانا صاحب ہمیں سہارا دے کر کار تک لے گئے۔ ڈاکٹر اکرم نے بھی ہاتھ بٹایا۔ امّاں کوٹھی کے گیٹ تک گھبراہٹ کے مارے کار کے ساتھ چلی گئیں۔ انہیں ہوش نہیں تھا کہ وہ بُرقع کے بغیر ہی کوٹھی کے گیٹ تک آگئی ہیں۔

اِدھر ہم ہسپتال گئے۔ اُدھر امّاں نے ہر طرف ٹیلی فون کھڑکا دیئے۔ کراچی' اسلام آباد اور فیصل آباد ہر طرف ہماری بیماری کی اطلاع پہنچ گئی۔ اسٹوڈیو سے ہمارے اسسٹنٹ کا ٹیلی فون آیا۔ وہ ہم سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ ہم کس وقت

اسٹوڈیو پہنچیں گے۔ جواب میں ہماری بیماری کی اطلاع ملی تو اس اللہ کے بندے نے سارے اسٹوڈیو میں صور پھونک دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے اندر ساری فلمی دنیا کو ہماری بیماری کی اطلاع مل گئی تھی۔ اس زمانے میں لوگوں کا آپس میں میل ملاپ بہت زیادہ تھا۔ پیار اور خلوص بھی کم نہ تھا۔ ہر شخص دوسرے کی خبر رکھتا تھا اور سبھی ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ ایسا زمانہ تھا کہ نہ تو بیماریاں اتنی زیادہ ہوتی تھیں اور نہ ہی حادثے اور جرائم کی بہتات تھی۔ چوری' ڈاکے کی خبر کبھی کبھار ہی سننے میں آتی تھی۔ قتل تو ایسی چیز تھی کہ مہینوں' برسوں کے بعد ہی کہیں سے خبر آتی تھی اور ہر طرف سنسنی سی پھیل جاتی تھی۔ ہر شخص خوف زدہ ہو جاتا تھا۔ شدید بیماریوں کا زیادہ چرچا نہیں تھا۔ عام بیماریوں کا تذکرہ ہی عموماً سننے میں آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ السر کا نام سن کر سبھی پریشان ہو گئے تھے۔ اس مرض کے بارے میں تفصیلی معلومات ہر ایک کو حاصل نہ تھیں اور پھر جس کسی نے بھی سُنا کہ ہمیں خون کی الٹیاں ہوئی ہیں وہ بوکھلا کر رہ گیا۔ سب نے ایک دوسرے کو اطلاع فراہم کر دی اور پھر جس کو بھی موقع ملا اس نے ہمارے گھر سے اور ایک دوسرے سے معلومات حاصل کرنی شروع کر دیں۔

یو۔ سی۔ ایچ گلبرگ لاہور میں امریکی انتظامیہ کے زیر اہتمام چلایا جاتا تھا۔ یہاں بیشتر ڈاکٹر امریکن تھے اور جو پاکستانی تھے بھی تو بیرونی تعلیم یافتہ تھے۔ ہسپتال کا نظم و نسق امریکی طرز کا تھا۔ یہ ایک بہت خوبصورت اور صاف ستھری عمارت تھی۔ جدید ترین ساز و سامان سے سجی ہوئی۔ آس پاس سبزہ زار' پھول اور قد آور درخت تھے۔ عملہ بھی نہایت مُستعد اور فرض شناس تھا۔ یہ ہسپتال مکمل طور پر ائر کنڈیشنڈ تھا۔ پرائیویٹ کمرے اس قدر شفّاف اور خوبصورت تھے کہ اس زمانے میں تو لاہور کے بہت اچھے ہوٹلوں میں بھی یہ معیار نہیں تھا۔

ہسپتال پہنچتے ہی ہمیں فوراً چیک اپ کے لیے پہنچا دیا گیا۔ مختلف ٹیسٹ شروع ہو گئے۔ اس اثنا میں ہمارے دوست احباب بھی ہسپتال پہنچ گئے لیکن ہم ان کی آمد سے بے خبر تھے۔ ہماری حالت خاصی تشویش ناک تھی اس لیے فوراً ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ہر قسم کے ملاقاتیوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ صرف رانا صاحب ایک بار ہمارے پاس تشریف لائے تھے۔ انہوں نے ہمیں تسلّی دی اور بتایا کہ تمام عزیزوں اور دوستوں کو آپ کی بیماری کی خبر دے دی گئی ہے۔

ابھی وہ ہمارے پاس ہی موجود تھے کہ اچانک ایک بار پھر ہمارا دل گھبرانے لگا۔ ہم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سر چکرا رہا تھا۔ متلی سی ہو رہی تھی اور جسم پسینے میں ڈوب گیا تھا۔ ایک سانولی سلونی نرس برف کی طرح سفید اور شفّاف لباس پہنے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ہم نے بے بسی سے کہا ''سسٹر۔۔۔''

وہ لپک کر ہمارے پاس آئیں اور اسی وقت ہم نے ابکائیاں لینی شروع کر دیں۔ نرس نے فوراً بیڈ پین اٹھا کر ہمارے سامنے کر دیا مگر اس سے پہلے ہی ہم نے خون کی ایک الٹی کر دی جس سے نہ صرف ہمارا لباس اور بستر بلکہ فرش تک رنگین ہو گیا۔ نرس نے آگے بڑھ کر ہمیں سنبھالنا چاہا مگر ہم الٹیاں کرنے کے موڈ میں تھے۔ اوپر تلے پانچ خون کی الٹیاں کرنے کے بعد ہمیں قدرے سکون محسوس ہوا مگر اس اثنا میں نرس کی یونیفارم خون میں لت پت ہو چکی تھی۔ ہمارے بستر پر اور آس پاس تمام کمرے میں خون ہی خون بکھرا ہوا تھا۔ بے چارے رانا صاحب جو ہمیں تسلّی دینے کے لیے آگے بڑھے تھے ان کا تمام لباس بھی خون میں لت پت ہو گیا تھا مگر ہمارے پاس شرمندہ ہونے کے لیے بھی وقت نہیں تھا۔ اُلٹیاں کرنے کے فوراً بعد ہماری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور ہم ایک بار پھر بے ہوش ہو گئے۔

ہوش میں آئے تو دیکھا کہ کمرے میں صفائی ہو رہی ہے۔ ایک امریکی ڈاکٹر ولیم بھی موجود ہیں۔ ان کی نگرانی میں ہمیں دوسرے بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ اس سے پہلے دو نرسوں نے آگے بڑھ کر ہماری قمیص اتار کر ہسپتال کا گاؤن پہنا دیا تھا۔ شرم تو بہت آئی مگر مجبور تھے اس لیے چپ چاپ لیٹے رہے۔

رانا صفدر جنگ بدستور کمرے میں موجود تھے اور ڈاکٹر ولیم سے ہماری تازہ ترین صورت حال کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ولیم کا کہنا تھا کہ جب تک تمام رپورٹیں نہ آ جائیں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر ان کا اندازہ یہی تھا کہ ہمارا السر پھٹ گیا ہے۔ فوری طور پر السر کی دوائیاں بھی ہمیں دے دی گئی تھیں اور انجکشن وغیرہ بھی لگا دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم پر پوری طرح غنودگی طاری ہوتی' رانا صاحب نے ہمارے پاس آ کر بہت محبت اور ہمدردی سے دلاسا دیا اور کہا کہ دیکھیے۔ ''میں فی الحال آپ کی تازہ ترین حالت کے بارے میں امّاں کو نہیں بتاؤں گا۔ وہ بہت پریشان ہو جائیں گی اور ہسپتال آنے کے لیے ضد کریں گی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

ہم نے ان کی رائے سے اتفاق کا اظہار کیا اور پھر گہری نیند سو گئے۔ جب ہماری آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ صبح ہو چکی ہے۔

سامنے فرنچ کھڑکی کے شیشے میں سے باہر کا خوبصورت منظر نظر آرہا تھا۔ سورج کی روشنی ہر طرف پھیل چکی تھی۔ پرندے محوِ پرواز تھے۔ نیلے آسمان پر کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے بہت دل فریب لگ رہے تھے۔

ہم کو خیال ہی نہ رہا کہ ہم شدید بیمار ہیں۔ بے خیالی میں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ جب بیڈ سے سر ٹکایا تو احساس ہوا کہ ہم اپنے بیڈ روم میں نہیں ہسپتال کے کمرے میں ہیں۔ پھر ہمیں اپنی بیماری کی تفصیلات یاد آگئیں۔ جسم سے خون کافی مقدار میں نکل چکا تھا اس لیے نقاہت بھی محسوس ہو رہی تھی مگر پھر بھی ہم فوراً بیڈ سے اتر کر کھڑے ہوگئے۔ آنکھوں میں اندھیرا سا لہرایا اور ہم تھوڑے سے لڑکھڑائے بھی تھے۔ اسی وقت ایک نرس نے کمرے میں داخل ہو کر ہمیں تھام لیا۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے نرم لیکن تادیبی لہجے میں پوچھا۔

''باتھ روم جا رہے ہیں!'' ہم نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ مگر ذرا احتیاط سے کام لیں۔ آہستہ آہستہ اُٹھ کر کھڑے ہوں اور پھر یہ دیکھیں کہ کھڑے ہونے یا چلنے میں کمزوری تو محسوس نہیں ہوتی۔''

ہم نے نرس کے مشورے پر عمل کیا۔ پھر کہا ''ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ باتھ روم جا سکتے ہیں۔''

''آر یو شیور!'' اس نے تصدیق چاہی۔

ہم نے سر ہلا کر اقرار کیا اور آہستہ آہستہ باتھ روم کی طرف چل پڑے۔ باتھ روم بھی نہایت خوبصورت اور صاف شفّاف تھا۔ لگتا ہی نہ تھا کہ یہ ہسپتال کا باتھ روم ہے۔ ایک قابل تعریف بات یہ تھی کہ عام ہسپتالوں کے برعکس یہاں دوائیوں اور فینائیل کی بدبو بھی نہیں تھی۔

غسل خانے سے باہر نکلے تو نرس نے ہمیں بستر پر لٹا کر ہمارا بلڈ پریشر چیک کیا۔ ٹمپریچر لیا اور پھر ایک ننّھی منّی سی رنگین گولی ہمارے منہ میں ڈال دی۔ پانی کا گلاس بھی موجود تھا۔

''اب آپ لیٹ جایئے۔ بلا ضرورت بستر سے نہ اٹھئے۔ ٹھیک ہے؟''

ہم نے سر ہلا دیا۔

''بھوک لگی ہے۔ناشتا کریں گے ؟''

ہم نے انکار میں سر ہلا دیا۔

نرس نے کہا ''آپ کو ناشتا ملے گا بھی نہیں۔ابھی بیریم پلا کر آپ کا ایکسرے لیا جائے گا۔''

کچھ دیر بعد وہ ایک گلاس پانی میں سفید سفید گاڑھی سی چیز گھول کر لے آئی اور فرمائش کی کہ اسے پی جایئے۔عجیب بے مزہ سی چیز تھی مگر پی گئے۔

کچھ دیر بعد فلمساز اور ہدایتکار اقبال شہزاد آ گئے۔ان کا فلک شگاف قہقہہ ہر وقت ان کے ساتھ رہتا تھا مگر اس روز انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے قہقہے کو روکا۔ ہمارا جائزہ لینے کے بعد حال چال پوچھا اور پھر کہا ''یار سوفی۔میں تو گھبرا گیا تھا یار۔مگر تم تو ٹھیک ٹھاک نظر آ رہے ہو۔ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہیں خون دینا پڑے گا۔تم تو اچھے خاصے شریف آدمی ہو۔ڈریکولا کب سے بن گئے ؟''

ہم نے مسکرانے کی کوشش کی مگر ایک کمزور اور شرمندہ سی مسکراہٹ چہرے پر آ کر رہ گئی۔حقیقت یہ ہے کہ اب ہمیں بھی کمزوری اور نقاہت کا احساس ہونے لگا تھا۔اسی وقت ڈاکٹر ولیم بھی آ گئے۔ڈاکٹر ولیم دراز قد' سُرخ و سفید آدمی تھے۔آنکھیں نیلی' بال سنہرے۔کم گو تھے مگر کچھ دیر بعد ہم انہیں اپنے ڈھب پر لے آئے اور وہ کچھ دیر رک کر ہم سے باتیں کرنے لگے تھے۔ وہ سفید شیشوں کی عینک لگاتے تھے جس کے پیچھے ان کی ہلکی نیلی آنکھیں مختلف تاثرات کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔وہ ایک ہمدرد' غم گسار اور دردمند انسان تھے۔جب ہم انہیں اپنی پریشانی تکلیف یا بے چینی کا حال سناتے تو ان کی آنکھوں میں ایک درد کی سی کیفیت چھلکنے لگتی تھی۔

انہوں نے ہماری مزاج پرسی کی پھر بتایا ''میرے اندازے کے مطابق آپ کا السر پھٹ گیا ہے۔مزید تفصیلات ٹیسٹ مکمل ہونے کے بعد معلوم ہوں گی۔زیادہ اور اچانک خون نکل جانے کی وجہ سے آپ کو خون دینا ضروری ہے۔آپ کے ان دوست نے خون کی چھ سات بوتلیں فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔اس کے بعد اگر مزید ضرورت پڑی تو دیکھا جائے گا۔خون آپ کو ابھی لگا دیا جائے گا اور ہسپتال کی طرف سے فراہم کیا جائے گا۔'' اس زمانے میں یو سی ایچ میں خون کی سربند تھیلیاں امریکہ سے سپلائی کی جاتی تھیں تا کہ فوری طور پر مریض کو ہنگامی حالت میں خون دے دیا

جائے۔اس کے لواحقین بعد میں یہ کمی پوری کر دیا کرتے تھے۔یہ خون پلاسٹک کی صاف شفاف تھیلیوں میں سرد خانوں میں رکھا جاتا تھا اور مریض کو دینے سے پہلے یہ تصدیق کرلی جاتی تھی کہ اس کے خون کے گروپ کے مطابق ہی اس کو خون دیا جارہا ہے۔خون کو مزید چیک بھی کرلیا جاتا تھا اور مکمل اطمینان کرنے کے بعد ہی استعمال کیا جاتا تھا۔اس طریقے کا فائدہ یہ تھا کہ مریض کو فوری طور پر بلا تاخیر خون کی فراہمی شروع ہو جاتی تھی۔یہ نہیں ہوتا تھا کہ خون دینے کے انتظار میں وہ بے چارہ اللہ کو ہی پیارا ہو جائے۔اقبال شہزاد صاحب نے بتایا کہ فی الحال ایک بوتل خون وہ دے چکے ہیں۔ان کے دو عزیز بھی دو بوتلیں دے رہے ہیں۔مزید خون دینے کے لیے اسٹوڈیو سے ہمارے اسٹاف کے لڑکے اور دوسرے لوگ بھی پہنچ چکے ہیں۔

ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ اس زمانے میں فلمی دنیا ایک خاندان کی طرح تھی۔سب ایک دوسرے سے ملتے تھے۔محبت کرتے تھے۔ہمدردی رکھتے تھے اور دکھ درد میں ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔بعد میں ہمیں مختلف اوقات میں خون کی سترہ اٹھارہ بوتلیں فراہم کی گئی تھیں اور خون دینے والوں کی کبھی کمی نہیں پڑی بلکہ بہت سے لوگوں کو شکریہ کے ساتھ لوٹا دیا گیا۔اقبال شہزاد نے اس وقت ہمیں دو بوتل خون دیا تھا۔چھ سات مہینے بعد ہم دوبارہ اچانک السر برسٹ ہو جانے کے باعث ہسپتال پہنچے تو انہوں نے پھر ہمیں دو بوتل خون فراہم کر دیا تھا۔وہ اکثر مذاق میں کہا کرتے تھے کہ " آفاقی۔تمہاری رگوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے جس کی وجہ سے اب تم ایک بہتر انسان بن چکے ہو"۔

کبھی انہیں ہم سے شکایت پیدا ہوتی تو وہ کہتے "یار تم اتنے کمینے ہو گئے ہو؟"

ہم فوراً جواب دیتے "میر صاحب۔جب سے آپ نے خون دیا ہے ہم ایسے ہو گئے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے؟ کیا میرا خون خراب ہے؟" وہ مصنوعی غصے سے پوچھتے۔

"ارے نہیں۔بات یہ ہے کہ ہمیں تو انیس بوتل خون دیا گیا تھا۔نہ جانے کس کس کا خون ہمارے جسم میں دوڑ رہا ہے۔یوں سمجھئے کہ کاک ٹیل سی بن گئی ہے۔ظاہر ہے کہ ہماری خصلت میں کچھ نہ کچھ فرق تو پڑا ہو گا۔"

ڈاکٹر ولیم کی نگرانی میں ہمیں خون لگا دیا گیا اور ہم چُپ چاپ بے حس و حرکت لیٹ گئے۔اس کے بعد خون دینے کا یہ

سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ ہمیں باری باری خون اور گلوکوز دیا جاتا رہا۔ دوسرے دن اس بات کی بھی تصدیق ہوگئی کہ ہمیں شدید قسم کا السر ہے۔ معدے کے اندر ایک بڑی رگ اچانک پھٹ گئی ہے جس کی وجہ سے نلکے کی طرح خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس خون کو روکنا سب سے ضروری کام ہے۔

اقبال شہزاد نے پوچھا ''ڈاکٹر۔ آپ اس کا آپریشن کیوں نہیں کر دیتے؟''

ڈاکٹر نے جواب دیا ''شدید السر کے مریضوں کا آپریشن کرتے ہوئے بہت احتیاط اور چھان بین سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ السر کے 75 فیصد آپریشن میں مریضوں کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس لیے مجبوری کے سوا ہم آپریشن سے پرہیز کرتے ہیں''

یہ لگ بھگ پینتالیس سال پہلے کی بات ہے۔ اب تو دنیا نے اور میڈیکل سائنس نے بہت زیادہ ترقّی کر لی ہے۔

شہزاد صاحب کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھے رہے۔ اس دوران میں ہمارا چھوٹا بھائی علی عمران بھی پہنچ گیا۔ ان دنوں وہ کراچی میں امریکی تعلیمی فاؤنڈیشن میں کام کرتا تھا اور ہماری بیماری کی خبر سن کر نائٹ کوچ سے لاہور پہنچ گیا تھا۔ ہم سے بڑے بھائی سلطان بھی حیدر آباد سے کراچی اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز لاہور پہنچ گئے تھے۔

اس زمانے میں حیدر آباد سے براہ راست فضائی سروس میّسر نہ تھی۔ تمام بہن بھائی لاہور میں اکٹھے ہو گئے تھے اور باری باری ہماری خبر گیری کے لیے آتے تھے۔ دوست احباب اور فلم والوں کا بھی تانتا بندھا ہوا تھا۔ ہم تو خیر غنودگی کے عالم میں سوتے جاگتے رہتے تھے اور ہسپتال کی انتظامیہ کی طرف سے ملاقاتیوں پر سخت پابندی عائد تھی۔ اس کے باوجود فلم والے اور فلم والیاں کسی نہ کسی طرح ہمارے پاس پہنچ کر مزاج پُرسی کر لیا کرتے تھے۔ یہ تو ہمیں نرسوں نے بعد میں بتایا کہ ان دنوں ہسپتال میں بہت رونق ہو گئی تھی اور فلم والوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ فلمی دنیا کی ہر قابل ذکر ہستی ہسپتال کا پھیرا لگا چکی تھی۔ بعض فنکار کئی بار آئے اور دور ہی سے ہمیں محو خواب دیکھ کر لوٹ گئے۔ ہسپتال والوں کو اس ہجوم کی وجہ سے پریشانی تو ہوئی مگر دیرینہ آرزوئیں بھی پوری ہو گئیں۔ پاکستان کی فلمی دنیا کے ممتاز افراد کو یوں نزدیک سے دیکھنا اور ان سے باتیں کرنا عام حالات میں تو ان لوگوں کے لیے ایک خواب ہی تھا جو ہماری بیماری کی وجہ سے حقیقت میں بدل گیا تھا۔

فلم والے وقت کی پابندی نہیں کرتے اور کرتے بھی تو کیسے۔ جس کو جس وقت فرصت ملتی تھی وہ ہماری خبر لینے چلا آتا تھا۔ ہم دوائیوں کے زیر اثر بھی سوتے جاگتے رہتے تھے۔ کبھی آنکھ کھل جاتی تو سامنے کوئی شناسا کھڑا نظر آ جاتا۔ کبھی کوئی ہیروئن تشویش سے کھڑی گھورتی نظر آتی۔ ہمیں آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور وہ ہماری مزاج پرسی بھی کر لیا کرتی۔ ہسپتال والوں پر اس کا بہت رعب پڑ گیا تھا جس کی وجہ سے مستقبل میں ہمارے لیے کافی سہولتیں پیدا ہو گئیں اور کچھ پریشانیاں بھی پیش آئیں۔

ہماری بیماری کا یہ سلسلہ ایک ڈیڑھ سال تک جاری رہا تھا جس کی وجہ سے یو سی ایچ میں آمدورفت ہمارے معمول میں داخل ہو گئی تھی۔ اس کا احوال آپ آگے بھی سنیں گے۔

دس بارہ دن گزرنے کے بعد ڈاکٹر ولیم نے ہمیں یہ خوشخبری سنادی کہ آپ کے السر پر قابو پا لیا گیا ہے اور آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آئے گی مگر کم از کم چھ ماہ آپ کو کھانے پینے میں سخت پرہیز کرنا پڑے گا۔ ٹینشن اور تھکاوٹ پیدا کرنیوالے کاموں سے بھی دور رہنا ہو گا۔ آئندہ دو ماہ تک مکمل آرام کرنا ہو گا وغیرہ وغیرہ۔

ہماری حالت رفتہ رفتہ بہتر ہو گئی تھی۔ چلنے پھرنے بھی لگے تھے۔ ہنسی مذاق کرنے کی طاقت بھی عود کر آئی تھی جس کی وجہ سے خاصی دلچسپی رہتی تھی۔ جب مرض کی شدت ختم ہوئی اور ہوش ٹھکانے آئے تو ہم نے اپنے آس پاس کی چیزوں کا بہ غور جائزہ لینا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ اس ہسپتال میں نرسیں تعلیم یافتہ' مہذّب' خوش شکل اور بہت بااخلاق ہیں۔ ایک خاتون گہری سانولی رنگت کی تھیں مگر ناک نقشہ اور ملاحت ایسی کہ بس دیکھتے ہی رہو۔ نازک اندام اور اسمارٹ تھیں مگر ہم نے انہیں کبھی بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ڈیوٹی اکثر رات کے وقت ہوتی تھی۔ ہماری حالت کچھ بہتر ہوئی تو ہم مسلسل لیٹے رہنے سے عاجز آ گئے۔ کوئی بات کرنے والا بھی نہیں تھا۔ رات کے وقت اکثر ہماری آنکھ کھل جاتی تھی اور ہم بہت دیر تک جاگتے رہتے تھے۔

اقبال شہزاد صاحب نے بتایا کہ فی الحال ایک بوتل خون وہ دے چکے ہیں۔ ان کے دو عزیز بھی دو بوتلیں دے رہے ہیں۔ مزید خون دینے کے لیے اسٹوڈیو سے ہمارے اسٹاف کے لڑکے اور دوسرے لوگ بھی پہنچ چکے ہیں۔

ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ اس زمانے میں فلمی دنیا ایک خاندان کی طرح تھی۔ سب ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ محبت

کرتے تھے۔ ہمدردی رکھتے تھے اور دکھ درد میں ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔ بعد میں ہمیں مختلف اوقات میں خون کی سترہ اٹھارہ بوتلیں فراہم کی گئی تھیں اور خون دینے والوں کی کبھی کمی نہیں پڑی بلکہ بہت سے لوگوں کو شکریہ کے ساتھ لوٹا دیا گیا۔ اقبال شہزاد نے اس وقت ہمیں دو بوتل خون دیا تھا۔ چھ سات مہینے بعد ہم دوبارہ اچانک السر برسٹ ہو جانے کے باعث ہسپتال پہنچے تو انہوں نے پھر ہمیں دو بوتل خون فراہم کر دیا تھا۔ وہ اکثر مذاق میں کہا کرتے تھے کہ " آفاقی۔ تمہاری رگوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے جس کی وجہ سے اب تم ایک بہتر انسان بن چکے ہو"۔

کبھی انہیں ہم سے شکایت پیدا ہوتی تو وہ کہتے "یار تم اتنے کمینے ہو گئے ہو؟"

ہم فوراً جواب دیتے "میر صاحب۔ جب سے آپ نے خون دیا ہے ہم ایسے ہو گئے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے؟ کیا میرا خون خراب ہے؟" وہ مصنوعی غصے سے پوچھتے۔

"ارے نہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمیں تو انیس بوتل خون دیا گیا تھا۔ نہ جانے کس کس کا خون ہمارے جسم میں دوڑ رہا ہے۔ یوں سمجھئے کہ کاک ٹیل سی بن گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری خصلت میں کچھ نہ کچھ فرق تو پڑا ہو گا۔"

ڈاکٹر ولیم کی نگرانی میں ہمیں خون لگا دیا گیا اور ہم چُپ چاپ بے حس و حرکت لیٹ گئے۔ اس کے بعد خون دینے کا یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ ہمیں باری باری خون اور گلوکوز دیا جاتا رہا۔ دوسرے دن اس بات کی بھی تصدیق ہو گئی کہ ہمیں شدید قسم کا السر ہے۔ معدے کے اندر ایک بڑی رگ اچانک پھٹ گئی ہے جس کی وجہ سے نلکے کی طرح خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس خون کو روکنا سب سے ضروری کام ہے۔

اقبال شہزاد نے پوچھا "ڈاکٹر۔ آپ اس کا آپریشن کیوں نہیں کر دیتے؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا "شدید السر کے مریضوں کا آپریشن کرتے ہوئے بہت احتیاط اور چھان بین سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ السر کے 75 فیصد آپریشن میں مریضوں کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس لیے مجبوری کے سوا ہم آپریشن سے پرہیز کرتے ہیں"

یہ لگ بھگ پینتالیس سال پہلے کی بات ہے۔ اب تو دنیا نے اور میڈیکل سائنس نے بہت زیادہ ترقّی کر لی ہے۔

شہزاد صاحب کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھے رہے۔ اس دوران میں ہمارا چھوٹا بھائی علی عمران بھی پہنچ گیا۔ ان دنوں وہ

کراچی میں امریکی تعلیمی فاؤنڈیشن میں کام کرتا تھااور ہماری بیماری کی خبر سن کر نائٹ کوچ سے لاہور پہنچ گیا تھا۔ ہم سے بڑے بھائی سلطان بھی حیدر آباد سے کراچی اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز لاہور پہنچ گئے تھے۔

اس زمانے میں حیدر آباد سے براہ راست فضائی سروس میّسر نہ تھی۔ تمام بہن بھائی لاہور میں اکٹھے ہو گئے تھے اور باری باری ہماری خبر گیری کے لیے آتے تھے۔ دوست احباب اور فلم والوں کا بھی تانتا بندھا ہوا تھا۔ ہم تو خیر غنودگی کے عالم میں سوتے جاگتے رہتے تھے اور ہسپتال کی انتظامیہ کی طرف سے ملاقاتیوں پر سخت پابندی عائد تھی۔ اس کے باوجود فلم والے اور فلم والیاں کسی نہ کسی طرح ہمارے پاس پہنچ کر مزاج پُرسی کر لیا کرتے تھے۔ یہ تو ہمیں نرسوں نے بعد میں بتایا کہ ان دنوں ہسپتال میں بہت رونق ہو گئی تھی اور فلم والوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ فلمی دنیا کی ہر قابل ذکر ہستی ہسپتال کا پھیرا لگا چکی تھی۔ بعض فنکار کئی بار آئے اور دور ہی سے ہمیں محو خواب دیکھ کر لوٹ گئے۔ ہسپتال والوں کو اس ہجوم کی وجہ سے پریشانی تو ہوئی مگر دیرینہ آرزوئیں بھی پوری ہو گئیں۔ پاکستان کی فلمی دنیا کے ممتاز افراد کو یوں نزدیک سے دیکھنا اور ان سے باتیں کرنا عام حالات میں تو ان لوگوں کے لیے ایک خواب ہی تھا جو ہماری بیماری کی وجہ سے حقیقت میں بدل گیا تھا۔

فلم والے وقت کی پابندی نہیں کرتے اور کرتے بھی تو کیسے۔ جس کو جس وقت فرصت ملتی تھی وہ ہماری خبر لینے چلا آتا تھا۔ ہم دوائیوں کے زیر اثر بھی سوتے جاگتے رہتے تھے۔ کبھی آنکھ کھل جاتی تو سامنے کوئی شناسا کھڑا نظر آ جاتا۔ کبھی کوئی ہیروئن تشویش سے کھڑی گھورتی نظر آتی۔ ہمیں آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور وہ ہماری مزاج پرسی بھی کر لیا کرتی۔ ہسپتال والوں پر اس کا بہت رعب پڑ گیا تھا جس کی وجہ سے مستقبل میں ہمارے لیے کافی سہولتیں پیدا ہو گئیں اور کچھ پریشانیاں بھی پیش آئیں۔

ہماری بیماری کا یہ سلسلہ ایک ڈیڑھ سال تک جاری رہا تھا جس کی وجہ سے یو سی ایچ میں آمدورفت ہمارے معمول میں داخل ہو گئی تھی۔ اس کا احوال آپ آگے بھی سنیں گے۔

دس بارہ دن گزرنے کے بعد ڈاکٹر ولیم نے ہمیں یہ خوشخبری سنا دی کہ آپ کے السر پر قابو پا لیا گیا ہے اور آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آئے گی مگر کم از کم چھ ماہ آپ کو کھانے پینے میں سخت پرہیز کرنا پڑے گا۔ ٹینشن اور تھکاوٹ پیدا

کرنیوالے کاموں سے بھی دور رہنا ہوگا۔ آئندہ دو ماہ تک مکمل آرام کرنا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔
ہماری حالت رفتہ رفتہ بہتر ہوگئی تھی۔ چلنے پھرنے بھی لگے تھے۔ ہنسی مذاق کرنے کی طاقت بھی عود کر آئی تھی جس کی وجہ سے خاصی دلچسپی رہتی تھی۔ جب مرض کی شدت ختم ہوئی اور ہوش ٹھکانے آئے تو ہم نے اپنے آس پاس کی چیزوں کا بہ غور جائزہ لینا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ اس ہسپتال میں نرسیں تعلیم یافتہ' مہذّب' خوش شکل اور بہت بااخلاق ہیں۔ ایک خاتون گہری سانولی رنگت کی تھیں مگر ناک نقشہ اور ملاحت ایسی کہ بس دیکھتے ہی رہو۔ نازک اندام اور اسمارٹ تھیں مگر ہم نے انہیں کبھی بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ڈیوٹی اکثر رات کے وقت ہوتی تھی۔ ہماری حالت کچھ بہتر ہوئی تو ہم مسلسل لیٹے رہنے سے عاجز آ گئے۔ کوئی بات کرنے والا بھی نہیں تھا۔ رات کے وقت اکثر ہماری آنکھ کھل جاتی تھی اور ہم بہت دیر تک جاگتے رہتے تھے۔

ایک شخص کمرے میں بالکل تنہا لیٹا ہو' اس کے بازو میں خون دینے کے لیے سرنج لگی ہو۔ ملنے جلنے کی اجازت نہ ہو اور نیند بھی اُڑ گئی ہو تو ذرا سوچیے کہ وہ کیا کرے گا؟ وہی جو ہم نے کیا۔
ہم نے سرہانے لگی ہوئی برقی گھنٹی کا بٹن دبایا اور فوراً ہی وہ خاتون کمرے میں پہنچ گئیں۔
''جی؟ کیا بات ہے؟'' انہوں نے خشک لہجے میں پوچھا۔
ہم نے پوچھا ''سسٹر۔ کیا باہر بارش ہو رہی ہے؟ آندھی ہے؟''
''بالکل نہیں۔''

''مگر ہمیں ایسا ہی لگ رہا ہے۔''
''یہ آپ کا احساس ہے۔ دوائیوں کے استعمال کی وجہ سے آپ کے ذہن کو ایسا محسوس ہو رہا ہے۔''
''وقت کیا ہوا ہے؟'' ہم نے پوچھا۔
انہوں نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا ''تین بجے ہیں؟''
''دن کے یا رات کے؟'' ہم نے پوچھا ''ہمیں تو دن اور رات کا فرق ہی محسوس نہیں ہوتا۔ کمرے میں ہر وقت بجلی جلتی

رہتی ہے۔"

وہ کسی تاثر کا اظہار کیے بغیر خُشک لہجے میں بولیں "ٹھیک ہو جائے گا۔اور کچھ ؟"

ہم نے کہا "دل بہت گھبرا رہا ہے۔"

"تکلیف تو نہیں ہے ؟"

"جی نہیں"

"تو پھر آپ کو نیند کی گولی کھلا دیتی ہوں" وہ فوراً رخصت ہو گئیں۔ایک گولی اور پانی کا گلاس لے کر نمودار ہوئیں اور ہمیں گولی کھلا کر یہ جا وہ جا۔

دو دن بعد ہم پھر جاگ رہے تھے۔انہیں بلایا تو وہ آ تو گئیں مگر ناخوش نظر آ رہی تھیں۔

"جی۔کیا بات ہے ؟"

ہم نے کہا "دل بہت گھبرا رہا ہے۔آپ کچھ دیر یہاں بیٹھ کر باتیں نہیں کر سکتیں ؟"

انہوں نے خُشک لہجے میں فرمایا "یہ میری ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے۔"

ہم نے کہا "مریض کا خیال رکھنا اور دل بہلانا بھی تو آپ کی ڈیوٹی ہے۔"

بولیں " آس پاس کے سبھی کمروں کے مریضوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔آپ ایسا کیجئے کہ گھر سے ریڈیو منگا لیجئے۔دل بہل جائے گا۔یا پھر کہیئے تو آپ کو گولی دید وں ؟"

"جی نہیں۔شکریہ" ہم نے ناراض ہو کر کہا۔

وہ جانے لگیں۔ہم تنہا اور سیدھے لیٹے لیٹے بالکل تنگ آ چکے تھے۔ایسا بھی کیا کہ کوئی دو باتیں کرنے والا بھی نہ ہو۔

ہم نے پوچھا "سنئے۔آپ کا نام کیا ہے ؟"

انہوں نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ہمیں گھورا اور بولیں "اس کا کیا مطلب ہے ؟"

"مطلب یہ کہ آپ کا کوئی نام تو رکھا ہو گا گھر والوں نے ؟"

"سوری۔ہمیں مریضوں کو نام بتانے کی اجازت نہیں ہے۔مگر آپ کیوں نام پوچھ رہے ہیں ؟"

ہم نے کہا ''آپ نے اتنی ہمدردی اور خلوص سے ہماری دیکھ بھال کی ہے تو کیا ہم آپ کا نام بھی نہ پوچھیں۔ اپنے محسنوں کو یادرکھنا بھی تو ضروری ہے۔''

''یہ میرا فرض ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ہم سبھی مریضوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں'' یہ کہہ کر وہ رُخصت ہو گئیں۔ پلٹ کر پوچھا ''گولی کھلادوں؟''

ہمارا بس چلتا تو اس بدمزاج لڑکی کو گولی ماردیتے مگر ایسا کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ ناچار خاموش لیٹے رہے۔

کچھ دیر بعد ہم نے دوبارہ بٹن دبایا وہ فوراً لپکی ہوئی آئیں۔

''اب کیا بات ہے؟'' انہوں نے بیزاری سے پوچھا۔

ہم نے کہا ''یہ دیکھئے۔ شاید سرنج کی سوئی ہل گئی ہے۔ بازو میں درد ہو رہا ہے اور سرنج کے آس پاس کی جگہ نیلی ہو گئی ہے۔''

انہوں نے پریشانی سے ہماری کلائی کا جائزہ لیا اوہو۔ یہ تو خون ہی رک گیا ہے۔ ٹھیک کرنا پڑے گا۔''

انہوں نے سرنج باہر نکالی تو خون کی پچکاری سی نکلی اور بازو والی دیوار پر خون کے چھینٹے پڑ گئے۔

''اوہ سوری'' انہوں نے فوراً خون کی روانی کو روک دیا۔ کپڑا اٹھا کر دیوار کو صاف کیا اور پھر نئے سرے سے ایک اور جگہ سوئی بھونک کر اس پر ٹیپ لگا دیا۔

''دیکھئے۔ اب ہاتھ بالکل نہ ہلائیے اور چپ چاپ لیٹے رہئے۔''

ہم نے پوچھا ''کیا بولنے سے سوئی ہل جاتی ہے؟''

انہوں نے ہمیں گھورا مگر خاموش رہیں۔

ہم نے کہا ''ڈاکٹر تو ہمیں خون دینے کا مشورہ دے رہے ہیں اور آپ ہمارا خون یوں ضائع کر رہی ہیں۔ آپ کو نرسنگ کرتے ہوئے کتنا عرصہ گزرا ہے؟''

کہنے لگیں ''تیسرا سال ہے۔''

''اتنی دیر میں آپ نے سرنج لگانا بھی نہیں سیکھا'' ہم نے خفگی سے کہا ''صبح ہم ڈاکٹر ولیم سے یا آپ کی ہیڈ نرس سے

بات کریں گے۔‘‘

وہ ایک دم پریشان ہو گئیں ’’سوری۔ میں نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا۔‘‘

’’ایک ٹرینڈ نرس کو ایسی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ یہی تو ہم بھی کہہ رہے ہیں‘‘

وہ کچھ شرم سار سی کھڑی رہیں۔ ایک دو بار نظریں اٹھا کر ہمیں دیکھا اور خاموشی سے رُخصت ہو گئیں۔

سوئی نکالنے اور دوبارہ لگانے سے ہمیں تکلیف تو ہوتی تھی مگر اب ہم تکلیف کے عادی ہو چکے تھے۔ پچھلے دو ہفتوں میں اتنی بہت سی سوئیاں ہمارے بازوؤں میں لگائی گئی تھیں کہ ہم نے صبر کر لیا تھا اور سوئی لگنے پر اُف تک نہیں کرتے تھے۔ جن دنوں ہم بے ہوش تھے اس زمانے میں ہمارے سوتے میں نرسیں آ کر تھوڑی تھوڑی دیر بعد انجکشن لگا کر چلی جاتی تھیں اور ہم آنکھ کھول کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ شاید ہم بے حس ہو چکے ہیں اور ہمیں تکلیف ہی نہیں ہوتی لیکن حقیقت دراصل یہ تھی کہ ہم نے صبر کر لیا تھا کہ جو تکلیف ہونی ہے وہ تو ہونی ہی ہے‘ تو پھر بلاوجہ شور مچانے اور منہ بنانے سے فائدہ‘ خون دیتے وقت جب سوئی کا رُخ بدل جانے کی وجہ سے خون رک جاتا ہے تو وہ رگ کے بجائے کہیں اور جانے لگتا ہے اور وہ جگہ نیلی پڑ جاتی ہے۔ تکلیف اور درد بھی ہونے لگتا ہے مگر ہم اس کے بھی عادی ہو چکے تھے۔ دیکھنے والے ہماری کلائیوں اور بازوؤں کے نیل دیکھ کر پریشان ہوتے رہتے تھے مگر ہم راضی برضا خاموش رہتے تھے۔

دوسرے روز علی الصبح پہلے تو ڈاکٹر ولیم کمرے میں داخل ہوئے اور پھر ان کے پیچھے پیچھے وہی سانولی سلونی نرس نمودار

ہوئیں۔ ڈاکٹر ولیم نے حسب معمول نرس کے ہاتھ سے ہمارا چارٹ لے کر دیکھا۔ پھر ہمارا حال چال پوچھا۔ ہم نے اپنا بازو آگے بڑھا دیا۔ نرس کا رنگ اُڑ گیا۔ ڈاکٹر ولیم نے کہا ’’اوہو۔ کیا رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی؟‘‘

ہم نے کہا ’’جی ہاں‘‘ یہ کہہ کر نرس کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید ہم اب ان کی شکایت کریں گے۔ ڈاکٹر ولیم کے علاوہ سینئر نرس بھی ہمراہ تھیں اور وہ بہت ہٹلر قسم کی خاتون تھیں۔ تمام نرسوں کی ان سے جان جاتی تھی۔

معمولی سی غلطی کو بھی معاف نہیں کرتی تھیں۔

ہم نے مسکرا کر بے پروائی سے کہا ''ڈاکٹر۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ بیماری میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر ولیم مسکرائے اور بولے ''گڈ شو۔ مریضوں کو ایسا ہی بہادر ہونا چاہیے'' یہ کہہ کر انہوں نے ہمارے چارٹ کے کاغذات نرس کے حوالے کیے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ نرس کو ہماری طرف توجہ دینے یا ہم سے بات کرنے کی مہلت نہیں تھی۔ پھر بھی وہ کمرے سے رُخصت ہوتے وقت پلٹ کر ممنون نظروں سے ہمیں دیکھنا نہ بھولیں۔

ہمیں ان کا یہ انداز بہت بھلا لگا۔

کچھ دیر بعد وہی نرس دوبارہ افتاں وخیزاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ خدا جانے کتنی دور سے بھاگی ہوئی آئی تھیں۔ ان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

ہمارے بیڈ کے پاس آ کر پہلے تو چند لمحے وہ اپنی سانس درست کرتی رہیں پھر بولیں ''مسٹر آفاقی۔ میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں۔''

''کس لیے؟'' ہم نے پوچھا۔

''یہی کہ آپ نے ڈاکٹر اور ہیڈ نرس سے میری شکایت نہیں کی۔''

ہم نے بے پروائی سے کہا ''کوئی بات نہیں۔ بیماری میں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔''

وہ بولیں ''پھر بھی شکریہ۔ میری ڈیوٹی ختم ہو رہی ہے۔ میں نے سوچا کہ پہلے آپ کا شکریہ ادا کرتی چلوں'' یہ کہہ کر وہ رُخصت ہونے لگیں مگر دروازے کے پاس جا کر پھر رُک گئیں اور پلٹ کر بولیں ''میرا نام لیلیٰ ہے'' یہ کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔

ہم نے سوچا کہ واقعی نام تو بہت موزوں ہے۔ بالکل اسم با مسمّٰی ہیں۔

ان کے بعد جن صاحبہ کی ڈیوٹی تھی وہ نسبتاً کم عمر بلکہ نو عمر تھیں اور نرسنگ میں ابھی ان کا پہلا ہی سال تھا۔ یہ بات وہ ہمیں خود بتا چکی تھیں۔ دستور یہ تھا کہ صبح کمرے کی صفائی اور بستر کی چادر بدلنے کے لیے بیک وقت دو نرسیں کمرے میں آیا کرتی تھیں جن میں سے ایک سینئر ہوتی تھی اور دوسری جونیئر۔ اتفاق سے یہ دونوں ہنس مکھ اور خوش مزاج

تھیں اس لیے دو چار باتیں بھی کر لیا کرتی تھیں اور ہماری بات کا جواب بھی دے دیتی تھیں۔ایک دن ہم نے ان سے بھی نام پوچھا تھا۔دراصل سسٹر سسٹر کہہ کر مخاطب کرنا ہمیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ویسے بھی ہم جاننا چاہتے تھے کہ جن نرسوں نے اتنے خلوص اور ہمدردی سے ہماری خدمت کی ہے کم از کم ہم ان کے نام تو یاد رکھیں۔

ہمارے سوال کے جواب میں سینئر نرس نے کہا''دیکھئے مسٹر۔ہمیں اپنے نام بتانے کا آرڈر نہیں ہے۔''

''اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' ہم نے پوچھا۔

کہنے لگیں''دنیا میں ہر طرح کے لوگ پھرتے ہیں۔مریض بھی ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض لوگ نام جاننے کے بعد اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں'' پھر ذرا رک کر بولیں''ویسے میرا نام(ہم مصلحتاً صرف ابتدائی حرف لکھ رہے ہیں) پی ہے مگر اس کا نام میں نہیں بتاؤں گی۔''

''مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ میں تو شادی شدہ ہوں مگر یہ ابھی کم عمر لڑکی ہے۔''

یہ سُن کر وہ کم عمر نرس معصومیت سے مسکرائی۔اس کا قد چھوٹا' جسم متناسب اور رنگ گورا تھا۔ناک نقشہ مناسب تھا مگر سب سے نمایاں چیز اس کی بھوری مسکراتی ہوئی آنکھیں تھیں جو اس کے ہر دم مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ساتھ مسکراتی رہتی تھیں۔وہ ایک شوخ اور چُلبلی لڑکی تھی۔بولتی کچھ نہیں تھی مگر شوخی اور بے چینی اس کے انگ انگ سے ٹپکی پڑتی تھی۔

دو چار دن بعد خون دینے کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ہم اٹھ کر چہل قدمی کرنے لگے۔کبھی اپنے کمرے سے نکل کر اِدھر اُدھر اور ہسپتال کے ٹیرس پر بھی چلے جاتے تھے۔ہمارا کمرہ ایک دائرے کے اندر تھا جس میں چاروں طرف کمرے تھے۔درمیان میں تھوڑی خالی جگہ تھی۔اس کے باہر جاؤ تو سامنے ہی نرسنگ کا اسٹاف روم تھا اور اس کے دونوں جانب پھر پرائیویٹ کمروں کی قطاریں تھیں۔

اب ہمارے پاس تیمار داروں کی آمدورفت بھی بڑھ گئی تھی۔یوں تو وقت مقررہ کے سوا کسی اور وقت ملاقاتیوں کی آمد پر پابندی تھی مگر فلم والے پھر بھی کسی نہ کسی طرح پہنچ جایا کرتے تھے اور ہسپتال کا سٹاف بھی انہیں خصوصی

رعایت دے دیا کرتا تھا۔ ہمارے بہن بھائیوں میں سے کسی ایک کو ہر وقت آنے کی اجازت مل گئی تھی اس لیے ہمارے لیے تھیلی بھر بھر کر آئس کریم لائی جاتی تھی۔ ہم خود بھی کھاتے اور آنے جانے والوں اور نرسوں کو بھی پیش کر دیا کرتے تھے۔ یہ نرسیں آغاز میں تو بہت محتاط رہیں مگر پھر رفتہ رفتہ قدرے بے تکلّف ہو گئیں۔

آئس کریم کی ہمارے پاس ہر وقت کافی مقدار موجود رہتی تھی۔ جو مزاج پُرسی کے لیے آنے والوں کو کھلانے کے بعد بھی بچ رہتی تھی اس لیے ہم نے نرسوں کو بھی اس میں شریک کر لیا۔ شروع میں تو انہوں نے بہت انکار کیا اور کہا کہ ہسپتال کی انتظامیہ کی طرف سے سخت ممانعت ہے مگر پھر ہمارے اصرار پر رضامند ہو گئیں۔

ہم اپنے چھوٹے بھائی یا کسی اور آنے والے سے کہتے ”بھئی دیکھتے کیا ہو۔ سسٹر کو آئس کریم نکال کر دو۔“

وہ ”نہ نہ“ کرتی رہتیں مگر آئس کریم ان کے ہاتھ میں تھما دی جاتی تھی۔ وہ پریشانی سے دیکھتیں تو ہم کہتے۔

”جلدی سے کھا لیجئے۔ اگر کوئی آ گیا تو ہم ذمہ داری نہیں لیں گے۔“

ایک دن بہت پُر لطف فلمی سین ہو گیا۔ ہمارا چھوٹا بھائی علی عمران الصبح ناشتا اور آئس کریم لے کر آیا تو اس وقت کمرے میں دو نرسیں موجود تھیں جن میں سے ایک پہلی مرتبہ ہمارے کمرے میں آئی تھیں۔

ہم نے اپنے بھائی سے کہا ”بھئی سسٹر کو آئس کریم دو نا۔“

سسٹر کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے اشارے سے دوسری نرس کی طرف دیکھا۔

ہم نے کہا ”کوئی حرج نہیں ہے۔ نئی نرس کو بھی آئس کریم دے دو۔ بہت اچھی اور مزیدار ہے۔“

دوسری نرس نے کہا ”سوری مسٹر آفاقی۔ میں ڈیوٹی پر ہوں اس لیے آئس کریم نہیں کھاؤں گی۔“

ہم نے کہا ”اس میں کیا برائی ہے سسٹر۔ آئس کریم ہی تو ہے ایک منٹ میں گھل جائے گی۔ لیجئے۔ پلیز۔ ہماری خاطر۔“

انہوں نے جھجکتے ہوئے دروازے کی دیکھا۔

ہم نے علی عمران سے کہا ”تم دروازے کے پاس جا کر کھڑے ہو جاؤ۔ اگر ہیڈ نرس یا کوئی ڈاکٹر اس طرف آنے لگے تو ہمیں بتا دینا۔“

دونوں نرسوں نے فوراً آئس کریم لے لی اور اس سے لطف اندوز ہونے لگیں۔ یکایک عمران نے دروازہ کھول کر اندر

جھانکا اور کہا ''سینئر نرس اس طرف آرہی ہیں۔''

دونوں نرسوں کے چہرے ایک دم سفید ہوگئے۔

ہم نے کہا ''تم دونوں باتھ روم میں چلی جاؤ۔ جلدی کرو۔'' وہ دونوں فوراً باتھ روم کے اندر غائب ہو گئیں۔ سینئر نرس مسز پی اندر آئیں تو انہوں نے حسب معمول کھڑے کھڑے ہماری مزاج پُرسی کی۔ پھر کہا ''اوہو۔ آئس کریم کھائی جارہی ہے؟''

ہم نے کہا ''عمران۔ سسٹر کو بھی آئس کریم دو۔''

وہ بولیں ''اوہ نو۔ میں ڈیوٹی پر ہوں۔ اس وقت آئس کریم نہیں کھاسکتی''

ہم نے کہا ''سسٹر۔ مشکل یہ ہے کہ ڈیوٹی کے بغیر آپ ہمارے کمرے میں نہیں آتی ہیں۔ تو پھر ہم آپ کو آئس کریم کس وقت کھلائیں؟''

وہ مسکرانے لگیں ''آئس کریم کھلانا کوئی ضروری تو نہیں ہے۔''

ہم نے کہا ''دیکھئے۔ بیمار کا دل رکھنا بھی نرسوں کا فرض ہوتا ہے۔ ہماری خاطر ایک آئس کریم کھالیں گی تو قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ عمران' سسٹر کو آئس کریم دو۔''

سسٹر نے بہت مجبوری سے ہمیں دیکھا اور پھر آئس کریم لے لی۔ وہ بہت خوش اخلاق اور اچھی خاتون تھیں۔ کبھی کبھار ہم سے اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرلیتی تھیں۔ سیاست اور فلم ان کے پسندیدہ موضوعات تھے۔

انہوں نے آئس کریم لے تو لی مگر پریشان تھیں ''آپ بہت ضد کرتے ہیں۔ بلاوجہ مجبور کرتے ہیں۔ آج آپ نے مجھ سے اصولوں کی خلاف ورزی کرائی ہے مگر یاد رکھئے۔ اس کے بعد میں ہرگز آپ کی دعوت قبول نہیں کروں گی۔''

ہم نے کہا ''وعدہ رہا۔ ہم پھر کبھی آپ کو مجبور نہیں کریں گے۔''

وہ آئس کریم کھانے میں مصروف ہوگئیں۔ ہم بھی آئس کریم کھا رہے تھے۔ عمران بھی آئس کریم کھا رہے تھے اس لیے کمرے میں خاموشی چھاگئی تھی۔

باتھ روم میں پناہ لینے والی دونوں نرسوں کو جب باہر سے کوئی آواز سنائی نہیں دی تو وہ یہ سمجھیں کہ سینئر نرس کمرے سے رُخصت ہو چکی ہیں۔ چنانچہ وہ باتھ روم کا دروازہ کھول کر کمرے میں آگئیں۔ دونوں کے ہاتھوں میں آئس کریم تھی۔

سینئر نرس نے انہیں دیکھا اور انہوں نے سینئر نرس کو دیکھا۔ تینوں کے ہاتھوں میں ایک ایک آئس کریم تھی اس لیے سب یکساں مجرم تھیں۔ دونوں نرسیں گھبرا کر دوبارہ باتھ روم میں گھس گئیں مگر ہیڈ نرس نے شکوہ بھرے انداز میں ہماری طرف دیکھا اور بولیں ''مسٹر آفاقی۔ یو آر امپاسیبل۔ آپ نے ہمارے ہسپتال کا نظام خراب کر دیا ہے۔''

ہم نے کہا ''مگر منہ کا ذائقہ تو اچھا کر دیا ہے نا؟''

انہوں نے اپنی مسکراہٹ روکنے کی کوشش کی مگر پھر بے اختیار مسکرانے لگیں۔

ہم نے کہا ''مسز پی۔ آپ اکثر مسکراتی رہا کیجئے۔ مسکراتی ہوئی آپ بہت اچھی لگتی ہیں۔''

انہوں نے جلدی جلدی بقایا آئس کریم ختم کی اور ہمیں گھورتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

ہم نے باتھ روم کی طرف دیکھ کر آواز دی ''باہر آجایئے۔ خطرہ ٹل گیا ہے۔''

وہ دونوں باہر نکلیں تو بہت سہمی ہوئی تھیں۔

''آج خیر نہیں ہے ہماری'' چھوٹی نرس نے کہا۔

ہم نے کہا ''فکر نہ کیجئے۔ سبھی یکساں قصوروار ہیں۔ آرام سے اپنی آئس کریم ختم کر لیجئے۔ مسز پی آپ کو کچھ نہیں کہیں گی۔''

اس طرح کی شرارتیں ہمارے کمرے میں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ اس دوران میں نرسوں اور ہسپتالوں کے دوسرے عملے سے بھی ہماری خاصی بے تکلّفی ہو گئی تھی۔ ہنسی مذاق اور لطیفہ بازی کا سلسلہ بھی چلتا رہتا تھا۔ ہمارے کمرے میں فلمی ہستیوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی اس لیے نرسیں اور اسٹاف کے دوسرے لوگ بھی بہانے بہانے کمرے میں آجاتے تھے۔ ہمارے کمرے کی انچارج نرسیں ان لوگوں کے جانے کے بعد فن کاروں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار بھی کر دیتی تھیں۔

ہمیں نرم غذا کھانے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی جس کی وجہ سے خون اور گلوکوز وغیرہ سے جان بچ گئی تھی۔ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہم ناشتا کرنے کے بعد بستر پر نیم دراز اخبار پڑھ رہے تھے کہ لیلیٰ ہاتھ میں دوائیوں کی ٹرے اور بلڈ پریشر چیک کرنے کا آلہ لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ہم انہیں دیکھ کر کچھ متعجب ہوئے اس لیے کہ دن کے وقت ان کی ڈیوٹی ختم ہو جایا کرتی تھی۔

''ارے۔آپ آج ابھی تک نہیں گئیں؟''

وہ بولیں ''دراصل آج چکن کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے اس لیے میں ڈبل ڈیوٹی دے رہی ہوں۔''

''چکن؟'' ہم نے حیران ہو کر پوچھا ''یہ کون ہیں؟''

بولیں '' دن کے وقت جس ینگ لڑکی کی ڈیوٹی ہوتی ہے اس کا پیٹ نیم چکن ہے۔گھر والے اسی نام سے پکارتے ہیں اس لیے ہسپتال میں اس کی دوست لڑکیاں اور ہوسٹل کی فرینڈز بھی اس کو چکن ہی کہتی ہیں۔''

''بہت دلچسپ نام ہے'' ہم نے کہا ''کیا یہ بہت ڈرپوک ہیں جو انہیں یہ نام دیا گیا ہے۔''

کہنے لگیں ''یہ بات نہیں ہے۔آپ نے اس کا سائز نہیں دیکھا؟ چھوٹی سی تو ہے۔ بچپن میں اور بھی چھوٹی تھی۔ بالکل مرغی کا چوزہ لگتی تھی اس لیے پیار سے اس کا نام چکن رکھ دیا گیا'' یہ کہہ کر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں مگر ہم نے محسوس کیا کہ وہ ہم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر پھر رُک جاتی ہیں۔ ہم نے خواہ مخواہ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا۔کچھ دیر بعد وہ جب سامان سمیٹ کر جانے لگیں تو یکایک دروازے کے پاس جا کر رک گئیں۔ پھر وہاں سے لوٹ کر آئیں اور کہا ''مسٹر آفاقی۔میرے پاس آپ کے لیے ایک چیز ہے''!

''ایک چیز؟! کیا چیز ہے؟''

انہوں نے یونیفارم کی جیب سے ایک چھوٹا سا لفافہ نکالا اور ہمارے حوالے کر دیا۔ ہم نے لفافہ اٹھایا تو اس میں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا تو وہ مسکرائیں اور بولیں ''چکن نے آپ کے لیے دیا تھا۔ پڑھ لیجئے'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے رخصت ہو گئیں۔

یا اللہ خیر۔ ہم نے سوچا۔یہ معاملہ کیا ہے' چکن کا مسئلہ کیا ہے۔اس طرف ہمارا قطعی دھیان نہیں گیا کہ یہ کوئی رومانی

معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ خوشبودار لفافہ دیکھ کر ہم کچھ الجھ سے گئے تھے۔

ہم نے لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک چھوٹا سا رنگین کاغذ برآمد ہوا۔ اس کاغذ پر ٹوٹے پھوٹے حروف میں جو کچھ لکھا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر روز آپ کو دیکھنے اور آپ کی خدمت کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ آج میں خود بیمار ہو گئی ہوں اس لیے آپ کی خدمت نہ کر سکوں گی لیکن آپ کو دیکھے بغیر دن گزارنا بہت مشکل ہو گا۔ کاش میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں اور ڈیوٹی پر پہنچ جاؤں۔ ویسے میں نے ڈاکٹر سے کہہ کر انجکشن لگوالیا ہے۔ میرے لیے دعا کریں۔ فقط بہ قلم خود۔

یہ خط ہمارے لیے بہت حیران کن تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کی رومانی خط و کتابت سے ہمارا کبھی نوعمری میں بھی واسطہ نہیں پڑا تھا جبکہ ذہن ناپختہ اور جذبات تلاطم خیز ہوتے ہیں۔ اب اس عمر میں جب کسی لڑکی کا ''پرچہ'' موصول ہوا تو ہم بہت حیران ہوئے۔ کچھ دیر بعد جب اس کے عواقب پر غور کیا تو پریشان بھی ہوئے۔ یہ یک طرفہ آگ کیوں کر بھڑک اٹھی اور اس کے لیے پہلی چنگاری کس نے اور کب ڈالی تھی؟

ہم نے اپنے دماغ پر زور ڈالا اور یاد کرنے کی کوشش کی کہ ہماری وہ کون سی حرکت تھی جس کی بنا پر ایک نادان لڑکی غلط فہمی کا شکار ہو گئی؟ شاید ہماری بے تکلفی اور ہنسی مذاق کرنے کی عادت؟ مگر یہ تو معمول کی بات ہے۔ تو پھر اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ ہسپتال میں زیر علاج مریضوں اور نرسوں کے مابین رومانی اور جذباتی تعلقات کے بارے میں ہم نے پڑھا اور سنا تو ضرور تھا مگر کبھی خود ان چیزوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

جن دنوں ہم ''زمیندار'' بند ہونے کے بعد ''آثار'' میں کام کر رہے تھے تو لاہور میں ایک زبردست دھماکہ ہوا تھا۔ رتن سینما کے مالک اور مشہور فلم ساز و تقسیم کار چوہدری عید محمد صاحب (اب مرحوم ہو چکے ہیں) کے بڑے صاحبزادے بیمار ہو کر ہسپتال پہنچے تو وہاں ایک نرس سے آنکھ لڑا بیٹھے۔ معاملہ اتنا بڑھا کہ جسمانی مرض سے تو صحت یاب ہو گئے مگر مرضِ عشق جان کو لگا بیٹھے۔ کافی دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

خوش شکل نرس نے اپنی ہمراز سہیلیوں کو بتایا کہ شادی کے وعدے وعید ہو چکے ہیں ' جلد ہی ہماری شادی ہو جائے گی اور میں ایک بہت بڑے آدمی کی بہو بن جاؤں گی۔

پھر ایک دن صبح سویرے ایک ویران سڑک کے کنارے ایک لڑکی کی لاش ملی جسے زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا۔اس زمانے میں ایسے واقعات برائے نام ہی رونما ہوتے تھے اور جب ہوتے تھے تو سارے شہر میں ہی نہیں، پورے صوبے میں تہلکہ سا مچ جاتا تھا۔دوسرے دن لڑکی کی شناخت ہوگئی اور پولیس اس کی ڈائری اور سہیلیوں کی مدد سے اصل واقعات تک پہنچ گئی۔چوہدری عید محمد صاحب نے اثر ورسوخ اور دولت کے بل بوتے پر اس واقعے کو دبانے کی بہت کوشش کی مگر ایک سرپھرے صحافی کی بدولت یہ راز فاش ہوگیا اور بات اتنی بڑھ گئی کہ ان کے صاحبزادے پھانسی کے پھندے تک جا پہنچے لیکن پھر عدالت عالیہ سے انہیں بری کر دیا گیا مگر اس مقدمے کی وجہ سے چوہدری صاحب کے بارہ پندرہ لاکھ روپے اڑ گئے جو کہ اس زمانے میں بہت بڑی رقم تصوّر کی جاتی تھی۔
یہ تو ایک ٹریجڈی تھی لیکن اس حوالے سے کئی خوشگوار کہانیاں بھی ہمارے علم میں ہیں۔

''آفاق'' کے دنوں میں ہمارے ایک رفیق کار کی بیگم گھر میں چولہا جلاتے ہوئے آگ کی لپیٹ میں آگئیں اور بالآخر فوت ہوگئیں۔انہوں نے دو کمسن بیٹے چھوڑے تھے۔ ہمارے دوست ان کی طرف سے بہت پریشان رہا کرتے تھے۔ اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ وہ ان ہی دنوں بیمار ہو کر ہسپتال پہنچ گئے۔جوان رعنا تھے مگر بے حد شریف اور شرمیلے۔وہاں ایک لیڈی ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی اور وہ ان پر مہربان ہوگئیں۔وہ تندرست اور ہنسی خوشی رہنے لگے بلکہ آج تک رہتے ہیں۔ان کی دوسری بیگم نے پہلی بیوی کے بیٹوں کو سگی ماں کا پیار دیا اور اپنے بچّوں کی طرح پالا۔ان کے اپنے بھی بچّے ہوئے جواب بڑے اور شادی شدہ ہو چکے ہیں۔یہ ایک خوشحال اور خوش باش مثالی خاندان ہے۔
اس طرح کے کچھ اور واقعات بھی ہمارے علم میں تھے مگر جب ہم اچانک خود ایسی ہی ایک کہانی کا کردار بن گئے تو ہمارے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ہماری بے تکلفی اور ہنسی مذاق کرنے کی عادت کئی بار اور بھی ہمارے لیے مشکل کا سبب بن چکی ہے جس کا بیان مناسب موقع پر ہوگا لیکن یہ سب نادانستہ باتیں ہیں۔ہم نے جان بوجھ کر کبھی ایسا افسانہ گھڑنے اور اس کا کردار بننے کی کوشش نہیں کی۔
اس روز کے بعد لیلیٰ جب بھی ہمارے کمرے میں آتیں، مسکرا کر معنی خیز انداز میں ہمیں دیکھ کر چلی جاتیں۔شام کو وہ پھر آگئیں اور بولیں ''مسٹر آفاقی۔میں اسے کیا جواب دوں؟''

''کس بارے میں ؟''

وہ ہنسنے لگیں ''صبح آپ کو جو لفافہ دیا تھا۔ بھول گئے ؟ کیا جواب میں کچھ نہیں دیں گے ؟''

ہم نے کہا'' وہ تو بیو قوف ہے۔اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔'' وہ زیر لب مسکرا کر رُخصت ہو گئیں۔

دوسرے دن چکن بنفس نفیس تشریف لے آئیں۔شروع میں تو کچھ سنجیدہ رہیں مگر دوپہر کے وقت تشریف لائیں تو فرمایا'' آپ نے کوئی جواب نہیں دیا؟''

ہم نے کہا'' کوئی سوال ہی نہیں تھا تو جواب کیا دیتے۔''

بولیں ''آپ تو اتنے بڑے رائٹر ہیں۔ کہانیاں اور ڈائیلاگ لکھتے ہیں۔اتنی سی بات بھی نہیں سمجھے ؟''

ہم نے کہا'' دیکھو چکن۔۔۔''

وہ بات کاٹ کر بولیں ''آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟''

''بس۔ پتا چل گیا۔ ہم یہ کہہ رہے تھے کہ یہ بچّوں جیسی حرکتیں ہمیں پسند نہیں ہیں اور آئندہ تم بھی احتیاط سے کام لینا۔ جس کو تم نے خط دیا تھا وہ بھلا ہمارے اور تمہارے بارے میں کیا سوچتی ہو گی ؟''

کہنے لگیں ''اُس کی فکر نہ کریں۔ وہ میری روم میٹ ہے۔ بہت رازدار سہیلی ہے۔اسے میں نے سب کچھ بتا دیا ہے''

''سب کچھ ؟'' ہم پریشان ہو گئے۔ ''کیا سب کچھ بتا دیا ہے ؟''

''یہی کہ میں آپ کو کیا سمجھتی ہوں'' وہ نظریں جُھکا کر بولیں۔

ہم نے سنجیدگی اور غصّے سے کہا'' جو بھی سمجھتی ہو وہ تمہاری ذمّے داری ہے مگر یہ باتیں ہمیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ آئندہ خیال رکھنا۔''

وہ ایک لمحہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ہمیں دیکھتی رہیں پھر بولیں ''معلوم ہو گیا کہ اب تک آپ کی شادی کیوں نہیں ہوئی ہے'' اور کمرے سے رخصت ہو گئیں۔

مگر یہ قصّہ کسی طور ختم نہیں ہوا۔ دو دن بعد ہمیں ایک اور خوشبودار لفافہ مل گیا۔ یہ ذرا تفصیلی تھا۔اس میں انہوں نے باضابطہ اظہار محبت کرتے ہوئے چند حسب حال فلمی اشعار بھی لکھے تھے اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر آپ

نے میرا دل توڑا تو میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ بس اپنی جان لے لوں گی۔ خودکشی کرلوں گی۔''
ہم یہ خط پڑھ کر بوکھلا گئے۔ پہلے سوچا کہ ڈاکٹر یا ہسپتال کے عملے سے بات کریں۔ پھر خیال آیا کہ وہ نوعمر لڑکی ہے اور جذباتی ہے۔ ذہن بھی کچّا ہے۔ ایسی لڑکیاں اس عمر میں کچھ بھی کر گزرتی ہیں۔ ایسا نہ ہو' وہ بلاوجہ کام سے جائے اور بیکار بھی ہو جائے یا اپنی دھمکی کے مطابق جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب ہم واقعی پریشان اور فکر مند ہو گئے تھے۔
اگلے روز دوپہر کو وہ کمرے میں آئی۔ یہ وقت ذرا فرصت کا ہوتا تھا۔ وہ کمرے میں آئی اور دروازہ بند کر کے اس سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اور ہماری طرف تکنے لگی۔ معلوم ہوا کہ صاحب زادی فلموں سے بھی کافی متاثر ہیں۔
ہم نے کہا'' دروازہ کھول دو اور اِدھر آ کر ہماری بات سنو۔''
انہوں نے دروازہ تو نہ کھولا البتہ ہمارے پائینتی آ کر بیٹھ گئیں۔ ''حکم کیجئے؟'' انہوں نے بڑی عاجزی سے کہا۔
ہم نے کہا'' دیکھو۔ تم ابھی کم عمر ہو۔ ناتجربہ کار اور بیوقوف ہو۔ اس طرح کی باتیں اور حرکتیں تمہاری زندگی اور کیریئر کو ختم بھی کر سکتی ہیں۔ دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی ناجائز فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے اور دنیا میں زیادہ تر لوگ ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں جس کی وجہ سے لڑکیوں کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔''
کہنے لگیں'' آپ دوسروں سے مختلف ہیں اس لیے تو آپ کا انتخاب کیا ہے''
لیجئے۔ اور سنئے!
ہم نے گھبرا کر کہا'' بس' اب تم جاؤ۔ بیوقوفی چھوڑو اور بائبل پڑھ کر عقل اور رہنمائی حاصل کرو۔''
وہ چلی تو گئیں مگر انہوں نے بیوقوفی ترک نہ کی یہاں تک کہ یہ سلسلہ ہمارے مکمل صحت یاب ہو کر گھر آ جانے کے بعد بھی جاری رہا۔ ان کے خطوط پہلے باقاعدگی سے موصول ہوتے رہے۔ پھر گنڈے دار ہو گئے یہاں تک کہ بند ہو گئے اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔
اس دوران میں ہم کئی بار ہسپتال گئے۔ یہاں تک کہ چند ماہ بعد دوبارہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو کر اسی ہسپتال میں پہنچ گئے جہاں بالآخر ہمارا آپریشن کیا گیا۔ اس تمام عرصے میں ہمارا اچکن سے سامنا ہوتا رہا۔ وہ ڈیوٹی میں اور

ڈیوٹی کے بغیر بھی ہمارے کمرے میں آکر سرد آہیں بھرتی تھیں اور آنکھوں میں آنسو بھر کر ہمیں دیکھا کرتی تھیں۔ ہمارے لیے دعائیں بھی کرتی تھیں۔ باغ سے پھول توڑ کر گلدستے بھی بنا کرلے آتی تھیں۔

جب ہم کافی بہتر ہو گئے تھے تو ایک رات وہ ڈیوٹی پر مامور تھیں۔ رات گئے وہ اچانک ہمارے کمرے میں آ گئیں۔ کافی اشک بہائے اور اتنی سرد آہیں بھریں کہ ہمارا کمرا برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ پہلے تو ہم سوتے بنے رہے۔ پھر جاگے تو انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ تنگ آکر دھمکی بھی دی کہ اگر وہ باز نہ آئیں تو ہم صبح ایڈمنسٹریٹر سے بات کریں گے مگر ان کا لڑکپن کا عشق تھا۔ جواب میں انہوں نے دھمکی دے دی کہ ایک دن آپ کو خبر مل جائے گی۔ یہ کہا اور رخصت ہو گئیں ۔ اس سے پہلے وہ خط کے ذریعے بھی ہمارے گھر پر دھمکی پہنچا چکی تھی کہ ایک دن آپ کو خبر مل جائے گی تو پھر میری محبت کا یقین آ جائے گا۔

ہمارے تو اوسان ہی خطا ہو گئے۔ ایسے واقعات بھی ہمارے علم میں ہیں جب نو عمر لڑکیوں نے جوش جذبات میں عجیب وغریب کارنامے سرانجام دیئے۔ ہمیں یہ فکر پڑ گئی کہ کہیں یہ بھی کوئی انتہا پسند حرکت نہ کر بیٹھے۔ رات کو سوئے تو خواب دیکھتے رہے کہ اخباروں میں خبریں شائع ہو رہی ہیں جن میں ہمیں موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ سب لوگ ہمیں الزام دے رہے ہیں کہ ہماری وجہ سے ایک معصوم لڑکی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

کئی روز تک ہم ذہنی پریشانی اور الجھن میں گرفتار رہے اور اللہ سے دعا کرتے رہے کہ ہمیں اس ناگہانی مصیبت سے بچائے۔ ہم نے اپنے آپ سے عہد بھی کیا کہ آئندہ ہر ایک سے بے تکلف نہیں ہوا کریں گے۔ خاص طور پر لڑکیوں سے ہرگز ہنسی مذاق نہیں کریں گے۔ ان سے بات کرتے ہوئے ہر وقت تیوری پر بل ڈالے رہیں گے۔ سیدھے منہ بات ہی نہیں کریں گے۔ کوئی لڑکی بے تکلّف ہونے کی کوشش کرے گی تو اسے بُری طرح ڈانٹ دیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ بیماری ہمارے لیے پریشان کن تو تھی ہی لیکن ہسپتال کی آمدورفت کے حوالے سے اتنا بہت سا مواد حاصل ہو گیا کہ ان مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر ایک بہت اچھی' دلچسپ' ڈرامائی اور سبق آموز فلم بنائی جاسکتی ہے۔

ہماری ہسپتال آمد و رفت کا سلسلہ وقفے وقفے سے ڈیڑھ دو سال تک جاری رہا اور اس زمانے کے بہت سے واقعات ہمیں زندگی بھر یاد رہیں گے۔

چِکن کی داستان تو بیان ہو چکی۔ اب ایک اور دلچسپ ڈرامائی موڑ بھی سن لیجئے۔

لیلیٰ کو ہم نے چِکن کے لیے کوئی جوابی پیغام نہیں دیا تھا اور اس کے زبانی دریافت کرنے پر رُکھائی سے مسئلہ نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کے بعد ڈیوٹی کے دوران میں لیلیٰ کے طرز عمل میں ہم نے کوئی تبدیلی نہیں دیکھی اور یہ ہمارے لیے بہت اطمینان کا سبب تھا۔ دراصل سکینڈل سے ہم بہت گھبراتے ہیں اور ایسے واقعات سے کوسوں دور رہتے ہیں جن کی وجہ سے کسی بھی مرحلے پر ذرا سا بھی سکینڈل بن جائے۔ اسے آپ ہماری کمزوری کہہ لیجئے۔ بزدلی کا نام دیجئے یا احتیاط پسندی سمجھئے۔ شاید اسی وجہ سے ہم رومانی واقعات اور جذباتی تعلقات سے محفوظ بھی رہے۔

چِکن کا پہلا خط موصول ہوئے تین چار روز گزر چکے تھے اور اب ہم ڈاکٹر ولیم سے تقاضے کرنے لگے تھے کہ ہمیں گھر واپس جانے کی اجازت دے دی جائے۔ ایک روز وہ نیم رضامند بھی ہو گئے مگر دوسرے ہی دن انہوں نے ہمیں مطلّع کیا کہ ہمارا ٹمپریچر خلاف معمول کچھ بڑھ گیا ہے اس لیے مزید ٹیسٹ اور چیک اپ کی غرض سے ہمارا مزید کچھ روز قیام ضروری ہے۔ یہ تو ہمیں بعد میں پتا چلا کہ چِکن نے ہمارے چارٹ پر جان بوجھ کر ٹمپریچر بڑھا دیا تھا۔ حماقت ملاحظہ ہو کہ دو دن بعد اس نے یہ بات ہمیں بھی بتا دی۔ ہم بہت ناراض ہوئے اور کہہ دیا کہ ہم ڈاکٹر ولیم سے شکایت کریں گے۔

وہ بہت پریشان ہوئی۔ روئی دھوئی۔ معافی مانگی کہ غلطی ہو گئی۔ آئندہ خیال رکھوں گی لیکن اس حرکت کی وجہ سے ہمارا ہسپتال میں قیام کچھ اور بڑھ گیا اور اسی دوران میں ایک نیا گل کِھل گیا۔

لیلیٰ کی ڈیوٹی صبح ختم ہو جاتی تھی۔ اس روز وہ ڈیوٹی ختم ہونے سے پہلے ہمارے کمرے میں آئی تو کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ جاتے جاتے وہ ایک کاغذ ہمارے سامنے ڈال گئی۔

جانے لگی تو ہم نے پکارا ''آپ یہ کاغذ چھوڑ گئی ہیں۔''

اس نے کہا ''یہ آپ کے لیے ہے؟'' اور غائب۔

ہم نے کاغذ اٹھایا تو یہ بھی ایک رنگین کاغذ تھا مگر ہینڈ رائٹنگ مختلف تھی۔ اس میں پختگی تھی اور یہ انگریزی میں لکھا تھا۔ پڑھا تو ہم ہکّا بکّا رہ گئے۔

یہ خط لیلیٰ کی جانب سے تھا۔

اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جب آپ پہلے دن ہسپتال آئے تھے تو میری ڈیوٹی تھی۔ ہم نرسیں سیریس مریضوں سے بہت گھبراتی ہیں اور آپ نے تو آتے ہی خون کی اُلٹیاں شروع کر دی تھیں۔ میرا سارا یونیفارم خون میں بھر گیا تھا اور میں نے دل ہی دل میں آپ کو بہت بُرا بھلا کہا کہ یہ کیا مصیبت نازل ہو گئی ہے۔ دو چار دن اسی ناراضگی اور پریشانی میں گزر گئے۔ پھر مجھے آپ سے ہمدردی ہونے لگی اور ترس آنے لگا۔ یہاں تک کہ دل میں ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا مگر پھر چِکن کو آپ کی طرف مائل ہوتے دیکھا تو خاموش رہنا ہی مناسب جانا۔ رفتہ رفتہ یہ معلوم ہو گیا کہ آپ کو چِکن سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی بیوقوفی سے آپ ناراض ہیں۔ چنانچہ ہمّت کر کے ان سطور کے ذریعے آپ تک اپنے دلی جذبات پہنچا رہی ہوں۔

ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ لیجئے اور سنئے۔

یک نہ شد دو شد۔

سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ لہٰذا خاموش رہے۔

شاید انہوں نے اس خاموشی کو نیم رضامندی سمجھا اس لیے ایک اور خط لکھ مارا۔

تیسرے دن وہ خاموش نگاہوں سے دیکھتی ہوئی ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔

ہم نے کہا ”بھئی وہ تو کم عمر ہے اس لیے بیوقوف ہے مگر آپ تو بچّی نہیں ہیں۔ آپ کو تو کچھ عقل کی بات کرنی چاہیے تھی۔“

انہوں نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں گھمائیں اور نہایت سنجیدگی سے بولیں ”عقل اور دل کی تو ہمیشہ سے لڑائی ہوتی آئی ہے۔“

ماشاءاللہ۔ کیا جواب ہے!

ہم نے کہا ’’تو پھر اس لڑائی کا فیصلہ ہو گا تو دیکھیں گے۔‘‘

ہم دو چار دن بعد ہسپتال سے چلے آئے مگر ڈاکٹر ولیم کے پاس مشورے کی غرض سے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ ہم ہسپتال جاتے تو وہاں پرانے مریض ساتھیوں کی خبر لینے بھی چلے جاتے تھے مگر ہمارے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ہماری یہ حرکت یا حماقت ان دو خواتین کے لیے مختلف معانی کی حامل ہے۔ وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ شاید ہم ان ہی کی خاطر ہسپتال جاتے ہیں۔ چنانچہ گھر کے پتے پر خطوں کی آمد شروع ہو گئی تو ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس کے بعد ہم نے خود کو ’’ڈاکٹرز آفس‘‘ کے علاقے تک محدود کر لیا اور دوسری منزل پر جانا بالکل ترک کر دیا۔ لیکن آپ نے وہ محاورہ تو سنا ہو گا کہ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ انگریزی میں جو محاورہ ہے اس کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے کہ انسان سوچتا رہ جاتا ہے اور خدا اس کے ارادوں کو ملیامیٹ کر دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہمارے ساتھ بھی پیش آیا۔

اِن دنوں ہم بالکل ریٹائرمنٹ اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ سخت پرہیزی کھانا کھاتے تھے۔ کھانے کے بعد چہل قدمی ضرور کرتے تھے۔ زیادہ تر آرام کرتے رہتے تھے۔ لکھنے سے بھی پرہیز تھا۔ صرف پڑھنے سے سروکار تھا۔ یار دوستوں سے ٹیلی فون پر گپ شپ کر لیتے تھے ورنہ لکھنے لکھانے اور فلم بنانے کے سلسلے میں تمام منصوبے وقتی طور پر ہم نے بالائے طاق رکھ دیے تھے۔ غصّہ ہمیں ہمیشہ سے بہت زیادہ آتا ہے۔ ان دنوں چڑچڑاپن کچھ اور زیادہ ہو گیا تھا۔ ذرا سی بات پر ہم غصّے میں آگ بگولا ہو جاتے تھے اس لیے گھر والے بہت سے امور ہمارے علم ہی میں نہیں لاتے تھے۔ سٹوڈیو میں ہمارا دفتر بھی موجود تھا اور سٹاف بھی تھا لیکن انہیں ہم نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ کام کاج یا کاروبار کی کوئی بات ہم سے نہ کریں ورنہ ہمیں غصّہ آ جائے گا اور ہم پریشان ہو جائیں گے اور ان دونوں باتوں سے ڈاکٹر نے ہمیں پرہیز کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

ہمارے گھر پر عموماً فلمی اداکاروں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ نہ ہی کبھی کبھار ملاقات کرنے کے سوا کوئی فلمی مصروفیت ہم گھر کے لیے اٹھا رکھتے تھے مگر ان دنوں چونکہ بیماری سے اٹھے تھے اور اسٹوڈیو یا دفتر نہیں جاتے تھے، اس لیے کئی فنکار ہماری مزاج پُرسی کے لیے گھر بھی آ جاتے تھے۔

رخسانہ (چیکو) اوران کی والدہ کاقصّہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔رخسانہ کی والدہ کسی زمانے میں مِڈ وائف تھیں۔ دُبلی پتلی، چھوٹے قد کی خاتون تھیں۔ باتیں ایسے کرتی تھیں جیسے مشین گن گولیاں برساتی ہے۔یعنی مسلسل اوراندھا دھند، آنکھوں پر بڑے بڑے شیشوں کی عینک بھی پہنتی تھیں۔ان کا خیال تھا کہ دنیا کا کوئی مریض ایسا نہیں ہے جس کا علاج ان کے پاس نہ ہو۔انہوں نے ہمارے گھر آکر ہمیں کافی ڈانٹا ڈپٹا اور کہا"آفاقی! تم کتنے بے وقوف ہو۔"

"کیوں؟" ہم نے گھبرا کر پوچھا"ہم نے کیا کر دیا؟"

بولیں" ارے بھئی تمہیں السر تھا تو مجھے بتایا ہوتا۔میں دو پُڑیوں میں ٹھیک کر دیتی۔" ہمارے آپریشن کے بعد بھی انہوں نے ہم سے یہی کہا تھا کہ اگر مجھ سے پُڑیوں لے لیتے تو آپریشن وغیرہ کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔کچھ اور قریبی دوست فنکار بھی اُدھر اِدھر کی باتیں کرنے کے لیے ہمارے پاس آجاتے تھے مگر اب ہم مسلسل بیکاری اور آرام کرنے سے اُکتا چکے تھے۔ کبھی سوچتے کہ خدا جانے یہ اَلسر کیا بلا ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹروں نے ہم سے چھپایا ہو اور درحقیقت یہ کوئی مہلک اور جان لیوا مرض ہو۔ کبھی خیال آتا کہ اتنی جدوجہد کے بعد کامیابی کی پہلی سیڑھی پر چڑھے تو اچانک بیمار پڑ گئے۔ کہیں یہ ہماری زندگی کا آخری دور تو نہیں ہے؟۔۔اکیلے بیٹھے بیٹھے دنیا بھر کے وسوسے ہمیں گھیر لیتے تھے۔سارے پُرانے دُکھ یاد آجاتے۔مصیبت زدہ دوستوں اور رشتے داروں کا خیال کر کے خود بخود آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

کچھ دن بعد ہم نے محسوس کیا کہ ہم قنوطی اور یاس زدہ ہو گئے ہیں۔مایوسی اور محرومیوں نے ہمیں گھیر لیا ہے۔اب ہم زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہیں گے۔یہ سوچ سوچ کر ہم باقاعدہ ڈپریشن کے مریض بن گئے تھے۔

جب نیند کے لیے خواب آور گولیاں بھی بے اثر ہونے لگیں اور ہم بلاوجہ ساری ساری رات بے کار کے اندیشے ہائے دور دراز کی وجہ سے کروٹیں بدلنے لگے تو ہماری پریشانی اور الجھن میں اضافہ ہو گیا۔ڈاکٹر ولیم نے ہمیں تمام نیند آور دوائیں استعمال کرادی تھیں اور ان کے ناکام ہونے پر"م" (بوجوہ نام نہیں لکھ رہے)نام کی گولیاں تجویز کی تھیں۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ بعض نشے باز ان گولیوں کو منشیات کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔اس کی ایک شیشی میں موٹی موٹی دس سفید گولیاں ہوتی تھیں۔ڈاکٹر ولیم نے ہمیں رات کو ایک چوتھائی گولی کھانے کی ہدایت کی تھی۔ یہ

امر مجبوری ہم نصف گولی بھی کھا سکتے تھے لیکن جب دماغ مسلسل سوچنے میں مصروف رہے تو کیسی گولی' کہاں کی گولی۔ایک رات ہم نے پاؤ گولی کھائی مگر نیند نہ آئی تو باقی پاؤ حصّہ بھی کھالیا۔پھر بھی نیند نہ آئی تو بقیہ آدھی گولی بھی ہضم کرلی۔ایک گھنٹہ سوئے تھے کہ پھر آنکھ کھل گئی اور اتنی بے چینی ہوئی کہ ہم پریشان ہو کر مزید پوری ایک گولی کھا بیٹھے۔کچھ دیر بعد نیند آگئی مگر دو تین گھنٹے بعد ہی آنکھ کھل گئی۔بہر حال صبح ہو چکی تھی اس لیے کچھ حوصلہ ہوا مگر دوائی کی زیادہ مقدار کھانے کی وجہ سے ''ہینگ اوور'' ہو گیا۔یعنی سر میں درد اور چکّر وغیرہ۔ڈپریشن اتنا شدید کہ دو چار بار سوچا کہ خودکشی کرنا بہتر ہو گا مگر وہ کون سا طریقہ اپنائیں جس سے تکلیف نہ ہو۔کافی دیر تک خودکشی کرنے کے مختلف طریقوں پر غور کرتے رہے اور جب مرنے کی ہمّت نہ پڑی تو سوچا کہ کیوں نہ ڈاکٹر ولیم سے مشورہ کریں۔

ڈاکٹر ولیم کے دفتر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج ان کے پاس ملاقات کا وقت نہیں ہے۔ ہم نے انہیں ایک چٹ لکھ کر بھیجی کہ ہمیں دو منٹ ضرور دے دیں۔نہایت ایمرجنسی کی صورت ہے۔

انہوں نے فوراً ہمیں طلب کرلیا۔ہماری شکل دیکھی تو وہ کچھ اور سنجیدہ ہو گئے۔''کیا پرابلم ہے ؟'' انہوں نے پوچھا۔ ہم نے اپنی ذہنی کیفیت کے بارے میں بتایا۔گولی کھانے کا قصّہ بھی سنایا۔وہ بولے ''مجھ سے غلطی ہو گئی۔پوری شیشی آپ کو نہیں خریدنی چاہیے تھی۔جو لوگ زیادہ خواب آور گولیاں کھا کر مر جاتے ہیں وہ اسی طرح غیر ارادی طور پر گولیاں کھاتے رہتے ہیں جیسے کہ آپ نے کھالیں۔شکر ہے کہ نیند آگئی تھی ورنہ آپ تو ساری شیشی خالی کر دیتے۔''

''ڈاکٹر آخر ہمیں ہوا کیا ہے ؟'' ہم نے پوچھا۔

بولے ''ڈپریشن۔۔۔غالباً نروس بریک ڈاؤن ہونے والا ہے۔''

ہم نے گھبرا کر پوچھا ''تو پھر کیا کریں ؟''

کہنے لگے ''آپ فوراً ہسپتال میں داخل ہو جائیں۔ایک کمرہ ابھی خالی ہوا ہے۔میں آپ کے نام کر دیتا ہوں۔''

ہم نے کہا ''مگر ہسپتال میں داخل ہو جانے سے ڈپریشن کیسے دور ہو جائے گا؟''

وہ مسکرائے ''آپ کا علاج کریں گے۔ٹیسٹ لیں گے۔چیک اَپ کریں گے۔بس آپ آج ہی آجایئے۔''

اس طرح ہم دوبارہ ہسپتال میں داخل ہو گئے۔

شام تک ہمارے ہسپتال میں داخل ہونے کی خبر سب کو معلوم ہوگئی۔ فوراً فرداً ہسپتال کے سبھی پرانے لوگ مزاج پرسی کے لیے آئے۔ ہم نے یہ کہہ کر معاملہ رفع دفع کر دیا کہ چیک اپ کے لیے آئے ہیں۔

چِکن بھی مسکراتی ہوئی آگئیں ''میں جانتی تھی' آپ ضرور آئیں گے۔''

''کیسے جانتی تھیں؟''

''میرا دل کہہ رہا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی رخصت ہوگئیں۔

رات کے وقت لیلیٰ بھی ''ہیلو'' کہنے کے لیے آگئیں۔ نظریں جھکا کر بولیں ''آپ کا کوئی خط مجھے نہیں ملا۔''

ہم نے کہا ''ملتا کیسے۔ ہم نے لکھا ہی نہیں تھا۔''

''آپ سے یہ اُمید نہ تھی۔'' انہوں نے کہا اور رُخصت ہوگئیں۔

صبح تک فلمی حلقوں میں بھی ہمارے دوبارہ ہسپتال میں داخل ہونے کی خبر عام ہوگئی اور احوال پُرسی کے لیے سب نے آنا شروع کر دیا۔ لوگ تو گھبرا کر آتے تھے مگر ہمیں صحیح سلامت' چلتا پھرتا دیکھ کر بہت مایوس ہوتے تھے۔ حیران بھی ہوتے تھے۔

محمد علی نے ہمارا جائزہ لینے کے بعد کہا ''آفاقی میں تو پریشان ہو گیا تھا مگر تم اچھے خاصے ہو؟''

ہم نے کہا ''تو پھر کیا کریں۔ سخت بیمار پڑ جائیں؟''

''ارے نہیں صاحب' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ مگر تمہیں ہسپتال میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ مری چلے جاتے۔ سیر بھی ہو جاتی اور صحت بھی ٹھیک ہو جاتی۔''

اس روز تمام دن احوال پُرسی کرنے والے آتے رہے۔ دوسرے دن ڈاکٹر ولیم راؤنڈ پر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ تمام ٹیسٹ درست ہیں۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔

''اس کا مطلب کیا ہے؟'' ہم نے پوچھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ جسمانی طور پر ٹھیک ہیں۔ اب آپ کا نفسیاتی علاج ہونا چاہیے۔''

''یعنی ماہر نفسیات کے ذریعے؟''

''بالکل ٹھیک سمجھے۔ دس بجے آپ کے پاس ڈاکٹر رام کو بھیجوں گا۔ اوکے؟'' یہ کہہ کر وہ رُخصت ہو گئے اور ہم اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

ٹھیک دس بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ ایک دراز قد۔ نہایت خوش شکل۔ میک اَپ سے آراستہ۔ ترشی ہوئی زلفوں والی خاتون سامنے کھڑی تھیں۔ ملاحت ان پر ٹوٹی پڑتی تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کی پھول دار شلوار قمیص انہوں نے زیب تن کر رکھی تھی۔

''ہیلو۔ مسٹر علی آپ ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں''!

''میرا نام ڈاکٹر رام ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ راستہ چھوڑ و اور مجھے اندر آنے دو۔ ہم گھبرا کر ایک طرف کو ہٹ گئے۔ وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئیں۔ بھینی بھینی خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔ وہ ایک کُرسی پر بیٹھ گئیں اور بولیں ''آپ کی کیس ہسٹری میں نے دیکھ لی ہے۔ اب ڈاکٹر ولیم نے آپ کو میرے سُپرد کیا ہے۔''

''آپ کیا کریں گی؟ کس طرح علاج کریں گی؟''

''پریشان نہ ہوں۔ میں کچھ نہیں کروں گی۔ صرف باتیں کروں گی۔ آپ بھی آرام اور سکون کے ساتھ بیٹھ جائیں اور باتیں کریں۔''

کافی عرصے بعد ہمیں کوئی باتیں کرنے والا ملا تھا۔ ہمارے تو دل کی مراد بر آئی۔ اب جو باتیں شروع ہوئیں تو بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ انہوں نے ہمارے بچپن کے بارے میں پوچھا تو ہم نے اپنی پیدائش سے پہلے کے حالات بھی بیان کر دیئے۔ خاندان، بچپن، دوست احباب، ماں باپ، بہن بھائی، رشتے دار سبھی کچھ بتا دیا۔ وہ بڑے اطمینان سے سنتی رہیں اور درمیان میں سوالات بھی کرتی رہیں۔ کبھی حیران ہوتیں۔ کبھی مسکراتیں۔ گویا پوری دلچسپی سے ہماری داستان سن رہی تھیں۔

ہم تو تمام دن یہ سلسلہ جاری رکھ سکتے تھے مگر انہوں نے اچانک اپنا دست حنائی اٹھایا۔ ننھی سی نازک گھڑی پر نظر ڈالی

اور اٹھ کھڑی ہوئیں ”اوکے۔ پورا ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اب میں چلتی ہوں۔ کل دس بجے پھر آؤں گی۔“ یہ کہہ کر وہ رُخصت ہو گئیں۔

ہمیں وہ بہت اچھی لگیں۔ چِکن نے آکر ہم سے پوچھا ”کیوں! ڈاکٹر رام کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

ہم نے کہا ”ان کا نام غلط ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”ان کا نام ڈاکٹر سیتا ہونا چاہیے تھا اور انہیں ڈاکٹر کے بجائے شاعرہ‘ فنکارہ یا اداکارہ ہونا چاہیے تھا۔“

دوسرے دن وہ پھر آ گئیں۔ کافی دیر تک ہم سے کُرید کُرید کر پوچھتی رہیں اور ہم بیان کرتے رہے۔ کیا پسند کرتے ہیں۔ کیا ناپسند کرتے ہیں۔ تیز ہوا چلتی ہے تو ڈر لگتا ہے۔ آندھی کی سائیں سائیں سے خواہ مخواہ سہم جاتے ہیں۔ خودبخود اداس اور غمگین ہو جاتے ہیں۔ مسلسل کوئی لڑکی اچھی نہیں لگتی۔ آج اچھی لگ رہی ہے۔ کل اس کے عیب نظر آنے لگتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر ہم نے یہ بھی بتا دیا کہ ہمارے خیال میں آندھی سے ڈرنے کا کیا سبب ہے۔ بچپن میں ایک بار آندھی چلی تو بانسوں والے بازار میں آگ لگ گئی۔ شعلے ہمارے گھر سے بھی نظر آ رہے تھے۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ آندھی کی وجہ سے آگ بہت جلد ہر طرف پھیل گئی ہے۔ دوسری بار بھی بچپن ہی کے دور میں ایک بار شہر میں سرکس آیا ہوا تھا کہ کسی نے جلتا ہوا سگریٹ پھینک دیا اور آگ لگ گئی۔ جنگلی جانور بھی پنجروں سے نکل آئے اور بھگدڑ مچ گئی۔

وہ بولیں ”آپ نے بالکل صحیح تجزیہ کیا ہے۔“ اس روز بھی وہ ایک گھنٹے کے بعد رخصت ہو گئیں۔

تیسرے روز وہ آئیں تو ہماری باتیں اور ان کے سوالات قریب قریب ختم ہو گئے تھے۔

ہم نے کہا ”ہم سے تو آپ نے سب کچھ پوچھ لیا۔ اب کچھ اپنے بارے میں بھی بتایئے۔“

انہوں نے بتایا کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئیں۔ اعلیٰ تعلیم امریکہ سے حاصل کی اور کچھ وقت وہاں پریکٹس بھی کی۔ اب دو سال سے اس ہسپتال میں کام کر رہی ہیں۔

”آپ کی عمر چھبیّس سال تو ہو گی؟“ ہم نے پوچھا۔

ان کے منہ سے بے اختیار نکلا ''جی نہیں میں اٹھائیس سال کی ہوں۔''

''رام آپ کے شوہر کا نام ہے؟''

وہ ہنس پڑیں ''ارے نہیں۔ میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔ آپ کی عمر تو مجھ سے بھی زیادہ ہے اور آپ نے بھی شادی نہیں کی۔''

ہم نے ذاتی مجبوریاں بیان کر دیں۔ کہنے لگیں ''یہ تو غیر فطری بات ہے۔ نفسیاتی خلل کی نشاندہی کرتی ہے۔ نارمل شخص کو اتنی عمر میں لازماً شادی کر لینی چاہیے۔''

ہم نے پوچھا ''تو پھر آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

وہ ایک دم سیریس ہو گئیں ''پرسنل ہونے کی ضرورت نہیں؟''

ہم نے کہا ''ہم تو اس لیے پوچھ رہے ہیں کہ اگر اتنی دیر تک شادی کرنا نارمل بات نہیں ہے تو آپ نے بھی تو شادی نہیں کی۔ تو کیا آپ کا بھی نفسیاتی مسئلہ ہے؟''

وہ ناراض ہو گئیں ''آپ کو میری ذات کے بارے میں پوچھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''تو پھر آپ نے ہماری ذات کے بارے میں کیوں پوچھا تھا''!

بولیں ''میں تو ڈاکٹر ہوں۔''

ہم نے کہا ''ہم بھی مریض ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ اگر ہم نفسیاتی بیمار ہیں تو پھر آپ کیا ہیں؟''

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں ''ایکسکیوز می۔ آپ قطعی نارمل نہیں ہیں۔ میں ڈاکٹر ولیم سے آپ کی شکایت کروں گی۔''

یہ کہہ کر وہ غصّے میں اٹھ کر چلی گئیں۔

سہ پہر کو ڈاکٹر ولیم آئے پھر بولے ''مسٹر آفاقی! آپ نے ڈاکٹر رام کو ناراض کر دیا۔''

''ہم نے تو کچھ نہیں کہا۔''

''وہ آپ کی بہت شکایت کر رہی تھیں۔ آخر ہوا کیا تھا؟''

ہم نے بتایا تو وہ مسکرانے لگے ''وہ تو تحلیل نفسی کی غرض سے سوالات کر رہی تھیں مگر آپ کو اس طرح نہیں کہنا

چاہیے تھا۔''

ہم نے کہا''ڈاکٹر! انہوں نے خود ہی تو کہا تھا کہ نارمل شخص کو25' 26 برس کی عمر میں شادی کر لینی چاہیے۔''

''ارے وہ تو ڈاکٹر ہیں۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ خیر اب وہ آئیں گی تو ہم معذرت کر لیں گے۔''

کہنے لگے ''اب وہ نہیں آئیں گی۔ان کی سٹنگز پوری ہو چکی ہیں۔''

''اوہو! تو گویا وہ ہمارا علاج کرنے کے سلسلے میں آتی تھیں۔''

اسی روز دفتر نے ہمیں بل بھی ارسال کر دیا۔40 روپیہ فی گھنٹہ کے حساب سے ہمیں ڈاکٹر رام کو 3 گھنٹے کی فیس 120 روپے ادا کرنی تھی۔

''بیکار گپ شپ کی فیس اتنی زیادہ؟'' ہم نے حیران ہو کر کہا''وہ بس اُدھر اِدھر کی باتیں ہی کرتی رہتی تھیں۔''

ڈاکٹر ولیم مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ شام کو چِکن ہنستی ہوئی ہمارے کمرے میں آئی۔ وہ ہنسی کے مارے گری پڑ رہی تھی۔

''بات کیا ہے؟''

کہنے لگی''آپ کو پتا ہے ڈاکٹر رام نے آپ کی رپورٹ میں کیا لکھا ہے؟''

''کیا لکھا ہے؟'' ہم نے چونک کر پوچھا۔

بولی'' میں ابھی آپ کو آپ کا چارٹ اور فائل لا کر دکھا دیتی ہوں مگر قسم کھایئے کہ کسی کو بتائیں گے نہیں ورنہ میری نوکری چلی جائے گی۔''

ہم نے کہا''یہ مریضوں کے حق میں بہتر ہو گا۔اب تم بھاگ کر جاؤ اور چارٹ لے آؤ۔''

کچھ دیر بعد وہ سب کی آنکھ بچا کر دفتر سے ہمارا چارٹ اور فائل لے آئی۔ڈاکٹر رام نے ہمارے بارے میں تین صفحات پر مشتمل رپورٹ لکھی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ'' یہ شخص نارمل انسان نہیں ہے۔اس کے اندر غیر معمولی جراثیم موجود ہیں۔اس بات کا قوی امکان ہے کہ آئندہ دو چار سالوں میں یہ بالکل پاگل ہو جائے گا۔''

لیجئے۔اتنی مہنگی فیس دینے کا ہمیں یہ صلہ ملا تھا!

یہ رپورٹ پڑھ کر ہمیں بہت غصہ آیا۔اگر کوئی کمزور ذہن کا وہمی آدمی ہوتا تو اس رپورٹ کو پڑھ کر واقعی ذہنی بیمار ہو جاتا مگر ہم تو بقول شخصے ڈھیٹ آدمی ہیں اس لیے ان کے خیالات کا مطلق کوئی اثر قبول نہیں کیا۔خدا جانے ڈاکٹر رام اب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ان کی شادی ہو چکی ہے یا ہنوز کنواری ہیں! اگر کہیں ملاقات ہوتی تو ان سے یہ ضرور پوچھتے کہ ہم تو ان کی تشخیص کے برعکس خدا کے فضل سے اب تک بالکل صحیح الدماغ ہیں۔مگر ان کا کیا حال ہے؟

اس مرتبہ ہسپتال میں ہمارا قیام بارہ چودہ دن رہا۔کوئی خاص تکلیف یا بیماری تو تھی نہیں اس لیے وقت بہت اچھا اور سکون سے گزرتا تھا۔سوائے ان دو خواتین کی حرکتوں کے سبھی کچھ ٹھیک تھا۔ان کا سائیڈ ٹریک ساتھ ساتھ چلتا رہا اور موقع پا کر وہ خوشبو بھرا خط ہمارے حوالے کرنا نہیں بھولتی تھیں۔چکن کے مزاج میں بچپنا زیادہ تھا اس لیے وہ زبانی اظہار محبت سے بھی باز نہیں آتی تھی اور موقع ملنے پر ڈرامائی منظر پیدا کرنے سے بھی نہیں چوکتی تھی۔دوسری خاتون سنجیدہ تھی اس لئے وہ نظروں نظروں میں ملامت کرنے کے سوا کوئی اور جارحانہ حرکت نہیں کرتی تھی۔ہم نے ایک روز تنگ آ کر نہایت سنجیدگی سے انہیں دھمکی دی کہ اگر وہ یہ ڈراما پیش کرنے سے باز نہ آئیں تو ہم ابھی جا رہے ہیں ایڈمنسٹریٹر کے پاس۔اس دھمکی کا اثر یہ ہوا کہ وہ خاموش تاثرات' سرد آہوں اور غمگیں نگاہوں تک ہی محدود رہیں اور ہم مزید آفات سے محفوظ رہے۔

ہسپتال میں ہمیں ہر طرح کا سکون میّسر تھا۔ڈرائیور گھر سے کھانا اور ناشتہ لے آتا تھا۔ملاقاتیوں پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔گھر والے دوست احباب فلم والے سبھی جب دیکھو منہ اٹھائے چلے آتے تھے اور کوئی روک ٹوک نہ تھی۔اس سے یہ فائدہ تھا کہ سٹوڈیو اور فلمی دنیا سے دور رہنے کے باوجود ہم تازہ ترین فلمی خبروں' سکینڈلز اور ہنگاموں سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔آپ ان کے سامنے دوسری ہیروئن کی تعریف کر دیں یا اس سے منسوب کر کے کوئی ریمارک بتا دیں۔بس اس کے بعد تو اللہ دے اور بندہ لے۔وہ الفاظ کی مشین گن لے کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور چُن چُن کر نشانے لگاتی ہیں۔

ایک دن بہار تشریف لائیں۔ وہ تعلیم یافتہ اور اچھی انگریزی بولنے والی ہیروئن تھیں۔ ہم سے تو خیر وہ اردو یا پنجابی ہی میں بولا کرتی تھیں مگر جب بھی موقع ملتا تو خالص کانونیٹ کے انداز میں انگریزی کا دریا بہادیتی تھیں۔ انہوں نے چند ہی منٹوں میں معاملات کو بھانپ لیا۔ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتی اور کھلکھلاتی رہیں پھر جاتے جاتے یہ فرمایا ''آفاقی صاحب! ہسپتال آنے سے آپ کو ایک فائدہ تو ہو ہی گیا۔

''وہ کیا؟'' ہم نے پوچھا

کہنے لگیں ''اب آپ کے ہاتھ پیلے ہو جائیں گے۔ ''

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

وہ بولیں ''میں صرف رائٹر کے لکھے ہوئے مکالمے ہی نہیں بولتی۔ آس پاس کی چیزوں کا مشاہدہ بھی کر سکتی ہوں۔ ''

ایک دن ساقی صاحب آئے۔ کچھ دیر بعد دلجیت مرزا بھی پہنچ گئے۔ اسلم پرویز بھی موجود تھے۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ سبھی اداکار اور ایکٹریس ہماری مزاج پرسی کے لئے آتے رہتے ہیں۔

ساقی صاحب نے بہت مفید مشورہ دیا بولے ''آفاقی صاحب! موقع اچھّا ہے۔ آپ نئی فلم کی شوٹنگ شروع کر دیں آسانی سے بن جائیگی۔ ''

ہم نے پوچھا ''یہاں؟ ہسپتال میں؟ ''

''اس میں کیا مشکل ہے'' وہ بولے بھئی آپ تو رائٹر ہیں۔ ہسپتال کے پس منظر میں کوئی کہانی بنا لیجئے۔ اصلی نرسیں اور ڈاکٹر بھی مل جائیں گے۔ ماحول بھی اصلی ہو گا۔ ''

اس قسم کے مشورے ہمیں اکثر ملتے رہتے تھے۔ سنتوش کہتے تھے کہ آفاقی صاحب شادی کئے بغیر ہسپتال سے نہیں جائیں گے غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

اس ماحول میں ہماری ذہنی کیفیت بہت جلد ٹھیک ہو گئی اور ڈپریشن بھی دور ہو گیا۔ جتنے دن ہم ہسپتال میں رہے ایک بار بھی خواب آور یا مسکّن گولی کھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ صحت بھی قدرے بہتر ہو گئی۔ بقول لہری صاحب کے ہمارا دو چھٹانک وزن بڑھ گیا تھا۔

ہسپتال سے گھر گئے تو پھر وہی پرہیز، آرام اور پریشان کر دینے والے کاموں سے گریز جاری رہا مگر اب ہم شام کے وقت گاڑی لے کر قریب کے دوستوں اور ملاقاتیوں کے پاس چلے جاتے تھے۔ فلمیں دیکھنے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ چائنیز ریستوران کے چکّر بھی لگنے لگے۔ اگر کوئی فلم والا ہمیں وہاں دیکھ کر اظہار حیرت کرتا تھا تو ہم نہایت صفائی سے یہ جھوٹ بول دیا کرتے تھے کہ یہ کھانا ہم ڈاکٹر کے مشورے پر کھا رہے ہیں۔ السر کے مریض کے لئے چینی کھانا بہت مفید ہوتا ہے۔

چھ مہینے مزید گزر گئے ہمارا وزن بڑھ گیا۔ چہرے پر رونق آگئی اور سُرخی جھلکنے لگی۔ کبھی کبھی ہمیں یہ شبہ بھی گزرنے لگا کہ شاید ہماری دیرینہ آرزو پوری ہونے کا وقت آگیا ہے کیونکہ ہماری چھوٹی سی توند بھی نکل آئی تھی یا شاید محض ہمارا وہم تھا۔

طارق صاحب ان دنوں باقاعدگی سے رابطہ رکھتے تھے اور اب انہوں نے سنجیدگی سے اصرار کرنا شروع کر دیا تھا کہ ہمیں کم سے کم کہانی تو بنا ہی لینی چاہیے تاکہ دو چار مہینے بعد فلم کا آغاز کر دیا جائے۔ ہم نے ایک دو کہانیوں کا ون لائین سکرین پلے بھی بنانا شروع کر دیا تھا۔

ہم تو اپنی دانست میں بالکل تندرست ہو گئے تھے اور کام کا آغاز کرنے کے لئے پر تول رہے تھے مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ان دنوں ہماری بڑی بہن امینہ آپا یو سی ایچ میں زیر علاج تھیں۔ ہم ایک شام ان کی مزاج پرسی کیلئے ہسپتال گئے۔ وہ ٹھیک ہو چکی تھیں اور اگلے دن ہسپتال سے رخصت ہونے والی تھیں۔ اچانک ہماری طبیعت خراب ہو گئی۔ جی متلانے لگا چکّر سے آنے لگے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ہم نے فوراً نرس کو طلب کیا اور ڈاکٹر ولیم کو بلانے کیلئے کہا۔

چند منٹ بعد ڈاکٹر ولیم تشریف لے آئے انہوں نے ہمارا معائنہ کیا اور بولے آپ کو اسی وقت ہسپتال میں داخل ہو جانا چاہیے۔

ہم نے کہا" مگر ڈاکٹر ہمارے پاس تو سامان بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ٹوتھ برش تک نہیں ہے۔ "

وہ بولے" یہ سب چیزیں سامنے گلبرگ میں مل جاتی ہیں ایک کمرہ بھی اتفاق سے خالی ہے۔ "

پوچھا'' کون سانمبر ''!

بولے'' یہی جہاں آپ بیٹھے ہوئے ہیں۔آپ کی سسٹر کل کے بجائے آج ہی ڈسچارج ہو جائیں گی۔یہ گھر جاکر آپ کا سامان وغیرہ بھی لے آئیں گی۔ ''

آمینہ آپا نے آؤ دیکھانہ تاؤ فوراًاپنا بیگ اور پرس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں،اس طرح ڈاکٹر ولیم نے ہمیں اسی وقت ہسپتال میں داخل کرلیا۔ابھی وہ ہمارے لئے مختلف ٹیسٹ کرانے کی ہدایات تحریر کر ہی رہے تھے کہ ہمیں خون کی ایک الٹی ہوئی اوراس کے بعد توتانتا بندھ گیا۔تھوڑے وقفے سے خون کی پانچ الٹیاں ہوئیں اور ہم بے جان ہو کر وہیں لیٹ گئے۔فوری طور پرا نجکشن لگائے گئےاور انسدادی تدابیر پر عمل شروع کر دیا گیا۔

اسی رات ہمیں خون کی دو الٹیاں اور ہوئیں۔اچانک اس قدر کمزوری طاری ہوئی کہ ہم قریب قریب بے ہوش ہو گئے۔ہمارے گھر خبر کردی گئی تھی اوراماں گھبرائی ہوئی ہسپتال پہنچ کر ڈاکٹروں کو بُرا بھلا کہنے میں مصروف ہو چکی تھیں۔ان کے خیال میں نہ ہم ہسپتال آتے اور نہ بیمار ہوتے۔

ان سے ہماری خون کی الٹیوں کی تعداد پوشیدہ رکھی گئی تھی مگر پھر بھی وہ کچھ بھانپ گئی تھیں اور کسی صورت ہسپتال سے رخصت ہونے کے لئے تیّار نہیں تھیں۔بڑی مشکل سے انہیں سمجھابجھا کر روانہ کیا گیا۔انہوں نے گھر پہنچتے ہی ہر طرف ٹیلی فون اور تار کھڑکا دیئے۔رات کے بارہ ایک بجے تک کرۂارض پر بسنے والے ہمارے سارے رشتے دار ہماری بیماری سے باخبر ہوچکے تھے اور سب کا رُخ لاہور کی جانب تھا۔

تازہ اُلٹیوں نے ہمیں واقعی بے حال کر دیا تھا۔ڈاکٹروں کے میڈیکل بورڈ نے یہ فیصلہ کیا تھاکہ ہمارابلاتاخیر آپریشن کرناضروری ہے ورنہ جس رفتار سے ہمارے جسم سے خون خارج ہورہاہے اس کے بعد ہم خون کی کمی کے باعث اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔

ہمارے بھائیوں کوڈاکٹر ولیم نے تمام حالات سے آگاہ کرنے کے بعد کہا'' یہ سرجن ڈاکٹر ڈنلپ ہیں۔ان کامشورہ ہے کہ آپریشن فوری طور پر ہوناچاہیے۔فی الحال خون کی چار بوتلیں درکار ہوں گی۔یہ خون آپ لوگ کل بھی فراہم کر سکتے ہیں۔ہم انہیں ہسپتال کے بلڈ بینک سے خون دے دیں گے۔'' یہ کہہ کرانہوں نے ایک فارم ہمارے بھائی کے

آگے رکھ دیا۔" یہ فارم پُر کرکے سائن کر دیجئے۔"
فارم میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ اگر مریض کی موت واقع ہو جائے تو ہسپتال ذمہ دار نہیں ہو گا۔

یہ پڑھ کر سلطان بھائی کا چہرہ سفید ہو گیا۔ انہوں نے گھبرا کر ڈاکٹر ڈنلپ کی طرف دیکھا۔
وہ بولے "یہ رسمی کارروائی ہوتی ہے۔"
"ڈاکٹر! یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔ میں اپنی والدہ سے پوچھے بغیر سائن نہیں کر سکتا۔"
ڈاکٹر نے کہا "آپ فوری طور پر ٹیلی فون کرکے اجازت حاصل کر لیجئے اور یہ بھی یاد رکھیے کہ آپریشن کی صورت میں مریض کے بچنے کے پچیس فیصد امکانات ہیں جب کہ دوسری صورت میں ایک فیصد بھی نہیں ہیں۔"
ہم تو غنودگی کے عالم میں تھے۔ یہ سب باتیں ہمیں بعد میں معلوم ہوئیں۔ بہرحال امّاں نے دل تھام کر آپریشن کی اجازت دے دی اور خود جائے نماز' قرآن شریف اور تسبیح لے کر بیٹھ گئیں۔
علی الصبح ہمارا آپریشن ہونا طے پایا۔ رات گئے ہمیں آپریشن کیلئے تیار کرنا شروع کر دیا گیا تھا۔ ہمارا چھوٹا بھائی عمران بھی پہنچ گیا تھا۔ سب سے بڑے آغا بھائی اور سلطان بھائی بھی ہسپتال میں موجود تھے۔
ہمیں کچھ ہوش آیا تو تمام صورت حال سے آگاہ کیا گیا۔ کمرے میں اداسی اور خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر شخص چپ چپ اور سہما سہما نظر آ رہا تھا۔ سرگوشیوں میں باتیں ہو رہی تھی۔
ڈاکٹر ولیم نے ہمیں مختصراً تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور پھر پوچھا "ڈر تو نہیں لگ رہا؟"
ہم نے کہا "بالکل نہیں مگر پریشانی ہے؟"
ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی "یعنی ڈر لگ رہا ہے؟"
ہم نے اس حالت میں بھی ولیم کو لکھنؤ کے بانکے کا لطیفہ سنا دیا جو شدید سردی میں بھی صرف ململ کا کُرتہ پہنے بیٹھے تھے۔ جب ان سے کسی نے پوچھا آپ کو سردی نہیں لگ رہی؟ انہوں نے جواب دیا "سردی وردی کی تو ایسی تیسی مگر یہ کم بخت کپکپی پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہے۔"
اس کے بعد ہم نے انہیں اپنے ڈر اور پریشانی کا فرق سمجھایا۔ دراصل ہمیں پریشانی یہ تھی کہ اگر ہم انتقال کر گئے تو

ہمارے گھر والوں کا کیا ہو گا۔

ڈاکٹر ولیم نے کہا ”مسٹر آفاقی! ہر ایک کا رکھوالا اللہ ہے اور آپ کو تو خدا نے بھائی بھی دے رکھے ہیں اور اتنے بہت سے رشتے دار اور مخلص دوست بھی ہیں۔ کیا آپ کو اللہ پر بھروسا نہیں ہے؟ “

ہم شرمندہ ہو گئے۔ ڈر ہمیں واقعی بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ اللہ نے ہمارے دل کو ہر طرح کے خوف سے آزاد کر دیا تھا۔

دل میں یہ خیال تھا کہ اگر اتنی ہی زندگی اللہ کو منظور ہے تو یونہی سہی۔ اللہ میاں سے کوئی بحث تو کر نہیں سکتا۔

ڈاکٹر ولیم کی گفتگو کے بعد ہمارے دل کو سکون مل گیا تھا۔ صرف امّاں کا خیال تھا کہ وہ ہمیں کتنا یاد کریں گی۔ کتنا مِس کریں گی۔ کتنا غم کریں گی۔ اس کے سوا کوئی خیال دل میں نہ تھا۔

جب سب رُخصت ہو گئے تو ہم نے اپنے چھوٹے بھائی عمران کو مختصراً بتایا کہ کن لوگوں کی طرف ہمارے کتنے پیسے بقایا ہیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ ہمیں کن کن لوگوں کو کتنے کتنے پیسے دینے ہیں۔ کون سے بینک میں کتنی رقم ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

عمران ہم بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے مگر سب سے زیادہ ذہین اور سمجھدار اور بُردبار بھی ہے۔ اس نے ہماری تمام باتیں بڑے اطمینان سے سنیں۔ کسی قسم کے غم و فکر یا جذباتیت کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ ہم نے بعد میں سوچا تو خیال ہوا کہ وہ خاصا دل گداز ڈرامائی اور ٹریجڈی سین تھا مگر یہ ڈرامہ عمران پر کوئی اثر نہ کر سکا۔ کم از کم اس نے ہمارے سامنے تو بڑی حقیقت پسندی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ ہم نہیں جانتے۔

صبح تک ہر ایک پُرسان حال کو ہمارے آپریشن کی اطلاع مل چکی تھی اور دوست احباب فلم والے اور رشتے دار جوق در جوق ہسپتال پہنچ گئے تھے۔ ہر کوئی خون دینے کی پیش کش کر رہا تھا۔ ہم ان سب باتوں سے بے خبر تھے۔

آپریشن سے پہلے ہمیں ”تیّار“ کیا گیا تھا۔ یہ ایک طبّی اصطلاح ہے۔ اس میں مریض کو بھوکا پیاسا رکھنا بھی شامل ہے اور جسم کے جس حصّے کا آپریشن مقصود ہوتا ہے اس کو صاف کرنا بھی اس تیّاری کا ایک حصّہ ہوتا ہے۔

ہمیں بے ہوشی کا انجکشن تو دیا گیا تھا مگر مقامی طور پر بھی پیٹ کو سُن کر دیا گیا تھا۔ ہمیں وہ سب کچھ بخوبی یاد ہے۔

کمرے سے آپریشن تھیٹر لے جاتے وقت ہمارا ذہن نارمل تھا اور ہم خلاف توقّع مطمئن پُرسکون اور خوش مزاج تھے حالانکہ عام حالات میں ہم ذرا سی بات سے گھبرا کر نروس ہو جاتے ہیں۔ یہ شاید دوائیوں کا اثر تھا۔

ہمیں سٹریچر کے ذریعے تھیٹر لے جایا گیا حالانکہ ہمارا اصرار تھا کہ ہم خود بھی چل کر جا سکتے ہیں۔آپریشن ٹیبل پر لٹانے کے بعد ڈاکٹر اور نرسیں اِدھر اُدھر مصروف ہو گئے اور ہم خاموش لیٹے ان کی باتیں سنتے رہے یا چھت کو تکتے رہے۔ان کی گفتگو ہمارے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ڈاکٹری اصطلاحات تھیں جو ہماری سمجھ سے باہر تھیں۔

اتنی دیر میں ہمارے اوپر غنودگی سی طاری ہو گئی۔

ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم بادلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔بادلوں میں سے اچانک ایک چہرہ نمودار ہوا جس نے سر پر کپڑے کی ٹوپی پہن رکھی تھی اور ناک پر ڈاکوؤں جیسا نقاب باندھ رکھا تھا۔یہ شکل دیکھ کر ہم دل ہی دل میں ہنسے پھر اچانک ہمیں خیال آیا کہ شاید ہم مر چکے ہیں اور عالم بالا میں کوئی فرشتہ ہم سے حساب کتاب لینے آیا ہے۔

فرشتہ جب بولا تو ایسا لگا جیسے میلوں دور سے ایک گونج دار آواز سنائی دے رہی ہے۔فرشتے نے انگریزی میں بھرائی ہوئی آواز میں ہم سے پوچھا ''تم کیا محسوس کر رہے ہو''

ہم نے جواب دیا بہت اچھا مگر یہ صرف ہمارا ذہنی جواب تھا ہمارے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ہم سوچنے لگے کہ فرشتہ انگریزی کیوں بول رہا ہے؟کیا یہاں کی سرکاری زبان انگلش ہے؟پھر ہمیں یوں لگا جیسے ہمارے پیٹ پر کوئی انگلیوں سے لکیریں کھینچ رہا ہے حالانکہ اس وقت نشتر سے ہمارا پیٹ چاک کیا جا رہا تھا مگر ہمیں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔

ہماری آنکھوں کے سامنے بادلوں میں ایک دو نئے چہرے بھی نمودار ہو گئے۔وہ سب کپڑے کی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے اور ان کے چہروں پر دہشت گردوں جیسے نقاب تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ایک فرشتے نے عینک بھی لگا رکھی تھی۔ہمارے ذہن میں خیال آیا کہ کیا فرشتے بھی عینک لگاتے ہیں؟اس کے بعد اچانک ہم ایک بہت گہری اور تاریک وادی میں ڈوب گئے۔ہمارے ذہن نے بتایا کہ ہم مر چکے ہیں اور ہم دنیا و مافیا سے بے خبر ہو گئے۔

ہمیں ہوش آیا تو یہ خیال بھی ساتھ ہی آیا کہ ہم تو مر چکے ہیں۔نگاہوں کے سامنے بادلوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بادل بھی اُڑ رہے تھے اور ہم بھی پرواز کر رہے تھے۔ہم سوچنے لگے کہ یہ کون سی جگہ ہے؟مرنے کے بعد ہم جنّت میں ہیں یا دوزخ میں؟اس کے ساتھ ہی ذہن ایک بار پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔

دوبارہ ہوش آیا تو ہم بدستور بادلوں میں اُڑ رہے تھے۔ بادل کافی تیزی سے ہمارے آس پاس سے گزر رہے تھے۔
دراصل ہمیں آپریشن تھیٹر سے باہر کمرے کی طرف لے جایا جارہا تھا۔ ہماری پرواز جاری تھی کہ کہیں سے ایک زنانہ شکل نمودار ہوئی اور وہ چہرہ ہمارے ساتھ ساتھ پرواز کرنے لگا۔ ہم نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھونے کی کوشش کی مگر کچھ ہاتھ میں نہ آیا۔ ہم نے پوچھا ''سنو کیا تم حور یا پری ہو؟''

جواب ملا ''آفاقی صاحب! میں رخسانہ ہوں۔ (چیکو)
''اوہو۔ یہ تو فلم ایکٹریس رخسانہ ہے مگر یہ آسمان پر کیسے آگئی؟ کیا یہ بھی مر گئی ہے؟'' اس کی جواں مرگی کا بہت افسوس ہوا۔ اس کے بعد ہم پھر مر گئے اور تاریکی میں ڈوب گئے۔
سونے جاگنے اور مرنے جینے کا یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا پھر جب ہم نے آنکھیں کھولیں تو دنیا کا سامان نظر آنے لگا۔ کمرہ فرنیچر ایک نرس ڈاکٹر ایک دو پریشان صورت رشتے دار۔
ہمیں آنکھیں کھولتے دیکھا تو سب خوش ہو گئے ہمیں کچھ عجیب سا لگا۔ بھئی ہم تو مر گئے ہیں۔ تو پھر یہ سب چیزیں اور یہ مانوس لوگ کہاں سے اور کیسے آ گئے؟
ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر ہمارا ہاتھ تھام لیا اور انگریزی میں پوچھا۔
''ہیلو علی اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟ ''
یہ ڈاکٹر ڈنلپ تھے۔ ہم انہیں پہچان گئے ہم نے اپنا ہاتھ ہلانا چاہا مگر انہوں نے روک دیا'' حرکت نہ کرنا تمہارے بازو میں ڈرپ لگا ہوا ہے۔ خون دیا جا رہا ہے۔''
ہمیں یکا یک سب کچھ یاد آ گیا۔ اوہو۔ ہمارا تو آپریشن ہوا تھا اور ہم ابھی تک زندہ ہیں اور دنیا ہی میں ہیں۔ ہم نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔
دو دن تک ہمارے لئے حرکت کرنا بھی دشوار تھا۔ ہمیں ارد گرد تکیے لگا کر چت لٹا دیا گیا تھا۔ پیٹ میں سخت تکلیف اور درد تھا۔ ڈاکٹر نے مطّلع کیا کہ تمہارا پیٹ کٹا ہوا ہے۔ احتیاط سے لیٹے رہو اور برداشت کرتے رہو۔ تکلیف ناقابل برداشت ہو جائے تو نرس کو بتا دینا۔ پھر وہ نرس کو کچھ ہدایات دے کر رخصت ہو گئے۔ ہم نے سوچنا چاہا مگر نیند سی آ

گئی مگراس بار پوری طرح احساس تھا کہ ہم مرے نہیں ہیں‘ بے ہوش ہو رہے ہیں۔
تیسرے دن نرس اپنی سپر وائزر کے ساتھ آئی اور اس نے ہم سے کہا ”مسٹر آفاقی! آپ کو اٹھ کر نیچے اس کرسی پر بیٹھنا ہے۔“ کرسی ہمارے بیڈ کے برابر ہی رکھی ہوئی تھی مگر جس شخص کیلئے حرکت کرنا بھی مشکل ہو وہ بیڈ سے اتر کر کرسی پر کیسے بیٹھ جائے؟
اس نے کہا ”فکر نہ کیجئے۔ ہم دونوں آپ کو سہارا دے کر اٹھائیں گے۔ بالکل تکلیف نہیں ہو گی۔“
ہم نے چڑ چڑے پن سے کہا ”آپریشن ہمارا ہوا ہے یا تم دونوں کا؟ ہم کو ہاتھ مت لگانا۔ بہت تکلیف ہے۔“
وہ بولی ”ڈاکٹر کا آرڈر ہے۔ آپ کو کرسی پر بیٹھنا ہی پڑے گا۔“
”ہر گز نہیں بیٹھیں گے۔ ہمیں ہاتھ لگایا تو بہت بُرا ہو گا۔“
نرسوں نے بے بسی سے آپس میں نگاہوں کا تبادلہ کیا اور چپ چاپ رخصت ہو گئیں۔
کچھ دیر بعد ڈاکٹر ولیم تشریف لے آئے ”ہیلو کیا مسئلہ ہے؟“
ہم نے ان سے نرسوں کی شکایت شروع کر دی ”ہمیں اتنی سخت تکلیف ہے اور یہ ہمیں اٹھ کر کرسی پر بیٹھنے کیلئے کہہ رہی ہیں۔ آپ انہیں کچھ عقل سکھایئے۔“
وہ سنتے رہے پھر بولے ”یہ میرے کہنے پر ایسا کر رہی ہیں۔“
ہم نے لاجواب ہو کر انہیں دیکھا۔
انہوں نے کہا ”آج آپ کرسی پر بیٹھیں گے اور کل آپ کو خود چل کر باتھ روم جانا ہو گا۔“
”کیا؟ آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟“
انہوں نے نرسوں سے کہا ”انہیں اٹھایئے اور آرام سے کرسی پر بٹھا دیجئے۔“
کہنے اور کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ہم کس طرح اٹھے اور کتنی تکلیف برداشت کر کے کرسی پر بیٹھے‘ یہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔
”شان دار“ ڈاکٹر نے تعریفاً کہا اور رخصت ہو گئے۔

دوسرے دن ڈاکٹر ولیم سویرے سویرے آئے تو کاغذ اور قلم سنبھال کر ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے کاغذ پر ہمارے معدے کا نقشہ بنایا اور پھر یہ بتایا کہ ہمارے معدے کا کون سا نصف سے زیادہ حصّہ کاٹ کر نکال دیا گیا ہے اور غذا کی نالی کو باقیماندہ معدے میں کس طرح اور کس جگہ جوڑ دیا گیا ہے۔ ہمارے معدے کے اندر سے کہاں کہاں زخم تھے اسلئے کہاں کہاں سے ہمارے معدے میں سے زخمی شریانیں نکال دی گئی ہیں اور معدے کی متاثرہ دیواروں کو کھرچ دیا گیا ہے۔ گویا اب ہمارا معدہ مقامی طور پر اسمبل کر دیا گیا ہے۔

ہم نے پریشانی سے یہ سب کچھ سنا اور کہا ''ڈاکٹر! اب کیا ہوگا۔ ہمارا معدہ تو بہت چھوٹا سا رہ گیا ہے اور وہ بھی کٹا پھٹا۔ ہم کھانا کیسے کھائیں گے اور کتنا کھائیں گے؟''

ڈاکٹر ولیم مسکرائے ''معدہ ہر ایک کا ایک ہی سائز کا ہوتا ہے۔ قدرت نے اس میں الاسٹک کی طرح پھیلنے کی صلاحیت رکھی ہے جو لوگ سیروں خوراک کھاتے ہیں ان کا معدہ بھی ہمارے آپ کے برابر ہوتا ہے۔ انسان معدے کو جتنا چاہے بڑھا سکتا ہے۔ آپ کو فی الحال ڈرپ کے ذریعے گلوکوز دی جائے گی۔ پھر رقیق غذا ملے گی۔ آٹھ دن کے بعد بسکٹ وغیرہ کھا سکیں گے۔''

آپریشن کی تکلیف تو ہم نے برداشت کرلی مگر آپریشن کی وجہ سے جو تکالیف وقتاً فوقتاً ہو جاتی تھیں وہ برداشت سے باہر تھیں۔ ایک دن تو ہم نے واقعی چیخنا اور شور مچانا شروع کر دیا۔ نرسوں نے تسلی دی تو ہم انہیں بُرا بھلا کہنے لگے۔ وہ ہنستی ہوئی بھاگ گئیں۔

رات کے بارہ بج رہے تھے اور ہماری تکلیف برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ ہسپتال میں رہ کر ہمیں تکلیف برداشت کرنے کی عادت پڑ چکی تھی مگر یہ تکلیف کسی طرح برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ نرسیں ہماری گالیوں کے جواب میں یہ اطلاع دے رہی تھیں کہ مسٹر ڈیوڈ کو خبر دے دی گئی ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں آجائیں گے تو آپ کی تکلیف ختم ہو جائے گی۔

ہسپتال کے دوران قیام میں یوں تو ہمیں بہت سے تجربات ہوئے مگر دو واقعات ہم کبھی نہیں بھول سکیں گے۔

ہم مارے تکلیف کے چیخیں مار رہے تھے کہ اچانک صوفی صاحب ہمارے کمرے میں آ گئے۔ ان کی عمر تیس بتیس

سال کے لگ بھگ ہو گی۔اس سے پہلے بھی وہ ایک دو بار ہم سے ملاقات کیلئے آچکے تھے۔ صحتمند آدمی تھے۔ چہرے پر سیاہ داڑھی تھی۔ باتیں بہت اچھی کرتے تھے۔ پانچوں وقت کے نمازی تھے۔ دوسرے مریضوں کی خبر گیری میں لگے رہتے تھے۔ ہر لحاظ سے وہ ایک اچھے آدمی تھے مگر ہاتھوں سے محروم تھے۔ایک ہاتھ کی انگلیاں غائب تھیں۔ دوسرا ہاتھ کلائی تک تھا۔ معلوم ہوا کہ ایک بار وہ آگ میں جل گئے تھے۔ کئی ماہ زیر علاج رہے اور بچ تو گئے مگر ہاتھوں سے محروم ہو گئے۔ ٹانگیں سلامت تھیں مگر ایک ٹانگ کا زخم کسی طرح ٹھیک ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ یہ ناسور کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس کا علاج کرانے کیلئے وہ ہسپتال میں کئی ماہ سے مقیم تھے۔ دنیا میں ان کے عزیز واقارب نہ ہونے کے برابر تھے۔ خدا جانے کس طرح گزر بسر ہوتی تھی مگر اپنا ہر کام وہ خود کرتے تھے۔ کھانے پینے کیلئے بھی وہ دوسروں کے محتاج نہ تھے۔ ہر وقت ہنستے رہتے تھے۔

اس رات وہ ہمارے پاس آکر چپ چاپ بیٹھ گئے اور ہمدردی سے ہمیں دیکھتے رہے۔ پھر پوچھا ''کیا بہت زیادہ تکلیف ہے؟''

ہم نے کہا ''صوفی صاحب! برداشت سے باہر ہے۔''

وہ بولے ''آفاقی صاحب! اللہ تکلیف بھی انسان کو قوّت برداشت دیکھ کر دیتا ہے۔ اب یہ خود انسان پر منحصر ہے کہ وہ اسے کیوں کر برداشت کرتا ہے۔''

ہم نے جھنجھلا کر کہا ''صوفی صاحب! جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔''

صوفی صاحب اداسی سے مسکرائے۔ پھر کہا ''آفاقی صاحب! آگ میں میرا تمام جسم جل گیا تھا۔ کھال اُتر گئی تھی۔ جسم گوشت کا لوتھڑا بن چکا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔اس پر آتشزدگی کی تپش آپ میری حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جسم کا یہ حال تھا کہ مجھے عام بستر پر نہیں لٹایا جا سکتا تھا۔ باریک تاروں والے لوہے کے بیڈ پر میں چھ ماہ بالکل چت لیٹا رہا۔ تار میرے جسم میں پیوست ہو جاتے تھے اور جسم کو حرکت دینے سے گوشت کے لوتھڑے الگ ہو جاتے تھے۔''

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا اور پوچھا ''تو پھر آپ اتنی تکلیف کیسے برداشت کرتے تھے؟ کیا ڈاکٹر انجکشن دے دیا

کرتے تھے؟"

بولے" انجکشن اور دوائی بے اثر ہو چکی تھی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر میں نے اللہ سے لو لگائی۔ ہر وقت قرآن کی آیات تلاوت کرتا تھا۔ ہر وقت اللہ کو یاد کرتا رہتا تھا۔ اچانک احساس ہوا کہ میری تکلیف غائب ہو چکی ہے۔ خیال آیا کہ تکلیف سوچنے یا چیخنے چلانے سے تو کم نہیں ہو گی۔ برداشت کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور تکلیف سہنے کیلئے اللہ کو یاد کرنے سے بڑھ کر کوئی اور تسکین دینے والی دوائی نہیں ہے۔ اللہ کی رضا پر راضی رہنا چاہئے۔ وہ برداشت اور صبر بھی دے دیتا ہے۔"

پھر انہوں نے اپنا جسم دکھایا جو ہر طرف سے نُچا ہوا تھا۔ ٹانگوں کا ناسور بھرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ہاتھوں سے وہ محروم تھے۔ پھر بھی خوش و خرّم اور مطمئن تھے' ہنستے بولتے بھی رہتے تھے۔ دوسرے مریضوں کا دل بہلاتے اور دکھ درد بانٹتے رہتے تھے۔ ہم نے سوچا کہ اس شخص کے مقابلے میں ہماری تکلیف تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ تو پھر ہم کیوں برداشت نہیں کر سکتے؟

ہم نے قرآن شریف کی آیات پڑھنی شروع کر دیں۔ یقین کیجئے۔ چند لمحے بعد سکون سا آ گیا۔ پندرہ منٹ بعد ڈیوڈ آیا تو ہم آرام سے چپ چاپ لیٹے ہوئے تھے۔ تکلیف کا احساس بہت کم ہو گیا تھا۔ یوں سمجھئے کہ صبر سا آ گیا تھا۔

صوفی صاحب کی نصیحت نے ہمیں زندہ رہنے کا ایک نیا انداز سکھا دیا تھا دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے۔

ہم کافی ٹھیک ہو گئے تھے۔ تھوڑا بہت ٹہلتے بھی تھے مگر کھا نہیں سکتے تھے۔ اگر ایک بسکٹ کھا لیتے تھے تو دس منٹ تک ڈکاریں آتی رہتی تھیں۔ ہر چیز کا پرہیز تھا۔ دنیا کو صرف کھڑکیوں کے ذریعے ہی دیکھ سکتے تھے ورنہ دنیا کی تمام رنگینیوں سے بے تعلق ہی تھے۔

ان ہی دنوں ہمارے سامنے والا کمرا آباد ہو گیا۔ وہاں سے باتیں کرنے اور ہنسنے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ زنانہ' مردانہ اور بچّوں کی آوازیں۔ پھر ایک صاحب کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ گرم رنگین گاؤن پہن کر وہ چہل قدمی کرتے تھے۔ عمر چالیس پینتالیس سال ہو گی۔ متوسط قد' مضبوط اور صحت مند جسم' چہرے پر سختی جھلکتی رہتی تھی۔ اونچی آواز میں بولتے تھے اور بلند آواز میں قہقہے لگاتے تھے۔ ان کے ہمراہ تیس پینتیس

سال کی عمر کی ایک خوش شکل خاتون بھی نظر آتی تھیں۔ معلوم ہوا کہ وہ ان کی بیگم ہیں۔ان کا ایک چودہ پندرہ سال کی عمر کا بیٹا بھی تھا۔وہ تینوں ایک خوشحال اور خوش باش گھرانے کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ہمیں ان پر رشک آتا تھا کہ دیکھو، یہ بھی ہسپتال میں ہیں مگر کتنے مزے میں ہیں۔ایک ہم ہیں کہ دنیا ہمارے لئے شجرِ ممنوعہ بن چکی ہے۔ کمرے میں بھوکے پیاسے پڑے رہتے ہیں۔خدا جانے صحت مند ہوں گے یا نہیں۔ نرس سے ان کے بارے میں پوچھا کہ یہ صاحب اچھے خاصے ہٹے کٹے ہیں۔ پھر ہسپتال کیوں آئے ہیں؟

اس نے کہا" مسٹر آفاقی۔پیسے والے لوگ ہیں۔اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔چھینک آتی ہے تو کمرا بک کرا لیتے ہیں۔"

"مگر انہیں بیماری کیا ہے؟"

"اللہ جانے۔ابھی تو ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔بڑے لوگوں کے نخرے ہیں۔"

اگلے دن سہ پہر کے وقت اچانک سامنے والے کمرے سے عجیب سی آوازیں آنے لگیں۔یوں لگا جیسے کوئی زور زور سے سانس لے رہا ہے۔عام طور پر دمے کا دورہ پڑے تو ایسی ہی آوازیں سننے میں آتی ہیں پھر ہسپتال میں بھاگ دوڑ سی شروع ہو گئی۔ گھبرائی گھبرائی نرسیں اُدھر سے اِدھر جاتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ڈاکٹر بھی سامنے والے کمرے میں پہنچ گئے۔پھر ہم نے کھڑکی سے دیکھا کہ ایک سٹریچر پر ڈال کر کسی کو لے جا رہے ہیں۔ہم نے گھنٹی بجا کر نرس کو طلب کیا۔ وہ کافی دیر بعد آئی۔

"کیا مصیبت ہے۔اتنی دیر سے گھنٹی بجا رہا ہوں۔"

"ہم سب مصروف تھے۔ایمرجنسی ہو گئی ہے" اس نے جواب دیا۔

"کیا ہو گیا؟"

"سامنے والا مریض ہے نا۔اسے سخت ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔"

ہم نے کہا" مگر وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔دمے کے مریض ہیں شاید۔"

"ارے نہیں مسٹر آفاقی۔وہ ہارٹ پیشنٹ ہیں۔ایک دم ان کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ ایکسکیوزمی" وہ تیزی سے رخصت ہو گئی۔آس پاس سنّاٹا سا چھا گیا۔

دس منٹ بعد چکن کمرے میں داخل ہوئی۔ چہرہ اداس تھا۔ آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں'' مسٹر آفاقی۔ وہ آپ کے سامنے والے پیشنٹ تھے نا؟ان کی ڈیتھ ہو گئی۔''

ہمارا دل دَھک سے رہ گیا۔ وہ شخص جس کی تندرستی اور خوش قسمتی پر ہم رشک کیا کرتے تھے آناً فاناً میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

ایک دم بھاگ دوڑ سی مچ گئی۔ سامنے والے کمرے سے زور زور سے چیخنے اور رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر ایک نوجوان آواز کڑکنے لگی۔ کوئی پنجابی میں ڈاکٹروں کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔'' یہ ظالم ہیں' قصائی ہیں۔ انہوں نے میرے باپ کو مار دیا ہے۔ میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

پھر ہاتھاپائی کی آوازیں آنے لگیں۔ عورتیں زور زور سے چیخ رہی تھیں۔ بین کر رہی تھیں۔ بچّے رو رہے تھے۔

کچھ دیر بعد ایک دم خاموشی چھاگئی۔ ہر طرف سوگوار سنّاٹا پھیلا ہوا تھا۔

نرس نے آکر کہا'' ملک صاحب کی ڈیڈ باڈی لے گئے ہیں۔ سامنے والا کمرا خالی ہو گیا ہے''

زندگی اور موت کا فلسفہ اتنی نفاست اور خوبصورتی سے قدرت کے سوا کون سمجھا سکتا ہے۔

جب ذرا صحت بحال ہوئی اور ہوش ٹھکانے آئے تو ہم بھی گاؤن پہن کر ہسپتال کے بالائی حصّے میں چہل قدمی کرنے لگے مگر اس سے پہلے ہم نے وہیل چیئر پر بیٹھ کر ہسپتال کا چکّر لگانا شروع کر دیا تھا۔ یو سی ایچ میں سیڑھیوں کے علاوہ ڈھلوان راستے (ریمپ) بھی بنے ہوئے ہیں جن پر ہم بڑے مزے سے اپنی وہیل چیئر گھماتے ہوئے ہسپتال کے مختلف حصوں میں پہنچ جاتے تھے۔ ہمارے ساتھ ہسپتال میں جو وی آئی پی سلوک روا رکھا گیا تھا اس کا سب سے بڑا سبب فلمی صنعت سے ہمارا وابستہ ہونا تھا۔ فلم کو اس زمانے میں معاشرے میں قدر و منزلت حاصل تھی۔ یوں تو فلموں سے ہر قسم کے لوگ وابستہ تھے لیکن تعلیم یافتہ' ذہین اور قابل عزّت حضرات کی تعداد بھی کافی تھی۔ جن کو معاشرے میں عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور سرکار دربار میں بھی ان کی پذیرائی کی جاتی تھی۔ بڑے بڑے سیکرٹری اور وزیر فلمی ہستیوں کو (محض اداکاروں ہی کو نہیں) نہ صرف بخوبی جانتے پہچانتے تھے بلکہ انہیں عزّت و احترام بھی دیتے تھے۔ فلمی ہستیوں اور فن کاروں کو ایک نظر دیکھنے کیلئے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے ترسا کرتے

تھے کیونکہ اس زمانے میں فن کاروں نے خود کو سستا اور عام نہیں کیا تھا اور عام جگہوں پر گھومتے پھرتے نظر نہیں آتے تھے۔ان کے فضول اور عامیانہ قسم کے بیانات بھی آئے دن شائع نہیں ہوتے تھے جیسا کہ آج کل معمول بن چکا ہے کہ جس کے جو منہ میں آتا ہے وہ اخبار میں شائع کرا دیتا ہے جس کی وجہ سے فلمی صنعت سے وابستہ لوگوں کی قدر و منزلت اور عزّت و احترام میں کمی آگئی ہے۔

ہم سے ملنے کیلئے قریب قریب سبھی قابل ذکر ہیرو ٗ ہیروئنیں ٗ ہدایت کار ٗ فلم ساز ٗ سٹوڈیو اونرز رائٹرز ٗ موسیقار اور تکنیک کار آتے رہے تھے۔وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم فلمی دنیا میں کوئی توپ قسم کی چیز تھے۔اصل وجہ یہ تھی کہ ان دنوں فلمی صنعت کا ماحول ایک خاندان کی طرح تھا۔ آپس میں میل جول تھا۔آئے دن مختلف قسم کی تقریبات منعقد ہوتی رہتی تھیں اور فلم والوں کو یکجا ہونے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔آپس میں سلوک اور محبت کا جذبہ بھی تھا۔ لوگ خلوص اور بے غرضی سے ایک دوسرے سے ملتے تھے۔کم از کم دنیا میں دکھاوے کی خاطر ہی بھرم رکھ لیا کرتے تھے۔دلوں کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ فلمی دنیا میں چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر ایک سے ہماری یاد اللہ اور بیشتر سے بے تکلّفی تھی۔ ذاتی تعلّقات تھے۔اسلئے بھی سب ہمارے ساتھ شیر و شکر تھے۔ ہسپتال والوں کی تو جیسے عید ہوگئی تھی۔ان کے پسندیدہ فنکار انہیں آنکھوں کے سامنے جیتے جاگتے نظر آ رہے تھے۔وہ ان سے بات چیت بھی کر سکتے تھے۔ان کے آٹو گراف بھی لے سکتے تھے۔فنکاروں کے آٹو گراف بھی ایک مخصوص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ان کے پرستار آٹو گراف حاصل کرنے کیلئے پیسے خرچ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

ہم ایک واقعہ بیان کر چکے ہیں کہ ایک بار بہار اور دوسرے فنکار سیّد کمال کو گھیر گھار کر شیزان ریستوران میں لے گئے۔کمال صاحب کچھ دیر کیلئے غائب ہوئے اور پھر آئے تو بڑی فراخدلی سے انہوں نے کھانے پینے کی اشیاء منگوانے کیلئے آرڈر دیئے۔سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کمال حاتم طائی کیسے بن گئے۔کمال نے تمام فنکاروں سے آٹو گراف حاصل کر کے ریستوران کے منیجر صاحب کو دے دیئے۔ان کا کہنا تھا کہ اس بے چارے کے بچّے فنکاروں کے

آٹو گراف حاصل کرنے کے بہت دلدادہ ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ کمال نے منیجر صاحب سے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ سب فنکاروں کے آٹو گراف لے دیں گے۔ اس کے بدلے منیجر صاحب بل کی رقم معاف کر دیں گے۔

ہماری مزاج پُرسی کیلئے جو لوگ بھی آتے رہے اس میں خلوص اور ہمدردی کے سوا کسی اور مصلحت کو دخل نہ تھا۔ چلتے چلتے اس بارے میں ایک اور وضاحت بھی کر دیں۔ اسد جعفری (اب مرحوم ہو چکے ہیں) نے پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے ایک بار لکھا تھا کہ جب ہم بیمار پڑے اور ہسپتال گئے تو محمد علی اور زیبا کئی بار ہماری مزاج پُرسی کیلئے ہسپتال گئے اور انہوں نے ہمارا بل بھی ادا کر دیا تھا۔ ہم نے اسد جعفری سے تو کچھ نہ کہا چونکہ اس کے بعد ان سے بالمشافہ ملاقات کی نوبت ہی نہیں آئی اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن اللہ بخشے مرحوم کو یادداشتوں کے حوالے سے گپیں لگانے کی عادت تھی۔ غالباً اس طرح وہ قارئین کو یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ ان کے فلمی دنیا میں ہر ایک سے بہت گہرے اور بے تکلفانہ گھریلو اور ذاتی تعلقات تھے۔ ہمارے معاملے میں حقیقت یہ ہے کہ ہم 1965ء میں بیمار پڑے تھے، اس وقت تک محمد علی اور زیبا کی آپس میں شادی ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ اس وقت ان کے تعلقات خاصے کشیدہ تھے کیونکہ ایرانی فنکارہ ماہ پارہ سے محمد علی کا سکینڈل بہت زوروں پر تھا اور نوبت شادی تک پہنچنے والی تھی۔ دراصل یہ حُبّ علی سے زیادہ بغض معاویہ والا معاملہ تھا۔ ان دونوں میں اس قسم کی کشیدگی اکثر پیدا ہوتی رہتی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ محبت ہی دراصل نفرت کا پیش خیمہ ہوتی ہے تو یہ بات علی زیب پر بھی صادق آتی تھی۔ ناراض ہو کر ایک دوسرے کو پریشان کرنے کیلئے یہ دونوں اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے تھے لیکن ان کے پس منظر میں بے محابا پیار کے جذبات کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بہر حال ہم یہ بتا رہے تھے کہ محمد علی اور زیبا اس وقت تک میاں بیوی نہیں بنے تھے اور اس زمانے میں غیر شادی شدہ آرٹسٹ کُھلے بندوں ساتھ ساتھ نہیں گھومتے تھے جیسا کہ بعد میں عام رواج ہو گیا۔ جہاں تک ہمارے ہسپتال کا بل ادا کرنے کا تعلق ہے۔ یہ بھی خلاف حقیقت ہے۔ علی زیب ہی کیا کسی سے بھی ہم زندگی بھر ایک پیسہ تک لینے کے روادار نہیں ہوئے۔ جہاں تک ہو سکا دوسروں کے کام آئے لیکن خدا کا شُکر ہے کہ کبھی کسی کا مالی یا کسی اور قسم کا احسان نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کسی مصلحت کے پابند نہیں ہوئے۔ اس زمانے میں ہمارے مالی حالات عام دنوں کے مقابلے میں کہیں بہتر تھے۔ ''کنیز'' اسی زمانے میں ریلیز ہوئی تھی اور ہماری جیب گرم تھی۔

یہ سطور ریکارڈ درست کرنے کی غرض سے لکھ دی ہیں تاکہ سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔

اسد جعفری کا ذکر چھڑ گیا ہے تو کچھ ان کے بارے میں بھی ہو جائے۔ اسد جعفری ہمارے بہت اچھے اور بے تکلّف دوست تھے۔ ان کا تعلق حیدر آباد دکن سے تھا جہاں ان کے والد آرمی میں تھے۔ اسد جعفری اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر ایک کے نزدیک تر ہونا چاہتے تھے۔ ان کا نہ کوئی بھائی تھا' نہ بہن۔ والد انتقال کر چکے تھے۔ لے دے کر ایک والدہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ ماں بیٹے میں مثالی پیار تھا۔ اسد جعفری نے اپنی والدہ کی حتی المقدور بلکہ مقدور سے بڑھ کر خدمت کی اور ہر طرح انہیں آرام اور خوشی فراہم کرنے کی کوشش کی۔ سوائے شادی کے۔ والدہ ہر ماں کی طرح ان کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی تھیں مگر اسد یہ معاملہ گول کر جاتے تھے۔ انہیں بے تکلّف دوست جعفری کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ کم از کم ہم نے تو انہیں کبھی اسد یا اسد جعفری نہیں کہا۔

جعفری ڈھاکہ میں کسی انگریزی فرم میں کام کرتے تھے اور غالباً ٹائپسٹ تھے۔ ضیا سرحدی پاکستان آئے اور انہوں نے ''راہ گزر'' کے بعد دوسری فلم ''آخر شب'' کا آغاز کیا تو اس فلم میں ایک کردار کیلئے ان کی نگاہ انتخاب اسد جعفری پر پڑ گئی۔ اس طرح وہ ضیا سرحدی جیسے نادرِ روزگار کی دریافت کہے جاتے ہیں۔

فلم ''آخر شب'' تو مکمل نہ ہوئی مگر ان ہی دنوں میں حسن طارق اور شمیم اشرف ملک (یہ دونوں ہمارے گہرے دوست تھے۔ اب دونوں دنیا میں موجود نہیں ہیں) نے مل کر ایک فلم ''نیند'' بنائی جس میں ملکۂ ترنم نور جہاں ہیروئن تھیں اور اسلم پرویز، وہ تھے تو ہیرو مگر ان کا کردار ویلن جیسا تھا۔ اس قسم کا کردار انہوں نے پہلی بار ادا کیا تھا اور خوب داد پائی۔ اسی فلم سے لوگوں کو احساس ہوا تھا کہ اسلم پرویز دراصل ہیرو سے زیادہ ویلن کے کردار کیلئے موزوں ہیں۔ اس کے بعد طارق صاحب نے فلم ''شکوہ'' میں انہیں اسی قسم کا کردار سونپا اور اسلم پرویز نے خوب واہ واہ حاصل کی۔ اس کے بعد تو چل سو چل والا معاملہ ہو گیا اور وہ برّ صغیر کی فلمی دنیا کے ممتاز ویلن کہلائے۔

''نیند'' میں جعفری صاحب نے ایک کلرک کا کردار کیا تھا جو چپکے چپکے ریلوے لائن پر کوئلہ چننے والی سے عشق کرتا ہے مگر وہ کسی اور کی شیدائی ہے۔ جعفری نے یہ کردار بہت خوبی سے ادا کیا تھا۔ اس فلم میں نیلو اور نگہت سلطانہ نے بھی نمایاں کردار کئے تھے۔ اس کے بعد وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر اداکار بن گئے مگر کردار ادا کرنے والوں کو مالی اعتبار سے

ہمیشہ تنگدست ہی رہناپڑتا ہے۔ پھر جعفری ہر قسم کے کرداروں کیلئے موزوں بھی نہیں تھے۔ مخصوص قسم کے کردار ہی کر سکتے تھے۔ وہ دراصل ہیرو بننے کے چکّر میں فلمی دنیامیں آئے تھے لیکن ہماری فلموں میں ہیرو میں جس قسم کی چاکلیٹ ہیرو جیسی خصوصیات درکار ہوتی ہیں جعفری ان سے محروم تھے اس لئے ہیرو کے بجائے سائیڈ کرداروں تک محدود ہو کر رہ گئے۔ تعلیم یافتہ' شریف اور وضع دار آدمی تھے۔ جب مالی مشکلات کا شکار ہوئے تو گھبرا کر صحافی بن گئے اور اخبارات و

جرائد میں لکھنے لگے۔ کچھ عرصے بعد انہیں یہ شکایت پیدا ہو گئی کہ فلم والے انہیں محض صحافی سمجھتے ہیں' اداکار جان کر انہیں کوئی کام نہیں دیتا۔ ایک دن وہ ہمارے پاس آئے۔ سخت شکوہ کیا اور ہمیں بُرا بھلا بھی کہا۔ ہم نے پوچھا'' بھائی اس قدر ناراض ہونے کا سبب تو بتاؤ۔

کہنے لگے ''تم کہانیاں لکھتے ہو۔ ہر ایک تمہاری بات مانتا ہے۔ کیا میری سفارش نہیں کر سکتے ؟ یار مجھے تو اب فلم والے جرنلسٹ ہی سمجھنے لگے ہیں۔ اداکاری کا موقع کوئی نہیں دیتا۔''

ہم نے انہیں چائنیز ریستوران میں لے جا کر کھانا کھلایا۔ گرین ٹی پلائی۔ ایک عدد سگار بھی پیش کیا۔ جب ان کا موڈ بہت خوشگوار ہو گیا تو ہم نے انہیں سمجھایا کہ بھائی ہماری مانو تو فلم کا پیچھا چھوڑ دو۔ ہیرو تو تم بن نہیں سکتے۔ دوسرے کرداروں میں ''شامل باجا'' بن کر رہ جاؤ گے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تم خاصے سر گرم صحافی بن چکے ہو۔ لوگ اب تمہیں صحافی کے طور پر ہی جانتے ہیں۔ مثلاً ہم ہی کو دیکھ لو۔ کسی فلم کے لیے اداکاروں کے ناموں پر غور کرتے ہوئے کبھی تمہارا نام ہی ذہن میں نہیں آیا۔''

وہ ناراض ہو گئے اور ہمیں بُرا بھلا کہنے لگے ''تم بے وفا دوست ہو۔ برادر یوسف ہو۔ کچھ شرم کرو۔''

ہم نے انہیں بتایا'' بھَائی۔ دو کشتیوں میں بیک وقت سوار ہونے والے عموماً ساحلِ مراد تک نہیں پہنچتے۔ تم دونوں میں سے ایک چیز کا انتخاب کر لو۔ اداکار بن جاؤ یا پھر صحافی بن کر اپنی شناخت کراؤ۔ ویسے ہمارا ذاتی مشورہ یہ ہے کہ تم صحافی بہت اچھے بن سکتے ہو۔''

وہ پھر ہتھّے سے اکھڑ گئے " کیا مطلب ہے' کیا میں اچھّا اداکار نہیں ہوں؟ مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ کون سا ایکٹر مجھ سے زیادہ اچھّا ہے؟ میں کسی سے کم ہوں کیا؟ تم دوست نہیں بغلی گھونسے ہو۔ میری قدر نہیں ہے تمہیں۔ ایک وقت آئے گا جب دنیا بطور اداکار میرے گن گائے گی۔"

"اور پھر تمہاری آنکھ کھل جائے گی" ہم نے فقرہ مکمل کیا۔

وہ بے اختیار ہنس پڑے۔ پھر ہمیں گلے سے لگایا اور کہا "آفاقی' تم بہت گھٹیا قسم کے انسان ہو۔ مگر ایک خوبی تو ہے، تم منافق نہیں ہو۔ جاؤ اس ایک خوبی کی خاطر تمہیں معاف کرتا ہوں۔"

یہ 1967-68ء کا ذکر ہے۔ اس کے بعد جعفری نے زیادہ توجّہ صحافت کو دی۔ خصوصاً فلمی صحافت میں انہوں نے بہت نام پیدا کیا۔ جب فلمی مصروفیات کم ہو گئیں تو وہ لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ کچھ عرصے تو اداکاری کا کیڑا ان کے ذہن میں کلبلاتا رہا مگر پھر انہیں صبر آ گیا تھا اور وہ کل وقتی صحافی بن کر رہ گئے تھے۔

وہ ایک اچھے فوٹو گرافر بھی تھے اس لیے کیمرہ بھی گلے میں لٹکائے پھرتے تھے جس کی وجہ سے انہیں بہت آسانی ہو گئی تھی۔ لاہور آتے تو ہم سے ضرور ملاقات کرتے۔ کبھی گھر آ جاتے۔ کھانا کھاتے' چائے پیتے اور تصویریں بناتے۔ ہماری بیوی اور بچّیوں سے وعدہ کرتے تھے کہ ان تصویروں کی ایک ایک بہت عمدہ کاپی انلارج کرا کے بھیجوں گا مگر یہ وعدہ انہوں نے کبھی پورا نہیں کیا۔ ڈھٹائی ملاحظہ ہو کہ اگلی بار پھر آن دھمکتے تھے۔ شکوہ شکایت کے جواب میں فرماتے۔ "ارے بھابی۔ پرانی باتیں چھوڑیئے۔ اس بار ایسی تصویریں بنائی ہیں کہ آپ خود کو نہیں پہچانیں گی اور یہ نادیہ تو آپ کو کسی اور کی بچّی نظر آئے گی۔ بس کراچی جاتے ہی آپ کو تصویریں بھیج دوں گا۔"

مگر ان کا یہ وعدہ کبھی پورا نہیں ہوا۔

جعفری ہنس مکھ آدمی تھے۔ دلچسپ باتیں کرتے تھے مگر دل بہت کمزور تھا یا پھر انہیں حسب خواہش رونے اور آنسو بہانے کا گر آتا تھا۔ ذرا سے بھی جذباتی ہوتے تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور آواز بھرا جاتی تھی۔ ہمارے دوست رشید جاوید کہا کرتے تھے۔ "بیٹا جعفری۔ رونے کے معاملے میں تو تم دلیپ کمار ہو۔ کاش دوسرے معاملات میں بھی کچھ سیکھ لیتے۔" جعفری ہنس کر ٹال دیتے تھے۔

ان کی ذاتی اور گھریلو زندگی میں خاصی تلخیاں پیدا ہوتی رہیں۔ والدہ ان کی زندگی کا محور تھیں۔ کافی دیر سے شادی کی مگر گھریلو سکون میّسر نہ آسکا۔ دوسری شادی کے بعد انہیں گھر کا سکون اور خاندان کی یگانگت کا احساس ہوا مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ وہ مختلف امراض کا شکار ہو گئے تھے مگر معاشی ضروریات پوری کرنے کے لئے شب و روز کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ جس معیار کے صحافی تھے' افسوس کہ مالی لحاظ سے ان کی ایسی قدر نہیں ہوئی۔ بڑے بڑے لوگوں تک رسائی رکھنے کے باوجود انہوں نے کبھی کسی کا احسان لینا گوارا نہ کیا اور نہ ہی دولت کمانے کا کوئی نامناسب طریقہ اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ بیوی بچّوں کے لیے کچھ نہ چھوڑ سکے۔ ان کے بعد ان کی بیوہ نے بڑی ہمت کا ثبوت دیا اور بچّوں کی پرورش کی ذمّے داری سنبھال لی۔ دیانت دار اور خود دار صحافیوں کو ہم نے اس معاشرے میں ہمیشہ پریشان حال ہی دیکھا۔ اسد جعفری اس کی ایک نمایاں مثال تھے۔

لوگ اکثر اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ کراچی جو قیام پاکستان کے فوراً بعد حکومت کا مرکز بن گیا تھا اور صنعت و تجارت کے اعتبار سے بھی پاکستان کا سب سے بڑا اور اہم شہر سمجھا جاتا تھا جہاں سرمائے کی کوئی کمی نہ تھی' خوبصورت ساحل سمندر کے علاوہ فلک بوس عمارتیں اور خوبصورت کشادہ سڑکیں اور شاپنگ سینٹر تھے۔ اس کے باوجود یہ شہر پاکستان کی فلمی صنعت کا مرکز کیوں نہ بنا' یہ اعزاز لاہور کے حصّے میں کیوں آیا؟

اس کا ایک جواب تو بہت آسان ہے۔ لاہور قیام پاکستان سے پہلے بھی برصغیر میں فلمی صنعت کا ایک اہم مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت صحیح معنوں میں بمبئی اور کلکتہ کے بعد لاہور ہی فلم سازی کا سب سے بڑا اور قابل ذکر گڑھ تھا۔ فلمیں تو مدراس میں بھی بنائی جاتی تھیں اور وہاں کی فلمی صنعت مالی اعتبار سے مضبوط بھی تھی اس لئے کہ وہاں ڈھنگ سے کام کیا جاتا تھا۔ چند بڑے فلم ساز ادارے تھے جن کے زیر اہتمام فلمیں بنتی تھیں۔ ان اداروں کے اپنے فلم سٹوڈیوز' تقسیم کار ادارے اور سینما گھر بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ فلموں کا تمام منافع یہ سمیٹ لیا کرتے تھے اس لئے ان کی مالی حالت بہت مستحکم تھی لیکن مدراس میں بیشتر علاقائی زبان کی فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ اس لئے وہ ملک گیر شہرت اور کامیابی نہیں حاصل کر سکیں۔ اس کے مقابلے میں بمبئی اور کلکتہ کے بڑے فلم ساز ادارے رفتہ رفتہ کمزور اور بے بس ہوتے جا رہے تھے جس کی وجہ سے ''آزاد فلم سازوں'' کی کھیپ کی کھیپ میدان میں آ گئی تھی۔ یہ لوگ چند کے سوا

اکثر فلم سٹوڈیوز کی سہولت سے محروم تھے۔ان کا اپنا تقسیم کارادارہ بھی نہ ہوتا تھا۔ سینما گھروں کے مالک بھی نہ تھے۔ ڈسٹری بیوشن اور ایگزی بیشن کیلیئے یہ دوسروں پر انحصار کرتے تھے۔ سرمائے کیلیئے بھی یہ باہر کے سرمایہ کاروں کے رحم وکرم پر تھے جو بھاری سود پر انہیں سرمایہ فراہم کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ کامیاب فلمیں تخلیق کرنے کے باوجود ان کے حصّے میں فلم کے منافع کا صرف ایک محدود حصّہ ہی آتا تھا چنانچہ یہ مالی اعتبار سے مستحکم نہ تھے۔

لاہور میں چند بڑے فلم سازادارے تھے۔ان کے اپنے سینما گھر تھے اور یہ فلموں کی تقسیم کاری کے فرائض بھی خود ہی سرانجام دیا کرتے تھے اس لئے یہ مالی اعتبار سے مضبوط و مستحکم تھے۔لاہور فلمی مرکز بھی تھااور فلموں کیلیئے ایک نرسری کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔یہ شہر برّصغیر کے دوسرے شہروں کو ''خام مال'' یعنی فنکار' ہنر مند' موسیقاراور گلوکار فراہم کیا کرتا تھا۔یہاں سے فلمی زندگی کا آغاز کرنے والے فنکار کلکتہ اور بمبئی جاکر ممتازاور اہم نام بن جایا کرتے تھے۔ایک زمانے میں بمبئی اور کلکتہ کی فلمی صنعت پر پنجاب ہی کے لوگوں کاراج تھا۔
لاہور میں مصنّف' موسیقار' ہدایت کاراور کاریگر بھی موجود تھے جس کی وجہ سے اعلیٰ معیار کی فلمیں تخلیق کی جاتی تھیں۔لاہور کی فلمیں پنجابی زبان میں بنائی جانے کے باوجود اپنے فن کاروں کی دلکشی' موسیقی کی کشش اور ہنرِمندی کے باعث سارے ہندوستان میں کامیابی سے ہم کنار ہوتی تھیں۔پھر یہاں اردو فلمیں بھی بننی شروع ہو گئیں جو بہت معیاری تھیں لیکن قیام پاکستان کے بعد یہ صورتحال تبدیل ہوگئی۔لاہور کے فلم سازاور ہنرمندوں کی اکثریت ہندو تھی اوروہ تقسیم کے بعد لاہور سے ترک وطن کر گئے تھے۔لاہور کے ممتاز فلم سٹوڈیوز فسادات کی نذر ہوکر جل چکے تھے۔ سرمایہ عنقا تھا۔ان حالات میں محض فنکاروں اور چند ہنر مندوں کے بل بوتے پر فلمیں بنانا بہت مشکل کام تھا۔

قیام پاکستان کے بعد بمبئی کے ممتاز مسلمان فلم سازوں اور ہدایتکاروں نے پاکستان کادورہ کیا تھا۔وہ اپنی سر گرمیاں پاکستان منتقل کرنا چاہتے تھے۔ ان میں محبوب خان اوراے آر کاردار جیسے کامیاب فلم ساز بھی شامل تھے۔ مگر ان لوگوں نے دیکھا کہ لاہور میں نگار خانے راکھ کاڈھیر بن چکے ہیں۔ضروری سازوسامان کے علاوہ تربیت یافتہ اور کامیاب

فنکار اور ہنرمند بھی نہیں ہیں۔ سرمائے کا دور دور تک نام ونشان نہیں ہے۔ان حالات میں انہیں لاہور میں فلم سازی کا مستقبل بہت تاریک نظر آیا۔ وہ کراچی گئے تو وہاں بھی قیام پاکستان کے فوراً بعد افراتفری کا عالم تھا۔ سرمایہ تو لاہور کے مقابلے میں زیادہ تھا مگر سٹوڈیوز نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی' نہ فنکار اور ہنرمند تھے۔ مختصر یہ کہ کراچی میں فلمی صنعت کا نام ونشان تک نہ تھا۔ان حالات میں ان لوگوں نے بمبئی میں فسادزدہ ماحول اور ہندوانہ تعصّب کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی کیونکہ ان کے خیال میں وہاں کم از کم فلم سازی تو ہوسکتی تھی۔

کراچی میں فلم سازی کے امکانات کے بارے میں ان کی رائے غلط بھی نہ تھی اور بعدازاں یہ مشاہدہ بھی ہوا کہ قیام پاکستان کے بعد بھی کافی عرصے تک کراچی میں فلم سازی شروع نہ کی جاسکی حالانکہ وہاں سینما گھر موجود تھے۔ فلم تقسیم کار ادارے بھی تھے اور نت نئے خوبصورت اور شاندار سینما گھر بھی تعمیر کئے جارہے تھے مگر یہ سب چیزیں بھارتی فلموں کے لئے مخصوص تھیں۔ بھارتی فلمیں اس زمانے میں کُھلے عام پاکستان آتی تھیں۔ فلم تقسیم کاروں نے پونے ان کے حقوق خرید کر لاکھوں روپیہ کماتے تھے۔ سینما گھروں کی بھی موج تھی کیونکہ بمبئی کے ممتاز اور مقبول فن کاروں کی کامیاب فلمیں یہاں نمائش کیلئے پیش کی جاتی تھیں۔ یہ وہ حالات تھے جن کی بنا پر یہ طبقات بھارت سے بدستور فلموں کی درآمد کے حق میں تھے۔ پاکستان میں فلم سازی سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ان حالات میں جبکہ اس ملک میں فلم بنانے ہی کے لالے پڑے ہوئے تھے' یہ کہاں ممکن تھا کہ کراچی میں نئے سرے سے فلمی صنعت کی بنیاد رکھنے کیلئے فلم اسٹوڈیوز تعمیر کئے جائیں۔ البتہ لاہور میں بنائی جانے والی فلموں کے لئے بیشتر سرمایہ کراچی ہی سے فراہم کیا جاتا تھا۔ کراچی کے فلم ڈسٹری بیوٹرز بھی لاہور کے تقسیم کاروں کے مقابلے میں زیادہ دولت مند اور باوسائل تھے۔اس کے علاوہ بعض فلم سازوں نے انفرادی کوششوں سے بھی کراچی کے بعض سرمایہ کاروں سے فلم سازی کیلئے سرمایہ حاصل کیا لیکن بدقسمتی سے اس قسم کے بیشتر تجربات ناکام ہوگئے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں نے (چند کو چھوڑ کر) سرمایہ حاصل کیا تھا وہ فلم سازی کے رموز کا تجربہ نہیں رکھتے تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب کراچی میں فلم سازی کا آغاز ہوا اور فلمی صنعت کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو یہ سعادت کسی دولت مند سرمایہ دار یا بڑے تقسیم کار اور فلم ساز کے حصّے میں نہیں آئی تھی۔اس کام کیلئے قرعۂ فال ایک ایسے شخص کے نام

نکلاجو کوئی معروف شخص کبھی بھی نہیں تھا۔نہ فنانسر تھانہ فلم ساز و تقسیم کار تھا۔یہ شخص بھی قیام پاکستان کے بعد اس ملک کی محبت میں بمبئی سے پاکستان آیا تھااور کراچی میں قیام پذیر ہو گیا تھا۔ان صاحب کا نام منوّر تھا۔پورا نام تو خدا جانے کیا تھا مگر وہ اپنے حلقے میں منوّر چاچا کے نام سے مشہور تھے اور جگت چاچا تھے۔بمبئی میں وہ باضابطہ طور پر فلمی صنعت سے وابستہ نہیں تھے لیکن فلم والوں سے ان کا میل جول اور دوستی کا رشتہ تھا۔

کراچی میں فلمی صنعت قائم کرنے کا خیال سب سے پہلے منوّر چاچا کو آیا تھااور یہ سہرا ان ہی کے سر ہے۔یہ اور بات ہے کہ آج پاکستان کی فلمی صنعت سے وابستہ لوگ اور خاص طور پر کراچی کی فلمی صنعت سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی اس حقیقت سے اور چاچا منوّر سے واقف نہیں ہیں۔چاچا منوّر کی دلیل بہت سادہ مگر موثر تھی۔ان کا کہنا تھا کہ بمبئی کی طرح کراچی بھی ایک صنعتی اور تجارتی شہر ہے۔یہاں بھی سرمائے کی فراوانی ہے۔بمبئی کے مانند یہاں بھی ساحل سمندر ہے،خوبصورت عمارتیں اور کشادہ سڑکیں ہیں۔یہ بھی ایک کاسموپولیٹن شہر ہے جہاں دنیا بھر سے سیّاح آتے ہیں۔اس زمانے میں تو کراچی میں شراب خانے اور نائٹ کلب بھی تھے۔اسی لئے مغربی سیّاح اس طرف کارُخ کرتے تھے۔کراچی کے ساحل پر سیاح خواتین اور مرد دھوپ میں پڑے اینڈتے رہتے تھے۔اس کے بعد تاریخی مقامات دیکھنے کی غرض سے لاہور کا چکّر بھی لگا لیتے تھے۔

چاچا منوّر نے کہا''اگر یہ سب چیزیں کراچی میں بھی ہیں تو پھر یہاں فلمی صنعت کیوں نہیں ہے؟''

جواب ملا''اس لئے کہ یہاں فلم اسٹوڈیو تک نہیں ہے۔''

بس پھر کیا تھا۔چاچا منوّر کراچی میں فلمی نگار خانہ قائم کرنے کی کوشش میں لگے گئے۔خود تو ان کے پاس سرمایہ تھا نہیں ، انہوں نے اپنے ہی جیسے مہم جُو محبّ وطن دوستوں کو اکٹّھا کیااور فلم اسٹوڈیو بنانے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ ان کے ایک دوست ٹیلر ماسٹر اے ایم قریشی تھے۔ایک اور صاحب کا نام بخاری تھا۔چاچا منوّر کی طرح ان دونوں کا بھی فلمی صنعت سے کوئی باقاعدہ اور باضابطہ تعلق نہیں تھا۔بس ایک دُھن سوار تھی۔انہوں نے گاندھی گارڈن کے سامنے ایک کھلا میدان فلم اسٹوڈیو تعمیر کرنے کے لئے حاصل کر لیا۔یہاں باغ تھاجو برائے نام ہی تھا۔سستا زمانہ تھا اس لئے زمین خریدنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔آج کل تو اس زمین کی قیمت کروڑوں میں ہے۔اس جگہ اب یہ

فلم اسٹوڈیو نہیں رہا۔ایک نو منزلہ شاندار عمارت بن چکی ہے جو مسٹر حسین ڈی سلوا کی ملکیت ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ بعد میں مسٹر حسین ڈی سلوا نے بھی فلم سازی کے سلسلے میں سرمایہ کاری کی اور ایک فلم بنائی تھی جس کا نام ''انتخاب'' تھا۔انتخاب کے ہدایت کار ہمایوں مرزا صاحب تھے۔یہ ان کی بھی پہلی فلم تھی۔ان دونوں کا ملاپ کچھ اس وجہ سے بھی ہو گیا تھا کہ حسین ڈی سلوا عمارتیں بناتے تھے اور ہمایوں مرزا ایک آرکیٹیکٹ تھے مگر فلمیں بنانے کا شوق رکھتے تھے۔اس لئے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر فلمی صنعت سے وابستہ ہو گئے۔ ہمایوں مرزا مرحوم نے پاکستان کے ممتاز فلم ساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے ایک مخصوص مقام بنا لیا تھا۔

حسین ڈی سلوا کی فلم ''انتخاب'' میں نیّر سلطانہ نے پہلی مرتبہ اداکاری کی تھی۔ اس فلم میں تو وہ معاون اداکارہ تھیں۔جمیلہ رزّاق اس کی ہیروئن تھیں۔

منوّر چاچا کے اسٹوڈیو کا نام فیڈرل اسٹوڈیو رکھا گیا تھا۔یہ بغیر چھت کا اسٹوڈیو تھا۔اسٹوڈیو بنانے کا قصّہ بھی دلچسپ ہے۔ہوا یہ کہ ان ہی دنوں کراچی میں ایک انٹرنیشنل صنعتی نمائش لگی تھی۔جس میں بعض اداروں نے پختہ اور نیم پختہ عمارتیں بھی تعمیر کی تھیں۔نمائش ختم ہو گئی تو چاچا منوّر نے بھاگ دوڑ کر کے یوگوسلاویہ کا پویلین حاصل کر لیا۔ اس پویلین کی دیوار اکھاڑ کر انہوں نے اپنے فلم اسٹوڈیو کی چار دیواری بنالی۔چھت ڈالنے کی توفیق نہ تھی۔اس لئے یہ اسٹوڈیو چھت کے بغیر ہی کام چلاتا رہا۔اسی قسم کا اسٹوڈیو لاہور میں بھی پہلی مرتبہ 1928ء میں اے آر کاردار صاحب نے اداکار ایم اسماعیل اور اپنے چند دوستوں کی مدد سے راوی کے کنارے بنایا تھا۔اس کی بھی چھت نہ تھی اور ٹین کی چادروں کی مدد سے چار دیواری بنائی گئی تھی۔ یہاں بھی صرف دن کے وقت ہی آؤٹ ڈور شوٹنگ کی جاتی تھی مگر فرق صرف یہ ہے کہ اے آر کاردار نے یہ اسٹوڈیو 30ء کی دہائی میں قیام پاکستان سے کئی سال قبل تعمیر کیا تھا اور چاچا منوّر نے یہی تجربہ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں دہرایا تھا۔

چاچا منوّر کے فیڈرل اسٹوڈیو میں سب سے پہلے جس فلم کی شوٹنگ کا آغاز کیا گیا اس کا نام ''بے کس'' تھا۔کراچی میں آلات اور سازوسامان نہیں تھا اس لئے لاہور کے ایک قدیم پنچولی اسٹوڈیو سے کیمرہ اور ریکارڈنگ کے لئے ساؤنڈ

ٹریک حاصل کیا گیا تھا۔اس اسٹوڈیو کا نام قیام پاکستان کے بعد ملکہ اسٹوڈیو رکھ دیا گیا تھا کیونکہ یہ مغنیّہ ملکہ پکھراج کے شوہر سیّد شبیر شاہ کے نام الاٹ کیا گیا تھا۔فیڈرل اسٹوڈیو کیلئے ہنرمند بھی لاہور ہی سے بلائے گئے تھے۔ریاض احمد اس کے کیمرہ مین تھے۔یہ وہی ریاض احمد تھے جنہوں نے بعد میں ''باغی'' جیسی فلم بنائی۔ہدایت کاری کے لئے شکور قادری کی خدمات حاصل کی گئیں۔اے زیڈ بیگ نے اس کی صدابندی کی تھی اور اے کے جان اس کے فلم ساز تھے۔اس فلم سے تعلق رکھنے والے سبھی ہنرمند اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔فلم ساز کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے۔

فلم ''بے کس'' کی شوٹنگ کا سلسلہ تین چار مہینے تک جاری رہا۔اس کے اداکاروں میں کچھ تو لاہور کے اداکار شامل تھے اور کچھ کراچی ہی سے اکٹھے کر لئے گئے تھے۔اس کی فلم بندی بھی بے کسی اور بے سروسامانی کے عالم میں کی جارہی تھی۔بہت کفایت شعاری برتی گئی مگر پھر بھی فلم ساز کا سرمایہ ختم ہوگیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ عملے کی تنخواہوں کیلئے بھی رقم نہ تھی۔نتیجہ یہ نکلا کہ کراچی میں شروع ہونے والی یہ پہلی فلم نامکمل ہی رہی۔ہنرمند اور سازوسامان واپس لاہور بھیج دیا گیا۔جسے تھوڑی بہت رقم مل گئی اس نے بھاگتے چور کی لنگوٹی سمجھ کر قبول کرلی اور آئندہ کیلئے صبر کرلیا۔

جس اسٹوڈیو کا آغاز بلکہ بسم اللہ اس قدر بے کسی کے عالم میں ہوئی تھی۔وہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور ختم ہو گیا بلکہ قصّہ پارینہ بن گیا۔آج خود فلم والے بھی اس اسٹوڈیو کے نام سے ناواقف ہیں مگر یہ کریڈٹ چاچا منوّر اور ان کے ساتھیوں کو جاتا ہے کہ انہوں نے کراچی میں فلم صنعت قائم کرنے کے سلسلے میں پہلی بنیاد رکھی تھی۔

کراچی کا دوسرا اسٹوڈیو باری پور میں قائم کیا گیا تھا جس کا نام قیصر اسٹوڈیو تھا۔قیصر اسٹوڈیو میں بھی ضروری سازوسامان کا مسئلہ درپیش رہا جس کی وجہ سے یہ فلم اسٹوڈیو بھی پنپ نہ سکا۔

شہر میں پہلا باقاعدہ فلم اسٹوڈیو ایسٹرن فلم اسٹوڈیو تھا۔یہ اسٹوڈیو ہارون فیملی نے قائم کیا تھا جو کراچی کا مشہور سیاسی اور صنعت کار خاندان تھا۔انہوں نے کولمبو پلان کے تعاون سے اسے منگھو پیر روڈ پر تعمیر کیا تھا۔یہ سات ایکڑ اراضی پر پھیلا ہوا تھا۔غور کیا جائے تو یہی کراچی کا پہلا معقول اسٹوڈیو تھا جس میں تمام ضروری آلات موجود تھے۔ریکارڈنگ

ہال مختصر لیکن بہت خوب صورت تھا۔اسٹوڈیو میں ایک لیبارٹری بھی تھی جس کے انچارج ایم اے شیرازی مقرر کئے گئے تھے۔

شیرازی صاحب بمبئی کے ایک ممتاز ہنرمند تھے۔انہوں نے کمال امروہوی کی مشہور فلم ''محل'' کے پرنٹ بھی تیار کئے تھے۔وہ بمبئی ٹاکیز سے وابستہ رہے تھے جو کہ برّصغیر کا ایک نمایاں اور قابل ذکر فلم ساز ادارہ تھا۔اس اسٹوڈیو میں اسماعیل گیلانی کو عکاسی کے شعبے کا انچارج مقرر کیا گیا تھا۔ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے طور پر اقبال شہزاد اس اسٹوڈیو سے وابستہ رہے۔اقبال شہزاد ایک ذہین' خوبرو اور اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھے جو انگلستان سے تربیت حاصل کرکے آئے تھے۔

ایسٹرن اسٹوڈیو میں دو کشادہ شوٹنگ فلور بھی تعمیر کئے گئے تھے جن کی گنجائش بعد میں بڑھادی گئی تھی۔ہارون فیملی نے ایک اچھّا کام یہ کیا کہ چاچا منوّر کو ایسٹرن اسٹوڈیو کا منیجر مقرر کیا گیا۔یہ اسٹوڈیو اے جی مرزا کی نگرانی میں کام کرتا تھا جو ایک بہت اچھے منتظم تھے۔ان کے زمانے میں ایسٹرن اسٹوڈیو نے بہت ترقی کی تھی۔یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب یہ نگار خانہ ہمہ وقت گہما گہمی اور مصروفیت کی آماج گاہ بن گیا بلکہ لاہور کے فلم ساز اور ہدایت کار بھی یہاں فلم بندی کرتے رہے۔اس اسٹوڈیو میں شوٹنگ کے سلسلے میں وہ تمام جدید سہولتیں موجود تھیں جن سے اس زمانے میں لاہور کے بڑے اسٹوڈیوز بھی محروم تھے۔مثال کے طور پر ڈولی کرین سب سے پہلی بار اسی سٹوڈیو میں استعمال کی گئی تھی۔کیمروں اور لائٹس کے علاوہ دوسرے آلات بھی جدید اور عمدہ تھے۔

ایسٹرن فلم اسٹوڈیو میں سب سے پہلے جس فلم کی شوٹنگ کا آغاز کیا گیا وہ ''ہماری زبان'' تھی۔اس کے فلم ساز اے آر خان تھے۔اے آر خان بھارت کے ممتاز ترین فلم ساز وہدایت کار محبوب خان کے بھائی تھے۔ اس فلم کی ہدایت کاری کے فرائض شیخ حسن نے سرانجام دیے تھے۔

لاہور سے پنچولی پکچرز اور اسٹوڈیوز کے منیجر دیوان سرداری لال بھی کراچی پہنچ گئے تھے اور انہوں نے چاچا منوّر کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے صنعتی نمائش کا ایک پویلین حاصل کرکے جیل روڈ پر ایک فلم اسٹوڈیو کی بنیاد رکھ دی تھی جس کا نام کراچی اسٹوڈیوز تھا۔لاہور کے ایک کرسچین فلم ساز رابرٹ ملک نے اس اسٹوڈیوز میں ''فن کار'' کے نام

سے ایک فلم کا آغاز کر دیا۔ کراچی فلم اسٹوڈیوز در حقیقت ایسٹرن اسٹوڈیوز سے پہلے قائم کیا گیا تھا۔ جب ایسٹرن فلم اسٹوڈیو میں بہترین ساز و سامان اور اعلیٰ تربیت یافتہ ہنرمندوں کے ساتھ فلم بندی کا آغاز کیا گیا تو کراچی اسٹوڈیوز اور قیصر اسٹوڈیوز کے فلم سازوں نے بھی اپنا بوریا بستر سنبھال کر ایسٹرن اسٹوڈیوز میں جا کر ڈیرے ڈال دیے۔ کراچی اسٹوڈیوز کو فلم ساز' عکاس اور ہدایت کار جعفر شاہ بخاری نے سنبھالا دینے کی کوشش کی مگر وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے کچھ عرصے بعد خود جعفر شاہ بخاری نے بھی ایسٹرن اسٹوڈیو کا رُخ کر لیا اور وہاں فلم بندی شروع کر دی۔

جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہے اسی طرح ایسٹرن فلم سٹوڈیوز کے وجود میں آنے کے بعد دوسرے فلم سٹوڈیوز کا خاتمہ ہو گیا اور سبھی فلمی سرگرمیاں ایسٹرن فلم سٹوڈیو میں منتقل ہو گئیں۔

اس سٹوڈیوز نے بڑے عروج کا زمانہ دیکھا ہے۔ یہاں کراچی اور لاہور کے فلم سازوں اور فنکاروں کے جمگھٹے لگے رہتے تھے اور سٹوڈیوز کے گیٹ کے باہر سینکڑوں بلکہ ہزاروں پرستار اپنے محبوب ستاروں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے دن رات منتظر کھڑے رہتے تھے۔

ایسٹرن سٹوڈیوز میں فلم بندی کا آغاز 1953ء میں ہوا تھا پہلے اس کے منتظم اعلیٰ اے جی مرزا رہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے منتظم تھے۔ ان کے بعد یوسف ہارون اور محمود ہارون کے چھوٹے بھائی سعید ہارون نے اس سٹوڈیوز کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ وہ ایسٹرن سٹوڈیوز کا سنہری دور تھا۔ کراچی میں کچھ عرصے بعد اور سٹوڈیوز بھی قائم کئے گئے تھے۔ مثلاً 1960ء میں ایسٹرن سٹوڈیوز کے نزدیک ہی ماڈرن سٹوڈیوز کا قیام عمل میں آیا۔ اس سٹوڈیوز میں سب سے پہلے سیٹ پر جانے والی فلم کا نام ''ہمدم'' تھا۔ ماڈرن سٹوڈیو بھی کچھ عرصے تک چلتا رہا۔

1972ء میں کراچی میں ایک اور سٹوڈیو زانٹر نیشنل سٹوڈیوز کے نام سے قائم کیا گیا تھا۔ یہ بین الاقوامی شہرت یافتہ ایڈورٹائزنگ کمپنی'' لنِ ٹاس'' کے مالک سی اے رؤف نے تعمیر کیا تھا۔ اس سٹوڈیوز میں رنگین فلموں کے لئے ایک بہت اچھی لیبارٹری بھی بنائی گئی تھی۔ اس کا معیار اتنا بلند تھا کہ لاہور کے کئی فلم ساز مقامی ایورنیو شاہ نور اور باری

سٹوڈیوز میں فلم بندی کرنے کے بعد اپنی فلموں کا نیگیٹو پروسسنگ اور پرنٹ بنانے کے لئے انٹر نیشنل سٹوڈیوز کراچی بھیج دیا کرتے تھے اور اس کے نتائج بھی بہت اچھے اور اطمینان بخش تھے۔

انٹر نیشنل سٹوڈیوز میں فلموں کی شوٹنگ بھی ہوتی رہی۔ اس فلم سٹوڈیوز میں سب سے پہلے جس فلم کی شوٹنگ کی گئی اس کا نام "چوری میرا کام" تھا جس کے ہدایت کار اقبال کاشمیری تھے۔

کراچی میں فلم صنعت کا قیام عمل میں آیا تو رفتہ رفتہ فلم سازی کی سرگرمیاں بھی شروع ہو گئیں۔ نہ صرف کراچی کے فلم سازوں نے یہاں فلم بندی شروع کر دی تھی بلکہ لاہور کے ممتاز فلم ساز اور ہدایت کار بھی یہاں فلمیں بنانے میں مصروف ہو گئے تھے۔

کراچی کے فلمی صنعت کو فنکاروں، موسیقاروں اور گلوکاروں کی کم یابی کا ہمیشہ شکوہ رہا ہے۔ حالانکہ ستم ظریفی یہ دیکھئے کے لاہور کی فلمی صنعت کو کراچی سے بہت سے ممتاز اور ذہین فلم ساز، ہدایت کار، مصنّف، نغمہ نویس، فنکار، موسیقار اور گلوکار دستیاب ہوئے۔ ابتدا میں ان نئے لوگوں سے کوئی واقف نہیں ہوتا تھا اس لئے بھاری بھر کم نام شامل کرنے کیلیئے لاہور سے نمایاں فنکاروں اور ہنر مندوں کو بلایا جاتا تھا۔ ایک فلم کی کامیابی کے بعد جب کراچی کے فنکار وغیرہ شہرت اور مقبولیت حاصل کر لیتے تھے تو وہ لاہور کا رُخ کرتے تھے اس لئے کہ یہی فلم ساز کا مرکز تھا اور لاہور کی فلموں میں کام کئے بغیر بھاری معاوضہ اور ملک گیر شہرت حاصل نہیں کی جاسکتی تھی۔ کراچی کے فلم ساز ان ہی فنکاروں کو شہرت یافتہ ہو جانے کے بعد بھاری معاوضے دے کر لاہور سے کراچی بلایا کرتے تھے اور ان کے ناز نخرے بھی اٹھاتے تھے۔ یہ بھی ایک ستم ظریفی تھی۔

اب ذرا یہ دیکھئے کہ کراچی نے پاکستان کی فلمی صنعت کو کیسے کیسے ستارے اور فن کار "عطیہ" کئے ہیں۔ اداکاروں کی فہرست میں وحید مراد، محمد علی، زیبا، غلام محی الدین، دیبا، بابرہ شریف، شمیم آرا، رخسانہ، بدر منیر، نگہت سلطانہ، سنگیتا، کویتا، آسیہ، ماہ پارہ، نیر سلطانہ، ساقی، نرالا، لہری، کمال ایرانی، تمنا، رتن کمار، شاہنواز، سلونی، ترنم اور جمیلہ رزاق جیسے فنکار شامل ہیں۔ مذکورہ بالا فنکاروں میں سے بعض کا تعلق پنجاب سے بھی ہے لیکن انہوں

نے اپنے کیریئر کا آغاز کراچی سے ہی کیا تھا اور وہیں سے شہرت کے پہلے زینے پر قدم رکھا تھا۔
موسیقاروں میں کراچی نے پاکستان کی فلمی صنعت کو جو نام مہیا کئے ان کی فہرست بھی طویل ہے۔ سہیل رعنا' خلیل احمد' نذر صابر' غلام نبی' عبداللطیف' غلام علی' لعل محمد اقبال' نثار بزمی اور دیبو بھٹہ چاریہ کے نام اس فہرست میں شامل ہیں۔ کراچی سے بہت اچھے نغمہ نگار بھی فلمی دنیا کو میسر آئے۔ان میں مسرور انور' حمایت علی شاعر' فیاض ہاشمی' سرور بارہ بنکوی' طفیل احمد جمالی 'تسلیم فاضلی' صہبا اختر' یونس ہمدم' دُکھی پریم نگری اور شیون رضوی شامل ہیں۔ کہانی نویسوں میں ابراہیم جلیس' بشیر نیاز' دُکھی پریم نگری' مسرور انور اور اقبال رضوی جیسے معروف لوگوں کو اسی شہر سے شہرت کی چکا چوند ملی تھی۔ گلوکاروں میں احمد رشدی' رونا لیلیٰ' مسعود رانا' روبینہ بدر' مہناز اور مجیب عالم کو کراچی کی فلموں سے ہی شہرت ملی تھی۔ عکاسوں میں سہیل ہاشمی' افضل چودھری' جان محمد' اے آر ناصر' ایم ایوب' محبوب علی اور سعید رضوی جیسے عکاسوں کو اسی شہر کی فلمی صنعت نے موقع دیا تھا۔ تدوین کاروں اور ہنر مندوں میں حسن ضیا' ایم طفیل' اقبال شہزاد اور رفعت قریشی کا تعلق بھی کراچی ہی سے رہا ہے۔

کراچی میں فلم سازی کے میدان میں کئی لوگ آئے جن میں سے کچھ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے اور ایک دو فلمیں بنانے کے بعد ہی اس شعبے کو خیرباد کہہ گئے مگر ایسے افراد کی بھی کمی نہیں ہے جنھوں نے پاکستان کی فلمی صنعت پر اپنی کارکردگی سے گہرے نقّوش چھوڑے ہیں۔ مثلاً وحید مراد' پرویز ملک' سیّد مختار احمد' جگدیش چندر آنند' سعید ہارون' بہار علی بلوچ اور اداکار رتن کمار کے بھائی وزیر علی نے بھی فلم سازی کا آغاز کراچی ہی سے کیا تھا اور ایک زمانے میں "فلمز حیات" نامی فلم ساز ادارہ قائم کرنے کے بعد لاہور منتقل ہو گئے تھے جہاں انہوں نے "ناگن" جیسی سپر ہٹ اور ناقابل فراموش فلم بنائی۔

کراچی کے نگار خانوں میں جو کامیاب اور معروف فلمیں بنائی جا چکی ہیں اب ذرا ان کی فہرست پر بھی ایک نظر ڈالئے۔ ہیرا اور پتھر' ارمان' سالگرہ' احسان' نادان' سوغات' جاگ اٹھا انسان' رشتہ ہے پیار کا (رنگین فلم جس کی فلم بندی یورپ کی گئی تھی) زمانہ کیا کہے گا 'انتخاب' بنجارن' دوراہا' رات کے راہی' چاند سورج' سمندر' انہونی'

مس 56، رم جھم، آنچل، بیس دن، بیوی ہو تو ایسی اور عید مبارک وغیرہ کے علاوہ مقامی زبانوں کی معروف فلمیں بھی یہاں بنائی گئیں جن میں سندھی فلم عمر ماروی ،نوری جام تماچی، پہلی پشتو فلم یوسف خان شیر بانو، گجراتی فلم ماں تے ماں اور پہلی بلوچی فلم حمل ماہ گنج شامل ہیں۔

کراچی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پاکستان کی پہلی انگریزی فلم ''بیانڈ دی لاسٹ ماؤنٹین'' کراچی ہی میں بنائی گئی تھی۔اس کے فلم ساز و ہدایت کار جاوید جبّار تھے جو بعد میں سینیٹر اور وفاقی وزیر بھی بنے۔کراچی میں پنجابی فلم ''ہیر'' بھی بنائی گئی تھی۔اداکار انور اقبال نے بھی ایک بلوچی فلم بنائی تھی جو درحقیقت پاکستان میں بلوچی زبان میں بنائی جانے والی پہلی فلم تھی مگر بدقسمتی سے یہ فلم نمائش پذیر نہ ہو سکی۔

کراچی کی فلمی صنعت کو اور بھی کئی اعزاز حاصل ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کراچی نے پاکستان کی فلمی صنعت کے لئے کتنی گراں قدر اور قابل ذکر خدمات سرانجام دی ہیں۔

بھارت کے فن کاروں اور ہنر مندوں کے اشتراک سے بنائی جانے والی فلموں کا آغاز سب سے پہلے کراچی میں ہوا تھا۔تقسیم کار اور فلم ساز شیخ لطیف حسین نے کراچی میں فلم ''انوکھی'' بنائی تھی جس کی ہیروئن شیلا رمانی بمبئی کی فلموں کی ممتاز ڈانسر اور ویمپ تھیں۔اس فلم کے ہدایت کار تمر برن تھے۔انوکھی میں لہری نے پہلی بار مزاحیہ کردار کیا تھا جو اس قدر پسند کیا گیا کہ لہری کچھ عرصے بعد کراچی سے لاہور منتقل ہو گئے اور پاکستان کے صف اوّل کے منفرد کامیڈین بن گئے۔کراچی ہی میں فلم ساز فاضلانی نے بے حد معیاری اور پہلی سندھی فلم ''عمر ماروی'' بنائی تھی جس میں ہیروئن کے طور پر نگہت سلطانہ کو پیش کیا گیا تھا۔فاضلانی اس فلم کے ہیرو تھے۔عمر ماروی میں موسیقار غلام نبی عبداللطیف کو پہلی بار موقع دیا گیا تھا اور انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے باعث بہت مقبولیت حاصل کی تھی۔کراچی کی فلم ''کارنامہ'' میں احمد رشدی نے اپنا پہلا فلمی گانا گایا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی مدھر آواز کے سہارے چوٹی کے گلوکار بن گئے تھے۔بمبئی سے آئے ہوئے کہنہ مشق تجربہ کار اور معروف ہدایت کار نجم نقوی نے پاکستان میں اپنی پہلی فلم کراچی میں بنائی تھی۔اس فلم کا نام ''کنواری بیوہ'' تھا اور اس کی ہیروئن شمیم آراء تھیں۔ یہ بطور اداکارہ شمیم آراء کی پہلی فلم تھی جو ناکام ہو گئی تھی۔ شمیم آراء کو بھی قبول عام حاصل نہیں ہو سکا تھا۔

فلمی دنیاکادستور ہے کہ عموماً پہلی فلم میں ناکام ہونے والے فن کارگمنام اور پسماندہ ہی رہ جاتے ہیں مگر شمیم آراء نے اپنی پہلی فلم کی ناکامی کے باوجود رفتہ رفتہ اپنی محنت، شوق اور لگن سے بلند ترین مقام حاصل کرلیا۔1956ء میں کراچی کی فلم ”مس56“ میں کام کرنے کے لئے بھارت کی شوخ و چنچل ہیروئن میناشوری پاکستان آئی تھیں۔اس فلم کے ہدایت کاران کے شوہر شوری تھے۔سنتوش کمارنے اس فلم میں ہیرو کا کردار کیا تھا۔پھر میناشوری پاکستان ہی کی ہو کر رہ گئی تھیں ۔کراچی سے وہ لاہور آگئی تھیں اور کئی سال تک فلمی دنیامیں دھومیں مچانے کے بعد کسمپرسی کے عالم میں انتقال کر گئیں۔

ہدایت کار ہمایوں مرزانے اپنی پہلی فلم ”انتخاب“ کراچی میں بنائی تھی جس کی ہیروئن جمیلہ رزّاق تھیں۔جمیلہ رزّاق نے کچھ عرصے بعد کراچی میں ایک فلم ”ہم ایک ہیں" بنائی تھی جس کے مصنف ہدایت کاراور نغمہ نگار فیاض ہاشمی تھے۔

عزیزاحمدنے بطور ہدایت کار کراچی میں اپنی پہلی فلم ” منڈی“ بنائی تھی جس میں بھارت کی فلمی دنیاکی معروف گلوکارہ اور ہیروئن خورشید بیگم نے مرکزی کردارادا کیا تھا۔یہ فلم ناکام ہوگئی تھی۔

اور تواور مہدی حسن کو فلمی دنیاسے متعارف کرانے کا سہرا بھی کراچی ہی کے سر ہے۔کراچی میں بنائی جانے والی فلم ”شکار“ میں مہدی حسن نے پہلی بار فلم کے لئے گلوکاری کی تھی۔اس کے بعد انہوں نے عظمت کی جو بلندیاں حاصل کیں وہ اب تاریخ کا حصّہ ہے۔

ایس ایم یوسف جیسے کامیاب اور مشہور و معروف ہدایت کار بمبئی سے آئے توانہوں نے اپنی سپر ہٹ فلم ”سہیلی“ کاآغاز کراچی ہی میں کیا تھاجس نے کامیابیوں کے نئے ریکارڈ قائم کئے تھے۔ایس ایم یوسف صاحب کے بڑے صاحب زادے اقبال یوسف نے بھی اپنی فلمی زندگی کاآغاز کراچی ہی سے کیا تھا۔انہوں نے فلم سازاور صدابندی کے ماہر اقبال شہزاد کے لئے فلم ”رات کے راہی“ کراچی میں بنائی تھی۔اتفاق سے یہ اقبال شہزاد کی بھی بطور فلم ساز پہلی فلم تھی۔آگے چل کراقبال شہزادنے فلمی دنیامیں بہت سے معرکے سر کئے۔فلم سازی کے علاوہ ہدایت کاری بھی کی۔لاہور میں سینے ٹیل سٹوڈیو بھی قائم کیااور اس وقت کی مقبول و معروف ہیروئن ریحانہ سے شادی کی۔ان کی فلم

''رات کے راہی'' میں ریحانہ اور درپن نے مرکزی کردار کئے تھے۔ شمیم آراء نے اس فلم میں ایک رقاصہ کی حیثیت سے کام کیا تھا۔

فضلی برادرز کا نام بھارتی فلمی صنعت میں آسمان کی بلندیاں چھورہا تھا۔ سبطین فضلی اور حسنین فضلی دو بھائی تھے جنہوں نے کلکتہ سے فلم سازی اور ہدایت کاری کا آغاز کیا تھا پھر بمبئی جا کر بھی نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ حسنین فضلی نے کراچی میں ''دعا'' کے نام سے ایک فلم کا آغاز کیا تھا جو پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ سبطین فضلی صاحب نے لاہور آکر ''دوپٹہ'' جیسی مایہ ناز فلم بنائی تھی جس کی ہیروئن نور جہاں تھیں۔ ہیرو کے طور پر ایک نیا چہرہ ''اجے کمار'' پیش کیا گیا تھا۔ سدھیر نے اس فلم میں معاون اداکار کے طور پر کام کیا تھا۔ سبطین فضلی صاحب نے اس کے بعد لاہور میں ''آنکھ کا نشہ'' اور ''تصویر'' نامی فلمیں بھی بنائی تھیں۔

فضلی برادرز کے تیسرے اور سب سے بڑے بھائی فضل کریم فضلی صاحب تھے۔ فضل کریم فضلی انڈین سول سروس سے تعلق رکھتے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے یہاں بھی اہم وفاقی عہدوں پر کام کیا۔ کہنے کو وہ بیوروکریٹ تھے اور وہ بھی انگریز کے زمانے کے مگر سرتاپا مشرقی تہذیب و تمدّن اور اعلیٰ ادبی ذوق کے مالک تھے۔ وہ بلند پایہ شاعر اور اہل قلم تھے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہیں یکایک جانے کیا سوجھی کہ فلم کے میدان میں کود پڑے۔ فلم کا انہیں کوئی سابقہ تجربہ نہ تھا۔ ان کے دونوں چھوٹے بھائیوں نے اس شعبے میں ہندوستان گیر شہرت اور کامیابیاں حاصل کی تھیں مگر فضل کریم فضلی فلم کے ماحول سے ہمیشہ دور ہی رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور ''چراغ جلتا رہا'' کے نام سے ایک بامقصد اصلاحی فلم بناڈالی۔ اس فلم میں سبھی ناتجربہ کار اور نووارد تھے۔ فضل کریم فضلی صاحب بذاتِ خود اس میدان میں بالکل نووارد تھے۔ کاسٹ میں انہوں نے تمام نئے اداکار بھرتی کر لیے تھے۔ اس فلم کی ہیروئن زیبا تھیں۔ ہیرو کا نام عارف تھا۔ دیبا، محمد علی، کمال ایرانی کی بھی یہ پہلی فلم تھی۔ نہال عبداللہ فلم کے موسیقار تھے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ مادر ملت فاطمہ جناح نے یہ فلم دیکھی۔ وہ اس کے پریمئر شو میں شریک ہوئی تھیں۔

''چراغ جلتا رہا'' نے خاصی کامیابی حاصل کی۔ حکومت نے اس کی مقصدیت کے پیش نظر اس کا تفریحی ٹیکس بھی

معاف کر دیا تھا۔چراغ جلتا رہا کے سبھی اداکاروں نے مستقبل میں شہرت اور مقبولیت حاصل کی سوائے ہیرو کے جو اس فلم کے بعد لاپتہ ہوگئے۔چراغ جلتا رہامیں بھارت کے معروف گلوکار طلعت محمود کی آواز میں بھی گانے ریکارڈ کئے گئے تھے۔اداکارہ سلونی کو بھی فضلی صاحب ہی نے اپنی دوسری فلم ''ایسا بھی ہوتا ہے'' میں روشناس کرایا تھاجو پاکستان کی ممتاز ہیروئن بن گئی تھیں۔بعد میں انہوں نے کئی کامیاب اردواور پنجابی فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔لاہور آنے کے کچھ عرصہ بعدانہوں نے فلم سازاور سٹوڈیواونر ملک باری کے ساتھ شادی کرنے کے بعد فلمی دنیاسے کنارہ کشی اختیار کرلی۔مشہور موسیقار نثار بزمی نے بھی پاکستان آنے کے بعد فلم ''ایسا بھی ہوتا ہے'' کی موسیقی ہی سے شہرت حاصل کی اور پاکستان کے معروف موسیقار بن گئے۔گلوکار ایم کلیم کو بھی فضلی صاحب ہی نے پہلی بار متعارف کرایا تھا۔فضلی صاحب نے ایک فلم ''وقت کی پکار'' میں زیبا کے ساتھ ایک نئے ہیرو طاہر کو پیش کیا تھاجو کامیاب نہ ہوسکے۔طاہر نے بعد میں ''سنگتراش'' کے نام سے کراچی میں ایک فلم بنائی تھی جو نمائش کے لیے پیش نہ کی جاسکی۔

موسیقار نثار بزمی کو فلم سازنذیر صوفی نے اپنی فلم ''ہیڈ کانسٹیبل'' میں بھی موسیقار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔اس فلم کی موسیقی تو پسند کی گئی تھی مگر فلم فلاپ ہوگئی۔نذیر صوفی ایک انتہائی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین آدمی تھے مگر فلمی دنیاانہیں اور وہ فلمی دنیا کوراس نہ آسکے۔پاکستان کا پہلا صدارتی ایوارڈ پانیوالے عکاس سہیل ہاشمی کو ''عمر ماروی'' کی لاجواب عکاسی کے لیے اس اعزاز سے نوازا گیا تھا۔

کراچی میں یوں توان گنت افراد نے فلمی صنعت کی ترقی اور سربلندی کے لیے اپنے طور پر خدمات سرانجام دی تھیں مگران میں سرفہرست ہدایت کار شیخ حسن کا نام ہے۔

شیخ حسن ایک انتہائی باصلاحیت اور ہنر مند انسان تھے۔افسوس کہ مناسب مواقع نہ ملنے کے باعث وہ پاکستان کی فلمی صنعت میں اپنے شایانِ شان مقام حاصل نہ کرسکے مگرانہوں نے کبھی کراچی چھوڑ کر لاہور کارخ نہیں کیا۔آزاد منش اور بے نیاز انسان تھے۔کسی کی خوشامد یا پارٹی بازی سے ہمیشہ دور رہے۔یہی وجہ ہے کہ انہیں ممتاز اور کامیاب ہدایت کاروں کی صف میں جگہ نہ مل سکی۔شیخ حسن نے فلمی دنیا کو ابراہیم جلیس، دکھی پریم نگری، رشید لاشاری اور

موسیٰ کلیم جیسے لکھنے والوں کی طرف متوجہ کیا تھا۔ شیخ حسن ہی کی بدولت غلام نبی عبداللطیف ، غلام علی، لعل محمد اقبال اور نیاز احمد جیسے کامیاب اور ذہین موسیقار فلمی دنیا کو نصیب ہوئے تھے۔ انہوں نے ہی نگہت سلطانہ، عشرت چودھری، مشتاق چنگیزی، محمود لاسی، سلطانہ، ملک انوکھا، مقصود حسین اور بہت سے دوسرے فنکاروں کو پہلی بار کیمرے کے سامنے آنے کا موقع دیا تھا۔ افسوس کہ یہ شریف النفس اور ذہین ہنر مند فلمی دنیا میں اپنا جائز مقام حاصل نہ کر سکا۔

عزیز تبسم جیسے ہدایت کار اور بدر منیر جیسے اداکاروں نے بھی کراچی ہی سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا۔ کراچی کسی زمانے میں کمرشل فلموں اور دستاویزی فلموں کا مرکز تھا۔ مسٹر نصراللہ گزدر منصور بابر اور مسٹر مرچنٹ جیسے کامیاب لوگوں نے کراچی ہی سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا۔ ان اشتہاری فلموں کا معیار بہت بلند تھا اور ان میں سے کئی فلموں نے ایوارڈز بھی حاصل کئے۔ یہ اعزاز بھی کراچی ہی کے حصے میں آیا ہے کہ پاکستان کی پہلی سائنس فکشن ""شانی ""یہیں بنائی گئی۔ نامور ہدایت کار رفیق رضوی جو بمبئی سے آنے کے بعد کراچی میں ہی زیادہ تر فلمیں بناتے رہے، ان کے صاحبزادے سعید رضوی نے یہ فلم بنائی تھی۔

کراچی میں بہت سی کامیاب اور قابل ذکر فلمیں بنائی گئیں جنہیں صدارتی ایوارڈز کے علاوہ ""نگار"" ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔ پاکستان میں نگار فلم ایوارڈ بمبئی کے فلم فیئر ایوارڈ کا ہم پلہ رہا ہے۔ کراچی کی جن فلموں نے صدارتی اور نگار ایوارڈز حاصل کئے، اب ذرا ان کی طویل فہرست بھی ملاحظہ کر لیجئے۔

سندھی فلم ""عمر ماروی"" ہمایوں مرزا کی فلم ""بڑا آدمی"" جعفر شاہ بخاری کی ""فیصلہ"" انسان بدلتا ہے"" کمال کی ""ہنی مون ""ایس ایم یوسف کی ""عید مبارک"" پرویز ملک کی ""دشمن"" اجے کاردار کی ""قسم اس وقت کی"" شیخ حسن کی ""جاگ اٹھا انسان"" مسرور انور کی ""بیوی ہو تو ایسی، چراغ جلتا رہا"" اور فلم ساز ووہرا کی فلم ""آگ کا دریا"" اس کے ہدایت کار ہمایوں مرزا تھے۔ اداکاروں میں محمد علی، شمیم آرا، لہری اور ساقی نمایاں تھے۔ کراچی ہی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اردو کے شہرۂ آفاق شاعر جوش ملیح آبادی نے کراچی کی فلم ""آگ کا دریا"" کے لیے نغمات تحریر کئے تھے۔ فلم ""نئی لیلیٰ نیا مجنوں"" ہدایت کار قمر زیدی کی فلم "" سالگرہ"" کے علاوہ کراچی کی سندھی فلموں نے بھی

نگار ایوارڈز حاصل کئے۔ ان میں ”ملن سوڈا پٹ سند جا“ غیرت جو سوال، اجرک، حاضر سائیں، گھاتو گھر نہ آیا، سندھڑی تاں صدقے، امید ممتا، حیدر خاں“ شامل ہیں۔ ”زمانہ کیا کہے گا“ (ہدایت کار و فلم ساز اقبال یوسف) ”کرن اور کلی“ اور ”میخانہ“ کو بھی نگار ایوارڈز مل چکے ہیں۔ میخانہ کے فلم ساز، ہدایت کار اور نغمہ نگار نخشب جار چوی تھے۔ کراچی کے فلم سازوں میں رؤف شمسی (کاشف فلمز) کا نام بھی نمایاں ہے۔ انہوں نے لاہور میں فلمیں پروڈیوس کیں مگر ان کا مرکزی دفتر اور تقسیم کا ادارہ کراچی ہی میں تھا۔ رؤف شمسی نے ہدایت کار نذرالاسلام کے تعاون سے ”بندش“ جیسی سپر ہٹ فلم بنائی تھی جس کی فلم بندی پہلی بار انڈونیشیا میں کی گئی تھی۔ اس کے بعد کسی اور پاکستانی فلم کی شوٹنگ انڈونیشیا میں نہیں ہوئی۔ ”آئینہ“ جیسی مایہ ناز فلم بھی رؤف شمسی ہی نے نذرالاسلام کے تعاون سے پروڈیوس کی تھی۔ اسی ادارے نے لاہور میں انتظار) ہدایت کار ایس سلیمان) زینت (ہدایتکار ایس سلیمان) انسانیت (ہدایت کار ایس سلیمان) اور موم کی گڑیا جیسی فلمیں بھی بنائی تھیں۔ معروف شاعر، حمایت علی شاعر کراچی ہی سے نغمہ نگار کے طور پر لاہور آئے تھے۔ یہاں انہوں نے کہانی نویسی کے علاوہ فلم سازی اور ہدایت کاری بھی کی اور بہت نام کمایا۔

اداکارہ رانی کو رانی کراچی نے بنایا۔ ویسے تو انکا تعلق لاہور سے تھا۔ وہ مزنگ کے مردم خیز محلّے میں پیدا ہوئی تھیں مگر پھر تقدیر کے ستارے انہیں کراچی لے گئے جہاں ان کے سوتیلے والد ملازمت کے سلسلے میں چلے گئے تھے۔ یہیں ان کی والدہ نے انہیں معروف مغنیّہ اور اداکارہ مختار بیگم کی تحویل میں دے دیا تھا۔

مختار بیگم سُر سنگیت کی ملکہ تھیں۔ ان کی نگرانی اور سرپرستی میں فریدہ خانم اور نسیم بیگم جیسی گلوکاراؤں نے تربیت حاصل کی تھی۔ انہوں نے رانی کو بھی پہلے تو موسیقی سے روشناس کرانے کی کوشش کی لیکن جب انہیں گلوکاری کی مطلوبہ صلاحیتوں سے محروم پایا تو رقص کی تربیت دی اور ایک ماہر رقاصہ بنا دیا۔

رانی کا اصلی نام ناصرہ تھا۔ جب انہوں نے شوبزنس کی دنیا میں قدم رکھا تو انہیں رانی کا نام دیا گیا۔ پھر تو ایسا ہوا کہ قریبی لوگوں کے سوا کسی کو بھی ان کا اصلی نام یاد نہیں رہا۔ سب انہیں رانی کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو رانی کا شمار بھی کراچی کے فن کاروں ہی میں کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ کراچی کے راستے پاکستان کی فلمی دنیا میں آئی

تھیں۔

ایمی مینوالا نے رقاصہ کے طور پر بہت شہرت اور پذیرائی حاصل کی۔ایمی کراچی ہی میں پیدا ہوئی تھیں اور ان کا تعلق پارسی فرقے سے تھا۔کراچی کے معروف میٹروپول ہوٹل کے مالک سائرس مینوالا ان کے ماموں تھے۔ایمی کو بچپن ہی سے رقص کا شوق تھا۔ان کی والدہ نے بھی اس شوق کو پروان چڑھایا اور انہیں باقاعدہ کلاسیکی رقص سکھانے کا اہتمام کیا۔ایمی میٹروپول ہوٹل میں رقص کرتی تھیں۔ان دنوں کراچی کے ہوٹلوں میں رقص کا رواج تھا۔

میٹروپول ہوٹل کو کراچی کے ہوٹلوں میں بہت ممتاز مقام حاصل تھا۔ یہ جگہ غیر ملکی سیّاحوں کا ٹھکانا تھی۔ایمی کا کلاسیکی اندازکا رقص بھی میٹروپول ہوٹل کی ایک خصوصیت سمجھا جاتا تھا۔خاص طور پر غیر ملکی سیّاح اس کے بہت دلدادہ تھے۔

ایمی کو سب سے پہلے ”نگار“ ویکلی کے ایڈیٹر الیاس رشیدی صاحب نے تلاش کیا اور جب لاہور میں ”نگار ایوارڈز“ کی تقریب منعقد ہوئی تو ایمی مینوالا کو خاص طور پر اس میں رقص پیش کرنے کے لیے مدعو کیا۔ ساری فلمی صنعت اس تقریب میں موجود تھی۔ایمی کے رقص خصوصاً ”مورناچ“ نے ہر ایک کو متوجہ کر لیا۔یہیں سے ایمی کی شہرت اور فلمی زندگی کا آغاز ہوا۔ جب لاہور کے فلم سازوں کی آفرز میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تو ایمی اپنی والدہ اور بھائی کے ہمراہ کراچی سے لاہور منتقل ہو گئیں۔

ایمی ہی کی طرح رخسانہ (چیکو) کو بھی نگار فلم ایوارڈز کی تقریب کی بدولت ہی فلمی دنیا تک رسائی حاصل ہوئی تھی۔ وہ بھی نگار ایوارڈز کی ایک تقریب میں شریک ہونے کے لیے لاہور آئی تھیں اور پھر یہیں کی ہو کر رہ گئی تھیں مگر ان کا آغاز کراچی ہی سے ہوا تھا۔

پنّا کا شمار پاکستان کی چند ہنر مند رقاصاؤں میں ہوتا تھا۔وہ بھی کلاسیکی رقص کرتی تھیں۔بعد میں انہوں نے زرّیں نام اختیار کر لیا تھا اور معروف ہدایتکار ایس سلیمان سے شادی کے بعد زرّیں سلیمان کے نام سے جانی گئیں لیکن ابتدائی دنوں میں وہ پنّا کے نام سے ہی فلموں میں کام کرتی رہیں۔انہیں بھی عموماً ڈانسر کے طور پر فلموں میں کاسٹ کیا جاتا تھا۔وہ اور ایمی اس زمانے میں کلاسیکی رقص جاننے والی دو فلمی ڈانسرز تھیں۔شاہِ ایران کے دورِ حکومت میں پاکستان

سے ایک فلمی وفد تہران میں منعقد ہونیوالے فلمی میلے میں شرکت کی غرض سے تہران بھیجا گیا تو ایمی اور پنّا دونوں اس میں شامل تھیں۔ان دونوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اعلیٰ ترین تقاریب میں شہنشاہ اور سر براہانِ مملکت کے سامنے رقص کیا اور داد حاصل کی۔پاکستان سے بیرونِ ملک بھیجے جانیوالے ثقافتی وفود میں بھی رقاصاؤں کی حیثیت سے ان دونوں کو نمائندگی کا موقع ملتا رہا۔دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات میں ان کا بڑا کردار رہا ہے۔یہ دونوں کراچی ہی کی دین ہیں۔

پاکستان کا سب سے بڑا' اہم اور بااثر فلمی جریدہ ''نگار'' بھی کراچی ہی سے شائع ہوتا ہے۔''نگار'' ویکلی کو پاکستان کی فلمی صنعت میں ایک اہم تعمیری مقام حاصل ہے اور یہ اس کے مالک اور مدیر الیاس رشیدی صاحب کی بدولت ہے۔ ایک وقت تھا جب ''نگار'' ویکلی پاکستان کی فلمی صنعت میں سب سے بلند' مضبوط اور موثر آواز تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے تعاون کے بغیر بڑے بڑے فلم ساز اور اداکار خود کو نامکمل اور بے بس خیال کرتے تھے۔نگار کی آواز کو مسترد یا نظرانداز کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔نگار کی معرفت بہت سے معروف اور کامیاب فنکار اور ہنرمند بھی فلمی صنعت کو میّسر آئے جنہوں نے پاکستان کی فلمی دنیا میں قابل تعریف کارنامے سرانجام دیئے۔نگار کا سب سے بڑا کارنامہ '' نگار فلم ایوارڈز'' کا اجراء ہے۔پہلے نگار ایوارڈز کی تقریب 1957ء میں لاہور میں منعقد ہوئی تھی۔فلمی صنعت پہ کئی بار بُرا وقت آیا، ملکی سیاست میں ردوّبدل ہوا مگر نگار ایوارڈز حکومت کی امداد کے بغیر ہی جاری رہے۔کسی غیر سرکاری ادارے یا سرمایہ کار سے بھی اس کے لیے مالی امداد حاصل نہیں کی گئی۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی نگار ایوارڈز کو ایک باوقار مقام حاصل ہے۔لیکن آج کل یہ بند ہے۔
دراصل یہ کام حکومت یا کسی سرکاری تنظیم کا تھا جو ایڈیٹر نگار نے رضاکارانہ طور پر اپنے ذمّے لے لیا۔حکومت نے فلمی صنعت کی بے شمار اپیلوں اور بے پناہ مطالبوں کے بعد صدارتی فلم ایوارڈز اور پھر نیشنل فلم ایوارڈز کا سلسلہ شروع کیا تھا مگر یہ بھی باقاعدگی سے جاری نہ رہ سکا۔صدارتی فلم ایوارڈ تو صرف ایک ہی بار منعقد ہوا تھا۔نیشنل فلم ایوارڈ بھی تین بار سے زائد تقسیم نہ کیا جاسکا۔اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو کام حکومت اپنے تمام تر وسائل کے باوجود انجام نہیں دے سکی وہ نگار ویکلی کے ایڈیٹر الیاس رشیدی نے سالہا سال سرانجام دیا۔

فلمی صحافت میں بھی کراچی کا حصہ قابل ذکر ہے۔لاہور پاکستان کی فلمی صنعت کا مرکز رہا ہے مگر یہاں سے کوئی بہت معیاری اور قابل ذکر اردو یا انگریزی فلمی میگزین نہیں نکالا جاسکا۔ وقتاً فوقتاً اردو اور انگریزی کے چند ہفت روزہ اور ماہانہ میگزین نکلتے رہے مگر 'نگار' جیسی باقاعدگی اور کارکردگی کسی کے حصّے میں نہ آسکی۔ کراچی ہی سے اردو کا ایک اور ہفت روزہ ''کردار'' بھی شائع ہوا کرتا تھا جس کے مالک و مدیر خواجہ بقاﷲ تھے۔اب مرحوم ہوچکے ہیں۔ایسٹرن اسٹوڈیوز کے تعاون سے ایک انگریزی ماہنامہ ''ایسٹرن فلم'' بھی کافی عرصے تک شائع ہوتا رہا۔کسی زمانے میں یہ ایک قابل ذکر فلمی پرچہ تھا مگر پاکستانی روایات کے مطابق بالآخر بند ہو گیا۔اس کے باوجود کراچی سے فلم' ٹی وی اور فیشن کے حوالے سے کئی میگزین نکالے گئے جن میں سے کچھ آج بھی باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔اس شعبے میں بھی کراچی کی کارکردگی قابل ذکر اور لاہور کے مقابلے میں بہتر ہے۔ان تمام قابل ذکر خوبیوں کے باوجود کراچی میں فلمی صنعت مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔کراچی میں چند سال تو فلمی گہما گہمی رہی اور لاہور کے فلم سازوں نے بھی کراچی کا رخ کرلیا تھا مگر مقامی طور پر کوئی مضبوط بنیاد مہیّا نہ ہونے کے باعث کراچی میں مقامی صنعت قائم ہو سکی۔آج بھی یہی عالم ہے کہ کراچی میں کامیابی اور شہرت حاصل کرنے والا ہر شخص لاہور کا رخ کرتا ہے اور پھر یہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ایسٹرن فلم اسٹوڈیوز کے مالک اور منتظم سعید ہارون اس بارے میں بہت شاکی رہا کرتے تھے۔ان کی خواہش تھی کہ کراچی بھی فلم صنعت کا مرکز بن جائے اور کراچی کے فنکار اور ہنر مند لاہور کا رخ کرنے کے بجائے کراچی ہی میں مصروف رہیں بلکہ لاہور کے فنکار بھی کراچی آنے پر مجبور ہو جائیں۔ کراچی سے آغاز کرنے اور پھر لاہور چلے جانے والوں کو وہ ''نمک حرام'' کہا کرتے تھے اور اس سلسلے میں کافی دلیلیں بھی دیا کرتے تھے لیکن سچ تو یہ ہے کہ شدید خواہش کے باوجود خود سعید ہارون بھی کراچی میں ایک مستحکم فلمی صنعت قائم کرنے کے سلسلے میں عملی اقدامات نہ کرسکے۔ محض خواہش سے کیا ہوتا ہے جبکہ اس کے ساتھ کوشش بھی نہ کی جائے۔

لاہور پاکستان کی فلمی صنعت کا مرکز رہا ہے مگر یہاں سے کوئی بہت معیاری اور قابل ذکر اردو یا انگریزی فلمی میگزین نہیں نکالا جاسکا۔ وقتاً فوقتاً اردو اور انگریزی کے چند ہفت روزہ اور ماہانہ میگزین نکلتے رہے مگر نگار جیسی باقاعدگی اور

کارکردگی کسی کے حصّے میں نہ آسکی۔ کراچی ہی سے اردو کا ایک اور ہفت روزہ ''کردار'' بھی شائع ہوا کرتا تھا جس کے مالک و مدیر خواجہ بقا اللہ تھے۔اب مرحوم ہوچکے ہیں۔ایسٹرن اسٹوڈیوز کے تعاون سے ایک انگریزی ماہنامہ ''ایسٹرن فلم'' بھی کافی عرصے تک شائع ہوتا رہا۔ کسی زمانے میں یہ ایک قابل ذکر فلمی پرچہ تھا مگر پاکستانی روایات کے مطابق بالآخر بند ہوگیا۔اس کے باوجود کراچی سے فلم، ٹی وی اور فیشن کے حوالے سے کئی میگزین نکالے گئے جن میں سے کچھ آج بھی باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔اس شعبے میں بھی کراچی کی کارکردگی قابل ذکر اور لاہور کے مقابلے میں بہتر ہے۔ان تمام قابل ذکر خوبیوں کے باوجود کراچی میں فلمی صنعت مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

کراچی میں چند سال تو فلمی گہما گہمی رہی اور لاہور کے فلم سازوں نے بھی کراچی کا رُخ کر لیا تھا مگر مقامی طور پر کوئی مضبوط بنیاد مہیّا نہ ہونے کے باعث کراچی میں صحیح معنوں میں نہ تو کوئی بہت اچھا فلم اسٹوڈیو بن سکا اور نہ ہی مقامی صنعت قائم ہو سکی۔

ایسٹرن فلم اسٹوڈیوز کے مالک اور منتظم سعید ہارون اس بارے میں بہت شاکی رہا کرتے تھے۔ان کی خواہش تھی کہ کراچی بھی فلم صنعت کا مرکز بن جائے اور کراچی کے فنکار اور ہنر مند لاہور کا رُخ کرنے کے بجائے کراچی ہی میں مصروف رہیں بلکہ لاہور کے فنکار بھی کراچی آنے پر مجبور ہو جائیں۔ کراچی سے آغاز کرنے اور پھر لاہور چلے جانے والوں کو وہ ''نمک حرام'' کہا کرتے تھے اور اس سلسلے میں کافی دلیلیں بھی دیا کرتے تھے لیکن سچ تو یہ ہے کہ شدید خواہش کے باوجود خود سعید ہارون بھی کراچی میں ایک مستحکم فلمی صنعت قائم کرنے کے سلسلے میں عملی اقدامات نہ کر سکے۔ محض خواہش سے کیا ہوتا ہے جبکہ اس کے ساتھ کوشش بھی نہ کی جائے۔

لاہور کے فلمی نگار خانوں کے مالک خالص پیشہ ورانہ انداز میں کام کرتے تھے۔ فلم سازوں کو بہت سی سہولتیں اور مراعات فراہم کرتے تھے جو کہ کراچی میں میّسر نہ تھیں۔ ہم نے خود کئی بار سعید ہارون صاحب سے کہا تھا کہ وہ بھی فلم سازوں کو متوّجہ کرنے کے لیے پُرکشش مراعات اور سہولتیں پیش کریں۔ جس طرح لاہور کے نگار خانے کاروباری مسابقت کے سلسلے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر مراعات پیش کرتے ہیں۔اسی طرح ایسٹرن اسٹوڈیوز بھی

سہولتیں فراہم کریں لیکن ایسا نہ ہوا۔

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سعید ہارون صاحب ایک بہت بڑے کاروباری خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنے خاندان والوں پر اثر رسوخ نہیں رکھتے تھے۔ وہ یوسف ہارون اور محمود ہارون کے چھوٹے بھائی تھے۔ سب سے چھوٹے تھے اس لیے ان کی آواز کوئی نہیں سنتا تھا۔ انکی والدہ لیڈی عبداللہ ہارون تحریک پاکستان کی سرگرم اور معزز خاتون تھیں۔ ایک فلاح کار کی حیثیت میں بھی انہوں نے کراچی اور سندھ میں خدمات انجام دی تھیں۔

ایک المیہ یہ بھی تھا کہ ان کے بھائیوں کو حواریوں نے یقین دلایا تھا کہ سعید ہارون میں کاروباری صلاحیتیں نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔

سعید ہارون ایک شریف النفس، مخلص اور دردمند انسان تھے۔ ان میں بناوٹ نام کو نہ تھی۔ غریبوں کی تکلیف دیکھ کر تڑپ جاتے تھے اور مقدور سے بڑھ کر مدد کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص کاروباری صلاحیتوں سے عاری ہی سمجھا جائے گا۔ کاروبار کرنے کے لیے نرم دلی، ہمدردی اور انسان دوستی گھاٹے کا سودا سمجھے جاتے ہیں لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ جب سعید ہارون صاحب کا اچانک عارضہ قلب کی بنا پر انتقال ہوا تو لاکھوں افراد روتے پیٹتے ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔

یوسف ہارون اور محمود ہارون جو کاروباری کامیابی اور سیاست میں اہم مقام رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں سعید ہارون کی پاسنگ بھی نہ تھے۔ یہ احساس انہیں خود بھی سعید کی موت کے بعد ہوا جب لاکھوں سوگوار افراد دھاڑیں مارتے ہوئے ان کے جنازے میں شرکت کے لیے پہنچ گئے۔ اگر سعید ہارون کو اختیارات اور وسائل بھی حاصل ہو جاتے تو وہ کس قدر مقبولیت حاصل کر سکتے تھے، یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

ایسٹرن اسٹوڈیوز کی جانب سے فلم سازوں کو سہولتیں فراہم نہ کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ "ہارون گروپ" ایک دیو قامت ادارہ ہے جس کا انحصار دوسری صنعتوں اور کاروبار پر ہے۔ فلم کو ان کے نزدیک اہمیت حاصل نہیں تھی۔ درحقیقت فلم اسٹوڈیو بھی انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی سعید ہارون کے شوق کی خاطر ایک "کھلونے" کے طور پر بنا دیا تھا تاکہ وہ مصروف رہیں۔ اس کے فائدے اور نقصان سے انہیں زیادہ دلچسپی نہیں تھی جبکہ لاہور کے فلم اسٹوڈیوز

کے مالک سرتاپا اسی کاروبار سے منسلک تھے۔ ان کی روزی' ترقی اور کامیابی کا انحصار بھی فلم ہی پر تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں وہ اپنے کاروبار کو فروغ دینے کی کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔ اگر کراچی میں ایسٹرن اسٹوڈیوز یا کوئی اور ادارہ فلم سازوں کو ایسی ہی مراعات اور کاروباری تحفّظ فراہم کرتا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہاں بھی مضبوط بنیادوں پر فلمی صنعت قائم نہ ہوتی۔

ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ کراچی میں جو لوگ سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے فلمی صنعت میں آئے وہ اس کاروبار سے واقف نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے کارندوں کے طور پر انہوں نے غلط افراد کا انتخاب کیا جس کی وجہ سے ان کا کثیر سرمایہ نقصان کی نذر ہو گیا اور وہ تائب ہو گئے۔

فلم ایک ایسا کاروبار ہے جو ہمہ وقت توّجہ اور مصروفیت چاہتا ہے۔ دنیا بھر میں فلمی صنعت کی کامیابی میں ایسے ہی افراد اور اداروں کا عمل دخل رہا ہے جو محض فلم پر انحصار کرتے ہیں۔ یہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ فلم میکنگ بسکٹ 'جوتے' کپڑے یا ٹافی بنانے کی طرح کا بزنس نہیں ہے۔ اس میں تخلیق' فن اور صلاحیتوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک کاروباری شخص جو دوسرے کاروبار میں تو کامیاب ہوتا ہے' فلم کے کاروبار میں اکثر نقصان اٹھاتا ہے کیونکہ وہ اس کے اسرار و رموز سے واقف نہیں ہوتا۔ فلم سازی پارٹ ٹائم کاروبار نہ کبھی رہا ہے اور نہ بن سکتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ کراچی کے سرمایہ کاروں اور کاروباری افراد میں ان مطلوبہ ضرورتوں پر پورا اترنے والا ایک فرد بھی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لاکھوں کروڑوں کا سرمایہ لگانے کے باوجود انہیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور یہی کراچی میں فلمی صنعت کی ناکامی کا بنیادی سبب ہے۔

صحافی ہونے کی وجہ سے ہمیں کراچی کی فلمی صنعت کے بارے میں بھی معلومات حاصل تھیں۔ کچھ عرصے بعد جب نگار ویکلی کے ایڈیٹر الیاس رشیدی صاحب سے ملاقات اور دوستی ہوئی تو ہم نے ان کے پرچے میں ایک ہفتہ وار کالم بھی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ لاہور کی فلمی سرگرمیوں کے بارے میں تھا جسے ہم ''علی بابا'' کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ اس کالم میں بہت سی ''اندرونِ خانہ'' باتیں بھی ہوتی تھیں جس کی وجہ سے یہ بہت مقبول ہو گیا۔ ہماری ملاقات اور رسائی فلمی صنعت کے ہر شخص تک تھی اس لیے بہت سے رازہائے درون پردہ سے واقف تھے۔ اس طرح کراچی

سے ہمارا پہلا باضابطہ، رابطہ اور واسطہ قائم ہوا۔ علی بابا کا فلمی نام ہم نے اسی مصلحت سے اختیار کیا تھا کہ جاننے والے ہم سے شکوہ شکایت نہ کریں۔ پھر بھی قریبی لوگوں کو اصلیت کا علم ہو گیا تھا اور وہ ہم سے شکایت کرتے رہتے تھے جیسا کہ سنتوش کمار اور صبیحہ خانم کی شادی اور پہلے بچّے کی پیدائش کا واقعہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس کی خبر سب سے پہلے ہم نے ہی دی تھی۔

کراچی میں لاہور کے فلم سازوں کے فلم یونٹ عموماً جایا کرتے تھے جن کی وجہ سے وہاں کافی رونق اور گہما گہمی پیدا ہو جاتی تھی۔ مشرقی پاکستان کے سیلاب زدگان کی امداد کے لیے فلم اسٹار کرکٹ میچ بھی منعقد ہوا کرتے تھے۔ پاکستان کے سبھی نامور فنکاران میچوں میں شریک ہوتے تھے۔ ایک بار تو لاہور سے ریلوے کے خصوصی ڈبّوں میں یہ قافلہ کراچی گیا تھا۔ فلم اسٹارز کو دیکھنے والوں کا جمگھٹا لگ جاتا تھا۔ نگار فلم ایوارڈز کی تقاریب کے سلسلے میں بھی خوب رونق رہا کرتی تھی۔ بڑے بڑے لوگ ان تقاریب میں مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کرتے تھے۔ ایک بار ذوالفقار علی بھٹّو بھی چیف گیسٹ تھے۔ وہ ان دنوں پاکستان کے وزیر صنعت تھے۔ انہیں لینے کے لیے ہم بھی 70 کلفٹن گئے تھے۔ دوسرے وزراء بھی لاہور اور کراچی کی ان تقاریب میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ کراچی والوں کے لیے فلم اسٹارز کا وہاں اکٹّھا ہو جانا ایک میلے کی حیثیت رکھتا تھا۔ مختلف معززین اور ممتاز صنعت کاروں کی طرف سے جگہ جگہ دعوتیں دی جاتی تھیں جن میں معززین شہر کے علاوہ سفارت کار بھی اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ کراچی کا پاکستان کی فلمی صنعت میں بہت نمایاں کردار تھا۔

ہم کراچی پہلی بار 1956ء میں گئے تھے۔ ہوائی سفر کے لیے ایک نیا ہوائی جہاز وائکاؤنٹ متعارف کرایا گیا تھا اور اس سلسلے میں کچھ صحافیوں کو بھی آمدورفت کا ٹکٹ دیا گیا تھا۔ ہم اسی سلسلے میں کراچی گئے تھے۔ کراچی کے بارے میں صحیح حقائق کا علم نہ تھا۔ وہاں کی سڑکیں، بازار، شاندار ہوٹل، غیر ملکی سیّاحوں کے غول، اونچی اونچی عمارتیں دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ محمّدی ہاؤس کراچی کی بلند ترین عمارت تھی۔ یہ غالباً نو یا دس منزلہ عمارت ہے۔ لاہور والوں کے لیے یہ بھی بہت تھی۔ کراچی ایک صاف ستھرا، روشن اور منظّم شہر تھا۔ لاہور والوں کے لیے تو وہاں کی ہر چیز انوکھی تھی۔

ہوش سنبھالنے کے بعد ہم نے ساحل سمندر پہلی بار کراچی ہی میں دیکھا تھا اور سمندر کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ کلفٹن پر خوب چہل پہل تھی۔ مہذّب مجمع تھا۔ عورتیں اور مرد سبھی بے تکلّف گھوم رہے تھے۔ غیر ملکی خواتین بھی تھیں۔ ساحل پر ہم نے بھی پتلون کے پائنچے اوپر چڑھائے اور بہت ہمت کر کے پانی کی طرف چلے۔ سمندر سے ہمیں بہت ڈر لگتا ہے لیکن سمندر کا نظارہ بہت اچھا بھی لگتا ہے بشر طیکہ دن کا وقت ہو' سمندر پُر سکون ہو اور آس پاس خوب رونق بھی ہو۔ جب پانی کی جھاگ اڑاتی ہوئی لہریں ہمارے پیروں سے ٹکرائیں اور واپسی پر جب پیروں تلے ریت کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی تو بے حد لطف آیا اور عجیب قسم کی طمانیت اور سکون کا احساس ہوا۔ پانی ابھی ہمارے ٹخنوں تک بھی نہیں پہنچا تھا۔ اگلی بار ہم نے دو چار قدم آگے بڑھائے۔ اس بار پانی کی لہریں ہمارے ٹخنوں تک پہنچ گئیں تو ہمارے ڈر کا آغاز ہوا۔ ہمارے آس پاس عورتیں' مرد اور بچّے پانی میں ہم سے بھی بہت آگے تک چلے گئے تھے اور ہمارے دوست ہمیں شرم دلا رہے تھے کہ بھائی' تم تو عورتوں سے بھی گئے گزرے ہو۔

کلفٹن کے ساحل پر ہر جانب خوشیاں اور چہل پہل تھی۔ زندگی مطمئن اور رنگین محسوس ہو رہی تھی۔ یہ سب چیزیں لاہور میں میّسر نہیں تھیں اس لیے ہم کراچی اور کراچی کی ہر چیز کو حیران ہو کر دیکھتے رہے۔

اگلے دن لانچ پر سوار ہو کر منوڑہ پہنچ گئے۔ غالباً ڈیڑھ آنے یا دو آنے کا ٹکٹ تھا ایک طرف کا۔ سمندر ہم نے کلفٹن پر بھی دیکھا تھا مگر جب منوڑہ کا کھلا سمندر دیکھا تو دہشت زدہ رہ گئے۔ اونچی اونچی شور مچاتی ہوئی لہریں' دور بحری جہازوں اور کشتیوں کی آمد و رفت' ساحل پر سیر کرنے والوں کا ہجوم' عجیب نظارہ تھا۔

کراچی ہمیں لاہور کے مقابلے میں سستا اور غریب پرور شہر لگا۔ بڑے ہوٹلوں کی بات اور ہے لیکن درمیانہ درجے کے ہوٹل کافی سستے تھے۔ کھانے پینے کی چیزیں بھی مقابلتاً سستی تھیں۔ جوتے اور کپڑے بھی ارزاں لگے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر چیز کی بہت زیادہ ورائٹی تھی۔ گرمیوں میں ہم چپل استعمال کرنے کے عادی ہیں۔

کراچی کی زیب النساء اسٹریٹ کی زیبائش نے ہمیں مسحور کر دیا تھا۔ دکانیں روشن اور شاندار۔ فٹ پاتھ صاف ستھرے' خریدار معقول اور طرح دار۔ یہیں ایک دکان میں ہم نے چپّلیں دیکھیں۔ مختلف ڈیزائن کی چپلیں نظر آئیں۔ خوب صورت' نازک اور نفیس' قیمت لاہور سے بھی کم۔ ہم نے فوراً چار جوڑی چپلیں خرید لیں۔ جوتوں پر

نظر ڈالی تو وہ بھی ایک سے بڑھ کر ایک۔ قیمت بھی لاہور کے مقابلے میں کم تھی۔اس کے بعد ہمارا یہ معمول رہا کہ جب بھی کراچی جاتے تھے' ڈھیر ساری چپّلیں اور جوتے ضرور خرید کر لاتے تھے۔ یہاں تک کہ کئی سال کے بعد لاہور میں بھی یہ چیزیں دستیاب ہونے لگیں اور کراچی میں قیمتیں بڑھ گئیں۔

کراچی میں ہم نے پہلی بار نگار ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ ہمارے دوستوں نے لاہور میں یہ مشورہ دیا تھا کہ یہاں اے پی پی کا دفتر ہے اور دوسرے صحافی بھی مل جاتے ہیں۔ یہ شہر کا مرکزی علاقہ ہے۔ ہر جگہ آسانی سے جا سکتے ہیں۔ نگار ہوٹل پاکستان چوک کے گردونواح میں ہے۔ یہ صاف ستھرا ہوٹل تھا مگر جب رات ہوئی تو قیامت نازل ہو گئی۔ کھٹملوں نے کاٹ کاٹ کر بُرا حال کر دیا۔ روشنی جلا کر دیکھا تو کھٹملوں کا ایک لشکر حملہ آور ہو چکا تھا۔ ہم تو مکھی مچھر تک نہیں مار سکتے' اس چھوٹے سے کیڑے کو کیا مارتے مگر اپنی جان کا سوال تھا اس لیے جوتا سنبھال کر بیٹھ گئے۔ چادر فرش پر جھاڑی اور آنکھیں بند کر کے ان کا قتل عام شروع کر دیا۔

دوبارہ سوئے تو چند منٹ بعد پھر جسم میں سوزش اور ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ روشنی جلا کر دیکھا تو پھر کھٹملوں کا ایک دستہ موجود تھا۔ یہ سلسلہ ساری رات جاری رہا۔ خدا جانے یہ سینکڑوں ہزاروں کھٹمل کہاں سے آ گئے تھے۔ ہم نے یہ تجربہ بھی کر کے دیکھا کہ روشنی میں کھٹمل فرار ہو جاتے ہیں اور اندھیرا ہوتے ہی پھر شب خون مارتے ہیں۔ آخر ہم روشنی جلا کر ہی سو گئے۔ کچھ دیر بعد محسوس ہوا کہ کھٹمل پھر آ گئے ہیں۔

خدا جانے انہیں کس طرح علم ہو گیا تھا کہ ہم سو گئے ہیں۔ جیسے ہی ہم نیند کی گود میں گئے انہوں نے پھر ہلّہ بول دیا۔ یہ آنکھ مچولی دن نکلنے تک ہوتی رہی۔ صبح ہمارے بیڈ کے آس پاس خون ہی خون تھا۔

ہم نے منیجر سے شکایت کی تو وہ حیران رہ گئے ''کمال ہے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

ہم نے کہا'' بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ آپ ابھی ہمارے کمرے میں چل کر دیکھ لیجئے۔''

وہ بے اعتباری سے سوچتے رہے۔ پھر ہمارے ساتھ چل پڑے۔ ہمارے کمرے کا فرش سرخ ہو رہا تھا۔ ہمارا جسم بھی کچھ کم فگار نہیں تھا۔ انہوں نے ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا مگر وہ اس بات پر بہت حیران تھے کہ ایسا واقعہ پہلے تو کبھی پیش نہیں آیا۔ ہم ان سے کھٹملوں کی شکایت کرنے والے پہلے مہمان تھے۔ (بقول ان کے) ہم نے کہا'' اب کیا

کریں۔ سامان اُٹھا کر کسی اور ہوٹل میں چلے جائیں؟''

''ارے نہیں جناب' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم آپ کو خفا ہو کر نہیں جانے دیں گے۔ آپ کو دوسرا کمرا دے دیتے ہیں۔ اس میں خوب اچھی طرح صفائی ستھرائی۔۔۔ کرا دیں گے۔''

دوسرا کمرا بھی ہمارے لیے رات کے وقت معرکہ گاہ ہی ثابت ہوا۔

ہم نے ابراہیم جلیس اور دوسرے دوستوں کو ماجرا سنایا تو وہ بہت ہنسے اور بولے '' بھائی' یہ تو کراچی کی سوغات ہے۔ دوسری چیزوں کی طرح اسے بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مگر ہمیں تو کراچی میں ایسی کوئی شکایت نہیں ہے۔''

شاید کراچی والے عادی ہو چکے تھے یا پھر کھٹمل باہر سے آنے والوں پر ہی مہربانی کرتے ہیں۔

دوسرا کمرا سڑک کے سامنے ہی تیسری منزل پر تھا۔ صبح کراچی کے ایک دوست تشریف لے آئے۔ ہم غسل خانے سے نکلے تو وہ بہت جوش میں تھے۔

''یار حد ہو گئی۔ بڑے چھپے رستم نکلے۔''

''کیا بات ہے؟'' ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اب انجان نہ بنو۔ اب پتا چلا کہ تم نے یہ ہوٹل کیوں نہیں چھوڑا۔''

''بھلا کیوں نہیں چھوڑا؟'' ہم نے ان سے پوچھا۔

''آنکھ مٹکا جو چل رہا ہے'' انہوں نے بڑے وثوق سے کہا ''یار' ویسے ہو بڑے خوش قسمت۔ اتنی خوب صورت لڑکی اور بالکل سامنے والی کھڑکی میں۔''

''کہاں ہے؟'' ہم نے ان سے پوچھا اور اپنی بالکونی میں چلے گئے۔ کراچی کی پرانی عمارتوں میں کھڑکیوں کے سامنے بالکونیاں بھی ہوتی ہیں جو بیٹھنے' سامان رکھنے یا کپڑے سکھانے کے کام آتی ہیں۔ ہماری کھڑکی کے سامنے والی عمارت کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی مگر وہاں کوئی نظر نہ آیا۔

''کون سی کھڑکی ہے؟'' ہم نے اپنے دوست سے پوچھا۔

''اب اتنا بھی نہ بنو' یہ سامنے والی'' انہوں نے کہا''صبر کرو' ابھی آجائے گی۔''
ہم نے کافی دیر صبر کیا یہاں تک کہ کھڑکی میں ایک خوب صورت چہرہ نمودار ہو گیا۔

ہماری طرف دیکھ کر وہ مسکرائی۔ رسّی پر ایک کپڑا پھیلا دیا اور غائب ہو گئی۔ ہم نے انہیں یقین دلانے کی بہتیری کوشش کی کہ ہم نے سامنے والی کھڑکی زندگی میں پہلی بار ہی دیکھی ہے مگر انہیں یقین نہیں آیا۔
وہ کہنے لگے ''یار' میں اتفاق سے شادی شدہ ہوں ورنہ ضرور اس ہوٹل میں یہ کمرہ لے لیتا۔''
اسی دورے میں ہم نے پہلی بار ایسٹرن فلم اسٹوڈیو دیکھا۔ اس زمانے میں وہاں بڑی رونق تھی۔ جگدیش چند آنند کی فلم ''مس 56ء'' کی شوٹنگ جاری تھی جس میں میناشوری پہلی بار کسی پاکستانی فلم میں کام کرنے کے لیے آئی تھیں۔ سنتوش صاحب اس فلم کے ہیرو تھے۔ سیٹ پر ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ جہانگیر خان بھی ملے۔ جہانگیر خان لاہور کے صحافی تھے۔ انگریزی روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں کام کرتے تھے۔ خوبرو جوان تھے۔ ہماری ان سے لاہور ہی سے یاداللہ تھی۔ وہ شوکت حسین رضوی کی پنجابی فلم ''چن وے'' میں بھی کام کر چکے تھے اور اداکاری میں ناکام ہو چکے تھے۔ ان دنوں محکمہ اطلاعات میں افسر تھے اور خام فلم کے لائسنس جاری کرنا ان ہی کے اختیار میں تھا۔ میناشوری کے ساتھ ان کے رومان کے چرچے بھی ہم نے سنے۔ جب مینا نے اپنے شوہر روپ کے شوری کو چھوڑ کر پاکستان میں رہنے کی خواہش کا اظہار کیا تو یار لوگوں نے کہا' مینا نے جہانگیر خاں کی خاطر پاکستان میں بسیرا کیا ہے اور بہت جلد دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مینا کی ذاتی زندگی ہمیشہ بے سکون ہی رہی۔ ازدواجی زندگی اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی۔ جیون ساتھی انہیں کبھی نہ مل سکا یہاں تک کہ زندگی کے آخری دن بھی انہوں نے تنہا' کسمپرسی کے عالم میں ہی گزارے۔

اقبال شہزاد سے ہماری ملاقات لاہور میں بھی ہو چکی تھی۔ کراچی میں بھی ملے اور پھر یہ ملاقاتیں ایک مخلصانہ دوستی میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ کراچی میں تھے تو ہم نے کئی بار ان کے پاس ہی قیام کیا۔ پھر وہ لاہور منتقل ہو گئے۔ ایسٹرن اسٹوڈیو انہوں نے چھوڑ دیا تھا اور فلم سازی کا دھندا کرنے لگے تھے۔ وہ کامیاب فلم ساز اور ہدایتکار تھے۔ لاہور میں

انہوں نے ملتان روڈ پر ''سینے ٹیل'' کے نام سے ایک فلم اسٹوڈیو بھی تعمیر کیا۔اب غالباًوہاں کسی کمپنی کا اسٹور ہے۔ اقبال شہزاد پہلے' کاروبار کے سلسلے میں پاکستان سے باہر آتے جاتے رہتے تھے۔کچھ عرصے بعد باہر ہی زیادہ وقت گزارنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ انتقال سے کئی سال پہلے امریکہ میں سکونت اختیار کرلی تھی اور وہیں آخری دن گزارے۔

اقبال شہزاد ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خوب صورت کھرے انسان تھے۔ باتیں بہت دلچسپ کرتے تھے۔ان کا فلک شگاف قہقہہ مشہور تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتے تھے۔بہت زندہ دل آدمی تھے۔ وہ انگلینڈ سے ساؤنڈ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرکے آئے تھے اور ایسٹرن اسٹوڈیوز میں ساؤنڈ انچارج تھے۔ بہت مجلسی آدمی تھے۔ کراچی کا کوئی قابل ذکر شخص یا گھرانا ایسا نہ تھا جس سے اقبال شہزاد کے مراسم نہ ہوں۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک' ہر ایک سے ان کی یاد اللہ اور بے تکلّفی تھی۔ رہنے والے تو وہ لاہور کے تھے 'مزنگ میں ان کا آبائی گھر تھا' سات بھائی تھے اور اللہ کے فضل سے سبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مختلف شعبوں میں کامیاب و کامران' لیکن انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کراچی کے ایسٹرن اسٹوڈیوز سے کیا تھا۔

معروف کرکٹر وقار حسن ان کے چھوٹے بھائی ہیں جن کا فلمی دنیا سے کبھی براہِ راست تعلق نہیں رہا البتہ وقار نے کراچی کی معروف اداکارہ جمیلہ رزاق سے شادی کی اور خوش و خرّم زندگی گزار رہے ہیں۔

اقبال شہزاد بھی ایسٹرن فلم اسٹوڈیوز میں ہی کام کررہے تھے کہ انہوں نے فلم ساز بننے کا فیصلہ کیا۔ایس ایم یوسف صاحب بمبئی سے پاکستان آچکے تھے اور کراچی میں مقیم تھے۔ان کے صاحب زادے اقبال یوسف ان کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتے رہے تھے۔اقبال شہزاد سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کے خیالات سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی پہلی فلم کی ہدایت کاری کے فرائض اقبال یوسف کو سونپ دیئے۔اقبال شہزاد کی پہلی فلم کا نام ''رات کے راہی'' تھا۔اس فلم میں بمبئی کی چلبلی ہیروئن ریحانہ نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ شمیم آرا اس فلم میں ایک ڈانسر کے طور پر پیش کی گئی تھیں۔ان کی پہلی فلم ''کنواری بیوہ'' کئی سال پہلے فلاپ ہوچکی تھی اور خیال کیا جاتا تھا کہ فلمی دنیا میں ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔اس کے باوجود شمیم آرا نے ہمت نہ ہاری اور '' رات کے راہی'' میں انہوں نے بہت محنت اور

لگن سے کام کیا۔ الیاس رشیدی صاحب نے انہیں آگے بڑھانے میں نمایاں حصّہ لیا اور جب انور کمال پاشا نے اپنی فلم ""انار کلی"" کا آغاز کیا تو الیاس صاحب کی سفارش اور اصرار پر شمیم آرا کی نانی اماں نے یہ عقلمندی کی کہ لاہور کی فلموں میں موقع ملتے ہی کراچی سے ترک سکونت کر کے لاہور آ گئیں اور لاہور ہی کو اپنا ٹھکانا بنالیا۔ کراچی میں شمیم آرا کی جائیدادا اور رشتے دار موجود تھے اور وہ باقاعدگی سے کراچی جا کر اپنی کوٹھی میں قیام کرتی تھیں مگر اس کے بعد وہ لاہور ہی کی ہو کر رہ گئیں۔

""رات کے راہی"" کی ہیروئن ریحانہ تھیں۔ اس سے پہلے وہ لاہور میں بنائی جانے والی فلم "" وحشی"" میں کام کر چکی تھیں جس کے ہدایت کار منوّر ایچ قاسم تھے۔ ""وحشی"" پاکستان میں ریحانہ کی پہلی فلم بھی جو ہر لحاظ سے ایک فلاپ فلم تھی۔ ریحانہ نے جب بمبئی کی فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو کر پاکستان آنے کا ارادہ کیا تھا تو سب سے پہلے اپنی والدہ اور والد کے ساتھ لاہور آئی تھیں۔ ان سے اپنی ملاقات کا احوال ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ شباب صاحب کی فلم ""ٹھنڈی سڑک"" کے لیے بھی ریحانہ کو کاسٹ کرنے کا قصد کیا گیا تھا مگر ان کے معاوضے کی رقم سن کر شباب کیرانوی پسپا ہو گئے تھے۔

ریحانہ بمبئی میں ایک کامیاب ہیروئن تھیں۔ انہوں نے وہاں ممتاز اداکاروں کے ساتھ کام کیا اور شہرت حاصل کی۔ وہ شوخ اور چلبلے کرداروں کے لیے مخصوص سمجھی جاتی تھیں لیکن بد قسمتی سے شہرت اور دولت کے باوجود وہ گھریلو زندگی اور سکون قلب سے ہمیشہ محروم ہی رہیں۔ پاکستان آنے کے بعد بھی ان کے ستاروں کی یہ گردش جاری رہی۔ انہوں نے یہاں اپنی فلمی زندگی کا آغاز ہی ایک ناکام فلم سے کیا تھا۔ اگر انہیں کسی اچھے ہدایت کار کی فلم میں کام کرنے کا موقع مل جاتا تو حالات یکسر مختلف ہوتے مگر قسمت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ پاکستان میں بھی انہیں سکون قلب اور گھریلو زندگی حاصل نہ ہو سکی حالانکہ وہ طبعاً ایک سادہ گھریلو قسم کی خاتون تھیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ فلموں میں اپنے شوخ و چنچل کرداروں کے حوالے سے شہرت رکھتی تھیں مگر عام زندگی میں بے حد سنجیدہ' متین اور لیے دیئے رہنے کی قائل تھیں۔ خوش اطواری اور شائستگی ان پر ختم تھی۔ شاید اس لیے کہ لکھنؤ سے ان کا تعلق تھا جو تہذیب و شائستگی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔

لاہور میں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو ریحانہ نے کراچی کا رُخ کیا۔ یہیں ان کی ملاقات اقبال شہزاد سے ہوئی۔ وہ ایک خوب رو سجیلے اور کامیاب جوان تھے جن کا مستقبل بہت روشن نظر آتا تھا۔ اقبال شہزاد کو ریحانہ کی سادگی سنجیدگی اور گھریلو پن بہت بھایا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے نزدیک ہوگئے۔ یہاں تک کہ شادی کی نوبت آگئی۔ اقبال شہزاد کے خاندان والے اس شادی کے حق میں نہیں تھے۔ انہیں یہ پسند نہ تھا کہ ایک فلمی اداکارہ خاندان میں بہو بن کر آئے مگر محبت نے اقبال شہزاد کو اندھا کر دیا تھا۔ گھر والوں کی مخالفت کے باوجود انہوں نے ریحانہ سے شادی کرلی۔ وہ ریحانہ کو اپنا بنا کر لاہور لائے تو خاندان والوں نے بھی پذیرائی کی۔ کچھ عرصے تو جوش و خروش قائم رہا مگر اس کے بعد دونوں کو احساس ہوا کہ ان کے مزاجوں میں بہت فرق ہے۔ اقبال شہزاد ایک بے تکلّف ہنس مکھ اور شور شرابا پسند کرنے والے آدمی تھے جبکہ ریحانہ سنجیدہ اور خاموشی پسند تھیں۔ شادی تو دونوں نے بڑے چاؤ سے کی تھی مگر بد قسمتی سے جلد ہی دونوں کو احساس ہونے لگا کہ یہ فیصلہ درست نہیں تھا۔ محبت کا اُبال اترا تو اقبال شہزاد کو اپنے اس عاجلانہ فیصلے پر پچھتاوا ہونے لگا۔ ایک معروف اداکارہ بیوی کا ماضی بھی انہیں رہ رہ کرستانے لگا حالانکہ ریحانہ نے نہایت خلوص اور دیانت داری سے کام لیتے ہوئے انہیں اپنے ماضی کی کتاب کے ایک ایک ورق اور ایک ایک سطر سے آگاہ کر دیا تھا۔ ان دونوں کے مزاجوں اور اندازِ فکر میں بھی فرق تھا۔ شہزاد کے ہنگامہ خیز مزاج کے برعکس ریحانہ کو سکون اور خاموشی سے پیار تھا۔ شاید زندگی بھر کے ہنگاموں کے بعد وہ سکون اور خاموشی کی متلاشی تھیں۔ گھر کے اندر بھی وہ لیے دیے رہتی تھیں اور اقبال شہزاد کو بھی منظّم اور ایک باضابطہ زندگی گزارنے کی ضرورت کا احساس دلاتی رہتی تھی۔ دوستوں نے جب ان کی سرد مہری دیکھی تو خود بھی احتیاط برتنی شروع کر دی تھی۔ ایک طرف شہزاد کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ انہوں نے ایک اداکارہ سے شادی کرکے غلطی کی ہے تو دوسری طرف ان کی اداکاری ترک کرنے کے مطالبے پہ ریحانہ کو بھی یہ خیال ستانے لگا کہ شاید فلم کی چمک دمک والی زندگی سے کنارہ کش ہو کر ان سے غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ شہزاد کی خواہش تھی کہ وہ فلمی دنیا سے قطعی کنارہ کش ہو کر گھریلو بیوی بن کر گھر سنبھالیں جبکہ ریحانہ کا اصرار تھا کہ گنی چنی فلموں میں انہیں کام کرنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ یہ بھی درست ہے کہ فلم رات

کے راہی شروع کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ریحانہ کا شوق اداکاری بھی پورا ہوتا رہے اور اقبال شہزاد کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے کہ وہ کسی اور کی فلم میں کام نہیں کریں گی۔

ان ہی دنوں ہم کراچی گئے اور ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ شہزاد صاحب دوسرے ہی دن صبح سویرے ہوٹل میں آن دھمکے۔ وہ اس بات پر بہت ناراض تھے کہ ان کا گھر چھوڑ کر ہم ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہیں۔ ہم ریحانہ کے طرزِ عمل کے بارے میں مشترک دوستوں سے سُن چکے تھے اس لیے بہانہ بازی شروع کر دی مگر اقبال شہزاد نے اصرار کیا اور یہ بھی کہا کہ ریحانہ بھی چاہتی ہیں کہ ہم ان کے گھر قیام کریں۔ اس سے پہلے ریحانہ سے ہماری کئی بار ملاقات ہو چکی تھی۔ گپ شپ بھی رہی تھی اور ہم دونوں کافی حد تک ایک دوسرے کو سمجھ بھی چکے تھے۔

شہزاد صاحب نے ہمارا سامان اپنی کار میں رکھا اور اپنے بنگلے پر لے گئے۔ وہاں ہمارا قیام دو دن رہا اور اس عرصے میں ہم نے ریحانہ کو بے حد متواضع بااخلاق اور مہربان پایا۔ وہ ہم سے زمانے بھر کی باتیں کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ دبی زبان میں اقبال شہزاد کی شکایت بھی کر ڈالی۔

ہم نے انہیں سمجھایا کہ شہزاد نے کافی وقت کنوارپن میں گزارا ہے۔ رفتہ رفتہ شادی شدہ زندگی کے عادی ہو جائیں گے۔ شہزاد سے اس موضوع پر بات ہوئی تو انہوں نے بات ہنسی مذاق میں ٹال دی مگر ہمیں یہ احساس ہو گیا کہ ان دونوں کے مابین ذہنی رفاقت اور ہم آہنگی کی کمی ہے۔ انسان کی حیثیت سے دونوں بہت اچھے تھے مگر افسوس کہ ساتھ نبھا نہ سکے۔

ریحانہ اور شہزاد کچھ عرصے بعد علیحدہ ہو گئے۔ طلاق کے بعد بھی دونوں میں سے کسی نے اس بارے میں لب کشائی نہیں کی۔ ریحانہ نے ایک بار پھر فلموں کی طرف دھیان دیا مگر ان کے عروج کا دور گزر چکا تھا۔ پاکستان کی فلمی دنیا میں نئے نئے چہرے اور شاداب و شگفتہ اداکارائیں داخل ہو گئی تھیں۔ فلمی صنعت میں ریحانہ کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر کراچی سے لاہور آ گئیں اور سمن آباد کے ایک گھر میں رہائش اختیار کر لی۔ یہاں اکثر ان سے ہماری ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ خاموش اور سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ خود فراموش وہ پہلے بھی تھیں۔ اکثر کھوئی کھوئی سی رہتی تھیں اور مخاطب کرنے پر چونک پڑتی تھیں اب یہ کیفیت کچھ بڑھ گئی تھی بلکہ اس میں مایوسی

محرومی اور ڈپریشن کا اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد سنا کہ انہوں نے کسی پولیس افسر سے شادی کر لی ہے مگر یہ بھی زیادہ عرصے نہ چل سکی اور ایک بار پھر وہ تنہا ہو گئیں اور کراچی میں رہنے لگیں۔ یہاں انہوں نے ایک مکان خرید لیا تھا۔ خاموشی سے زندگی کے دن گزار رہی تھیں۔ ان کی اس تنہائی اور عدم تحفّظ کو دور کرنے کے لیے الیاس رشیدی صاحب سر گرم عمل ہو گئے اور ان کے ایک جاننے والے سے ریحانہ کی شادی ہو گئی۔ یہ صاحب پہلے سے شادی شدہ تھے۔ آغاز میں چھوٹے موٹے کاروباری تھے۔ انہوں نے شادی سے پہلے ریحانہ کے سبھی مطالبے تسلیم کر لیے اور ان کے اصرار پر الیاس صاحب نے بھی سفارش کر دی۔ ان کے اور ریحانہ کے ذہنی پس منظر اور ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا اس کے باوجود ریحانہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ رہی سہی زندگی اسی پناہ گناہ میں بسر کر دیں گی۔ ان صاحب کی وعدہ خلافیاں اور ناانصافیاں بھی ریحانہ کی ثابت قدمی کو کمزور نہ کر سکیں۔ یہاں تک کہ وہ اچانک انتقال کر گئے۔ ریحانہ ایک بار پھر تنہا ہو کر رہ گئیں۔ دنیا میں صرف ایک والدہ رہ گئی تھیں جو پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اللہ سے لو لگا لی۔ اولاد کوئی تھی نہیں دور پرے کا کوئی رشتے دار بھی نہ تھا۔ ملنے والوں سے انہوں نے رفتہ رفتہ قطع تعلق کر لیا تھا۔ سر چھپانے کے لیے ایک گھر جو انہوں نے اپنی ذاتی کمائی سے خریدا تھا۔ اس کے ایک حصے کے کرائے سے دال روٹی کما کر گزارہ کر لیتی ہیں۔ مدتوں سے کسی نے ان کی صورت تک نہیں دیکھی۔ اگر دیکھے بھی تو نہ پہچانے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ریحانہ جس نے شوخ و چنچل کرداروں میں جان ڈال دی تھی اور برّصغیر کی صف اول کی ہیروئن تھی جس کے ایک اشارے پر سینکڑوں اہل ثروت اپنا سب کچھ لٹانے پر تیار رہا کرتے تھے۔ جس کے بنگلے کے آگے بڑے بڑے فلم سازوں کی قطاریں لگی رہتی تھیں اور معروف اداکار جس کے ساتھ کام کرنا اپنے لیے باعث عزت سمجھتے تھے اس کا یہ انجام ہو گا۔

کراچی ہی کے فنکار وحید مراد بھی تھے۔ وہ صف اوّل کے تقسیم کار نثار مراد کے اکلوتے صاحب زادے تھے۔ نثار مراد صاحب ایک متّمول اور بااثر آدمی تھے۔ محاورے کے مطابق وحید مراد سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ماں باپ دونوں کی آنکھ کا تارہ اور احباب کے لاڈلے تھے۔ سانولی سلونی شکل 'ذہانت' رکھ رکھاؤ' پُرکشش شخصیت۔ زمانۂ طالب علمی میں بھی ایک محبوب اور مقبول شخصیت تھے۔ دنیا کی کون سی نعمت اور آسائش تھی جو انہیں

حاصل نہ تھی۔ بہت اچھے نمبروں سے انگریزی لٹریچر میں ایم اے کا امتحان پاس کیا تو باپ نے توجہ دلائی کہ اب انہیں ان کا بزنس سنبھال لینا چاہیے۔ وحید مراد کے اس بارے میں اپنے ذاتی خیالات تھے۔ ڈسٹری بیوشن سے انہیں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ فلم سازی کے شعبے کو اپنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے پہلے درپن صاحب کو ہیرو کاسٹ کرکے ایک فلم بنائی۔ پھر اداکاروں کے نخروں سے تنگ آئے تو خود اداکار بننے کا فیصلہ کیا۔ بہت ذہین اور سوجھ بوجھ والے تھے اس لیے بذات خود تجربہ کرنے کے بجائے پہلے دوسرے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دی۔

''دامن''اور'' اولاد'' میں کام کیا تو بہت پسند کیے گئے۔ خاص طور پر سنتوش صاحب کی فلم ''دامن'' میں ان کا ماڈرن اور شوخ کردار بہت مقبول ہوا۔ پرویز ملک ان کے زمانہ طالب علمی کے دوست تھے اور وہ بھی فلموں کے شوقین تھے۔ وہ امریکہ سے فلم تکنیک کی ڈگری لے کر آئے تو وحید مراد نے ان کے ساتھ مل کر فلم سازی کا آغاز کیا۔ پرویز ملک کیمرا وغیرہ اپنے ہمراہ لے کر آئے تھے ''ہیرا اور پتھر'' ان کی پہلی فلم تھی جس میں وحید مراد کے بالمقابل زیبا نے ہیروئن کا کردار کیا تھا۔ پہلا ہی تجربہ کامیاب رہا۔ اس فلم میں وحید نے گدھا گاڑی چلانے والے غریب نوجوان کا کردار کیا تھا۔ اس فلم میں سہیل رعنا موسیقار تھے اور مسرور انور نغمہ نگار۔ ان چاروں کا ساتھ کافی عرصہ قائم رہا اور انہوں نے ''ارمان'' کے علاوہ اور بھی کئی معیاری اور کامیاب فلمیں تخلیق کیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ سب بکھر گئے۔ دوسری چیزوں کے علاوہ اس میں وحید مراد کی خالص کاروباری ذہنیت اور موقع پرستی کو بھی دخل تھا۔ وحید مراد کے والد کے پاس بھی پیسہ تھا مگر وحید مراد نے جتنا پیسہ کمایا وہ اس سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ شہرت' دولت' مقبولیت وحید مراد کے گھر کی باندیاں ہو گئیں۔ ان کے پرستاروں کی تعداد لاکھوں کروڑوں میں تھی۔ وہ پاکستان کے واحد اداکار ہیں جن کی پیروی کرکے نوجوان خوش ہوا کرتے تھے۔ ان کے بال' ان کی چال۔ ان کا اندازِ گفتگو بے شمار نوجوانوں نے اپنا لیا تھا۔ صنف مخالف میں بھی وہ بے حد مقبول تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وحید مراد جیسی مقبولیت پاکستان کے کسی اور ہیرو کے حصّے میں نہیں آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سُپر اسٹار بن گئے۔ فلم سازی کی تو اس میں بھی کامیاب رہے۔ ہدایت کاری پہ بھی ہاتھ صاف کیا مگر یہ تجربہ زیادہ کامیاب نہ رہا۔

گانوں کی پکچرائزیشن' رومانی مکالموں کی ادائیگی اور رقص ان کی منفرد خوبیاں تھیں مگر پھر جب دورِ زوال شروع ہوا

تو زوال کا یہ سفر کسی طرح رُکنے میں نہ آیا۔ وحید مراد نے بہتیرے ہاتھ مارے مگر اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل نہ کر سکے۔ ان کے پاس دولت، شہرت، صلاحیت، تجربہ، خود اعتمادی، تعلیم، صحت، شکل وصورت سبھی کچھ تھا مگر ناکامی کو انہوں نے اپنے ذہن اور اعصاب پر سوار کر لیا تھا۔ یہ مایوسی اور محرومی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے منشّیات کا سہارا لیا مگر ناکام رہے۔ الٹی صحت تباہ کر بیٹھے۔ سماجی زندگی ختم ہو گئی۔ ساکھ مٹی میں مل گئی۔ انہوں نے بہت کوشش کی مگر خود کو اس گنبد سے باہر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخری سالوں میں ان کی حالت دیکھ کر دُکھ بھی ہوتا تھا اور عبرت بھی۔ صحت نے جواب دے دیا تھا۔ خود فراموشی کے عالم میں لاہور میں نہر والی سڑک پر ایک حادثہ کر بیٹھے تھے جس کے نقوش ان کے چہرے پر دیکھے جا سکتے تھے۔ اس حادثے کی اطلاع ہم کو بھی اتفاقاً ہی ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں ان کے گھر والے امریکہ گئے ہوئے تھے اور نوکروں کے سوا گھر میں کوئی نہ تھا۔ وہ کار لے کر نکلے اور حادثہ کر بیٹھے۔ کافی دیر کے بعد کسی نے اطلاع دی تو انہیں بے ہوشی کے عالم میں سروسز ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ان کی حالت اور حلیہ دیکھ کر کوئی بھی نہ پہچان سکا کہ وہ اپنے زمانے کے مقبول ترین ہیرو وحید مراد ہیں۔ ان کے ایک مداح کی نظر پڑی تو اس نے انہیں پہچان کر فلم کے لوگوں کو اطلاع دی۔ ہدایت کار جاوید فاضل ہسپتال پہنچنے والی پہلی فلمی شخصیت تھے۔ انہوں نے ہمیں مطلّع کیا۔ ہسپتال پہنچے تو وحید کو دیکھ کر رونگھٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ جنرل وارڈ کے ایک بیڈ پر میلے سے کمبل میں لپٹے ہوئے زخمی اور بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ کسی نے ان کی خبر گیری کرنے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی تھی۔ جاوید نے ہسپتال کے ایم ایس سے بات کر کے وحید کو پرائیویٹ کمرے میں منتقل کر دیا اور فلم انڈسٹری کے لوگوں کو ان کے بارے میں اطلاع دی۔

نثار صاحب کے مالی حالات دراصل اس وقت سُدھرنے شروع ہوئے تھے جب وحید مراد نے اداکار کے طور پر کامیابی حاصل کی اور عروج پر پہنچ گئے۔ ان کی فلموں سے بھی خوب منافع ہوا مگر وحید مراد ایک خالص کاروباری ذہنیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے کاروبار اور منافع میں اپنے والد کو بھی دخل انداز نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ عروج پر آئے تو کوئی فلم ساز جو نثار مراد صاحب کے پرانے دوست تھے۔ شکایت لے کر ان کے پاس گئے اور کہا کہ وحید سے سفارش کر دیجئے۔ مگر نثار صاحب بیٹے کے آگے لاچار تھے۔ ویدو (وحید مراد کا پیار کا نام) ان کے لیے حرفِ آخر تھا۔

اس کا ہر لفظ ان کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔انہوں نے بچپن ہی سے اس کی ناز برداری کی تھی‘ اس کی کسی ضد سے سرتابی نہ کی۔ پھر جب وہ بڑا ہو کر معروف اور کامیاب اداکار اور فلم ساز بھی بن گیا تھا تو وہ اس کے سامنے کیسے زبان کھول سکتے تھے۔ ہم شاید پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ فلمی دنیا میں ہم نے دو باپ ایسے دیکھے جو اپنے بیٹوں پر نثار تھے۔ وہ دن کہیں تو دن‘ اگر رات کہہ دیں تو رات۔ پہلے حکیم احمد شجاع تھے۔اپنے زمانے کے صاحبِ علم اور بے بہا اہل قلم۔ان کی قابلیت اور صلاحیت کی ایک دنیا معترف تھی مگر وہ اپنے بیٹے انور کمال پاشا کے مرید تھے۔پاشا صاحب ان کی آنکھ کا تارہ اور زندگی کا سہارا تھے۔ان کی ہر فرمائش اور خواہش ان کے نزدیک آسمانی ہدایت تھی۔افسوس کہ پاشا صاحب نے اپنے عظیم والد کی عزّت اور قدر نہ کی حالانکہ وہ نہ صرف ہر طرح قابل احترام تھے بلکہ پاشا صاحب کے پاس جو کچھ بھی تھا ان ہی کا دیا ہوا تھا۔ذہانت‘ علم‘ صلاحیت‘ تجربہ‘ قلم کاری‘ گفتگو کا ڈھنگ سبھی کچھ انہیں میراث میں ملا تھا مگر ان کا طرزِ عمل والد کے ساتھ بعض اوقات گستاخانہ بھی ہو جاتا تھا جس کے خود ہم بھی شاہد ہیں۔

ایسے ہی دوسرے فلمی والد نثار مراد صاحب تھے۔وحید مراد ان کی اکلوتی اولاد تھے۔بہت باصلاحیت تھے مگر انہیں بھی تمام دنیاوی بڑائیاں باپ ہی کے طفیل حاصل ہوئی تھیں۔جب وہ آگے بڑھ گئے تو علم و دانش میں باپ کو بھی کم تر سمجھنے لگے۔ نثار صاحب نے کبھی اس بات کا برا نہیں مانا۔انہیں تو بیٹے سے عشق تھا‘ عاشق اپنے محبوب کی کسی بات کا کب بُرا مانتا ہے لیکن اس عاشقی کے باعث وحید مراد ہر طرح کی پابندیوں اور بندشوں سے آزاد ہو گئے تھے۔اگر باپ بیٹے کے رشتے کے حوالے سے ان دونوں کے مابین ہم آہنگی کا رشتہ قائم رہتا تو شاید نثار صاحب بیٹے کو بربادی کی راہ پر چلنے سے روک لیتے۔ مگر مشیّت ایزدی میں کسی کا کیا دخل کہ قدرت کو ایسا ہی منظور تھا۔افسوس اس بات کا ہے کہ تمام عمر دنیاوی آسائشیں حاصل کرنے والے ان باپ بیٹے نے زندگی کے آخری ایّام ناگفتہ بہ حالت میں گزارے۔ وحید مراد کی پریشانیاں‘ محرومیاں اور مایوسیاں خود ان کی ذہنی اختراع تھیں ورنہ انہیں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔بس وہ اداکار کی حیثیت سے خود کو نظر انداز کیے جانا برداشت نہ کر سکے اور اپنے آپ کو برباد کر بیٹھے۔

نثار صاحب تمام عمر بہت اچھی صحت کے مالک رہے۔بلکہ دیکھنے والے ان پر رشک کرتے تھے لیکن آخری دنوں میں صاحب فراش ہو گئے۔فالج نے معذور کر دیا تھا اور یہ سلسلہ کافی عرصے تک قائم رہا۔ ان کا لاہور میں انتقال ہوا تھا۔

انتقال سے پہلے ہی فلمی دنیا انہیں فراموش کر چکی تھی۔ بہت سے لوگ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ لاہور میں ہیں یا کراچی میں۔ ان کے انتقال کے موقع پر بھی ہم لاہور میں موجود نہیں تھے۔ دو تین روز بعد واپس آئے تو اپنی بیگم کے ہمراہ تعزیت کے لیے گلبرگ میں وحید مراد کی کوٹھی پر گئے۔ کسی زمانے میں زندگی کی حرارتوں سے معمور یہ کوٹھی اس وقت نیم تاریکی اور سوگواری کا منظر پیش کر رہی تھی۔

ایک نئے چوکیدار نے ہماری شناخت پوچھی اور کافی جرح کے بعد بڑا گیٹ کھول کر لان میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بٹھا دیا۔ ہر طرف خاموشی اور اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس کوٹھی سے متصّل بالکل ایسی ہی دوسری کوٹھی تھی جو وحید مراد نے خرید لی تھی۔ کچھ دیر بعد وحید کی بیگم سلمیٰ اندر سے نکل آئیں۔ ان سے پُرانی یاد اللہ تھی۔ بہت اخلاق سے پیش آئیں مگر انہوں نے گھر کے اندر آنے کو نہ کہا۔ وہ شاید مصروف اور جلدی میں تھیں۔ ہم نے دلی تعزیت پیش کی اور آخری دنوں کا احوال دریافت کیا جس کے جواب میں انہوں نے مختصر جواب دے کر ہمیں فارغ کر دیا۔
اس گھر میں ہم بہت سے اچھے دنوں کے شاہد تھے۔ وحید مراد جن دنوں ڈپریشن کے مریض ہو چکے تھے اور ایکسیڈنٹ کے بعد صحت یاب ہو کر گھر چلے گئے تھے تو اس وقت بھی ہم بعض دوستوں کے کہنے پر انہیں سمجھانے اور اعتماد دلانے کی غرض سے ان کے گھر گئے تھے۔ وہ بے حد کمزور نظر آ رہے تھے۔ چہرے کی دلکشی اور کشش نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ پیشانی پر زخم کا نشان نمایاں تھا مگر قدرے حوصلہ مند نظر آئے۔ فلم سازوں کی شکایت کرتے رہے
"دوستوں نے بھی اپنی فلموں میں کاسٹ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ لوگ تھوڑا سا بھی لحاظ نہیں کرتے۔"
جی میں تو آئی کہ پوچھیں کہ بھائی آپ نے کب کسی کا لحاظ کیا تھا؟ مگر چُپ رہے۔ کاروباری دنیا میں ہر طلب کا تعلق مانگ سے ہوتا ہے۔ کسی چیز کی مانگ ہو تو لوگ اس کے حصول کی خاطر زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں۔ جس طرح کی وحید مراد کی مانگ تھی تو ایک دنیا ان کے پیچھے پیچھے سر گرداں تھی مگر جب مانگ نہ رہی تو فلم سازوں نے بھی کاسٹ کرنا چھوڑ دیا اور ان ستاروں کے پیچھے لگ گئے جن کی مانگ تھی۔
بزنس کا یہ بنیادی اصول وحید مراد جیسے ذہین اور قابل شخص کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور یہی ان کے لیے تمام خرابیوں کا سبب تھا۔

ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ فلم ''عندلیب'' کی فلم بندی کے زمانے میں فلم ساز راشد مختار صاحب کو وحید سے کچھ شکایت پیدا ہوئی۔ان کے والد سیّد مختار احمد اور وحید کے والد نثار مراد صاحب پرانے دوست تھے مگر ان دونوں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی تھی کہ آپ نوجوان لوگ اپنے مسائل خود ہی طے کرلیں۔

راشد صاحب نے وحید مراد سے بات کی تو وحید کا جواب تھا''راشد صاحب! یہ کاروبار ہے۔اس میں تعلقات کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔کاروبار تو''کٹ تھروٹ'' کا بزنس ہے۔آپ کا بس چلے گا تو آپ میری گردن کاٹ لیں گے۔میرا بس چلا تو میں آپ کی گردن کاٹنے سے نہیں ہچکچاؤں گا۔''

راشد مختار صاحب نے یہ پیغام لفظ بہ لفظ ہمیں سنادیا تھا اور اس کے بعد پھر کبھی وحید مراد کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔

پرویز ملک صاحب وحید مراد کے پرانے دوست اور ابتدائی زمانے کے رفیق تھے۔دونوں نے ایک ساتھ ہی کام شروع کیا تھا۔''ہیرا اور پتھّر'' اور ''ارمان'' کی کامیابیوں میں پرویز ملک کا بھی نمایاں حصّہ اور ہاتھ رہا تھا مگر جب وحید مراد کامیاب فلم ساز ہوئے تو کاروباری معاملات میں بالکل''فلم ساز'' بن گئے۔ارمان نے بے انتہا کامیابی حاصل کی تھی۔ کارکنوں کو وحید مراد کے سامنے لب کشائی کی ہمت نہ تھی۔اس لیے انہوں نے پرویز ملک صاحب سے کہا کہ فلم کی کامیابی پر رواج کے مطابق کارکنوں کو بھی بونس دینا چاہیے۔بونس کے حق دار ان کارکنوں کی تعداد ایک درجن بھی نہ تھی۔

پرویز ملک گئے اور فلم ساز کے کمرے میں وحید مراد سے ملاقات کی۔وحید کے پرانے اور بے تکلف دوست ہونے کی بنا پر انہوں نے کسی تمہید کے بغیر یہ مسئلہ وحید مراد کے سامنے پیش کردیا اور کہا کہ ان لوگوں کے تعاون سے جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اس میں انہیں بھی شریک کرنا چاہیے۔

پرویز صاحب نے چند ناموں کی ایک مختصر فہرست بھی وحید مراد کے سامنے رکھ دی تھی جس میں خود ان کا نام شامل نہیں تھا۔

وحید مراد نے کسی تامل کے بغیر وہ کاغذ پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور کہا ''پرویز! اگر ان لوگوں نے کام کیا ہے تو میں نے اس کا معاوضہ بھی ادا کیا ہے۔ اگر میری فلم فلاپ ہو جاتی تو کیا یہ کارکن میرا نقصان پورا کر دیتے؟''

پرویز ملک اس خلافِ توقّع طرزِ عمل پر حیران رہ گئے۔

وحید مراد نے ان کی معلومات میں مزید اضافہ کرنے کے لیے کہا ''پرویز! یاد رکھو، یہ بزنس ہے اس میں کسی کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔''

جب وحید مراد کی زبان سے ہم نے فلم والوں کی بے رُخی اور بدلحاظی کا شکوہ سنا تو خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

اس روز وحید مراد ہمیں بہتر موڈ میں نظر آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اچھّا کردار ملے تو وہ اب بھی گزشتہ کامیابیوں کی یادیں تازہ کر سکتے ہیں۔

ہم نے کہا ''آپ خود فلم کیوں نہیں بناتے ہیں۔ اپنے لیے کوئی اچھّا کردار لکھوائیں اور کسی اچھے ڈائریکٹر کی خدمات حاصل کر کے بہت اچھی فلم بنائیں جیسا کہ ''ارمان'' میں کیا تھا۔''

وحید نے ہماری تجویز کا پہلا حصّہ تو نظرانداز کر دیا مگر آخری حصّے کے بارے میں تبصرہ کرنا مناسب جانا۔ بولے ''آفاقی صاحب! پرویز میرا پرانا دوست ہے۔ اس نے بھی مجھے کاسٹ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔''

وحید مراد کا یہ شکوہ بھی درست نہ تھا اس لیے کہ پرویز ملک نے کافی عرصے پہلے وحید مراد کے بجائے ندیم اور دوسرے اداکاروں کے ساتھ فلمیں بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس روز وحید مراد قدرے خوشگوار موڈ میں تھے اس لیے ہم نے تلخی پیدا کرنے والی گفتگو سے گریز کیا۔ چائے پی کر چلے آئے۔

چند روز بعد وحید مراد نے ایک ٹی وی پروگرام میں حصّہ لیا تو ان کے پرستار اپنے پسندیدہ اداکار کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کی صحت بگڑ چکی تھی۔ چہرے پر وہ تازگی اور دلکشی نہیں تھی جو وحید مراد کی پہچان تھی۔ وحید اگر غور کرتے تو وہ بھی اس نتیجے پر پہنچتے کہ ان کا ٹی وی کیمرے کے سامنے نہ آنا بہتر تھا۔ جس نے بھی انہیں اس پروگرام میں دیکھا غم زدہ ہو گیا۔ وہ اپنے ماضی کے دنوں کا سایہ نظر آ رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وحید مراد کو کامیابیاں بہت آسانی سے اور فراواں مل گئی تھیں۔ وہ ان کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ ناکامی برداشت کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ وہ ماضی میں رہنا چاہتے

تھے۔اُس زمانے میں سانس لینا چاہتے تھے جب وہ پاکستان کے سب سے مقبول' منفرد اور اکیلے ہیرو تھے۔وہ یہ بھول گئے تھے کہ وقت بڑا بے رحم ہے۔اس کی زد سے کون بچا ہے۔نشیب و فراز' عروج و زوال' بلندی اور پستی ہم خاکی انسانوں کا مقدر ہیں۔کاش وہ ٹھنڈے دل سے غور کرتے تو انہیں احساس ہو جاتا کہ قدرت نے انہیں صرف ایک ہی سہولت سے محروم کیا ہے۔وہ صرف اداکار کے طور پر غیر مقبول ہوئے تھے جو کہ اکثر اداکاروں کا نصیب ہوتا ہے۔ دوسری تمام نعمتیں انہیں حاصل تھیں مگر وہ صرف ایک محرومی کو دل سے لگا کر بیٹھ گئے۔دوسری ڈھیر ساری نوازشوں کو فراموش کر بیٹھے۔

وحید مراد نے کراچی میں آنکھ کھولی تھی۔زندگی کا بیشتر وقت وہیں گزارا تھا مگر لاہور میں گلبرگ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ان کے والد بھی اسی قبرستان میں محوِ خواب ہیں۔یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ انہیں لاہور کی مٹّی نصیب ہوئی۔ حالانکہ لاہور میں اب ان کا نہ گھر ہے' نہ کوئی پہچان۔ان کی بیگم اور بچّے بھی اس شہر کو چھوڑ گئے ہیں مگر وہ اسی مٹّی میں دائمی گھر بنا چکے ہیں۔ اللہ انہیں اور ان کے والدین کی روحوں کی مغفرت کرے۔

وحید مراد کے ساتھ اس آخری ملاقات کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا جب ہم ان کی کوٹھی کے لان میں سوچتے رہے کہ سلمیٰ مراد کی اس سرد مہری کا کیا سبب تھا؟ شاید وہ ماضی کے تمام رشتے ختم کرنا چاہتی تھیں۔۔۔! پرانی یادوں کو بھلا دینا چاہتی تھیں۔

وحید مراد کے علاوہ کراچی کے کئی فن کاروں نے فلمی دنیا میں بہت دھومیں مچائیں۔ شمیم آرا۔نیّر سلطانہ۔رانی۔محمد علی۔زیبا۔ لہری۔نرالا۔مصطفےٰ قریشی۔احمد رُشدی۔مسعود رانا۔مسرور انور۔پرویز ملک۔سہیل رعنا۔حمایت علی شاعر۔سرور بارہ بنکوی۔نثار بزمی۔رخسانہ۔اقبال یوسف۔اقبال شہزاد کوئی ایک نام ہو تو گنوائیں۔یہ سب پاکستان کی فلمی صنعت کے ماتھے کا جھومر ہیں۔اگر پاکستانی فلمی صنعت اس کے لیے کراچی کی شُکر گزار نہ ہو تو یہ احسان فراموشی ہوگی۔

کراچی ایک زمانے میں واقعی عروس البلاد تھا۔بہت بڑا' روشن' ترّقی یافتہ' مہذّب اور بارونق شہر تھا۔لاہور تو اس کے مقابلے میں ایک گاؤں ہی معلوم ہوتا تھا۔ان دنوں لاہور والے حیران ہونے کے لیے کراچی جایا کرتے تھے اور

واپسی میں ایسے ہی قصّے سناتے تھے جیسے کہ یورپ سے واپس آنے والے سنایا کرتے تھے۔

"کیا بتائیں۔ کراچی میں کتنا ہنگامہ ہے۔ کاروں کی ریل پیل ہے۔ وہاں تو سڑک عبور کرنا بھی دشوار ہے۔ دولت کمانا اس قدر آسان ہے کہ جو وہاں گیا وہ امیر ہو گیا۔ کراچی بڑا غریب پرور شہر ہے۔ ٹریفک ایسا ہے کہ دیکھنے سے تعلّق رکھتا ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ کے فاصلے اتنے زیادہ ہیں کہ آمد ورفت ہی میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ کراچی والوں کو ایک دوسرے کی خبر نہیں ہوتی۔ پڑوس والے کو بھی یہ معلوم نہیں کہ برابر میں کون رہتا ہے۔ کراچی کی سڑکوں' بازاروں اور دکانوں کا کیا کہنا۔ روشنی ایسی کہ دن نکلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہاں کے لوگ مشینوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی شام رات کے گیارہ بارہ بجے شروع ہوتی ہے اور یہی ایک دوسرے کے گھر جانے کا وقت ہے (ان دنوں لاہور میں سات بجے ہی رات ہو جایا کرتی تھی اور آٹھ نو بجے تو سارا شہر سنسان ہو جاتا تھا۔)

کراچی یاترا سے آنے والوں کی داستانیں کئی کئی دن جاری رہتی تھیں اور لوگ بڑے شوق وذوق سے سنتے اور حیران ہوتے رہتے تھے۔

اس وقت کا کراچی ہمیں بھی بہت اچھّا لگتا تھا۔ ہم ایک بار کراچی گئے تو پھر بار بار وہاں جانے کے بہانے ڈھونڈتے رہے۔ عموماً فلمی مصروفیات کے سلسلے میں ہی جانا ہوتا تھا۔ کبھی دوست احباب کے گھر قیام کرتے تو کبھی ہوٹلوں میں۔ میٹروپول ہوٹل ہمارا پسندیدہ ہوٹل تھا۔ بعد میں اس کے سامنے کلفٹن روڈ پر پُل سے اُترتے ہی ایک چھوٹا سا خوب صورت اور ماڈرن ہوٹل بن گیا تھا۔ جس کا نام "کولمبس" تھا۔ ایک بار اس میں قیام کیا تو اتنا اچھّا لگا کہ پھر وہیں جا کر ٹھہرتے تھے اور کلفٹن کی جانب والا کمرہ لیتے تھے۔ شیشے کی دیوار میں کلفٹن کو جانے والی سڑک کی روشنیاں دور تک نظر آتی تھیں اور آنکھوں کو بہت بھلی لگتی تھیں۔

اسی ہوٹل کے دوران قیام میں ہماری فلم "میرا گھر میری جنّت" کے سلسلے میں ایک حادثہ بھی پیش آگیا تھا جس کا تذکرہ آگے بیان ہوگا۔ اس کشادہ روشن سڑک کے دونوں جانب سمندری دلدل تھی۔ کافی فاصلے پر کلفٹن کے ساحل کی آبادی تھی جو زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اب اس جگہ کو دیکھیں تو پہچانی نہیں جاتی۔ کولمبس ہوٹل بھی اب ناپید ہو چکا ہے۔ فلک بوس عمارتوں اور شاپنگ سینٹرز کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو دور تک پھیلا نظر آتا ہے۔

کراچی کو پسند کرنے والوں کے پاس پسندیدگی کی مختلف وجوہات تھیں۔ ہمیں کراچی کا شور و غل (جسے ابراہیم جلیس اور طفیل احمد جمالی غُل غپاڑہ کہتے تھے) کبھی پسند نہیں آیا حالانکہ آج کے مقابلے میں بہت کم تھا مگر شہر کی صفائی خوبصورتی اور نظم و ضبط نے بہت متاثر کیا تھا۔ یہ ایک مہذب اور ترقّی یافتہ شہر تھا۔ جس کے بعض حصّے مغربی ملکوں کے شہروں کے معیار کے تھے۔ ملک کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں یہ ایک بالکل مختلف دنیا تھی جس کے طور طریقے بھی مختلف تھے۔

ہمیں جن چیزوں نے حیران اور متاّثر کیا ان میں گدھا گاڑی بھی شامل تھی۔ اُس زمانے میں شہر میں گدھا گاڑیوں کی ریل پیل تھی۔ چھوٹی سی گاڑی کے آگے ایک چھوٹا سا گدھا جتا ہوا بھاگا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور گدھا بھی دوڑتا رہتا تھا۔ پوچھا کہ بھئی یہ کیا ہے۔ جواب ملا ''یہ پنخ ہے۔''

''یعنی گدھے کی پنخ؟'' ہم نے حیران ہو کر پوچھا ''مگر اس کا فائدہ کیا ہے۔ گاڑی تو ایک ہی گدھا کھینچتا ہے۔''

بولے '' اس کا فائدہ یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر گدھا یہی سمجھتا ہے کہ گاڑی دوسرا گدھا کھینچ رہا ہے۔ اس طرح دونوں خوش رہتے ہیں اور تیز بھاگتے ہیں۔''

گدھے کے گدھے پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا۔

گدھا گاڑی کے علاوہ اونٹ گاڑی بھی ہم نے کراچی میں کثرت سے استعمال ہوتے ہوئے دیکھی۔ اونٹ اکیلا ہی بوجھ کھینچتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی پنخ نہیں دیکھی۔ شاید اس لیے کہ اونٹ کو دھوکا دینا بہت مشکل ہے۔ وہ ایک ذہین اور چالاک جانور ہے۔

فٹن یا وکٹوریا کو دیکھ کر ہمارا دل خوش ہو گیا۔ لاہور میں تو اس کا رواج ہی نہیں ہے۔ البتہ دہلی اور میرٹھ میں خاندانی رئیسوں کو فٹن میں سوار دیکھا تھا۔ بمبئی کی فلموں میں بھی فٹن یا وکٹوریا نظر آجاتی ہے۔ یہ خاصی آرام دہ' کشادہ اور ہوادار سواری ہے جس میں ڈرائیور یعنی کوچوان سواریوں کے مقابلے میں اونچی جگہ پر بیٹھتا ہے۔

محبوب صاحب کی فلم ''آن'' میں ایک گانے میں دلیپ کمار جب راج کماری (نادرہ) کو لے کر جاتے اور گانا گاتے ہیں تو وہ بھی فٹن ہی میں سوار ہیں۔ میرٹھ کی چھاؤنی میں کبھی کبھی وکٹوریا نظر آجاتی تھی۔ یہ بہت صاف شفّاف اور

چمک دار تھی۔ اسے چار گھوڑے کھینچتے تھے۔ آگے پیچھے بگل بجاتے ہوئے گھوڑوں پر سوار فوجی ہوتے تھے۔ یہ دراصل فوج کے جی او سی بریگیڈیئر اکبر خان کی سواری تھی۔

اکبر خان کے بارے میں سنا ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی تھے جو انگریزی فوج میں بریگیڈیئر کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ ان کی سواری کی شان دیکھنے کے لائق تھی۔ چھاؤنی کی کشادہ سڑکوں اور لاہور کے کمپنی باغ کے سامنے والی ٹھنڈی سڑک یا مال پر سے یہ جلوس گزرتا تو چلتے ہوئے لوگ رُک کر دیکھنے لگتے تھے۔

کراچی پہنچ کر ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وکٹوریا میں سواری کی۔ اونٹ گاڑی اور گدھا گاڑی ہمیں سواری کے لیے مناسب نہ لگی۔ چونکہ یہ گدھے کے سپرد تھی جس کی بیوقوفی اور دولتی سے ڈر لگتا ہے۔ دوسری گاڑی اونٹ کے رحم و کرم پر تھی جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ یہ وہ جانور ہے جو قسطوں میں ٹانگیں تہ کر کے اٹھتا اور بیٹھتا ہے اور قدرت نے اس کی کمر کے بیچوں بیچ ایک گنبد نما کوہان بھی تخلیق کیا ہے۔ غالباً اس خیال سے کہ اس کی پیٹھ پر کوئی بیٹھ نہ سکے مگر حضرت انسان اس پر بھی سواری کرتے ہیں۔

وکٹوریا کی سیر نے کراچی کی کھلی، صاف شفّاف سڑکوں پر بہت لطف دیا۔ صاف اور تازہ ہوا کے جھونکوں نے اس لطف کو دوبالا کر دیا۔ کراچی میں ہر وقت چلنے والی ہوائیں بھی ہمیں بہت اچھی لگیں۔ شام کے وقت تو آسمان پر گہرے بادلوں اور ہوا کے جھونکوں کی بہار ہی کچھ اور ہوتی تھی۔ لاہور میں یہ ہوا میسّر نہ تھی۔ یہاں بس ضرورت کے مطابق ہوا چلتی رہتی ہے۔ اگر تیز چلے تو اسے آندھی کہتے ہیں۔ مگر کراچی میں یہ ہوا ایک مستقل تازگی فراہم کیا کرتی تھی۔ (افسوس کہ اب یہ بھی کمیاب ہے) ایک اور بات ہمیں یہ پسند آئی کہ کراچی میں ہر وقت ہوا چلنے کے باوجود خاک نہیں اڑتی تھی۔ سڑکیں اور فٹ پاتھ بہت صاف ستھرے تھے۔ کافی عرصے تک تو ہم اس بات پر ہی حیران ہوتے رہے کہ فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر سفر کرنے کے باوجود نہ جوتوں پر گرد جمتی تھی نہ قمیص کا کالر میلا ہوتا تھا۔ یہی خوبیاں بعد میں ہم نے یورپ اور امریکہ میں بھی پائیں۔

وکٹوریہ شاہانہ سواری ہونے کے باوجود کافی سستی لگی۔ اس میں عام طور پر سیّاح اور باہر سے آنے والے لوگ ہی سواری کرتے تھے۔ کچھ دور جانے کا کرایہ چار آنے سمجھ لیجئے۔ اگر بھاؤ تاؤ کر لیں تو اس میں مزید کفایت ہو جاتی تھی۔

وکٹوریا کا کوچوان ایک لمبا سا کوڑا لے کر بیٹھتا ہے۔ کبھی ہم نے یہ کوڑا گھوڑے کو مارنے کے لیے استعمال ہوتے نہیں دیکھا۔ شاید یہ ڈیکوریشن کا حصّہ ہے یا وکٹوریا کے لوازمات میں شامل ہے۔ کوچوان کی گفتگو بھی بہت مزے دار تھی۔ کراچی کے بارے میں ساری معلومات انہیں حفظِ زبان تھیں۔ کئی کوچوان کافی ادب ذوق نظر آئے۔ انہیں شعر و شاعری سے خاصی رغبت تھی۔ ایک درمیانہ عمر کوچوان کو داغ کا سارا دیوان حفظ تھا۔ ہم نے اس کے ساتھ اپنے سفر کو مزید طویل کر دیا۔ اس اللہ کے بندے نے داغ دہلوی کے اشعار تحت اللّفظ میں سنائے تو ہم دونوں بھول گئے کہ ہمیں جانا کہاں ہے۔ بس وہ سڑکوں پر چکّر لگاتا رہا اور شعر سناتا رہا۔ بار بار کہتا تھا ''میاں۔ داغ کی کیا بات ہے۔ اُس جیسا شاعر تو پھر دلّی میں بھی پیدا نہیں ہوا' کراچی میں کیا پیدا ہو گا۔''

ہم نے کہا ''بھائی۔ آپ کیوں کوشش نہیں کرتے؟''

بولے ''میاں کیوں مذاق کرو ہو۔ ہم شاعری جوگے کہاں رہے؟''

''تو پھر کس جوگے رہ گئے ہو؟''

کہنے لگے ''بس فٹن ہانکتے جوگے رہ گئے ہیں سو ہانک رہے ہیں۔ زندگی کی گاڑی ہانکنا ان دنوں بڑا مشکل ہووے ہے۔ ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑے ہے۔''

وہ سستا زمانہ تھا۔ ہم نے آدھے سے زیادہ دیوانِ غالب بھی سنا۔ سیر کی سوا لگ 'کرایہ ایک روپے چار آنے دیا تو وہ خوش ہو گئے۔ آج کی مہنگائی کے زمانے میں خدا جانے ان کا کیا حال ہو گا اور وہ زندگی کی گاڑی کیسے ہانک رہے ہوں گے۔

وکٹوریا اب کراچی میں بھی خال خال ہی نظر آتے ہیں بلکہ ناپید ہو چکے ہیں۔ آج کی تیز رفتار دنیا میں ان چیزوں کا بھلا کیا کام۔ البتہ نمائش اور تفریح کی اور بات ہے۔

تیز رفتاری سے یاد آیا کہ اس زمانے میں کراچی میں ٹرام بھی چلتی تھی۔ ٹن ٹن گھنٹی بجاتی ہوئی سڑک پر سے گزرتی تو ہم جیسے شہر میں نووارد تو چوکنّا ہو کر دیکھنے لگتے تھے۔ سڑک کے درمیان میں ٹرام کی پتلی سی پٹڑی ہوتی تھی جس پر دوسرا ٹریفک مداخلت کرنے سے گریز کرتا تھا۔ ٹرام کافی سست رفتاری سے چلتی تھی۔ اوپر چھت آس پاس سے کھلی ہوئی۔ درمیان میں لکڑی کی سیٹیں۔ ٹرام کے پچھلے حصّے میں کھڑے ہونے کے لیے کُھلی جگہ ہوتی تھی۔ ہمیں وہ جگہ سب

سے زیادہ پسند آئی۔ چلتی ٹرام میں سوار ہونا اور اس پر سے اُترنا کوئی مشکل کام نہ تھا کیونکہ وہ بہت سُست رفتار سے چلتی تھی۔ اسے پکڑنے کے لیے بھاگنا بھی ضروری نہ تھا۔ بس ذرا تیز قدمی سے چل کر ٹرام پر چڑھ جایئے۔ پچھلے حصّے میں کھڑے ہو کر آس پاس کا نظارہ کیجئے۔ یار لوگ سڑک چلتے اور باتیں کرتے کرتے بڑے آرام اور اطمینان سے ٹرام میں سوار ہو جاتے تھے۔ اُترتے وقت بھی کسی تکلّف یا اہتمام کی ضرورت نہ تھی۔ بس پہلے ایک پیر لٹکائیں' پھر جیسے ہی ٹرام کی رفتار ہلکی ہو آہستہ سے سڑک پر کود جائیں۔

ٹرام بہت غریب پرور سواری تھی۔ غالباً کراچی کے ایک حصّے سے دوسرے حصّے تک سفر کرنے کا کرایہ ایک یا ڈیڑھ آنہ تھا۔ ٹریفک میں بہتری پیدا کرنے کے نام پر یہ بند کر دی گئی۔ حالانکہ چلتی رہتی تو بہتوں کا بھلا ہوتا۔ دنیا کے بہت سے ترّقی یافتہ ملکوں میں آج بھی ٹرام چلتی ہے مگر ہمارے بااختیار لوگوں کو شاید عام لوگوں کی سواری اور سہولت اچھی نہیں لگتی۔ ٹرام کراچی میں آمدورفت کا بہت اچھّا اور سستا ذریعہ تھی۔ رش کے اوقات میں تو ذرا بھیڑ بھاڑ ہوتی تھی' اس کے علاوہ ہر وقت بڑے آرام سے سفر اور فاصلہ طے ہو جاتا تھا اور جیب پر بوجھ بھی نہیں پڑتا تھا۔ کراچی غریب پرور شہر تھا اور کافی عرصے تک ایسا ہی رہا۔ 60ء کی دَہائی میں ہم نے بہت بڑے بڑے نہایت لطیف چِتلی والے کیلے وکٹوریا روڈ پر بارہ آنے درجن خریدے۔ ان سے دوبار پیٹ بھرا جا سکتا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ قبل ہم فلم ساز شوکت شیخ کے ہمراہ کراچی گئے۔ وہ اپنی زیرِ تکمیل فلم ''گیسٹ ہاؤس'' کا تنازعہ نمٹانے کے سلسلے میں کراچی گئے تھے اور ہم دونوں ریکس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کے تقسیم کار نے قسط ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر یہ قسط جاری نہ ہوئی تو شوکت شیخ ہمیں لے کر کراچی پہنچ گئے۔ ہم ان کے دوست بھی تھے اور کہانی کے مصنّف بھی۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو ہم الیاس رشیدی صاحب سے کہہ کر دباؤ ڈلوا کر ان کا مسئلہ حل کرا دیں گے۔ ہم تو اس امید پر گئے تھے کہ جاتے ہی قسط وصول ہو جائے گی مگر وہاں معاملہ کچھ اور تھا۔ تین دن کے بعد شوکت شیخ کے پاس نقدی ختم ہو گئی۔ ہوٹل کا کرایہ تو ہوٹل چھوڑتے وقت ہی ادا کیا جاتا تھا اس لیے اس طرف سے اطمینان تھا۔ یہ ہوٹل بھی خاصا مہنگا تھا مگر ناشتا ہوٹل کے کرائے میں ہی شامل تھا جیسا کہ اس زمانے میں رواج تھا۔ ہم دونوں صبح اٹھ کر تیار ہو کر خوب پیٹ بھر کر ناشتا کرتے اور ہوٹل سے نکل جاتے۔ ''نگار'' کے دفتر کی حاضری تو معمول میں شامل

تھی۔دوسرے فلم سازوں اور دوستوں کے دفتروں کا بھی پھیر الگ جاتا تھا۔شوکت شیخ کے تقسیم کار کی طرف سے وعدہ فردا پر ہی ٹرخایا جارہا تھا۔ہم نے شروع دنوں میں کُھلے دل سے خرچ کیے تھے۔مہنگے اور اچھے ریستورانوں میں کھانے کھائے اور دوستوں کو بھی کھلائے۔فلمیں دیکھیں' تھوڑی سی شاپنگ بھی کرڈالی۔جب پیسے ختم ہونے لگے تو پریشانی ہونے لگی۔

ایک روز ہوٹل سے نکلے تو ہم دونوں کے پاس کل جمع پونجی ایک روپیہ دو آنے تھے۔ اگر جیب خالی ہو تو انسان زیادہ حسّاس اور محتاط ہو جاتا ہے۔ہم دونوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔

دوپہر کے وقت ہم حسب معمول ''نگار'' کے دفتر میں گئے۔وہاں محفل جمی ہوئی تھی۔کھانے کا وقت ہوا تو الیاس صاحب نے اپنے گھر سے منگوایا ہوا کھانا اور بازار سے منگوا کر کچھ کھانا میز پر لگوا دیا۔

عام دنوں میں ''نگار'' کے دفتر میں لنچ کھانا ہمارا معمول تھا مگر اس روز ہمارے ساتھ شوکت شیخ بھی تھے اور جیب میں پیسے نہ ہونے کی بنا پر وہ دفتر میں کھانا کھانے میں تامل کر رہے تھے۔الیاس صاحب کے اصرار پر انہوں نے بہانہ بنا دیا کہ ہمیں کسی کے پاس لنچ کے لیے جانا ہے۔

ہم دفتر سے نکلے تو سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے ہم نے پوچھا ''ہمیں لنچ کے لیے کہاں جانا ہے؟''

بولے ''کہیں بھی نہیں۔''

''مگر آپ نے تو کہا تھا۔۔۔''

''یار سمجھا کرو'' وہ بات کاٹ کر بولے ''اپنی جیب میں تو کچھ ہے نہیں۔اس طرح وہاں کھانا کھاتے ہوئے جھجک سی ہو رہی تھی' اس لیے میں نے بہانہ بنا دیا۔''

ہم نے کہا ''مگر یہ تو گھر جیسی بات ہے۔الیاس صاحب سے ہمارا کوئی تکلّف نہیں ہے۔''

بولے '' تمہارا نہیں ہوگا۔میرا تو تکلّف ہے۔یار' مجھے تو اچھا نہیں لگا۔اگر کھانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔مجھے کوئی اعتراض

نہیں ہے۔''

ہم نے کہا'' شیخ جی۔ اتنے اصول پرست اور فارمل بھی نہ بنو۔ تم نہ کھاؤ گے تو ہم کیسے کھا سکتے ہیں۔ اور پھر کھائیں گے کیا' ہمارے پاس تو کل سرمایہ ایک روپیہ دو آنے یا چار آنے رہ گیا ہے۔''

وہ مسکرائے ''دیکھو' میرے پاس سگریٹ کی دو ڈبیاں ہیں۔ تمہارے پاس پائپ کا تمباکو اور ماچس ہے' ہے نا؟''

''ہاں ہے تو'' ہم نے کہا۔

''اب دوسری ضرورت رہ گئی کھانا۔ تو وہ بھی اللہ پوری کر دے گا' آؤ میرے ساتھ۔''

ہم پیدل ہی ریکس سینما کے چوک کی طرف چل پڑے۔ سڑکوں پر خوب رونق تھی۔ دکانیں دنیا بھر کی چیزوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جیب میں پیسہ نہ تھا مگر ہم رئیسوں کی طرح دیکھتے ہوئے اور ٹہلتے ہوئے چوک کی طرف چل دیئے۔

لنچ کا وقت تھا۔ ٹھیلے والے ہوٹلوں پر خوب رش تھا۔ یہ عوامی ہوٹل ہوتے ہیں اور عام لوگوں کے لیے بہت غنیمت ہیں۔ شوکت شیخ ایک ٹھیلے کے پاس جا کر کھڑے ہوئے۔ نہایت مزے دار خوشبودار کباب گرما گرم فروخت ہو رہے تھے۔ چار کباب' دو نان نو آنے کے تھے۔ وہیں کھڑے کھڑے کھا لیے۔ اتنا لطف آیا کہ بیان سے باہر ہے۔ لیجئے' نو آنے میں ہم دونوں کا پیٹ بھر گیا۔ سامنے کی دکان سے چار آنے کی دو آئس کریم خریدیں اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس سے زیادہ سستا اور مزے دار لنچ کیا ہو سکتا ہے اور وہ بھی ساڑھے چھ آنے پر ہیڈ!!

نزدیک ہی پریس کلب تھا۔ یہ جگہ' یہ عمارت اور یہ ماحول ہمیں پہلے دن سے ہی بھا گیا تھا۔ ہم لوگوں نے ورائٹی شو کے ذریعے چندہ اکٹھا کر کے لاہور میں ایک مختصر سا پریس کلب بنایا تھا مگر کراچی کے پریس کلب کی بات ہی اور تھی۔ اس کی ایک خوبی یہ دیکھی کہ پریس کے لوگ اسے باقاعدگی اور پابندی سے استعمال بھی کرتے ہیں۔

شام کی چائے ہم دونوں نے پریس کلب ہی میں جا کر پی۔ چائے کے لیے پیسے ہمارے پاس موجود تھے مگر وہاں کچھ شناسا مل گئے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے ہم کیسے بل ادا کر سکتے تھے۔ مشرقی وضع داری کی کیا بات ہے!

کراچی میں یوں تو بہت سے فن کار، فلم ساز اور دوسرے لوگوں سے ملاقاتیں رہا کرتی تھیں مگر دو فن کارائیں ایسی تھیں جن کے گھر جانا اور کھانا لازمی امر تھا۔ ان میں سے ایک شمیم آرا تھیں اور دوسری زیبا۔ زیبا فلمی دنیا میں شمیم آرا کے بعد آئی تھیں مگر وہ شمیم آرا کو روزِ اوّل ہی سے اپنی حریف سمجھتی تھیں حالانکہ اس وقت تک دونوں میں سے کوئی ایک بھی اسٹار یا سُپر اسٹار نہ بن سکی تھیں۔

زیبا کے گھر پر لطیفہ بازی اور فقرے بازی کے علاوہ سب سے اہم موضوع شمیم آرا ہوا کرتی تھیں۔ وہ کرید کرید کر شمیم آرا کے بارے میں پوچھتی تھیں۔

شمیم آرا کے پاس کتنی فلمیں ہیں؟ پروڈیوسروں کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے۔ پھر وہ سوال کرتیں "آفاقی، سچ بتاؤ۔۔۔ کیا شمیم آرا بڑی ہیروئن بن جائے گی؟"

"کیوں نہیں، ہو سکتا ہے" ہم مصلحت آمیز جواب دیتے۔

وہ کہتیں "بھئی ہیروئن بننا کوئی آسان تو نہیں ہے اور وہ بھی اتنی بڑی بڑی ہیروئنوں کے مقابلے میں؟"

"ہاں، مشکل تو ہے" ہم جواب دیتے۔

"اور شمیم آرا کی تو پہلی فلم بُری طرح فلاپ بھی ہو چکی ہے" وہ تبصرہ کرتیں۔

"اس سے کیا ہوتا ہے، فلمیں تو فلاپ ہوتی ہی رہتی ہیں۔"

"مگر اس کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے ایکٹریسوں پر۔"

"ہاں، پڑتا تو ہے۔"

"تو پھر شمیم آرا کیسے ہیروئن بن سکتی ہیں؟" وہ دلیل پیش کرتیں۔

"اللہ مالک ہے" ہم گول مول جواب دیتے۔

الیاس رشیدی صاحب چپکے چپکے معنی خیز انداز میں ہماری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہتے تھے۔

واپسی پر وہ ہم سے کہتے "یار پتا نہیں، اس کے ذہن پر شمیم آرا کیوں سوار ہے۔ اس کی کیا فکر ہے اور دوسری ہیروئنیں بھی تو ہیں، ان کی اسے فکر ہی نہیں ہے۔"

شمیم آرا کے ہاں بھی اسی قسم کی گفتگو زیبا کے بارے میں ہوتی رہتی تھی۔ شمیم عموماً اس میں شریک نہیں ہوتی تھیں مگر ان کی نانی امّاں اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد یہی موضوع چھیڑ دیا کرتی تھیں۔

''یوں کہ الیاس صاحب' تمہاری زیبا سنا ہے' لاہور کی فلموں میں کام کریں گی؟''

''میری کیوں؟''

''بھئی آپ ان کی پبلسٹی بھی تو بہت کرتے ہیں۔ آسمان پر چڑھا دیا ہے کل کی لڑکی کو۔''

الیاس صاحب معنی خیز انداز میں زیرلب تبسّم سے ہماری طرف دیکھ کر کہتے ''کیوں نہ ہو۔ اپنے کراچی کی آرٹسٹ کو ہم پبلسٹی نہیں دیں گے تو اور کس کو دیں گے' شمیم کی کچھ کم پبلسٹی کی ہے۔''

''مگر آج کل ان ہی کی خبروں اور تصویروں سے نگار بھرا رہتا ہے'' وہ پان کی گلوری کے ساتھ ہی فقرہ بھی آگے بڑھا دیتی تھیں ''آفاقی۔ تم بتاؤ' کیا لاہور میں ہیروئنوں کی کمی ہے جو پروڈیوسر زیبا کے انتظار میں دن گن رہے ہیں؟''

ہم جواب میں کہتے ''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ہیروئنیں تو کئی ہیں مگر ماں جی' فلمیں بھی تو زیادہ بننے لگی ہیں۔ ہیرو اور ہیروئنوں کی ضرورت تو پڑی ہی رہتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر انہوں نے اپنی فلم میں کون سا تیر مارا ہے جو پروڈیوسر ان کے پیچھے بھاگیں گے؟''

''پہلی فلم سے کچھ فرق نہیں پڑتا'' الیاس صاحب ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے کہتے ''پہلی فلم تو شمیم کی بھی فلاپ ہو گئی تھی۔ آرٹسٹ میں صلاحیت ہونی چاہیے۔ کیوں آفاقی؟''

ہم جواب میں کہتے ''اور کیا۔ ٹیلنٹ ہو اور قسمت ساتھ دے تو فلاپ ایکٹر بھی سُپر ہٹ ہو جاتے ہیں۔''

شمیم آرا اس گفتگو سے اکتا کر بالآخر بیچ میں بول پڑتی تھیں ''چھوڑیں بھی ماں جی۔ ہمیں کسی سے کیا۔ ہر ایک کی قسمت اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ جو قسمت میں لکھا ہو گا' ہو جائے گا۔''

اس وقت نہ شمیم آرا کو معلوم تھا اور نہ ہی زیبا کو یہ علم تھا کہ قسمت کی دیوی ان دونوں پر مہربان ہونے کے لیے پر تول رہی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ان دونوں فن کاراؤں کو بھی عروج حاصل ہوا۔ دونوں باری باری لاہور آ کر آباد ہو گئیں اور

ہیر وئنوں کی صف ؔمیں امتیازی مقام حاصل کیا۔ شمیم آرا نے اپنی اداکاری کے بل پر نام پیدا کیا تو زیبا کی خوب صورتی نے انہیں شہرت کے آسمان تک پہنچا دیا۔

زیبا نے شادی سے پہلے ہی فلم سازی کا آغاز کر دیا تھا اور ان کی پہلی فلم ''صاعقہ'' نے دھومیں مچا دی تھیں۔ یہ فلم غیر ممالک کے فلمی میلوں میں بھی بھیجی گئی اور روس کی حکومت نے اسے خرید کر روسی زبان میں ڈب کر کے پیش کیا تو وہاں بھی اسے بے حد پسند کیا گیا۔

شہرت' مقبولیت' دولت ان دونوں کا مقدر بنی مگر ان کی باہمی چپقلش ہمیشہ جاری رہی' یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔

لیجئے 'کراچی کی ایک مشہور چیز تو ہم بھول ہی گئے۔ یہ بندو خاں کے کباب تھے۔ بلکہ اب بھی ہیں۔ بلکہ اب تو اس نام کی دکانیں لاہور میں بھی کھل گئی ہیں۔ خدا جانے ان کا اصلی بندو خاں سے کوئی تعلق ہے یا محض نام کی حد تک ان کی شہرت سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

کراچی پہنچتے ہی ہمارے مہربان دوستوں نے ہمارے لئے جن جگہوں پر جانا ضروری سمجھتے ہوئے جو فہرست مرتب کی تھی اس میں بندو خاں بھی شامل تھے۔

''یہ بندو خاں کون صاحب ہیں؟'' ہم نے طفیل احمد جمالی سے پوچھا۔

انہوں نے کہا ''یہ صاحب نہیں' کباب ہیں۔''

''کیا۔۔۔بندو خاں کبابوں کا نام ہے؟''

''بھئی تم تو بہت کوڑھ مغز انسان ہو۔ تم پاکستان میں رہتے ہو نا؟'' انہوں نے کہا۔

''بالکل۔''

''تو پھر بندو خاں کے کبابوں کا نام تک نہیں سنا' بڑی شرم کی بات ہے۔''

ابراہیم جلیس بولے ''واقعی۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ہاکس بے پر جا کر سمندر میں ڈوب مرتا۔''

ہم نے عرض کیا ”مگر لاہور میں کوئی بندو خاں کے کبابوں کو نہیں جانتا۔ وہاں اور بھی مشہور کباب والے ہیں مثلاً چونا منڈی کے کباب‘ گوالمنڈی کے کباب۔“

”بھئی مانتے ہیں کہ لاہور والے بہت خوش خوراک ہیں۔ وہاں کھانے پینے کی چیزوں کی بھی بڑی ورائٹی ہے مگر چٹ پٹی چیزوں میں کراچی کا جواب نہیں ہے۔ تم بہت لاہور لاہور کرتے ہو‘ یہ بتاؤ وہاں گولے کے کباب ہوتے ہیں؟“ انہوں نے کہا۔

”نہیں تو؟“

”یہاں ہوتے ہیں۔ ریوالی سینما جانے والی سڑک پر چل کر تمہیں کھلائیں گے۔ کیا یاد کرو گے۔“

”کیوں نہیں‘ کل ہی پروگرام بنالو“ الیاس صاحب نے تائید کی۔

”اور بندو خاں کے کباب تو یقیناً لاہور میں نہیں ہوتے اسلئے کہ وہاں بندو خاں ہی نہیں پائے جاتے۔ اس کے علاوہ چائنیز فوڈ جیسا کراچی میں ہوتا ہے وہ تم لاہور والوں کو کہاں نصیب ہے۔“

یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس وقت تک لاہور میں چائنیز کھانے کے ریستوران ہی صرف دو تھے اور وہ بھی بس واجبی سے۔ جبکہ کراچی میں بہت اچھے چائنیز ریستوران تھے۔

اسی شام ہم لوگ موٹر رکشوں میں سوار ہو کر بندو خاں کی دکان پر پہنچ گئے۔ یہ دکان لب سڑک ہی تھی۔ سڑک پر دور تک کاروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ اس وقت تک لاہور میں کاروں کی بہتات نہیں ہوئی تھی۔

”دیکھا تم نے“ جمالی صاحب نے کہا ”اتنی بہت سی کاریں دیکھی ہیں کبھی؟ یہ سب بندو خاں کے کباب کھانے آئی ہیں؟“

”کاریں؟“ ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

”بھئی تم واقعی اوّل نمبر کے کوڑھ مغز ہو۔ کاریں نہیں کاروں والے اور دیکھو کتنے صبر سے لائن میں کھڑی ہیں۔“

سامنے ہی کاؤنٹر پر کباب بن رہے تھے اور پراٹھے تلے جارہے تھے۔ نہایت اشتہا انگیز خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بندو خاں کو تو اشتہار دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ شہر کی ایک اہم سڑک پر ان کے کباب پراٹھوں کی مہکتی

ہوئی خوشبو سب سے مؤثر اور بڑا اشتہار تھی۔

اس کاؤنٹر یا باورچی خانے کے عقب میں میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ شوقین لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ بیرے بڑی پُھرتی اور مستعدی سے کباب پراٹھے اِدھر سے اُدھر لے جا رہے تھے۔ گرما گرم کباب پراٹھے بھوک کو اور بڑھا دیتے تھے۔ ہماری باری کافی دیر بعد آئی۔

ہم نے بے صبری سے پوچھا" کیا ان کبابوں کیلئے ایک دن پہلے آرڈر دینا پڑتا ہے؟"

بولے "صبر کرو۔ دیکھتے نہیں کتنی بھیڑ ہے۔ باری آنے پر کباب ملیں گے۔ بھائی یہ کراچی ہے' یہاں ڈسپلن کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔"

جب کباب اور سنکے ہوئے سرخ پراٹھے میز پر آئے تو ساری شکایت دور ہوگئی۔ بندو خاں کا کباب پراٹھا واقعی ایک مختلف اور منفرد چیز تھی۔

ہمیں یاد آیا کہ قیام پاکستان سے پہلے بھی ایک کباب پراٹھے والے سارے ہندوستان میں مشہور تھے۔ علی گڑھ کی نمائش مشہور تھی۔ اس نمائش کے دنوں میں علی گڑھ میں یہ کباب اور پراٹھے ایک نرالی خصوصیت سمجھے جاتے تھے۔ بہت سے لوگ صرف ان ہی کی خاطر نمائش میں جاتے تھے۔ ہندوستان کے طول وعرض میں جہاں کہیں کوئی نمائش لگتی تھی یہ صاحب وہاں پہنچ جاتے تھے۔ نام تو ان کا یاد نہیں ، علی گڑھ کے کباب پراٹھے والے کہلاتے تھے۔

ہم جب میرٹھ میں پڑھتے تھے تو وہاں بھی سال کے سال نوچندی کا میلہ لگتا تھا۔ دور دور سے دکاندار آتے تھے۔ شریک ہونے والے بھی اس کے انتظار میں رہتے تھے۔ اِدھر نوچندی کا میلہ شروع ہوا' اُدھر لوگوں نے اِدھر کا رخ کیا۔ صاحب حیثیت لوگ خیمے اور شامیانے لگا لیا کرتے تھے جہاں نشست و برخاست بلکہ سونے تک کا انتظام ہوتا تھا۔ سارا دن گھوم پھر کر وہاں آرام کیا جاتا تھا۔ نمائش میں دیر ہو جائے تو وہیں سو جاؤ۔ قسط 370 ختم

نوچندی کے میلے میں بھی علی گڑھ کے کباب پراٹھے بنانے والے بطور خاص شریک ہوتے تھے اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی نوچندی میں جائے اور یہ کباب پراٹھے نہ کھائے۔

چند سال قبل ہمیں معلوم ہوا کہ لاہور میں علی گڑھ ایسوسی ایشن کے تحت جو سکول قائم ہے وہاں بھی سال کے سال یہ

کباب پراٹھے پیش کئے جاتے ہیں۔ گویا کباب ساز بھی پاکستانی ہو گئے تھے۔ ہم نے خاص طور پر مسعود زیدی صاحب سے فرمائش کی کہ ہمیں بھی اس دعوت میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے تاکہ ہم بھی یہ کباب پراٹھے چکھ لیں۔ کھائے تو پتہ چلا کہ واقعی وہی لطف اور ذائقہ تھا۔ یہ وہی علی گڑھ کے کباب اور پراٹھے تھے۔ ہم نے یہ کباب پراٹھا چالیس پچاس سال کے بعد کھایا تھا۔

بندو خان کے کبابوں سے ہمیں ایک اور بندو خان یاد آ گئے۔

رات کو ہمارے ہوٹل میں محفل جمی تو کافی دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ وقفے وقفے سے لطیفہ بازی بھی جاری رہی۔

ہم نے حاضرین محفل سے پوچھا ''دوستو! ان بندو خاں کے علاوہ بھی کسی بندو خاں کو جانتے ہو؟''

بولے ''نہیں تو' ان کی دکان کہاں ہے؟''

ہم نے کہا ''ان کی کبابوں کی دکان نہیں ہے۔''

''تو پھر وہ کیا بیچتے ہیں؟'' کارٹونسٹ ابن حسن نگار صاحب نے ترنگ میں آ کر پوچھا۔

''وہ سارنگی بجاتے ہیں۔''

''ہاں۔ نام تو سنا ہے۔ سنا ہے سارنگی نواز ہیں تو سارنگی ہی بجاتے ہوں گے۔''

استاد بندو خاں اس وقت انتقال کر چکے تھے۔ ان کے بارے میں ماہرین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ برّصغیر نے ان کے پائے کا کوئی اور سارنگی نواز پیدا نہیں کیا۔ استاد بندو خاں کی پاکستان دوستی بھی ضرب المثل تھی۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کے دہلی سٹیشن پر کام کرتے تھے۔ پاکستان کا قیام عمل میں آتے ہی وہ 1947ء میں پاکستان چلے آئے' حالانکہ ان کے رُتبے اور ہنر مندی کے پیش نظر دہلی ریڈیو سٹیشن کے ذمّے دار افسروں' یہاں تک کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل جیسے کٹّر متعصّب ہندو وزیر نے بھی انہیں ہندوستان میں روکنے کی بے حد کوشش کی اور اس کے عوض مالی فوائد کے لالچ بھی دیئے مگر خان صاحب نے کسی کی ایک نہ سنی۔ سارنگی سنبھالی اور لاہور پہنچ گئے۔

قیام پاکستان کے وقت اس ملک میں صرف تین ریڈیو سٹیشن تھے۔ ایک لاہور میں' دوسرا پشاور میں اور تیسرا ڈھاکا

میں۔دوسرے تمام ریڈیو سٹیشن بعد میں قائم ہوئے تھے۔استاد بندو خاں دہلی سے لاہور چلے آئے تھے۔یہاں دل نہ لگاتو کچھ عرصے بعد حیدر آباد سندھ چلے گئے جہاں اس وقت ریڈیو سٹیشن قائم ہو چکا تھا۔حیدر آباد سے نقل وطن کر کے وہ کراچی چلے گئےاور مرتے دم تک وہیں رہے۔وہ ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ تھےاورانتہائی قلیل معاوضے پر کام کرتے تھے لیکن بھارتی لیڈروں اور حکام کے فائدہ مند پیغامات کے باوجودانہوں نے پاکستان کی سرزمین کو چھوڑناپسند نہ کیا۔وہ بہت محبوب وطن پاکستانی تھے۔جب وہ لاہور آئے تو اسی زمانے میں بھارت سےاور بھی کئی ممتاز ماہرین موسیقی اور سازندے بھی یہاں آچکے تھے جن میں حامد حسین خاں' نتّھو خاں' حیدر بخش خالواور استاد نبی بخش جیسے ماہرین فن بھی شامل تھے مگراستاد بندو خاں نے اپنے فن کے ذریعے اس ملک کی جو خدمت کی اس کے سبھی معترف اور مدّاح ہیں۔بھارت سے انہیں لالچ دلانے کی بہت بڑے معاوضوں اور دوسرے مالی فوائد کی بار بار پیشکش کی گئی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔روکھی سوکھی کھاکر گزر بسر کرتے رہے یہاں تک کہ کراچی میں 1955ء میں انتقال کر گئے۔انتقال کے وقت ان کی عمر 73 سال کے لگ بھگ تھی۔اس کے باوجود وہ آخر دم تک سارنگی سے سننے والوں کو مسحور کرتے رہے۔

آج کی نسل میں شاید کوئی ان کے نام تک سے واقف نہیں ہے کیونکہ پوپ موسیقی نے نوجوانوں کو اپنے بے ہنگم ردھم کے شکنجے میں جکڑ لیاہےاور وہ مشرق کی کلاسیکی موسیقی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے' جانتے تو وہ مغرب کی موسیقی کے بارے میں بھی نہیں ہیں مگر وہ نسبتاً بہت آسان ہے اسلئے اسی کے شیدائی ہیں۔

استاد بندو خاں خاندانی موسیقاروں کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ان کا سن پیدائش 1882ء ہے۔ان کے والد استاد علی جان خاں خود کبھی موسیقی کے استاد تھے۔ابتدائی تربیت ان ہی سے حاصل کی لیکن ان کو تراشنے میں سب سے نمایاں ہاتھ استاد مامون خاں کا تھا جنہوں نے بعد میں ان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی تھی۔

استاد مامون خاں بذات خود بہت بڑے سارنگی نواز تھے۔سُر ساگران ہی کی ایجاد ہے۔بندو خاں کو سارنگی اور دوسرے سازوں سے عشق تھا۔سیکھنے کی خاطر انہوں نے ہندوستان بھر کی خاک چھان ماری۔جہاں سے کسی ہنر مند کے بارے میں خبر آتی تھی۔وہیں پہنچ جاتے تھے۔

ایک دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ استاد بندو خاں نے سارنگی بجانے میں تو کمال حاصل کر لیا تھا مگر وہ اس میں نت نئی تبدیلیاں کرنے کے بارے میں بھی سوچتے۔ انہوں نے سارنگی میں کئی تبدیلیاں کیں۔ سارنگی کے تاروں کی تعداد انہوں نے 34 سے گھٹا کر 12 کر دی جس کی وجہ سے اس کی دلکشی اور سُریلے پن میں اضافہ ہو گیا۔

سارنگی کا لفظ دراصل ''سو رنگی'' سے نکلا ہے۔ یعنی اس ساز سے سو مختلف آوازیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ جب استاد بندو خاں دہلی ریڈیو سٹیشن سے وابستہ تھے تو کسی نے ان کی سارنگی کو ریکارڈ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی مگر جب وہ پاکستان چلے آئے تو بھارت والوں کو ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا اور انہوں نے ریڈیو پاکستان سے درخواست کی کہ استاد بندو خاں کی سارنگی نوازی کے ریکارڈ انہیں بھیج دیئے جائیں مگر ان کی یہ درخواست منظور نہ کی گئی۔

استاد بُندو خاں نے اپنی تعلیم اور تربیت کا آغاز آٹھ سال کی عمر میں کیا تھا اور نوجوانی میں ہی نام پیدا کر لیا تھا۔ وہ بہت معصوم اور سادہ دل انسان تھے۔ اپنے دوسرے ہم عصر استادوں کے برعکس وہ دوسروں کو یہ فن سکھانے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے کلاسیکی موسیقی کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام ''جوہرِ موسیقی'' ہے۔ یہ کتاب اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کی گئی ہے تاکہ سبھی اس سے فیض یاب ہو سکیں۔

استاد کی یہ عادت تھی کہ جب محفل میں سارنگی نوازی کا مظاہرہ کرتے تھے تو سُر کے بارے میں معلومات بھی فراہم کرتے جاتے تھے۔ بڑے بڑے دینی سکالر بھی ان کے مدّاح اور مُعترف تھے۔ ان کی انفرادیت یہ تھی کہ وہ نہ صرف سارنگی بجانے میں ماہر تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کلاسیکی موسیقی پر بھی پورا عبور رکھتے تھے۔

بُندو خاں کو یہ کمال حاصل تھا کہ وہ سارنگی کی مدد سے مختلف سُریلی اور نازک آوازیں نکال سکتے تھے جو کہ عام طور پر سازوں کے ذریعے نہیں پیدا کی جاسکتیں۔

بدقسمتی یہ ہے کہ سارنگی اپنی تمام تر نفاست دلکشی اور سُریلے پن کے باوجود اب ایک متروک ساز بن کر رہ گئی ہے۔ نئی نسل میں سارنگی پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ میوزیکل آرکسٹرا میں بھی اس کی ضرورت کم ہی محسوس ہوتی ہے۔ جہاں تک ماڈرن موسیقی کا تعلق ہے تو اس میں تو سارنگی کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

استاد بُندو خاں پاکستان میں زیادہ ناموری بھی نہ حاصل کر سکے نہ ہی مالی طور پر خوشحال ہوئے۔ بہت تنگی ترشی سے

گزارا کرتے تھے۔ تمام تر قدر دانی زبانی جمع خرچ اور واہ واہ تک ہی محدود تھی۔ ایسے مایہ ناز ہنر مند کی بے قدری اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ بُندو خاں کباب والے کو بے شمار لوگ جانتے ہیں مگر بُندو خاں سارنگی نواز کے نام سے کوئی واقف نہیں ہے۔

قدرت انسان کو اپنی خود مختاری کے عجیب عجیب نمونے دکھاتی ہے مگر حضرت انسان اس سے کوئی سبق یا عبرت حاصل نہیں کرتے۔ ذرا سا اقتدار، اختیار یا دولت مل جائے تو یہ خود کو زمین پر خدا سمجھنے لگتے ہیں اور دوسرے انسانوں کو مُشتِ خاک کی حیثیت دیتے ہیں حالانکہ طاقت ور ترین اور دنیا میں بااختیار ترین انسان بھی اللہ کے سامنے بے حیثیت اور بے اختیار ہوتا ہے۔

کچھ سال پہلے ہالی وڈ کے معروف اداکار کرسٹوفر ریو کے بارے میں پڑھا اور ان کی ایک تصویر دیکھی تو انسان کی بے طاقتی اور محتاجی کا ایک اور منظر سامنے آ گیا۔ کرسٹوفر ریو صاحب نے ''سُپر مین'' فلموں کی سیریز کے ذریعے دنیا بھر میں شہرت حاصل کی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ''سُپر مین'' نے ساری دنیا کے بچّوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ہر بچّہ سُپر مین بننے کا خواہاں اور آرزو مند تھا۔ ماں باپ بچّوں کو کسی کام پر آمادہ کرنے کے لیے سُپر مین کی مثال دیا کرتے تھے اور یہ ڈراوا دیتے تھے کہ دیکھو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو سُپر مین کیسے بنو گے؟

سُپر مین ایک خیالی فلمی کردار سہی مگر اس فلم کے اداکار کو حقیقی زندگی میں جو شہرت اور دولت حاصل ہوئی وہ زمانۂ جدید میں ایک انوکھی مثال ہے۔ بچّوں کی فلموں کے کردار عموماً اس طرح عالمگیر شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں کرتے مگر سُپر مین کو ایسی عظمت و شہرت ملی کہ وہ ضرب المثل بن گیا۔ کرسٹوفر ریو کا معاوضہ کروڑوں تک پہنچ گیا۔ بچّوں کے نزدیک وہ در حقیقت ایک طاقت ور ترین شخص تھا جو ناممکن کو بھی ممکن بنانے کی قوّت اور اہلیت رکھتا تھا۔ اسکرین پر سُپر مین کو دیکھتے ہی سب مطمئن ہو جاتے تھے کہ بس اب سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔

یہ سُپر مین ایک حادثے میں گھوڑے سے گر کر زخمی ہوا اور ریڑھ کی ہڈی پر ایسی چوٹ آئی کہ سارا جسم معذور ہو کر رہ گیا۔ دنیا کے بہترین ڈاکٹر علاج معالجے کے لیے میّسر تھے۔ دنیا بھر میں بچّے اور بڑے سب اس کی صحت یابی کے لیے دعا کر رہے تھے مگر سُپر مین ایک بے حس و حرکت زندہ لاش بن کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سوا جسم کے کسی بھی

حصّے کو حرکت دینے سے معذور تھا۔ یہاں تک کہ انگلی تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ طویل عرصے تک جدید ترین علاج اور سائنس کی مہیّا کردہ سہولتوں کے بعد بھی سُپر مین کا جسم بے حس و حرکت رہا مگر اس نے سُپر مین ہونے کا ثبوت دیا۔ اس نے اپنی قوتِ ارادی کے بل پر اس معذوری کے باوجود ایکسر سائز کے ذریعے خود کو بے کارِ محض ہونے سے بچالیا۔ اس کا جسم بے کار تھا لیکن ذہن بیدار تھا۔ چنانچہ اس نے خود کو مصروف رکھنے کے لئے ایک فلم کی ہدایتکاری کرنے کی ٹھانی۔ وہ بستر اور وہیل چیئر تک محدود رہنے کے باوجود فلم کا ہدایتکار بن گیا۔۔اور اس کی فلم نے نمایاں کامیابی حاصل کرلی۔ اسکے بعد وہ دوسری فلم بنانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اس کے پاس مال و دولت کی کمی نہیں ہے۔ وسیع و عریض کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا اور قدرتی مناظر میں گھرا ہوا انتہائی خوبصورت اور آرام دہ گھر تھا۔ دولت تھی، عزّت تھی، مقبولیت اور شہرت تھی۔ غرضیکہ دنیا کی ہر نعمت میّسر تھی مگر وہ اپنے جسم کو حرکت دینے سے معذور تھا۔ اس کے دماغ اور آنکھوں ہی میں زندگی ہے، باقی جسم مردہ سمجھ لیجئے۔ وہ پھر بھی زندگی کی جدوجہد اور مصروفیات میں لگا ہوا ہے۔ اپنے محیّر العقول کارناموں کے باوجود وہ ایک عام انسان تھا مگر حالات کے آگے ہار نہ مان کر اس نے خود کو صحیح معنوں میں سُپر مین ثابت کر دیا۔ یہاں تک کہ وفات پا گیا۔ مگر سُپر مین کی اس داستان کے پیچھے ایک اور حقیقت بھی نمایاں ہے وہ یہ کہ انسان کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہیں ہے جو مشیّتِ ایزدی کے اشاروں پر چلتا ہے۔ اس کے بغیر وہ ایک مُشتِ خاک سے زیادہ نہیں ہے۔

فلمی دنیا میں حادثات رونما ہوتے رہے ہیں جن کے باعث کئی ممتاز فنکار موت کی آغوش میں پہنچ گئے یا عمر بھر کے لیے معذور و اپاہج ہو کر رہ گئے۔ پچھلے دنوں ایک بہت پرانی بھارتی فلم ٹیلی وژن پر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اداکارہ ثریا گانے اور ناچنے میں مصروف تھیں۔ پرانے انداز کے لباس میں ایک شخص سامنے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ فلم کا ہیرو تھا جس کو لُبھانے کی خاطر فلم کی ہیروئن مصروفِ رقص تھی۔ ثریا کو تو سب نے پہچان لیا مگر ہیرو کو پہچاننا بہت دشوار تھا۔ آخر ہماری مدد حاصل کی گئی کہ دیکھئے اور پہچان کر بتایئے کہ یہ ہیرو کون سا اداکار ہے؟

ہم نے ایک نظر ڈالی اور پہچان گئے۔ یہ اداکار شیام تھے۔ اپنے دور کے سُپر سٹار اور مقبول ترین اداکار۔ جس کی مردانہ وجاہت، زندہ دلی اور رنگین مزاجی اس زمانے میں فلمی حلقوں میں موضوع بحث رہا کرتی تھی۔ سعادت حسن منٹو نے

جب روزنامہ آفاق میں خاکے لکھنے شروع کئے توان میں ایک کہانی میں شیام بھی نمایاں کردار تھے۔شیام سعادت حسن منٹو کے بے تکلّف دوست اور شام کی محفلوں کے شریک تھے۔دل پھینک آدمی تھے،خوبرواور وجیہہ تھے۔ تعلیم یافتہ تھے،دراز قامت اور متناسب الاعضا تھے۔ان کی اداکاری تصنّع سے پاک تھی۔یوں لگتا تھا کہ جیسے عام زندگی میں باتیں کررہے ہیں۔ان تمام خوبیوں نے شیام کواس دور کی ایک مقبول فلمی شخصیّت بنادیا تھا۔ان کی فلمیں بھی زیادہ تر کامیاب ہی رہیں۔اردو، پنجابی دونوں زبانوں کی فلموں میں کام کرتے تھے لیکن ان کی شُہرت زیادہ اردو فلموں کی بناپر ہوئی تھی۔

شیام کی فلموں میں مجبور،دل لگی،شکایت،بازار،چاردن،دادا،مینابازار، چاندنی رات،پتنگا،مداری،چھوٹی بھابی،کالے بادل،رات کی رانی،بھائیا جی، سنگیتااور شبستان جیسی فلمیں بھی شامل ہیں۔شبستان ان کی آخری فلم تھی۔اس فلم کی شوٹنگ کے دوران میں وہ گھوڑے سے گر کر شدید زخمی ہوگئے تھے اور ڈاکٹروں کی کوئی بھی کوشش انہیں زندگی دینے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ ان کے دماغ کی نَس پھٹ گئی تھی جس کی وجہ سے ان کا دماغی توازن بے قابو ہو گیا تھا۔وہ نیم بیہوشی کے عالم میں تھے مگر بہت جارحانہ حرکتیں کررہے تھے۔انہیں بیہوش کرنے کے لیے کئی انجکشن لگائے گئے مگر وہ بیہوش ہونے کی بجائے ہمیشہ کی نیند سوگئے۔اس طرح ممبئی کی فلمی صنعت ایک مقبول اور معروف ہیرو سے محروم ہوگئی۔

شیام تو دنیا سے رخصت ہوگئے مگر اپنے پیچھے ایسی ہستیاں چھوڑ گئے جن کی بدولت پاکستان میں بھی ان کے نام کا سلسلہ چل رہا ہے۔ٹی وی کی مقبول اداکارہ اور پروڈیوسر ساحرہ کاظمی اداکار شیام ہی کی صاحبزادی ہیں۔آج کے بہت سے لوگوں کو غالباًاس کہانی کا علم نہیں ہے مگر ضروری ہے کہ انہیں اس سے آگاہ کیا جائے۔

کئی سال پہلے کی بات ہے جب ساحرہ کاظمی اور راحت کاظمی کی بیٹی نداکاظمی نے ٹی وی کے ڈرامے میں اداکارہ کے طور پر حصّہ لیا تو وہ اپنی نسل کی تیسری اداکارہ تھیں۔آگے چل کر شوبزنس میں یہ خاندان کیا کارنامے سرانجام دے گا؟اس کا جواب وقت ہی دے گا مگر اب تک کا حاصل جمع بیان کرنا نامناسب ہو گا۔

شیام کا تعلق راولپنڈی سے تھا۔انہوں نے تعلیم بھی وہیں حاصل کی تھی مگر فلمی زندگی کا آغاز لاہور سے کیا تھا۔خوب

صورت اور جامہ زیب آدمی تھے۔ شگفتہ مزاج اور زندہ دل بھی تھے۔ لاہور کی فلمی دنیا میں جب قسمت آزمائی کے لیے پہنچے تو بہت جلد لوگوں کی نظروں میں آ گئے۔ ان کی پہلی فلم پنجابی زبان میں تھی جس کا نام ''گوانڈی'' تھا۔ اس فلم کی ہیروئن وینا تھیں جو اپنے حُسن و جمال اور شاہانہ انداز کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں۔

وینا نے ایک زمانے میں لاہور اور ممبئی کی فلمی دنیا میں بہت دھوم مچائی تھی۔ اپنے رومانوی کرداروں کے حوالے سے بھی انہوں نے بہت شہرت حاصل کی تھی اور شادیوں کے حوالے سے بھی۔ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد ساری زندگی بھارت ہی میں گزار دی حالانکہ ان کا تعلق پاکستانی پنجاب سے تھا۔

شیام آغاز ہی سے دل پھینک طبیعت کے مالک تھے۔ لاہور کی فلمی دنیا میں ان کا پہلا واسطہ اداکارہ کلدیپ کور سے پڑا تھا۔ کلدیپ کور جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، سکھ تھیں۔ شکل و صورت بہت اچھی تھی مگر انداز ویمپ کا تھا۔ اس لیے انہوں نے ویمپ کے کرداروں میں بہت شہرت حاصل کی تھی۔ کلدیپ کور کے ساتھ شیام کی وابستگی اتنی زیادہ تھی کہ جب انہوں نے قسمت آزمائی کی غرض سے ممبئی کا رخ کیا تو شیام نے بھی ان کے ساتھ ہی رختِ سفر باندھ لیا۔

ممبئی کے فلمی پرستان میں شیام کو اور بھی کئی پریاں نظر آ گئیں چنانچہ انہوں نے کلدیپ کور سے پرانا تعلق ختم کر کے نئی دوستیاں قائم کر لیں۔ کلدیپ کور کون سی ان کے نام پر وقف ہو چکی تھیں۔ انہوں نے بھی نئی چراگاہیں تلاش کر لیں۔ اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے سے آزاد و بے تعلق ہو گئے۔

ممبئی میں شیام کے رومانی تعلقات کے حوالے سے کئی فلم ایکٹریسوں کا نام لیا جاتا رہا جن میں نگار سلطانہ بھی شامل تھیں۔ نگار سلطانہ بھی مزاج اور طبیعت کے حساب سے عورتوں کی شیام ہی تھیں۔ وہ کبھی ڈال ڈال، کبھی پات پات محوِ پرواز رہا کرتی تھیں۔ شیام کے سکینڈلز تو بہت سے بنے مگر انہوں نے اپنی شریکِ حیات بنانے کے لیے جس ہستی کا انتخاب کیا وہ تاج قریشی تھیں جو فلمی حلقوں میں تاجی کے نام سے جانی جاتی تھیں۔

تاجی کوئی بڑی اور معروف اداکارہ نہیں تھیں۔ چند فلموں میں انہوں نے معمولی کردار کئے تھے۔ اداکار ظہور راجا سے

غالباًان کی شادی بھی ہوئی تھی مگر جب شیام ان کی زندگی میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنی باقی زندگی شیام کے نام وقف کر دی اور شیام سے شادی کر لی۔

شیام اور تاجی کی پہلی ملاقات لاہور کے فلیٹیز ہوٹل کی ایک تقریب میں ہوئی تھی جس میں تاجی اپنی بہن زیب قریشی کے ہمراہ شریک تھیں۔ زیب قریشی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوبصورت دوشیزہ تھیں۔ انہوں نے صرف ایک فلم میں کام کیا تھا جو ہدایت کار محبوب نے ''انوکھی ادا'' کے نام سے بنائی تھی۔ اس فلم کی ہیروئن پری چہرہ نسیم بانو تھیں۔ بعد میں یہ دونوں بہنیں لاہور سے ممبئی چلی گئی تھیں۔

شیام سے شادی کے بعد تاجی اور شیام ایک خوش و خرّم زندگی بسر کر رہے تھے کہ 1950ء میں اچانک وہ حادثہ پیش آیا جس نے شیام کی زندگی کا سفر مختصر کر دیا اور تاجی کو زندگی کی نئی راہوں پر ڈال دیا۔

اپریل کا مہینہ تھا۔ فلمستان کی فلم ''شبستان'' کی شوٹنگ کی غرض سے شیام اور نسیم بانو لوکیشن پر گئے ہوئے تھے جو ممبئی سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر تھی۔ ایس مکرجی اس فلم کے ہدایت کار تھے۔ منظر یہ تھا کہ فلم کا ہیرو شیام اپنی محبوبہ (نسیم بانو) سے ملاقات کے لیے ایک مقام پر جاتا ہے۔ فلم کے ویلن (سپرو) کو اس کا علم ہو جاتا ہے اور وہ اسے گھیرنے کی کوشش کرتا ہے مگر شیام گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جاتا اور ویلن کے ہاتھ نہیں آتا۔ اس سین کے لیے فلم ساز کو تربیت یافتہ گھوڑا نہ مل سکا تو انہوں نے ایک نئے گھوڑے کا بندوبست کیا۔

شیام بہت اچھا گھڑ سوار تھا اور منہ زور گھوڑوں کو بھی قابو میں کر لیا کرتا تھا مگر اس روز یہ اناڑی گھوڑا اس کے قابو میں نہ آسکا

جب شاٹ فلمانے کے لیے شیام نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا تو اچانک توازن بگڑ گیا۔ اس نے بھاگتے ہوئے گھوڑے کو روکنے اور خود سنبھلنے کی کوشش کی مگر فلم یونٹ کے ارکان یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئے کہ شیام کا ایک پاؤں رکاب میں سے نکل چکا ہے اور وہ گھوڑے کی ایک جانب جھکا ہوا ہے۔ کوشش کے باوجود وہ نہ سنبھل سکا اور گھوڑے سے نیچے گر گیا مگر ستم یہ ہوا کہ اس کے باوجود گھوڑا نہ رکا اور شیام کو گھسیٹتا ہوا کافی دور تک لے گیا۔ لوگوں نے دوڑ کر گھوڑے کو روکا تو پتا چلا کہ ایک طرف کی رکاب کا بند ٹوٹ گیا تھا۔ شیام کا دوسرا پیر دوسری رکاب میں پھنس گیا تھا جس کی وجہ سے

وہ زمین پر گر جانے کے بعد بھی نہ سنبھل سکا تھا۔اس کے سر سے خون جاری تھا اور وہ بے ہوش تھا۔فلم والوں کی روایت کے مطابق فلم یونٹ کے پاس فرسٹ ایڈ کا کوئی سامان نہ تھا ور نہ ابتدائی طبّی امداد دی جاسکتی تھی۔

شیام کو فوری طور پر ایک قریبی پرائیویٹ ہسپتال میں لے جایا گیا۔یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے ممبئ میں پھیل گئی اور شیام کے پرستار ہسپتال پہنچ گئے۔ شیام پر جارحانہ کیفیت طاری تھی۔پُر سکون کرنے کے لیے ڈاکٹروں نے کئی انجکشن لگائے جس کے بعد وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں رہے اور پھر انتقال کر گئے۔
بھارت کی فلم انڈسٹری میں اس اچانک موت نے ہلچل مچادی تھی کیونکہ شیام اس وقت کا مشہور ہیرو تھا اور کئی فلموں میں کام کر رہا تھا۔

شیام کی موت نے تاج قریشی عرف تاجی کو بے سہارا کر دیا تھا۔شیام سے تاجی کی دو اولادیں تھیں۔ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔یہ لڑکی آج ساحرہ کاظمی کے نام سے مشہور ہے۔
شیام کی موت کے بعد دلیپ کمار نے مالی مدد کی غرض سے تاجی کو اپنی پرائیویٹ سیکرٹری بنالیا تھا۔فلموں میں تاجی کا کوئی مستقبل نہ تھا اس لیے دونوں بہنوں نے لاہور کا رخ کیا۔یہاں زیب قریشی نے ایک پاکستانی فلم میں کام بھی کیا تھا مگر اداکارہ کے طور پر مقامی فلمی صنعت میں کوئی مقام نہ بنا سکیں۔تاجی نے ایک اعلیٰ سرکاری ملازم انصاری صاحب سے شادی کرلی تھی جنہوں نے تاجی کے دونوں بچوں کو نہ صرف اولاد کی طرح پالا بلکہ انہیں اپنا نام بھی دیا۔یہی وجہ ہے کہ ساحرہ شادی سے پہلے ساحرہ انصاری کہلاتی تھیں۔انصاری صاحب کو اپنی ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں میں رہنا پڑتا تھا مگر ساحرہ کو انہوں نے تعلیم و تربیت کے خیال سے کراچی میں چھوڑ دیا تھا جہاں انہوں نے زیادہ وقت گزارا۔کراچی کے اعلیٰ اور مہنگے ترین سکولوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ساحرہ نے کراچی کے بہترین گرلز کالج سینٹ جوزف سے بی اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ساحرہ کو اداکاری کا بچپن ہی سے شوق تھا اور کیوں نہ ہوتا،وہ ایک معروف اداکار باپ کی بیٹھی تھیں۔ان کی والدہ اور خالہ بھی اداکاری کے میدان میں سر گرم رہ چکی تھیں۔اس

طرح اداکاری کے جراثیم انہوں نے ورثے میں پائے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی ساحرہ نے ڈراموں میں حصّہ لیا تھا اور بہت اچھی اداکارہ کہلاتی تھیں۔ وہ کالج کی ڈرامیٹک سوسائٹی کی سیکرٹری بھی رہ چکی ہیں۔

انصاری صاحب سے شادی کے بعد تاجی نے دو بچّوں کو جنم دیا جن میں ایک لڑکا ہے اور دوسری لڑکی۔ لڑکی کا نام زینت انصاری اور لڑکے کا شاکر انصاری ہے۔ ساحرہ کے حقیقی بھائی ڈاکٹر ہیں اور بیرون ملک رہتے ہیں۔ شوبزنس کی جانب سب سے پہلے ساحرہ کے بھائی شاکر انصاری نے رُخ کیا تھا۔ وہ انگریزی کے نیوز ریڈر تھے۔ حالانکہ اس زمانے میں وہ نوعمر تھے اور سکول کے طالب علم تھے۔ انہیں پاکستان ٹیلیویژن کے سب سے کم عمر نیوز ریڈر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی ساحرہ انصاری بھی ٹیلیویژن سے نیوز ریڈر کے طور پر وابستہ ہو گئی تھیں لیکن وہ اداکارہ اور بالآخر پروڈیوسر بننے کی خواہش مند تھیں۔ اللہ نے ان کی یہ دونوں خواہشیں پوری کرادیں۔ انہوں نے ٹی وی ڈراموں میں کام کیا اور اپنی اداکاری کا لوہا منوالیا۔ پروڈیوسر کے طور پر انہوں نے جو ڈرامے اور دیگر پروگرام پیش کئے ہیں وہ بھی انتہائی معیاری اور منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ساحرہ اسلام آباد چلی گئی تھیں جہاں ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے والد انصاری صاحب نے مستقل رہائش اختیار کرلی تھی۔

ساحرہ کو اداکاری کی ترغیب دینے والے ظفر صمدانی تھے۔ (آج انکے صاحبزادے عروج صمدانی الیکٹرانک میڈیا میں نمایاں نام ہیں)۔ وہ اُس زمانے میں راولپنڈی اسلام آباد ٹیلیویژن سنٹر کے جنرل منیجر تھے۔ صمدانی صاحب بلند مرتبہ صحافی تھے اور انہیں باصلاحیت افراد کو جانچنے کا ہنر بھی آتا تھا۔ انہوں نے ساحرہ کو اداکاری کرنے پر اُکسایا۔
اسلام آباد سنٹر سے جب ڈرامہ ”قربتیں اور فاصلے“ پیش کیا گیا تو اس میں ساحرہ کو ہیروئن کی حیثیت سے کاسٹ کر لیا گیا۔ راحت کاظمی اس سیریل کے ہیرو منتخب کئے گئے تھے۔ یہ 1971ء کا واقعہ ہے جب ان دونوں نے قربتیں اور فاصلے میں ایک دوسرے کے بالمقابل اداکاری کا مظاہرہ کیا اور نہ صرف اس ڈرامے کو بلکہ اس جوڑی کو بھی بے انتہا پسند کیا گیا۔ ڈرامے کی قربتیں آگے چل کر مستقل قربت کا ذریعہ بن گئیں اور ان دونوں کی شادی ہوگئی جس کے بعد ساحرہ انصاری، ساحرہ کاظمی بن گئیں۔

قربتیں اور فاصلے کی کامیابی اور بے انتہا مقبولیت کے بعد ان دونوں نے چند اور ڈراموں میں بھی یکجا کام کیا جن میں ''تیسرا کنارہ'' اور ''پرچھائیں ''سر فہرست ہیں۔1974ء میں ساحرہ اور راحت کاظمی کی شادی ہوئی تھی۔
راحت کاظمی کے والدین ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے اور مستقل طور پر راولپنڈی میں آباد ہو گئے تھے۔

راحت نے راولپنڈی ہی میں تعلیم مکمل کی اور پھر مقابلے کے امتحان میں سی ایس پی بننے کے بعد وزارت خارجہ سے منسلک ہو گئے۔جب انہوں نے ٹی وی اور بعد میں فلمی صنعت سے وابستگی اختیار کی تو وزارت خارجہ کی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔انہوں نے ٹی وی میں اداکاری کے علاوہ کمپیئر نگ بھی کی۔''ننگے پاؤں ''اداکاری کی حیثیت سے ان کا آخری ڈرامہ تھا۔انہوں نے کئی مقبول اور اعلیٰ معیاری ٹی وی ڈراموں میں کام کیا اور داد و تحسین حاصل کی۔اب کافی عرصے سے وہ اور ساحرہ کاظمی کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔کچھ عرصہ وہ لاہور میں بھی رہے مگر فی الحال مستقل ٹھکانا کراچی ہی کو بنایا ہے۔یہ دونوں میاں بیوی باصلاحیت' ذہین اور تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔
ساحرہ نے نیوز ریڈر 'اداکارہ اور پروڈیوسر کے طور پر اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کرالیا ہے۔راحت کاظمی نے بھی مصنّف' اداکار اور بہت اچھے منتظم کی حیثیت سے اپنا مقام بنایا ہے۔انہوں نے جرائد کی ادارت بھی کی ہے۔انتہائی ذہین اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔انہوں نے فلموں میں اداکاری بھی کی ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں اداکار کے طور پر اپنی فلموں میں کام کرنے کیلئے ہم نے بطور خاص اسلام آباد سے بلایا تھا مگر بعض وجوہ کی بنا پر وہ ہماری فلم میں کام نہ کر سکے اور ایس سلیمان کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔

راحت کاظمی نے ایس سلیمان کی دو فلموں میں کام کیا جن میں سے ایک ''آج کل'' اور دوسری ''انسانیت'' ہے۔
انہوں نے ریاض احمد کی فلم ''خاندان'' میں بھی اداکاری کی تھی مگر فلمیں راحت کاظمی کو راس نہ آئیں اور انہوں نے فلموں سے مستقل طور پر کنارہ کر لیا۔

اداکار شیام کے سلسلے میں ایک معروف اداکارہ نگار سلطانہ کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ نگار سلطانہ ایک زمانے میں بمبئی کی فلمی صنعت کی نمایاں ہیروئن تھیں مگر انہوں نے اداکاری کے مقابلے میں دوسرے مشاغل پر زیادہ توّجہ دی جس کی وجہ سے وہ فلمی صنعت میں ممتاز مقام حاصل نہ کر سکیں۔ نگار سلطانہ 2000ء میں انتقال کر گئی تھیں۔ بد قسمتی سے بمبئی کی فلمی صنعت میں جو معدودے چند مسلمان تعلیم یافتہ اور اچھے خاندان سے تعلق رکھنے والی اداکارائیں نمایاں ہوئیں انہوں نے اچھے کردار کا مظاہرہ نہیں کیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو شرمندگی اٹھانی پڑی۔ ایک زمانے میں یہ رجحان بہت عام تھا کہ کسی ایک مسلمان اداکارہ کے حوالے سے ہندو پریس اور فلم بین مسلمانوں کو شرمندہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ جب بیگم پارہ فلمی دنیا سے وابستہ ہوئی تھیں تو انہوں نے بھی جگ ہنسائی کا موقع فراہم کیا تھا۔ نگار سلطانہ کی داستان بھی مختلف نہیں ہے۔

نگار سلطانہ کا اصلی نام بھی یہی تھا۔ ان کا تعلق حیدر آباد دکن کے ایک نہایت شریف اور معزز گھرانے سے تھا۔ ان کے والد فوج میں کیپٹن تھے مگر ریٹائرمنٹ کے بعد جوئے اور ریس کی لت پڑ گئی۔ اس کے ساتھ دوسری ''بدعتیں'' بھی لاحق ہو جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا اور وہ اپنی اولاد کی مناسب تعلیم و تربیت پر توجّہ نہ دے سکے جس کا عبرت آموز نتیجہ نگار سلطانہ کی صورت میں سب کے سامنے آیا۔

والد نے سب کچھ لٹا دیا تو بیٹیاں جوان ہو گئیں۔ نگار سلطانہ تین بہنیں تھیں۔ بڑی بہن کی شادی حیدر آباد کے ایک کاروباری شخص سے ہوئی تھی۔ نگار سلطانہ نو عمری سے ہی آزاد خیال اور ہٹ دھرم تھیں۔ حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ نگار سلطانہ کی شادی ایک بوڑھے موٹر ڈرائیور سے کر دی گئی۔ نگار ایک نہایت حسین و جمیل دوشیزہ تھیں۔ تعلیم معمولی سہی مگر حسن و جمال اور رعنائی میں ہزاروں میں ایک تھیں لیکن حالات کے جبر کے آگے مجبور ہو کر باپ نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ اس وقت ان کی مالی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی اور نگار سلطانہ کی آزاد مزاجی کے پیشِ نظر وہ جلد سے جلد بیٹی کا بوجھ اتارنا چاہتے تھے۔ اس موٹر ڈرائیور سے نگار سلطانہ کا ایک بچّہ بھی ہے۔

نگار جیسی اونچی پرواز والی حسینہ کے لئے شادی کا یہ بندھن قید کی زنجیر سے کم نہ تھا۔ کچھ عرصے بعد ان کی والدہ چل

بسیں۔ وہ شاید اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے والدہ کی آنکھ بند ہوتے ہی اپنے شوہر سے طلاق حاصل کرلی اور چمک دمک کی دنیا میں نام اور پیسہ کمانے کے شوق میں بمبئی پہنچ گئی۔

بمبئی کی فلمی صنعت میں حیدر آباد دکن سے تعلق رکھنے والے چند ممتاز افراد بھی موجود تھے۔ جے راج، کے این سنگھ اور جگدیش سیٹھی نگار کے والد کے دوست اور شناسا بھی تھے۔ نگار سلطانہ نے ان کی سفارش سے فلمی دنیا میں پیر پھیلانے کا فیصلہ کیا اور فلم ساز وہدایتکار ایم بھونانی کی فلم ''رنگ بھومی'' میں نگار سلطانہ کو اداکاری کا موقع مل گیا۔ نگار سلطانہ نے اپنی زیادہ تر توجہ سوشل تعلقات اور ''غیر نصابی'' سرگرمیوں پر مرکوز رکھی تھی۔ اس فلم نے تو قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کی تھی مگر نگار سلطانہ اپنے حسن وجمال اور شعر وشاعری کے زور پر بمبئی ٹاکیز سے وابستہ ہوگئی۔ ادبی ذوق نے بھی نگار سلطانہ کو بمبئی کے فلمی حلقوں میں متعارف کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ ایک بے تکلّف، بے جھجک، آزاد خیال خاتون تھیں جو ہر قسم کی مردانہ محفلوں میں مرکز نگاہ بن جایا کرتی تھیں۔

نگار سلطانہ نے اداکاری کی جانب توّجہ دینے کے بجائے سیکنڈلز اور رومان پسندی کا راستہ اختیار کیا اور بہت جلد فلمی حلقے اور فلمی جرائد ان کی خبروں اور سرگرمیوں سے واقف ہوگئے۔ اس زمانے میں انہوں نے جو رومانی فتوحات کیں ان میں کمال امروہوی، اداکار رحمٰن اور ہدایت کار نجم نقوی شامل ہیں۔ نجم نقوی ایک شرمیلے اور شریف النفس انسان تھے مگر کیونکہ ایک کامیاب ہدایت کار تھے اس لئے نگار سلطانہ کی جارحانہ کارروائیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ بمبئی ٹاکیز کی انتظامیہ کو علم ہوا تو انہوں نے ادارے کی نیک نامی کے پیش نظر نگار سلطانہ کو برطرف کردیا مگر اس وقت تک نگار سلطانہ نے بمبئی کی فلمی دنیا میں کافی دور تک پیر پھیلا لئے تھے۔ انہوں نے رنجیت فلم کمپنی سے وابستگی اختیار کرلی۔ ابھی ان کی کوئی قابل ذکر فلم ریلیز نہیں ہوئی تھی مگر رومانی محاذ پر ان کی پیش قدمی بہت تیزی سے جاری تھی۔

ظہور راجا ایک معروف اداکار اور ہیرو تھے اور ایک اطلاع کے مطابق انہوں نے تاجی سے شادی کرلی تھی۔ تاجی ان دنوں اپنے والدین کے پاس لاہور گئی ہوئی تھیں۔ نگار سطانہ نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ظہور راجا پر ڈورے ڈالنے شروع کردیئے۔ کہتے ہیں کہ تاجی اچانک لاہور سے واپس بمبئی پہنچیں تو انہوں نے نگار سلطانہ کو اپنے شوہر کے ساتھ

موجود پایا۔ وہ الٹے قدموں واپس چلی گئیں اور پھر ظہور راجا سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ ادھر ظہور راجا کو ناکامیوں نے پریشان کر رکھا تھا۔ وہ زیادہ عرصے تک نگار سلطانہ کے چونچلے نہ اٹھا سکے۔ نگار سلطانہ نے کسی تاخیر کے بغیر پونا کا رُخ کیا جو فلمی صنعت کا ایک اہم مرکز تھا۔ پونا میں نگار کی ملاقات شیام سے ہوئی۔ نگار نے ہدایت کار اور اداکار کشور ساہو پر بھی جال پھینکا۔ ان کی اسی زمانے میں اداکارہ سینہ پر بھا پردھان سے طلاق ہوئی تھی مگر کشور ساہو سنجیدہ مزاجی کے باعث نگار سلطانہ کے جال میں نہ پھنسا تو نگار نے شیام کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا مگر اسی زمانے میں شیام کو لاہور جانے کا اتفاق ہو گیا جہاں اس کی ملاقات تاج قریشی سے ہو گئی اور ان دونوں نے آپس میں شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔
نگار کو یہ خبر ملی تو وہ آگ بگولا ہو گئی اور اس لئے کہ وہ شیام پر اپنا حق سمجھتی تھی۔ شیام نے نگار سلطانہ سے قطع تعلق کرلیا تو اس نے نغمہ نگار ڈی این تدھوک کو اپنی دلچسپی کا مرکز بنالیا۔
تاجی سے شیام کی شادی کے بعد ناامید ہو کر نگار سلطانہ نے دوسرے منصوبوں پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایس ایم یوسف کی زیر نگرانی "دل کی بستی" کے نام سے ایک فلم بنائی جا رہی تھی۔ جس کے ہدایت کار وحید قریشی تھے۔ نگار سلطانہ کی ایس ایم یوسف سے پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی جہاں ایس ایم یوسف صاحب کو نگار سلطانہ کی حرکتیں سخت ناپسند ہوئی تھیں۔ ان دنوں وہ فلم "دربان" بنا رہے تھے جس کی ہیروئن کو شلیا تھیں۔ یوسف صاحب کو نگار سلطانہ کی آزاد روی پر اعتراض تھا جو بلاتامل ہر ایک سے گھل مل جاتی تھی۔
"دل کی بستی" کی فلم بندی پونا میں ہوئی تھی، اس زمانے میں نگار سلطانہ نے ایک بار پھر ایس ایم یوسف کو شکار کرنا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ نگار کا منصوبہ اس وقت کامیابی سے ہم کنار ہوا تھا جب یوسف صاحب نے "بکھرے موتی" کے نام سے ایک فلم کی ہدایت کاری کا آغاز کیا جس کے فلم ساز مسٹر کبیر تھے۔ اس فلم کے لئے انہوں نے نگار سلطانہ کو ہیروئن منتخب کیا تھا۔ یوسف صاحب نے اس انتخاب پر سخت اعتراض کیا مگر پروڈیوسر کی یقین دہانی اور نگار سلطانہ کی طرف سے اچھے کردار کا مظاہرہ کرنے کے وعدے کے بعد وہ مجبور ہو گئے۔ دل کی بستی اور بکھرے موتی کی فلم بندی کے دوران میں نگار سلطانہ ایس ایم یوسف کے نزدیک تر ہو گئیں۔
مشاعرے کی محفلیں سجائی جاتی تھیں جن میں نگار سلطانہ بھی ترنم سے بھاری آواز میں اپنا کلام سناتی تھیں۔ نگار سلطانہ

کو مردوں کے انداز میں بات کرنے کی عادت تھی اور وہ خود کو مؤنث کے بجائے مذکر سمجھ کر گفتگو کرتی تھیں مثلاً میں جاؤں گا' میں آؤں گا وغیرہ۔

ایس ایم یوسف کے دفاعی حصار ایک ایک کر کے نگار سلطانہ کی پُر عزم منصوبہ بندی کے سامنے ٹوٹ کر رہ گئے اور فلمی دنیا کے لوگ ایک روز یہ خبر سن کر حیرت زدہ رہ گئے کہ ایس ایم یوسف اور نگار سلطانہ کی شادی ہو رہی ہے۔ یوسف صاحب نے نگار سلطانہ سے شادی کرنے سے پہلے ایک باقاعدہ معاہدہ تیار کیا تھا جس کے تحت نگار سلطانہ کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی کو فراموش کر کے ایک گھریلو خاتون کی حیثیت سے نئی زندگی کا آغاز کرے گی۔ نگار سلطانہ جس محلے میں رہتی تھی وہاں اس کی شہرت اچھی نہ تھی۔ یوسف صاحب نے باندرہ کے علاقے میں نگار سلطانہ کو ایک فلیٹ خرید کر دیا اور ایک کار بھی دی۔

معاہدے کے مطابق نگار سلطانہ کو اداکاری ترک کر دینی تھی۔ نگار سلطانہ کا حق مہر صرف 125 روپے طے پایا تھا حالانکہ یوسف صاحب نے شادی کے موقع پر مکان اور کار کے علاوہ اور بھی بہت سے قیمتی تحائف نگار سلطانہ کی نذر کیے تھے۔ سب سے دلچسپ یہ شق تھی کہ نگار سلطانہ آئندہ عورتوں کی زبان میں گفتگو کرے گی اور گھرداری سنبھالے گی۔

گھریلو اخراجات کے لیے نگار سلطانہ کو پانچ ہزار روپے ماہوار دینے کا معاہدہ ہوا تھا جو کہ اس زمانے میں ایک خطیر رقم تھی۔ اس طرح نگار سلطانہ نے ایک بالکل نئی زندگی کا آغاز کیا۔

کچھ عرصے تک تو حالات درست رہے مگر پھر نگار سلطانہ نے پَر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ یوسف صاحب اپنی مصروفیات میں رہتے تھے ادھر نگار سلطانہ کے فلیٹ پر دوبارہ محفل آرائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اسکینڈلز بھی چل پڑے جن کا تذکرہ اخبارات و رسائل میں بھی آنے لگا۔

ایک روز مدہوشی کے عالم میں نگار سلطانہ نے اپنی نئی کار کا ایکسیڈنٹ کر دیا۔ بڑی مشکل سے یوسف صاحب نے یہ معاملہ رفع دفع کرایا مگر اب ان دونوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔ رفتہ رفتہ نگار سلطانہ نے پرانے طور

طریقے اختیار کر لیے تھے اور پرانے ملاقاتیوں سے میل جول کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں اخبارات نے یہ بھی لکھا تھا کہ اداکار شیام کی موت پر یوسف صاحب نے نگار سلطانہ کو شیام کی ارتھی کے جلوس اور آخری رسوم میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی تھی جس کی وجہ سے ان دونوں میں سخت جھگڑا ہوا۔

یوسف صاحب فلم "آنند بھون" کی فلم بندی کے سلسلے میں بمبئی کے نزدیک ایک پُر فضا مقام اوٹی گئے ہوئے تھے۔ نگار سلطانہ نے ان سے جھگڑا کرنے کے بعد سامان سمیٹا اور روٹھ کر بمبئی پہنچ گئیں۔ اس فلم میں نگار سلطانہ اداکاری بھی کر رہی تھیں۔ یہ فلم تین چوتھائی کے قریب بن چکی تھی اس لیے یوسف صاحب نے جھگڑے کو بڑھانے سے پرہیز کیا مگر نگار سلطانہ نے بمبئی پہنچ کر نئے گل کھلانے شروع کر دیئے تھے۔

اسی زمانے میں نگار سلطانہ کی ملاقات "مغل اعظم" کے ہدایت کار کے آصف سے ہو گئی جنہوں نے نگار کو اپنی فلم میں ایک اہم کردار ادا کرنے کی پیش کش کر دی۔ نگار سلطانہ نے لڑ جھگڑ کر یوسف صاحب کو رضامند کر لیا تھا اور وہ بھی مصلحتاً راضی ہو گئے تھے مگر جیسے ہی فلم "آنند بھون" کی شوٹنگ ختم ہوئی' ایس ایم یوسف نے نگار سلطانہ کو واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اگر وہ فلموں میں کام کرے گی تو ان کی شادی ختم ہو جائے گی۔ نگار نے گھریلو زندگی پر فلمی زندگی کو ترجیح دی۔ اس طرح ڈھائی سال کے بعد ایس ایم یوسف نے نگار سلطانہ کو طلاق دے دی۔ یوں نگار سلطانہ گھریلو اور شریفانہ زندگی کو ٹھکرا کر ایک بار پھر فلمی دنیا کی چکا چوند میں پہنچ گئی۔

ان ہی دنوں اداکار درپن پاکستان سے بمبئی گئے تھے۔ وہ بعض گھریلو جھگڑوں سے تنگ آ کر بمبئی کی فلموں میں قسمت آزمائی کرنے کے ارادے سے گئے تھے۔ ان کی خوب صورتی اور جامہ زیبی نگار سلطانہ کو ایسی بھائی کہ اس نے درپن سے شادی کر لی۔

درپن کو بمبئی میں کامیابی نصیب نہ ہو سکی تھی۔ ادھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان پر نگار سلطانہ کا اصلی روپ بھی واضح ہونے لگا تھا۔ چنانچہ درپن نے بھی نگار سلطانہ کو طلاق دے کر لاہور کا ٹکٹ کٹایا اور مقامی فلموں میں بہت کامیابی حاصل کی۔

نگار سلطانہ کے شب و روز ایک بار پھر ان ہی سرگرمیوں میں گزرنے لگے جن کے لیے وہ مشہور تھیں۔ مغل اعظم

کے ہدایت کار کے آصف نے دلیپ کمار کی مرضی اور اطلاع کے بغیر ان کی بہن سے شادی کرلی تھی جس کی وجہ سے ان دو قدیم دوستوں کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے تھے۔ اگر بھاری مالی نقصانات کے پیش نظر بمبئی کے ممتاز فلمی افراد درمیان میں نہ پڑتے تو شاید مغل اعظم کی تکمیل ہی کھٹائی میں پڑ جاتی۔ حالات کی نزاکت اور باہمی دوستوں کے زور دینے پر دلیپ کمار یہ فلم مکمل کرانے پر آمادہ ہو گئے مگر کے آصف سے ان کی دانت کاٹی دوستی قصۂ پارینہ بن کر رہ گئی تھی۔

نگار سلطانہ کی ہنرمندی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے ''مغل اعظم'' کی فلم بندی کے دوران میں کے آصف کو اپنی اداؤں کے جال میں گرفتار کرلیا۔ حالات اتنے نازک اور سنگین ہو گئے کہ آصف کی بیوی اور دلیپ کمار کی بہن گھر چھوڑ کر چلی گئیں اور کچھ عرصے بعد نگار سلطانہ نے کے آصف سے شادی کرلی۔
''مغلِ اعظم'' نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی اور کے آصف کا شمار ہندوستان کے عظیم ہدایت کاروں میں ہونے لگا۔ کے آصف نے ''محبت اور خدا'' کے نام سے ایک نئی فلم کا آغاز کیا مگر ابھی وہ ابتدائی مراحل ہی میں تھی کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے اور نگار سلطانہ بیوہ ہو گئیں۔ ہماری معلومات کے مطابق پھر انہوں نے کے آصف کی بیوہ کی حیثیت سے باقی ماندہ زندگی گزاری لیکن ان کا ماضی آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔

نگار سلطانہ بھارت کی فلمی دنیا میں اپنی رسوا کن داستانوں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ انہوں نے اپنے خاندان اور بھارت کے مسلمانوں کے منہ پر جی بھر کر کالک ملی۔ نگار سلطانہ ایک خوب صورت' جاذب نظر اور پُرکشش شخصیت کی مالک تھیں۔ اگر اداکاری کی طرف توجہ دیتیں تو صف اوّل کی ایکٹریس بن سکتی تھیں مگر انہوں نے نہ تو فلمی کیریئر کو اہمیت دی اور نہ ہی گھر بسانے پر توجہ دی۔ اپنی رنگین مزاجیوں کے باعث نت نئے گل کھلاتی رہیں یہاں تک کہ تھک ہار کر بیٹھ گئیں۔

☆

اس دور کی ایک اور ترقّی پسند اور آزاد خیال اداکارہ بیگم پارہ بھی تھیں۔ بیگم پارہ آندھی اور طوفان کی طرح بمبئی کی فلمی

دنیا میں وارد ہوئی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اخبارات کے گپ شپ کے کالموں اور سنسنی خیز خبروں کا موضوع بن گئیں۔ وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور خود بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ ان کے والد سیشن جج تھے اور ریاست بیکانیر میں وزیر قانون کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ انکا ایک قدامت پسند گھرانے سے تعلق تھا۔ ان کے گھر کے طور طریقوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے گھرانے میں لڑکیوں کو فلمیں دیکھنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ محض چیدہ چیدہ فلمیں ہی دیکھنے کی اجازت ملتی تھی مگر بیگم پارہ کے ذہن میں مغربی آزادی کا تصوّر پرورش پارہا تھا۔

بیگم پارہ نے علی گڑھ سے میٹرک کیا تھا۔ ایک قدامت پرست گھرانے میں جنم لینے کے باوجود ان کے خیالات قطعی ماڈرن تھے۔ وہ چپکے چپکے گلیمر کی دنیا میں جانے کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ ان کے خوابوں کی تعبیر اس وقت ملی جب ان کے بھائی نے بمبئی میں ملازمت کرتے ہوئے ایک نہایت آزاد خیال اور تعلیم یافتہ اداکارہ سے شادی کرلی' یہ پروتیما داس گپتا تھیں۔ پروتیما کی آزادروی کی داستانیں آج کی ہیروئنوں کو بھی شرمانے کے لیے کافی ہیں۔ وہ بڑی آزادی اور بے باکی سے نائٹ کلبوں اور ہوٹلوں کے شراب خانوں میں گھومتی پھرتی تھیں۔ نیم عریاں لباس پہنتی تھیں اور سر سے پیر تک مغربی عورت کی تصویر بن چکی تھیں۔ شوہر کی طرف سے بھی ان پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر روز کوئی نہ کوئی اسکینڈل ان کے حوالے سے فلمی رسائل اور اخبارات کی زینت بنتا تھا۔

بیگم پارہ اپنے بھائی بھاوج کے پاس بمبئی گئیں تو بھاوج نے انہیں بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ ذہنی طور پر تو وہ پہلے ہی آزاد خیال تھیں مگر بمبئی میں انہیں پروتیما داس گپتا کے ساتھ عملی طور پر بھی آزادی کا مزہ چکھنے کا موقع ملا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ دونوں خواتین بمبئی کے فلمی حلقوں میں بدنامی کی حد تک شہرت یافتہ ہوگئیں۔ اسی زمانے میں ایک فلم ساز نے انہیں فلم ''چاند'' میں ہیروئن کا کردار پیش کیا تو بیگم پارہ کی دلی مراد بر آئی۔

چاند ۱۹۴۴ء میں سیٹ پر گئی تھی اور اس میں جو مناظر پیش کیے گئے تھے وہ آج کے دور میں بھی انتہائی آزاد تصوّر کیے جاتے ہیں۔ لگ بھگ پینسٹھ سال قبل بننے والی اس فلم میں بیگم پارہ نے ایک مغرب زدہ ماڈرن لڑکی کا کردار ادا کیا تھا۔ نائٹ کلب' سوئمنگ پول اور غسل خانے کے مناظر اس فلم میں بہت بے باکی سے پیش کیے گئے تھے۔ اس زمانے میں یہ افواہ بھی گرم ہوئی تھی کہ بیگم پارہ جس ہیرو کے ساتھ بطور ہیروئن جلوہ گر ہوئی ہیں وہ ان کا بھائی ہے لیکن

درحقیقت وہ ان کا کزن تھا۔ مگر اس فلم کو شہرت دینے کی خاطر فلم ساز نے صحیح صورت حال کی وضاحت پیش کرنا ضروری نہ سمجھا اور ہندوستان کے طول وعرض میں ایک قدامت پسند طبقے نے بیگم پارہ کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا مگر بیگم پارہ اس قسم کے اعتراضات کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ انہوں نے نہ تو اس خبر کی تردید کی اور نہ ہی اپنی زندگی کا چلن بدلنے کی کوشش کی۔

فلم ''چاند'' کاروباری طور پر ایک کامیاب فلم تھی جس میں بیگم پارہ کے حُسن و جمال اور بے باک اداکاری کا نمایاں ہاتھ تھا لیکن اداکارہ کی حیثیت سے وہ نقّادوں کو متاثر نہ کر سکی تھیں۔ بعد کی فلموں میں انہوں نے خاصی بہتر اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ ان میں سوہنی مہینوال' چھمیا اور جِھرنا قابل ذکر ہیں۔ لیکن بیگم پارہ کو معیاری اور صف اوّل کی ہیروئن کا مرتبہ کبھی حاصل نہ ہوا۔ انہیں اس کی پروا بھی نہ تھی۔ وہ بخوبی جانتی تھیں کہ محدود اداکارانہ صلاحیتوں کے ہوتے ہوئے وہ محض جسمانی کشش اور نمائش کے ذریعے ہی کامیابی حاصل کر سکتی ہیں۔ یوں بھی انہوں نے اپنی توّجہ فلموں اور اداکاری کے مقابلے میں دوسری سرگرمیوں اور دلچسپیوں پر مرکوز رکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کل 30 کے لگ بھگ فلموں میں کام کیا مگر کوئی نقش نہ چھوڑ سکیں۔ وہ فلمی حلقوں میں اپنی ''فاسٹ لائف'' کے حوالے سے مشہور تھیں جن کو مہمیز کرنے میں ان کی بھاوج پروتیما داس گپتا کا بھی نمایاں ہاتھ تھا۔ یہ دونوں اس قدر شیر وشکر ہو چکی تھیں کہ بھائی کی طرف سے پروتیما داس گپتا کو طلاق دینے کے بعد بھی یہ دونوں گہری سہیلیاں ایک ساتھ ہی رہا کرتی تھیں۔

بیگم پارہ ایک خوب صورت چہرے اور پُرکشش جسم کی مالک تھیں۔ اداکاری کے سلسلے میں وہ کسی پابندی کی قائل نہ تھیں۔ فلم سازوں کا ہر مطالبہ وہ بخوشی پورا کر دیتی تھیں اور ایسے کردار ادا کرنے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں کرتی تھیں جو ان کی بہت سی سنجیدہ اور متین ہم عصر اداکارائیں کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کی پہچان ایک جارحانہ مزاج کی لڑنے جھگڑنے والی ہیروئن کی حیثیت سے رہی تھی۔ وہ گھریلو اور معاشرتی فلموں کے لیے موزوں نہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ چُلبلے اور بے باک قسم کے کرداروں کے لیے فلم سازوں نے انہیں مخصوص کر دیا تھا۔ گلیمر اور ناز وانداز کے سوا ان میں اداکارانہ صلاحیتیں مفقود تھیں۔

ایک مشکل یہ بھی تھی کہ بیگم پارہ ایک ایسے دور میں فلمی دنیا میں آئی تھیں جب بمبئی کی فلمی صنعت پر بڑی بڑی ایکٹریسوں کا راج تھا۔ نرگس، ثریا، نور جہاں، مدھو بالا، مینا کماری ان کی ہم عصر اداکارائیں تھیں۔ بھلا ایسی ایکٹریسوں کے سامنے ان کی دال کیسے گل سکتی تھی۔ محض اپنی آزادروی، سماجی سرگرمیوں اور تعلقات کی بنا پر ہی وہ فلموں میں کام حاصل کرتی رہی تھیں۔ اداکارہ کی حیثیت سے وہ کسی شمار و قطار میں نہ تھیں۔

دلیپ کمار کے بھائی ناصر خان سے شادی سے پہلے فلم بین انہیں تقریباً بھول ہی چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شادی کی خبر نے کسی قسم کی ہلچل پیدا نہیں کی۔ خود ناصر خان بھی اس وقت اپنے عروج کا زمانہ گزار چکے تھے اور یہ دونوں ہی قریب قریب "سابق" بن چکے تھے۔ بیگم پارہ اور ناصر خان کے صاحب زادے ایوب خان بھی آج کل بمبئی میں ہیرو بن چکے ہیں اور ابتدائی ناکامیوں کے بعد اب ان کا شمار ٹی وی کے ہونہار اداکاروں میں ہونے لگا ہے۔

بیگم پارہ کو اپنے جیٹھ دلیپ کمار سے یہ شکایت رہی ہے کہ انہوں نے اپنے بھتیجے ایوّب کو فلمی صنعت میں متعارف کرانے کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ اُدھر دلیپ کمار کا یہ کہنا ہے کہ بھئی، اداکار کسی کی سفارش سے نہیں بن سکتا۔ جس کسی میں صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ کسی سفارش کے بغیر ہی ترقّی کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔

بیگم پارہ نے 1985ء میں ناصر خان سے شادی کی تھی۔ اس وقت وہ دونوں فلم "لٹیرا" میں کام کر رہے تھے۔ شادی کے بعد بیگم پارہ نے فلمی دنیا کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ بمبئی میں لیبارٹری میں آتش زدگی کے باعث بے شمار پرانی فلموں کے نیگیٹوز جل کر تباہ ہو گئے تھے۔ ان میں بیگم پارہ کی بھی کئی فلمیں تھیں۔ اس کے باوجود بہت سے پرانی بھارتی فلمیں فلم میوزیم میں موجود ہیں۔ بیگم پارہ کا 2008ء میں انتقال ہو گیا تھا۔

بیگم پارہ اور نگار سلطانہ کا دور بہت پرانا ہے۔ ہم نے ابھی باقاعدگی سے فلمیں دیکھنی شروع نہیں کی تھیں جب ان دونوں نے فلمی دنیا کو اپنی حشر سامانیوں سے تہ و بالا کر دیا تھا۔ وہ زمانہ ایسا تھا جب نوعمر بچّوں کو آزادی سے فلم دیکھنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ نہ ہی تمام فلمیں گھر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے موزوں تصوّر کی جاتی تھیں۔ ایک سنسر حکومت کا تھا اور دوسرا زیادہ سخت سنسر گھر والوں کا ہوا کرتا تھا۔ گھر والے یہ فیصلہ کرتے تھے کہ لڑکے بالیوں کے لیے کون سی فلم دیکھنے دکھانے کے قابل ہے۔ لڑکیاں خاندان کی عورتوں یا کسی بڑی عمر کی رشتے دار کے بغیر سینما گھر

نہیں جاسکتی تھیں اور وہاں بھی علیحدہ زنانہ کلاس میں بیٹھ کر فلمیں دیکھتی تھیں۔ریڈیو ہر ایک گھر میں نہیں ہوتا تھا۔ جن خوش حال اور ماڈرن گھروں میں ریڈیو موجود تھا وہاں بھی خبروں اور چیدہ چیدہ ڈراموں کے سوا اس کا استعمال ممنوع تھا۔ فلمی گانوں اور فرمائشوں کے پروگرام اس زمانے میں بھی ہوا کرتے تھے مگر گھر کے نوجوانوں کو سننے کی اجازت نہ تھی۔اور تو اور' فلمی رسائل بھی گھروں کے اندر ممنوع سمجھے جاتے تھے۔

ہمیں یاد ہے کہ فلموں کی شوقین رشتے دار خواتین چوری چھپے ہم سے ''شمع'' یا'' آریہ ورت'' نامی فلمی میگزین منگایا کرتی تھیں اور انہیں چھپ کر پڑھتی تھیں۔فلمی رسالے شریف گھرانوں میں لائے جانے کے قابل نہیں سمجھے جاتے تھے۔

اب ذرا سوچیے کہ اُس زمانے میں اگر نگار سلطانہ اور بیگم پارہ جیسی ایکٹریسیں یکایک فلم اسکرین پر نمودار ہو جائیں گی تو اس کا کیا ردّ عمل ہو گا؟ ہم چھوٹے تھے اس لیے ہمارے ہم عمروں کے سامنے بڑے لوگ بیگم پارہ اور نگار سلطانہ کا تذکرہ بھی نہیں کرتے تھے کہ مبادا نو عمر لوگ ان کی باتیں سن کر گمراہ ہو جائیں۔ان دونوں کا تعلق متوسط' شریف مسلمان گھرانوں سے تھا اس لیے ان کی آزاد خیالی اور بے راہ روی سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ندامت کا باعث تھی۔

غیر منقسم ہندوستان میں کہنے کو تو ہندو اور مسلمان ساتھ رہتے تھے مگر ان کے درمیان کشیدگی اور نفرت کا رشتہ بھی

قائم تھا۔ہندو لڑکے مسلمانوں کو شرمندہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ مسلمان بھی جوابی کارروائی کے طور پر انہیں شرمندہ کرنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ مسلمان اداکاروں کا تذکرہ مسلمان بڑے فخر سے کرتے تھے اور ان کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے۔ہندو ان میں نقص اور عیب نکالتے رہتے تھے اور اپنے ہندوؤں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے۔دلیپ کمار' راج کپور اور دیو آنند اس زمانے کے سُپر اسٹارز تھے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اداکار کی حیثیت سے دلیپ کمار کا ان دونوں سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔اس کے باوجود ہندو پریس اور ہندو فلم بین انہیں دلیپ کمار کے مقابلے میں برتر ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

دلیپ کمار کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ متعصّب ہندو بھی ان کی فلمیں دیکھنے پر مجبور تھے لیکن جب بھی موقع ملتا تھا' راج کپور یا دیو آنند کو دلیپ کمار کا مد مقابل ثابت کرنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

اس پس منظر میں جب نگار سلطانہ بمبئ کی فلمی دنیا میں وارد ہوئیں اور ان کی داستانیں عام ہونے لگیں تو ہمارے ہندو ساتھیوں اور دوستوں کو ایک نادر موقع مل گیا کہ وہ ان کے حوالے سے مسلمانوں کو شرمندہ کریں۔ نگار سلطانہ نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی اس لیے مدافعت میں کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اس طرح بیگم پارہ جب چمک دمک کے ساتھ فلموں میں جلوہ گر ہوئیں تو ہندو پریس نے اس بات کو بہت اچھّالا کہ فلم ''چاند'' میں وہ اپنے بھائی کے مقابلے میں ہیروئن کا کردار کر رہی ہیں۔ حالانکہ وہ انکے کزن تھے فلمی مصلحتوں اور غالباً فلم ساز کے مطالبے پر بیگم پارہ نے اس خبر کی تردید بھی نہیں کی جس کی وجہ سے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو ہزاروں باتیں سننی پڑیں۔ یہ ایسا مسئلہ تھا جس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ہمیں آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ان کی وجہ سے ہم سر اٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے اور ہندو دوستوں کو ایک دل پسند موضوع ہاتھ لگ گیا تھا۔ یہ صدمہ ہم کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ اور پھر جب فلم ''چاند'' اور بیگم پارہ کی دوسری فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئیں تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ فلم میں ٹب میں غسل کرنے کے مناظر ہالی ووڈ کی فلموں کے انداز میں فلمائے گئے تھے اور ان مناظر میں عریانی اور بے باکی کا ایسا مظاہرہ کیا گیا تھا جو اس زمانے میں ہندوستانی فلموں میں نظر نہیں آتا تھا۔ خود سوچ لیجئے کہ ہم لوگوں کو کتنی شرمندگی اٹھانی پڑی ہو گی لیکن مجبور تھے۔

ایسی ہی ندامت بلکہ ذلّت اس وقت اٹھانی پڑی تھی جب نرگس نے راج کپور کے عشق میں گرفتار ہو کر کُھلے بندوں اس کے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا۔ اُس زمانے میں بھی فلمی دنیا میں اس قسم کی مثالیں بہت کم تھیں اور نرگس نے بھی حد کر دی تھی۔ نرگس اور راج کپور میاں بیوی کی حیثیت سے قریب قریب دس سال تک ایک ساتھ رہے اور یہ تمام عرصہ ہندوستان کے مسلمانوں نے کانٹوں پر گزارا۔ یہ تصوّر ان کے لیے تسلّی بخش نہ تھا کہ نرگس نے دلیپ کمار کی طرف سے انکار ہونے کے بعد راج کپور کی طرف توّجہ دی تھی۔ ہندو راج کپور اور نرگس کے تعلقات کے حوالے سے

شرمندہ کرتے رہتے تھے اور مسلمان شرم سار ہوتے رہتے تھے۔ ستم یہ کہ جب نرگس نے بالکل مجبوری کے عالم میں راج کپور سے علیحدگی اختیار کی تو انہیں اپنا جیون ساتھی بنانے کے لیے ایک ہندو ہی ملا۔ خیر سنیل دت بطور انسان بہت اچھے ثابت ہوئے۔ وہ شوہر بھی مثالی تھے مگر مسلمانوں کو نرگس کی اس شادی کی بنا پر مستقل ندامت اٹھانی پڑتی تھی۔

مدھو بالا کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ دلیپ کمار کے ساتھ مدھو بالا کی منگنی ہو چکی تھی۔ دلیپ کمار کے گھر والے اس شادی کے لیے تیار تھے مگر مدھو بالا کے لالچی اور خود غرض والد عطاالرحمن خاں کی وجہ سے ایسی غلط فہمیاں اور شکر رنجیاں پیدا ہوئیں کہ یہ تعلق ٹوٹ گیا۔ مدھو بالا دل کی مریضہ تھیں۔ ان کے دل میں سوراخ تھا جس کی وجہ سے وہ بہت دھان پان اور نازک اندام تھیں۔ ان کے لیے ذرا سا صدمہ بھی جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر حالات و واقعات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ مدھو بالا نہ چاہتے ہوئے بھی دلیپ کمار سے دور ہو گئیں۔

دلیپ پھر کبھی کسی دوسرے کے سامنے مدھو بالا کا نام تک اپنے لب پر نہ لائے۔ مدھو بالا نے کچھ عرصے بعد شادی کر لی اور وہ بھی ایک ہندو سے۔ کشور کمار ایک اچھے انسان تھے مگر کسی اعتبار سے بھی مدھو بالا کے قابل نہ تھے۔ مگر ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ ذلّت اور رسوائی کا باعث تھا۔ مدھو بالا کی بے بسی اور مجبوری کا سب کو احساس تھا۔ کشور کمار کی خوبیوں سے بھی کسی کو انکار نہ تھا مگر کہاں دلیپ کمار اور کہاں کشور کمار۔ لاکھوں کروڑوں مسلمانوں نے مدھو بالا کی اس غلطی کو کبھی معاف نہیں کیا۔

کون کہتا ہے کہ دو قومی نظریہ قائدِ اعظم کی ایجاد تھا؟ بھائی چارے اور خلوص و محبت کی باتیں اپنی جگہ مگر یہ حقیقت ہے

کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے۔ اگر کہا جائے کہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے تو یہ بھی غلط نہ ہوگا۔ آج جب بھارت سے فن کاروں اور دانشوروں کے وفد

پاکستان آکر یہ راگ الاپتے ہیں کہ دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کے نزدیک ہیں۔ان کا کلچر ایک ہے' رہن سہن' طور طریقے ایک ہیں۔فن کسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا تو خون جل کر رہ جاتا ہے۔ مسلمان اور ہندو نہ کبھی ایک اور ہم خیال تھے' نہ ہوں گے۔ہم نے جب سے ہوش سنبھالا' یہی دیکھا اور محسوس کیا۔واقعات تو بے شمار ہیں۔ مناسب موقع پر یہ آپ بیتی اور جگ بیتی بھی بیان کی جائے گی مگر یہ حقیقت ہے کہ نگار سلطانہ اور بیگم پارہ جیسی فن کاراؤں کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ کوشش کے باوجود بھی نہیں۔سالہا سال کے سفر کی گرد نے بہت سی چیزوں کو ڈھانپ لیا ہے مگر ایسے واقعات زمانے کی گرد میں بھی دفن نہیں ہوتے۔

یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ وہ کسی بھی حال میں خوش اور مطمئن نہیں رہتا۔اگر وہ بہت مصروف ہے تو فرصت کے دن رات کی جستجو کرتا ہے اور اگر فرصت میں ہے تو چاہتا ہے کہ کوئی مصروفیت تلاش کی جائے۔بے کاری سے بھی وہ اکتا جاتا ہے۔اگر کچھ بیمار رہے تو چاہتا ہے کہ تندرست ہو جائے اور تندرستی میں وہ چاہتا ہے کہ کبھی کچھ وقت بستر پر دراز ہونے کے لئے بھی مل جائے تو کیا بُرا ہے۔کیونکہ مکمل تندرستی کی صورت میں تو وہ بھاگ دوڑ میں ہی لگا رہتا ہے۔آرام کرنے کے لئے کوئی لمحہ اسے نہیں نصیب ہوتا۔ہمارا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔بھئی بیماری کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔ کبھی کبھار چلتے پھرتے بیمار ہو جانا اور بات ہے مگر مستقل طور پر بیماری کی نذر ہو جانا اور لمبے عرصے تک اسپتالوں میں آمد و رفت جاری رکھنا یا پھر صاحب فراش رہنا مختلف بات ہے۔شُکر ہے کہ ہم سیریس بیمار بہت زیاد عرصے نہیں رہے تھے لیکن بیماری کا یہ سلسلہ جب ایک بار شروع ہوا تو پھر چلتا ہی رہا۔مانا کہ ہم چلتے پھرتے بھی تھے۔دوستوں کے گھر جا کر گپ شپ بھی لگاتے تھے۔وہ بھی ہمارے گھر آ کر جمگھٹا لگا لیتے تھے مگر بیماری تو پھر بیماری ہے۔نیند نہ آنا،ڈپریشن' چِڑچِڑا پن' سنجیدگی سے اللہ میاں سے اپنی صحت یابی کے لئے دعائیں مانگنی شروع کر دی تھیں۔اللہ میاں نے بہت کرم فرمایا کہ ہم بیماری کے باوجود مکمل بیمار نہ تھے مگر مکمل تندرست بھی نہیں تھے۔ دُبلا پن ہمیشہ ہمارا مسئلہ رہا ہے۔ہمیں تو یہی یاد ہے کہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہمیں یہی فکر رہی کہ موٹے کیسے ہوں اور طاقت کیسے آئے؟ لڑکپن میں بھی یہی حال تھا کہ وزن بڑھانے اور طاقت ور ہونے والی ہر تدبیر پر عمل کرتے تھے۔ کسی نے کہا گاجر ہندوستان کا سیب ہے بلکہ سیب سے بھی زیادہ طاقت بخش ہے۔ہم نے گاجریں کھائیں بلکہ چرنی

شروع کر دیں۔ اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے گاجریں چباتے یا چرتے رہتے تھے۔ " ہوکا" ہماری کمزوری ہے' ہمیں ہر چیز کا" ہوکا" ہو جاتا ہے۔ گاجریں کھانے کا بھی ہوکا ہو گیا۔ ایک دن صبح سے شام تک دو ڈھائی سیر گاجریں کھا گئے' یعنی دوسری چیزوں کے علاوہ۔ نتیجہ یہ کہ دستوں کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ ایک ٹیچر سے سنا کہ ٹماٹر خالص خون بنانے والی چیز ہے۔ ہم نے ٹماٹر کھانے شروع کر دیے۔ دو تین سیر روزانہ کھا جاتے تھے۔ چار دن گزرے تو آئینہ دیکھنا شروع کر دیا کہ چہرہ کتنا سُرخ ہو گیا ہے اور گال کس قدر بھر گئے ہیں۔ ہوا کچھ بھی نہیں۔ اُکتا کر یہ بھی چھوڑ دیا۔ کھیل کود' ورزش' دودھ دہی' پھل' گوشت' مرغی یہاں تک کہ مچھلی تک کھانے لگے جو ہمیں سخت ناپسند تھی مگر کیا مجال جو ایک پاؤنڈ بھی وزن بڑھا ہو۔ چہرے کی سُرخی میں بھی کوئی اضافہ نظر نہیں آیا۔ سوچا' دوسروں سے رائے لیں۔

پوچھتے "کیوں آپ کو ہمارا چہرہ کیسا لگ رہا ہے؟"

جواب ملتا "یوں ہی لگ رہا ہے جیسا کہ ہے۔"

"مطلب یہ ہے کہ کوئی رنگت میں سُرخی یا چہرے پر رونق زیادہ نظر آتی ہے؟"

وہ غور سے جائزہ لیتے "مجھے تو کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ مگر بات کیا ہے؟"

"بات کچھ بھی نہیں۔ بس ایسے ہی پوچھا کہ کیا ہم پہلے سے زیادہ تندرست نظر آتے ہیں کہ نہیں؟"

"میاں جتنے ہو اتنا ہی کافی ہے۔ شُکر کرو۔ بہت سوں سے بہتر ہو۔" لیجئے بات ہی ختم ہو گئی۔ نہ پیٹ بڑھا' نہ چہرے پر گوشت چڑھا۔ اسی تگ و دو میں لڑکپن گزرا۔ جوانی آگئی مگر ہمارا وہی حال رہا کہ نہ ساون سُوکھے نہ بھادوں ہرے۔ ویسے کے ویسے ہی رہے۔ سب یہی کہتے تھے کہ بھائی تم فٹ ہو، اسمارٹ ہو اور کیا چاہیے؟ مگر ہم اپنے سے زیادہ وزن کے لوگوں پر رشک کرتے تھے۔ حکیم، ڈاکٹر، ہومیوپیتھ، آیورویدک، سبھی قسم کے علاج کر دیکھے۔ صرف تعویذ گنڈا کرنیوالوں کی باری نہ آئی۔ اسی چکر میں بہت سے اطبا سے تعلقات استوار ہو گئے اور جب چھان بین کی تو بہت سے علاج اور دوائیاں بھی ہمیں معلوم ہو گئیں مگر وزن جوں کا توں رہا۔

اب بیماری اور تندرستی کا ذکر نکلا ہے تو چند معالجوں کا یہاں ہو جائے۔ حکیم نیّر واسطی صاحب کا تذکرہ کافی تفصیل سے پیش کر چکے ہیں۔ ایک اور حکیم صاحب کے بارے میں سنا کہ غضب کے معالج ہیں اور دوائی ایسی دیتے ہیں کہ مردے میں جان ڈال دیتے ہیں۔ کئی لوگوں سے ان کی تعریف سنی تو سوچا کیوں نہ آزمایا جائے۔ ان کا نام حکیم محمد میاں تھا۔ بیڈن روڈ پر ایک ذیلی سڑک پر ان کا دواخانہ تھا۔ ہم اس زمانے میں ''آفاق'' میں کام کرتے تھے اور بیڈن روڈ سے روزانہ گزر کر لکشمی چوک جایا کرتے تھے۔ اس طرح حکیم صاحب تو ہماری راہ میں تھے۔ ایک دن ہمّت کر کے ان کے پاس پہنچ گئے۔ حکیم صاحب کا مطب ایک طویل کمرے پر مشتمل تھا جسے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اسی گھر کے پچھلے حصّے میں حکیم صاحب کی رہائش تھی۔ داخل ہونے پر بالکل سامنے حکیم صاحب کی بڑی سی میز تھی جس کے چاروں طرف کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی دائیں جانب کمپاؤنڈر تشریف فرما ہوتے تھے۔ ان کا فاصلہ حکیم صاحب کی میز سے زیادہ نہ تھا۔

حکیم صاحب نسخہ وغیرہ لکھنے کے قائل نہیں تھے۔ دوائی تجویز کر کے آواز لگاتے ''اماں۔۔۔'' (نام صحیح طور پر یاد نہیں رہا)

''ہاں جی۔'' وہ جواب میں ہانک لگاتے۔

''اماں جوارش فلاں اور معجون فلاں بنا دو۔''

کمپاؤنڈر صاحب دوائی بنا کر لاتے۔ حکیم صاحب پیسے وصول کرتے اور ترکیب استعمال بتا کر مریض کو رُخصت کر دیتے۔

ہم گئے تو حکیم صاحب تنہا تشریف فرما تھے اور مناجات یا منقبت پڑھ رہے تھے۔ گنگناتے بھی جاتے تھے۔ ہم رُک گئے کہ انہیں ڈسٹرب کریں یا نہ کریں کیونکہ وہ اس میں کھوئے ہوئے تھے۔

مگر حکیم صاحب نے ہمیں دیکھ لیا ''آؤ میاں آؤ۔ رُک کیوں گئے؟'' پاس جا کر سلام عرض کیا۔ جس کا جواب انہوں نے مسکرا کر بڑی خندہ پیشانی سے دیا۔

حکیم صاحب کی عمر اس وقت ساٹھ کے لگ بھگ ہو گی مگر رنگ سُرخ و سفید، چہرہ بارونق، روشن آنکھیں، دانت بھی

اصلی اور مکمل، قدرے بھاری، جسم، سفید کرتہ اور پاجامہ پہنے بڑے اچھے لگ رہے تھے ''کیوں میاں! کیسے آئے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

ہم نے پاس بیٹھ کر کہا ''حکیم صاحب! ذرا ہماری نبض دیکھئے۔''

وہ مسکرائے ''سمجھا۔ ہمارا امتحان لینے آئے ہو؟''

''ارے نہیں حکیم صاحب۔'' ہم نے گھبرا کر کہا ''دراصل ہم۔۔۔''

انہوں نے بات کاٹ دی ''بس بس۔ رہنے دو۔ نبض دکھاؤ۔''

حکیم صاحب نے آنکھیں بند کر کے ہماری نبض محسوس کی۔

''تیزابیت ہے۔ ہاضمہ ٹھیک کام نہیں کر رہا۔ اعصابی کشمکش بھی ہے۔''

''جی!'' ہم نے ان سے اتفاق کیا۔

''فکر کیوں کرو ہو۔ اللہ شفا دے گا۔'' انہوں نے ہماری نبض چھوڑ کر سامنے میز پر سے تسبیح اٹھالی۔ ہم سمجھے شاید ہماری صحت یابی کے لیے دعا کریں گے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر کے تسبیح کے دانے گننے شروع کر دیئے۔ ساتھ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے بھی جا رہے تھے۔

یکایک انہوں نے ایک دانے کو دو انگلیوں سے مضبوطی سے تھام لیا اور آنکھیں کھول کر اسے غور سے دیکھا۔ پھر پکار کر کہا'' اماں نبن (یہی نام فرض کر لیجئے) معجون فلاں اور اکسیر فلاں۔''

چند لمحے بعد کمپاؤنڈر دو ڈبیاں لیکر چلے آئے۔ ظاہر ہے کہ ادویات تیار رکھی ہوئی تھیں۔

''لو میاں! اللہ کا نام لیکر شروع کر دو۔ یہ دوائی آٹھ روز کی ہے مگر دس بارہ دن بھی چل جائے گی۔''

یہ کہہ کر انہوں نے ترکیب استعمال بتائی۔ ہم نے قیمت دریافت کی۔ قیمت زیادہ نہیں تھی۔ قیمت ادا کر کے ہم چلے آئے۔

حکیم صاحب کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مریضوں کو دوائی دینے کے لیے استخارہ نکالتے تھے اور استخارے میں جو دوائی نکلتی تھی وہی استعمال کراتے تھے۔ فائدہ ہو یا نہ ہو۔ دوائی استخارے کے مطابق ہی دیتے تھے، کہتے ''میاں! دوائی تو یہی

رہوے گی۔"

ہم نے عرض کیا" ہمارا وزن نہیں بڑھتا۔"

انہوں نے کہا" ارے میاں! فائدہ ہو گا تو وزن بڑھے ہی بڑھے۔"

۔۔۔مگر وزن تھا کہ وہیں قائم رہا۔

اس دوران میں حکیم صاحب سے خاصے گہرے تعلّقات ہو گئے۔انہوں نے اپنے سہارنپور کے قصے سنائے۔ بچپن اور جوانی کی داستانیں بیان کیں۔اپنے تجربات اور مشاہدات سے آگاہ کیا مگر ان کی تسبیح نے ہماری دوائی بدل کرنہ دی۔ مایوس ہو کر ہم نے ان کا علاج ترک کر دیا۔

بیڈن روڈ پر ہی،ان سے قدرے آگے بڑھ کر،ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر صاحب تھے۔نام ان کا محمود الحسن تھا۔ لدھیانے سے تعلق تھا جہاں ان کے والد خاندانی حکیم تھے۔گویا محمود الحسن ہومیو پیتھ بھی تھے اور حکمت سے بھی ان کا دیرینہ تعلق تھا۔ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ روحانی قوّتوں کے بھی مالک ہیں۔ ایک خاتون مریضہ کی بیماری کا حال سن کر انہوں نے کہا" وہ جو چار پائی کے نیچے گاڑر کھا ہے وہ تو باہر نکال۔اس کے بغیر ٹھیک نہیں ہو گی۔"

معلوم ہوا کہ اس خاتون نے اپنے شوہر کو قتل کر کے کمرے میں دفن کر رکھا تھا۔اس طرح کی اور بھی کئی داستانیں ان سے منسوب تھیں۔ان کے علاج معالجوں کا بھی چرچا سا تھا۔ہمارے آفاق کے دو تین ساتھیوں کا بھی انہوں نے حیرت انگیز علاج کیا تھا حالانکہ وہ دوسرے علاج کرا کے تھک چکے تھے۔ہمیں اس وقت تک ہومیو پیتھک طریقہ علاج کے متعلق زیادہ معلومات نہیں تھیں۔بس معمولی شُد بُد تھی۔ہمارے پیٹ میں کبھی کبھی سخت درد اور دُکھن ہوتی تھی۔یہ دراصل گیس کا سبب تھا جو ہمیں بعد میں علم ہوا۔

ایک دن پیٹ میں زیادہ تکلیف ہوئی تو ہم ایک دوست کے مشورے پر ڈاکٹر محمود الحسن کے پاس چلے گئے۔

بیڈن روڈ پر کئی دکانوں کے درمیان ان کا مطب تھا۔ایک اونچی سی سیڑھی چڑھنے کے بعد دکان میں داخل ہوتے تھے۔بائیں جانب ایک بڑی سی میز کے سامنے ڈاکٹر صاحب تشریف فرما تھے۔زیادہ سردی نہیں تھی مگر وہ لمبا سا

اوور کوٹ پہنے بیٹھے تھے۔ سر پر قراقلی ٹوپی تھی۔ گہرا سانولا رنگ، وہ قد آور اور مضبوط کاٹھی کے بزرگ تھے مگر گھنی اور پھیلی ہوئی کھچڑی داڑھی کے علاوہ ان کی ضعیف العمری کا کوئی اور نشان موجود نہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو ہم نے بعد میں موسم گرما میں بھی وہی لمبا سا اوور کوٹ زیب تن فرمائے دیکھا اور حیران ہوتے رہے کہ انہوں نے یہ گرم اوور کوٹ بطور یونی فارم کس لیے پسند فرمایا ہے۔ مگر کبھی ان سے دریافت کرنے کی جرأت نہ ہو سکی ڈاکٹر صاحب کے سامنے بہت لمبی چوڑی میز تھی جس پر ایک قلم اور چند کاغذ کے پرزوں کے سوا کوئی اور چیز نہ تھی۔ وہ اپنی کرسی پر تشریف فرما خاموش بیٹھے تھے۔ شاید کسی سوچ میں گم تھے۔ ان کی عادت تھی کہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے داڑھی کے اندرونی حصّے میں نیچے سے اوپر کی جانب انگلیاں پھیرتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی وہ یہی کر رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک پرانی سی آرام دہ کرسی پر ایک اور صاحب تشریف فرما تھے۔ وہ تہبند اور کُرتہ پہنے ہوئے تھے۔ سر سے ننگے اور بالوں سے بھی قریب قریب محروم۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ حقّہ پی رہے تھے حالانکہ ہم نے یہ سُن رکھا تھا کہ ہومیو پیتھک ادویات کو تمبا کو اور حقّے کے دھوئیں اور خوشبو سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹرز سگریٹ پینے سے پہلے اور بعد کافی دیر تک دوائی کے استعمال سے منع کرتے ہیں مگر یہاں معاملہ یہ تھا کہ دواخانے میں ڈاکٹر صاحب کے عین سامنے ایک صاحب حقّہ نوشی میں مصروف تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے پرانے اور بے تکلّف دوست تھے۔ ہم نے اکثر انہیں وہیں حقّہ پیتے ہوئے دیکھا لیکن دونوں حضرات کو عموماً خاموش اپنی اپنی سوچوں میں گم ہی پایا۔ یہ بھی عجیب و غریب قسم کی دوستی تھی۔ کہتے ہیں کہ گفتگو کی انتہا خاموشی ہے۔ بشر طیکہ دونوں فریق ذہنی اور روحانی طور پر ایک دوسرے سے قریب تر ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے ہمیں داخل ہوتے دیکھا تو ایک نگاہِ غلط انداز ہماری جانب ڈالی اور پھر داڑھی میں انگلیاں گھمانے میں مصروف ہو گئے۔

ہم ان کے نزدیک والی کرسی پر بیٹھ گئے اور عرضِ حال کیا ''ڈاکٹر صاحب ہمارے پیٹ میں بہت سخت تکلیف ہے۔ ہاتھ لگانے سے دُکھتا ہے۔ بھوک بھی نہیں لگتی۔ یہ دیکھئے۔''

ہم نے ان کی توجّہ اپنے پیٹ کی طرف مبذول کرانی چاہی مگر انہوں نے کاغذ کا ایک پرزہ اٹھا کر قلم سے اس پر کچھ لکھنا

شروع کر دیا۔ کسی دوائی کا نام لکھ کر پرزہ انہوں نے ہمارے حوالے کیا اور ہاتھ سے دکان کی اندرونی سمت میں اشارہ کیا جہاں ایک کاؤنٹر نما چیز کے پیچھے ان کا دواخانہ تھا۔

ہم نے کہا ”مگر ڈاکٹر صاحب! آپ نے ہمارا حال تو سنا ہی نہیں۔“

انہوں نے خاموشی سے ہاتھ ہلا دیا کہ ”اُدھر جاؤ۔ میرا مغز نہ کھاؤ۔“

مایوسی تو بہت ہوئی مگر قہر درویش بر جان درویش۔ مجبوراً یہ سوچتے ہوئے دوائی لینے چل پڑے کہ یہ کہاں آن پھنسے ہیں۔

کھڑکی کے پیچھے ایک نوجوان کلین شیو کمپاؤنڈر بیٹھے ہوئے تھے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ یہ دوسری حیرت تھی۔ خیر۔ ہم نے پرچی ان کے حوالے کی تو انہوں نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ سگریٹ ایش ٹرے میں رکھی اور سفید کاغذ کے ایک پُرزے پر تھوڑا سا سفید رنگ کا سفوف انڈیل کر اس پر ایک اور شیشی میں سے چند قطرے ٹپکا دیئے۔ یہ ہمارا ہومیو پیتھک دوائی استعمال کرنے کا پہلا موقع تھا اور ہم اس طریقۂ علاج کے رموز و اسرار سے قطعی واقف نہ تھے۔ انہوں نے اس کاغذ کو پڑیا بنانے کے لیے موڑا تو ڑا مگر بند کرنے کے بجائے ہماری جانب ہاتھ بڑھا کر بولے ”منہ کھولیں۔“

ہم نے منہ کھول دیا۔ انہوں نے وہ سفوف ہماری زبان پر ڈال دیا۔ وہ میٹھا تھا مگر دوائی کے قطروں میں تیزی تھی۔

بولے ”اب دس پندرہ منٹ تک کچھ نہ کھانا۔“

ہم نے سر ہلا کر اتفاق کیا اور پوچھا ”کتنے پیسے؟“

بولے ”وہ اُدھر۔ ڈاکٹر صاحب کو دے دیں۔“

ہم دوبارہ ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ گئے ”ڈاکٹر صاحب! کتنے پیسے ہوئے؟“

وہ انگلیوں سے داڑھی میں کنگھی کرتے ہوئے بولے ”آٹھ آنے۔“

ہم نے آٹھ آنے نکال کر پیش کر دیئے۔

بولے ”اور دیکھو۔اب آٹھ دن تک شکل نہ دکھانا۔“

”جی!“ ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

ان کے حقّہ نوش دوست نے کہا”پُتر! یہ آٹھ دن کی دوائی ہے۔اب تم جاؤ۔آٹھویں دن آجانا۔“

ہم بہت حیران ہوئے کہ صرف ایک ہی پُڑیا کھلا کر آٹھ دن کے لیے فارغ کر دیا۔آٹھ دن کی دوائی کی قیمت آٹھ آنے اس وقت بھی بہت کم لگی۔

ہم وہاں سے آتو گئے مگر ڈاکٹر صاحب سے بالکل متاثّر نہ ہوئے۔سوچا یہ بھی کوئی ڈاکٹر ہیں اور یہ بھی کوئی طریقہ علاج ہے۔جادو ٹونا لگتا ہے۔کسی اور ڈاکٹر حکیم کے پاس جانا پڑے گا۔

دفتر آکر کام میں مصروف ہو گئے۔دوسرے دن صبح آنکھ کھلی تو پیٹ پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔تکلیف نے ہمیں بے چین کر رکھا تھا۔بڑی مشکل سے امّاں سے یہ بات پوشیدہ رکھی ورنہ وہ ان گنت فضیحتے کرتیں اور فوراً ڈاکٹر اکرم کے پاس جانے کا مشورہ دے دیتیں۔

دفتر پہنچے تو پیٹ کی تکلیف اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ڈاکٹر صاحب پر بہت غصّہ آیا کہ خدا جانے کیا دوائی دے دی ہے کہ فائدے کے بجائے نقصان ہو گیا۔سوچا کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس جا کر انہیں یہ صورت حال بتا کر شرمندہ تو کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب کی دکان میں وہی کل والا نقشہ تھا۔وہی بزرگ اسی طرح بیٹھے حقّہ پینے میں مصروف تھے۔لگتا تھا جیسے وقت تھم گیا ہے۔سب کچھ ویسا کا ویسا ہی رہ گیا ہے۔

ہم غصّے میں ایک سیڑھی چڑھ کر ڈاکٹر صاحب کے پاس چلے گئے۔کہنا تو بہت کچھ چاہا مگر ڈاکٹر صاحب کو دیکھا تو غصّہ دودھ کے اُبال کی طرح بیٹھ کر رہ گیا۔جھگڑا کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔پھر بھی ہم نے ناراضگی سے کہا” ڈاکٹر صاحب! آپ کی دوا سے تو تکلیف اور بڑھ گئی ہے۔میرا پیٹ پھوڑے کی طرح دُکھ رہا ہے۔اب کیا ہو گا؟“

ڈاکٹر صاحب نے ایک نگاہ ہم پر ڈالی پھر ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بڑے اطمینان سے فرمایا”ہو گا کیا، پیٹ پھٹ جائے گا۔تم مر جاؤ گے۔“

ہم نے چونک کرانہیں دیکھا۔غصّہ دوبارہ آنے لگا۔ مگر ہمارے بولنے سے پہلے حقّہ نوش بزرگ بولے۔"پُتر۔کوئی فکر کی لوڑ نہیں ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں صحیح دوائی دی ہے۔اب تم جاؤ۔سات دن بعد آنا۔جاؤ۔شاباش میرا پُتر"۔

یہ صاحب ڈاکٹر صاحب کے سرکاری ترجمان تھے۔ان کا لہجہ اس قدر مشفقانہ اور بزرگانہ تھا کہ ہم پھر غصّہ نہ کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب کو گھور کر رہ گئے۔پھر خاموشی سے چلے آئے۔

کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کا وقت بھی نہ ملا۔ڈاکٹر اقبال بھی بیڈن روڈ پر ہی ہوتے تھے مگر ہم ان سے علاج نہیں کرانا چاہتے تھے۔اس لیے ایک اور دن گزر گیا۔

تیسرے دن صبح محسوس ہوا کہ پیٹ کی تکلیف میں کچھ کمی ہے۔چوتھے دن مزید بہتری ہوگئی۔ساتویں دن تو دکھ درد سب جاتا رہا تھا۔بھوک بھی بہتر ہوگئی تھی جس کی وجہ سے امّاں ناشتے کے وقت کچھ خوش خوش نظر آئیں۔

ڈاکٹر صاحب کے پاس جا کر ہم نے انہیں تمام احوال سنایا۔ان کے دوست اسی طرح بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔ڈاکٹر صاحب نے ہماری بات پوری ہونے سے پیش تر ہی کاغذ کے ایک پُرزے پر کچھ لکھ کر دے دیا اور ہاتھ کے اشارے سے فرمایا کہ دفع ہو جاؤ۔کمپاؤنڈر سے جا کر دوائی لے لو۔

کمپاؤنڈر نے اس روز ہمارے لیے سفوف کی تین پڑیاں بنائیں۔ایک بذات خود ہماری زبان پر ڈال دی۔باقی دو لپیٹ کر حوالے کیں اور کہا"چار چار گھنٹے کے وقفے سے کھانا۔"

"اور پھر کب آئیں؟" ہم نے پوچھا۔ہمارا خیال تھا کہ شاید اب تین ہفتے بعد آنا پڑے گا۔

کمپاؤنڈر نے ایش ٹرے سے سگریٹ اٹھایا اور بیزاری سے ہمیں اشارے سے بتایا کہ باقی باتیں اُدھر جا کر کرو۔ڈاکٹر صاحب ہی بتائیں گے۔ہم کشاں کشاں ڈاکٹر صاحب کے حضور میں جا پہنچے"ڈاکٹر صاحب، کتنے پیسے ہوگئے؟"

وہ بدستور کنگھی میں لگے ہوئے تھے۔ہماری طرف دیکھا اور بولے"ایک روپیہ۔"

ہم نے خوشی خوشی ایک روپیہ ان کے سامنے رکھ دیا۔

"اب کب آئیں؟" ہم نے پوچھا"اگلے مہینے؟"

بولے ”کل صبح۔“

ہم حیران رہ گئے۔ ہم تو آٹھ دن گزرنے کے عادی ہونے لگے تھے۔ مگر یہاں معاملہ ہی مختلف ہو گیا تھا۔ عجیب بات یہ کہ آٹھ دن کی دوائی کی قیمت آٹھ آنے اور ایک دن کی دوائی ایک روپے میں؟ پھر معلوم ہوا کہ قیمت ڈاکٹر صاحب کے موڈ اور مرضی پر منحصر تھی۔ جو منہ میں آتا کہہ دیتے تھے۔ کم و بیش سے انہیں غرض نہیں تھی۔

دوسرے دن گئے اور جاتے ہی خوشی خوشی ڈاکٹر صاحب کو اپنا احوال بتانے لگے۔ ابھی دوسرا فقرہ ہی ادا کیا تھا کہ انہوں نے پُرزہ اٹھا کر کچھ لکھا اور ہمارے سامنے رکھ دیا۔

ہم نے کہا ”ڈاکٹر صاحب! آپ نے ہمارا حال تو سنا ہی نہیں۔“

ڈاکٹر صاحب قدرے بہتر موڈ میں تھے۔ بولے ”جب آپ سیڑھی چڑھے تھے اسی وقت میں نے دیکھ لیا تھا کہ سب ٹھیک ہے۔“ پھر اپنے دوست سے مخاطب ہوئے ”کیوں۔ چہرہ کیسا صاف ہے۔ رنگ بھی سُرخ ہے۔ طبیعت بھی بحال ہے۔ کیوں‘ ہے کہ نہیں؟“

انہوں نے تائید فرما دی ”کیسے نہیں ہو گی۔ دوائی کس کی کھائی ہے“!

ان ڈاکٹر صاحب سے ہم وقتاً فوقتاً علاج کراتے رہے مگر دل نہیں ٹھکا۔ دراصل ان کا انداز ہمیں پسند نہیں آیا تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں ڈاکٹروں ٗ حکیموں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بیمار کم تھے‘ معالج بہت زیادہ تھے مگر ہمارے دوست صلاح الدین کا انہوں نے معرکہ آراء علاج کیا تھا۔ کچھ اور بھی حضرات کا انہوں نے علاج کیا تھا۔ دو تین فلمی حضرات اور ایک دو ایکٹریسوں کو بھی ان کے علاج سے فائدہ ہوا۔

ہم ہر روز لکشمی چوک جاتے ہوئے بیڈن روڈ سے گزرتے تھے اور ڈاکٹر صاحب کی دکان کی جانب نظر ضرور ڈالتے تھے۔ مریض تو کم ہی نظر آئے مگر ان کے حقّہ نوش دوست کو ہمیشہ حاضر پایا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی پریکٹس نہیں چلتی تھی۔ کافی مریض آتے تھے۔ بڑے بڑے اعلیٰ حکّام اور پیسے والے ان کے مستقل مریض تھے۔ گورنر ہاؤس سے کئی بار انہیں لینے کے لئے شاندار گاڑی ہم نے بھی آتی دیکھی مگر ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر واپس بھیج دیتے کہ اس وقت فرصت نہیں ہے۔ کئی لوگوں سے ان کی روحانی قوّتوں کے بارے میں بھی واقعات سنے مگر ڈاکٹر

صاحب عموماً خاموش ہی رہا کرتے تھے۔ نہ جانے ضرورت کے وقت بھی مختصر فقرہ کیسے ادا کرتے تھے۔ مگر بڑے وضع دار اور بے نیاز آدمی تھے۔ان کا لباس ہمیشہ ہم نے وہی دیکھا۔کم ہی ہو گا جب ہم نے انہیں محض شلوار قمیض میں دیکھا ہو گا۔ سخت گرمی میں بھی واسکٹ لازماً پہنا کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی وسیع و عریض کوٹھی ماڈل ٹاؤن ہی میں تھی۔ ان کا کوئی بیٹا صبح انہیں دکان پر ڈراپ کر کے چلا جاتا تھا اور پھر رات کو مقرّرہ وقت پر لے جاتا تھا۔دن میں وہ لنچ، چائے اور قیلولہ فرماتے تھے۔ اس مقصد کے لئے دکان میں ایک جانب پردہ لٹکا ہوا تھا۔اس کے پیچھے کیا تھا؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔البتہ چائے کے وقت اندر سے برتنوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔چائے نزدیک کے تنور نما ہوٹل سے آتی تھی مگر سروس کمپاؤنڈر کے ذمّے تھی۔چائے کی گول ٹرے آتے ہی کمپاؤنڈر یہ چائے اور برتن لے کر پردے کے پیچھے چلا جاتا تھا۔ڈاکٹر صاحب بھی پردے کے پیچھے روپوش ہو جاتے تھے۔ چائے وہ صرف ایک وقت سہ پہر کو پیتے تھے۔کھانا کھاتے ہوئے ہم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا مگر جب وہ میز پر نظر نہ آئیں تو کمپاؤنڈر صاحب یہی فرماتے تھے کے اندر آرام کر رہے ہیں۔پردے کے پیچھے کا اسرار کافی عرصے بعد ہم پر آشکار ہو گیا تھا۔اس زمانے میں ان کے بڑے صاحبزادے حامد حسن صاحب ان کے جانشین بن چکے تھے۔

پردے کے پیچھے صرف ایک لکڑی کی بینچ پڑی ہوئی تھی۔اسی پر چائے پی جاتی تھی۔اس پر لیٹ کر قیلولہ کر لیتے تھے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

قد کاٹھ میں حامد حسن اپنے والد سے کم تھے مگر حلیہ بالکل وہی تھا۔ایک فرق یہ تھا کہ ابا جان خاموشی کا روزہ رکھ کر بیٹھتے تھے مگر حامد حسن خاصے باتونی تھے۔وہ جنگ کے زمانے میں برما کے جنگلات میں فوجی ڈیوٹی دے چکے تھے۔ ان کا بیان تھا کہ ایک بار وہ جنگل میں بھٹک کر جنگلی قبائل میں پہنچ گئے تھے۔ان جنگلیوں کے رہن سہن اور رسم و رواج کا وہ بہت دلکش اور رنگین مگر انوکھا نقشہ کھینچتے تھے۔ سردار کس طرح درجنوں بیویاں رکھتے تھے اور عورتوں کو کس قدر آزادی حاصل تھی وغیرہ وغیرہ۔ کئی بار یوں محسوس ہوا جیسے کہ ڈاکٹر صاحب مبالغہ آرائی کر رہے ہیں۔ان سے

ہماری قدرے بے تکلّفی بھی ہو گئی تھی اس لئے کہ عمر میں زیادہ فرق نہ تھا۔ ہم سے وہ بہر حال پندرہ' بیس سال بڑے تھے۔ وہ گفتگو میں بڑے زوردار الفاظ استعمال کرتے تھے اور دعوے بھی خوب کرتے تھے۔

''بس جی! ایک پڑیا میں بیس سال کا مرض اُڑا کر رکھ دیا میں نے۔ ایک کے بعد دوسری پڑیا کھانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔''

ایک بار ایک سادہ لوح مریض یہ سن کر پوچھ بیٹھا ''ڈاکٹر صاحب! کیا مریض اللہ کو پیارا ہو گیا تھا؟''
انہوں نے اسے گھورا اور بولے ''کس قدر علم کی کمی ہے۔ ارے وہ تندرست ہو گیا تھا بالکل بھلا چنگا۔''

ڈاکٹر حامد حسن دوائی کی قیمت اپنے والد کے مقابلے میں زیادہ وصول کرتے تھے۔ کمپاؤنڈر ان کا بھی وہی تھا مگر حقّہ بردار بزرگ غائب تھے۔ انہوں نے بھی کچھ مریضوں کے کامیابی سے علاج کئے مگر ان کی خودستائی سے ہم عاجز تھے۔ گورنر ہاؤس سے ان کا بلاوا بھی آجاتا تھا اور اس کا عموماً تذکرہ کرتے رہتے تھے حالانکہ ان کے والد نے کبھی اس بارے میں اشارہ تک نہیں کیا تھا۔ حامد حسن کا کہنا تھا کہ وہ خاندانی حکیم بھی ہیں اور ان کے جدّامجد راجاؤں' نوابوں کا علاج کرتے تھے اور ایک ہی خوراک میں ''مرض کو اڑا کر رکھ دیتے تھے۔'' یہ ان کا تکیہ کلام تھا۔
ہمارے والد آکا میاں کو بھی آخری دنوں میں ہم نے ڈاکٹر صاحب کو دکھایا تھا اور ایک بار ان کے وعدہ کرنے کے باوجود انہیں دیکھنے کیلئے نہ آنے سے بدمزگی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ آکا میاں کا مرض علاج کی حد سے آگے گزر چکا تھا مگر تکلیف کی شدّت تھی۔ وہ گھبرا کر مختلف معالجوں اور ڈاکٹروں سے رجوع کرنے کیلئے کہا کرتے تھے اور ہم لوگ ان کا دل رکھنے کی خاطر حکم کی تعمیل میں پس و پیش نہیں کرتے تھے حالانکہ جانتے تھے کہ مرض لادوا ہو چکا ہے۔
ان کی فرمائش پر ایک بار ڈاکٹر حامد حسن صاحب بھی ہمارے گھر تشریف لائے۔ آکا میاں کو بہت تسلّی دلاسے دیتے۔ مختلف واقعات بھی سناتے کہ کس طرح ایک پڑیا سے انہوں نے مرض کو اُڑا کر رکھ دیا تھا۔
آکا میاں ان سے بہت متاثّر ہوئے۔ شام کو ہم دوائی لے کر آئے تو انہوں نے کہا ''بھئی تمہارا یہ ڈاکٹر تو کافی سمجھدار لگتا ہے۔ اب کچھ دن اس کا علاج کریں گے۔''

دو دن بعد تکلیف بڑھ گئی۔ آکا میاں کا اصرار تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ تاکہ وہ دیکھ کر دوائی تبدیل کریں۔ ہم نے کہا بھی کہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر کو صرف مریض کا حال بتا دینا ہی کافی ہے مگر وہ مصر تھے کہ ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ۔

ہم نے ڈاکٹر صاحب کو فون کرکے درخواست کی کہ وہ کلینک جاتے ہوئے اِدھر سے گزرتے جائیں مگر ڈاکٹر صاحب نہ آئے۔ شام کو پھر ان سے درخواست کی کہ رات کو گھر جاتے ہوئے ہمارے گھر کی طرف سے نکلتے جائیں مگر ڈاکٹر صاحب نہ آئے۔

ہم رات کو گھر پہنچے تو آکا میاں تکلیف سے بے چین تھے۔ بار بار ڈاکٹر صاحب کا پوچھ رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب لا پتہ تھے۔

ہمیں یاد ہے کہ وہ نیو ائیر نائٹ تھی۔ ہوٹلوں' کلبوں میں خوب رونق اور ہنگامے تھے مگر ہم سٹوڈیو سے سیدھے گھر آ گئے تھے۔ آکا میاں کی بیماری اور تکلیف کی وجہ سے ہم بہت پریشان اور اداس تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی وعدہ خلافی کا سنا اور آکا میاں کی تکلیف کو دیکھا تو ہمیں بہت غصّہ آیا۔

اوپر اپنے کمرے میں جا کر ہم نے ڈاکٹر صاحب کے گھر کا فون نمبر ملایا۔ رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ سردی کڑاکے کی تھی اور ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ اُس زمانے میں تو سردی کے مارے کھیتوں اور باغوں کے لان میں پانی بھی جم جاتا تھا۔

کافی دیر کے بعد کسی نے فون اٹھایا تو ہم نے ڈاکٹر صاحب سے بات کرانے کی درخواست کی۔ کافی پس و پیش کے بعد انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو جگایا۔

''ہیلو''!

ہم نے اپنا نام بتایا۔

وہ پریشان ہو کر بولے ''آفاقی صاحب! اتنی رات گئے ٹیلی فون؟ خیریت تو ہے؟ ''

ہم نے کہا ''ڈاکٹر صاحب! نہ آپ مسیحا ہیں نہ لاعلاج مرض کو ٹھیک کر سکتے ہیں۔ مگر کسی بیمار کا دل توڑ کھ سکتے ہیں۔''

''کیوں۔۔۔ کیا ہوا؟ ''

''آپ نے دوبارہ وعدہ کیا اور نہ آئے۔ آکا میاں آپ کے انتظار میں گھڑیاں گنتے رہے۔ اگر فیس درکار تھی تو وہ بھی بتا دیتے۔ ہمیں انکار نہ ہوتا۔ مگر ایک بوڑھے اور بیمار شخص کو اس طرح تکلیف اور عذاب میں مبتلا رکھنا تو کوئی مناسب بات نہیں ہے۔''

ہم نے اور بھی بہت کچھ کہا۔ ڈاکٹر صاحب کافی تنک مزاج تھے مگر چُپ چاپ سنتے رہے۔ پھر کہا ''شرمندہ ہوں۔ میں صبح سویرے ہی پہنچوں گا۔''

ہم نے کہا ''شکریہ! بس رہنے دیجئے۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ آپ کی دوا سے فائدہ نہ ہوگا۔ اس لئے یہ احسان نہ ہی فرمائیں۔'' ہم نے غصّے میں فون بند کر دیا۔ چند لمحے میں بزرگ اور مانے ہوئے معالج کی شان میں گستاخی کر دی ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ہم کافی شرمسار ہوئے۔ سوچا کہ کل ڈاکٹر صاحب کے پاس خود جا کر معذرت کریں گے۔

یکایک کوٹھی کے گیٹ پر کار کا ہارن چلاّنے لگا اور اس کے ساتھ ہی ہمارے کتّے جنگلی نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ہم نے کمبل لپیٹا اور نیچے کی طرف چلے کہ اتنی رات گئے' ایسے موسم میں کون آ گیا۔

نیچے پہنچے تو ہمارے بھائی ڈاکٹر حامد کو لے کر آکا میاں کے کمرے میں پہنچ چکے تھے اور ڈاکٹر صاحب ان کی زبانی احوال سننے میں مصروف تھے۔ وہ حسب معمول لمبا اوور کوٹ اور قراقلی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ اپنے والد کی طرح وہ اپنی داڑھی میں انگلیاں تو نہیں گھماتے تھے مگر داڑھی کو مٹھی میں لے لیا کرتے تھے۔ غور و فکر کرتے وقت وہ ایسا ضرور کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ یہی کر رہے تھے اور بہت غور سے آکا میاں سے بیماری کی تفصیل سن رہے تھے۔ ہم پیچھے ہی کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہماری بدتمیزی کے جواب میں جس بلند اخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا اس کی وجہ سے ہم اور بھی زیادہ شرمندہ ہو گئے تھے۔

آکا میاں نے جب اپنی بیماری کی تفصیل بیان کر دی تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ درد تو آپ کا تھوڑی دیر میں ہی ختم ہو جائے گا۔ میں آپ کیلئے ایک دوائی لے کر آیا ہوں جو آپ کی تکلیف کو اُڑا کر رکھ دے گی''۔

یہ کہہ کر انہوں نے چند پُڑیاں دے کر ضروری ہدایات دیں۔ آکا میاں نے انہیں بہت دعائیں دیں اور شکریہ ادا کیا۔ اماں نے پان کی ایک گلوری بنا کر ان کو بھجوائی۔ اتنی رات گئے مہمان کی اور کیا تواضع ہو سکتی تھی؟ ہمیں معلوم تھا کہ

ڈاکٹر صاحب پان نہیں کھاتے مگر انہوں نے شکریہ ادا کر کے گلوری اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی اور رخصت کی اجازت چاہی۔ ہم سامنے سے کھسک گئے۔ آگے کیا ہوا، اسکا ذکر ہم پہلی قسطوں میں کر چکے ہیں، مقصد اس واقعہ کو دہرانے کا یہ تھا کہ آپ کو بتایا جاسکے کہ کیسے کیسے لوگ ہوا کرتے تھے جو اپنی ذات میں انجمن ہوتے تھے۔

گزرے ہوئے لوگوں اور گزرے زمانے کا تذکرہ نکلا تو اداکار اسماعیل شاہ یاد آگئے۔ اسماعیل شاہ 1980-81ء میں فلمی دنیا میں وارد ہوئے تھے۔ ابتدائی فلموں ہی میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ایک دم مقبول ہیرو بن گئے۔ ایسی خوش بختی فلمی دنیا میں بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ اسماعیل شاہ بھی ان ہی خوش نصیب لوگوں میں تھے۔

وہ جس طرح اچانک فلمی دنیا میں آئے تھے اسی طرح اچانک رخصت ہو گئے۔ وہ کسی تقریب کے سلسلے میں اپنے وطن مالوف کوئٹہ گئے تھے کہ اچانک دل کا دورہ پڑنے سے آناً فاناً دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ اکتوبر 1993ء کی بات ہے۔ اس وقت ان کی عمر 35 سال سے زیادہ نہ تھی۔ صحت بھی اچھی تھی۔ سرخ و سفید رنگت، براؤن آنکھیں، براؤن گھنے بال جن کو وہ ہمیشہ ایک ہی انداز میں سنوار کر رکھتے تھے۔ ایسا خوبرو، مصروف اور کامیاب اداکار ایک دم دنیا سے روپوش ہو جائے تو یہ بجائے خود ایک المناک اور ساکت کر دینے والی بات ہے۔ نہ بیمار ہوئے، نہ کسی حادثے کا شکار ہوئے۔ بس ایک دن دل کا دورہ پڑا اور چپکے سے چل پڑے۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ آج تم کل ہماری باری ہے۔

اسماعیل شاہ کا تعلق کوئٹہ سے تھا۔ وہ دوسرے بہت سے فنکاروں کی طرح ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے تربیت حاصل کر کے فلمی دنیا میں آئے تھے۔ ریڈیو کسی زمانے میں اداکاروں کی تربیت گاہ سمجھا جاتا تھا۔ جب پاکستان میں ٹیلی ویژن متعارف ہوا تو ریڈیو کی جگہ ٹیلی ویژن نے لے لی۔ ریڈیو میں تو مکالموں کی ادائیگی اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے متاثر کن اداکاری کے گر سکھائے جاتے تھے۔ اس ادارے کے سربراہ ایسے جید اور ثقہ عالم لوگ تھے کہ تلفظ، ادائیگی اور لب و لہجے کی معمولی سی غلطی بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اکثر اوقات تو ڈراما یا پروگرام ختم ہوتے ہی ڈائریکٹر جنرل

بخاری صاحب کا ٹیلی فون آجاتا تھا اور وہ غلطی کی نشاندہی کر کے اس کی تصحیح کر دیا کرتے تھے۔ وہ لوگ فاضل بھی تھے۔ اپنے کام سے مخلص اور دیانتدار بھی تھے۔ ایسے سربراہوں کے ہوتے ہوئے کسی غلط بولنے والے کا ریڈیو میں داخلہ ہی ناممکن تھا۔ سفارش کوئی نہیں سنی جاتی تھی۔ میرٹ اور صرف میرٹ ہی معیار تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں جن لوگوں نے ریڈیو میں کام کیا وہ اپنی جگہ آفتاب و ماہتاب تھے۔ ہر فنکار اپنی جگہ منتخب روزگار اور ہیرا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیو کے ڈرامے اور پروگرام انتہائی پسند کئے جاتے تھے۔ ٹیلی ویژن کے آجانے کے بعد بھی ریڈیو سے دلچسپی اور دل بستگی قائم رہی مگر پھر جب معاشرے میں دورِ زوال کا آغاز ہوا تو ریڈیو بھی اس کی زد میں آگیا۔

اگر ابتدائی زمانے کے ریڈیو پروگراموں کا آج کے پروگراموں اور فنکاروں سے مقابلہ کیا جائے تو ندامت سے سر جھک جاتا ہے۔ دنیا وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی ہے۔ افسوس کہ ہم نے ترقی معکوس کو اپنا شعار بنالیا۔ صرف ریڈیو تک ہی منحصر نہیں ہے۔ سبھی شعبوں کا یہی حال ہے۔

جب ٹیلی ویژن کا آغاز ہوا تو یہاں بھی اس نئے میڈیا کے سربراہ اور کرتا دھرتا چنے ہوئے لوگ تھے جنہوں نے اپنی محنت، خلوص اور لگن سے پاکستان ٹیلی ویژن کو دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بھر میں نمایاں کر دیا۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگراموں اور فنکاروں کی ہر جگہ مثالیں دی جاتی تھیں۔ دلیپ کمار جیسا مایہ ناز فنکار پی ٹی وی کے ڈرامے دیکھتا تھا۔ ان کا شیدائی تھا اور پاکستانی فنکاروں کی مہارت کا مداح۔ بھارت میں بڑے بڑے فلمساز، ہدایت کار اور فنکار پی ٹی وی کے پروگرام دیکھ کر ان سے سیکھا کرتے تھے۔ افسوس کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹیلی ویژن بھی زوال پذیر ہو گیا۔ آج کے ٹیلی ویژن کا ماضی کے ٹیلی ویژن پروگراموں سے موازنہ کیا جائے تو ایک بار پھر سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔

اسماعیل شاہ جب ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے وابستہ ہوئے اس وقت بھی ان اداروں کا کچھ بھرم قائم تھا گرچہ تنزلی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود معاملہ بہت غنیمت تھا۔ ہمارے ہاں زوال رفتہ رفتہ آیا ہے۔ یہ بلا ایک دم نازل نہیں ہوئی ہے۔ اگر آغاز ہی میں اس کو روک دیا جاتا تو یہ صورتحال نہ ہوتی جو آج ہے۔ اب تو حالات پستی کی آخری حد تک پہنچ چکے ہیں۔ پھر بھی اصلاح کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔

اسماعیل شاہ نے ٹیلی ویژن پر اداکاری کا آغاز کاسٹیوم ڈراما ''شاہین'' سے کیا تھا۔اس وقت وہ نوجوان تھے۔ مرکزی کردار میں انہوں نے اتنی اچھی اداکاری کی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔اس کے بعد انہوں نے اور بھی کئی ٹی وی ڈراموں میں کام کیااور سب کو متاثر کیا۔ان کی اداکارنہ صلاحیتوں سے متاثر ہو کر فلمی صنعت نے بھی ان کی طرف دھیان دیا۔ٹیلی ویژن نے اب فلموں کے لئے تربیت گاہ اور نرسری کے فرائض سنبھال لئے ہیں اور کئی اچھے فنکار اسی راستے سے فلمی صنعت میں آئے ہیں۔

اسماعیل شاہ سے بہت سے فلم ساز متاثر تھے مگر ہماری فلمی صنعت کا ایک یہ بھی انداز ہے کہ تعریف تو سب کرتے رہتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے ؟اکثر فلم سازوں اور ہدایت کاروں میں خود اعتمادی کا فقدان ہے اس لئے وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ پہل کوئی اور کرے اور جب کوئی من چلا پہلا قدم اٹھا کر تجربہ کرتا ہے اور یہ تجربہ کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر بھیڑ چال شروع ہو جاتی ہے اور فلم سازوں کا رخ اسی طرف ہو جاتا ہے۔

اسماعیل شاہ کو فلم کے لئے انتخاب کرنے والے پہلے فلم ساز سجاد گل تھے۔انہوں نے مہم جوئی سے تعلق رکھنے والی ایک فلم ''سونے کی تلاش'' بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔یہ ایک مختلف اور انوکھی کہانی تھی جس کی فلم بندی مصر میں کی جانے والی تھی۔

سجاد گل اور ان کے بھائی شہزاد گل اس قسم کے تجربات کرنے کے عادی ہیں۔ کبھی وہ'' لوسٹوری'' بنانے کینیا چلے جاتے ہیں اور انگلستان کی ایک لڑکی کو ہیروئن منتخب کرتے ہیں۔ کبھی منیلا، کبھی کولمبو میں فلمیں بناتے ہیں۔

''سونے کی تلاش'' کے ہدایت کار حسن عسکری تھے۔اس فلم میں اسماعیل شاہ کو ہیرو منتخب کیا گیا۔ہیروئن ایک مصری دوشیزہ فائز کمال تھیں۔یہ فلم بڑے سرمائے سے بنائی جانے والی تھی مگر ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس کی تکمیل میں التوا ہو گیا۔یوں اسماعیل شاہ کی پہلی فلم کھٹائی میں پڑ گئی تھی اور اس طرح ان کا فلمی مستقبل بھی خطرے میں تھا۔ مگر اسی دوران میں ہدایت کار ممتاز علی خان نے انہیں اپنی فلم ''باغی قیدی'' میں ہیرو کے طور پر چن لیا۔

ممتاز علی خاں بنیادی طور پر پشتو فلموں کے ہدایت کار تھے۔انہوں نے پشتو میں بے حد معیاری اور کامیاب فلمیں بنائی ہیں مگر گاہے بگاہے وہ اردو فلمیں بھی بناتے رہے جن میں سے اکثر کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھیں۔

"باغی قیدی" سجاد گل کی فلم "سونے کی تلاش" سے پہلے ریلیز ہوگئی۔اس طرح فلمی صنعت میں اسماعیل شاہ کو متعارف کرانے کا سہرا ممتاز علی خاں کے سر باندھا گیا۔

باغی قیدی میں اسماعیل شاہ نے بہت اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا اور اپنے کردار کے ساتھ پورا پورا انصاف کی تھا۔پہلی فلم کی کامیابی نے انہیں راتوں رات سٹار بنادیا اور فلم سازوں نے حسب معمول ان کے دروازے کا رخ کرلیا۔باغی قیدی 1986ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اسماعیل شاہ 1993ء میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔اس طرح سات سال کے مختصر عرصے میں انہیں لگ بھگ 44 فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا جن میں سے بیشتر کامیاب فلمیں تھیں لیکن آخری زمانے میں قسمت نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور کئی فلموں کی ناکامی سے بددل ہوکر وہ فلمی صنعت سے بھی بد دل ہوگئے تھے۔

ان کی اس بددلی اور مایوسی کا ایک سبب محبت میں ناکامی بھی تھا۔اسماعیل شاہ نے یوں تو کئی ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا تھا مگر بابرہ شریف کے ساتھ کام کرنے کے بعد وہ ان میں دلچسپی لینے لگے۔بابرہ نے بھی ایک خوبرو، خوش اطوار اور شائستہ نوجوان پا کر ان کی طرف توجہ دینی شروع کردی۔یہ بھی سچ ہے کہ ایک موقع پر بابرہ شریف ان کے بارے میں سنجیدہ ہوگئی تھیں مگر ان کی شراب نوشی کی وجہ سے پریشان ہوگئیں۔فلمی دنیا میں وہ شرابی شوہروں کا انجام دیکھ چکی تھیں۔تھوڑی بہت مے نوشی تو شاید وہ برداشت کرلیتیں مگر اسماعیل شاہ اعتدال کی حد سے گزر چکے تھے۔انہوں نے اس عادت پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر وہ بے بس ہوچکے تھے۔ان کی یہی عادت فلمی صنعت میں ان کی پسماندگی کا سبب بھی قرار دی جاسکتی ہے۔ اداکاری کی طرف وہ توجہ مرکوز نہیں رکھ سکے لہٰذا ان کا پچھلی جانب سفر شروع ہوگیا۔جب کامیابیوں اور مقبولیت میں کمی ہونے لگی تو اسماعیل شاہ بددل اور فلمی صنعت سے برگشتہ ہوگئے حالانکہ فلم والوں کا قصور نہ تھا۔ غلطی اور کوتاہی خود ان کی تھی۔ہر ناکامی کے بعد ان کی اس عادت میں اضافہ ہوتا گیا۔ شاید یہی عادت بدبالآخر ان کے ہارٹ فیل کا سبب بن گئی۔وہ شخص جو ٹیلی ویژن کے پہلے ڈرامے اور پہلی فلم ہی سے

کامیابیوں کا خوگر ہو گیا تھا، وہ ناکامیوں کو کیسے برداشت کر لیتا؟ ان کی موت پر کہا گیا کہ بابرہ شریف کے عشق میں دیوانہ ہو کر اس نے شراب نوشی بڑھادی تھی، بابرہ وفا کرتی تو وہ بچ جاتا، حالانکہ یہ حقیقت نہیں، اس میں بابرہ کا ذرا بھی دوش نہیں تھا۔ اسماعیل شاہ نے خود اپنے آپ کو تباہ کیا، وہ شراب چھوڑ دیتا یا کم کر دیتا تو ممکن ہے بابرہ شریف اس سے تعلق بڑھا لیتیں۔ ہم جانتے ہیں کہ بابرہ حقیقت میں شریف بھی تھیں۔ وہ اعتدال سے بڑھنے والوں سے اجتناب کرتی تھیں۔

اسماعیل شاہ نے بہت سے ممتاز ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا جن میں حسن عسکری، حیدر چوہدری، سنگیتا، اقبال کاشمیری، جان محمد جمن، حسنین اور شمیم آرا کے ساتھ انہیں کام کرنے کا موقع ملا۔ اسی طرح اس زمانے کی مقبول ہیروئنوں کے بالمقابل بھی انہوں نے کام کیا۔ نادرہ، نیلی، اسماعیل شاہ اور اظہار قاضی ایک ہی سال میں فلموں میں جلوہ گر ہوئے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ ان میں سے دو یعنی اسماعیل شاہ اور نادرہ عین شباب میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ نیلی اور اظہار قاضی خدا کے فضل سے بقید حیات ہیں مگر فلمی دنیا کو خیر باد کہہ چکے ہیں۔

اسماعیل شاہ ایک حساس اور ذہین اداکار تھے۔ ہر کردار کو سوچ سمجھ کر ادا کرتے تھے اور اس کے ساتھ پورا انصاف کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ذاتی زندگی میں وہ ایک شائستہ، خوش اطوار، خوش لباس اور خوش مزاج انسان تھے۔ انتہائی مہذب اور خوش اخلاق بھی تھے۔ اپنی ذمہ داریوں کو دیانتداری سے نبھانے کی کوشش کرتے تھے۔ افسوس کہ جب وہ شراب خانہ خراب کے آگے بے بس ہوئے تو ان کی ساری خوبیاں تو ان کے ساتھ رہیں مگر ارتکاز نہ ہونے کی وجہ سے اداکاری بہت زیادہ متاثر ہوئی اور ظاہر ہے کہ یہی ایک فنکار کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔

اسماعیل شاہ کو رقص میں بھی مہارت حاصل تھی۔ بعض لوگوں کے خیال میں وہ پاکستانی اداکاروں میں وحید مراد کے بعد سب سے اچھے ڈانسر تھے۔ ان کی مشہور اور قابل ذکر فلموں میں ناچے ناگن، لیڈی اسمگلر، منیلا کے جانباز، مکھڑا، دوستی، تیزاب، ایک سے بڑھ کر ایک، حفاظت، برداشت، ہوشیار، کالے چور، اللہ وارث، درندگی، باغی، قیدی، وطن کے رکھوالے اور چاہت شامل ہیں۔ وہ جس تیزی سے فلمی افق پر نمودار ہوئے تھے، اسی تیزی سے غائب بھی ہو گئے۔ ان کی اچانک موت کی خبر نے ساری فلمی صنعت کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔ کئی دن تک ان کے تذکرے اور ان کی خوبیوں کا

بیان ہوتا رہا مگر پھر فلمی دنیا کے دستور کے مطابق وہ ایک بھولی ہوئی داستان بن کر رہ گئے۔ غالباً آج کے فلم بینوں کی بہت بڑی تعداد ان کا نام تک نہیں جانتی۔ رہے فلم ساز اور ہدایت کار تو ان بے چاروں کو دوسرے ناموں سے اتنی فرصت کہاں کہ کسی بچھڑے ہوئے ساتھی کو یاد رکھیں۔

تقسیم برصغیر کے موقع پر لاکھوں مہاجرین مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں سے لٹ پٹ کر پناہ کی تلاش میں پاکستان آئے تھے جن میں سے اکثر نے لاہور ہی کو رہائش کے لئے منتخب کیا۔ خصوصاً تہذیبی اور ثقافتی تعلق رکھنے والے افراد کو لاہور سے بہتر کوئی اور جگہ میسر نہیں آسکتی تھی۔

لاہور اپنی تہذیبی، علمی اور ثقافتی روایات کے حوالے سے سارے برصغیر میں منفرد نوعیت کا شہر تھا اور اس کی گوناگوں خصوصیات کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم لاہور ایک ایسا شہر تھا جہاں غالب کے الفاظ میں "منتخب روزگار" لوگوں کا جمگھٹا تھا۔ یہ علم و فن کے علاوہ موسیقی کا بھی گہوارہ تھا۔ برصغیر میں موسیقی کے شعبے میں جن لوگوں نے بہت نام پیدا کیا ان میں سے بہت بڑی تعداد لاہور سے تعلق رکھنے والوں کی تھی۔ گائیکی ہو یا سازوں اور طبلے کا میدان۔ ہر شعبے میں یہاں کے لوگوں نے ایسا نام پیدا کیا کہ آج بھی سارے برصغیر میں یاد کئے جاتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ یہ سب لوگ شہر لاہور ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ لاہور میں ایک ایسی کشش تھی کہ آس پاس کے علاقوں کے لوگ بے اختیار یہاں کھنچے چلے آتے تھے اور پھر ہمیشہ کے لئے لاہور ہی کے ہو کر رہ جاتے تھے۔ اس لئے لاہور ہی کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے اور لاہور والے کہلاتے تھے۔ نام گنوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پاکستان میں موسیقی کے میدان میں جو فن کار اور فنکارائیں نامور ہوئیں اور جنہوں نے ہندوستان میں بھی اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ وہ لاہور ہی سے گئے تھے اور جب لوٹ کر آئے تو لاہور ہی میں آکر اس کی مٹی میں جذب ہو گئے۔ بقول غالب ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لعین

تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

فلم و فن سے تعلق رکھنے والی، چار دانگ عالم میں اپنا نام پیدا کرنے والی بے شمار ہستیاں لاہور کی خاک میں پنہاں ہیں۔ جب وہ زندہ تھے تو ان کی آوازیں اور سازوں کی جھنکاریں گونجتی تھیں، اب ان کے نام اور کارنامے ہی باقی رہ گئے ہیں جن کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہیں۔

یوں تو مہاجر بن کر آنے والوں کو جہاں جگہ ملی وہ وہاں بس گئے مگر اس سلسلے میں لاہور کی کڑی باوا کو ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ یہ کشمیری دروازے اور مستی دروازے کے درمیان واقع ہے۔ یہ کوئی ایک عمارت نہیں ہے بلکہ بہت سی عمارتوں کا مجموعہ ہے لیکن ان سب کا مالک ایک ہی تھا۔ وہ ایک ہندو رئیس تھا۔ پرانا لاہور حویلیوں، کڑیوں اور ڈیروں کے حوالے سے بہت مشہور تھا۔ ان میں سے کچھ اب بھی باقی رہ گئی ہیں۔ ان میں راجے دی حویلی بھی ہے جسے حویلی دیان سنگھ بھی کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں اس کے دروازے کے آگے ہاتھی جھومتے تھے، آج کل یہاں خفیہ پولیس کا ہیڈ کوارٹر ہے اور پولیس کی کاریں کھڑی نظر آتی ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اسے پنجاب خفیہ پولیس کا ہیڈ کوارٹر بنا لیا گیا تو اس کی دیکھ بھال ہو گئی ورنہ یہ بھی آج کھنڈر بن چکی ہوتی یا اس کی جگہ نئی عمارت یا پلازہ نظر آتا۔ کڑی باوا کچھ عجیب سا نام لگتا ہے لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پنجاب (امرتسر پٹیالہ وغیرہ) سے آنے والے موسیقاروں اور سازندوں کو سر چھپانے کے لئے یہی عمارت ملی اور انہیں راس بھی آئی۔ بہت سے تو عارضی قیام کے بعد یہاں سے رخصت ہو گئے۔ بعض نے یہاں ڈیرا جما لیا اور اسے اپنی رہائش گاہ بنا لیا۔ پھر جب حالات بدلے اور خوشحالی کا دور دورہ ہوا تو ایسے افراد نے شہر کے نو آباد اور خوبصورت علاقوں میں رہائش اختیار کر لی لیکن کڑی باوا کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ موسیقی کے بارے میں جاننے والے اور مستقل طور پر لکھنے والے صحافی سعید ملک صاحب نے یہ انکشاف کیا ہے کہ 1947ء میں امرتسر سے آنے والے ربابیوں کی اکثریت نے کڑی باوا ہی کو اپنا ٹھکانا بنایا تھا۔

ربابی وہ لوگ تھے جو دربار صاحب (گولڈن ٹیمپل) امرتسر میں گورو گرنتھ صاحب کا الاپ کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سے بمبئی سے آئے تھے جہاں وہ موسیقاروں اور سازندوں کی حیثیت سے فلمی دنیا سے وابستہ تھے۔ یہ فلم

آرکسٹرا میں شامل ہوتے تھے۔ فلموں کے لئے موسیقی بناتے تھے اور انڈین فلم انڈسٹری کو اپنے فن اور ہنر سے سجاتے تھے۔

کڑی باوا انہیں ایک پر سکون آشیانہ محسوس ہوئی لہٰذا انہوں نے اسی کو اپنا ٹھکانا بنالیا۔ یہ ہر اعتبار سے ایک موزوں جگہ تھی۔ نزدیک ہی مارکیٹ اور منڈی تھی۔ آس پاس بھی فن سی تعلق رکھنے والوں کی رہائش تھی۔ یہ علاقہ لاہور کا ثقافتی مرکز کہلاتا تھا۔ سعید صاحب کی تحقیق کے مطابق جن نامور فن کاروں نے یہاں مستقل رہائش اختیار کی ان میں کلاسیکی گائیک سنگیت ساگر استاد بھائی لعل محمد، ان کے صاحبزادے غلام حسن شگن، گلوکار منیر حسین (یہ بات شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ معروف گلوکار منیر حسین مایہ ناز موسیقار غلام حیدر کے داماد تھے) لوک گائیک سائیں اختر حسین اور ماسٹر اعجاز حسین (جن کا تعلق پٹیالہ سے تھا) ستار نواز استاد فتح علی خاں اور عنایت علی خاں (جن کا تعلق ریاست کپور تھلہ سے رہا تھا) وائلن نواز ظہیر الدین، موسیقار رشید عطرے، موسیقار وزیر علی افضل، موسیقار تصدق حسین، کالے خاں، موسیقار ماسٹر رفیق علی اور ان جیسے اور کئی فنکار شامل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کلاسیکی موسیقی کے علاوہ پاکستانی فلموں کی موسیقی ترتیب دینے کے حوالے سے بھی بہت شہرت حاصل کی ہے۔

ظاہر ہے کہ جہاں اتنے بہت سے اعلیٰ معیاری ہنر مند یکجا ہوں گے، اس کی ثقافتی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہاں بہت سے نئے اور نوجوان گلوکاروں اور موسیقاروں نے بھی جنم لیا اور کامیابیاں حاصل کیں۔

بھارت سے آنے والوں کے لئے ابتدائی ایام بہت کٹھن تھے کیونکہ پاکستان میں نہ تو فلمی صنعت مستحکم و خوشحال تھی اور نہ ہی ان کے لئے کسی اور جگہ گنجائش تھی۔ لے دے کر صرف ریڈیو پاکستان ہی ایسا ادارہ تھا جہاں سے گزارے کے لئے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی۔ تقسیم کے ہنگاموں اور انقلاب نے رئیسوں کو بے گھر اور بے آسرا کر دیا تھا تو پھر فن اور موسیقی کی سرپرستی کون کرتا لیکن بعد میں جب فلمی صنعت نے نئی زندگی پائی اور فلمسازی کا آغاز ہوا تو ان لوگوں کے لئے بھی روزگار اور مصروفیات کے دروازے کھل گئے۔ ملک میں حالات معمول پر آئے تو ثقافتی سرگرمیاں بھی شروع ہو گئیں لیکن انہیں سب سے زیادہ سہارا اور فروغ فلمی صنعت ہی سے ہوا تھا۔ سازندوں اور موسیقاروں کی حیثیت سے انہوں نے فلمی صنعت کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا۔ جب خوشحالی آئی تو بہت سے لوگ

کٹری باوا سے رخصت ہو کر زیادہ خوشحال اور جدید علاقوں میں آباد ہو گئے لیکن ان کی جگہ نئے آنے والوں نے لے لی اور کٹری پہلے ہی کی طرح آباد رہی مگر اب کٹری کی حالت ابتر ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پرانی عمارت پر کوئی پیسہ لگانے کو تیار نہیں ہے حالانکہ اس نے انہیں سر چھپانے کی جگہ فراہم کی ہے۔ بہرحال کٹری باوا اب ویسی نہیں رہی جیسی کہ چالیس پچاس سال پہلے تھی۔ اس وقت یہاں بہت چہل پہل تھی۔ سازوں اور گانوں کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں۔ آپس میں میل ملاپ بھی زیادہ تھا مگر اب وہ سب باتیں قصہ پارینہ ہو گئی ہیں۔ جیسے جیسے لاہور ماڈرن ہو رہا ہے۔ پلازے اور بلند عمارات اور شاپنگ سنٹر تعمیر ہو رہے ہیں، اس لحاظ سے کٹری باوا جیسی عمارتوں کی افادیت کم بلکہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اب ان پرانی عمارتوں کی کہاں گنجائش ہے؟ مگر کتنی افسوس ناک بات ہے کہ ایسی پرانی اور تاریخی یادگاروں کو حفاظت سے سنوار کر رکھنے کے بجائے انہیں کھنڈرات میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد یہاں نئی عمارتیں بن جائیں گی۔

دنیا بھر میں لوگ، معاشرہ اور حکومتیں اپنے قدیم تاریخی اور ثقافتی ورثے کی حفاظت کرتی ہیں اور انہیں آنے والی نسلوں کے لئے سنبھال کر یادگاروں کی شکل دیتی ہیں۔ قدیم لاہور بذات خود ایک سنبھال کر رکھنے کی چیز ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں نئی آبادیوں کے شانہ بشانہ پرانے علاقوں کو بھی سنبھال کر رکھا گیا ہے اور وہ لوگ بڑے فخر کے ساتھ باہر سے آنے والوں اور سیاحوں کو یہ مقامات دکھاتے ہیں مگر ہمارے ہاں انہیں بیکار اور فرسودہ سمجھ کر برباد اور مسمار کر دیا گیا ہے۔ اس عمارت کو ایک ثقافتی کمپلیکس کی شکل دے کر محفوظ رکھا جا سکتا ہے جہاں موسیقی اور ساز بجانے کی کلاسیں شروع کی جا سکتی ہیں مگر لاہور میں دوسری یادگاروں کو کہاں سنبھالا گیا ہے جو کٹری باوا کو اہمیت دی جائے گی۔ اس کا انجام ابھی سے نظر آ رہا ہے۔ اس تک پہنچنے میں اور کتنا وقت لگے گا؟ اس کا فیصلہ بھی وقت ہی کرے گا۔

دنیا بھر میں تاریخی شہروں کو ان کی قدیم روایات اور ثقافت و فن کے حوالے سے جانا جاتا ہے اور یہ ہر قوم کے لئے سرمایہ افتخار ہوتے ہیں۔

ترقی یافتہ مغربی ملکوں کی تو بات ہی الگ ہے۔ مشرقی ممالک میں بھی شہروں کے قدیم حصے محفوظ ہیں۔ ترکی، ایران،

مصر جہاں جایئے نئے شہروں کے شانہ بشانہ پرانے شہر اور یادگاریں ضرور نظر آئیں گی۔ ہم نے ترکی کے شہر اناطولیہ کا تذکرہ کیا تھا جہاں ہم نے صرف دو دن قیام کیا تھا۔ ایک انگریزی بولنے اور سمجھنے والے ٹیکسی ڈرائیور سے ملاقات ہو گئی جو ہمیں ائیر پورٹ سے ہوٹل تک لے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ ہمارے مستقل گائیڈ اور ٹیکسی ڈرائیور بن گئے۔ ان دنوں ہم اداکار و فلم ساز اعجاز درانی کے ساتھ ایک فلم کی لوکیشنز دیکھنے کے لئے ترکی کے شہروں کا دورہ کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ مستقل گھومنے پھرنے سے فرصت ہی نہیں تھی۔

دوسرے دن موقع پا کر ان صاحب نے ہم سے فرمائش کی کہ آپ پرانا اناطولیہ ضرور دیکھئے۔ میں خود بھی وہاں رہتا ہوں۔ میری کمپنی کا صدر دفتر بھی وہیں ہے۔ وہاں پرانی عمارتوں میں بے حد خوبصورت اور آرام دہ ہوٹل بھی ہیں جہاں سے نہ صرف شہر کا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے بلکہ سمندر بھی نظر آتا ہے۔ ہم نے اخلاقاً ہامی بھر لی۔ شام کو جب تھکے ماندے ہم لوگ لمبے سفر کے بعد واپس ہوٹل جانے لگے تو ٹیکسی ڈرائیور نے کہا ”برادر۔ کیا خیال ہے، ہوٹل جانے سے پہلے پرانے اناطولیہ کا ایک چکر نہ لگایا جائے؟“

مروتاً اقرار کرنا پڑا۔ انہوں نے خوشی خوشی ٹیکسی کا رُخ پرانے شہر کی طرف موڑ لیا۔

شہر کے آغاز ہی میں ایک بورڈ پر لکھا تھا ”پرانا اناطولیہ آپ کا خیر مقدم کرتا ہے۔“

شہر کا یہ حصہ ہمارے پرانے شہروں کی طرح ہی تھا۔ پرانی عمارتیں گلیاں پیچ دار راستے پرانی وضع کے بازار اور دکانیں ۔ قہوہ خانے وغیرہ مگر ہر چیز صاف ستھری اور آراستہ۔ سڑکیں پختہ اور صفائی کا معیار مغربی طرز کا۔ انہوں نے بہت سی پرانی عمارتوں کے بارے میں بتایا۔ ایک پرانے بازار میں لے گئے اور آخر میں ایک تین منزلہ ہوٹل پہنچے۔

یہ ایک پرانی وضع کی تین منزلہ عمارت تھی۔ ہر چیز قدیم مگر بہت سلیقے سے سجا کر رکھی گئی تھی تنگ سیڑھیاں اگر کمرے کشادہ اور ہوادار، ہر کمرے میں بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جن پر شیشے لگے ہوئے تھے آس پاس کے مناظر ایک عجیب لطف دے رہے تھے۔ اس ہوٹل میں تمام جدید سہولتیں موجود تھیں۔ کرایہ نئے شہر میں ہمارے ہوٹل سے زیادہ تھا مگر مالک نے کہا جب ہم فلم یونٹ کے ساتھ آئیں تو وہ وہیں قیام کریں۔ وہ ہمارے ساتھ خصوصی رعائت کریں گے اور خاص اہتمام بھی کر دیں گے۔ اس ہوٹل کے سامنے پرانی عمارت میں ٹیکسی کمپنی کا صدر دفتر تھا۔ عمارت پرانی

مگر ہر سہولت اور آسائش جدید۔مالک نے کہا کہ وہ ہمیں رعائت کے ساتھ ٹیکسی اور دوسری ٹرانسپورٹ دلادیں گے۔ اس علاقے کے پرانے گھروں کی کھڑکیوں، بالکونیوں اور چھجوں پر کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔خواتین پڑوسنوں سے گپ شپ میں مصروف تھیں۔

بازار میں پرانے نوادرات کے علاوہ جدید ضروریات کی اشیا بھی موجود تھیں۔قہوہ خانوں میں قہوے کی خشبو اور سمارٹ ویٹریس پرانے ترکی لباس میں ملبوس نظر آتیں تھیں۔غرضیکہ ہر جگہ پرانا ماحول برقرار رکھا گیا تھا مگر صفائی اور عمدگی کے ساتھ۔

ہمیں خیال آیا کہ ہمارے پرانے لاہور کے کئی محلے اور علاقے ثقافتی علمی وادبی اور تاریخی اعتبار سے یادگار ہیں۔پرانی عمارتیں بالکونیاں گلیاں اور پیچ دار راستے بھی ہیں مگر سب کچھ غفلت کی نظر ہو چکا ہے۔کاش ہمارے شہر کا کوئی ٹیکسی ڈرائیور بھی بیرونی سیاح کو فخر کے ساتھ پرانا شہر دکھانے کی دعوت دے سکتا یقین کیجئے دوسروں کے مقابلے میں ہمارے پاس دکھانے کے لئے بہت کچھ ہے۔بہت قیمتی سرمایہ ہے مگر کون پرواہ کرتا ہے؟ہائے۔صد افسوس!

بہت سے قارئین نے یہ شکوہ کیا ہے کہ یہ پشتو فلم کی ہیروئن خانم کو ہم نے قطعی نظرانداز کر دیا ہے اور انکے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ان کا یہ شکوہ بجا ہے لیکن یہ داستان ابھی جاری ہے اور اللہ جانے کب تک جاری رہے گی۔ظاہر ہے کے اتنی بڑی فلمی صنعت (مشرقی پاکستان کراچی اور لاہور کی فلمی صنعتیں بہت زیادہ ترقی کر گئی تھیں)اور ان سے وابستہ بیشمار لوگوں کا تذکرا یک وقت تو نہیں کیا جاسکتا۔پھر یہ بھی خیال رہے کہ یہ محض فلمی صنعت کی الف لیلہ نہیں ہے ہماری یادداشتوں اور تاثرات کا مجموعہ بھی ہے۔خانم کا تذکرہ اس سے پہلے کیا جاچکا ہے لیکن بہت زیادہ تفصیل بیان نہیں کی گئی۔ان جیسے اور بھی فنکار اور بہت سے لوگ قابل ذکر لوگ ہیں جن کا تفصیلاً بیان نہیں کیا گیا ہے۔اگر زندگی رہی تو یقیناًان کی بھی باری آئے گی بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ داستان محض پاکستانی فلمی صنعت تک محدود ہے۔ایسا نہیں ہے۔اپنے تاثرات کے ضمن میں ہم بیرونی مغربی اور بھارتی فلمی صنعت اور ممتاز فنکاروں کا بھی تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔یہ دراصل ایک شخص کے خیالوں اور یادوں کی دنیا ہے۔جس طرح خیال کسی وقت کہیں بھی جاسکتا ہے اسی طرح داستان کسی بھی وقت کوئی بھی رخ اختیار کر سکتی ہے۔اس مختصر معذرت یا تشریح کے بعد آمدم برسر

مطلب۔

خانم پاکستان کی فلمی صنعت سے وابستگی کا عرصہ لگ بھگ بیس سال ہے لیکن اگر اس میں ان کی نو سال بعد ریلیز ہونے والی پشتو فلم ''پختو'' کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ عرصہ اٹھائیس انیتس سال ہو جاتا ہے لیکن یہ حساب ہمارے خیال میں درست نہیں ہے۔ان کی آخر دو فلمیں 1991ء میں نمائش کے لئے پیش کی گئی تھیں جس کے بعد وہ فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو گئی تھیں۔ فلم ''پختو'' مختلف وجوہ کی بنا پر التوا میں پڑی رہی اور اس کی نمائش سنہ 2000 میں ہوئی۔اس لئے مناسب ہے کہ پہلے ان کی آخری فلم کے بارے میں کچھ بیان کر دیا جائے۔ یہ ایک پشتو فلم تھی جس کے ہدائت کار وزیر اعظم تھے جی نہیں پاکستان کے وزیر اعظم نہیں انکا نام ہی وزیر اعظم تھا۔ہے تو کچھ انوکھا سا نام لیکن نام رکھنے پر کسی کی پابندی نہیں ہے۔ عموماً بادشاہ شہنشاہ یہاں تک کہ شہزادہ نام بھی رکھے جاتے ہیں لیکن وزیر اعظم ایک انوکھا نام ہے۔ کم از کم ہم نے اس پہلے اور اس کے بعد اس نام کے کسی بھی شخص کے بارے میں نہیں سنا۔ سچ مچ کے وزیر اعظم البتہ بہت آئے اور گئے مگر یہ ایک علیحدہ قصہ ہے۔

فلم ''پختو'' کے ہیرو گلریز تبسم تھے یہ غالباً ان کی پہلی اور آخری فلم تھی۔اس بارے میں ہماری معلومات یہی ہیں ۔گل ریز تبسم بنیادی طور پر ایک لوک گلو کار تھے۔ فلم پختو ان کی اداکاری کا پہلا تجربہ تھی جو آخری بھی ثابت ہوئی۔ ہم نے تو یہ فلم نہیں دیکھی مگر دیکھنے والے ان کی اداکاری کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ اگر یہ فلم بروقت ریلیز ہو جاتی تو گل ریز اداکار کی حیثیت سے بھی بہت شہرت اور کامیابی حاصل کرتے مگر قسمت کو یہی منظور تھا۔

جن دنوں یہ فلم نمائش پذیر ہوئی اس وقت پاکستان میں فلمی صنعت زوال سے دوچار تھی اور سکڑ کر چند فلموں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔اس فلم کی کہانی خلیل خان نے لکھی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مکالمہ نویس خلیل خان خاموش فلموں کے زمانے میں اداکاری کرتے رہے۔ جب بولتی فلموں کا دور آیا تو انکی اداکاری کا دور ختم ہو گیا تھا پھر انہوں نے مکالمہ نویسی اور کہانی لکھنے کی طرف توجہ دی اور پشتو فلموں کے مصنف بن گئے۔اب وہ مرحوم ہو چکے

ہیں۔اللہ تعالی مغفرت کرے۔ہم نے نہ توان کی کوئی خاموش فلم دیکھی اور نہ ہی کوئی پشتو فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا لیکن ان کی بزرگی اور گزشتہ کاموں کی پیش نظر وہ اچھے الفاظ میں یاد کئے جانے کے قابل ہیں۔

پختو کے اداکاروں میں گل ریز تبسم اور خانم کے علاوہ نعمت سرحدی، آصف خان اور بدر منیر بھی شامل تھے۔

بدر منیر کو پشتو فلموں میں کم و بیش وہی حیثیت حاصل رہی ہے جو مرحوم سلطان راہی کو پنجابی فلموں میں حاصل تھی۔یعنی کوئی پنجابی فلم ان کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی اور مشکل سے ہی کامیاب ہوتی تھی ۔پنجابی اور پشتو فلموں میں ان دونوں فنکاروں پر قدرت کا کرم تھا کہ فلم بین ان کے شیدائی تھے۔فلم اچھی ہو یا بری ان کی بلا سے ان کو تو اپنے محبوب فنکاروں کو دیکھنے سے مطلب تھا۔یہ مقام بھی بہت کم فنکاروں کو حاصل ہوتا ہے۔اگر یہ فلم بر وقت ریلیز ہو جاتی تو ممکن ہے بہت کامیاب ہوتی لیکن التوا اور تاخیر کے باوجود اسے ناکام نہیں کہا جا سکتا۔شاید اس لئے کہ پشتو فلموں کے مقبول اور نامور فنکار اس فلم میں کام کر رہے تھے۔اس فلم کے سبھی اہم فنکار پشتو فلموں کے مانے ہوئے فنکار رہے ہیں۔نعمت سرحدی بعد میں فلموں سے وابستہ ہوئے مگر ان کی عمدہ اداکاری کی وجہ سے بہت جلد ممتاز ولن بن گئے تھے۔

ہم نے مختلف ایوارڈ کے سلسلے میں پشتو فلمیں بھی دیکھی ہیں۔نعمت سرحدی کو فلموں میں دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ایک روز ان سے ملاقات ہوئی تو ہم نے بطور خاص ان کی فلموں اور اداکاری کا تذکرہ کیا اور ان کی تعریف کی۔تعجب کی بات یہ ہے کہ اتنے اچھے اداکار کی خدمات سے پنجابی اور اردو کے فلم سازوں نے فائدہ نہیں اٹھایا اس کا سبب بھیڑ چال کے سوا اور کچھ نہیں۔

نعمت سرحدی تعریف سن کر بہت خوش ہوئے۔ظاہر ہے ہر انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی تعریف سن کے بہت خوش ہوتا ہے۔ہم اس وقت فلمی صنعت سے عملی طور پر کنارہ کش ہو چکے تھے۔اس لئے نعمت سرحدی کیلئے یہ تعریف قطعی متوقع تھی۔

”خانم “ کی آخری فلم کا حال آپ نے سن لیا اب ان کی پہلی فلم کا احوال سننے سے پہلے کچھ ان کی شخصیت کے بارے میں بتا دیا جائے تو بہتر ہو گا۔

خانم کا تعلق گوجرانوالہ سے تھااور وہ فلموں میں کام کرنے کے لئے گوجرانوالہ سے لاہور آئی تھیں۔ان کے بارے میں ہم نے کہیں سنااور پڑھاہو کہ وہ مشہور ڈریس ڈیزائنر بی.جی کی بہن ہیں لیکن یہ درست نہیں ہے۔خانم کی ایک بہن ہیں جو ریڈیو پر گلوکاری کرتی رہی ہیں پھر ریڈیو ہی کے ایک افسر سے ان کی شادی ہو گئی اور اب تک ہنسی خوشی زندگی بسر ہو رہی ہے۔

خانم کا ایک حوالہ یہ بھی ہے کہ بمبئی کی فلمی صنعت کی ایک اداکارہ ایتا تھیں۔انہوں نے زیادہ فلموں میں کام نہیں کیا اور نا ہی صف اول میں جگہ حاصل کر پائیں ایتا خانم کی خالہ زاد بہن ہیں یا یوں کہئے کے خانم ایتا کی خالہ زاد بہن ہیں ۔ایتا ان سے پہلے فلمی صنعت سے وابستہ ہوئی تھیں اور غالباًان کے فلمی دنیا میں آنے سے پہلے ہی رخصت ہو گئیں ۔لیکن عام رواج کے مطابق ان کا ایک ملا جلا یا ہندوانہ نام رکھ دیا گیا۔وہ بھرے بھرے جسم اور موٹی موٹی آنکھوں اور بیزوی چہرے کی وجہ سے اسکرین پر بہت اچھی لگتی تھیں۔اداکاری بھی ٹھیک ہی کر لیتی تھیں مگر عروج حاصل نا کر پائیں۔خدا جانے وہ فلموں سے کیوں رخصت ہوئیں اور اب کہاں ہیں؟

خانم کا تعلق ایک پیشہ وارانہ خاندان سے تھا لیکن پاکستانی فلموں کے ایک معروف ہیرو کے والد نے ان کی والدہ سے نکاح کر لیا تھا۔خانم اور ان کی بہن انہی کی اولادیں ہیں مگر یہ شادی کھلے عام نہیں ہوئی تھی،اور نہ ہی کبھی اس کا باقاعدہ اعلان کیا گیا تھا اس لئے بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں۔خانم کے والد نے کبھی کھم کھلا ان سے وابستگی کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔نہ ہی وہ اپنے اس خاندان کے ساتھ کہیں دیکھے گئے۔بہر حال دنیا میں خصوصاً فلمی دنیا میں ایسے واقعیات رونما ہوتے رہتے ہیں اس لئے یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے۔

"خانم" اپنی والدہ کے ساتھ گوجرانوالہ سے لاہور آئیں تو اداکارہ بننے کا شوق اپنے ساتھ لے کر آئیں۔لوگوں نے انہیں مشورہ دیا فلم ساز شباب کیرانوی سے ملو۔شباب صاحب متواتر اور مسلسل فلمیں بناتے رہتے تھے اور نئے چہرے متارف کرانے کے لئے بھی مشہور تھے۔انہوں نے فلمی صنعت کو کئی نامور فنکار اور فنکارائیں دی ہیں۔بہت سے فنکاروں نے ان کی فلموں سے شہرت اور مقبولیت حاصل کی جبکہ وہ اس سے پہلے زیادہ مشہور نہیں تھے۔

شباب صاحب نے خانم کو بھی مایوس نہیں کیا۔شباب کیرانوی کی فلم، بازار، خانم کو ایک مختصر سا کردار دیا گیا تھا اس فلم

کے ہدایت کار مشہور عکاس اے حمید (بھائیا جی) تھے۔ ہماری لکھی ہوئی پہلی فلم ،ٹھنڈی سڑک، کے ہدایت کار بھی یہی تھے۔اے حمید کے بارے میں ہم بہت تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ وہ شباب کیرانوی کے بہت قریبی دوست تھے اور فلمی دنیا سے انہیں متعارف کرانے کا سہرا ابھی حمید صاحب کے سر ہے۔، بازار کے دوسرے اداکاروں میں سنگیتا ،نشو ،ایک اور نیا چہرہ عادل اور طالش بھی شامل تھے ایم ارشد اس فلم کے موسیکار تھے۔ یہ خانم کی پہلی فلم تھی جو غالباً 1972 مین نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی۔

"بازار" نے اوسط درجے کی کامیابی حاصل کی تھی۔ خانم اس فلم میں کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں لیکن فلم ساز اور گلوکار عنایت حسین بھٹی کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں ۔عنایت حسین بھٹی اور ان کے بھائی کیفی ممتاز فلم ساز اور ہدایت کار تھے۔ ان دونوں کے اشتراک سے متعدد پنجابی فلموں نے جنم لیا اور مختلف فنکاروں کو ان کی فلموں سے شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی۔ اداکارہ رانی کو ایک اچھی اداکارہ لیکن ایک منحوس ہیروئین تصور کیا جاتا تھا کیونکہ وہ جس فلم کام کرتی تھیں وہ فلاپ ہو جاتی تھی حالانکہ رانی کی اداکاری اور رقص کے سب معترف تھے ۔ کیفی کی پنجابی فلم رانی کی پہلی سپر ہٹ فلم تھی اس طرح ان کی ناکامیوں کا دور ختم ہو گیا اور قسمت ان ایسی مہربان ہوئی کہ وہ کامیاب ترین ہیروئن کے مرتبے پر پہنچ گئی تھیں۔ اس کامیابی میں ہمارے دوست فلم ساز و ہدایت کار حسن طارق کا بھی نمایاں ہاتھ تھا جن کے ساتھ بعد میں رانی کی شادی ہو گئی تھی۔ یہ داستان پہلے ہی بیان کی جا چکی ہے

خانم کو بھٹی صاحب نے ایک سرائیکی فلم میں ہیروئین کے طور پر پیش کیا جس کا نام " دھیاں نمانیاں" تھا۔ عنایت بھٹی اس فلم کے ہدیت کار اور عاشق حسین (جو نہ تو بھٹی تھے اور نہ ہی عنایت حسین سے ان کا کوئی تعلق تھا) اس فلم کے موسیقار تھے۔ فلم کے اداکاروں میں اسد بخاری، صاعقہ اور خود عنایت بھٹی بھی شامل تھے۔ یہ فلم 1973 میں ریلیز ہوئی اور بہت کامیاب ہوئی۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے خانم کی بطور ہیروئن پہلی ہی فلم کامیابی سے ہمکنار ہو گئی تھی۔ اس طرح خانم کا شمار باقائدہ ہیروئنوں میں ہونے لگا جس کا سہرا عنایت حسین بھٹی کے سر تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ عنایت حسین بھٹی نے خانم کو اگلی بار ایک پنجابی فلم میں ہیروئین کی حیثیت سے پیش کیا۔اس فلم کا نام چیخ تھا۔اس کے فلم ساز ندیم عباس اور ہدائت کار کیفی تھے۔ماسٹر عنایت حسین موسیقار نے اس فلم کی موسیقی ترتیب دی تھی۔اسکے اداکاروں میں خانم کے علاوہ غزالہ،اسد بخاری اور کیفی شامل تھے۔تقدیر کا ستارہ ان دنوں عنایت حسین اور کیفی پر مہربان تھا۔ان کی اکثر فلمیں کامیاب ہو رہی تھیں۔چیخ بھی ایک کامیاب فلم تھی جو 1974 میں ریلیز ہوئی تھی اس خانم کی ایک اور فلم، بابل صدقے، نمائش کے لیے پیش کی گئی اور ناکام ہو گئی حالانکہ اسلم ڈار جیسے کہنہ مشق اور کامیاب ہدایت کار نے بنائی تھی،اس کے موسیقار کمال احمد تھے۔خانم کے ساتھ شاہد اس فلم میں ہیرو تھے۔عالیہ اور سلطان راہی جیسے نام بھی اس فلم میں شامل تھے لیکن یہ ناکام ہو گئی۔اس ہیروئن کی حیثیت سے خانم کی کامیابی اور ناکامیوں کا حساب برابر ہو گیا۔اس طرح خانم کی اداکاری کا دور شروع ہوا۔

خانم نے پاکستان کی سبھی زبانوں میں بنائی جانے والی فلموں میں کام کیا ہے۔اردو، سرائکی،سندھی پنجابی اور پشتو فلموں میں انہوں نے اداکاری کے جوہر دکھائے۔ان کا آغاز اردو فلموں سے ہوا اور انجام پشتو فلموں پر ہوا۔

عنایت حسین بھٹی کا ساتھ خانم کو ایسا راس آیا کہ اگلی بار ایک سال میں ان کی پانچ فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ان میں ایک سرائیکی فلم ''رب دا روپ'' کے فلم ساز ندیم عباس اور ہدایت کار کیفی تھے۔صفدر حسین نے اس کی موسیقی بنائی تھی۔عنایت حسین بھٹی کے ساتھ بہار بھی اس فلم کی کاسٹ میں شامل تھیں۔ظاہر ہے اس فلم کی ہیروئین خانم ہی تھیں۔یہ فلم کامیاب رہی۔دوسری فلم پنجابی زبان میں تھی اس کا نام '' فرض تے اولاد'' تھا۔ملک نثار احمد اس کے ہدایت کار تھے۔موسیقار رفیق بھی تھے۔نغمہ، حبیب،اسد بخاری اور مسعود اختر بھی اس فلم کے اداکاروں میں شامل تھے۔یہ سب اس وقت پنجابی فلموں کے بڑے نام تھے۔پنجابی فلم ''چھڈ برے دی یاری'' آسیہ ،اقبال حسن،اورنگزیب، اور افضل خان جیسے اداکار خانم کے ہمراہ اس فلم میں تھے لیکن یہ فلم ان بڑے ناموں کے باوجود یہ فلم ناکام ہو گئی۔پنجابی فلم، بابل ڈاکو، بھی اس سال ریلیز ہوئی تھی اس میں خانم،روزینہ،اقبال حسن اور افضل خان نمایاں اداکار تھے مگر یہ بھی زیادہ کامیابی حاصل نا کر سکی۔

اسی سال 1974ء میں خانم کی پہلی پشتو فلم، کوچوان، ریلیز ہوئی تھی جس کے فلم ساز محمد اکرم پپو اور ہدایت کار

یوسف بھٹی تھے۔ موسیقی رفیق شنواری نے مرتب کی تھی۔اس کے اداکاروں میں بدر منیر اور نعمت سرحدی بھی شامل تھے۔ حسین اتفاق یہ ہے خانم کی پہلی پشتو فلم بھی بہت کامیاب زیادہ کامیاب ہوئی اور وہ پہلی ہی فلم سے پشتو فلموں کی کامیاب اور مقبول ہیروئن بن گئیں۔اس کے بعد خانم کی پنجابی اور پشتو فلموں کا دور شروع ہو گیا۔ جن میں کامیاب فلموں کا اوسط زیادہ تھا۔ان فلموں نے خانم کو ایک کامیاب اداکارہ بنادیا۔

1989 میں ان کی پہلی سندھی فلم، سنن جو پیار، نمائش کے لیے پیش کی گئی تو وہ بیک وقت پانچ زبانوں میں کام کرنے والی واحد ہیروئن بن گئیں۔ یہ ان کا ہی کریڈٹ ہے،انکے بعد کسی اور اداکارہ کو یہ مقام نہیں ملا۔اس فلم کے فلم ساز شیر محمد لاشاری اور ہدایت کار صمد شیخ تھے۔ موسیقی ظفر علی نے ترتیب دی تھی۔اداکاروں میں انور اقبال، شکیلہ اور شہزادی شامل تھے۔ یہ ایک کامیاب فلم تھی مگر خانم کو پشتو فلمیں زیادہ راس آئیں۔ان کی پشتو فلم ،انگار، بہت کامیاب ہوئی۔اس کے ہدایت کار عنایت اللہ اور موسیقار رفیق شنواری تھے۔بدر منیر شہباز درانی،اور بیدار بخت بھی اس کے اداکاروں میں شامل تھے۔ خانم کی چند فلموں کے نام ذیل میں دیئے جارہے ہیں۔
شرط (پنجابی) فٹافٹ (پنجابی) غضب) پشتو) ضدی، پختون، پڑانگ (پشتو) مرزا جٹ (پنجابی) پیسہ (پشتو) تابہ فرمان) پشتو) نمک حلال، کاکا جی، لال طوفان (پنجابی) حیدر خان (پنجابی) نہلا دہلا) سرائیکی) شک (اردو) حقدار اور جائیداد (پشتو) شک کو پشتو میں دشمن کے نام سے پیش کیا گیا تھا۔اس زمانے میں اردو پنجابی اور اردو پشتو فلمیں بنانے کا رجحان چل پڑا تھا۔اس طرح کی فلموں میں اصلی زبان کی فلموں کو پسند کی جاتی تھی جبکہ دوسری زبان کی فلمیں اتنی زیادہ پسند نہیں کی جاتی تھی۔ سچ پوچھیئے تو اس رجحان نے فلمی صنعت کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچایا تھا۔

خانم یہ فلمیں بھی ہٹ ہوئی تھیں۔ ناگن (پنجابی) شرافت (پنجابی) حساب کتاب) پنجابی) فرض لاقانون (پشتو) خانم کی ایک پنجابی فلم ،بشیرا ان ٹربل، اسماعیل شاہ ہیرو تھے۔ جہانزیب اور شاہدہ منی بھی اس فلم کی کاسٹ میں شامل تھے۔لاس پہ لاس (پشتو) فرار (پشتو) اس کے اداکاروں میں مسرت شاہین آصف خان اور نعمت سرحدی بھی شامل تھے۔

مسرت شاہین کی پشتو فلموں میں آمد سے ان کی مقبولیت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔اس کامیابی میں ان کی بے باکی اور نیم عریانی کو بھی دخل تھا۔ایک اور ہیروئن شہناز نے بھی پشتو فلموں میں بہت مقبولیت حاصل کرلی تھی اس لئے خانم کی پشتو فلموں کی تعداد کم ہو گئی تھی۔1991ان کی دو پشتو فلمیں دلیر دشمن اور سرپہ تلی، نمائش کے لئے پیش کی گئیں۔انہیں اوسط درجے کی کامیابی ملی تھی۔ایک لحاظ سے یہ خانم کی آخری فلمیں تھیں کیونکہ ان کی اگلی فلم آٹھ،نو سال بعد ریلیز ہوئی تھی۔اس وقت خانم فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو چکی تھیں۔

خانم نے ساٹھ کے قریب فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے اور پانچ زبانوں کی فلموں میں کام کیا جو کہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر قسم کے کردار بخوبی ادا کرتی تھیں اور ہر زبان کے مکالموں کی ادائیگی عمدگی سے کرتی تھیں خانم کو فلم بینوں کے ایک حلقے میں بہت پسند کیا جاتا تھا اگرچہ کئی کامیاب پنجابی فلموں میں کام کرنے کے باوجود وہ پنجابی فلموں میں صف اول کی ہیروئن کا درجہ حاصل نہ کرسکیں مگر انہوں نے اپنے پرستاروں کو کبھی مایوس بھی نہیں کیا۔

خانم کا واسطہ زیادہ تر پشتو اور پنجابی فلموں سے پڑتا رہا اس لئے ہم سے ان کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی البتہ نگار خانوں یں آمنا سامنا ہو جاتا تھا مگر باقاعدہ ملتعارف اور گفتگو کا کبھی اتفاق نہیں رہا۔

خانم نے پشاور کے ایک شخص سے شادی کرلی اور لاہور میں رہائش پذیر ہو گئیں۔یہ پشاور میں سینما گھروں کے مالک ہیں۔فلموں سے کنارہ کش ہونے کے بعد وہ پھر کبھی اخبارات کے صفحات تک میں نظر نہ آئیں۔نگار خانوں یا فلمی تقاریب کا تو ذکر ہی کیا ہے۔سنا ہے وہ دو بچوں کی ماں ہیں اور بہت ہنگامہ پرور زندگی بسر کرنے کے بعد ایک پرسکون زندگی گزار رہی ہیں۔

اکتوبر 2001 میں ایک خبر نے برصغیر کے فلمی شائقین کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔معلوم ہوا کہ اداکار دلیپ کمار کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے اور انہیں ہسپتال ہمہ وقت نگرانی کے کمرے میں رکھا گیا ہے۔دلیپ کمار عرصے دراسے فلمی دنیا سے دور ہیں اور ایک لحاظ سے گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ایک زمانے میں انہوں نے بمبئی کی سیاست میں دلچسپی لی تھی لیکن اس کے بعد انہوں نے کبھی سیاست کا رخ نہیں کیا حالانکہ بھارت کی سبھی سیاسی

پارٹیوں نے انہیں اپنی پارٹی کا ٹکٹ دینے کی پیشکش کی تھی مگر دلیپ کمار ایک صاف اور کھرے آدمی ہیں۔ برصغیر کا سیاسی ماحول ان کو راس نہیں آسکتا اس لئے انہوں نے اس خارزار میں قدم رکھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ ان کا کہنا ہے موجودہ سیاسی نظام میں کسی دیانت دار اور صاف گو انسان کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ محض اقتدار اختیار اور دولت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

دلیپ کمار کو اداکار کی حیثیت جو مقام حاصل رہا ہے بلکہ اب بھی حاصل ہے اور انہیں جس قدر مقبولیت ملی ہے وہ کسی اور اداکار کے حصے میں نہیں آئی۔ ایک زمانے میں بھارت کے متعصب پریس نے ان کے مقابلے میں راج کپور دیو آنند کو لاکر کھڑا کر دیا تھا اور یہ فلمی صنعت کے تین بڑے سپر سٹار کہلاتے تھے لیکن در حقیقت میں ان دونوں اداکاروں کا دلیپ کمار سے کوئی مقابلہ اور موازنہ ہی نہیں تھا۔ اس کے بعد بھی دلیپ کمار کے سامنے کوئی ہیرو لانے کے لئے بہت زور لگایا گیا۔ جب امیتابھ بچن نے شہرت اور عروج حاصل کیا تو یہ کہا گیا کہ وہ بھارت کے عظیم ترین اداکار ہیں اور انہیں ملینیم ایوارڈ سے بھی نوازا گیا لیکن جہاں تک اداکاری کا تعلق ہے امیتابھ بچن کو دلیپ کمار سے ہمسر کسی طور بھی نہیں کہا جاسکتا۔ خود امیتابھ بچن دلیپ کمار کی عظمت کے معترف ہیں اور ان کی بڑائی کو کھلے عام قبول کرتے ہیں۔

جب ان سے دریافت کیا گیا تھا کہ کیا وہ مقبولیت اور فن اداکاری میں دلیپ کمار پر فوقیت رکھتے ہیں تو انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور کہا کہ دلیپ صاحب سے تو میں نے سیکھا ہے تو ان کا اور میرا کیا مقابلہ؟

ایک لحاظ سے یہ سچ بھی ہے۔ ایک زمانے میں بھارت کا ہر فنکار دلیپ کمار سے متاثر تھا اور ان کے انداز کی نقل کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر کوئی بھی ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکا۔ امیتابھ بچن کو صرف ایک بار دلیپ کمار کے ساتھ ایک فلم ،شکتی، میں کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ یہ فلم 1980/81 میں ریلیز ہوئی تھی اور اس فلم میں امیتابھ بچن نے دلیپ کمار کے بیٹے کا کردار کیا تھا۔ وہ امیتابھ کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ خدا جانے یہ امیتابھ کی خواہش تھی کہ ہدایت کار کی کوئی مصلحت کہ اس فلم میں ان دونوں کا ڈرامائی منظر ایک ہی تھا۔ یہ بہت ہی پر اثر اور بھرپور منظر تھا جس میں دونوں نے مثالی اداکاری کا مظاہرہ کا تھا لیکن دیکھنے والوں کی یہ رائے یہ تھی کہ دلیپ کمار اس منظر میں امیتابھ پر چھائے رہے ۔ بہر حال دلیپ کمار کا بھارت کی فلمی تاریخ میں جو مقام حاصل اسے کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ انہیں صرف مسلمان

ہونے کی وجہ سے بھارتی میڈیا اور فلمی صنعت جس طرح یکسر نظر انداز اور فراموش کر دیا ہے، وہ ہندوؤں کی اور ایک مخصوص ذہنیت کے پیش نظر کوئی ناقابل تصور بات نہیں ہے کیونکہ بھارتی حکومت ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت ہندوستان کی تاریخ کو جس طرح مسخ کر رہی ہے اس کو دیکھ کر دلیپ کمار کے ساتھ بھارتی میڈیا اور فلمی صنعت کا سلوک حیرت کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔

دلیپ کمار کے بیشتر ساتھی تو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں یا پھر زندگی کے سفر میں ہارے ہوئے جواری کی مانند نظر آتے ہیں لیکن دلیپ ان سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ایک الگ تھلگ اور ایک محدود سے ماحول میں رہنے کے آدمی ہیں۔ جب وہ اپنی زندگی کے عروج پر تھے اس وقت بھی ان کی زندگی ایک بند لفافے کی طرح تھی اور اب وہ فلمی دنیا سے کنارہ کش اور قطعی گوشہ نشین اور خلوت پسند ہو چکے ہیں، ان کی زندگی سربستہ راز بن کر رہ گئی۔

دلیپ کمار کو یاد کیا ہے تو کامنی کوشل کا خیال آگیا ہے دل میں، نہ جانے کیوں؟ حالانکہ اب تو دونوں کو ایک ساتھ کام کئے ہوئے نصف صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان دہنوں کی آخری فلم ''آرزو'' 1950 نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد انہیں کسی فلم میں انہیں یکجا ہو کر کام کرنا نصیب نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ اس وقت کی سب سے مقبول اور کامیاب فلمی جوڑی تصور کی جاتی تھی۔

یہ دلیپ کمار کی فلمی زندگی کا دور آغاز تھا لیکن ابتدائی چار پانچ سالوں ہی میں انہوں نے ساری فلمی صنعت پر اپنی دھاک بٹھادی تھی۔ سارا بر صغیر ان کا دیوانہ تھا۔ ان کی ہر حرکت فلم بینوں کو بھاتی تھی۔ ان کا ہر انداز ان کے دلوں پر نقش ہو کر رہ جاتا تھا۔ جب وہ آہستگی سے اپنے مخصوص انداز میں مکالمے بولتے تھے تو پورا سینما ہال ساکت ہو جاتا تھا اور دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ ان دونوں کی فلمی علیحدگی یا جدائی کا سبب بھی کوئی پوشیدہ راز نہیں تھا کیونکہ ان دونوں کے پیار کی داستانیں ہر ایک زبان پر تھیں۔

دلیپ کمار نے اس وقت تک بمبئی کی ممتاز ترین اداکاراؤں کے ساتھ کام کیا تھا اور ان کی اداکاری کا اعجاز تھا کہ اپنی اداکاری کے زور پر ہر وہ فلمی جوڑی کو مقبول بنا دیتے تھے، لیکن کامنی کوشل کے ساتھ ان کی فلمیں سحر طاری کر دیتی

تھیں۔یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جیتے جاگتے کردار حقیقی زندگی میں پیار کی داستان پیش کر رہے ہیں۔

کامنی کوشل ایک ننھی منھی گڑیا جیسی ہیروئن تھیں، بوٹا سا (چھوٹے بوٹے جیسا) قد۔ بڑی بڑی متاثر کرنیوالی آنکھیں ،بیضوی چہرہ، سیاہ بال، کھلتی ہوئی رنگت۔ان کے چہرے پر معصومیت تھی اور انداز میں لڑکپن۔ مکالمے بولنے کا انداز بالکل سیدھا سادہ اور روزمرہ کی گفتگو جیسا۔ وہ بڑے سے بڑا رومانی فقرہ بھی اتنی آسانی، سادگی اور تاثر کے ساتھ ادا کرتی تھیں کہ سننے اور دیکھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔

جب انہوں نے دلیپ کمار کے ساتھ پہلی فلم ''ندیا کے پار'' میں کام کیا تو فلمی دنیا کے لیے کوئی انجانا نام نہیں تھیں۔اس سے پہلے وہ چار پانچ فلموں میں اداکاری کر چکی تھیں۔ لیکن صحیح معنوں میں کامیابی اور مقبولیت سے محروم تھیں۔ندیا کے پار ان کی چھٹی اور غالباً دلیپ کمار کی بھی چھٹی فلم تھی لیکن فرق یہ تھا کہ پہلی فلم ''جگنو'' کے بعد ہی دلیپ کمار برصغیر کے نامور اور محبوب ترین ہیرو بن گئے تھے۔ گرچہ یہ ان کی دوسری فلم تھی لیکن پہلی فلم جوار بھاٹا سے پہلے ریلیز ہوگئی اس لیے پہلی فلم کہلائی۔اس کے بعد پھر دلیپ کمار کا کبھی نہ ختم ہونے والی مقبولیت کا دور شروع ہوا جو آج تک جاری ہے حالانکہ انہیں فلموں میں اداکاری چھوڑے ہوئے بھی ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن فلم بین انہیں روز اول کی طرح آج بھی چاہتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں۔

ویڈیو نے پرانی فلموں اور اداکاروں کو ایک بار پھر زندہ جاوید بنا دیا ہے اور نئی نسل بھی ماضی کی فلموں اور اداکاروں کی شکل، صورت اور فن اداکاری سے بخوبی آگاہ ہو چکی ہے۔سائنس کی اس ایجاد نے ماضی کو حال سے کو روشناس کروانے میں بہت نمایاں اور کارآمد کردار ادا کیا ہے۔

''ندیا کے پار'' کے مصنف اور ہدایت کار کشور ساہو تھے۔کشور ساہو سے آج کی نسل بہت زیادہ واقف نہیں ہے لیکن وہ اس عہد کے ایک تعلیم یافتہ ،ذہین اور باصلاحیت ہدایت کار تھے۔وہ مصنف بھی تھے اور اداکار بھی۔انہوں نے بہت کم فلمیں بنائیں اور بہت کم کام کیا لیکن ان کے کردار اور انکی فلمیں اپنے موضوعات اور پیشکش کے اعتبار سے قطعی مختلف اور بے حد اعلیٰ معیار کی تھیں۔

ندیا کے پار بنیادی طور پر ایک رومانی داستان ہے۔ایک تعلیم یافتہ ،بے فکرے دولت مند نوجوان اور ملاحوں کی ایک

الھسڑاور سیدھی سادی لڑکی کی محبت کی یہ کہانی کشور ساہو نے بڑے اچھوتے اور حسین انداز میں پیش کی تھی۔ سی رام چندر نے اس کی رومانی موسیقی بنائی تھی۔ کہانی، مکالموں، موسیقی، اداکاری ،اور ہدایت کاری کے اعتبار سے یہ ایک ایسی فلم تھی جس نے فلم بینوں کا ذوق اور معیار بدل کے رکھ دیا تھا۔ دلیپ کمار اور کامنی کوشل کے والہانہ پیار کی یہ کہانی امر ہو کر رہ گئی اور بھارتی فلموں میں ایک ایسی فلمی جوڑی نے جنم لیا جسے دیکھنے والے آج بھی یاد کرتے ہیں۔

دلیپ کمار نے اپنے عہد کی ممتاز اور حسین ترین ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ مگر کامنی کوشل کے ساتھ ان کی اداکاری میں ایسی حقیقت اور والہانہ کیفیت نظر آئی تھی جو کسی اور فلم کے حصے میں نہیں آئی۔ کامنی کوشل بھی اپنے کردار میں ڈوب کر اداکاری کرتی تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان دونوں کے علاوہ تیسرا ذی نفس دنیا میں موجود ہی نہیں۔ ندیا کے پار نے ہر طرف دھومیں مچادیں تھیں۔ دلیپ کمار تو پہلے بھی ایک انتہائی مقبول اور محبوب ہیرو تھے لیکن اس فلم نے کامنی کوشل کے قدو قامت میں بھی بہت اضافہ کر دیا تھا اور وہ راتوں رات بھارتی فلم صنعت کی سپر اسٹار بن گئی تھیں۔

اسی سال ان کی دلیپ کمار کے ساتھ دوسری فلم ''شہید بھی نمائش کے لیے پیش کی گئی اور حسب توقع نمائش کے پہلے ہی دن سپر ہٹ تسلیم کرلی گئی۔ شہید ایک انقلابی قوم پرست نوجوان کی داستان تھی جس کا باپ پولیس آفیسر تھا۔ یہ کہانی انگریزی حکومت کے دور سے تعلق رکھتی تھی جب آزادی کی تحریک پورے عروج پر تھی اور نوجوان طلبہ خصوصاً اس غلامی کے خلاف نبرد آزما تھے۔ باپ اور بیٹے کے فرض کی کشمکش کے درمیان ایک محبت کی داستان بھی پروئی گئی تھی جس میں کامنی کوشل کا کردار بہت نمایاں تھا۔ اس فلم کے ہدایت کار رمیش سہگل تھے جو سید شوکت حسین رضوی کے معاون بھی رہے تھے۔ اور بعد میں حقیقت سے قریب موضوعات فلمانے کے حوالے سے انہوں نے بہت شہرت حاصل کی تھی۔ ماسٹر غلام حیدر اس فلم کے موسیقار تھے جنہوں نے بہت دلکش دھنیں بنائیں تھیں۔ خاص طور پر اس فلم کا ترانہ نما گانا بہت مقبول ہوا تھا اور آج بھی خون کی گردش کو تیز کر دیتا ہے۔ اس کے بول تھے۔

وطن کی راہ میں وطن کے نوجوان شہید ہو

پکارتے ہیں یہ زمین و آسمان شہید ہو

وطن کی راہ میں وطن کے نوجوان شہید ہو

ایسا نغمہ ہے جو ہر وقت اور ہر زمانے میں موثر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس فلم میں دلیپ کمار کا انجام المیہ تھا۔ وہ وطن کی راہ میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور کامنی کوشل ان کا سوگ منانے کے لیے اپنی محبت کی یادیں سمیٹے ہوئے زندگی کے طویل سفر میں اکیلی تنہا رہ گئیں۔

شہید بھی ایک کامیاب فلم تھی اور اس کی نمایاں خوبی میں کامنی کوشل اور دلیپ کمار کی رومانی جوڑی تھی۔

ان دو فلموں کی نمائش کے بعد فلم بین ان دونوں کو زیادہ سے زیادہ فلموں میں یکجا دیکھنے کے تمنائی ہو گئے مگر یہ ممکن نہ تھا کیونکہ دلیپ کمار ایک وقت میں صرف ایک ہی فلم میں کام کیا کرتے تھے اور اس کے خاتمے تک دوسری فلم کی شوٹنگ کا آغاز نہیں کرتے تھے۔ ساری زندگی وہ اسی اصول پر گامزن رہے اسی لیے لوگ ان کی فلموں کے منتظر رہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی کامیاب ہیرو بیک وقت ایک سے زیادہ فلموں میں کام کر کے پیسے کماتے تھے مگر دلیپ کمار نے اپنا یہ اصول کبھی بھی ترک نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پچاس سال سے زیادہ عرصے تک فلمی صنعت سے وابستہ رہنے کے باوجود مشکل سے 55 فلموں میں اداکاری کی ہے جو کہ ایک ناقابل یقین اور حیرت کن بات ہے۔ انہیں دولت کا لالچ نہیں تھا۔ وہ من پسند کردار ہی قبول کرتے تھے اور اس کو ادا کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں لگا دیتے تھے۔ اس دور میں وہ سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے والے اداکار تھے۔ بڑے بڑے فلمساز ان کے آگے پیچھے پھرا کرتے تھے اور انہیں بڑے سے بڑا معاوضہ ادا کرنے کو تیار تھے کیونکہ کسی فلم کی فروخت اور کامیابی کے لیے دلیپ کمار کے نام کا اعلان ہی کافی تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے دولت کی خاطر اپنے اصول اور فن کو قربان نہیں کیا۔ اپنی طویل زندگی کے آخر میں انہوں نے ذرا زیادہ فلموں میں اداکاری کی۔ کیونکہ کئی فلمیں بہت تیزی کے ساتھ مکمل ہو جاتی تھیں۔ اگر وہ سابق رفتار سے ہی کام کرتے رہتے تو شاید ان کی کل فلموں کی تعداد مشکل سے چالیس بھی نہ ہوتی۔

یہ دلیپ کمار کی فلمی زندگی کا دور آغاز تھا لیکن ابتدائی چار پانچ سالوں ہی میں انہوں نے ساری فلمی صنعت پر اپنی دھاک بٹھادی تھی۔ سارا بر صغیر ان کا دیوانہ تھا۔ ان کی ہر حرکت فلم بینوں کو بھاتی تھی۔ ان کا ہر انداز ان کے دلوں پر نقش ہو کر رہ جاتا تھا۔ جب وہ آہستگی سے اپنے مخصوص انداز میں مکالمے بولتے تھے تو پورا سینما ہال ساکت ہو جاتا تھا اور دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ ان دونوں کی فلمی علیحدگی یا جدائی کا سبب بھی کوئی پوشیدہ راز نہیں تھا کیونکہ ان دونوں کے پیار کی داستانیں ہر ایک زبان پر تھیں۔

دلیپ کمار نے اس وقت تک بمبئی کی ممتاز ترین اداکاراؤں کے ساتھ کام کیا تھا اور ان کی اداکاری کا اعجاز تھا کہ اپنی اداکاری کے زور پر ہر وہ فلمی جوڑی کو مقبول بنادیتے تھے، لیکن کامنی کوشل کے ساتھ ان کی فلمیں سحر طاری کر دیتی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جیتے جاگتے کردار حقیقی زندگی میں پیار کی داستان پیش کر رہے ہیں۔

کامنی کوشل ایک ننھی منھی گڑیا جیسی ہیروئن تھیں، بوٹا سا (چھوٹے بوٹے جیسا) قد۔ بڑی بڑی متاثر کرنیوالی آنکھیں ،بیضوی چہرہ، سیاہ بال، کھلتی ہوئی رنگت۔ ان کے چہرے پر معصومیت تھی اور انداز میں لڑکپن۔ مکالمے بولنے کا انداز بالکل سیدھا سادہ اور روزمرہ کی گفتگو جیسا۔ وہ بڑے سے بڑا رومانی فقرہ بھی اتنی آسانی، سادگی اور تاثر کے ساتھ ادا کرتی تھیں کہ سننے اور دیکھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔

جب انہوں نے دلیپ کمار کے ساتھ پہلی فلم ''ندیا کے پار'' میں کام کیا تو فلمی دنیا کے لیے کوئی انجانا نام نہیں تھیں۔ اس سے پہلے وہ چار پانچ فلموں میں اداکاری کر چکی تھیں۔ لیکن صحیح معنوں میں کامیابی اور مقبولیت سے محروم تھیں۔ ندیا کے پار ان کی چھٹی اور غالباً دلیپ کمار کی بھی چھٹی فلم تھی لیکن فرق یہ تھا کہ پہلی فلم ''جگنو'' کے بعد ہی دلیپ کمار برصغیر کے نامور اور محبوب ترین ہیرو بن گئے تھے۔ گرچہ یہ ان کی دوسری فلم تھی لیکن پہلی فلم جوار بھاٹا سے پہلے ریلیز ہو گئی اس لیے پہلی فلم کہلائی۔ اس کے بعد پھر دلیپ کمار کا کبھی نہ ختم ہونے والی مقبولیت کا دور شروع ہوا جو آج تک جاری ہے حالانکہ انہیں فلموں میں اداکاری چھوڑے ہوئے بھی ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن فلم بین انہیں روز اول کی طرح آج بھی چاہتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں۔

ویڈیو نے پرانی فلموں اور اداکاروں کو ایک بار پھر زندہ جاوید بنا دیا ہے اور نئی نسل بھی ماضی کی فلموں اور اداکاروں کی

شکل، صورت اور فن اداکاری سے بخوبی آگاہ ہوچکی ہے۔ سائنس کی اس ایجاد نے ماضی کو حال سے روشناس کروانے میں بہت نمایاں اور کار آمد کردار ادا کیا ہے۔

"ندیا کے پار" کے مصنف اور ہدایت کار کشور ساہو تھے۔ کشور ساہو سے آج کی نسل بہت زیادہ واقف نہیں ہے لیکن وہ اس عہد کے ایک تعلیم یافتہ، ذہین اور باصلاحیت ہدایت کار تھے۔ وہ مصنف بھی تھے اور اداکار بھی۔ انہوں نے بہت کم فلمیں بنائیں اور بہت کم کام کیا لیکن ان کے کردار اور انکی فلمیں اپنے موضوعات اور پیشکش کے اعتبار سے قطعی مختلف اور بے حد اعلیٰ معیار کی تھیں۔

ندیا کے پار بنیادی طور پر ایک رومانی داستان ہے۔ ایک تعلیم یافتہ، بے فکرے دولت مند نوجوان اور ملاحوں کی ایک الہڑ اور سیدھی سادی لڑکی کی محبت کی یہ کہانی کشور ساہو نے بڑے اچھوتے اور حسین انداز میں پیش کی تھی۔ سی رام چندر نے اس کی رومانی موسیقی بنائی تھی۔ کہانی، مکالموں، موسیقی، اداکاری، اور ہدایت کاری کے اعتبار سے یہ ایک ایسی فلم تھی جس نے فلم بینوں کا ذوق اور معیار بدل کے رکھ دیا تھا۔ دلیپ کمار اور کامنی کوشل کے والہانہ پیار کی یہ کہانی امر ہو کر رہ گئی اور بھارتی فلموں میں ایک ایسی فلمی جوڑی نے جنم لیا جسے دیکھنے والے آج بھی یاد کرتے ہیں۔

دلیپ کمار نے اپنے عہد کی ممتاز اور حسین ترین ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ مگر کامنی کوشل کے ساتھ ان کی اداکاری میں ایسی حقیقت اور والہانہ کیفیت نظر آئی تھی جو کسی اور فلم کے حصے میں نہیں آئی۔ کامنی کوشل بھی اپنے کردار میں ڈوب کر اداکاری کرتی تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان دونوں کے علاوہ تیسرا ذی نفس دنیا میں موجود ہی نہیں۔ ندیا کے پار نے ہر طرف دھوم مچادی تھیں۔ دلیپ کمار تو پہلے بھی ایک انتہائی مقبول اور محبوب ہیرو تھے لیکن اس فلم نے کامنی کوشل کے قدو قامت میں بھی بہت اضافہ کر دیا تھا اور وہ راتوں رات بھارتی فلم صنعت کی سپر اسٹار بن گئی تھیں۔

اسی سال ان کی دلیپ کمار کے ساتھ دوسری فلم "شہید بھی نمائش کے لیے پیش کی گئی اور حسب توقع نمائش کے پہلے ہی دن سپر ہٹ تسلیم کرلی گئی۔ شہید ایک انقلابی قوم پرست نوجوان کی داستان تھی جس کا باپ پولیس آفیسر تھا۔ یہ کہانی انگریزی حکومت کے دور سے تعلق رکھتی تھی جب آزادی کی تحریک پورے عروج پر تھی اور نوجوان طلبہ

خصوصاً اس غلامی کے خلاف نبرد آزما تھے۔ باپ اور بیٹے کے فرض کی کشمکش کے درمیان ایک محبت کی داستان بھی پروئی گئی تھی جس میں کامنی کوشل کا کردار بہت نمایاں تھا۔اس فلم کے ہدایت کار رمیش سہگل تھے جو سید شوکت حسین رضوی کے معاون بھی رہے تھے۔اور بعد میں حقیقت سے قریب موضوعات فلمانے کے حوالے سے انہوں نے بہت شہرت حاصل کی تھی۔ماسٹر غلام حیدر اس فلم کے موسیقار تھے جنہوں نے بہت دلکش دھنیں بنائی تھیں۔خاص طور پر اس فلم کا ترانہ نما گانہ بہت مقبول ہوا تھا اور آج بھی خون کی گردش کو تیز کر دیتا ہے۔اس کے بول تھے۔

وطن کی راہ میں وطن کے نوجوان شہید ہو

پکارتے ہیں یہ زمین و آسمان شہید ہو

وطن کی راہ میں وطن کے نوجوان شہید ہو

ایسا نغمہ ہے جو ہر وقت اور ہر زمانے میں موثر ثابت ہو سکتا ہے۔اس فلم میں دلیپ کمار کا انجام المیہ تھا۔وہ وطن کی راہ میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور کامنی کوشل ان کا سوگ منانے کے لیے اپنی محبت کی یادیں سمیٹے ہوئے زندگی کے طویل سفر میں اکیلی تنہا رہ گئیں۔

شہید بھی ایک کامیاب فلم تھی اور اس کی نمایاں خوبی میں کامنی کوشل اور دلیپ کمار کی رومانی جوڑی تھی۔

ان دو فلموں کی نمائش کے بعد فلم بین ان دونوں کو زیادہ سے زیادہ فلموں میں یکجا دیکھنے کے تمنائی ہو گئے مگر یہ ممکن نہ تھا کیونکہ دلیپ کمار ایک وقت میں صرف ایک ہی فلم میں کام کیا کرتے تھے اور اس کے خاتمے تک دوسری فلم کی شوٹنگ کا آغاز نہیں کرتے تھے۔ساری زندگی وہ اسی اصول پر گامزن رہے اسی لیے لوگ ان کی فلموں کے منتظر رہا کرتے تھے۔اس زمانے میں بھی کامیاب ہیرو بیک وقت ایک سے زیادہ فلموں میں کام کر کے پیسے کماتے تھے مگر دلیپ کمار نے اپنا یہ اصول کبھی بھی ترک نہیں کیا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پچاس سال سے زیادہ عرصے تک فلمی صنعت سے وابستہ رہنے کے باوجود مشکل سے 55 فلموں میں اداکاری کی ہے جو کہ ایک ناقابل یقین اور حیرت کن بات ہے۔انہیں دولت کا لالچ نہیں تھا۔وہ من پسند کردار ہی قبول کرتے تھے اور اس کو ادا کرنے میں اپنی تمام تر

صلاحیتیں لگادیتے تھے۔اس دور میں وہ سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے والے اداکار تھے۔ بڑے بڑے فلمساز ان کے آگے پیچھے پھرا کرتے تھے اور انہیں بڑے سے بڑا معاوضہ ادا کرنے کو تیار تھے کیونکہ کسی فلم کی فروخت اور کامیابی کے لیے دلیپ کمار کے نام کا اعلان ہی کافی تھا۔اس کے باوجود انہوں نے دولت کی خاطر اپنے اصول اور فن کو قربان نہیں کیا۔اپنی طویل زندگی کے آخر میں انہوں نے ذرا زیادہ فلموں میں اداکاری کی۔ کیونکہ کئی فلمیں بہت تیزی کے ساتھ مکمل ہو جاتی تھیں۔اگر وہ سابق رفتار سے ہی کام کرتے رہتے تو شاید ان کی کل فلموں کی تعداد مشکل سے چالیس بھی نہ ہوتی۔

دلیپ کمار ایک خوب رو، مقبول ترین ہیرو تھے جن کی محبت میں پورا برصغیر گرفتار تھا۔ بڑی بڑی فلمی ہیروئنیں بھی ان کی توجہ اور قربت کی طالب رہا کرتی تھیں۔ان کے ساتھ کسی بھی فلم میں ہیروئن کا کردار ادا کرنا ہر ہیروئن کا خواب تھا لیکن یہی دلیپ کمار کی پہلی فلم ''ندیا کے پار'' کی فلم بندی کے دوران میں ہی کامنی کوشل کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔دونوں شادی کرنا چاہتے تھے، دلیپ کمار تو اسکی محبت میں دیوانے ہو چلے تھے۔دونوں طرف ہی آگ برابر لگی ہوئی والا معاملہ تھا۔دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا۔چاہا اور نوبت عشق تک جا پہنچی۔اس محبت کا بنیادی سبب ظاہری شکل وصورت اور شہرت سے زیادہ ان دونوں کی ذہنی ہم آہنگی تھا۔دلیپ کمار کوئی ڈگری یافتہ انسان نہیں ہیں پر ان کا مطالعہ بہت زیادہ ہے اور وہ ایک دانشور کی حیثیت سے بھی جانے جاتے تھے۔ مختلف علوم کے بارے میں ان کی معلومات اور اردو، انگریزی زبانوں میں ان کا طرز تخاطب بڑے بڑے دانشوروں کو حیران کر دیتا تھا۔ادھر کامنی کوشل بھی ایک تعلیم یافتہ اور بڑے روشن گھرانے سے تعلق رکھنے والی خاتون تھیں۔جب فلموں میں اداکاری شروع کی تو ایک شادی شدہ خاتون تھیں۔یہ وہ زمانہ تھا جب فلمی ہیرو ایک ہیروئن سے شادی کرنے سے دور بھاگتے تھے کیونکہ عام خیال یہ تھا کہ شادی شدہ فنکاروں میں فلم بینوں کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔لیکن کامنی کوشل کے بارے میں سب کو پتہ تھا کہ نہ صرف وہ شادی شدہ ہیں بلکہ ایک رنڈوے سے بیاہی ہیں اور اپنی بہن کے دو بچوں کی ماں بھی ہیں۔

کامنی کوشل کی زندگی کا یہ پہلو یا المیہ بجائے خود ایک فلمی کہانی کا موضوع بن سکتا ہے۔قصہ در اصل یہ تھا کہ کامنی

کوشل کی بڑی بہن کی شادی ایک انجنئیر سے ہوئی تھی جو کہ بمبئی میں رہتے تھے۔ بہن کا اچانک انتقال ہو گیا تو بچے ماں کی ممتا سے محروم ہو گئے۔ سب جانتے تھے کہ کامنی کوشل کے بہنوئی ایک جوان آدمی ہیں اور باقی زندگی تنہا نہیں رہ سکیں گے۔ کامنی کوشل کے گھر والوں کی خواہش تھی کہ بچے ان کے سپرد کر دیے جائیں مگر بچوں کے باپ اس پر رضا مند نہ تھے۔ چنانچہ اس مسئلے کا حل تلاش اس طرح کیا گیا کہ کامنی کوشل (جن کا اصلی نام اوما کیشب تھا) اپنے بہنوئی سے شادی کر لیں تو بچوں کو کھوئی ہوئی ممتا مل جائے گی۔ کامنی کوشل کو رشتوں کی کوئی کمی نہ تھی، وہ خوبصورت اور تعلیم یافتہ تھیں۔ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ذہین اور صلاحیتوں سے مالا مال تھیں۔

کامنی کا تعلق لاہور سے تھا، جہاں انہوں نے کنئیرڈ کالج جیسے تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کی تھی۔ حسین و جمیل تھی، طالب علمی کے زمانے ہی سے کھیلوں ، ڈراموں، مباحثوں اور سماجی تقریبات میں پیش پیش رہتی تھیں۔ وہ بہت اچھی پیراک بھی تھیں۔ ڈراموں میں بھی اداکاری کے حوالے سے لاہور کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھیں۔ بچپن ہی سے لاہور ریڈیو بچوں کے پروگراموں میں حصہ لیا کرتی تھیں اور اس کے بعد بھی ریڈیو سے وابستہ رہی تھیں۔ انہیں اس سے پہلے معروف ہدایت کار و فلم ساز چیتن آنند نے اپنی فلم میں کام کرنے کی پیشکش کی تھی لیکن انہوں نے اداکاری میں کوئی رغبت ظاہر نہ کی حالانکہ چیتن آنند جیسے ساتھ کام کرنا ایک اعزاز تھا۔

چیتن آنند کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ دیو آنند کے بڑے بھائی تھے اور ان کی پہلی فلم ''نیچا نگر'' نے اس زمانے میں (قیام پاکستان سے قبل) بین الاقوامی شہرت حاصل کی تھی۔ اس فلم کی موسیقی روی شنکر جیسے مایہ ناز فنکار نے مرتب کی تھی۔ اس فلم کے ہیرو رفیق انور تھے جو ایک نامور رقاص بھی تھے اور انہوں نے بعد میں دو فلمیں بھی بنائی تھیں۔

چیتن آنند بمبئی سے لاہور آئے تو اس وقت فلم '' نیچا نگر '' کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس لیے انہوں نے اوما (کامنی کوشل) کو اپنی فلم میں ہیروئن کے کردار کی پیشکش کی تھی مگر انہوں نے اور گھر والوں نے فلم کے ماحول کو نامناسب خیال کرتے ہوئے معذرت کر دی۔ مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس وقت کس کو معلوم تھا کہ اوما کو حالات خود بخود لاہور سے بمبئی جانے پر مجبور کر دیں گے۔

فلم ''نیچا نگر'' 1946 میں ریلیز ہوئی تھی۔اس میں رفیع پیر زادہ نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔نیچا نگر میں ہی چیتن آنند نے انہیں اوما سے کامنی کوشل بنا دیا اور پھر ہمیشہ کے لیے یہ نام ان کی پہچان بن گیا۔

اگلے سال 1947 میں ان کی دو فلمیں ریلیز ہوئی تھیں۔پہلی ''جیل یاترا'' اور دوسری فلمستان کی ''دو بھائی''جیل یاترا کے ہدایت کار اور مرکزی کردار معروف کریکٹر اور ایکٹر جاگیر دار تھے۔یہ بہت معیاری اور خوبصورت فلم تھی ۔راج کپور اس فلم کے ہیرو تھے۔اس کے فلمساز بھی جاگیر دار ہی تھے۔

''دو بھائی'' میں ان کے ساتھ ایک نئے ہیرو راجن ہسکر نے کام کیا تھا۔الہاس بھی اسی فلم کے اداکاروں میں شامل تھے۔یہ دراصل مسلمان ہیں اور ان کا نام اقبال ہے لیکن بھارتی فلمی صنعت میں کام کرنے کے لیے انہوں نے مصلحتاً راجن ہسکر کا نام اختیار کیا تھا۔اس فلم کے موسیقار ڈی برمن اور نغمہ نگار منشی دل تھے جو اس کے مصنف بھی تھے۔دو بھائی اپنی موثر کہانی، مکالموں اور نغمات کی بناء پر بہت کامیاب ہوئی تھی۔گیتا رائے نے اس کے لیے بہت خوبصورت گانے گائے تھے۔اس وقت تک وہ گیتا دت (گرودت کی بیگم) نہیں بنی تھیں۔ان کا گایا ہوا ایک نغمہ بہت مقبول ہوا تھا اور آج بھی سب کو یاد ہے۔اس کے بول یہ ہیں۔۔

میرا سندر سپنا ٹوٹ گیا

میں پیار میں سب کچھ ہار گئی

بے درد زمانہ جیت گیا

میرا سندر سپنا ٹوٹ گیا۔

''دو بھائی'' نے ہر جگہ جھنڈے گاڑ دیے۔یہ ایک معاشرتی کہانی تھی جسے کہانی ،موسیقی اور اداکاری نے سجا کر ایک بے حد کامیاب فلم بنا دیا تھا۔

1947 میں ملک کی تقسیم ہو گئی۔

1948 میں کامنی کوشل کی پہلی فلم ''آگ'' تھی۔آگ ہدایت کار اور فلم ساز کی حیثیت سے ان کی پہلی فلم تھی

۔اس فلم میں انہوں نے تین ہیر وئنوں کو یکجا کر دیا تھا ۔ان میں نرگس، کامنی کوشل اور نگار سلطانہ شامل تھیں۔ راج کپور ان تین ہیر وئنوں کے اکلوتے ہیر و تھے۔ تین ہیر وئنوں کے باوجود یہ فلم کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوئی۔ اسی سال کامنی کوشل کی تین فلمیں نمائش کے لیے پیش کر دی گئی تھیں۔ جس میں ان کی ایک فلم دلیپ کمار کے ساتھ ان کی فلم ''ندیا کے پار'' تھی۔ پگڑی میں ان کے ساتھ واسطی ہیر و تھے۔ اسی سال میں دلیپ کمار کے ساتھ ان کی دوسری فلم ''شہید'' بھی ریلیز ہوئی تھی۔ ندیا کے پار اور شہید دونوں ان کی بے حد کامیاب اور روایت ساز فلمیں تھیں۔ اسی سال کامنی کوشل کی ایک اور بے حد کامیاب فلم ضدی بھی نمائش پذیر تھی۔ ضدی کی مصنف مشہور افسانہ نگار خاتون عصمت چغتائی تھیں اور اس کے ہدایت کار ان کے شوہر شاہد لطیف تھے۔ دیو آنند اس فلم کے ہیر و تھے۔ ضدی ایک بہت اچھی رومانوی فلم تھی اور غالباً دیو آنند کی اداکاری کے اعتبار سے بہترین فلم تھی۔ اس فلم میں پران اور کل دیپ کور نے کام کیا تھا۔ اس فلم کا ایک اہم بلکہ مرکزی کردار نواب کاشمیری نے ادا کیا تھا جو اپنے دور کے بہترین کریکٹر ایکٹر تھے۔

اس دوران میں دلیپ کمار اور کامنی کوشل کی محبت کی داستانیں عام ہو گئی تھیں اور فلمی حلقوں سے نکل کر اخبارات کی زینت بھی بن رہی تھیں۔ اس کے باوجود بھی دلیپ کمار اور کامنی کوشل نے شبنم اور آرزو میں بھی ایک ساتھ کام کیا۔ یہ دونوں بے حد متاثر کن اور خوبصورت فلمیں تھیں۔ آرزو کی مصنفہ بھی عصمت چغتائی اور ہدایت کار شاہد لطیف تھے۔ آرزو کی تکمیل تک فلمی حلقوں میں یہ بات عام ہو چکی تھی کہ یہ دلیپ کمار اور کامنی کوشل کی آخری فلم ہو گی کیونکہ ان کے عشق کی آگ بھڑک چکی تھی اور کامنی کوشل کے شوہر اور اس کے بھائی اس رسوائی پر بہت چراغ پا تھے۔ انہوں نے نہ صرف کامنی کوشل کو اس سے باز رکھنے کے لیے تمام حربے استعمال کیے بلکہ غنڈوں کی مدد سے دلیپ کمار پر قاتلانہ حملہ بھی کروایا تھا۔ دلیپ کمار تو اس حرکت سے بالکل متاثر نہیں ہوئے مگر گھریلو دباؤ نے کامنی کوشل کو پسپائی کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ سب سے بڑی زنجیر ایک بار پھر اس کی بڑی بہن کے بچے بن گئے تھے جن کی خاطر کامنی کوشل نے ساری دنیا چھوڑ کر اپنے بہنوئی سے شادی کی تھی۔ کامنی ایک زبردست کشمکش اور زبردست آزمائش سے دوچار تھیں۔ ایک طرف دلیپ کمار کی محبت تھی جس کی خاطر وہ اپنا مذہب تک چھوڑنے کو آمادہ

تھیں۔دلیپ کمار سے شادی کرنے کے لیے تیار تھیں۔ مگر دوسری طرف خاندان کی رسوائی اور بچوں کی جدائی تھی۔کامنی کوشل نے کافی عرصے تک اس ذہنی کشمکش کا مقابلہ کیا مگر بالآخر ایک مشرقی عورت کی طرح ممتا اور شوہر کی نیک نامی کے حق میں محبت سے دستبردار ہو گئیں۔

آرزو دلیپ کمار اور کامن کوشل کی آخری فلم تھی ۔اتفاق یہ تھا کہ آرزو کی کہانی بھی اسی صورت حال کے عین مطابق تھی جس سے کامنی کوشل اور دلیپ کمار ان دنوں دوچار تھے۔یہی وجہ ہے کہ اداکاری کے اعتبار سے یہ ان دونوں کی ایک ناقابل فراموش فلم بن گئی تھی۔

آرزو کی ریلیز سے پہلے ہی یہ خبر عام ہو گئی تھی کہ آئندہ دلیپ کمار اور کامنی کوشل ایک ساتھ کسی فلم میں نظر نہیں آئیں گے۔دونوں فنکاروں نے اس فلم میں اپنے جذبات کا نچوڑ پیش کر دیا تھا۔کہانی، مکالموں اور سیچویشنز نے اس تاثر کو دوبالا کرنے میں بہت مدد کی تھی۔

اس طرح بھارتی فلمی صنعت کا ایک رومان پایہ اختتام تک پہنچا۔اس کے بعد دلیپ کمار نے دوسرا عشق مدھوبالا سے کیا تھا مگر اس کا انجام بھی ان کی فلموں کی بیشتر کہانیوں کی طرح المناک ہی ہوا اور یہ داستان بھی۔

دلیپ کمار روزِ اوّل سے ہی فلموں میں ایک ناکام عاشق کا المیہ کردار ادا کرنے کے لیے مشہور ہو گئے تھے مگر کون جانتا تھا کہ وہ اپنی حقیقی زندگی میں بھی وہ ایسے المیہ انجام سے دوچار ہونگے۔ایک بار نہیں، دوبار۔ مگر تقدیر کا حال کون جانتا ہے؟اور دنیا میں ہر شخص کو ہر خوشی بھی نہیں ملتی۔

کامنی کوشل کو ہر طرح کی مجبوریوں، دباؤ اور یہاں تک کہ تشدد کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ پھر ان کی سب سے بڑی کمزوری ان کی بڑی بہن کے بچے تھے۔جن کی خاطر انہوں نے اپنی خوشیاں قربان کر دی تھیں۔کامنی کوشل کی حقیقی زندگی کسی بھی فلمی کہانی یا افسانے سے مختلف نہیں ہے۔اس قسم کے واقعات کو مرکزی خیال بنا کر انڈیا اور پاکستان میں کئی فلمی کہانیاں بنائی گئیں جو کامیابی سے ہم کنارہ بھی ہوئیں۔کامنی کوشل کو کیا پتہ تھا کہ وہ حقیقی زندگی میں بذات خود ایک کہانی بن کر رہ جائیں گی۔

کامنی کوشل کو غم غلط کرنے کے لیے ان کے شوہر انہیں بچوں کے ہمراہ لے کر یورپ کے تفریحی دورے پہ چلے گئے۔اس سیر کا مقصد یہ تھا کہ ماحول کی تبدیلی کے باعث کامنی کوشل نئے حالات سے سمجھوتہ کرلیں اور اپنی محبت کو یکساں فراموش کر دیں۔یہ نسخہ بہت حد تک کامیاب ثابت ہوا۔یوُرپ سے واپسی کے بعد ایک دفعہ پھر کامنی کوشل نے فلموں میں کام شروع کر دیا مگر فلم سازوں کو آگاہ کر دیا تھا کہ وہ کسی فلم میں دلیپ کمار کے ساتھ کام نہیں کریں گی۔اس طرح دونوں فنکاروں نے جدائی کے بعد بھی اپنا فلمی سفر جاری رکھا۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اگر کامنی کوشل کے خاوند اتنے ہی غیرت مند تھے تو انہوں نے اپنی بیوی کا تعلق فلمی دنیا سے منقطع کیوں نہیں کیا۔ مگر پیسے کا لالچ ان کی غیرت کی راہ میں حائل ہو گیا تھا۔کامنی کوشل اس کے بعد بھی فلموں میں اداکاری کرتی رہیں،ان کی بعض فلمیں کامیاب بھی ہوئیں لیکن فلم بینوں کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے ایک کسک پیدا ہو گئی تھی اور وہ جب بھی دلیپ کمار اور کامنی کوشل کو دوسرے اداکاروں کے ساتھ کام کرتے ہوئے دیکھتے تو اس ناکام جوڑے کو ضرور یاد کیا کرتے تھے۔کچھ دیر تک یہ تاثر رہا لیکن رفتہ رفتہ فلم بین ان دونوں کو ایک دوسرے کے بغیر دیکھنے کے عادی ہو گئے۔وقت ہر قسم کے دکھ اور درد کا علاج ہے۔زمانہ ہر طرح کی یادوں اور جذبوں کو وقت کی گرد میں چھپا دیتا ہے۔

دلیپ کمار اور کامنی کوشل کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا۔لوگ تو بھول ہی گئے مگر کون جانے ان دونوں کے دلوں سے بھی یہ داغ مٹ گیا یا اس کے نشان باقی ہیں؟

اس علیحدگی کے بعد کامنی کوشل نے ''نمونہ'' میں کام کیا جس کے ہیرو دیو آنند تھے۔ان دونوں کی ایک فلم ''ضدی'' اس سے پہلے بہت پسند کی گئی تھی اور ان کی جوڑی فلم بینوں کے لیے نئی نہیں تھی مگر وہ مولوی مدن جیسی بات کہاں؟کامنی کوشل کے علاوہ مدھو بالا بھی اس فلم کی ہیروئن تھیں۔فلم ''راکھی'' میں کامنی کوشل کے ساتھ ہیرو کرن دیوان تھے۔اس فلم کے ہدایت کار بی مہرا تھے جو دلیپ کمار اور کامنی کوشل کی یادگار فلم ''شبنم'' کے ہدایت کار تھے۔یہ فلم بھی فلمستان نے بنائی تھی۔ایس ڈی برمن نے موسیقی ترتیب دی تھی۔مگر اس فلم کا کسی نے نوٹس تک نہیں لیا۔بکھرے موتی فلم کے ہدایت کار ایس ایم یوسف تھے جس کے موسیقار غلام حیدر تھے۔فلم پونم

1952 میں ریلیز ہوئی تھی جس کے ہدایت کار ایم صادق اور موسیقار شنکر جے کشن تھے۔اس فلم میں ہیرو کا کردار اشوک کمار نے ادا کیا تھا۔اپنی موسیقی، کہانی اور کامنی کوشل اور اشوک کمار کی معیاری اداکاری کے باعث یہ فلم کافی پسند کی گئی تھی۔
''کوئل'' میں شیکھر ان کے ہیرو تھے۔فینس پکچرز کی فلم ''آنسو'' کے ہیرو بھی شیکھر ہی تھے۔چکرورتی کی کاسٹیوم فلم ''شہنشاہ'' میں مدراس کے اداکار رنجن کامنی کوشل کے ہیرو تھے۔اس کے موسیقار ایس ڈی برمن تھے۔اسی سال کامنی کوشل نے فلم ''رامی دھوبن'' میں بھی کام کیا جس کے ہیرو ابھی بھٹاچارجی تھے۔1953ء میں کامنی کوشل کی ایک بہت اچھی فلم ''بیراج بہو'' بھی نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی۔ اس کے ہدایت کار بمل رائے تھے اور کہانی نویس مکھ رام شرما جو گھریلو اور معاشرتی کہانیاں لکھنے کے لئے بہت شہرت رکھتے تھے۔

مکھ رام شرما کو بدقسمتی سے اتنی شہرت نہیں ملی جس کے وہ حق دار تھے مگر انہوں نے بھارتی فلمی صنعت میں انقلاب پیدا کرنے والی کہانیاں لکھی ہیں جن کو زیادہ تر بی آر چوپڑا نے بنایا تھا اور وہ سب کی سب فلمیں بے انتہا کامیاب ہوئی تھیں مثلاً ایک ہی راستہ جس میں انہوں نے ایک بیوہ ہندو عورت کی دوسری شادی کرادی تھی۔مینا کماری اور اشوک کمار اس کے مرکزی کردار تھے اور یہ فلم بے حد کامیاب ہوئی تھی۔

''سادھنا''ایک طوائف کی کہانی تھی جو خالص پیشہ ور طوائف تھی مگر حالات کے تحت ایک گھر میں چند روز رہی تو اسے حقیقی زندگی اور عورت کی حقیقت کا احساس ہوا۔ اس فلم میں ہیرو نے اس سے شادی کرلی تھی۔''قانون'' ایک ایسی فلم تھی جو قانونی کمزوروں کی نشاندہی کرتی تھی۔اس فلم میں ایک بھی گانا نہیں تھا مگر یہ سپر ہٹ ہوئی تھی۔
''دھول کا پھول'' ایک ناجائز بچے اور اس کی ماں کی کہانی تھی جس کا بھارتی سماج اور فلمی دنیا میں تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی سپر ہٹ فلم تھی۔مکھ رام شرما کی ہر کہانی مختلف معاشرتی موضوع کے بارے میں ہوتی تھی اور ہر فلم سپر ہٹ ثابت ہوئی۔
''بیاج بہو'' بھی بہت اچھی کہانی تھی جسے ہدایت کار بمل رائے نے بہت خوبصورتی سے فلمایا تھا۔ سنیل چوہدری اس

کے موسیقار تھے۔اس فلم کے ہیرو ابھی بھٹاچارجی تھے۔یہ بے حد کامیاب فلم تھی جس کا چربہ پاکستان میں ''چھوٹی بیگم'' کے نام سے بنایا گیااور یہ فلم بھی سپر ہٹ ہوئی تھی۔اس میں مرکزی کردار صبیحہ خانم نے یکساں مہارت اور خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔سدھیر اس فلم میں ہیرو تھے۔ کامنی کوشل کی چند اور فلمیں یہ ہیں۔چالیس بابا ایک چور۔یہ سنتوش کی مزاحیہ فلم تھی جس کے ہیرو بلراج ساہنی تھے۔''رادھا کرشن'' میں راجن کپور ہیرو تھے۔فلم ''سنگم'' میں ان کے ہیرو شیکھر تھے۔''ایک شریمان ایک شریمتی'' رومانوی اور ہلکی پھلکی فلم تھی جس کے ہیرو شمی کپور تھے۔یہ بھی کامیاب فلم تھی۔فلم ''آبرو'' میں کشور کمار ہیرو تھے۔1957ء میں انہوں نے ''گریٹ شو آف انڈیا'' میں کام کیا تھا۔انہوں نے سہراب مودی کی ایک فلم میں بھی کام کیا تھا۔ان کی مشہور اور یادگار فلم ''جیلر'' کو انہوں نے دوبارہ بنایا۔''بینک منیجر'' میں وہ شیکھر کے ساتھ ہیروئن تھیں۔اس کے ہدایت کار راکھن تھے جو بعد میں پاکستان بھی آئے تھے اور فلم ''سہرا'' بنائی تھی۔وہ دراصل مسلمان تھے۔ان کا نام رفیق علی خاں تھا۔نائٹ کلب میں اشوک کماران کے ساتھ ہیرو تھے۔لطف کی بات یہ ہے کہ اسی سال انہوں نے ''شہید'' نام کی ایک فلم میں کام کیا مگر اس کے ہیرو دلیپ کمار کی جگہ اشوک کمار تھے۔

اس فلم کو پہلی فلم ''شہید'' جیسی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔یہ کامنی کوشل کا ہیروئن کی حیثیت سے زوال کا زمانہ تھا۔اگرچہ وہ دیکھنے میں پہلے ہی جیسی نظر آتی تھی مگر ہیروئن کے طور پر ان کی مانگ میں کمی آچکی تھی۔ایک عرصے تک وہ فلموں سے علیحدہ رہیں پھر منوج کمار کی فلم ''اُپکار'' میں ایک کریکٹر ایکٹریس کی حیثیت سے نمودار ہوئیں۔اس فلم کے مرکزی رومانی کردار آشا پاریکھ اور منوج کمار نے ادا کئے تھے۔اسکے بعد انہوں نے کریکٹر ایکٹریس کے طور پر کئی فلموں میں بہت اچھی اداکاری کی۔اداکارہ تو وہ بہت اچھی تھیں اس لئے کریکٹر ایکٹریس کے کرداروں کے ساتھ بھی انصاف کرتی رہیں۔

کامنی کوشل رفتہ رفتہ اداکاری سے کنارہ کش ہو گئیں مگر انہوں نے دستاویزی فلمیں بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔چند سال قبل وہ اپنے شوہر کے ساتھ لاہور آئی تھیں۔ان سے ملاقات ہوئی تو تمام پرانی یادیں تازہ ہو گئیں جو کہ اب قصہ پارینہ ہو چکی ہیں مگر دلیپ کمار اور کامنی کوشل کی فلمیں دیکھنے والوں کے دلوں پر آج بھی نقش ہیں۔کافی عمر کے باوجود

ان میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ویسا ہی قد و قامت، پھرتی اور چہرے پر وہی معصومیت۔ ظاہر ہے کہ ان کے شوہر کی موجودگی میں ان سے پچھلے واقعات کے بارے میں گفتگو نہیں کی جا سکتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ زندگی سے قطعی مطمئن ہیں اور یہ کہ ان کے شوہر کے تعاون کے بغیر وہ فلمی دنیا میں اتنی کامیابیاں حاصل نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کے شوہر بھاری جسم کے ایک صحت مند آدمی ہیں۔ گفتگو میں شائستگی اور علم کی جھلک نظر آتی ہے۔ مگر اس محفل میں بیشتر لوگوں کی نظروں میں ہم بھی ان میں شامل تھے۔ وہ ایک مجسم ویلن نظر آتے تھے۔ ہم نے ان سے چند باتیں تو کیں مگر اوپری دل سے۔

کامنی کوشل کو اپنے سامنے دیکھ کر پرانی باتوں کی یادیں تازہ ہونا ضروری تھا۔ دلیپ کا ذکر اداکار اور ان کے ہیرو کی حیثیت سے بھی اس محفل میں ہوا۔ کامنی کوشل نے بہت سادگی اور اعتماد سے جوابات دیئے، اپنے چہرے سے انہوں نے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار نہیں کیا اور کیوں نہ ہو۔ آخر وہ ایک بہت بڑی اداکارہ ہیں۔

کامنی کوشل کا تعلق لاہور کے ایک نہایت تعلیم یافتہ اور معروف گھرانے سے ہے۔ ان کے والد رائے بہادر کیشب بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے۔ علمی حلقوں میں انہیں بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا تھا۔ مالی اعتبار سے بھی خوشحال تھے۔ رائے بہادر کا خطاب ان کی خاندانی عظمت اور وجاہت کی وضاحت کر سکتا ہے۔ وہ ایک سائنسدان اور فلاسفر بھی تھے۔ پنجاب یونیورسٹی میں بھی وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ان کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ چھوٹی بیٹی اوما (کامنی کوشل) تھیں۔ وہ بہت ذہین اور باصلاحیت بچی تھیں۔ ابھی وہ سات سال کی تھیں کہ ان کے والد کا اچانک انتقال ہو گیا اور یہ خاندان اپنے سرپرست سے محروم ہو گیا۔ مگر ان کی والدہ نے ہمت نہ ہاری اور اپنی اولاد کو بہترین تعلیم دلائی۔ اوما کیشب نے کنیرڈ کالج اور گورنمنٹ کالج جیسے تعلیمی اداروں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ زمانہ طالب علمی میں وہ ریڈیو کے ڈراموں میں بھی حصہ لیتی رہیں۔ کھیلوں، مباحثوں میں بھی وہ ہمیشہ پیش پیش رہیں۔ ہر امتحان انہوں نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ وہ کالج کے زمانے میں پیراکی کی چیمپیئن بھی رہ چکی ہیں۔ ہر اعتبار سے وہ زندگی سے بھرپور اور ایک شوخ و طرار لڑکی تھیں جسے زندگی کی ہر خوبصورت چیز سے پیار تھا۔ ایک ایسی زندہ دل لڑکی کو آگے چل کر جس قسم کے حوادث و آلام کا شکار ہونا پڑا، اس کے بارے میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ذاتی

حیثیت میں جن ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہوئیں، دیکھا جائے تو اسے قسمت کی ستم ظریفی کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ بدرجہا بہتر خوشیوں کی حقدار تھیں۔ بہر حال، قدرت کے آگے کون سر اٹھا سکتا ہے۔ انہیں جس قسم کے ڈرامائی حالات اور اتار چڑھاؤ سے دوچار ہونا پڑا، یہ داستان پہلے بیان کی جاچکی ہے۔ ایک بار انہوں نے چیتن آنند کی پیشکش پر فلموں میں کام کرنے اور لاہور چھوڑ کر بمبئی جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن تقدیر ان کی اس حرکت پر مسکرا رہی تھی۔ وہ لاہور چھوڑ کر بمبئی بھی گئیں مگر ایک رنڈوے کی بیوی بن کر جو ان کا بہنوئی بھی تھا۔ پھر انہوں نے چیتن آنند کی فلم ''نیچا نگر'' میں کام بھی کیا۔ غالباً اس کے لئے ان کے شوہر نے انہیں مجبور کیا ہوگا ورنہ اگر انہیں اداکاری سے دلچسپی ہوتی تو وہ پہلے ہی یہ پیشکش قبول کر لیتیں۔

فلم ہی کے حوالے سے وہ دلیپ کمار سے روشناس ہوئیں۔ یہ ملاقات بڑھ کر محبت کے تناور درخت کی شکل اختیار کر گئی، یہاں تک کہ عشق کی داستان بن گئی۔ بھارتی فلمی صنعت میں اس سے پہلے اور اس کے بعد عشق کی ایسی کہانی دوبارہ دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی۔ یوں تو دلیپ کمار اور مدھو بالا کی محبت کے بھی چرچے ہوئے اور اس کا انجام بھی المناک ہوا مگر دلیپ کمار اور کامنی کوشل کا عشق بالکل انوکھا تھا۔ جب ایک تعلیم یافتہ، ذہین، سمجھدار، شادی شدہ عورت نے محبت کے آگے سب کچھ بھلا دیا۔ یہاں تک کہ اپنی بہن کے ان دو بچوں کو بھی فراموش کر دیا جن کی خاطر اس نے اپنی زندگی، تمام آرزوئیں اور خوشیاں قربان کر دی تھیں۔ مگر انجام وہی ہوا جو کلاسیکی عشق کی داستانوں کا ہوتا ہے۔ یعنی جدائی، محرومی اور محض یادیں ہی زندگی کا حصہ بن کر رہ گئیں۔ یہ کامنی کوشل کی پہلی محبت تھی اور کہتے ہیں کہ عورت اپنی پہلی محبت کو زندگی بھر یاد رکھتی ہے۔

منفرد موسیقار خواجہ خورشید انور کے بارے میں ہم پہلے بھی تفصیل سے بتا چکے ہیں اور ہمارے خیال میں ان کی زندگی کا کوئی گوشہ بیان کرنے سے نہیں رہ گیا تھا۔ مگر جو کہتے ہیں انسان زندگی بھر سیکھتا ہی رہتا ہے اور کبھی مکمل ہونے کا دعوی بھی نہیں کر سکتا تو یہ بالکل درست اور آزمودہ بات ہے۔ آپ بھی اپنی زندگی میں ایسے تجربات کرتے ہوں

گے۔ہر شخص کو اپنے شعبے میں ان مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔اسی لیے صحیح فنکاراور عالم ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ وہ ابھی محض طالب علم ہیں اور سیکھنے کے لیے بہت کچھ باقی ہے۔

خواجہ خورشید انور صاحب سے ہماری گفتگو بھی ہوتی رہی اور ملاقات کا بھی موقع ملا۔خورشید صاحب کم گو اور کم آمیز آدمی تھے لیکن جو ان کے بارے میں تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ خوش مزاج، چڑچڑے اور تنہائی پسند تھے۔کسی کو دوست نہیں بناتے تھے اور کسی محفل میں کھلتے نہ تھے۔

پچھلے دنوں ان کے بھائی خواجہ سلطان احمد صاحب نے پرزور تردید کی ہے۔سعید ملک صاحب فن موسیقی کے ماہر بھی ہیں اور رسیا بھی ہیں۔وہ موسیقی اور موسیقاروں کے بارے میں اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں۔70 سال سے اوپر عمر ہے لیکن ماشاءاللہ حافظہ ابھی بھی قابل رشک ہے۔انہوں نے نقادوں کی طرح موجوں کا نظارہ ساحل پر بیٹھ کر نہیں کیا۔بلکہ بذات خود دریاؤں میں شناوری کرتے رہے ہیں۔گائیکی اور سازنوازی انہوں نے بڑے بڑے استادوں سے سیکھی ہے ۔ بہت بڑے بڑے استادوں کی صحبت انہیں حاصل رہی ہے۔علم موسیقی کے بارے میں ان سے زیادہ جاننے والا اور اسے خوبصورتی سے بیان کرنے والا غالباً آج ان کے مقابلے میں دوسرا کوئی نہیں ہے۔انہوں نے لاہور میں اس وقت ہوش سنبھالا جب یہ شہر علم و فن کا گہوارہ تھا۔ خصوصاً موسیقی کے حوالے سے یہ ایک بے مثال شہر تھا جہاں اپنے زمانے کے نامور ہنر منداور موسیقار محفلیں سجاتے تھے۔سعید ملک صاحب کو بچپن ہی سے موسیقی کا شوق تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس شوق سے بھی پورا پورا انصاف کیا اور علم موسیقی کے بارے میں نہ صرف خود سیکھا بلکہ دوسروں کی بھی بابت جاننے کی کوشش کی۔برصغیر کے عظیم ترین موسیقاروں اور سازندوں کو انہوں نے بذات خود سنا ہے اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہوئے ہیں۔سالہا سال سے وہ موسیقی کے بارے میں معتبر انگریزی جرائد اور اخبارات میں لکھ رہے ہیں جو آنے والے دور میں اس فن کے دلدادگان کے لیے مستند حوالوں کا کام دے گی

۔

ملک صاحب ہمیشہ معلومات کی کھوج میں لگے رہتے ہیں۔پچھلے دنوں وہ خواجہ خورشید انور کے بارے میں بہت سی ایسی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں جو خورشید صاحب کے بارے میں دلچسپ اور حیرت انگیز انکشافات کی

حیثیت رکھتی ہیں۔

خواجہ سلطان احمد سپریم کورٹ کے وکیل ہیں اور بہت اعلیٰ درجے کے وکیل ہیں۔ بہت کم لوگ ان کے بارے میں خواجہ انور رشید کے حوالے سے جانتے ہیں۔ خواجہ سلطان احمد کی ساری زندگی وکالت کرتے گزری ہے مگر موسیقی اور فنون لطیفہ سے ان کی دلچسپی ہمیشہ قائم رہی ہے۔ موسیقی کے سلسلے میں وہ معلومات کا خزانہ ہیں۔ خواجہ سلطان احمد فلموں کے بارے میں بہت سے فلم سازوں اور فلم نگاروں سے زیادہ جانتے ہیں۔ خصوصاً قیام پاکستان سے پہلے کی فلموں اور موسیقی کے بارے میں ان کی معلومات قابل رشک ہیں۔

ان کا تعلق اپنے مرحوم بھائی اور عظیم موسیقار کے ساتھ ہمیشہ برقرار رہا۔ وہ ان کے مداح بھی ہیں اور ان کے بارے میں بھائی کی حیثیت سے بہت کچھ جانتے ہیں لیکن دوسرے موسیقار کے بارے میں بھی تمام معلومات ان کی انگلیوں پر ہیں ۔ فلموں اور فلمی موسیقی کے علاوہ کلاسیکی موسیقی سے بھی انہیں بہت لگاؤ ہے ۔ شاید شوق انہیں اپنے والد سے ورثے میں ملا ہے۔ ان کے والد بھی ایک وکیل تھے لیکن فرصت میں ان کے مشاغل موسیقی اور موسیقاروں سے ملاقاتیں اور ان کی محفلیں آراستہ کرنا تھا۔

خواجہ خورشید نے بھی آنکھیں کھول کر یہی ماحول دیکھا تھا۔ ان کے گھر میں کلاسیکی موسیقاروں اور مایہ ناز سازندوں کی آئے روز محفلیں سجا کرتی تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک گائیک اور موسیقار یہاں موجود ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب کے والد صاحب کو بھی کلاسیکی موسیقی سے والہانہ لگاؤ تھا مگر صرف سننے کی حد تک ۔ مگر انہیں یہ فن اس قدر اچھا لگتا تھا کہ ان کی خواہش تھی کہ ان کی اولاد میں بھی وہی ذوق پیدا ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب خواجہ خورشید انور نے موسیقی کی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا تو ان کے والد نے ان کی حوصلہ افزائی کی بلکہ انہیں باقاعدہ موسیقی سیکھنے کے سلسلے میں ہر سہولت فراہم کی اور ان کی ہر طرح کی مدد کی۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خواجہ خورشید صاحب نہ گا سکتے تھے اور نہ ہی کوئی ساز بجا سکتے تھے۔ دراصل یہ الزام ان کے پیشہ ور حریف اور ہم عصر ان پر عائد کیا کرتے تھے۔ وہ یہ گوارا ہی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی ان کے حلقے سے باہر کا کوئی

شخص موسیقی میں نام پیدا کرے ۔ یہ کشمکش ہمیشہ ہماری فلمی موسیقی اور کلاسیکی میں جاری رہی ہے۔ برادری سے باہر
کے

تعلیم یافتہ موسیقاروں اور گلوکاروں کو بہت مشکل سے برداشت کیا جاتا تھااور جب تک وہ ہر طرح اپنے فن کالوہانہ منوا لیں اورانہیں مستند نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ مسئلہ صرف خواجہ خورشید انور کا ہی نہیں تھا ۔ نثار بزمی، مصلح الدین، روبن گھوش، عطاء الرحمن خاں، خلیل احمد، سہیل رعنا جیسے موسیقار بھی اس کا نشانہ بنے۔ سازندے جو موسیقی کی ترتیب میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کو شروع میں ان کا تعاون بہت مشکل سے حاصل ہوا۔ اگر یہ اپنی ہنر مندی کا ثبوت نہ دیتے اور ہر کسوٹی پر پورے نہ اترتے تو انہیں وہ مقام حاصل نہ ہوتا جس کے وہ بعد میں حق دار تسلیم کیے گئے۔
خواجہ سلطان احمد نے اپنے بھائی کے بارے میں اس تاثر کو قطعی غلط قرار دیا اور بتایا کہ وہ خورشید انور کو ابتداء ہی سے کلاسیکی گانے گانے کا شوق تھا۔ وہ ہر بڑے کلاسیکی گائیک کی آواز اور گائیکی کی نقل اس خوبی سے کرتے تھے کہ سننے والے حیران رہ جاتے تھے۔ وہ بہت خوش گلو تھے۔ گھر کے ماحول کی تربیت نے ہی انہیں موسیقی کے اسرار اور رموز سے آشنا کیا تھا ورنہ وہ کسی کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے۔ البتہ آگے چل کر انہوں نے مایہ ناز موسیقار استاد توکل حسین خاں کی شاگردی اختیار کی تھی۔ وہ اس معاملے میں انتہائی محتاط بلکہ کنجوس تھے اور پرانے دور کے استادوں کی طرح اپنے فنی رموز دوسروں کو بتانے کے قائل نہ تھے۔ یہاں تک کے وہ ریڈیو پر گانے کے حق میں بھی نہ تھے اور اس سے بھی پرہیز کرتے تھے۔
خواجہ خورشید کے علاوہ انہوں نے صرف ایک اور شخص کو شاگردی کا شرف بخشا تھا جو سوہنی خاں تھے۔ انہوں نے لاہور میں اپنے سازندوں کا گروپ بھی بنایا تھا۔ جو سوہنی خاں کے بینڈ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اسطرح سوہنی خاں خواجہ صاحب کے استاد بھائی تھے۔
سلطان احمد صاحب نے یہ دلچسپ بات بھی بتائی کہ جب خواجہ انور کی شادی ہوئی تو سوہنی خاں اپنے بینڈ کے ساتھ دلہا کے گھوڑے کے آگے ساز بجاتے جارہے تھے۔ اس وقت تک خواجہ صاحب موسیقار بن چکے تھے۔ ایسا واقعہ بھی شاید اس سے پہلے بعد رونمانہ ہوا ہو گا کہ ایک نوجوان موسیقار کی برات میں ممتاز گائیک اور سازندے بینڈ بجاتے ہوئے دلہا

کے آگے آگے چل رہے تھے۔اس زمانے میں برات کے ساتھ بینڈ کا رواج تھا۔جو کہ قیام پاکستان کے بعد بھی کچھ عرصے تک باقی رہا مگر بعد میں دوسری پرانی روایات کی طرح رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔

اس ضمن میں چلتے چلتے یہ سن لیجئے کہ خواجہ صاحب کے استاد اور برصغیر کے مانے ہوئے استاد توکل حسین خاں کسی طرح رضامند نہ ہوئے تھے۔یہاں تک کے ریڈیو کے ذریعے بھی اپنی آواز دوسروں تک پہنچانے کے لیے تیار نہ ہوئے تھے۔

لاہور کی ایک گراموفون کمپنی استاد کے ریکارڈ بنانے کی خواہش مند تھی مگر استاد توکل حسین خاں صاحب کسی طرح بھی رضامند نہ ہوتے تھے۔خواجہ خورشید انور نے انہیں کسی نہ کسی طرح رضامند کر لیا اور اپنے ساتھ ریکارڈنگ کے لیے گراموفون کی کمپنی میں لے گئے۔ان دنوں گراموفون کمپنیاں ریکارڈ تیار کر کے فروخت کرتی تھیں ۔جن کے ذریعے لوگ موسیقاروں اور سازندوں سے بھی روشناس ہو جاتے تھے ۔شوقین لوگ گراموفون اپنے گھروں میں ضرور رکھتے تھے۔اسے عموماً باجا کہا جاتا تھا۔ہم نے اپنے بچپن میں بھونپو والے یہ گراموفون باجے کئی گھروں میں دیکھے ہیں اور پرانے گلوکاروں کی آوازیں بھی سنی ہیں۔

گراموفون کمپنی والے بہت خوش تھے کہ استاد توکل حسین ان کے لیے اپنی آواز میں گانے ریکارڈ کرانے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔اسٹوڈیو میں ان کی بہت آؤ بھگت کی گئی اور ریکارڈنگ کی تمام تیاریاں مکمل کرنے کے بعد خاں صاحب کو دعوت دی گئی کہ وہ مائیکروفون کے سامنے تشریف لائیں۔عین اس وقت ایک انوکھا کام ہو گیا۔۔

یکایک خاں صاحب کو نہ جانے کیا خیال آیا۔انہوں نے پوچھا کہ ان کی موسیقی اور گانے کے ایک ریکارڈ کی کیا قیمت ہو گی۔

مینجر نے فخریہ انداز میں کہا ”خاں صاحب‘اس کی قیمت ہم نے تین روپے فی ریکارڈ مقرر کی ہے۔“

یہ سن کر استاد توکل حسین ہتھے سے اکھڑ گئے اور بولے ”میں اپنی آواز اور فن کو اس قدر سستا نہیں کر سکتا کہ تین روپے میں اس کا ریکارڈ فروخت ہو۔“ یہ کہہ کر انہوں نے گانے ریکارڈ کرانے سے صاف انکار کر دیا۔انہیں بہت

سمجھایا گیا کہ اس طرح انکی آواز ملک کے کونے کونے تک پہنچ جائے گی اور آنے والی نسلیں بھی اس سے فیض حاصل کریں گی مگر خان صاحب اپنے فن کو اتنا سستا فروخت کرنے پر تیار نہیں ہوئے اور صاف انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ریکارڈنگ منسوخ کر دی گئی اور ان کے گانوں کے ریکارڈ نہ بن سکے۔

اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے فن کو دوسروں تک پہنچانے اور عام کرنے کے کس قدر مخالف تھے ۔یہی طرز عمل دوسرے استادوں کا بھی تھا۔ وہ اپنے فن کو بہت قیمتی سمجھتے تھے اور اسے کم قیمت پر فروخت کرنے پر کسی طرح بھی روادار نہ تھے۔

بات خواجہ خورشید کی گلوکاری کی ہو رہی تھی۔ وہ کلاسیکی گانے بہت خوبی سے گاتے تھے۔ ہر بڑے کلاسیکی گلوکار کی آواز میں اس کی ہو بہو نقل کر کے سنا دیتے تھے۔ کتنی مشکل استھائی اور انترہ ہو وہ اسے بخوبی ادا کر سکتے تھے۔ وہ گھنٹوں ریاض کیا کرتے تھے اور عموماً نامور گلوگاروں اور گائیکوں کے نغمات ہی گاتے تھے۔

ایک دن استاد توکل حسین خاں خواجہ صاحب کے والد کے پاس آئے تو انہوں نے خواجہ خورشید انور کی آواز سن لی۔ دریافت کیا'' یہ کون گا رہا ہے؟''

ان کے والد نے بتایا'' میرا بیٹا ہے۔اسے گانے کا بہت شوق ہے''

خاں صاحب نے کہا'' بہت اچھی آواز ہے۔ ذرا بلایئے''

خواجہ خورشید انور کو خاں صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ ان کی گائیکی اور آواز کی خوبصورتی سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ بذات خود انہیں گانے کی تعلیم دینے کی خواہش ظاہر کر دی۔ خواجہ خورشید انور کے لیے یہ ایک اعزاز کی بات تھی ۔ اس طرح وہ استاد توکل حسین خاں کے شاگرد بن گئے جو گوالیار گھرانے کے بہت نامی گرامی گانے والے تھے۔

خواجہ سلطان نے بتایا کہ خواجہ خورشید جن دنوں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک تھے تو بعض اپنے گانے بھی نشر کر دیا کرتے تھے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بہت اچھے گلوکار تھے۔ افسوس کہ یہ ریکارڈ اب دستیاب نہیں ہے ورنہ ان کے معترضین کے لیئے منہ بولتا جواب فراہم کرتا ۔ وہ تان پورہ اور طبلہ بھی بہت خوبی سے بجاتے تھے۔

سنہ 1940 میں گلے کی خرابی کے باعث انکا ٹانسلز کا آپریشن ہونے کے بعد انہوں نے گلوکاری ترک کردی تھی۔
اس کا ان کی آواز پر بھی اثر پڑا تھا اور ڈاکٹر نے انہیں گانے سے منع کر دیا تھا۔
خواجہ سلطان احمد نے اس خیال کی بھی پرزور تردید کی کہ خواجہ خورشید انور طرز بنانے میں بہت زیادہ وقت لیتے تھے۔ دراصل وہ طرز کو سیچویشن اور بولوں کے موڈ کے مطابق بناتے تھے اور جب تک موزوں طرز نہیں سوجھتی تھی وہ اسے ریکارڈ نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات وہ بہت جلد طرز بنالیا کرتے تھے۔
اس سلسلے میں انہوں نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا جو اس سے پہلے سامنے نہیں آیا تھا۔ بھارت کے معروف موسیقار روشن خواجہ صاحب کے شاگرد رہ چکے ہیں، انہیں پہلی بار ہدایت کار کیدار شرما نے اپنی فلم ”باورے نین“ کی موسیقی بنانے کے لیے منتخب کیا تھا، کیدار شرما جیسے اعلیٰ پایہ ہدایت کار کے ساتھ پہلی بار کام کرتے ہوئے وہ کچھ نروس تھے۔
روشن اپنے استاد کے پاس پہنچے اور انہیں درخواست کی کہ اگر وہ چند دھنیں ان کے لیے بنادیں تو اس طرح ان کا مستقبل روشن ہو سکتا ہے۔ خواجہ نے اپنے شاگرد کی فرمائش پوری کرنے کا وعدہ لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ روشن کی فلم فلاپ نہ ہو۔ ایک روز جب روشن خواجہ صاحب سے دھنیں لینے کے لیے آئے تو خواجہ صاحب اپنا وعدہ بھول چکے تھے۔ روشن کی ہدایت کار کو سنانے کے لیے اسی روز دھنوں کی ضرورت تھی۔ خواجہ صاحب نے اپنے بھائی سلطان سے کہا کہ وہ روشن کے ساتھ بیٹھ کر انکو چائے پلائیں اور گپ شپ کریں۔ یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے اور قریباً نصف گھنٹے بعد جب وہ باہر آئے ان کے پاس تین طرزیں تیار تھیں۔ ان میں سے دو دھنیں روشن نے فلم ”باورے نین“ میں استعمال کیں۔ یہ دھنیں سپر ہٹ ثابت ہوئیں۔ یہ گانے حسب ذیل ہیں 1۔(سُن بلم سچ بولے رےُ اب کیا ہو گیا؟) 2۔ (گھر گھر کے آسمان تک چھانے لگی)۔ یہ دونوں گانے آج بھی روز اول کی طرح مقبول ہیں۔ روشن نے خواجہ خورشید انور کی بنائی ہوئی تیسری دھن ضیاء سرحدی کی فلم ”ہم لوگ“ میں استعمال کی تھی اور یہ بے حد مقبول ہوئی تھی۔ اس گانے کے بول یہ ہیں۔ چھن چھن باجے پائل موری، آجا چوری چوری

ان تینوں دھنوں کو آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں مگر کسی کو علم نہیں ہے کہ یہ دھنیں خواجہ خورشید نے بنا کر اپنے شاگرد کو تحفے میں دی تھیں۔

روشن بذات خود اچھے موسیقار تھے۔ان کا شمار بھارت کے ممتاز موسیقاروں میں ہوتا ہے۔اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خواجہ صاحب کے بارے میں یہ تاثر غلط ہے کہ وہ سست رفتاری سے کام کرتے تھے اور دھنیں بنانے میں بہت وقت لگاتے تھے۔

خواجہ سلطان نے ایک اور واقعہ سنایا۔انہوں نے بتایا کہ اے آر کاردار کی فلم ”کڑمائی“ خواجہ صاحب کے موسیقار کی حیثیت سے پہلی فلم تھی۔اس کی موسیقی ترتیب دینے کے دوران معروف سارنگی نواز حفیظ خاں نے خواجہ صاحب کے ساتھ زیادہ تعاون نہیں کیا بلکہ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ حالات سے بددل ہو کر خواجہ صاحب نے یکسر موسیقاری ترک کرنے کا ارادہ کر لیا۔بات یہ تھی کہ حفیظ خاں اس زمانے میں بہت نامور سارنگی نواز تھے۔انہوں نے خواجہ صاحب کی دھنوں کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی تھی کی وہ سُر اور تال میں نہیں ہیں۔اس قسم کی باتیں سن کر خواجہ صاحب ناراض ہو گئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ کام ہی چھوڑ دیں گے۔مگر موسیقار اور گلوکار رفیق غزنوی کے اصرار پر انہوں نے یہ فیصلہ تبدیل کر دیا۔رفیق غزنوی ان کے بہت اچھے دوست تھے اور ان کی صلاحیتوں کے مداح تھے۔

رفیق غزنوی نے نوجوان مینڈولین نواز سجاد حسین کو حفیظ خاں کے پاس بھیجا تاکہ وہ انہیں سمجھائیں اور آئندہ اس قسم کی باتیں کرنے سے باز رہیں۔سجاد حسین نے حفیظ خاں کے سامنے خواجہ صاحب کی طرزیں سنا کر انہیں قائل کر لیا اور وہ سُر اور تال کے عین مطابق ہیں۔سجاد حسین کچھ عرصے بعد خود بھی موسقار بن گئے تھے۔اور بطور موسیقار ان کا انداز بالکل منفرد اور بے حد خوبصورت تھا۔اس طرح خواجہ صاحب نے اپنا ارداہ تبدیل کر دیا ورنہ فلمی صنعت ایک بلند پایہ موسیقار سے محروم رہ جاتی۔

سجاد حسین خواجہ خورشید انور کی فلموں کے لیے سازندے کے طور پر کام کر رہے تھے اور معروف موسیقار ہونے کے

بعد بھی اس بات پر فخر کرتے تھے۔ایک اور نامور موسیقار غلام محمد نے ''پاکیزہ'' کی موسیقی بنائی تھی۔وہ بھی خواجہ صاحب کے ساتھ آرکسٹرا میں کام کرتے رہے۔یہاں تک کہ معروف موسیقار بن جانے کے بعد بھی خواجہ صاحب کے لیے ڈھولک بجاتے رہے اور اس پر فخر بھی کرتے تھے۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بمبئی کی فلمی صنعت میں موسیقار کی حیثیت سے خواجہ خورشید کی کتنی وقعت اور اہمیت تھی۔

خواجہ سلطان نے ایک انکشاف یہ بھی کیا کہ گلوکار مکیش کی خواہش تھی کہ وہ خواجہ صاحب کے لیے گائیں۔انہوں نے بذات خود بھی خواجہ صاحب سے درخواست کی، روشن کے ذریعے بھی خواجہ صاحب تک یہ پیغام پہنچایا۔

روشن نے کئی بار گانوں کے لیے مکیش کا نام تجویز کیا لیکن خواجہ خورشید انور کا کہنا تھا کہ وہ سہگل کے انداز میں ناک سے گاتے ہیں جو کہ صرف سہگل ہی پر جچتا ہے۔ان کا مشورہ تھا کہ مکیش اپنے گانے کا انداز بدلیں اور اپنا ذاتی انداز اختیار کریں۔یہ بھی حقیقت ہے کہ مکیش نے جب پھر اپنا ذاتی انداز اپنایا تو وہ بہت مقبول گلوکار بن گئے۔

خواجہ صاحب کا مشورہ تھا کہ انہیں کسی اور کی آواز کی نقل نہیں کرنی چاہیے اس طرح وہ ایک نمایاں گلوکار نہیں بن سکیں گے۔

سب جانتے ہیں کہ خواجہ خورشید انور نے ''تان سین'' کے نام سے ایک فلم بنانے کا اعلان کیا تھا۔اور مہدی حسن اور نور جہاں کی آوازوں میں چند گانے بھی ریکارڈ کر لیے تھے۔بعد میں نور جہاں کے اختلاف کی بناء پر انہوں نے ان سے مزید گانے لینے سے انکار کر دیا۔نور جہاں کے سوا کوئی دوسری گلوکارہ ان گانوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی تھی ۔اس لیے انہوں نے بالآخر یہ فلم بنانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا تھا۔خواجہ سلطان احمد نے ٹیپ پر ریکارڈ کیے ہوئے یہ دو گانے سعید ملک صاحب کو سنوائے جو کہ اپنی مثال آپ تھے۔

خواجہ سلطان احمد نے یہ بھی بتایا کہ آصف نے اپنی فلم ''مغل اعظم'' کی موسیقی کے لیے خواجہ خورشید انور سے معاہدہ کیا تھا مگر یہ فلم سات سال میں بھی مکمل نہ ہو سکی۔یہاں تک کے برصغیر تقسیم ہو گیا اور خواجہ صاحب پاکستان چلے آئے۔

خواجہ خورشید انور کے بارے میں اس بات پر سب متفق ہیں کہ وہ موسیقار کے طور پر خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات کو سالہاسال گزر جانے کے باوجود ان کی موسیقی آج بھی دلوں کو متاثر کرتی ہے۔

خواجہ خورشید انور کا تذکرہ چھڑ گیا ہے۔ تو کچھ اور دلچسپ باتیں بھی ہو جائیں۔ یہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ خواجہ صاحب اور فیض احمد فیض طالب علمی کے زمانے سے گہرے دوست تھے اور یہ دوستی آخر دم تک قائم رہی۔ فیض احمد فیض تو انکے ایک طرح سے دیوانے تھے کیونکہ انکی شاعری ان کے دل میں اتر جاتی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں فیض صاحب کو موسیقی سے لگاؤ تھا اور خواجہ صاحب شاعری کرتے تھے۔ اس سلسلے میں فیض صاحب کی صاحب زادی سلیمہ ہاشمی کے مضمون کا ایک اقتباس سنئے۔ وہ لکھتی ہیں۔

''خواجہ خورشید انور سے ابا کی دوستی گورنمنٹ کالج کے زمانے سے تھی۔ ابا (فیض احمد فیض) کہا کرتے تھے کہ خواجہ صاحب اس زمانے میں ان سے بہتر شاعر تھے، جب ابا بیروت میں تھے تو خواجہ صاحب دنیا سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ مجھے کہیں ملے اور کہا۔۔۔ ''فیض کو خط لکھو تو کہہ دینا کہ بیمار ضرور ہوں لیکن اسے ملے بغیر دنیا سے نہیں جاؤں گا۔ اسے معلوم ہے کہ میں کتنا ڈھیٹ ہوں۔''

اباجی جب بالآخر گھر لوٹے تو خواجہ صاحب اسپتال میں داخل تھے۔ ابا کے آتے ہی میں نے ذکر کیا تو بولے کل چلیں گے ۔

دوسرے روز ہم اسپتال پہنچے تو دونوں ملے۔ خواجہ صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے اور کوئی خاص کمزور بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ ابا کی صحت پہلے سے بہتر تھی۔ دونوں گلے ملے اور ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

میں نے دیکھا کہ معاملہ کچھ جذباتی ہو رہا ہے تو ڈانٹ کر کہا ''خواجہ صاحب سردیاں آ رہی ہیں۔ اب آپ دونوں باغ میں بیٹھ کر اپنی آٹو بائیو گرافی شروع کر لیں''

خواجہ صاحب مسکرا دیے اور کہنے لگے ''فیض تُوں آ گیا ایں ہن بس میں ٹُر چلاں۔'' (فیض تُو آ گیا ہے بس اب میں چلا)

ابا کی آنکھوں میں مجھے کچھ نظر آیا۔ جلدی سے بولے ”ہاں۔نال چلاں گے۔“

لیکن خواجہ صاحب اپنی بات کے پکے تھے۔ ہفتے بھر بعد دنیا چھوڑ گئے۔ فیض جو دوستی نبھانے کے قائل تھے بیس دن بعد وفات پا گئے۔

”تان سین“ کے گانوں کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں نور جہاں اور خواجہ صاحب کے مابین کیا اختلاف پیدا ہو گئے تھے؟ یہ بھی خواجہ سلطان احمد کی زبانی سنئے۔

خواجہ صاحب نے جب میڈم نور جہاں کا گایا ہوا نغمہ سنا تو انہیں محسوس ہوا اس میں ترانے کی ادائیگی حسب توقع نہیں ہے۔انہوں نے نور جہاں سے کہا کہ یہ گانا دوبارہ ریکارڈ کرنا پڑے گا۔

نور جہاں نے اس بات کو اپنی توہین سمجھا اور دوبارہ گانا گانے سے معذرت کر لی۔خواجہ صاحب بھی اپنی ضد کے پکے تھے اور نور جہاں بھی۔خواجہ صاحب گانے سے مطمئن نہ تھے اور نور جہاں غلطی کی اصلاح کے لیے تیار نہیں تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خواجہ صاحب نے یہ فلم بنانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ان کے خیال میں ان گانوں کے ساتھ کوئی انصاف نہیں کر سکتا تھا۔خواجہ صاحب کو اس کا دکھ ہوا لیکن نور جہاں بھی کہا کرتی تھیں کہ خواجہ صاحب نے تو ان کا دل ہی توڑ دیا تھا اس لئے وہ ضد پر مجبور ہو گئیں۔

خواجہ خورشید انور نے ایک خوش حال، تعلیم یافتہ اور معزز گھرانے میں جنم لیا تھا۔اعلی تعلیم انتہائی اعزاز کے ساتھ حاصل کی تھی۔وہ چاہتے تو آئی سی ایس بن کر انگریزی سرکار میں اعلیٰ عہدے حاصل کر سکتے تھے لیکن ان کا رجحان موسیقی میں تھا۔انہوں نے دوسرے سارے پیشے چھوڑ کر موسیقی کو اپنانے کا فیصلہ کیا اور آخر وم تک اس فیصلے پر قائم رہے۔

فلمی دنیا سے خواجہ صاحب کی وابستگی بھی ایک حادثہ ہی تھا۔سنہ 1939 سے 1940 میں خواجہ صاحب آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ یہاں انہوں نے بہت سے گانوں کی طرزیں بنائیں جو بہت مقبول تھیں۔ کئی فلم

سازوں اور ہدایت کاروں نے ان کی موسیقی سے متاثر ہو کر فلموں میں موسیقی بنانے کی دعوت دی۔ وہ اپنی پنجابی فلم ''کڑمائی'' کے لیے ان سے موسیقی بنوانا چاہتے تھے۔

اس طرح خواجہ خورشید انور سنہ 1941 میں موسیقار کی حیثیت سے فلمی دنیا سے متعارف ہوئے۔ اس فلم کے گانے اتنے مقبول ہوئے کہ ہر طرف خواجہ صاحب کی مانگ ہو گئی اور اگلے چند سالوں میں وہ ایک نامور اور قابل ذکر حیثیت سے پہچانے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد خواجہ صاحب فلم سازوں کے روکنے کے باوجود پاکستان آ گئے اور اپنے اس فیصلے پر وہ کبھی پریشان نہیں ہوئے۔

مظہر شاہ کو پاکستان کی پنجابی فلموں میں ایک زمانے میں وہ ممتاز حیثیت حاصل تھی جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ مظہر شاہ کے بارے میں ہم ان کی فلموں کے حوالے سے بتا چکے ہیں۔ مگر ان کے پرستاروں کو شکایت ہے کہ ہم نے مظہر شاہ جیسے اعلیٰ پایہ فنکار کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ پچھلے دنوں ان کے ایک مداح نے یہ شکایت کرتے ہوئے فرمائش کی ہے کہ مظہر شاہ کے بارے میں کچھ تفصیل سے بتایا جائے۔ مظہر شاہ ان فنکاروں میں شامل ہیں۔ جو اپنے فن کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کے بارے میں عام طور پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ اپنی وفات سے چند سال قبل وہ اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ فلمی دنیا میں ان کی جگہ ایک نئے ولن آ گئے تھے اور وہ بددل ہو کر گھر بیٹھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص نے اس قدر عروج دیکھا ہو وہ بھلا کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اسے نظر انداز کیا جائے اور اس پر دوسروں کو ترجیح دی جائے۔ ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ ہے۔ جب تک کسی کو عروج حاصل ہے اسے سر آنکھوں پہ بٹھایا جاتا ہے۔ جہاں وہ مائل بہ زوال ہوا لوگوں نے اس کو نگاہوں سے گرا دیا اور بھول ہی گئے۔ مظہر شاہ بھی اسی سلوک کا نشانہ بنے حالانکہ وہ اس کے مستحق نہیں تھے۔ ان کی خدمات کے پیش نظر نہ انہیں نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی فراموش کیا جا سکتا ہے۔

مظہر شاہ وہ فنکار ہیں جنہوں نے فلموں میں ''بڑھک'' کو ایک آرٹ بنا دیا۔ وہ بڑھک مارنے میں یکتا تھے۔ بعد میں دوسرے اداکاروں نے بھی ''بڑکیں'' لگانے کی روایت کو اپنایا مگر۔

وہ بات کہاں مولوی مدن سی۔

مظہر شاہ جیسا انداز کسی اور کو نصیب نہ ہوا۔اس لیے کہ مظہر شاہ کی شخصیت اور آواز میں جو رعب ودبدبہ اور وقار تھا اور وہ بہت کم دیکھنے اور سننے میں آتا ہے۔ وہ بہت بلند قامت نہ تھے مگر ڈیل ڈول اور چہرے مہرے کی وجہ سے مختلف اور نمایاں نظر آتے تھے۔ گندمی رنگت، ستواں ناک، بڑی بڑی چمک دار آنکھیں جن سے وہ مختلف سچویشن کے مطابق کام لیتے ہیں۔ مگر مظہر شاہ کی آواز میں قدرتی گھن، گرج اور گہرائی تھی۔اس پر انکا مکالمہ ادا کرنے کا انداز۔یہی وجہ ہے کہ ان کے مکالمے آج بھی فلم سازوں کو یاد ہیں۔انہوں نے مکالمے ادائیگی کا منفرد انداز اپنایا تھا۔جو ان کی شخصیت کے عین مطابق تھا۔جب وہ پنجابی گبرو کے انداز میں کرتا لاچا پہن کر اور سر پر پگڑی باندھ کر سینہ تان کر کھڑے ہوتے تو کسی تصویر کی مانند نظر آتے تھے۔

وجیہہ، باوقار، پر شکوہ اور دوسروں سے ممتاز۔ان کے بال گھنے سیاہ اور گھونگریالے تھے جن میں کرداروں کی مناسبت سے وہ چمک ان کے چہرے کی آب وتاب اور رعب وداب میں مزید اضافہ کر دیتی تھی۔

مظہر شاہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مظہر شاہ ان کا فلمی نام تھا۔ان کا اصلی نام منور شاہ تھا۔انہوں نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔اس کے بعد پولیس میں سپاہی بھرتی ہو گئے اور اس کے بعد جلد ہی ترقی کر کے سب انسپکٹر بن گئے۔ وہ اس محکمے میں اپنی دیانت داری، اصول پرستی اور فرض شناسی کی وجہ سے بہت ترقی کر سکتے تھے مگر افتاد طبع کے ہاتھوں مجبور تھے۔ پولیس کے ڈی آئی جی سے اختلاف ہو گیا اور نوبت تلخ کلامی تک پہنچ گئی۔اس سے پہلے کہ کوئی جواب طلبی ہوتی انہوں نے نوکری سے استعفی دے دیا۔

سید عاشور کاظمی فلم ’’بے گناہ‘‘ بنا رہے تھے۔ منور شاہ پروڈکشن کنٹرولر کی حیثیت سے اس ادارے سے وابستہ ہو گئے ۔ایک چھوٹے کردار میں انہیں مظہر شاہ کے نام سے پیش کیا گیا۔یہ نام عاشور کاظمی نے رکھا تھا جو انہیں بہت راس

آیا۔ کردار تو بہت چھوٹا تھا مگر ان کی اداکاری سے متاثر ہو کر اس میں اضافہ کر دیا گیا۔ فلم ''بے گناہ'' ریلیز ہوئی تو مظہر شاہ کا نام ہر ایک کی زبان پر تھا۔

اس طرح انہوں نے پہلی فلم ہی سے مقبولیت اور کامیابی حاصل کر لی تھی۔

''بے گناہ'' اردو فلم تھی۔ اس زمانے میں اردو فلمیں بہت زیادہ تعداد میں بن رہی تھیں۔ مظہر شاہ نے بھی چند فلموں میں کام کیا جن میں ممتاز، مظلوم اور نائٹ کلب قابل ذکر ہیں مگر اردو فلموں میں وہ اپنی صلاحیتوں کے جوہر نہ دکھا سکے پنجابی فلموں کا دور شروع ہوا تو ہر ایک کی توجہ اس طرف ہو گئی۔ فلم ساز اور ہدایت کار اسلم ایرانی نے پنجابی فلم ''بہروپیا'' شروع کی تو مظہر شاہ کو ولن کے کردار میں پیش کیا۔ اکمل اس فلم کے ہیرو تھے۔ عام طور پر فلموں میں ہیرو اور ہیروئن کی جوڑی ہوتی ہے مگر اس فلم میں اکمل اور مظہر شاہ کی جوڑی کو لوگوں نے بے انتہا مقبول کر دیا۔ اس کے بعد تو یہ عالم تھا کہ ہر فلم میں یہ دونوں ایک ہی ساتھ کاسٹ کیے جاتے تھے۔ اس جوڑی نے فلم کی صنعت میں بے پناہ شہرت اور کامیابیاں حاصل کیں اور انہیں پنجابی فلموں میں لازم و ملزوم سمجھا جانے لگا۔

''چاچا جی'' ''ملنگی'' ''جگری یار'' ان کی اس دور کی کامیاب فلمیں تھیں۔

اکمل اور مظہر شاہ اصلی زندگی میں گہرے دوست تھے۔ ایک دوسرے کے بغیر انہیں چین نہیں آتا تھا۔ ان دونوں نے 25 سے 34 فلموں میں ایک ساتھ کام کیا اور بے انتہا مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اس زمانے میں ان کی فلمیں کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھیں اور یہ دونوں ہیرو اور ولن کے لیے لازم اور ملزوم بن گئے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح بعد کے دور میں سلطان راہی اور مصطفیٰ قریشی پنجابی فلموں میں لازم ملزوم بن گئے تھے۔

مظہر شاہ نے اردو فلموں میں کام کیا مگر وہ بلند مرتبہ نہ حاصل کر سکے جو انہیں پنجابی فلموں میں ملا تھا۔ ان کی فلموں میں ممتاز، نائٹ کلب، مظلوم، بے خبر اور زمین کا چاند شامل ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ اس لیے انہیں اردو فلموں میں پذیرائی نہیں مل سکی۔

ایک زمانے میں قومی زبان اردو میں بہت ساری فلمیں بنائی جاتی تھیں اور ملک کے طول و عرض میں ان کو بہت مقبولیت اور کامیابی حاصل کرتی تھیں۔ مگر پھر پنجابی فلموں کو جب پذیرائی ملی تو وہ بھی کافی تعداد میں بننے لگیں۔

ان کی پہلی بے حد کامیاب فلم ''بہروپیا'' تھی جس کے ہدایت کار اسلم ایرانی تھے۔اس فلم میں انہوں نے اکمل کو ہیرو اور مظہر شاہ کو ولن کے طور پہ کاسٹ کیا تھا۔''بہروپیا'' کی نمایاں کامیابی نہ صرف ان اداکاروں کو استاد بنا دیا بلکہ ان کی جوڑی بھی مقبول ہوگئی۔اس سے پہلے وہ دونوں فلم ''بچہ جمہورا'' میں بھی یکجا ہوئے تھے۔ مگر یہ فلم سپر ہٹ نہ ہوئی تھی۔ فلم ''مظلوم'' میں بھی انہوں نے ایک ساتھ کام کیا تھا مگر وہ کہتے ہیں نہ کامیابی سے بڑھ کر کوئی چیز کامیابی نہیں ہوتی۔ تو یہی معاملہ ان دونوں کے ساتھ پیش آیا۔''بہروپیا'' ایک سپر ہٹ فلم تھی جس نے ان دونوں کو بھی اسٹار بنا دیا تھا۔ اس کے بعد تو اس جوڑی کی کامیاب فلموں کی قطار ہی لگ گئی۔ جگری یار، ملنگی، چاچا جی ان دونوں کی سپر ہٹ اور یادگار فلمیں ہیں۔ فلم 'ہتھ جوڑی' نے بھی کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے اور بعض چھوٹے شہروں میں بھی کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے اور بعض چھوٹے شہروں میں بھی سلور جوبلی منائی۔

''رن مرید'' ان دونوں کی آخری فلم تھی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس فلم کی نمائش سے پہلے ہی اکمل وفات پا گئے تھے۔ یہ فلم اکمل کی وفات کے بعد ریلیز ہوئی تھی۔ اکمل کا ساتھ کیا چھوٹا قسمت نے بھی مظہر شاہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ذاتی طور پر بھی مظہر شاہ کو انکی جوانی کی موت کا صدمہ پہنچا۔اور ان کی یاد میں وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے اور یہ زخم زندگی بھر رستا رہا۔

اور جب تک زندہ رہے تب تک ان کا ذکر کر کے روتے رہے۔ یہ سچ ہے کہ اسکرین پہ یہ دونوں جانی دشمن حقیقت میں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی اور گہرے دوست تھے۔ فلموں کی شوٹنگ کے علاوہ فارغ اوقات یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے تھے۔

فلموں میں مظہر شاہ کی دو خصوصیات فلم بینوں کے لیے پر کشش تھیں۔ایک تو ان کی زوردار بھڑک اور دوسرا ان کا تکیہ کلام۔ہر فلم میں ان کا ایک تکیہ کلام ضرور ہوتا تھا جو فلم دیکھنے والوں کی زبانوں پر چڑھ جاتا تھا۔جنے ڈاڈے نال ویر پایا۔ اودھی ماں نے وین پایا۔۔۔۔ یا پھر، ٹبّر کھا جاواں تے ڈکار تک نہ لاں،یعنی پورا خاندان کھا جاؤں پر ڈکار نہ لوں ۔حزیں قادری اس زمانے میں پنجابی فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھتے تھے اور کیا خوب لکھتے تھے ۔وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس طرح کے کردار تلاش کرتے تھے اور بہت خوبصورت مکالمے لکھتے تھے۔ان کے لکھے ہوئے کردار اور مظہر شاہ کی زبان سے ادا کیے گئے تکیہ کلام بے حد مقبول ہوتے تھے اور آج تک دیکھنے والوں کو یاد ہیں۔

مظہر شاہ نے زیادہ تر فلمیں اسلم ایرانی،ایم جے رانا اور وحید ڈار کے ساتھ کی تھیں۔یہ تینوں پنجابی فلموں کے اچھے ہدایت کار اور فلم ساز تھے ان کی ساری فلمیں ہی زیادہ تر ہٹ ہوتی تھیں۔

مظہر شاہ نے تیس سال فلموں میں کام کیا ہے اور اس دورانیے میں ڈھائی سو سے زائد فلموں میں کام کیا۔وہ ان اداکاروں میں تھے جن کا نام سن کر ہی انکے پرستار فلم دیکھنے آجاتے تھے۔فلم اچھی ہو یا بری لیکن مظہر شاہ کی اداکاری ان کو ہمیشہ پسند آتی تھی ۔مظہر شاہ کی اداکاری کا ایک مخصوص انداز تھا۔اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔اگر فلمیں ایک سی کہانیوں پر بنائی جائیں اور ایک ہی جیسے کردار ادا کرنے کو ملیں تو اداکار ایک ہی حد تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے لیکن مظہر شاہ کی بارعب جوشیلی آواز،ادائیگی کا والہانہ انداز ہر فلم میں بھلا لگتا تھا۔انہوں نے فلم ساز کی اہمیت سے چار یا پانچ فلمیں بنائیں تھیں۔ان میں بعض فلموں میں انہوں نے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔''سردار سائیں''میں وہ ہیرو تھے اور سلطان راہی ولن کے کردار میں تھے۔فلم ''محرم دل دا''میں انکی ہیروئن رانی تھیں۔فلم ضدی میں بھی وہ ہیرو تھے اور ان کی ہیروئن عالیہ تھیں۔کجلا اور بابل دیاں گلیاں بھی انکی ذاتی فلمیں تھیں۔ان کی بطور فلم ساز آخری فلم ''گنگا سنگھ''تھی جو آج تک ریلیز نہ ہو سکی۔وجہ یہ ہے کہ اس وقت رنگین فلموں کا وقت شروع ہو چکا تھا اور ان کی فلم بلیک اینڈ وائٹ تھی۔اس میں کچھ حصہ خوبی تقدیر کا بھی تھا۔دراصل انکا دور زوال شروع ہو چکا تھا۔ایک طویل عرصے

تک پنجابی فلموں میں حکمرانی کرنے کے بعد انکے دوسرے حریف میدان میں آ گئے تھے اور وہ پس منظر میں چلے گئے تھے۔ کچھ فلم سازوں کی بھیڑ چال نے بھی انہیں نقصان دیا۔

دراصل ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ رواج ہے کہ جو عروج پہ ہوتا ہے سب اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور جب اس کی چند فلمیں ناکام ہو جائیں تو سب اسے نظر انداز کرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ حلانکہ وہ صلاحیتوں اور توانائیوں سے محروم نہیں ہوتا۔ مظہر شاہ کے ساتھ بھی یہی المیہ ہوا۔ رفتہ رفتہ فلم سازوں نے انہیں فراموش کر دیا۔ انہیں اس بات کا بہت قلق اور شکوہ تھا۔ ایک تو فلم سازوں کی بے اعتنائی دوسرے مالی نقصانات نے انہیں شکستہ دل کر دیا تھا۔ انکی ذاتی فلم بابل دیاں گلیاں نے انہیں مالی نقصان پہنچایا تھا۔ رہی سہی کسر تھی وہ سیڑھیوں سے گر کر ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنے کی وجہ سے پوری ہو گئی۔ وہ بقیہ زندگی بیساکھیوں کے محتاج بن کر رہ گئے۔ دل ٹوٹ چکا تھا مالی حالات بہت خراب تھے اور فلمسازوں نے انہیں فراموش کر دیا تھا۔ چلنے پھرنے کی محتاجی نے انکو بستر کی حد تک محدود کر دیا۔ طویل عرصے تک بیمار رہے پر فلم سازوں کی طوطا چشمی دیکھیے کہ ہیروئن رانی کے علاوہ کوئی بھی ان کی بیمار پرسی کے لیے نہیں گیا۔ نہ انکے ساتھیوں اور جونیئر نے انکی خبر لی۔ اس طرح کس مپرسی اور گمنامی کے عالم میں طویل علالت کے بعد وہ وفات پا گئے۔ جنازے میں بھی بہت کم فنکاروں اور فلم سازوں نے شریک ہونے کی زحمت گوارا کی۔ اس طرح ایک نامور اور منفرد فنکار اور بہت اچھا انسان دنیا سے رخصت ہو گیا۔

جہاں تک انکی اداکاری کا تعلق ہے، ایسے والہانہ اور بے ساختہ انداز والا ولن پنجابی فلموں میں بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ وہ عجب و ارفتگی کے عالم میں مکالمے ادا کرتے تھے۔ باوقار شخصیت اور بھرپور آواز کی وجہ سے اس میں مزید دبدبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ فائٹ کرنے میں بھی بہت پھرتیلے تھے مگر ولن تھے اس لیے ہمیشہ ہیرو سے مار کھاتے رہے۔ ورنہ وہ ان پر اکثر بھاری رہتے تھے۔ ان کے مکالمے دیکھنے والوں کے ذہنوں میں نقش ہو جاتے تھے۔ آج بھی بہت سے لوگوں کو ان کے مکالمے لفظ بہ لفظ یاد ہیں۔ اور وہ مظہر شاہ کو یاد کرتے ہیں۔ خصوصاً ان کے مکالموں میں مخصوص تکیہ کلام سب کو یاد ہو جاتے تھے۔ کچھ مشہور فقرے ہیں۔

میں وخت پادیاں گا(قیامت ڈھا دوں گا) جنے ساڈے نال متھالا یا او دھی ماں نے وین ای پائے (جس نے ہمارے ساتھ ٹکرلی اس کی ماں نے نے بین ہی کیے)

بھن دیاں گا

تری لاش نوں وی مچھلیاں کھان گئیاں۔

ایسے بے شمار فقرے ان کی یادوں کو تازہ کر دیتی ہیں۔

ان کی بھڑک توان کی زندگی میں مشہور ہو گئی تھی۔ یہ واقعہ ہم پہلے بھی دہرا چکے ہیں کہ ایک دفعہ صدر اور وزیر اعظم بننے سے پہلے ایک دفعہ ذوالفقار علی بھٹو جلوس کے ساتھ لکشمی چوک سے گزر رہے تھے۔ ہزاروں کا ہجوم تھا۔ مظہر شاہ سامنے ہوٹل کے بر آمدے میں کھڑے جلوس دیکھ رہے تھے۔ جلوس لکشمی چوک میں پہنچا تو مظہر شاہ نے ایسی زوردار بھڑک لگائی کہ بھٹو صاحب بھی متوجہ ہو گئے۔ جلوس میں شامل لوگوں نے مظہر شاہ کو دیکھ کر خوشی کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ انہوں نے بھی جوش میں آکر خوب بھڑکیں لگائیں۔ اس موقع پر ایسا لمحہ بھی آگیا کہ لوگ بھٹو کو چھوڑ کر مظہر شاہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور جلوس درہم برہم ہونے لگا۔ بھٹو صاحب حیران ہو کر یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ ایک شخص ان کے ہوتے ہوئے مجمع کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

پوچھا ”یہ کون ہے؟“

لوگوں نے بتایا کہ یہ پنجابی فلموں کا مشہور ترین ولن ہے۔ بھٹو صاحب کا جلوس گزر گیا پر وہ اس بات کو نہ بھول پائے۔ ایک اسمبلی میں ولی خاں کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

”ولی خاں سے کہہ دو کہ مظہر شاہ کی طرح بھڑکیں نہ مارے۔“

ذاتی زندگی میں بھی مظہر شاہ سادہ دل انسان تھے۔انہوں نے دو شادیاں کی تھیں ۔دونوں سے ان کی اولاد ہے۔وہ اپنی والدہ سے بہت پیار کرتے تھے اور ان سے ڈرتے بھی تھے۔ان کا حکم انہوں نے کبھی نہیں ٹالا۔ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ والدہ کے انتقال پر مظہر شاہ غم سے نڈھال تھے۔جب ان کی والدہ کی ذاتی دولت تقسیم ہونے کا وقت آیا تو انہوں نے لاکھوں روپیہ اور زیورات چھوڑ کر ان کی جوتیاں اٹھالیں اور ساری زندگی ان کو سنبھال کر رکھا۔وہ ہر روز انہیں پالش کرتے تھے اور انہیں اپنے سرہانے رکھ کر سوتے تھے۔مرتے وقت نصیحت کی تھے کہ ان کی ماں کی جوتیاں ان کے ساتھ دفن کردی جائیں۔یہ وہ واحد اثاثہ تھا جو وہ اپنے ساتھ لے کر گئے تھے۔

ہمیں ان کے ساتھ کام کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔دراصل وہ پنجابی فلموں کے اداکار تھے اور ہم اردو فلموں کے مصنف اور فلمساز لیکن اسٹوڈیو میں جب بھی ملاقات ہوتی بہت عزت واحترام سے ملتے تھے۔یہ جذبہ دو طرفہ تھا۔

غالباً مظہر شاہ کی واحد خرابی ان کی مہ نوشی تھی۔اس عالم میں وہ کبھی کبھی جھگڑے بھی کرلیا کرتے تھے مگر دوسرے دن متعلقہ شخص سے معافی مانگ کر حساب صاف کردیتے تھے۔وہ فلم سازوں کی بے وفائی اور بے اعتنائی کا داغ لے کر دنیا سے گئے۔کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ چڑھتے سورج کے پجاری ہیں۔یہ غلط بھی نہیں ہے مگر یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔

اب کچھ اشوک کمار کے بارے ہو جائے۔

برصغیر کے ایک عظیم اور ہندوستانی فلمی صنعت کے پہلے سپر سٹار اشوک کمار اپنی زندگی کے آغاز ہی میں ایک لیجنڈ بن گئے تھے۔چند سال سے بیمار تھے مگر ان کی وفات ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے ہوئی۔انہوں نے 90 سال کی طویل عمر پائی۔صحت بھی اچھی تھی۔جس کا راز غالباً ان کا سادہ انداز زندگی اور بے عیب اطوار تھے۔

اشوک کمار نے اس طویل زندگی میں 65 سال سے زیادہ عرصہ فلموں سے وابستہ ہو کے گزارا تھا۔وہ ان خوش نصیب فنکاروں میں سے تھے۔جن کی پہلی ہی فلم ہٹ ہوگئی تھی اور پھر ایک کے بعد ایک ہٹ ہوتی گئی۔اپنی وجاہت،

خوبصورتی اور بناوٹ سے پاک اداکاری کے باعث وہ ابتداء ہی سے فلم بینوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ سالہاسال ہیرو کے طور پر فلمی صنعت پہ راج کرتے رہے پھر کریکٹر ایکٹر کی حیثیت سے بھی بے شمار فلموں میں بھی اداکاری کی۔ وہ بہت اچھے اور قدرتی انداز میں اداکاری کرنے والے فنکار تھے۔ مزاحیہ کردار میں ویسے ہی کامیاب تھے جیسے ڈرامائی کرداروں میں کامیاب اور مقبول تھے۔ انہوں نے لگ بھگ سات دہائیوں تک اداکاری کے میدان میں جوہر دکھائے اور ہمیشہ مقبول و محترم رہے۔

ان کا اصلی نام کمد لعل کنجی لعل گنگولی تھا۔ 1911 میں پیدا ہوئے تھے۔ بی، ایس، سی کی ڈگری لینے کے بعد کلکتہ سے بمبئی چلے آئے۔ وہ بمبئی ٹاکیز کی لیبارٹری سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وجیہہ اور خوبصورت نوجوان تھے۔ بمبئی ٹاکیز کے مالک ہمنسو رائے تھے۔ جو بہت سمجھ دار اور تعلیم یافتہ انسان تھے۔ مشہور و معروف مثالی اداکارہ دیویکارانی کے شوہر تھے جو بذات خود اداکاروں کی پہچان کے لیے مشہور تھیں اور دل پھینک اور رنگین مزاج تھیں۔ نجم الحسن، مسعود پرویز اور اشوک کمار جیسے فنکار اور ہیرو ان کی دریافت تھے۔

لیبارٹری میں کام کرنیکے دوران ہی وہ دیویکارانی کی نظر میں آ گئے تھے۔ فلم ''اچھوت کنیا'' میں انہوں نے پہلی بار دیویکارانی کے ساتھ ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ پہلی ہی فلم سپر ہٹ ہو گئی تھی۔ انہوں نے 1930 میں اداکاری کا آغاز کیا تھا۔ یہ خاموش فلموں کا دور تھا۔ جب بولتی فلموں کا آغاز ہوا تو اس وقت بھی اشوک کمار مقبول ہیرو کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ''قسمت'' ان کی ایسی فلم تھی جو مسلسل تین سال تک ایک سینما گھر میں چلتی رہی تھی۔ ''قسمت'' میں ہیروئن ممتاز شانتی تھیں جو بعد میں نغمہ گار، مصنف، فلم ساز اور ہدایت کار ولی صاحب کی بیگم بن گئی تھیں۔ وہ پنجاب کے ایک مسلم خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ممتاز شانتی ان کا فلمی نام تھا۔ جس طرح اشوک کمار کا فلمی نام کمد لعل گنگولی تھا۔ دونوں ہی فنکاروں کو ان کے فلمی نام راس آئے۔ اور وہ سپر سٹار بن گئے۔ ''قسمت'' کی فقید المثال کامیابی نے انہیں عظیم ترین فنکار بنا دیا تھا۔ وہ ایسے اداکار تھے جو اپنی پہلی ہی فلم سے سپر ہٹ ہیرو بن گئے تھے۔ اور آخر دم تک مقبول اداکار کی حیثیت سے فلموں میں کام کرتے رہے۔

اشوک کمار نے لاتعداد فلموں میں ہیرو اور پھر کریکٹر ایکٹر کے طور پہ کام کیا اور ہمیشہ مقبول اور معروف رہے۔ فلمی دنیا میں انہیں ہمیشہ انتہائی عزت و احترام کا درجہ حاصل رہا۔ عام طور پہ انہیں دادا منی کے نام سے پہچانا جاتا تھا جو بنگال میں بڑے بھائی کو پکارا جاتا ہے۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اتنی طویل فلمی زندگی گزارنے کے باوجود ان کا ایک بھی اسکینڈل نہیں ہوا جو ایک انوکھی اور ناقابل یقین حقیقت ہے۔ انہوں نے مقبولیت کے زمانے کی ہی ایک گھریلو تعلیم یافتہ خاتون شوبھا سے شادی کرلی تھی اور مثالی شادی ثابت ہوئی تھی۔ ان کی صرف ایک بیٹی پریتی گنگولی ہے جس نے فلموں میں اداکاری بھی کی ہے۔

اشوک کمار کے گنگولی خاندان کو برصغیر کی فلمی صنعت میں ایک نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ جو کہ غالباً اشوک کمار کی وفات کے بعد اختتام کو پہنچ گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب مشہور گلوکار، اداکار اور فلم ساز وہدایت کار کشور کمار، اشوک کمار کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے درمیان بھائی انوپ کمار تھے۔ انہوں نے اشوک کمار اور کشور کمار کی طرح عروج اور شہرت تو حاصل نہیں کی۔ مگر بمبئی کی فلموں میں کام کرتے رہے ہیں۔

کشور کمار تو ایک زمانے میں گلوکار اداکار کی حیثیت سے بمبئی میں ایک نمایاں فلمی ہستی تھے۔ یہ وہی کشور کمار ہیں جن سے مدھو بالا نے شادی کی تھی۔ کشور کمار کی مقبولیت ایک جگہ پر لیکن مدھو بالا سے ان کی شادی پر سب نے اظہار ہمدردی ظاہر کی تھی۔ مدھو بالا جیسی حسین و جمیل ہیروئن برصغیر کی فلموں کو شاید ہی کبھی نصیب ہوئی ہو۔ وہ حسن وجمال اور رعنائی کا پیکر تھی۔ اس کی ہستی فلم بینوں کے لیے ایک سوغات سے کم نہ تھی۔ وہ بہت اچھی اداکارہ بھی تھی لیکن اس کی زندگی المیوں کا شکار ہی رہی جس کا سب سے بڑا سبب خود اس کے والد عطاءاللہ خاں تھے۔

مدھو بالا اور دلیپ کمار کا عشق ایک زمانے میں ہر شخص کی زبان پر تھا اور دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی والا معاملہ تھا لیکن مقدر نے ان دونوں کو ہمیشہ کے لیے جدا کردیا۔ مدھو بالا دل کے ایک مہلک عارضے میں مبتلا تھی۔ اس کے دل میں سوراخ تھا جس کا اس وقت کوئی علاج نہ تھا۔ اس پر مسلسل صدمے، مجبوریاں بے کسی اور سب سے آخر میں محبوب سے جدائی۔ اس نے والد سے بغاوت لیکن بہت دیر سے جب کچھ بھی نہ بچا تھا۔ کشور کمار کے ساتھ مدھو بالا

کی شادی کی خبر پر کسی کو یقین نہ آیا مگر یہ ایک حقیقت تھی۔ شادی کے بعد وہ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہی۔ کشور کمار نے ان کی دل جوئی، علاج اور خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر موت کا علاج نہیں ہے۔ بہر حال، یہ ایک علیٰحدہ اور انتہائی دل گداز داستان ہے جو پہلے بھی تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے۔

اشوک کمار کو ہمیشہ بھارتی فلم میں ایک بلند مقام اداکار کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ انہوں نے ہر قسم کی فلموں میں ہر طرح کے کردار ادا کیے اور شہرت پائی۔

وہ انتہائی خوب رو، مہذب، شریف النفس اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انتہائی شرمیلے انسان تھے۔ اس وقت کے جب لاکھوں حسین لڑکیاں ان کی ایک نگاہ کی منتظر رہا کرتی تھیں۔ اور ان سے بات کرنے کو زندگی معراج سمجھتی تھیں۔ اشوک کمار نے نیکی کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ وہ ہمیشہ صنف مخالف سے کتراتے تھے۔

سعادت حسین منٹو اشوک کمار کے بہت ہی قریبی اور گہرے دوست تھے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ اشوک کمار لڑکیوں کے معاملے میں بزدلی کی حد تک شرمیلے ہیں۔ ایک بار دوبئی میں اشوک کمار اور منٹو صاحب کسی دوکان سے شاپنگ کر رہے تھے کہ چند خوبصورت لڑکیاں بھی آ گئیں۔ وہ اشوک کمار سے باتیں کرنا چاہتی تھیں۔ ان سے آٹو گراف لینا چاہتی تھیں پر اشوک کمار اس زنانہ ہجوم سے ایسے گھبرائے کہ پسینے چھوٹ گئے۔ خریدا ہوا سامان ہاتھ سے گر گیا اور دکان کے عقبی دروازے سے بھاگ گئے۔ انہوں نے اپنے زمانے کی سبھی حسین اور مایہ ناز لڑکیوں کے ساتھ کام کیا مگر کبھی کوئی اسکینڈل نہ آیا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے اور کسی بھی حسین و جمیل لڑکی کو تہذیب کے دائرہ کار سے باہر نکلنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ آخر کار سبھی لڑکیوں نے ہار مان کر انہیں " دادا منی " کہنا شروع کر دیا تھا۔ سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ ان کے تلوں میں تیل نہیں ہے۔ انہوں نے ایک انتہائی شریفانہ اور بے داغ زندگی گزاری۔ یہی وجہ ہے کہ ان کیلیے عقیدت واحترام کے سوا کوئی اور جذبہ کسی کے پاس نہ تھا۔

اشوک کمار طویل عمر پانے کے باوجود بالعموم صحت منداور چاق وچوبند رہے۔ کسی قابل ذکر بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے ۔ اس کا ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ بہت اچھے ایک ہومیو پیتھک معالج بھی تھے۔اپنا اور جاننے والوں کا ہومیو پیتھی سے ہی علاج کرتے تھے۔یہ ان کا مشغلہ بھی تھا اور شوق بھی تھا۔فلمی صنعت کے بے شمار لوگ ان سے دوائیاں لیا کرتے تھے۔

ان کے خاندان کی شہرت اور اختیار ایک زمانے میں فلمی دنیا پر محیط تھا۔خود تو ایک مایہ ناز اداکار تھے ہی،ان کے دونوں بھائی بھی فلمی صنعت میں نمایاں کامیاب تھے۔ان تینوں نے کشور کمار کی ایک مزاحیہ فلم ''چلتی کا نام گاڑی''میں ایک ساتھ کام کیا تھا۔مدھوبالا اس میں ہیروئن تھیں۔یہ فلم بخاری صاحب نے لکھی تھی۔جو بعد میں پاکستان چلے آئے تھے ۔ بے حد خلیق، نفیس اور وضع دار آدمی تھے۔افسوس کے لاہور کی فلمی دنیا ان سے فائدہ نہ اٹھا سکی۔وہ ہپناٹزم اور یوگا سے بہت دلچسپی رکھتے تھے ۔ہم نے ان سے ہپناٹزم کے بارے میں ایک ضخیم کتاب بھی پڑھنے کو لی تھی مگر ابتدائی معلومات کے علاوہ اور کچھ نہ حاصل کر سکے تھے۔وہ کہا کرتے تھے کہ یوگا کی مشقوں اور طریقوں سے ہر بیماری کا علاج ہوسکتا ہے۔ اس کا زندہ ثبوت وہ خود تھے۔اوّل تو خاصی عمر کے باوجود وہ کبھی بیمار نہ ہوئے اور اگر کبھی بیمار ہوتے تو یوگا کے ذریعے اپنا خود ہی علاج کر لیا کرتے تھے۔بے کاری ، پریشانی اور لاہور فلموں کی بے رخی نے انہیں بالآخر وقت سے پہلے ہی مرحوم کر دیا۔موت ایک ایسا مرض جس کا علاج ہی نہیں ہے۔وہ یوگا کے ذریعے بھی اس کا علاج نہیں کر سکے۔ان کی ایک ہی بیٹی تھی جس سے انہیں بے انتہا محبت تھی ۔خدا جانے اب وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

اشوک کمار اور ان کے بھائی فلمی ستون تھے ہی ان کے بہنوئی ایس مکرجی بھی بمبئی کی فلمی دنیا میں بہت بڑی ہستی رہے ہیں۔ہمنسو رائے اور دیویکا رانی کے بعد وہ بھی بمبئی ٹاکیز جیسے ادارے کے ڈائریکٹروں میں شامل تھے۔بعد میں انہوں نے بمبئی ٹاکیز سے علیحدہ ہو کر ''فلمستان'' کے نام سے ذاتی فلم ساز ادارہ بنالیا تھا۔اور بہت سی کامیاب فلمیں بنائی تھیں۔ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ انہوں نے اسکرین پلے بنانے پر عبور حاصل کیا ہے۔انہیں موسیقی کا بھی شعور تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر فلم موسیقی کے اعتبار سے انتہائی مقبول اور کامیاب ہوتی تھیں۔انہوں نے ناگن

،جنگلی،پروفیسر اور بہت سی ہلکی پھلکی میوزیکل اور رومانی فلمیں بنائیں۔ان کا یہ اعزاز تھا کہ انکی کوئی فلم فلاپ نہیں ہوئی ۔اس طرح یہ خاندان کافی عرصے تک بمبئی کی فلمی صنعت پہ چھایا رہا۔اپنے بیٹے کو بھی انہوں نے ایک کامیاب ہیرو بنا دیا تھا مگر وہ کسی اور کی فلم میں کام نہ کر سکا اور فلمی صنعت میں کوئی مقام نہ حاصل نہ کر سکا۔

ایس مکرجی، کشور کمار اور انوپ کمار کی وفات کے بعد اشوک کمار ہی اس خاندان کی نمائندگی کرنے والے تنہا فرد رہ گئے تھے اور اب وہ بھی نہیں رہے۔اس طرح پر تھوی راج اور راج کپور کے خاندان کی طرح یہ خاندان بھی فلمی صنعت پر اپنی چھاپ لگا کر رخصت ہو گیا۔

دراصل اشوک کمار کی پہلی فلم ''جیون نیا'' تھی جو 1930 میں ریلیز ہوئی تھی۔اس کی ہیروئن دیویکا رانی تھی۔یہ ایک کامیاب فلم تھی مگر دوسری فلم ''اچھوت کنیا'' نے اشوک کمار کو ایک دم آسمان پر پہنچا دیا۔یہ ایک بہت اچھے موضوع اور بلند مقصد کے تحت بنائی گئی تھی۔اس کی بے شمار کامیابی نے اشوک کمار کو لیجنڈ بنا دیا تھا۔بعد میں ''قسمت '' نے انکی عظمت اور مقبولیت پر مہر ثبت لگا دی تھی۔اس کے بعد اشوک کمار نے لاتعداد فلموں میں کام کیا اور ایک بار جب بلند مقام حاصل کر لیا تھا اس پر آخر دم تک فائز رہے۔

جب بولتی فلموں کا زمانہ آیا تو فلموں میں گانے شوٹنگ کے ساتھ ہی ریکارڈ کیے جاتے تھے۔اور عموماًاداکار خود ہی گاتے تھے۔پلے بیک کا رواج نہ تھا ۔ جھاڑیوں اور دیواروں کے پیچھے سازندے بیٹھ جاتے تھے اور سیچویشن کے مطابق ہیرو اور ہیروئن نغمہ سرائی کرتے تھے۔اشوک کمار نے موسیقی کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انکو موسیقی کی الف بے کا بھی نہیں پتہ تھا۔ مگر اس زمانے میں گانوں کے بول سادہ اور طرزیں آسان ہوتی تھیں۔اس لیے ذرا سی مشق کے بعد اداکار اپنے گانے خود ہی گا لیا کرتے تھے۔

مثال کے طور پر غالباً''اچھوت کنیا'' میں اشوک کمار اور ہیروئن دیویکا رانی نے اپنے گانے خود ہی گائے تھے۔یہ فلم ہماری پیدائش کے آس پاس ریلیز ہوئی ہم نے کافی عرصہ کے بعد دیکھی۔اس کا ایک گانا اور رومانی منظر ہمیں یاد ہے ۔

کیمرا ایک جگہ نصب ہے۔ سامنے ایک بڑا سا درخت اور جنگل کا ایک چھوٹا سا حصہ نظر آرہا ہے۔ ہیرو اور ہیروئن ایک بڑے درخت کے تنوں کے پاس کھڑے ہیں ۔ ہیروئن گانا شروع کرتی ہے اور یہ دوگانا تھا۔

میں بن کے چڑیا بن کے بن میں گھوموں رے۔

ہیرو گاتا تھا،

میں بن کے پنچھی بن کے بن میں ڈولوں رے۔

سارے گانے کے دوران کیمرا ایک ہی جگہ نصب رہتا ہے۔ ایک بول کے بعد ہیروئن ایک درخت کے تنے پر چڑھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہیرو بھی اسی تنے پر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ دونوں باری باری بول ادا کرتے ہیں۔ بہت سادہ دھن اور اس سے بھی زیادہ سادہ بول تھے جو آج بھی ہمیں یاد ہیں۔ اشوک کمار اور دیویکا رانی کی آوازیں بھی ناپختہ اور لرزاں تھیں لیکن گانا بہت اچھا لگا اور بے پناہ مقبول ہوا۔

اشوک کمار نے فلم ''قسمت'' کے گانے بھی خود ہی گائے تھے۔ ان کا گایا ہوا ایک گانا اس وقت بھی سپر ہٹ تھا اور آج بھی سب کو یاد ہے۔ منظر یہ ہے کہ ایک کمرے میں ہیروئن سو رہی ہے یا بظاہر سو رہی ہے۔ ہیرو کھڑکی میں سے جھانکتا ہے اور گاتا ہے۔

دھیرے دھیرے آ رے بادل

دھیرے دھیرے آ

میرا بلبل سو رہا ہے

شور و غل نہ مچا

آج یہ بول، طرز اور موسیقی عجب سی لگتی ہے مگر یہ گانا اس وقت بھی ہٹ تھا اور آج بھی سپر ہٹ ہے۔ گانے کے دوران کیا مجال جو ہیروئن اٹھ کے کھڑی ہو جائے یا پھر کروٹ ہی بدل جائے۔ صرف ہیرو صاحب ہی کبھی ایک کھڑکی سے اور کبھی دوسری کھڑکی سے جھانک کر گاتے ہیں۔

یہ فلمیں ہم نے کافی عرصہ بعد بلکہ پاکستان بننے کے بعد دیکھی ہیں لیکن ہمارا مشورہ ہر شوقین کے لیے ہے کہ اسے یہ فلمیں دیکھنی چاہیں۔ ایک وقت میں یہ گورنمنٹ کالج لاہور کے توسط سے دیکھنے کو مل جاتی تھیں۔ مگر بھارتی فلم انڈسٹری نے ان سب فلموں کو ویڈیو میں تبدیل کر دیا ہے اور سیٹلائیٹ پر مختلف چینلز سے بھی یہ فلمیں دکھائی جا رہی ہیں۔

اشوک کمار کی یادگار فلمیں لاتعداد ہیں۔ چند نام ہمیں یاد رہ گئے ہیں۔

اچھوت کنیا، قسمت، محل، جیول تھیف، افسانہ، نجمہ، تیری صورت، کنگن، بندھن، میری آنکھیں، چلتی کا نام گاڑی، دیدار اور بے شمار ایسی فلمیں جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس طرح اداکاری کرتے تھے جیسے سچ مچ باتیں کر رہے ہیں۔ نہ کوئی بناوٹ نہ اداکاری۔ روزمرہ کی بول چال اور نقل و حرکت۔ وہ تھیٹر کے عروج کا دور تھا۔ فلموں میں اداکاروں پر بھی تھیٹر کا انداز چھایا ہوا تھا مگر اشوک کمار، موتی لعل اور بعد میں دلیپ کمار جیسے اداکاروں نے حقیقی اداکاری اور بول چال کے ذریعے انقلاب برپا کر دیا۔

فلم ''دیدار'' میں اشوک کمار اور دلیپ کمار پہلی بار یک جا ہوئے تھے بلکہ انڈین فلموں کے سب سے بڑے اور مقبول ہیرو سمجھے جاتے تھے۔ نرگس اس فلم کی ہیروئن تھیں اور نوشاد موسیقار، اس فلم کے تمام گانے ہٹ تھے۔ جب اشوک کمار، دلیپ کمار اور نرگس جیسے فن کار اکٹھے ہو جائیں تو ایسی فلم میں اداکاری کے معیار کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک سپر ہٹ اور کئی اعتبار سے ایک ناقابل فراموش فلم ہے۔ نمی بھی اس کی کاسٹ میں شامل تھیں۔

یہ ایک خالص رومانی اور جذباتی فلم تھی اس کی موسیقی تو شاہکار تھی۔ کہانی یہ تھی کہ دلیپ کمار سڑکوں پر ہارمونیم بجا کر پیسے کماتے ہیں۔اشوک کمار ایک بلند پایہ ڈاکٹر اور خوش ذوق انسان ہیں۔دلیپ کمار کا گانا سن کر بہت متاثر ہوتے ہیں اور انہیں گھر لے آتے ہیں۔نرگس ان کی منگیتر ہیں دونوں دولت منداور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

دلیپ کمار کی آواز سے نرگس بھی متاثر ہو جاتی ہیں اور ان کو گھر بلا کر خاطر و مدارت کرتی ہیں۔ان مہربانیوں کی بدولت دلیپ کمار غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور نرگس کے عشق میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کیا ہے تو اپنی آنکھیں دوبارہ جلا کر اندھے ہو جاتے ہیں۔اس سے پہلے ایک سین میں وہ جب ڈاکٹر کے سامنے اپنی محبت کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہ غصے میں آکر ایک تھپڑ رسید کر دیتے ہیں۔مگر بعد میں اپنی اس حرکت سے پشیمان ہو جاتے ہیں۔نرگس سے دلیپ کمار کی والہانہ محبت کو دیکھ کر وہ اپنی محبت سے دستبردار ہونے کو تیار ہو جاتے ہیں۔مگر ادھر دلیپ کمار کو احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے محسن جنہوں نے انکی آنکھوں کا آپریشن کیا تھا انکے ساتھ احسان فراموشی اور محسن کشی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی محبت کی بھی تذلیل کی ہے احساس ندامت کے باعث وہ اپنی آنکھیں پھوڑ لیتا ہے۔ڈاکٹر کو بے حد قلق ہوتا ہے اور وہ اس آپریشن کو اپنے پروفیشن کا تاج محل کہتا تھا جسے اس کی وجہ سے دلیپ کمار نے مسمار کر دیا۔

ڈاکٹر کہتا کہ کاش تم ایسا نہ کرتے تو نرگس سے دستبردار ہونیکا فیصلہ کر لیا تھا۔دراصل نرگس کا ''دیدار'' کرنے کی غرض سے ہی جو پہلے ہی اندھے تھے آنکھوں کے آپریشن کی آرزو کرتے ہیں اور آنکھیں ملنے پر نرگس پر دل وجان سے فریفتہ ہو جاتے ہیں۔

اس فلم کا ایک خوبصورت سین ہمیں آج بھی یاد ہے۔دلیپ کمار کو آنکھیں مل چکی ہیں۔مگر وہ نرگس کو چاہتے بھی ہیں مگر اظہار کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ایک موقع پر وہ اپنی آنکھیں ملتے ہیں تو نرگس پریشان ہو کر پوچھتی ہیں کہ کیا ہوا؟

جواب میں وہ کہتے ہیں ''آنکھ میں کچھ گر گیا ہے۔''

نرگس بے تکلفی اور معصومیت سے پاس آکر کہتی ہیں ''دکھائیں میں دیکھتی ہوں''

وہ ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھتی ہیں اور کہتی ہیں '' اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''نہیں''

وہ کہتے ہیں ''کیا آپ کو اس میں کچھ نظر نہیں آتا؟''

وہ دوبارہ آنکھوں میں جھانکتی ہیں اور کہتی ہیں ''ان میں تو کچھ بھی نظر نہیں آرہا''

''بالکل نہیں'' وہ ایک بار پھر آنکھوں کا معائنہ کرکے سادگی سے کہتی ہیں کہ جواب میں جس طرح دلیپ کمار انہیں مایوسی کے جس انداز کے تاثر سے انہیں دیکھتے ہیں وہ آج تک ہمیں نہیں بھولتا۔ دراصل یہ فلم ان فن کے شاہکاروں کی فلم تھی۔

یہ ایک سادہ سی رومانی کہانی تھی۔ جسے اداکاری، ہدایت کاری مصنف کے مکالموں اور سچویشنز کے مطابق گانوں نے ایک ناقابل فراموش فلم بنادیا تھا۔ ایسی فلمیں اب کہاں؟

لیجئے۔ ایک اور قابل ذکر بات ہم بیان کرنا بھول ہی گئے تھے۔ ہم نے ہوش سنبھالنے کے بعد بھوپال میں زنانہ کلاس میں جو پہلی فلم دیکھی وہ اشوک کمار کی ''کنگن'' دیکھی تھی۔ اس کے ہیرو اشوک کمار تھے اور فلم کی ہیروئن لیلا چٹنس تھی جس کا فلم میں نام رادھا تھا۔ یہ فلم دیکھ کر ہم رادھا کے عشق میں گرفتار ہوگئے تھے اور جب تک دوسری فلم ''بغداد کا چور'' نہیں دیکھی رادھا کو نہ بھول سکے۔ وہ بچپن کا زمانہ تھا، نا سمجھی بھی تھی اور جذباتیت بھی۔ اس میں ذوق لطیف بھی شامل تھا۔ لیلا چٹنس کا تعلق ایک اعلیٰ گھرانے سے تھا۔ اور وہ بی اے پاس تھیں۔ اشوک کمار بی ایس سی تھے۔ یہ اس وقت کا دور ہے جب میٹرک پاس کو بھی ایک تعلیم یافتہ سمجھا جاتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پچاس ساٹھ سال پہلے ہندوستان کی فلمی صنعت میں تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت تھی اور شریف خاندان کے لڑکے اور

لڑکیوں کی فلم کی صنعت میں شمولیت کو برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ماحول بھی بہت اچھا تھا۔جب ساٹھ سال قبل کی ہندوستانی فلمی صنعت کا آج اپنی فلم صنعت سے موازنہ کرتے ہیں تو احساس ندامت اور پریشانی سے سر جھکا کر ماتم کرنے کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔

اشوک کمار کو انڈیا کی سب سے بڑی فلمی صنعت کا اعزاز دادا بھائی پھالکے ایوارڈ دیا جا چکا ہے۔اس کے علاوہ 65 سالوں میں انہوں نے اور بھی متعدد فلمی ایوارڈ حاصل کیے تھے۔مختصر یہ کہ کوئی بھی ایسا فلمی اعزاز نہ تھا جو اشوک کمار نے حاصل نہ کیا ہو۔وہ یقیناً اُن تمام اعزازت کے حق دار تھے۔

اشوک کمار نے اپنی طویل زندگی میں ہمیشہ برتر حیثیت برقرار رکھی اور انہوں نے اپنی زندگی میں معقول بلکہ بھاری معاوضے لیے اور وہ خاصے متمول اور دولت مند آدمی تھے۔اس کی وجہ یہ کہ وہ سادگی سے زندگی گزارتے تھے۔مختصر سا خاندان تھا۔تین افراد پر مشتمل ایک وہ خود ایک بیوی اور ایک بیٹی۔وہ تقاریب میں شرکت کرنے سے پرہیز کرتے تھے اور خود بھی تقاریب منعقد نہیں کرتے تھے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کمایا کم ہی صرف کیا اور بہت کم خرچ کیا۔وہ کافی دنوں سے اپنی بیٹی پریتی گنگولی کے ساتھ مل کر ایک اکیڈمی بھی چلا رہے تھے۔وہ ساری زندگی بمبئی فلمی ستاروں اور شخصیات کے ساتھ رہے جو اپنی زندگیوں میں عیش و عشرت اور بے تحاشہ دولت لٹانے کے عادی ہیں لیکن وہ ان ""جراثیم"" سے قطعی محفوظ رہے جو کہ بجائے خود ایک کارنامے سے کم نہیں ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اشوک کمار اپنی فلمی زندگی میں ایک کنجوس اور کفایت شعار کی شہرت رکھتے تھے۔اس سلسلے میں کوئی لگ بھگ پچاس سال پہلے کا واقعہ سن لیجئے۔

شاعر اور فلم ساز نخشب جارچوی نے جب اپنی فلم ""نغمہ"" بنائی تو اس کے لیے سب سے پہلے اشوک کمار کو ہیرو کے لیے رابطہ کیا۔نخشب بمبئی فلم کی صنعت میں جانے پہچانے تھے اور ممتاز شاعر تھے۔ان کا خیال تھا کہ اشوک کمار ان کے ساتھ لحاظ اور رعایت کریں گیا،اشوک کمار کو کسی نے بتا دیا تھا کہ نخشب معاوضہ دینے کے معاملے میں اچھی شہرت کے حامل نہیں ہیں۔اشوک کمار نے اپنی دانست میں احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا کہ وہ ہر روز

ایک شفٹ کا معاوضہ پانچ ہزار روپے وصول کریں گے۔ نخشب اس پر فوراً رضامند ہو گئے ۔انہوں نے ایک چالاکی کی کہ اشوک کا سارا کام یکجا کر کے دو تین دن میں مکمل کر لیا۔ گویا بیس ہزار روپے ادا کر کے پوری فلم کا کام ختم کر دیا۔اس کے بعد اشوک کمار اس بات کے منتظر رہے کہ انہیں کام مکمل کرنے کے لیے بلایا جائے گا مگر ان کو وہ بلاوا نہیں آیا اور فلم نمائش کے لیے پیش کر دی گئی۔

دیکھا جائے تو نخشب صاحب کی بد دیانتی اور زیادتی تھی۔اشوک کمار جیسے اعلیٰ پایہ کے اداکار کا معاوضہ بیس ہزار سے بدرجہا زیادہ تھا مگر نخشب صاحب اس قسم کے تجربات کرنے کے عادی تھے۔

کچھ اس سے ملتا جلتا تجربہ موسیقار نوشاد کو بھی ہوا تھا۔ نخشب صاحب نے نوشاد صاحب کو اپنی فلم میں موسیقی کے لیے پیشکش کی تو نوشاد صاحب ایک وقت میں ایک ہی فلم کیا کرتے تھے۔انہوں نے معذرت کی تو نخشب صاحب کو یہ بات بھی ناگوار گزری۔انہوں نے ایک نئے موسیقار کو اپنی فلم میں نشاد کے نام سے متعارف کروایا۔ نوشاد اور نشاد میں بہت کم فرق محسوس ہوتا ہے۔اس طرح نخشب نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ نشاد صاحب نے بہت اچھی موسیقی بنائی۔اس کے بعد انہوں نے کئی اور فلمیں بنائیں اور بہت نام پیدا کیا اور پھر پاکستان چلے آئے۔ نشاد صاحب کا اصلی نام شوکت علی تھا۔اس کے بعد نشاد بنے تو انکا اصلی نام کسی کو بھی یاد نہیں تھا۔وہ بہت اچھے سازندے تھے مگر موسیقی میں نام پیدا کیا۔

بات اشوک کمار کی تھی جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ۔اشوک کمار ایک منفرد انداز لے کر فلمی صنعت میں آئے تھے اور ہمیشہ سب سے مختلف اور منفرد ہی رہے۔ ہر لحاظ سے وہ دوسروں سے مختلف تھے۔اداکاری میں بھی ان کا انداز سب سے نرالا تھا۔ طور طریقے اور رکھ رکھاؤ میں بھی سب سے الگ تھے۔ان جیسا نہ ہی کوئی اداکار دوسرا تھا نہ ان جیسا آدمی۔ انہوں نے اس قدر طویل عرصہ اداکار کی حیثیت سے فلمی صنعت میں گزارا کہ ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔اور اپنے کردار، شرافت کے اعتبار سے بھی ایک واضح مثال تھی۔ صرف ایک بیوی کے ساتھ ساری زندگی گزارہ کیا اور مثالی زندگی گزاری ۔فلم اسٹوڈیو اور گھر کے سوا کہیں اور نہیں پائے گئے۔ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے

اپنی ساری زندگی صرف اداکاری ہی کی۔ نہ انہوں نے فلمسازی کا شوق چرایا اور نہ ہدایت کار بننے کا۔ لیبارٹری میں کام سیکھنے آئے تھے۔ تقدیر نے اتفاق سے ہیرو بنادیا کیونکہ فلم کا منتخب ہیرو آیا نہیں تھا۔ ہیرو کیا بنے کہ پھر زندگی بھر ہیرو ہی رہے۔ کریکٹر ایکٹر کے طور پہ کام کیا تو مرکزی رول ادا کیا۔ اپنی عادات واطوار، شرافت اور شرمیلے پن کی وجہ سے سب سے نرالے تھے۔

اسکرین پر ہی جو بولتے تھے اس پر اکتفا کیا۔ کسی جلسے یا تقریب میں نہ کبھی شرکت کی اور نہ ہی تقریر کی۔ مجمع دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے اور پسینے چھوٹنے لگ جاتے تھے۔ لڑکیوں کے جھرمٹ سے بوکھلا جاتے تھے۔ ایسے شخص کو عجیب وغریب نہیں تو کیا کہا جائے!

اشوک کمار کی چند فلموں کے نام ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ ان کی معیاری اور کامیاب فلموں کی تعداد کا کوئی حساب کم از کم ہمارے پاس تو نہیں ہے۔ آرتی، بندنی، گمراہ، قانون اور ممتا بھی ان کی قابل ذکر فلمیں ہیں۔ کوئی کہاں تک یاد رکھے اور کہاں تک گنوائے۔ 65 برس کا قصہ ہے کوئی دو چار برس کی بات نہیں ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فلمی صنعت کو ایسا انسان نصیب نہیں ہوگا۔ سعادت حسین منٹو بمبئی میں تھے اور ان کے بہت گہرے دوست تھے۔ انہوں نے منٹو کو پاکستان آنے سے باز آنے کی بہت کوشش کی اور بعد میں بھی ہمیشہ ان کی کمی محسوس کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست ہی نہ تھے بلکہ مداح بھی تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ پاکستان والوں نے منٹو کی قدر نہیں کی ادھر منٹو انکی باتیں کرتے ہوئے نہیں تھکتے تھے۔ اب نہ سعادت حسین منٹو رہے اور نہ ہی اشوک کمار۔ دونوں کی باتیں ہی رہ گئی ہیں۔

اشوک کمار کے ذکر سے ہمیں ایک اور پرانے اور بے حد کامیاب اور نامور اداکار یاد آگئے۔ اشوک کمار نے فلمی دنیا کا آغاز 1930 میں کیا تھا اور جس اداکار کا ہم تذکرہ کرنے لگے ہیں انہوں نے 1929 میں اداکاری شروع کی تھی۔ یہ ایک مسلمان اداکار تھے اور تعریف کی یہ بات ہے کہ اس زمانے میں جب مسلمان فنکار مصلحتاً اپنے نام ہندوؤانہ رکھ

لیتے تھے تاکہ تعصب کی وجہ سے انہیں نقصان نہ پہنچے تو اس اداکار نے بڑے دھڑلے سے اپنے اصلی نام سے اداکاری کا آغاز کیا اور ایسا نام پیدا کیا ہے کہ لوگ مثالیں دیا کرتے تھے۔ یہ مظہر خان تھے۔

ہم نے سب سے پہلے پاکستان کی فلمی صنعت میں ایک لیبارٹری کے انچارج کا نام سنا تھا۔ یہ پیارے خان تھے اور ایورنیو اسٹوڈیو کے انچارج تھے۔ جب پاکستان میں رنگین فلموں کا آغاز ہوا تو آغا جی اے گل نے ایورنیو اسٹوڈیوز میں سب سے پہلے رنگین فلموں کی لیبارٹری نصب کرائی ۔ پیارے خان کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ بھیجا اور جب وہ مختصر تعلیم حاصل کرکے واپس آئے تو انہوں نے کارکردگی کے ایسے نمونے پیش کیے کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ پاکستان کی فلمی صنعت میں بڑے بڑے فلمسازوں، ہدایت کاروں اور فنکاروں کی ایسی شہرت اور دبدبہ نہیں تھا جیسا کہ پیارے خان کا تھا۔ اسٹوڈیو کے مالک آغا جی اے گل سے لے کر تمام فلم ساز، ہدایت کار ، فنکار اور کیمرامین کو خوش کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ جانتے تھے کہ لیبارٹری کو فلم کی مجموعی اعتبار سے کیا اہمیت حاصل ہے۔ اگر ہر لحاظ سے فلم خوبصورت کیوں نہ بنالی جائے تو اس کا لیبارٹری میں ستیاناس کیا جا سکتا ہے۔ نہ کیمرہ مین کی ہنرمندی اور نہ ہی ہدایت کار کی مہارت نظر آتی ہے ۔ سیٹ کی خوبصورتی پر پانی پھر جاتا ہے۔ اداکاروں کی شکل وصورت مسخ ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ لیبارٹری کے اچھے یا برے سے پوری فلم کا مجموعی تاثر یا معیار بہتر یا برا ہو سکتا ہے۔ پاکستان کی واحد اور سب سے بڑی لیبارٹری کے انچارج پیارے خان تھے۔ ان کے سامنے مالک بھی دم نہیں مار سکتے تھے بلکہ ان کی خوشنودی میں لگے رہتے تھے۔ کیونکہ بڑی بڑی فلمیں انکی لیبارٹری میں ان کی مدد سے تیار کی جاتی ہیں۔ حکومت پاکستان کے شعبہ فلم کا تمام تر کام بھی ایورنیو اسٹوڈیو میں ہوتا تھا۔ کیونکہ یہاں پیارے خان لیبارٹری انچارج تھے۔

پیارے خان بذات خود بہت نرم دل، ہنس مکھ اور پیارے انسان تھے۔ البتہ اپنے معاونین، کیمرامین کی غلطی پر ان کو سخت ڈانٹ دیا کرتے تھے اور وہ سب دم سادھے سنتے رہتے تھے۔ پیارے خان کا پہلا تعارف ہم نے یہ سنا تھا کہ یہ اداکار مظہر خان کے بھائی ہیں۔ مظہر خان قیام پاکستان سے قبل ہی برصغیر کی فلمی دنیا میں بڑا نام بنا چکے تھے۔ ہم نے بھی ان کی چند فلمیں دیکھی تھیں اور ان کے بارے میں کچھ پڑھا اور سنا تھا۔ ابتداء میں مظہر خان اپنے بھائی پیارے

خان کا حوالہ تھے مگر بعد میں جب پیارے خان نے اپنی ہنر مندی کا مظاہرہ دکھایا تو لوگ کہنے لگے کہ بھارتی مظہر خان پیارے خان کے بھائی ہیں۔

ہم سے پیارے خان بہت شفقت اور بے تکلفی سے پیش آتے تھے۔آنکھیں بھی دکھاتے تھے مگر ہنسا کر انہیں بہلانے میں ماہر تھے۔پہلے صحافی کے طور پر اور پھر کہانی نویس، فلم ساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے ان سے واسطہ پڑتا رہا۔ایور نیو سٹوڈیو یوں بھی اس زمانے میں پاکستان کی فلمی صنعت کا دل اور ایک درسگاہ اور سوشل مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ پیارے خان سے لیبارٹری میں ملنے کی اجازت نہیں تھی مگر ہم موقع پا کر ان کے پاس چلے جاتے تھے۔

"میاں جوتے اتارے کہ نہیں؟" وہ عینک کے شیشوں کے اوپر سے دیکھ کر پوچھتے۔

"بالکل اتار دیے کہے تو موزے وغیرہ بھی اتار دوں؟"

وہ ہنس پڑتے "شیطان آدمی۔موزے وغیرہ نہ اتارو جلدی بولو کیا کام ہے۔میں اس وقت بہت ضروری کام کر رہا ہوں۔"

ہم اپنے مطلب کی بات کر کے چلے آتے۔یہ اس وقت کی بات ہے جب ہم ہدایت کار اور فلم ساز بن چکے تھے۔

پیارے خان صبح لیبارٹری میں داخل ہوتے تو رات ہی کو برآمد ہوتے تھے۔البتہ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ چائے نوشی یا پان کھانے کے لیے مختصر وقت کے لیے باہر آتے تھے۔کھانا ہمیشہ گھر کا کھاتے تھے جو بے حد لذیز ہوتا تھا۔ہماری انکے گھر تک رسائی ہو گئی تھی ہم اکثر ان سے شامی کباب اور پراٹھوں کی فرمائش کیا کرتے تھے۔

وہ کہتے "بھائی یہ لیبارٹری ہے ہوٹل نہیں ہے۔ہوٹل اسٹوڈیو کے سامنے ہیں۔"

"مگر خان صاحب ایسے شامی کباب کسی ہوٹل سے نہیں ملتے۔"

''اچھاتو مجھے باورچی کہہ رہے ہو؟''

''جی ہر گز نہیں کھاناتو بھابی پکاتی ہیں آپ تو صرف کھاتے ہیں۔ خان صاحب لیبا رٹری میں بیٹھ کر حکم چلانا بہت آسان ہے اور مگر اچھا کھانا پکانا بہت مشکل ہے۔''

''ٹھیک ہے بھئی کل شامی کباب کھالینا اب جاؤ۔ ابھی مجھے کام کرنے دو۔''

جن دنوں ہم فلم ساز بنے تو اکثر ان سے جلدی نیگیٹو ڈیویلپ کرانے یا اپنے پرنٹ نکلوانے کی فرمائش لے کر پہنچ جاتے تھے۔ لیبارٹری میں کاموں کی بھرمار تھی اس لیے بعض اوقات ان کاموں میں مہینے لگ جاتے تھے اور کئی فلموں کی ریلیز ملتوی ہو جاتی تھی۔

''کیوں میں اتنا ڈراؤنا آدمی ہوں؟''

''جی نہیں۔ مگر وہ ڈرتے ہیں کہ آپ فلم دھوتے ہوئے کہیں ان کے کیئے دھرے پر پانی نہ پھیر دیں۔''

کسی اور کو پیارے خان سے بے تکلفی سے بات کرنے کی نہ ہی جرات تھی نہ ہی اجازت۔ کئی بار آغا صاحب خان صاحب سے کام کروانا چاہتے تو براہ راست کہنے کی بجائے پیغام ہمارے ذریعے دیا جاتا تھا۔ ہم خان صاحب کی جان کھا جاتے تھے یہاں تک کے وہ آخر کار راضی ہو جاتے تھے۔

پیارے خان درمیانے قد کے خوبصورت آدمی تھے۔ بالوں کی ایک لٹ ایک ہاتھ سے مڑوڑتے رہتے تھے۔ خصوصاً غور کرتے وقت ایسا ضرور کرتے تھے۔ آغا صاحب نہ ان کی قدر کرتے تھے بلکہ انکی دلی قدر کرتے تھے۔ جن دنوں آغا صاحب قلیل علالت میں لندن میں مقیم تھے تو پیارے خان بھی لاہور میں شدید بیمار تھے۔ آغا صاحب اپنی بیماری اور تکلیف میں بھی ان کی بیمار پرسی روز کیا کرتے تھے۔ اور خبر رکھتے تھے۔ ان ہی دنوں ہم لندن گئے تو ان سے ملاقات

ہوئی تو آغا صاحب کی طبعیت کافی خراب تھی۔ سب سے پہلے پیارے خان کے بارے میں پوچھا پھر لاہور کے دوسرے لوگوں کے بارے میں پوچھا۔ ہم نے مصلحتاً انہیں پیارے خان کی نازک حالت کے بارے میں نہیں بتایا۔

یہ پیارے خان تھے۔ اداکار مظہر خان کے بھائی۔ دونوں بھائی اپنے اپنے شعبے میں کامیاب اور نامور تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پیارے خان کو اداکاری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

مظہر خان نے اداکاری کا آغاز خاموش فلم ''چیلنج'' سے کیا تھا جو 1929 میں بنائی گئی تھی۔ اس زمانے میں فلموں کا نام اکثر انگریزی میں رکھا جاتا تھا۔ اور پھر انگریزی نام اور اس کی اردو عرفیت ضرور ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ہر اداکار کسی ایک کمپنی کا ملازم ضرور ہوتا تھا۔ مظہر خان ایمپیریل کمپنی سے وابستہ تھے۔ مظہر خان ایک بلند و قامت، خوب رو اور باوقار آدمی تھے۔ آواز میں بھی رعب و تاثر تھا۔ وہ اعلی تعلیم یافتہ تھے۔ اس زمانے میں بیشتر افراد اعلی تعلیم یافتہ ہوا کرتے تھے۔ خاموش فلموں کے زمانے میں فلمیں زیادہ نہیں چلا کرتی تھی۔ مظہر خان کی فلم نے کامیابی حاصل کی اور ان کی اتنی مانگ ہو گئی کے ایک ہی سال میں 5 سے 6 فلمیں ریلیز ہو گئیں۔ فلم اس زمانے میں ایک نئی ایجاد اور انوکھی تفریح سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے عموماً سب فلمیں کامیاب ہو جاتی تھیں۔ کوئی کم اور کوئی زیادہ، فنکاروں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ فلموں میں چند ہزار روپے لاگت آتی تھی اور چند مہینوں میں مکمل ہو جاتی تھیں۔ اس زمانے کے سپر اسٹار، میں پرتھوی راج، چندر موہن، سہراب مودی، ای بلیموریا شامل تھے۔ مظہر خان بھی اسی فہرست میں شامل تھے ۔ انہوں نے بہت سی خاموش فلموں میں کام کیا تھا۔ ن میں سلوچنا، جلو بھائی، مختار بیگم، اختری ، ہر میلا، منورما، ستارہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی آخری خاموش فلم ''قمر الزماں'' تھی۔ بولتی فلموں کے آغاز کے ساتھ بھی خاموش فلمیں بنائی جاتی تھیں کیونکہ بولتی فلموں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔ برصغیر کی آخری خاموش فلم ''وجے ڈنکا'' تھی۔

مظہر خاں نے بولتی فلموں میں کام کرنے کا آغاز 1931 میں ایک کاسٹیوم فلم ''نور جہاں'' سے کیا تھا۔ اس کے ہدایت کار تاریخی حیثیت کے مالک عذیر امیر تھے۔ ان کی دوسری بولتی فلم ''صبح کا تارہ'' تھی۔ یہ فلم بمبئی میں بنی تھی

اوراس میں مظہر خان کے علاوہ کے ایل سہگل جیسے فنکار بھی شامل تھے۔ یہ بہت کامیاب اور مقبول فلم ثابت ہوئی ۔اس کے بعد وہ انڈیا چلے آئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ یہاں ان کی پہلی فلم ’’ عورت کا پیار‘‘ تھی ۔اے آر کاردار اس کے ہدایت کار تھے۔اداکاروں میں مختارہ بیگم بھی شامل تھیں۔اس کے بعد فلم ’’ایک دن کا سلطان‘‘ میں انہوں نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔اختری اور سبیتا دیوی نے اس میں مرکزی رول ادا کیے تھے۔ یہ بے حد کامیاب فلم تھی۔انہوں نے ایک فلم میں گل حمید جیسے نامی گرامی اور مقبول ترین ہیرو کے ساتھ کام کیا تھا۔ سبیتا دیوی اس کی ہیروئن تھی۔ایک فلم ’’سیتا‘‘ میں ان کے ساتھ درگا کھوٹے پر تھوی راج کے۔ سی ڈی ، گل حمید، ہیرا لال، مختارہ بیگم، ترلوک کپور، اور رادھارانی جیسے فنکار تھے۔ دلچسپ بات ہے کہ اس فلم میں اے آر کاردار نے بھی اداکاری کی تھی۔ وہ مسلسل کامیاب فلموں میں کام کرتے رہے۔ان ہی دنوں انہوں نے ایک فلم ’’غازی صلاح الدین‘‘ میں کام کیا جس کے موسیقار کھیم چند پرکاش تھے۔ان کی ایک مشہور فلم ’’ میری آنکھیں‘‘ تھی جس میں خورشید، ستارہ، ایشور لال، ترلوک کپور اور مزاحیہ اداکار غوری تھے۔ان کی اس زمانے کی مشہور فلموں میں اچھوت ، بھروسا قابل ذکر ہیں۔ بھروسا کے فلمساز اور ہدایت کار سہراب مودی تھے۔ان کے ساتھ چندر موہن، سردار اختر، شیلا، مایہ دیوی جیسے فنکار بھی موجود تھے۔

مظہر خان کی ایک یادگار فلم ’’پڑوسی‘‘ تھی جو وی شانتارام نے بنائی تھی۔ یہ دراصل ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر بنائی گئی تھی اور اس کا شمار کلاسیکل فلموں میں ہوتا ہے جس نے وی شانتارام کے ساتھ ساتھ مظہر خان اور جاگیردار کو بھی بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔ جاگیردار اور مظہر خان نے اس فلم میں دو ہندو مسلم پڑوسی دوستوں کے کردار ادا کیے تھے۔ جو تعصب کے زہر سے آزاد رہتے ہوئے اپنی جان دے دیتے ہیں اور دوسروں کے لیے مثال قائم کر دیتے ہیں۔ یہ فلم غالباً 1941 میں ریلیز ہوئی تھی۔

اس زمانے میں مظہر خان کریکٹر ایکٹر کی حیثیت سے بھی کام کرنے لگے تھے مگر ان کی بہت مانگ تھی اور ان کا نام دیکھ کر فلم بین سینموں کا رخ کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

1942 میں مظہر خان نے اداکاری کے ساتھ ہدایت کاری بھی شروع کر دی۔ ''ماروی'' بطور ہدایت کار ان کی پہلی فلم تھی۔ اسی سال انہوں نے ''گھر سنسار'' اور ''بھگت کبیر'' جیسی یادگار فلموں میں کام کیا تھا۔ اس ایک سال میں ان کی سات فلمیں ریلیز ہوئی تھی۔ 1943 میں وہ فلم ساز بھی بن گئے تھے۔ فلمساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے ان کی پہلی فلم ''بڑی بات'' تھی۔ فیروز نظامی ان کے موسیقار تھے۔ اس فلم میں مظہر خان کے ساتھ سورن لتا، الماس کمار، اور یعقوب جیسے فنکار بھی شامل تھے۔ اسی زمانے میں ان کی ایک مشہور فلم ''پھول'' بنی جس کے ہدایت کار کے آصف تھے۔ یہ دراصل ہدایت کار کے حوالے سے کے آصف کی پہلی فلم تھی جس میں انہوں نے اس وقت کے بڑے بڑے فنکار اکٹھے کیے ہوئے تھے۔ ان میں ثریا، وینا، پرتھوی راج، یعقوب، ستارہ، واسطی، ایم اسماعیل، درگا کھوٹے، جلو بائی اور آغا زنے بھی اس فلم میں مظہر خان کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس فلم کے موسیقار ماسٹر غلام حیدر خان تھے۔ اشرف خاں اور ڈکشٹ بھی دوسرے درجنوں اداکاروں کی طرح اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ 1945 میں ان کی فلم ''پہلی نظر'' ریلیز ہوئی۔ اس کے فلم ساز اور ہدایت کار بھی وہی تھے۔ انل بسواس اس کے موسیقار تھے۔ اس کی کاسٹ میں وینا، موتی لال، منور سلطانہ، (یہ ان کی پہلی فلم تھی) ککو، ببو وغیرہ شامل تھے۔ یہ ایک مسلم سوشل فلم تھی اور بہت مقبول ہوئی۔ اس کی موسیقی بھی بہت اچھی تھی۔ خصوصاً مکیش کا گایا ہوا ایک گانا تو آج تک سب کو یاد ہے۔

دل جلتا ہے تو جلنے دو

آنسو نہ بہا فریاد نہ کر

ہر اعتبار سے یہ ایک کامیاب اور یادگار فلم تھی۔

1950 میں مظہر خان نے فلم ''نرالا'' میں کام کیا۔ یہ ایک رومانی اور ہلکی پھلکی میوزیکل فلم تھی۔ جس میں مدھو بالا اور دیو آنند نے مرکزی رومانی کردار ادا کیے تھے۔ اس طرح انہوں نے فنکاروں کی ایک نئی نسل کے ساتھ کام کیا تھا

۔اس سے پہلے وہ اس عہد کے نامور فنکاروں کے ساتھ مختلف فلموں میں کام کیا کرتے تھے۔ سی رام چندر نے اس کی بہت اچھی موسیقی بنائی تھی۔

محفل میں جل اٹھی تھی شمع پروانے کے لیے

پریت بنی ہے دنیا میں جل جانے کے لیے

اسی فلم کا ناقابل فراموش نغمہ ہے۔

مظہر خان کی آخری فلم جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے۔ ''درد دل'' تھی۔ اس کے فلم ساز و ہدایت کار نتن بوس تھے۔ نمی اور پریم ناتھ اس میں مرکزی کرداروں میں تھے۔ رتن کمار نے بھی اسی فلموں میں کام کیا تھا۔ یہ 1953 میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔

اس کے بعد مظہر خان فلموں سے اور پھر دنیا سے بھی کنارہ کشی کر گئے تھے۔

مظہر نے 1929 کی خاموش فلموں سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا اور 1953 میں آخری فلم میں کام کیا۔ اس طرح انہوں نے قریباً 24 سال تک فلموں میں مختلف حیثیتوں سے کام کیا جبکہ اشوک کمار بیسویں صدی کے آخر تک فلموں میں کام کرتے رہے۔ مظہر خان کی فلموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایک زمانے میں ان کی سات سات فلمیں بھی ریلیز ہوتی تھیں۔ انہوں نے ہیرو اور کریکٹر ایکٹر کے طور پر بعض یادگار کردار بھی بخوبی سے ادا کئے۔ ان کا انتقال اپنے بھائی پیارے خان سے پہلے ہو چکا تھا۔ یہ دونوں نامور بھائی جنہوں نے مختلف شعبوں میں مثالی عروج حاصل کیا تھا اب دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ مگر اپنی یادیں اور کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔

پاکستان میں مختلف سرکاری اداروں نے اپنے مختلف اوقات میں فلم بنانے کا ارادہ کیا اور شوق پورا کیا۔ مگر قسم لے لیجئے جو کسی ایک ادارے نے بھی بے شمار وسائل اور دولت کی فراوانی کے باوجود کبھی کوئی کام کی فلم بنا کر دی ہو۔ پہلے

مختلف اداروں نے بانی پاکستان قائد آعظم محمد علی جناح کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں بارہا فلمیں بنانے کاارادہ کیا۔ بعض تو محض ارادہ کر کے ہی رہ گئے۔ بعض اس سے بڑھ کر کاغذی کاروائیوں تک پہنچ گئے۔ مختلف حکومتیں آئیں اور گئیں کئی حکمران بر سر اقتدار آئے۔ تخت وتاج سے محروم ہو کر رخصت ہو گئے مگر کیا مجال کہ قائد آعظم کے بارے میں فلم بنانے کی آرزو پوری ہوئی ہو۔

بلکہ دنیا بھر اس ہستی کو روشناس کرانا پاکستانی حکمرانوں اور فلمسازوں کا فرض اولین تھا جس نے انگریزی حکومت اور ہندو ذہنیت کی مشترکہ سازش کے باوجود تن تنہا جنگ لڑ کر بر صغیر کے مسلمانوں کو ایک آزاد اور خود مختار وطن بنا کر دیدیا۔ یہ بجائے خود ایک عظیم نا قابل فراموش کارنامہ ہے۔ دنیا میں ایسی کوئی اور ایک بھی مثل ہو تو پیش کیجیئے کسی کو بھی یہ فرض ادا کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔

اول تو یہی فیصلہ نہیں ہو سکا کہ قائد آعظم کے بارے میں جو فلم بنائی جائے وہ انکی سیاست کے بارے میں یا پھر ان کی زندگی کے بارے میں بنائی جائے پھر یہ بحث چلتی رہے گی کہ یہ فلم اردو میں بنائی جائے یا انگریزی میں تاکہ بیرونی دنیا میں قائد آعظم کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکیں۔ اس کے بعد موضوع بحث رہا کہ فلم میں کیا دکھایا جائے اور کیا نہ دکھایا جائے۔ مختصر کہ ہم پاکستان والے اس بحث میں پڑ رہے ہیں اور ادھر گاندھی کے بارے میں ایک بہت بڑے پیمانے پر فلم بنی اور ساری دنیا میں واہ واہ ہو گئی۔ کہنے کو تو یہ فلم انگریزوں نے بنائی تھی پر بھارتی حکومت اور دانشوروں نے اس کے لیے مناسب ماحول پیدا کیا۔ ہر قسم کی سہولتیں اور تعاون پیدا کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی کا چرچہ ساری دنیا میں ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اس فلم میں گاندھی جی کی عظمت میں گن گائے تھے اور قائد آعظم کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا تھا۔

ہم لوگ بہت جلد جوش جذبات میں آجاتے ہیں۔ گاندھی کا پوری دنیا میں ڈھنکا بجا تو ہم نے سوچا ہم کسی سے کم نہیں۔ کیوں نہ قائد آعظم کے بارے میں ایسی ہی یا اس سے بھی بڑی فلم بنا کر پوری دنیا میں بتادیا جائے قائد آعظم کیا چیز

تھے۔ پھر باتیں، مشورے اور مباحثے شروع ہو گئے۔ سرکاری محکموں میں فائلوں کی نقل و حمل تیز ہو گئی۔ مگر وہی معاملہ ہوا کہ۔۔

اور سفر آہستہ آہستہ

اس دوران میں باہر سے اکبر صاحب میدان میں آ کر کود پڑے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ بین الاقوامی پیمانے پر قائد اعظم کے بارے میں فلم بنائیں گے۔ اکبر صاحب نے چپکے چپکے خود ہی ایک اسکرپٹ تیار کیا۔ فلم کی کاسٹنگ کی۔ ہدایت کار اور فلم کے دوسرے ارکان کا انتخاب کیا اور فلم کی شوٹنگ شروع کر دی۔ ان کی غلطی یہ تھی کہ اتنے بڑے ۔ اہم اور متنازعہ مسئلے پر فلم بنانے سے پہلے صاحب الرائے اور صاحب علم و دانش حضرات سے مشورہ کرنا بھی ضروری نہ سمجھا اور یہ بھول گئے کہ وہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال رہے ہیں۔ ادھر پاکستان میں تفصیلات اور سیاق وسباق جانے بغیر ان کی فلم ''جناح'' کی مخالفت شروع ہو گئی۔ ہم لوگوں کی یہ عادت ہے خود تو کوئی کام کرتے نہیں ، محض باتیں بناتے رہتے ہیں اور اگر کوئی دوسرا کام کرے تو خورد بینیں، ہتھوڑیاں اور کلہاڑیاں لے کر اس کے پیچھے پڑھ جاتے ہیں اور غلطیاں گنوانی شروع کر دیتے ہیں۔ اعتراض کرنا ہمارا قومی مشغلہ ہے پھر یہ تو قائد اعظم کے بارے میں فلم کا معاملہ تھا۔ جس سے جو کچھ بنا اس نے اس کی مخالفت میں کہا (اور موقع ملا تو کیا بھی) اور فلم ساز اکبر کے لتے لینے شروع کر دیے۔ اکبر صاحب اور اس کے ہدایت کار کے بارے میں ایسی ویسی اطلاعات فراہم کی گئیں کہ قائد اعظم کے بارے میں بڑے پیمانے پر ایک فلم بنانے کا سوچا اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔

شامت اعمال یہ کہ اس فلم سے ان کو پاکستان کی حکومت سے بھی سرمایہ درکار تھا ۔ اب آپ جانتے ہیں کہ قومی خزانے اور ٹیکس دہندگان سے وصول ہونے والی رقم کے بارے میں ہم لوگ کتنے حساس ہیں۔ ایک ایک پائی کا حساب طلب کرتے ہیں۔ اسی حساب کتاب میں قومی خزانہ ہمیشہ خالی رہتا ہے اور قرضوں کا انبار بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ کشکول ہاتھ میں پکڑے ہم ساری دنیا میں ''ہیلپ ہیلپ'' پکارتے پھرتے ہیں۔

فلم ''جناح'' کے سلسلے میں بھی یہی ہوا۔ ہر فرد کی خواہش تھی کہ وہ اس فلم کی کہانی سنے۔ اسکرپٹ پڑھے۔ اس کی کاسٹ پر غور کرے اور غلطیوں کی نشاندہی کرے۔

یہ ایک طویل داستان ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اکبر صاحب پاکستان میں آکر صفائیاں پیش کرتے رہے۔ انہوں نے واقعی قومی نظریہ پر اسکرپٹ میں غلطیاں کی تھیں۔ اگر وہ اپنی جیب سے سارے پیسے خرچ کر کے یہ فلم بناتے تب بھی فلم دیکھنے کے بعد بھی پاکستانی قوم انہیں ہرگز نہ بخشتی۔ یہ تو سرکاری خزانے سے رقم دینے کا معاملہ تھا۔ بہت سی کمیٹیاں بیٹھیں۔ بہت سے خفیہ اور غیر خفیہ اجلاس ہوئے اور بالآخر وہ اسکرپٹ تبدیل کرنے پہ آمادہ ہو گئے۔ ادھر فلم بنانے کے لیے سرمایہ کم پڑ گیا۔ چندے کی اپیلیں کی گئیں۔ فلم تو جیسے تیسے نمائش کے لیے پیش کر دی گئی مگر ساری دنیا نے تماشہ دیکھ لیا کہ ''زندہ قومیں'' اپنے بانی اور محسن کو کس طرح خراج تحسین پیش کرتی ہیں۔

اس فلم کو ہم نے بھی دیکھا۔ ہر ایک کا اپنا نقطہ نظر اور معیار ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ فلم خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ تھی۔ اگر اکبر صاحب سقراط اور افلاطون بننے کی بجائے اس موضوع، اسکرپٹ اور کاسٹ کے بارے میں پروفیشنل اور اس ہنر کے جاننے والوں سے مشورہ کر لیتے تو شاید یہ تمام مسائل کے باوجود یہ ایک بہترین فلم بن سکتی تھی۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ ''گاندھی'' بنانے والے کون لوگ تھے۔ وہ خالص پروفیشنل اور ہنرمند انتہائی تجربہ کار لوگ تھے۔ جنہیں فلم سازی اور مارکیٹنگ کے تقاضوں کا پورا علم تھا۔ انہوں نے بہت غور و حوض کے بعد یہ منصوبہ شروع کیا تھا۔ اور انتہائی ماہرانہ انداز میں اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ ''گاندھی'' بنانے والے دیو قامت قد والے لوگوں کے سامنے ''جناح'' بنانے والے اس میدان میں زیادہ سے زیادہ بونے ہی کہے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پہ ''گاندھی'' کی نمائش کے بعد ''جناح'' کے بارے میں بہتر فلم بنانے کی ضرورت تھی ورنہ جہاں اتنے طویل عرصے تک صبر کیا تھا اسی پر گزارہ کرتے رہتے۔ یہ سب اپنی جگہ پر اکبر صاحب کو یہ کریڈٹ ملنا ضروری تھا کہ دوسرے ادارے اور حکومتی ادارے محض باتیں کرتے رہے انہوں نے ایک فلم تو دنیا کے سامنے بنا کر پیش کر دی۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ کریڈٹ دینا ہماری قومی عادت نہیں۔ بہر حال فلم ساز نے نفع کمایا کہ نقصان اٹھایا اور اس فلم سے اگر

قائد آعظم کا صحیح امیج نہیں پیش کیا گیا اور کوئی فائدہ نہیں ہوا تو کم از کم نقصان بھی نہیں ہوا۔ اتنا تو ہوا کہ مغرب کے لوگ قائد آعظم کے نام سے واقف تو ہو گئے ۔ یہ اور بات ہے کہ انکے کارنامے اور ان کی شخصیت کے بارے میں وہ کچھ نہ سمجھ سکے۔ یہ تذکرہ تو تمہید کے طور پیش کیا گیا۔ مقصد تو یہ کہنا تھا کہ ہمارے کسی سرکاری ادارے نے کبھی کوئی ڈھنگ کی فلم نہیں بنائی۔ حالنکہ وسائل اور سرمائے کی کمی نہ تھی۔ نیف ڈیک نے تحریک پاکستان کے بارے میں فلم ''خاک اور خون'' بنائی اس کے معیار سے وہ کتنے مطمئن تھے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ بہت عرصے تک اس کی نمائش ہی نہ کی گئی۔ نمائش ہوتی تو دیکھنے والوں کو تو بہت مایوسی ہوتی لہذا اس فلم کو سنبھال کے رکھ دیا گیا ہے۔ نیف ڈیک نے فلم کے کچھ اور منصوبوں پر عمل کیا مگر سعادت حسن منٹو کے الفاظ میں یا تو ''اسقاط'' ہو گیا یا پھر ایک عجیب الخلقت چیز سامنے آئی۔ کچھ لوگ نیف ڈیک سے سرمایہ لے کر بیرون ملک چلے گئے۔ اور من مانے تجربے کرتے رہے ۔ ان ہی اصحاب میں ایک نام ''جناح'' کے ہدایت کار جمیل دہلوی کا بھی ہے۔ نیف ڈیک کے سرمائے سے انہوں نے ''بلڈ آف حسین'' بنا دی۔ نیف ڈیک سے بھلا اس فلم سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا۔ ایسی چند اور بھی مثالیں ہیں جن میں چند کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔

ہماری ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہم ہر چیز پر پردہ ڈالتے ہیں کیونکہ بچپن سے مولوی صاحب سے سنتے آئے ہیں کہ '' اے لوگو! دوسروں کے عیبوں کی پردہ پوشی کرو'' ہم مولوی صاحب کی بہت قدر کرتے ہیں۔ ان سے ڈرتے بھی ہیں اور یہی مناسب سمجھا کہ ''پردے میں رہنے دو پردہ نہ اٹھاؤ۔''

پچھلے دنوں ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور کے ایک شمارے میں اشفاق نقوی صاحب کا ایک بہت دلچسپ مضمون فلم ''قسم اس وقت کی'' کے بارے میں پڑھا۔ جس میں انہوں نے اس فلم کی تکمیل کے دوران اپنی وابستگی کے زمانے کے کچھ کچھ واقعات، کچھ تجربات اور کچھ تاثرات بیان کیے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے مضمون ''ثقہ'' ہے کہ اشفاق نقوی صاحب اس زمانے میں پاکستان ائیر فورس سے منسلک تھے اور سرکاری طور پر انہیں اس فلم کے انتظامات کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ انہوں نے بڑی دلچسپ روداد بیان کی ہے اور گویا کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔ ان کا یہ مضمون دلچسپ بھی ہے

اور سبق آموز بھی بلکہ عبرت ناک بھی۔ عبرت تو بہت پہلے حاصل کی جاچکی ہے۔خدا جانے کہ کسی نے اس سے سبق بھی سیکھا یا نہیں۔بظاہر تو اس کا جواب نفی میں ہے۔

ان کی زبانی یہ داستان سننے سے پہلے مناسب ہے کہ ہم بھی کچھ اس کے بارے میں حاشیہ آرائی کر دیں اور اپنی معلومات آپ لوگوں تک پہنچانے کی سعادت حاصل کریں۔

فلم ''قسم اس وقت کی 1929'' میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔اس کی شان نزول یہ تھی کہ پاکستان ائیر فورس کے کچھ اعلیٰ عہدے داروں کو یہ احساس ہوا یا انہیں یہ احساس دلایا گیا کہ پاک فضائیہ کو دنیا سے متعارف بنانے کے لیے ایک فلم بنانی چاہیے جس میں ائیر فورس کی تمام خوبیوں اور ہنر مندیوں کا نچوڑ بھی ہو اور یہ ایک کمرشل فلم بھی ہو۔یعنی کہ دستاویزی بھی ہو اور کمرشل بھی۔دستاویزی اس لیے کہ دنیا پاک فضائیہ کی ہنر مندی اور مہارت سے واقف ہو سکے اور کمرشل اس لیے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ لوگون کو پاک فضائیہ کے بارے میں معلومات حاصل ہوں۔یہ بہت نادر اور مفید خیال تھا بلکہ نیک خیال تھا۔جس نے بھی یہ آئیڈیا سوچا اور پیش کیا اس کے خلوص،جذبہ حب الوطنی،اور دانش مندی کی داد دینی چاہیے۔مگر بد قسمتی کے ساتھ یہاں وہ معاملہ ہوا کہ بقول شاعر۔۔۔

میں خیال ہوں کسی اور کا

مجھے سوچتا کوئی اور ہے

اس خیال کو عملی جامہ بنانے کے لیے جن صاحب کو موزوں ترین سمجھا گیا ان کا نام تھا اے،جے،کاردار۔ان کے ساتھ قدرت نے ایک عجیب مذاق کیا تھا۔انہوں نے ایک حقیقت پسند آنہ آرٹ فلم ''جاگو ہوا سویرا'' کے نام سے بنائی تھی۔ اس کے لیے سرمایہ ایک حوصلہ مند فرد نے دیا تھا اس زمانے میں نیورئیل فلمز کا بہت چرچا تھا۔اٹلی میں ،فرانس میں،سوئیڈن میں یہاں تک کہ ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں بھی اس قسم کی فلمیں بن رہی تھیں۔منافع ہو یا نہ ہو اس طرح کی فلمیں بنانے سے عالمگیر شہرت ضرور مل جاتی تھی۔اور اس طرح اس کے ملک کو بھی ایک

اعزاز حاصل ہو جاتا تھا۔اٹلی میں روزے لینی،ڈے سیکا وغیرہ نے اپنی فلموں سے ساری دنیا کو چونکا کر رکھ دیا۔بھارت میں ستیہ جیت رے نے اس حوالے سے بہت نام پیدا کیا۔ان کے دیکھا دیکھی پاکستان میں بھی چند لوگوں نے اس نئی لہر کے مطابق ایسی فلمیں بنانے کے تجربے کیے مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔نہ جانے انہیں لہریں کہاں سے کہاں بہا کر لے گئیں۔ان کے نام گنوانا بھی مفاد عامہ کے حق میں نہیں ہے اس لیے پردے میں ہی رہنے دیجئیے۔

اے ،جے،کاردار صاحب کا پس منظر یہ ہے کہ وہ خالص لاہوریے ہیں۔کاردار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جن میں سب سے ممتاز اور نمایاں نام اے،آر،کاردار کا ہے۔انہوں نے لاہور میں فلم سازی کے ابتدائی تجربات کیے۔لاہور کا پہلا اسٹوڈیو بھی انہوں نے دریائے راوی کے کنارے بنایا تھا۔ایم اسماعیل اور کچھ دوسرے سر پھرے بھی ان کے ساتھ تھے۔کاردار صاحب نے لاہور میں فلم سازی کا آغاز کرنے والوں میں سے ہیں،پھر وہ کلکتہ چلے گئے اور براستہ کلکتہ بمبئی پہنچ کر دم لیا۔اے آر کاردار کو محض فلمیں بنانے کا شوق تھا جو بعد میں ان کا کاروبار بن گیا۔انہوں نے ہمیشہ کمرشل فلمیں بنائیں۔نام بھی کمایا اور پیسے بھی۔شاید اس لیے کہ اس وقت تک رئیلسٹک فلمیں بنانے کا چرچہ نہیں ہوا تھا حالانکہ اس زمانے میں بھی نیو تھیٹرز نے بہت معیاری اور حقیقی زندگی سے قریب خوب صورت فلمیں بنا کر دھومیں مچادی تھیں مگر یہ سب کمرشل فلمیں تھیں۔کاروباری اعتبار سے بھی بہت کامیاب تھیں اور آج تک ناقابل فراموش ہیں ۔مگر اے،آر،کاردار صاحب (عبدالرشید کاردار) اس چکر میں نہیں پڑے۔وہ کامیاب اور معیاری کمرشل فلمیں بناتے رہے۔ایک زمانے میں ہندوستان کے ممتاز ترین فلم سازوں اور ہدایت کاروں میں شمار کیے جاتے تھے۔

اے،آر کاردار صاحب نے جب بمبئی کی فلمی صنعت میں قدم جمالیے تو لاہور کے دوستوں اور رشتے داروں کو بھی فراموش نہیں کیا۔اشفاق ملک صاحب جنہوں نے پاکستان کی فلمی صنعت میں بہت نام اور پیسہ کمایا۔اور ایک فلم اسٹوڈیو بھی بنایا تھا،یہ ان کے بھانجے تھے۔جنہیں کاردار صاحب نے اپنے پاس بمبئی میں بلا کر تربیت کی تھی۔انہوں نے نصرت کاردار کو بھی بمبئی بلا کر فلم ''درد'' کا ہیرو بنا دیا تھا۔یہ فلم سپر ہٹ تھی پر بدقسمتی سے نصرت صاحب کو

دوبارہ ہیرو بننے کا چانس نہیں مل سکا پھر وہ پاکستان آگئے اور کریکٹر ایکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔وہ تعلیم یافتہ ،شائستہ اور بہت ذہین آدمی تھے۔اگر اداکاری کی جگہ کچھ اور کرتے تو بہت کامیاب ہو جاتے مگر انہیں اداکاری کا شوق تھا لہذا ساری زندگی اداکاری کرتے رہے۔وہ ہم سے سینئر تھے اور مگر مہربان اور بے تکلف دوست تھے۔ان کے کئی واقعات ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔

اے جے کاردار نصرت کاردار سے تعلیم میں کم مگر ہوشیاری میں بہت زیادہ تھے۔نصرت کاردار گریجویٹ تھے مگر اے جے کاردار غالباًبی اے بھی نہ کر سکے۔وہ ایک بلند خیال اور ذہین نوجوان تھے۔کچھ کرنے کی امنگ انکے دل میں مچلتی رہتی تھی۔فلم سے انہیں بھی دلچسپی تھی۔انہوں نے لاہور میں ایک فوٹو گرافی کی دکان بھی کھولی تھی۔اور ایڈورٹائزنگ بھی کرتے رہے۔مگر یہ کام ان کی امنگوں کے مطابق نہ تھے۔لہذاوہ بھی ٹکٹ کٹا کر بمبئی چلے گئے۔اور اے آر کاردار کے ساتھ کچھ وقت رہے۔اشفاق کاردار نے تواے آر کاردار سے باقاعدہ ہدایت کاری کی تربیت حاصل کی تھی اور بمبئی میں ایک فلم کی ہدایت کاری بھی کی تھی۔نصرت کاردار کوہدایت کاری کا شوق نہیں تھااس لیے اداکار بن گئے ۔مگراے جے کاردار کوئی فیصلہ نہ کرسکے۔اے آر کاردار صاحب سے انہوں نے کچھ سیکھا یا خود سیکھنے کی کوشش کی یہ کوئی نہیں جانتا۔مگر کچھ عرصے بعد وہ دوبئی سے انگلستان چلے گئے۔وہاں وہ کیا کرتے رہے،کسی فلم انسٹیوٹ سے تعلیم حاصل کی یا پھر کسی ہدایت کار کے ساتھ کام کرتے رہے۔ہاں اتنا ضرور سنا تھا کہ انہوں نے لبنانی دوشیزہ سے شادی کرلی ہے جو کسی وزیر یا وزیر اعظم کی بیٹی ہے۔مگر یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں جن کی آج تک تصدیق نہیں ہوئی ۔نہ ہم نے ان سے پوچھا اور نہ ہی انہیں بتانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

پھر ایک بار غلغلہ بلند ہوا کہ اے جے کاردار انگلستان سے پاکستان آئے ہیں۔وہ ایک حقیقت پسندانہ فلم بنائیں گے ۔بتایا گیا کہ انہوں نے ہندوستان کی فلمی صنعت میں بہت زیادہ کارنامے سرانجام دیے ہیں۔(کارناموں کی تفصیل کا علم نہ ہو سکا)اب وہ عالمی پیمانے پر ایک بہت عظیم فلم بنارہے ہیں جس کے لیے انگلستان سے ایک ماہر کیمرامین مارشل ساتھ آئے ہیں۔اس فلم کیلیے سرمایہ غالباًایک لقمان صاحب نے فراہم کیا تھا۔کاردار صاحب نے ان کو یقین دلایا تھا

کہ اس فلم کی ریلیز کے بعد وہ عالمی شہرت یافتہ ہو جائیں گے۔اور دنیائے فلم کی تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

اس فلم کا نام ''جاگو ہوا سویرا'' تھا۔اخبارات اس فلم کے بارے میں روزانہ خبریں شائع کرنے لگے۔اے جے کاردار نے آتے ہی بہت اونچی سطح کے لوگوں کا تعاون حاصل کر لیا تھا۔فیض احمد فیض اس کا اسکرپٹ لکھ رہے تھے۔نغمات بھی ان ہی کے تحریر کردہ تھے۔کہانی میں مشورہ دینے والے اور بھی بہت نامور ہستیوں کے نام تھے۔دیکھتے ہی دیکھتے اے جے کاردار میڈیا پر چھا گئے۔ان کی خبریں اور انٹرویو شائع ہونے لگے۔کچھ صحافیوں نے ان کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیے۔

اے جے کاردار صاحب سے ہماری بھی ملاقات ہوئی۔وہ جس حلقے میں بیٹھے تھے اس کے کچھ شریک ہمارے بھی دوست تھے۔ہم نے انہیں ایک کم گو اور سنجیدہ انسان پایا۔کم از کم انہوں نے ہمارے سامنے بہت کم گفتگو کی۔

ہمارا خیال تھا کہ اپنی فلم اور ورلڈ سینما کے بارے میں ان سے کچھ تبادلہ خیال ہو گا اور ہماری فلمی معلومات میں کچھ اضافہ ہو گا۔اس زمانے میں غیر ملکی معروف و مقتدر فلمی جرائد بھی پاکستان میں آتے تھے جن کا مطالعہ ہم بہت انہماک سے کرتے تھے۔اور دنیا بھر میں سینما کے سلسلے میں کیا تجربات ہو رہے ہیں۔اور کیسے کیسے لوگ کیا کام کر رہے ہیں ۔یہ جان کر ہمیں بہت خوشی ہوتی تھی اور رشک بھی آتا تھا آخر ہمارا کوئی پاکستانی ایسا کام کیوں نہیں کرتا یا کیوں نہیں کر سکتا؟

اے جے کاردار صاحب کے بارے میں سن کر اور پڑھ کر ہمارے حوصلے بلند ہو گئے اور امنگیں تازہ ہو گئیں کہ اب کوئی بھی پاکستانی بھی اس میدان میں نام پیدا کرے گا۔اے جے کاردار کی تخلیقی صلاحیتوں کا ہمیں زیادہ اندازہ نہیں ہو سکا۔ کیونکہ چند ملاقاتوں میں انہوں نے فلموں اور فلمی تکنیک،اور عالمی رجحانات کے بارے میں کوئی بات نہیں کی لیکن ان کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کے پیش نظر ہم نے ان سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی

تھیں ۔ان کے بڑے بھائی نصرت کاردار بھی ہمیں اپنے چھوٹے بھائی کی خداداحیرت انگیز صلاحتیوں کے بارے میں بہت کچھ بتاتے رہتے تھے اور ہماری توقعات میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔

''جاگو ہوا سویرا''بنتی رہی اور پھر اس کے بارے میں رفتہ رفتہ خبریں بھی کم ہو گئیں۔یہاں تک کہ یہ نمائش کے لیے پیش کردی گئی۔

پاکستان میں بہت سارے لوگوں نے ہماری طرح پہلے ہی شو میں فلم دیکھی تھی۔ایسی ہی تھی جیسے رئیلسٹک فلم کو ہونا چاہیے تھا۔یعنی غربت،افلاس،بیماری،مصائب،مختلف کردار مختلف عوارض میں مبتلا تھے۔ان میں اکثر کھانسے بغیر یا ہانپے بغیر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔اس فلم کا پس منظر مشرقی پاکستان تھا۔مشرقی پاکستان میں اس وقت بھی بہت غربت تھی۔دیہاتی آبادی اتنی کمزور،مریل لگتی تھے جیسے کہ میڈیکل کے طلبا کے لیے یونیورسٹیوں میں ڈھانچے ہوں۔مگر کاردار صاحب نے ان میں سے بے حد مریل اور کمزور کردار ڈھونڈ کے فلم میں پیش کیے تھے جنھیں دیکھ کے حیرت ہوتی تھی کہ آخر یہ کیونکر زندہ ہیں اور چلتے پھرتے کیسے ہیں۔یہ کردار ایک فقرہ کئی منٹ میں ادا کرتے تھے۔اگر ان کو ندی کے کنارے سے جھونپڑی تک جانا پڑتا تھا تو چند گز کا فاصلہ کئی منٹ میں طے کرتے تھے اور اس تمام عرصے میں کیمرا تماشائیوں کو ان کی سست روی کا مظاہرہ دکھاتا رہتا تھا۔اس فلم کی کہانی،مقصد نہ تو اس وقت ہماری سمجھ میں آیا تھا اور نہ ہی بعد میں کسی نے سمجھایا حالانکہ ہم کاردار صاحب کے مداحوں سے دریافت بھی کرتے رہے۔مجموعی طور پر یہ اسی نوعیت کی فلم تھی جیسی اس زمانے میں حقیقت پسندانہ فلمیں بنا کرتی تھیں۔

اٹلی کی فلموں میں غربت کے ساتھ گلیمر بھی ہوتا تھا اس طرح عام فلم بینوں کو بھی دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی مگر برصغیر کی فلموں میں یہ بھی نظر نہیں آیا کرتا تھا۔ستیہ جیت رے کی ابتدائی فلموں کا بھی یہی نمونہ تھا جس پر انہیں بہت سارے اعزازات ملے تھے اور وہ دنیا کے دس بہترین ہدایت کاروں کی صف میں شامل ہو گئے لیکن بعد میں انہوں نے شہری زندگی اور عام لوگوں کے مسائل کے بارے میں بھی فلمیں بنائیں جن میں خوش شکل ہیروئنیں نظر آجاتی تھیں لیکن یہ ان کے اپنے ملک میں بھی فلمیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ہمیں یاد ہے کہ ایک بار بمبئی کے ایک سینما میں ان کی

شہرہ آفاق فلموں کا فیسٹیول منعقد ہوا تھا۔ ہر روز ایک فلم دکھائی جاتی تھی۔ یہ تاریخ ساز فلمیں تھیں لیکن کسی دن کسی ایک فلم کا ایک بھی شو فل نہیں ہو سکا تھا اور بمبئی کے فلم نقادوں اور دانشوروں نے اس بدذوقی پر عوام کے خوب لتے لیے تھے ۔ اگر اے جے کاردار کی فلم ''جاگو ہوا سویرا'' کو بھی عام فلم بینوں نے نہیں دیکھا تو یہ کوئی انوکھی اور انہونی بات نہیں تھی۔ ستیہ جیت رے کی فلموں کے ساتھ ہمسایہ ملک میں ان کے ہم وطنوں نے یہی سلوک روا رکھا تھا۔ دراصل بات یہ تھی (بلکہ اب بھی ہے) یہ غربت و بیماری اور مصائب بھری زندگی مغرب والوں کے لیے ایک عجوبہ تھی جیسے کہ ہاتھی کا مہاوت، بین بجا کر پٹاری سے سانپ نکالنے والا سپیرا اور کیلوں بھرے بستر پر بیٹھا ننگ دھڑنگ جوگی ان کے لیے ایک عجوبہ تھا۔ مگر خود برصغیر کے لوگوں کے لیے تو یہ روزمرہ کی بات تھی۔ وہ صبح شام یہی کردار اور مناظر دیکھتے تھے (آج بھی دیکھتے ہیں) یہاں کی آبادی کی اکثریت بذات خود ایسی ہی دکھ بھری زندگی بسر کرتی ہے۔ وہ ان مصائب اور دکھوں سے کچھ دیر کے لیے نجات حاصل کرنے اور رنگین، خوبصورت، خوشیوں بھری زندگی دیکھنے کے لیے فلمیں دیکھتے ہیں اور تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے ایسے خواب آنکھوں میں بسا کر لے جاتے ہیں ۔ جن سے وہ زندگی بھر محروم رہتے ہیں

اے جے کاردار صاحب کی فلم بھی ایک کلاسیکی فلم قرار پائی۔ پاکستان کے کور ذوق فلم بینوں نے تو اس کو پسند ہی نہیں کیا مگر عالمی فلمی میلے میں اس کو بہت سراہا گیا اور کاردار کو بہت سے اعزازات سے نوازا گیا۔ اس فلم کی سب سے بڑی خوبی اس کی خوبصورت عکاسی تھی۔ اے جے کاردار نے اس قسم کی فلموں کے تمام لوازمات کا پورا پورا خیال رکھا تھا۔

بہرحال۔ اے جے کاردار کی پذیرائی پر سب پاکستانی بہت خوش ہوئے۔ انہیں فخر تھا کہ ہمارے ملک کا ہدایت کار بھی عالمی فلموں میں نمایاں ہوا اور عالمی فلمی افق پر جلوہ گر ہو کر اس نے پاکستانیوں کی عزت رکھ لی۔ لوگوں نے اس صورت حال سے سمجھوتا کر لیا۔ وہ جان گئے کہ وہ ان کی فلمیں دیکھیں یا نہ دیکھیں عالمی سطح پر ان کی فلمیں بڑے ذوق شوق سے دیکھی جائیں گی اور پاکستان کا نام اور اونچا ہو گا۔ عام فلم بینوں نے صبر کر لیا اور سمجھ لیا کہ یہ فلمیں انکے فہم اور شعور سے بالاتر ہیں۔ مگر یقیناً بہت بری فلمیں ہیں جو دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کے لوگوں میں پسند کی جاتی ہیں۔ جس طرح

تجریدی آرٹ عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا مگر جب وہ پڑھے لکھے لوگوں سے اس کی تعریف سنتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پکاسو اور دوسرے تجریدی مصوروں کے شاہکار لاکھوں ڈالرز میں فروخت ہوتے ہیں تو وہ اپنی کم عقلی کو الزام دیتے ہیں مگر اتنا ضرور جانتے ہیں یہ پڑھے لکھے دولت مند لوگوں کے لیے ہیں۔ عام غریب لوگوں کے ساتھ ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

''جاگو ہوا سویرا'' کی عالمی پذیرائی کے بعد پاکستان میں اے جے کاردار کا بہت بڑا نام ہو گیا تھا۔ سب ان پر فخر کرنے لگے تھے اور مستقبل میں ان کی کامیابیوں کی توقع وابستہ کرنے میں حق بجانب تھے۔

اے جے کاردار اپنی کامیابیوں کے جھولوں میں جھولتے رہے اور نئے نئے منصوبے بناتے رہے۔ ان کا اگلا منصوبہ ''دور ہے سکھ کا گاؤں'' تھا۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے یہ بھی ایک خالص حقیقت پسندانہ فلم تھی۔ اس بار مشرقی پاکستان کی فلم ڈیولپ منٹ کارپوریشن بھی اسی منصوبے میں شامل تھی۔ حسب معمول مارشل ہی اس کا عکاس تھے۔ فیض صاحب کا نام بھی اس سے وابستہ تھا اور دوسرے بڑے بڑے نام بھی شامل تھے۔ مگر بدقسمتی سے یہ فلم مکمل نہ ہو سکی، فلم کا بجٹ ختم ہو گیا مگر فلم کی شوٹنگ مکمل نہ ہوئی۔ کاردار صاحب مشرقی پاکستان جا کر اس کی شوٹنگ کرتے رہتے تھے۔ مگر اس کا نیگیٹو تک مغربی پاکستان نہیں لا سکتے تھے۔ اس کے لیے رقم ادا کرنا ضروری تھا جو دستیاب نہ تھی۔

اس زمانے میں ہماری کاردار صاحب سے زیادہ ملاقاتیں رہیں۔ وجہ یہ تھی کہ لاہور میں کوڈک فلمز کے دفتر کے اوپر کچھ خوش ذوق تعلیم یافتہ لوگوں نے فلم انسٹیٹیوٹ کے نام سے ادارہ بنایا تھا۔ اور یہاں فلم کے شوقین اکٹھے ہو کر فلم کے بارے میں باتیں کرتے تھے اور دنیا سے آئے ہوئے بلند پایہ فلمی جرائد کا مطالعہ کرتے تھے۔ ایک لحاظ سے یہی کاردار صاحب کا ہیڈ آفس تھا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔دوپہر کے وقت نان کباب منگوا کر کھائے جاتے تھے۔یہ کیمرا مین مارشل کا پسندیدہ لنچ تھا۔نان کباب کھا کر وہ ننگے فرش پر اخباروں کا سرہانہ بنا کر گرم آگ برساتے موسم میں بڑے آرام سے قیلولہ کرنے کے لیے سو جاتے تھے۔ہم نے بہت کریدا مگر اے جے کاردار کی کم گوئی کی دیوار کو عبور نہ کر سکے۔فلم کے بارے میں ان سے تبادلہ خیال کرنے اوران کے افکار جاننے کا ہمیں کبھی موقع نہیں مل سکا۔دوسرے لوگ ان سے بے حد مرعوب تھے مگر ہم کو مایوسی ہوئی تھی۔

مارشل بہت عوامی قسم کے انگریز تھے۔انگلستان کے ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔عکاسی کا انہیں دیوانگی کی حد تک شوق تھا بلکہ یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔لاہور کی شدید گرمی میں بھی وہ تانگے میں سفر کرتے تھے۔نان کباب کھاتے تھے۔دیسی جم خانہ شراب پیتے تھے اور بہت خوش اور مگن رہتے تھے۔جم خانہ وہسکی انہیں اتنی پسند تھی کہ وہ اپنی قیمتی اسکاچ وہسکی کی بوتل دے کر سستی جم خانہ کی بوتل لے لیتے تھے۔اوراس سودے پر خوش بھی ہوتے تھے۔ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ اچھا خاصا انگریز جو کہ بہت اچھا عکاس بھی ہے۔ساری دنیا چھوڑ کر اے جے کاردار کے ساتھ صعوبتیں کیوں برداشت کر رہا ہے۔لاہور اور مشرقی پاکستان کی گرمی کو انگلستان کے رنگین موسم پر کیوں ترجیح دیتا ہے؟ آخر ہم ایک دن یہ راز جان ہی گئے۔

بات یہ تھی کہ انگلستان کی سینما گرافی کی انجمن کا رکن بننے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی عکاس قومی یا بین الاقوامی سطح پر کوئی امتیازی کام کر کے دکھائے۔اس کے بعد ہی وہ ایسوسی ایشن کا رکن بن سکتا ہے اور پھر اس کے لیے تمام دروازے کھل جاتے تھے۔کیا وہ ایک مستند کیمرا مین بننے کے لیے یہ سب پاپڑ بیل رہا تھا۔

''دور ہے سکھ کا گاؤں''ہنوز دور ہی ہے بلکہ اب تک اس کا نیگیٹو تک خراب ہو چکا ہو گا۔ان ہی دنوں ہم ایک بار ڈھاکہ گئے تو فلم ڈیویلپ منٹ کارپوریشن کے مینیجنگ ڈائریکٹر سے درخواست کی کہ ہمیں''دور ہے سکھ کا گاؤں'' کے رش پرنٹ دیکھنے کی اجازت دی جائے۔ان سے ہمارے بہت اچھے ذاتی مراسم تھے۔کیونکہ ہم نے ان کی بیگم کے سکول

کے لیے چندا اکھٹے کرنے میں بہت مدد فراہم کی تھی، اور لاہور سے میڈم نور جہاں، اعجاز درانی، نیلو اور رتن کمار کو راضی کر کے شو پیش کرنے کے لیے ڈھاکہ لے گئے تھے۔

فلم کے رش پرنٹ دیکھ کر میں فلم کی کہانی اور موضوع کا تو کچھ اندازہ ہو سکا مگر اس کی لاجواب عکاسی اور چند مناظر کی خوبصورتی نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ ندی کے پانی میں گرتی ہوئی بارش کی بوندیں، ساحلی علاقوں کا حسن، تیز طوفانی ہواؤں میں جھومتی ہوئی تناآور درختوں کی شاخیں، طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے پس منظر میں فلمائے ہوئے منظر بے حد حسین تھے۔ ٹیمپو اس کا بھی بہت سست ہی تھا مگر ''جاگو ہوا سویرا'' کے مقابلے میں قدرے تیز لگا۔ ممکن ہے فلم کی تکمیل کے بعد یہ بھی سست ہو جاتا۔ ماحول اس فلم کا بھی دکھ سے بھرا ہوا تھا۔ ظاہر ہے جب اس کا نام ہی ''دور ہے سکھ کا گاؤں'' تھا تو دکھوں کا اندازہ خوبی لگایا جا سکتا تھا۔

فلم نامکمل ہی رہی اور فلمی نقاد اور عالمی فلموں کے میلے اے جے کاردار کا اگلا شاہکار دیکھنے سے محروم ہی رہ گئے۔

اے جے کاردار پھر ایک دفعہ پاکستان سے غائب ہو گئے پھر ایک روز خبر آئی کہ پاکستان فضائیہ ایک فلم بنا رہی ہے جس کے ہدایت کار کے طور پر اے جے کاردار کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ اس طرح اے جے کاردار ایک بار پھر بڑی دھوم دھام سے پاکستان تشریف لائے۔ معلوم ہوا کہ یہ فلم رئیلیسٹک نہیں ہو گی کیونکہ پاکستانی فضائیہ کی کارکردگی اور مہارت کو دلچسپ، دلکش اور کمرشل انداز میں دکھانا اس کا مقصود ہے۔ اس فلم کے مصنف اور نغمہ کار بھی حسب سابق فیض احمد فیض صاحب ہی تھے۔ کیمرا مین مارشل ہی تھے۔ موسیقی مرتب کرنے کے لیے رفیق غزنوی صاحب کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ وہ فلمی موسیقی بلکہ برصغیر کی موسیقی کا ایک بہت بڑا نام ہیں۔ فلم کے کمرشل ہونے کا اندازہ اس کی کاسٹ سے بھی ہو گیا۔ اس فلم میں شبنم اور طارق عزیز مرکزی کردار تھے۔ مشرقی پاکستان کی نوخیز اداکارہ روزی اور کراچی کی چنچل ابھرتی ہوئی ہیروئن روزینہ بھی کاسٹ میں شامل تھیں۔ اور لوگوں کے نام دیکھ کر یہ توقع ہوئی کہ یہ فلم لازماً کمرشل ہو گی۔ لیکن اے جے کاردار ''جاگو ہوا سویرا'' کے گنبد میں بند تھے۔ عالمی میلوں میں اعزاز حاصل کرنے کا نشہ ابھی تک نہیں اترا تھا۔ انہوں نے اس وقت تک بس حقیقت پسندانہ فلمیں ہی بنائی تھیں

۔کمرشل فلم بنانے کا نہ ہی ان کو اندازہ تھا نہ ہی ارادہ تھا۔ بہر حال یہ فلم جس کا نام ""قسم اس وقت کی"" رکھا گیا تھا بہت بڑے پیمانے پر شروع کی گئی تھی۔نہ پیسے کی کمی تھی اور نہ ہی وسائل یا سہولتوں کی۔

اس فلم کے لئے اعلیٰ ترین جیٹ فائٹر طیارے ایک اشارے پہ یوں حاضر ہو جاتے تھے جیسے سڑکوں پہ موٹر رکشہ۔ایئر فورس کے میس،اعلی پایہ کے ہوٹل،کلب، تمام سرکاری وغیر سرکاری ادارے خدمت کے لیے ہر وقت حاضر تھے۔ غرضیکہ ہر سہولت مہیا کی گئی تھی جس کا کوئی ہدایت کار تصور کر سکتا ہے اور پاکستانی ہدایت کار تصور تک نہیں کر سکتا۔ یہ فلم مشرقی اور مغربی پاکستان میں بنتی رہی اور ہدایت کار کے اشاروں پہ طیارے مکھیوں کی طرح اڑتے رہے۔اخبارات نے ایک مرتبہ پھر اودھم مچادیا کہ اس فلم کو دیکھ کر ساری دنیا پاکستان فضائیہ کی ہنر مندی اور ہوا بازوں کی مہارت دیکھ کر دنگ رہ جائے گی۔اس فلم کے لیے جنگی طیاروں کی ""ڈاگ فائٹ"" کا بھی اہتمام کیا گیا۔ماہر ترین ہوا باز اپنے کرتب دکھانے کے لیے ہمہ وقت کمر بستہ رہے۔رہے فنکار تو وہ بھی دل و جان سے تعاون کر رہے تھے۔یہ کسی فلم ساز کی نہیں بلکہ پاکستان فضائیہ کی فلم تھی ۔ کس کی مجال تھی کہ مکمل تعاون نہ کرتا۔ فلم میں دو گانے بھی شامل تھے جو فیض نے لکھے تھے۔رومانی مناظر بھی تھے جن میں ہیروئن گھر کی چھت پہ اور ہیرو جنگی جیٹ پہ سوار ہوا سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے آسمان پر ہوائی جہاز کو قلابازیاں لگواتا رہتا تھا۔کئی مناظر میں تو ہیروئن اپنا ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتی تھی کہ ہوائی جہاز ""زن"" سے گزر جاتا تھا۔شکر ہے کہ یہ فلم مکمل ہوگئی اور نمائش کے لیے بھی پیش کر دی گئی۔فلم بین سینما گھروں پہ ٹوٹ پڑے۔آخر قابل فخر فضائیہ کے کارناموں پر مبنی فلم تھی۔حب الوطنی کا جذبہ انہیں جوق در جوق لے گیا پر فلم دیکھنے کے بعد ان کا جذبہ سرد پڑ گیا۔یہ فلم نہ ہی دستاویزی تھی نہ ہی کمرشل۔کہانی میں بھی دیکھنے والوں کو دلچسپی اور ربط نظر نہیں آیا۔

بڑے بڑے ناموں کی وجہ سے جو توقعات پیدا ہو گئی تھیں وہ کرچی کرچی ہو کر رہ گئیں۔ ""قسم اس وقت کی"" ہر لحاظ سے ایک مایوس کن فلم ثابت ہوئی۔عوام تو بے شک جاہل،بے شعور اور بدذوق ہیں مگر دانشوروں اور نقادوں نے بھی اسے پسند نہیں کیا۔یہاں تک کے اے جے کاردار کے مداح بھی منہ لٹکاتے نظر آئے۔

پاکستان کی فلمی دنیامیں آنے والے دوافراد نے ہلچل مچاد تھی۔ان میں سے ایک اے جے کاردار ہیں اور دوسرے محمود سپرا۔سالہاسال بعد محمود سپرا بھی سلمی آغا کے ہمراہ اسی تزک واحتشام کے ساتھ پاکستان تشریف لائے تھے اور میڈیا نے انہیں سر آنکھوں پہ بٹھایا تھا۔ان دونوں کو دیومالائی شخصیت بنادیا گیا تھا۔ محمود سپرا کی کہانی بھی اے جے کاردار سے ملتی جلتی ہے۔وہ لاہور اور کراچی میں ایڈورٹائزنگ اور دوسرے غیر اہم کام کرتے رہے پھر انگلستان چلے گئے۔

کافی عرصے بعد یہ خبریں آنے لگیں وہ کروڑپتی (پاؤنڈوں میں) ہوگئے ہیں۔ہالی وڈ میں بھی فلمیں بناتے ہیں ۔انگلستان کی فلمی صنعت میں بہت ممتاز ہیں۔وہ بھی ایک فلم بنانے کی غرض سے پاکستان آئے تھے۔یہ انگریز ہنر مندوں اور بہت سارے انگریز کرداروں پر مشتمل تھی۔ حکومت نے سپرا صاحب کے لیے سب بند دروازے کھول دیے۔منہ مانگی ان کو ہر سہولت فراہم کی گئی۔ان کا فلم یونٹ انگلستان سے آیا تو سنا کہ پینے کا پانی بھی وہیں سے بر آمد کیا گیاہے۔اصیل گھوڑے ،قدیم اسلحے اور دیگر لوازمات ٹرکوں میں بھر کر لائے گئے مگر یہ فلم مکمل تو کیا ہوتی ڈھنگ سے شروع بھی نہ ہو سکی۔اسلام آباد کے ہوٹلوں کا لاکھوں کا بل اور انگلستان سے درآمد شدہ گھوڑے یہیں گروی پڑے رہ گئے اور محمود سپرا صاحب واپس چلے گئے ۔مگر یہ ایک علیحدہ کہانی ہے اور کافی تفصیل سے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ۔اے جے کاردار صاحب نے کم از کم دو فلمیں مکمل تو کیں جن میں سے ایک کو عالمی اعزازات بھی حاصل ہوئے۔اس کے بعد وہ پھر انگلستان کی دھند میں غائب ہوگئے۔فلموں کے حوالے سے پھر ان کا نام کسی نے نہیں سنا ۔خدا جانے وہ کیا کر رہے ہیں۔کہاں ہیں۔کس حال میں ہیں۔۔۔؟اور مارشل کو اس کے خوابوں کی تعبیر ملی ہے کہ نہیں؟

یہ بھول جایئے اور اشفاق نقوی صاحب کی داستان سنئیے۔یعنی ""قسم اس وقت کی"" کی کہانی۔۔۔اشفاق نقوی صاحب کی زبانی۔

زندگی کا ایک خاص حصہ گزر جانے کے بعد جب آدمی اپنے ماضی کی طرف نظر دوڑاتا ہے تو اس کو مختلف قسم کی تصویریں نظر آتی ہیں جنہیں دیکھ کر کبھی وہ خوش ہو جاتا ہے اور کبھی شرما جاتا ہے۔ہم نے جب اپنی بیتی ہوئی زندگی کی

بہت ساری جھلکیاں دیکھیں تو ہمیں کم از کم ایک ٹکڑے پر نہ خوشی ہوئی اور نہ ہی ندامت ہوئی، بس کھسیانے سے ہو کر رہ گئے۔

یوں تو ہم نے زندگی بھر بھانت بھانت کے کام کئے، سمندر میں پھلانگے اور خشک رہے، خشکی پر لیٹے تو بھیگ گئے، مگر ایک دفعہ ہم ایسے بھنور میں جھونکے گئے کہ پورے ڈیڑھ سال تک اس کی گردش میں رہنا پڑا اور حیرت یہ ہے کہ بچ بھی نکلے۔ آیئے یہ داستان بھی سنیئے۔

یہ قصہ ان دنوں کا ہے۔ جب ائیر مارشل نور خان پاک فضائیہ کے سربراہ تھے انہیں اچانک ایک فلم بنانے کی سوجھی ۔ بالکل کمرشل فلم وہ جو سکرین پہ دکھائی جاتی ہے۔ اس کا اولین مقصد تو فضائیہ کی پروجیکشن تھا اور ساتھ ہی ملکی یک جہتی کا خیال بھی رکھا گیا تھا۔ کہانی کچھ اس طرح تھی کہ مغربی پاکستان کا ایک نوجوان، یعنی ہیرو فضائیہ میں فلائٹ لیفٹیننٹ ہے اور مشرقی پاکستان کی رہنے والی ہیروئن فوج میں نرس بن کر پشاور میں تعینات ہے۔ کس طرح دونوں کی نگاہیں لڑ جاتی ہیں۔ ادھر ہیرو کی بہن اس کے ایک مشرقی پاکستانی دوست اور فضائیہ کے دوست سے عشق فرمانے لگتی ہے۔ (فلم میں ان کا ایک دوگانا بھی ریکارڈ کیا گیا جو کہ آدھا اردو میں اور آدھا بنگالی میں تھا)

اب چونکہ ان دنوں ہم بھی فضائیہ میں جھک مار رہے تھے تو اچانک ہم پر ایک روز حکم نازل ہوا کہ یہ فلم تم بناؤ گے یعنی بندہ حقیر کی تقدیر میں یہ بھی لکھا تھا کہ فلاں فلاں گھڑی اس کو فلم کی دنیا میں کوچ کرنا پڑے گا۔ اب مجبوری تھی، ہم اس دنیا میں داخل ہو ہی گئے اور بخیر و عافیت لوٹ بھی آئے، مگر صرف لوٹ آنے کی حد تک۔ اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں جو ہم پر بیتی وہ ہم ہی جانتے ہیں۔

ہم نے اے جے کاردار کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوا تھا کہ بہت ماہر فلم ساز ہے، دنیا کے دس بہترین ڈائیریکٹرز میں شمار ہوتا ہے۔ انگلستان میں باقاعدہ ٹریننگ حاصل کر چکا ہے اور اس کی بنائی ہوئی فلمیں بین الاقوامی میلوں میں انعام بھی حاصل کر چکی ہیں۔ اس کی بیوی ایک لبنان کے وزیر کی بیٹی ہیں اور ایک زمانے میں مس لبنان بھی رہ چکی ہیں

،وغیرہ ۔۔۔اوردوسری جگہ یہ بھی مشہور تھاکہ وہ دوسری جنگ عظیم میں لبنان کی طرف سے بحری افسر رہا ہے۔جنگ کے ختم ہونے کے بعد جب وہ رہاہو کراے آر کاردار کے پاس بمبئی پہنچاتواس نے اسے مدراس بھیجاتاکہ وہاں سے کچھ وصولی کرلائے۔مگر وہ ایسا کیا گیاکہ کئی ماہ تک غائب رہا۔معلوم ہواکہ وہ سر منڈواکرایک آشرم میں سادھوبن کے بیٹھاہواہے۔ قصہ کوتاہ اس کے بارے میں جوکچھ بھی سناوہ ایک شریف آدمی کو خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھااور ہم خود کو شریف آدمی ہی سمجھتے تھے،بلکہ اب تک سمجھتے ہیں۔

کاردار نے اپنی مدد کے لیے ایک نائب بھی چن رکھا تھا،ثناءاللہ گنڈاپور۔وہ کبھی نیف ڈیک کالاہور میں مینجر بھی بن گیا ۔ کیمرہ مین مرون مارشل تھا۔اس کا تعلق توانگلستان کے کسی امیر گھرانے سے تھامگر فوٹو گرافی کاشوق اسے لے ڈوبا۔اس نے باقاعدہ ٹریننگ حاصل کرکے کیمرامین کاپیشہ اختیار کرلیا ۔اس کا یہ شوق جنون کی حدتک بڑھاہواتھا ۔لوگ مذاق میں اس کے بارے میں کہاکرتے تھے کہ اگرمارشل کوسڑک پر جاتے ہوئے کوئی آدمی دکھائی دے تووہ بڑھ کراسے روکنے کی بجائے فوراًاپنا کیمرانکال کراس کی فلم بنانی شروع کردے گا۔

اس کی بیوی کراچی میں رہتی تھی اس سلسلے میں ایک مرتبہ اس نے ہمیں شکایت بھی کی۔کہنے لگی کہ جب مجھے معلوم ہوتاہے کہ کئی روز باہر رہنے کے بعد وہ فلاں دن گھر آئے گاتو میں اس روز خاص طرح کے بال بنواتی ہوں اور میک اپ کر کے بیٹھ جاتی ہوں مگر جب یہ گھر میں داخل ہوتاہے توہیلو کہہ کر فرش پہ بیٹھ جاتاہے اوراپنے کیمرے نکال کران کے لینز صاف کرنے شروع کردیتا ہے۔میری طرف دیکھتا بھی نہیں ہے۔

خیر اس بے اعتنائی کااس محترمہ نے بڑے اچھے طریقے سے بدلہ لیامگر وہ ایک الگ داستان ہے۔

یہ توجملہ معترضہ تھا ۔اب ہوایوں کے ہمیں اس دیوانے کے ساتھ نتھی کردیا گیا۔اس کے ذمے یہ کام تھاکہ وہ فلم ڈائیریکٹ کرے اور ہمارے ذمے یہ کام تھاکہ فلم کاکام کرتے ہوئے اسے جو بھی درکار ہو ہم نے اسے فراہم کرناہے۔ ہم فلم کے پروڈکشن مینیجر بنادیے گئے۔یہ فلم توپشاور میں ہوئی مگر رفتہ رفتہ آگے کھسکتی رہی ۔یہاں تک کے اس

زمانے کے مشرقی پاکستان تک جا پہنچی۔ ظاہر ہے ہم بھی اس کے ساتھ ساتھ کھسکتے رہے بلکہ گھسٹتے رہے اور نتیجے میں کوئی پچیس پاؤنڈ وزن کھو بیٹھے۔

پہلے تو ہم نے اس کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنا شروع کی جوں جوں اضافہ ہوتا رہا ہماری پریشانی میں اضافہ ہوتا رہا۔

اول تو اسی خبر نے مرعوب کر کے رکھ دیا کہ فلم کی کہانی لکھنے والوں میں پروفیسر احمد علی اور زیڈ اے بخاری جیسے لوگ ہیں اور نغمہ نگاروں میں فیض احمد فیض۔ مگر آگے چل کر جب ہم نے فلم میں کام کرنے والوں کی فہرست دیکھی تو بھونچارہ گئے۔ اس زمانے کی فلمی دنیا کا کون سا بڑا نام تھا جو اس میں شامل نہیں تھا۔ شبنم، سورن لتا، فریدہ خانم، روزینہ، صاعقہ، مینا شوری، طارق عزیز، شہزادی تاج، مشرقی پاکستان سے روزی اور دو مرد اداکار۔ خدا کی پناہ ان کے علاوہ جو آرٹ ڈائیریکٹر تھی جس کے ذمے میک اپ اور مختلف لباس تجویز کرنے کا کام تھا وہ تھی بین الاقوامی شہرت یافتہ مصورہ لیلیٰ شہزادہ۔ اسے ہم نے بہت عرصہ پہلے جونا گڑھ میں دیکھ رکھا تھا۔ اس کے والد علی بھائی جویری یعنی جوہری ساتھ والی ریاست جام نگر میں رہتے تھے اور ہندوستانیوں کے پرل کنگ (سچے موتیوں کے بادشاہ) مشہور تھے۔ وہ بحری جہاز کو لے کر سمندروں میں کھنگالتے اور ان کی تہہ سے موتیوں کو نکالتے تھے۔ انہیں ایک مرتبہ جونا گڑھ کے دیوان (وزیر اعظم) نے مدعو کیا اور وہ اپنی انگریز بیوی اور بچیوں لیلیٰ اور نور جہاں سمیت وہاں آن پہنچے۔ یہ دونوں وہاں گھڑ سواری سے دل بہلانے لگیں۔ ان دنوں ہم بھی جونا گڑھ لانسرز میں لیفٹیننٹ تھے۔ اور کبھی کبھی گھوڑا دوڑاتے ان کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔ لیلیٰ تو اس کے بعد تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ چلی گئی اور بعد میں ایک عیسائی پائلٹ سے ساتھ شادی کر لی مگر جب یہ فلم بنی تو وہ اپنے پہلے شوہر کو چھوڑ کر سیاسا ایڈورٹائزنگ والے شہزادہ احمد شاہ سے شادی کر چکی تھی۔ اسے لال مین کہہ کر پکارتی تھیں۔ باقی رہی اس کی بہن نور جہاں تو وہ پاکستان کے اوائلی ایام میں اپنی چھوٹی سی سرخ رنگ کی کار کا ہڈ اتار کر کراچی کے صدر بازار میں بلاوجہ چکر کاٹتی اور دیکھنے والوں کو ترساتی۔ اس نے بعد میں ایک چھوٹے موٹے ایکٹر سے شادی کر لی۔

ہاں تو، یہ فلم بنانے کے سلسلے میں ہماری اولین ڈیوٹی تھی کہ ان کے تمام فلمی ستاروں کو سنبھالیں، ان کے قیام اور طعام کا انتظام کریں۔ اور ان کے ناز نخرے اٹھائیں اور اس کے ساتھ یہ بھی حکم تھا کہ انہیں شوٹنگ کے وقت پہ پہنچائیں ۔آخری بات کا یہ قبیلہ بالکل بھی عادی نہ تھا یہ عادی تھا تو بس لاڈ کرنے کا اور لاڈ اٹھوانے کا۔

پہلا مرحلہ انکے قیام کا تھا۔ پشاور ایک چھوٹا سا شہر اور اتنے بڑے بڑے مہمان! مگر ڈیوٹی آخر دیوٹی تھی، ان کی رہائش کا انتظام کرنا ہی پڑا۔ ڈین ہوٹل میں کمرے لے کر خواتین کو وہاں فٹ کیا۔ طارق عزیز اور دو بنگالی ایکٹروں کو آفیسر میس میں ٹھہرایا اور خود کاردار اور دیگر اس کے عملے کو پشاور کلب کے حوالے کر دیا۔ لیلیٰ نے کوئی پرابلم پیش نہ کی۔ وہ ائیر مارشل نور خان کی عزیزہ۔۔۔ تھی اس لیے ائیر ہاؤس میں چلی گئی۔ اس وجہ سے ہماری شان تو بڑھ گئی پر لوگوں نے اس پر حسد کرنا شروع کر دیا کیونکہ ہم کھلے بندوں سے ان کے گھر میں داخل ہو سکتے تھے۔ چاہے رات کے دو ہی کیوں نہ بجے ہوں۔ آخر لیلیٰ کو لانا اور واپس چھوڑنا بھی تو ہمارے ہی ذمہ میں تھا۔ ویسے لیلیٰ ہم پر کچھ زیادہ مہربان ہی ہو گئی تھی۔

مہمانوں کو ٹھکانے لگا تو دیا مگر شامت آگئی ہماری۔ دن میں چار مختلف مقامات کا چکر لگانا پڑتا۔

پشاور کی عوام کو جونہی خبر ملی کہ ان کے شہر میں ایسی شہرہ آفاق ہستیاں نازل ہو گئی ہیں تو انہیں شوق دیدار نے برانگیختہ کر کے ہمارے لیے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا یعنی ان نامور ہستیوں کو نگاہ بد سے بچانے کا۔ اس سلسلے میں پولیس کی مدد طلب کی جو مل تو گئی مگر بذات خود ایک مصیبت ثابت ہوئی۔ سپاہی جو تعینات کیے گئے وہ بھی تو بچارے دل پشوری کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے خود بہانے بنا بنا کر ان کے کمروں میں جانا شروع کر دیا اور اسی پہ اکتفا نہیں اور اپنے دوستوں کو بھی دعوت دیدار دینے لگے۔ شبنم کے ساتھ تو خیر اس کا میاں روبن گھوش تھا اور ایک آدھ اور بھی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی بڑی بی کو ساتھ لے آئی تھیں مگر وہ جو غلطی سے تنہا آ گئیں وہ پریشان ہونے لگ گئیں۔ اور ہمارے سامنے شکایات کے انبار لگنا شروع ہو گئے۔ اس طرح ہماری ڈیوٹی میں ایک اور اضافہ ہو گیا کہ ان کی اشک شوئی کرنا۔ ان کو یقین دلانا کہ ان کا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، بس بیچارے زیر دیوار کھڑے ہیں تیر اکیا لیتے ہیں وغیرہ۔

ان حالات سے تنگ آکر ہم نے کاردار بھائی سے کہا کہ ان پری نما چہروں سے جلدی چھٹکارا حاصل کرو۔ جس کا کام نہ ہوا سے واپس لاہور بھیج دو۔ آخر پشاور کو نسا دور ہے جس روز شوٹنگ ہو فلائٹ کے ذریعے بلا لو تاکہ شام کو اپنے گھر لوٹ جائیں۔ شکر ہے کہ بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ میں نے بیشتر کو وہاں سے روانہ کر کے سکھ کی سانس لی۔

فلم کی شوٹنگ ہوتی رہی اور ہم صبح شام ہوائی اڈے سے لے کر آتے جاتے رہے۔ ایک دفعہ ہم کسی پری نما چہرے کو ہوائی اڈا سے لے کر آرہے دیکھا کہ ہماری بیگم پیدل جا رہی ہے۔ ہم نے گاڑی روک کر ساتھ بیٹھنے کو کہا تھا تو اس نے منہ بنا کر اور تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔

ایک صبح صاعقہ کی آمد تھی، باقی تمام عملہ موقع واردات پر پہنچ چکا تھا۔ ہمیں اسے ہوائی اڈے سے سیدھے پہنچانا تھا۔ سین کچھ اس طرح تھا کہ پشاور کے ایک پرانے مکان کی چھت پر صاعقہ اور روزینہ کھڑی ہیں، اوپر سے فضائیہ کے تین طیارے گزرتے ہیں جنہیں دیکھ کر یہ دونوں ہاتھ ہلاتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے تین فائٹر پشاور کے رن وے پر کھڑے تھے۔

صاعقہ جہاز سے اتری تو انہیں آگے بڑھ کر کار کی طرف لے جانے لگے تو اس کی باجی بول اٹھی ”لڑکی کی طبیعت خراب ہے جہاز میں قے کرتی رہی ہے۔“ اب تو ہم جان چکے تھے کہ اس قے کا طبیعت کی خرابی سے کوئی تعلق نہیں، پرواز کے دوران ایک آدھا جھٹکا لگے تو ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ مگر وہ کہاں ماننے والی تھیں کہنے لگیں شوٹنگ بعد میں دیکھی جائے گی پہلے لڑکی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر چلیں۔ ہم برے پھنسے۔ ادھر اس کے انتظار میں شوٹنگ نہیں ہو سکتی ادھر اس کا یہ اصرار۔ چار و ناچار ہم اندر گئے اور ڈاکٹر صاحب سے سرگوشی کی کہ جو مریضہ لے کر آیا ہوں اس کی طبعیت میں کوئی خرابی نہیں، بس جلدی سے تسلی کے لیے کوئی ہلکی سی دوا دے دو تاکہ شوٹنگ میں تاخیر نہ ہو۔ انہوں نے اثبات پر سر ہلا دیا اور مریضہ کو اندر لے گئے اور ہمیں باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ چلو کوئی بات نہیں ہم باہر آگئے اور انتظار کرنے لگے ۔ جب وہ انتظار ایک حد سے بڑھنے لگا تو ہم باہر آگئے۔ ادھر ادھر ٹہلتے رہے اور جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اندر دروازہ کھول کر جا دھمکے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ مریضہ کے بازو پر پٹی باندھے اس کا بلڈ پریشر چیک کر رہے

تھے۔ ہم پر نظر پڑی تو باہر جانے کا اپنی آنکھوں سے حکم صادر کیا۔ ہم تو اپنا سر پکڑ کر رہ گئے۔ ہم جتنی بھی جلدی میں تھے ڈاکٹر صاحب اتنی ہی دیر کر رہے تھے۔ کوئی مزید آدھ گھنٹے کے بعد مریضہ کمرے سے باہر نمودار ہوئی۔ ہاتھ میں کوئی ایک پرچی تھی جس پر درجن بھر دوائیاں لکھی ہوئی تھیں جنہیں بنواتے بنواتے کوئی آدھ گھنٹہ اور صرف ہو جاتا ۔ ہم نے اپنے معزز مہمانوں سے درخواست کی کہ شوٹنگ کے لیے چلیں ہم دوائی پھر آ کر لے جائیں گے۔ کہنے لگی پہلے دوا لیجئیے ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ میرے سامنے آ کر کھانا! ہائے ڈاکٹر تیرے صدقے (ویسے یہ ڈاکٹر پانچ وقت کے نمازی کیا تہجد گزار بھی مشہور تھے)

خیر، یہ شوٹنگ کسی طور اس روز مکمل ہو ہی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ کاردار بار بار کٹ کا نعرہ لگاتے کیونکہ جہاز اوپر سے اتنی تیزی سے گزرتے کہ کبھی ایک لڑکی ہاتھ اٹھانے میں تاخیر کر دیتی کبھی دوسری۔ بس وائرلیس کے لیے جہازوں کو بار بار کہنا پڑتا کہ ایک چکر اور لگاؤ۔ اس وجہ سے اتنی دیر ہو گئی کہ صاعقہ لاہور گھر اپنے واپس نہ جا سکی۔

اس رات بستر استراحت پر لٹانے کے بعد ہم اپنے گھر جاتے ہوئے آفیسر میس میں سے گزرے۔ رات کے کوئی 11 بج رہے تھے۔ دیکھا کہ میس کے بار میں بتیاں جل رہی ہیں۔ ہمیں بڑی حیرت ہوئی کیونکہ بار تو رات 10 بجے بند کرنے کا حکم ہوتا ہے ۔ ہم گاڑی روک کر اندر گئے تو وہ تینوں پائلٹ جنہوں نے لڑکیوں کے اوپر سے پرواز کی تھی وہاں اپنے غم غلط کر رہے ہیں۔ ہم دیکھتے ہی پھٹ پڑے ''سر'' آپ نے مروا دیا۔ ہم سے بار بار چکر لگوائے مگر وہ لڑکیاں ہمیں دکھائی تک ہی نہیں دیں۔'' ہم فوراً جلال میں آ گئے۔

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' ہم نے کہا'' بار مت بند ہونے دینا ہم بھی ان کو لے کر آتے ہیں۔''

ہم واپس ڈین ہوٹل آئے، روزینہ اور صاعقہ کو جگا کر فوراً تیار ہونے کا حکم دیا اور انہیں جیپ میں بٹھا کر واپس آفیسر میس آ گئے۔ لڑکوں کی تو باچھیں نکل گئیں اور وہ خوشی سے میوزک اونچا چلا کر ڈانس کرنے لگ پڑے۔ ان میں سے ایک تو آگے چل کر ائر چیف مارشل اور فضائیہ کا سربراہ بھی بنا۔ روزینہ یہ سمجھی کہ ہم ان کو کسی ذاتی غرض سے جگا کر

لائے ہیں۔ وہ ہمارے برابر کاؤنٹر کے اونچے اسٹول پر بیٹھی اپنا پاؤں بڑھا کر ہماری ٹانگ ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگی ۔ہم نے فوراً ڈانٹ دیا۔اگر اسکی یہ حرکت برداشت کر لیتے تو وہ کل ہمارا حکم کیسے مانتی۔

اب کچھ مینا شوری کے بارے میں سنیئے۔یہ محترمہ جتنے دن شوٹنگ چلتی رہی پشاور میں ہی براجمان رہیں۔گجرات کی یہ الھڑ پہلے پہلے مینا کے نام سے فلم سکندر اعظم میں آئی اوراس کے مکھڑے کے کالے تل پر دنیا فریفتہ ہو گئی۔بعد میں لارا لپا گرل کے نام سے مشہور ہوئی ۔مگر یہ سب باتیں اس وقت کی ہیں جب آتش جوان تھا۔اب تو پلوں کے نیچے سے بہت سارا پانی گزر چکا تھا۔ان دنوں تو اسے دیکھ کر یہی لگا کہ وہ شدید ذہنی کوفت میں مبتلا ہے۔بار بار اپنے اس بیتے ہوئے زمانے کو یاد کرتی۔''میرے گھر کے گرد راجے مہاراجے چکر لگایا کرتے تھے''اس کا تکیہ کلام بن چکا تھا ۔اس کا دل بہلانا بھی ہمارے ہی فرائض میں شامل ہو گیااور جب اسے یہ پتہ چلا کہ اس کا پہلا میاں ظہور راجا ہمارا دوست رہا ہے تو وہ ہم سے اور بھی زیادہ ہمدردیاں طلب کرنے لگی۔ویسے کاردار نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ مینا کو ہر روز ایک شراب کی بوتل مہیا کر دی جائے۔

چلتے چلتے ظہور راجا کے بارے میں بھی سن لیجئیے۔یہ نوجوان پنڈی کا رہنے والا تھااور ایک دن گھر سے فرار ہو کر بمبئی کے فلمستان پہنچ گئے۔اس کے باپ تھانے دار تھے جب انہیں پتہ لگا کہ اس فلم میں ظہور راجا بھی ہیں تو اس کی بہنیں اپنے بھائی کو دیکھنے کے لیے تڑپ اٹھیں۔اس زمانے میں آج کی طرح لڑکیاں منہ اٹھائے سینما کی طرف نہیں نکل جاتی تھیں۔انہوں نے اپنی والدہ کو اپنے ساتھ ملایا۔وہ بھی اپنے لخت جگر کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گئیں مگر پھر وہی ڈر۔ بڑے راجا صاحب سے فلم دیکھنے کی اجازت کیسے لی جائے؟ایک دن انہیں اچھے موڈ میں دیکھ کر نہ صرف فلم دیکھنے کی اجازت مل گئی بلکہ وہ خود بھی ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئے۔

پورا خاندان سینما گھر پہنچا، فلم شروع ہوئی اور ظہور راجا نے اپنا دیدار کرانا شروع کیا۔مگر آگے چل کر وہ سین آیا جس میں ظہور راجا کی پٹائی ہونے لگتی ہے۔یہ دیکھ کر اس کی ماں اور بہنیں تو بلبلا اٹھیں مگر راجا صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے تھانے درانہ آواز لگائی''ہور مار، بمبئی جا کر کنجر بن گیا اے۔''

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ہماری فلم میں سورن لتا بھی تھی۔اسے دیکھ کر ہمیں اس کی کئی سال پرانی فلم یاد آگئی جس میں اس کا گانا" اکھیاں ملا کے 'جیا برما کے ، چلے نہیں جانا" زباں زد عام ہوا کرتا تھا۔اب ہم نے ان کو نہایت کم گو، مدبر، سنجیدہ اور انتہائی باوقار پایا۔وہ اکیلی اپنے کمرے کے برآمدے میں بیٹھی رہتی اور دوسروں کمروں کے گرد چکر کاٹنے والوں کا تماشہ دیکھتی۔

کاردار فلم میں لمبے مکالمے کا قائل نہیں تھا،ان کا کہنا تھا کہ ریڈیو ڈراموں کی کہانی مکالمے کے ذریعے آگے چلتی ہے مگر فلم میں تو سیلولائیڈ یعنی تصویر خود بولتی ہے۔اسی لیے فلموں کے عالمی مقابلوں میں تمام فلمیں بغیر ساؤنڈ ٹریک کے دکھائی جاتی ہیں۔یہ فلم جو ہم بنارہے تھے اس میں بھی مکالمے کا فقدان تھا۔اس لیے سورن لتا ایک روز ہم سے پوچھنے لگی" نقوی صاحب، کیا یہ سائیلنٹ فلم بن رہی ہے ؟""

اس دوران ہم نے پشاور کلب میں فریدہ خانم کا ایک گانا بھی فلم بند کیا۔کلام فیض صاحب کا۔۔۔

ہم گھوم پھر کے کوچہ قاتل سے آئے ہیں۔

اور آواز فریدہ کی۔بس سماں بندھ گیا۔مگر مصیبت یہ ہوئی ہے کہ کلب کے تمام ممبران شراب کے نشے میں دھت وہاں آدھمکے اور ہمیں کئی ری ٹیک کرنے پڑے۔

اس فلم کے ایک سین میں شبنم کو بطور فوجی نرس پیش کرنا تھا لہذا اس کے لیے وردی درکار تھی۔ہم فوراً سی ایم ایچ کے نرسنگ ہاسٹل پہنچے اور میٹرن سے اپنا مدعا بیان کیا۔وہ کہنے لگی وردی تو آپ کو مل جائے گی مگر پہنائیں گے ہم خود ۔آپ فلموں والے (یعنی ہمیں یہ بھی سننا تھا) نرسوں کو بڑے غلط انداز میں پیش کرتے ہیں،اسے وارڈ میں مریضوں کے درمیان اچھلتے کودتے اور گانا گاتے دکھاتے ہیں۔ہم شبنم کو خود سمجھائیں گے کہ نرس بن کر کیسے چلنا پھرنا چاہیے۔

شام ہوئی تو ہم شبنم کو سی ایم ایچ کے نرسنگ ہاسٹل لے گئے۔مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وردی پہنانے کی رسم ادا کرنے کے لیے اسپتال کی تمام نرسیں موجود تھیں پھر وہاں پر ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی۔شبنم خاصی دراز قد ہے

اور اسے کسی کی شلوار پوری نہیں آرہی تھی۔ مجبوراً ہم بھاگ کر اپنے ایک افسر کے گھر گئے اور اس کی دراز قد کی بیوی کی منت کر کے لٹھے کی شلوار مستعار لے آئے۔ یہ الگ بات ہے کہ چند روز بعد جب ہم یہ شلوار واپس کرنے گئے تو انہوں نے اسے صحن میں پڑے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا۔ خیر باقی تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا پر ہماری شوٹنگ کوئی دو گھنٹے لیٹ سٹارٹ ہوئی۔

ہر فلم کا باقاعدہ ایک اسکرپٹ ہوتا ہے جس میں ہر تفصیل درج ہوتی ہے۔ یعنی فلاں سین اس طرح ہو گا۔ اس میں فلاں فلاں یہ کپڑے پہنیں گے۔ اس کے لیے یہ سامان درکار ہو گا مگر ہماری اس فلم کا کم از کم ہمارے پاس کوئی اسکرپٹ نہیں تھا۔ بس ہر بات کاردار کے اپنے دماغ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے کہتا چلو فلاں لوگوں کو ساتھ لو، وارسک ڈیم پر شوٹنگ کرنی ہے یا جھیل کے کنارے سین فلمائیں گے۔ ہم حکم کی بجا آوری کرتے تھے۔ ہمیں کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ فلم کے سین کے لیے کیا کیا چاہیے۔ ایک شام ہم پشاور سے کوئی 8 یا 10 میل دور پشاور کالونی پہنچے۔ وہاں فضائیہ کے افسر فیملی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ شوٹنگ شروع ہوئی اور چلتی رہی۔ رات کوئی بارہ بجے کاردار کہنے لگا کہ دو سپاہی چاہیں جن کے ہاتھوں میں اسٹین گن ہو۔ سپاہی تو اس وقت وہاں موجود تھے مگر اسٹین گنیں کہاں سے آئیں؟ مجبوراً ہمیں پشاور سے واپس آکر آرمامنٹ افسر کو جگانا پڑا۔ اس نے آکر آرمری کھولی اور دو عدد اسٹین گنیں ہمارے حوالے کیں۔ ہم لے کر گاڑی بھگاتے ہوئے وارسک پہنچے اور وہ اسٹین گنیں پیش کیں۔ کاردار نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ کہنے لگا میں نے سین کا وہ حصہ کاٹ دیا ہے، اب ان کی ضرورت نہیں، ہم تو سر پیٹ کے رہ گئے۔

ایک مرتبہ کاردار کو جو سین فلمانے کی سوجھی وہ بھی وارسک میں ہی تھا۔ اس میں روزینہ اور اس کی سہیلی شبنم علی الصباح ایک مکان کے سامنے کھڑی دکھائی جاتی ہیں ۔ اوپر سے ایک ون او فور (104) طیارہ چڑھتے سورج کی طرف پرواز کرتا ہوا گزرتا ہے اور یہ دونوں اسے دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہیں۔

اب باقی تو سب کچھ ٹھیک تھا مگر ون او فور طیارے صرف سرگودھا میں تھے۔ سو ہم نے وہاں کے بیس کمانڈر کو فون کیا۔

ان دنوں ظفر چوہدری صاحب وہاں تعینات تھے۔ ہم نے کہا" سر کل صبح پانچ بجے ایک ون او فور طیارہ چاہیے جو وارسک کے اوپر پرواز کرے اسے ہم نیچے سے کنٹرول کرلیں گے۔"

"ظفر چوہدری بھناگئے۔ کہنے لگے کون بول رہا ہے؟"

ہم نے کہا" فلائٹ لیفٹیننٹ نقوی۔"

غصے سے بولے "کس سے بات کررہے ہو؟"

ہم نے بڑے آرام سے کہا" بیس کمانڈر سرگودھا سے، یہ سی این سی کا آرڈر ہے۔"

جھنجھلا کر بولے "ڈیم اٹ! صبح پہنچ جائے گا۔"

اب پشاور کی سردی اور اتنے سویرے روانگی۔ ہم نے ڈین ہوٹل کے مینجر کو کڑا حکم دیا کہ صبح چار بجے جگا کر شبنم اور روزی کو ناشتہ کروادینا۔ لیلیٰ کی فکر نہیں تھی وہ ہمارے ساتھ صبح تین بجے بھی تیار تھی۔ پورا یونٹ وقت پر وارسک پہنچ گیا روزی اور شبنم کو ایک افسر کے گھر کے سامنے کھڑا کیا اور گھر والوں کو سختی سے منع کیا کہ وہ کھڑکیوں سے نہ جھانکیں۔ ادھر سورج نمودار ہوتے ہی 104 بھی پہنچ گیا۔ وہ اوپر سے اتنی تیزی سے گزرا کہ یہ پری نما چہرے اسے دیکھتے ہی رہ گئے اور ہاتھ ہلانا بھی بھول گئے۔ مجبوراً اس طیارے کے پائلٹ عارف اقبال سے دو چکر مزید لگوانے پڑے۔

شوٹنگ ختم کرکے واپس پشاور پہنچے تو شبنم پوچھنے لگی کہ آج کوئی اور کام تو نہیں؟ ہم نے کہا فی الحال تو نہیں۔ تو کہنے لگی پھر آج مجھے لنڈی کوتل میں شاپنگ کروادو۔

وہاں واپسی پر اسلامیہ کالج کے سامنے بڑی کڑی چیکنگ ہوتی تھی۔ ہم نے فوراً وردی پہنی اور شبنم اور روبن گھوش کو لنڈی کوتل لے گئے۔ وہاں شبنم نے 28 ہزار کی شاپنگ دے ماری۔ ہم نے مذاق سے کہا کہ آج تو تم نے بڑے پیسے

خرچ کر ڈالے۔ کہنے لگی کوئی بات نہیں یہ تو میں نے رات طارق عزیز سے جیتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہمارا ایمنجر کو تڑی لگانا بے سود رہا، شبنم تو صبح چار بجے تک تاش کھیلتی رہی تھی۔

پشاور سے ہمارا یونٹ کراچی سے پی آئی اے کے ذریعے ڈھاکا پہنچا۔ وہاں ہماری پریشانیوں میں اتنی کمی ہوئی کہ ہمارے ذمے صرف مرد ہی مرد تھے۔ خواتین میں صرف روزی اور شبنم تھیں۔ جن کے اپنے گھر موجود تھے۔ لیلی کو کاردار کسی خاص مصلحت کی بنا پر پیچھے چھوڑ آیا اور اس کی جگہ ایک مقامی منحوس صورت میک اپ مین کی خدمات حاصل کر لیں جس کا ہمیں آج تک قلق ہے۔

طارق عزیز وغیرہ کو ہم نے ایک بڑا مکان نما ہوٹل میں ٹھہرا دیا، کاردار خود انٹر کان میں چلا گیا اور ہم نے آفیسر میس میں ڈیرا جما لیا۔ ہم نے پہنچتے ہی ایک ٹیکسی کرائے پر لے لی جس کا ڈرائیور پشاور کا رہنے والا تھا۔ ان دنوں ہم پشتو میں خاصے رواں تھے۔ وہ رات دن ہماری خدمت میں مصروف رہتا۔ یہ جنوری 1969 ذکر ہے۔ ڈھاکہ میں خاصی گڑ بڑ تھی اور احتجاجی جلوس نکلتے رہتے تھے اس لیے شہر اکثر کرفیو میں ڈوبا رہتا۔ ہم نے فوراً کرفیو پاس بنوایا، اپنا بھی اور ٹیکسی کا بھی، اور ساتھ یہ بھی لکھوا لیا کہ اس ٹیکسی میں ہمارے علاوہ چار مسافر اور بھی سفر کر سکتے ہیں۔ اس کا ایک فائدہ ندیم کو بھی ہوا۔ وہ ان دنوں کسی فلم کی شوٹنگ میں یہاں آیا ہوا تھا۔ ہم کرفیو کے دوران میں ایک شام انٹر کام پہنچے تو دیکھا کہ وہ رونی صورت بنا کر لابی میں گھوم رہا ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی منتیں کرنے لگا کہ کسی طرح اسے شبنم کے گھر پہنچا دو۔ ہم اسے لے کر ایلیفنٹ روڈ پر شبنم کے گھر چھوڑ آئے۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ اس رات وہ 70 ہزار روپے ہار چکا ہے۔ ظاہر ہے شبنم اور روبن گھوش سے کون جیت سکتا تھا۔

ہم نے شوٹنگ میں کام آنے والا بھاری سامان کراچی سے بذریعہ بحری جہاز چٹاگانگ بھجوا دیا تھا۔ تاکہ وہاں سے آگے ڈھاکہ پہنچ سکے۔ دو ایک روز انتظار کیا مگر سامان نہ پہنچا۔ کاردار نے ہم سے چٹاگانگ جانے کو کہا۔ مارشل لاء کا زمانہ تھا، ہم نے سوچا بندرگاہ والوں پر رعب تو وردی سے ہی پڑے گا۔ مگر ہماری وردی پشاور میں پڑی تھی۔ ہمارا ایک پرانا شاگرد پرویز ان دنوں ڈھاکہ میں تھا۔ وہ بھی ہمارے ہی قد کاٹھ کا تھا، اس کی وردی پہنی اور فوکر میں سوار ہونے بیٹھ

گئے۔ کافی عرصے بعد یہی پرویز لاہور میں تعینات تھا۔ وہاں یوم دفاع پر فضائی مظاہرہ ہونا تھا جس میں آرمی کا ایک مشاق طیارہ بھی حصہ لے رہا تھا۔ پرویز شوقیہ طور پر اس طیارے میں بیٹھ گیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ طیارہ ایک ہینگر سے ٹکرا کر پورے مجمع کے سامنے پاش پاش ہو گیا۔

ڈھاکہ سے چٹاگانگ جانے والے فوکر کا پائلٹ تو کوئی بنگالی تھا مگر اس میں کیپٹن راحت بھی موجود تھے جوان دنوں پی آئی اے کے ٹیسٹ پائلٹ تھے۔ ایک زمانے میں وہ پی اے ایف میں تھے اور اکارڈن کے ساتھ بڑے خوبصورت گانے سنایا کرتا تھے۔ ان کا گایا ہوا گانا ''ابھی نہ جاؤ چھوڑ کے، ابھی تو جی بھرا نہیں'' آج تک یاد ہے۔ ان کو گانے کا اس قدر شوق تھا کہ جب وہ پی آئی میں چلے گئے تو خاصے سنئیر ہونے کے باوجود نائٹ کوچ پر اپنی ڈیوٹی لگواتے تا کہ اطمینان سے پنڈی سے کراچی تک مائک پر مسافروں کو گانے سناتے رہیں۔ پچھلے دنوں اخباروں میں کیپٹن ثروت کا ذکر اکثر آتا رہا ہے۔ وہی جو جنرل مشرف کو کولمبو سے کراچی لا رہا تھا۔ یہ کیپٹن ثروت انہی کیپٹن راحت کا بیٹا ہے۔

ہم ڈھاکہ سے جہاز میں سوار ہوئے تو کیپٹن راحت کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ انہوں نے فوراً ہمیں کاک پٹ میں بلا لیا اور جس پائلٹ کا انہیں ٹیسٹ لینا تھا اسے پیچھے بھیج دیا اور ہم اس کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جہاز اوپر اٹھا ابھی کوئی دس منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ جہاز لینڈ کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ ہم کومیلا پہنچ گئے ہیں۔ مگر لینڈ کرنے کے بعد اس علاقے کی پسماندگی دیکھ کر بہت دکھ ہوا، نہ کوئی ٹرمینل، نہ کوئی بس، صرف سیڑھی لگانے والے دو آدمی تھے۔ جہاز کا عملہ اتر کر ٹارمک پر کھڑا ہو گیا۔ کومیلا اترنے والے مسافر بھی نکل کر جہاز کے قریب کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں سائیکل رکشہ جہاز کی سیڑھیوں کے پاس آکر رکے تو اور وہاں سے سوار ہونے والے مسافران میں سے نکل کر جہاز میں داخل ہونے لگے۔ ان خالی رکشاؤں میں وہاں پر اترنے والے مسافر بیٹھ کر اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس جہاز کی واحد ائیر ہوسٹس ہمیں ٹیسٹ پائلٹ سے خوش گپیاں کرتے دیکھ کر ہمارے پاس آئی اور رونی صورت بنا کر کہنے لگی ''سر پی آئی اے والوں سے کہیں کہ کوئی ہمارا بھی خیال کریں، مسافر بار بار گھنٹی بجا کر بلاتے ہیں اور اگر کسی کے پاس پہنچنے میں ذرا بھی دیر کر دوں تو ڈانٹنے لگتے ہیں۔ آپ ہی بتایئے اتنے سارے مسافر اور فلائنگ ٹائم صرف آٹھ

منٹ کا۔ میں اس دوران میں کس کس کے پاس پہنچ سکتی ہوں۔" ویسے یہ ہم نے بھی نوٹ کیا کہ وہاں کے کچھ لوگ زیادہ ہی ڈیمانڈنگ تھے۔

کومیلا سے روانہ ہوئے تو آگے کچھ لمبا سفر تھا۔ راحت کہنے لگے "تم پہلی بار مشرقی پاکستان آئے ہو' تمہیں یہ علاقہ دکھاتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی وہ جہاز کو بہت نیچے لے گئے۔ ہم نے کہا بھئی یہاں سے تو کچھ نظر نہیں آتا تو وہ کہنے لگے یہ لو۔

وہ فوراً جہاز کو سات ہزار کی بلندی پر لے گئے اور اسے کبھی دائیں اور کبھی بائیں جھکانے لگے۔ نتیجہ یہ کے پیچھے بیٹھے مسافروں کی چیخیں نکل گئیں یہاں تک کے جہاز کا اصلی کیپٹن بھاگا ہوا کاک پٹ میں آکر پوچھنے لگا "سر خیریت تو ہے۔"

چٹاگانگ پہنچ کر اس ہوائی اڈے کی زبوں حالی میں نے دیکھی۔ وہاں سے ہم سیدھے گودی پر پہنچے اور اپنے سامان کے بارے میں دریافت کیا۔ کہنے لگے سامان آ تو گیا ہے مگر ویئر ہاؤس میں پڑا ہوا ہے۔ اس وقت دیر ہو چکی ہے، صبح آکر نشاندہی کر دیجئیے تا کہ اسے آگے روانہ کر دیں۔

اب چٹاگانگ میں کوئی آفیسر میس تو تھا نہیں اس لیے ہم نے شاہ جہاں ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ شام ڈھلنے پر ہم شہر دیکھنے پہنچے۔ ڈھاکہ میں تو ہر قسم کے رکشاؤں کی بھرمار ہے مگر وہاں کوئی ایک بھی نظر نہیں آیا۔ صرف ٹیکسیاں تھیں ۔ ہم نے ایک میں بیٹھ کر کہا شہر کا چکر لگاؤ۔ وہ ہمیں سیدھا وہاں کے بازار حسن میں لے گیا۔ یہ بازار حسن کیا تھا بس چند جھونپڑیاں تھیں۔ جن میں سے چپٹے ناکوں والی کوئی تین تین فٹ کی لڑکیاں نکل کر "ہیلو چم، ہیلو چم" کہتی ہوئی ہماری ٹیکسی کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ ہم نے ٹیکسی والے کو ڈانٹا تو کہنے لگا کہ یہاں باہر کے ملکوں کا جہاز آتا ہے، اس میں سے جو سیلر اترتا ہے اس کو ہم یہیں لے آتا ہے۔ ہم نے کہا کمبخت ہم سیلر نہیں ہمیں واپس ہوٹل لے چلو۔ ہوٹل پہنچ

کر ہم اس کی سب سے بالائی منزل پر چلے گئے جہاں ایک بہت ہی خوبصورت بار تھا۔اور اس کی بڑی کھڑکیوں سے پورے شہر کا دلفریب منظر نظر آتا تھا۔

اگلے روز ہم اپنا سامان بھجوا کے واپس ڈھاکہ آ گئے۔اور وہاں قیام کے دوران میں اور بھی بہت سے لطیفے ہوئے۔ایک روز جب کرفیو نہیں تھا تو ہماری ٹیکسی کاردار کے حوالے تھی۔ہم نے بیٹ مین کو کہا کے وہ رکشہ لے آئے۔وہاں پر ایسے رکشے بھی تھے جو آگے سے آدمی کھینچتے تھے اور ایسے بھی تھے جو کہ سائیکل لگے ہوئے تھے۔اس کے علاوہ موٹر سائیکل رکشہ بھی تھا۔اس لیے ہم نے اپنے بیٹ مین کو باقاعدہ ہدایت دی کہ وہ موٹر سائیکل رکشہ لے کر آئیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ نمودار ہوئے اور مسکراتے ہوئے کہنے لگے ''شباب بے بی آ گیا ہے، بالکل نیا والا''

ہم تو سیخ پا ہو گئے، ''ارے گدھے'' ہم چلائے ''ہم نے رکشہ لانے کو کہا تم بے بی لے آئے ہو۔''

ساتھ والے کمرے میں ایک ہمارا بنگالی شاگرد تھا۔ہماری آواز سن کر دوڑتا ہوا ہمارے کمرے میں داخل ہوا۔پوچھنے لگا ''کیا ہوا سر؟''

ہم نے بتایا کہ اس کمبخت سے رکشا لانے کو کہا اور یہ کوئی لونڈیا پکڑ لایا ہے۔

ہمارے شاگرد نے بیٹ مین سے بنگلہ میں بات کی اور ہنسنے لگا۔کہنے لگا ''سر یہاں رکشا تو اس کو کہتے ہیں جس کو آدمی کھینچتا ہے، موٹر رکشے کو بے بی کہتے ہیں ۔''

ڈھاکہ کے ایک مقامی ایم پی اے تھے جو وہاں کے پوش علاقے دھان منڈی میں رہتے تھے۔ان کی بیگم شوقیہ طور پر فلموں میں کام کرتی تھیں۔نام تو نا جانے ان کا کیا تھا پر ان کو شاتی کہتے تھے۔ایک شام ہم ان کے گھر گئے۔باتوں باتوں میں خاصی دیر ہو گئی۔جب وہ اٹھنے لگے تو وہ کہنے لگی '' نو بکی شاب، آپ اتنا دیر سے کدھر جائے گا، آج رات آپ ہمارا

شاتھ سو جاؤ۔'' ہم تھوڑے سے چکرائے مگر پھر تھوڑی بعد یہ سمجھ آئی کہ وہ یہ کہہ رہی ہیں کہ آج کی رات ہماری طرف سو جائیں۔

ایک دفعہ ہم بازار سے گزر رہے تھے کہ دیکھا کہ نوجوان لڑکوں کا بڑا منظم جلوس جا رہا ہے۔ وہ چار چار کی ٹکریوں میں بٹے ہوئے تھے تاکہ دفعہ 144 کی خلاف ورزی نہ ہو۔ ساتھ ہی وہ نعرہ لگا رہے تھے '' چلبے نئیں، چلبے نئیں (یعنی نہیں چلے گا، نہیں چلے گا)

ہم نے گاڑی روک کر ایک لڑکے سے پوچھا کہ '' کی چالبے نئیں ؟''

بڑے معصومانہ انداز سے کہنے لگا'' امی جانی ناں۔'' یعنی میں نہیں جانتا۔

گویا وہ تو نعرہ اس لیے لگا رہا تھا کیونکہ اسے نعرہ لگانے کے لیے کہا گیا تھا۔

ایک روز کرفیو کے دوران ہم کرفیو کے دوران روزی کی خیریت پوچھنے اسکے گھر گئے تو پوچھا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ کرفیو کی وجہ سے تم بازار نہیں جا سکتی تو وہ کہنے لگی۔ ''نو کبی شاب، کچھ نہیں چاہیے۔ گھر میں تالاب ہے مو چلی پکڑتا اور کھاتا۔''

کاردار کو صبح سویرے سویرے سین فلمانے کا بہت شوق تھا۔ ڈھاکہ میں بھی انہوں نے ایک ایسا ہی پروگرام بنایا کہ شبنم اور طارق عزیز کو ایک ڈولتی ہوئی ناؤ میں بیٹھا کر صبح سویرے ایک سین فلمایا جائے۔ اب وہ سین دریا کے کسی حصے میں فلمایا جائے اور اس کے لیے جگہ کا تعین کرنا ضروری تھا۔ لہذا ہم نے ڈھاکہ کے بیس کمانڈر جو بعد میں فضائیہ کے سربراہ بھی بنے ان سے ہیلی کاپٹر دینے کی استدعا کی۔ پہلے تو وہ برہم ہوئے اور بعد میں انہوں نے ائیر ہیڈ کوارٹر پشاور سے بات کرنے کے بعد تیار ہو گئے۔ اس ہیلی کاپٹر پر ہم نے بوڑھی گنگا پر کئی چکر لگائے۔ ایک گوشہ کاردار کو پسند آ گیا۔ چونکہ اس مقام پر صبح سویرے پہنچنا تو ناممکن تھا اس لیے مشرقی پاکستان کا ایک اسٹیمر حاصل کیا تاکہ اس میں پورا فلم یونٹ رات گزارے اور تڑکے اپنا کام شروع کر دیں۔

سدر گھاٹ سے اسٹیمر میں سوار ہو کر چلنے سے پہلے ہم نے ملازم کو ایک روپیہ دیا تاکہ وہ ہمارے لیے ایک پان لے آئے۔ ہم نے کہا ایک روپے میں ایک دو پان تو آئیں گے مگر اس نے چالیس پان لا کر سامنے رکھ دیے اور ساتھ ہی ایک پتے میں لپٹا ہوا کوئی پاؤ بھر چونا بھی۔

اس اسٹیمر میں دو کیبن تھے۔ ایک شبنم اور روبن گھوش کو دے دیا اور دوسرا ہم نے سنبھال لیا۔ باقی تمام لوگوں کو نیچے ہولڈر میں بھیج دیا، مشرقی پاکستان کی تقریباً آدھی آبادی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں رہتی ہے جن کے درمیان ایک نیم گولائی کی چھت ہوتی ہے۔ یہ کشتیاں وہاں کے عظیم اور کشادہ دریا بوڑھی گنگا کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ چلتی یا کھڑی رہتی ہے۔ صرف اسٹیمر دریا کے بیچوں بیچ چلتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد مغرب کا وقت آ گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہر ڈولتی ہوئی کشتی کی منحنی چھت پہ گھرانے کا سربراہ کھڑا نماز پڑھ رہا ہے۔ عجب رونگٹے کھڑے کرنے والا منظر تھا۔

کچھ دیر بعد چاند ابھر آیا۔ کاردار نے کہا نیچے جا کر شبنم اور روبن گھوش کو بلا لاؤ۔ ہم نے نیچے جا کر ان کے کمرے میں دیکھا تو شبنم سو رہی ہے اور روبن کپڑے پہن کر کرسی پہ بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے۔ اسے اوپر آنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ ہم جب اوپر واپس اکیلے پہنچے تو کاردار نے اکیلے دیکھ کر پوچھا کیا ہوا تو ہم نے کہا کہ شبنم سو رہی ہے اور روبن اس کا پہرا دے رہا ہے۔

جب وہ مقام آیا تو ہم نے اسٹیمر کو رکوا دیا۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ رکا ہوا جہاز دیکھ کر وہاں کے لوگوں کو اس بات کا تجسس ہوا تو وہ اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیاں لے کر جہاز کے قریب آ گئے۔ نئی نئی صورتوں پہ نظر پڑتے ہی انہوں نے گانا شروع کر دیا۔ ایک بنگالی ملازم کے ذریعے ان کو سمجھایا کہ کل ان کی کشتیاں درکار ہوں گی۔ ہم نے بھی بنگالی میں اپنا جوہر دکھاتے ہوئے کہا کہ ''ٹاکا دیبن''یعنی پیسے بھی دیں گے۔ وہ بڑی خوشی سے مان گئے اور اگلی صبح ہمارے بیدار ہونے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئے۔

پو پھٹتے ہی ہم نے شبنم اور طارق کو ایک ناؤ میں بٹھادیا، دوسری میں کیمرا مین بیٹھ گیا اور تیسری میں کاردار اور ہم۔ اس تمام تردد کا نتیجہ ایک چھوٹا سا سین تھا۔ جس میں کاردار کی ہٹ دھرمی کے علاوہ کوئی مکالمہ نہیں تھا۔ ایک چھوٹا سا سین جس میں طارق اور شبنم کو ایک ناؤ میں آمنے سامنے بیٹھا دکھایا گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہیں اور طارق ناؤ کے کنارے پر اپنی ہتھیلی کھول کر رکھ دیتا ہے اور شبنم اس کی ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ اللہ اللہ، خیر صلیٰ، شاٹ ختم اور ہم بدھوؤں کی طرح لوٹ کر اپنے گھر یعنی ڈھاکہ واپس آگئے۔

اللہ اللہ کر کے فلم کی شوٹنگ ختم ہوئی۔ اس کے بعد ہم نے اسے ایڈٹ کرایا اور پھر اسے بڑے فخریہ انداز میں فلم سنسر بورڈ کے سامنے پیش کرنیکے لیے لاہور پہنچ گئے۔ مگر ہائے رے قسمت، انہوں نے فلم دیکھ کر اسے پاس کرنے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ کہ فلم میں ایک سین جس میں شادی کا ڈانس دکھایا گیا تھا اس میں ایکٹرس کا زیریں لباس گھٹنوں سے ذرا اوپر تھا۔ اس وقت تک ائیر مارشل نور خان مغربی پاکستان کے گورنر بن چکے تھے۔ اس لیے ہم سیدھے گورنر ہاؤس پہنچے۔ وہاں سامنے ہی ان کی بیگم کھڑی تھی۔ وہ غصیلی مشہور تھیں مگر اس روز بڑی شفقت سے پیش آئیں۔ پوچھنے لگی ''نقوی صاحب پان کھایئے گا؟''

ہم نے اپنی بپتا بیان کی اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ ایک پنجابی فلم جو پاس ہو چکی ہے اس میں لاچے میں ملبوس ہیروئن کو زمین پر لیٹے ہوئے ہیرو کے سر پہ ناچتے ہوئے دکھایا ہے اور وہ نیچے سے معنی خیز نظریں بنا کر اوپر کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر وہ فلم پاس ہو سکتی ہے تو ہم نے کیا گناہ کیا ہے؟

انہوں نے فوراً ایک نیا بورڈ تشکیل دینے کا حکم صادر کر دیا جس نے ہماری فلم ڈھائی منٹ میں پاس کر دی۔

اب آیا فلم کی رونمائی کا مسئلہ۔ اس وقت ائر مارشل رحیم خان فضائیہ کے سربراہ تھے۔ انہوں نے صدر جنرل یحیٰ خان کو مدعو کیا اور ساتھ ہی تمام سفیروں اور بڑے بڑے افسروں کو۔ ہم نے فلم دکھانے کا پنڈی کے ایک بڑے سینما میں انتظام کیا۔ جس دروازے سے صدر صاحب نے نکلنا تھا اس کے سامنے ہم نے تمام ایکٹر اور ایکٹرسوں کو لائن حاضر کر

کے رکھا ہوا تھا۔ صدر صاحب نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا مگر جاتے جاتے ہم نے انہیں یہ کہتے سنا کہ تم نے میری شام برباد کردی۔

ہم نے یہ فلم ایک ڈسٹری بیوٹر کے حوالے کی اور سکون کا سانس لیا۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ وہ فلم پشاور کے سینما میں لگی ہے۔ ہم نے کہا دیکھیں تو سہی ہماری اسکرین پر کیسی کارکردگی لگتی ہے اور لوگ ہماری انتھک محنت کا کیسے گرم جوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم نے پہلا ہفتہ گزرنے دیا سوچا کہ رش ختم ہو جائے تو پھر جا کر اطمینان سے دیکھیں گے، مگر وائے قسمت۔ اگلے ہفتے اپنی بنائی ہوئی فلم دیکھنے پہنچے تو معلوم ہوا کہ اُتر چکی ہے۔

اس معرکہ آرا فلم کا نام تو بتانا ہم بھول ہی گئے۔ اس کا نام تھا ''قسم اس وقت کی'' اسی لیے ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ آئندہ کبھی فلم بنانے کی جھنجھٹ میں نہیں پڑیں گے۔

ایک صاحب نے شکایت کی ہے کہ جناب آپ نے فلمی الف لیلہ خود نوشت کے طور پر لکھنی شروع کی تھی اور اس میں اپنی ذاتی زندگی اور تجربات کے علاوہ فلمی، ادبی اور صحافتی زندگی کا احوال بیان کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا لیکن کچھ عرصے سے یہ محض فلموں اور فلم والوں کیلئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ ادب اور صحافت کا تذکرہ برائے نام ہی کیا جاتا ہے۔ یہ صاحب امریکا میں رہتے ہیں اور باقاعدگی سے سرگزشت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جب کوئی شخص اتنی دور دراز سے فون کرے اور اپنی شکایت بیان کرے تو اس پر غور کرنا اور جواب دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

ہم نے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے ہماری دانست میں وہی کافی ہے انسان کی ذات اور شخصیت کے مقابلے میں اس کے تجربات، مشاہدات اور تاثرات زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں پھر جب موقع ملتا ہے ہم اپنے بارے میں بیان کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ادب اور صحافت کے بارے میں بہت کچھ بیان کر چکے ہیں اور آئندہ بھی بیان کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان صاحب کے اعتراض کے جواب میں عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ آغاز میں صحافت سے باقاعدہ وابستگی کا عرصہ آٹھ سال تھا۔ اس عرصے میں پیش آنے والے واقعات، تجربات اور مشاہدات کے

علاوہ بلند پایہ صحافیوں کے بارے میں بھی اپنے علم اور تجربے کے مطابق بیان کرتے رہے ہیں۔البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے بہت زیادہ تفصیل سے ان شخصیات کا بیان نہیں کیا۔اس کی بھی وجوہات ہیں۔دراصل اس داستان میں ہم نے اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربات کا زیادہ تفصیلی بیان کیا ہے۔مثلاً آغا شورش کاشمیری کے ساتھ ہم نے ان کے ہفت روزہ ''چٹان'' میں ایک سال سے زائد عرصے کام کیا لیکن اس دوران میں ہمیں ان سے بہت زیادہ قریب رہ کر انہیں دیکھنے کا موقع ملا۔اس لئے اس کے بارے میں یقیناً تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔حمید نظامی صاحب نوائے وقت کے مدیر اعلیٰ تھے۔ان کے ماتحت بھی ہم نے ایک سال کے لگ بھگ کام کیا مگر اس دوران میں ان سے گنتی کی تین ملاقاتیں ہوئیں جن کا حال ہم نے بہت تفصیل سے بیان کر دیا۔دوسرے حضرات کے بارے میں بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔میر نور محمد صاحب اور مولانا غلام رسول مہر کی نگرانی میں بھی ہم کام کرتے رہے مگر ذاتی ملاقاتوں کا موقع کم ہی ملا۔تاہم اپنے تاثرات اور مشاہدات ہم نے خاصی وضاحت کے ساتھ بیان کیے۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ محض کسی شخصیت کے حالات زندگی بیان کر دینا اور اس کے کارناموں کا تذکرہ کر دینا ہمارے نزدیک ضروری نہیں ہے۔یہ تو وہ نادر روزگار ہستیاں ہیں جن کے بارے میں سبھی جانتے ہیں اور ان کے متعلق آئے دن اخبارات میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔اگر ہم بھی وہی واقعات دہرا دیں تو یہ ایک بے معنی کام ہو گا۔البتہ ان کے بارے میں رائے اور ان کے انداز و اطوار کے بارے میں جہاں تک ہم نے دیکھا وہ بیان کر چکے ہیں۔

ادب سے بھی ہمارا رشتہ نیمے دروں نیمے بروں والا ہی رہا ہے۔پہلے صحافت سے جو وقت بچتا تھا وہ ادب اور ادیبوں کی نذر کر دیتے تھے۔''آفاق'' کے سنڈے ایڈیشن کے حوالے سے جن نامور ہستیوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں ان سب کے بارے میں کافی تفصیل سے ہم بیان کر چکے ہیں اور باقی ماندہ کے بارے میں بھی یقیناً بتائیں گے پھر جب ہم نے فلمی صنعت سے وابستگی اختیار کی تو دوسرے تمام شعبوں سے عملی طور پر رابطہ کٹ گیا۔فلم میں شب و روز توجہ اور مصروفیت درکار ہوتی ہے۔اس زمانے میں مقابلہ بھی بہت سخت تھا اور کچھ حاصل کرنے یا بننے کیلئے بہت زیادہ تگ و دو کرنی پڑتی تھی۔ہم عملی طور پر فلمی دنیا ہی میں رہتے تھے۔فلم ہی کھاتے پیتے تھے اور فلم ہی اوڑھتے بچھاتے تھے۔فلم ہی کے بارے میں دیکھتے اور سنتے تھے۔اس کے متعلق ہی پڑھتے تھے اور بہترین فلمیں دیکھنے کیلئے بھی وقت نکالتے

تھے اس وجہ سے دوسرے شعبوں کیلئے ہمارے پاس وقت تھا نہ ہی مہلت۔اس کے باوجود چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہ جائے کے مصداق جب بھی موقع ملتا تھا ادبی اور صحافتی حلقوں کا چکر لگا کر دوستوں سے ملاقات کر آتے تھے۔

زندگی کا طویل ترین عرصہ ہم نے فلمی صنعت میں گزارا۔وہیں لوگوں سے میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔تجربات ،مشاہدات،دوستیاں،دشمنیاں سب اسی حلقے تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔دوستیاں اتنی زیادہ تھیں کہ فارغ اوقات میں بھی فلم والوں کے ہمراہ ہی رہتے تھے۔ظاہر ہے کہ فلم کے بارے میں ہماری معلومات،مشاہدہ،تجربہ اور تاثرات دوسرے شعبوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔یہ وجہ ہے کہ اس داستان میں فلم اور فلم والوں کا تذکرہ زیادہ ہوتا ہے اسی بنا پر معراج رسول صاحب اور فراز صاحب نے ہمیں یہ مشورہ دیا تھا کہ اس داستان کا نام فلمی الف لیلہ رکھا جائے۔امید ہے کہ ہمارے گمنام امریکی قاری اور دوسرے قارئین اس نکتے کو سمجھ گئے ہوں گے اور فلم کے زیادہ تر تذکرے کا سبب بھی جان گئے ہوں گے۔

روزنامہ ”آفاق“ کے پہلے دور میں اس کے مدیر پروفیسر سرور صاحب تھے۔ان کے ساتھ ہم نے ایک سال کے زائد عرصے سے کام کیا۔سرور صاحب بزرگی اور علمی فضیلت کے باوجود کھلے دل سے دوسروں خصوصا نوجوان کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے اور کام کی ضروری باتوں کے علاوہ دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنے کی سعادت بخش دیا کرتے تھے۔

سرور صاحب سے ہم نے صحافت کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔وہ تحقیق کے میدان سے تعلق رکھنے والے خالص علمی وادبی کام کرنے والے آدمی تھے مگر تلاشِ معاش نے انہیں صحافت سے وابستہ کر دیا تھا۔انہیں یہ تبدیلی پسند نہ تھی کہ کتابیں چاروں طرف بکھری ہوئی ہوں اور وہ تحقیق کے موتی تلاش کرتے رہیں۔جبکہ روزانہ صحافت میں تحقیق و علمی پیاس کو بجھانے کی گنجائش ہی نہ تھی ۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے فرائض خوش اسلوبی سے نبھائے۔اکثر ہم نے محسوس کیا کہ وہ اس کام سے دل برداشتہ ہیں مگر کنارہ کش نہ ہوئے۔

ایک طرف وہ خالص علمی ذوق رکھتے تھے تو دوسری طرف ادب اور فنون لطیفہ سے بھی لگاؤ تھا۔ سعادت حسین منٹو جیسے بے باک اور بدنام زمانہ افسانہ نگار کے وہ عاشق تھے اور ان ہی کے اصرار پر منٹو صاحب نے آفاق کے سنڈے ایڈیشن کے لیے بطور خاص مضامین لکھے تھے جو بعد میں ''گنجے فرشتے'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ان میں سے کئی خاکے انہوں نے آفاق کے دفتر میں ہمارے کمرے ہی میں بیٹھ کر تحریر فرمائے تھے۔اس بہانے ہمیں منٹو صاحب کے نزدیک ہونے اور ان کے گھر جانے کا موقع بھی ملتا رہا۔ منٹو صاحب کے بارے میں اپنے مشاہدات اور تاثرات ہم بہت تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ ہمیں حیرت اس بات پر تھی کہ ایک طرف تو سرور صاحب مولانا عبیداللہ سندھی اور شاہ ولی اللہ کے مرید ہیں اور دوسری طرف سعادت حسن منٹو جیسے افسانہ نگار کے پرستار بھی ہیں۔ یہ ان کے اعلیٰ ذوق کا ثبوت ہے۔ منٹو صاحب ایک بدنام افسانہ نگار خیال کئے جاتے تھے مگر پروفیسر سرور صاحب نے بہت لڑ جھگڑ کر انتظامیہ کو ان کے مضامین حاصل کرنے پر آمادہ کیا تھا اور پھر خود منٹو صاحب سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ اخبار کی پالیسی کے تحت لکھیں۔ منٹو صاحب نے اس بات کی حامی نہیں بھری تھی کیونکہ وہ کسی قسم کی پابندی یا بندش کے قائل ہی نہیں تھے۔ وہ تو قلم اٹھاتے تھے اور لکھنا شروع کر دیتے تھے۔اب ان کے ذہن اور قلم کے اشتراک سے کیا تحریر برآمد ہوتی ہے اس کا کسی کو بلکہ شاید منٹو صاحب کو بھی علم نہیں ہوتا تھا۔

منٹو بھی جانتے تھے کہ انہیں بد معاش افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ فحاشی کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے ان پر۔ لیکن منٹو کہتے تھے کہنے دو جو کوئی کہتا ہے۔ وہ کہتے سوفی میاں، کردار بذات خود اپنے آپ کو مجھ سے لکھواتے ہیں۔ وہ میری انگلی پکڑ کر مجھے ساتھ لیے لیے پھرتے ہیں۔ میرا ان پر کوئی بس نہیں چلتا۔ میں ان کی رضا کا پابند ہوں۔ وہ میرے قلم کے پابند نہیں ہیں۔

پھر بھی شکر ہے کہ منٹو صاحب نے ''آفاق'' کے لیے جو معرکہ آرا خاکے اور مضامین لکھے وہ ''قابل اعتراض'' کی زد سے باہر تھے۔ اگر وہ تھوڑی بہت آزادی حاصل کر لیتے تھے تو اسے درگزر کر دیا جاتا تھا۔ دراصل سعادت حسن منٹو اتنا بڑا نام تھے کہ ان کے سامنے کسی کو دم مارنے کا یارا نہ تھا۔ وہ کسی کے پابند تھے نہ کسی سے ڈرتے تھے۔ نہ کسی

کی پرواکرتے تھے۔ وہ توصرف تخلیق کار تھے۔ جو شبیہ ان کے ذہن میں آجاتی تھی وہ اس کو کسی مبالغے کے بغیر پڑھنے والوں کے سامنے جھاڑ پونچھ کر پیش کردیتے تھے۔

سرور صاحب انتظار حسین صاحب کے بھی بڑے مداح تھے۔ انتظار حسین اس وقت افسانہ نگاروں میں ایک اہم اور قابل ذکر شخصیت تھے۔ سرور صاحب کی خواہش تھی کہ انتظار صاحب آفاق کے ادارے میں شامل ہوجائیں۔ مگر انتظار صاحب کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ادبی دائرے سے باہر نکل نہیں سکتے تھے اس لئے انہیں کوئی دوسرا کام نہیں سونپا جا سکتا تھا۔ آخر سرور صاحب نے ان کے لئے روزانہ کالم لکھنے کی گنجائش نکالی۔ انتظار حسین صاحب ''محفلیں'' کے عنوان سے ادبی چاشنی سے بھرپور کالم لکھتے رہے جو اپنی نوعیت کے منفرد اور مختلف تھے۔ اس قسم کے کالم نہ اس وقت کسی نے لکھے اور نہ ہی آج کل لکھے جاتے ہیں۔

اس بہانے انتظار حسین صاحب ہمارے ہم نشین اور دوست بن گئے۔ ہم نے انہیں اپنے کمرے میں براجمان کرایا۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ ایک تو فرصت کے اوقات میں ان سے گپ شپ چلتی رہتی تھی دوسرے یہ کہ ان کے حوالے سے نامور ادیب، شاعر اور افسانہ نگار دفتر میں تشریف لے آتے تھے۔ ہم بھی ان کی محفل میں شامل ہوجاتے تھے۔ چائے کا بل انتظار صاحب کے ذمے ہوتا تھا اور لطف ہم حاصل کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سی ہستیوں سے اسی بہانے ہمارے تعلقات استوار ہوئے جن میں ناصر کاظمی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

انتظار صاحب کا ہمارے کمرے میں بیٹھنے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ وہ اپنے گھر سے ''سائیکل لنچ سروس'' کے ذریعے باقاعدگی سے کھانا منگواتے تھے۔ گھر کا کھانا ہمیں بھلا اور کہاں نصیب ہوسکتا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ بارہ ایک بجے تک اخبارات پڑھتے۔ باتیں کرتے اور سوچتے۔ ایک بجے کے بعد وہ کالم لکھنے کا آغاز کرتے تھے۔ اس وقت تک ان کا لنچ پہنچ جاتا تھا۔ ہمیں سخت بھوک لگی ہوتی تھی اور ہمارے تقاضے جاری رہتے تھے کہ چچا(ہم نے ان کا پیار کا نام رکھا تھا جو پہلے سارے دفتر میں اور سارے صحافتی حلقوں میں معروف ہوگیا) کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ وہ لکھنے میں مشغول تھے۔ ہمارے تقاضے جب بہت بڑھ جاتے تو کہتے ''یار تم کھالو۔ مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔''

اس طرح ان کا لنچ ہمارے کھاتے میں آجاتا تھا۔ اگر کچھ بچ جاتا تھا تو وہ ان کے حصے میں آجاتا تھا ورنہ صبر و شکر کر کے چائے منگواتے۔ خود بھی پیتے اور ہمیں بھی پلاتے اور شام کے وقت اپنے مستقل ٹھکانے ''ٹی ہاؤس'' کی راہ لیتے۔

ایک اور فائدہ یہ بھی تھا کہ سارے ہی شاعر' ادیب اور صحافی ہم دونوں کے واقف تھے۔ جب کوئی ہمارا دوست ہم سے ملنے آتا تو ہم فوراً لے کر اسے انتظار صاحب کے پاس پہنچ جاتے۔

''انتظار صاحب۔ دیکھیے۔ دیکھیے کون آیا ہے؟''

وہ کہتے ''اخاہا۔ بھئی آپ بہت دن بعد نظر آئے۔''

ہم فوراً مہمان کیلئے ایک کرسی انتظار صاحب کی میز کے سامنے رکھ دیتے اور ان سے کہتے ''چچا۔ چائے کا آرڈر دے دوں؟''

ظاہر ہے یہ آرڈر ان کی طرف سے دیا جاتا تھا اور بل بھی وہی دیتے تھے۔ وہ سر ہلا دیتے اور اس طرح بل کا خرچہ انکے اوپر پڑ جاتا۔ یہ تو محض چند فوائد ہیں۔ انتظار صاحب کی صحبت اور ہم نشینی کی بدولت ہماری ادبی صلاحیت میں بھی نمایاں اضافہ ہوا اور معلومات میں بھی۔ ہم باتوں باتوں میں ان سے محاوروں کے بارے میں گفتگو کر لیا کرتے تھے۔

ہم کہتے '' انتظار صاحب یہ جو آپ نے محاورہ لکھا ہے یہ اردو کا سکہ بند محاورہ نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی ہاپوڑ کی علاقائی اصطلاح ہے اور یہاں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے بالکل نیا محاورہ لکھا ہے۔''

وہ ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔ کبھی انہوں نے اس موضوع پر سنجیدہ بحث نہیں کی۔ جب بھی ان کے محاوروں کی تعریف کی جاتی ہم ان سے کہتے '' آپ نے محاورے کو بگاڑ دیا ہے اور لوگ انجانے میں تعریف کر رہے ہیں''

''بھائی تم تو جانتے ہو نا۔ مت کرو تعریف'' وہ چڑ کر کہتے۔

کبھی کبھی ہم اس ادیب پر زبانی تبصرہ کرتے ہوئے اسے انتظار حسین کا بگڑا ہوا محاورہ'' کہہ تو انتظار صاحب ہمیں بہت دیر تک گھورتے رہتے۔

ایک دن کلیم عثمانی صاحب نے کہا۔'' چچا۔ آپ نے اس کو اتنی لفٹ کیوں دے دی ہے۔''

وہ بولے'' میں نے کہاں دی ہے۔اس نے خود ہی لے لی ہے۔''

روزنامہ'' آفاق'' کے دفتر میں اس زمانے میں بہت سے معروف اور نامور یگانہ روزگار لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔عملے کے افراد کے علاوہ لاہور بلکہ پاکستان کا شاید ہی کوئی قابل ذکر شخص ہو جو'' آفاق'' کے دفتر میں نہ آیا ہو۔بعد میں جب ہم نے'' آفاق'' میں فلمی صفحے کا آغاز کیا تو فلمی صنعت سے تعلق رکھنے والے افراد کا بھی آنا جانا ہو گیا لیکن ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا کہ کوئی خاتون فن کارہ دفتر میں نہ آئیں۔یہ روایت آخر دم تک نبھائی گئی۔اس صفحے کے مقبول اور بااثر ہونے کے باوجود کبھی کسی فنکارہ نے روزنامہ'' آفاق'' کے دفتر کو رونق بخشی۔ایسا جان بوجھ کر کیا گیا تھا۔وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں فلمی صنعت کے لئے فلمی پرچے شائع ہوا کرتے تھے۔ان کے دفاتر میں فلم ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔یہ ہم پہلے بھی روزناموں میں فلمی جرائد بہت کم تھے۔روزناموں میں فلمی سرگرمیوں میں تذکرہ نہیں ہوتا تھا۔فلمی صنعت میں ایکٹریسوں میں مقابلے کی اسپرٹ بھی زیادہ تھی۔اس کے مقابلے میں پبلسٹی حاصل کرنے کی سہولتیں برائے نام تھیں۔ریڈیو پر کبھی کبھار فلمی گانوں کی پیشکش کے سوا فلموں اور فلمی صنعت کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا تھا۔ٹیلی وژن اس وقت تک پاکستان میں رائج نہ ہوا تھا۔ان حالات میں فلمی ایکٹریسوں اور ایکٹروں کو اپنی پبلسٹی کرانے کیلئے فلمی جرائد ہی کا سہارا لینا پڑتا تھا۔فلمی جرائد کے سرورق پر رنگین بلاک اور طباعت کے اخراجات بھی یہ خواتین بخوشی ادا کر دیا کرتی تھیں۔

وہ ماحول آج کے ماحول سے یکسر مختلف بلکہ منفرد تھا۔

آج یہ حال ہے کہ ریڈیو، ٹی وی فلم کی پبلسٹی کرتے رہتے تھے۔ ہر اخبار میں شو بز نس کے بارے میں روزانہ خبریں اور تصاویر شائع ہوتی ہیں۔ صحافی فلم ایکٹریسوں اور ایکٹروں کے انٹرویو لینے اور تصاویر بنانے کیلئے ان کے پیچھے چکر لگاتے رہتے ہیں۔

انقلابات ہیں زمانے کے۔

ان دنوں میں فلمی ہیروئن اور ہیرو پبلسٹی حاصل کرنے کی خواہش میں صحافیوں کی خاطر مدارات اور دل جوئی میں لگے رہتے تھے۔ پبلسٹی کی تو شو بزنس میں ہر شخص کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ عوام میں روشناس نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ فلم والے فلمی صحافیوں کی آؤ بھگت میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔

یہ اس دور کی ایک مدھم سی تصویر ہے تا کہ آج کے لوگ بھی اس زمانے کے انداز اور ماحول سے واقف ہو سکیں۔ آج تو ہر طرف شو بز کا چرچہ ہے اور ٹیلی وژن سے لے کر جرائد اور معتبر اخبارات تک سبھی شو بزنس کے بارے میں خبروں اور تصاویر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اب الٹی گنگا بہہ رہی ہے یا کہہ سکتے ہیں کہ پہلے زمانے میں الٹی گنگا بہتی تھی۔

"آفاق" کا تذکرہ نکلا تو لا محالہ یہ سب باتیں یاد آگئیں۔ حالانکہ مقصد "آفاق" کے پہلے مدیر پروفیسر محمد سرور کے بارے میں بتانا تھا۔

سرور صاحب ۵۲-۱۹۵۱ء میں روزنامہ "آفاق" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ اس سے پہلے وہ جو کارنامے سرانجام دے چکے تھے ہم لوگ ان سے ناواقف تھے۔ یہ ہماری کم علمی سمجھ لیجئے یا سرور صاحب کی منکسر المزاجی۔ وہ ذاتی تشہیر کے قابل نہ تھے۔ بلکہ اس زمانے کے وضع داری کے تقاضوں کے مطابق اسے برا جانتے تھے۔ سرور صاحب کے ایک بھانجے صدیق صاحب بھی "آفاق" کے عملے میں شامل تھے مگر شعبہ ادارت سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ رفتہ رفتہ جب ہمارے صدیق صاحب سے مراسم بڑھے اور سرور صاحب کے بارے میں مختلف حوالوں سے معلومات حاصل ہوئیں تب جا کر ہمیں معلوم ہوا کہ وہ کتنی ثقہ اور بھاری بھرکم شخصیت تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے

لباس یا طرز گفتگو سے خود کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دیکھنے میں وہ بہت سادہ لگتے تھے۔ گرمیوں میں پتلون قمیص اور سردیوں میں پتلون کوٹ ان کا لباس تھا۔ ٹائی پابندی سے نہیں لگاتے تھے۔ کبھی کھلے پائنوں کا پاجامہ اور شیروانی بھی زیب تن فرماتے تھے۔ کبھی جاڑوں میں قراقلی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ سرور صاحب اس وقت بھی قریب قریب فارغ البال ہو چکے تھے۔ ان کے تمام بال قریباً سفید ہو چکے تھے۔ کلین شیو تھے۔ یعنی داڑھی مونچھوں سے آزاد، سرخ و سفید رنگت ، درمیانہ قد بول چال میں متانت اور علمیت۔ گفتگو کے دوران میں وہ کبھی کبھی ہکلاتے بھی تھے مگر بہت کم۔ ان کی یہ ہکلاہٹ کبھی مسئلہ نہیں بنی۔ وہ روانی سے اپنا ماضی الضمیر بیان کر دیتے تھے اس لئے ان کا کبھی کبھی ہکلانا سننے والوں کو محسوس نہیں ہوتا تھا۔

ہم صحافت میں بالکل نووارد تھے۔ اس وقت تک میل جول بھی زیادہ نہ ہوا تھا۔ اس لئے پروفیسر سرور جب مدیر ہوئے تو ہم ان کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتے تھے سوائے اس کے کہ وہ جامعہ ملیہ دہلی سے فارغ التحصیل ہیں۔ عبید اللہ سندھی شاہ ولی اللہ کے مداح ہیں اور ان دونوں ہستیوں کے بارے میں بہت معرکے کی کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہم پر منکشف ہوئی۔

سرور صاحب عملے کے ہر شخص سے بے تکلفی سے گفتگو کرتے تھے۔ اس لئے ان کا وہ رعب نہیں تھا جو ایک ایڈیٹر کا ہونا چاہیئے تھا۔ جب وہ کسی کو طلب کرتے تو بڑی نرمی اور شفقت سے اس کی غلطی کی نشاندہی کرنے کے بعد ضروری ہدایات دیتے تھے۔ بیٹھنے کی عزت بھی بخش دیتے تھے اور چائے سے بھی تواضع کر دیا کرتے تھے۔ اپنی گفتگو میں انہوں نے کئی بار مصر اور قاہرہ کا تذکرہ کیا تھا مگر سرسری سا۔ ایک بار انہوں نے اپنے سوٹ کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے قاہرہ میں خریدا تھا۔ اس کی قیمت انہوں نے پاؤنڈز میں بتائی تھی جو ہمارے خیال میں بہت زیادہ تھی۔ مگر انہوں نے خود ہی وضاحت کر دی کہ وہ مصری پاؤنڈ کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ جو برطانوی پاؤنڈ کے مقابلے میں کافی سستا تھا۔

جب سرور صاحب کے بارے میں ہمیں تفصیل سے معلومات حاصل ہوئیں۔اسی وقت ''آفاق ''کا پہلا دور ختم ہوچکا تھا۔دوسری بار یہ اخبار نئے انتظام اور نئے مدیر (مولانا غلام رسول مہر) کے تحت نکلا تھا مگر میر نور احمد صاحب دونوں بار اس کے مینجنگ ایڈیٹر تھے۔جب سرور صاحب کی قدر وقیمت کھلی تو ہم سے جدا ہوچکے تھے۔اس بات کا ہمیں دکھ اور شرمندگی رہے گی کہ کاش ہم سرور صاحب کی شخصیت اور حقیقت سے پہلے واقف ہوگئے ہوتے تو ہمارا طرزِ عمل ان کے ساتھ مختلف ہوتا اور ہم ان کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

سرور صاحب کی سادگی اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ جب تک وہ اداریہ لکھ کر دفتر سے نہیں چلے جاتے تھے تو ہمارے یا جن صاحب کے سپرد پروف ریڈنگ کی ذمے داری کرتے تھے انہیں یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ اگر کہیں اداریے میں کوئی غلطی ہو تو درست کر دیجئے گا۔

''آفاق'' میں عبدالرشید خوش نویس کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ان کا طرز تحریر دوسروں سے مختلف تھا۔خود بھی صاحب مطالعہ تھے۔اس وقت جوان ہی تھے۔(میاں محمد شفیق) کی ڈائری اور اخبارت کے اداریے کی کتابت ان کے سپرد تھی۔انہیں شفیق صاحب اور سرور صاحب دونوں کی طرف سے اجازت حاصل تھی کہ اگر کہیں کوئی غلطی ہو تو اسے خود درست کردیں۔کئی بار ان دونوں حضرات کی غیر حاضری میں وہ ہمارے پاس آجاتے اور کہتے ''آفاقی۔(وہ بے تکلفی میں ہمیں صاحب کہنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے تھے۔ویسے بھی وہ ہم سے عمر میں بڑے تھے اور ان سے اکثر ہنسی مذاق بھی کرتے تھے) یہ دیکھو۔شاید جلدی میں لفظ غلط استعمال کر دیا ہے۔اسے یوں ہونا چاہیے۔''

ہم کسی فتنے سے بچنے کیلئے کہہ دیتے تھے کہ خود ہی اصلاح کرلیں۔انہیں دونوں حضرات کی طرف سے اجازت مل چکی تھی کئی بار ہماری رائے معلوم کرنے کیلئے بہت زیادہ اصرار کرتے تو ہم نے انہیں غلط بتادیا جس پر اگلے دن ان سے جواب طلبی ہوئی۔ان کی یہ خوبی دیکھیے کہ ذمہ داری ہم پر عائد کرنے کے بجائے خود قبول کرلی لیکن کتنی حیرت انگیز

بات ہے کہ سرور صاحب جیسا جید عالم اپنے اداریے کی اصلاح کیلئے خوش نویس کو یا ہمیں اجازت مرحمت کر دیا کرتا تھا۔یہ ان کی اعلیٰ ظرفی اوراحساس کمتری سے قطعی آزاد ہونے کا ثبوت تھا۔

پروفیسر سرور کا تعلق تو کشمیر سے تھا لیکن ان کے آباؤاجداد ڈوگرہ حکومت کے خلاف احتجاج اور بغاوت کے بعد چلے آئے تھے۔سرور صاحب کے والد برطانوی فوج میں ملازم تھے۔ریٹائرڈ ہونے کے بعد ضلع گجرات کے ایک گاؤں میں انہوں نے زمیں داری شروع کر کے یہیں رہائش اختیار کرلی تھی۔سرور صاحب اسی قصبے میں پیدا ہوئے تھے۔انہوں نے میٹرک تک تعلیم گجرات میں حاصل کی تھی۔گویا ہر لحاظ سے پنجابی تھے مگر ہم نے اپنی زبان سے ایک بار بھی پنجابی کا لفظ نہیں سنا۔وہ اس قدر شستہ اور شائستہ اردو بولتے اور لکھتے تھے کہ کیا کوئی اہل زبان بھی لکھے گا یا بولے گا۔

گجرات میں انہیں مولانا نصراللہ خاں عزیز جیسے استاد سے پڑھنے کا موقع ملا یہ مسلم ہائی اسکول تھا جو سید عطاءاللہ بخاری نے قائم کیا تھا۔یہاں سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ اپنے ذہنی اور طبعی رجحان کے تحت جامعہ ملیہ اسلامیہ چلے گئے۔اس وقت جامعہ علی گڑھ میں تھی مگر بعد میں دہلی منتقل ہوگئی تھی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے بانی مولانا محمد علی جوہر تھے۔اس کا سنگ بنیاد شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے رکھا تھا۔اس زمانے میں مسلم ہائی اسکول اور جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو حکومت کا باغی تصور کیا جاتا تھا۔حیرت کی بات یہ ہے کہ ایسے جید علما کے زیرسایہ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود سرور صاحب ذہنی طور پر آزاد خیال تھے اور کٹر ملائیت کو پسند نہیں کرتے تھے۔وہ اپنے خیالات کا آزادی اور بے باکی سے اظہار کرنے میں بالکل ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔

سرور صاحب نے جامعہ ملیہ سے ادب میں بی اے آنرز کیا اور مزید تعلیم کیلئے جامعہ الازہر قاہرہ میں داخلہ لے لیا۔اس طرح سرور صاحب کی دینی پرورش عربی ماحول میں ہوئی۔انہوں نے مصر کے بڑے نامور اساتذہ سے تعلیم حاصل

کرتے ہوئے انہیں اپنے اخبار میں ”زمیں دار“ میں اداریہ نویس کے طور پر ملازم رکھ لیا مگر یہ ملازمت زیادہ عرصے تک نہیں کرسکے کیونکہ جامع ملیہ دہلی کے چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین نے انہیں اپنے پاس بلالیا اور تاریخ ادب، عربی کا پروفیسر مقرر کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین وہی ہستی ہیں جو بعد میں بھارت کے صدر منتخب ہوئے تھے۔

ان ہی دنوں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ سید ہاشمی فرید آبادی جنہوں نے علمی شعبے کے علاوہ مورخ کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے وہ حجاز سے واپس آئے تو انہوں نے مولانا عبیداللہ سندھی کا پیغام پروفیسر سرور کو پہنچایا کہ وہ کسی ایک شخص کے منتظر ہیں جو ان کے پاس حجاز مقدس چلا جائے تو وہ اس کو اپنا علم منتقل کردیں۔ مولانا سندھی کا یہ کمال تھا کہ خدا جانے انہیں ہندوستان واپس چلے جانے کی مہلت ملے یا نہ ملے اس لئے ان کا علم تو منتقل ہو جائے۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ سید ہاشمی فرید و تالیف میں ساری عمر مصروف رہے۔ انجمن ترقی اردو میں ڈاکٹر عبدالحق کے ساتھ بھی کام کیا اور ریاست حیدر آباد کے دارالترجمہ سے بھی وابستہ رہے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے پاکستان کی تاریخ بھی تصنیف کی تھی افسوس کہ یہ کتاب ناقدری کی نذر ہوگئی۔ نصاب کتب مافیا کی مہربانی سے یہ کتاب بالائے طاق رکھ دی گئی۔ حالانکہ یہ پاکستان کی ایک مستند تاریخ ہے۔

ذاکر حسین صاحب نے پروفیسر سرور کو مولانا عبیداللہ سندھی کے پاس بھیج دیا جہاں وہ مکہ معظمہ میں مولانا سندھی کے ساتھ رہے۔ وہاں انہوں نے شاہ ولی اللہ کے بارے میں مولانا عبیداللہ سندھی اور شاہ ولی اللہ کے افکار اور فلسفے کی ترویج کے سلسلے میں بیت الحکمت کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی تو سرور صاحب کو اس کا نگراں مقرر کیا گیا۔ پروفیسر سرور ۱۹۴۲ء میں پنجاب آ گئے۔ جہاں وہ کوئی ٹھوس سیاسی کام کرنے کے خواہش مند تھے۔ یہاں انہیں روزنامہ ”احسان“ کا مدیر مقرر کیا گیا مگر اخبار کی پالیسی سے اتفاق نہ کرنے کے باعث ایک سال بعد ہی اس سے سبک دوش ہوگئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اشاعتی ادارہ قائم کرلیا تاکہ مولانا عبیداللہ سندھی اور شاہ ولی اللہ کے بارے میں تصنیف و تالیف کا کام کیا جائے۔ انہوں نے مولانا عبیداللہ سندھی کے بارے میں ایک جامع کتاب بھی لکھی۔

لاہور میں روزنامہ ''امروز'' کا اجرا ہوا تو مولانا چراغ حسن حسرت اور فیض احمد فیض کے ساتھ پروفیسر سرور بھی اس کی مجلس ادارت میں شامل تھے لیکن یہ میاں افتخار الدین کا اخبار تھا جو اشترا کی نظریات کے حامی تھے۔ پروفیسر سرور اختلاف رائے کے باعث مستعفی ہو کر چلے آئے اور ایک ہفت روزہ ''آفاق'' کے نام سے جاری کیا۔ لاہور میں ادارہ ثقافت اسلامیہ میں وہ اس کے جریدے '' المعارف'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور تین سال تک خدمات سرانجام دیتے رہے۔ یہاں انہوں نے ''ارمغان شاہ ولی اللہ'' جیسی کتاب تحریر کی جسے اس موضوع پر بہترین تصنیف قرار دیا جاتا ہے ۔ علمی وادبی خدمات پر حکومت نے انہیں '' تمغائے امتیاز'' سے بھی نوازا تھا۔ انہوں نے اصولوں اور ضمیر کے خلاف کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ نہ ہی کبھی مصلحت کو ضرورت پر حاوی آنے دیا۔ وہ اپنے صاحبزادے سلمان سرور سے ملاقات کیلئے ابوظبی گئے تھے کہ اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ ان کی وفات 20 دسمبر 1983ء کو ہوئی تھی۔ اس طرح انہیں دیارِ غیر میں موت کا ذائقہ چکھنا پڑا لیکن تدفین پاکستان ہی میں ہوئی۔

پروفیسر سرور ایک عظیم انسان، مفکر، معلم، مصنف اور تحقیقی شخصیت تھے۔ مگر ہماری کوئی نالائقی دیکھیے کہ جب تک ہم نے ان کے ساتھ کام کیا ان کی مصروفیات سے لاعلم رہے اور کوئی فیض نہ اٹھا سکے۔ وہ بھی غضب کے سادہ اور منکسر المزاج انسان تھے۔ کیا مجال جو کسی پر اپنی علمیت، بزرگی اور فضیلت کا راز کھولا ہو۔

''آفاق '' کے ایک سالہ دور میں ہم نے انہیں جتنا دیکھا یہی محسوس کیا کہ وہ اپنے موجودہ کام سے خوش اور مطمئن نہیں ہیں۔ وہ اپنے کام دیانتداری سے سرانجام دیتے تھے۔ مگر سرمایہ کاروں کی مصلحتوں سے سمجھوتا کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔

یہ واقعہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں ایک بار انہوں نے ہمیں اپنے کمرے میں بلایا اور چند مہمانوں کی موجودگی میں کاپی میں اغلاط پر بہت ڈانٹا۔ ہم کو یہ بات بہت بری لگی۔ ایک تو انہوں نے ہمیں صفائی کا موقع نہ دیا کیونکہ اس غلطی کی ذمے دار نہ تھے۔ دوسرے یہ انہوں نے کئی مہمانوں کے سامنے ہمیں ڈانٹا۔ ہم نے ملازمت نئی نئی شروع کی تھی۔ ایسی ڈانٹ ڈپٹ کے عادی نہ تھے۔ اس واقعے سے اتنے دلبرداشتہ ہوئے کہ نیوز ایڈیٹر ظہور عالم شہید صاحب

ان کے پاس پہنچے اور انہیں استعفیٰ پیش کر دیا۔ وہ حیران ہوئے۔ ہم نے انہیں وجہ بتائی اور کہا کہ ہم کسی قیمت پر بھی اب ''آفاق'' میں کام نہیں کریں گے۔ یہ کہہ کر ہم نے اپنے کاغذات سمیٹنے شروع کر دیے۔ دل سخت اداس تھا اور ہم پر جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس واقعے کو ہم نے اپنی توہین جانا تھا یہ دنیاوی معاملات کے نشیب و فراز سے ہمارا پہلا واسطہ تھا۔ نوعمر بھی تھے۔ جذباتی اور حساس بھی تھے۔ اس لئے شاید بہت زیادہ اثر قبول کر لیا۔

ہم اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھے تھے کہ دونوں شانوں پر بوجھ محسوس ہوا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو کرسی کے پیچھے سرور صاحب کھڑے تھے۔ کہنے لگے ''اتنی سی بات پر ناراض ہو گئے۔ کیا میں تمہارا استاد اور باپ کی جگہ نہیں ہوں۔ تمہیں ڈانٹنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے؟''

ان کی اس شفقت بھری گفتگو پر ہمارا دل بھر آیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ گھبرا گئے۔ پاس والی کرسی پر بیٹھ کر تسلی دیتے رہے اور کہا ''مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے پہلے صورت حال معلوم کر لینی چاہیے تھی۔ چلو۔ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ معاف کر دو۔''

ہم اور زیادہ رونے لگے۔ انہوں نے ٹھنڈا پانی پلایا۔ کچھ دیر تسلی دی۔ جب ہمارا دل ذرا ٹھکانے پر آیا تو کہنے لگے ''تم اتنی سی بات پر اتنے زیادہ ناراض ہو گئے۔ تمہیں کیا پتا کہ میں کہاں سے کیا کیا باتیں سن کر آتا تھا۔''

ان کا یہ فقرہ زندگی بھر ہمیں یاد رہے گا اور ان کا مشفقانہ اور اعلیٰ ظرفی کا کردار بھی۔ انہوں نے اس ایک فقرے سے ہمیں یہ سمجھا دیا تھا کہ زندگی میں انسان کو ہر طرح کی صعوبتیں سہنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کسی کی زیادتی یہ سوچ کر برداشت کر لینی چاہیے۔ کہ ممکن ہے اسے اس سے بھی زیادہ زیادتی اور ناانصافی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ دوسروں کو بھی مارجن اور سہولت دینی چاہیے۔

سرور صاحب سے آفاق چھوڑنے کے بعد ایک دو بار ہی سرسری طور پر ملاقات ہوئی۔ ہمیشہ محبت سے پیش آئے۔ ہماری فلمی کامیابیوں کا انہیں صرف سرسری علم تھا کیونکہ فلم سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی مگر ہماری کامیابی پر وہ بہت

خوش تھے۔ان کی عظمت اور اہمیت کا احساس ہمیں اس وقت ہوا جب کہ ہمارا ان سے ساتھ چھوٹ چکا تھا اور پھر بعض واقعات اور خوبیوں کی وجہ سے ہمیشہ ہمیں یاد رہیں گے۔ان جیسی ہستی کے ساتھ کام کرنا ہمارے لیے واقعی بہت بڑے اعزاز اور افتخار کی بات ہے۔اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے۔

انیس دوسانی مشرقی پاکستان کی فلمی صنعت کا ایک بہت بڑا نام تھے۔اگر یہ کہا جائے کہ مشرقی پاکستان میں صنعت فلم سازی کو قائم کرنے اور بام عروج پہنچانے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا تو غلط نہ ہوگا۔انہیں کسی زمانے میں مشرق پاکستان کا ''فلمی مغل'' کہا جاتا تھا اور وہ اس لقب کے حق دار بھی تھے۔

انیس دوسانی اور ان کے خاندان کو اگر ایک مستقل مہاجر خاندان کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔پچاس سال کے مختصر عرصے میں ان لوگوں نے تین بار ہجرت کی اور ہر بار سب کچھ لٹا کر نئے سرے سے اپنے کاروبار کا آغاز کیا اور قدرت نے ہر بار انہیں کامیابی اور کامرانی سے نوازا۔کوئی کمزور دل اور پست ہمت انسان ہوتا تو وہ کلکتہ سے ڈھاکا پہلی ہجرت کے وقت ہی بددل شکستہ اور مایوس ہو جاتا لیکن دوسانیوں نے مایوس ہونا سیکھا ہی نہیں تھا۔ ''دوسانیوں'' کی اصطلاح پر آپ حیران نہ ہوں۔انیس دوسانی سے پہلے ان کے والد اور چچا کلکتہ میں فلمی کاروبار ہی کرتے تھے لیکن یہ فلموں کی ڈسٹری بیوشن تک محدود تھا۔

انیس دوسانی صاحب کے والد کا نام ہمیں معلوم تھا مگر ایسا دماغ سے اترا کہ ہم انہیں ''بڑے دوسانی'' ہی کے نام سے یاد کرتے رہے۔انیس صاحب نے بھی کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔انہیں نہ تو ہم نے بتایا تھا کہ ہم ان کے والد کا نام بھول گئے ہیں اور نہ ہی کبھی انہیں یہ شک ہونے دیا۔اس وقت بھی بڑے دوسانی صاحب کا نام ہمارے ذہن میں گھوم رہا ہے لیکن پورا نام یاد نہیں۔

انیس دوسانی کے والد اور چچا کلکتہ میں خاموش فلموں کے زمانے سے یہی کاروبار بھی کرتے تھے مگر فلم ان کا ایک مخصوص اور دل پسند کام تھا۔ان لوگوں نے کلکتہ میں کئی خاموش فلمیں ریلیز کی تھیں۔دوسانی فلمز کے نام سے ان کا

تقسیم کار ادارہ ہندوستان کے مشرقی حصے کے لیے فلموں کے حقوق حاصل کرتا تھا۔جب بر صغیر کی پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' سارے ملک میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تو کلکتہ اور مشرقی سرکٹ میں اس کے تقسیم کار دوسان فلمز ہی تھے ۔اس طرح اس خاندان کو ایک نمایاں اہمیت حاصل رہی ہے۔ میمن لوگ کاروبار کے معاملے میں سیلف اسٹارٹ ہوتے ہیں۔انہیں کاروبار کرنے اور پیسہ کمانے کے گر آتے ہیں۔عام طور پر یہ لوگ دیانت دار بھی ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سارے ہندوستان کے تجارتی مراکز میں ہر جگہ میمن کاروباری حضرات موجود ہیں اور ہر جگہ خوش حال اور کامیاب ہیں۔انیس دوسانی کے خاندان نے فلموں کے سلسلے میں اتنی نمایاں خدمات سر انجام دی تھیں کہ انیس دوسانی کے چچا کو انگریزی حکومت نے ''خان بہادر'' کا خطاب دیا تھا۔ گویا ان کا خاندان ایک سکہ بند فلمی خاندان تھا۔

تقسیم ملک کے وقت دوسانی خاندان نے پہلی ہجرت کی اور کلکتہ سے ڈھاکہ کا رخ کیا۔ کلکتہ سے یہ لٹ پٹ کر آئے تھے۔زمین ' جائداد' کاروبار۔ فلمیں سب کچھ وہیں رہ گیا تھا۔جو تھوڑا بہت بچا کرلا سکے تھے وہ اپنے ساتھ لے آئے اور ڈھاکا میں از سر نو ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے ڈھاکا میں کاروباری اور تجارتی اعتبار سے اپنے پیر جما لیے۔ فلموں کی تقسیم کاری کا بزنس انہوں نے ڈھاکا میں بھی شروع کر دیا۔ اس وقت ڈھاکا میں تو فلمیں بنتی نہیں تھیں۔ مغربی پاکستان سے فلمیں نمائش کے لیے ڈھاکا اور مشرقی پاکستان جاتی تھیں۔ڈھاکا میں کئی تقسیم کار ادارے تھے جن میں سے ایک کراچی کے تقسیم کار جے سی آنند کا ادارہ ایور ریڈی پکچرز بھی تھا۔ایور ریڈی پکچرز بہت بڑا ادارہ تھا۔جو ہر سال درجنوں فلمیں ریلیز کرتا تھا۔جب تک پاکستان میں بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندی نہیں عائد ہوئی تھی اس وقت تک بھارت سے اردو اور بنگلہ فلمیں بھی ڈھاکا میں ریلیز کی جاتی تھیں یہاں تک کہ مغربی پاکستان میں بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندی لگ جانے کے باوجود ڈھاکا کے کچھ تقسیم کار کلکتہ سے بنگالی اور اردو فلمیں منگا کر ریلیز کرتے تھے۔ان لوگوں کی تمام تر ہمدردیاں بھارتی فلموں کی درآمد کا سلسلہ جاری رہے۔یہ دولت کمانے کا بہت آسان نسخہ تھا۔ تھوڑی سی رقم دے کر کامیاب بھارتی فلموں کے حقوق حاصل کر لیے جاتے تھے اور یہ فلمیں مشرقی پاکستان کے علاوہ بعض اوقات مغربی پاکستان میں بھی پہنچ جاتی تھیں۔اس منافع کے سودے میں بھارتی فلموں کی آمد پر بندش لگ جانے سے گھاٹے کا اندیشہ تھا اس لیے ڈھاکا کے تقسیم کار (اور مغربی پاکستان کے تقسیم کار بھی) بہر صورت

بھارتی فلموں کی درآمد کے قائل تھے۔اس مقصد کے لیے وہ جائز وناجائز تمام ذرائع استعمال کرتے تھے۔ایک موقع پر جب پاکستان میں بھارتی فلموں کی درآمد بند کرنے کے سلسلے میں ڈھاکا میں منعقد ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس میں بل پیش ہونے والا تھا توڈھاکا کے تقسیم کاروں نے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیے تھے۔اسمبلی کے ارکان کی بیگمات کی سیر و تفریح اور شاپنگ کے لیے کلکتہ کی سیر کرائی گئی اور دوسری'' خدمات'' سے بھی نوازا گیا۔یہ ایک علیٰحدہ کہانی ہے جس کے کرداروں میں ڈھاکا' کراچی اور لاہور سبھی شہروں کے تقسیم کار شامل تھے۔

ڈھاکا میں دوسانی خاندان نے تقسیم کاری کا آغاز کیااور مغربی پاکستان سے اردو فلمیں حاصل کرکے مشرقی پاکستان میں نمائش کے لیے پیش کرنے لگے۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے دوسرے کاروبار اور تجارت بھی شروع کردی۔۱۹۷۰ء میں جب وہ ڈھاکا سے کراچی آئے تو مشرقی پاکستان میں اپنی رہائش گاہ اور دفاتر کے علاوہ تقسیم کار ادارہ' بے شمار فلمیں' ایک شان دار کئی منزلہ کمرشل عمارت' ایک سنیما ہاؤس اور ایک چائنیز ریستوران بھی وہیں چھوڑ آئے تھے ۔ یہ ان کی دوسری ہجرت تھی۔

اس سے پہلے مشرقی پاکستان میں ان کی مصروفیات کا حال سنئے۔تقسیم کاری کا بزنس تو چل ہی رہا تھا مگر انہیں خیال آیا کہ کیوں نہ فلم سازی کا آغاز کیا جائے۔

ان کی پہلی بنگلہ فلم ''راج دہانیر بوکے'' تھی۔یہ فلم بہت کم سرمائے سے اور بالکل نئی کاسٹ اور نئے ہدایت کار کے ساتھ بنائی گئی تھی۔اس کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ اس فلم میں روبن گھوش کو پہلی بار میوزک ڈائریکٹر کے طور پر متعارف کرایا گیا تھا جو آگے چل کر پاکستان کی فلمی صنعت کے مایہ ناز موسیقار ثابت ہوئے اور انہوں نے بہت سی اردو فلموں کے لیے ناقابل فراموش گانے ترتیب دیے۔اسی فلم میں معاون اداکارہ کے طور پر دبلی پتلی' گہری سانولی رنگت لیکن بڑی بڑی چمک دار آنکھوں اور بہت لمبے سیاہ بالوں والی ایک لڑکی بھی متعارف کرائی گئی تھی جس کا نام جھرنا تھا۔جھرنا چشمے کو کہتے ہیں۔یہ لفظ ہندی اور بنگلہ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔یہی جھرنا بعد میں شبنم بن گئیں اور پاکستان کی صف اوّل کی ممتاز ہیروئن بن گئیں۔انہوں نے تیس سال سے زائد فلموں میں کام کیا۔ڈھاکا سے مغربی

پاکستانی آنے کے بعد انہیں بہت عروج حاصل ہوا۔ایک وقت ایسا بھی تھاجب وہ پاکستان کی مصروف ترین اور بے حد مقبول ہیروئن بن گئیں اوراس حیثیت سے انہوں نے سلور جوبلی منائی۔ پاکستان کا کون سامعروف ہیرو ہے جس کے ساتھ انہوں نے کام نہیں کیا بلکہ اداکاروں کی دوسری اور تیسری نسل کے ساتھ بھی انہوں نے کام کیا تھا۔ جب پاکستان میں اردو فلموں پر زوال آیاتو وہ ڈھاکا چلی گئیں اور وہاں بنگلہ فلموں میں کام کیا مگر مقامی ہیروئنوں نے انہیں ٹکنے نہیں دیا۔ مجبوراً وہ دوبارہ لاہور آ گئیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے پنجابی فلموں میں بھی اداکاری کی۔ کچھ عرصے بعد وہ اداکاری سے کنارہ کش ہو گئیں۔ اس کا ایک سبب ان کی بیماری بھی تھی۔اردو فلموں کی قلت کے پیش نظر روبن گھوش بھی گھر بیٹھ رہے تھے۔اس طرح یہ مقبول جوڑی جو موسیقار اور ہیروئن پر مشتمل تھی فلمی افق سے غائب ہو گئی۔

"راج دہانیر بوکے" کے ساتھ ہی ایک اور بنگلہ فلم "ہرانودن" میں بھی شبنم نے اداکاری کی تھی اور روبن گوش نے اس کی موسیقی بنائی تھی مگر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کون سی فلم ان کی پہلی فلم تھی۔عام طور پر" راج دہانیر بوکے" ہی ان کی پہلی فلم قرار دی جاتی ہے۔یہ فلم ساز کی حیثیت سے انیس دوسانی کی پہلی فلم تھی۔

"راج دہانیر بوکے" کی ایک اور نمایاں خصوصیات یہ تھی کہ یہ پہلی پاکستانی فلم بھی جس کے لیے طلعت محمود نے گلوکاری کی تھی۔طلعت محمود رہنے والے تو لکھنؤ کے تھے لیکن عرصہ دراز تک کلکتہ میں رہنے کی وجہ سے بنگلہ سے بھی واقف تھے اور بہت سے غیر فلمی بنگالی گیت انہوں نے گائے تھے جو بہت زیادہ مقبول ہوئے۔اس زمانے میں کلکتہ اور ڈھاکا آمدورفت میں کوئی دقت نہ تھی اس لیے دونوں شہروں کے لوگ آزادی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے تھے۔

طلعت محمود جب اس فلم کے گانے ریکارڈ کرانے کے لیے آئے تو وہ ریل کے ذریعے چٹا گانگ بھی گئے تھے۔ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہر اسٹیشن پر جہاں ٹرین رکتی تھی سیکڑوں مداح ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو جاتے

تھے ۔طلعت محمود نے مشرقی پاکستان کی ایک اردو فلم " ہم سفر " کے لیے گانے گائے تھے۔اس فلم کے ہدایت کار شوکت ہاشمی تھے۔وہی اس کے مصنف بھی تھے۔

انیس دوسانی کے بارے میں دوسری باتیں بتانے سے پہلے ان کی پیدائش اور تعلیم و تربیت کا ذکر بھی ہو جائے تو بہتر ہے۔انیس دوسانی ۱۹۳۷ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے تھے اور محاورے کے مطابق منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئے تھے کیونکہ خوش حال اور دولت مندی کا دور دورہ تھا۔انہوں نے دار جلنگ کے اعلیٰ ترین اور مہنگے اسکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔لندن کے جے آرتھر رینک اسٹوڈیوز میں بھی انہوں نے ایک سال تک فلم کی تربیت حاصل کی تھی۔جب وہ فارغ التحصیل ہوگئے تو ان کے والد نے کاروبار کا زیادہ تر بوجھ ان پر ڈال دیا مگر خود بھی اس کی دیکھ بھال میں شامل رہے۔

انیس دوسانی نے فلم سازی کے میدان میں ایک بنگلہ فلم کی تیاری سے قدم رکھا تھا مگر ان کو جوش جنون انہیں اور بھی کچھ کرنے پر اکساتا رہا۔انہیں بخوبی احساس تھا کہ فلم کی بڑی مارکیٹ مغربی پاکستان ہے اس لیے اردو فلمیں بنا کر ہی فلم سازی میں مقام اور منافع حاصل کیا جا سکتا ہے۔انہیں یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ تقسیم کا ادارے کے لیے اردو فلموں کا بنانا بھی ضروری ہے۔

ڈھاکے میں ان دنوں میں اول تو فلم بنانا ہی کارے دارد تھا۔نہ اداکار' نہ ہدایت کار' نہ مصنف' نہ موسیقار' نہ عکاس۔کچھ بھی تو دستیاب نہ تھا۔ بنگلہ فلمیں بنانے والے ڈھاکے سے گانوں کی صدابندی کے لیے لاہور آیا کرتے تھے۔موسیقار اور گلوکار بھی یہیں سے حاصل کیے جاتے تھے۔ایسے میں ڈھاکا میں ایک اردو فلم بنانے کا ارادہ کرنا اور پھر ااسے پایہ تکمیل تک پہنچا دینا انیس دوسانی جیسے باہمت انسان ہی کا کام تھا۔

انیس دوسانی نے ڈھاکا میں پہلی اردو فلم " چندا " کا آغاز کیا جس کے فلم ساز وہ خود ہی تھے۔"چندا" کے ہدایت کار احتشام تھے۔یہ کچھ عرصے مغربی پاکستان خصوصاً لاہور کے فلمی حلقوں میں رہ چکے تھے اور کیپٹن رحمٰن کے نام سے

جانے جاتے تھے۔ کیپٹن رحمان بہت دلچسپ اور باتونی آدمی تھے۔ ہمارے ان سے ان ہی دنوں کی ملاقات اور دوستی ہے جب وہ لاہور کے نگار خانوں میں فلم سازی اور ہدایت کاری سیکھتے نظر آتے تھے۔ اس فلم میں بھی نئے لوگ متعارف کرائے گئے تھے۔ جن میں بھی نئے لوگ متعارف کرائے گئے تھے جن میں رحمٰن، شبنم اور مزاحیہ اداکار سبھاش دتہ کے علاوہ فلم کی ہیروئن سلطانہ زمان بھی شامل ہیں۔ سلطانہ زمان کیمرا مین زمان کی بیگم تھیں۔ بعد میں ان دونوں کی علیٰحدگی ہوگئی تھی۔ زمان صاحب پاکستان ٹیلی وژن سے وابستہ ہوگئے تھے۔ وہ مغربی پاکستان میں اسٹیشن منیجر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ ذرا غور کیجئے کہ پہلی فلم میں یہ سب لوگ بالکل نئے نوآموز اور ناتجربہ کار تھے لیکن کچھ عرصے بعد ان سب نے فلمی صنعت میں بہت نمایاں حیثیت حاصل کرلی اور انہوں نے اپنے شعبے میں بام عروج تک پہنچ گئے۔ روبن گھوش اس فلم کے موسیقار تھے۔ ان تمام فنکاروں نے سارے ملک میں نام پیدا کیا۔

سبھاش دتہ بطور مزاحیہ اداکار اس فلم میں پہلی بار پیش کیے گئے تھے۔ سبھاش دتہ نے اس فلم میں بہت سادہ مگر بہت اچھی اداکاری کی تھی۔ اس فلم میں مزاحیہ اداکار کے طور پر انہیں نگار ایوارڈ دیا گیا تھا۔ سبھاش دتہ کا تعارف ایک مزاحیہ اداکار کی حیثیت سے ہوا تھا لیکن بعد میں انہوں نے ہدایت کار اور فلم ساز کی حیثیت سے بنگلہ فلمی صنعت میں بہت نمایاں حیثیت حاصل کی اور بے حد کامیاب اور مقبول فلمیں بنائیں۔ اس فلم میں شبنم نے معاون اداکارہ کی حیثیت سے اتنی اچھی اداکاری کی تھی کہ دیکھنے والوں نے ہیروئن سے بھی زیادہ پسند کیا۔ کچھ عرصے بعد شبنم ہیروئن کی حیثیت سے فلمی صنعت میں ابھرنے لگیں اور فلم ''چندا'' کی ہیروئن سلطانہ زمان کچھ عرصے بعد فلمی افق سے ہی غائب ہوگئیں۔ اس کے برعکس شبنم سپر اسٹار بن گئیں۔

انیس دوسانی کے بقول اس فلم پر ایک لاکھ روپے لاگت آئی تھی۔ فلم کی کاسٹ اور کریڈٹ بالکل نئے اور انجانے تھے ۔ ظاہر ہے کہ اردو فلموں کے لیے اصل مارکیٹ تو مغربی پاکستان ہی تھی۔ جب ''چندا'' مکمل ہو کر نمائش کے لیے تیار ہوئی تو انیس دوسانی نے اس کو مغربی پاکستان میں ریلیز کرنے کا پروگرام بنایا۔ مغربی پاکستان کا سٹ سسٹم بہت مضبوط تھا۔ فلم کی فروخت اور کامیابی کے لیے فلم میں بڑے بڑے ناموں کی موجودگی ضروری تھی لیکن ''چندا'' میں

ہر نام پاکستانی فلم بینوں کے لیے نامانوس اور بالکل نیا تھا۔ بعد میں یہ سب لوگ نامور اور سپر اسٹار ہو گئے تھے مگر ''چندا'' کی ریلیز کے موقع پر یہی کاسٹ اور ہدایت کار بالکل نئے تھے اور ان نئے ناموں والی فلم کو ریلیز کرنے کا خطرہ کوئی مول نہیں لے سکتا تھا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ نگار ویکلی کے مدیر الیاس رشیدی صاحب نے ہمارے سامنے پنجاب اور کراچی کے کئی تقسیم کاروں سے '' چندا'' کی ریلیز کے لیے کہا مگر کوئی آمادہ نہ ہوا۔ الیاس صاحب نے ایک تقسیم کار کو یہ پیشکش بھی کی کہ وہ سوا لاکھ روپے میں ساری مغربی پاکستان کے لیے ''چندا'' کے حقوق حاصل کر لیں مگر ہمارے ایک دوست تقسیم کار ''چندا '' کو اس قیمت میں بھی بہت مہنگا سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے معذرت کر دی۔

انیس دوسانی بلند حوصلہ انسان تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مغربی پاکستان میں کوئی ان کی فلم خریدنے پر آمادہ نہیں ہے تو انہوں کراچی میں اپنا تقسیم کار ادارہ دوسانی فلمز قائم کر کے اللہ کا نام لے کر ''چندا'' کراچی ' سندھ اور بلوچستان سرکٹ میں نمائش کے لیے پیش کر دی۔ کہتے ہیں کہ اللہ ہمیشہ حوصلہ مندوں کا ساتھ دیتا ہے۔ یہی معاملہ انیس دوسانی کے ساتھ بھی پیش آیا ۔ ان کی جس فلم پر کل ایک لاکھ روپے لاگت آئی تھی اس نے صرف کراچی سرکٹ میں بیس لاکھ روپے سے زائد کا بزنس کیا۔ اس طرح کراچی میں دوسانی فلمز کا تقسیم کار ارادہ بھی مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گیا۔

کراچی میں ''چندا'' کی نمائش ہوئی تو دیکھنے والوں کو سبھی کچھ بہت اچھا لگا۔ مشرقی پاکستان کے آؤٹ ڈور مقامات یہاں کے لوگوں کے لیے نئے اور بے حد دلکش تھے۔ اداکار سبھی نئے تھے اور ان میں سے کئی اداکاروں کا اردو تلفظ بھی بہت اچھا نہیں تھا مگر یہی بات اس فلم کی خوبی بن گئی۔ بنگالی اداکاروں کے لیے بہت آسان اور سادہ مکالمے لکھے گئے تھے۔ جو فلم بینوں نے مغربی پاکستان کی فلموں میں عموماً بھاری بھر کم اور مشکل ڈرامائی مکالموں کا رواج تھا۔ گانوں کی طرزیں بھی سادہ اور عام فہم تھیں اور دل نشیں بھی۔ اس لیے '' چندا'' کی موسیقی بھی سب کو بہت پسند آئی۔ کراچی میں چند ہفتوں کی نمائش کے بعد یہ سب نام فلم بینوں کے لیے مانوس ہو گئے اور وہ ان کو پسند کرنے لگے۔

پنجاب اور صوبہ سرحد کے سرکٹ کے لیے اس فلم کو جے سی آنند صاحب نے ریلیز کیا تھا اور اس سرکٹ میں بھی اسے بہت مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ انیس دوسانی ہی کی جُرات رندانہ کا یہ ثمر تھا کہ جس فلم پر صرف ایک لاکھ روپے لاگت آئی تھی اس نے سارے پاکستان میں تقریباً چالیس لاکھ روپے کا بزنس کیا۔ ۱۹۲۱ء میں یہ بہت معقول رقم تھی اور ہٹ فلمیں ہی اتنی کمائی کرتی تھیں۔

انیس دوسانی کا نام مغربی پاکستان میں بھی ایک جانا پہچانا نام بن گیا۔

''چندا'' کی کامیابی نے انیس دوسانی کو ایک نیا حوصلہ بخشا۔ اب انہوں نے اردو فلمیں بنانے کا عزم کر لیا تھا۔ پہلی کامیابی نے ان کے حوصلے بلند کر دیے تھے۔ اسی طرز پر وہ دوسری فلم بنانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے لیکن اس بار انہوں نے زیادہ منصوبہ بندی اور سوجھ بوجھ سے کام لیا۔

انیس دوسانی کی دوسری اردو فلم ''تلاش'' تھی۔ قسمت ان پر مہربان تھی اس لیے ''تلاش'' نے ''چندا'' سے زیادہ کامیابی حاصل کی اور مقبولیت کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ ''چندا'' کے موسیقار روبن گھوش اور نغمہ نگار سرور بارہ بنکوی تھے۔ سرور صاحب ایک مستند اور مقبول ادبی شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے مگر جب انہوں نے فلمی گیت لکھے تو ایک نیا معیار قائم کر دیا۔ ان کے نغمات میں ادبی چاشنی اور دلکشی بھی تھی اور نغمگی بھی۔ بول سچویشنز کے حساب سے بھی بہت موزوں اور برمحل تھے۔ ''چندا'' میں ان دونوں کی ٹیم نے موسیقی کے دلدادہ لوگوں کے دل موہ لیے تھے۔

''تلاش'' کی ہدایت کاری انیس دوسانی نے احتشام صاحب کے چھوٹے بھائی مستفیض کے سپرد کر دی حالانکہ وہ پہلی فلم کی کامیابی کے بعد اس ہدایت کار کو لے سکتے تھے مگر وہ نت نئے تجربات کرنے اور نئے نئے لوگوں کو آزمانے کے قائل تھے۔ بعد میں احتشام اور مستفیض نے بہت سی کامیاب فلمیں بنائیں اور مشرقی پاکستان کی صنعت فلم سازی میں انہیں بہت نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔ انیس دوسانی کاروبار کے معاملے میں بھی انصاف پسند اور بہت کھرے انسان

تھے۔انہوں نے اپنے ہدایت کاروں کو فلم میں حصے دار کے طور پر شامل کر لیا تھااور انہیں ہر فلم کا معقول منافع دیا کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ کام کرنے والے فلم ساز اور ہدایت کار بھی دولت منداور خوش حال ہو گئے تھے۔

’’تلاش ‘‘ میں شبنم اور رحمٰن کو پہلی بار فلم جوڑی کی حیثیت سے پیش کیا تھااور پہلی فلم ہی سے یہ فلمی جوڑی مقبول ترین فلمی جوڑی بن گئی تھی۔ سبھاش دتہ بھی اس کے اداکاروں میں شامل تھے۔دوسرے تمام اداکار بھی ڈھاکہ سے ہی تعلق رکھتے تھے۔فلم کے مصنف اور ہدایت کار مستفیض تھے مگر اس کے مکالمے اور نغمات سرور بارہ بنکوی نے لکھے تھے۔ سرور بارہ بنکوی کے نغمات اور روبن گھوش کی دھنوں نے دھوم مچادی اور اس فلم کی موسیقی بھی بہت پسند کی گئی ۔انیس دوسانی کی یہ دوسری فلم گولڈن جوبلی تھی۔اس کی کامیابی کے بعد انیس دوسانی ایک معتبر فلم ساز قرار دے دیے گئے۔

’’تلاش ‘‘کے بعد ہدایت کار مستفیض نے ان کے لیے فلم ’’پیسہ‘‘ بنائی۔یہ بھی ایک معیاری فلم تھی اگرچہ کاروباری اعتبار سے یہ چنداور تلاش جیسی کامیابی حاصل نہیں کر سکی تھی۔اس فلم میں شبنم کے ساتھ عظیم ہیرو تھے۔اس فلم کے نغمہ نگار سکہ بند شاعر فیاض ہاشمی تھے۔روبن گھوش نے طرزیں بنائی تھیں۔

اب انیس دوسانی کی کراچی اور لاہور آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔اپنی دلکش شخصیت اور شائستہ بات چیت کی وجہ سے وہ فلمی حلقوں میں بہت جلد مقبول ہو گئے۔لاہور میں سنتوش کمار سے ان کی بہت گہری دوستی ہو گئی تھی۔ جب بھی وہ لاہور آتے تھے توان کی شام سنتوش کمار کے گھر پر ہی گزرتی تھی۔یہاں کچھ اور مہمان بھی مدعو ہوا کرتے تھے۔سنتوش کمار کا دستر خوان (یا کھانے کی میز) بہت وسیع تھا۔کئی اقسام کے لذیذ کھانے میز پر موجود ہوتے تھے۔

تاش کھیلنے والوں کے لیے تاش کی محفل الگ کمرے میں جمتی تھی۔جام وساغر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے علیحدہ نشست کا بندوبست ہوتا تھا۔رات گئے تک گپ شپ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔رات گئے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو

سدھار جاتے تھے۔اس قسم کی محفلیں اس زمانے میں فلمی دنیا میں عام تھیں اور مختلف افراد کے گھروں پر ان کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ علی زیب کے گھر پر محفلیں اور ادبی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔آغا گل اور شبنم کے گھروں پر بھی اکثر ایسی تقریبات منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں فلمی ہستیوں کے علاوہ علمی و ادبی شخصیات کا بھی جمگھٹا ہوتا تھا۔ محمد علی کے گھر پر جوش ملیح آبادی، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، فیض احمد فیض جیسے لوگ مدعو ہوا کرتے تھے۔اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیسی محفل اور کیسی رونق ہوتی ہو گی۔اب تو یہ حال ہے کہ بقول شاعر.....

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

اب تو گئے دنوں کی یادیں اور باتیں ہی رہ گئی ہیں۔نہ وہ لوگ رہے نہ وہ محفلیں۔

انیس دوسانی کی اگلی فلم ''ساگر'' تھی۔یہ رنگین فلم تھی اور اس پر انہوں نے کھلے دل سے روپیہ لگایا تھا۔اس کی کہانی احتشام نے لکھی تھی۔اس کے ہدایت کار بھی مستفیض تھے۔عطا الرحمٰن خان اس کے موسیقار تھے۔ترانہ، شہنشاہ اور سبھاش دتہ بھی اس کے اداکاروں میں شامل تھے۔انیس دوسانی نے جس شوق اور جتنے سرمائے سے یہ فلم بنائی تھی یہ اس کے مطابق کامیابی حاصل نہ کر سکی۔اس کی ایک وجہ کہانی کی کمزور اور دوسری وجہ شبنم کے ساتھ عظیم کی فلمی جوڑی بھی تھی۔ فلم بین شبنم اور رحمٰن کو فلمی جوڑی کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔دراصل ڈھاکہ کی اردو فلموں کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ کہانی کے مواد اور معیار کے اعتبار سے ڈھاکہ کی فلمیں زیادہ بھاری بھر کم نہیں ہوتی تھیں۔سیدھی سادی کہانیاں فلمائی جاتی تھیں۔ مغربی پاکستان کی فلموں کی طرح ان کی کہانیاں نہیں فلمائی جاتی تھیں۔ مغربی پاکستان کی فلموں کی طرح ان کی کہانیوں میں زیادہ مواد اور نشیب و فراز نہیں ہوتا تھا۔اداکاروں کا نیا پن اور سچویشنز کی انفرادیت بھی باقی نہیں رہی تھی حالانکہ اداکاری اور ہدایت کاری کا معیار بہت بہتر اور بلند ہو گیا تھا لیکن اسکرپٹ اور کہانی کی کمزوری کی وجہ سے یہ فلمیں زیادہ کامیابی حاصل نہیں کر سکی تھیں۔

انیس دوسانی کو اس فلم میں اگر زیادہ فائدہ نہیں ہوا تو نقصان بھی نہیں ہوا تھا۔

رنگین فلم ''ساگر'' کا بہت زیادہ کامیاب نہ ہونا ان کے لیے مایوسی کا سبب نہ بن سکا تھا۔ اس بار انہوں نے ایک رنگین سنیما اسکوپ فلم بنانے کا منصوبہ بنایا اور ''مالا'' کے نام سے ایک بڑی لاگت کی فلم کا آغاز کیا۔ ''مالا'' کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہ پاکستان کی پہلی رنگین سنیما اسکوپ فلم تھی۔ اس کے ہدایت کار بھی مستفیض تھے۔ اداکاروں میں سلطانہ زمان، عظیم مرکزی کرداروں میں تھے۔ اس فلم کی خامی بھی اس کی کمزور کہانی تھی۔ اداکار بھی مقبول نہ تھے اس لیے یہ فلم زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔

انیس دوسانی اس وقتی ناکامی سے دل برداشتہ ہونے والے نہیں تھے۔ اس بار انہوں نے پھر ایک بالکل نئی کاسٹ کی فلم بنانے کا منصوبہ بنایا۔ یہ فلم ''چکوری'' تھی جس نے کئی اعتبار سے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔

''چکوری'' ایک تاریخ اور تاریخ ساز فلم تھی جس میں پہلی بار نذیر بیگ کو ندیم کے نام سے ہیرو کے کردار میں پیش کیا گیا تھا۔ فلم ساز انیس دوسانی نے اس فلم میں بالکل نئی رومانی جوڑی کا انتخاب کیا تھا۔ ''چکوری'' میں ندیم اور شبانہ کو پہلی بار متعارف کرایا گیا تھا۔ ندیم کے ہیرو بننے کی داستان کئی بار سنائی جا چکی ہے۔ وہ ڈھاکا کی معروف گلوکارہ فردوسی بیگم کی سفارش پر گلوکاری کرنے کے لیے ڈھاکہ گئے تھے۔ ''چکوری'' کے ہیرو آعظم تھے لیکن عین وقت پر وہ شوٹنگ کے لیے دستیاب نہ ہو سکے تو ہدایت کار مستفیض نے ندیم کو ہیرو کا کردار سونپ دیا۔ یہ دونوں فن کار بعد میں مایہ ناز سپر اسٹار بن گئے۔ ندیم بیگ لگ بھگ ۲۵ سال تک ہیرو کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور آج بھی اداکاری میں ایک بلند مقام اور معتبر نام کے مالک ہیں۔ شبانہ کو بھی بے حد مقبولیت حاصل ہوئی وہ بھی ۲۵ سال سے زائد عرصے تک فلموں میں ہیروئن کی حیثیت سے کام کرتی رہیں۔ انہوں نے اصرار کے باوجود مغربی پاکستان میں رہائش اختیار نہیں کی۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہ بنگلہ فلموں کی سپر اسٹار ہیروئن بن گئی تھیں اور آج بھی اداکاری کے میدان میں جلوہ گر ہیں۔ اس فلم کے اداکاروں میں ریشماں، مصطفیٰ، ڈیئر اصغر اور عرفان بھی شامل تھے۔

’’چکوری ‘‘ کے لیے انیس دوسانی نے کچھ اور تجربے بھی کیے تھے۔ مثلاً موسیقار روبن گھوش کے لیے اختر یوسف نے نغمات لکھے تھے۔ ندیم جو کہ گلوکار بننے گئے ان سے ایک بھی گانا نہیں گوایا گیا۔ اس فلم میں احمد رشدی اور مجیب عالم کی آوازوں میں گانے ریکارڈ کیے گئے تھے۔ ’’چکوری‘‘ اپنی موسیقی کے حوالے سے بھی ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ اس کی کہانی سادہ رومانی اور بہت عام فہم تھی۔ دراصل یہ ایک لو اسٹوری تھی۔ بہت اچھی موسیقی، خوب صورت لوکیشنز اور نئی فلمی جوڑی کی وجہ سے اس فلم کو بے پناہ کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ ۷۵ ہفتوں سے بھی زیادہ چلی اور اس نے کئی نگار ایوارڈ حاصل کیے تھے۔

’’چکوری‘‘ کی عدیم المثال کامیابی میں شاید قسمت کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ سبھی کے ستارے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے تھے جن کی وجہ سے ایک سپر ہٹ اور یادگار فلم وجود میں آئی تھی۔ ندیم اور شبانہ راتوں رات سپر اسٹار بن گئے تھے۔ مغربی پاکستان کے فلم ساز اور ہدایت کار ان دونوں کو اپنی فلموں میں کاسٹ کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ ندیم کی دوسری فلم ’’ چھوٹے صاحب‘‘ تھی۔ یہ ایک مزاحیہ فلم تھی اس کے فلم ساز احتشام اور ہدایت کار مستفیض احتشام صاحب کے چھوٹے بھائی تھے اور احتشام صاحب ’’چکوری‘‘ کی ریلیز کے کچھ عرصے بعد ہی ندیم کے خسر بن گئے تھے لیکن اس فلم کے سرمایہ کار بھی انیس دوسانی ہی تھے۔ ندیم کے ساتھ شبانہ نے مرکزی کردار کیا تھا۔ یہ ایک خالص مزاحیہ فلم تھی علی حسین اس کے موسیقار تھے اور نغمات اختر یوسف نے لکھے تھے۔ یہ بھی ایک کامیاب فلم تھی۔ اس کامیابی میں ندیم اور شبانہ کی فلمی جوڑی کی مقبولیت کا بھی نمایاں ہاتھ تھا۔

انیس دوسانی نے اس کے بعد فلم ’’چاند‘‘ اور ’’چاندنی ‘‘بنائی۔ احتشام اس کے ہدایت کار تھے۔ ندیم اور شبانہ مرکزی کرداروں میں پیش کئے گئے تھے۔ ریشماں، مصطفٰے اور مزاحیہ اداکار ڈئیر اصغر تھی اس میں نمایاں اداکار تھے۔ اس کے موسیقار کریم شہاب الدین تھے۔ نغمات سرور بارہ بنکوی نے لکھے تھے۔ اس فلم کی موسیقی بے حد پسند کی گئی۔ مسعود رانا کے دوگانے سپر ہٹ اور یادگار ہو گئے۔

ڈھاکہ میں انیس دوسانی نے آخری فلم ''قلی'' بنائی تھی جو کامیاب نہ ہو سکی۔اس کے اداکاروں میں بھی ندیم اور شبانہ شامل تھے۔ سجاتا' جلیل افغانی اور عظیم بھی اس کی کاسٹ میں تھے۔ سرور بارہ بنکوی کے نغمے موسیقار علی حسین نے طرزوں میں ڈھالے تھے۔ یہ ڈھاکا میں انیس دوسانی کی آخری فلم تھی جو کامیاب نہ ہو سکی۔

مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات دگرگوں ہو گئے تھے اس لیے انیس دوسانی اور ان کے خاندان نے ایک بار پھر ہجرت کی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان چلے آئے۔اس بار انہیں کچھ بھی ساتھ لانے کا موقع نہیں ملا تھا۔سارے اثاثے ڈھاکہ میں رہ گئے تھے۔ صرف حوصلہ اور عزم ان کے ساتھ تھا۔

کراچی میں اس خاندان نے نئے سرے سے زندگی کا آغاز کیا۔چندریگر روڈ کے آخری کنارے پر ایک چائنیز ریستوران کا آغاز کیا گیا جو ڈھاکہ کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا۔اس ریستوران میں ہم انیس دوسانی صاحب سے ملنے گئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ خود اور ان کے والد بڑے دوسانی صاحب بذات خود دیکھ بھال اور گاہکوں کی سروس کے لیے موجود تھے۔اس قدر عروج کے بعد زوال سے ہمکنار ہونے کے باوجود نہ تو ان کے حوصلے میں کمی آئی تھی اور نہ ہی کسی قسم کا احساس کمتری پیدا ہوا تھا۔

کراچی میں انیس دوسانی نے ایک بار پھر فلم سازی کا آغاز کیا۔ان کی پہلی فلم ایک پنجابی فلم تھی جس کے ہدایت کار جعفر بخاری اور موسیقار جے اے چشتی تھے۔اس کا نام ''مترئی ماں '' تھا۔بد قسمتی سے پاکستان میں بنائی ہوئی پہلی فلم ہی کامیاب نہ ہو سکی۔ مگر انیس دوسانی ہمت ہارنے والے نہ تھے۔

اس بار انہوں نے ہدایت کار و فلم ساز پرویز ملک کے اشتراک سے فلم سازی کا آغاز کیا۔اس سے پہلے وہ پرویز ملک کی فلمیں ڈسٹری بیوشن کے لیے حاصل کر چکے تھے اور دونوں کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ان دونوں کی پہلی اردو فلم ''انمول'' تھی جس نے کامیابی کا نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اس فلم کے اداکاروں میں شبنم اور شاہد نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ علاؤالدین' منور سعید اور افضال احمد بھی اس کے نمایاں اداکاروں میں شامل تھے۔نغمہ نگار مسرور انور اور

موسیقار نثار بزمی تھے۔ یہ فلم ہر اعتبار سے ایک بہت معیاری اور کامیاب فلم تھی جس نے پاکستان میں پرویز ملک اور انیس دوسانی کے اشتراک کا آغاز کیا۔ یہ ساتھ ان دونوں کو بہت راس آیا اور انہوں نے بعد میں بھی کئی کامیاب اور معیاری فلمیں بنائیں جن میں ''دشمن پہنچان'' قابل ذکر ہیں۔

انیس دوسانی اور پرویز ملک کی دوستی بہت گہری تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مزاج شناس تھے اور ان کے خیالات وافکار بھی بہت حد تک یکساں تھے۔ پاک پتن میں بابا فریدؒ کے عرس کے لیے انیس دوسانی کراچی سے بطور خاص لاہور آتے تھے۔ وہ اور پرویز ملک باقاعدگی سے ہر سال اس عرس میں شرکت کرتے تھے۔

ایک بار معلوم ہوا کہ پرویز صاحب اور انیس دوسانی نے ایک مرشد کے ہاتھوں پر بیعت کرلی ہے۔ یہ ایک غیر ملکی اور ہالینڈ کے رہنے والے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اسی کے ہو کر رہ گئے۔ دنیا کو چھوڑ کر دین کو اپنالیا۔ گمنام اور الگ تھلگ رہتے تھے۔ بہت کم لوگ ان کی بزرگی اور فضیلت کے بارے میں جانتے تھے۔ وہ بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور لوگوں کے سامنے اللہ والے بزرگ کی حیثیت سے آنے سے پرہیز کرتے تھے۔ چند سال قبل ان کے مرشد کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔

چندروز قبل رات کے وقت اسلام آباد سے پرویز ملک صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انہوں نے علیک سلیک کے بعد پوچھا ''آپ کو انیس دوسانی کی خبر تو مل گئی ہو گی؟''

ہم نے پریشانی سے کہا ''نہیں۔ انہیں کیا ہوا؟''

بولے ''ان کا ہارٹ فیل کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔''

کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے پھر مزید بات کیے بغیر ٹیلی فون بند کر دیا۔ پہلی رمضان ۷ نومبر ۲۰۰۱ء کو وہ تیسری بار ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ مگر اس بار آخری اور دائمی ہجرت تھی۔ اس کے بعد انہیں کوئی اور ہجرت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

انیس دوسانی صاحب سے ہماری کافی ملاقاتیں رہیں۔سب سے زیادہ ملاقاتیں سنتوش صاحب کے گھر پر ہوتی تھیں یا تو سنتوش صاحب ہمیں مدعو کر لیتے تھے یا پھر انیس دوسانی بتادیتے تھے۔ویسے بھی ہمیں علم تھا کہ لاہور کے دوران قیام میں وہ شام کو سنتوش صاحب کے گھر پر ہی ملتے ہیں۔وہ خوش مزاج اور باتونی آدمی تھے مگر ہر ایک سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔جسم بھاری تھا اور آواز میں بھی بھاری پن تھا۔قد کے اعتبار سے یہ بھاری پن برا نہیں لگتا تھا۔حیرت کی بات ہے کہ ان کے وزن میں ہم نے کبھی کوئی نمایاں کمی نہیں دیکھی۔گوری رنگت تھی۔آنکھیں بڑی بڑی اور چمک دار جن سے ذہانت ٹپکتی تھی۔مسکراتے تو بہت اچھے لگتے تو۔ان کی عادت تھی کہ ایک ہاتھ سے دوسرا ہاتھ (ہتھیلی) ملتے رہتے تھے۔خصوصاً جب کسی بات پر غور کر رہے ہوں۔

انیس صاحب سے ہماری ڈھاکہ میں بھی ملاقاتیں رہیں۔ ایک بار وہ ہمیں اپنے خوب صورت اور شان دار گھر پر بھی لے گئے تھے لیکن ان سے پہلی ملاقات بہت ڈرامائی قسم کی تھی۔ہوا یہ کہ جب ۶۲،۱۹۶۱ء میں میڈم نور جہاں، اعجاز، نیلو اور رتن کمار نیف ڈیک کے اس وقت کے ایم ڈی خیر الکبیر صاحب کی بیگم کے اسکول کے لیے فنڈز فراہم کرنے کے سلسلے میں شو پیش کرنے کے لیے ڈھاکہ گئے تو اس ٹیم کے ہم انچارج تھے۔رتن کمار ہمیں ہیڈ ماسٹر کہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں انیس دوسانی صاحب سے ہوٹل میں ملاقات ہوئی مگر ہم ان سے زیادہ واقف نہ تھے۔فلم سازی کا بھی انہوں نے نیا نیا آغاز کیا تھا۔سچ تو یہ ہے کہ ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔انہوں نے یہ شو سنیما ہال میں ٹکٹ خرید کر دیکھے تھے۔ہوٹل شاد باغ میں جب میڈم نور جہاں نے عملے کے نچلے ارکان کے لیے ایک شام گانا سنانے کا وعدہ کیا تھا اور ہوٹل کے انتظامیہ نے اپنی طرف سے بہت سے معززین اور ان کی بیگمات کو مدعو کر لیا تھا ان میں انیس دوسانی صاحب شامل نہ تھے۔جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں میڈم نور جہاں ان امیر لوگوں کو دیکھ کر بہت برہم ہو گئی تھیں اور انہوں نے یہ کہہ کر ان سب کو باہر نکالنے کے لیے کہا تھا کہ یہ پروگرام میں نے نچلے ملازمین اور ان کے خاندانوں کے لیے کیا ہے نہ کہ دولت مندوں کے لیے۔میڈم کا حکم بھلا کون ٹال سکتا تھا۔مجبوراً انتظامیہ نے تمام معززین اور قیمتی ساڑیوں اور زیورات سے لدی ہوئی بیگمات کو باہر جانے پر رضا مند کر لیا۔خدا جانے اس کے لیے بعد میں انہیں کیا خمیازہ بھگتنا پڑا ہو گا۔

اس سے پہلے سیلاب زدگان کی امداد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی غرض سے ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں کرکٹ میچ کھیلے گئے تھے۔ پاکستانی فلمی فنکار پہلی بار ڈھاکہ گئے تھے جنہیں دیکھنے کو ایک عالم امنڈ آیا تھا۔ یہ واقعات بھی ہم تفصیلاً بیان کر چکے ہیں۔ اس دوسرے میں پاکستانی فلمی صنعت کے سبھی ممتاز فنکار شامل تھے۔ پاکستان فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کی طرف سے ان کی نگرانی ہمارے سپرد کی گئی تھی۔ ہم نے تمام فنکاروں کو بتا دیا تھا کہ وہ کسی انجانے شخص کی دعوت قبول نہ کریں۔ نہ کسی کی کار میں بیٹھ کر ہوٹل جائیں اور نہ ہی کسی کو ملاقات کے لیے وقت دیں۔ سب کو ہم سے رابطہ کرنا ضروری تھا۔ فلمی فنکاروں کے لیے وہاں بھی لوگوں کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ ڈھاکہ ائرپورٹ پر ہزاروں افراد فنکاروں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے موجود تھے۔ سیکڑوں شوقین پرستار ائرپورٹ کی چھت پر چڑھ گئے تھے جس سے کافی نقصان ہوا مگر شکر ہے کہ چھت سلامت رہی۔ ہوٹل والوں کو ہم نے یہ واضح ہدایت دی تھی کہ کسی فنکارہ کے لیے موصول ہونے والی ٹیلی فون کال براہ راست انہیں نہ دی جائے بلکہ ہم سے رابطہ قائم کرایا جائے۔

اس انتظام کے بعد کافی امن وسکون اور نظم وضبط رہا۔ بے شمار پرستاروں کے ٹیلی فون موصول ہوتے تھے جن میں سے ملاقات کے خواہش مند بھی تھے بعض کھاتے پیتے گھرانے فنکاروں کو اپنے گھر بھی مدعو کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وقت کی کمی اور دیگر مصروفیات کے باعث یہ ممکن نہ تھا۔ اس لیے ہم ہر ایک کو معذرت کر کے ٹال دیا کرتے تھے۔

ڈھاکہ ہماری فلائٹ شام ڈھلے پہنچی تھی۔ سیکڑوں پولیس والے حفاظت کے لیے موجود تھے پھر بھی لوگ ان کا حصار توڑ کر اندر آ گئے تھے جنہیں لاٹھی چارج کے ذریعے نکالا گیا۔ ہوٹل کے سامنے سیکڑوں افراد شب و روز صرف اس انتظار میں کھڑے رہتے تھے کہ شاید آتے جاتے فنکاروں کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ یہی منظر کراچی کی میٹروپول ہوٹل کے سامنے بھی دیکھنے میں آتا تھا۔ جب کرکٹ میچ کے لیے فنکار کراچی جایا کرتے تھے۔

ان واقعات سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایک زمانے میں فلمی فنکاروں کی کتنی عزت اور قدر و منزلت تھی اور لوگ ان کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے کسی قدر تردد اور تگ و دو کرتے تھے۔آج فنکاروں کی طرف کوئی نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

ا۔ایک وجہ تو یہ ہے کہ فلموں کو اب پہلے جیسی مقبولیت حاصل نہیں رہی ہے کیونکہ ان کا معیار انتہائی پست ہو گیا ہے۔جب لوگ فلمیں ہی نہ دیکھیں گے فنکاروں کو پسند کیسے کریں گے۔

۲۔ فلمی فنکاروں نے اپنے کردار اور آئے دن کے اسکینڈلز اور ایک دوسرے پر الزامات عائد کر کے کردار کشی کی وجہ سے عام لوگوں کو ان سے بد ظن کر دیا ہے ۔ان کی نظروں میں اب فن کاروں کی قدر و عزت نہیں رہی ہے۔

۳۔فلمی فنکار بلا تکلف ٹی وی پر نمودار ہو کر عجب بے تکی باتیں اور حرکتیں کرتے ہیں جس کی وجہ سے دیکھنے والوں کی رائے خراب ہو جاتی ہے اور وہ گھر بیٹھے انہیں دیکھ بھی لیتے ہیں۔

۴۔فنکار اب اسٹیج ڈراموں اور دوسرے پروگراموں میں بہت کثرت سے دیکھے جاتے ہیں۔یہ پروگرام ہزاروں افراد دیکھتے ہیں اور پھر ٹی وی کے ذریعے بھی بار بار پیش کیے جاتے ہیں۔اس وجہ سے فنکاروں کو دیکھنے کا اشتیاق ختم ہو گیا ہے۔

۵۔آخری اور سب سے بڑی وجہ خود فنکاروں کی شخصیت ہے۔ہمارے موجودہ فنکاروں میں صحیح معنوں میں سپر اسٹار کسی کو کبھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔سپر اسٹار وہ فنکار ہوتا ہے جس کا نام ہی دیکھ کر فلم بین اس فلم کا انتظار کرنے لگتا ہے۔فلم خواہ کیسی بھی ہو وہ اپنے محبوب فنکاروں کی خاطر فلم کو ضرور دیکھتا ہے۔باکس آفس اسٹار بھی ایسے ہی ہوتے ہیں جن کا نام باکس آفس پر فلم بینوں کی آمد کی ضمانت ہوتا ہے۔یہ لوگ اپنے فن، شخصیت رکھ رکھاؤ اور جاذبیت کی وجہ سے عوام کے دلوں میں اپنی جگہ بناتے ہیں۔بد قسمتی سے پاکستان کے فلمی فنکاروں کی نئی نسل میں ایسا کوئی ایک بھی فنکار موجود نہیں ہے جس کی فلم دیکھنا فلم بینوں کے ایک طبقے کے لیے لازمی حیثیت رکھتا ہو۔ہیروئنوں نے ہر قسم کی

اوٹ پٹانگ اور فضول فلموں میں اتنی کثرت سے کام کیا ہے کہ فلم بین ان سے اکتا چکے ہیں۔ مرد فنکاروں میں بھی اس وقت کوئی ایسا فنکار موجود نہیں ہے جس کو دیکھنے کی فلم بین تمنا کریں۔ لے دے کر ایک شان ہیں مگر ان کا یہ عالم ہے کہ وہ اردو پنجابی ہر فلم میں کام کرتے نظر آتے ہیں خواہ کردار کا تقاضا ہو یا نہ ہو۔ ایک تو کرداروں کی یکسانیت ہوتی ہے اس پر انہوں نے اپنے آپ پر سلطان راہی کا ٹھپا لگا یا ہے اور ہر فلم میں ایک ہی قسم کے غضب ناک اور خوں خوار انداز میں نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے وہ پنجابی فلم بینوں کے ایک مخصوص طبقے میں پسند کیے جاتے ہوں لیکن عمومی طور پر ان کے اس انداز کو پسند نہیں کیا جاتا۔

یہ بھی سچ ہے کہ فنکاروں کی نئی پود میں صرف شان ہی اپنے چہرے مہرے اور صلاحیتوں کی بنا پر نمایاں ہیں مگر لا ابالی طبیعت اور پیسہ کمانے کے لالچ نے انہیں خراب کر دیا ہے۔ دلیپ کمار نے ساٹھ سال کی فلمی زندگی میں ساٹھ فلموں میں بھی کام نہیں کیا حالانکہ منہ مانگی قیمت پر فلم ساز انہیں سائن کرنے کے لیے ترسا کرتے تھے۔ مگر ہمارے فنکاروں چند سالوں میں ہی سیکڑوں فلموں میں کام کر لیتے ہیں اور پھر فخریہ طور پر بتاتے ہیں کہ میں نے سیکڑوں فلموں میں کام کیا ہے اور ایک مہینے کے اندر فلم مکمل کرائی ہے۔ ان حالات میں سپر اسٹار کہاں سے آئے اور کیسے آئے۔ خاص طور پر ایسے حالات میں جبکہ ملک میں فلم سازی بہت کم ہو گئی ہے اور اردو فلمیں تو برائے نام ہی بن رہی ہیں۔ یہ تذکرہ دراصل برسبیل تذکرہ سمجھئے۔

ہم یہ بتا رہے تھے کہ جب پہلی بار مغربی پاکستان کے فنکار ڈھاکہ اور چٹا گانگ پہنچے تو یہاں ہر طبقے کے لوگ ان کی دید کو ترستے تھے۔ ہماری تاکید اور پابندی کے باوجود ڈھاکہ ائرپورٹ پر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ روشنی کم تھی۔ سورج ڈھل چکا تھا۔ منتظمین کو کوئی جانتا پہچانتا نہ تھا۔ ایسے میں کئی امیر زادے ہیروئنوں کے پاس پہنچ کر انہیں اپنی کاروں میں بیٹھا کر ہوٹل پہنچانے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ بعض نے یہ جھوٹ بھی بول دیا کہ وہ منتظمین میں شامل ہیں۔ لاہور سے تیس سے اوپر فنکار اور نمائندے ڈھاکہ پہنچے تھے۔ ائرپورٹ پر افراتفری کا عالم تھا۔ ہم نے فنکاروں کو فلم پروڈیوسرز

ایسوسی ایشن کے جنرل سیکریٹری عزیز احمد صاحب اور اداکار نصرت کاردار کی نگرانی میں دے دیا تھا مگر پھر بھی من چلے اپنے کام میں مصروف تھے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔

ہمیں کسی نے بتایا کہ بعض ہیروئنیں کچھ انجانے لوگوں کی کاروں میں بیٹھ کر گئی ہیں۔ ہم بھاگے بھاگے گئے۔ ایک کھلی چھت کی شان دار گاڑی میں نیلو، نگہت سلطانہ تشریف فرما تھیں۔ ایک اور بڑی سی کار میں چند اور ہیروئنیں بھی جلوہ گر نظر آئیں۔ ہمیں بہت غصہ آیا۔

ہم نے نیلو سے کہا "آپ اس گاڑی میں کیوں بیٹھ گئی ہیں۔"

کہنے لگیں "انہوں نے کہا تھا کہ ہوٹل پہنچا دیں گے۔"

"آپ انہیں جانتی ہیں؟"

"نہیں؟"

"کسی منتظم نے آپ کو اس کار میں بیٹھنے کو کہا تھا؟"

"نہیں؟"

"تو پھر آپ اس کار میں کیوں بیٹھ گئیں۔ فرض کیجئے اگر یہ لوگ آپ کو کہیں اور لے گئے تو کیا ہو گا؟"

وہ ڈر گئیں اور فوراً کار سے باہر نکل گئیں۔

کار کا مالک ایک اسمارٹ نوجوان تھا۔ اس نے کہا "سر۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ میں تو صرف انہیں ہوٹل تک پہنچانا چاہتا تھا۔"

ہم نے انہیں ڈانٹ دیا" کسی کو اطلاع دیے بغیر آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ کے خلاف اغوا کی رپورٹ درج کرائی جاسکتی ہے۔"

وہ گھبرا گیا "سوری سر۔ میں نے غلط فہمی میں ایسا کر دیا تھا۔ معاف کر دیجئے۔"

اس قسم کے مسائل تھے جن سے ہمیں ڈھاکہ میں دوچار ہونا پڑ رہا تھا مگر ہم نے بہت سخت ڈسپلن قائم کر رکھا تھا جس کے سب معترف تھے۔ صدر عطااللہ شاہ ہاشمی صاحب' الیاس کاشمیری صاحب اور دوسرے معتبر لوگ ہمیں ہیڈ ماسٹر یار نگ ماسٹر کہنے لگے تھے۔

اسی زمانے میں ہماری پہلی بار انیس دوسانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ نوجوان' اسمارٹ اور خوش لباس تھے۔ انہوں نے باقاعدہ وقت لے کر ہم سے ہوٹل میں ملاقات کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ فنکاروں کو ایک شام مدعو کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے ان سے بھی معذرت کر دی اور بتایا کہ یہ لوگ صرف میچ کے لیے یہاں آئے ہیں۔ اس کے بعد چٹاگانگ جانا ہے اور واپسی پر ڈھاکہ پہنچ کر لاہور۔"

وہ بولے "تو پھر واپسی پر کوئی وقت نکل سکتا ہے؟"

"ناممکن ہے۔ اس شام کی فلائٹ بک ہے۔ کسی کے پاس وقت نہیں ہوگا۔ ممکن ہے کچھ فنکار تھوڑا سا وقت نکال کر شاپنگ کے لیے بھی جائیں۔ امید ہے آپ ہمارا مسئلہ سمجھ گئے ہوں گے۔"

وہ مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔ ہمیں یاد ہی نہیں رہا کہ ہم ان سے پہلی بار کب اور کہاں ملے تھے۔ انہوں نے بھی کبھی تذکرہ نہیں کیا۔ ممکن ہے انہیں بھی ہوٹل کی لابی میں ہونے والی یہ سرسری سی ملاقات یاد نہ رہی ہو۔

انیس دوسانی نے ہماری فلم ''سزا'' کراچی میں نمائش کے لیے خریدی تھی۔اس فلم میں نیا ہیرو جمیل اور نووارد ہیروئن روزینہ تھیں۔ قوی تھے۔ نیّر سلطانہ اور درپن بھی تھے مگران میں کوئی ایک نام بھی اس وقت مقبول نہ تھا۔ ان حالات میں نئے چہروں اور کریکٹر ایکٹروں کی وجہ سے کوئی فلم خریدنے کو تیار نہ تھا۔انیس صاحب کراچی سے لاہور آئے تو ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں ان سے ملاقات ہوئی۔

''آپ کی فلم کا بزنس ہو گیا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

ہم نے سچ سچ بتادیا کہ لوگ بہت کم رقم پیش کرتے ہیں۔اس وقت تک فلم کی بارہ ریلیں (رش پرنٹس) ایڈٹ ہو چکی تھیں۔ ہم نے اسی شام انہیں اسٹوڈیو میں فلم دکھادی۔ رات کو رخصت ہوتے ہوئے وہ کچھ نہ بولے۔ دوسرے دن ہوٹل میں بات ہوئی تو انہوں نے جو رائے دی اس کے الفاظ آج بھی ہمیں یاد ہیں۔

انہوں نے کہا'' آفاقی صاحب۔اس فلم میں سب کچھ ہے سوائے اسٹار کاسٹ کے۔اگر آپ کا نیا ہیرو ندیم کی طرح کلک ہو گیا تو یہ سپر ہٹ فلم ہو گی۔''

ہمارا ہیرو ندیم کی طرح کلک نہ ہو سکا۔ قسمت کی بات ہے پھر بھی اس فلم نے بہت اچھا بزنس کیا تھا۔ فلم کی ریلیز کے بعد ہمیں کچھ شکایات پیدا ہو گئی تھیں مگر ملاقات اور دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ہاں۔ایک واقعہ جو غالباً پہلے بھی بیان کر چکے ہیں فلم ساز' تقسیم کار' اسٹوڈیو آنر ملک غلام باری کا ہے۔انہوں نے گلبرگ میں بہت شاندار اور خوب صورت گھر بنایا تھا۔ جس میں سوئمنگ پول بھی تھا۔ایک غسل خانہ اس طرح بنایا تھا کہ ایک جانب شیشے کی دیوار میں سے اندر والا باہر سب کچھ دیکھ سکتا ہے مگر باہر والا اندر والے کو نہیں دیکھ سکتا۔ باری صاحب نے بہت شوق سے گھر بنایا تھا اور ہمیں دکھایا بھی تھا۔

انیس صاحب ہمارے ساتھ باری اسٹوڈیو میں باری صاحب سے ملنے گئے تو ہم نے گھر کا ذکر چھیڑ دیا۔اور اشتیاق سے بولے ''کیا میں یہ گھر دیکھ سکتا ہوں؟''

باری صاحب نے کہا" اس وقت بہت رات ہو گئی ہے۔ کل کسی وقت دن میں دیکھ لیجئے گا۔"

"مگر کل تو میں واپس جا رہا ہوں۔"

ہم نے بہت زور دیا کہ اتنا خوب صورت گھر دکھا ہی دیں تو بہتر ہے۔ باری صاحب کچھ پس و پیش کے بعد رضامند ہو گئے۔ رات گئے ان کی کار میں ہم تینوں نئے گھر پہنچے۔ چوکیدار نے پذیرائی کی۔ باری صاحب نے گھنٹی بجانے سے بولے" ذرا آہستہ بولیے گا۔ گھر والے سو گئے ہیں۔"

بہر حال دبے قدموں چلتے ہوئے اور سرگوشیاں کرتے ہوئے ہم لوگوں نے اس گھر کا نچلا حصہ دیکھا۔ اوپر کے حصے کے بارے میں باری صاحب نے معذرت کر دی کہ وہاں فیملی رہتی ہے۔ وہ لوگ سو گئے ہیں۔

اگلے دن باری صاحب ہم سے بہت ناراض ہوئے "آفاقی۔ یہ کیا حرکت تھی۔"

"کون سی؟"

"انیس دوسانی کو گھر دکھانے کی؟"

ہم نے کہا" اس میں کیا برائی ہے۔ وہ بھی صاحب ذوق آدمی ہے۔ ہم نے سوچا کہ آپ کا گھر دیکھ کر ان پر رعب پڑ جائے گا۔"

دراصل باری صاحب کی اس وقت سلونی سے شادی ہو چکی تھی جس پر ان کی بیگم اور بچے بہت ناراض تھے۔ بیگم نے گھر میں ان کا داخلہ تک بند کر دیا تھا کہ سلونی سے شادی کی ہے تو اسی کے پاس رہو۔ اس کہانی کا انجام یہ ہوا کہ اختلافات حد سے زیادہ بڑھ گئے۔ باری صاحب سلونی کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ نوجوان بیٹے باغی ہو گئے۔ انہوں نے عملی طور پر اسٹوڈیو پر قبضہ کر لیا۔ باری صاحب کچھ عرصے اس کشیدگی کے عالم میں لاہور میں رہے پھر دبئی چلے گئے۔ چند بار لاہور آئے بھی تو بہت کم لوگوں سے ملنا ہوا۔ البتہ چھوٹے بیٹے خرم کی شادی انہوں نے بڑی دھوم دھام سے کی تھی۔

کارڈ دینے بذات خود ہمارے دفتر آئے تھے پھر ایک بار جب وہ سلونی اور ان کی بیٹیوں کے ساتھ لاہور آئے تو ان کی گلبرگ والی کوٹھی میں ہم گئے۔رات کے وقت گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں۔ سلونی اور ان کی بچیوں سے بھی ملاقات ہوئی ۔سلونی سے باری صاحب کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔

اگرچہ انہیں اپنی پہلی فیملی، اسٹوڈیو اور جائداد سے ہاتھ دھونے پڑے مگر وہ دبئی میں اپنا کاروبار جما چکے تھے اور خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے۔انہوں نے سلونی سے بھی ملاقات کرائی۔

اس دن کمرے میں ایک قد آور لمبی چوڑی خاتون داخل ہوئیں تو ہم بالکل نہیں پہچانے۔

باری صاحب نے مذاقاً کہا'' یہ میری اماں ہیں۔''

وہ بولیں'' توبہ کیجئے ملک صاحب! یہ کیا کہہ رہے ہیں؟''

ہم انہیں اب پہچان گئے تھے پھر بھی انہوں نے اپنا تعارف کرانا ضروری سمجھا'' آفاقی صاحب میں سلونی ہوں۔''آپ کیسے ہیں؟''

''دیکھ لیجئے۔ویسے کے ویسے ہی ہیں مگر آپ۔۔۔''

وہ ہنسنے لگیں'' اس کے آگے کچھ نہ کہئے۔کیا کروں۔کسی طرح وزن کم نہیں ہوتا۔بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔''

اس کاروباری صاحب کی دونوں بیٹیوں سے بھی ملاقات ہوئی۔دونوں بڑی ہوگئی تھیں۔باری صاحب سے ہماری بہت بے تکلفی رہی ہے۔وہ پیٹ کے بہت ہلکے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے رومانس اور عشق کے واقعات بھی لفظ بہ لفظ ہمیں سنادیا کرتے تھے۔کئی بار وہ عاشق مزاجی کی وجہ سے مشکل میں بھی پھنسے مگر پھر معاملہ سنبھل گیا۔

سلونی کے ساتھ بھی بقول ان کے مذاق مذاق میں ملاقات شروع ہوئی تھی مگر سلونی بے حد سنجیدہ ہوگئیں یہاں تک کہ دو تین بار انہوں نے خواب آور گولیاں بھی کھالیں اور اسپتال پہنچ گئیں۔ایک بار تو وہ سچ مچ موت کے منہ سے باہر آئیں۔ان کا کہنا تھا کہ چاہے جان جائے پر پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔

ان کی صدق دلی اور وارفتگی کے سامنے باری صاحب نے ہتھیار ڈال دیے اور ان سے باقاعدہ شادی کرلی جو انہیں بہت مہنگی پڑی۔ پاکستان کی دولت اور جائداد بچوں کے حصے میں آئی اور وہ خود تھوڑا بہت روپیہ لے کر دبئی چلے گئے۔ وہ قسمت کے دھنی مشہور ہیں۔دبئی جاکر بھی دولت کی دیوی ان پر مہربان ہوگئی اور ٹھاٹ سے زندگی گزرنے لگی۔ہم نے دیکھا کہ وہ اپنے اس خاندان کے ساتھ بہت خوش و خرم اور سکھی تھے۔اگر سب کچھ کھو کر گھریلو خوشی اور ذہنی سکون مل جائے تو یہ سودا مہنگا نہیں ہے اور انہیں تو سب کچھ کھو کر بھی اللہ کی مدد سے بہت کچھ مل گیا۔

انیس دوسانی صاحب اس پراسرار انداز میں مکان دکھانے پر بہت حیران تھے۔انہوں نے ہم سے پوچھا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔باری صاحب تو اپنا گھر اس طرح دکھا رہے تھے جیسے کسی اور کا گھر ہو۔

دوسانی صاحب کو ہم نے یہ کہانی تفصیل سے بتائی تو وہ حیران رہ گئے۔باری صاحب وہ آدمی تھے کہ بقول شخصے چور چوری سے جاتا ہے پر ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔شادی کے بعد بھی وہ ہیرا پھیری کرتے رہے مگر آخر ایک بار ایسے پھنسے کہ زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔دیکھیے۔تذکرہ انیس دوسانی صاحب کا ہو رہا تھا اور بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

انیس دوسانی سے کئی سال پہلے ملاقات ہوئی تھی۔صحت کے اعتبار سے بہتر نظر آرہے تھے لیکن بالوں میں سفیدی آگئی تھی۔کلین شیو تھے ورنہ ان کی داڑھی اور مونچھیں بھی یقیناً سفید ہوگئی ہوں گی۔وہ بہت کم آمیز اور عام طور پر کم گو انسان تھے۔مخصوص حلقے میں ہی باتیں کرتے تھے اور ان کے موضوعات کا دائرہ بھی زیادہ وسیع نہیں تھا۔کم سے کم ہم نے ان کے بارے میں یہی اندازہ لگایا۔خوداعتمادی اور ہر طرح کے احساس کمتری سے محفوظ ہونے کے علاوہ ان کی ایک خوبی... بہت نمایاں تھی کہ کبھی اپنی ذات اور اپنے کاموں کے بارے میں بات نہیں کرتے تھے۔ان کی جگہ

کوئی اور ہوتا تو مشرقی پاکستان میں اردو فلموں اور صنعت فلم سازی کی بنیاد رکھنے کے حوالے سے ہر وقت ڈینگیں جاری رہتیں مگر ہم نے ان کی زبان سے کبھی اس بارے میں کوئی تذکرہ نہیں سنا۔ اگر کبھی اس موضوع پر گفتگو شروع ہو جاتی تو مختصر سی بات کر کے اسے فوراً ختم کر دیتے تھے۔

ان کی ایک خوبی جو کہ قابل تقلید ہے' صبر و شکر اور قناعت پسندی تھی۔ انہوں نے اور ان کے خاندان نے کلکتہ سے ہجرت کے بعد جو نشیب و فراز دیکھے تھے اور پھر مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد مغربی پاکستان آنے کے بعد جن شدید مالی مشکلات سے دوچار ہوئے تھے۔ اس بارے میں کبھی کلمہ شکایت ان کی زبان پر نہیں آیا۔ وہ ہر حال میں راضی بہ رضا اور خوش رہنے کے عادی تھے۔ اردو کے محاورے ''ساون سوکھے نہ بھادوں ہرے'' کے مطابق جس حال میں بھی اللہ تعالیٰ انہیں مبتلا کرتا وہ اسی میں قانع اور مطمئن نظر آتے تھے۔ ہم نے کبھی ان کی زبان سے مشرقی پاکستان میں چھوڑی ہوئی دولت اور جائداد کا رونا تو کیا ذکر تک نہیں سنا۔ دیکھنے والے ان کے مالی اتار چڑھاؤ پر افسوس کرتے تھے مگر انہوں نے کبھی افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ زندگی میں ہم نے بے شمار اور مختلف قسم کے رنگ دیکھے ہیں اور ان سے ملے ہیں۔ ان کی خوبیوں' کردار کی عظمت' صلاحیتوں اور بعض اوقات ان کی خوبیوں' کردار کی عظمت' صلاحیتوں اور بعض اوقات ان کی خامیوں نے ہمیں کافی متاثر کیا۔ بعض واقعات (خوشگوار اور ناخوشگوار) تو ایسے ہیں جو ہمارے دماغ کی سلیٹ پر نقش ہو چکے ہیں۔ ان ہی میں ایک واقعہ کراچی کے معمولی سے چائنیز ریستوران میں' ڈھاکہ سے لٹ پٹ کر آنے کے بعد ہماری انیس دوسانی صاحب سے ملاقات بھی ہے۔ کسی نے ہمیں بتایا تھا کہ ڈھاکہ سے وہ کچھ بھی ساتھ نہ لا سکے۔ اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ جائیداد اور املاک واثاثے فروخت کرتے۔ دراصل وہ مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات کے بارے میں صحیح اندازہ لگانے میں ناکام رہے تھے۔ ہوشیار اور سمجھ دار لوگوں نے 1969ء ہی سے سیاسی حالات کو بھانپ لیا تھا اور اپنے اثاثے مغربی پاکستان منتقل کرنے شروع کر دیے تھے۔

انیس دوسانی اینڈ فیملی نے کراچی میں ایک تقسیم کارادارہ قائم کرنے کے سواڈھاکہ سے کسی قسم کی املاک کی منتقلی نہیں کی۔انہیں حالات کا علم اس وقت ہوا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ جلدی میں جو روزمرہ کا سامان سمیٹ سکتے تھے وہ سمیٹااور کراچی آ گئے۔

ہمارا خیال تھا کہ وہ کافی مال ودولت ڈھاکہ سے لائے ہوں گے۔کراچی میں شان دار چائنیز ریستوران قائم کیا ہوگا مگر جب اس ریستوران میں پہنچے تو دیکھا کہ ایک اوسط سائز کا لیکن سلیقے سے آراستہ ریستوران تھا جس میں مشکل سے چالیس پچاس افراد کے بیٹھنے کی جگہ ہوگی۔یہاں انیس دوسانی صاحب اوران کے والد بذات خود کھڑے ہوکر کام کی نگرانی کررہے تھے بلکہ بلا تکلف میزوں پر کھانے کا سامان بھی رکھ رہے تھے۔ہم نے بڑے دوسانی صاحب کے زمانہ عروج کاذکر سنا تھا پھر ڈھاکہ میں اس خاندان کی خوش حالی اور دولت مندی کا بذات خود نظارہ کیا تھا۔جب ان دونوں باپ بیٹوں کو کسی جھجک کے بغیر اس طرح کام کرتے ہوئے دیکھا تو چند لمحے ایک طرف چپ چاپ کھڑے دیکھتے رہے۔عالم تصور میں فلمی فلیش بیک کی طرح ان کے دور عروج کے مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔زمانے کی بے مہری اور انقلاب سے عبرت بھی حاصل ہوئی اور ان دونوں کے عزم وارادے اور خوداعتمادی کو دیکھ کر انسان کی عظمت کا احساس بھی بہت شدت سے ہوا۔

یہ منظر اور یہ واقعہ ہم شاید ساری زندگی نہ بھول سکیں گے۔کہنے کو بہت معمولی سی بات تھی لیکن غور کیجئے تو زندگی کے فلسفے کا نچوڑ آنکھوں کے سامنے تھا۔

ہم تو ایک جانب کھڑے تھے۔انیس صاحب کی نظر ہم پر پڑی تو مسکراتے ہوئے آگے آئے۔بہت محبت سے ملے۔ کسی قسم کی شرمندگی یا کمتری کا شائبہ تک ان کے طرزِ عمل میں نہ تھا۔ویسے کے ویسے ہی تھے جیسے کہ ہم سے ملتے رہے تھے۔معذرت کی کہ مصروفیات کا وقت ہے اس لیے زیادہ باتیں نہیں کر سکیں گے پھر کہا آپ کھانا توضرور کھائیں گے ؟

ہم تو ملاقات کے لیے گئے تھے مگر کھانے کا وقت تھا اس لیے سر ہلا دیا۔

وہ حسبِ معمول خوش و خرم تھے مگر ہمارے دل کو اداسیوں نے گھیر لیا تھا۔ انہوں نے ایک خالی میز تلاش کر کے ہمیں بٹھایا۔ وہاں ایک صاحب اور پہلے سے بیٹھے تھے۔ انیس صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ اگر ایک مہمان کو ان کے ساتھ میز پر بٹھا دیا جائے تو انہیں اعتراض تو نہ ہو گا؟

انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ ہم بیٹھ گئے۔ انیس صاحب بولے'' ابھی ویٹر کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ میں سامنے والی میز کے مہمانوں کو دیکھ لوں؟''

وہ چلے گئے۔ ویٹر کو ہم نے اپنے پسندیدہ کھانوں کا آرڈر دیا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد گرین ٹی کی باری آئی تو انیس صاحب پھر ہمارے پاس آ گئے۔

ہم نے کھانے کا بل طلب کیا تو ویٹر نے بتایا کہ وہ ادا کر دیا گیا ہے۔ کس نے ادا کیا ہو گا یہ ہم جانتے تھے۔ انیس صاحب کی طرف دیکھا تو وہ دوسرے گوشے میں مصروف تھے۔ مسکرا کر اشاروں میں خدا حافظ کہا اور ہم چلے آئے۔

کافی دیر باہر کھڑے زمانے کی بے ثباتی اور انسان کی اولوالعزمی کے بارے میں سوچتے رہے پھر ٹیکسی لے کر اگلے سفر پر رخصت ہو گئے۔

انیس صاحب کے حالات رفتہ رفتہ بہتر ہو گئے۔ انہوں نے'' انمول'' جیسی کامیاب فلم بنائی۔ اردو فلمیں بھی بنائیں اور ریلیز کرنے کے لیے حاصل کیں۔ خوش حالی کا ایک بار پھر دور دورہ ہو گیا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ اللہ بھی حوصلہ مند لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ انیس دوسانی اس کی نمایاں مثال تھے۔

اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے مگر پاکستان اور بنگلہ دیش کی فلمی تاریخ میں ان کا کام ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے مشرقی پاکستان میں پہلی اردو فلم بنائی تھی اور پھر یکے بعد دیگرے کئی اردو فلمیں بنائی تھیں۔ اب وہ بنگلہ دیش بن

چکا ہے۔ نئی نسل تو نہ اردو بولتی ہے نہ سمجھتی ہے۔ وہ بھلا اس ملک میں پہلی اردو فلم بنانے والے کے نام سے کیا آشنا ہو گی؟ اس طرح بنگلہ دیش میں ان کا نام کسی کو یاد نہیں رہے گا نہ رہا ہو گا۔ سوائے چند پرانے لوگوں کے۔ رہ گیا ہمارا آج کا پاکستان تو یہاں کی فلمی صنعت میں جو انقلابات رونما ہوئے ہیں ان کے بعد ہماری اردو فلمیں بنانے والوں کو فلمی صنعت نے بھی بھلا دیا ہے اور فلم بینوں نے بھی۔ انیس دوسانی کا نام اجنبی ہو گا۔ کون کسی کو یاد رکھتا ہے۔ وہی بات ہے کہ آج مرے کل دوو سرا دن۔

سابق مشرقی پاکستان کی اردو فلموں کا ذکر چل نکلا ہے تو اس بارے میں کچھ اور قابل ذکر باتیں بھی بیان کرنا ضروری ہے ورنہ غلط فہمی اور ابہام کا احتمال ہے۔

ہم نے مشرقی پاکستان کی پہلی اردو فلم ''چندا'' کو قرار دیا ہے۔ بعض لوگ اس سلسلے میں اس سے پہلے بنائی جانے والی دو اردو فلموں کا بھی تذکرہ کریں گے اور اس حوالے سے ہمارے دعوے کو غلط قرار دیں گے یہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔

ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان میں جو اردو (اور انگریزی) فلم سب سے پہلے بنائی گئی تھی یہ اے' جے' کاردار کی فلم '' جاگو ہوا سویرا'' تھی۔ جاگو ہوا سویرا 1959ء میں بنی تھی۔ یہ درست ہے کہ اس کی شوٹنگ مشرقی پاکستان میں ہوئی تھی لیکن یہ مشرقی پاکستان کی فلم نہ تھی۔ اس کے فلم ساز نعمان صاحب تھے جن کا مشرقی پاکستان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے ہدایت کار اے جے کاردار یہ منصوبہ لے کر لندن سے تشریف لائے تھے مگر ان کا تعلق پنجاب سے تھا۔ اس کی کہانی اور نغمات فیض احمد فیض صاحب نے تحریر کیے تھے۔ کیمرا مین ایک انگریز مارشل تھے۔ موسیقی کلکتہ سے آئے ہوئے موسیقار تمر بران نے بنائی تھی۔ دراصل بنیادی طور پر یہ ایک حقیقت پسند آرٹ فلم تھی جسے بیرونی ممالک میں نمائش کے لیے پیش کرنے کے مقصد سے بنایا گیا تھا اور اے جے کاردار اس مقصد میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ''جاگو ہوا سویرا'' پہلی پاکستانی فلم تھی جو قابل ذکر بین الاقوامی فلمی میلوں میں نمائش کے لیے پیش کی گئی اور اسے سراہا گیا۔ کئی بین الاقوامی ایوارڈ اس فلم نے حاصل کیے۔ بیرون ملک اس فلم کو بہت پذیرائی ملی اور اعزازات حاصل ہوئے لیکن پاکستان میں یہ ایک مکمل فلاپ فلم ثابت ہوئی جیسا کہ آرٹ فلموں کا مقدر رہے۔ خواہ

وہ پاکستان میں بنائی جائیں یا بھارت میں۔ مذکورہ بالا حقائق کے پیش نظر ''جاگو ہوا سویرا'' کو مشرقی پاکستان کی پہلی اردو فلم نہیں کہا جا سکتا۔ یہ فلم مشرقی پاکستان میں وہاں کے فنکاروں کو لے کر بنائی ضرور گئی تھی مگر یہ منصوبہ باہر والوں کا تھا۔ اس کے فنکاروں میں بھی لاہور کے کچھ اداکار شامل تھے۔ یہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبان میں فلمائی گئی تھی۔

بعض لوگ ہدایت کار شوکت ہاشمی کی فلم '' ہم سفر '' کو مشرقی پاکستان کی پہلی اردو فلم قرار دیتے ہیں لیکن یہ بھی درست نہیں ہے۔ یہ فلم بھی باہر کے لوگوں نے بنائی تھی البتہ اس کی شوٹنگ مشرقی پاکستان میں کی گئی تھی اور اس کے اداکاروں میں مقامی فنکار بھی شامل تھے۔

شوکت ہاشمی نے یہ منصوبہ کراچی اور لاہور میں بیٹھ کر بنایا تھا۔ اس کے فلم ساز بھی مغربی پاکستان کے تھے اور ہدایت کار بھی۔ اس کے نمایاں اداکاروں کا تعلق بھی لاہور سے تھا۔ یاسمین اور اسلم پرویز اس کے مرکزی کردار تھے۔ لاہور اور ڈھاکہ کے کچھ اور فنکار بھی اس میں کام کر رہے تھے۔ البتہ اس فلم کے موسیقار مصلح الدین تھے جن کا تعلق ڈھاکہ سے تھا مگر جس وقت شوکت ہاشمی نے انہیں موسیقار منتخب کیا اس وقت وہ مغربی پاکستان آچکے تھے اور لاہور میں کام کر رہے تھے۔

''ہم سفر'' کو اوسط درجے کی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس فلم کو مشرقی پاکستان کی پہلی یا دوسری اردو فلم ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح ہے جیسے کہ ہالی ووڈ کی کسی فلم کو پاکستان میں شوٹنگ کرنے کی بنا پر پاکستانی فلم نہیں کہا جا سکتا۔

مشرقی پاکستان کی پہلی اردو فلم تخلیق کرنے کا سہرا انیس دوسانی کے سر ہے جنہوں نے ہدایت کار سے لے کر مصنف، نغمہ نگار، اداکار، عکاس سبھی مشرقی پاکستان میں تلاش کر کے انہیں پہلی بار اردو فلم میں پیش کیا تھا۔ یہ ایک خالص مشرقی پاکستانی فلم تھی۔ اگرچہ ان کے نغمہ نگار سرور بارہ بنکوی کراچی کے تھے لیکن اس زمانے میں وہ ڈھاکہ ہی میں

رہائش پذیر تھے۔اس کے بعد بھی وہ کافی عرصے تک ڈھاکہ میں رہے مشرقی پاکستان بننے کے بعد بھی وہ ڈھاکہ گئے اور دونوں ملکوں کے اشتراک سے ایک اردو فلم بنانے کا منصوبہ بنا رہے تھے کہ فرشتہ اجل کا شکار ہو گئے۔ان کا انتقال ڈھاکہ میں ہوا تھا۔ یہاں انہیں ادبی اور فلمی حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل تھی اور بنگلہ دیش بننے کے تازہ زخموں کے باوجود جب وہ ڈھاکہ گئے تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا اور ڈھاکہ والوں نے اصرار کیا تھا کہ وہ دوبارہ ڈھاکہ میں رہائش اختیار کر لیں۔ سرور بارہ بنکوی نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا اور اپنے خاندان کے ساتھ بنگلہ دیش منتقل ہونے کے انتظامات کر رہے تھے کہ اچانک ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے وفات پا گئے۔

اس اعتبار سے ''چندا'' ہی مشرقی پاکستان کی پہلی اردو فلم تھی اور خالص مشرقی پاکستان کے فنکاروں اور ہنر مندوں پر مشتمل اردو فلم بنانے کا اعزاز یقیناً انیس دوسانی کو حاصل ہوا تھا۔ یہ بات محض وضاحت اور فلمی ریکارڈ درست کرنے کے خیال سے واضح کی گئی ہے۔

مشرقی پاکستان کی اردو فلموں کا ذکر چل نکلا ہے تو یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ''چندا'' اور ''تلاش'' کی کامیابی کے بعد ڈھاکہ میں اور بھی کئی فلم سازوں نے اردو فلمیں بنانے کا آغاز کر دیا تھا کیونکہ اس طرح انہیں ایک وسیع مارکیٹ حاصل ہو سکتی تھی۔ مشرقی پاکستان کے فلم سازوں' ہدایت کاروں' فنکاروں' موسیقاروں اور گلوکاروں نے اردو فلموں میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور نام پیدا کیا۔ان میں سے کچھ فنکار تو مغربی پاکستان میں ہی آباد ہو گئے تھے۔ مثلاً روبن گھوش، شبنم، مصلح الدین، رونا لیلیٰ، دیبو بھٹاچاریہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

مشرقی پاکستان نے اردو فلموں کی موسیقی میں بھی نمایاں کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ایک اندازے کے مطابق بنگلہ دیش بننے تک مشرقی پاکستان میں بیس کے لگ بھگ اردو فلمیں بنائی گئی تھیں جن میں سے پندرہ سپر ہٹ ہوئی تھیں۔ ڈھاکہ میں بنائی جانے والی اردو فلموں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی موسیقی تھی۔اگرچہ نغمہ نگاروں کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا مگر وہ عرصہ دراز سے مشرقی پاکستان ہی میں آباد ہو چکے تھے۔اس لیے انہیں مشرقی پاکستانی ہی قرار دینا مناسب ہے۔

مشرقی پاکستان کے نغمہ نگاروں نے اپنے خوب صورت الفاظ اور رومانی نغمہ بار شاعری سے پاکستان کی فلمی موسیقی میں ایک نیا معیار قائم کیا تھا۔ سرور بارہ بنکوی، اختر یوسف، دیپ، شاعر صدیقی جیسے نغمہ نگار ڈھاکہ کی اردو فلموں کے لیے نغمات لکھا کرتے تھے جو وہاں کے موسیقاروں کی سحر آفریں دھنوں اور دلکش سریلی آوازوں کی وجہ سے آج بھی یاد رکھے جاتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی اردو فلموں کے لیے لاہور اور کراچی کے گلوکاروں نے بھی اپنی آوازیں فراہم کی ہیں مگر مشرقی پاکستان کے گلوکاروں میں رونا لیلیٰ، فردوسی بیگم اور بشیر احمد جیسے نام بھی شامل ہیں جن کے گانے اب بھی زبان زد خاص و عام ہیں اور بھلائے نہ بھولیں گے۔ دراصل مشرقی پاکستان میں بنائی جانے والی فلمیں اپنی نغمہ بار حسین موسیقی کے حوالے سے ہی کامیابی اور شہرت حاصل کرتی تھیں۔

''ہم سفر'' کے موسیقار مصلح الدین تھے۔ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ اس کے نغمے لاہور میں لکھے اور ریکارڈ کیے گئے تھے۔ ان میں بعض نغمات آج بھی حد درجہ مقبول ہیں۔ ایک نغمہ جسے ہم غلطی سے ''آدمی'' سے منسوب کر بیٹھے دراصل '' ہم سفر'' کا نغمہ تھا۔ اگرچہ '' آدمی'' کے موسیقار بھی مصلح الدین اور گیت نگار تنویر نقوی ہی تھے اگر ہم نے غلطی سے اس نغمے کو ''آدمی '' سے منسوب کر دیا۔ اس نغمے کے بول یہ ہیں۔

زندگی میں ایک پل بھی چین آئے نا

اس جہاں میں کاش کوئی دل لگائے نا

یہ گیت ناہید نیازی اور سلیم رضا کی آوازوں میں الگ الگ ریکارڈ کیا گیا تھا اور باری باری ہیرو اور ہیروئن پر فلمادیا گیا تھا ۔ یہ مصلح الدین کے آغاز کا زمانہ تھا مگر انہوں نے ابتدائی فلموں ہی میں اپنی ہنر مندی اور سحر کاری کا مظاہرہ کر دیا تھا۔

اسی فلم کا ایک نغمہ بھارتی گلوکار، ہیمنت کمار کی آواز میں کلکتہ میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس زمانے میں ڈھاکہ اور کلکتہ کے مابین آمد ورفت آسان تھی۔ تنویر نقوی کا لکھا ہوا یہ نغمہ صلح الدین نے کلکتہ جا کر صدا بند کیا تھا۔ یہ بھی ایک سپر ہٹ نغمہ تھا۔ اس کے بول یہ تھے۔

کھویا کھویا چاند ہے

تم کو قسم ہے میری

ایک بار مسکرادو' ایک بار مسکرادو

اس فلم کے لیے ایک اور نغمہ بھی بھارتی گلوکارہ سندھیا مکرجی کی آواز میں کلکتہ میں ریکارڈ کیا گیا تھا جس کے بول شاعر صدیقی نے لکھے تھے۔

انکھیاں چھلکیں

میرا دل دھڑکے

سانوریا سانوریا ہو

یہ بھی مقبول نغمہ تھا۔ ریڈیو پاکستان سے ہم سفر کے یہ دونوں نغمات اکثر پیش کیے جاتے تھے مگر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد انہیں بھارتی گلوکاروں کے نغمات قرار دے کر ریڈیو پر ممنوع کر دیا گیا مگر کیسٹ اور ریکارڈوں کے ذریعے ان کی مقبولیت قائم رہی۔

اس فلم کا ایک مقبول گیت ناہید نیازی اور دیگر خواتین کی آوازوں میں تھا جس کے بول یہ تھے۔

مہکی فضاؤں میں

ٹھنڈی ہواؤں میں

اس لحاظ سے اس فلم کے نغمات مشرقی پاکستان کے موسیقار کے یادگار نغمے بن گئے۔

''چندا '' کے موسیقار روبن گھوش تھے جنہوں نے بنگلہ لوک گیتوں سے بھی مدد لی تھی۔اس فلم میں فردوسی بیگم کے نغمات تھے جن کے بول سرور بارہ بنکوی نے لکھے تھے۔ اس زمانے میں ڈھاکہ میں ایک اور گلوکارہ فریدہ یاسمین بھی تھیں جو بعد میں فلمی افق سے غائب ہو گئیں۔انہوں نے اور فردوسی بیگم نے ''چندا'' میں بہت اچھے نغمات گائے تھے۔

۱۔انکھیاں توری راہ تکیں سجنا آجا۔

۲۔رنگ روپ جوانی۔رات ساون کی سہانی۔

۳۔ چھلکے گگریا' بھیگے چزیا

ایسے نہ دیکھو سانوریا

یہ نغمات فردوسی بیگم اور فریدہ یاسمین کی آوازوں میں تھے۔بولوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سرور بارہ بنکوی جیسے معتبر اردو شاعر نے فلم کے ماحول اور اداکاروں کی ذہنی استعداد کو پیش نظر رکھ کر یہ بول لکھے تھے۔

فلم ''تلاش'' انیس دوسانی صاحب کی فلم تھی جس کے ہدایت کار مستفیض تھے۔

اس فلم کے موسیقار بھی روبن گھوش اور نغمہ نگار سرور بارہ بنکوی ہی تھے۔

روبن گوش نے اس فلم کے تمام نغمات ڈھاکہ کے گلوکاروں کی آوازوں میں ہی ریکارڈ کیے تھے۔''تلاش'' ایک رومانی اور نغماتی فلم تھی اور اس کی کامیابی میں موسیقی کو بھی بڑادخل تھا۔

اس فلم کا ایک گانا تو جیسے امر ہو گیا ہے۔ وہ یہ تھا۔

کچھ اپنی کہئے کچھ میرے سنئے۔

بشیر احمد کا ایک مزاحیہ گیت ”رکشے والا بے چارہ“ بھی ایک مقبول نغمہ تھا۔ جو مزاحیہ اداکار سبھاش دتہ پر فلمایا گیا تھا۔

فلم ”ملن“ کے موسیقار خان عطاالرحمٰن تھے۔ اس فلم کے فلم ساز اور ہیرو رحمٰن تھے۔ یہ کہانی پہلے بھی سنائی جاچکی ہے کہ جیپ کے ایک حادثے میں رحمٰن کی ایک ٹانگ ضائع ہو گئی تھی جس کے بعد وہ لندن سے مصنوعی ٹانگ بنوا کر لائے تھے۔ رحمٰن نے فلم ”ملن“ کا آغاز کیا تو دراصل یہ ایک امدادی فلم تھی جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے فنکاروں اور ہنر مندوں نے مکمل تعاون کیا تھا۔ اس فلم میں ”دیبا“ نے صرف ایک روپے معاوضے پر کام کیا تھا۔ میڈم نور جہاں نے بشیر احمد کے ساتھ ایک دوگانا ریکارڈ کرایا تھا اور کوئی معاوضہ وصول نہیں کیا تھا۔ اس فلم کے موسیقار خان عطاالرحمٰن تھے۔ نغمات سرور بارہ بنکوی اور بی ' اے ' دیپ نے لکھے تھے۔ اس فلم کے ہدایت کار بھی رحمٰن خود ہی تھے۔

تم جو ملے پیار ملا۔

دل کو قرار آ گیا۔

لیکن سب سے زیادہ مقبول گیت بشیر احمد کا گایا ہوا تھا جو آج بھی اسی طرح شگفتہ اور دلکش ہے۔ گیت کے بول یہ ہیں۔

تم سلامت رہو۔ گنگناؤ ہنسو

میں تمہارے لیے گیت گاتا رہوں

ایک اور گیت یہ تھا۔

جو مجھ سے دور ہے کہیں وہ تم تو نہیں۔

اس فلم کے نغمات کی دُھنیں بے حد دلکش تھیں جن کی وجہ سے ہی اس فلم کو بہت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔

""ملن ""کی کامیابی نے رحمٰن کو دوبارہ ہیرو بنادیا اور اپنے پیروں میں کھڑا ہونے کے قابل بنادیا۔سچ تو یہ ہے کہ یہ فلم مشرقی او مغربی پاکستان کے فلم والوں کے باہمی تعاون کی انمول مثال تھی۔ جس میں کام کرنے کے لیے کسی نے معاوضہ نہیں لیا۔ مگر اس کہانی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ""ملن"" کامیابی کے بعد رحمٰن حد درجہ مغرور اور خود پسند ہو گئے ۔معاوضہ تو کسی نے بھی نہیں لیا تھا مگر رحمٰن نے زبانی اور عملی طور پر بھی ان کے خلوص اور تعاون کا اعتراف نہیں کیا۔ ہر ایک کے ساتھ ان کا رویہ بدلا ہوا تھا جس کی وجہ سے خود مشرقی پاکستان کی فلمی صنعت میں ان کے بارے میں اظہار تاسف کیا گیا۔

دیبا نے اس فلم میں کوئی معاوضہ نہیں لیا تھا مگر رحمٰن کے حسن سلوک کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ لاہور جانے کے لیے ڈھاکہ ائرپورٹ گئیں تو رحمٰن نے ائرپورٹ پر انہیں خدا حافظ کہنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ ""ملن"" کی کامیابی نے انہیں ایک نئی زندگی دی تھی۔ وہ نئے سرے سے ہیرو اور ایک کامیاب فلم ساز اور ہدایت کار بن گئے تھے۔ منافع بھی کمایا تھا مگر مدد کرنے والوں کی طرف سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔

دیبا کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ انہوں نے دل وجان سے کسی معاوضے کے بغیر "" ملن"" میں کام کیا تھا مگر رحمٰن نے ان کی مناسب دیکھ بھال نہیں کی یہاں تک کہ رخصت کرنے ائرپورٹ تک نہ گئے۔ خان عطاالرحمٰن ' سرور بارہ بنکوی اور دوسرے لوگوں کو بھی رحمٰن کے رویے سے شکایت تھی۔ رحمٰن نے اس فلم کے بعد اور بھی فلمیں بنائیں اور کئی فلموں میں کام بھی کیا مگر وہ ساتھیوں کی نظروں سے گر گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب کچھ عرصے بعد دوبارہ وہ

زوال سے ہمکنار ہوئے تو کسی نے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے ڈھاکہ میں ایک فوٹو گرافی کی دکان کھول لی ہے پھر اس کے بعد ان کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔

مشرقی پاکستان کی فلم ''سنگم'' کے موسیقار عطاالرحمن تھے۔ ''سنگم'' کی امتیازی خوبی یہ تھی کہ یہ پاکستان کی پہلی رنگین فلم تھی۔ ''سنگم'' کے گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔ فلم ''کارواں'' کے موسیقار روبن گوش تھے۔ ''کارواں '' مغربی پاکستان میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئی تھی مگر اس کے نغمات آج بھی گونج رہے ہیں۔ بشیر احمد کا گایا ہوا گیت ...

جب تم اکیلے ہوں گے

ہم یاد آئیں گے

آج پاکستان کے سپر ہٹ نغموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

''کاجل '' ہدایت کار کی حیثیت سے نذرالاسلام کی پہلی فلم تھی۔ یہ ۱۹۶۵ء میں ریلیز ہوئی تھی اور صرف موسیقی کی وجہ سے یادرکھی جائے گی۔ شبنم نے اس فلم میں ڈبل رول کیا تھا۔ اپنی پہلی فلم سے نذرالاسلام کو شبنم کی اداکاری ایسی پسند آئی کہ پھر ان کی بیشتر فلموں میں شبنم ہی نے ہیروئن کا کردار ادا کیا۔ ان میں سے بعض فلمیں مثلاً آئینہ' بندش' احسان تو ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ اس فلم کے موسیقار سبل داس تھے۔ سرور بارہ بنکوی کے نغمات فردوسی بیگم کی آواز میں ریکارڈ کیے گئے تھے۔ ایک گانا بہت پسند کیا گیا تھا۔

یہ آرزو جواں جواں

یہ چاندنی دھواں دھواں

پکارتے پھریں تمہیں

بتاؤ ہم کہاں کہاں

یہ نغمہ فردوسی بیگم کے ناقابل فراموش گیتوں میں شمار ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر ”کاجل“ کی موسیقی اچھی تھی۔

فلم ”بھیا“ کے موسیقار روبن گوش تھے۔اس فلم کے گیت روبن نے مغربی پاکستان کے گلوکاروں کی آوازوں میں ریکارڈ کیے تھے اور جن میں سے بیشتر مقبول ہوئے تھے۔

احمد رشدی اور مسعود رانا نے ایک قوالی گائی تھی جو آج بھی قوالوں کی زبانوں پر ہے۔

مدینے والے سے میرا سلام کہہ دینا۔

احمد رشدی اور مالا کی آوازوں میں ریکارڈ کیا ہوا یہ دوگانا بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔

ایک اور گیت احمد رشدی نے گایا تھا۔

بہنا میری پیاری بہنا رے۔

فلم ”ایندھن“ کے موسیقار سبل داس تھے۔ یہ وہی سبل داس ہیں جن کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ جب ایک پروگرام کے سلسلے میں میڈم نور جہاں ڈھاکہ گئیں تو ساری فلمی صنعت ان سے ملنے اور انہیں دیکھنے کے لیے امڈ آئی۔ ان میں سبل داس بھی تھے۔ جنہیں میڈم نور جہاں مطلق نہیں جانتی تھیں۔ ہوٹل کے کمرے میں گانے کی ریہرسل شروع ہوئی تو میڈم کو ہارمونیم بجانے والا پسند نہیں آیا۔ سبل داس احتراماً ہارمونیم لے کر بیٹھ گئے۔ میڈم کو یہ سنگت بہت پسند آئی اور انہوں نے کہا کہ میرے تمام پروگراموں میں آپ ہی ہارمونیم بجائیں گے۔

سبل داس تو خاموش رہے لیکن انہیں جاننے والے دوسرے لوگ بہت حیران بلکہ پریشان ہوئے کہ ایک مانا ہوا موسیقار تقریب میں ہارمونیم کس طرح بجا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ان دنوں سبل داس کی بیگم کافی بیمار تھیں اور موسیقی کے یہ پروگرام رات ہی کو ہوتے تھے۔

حمید صاحب نے ہمیں ایک طرف لے جا کر سمجھایا کہ یار میڈم کو سمجھاؤ۔ یہ بہت بڑا موسیقار ہے۔ اسٹیج پر ہارمونیم کیسے بجا سکتے ہیں۔

ہم نے نرم لفظوں میں میڈم کو حالات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ سبل داس کی بیگم بھی بیمار ہیں اس لیے وہ رات کو وقت نہیں دے سکتے۔ مگر میڈم جو بات کہتی تھی اسے منوا کر رہتی تھیں۔ انہوں نے منتظمین کو صاف جواب دے دیا کہ اگر سبل داس ہارمونیم نہیں بجائیں گے تو وہ گانا نہیں گائیں گی پھر خود سبل داس سے بھی انہوں نے کہا" بھائی جان۔ آپ بے حد اچھا ہارمونیم بجاتے ہیں جس کی وجہ سے گانے میں جان پڑ جاتی ہے مہربانی سے تھوڑا وقت نکالیے نا "

سبل داس کے لیے میڈم نوجہاں کی تعریف ایک سند کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ خود بھی میڈم نور جہاں کی سنگت میں ساز بجانے کو اپنے لیے ایک اعزاز تصور کرتے تھے ۔ بہت بامروت اور لحاظ والے وضع دار آدمی تھے۔ مان گئے اور جب تک میڈم ڈھاکہ میں رہیں وہی میڈم کے ساتھ ہارمونیم بجاتے رہے۔ آخری دن جب میڈم نے ہوٹل کے ملازمین اور ان کے خاندانوں کے لیے وقت دیا تھا تو سبل داس نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ میڈم اس وقت ساڑھے دن بج چکے ہیں۔ آپ کی محفل تو رات گئے تک جاری رہے گی۔ مجھے بیوی کی تیمارداری کے لیے اجازت دیجئے۔

میڈم کہاں ماننے والی تھیں۔ کہنے لگیں "بھائی جان! ذرا یہ سوچیے کہ اگر ان بے چارے غریبوں کے لیے سنگت نہ ہونے کی وجہ سے میں اچھے گیت نہ پیش کر سکی تو کیا یہ ان کے ساتھ ناانصافی نہیں ہو گی؟ آپ آج کی رات اور مہربانی کر دیجئے۔ بھابی سے میری طرف سے معذرت کر لیجئے گا۔"

سبل داس رضامند ہو گئے۔ گیارہ بارہ بجے تک کھانے کا سلسلہ جاری رہا پھر موسیقی کی محفل سجی جو صبح چار بجے تک جاری رہی۔ ایسا سماں بندھ گیا تھا کہ نہ گانے والی کو ہوش تھا نہ سننے والوں کو۔ بجانے والے بھی مدہوش تھے۔

میڈم نور جہاں نے ہر ایک کی فرمائش پر اس کے پسند کے گیت گائے۔ وہ خود بھی موسیقی کے سحر میں کھو سی گئیں تھیں۔ اگر ایک ناخوشگوار واقعے کی وجہ سے میڈم کا موڈ خراب نہ ہوتا تو شاید یہ محفل صبح تک جاری رہتی۔

اگلے دن سبل داس سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے ان کا بہت شکریہ ادا کیا اور تکلیف دینے پر معذرت کی ۔انہوں نے کہا ’’مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔ ایسی یادگار محفلیں اور نور جہاں کی زبان سے آمنے سامنے بیٹھ کر گیت سننا کسی کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے۔‘‘

’’ایندھن‘‘ کی موسیقی بہت اچھی تھی۔ سبل داس کا بنایا ہوا یہ نغمہ خاص طور پر مقبول ہوا۔

بے کل رات بتائی

بے چین دن گزارا

ڈھاکہ کی فلمیں درشن‘ چھوٹے صاحب‘ نواب سراج الدولہ اور چکوری بھی ایک ہی سال میں ریلیز ہوئی تھیں اور ان سب کی موسیقی بہت اچھی تھی۔

’’چکوری ‘‘ ندیم اور شبانہ کی پہلی فلم تھی۔ روبن گھوش کی موسیقی نے دھومیں مچا دی تھیں۔ یہ فلم ۱۹۶۷ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ندیم اور فردوسی بیگم کی آواز میں ایک دوگانا بھی اس کے لیے صدابند کیا گیا تھا۔ اس کے بول تھے۔

کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہیں

یہ بہاریں یہ سماں

یہ گیت احمد رشدی کی آواز میں بھی ریکارڈ کیا گیا تھااور امر ہو گیا۔اس فلم کے لیے ایک دوگانہ فردوسی بیگم اور مجیب عالم نے بھی گایا تھا۔

وہ میرے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں۔

اس فلم میں ناہید نیازی کی چھوٹی بہن نجمہ نیازی نے بھی ایک گانا گایا تھا۔

رات ہے جواں دن سہانا

دل ہو گیا ہے دیوانہ

فلم ''ڈاک بنگلا'' کی موسیقی علی حسین نے بنائی تھی۔یہ بھی بہت اچھی میوزکل فلم تھی۔

موسیقی کے لحاظ سے ''درشن'' بھی ایک ناقابل فراموش فلم ہے۔اس کی نمایاں خوبی یہ تھی کہ گلوکار بشیر احمد نے اس کی موسیقی بھی ترتیب دی تھی۔اس کے گیت بھی خود بشیر احمد نے لکھے تھے۔اور گانے بھی خود ہی گائے تھے۔اس فلم کی موسیقی واقعی ناقابل فراموش ہے۔چند گانے یہ ہیں۔

ا۔ہم چلے چھوڑ کر تیری محفل صنم

۲۔تمہارے لیے اس دل میں اتنی محبت ہے

۳۔دن رات خیالوں میں تجھے یاد کروں گا

۴۔یہ سماں پیارا پیارا' یہ ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی (مالانے گایا تھا)

۵۔ گلشن میں بہاروں میں تو ہے۔

۶۔ یہ موسم یہ مست نظارے پیار کرو توان سے کرو۔

یہ تمام نغمات (ایک کے سوا) بشیر احمد نے گائے تھے اور سب کے سب آج بھی سپر ہٹ سمجھے جاتے ہیں۔اسی فلم میں بشیر احمد نے میڈم نور جہاں کے ساتھ بھی ایک دوگانا گایا تھا جس کے بول تھے۔

چن لیا اک پھول کو۔

''درشن'' بے حد کامیاب فلم تھی جس کی کامیابی میں بلاشبہ بہت بڑا ہاتھ بشیر احمد کا تھا۔یہ میوزیکل فلم دراصل ''ون مین'' شو تھی۔

سراج الدولہ میں موسیقار' ہدایت کار اور فلم ساز عطاالرحمن تھے۔فردوسی بیگم کی گائی ہوئی یہ غزل آج بھی سب کو یاد ہے۔

ہے یہ عالم تجھے بھلانے میں

اشک آتے ہیں مسکرانے میں

سرور بارہ بنکوی اس کے نغمہ نگار تھے۔

فلم '' چھوٹے سرکار'' میں موسیقار علی حسین نے مالا اور احمد رشدی کی آوازوں میں گانے بنائے تھے۔ مستفیض اس کے ہدایت کار تھے۔اس کے یہ گانے بہت پسند کیے گئے تھے۔

۱۔ جھومیں رہے کلیاں

۲۔ بگیا میں بہار آئی (مالا)

۳۔ بدرا کاہے اس پریتم کی یاد دلائے (مالا)

۴۔ آنکھوں کے گلابی ڈورے، زلفوں کا مہکتا سایہ (احمد رشدی)

۵۔ میرے ہمراہی میرا ساتھ نبھانا (مالا، احمد رشدی)

یہ سب کے سب سپر ہٹ گانے تھے۔ جنہوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں دھوم مچادی تھی اور مشرقی پاکستان کے موسیقاروں کا لوہا منوالیا تھا۔ فلم ''چاند اور چاندنی'' میں کریم شہاب الدین کی موسیقی بھی ایک قابل ذکر چیز تھی۔

فلم ساز انیس دوسانی مرحوم کے تذکرے میں ڈھاکہ میں بنائی جانے والی اردو فلموں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے ڈھاکہ کی فلمی صنعت کے آغاز اور درجہ بدرجہ ترقی کے بارے میں بھی سیر حاصل معلومات فراہم کی جاچکی ہیں۔ ڈھاکہ میں فلم سازی کا آغاز تو بنگلہ فلموں سے ہوا تھا۔ لیکن بعد میں جب اردو فلمیں یہاں بنائی گئیں تو وہاں فلم کے سازوں کو یہ تجربہ زیادہ مفید اور منفعت بخش معلوم ہوا جس کے نتیجے میں ممتاز اور ذہین فلم سازوں اور ہدایتکاروں نے اردو فلم کی طرف توجہ دی اور قابل ذکر فلمیں بنا کر پاکستان کی فلمی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کردیا۔ کون جانتا تھا کہ کبھی ایسا بھی وقت آئے گا جب مشرقی پاکستان کی جگہ بنگلہ دیش بن جائے گا اور رفتہ رفتہ مغربی پاکستان کے ساتھ ہی اردو زبان سے بھی بنگلہ دیشیوں کا رشتہ ختم ہو جائے گا۔ یہ بنگالی قوم پرستی کا نتیجہ ہے یا پھر پاکستان دشمن بھارتی لابی اور وہاں کی کثیر اور بااثر ہندو آبادی نے ایسی فضا پیدا کردی کہ آہستہ آہستہ بنگلہ دیش میں اردو کا رواج ہی ختم ہو گیا۔

1987ء میں ڈھاکہ گئے تو یہ حیران رہ گئے کہ اب وہاں اردو کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ کوئی قابل ذکر معیاری اردو اخبار یا جریدہ موجود نہیں ہے۔ اردو کی تعلیم اسکولوں اور درسگاہوں میں ختم ہوچکی ہے۔ ہر طرف بنگلہ زبان کی حکمرانی ہے۔ ڈھاکہ میں ہم نے سڑکوں اور دکانوں پر تمام سائن بورڈ بنگلہ میں لکھے ہوئے دیکھے اردو تو کیا انگریزی کا استعمال بھی

نظر نہ آیا جس کی وجہ سے یہ شہر اور ملک ہمارے لئے بالکل اجنبی ہو گیا۔ کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ کون سی دکان کس چیز کی ہے نہ ہی کسی اداروں یا فائیو اسٹار ہوٹلوں کے کسی جگہ انگریزی کا نام و نشان تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک اچھا اور قابل تقلید جذبہ ہے۔ ہم نے پاکستان میں اپنی قومی زبان اردو کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے۔ اور اس بتدریج جس بنگالیوں کی قوم پرستی کا یہ اظہار قابل تعریف ہے۔ کاش ہم نے بھی اپنی قومی زبان کو اس کا جائز حق اور مرتبہ دیا ہوتا۔ خیر یہ ایک علیٰحدہ انتہائی دکھ بھری داستان ہے۔

ہم نے دیکھا کہ ہر طرف بنگالی زبان ہی بولی جارہی ہے۔ صرف پرانی نسل کے لوگ اردو سمجھتے ہیں۔ باہمی بول چال میں وہ بنگلہ دیش ہی استعمال کرتے ہیں یا پھر تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی بھی استعمال کرلیتا ہے۔ عوام چونکہ انگریزی سے نابلد ہیں۔ اس لئے ان کی بات سمجھنا اور انہیں اپنی بات سمجھانا ایک مسئلہ تھا۔ وہی بات تھی کہ۔۔۔

زبان یار من بنگلہ و من بنگلہ نمی دانم کسی دکان والے سے۔ کسی رکشا والے سے۔ راہ گیر سے بات کرنی، سمجھانی اور اس بات کی بات سمجھنی کافی مشکل تھی۔ بس مفہوم کا اندازہ فریقین کو ہو جاتا تھا۔ خریداری کیلئے رکشا والے سے کرایہ طے کرنے کیلئے ''کتنے ٹکے'' دریافت کر کے ہاتھ سے بھی دریافت کرتے تو وہ جواب میں انگلیوں سے بھی اپنا مطلب واضح کر دیتے تھا۔ یعنی وہی صورتحال تھی جس سے ہم جرمنی، اٹلی، فرانس اور سوئزرلینڈ وغیرہ میں دوچار ہوتے رہے تھے۔ کبھی جب رات کو سونے کیلئے لیٹتے اور ان تمام باتوں کا خیال آتا تو دل آپ ہی آپ بھر آتا تھا اور اپنے حکمرانوں اور رہنماؤں کی حماقتوں اور کوتاہیوں پر رونا آجاتا تھا۔ یہ ہی وہ ڈھاکہ تھا جہاں ہر شخص اردو سمجھتا تھا اور حتیٰ الامکان بولنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ اردو دانوں کی کمی نہ تھی۔ مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ اردو کے میگزین بھی شائع ہوتے تھے۔ مایہ ناز اور بڑے پائے کے اردو اہل قلم یہاں موجود تھے اور اب یہ حال ہو گیا ہے کہ اردو سمجھنے اور بولنے والے خال خال ہی ملتے ہیں۔ کیا یہی وہ پاکستان ہے جس کا خواب قائداعظم نے دیکھا تھا؟ یہ وہ بنگالی ہیں جو تحریک پاکستان میں پیش پیش تھے؟

مایوسی اور اداسی کے عالم میں یکایک قریب کی کسی مسجد سے لاؤڈ اسپیکر پر اذان کی آواز بلند ہوتی تو دل کو قرار سا آجاتا تھا کہ ابھی یہاں اسلام تو باقی ہے بلکہ بہت مضبوطی سے باقی ہے۔اسلام کا رشتہ جب تک قائم ہے دوسرے رشتے اس کے آگے ہیچ ہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بنگلہ دیش کے قیام سے دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔یہ ایک بودی اور احمقانہ بات ہے۔دو قومی نظریے کی بنیاد یہ تھی کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں۔جن میں کوئی بھی قدر مشترک نہیں ہے بلکہ دونوں میں بے حد تضاد پایا جاتا ہے۔بنگلہ دیش جن وجوہات کی بنا پر بھی قائم ہوا وہ ایک علیٰحدہ بحث ہے مگر اس سے دو قومی نظریے پر کوئی اثر نہیں پڑا۔دو قومی نظریہ اس وقت ختم ہوتا اگر بنگلہ دیش بھارت میں دوبارہ ضم ہو جاتا اور اپنا اسلامی تشخص ختم کر دیتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔بنگلہ دیشی ایک ملک کے باسی ہیں۔مگر کٹر مسلمان ہیں۔ہم نے محسوس کیا کہ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہاں ہندو اور بھارت کے خلاف زیادہ نفرت پیدا ہو گئی۔انہیں پاکستان اور بھارت کا فرق بھی معلوم ہو گیا اور بھارتی مقاصد کا بھی علم ہو گیا۔اب وہ زیادہ مضبوطی سے اپنے مذاہب پر عمل پیرا ہیں۔

دو قومی نظریہ مختلف ملکوں کے قیام سے ختم نہیں ہو سکتا۔ویسے تو دنیا میں اور بھی بہت سے اسلامی ملک ہیں۔وہاں کے مسلمان بھی دوسری اقوام کے مقابلے میں ایک الگ قوم ہیں۔سعودی عرب، مراکش، مصر، انڈونیشیا میں غیر مسلموں کی سازشوں کے خلاف مسلمانوں کی نفرت اور جدوجہد کا سلسلہ جاری ہے۔اسی طرح ترکی کو دیکھ لیجئے۔کہنے کو قبرص ایک سیکولر ملک ہے لیکن یہاں رہنے والے مسلمان ہیں۔اگر ایسا نہ ہوتا ہو وہ یورپی اقوام اور یونان کے ساتھ غلط ملط کیوں نہ ہو جاتا؟ قبرص کے معاملے میں ترکوں کا یونانیوں سے پرانا جھگڑا ہے۔یہ محض زمینی اور جغرافیائی جھگڑا نہیں ہے بلکہ یہ دو مختلف اقوام کے مابین جھگڑا ہے جن میں سے ایک مسلمان ہے اور دوسری مسیحی۔

بات کہیں سے کہیں چلی گئی۔ہم دراصل یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ ڈھاکہ جب تک مشرقی پاکستان رہا وہاں کے فلمسازوں ، ہدایتکاروں، موسیقاروں اور اداکاروں نے اردو فلمی صنعت کیلئے گراں بہا خدمات سر انجام دیں۔بڑے بڑے کارنامے کیے۔رنگین فلمیں بنائیں۔سینما اسکوپ فلموں کا تجربہ کیا۔وہاں کے موسیقاروں نے پاکستان کی فلمی

صنعت کو سجانے بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔اس طرح ڈھاکہ کے شاعروں نے فلمی شاعری سے بہت اعلیٰ معیار قائم کیے۔وہاں کے گلوگاروں کی نمایاں خدمات سے بھی انکار کیا جا سکتا۔بشیر احمد، رونالیلیٰ، فردوسی بیگم اور گلشن آرا اس کی چند نمایاں مثالیں ہیں۔ڈھاکہ میں ''تنہا'' اور ''سراج الدولہ'' جیسی انقلابی اور تاریخی فلمیں بھی بنائی گئی ہیں۔پاکستان کی فلمیں موسیقی میں بھی ڈھاکہ کی فلموں کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔

ڈھاکہ میں بنائی ہوئی فلمیں موسیقی اور نغمات کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز اور نمایاں رہی ہیں بلکہ یہ کہنا درست ہے کہ وہاں کی کامیاب ترین فلموں کی کامیابی میں موسیقی کا بھی نمایاں ہاتھ رہا ہے۔اس قسم کی چند قابلِ ذکر مثالیں پیش کرنا زیادہ مناسب ہوگا تاکہ مشرقی پاکستانی فلموں کی موسیقی کا ایک جائزہ پیش کیا جا سکے۔

مشرقی پاکستان میں 1959ء میں ''جاگو ہوا سویرا'' بنی تھی۔اس کے فلم ساز، ہدایت کار اور مصنف مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے مگر پس منظر وہاں کا تھا اور مقامی فنکاروں نے بھی اس میں حصہ لیا تھا۔اس کی موسیقی بھارت سے درآمدہ موسیقار تمر برن نے بنائی تھی۔یہ ایک حقیقت پسندانہ آرٹ فلم تھی جس میں گانوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن طرزیں بہت دلکش اور پراثر تھیں۔فیض احمد فیض کے لکھے ہوئے بولوں کے بارے میں تبصرہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

یہاں 1960ء میں بنائی جانے والی ''ہم سفر'' تھی۔جس کے ہدایتکار شوکت ہاشمی اور مرکزی کردار یاسمین اور اسلم پرویز مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے مگر موسیقی وہاں کے نوخیز موسیقار مصلح الدین نے مرتب کی تھی۔''ہم سفر'' نے جتنی نمایاں ترقی حاصل کی اس میں مصلح الدین کی موسیقی نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ناہید نیازی اور سلیم رضا کی آوازوں میں گائے ہوئے تنویر نقوی کے گیتوں نے سماں باندھ دیا تھا، بھارتی گلوکار ہیمنت کمار نے بھی اس کیلئے آواز فراہم کی تھی۔موسیقی کی خوبی یہ تھی کہ مصلح الدین نے بنگلہ لوگ گیتوں سے مدد لی تھی۔اس فلم کے سپر ہٹ گانے یہ تھے۔

1۔ ""زندگی میں ایک پل بھی چین آئے نا"" (گلوکار۔ سلیم رضا' ناہید نیازی)

2۔ کھویا کھویا چاند ہے تمہیں قسم ہے میری ایک بار مسکرادو"" (گلوکار ہیمنت کمار)

3 سانوریا سانوریا ہو انکھیاں چھلکیں میرا دل دھڑکے""(گلوکار ہیمنت کمار، سیندھیا مکرجی)

4 مہکی فضاؤں میں ٹھنڈی ہواؤں میں (گلوکارہ۔ ناہید نیازی اور لڑکیاں)

""ہم سفر"" بھی مکمل طور پر مشرقی پاکستان کی فلم نہیں تھی مگر اس کے موسیقار وہیں کے تھے اور موسیقی اس فلم کی جان تھی۔

""چندا"" وہ فلم تھی جس نے مشرقی پاکستانی فلم سازوں کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ یہ مکمل طور پر مشرقی پاکستان کی فلم تھی۔ فلم ساز، ہدایت کار، موسیقار، اداکار یہاں تک کہ گیت نگار سرور بارہ بنکوی بھی وہیں مقیم ہو چکے تھے۔

روبن گوشن نے اس فلم سے اردو موسیقی کا آغاز کیا تھا۔ انہوں نے بھی بنگلہ لوک موسیقی سے بہت مدد لی تھی۔ اس اعتبار سے بھی یہ فلم قابل ذکر تھی کہ اس کے تمام نغمات مشرقی پاکستان کے گلوکاروں نے گائے تھے۔ مثلاً۔۔۔

رنگ روپ جوانی، رت ساون کی سہانی (گلوکارہ' فردوسی بیگم)

یہ چھلکے گگریا بھیگے چنریا، ایسے نہ دیکھو سانوریا(گلوکارہ فردوسی بیگم، فریدہ یاسمین)

""تلاش"" بھی خالصتاً مشرقی پاکستان کی فلم تھی جس کے موسیقار روبن گھوش اور نغمہ نگار سرور بارہ بنکوی تھے۔ اس فلم کا یہ گانا تو ہر ایک زبان پر تھا اور آج بھی ہے۔ ایک طرح سے یہ ضرب المثل بن چکا ہے۔

کچھ اپنی کہئے۔ کچھ میری سنئے

یہ گیت فردوسی بیگم اور بشیر احمد کی آوازوں میں تھا۔ اس فلم کے دوسرے گانے بھی بہت پسند کیے گئے تھے۔

اداکار، ہدایت کاراور فلم سازر حمٰن کی فلم" ملن "کے موسیقار عطاالرحمن تھے۔ یہ ہمہ صفت انسان تھے۔ بلا کے ذہین، بلاصلاحیت، اعلیٰ تعلیم یافتہ، اردو بنگلہ اور انگریزی تینوں زبانوں پر انہیں عبور حاصل تھا۔ فلم ساز وہدایت کار بنے تو''سراج الدولہ'' اور''سات بھائی چمپا'' جیسی فلمیں بنائیں۔ وہ مصنف اور ہدایت کار بھی تھے اور بہت اچھے اداکار بھی تھے۔''ملن''ایک نغمہ بار فلم تھی جس کے گانوں نے سندربن سے کراچی اور خیبر تک دھوم مچادی تھی۔ سرور بارہ بنکوی اور بی'اے دیپ نغمہ نگار تھے۔اس فلم میں میڈم نور جہاں کے ایک دوگانے کے علاوہ تمام گانے مقامی موسیقاروں نے گائے تھے اور کیا خوب گائے تھے بول سنئے تو آپ کی یادیں بھی تازہ ہو جائیں گی۔

تم سلامت رہو گنگناؤ ہنسو

میں تمہارے لیے گیت گاتا رہوں

بشیر احمد کا یہ نغمہ اسٹریٹ سانگ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ان ہی کی آواز میں یہ گیت ذرا یاد کیجئے۔

تم جو ملے پیار ملا

دل کا قرار آ گیا

اس کے علاوہ یہ گیت بھی قیامت کا تھا

جو مجھ سے دور رہے کہی وہ تم تو نہیں۔

یہ فلم ہر اعتبار سے ایک معیاری فلم تھی۔ دیبا کے سوا دیگر تمام اداکاروں کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔اس کے ہیرو رحمٰن تھے۔

پاکستان کی رنگین فلم ''سنگم'' بنانے کا اعزاز بھی مشرقی پاکستانیوں کے حصے میں آیا تھا۔اس کی موسیقی عطاالرحمٰن اور روبن گھوش نے مرتب کی تھی۔

''سنگم'' کے گیت بھی سارے ملک میں پسند کیے گئے تھے۔

فلم'' کارواں'' نے زیادہ کامیابی حاصل نہیں کی مگر اس کو موسیقی بھی بہت اچھی تھی۔خاص طور پر ایک گیت نے تو سننے والوں کو پاگل کر دیا تھا۔یہ بشیر احمد نے گایا تھا۔

جب تم اکیلے ہو گے

ہم یاد آئیں گے

بشیر احمد بہت خوب صورت میٹھی آواز کے مالک تھے جنہیں مشرقی پاکستان کا احمد رشدی کہا جاتا تھا مگر یہ انصافی دیکھیے کہ اتنی خوب صورت آواز سے مغربی پاکستان کے موسیقاروں اور ہدایت کاروں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔بشیر احمد بعد میں موسیقار بن گئے تھے۔موسیقی کے اعتبار سے نذرالاسلام کی پہلی اردو فلم ''کاجل'' بھی ایک قابل ذکر فلم ہے۔اسکے موسیقار سیل داس اور گیت نگار سرور بارہ بنکوی تھے۔فردوسی بیگم کی آواز میں گایا ہوا ایک نغمہ اس فلم کی جان تھا۔

یہ آرزو جواں جواں

یہ چاندنی دھواں دھواں

پکارتے پھریں تمہیں

بتاؤ ہم کہاں کہاں

سبل داس بھی ایک بہت باصلاحیت اور ذہین موسیقار تھے جن کو کبھی مغربی پاکستان آنے کی دعوت نہیں دی گئی ورنہ وہ بھی بہت نام پیدا کرتے۔

روبن گھوش نے فلم ''بھیا'' کی موسیقی بنائی تھی۔اس کیلئے گلوکارہ مغربی پاکستان سے بھی لئے گئے تھے۔اس فلم کی موسیقی اس کی سب سے نمایاں خوبی تھی۔

فلم ''بیگانہ'' میں روبن گھوش نے ایک بار پھر اپنی موسیقی سے سننے والوں کو چونکا دیا تھا۔یہ فلم تو نہ چلی مگر اس کے گانے خوب چلے۔فردوسی بیگم نے اس کیلئے گانے گائے تھے۔ان کے گائے ہوئے دو نغمات آج بھی تازہ اور شگفتہ ہیں۔

یہ پیار کی سوغات ہے

یہ تھے تمہاری ادا کے قابل

اب جگر تھام کر بیٹھئے کہ فلم ''چکوری'' کا ذکر ہو رہا ہے۔''چکوری'' وہ فلم تھی جس نے ندیم اور شبانہ جیسے سپر اسٹارز کو جنم دیا تھا اور سارے ملک میں کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کئے تھے حالانکہ اس میں کچھ نیا تھا۔''چکوری'' کی کامیابی میں اس کی موسیقی کو بھی بہت دخل تھا جو روبن گھوش نے مرتب کی تھی۔

کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہیں

یہ بہاریں یہ سماں

نے ایسا سماں باندھا تھا جو آج بھی بندھا ہوا ہے۔کوئی اسے کھول نہیں سکا۔ایک اور نغمہ بھی ہر ایک کی زبان پر تھا۔

وہ میرے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں

یہ گیت احمد رشدی اور فردوسی بیگم کی آوازوں میں الگ الگ ریکارڈ کیا گیا تھا اور وہ مختلف سچویشنز پر استعمال ہوا تھا۔ایک اور گیت بھی بہت مقبول ہوا تھا۔

رت ہے جواں دن سہانا

دل ہو گیا ہے دیوانہ

''درشن'' ایک ایسی فلم تھی جس نے دیکھنے والوں پر ایک رومانی سحر طاری کر دیا تھا اور اس نے فلم کی موسیقی کا نمایاں ہاتھ تھا جو گلوکار بشیر احمد نے مرتب کی تھی۔''درشن'' کو اگر میوزیکل فلم کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔اس کے قریب قریب سبھی گانے سپر ہٹ تھے۔ذرا یاد کیجئے۔

گلشن میں بہاروں میں تو ہے (گلوکار۔بشیر احمد)

یہ موسم یہ مست نظارے پیار کرو توان سے کرو (گلوکار۔بشیر احمد)

اس نغمے نے نیو تھیٹرز کی ایک پرانی کامیاب فلم کی یادیں تازہ کر دی تھی۔جس میں پنکج ملک کی آواز میں جو گانا ریکارڈ کیا گیا تھا اس کا انداز اور اسلوب بھی ایسا ہی تھا شاعر نے ہیروئن سے اظہار محبت کے بجائے ایک نیا تخیل پیش کیا تھا۔

ہیرو اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

یہ راتیں، یہ رم جھم، یہ موسم سہانا۔

مجھے بھول جانا انہیں نہ بھلانا۔

اس کے بعد شاعر نے الفاظ کی مدد سے ایسا سماں باندھا ہے اور ماحول کی ایسی منظر کشی ہے یہ گیت آرزو لکھنوئی یا فیاض ہاشمی کا لکھا ہوا تھا۔یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

درشن کے کچھ اور مقبول گانے یہ تھے۔

چن لیا اک پھول کو(گلوکار۔میڈیم نور جہاں،بشیر احمد)

یہ سماں پیارا پیارا

یہ ہوائیں بھیگی بھیگی(گلوکارہ' مالا)

تمہارے لیے اس دل میں اتنی محبت ہے(گلوکار۔بشیر احمد)

دن رات خیالوں میں تجھے یاد کروں گا(گلوکار۔بشیر احمد)

گلشن میں بہاروں میں تو ہے(گلوکار۔بشیر احمد)

ہم چلے چھوڑ کر تیری محفل صنم(گلوکار۔بشیر احمد)

نواب سراج الدولہ ایک نئی تاریخی فلم تھی۔بہت کم سرمائے اور انتہائی محدود وسائل سے بنائی گئی تھی۔اس کے موسیقار، فلم ساز ہدایت کار اور مصنف عطاالرحمٰن تھے۔اس فلم میں موضوع کے اعتبار سے موسیقی کی گنجائش بہت کم تھی مگر سرور بارہ بنکوی کی یہ غزل حاصل فلم تھی۔

یہ ہے عالم تجھے بھلانے میں

اشک آتے ہیں مسکرانے میں

اسی سال فلم ''چھوٹے صاحب'' نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی۔یہ ندیم کی دوسری فلم تھی۔اس کے ہدایتکار مستفیض تھے اور موسیقار علی حسین۔اس فلم کے چند گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔احمد رشدی اور مالا کی آوازوں میں بیشتر گیت صدا بند کیے گئے تھے۔

جھومیں ری کلیاں، بگیا میں آئی بہار (گلوکارہ' مالا)

آنکھوں کے گلابی ڈورے' زلفوں کا مہکتا سایہ (گلوکار احمد رشدی)

کاہے بدرا کا ہے۔اس پریتم کی یاد دلائے (گلوکارہ مالا)

ابھی یوں نہ جایئے (گلوکار۔احمد رشدی)

موسیقی کے لحاظ سے مشرقی پاکستان کی ایک اور فلم ''چاند اور چاندنی'' بھی قابل ذکر اور یادگار ہے۔اس کے ہدایتکار شور لکھنوئی اور موسیقار کریم شہاب الدین تھے۔دونوں کا تعلق کراچی سے تھا۔سرور بارہ بنکوی نے اس فلم کی موسیقی بے انتہا پسند کی گئی تھی۔یہ ایک میوزیکل فلم تھی۔اس چند نغموں کے بول سنئے اور سوچئے کہ یہ واقعی ابھی تک آپ کے کانوں میں رس کھول رہے ہیں۔

لائی گھٹا موتیوں کا خزانہ (گلوکارہ مالا' اور لڑکیاں)

تیری یاد آگئی غم خوشیوں میں ڈھل گئے (گلوکار' احمد رشدی)

جان تمنا خط ہے تمہارا پیار بھرا افسانہ (گلوکار' احمد رشدی)

یہ سماں موج کا کارواں (گلوکار مسعود رانا)

مشرقی پاکستان کی اکثر فلموں کی موسیقی بہت دلکش ہوتی تھی جن کی تفصیل بیان کرنا آسان نہیں ہے اور نہ ہی وہ تمام گیت اور ان کی تفصیل ہمیں بخوبی یاد ہے۔مگر چند فلموں کے سپر ہٹ نغمات یادیں تازہ کرنے کیلئے پیش ہیں۔

پھر ایک بار وہی نغمہ گنگنا دو زرا (فلم چکوری' گلوکار بشیر احمد)

اے ماں پیاری ماں (فلم قلی' گلوکار احمد راشدی اور ندیم)

تم ضد جو کر رہی، ہم کیا تمہیں سنائیں (فلم داغ گلوکار۔ مہدی حسن)

اناڑی تجھے جان گئی رے، پہچان گئی رے (فلم اناڑی، گلوکار۔ بشیر احمد، مینا بشیر)

لکھے پڑھے اگر ہوتے، تو ہم تم کو خط لکھتے (فلم اناڑی، گلوکار۔ ندیم، یاسمین)

جسے چاہا اسے اپنانے کے یہ دن آئے (فلم کنگن، گلوکار۔ بشیر احمد، مینا بشیر)

اچھا کیا دل نہ دیا، ہم جیسے دیوانے کو (فلم پیاسا، گلوکار۔ احمد رشدی)

مشرقی پاکستان کی فلموں کا تذکرہ کافی طویل ہے۔ پہلے بھی سنا چکے ہیں۔ اس بار پھر موسیقی کے حوالے سے سنا رہے ہیں مگر معاملہ وہی ہے کہ کہاں تک سنو گے، کہاں تک سناؤں۔

مشرقی پاکستان کی فلموں کا خیال آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان کا خیال بھی دل کو جلانے آجاتا ہے پھر وہاں کے لوگ، دوست احباب، فنکار، ہنر مند اور پیار بھرے انسان یاد آجاتے ہیں۔ ایک چبھن، ایک کسک سی دل میں رہ گئی ہے۔ جو بھی ہوا اس کا ڈر تو تھا مگر جب یہ رونما ہوا تو بالکل اچانک اور آناً فاناً ہو گیا اس لیے یہ صدمہ بھلائے نہیں بھولتا۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے ہر شعبے میں نمایاں کام کیے ہیں۔ یہ تو صرف فلم کے حوالے سے تھوڑا سا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہاں۔ یاد۔ آیا۔ مشرقی پاکستان کا ایک اور فلمی نغمہ بھی بہت مقبول ہوا تھا اور آج بھی مقبول ہے۔ اس کے نغمہ نگار جمیل الدین عالی ہیں او یہ ناہید نیازی کی آواز میں صدا بند کیا گیا تھا۔ یہ فلم ''پریذیڈنٹ'' کے لیے ریکارڈ کیا گیا تھا مگر بعد میں اس کا نام ''سن آف پاکستان'' رکھ دیا گیا تھا۔ یہ فلم صرف ڈھاکہ میں ہی نمائش پذیر ہوئی تھی۔ بقیہ پاکستان ''سن آف پاکستان'' کو دیکھنے سے محروم ہی رہا۔ اس کا مکھڑا یہ تھا۔

میں چھوٹا سا ایک لڑکا ہوں

کام کروں گا بڑے بڑے

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس فلم کے گیتوں کے ریکارڈ بن کر مغربی پاکستان پہنچ گئے تھے اور یہ گانا بے حد مقبول ہوا تھا۔ یعنی ہمیں صرف گانوں پر ہی گزارہ کرنا پڑا، بقیہ ساری فلم نگاہوں سے اوجھل رہی جس طرح کہ مشرقی پاکستان ہم سب کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔

دنیا کی فلمی تاریخ میں غالباً صرف دو فنکارائیں ایسی ہیں جنہوں نے بلا ضرورت لوگوں کے سامنے آنا' تقاریب میں شرکت کرنا اور اپنی تصاویر اور خبریں اخبارات میں شائع کرانا پسند نہیں کیا ورنہ عام طور پر فلم ایکٹریس خود نمائی کی ولدادہ ہوتی ہیں اور ریٹائر ہو جانے اور گمنامی کی زندگی بسر کرنے کے باوجود ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ انہیں پبلسٹی ملتی رہے خواہ اس کا طریقہ یا ذریعہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

ہالی وڈ کی معروف ترین ہیروئن گریٹا گاربو گزشتہ صدی کی تیسری دہائی میں ہالی وڈ کی ہیروئن ذاتی پبلسٹی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں اور تقاریب میں شریک ہو کر اپنی تصاویر بنوانا اور شائع کرانا اپنا حق سمجھتی تھیں۔ اس زمانے میں بھی گریٹا گاربو ایک الگ تھلگ رہنے والی گوشہ نشین ہیروئن تھیں۔ فلم کی شوٹنگ کے بعد وہ کہیں نظر نہیں آتی تھیں۔ اوّل تو خریداری کے لیے جاتی ہی نہ تھیں لیکن اگر شاپنگ سینٹر یا ہوٹل میں جانا پڑتا تھا تو سیاہ شیشوں کا چشمہ پہن کر سر پر بڑا سا ہیٹ رکھ لیا کرتی تھیں تاکہ پہنچانی نہ جا سکیں۔ لوگوں کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ کسی سیاہ چشمے والی عورت کے ہیٹ پہنے دیکھتے تو گریٹا گاربو سمجھ کر اس کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش ضرور کرتے تھے ۔ گریٹا گاربو عروج کے زمانے میں ہی فلموں سے کنارہ کش ہو گئی تھیں اور اس کے بعد ایسی غائب ہوئیں کہ لوگ اور اخبار نویس بس ان کے بارے میں اندازے ہی لگایا کرتے تھے۔ وہ گھر کی چار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ اگر کسی ضرورت کے تحت گھر سے باہر نکلنا پڑتا تھا تو پھر گہرا سیاہ چشمہ اور بڑا سا ہیٹ ضرور استعمال کرتی تھیں۔ وہ اس عادت کی وجہ سے فلمی دنیا کی ایک پراسرار ہستی بن کر رہ گئی تھیں۔ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا نہ ہی ان کی نقل و حرکت کا علم ہوتا تھا۔ اس طرح انہوں نے ایک طویل پراسرار زندگی بسر کی۔ انہوں نے بہت طویل

عمر پائی تھی مگر اپنی روش کبھی ترک نہیں کی حتیٰ کہ جب ان کا انتقال ہوا تو دنیا کو صرف اتنا معلوم ہوا کہ گریٹا گاربو کا انتقال ہو چکا ہے۔اس سے زیادہ صرف قیاس آرائیوں پر ہی مبنی تھا۔

ہندوستان کی فلمی صنعت میں ایک ایسی ہی پر اسرار ہستی اداکارہ اور گلوکارہ ثریا ہی ہیں۔انہوں نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز ایک کم سن اداکارہ کی حیثیت سے فلم ''تاج محل'' سے کیا تھا۔یہ فلم 1941 ء میں بنائی گئی تھی۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ایس ڈی برمن جو آگے چل کر برصغیر کے نامور موسیقار بنے وہ اس وقت گلوکار تھے اور عموماً بنگالی نغمے گایا کرتے تھے۔انہوں نے فلم ''تاج محل'' میں پہلی مرتبہ اردو گانا گایا تھا۔اس فلم کے موسیقار مدھولال ماسٹر تھے۔ اس فلم میں ایس' ڈی' برمن کے گائے ہوئے نغمے کے بول یہ تھے۔

پریم کی ساری نشانی۔

ثریا نے اس فلم میں ایک چھوٹی بچی کا کردار ادا کیا تھا۔اس کی دوسری فلم '' تمنا'' تھی جو 1942ء میں ریلیز ہوئی تھی ۔اس فلم میں انہوں نے کم سنی کے باوجود ایک نغمہ بھی گایا تھا جو ان کا پہلا فلمی نغمہ تھا۔اس کے بول تھے۔

جاگو آئی آشا۔

دراصل یہ ایک دوگانا تھا جس میں ان کے ساتھ مناڈے کی آواز تھی۔مناڈے اس زمانے میں گمنام اور نووارد تھے۔ بعد میں وہ بہت مقبول گلوگار بن گئے تھے۔ مناڈے کے چچا کے 'سی' ڈے اس فلم کے موسیقار تھے۔یہ بنگلہ اور اردو فلموں کے بتہ مامور موسیقار اور گلوکار تھے۔نیو تھیٹرز اور بمبئی ٹاکیز کی معروف فلموں میں وہ موسیقاری اور گلوکاری کرتے رہے ہیں۔

یہ فلمی دنیا میں ثریا کا آغاز تھا جس کو بہت سے لوگ بھول بھی گئے ہوں گے کیونکہ ان کے یہ گانے قابل ذکر نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے مقبولیت حاصل کی تھی۔گلوکارہ کی حیثیت سے ثریا کی پہلی مشہور فلم ''شاردا'' تھی۔اس کے موسیقار نوشاد تھے اور ہیروئن مہتاب کی گلوکارہ کے طور پر منتخب کیا تھا۔ نوشاد جیسے موسیقار نے انہیں اپنے زمانے کی

مشہور معروف ہیروئن مہتاب کی گلوکارہ کے طور پر منتخب کیا تھا۔ نوشاد کا نام جادو اثر تھا۔ یہ فلم بھی 1942ء میں ریلیز ہوئی تھی اور سچ پوچھئے تو یہی ثریا کی شہرت کا سبب مل گئی ۔''شادرا'' کی موسیقی اتنی اچھی تھی کہ عرصہ دراز گزرنے کے باوجود آج بھی اس کے گیت مقبول ہیں۔ مثلاً یہ وہ نغمات ہیں جو آج بھی سننے والوں کو مسحور کر دیتے ہیں۔

پنچھی جا

پیچھے رہا ہے بچپن میرا

اس کو جا کے لا

اور..... میرے دل کو سجن سمجھا دو۔

اس فلم کی موسیقی کیا ہٹ ہوئی کہ ثریا کو گلوکارہ کی حیثیت سے اونچا مقام مل گیا۔ انہوں نے مہتاب کے لیے تین فلموں میں پلے بیک نغمات گائے تھے جو شاردا۔ قانون اور سنجوگ تھیں۔

ثریا کی آواز میں ایک عجیب سی نغمگی ، پختگی۔ گہرائی اور چھپی ہوئی سیکس اپیل تھی۔ سننے والے کو محسوس ہوتا تھا جیسے گانے والی اپنے دل کی گہرائیوں اور جذبات کی شدت کے ساتھ گا رہی ہے۔ ان کی آواز دوسری گلوکاراؤں سے مختلف تھی اور الگ سے پہچانی جاتی تھی۔ ویسی آواز پھر کبھی برصغیر کی فلمی دنیا میں سننے میں نہیں آئی۔ وہ بولوں کے ساتھ پورا انصار کرتی تھیں۔ ہر بول کو اس کے تقاضوں کے مطابق سادگی سے لیکن انتہائی پر اثر انداز میں ادا کرتی تھیں اور گائے ہوئے خود بھی نغمے میں ڈوب جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گائے ہوئے نغمات آج بھی اتنے ہی پر اثر اور مسحور کن ہیں جیسے کے پچاس سال پہلے تھے۔ ان کی آواز کی انفرادیت اور جادو وقت گزرنے کے باوجود آج بھی سب سے الگ تھلگ محسوس ہوتا ہے۔

ثریا کا تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ ثریا نے بمبئی میں ایک خوش حال گھر میں آنکھیں کھولی تھیں۔ حالانکہ ان کے خاندان کا تعلق پنجاب (لاہور) سے تھا۔ ان کی والدہ اور ماموں ظہور نے فلمی دنیا کو اپنا ہدف بنایا تھا۔ ظہور فلموں میں ولن اور دوسرے معاون کردار کرتے تھے۔ ان ہی کے سر ثریا کو فلموں میں متعارف کرانے کا سہرا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کر چکے ہیں ثریا ہمیشہ ایک پر اسرار شخصیت رہی ہیں۔ جب وہ فلموں میں اداکاری کرتی تھیں اس وقت بھی عام محفلوں اور فلمی تقاریب سے دور ہی رہا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ غالباً وہ اپنی نانی اور والدہ کی عائد کردہ پابندیوں کی وجہ سے فلم والوں سے گھلنا ملنا پسند نہیں کرتیں۔ فلم اسٹوڈیو اور گھر کے سوا وہ کہیں اور نہیں دیکھی گئیں۔ البتہ ان کے بارے میں چند اسکینڈلز ضرور بنے۔ ان میں فہرست دیو آنند کا نام ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ دیو آنند کے سوا کسی اور کے ساتھ ان کا نام کبھی منسلک نہیں کیا گیا تو غلط نہ ہوگا۔ یہ داستان بھی کافی تفصیل سے فلمی الف لیلہ میں بیان کی جا چکی ہے۔ ثریا کا کوئی ہم راز اور دوست نہ تھا۔ یہاں تک کہ کسی فلمی اداکارہ سے بھی ان کی گہری اور بے تکلف دوستی نہیں تھی اس لیے اس بات کی باقاعدہ تصدیق نہیں کی جا سکی تھی کہ کیا واقعی ثریا اور دیو آنند ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور شادی کے رشتے میں بندھنا چاہتے تھے۔ ایسی باتوں کی تصدیق ہم راز ہی کر سکتے ہیں لیکن مشکل یہ تھی کہ ثریا کی طرح دیو آنند بھی سب سے الگ تھلگ رہنے والے اور اپنا راز اپنی ذات تک محدود رکھنے والے کم گو ہیرو تھے۔

ایک زمانے میں دیو آنند بھارتی فلمی صنعت کے "تین بڑوں" میں شمار کیے جاتے تھے جن میں دلیپ کمار اور راج کپور بھی شامل تھے۔ ان کے پرستاروں کی تعداد لاکھوں کروڑوں میں تھی لیکن وہ بہت کم آمیز انسان تھے۔ فلمی تقاریب اور محفلوں سے وہ دور ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنی مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر صنف مخالف سے میل جول کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی فلرٹ کیا حالانکہ ان کی باقی دو ہم عصر تو اس معاملے میں بہت آگے تھے۔ دلیپ کمار کم آمیز ہونے کے باوجود چھپے رستم تھے۔ ان کی قریبی دوست انہیں خاموش کارکن کہا کرتے تھے۔ مطلب یہ کہ وہ رومان پسند تھے لیکن بہت منتخب لڑکیاں ہی ان کی توجہ کا مرکز بنتی تھیں۔ ان کے ساتھ دلیپ کمار کی ملاقاتیں اس قدر

پراسرار ہوتی تھیں کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی تھی۔ان میں کامنی کوشل، مدھوبالا اور وجنتی مالا کا نام سر فہرست ہے۔

جہاں تک راج کپور کا تعلق ہے تو وہ عشق کیے رہ نہیں سکتے تھے اور ان کا عشق پوشیدہ اور ڈھکا چھپا بھی نہیں رہتا تھا۔ ان کی رومان پسندی کا ہر ایک کو علم تھا اور وہ اپنی رنگین مزاجی اور رنگین داستانوں کی وجہ سے ساری فلمی دنیا میں بلکہ باہر کی دنیا میں بھی مشہور تھے۔

ان دونوں کے مقابلے میں دیو آنند ایک مختلف مزاج کے اداکار تھے۔اول تو ان کا حلقہ احباب ہی بہت محدود تھا۔ دوسرے وہ کام اور صرف کام سے واسطہ رکھتے تھے۔اس کے سوا ان کی زندگی میں کوئی اور دلچسپی نہیں تھی۔صنف مخالف کے ساتھ انہیں خاص دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی وہ فلرٹ کے قائل تھے۔ان سے پہلے ہندوستان کے ایک اور سپر اسٹار اشوک کمار بھی اس مزاج کے آدمی تھے۔ان کی بیوی کے سوا شاید کبھی ان کی زندگی میں کوئی اور لڑکی ہی داخل نہیں ہوئی۔وہ دوسری لڑکیوں سے صرف کام کی حد تک واسطہ رکھتے تھے۔ان کے اس مزاج کی وجہ سے فلمی ہیروئنیں انہیں ''دادا منی'' یعنی بڑا بھائی کہا کرتی تھیں۔

دیو آنند کے بارے میں کبھی کوئی اسکینڈل سامنے نہیں آیا البتہ یہ ضرور سنتے تھے کہ بمبئی ٹاکیز کی روح رواں اور اپنے عہد کی معروف ہیروئن دیویکا رانی ان میں دلچسپی رکھتی تھیں۔دیویکا رانی ایک رومان پسند خاتون تھیں۔ہر خوب صورت شخصیت ان کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔ایسی کئی مثالیں موجود ہیں لیکن اشوک کمار نے ان میں کبھی دلچسپی نہیں لی اور نہ ان سے کوئی تعلق رکھا۔ معروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو ان کے بہت نزدیک اور گہرے دوست تھے۔ انہوں نے اشوک کمار کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بے حد شرمیلے تھے۔لڑکیوں کا ہجوم اپنی طرف آتے ہوئے دیکھتے تو ان کے ہاتھ پیر پھول جاتے تھے اور وہ دوسرے راستے سے باہر بھاگ جاتے تھے حالانکہ وہ اس وقت کے سب سے بڑے اور مقبول ترین ہیرو تھے۔

دیو آنند کو شرمیلا تو نہیں کہا جا سکتا مگر وہ اپنے خول کے اندر رہنے والے انسان ہیں (اب وہ فوت ہو چکے ہیں)۔ فرق صرف یہ ہوا ہے کہ جوانی کا دور گزر جانے کے بعد جب انہوں نے فلم سازی اور ہدایت کاری کا آغاز کیا تو اپنی فلموں کی ہیروئنوں کے ساتھ ان کی رنگین داستانیں سننے میں آئیں اور اخبارات میں شائع بھی ہوئیں لیکن یہ بھی ایک خاص حد تک ہی رہا۔ جن دنوں وہ سپر اسٹار تھے اور ثریا کے ساتھ محبت میں گرفتار بھی تھے وہ ایسا دور تھا جب دیو آنند دوسری لڑکیوں اور ہیروئنوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے وقت کی حسین ترین اور بہترین ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا مگر کسی کے ساتھ سیریس نہیں ہوئے ۔ صرف وحیدہ رحمان سے ان کا نام وابستہ کیا گیا تھا مگر اس کی بھی کوئی تصدیق نہ ہو سکی۔

خاص کلام یہ ہے کہ ثریا اور دیو آنند بہت کم آمیز اور صنف مخالف سے دور رہنے والی ہستیاں تھیں مگر جب انہوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا تو پھر دلوں کی گہرائی اور ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ ان کی محبت کا انجام المناک تھا جس کا سبب ثریا کے گھر والے تھے جو سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں دونوں کا مذہب بھی رکاوٹ بنا ہو لیکن کہتے ہیں کہ دیو آنند ثریا سے شادی کی خاطر مذہب بھی ترک کرنے پر آمادہ تھے۔ اس لیے یہی خیال غالب ہے کہ دولت کے لالچ میں ثریا کے گھر والوں نے انہیں زندگی کی پہلی اور آخری محبت کو حاصل نہیں کرنے دیا۔

ہالی وڈ کے معروف ہیرو گریگری پیک سے ثریا کی دلچسپی بلکہ محبت بھی اس زمانے میں بہت مشہور ہوئی تھی۔ یہ محبت یک طرفہ تھی۔ ظاہر ہے کہ ہالی وڈ کے ایک سپر اسٹار کو ایک بھارتی ہیروئن اور گلوکارہ میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ثریا نے گریگری پیک سے خط و کتابت کے ذریعے رابطہ ضرور رکھا تھا مگر اس سے زیادہ بات نہ بڑھی اور نہ ہی بڑھ سکتی تھی ۔ہاں ایک بار جب کسی شوٹنگ کے سلسلے میں گریگری پیک نے بمبئی ہوائی اڈے پر مختصر قیام کیا تو پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت وہ ثریا سے ملاقات کے لیے میرین ڈرائیو پر اس کے فلیٹ پر بھی گئے۔ اس طرح ثریا جو بذات خود

لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھیں اپنے دل پسند ہیرو کے انتظار میں چشم براہ تھیں۔ان کے فلیٹ پر گریگری پیک نے مختصر قیام کیا۔ان کی خاطر مدارات بھی کی گئی۔تصاویر بھی اتاری گئیں جو بمبئی کے ممتاز فلمی جرائد میں شائع ہوئی تھیں۔

ثریا اور دیو آنند کو ''ظالم سماج'' یعنی ثریا کے گھر والوں نے جدا کر دیا۔ان دونوں کے یک جا کام کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ملاقاتیں تو ویسے بھی اسٹوڈیو کے علاوہ نہیں ہوتی تھیں اس لیے یہ سلسلہ قطعی طور پر بند ہو گیا۔ثریا نے اس کے بعد فلموں میں کام تو کیا لیکن بجھے ہوئے دل کے ساتھ۔ان کی شوخی مسکراہٹ اور شگفتگی رخصت ہو گئی تھی۔ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے بعد انہوں نے اپنی فلموں میں جو نغمات گائے ان میں سوز کا عنصر زیادہ ہو گیا تھا پھر ایک وقت ایسا آیا جب ثریا نے ''خود مختاری'' حاصل کر لی۔انہوں نے اپنے ماموں ظہور کو پاکستان روانہ کر دیا۔نانی کا انتقال ہو چکا تھا اور غالباً ان کی ''آزادی'' کا سلسلہ اس کے بعد ہی شروع ہوا تھا۔ماموں کو لاہور ڈسپیچ کرنے کے بعد انہوں نے اپنی والدہ سے بھی سرد مہری اور بے تعلقی اختیار کر لی۔یہ ایک سو فیصد سچائی ہے کہ ثریا نے اپنی والدہ سے اس قدر بے تعلقی اختیار کر لی تھی کہ جب وہ بیمار ہوئیں تو بھی ثریا نے انہیں معاف نہیں کیا۔ان کی خدمت اور علاج معالجہ تو دور کی بات ہے وہ آخری دنوں میں ماں سے ملاقات کی بھی روادار نہ تھیں۔ان کی والدہ نے بمبئی کے ایک عام اسپتال میں زندگی کے آخری ایام گزارے اور ایک لاوارث کی طرح وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔اس میں قطعی مبالغہ نہیں ہے۔اگرچہ یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ کوئی اکلوتی بیٹی حقیقی ماں کے ساتھ ایسا ''ظالمانہ'' سلوک بھی کر سکتی ہے لیکن یہ ایک سنگین اور انتہائی تلخ حقیقت ہے۔بمبئی کے فلمی حلقے اور صحافی اس کے گواہ ہیں۔اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بیٹی نے اگر اپنی ماں کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیا تو اس کی وجوہات کیا تھیں؟اس سے پہلے جب ثریا بے بس پنچھی کی مانند ان لوگوں کے قبضے میں تھیں تو انہیں کیسے روح فرسا سلوک کا نشانہ بننا پڑا ہو گا۔وہ ایک بے حد حساس فنکارہ کی حیثیت سے کتنی ذہنی اذیت سے گزری ہوں گی۔ان کے شب و روز کس طرح محرومیوں' المیوں اور مایوسیوں کے عالم میں گزرے ہوں گے۔ایک ایسی ہیروئن جس کے پرستاروں کی تعداد کروڑوں میں تھی اپنے فلیٹ میں کتنی بے بسی اور مجبوری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گی کا رد عمل اس قدر شدید اور ناقابل یقین حد تک سنگین تھا؟

بہرحال، یہ ایک علیٰحدہ کہانی ہے اور عبرتناک کہانی ہے جس سے سوچنے سمجھنے والے ایک فلم ایکٹریس کی زندگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور ان واقعات کے پس منظر میں چھپے ہوئے المیوں سے سبق بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

برصغیر کی معروف ترین ہیروئنوں میں سے پیشتر کی یہی داستان ہے جو گھر والوں کے لیے سونے کی کان بنی رہیں اور انہیں عیش و عشرت کے سامان فراہم کرتی رہیں مگر اپنی خوشیوں، تمناؤں اور آرزوؤں سے محروم ہی رہیں۔ ان کے المیے بذات خود فلمی کہانیوں کے موضوع بن سکتے ہیں۔ مینا کماری، مدھو بالا، ثریا سبھی اس دردناک داستان کے کردار ہیں۔

پچھلے دنوں جرمنی سے وصول ہونے والے ایک ٹیلی فون کی وجہ سے ثریا کا تذکرہ تازہ ہو گیا۔ ایک خاتون نے گھر کے ٹیلی فون پر ہم سے رابطہ قائم کیا اور پھر وہاں سے دفتر کا ٹیلی فون نمبر حاصل کر کے بات کی۔ اس سے پہلے ہمیں گھر والوں نے بتا دیا تھا کہ ایک خاتون کا جرمنی سے ٹیلی فون آیا تھا۔

ہم بہت حیران ہوئے کہ جرمنی میں بھلا کون ہماری شناسا خاتون ہیں جنھوں نے ہمیں اتنے دور دراز ملک سے یاد کیا ہے۔ کافی عرصے قبل بھی ہمیں جرمنی سے ایک ٹیلی فون موصول ہوا تھا۔ یہ بھی ایک خاتون کا تھا جن کا تعلق وائس آف جرمنی سے تھا۔ وہ گلوکارہ مالا کے بارے میں ہم سے معلوم کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے سرگزشت کے کسی شمارے میں مالا کے بارے میں ہمارا مضمون پڑھا تھا۔ ان کی جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش کے بارے میں وہ ہم سے تصدیق کرنا چاہتی تھیں اور ان کے متعلق کچھ اور تفصیلات بھی معلوم کرنا چاہتی تھیں۔

اس بار جن خاتون نے جرمنی سے ہمیں ٹیلی فون کیا ان کا نام شہناز تھا۔ وہ ذاتی طور پر یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ ماضی کی نامور بھارتی فلم اسٹار اور گلوکارہ ثریا کیا آج بھی بقید حیات ہیں اور اگر وہ زندہ ہیں تو کس حال میں ہیں۔ سب سے بڑھ کر انہیں یہ معلوم کرنا تھا کہ آیا وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہیں یا کسی سے شادی کر کے یہ عہد اور ضد توڑ دی ہے جس پر دیو آنند سے محبت میں ناکامی کے بعد سے وہ عرصہ دراز تک قائم رہی تھیں۔

اگلے روز دفتر میں ان کا ٹیلی فون موصول ہو گیا۔ وہ ہم سے کوشش کے باوجود گزشتہ روز رابطہ قائم نہیں کر سکی تھیں۔ ثریا کے بارے میں ہم اچانک ٹیلی فون موصول ہونے کے بعد اپنے حافظے کی کوٹھری سے یہ سب کچھ معلومات کھنگال کر فراہم نہیں کر سکتے تھے اس لیے اگلے روز تک مہلت طلب کی اور پھر پرانی یادیں تازہ کرنے بیٹھ گئے۔ انسانی حافظہ بہر حال کمپیوٹر کی طرح فوری طور پر ایک بٹن دبا کر ساری تفصیلات مہیا کرنے کے قابل نہیں ہے پھر بھی ہم نے جو بھی یاد کر سکے انہیں بتا دیا۔

ثریا خانم اب ایک ''قصہ پارینہ'' بن چکی ہیں۔ کیبل ٹی وی سے کبھی کبھی ان کی پرانی فلمیں نمائش کے لیے پیش کی جاتی ہیں اور ان کے پرستار اور پرانے فلم بین ان کے بارے میں بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ پرانی فلمیں ہی اب ویڈیو اور کمپیوٹر کی مدد سے پرانے فلمی ستاروں کو آج کی نسل سے متعارف کرانے کا ذریعہ رہ گئی ہیں۔ ذرا سوچئے کہ اگر ٹیلی وژن اور ویڈیو کی مدد حاصل نہ ہوتی تو ہماری پرانی فلموں، فلمی ستاروں اور مایہ ناز ہنر مندوں کے بارے میں کون جانتا اور ان کی عظمت اور خدمات کا کس طرح احساس کیا جاتا؟

پچھلے دنوں ثریا کی ایک پرانی فلم دیکھی تو اس سنہرے دور کی یادیں تازہ ہو گئیں جو اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ گزرا ہوا زمانہ لوٹ کر نہیں آتا اور نہ ہی وقت کا پہیا الٹا چل سکتا ہے۔ خاص طور پر اب جبکہ ساری دنیا کی سوچ، شکل صورت اور طور طریقے ہی بدل گئے ہیں تو اس ماحول اور ان کرداروں کا دوبارہ جنم لینا ایک ناممکن سی بات نظر آتی ہے۔ وہ پر سکون دور تھا جب اخلاق، مروت اور شائستگی ہماری اقدار کا حصہ ہوا کرتی تھیں۔ اب نہ وہ زمانہ رہا۔ نہ وہ لوگ اور نہ ہی وہ قدریں۔ روایات بدل گئی ہیں صرف قصے اور کہانیاں باقی رہ گئی ہیں۔

اللہ اللہ۔ ثریا کا بھی کیا دور تھا اس زمانے میں گانے والے ستارے انگلیوں پر ہی گنے جاتے تھے اور ان کی قدر و قیمت بے اندازہ کی جاتی تھی۔ گلوکارائیں اور مغنیائیں ایک سے بڑھ کر ایک موجود تھیں مگر ایسی فنکارائیں جو سپر اسٹار ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کی گلوکارہ بھی تھیں انگلیوں پر ہی گنی جا سکتی تھیں۔ مثال کے طور پر ثریا، نور جہاں، خورشید بانو بمبئی کی فلمی دنیا کے ممتاز نام تھے جو دونوں شعبوں میں مہارت رکھتے تھے۔ ان میں نور جہاں اور ثریا کو بہت زیادہ

نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ خورشید بانو وہی ہیں جن کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ جنہوں نے ”تان سین“ جیسی فلم میں ایسے نیم کلاسیکی نغمے گائے تھے جو آج بھی ویسے ہی مدھر ' پُراثر اور دلوں کے اندر تک پہنچ جانے کی صلاحیت اور طاقت رکھتے ہیں۔ فلم بینوں نے یہ فلم دیکھی تو انہیں یہ محسوس ہوا جیسے کہ وہ جس تان سین کے بارے میں پڑھتے اور سنتے رہے ہیں وہ ایسا ہی ہو گا جیسا کہ 'ایل' سہگل کی صورت میں اسکرین پر نظر آ رہا ہے۔ تان سین کی محبوبہ ”تانی“ کا جو نقشہ فلم بینوں کے ذہنوں میں تھا خورشید بانو کی گائیکی' اداکاری اور جاذبیت نے اسے ایک سراپا بنا کر ان کے سامنے پیش کر دیا تھا۔

کلکتہ میں کانن بالا ایسی اداکارہ تھیں جو اول درجے کی گلوکارہ بھی تھیں۔ ان کی ایک خوبی یہ تھی کہ بنگلہ اور اردو دونوں زبانوں کی فلموں میں کام کرتی تھیں اور گاتی بھی تھیں۔ ان کی اردو فلموں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ انہوں نے نیو تھیٹرز کی فلموں ہی میں کام کیا تھا۔ ایک فلم ”جواب“ واقعی لاجواب فلم تھی۔ اس کے ہیرو بروا تھے جو کہ اعلیٰ درجے کے ہدایت کار بھی تھے۔ انہوں نے کئی اردو فلموں میں اداکاری کی جوہر دکھائے اور داد حاصل کی۔ وہ حقیقی نظر اور سادہ اداکاری کرتے تھے اور سچ مچ کے چلتے پھرتے کردار نظر آتے تھے۔ فلم ”جواب“ میں کانن بالا کا گایا ہوا ایک نغمہ آج بھی ہمیں یاد ہے اور اس فلم کے کچھ حصے بھی ایک خواب کے مانند دھندلے دھندلے سے آنکھوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔ ہم نے فلم نوعمری میں دیکھی تھی مگر اس کا تاثر اتنا بھرپور تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے کل کی بات ہے۔

کانن بالا نے اس فلم میں ایک گیت گایا تھا جس کے بول یہ تھے۔

اے چاند چھپ نہ جانا

جب تک میں گیت گاؤں

یہ ساز زندگی کا

جی بھر کے میں بجاؤں

اے چاند چھپ نہ جانا

یہ سادہ سی دل میں اتر جانے والی طرز اور فلم کا وہ منظر آج بھی ہمارے ذہن کے پردے پر فلم کی طرح نظر آتا ہے۔ منظر یہ ہے کہ فلم کے ہیرو کے 'سی' بروا اپنی یادداشت کھو چکے ہیں۔ جس گاؤں میں پہنچتے ہیں وہاں ان کی ملاقات کانن بالا سے ہوتی ہے جو ان کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ بروا کھوئے کھوئے سے آدمی ہیں۔ انہیں اپنے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ منظر یہ ہے کہ بروا کو سلانے کے لیے کانن دیوی یہ لوری نما گیت گاتی ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں اور وہ نیند کی آغوش میں گم ہو جاتے ہیں۔ لوری کا یہ بھی ایک انوکھا انداز تھا کہ براہ راست سلانے والے کو مخاطب کرنے کے بجائے وہ چاند سے مخاطب تھیں۔

ہدایت کار نے چاندنی رات کا تاثر پیدا کرنے میں بڑی مہارت کا مظاہرہ کیا تھا۔ آسمان کے چاند سے ہم کلام ہو کر دراصل وہ اپنے زمین کے چاند سے مخاطب تھیں۔ اس زمانے میں ایسی ہی فلمیں بنا کرتی تھیں جو اپنی نازک خیالی اور موضوع اور پیشکش کے انداز کے اعتبار سے یادگار بن جاتی تھیں۔ نیو تھیٹرز ایک ایسا فلم ساز ادارہ تھا جس نے یکے بعد دیگرے کئی خوب صورت' بامقصد اور آرٹسٹک فلمیں بنا کر سارے ہندوستان کو مسحور کر دیا تھا۔ ان کی ہر فلم میں کوئی مقصد اور پیغام ضرور ہوتا تھا۔ بعد میں برصغیر میں آرٹ فلموں کے نام پر جو فلمیں بنائی گئیں وہ نیو تھیٹرز کی فلموں کے مقابلے میں اس اعتبار سے کم تر تھیں کہ نیو تھیٹرز کی فلمیں کمرشل ہوتی تھیں اور کاروباری لحاظ سے بھی کامیاب تھیں۔ جنہیں ہر طبقے کے فلم بین سمجھ سکتے تھے اور ان سے پوری طرح لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔ یہ وہ فلمیں تھیں جن میں فلم بنانے والا اور فلم دیکھنے والا دونوں ہم خیال اور ایک دوسرے کے ہم قدم ہو جاتے تھے ۔ افسوس کہ نیو تھیٹرز کی یہ مایہ ناز فلمیں اب ویڈیو پر بھی دستیاب نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ بھارت میں مل جاتی ہوں مگر پاکستان میں تلاش کے باوجود کہین سے حاصل نہ ہو سکیں۔

کلکتہ کے گلوکار اور اداکاروں میں پنکج ملک بھی ایک نمایاں نام ہیں۔ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ اعلیٰ درجے کے موسیقار بھی تھے۔کے ایل سہگل جیسے عظیم فنکار کی متعدد فلموں کی موسیقی پنکج ملک نے ہی ترتیب دی تھی۔ایک فلم میں انہوں نے ایک تجربہ بھی کیا تھا کہ سہگل کے گائے ہوئے گانے خود اپنی آواز میں بھی ریکارڈ کیے۔بازار میں دونوں آوازوں میں گائے ہوئے نغمات کے ریکارڈ فروخت ہوتے تھے۔مثال کے طور پر سہگل کا نغمہ۔

اے کاتب تقدیر مجھے اتنا بتا دے

کیوں مجھ سے خفا ہے تو کیا میں نے کیا ہے

حصے میں سب کی آئی ہیں رنگین بہاریں

مایوسیاں لیکن مجھے شیشے میں اتاریں

میں ہوں کہ سدا غم کا زہر میں نے پیا ہے

(نوٹ.... یہ بول محض یادداشت کی مدد سے لکھے گئے ہیں۔آخری بند میں تبدیلی بھی ہوسکتی ہے)

سہگل اور پنکج ملک دونوں اپنے عہد کے مقبول اور ممتاز گلوکار تھے اور ان دونوں کی آوازوں میں ایک ہی نغمہ سننے والوں کے لیے ایک سنسنی خیز تجربہ تھا۔

اسی طرح بمبئی میں سریندر ایک نمایاں اداکار اور گلوکار تھے۔فلم ''انمول گھڑی'' میں انہوں نے میڈم نور جہاں کے مقابلے میں ہیرو کا کردار کیا تھا اور اپنے نغمات بھی خود ہی گائے تھے مگر ایسے اعلیٰ فنکاروں کی تعداد بہت کم تھی۔

ثریا نے ریڈیو پر بچوں کے پروگراموں سے گلوکاری کا آغاز کیا تھا اور پھر بچپن ہی میں فلموں میں اداکاری کرنے لگیں جس کا ذکر آپ سن چکے ہیں۔ ابتداء میں اپنی فلموں کے لیے ہی ثریا نے اپنی آواز مخصوص رکھی تھی لیکن بعد میں

دوسری اداکاروں کے لیے بھی پلے بیک گیت گائے۔ثریا کی شہرت کا آغاز دراصل فلم ''اشارہ'' سے ہوا تھا۔اس فلم کے ہیرو پرتھوی راج اور ہیروئن سورن لتا تھیں۔ثریا نے اس فلم میں معاون اداکارہ کے طور پر کام کیا تھا۔ ان کے ساتھ ستیش کی جوڑی تھی جو فلموں میں چھوٹے موٹے کردار ادا کرتے تھے۔ اس فلم میں ان کے دو گیت ان کی ہمہ گیر شہرت کا سبب بن گئے تھے۔

یہ گیت آج بھی اسی طرح تروتازہ ہیں۔

پنگھٹ مرلیا باجے رے

باغن میں کوئل بولی

دوسرا گانا ڈوئیٹ تھا جس میں ان کا ساتھ ستیش نے دیا تھا۔

''اسٹیشن ماسٹر'' اور ''اشارہ'' میں انہوں نے اپنے گانے خود اپنے اوپر فلمانے کے لیے گائے تھے۔''انمول گاڑی'' اپنے زمانے کی بلکہ ہر زمانے کی ایک ناقابل فراموش فلم ہے جس میں نور جہاں اور سریندر نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ نوشاد کی موسیقی نے اس فلم کو امر بنا دیا تھا۔''انمول گھڑی'' ایک رومانی کہانی ہے جس میں ایک ہی ہیرو سے دو ہیروئنیں محبت کرتی ہیں مگر وہ جس لڑکی کو پسند کرتا ہے وہ نور جہاں ہیں۔اس فلم میں نور جہاں کے نغمات نے ہر چیز کو دھندلا کر رکھ دیا تھا حالانکہ ''انمول گھڑی'' میں ثریا کے تین نغمے بھی شامل ہیں۔یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ نور جہاں کے ہوش ربا اور غیر فانی نغمات کے باوجود ثریا نے بھی اپنی آواز کی الگ سے پہچان کرا دی تھی ۔

اس کے بعد ثریا کے عروج کا دور شروع ہو گیا۔ثریا کو جن موسیقاروں نے بام عروج تک پہنچانے میں نمایاں حصہ لیا ان میں خوشاد' خواجہ خورشید انور اور حسن لال بھگت رام قابل ذکر ہیں۔ان ہنر مند باکمال موسیقاروں نے ثریا کو صحیح معنوں مین اوج ثریا تک پہنچا دیا تھا۔انل بسواس' ایس۔ڈی برمن اور غلام محمد نے بھی ان کی آواز کا بہت اچھا

استعمال کیا لیکن آخر الذکر موسیقاروں کے ساتھ ثریا کی فلموں کی تعداد زیادہ نہیں ہے مگر ثریا نے '' انمول گھڑی'' کے بعد عروج کی جانب جو سفر شروع کیا تھا وہ بتدریج آگے ہی بڑھتا رہا۔

ثریا نے لگ بھگ بائیس سال فلموں میں کام کیا اور اس عرصے میں صرف 65 فلموں میں اداکاری کی۔ پانچ یا چھ فلموں میں انہوں نے نے پلے بیک سنگر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ ان فلموں کی فہرست میں وہ فلمیں شامل نہیں ہیں جو نامکمل ہی رہ گئیں اور کبھی نمائش کے لیے پیش نہ کی جا سکیں۔ ان ہی میں ایک فلم '' جانور'' بھی شامل ہے۔

'' جانور'' کے بارے یہ داستان مشہور ہے کہ اس فلم کے ہیرو دلیپ کمار' ثریا پر مہربان ہو گئے اور انہوں نے ثریا کے حصول کی خاطر یہاں تک اظہار کر دیا کہ اگر ثریا نے ان کی خواہش پوری نہیں کی تو وہ اس فلم میں نہیں رہیں گی۔ ثریا نے یہ فلم خود ہی چھوڑ دی تھی اور بمبئی کی فلمی دنیا میں کافی عرصے تک اس بات کا چرچا رہا لیکن اس واقعے نے دو باتیں ثابت کر دیں۔ ایک تو یہ کہ ثریا نے اپنے آپ کو کبھی ارزاں جنس نہیں بنایا اور اپنے وقار اور عزت کی ہمیشہ حفاظت کی۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے اس وقت کے سب سے مقبول اور عظیم ہیرو دلیپ کمار کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ حالانکہ اس زمانے میں دلیپ کمار کا نام ہی جادوئی اثر رکھتا تھا اور بہت سی بڑی بڑی نامور فلمی ہیروئنیں ان کے ساتھ کام کرنے اور ان کی نگاہ التفات حاصل کرنے کی متمنی رہا کرتی تھیں۔ یہ واقعہ ثریا کے ذاتی کردار اور مضبوط قوت ارادی کا بھی مظہر ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ دوسری ہیروئنوں سے کس قدر مختلف تھیں ہمیشہ انہوں نے اپنی یہ وضع نبھائی اور اس روش پر قائم رہیں۔

ان کی ایک اور نامکمل فلم '' پاگل خانہ'' تھی جس میں بھارت بھوشن ہیرو کا کردار کر رہے تھے۔ بھارت بھوشن کا کچھ عرصے قبل انتہائی کس مپرسی کے عالم میں انتقال ہوا ہے۔ ان کی عمر 80 سال کے لگ بھگ تھی۔ حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ انہوں نے زندگی کے آخری ایام بہت مفلسی اور بے بسی کے عالم میں بسر کیے۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کیونکہ بھارت بھوشن اپنے دور میں کافی کامیاب ہیرو تھے اور جن کی بعض فلموں نے تو کامیابی کے ریکارڈ قائم کر دیے تھے اور ان کی مالی حالت بھی اچھی تھی۔ ان کے ایک بھائی محض ان کے بل بوتے پر فلم ساز بھی بن گئے تھے جس میں

خود بھارت بھوشن بھی حصے دار تھے۔اس کے باوجود ان کی مفلسی اور کس مپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ نہیں آئی۔وہ کافی عرصے سے فلموں سے کنارہ کش ہو چکے تھے یا دوسری لفظوں میں فلمی صنعت نے ان سے کنارہ کرلیا تھا۔اس لیے ان کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔فلمی دنیا کی یہ بھی عجیب ریت ہے کہ اپنے زمانے میں دولت اور شہرت میں کھیلنے والے فنکاروں نے زندگی کی شام بہت بری حالت میں گزاری۔ایسی کئی مثالیں بھارت اور پاکستان کی فلمی دنیامیں موجود ہیں۔

بھارت بھوشن کے سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان کی اکثر فلموں نے بے حد کامیابی حاصل کی مگر اس کامیابی کے پیچھے محمد رفیع کی آواز کو ہمیشہ نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ایک زمانے میں بھارت بھوشن کو خوش قسمت ترین اداکار کہا جاتا تھا کیونکہ ان کی متعدد فلموں نے بے انتہا کامیابی حاصل کی تھی پھر بھی بھارت بھوشن کا شمار کبھی بھارت کے اول درجے کے اداکاروں میں نہیں کیا گیا۔کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ محمد رفیع کی موت ہی بھارت بھوشن کے زوال اور گمنامی کا سبب بنی۔یہی آواز تھی جو ان کے کرداروں کو زندگی اور مقبولیت دیا کرتی تھیں۔

ثریا بائیس سالہ فلمی زندگی میں بارہ تیرہ سال تک صف اول کی ممتاز فنکارہ کے مقام پر فائز رہیں۔اداکارہ اور گلوکارہ کی حیثیت سے ان کا طوطی بولتا تھا اور وہ سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے والی ہیروئن تھیں کیونکہ گلوگارہ بھی تھیں۔ان کا نام فلموں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا مگر جب پلے بیک گانوں کا رواج عام ہو گیا اور نور جہاں کے پاکستان آجانے کے بعد لتا منگیشکر کی آواز نے قیامت ڈھائی تو ثریا جیسی اداکارہ اور گلوکارہ کی قدر و قیمت میں کمی واقع ہونے لگی۔دوسری خوب صورت اور اعلیٰ پائے کی ہیروئنوں کو لتا کی چمک دار آواز کا سہارا ملا تو ثریا کی اہمیت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔

ثریا نے کامیابیوں، کامرانیوں اور مقبولیت و محبوبیت کی تمام منزلیں طے کرلی تھیں۔دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ مزید دولت اور شہرت کی انہیں خواہش نہیں رہی تھی۔شاید محبت میں ناکامی اور گھریلو زندگی کی تلخیوں اور مایوسیوں نے بھی انہیں دل برداشتہ کر دیا تھا۔نانی کے انتقال اور اپنے ماموں اور والدہ کے شکنجے سے آزاد ہونے کے بعد انہوں

نے خود مختار' خاموش اور پر سکون زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور 1962ء میں فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو گئیں۔ کنارہ کشی بھی ایسی مکمل اور جامع کہ اس کے بعد نہ انہوں نے گویا گانا ریکارڈ کرایا اور نہ کسی فلم میں کام کیا۔ کسی اسٹوڈیو میں ان کا سایہ تک نہیں دیکھا گیا۔ نہ ہی فلمی تقاریب اور دوسری سوشل محفلوں میں وہ کبھی نظر آئیں۔ انہوں نے مکمل گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ مقولہ ہے کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ فلمی دنیا میں تو یہ ایک معمول ہے۔ رفتہ رفتہ لوگ ثریا کو بھی بھولنے لگے لیکن کبھی کبھی اخبارات و جرائد میں ان کے نغمے اور پرانی فلموں نے ان کی یادوں کو ایک نئی زندگی بخشی۔ اس طرح ثریا بھولے جانے کے باوجود نہ بھلائی جا سکیں۔ آج بھی لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگ انہیں یاد کرتے ہیں۔ ہمارے آس پاس درجنوں ایسے حضرات بھی ہیں جو آج بھی ہم سے ثریا کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کی فلموں اور گانوں کی باتیں کرتے ہیں۔ ویڈیو اور کیبل پر ان کی پرانی فلمیں دیکھنے کے منتظر رہتے ہیں۔ انہوں نے ثریا کو آج بھی نہیں بھلایا ہے۔ کئی جاننے والوں کی مستقل فرمائش رہتی ہے کہ ہم ثریا کے بارے میں لکھیں۔

کہتے ہیں ''بھائی، اتنا کچھ تو لکھ چکے ہیں۔''

وہ کہتے ہیں ''مگر آپ نے ثریا جیسی فنکارہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے اس لیے اور لکھئے۔''

سوچتے ہیں اور کیا لکھیں؟ کاش ہماری ثریا سے ذاتی شناسائی اور ملاقات ہوتی تو ہم ان کے بارے میں مزید لکھتے مگر یہ موقع کبھی حاصل نہیں ہوا اور ہوتا بھی کیسے۔ نہ ہم کبھی بمبئی گئے اور نہ ہی ثریا کبھی پاکستان آئیں حالانکہ یہ ان کا آبائی ملک ہے۔ البتہ 1950ء سے ہم لاہور اور پاکستان میں ثریا کے پرستاروں کے بارے میں سنتے اور خبریں پڑھتے رہے ہیں جو ان کے نام پر اپنی جان تک دینے کو آمادہ تھے۔ لاہور کا ایک درزی' ایک قصاب اور ایک صحافی۔ یہ تین اشخاص ایسے ہیں جنہیں ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان سے ملاقات کا موقع بھی ملا۔ انہیں واقعی ثریا سے عشق تھا۔ انہوں نے جتنا ثریا کو یاد کیا اور اس کا ذکر کیا اگر اتنا اللہ کو یاد کیا ہوتا تو غالباً اولیاء میں شمار ہوتے۔ ہمارے ایک فلمی صحافی دوست کا دعویٰ تھا کہ ثریا ان سے محبت کرتی ہے۔ انہیں خط لکھتی ہیں۔ دراصل یہ خط وہ ہی ثریا کی طرف سے لکھ لیا کرتے تھے اور دوستوں کو دکھایا کرتے تھے۔ شکستہ خط میں لکھی ہوئی یہ تحریریں بہت سادہ اور مختصر ہوا کرتی تھیں

مگر وہ انہیں اتنی بار پڑھ کر سناتے تھے کہ سننے والوں کو بھی حفظ ہو جاتی تھی۔ وہ قسمیں کھایا کرتے تھے کہ یہ ثریا کا ہینڈ رائٹنگ ہے۔ ثریا کا ہینڈ رائٹنگ کسی نے دیکھا ہوتا تو اس کی تصدیق یا تردید کر سکتا تھا۔ اس لیے ان کی اس بات کو سبھی تسلیم کر لیا کرتے تھے لیکن کسی کو یقین نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ ان کی یک طرفہ محبت ہے جسے وہ دو طرفہ عشق کا نام دے رہے ہیں۔ وہ گھنٹوں ہمیں ثریا کی باتیں سنایا کرتے تھے۔ راتوں کو سڑکوں پر ہمارے گلے میں ہاتھ ڈال کر گھومتے تھے اور موضوع گفتگو صرف ایک ہی ہوتا تھا.... ثریا۔ اس دوران میں ہم محض خاموش سامع کی حیثیت رکھتے تھے۔

ایک صاحب کافی عرصے بمبئی میں پی' آئی' اے سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ بڑے وثوق سے یہ کہتے ہیں کہ ان کی ثریا سے اکثر ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ انہوں نے عشق و محبت کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ وہ محض ثریا کے مداح تھے۔

ان کا کہنا ہے کہ ثریا کے ساتھ ان کی طویل ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور ثریا انہیں اپنی فلمی زندگی کے واقعات سنایا کرتی تھیں۔ مثلاً موسیقار انل بسو اس کی وہ اس لیے معترف تھیں کہ انہوں نے ثریا کو گلوکاری کے وقت صحیح جگہ پر سانس لینے کا گر سکھایا تھا۔ وہ کئی موسیقاروں کا عقیدت سے ذکر کرتی تھیں جس میں انل بسواس، خواجہ رشید انور اور نوشاد سر فہرست ہیں۔ وہ بتایا کرتی تھیں کہ جب خواجہ خورشید انور انہیں کوئی طرز یاد کراتے تو کس طرح ہارمونیم پر آگے کی طرف جھک کر انہیں گا کر طرز سناتے تھے۔

اس دوران میں ان کے لمبے لمبے بال ان کا نصف چہرہ ڈھانپ لیا کرتے تھے جنہیں وہ بار بار انگلیوں سے پیچھے ہٹاتے رہتے تھے۔ خواجہ صاحب کی یہ عادت خود ہمیں بھی یاد ہے۔ بالوں کو سمیٹنے کا ان کا ایک مخصوص انداز تھا اور وہ بالکل غیر محسوس اور غیر ارادی طور پر ایسا کرتے رہتے تھے مگر ان کا ذہن دُھن اور موسیقی میں الجھا رہتا تھا۔ نوشاد صاحب کے بارے میں ثریا کا کہنا تھا کہ وہ بہت زیادہ ریہرسل کراتے تھے اور جب تک پوری طرح مطمئن نہیں ہو جاتے تھے گانے کی صدابندی نہیں کرتے تھے۔

ثریا نے کہا"آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سارے دن فلم کی شوٹنگ کرنے کے بعد میں تھک کر چور ہو جایا کرتی تھی لیکن وہی وقت گانے کی ریہرسل کے لیے فارغ ہوتا تھا۔"مگر نوشاد صاحب کی ریہرسل بھی لازمی تھی چاہے اس میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگ جائے۔ثریا نے انہیں اپنے پہلے گانے کی صدابندی کا دلچسپ واقعہ بھی سنایا۔ ثریا اس وقت نو عمر تھیں اور مائیکروفون تک ان کا منہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔چنانچہ گانے کی ریکارڈنگ کے لیے انہیں لکڑی کے اسٹول پر کھڑا کیا گیا تھا۔ثریا نے تمام عمر شادی نہیں کی یا شادی کر لی؟اس بارے میں مصدقہ اطلاع کوئی نہیں ہے کیونکہ نہ تو کبھی کسی نے ان کی شادی کا کارڈ دیکھا نہ شادی میں شرکت کی۔یہاں تک کہ کسی کو اس شادی کی کانوں کان خبر تک نہ ہو سکی مگر ایک صحافی یہ دور کی کوڑی لے کر آئے تھے کہ ثریا نے معروف ساؤنڈ ریکارڈسٹ ایشان گھوش سے شادی کر لی تھی لیکن ان کی ساری زندگی اسرار کے پردوں میں چھپی ہوئی ہے اس لیے اس خبر کی تصدیق کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔

اس قدر پر اسرار انداز میں ساری زندگی بسر کر دینا صرف ثریا ہی کے بس کی بات ہے۔سچ کیا ہے یہ کوئی نہیں جانتا نہ جان سکتا ہے۔جس عورت نے ایک طویل عرصہ فلمی دنیا میں اس طرح گزار دیا کہ اس کی نجی زندگی کے حقائق کا کسی کو علم ہی نہ ہو سکا اس کے بارے میں کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ثریا کی مثال ایک ایسے ستارے کی طرح ہے جو بہت روشن اور چمک دار ہوتا ہے۔آسمان کو اپنی روشنی سے منور کر دیتا ہے مگر پھر آسمان کی پنہائیوں میں ایسا گم ہوتا ہے کہ تلاش کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

میڈم نور جہاں ثریا کی ہم عصر تھیں۔ثریا تو بمبئی ہی میں پلی بڑھی تھیں اور انہوں نے وہیں فلمیں زندگی کا آغاز کیا تھا پھر خداداد آواز اور نانی کی تربیت سے گائیکی میں بھی قدم رکھ دیا اور گلوکارہ کی حیثیت سے بڑا نام پیدا کیا۔انہوں نے بچپن میں فلمی زندگی کا آغاز اداکاری سے کیا تھا اس لیے جب گلوکاری شروع کی تو انہیں بیک وقت اداکارہ اور گلوکارہ ہونے کی منفرد حیثیت حاصل ہو گئی۔شاید ثریا بمبئی کی فلموں میں اور بھی زیادہ نام اور دولت کماتیں اور بہت ممکن ہے کہ وہ اتنی جلد فلمی دنیا سے کنارہ کش بھی نہ ہوتیں اگر نور جہاں اچانک لاہور سے بمبئی نہ پہنچ جاتیں۔

نور جہاں نے ثریا کے برعکس اپنی زندگی کا آغاز گلوکاری سے کیا تھا۔ اداکارہ وہ بعد میں بنی تھیں۔ شہرت انہوں نے اپنے گانوں کے حوالے سے ہی حاصل کی تھی پھر جب اداکاری کی تو اللہ نے ایسی مہربانی کی کہ بطور ہیروئن ان کی پہلی فلم ''خاندان'' نے ایسی کامیابی اور مقبولیت حاصل کی کہ بڑی بڑی پرانی ہیروئنیں حیران رہ گئیں۔ نور جہاں کی فلم تو ہندوستان کے شہروں میں بعد ریلیز ہوئی تھی لیکن ان کی سریلی ہوش ربا آوازیں اس سے پہلے ہی برصغیر کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نور جہاں کی آواز میں جو انوکھا پن تھا وہ اس زمانے کے معروف ترین گلوکارہ کو بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک عجیب وغریب آواز تھی جس میں چنچل پن اور شوخی بھی تھی۔ چلبلا پن بھی تھا۔ سوز بھی تھا اور درد کا ایک گہرا تاثر بھی۔ وہ جب کوئی المیہ گیت گاتی تھیں تو لگتا تھا دل کی گہرائیوں سے گا رہی ہیں اسی لیے ان کے نغمات سننے والوں کے دلوں میں اتر کر گھر کر لیتے تھے۔ سوز کے علاوہ ان کی آواز میں سریلا پن، مٹھاس اور ایک تہ در تہ سیکس اپیل بھی تھی جو براہ راست سامعین کے جذبات واحساسات پر حملہ آور ہوتی تھی۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ایسی آواز برصغیر میں نہ پہلے کبھی سنائی دی تھی اور نہ ہی بعد میں سننے کو ملی۔

''خاندان'' نے نور جہاں کو راتوں رات سپر اسٹار بنا دیا۔ ادھر فلم کے ہدایت کار شوکت حسین رضوی کے عشق نے انہیں بے پناہ مصائب سے دوچار کر دیا۔ انہوں نے خاندان کے ہدایت کار کی محبت پر اپنے خاندان کی محبت کو ترجیح دی اور عدالت میں صاف مکر گئیں کہ وہ شوکت صاحب سے کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ وکیل اور گھر والوں کے کہنے پر انہوں نے عدالتی بیان میں یہ تک کہہ دیا کہ وہ تو شوکت حسین رضوی کو اپنا بھائی سمجھتی ہیں۔ واقفان حال اس بیان پر حیران رہ گئے مگر شوکت صاحب کے دل پر کیا گزری؟ یہ خود وہی جانتے تھے۔ اس بے وفائی پر وہ دل شکستہ ہو کر رہ گئے۔ بمبئی سے انہیں ہدایت کاری کے لیے بہت اچھی پیشکش ملی تو وہ فلم ساز ایس ایم دیا داس سے تین فلموں کا معاہدہ کر کے بمبئی چلے گئے۔ بظاہر یہ کہانی ختم ہوگئی تھی لیکن قسمت کے کھیل انوکھے ہوتے ہیں۔ بعد میں نور جہاں بھی بمبئی پہنچ گئیں اور بالآخر شوکت حسین رضوی کے گھر کی زینت بن گئیں۔ تقدیر کے لکھے کو نہ کوئی جانتا ہے اور نہ ہی مٹا سکتا ہے۔ ذرا سوچیے کہ اگر یہ کہانی عدالتی کارروائی کے بعد ختم ہو جاتی اور حالات نور جہاں اور شوکت حسین رضوی کو دوبارہ آمنے سامنے نہ کر دیتے اور نور جہاں اور شوکت حسین رضوی کی شادی نہ ہوتی تو بعد میں رونما ہونے والے

واقعات کس قدر مختلف ہوتے۔ خدا جانے وہ دونوں الگ الگ کیسی زندگی گزارتے۔ شوکت صاحت کی ہدایت کاری کا سبھی لوہا مانتے تھے۔ وہ نور جہاں کے بغیر بھی بہت بڑے ہدایت کار بن جاتے بلکہ مستقبل میں اور بھی بہت سے کارنامے سرانجام دیتے جو باہمی جھگڑوں کے باعث وہ نہ کرسکے۔ نور جہاں اور شوکت صاحب کے اختلافات' جھگڑوں اور مقدمے بازی نے ایک بہت عظیم ہدایت کار فلمی صنعت سے چھین لیا اور پھر وہ ہدایت کار کی حیثیت سے کسی کام کے نہ رہے۔ زندگی میں جو ابتری پیدا ہوئی اور انہوں نے ذہنی طور پر جو دکھ اٹھائے شاید وہ ان سے بھی بچ جاتے۔ گویا شوکت صاحب کے لیے یہ سودا مہنگا پڑا تھا۔ نور جہاں کا معاملہ بھی یہ تھا کہ وہ کسی سے بھی شادی کرتیں اور کسی بھی فلم میں کام کرتیں بہر حال نور جہاں ہی رہتیں۔ شہرت اور دولت ان کی باندیاں ہوتیں اور گلوکارہ کی حیثیت سے ان کی عظمت میں کوئی کمی نہ ہوتی لیکن وہ بھی ان دکھوں اور غموں سے محفوظ رہتیں جو باہمی اختلافات اور جھگڑوں نے ان کی زندگی میں گھول دیے تھے۔ انہوں نے بھی اس جھگڑے اور علیٰحدگی کی بہت بڑی قیمت ادا کی۔ سچی خوشی اور گھریلو زندگی سے وہ تمام عمر محروم رہیں۔ اگر ان کے بچے نہ ہوتے تو شاید وہ پاگل ہو جاتیں پھر انہوں نے زندگی کو ایک نئی ڈگر پر ڈال دیا۔ مقدمے بازیاں' رسوائیاں اور غم والم کی کٹھنائیاں ان کے حصے میں بھی آئیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نور جہاں کے لیے بھی یہ تجربہ خوشگوار ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ انتہائی تباہ کن رہا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر نور جہاں اور شوکت حسین رضوی دوبارہ یک جانہ ہوتے تو یہ ان دونوں کے حق میں بہتر ہوتا۔ یہ محض قیاس آرائی ہے۔ حقیقت میں کیا ہوتا یہ کون جانتا ہے یا جان سکتا ہے۔ یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ فلم ''خاندان'' نے نور جہاں اور شوکت حسین رضوی کو یک جا کیا تھا اور پھر نور جہاں کا خاندان ہی ان دونوں کی جدائی اور دکھوں کا سبب بن گیا۔ گویا ''خاندان'' کو نور جہاں اور شوکت صاحب کی زندگیوں میں ایک بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔

ہم نے ایک بار شوکت صاحب کو بہت اچھے موڈ میں دیکھ کر یہ سوال کیا تھا کہ اگر آپ کی اور میڈم کی شادی نہ ہوتی تو کیا یہ آپ دونوں کے حق میں بہتر نہ ہوتا؟

شوکت صاحب نے ایک قہقہہ لگایا پھر سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر کہنے لگے ''ارے میاں! تم اللہ میاں کے کاموں میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟''

ہم نے عرض کی ''ہم دخل نہیں دے رہے۔ صرف یہ دریافت کر رہے ہیں کہ آپ کے خیال میں اگر آپ دونوں نہ ملتے تو کیا یہ خود آپ دونوں کے لیے اور فلمی دنیا کے لیے بہتر نہ ہوتا؟''

کہنے لگے ''ارے میاں! شیخ چلی جیسی باتیں کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ تو وہی بات ہے کہ..... جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟ لیکن جو ہوا ایسا کیوں نہ ہوتا اس لیے کہ یہ اللہ کی رضا اور تقدیر کا فیصلہ تھا پھر کسی اور طرح کیسے ہو سکتا تھا؟''

پھر کچھ توقف سے پوچھا ''تم تقدیر اور اللہ کی رضا پر ایمان رکھتے ہو؟''

ہم نے کہا ''سو فیصد۔''

بولے '' بس تو پھر یہ اگر مگر چونکہ چنانچہ کس لیے؟''

بات ثریا اور نور جہاں کے ذکر سے شروع ہوئی تھی۔ نور جہاں نے بمبئی کی فضاؤں میں قدم رکھتے ہی ہلچل مچا دی۔ ایک تو پہلے ہی سے نامور تھیں۔ ایک عالم ان کا پرستار اور مداح تھا۔ بڑے بڑے موسیقار ''خاندان'' کے گانے سن کر ہی یہ تمنا کرنے لگے کہ نور جہاں کی آواز سے فائدہ اٹھائیں۔ ہدایت کار ان کی اداکاری سے متاثر ہو کر انہیں اپنی فلموں میں کاسٹ کرنے کی آرزو کرنے لگے تھے۔

یوں تو نور جہاں کی بمبئی آمد نے سبھی ہیروئنوں کو متاثر کیا لیکن وہ سب سے زیادہ اثر انداز ثریا پر ہوئی تھی۔ ان کی آمد سے پہلے ثریا کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ وہ اداکارہ بھی تھیں اور گلوکارہ بھی۔ اس اقلیم میں ان کی مطلق العنان حکمرانی تھی ۔ جب نور جہاں وارد ہوئیں تو ان کا سنگھاسن ڈانواں ڈول ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نور جہاں گلوکارہ اداکارہ کی حیثیت سے ان سے آگے نکل گئیں۔ اس کے بعد جو ہوا وہ فلمی تاریخ کا حصہ ہے۔ بمبئی کے سبھی موسیقار نور جہاں کے گن گا رہے

تھے اور جب وہ بمبئی سے پاکستان آئیں تو کسی استثنا کے بغیر سبھی موسیقاروں نے ان کی کمی کو حد سے زیادہ محسوس کیا۔ ایک صحافی کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے کہ نور جہاں کی بمبئی سے روانگی نے موسیقاروں کی صفوں میں صف ماتم بچھادی تھی۔ایک نقاد کا یہ قول بھی درست ہے کہ اگر نور جہاں بمبئی سے رخصت نہ ہو جاتیں تو ماسٹر غلام حیدر لتا مینگیشکر کو گلوکارہ کی حیثیت سے موقع نہ دیتے اور لتا کو وہ عروج اور شہرت نہ ملتی جو بعد میں ان کے حصے میں آئی مگر قسمت کے لکھے کو کون مٹاسکتا ہے۔یہی تقدیر کا فیصلہ تھا۔اس کے سامنے سبھی کو سر جھکانا پڑتا ہے۔اگر نور جہاں نے دوسری تمام گلوکاراؤں کو گہنا دیا تھا تو لتا نے ان کی جانشین بن کر رفتہ رفتہ دوسری تمام نامور گلوکاراؤں کی چھٹی کرادی اور پھر بھارت کی فلمی دنیا میں صرف ایک ہی سریلی آواز گونجتی رہی۔لتا کی آواز۔

میڈم نور جہاں کی زندگی میں کس کی مجال تھی جو ان کا گیت گا سکتا تھا مگر موت ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جو حالات کو یکسر تبدیل کر دیتی ہے۔زندگی میں انسان کا رعب' دبدبہ' شان و شوکت' کروفر' اختیارات ' اقتدار چاہے جتنا بھی ہو اس کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد سب کچھ مٹی میں مل جاتا ہے۔راکھ ہو جاتا ہے۔

جو گلوکارائیں نور جہاں کے سامنے آواز نکالتے ہوئے ڈرتی تھیں آج بڑی آزادی سے نور جہاں کے نغموں کا حلیہ بگاڑنے میں مصروف ہیں۔اب انہیں نور جہاں کا کوئی ڈر نہیں ہے۔حالانکہ ایک زمانہ تھا جب ساری فلمی صنعت نور جہاں کے سامنے دم بخود ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی۔زندگی میں انسان خود کو بہت کچھ سمجھ لیتا ہے۔یہ بھول جاتا ہے کہ آنکھ بند ہوتے ہی سب کچھ ختم ہو جائے گا۔دنیا کا یہی دستور ہے مگر میڈم نور جہاں کے نغموں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ صحیح معنوں میں انتہائی افسوس ناک اور تکلیف دہ ہے۔وہ عورت جس کے نام اور ذکر کے بغیر فلم کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا آج اتنی جلدی قصہ پارینہ بن کر رہ گئی ہے۔ان کے نغمے لاوارث ہو گئے ہیں جن پر جو چاہے اپنا حق جتا سکتا ہے۔ یہ تو ان کے فن کے ساتھ ہو رہا ہے۔دنیاوی معاملات میں بھی ان کی نشانیاں غائب ہو رہی ہیں بلکہ ہو چکی ہیں۔

گلبرگ کے لبرٹی چوک میں ان کی کوٹھی جو کبھی فلم سازوں ہدایت کاروں اور موسیقاروں کے لیے زیارت گاہ تھی اب زمین بوس ہو چکی ہے۔یہ کوٹھی انہوں نے اپنی زندگی میں ہی فروخت کر دی تھی۔خریدار نے اس کی اینٹ سے

اینٹ بجادی‘ ملبافروخت کردیا۔اب اس جگہ ایک عظیم الشان پلازا تعمیر ہو چکا ہے۔نور جہاں ایک قومی سرمایہ تھیں۔ ان کی رہائش گاہ کو ان کی یادگار کے طور پر قائم رکھا جا سکتا تھا جس میں ان کے نغمات‘ فلمیں اور دوسری اشیاء محفوظ کی جاسکتی تھیں۔اگر کوئی ترقی یافتہ ملک ہوتا تو بالکل یہی ہوتا۔اس جگہ نور جہاں میوزیم ہوتا مگر اب یہاں ایک پلازا ہوگا۔کسی کو یاد بھی نہیں رہے گا کہ اس جگہ عرصہ دراز تک برصغیر کی عظیم فنکارہ نے زندگی کے روز و شب گزارے ہیں۔دکھ سہے ہیں‘ خوشیاں سمیٹی ہیں۔یہی دنیا کا دستور ہے۔اس کے باوجود حضرت انسان اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔

اب شاہ نور اسٹوڈیو کا قصہ بھی سن لیجئے۔یہ پاکستان کا سب سے پہلا اور سب سے خوبصورت اسٹوڈیو تھا۔خوبصورت سرسبز لان‘ اونچے اونچے لہراتے ہوئے درخت‘ پھلواریاں‘ دلکش عمارتیں‘کیا نہیں تھا یہاں۔اس کے خوبصورت لان اور باغ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔لوگ سیر کے لیے یہاں آتے تھے۔اس اسٹوڈیو میں پاکستان کی اولین یادگار فلمیں بنائی گئی ہیں۔کیسے کیسے فنکاروں نے یہاں کام کیا ہے۔شاہ نور دراصل نور جہاں اور شوکت صاحب کے نام کا مجموعہ تھا جنہیں لوگ سید ہونے کے ناتے شاہ جی بھی کہتے تھے۔

میڈم نور جہاں اور شوکت صاحب کے جھگڑوں اور مقدمے بازی کے بعد بالآخر ان دونوں کی زندگی میں ہی ان کے حصے بخرے ہوگئے تھے۔ میڈم نور جہاں اور ان کے بیٹوں اور بیٹیوں کے حصے الگ ہوگئے تھے۔ایک حصہ شوکت صاحب کے پاس رہ گیا تھا وہ بھی ادھورا۔اس میں شوکت صاحب اور میڈم کی رہائش گاہ بھی تھی جس میں شوکت صاحب نے ساری زندگی گزاردی۔ میڈم یاسمین سے شادی کے بعد بھی وہ یہیں قیام پذیر رہے اور اسی جگہ انہوں نے آخری سانس لی تھی۔اب شاہ نور اسٹوڈیو کا بیشتر حصہ ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے بلکہ یہ ملبا بھی فروخت کیا جاچکا ہے۔ شوکت صاحب اور میڈم کے بیٹے اور بیٹیوں نے یہ قیمتی زمین فی مرلہ کے حساب سے فروخت کردی ہے۔اس طرح ایک اور بہت عظیم فلمی ورثہ اور یادگار خاک میں مل گئی ہے۔لے دے کر وہ حصہ رہ گیا ہے جو شوکت صاحب کے پاس تھا۔کوٹھی میں میڈم یاسمین اپنے دو بیٹوں کے ساتھ رہتی مگر آس پاس ویرانی ہے۔کچھ عرصے بعد اردگرد کی

زمینوں میں خدا جانے کیسے کیسے گھر بن جائیں گے یا پھر دکانیں اور شاپنگ سینٹر کھڑے ہو جائیں گے۔اس ماحول میں میڈم یاسمین کب تک شوکت صاحب کی یادوں کو سمیٹ کر بیٹھی رہیں گی؟اسٹوڈیو کی حیثیت سے یہ حصہ اب نامکمل اور ادھورا ہے۔

فلم سازی کی رفتار پہلے ہی کم ہو گئی ہے اب اس بے سروسامان اسٹوڈیو میں کون آکر فلم بنائے گا۔فیض صاحب کے الفاظ میں....

اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

یہ ہے انجام نور جہاں اور شوکت حسین رضوی کے عشق اور ملاپ کا جس نے ایک زمانے میں ہندوستان کی فلمی صنعت کو چونکا کر دیکھ دیا تھا۔اسی لیے کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔

نور جہاں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔لکھا جا رہا ہے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کا جسمانی وجود اور اس کی مادّی نشانیاں تو مٹ جاتی ہیں لیکن اس کی یادیں اور کارنامے ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔

نور جہاں نے فیض احمد فیض کی نظم سب سے پہلے کہاں اور کس تقریب میں گائی تھی؟اس بارے میں مختلف رائے ہیں۔ہم نے انہیں یہ نظم لاہور کے برٹ انسٹی ٹیوٹ ہال میں گاتے ہوئے سن اور دیکھا تھا۔یہ نگار ایوارڈ 1957ء کے انعقاد کی تقریب تھی۔اتنا یاد رہے کہ نور جہاں کو مدیر نگار الیاس رشیدی صاحب نے اپنے ذاتی مراسم کی بنا پر اس تقریب میں گانے پر آمادہ کیا تھا کیونکہ وہ تقاریب میں نغمہ سرا ہونا پسند نہیں کرتی تھیں۔

یہ منظر بھی بہت عجیب تھا کہ اس تقریب میں مہمانوں کی پہلی صف میں دوسرے ممتاز لوگوں کے شانہ بشانہ سید شوکت حسین رضوی بھی تشریف فرما تھے۔اس وقت شوکت صاحب ایک جوان رعنا ہی کہے جا سکتے تھے۔دراز قد' سرخ وسفید رنگت' گھنگریالے بال' ہونٹ ایسے سرخ جیسے ابھی لپ اسٹک لگا کر آئے ہوں۔شوکت صاحب کی

شخصیت بے حد دلکش اور مرعوب کن تھی۔ بہت خوش لباس تھے اور جامہ زیب بھی۔ کوٹ پتلون، کرتہ پاجامہ، شیروانی، جو بھی لباس پہنتے تھے ان کے سراپا پر سج جاتا تھا۔ لباس ان کو نہیں سجاتا تھا وہ خود ہی لباس کو سجا دیتے تھے۔ ایسی شخصیات بہت کم ہی دیکھی ہیں جو ہر جگہ دوسروں پر چھا جائیں۔ اس وقت سنتوش کمار، درپن، یوسف خان اور سدھیر جیسے خوب صورت ہیرو بھی تھے مگر شوکت صاحب جس محفل میں آتے تھے سب سے الگ اور نمایاں نظر آتے تھے۔ شخصیت کی یہ جادوگری۔ بعد میں اداکار محمد علی میں دیکھی۔ یہ بھی ہر جگہ نمایاں نظر آتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم نے انہیں یورپ میں بھی انگریزوں کے مجمع میں سب سے ممتاز ہی پایا۔

اس تقریب میں جب میڈم نور جہاں جھلملاتی ہوئی ساڑھی پہن کر سٹیج پر نمودار ہوئیں تو سٹیج روشن ہو گیا۔ وہ بھی انتہائی خوش لباس اور جامہ زیب تھیں۔ ہمیشہ ساڑی پہنتی تھیں۔ اس کے سوا کوئی لباس انہوں نے استعمال نہیں کیا۔ البتہ جب ہم روزنامہ ''آفاق'' کی طرف سے 1953ء میں ان سے انٹرویو لینے گئے تھے تو پہلی اور آخری بار ہم نے انہیں شلوار قمیص میں ملبوس دیکھا تھا۔ بالکل سادہ سا لباس تھا۔ آس پاس بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔ وہ مغنیہ اور اداکارہ سے زیادہ گھریلو خاتون نظر آتی تھی۔ اس ملاقات کا تفصیلی احوال ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ مقصد یہ بتانا ہے کہ ہم نے انہیں صرف ایک ہی بار گھر میں شلوار قمیص پہنے دیکھا تھا۔ اس کے بعد کبھی گھر کے اندر بھی انہیں لباس میں نہیں دیکھا۔ ساڑی ان کا پسندیدہ لباس تھا۔ ساڑیوں کے انتخاب اور اسے باندھنے کا ڈھنگ بھی انہیں آتا تھا۔ ساڑی پہن کر وہ شاہانہ چال سے کہیں داخل ہوئی تھیں تو ان پر مہارانی کا گمان گزرتا تھا۔ وہ زیورات کا زیادہ استعمال نہیں کرتی تھیں مگر زیور قیمتی اور بے حد خوب صورت ہوتا تھا۔ ان کا ذوق ہر معاملے میں بہت اعلیٰ تھا۔ زیور کا معاملہ یہ ہے کہ اگر کسی خاتون کو خوب صورت زیور پہنے دیکھتی تھیں تو جان پہچان نہ ہونے کے باوجود اس کی تعریف کر کے دریافت کرتی تھیں کہ کہاں سے بنوایا ہے۔ نور جہاں کو تو سبھی جانتے تھے اور ان کی زبان سے اپنے زیور کی تعریف سن کر خواتین خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھیں۔ کئی بار تو انہوں نے اپنا زیور اتار کر میڈم کو نذر کر دیا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ میڈم نے نمونے کے لیے زیور قبول کر لیا اور پھر بھول گئیں۔ کسی نے بعد میں واپس لیا اور کسی نے اسے اپنے لیے اعزاز سمجھ کر واپس ہی نہیں مانگا۔

جو نغمہ پیش کرنے کے لیے میڈم نور جہاں کا نام پکارا گیا تو ہال میں سنسنی پھیل گئی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں ساڑی سنبھالتی ہوائی اسٹیج پر تشریف لائیں تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ دیر تک تالیوں کی گونج رہی۔ محفل میں شہر کے منتخب افراد بھی مدعو تھے جنہوں نے کبھی بنفس نفیس نور جہاں کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے لیے یہ ایک ناقابل فراموش تجربہ تھا۔

وہ منظر ہمیں آج بھی یاد ہے۔ اسٹیج کے بالکل سامنے شوکت صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کی میڈم سے علیٰحدگی ہو چکی تھی۔ آمنا سامنا بھی بہت کم ہوتا تھا۔ بھری محفل میں جب نور جہاں اسٹیج پر نمودار ہوئیں تو تمام نظریں شوکت صاحب کی جانب گھوم گئیں۔ ان کا سرخ و سپید چہرہ کچھ اور سرخ ہو گیا۔

اس تقریب میں میڈم نے فیض صاحب کی نظم پیش کی۔

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

ایک تو نظم کے بول پھر عین سامنے شوکت صاحب کی موجودگی۔ اس پر میڈم کا گانے کا انداز۔ یہ نظم دونوں کے حسب حال تھی اس لیے شاید اس محفل میں شریک ہر شخص کو کبھی نہیں بھولے گی۔

ہمارے خیال میں یہ کسی تقریب میں میڈم کے گانے کا پہلا موقع تھا مگر ایک تجربہ کار صحافی اور موسیقی کے نقاد اور قدر دان ڈاکٹر افضل مرزا کی تحقیق یہ ہے کہ میڈم نے زندگی میں پہلی بار جس تقریب میں اسٹیج پر آ کر نغمہ سرائی کی وہ پنجاب ریڈ کراس کے لیے چندہ جمع کرنے کی ایک تقریب تھی جو یونیورسٹی ہال میں منعقد ہوئی تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے تقریب میں گانے کی ہر درخواست مسترد کر دی تھی۔ ڈاکٹر افضل کہتے ہیں کہ اس تقریب میں بھی انہوں نے فیض صاحب کی یہی نظم گائی تھی۔ دراصل ان ہی دنوں فلم ساز آغا جی اے گل کی فلم ''قیدی'' نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس کے ہدایت کار نجم نقوی اور ہیرو درپن تھے۔ شمیم آرا نے ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ نظم میڈم کی آواز میں شمیم آرا پر فلمائی گئی تھی۔ اس کی طرز رشید عطرے صاحب نے بنائی تھی اور بہت خوب بنائی تھی مگر

بعد میں میڈم نور جہاں نے اس میں خود ہی کچھ تبدیلیاں کرلی تھیں۔ عطرے صاحب کی طرز میں کلاسیکی رنگ تھا لیکن میڈم نے اسے سہل اور مزید دلکش بنا دیا تھا۔

ہم تو یونیورسٹی ہال میں موجود نہ تھے مگر جو لوگ وہاں موجود تھے ان کا کہنا ہے کہ میڈم کی آواز اور نظم کے الفاظ نے پورے ہال پر سحر طاری کر دیا تھا۔ انہوں نے انتہائی خوب صورت نظم۔ اس پر دلکش طرز اور ان سب پر مستزاد نور جہاں کی مقناطیسی حسین شخصیت۔ جنہوں نے دیکھا اور سنا وہ بھلا اس تجربے کو کیسے بھلا سکتے ہیں۔

کیا میڈم نور جہاں کا فیض صاحب سے کوئی روحانی اور جذباتی تعلق تھا؟ ڈاکٹر افضل اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نور جہاں کا فیض کے کلام سے پہلا واسطہ فلم ''جگنو'' کے گانوں کے زمانے میں قائم ہوا تھا۔ ''جگنو'' میں انہوں نے ایک المیہ گانا گایا تھا۔ جس کے بول یہ تھے۔

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

یہ نغمہ ادیب سہارنپوری نے لکھا تھا اور اس کی طرز فیروز نظامی نے بنائی تھی۔ فیروز نظامی صاحب کے بارے میں شاید ہم بتا چکے ہیں کہ وہ ایک عظیم موسیقار اور بہترین اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے۔ مزید یہ کہ وہ پاکستان کے مایہ ناز کرکٹر نذر محمد کے بھائی اور کرکٹر مدثر نذر کے چچا تھے۔ نذر محمد وہی ہیں جو ایک روایت کے مطابق چھت سے کودنے کی وجہ سے بازو کی ہڈی تڑوا بیٹھے تھے۔ اس طرح پاکستانی کرکٹ ٹیم ایک بے مثال کرکٹر سے محروم ہو گئی تھی۔ یہ تمام واقعات بھی پہلے بیان کیے جا چکے ہیں اس لیے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

''جگنو'' کے گانے میں صرف مکھڑے میں فیض صاحب کا یہ مصرع معمولی سی ترمیم کے ساتھ استعمال کیا گیا تھا۔ بقیہ گانا سچویشن کے مطابق لکھا گیا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شوکت صاحب جیسا شعری ذوق رکھنے والا شخص یہ ضرور جانتا ہو گا کہ یہ مصرع فیض صاحب کی نظم سے لیا گیا ہے بلکہ بہت ممکن ہے کہ ان کے پاس کلام فیض بھی موجود ہو۔ اس طرح نور جہاں کو بھی علم ہو گا کہ یہ مصرع فیض صاحب کی نظم سے لیا گیا ہے۔ یقیناً انہوں نے فیض

صاحب کی پوری نظم بھی پڑھی ہو گی جوان کے ذہن پر نقش ہو گئی۔اس کے ساتھ ہی فیض صاحب کی شاعری اور شخصیت سے ان کا ایک ایسا رشتہ قائم ہو گیا جو مرتے دم تک قائم رہا۔فیض صاحب کی نظم کا مصرع یوں ہے۔

آج کی رات ساز دل پر درد نہ چھیڑ

فلمی گیت نگار نے فلمی طرز کی ضرورت کے تحت " دل پر درد" اس میں سے خارج کر دیا اور گانے کی استھائیاں بذات خود لکھیں۔

میڈم نور جہاں ہمیشہ فیض صاحب کی شاعری کی مداح رہیں۔اسی طرح فیض صاحب بھی ان کے بہت بڑے مداح تھے۔پاکستان کے قیام کے زمانے میں ان دونوں کی ملاقاتیں بھی ہوئیں۔دونوں کو ایک دوسرے سے عقیدت تھی اور وہ ایک دوسرے کی عظمت کے قائل تھے۔

نور جہاں فیض صاحب کے کلام سے کتنی متاثر تھیں اس سلسلے میں سعادت حسن منٹو نے اپنے مضمون "نور جہاں سرور جہاں" میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ایک بار منٹو صاحب نے نور جہاں کو اپنے فلیٹ پر کھانے پر مدعو کیا تھا۔منٹو صاحب کے نور جہاں اور شوکت حسین رضوی دونوں سے دیرینہ مراسم تھے۔یہ واقعات بھی انہوں نے تحریر کیے ہیں اور ان دونوں کے عشق اور شادی کا قصہ بھی اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے۔

منٹو صاحب کے لکشمی مینشن والے فلیٹ پر نور جہاں تشریف لائیں۔یہ دراصل فرمائشی پروگرام تھا۔منٹو صاحب کی بیگم صفیہ کی چند سہیلیوں نے نور جہاں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔منٹو صاحب نے نور جہاں کو مدعو کیا اور وہ چلی آئیں۔

مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب کھانے کے بعد منٹو اور مہمانوں نے فرمائش کی کہ نور جہاں کچھ سنائیں۔نور جہاں نجی محفلوں میں نہیں گایا کرتی تھیں،ایسا کبھی نہیں ہوا تھا مگر منٹو صاحب سے تعلقات اور ان کی شخصیت کا احترام بھی مقصود تھا۔انہوں نے یہ عذر کر دیا، منٹو جب کسی بات پر اڑ جاتے تھے تو انکار ممکن نہ تھا۔ان کی بیگم نے فرمائشی

نظروں سے انہیں دیکھا تو انہوں نے اصرار کیا۔ یہ میڈم کی زندگی کا پہلا اور آخری واقعہ ہے کہ اس موقع پر وہ بے بس ہو گئیں اور اپنا اصول توڑا۔ میڈم نے فیض صاحب کی یہی نظم سنا دی۔

آج کی رات

سازِ دل پر درد نہ چھیڑ

اس وقت تک انہوں نے فیض صاحب کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت'' نہیں گائی تھی۔ جو بعد میں ان کی من پسند چیز بن گئی تھی اور وہ تقریبات میں یہی نظم پیش کرتی تھیں۔ ممکن ہے اس میں کچھ دخل حالات کا اور احساسات کا بھی ہوا اور وہ یہ نظم گاتے ہوئے اپنی دانست میں براہ راست شوکت صاحب سے مخاطب ہوتی ہوں۔

فیض صاحب سے نور جہاں کا رشتہ دو عظیم فنکاروں کا رشتہ تھا۔ فیض صاحب نور جہاں کے مداح تھے۔ان کی نظمیں اور غزلیں اور بھی بہت سے نامور گلوکاروں اور گلوکاراؤں نے گائیں مگر یہ نظم انہوں نے نور جہاں کے نام کر دی تھی۔یعنی اس کے حوالے کر دی تھی۔اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ فیض صاحب نے کبھی کسی مشاعرے میں یہ نظم نہیں پڑھی۔اگر فرمائش کی جاتی تو وہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں مسکرا کر کہا کرتے تھے ''بھئی یہ نظم اب ہماری نہیں رہی۔اب یہ ان ہی کی ملکیت ہے۔''

ایک بہت بڑے فنکار کا دوسرے بہت بڑے فنکار کے لیے یہ جذبہ اور احترام واقعی اپنی مثال آپ ہے۔اس سے فیض صاحب کی وضع داری بھی ظاہر ہوتی ہے۔

فیض صاحب اور نور جہاں کا یہ واقعہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں لیکن اس موقع پر اسے دہرانا برمحل ہو گا کہ فیض صاحب کے اعزاز میں لاہور میں ایک بہت بڑی تقریب منعقد ہوئی جس میں ممتاز فنکاروں' دانش وروں اور ہنر مندوں نے انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ ہر ایک کا اپنا انداز تھا۔

ملکہ پکھراج نے فیض صاحب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں انہیں اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔

جب میڈم نورجہاں کی باری آئی تو وہ شرارت آمیز مسکراہٹ اور شوخ آنکھوں کے ساتھ اسٹیج پر آئیں۔ مناسب الفاظ میں فیض صاحب کی شاعری کو سراہا اور پھر اپنے بے باک انداز میں بولیں " میں فیض صاحب کو بھائی نہیں سمجھتی۔ وہ میرے محبوب ہیں۔"

ہال میں قہقہے بلند ہوئے اور بہت دیر تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ فیض صاحب شرمیلی طبیعت کے مالک تھے مگر اس شرارت پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

میڈم نورجہاں کے بارے میں کچھ اور دلچسپ معلومات بھی حاصل ہوئی ہیں۔ آپ بھی سنئے۔

پروفیسر سید علی عباس جلال پوری ایک نقاد تھے۔ موسیقی سے بھی لگاؤ رکھتے تھے بلکہ اس کے اسرار و رموز سے بھی آشنا تھے۔ اپنے زمانے کے بڑے بڑے موسیقاروں اور گانے والوں کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہتے تھے۔ انہوں نے نورجہاں کے بچپن اور ابتدائی زندگی کے بارے میں ایک مضمون لکھا جو بے حد دلچسپ ہے۔ تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے ممکن ہے کچھ اختلافات کیا جائے لیکن مندرجات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس مضمون میں جلال پوری صاحب نے نورجہاں کے بچپن کے واقعات قلم بند کیے ہیں جس میں ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بھی معلومات ہیں۔

انہوں نے لکھا ہے کہ لوگ جس ہستی کو آج نورجہاں کے نام سے جانتے ہیں اس کا اصلی نام اللہ رکھی تھا اور وہ قصور میں پیدا ہوئی تھیں۔ قصور وہ مردم خیز جگہ ہے جہاں بڑے بڑے فنکاروں نے جنم لیا جن میں استاد بڑے غلام علی خاں بھی شامل ہیں۔ انہوں نے اس مضمون میں استاد عبدالوحید خاں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو "بہری خاں" کے نام سے بھی مشہور تھے۔ ان کا تعلق کیرانہ گھرانے سے تھا۔ وہ بھاری جسم کے مالک تھے۔ چہرے پر بڑی بارعب مونچھیں تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنی کلائیوں میں پھولوں کے گجرے پہنا کرتے تھے اور ایک پھول" عموماً گلاب کا پھول ان کے ہاتھ

میں ضرور ہوتا تھا۔ کسی زمانے میں وہ فیصل آباد کی کسی بائی جی کے ساتھ سارنگی بجاتے تھے۔ شاہی محلے کی زینب بیگم اور ان کی بہن ہیرا بھائی کے ساتھ بھی سنگت کر چکے تھے۔ استاد غلام علی خاں کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے لیکن بعد میں تعلقات بحال ہو گئے۔ بڑے غلام علی خاں کے بارے میں کون نہیں جانتا۔ وہ راگ درباری اور کلاسیکی گائیکی کے بے مثال فنکار تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ ان کی آواز میں جادو ہے۔ جو بھی سنتا ہے مسحور ہو جاتا ہے۔ ایک بار انہوں نے کسی محفل میں رگ شندھ کلیان گایا اور ساری محفل ساکت رہ گئی۔ لگتا تھا جیسے کسی نے ان سب کو جادو کے زور سے پتھر کا بنا دیا ہے۔

پروفیسر عباس جلال پوری صاحب نے ان دونوں عظیم گلوکاروں کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے اور اسی ضمن میں نور جہاں کا تذکرہ بھی چھیڑ دیا ہے۔

لاہور میں جلال پوری صاحب کے ایک عم زاد پیر تھے۔ ان کے مریدوں اور مداحوں کا حلقہ بہت وسیع تھا جن میں بڑے نامور موسیقار اور گلوکار بھی شامل تھے۔ پیر صاحب کے دولت کدے پر آئے دن موسیقی کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جن میں اس زمانے کے مانے ہوئے فنکار شریک ہو کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ آگے کے واقعات خود ان کی زبانی سنئے۔

"ایک بار میں نے بھائی صاحب کے سامنے تجویز پیش کی کہ وہ استاد وحید خاں عرف بہرے خاں۔ عنایت بائی ڈھیرو والی کو بھی کبھی مدعو کریں۔ اس فہرست میں ایک بائی جی کا نام بھی شامل تھا جو اپنے ساتھ ایک دس گیارہ سالہ بچی کو بھی لے کر آتی تھی اور اسے نوری کے نام سے پکارتی تھی۔

جس شام یہ محفل آراستہ ہوئی اسی روز ان کے ملازم خدا بخش نے آ کر بتایا کہ قصور سے کچھ لوگ لاہور آئے ہیں اور شرف ملاقات چاہتے ہیں۔ پیر صاحب نے اجازت دے دی۔

کچھ دیر بعد عیدن بائی نامی ایک خاتون اندر داخل ہوئی۔ وہ گوری چٹی مگر قدرے بھاری جسم کی تھی۔ اس کے ہمراہ ایک نو دس سالہ بچی بھی تھی۔ جو ایک لمحہ بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ عیدن بائی نے احترام سے سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گئی۔ پیر صاحب نے ان کے بارے میں بتایا۔ اس دوران میں وہ چلبلی بچی کمرے سے باہر چلی گئی جہاں دوسرے بچوں نے اسے گھیر لیا اور کہا کہ وہ انہیں گانا سنائے ورنہ وہ اس کی پٹائی کریں گے۔ بچوں کے ڈر سے وہ دوبارہ کمرے میں آگئی۔ پیر صاحب کو ملازم نے بتا دیا تھا کہ باہر بچوں نے اس کم سن بچی کو کس طرح ستایا تھا۔

پیر صاحب نے عیدن بائی سے پوچھا ''یہ بچی کون ہے؟''

جواب ملا ''سرکار یہ میری چھوٹی بہن نوری ہے۔''

''نوری؟''

''جی ہاں! گھر میں ہم لوگ اسے نوری کہہ کر بلاتے ہیں۔''

پیر صاحب نے دریافت کیا ''کیا اسے گانے کی تعلیم دی جاتی ہے؟''

اس پر پیر صاحب نے مسکرا کر بچی کو پاس بلایا اور اسے گود میں بیٹھا کر لاڈ سے پوچھا ''تم ہمیں اپنا سبق نہیں سناؤ گی؟''

بچی پہلے شرمائی پھر جواب دیا ''جی ضرور۔'' اور اس کے ساتھ ہی گنگنانا شروع کر دیا۔ بچی کی آواز سن کر پیر صاحب بہت متاثر ہوئے۔ ان کی ملاقات سیٹھ پنچولی سے بھی تھی جو لاہور میں فلمیں بنایا کرتے تھے۔ انہوں نے سیٹھ پنچولی سے بچی کی سفارش کی اور ریڈیو والوں سے بھی اس کو موقع دینے کے لیے کہا۔

ایک روز میں پیر صاحب کے گھر گیا تو ڈرائنگ روم میں عیدن بائی اور نوری موجود تھیں۔

پیر صاحب نے بچی سے پوچھا ''سنا ہے تم پنچولی فلم کے لیے گا رہی ہو؟''

بچی نے اپنی شوخ اور روشن آنکھیں گھمائیں اور کہا ''جی ہاں۔''

''کیا گایا ہے۔ ہمیں بھی سناؤ۔'' پیر صاحب نے بچی کی دل جوئی کے خیال سے کہا۔

نور جہاں (نوری) نے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے اداکاری کے ساتھ ساتھ فوراً گانا شروع کر دیا۔

شالا جوانیاں مانے

اکھاں نہ موڑیں

پی لے۔ پی لے۔

بچی کی خوب صورت سریلی آواز سن کر میں حیران رہ گیا۔ اس کی آواز میں ایک کلاسیکی ٹچ تھا جو کہ اس عمر کی بچی کے حوالے سے ایک حیران کن بات تھی۔ پیر صاحب نے سن کر تالی بجائی اور کہا'' اللہ عمر دراز کرے۔''

تعریف سن کر بچی اتنی خوش ہوئی کہ معصوم انداز میں کود کر کمرے کے درمیان میں آ گئی۔ اس نے گانا شروع کر دیا اور میز پر سے گلاس اٹھا کر ایک مہمان کے پاس جا کر ''پی لے پی لے۔'' کہا تو میں اور پیر صاحب بے ساختہ ہنسنے لگے۔ اس بچی کی خود اعتمادی اور بے باکی حیرت انگیز تھی۔

پیر صاحب نے عیدن بائی سے کہا کہ وہ اس بچی کی تعلیم اور تربیت پر خصوصی توجہ دیں۔

یہ نور جہاں کی زندگی کا ایک اہم لمحہ تھا جب اس کی آواز اور گائیکی نے پیر صاحب جیسے موسیقی کی پرکھ رکھنے والے شخص کو متاثر کر دیا تھا۔ پیر صاحب کو یہ گانا اتنا پسند آیا کہ انہوں نے بار بار سنانے کی فرمائش کی اور بچی نے ہر بار پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت انداز میں گایا۔ یہی وہ گانا ہے جس نے نور جہاں کو بے بی نور جہاں اور پھر برصغیر کی عظیم ترین گلوکارہ اور فنکارہ بنانے میں سنگ میل کا کام کیا۔ نور جہاں کے گانے میں ایسی تاثیر تھی کہ جو لوگ موسیقی کے

قدر دان تھے وہ بھی جھومنے لگے اور جو موسیقی کے دلدادہ نہ تھے وہ بھی سر ہلانے پر مجبور ہو گئے۔لوگ اسے ملکہ ترنم کہتے ہیں مگر میں اسے پاکستان کی بلبل کہا کرتا ہوں۔''

عباس جلال پوری صاحب نے ایک اور واقعہ بھی بیان کیا جب محفل میں اختری بائی فیض آبادی بھی موجود تھیں۔وہ لکھنو سے پیر صاحب کے سلام کے لیے آئی تھی اور ان ہی کی مہمان تھیں۔

''اختری بائی استاد امید علی خان سے کچھ سننے کی حسرت لے کر آئی تھی۔وہ اس زمانے میں ایک جوان رعنا تھے اور اختری بائی ان سے بہت متاثر نظر آتی تھی۔استاد عبدالوحید خاں عرف بہرے خاں بھی اس موقع پر موجود تھے۔

محفل میں نغمہ آرائی کا آغاز ہوا تو سب نے اپنے گانوں سے سماں باندھ دیا۔ہر گانے والا اور گانے والی منتخب روزگار تھی۔ آدھی رات گزر چکی تھی مگر سننے والوں کا دل نہیں بھرا تھا۔

جب سب گا چکے تو پیر صاحب نور جہاں سے مخاطب ہوئے ''نور جہاں۔تم نے آج اپنا سبق نہیں سنایا؟''

نور جہاں ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی تھی۔پیر صاحب کی بات سن کر فوراً کھڑی ہو گئی اور احترام آمیز انداز میں بولی ''سرکار۔میں خان صاحب (امید علی خاں) کے بعد گانا سنانے کی جسارت کیسے کر سکتی ہوں؟''

پیر صاحب نے فرمایا'' ہم تمہیں ان سے اجازت دلا دیں گے۔''

نور جہاں نے سوالیہ نگاہوں سے خاں صاحب کی طرف دیکھا۔انہوں نے سر کی جنبش سے اجازت دے دی۔

نور جہاں کے بھائی نے ہارمونیم سنبھالا اور ایمن کلیان کا الاپ شروع کر دیا۔

نور جہاں پیر صاحب اور دوسرے حاضرین کے سامنے مودب ہو کر دوزانو بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ننھے منھے ہاتھ اس کی گود میں رکھے ہوئے تھے پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا جیسے دعا کر رہی ہو۔ سب خاموش تھے اور دلچسپی سے اس بچی کو دیکھ رہے تھے جس نے محفل کے آداب کا مکمل لحاظ رکھا تھا اور اب گانے کا آغاز کرنے والی تھی۔

ہارمونیم کے الاپ کے ساتھ آواز ملا کر اس نے الاپ کا آغاز کیا ''نی رے گا رے نی رے نی سا۔''

اس آواز اور الاپ کو سن کر سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ پیر صاحب جھومنے لگے۔ استاد عبدالوحید خاں اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر آگے کی جانب جھک گئے۔ نور جہاں کا الاپ جادو اثر تھا۔ جب اس نے گانے کا آغاز کیا تو محفل پر سکتہ سا چھا گیا۔ ہر طرف سکوت اور خاموشی تھی جو گانا ختم ہونے کے بعد بھی کچھ دیر تک قائم رہی۔ جلال پوری صاحب کہتے ہیں کہ پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ استاد عبدالوحید خاں اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے نور جہاں کی جانب دونوں بازو پھیلا دیے۔ نور جہاں ان کی نزدیک آئی تو انہوں نے اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر پیشانی کو بوسہ دیا اور بے اختیار کہہ اٹھے ''اللہ کی دین ہے۔''

جلال پوری صاحب کا کہنا ہے کہ یہ نور جہاں کی زندگی کا یادگار اور عظیم ترین لمحہ تھا۔ اس نے یقیناً اس فقرے سے اپنے روشن مستقبل کا اندازہ لگایا ہو گا۔ مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس اور دکھ رہا ہے کہ نور جہاں نے کلاسیکی موسیقی چھوڑ کر فلمی موسیقی کو اپنایا ورنہ کلاسیکی گانے والیوں میں وہ بہت بلند مقام حاصل کر لیتی لیکن پھر میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ خود کو کلاسیکل موسیقی تک محدود رکھتی تو کروڑوں انسانوں کو اپنی آواز گانوں سے محروم کر دیتی۔''

نور جہاں کو ملکہ ترنم اور برصغیر کی عظیم ترین گلوکارہ بنانے میں سب سے بڑا ہاتھ تو اللہ میاں ہی کا تھا۔ ابراہیم جلیس میڈم کی آواز کے بہت بڑے مداح تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ایسا لگتا ہے جیسے اللہ میاں نے نور جہاں کو بنانے کے لیے فرشتوں کو تفصیلی ہدایات دی تھیں اور انہوں نے چھٹی کے دن بیٹھ کر انہیں بنایا تھا۔

ہم انسان اللہ تعالیٰ کی ایسی مخلوق ہیں جنہیں اللہ میاں نے دوسری تمام مخلوقات پر فوقیت دی ہے۔انسان کو زمین پر اللہ کا خلیفہ اوراس کی بہترین تخلیق کہا جاتا ہے۔اس کے بارے.... میں قرآن کی بہت سی آیات موجود ہیں۔یہ وہ خاکی مخلوق ہے جس کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ یہ زمین پر ہمارا خلیفہ ہوگا۔اسے سجدہ کرو۔ فرشتے تو حکم بجالانے کے عادی تھے۔فوراً سجدے میں جھک گئے لیکن ابلیس نے انکار کر دیا۔انسان پر اللہ تعالیٰ کی نوازش اور مہربانی کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس انکار پر اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو راندہ درگاہ کر دیا۔انسان کی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت بھلا اور کیا ہوگا۔

انسان کی بھی مختلف اقسام ہوتی ہیں لیکن ایسے بہت کم ہوتے ہیں جو کسی شعبے میں نمایاں خدمات سرانجام دیتے ہیں اور ایک عالم میں ان کا شہرہ ہو جاتا ہے۔" بہت کم" پر شاید آپ کو اعتراض ہو مگر ذرا سوچیے کہ اللہ کی اس مخلوق کی تعداد اربوں میں ہے۔اس وقت بھی دنیا میں پانچ ارب سے زائد انسان بستے ہیں۔ گزرے زمانوں میں بھی اربوں انسان دنیا میں آتے جاتے رہے ہیں لیکن ان میں سے نمایاں کتنے ہیں؟ کتنے ہیں جنہوں نے کسی شعبے میں اپنی کارکردگی کا لوہا منوایا؟ گنتی کیجیے تو شاید چند ہزار بھی نہ ہوں گے۔اسی لیے بزرگ کہا کرتے تھے کہ اللہ نے جسے عزت اور مرتبہ عطا فرمایا ہے اس کی تعظیم کرو کہ ایسے لوگ دنیا میں خال خال ہی ہوتے ہیں۔

نور جہاں بھی ایک ایسی ہی خدائی تخلیق تھیں۔آواز اور شکل و صورت تو اللہ کی دین تھی لیکن ان صلاحیتوں کو انہوں نے جس محنت اور کاوش سے اجاگر کیا ہے اس کے لیے ان کو خراج تحسین پیش نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ ایک دور افتادہ قصبے سے تعلق رکھنے والے ایک انتہائی پسماندہ گھرانے کی یہ بچی کس طرح قدم بہ قدم ترقی کی منزلیں طے کرتی ہوئی ملکہ ترنم نور جہاں بنی ۔یہ ایک سبق آموز مثال ہے۔تقدیر اور تدبیر کا فلسفہ ایسے ہی معاملات میں برحق نظر آتا ہے۔ تقدیر نے نور جہاں کو جن صلاحیتوں اور مواقع سے نوازا انہوں نے اپنی تدبیر سے ان مین چار چاند لگا دیے۔باقی دنیا کو چھوڑیئے۔ صرف برصغیر پاک وہند کی بات کیجیے جس میں سری لنکا، بنگلہ دیش، نیپال بھوٹان بھی شامل ہے۔ موسیقی اور گلوکاری کے شعبے میں اس سرزمین نے بڑی بڑی ہستیوں کو جنم دیا ہے جن کی ہنرمندی کو ہر ایک نے تسلیم

کیا مگراس کے باوجود یہاں نور جہاں صرف ایک ہی پیدا ہوئی۔ان سے پہلے توان کی کوئی مثال ہی نہیں ہے۔کیا بعد میں کوئی نور جہاں جنم لے گی؟موسیقاروں اور گلوکاروں کا جو معیار اس وقت دیکھنے میں آرہا ہے اس کے پیش نظر تو دور دور تک ایسا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔اس لیے بہتر ہے کہ صرف ایک ہی نور جہاں پر اکتفا کیجئے اور اللہ کی اس دین پر اظہار تشکر کیجئے۔

ہمارے ہاں ایک رواج یہ بھی ہے کہ ہم لوگ ''اگر مگر'' کے بہت دلدادہ ہیں۔ہمیشہ اس الجھن میں گرفتار رہتے ہیں کہ اگر یوں نہ ہوتا تو اور یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔ ایک زمانے میں فلمی نقادوں اور موسیقاروں کے حلقے میں یہ بحث چلتی رہی ہے کہ اگر نور جہاں بمبئی سے پاکستان نہ آتیں تو کیا ہوتا؟

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہاں رہ کر وہ زیادہ بڑے کام کر سکتی تھیں۔انہیں منجھے ہوئے اور پر اعتماد موسیقاروں اور اعلیٰ پائے کے نغمہ نگاروں کا تعاون حاصل ہوتا۔پاکستان میں انہیں جن موسیقاروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ان کا ایک محدود انداز تھا لیکن بمبئی میں بر صغیر کے تمام حصوں سے آنے والے موسیقار اپنی موسیقی کا جادو جگا رہے تھے۔ ان کا انداز' رنگ اور ڈھنگ۔ ان کا اسلوب سبھی ایک دوسرے سے مختلف تھا۔پچھلی صدی اس اعتبار سے ایک یادگار صدی تھی کہ اس دور میں ہر شعبے میں' خصوصاً علم وادب اور فنون لطیفہ سے متعلق شعبوں میں ایسی ایسی نادر روزگار ہستیوں نے ہمارے بر صغیر کو نوازا تھا کہ اب سوچتے ہیں تو یقین ہی نہیں آتا کہ کیسے کیسے قد آور لوگ اور دیو قامت ہستیاں ایک ہی وقت میں ایک ہی آسمان تلے جمع ہو گئی تھیں۔اب توان کے بارے میں یہ سوچ کر مایوسی ہوتی ہے کہ بڑے لوگوں کی آمد کا جو سلسلہ کسی زمانے میں تواتر کے ساتھ جاری تھا صدی کی آخری چوتھائی میں یک لخت رک کیوں گیا۔بعض حضرات اس کی تاویل یہ پیش کرتے ہیں کہ اب نیا زمانہ ہے جس کے نئے تقاضے ہیں۔ہر شعبے میں نئے لوگ آرہے ہیں اور اپنے فن کا جادو جگا رہے ہیں۔بات صرف اتنی ہے کہ وہ پرانے لوگوں سے مختلف ہیں اس لیے پرانے وقتوں کے لوگوں کی نظروں میں ان کی اہمیت بھی کم ہے مگر ہم اس خیال سے متفق نہیں ہیں۔ہمیں تو بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے انسان بنانے کا بھی دو نمبر کام شروع ہو گیا ہے۔ورنہ کیا وجہ ہے کہ دیو قامت لوگوں کے

بجائے اب بونے بھی نہیں بالشتیے پیدا ہو رہے ہیں۔ قلم اور موسیقی کے شعبے ہی میں دیکھ لیجئے۔ کہاں سے چلے تھے اور کہاں پہنچ گئے۔ اس دور میں جو لوگ صف اول میں کبھی جگہ نہ پا سکے آج وہ بھی موجودہ لوگوں کے مقابلے میں آسمان پر بیٹھے نظر آئے ہیں۔ واقعی قحط الرجال ہے۔

دیکھیے۔ ذکر تھا میڈم نور جہاں کا اور بات کہاں پہنچ گئی۔ اگر میڈم پاکستان نہ آتیں تو ممکن ہے وہ زیادہ شہرت اور دولت کماتیں درجنوں صف اول کے موسیقاروں کی طرزیں گاتیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پنجابی فلموں کے لیے اچھے برے ہر قسم کے گانے شب و روز ریکارڈ کرا کے اپنی ملکوتی آواز کو خراب نہ کر لیتیں۔ انہوں نے بعض اوقات دن میں تین تین اور چار چار گانے بھی ریکارڈ کرائے ہیں۔ ہر قسم کی طرزیں اور ہر قسم کے بول۔ ہر قسم کے موسیقار اور ہر طرح کے مطالبے اور فرمائشیں۔ ان کا گلا جو نور سے بھرا ہوا تھا آخر ایک انسان ہی کا گلا تو تھا، لوہے فولاد سے نہیں بنایا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پہلے نصف دور کے گانوں اور بعد کے گانوں میں آواز کا فرق صاف نمایاں ہے۔ ایک تو گانے کی بہتات اس پر ہر قسم کی بدپرہیزیاں۔ راتوں کو دیر سے سونا۔ دن کو دیر سے بیدار ہونا۔ ہر قسم کی مرغن اور چٹ پٹی خوراک کھانا اور کسی قسم کی جسمانی ورزش نہ کرنا۔ ان کی بدپرہیزی تو ضرب المثال تھی۔

سعادت منٹو صاحب نے لکھا تھا کہ گانے والے اپنی آواز کی بہت دیکھ بھال کرتے ہیں۔ کھٹی اشیا اور برف کی طرح ٹھنڈا پانی پینے سے احتراز کرتے ہیں۔ ان کے سونے اور جاگنے کے اوقات مقرر ہیں مگر نور جہاں کا یہ عالم تھا کہ خوب چٹ پٹی مسالے دار چیزیں مزے لے لے کر کھاتیں۔ اچار اور کھٹی چٹنی کا فراوانی سے استعمال کرتیں اس پر برف کی طرح یخ پانی پی کر گانا ریکارڈ کرانے چلی جاتی تھیں۔ منٹو صاحب نے یہ بمبئی کے دنوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس کے بعد پچاس سال سے بھی زائد عرصے تک وہ اسی معمول پر عمل کرتی رہیں۔ اسے بھی خدا کی دین ہی کہنا چاہیے۔ البتہ ایک بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر نور جہاں بمبئی سے نہ آتیں تو لتا منگیشکر کو ایسا عروج نہ ملتا۔

میڈم نور جہاں کو ہم نے پہلی بار ان کی شاہ نور اسٹوڈیو والی کوٹھی میں دیکھا تھا۔ یہ انٹرویو کافی دیر تک جاری رہا۔ اس کے بعد جب ہم فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے تو اکثر کہیں نہ کہیں آمنا سامنا ہو جاتا تھا پھر وہ اعجاز درانی کی بیگم تھیں تو

ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے اداکاری چھوڑ دی تھی۔ صبح شوہر کو گھر گرہستن بیوی کی طرح رخصت کرتی تھیں۔ سارے دن گھر بیٹھ کر واپسی کا انتظار کرتی تھیں اوران کے بغیر رات کا کھانا نہیں کھاتی تھیں چاہے رات کے بارہ ہی کیوں نہ بج جائیں۔اعجاز کے لیےاپنے ہاتھوں سے کھانے پکاتی تھیں۔

اس سے پہلے ہم ان کی اداکاری کا دور بھی دیکھ چکے تھے۔ کہاں وہ گلیمر کی زندگی اور کہاں یہ گھریلو نیک پروین جیسا کردار۔ نور جہاں نے حتی الامکان اس کردار کو نبھانے کی کوشش کی لیکن بالآخر علیٰحدگی ہوگئی۔اس کے اسباب بہت سے ہیں جن کی تفصیل پہلے بھی ہم بیان کرچکے ہیں۔

سعادت منٹو صاحب نے لکھا تھا کہ گانے والے اپنی آواز کی بہت دیکھ بھال کرتے ہیں۔ کھٹی اشیااور برف کی طرح ٹھنڈا پانی پینے سے احتراز کرتے ہیں۔ان کے سونے اور جاگنے کے اوقات مقرر ہیں مگر نور جہاں کا یہ عالم تھا کہ خوب چٹ پٹی مسالے دار چیزیں مزے لے لے کر کھاتیں۔اچار اور کھٹی چٹنی کا فراوانی سے استعمال کرتیں اس پر برف کی طرح یخ پانی پی کر گانا ریکارڈ کرانے چلی جاتی تھیں۔ منٹو صاحب نے یہ بمبئی کے دنوں کا نقشہ کھینچا ہے۔اس کے بعد پچاس سال سے بھی زائد عرصے تک وہ اسی معمول پر عمل کرتی رہیں۔اسے بھی خدا کی دین ہی کہنا چاہیے۔البتہ ایک بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر نور جہاں بمبئی سے نہ آتیں تو لتا منگیشکر کو ایسا عروج نہ ملتا۔

میڈم نور جہاں کو ہم نے پہلی بار ان کی شاہ نور اسٹوڈیو والی کوٹھی میں دیکھا تھا۔ یہ انٹرویو کافی دیر تک جاری رہا۔اس کے بعد جب ہم فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے تو اکثر کہیں نہ کہیں آمنا سامنا ہو جاتا تھا پھر وہ اعجاز درانی کی بیگم تھیں تو ملاقات ہوگئی۔انہوں نے اداکاری چھوڑ دی تھی۔ صبح شوہر کو گھر گرہستن بیوی کی طرح رخصت کرتی تھیں۔سارے دن گھر بیٹھ کر واپسی کا انتظار کرتی تھیں اوران کے بغیر رات کا کھانا نہیں کھاتی تھیں چاہے رات کے بارہ ہی کیوں نہ بج جائیں۔اعجاز کے لیےاپنے ہاتھوں سے کھانے پکاتی تھیں۔

اس سے پہلے ہم ان کی اداکاری کا دور بھی دیکھ چکے تھے۔ کہاں وہ گلیمر کی زندگی اور کہاں یہ گھریلو نیک پروین جیسا کردار ۔نور جہاں نے حتی الامکان اس کردار کو نبھانے کی کوشش کی لیکن بالآخر علیٰحدگی ہو گئی۔ اس کے اسباب بہت سے ہیں جن کی تفصیل پہلے بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔

جب انہوں نے باقاعدہ گلوکاری کا آغاز کیا تو یہ ان کی نئی زندگی کا آغاز تھا۔ ہم نے گلوکاری کی حیثیت سے بھی ان کو دیکھا فلمی صنعت پر وہ ایک زمانے میں واقعی حکمرانی کرتی تھیں۔ان کی آواز کے بغیر کوئی فلم مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ بطور گلوکارہ ان کے بہت اچھے موڈ بھی ہم نے دیکھے اور برہمی کا تماشا بھی دیکھا۔ایک بار وہ ہم سے بھی بہت ناراض ہو گئی تھیں مگر یہ ناراضگی عارضی رہی۔

شوکت حسین رضوی سے ان کی صلح ہوئی تو سب سے زیادہ خوش ہونے والوں میں ہم بھی شامل تھے۔شاہ نور اسٹوڈیو میں شوکت صاحب کے گھر آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا جہاں میڈم یاسمین انتہائی محبت اور احترام سے ان کا خیر مقدم کرتی تھیں۔ان ملاقاتوں سے ہمیں پرانے مناظر اور واقعات فلیش بیک میں چلتے ہوئے نظر آتے تھے۔

وہ علاج کے لیے امریکہ گئیں تو سبھی ان کے لیے دعا گو تھے۔دل کا آپریشن کرا کے واپس آئیں تو شوکت صاحب اور میڈم یاسمین بذات خود ائر پورٹ پر ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

انہوں نے کچھ دن آرام کیا پھر چند گانے بھی ریکارڈ کرائے مگر ایک بار پھر بیماری نے انہیں گھیر لیا۔ کراچی اور پھر وہاں سے امریکہ گئیں۔ان کی صحت یابی اور صحت کی خرابی کی خبریں باقاعدگی سے موصول ہوتی رہتی تھیں۔کئی بار ان کے انتقال کی افواہیں بھی پھیل گئی۔

میڈم اس پر بہت ناراض تھیں۔وہ شکایت کرتی تھیں ”یہ کیسے لوگ ہیں۔مجھے جیتے جی مار دیا؟“

امریکہ سے علاج کرانے کے بعد وہ پاکستان واپس آئیں مگر کراچی ہی میں مقیم رہیں۔ لاہور اور لاہور والے ان کے منتظر ہی رہے۔وہ خود بھی لاہور آنے کے لیے بے چین تھیں مگر صحت کی خرابی کے باعث یہ ملتوی ہوتا رہا۔ یہاں تک

کہ ایک دن موت کا فرشتہ آیا اور انہیں اپنے ساتھ لے گیا اس کے بعد ان کی مغفرت کی دعا ہی کی جاسکتی ہے جو ہم باقاعدگی سے کرتے ہیں۔ کچھ عرصے قبل کراچی گئے تو پرویز ملک صاحب سے ملنے ان کے گھر گئے ان کے گھر کا پتا یہ بتایا گیا تھا کہ قبرستان کے پاس ہے ہم راستہ بھول کر آس پاس گھومتے رہے۔ کئی بار قبرستان کے سامنے سے گزرے۔ بالآخر پرویز ملک صاحب کا گھر مل گیا۔

باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ میڈم نور جہاں سامنے والے قبرستان مین دفن ہیں۔ ہم فاتحہ پڑھنے گئے تو قبرستان کے اندر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ باہر ہی سے فاتحہ پڑھی۔ میڈم کے لیے بھی اور اس قبرستان کے دوسرے مکینوں کے لیے بھی۔ خیال آیا کہ دیکھیے انسان بھی ایک مشت خاک ہی تو ہے۔ مٹی سے بنا ہے اور مٹی میں ہی مل جاتا ہے۔ اس کے لیے بھی قدرت نے وقت اور مقام مقرر کر دیا ہے۔ یہ قضا و قدر ہی سمجھئے کہ قصور کی مٹی سے جنم لینے والی نور جہاں نے ساری دنیا کی خاک چھان ماری۔ نگر نگر گھومتی پھرتی رہیں۔ کیا کیا نہ دیکھا اور کس جگہ نہیں گئیں۔ اس سیر و سیاحت کا خاتمہ کراچی کے اس قبرستان پر ہوتا تھا جہاں ان کا کوئی عزیز ہے نہ پرانے رفیق۔ اجنبی جگہ اور اجنبی لوگوں کے درمیان خدا جانے وہ کیا محسوس کرتی ہوں گی!

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے۔

ہم نے فلمی الف لیلہ لکھنے کا جب آغاز کیا تو یہ صرف الف لیلہ تھی۔ دراصل بنیادی طور پر یہ ہماری خودنوشت تھی۔ جس میں ہمیں اپنی زندگی کے مختلف مراحل کا تذکرہ کرنا تھا۔ معراج رسول صاحب اور فراز صاحب کو یہ خیال سوجھا کہ اپنی زندگی کا بیشتر (اور بہترین) حصہ ہم نے فلمی صنعت اور فلمی دنیا میں گزارا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ہماری خود نوشت میں فلم کا احوال قدرے زیادہ ہو گا اس لیے کیوں نہ اسے ''فلمی الف لیلہ'' کا نام دے دیا جائے۔ ان کے خیال میں فلموں کے حوالے سے عام قارئین کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہو جائے گا اور اس طرح ہم تفصیل کے ساتھ فلمی دنیا سے وابستگی کے دور کے واقعات لکھ سکیں گے۔

ایک تو ان کا طرز استدلال دوسرے اس دلیل کی معقولیت نے ہمیں قائل کر دیا اور ہم اس کا عنوان ''فلمی الف لیلہ'' رکھنے پر رضامند ہو گئے لیکن ہمیں اعتراض یہ تھا کہ اس طرح تو یہ ہماری خود نوشت کے بدلے فلمی داستان بن کر رہ جائے گی لیکن فراز صاحب نے سمجھایا کہ جب لوگ پڑھیں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ محض فلم تک محدود نہیں ہے۔ اس میں صحافت، ادب اور دیگر شعبوں کے واقعات اور افراد کا تذکرہ بھی ہے جو ہماری زندگی میں شامل ہوتے رہے ہیں اور جنہیں فراموش کرنا ممکن نہیں ہے۔

ہم سیدھے سادے بھولے آدمی ان کی باتوں میں آ گئے۔ ہم نے اس آپ بیتی کے آغاز میں ہی فلموں سے اپنی دلچسپی بلکہ والہانہ حد تک لگاؤ کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھا۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ ہمیں بچپن ہی سے کہانی سننے اور فلمیں دیکھنے کا بہت شوق رہا ہے۔ ہماری فرمائشوں سے تنگ آ کر اماں اور ہماری بڑی بہنوں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے یہ مشورہ دیا کہ اگر کہانی سننے کا شوق ہے تو خود ہی پڑھنا سیکھو تاکہ دوسروں کی محتاجی اور روز روز کی دانتا کل کل ختم ہو۔ ہمیں یہ محتاجی واقعی بہت گراں گزرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ کہانی سنانے کے لیے فرصت کی ضرورت ہوتی تھی جب فرصت ہوتی تو دن کے وقت کوئی کہانی سنانے پر آمادہ نہ ہوتا۔

اماں نے کہا ''بیٹا۔ دن کے وقت کہانی نہیں سناتے ہیں اور نہ سنتے ہیں؟''

ہم نے پوچھا ''کیوں؟''

بولیں ''مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تمہیں کہانی سنانے کی وجہ سے بے چارے مسافر راستہ بھول کر بھٹکتے پھریں؟''

مسافروں کے بے چارگی اور مصائب کے خیال سے ہم نے دن میں کہانی سنانے کی فرمائش ترک کر دی۔ یہ خیال ہمارے ذہن میں راسخ ہو گیا تھا کہ واقعی دن میں کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ کافی عرصے تک ہم

اسے سچ سمجھتے رہے۔ جب کچھ عقل آئی تو سوچا کہ یہ تو ہمیں سراسر بیوقوف بنایا گیا ہے۔ کہانی سنانے کا مسافروں کے راستہ بھولنے سے کیا تعلق ہے؟

مگر اس وقت تک ہم نے ''کہانی'' کے شوق میں پڑھنا سیکھ لیا تھا اور اس باب میں خود کفیل ہو گئے تھے اس لیے بات آئی گئی ہوئی۔ البتہ ہم نے اماں سے یہ شکایت ضرور کی کہ دن کے وقت کہانی نہ سنانے کی غرض سے انہوں نے ہمیں ایک غلط مفروضہ کیوں سمجھایا تھا؟

ان کا جواب یہ تھا ''دیکھو بیٹا۔ دن کا وقت کام کا ہوتا ہے۔ ہزاروں کام اور مسئلے ہوتے ہیں۔ اس لیے اطمینان سے بیٹھ کر کہانی سنانا مشکل ہے۔ کہانی سنانے کے لیے سنانے والے کی مکمل توجہ اور یکسوئی ضروری ہوتی ہے ورنہ کہانی کا مزہ خراب ہو جاتا ہے۔ رات کے وقت کھانا کھا کر اور سب کاموں سے فارغ ہو کر اطمینان سے بیٹھ کر کہانی سنانے اور سننے کا جو مزہ ہے وہ دن کے وقت کہانی سنانے میں نہیں آ سکتا۔ نہ سنانے والے کو نہ سننے والے کو تو پھر اسکا فائدہ؟''

اماں کی یہ دلیل ہمارے ذہن میں بیٹھ گئی۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے بچپن میں کہانی سنانا اور سننا بھی روزمرہ کی زندگی کا حصہ تھا۔ رات کو کھانا جلدی کھا لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد لالٹین لیمپ یا شمع کی مدھم خواب ناک روشنی میں سب لوگ ایک ہی کمرے میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں بھوپال میں ہمارے گھر میں بجلی نہیں تھی۔ کچھ عرصے بعد ہمارے گھر تک بھی بجلی کی رسائی ہو گئی لیکن بجلی کے بلب کی روشنی میں ''داستان گوئی'' کا وہ لطف ہی نہیں تھا۔ اس لیے کہانی سناتے وقت بجلی کا بلب بجھا دیا جاتا تھا لیمپ یا لالٹین روشن کر دی جاتی تھی۔ سب لوگ اماں کے ارد گرد بیٹھ جاتے یا لیٹ جاتے۔ گرمیوں کے موسم میں وہ بچوں کو دور بیٹھنے کی ہدایت کرتی رہتی تھیں مگر کون سنتا ہے۔ کوئی ان کی گود میں سر رکھے لیٹا ہے۔ کوئی پشت سے لگا بیٹھا ہے۔ سردیوں میں داستان گوئی کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔ انگیٹھی سلگ رہی ہے۔ بچے بڑے سب شالیں، رضائیاں، دلائیاں اوڑھے بیٹھے یا لیٹے ہیں۔ اماں اپنے نرم اور عطر سے مہکتے ہوئے لحاف میں بیٹھی ہیں۔ اماں کو عادت تھی کہ وہ لحاف اور بستر میں ہلکی سی خوشبو ضرور لگا دیتی تھیں۔ ہمارے بستر

کو بھی وہ پاکستان آنے کے بعد مہکاتی رہیں۔ عطر کی یہ خوشبو موسم کے اعتبار سے ہوتی تھی۔ گرمی میں بہترین اور پسندیدہ خوشبو خس کی ہوتی تھی۔ چنبیلی اور عطر شمامہ بھی ان کی پسندیدہ خوشبوئیں تھیں۔

سردیوں میں خشک میوے کھانے کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ بادام، کشمش، انجیر، اخروٹ، مونگ پھلی اور بعض اوقات ریوڑیاں اور گزک (گجک) بھی اس مینیو میں شامل ہوتی تھی۔ بچے اور جوان ان میووں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اماں چند دانے کھانے کے بعد کلی کرکے اپنا منہ صاف کرتیں اور پھر پاندان کھول کر بڑے اہتمام سے اپنے لیے پان بناتیں تو بڑی عمر کی لڑکیوں کی فرمائشیں بھی شروع ہو جاتی تھیں۔ بچے اور نوعمر لوگ میوہ خوری کو ترجیح دیتے تھے۔ انجیر کھانے کا طریقہ یہ تھا کہ جو بھی سیانی لڑکی انگیٹھی کے پاس بیٹھی ہوتی اس کی ڈیوٹی تھی کہ انجیر گرم کرکے بچوں کو دیتی رہیں۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ گرم کیا ہوا انجیر نزلہ زکام کے لیے بہت مفید ہوتا ہے۔ اماں اس کے مختلف طبّی فوائد بھی بتاتی رہتی تھیں۔ ہر چیز جو ہم لوگ کھاتے تھے اس کے فوائد سے ہمیں ضرور آگاہ کیا جاتا تھا۔

جب تک پاندان کھلا رہتا تھا حاضرین کی بے تابی میں اضافہ ہوتا رہتا تھا مگر یہ ممکن نہ تھا کہ پان کی گلوری منہ میں رکھے بغیر کہانی کا آغاز کیا جائے۔ سب سے پہلے اماں اپنے لیے پان بناتی تھی۔ اس کے بعد لڑکیوں بالیوں کی فرمائشیں پوری کرتی تھی۔ لڑکوں کو پان کھانے پر ٹوکا جاتا تھا مگر کبھی کبھی پان کا ایک ٹکڑا مل جاتا تھا۔ البتہ انہیں الائچی اور چھالیا کے چند دانے فراہم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔

ہم سب بے تابی سے پاندان بند ہونے کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ جیسے ہی پاندان کا ڈھکنا بند ہوتا سب کی ''ہوں ہوں'' شروع ہو جاتی کہ اب ضبط کا یارا نہیں ہے۔ کہانی شروع کیجئے۔

اماں اس معاملے میں جمہوریت کی قائل تھیں۔ پہلے یہ سوال کرتی تھیں کہ بھئی آج کون سی کہانی سنو گے؟ ہر شخص اپنی فرمائش بیان کرتا تھا لیکن اکثریت کی بات مان لی جاتی تھی۔ کبھی کسی کا دل رکھنے کے لیے اماں کسی فرد واحد کی

فرمائش کو فوقیت دے دیا کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ بھئی یہ کون سی روز روز فرمائش کرتا ہے یا کرتی ہے۔ آج اس کا دل رکھنے کو یہی کہانی سنا دیتے ہیں۔

کہانیاں ہر قسم کی ہوتی تھیں۔ پرانی ادبی داستانیں، طلسم ہوش ربا، الف لیلہ کے قصے، مختلف مشہور تہذیبوں کا خلاصہ، تاریخی واقعات پر مبنی کہانیاں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے حالات زندگی اور اہم واقعات۔ مسلمانوں کی فتوحات اور مسلمان سپہ سالاروں کے کارنامے۔ بعض اوقات وہ کسی تازہ افسانے کو بھی کہانی بنا کر سنا دیا کرتی تھیں مگر یہ وضاحت ضرور کر دیتی تھیں کہ یہ افسانہ یا کہانی کس نے لکھی ہے اور اسکی ادبی یا علمی حیثیت اور مرتبہ کیا ہے۔ اس طرح مصنف کا تعارف بھی ہو جاتا تھا۔

حجاب اسماعیل پر اسرار کہانیاں لکھنے کے لیے مشہور تھیں۔ یہ بعد میں حجاب امتیاز علی بن گئی تھیں۔ ان کی کہانیاں اماں نمک مرچ لگا کر اس طرح سنایا کرتی تھیں کہ پراسراریت میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ ڈراؤنی کہانیاں سنانے کی فرمائش بھی ہوا کرتی تھی۔ جنوں بھوتوں اور پریت چڑیلوں کی داستانیں بھی اماں کو یاد تھیں۔ ہم سب ڈرتے بھی رہتے تھے مگر کہانی ختم کرنے پر اصرار بھی نہیں کرتے تھے۔ چھوٹے بچے کھسکتے ہوئے بڑوں کے نزدیک اور ہم عموماً اماں کے لحاف کے اندر پہنچ جاتے تھے۔

اماں کی داستان گوئی کے دوران میں سوالات کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ معقول سوال کا جواب تو وہ دے دیا کرتی تھیں مگر بلاوجہ کے بے تکے اور بے معنی سوال برائے سوال پر ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔ دوسرے سامعین بھی شدید احتجاج کرتے تھے۔ بعض کہانیاں اور بعض موڑ ایسے ہوتے تھے کہ کسی سوال کے ذریعے مداخلت سخت ناگوار گزرتی تھی مگر اماں ایسے سوال کا جواب ضرور دیا کرتی تھیں جس سے پوچھنے والے کی معلومات میں اضافہ ہو۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا ہے۔ کہانیوں کے موضوعات کا کوئی تعین نہیں تھا۔ یہ لامحدود تھے۔ شیخ سعدی کی حکایتیں۔ خیام کی رباعیوں کے ترجمے۔ خلیل جبران کی کہانیوں کی آسان اور عام فہم تلخیص۔ مرزا غالب کے واقعات اور اشعار۔

فسانہ آزاد، فسانہ عجائب کے واقعات اور کردار۔ان کے لکھنے والوں کا تعارف۔ غرضیکہ دنیا کا ہر موضوع کہانیوں کے ذریعے اماں سنادیا کرتی تھیں پر چھوٹوں کے لیے میاں پودنے کی کہانی۔ سپاہی میاں اور بندر کی داستان، جب انتہائی فاقہ کشی کے عالم میں بندر نے سپاہی میاں کو ایک مٹھی بھنے ہوئے چنے پیش کئے تھے اور اس کے بعد سپاہی میاں کا پیچھا ہی نہ چھوڑا۔ جب سپاہی میاں ان سے جانے کے لیے کہتے تو وہ بندر جواب میں کہتا تھا۔ میں چلا جاؤں گا۔ مگر لاؤ میرے مٹھی بھر چنے۔ سپاہی میاں وہ مٹھی بھر چنے بھلا کہاں سے لا کر واپس کر سکتے تھے۔اس لیے بندر سے نجات نہ مل سکی۔ پیر تسمہ پا کی کہانی اور اس کی تشریح۔ جل پری کی کہانی۔

گھر سے نکالے ہوئے بے روزگار سپاہی کی داستان جسے بیوی نے یہ کہہ کر گھر سے نکال دیا تھا کہ ’’تم نکھٹو آدمی ہو کچھ کما کر لاؤ گے تو گھر میں آکر منہ دکھانا ورنہ واپس نہ آنا۔‘‘

زاد راہ کے طور پر بیوی نے ترس کھا کر چار روٹیاں بھی سپاہی کو دے دی تھیں۔ سپاہی میاں قصبوں اور جنگلوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔(اس زمانے میں جنگل زیادہ ہوا کرتے تھے)

جب بھوک نے بہت ستایا تو وہ ایک کنوئیں کی منڈیر پر جا کر بیٹھ گئے کیونکہ وہاں ڈول اور رسی بھی تھی جس کے ذریعے وہ پانی بھی حاصل کر سکتے تھے۔

چاروں، روٹیاں انہوں نے کنوئیں کی منڈیر پر رکھ دیں اور بلند آواز سے خود سے سوال کیا’ایک کھاؤں یا دو کھاؤں۔ تین کھاؤں یا چاروں کو ہی کھا جاؤں؟‘‘

حسن اتفاق سے اس کنوئیں میں چار پریاں رہتی تھیں۔انہوں نے سپاہی میاں کی آواز سنی تو ڈر کر باہر نکل آئیں۔ ان کا رعب دار خوفناک حلیہ اور تلوار دیکھ کر وہ ڈر گئیں۔ان کا خیال تھا کہ یہ خطرناک آدمی انہیں کھانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

انہوں نے ہاتھ باندھ کر درخواست کی کہ آپ ہم پر رحم کریں۔

سپاہی میاں نے کہا" خاک رحم کروں۔ میں بھوکا اور بے روزگار ہوں۔ بیوی نے گھر سے باہر نکال دیا ہے۔"

پریوں نے انہیں ایک دیگچی تحفے میں پیش کی جس کی یہ خوبی تھی کہ جو فرمائش کریں وہ پکا پکایا کھانا اس میں موجود ہوتا تھا۔ سپاہی میاں نے آزمائش کے طور پر آزمایا اور درست پایا تو یہ دیگچی اٹھا کر گھر لے گئے۔

بیوی نے خالی ہاتھ آتے ہوئے دیکھا تو دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔

سپاہی میاں نے دیگچی کے بارے میں بتایا اور ثبوت بھی پیش کیا تو بیوی نے انہیں گھر میں داخلے کی اجازت دے دی۔

یہ دیگچی ان کے بہت کام آئی۔ پڑوسیوں پر بہت رعب پڑا۔ کھانے پینے کے جھنجھٹ سے آزادی مل گئی مگر پھر ایک دن جب وہ ایک سرائے میں مقیم تھے تو سرائے کی چالاک مالکہ نے اسکی خوبی سنی تو ایک ویسی ہی دیگچی کمرے میں لا کر رکھ دی اور اصلی دیگچی غائب کر دی۔ جب دیگچی کی کرامت غائب ہو گئی تو بیوی نے ایک بار پھر سپاہی میاں کو گھر سے نکال باہر کیا۔

سپاہی میاں چار بار کنوئیں پر گئے اور چاروں مرتبہ ایسے ہی نادر و نایاب تحائف پریوں نے ان کی نذر کیے تاکہ اپنی جان تو بچائیں۔ سپاہی میاں نے واپسی پر سرائے میں قیام کیا کیونکہ اس کی مالکہ ان کی بے وقوفی اور افادیت سے واقف ہو گئی تھی اور انہیں گھر جاتے ہوئے مفت میں سرائے میں قیام کرنے کی مستقل پیشکش کر دی تھی۔

سپاہی میاں سادگی میں تحفے کے بارے میں بتاتے تو سرائے کی مالکہ ویسی ہی ایک نقلی چیز ان کے کمرے میں رکھ دیا کرتی تھی اور اصلی تحفہ غائب کر دیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ سپاہی میاں کی گھر جانے پر درگت بنتی تھی۔ آخر وہ تنگ آ گئے۔ ادھر چاروں پریاں بھی اپنے خصوصی تحائف پیش کر کے تہی دست ہو چکی تھیں۔ بالآخر انہوں نے سپاہی میاں کی مدد کی اور سرائے کی مالکہ کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ وہ آپ کی مجرم ہے۔ اس سے اپنی چیزیں واپس لیں۔ سپاہی میاں لحاظ کے مارے بولے کہ ثبوت کے بغیر کسی شریف عورت کو کیسے الزام دے سکتا ہوں؟

پریوں نے انہیں ایک موٹا سا جادوئی ڈنڈا دے دیا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ جو بھی جھوٹ بولتا تھا یہ ڈنڈا خود بخود یعنی (سیلف اسٹارٹ ہو کر) جھوٹے کی مرمت شروع کر دیتا تھا۔ سپاہی میاں یہ ڈنڈا لے کر سرائے میں پہنچے تو وہاں ان کی بہت آؤ بھگت کی گئی۔ مالکہ بھانپ گئی تھی کہ یہ احمق پھر کوئی نایاب تحفہ لے کر آیا ہے۔ اس کے دریافت کرنے پر سپاہی میاں نے ڈنڈے کی خصوصیت بیان کر دی اور پوچھا کہ میرا سامان تم نے غائب کیا ہے؟

سرائے کی مالکن نے صاف انکار کر دیا۔ یہ سنتے ہی جادوئی ڈنڈا حرکت میں آ گیا اور سرائے کی مالکہ کی دھنائی کر دی۔ عاجز آ کر اس نے حقیقت حال بیان کر دی اور سپاہی میاں کو ان کے تمام جادوئی تحائف لوٹا دیئے۔ سپاہی میاں گھر میں بیوی کے سامنے سرخ رو ہو گئے۔ ادھر پریوں کی سپاہی میاں سے جان چھوٹ گئی۔

اس قسم کی دلچسپ داستانیں اماں اس قدر دلکش انداز میں مکالموں کی ادائیگی کے ساتھ اور مختلف کرداروں کے تاثرات کے ساتھ سناتی تھیں کہ ہم سب مبہوت رہ جاتے تھے۔ ہر کہانی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا تھا اور یہ سبق آموز بھی ہوتی تھیں۔ اماں آخر میں یہ وضاحت ضرور کرتی تھیں کہ اس کہانی سے کیا سبق حاصل ہوتا ہے۔

آج جب ان دنوں کی یاد آتی ہے تو فلمیں اور ٹی وی اس کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔ جتنا تنوع اور موضوعات کی رنگا رنگی اماں کی داستانوں میں ہوتی تھی وہ آج ٹی وی کو کہاں نصیب ہے۔ اماں کا مطالعہ بہت زیادہ تھا جسے وہ کہانیوں کی شکل میں ہم سب کو گھول کر پلا دیا کرتی تھی۔ بادشاہوں کے انصاف اور ظلم کی داستانیں سنا کر وہ اس طرز حکومت کی برائیوں اور خوبیوں کو واضح کر دیا کرتی تھیں۔ ہمارے علم کی بنیاد ان ہی کہانیوں نے فراہم کی اور سبق آموز اور عبرت ناک باتیں ہمارے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئیں۔

دیکھیے۔ فلمی الف لیلہ سے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہم یہ بتا رہے تھے کہ اس سلسلے اور خود نوشت کا عنوان فلمی الف لیلہ کیوں منتخب کیا گیا۔

جب ہم نے فلموں کا ذکر چھیڑ دیا تو فراز صاحب پھر دور کی کوڑی لائے اور کہنے لگے ''حضرت، آپ تو باتوں باتوں میں فلم کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ یہ تو بے حد مفید اور تحقیقی کام ہے۔ کیوں نہ آپ کو پاکستان کی فلمی صنعت کی تاریخ کا مورخ بنا دیں۔''

ہم نے کہا ''حضرت یہ نہ تو تخلیقی کام ہے اور نہ ہی تاریخ۔ یہ تو ہماری یادوں کا مجموعہ ہے۔ تاریخ کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ تاریخ تو ہمیں یاد ہی نہیں رہتی۔ اسی لیے یہ واقعات کسی ترتیب کے بغیر پیش کیے جا رہے ہیں۔ جیسے جیسے یاد آتے رہتے ہیں ہم لکھتے جاتے ہیں۔''

انہوں نے پان منہ میں رکھا اور بولے ''آپ ذرا اس تجویز پر غور کیجئے۔ اگر اس بہانے پاکستانی فلمی صنعت اور فلمی شخصیات کی ایک تاریخ مرتب ہو جائے تو سوچئے کہ یہ کس قدر مفید کارنامہ ہو گا۔ آنے والے دور میں لوگ ریفرنس کے طور پر اس سے رجوع کیا کریں گے۔''

ہم نے کہا ''بھائی۔ کہاں کا ریفرنس اور کون سے لوگ۔ یہاں تو فلمی صنعت کا ہی بولو رام ہو گیا ہے۔ پرانی فلموں اور فلم والوں کو لوگ بھول گئے ہیں۔ نئی نسل تو اس بارے میں قطعی لا علم ہے۔ انہیں بھلا ان واقعات میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟''

مگر فراز صاحب واقعی اسم بامسمیٰ ہیں۔ خدا جانے ان کا نام والدین نے سوچ سمجھ کر اور ستاروں کا حساب کتاب لگا کر رکھا تھا یا غلطی سے پسندیدہ نام رکھ دیا تھا مگر بعد میں دنیا نے انہیں واقعی ''فراز'' بنا دیا۔ وہ جس چیز کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اس کی جان نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ انہوں نے باقاعدہ طور پر یہ مہم شروع کر دی اور طرح طرح سے ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگے کہ ہم اس خود نوشت کو اگر فلم کی تاریخ بنائیں گے تو کیا اجر پائیں گے؟ اللہ سے نہیں، اہل دنیا سے۔ جب انہوں نے بار بار یہی بات کہی اور لکھی تو ہم نے بھی سوچا کہ کہتے تو ٹھیک ہیں۔ اسی دوران میں کچھ اور لوگوں نے بھی ہم سے کہا کہ آپ تو بہت بڑا کام کر رہے ہیں کہ پاکستان کی فلمی صنعت کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔

ہم بہت حیران ہوئے کہ ان جانے میں ہم ایک بڑا کام کیے جا رہے ہیں اور ہمیں اس کا احساس ہی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر لوگ اسے فلمی تاریخ سمجھ کر پڑھتے ہیں تو یہ ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ مختصر ہی سہی مگر ہمیں پاکستان کی فلمی صنعت کی تاریخ (کسی ترتیب کے بغیر ہی سہی) لکھنی چاہئے۔ صرف اتنا ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں یقین اور تصدیق نہیں ہے دوسروں یا کتابوں اور رسائل سے یہ معلومات حاصل کر لی جائیں اور فلمی تاریخ کا ایک ہلکا سا خاکہ بن جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

ہم نے تاریخ نویسی کے خیال سے قلم اٹھایا تو معاً خیال آیا کہ گئے گزرے واقعات اور لوگوں میں اب لوگوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ پرانے لوگ اب فلم دیکھنا ہی چھوڑ چکے ہیں۔ نئی نسل کو پرانے لوگوں کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے تو پھر اس داستان طولانی کو پڑھے گا کون؟ یہ سوچ کر ہم نے فراز صاحب سے ہر لفظ کے بعد یہ پوچھنا ضروری سمجھا کہ قارئین کا ردعمل کیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم بلاوجہ کاغذ کالے کر رہے ہیں اور پڑھنے والوں کو بور کر رہے ہیں؟ انہوں نے ہمیں دلاسا دیا کہ ایسی بات نہیں ہے۔ پرانے لوگ اپنی یادیں تازہ کرنے کے لیے اور نئی نسل کے لوگ اس زمانے کے بارے میں جاننے کے لیے داستان پڑھتے ہیں اور اس سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔ ''سرگزشت'' میں شائع ہونے والے قارئین کے خطوط سے بھی ہمیں کچھ اندازہ ہوا مگر جب ہر طبقے، شعبے اور مزاج کے لوگوں نے فرداً فرداً ہمیں بتایا کہ وہ اس کو واقعی پسند کرتے ہیں تو قدرے ڈھارس بندھی۔

ہمیں لوگ مصنف، فلم ساز، ہدایت کار، صحافی، کالم نگار، سفرنامہ نگار کے نام سے تو جانتے ہی تھے مگر اب فلمی الف لیلہ کے حوالے سے ہمارا ایک نیا حوالہ اور نئی شناخت بن گئی ہے اور ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ کیا واقعی اتنے بہت سے صاحب علم و فکر اور دانشور بھی اس کو پڑھتے ہیں اور بور نہیں ہوتے بلکہ جب ملاقات ہوتی ہے تو اسکے بارے میں تبادلہ خیال کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

کچھ خطوط بھی ہمیں گھر کے پتے پر موصول ہوئے پھر ٹیلی فون کالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ ملک سے باہر بھی ''الف لیلوی'' لوگ موجود ہیں۔ بعض اوقات وہ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔

ہمیں مشورے دیتے ہیں۔ ہم سے فرمائشیں کرتے کہ فلاں کا تذکرہ آپ نے نہیں کیا یا بہت مختصر کیا۔ ہم حیران ہیں کہ اگر واقعی تفصیل سے ہر ایک کے بارے میں لکھیں تو کیوں کر لکھیں۔ یہ داستان تو شیطان کی آنت کی طرح لا متناہی ہے۔ کب ختم ہو گی اور کیسے ختم ہو گی۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم لکھ لکھ کر تھک گئے ہیں۔ ہم نے ابتدائی زندگی سے ہی مطالعے کا آغاز کر دیا تھا۔ وجہ بیان کی جا چکی ہے پھر چوتھی یا پانچویں جماعت میں تھے جب لکھنے کا آغاز کیا۔ وہ دن اور آج کا دن لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ ابتدائی دس بارہ سالوں میں ہم صرف لکھتے رہے۔ شائع کرانے کی ہمت نہ پڑی۔ نہ ہی معیار کے اعتبار سے اشاعت کی ضرورت سمجھی۔ لکھتے رہے اور جمع کرتے رہے پھر انہیں پھاڑ کر پھینک دیتے تھے پھر جب لکھنا اور چھپنا شروع کیا تو شوق میں آکر کسی صلے یا ستائش کی توقع کے بغیر لکھتے رہے۔ ہزاروں صفحات ہمارے نام کے بغیر شائع ہوئے۔ ہزاروں صفحات پر ہمارا نام شائع ہوا مگر ہم نے ان تحریروں کو سنبھالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ باقاعدہ لکھنے کا آغاز کیا تب بھی کسی مطبوعہ تحریر کو سنبھال کر نہ رکھا۔

نتیجہ یہ ہے کہ اب پچھتاتے ہیں کہ گزشتہ پچاس سالوں میں ہم نے بعض ایسی تحریریں بھی لکھی ہیں جو ہمیں احتیاط سے محفوظ رکھنی چاہئے تھیں مگر وہ ناپید ہیں۔

اگر حساب لگائیں تو بلا مبالغہ لاکھوں صفحات لکھ چکے ہیں۔ لکھنے کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ مختلف شعبوں کے لیے لکھتے ہیں۔ فلمی الف لیلہ کہاں تک لکھیں اور کیوں کر لکھیں؟ حافظے کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے اور لکھنے کی بھی۔ کب تک حافظے کے برتن کو کھنگالتے رہیں اور لسی نکالتے رہیں اور پھر لکھنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ ہاتھ کو بھی حرکت دینی پڑتی ہے یہ ایک بے حد تھکا دینے والا کام ہے۔

اب چند برسوں سے ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ فلم والے ابھی تک ہم سے بالکل مایوس نہیں ہوئے ہیں۔ کہانیاں لکھنے کی فرمائش کرتے رہتے ہیں۔ دلکش معاوضوں کی پیشکش بھی کرتے ہیں مگر جیسی فلمیں بن رہی ہیں ان سے ہمارا

دل اچاٹ ہو چکا ہے۔نہ وہ دماغ نہ صلاحیتیں، نہ وہ ماحول، نہ وہ انہماک شوق اور لگن۔ یہ لوگ فلم کیسے بنائیں گے ؟اور کیسی فلم بنائیں گے ؟ یہ سوچ کر فلم سے ہم دامن بچاتے رہے ہیں۔

ایک نئی ''آزمائش'' ٹی وی ڈرامے کی شکل میں سامنے آئی ہے۔جب سے پاکستان میں ٹی وی کے نجی ڈرامے بنانے کا سلسلہ شروع ہوا ہے یہ ایک باقاعدہ صنعت بن چکی ہے۔ایک اچھے ٹی وی سیریل پر فلم کے مساوی ہی لاگت آتی ہے۔ معیار تو جیسا بھی ہے مگر معاوضوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔بے شمار لوگ ٹی وی ڈراما سیریل بنا رہے ہیں اور بہت دل فریب پیشکش کے بعد تقاضے بھی کرتے ہیں لیکن اس کے لیے بھی وقت اور یکسوئی کی ضرورت ہے ہم سوچتے ہیں کہ کیا ساری زندگی صفحات کالے کرتے ہی گزر جائے گی۔ فرصت کے لمحات بھی ملیں گے یا نہیں؟ مگر دوسری طرف مشکل یہ ہے کہ جس روز ہم کو لکھنا نہیں ہوتا ہم پریشان ہو جاتے ہیں کہ وقت کیسے گزاریں؟

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔آپ کہیں گے کہ صاحب یہ کس قسم کا جملہ معترضہ تھا کہ پوری داستان سنا ڈالی۔اس تمہید کا مقصد کچھ اور تھا۔ پچھلے دنوں ہم نے بھارت اور پاکستان کے کچھ ممتاز فنکاروں کے واقعات بیان کئے ہیں۔ میڈم نور جہاں کے علاوہ ثریا کا بھی تذکرہ رہا۔اب دور دیس سے ایک صاحبہ نے بذریعہ ٹیلی فون (کمپیوٹر، فیکس اور انٹرنیٹ سے ہم محروم ہیں کہ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتے) یہ شکایت کی ہے کہ آپ نے ثریا کا تو ذکر کر دیا مگر مینا کماری اور میناشوری کا تذکرہ ہی نہیں کیا۔

ہم نے عرض کیا کہ ان دونوں خواتین کا ہم تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں بلکہ مینا کماری پر اس قدر تفصیلی داستان لکھی تھی کہ پڑھنے والے حیران رہ گئے۔

کہنے لگیں ''آپ نے میڈم نور جہاں کے بارے میں بھی کئی بار لکھا۔ثریا خانم کے بارے میں بھی لکھ چکے ہیں۔''

ہم نے کہا'' دراصل بعض نئے حوالوں سے تذکرہ کرنا پڑتا ہے۔''

بولیں ”آپ کے لیے نئے حوالے تلاش کرنے کیا مشکل ہیں۔ بس میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ مینا کماری اور مینا شوری کے بارے میں بھی لکھیں اور دیکھیے۔ میں بہت مہنگا ٹیلی فون کر رہی ہوں۔“

اس سے کچھ دیر پہلے ایک پرانے صحافی، فلم بینا اور دانشور ہمارے پاس سے اٹھ کر گئے تھے۔ انہوں نے کتابی مجموعے میں مینا کماری، مدھو بالا، منگیشکر کے بارے میں ساری داستان ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کے مطالعے کے بعد مجھے ان کے بارے میں بہت سی نئی معلومات حاصل ہوئیں جو بہت کوشش اور مسلسل مطالعے کے باوجود مجھے معلوم نہ ہو سکی تھیں۔ آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہو جاتا ہے؟

ہم ان کی بات سن کر ہنسے اور جواب دیا ”دراصل ہمارے قبضے میں ایک جن ہے۔ جب ہم کان کھجاتے ہیں تو وہ فوراً حاضر ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ”کیا حکم ہے میرے آقا“ ہم اس سے کہتے ہیں کہ فلاں شخصیت کے بارے میں خفیہ و ظاہرہ تمام معلومات فراہم کر دو۔“

وہ ”بہتر ہے“ کہہ کر غائب ہو جاتا ہے۔ چند لمحے بعد نمودار ہوتا ہے اور ایک پلندا ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

انہوں نے پوچھا ”تو کیا یہ سب تحریریں جنات کی لکھی ہوئی ہیں؟“

ہم نے کہا ”جی نہیں۔ دراصل وہ جناتی زبان میں لکھی ہوتی ہیں۔ شاید وہ انگلش میڈیم میں پڑھا ہوا جن ہے۔ اس لیے ہم اس کا آسان اور عام فہم اردو میں ترجمہ کر لیتے ہیں۔“

وہ کہنے لگے ”گویا آپ کو یہ خیالات اور واقعات کہیں اور سے ملتے ہیں؟“

ہم نے غالب کا یہ شعر انہیں سنا دیا۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

ان صاحب نے ہمیں یہ معلومات فراہم کیں کہ جب انہوں نے مدھوبالا کے بارے میں ہمارا مضمون پڑھااور یہ پتا چلاکہ مدھوبالا کے والد عطااللہ خاں کا آبائی گھر پرانے شہر میں ہے تو وہ اسکی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔پوچھتے ہوئے بالآخر ایک پرانے بوسیدہ مکان تک پہنچ گئے۔آس پاس والوں سے تصدیق کی تو معلوم ہوا کہ یہی کسی زمانے میں عطااللہ خاں کا گھر تھا۔بعد میں جب وہ بمبئی منتقل ہوگئے تو کافی عرصے تک یہ مکان ان کے رشتے داروں کی تحویل میں رہاپھر فروخت کر دیا گیا۔اب ایک صاحب اس مکان میں رہتے ہیں۔انہیں صرف اتنا علم ہے کہ یہ مکان کسی زمانے میں فلم اسٹار مدھوبالا کے والد کا گھر تھا۔وہ جوانی میں مدھوبالا کے فین تھے پھر فلموں میں دلچسپی ختم ہوگئی۔ہمارے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ یہ گھر اب کافی خستہ حالت میں ہے۔اس کی مناسب دیکھ بھال نہیں کی جاتی۔ان کا کہنا ہے کہ کاش میرے پاس اتنا سرمایہ ہوتا کہ میں یہ مکان خرید کر مدھوبالا کی یادگار کے طور پر اسے وقف کر دیتا جہاں مدھوبالااور اس کی فلموں کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی جاتیں۔ان کی فلموں کے پوسٹر وغیرہ سجائے جاتے۔اب تو پرانی فلموں کے ویڈیو بھی آسانی سے مل جاتے ہیں۔مدھوبالا کی پرانی فلموں کے ویڈیو بھی آسانی سے مل جاتے ہیں۔مدھوبالا کی پرانی فلموں کے ویڈیو بھی اس مکان میں رکھ دیئے جاتے اور ہفتے میں ایک یادو روز ان ویڈیو فلموں کی نمائش کے لیے وقف کر دیئے جاتے۔

یہ صاحب مدھوبالا کے مداح ہیں۔وہ زمانہ طالب علمی میں فلموں کے رسیا تھے۔پاکستانی اور بھارتی فلمیں باقاعدگی سے دیکھا کرتے تھے۔ہماری فلمیں بھی انہوں نے اسی زمانے میں دیکھی تھیں انہوں نے بتایا کہ فلم ""کنیز"" انہوں نے کافی عرصے بعد دیکھی تھی جب وہ فرسٹ ائیر کے طالب علم تھے۔

دراصل ہم سب جانتے ہیں کہ چالیس کی دہائی سے برصغیر میں فلموں کی مقبولیت کا سلسلہ شروع ہوا تھا جس میں بتدریج

اضافہ ہوتا رہا۔ سنہ پچاس کے بعد تو فلمیں دیکھنا ایک معاشرتی سرگرمی اور کلچر کا حصہ بن گیا تھا۔ تعلیم یافتہ لوگ، ان پڑھ خاندان، طالب علم، مرد و زن سبھی فلمیں دیکھا کرتے تھے اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں باہمی تبادلہ خیال کرتے تھے۔ یہ دور دراصل فلم کا دور تھا۔ جن لوگوں نے اس زمانے میں فلمیں دیکھی ہیں ان کی پسندیدہ فلموں کی کہانیاں، مکالمے اور گانے تک انہیں آج بھی یاد ہیں۔ فلموں کا معیار، موضوعات اور پیشکش کا انداز بہتر ہوتا تھا۔ اس لیے اس کا تاثر دیرپا ہوتا ہے۔ آج بھی ان کے ذہنوں پر ان فلموں کے نقوش موجود ہیں۔

ان کی اس بات سے ہمیں بیرون ملک سے آنے والی خاتون کی ٹیلی فونک فرمائش یاد آگئی جنہوں نے مینا کماری کے بارے میں ''کچھ اور'' بیان کرنے کی فرمائش کی ہے۔

مینا کماری کو ہم نے بذات خود کبھی نہیں دیکھا۔ فلموں ہی میں دیکھتے رہے۔ انکے بارے میں اخبارات و جرائد میں پڑھتے رہے۔ بمبئی جانے والے فلمی دوستوں سے انکے متعلق ''آف دی ریکارڈ'' باتیں سنتے رہے جو ہمارے ذہن میں محفوظ ہوتی رہیں۔ شروع میں ہم نے مینا کماری کی فلمیں دیکھی تھیں اور ان کے حسن، مکالموں کی ادا کاری کے غمناک انداز اور اداکاری کے انوکھے انداز نے ہمیں ان کا مداح بنا دیا تھا۔ اس وقت ہم طالب علم تھے اور مینا کماری کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہ تھا سوائے اس کے کہ انہوں نے بہت کم عمر میں چائلڈ اسٹار کے طور پر اداکاری کا آغاز کیا تھا۔

جیسا کہ ہم کئی بار بیان کر چکے ہیں۔ تقسیم برصغیر کے بعد کا دور دراصل فلموں کی بے پناہ مقبولیت کا دور تھا۔ اس زمانے میں جیسی فلمیں بنائی گئیں اب ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف، فلم ساز، ہدایت کار، موسیقار، ہنرمند اور فنکاروں کی ایک فوج ظفر موج تھی جو فلمی میدان جنگ میں برسرپیکار تھی۔ یہ لوگ صحت مند مقابلے کے قائل تھے۔ اپنی قابلیت، صلاحیت اور ہنرمندی سے دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وسیع الظرف تھے۔ اس لیے ایک دوسرے کی صلاحیتوں کا برملا اعتراف بھی کرتے تھے۔ سن ۴۵ء سے ۸۰۔۱۹۷۹ء کے زمانے میں پاک و ہند میں جیسی فلمیں تخلیق کی گئیں اب ان کی مثال پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔

مینا کماری شاعرہ بھی تھیں اور نثر بھی لکھا کرتی تھیں مگر ان دونوں ذرائع سے دراصل وہ اپنے دکھوں کا اظہار کرتی تھیں کہ ان کا دکھ درد سننے والا بھی کوئی نہ تھا۔

ایک بار مینا کماری نے لکھا۔

''میں عرصہ دراز تک دوسروں کے تخیل کے مطابق تراشی ہوئی مینا کماری کی زندگی بسر کرتی رہی ہوں۔ مداح، پرستار، پبلسٹی کرنے والے، اخبارات، رسائل و جرائد، کالم نگار، ہدایت کار، نقاد ہر ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق ایک مینا کماری تخلیق کر لی تھی۔ ہر ایک کی شکل مختلف ہے۔ میں سوچتی ہوں کیا کبھی ان تمام مینا کماریوں کو یکجا کر کے ایک قالب میں دیکھنے کی بھی کوئی جستجو کرے گا؟ میں مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ایک شخصیت ہوں۔ کیا کوئی ان سب کو اکٹھا کر کے ایک سانچے میں ڈھالے گا تاکہ میں یہ محسوس کر سکوں کہ انہوں نے حقیقی مینا کماری کو پالیا ہے؟''

اس طرح کی بے شمار تحریریں وہ لکھتی رہتی تھیں۔ شائع کرانے کے لیے نہیں صرف اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی خاطر۔ انہوں نے شاعری بھی کی اور بہت اچھے اشعار لکھے مگر وہ انہیں چھپا کر رکھتی تھیں جس طرح کہ وہ اپنی اصلیت اور رازدل کو ہمیشہ چھپایا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود ان کے کچھ اشعار ان کی زندگی ہی میں شائع ہو گئے تھے۔ یہ غم و الم سے بھرپور نوحے تھے۔ ان کی تحریروں کو پڑھئے تو مینار کماری خود اپنے اوپر ماتم کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مینار کماری نے لگ بھگ ۹۱ فلموں میں کام کیا۔ فلم چاہے جیسی ہو۔ مینا کماری کی شخصیت اور اداکاری اس میں نمایاں اور حاوی نظر آتی ہے۔ مہ جبیں نے اپنے چہرے پر مینار کماری کا نقاب پہن لیا کیونکہ انہیں اپنی بہنوں، بھائیوں اور والد کی کفالت کرنی تھی۔ انہیں زندگی کی خوشیاں، آسائشیں اور نعمتیں فراہم کرتی تھیں۔ شاعرہ اور مصنفہ ناز نے اپنے خوابوں کو دوسروں کے خوابوں پر قربان کر دیا۔ مینا کماری نے بہت دولت کمائی مگر پہلے وہ ان کے والد اور بہن بھائیوں کے کام آئی۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ جب عمر میں خود سے کافی بڑے شادی شدہ لیکن بہت بڑے مصنف اور ہدایت کار کا سہارا لیا اور اسے اپنا شریک حیات بنایا تو وہ بھی خوشیوں کا دشمن نکلا۔ بچی کچھی پونجی شوہر کی نذر ہو گئی اور وہ

دونوں ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ستم یہ کہ شوہر نے قدر نہ کی یہاں تک کہ بیماری کے دنوں میں بھی کمال امروہوی کو اپنی فلم ''پاکیزہ ''مکمل کرنے کی دھن تھی۔ یہ پرواہ نہ تھی کہ ان کی بیوی اور فلم کی ہیروئن کس کرب سے گزر رہی ہے اور زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہے۔ مسلسل ناکامیوں، تلخیوں، مایوسیوں اور دل شکنیوں کے بعد بھی جب مینا کماری کو سکون کا سانس نصیب نہ ہوا تو اس نے شراب کا سہارا لیا۔ شراب خانہ خراب نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ جس طرح سعادت حسن منٹو نے اپنے غموں کو شراب میں ڈبونے کی کوشش کی تھی ایسا ہی تجربہ مینا کماری نے بھی کیا اور دونوں نے گھاٹا ہی اٹھایا۔

مینا کماری کی زندگی اب ایک کھلی کتاب ہے۔ اس کے بارے میں مزید بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں ہے۔ اس موقع پر مینار کماری کے ایک مخلص اور بے لوث پرستار کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ ان صاحب کا نام شیبا چھاچھی ہے۔ انہوں نے نئی دہلی میں مینا کماری کی یادگار کے طور پر ایک میوزیم قائم کیا ہے۔ اس میوزیم میں مینا کماری کی زندگی کے متعلق ہر طرح کی معلومات اکٹھی کر دی گئی ہیں۔ حالات زندگی، خاندانی حالات، بچپن سے جوانی اور پھر دم واپسیں تک کے تمام واقعات، تصاویر، تحریریں اور فلمیں۔ ان کے بارے میں لکھے گئے مضامین ان کی فلموں پر لکھے جانے والے تبصرے۔ شعبہ اداکاری میں انکی خدمات۔ اس عمارت میں داخل ہونے کا راستہ، مینا کماری کی مشہور فلموں کے پوسٹروں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ میرے اپنے صاحب بی بی اور غلام، کوہ نور، پھول اور کانٹے، منجھلی دیدی، پاکیزہ اور دیگر معروف فلموں کے پوسٹر اس خوب صورتی سے ڈیزائن کر کے سجائے گئے ہیں کہ میوزیم کے اندر قدم رکھنے والے کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ ''ملکہ غم'' کے دربار میں حاضر ہو رہا ہے۔ مینا کماری کو انکی زندگی ہی میں ''کوئن آف ٹریجڈی'' کا خطاب دے دیا گیا تھا جو کہ ان کے فلمی کرداروں کے علاوہ ان کی حقیقی زندگی کے بھی عین مطابق تھا۔

مینا کماری کا پسندیدہ رنگ، اگر اس کو رنگ کہا جا سکتا ہے تو سفید تھا۔ وہ عام طور پر سفید لباس پہنا کرتی تھیں۔ مشرقی معاشرے میں سیاہ رنگ ماتم اور سفید سوگ کے لیے مخصوص ہے۔ انہیں آغاز ہی سے سفید پوشی کا شوق تھا۔ شاید آنے والے واقعات ان پر منکشف ہو گئے تھے۔

یہاں مینا کماری کی تحریریں بھی آویزاں ہیں۔

''جل پری'' کے زیر عنوان یہ سطور ہیں۔

''جل پری حسن مجسم، سراپا کشش لیکن ہمیشہ تنہا۔ جو ہمیشہ اس خواہش میں رہتی ہے کہ کاش اسکے پر لگ جائیں وہ تنہائی کے اس حصار سے پرواز کر کے باہر نکل جائے۔''

ایک اور تحریر دیکھیے۔

''اس کٹی پتنگ کو دیکھو۔ میری زندگی بھی ایک کٹی پتنگ کے مانند ہے کیونکہ کٹی پتنگ کی طرح میرا بھی کوئی گھر۔ کوئی سہارا، کوئی منزل، کوئی امید نہیں ہے۔ ہوا کے جھونکے اسے ایک طرف سے دوسری طرف اڑائے لیے پھرتے ہیں یہاں تک کہ یہ لوٹنے والوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔''

اس میوزیم میں مینا کماری کا ایک حسین و جمیل پورٹریٹ بھی ہے۔ جس کے آگے ایک باریک اور خوب صورت شیشہ لگا ہوا ہے۔ اس کو آپ ''شیشہ گھر'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس ہال میں ہر طرف آئینے لگے ہوئے ہیں۔ ان آئینوں میں مینا کماری کی مختلف تصاویر کے عکس نظر آتے ہیں۔ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ ان میں مہ جبیں کون ہے۔ ناز کون ہے اور مینار کماری کون سی ہے لیکن یہ ایک ایسا معما ہے جسے زندگی بھر خود مینا کماری بھی حل نہ کر سکی تھی۔

میوزیم میں مینا کماری کی اپنی آواز میں چند اشعار بھی سننے کو ملتے ہیں۔ اسکا عنوان ہے ''قہقہہ''

"ہر مرتبہ جب میں خود کو تلاش کرنے اور جاننے کی کوشش کرتی ہوں۔

مجھے ایک بلند قہقہے کی آواز سنائی دیتی ہے

جیسے کوئی کہہ رہا ہو

دیکھنا۔ تم ایک بار پھر ہار گئیں!

لیجئے۔ مینا کماری کا یہ نیا روپ بھی ملاحظہ کر لیجئے۔

پاکستان اس اعتبار سے بھی خوش قسمت ہے کہ یہاں موسیقی کے شعبے میں اللہ نے ہمیں دو ''نور'' دے رکھے ہیں۔ آپ انہیں ''انوار'' بھی کہہ سکتے ہیں لیکن یہ ایک مشکل لفظ ہے اور دینی اور مذہبی حوالے سے استعمال کیا جاتا ہے اس لیے کوئی صاحب اس پر اعتراض بھی کر سکتے ہیں۔ دیکھیے۔ ایک تو ہمارے ہاں ''نور جہاں'' تھیں بلکہ ہیں اور اپنی آواز کی وجہ سے ہمیشہ رہیں گی۔ دوسری نیرہ نور ہیں۔ نور جہاں کا مطلب ہے دنیا کو روشن کرنے والا۔ نیرہ کا مطلب ہے۔۔۔ ٹھہریئے۔ پہلے یہ بتاتے چلیں کہ نیر سورج کو کہتے ہیں۔ نیر تاباں بھی شاعری میں عام مستعمل ہے۔ نیرہ، نیر کا مونث ہے یعنی لیڈی سورج۔ اس لفظ کو مونث غیر جاندار کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نیرہ نور ڈبل روشنی ہیں۔ اس اعتبار سے کہ ایک تو سورج کی روشنی ہیں، اس پر نور بھی ہیں۔ نور کو عموماً چاند کی روشنی کے حوالے سے استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں ٹھنڈک ہوتی ہے۔ اس کی روشنی سورج کی روشنی کی طرح تپتی ہوئی جلانے والی نہیں ہوتی۔ چاند کی روشنی دھیمی، خنک اور پر سکون ہوتی ہے۔ سورج تیز ہو تو انسان بے چین ہو جاتا ہے۔ چاند کی روشنی کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتی بلکہ آسودگی۔ طمانیت اور سکون فراہم کرتی ہے۔

یہ تمہید دراصل گلوکارہ نیرہ نور کا تذکرہ کرنے کی غرض سے باندھی گئی ہے۔ نیرہ نور کو گلوکارہ بھی نہیں کہہ سکتے لیکن وہ گلوکارہ بھی ہیں اور ایک عدیم المثال گلوکارہ ہیں۔ وہ صاحب طرز ہیں۔ ان کی آواز میں ایک مخصوص انفرادیت ہے۔ مٹھاس کے ساتھ سوز اور عجیب سے ایکسپریشن کی آمیزش ہے۔ ان کی آواز کا موازنہ اگر ناہید اختر اور رونا لیلیٰ کی آوازوں سے کیا جائے تو یہ رونا لیلیٰ کی آواز سے قدرے زیادہ قریب محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود الگ بھی

ہے۔ ناہید اختر اور رونا لیلیٰ کی آوازوں میں جو کھنک، رچاؤ، شوخی، تاثر اور زندگی ہے نیرہ نور کی آواز میں بھی یہ تمام خصوصیات موجود ہیں۔ وہ چاہیں تو پر سوز انداز میں گائیں۔ جی چاہے تو شوخ و شنگ تاثر پیدا کریں۔ ان کی آواز میں گہرائی

ہے اور ایسی پاکیزگی ہے جو کسی اور گلوکارہ کی آواز میں نہیں ہے۔ انکا نغمہ سن کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک عام سی گھریلو سادہ لڑکی گا رہی ہے۔ اس میں پیشہ ورانہ رنگ کی مطلق آمیزش نہیں ہے۔

نیرہ نے نہ تو آغاز ہی سے گائیکی اور موسیقی کی تربیت حاصل کی اور نہ ہی کلاسیکی موسیقی کا ریاض کیا۔ اسکے باوجود وہ بے انتہا سریلی ہیں۔ وہ کوئی بھی گانا گائیں کبھی بے سری نہیں ہوتیں۔ کسی بھی سر تک ان کی رسائی ہے۔ پیشہ ور موسیقاروں اور گلوکاروں کے نزدیک وہ ''عطائی'' ہیں۔ یعنی انہوں نے موروثی طور پر یہ فن حاصل نہیں کیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ ''خاندان'' سے باہر ہیں۔ موسیقی کے کسی گھرانے سے انکا تعلق نہیں ہے۔ دراصل بنیادی طور پر وہ ایک گھریلو خاتون ہیں جسے قدرت نے ایک خوب صورت موثر آواز سے نوازا ہے۔

نیرہ نور کو ہم جانتے بھی تھے اور نہیں بھی جانتے تھے۔ لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں وہ جے بلاک کی جس کوٹھی کے نصف حصے میں رہا کرتی تھیں اس کے بقیہ نصف حصے میں ہماری خالہ اماں کی رہائش تھی۔ یہ وہی خالہ اماں ہیں جنہوں نے ہمیں گیارہ بارہ سال کی عمر میں گود لے لیا تھا اور ہم بھوپال میں اپنے ماں باپ اور بہن بھائی کو چھوڑ کر ان کے پاس میرٹھ چلے گئے تھے۔

یہ بات ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ خالہ اماں ہماری والدہ کی بہنوں میں منجھلی تھیں۔ اس لیے ہماری اماں عموماً انہیں صرف ''منجھلی'' کہہ کر مخاطب کرتی تھیں اور وہ اماں کو ''آپا'' کہا کرتی تھیں۔ دونوں بہنوں میں اتنا پیار تھا کہ یقین نہیں آتا تھا۔ ایسا پیار افسانوں اور ناولوں ہی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ حقیقی زندگی میں اس کا نمونہ کم ہی نظر آتا ہے۔ خالہ اماں بے اولاد تھیں اور ہندوستان کے بڑے بڑے ڈاکٹروں نے تفصیلی چیک اپ کے بعد انہیں بتایا تھا کہ وہ کبھی صاحب اولاد نہ ہوں گی۔

خالہ اماں کو بچوں سے بہت زیادہ انس اور دلچسپی تھی۔ یوں بھی ان کے شوہر ''خالو ابا'' انڈین پولیس سروس میں ایک بڑے افسر تھے اور ان کے تبادلے ملک کی غیر مانوس ناموں والی جگہوں پر بھی ہوتے رہتے تھے۔ نوکروں کی ایک فوج انکی خدمت کے لیے موجود تھی۔ انڈین پولیس کے ایک اعلیٰ ہندوستانی افسر ہونے کے علاوہ خالو ابا صاحب جائیداد بھی تھے جو انہیں ورثے میں ملی تھی۔ وسط ہند میں ریاست بھوپال اور ریاست گوالیار کے مابین ان کی زرخیز زمینیں تھیں جن کی دیکھ بھال ان کے چھوٹے بھائی اور بھتیجے کیا کرتے تھے۔ دہلی اور میرٹھ میں ان کی قیمتی رہائشی جائیداد بھی تھی۔ یہ سب کچھ تھا پھر بھی وہ دونوں بالکل اکیلے تھے۔

منجھلی بہن کی اداسی اور تنہائی کو دیکھ کر ہماری اماں دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھی۔ ایک بار دونوں بہنوں میں یہ سمجھوتا ہوا کہ اب جو بھی اولاد ہو گی وہ پیدا ہوتے ہی خالہ اماں کی گود میں ڈال دی جائے گی۔ اس طرح ہماری بہن انیسہ آپا کی پیدائش جب جنوبی ہندوستان میں ہوئی تھی اماں پہلے ہی وہاں پہنچ گئی تھیں اور خالہ اماں نے پیدا ہونے والے بچے کے خیر مقدم کے لیے تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ لڑکا ہو گا یا لڑکی اس سے پہلے اماں چار بچوں کی ماں بن چکی تھیں جن میں دو لڑکے تھے اور دو لڑکیاں۔ لڑکوں اور لڑکیوں میں ہمارے خاندان میں کبھی امتیاز روا نہیں رکھا گیا بلکہ لڑکیوں کی پیدائش پر زیادہ خوشی منائی جاتی تھی اور ان کی شان دار پذیرائی کی جاتی تھی۔ یہ رواج آج بھی ہمارے گھرانے میں موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں دو بیٹیوں سے نوازا ہے۔ بڑی نادیہ اور چھوٹی سارہ یعنی پارو۔ ان دونوں کی پیدائش پر ہمیں بے انتہا خوشی ہوئی۔ ہماری دعا بھی یہی تھی کہ اللہ ہمیں بیٹی دے۔ بعد میں دوسرے بچے کی پیدائش سے پہلے لبنیٰ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اگر ایک بیٹا پیدا ہو جائے تو بہن بھائی کی جوڑی بن جائے گی لیکن اللہ کو دو بہنوں کی جوڑی بنانا منظور تھا۔

ان دونوں بیٹیوں کی پیدائش گلبرگ کے یونائیٹڈ کرسچین اسپتال (یو۔ سی۔ ایچ) میں ہوئی تھی جو اس زمانے میں شہر کا بہترین اسپتال تھا اور یہاں اس وقت بھی امریکی معالجین موجود تھے۔ ہم شادی سے پہلے اپنی طویل بیماری کے سلسلے

میں کافی عرصے تک یو سی ایچ میں مقیم رہے تھے۔ بعد میں بھی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا جس کے نتیجے میں ایڈمنسٹریٹر اور امریکی ڈاکٹروں سے لے کر اسٹاف کا معمولی رکن تک ہم سے واقف ہو چکا تھا۔ نادیہ کی پیدائش پر نچلے عملے نے نیم دلی سے مبارکباد پیش کی۔ ہم تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ لبنیٰ اور دوسرے اہل خاندان بھی بے حد خوش تھے۔ اسپتال سے رخصت ہوتے وقت کسی نے بخشش طلب نہ کی مگر جب لبنیٰ نے ان کو معقول ''انعام'' دیا تو انہیں عجیب سی ''بے یقین خوشی'' کا احساس ہوا۔

پارو کی پیدائش لگ بھگ چار سال بعد ہوئی مگر عملے کی ہم سے اور لبنیٰ سے شناسائی تھی اور سب کے سب بیٹے کے لیے دعائیں کر رہے تھے۔ جب بیٹے کی جگہ بیٹی پیدا ہوئی تو ماں باپ تو بے حد خوش تھے مگر عملے نے مبارک باد پیش کرنے کے بجائے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے لبنیٰ کو تسلی بھی دی کہ بیگم صاحب۔ غم نہیں کیجئے۔ اللہ نے چاہا تو اگلی بار بیٹا ہوگا۔ پارو (سارہ) انتہائی خوب صورت بچی تھی۔ اس کے نقش و نگار انتہائی تیکھے اور نازک تھے۔ چہرہ گلابی تھا اور ہونٹ سرخ جیسے لپ اسٹک لگا رکھی ہو۔ بال شربتی تھے اور آنکھوں کی رنگت بھی بالکل سیاہ نہ تھی۔ اس کی خوب صورتی کی وجہ سے ہی اسے پیار سے ہم ''پارو'' کہنے لگے جو بعد میں اس کا نام بن گیا۔ شباب کیرانوی اس کو دیکھ کر کہا کرتے تھے ''یار آفاقی۔ نوٹ کر لو۔ تمہاری بیٹی تو بالکل انگریز لگتی ہے''

یہ سب بیان کرنے کا میرا مقصد یہ ہے کہ ماں باپ کے نزدیک بچہ تو بچہ ہی ہوتا ہے۔ ماں کے جگر کا ٹکڑا اور باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک مگر اماں نے بہن کی محبت میں اپنے جگر کا یہ ٹکڑا پیدا ہوتے ہی ''منجھلی'' کی گود میں ڈال دیا۔ اس بچی کی پرورش اور دیکھ بھال خالہ اماں اور آپاؤں نے ہی کی۔ اماں اس خیال سے دور ہی رہیں کہ کہیں خون کی محبت جوش نہ مارے اور وہ اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔

بچی کا نام انیسہ بیگم رکھا گیا۔ اہل خاندان کو علم تھا کہ انیسہ آپا کس کی بیٹی ہیں مگر سب نے اس راز کو ہمیشہ سربستہ راز ہی رکھا۔ انیسہ آپا جب ملتی تھیں تو اماں کو خالہ اماں ہی کہتی تھیں۔ اماں کی کوشش ہوتی تھی کہ ان سے کم سے کم ملاقات ہو تاکہ انسیت زیادہ نہ بڑھے۔ اس کہانی کا افسانوی پہلو یہ ہے کہ انیسہ آپا کو اس حقیقت کا علم اس وقت ہوا جب انکی

شادی کے موقع پر نکاح سے پہلے قاضی اور وکیل صاحب ان کے پاس پہنچے اور ان کا۔۔۔اور ان کے والد کا نام لے کر ان سے شادی کے لیئے رضامندی حاصل کرنی چاہئے۔انیسہ آپا کے لیے یہ غیر متوقع خبر بہت بڑا صدمہ بن گئی اور وہ اتنا روئیں کہ دیکھنے والے پریشان ہو گئے۔عام مہمانوں کا خیال تھا کہ رخصتی کے موقع پر لڑکیاں رویا ہی کرتی ہیں مگر واقفان حال بخوبی جانتے تھے کہ اس کا سبب کیا ہے۔

نیرہ نور اپنے خاندان کے ہمراہ ان ہی خالہ اماں کی کوٹھی کے نصف حصے میں رہا کرتی تھیں۔ہم لاہور آنے کے بعد اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنے لگے تھے۔انیسہ آپا شادی کے بعد دہلی میں ہی مقیم رہیں۔چند بار ملاقات کے لیے ضرور آتی رہیں۔چند سال قبل ان کا دہلی میں انتقال ہو گیا ہے۔

ہم خالہ اماں کے پاس جاتے رہتے تھے۔اخباری مصروفیات کے باعث جب بھی موقع ملتا تھا خالہ اماں کے گھر کا پھیرا ضرور لگتا تھا۔ہمارے گھر سے یہ گھر زیادہ دور بھی نہ تھا۔پیدل جاتے ہوئے مشکل سے تین چار منٹ کا راستہ تھا۔

نیرہ نور کو ہم نے شاید کئی بار دیکھا ہو گا مگر صرف گزرتے ہوئے۔چہرہ شناسا تک نہ تھے اور نہ ہی یہ جانتے تھے کہ۔۔۔

ایسی چنگاری بھی یارب تیرے خاکستر میں ہے۔

پھر ہم فلموں سے وابستہ ہو گئے مگر نیرہ نور سے بے خبر ہی رہے۔وجہ یہ تھی کہ نیرہ نور ایک سیدھی سادی، کم آمیز اور کم گو لڑکی تھیں۔خالہ اماں کے گھر بھی انکی آمدورفت زیادہ نہ تھی۔اللہ نے انہیں بہت خوب صورت آواز سے نوازا تھا مگر انہوں نے موسیقی یا گلوکاری کی کوئی تربیت حاصل نہیں کی تھی۔وہ سن ۷۰ کے اوائل میں لاہور کی معروف درس گاہ این سی اے میں ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کا کورس کر رہی تھیں۔اس زمانے میں تعلیمی درس گاہوں میں اکثر آل پاکستان مقابلے ہوتے رہتے تھے۔جن میں تقاریر اور موسیقی کا مقابلہ بھی شامل تھا۔ نیرہ نور اپنے کالج کی طرف سے موسیقی کے مقابلوں میں حصہ لیتی تھیں اور خوش گلوئی کے باعث انعام بھی حاصل کر لیا کرتی تھیں۔ایسی ہی ایک تقریب میں ٹیلی وژن کے پروگرام منیجر رفیق وڑائچ صاحب کی توجہ انکی طرف منعطف ہو گئی۔ وہ لاہور ٹی وی سے

ایک تفریحی پروگرام پیش کرتے تھے۔انہوں نے نیرہ نور کے بارے میں سن رکھا تھا۔ان کی آواز سنی تو انہوں نے نیرہ نور کو اپنے پروگراموں میں حصہ لینے پر آمادہ کرلیا۔اسی زمانے میں ارشد محمود نے لاہور ٹی وی سے پیش کیے جانیو الے شعیب ہاشمی اور سلیمہ ہاشمی کے پروگراموں ''ٹال مٹول'' اور ''سچ گپ'' کے لیے نیرہ نور کی آواز میں کئی گیت غزلیں اور نظمیں ریکارڈ کیں۔اس طرح نیرہ نور اتفاق سے یا پھر حسن اتفاق سے گلوکارہ کے طور پر دریافت کرلی گئیں۔جس نے انکی آواز سنی مسحور ہو گیا۔

نیرہ محض شوقیہ غزل سرائی کرتی تھیں۔اختری فیض آبادی، بیگم اختران کی آئیڈیل تھیں اور نیرہ کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بیگم اختر کے انداز میں غزل گائیں۔انہوں نے اس رنگ میں بہت سی غزلیں گائیں اور ریکارڈ بھی کرائیں۔

غزل ایک ایسی صنف ہے جو اپنی نغمگی الفاظ کی خوب صورتی اور ان کی ترتیب کی وجہ سے سننے والوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔غزل کو پسند کرنے کے لیے واقفیت بھی ضروری نہیں ہے۔بمبئی میں جب سہراب مودی صاحب نے فلم ''مرزا غالب '' بنائی اور ثریا اور محمد رفیع کی آوازوں میں غالب کی غزلیں پیش کیں تو سارا ہندوستان ہمہ تن گوش ہو گیا۔ہمارے دوست مصنف عزیز میرٹھی ان دنوں بمبئی گئے ہوئے تھے وہاں سے واپس آکر انہوں نے بتایا کہ مرزا غالب دیگر خوبیوں کے علاوہ موسیقی اور غالب کی غزلوں کی وجہ سے بھی بے حد مقبول ہوئے۔

انہوں نے کہا''آفاقی صاحب میں نے غزل کی تاثیر اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔بمبئی کے جس سینما میں، میں نے یہ فلم دیکھی اس کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اکثریت مرہٹہ فلم بینوں کی تھی جن میں سے اکثر غالب کا نام تو کیا اردو بھی نہیں جانتے ہوں گے مگر جب غزل سامنے آتی تھی تو ہال میں سناٹا چھا جاتا تھا۔صرف سانس لینے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں کیونکہ ہر شخص مکمل توجہ اور دلچسپی سے غزل سننے کا خواہش مند تھا۔''

ان غزلوں میں ایسی سادہ غزل بھی تھی

دل ناداں تجھے ہوا کیا

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

لیکن اس کے ساتھ ہی ثریا کی آواز میں یہ غزل بھی پیش کی گئی تھی۔

نکتہ چیں ہے غم دل جس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات کہ جب بات بنائے نہ بنے

غالب کے اس شعر کی بڑے بڑے نقادوں نے بے شمار شرحیں بیان کی ہیں لیکن فلم کے تماشائی اس کے معنی، مطلب سے یکسر بے تعلق ہو کر محض غالب کی غزل کے سحر میں کھو گئے تھے۔

خود نیرہ نور کا کہنا ہے ”غزل میری پسندیدہ صنف ہے۔ کیونکہ یہ سامعین پر بھرپور تاثر چھوڑتی ہے۔ سننے والا فوراً اس سے متاثر ہوتا ہے اور پھر یہ تاثر بہت دیر تک قائم رہتا ہے۔“

لاہور ٹیلی ویژن سے ”سخن ور“ کے عنوان سے ایک موسیقی کا پروگرام پیش کیا جاتا تھا۔ اس میں ایک بار نیرہ نور نے بہزاد لکھنوی کی یہ غزل پیش کی اور سامعین کو بے خود کر دیا

اے جذبہ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے

منزل کی طرف دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے

ایک تو یہ غزل اس پر نیرہ نور کی آواز۔ ہر طرف اس کا چرچا ہو گیا۔

ان ہی دنوں انہوں نے پی ٹی وی کراچی کے ڈراما سیریل ”تیسرا کنارہ“ کے لیے احمد شمیم کی یہ نظم صدا بند کرائی۔

کبھی ہم خوب صورت تھے

حسینہ معین کے لکھے ہوئے اس سیریل میں یہ نظم پس منظر میں مختلف مقامات پر پیش کی گئی۔

نیرہ نور نے ٹی وی کے لیے جو غزلیں اور نظمیں گائیں وہ سب کی سب مقبول ہوئیں۔ اس میں طرزوں کی دلکشی اور نغمات کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ نیرہ نور کی آواز کا بھی بڑا دخل تھا۔

جب انور مقصود نے اپنا مشہور پروگرام سلور جوبلی پیش کیا تو اس کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس پروگرام کے ذریعے نئی نسل کو پرانی فلموں، پرانے فنکاروں اور ہنرمندوں سے متعارف کرایا گیا تھا۔ اس دور کے مقبول ترین گانے نئی آوازوں میں پیش کئے گئے تو پوپ میوزک کے شیدائی نوجوان حیران رہ گئے۔ ان نغموں کی مٹھاس، طرزیں اور راگ راگنیوں کا رچاؤ، دھنوں کی سادگی اور گلوکاری کا اسلوب سب کچھ ان کے لیے نیا انوکھا اور بہت دلکش تھا۔ اس طرح انہیں اپنے ماضی کی خوب صورتیوں اور رعنائیوں کا علم ہوا۔ اس سے پہلے ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی جو کہ بدقسمتی ہی کہی جائے گی۔ کوئی بھی قوم اپنے ماضی کی روایات و اقدار سے رشتہ توڑ کر صحیح معنوں میں ایک باشعور اور پر اعتماد قوم نہیں بن سکتی۔ زندہ اور ترقی یافتہ اقوام اس بات کا خاص طور پر اہتمام کرتی ہیں کہ ماضی اور حال کے مابین رشتہ اور تسلسل قائم رہے لیکن ہمارے ملک کے حکمرانوں، بیوروکریٹس اور جدید روشنی کے دلدادہ مغرب پسند، دانش وروں نے اس کی ضرورت و اہمیت کو محسوس نہیں کیا۔ بہر حال دیر آید درست آید۔

انور مقصود صاحب نے اس بہت بڑی ضرورت کو ''سلور جوبلی'' کے ذریعے پورا کیا۔ اس پروگرام میں پرانے زنانہ اور مردانہ سپرہٹ نغمات آج کی آوازوں میں پیش کئے گئے اور بے حد پسند کئے گئے۔

نیرہ نور نے بھی اس پروگرام میں اپنی آواز کا جادو جگایا۔ خصوصاً خورشید بیگم کا نغمہ۔

گھٹا گھنگور گھور

مور مچائیں شور

میرے سجن آجا آجا۔

جب نیرہ نور نے پیش کیا تو نئے لوگوں کو تو یہ بہت بھایا ہی تھا مگر پرانے زمانے میں خورشید بیگم کی آواز میں یہ نغمہ سننے والے بھی جھوم جھوم گئے۔ نیرہ نور نے یہ نغمہ اس قدر عمدگی سے پیش کیا تھا کہ اس کا تاثر بہت عرصے تک قائم رہا۔

نیرہ نور گلوکارہ نہ ہونے کے باوجود اب ایک معروف اور بہت مقبول گلوکارہ بن چکی تھیں۔ فلمی صنعت کے لوگوں کو عام طور پر نئی صلاحیتوں کی موجودگی کا علم کچھ دیر سے ہوتا ہے۔ جب تک کوئی اپنے آپ کو ہر طرح منوا نہ لے یا کوئی قابل ذکر اور ممتاز فلم ساز و ہدایت کار اس کی خدمت حاصل نہ کر لے ہمارے فلم ساز قطعی بے خبر اور بے نیاز رہتے ہیں مگر جوں ہی کوئی ممتاز ہنر مند کسی اور کو اپنی فلم میں لیتا ہے سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور پھر کامیابی حاصل کرنے کی صورت میں تو بھیڑ چال کی دوڑ شروع ہو جاتی ہے اور سب اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اسے ہر طرح اس قدر مجبور کر دیتے ہیں ایسی ایسی سفارشیں اور ایسے ایسے لالچ دیتے ہیں کہ اس کی مصروفیات میں بے انتہا اضافہ ہو جاتا ہے اور پھر جب اس کے نخرے اور مصروفیات میں بے انتہا اضافہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کا رونا رونے لگتے ہیں کہ دیکھیے فلاں فنکار کس قدر تنگ کر رہا ہے۔

بہر حال۔ فلم والوں کو نیرہ نور کی موجودگی کا احساس ہو گیا اور فلم سازوں نے نیرہ نور کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن نیرہ نور نے گلوکاری کو کبھی ذریعہ معاش یا وجہ شہرت بنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صرف اپنی پسند کے فلم سازوں اور موسیقاروں کے ساتھ ہی کام کرنے پر تیار ہوتی تھیں۔ اسی لیے انہوں نے بہت کم کام کیا حالانکہ ایک زمانے میں نیرہ نور کو ہر فلم ساز اور موسیقار اپنی فلم میں لینے کا خواہش مند تھا لیکن کوئی ترغیب اور لالچ نیرہ نور کے ارادے کو متزلزل نہ کر سکا۔ نیرہ نور نے بہت کم فلموں میں گلوکاری کرنے کی ہامی بھری حالانکہ وہ چاہتیں تو اس وقت مصروف ترین گلوکارہ بن سکتی تھیں۔

نیرہ نور نے ناصر کاظمی اور ابن انشا کا کلام بھی گایا تھا اور یہ نغمات بے حد مقبول ہوئے تھے۔انہوں نے ملی ترانے بھی گائے اور فلمی نغمات بھی گائے۔ان کے گائے ہوئے سبھی نغمات بے حد مقبول ہوئے۔

فلم ''گھرانا'' کا یہ نغمہ ہر ایک کے دل میں اتر گیا تھا۔

تیرا سایہ جہاں بھی ہو سجنا۔

پلکیں بچھا دوں

یا فلم ''پھول میرے گلشن کا'' کا یہ نغمہ

تو ہی بتا پگلی پون

فلم ''پردہ نہ اٹھاؤ'' کا نغمہ

اتنا کبھی نہ چاہو مجھے

فلم ''آئینہ'' کا یہ نغمہ تو جیسے سارے ملک بلکہ بیرون ملک بھی گونجنے لگا تھا۔

روٹھے ہو تم، تم کو کیسے مناؤں پیا۔

اس کے نغمہ نگار کلیم عثمانی اور موسیقار روبن گھوش تھے۔

۱۔ٹوٹ گیا سپنا

۲۔ صبح کا تارا

۳۔آج غم ہے تو کیا

جب ہم نے فلم ''آس'' کا آغاز کیااور بذات خود پہلی باراس کی ہدایت کاری کا بھی فیصلہ کیاتو فلم کے تھیم سانگ کے لیے نثار بزمی صاحب نے نیرہ نور کا انتخاب کیا۔ یہ نغمہ مسرور انور نے لکھا تھا۔ بزمی صاحب نے اس کی طرز بنائی اور ہمیں بے حد پسند آئی۔ یہ وہ نغمہ تھا جو فلم میں بارہا مختلف اوقات میں پیش کیا جانے والا تھا۔

بول ری گڑیا بول ذرا۔

ہم نے نیرہ نور سے رابطہ قائم کیا۔اب فلم اسٹوڈیوز میں ہمارا آمنا سامنا ہو چکا تھا۔ نیرہ ویسے بھی ہمیں جانتی تھیں اور ہم انہیں۔ اس زمانے میں وہ بیماری اور گلے کی خرابی کا عذر پیش کر کے گلوکاری سے گریز کرتی تھیں مگر ہم ان کے گھر پہنچ گئے۔ بڑی عقل سے انہیں رضامند کیا۔ نثار بزمی کا نام سن کر وہ دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئیں۔

ہم نے کہا''آپ ہمارے ساتھ ریہرسل کے لیے تو چلیئے۔ وہاں آپ کی آواز کا بھی پتا چل جائے گا پھر اگر ضرورت پڑی تو ہم اس گانے کی صدابندی ملتوی کر دیں گے۔''

نیرہ نور کو ہم نے اپنی کار میں بٹھایا اور ایورنیو اسٹوڈیوز کی طرف چل پڑے۔ چند ہی لمحے بعد ہم دونوں اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے کہ ہمیشہ سے ایک دوسرے سے واقف ہیں اور بے تکلف دوست بھی ہیں۔ پہلے تو انہوں نے ہم سے پوچھا کہ آخر ہم نے تین سال تک کوئی فلم کیوں نہیں بنائی۔ ہماری فلم ''سزا'' ۱۹۷۰ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ آس کا آغاز ۱۹۷۳ء کے آغاز میں ہوا تھا۔ گویا ہماری آخری فلم اور نئی فلم کے درمیان تین سال کا طویل وقفہ تھا۔ اس زمانے میں پاکستان میں فلم سازی عروج پر تھی۔ کامیاب فلم سازوں نے تو جیسے فلمیں بنانے کی فیکٹریاں لگا رکھی تھیں۔ ایک سال میں دو تین فلمیں بنانا تو مشکل کام ہی نہ تھا۔ ان میں شباب کیرانوی جیسے فلم ساز و ہدایت کار بھی شامل تھے جو سال میں کم از کم تین چار فلمیں ضرور بنا لیتے تھے لیکن اس میں ان کے دونوں بیٹوں نذر شباب اور ظفر شباب کی فلمیں بھی شامل ہوتی تھیں مگر دوسرے معروف ہدایت کار بھی دھڑا دھڑ فلمیں بنانے میں مصروف تھے۔ حسن طارق کی ہر وقت کم از کم ایک یا دو فلمیں سیٹ پر زیر تکمیل رہتی تھیں۔ سید سلیمان کا بھی یہی معاملہ تھا۔

دوسرے فلم سازاور ہدایت کار بھی ایک فلم کی تکمیل کے بعد دوسری فلم کے آغاز میں وقفہ نہیں آنے دیتے تھے۔ ایسے میں اگر ہم جیسا فلم ساز جس کی اولین تین فلمیں کامیاب بھی ہو چکی تھیں آخراس قدرسست کیوں تھا؟

دراصل نیرہ نور ہم سے یہی دریافت کرنا چاہتی تھیں۔ ہم نے انہیں مختصراََ بتایا کہ دراصل ہم فلم سازکے جھنجٹ سے اتنے پریشان ہو جاتے ہیں کہ پھر بے فکری اور سکون سے کام کرنے کے لیے اسکرپٹ لکھنے کو بہتر سمجھتے ہیں اسکرپٹ بھی ہم ایک وقت میں ایک ہی لکھتے تھے اور ایک اسکرپٹ مکمل کرنے کے بعد دوسرا اسکرپٹ لکھنے کی ہامی ذرا دیر سے ہی بھرتے تھے۔

فلم سازی میں طویل تعطل کی ایک وجہ ہم نے انہیں یہ بھی بتائی کہ ہماری صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ کبھی بخار، کبھی ملیریا، کبھی ٹائی فائڈیاکسی اور قسم کا بخار ہم کو گھیر لیتا ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ بخار تو نہیں ہے مگر درجہ حرارت صرف ایک ڈگری بڑھ گیا ہے۔اس کی وجہ سے ہمارے سراور آنکھوں میں ہلکا ہلکا سادرد ہو جاتا تھا۔طبیعت میں اضمحلال پیدا ہو جاتا تھا۔لکھنے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ہر قسم کے ڈاکٹر حکیم ٹیسٹ لینے کے باوجود یہ راز نہیں سمجھ سکے تھے کہ آخر ہمیں یہ معمولی سی حرارت کیوں ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں بھی ہم کام نہیں کر سکتے تھے۔

نیرہ بہت توجہ اور غور سے ہماری باتیں سنتی رہیں۔ان دنوں وہ بھی دبلی پتلی اور نازک اندام تھیں۔

جواب میں ہم نے ان کی مزاج پرسی کی تو انہوں نے بیماریوں کی ایک طویل داستان ہمیں سنانی شروع کردی۔

’’آفاقی صاحب۔کیا بتاؤں۔ میں کچھ کرنے کا ارادہ کرتی ہوں تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے‘‘ پھر طبیعت کی خرابی کی تفصیل بتاتی ہیں۔اس طرح ایک دوسرے کی مزاج پرسی کرتے ہوئے اسٹوڈیوز تک کا سفر بہت آسانی سے کٹ گیا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ ہم کب نیرہ کے گھر سے روانہ ہوئے تھے اور کب اسٹوڈیو پہنچ گئے۔اس دوران میں ہم دونوں نے نہ صرف ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کی بلکہ ضروری طبّی مشوروں کا بھی تبادلہ کیا۔اس طرح پہلی ہی تفصیلی ملاقات میں ہم دونوں کے مابین ایک مضبوط رشتہ قائم ہو گیا۔ یہ بیماریوں کا رشتہ تھا۔

اسٹوڈیو پہنچ کر نیرہ نور اپنی تمام بیماریاں بھول گئیں۔جب نثار بزمی صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی اور گانے کی سچویشن اور کہانی کا مختصر پس منظر انہیں بتایا گیا تو ان کی رہی سہی علالت اور اضمحلال بھی رخصت ہو گیا۔انہوں نے ریہرسل میں زور و شور سے حصہ لیا۔

اس زمانے کے رواج کے مطابق ای ایم آئی اسٹوڈیو میں جا کر تین مکمل ریہرسل کیں اور پھر گانے کی صدابندی بھی کرائی۔انہوں نے ہماری ایک ہی فلم میں گلوکاری کی۔اسکی وجہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ حتی الامکان گلوکاری،خاص طور پر فلموں کے لیے گلوکاری سے احتراز کرتی تھیں حالانکہ ان کے گائے ہوئے فلمی گانے یقیناًان کی شہرت کا اور ان کو ہمیشہ یاد رکھنے کا ایک بہانہ بن گئے ہیں۔

’’بول ری گڑیا بول ذرا‘‘

بہت مقبول ہوا۔اس کی سچویشن کے مطابق اسکو فلم میں کئی بار استعمال کیا گیا تھا اور ہر بار بہت موزوں اور بر محل استعمال ہوا تھا جس نے اس کے لطف کو دوبالا کر دیا۔پھر فلم کے اختتام پر بھی یہی گانا اورلیپ کیا گیا،جب فلم کے ہیرو محمد علی ہوش و حواس سے قطعی بیگانہ ہو چکے ہیں اور عالم بے خودی میں ہیروئن شبنم کی عروسی لباس میں ملبوس لاش کو کاندھے پر رکھ کر سیڑھیوں پر نمودار ہوتے ہیں۔ولن اور ہونے والے دلہا عقیل کو یہ علم نہیں ہے کہ شبنم پہلے ہی زہر کھا کر جان دے چکی ہے جس کی وجہ سے محمد علی ہوش و حواس کھو چکے ہیں۔

برات میں شامل دوسرے لوگ بھی اس حقیقت سے ناآشنا ہیں اور محمد علی کی اس معیوب اور غیر اخلاقی بلکہ مجرمانہ حرکت پر حیران ہیں یا انہیں نفریں کر رہے ہیں۔عقیل (حامد) محمد علی (ناصر) کو رکنے کا حکم دیتا ہے۔بصورت دیگر اسے گولی مار کر ہلاک کرنے کی دھمکی دیتا ہے لیکن محمد علی اس وقت ہوش و خرد کی سرحدیں پار کر چکے ہیں۔ہر سیڑھی پر جب گولی لگتی ہے تو وہ لڑکھڑاتے ہیں لیکن آخری زینے تک پہنچنے سے پہلے ان کے قدم نہیں رکتے۔

’’آس ‘‘ کہنے کو ایک رومانی داستان تھی لیکن اس میں ہماری معاشرتی خرابیاں، انسانی لالچ، خود غرضیاں، انسانی نفسیات

اور بنیادی طور پر عورت ذات کی مجبوریوں اور لاچاریوں کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی جسے اگر ماں باپ کی طرف سے اپنا بر منتخب کرنے کی اجازت دے دی جائے تو دوسری مجبوریاں اسکے پیروں کی زنجیر بن جاتی ہیں۔ایسی لڑکی جو اسکا انتخاب بنتی ہے وہ ایک معمول یا کھلونے کے مانند زندہ رہتی ہے اور اسی طرح مر جاتی ہے۔اسی دوران میں وہ مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔ کئی بار سمجھوتے کرتی ہے۔اپنی اور دوسروں کی خوشیوں کے حصول کے لیے کوشش کرتی رہتی ہے لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس کوشش میں واقعی کامیاب ہوتی ہے۔ بظاہر کامیاب، خوش و خرم اور مطمئن عورتوں کی زندگی کا مطالعہ کریں تو پس پردہ دکھوں، قربانیوں اور سمجھوتوں کی ایک طویل داستان نظر آجاتی ہے۔

’’آس‘‘ میں شبنم کو مرکزی کردار کی حیثیت حاصل تھی حالانکہ کہانی کا مرکزی کردار محمد علی تھے۔دیکھا جائے تو اس کہانی کے اور بھی کئی بنیادی کردار تھے جن کے بغیر کہانی آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور نہ اپنے منطقی انجام تک پہنچ سکتی تھی۔ مثلاً محمد علی کی خالہ، سنتوش رسل، جو ایک مجبور اور بے بس عورت کا مجسم نمونہ تھی۔ جس کی عزیز مرنے والی بہن کے بچوں کو ان کا حق اور گھر میں ان کا جائز مقام دلانے میں ناکام رہی تھی حالانکہ اس گھر کے حالات بدلنے اور ایک معمولی دکان دار کو دولت مند بنانے میں ان ہی یتیموں کی دولت کارفرما تھی۔ ’

’سنتوش رسل‘‘ بھی ایک بے زبان گڑیا کی طرح تھیں پھر شبنم بذات خود اس معاشرے میں عورت کی علامت تھیں۔انہیں دولت مند باپ کا پیار اور اعتماد حاصل تھا۔ بعد میں وہ ایک خود سر اور محبت اور توجہ سے محروم نفسیاتی مریض، محمد علی کو ایک نارمل انسان بنانے اور اس کی محبت حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوگئی تھیں مگر محبت کی مجبوریاں ان کی راہ میں حائل ہوگئیں۔اپنے محبوب محمد علی کی بہن کو اس کی محبت دلانے کے لیے جب انہوں نے قوی کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر آپ نے اس کا ہاتھ نہ پکڑا تو آپکی مریضہ صحت مند اور جاں بر نہ ہو سکے گی تو جواب

میں قوی نے معذرت کا اظہار کیا۔اس بات کا شبنم کو بھی علم تھا کہ ڈاکٹر قوی اس کو پسند کرتا ہے لیکن ہیرو کی بہن فریدہ کو خوشیاں اور نئی زندگی دینے کے لیے یہ ضروری تھا کہ قوی کی اس سے شادی ہو جائے۔

قوی نے اس موقع پر یہ اظہار بھی کر دیا کہ وہ شبنم کو پسند کرتا ہے۔

شبنم کا جواب یہ تھا کہ ضروری تو نہیں ہے کہ جسے پسند کیا جائے،چاہا جائے وہ حاصل بھی ہو جائے۔محبت صرف پانے کا نہیں کھونے کا نام ہے۔

قوی ایک شریف انسان کی طرح اپنی محبت سے دستبردار ہو جاتا ہے تو شبنم اب ایک نئی خواہش کا اظہار کرتی ہے،ان کا اصرار ہے کہ وہ فریدہ سے ضرور شادی کریں۔

قوی کا کہنا ہے کہ آپ کسی اور کو پسند کرتی ہیں مجھے نہیں مل سکتیں۔میں اس حقیقت کو کسی شکوہ شکایت اور تلخی کے بغیر تسلیم کرتا ہوں لیکن یہ تو زبردستی اور ناانصافی ہے کہ میں ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لوں جسے میں پسند نہیں کرتا۔

شبنم پھر قوی کو ایک لیکچر دے کر یہ سمجھاتی ہیں کہ جب انسان کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کی خاطر قربانی بھی دیتا ہے میں چاہتی ہوں کہ میری خاطر آپ فریدہ سے شادی کر لیں۔نہ صرف شادی کر لیں بلکہ اسے ایک اچھے شوہر کی محبت اور توجہ بھی دیں۔اسے کبھی یہ احساس نہ ہونے دیں کہ آپ نے کسی اور کے کہنے پر اس سے شادی کی ہے۔

ڈاکٹر قوی ایک حساس اور ذہین آدمی ہے۔وہ معقولیت کی ہر بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہے۔لیکن شبنم کی یہ ضد اور منطق اسے عجیب سی لگتی ہے بلکہ اسے مضطرب اور مشتعل بھی کر دیتی ہے۔

شبنم کے اس اصرار پر کہ آپ فریدہ سے شادی کر لیں میری خاطر ! قوی رضامند ہو جاتا ہے لیکن ایک شرط پر؟

’’وہ شرط کیا ہے؟‘‘ شبنم دریافت کرتی ہے۔

''میں اس کے جواب میں آپ سے جو بھی مانگوں گا وہ آپ مجھے دیں گی۔''

''ڈاکٹر صاحب! آپ اگر جان بھی مانگیں گے تو انکار نہیں کروں گی۔''

''اور اگر میں اس سے بھی کوئی زیادہ قیمتی چیز مانگ لوں تو؟''

شبنم ہنستی ہے ''جان سے زیادہ قیمتی چیز کیا ہو سکتی ہے؟''

''یہ میں آپ کو وقت آنے پر بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے مجھے آپ کی یہ شرط منظور ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے لیکن ہمارے اس سمجھوتے کی خبر ہم دونوں کے سوا کسی اور کو نہیں ہونی چاہئے۔ فریدہ کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ نے میری سفارش پر اس کو اپنایا ہے۔''

اس عجیب وغریب ''وعدے'' پر یہ سین ختم ہو جاتا ہے ڈاکٹر فریدہ سے شادی کر لیتا ہے۔ محمد علی بھی اپنی بہن کو تندرست اور خوش و خرم دیکھ کر بہت خوش ہے۔ ڈاکٹر باتوں باتوں میں کئی بار شبنم کو یہ بتاتا رہتا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو تمام خوشیاں دی ہیں۔ فریدہ بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ وہ ایک خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔

یہ کہانی کا ایک موڑ تھا جس کے بعد کہانی مرکزی کرداروں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ شبنم محمد علی اور عقیل کی تکون ایک بار پھر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ محمد علی اور شبنم بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ محمد علی اور شبنم نے ایک گھروندا تحفے میں دیا ہے جبکہ شبنم کو محمد علی نے ایک آنکھیں مٹکانے اور ہنسنے بولنے والی گڑیا تحفے میں دی ہے پھر یہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ درمیان ایک طویل عرصہ حائل ہو جاتا ہے جس کے بعد تقدیر ایک بار پھر انہیں ایک دوسرے کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔

محمد علی کو اپنے خالہ زاد بھائی عقیل سے بچپن ہی سے شکایت بلکہ نفرت ہے جو اس کو اور اسکی بہن کو اپنے گھر میں زبردستی کا مہمان سمجھتا ہے۔ ادھر خالو (ننھا) کا یک طرفہ اور جانبدارانہ رویہ ان دونوں کے مابین حائل خلیج کو مزید

وسیع کر دیتا ہے۔ محمد علی کو ہر قدم پر محرومی اور ناانصافی ملتی ہے۔اس طرح ان دونوں کی باہمی ناپسندیدگی ضد اور نفرت کا روپ دھار لیتی ہے۔ عقیل کی خواہش اور عادت ہے کہ وہ کوئی بھی چیز جو محمد علی کو پسند ہے اس سے چھین لینا چاہتا ہے اور اپنے خود غرض باپ کی وجہ سے اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ محبت کرنے والی خالہ اس ناانصافی پر احتجاج کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی۔

کئی غلط فہمیوں اور جھڑپوں کے بعد محمد علی اور شبنم ایک بار پھر ایک دوسرے کے نزدیک آجاتے ہیں۔دونوں نے ایک دوسرے کے دیئے ہوئے تحفے کو ابھی تک سنبھال کر رکھا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بچپن کی دوستی کو انہوں نے فراموش نہیں کیا۔ عقیل کو یہ خوش فہمی ہے کہ وہ دولت مند ہے۔خوب صورت ہے۔اس کا مستقبل زیادہ تابناک ہے اس لیے شبنم پر اس کا حق ہے۔اس کی طلب میں محبت سے زیادہ نفرت اور رقابت کارفرما ہے۔اب وہ جانتا ہے کہ محمد علی اور شبنم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور اسی لیے اس کو یہ ضد ہو گئی ہے کہ شبنم سے اس کی شادی ہونی چاہیئے۔اس مطالبے میں اس کو اپنے باپ کی حمایت بھی حاصل ہے۔

خالہ کو شبنم اور محمد علی کے جذبات کا بخوبی علم ہے۔وہ یہ بھی جانتی ہے کہ محمد علی کو ایک نارمل انسان بنانے میں شبنم کے نفسیاتی علاج اور محبت کا کتنا زیادہ دخل ہے مگر اس کی کمزور آواز کوئی نہیں سنتا لیکن ابھی ایک مضبوط سہارا موجود ہے اور وہ ہے شبنم کا باپ۔ یہ کردار ساقی صاحب نے ادا کیا تھا۔

بیٹی کی شادی کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو ساقی کے سامنے محمد علی اور عقیل میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا سوال ہے لیکن وہ یہ حق اپنی بیٹی کو منتقل کر دیتا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ شبنم کی رائے کو اس بارے میں فوقیت حاصل ہو گی۔ محمد علی ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہر گیا ہوا ہے اور ان تمام مسائل سے بے خبر ہے مگر شبنم کی محبت میں سرشار ہے۔ شبنم نے اس کو سمجھایا ہے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ اور ذہین آدمی ہے۔اسے اپنا وقت اور زندگی بلاوجہ ضائع کرنے کے بجائے ایک کامیاب انسان بننا چاہیئے تاکہ جب وہ شبنم کے باپ سے اس کا ہاتھ مانگے تو انکار کی گنجائش نہ ہو۔

محمد علی یہ "آس" لے کر ملازمت پر جاتا ہے اور اسکو یقین ہے کہ اب اس کی اور شبنم کی راہ میں کوئی دیوار حائل نہ ہو گی۔

اور بظاہر صورت حال بھی یہی ہے۔

لیکن تقدیر ایک جانب کھڑی مسکرا رہی ہے۔

ڈاکٹر قوی کی بیوی جب ایک روز اسکو یہ خوش خبری سناتی ہے کہ اسکی بہترین سہیلی شبنم کی شادی ہو رہی ہے اور یہ فیصلہ شبنم پر چھوڑ دیا گیا ہے تو ڈاکٹر یک لخت سوچ میں پڑ جاتا ہے۔

فریدہ خوشی کے عالم میں بہت کچھ کہہ رہی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ میں جانتی ہوں کہ باجی کا فیصلہ میرے بھیا کے حق میں ہی ہو گا۔ وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ بھیا کو نئی زندگی بخشنے میں باجی کا بہت نمایاں ہاتھ ہے۔

فریدہ مگن ہو کر بولے جا رہی ہے مگر ڈاکٹر کچھ نہیں سن رہا۔ اس کا ذہن کسی اور طرف چلا گیا ہے۔ اسے پرانی باتیں یاد آ رہی ہیں اور پرانے زخم تازہ ہو کر دکھ دینے لگے ہیں۔

بیوی کو بولتا ہوا چھوڑ کر وہ ایک دم گھر سے رخصت ہو جاتا ہے اور سیدھا شبنم کے گھر کا رخ کرتا ہے جو اس وقت اپنے گھر میں اکیلی ہے۔ وہ حسب معمول خوشگوار موڈ میں قوی کا خیر مقدم کرتی ہے اور فریدہ کی خیریت دریافت کرتی ہے۔ ڈاکٹر اسے بتاتا ہے کہ فریدہ اس بات کی گواہ ہے کہ میں نے اسکو کبھی معمولی سی شکایت کا موقع بھی نہیں دیا۔

شبنم ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ اس نے اپنے وعدے کا پوری طرح پاس کیا ہے۔

ڈاکٹر اس سے کہتا ہے "اب وعدہ نبھانے کی تمہاری باری ہے۔"

پھر وہ شبنم کو وہ شرط یاد دلاتا ہے۔

شبنم مسکراتی ہے اور کہتی ہے ”ڈاکٹر صاحب مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ مانگئے آپ کیا مانگنا چاہتے ہیں؟“

ڈاکٹر کہتا ہے ”تمہاری شادی کی بات چیت چل رہی ہے۔ اور تمہیں (ناصر) محمد علی اور حامد (عقیل) میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ناصر کی بجائے حامد سے شادی کرو۔“ شبنم حیران رہ جاتی ہے "ڈاکٹر صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بچپن سے ناصر کو پسند کرتی ہوں۔"

' ڈاکٹر قوی کا لہجہ ایک دم بدل جاتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک طنزیہ اور انتقامی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے ”میں بھی بچپن سے کسی اور کو پسند کرتا تھا اس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر تم نے مجھے فریدہ سے شادی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔“

وہ کہتی ہے ”مگر ڈاکٹر صاحب ناصر اور میں۔۔۔“

وہ بات کاٹ دیتا ہے ”میں جانتا ہوں مگر تمہی نے تو کہا تھا کہ محبت صرف پانے ہی کا نہیں کھونے کا بھی نام ہے اور محبت کی خاطر قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ تم نے کتنی آسانی سے کہہ دیا تھا اور اپنی بات منوا بھی لی تھی۔ دوسروں کو مشورہ دینا بہت آسان ہے مگر جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو۔ میرے کہنے کے مطابق حامد سے شادی پر رضامندی کا اظہار کر دو۔“

ڈاکٹر جاتے ہوئے چھپے لفظوں میں یہ دھمکی بھی دے دیتا ہے کہ اگر شبنم نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو ”وہ بھی اپنے وعدے سے آزاد ہو جائے گا۔“

اسطرح شبنم جیتی ہوئی بازی ہار جاتی ہے۔ ایک طرف محبت ہے اور دوسری طرف فریدہ کی زندگی اور خوشیاں پھر وعدے کا پاس بھی ہے۔ مگر ناصر کا کیا ہو گا جو اسکے وعدے کی آس پر ایک نئی زندگی شروع کر رہا ہے اور جسے زندگی میں پہلی بار محبت توجہ اور خلوص ملا ہے؟

یہ ایک جذباتی کشمکش کا مرحلہ تھا اور کہانی کا اہم ترین موڑ۔

بالآخر شبنم باپ کو حامد کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ سنادیتی ہے۔ حامد، فریدہ، خالو یہاں تک کہ خود شبنم کا باپ اس فیصلے پر حیران رہ جاتے ہیں۔ خود حامد کو بھی یقین نہیں آتا کہ یک لخت پانسا اس کے حق میں کیسے پلٹ گیا؟

ناصر (محمد علی) کو اس بات کا علم ہوتا ہے تو وہ اس کو سراسر بے وفائی، فریب اور شبنم کا لالچ تصور کرتا ہے جس نے محض دولت کی خاطر حامد کو اس پر ترجیح دی ہے۔ غلط فہمیاں بڑھتی رہتی ہیں مگر شبنم چپ ہے۔ وہ ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہیں نکالتی۔ وہ دونوں سے کیے ہوئے وعدوں کو نبھانا چاہتی ہے مگر بے وفائی کی مرتکب بھی نہیں ہونا چاہتی اور اپنے منہ پر لگی ہوئی مہر بھی نہیں کھولنا چاہتی۔ اسکا واحد حل اس کے نزدیک صرف ایک ہی رہ جاتا ہے وہ دلہن تو بن جاتی ہے مگر شادی سے پہلے زہر کھا کر جان دے دیتی ہے۔

لوگ پوچھتے تھے اور آج بھی پوچھتے ہیں کہ ''آس'' میں ولن کون تھا۔ خالو، حامد یا قوی؟ دیکھا جائے تو آخر میں ولن ڈاکٹر ہی ثابت ہوتا ہے جس نے جمی جمائی بازی الٹ دی تھی۔ کیا وہ سنگ دل اور خود غرض تھا؟ منتقم مزاج تھا؟ کم ظرف تھا؟ اسنے ایک بہت غلط حرکت کی تھی؟

اس کی جگہ ہو کر سوچئے تو وہ بھی حق بجانب نظر آتا ہے۔

دراصل ''آس'' کی کہانی ایک انتہائی پیچیدہ اور انسانی جذبوں، احساسات اور نفسیات کی کہانی ہے۔

لیکن خلاصہ پھر وہی ہے عورت گڑیا کی مانند ایک بے زبان اور خاموش کھلونا۔ جس طرح شبنم کی گڑیا نہیں بول سکتی تھی اسی طرح شبنم نے بھی زہر کھا کر جان دے دی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔

فلم کے آخری منظر میں اس گانے کے بول اوور لیپ ہوتے ہیں اور کیمرا بلندی سے آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا نیچے فرش پر پڑی ہوئی ناصر اور شبنم کی لاشوں پر اور پھر شبنم کے کلوزاپ پر جاتا ہے تو اس وقت پتا چلتا ہے کہ ''گڑیا بھی شبنم کے ہاتھ میں تھی۔ دونوں خاموش تھیں اور نیرہ نور کی آواز گونج رہی تھی۔

بول ری۔ گڑیا بول ذرا۔

لیجئے بات نیرہ نور سے چلی تھی اور فلم ''آس'' کی کہانی کا ذکر درمیان آگیا۔ اسکا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ابھی دو روز قبل ایک صاحب ہم سے ملنے کے لیے آئے۔ اب یہ امریکا میں مقیم ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں فلمیں دیکھتے رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اس زمانے میں فلمیں دیکھنا ان سب کا مرغوب ترین مشغلہ تھا پھر انہوں نے ہماری فلموں کا ذکر چھیڑ دیا۔

پوچھنے لگے ''آپ نے جتنی فلمیں خود بنائی ہیں ان میں آپ کے نزدیک سب سے اچھی فلم کون سی ہے؟''

ہمارے جواب دینے سے پہلے ہی وہ بول پڑے ''مجھے سب سے زیادہ ''آس'' پسند آئی تھی جو میں نے کئی بار دیکھی۔ اس کے گانے اور مکالمے مجھے آج تک یاد ہیں۔ ان دنوں ہم سب دوست آپس میں یہ بحث کیا کرتے تھے کہ ''آس'' میں ولن کون ہے؟

اس طرح بات سے بات نکلتی رہی۔ نیرہ نور اور ان کے حوالے سے فلم ''آس'' کے نغمے کا ذکر آیا تو پرانی یادیں اور باتیں ایک بار پھر تازہ ہو گئیں''

نیرہ نور سے ہماری باقاعدہ ملاقاتیں بہت کم ہوئی ہیں لیکن جب بھی آمنا سامنا ہوا یا بات چیت کا موقع ملا تو یوں محسوس ہوا جیسے ہم بہت قریبی دوست یا رشتے دار ہیں۔ انہوں نے کبھی اجنبیت اور غیریت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ نہ جانے کیوں نیرہ بھی ہمیں ہمیشہ اپنی اپنی سی ہی لگی ہیں۔

نیرہ نور کی شادی شاہ نواز زیدی صاحب سے ہوئی تو ہم اس میں شریک نہیں تھے۔شاہ نواز کے عم زاد میرٹھ میں ہمارے کلاس فیلو تھے اور اتنا میل جول تھا کہ ہمیں ایک ہی خاندان کا گمان گزرتا تھا۔اس حوالے سے شاہ نواز بھی ایک طرح ہمارے دوست اور عزیز ہی ہو گئے۔نیرہ نور سے ان کی شادی کے بعد ہم نے بعض محفلوں میں جب ان دونوں کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔شاہ نواز کی کوشش ہوتی کہ وہ اسٹیج کے بالکل نزدیک بلکہ سامنے بیٹھیں تاکہ نیرہ نغمہ سرا ہوں تو انہیں دیکھتے ہی رہیں اور سنتے ہی رہیں۔اس محفل میں اگر کوئی شخص والہانہ اور مسحور کن انداز میں نیرہ کو دیکھتا اور سنتا ہوا نظر آتا ہے تو وہ شاہ نواز زیدی ہوتے ہیں۔کسی کو یقین نہیں آتا کہ یہ شخص جو اس قدر انہماک سے ٹکٹکی لگائے انتہائی انہماک،استغراق اور شوق کے عالم میں نیرہ نور کو دیکھ اور سن رہا ہے وہ ان کا شوہر ہے اور یہ دونوں ایک ہی گھر میں ہوتے ہیں۔شاہ نواز زیدی کو تخلیقی فنون ورثے میں ملے ہیں وہ مصور بھی ہیں۔غالباً شاعری بھی کرتے ہیں لیکن بے قاعدہ،بہت اچھے منتظم اور اس سے بھی زیادہ شائستہ اور خلیق انسان ہیں۔

ان کا ایک اور جوہر اس وقت کھلا جب انہوں نے ٹیلی ویژن کے چند ڈراموں میں اداکاری کی اور اپنی فطری اور بے ساختہ اداکاری سے دیکھنے والوں کو حیران کر دیا۔مگر جس طرح گلوکاری نیرہ نور کا محض شوق اور جز وقتی مشغلہ ہے اسی طرح اداکاری شاہ نواز زیدی کا شوق اور جزوی مشغلہ ہے اگر وہ باقاعدہ اداکاری کریں تو بہت سے سکہ بند جگادری اداکاروں کو پیچھے چھوڑ دیں۔مگر یہ دونوں من موجی اور درویش صفت لوگ ہیں۔نہ پیسے کا لالچ ہے نہ شہرت کی تمنا اپنی پسند،مرضی اور شوق سے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔

کچھ دن قبل یکایک ہمیں ٹیلی فون پر نیرہ نور سے بات کرنے کا موقع ملا۔وہ کافی عرصے سے کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔دراصل کراچی میں ہماری خاتون رپورٹر ان کا فیملی فیچر بنانا چاہتی تھیں مگر ہزار کوشش کے باوجود یا تو نیرہ نور سے رابطہ نہیں ہوتا تھا یا پھر وہ مصروفیت کا عذر کر کے ''آئندہ'' کی مہلت لے لیا کرتی تھیں۔ہم نے ان خاتون سے نیرہ کا ٹیلی فون نمبر حاصل کیا۔ٹیلی فون ملایا تو خود نیرہ نے ہی ریسور اٹھایا۔ہم نے علیک سلیک کے بعد باتیں شروع کر دیں۔ وہ بھی اس طرح مخاطب تھیں جیسے کہ ہم دونوں روزانہ ملتے ہیں یا ٹیلی فون پر بات چیت کرتے ہیں۔

ہم نے ان سے شکوہ کیا کہ قدرت نے انہیں اتنی اچھی آواز اور گلوکاری کی فطری صلاحیت عطا کی ہے مگر وہ اسکو اہمیت نہیں دے رہیں جو کہ ''کفران نعمت'' کے زمرے میں آتا ہے۔

وہ ہنسیں اور بولیں '' کیا کروں۔ فلموں میں اب گانوں کی گنجائش نہیں ہے۔ معقول فلمیں بھی نہیں بنتی ہیں''

پھر پرانے دنوں کی یادیں تازہ کرنے لگیں۔ انہوں نے فلموں کے لیے جو مقبول گیت گائے تھے وہ ہم دونوں کو یاد تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اب وہ سنجیدگی سے گلوکاری کی طرف توجہ دے رہی ہیں اور کچھ البم تیار کرنے میں مصروف ہیں۔

ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ لتا منگیشکر کی ''گیتا نجلی'' کے انداز میں معروف گلوکاروں کے مقبول گیتوں اور غزلوں کو اپنی آواز میں اور ان ہی پرانی دھنوں میں دوبارہ ریکارڈ کیوں نہیں کرتیں؟ یہ خیال انہیں پسند آیا۔ ممکن ہے ہمارا دل رکھنے کے لیے انہوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا ہو لیکن انہوں نے ہم سے وعدہ کیا کہ وہ اس مشورے کو ضرور عملی جامہ پہنائیں گی۔

نیرہ نور موسیقی اور گائیکی کے ایک ایسے زیر زمین پوشیدہ ذخیرہ کی طرح ہیں جسے پوری طرح دریافت کر کے باہر نکالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ جس طرح پاکستان زیر زمین معدنیات کی بے پناہ دولت سے مالا مال ہے لیکن بدقسمتی سے یہ بے بہا خزانے ابھی تک زمین ہی میں دفن ہیں۔ انہیں برآمد کر کے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اسی طرح نیرہ نور کی آواز موسیقی کی دولت سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ اس میں زیادہ قصور خود نیرہ نور کا بھی ہے۔ انہوں نے اپنے اس فن اور ہنر کو ''گھر کی مرغی دال برابر'' سمجھ کر نظرانداز کر رکھا ہے۔

ہر گلوکارہ اور فنکارہ کے گانے کا انداز جدا ہوتا ہے۔ کوئی گلوکار گاتے ہوئے بولوں اور موسیقی کے سروں میں خود بھی گم ہو جاتا ہے اور دیکھنے والے کو نظر آتا ہے کہ وہ خود بھی اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا ہے۔ کچھ گلوکار ہاتھوں

اور شانوں کی حرکت سے ادائیگی کرتے ہیں مگر بعض ایسے بھی ہیں جن کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے خالی ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی اور نغمہ سرا ہے۔ان کا اس نغمے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس سلسلے میں مختلف گلوکاروں کے انداز کا تذکرہ بہت طویل ہو جائے گا لیکن نیرہ کے حوالے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا انداز کسی حد تک لتا منگیشکر سے ملتا ہے۔ لتا بھی گانا گاتے ہوئے سپاٹ اور بے تاثر چہرے کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ اسی طرح نیرہ نور کے چہرے پر بھی گانا گاتے وقت تاثرات نظر نہیں آتے۔ اب کچھ عرصے سے وہ بعض اوقات مشکل جگہوں پر ہاتھوں اور چہرے سے تاثرات کا اظہار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں مگر مجموعی طور پر وہ گاتے ہوئے کسی خاص اور بھرپور تاثر کا اظہار نہیں کرتیں۔ البتہ بعض مقامات پر ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ کسی کرب سے گزر رہی ہیں۔ جب سے انہوں نے عینک لگانی شروع کی ہے تو وہ گلوکارہ سے زیادہ ٹیچر نظر آتی ہیں۔ لتا کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔

نیرہ کے تازہ نغمات نہ ہونے کے برابر ہیں اور ٹیلی ویژن، ریڈیو والے ان کے پرانے نغمات سے ہی کام چلا رہے ہیں جیسا کہ ہم نے ان سے بھی کہا تھا اس خداداد اور بے بہا سرمائے کے استعمال کے سلسلے میں کنجوسی سے کام لینا کسی طور بھی مناسب نہیں ہے مگر لوگوں کو تو ان کے نغمات کی ضرورت ہے نا۔ بعض پہلوان اپنی طاقت سے بے خبر ہوتے ہیں یہی حال نیرہ نور کا بھی ہے وہ اپنی آواز کی طاقت اور صلاحیتوں کی فراوانی سے بے خبر ہیں جو کہ ہم سب کے لیے نقصان دہ ہے ۔

لیجئے۔ ہمیں یاد آیا کہ نیرہ نور نے ہماری ایک اور فلم ”اجنبی“ کے لیے بھی ایک ہلکا پھلکا گیت ریکارڈ کرایا تھا جو بابرہ شریف اور قوی پر فلمایا گیا تھا۔ نثار بزمی ہی اس فلم کے بھی موسیقار تھے اور گانے کا مکھڑا تھا۔

ذرا نبض دیکھ کر

سچویشن یہ ہے کہ بابرہ شریف قوی سے محبت کرتی ہیں۔ وہ ایک ڈاکٹر ہیں لیکن بچپن ہی سے چپکے چپکے دیبا کو پسند کرتے ہیں۔ ''اجنبی'' کی کہانی بھی دراصل ایک تکون ہے۔ محمد علی، قوی اور دیبا بچپن ہی سے ساتھ کھیل کر جوان ہوئے ہیں۔ دیبا کا کردار آغاز میں ٹام بوائے قسم کا ہے۔ تینوں میں بہت گہری دوستی ہے۔ قوی اور محمد علی دونوں دیبا کے دوست ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں۔

دیبا کا یہ حال ہے کہ وہ بے دھڑک مردانہ کھیل کھیلتی ہیں۔ کبڈی کے ایک میچ کو ہم نے ایک گانے کی سچویشن بھی بنایا تھا جس میں دیبا بھی ''کبڑی کبڑی'' کھیلتی نظر آتی ہیں۔ دراصل اس فلم میں بہت سی ایسی انوکھی باتیں تھیں جو اس وقت فلم بینوں کے لیے قبل از وقت تھیں۔ کئی اعتبار سے ہم نے اس فلم میں تجربے کئے تھے۔ اس کی روداد ہم پہلے بیان کر چکے ہیں دوبارہ دہرانے کا محل نہیں ہے یہ بھی ایک نفسیاتی قسم کی کہانی تھی۔ ہر کردار اپنی نفسیاتی الجھنوں اور خواہشات کے پھندوں میں الجھا ہوا تھا۔

بہرحال۔ بابرہ شریف قوی کو پسند کرتی ہیں اور ہلکے پھلکے انداز میں ان سے کہتی ہیں کہ ذرا میری نبض دیکھ کر بتایئے کہ مجھے کیا بیماری ہے۔ یہ گانا ''آس'' کے گانے سے یکسر مختلف تھا مگر نیرہ نور نے بہت عمدگی سے گایا تھا۔ ان کے گائے کچھ فلمی گیت یہ ہیں۔

۱۔ موسم تو دیوانہ ہے (فلم دوساتھی)

۲۔ تیرا پیار بن کے آئے (فلم بھول)

۳۔ ایک اجنبی چہرے (فلم باغی)

۴۔ پھول بن جاؤں گی (فلم قسمت)

۵۔ کچھ لوگ محبت کا صلہ (فلم گمراہ)

اس کے علاوہ اور بھی فلمی گانے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ نیرہ نور کے فلمی گانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ بد قسمتی ہے اب تو نہ وہ فلمیں ہیں جن میں گانوں کی سچویشنز کے مطابق گانے بنائے جاتے تھے اور نہ ہی وہ فلم ساز اور ہدایت کار رہے۔ نہ وہ ماحول رہا۔ اس لیے یہ توقع رکھنالا حاصل ہے کہ نیرہ نور ایک بار پھر فلمی گانے گائیں گی لیکن موسیقی کے دوسرے میدان تو کھلے ہیں۔

ہم تو سمجھتے تھے کہ گلوکارہ مالا کو سب ہی بھول چکے ہیں۔ مالا ایک زمانے میں پاکستان کی ممتاز گلوکاراؤں میں شمار ہوتی تھیں۔ سانولی، سلونی، بوٹا سا قد (یعنی قدرے چھوٹا) بھرا بھرا جسم جو بعد میں گول مٹول ہو گیا تھا۔ دلکش نقش و نگار۔ ان کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز ان کی آنکھیں تھیں۔ ہم کبھی یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ان کی آنکھوں کا رنگ سیاہ تھا یا براؤن۔ ان کی آنکھیں بہت بڑی بڑی بھی نہیں تھیں مگر ان میں ایک عجیب سا تاثر موجود رہتا تھا۔ کبھی مسکراتی ہوئی شوخ، کبھی سوچتی ہوئی فکر مند کبھی اداس اور غمگیں، کبھی مایوس۔ زندگی کے آخری دنوں میں مایوسی کا تاثر ہی ان کی آنکھوں میں اکثر و بیشتر نظر آتا تھا کیونکہ زندگی نے ایک مختصر عرصے تک خوشیاں اور کامرانیاں دینے کے بعد ان کی طرف سے منہ موڑ لیا تھا۔ زندگی میں انہیں بہت زیادہ مایوسیاں اور محرومیاں ملی تھیں۔ محبت میں ناکامیاں، خواہشات کی بلندیاں مگر ہمتوں کی پستیاں، جب فلم ساز عاشق بٹ سے ان کی شادی ناکام ہو گئی تو وہ سچ مچ مرقع حزن و ملال بن کر رہ گئی تھیں پھر تقدیر اور خوشیوں کی طرح صحت نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ اکثر بیمار رہنے لگیں حالانکہ وہ اپنی بیماری کا تذکرہ کرنا پسند نہیں کرتی تھیں مگر سب جانتے تھے کہ وہ کئی امراض میں مبتلا ہیں۔

مالا کی بہن شمیم نازلی ان کی سدا کی ساتھی، غم گسار، سہیلی، مشیر اور تسلی دینے والی ہستی تھیں۔ انہوں نے مالا کے آغاز کے دنوں میں بھی ان کی رہنمائی کی تھی۔ انہیں آگے بڑھانے میں ہاتھ بٹایا تھا۔ مفید مشورے دیے تھے اور ایک لحاظ سے وہ ان کی استاد اور بزنس منیجر بھی تھیں۔ وہ ہر وقت مسکراتی اور ہنستی رہتی تھیں۔ پہلے تو عادتاً لیکن بعد میں غالباً مالا کا حوصلہ بڑھانے کے لیے۔ اگر شمیم نازلی کا ساتھ اور حوصلہ افزائی نہ ہوتی تو شاید مالا اس سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئی ہوتیں۔

مالا کا ذکر اس حوالے سے آیا کہ لندن سے ایک خاتون نے فون کر کے دریافت کیا کہ مالا کی تاریخ پیدائش کیا تھی اور انہوں نے سب سے پہلے فلمی گانا کب گایا تھا؟ چند سال قبل بھی ہمیں جرمنی سے ایک دن اچانک ٹیلی فون موصول ہوا تھا اور ایک خاتون نے (جن کا نام غالباً شہناز تھا) یہ دریافت کیا تھا کہ مالا کی صحیح تاریخ پیدائش کیا ہے اور وہ کہاں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا تعلق وائس آف جرمنی سے تھا اور وہ مالا کے بارے میں ایک پروگرام پیش کرنا چاہتی تھیں۔ ہمیں یہ سن کر خوشی بھی ہوئی اور دکھ بھی ہوا۔ خوشی اس لیے کہ کسی نے تو مالا کو یاد رکھا اور وائس آف جرمنی سے ایک پروگرام میں انہیں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ دکھ کا سبب یہ تھا کہ اس وقت پاکستان میں مالا کو لوگ بھول چکے تھے۔ نہ کبھی کسی محفل میں ان کا ذکر ہوتا تھا نہ اخباروں اور جرائد میں ان کا تذکرہ ہوتا تھا۔ ریڈیو سے شاید ان کا کوئی بھولا بسرا گیت سنایا جاتا ہو مگر ٹیلی ویژن والوں نے جیسے مالا کا بائیکاٹ ہی کر دیا تھا۔ کسی پروگرام میں مالا کا ذکر نہ ان کے بارے میں کوئی پروگرام۔ نہ مالا کا کوئی نغمہ پیش کرنے کی ضرورت کبھی محسوس کی گئی۔

فلم ''عندلیب'' میں مسرور انور صاحب کا لکھا ہوا ایک نغمہ میڈم نور جہاں کی آواز میں بہت مقبول ہوا تھا۔

کوئی یوں بھی روٹھتا ہے

مانا مری خطا ہے

مگر اب معاف کر دو

جب کبھی بھی مالا کے حوالے سے یہ نغمہ بہت یاد آتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مالا یہ بول ادا کر رہی ہیں اور شکوہ کر رہی ہیں کہ

کوئی یوں بھی بھولتا ہے؟

ان خاتون نے اپنا نام نہیں بتایا۔نہ ہم نے دریافت کیا۔انہوں نے اتنا بتایا کہ وہ مالا کے بارے میں ایک پروگرام بی بی سی سے پیش کرنا چاہتی ہیں۔ ہمیں معاً وہی خیال دوبارہ آیا کہ دیار غیر میں تو مالا کو یاد کیا جارہا ہے لیکن خود اپنے ملک میں کوئی مالا کا نام تک نہیں لیتا۔

جرمن خاتون نے بتایا تھا کہ انہوں نے ''سر گزشت'' میں مالا کے بارے میں ہماری مفصل تحریر پڑھی تھی مگر اب یہ پرچہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ادھر ہمارا اب یہ حال ہو چکا ہے کہ جو بھی ہم لکھ دیتے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے ایک بوجھ ہمارے ذہن پر سے اٹھ گیا ہے اور ہم بری الذمہ ہو گئے ہیں پھر اس بارے میں تفصیلات ہمارے ذہن میں نہیں رہتیں۔شاید اس خیال سے کہ کہاں کہاں تک کون کون سی باتیں یاد رکھیں۔آخر دماغ ہے کمپیوٹر تو نہیں ہے جس طرح کمپیوٹر وائرس کی وجہ سے اس میں موجود مندرجات غائب ہو جاتے ہیں اسی طرح کبھی کبھی وقتی طور پر ہمارے ذہن سے بھی کوئی نام کوئی جگہ یا کوئی تاریخ یک دم غائب ہو جاتی ہے۔کوشش کے باوجود یاد نہیں آتا۔پھر شکر ہے کہ کچھ دیر بعد خود بخود یاد آجاتا ہے۔ہم اس وقت سے ڈرتے ہیں جب بھولا ہوا ہمیں یاد ہی نہ آئے۔اللہ رحم کرے۔

بہرحال۔ہم نے ان سے عرض کی کہ وہ ہمیں اگلے روز فون کریں۔ہم اپنے دماغ پر زور ڈالیں گے یا کسی سے دریافت کریں گے۔

وہ بولیں ''آپ'' سر گزشت'' کے ریکارڈ دیکھ کر بتا سکتے ہیں۔''

اب ہم انہیں کیا بتاتے بات یہ ہے کہ ''سر گزشت'' کے تمام شمارے ہمارے پاس موجود تو ہیں لیکن کسی ترتیب سے نہیں ہیں۔وجہ یہ ہے کہ ہم تو ترتیب سے رکھ دیتے ہیں مگر مختلف حضرات و خواتین کو جب بھی ضرورت پڑتی ہے یا شوق دامن گیر ہوتا ہے تو وہ بلا تکلف کوئی شمارہ اس میں سے نکال لیتے ہیں اور پھر جس جگہ چاہیں رکھ دیتے ہیں۔بعض اوقات اپنے ہمراہ بھی لے جاتے ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایسا نہ ہوا اور تمام پرچے ترتیب سے رکھے ہوں تب بھی ''فلمی الف لیلہ'' میں شائع ہونے والے مندرجات کی نہ تو کوئی فہرست ہے نہ کوئی کیٹلاگ اور ہو بھی کیوں کر۔ کوئی واقعہ کسی ترتیب سے نہیں لکھا گیا ہے جس کا تذکرہ شروع ہوا اس کے بارے میں لکھ دیا۔ ہمیں خود یاد نہیں رہتا کہ کون سے شمارے یا کون سی قسط میں کس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک عجیب بد نظمی کا عالم ہے۔ بہر حال جو بھی ہے سو ہے لیکن خود ہمارے لیے یہ معلوم کرنا کارے دارد ہے کہ کس کس شمارے میں ہم نے کس کس شخصیات کے بارے میں لکھا ہے۔

ان کا فون بند ہونے کے بعد ہمیں خیال آیا کہ فلمی الف لیلہ میں شائع ہونے والی ممتاز اور قابل ذکر ہستیوں کی تصویر بھی پس ورق پر شائع کی جاتی ہے لیکن رسائل کے اس ڈھیر میں سے ایک تصویر تلاش کرنا بھی بہت مشکل کام ہے۔ لہٰذا ہم نے ایسی موثر ترکیب استعمال کی جو ایسے مواقع پر کرتے ہیں یعنی اپنی بیگم لبنیٰ سے درخواست کی کہ پلیز وہ مالا کی تصویر والا پرچہ نکال دیں۔

''اور اگر مالا کی تصویر شائع ہی نہیں کی گئی ہو تو؟'' انہوں نے سوال کیا۔

ہم لاجواب ہو گئے۔ صرف اتنا کہا کہ کوشش کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ خوش قسمتی سے یہ پرچہ بہت جلد دستیاب ہو گیا۔ جب ہم دفتر سے واپس گھر پہنچے تو یہ پرچہ میز پر سامنے رکھا ہوا تھا۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو ہم سوچتے ہیں کہ بیوی کس قدر کارآمد ہستی ہوتی ہے اور کیسے کیسے وقت میں کام آتی ہے۔

مالا کے بارے میں ہم نے اپنا مضمون پڑھا تو مطلوبہ معلومات حاصل ہو گئیں جو ہم نے ایک کاغذ پر نوٹ کر لیں اور جب دور دیس سے ان کی فون کال دوبارہ موصول ہوئی تو ہم نے انہیں بتا دیا۔ آپ کو بھی اس خیال سے بتا رہے ہیں کہ شاید آپ کو بھی کبھی مالا کی یاد آتی ہو اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی خواہش دل میں ہوتی ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر بھی یہ ضروری ہے کہ آپ مالا کو یاد کریں اور ان کے بارے میں آگاہ ہوں کہ ۶۰ کی دہائی میں مالا پاکستان میں کس قدر مصروف، مقبول اور معروف گلوکارہ تھیں۔

مالا فیصل آباد (سابق لائل پور) میں ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا نام نسیم بیگم تھا۔ مالا ان کا فلمی نام تھا۔ اس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ اس وقت نسیم بیگم بھی اپنی آواز کا جادو جگا رہی تھیں اور بیک وقت ایک نام کی دو گلوکارائیں ایک فلمی صنعت میں نہیں ہو سکتی تھیں۔ سوائے اس کے کہ انہیں نسیم بیگم سینئر اور نسیم جونیئر کا نام دیا جائے۔

مالا کا تعلق ایک موسیقی سے تعلق رکھنے والے گھرانے سے تھا۔ ان کی آواز کی مٹھاس اور خوب صورتی نے آغاز ہی سے سننے والوں کو متاثر کیا۔ گھر والوں نے ان کے شوق کے پیش نظر انہیں موسیقی اور گلوکاری کی باقاعدہ تعلیم دی جس میں شمیم نازلی نے نمایاں حصہ لیا۔ شمیم نازلی اور مالا کا ہمیشہ ساتھ رہا۔ ان دونوں بہنوں کی باہمی محبت۔ سلوک اور اعتماد قابل رشک تھا۔ شمیم نازلی نے فیصل آباد کے ہنر مند موسیقاروں کی مدد سے مالا کو فلمی صنعت میں گلوکاری کرنے کے لیے بہت محنت کی۔ خود مالا کو بھی موسیقی سے بہت دلچسپی تھی اور فلموں کے لیے نغمہ سرائی کرنا ان کی تمنا تھی۔

شمیم نازلی مالا کو لے کر لاہور آ گئیں اور مختلف موسیقاروں سے مالا کو ملوایا۔ نئی آوازوں اور نئے چہروں کو فلم والے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ خصوصاً نامور لوگ تو ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہی انہیں ''ڈسمس'' کر دیتے ہیں۔

لیکن قسمت مالا پر مہربان تھی۔ انہیں فلمی صنعت میں زیادہ پاپڑ نہیں بیلنے پڑے۔ موسیقار ماسٹر عبداللہ نے ان کی آواز سنی اور فوراً ہی انہیں اپنی زیر تکمیل فلم ''سورج مکھی'' کے لیے منتخب کر لیا۔ ''سورج مکھی'' کے ہدایت کار دلشاد ملک تھے اور اس کے اداکاروں میں اسلم پرویز، بہار، آصف جاہ اور رخسانہ قابل ذکر تھے۔ یہ فلم تین اگست ۱۹۶۲ء کو ریلیز ہوئی اور اسکے ساتھ ہی مالا کی مقبولیت کا آغاز ہو گیا۔ ماسٹر عبداللہ ایک ہنر مند تخلیق کار تھے۔ وہ موسیقی بنانے کے لیے بہت محنت کرتے تھے۔ عام راگ راگنیوں کو استعمال کر کے چلتے ہوئے مقبول گانے بنانے کے بجائے وہ طرز میں کوئی نئی بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے بہت کم فلموں میں موسیقی مرتب کی جس کی مختلف

وجوہ تھیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت بڑے بڑے موسیقار بھی ان کی صلاحیتوں اور ہنر مندی کے معترف تھے۔

''سورج مکھی'' نے بہت زیادہ کامیابی حاصل نہیں کی مگر اس کے گانے ایک دم مقبول ہو گئے۔ایک تازہ سریلی اور تاثر سے بھرپور آواز سن کر سب چونک اٹھے اور ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کی بھائی یہ گلوکارہ کون ہے کہاں سے آئی ہے ؟اس طرح مالا اپنی پہلی فلم کے بعد ہی کامیابی کے جھولے جھولنے لگیں۔یہ وہ زمانہ تھا جب میڈم نور جہاں، ناہید نیازی، نسیم بیگم اور زبیدہ خانم جیسی آوازیں بھی فلمی دنیا میں گونج رہی تھیں۔مالا کی آواز کی مٹھاس اور سریلے پن کی وجہ سے انہیں بہت جلد صف اول کی گلوکارہ کا مقام حاصل ہو گیا۔جب قسمت مہربان ہوتی ہے تو سارا جگ مہربان ہو جاتا ہے۔ انہیں بہترین موسیقاروں کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل ہوا اور انہوں نے گائیکی کا حق ادا کر دیا۔اس زمانے میں مالا کے گائے ہوئے اکثر گانے مقبول ہوا کرتے تھے۔

دل دیتا ہے رو رو دہائی

کسی سے کوئی پیار نہ کرے

بڑی مہنگی پڑے گی یہ جدائی

کسی سے کوئی پیار نہ کرے

یہ شریف نیر صاحب کی فلم ''عشق پر زور نہیں'' کا سپر ہٹ نغمہ تھا جس نے ہر طرف مالا کے نام کا ڈنکا بجا دیا۔ماسٹر عنایت حسین نے راگ پہاڑی میں یہ گانا بنایا تھا لیکن اس میں چند جدتیں بھی کی تھیں۔ماحول پیدا کرنے اور گیت کو مزید پر اثر بنانے کے لیے سائیں اختر کے الاپ کی آمیزش نے اسے ایک یادگار نغمہ بنا دیا تھا۔یہ نغمہ یاسمین پر فلمایا گیا تھا اس سے پہلے اس قسم کا ایک جدائی کا گیت زبیدہ خانم کی آواز میں رشید عطرے نے مرتب کیا تھا۔فلم تھی ''سات لاکھ'' نغمہ نگار اور فلم ساز سیف الدین سیف تھے اور گانے کے بول یہ تھے

آئے موسم رنگیلے سہانے

جیا نہیں مانے

تو چھٹی لے کے آجا بالما

ان دونوں فلموں کے مابین لگ بھگ پانچ سال کا وقفہ تھا لیکن سچویشن قریباً ایک ہی جیسی تھی۔ راگ اور ٹھاٹ بھی ایک ہی تھا۔ ان کے تخلیق کار بھی وقت کے نامور اور قابل فکر موسیقار تھے۔

''سات لاکھ'' کا نغمہ رشید عطرے نے مرتب کیا تھا ''عشق پر زور نہیں'' کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین اور نغمہ نگار قتیل شفائی تھے۔ ایسے ہنر مند اور ممتاز لوگوں نے یہ نغمے تخلیق کیے تھے جن کی مثال اب شاید ہی پیدا ہو۔ مزے کی بات یہ ہے کہ فلم ساز و اداکار الیاس کاشمیری کے اصرار پر ماسٹر عنایت نے یہ نغمہ بنایا تھا کیونکہ اس سے پہلے راگ پہاڑی میں عطرے صاحب ایک تہلکہ خیز نغمہ تخلیق کر چکے تھے۔ یہ ایک لحاظ سے ماسٹر عنایت ہی کے لیے نہیں بلکہ گیت نویس اور گلوکارہ کے لیے بھی ایک چیلنج تھا۔ یہ دونوں ہی نغمے بے حد مقبول ہوئے اور آج بھی یادگار ہیں۔

مالا اور زبیدہ خانم کی آوازوں کا اگر موازنہ کیا جائے تو مالا کی آواز میں مٹھاس زیادہ تھی مگر زبیدہ خانم کی آواز میں ٹھہراؤ، تاثر اور سوز کی کیفیت تھی۔ مالا کے ساتھ ایک المیہ یہ تھا کہ اونچے سروں پر گاتے ہوئے ان کی آواز کا معیار برقرار نہیں رہتا تھا یہی ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ زبیدہ خانم کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ جن موسیقاروں نے مالا کی آواز کے ساتھ ان کے سر کی آخری حد کو مدنظر رکھ کر موسیقی مرتب کی وہ تمام گانے بے عیب اور خوب صورت ہیں۔

مثال کے طور پر ''نائلہ'' کے گانوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو سب کے سب ہٹ تھے۔ ماسٹر عنایت اس فلم کے موسیقار اور قتیل شفائی نغمہ نگار تھے۔ ماسٹر عنایت نے مالا کی آواز کے اسکیل اور رسائی کو فراموش نہیں کیا اور یادگار

نغمات تخلیق کئے۔ جن موسیقاروں نے محض ایک نغمہ بنا کر اسے گانے کے لیے مالا کی خدمات حاصل کیں انہوں نے خود اپنے ساتھ بھی اور مالا کے ساتھ بھی ناانصافی اور زیادتی کی۔ بہر حال یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔

مالا کی آمد ہنگامہ خیز تھی اور ان کی رخصت رقت آمیز۔ انہوں نے ۱۹۶۲ء سے ۸۲۔۱۹۸۰ تک گلوکاری کی اور بیس سال طویل عرصے میں مقبولیت اور پذیرائی حاصل کی لیکن آخری سالوں میں کچھ تو صحت کی خرابی اور زیادہ تر موسیقاروں کی بھیڑ چال کی وجہ سے ان کے گانوں کی تعداد بتدریج کم کرنے لگی۔ اب ناہید اختر، رونا لیلیٰ اور نیرہ نور جیسی آوازیں ہی فلمی صنعت کو میسر آ چکی تھیں یہ تروتازہ اور ہر لحاظ سے بہت خوب صورت کھنک دار اور سریلی آوازیں تھیں۔ وقت بہت بے رحم اور بے مروت ہوتا ہے۔ کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتا تو مالا کیساتھ کیا نبھاتا۔ رفتہ رفتہ مالا پس منظر میں چلی گئیں۔ اس پر ستم یہ کہ انہوں نے اپنی جمع پونجی فلم سازی کی نذر کر دی۔ جب برا وقت آتا ہے تو ہر طرف سے آتا ہے۔ فلموں میں مانگ کی کمی، صحت کی خرابی، گھریلو حالات اور ازدواجی الجھنوں نے انہیں بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ شمیم آرا، زمرد جیسی سہیلیاں اور شمیم نازلی جیسی بہن ہی اب ان کی دم ساز اور غم گسار، باقی رہ گئی تھیں۔

مالا کا بہترین دور ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء کا زمانہ تھا جب انہوں نے پے در پے کئی فلموں کے لیے بہت خوبصورت گانے گائے۔ احمد رشدی کے ساتھ گائے ہوئے ان کے دوگانے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ انہوں نے اپنی فلمی کیریئر میں قریب قریب دو سو فلموں کے لیے ایک ہزار کے لگ بھگ گانے صدا بند کرائے جن میں سے بہت سے سپر ہٹ اور یادگار نغمات ہیں اور فلموں کی کامیابی میں مالا کی آواز اور نغموں کا بھی نمایاں ہاتھ ہے۔ ان کی یادگار اور قابل ذکر فلموں میں انیلا۔ نائلہ، صاعقہ، ارمان، کنیز، تاج محل، احسان، افشاں، دل لگی، دل میرا دھڑکن تیری، بہاریں پھر بھی آئیں گی، انسانیت، دوراہا، سرحد، سورج مکھی، عشق پر زور نہیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی فلموں میں مالا نے اپنی آواز کا جادو جگایا اور ان کی مقبولیت میں حصہ لیا۔ مالا کی بعض فلمیں تو ان کی گلوکاری کے باعث بہت مقبول ہوئیں اور ان کے گائے ہوئے گیت امر ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں مالا نے بھی بہت اچھے ملی ترانے گائے۔

جنہوں نے قوم کا اور خصوصاً فوجیوں کا حوصلہ بڑھانے میں اہم کردار سرانجام دیا۔ مالا نے ہر قسم کے نغمات گائے ہیں۔ اور سب کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ شوخ و شنگ، طربیہ، حزنتیہ، مزاحیہ، رومانی ہر طرح کے گانے وہ یکساں مہارت کے ساتھ گاتی تھیں۔

پہلے تو نئی گلوکاراؤں کی آمد کی وجہ سے ان کی مانگ میں کمی ہوئی۔ اس کے بعد ان پر فالج کا حملہ ہوا جس کے باعث وہ کافی عرصے تک نغمہ سرائی کے قابل نہ رہیں۔ مالی حالات پہلے ہی ابتر ہو چکے تھے۔ سمن آباد میں کرائے کا ایک مکان ان کا آخری ٹھکانا تھا جہاں صرف ان کے انتہائی قریبی لوگ ہی ملاقات کے لیے جاتے تھے۔ کہاں تو فلم سازوں، موسیقاروں، گلوکارہ کا یہ المناک انجام عبرت انگیز ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب وہ علاج معالجے کے اخراجات بھی برداشت کرنے کے قابل نہ رہیں تھیں کہتے ہیں کہ ایک ہمدرد اور ان کے مداح ڈاکٹر نے ان کا بلا معاوضہ علاج کیا اور انہیں مفت ادویات بھی فراہم کرتے رہے۔ اگر یہ سہولت حاصل نہ ہوتی تو شاید وہ علاج معالجے سے بھی محروم رہتیں۔ اس قدر عروج دیکھنے کے بعد ایسا زوال خدا کسی کو نہ دکھائے۔ مالا کی ہمت اور اعلیٰ ظرفی تھی کہ ان تمام مصائب و آلام کے باوجود وہ مسکرانے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔ اسی زمانے میں ہم بھی چند بار ان کے سمن آباد والے مکان میں گئے۔ کچھ اور پرانے ساتھی بھی اکٹھے ہو جاتے تھے تو ان کا دل بہل جاتا تھا اور وقت اچھا گزر جاتا تھا مگر اس کے بعد پھر وہی تنہائی کا زہر اور محرومیوں اور مایوسیوں کا ہجوم۔

وہ ہمیشہ ایک خوش مزاج، خوش اخلاق، ملنسار، شائستہ اور خوش اطوار گلوکارہ رہیں۔ کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ہمیشہ مروت اور رواداری کا مظاہرہ کیا۔ اپنے دور عروج میں بھی کبھی غرور یا تکبر نہیں کیا۔ اتنی خوبیوں کے باوجود ان کے ستارے جب گردش میں آئے تو سبھی کچھ اجڑ کر رہ گیا۔ ہم نے فلمی زندگی میں ایسے اور بھی کئی عبرت انگیز واقعات دیکھے ہیں اور زمانے کی بے وفائیوں اور کج ادائیوں کا نظارہ کیا ہے خدا کسی کو اچھے دن دکھانے کے بعد برے وقت سے دوچار نہ کرے۔ ہر ایک کے لیے یہی دعا کرنی چاہئے۔ وہی جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہئے ذلت بلاشبہ وہی مختار مطلق ہے۔

اس طرح ایک دن چپکے سے مالا نے غم زندگی سے نجات حاصل کرلی۔ دیکھا جائے تو وہ اس سے پہلے بھی کب زندہ تھیں۔ اگر سانس لینے کا نام زندگی ہے تو وہ زندہ تھیں ورنہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی کیا زندگی ہے! مالا نے دوبارہ شادی کی اور دونوں شادیاں ناکام ہوئیں۔ اس بات نے بھی انہیں بہت دکھی اور مایوس کردیا تھا۔ مالا کی وفات کے بعد بہت جلد فلمی صنعت اور فلم بینوں نے انہیں بھلا دیا۔ وفات سے کئی سال پہلے ہی انہیں بھلا دیا گیا تھا۔ کبھی کبھی ریڈیو سے ان کا کوئی نغمہ پیش کردیا جاتا ہے ٹیلی ویژن پر تو جیسے ان کا داخلہ ہی ممنوع ہے۔ اب تو نئی نسل کی اکثریت مالا کے نام سے بھی واقف نہیں ہے۔ مالا کا گایا ہوا ایک نغمہ اس المیے کی حرف بحرف عکاسی کرتا ہے۔

بھولی ہوئی ہوں داستاں

گزرا ہوا خیال ہوں

واقعی اب وہ ایک بھولی ہوئی داستاں اور گزرا ہوا خیال ہی بن کر رہ گئی ہیں۔

مالا نے اپنے دور کے سبھی ممتاز موسیقاروں کے ساتھ کام کیا اور قریباً تمام مرد گلوکاروں کیساتھ مل کر دوگانے گائے تھے۔ ان کے گائے ہوئے بعض نغمات واقعی ناقابل فراموش ہیں لیکن خود انہیں زمانہ فراموش کرچکا ہے۔

پاکستان کے نامور گلوکاروں کے بارے میں بہت سے لوگ یہ جاننے کے خواہش مند رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی گلوکاری کا آغاز کب اور کس فلم سے کیا تھا۔ ان کی معلومات اور ریکاڈز کے لیے ایک مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔

ملکہ ترنم نورجہاں کی بطور گلوکارہ پہلی فلم ''پنڈ دی کڑی'' تھی اس فلم میں انہوں نے ایک کم سن بچی کا کردار بھی ادا کیا تھا۔ اسکے بعد انہوں نے متعدد پنجابی فلموں میں نغمہ سرائی کی لیکن ان کی پہلی اردو فلم ''خاندان'' تھی۔

وہ اس فلم کی ہیروئن بھی تھیں۔ اور اس فلم کی نمائش کے ساتھ ہی ان کی مقبولیت اور شہرت کا دور شروع ہوا جو ان کے آخر وقت تک جاری رہا۔ میڈم نورجہاں نے بے شمار مقبول گانے اور ملی ترانے گائے اور ایک ناقابل فراموش

مقام حاصل کیا۔انہوں نے گلوکاری کا آغاز پنجابی فلم سے کیا تھااور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ آخری زمانے میں انہوں نے زیادہ پنجابی فلموں کے لیے ہی گلوکاری کی اور وہ پنجابی فلموں کی ایک ناگزیر ضرورت بن گئی تھیں۔نورجہاں نے ایک پنجابی فلم کے لیے جو گانا صدابند کرایا تھاوہ ان کے حسب حال ہے۔اس گانے کے بول ہیں

میرے چرچے گلی گلی تھاں تھاں

مرے ورگی اور کوئی نئیں آں

عنایت حسین بھٹی نے نذیر صاحب کی پنجابی فلم ''پھیرے'' سے فلمی گلوکاری کا آغاز کیا تھا یہ فلم اگست ۱۹۴۹ء میں ریلیز ہوئی تھی۔جی اے چشتی اسکے موسیقار تھے۔بعد میں وہ اداکار اور فلم ساز بھی بن گئے تھے۔

زبیدہ خانم کی پہلی فلم نذیر صاحب کی پنجابی فلم ''شہری بابو'' تھی۔وہ ایک زمانے میں مقبول ترین گلوکاراؤں میں شمار کی جاتی تھیں۔انہوں نے فلم '' پاٹے خاں'' میں اداکاری بھی کی تھی بعد میں عکاس ریاض شاہ بخاری سے شادی کر کے وہ فلمی دنیا سے قطعی کنارہ کش ہو گئیں۔

اقبال بانو نے بہت کم فلمی گانے گائے ہیں مگر ان میں سے بیشتر بے حد مقبول اور ناقابل فراموش ہیں۔فلمی گلوکارہ کی حیثیت سے ان کی پہلی فلم انور کمال پاشا کی فلم ''گمنام'' تھی۔جو ۱۹۵۴ء میں ریلیز ہوئی تھی۔اس کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے۔اس فلم کے نغمات بمبئی تک مقبول ہوئے تھے۔

فضل حسین نے بہت کم عرصے گلوکاری کی۔ان کی پہلی فلم بھی ''گمنام'' تھی۔

سلیم رضا کسی زمانے میں مقبول ترین گلوکاروں میں ممتاز تھے۔انکی پہلی فلم '' نوکر'' تھی جو ۱۹۵۵ء میں ریلیز ہوئی تھی۔اس کے بعد انہوں نے بے شمار مقبول گیت گئے۔مصروفیات کی کمی کے باعث وہ کینیڈا چلے گئے تھے اور وہیں انہوں نے وفات پائی۔

کوثر پروین اداکارہ آشا پوسلے کی چھوٹی بہن تھی۔ انہوں نے بھی اپنی گلوکاری کا آغاز فلم ''نوکر'' سے کیا تھا۔کافی عرصے تک وہ بہت مقبول فلمی گلوکارہ کی حیثیت سے مصروف رہیں۔وہ جوانی ہی میں انتقال کر گئی تھیں۔

نسیم بیگم کی پہلی فلم ''بے گناہ'' تھی جو فروری ۱۹۵۸ء میں ریلیز ہوئی تھی۔اس کے موسیقار شہریار تھے۔نسیم بیگم کا شمار صف اول کی گلوکاراؤں میں ہوتا تھا۔وہ مختار بیگم کی شاگرد تھیں اور انتہائی مشکل گانے بھی انتہائی خوب صورتی سے گاتی تھیں۔انہیں کلاسیکی موسیقی پر بھی عبور حاصل تھا۔وہ جوان العمری میں ہی وفات پا گئیں۔

ناہید نیازی کا تعلق بہت ممتاز گھرانے سے تھا۔ان کے والد سرور نیازی ریڈیو کے اعلیٰ افسر رہ چکے تھے اور کئی نغمات اور نعتیں بھی انہوں نے تحریر اور کمپوز کی تھیں۔ناہید نیازی کی پہلی فلم زہر عشق تھی۔یہ فلم ۱۹۵۸ء میں ریلیز ہوئی تھی۔کئی سال تک وہ مقبول گلوکارہ کے طور پر مصروف رہیں۔موسیقار مصلح الدین سے شادی کرنے کے بعد وہ انگلستان چلی گئی تھیں۔

اخلاق احمد کی پہلی فلم ''بادل اور بجلی'' ۱۹۷۳ء میں ریلیز ہوئی تھی جس کے موسیقار سہیل رعنا تھے۔انہوں نے بہت سے انتہائی مقبول گیت گائے اور متعدد ایوارڈ حاصل کیے پھر شاید انہیں نظر لگ گئی۔وہ بلڈ کینسر میں مبتلا ہونے کے بعد انگلستان میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔اب ان کا انتقال ہو چکا ہے وہ اپنے دور میں مقبول ترین گلوکاروں میں شمار ہوتے تھے۔

ناہید اختر کی پہلی فلم ''ننھا فرشتہ'' ۱۹۷۴ء میں ریلیز ہوئی تھی۔اس کے موسیقار ایم اشرف تھے۔ ناہید اختر نے طویل عرصے تک گلوکارہ کے طور پر فلمی دنیا پر حکمرانی کی پھر اچانک غائب ہو گئیں۔چند سال بعد نمودار ہوئیں تو ایک صحافی آصف علی پوتا سے شادی کر کے گلوکاری سے کنارہ کش ہو گئیں۔انہوں نے فلم اور ٹی وی کے لیے بہت سے ناقابل فراموش نغمے گائے ہیں۔

اے نیر کی پہلی فلم ’’ بہشت ‘‘ تھی۔ جس کے ہدایتکار پہلے ریاض شاہ تھے مگران کی وفات کے بعد حسن طارق نے اسے مکمل کرایا تھا۔ رشید عطرے اس کے موسیقار تھے۔

ایس بی جان اپنی پہلی فلم ’’سویرا‘‘ میں ایک نغمے کی وجہ سے مشہور ہوئے تھے۔ یہ فلم ۱۹۵۹ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے موسیقار منظور اور ہدایت کار رفیق رضوی تھے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ ایس بی جان کا نغمہ۔

تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

یہ مانا کہ موسم جواں ہے حسین ہے

بے انتہا مقبول ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی قابل ذکر گیت نہیں گایا اور بہت جلد فلمی افق سے غائب ہو گئے۔

رونا لیلیٰ کی پہلی فلم ’’ہم دونوں‘‘ ۱۹۶۶ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے موسیقار ناشاد تھے۔ پہلی فلم ہی نے انہیں بے پناہ شہرت اور مقبولیت سے سرفراز کر دیا تھا۔ انہوں نے قریب قریب سبھی ممتاز موسیقاروں کے ساتھ کام کیا اور بہت خوب صورت نغمات پیش کیے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد وہ پاکستان سے رخصت ہو کر ڈھاکا چلی گئی تھیں۔ انہوں نے بمبئی میں بھی گلوکاری کی مگر جمنے نہ پائیں۔ پاکستان سے جانے کے بعد انہیں پہلے جیسی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی اور رفتہ رفتہ وہ غیر معروف ہو کر رہ گئیں۔

احمد رشدی کی پہلی فلم ’’ کارنامہ ‘‘ ۱۹۵۶ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ یہ کراچی میں بنائی گئی تھی۔ اس کے موسیقار نتھو خاں اور ہدایت کار اقبال حسین تھے۔ اسکے بعد احمد رشدی نے بے مثال مقبولیت اور کامیابیاں حاصل کیں۔ وہ بہت میٹھی سریلی اور خوب صورت آواز کے مالک تھے۔ ہر قسم کے گیت گا سکتے تھے۔ سبھی موسیقاروں کے ساتھ انہوں نے کام کیا اور بے شمار یادگار نغمات پیش کیے۔ اردو فلموں کے زوال کے بعد وہ کراچی چلے گئے تھے عارضہ قلب میں مبتلا ہو کر وہ قدرے کم عمری ہی میں انتقال کر گئے۔

مسعود رانا احمد رشدی کے بعد گلوکاری کے میدان میں نمودار ہوئے مگر اپنی آواز کے حسن اور بے مثال ادائیگی کے باعث بہت جلد فلمی افق پر چھا گئے۔ان کی پہلی فلم ''انقلاب'' کراچی میں بنائی گئی تھی۔ اس کے موسیقار نتھو خاں تھے۔بعد میں وہ بھی احمد رشدی کی طرح لاہور منتقل ہو گئے تھے۔انہوں نے لاتعداد یادگار فلموں کے لیے گلوکاری کی۔اردو فلموں کے زوال کے بعد فلموں سے کنارہ کش ہو گئے چند سال قبل انتقال کر گئے۔

ایم کلیم کی آواز منفرد اور دوسرے گلوکاروں سے مختلف تھی۔ان کی پہلی فلم '' چراغ جلتا رہا'' تھی جس کے موسیقار ماسٹر عبداللہ اور مصنف وہدایت کار فضل احمد کریم فضلی تھے۔انہوں نے بہت کم فلموں کے لیے گلوکاری کی اور جلد ہی فلمی افق سے غائب ہو گئے۔

مہدی حسن کا شمار لازوال گلوکاروں میں ہوتا ہے۔وہ غزل کی گائیکی کے بادشاہ کہلائے۔ہر قسم کے گانے انتہائی خوب صورتی سے گائے۔ان جیسی آواز کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی۔کلاسیکی موسیقی پر بھی انہیں عبور حاصل تھا۔فلموں میں انہوں نے ''شکاری'' سے گلوکاری کا آغاز کیا تھا جو کراچی میں بنائی گئی تھی اور ۱۹۵۶ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اصغر علی محمد حسین اور فلم کے موسیقار تھے۔مہدی حسن بعد میں فلمی گلوکار اور کلاسیکی موسیقی اور غزل گوئی میں عالمگیر شہرت حاصل کی تھی۔ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ہر قسم کے گیت گانے پر عبور حاصل تھا۔کچھ عرصے سے فالج کے عارضے میں مبتلا تھے۔

گلوکار کی حیثیت سے عالمگیر کی پہلی فلم ''جاگیر'' تھی۔جس کے موسیقار نثار بزمی تھے۔عالمگیر نے بعد میں گلوکار کی حیثیت سے بہت مقبولیت حاصل کی۔پاکستان میں انہوں نے پوپ موسیقی کا آغاز کیا تھا۔کافی عرصے سے وہ فلمی دنیا سے دور ہیں۔

طاہرہ سید نے بہت کم فلمی نغمے گائے ہیں۔ان کی پہلی فلم ''محبت'' تھی۔جس کے موسیقار نثار بزمی اور ہدایت کار ایس سلیمان تھے۔

حبیب ولی محمد شوقیہ غزل گو ہیں۔ان کی ایک غزل فلم ساز اقبال شہزاد نے اپنی فلم ''بازی'' میں شامل کی تھی جسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔وہ زیادہ تر ریڈیو سے گاتے رہے ہیں۔

ثریا ملتانیکر کی پہلی فلم اقبال شہزاد کی فلم ''بدنام'' تھی جو ۱۹۶۸ء میں ریلیز ہوئی تھی۔اس کے موسیقار دیبو بھٹا چاریہ تھے۔ثریا ملتانیکر کی اس غزل کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اس کے نغمہ نگار مسرور انور تھے۔اس کے بعد انہوں نے فلم کے لیے نہیں گایا۔

نیرہ نور کی پہلی فلم ''گھرانا'' تھی جو ۱۹۷۳ء میں ریلیز ہوئی تھی اس کے موسیقار ایم اشرف تھے۔یہ معلومات حافظے کی مدد سے مرتب کی گئی ہیں جن میں غلطی کا امکان اور تصحیح کی گنجائش موجود ہے۔

ہمارے بعض فلم اسٹارز نے بھی فلموں کے لیے گلوکاری کی ہے۔مثلاً ندیم، دراصل بنیادی طور پر یہ گلوکار تھے اور وہ گلوکاری کے خیال سے ہی ڈھاکا گئے تھے۔فردوسی بیگم ان کی سفارش تھیں انہوں نے فلم ''چکوری'' کے لیے ایک گیت ریکارڈ کرایا تھا۔'' چکوری'' ان کی بطور اداکار بھی پہلی فلم تھی اور بے حد کامیاب ہوئی تھی۔ اس فلم کے موسیقار روبن گھوش اور ہدایت کار احتشام تھے جو ندیم کے خسر بھی بن گئے تھے۔پچھلے دنوں یعنی فروری ۲۰۰۲ء میں ڈھاکا میں ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ندیم سے اکثر یہ گانا سنانے کی فرمائش کیجاتی ہے اور یہ فرمائش پوری بھی کرتے ہیں لیکن ریاض نہ ہونے کی وجہ سے کانپتی ہوئی آواز میں گاتے ہیں اور گانے کا حق ادا نہیں کر سکتے۔چکوری مئی ۱۹۶۷ء میں ریلیز ہوئی تھی۔اس فلم نے ندیم اور ہیروئن شبانہ کو راتوں رات سپر اسٹار بنا دیا تھا۔

وحید مراد نے فلم ''اشارہ'' بنائی تو اس کی ہدایت کاری کے فرائض بھی خود ہی سر انجام دیئے تھے۔اس فلم میں انہوں نے ایک گانا بھی گایا تھا جس کے بول تھے۔

جیسے تیسے بیت گیا دن

یہ فلم ۱۹۶۹ء میں ریلیز ہوئی تھی۔دیبا اور روزینہ نے ان کے ساتھ رومانی کردار ادا کیے تھے۔

مرزاغالب پھر یاد آگئے۔نہ جانے کیا بات ہے کہ جس طرح غالب کو شکایت ہے کہ۔۔۔

بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

اس طرح غالب نے دوسروں کے لیے یہ مشکل پیدا کر دی ہے کہ غالب کے حوالے کے بغیر بہت کم باتیں کہی جاسکتی ہیں۔اس وقت غالب صاحب کے یاد آنے کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے دنیا بھر کے موضوعات کے بارے میں شاعری کی ہے۔فی الحال ہمیں موسیقی کے سلسلے میں کچھ کہنا تھا تو مرزا کا حوالہ دینا لازم جانا۔مرزا غالب نے فرمایا ہے کہ۔۔۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب

موت کیا ہے ان ہی اجزا کا پریشاں ہونا

''سبب'' کے سلسلے میں ناصر کاظمی کا یہ شعر بھی یاد آگیا

دل ڈھرکنے کا سبب یاد آیا

وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا

سوال یہ تھا کہ موسیقی کیا ہے۔یعنی اس کی مختصر ترین تعریف کیا ہو سکتی ہے۔ یوں تو یہ ایک ''علم دریا'' ہے۔اس بارے میں ماہرین اور اساتذہ نے بہت کچھ لکھا ہے اور بہت کچھ ارشاد فرمایا ہے لیکن ایک عام آدمی یا معمولی فہم رکھنے والے شخص کے سامنے آپ موسیقی کے مختصر تعریف کیسے کریں گے؟

اس پر ہمیں موسیقار رشید عطرے اور خواجہ خورشید انور صاحب کا چشم دید واقعہ یاد آگیا جو پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ فلم ''انتظار'' کے بے مثال کامیابی کا جشن منانے کے لیے اداکار سنتوش کمار صاحب نے اپنی مسلم ٹاؤن والی کوٹھی

میں بہت بڑے پیمانے پر ایک دعوت دی تھی جس میں فلمی صنعت کے تمام قابل ذکر افراد موجود تھے۔ بادہ و ساغر کا بھی اہتمام تھا کیونکہ مرزا غالب یہ نکتے کی بات بیان کر گئے ہیں کہ۔۔۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

چنانچہ بادہ و ساغر بلکہ بوتلوں کا بھی بندوبست تھا۔ ہر کوئی اپنی پسند کے مشروبات سے جی بہلا رہا تھا۔ ہم آئی اے رحمان صاحب کے ساتھ گھومتے پھرتے تھے اور مختلف قسم کے لوگوں سے مل رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ خواجہ خورشید انور صاحب اور مسعود پرویز صاحب ایک علیٰحدہ کمرے میں تشریف فرما ہیں۔(یہ 58-1957 کا واقعہ ہے) ہم بھی رحمان صاحب کے ساتھ اس چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گئے۔ یہ دونوں حضرت کافی کم گو تھے بلکہ بعض اوقات تو بولتے ہی نہیں تھے۔

ہم رحمن صاحب کے ساتھ اندر پہنچے تو گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فلم ’’ انتظار‘‘ اپنی موسیقی کے اعتبار سے ایک سنگ میل تصور کی گئی تھی اس لیے ہم نے موسیقی کے بارے میں ہی بات چھیڑ دی۔ خواجہ صاحب سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

رحمن صاحب نے گفتگو کا آغاز انگریزی میں کیا تھا اس لیے خواجہ خورشید انور نے بھی انگریزی میں ہی جواب دینا مناسب سمجھا۔

ابھی یہ گفتگو شروع ہی ہوئی تھی کہ رشید عطرے صاحب سفید شارک اسکن کا سوٹ پہنے ،سرخ رنگ کی ٹائی باندھے کمرے میں تشریف لے آئے اور محفل میں شریک ہونے کے بجائے انہوں نے چھوٹے سے کمرے کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر باتیں سننے کو ترجیح دی۔ عطرے صاحب اس وقت ترنگ میں تھے۔ ہم نے ان کے مے نوشی کے جو درجے مقرر کیے تھے ان میں پہلا درجہ نشان کا تھا۔ ایک پیگ پینے کے بعد وہ کیف و نشاط کی کیفیت میں بہت اچھی‘

دلچسپ اور معلوماتی باتیں کرتے تھے۔ دوسرا مرحلہ دوسرے پیگ کے بعد شروع ہوتا تھا۔ اس میں وہ سنجیدگی کے ساتھ موضوع پر بات چیت کرتے تھے۔ تیسرا مرحلہ تیسرے پیگ کے بعد یہ تھا کہ وہ بحث و مباحثہ اور تکرار شروع کر دیتے تھے۔ ہر فقرے کو بار بار دہراتے تھے اور یہ بھول جاتے تھے کہ یہی بات وہ پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔ گویا بہکنے کا آغاز ہو جاتا تھا۔ ان کے دوستوں کی خواہش اور کوشش ہوا کرتی تھی کہ وہ صرف تین جام تک ہی محدود رہیں مگر عطرے صاحب کہاں باز آنے والے تھے۔ اصرار کرکے چوتھا پیگ بھی نوش جاں کر لیتے تھے۔ یہ مرحلہ تھا جب وہ اردو اور پنجابی سے انگریزی بولنے لگتے تھے۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہتا تھا یہاں تک کہ انہیں نیند آجاتی تھی یا دوست احباب انہیں پکڑ کر ان کی کار میں بٹھا دیتے تھے اور ڈرائیور کو ہدایت کر دیتے تھے کہ انہیں سیدھا گھر لے جائے۔ کہیں اور ہرگز نہ لے جائے

اس روز جب عطرے صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو چوتھے مرحلے میں تھے۔ کچھ دیر تک وہ چوکھٹ پہ کھڑے خاموشی سے خواجہ صاحب کی باتیں سنتے رہے پھر نہ جانے کیا سوجھی کہ آگے بڑھ کر چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو کر انہوں نے خواجہ صاحب کو مخاطب کیا اور کہا کہ خواجہ صاحب گٹ پٹ انگریزی بولنے سے کام نہیں چلتا۔ انگریزی بولنے سے میوزک نہیں آجاتی۔

ان کے اس دخل در معقولات نے ہم سب کو حیران کر دیا۔ خواجہ خورشید انور اور مسعود پرویز کم گو، صلح پسند اور شائستہ لوگ تھے۔ انہوں نے عطرے صاحب کی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ ادھر توجہ ہی نہ دی۔

عطرے صاحب اس پر مزید تاؤ کھا گئے اور آگے بڑھ کر مزید انگریزی بولنے لگے۔ اب وہ براہِ راست خواجہ صاحب سے مخاطب تھے ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ میوزک کے بارے میں کچھ نہیں جانتے نہ سازوں اور گائیکی سے آگاہ ہیں۔ آپ کوئی ساز بجا سکتے ہیں نہ گا سکتے ہیں اور میوزک ڈائریکٹر بن سکتے ہیں

اس زمانے میں ہم نے بھی خواجہ خورشید انور صاحب کے بارے میں فلمی حلقوں خصوصاً سازندوں اور جدی پشتی موسیقاروں کی زبانی یہی سنا تھا کہ کوئی ساز بجانا نہیں جانتے اور نہ ہی گا سکتے ہیں۔ اس بات کو تقویت یوں ملی کہ دوسرے تمام موسیقار تو دھن بناتے وقت اور اپنی دھن فلم ساز و ہدایت کار یا گلوکار کو سناتے وقت بذات خود ہار مونیم بجاتے تھے اور گا کر دھن سنایا کرتے تھے مگر خواجہ صاحب کو ہم نے نہ تو کبھی کسی کو دھن سناتے ہوئے دیکھا اور نہ ہی ہار مونیم یا کوئی اور ساز بجاتے ہوئے پایا۔ اس لیے ہم نے بھی اس افواہ پر یقین کر لیا تھا حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ نوجوانی میں ہی ساز بجاتے اور گاتے تھے۔ بعد میں انہوں نے یہ طریقہ اپنایا تھا کہ دھن بنا کر لاتے تو اپنے اسسٹنٹ اور سازندوں کو ساز بجانے کے لیے کہتے اور بذات خود صرف زبانی ہدایات کے ذریعے سازندوں اور گلوکاروں کو مطلوبہ تاثر پیدا کرنے کے لیے کہا کرتے تھے۔

ہم نے خود کئی بار خواجہ خورشید انور صاحب کو سوچوں میں گم، خلا میں گھورتے اور ماچس کی ڈبیا کو میز پر مارتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس طرح وہ دھنیں تخلیق کیا کرتے تھے۔ ان کی اس عادت کو دیکھ کر اور فلمی صنعت کے پیشہ ور موسیقاروں اور سازندوں کی باتیں سن کر خود ہم بھی اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے کہ خواجہ صاحب واقعی نہ تو کوئی ساز بجا سکتے ہیں اور نہ ہی گا سکتے ہیں۔ یہ تو ہمیں بعد میں اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ جو شخص موسیقی سے نابلد ہو نہ ساز بجا سکے نہ گانا گا سکے، وہ مہدی حسن اور نور جہاں جیسے گانے والوں کو موسیقی کی لہروں اور الفاظ کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں کیسے ہدایات دے سکتا ہے۔

خواجہ صاحب جب تک ادائیگی سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوتے تھے اس وقت تک گلوکار کو بار بار ہدایت دیتے رہتے تھے اور اس کے بالکل نزدیک جا کر بذاتِ خود گا کر بھی مخصوص جگہ کی نشان دہی کر دیا کرتے تھے۔ سازوں پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا۔ چالیس پچاس سازوں کے درمیان میں اگر کوئی ایک سازندہ بھی کوئی غلطی کرتا تو بے چین ہو کر کھڑے ہو جاتے اور متعلقہ سازندے کے پاس جا کر اس کی اصلاح کرتے تھے۔

جہاں تک راگ راگنیوں اور سُر کا تعلق ہے خواجہ صاحب کو اس ہنر اور فن پر عبور حاصل تھا۔ کچھ تو خداداد صلاحیت تھی اور کچھ اکتساب اور ریاض کا اثر تھا کہ وہ ہر راگ اور راگنی کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے تھے۔

فلمی دنیا میں کچھ عرصے رہنے کے بعد ہمیں کچھ شعور آیا تو دیکھا کہ بڑے سے بڑا گلوکار' سازندہ' اور موسیقی اور استاد بھی خواجہ صاحب کے آگے دم نہیں مار سکتا تھا۔ اگر وہ کسی کی غلطی کی نشان دہی کرتے یا اس کی اصلاح کرتے تھے تو اس کے ساتھ ہی اس کو قائل بھی کر دیا کرتے تھے۔ وہ مہدی حسن کی اصلاح کر دیا کرتے تھے۔ استاد شریف خاں پونچھ والے ستار نوازی میں برصغیر کے مانے ہوئے ستار نواز تھے بے حد منکسر المزاج لیکن اپنے ہنر میں یکتا۔ خواجہ صاحب ان کی بے حد عزت کرتے تھے لیکن اگر وہ ان کی ضرورت کے مطابق نتائج دینے میں ناکام ہوتے تو خواجہ صاحب انہیں قریب آکر آہستگی سے بتاتے اور سمجھاتے اور شریف خان سر ہلا کر مان جاتے۔

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ میوزک کیا ہے؟ اور یہ سلسلہ رشید عطرے صاحب اور خواجہ خورشید انور کے ایک یادگار واقعے کی یاد تازہ کرنے تک پہنچ گیا۔ جس روز کا ہم نے ذکر کیا ہے اس روز خواجہ صاحب نے عطرے صاحب کے بار بار مطالبات کے باوجود ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دراصل بحث مباحثہ کرنا ان کی عادت نہ تھی۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ سنتوش صاحب سے کہا "اچھا سنتوش۔ خدا حافظ۔" اور کمرے سے نکل کر چلے گئے۔ مسعود پرویز صاحب بھی ان کے ساتھ ہی چلے گئے۔

اگلے روز عطرے صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو بہت نادم ہوئے۔ جب تک بذاتِ خود خواجہ صاحب کے پاس جا کر انہوں نے معذرت نہ کی انہیں چین نہ آیا۔

ان سے ہماری ملاقات ہوئی تو ہم نے انہیں گزشتہ رات کا واقعہ یاد دلایا۔ ایک رنگ سا ان کے چہرے پر آکر چلا گیا۔

آہستگی سے بولے "بس آفاقی۔ ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ اسی لیے تو نشے کو حرام قرار دیا گیا"

ہم نے انہیں چائے پلائی اور کہا کہ چلئے۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا مگر بہتر ہوا گر آپ آئندہ ''خطرے'' کے مرحلے میں داخل ہونے سے پرہیز کریں۔ انہوں نے فوراً غالب کا ایک شعر سنا دیا۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

ہم نے عرض کی کہ حضرت! مرزا غالب کو تو حالات و واقعات نے ''گویا نہ بے خودی'' کا طلب گار بنا دیا تھا۔ آپ تو اللہ کے فضل سے ہر طرح خوش و خرم اور مطمئن ہیں۔ زمانے کا ملال پھر آپ کو اس کی کیا حاجت پیدا ہو گئی۔

ہنس کر بولے ''بس آفاقی۔ یہ انسان کی کمزوریاں ہیں جو اسے رسوا کرتی ہیں۔'' جب وہ اچھے موڈ میں اور سنجیدہ ہوتے تھے تو بہت اچھی ادبی قسم کی گفتگو کرتے تھے۔ مطالعہ تو ان کا زیادہ نہ تھا لیکن بڑے بڑے ادیبوں' شاعروں اور فنکاروں کی صحبت میں رہے تھے۔ کچھ زمانے نے انہیں سکھا دیا تھا اس لیے بہت کچھ جان گئے تھے۔

ہم نے کہا'' اچھا عطرے صاحب! اب ہم آپ سے وہی سوال کرتے ہیں کہ وہاٹ از میوزک۔ ایک فقرے میں اس کا جواب دیجئے۔''

مسکرائے اور بولے ''آرگنائزڈ نائس از میوزک'' ORGANIZED NOISE IS MUSIC یعنی بے ہنگم آوازوں اور شور کو منظم کر دیا جائے تو وہ میوزک ہے۔''

میوزک کی یہ جامع اور مختصر تعریف اور تشریح ہم کبھی نہیں بھولیں گے۔ اس کے بعد بھی ہم نے کئی لوگوں سے یہی سوال پوچھا اور جواب میں بہت طولانی گفتگو سے واسطہ پڑا جو کہ بے حد معلومات افزا بھی تھی لیکن پھر کسی نے ہمیں ایک فقرے میں میوزک کی جامع تعریف نہیں بتائی۔ اس بارے میں اگر آپ میں سے کسی کو علم ہو تو ضرور ہماری معلومات میں اضافہ کریں۔

موسیقی اور راگ راگنیوں کے بارے میں ہمارا علم بہت محدود ہے لیکن سننے اور جاننے کی حد تک دلچسپی لامحدود ہے۔ اگر اس بارے میں کوئی مضمون نظر سے گزرے یا کسی صاحب ہنر سے ملاقات ہو جائے تو کوشش کرتے ہیں کہ اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔اس ضمن میں سعید ملک صاحب ایک نادرِ روزگار ہستی ہیں۔وہ بنیادی طور پر صحافی ہیں۔ انگریزی صحافت میں انہیں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ وہ ہر موضوع ہے۔انہوں نے بذاتِ خود موسیقی ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔انہوں نے بذات خود موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔نوجوانی سے ہی بڑے بڑے موسیقاروں کی محفلوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے۔ان سے استفادہ کرتے رہے۔ایک زمانے میں خود بھی ریاض کرتے تھے۔ انہوں نے قیام پاکستان سے پہلے کا لاہور اور اس زمانے کے نامور اور یگانہ روزگار ہستیوں کو بھی دیکھا اور سنا ہے۔خود بھی ساز بجاتے ہیں اور ریاض نہ ہونے کے باوجود کلاسیکی راگ بھی گا بجاتے ہیں اور ریاض نہ ہونے کے باوجود کلاسیکی راگ بھی گا کر سنا دیتے ہیں۔طویل العمری اور صحت کی خرابی کے باوجود سعید ملک ایک انتہائی بلند حوصلہ انسان ہیں۔ انہوں نے اپنی کسی دلچسپی اور مشغلے میں آج تک خلل نہیں آنے دیا ہے۔ہر ہفتے فنون لطیفہ اور آثارِ قدیمہ کے موضوعات پر مختلف انگریزی اخبارات و جرائد میں لکھتے ہیں۔ایک زمانے میں وہ امریکن مرکز اطلاعات سے بھی وابستہ رہے ہیں جہاں ہمارے چھوٹے بھائی علی عمران ان کے رفیق کار تھے۔

سعید ملک صاحب تو ہم سے بھی سینئر ظاہر ہے کہ عمران تو ان کے سامنے ایک طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتے تھے لیکن ان کی اسی زمانے سے عمران سے دوستی اور تعلق رہا ہے۔وضع داری کا یہ عالم ہے کہ جب کبھی اس طرف تشریف لاتے ہیں ہم سے ملاقات کے لیے ضرور آتے ہیں۔اگر ملاقات نہ ہو تو پیغام چھوڑ کر جاتے ہیں۔ سعید ملک صاحب اپنے علم و ہنر ''قابلیت مشاہدے اور تجربات کی روشنی میں ایک ایسی ہستی ہیں جو کہ اب ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔کوئی اور ہوتا تو کبھی کا ریٹائر ہو کر گھر بیٹھ جاتا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ انہیں ذریعہ معاش کے لیے تگ و دو کرنے کی حاجت بھی نہیں ہے لیکن وہ مجسم غالب کے اس شعر کی تفسیر بنے ہوئے ہیں۔

شوق، ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

اس مختصر سے تعارف کے بعد سعید ملک صاحب کی نئی تحقیق کے بارے میں سنئے۔ ماہرین موسیقی، محقق اور فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والے سبھی لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ کلاسیکی موسیقی کی جڑیں دراصل لوک موسیقی اور لوک گیتوں میں ہیں۔لوک موسیقی یا فوک میوزک (FOLK MUSIC) کیا ہے؟ یہ کسی ایک فرد نے کسی ایک وقت ایجاد نہیں کی ہے۔دراصل گائیک، موسیقار، سازندے اور گانے کے شوقین، تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف اوقات میں اس خزانے میں اضافے کرتے رہے ہیں۔یہ ایک نادانستہ حرکت تھی جس نے رفتہ رفتہ ایک روایت اور پھر تہذیب و ثقافت کی ایک بنیاد کی حیثیت اختیار کرلی۔جس طرح شاعری، مصوری اور دیومالائی داستانیں سالہاسال میں انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ترقی کے مدارج طے کرتی رہی ہیں اسی طرح موسیقی اور راگ راگنیوں نے بھی صدیوں سفر کیا ہے جس کے بعد انہیں لوک موسیقی اور پھر کلاسیکی موسیقی کا درجہ حاصل ہوسکا ہے۔ہر آنے والی نسل نے پچھلی نسلوں سے جو کچھ حاصل کیا اسے اپنی طرف سے حسبِ توفیق اضافے کے بعد آگے بڑھادیا۔اس طرح موسیقی اور فنون لطیفہ کا یہ سفر جاری رہا اور آج بھی جاری ہے۔اگرچہ اس وقت ہماری لوک موسیقی اور کلاسیکی موسیقی پر بہت نازک وقت آیا ہوا ہے۔مغربی موسیقی اور پوپ میوزک نے ایسا اودھم مچار کھا ہے کہ اس کے شور وغل میں ہماری روایتی اور ثقافتی موسیقی دب کر رہ گئی ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ مغرب اس قدر مادی اور سائنسی ترقی کرنے کے باوجود اپنی جڑوں اور بنیادوں سے وابستہ ہے۔ یورپ اور امریکا میں لوک موسیقی اور لوک گیت گانے والے آج بھی بے حد مقبول ہیں اور جدید موسیقی کے شانہ بشانہ چل رہے ہیں۔امریکا میں لوک گلوکار کروڑوں اربوں کماتے ہیں اور بادشاہوں کی طرح رہتے ہیں۔ان کی مقبولیت اور قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے مگر افسوس کہ ہم جو کہ ان کے نقش قدم پر چلنا بہت بڑا اعزاز سمجھتے ہیں ان کی اس خوبی کو مطلق خاطر میں نہیں لاتے اور اپنی لوک موسیقی اور کلاسیکی موسیقی سے رفتہ رفتہ دور اور بے بہرہ ہوتے جا رہے ہیں۔اسے آپ احساسِ کمتری کہئیے یا مغرب سے مرعوبیت یا پھر اسے نئے نئے دولت مند

ہونے والوں کی کم مائیگی اور لاعلمی و جہالت کا نام دیجئے۔ بات ایک ہی ہے۔ یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ بہر حال موجود ہے کہ ہم اپنے ماضی سے رفتہ رفتہ تمام رشتے توڑ رہے ہیں اور مغربی قدروں کے سیلاب میں بہے چلے جا رہے ہیں۔

مشرق میں لوک موسیقی یا راگ راگنیوں کی ترویج کیسے ہوئی؟ ان راگوں کو رنگ، صورت اور نام کس نے دیے۔ ان کے لیے مختلف اوقات اور ضروریات کس نے مرتب کیں؟ یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔

پاکستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہونے والوں نے بعد میں برصغیر کے دوسرے خطوں کا رخ کیا اور وہاں بھی اپنی موسیقی اور اپنی روایات اپنے ساتھ لے کر گئے۔ یہاں تک کہ سری لنکا جیسے دور دراز علاقوں تک یہ آوازیں پہنچ گئیں اور مقامی رنگوں کی آمیزش سے انہوں نے وہاں کی لوک موسیقی کی شکل اختیار کر لی۔

ہمارے ہاں کئی راگوں کے نام مختلف علاقوں کے ناموں سے وابستہ ہیں۔ مثال کے طور سے آہر سے آہر بھیروں نے جنم لیا ہے۔ باز بہادر سے بہادری ٹوڈی کو منسوب کیا جاتا ہے۔ گوجری ٹوڈی کو گوجروں نے جنم دیا ہے اور یہ ان ہی کے نام سے منسوب ہو گئی ہے بھیرانی علاقے کے فوک بھیرویں راگ میں ڈھل گئے ہیں۔

کئی راگ ایسے ہیں جو اپنے علاقوں کے لوگوں کے مزاج، کلچر، امیدوں، محرومیوں اور جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ راگ جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے تخلیق کیے گئے تھے اور ان میں یہ جذبات پوری طرح سموئے ہوئے ہیں۔

پنجاب میں تین راگ ایسے ہیں جو علاقے کے لوگوں کی تخلیق خواہشوں اور جذبات کے اظہار سے متعلق ہیں لیکن برصغیر کے دوسرے علاقے کے ہنر مندوں نے بھی ان سے استفادہ کیا ہے لیکن چونکہ ان راگوں نے پنجاب کی سرزمین میں جنم لیا ہے اس لیے ان پر پنجاب رنگ کی مہر لگ گئی ہے۔

راگ بھیرویں بہت نازک سُروں پر مشتمل ہے۔ یہ پنجاب کی صوفیانہ شاعری کے اظہار کا ذریعہ ہے جسے صوفیاء کے علاوہ مختلف بزرگوں نے بھی اپنایا۔ مثال کے طور پر ہیر کو وارث شاہ نے ایک دائمی حیثیت دے دی۔ ''ہیر'' عموماً

راگ بھیروی میں ہی گائی جاتی ہے۔'' ہیر کیا ہے۔ہیر وارث شاہ دو رومانی کرداروں ہیر اور وارث شاہ کی داستان محبت ہے۔یہ کہانی پنجاب کے کلچر' رسوم وروایات کی مظہر ہے جس سے پنجاب کے دیہاتی ماحول کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اسے دیہاتوں میں عام طور پر گایا جاتا ہے۔شادی بیاہ کے موقع پر ہو یا کوئی اور اجتماع،لوگ ہیر گاتے ہیں جو کہ ہمیشہ راگ بھیرویں میں ہی گائی جاتی ہے۔

راگ تلنگ میں بھی پنجاب کے بہت سے لوک گیت گائے جاتے ہیں۔خاص طور پر شادی بیاہ کے موقع پر دلہا دلہن کے دوست اور سہیلیاں جو گیت گاتے ہیں وہ اسی راگ میں ہوتے ہیں۔

راگ تلنگ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں غم اور خوشی دونوں کا تاثر موجود ہے۔دلہن کے رشتے داروں کے لیے اس سے جدائی ایک غمگیں تاثر ہے جبکہ دولہا کے رشتے داروں کے لیے یہ ایک خوشی کا موقع ہے۔یہ دونوں قسم کے گیت راگ تلنگ میں ہی گائے جاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ یہ ایک ہی راگ جدائی کے غم اور ملاپ کی خوشی دونوں جذبات کو موثر طریقے پر پیش کرتا ہے۔

راگ تلنگ دلا بھٹی کی داستان کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔جس میں دلا بھٹی کی بہادری' شجاعت اور بے جگری کا بھی اظہار احسن طریقے پر کیا جاتا ہے۔

لوک گیت اور لوک راگ دراصل عوام کی امنگوں' خواہشوں اور جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ان میں افراد کے جذبات بھی شامل ہیں اور اجتماعی گروہوں کی امنگیں بھی ہیں اس طرح ان دونوں کی آمیزش سے یہ لوک نغمے اور گیت جنم لیتے ہیں۔

راگ تلنگ اور بھیرویں جب موسیقی کے استادوں اور ہنر مندوں تک پہنچے تو انہوں نے اپنے تجربات اور اضافوں کی مدد سے انہیں مزید نفاست اور حسن سے نوازا اور کلاسیکی رنگوں میں ڈھال دیا۔

شمالی پنجاب کے علاقوں میں جنم لینے والا ایک اور راگ ''پہاڑی'' ہے۔اس کے نام ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ پہاڑی علاقوں کا راگ ہے۔ پہاڑی راگ عموماً جدائی' دوری اور پیار سے محرومی کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ فلمی موسیقی سے اس کی دو نمایاں مثالیں فلم ''سات لاکھ'' کے گیت۔

آئے موسم رنگیلے سہانے

جیا نہیں مانے

تو چھٹی لے کے آجا بالما

اور فلم ''عشق پر زور نہیں'' کا یہ مشہور مقبول گیت ہے۔

دل دیتا ہے رو رو دُہائی

کسی سے کوئی پیار نہ کرے

کوئی سمجھے کسی کو نہ اپنا

جھوٹا نکلے گا جیون کا سپنا

ہائے نکلا سجن ہر جائی

کسی سے کوئی پیار نہ کرے

''سات لاکھ'' کا نغمہ سیف الدین سیف نے لکھا تھا اور اس کی دھن رشید عطرے صاحب نے بنائی تھی۔ ''عشق پر زور'' نہیں کے گیت نگار قتیل شفائی تھے اور ماسٹر عنایت حسین نے اس کی دھن بنائی تھی۔ یہ بھی عرض کر دیں جو کہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ ماسٹر عنایت حسین صحیح معنوں میں تخلیق کار اور مشکل پسند تھے۔انہوں نے ایک

بار ہم سے کہا تھا کہ آفاقی صاحب، پہاڑی راگ میں گانا بنا کر ہٹ کر گانا کون سا مشکل کام ہے۔ اس راگ میں بنایا ہوا نغمہ لازماً ہٹ ہو جاتا ہے۔ مزہ تو تب ہے کہ انسان خود کو مشکل میں ڈالے پھر اس مشکل کو سلجھائے اور ایک نئی دھن بنائے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ راگ پہاڑی کس قدر مقبول عام اور پسندیدہ راگ ہے۔ چلتے چلتے اسی ضمن میں یہ بھی بتا دیں کہ "سات لاکھ" کا گیت زبیدہ خانم نے گایا تھا اور نیلو پر فلمایا گیا تھا۔ "عشق پر زور نہیں" کا گیت مالا بیگم نے گایا تھا اور یہ یاسمین پر فلمایا گیا تھا۔ اس گیت میں سائیں اختر بھی گاہے بگاہے نمودار ہو کر آواز لگاتے تھے۔ اس میں یہ پُر سوز اضافہ کر دیا تھا۔ سائیں اختر کی آواز کا اتنا خوبصورت اور مختصر استعمال اس سے پہلے اور اس کے بعد شاید ہی کسی اور موسیقار نے کیا ہو۔

پہاڑی میں جدائی، فراق اور ہجر کی کیفیت اس لیے بھی موجود ہے کہ موسم سرما میں ان علاقوں کے مرد مختلف مزدوری اور کام کاج کے لیے گھروں سے دور چلے جاتے ہیں۔ عورتیں ہجر اور جدائی کے صدمات سہتی رہتی ہیں اور راگ پہاڑی میں لگائے ہوئے لوک گیت دراصل ان کے دلوں کے تاثرات کا اظہار ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کا بس چلتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح اپنے بیوی بچوں کو بھی شہروں میں اپنے پاس بلا لیتے ہیں لیکن جو لوک گیت ان لوگوں کے ذہنوں میں بس چکے ہوتے ہیں ان کی پکار اس کے بعد بھی گونجتی رہتی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔

بھیرویں راگ کو عموماً دیہاتی پس منظر سے تعلق رکھنے والے کرداروں اور سچویشن کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس راگ میں ایک خام پن، والہانہ پن اور بے ساختگی ہوتی ہے جو کہ دیہاتیوں کے مزاج کا لازمی جزو ہوتی ہے۔ سرائیکی اور سندھی لوک گیت بھی فلموں میں استعمال کیے جاتے ہیں اور بہت کامیاب اور مقبول رہے ہیں۔ خصوصاً راگ "کافی" اس ٹھاٹ کی عکاسی کرتا ہے۔ کافی کا جب مقبول نغموں اور فلموں میں استعمال کیا گیا تو جنوبی پنجاب اور سرائیکی علاقوں کا یہ راگ مقبول عام ہو گیا۔

جہاں تک لوک دھنوں کو فلموں میں استعمال کرنے کا تعلق ہے اس سلسلے میں ہر نامور اور بڑے موسیقار نے ان سے استفادہ کیا ہے۔نوشاد صاحب کی یہی سب سے بڑی خوبی اور انفرادیت رہی ہے کہ وہ برصغیر کے طول و عرض میں اور خاص طور پر یوپی ہند کے علاقوں میں لوک گیتوں کی تلاش کرتے رہے ہیں اور ان کی بنائی ہوئی بیشتر دھنیں ان لوک دھنوں پر ہی بنی ہیں۔ بعض اوقات انہوں نے بڑی ہنر مندی کے ساتھ ان میں ضروری تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نوشاد کے نغمے دلوں پر نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہر صوبے سے تعلق رکھنے والے موسیقاروں نے اپنے علاقوں کی لوک موسیقی کو اپنی دھنوں میں استعمال کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ایس' ڈی' برمن اپنے ہمراہ بنگال اور نیپال کی لوک دھنیں لے کر آئے تھے جنہیں بھوٹان اور دار جلنگ کے علاقوں کی لوک دھنوں کی آمیزش سے انہوں نے ایک نیا ہی رنگ روپ دے دیا تھا۔ اس طرح سہیل چوہدری بنگالی طرزیں اپنے جلو میں لے کر آئے اور چھا گئے۔ جنوبی ہند کے موسیقاروں رام چندر وغیرہ نے اپنے خطوں کی لوک موسیقی کو استعمال کیا اور داد پائی۔

پنجاب سے ماسٹر غلام حیدر پنجابی رنگ لے کر اٹھے اور ہندوستان کے طول و عرض میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ برصغیر کے موسیقاروں اور سامعین کے لیے ماسٹر غلام حیدر کی موسیقی ایک بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔شیام سندر وغیرہ نے بھی پنجابی لوک دھنوں کو استعمال کیا۔ پنجاب سے تعلق رکھنے والے ایک اور موسیقار او۔پی نیئر نے فلم ''نیا دور'' میں پنجابی دھنوں کو اردو الفاظ کے روپ میں ڈھال کر تہلکہ مچا دیا تھا۔انہوں نے پنجاب طرزوں اور لوک نغموں میں ذرا سی تبدیلی کے بغیر انہیں جوں کا توں اردو میں اپنا لیا اور ہر کوئی ان کے گن گانے لگا۔وہ واحد موسیقار ہیں جنہوں نے بھارتی فلمی صنعت میں لتا منگیشکر کی اجارہ داری اور حکمرانی کو تسلیم نہیں کیا۔جب لتا نے کہا کہ میں ان کے لیے گانا نہیں گاؤں گی تو سب یہ سمجھے کہ بطور موسیقار۔۔۔ان کا خاتمہ ہے لیکن انہوں نے آشا بھوسلے' گیتا دت' شمشاد اور دوسری آوازوں کے استعمال سے ایسا جادو پھونکا کہ لتا کی آواز کی کمی محسوس ہی نہیں ہوتی بلکہ ان گانوں میں ایک نیا پن اور نئی کیفیت پیدا ہو گئی۔

جن موسیقاروں نے راگ راگنیوں کو اپنی موسیقی کی بنیاد بنایا وہ بے حد کامیاب رہے۔ راگ درباری‘ میاں کی توڑی ‘ خیال ٹھمری اور موسیقاروں کے پسندیدہ راگ رہے ہیں۔ آج کی جدید مغربی انداز کی موسیقی کیونکہ لوک دھنوں اور صدہا سالوں سے مقبول راگ راگنیوں سے محروم ہے اسی لیے بے جان اور بے اثر ہے۔ کوئی مقبول ترین گانا بھی چندماہ تک ٹی وی اور ویڈیو کے سہارے قبول عام حاصل کرتا ہے مگر اس کے بول سننے والوں کو پھر بھی یاد نہیں ہوتے۔ چند مہینوں بعد لوگ اسے بھول جاتے ہیں لیکن 1942ء اور اس سے بھی پہلے راگوں میں ترتیب دیے ہوئے فلمی نغمات آج بھی لوگوں کو ازبر ہیں۔ یہ دراصل راگوں اور لوک دھنوں کی بدولت ہے مگر افسوس کہ مغرب کی اندھا دھند تقلید کے جوش میں ہم اپنی جڑوں سے جدا ہو کر رہ گئے ہیں اور وہی شعر ہم پر صادق آتا ہے کہ ۔۔۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

نہ ادھر کے رہے نہ اھر کے رہے

پچھلی صدی نے فنون لطیفہ کی ہر صنف میں بے شمار صاحب فن لوگوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ علم و ادب اور فنون لطیفہ کے ہر شعبے میں درجنوں ایسے قد آور لوگ موجود تھے۔ جن کا مثل آج ایک بھی نظر نہیں آتا۔ یہ دور بڑے اور گوناگوں لب و لہجے اور انداز کے شاعروں کا دور تھا۔ نامور اور صفِ اول کے شعراء درجنوں کی تعداد میں تھے جن کے سامنے آج کے بڑے بھی بونے نظر آتے ہیں۔

سردار جعفری بھی ایک ایسا ہی نام ہیں۔ کہتے کہ وہ ترقی پسند تحریک کے سرخیلوں میں شامل تھے اور عملی طور پر بھی وہ اس تحریک اور سوشلزم کی ترویج میں حصہ لیتے رہے لیکن انہوں نے اپنی شاعری پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔ وہ ایک بے بہا اور بے مثال شاعر تھے۔ ان کے ہم عصروں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے پورے ختم ہو جائیں مگر ان کی گنتی ختم نہ ہو لیکن وہ ایسا دور تھا کہ ہر صاحب ہنر اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر نمایاں ہو کر خود کو تسلیم کرا لیتا تھا۔

علی سردار جعفری کا زمانہ 70 سال سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہے۔اس دوران میں انہوں نے ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ رجحانات رکھنے کے جرم میں جیلیں بھی کاٹیں، فاقے بھی کیے، ہر طرح کے دکھ اٹھائے مگر اپنے نظریات سے جنبش نہیں کی۔وہ ان ترقی پسند اور اشتراکی شعراء اور شخصیات میں تھے جنہوں نے سوویت یونین کے خاتمے کے بعد بھی اپنے نظریات کو تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔اس اعتبار سے وہ ایک راسخ العقیدہ اشتراکی تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ بیسویں صدی کی ترقی پسند تحریک میں سب سے زیادہ قد آور اور ممتاز ترین شخصیت تھے تو غلط نہ ہو گا۔

علی سردار جعفری بھی عجیب گونا گوں طبیعت کے مالک تھے۔اشتراکی، عملی کمیونسٹ، ترقی پسند ادبی تحریک کے پیش رو، اس کے باوجود وہ ایک زندہ دل اور خوبصورت شخصیت اور رومانی شاعر بھی تھے۔بذاتِ خود وہ اپنے اشعار کی مانند خوبصورت اور دلکش تھے۔نکلتا ہوا قد، متناسب اعضاء، چہرے کے نقش و نگار ایسے کہ کسی فلم کے ہیرو بن سکتے تھے۔گھنے بال، بڑی بڑی آنکھیں، کھلتی ہوئی رنگت اور اس پر ان کا طرز گفتگو۔وہ لوگوں کو مسحور کرنے والی شخصیت تھے اور ہر ملاقاتی کا دل موہ لیتے تھے۔ان سب مصروفیات سے وقت نکال کر انہوں نے رومانی شاعری بھی کی یہاں تک کہ فلمی نغمہ نگاری سے بھی باز نہ رہے۔ان کے لکھے ہوئے فلمی نغمات اپنی شعریت، نغمگی اور خوشبو کے اعتبار سے ان کی اپنی ذات کی طرح منفرد اور نمایاں ہیں۔

پہلے تو سردار جعفری کا تعارف کرا دیا جائے کیونکہ نئی پود کی اکثریت شاید ان سے واقف بھی نہ ہو۔اس کی ایک وجہ تو مقبولِ عام سرگرمیوں سے ان کا پرہیز کرنا تھا۔مثلاً انہوں نے بہت کم فلمی گیت لکھے حالانکہ ان کی بہت مانگ تھی پھر ستم یہ ہوا کہ قیام پاکستان کے بعد دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے جس کی وجہ سے فنکاروں اور تخلیق کاروں کی آمدورفت بہت کم رہی پھر یہ حد امتیاز بھی قائم ہو گئی کہ وہاں کے شاعر اور ادیب بھارتی جرائد میں اور پاکستانی شاعر و ادیب پاکستانی جریدوں میں لکھنے لگے۔کتابوں اور رسائل کے آزادانہ باہمی تبادلے کی وجہ سے بھی پاکستان کی

نئی پود ایسے ایسے قابل اور تخلیق لوگوں سے ناآشنا رہی جن کی اردو ادب اور شاعری کے لیے ناقابل فراموش خدمات ہیں۔

علی سردار جعفری نومبر 1913ء میں بلرام پور میں پیدا ہوئے تھے۔اینگلو عربک کالج دہلی سے بی اے پاس کیا اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا جو کہ اس زمانے میں برصغیر کے ذہین مسلمانوں کی آماجگاہ تھی۔

زمانہ طالب علمی ہی میں وہ اشتراکی تحریک سے متاثر ہو گئے تھے۔انجمن ترقی پسند مصنّفین کی تشکیل ہوئی تو وہ اس کے بانی ارکان میں شامل تھے۔ان کی پہلی تحریر 1927ء میں طبع ہوئی تھی۔ان کی نثری تصنیف (جو افسانوں اور مضامین کا مجموعہ تھا) 1938ء میں شائع ہوئی تھی۔وہ بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن اتفاق کی بات یہ ہے کہ ان کے اشعار کا پہلا مجموعہ ''پرواز'' 1944ء میں شائع ہوا تھا۔اس اثناء میں وہ ایک سال جیل میں رہے۔جرم یہ تھا کہ انہوں نے جنگ کے خلاف نظمیں لکھی تھیں۔

علی سردار جعفری نے افسانے بھی لکھے۔غزلیں اور نظمیں بھی تخلیق کیں۔ان کی تصنیفات میں منزل (افسانوں کا مجموعہ) پرواز (نظموں کا مجموعہ) پیار) ڈراموں کا مجموعہ) نئی دنیا کو سلام (طویل نظم) خون کی لکیر (طویل نظم (امن کا ستارہ (طویل نظم) ایشیا جاگ اٹھا (طویل نظم) ترقی پسند ادب (نثری مضامین کا مجموعہ) ایک خواب اور (نظموں کا مجموعہ)۔پتھر کی دیوار (نظمیں (لہو پکارا ہے (نظمیں) پیغمبران سخت (میر۔غالب اور اقبال کے بارے میں تجزیاتی مقالے) اقبال شناسی (تنقید مضامین) اور دوسری کتابیں شائع ہیں۔

علی سردار جعفری نے ادبی جرائد کی ادارت بھی کی۔ماہنامہ ''نیا روپ'' ہفت روزہ ''پرچم'' سہ ماہی ''گفتگو'' ہفت روزہ ''قومی جنگ'' وغیرہ ان کی ادارت میں شائع ہوتے رہے اور یہ اپنے زمانے کے بہت معیاری جرائد تھے۔علی سردار جعفری کی نظموں کے مختلف زبانوں میں تراجم کیے گئے۔بھارتی حکومت نے انہیں اعلیٰ ترین شہری اعزاز ''پدم شری'' اور ''جن پت'' سے نوازا تھا جبکہ پاکستان کی حکومت نے انہیں ''تمغہ اقبال'' دیا تھا۔

علی سردار جعفری ادبی افق پر اس وقت نمودار ہوئے تھے جب 1930ء میں ''انگارے'' کے عنوان سے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ یہ حقیقت پسندی اور ترقی پسند تحریروں کی سمت پہلا قدم تھا اور اسی سے بعد میں انجمن ترقی پسند مصنّفین نے جنم لیا۔ یہ مجموعہ اس وقت کے رائج سماجی نظام کے خلاف ایک اعلان بغاوت تھا

سجاد ظہیر کے ساتھ علی سردار جعفری انجمن ترقی پسند مصنّفین کے بانی ارکان میں شامل تھے۔ یہ لوگ انگریزی حکومت کے باغی تھے۔ سردار جعفری نے مزدوروں اور محنت کشوں کے ساتھ شانہ بشانہ بھی کام کیا کیونکہ وہ محض شاعر اور ''بابو''نہیں تھے۔ ایک عملی انسان تھے۔

علی سردار جعفری بنیادی طور پر نظم گو شاعر تھے۔ انہوں نے نظم کی ہیئت اور معنویت کے سلسلے میں کئی تجربے بھی کیے تھے۔ مثلاً سرخ سویرا۔ صبح انقلاب۔ خون بیتی وغیرہ لیکن ان کا اصل مقام نظم گو شاعر کی حیثیت سے متعین ہو چکا ہے۔ انہوں نے کچھ غزلیں بھی لکھی ہیں مگر اس صنف میں زیادہ نمایاں نہ ہوئے۔ دراصل ان کا رجحان غزل کی طرف تھا بھی نہیں۔ ان کا شمار کلاسیکل ترقی پسند شعراء میں کیا جاتا ہے۔

جب ترقی پسند مصنّفین نے فلم کو ذریعہ اظہار بنانے کا فیصلہ کیا تو کئی نامور شعراء اور ادیب فلمی صنعت سے وابستہ ہو گئے۔ ان میں علی سردار جعفری بھی تھے کئی ادیبوں اور شاعروں نے فلم سازی' ہدایت کاری اور نغمہ نگاری کے ذریعے اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ کہانیاں اور مکالمے بھی لکھے لیکن علی سردار جعفری کو فلموں نے اپنی طرف راغب نہیں کیا۔ انہوں نے چند فلموں کے لیے نغمات تحریر کیے اور پھر اس شعبے سے قطع تعلق کر لیا۔

علی سردار جعفری صحیح معنوں میں انسان دوست اور سیکولر شخصیت تھے۔ جب بھارت نے پوکھران میں ایٹمی تجربہ کیا تو علی سردار جعفری نے اس کی شدید مذمت کی اور اسے برصغیر کو تصادم اور بربادی کی جانب لے جانے کا اقدام قرار دیا۔ بابری مسجد کی شہادت کے خلاف بھی انہوں نے آواز بلند کی اور کئی نظمیں اور مضامین لکھے۔ متعصّب ہندو جماعتوں کی طرف سے انہیں دھمکیاں بھی دی گئیں مگر وہ اپنی آواز بلند کرنے سے باز نہ آئے۔

علی سردار جعفری کو رفتہ رفتہ یہ احساس ہو گیا تھا کہ بھارت میں اردو کا مستقبل خطرے میں ہے۔ انہوں نے ادبی انجمنوں اور سرکاری اداروں پر بہت دباؤ ڈالا کہ اردو کی حفاظت کے لیے مناسب اقدام اٹھائے جائیں مگر افسوس کہ ان کوششوں میں کامیاب نہ ہوسکے۔ وہ آخر عمر تک مستعد اور تندرست رہے لیکن اگست 2000ء میں دماغ کے کینسر نے انہیں گھیر لیا۔ اس بیماری سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ انہوں نے 87 سال کے قریب عمر پائی جن میں 70 ستّر سال ادب اور ادبی تحریکوں کی نذر کر دیے۔

دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے وہ ایک مطمئن اور پرسکون انسان تھے کیونکہ انہوں نے ساری زندگی اپنے نظریات کے مطابق اور ان کے پرچار میں صرف کی تھی۔ دنیاوی آسائشوں اور ترغیبات سے انہیں کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ شاید یہی ان کی صحت اور خوشی کا راز تھا۔

جو لوگ بھارت کی فلموں سے بہت زیادہ متاثر ہیں وہ ہر پہلو سے بھارتی فلمی صنعت کی برتری اور پاکستانی فلمی صنعت کی کمتری ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ جہاں تک پاکستان کی فلمی صنعت بتدریج مائل بہ زوال ہی رہی اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس کے بارے میں بارہا اظہار خیال کیا جا چکا ہے اور اس کے اسباب بھی بیان کیے جا چکے ہیں لیکن بہر صورت بھارتی فلمی صنعت کی برتری ثابت کرنا بھی کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

پچھلے دنوں ایک صاحب نے اس بات پر بے حد افسوس کا اظہار کیا بھارت میں فلم سازوں' ہدایت کاروں اور فنکاروں کی ایک نئی نسل میدان میں آچکی ہے جو اپنے والدین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس میدان میں داخل ہوئے ہیں لیکن پاکستان میں ایسا بہت کم ہوا ہے اور کوئی بھی ایسی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی نامور فلمی شخصیت کی اولاد نے کامیابی حاصل کی ہو یا نام پیدا کیا ہو۔ اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اول تو پاکستان میں فلمی صنعت سے وابستہ لوگوں نے اپنی اولادوں کو فلمی صنعت سے روشناس کرانا ہی مناسب نہ سمجھا اور اگر ایسا ہوا بھی تو نئی پود کے یہ لوگ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

اس کے دو اسباب ہیں۔ایک معاشی اور دوسرا معاشرتی۔ پاکستان میں صنعت سازی کبھی بھی فلم سازوں یا فنکاروں کے لیے دولت کمانے کا وسیلہ نہ بن سکی۔اس کی وجہ محدود مارکیٹ اور بیرونی دنیا میں پاکستانی فلموں کا عدم تعارف ہے۔ جس کام سے ذہین اور تعلیم یافتہ افراد کو معقول آمدنی کا امکان ہی نہ ہو وہ اس کو کیوں اپنائیں گے جبکہ دوسرے شعبوں میں وہ اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر بہت زیادہ ترقی کر سکتے ہیں اور دولت بھی کما سکتے ہیں۔دوسرا سبب معاشرتی ہے۔ پاکستان میں فلمی صنعت کو کبھی معاشرے میں قدر واحترام کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔سوسائٹی میں اس سے وابستہ افراد کو بلند مقام نہیں دیا گیا۔خاندانی اور اخلاقی روایات کے تحت یہ ایک ناپسندیدہ پیشہ اور رسوا کن کام سمجھا گیا ہے۔ ان دونوں حقائق کی موجودگی میں پاکستان میں فلم والوں نے اپنی نئی نسل اور اولادوں کو اس شعبے سے دور ہی رکھا۔ سوائے معدودے چند مثالوں کے۔

ڈبلیو زیڈ احمد کے بیٹے فرید احمد نے ہدایت کاری کا پیشہ اختیار کیا تو ان کے والد یا اہل خاندان نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ فرید احمد نے عندلیب' بندگی' جان پہچان اور انگارے جیسی فلمیں بنا کر اپنی شناخت پیدا کی۔بعد میں وہ مختلف وجوہ کی بنا پر نقلِ وطن کر کے کینیڈا چلے گئے تھے۔وہاں سے کینسر کے آخری اسٹیج میں مبتلا ہو کر لاہور آئے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔

پرانے لوگوں میں نذیر صاحب کے ایک بیٹے افضل نذیر نے ڈسٹری بیوشن کا بزنس کیا تھا۔ایک دو فلموں میں اداکاری بھی کی مگر ناکام رہے۔نذیر صاحب کے کسی اور بیٹے یا بیٹی نے اس شعبے کی طرف توجہ نہیں دی حالانکہ نذیر صاحب اور ان کی بیگم سورن لتا دونوں فلمی دنیا کے درخشاں نام تھے۔

شوکت حسین رضوی کے بیٹے ہدایت کاری اور فلم سازی تک محدود رہے مگر دونوں شعبوں میں اکبر رضوی اور اصغر رضوی کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ان کی صاحب زادی ظلِ ہما نے شوکت صاحب کی زندگی کے آخری ایام میں گلوکاری کا آغاز کیا تھا جس سے شوکت صاحب سخت ناخوش تھے یہاں تک کہ انہوں نے آخری وقت بیٹی کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ میڈم یاسمین سے ان کے دو بیٹے ہیں۔ وہ صرف اپنے حصے کے بچے کھچے شاہ نور اسٹوڈیو کو

سنبھالنے میں مصروف ہیں۔ تخلیق کار باپ اور فنکارہ ماں کے ان بیٹوں نے ہدایت کاری‘ فلم سازی یا اداکاری میں مطلق دلچسپی نہیں لی۔

سبطین فضلی اور ان کے بھائی کے بیٹوں نے بزنس کی حد تک فلموں میں حصہ لیا ہدایت کاری‘ فلم سازی اور اداکاری سے پرہیز کرتے رہے۔

آغا جی اے گل نے اپنے بیٹوں کو امریکا سے فلم کی تعلیم دلائی اور ان کے بڑے بیٹے ریاض گل نے کچھ عرصے ان کے ساتھ اسٹوڈیو کی نگرانی بھی کی۔ انہوں نے ایک فلم بھی بنائی جو ناکام رہی۔ آغا صاحب کے دو چھوٹے بیٹوں نے ان کی زندگی ہی میں تعلیم کو خیر باد کہہ کر اسٹوڈیو کے معاملات سنبھال لیے تھے۔ سجاد گل اور شہزاد گل نے فلم سازی کے شعبے میں بہت نام پیدا کیا لیکن اداکاری یا ہدایت کاری سے دور ہی رہے۔

ملک باری فلم ساز‘ تقسیم کار اور اسٹوڈیو کے مالک تھے۔ ان کے دو بیٹوں راحیل اور خرم نے برائے نام فلم سازی بھی کی اور اسٹوڈیو کے نگراں بھی رہے مگر دونوں شعبوں میں کوئی نمایاں کارکردگی نہ دکھا سکے۔

شباب کیرانوی کے دو بیٹے نذر شباب اور ظفر شباب ان کی زندگی میں ہی فلم ساز اور ہدایت کار بن گئے تھے مگر اس میں شباب صاحب کی کوششوں اور سرپرستی کا نمایاں حصہ تھا۔ انہوں نے والد کی زندگی میں کامیابیاں بھی حاصل کیں مگر ان کی آنکھ بند ہوتے ہی مسلسل ناکامیاں ان کے حصے میں آئیں۔ ظفر شباب چند سال قبل مرحوم ہو چکے ہیں۔ فلم کے لیے نذر شباب کا وجود اور عدم وجود برابر ہے۔

وحید مراد کے والد نثار مراد صاحب بہت بڑے تقسیم کار تھے۔ وحید مراد نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد فلم سازی کی طرف توجہ دی اور کامیابیاں حاصل کیں۔ ہیرا پتھر اور ارمان سے انہوں نے آغاز کیا تھا مگر بعد میں فلم سازی میں وہ معیار برقرار رکھ سکے۔ انہوں نے اداکاری کا پیشہ اپنایا اور ایسی مقبولیت اور کامیابی حاصل کی کہ شاید و باید۔

آخری ایام غم والم کی داستان ہیں۔ بہر حال۔ان کے بعد ان کی بیٹی کی شادی کم عمری ہی میں کر دی گئی۔ان کے بیٹے عادل مراد کو ان کی والدہ نے اداکار بنانے کی کوشش کی۔اس خبر سے فلمی حلقوں میں سنسنی پھیل گئی تھی۔توقع تھی کہ وحید مراد کا بیٹا بہت بڑا اداکار بنے گا۔انہوں نے فلم ''راجا صاحب '' میں ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔یہ فلم ناکام ہو گئی اس کے ساتھ ہی عادل مراد بھی فلمی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ان میں اداکارانہ صلاحیتوں کی کمی تھی۔ دلچسپی اور شوق بھی نہ تھا۔ان کا فلموں سے رخصت ہو جانا ان کے حق میں بھی بہتر تھا اور فلمی صنعت کو بھی اس سے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ان کے کامیاب نہ ہونے کا ایک سبب تو ان کی صورت شکل تھی۔اتفاق سے ان کی اپنے مرحوم باپ میں بہت کم شباہت تھی سوائے آنکھوں کے۔وہ کم عمر بھی تھے اور اس وقت ان کی ہم عمر کوئی ہیروئن بھی صنعت میں موجود نہ تھی۔البتہ اگر وہ اس شعبے میں واقعی دلچسپی رکھتے ہیں تو کچھ عرصے بعد ہدایت کاری اور تکنیک کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ دوبارہ فلمی صنعت میں شمولیت اختیار کر سکتے ہیں۔ان کے والد وحید مراد ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے۔انہوں نے کئی کامیاب فلمیں بنائی تھیں اور ایک فلم '' اشارہ'' کی ہدایت کاری بھی کی تھی مگر یہ فلم کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وحید مراد کے ستارے اس وقت گردش میں آچکے تھے اور مسلسل کامیابیوں اور عروج کی انتہا کو چھو لینے کے بعد وہ روبہ زوال تھے۔

بڑے لوگوں کی اولاد کے اس شعبے میں نمایاں نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ جس طرح بڑے گھنے اور قد آور درخت کے سائے میں دوسرے پودے پروان نہیں چڑھتے اسی طرح باپ کی عظمت کے سائے میں پلنے والے بچے بھی نہیں پنپ سکتے۔مثلاً سلطان راہی کو پنجابی فلموں میں آخری وقت تک جو عروج حاصل رہا تھا وہ شاید ہی کسی دوسرے ہیرو کے حصے میں آئے گا۔وہ درمیانی عمر سے نکل چکے تھے۔چہرے پر بھی عمر کے آثار ہو گئے تھے۔جسم بھی بھاری ہو گیا تھا مگر خدا جانے اللہ تعالیٰ نے ان پر کن خوبیوں کی وجہ سے اپنا خاص کرم کیا تھا کہ لوگ انہیں دیکھنے کے لیے جوق در جوق سینما گھروں میں پہنچ جاتے تھے۔وہ صحیح معنوں میں باکس آفس سپر اسٹار تھے کیونکہ فلم بینوں کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا کہ ان کے مقابلے میں ہیروئن کون ہے۔ان کا ہدایت کار کون ہے۔کہانی کس نے لکھی ہے۔موسیقی کس نے ترتیب دی ہے۔انہیں تو صرف سلطان راہی کو دیکھنے سے مطلب تھا حالانکہ ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ

وہ عام طور پر ایک ہی قسم کا لباس ہر فلم میں زیب تن کرتے تھے بلکہ اکثر اوقات تو مکالمے بھی ویسے ہی یا بالکل وہی ہوتے تھے جیسے کہ گزشتہ فلم میں ہوتے تھے۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ میں کرداروں اور مکالموں کی یکسانیت سے تنگ آ چکا ہوں۔ مسلسل شب و روز ایک ہی قسم کے کردار ادا کرنے اور ایک جیسے مکالمے بولنے کی وجہ سے ہی وہ بیک وقت پانچ چھ فلموں کی شوٹنگ کر لیتے تھے۔ وہ گھنٹوں کے حساب سے فلم سازوں کو وقت دیتے تھے۔ وہ فلم کے سیٹ پر داخل ہو کر سب سے خوش اخلاقی سے علیک سلیک کرتے اور پھر لباس تبدیل کرنے چلے جاتے۔ سیٹ پر آ کر صرف وہ یہ دریافت کرتے تھے کہ اس سین کی نوعیت کیا ہے اور سچویشن کیا ہے؟ اس سے بعد وہ مکالمے دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

کہتے ’’ آغا جی ! ایک ریہرسل اور پھر ٹیک لیجئے۔‘‘

دوسرے فنکار پہلے ہی سے تیار ہوتے تھے۔ وہ کیمرے کے سامنے آ کر ریہرسل کے طور پر مکالمے بولتے اور ایکشن کرتے اور پھر شاٹ فلمایا جاتا تھا۔ کسی غلطی یا خامی کے بغیر ایسی تقدیر، ایسی پذیرائی اور ایسی صلاحیت بھلا کتنے اداکاروں کے نصیب میں ہوتی ہے؟

ان ہی سلطان راہی کے صاحب زادے حیدر سلطان نے بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اداکاری کا فیصلہ کیا۔ ان کی پہلی فلم ’’ہیرا‘‘ تھی جس کے ہدایت کار ظہور حسین گیلانی تھے۔ اس فلم میں حیدر سلطان کی اداکاری اچھی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس فلم میں ان کے والد سلطان راہی نے بھی کام کیا تھا۔ دونوں باپ بیٹوں کے بھی آمنے سامنے مناظر فلمائے گئے تھے جن میں حیدر نے کافی استقامت کا ثبوت دیا اور فلم بینوں نے انہیں پسند بھی کیا تھا۔ انہوں نے چند اور فلموں میں بھی اداکاری کی جن میں دنیا دیکھے گی‘ شہزادے‘ خزانہ‘ احساس اور مہلت وغیرہ شامل ہیں۔ سلطان راہی کی اچانک وفات کے بعد کئی فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے وعدہ کیا تھا کہ حیدر سلطان کو اپنی فلموں میں موقع دیں گے مگر دنیا کے دستور کے مطابق ’’چھوڑیے رات گئی، بات گئی‘‘ والا معاملہ ہوا اور کسی نے بھی وعدہ پورا نہیں کیا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر امریکا واپس چلے گئے۔ دوبارہ وطن کی مٹی کی کشش انہیں کھینچ لائی مگر چند ٹی

وی ڈراموں میں سائیڈ رول کرنے کے سوا کوئی اچھا موقع نہ ملا۔اب وہ قریب قریب بھولی ہوئی داستان بن چکے ہیں۔ لوگوں کو یاد بھی نہیں رہا کہ اپنے وقت کے سب سے مقبول اداکار کا ایک بیٹا بھی تھا جس نے اداکاری کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔

رنگیلا کو دیکھ لیجئے۔ایک بار کامیڈی کرداروں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ سب سے مقبول مزاحیہ اداکار بن گئے تھے۔ منور ظریف اور بعد میں ننھا کے ساتھ ان کی جوڑی بہت کامیاب رہی تھی۔رنگیلا ہمہ صفت موصوف انسان ہیں جو تعلیم سے محرومی کے باوجود بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ان صلاحیتوں کا مظاہرہ انہوں نے فلم ساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے بھی کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے گلوکاری بھی کی اور ان کے گائے ہوئے گیتوں نے بہت شہرت حاصل کی۔ایک نغمہ بے حد مقبول ہوا تھا اور آج بھی سب کو یاد ہے۔

گا میرے منوا گاتا جارے

جانا ہے ہم کا دور

رنگیلا پر بھی عروج کے بعد زوال کا دور آیا مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور مزاحیہ کرداروں میں بھی کام کرتے رہے۔ حالانکہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب انہوں نے ہیرو کی حیثیت سے کئی کامیاب فلموں میں کام کیا تھا اور اس وقت کی کئی ہیروئنیں ان کے ساتھ کام کر چکی تھیں۔

رنگیلا نے اپنی فلم ''خوبصورت شیطان'' کا آغاز کیا جس کے ہدایت کار، فلم ساز، موسیقار اور نغمہ نگار بھی وہ خود ہی تھے۔اس فلم میں انہوں نے اداکاری بھی کی تھی۔اس فلم میں انہوں نے اپنے بیٹے سلمان کو بھی ایک نمایاں کردار سونپا تھا مگر بدقسمتی سے یہ فلم بری طرح فلاپ ہوگئی۔رنگیلا کے لیے تو یہ کوئی نئی بات نہ تھی مگر سلمان کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔اس کے بعد کسی اور فلم ساز اور ہدایت کار نے انہیں اپنی فلم میں کاسٹ کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔

غالب کمال ایک اور بڑے ہیرو' فلم ساز اور ہدایت کار کمال کے بیٹے ہیں۔ صورت شکل بھی اچھی ہے اور کسی حد پر تھے اور فلم سازی وہدایت کاری بھی کررہے تھے اس وقت غالب بہت چھوٹے تھے۔ انہیں ہدایت کار ظہور حسین گیلانی نے فلم "مہندے" میں موقع دیا تھا مگر یہ فلم ناکام ہوگئی۔ ایک اور فلم "چوروں کے چور" میں بھی انہوں نے کام کیا مگر قسمت نے یاوری نہ کی۔

اس طرح غالب کمال فلمی دنیا سے "غائب کمال" ہوگئے۔ اس کے بعد انہوں نے چند ٹی وی ڈراموں میں کام کیا اور کمپیئرنگ بھی کی۔ ان کا انداز مزاحیہ ہے۔ شخصیت بھی پراثر ہے لیکن فلموں کے بعد ٹی وی میں بھی وہ کامیابی حاصل نہ کرسکے۔ وہ اب بھی کبھی کبھی کسی ٹی وی ڈرامے میں نظر آتے ہیں مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ یعنی وہ اپنے نامور باپ کے پاسنگ بھی نہیں ہیں۔

ایک مثال جو قدرے بہتر ہے ارباز خان کی ہے۔ ارباز خان اداکار آصف خان کے صاحب زادے ہیں۔ آصف خان نے یوں تو اردو پنجابی فلموں میں بھی اداکاری کی ہے لیکن دراصل وہ پشتو فلموں کے سپر اسٹار ہیں ان کے بیٹے ارباز خان نے اپنی اداکاری کا آغاز اردو فلموں سے کیا۔ قابلِ ذکر فلموں میں سید نور کی فلم "دوپٹہ جل رہا ہے" شامل ہے۔ اس فلم میں ان پر فلمایا ہوا ایک نغمہ بھی بہت مقبول ہوا تھا مگر اس کے باوجود ارباز خان صفِ اوّل کے ہیرو نہ بن سکے۔ اب بھی وہ فلموں میں اداکاری کرتے ہیں لیکن ممتاز نہیں ہوسکے پھر بھی وہ دوسرے فنکاروں کے بیٹوں کے مقابلے میں کامیاب کہے جاسکتے ہیں۔

منور ظریف کو پنجابی اور اردو فلموں میں شہنشاہِ ظرافت کا لقب دیا گیا تھا۔ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کی وجہ سے انہوں نے بہت شہرت حاصل کی تھی۔ وہ ایک نامور اور مزاحیہ اداکار ظریف کے چھوٹے بھائی تھے مگر مقبولیت اور شہرت کے جیسے معاملے میں ظریف سے بھی آگے نکل گئے تھے حالانکہ ظریف جیسے ذہین اور باصلاحیت مزاحیہ ادکار پاکستان میں بہت کم سامنے آئے ہیں۔ وہ اردو اور پنجابی دونوں فلموں میں یکساں مہارت سے اداکاری کرتے تھے۔ منور ظریف ان ہی کے چھوٹے بھائی تھے جس نے ثابت کردیا تھا کہ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔

بہر حال، منور ظریف نے طویل عرصے تک فلمی دنیا میں راج کیا اور پھر جوانی میں ہی انتقال کر گئے۔ان کے بیٹے فیصل ظریف کے نام سے فلموں میں جلوہ گر ہوئے الطاف حسین جیسے کامیاب ہدایت کار نے انہیں فلم ''پتر منور ظریف دا'' میں پیش کیا تھا مگر یہ تعارف بھی انہیں کامیابی نہ دلا سکا۔انہوں نے ایک اور فلم ''پتر جیرے بلیڈ دا'' میں بھی اداکاری کی تھی۔

''جیرا بلیڈ'' منور ظریف کی کامیاب ترین فلموں میں سے ایک تھی مگر اس بار بھی وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ان کی تیسری اور آخری فلم ''کھوٹے سکے'' تھی جو کہ اپنے نام کے مطابق ہی کھوٹا سکہ ثابت ہوئی۔ان مسلسل ناکامیوں نے فیصل ظریف اور فلم سازوں کو مایوس کر دیا اور وہ فلمی دنیا سے لاپتہ ہو گئے۔

نواز خان پشتو فلموں کی اداکارہ نگینہ خانم کے صاحب زادے ہیں۔انہیں ہدایت کار جلال خٹک نے فلم ''اور چوڑیاں ٹوٹ گئیں'' میں پہلی مرتبہ اداکاری کا موقع دیا تھا۔جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ ایک معاشرتی اور موضوعاتی فلم تھی۔یہ ہر لحاظ سے ایک اچھی فلم تھی سوائے اس کے کہ فلم سے وابستہ لوگوں کی قسمت اچھی نہیں تھی۔یہ فلم سخت ناکامی سے دوچار ہوئی۔جن لوگوں نے اس فلم کو دیکھا انہوں نے اسے پسند کیا مگر عام فلم بینوں تک اس کی رسائی نہ ہو سکی۔اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس اردو فلم کے ہدایت کار اور فن کار وغیرہ سبھی نئے اور غیر معروف تھے۔اگر اس کی مناسب پبلسٹی کی جاتی تو یہ بہت کامیابی حاصل کر سکتی تھی مگر وسائل کی کمی مانع رہی۔ایسا بھی نہیں ہے کہ نواز خان کو اس کے بعد اداکاری کا موقع نہیں ملا۔انہوں نے کئی فلموں میں اداکاری کی جن میں ''جینے دو'' جنگل کوئن ' دنیا دیکھے گی' دیکھا جائے گا' نوبے بی نو' دشمن زندہ رہا شامل ہیں مگر کوئی ایک فلم بھی کامیاب نہ ہو سکی۔اس کے بعد فلمی صنعت کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور نواز خان فلموں میں نظر نہ آئے۔

اقبال کاشمیری ایک کامیاب اور خوش قسمت ہدایت کار سمجھے جاتے ہیں۔انہوں نے سپر ہٹ پنجابی فلمیں بھی بنائی ہیں اور بے حد کامیاب اور اردو فلموں کے ہدایت کار ہونے کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہے۔جو ڈر گیا وہ مر گیا اس کی واضح مثال ہے۔پنجابی فلموں میں انہوں نے بہت سی سپر ہٹ فلمیں بنائی ہیں۔ایک وقت تھا جب ان کا نام فلم کی کامیابی کی

ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ سلطان راہی کو ممتاز کردار سونپ کر اسٹار بنانے کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ سلطان راہی اس وجہ سے تمام عمران کا بے حد احترام اور لحاظ کرتے رہے۔

اقبال کاشمیری جو اداکار ساز کہلاتے ہیں خود اپنے بیٹے کو اسٹار نہ بنا سکے۔ ان کے بیٹے فیصل نے بچپن ہی میں اداکاری کا آغاز کر دیا تھا۔ ہماری بطور فلم ساز پہلی فلم ''کنیز'' میں بھی انہوں نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

اقبال کاشمیری نے انہیں سوچ سمجھ کر اپنی فلم ''ممی'' میں مرکزی کردار کے لیے منتخب کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ فیصل کا بہترین ذریعہ تعارف ہو گا۔ اس فلم میں ان کے بالمقابل ریما جیسی ہیروئن تھیں۔ ''جو ڈر گیا وہ مر گیا'' کے بعد عتیقہ اوڈھو بھی اس فلم میں ایک اہم کردار میں پیش کی گئی تھیں، مگر تقدیر کے آگے کس کا بس چلا ہے۔ ''ممی'' کو اقبال کاشمیری ایک شاہکار بنانا چاہتے تھے مگر یہ بے حد ناکام اور بیکار فلم ثابت ہوئی۔ جب اتنے نامور ہدایت کار ہی اپنے بیٹے کو کامیاب نہ کرا سکے تو پھر دوسرے ہدایت کار کیوں کر ہمت کرتے؟ اس طرح فیصل اقبال ایک ہی فلم میں کام کرنے کے بعد لاپتا ہو گئے۔

پاکستانی فنکارہ نشو اپنے زمانے کی معروف ہیروئن تھیں۔ انہوں نے نغمہ نگار تسلیم فاضلی سے بھی شادی کی تھی مگر یہ ان کی پہلی شادی نہ تھی۔ تسلیم فاضلی شادی کے چند سال بعد ہی اچانک ہارٹ فیل کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ اس وقت وہ جوان العمر ہی تھے۔ نشو نے چند سال قبل اپنے شوہر کی بیٹی کو صاحبہ کے نام سے فلمی دنیا میں متعارف کروایا۔ صاحبہ نے بہت جلد ایک اداکارہ اور رقاصہ کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی۔ ایک زمانے میں وہ اداکار جان ریمبو (افضل) کے ساتھ اکثر فلموں میں کام کیا کرتی تھیں۔ اسی دوران میں باہمی دلچسپی اور پھر محبت نے جنم لیا۔ نشو اس شادی کے حق میں نہ تھیں مگر بیٹی کی ضد کے آگے ہار مان لی اور صاحبہ کی ریمبو کے ساتھ شادی ہو گئی۔ اب یہ دونوں ایک خوبصورت بچی کے والدین ہیں۔ صاحبہ نے شادی کے بعد اداکاری ترک کر دی اور گھر داری سنبھال لی۔

پنجابی فلموں میں اکمل کو 60 کی دہائی میں بے پناہ مقبولیت حاصل تھی۔ انہیں پنجابی فلموں کا دلیپ کمار بھی کہا جاتا تھا۔ وہ خود کو بھی دلیپ کمار ہی سمجھتے تھے بلکہ نمبرون دلیپ کمار کہلوانا چاہتے تھے۔ مگر بدقسمتی یہ تھی کہ دیسی کے دیسی ہی رہے اور دلیپ کمار کی شخصیت کے گھن نہ پاسکے۔ دلیپ کی شخصیت سازی نے ان کو یوسف سے دلیپ بنایا تھا جبکہ اکمل احساس برتری کے زعم میں پٹری سے اتر گئے۔ وہ مشہور و معروف کریکٹر ایکٹر اجمل کے چھوٹے بھائی تھے۔ میک اپ مین کی حیثیت سے فلمی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ پنجابی فلم ''جبرو'' میں ہدایت کار مظفر نے انہیں یاسمین کے ساتھ ہیرو بنا کر پیش کیا اور یہ پہلی فلم ہی کامیاب ہو گئی۔ اس طرح اکمل کے فلمی سفر کا آغاز ہوا رفتہ رفتہ وہ پنجابی فلموں کی ناگزیر ضرورت بن گئے۔ وہ مزاحیہ، ڈرامائی، ایکشن ہر قسم کے کردار کرنے پر قادر تھے۔ فردوس کے ساتھ ان کی جوڑی بہت مقبول ہوئی تھی۔ انہوں نے اس وقت کی سبھی پنجابی ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا تھا۔ بے اعتدالی اور منشیات کے باعث ان کی صحت نے جواب دے دیا اور وہ جوانی ہی میں انتقال کر گئے۔ یہ پنجابی فلموں کے لیے بہت بڑا جھٹکا تھا لیکن وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ ان کی جگہ دوسرے مقبول ہیرو آ گئے مگر لوگ اکمل کو آج بھی یاد کرتے ہیں۔

اکمل کے بیٹے شہباز اکمل نے بھی پنجاب فلموں میں اداکاری کا آغاز کیا تھا۔ ان کی پہلی فلم ''شکرا'' تھی جس کے ہدایت کار ظہور حسین تھے۔ یہ اوسط درجے کی فلم تھی مگر اس کے بعد شہباز کو کامیابی نہیں ملی اور وہ فلمی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

فلم ساز و ہدایت کار پرویز ملک بے شمار کامیاب فلمیں بنا چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے عمران ملک کو اپنی فلم ''شہزادہ'' میں اہم کردار سونپا تھا مگر یہ فلم ناکام ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی عمران ملک بھی فلمی افق سے غائب ہو گئے۔ شاید اس لیے بھی کہ پرویز ملک نے اس کے بعد کوئی اور فلم نہیں بنائی۔ مگر عمران نے پرویز صاحب کے ٹی وی سیریلز تم سے مل کر۔ ارمان اور یادیں میں مرکزی کردار ادا کیے ہیں۔ اب وہ ٹی وی اداکار بن چکے ہیں اور اس کے بعد ٹی وی کی ہدایت کاری کے میدان میں بھی قدم رکھ رہے ہیں۔ ''یادیں'' کے ہدایت کار عمران ملک ہی ہیں۔ ان کی سیریل ''تقدیر'' کے ہدایت کار بھی وہی ہیں۔

دلجیت مرزا پاکستانی فلمی صنعت کا ایک بڑا نام رہے ہیں۔ انہوں نے مزاحیہ اداکار کی حیثیت سے فلمی سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس کے بعد فلم سازی بھی کی اور کامیاب فلموں کے ہدایت کار بھی رہے۔ دلجیت مرزا نے طویل عرصے کے بعد ایک فلم ''رقعہ'' بنائی تو اس میں اپنے صاحبزادے دلاور کو مرکزی کردار سونپا۔ یہ فلم ایک اچھے موضوع پر بنائی گئی تھی مگر ایک تو دلجیت مرزا نے اس فلم کو ڈبل ورژن میں بنایا۔ یعنی اردو اور پنجابی زبانوں میں ڈبنگ کے بعد پیش کیا دوسرے یہ کہ فلم کے لیے مطلوبہ سہولیتں مہیا نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ''رقعہ'' بری طرح فلاپ ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی دلاور کے فلم کیریئر کا بھی بظاہر خاتمہ ہو گیا۔ اب نہ شاید دلجیت مرزا دوسری بار فلم بنائیں گے اور نہ ہی دلاور کو اداکاری کا موقع ملے گا۔

پنجابی فلموں کے ہدایت کار حسن رانا نے اپنے بیٹے احسن رانا کو اپنی فلم ''یار چن ورگا'' میں پیش کیا تھا مگر یہ فلم نام کے برعکس ثابت ہوئی اور فلاپ ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی احسن رانا کا چاند بھی گہنا گیا۔

سرفراز ہمارے زمانے میں ہدایت کار تھے پھر وہ بھی فلمی صنعت سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ کافی عرصے بعد انہوں نے ''دوستی'' کے نام سے ایک فلم کا آغاز کیا اور اپنے بیٹے عارف خان کو ہیرو کے کردار میں پیش کیا۔ ''دوستی'' کی ناکامی کے ساتھ ہی عارف خان کی ناکامی پر بھی مہر ثبت ہو گئی۔

طالش ہمہ گیر صلاحیتوں کے مالک فنکار تھے بلکہ انہیں بجا طور پر پاکستان کا سب سے اچھا اداکار کہا جاتا ہے۔ ان کے بیٹے سنی طالش نے فلم ''عاشقوں کی بارات'' میں اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن بدقسمتی سے یہ فلم ریلیز نہ ہو سکی اس لیے سنی دوبارہ فلموں میں نظر نہیں آئے۔ اب وہ ٹی وی ڈراموں میں اداکاری اور ہدایت کاری کر رہے ہیں اور ایک ہونہار اور ذہین ٹی وی ہدایت کار ہیں ہدایت کاری وہ کام ہے جو کہ ان کے والد مرحوم نے بے پناہ اداکارانہ صلاحیتیں اور بے اندازہ تجربہ حاصل کرنے کے بعد بھی نہیں کیا تھا۔ آغا طالش کو صرف اداکاری سے دیوانہ وار عشق تھا۔ وہ ایک ذہین اور باشعور اداکار تھے۔ اپنے کردار میں ڈوب کر نہیں، اسے سمجھ کر اداکاری کرتے تھے اور بہترین حقیقی اداکاری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ اداکاروں اور ہدایت کاروں کے اس سکول سے تعلق رکھتے تھے جس کا خیال ہے کہ ادکاری کی

معراج یہ ہے کہ وہ دیکھنے والوں کواداکاری نہ لگے بلکہ یوں محسوس ہو جیسے ایک حقیقی کرداران کے سامنے موجود ہے۔ سنی طالش ٹی وی ڈراموں میں ہلکے پھلکے کردار بھی کرتے ہیں اور کامیابی سے کرتے ہیں۔انہیں ایک بے حد کامیاب اور نامور اداکار کاہونہار بیٹا کہا جاسکتا ہے۔

سدھیر کے نام سے پاکستان میں کون واقف نہیں ہے۔قیام پاکستان کے بعد بلکہ اس سے پہلے سے وہ اداکاری کرتے رہے ہیں اور پاکستان کے سپر اسٹار کہلاتے تھے۔ان کی وجہ شہرت پنجابی فلمیں ہیں مگر انہوں نے اردو فلموں میں بھی بہت خوبصورت اداکاری کے نمونے پیش کیے ہیں۔ ایک زمانے میں سنتوش کماراور سدھیر ہی پاکستانی فلمی صنعت کے سپر اسٹار تھے۔دونوں میں دوستی بھی گہری تھی مگر پیشہ ورانہ رقابت بھی تھی اور کام کے ذریعے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔سنتوش صاحب نے بھی" شام ڈھلے" "دامن" اور "دیور بھابی" جیسی فلمیں پروڈیوس کی ہیں۔ سدھیر صاحب نے بھی فلم سازی کے میدان میں بہت کامیابی حاصل کی۔فلم بینوں کے ایک طبقے میں ان کی مقبولیت آسمان کو چھورہی تھی۔وہ جنگ جو ہیرو۔ عوامی ہیرواور باغی ہیرو کے لقب سے بھی پکارے جاتے تھے۔کئی یادگار اردو اور پنجابی فلموں میں انہوں نے لازوال اداکاری کا مظاہر کیا تھا۔

سدھیر صاحب کااصلی نام شاہ زمان تھا۔انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کانام بھی شاہ زمان ہی رکھا تھا۔سدھیر صاحب نے اپنی فلم" قاتل کی تلاش میں شاہ زمان کو ہیرو کی حیثیت سے روشناس کرایا تھا۔یہ فلم کامیاب نہ ہوسکی۔اس طرح شاہ زمان فلمی روایات کے مطابق فلمی افق سے غائب ہوگئے۔بعد میں انہوں نے پشتو فلموں کارُخ کیااور چند پشتو فلموں میں اداکاری کی جن میں بھڑاس، زبدبدمعاش، خاندانی بدمعاش وغیرہ شامل ہیں لیکن پھروہ پشتو فلموں سے بھی غائب ہوگئے۔ایک نامور اور تاریخ ساز اداکار، فلم ساز اور ہدایت کار کے بیٹے کا یہ انجام افسوس ناک اور عبرت انگیز ہے۔

نعمان حسن کو آپ کسی فنکار یا فنکارہ کا بیٹا تو نہیں کہہ سکتے لیکن وہ ایک مصنف باپ دبیر الحسن کے بیٹے اور ایک بہت نامور ہیروئن، فلم ساز اور ہدایت کارہ شمیم آرا کے سوتیلے بیٹے ہیں۔ شمیم آرا نے اپنی فلم "چپکے چپکے" میں انہیں ایک نئی اداکارہ نیہا کے ساتھ متعارف کرایا تھا لیکن یہ فلم چپکے سے ہی ناکام ہوگئی اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔

دراصل اس کی کہانی غیر موثر تھی اس کے علاوہ فلم کے ہیرو اور ہیروئن دونوں نووارد تھے۔ان کی مناسب پبلسٹی بھی نہیں کی گئی۔ مجموعی طور پر یہ ایک غیر معیاری فلم تھی۔ نعمان حسن کو فلم بینوں کا مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔اس طرح صرف ایک فلم میں کام کرنے کے بعد وہ فلمی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

پاکستانی کی فلمی صنعت میں ایسی کوئی ماڈل (ہماری یادداشت کے مطابق) نہیں ہے نہ ممتاز ہیروئن کی بیٹی یا بیٹے نے فلموں میں اداکاری کی ہو اور کامیابی حاصل کی ہو۔صرف اداکارہ لیلیٰ کی بیٹی سوئٹی نے اداکاری کی کوشش کی تھی مگر کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔اب لیلیٰ کی نواسی اور سوئٹی کی صاحب زادی جاناں کے نام سے ٹی وی ڈراموں اور اشتہاروں میں نظر آتی ہیں۔جاناں ایک خوبصورت شکل اور دلکش شخصیت کی مالک ہیں۔ خصوصاًان کا کتابی چہرہ اور غلافی آنکھیں بہت نمایاں ہیں لیکن بدقسمتی سے وہ اداکاری کی صلاحیتوں سے محروم ہیں اس لیے کامیاب نہ ہو سکیں۔

لیکن ایک ایسی مثال بھی موجود ہے جب ایک بہت بڑے اور نامور مصنف، فلم ساز اور ہدایت کار اور ایک صف اول کی ہیروئن کے بیٹے نے پاکستانی فلموں میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔یہ اداکار و ہدایت کار شان ہیں۔جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ شان ممتاز مصنف و ہدایت کار ریاض شاید اور اداکارہ نیلو کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ان دونوں کی صاحبزادی ""زرقا"" کی نوعمری میں شادی کی گئی تھی اور وہ اب ایک کامیاب اور خوشگوار گھریلو زندگی بسر کر رہی ہیں۔ شان کو لگ بھگ دس گیارہ سال پہلے ہدایت کار جاوید فاضل نے اپنی فلم ""بلندی"" میں رومانی ہیرو کے طور پر پیش کیا تھا۔اس فلم کی ہیروئن بھی بالکل نئی تھی۔یہ ریما تھیں۔جاوید فاضل اور فلم ساز اسلام بٹ نے دونوں کو بہت اچھے انداز میں متعارف کرایا تھا۔فلم کا آغاز یا مہورت ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی تقریب میں کیا گیا تھا جو کہ اس زمانے میں بالکل نیا تجربہ تھا۔""بلندی"" کے مصنف سید نور تھے۔یہ ہر اعتبار سے ایک معیاری فلم تھی جس میں نئی ہیروئن ریما نے ایک کلاسیکی رقص پیش کر کے دیکھنے والوں کو حیرت زدہ بلکہ سحر زدہ کر دیا تھا۔

""بلندی"" ریما اور شان کے فلمی سفر کا آغاز تھا اس کے بعد بھی ان دونوں نے بلندیوں کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔ ریما نے تو بہت سمجھداری اور سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا اور نہ صرف اچھے کرداروں اور ہدایت کاروں کو ترجیح دی بلکہ

منتخب کردار ہی کیے۔اس کے برعکس یہ کامیابی شان کے ناپختہ ذہن کے لیے بہت زیادہ ثابت ہوئی۔انہوں نے ہر قسم کی فلموں میں ہر طرح کے کرداروں کے لیے معاہدے کر لیے۔اس کے علاوہ اچانک مقبولیت نے ان کو غیر ذمے دار بھی بنا دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ بری صحبت میں پڑ کر وہ بری عادتوں میں بھی مبتلا ہو گئے تھے۔ نتیجہ وہی برآمد ہوا جو کہ ایسے معاملات میں ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔ شان رفتہ رفتہ فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے لیے ایک مسئلہ بن گئے اور اس کے نتیجے میں مقبولیت کی سیڑھی سے ایسے گرے کہ کچھ عرصہ فلمی دنیا سے غائب ہی رہے۔ وہ امریکا چلے گئے۔ جہاں شاید انہوں نے کافی غور و خوض کیا۔

چند سال بعد وہ دوبارہ فلموں میں نمودار ہوئے تو یہ ان کے لیے ایک نئے سفر کا آغاز تھا۔ بہر حال اپنی صلاحیتوں، محنت اور لگن سے انہوں نے دوبارہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لیا۔ایک بار پھر وہ فلم سازوں کی ضرورت بن گئے۔ ہدایت کاری کی صلاحیتیں انہیں باپ سے ورثے میں ملی تھیں اس لیے جب انہوں نے فلم گنز اینڈ روزز (ایک جنون) کی ہدایت کاری کا اعلان کیا تو سبھی نے اس کا خیر مقدم کیا لیکن یہ فلم تجربات کی نذر ہو گئی۔ انہوں نے کمرشل کے بدلے ایک علامتی آرٹ فلم بنا دی جسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس کے بعد بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری اور دوسری فلم کی ہدایت کاری کے فرائض سر انجام دیئے۔ یہ ایک کامیاب فلم تھی اور معیاری بھی تھی لیکن اس اثنا میں شان پنجابی اور اردو فلموں کے مقبول ترین ہیرو بھی بن چکے تھے۔ فلم سازان کا گھیراؤ کر چکے تھے۔ اس طرح وہ نہ اداکاری کے لیے پورا وقت دے سکتے تھے، نہ ہدایت کے لیے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انہوں نے بے شمار فلمیں سائن کر لیں۔ پنجابی فلم سازوں نے انہیں سلطان راہی کا انداز دے دیا۔ اس طرح کی فلمیں کامیاب ہوئیں تو وہ ایسے ہی کرداروں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئے۔ اب وہ پنجابی اور اردو فلموں کے سب سے زیادہ مقبول اور کامیاب اداکار ہیں لیکن شاید زیادہ عرصہ یہ مقام برقرار نہ رکھ سکیں کیونکہ کرداروں کی یکسانیت نے ان کی صلاحیتوں کو گہنا دیا ہے۔ وہ آج بھی مقبول ہیں لیکن اگر فلم سازوں سے تعاون نہ کرنے اور بلا سوچے سمجھے بے شمار فلمیں سائن کرنے کی روش برقرار رکھی تو شاید وہ زیادہ عرصے تک اس مقام پر فائز نہ رہ سکیں۔ انہیں اعتدال پسندی سے کام لے کر اچھے اور کم کردار قبول کرنے چاہئیں۔ ہدایت کاری کا شوق پورا کرنے کے لیے انہیں اگر چند فلموں کی قربانی بھی دینی پڑے تو اس سے گریز نہیں

کرنا چاہیے مگر فی الحال تو وہ کامیابیوں کے جھولے جھول رہے ہیں اس لیے کھری بات اور صحیح مشورہ شاید انہیں پسند نہ آئے۔ اگر وہ خود کو سنبھال کر رکھیں تو طویل عرصے تک فلمی دنیا پر راج کر سکتے ہیں۔ انہیں اس سلسلے میں اپنے سینئر ندیم کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔ زیادہ کرداروں اور زیادہ پیسوں کا لالچ کسی بھی اچھے کردار کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کام کرنے والے اداکار ہمیشہ کامیاب اور یادگار رہتے ہیں۔ بھارت میں دلیپ کمار اور پاکستان میں ندیم اس کی واضح مثالیں ہیں۔

شان کے چھوٹے بھائی اعجاز ریاض شاہد نے بھی اداکاری کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ ان کا فلمی نام سروش تجویز کیا گیا۔ ان کی پہلی فلم ''پیاری پیار'' تھی جس کے ہدایت کار اقبال کاشمیری تھے۔ اس فلم میں ان کا کردار زیادہ اہم اور نمایاں نہ تھا۔ سروش کو اس کے بعد ہدایت کار جاوید فاضل نے ''دنیا دس نمبری'' میں موقع دیا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد وہ فلمی دنیا سے غائب ہو گئے۔ اب شاید بہت کم لوگوں کو ان کا نام یاد ہو گا۔ یہ بھی قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایک بھائی بلندیوں کی چوٹی پر ہے اور دوسرا نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ ان دنوں وہ امریکا میں کوئی کاروبار کرتے ہیں۔

بھارتی فلمی صنعت میں صورتِ حال اس سے قدرے بہتر ہے۔ سب سے پہلے تو نوتن کی مثال ہے جو اپنے زمانے کی معروف ہیروئن شوبھنا سمرتھ کی صاحب زادی تھیں اور بہت ممتاز ہیروئن رہ چکی ہیں۔ ان کی چھوٹی بہن تنوجہ نے بھی اداکاری کی تھی مگر زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں۔

نرگس اور سنیل دت کے بیٹے سنجے دت نے بھارتی فلمی صنعت میں بہت کامیابیاں حاصل کیں مگر پھر بے اعتدالی کا شکار ہو گئے۔ وہ منشیات کے عادی ہو گئے تھے۔ کچھ اور مسائل بھی تھے جن کی وجہ سے وہ صفِ اول کے اداکاروں کی فہرست سے خارج ہو کر امریکا چلے گئے۔ فلمی دنیا میں ان کا دوسرا جنم بھی کامیاب تھا۔ وہ صحت مند ہو کر لوٹے تھے۔ چند اچھے کردار بھی انہیں مل گئے اور وہ ایک بار پھر مقبول ہیرو بن گئے مگر پھر دہشت گردی کے قانون کے تحت جیل چلے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ متعصب صوبائی حکومت ان کے مسلم دوست رویے کی وجہ سے ناراض تھی۔ بہر حال کافی

عرصے تک وہ قیدی و بند کی صعوبتیں سہتے رہے۔ان کی مخالف لابی اتنی طاقت ور تھی کہ سنیل دت ایک با رسوخ انسان اور ممبر پارلیمنٹ ہونے کے باوجود بیٹے کو نہ بچا سکے۔

جمیل پاکستانی اداکار تھا۔ یہ امن" اور "غرناطہ" میں بھی کام کیا تھا۔" سزا" میں تو وہ گزارا تھے لیکن ریاض شاہد جیسے مصنف و ہدایت کار بھی ان میں صلاحیتیں اور لگن پیدا کرنے میں ناکام رہے۔ کچھ عرصے بعد (70 کی دہائی کے آغاز میں) وہ ممبئی چلے گئے۔ وہاں ان کی ازدواجی تلخیوں کے باعث انہیں خاندان سے بے تعلق ہونا پڑا۔ جب ان کی بیٹی فرح نے ان کی مرضی اور ماں کی خواہش کے مطابق فلموں میں اداکاری کی تو وہ گھر والوں سے قطع تعلق کر کے حیدر آباد (دکن) چلے گئے۔ وہاں انہوں نے دوسری شادی کرلی اور ایک دور دراز علاقے میں اپنے نئے خاندان کے ساتھ گمنام لیکن مطمئن زندگی بسر کر رہے ہیں۔

فرح نے اپنی بے باکی اور آزاد خیالی کے حوالے سے بھارتی فلمی دنیا میں کافی نام (یا بدنامی) حاصل کی۔ ان کے اسکینڈلز عام تھے پھر وہ شادی کر کے فلمی دنیا کو خیر باد کہہ گئیں تو ان کی چھوٹی بہن "تبو" نے اداکاری کا آغاز کر دیا۔ تبو ایک خوش شکل اور بہت اچھی صلاحیتوں کی مالک اداکارہ ہیں انہوں نے چند فلموں میں یادگار کردار کیے ہیں جن میں مصنف۔۔۔ گلزار کی فلم "ماچس" قابل ذکر ہے۔ تبو اسکینڈلز کے معاملے میں اپنی بڑی بہن سے کم ہیں لیکن ان کی اداکاری کے سب معترف ہیں۔ اسکینڈلز کی طرح وہ پیسے کے لالچ کے معاملے میں بھی اپنی بڑی بہن سے پیچھے ہیں۔ وہ عموماً اچھی اور آرٹ فلموں ہی میں کام کرنے کو ترجیح دیتی ہیں۔

دلیپ کمار صاحب اولاد نہیں ہیں مگر ان کے بھائی ناصر خاں اور اداکارہ بھاوج بیگم پارہ کے بیٹے ایوب خاں فلموں میں کام کر رہے ہیں۔ ایوب خاں نے کوئی خاص کارکردگی نہیں دکھائی ہے۔ بیگم پارہ کو شکایت ہے کہ دلیپ کمار نے اپنے بھتیجے کے لیے کچھ نہیں کیا ورنہ وہ بہت بلند مقام حاصل کر لیتے۔ دلیپ کمار اس بارے میں حسبِ عادت خاموش ہیں۔

دلیپ کمار کے ہم عصر راج کپور اور دیو آنند تھے۔ راج کپور کے بیٹے کپور کو انہوں نے اپنی فلم ''بوبی'' میں تہلکہ آمیز انداز میں پیش کیا تھا اور رشی کپور درمیانہ عمر میں بھی آج تک اداکاری کر رہے ہیں۔ اگرچہ ان کا مقام گھٹ گیا ہے۔ راج کپور کے دوسرے بیٹے رندھیر کپور نے چند فلموں میں کام کیا مگر کوئی مقام حاصل نہ کر سکے۔ اس لیے ریٹائرڈ ہو گئے۔ ان کی اداکارہ بیوی ببیتا کو ''کپور خاندان'' کی روایات کے مطابق اداکاری سے کنارہ کش ہونا پڑا تھا۔ جس طرح رشی کپور کی اداکارہ بیگم نیتو سنگھ نے بھی شادی کے بعد اداکاری کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ راج کپور کے بھائی ششی کپور بہت عرصے تک کامیاب اداکار رہے پھر انہوں ے فلم سازی میں نام پیدا کیا۔ ان کی صاحبزادی سجاتا کو اداکاری سے دلچسپی نہ تھی۔ ویسے بھی راج کپور اور پرتھوی راج کے خاندان میں عورتوں کو شمعِ محفل کی بجائے چراغِ خانہ بنانے کا رواج تھا۔

کپور خاندان کا آغاز پرتھوی راج کپور سے ہوا تھا۔ وہ پشاور سے بمبئی پہنچے اور فلم اور تھیٹر کی دنیا پر چھا گئے۔ انہوں نے اپنے تھیٹر سے بہت اچھے اچھے فنکار پیدا کیے۔ اگرچہ پاکستان کی تحریک اور مسلمانوں کے بارے میں کچھ متعصّب تھے لیکن عام زندگی میں مسلمانوں سے گہرا میل ملاپ رکھتے تھے۔ وہ ایک حساس اور شائستہ انسان تھے۔ اردو کا لب و لہجہ اہل زبان کے مانند تھا۔ شکل و صورت، قد و قامت اور آواز کی گھن گرج کے باعث بھی نمایاں تھے۔ انہوں نے بہت جلد بمبئی کی فلمی دنیا میں ممتاز اور منفرد مقام حاصل کر لیا تھا۔ ''وہ سکندر'' ''ایک رات'' آوارہ'' جیسی فلموں کے اداکار رہے پھر مغلِ اعظم میں اکبر کا کردار ادا کر کے اپنی اداکاری کا لوہا منوایا۔

پرتھوی راج کپور نے اپنے خاندان کے لیے جو اصول اور ضابطے متعین کیے تھے وہ ان کی اولاد نے بھی اپنائے۔ ان کا گھرانا خالص مشرقی تہذیب و روایات کا پابند تھا۔ حفظِ مراتب یعنی چھوٹے بڑے کا لحاظ اور بزرگوں کا احترام ان کے خاندان کی نمایاں خوبی رہی ہے۔ راج کپور اتنے بڑے آدمی بن جانے کے باوجود والد کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے تھے اور مجال نہ تھی کہ ان کے سامنے بولیں۔ راج کپور کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائیوں کا بھی یہی برتاؤ تھا وہ راج کپور

کو ہمیشہ احترام اور عزت دیتے رہے۔ مشرقی شائستگی اور سب سے بڑھ کر اردو کا استعمال اس گھرانے کی نمایاں خوبی رہی ہے۔

پر تھوی راج، راج کپور، ششی کپور، شمی کپور، رشی کپور سبھی اعلیٰ درجے کی اردو بولتے رہے ہیں۔ ہمارے 1987ء میں ہونولولو کے فلمی سیمینار میں ششی کپور سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ دیر سے ہوائی پہنچے تھے مگر ہمارے بارے میں (یعنی پاکستانی نمائندے کے متعلق) پوری معلومات رکھتے تھے۔ ایک محفل میں دور ہی سے دیکھ کر خود چلے آئے حالانکہ ان کے پیچھے تھا۔ غرور یا بناوٹ کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔

وہ ہمارے پاس آئے اور آتے ہی اتنی بے تکلفی اور اپنائیت سے ''علی صاحب'' کہہ کر مخاطب کیا کہ ہم حیران رہ گئے۔ بے حد شستہ اردو میں بات کرتے ہیں۔ مشرقی ادب آداب اور لحاظ ملاحظہ کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ راج کپور سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی مگر حسن طارق ماسکو اور تاشقند میں ان سے ملے تھے اور ان کی شائستگی، اخلاق اور اردو کے لب ولہجے سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

راج کپور کی آنکھ بند ہوتے ہی اس خاندان کی روایات اور طور طریقے بدل گئے۔ شاید ان کے بعد خاندان کا کوئی سربراہ نہیں رہا تھا اور پرانی قدریں دم توڑ رہی تھیں۔

سب سے پہلے تو رندھیر کپور کی بیوی ببیتا نے، جو ہمیشہ سے باغی مشہور ہیں، اپنی بیٹی کرشمہ کو فلمی اداکار بنایا۔ سب حیران رہ گئے کہ کپور خاندان میں ایسا انقلاب کیسے رونما ہو گیا۔ کرشمہ اس خاندان کی پہلی لڑکی تھیں جو فلمی دنیا میں اداکارہ بن کر آئیں۔ آزاد خیال ماں کی اس بیٹی نے بے حجابی اور بے باکی میں بھی دوسری کئی ہیروئنوں کو پیچھے چھوڑ دیا اور بمبئی کی فلمی صنعت میں بہت جلد صفِ اول کی اداکارہ بن گئیں۔ ان دنوں بھارتی کمرشل فلموں میں ہیروئنوں کو اداکاری سے زیادہ جسم کی نمائش اور بے باک رقص کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ فلموں میں ہیروئن کو ڈرامائی صلاحیتیں دکھانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ وہ ڈیکوریشن کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ بہرحال کرشمہ کپور کے

ذریعے ان کی والدہ ببیتا نے کپور خاندان سے اپنا بدلہ لے لیا جو اداکاری سے محروم ہونے کے بعد ان کی تمنا رہی تھی۔ کرشمہ کے بعد اب ان کی چھوٹی بہن کرینا کپور بھی ہیروئن بن گئی ہیں۔ انہوں نے بے باکی اور جسم کی نمائش میں اپنی بہن کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے اس لیے بہت جلد مقبول ہو گئی ہیں۔ اس طرح کپور خاندان نے فلمی صنعت سے خواتین کے ذریعے اپنا تعلق قائم رکھا ہے کیونکہ رشی کپور کے بعد اس خاندان کے کسی اداکار نے اسی شعبے میں قدم نہیں رکھا اور نہ ہی کامیابیاں حاصل کیں۔

دیو آنند نے اپنے بیٹے کو فلم کی اعلیٰ تعلیم دلائی اور خود تربیت بھی دی مگر اداکاری میں وہ نمایاں کارکردگی نہیں دکھا سکے۔ اب دیو آنند انہیں فلم ساز اور ہدایت کار بنانے کی کوشش میں ہیں۔ دیو آنند کی ایک فلم میں وہ اپنے والد کے ساتھ ایک بار پھر اداکاری کر رہے ہیں مگر ان کے مقبول ہونے کی کوئی توقع نہیں ہے کیونکہ صورت شکل اور صلاحیتوں کے اعتبار سے وہ اپنے والد کے پاسنگ بھی نہیں ہیں۔

دھرمیندر اپنے زمانے کے سپر اسٹار رہے ہیں۔ وہ اپنی انسان دوستی اور غیر متعصب ہونے کے حوالے سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ پاکستان سے جانے والے ملاقاتیوں کی انہوں نے ہمیشہ آؤ بھگت کی۔ انہوں نے اپنے وقت کی مشہور و معروف ہیروئن ہیما مالنی سے دوسری شادی کر لی تھی مگر اتفاق یہ ہے کہ ان کی پہلی غیر ملکی بیگم کے فرزند سنی دیول نے اپنی پہلی فلم ہی میں نام پیدا کر لیا تھا اگرچہ وہ بہت زیادہ نمایاں اور صفِ اول کے اداکار نہ بن سکے۔ ان کے دوسرے بیٹے بوبی دیول نے بھی اداکاری کا آغاز کر دیا ہے اور کامیاب بھی ہیں اگرچہ اپنے والد کی طرح سپر اسٹار بننا ان کے کسی بیٹے کی قسمت میں نہیں ہے۔ سنی دیول اب ہدایت کار بن گئے ہیں۔

ہیما مالنی شادی کے بعد بھی کچھ عرصے تک اداکاری کرتی رہیں مگر بھارت کی فلمی دنیا میں نئے اور شاداب چہرے اتنی کثرت سے آتے ہیں کہ پرانی ہیروئنوں کو اپنی جگہ فوراً خالی کرنی پڑتی ہے۔

ہیما مالنی بھی اداکاری سے کنارہ کش ہو کر رقص کی تربیت دینے میں مصروف ہو گئیں۔ اداکارہ کی حیثیت سے وہ کبھی بھی ڈرامائی ہیروئن نہیں بنی تھیں۔ صرف رقص اور گلیمر کی وجہ سے مقبول تھیں۔ انہوں نے رقص کی تربیت کے لیے اکیڈمی قائم کی ہے اور دنیا بھر میں کلاسیکی رقص کے مظاہرے کرتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک بہت اچھی اور با ہنر رقاصہ تھیں۔ اب ان کی دو بیٹیاں بھی ان کے ساتھ رقص پیش کرتی ہیں۔ دھرمیندر اور ہیما مالنی کی کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے۔ صرف دو بیٹیاں ہیں جو رقص میں اپنی ماں کی شاگرد ہیں۔ صورت شکل کے اعتباد سے ممکن ہے وہ ہیروئن کے معیار پر پوری نہ اتریں مگر رقص میں انہوں نے ہیما مالنی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ رقص کو ہندو تہذیب میں برا نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ ان کی دیومالا اور مذہبی روایات کا ایک نمایاں حصہ ہے۔ شاید اسی لیے دھرمیندر خالص جٹ نے اپنی بیوی اور بیٹیوں کو اسٹیج پر رقص کا مظاہرہ کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ کچھ عرصہ قبل ہیما اور دھرمیندر کی ایک بیٹی ایشا دیول نے فلمی اداکاری بھی شروع کر دی ہے۔

امیتابھ بچن کو بھارتی میڈیا تعصّب کی وجہ سے بھارت کا سب سے بڑا اداکار قرار دیتا ہے حالانکہ وہ خود دلیپ کمار کی عظمت کے قائل اور معترف ہیں۔ امیتابھ نے کافی عرصے باغی غریب ہیرو کے کرداروں کے ذریعے شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ اس کے بعد اداکاری اور کرداروں کی یکسانیت کے باعث یہ سپر اسٹار ناکامی سے دوچار ہونے لگا اور ان کی آخری فلموں میں سے کوئی ایک بھی سپر ہٹ نہ ہو سکی۔ وہ اور جیہ بہادری دونوں بھارتی فلموں کے ممتاز اور نمایاں فن کار رہے ہیں مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ ان دونوں بڑے فنکاروں کا بیٹا ابھیشک بچن امیتابھ اور جیہ کی تربیت، وراثت اور کوشش کے باوجود اداکاری میں بلند مقام حاصل نہ کر سکا۔ امیتابھ ابھی تک بیٹے سے مایوس نہیں ہوئے ہیں۔ ان ہی دنوں انہوں نے کافی عرصے بعد ایک ذاتی فلم بنانے کا اعلان کیا ہے جس میں وہ ابھیشک کے ساتھ کام کریں گے مگر آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ ابھیشک بچن اپنے والد کی جگہ تو کیا لیں گے صف اول کے ہیرو بھی نہیں بن سکیں گے۔

آج کے نامور اور کامیاب بھارتی ہیرو عامر خان معروف ہدایت کار اور فلم ساز ناصر حسین کے بھتیجے ہیں جن کا پچھلے دنوں انتقال ہو گیا ہے۔ ایک کامیاب ترین کمرشل فلم ساز اور ہدایت کار تھے۔ ان کے بیٹے منصور خاں نے ہدایت کاری میں بہت نام پیدا کیا مگر انہوں نے اداکاری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔

بھارتی فلموں کے مشہور ہیرو اور طویل عرصے تک ہیرو کی حیثیت سے کام کرنے والے اداکار جتیندر بالآخر اداکاری سے ریٹائر ہو گئے۔ ان کو فلمی اداکاری کرتے ہوئے پچیس سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر گیا تھا مگر وہ بدستور جوان اور تر و تازہ نظر آتے تھے۔ ایک وقت تو یہ خیال ظاہر کیا جانے لگا تھا کہ شاید انہوں نے ہمیشہ جوان رہنے کا کوئی گر سیکھ لیا ہے لیکن وقت نے ان کو بھی رفتہ رفتہ صف اول سے صف سوئم میں دھکیل دیا تو وہ فلمی دنیا سے ریٹائر ہو گئے۔ انہوں نے بے شمار فلموں میں کام کیا تھا۔ اور بے اندازہ دولت کمائی تھی اس لیے پر سکون اور پر عیش زندگی گزار رہے ہیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے اپنے بیٹے کو تشار کپور کے نام سے فلموں میں متعارف کرایا ہے۔ اسی طرح اپنے وقت کے ایک اور مقبول ہیرو ونود کھنہ بھی بالآخر ریٹائر ہو گئے تھے۔ ونود کھنہ، امیتابھ بچن کے ہم عصر تھے اور ان کے ساتھ کئی کامیاب فلموں میں جلوہ گر ہوئے تھے۔ ایک زمانے میں انہیں نہ جانے کیا سوجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک گرو کے چیلے بن گئے مگر بہت جلد دوبارہ راہِ راست پر آ گئے لیکن کچھ عرصے فلموں سے غائب رہنے کی وجہ سے انہیں دوبارہ کافی جدوجہد کرنی پڑی۔ وہ دوبارہ فلمی صنعت میں قدم جمانے کے قابل ہو گئے لیکن وہ پہلی جیسی بات پیدا نہ ہو سکی۔ رفتہ رفتہ مقبولیت کم ہوئی تو وہ اداکاری سے کنارہ کش ہو گئے کیونکہ کریکٹر ایکٹر بننا انہیں منظور نہ تھا۔

کچھ عرصہ قبل انہوں نے ایک فلم کا آغاز کیا تو اپنے بیٹے اکشے کھنہ کو ہیرو کا کردار سونپا۔ ان کا ایک اور بیٹا راہول کھنہ بھی اداکاری کے میدان اترا ہے لیکن ان دونوں کو اپنے باپ جیسی شہرت اور کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ بھارت کے ایک مسلمان ادکار اور فلم ساز و ہدایت کار فیروز خان نے بھی اپنے بیٹے فردین خان کو اداکار بنا دیا ہے لیکن ابھی تک وہ کوئی قابل ذکر کامیابی نہیں کر سکے ہیں۔

پاکستان میں موسیقاروں کی اکثریت کا تعلق اس طبقے سے رہا ہے جو خاندانی طور پر موسیقی کے مختلف شعبوں سے نسل در نسل وابستہ رہے ہیں۔ماسٹر عنایت حسین، ماسٹر غلام حیدر، ایم اشرف، رشید عطرے، سلیم اقبال، ماسٹر عبداللہ، صفدر حسین، اختر حسین، فیروز نظامی، طفیل فاروقی، وزیر افضل، نذیر علی، طافواور بھی کئی نامور موسیقار اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں موسیقی کا علم ورثے میں ملتا ہے۔ آنکھ کھولنے کے بعد موسیقی، ساز اور راگ راگنیوں کی آوازیں ان کے کانوں میں گونجتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان میں اگر خداداد صلاحیتیں بھی موجود ہوں تو یہ موسیقی کے مختلف شعبوں میں بہت نام پیدا کرتے ہیں اور ان کے نام ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔

بخشی وزیر کا تعلق بھی اسی موسیقی نواز طبقے سے رہا ہے۔ وزیر حسین اور بخشی دو الگ افراد تھے اور آپس میں بھائی تھے۔ بھارت اور پاکستان میں موسیقاروں کی جوڑیوں کا رواج رہا ہے۔ یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ وہ آپس میں رشتے دار ہوں لیکن اکثریت ایسے ہی موسیقاروں کی رہی ہے جو باہمی رشتے دار بھی تھے۔ بعض اوقات ایک ہی استاد کے دو شاگرد ایک جوڑی بنالیا کرتے تھے۔ بھارت میں حسن لال بھگت رام، شنکر جے کشن، لکشمی کانت پیارے لعل، کلیان جی آنند جی اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ شنکر جے کشن میں شنکر کا تعلق پنجاب سے تھا جبکہ جے کشن بنگالی تھے لیکن جب انہوں نے باہمی امتزاج سے موسیقی ترتیب دی تو یوں لگتا تھا جیسے یہ کسی ایک ہی شخص کی تخلیق ہے۔اسی ہم آہنگی اور باہمی آمیزش نے فلمی دنیا میں بہت مقبولیت حاصل کی۔

پاکستان میں بخشی وزیر نے بھی ایک جوڑی کے طور پر فلمی موسیقی بنانے کا آغاز کیا۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ شاہی محلے میں ان کی رہائش تھی جو موسیقاروں گلوکاروں اور سازندوں کا گڑھ کہلاتا ہے۔ شاہی محلے کے نواحی علاقے مثلاً باغ منشی لدھا بھی ان فنکاروں اور تخلیق کاروں کی رہائش گاہ رہے ہیں۔

جس دنوں پاکستان میں پنجابی فلموں کا سنہری دور تھا اور پنجابی فلمیں کافی تعداد میں بنائی جاتی تھیں اس دور میں کئی بہت اچھے موسیقار سامنے آئے جنہوں نے اپنی تخلیق دھنوں سے سننے والوں کو چونکا دیا۔ بخشی وزیر بھی ایسے ہی موسیقاروں میں شامل ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ انہوں نے جس معیار کی موسیقی ترتیب دی اور مقبول طرزیں

بنائیں اسی کے مطابق انہیں شہرت اور پذیرائی نہیں مل سکی۔اس کی سب سے بڑی وجہ ان دونوں بھائیوں کی منکسر المزاجی اور محض اپنے کام سے کام رکھنے کی عادت بھی تھی۔ یہ دونوں بھائی درمیانی قد و قامت کے تھے۔جب بھی ملاقات ہوتی تو بہت خوش اخلاقی اور شائستگی سے ملتے۔ مختصر بات کرتے۔اگران کی کسی دھن کی تعریف کی جاتی تو شرمندہ سے ہو جاتے۔اس کے برعکس ایسے موسیقار بھی تھے جو خود اپنی زبان سے اپنی موسیقی کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے اور اگران کے کسی گانے کی تعریف کر دی جاتی تو یوں ظاہر کرتے جیسے کہ وہ تعریف نہیں کرتے وہ کم فہم اور فن موسیقی اور ذوقِ لطیف سے محروم ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں بہت سے پنجابی موسیقاروں نے بہت اعلیٰ درجے کی موسیقی تخلیق کی اور یادگار دھنیں بنائیں۔ان میں ماسٹر عبداللہ،وزیر افضل، صفدر حسین، تصدق حسین، ماسٹر عنایت حسین اور بخشی وزیر شامل ہیں۔ماسٹر عنایت حسین اور رشید عطرے ان خوش قسمت موسیقاروں میں شامل ہیں جن کی موسیقی کو وسیع پیمانے پر پذیرائی ملی اور سراہا گیا لیکن باقی دوسرے موسیقاروں کو قرار واقعی شہرت اور ایسی تعریف و توصیف نہ مل سکی جس کے وہ حق دار تھے حالانکہ انہوں نے بعض نادر روزگار دھنیں بھی بنائی ہیں جنہیں موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں نے بے حد سراہا۔

بخشی علی اور وزیر حسین یوں تو دو الگ الگ شخصیات تھیں مگر جب انہوں نے ایک ساتھ مل کر موسیقی کی طرزیں بنائی تو یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ یہ تخلیق دو افراد کی ہے۔طرزوں اور سازوں کی ترتیب میں ایسی ہم آہنگی اور نغمگی تھی کہ سننے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔بخشی وزیر کی مہارت اور ہنر مندی کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی اکثر پنجابی دھنوں کو بھارت کے نامور موسیقاروں نے اردو میں ڈھال کر پیش کیا اور خوب داد سمیٹی۔

بخشی وزیر کا بنایا ہوا ایک نغمہ سالہا سال پہلے ملکہ ترنم نور جہاں کی آواز میں اس قدر مقبول ہوا تھا کہ باید و شاید۔اس گانے کی سب سے بڑی خوبی اس کی طرز تھی اور پھر ملکہ ترنم نے اس نغمے کو اس قدر والہانہ انداز میں گایا تھا کہ الفاظ کا اثر دوبالا ہو گیا تھا۔اس نغمے کے بول یہ تھے۔

جدوں ہولی جئی لیندا میرا ناں

میں تھاں مر جانی آں

اس کا اردو ترجمہ یہ کہ وہ جب آہستہ سے بھی میرا نام لیتا ہے تو وہیں میرا دم نکل جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ ایک بہت نازک اور خوب صورت خیال ہے۔ اس کی طرز بناتے ہوئے موسیقاروں نے بہت باریک بینی سے کام کیا ہے۔ اس پر میڈم نور جہاں کی بے ساختہ ادائیگی سونے پر سہاگا ہے۔

بخشی وزیر نے کئی فلموں کی موسیقی بنائی اور بہت سے سپر ہٹ گانے تخلیق کیے۔ فلم ’’ بنارسی ٹھگ ‘‘میں ان کی موسیقی اس فلم کی جان تھی اور فلم کامیابی میں موسیقی کا بہت نمایاں ہاتھ تھا۔ بد قسمتی سے اپنے انکسار، کم آمیزی اور کم گوئی کی عادت کے باعث ان دونوں بھائیوں کو نہ تو بہت زیادہ فلموں میں موسیقی بنانے کا موقع ملا اور نہ ہی موسیقاروں کی صف میں ان کو جائز مقام حاصل ہوا۔ انہوں نے اپنے نغموں میں لوک گیتوں اور راگوں کی بھی آمیزش کی جس کی وجہ سے ان کی دلکشی میں اضافہ ہو گیا۔ ان کے چند سپر ہٹ نغمات یہ ہیں۔

جدو ہولی جئی لینداں میرا ناں

میں تھاں مر جانی آں

اکھ۔۔۔ لڑی بدو بدی، موقع ملے کدی کدی

جانڑ والیا تینوں میں سنا نہ سکی۔۔۔ سنا نہ سکی دل والی گل وے

گندلاں دا ساگ تے مکھن مکئی

ماہی میریا روند نہ ماریں

ان کے مقبول گانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں راگوں کا استعمال مٹھاس۔لوچ اور دل میں اتر جانے والی گہرائی پائی جاتی ہے۔ان کے اکثر گانے میڈم نور جہاں کی آواز میں ہی ریکارڈ کیے گئے ہیں۔یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے بہت سے گانے بھارت میں اردو بولوں کے ساتھ ہو بہو نقل کر لیے گئے۔

ابھی پنجابی فلموں کا سنہرا دور ختم نہیں ہوا تھا کہ بخشی وزیر کا دور روبہ زوال ہو گیا۔انہوں نے قدرے کم فلموں میں کام کیا ہے لیکن بعد میں رفتہ رفتہ فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے انہیں قریباً فراموش ہی کر دیا۔زمانے کی ناقدری، اپنوں کی بیگانگی اور بیکاری نے انہیں مختلف امراض میں مبتلا کر دیا جن میں شوگر کا مرض بھی شامل تھا۔طبّی تحقیق کے مطابق یہ مرض فکر اور پریشانیوں کے باعث پیدا ہوتا ہے اور ان میں اضافے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔یہ بھی ایک المیہ ہے کہ پاکستان کے دو بہت اچھے اور نامور موسیقار ماسٹر عنایت حسین اور ماسٹر عبداللہ بھی اس مرض کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ان دونوں کو فلمی دنیا نے فراموش کر دیا تھا۔بیکاری نے تفکر اور پریشانی نے شوگر کی بیماری کو جنم دیا اور بالآخر یہی مرض جان لیوا ٹھہرا۔

بخشی وزیر کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا تھا اس لیے انجام بھی ویسا ہی ہوا۔ بیماریوں اور بے روزگاری کے باعث دونوں بھائی یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو گئے۔آج شاید پنجابی فلموں کے دیکھنے والے اور فلم ساز شاید ان کے ناموں سے بھی واقف نہ ہوں گے۔

گزشتہ دنوں ایک روز ایک دوست کا ٹیلی فون موصول ہوا۔علیک سلیک اور مزاج پرسی کے بعد کہنے لگے " آپ کے ایک پرانے ملاقاتی میرے پاس بیٹھے ہیں۔آپ سے بات کرنے کے خواہش مند ہیں۔"

ہم نے پوچھا" اس سسپنس کی کیا ضرورت ہے۔کون ہیں۔نام تو بتایئے؟"

بولے "آپ آواز سن کر۔خود ہی پہچان لیجئے۔" اور ریسیور کسی اور کو دے دیا۔

دوسری جانب سے ایک مدھم سی زنانہ آواز سنائی دی "ہیلو۔آفاقی صاحب۔السلام علیکم۔"

" وعلیکم السلام"

"کہئے۔مجھے پہچانا؟"

ہم نے کہا کہ "ابھی تک تو نہیں پہچانا۔"!

دوسری جانب سے ہلکی سی ہنسی کی آواز کے بعد پوچھا گیا" کیا اب بھی نہیں پہچانا۔"

ہم آواز پہچان گئے تھے۔نام بتانے ہی والے تھے کہ دوسری جانب سے کہا گیا" آفاقی صاحب۔میں کومل ہوں؟"

ہم نے کہا" ہم بھی اب آواز پہچان گئے تھے۔"

دراصل کومل کے بولنے کا ایک خاص انداز یہ تھا کہ وہ آخری الفاظ کو ذرا لٹکا کر بولتی تھیں اور پھر ہنستی بھی تھیں۔

کہنے لگیں "شکر ہے کہ آپ پہچان تو گئے۔"

ہم نے پوچھا" اتنے عرصے کہاں رہیں؟ "

بولیں " باہر چلی گئی تھی۔دبئی میں تھی۔اب لاہور آگئی ہوں۔آپ نے آواز سے پہچان لیا۔میں تو آپ کو مان گئی۔ آپ سے تو ملے ہوئے بھی زمانہ گزر گیا۔"

ہم نے کہاں" ہاں۔آپریشن کے بعد جب ہم یو،سی،ایچ اسپتال میں تھے تو آخری بار وہیں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔

ہمارا السر کا آپریشن 1966ء میں ہوا تھا۔اب آپ خود حساب لگا لیجئے کہ ہم نے کتنے طویل عرصے بعد کومل کی آواز سنی تھی۔

کومل سے ہماری زیادہ رسم وراہ کبھی نہیں رہی۔ ساٹھ کی دہائی میں وہ شاہ نور اسٹوڈیو میں ہمیں نظر آئی تھیں۔ کسی نے تعارف کرایا کہ یہ نئی اداکارہ کومل ہیں۔ کومل دراز قد، دبلی پتلی بلکہ بہت نازک اندام لڑکی تھیں۔ کتابی چہرہ تھا۔ رنگت کھلتی ہوئی گندمی، ناک نقشہ مناسب، چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تھیں جو اکثر مسکراتی ہوئی لگتی تھیں۔ وہ بہت سادہ سے لباس میں تھیں۔ اس تعارف کے بعد ہم کسی اور طرف چلے گئے۔ یہ کومل سے ہماری پہلی ملاقات تھی۔ اس ملاقات میں بہت مختصر گفتگو ہوئی تھی مگر کومل کی مدہم آواز اور ان کے بولنے کا انداز ہمیں کچھ مختلف لگا۔ ان کا یہ نام فلمی تھا جو شاید کسی نے (غالباً نخشب جارچوی صاحب نے) ان کی نزاکت کے پیشِ نظر تجویز کیا ہوگا۔ ہمیں صرف ان کا نام اور آنکھیں ہی یاد رہیں۔

کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ نخشب صاحب اپنی فلم ''فانوس'' میں شمیم آرا کو کاسٹ کرنا چاہتے ہیں مگر انہوں نے معذرت کرلی ہے۔ نخشب صاحب بمبئی سے نئے نئے آئے تھے۔ نغمہ نگاری کی شہرت کے علاوہ فلم ''رفتار'' اور ''زندگی یا طوفان'' کے حوالے بھی ساتھ لائے تھے۔ عوامی شناخت اور شہرت دراصل انہیں کمال امروہوی کی فلم ''محل'' کے گیتوں سے ملی تھی۔ اس کے موسیقار کھیم چند پرکاش تھے نخشب صاحب بہت اچھے فلمی نغمہ نگار تھے لیکن تحقیقی شہرت انہیں ''محل'' کے گانوں سے ہی حاصل ہوئی تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے گیتوں اور کھیم چند پرکاش کی موسیقی نے فلم بینوں پر ایک سحر ساطاری کردیا تھا۔ کمال صاحب نے کہانی، منظر نامہ اور مکالمے بہت اچھے لکھے تھے۔ ان تمام خوبیوں نے مل کر ''محل'' کو ایک ناقابلِ فراموش فلم بنا دیا اور وہ ہمیشہ ایک کلاسیکی فلم کی حیثیت سے یاد رکھی جائے گی۔

نخشب صاحب یوں تو پہلے بھی بمبئی کی فلمی دنیا میں اپنی فقرے بازی، زندہ دلی، خوش بیانی (جو بعض اوقات بدکلامی کی صورت بھی اختیار کرلیتی تھی) دوست نوازی اور بے باکی کے باعث خاصے مشہور تھے مگر '' محل'' کی نمائش کے بعد ان کی شہرت اور مقبولیت بامِ عروج کو پہنچ گئی۔ نخشب صاحب کے ساتھ یہ معاملہ ہوا کہ بقول شاعر۔۔۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار

اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

وہ پہلے ہی شیخی خور اور خود پسند تھے۔ ''محل'' کے بعد متکبر بھی ہو گئے۔ تکبر اور خود پسندی یہاں تک بڑھ گئی کہ انہوں نے کسی دوسرے کو خاطر میں لانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بڑے بڑے لوگوں کے بارے میں کہہ دیا کرتے تھے کہ وہ کہاں کا شاعر یا ہدایت کار ہے۔ پاکستان تشریف لائے تو یہاں بھی ان کی اسی قسم کی گفتگو جاری رہی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں کسی کو نہ تو لکھتا آتا ہے اور نہ فلم بنانا۔ اب میں انہیں بتاؤں گا کہ فلم کیا ہوتی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے پہلے '' فانوس'' اور اس کے بعد ''میخانہ'' بنائی۔ دونوں فلموں کی موسیقی ناشاد نے مرتب کی تھی۔ نغمہ نگار، مصنف اور ہدایت کار نخشب صاحب خود تھے۔ موسیقی تو بہت مقبول ہوئی لیکن یہ دونوں فلمیں بری طرح فلاپ ہو گئیں مگر ان ناکامیوں کے بعد بھی وہ بڑے بول بولنے سے باز نہ آئے۔ دراصل فلموں اور ریس سے انہیں کافی دولت حاصل ہو گئی تھی۔ چھڑے چھانٹ تھے۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ نہ بیوی نہ بچے۔ بہن بھائی اگر ہوں گے تو ان کا کسی کا علم نہیں تھا۔ فلموں اور نغمہ نگاری کی بدولت بڑے بڑے سرکاری درباری لوگوں اور حکام سے ان کے دوستانہ مراسم ہو گئے تھے۔ خوش بیان اور میزبانی کے فن سے بخوبی آشنا تھے۔ اس لیے بڑے لوگوں سے دوستیاں آخری دم تک نبھاتے رہے۔ اچھا کھانے اور کھلانے کے بے حد شوقین تھے۔ خود بھی بہت لذیذ کھانے پکاتے تھے اور دوستوں کو دعوت عام تھی۔

نخشب صاحب کے بارے میں ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ کومل کے سلسلے میں ذکر آیا تو دوبارہ اس لیے لکھنا پڑا تا کہ آپ یہ جان سکیں کہ نخشب صاحب کے ساتھ کام کرنے سے شمیم آرا اور دوسرے قابل ذکر فنکاروں نے معذرت کیوں کر لی تھی۔

ہم نے شمیم آرا کی نانی صاحبہ سے پوچھا'' ماں جی، سنا ہے آپ نے نخشب صاحب کی فلم میں شمیم آرا کو کام کرنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ بہت بڑی فلم بنا رہے ہیں۔ ''

انہوں نے پان کی گلوری منہ میں دبائی اور بولیں" آفاقی صاحب، یوں کہ نخشب صاحب تو بہت بڑبولے اور بد کلام آدمی ہیں۔ کیا ہم جانتے نہیں ہیں۔ ساری خبریں رکھتے ہیں۔ رہی بڑی فلم بنانے کی بات تو بھیا۔ جب چاند چڑھے گا تو ساری دنیا دیکھ لے گی۔"

ان کا کہنا درست تھا۔ جب چاند چڑھا اور" فانوس" نمائش کے لیے پیش کی گئی تو ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ کیسی فلم تھی۔ بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نخشب صاحب نے کچھ نامور فنکاروں سے تو خود ہی رابطہ نہیں کیا کہ ان کے ساتھ گزارا نہیں ہوگا۔ کچھ فنکاروں نے بہت شائستگی سے معذرت کر دی۔ چنانچہ قرعہ فال کومل کے نام پڑ گیا جو اس زمانے میں فلمی دنیا میں داخل ہونے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھیں۔ جب نخشب صاحب نے انہیں اپنی فلم میں ہیروئن بنانے کا وعدہ کیا تو کومل کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ فلم کی تکمیل کے دوران میں کومل کے ساتھ نخشب صاحب نے جو بد سلوکی اور بدلحاظی بلکہ بد تمیزی کی وہ ایک علیحدہ داستان ہے

کومل میں اچھی ہیروئن بننے کے لیے مطلوبہ خوبیاں نہیں تھیں۔ اس لیے ایک دو فلموں میں کام کرنے کے بعد ہی رہ گئیں۔ نخشب صاحب کے سیٹ پر ہم کبھی نہیں گئے کیونکہ ان کی داستانیں سن چکے تھے۔ ویسے بھی انہوں نے شاہ نور اسٹوڈیو میں فلور کے دروازے پر ایک مسلح چوکیدار تعینات کر دیا تھا۔ اس کے بعد کسی نے ان کے سیٹ کا رخ نہیں کیا۔

"فانوس" کی ناکامی کے بعد کومل سے چند بار چلتے چلتے ملاقات ہوئی اور اس کے طویل عرصے بعد ایک دن یو سی ایچ میں وہ مل گئیں۔ بلکہ ان سے پہلے تنویر اجمیری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ ہم آپریشن کے بعد بحالی صحت کے سلسلے میں اسی اسپتال کے برابر والے کمرے میں ہیں تو وہ بلا تکلف چلے آئے۔ مزاج پرسی کی اور بے حد خلوص اور شفقت کا مظاہرہ کیا۔

دیکھنے میں وہ بالکل تندرست نظر آرہے تھے مگر اسپتال میں تندرست آدمی کا کیا کام۔ اسی لیے ہم نے ان سے پوچھ لیا کہ آپ اسپتال کیسے تشریف لائے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ دراصل کومل بیمار ہیں اور برابر والے کمرے میں زیر علاج ہیں۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کی اگلی فلم میں کومل کام کررہی ہیں لیکن یہ حقیقت ہم پہ بعد میں منکشف ہوئی کہ کومل ان کی کمزوری بن چکی تھیں۔

کومل کی اس بیماری اور نذیر اجمیری صاحب کی پریشانی اور بے بسی کا تذکرہ ہم اس سے پہلے بہت تفصیل سے بیان کر چکے ہیں اس لیے اس دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔جب ہم نے حالات کا جائزہ لیا تو نذیر اجمیری صاحب سے ہمیں دلی ہمدردی ہوگئی بلکہ ان پر بہت ترس بھی آیا۔

اسپتال کے چند دنوں کے دوران قیام میں ہماری نذیر صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی رہی۔وہ ہمارے پاس چلے آئے تھے۔ہم سے کومل کی بیماری کے بارے میں مشورے طلب کرتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ ہم کومل کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی کریں تاکہ وہ بیماری سے مقابلہ کرسکیں۔

نذیر اجمیری ایک زمانے میں ہمارے لیے بہت بڑا نام تھا۔وہ بمبئی میں بہت کامیاب فلمیں بنارہے تھے اس زمانے میں ہم نے ڈھنگ سے، فلمیں دیکھنا بھی نہیں سیکھا تھا مگر ان کی شہرت اور عظمت کی داستانیں سنتے اور فلمی اخبارات میں پڑھتے رہتے تھے۔اس وقت ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ کبھی ہم اور نذیر اجمیری صاحب ایک ہی شہر اور ایک ہی پیشے میں کام کریں گے اور ہمیں نذیر صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوگا۔ جن نامور ہستیوں سے لاہور اور پاکستان میں ہمیں ملنے کا موقع ملا اس پر ہم فخر کرتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اپنے عہد کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے نادر روزگار لوگوں سے ہمیں شرف ملاقات اور کچھ سے قربت کا موقع نصیب ہوا۔نذیر اجمیری کے بارے میں مختصراً ہم پہلے کبھی لکھ چکے ہیں مگر۔۔۔حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

وہ جس مرتبے اور اعلیٰ قابلیت کے مالک تھے اس کا تقاضا ہے کہ ان کے بارے میں قدرے تفصیل سے بیان کیا جائے۔ان کی داستان بجائے خود ایک دلچسپ افسانوی کہانی کی طرح ہے۔وہ اس زمانے میں شہرت کی بلندیوں پر تھے جب ہم ابھی ایک معمولی اور گمنام طالب علم تھے۔اس لیے بھی ان کے بارے میں قدرے تفصیل سے بیان کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

یوں تو بمبئی سے بہت سی نامور فلمی ہستیاں خصوصاً مصنف و ہدایت کار پاکستان آئے جن میں سے کچھ نے آسائشیں اور شہرت بھی پائی مگر دو ایسی ہستیاں ہیں جنہیں پاکستان میں خوشیوں اور کامیابیوں سے زیادہ غم اور ناکامیاں ملیں۔ان میں سے ایک نذیر اجمیری ہیں اور دوسرے ایم صادق۔ جنہیں فلم والے پیار سے بابو صادق کہا کرتے تھے۔ان دونوں کا نام شہرت اور دبدبہ اس وقت بھی عروج پر تھا جب ہم نے 50 کی دہائی میں فلمی صحافت اور پھر کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ہم مکتب کے پہلے درجے میں تھے جب یہ دونوں حضرات اعلیٰ ترین ڈگری یافتہ تسلیم کیے جا چکے تھے۔بابو صادق نے لاہور میں فلم ”بہاریں پھر بھی آئیں گی“ کا آغاز کیا تھا۔یہ دراصل ان کے لیے ایک روح فرسا اور جان لیوا تجربہ ثابت ہوا۔اسی فلم کی تکمیل کے دوران میں وہ مختلف مالی اور ذہنی پریشانیوں کا شکار ہوئے اور بالآخر ہارٹ فیل کے بعد انتقال کر گئے۔ایک اتنے بڑے اور کامیاب انسان یہ انجام ہمارے لیے بے حد غم ناک اور عبرت ناک تھا۔

نذیر اجمیری صاحب کی کہانی اس سے قدرے مختلف ہے۔وہ پاکستان آئے تو اسماعیل نور صاحب نے ان سے فلم ”قسمت“ بنوائی۔ اس کے مصنف اور ہدایت کار وہ خود ہی تھے۔مسرت نذیر اس کی ہیروئن تھیں اور اس کی کہانی اسی کردار کے گرد گھومتی تھی۔یہ ایک معاشرتی موضوع تھا جس میں مشرقی معاشرے میں ”طلاق“ کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی تھی۔خوش قسمتی سے نذیر صاحب کی پہلی فلم ہی پاکستان میں سپر ہٹ ہو گئی۔جس کے بعد انہیں کافی عرصے تک خوش حالی اور امن و سکون حاصل رہا۔

نذیر اجمیری صاحب فلم ساز بھی تھے۔ہدایت کار اور مصنف بھی تھے اور ان شعبوں میں بہت بلند مقام کے حامل تھے۔ان کی داستانِ حیات کچھ اس طرح ہے۔

جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے وہ ستمبر 1911ء میں اجمیر شریف میں پیدا ہوئے تھے اور اسی حوالے سے نذیر اجمیری کہلائے۔ ان کا نام محمد نذیر تھا وہ ایک پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو اجمیر شریف میں آباد ہو گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے اجمیر ہی میں حاصل کی۔ وہ ہمیشہ ایک ذہین اور محنتی طالب علم رہے۔ اجمیر شریف سے میٹرک اور انٹر کرنے کے بعد وہ بمبئی چلے گئے۔ وہ اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر سکتے تھے مگر ان کا رجحان ادب اور فنون لطیفہ کی طرف تھا۔ افسانہ نگاری اور کبھی کبھی شاعری بھی کر لیتے تھے۔ انہیں دراصل فلم کا ہدایت کار بننے کا شوق تھا۔ بمبئی میں سارے ملک سے فلموں کے رسیا آیا کرتے تھے اور قسمت آزمائی کرتے تھے۔ کچھ خوش نصیب ہی کامیاب رہتے تھے لیکن ہزاروں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔

نذیر صاحب نے پہلے تو شارٹ کٹ اختیار کیا اور ایک سینما میں منیجر ہو گئے لیکن اس طرح گوہر مقصود ہاتھ آتا نظر نہ آیا تو اچھی خاصی نوکری چھوڑ دی اور ایک فلم ساز ادارے رائل سینے ٹون میں اداکار کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ یہ 1933ء کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں فلم کمپنیوں میں ہر ایک ملازمت کرتا تھا۔ معاہدوں اور بڑے معاوضوں کا طریقہ رائج نہ ہوا تھا۔

نذیر صاحب کو سب سے پہلے ایک جادوئی فلم میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس کا نام ''الف لیلہ'' تھا۔ بمبئی میں اس وقت کئی فلم ساز کمپنیاں جادوئی اور ایکشن فلمیں بناتی تھیں۔ اس فلم میں انہوں نے اپنا نام محمد نذیر سے تبدیل کر کے ایم نذیر رکھ لیا۔ غالباً رسول اکرمؐ کا نام رکھنا فلم دنیا میں انہیں گوارا نہ ہوا تھا۔ یہ فلم 1933ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ مس زہرہ اس کی ہیروئن تھیں۔ ایم اسماعیل بھی اس کے اداکاروں میں شامل تھے جو لاہور سے گئے تھے اور پھر لاہور ہی واپس چلے گئے تھے۔

اس فلم کی ریلیز کے ساتھ ہی ایک واقعہ پیش آیا۔ فلم کے ٹائٹل میں ان کا نام صرف نذیر لکھا گیا تھا۔ انہوں نے اس پر سخت احتجاج کیا کیونکہ محمدؐ کا اسم گرامی تو وہ استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے مگر اس کے مخفف کو اپنے لیے باعثِ برکت سمجھتے تھے۔ انہوں نے کمپنی سے احتجاج کیا تو اپنا پورا نام ایم نذیر لکھنے کا مطالبہ کیا مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ نذیر صاحب

کو یہ بات پسند نہ آئی۔انہوں نے اچھی بھلی نوکری سے استعفےٰ دے دیا اور ایک دوسری کمپنی میں ملازمت کر لی جس کا نام کرشنا فلم کمپنی تھا۔ اس زمانے میں زیادہ تر فلم ساز کمپنیوں کے مالک ہندو یا پارسی تھے۔

انہیں کچھ عرصے انتظار کرنا پڑا۔1935ء میں ایک فلم ''فیشن ایبل انڈیا'' کے نام سے بنی تو اس میں نذیر صاحب کو مہمان اداکار کے طور پر کاسٹ کیا گیا۔ انہیں ہر ماہ باقاعدگی سے تنخواہ ملتی تھی اس لیے یہ بات زیادہ پریشان کن نہ تھی۔اس صبر کا پھل انہیں یہ ملا کہ کمپنی کی اگلی فلم ''زنگارو'' میں انہیں ہیرو کا کردار مل گیا۔اس زمانے کی معروف ہیروئن مس گلاب نے ان کے ساتھ ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔مس زہرہ مشتری اور انوری بھی اس کی کاسٹ میں شامل تھیں۔یہ ایک ایکشن فلم تھی لیکن یہی غنیمت تھا کہ انہیں ہیرو بننے کا موقع مل گیا۔ایکشن فلمیں اس زمانے میں کافی مقبول ہوئی تھیں اس لیے زیادہ تعداد میں ایسی ہی فلمیں بنائی جاتی تھیں۔نذیر صاحب کی اگلی فلم ''مرد کا بچہ'' تھی۔اس قسم کے نام سن کر آپ حیران نہ ہوں۔اس زمانے میں عام طور پر فلموں کے اسی طرح کے نام ہوتے تھے۔ ''مرد کا بچہ'' میں ان کی ہیروئن مس زہرہ تھیں۔اس زمانے کے کچھ اور مشہور فنکار بھی اس فلم کی کاسٹ میں شامل تھے۔

کرشنا فلم کمپنی کے لیے یہ ان کی آخری فلم تھی جس کے بعد وہ بمبئی ٹاکیز سے وابستہ ہو گئے۔یہ ان کی زندگی کا اہم ترین موڑ تھا۔بمبئی ٹاکیز اس وقت بھی ایک باوقار فلم ساز ادارہ تھا جس میں تعلیم یافتہ افراد کو ترجیح دی جاتی تھی اور یہ موضوعاتی اور معیاری فلمیں بنانے کے لیے مشہور تھا۔

بمبئی ٹاکیز میں غیر ملکی ہنر مند کام کرتے تھے۔دیویکا رانی جیسی فنکارہ اس کے مالک کی بیگم تھیں۔ہمنسو رائے ان کے شوہر تھے اور فلم کی تکنیک پر انہیں عبور حاصل تھا۔ہمنسو رائے اور دیویکا رانی کہ مشترکہ کوششوں سے بمبئی ٹاکیز برصغیر کا ایک بہت نامور فلم ساز ادار بن گیا تھا۔

1937ء میں ان کی فلم ’’ ساوتری‘‘ ریلیز ہوئی جس میں ہیروئن کا کردار کمپنی کی مالکہ دیویکارانی نے ادا کیا تھا۔اس سال ان کی چار فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھیں۔پہلی فلم ’’عزت‘‘ تھی جس کے ہدایت کار ایک جرمن فرانسس ’’جیون پربھات‘‘ کے ہدایت کار اور عکاس دونوں جرمن تھے۔اس فلم میں ایم نذیر اور دیویکارانی نے مرکزی کردار کیے تھے۔نذیر صاحب کی صلاحیتوں کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے 1937ء میں ہندوستان کی عظیم ترین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیروئن دیویکارانی کے ساتھ ہیرو کی حیثیت سے کام کیا تھا۔یہ وہی دیویکارانی ہین جن کے ساتھ کام کرکے اشوک کمار نے ملک گیر شہرت حاصل کی تھی۔دیویکارانی کے ساتھ ہیرو کے طور پر کام کرنا اس زمانے میں بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔اول تو بمبئی ٹاکیز کا نام ہی اس قدر مرعوب کن اور باوقار تھا کہ اس ادارے سے وابستہ ہونا بھی ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتا تھا۔ایم نذیر صاحب نے بمبئی ٹاکیز میں اداکاری سے آغاز کیا تھا اور اس کے بعد اسی ادارے میں مصنف اور ہدایت کار کی حیثیت سے بھی نمایاں کام کیے اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا

’’جیون پربھات‘‘ میں نذیر اجمیری صاحب دیویکارانی کے ہیرو تھے جبکہ رینو کا دیوی) جو بعد میں بیگم خورشید مرزا کہلائیں) کشور ساہو کے ساتھ معاون اداکارہ تھیں۔رینو کا دیوی نے آگے چل کر بہت نام پیدا کیا۔کشور ساہو بھی ہدایت کار اور اداکار کی حیثیت سے بمبئی کی فلمی صنعت کے نمایاں اور ممتاز لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نذیر صاحب کی اداکارانہ صلاحیتیں اور شخصیت کتنی پراثر ہوگی۔’’جیون پربھات‘‘ میں رینو کا دیوی نے پہلی بار کام کیا تھا۔وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور ایک معزز مسلم گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔’’جیون پربھات‘‘ ایک معاشرتی فلم تھی۔

ایم نذیر یعنی نذیر صاحب کی اسی سال ریلیز ہونے والی فلم ’’ پریم کہانی‘‘ تھی۔اس فلم میں دیویکارانی کے بالمقابل اشوک کمار ہیرو تھے۔نذیر صاحب نے اس میں کریکٹر کردار ادا کیا تھا۔یہ فلم اپنے زمانے کی کامیاب ترین فلم تھی۔ 1937ء میں نذیر صاحب کی اداکار کی حیثیت سے چار فلمیں ریلیز ہوئی تھیں اور یہ سب سپرہٹ فلمیں تھیں۔

اس قدر نمایاں کامیابی کے بعد نذیر صاحب کی آؤ بھگت اور مانگ میں اضافہ ہونا لازمی امر تھا۔

آئندہ سال نذیر صاحب کی تین فلمیں نمائش پذیر ہوئیں ان میں پہلی فلم ''بھابی'' تھی۔اس نام سے اور اس موضوع سے بھارت اور پاکستان میں بے شمار فلمیں بنتی رہی ہیں اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ان میں سے بیشتر سپر ہٹ ثابت ہوئی ہیں۔ چنانچہ ''بھابی'' بھی ایک بے حد کامیاب فلم تھی۔اس فلم میں مایا دیوی ہیروئن اور نذیر صاحب ہیرو تھے۔مایا دیوی اس دور کی صفِ اول کی ہیروئن تھیں۔اس فلم کی کاسٹ میں رینو کار دیوی' جیراج بھی شامل تھے۔ اس فلم کی کہانی ایک ممتاز بنگالی کہانی نویس سریندر رجی نے لکھی تھی۔گیت کیشب کے تحریر کردہ تھے جو اس دور کے مقبول گیت نگار تھے۔اس فلم میں دیور بھابی، جیٹھ جٹھانی اور ساس سسر کے رشتوں کی بہت خوب صورتی سے عکاسی کی گئی تھی۔

اس سال نذیر صاحب کی ریلیز ہونے والی دوسری فلم '' نرملا'' تھی۔یہ بھی ایک معاشرتی فلم تھی جس میں اشوک کمار اور دیویکا رانی نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔نذیر صاحب نے اس میں کریکٹر رول ادا کیا تھا اور بہت خوبصورتی سے نبھایا تھا۔اس سال نذیر صاحب کی ایک اور فلم ''وچن'' بھی نمائش کے لیے پیش کی گئی۔اس فلم میں بھی وہ کریکٹر رول میں تھے۔اشوک کمار اور دیویکا رانی نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔اس فلم کے مصنف آغا جانی کاشمیری تھے جو تھیٹر کے زمانے کے بھی کامیاب مصنف رہے تھے۔''وچن'' بمبئی ٹاکیز کی بے حد کامیاب فلم تھی۔

1939ء میں نذیر اجمیری (ایم نذیر) کی فلم '' نوجیون'' یعنی نئی زندگی ریلیز ہوئی۔اس فلم میں بھی ایم نذیر کریکٹر ایکٹر کے کردار میں تھے۔یہ اداکار کی حیثیت سے بمبئی ٹاکیز کے لیے ان کی آخری فلم تھی۔غالباً وہ ہیرو کے درجے سے گھٹ کر کریکٹر ایکٹر بننے سے تنگ آ گئے تھے یا کوئی اور وجہ تھی۔بمبئی ٹاکیز ایک ایسا فلم ساز ادارہ تھا جسے سارے برصغیر میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اس سے وابستگی کسی کے لیے بھی ایک اعزاز کی بات تھی لیکن نذیر صاحب نے بمبئی ٹاکیز سے کنارہ کش ہو کر پرکاش پکچرز سے وابستگی اختیار کر لی۔پرکاش پکچرز کا شمار بھی کامیاب فلم ساز اداروں میں ہوتا تھا۔

ستم ظریفی دیکھیے کہ انہوں نے پرکاش پکچرز کی دو فلموں میں کام کیا اور دونوں مرتبہ انہیں کریکٹر ایکٹر کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے کی فلموں میں کریکٹر ایکٹر کا کردار عموماً بہت جان دار ہوتا تھا اس لیے ان کرداروں کے لیے بہت اچھے اور منجھے ہوئے اداکار ہی منتخب کیے جاتے تھے۔ یہی بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہیرو اور ہیروئن کی طرح کریکٹر ایکٹر کو بھی معقول معاوضہ دیا جاتا تھا۔ بدقسمتی سے پاکستان کی فلمی صنعت میں یہ رواج کبھی بھی نہیں رہا۔ کریکٹر ایکٹر چاہے جتنا اچھا اور معیاری اداکار ہو اس کے اور ہیرو، ہیروئن کے معاوضوں میں بہت نمایاں فرق ہوتا تھا۔ ہم آغا طالش کے تذکرے میں بیان کر چکے ہیں کہ ایک مسلمہ اور مستند اعلیٰ ترین اداکار ہونے کے باوجود آغا طالش کے اور فلم کی ہیروئن اور ہیرو کے معاوضوں میں بہت زیادہ تفاوت تھا جس کا آغا طالش کو ہمیشہ بہت دکھ رہا اور وہ اس کا برملا اظہار بھی کرتے رہے۔ یہ افسوس بدقسمتی کی بات ہے کہ آغا طالش جیسے بے مثال اداکار کو ایک دوسرے درجے کے ہیرو سے بھی بہت کم معاوضہ دیا جاتا تھا۔

پرکاش پکچرز میں ایم نذیر کی پہلی فلم ''نری بھگت'' تھی۔ یہ ایک دھارمک یعنی ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والی فلم تھی۔ اس فلم میں نذیر صاحب نے معاون اداکار کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ اس ادارے کی دوسری فلم ''سردار'' تھی جس میں پرمیلا اور جینت نے مرکزی کردار کیے تھے۔ اس فلم کی کاسٹ میں شاہ نواز اور امیر بائی کرناٹکی جیسے فنکار بھی کام کر رہے تھے۔ امیر بائی کرناٹکی کو ایک گلوکارہ کی حیثیت سے بہت زیادہ مقبولیت حاصل رہی ہے حالانکہ انہوں نے کئی فلموں میں اداکاری بھی کی ہے۔

آئندہ سال انہوں نے پرکاش پکچرز کی فلم ''درشن'' میں کام کیا مگر معاون اداکار کی حیثیت سے۔ اس فلم میں مرکزی کردار پریم ادیب اور جیوتی نے ادا کیے تھے۔ نوشاد اس فلم کے موسیقار تھے۔ اس سال نذیر صاحب کی دوسری فلم ''مالا'' تھی جس میں جے راج، روز اور جینت نمایاں تھے۔ نذیر صاحب نے اس میں ایک مضبوط کریکٹر رول ادا کیا تھا۔ اس فلم کی موسیقی بھی نوشاد نے بنائی تھی جو بہت مقبول ہوئی تھی۔

"مسلم کا لعل"موہن پکچرز کی فلم تھی۔ یہ اداکار جادوئی فلمیں بنانے میں شہرت رکھتا تھا۔ ""مسلم کا لعل"" ان کی پہلی مسلم پس منظر کی فلم تھی۔ یہ ایم نذیر کی آخری فلم تھی۔ مطلب یہ کہ اداکار کی حیثیت سے ""مسلم کا لعل"" نذیر صاحب کی آخری فلم ثابت ہوئی۔ دراصل ایم نذیر کو یہ احساس شدت سے ہو چکا تھا کہ وہ اداکاری کی حیثیت سے فلمی دنیا میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ ایک حساس اور تعلیم یافتہ انسان تھے۔ دیانت داری کے ساتھ حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اداکار کی حیثیت سے کل سترہ فلموں میں کام کیا تھا جن میں سے اکثر فلموں میں وہ کریکٹر ایکٹر تھے مگر نذیر صاحب کے اندر کا فنکار انہیں یہ احساس دلا رہا تھا کہ اداکاری ان کا میدان نہیں ہے۔ انہیں فلم سازی کے دوسرے شعبوں کی جانب توجہ دینی چاہیے۔ ویسے بھی سترہ فلموں میں اداکاری کرنے کے بعد ان کا اداکاری کا شوق ختم ہو چکا تھا۔ انہیں یہ بھی احساس بخوبی ہو چکا تھا کہ اداکاری کوئی ""تخلیق"" کام نہیں ہے۔ یہ تو ایک قسم کی نقالی ہے۔ یعنی کسی کردار کو اسی کے انداز میں اسکرین پر پیش کر دینے کا نام اداکاری ہے۔ اس میں تخلیق کی گنجائش نہیں ہے سوائے اس کے کہ آپ اداکاری میں اپنے تاثرات اور حرکات و سکنات کی مدد سے ایک منفرد مقام پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

انہوں نے اس تمام عرصے میں سنجیدگی سے غور کیا تھا کہ فلمی صنعت میں ان کا اصل مقام کیا ہونا چاہیے؟ وہ بنیادی طور پر کہانی نویس تھے۔ اردو اور انگریزی ادب کا بھی انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کے اندر تخلیقی قوتیں بھی موجود تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک اور اہم فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے اداکاری کو خیر باد کہہ کر کہانی نویسی کا شعبہ اپنانے کا عہد کیا اور اس مقصد کے لیے کئی کہانیوں کے خاکے بھی مرتب کیے۔

انسان جب کوئی ارادہ کرتا ہے اور اس پر سختی سے عمل کرنے کا عہد کرتا ہے تو قدرت بھی اس کی مدد کرتی ہے۔ انہوں نے اللہ توکل موہن پکچرز کی ایک معقول ملازمت چھوڑ دی تھی۔ اداکاری کی طرف سے بھی منہ توڑ لیا تھا اور صرف کہانی نویس بننے کی دھن ان کے ذہن پر سوار تھی۔

اس زمانے میں اے آر کاردار نے اپنا ذاتی فلم ساز ادارہ کاردار پروڈکشنز کے نام سے بنایا۔ انہیں اپنے ادارے کی پہلی فلم کے لیے ایک بہت جان دار اور دلچسپ معاشرتی کہانی کی ضرورت تھی۔ نذیر اجمیری صاحب نے کاردار صاحب سے ملاقات کی اور انہیں ایک کہانی کا مرکزی خیال سنایا جسے سن کر کاردار صاحب پھڑک اٹھے۔ یہ ایک ایسی معاشرتی کہانی تھی جو اس زمانے سے لے کر آج تک ہمارے معاشرے کی حقیقی شکل وصورت کی عکاسی کرتی ہے اور آئندہ بھی کرتی رہے گی۔

انہوں نے کاردار صاحب کے لیے جو کہانی لکھی اس کا نام ''شاردا'' تھا۔ شاردا ایک گھریلو مسائل سے تعلق رکھنے والی کہانی تھی جس میں ہیروئن کا کردار مہتاب کو دیا گیا تھا اور انہوں نے اس کردار کے ساتھ پوری طرح انصاف کیا تھا۔ دوسرے اداکاروں میں واسطی، الیاس، اے شاہ شکارپوری، امیر بانو، راج کماری شکلا وغیرہ شامل تھے۔ اس فلم کے گیت نگار دی، این مدھوک تھے جو اس زمانے کے مقبول ترین گیت نگار تھے۔ ان گیتوں کی دھنیں نوشاد صاحب نے بنائی تھیں۔ کاردار صاحب نے اس فلم کے لیے اعلیٰ پائے کے ہنرمندوں کا انتخاب کیا تھا۔ کاردار بذات خود اس کے ہدایت کار تھے۔ اس فلم کا مرکزی خیال تعلیم تھا۔ خصوصاً لڑکیوں کی تعلیم جس کے بغیر نہ تو وہ اپنے گھر میں خوش رہ سکتی ہیں اور نہ ہی خاندان کو خوشیاں دے سکتی ہیں۔ یہ ایک بامقصد اور اصلاحی فلم تھی جسے کاردار صاحب نے بہت عمدگی سے فلمایا تھا۔

نوشاد صاحب کی موسیقی بھی اس فلم کی جان تھی۔ اس فلم کا اسکرپٹ اور نغمات نذیر صاحب نے ہی لکھے تھے۔ اس فلم کی گلوکاری ثریا نے کی تھی اور ان گانوں نے سارے برصغیر میں دھومیں مچادی تھیں۔ اس فلم نے مصنف اور نغمہ نگار کی حیثیت سے نذیر اجمیری صاحب کی دھاک بٹھادی۔ اس فلم میں انہوں نے ایم نذیر کا ٹائٹل دیا تھا اور اس وقت تک نذیر اجمیری کا نام فلموں کے لیے نہیں اپنایا تھا۔ نذیر صاحب نے فلم کی کہانی اور مختلف دلچسپ اور جان دار کرداروں کے ساتھ ساتھ مکالموں میں بھی تجربے کیے تھے۔ اس فلم میں واسطی کا تکیہ کلام ''پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے بھائی'' اس قدر مقبول ہوا کہ ہر ایک کی زبان پر چڑھ گیا۔ ہم اس وقت بہت کم عمر تھے مگر واسطی کا یہ تکیہ کلام

اسکول میں اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ ہمیں بھی یاد ہو گیا۔اس فلم کی موسیقی انتہائی دلکش، سریلی اور دل میں اتر جانے والی تھی جس کی دھنیں اور بول آج تک لوگوں کو یاد ہیں۔

اس فلم سے ایک نئے تخلیق کار نے جنم لیا تھا اور یہ نذیر اجمیری کی زندگی کا ایک انتہائی اہم موڑ تھا۔انہوں نے کہانی، منظر نامہ، مکالمے اور گیت لکھے تھے اور ان سب کو بے حد سراہا گیا تھا۔نوشاد نے اس فلم کے گیتوں کو انتہائی مسحور کن طرزوں سے سجایا تھا۔اداکاری اور ہدایت کاری کا معیار بھی بہت اعلیٰ تھا۔"شاردا" ہر اعتباد سے ایک دلکش اور کامیاب فلم ثابت ہوئی تھی جس نے فلم ساز و ہدایت کار کاردار اور مصنف و گیت نگار نذیر اجمیری کی زندگیوں کو ایک نیا رخ دے دیا تھا۔

"شاردا" کاردار پروڈکشنز کی پہلی تخلیق تھی، جس نے آئندہ کے لیے اے آر کاردار اور نذیر اجمیری کے روشن مستقبل کے لیے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ "شاردا" اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک معاشرتی فلم تھی جس میں اصلاحی پہلو نمایاں تھے۔ہدایت کار کاردار نے اس کہانی کے لیے بہت موزوں اداکاروں کا انتخاب کیا تھا۔جن کے فقرے، مکالمے اور اداکاری کا انداز بعد میں آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔اس فلم کے ٹائٹل پر کہانی و مکالمہ نویس کے طور پر ایم نذیر کا نام لکھا ہوا تھا لیکن یہ نذیر اجمیری ہی تھے۔ نوشاد اس کے موسیقار تھے۔وہ اس سے پہلے بھی بمبئی کی فلمی دنیا میں بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے کر برصغیر کے ممتاز موسیقار تسلیم کیے جا چکے تھے۔ "شاردا" نے ان کی اس شہرت میں مزید اضافہ کر دیا۔اس فلم کے گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔ڈی این مدھوک نے اس زمانے کے مطابق سیدھے سادے الفاظ میں گیت لکھے تھے جن کی دلکش طرزوں نے انہیں مزید دلفریب بنا دیا تھا۔ہم اس زمانے میں بہت چھوٹے تھے مگر "شاردا" فلم کے گانے گاتے پھرتے تھے۔اس زمانے میں خدا جانے طرز سمیت یہ گانے لوگوں کی زبانوں پر کیسے چڑھ جاتے تھے جبکہ نہ تو ویڈیو اتنا عام ہوا تھا اور ریڈیو اور ٹیلی وژن کا تو دور دور تک نشان نہ تھا۔اس کے باوجود ہٹ فلموں کے گانے لوگ سائیکلوں پر، تانگوں، ریڑھیوں اور پیدل چلتے ہوئے بلند آواز میں جب گاتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا اور یہ دلوں میں اتر جاتے تھے۔ان لوگوں سے سن سن کر

دوسروں کو بھی یہ گانے یاد ہو جاتے تھے۔ گویا یہ تمام کام سینہ بہ سینہ یا زبانی کلامی ہوتا تھا لیکن اس زمانے کی موسیقی کا تاثر دیکھئے کہ آج نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ گانے لوگوں کو یاد ہیں۔ خود ہمیں بھی بعض گانے طرزوں سمیت یاد ہیں مثلاً۔

پنچھی جا

پیچھے رہا ہے بچپن مرا

اس کو جا کر لا

شاعری کے اعتبار سے آپ چاہے جو کہہ لیں مگر الفاظ کی سادگی اور تاثر کے اعتبار سے یہ مکالموں کے مانند ہے۔ ایک لڑکی پنچھی سے مخاطب ہو کر کہہ رہی ہے کہ جاؤ اور میرے کھوئے ہوئے بچپن کو ڈھونڈ کر لاؤ۔

گھر آئی بدریا گھر آؤ

کچھ کہہ جاؤ، کچھ سن جاؤ

یہ بھی ایسا ہی سادہ اور پر تاثیر گیت ہے

ایک غزل جو ہمیں بہت بھائی تھی اور آج بھی یاد ہے وہ یہ تھی۔

تم نہیں آتے تو نہیں آؤ

یاد سے کہہ دو وہ بھی نہ آئے

ہم یہ گانا گاتے پھرتے تھے مگر اس کا مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پہلے یہ سمجھے کہ شاعر مخاطب سے کہہ رہا ہے کہ میرا یہ پیغام دینا نہ بھولنا کہ اگر تم خود نہیں آتے تو تمہاری یاد کیوں آتی ہے؟ بعد میں احساس ہوا کہ دراصل شاعر کہتا ہے کہ تم خود جا کر یاد سے کہہ دو کہ جب تم نہیں آتے تو تمہاری یاد بھی نہ آئے۔

اس فلم میں ''پنچھی جا'' والا گیت ثریا نے گایا تھا۔ باقی نغمات نرملا دیوی کے گائے ہوئے تھے۔

ایک اور گانا یاد آرہا ہے۔

بیچ بھنور میں میری ناؤ

ات ات پار لگاؤ۔

بہتر حال اپنی کہانی، اداکاری اور موسیقی کی وجہ سے ''شاردا'' ایک انتہائی مقبول اور یادگار فلم بن گئی تھی۔ اس کی کہانی کیونکہ معاشرتی اور خواتین کو پسند آنے والی تھی اس لیے یار لوگوں نے بعد میں اس پہ خوب ہاتھ صاف کیے۔ بھارت اور پاکستان میں معمولی سی تبدیلیوں کے ساتھ یہ کہانی بارہا بنائی گئی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر بار ہٹ ہوئی۔

پاکستان میں فلم ساز و ہدایت کار اشفاق ملک نے ''سلمیٰ'' کے نام سے بہت سپر ہٹ فلم بنائی تھی جس میں مرکزی کردار (شاید) بہار نے ادا کیا تھا۔ اشفاق ملک کاردار صاحب کے بھانجے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس رشتے سے ان کی فلمی پر اپنا حق سمجھتے ہوں مگر یہ نذیر اجمیری صاحب کے ساتھ ناانصافی تھی کہ ان کی ہٹ فلم کو کسی اور مصنف کے نام سے بنالیا جائے۔ نذیر صاحب اس بات سے بہت شاکی تھے۔ کچھ اور پنجابی اور اردو فلمیں بھی اسی کہانی کو نچوڑ کر بنائی گئی تھی۔

1957-59 میں جب لقمان صاحب کی فلم ''فرشتہ'' کی نمائش ہوئی تو ہمارا ان سے جھگڑا ہو چکا تھا اور ہم نے اختلافات کی بنا پر کہانی سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی مگر بنیادی طور پر مشہور ناول ''کرائم اینڈ پنشمنٹ'' کو ہم نے ہی

فلم کے لیے اخذ کیا تھا۔ لقمان صاحب نے اس کا کلائمکس بدل دیا۔ علاؤالدین صاحب کے کردار کا کہانی میں اضافہ کر دیا اور بھی کئی تبدیلیاں کیں مگر بنیادی ڈھانچا اور بہت سے سین ہمارے لکھے ہوئے بھی تھے۔ ہم تو قطع تعلق کر چکے تھے مگر عطاءاللہ شاہ ہاشمی مرحوم نے ہمیں ایسا جوش دلایا کہ ہم نے مطالبہ کر دیا کہ فلم پر مصنف کی حیثیت سے ہمارا نام دیا جائے۔ لقمان صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ ہم نے پروڈیوسرز ایسوسی ایشن میں مقدمہ دائر کر دیا جس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا مگر لقمان صاحب اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ ہمیں بھی ضد چڑھ گئی تھی۔ ہم نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔

یہ طول کہاں تک پہنچا، ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یہ مقدمہ بالآخر ہم جیت گئے تھے۔ اس واقعے کا حوالہ یوں آیا کہ ان دنوں ہم عدالتوں ہی میں زیادہ وقت گزارتے تھے اور ہمیں مقدموں میں مزہ آنے لگا تھا۔

وہاں ایک دن نذیر اجمیری صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ایک درخت کی چھاؤں میں سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے پاس جا کر سلام عرض کیا۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے پوچھا" خیریت تو ہے۔ عدالت سے کیسے آئے؟ "

ہم نے مختصراً قصہ سنا دیا اور کہا کہ ہم لقمان صاحب کی فلم کی نمائش کے خلاف حکم امتناعی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

وہ اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں مسکرائے اور بولے" میاں کیوں اپنا وقت اور پیسہ برباد کرتے ہو۔ ہندوستان اور پاکستان کی فلمی تاریخ میں لکھنے والوں کے ساتھ ایسی زیادتیاں ہوتی آئی ہیں مگر آج تک کسی رائٹر کو حکم امتناعی نہ مل سکا۔ "

ہم نے کہا" اللہ مالک ہے۔ کوشش تو کرنی چاہیے۔ "

ان کی ایک دو کہانیاں بھی یار لوگوں نے توڑ مروڑ کر اپنے ناموں سے بنالی تھیں مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔اس روز بھی وہ کسی ایسے ہی مقدمے کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔

ہمیں حکم امتناعی حاصل ہو گیا۔اس میں ہماری بھاگ دوڑ ، ہوشیاری اور ضد کے علاوہ ہمارے نوجوان وکیل دوست سلطان کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔افسوس کہ اس کے ایک ڈیڑھ سال بعد ہی وہ اسکوٹر کے حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔اللہ غریق رحمت کرے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو" فرشتہ " کا مقدمہ انڈوپاکستان کی فلمی تاریخ کا تاریخی اور انوکھا مقدمہ تھا۔ بعد میں لقمان صاحب سے ہماری دوبارہ تجدید دوستی ہو گئی جو آخر تک قائم رہی۔

فلمی دنیا بھی عجیب گورکھ دھندا ہے۔کامیابی اور ناکامی کا یہاں کوئی پتا نہیں چلتا۔نذیر صاحب کی پہلی ہی فلم سپر ہٹ ہو گئی تھی۔انہوں نے دوسری کہانی " دعوت" کے نام سے لکھی۔یہ بھی ایک سوشل فلم تھی۔کاسٹ بھی اچھی تھی۔اس فلم کے ہدایت کار بھی خود وہی تھے۔کہانی اور مکالموں پر حسبِ معمول ایم نذیر کا نام درج تھا۔تنویر نقوی صاحب نے اس کے نغمات لکھے تھے۔موسیقار و سنت کمار نائیڈو تھے جو نوشاد صاحب کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے۔ بہرحال جو بھی ہوا نتیجہ یہ نکلا کہ جب فلم کی نمائش ہوئی تو یہ سپر فلاپ ثابت ہوئی،سب حیران رہ گئے۔سب سے زیادہ حیران شاید خود نذیر صاحب ہوئے ہوں گے۔

غالباً نجومیوں نے مشورہ دیا کہ آپ اپنا نام بدل لیں تو نحوست دور ہو جائے گی۔چنانچہ انہوں نے اپنا نام نذیر اجمیری رکھ لیا اور کاردار صاحب کے لیے فلم " قیمت" لکھی۔اس کے مصنف اور ہدایت کار بھی وہی تھے۔مجروح سلطان پوری کے نغمات کی دھنیں نوشاد صاحب نے بنائی تھیں۔کاسٹ بھی اچھی تھی۔یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی یہ فلم فلاپ ہو گئی۔گویا نیا نام بھی نذیر صاحب کو راس نہ آیا۔اس فلم کا موضوع" جہیز" تھا جس میں اس کی مذمت کی گئی

تھی۔ ممکن ہے اس معاشرے میں اس خیال کو پسند ہی نہ کیا گیا ہو۔ خاص کر ہندو تو جہیز کے حق میں تھے حالانکہ رونا بھی روتے رہتے تھے۔

مجروح سلطان پوری نے بہت اچھے نغمے لکھے تھے اور نوشاد صاحب نے طرزیں بھی بہت اچھی بنائی تھیں لیکن نہ تو موسیقی کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی نہ ہی فلم کو۔ اور تو اور، خود ہمیں اس فلم کا ایک بھی گانا یاد نہیں ہے۔

اس زمانے میں تو "جہیز" کے بارے میں بنائی ہوئی یہ فلم فلاپ ہوگئی تھی مگر کچھ عرصہ بعد جب اسی موضوع پر پاکستان اور بھارت میں فلمیں بنائی گئیں تو بہت کامیاب ہوئیں۔ خود نذیر صاحب نے پاکستان آکر اس موضوع پر ایک فلم بنائی تھی جو بہت کامیاب رہی تھی۔ شاید یہ بدلے ہوئے زمانے کا تقاضا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بعض اوقات وقت سے پہلے بنائے ہوئے موضوعات محض معاشرے کی پسماندہ سوچ اور تعلیم کی کمی کے باعث ناکام ہوگئے لیکن کچھ عرصے بعد یہی موضوعات بے حد کامیاب ثابت ہوئے۔ ایسی بے شمار مثالیں برصغیر میں موجود ہیں۔ جہیز کے موضوع کا حشر تو آپ سن ہی چکے ہیں۔ طلاق ایک ایسا مسئلہ ہے ہندو معاشرے میں تو ممنوع ہی ہے لیکن مسلمانوں میں بھی ہندو اثرات کے باعث اسی شرعی حق کو تسلیم نہیں کیا گیا اور اب تک بہت سے لوگ اسی خیال کے حامی ہیں کہ طلاق کسی صورت میں قابل قبول نہیں ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ خیالات میں بھی تبدیلی آئی اور اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں ان کا اعتراف کیا جانے لگا تو عورت کو طلاق لینے کا حق بھی دے دیا گیا۔ اب تو نکاح نامے میں باقاعدہ یہ نکتہ بھی ہوتا ہے کیا بیوی طلاق لینے کا حق محفوظ رکھتی ہے؟ حالانکہ یہ سوال قطعی غیر ضروری اور بے معنی ہے۔ اسلام نے مخصوص حالات میں عورت کو خلع لینے کا اختیار دے رکھا ہے جسے مردانہ معاشرہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔

ہندو سماج میں بیوہ عورت یا تو شوہر کے ساتھ ستی ہو جاتی تھی یا پھر سارے زندگی زندہ بدست مردہ کی مانند گزارنے پر مجبور تھی۔ ہندو فلم بین یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ایک بیوہ دوسری شادی کرے لیکن بی آر چوپڑا نے اپنی ایک فلم میں بیوہ عورت کی دوسری شادی کرا دی اور یہ فلم بے حد کامیاب ہوئی۔ غالباً اس کا نام ایک ہی راستہ تھا اور اس میں

مینا کماری اور اشوک کمار نے مرکزی کردار کیے تھے۔ طوائف کو ایک گالی سمجھا جاتا ہے اور عام لوگ اسے گناہوں اور خرابیوں کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ برصغیر کی فلموں میں اگر کبھی طوائف کی ہیروئن کے روپ میں پیش بھی کیا گیا تو یہ نکتہ واضح کر دیا گیا کہ یہ

۱۔ خاندانی طوائف نہیں ہے۔

۲۔ مجبوراً اسے طوائف بنایا گیا ہے۔

۳۔ اس کے باوجود یہ پارسا اور گناہوں سے محفوظ ہے۔

لیکن بی آر چوپڑا ہی نے اپنی ایک فلم "سادھنا" میں ایک طوائف کو ہیروئن کے کردار میں پیش کیا جو کہ اسی ماحول کی پیداوار اور اسی ذہنیت کی مالک تھی مگر جب اس نے معاوضہ لے کر کسی شریف آدمی کی نقلی بیوی بننا قبول کیا تو رفتہ رفتہ گھریلو ماحول نے اسے یکسر تبدیل کر دیا اور اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ عورت کی عزت اور عظمت کیا ہے اور گھریلو زندگی کیسی ہوتی ہے جس سے کہ وہ قطعی ناآشنا تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی پرانی زندگی سے تائب ہو گئی اور ایک شریفانہ زندگی بسر کرنے کی خواہاں ہوئی مگر راہ میں بہت سی رکاوٹیں حائل تھیں۔ ہیرو کو علم تھا کہ یہ خالص طوائف ہے مگر وہ اس کی بدلی ہوئی شخصیت اور پوشیدہ خوبیوں کے باعث اسے پسند کرنے لگا لیکن ماں اور معاشرے کا ڈر تھا۔ فلم کا انجام یہ تھا کہ بالآخر ماں کو بھی اس لڑکی کی اصلیت کا علم ہو گیا اور اس کی تبدیلی کی خواہش کے پیش نظر اور اس کے خلوص، محبت اور خدمت کے جذبے کو دیکھ کر وہ اسے بہو بنانے پر آمادہ ہو گئی۔ یہ فلم بھی سپرہٹ ثابت ہوئی۔

دراصل بی آر چوپڑا اور ان کے مصنف مکھ رام شرما نے ایک زمانے میں اوپر تلے کئی غیر روایتی کہانیاں پیش کیں اور سب ہی کامیاب ثابت ہوئیں۔ ایک فلم "دھول کا پھول" میں انہوں نے ایک ناجائز بچے کی ماں کو ہیروئن بنا دیا تھا ۔ یہ بھی کامیاب تھی۔ ایک اور فلم "گمراہ" میں انہوں نے ایک شادی شدہ عورت کو اپنے شوہر کو بھلا کر پرانے

محبوب سے ملاقاتوں کو موضوع بنایا۔آخر میں بیوی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا مگر یہ فلم بھی روایت سے بالکل ہٹ کر تھی اور بے حد کامیاب ہوئی تھی۔

یوں تو بھارت میں ایک زمانے میں بہت سے ذہین اور عام ڈگر سے ہٹ کر فلمیں بنانے والے فلم ساز و ہدایت کار موجود تھے۔بی آر چوپڑا بھی ان ہی میں شامل تھے مگر بد قسمتی سے انہیں وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ حق دار تھے وہ محض ایک کامیاب ہدایت کار فلم ساز کی حیثیت سے ہی تسلیم کیے گئے حالانکہ انہوں نے اپنی فلموں میں پے در پے کئی کامیاب انقلابی تجربے کیے تھے۔ان کی ایک فلم ''خاتون'' خالص کمرشل فلم تھی جس میں ایک گانا بھی نہیں تھا جو کہ دیسی فلموں کے لیے ایک ان ہونی سی بات ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے باوجود ''خاتون'' سپر ہٹ ہوئی تھی حالانکہ عام تاثر یہی ہے کہ فلمیں گانوں کی وجہ سے ہی کامیاب اور مقبول ہوتی ہیں۔

نذیر اجمیری کو کبھی خود کفیل فلم ساز اور ہدایت کار کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی لیکن ان کے باوجود انہوں نے موضوعات میں نت نئے تجربات کیے جن میں سے کچھ کا تذکرہ ابھی کیا جا چکا ہے۔ان میں بعض اوقات انہیں کامیابی ملی اور بعض اوقات ناکامی۔

" دعوت "ان کی ایک تجرباتی مگر ناکام فلم تھی لیکن وہ تجربہ کرنے سے پھر بھی باز نہ آئے۔ان کی فلم ''قیمت'' بھی ایک معاشرتی فلم تھی جس کے موسیقار نوشاد اور گیت نگار خمار بارہ بنکوی تھے لیکن اسے بھی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اس فلم میں پہلی بار انہوں نے ہر شعبے میں اپنا نام نذیر اجمیری استعمال کیا تھا۔

ہدایت کار کی حیثیت سے وہ دو فلمیں بنا چکے تھے اور دونوں ہی ناکام رہی تھیں۔ ان کی تیسری فلم بمبئی ٹاکیز کے لیے بنائی گئی تھی۔یہ ''مجبور'' تھی جس میں ماسٹر غلام حیدر موسیقار تھے۔اسی فلم میں انہوں نے لتا منگیشکر سے ضد کر کے گلوکاری کرائی تھی منور سلطانہ اور شیام اس کے مرکزی کردار تھے۔ولی صاحب کے چھوٹے بھائی ناظم پانی پتی اس

کے نغمہ نگار تھے۔ قسمت کی بات یہ ہے کہ " مجبور" نے بھی کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی۔ حالانکہ اس کی موسیقی نے ملک میں دھومیں مچادی تھیں۔ اس کے تمام نغمے ہٹ ہوئے تھے۔ چند گانے شاید آپ کو بھی یاد ہوں۔

دل میرا توڑا مجھے کہیں کا نہ چھوڑا

اب کوئی جی کے کیا کرے جب کوئی آسرا نہیں

دیکھو جی دیکھو جی

میری بیّاں پکڑ کے چھوڑ نہ دینا

ہر شے پہ جوانی ہے

سجنی کے ہونٹوں پہ ساجن کی کہانی ہے

پردیسی چھورا چلا گیا

وہ گورا گورا چلا گیا

اس فلم کی موسیقی بے حد مقبول ہوئی تھی لیکن اس تناسب سے فلم کامیاب نہ ہوسکی۔ اس سے یہ خیال ایک بار پھر غلط ثابت ہو گیا کہ ہماری فلموں میں محض اچھی موسیقی کے سہارے فلمیں ہٹ ہوسکتی ہیں۔

نذیر صاحب کی ہدایت کار کی حیثیت سے صرف پہلی فلم کامیاب ہوئی تھی اس کے بعد انہیں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ ہوسکی حالانکہ ان کی صلاحیت اور قابلیت سے کسی کو انکار نہ تھا لیکن فلمی دنیا میں صرف کامیابی ہی ہر چیز کا سمانہ ہوتی ہے۔ کامیاب فلم ہے تو ہر چیز کامیاب ہے۔ اگر فلم ناکام ہے تو اس کی خوبیاں بھی خرابیوں میں بدل جاتی ہیں۔

نذیر اجمیری صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔پے درپے فلموں کی ناکامیوں نے انہیں دل برداشتہ کر دیا تھا۔ادھر مارکیٹ میں بھی ان کے خریدار زیادہ نہ تھے۔ان حالات سے بددل ہو کر انہوں نے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔بمبئی سے جو فلمی شخصیات پاکستان آئیں ان میں بیشتر نے اپنا زمانہ عروج گزرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا۔ بمبئی ایک بہت بڑی فلمی منڈی تھی۔اس کے مقابلے میں پاکستانی فلمی صنعت نوزائیدہ اور بے وسائل تھی پھر بھی اچھے دنوں کے گزر جانے کے بعد ہی بیشتر لوگوں نے پاکستان میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا تھا۔

نذیر اجمیری 1949ء کے لگ بھگ پاکستان آگئے تھے۔یہاں ان کی ملاقات ایس گل صاحب سے ہوئی۔ان کا قصہ پہلے تفصیل سے بیان کیا جاچکا ہے۔ان کا اصلی نام فضل شاہ تھا۔سندھ کے بااثر جاگیردار تھے مگر انہیں فلم،اداکاری موسیقی سے جنون کی حد تک دلچسپی تھی،یہی وجہ ہے کہ وہ تھے اور عرصہ دراز تک یہیں رہے۔سندھی جاگیرداروں کے رواج کے مطابق ان کی خاندانی بیگم وہیں رہتی تھیں۔لاہور میں جب انہوں نے فلم "بے قرار" کا آغاز کیا تو اس میں وہی ہیرو تھے۔ان کے ساتھ آہو چشم راگنی ہیروئن تھیں۔راگنی غیر منقسم ہندوستان کی فلموں کا ایک بہت بڑا نام تھیں۔"بے قرار" کی تکمیل کے وقت وہ شادی شدہ تھیں۔ان کے شوہر اسلم صاحب بھی ایک بڑے زمیندار تھے۔بے قرار میں ایس گل صاحب اور راگنی کی قربت محبت میں تبدیل ہوگئی۔راگنی نے اپنے شوہر سے طلاق حاصل کرلی۔انہوں نے رسمی طور پر کبھی اعلان نہیں کیا کہ ان کی ایس گل صاحب سے شادی ہوگئی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد وہ اور ایس گل زندگی کے ساتھی بن گئے تھے۔

ایس گل سے ہماری دیرینہ شناسائی تھی جو رفتہ رفتہ دوستی میں بدل گئی۔ہم صحافی تھے۔وہ فلم کے شیدائی۔مال روڈ پر گوگو کے عقب میں ان کا شاندار دفتر تھا۔اس زمانے میں لاہور ایک مختصر اور باہمی میل ملاپ والا شہر تھا۔ہر ایک دوسرے کو جانتا تھا۔مال روڈ اور فلمی نگارخانوں کے علاوہ ریستورانوں میں بھی سب ملتے رہتے تھے جس کی وجہ سے باہمی شناسائی اور تعلقات میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ایس گل صاحب کے اور ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ان سے تعلقات آخر دم تک قائم رہے حالانکہ وہ بھی فلمی دنیا چھوڑ چکے تھے اور ہم بھی۔وہ بہت شریف بااخلاق،شائستہ اور

زندہ دل شخصیت تھے۔ بعد میں جن دنوں محمد خان جونیجو پاکستان کے وزیراعظم تھے، ان کی بیٹی کی گل صاحب کے بیٹے سے شادی ہوگئی تھی اور وہ وزیراعظم کے سمدھی بن گئے تھے۔ مگر ان کے معمولات اور رویے میں ذرا سی بھی تبدیلی کبھی نہیں دیکھی بلکہ آخری چند سالوں میں بہت زیادہ محبت اور خلوص کا اظہار کیا کرتے تھے اور بار بار کراچی یا حیدر آباد آنے کی دعوت دیتے رہتے تھے۔

''بے قرار'' کے لیے انہوں نے نذیر اجمیری صاحب کے ساتھ غالباً حصہ داری کرلی تھی۔ وہی اس کے مصنف اور ہدایت کار تھے۔ ان کے ادارے کا نام '' فلم ساز'' تھا۔ جب 1964ء میں ہم نے فلم سازی کا آغاز کیا تو اپنے ادارے کا نام '' فلم ساز'' ہی رکھا تھا۔ کسی نے اس طرف توجہ نہیں دلائی۔ نہ ہی ایس گل نے کبھی شکوہ یا تذکرہ کیا۔ کافی عرصے بعد ایک بار کہا کہ بھائی، آپ نے میرے ادارے پر ہی قبضہ جمالیا ''

''وہ کس طرح''؟

''فلم ساز تو میرا ادارہ تھا۔''

ہم نے بہت معذرت کی کہ لاعلمی میں یہ غلطی ہوگئی۔ اگر وہ بتا دیتے تو ہم یقیناً نام بدل لیتے۔ وہ ہنس کر چپ ہوگئے۔ شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ان دنوں فلم سازی نہیں کررہے تھے البتہ مال روڈ کے عقب میں ان کا شاندار دفتر موجود تھا جہاں دوستوں کی محفلیں اور خاطر مدارات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

''بے قرار'' کی منصوبہ بندی کے دوران ہی میں ماسٹر غلام حیدر بھی بمبئی سے اپنے بیوی بچوں سے ملاقات کی غرض سے لاہور سے پہنچے تو گل صاحب اور نذیر اجمیری صاحب نے انہیں اپنی فلم کی موسیقی بنانے کے لیے کہا۔ وہ بمبئی میں ولی صاحب کی ایک فلم '' پُتلی'' پر کام شروع کرچکے تھے مگر بے قرار کی کہانی انہیں اتنی پسند آئی کہ اس کی موسیقی بنانے پر آمادہ ہوگئے۔ بے قرار میں برصغیر کے معروف ترین کامیڈین جاری نے بھی کام کیا تھا۔ مگر ان سب کی مشترکہ کوششوں کے باوجود بے قرار ناکام ہوگئی۔ اس کے بعد ماسٹر غلام حیدر بھی لاہور ہی کے ہوکر رہ گئے۔

بے قرار 1950ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ پاکستان میں ان دنوں فلم سازی برائے نام ہوتی تھی۔ نذیر صاحب بھی بے کار ہوگئے۔ ان کی ایک کہانی فلم ساز وہدایت کار امین ملک نے "پنجرہ" کے نام سے بنائی تھی مگر یہ فلم بھی نامساعد حالات اور وسائل کی کمی کے باعث کامیاب نہ ہو سکی۔ امین ملک کے بارے بتا چکے ہیں کہ آج کے پنجابی فلموں کے معروف مصنف وہدایت کار ناصر ادیب انکے داماد ہیں مگر یہ رشتہ امین ملک کی زندگی میں قائم نہیں ہوا تھا۔ وہ نسبتاً جوانی میں ہی انتقال کر گئے تھے وہ اس وقت پچاس کے پیٹے میں تھے کہ ہارٹ فیل ہو گیا۔

"پنجرہ" کی ناکامی نے نذیر اجمیری کی ناکامیوں کی فہرست میں ایک اور اضافہ کر دیا۔ یہ فلم 1951ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک نذیر اجمیری صاحب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ ان کی ضرورتیں محدود تھیں۔ وہ اولاد سے محروم تھے۔ ایک بیگم تھیں اور ایک بچی انہوں نے گود لے کر اس کی پرورش کی تھی۔ وہ سادگی کا دور تھا لوگ ہر قسم کے حالات میں عزت سے سفید پوشی کا بھرم رکھ سکتے تھے۔ ابھی پاکستان میں دولت کی ریل پیل، نام ونمود اور شان وشوکت کی نمائش کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔

بالآخر اے آر کاردار صاحب ہی نذیر اجمیری کے کام آئے۔ وہ بمبئی میں مقیم تھے مگر لاہور میں ان کی فلمیں کاردار پکچرز کا ادارہ ریلیز کرتا تھا۔ اس کے انچارج اسماعیل نور صاحب تھے جو کاردار صاحب کے داماد تھے۔ اسماعیل نور صاحب کے بارے میں بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ روشن خیال اور مجلسی آدمی تھے۔ اس زمانے میں سرکاری فلمی وفود میں وہی فلمی صنعت کی نمائندگی کیا کرتے تھے۔ کاردار صاحب کی فلمیں باقاعدگی سے پاکستان میں آکر نمائش پذیر ہوتی تھیں اور بے حد کامیاب بھی ہوا کرتی تھیں۔

کاردار صاحب کے مشورے پر یا بذات خود اپنے منصوبے کے تحت اسماعیل نور صاحب نے "قسمت" کے نام سے ایک فلم بنانے کا آغاز کیا تو مصنف وہدایت کار کی حیثیت سے نذیر اجمیری صاحب کا انتخاب کیا۔ اس فلم میں مرکزی کردار مسرت نذیر اور سنتوش کمار نے ادا کیے تھے۔ ایم اسماعیل کا بھی ایک جاندار اور دلچسپ کردار تھا۔ "قسمت" انتہائی کامیاب فلم ثابت ہوئی جس نے نذیر اجمیری صاحب کو نئی زندگی بخش دی۔ اسماعیل نور نے تو اس کے بعد کوئی

فلم نہیں بنائی مگر نذیر اجمیری کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔" قسمت" کی نمائش 1956ء میں ہوئی تھی۔ اس کی کامیابی کے بعد تقسیم کار نذیر اجمیری صاحب کے متلاشی ہو گئے تھے اور ان کی زندگی کا ایک اچھا خوش حال دور شروع ہو گیا۔

"قسمت" کے بعد نذیر اجمیری صاحب نے اسی نام کے وزن پر دو اور فلمیں بنائیں جن کے فلم ساز بھی وہ خود ہی تھے۔" شہرت" 1957 میں ریلیز ہوئی تھی جس میں ہیروئن کا کردار نسرین نے کیا تھا۔نسرین مثالی حسین و جمال کی مالک تھیں لیکن بد قسمتی سے اتنی اچھی اداکارنہ تھیں ورنہ تہلکہ مچا دیتیں۔ان کی شخصیت، سراپا اور شکل وصورت پر دوسری ہیروئنیں رشک کیا کرتی تھیں۔

"شہرت" ایک اوسط درجے کی فلم ثابت ہوئی۔

اس کے بعد نذیر صاحب نے" عزت" کے نام سے ایک فلم بنائی۔یہ 1960ء میں ریلیز ہوئی تھی۔یہ بھی اوسط درجے کی فلم تھی۔اسی زمانے میں ان کی فلم " شاردا" کی کہانی کو ازسر نو لکھوا کر اشفاق ملک صاحب نے "سلمیٰ" بنائی جو کہ ایک سپر ہٹ فلم تھی۔

ان کی دو فلمیں قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کر سکی تھیں اس لیے نذیر اجمیری صاحب ایک بار پھر فراموش کر دیے گئے۔انہیں 1963 ءمیں ایک فلم بنانے کا موقع ملا۔اس کا نام" پیغام" تھا اور یہ ایک کامیاب فلم تھی۔اگلی فلم" دل کے ٹکڑے" بھی کامیاب ثابت ہوئی اور وہ فلم سازی میں مصروف ہو گئے۔دل کے ٹکڑے 1965ء میں ریلیز ہوئی تھی۔" پردہ" 1966ء میں ریلیز ہوئی تھی اور" شب بخیر" 1967ء میں۔یہ دونوں فلمیں نمایاں کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہی تھیں اس لیے فلمی دنیا نے ایک بار پھر نذیر اجمیری کو فراموش کر دیا۔اس کے بعد انہوں نے نہ تو کوئی فلم بنائی اور نہ ہی کوئی کہانی تحریر کی۔1970ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح اجمیر سے شروع ہونے والا سفر بمبئی کے راستے لاہور پہنچ کر اختتام پذیر ہوا۔

نذیر اجمیری صاحب سے ہماری ملاقات زیادہ نہیں تھی مگر جب بھی ملاقات ہوئی وہ بہت شفقت اور مہربانی کا اظہار کرتے تھے۔ وہ بھاری بدن اور دلکش نقش و نگار کے مالک تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، گندمی رنگت۔ بات بہت ناپ تول کر کرتے تھے۔ اپنے عہد کی وضع داری اور شرافت و شائستگی کا نمونہ تھے۔

''کنیز'' کی ریلیز کے بعد ہم السر کی وجہ سے طویل بیماری کا شکار ہوئے تو ہمارا ٹھکانا لاہور کا اس دور کا سب سے اچھا ہسپتال یو سی ایچ تھا۔ دو ڈھائی سال تک ہسپتال میں ہماری آمد و رفت رہی۔ ڈپریشن سے بچنے کے لیے بھی ہم اس ہسپتال میں داخل ہو جاتے تھے۔ یہاں بہت سے ڈاکٹر امریکی تھے اور انتظامیہ بھی بہت مستعد تھی۔ کمرے ایسے کہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا گمان گزرتا تھا۔ (اس زمانے میں لاہور فائیو رسٹار ہوٹل سے محروم تھا) اس کے تمام کمرے ائر کنڈیشنڈ تھے۔ اس زمانے میں یہ لاہور کا مہنگا ترین ہسپتال تھا مگر کمروں کا کرایہ سن کر آپ حیران رہ جائیں گے۔ ڈبل روم کا کرایہ 32 روپے روزانہ تھا۔ اگر دوسرا مریض بھی ہو تو صرف سولہ روپے کرایہ تھا۔ ادویات اور ٹیسٹ وغیرہ ہسپتال ہی کی ذمے داری تھی اور بہت کم قیمت پر دوائیاں مل جاتی تھیں۔ عملہ بے حد تربیت یافتہ اور مہذب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم وہاں داخل ہونے کے بہانے ڈھونڈا کرتے تھے۔ 1966ء سے 1969ء کے آغاز تک ہم کسی نہ کسی وجہ سے اس ہسپتال کے مریض رہے۔ اس دوران میں کوئی کام نہیں کیا۔

غالباً 1968ء میں جب ہم اعصابی تناؤ کی شکایت میں مبتلا ہو کر ہسپتال گئے تو معلوم ہوا کہ برابر کے کمرے میں اداکارہ کومل براجمان ہیں۔ انہوں نے ہمارے متعلق سنا تو اپنی والدہ کے ہمراہ مزاج پرسی کے لیے آئیں۔ اگلے دن نذیر اجمیری صاحب بھی ہمارے کمرے میں تشریف لائے۔ وہ کومل کی بیماری کی وجہ سے خاصے پریشان تھے۔ ہم نے ڈاکٹروں اور نرسوں سے تمام معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ کوئی قابل ذکر بیماری نہیں ہے۔ ہم نے نذیر صاحب کو تسلی دی مگر انہیں اطمینان نہ ہو سکا۔ اس زمانے میں نذیر اجمیری صاحب سے ہماری بہت زیادہ ملاقات رہی۔ وہ اکثر ہمارے کمرے میں آ جاتے تھے۔ ہمیں بھی کوئی کام نہ تھا اس لیے اطمینان سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی تھیں۔

انہوں نے اپنے بمبئی کے تجربات سنائے اور اپنی زندگی کے نشیب و فراز اور تجربات سے بھی آگاہ کیا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کہانی نویسی اور ہدایت کاری پر انہیں عبور حاصل تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک ہنر مند تھے۔ افسوس کہ پاکستان کی فلمی صنعت نے ان کی قدر نہ کی اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ یو سی ایچ میں ملاقاتوں کے بعد ہماری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

ان کے بعد پاکستان آنے والوں میں ایم صادق ایک قابل ذکر نام ہیں جو فلمی حلقوں میں بابو صادق کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ وہ کاردار صاحب کے ہونہار شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے اور ایس یو سنی نے بطور ہدایت کار بہت سی کامیاب فلمیں بنائی تھیں۔ حالات کا جبر انہیں بھی لاہور لے آیا۔ وہ اسی خطے کے رہنے والے تھے مگر طویل عرصے تک بمبئی میں رہنے کی وجہ سے اپنے ہی وطن میں اجنبی تھے۔ انہوں نے " بہار و پھول برساؤ" کے نام سے ایک فلم شروع کی تھی۔ ابھی وہ نامکمل ہی تھی کہ وہ عارضہ قلب میں مبتلا ہوئے اور انتقال کر گئے۔ عام خیال یہ ہے کہ وہ مقامی فلم والوں کے طریقہ کار اور اداکاروں کے سلوک کی وجہ سے بہت دل برداشتہ ہو گئے تھے اور یہی ان کی وفات کا سبب بن گیا۔ وجہ کچھ بھی ہو، مرنے کے تو بہانے بن جاتے ہیں۔ موت اپنے مقررہ وقت پر ہی آتی ہے۔ ممکن ہے اگر وہ بددلی اور مایوسی کا شکار نہ ہوتے تو ایک کامیاب اور خوش و خرم انسان کی حیثیت سے جان دیتے۔ دل کی بیماری نے اچانک انہیں ایسا گھیرا کہ پھر اس کے پھندے سے نہ نکل سکے۔

دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا۔

یہ مکمل شعر بھی سن لیجئے۔

الٰہی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

قابل ذکر بات یہ ہے کہ شاعر کا ارشاد ہارٹ کی بیماری کی جانب نہیں ہے۔اس زمانے میں یہ بیماری عام نہیں ہوئی تھی لیکن شاعر عموماً بیماری دل کا رونا روتے رہتے تھے جس سے ان کی مراد محبت میں ناکامی ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب زمانہ ایسا بدلا ہے کہ شاعر بھی سچ مچ دل کی بیماری میں مبتلا ہو کر جان دیتے ہیں۔

متذکرہ بالا شعر فانی بدایونی کا خوبصورت کلام ہے جو زندگی بھر حزن وملال اور مایوسی و محرومی کا شکار رہے اور مجسم اس کی تصویر بن کر رہ گئے تھے۔انہیں کیا علم تھا کہ ایک زمانے میں یہ ایک حقیقی بیماری بن جائے گی جس میں لوگوں کی اکثریت مبتلا ہو گی۔

☆

انسانوں کی طرح بعض عمارتیں بھی ایک انفرادی اور ممتاز شخصیت کی حامل ہوتی ہیں۔قدیم تاریخی عمارتوں کا ذکر نہیں ہے جدید دور کی کئی عمارتیں بھی بعض حوالوں سے تاریخی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب سنیما کو ہر ایک کی زندگی میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ پاکستان کے بڑے شہروں، خصوصاً کراچی اور لاہور میں قیام پاکستان سے قبل کے کئی بہت اچھے سنیما گھر تھے جن کو بعد میں بھی بہت حفاظت سے رکھا گیا اور فلم بینوں کے لیے تفریح اور مجلسی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے تھے۔جب فلمی صنعت نے ترقی کی تو سنیما گھروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ کراچی اور لاہور فلمی صنعت کے مراکز تھے اس لیے یہاں بہت خوبصورت اور معیاری سنیما گھر تعمیر کے گئے۔ان کی دلکشی کا یہ عالم تھا کہ فلم دیکھنے کے علاوہ بہت سے لوگ اس خوبصورت ماحول کو دیکھنے کے علاوہ بہت سے لوگ اس خوبصورت ماحول کو دیکھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے ان سنیما گھروں میں جایا کرتے تھے اور ان کے صاف ستھرے ریستورانوں میں چائے کافی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔یہاں انہیں بہت سے ملاقاتی نظر آجاتے تھے جو فلم دیکھنے آتے تھے یا دیکھ کر جاتے وقت ہیلو ہیلو ہو جاتی تھی۔صاف شفاف خوبصورت عمارتیں، خوش پوش فلم بینوں اور خوش جمال خواتین کے ملبوسات سے مہکتے ہوئے ہال اور لابیاں یہ بجائے خود ایک

حسین اور دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا۔ مگر یہ دورِ رفتہ کی کہانیاں ہیں جو شاید اب کبھی لوٹ نہ آئے گا۔ نئی نسل تو اس کی لطافتوں اور حسن کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتی کیونکہ اب ماحول، طور طریقے، مجلس آداب اور فلموں کے معیار ہی بالکل تبدیل ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج کے نوجوان اس حسین اور یادگار وقت کا اندازہ تک نہیں لگا سکتے جس سے ان سے پہلی والی نسلیں تہذیبی، سماجی، روحانی اور ذہنی طور پر سیراب ہوتی رہی ہیں۔ ہمارے جوانی کے زمانے میں سنیما جانا اور فلم دیکھنا محض تفریح ہی نہیں تھی، اس کا ایک تہذیبی اور ثقافتی ضرورت سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں فلموں کا معیار اور موضوعات بھی بہت اچھے، دلچسپ، معاشرتی اور معلوماتی ہوتے تھے۔ تفریح کے ساتھ ساتھ یہ سب چیزیں بھی مل جاتی تھیں۔ ہالی ووڈ کی فلموں میں امریکا کے ابتدائی دور اور ریڈ انڈین عہد کی کہانیاں بھی کثرت سے فلمائی جاتی تھیں۔ ان فلموں میں ریڈ ایڈین لوگوں کو عموماً جنگلی، وحشی اور ظالم دکھایا جاتا تھا جو محض تیر کمان اور خنجروں کی مدد سے بندوقوں اور پستولوں سے مسلح امریکیوں پر چڑھ دوڑے تھے۔ یہ پہلو بہت کم اجاگر کیا جاتا تھا کہ جب یورپین لوگ امریکا پہنچے تو انہوں نے مقامی لوگوں کی زمینوں اور وسائل پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ آغاز میں یہ ایک نوآبادی تھا جسے بعد میں آزادی کی جنگ لڑنے کے بعد جارج واشنگٹن نے آزاد ملک بنایا تھا۔ امریکی اب یہ حقیقت فراموش کر بیٹھے ہیں کہ اپنی آزادی کے لیے جنگ کرنا ہر قوم کا حق ہے اور یہ حق اقوامِ متحدہ کے منشور میں بھی تسلیم کیا گیا ہے لیکن اب آزادی کی جنگ لڑنے والوں کو دہشت گرد کہا جاتا ہے۔ فلسطین پر اسرائیل نے قبضہ جما لیا ہے اور مزید پاؤں پھیلا رہا ہے۔ فلسطینی اپنے حق کے لیے جدوجہد کرتے ہیں تو دہشت گرد قرار پاتے ہیں۔ ایسا ہی معاملہ کشمیر میں بھی ہے جس پر بھارت نے زبردستی قبضہ جما رکھا ہے اور ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ کشمیری حیرت پسندوں کی جدوجہد کو بھی دہشت گردی کا نام دیا جاتا ہے۔ امریکا نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات بھی تبدیل کر لیے ہیں اور ڈنڈے کے زور سے من مانی کر رہا ہے۔ اب ہر چیز کا فیصلہ اور تعین امریکا کرتا ہے۔ وہی معاملہ ہے کہ

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے

تذکرہ امریکی فلموں کا ہورہا تھا۔ان فلموں مین ریڈ انڈینز بہر حال پسماندہ ہونے کی وجہ سے شکست کھاتے تھے۔رفتہ رفتہ یہ سمٹ کر جنگلوں اور مخصوص علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئے اور سارے ملک پر گوروں کا راج ہو گیا لیکن فلم دیکھنے والوں کو اس زمانے کے امریکا اور وہاں جا کر آباد ہونے والوں کی سخت جدوجہد اور مشکلات کے ساتھ ساتھ یہ بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ریڈ انڈینز کا کلچر کیا تھا۔وہ کس طرح رہا کرتے تھے۔ان کی رسومات اور عادات واطوار کیسی تھی۔ فلمی مبالغے کی گنجائش تو اپنی جگہ لیکن اس کے باوجود یہ فلمیں دیکھنے والوں کی تفریح کے علاوہ اس زمانے کی تاریخ اور ثقافت سے بھی آگاہ کرتی تھیں۔

ویسٹرن فلموں میں دھنا دھن اور گولیوں کی جنگیں، غنڈے، بدمعاش اور معاشرے پر ان کے اثرات، اچھے لوگ، برے آدمی، آوارہ عورتیں، طوائفیں، جرائم پیشہ۔نیک اور فرض شناس شہری۔پولیس کا نظام جس کو شیرف کے ذریعے چلایا جاتا تھا۔یہ سب کچھ ان فلموں میں تفریحی اور دلچسپ انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ہیرو عموماً بہادر اور بے خوف ہوتا تھا۔ویلن بدمعاش اور انتہائی بداطوار لیکن ان فلموں دیکھنے والوں کو اس دور کے امریکی معاشرے، رسومات اور طرز حکومت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔اگرچہ جرائم کا دور دورہ تھا لیکن پولیس کا شیرف اس کے باوجود بے حد بااختیار افسر ہوتا تھا جس کے خلاف بڑے سے بڑا مجرم بھی ہتھیار اٹھاتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔یہ قانون بھی تھا کہ دو آدمیوں میں سے کسی نے پہلے پستول نکالا مگر دوسرے شخص نے اسے پھرتی سے گولی چلا کر ہلاک کر دیا تو یہ حفاظت خود اختیاری کے تحت جرم

نہیں تھا۔ عموماً سچ ہوتے تھے۔برے کو سب برا سمجھتے تھے۔اس زمانے کی ایک مکمل تصویر فلم بین کے سامنے آجاتی ہے۔گویا فلمی کہانیوں کے ذریعے ہم امریکی تاریخ اور ثقافت کا ایک اور عہد دیکھ لیتے ہیں۔

جدید امریکی پس منظر میں بنائی جانے والی فلمیں عام امریکی روزمرہ کی زندگی، ان کے مسائل، ان کے جذبات و احساسات جرائم کے طور طریقوں اور رفتار کی حامل ہوتی تھیں۔امریکی فلموں کی ایک خصوصیت تسلیم کرنی پڑے گی کہ وہ ہماری طرح محض خیالی اور تصوراتی فلمیں بنانے کے کبھی قائل نہیں رہے کہ دراصل معاشرے میں کیا ہو رہا

ہے مگر فلم ساز ایک خیالی تصور فلم بینوں کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ امریکی فلمیں بہت حد تک اپنے معاشرے کی عکاسی کرتی رہی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ معلوماتی اور تعلیمی کوشش بھی قرار دی جاسکتی ہیں۔ ان میں مبالغہ بہت کم ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم پہلی بار یورپ اور امریکا گئے تو بہت سی چیزیں ہمیں مانوس نظر آئیں۔ لوگوں کا طرزِ عمل، رہن سہن، طور طریقے، بول چال کا انداز ہر ایک پہلو سے ہم بہت حد تک واقف تھے۔ مقصد یہ بیان کرتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ فلمیں اس لیے دیکھتے تھے کہ کوئی دوسری تفریح اور سماجی سرگرمی میسر نہ تھی لیکن ان فلموں کے ذریعے وہ بہت کچھ حاصل کر لیا کرتے تھے۔

ہندوستانی اور بعد میں پاکستانی فلموں میں عام طور پر خیالی کردار اور ماحول دکھائے جاتے رہے ہیں کیونکہ تھیٹر کے زمانے سے لوگوں کا جو مزاج بن چکا تھا اس میں اچانک تبدیلی لانا نقصان دہ ہوتا لیکن گانوں اور رومانی کہانیوں سے قطع نظر معاشرتی مسائل کے بارے میں بھی فلمیں بنائی جاتی تھیں جن میں دیکھنے والوں کو اپنے مسائل اور اپنی زندگی کا عکس نظر آجاتا تھا۔ رومانی فلموں میں بھی ماحول اور معاشرے کی قدروں کو پیش کر دیا جاتا تھا۔ پھر ایسی فلمیں بھی بنائی گئیں جو حقیقی زندگی کے مسائل اور واقعات پر مشتمل تھیں۔ ان فلموں کو دیکھ کر تفریح کے علاوہ بہت حد تک معلومات بھی حاصل ہو جاتی تھیں۔

اگر کسی فلم میں حقیقی زندگی سے مکمل اغماض کیا گیا تو وہ پنجابی فلمیں ہیں۔ ان میں جاگیر دار کے مظالم، غریب کی بغاوت اور مٹیاروں کے ناچ گانوں کی آج بھی بھرمار ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان فلموں کے ذریعے جاگیر داری نظام کے گھناؤنے پہلو کو اجاگر کیا گیا اور جاگیر داروں کی صحیح تصویر فلم بینوں کو دیکھنے کو ملی۔ ان فلموں کے ذریعے کچلے ہوئے مظلوم اور غریب مزارع اور عوام کے مسائل بھی سامنے آئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عام لوگوں کو جاگیر داروں اور امیروں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے والا اور انہیں نیچا دکھانے والا ہیرو میسر آگیا جس میں وہ اپنی ناآسودہ خواہشات کی جھلک دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ ان فلموں کے ذریعے لوگوں کو پولیس کے خلاف اپنے دلوں کے غبار نکالنے کا موقع بھی مل گیا۔ ظالم اور متکبر پولیس افسر کو جب وہ فلم میں ہیرو کے

ہاتھوں رسوا ہوتے دیکھتے ہیں تو ان کے دلوں کو سکون مل جاتا ہے لیکن وہ نکتہ بدستور اپنی جگہ قائم ہے کہ ان فلموں میں پیش کی جانے والی چیزوں اور معاشرت کا عام زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

گانے اردو فلموں میں بھی ضروری سمجھے جاتے ہیں اور اچھی خاصی معقول ہیروئن بھی وقتاً فوقتاً ناچتی گاتی نظر آتی ہے لیکن باقی دوسرے واقعات کا بہت حد تک عمومی اور حقیقی زندگی سے تعلق ہوتا ہے۔

انگریزی، اردو اور پنجابی کامیڈی فلمیں ایک علیٰحدہ دلچسپی کی حامل ہوتی تھیں۔ انگریزی میں میوزیکل اور مزاحیہ فلمیں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ یہ سب کچھ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک زمانے میں سنیما لوگوں کی آرزوؤں، امنگوں، حسرتوں اور خواہشوں کی آماجگاہ کیوں بن گیا تھا اور فلم بین تفریح کے علاوہ وہاں جا کر اور کیا کچھ حاصل کر لیا کرتے تھے۔

کراچی اور لاہور میں قیام پاکستان سے پہلے بھی بعض بہت اچھے سنیما گھر موجود تھے جن کا معیار قیام پاکستان کے بعد بھی کافی عرصے تک بہت اچھا رہا۔ پھر جب فلموں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو نئے سنیما گھروں کی تعمیر بھی شروع ہوگئی۔ شہروں کے بیچوں بیچ گنجائش کم تھی پھر نواحی آبادیاں بھی چھوٹے شہروں کی صورت اختیار کر چکی تھیں اس لیے نواحی علاقوں میں بھی بہت اچھے اور معیاری سنیما گھر تعمیر ہوئے۔ اس طرح مقامی آبادی خصوصاً خواتین کو یہ آسانی تھی کہ کچھ عورتیں اکٹھی ہو کر اور بچوں کو سمیٹ کر پیدل ہی سنیما جا سکتی تھیں۔ اس طرح سنیما گھروں کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ ایک وقت کراچی میں 80 کے لگ بھگ تھی۔ ان میں بیشتر بہت آرام دہ اور معیاری سنیما گھر تھے جہاں بہت اچھا ماحول پایا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ خواتین بے خوف و خطر مردوں کے بغیر ہی سنیما دیکھنے چلی جاتی تھیں۔

کراچی میں ایک سنیما ایسا بھی ہے جسے کئی لحاظ سے ایک منفرد اور تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بمبینو سنیما ہے۔ بمبینو سنیما کراچی میں آغا خان سوئم روڈ پر واقع ہے۔ اس کی تعمیر کو لگ بھگ 39 سال (اب پچاس سال) گزر چکے ہیں

مگر یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔ بمبینو سنیما کی ایک اہمیت تو یہ ہے کہ یہ جائے وقوع کے اعتبار سے بہت موزوں جگہ ہے۔ بندر روڈ اور آغا خاں روڈ کے سنگم پر اس کی خوبصورت عمارت آج بھی فخر سے سر اٹھائے کھڑی ہے۔ جن دنوں اس کی تعمیر کا آغاز ہوا، ہم فلمی صنعت سے وابستہ تھے اور کراچی کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ کافی طویل عرصے تک بھی ہمیں کراچی میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار ہم ایک ڈیڑھ ماہ سے زائد عرصہ کراچی میں مقیم رہے۔ چار پانچ دن کا پھیرا تو معمول کی بات تھی۔ کراچی اس زمانے میں نسبتاً ایک صاف ستھرا اور خوبصورت ماڈرن شہر تھا۔ ہم لاہور والوں کے لیے اس کا یہ پہلو دلکش تھا کیونکہ لاہور اس وقت تک قدیم عہد سے باہر نہیں نکلا تھا اور شہر کی شکل وصورت اور رہن سہن کے طریقوں میں زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ لاہور کی کاہل، ست رفتار اور آرام طلب زندگی کے مقابلے میں کراچی کا کاروباری اور تیز رفتار زندگی اور بھاگ دوڑ لاہور والوں کو عجیب سی لگتی تھی۔ چند روز تو ہم کراچی میں اس تبدیلی سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے مگر پھر یہ تیز رفتاری اور بھاگ دوڑ اعصاب پر سوار ہو جاتی تھی اور کراچی کی سڑکوں پر ٹریفک کے ہجوم سے گھبراہٹ سی ہونے لگتی تھی چنانچہ ہمیں لاہور کی یاد ستانے لگتی تھی اور ہم کسی نہ کسی طرح لاہور واپس پہنچ جاتے تھے۔

اس زمانے میں کراچی کے اکثر سنیما گھروں کا معیار اور انتظام لاہور کے سنیماؤں کے مقابلے میں بہتر تھا۔ ماحول بھی عموماً اچھا ہوتا تھا۔ نظم و نسق پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ سفید پتلون قمیص اور کالی ٹائی میں ملبوس اسٹاف فلم بینوں کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا اور انہیں خلاف تہذیب اور خلاف اخلاق حرکتیں کرنے سے منع بھی کر دیتا تھا۔ لاہور میں عموماً یہ دستور نہیں تھا اس لیے لاہور میں فلم بین ہمیشہ مادرِ پدر آزاد اور ہنگامہ آرائی میں مصروف رہے۔ کراچی کی سنیما گھروں میں خاص طور پر بہت اچھی کافی کا ایک بڑا مگ ملتا تھا جسے پینے کے بعد پیٹ اور دل دونوں بھر جاتے تھے۔

''نگار'' کے الیاس بھائی ہمارا کراچی میں ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔ وہی بہت سے لوگوں سے ہمیں ملایا کرتے تھے اور بہت سے لوگوں سے ان کے دفتر میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہی کراچی کے بارے میں ہمیں ہر قسم کی فلمیں خبریں، اسکینڈلز اور دیگر معلومات فراہم کیا کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ انہیں دفتر میں بیٹھے بٹھائے کراچی اور لاہور کے بے شمار

فلم والے ملتے رہتے تھے یا ان سے ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ رکھتے تھے اس طرح تمام خبریں خود چل کر ان تک پہنچ جاتی تھیں۔ اللہ بخشے الیاس صاحب بھی کیا خوب آدمی تھے۔ انتہائی بے ضرر، ہر ایک کے کام آنے والے اس حد تک کہ خدائی فوجدار بن کر کھڑے ہو جاتے تھے۔

''الیاس بھائی، آپ اس میں کیوں ٹانگ اڑاتے ہیں۔ آپ سے اس کا کیا واسطہ ؟''

وہ کہتے'' ارے میاں۔ اب وہ کہہ رہے ہیں تو کیا کروں ؟ اگر کسی کا بھلا ہو جائے تو میرا کیا نقصان ہے ؟''

کراچی کی سر کردہ فلمی ہیروئنوں سے ہماری پہلی ملاقات اور پھر تعلقات میں وسعت الیاس بھائی کے ذریعے ہی ہوئی تھی۔

پہلے تو شمیم آرا سے انہوں نے ہمیں ان کے گھر لے جا کر ملایا۔ ان کے گھر والوں سے ہماری واقفیت اور پھر ہمیشہ کے لیے گھریلو تعلقات الیاس بھائی کے ذریعے ہی ہوئے تھے۔ وہ ناظم آباد میں رہتی تھیں۔ اس زمانے میں بہت سے فلم والے ناظم آباد میں رہا کرتے تھے۔ الیاس بھائی جس سے ملاتے تھے اس کو یہ تو بھروسا ہوتا تھا کہ جو شخص ان کے ساتھ آیا ہے وہ قابلِ اعتماد ہے۔ پھر ہمارے نام سے بھی لوگ واقف تھے۔ اس پر الیاس بھائی کی تعریفیں۔

''ارے بھئی، یہ تو لاہور کی فلم انڈسٹری کے بادشاہ ہیں۔ ان کا حکم کوئی نہیں ٹال سکتا۔ صاف کہہ دیتے ہیں کہ میاں لاہور میں رہنا ہے یا نہیں'' گویا ہم لاہور کے غنڈے تھے۔ بھلا بتایئے کسی شریف صحافی کی تعریف کا یہ کون سا انداز ہے ؟

پھر وہ ہماری بہت ساری تعریف کر کے کہتے'' دیکھو میاں، یہ کراچی کی آرٹسٹ ہیں۔ کراچی والوں کا بھی پاکستان فلم انڈسٹری پر حق ہے۔ وہاں ان کی پبلسٹی کرانا اب تمہارا کام ہے۔ تصویریں میں تمہیں دے دوں گا۔ سارے اخباروں کو دے دینا اور دیکھو، ایسا نہ ہو کہ شائع نہ ہوں۔''

گویا ہم لاہور کے تمام اخباروں اور فلمی رسالوں کے مالک تھے۔ خیر' ہماری سب سے شناسائی تو تھی۔ پاکستان ٹائمز اور امروز کے فلمی شعبوں کے انچارج ہمارے دوست بھی تھے لیکن الیاس صاحب، یہ سب اتنے وثوق سے کہتے تھے کہ ہم پریشان ہو جاتے تھے کہ اگر ان کی فرمائش پوری نہ کی تو لوگ ہمارے بارے میں اور خود الیاس بھائی کے بارے میں کیا سوچیں گے۔

شمیم آرا سے پہلے انہوں نے ہماری ملاقات صوفیہ بانو سے کرائی تھی۔ صوفیہ بانو نے اتفاق سے لاہور آنے کا قصد ہی نہیں کیا ورنہ وہ بھی ہماری ذمے داری بن جاتیں۔

شمیم آرا نے انور کمال پاشا صاحب کی فلم ''انارکلی'' کے لیے لاہور آنے کا ارادہ کیا تو الیاس صاحب نے پھر ہمیں اس سے ملایا اور تاکید کی کہ دیکھو، لاہور میں ان کا خیال رکھنا۔ اس طرح شمیم آرا اور ان کے گھر والوں سے لاہور میں بھی ہمارا واسطہ پڑا۔ ان کی نانی ہمیں فون کر کے بلا لیتی تھیں۔ شمیم آرا پر شدید پابندیاں تھیں مگر پھر ہمارے معاملے میں انہیں کافی آزادی دے دی گئی اور وہ خود بھی ہمیں فون کر لیا کرتی تھیں۔ لاہور میں شمیم آرا کے شب و روز اور فلمی سفر کے ہر مرحلے کے ہم شاہد بھی ہیں اور بعض معاملات میں خود ان کا حصہ بھی رہے ہیں۔

ایک دن الیاس بھائی نے پوچھا'' میاں آج رات کا کیا پروگرام ہے؟ ''

ہمیں بہت حیرت ہوئی کیونکہ کراچی میں قیام کے دوران میں ہمارا ہر پروگرام الیاس بھائی سے جڑا رہتا تھا۔

''سنو کوئلے کے دھاگے والے کباب کھاؤ گے؟''

ہم نے فوراً ہامی بھر لی۔ الیاس بھائی نے فلمی چٹخاروں کے علاوہ ہمیں زبان کا چٹخارہ بھی لگا دیا تھا۔ کراچی کے ہر مشہور اور قابل ذکر ریستوران کی خصوصی ڈش ہم نے ان ہی کے ذریعے چکھی تھی۔ یہاں تک کہ زندگی میں پہلی بار چائنیز سوپ اور پھر چائنیز کھانا بھی ہمیں الیاس بھائی نے ہی کھلایا تھا۔ طفیل احمد جمالی اور ابراہیم جلیس بھی ساتھ تھے جب وہ ہمیں مسجد خضرا کے پاس والے چائنیز ریستوران میں لے گئے۔

ان وقت سارے کراچی میں تین ہی چائنیز ریستوران تھے۔ ہم نے تو پہلے کبھی سنا ہی نہیں تھا کہ پاکستان میں چائنیز کھانوں کے ریستوران بھی ہیں حالانکہ بعد میں معلوم ہوا کہ بیڈن روڈ اور ہال روڈ کے درمیان میں ایک کچے راستے پر نالے کے سامنے واحد چائنیز ریستوران واقع تھا جو ایک چینی خاتون چلاتی تھیں۔ بعد میں مال روڈ پر بھی ایک ریستوران بن گیا تھا۔

الیاس بھائی اس وقت صرف چائنیز سوپ کے شوقین تھے۔ جاتے ہی انہوں نے ایک سوپ اور آٹھ سلائس کا آرڈر دے دیا۔ مکھن کے ساتھ۔

ہم نے پوچھا" الیاس بھائی۔ ایک سوپ اور ہم چار پینے والے؟ "

بولے " اماں' تم نہیں جانتے، بڑے پیالے میں اتنا سوپ ہوتا ہے کہ ہم چاروں کے لیے کافی ہوگا۔ اور یہ سوپ پیا نہیں جاتا کھایا جاتا ہے۔"

کچھ دیر بعد واقعی ایک بہت بڑا چینی کا پیالہ چکن کارن سوپ سے لبالب بھرا ہوا سامنے آگیا۔ شاید اسی لیے آج بھی چکن کارن سوپ ہی ہماری واحد پسند ہے۔ پیالے میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ویٹر نے چار چھوٹے پیالے اور چینی کے عجیب شکل والے چمچے بھی لاکر رکھ دیے۔

ہم نے ہاتھ آگے بڑھایا تو الیاس بھائی نے روک دیا" اماں صبر کرو۔ یہ بہت گرم ہوتا ہے۔ ہم سب بے خبری میں اپنی زبان جلا چکے ہیں۔ ابھی چولہے پر سے پکتا ہوا آیا ہے۔ "

کچھ دیر بعد سلائس اور مکھن بھی آگیا۔ ہم لوگ ایک چمچہ سوپ لیتے اور سلائس کتر کر کھا لیتے۔ اس سے سب کا پیٹ بھر گیا۔

ہم نے پوچھا" الیاس بھائی۔ کیا چائنیز صرف سوپ ہی کھاتے ہیں، ان کے ہاں کوئی اور کھانا نہیں ہوتا؟"

کہنے لگے ” بھئی ' باقی سب الابلا ہوتی ہے۔نہ جانے کیا پکاتے ہیں۔سنا ہے سخت بدمزہ ہوتا ہے، تمہیں سوپ کیسا لگا؟ “

ہم نے اخلاقاً کہہ دیا” اچھا ہے۔“

بولے” شروع میں اچھا نہیں لگتا بعد میں مزہ پڑ جاتا ہے۔ویسے صرف سوپ ہی یہاں کام کی چیز ہے، باقی سب بے کار ہے۔ “

لیجئے گولے کے کبابوں سے بات چائنیز سوپ تک پہنچ گئی۔

الیاس بھائی نے ایک چلتا ہوا رکشہ پکڑا اور ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے۔راستے بھر وہ ولی والے کباب کی تعریف کرتے رہے تھے کہ کس غضب کے کباب بناتا ہے۔

ایک چھوٹی دکان کے سامنے چند کرسیاں اور بینچیں پڑی تھیں مگر خریداروں اور کھانے والوں کا ہجوم تھا۔دکاندار الیاس بھائی کو پہچانتا تھا۔انہوں نے انگلیوں کے اشارے سے بتایا کہ دو آدمیوں کے لیے کباب بھیج دو۔اس نے سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد کباب اور نان آ گئے۔واقعی، مزیدار تھے مگر مرچیں اس غضب کی تھیں کہ ناک اور آنکھ سے پانی کی جھڑی لگ گئی۔

”میاں' رومال نکالو رومال، اس کے بغیر یہ کباب نہیں کھا سکتے۔ “

ہم نے جیب سے رومال نکال کر آنسو اور ناک کا پانی صاف کیا۔اس کے بعد یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا۔کھاتے بھی جاتے تھے، روتے بھی جاتے، بعد میں چائے منگائی گئی۔چھوٹی سی پیالی میں آدھی پیالی چائے تھی۔کراچی کا یہ دستور ہمیں معلوم ہو چکا تھا۔

بل ادا کرنے کے بعد الیاس بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔ " آؤ' آج تمہیں چیکو سے ملاتے ہیں۔ "

چیکو کراچی کی فلموں میں نئی نئی آئی تھیں۔ بعد میں ان کا نام رخسانہ ہو گیا تھا مگر لاہور آنے کے بعد' بہت سی فلموں میں ہیروئن اور دیگر اہم کردار کیے۔ پھر شادی کر کے انگلستان چلی گئی تھیں۔

اس زمانے میں ریوالی سنیما نیا نیا بنا تھا اور قابل دید سنیما تھا۔ اس کے مالک سے بھی بعد میں ہماری دوستی ہو گئی تھی۔ غالباً ابو سیٹھ یا اسی قسم کا نام تھا۔ جوان آدمی تھے اور بہت دلچسپ، اقبال شہزاد سے بھی ان کی دوستی تھی۔ وہ اداکار بہار کے خالو بھی تھے۔

ریوالی سنیما کے برابر والی سڑک (جسے کراچی والے گلی کہتے تھے) پر بائیں جانب پرانے فلیٹ تھے ان میں سے ایک فلیٹ کی نچلی منزل کے ایک یا دو کمروں میں چیکو رہتی تھیں۔ ابھی نو وارد تھیں۔ ویسے بھی کام اور معاوضہ اس وقت کم ہی ملتا تھا۔

الیاس صاحب نے دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی " کھولو بھئی "!

" کون ہے؟ " اندر سے زنانہ آواز آئی۔

دروازہ فوراً کھل گیا۔ " آیئے " " السلام صاحب! " ان کی والدہ نے سلام کیا پھر چیکو نمودار ہوئیں۔ چھوٹے قد کی صحت مند، انتہائی سیماب صفت اور خوش شکل اداکارہ تھیں۔

" السلام و علیکم الیاس بھائی! " انہوں نے سلام کیا۔ الیاس صاحب کو ہیروئنوں کا الیاس بھائی کہنا قطعی برا نہیں لگتا تھا، وہ جگت بھائی تھے۔ کراچی میں تو الیاس بھائی کا طوطی بولتا تھا اس لئے بہت سی شوقین لڑکیاں انکی مدد سے ہی ملک کی صف اول کی ہیروئیں بن پائیں۔ شریف اور مرنجان مرنج انسان تھے۔ ویکلی نگار کے مالک تھے اس لئے نگار خانوں میں ان کا ادب لحاظ بہت تھا۔

"یہ دیکھو کون ہیں ؟" انہوں نے اس طرح کہا جیسے کوئی عجوبہ دکھا رہے ہوں۔" یہ آفاقی صاحب ہیں، لاہور سے آئے ہیں۔ بہت بڑے صحافی ہیں۔ تم جب لاہور جاؤ گی تو یہی تمہارے کام آئیں گے۔ ان کے کہے بغیر اسٹوڈیو میں داخلہ ہی نہیں ملتا۔"

چیکو جھٹ بولیں" آفاقی صاحب" آپ مجھے داخلے کا پاس دے دیں گے نا؟"

الیاس صاحب بول پڑے" دے دیں گے' دے دیں گے، اب تم ان کی خاطر تو کرو۔"

ان کی والدہ نے اپنے بیٹے محسن کو بھیج کر فوراً دو بوتلیں منگوائیں۔ پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ یہ سارا خاندان انتہائی باتونی تھا۔ سب بیک وقت یکے بعد دیگرے بولتے تھے اور بولتے ہی رہتے تھے۔ مگر بہت دلچسپ، سادے اور مخلص لوگ تھے۔ وہ بھی عجب دور تھا اور لوگ بھی عجیب ہی تھے۔ اب نہ وہ زمانہ رہا نہ ایسے۔ اس طرح چیکو سے ہماری پہلی ملاقات کراچی میں الیاس بھائی نے کرائی اور مراسم کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

زیبا سے بھی پہلی بار ہمیں کراچی میں الیاس بھائی نے ہی ملایا تھا۔ وہ فضل احمد کریم فضلی صاحب کی فلم" چراغ جلتا رہا" میں کام کر چکی تھیں۔ یہ فلم کراچی میں تو اچھی خاصی چل گئی مگر لاہور میں بالکل فلاپ ہو گئی تھی۔

الیاس صاحب ایک شام دفتر میں کہنے لگے" میاں، آج رات کو کھانا وہاں ہے۔"

"کہاں؟" ہم نے پوچھا۔

"ارے بھئی وہیں، زیبا کے گھر۔"

زیبا کی تصویریں ہم نے دیکھی تھیں۔ فلم کے بارے میں بھی تبصرے پڑھے تھے مگر بدقسمتی سے ان کی فلم نہیں دیکھی تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ زیبا کی پہلی فلم زیادہ کامیاب نہیں تھی مگر ان کی خوبصورتی کے چرچے ہر طرف ہو رہے تھے۔

ہم نے پوچھا'' وہاں کوئی تقریب ہے؟''

''یار، عجیب بات کرتے ہو۔ کیا تقریب کے بغیر کہیں کھانا نہیں کھا سکتے؟ آج انہوں نے کھانے پہ بلایا ہے۔''

''مگر آپ کو بلایا ہے۔ ہمیں تو نہیں بلایا۔''

انہوں نے ہمیں گھور کر دیکھا'' بھئی، تم ہمارے ساتھ چلو گے۔ جمالی صاحب اور ابراہیم جلیس بھی چلیں گے۔ جب انسان کسی کو بلاتا ہے تو ساتھ والوں کی بھی گنجائش رکھتا ہے اور تم کون سی پوری دیگ کھا جاؤ گے۔''

چلئے تصفیہ ہو گیا۔

زیبا بھی ان دنوں ناظم آباد میں ایک گھر کے بالائی حصے میں رہتی تھیں۔

الیاس بھائی نے دفتر سے نکل کر پہلے ایک رکشا والے کو پکارا'' اے میاں رکشہ ''!

وہ رک گیا تو انہوں نے بازو پکڑ کر ہمیں اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ رکشا والے سے کہا'' چلو۔''

''کدھر؟''

''ناظم آباد۔ صبر کرو، پتا بھی بتا دیں گے۔''

وہ چل پڑا۔

ہم نے کہا" مگر جمالی صاحب اور جلیس صاحب تو وہیں رک گئے۔"

"اماں وہ بچے نہیں ہیں۔ کراچی والے ہیں۔ سارے پتے نشان جانتے ہیں۔ وہ دوسرے رکشا میں آجائیں گے۔"

ہمارا رکشا پہلے پہنچ گیا۔ الیاس صاحب نے بھی راستے سے کباب وغیرہ خرید لیے تھے، بولے" خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا۔"

وہ تو رکشا سے اترتے ہی سیڑھیاں چڑھنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر ہم نے روک دیا" ان دونوں کو تو آلینے دیں۔"

"بھئی وہ بھی آجائیں گے، بچے تو نہیں ہیں کہ کھو جائیں گے۔'

اتنی دیر میں دوسرا رکشا بھی آگیا۔ ہم سب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے جہاں زیبا کی والدہ لالی جی نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔

"بیٹھئے، زیبا ابھی آجاتی ہے۔"

"بناؤ سنگھار کر رہی ہو گی؟" جمالی صاحب نے کہا۔

لالی جی ہنس پڑیں" یہ آپ خود ہی اس سے پوچھ لینا۔"

فوراً ہی زیبا بھی برآمد ہو گئیں۔ مسکرا کر سب سے علیک سلیک کی۔ ہمیں ذرا غور سے دیکھا۔

"ارے بھئی، یہ آفاقی ہیں۔ انہیں نہیں جانتیں، لاہور کے بہت بڑے صحافی ہیں۔ تم لاہور جاؤ گی تو پتا چلے گا۔"

زیبا نازک، خوبصورت، خوش لباس اور خوش مزاج لگیں۔ شمیم آرا کے مقابلے میں وہ زیادہ بے تکلف اور ہنس مکھ نظر آئیں۔ جلیس صاحب اور جمالی صاحب سے ان کی بے تکلفی تھی اس لیے فقرے بازی کا سلسلہ بھی رہا۔ ان کی

حاضر جوابی اور بذلہ سنجی ہمیں بہت اچھی لگی۔ شمیم آرا پر نانی اماں کی کڑی نظر اور نگرانی تھی اس کے مقابلے میں لالی جی نے زیبا کو بولنے چالنے کی آزادی دے رکھی تھی اس لیے پہلی ملاقات ہی میں لطیفے بازی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

کھانا بہت مزے دار تھا۔ ''بہت مزے دار کھانا ہے۔ آپ نے پکایا ہے؟'' ہم نے زیبا سے پوچھا۔

''جی نہیں۔ میں جھوٹ نہیں بولتی۔ ویسے میں بہت اچھا کھانا پکاتی ہوں۔''

کافی دیر تک چائے اور باتوں کا سلسلہ جاری رہا پھر زیبا نے اصرار کیا کہ وہ ہم سب کو کراچی کی مشہور آئس کریم کھلائیں گی۔ یہاں کس کو انکار تھا۔ ان کی گاڑی میں ہم سب سوار ہو گئے۔ انہوں نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ ہم کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لالی جی نے ساتھ چلنے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔ ہم نے یہ پہلی فلمی ہیروئن کی ماں دیکھی تھی جو ہر طرح محفل میں بھی شریک تھی اور روایتی ماں باپ وغیرہ سے بالکل مختلف تھی۔

راستے بھر باتیں اور لطیفے جاری رہے۔ سندھی مسلم سوسائٹی کے چوک میں آئس کریم کی دکان پر زیبا نے کار کھڑی کر دی۔ پلیٹوں میں ڈبل روٹی کے سلائس نما آئس کریم آ گئی۔ واقعی بہت مزے دار تھی۔ زیبا نے بتایا کہ ایکسلیسئر ہوٹل کے نیچے بھی بہت اچھی آئس کریم ملتی ہے۔ کھانی ہے؟

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ سب نے یہ پروگرام آئندہ کے لیے ملتوی کر دیا۔ بعد میں زیبا نے ہمیں وہاں لے جا کر بھی آئس کریم کھلائی۔ واقعی بہت مزے دار تھی یا شاید ہمیں ہر قسم کی آئس کریم اچھی لگتی ہے۔

وہ ہماری زیبا سے پہلی ملاقات تھی جو کافی دیر جاری رہی اور یوں لگا جیسے پرانی ملاقات ہے۔ باتیں، گپ شپ، ہنسی مذاق، لطیفے، فقرے بازی چلتی رہی۔ زیبا کھلے دل کی صاف گو اداکارہ ہیں۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر آ جاتا ہے۔ لگی لپٹی رکھنے یا منافقت سے بات کرنے کی قائل نہیں ہیں۔ جہاں بولنا مناسب نہ ہو، خاموش رہتی ہیں مگر چہرے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات یا یہ شخص انہیں ناپسند ہے۔

زیبا کی طرح ان کی والدہ لالی جی بھی ہمیں بہت اچھی لگیں۔ وہ بھی بناوٹ سے پاک اور صاف گو سادہ سی خاتون تھیں۔ ہر مذاق میں شامل۔ خاصی بلکہ بہت زیادہ لبرل قسم کی فلمی ماں تھیں ۔

زیبا نے ہم سے لاہور کی فلمی دنیا کے بارے میں بہت سوالات کیے۔ ان کا زیادہ زور شمیم آرا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر تھا۔ ان کی باتوں سے ہم نے اندازہ لگالیا کہ وہ شمیم آرا کو پسند نہیں کرتیں اور انہیں اپنی سب سے بڑی حریف سمجھتی ہیں اس لیے بہت کرید کرید کر شمیم آرا کے بارے میں پوچھتی رہیں۔

"کیا وہ لاہور میں کامیاب ہوں گی؟" انہوں نے پوچھا۔

"یہ تو اللہ ہی جانتا ہے" ہم نے کہا" اچھا کام کریں گی تو کیوں نہ کامیاب ہوں گی۔"

"شمیم آرا کا ہیروئن بن جانا بھی عجیب سی بات ہے۔ اتنی معمولی صورت ہے، باریک آواز۔ وہ لاہور کی ہیروئنوں کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہیں؟"

ہم خاموش رہے۔ الیاس بھائی نے بھی اشارہ کیا کہ بس سنتے رہو۔

واپسی پر جب وہ ہمیں ہوٹل چھوڑنے آئے تو کہنے لگے" یہ شمیم آرا سے جلتی ہے حالانکہ ہر ایک کی اپنی جگہ ہوتی ہے۔ شمیم آرا کی تعریف تم نے کی تو زیبا کو پسند نہیں آئی۔ "

ہم نے کہا" الیاس بھائی، یہ تو ممکن نہیں ہے کہ پہلے ہر ایک کی پسند اور ناپسند معلوم کریں اور پھر بات کی جائے۔ "

وہ ہنس کر چپ ہو گئے۔

ہم نے یہ بات نوٹ کی کہ شمیم آرا نے کبھی ہم سے زیبا کے بارے میں بات نہیں کی نہ کریدا۔ یہ ان کی کشادہ دلی تھی یا مصلحت اور ڈپلومیسی؟ اللہ جانے۔

سینما گھروں سے الیاس بھائی اور پھر کراچی کی ہیروئنوں کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ بمبینو سینما کی بات درمیان ہی میں رہ گئی۔

الیاس بھائی نے بندر روڈ سے گزرتے ہوئے ہمیں بتایا تھا کہ اس جگہ نیا سینما بن رہا ہے، بمبینو۔ ہمیں یہ نام کچھ عجیب سا لگا۔ بمبینو مکمل ہوا تو کراچی میں اس کی دھوم مچ گئی۔ بہت شاندار سینما تھا جس میں نو سو کے قریب سیٹیں تھیں۔ اس لحاظ سے بھی یہ بہت بڑا سینما تھا۔ الیاس بھائی نے ہمیں پہلے تو سینما دکھایا پھر سینما کے منیجر سے ملایا۔

جاوید ہاشمی صاحب اس کے منیجر تھے۔ ان کا فلمی دنیا سے بھی تعلق تھا۔ ہدایت کار تھے۔ معروف مشہور کیمرا مین سہیل ہاشمی کے بڑے بھائی تھے۔ بہت دلچسپ اور باتونی آدمی تھے۔ معلوم ہوا کہ سینما کے مالک حاکم علی زرداری ہیں۔ زمیندار ہیں۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ آصف علی زرداری کے والد ہیں اور پھر بے نظیر بھٹو کے سسر اور بھٹو فیملی کے سمدھی بن گئے۔ اس زمانے میں انہیں سیاست سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ ایک بار جاوید ہاشمی صاحب نے ہمیں ان سے ملایا۔ وہ اپنے کمرے میں سفید کرتہ اور شلوار پہنے بیٹھے تھے۔ خوش مزاج اور با اخلاق لگے۔ دیر تک فلموں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس لحاظ سے بھی بمبینو سینما کو انفرادیت حاصل ہے۔

بمبینو کے اوپر ایک چھوٹا سا سینما" اسکالا" کے نام سے بھی انہوں نے بنایا تھا۔ یہاں عموماً انگریزی فلمیں چلائی جاتی تھیں۔ بمبینو میں نذر الاسلام صاحب اور رؤف شمسی کی فلم" آئینہ " بہت طویل عرصہ تک چلتی رہی۔ بعد میں یہ اسکالا میں منتقل کر دی گئی تھی" آئینہ " مسلسل گیارہ ماہ یا ایک سال تک بمبینو اور اسکالا میں نمائش پذیر رہی۔ اس لحاظ سے یہ پاکستان میں سب سے زیادہ عرصے چلنے والی پاکستانی فلم ہے۔

بمبینو سینما آصف علی زرداری کے والد حاکم علی زرداری صاحب نے بڑی شوق سے بنوایا تھا۔ بہت خوبصورت اور شاندار سینما تھا۔ اس میں فلمیں بھی منتخب ہی چلا کرتی تھیں۔ اسکا نام بھی عجیب تھا لیکن کام بھی نرالا اور متاثر کن تھا

۔اسکے نام میں دلکشی ہی کافی تھی جو تماشائیوں کو اپنی جانب کھینچ لایا کرتی تھی۔اس سینما کی بدولت حاکم علی زرداری کا فلمی ستاروں سے بھی واسطہ رہتا تھا۔اس سینمانے انکے کاروبار کو پھلنے پھولنے میں کافی مدد دی۔

سینما کے عقب میں دفاتر تھے۔یہیں رؤف شمسی صاحب نے بھی اپنا دفتر بنایا تھا۔ بعد میں یہ سینما انہوں نے خرید لیا۔ کافی عرصے تک وہ اوران کے چھوٹے بھائی احمد شمسی اس سینما کو چلاتے رہے۔ان کا دفتر بدستور عقبی عمارت میں تھا۔ہم یہاں رؤف شمسی اور احمد شمسی صاحب سے ملتے رہے ہیں۔رؤف شمسی صاحب سے اتنے گہرے مراسم ہو گئے تھے کہ وہ ہمیں اپنے گھر میں ٹھہرایا کرتے تھے۔اب نہ رؤف شمسی رہے نہ احمد شمسی۔

انہوں نے بمبینو سینما شیخ امتیاز صاحب کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔آج کل ان کے صاحب زادے یہ سینما چلاتے ہیں۔شمسی صاحب نے شاہراہ فیصل پر مہران ہوٹل کے نزدیک بلکہ برابر ایک شاندار کئی منزلہ عمارت کاشف سینٹر بنالی تھی اور اپنے تمام دفاتر اس عمارت میں منتقل کر لیے تھے۔یہاں بھی ہماری شمسی صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی احمد شمسی صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔اسی کاشف سینٹر میں ہمارے دوست امجد شیخ کے دفاتر بھی تھے۔شاید اب بھی ہیں۔

بمبینو سینما میں بہت اچھی فلموں کی نمائش ہوا کرتی تھی۔زیادہ تر انگریزی فلمیں یہاں پیش کی جاتی تھیں۔غالباً یہاں جو پہلی فلم نمائش پذیر ہوئی وہ ہالی ووڈ کی مشہور فلم ''ساؤتھ پیسیفک'' تھی۔ہالی ووڈ کی مشہور زمانہ فلم ''کلوپیٹرا'' کی نمائش بھی اسی سینما میں ہوئی تھی۔فلم کی ہیروئن الزبتھ ٹیلر تھیں جنہیں دیکھنے کے لیے ایک خلقت ٹوٹی پڑتی تھی۔ خصوصاً نوجوان نسل ان کی شیدائی تھی۔یہ فلم اس حوالے سے بھی بہت مشہور ہوئی کہ اس کے ہیرو رچرڈ برٹن سے اس فلم کی تکمیل کے دوران میں الزبتھ ٹیلر کی محبت کا آغاز ہوا۔وہ اس وقت شادی شدہ تھیں مگر بعد میں طلاق حاصل کر کے انہوں نے رچرڈ برٹن سے شادی کر لی تھی۔ان سے بھی طلاق ہو گئی مگر دوبارہ شادی ہوئی۔یہ بھی پائیدار ثابت نہ ہوئی۔کہتے ہیں کہ الزبتھ ٹیلر نے کئی شادیاں کیں۔کئی عشق کیے مگر انہیں حقیقی محبت رچرڈ برٹن سے ہی تھی۔ رچرڈ برٹن نے کلوپیٹرا میں مارک انتھونی کا کردار ادا کیا تھا۔

''لارنس آف عریبیا'' جیسی یادگار فلم کی بھی اس سینما میں نمائش ہوئی تھی۔ اردو فلموں میں '' آئینہ'' نے اس سینما میں طویل ترین عرصے تک نمائش کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ یہ ندیم اور شبنم کی یاردگار فلموں میں شامل ہے۔اس کی موسیقی روبن گھوش نے بنائی تھی جو آج بھی سب کو یاد ہے۔عالمگیر کا گایا ہوا نغمہ '' مجھے دل سے نہ بھلانا'' آج بھی دلوں میں گونجتا ہے۔اس فلم کے سبھی گانے مقبول ہوئے تھے۔

ہالی ووڈ کی فلم چنگیز خان کی نمائش بھی اسی سینما میں ہوئی تھی۔

جب شیخ مختار کی فلم '' نور جہاں'' پاکستان میں آئی تو فلمی دنیا میں اودھم مچ گیا۔ صدر ضیاءالحق نے اس فلم کی درآمد کے لیے خصوصی طور پر اجازت دی تھی۔اس کے بعد یہ تاثر عام ہو گیا تھا کہ اب بھارتی فلموں کی نمائش پر سے پابندی ختم ہو جائے گی اور پرانی بھارتی فلمیں بھی پاکستان میں چلائی جائیں گی۔ نخشب صاحب کی فلم '' زندگی یا طوفان'' کی درآمد کے بعد بھی یہ تاثر عام ہو گیا تھا۔

پاکستان کی فلمی صنعت '' نور جہاں'' کی نمائش کے بعد ٹھپ ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ تقسیم کاروں اور سینما والوں نے پاکستانی فلمیں اس امید پر خریدنی اور چلانی بند کر دی تھیں کہ بھارتی فلموں کا سیلاب آنے والا ہے۔اسٹوڈیو میں کام رک گیا۔ پاکستانی فلم ساز فکر منداور بے کار ہو گئے۔ ہم نے بھی اس زمانے میں ان حالات کی پیش نظر انگلستان اور پھر امریکا اور کینیڈا کا رخ کیا تھا۔ پاکستانی تقسیم کاروں اور نمائش کاروں کے ایک بڑے طبقے کا ہمیشہ یہی طرزِ عمل رہا ہے کہ وہ ہمیشہ بھارتی فلموں کی درآمد کے لیے شور مچاتے رہے اور جب مقامی فلمی صنعت کے نمائندوں نے حکومت سے مطالبہ کیا اور نوبت ہنگاموں، جلوسوں اور احتجاج تک پہنچ گئی پھر بھی مغربی اور مشرقی پاکستان کے سرکردہ تقسیم کاروں کی یہی کوشش تھی کہ بھارت سے فلموں کی درآمد کا سلسلہ ختم نہ ہو۔

اس سلسلے میں ان کے پاس بہت سے اعتراضات اور دلائل تھے، مثلاً۔۔۔

بھاری فلموں کی درآمد پر پابندی لگنے سے مقامی سینما گھروں میں الو بولنے لگے گا کیونکہ بیشتر سینما گھروں میں بھارتی فلمیں ہی چلتی رہتی ہیں۔اس طرح سینما گھر ویران اور ان سے وابستہ بے شمار لوگ بے روزگار ہو جائیں گے۔

حقیقت یہ تھی کہ بھارتی فلمیں واقعی اس زمانے میں زیادہ تر سینما گھروں میں چلائی جاتی تھیں کیونکہ قیام پاکستان سے پہلے سے ان کی درآمد کا سلسلہ جاری تھا۔ نئی بھارتی فلمیں آتی رہتی تھیں اور پرانی بھارتی فلموں کی نمائش بھی جاری رہتی تھی۔ مگر اس زمانے میں انگریزی فلمیں بھی بہت بڑی تعداد میں آیا کرتی تھیں اور بہت مقبول تھیں۔ہالی ووڈ کے سبھی بڑے فلم ساز اداروں کے تقسیم کاری کے دفاتر پاکستان میں موجود تھے۔یہ درست ہے کہ پاکستانی فلمیں کی کھلی درآمد کے ہوتے ہوئے ان کی تعداد اور معیاری میں اضافہ ممکن نہ تھا۔ بھارت کے بڑے بڑے نامور اور مقبول فنکاروں، ہدایت کاروں اور موسیقاروں کی فلموں کے مقابلے میں پاکستانی فن کار اتنے زیادہ مقبول نہیں ہوئے تھے۔فلمیں بنتی ہی بہت کم تھیں۔ پھر بھارت کی بڑے سرمائے سے بنائی جانے والی فلموں کے مقابلے میں ان کا معیار بھی کم تھا اور اس میں اضافہ بھی ممکن نہ تھا کیونکہ سرمایہ نہیں تھا اور تقسیم کار یا تو مقامی فلمیں خریدتے ہی نہ تھے یا پھر ان کی بہت کم قیمت ادا کرتے تھے جس کی وجہ سے برائے نام سرمائے سے فلمیں بنائی جاتی تھیں۔یوں سمجھ لیجئے کہ اس زمانے میں (یہ 60ء کی دہائی کا قصہ ہے) جتنا معاوضہ ایک بھارتی سپر اسٹار وصول کرتا تھا، اتنی رقم میں یہاں فلم بن جاتی تھی۔ زیادہ سرمایہ اول تو دستیاب نہ تھا دوسرے تقسیم کار اور سینما والے انہیں اونے پونے دام ادا کرتے تھے۔

بہرحال ، یہ ایک علیٰحدہ داستان ہے جو پہلے سنائی جا چکی ہے۔بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندی عائد ہونے کے بعد ہی پاکستان میں اچانک فلم سازی کی رفتار اور معیار میں نمایاں اضافہ ہو گیا تھا۔اس کے باوجود بعض سینما والے پاکستانی فلموں پر انگریزی فلموں کو ترجیح دیتے تھے حالانکہ قانون کے مطابق خالص انگریزی فلمیں چلانے والے سینما گھروں کے لیے بھی سال میں 30 فیصد پاکستانی فلموں کی نمائش لازمی تھی مگر قانون کو یہاں کون پوچھتا ہے۔ہمیشہ سے جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ رہا ہے۔ لیکن مجبوراً مقامی فلموں پر جب اکتفا کرنا پڑا اور ان کا معیار بھی بہتر ہوا تو پھر

سینما گھروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا۔ان کے کرائے بھی بڑھ گئے اور تقسیم کاروں نے بھی دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنی شروع کر دی۔ جس فلم ساز نے اچھے دنوں کی آس پر تحریک چلائی تھی اس کے حصے میں بہت کم منافع آیا۔

کراچی اور لاہور میں بہت سے نئے سینما گھر تعمیر ہوئے جو دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ فلم بینوں کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا۔ بمبینو بھی ایسے ہی بہت بلند معیار اور شاندار سینما گھروں میں شامل تھے۔

اس سینما میں انگریزی اور اردو کی بہت اعلیٰ معیاری فلموں کی نمائش ہوا کرتی تھی۔اس زمانے میں کسی سینما گھر میں ریلیز ہونے والی فلم کے معیار کا اندزہ سینما گھر سے بھی لگایا جاتا تھا کیونکہ فلم بین جانتے تھے کہ اچھے سینما والے ہمیشہ اعلیٰ معیاری فلمیں ہی نمائش کے لیے پیش کرتے ہیں۔

ہماری بمبینو سینما میں اضافی دلکشی اور دلچسپی یہ تھی کہ اس کے منیجر جاوید ہاشمی ہمارے گہرے دوست تھے۔ وہ ہدایت کار بھی تھے۔ فلمی دنیا میں وہ اور ان کے کیمرا مین بھائی سہیل ہاشمی بہت مقبول تھے۔ ہر ایک سے ان کے تعلقات تھے۔ ہم کراچی جاتے تو جاوید صاحب سے بھی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ بعد میں جب ہم کینیڈا گئے تو ٹورنٹو میں ان سے ملاقات ہو گئی۔ وہاں بھی وہ سینما منیجر تھے بلکہ بیک وقت تین سینماؤں کے منیجر تھے۔ چنانچہ ٹورنٹو میں بھی ان کے سینما اور ان کے گھر پر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ کھلانے کے بہت شوقین تھے۔ خود بھی خوش خوراک تھے اور ان کی بیگم بے حد مزے دار کھانے پکاتی تھیں۔ کچھ عرصہ قبل جاوید ہاشمی کا انتقال ہو چکا ہے۔

بمبینو سینما میں جاوید صاحب نے سینما کے مالک حاکم زرداری صاحب سے ہمیں ملایا تو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کسی زمانے میں یہ پاکستانی سیاست اور حکومت کے اہم ترین ستون بن جائیں گے۔ان کے بیٹے آصف علی زرداری کی بے نظیر بھٹو سے شادی کے بعد ان خاندان کے دن بھی بدل گئے اور وہ حکمرانوں میں شامل ہو گئے۔ خود حاکم علی زرداری

صاحب بھی انتخاب میں کامیاب ہو کر سینیٹر اور پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیئرمین اور دوسرے اہم عہدوں پر فائز رہے پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا بیٹا بے نظیر بھٹو کا شوہر تھا اور وہ اپنے شوہر کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔

زمانہ بھی کیسے کیسے روپ بدلتا ہے۔ بمبینو کے خوبصورت دفتر میں وہ سفید لباس میں ملبوس باتیں کرتے رہے۔ پھر باہر تک چھوڑنے آئے۔ یہ ہماری ان سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ کون جانتا تھا کسی وقت وہ پاکستان کے طاقتور ترین افراد میں شامل ہوں گے۔ ہم نے تو انہیں ایک فلم والے یعنی سینما گھر کے مالک کی حیثیت سے ہی جانا اور ہمیشہ ان کا وہی روپ ہمیں یاد رہا۔

بمبینو کو رؤف شمسی صاحب نے خرید لیا تھا اور کافی عرصے یہ سینما ان کی ملکیت میں رہا۔اس کے بعد رؤف شمسی اس کے مالک بن گئے۔ جب انہوں نے اپنی فلمی سرگرمیاں ختم کر دیں تو سینما بھی فروخت کر دیا۔اب اس کے مالک شیخ امتیاز صاحب کے صاحبزادے ہیں۔اب اس کے جنرل منیجر منظور جیلانی ہیں۔ان سے ہماری کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ دراصل جب سے کراچی آمد و رفت اور فلم بینی کا سلسلہ کم ہوا ہے کراچی کے فلم اور سینما والوں سے ملاقات نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ الیاس بھائی کی عدم موجودگی میں وہ محفلیں اور ملاقاتیں بھی باقی نہیں رہیں۔

جاوید ہاشمی صاحب 70ء کی دہائی میں ہی کینیڈا چلے گئے تھے۔ان کی جگہ ان کے کزن مظفر ہاشمی اس کے منیجر ہو گئے تھے۔ مظفر ہاشمی سے بھی ہماری ملاقات ہوتی رہتی تھی مگر جاوید صاحب جیسی بے تکلفی نہ تھی۔ مظفر ہاشمی کچھ عرصے بعد نیف ڈیک کے چیئرمین بن گئے تھے۔ بھٹو خاندان نے ہاشمی خاندانی سے اپنے مراسم نبھاتے ہوئے انہیں یہ عہدہ دیا تھا۔

بمبینو کراچی کا مقبول ترین سینما رہا۔جب پنجابی فلموں کے ایک طویل دور کے بعد اردو فلموں کا زور شروع ہوا تو یہاں پھر اردو فلموں کی نمائش کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ شمیم آرا کی فلم ''منڈا بگڑا جائے'' اس سینما میں نمائش کے لیے پیش

کی گئی تھی اور بے حد مقبول ہوئی تھی۔ پاکستانی اسکرین کے ممتاز ترین فن کاروں کی فلمیں اس سینما میں نمائش پذیر ہوتی رہی ہیں۔

ایک قابل ذکر اور دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ 1992ء میں بمبینو میں ایک انگریزی فلم چل رہی تھی۔ انٹرویل میں کسی کی نظر پڑی کہ ایک کرسی کے نیچے ٹائم بم رکھا ہوا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ بے تحاشا بھاگ کھڑے ہوئے۔ پولیس کو اطلاع دی گئی اور بم ڈسپوزل اسکواڈ کا عملہ بھاگم بھاگ بمبینو پہنچا مگر ان کی آمد سے پہلے ٹائم بم کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور سینما کی عمارت کو شدید نقصان پہنچا۔ آتش زدگی سے فرنیچر تباہ ہو گیا۔ لاکھوں کا نقصان ہوا مگر کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔ یہی غنیمت تھا۔ بد قسمتی سے انشورنس والوں نے یہ نقصان پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ کافی عرصے تک یہ سینما اجاڑ پڑا رہا۔

جب سینما گھر کو مسمار کر کے پلازا اور شاپنگ سینٹر تعمیر کرنے کی لہر چلی تو بمبینو کے مالکوں نے بھی اس سینما کو شاپنگ مال بنانے کا منصوبہ بنایا لیکن حکومت نے روک دیا۔ اس طرح کراچی والوں کو اپنا ہر دلعزیز سینما دوبارہ واپس مل گیا۔ اب بمبینو سینما کی عمر لگ بھگ چالیس سال (پچاس) ہو چکی ہے مگر یہ ہمارے سامنے کا تو بچہ ہے کیونکہ ہماری آنکھوں کے سامنے اس نے جنم لیا تھا۔

☆

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ

جب تلک بھی چل سکے ساغر چلے

لیجئے، کیفی اعظمی بھی چل دیے۔ پچھلے دنوں علی سردار جعفری کا سوگ منایا تھا۔ اب کیفی اعظمی صاحب کا ماتم کر رہے ہیں۔ عام طور پر کسی مرنے والے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی جگہ اب کبھی پُر نہیں ہو گی۔ جب ہم نوجوان تھے تو اس مقولے پر بالکل یقین نہیں رکھتے تھے، یہ کیسے ممکن ہے کہ قدرت کے کارخانے میں جہاں اربوں کی آبادی

ہے، کسی ایک شخص کے دنیا سے جہاں اربوں کی آبادی ہے، کسی ایک شخص کے دنیا سے رخصت ہونے پر اس کی جگہ ہمیشہ کے لیے خالی ہو جائے؟ لیکن وہ زمانہ عظیم اور قد آور انسانوں کا تھا۔ ہم خود بھی نوجوان تھے۔ جس طرف نظر اُٹھاتے تھے زندگی کے ہر شعبے میں بے شمار ایسی ہستیاں نظر آجاتی تھیں کہ آنکھوں میں چکا چوند ہونے لگتی تھی۔ بڑے بڑے لوگ دنیا سے رخصت ہوتے تھے مگران کی جگہ لینے کے لیے دوسرے موجود تھے اور یہ سلسلہ مسلسل جاری تھا۔

رفتہ رفتہ جب وقت گزرا تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے عظیم ہستیاں پیدا کرنے والے سر چشمے خشک ہونے لگے ہیں جو موجود ہیں ان ہی کا دم بہت غنیمت ہے کہ آگے تو قحط الرجال ہے۔ کہاں دیو قامت لوگوں کو سر اُٹھا کر دیکھو تو سر سے ٹوپیاں گر جاتی تھیں اور ان کے چہروں کے پیچھے آسمان چھپ جایا کرتا تھا، کہاں اب بونے پیدا ہونے لگے جنہیں دیکھنے کے لیے جھکنا پڑتا ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو شاید خوردبین لگا کر دیکھنے کی نوبت آجائے گی مگر کوئی کام کا بندہ نظر نہیں آئے گا۔ گزشتہ پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں آخر یہ انقلابِ عظیم کیوں کر پیدا ہو گیا۔ دھرتی بانجھ پن کیوں ہو گئی۔ ہر شعبے میں ممتاز، قابل قدر اور یگانہ روزگار لوگ پیدا ہونے کیوں بند ہو گئے؟ انسانوں میں یہ مینوفیکچرنگ ڈیفیکٹ آخر کیوں اور کیسے پیدا ہو گیا کہ جو بھی جاتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آفتاب کا ایک اور ٹکرا ٹوٹ کر گم ہو گیا ہے۔ آخر دنیا تاریکیوں کی طرف کیوں بڑھ رہی ہے؟ روشنی اور چمک دمک کم کیوں ہوتی جا رہی ہے؟ واقعی، ایسا ہو رہا ہے یا ہماری نظری کمزوری اور قوتِ شناخت کی کمی ہے؟ وجہ کچھ بھی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ جو بھی جا رہا ہے اس کی جگہ لینے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ آدمیوں کا ہجوم ہے کہ بڑھتا جاتا ہے لیکن انسان ہیں کہ تیزی سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ جگر مراد آبادی نے ٹھیک ہی تو کہا تھا:

گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

انہوں نے لگ بھگ پچاس سال پہلے یہ شعر کہا تھا۔ کچھ تو ضرور محسوس کیا ہو گا تبھی تو یہ شعر کہا۔ اب دیکھتے ہیں تو لگتا ہے کہ انسان تو گھٹ ہی گئے ہیں، سائے بھی سمٹتے جا رہے ہیں۔ جب سایہ دار اونچے درخت ہی نہ رہیں گے تو سایہ

کہاں سے آئے گا؟ جس طرح جدید شہر تعمیر کرنے والے، سڑکوں کو کشادہ کرنے والے بے دردی سے درخت کاٹ کاٹ کر کاروں کے لیے سڑکیں چوڑی کر رہے ہیں مگر شہر سبزے اور سائے سے محروم ہوتے جا رہے ہیں اسی طرح قد آور ہستیوں کے جانے سے سائے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر طرف چٹیل میدان اور صحرا نظر آنے لگے ہیں کہ سبزہ ہے، نہ تازہ ہوا۔ نہ سایہ، شدید گرمی اور حبس کا عالم ہے۔ میر انیس کے بقول۔ وہ حبس تھا کہ لو کی دعا مانگتے تھے لوگ۔

اب وہی حبس ہے۔ وہی گھٹن ہے۔ وہی تمازت اور آسمان سے برستی ہوئی آگ ہے۔ معرکہ کرب وبلا تو تاریخ میں یادگار بن گیا مگر آج کا انسان ہر روز کرب وبلا کے امتحانوں سے گزرتا ہے۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

چھوڑیئے اس نوحے کو اور سنئے کیفی اعظمی کی باتیں۔

کیفی اعظمی علی سردار جعفری کے ہمعصر ہی تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ، ایک ہی ماحول، ایک ہی فضا، ایک ہی شہر میں زندگی بسر کی۔ دونوں کے نظریئے بھی ایک ہی تھے۔ دونوں نے کمیونسٹ تحریک کے لیے اپنی جوانیاں، رنگینیاں بلکہ تمام زندگیاں وقف کر دی تھیں کی۔ آپ ان سے لاکھ اختلاف رکھیں مگر ان کے خلوص، لگن اور بے لوث محنت کو کیسے فراموش کریں گے؟ علی سردار جعفری نے 82 سال کی عمر پائی۔ کیفی اعظمی 84 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ دونوں نے آخری سفر آخری سٹیشن بمبئی سے شروع کیا کیونکہ زندگی بھر وہیں رہے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ پرانی نسل کے بیشتر لوگوں کی طرح وہ بھی نئے ابتر حالات کے باعث دنیا سے مایوس ہی گئے ہوں گے۔

ہمیں ”سیف الدین سیف“ یاد آ گئے۔ ان کا ایک بہت طویل (اور شاید پہلا اور آخری انٹرویو) ہم نے تیرہ چودہ قسطوں میں اور چھ سات مہینوں میں مختلف اوقات میں ریکارڈ کیا تھا۔ جب لکھ گیا تو تصحیح اور ضروری اضافوں کے لیے

انہیں دیا گیا مگر ان ہی دنوں وہ بیمار ہو گئے اور چند ہی روز میں چٹ پٹ ہو گئے۔ آخری دنوں میں زبان بند ہو گئی تھی۔ بول نہیں سکتے تھے۔ لکھ کر یا اشاروں میں بات کرتے تھے۔ اللہ کی قدرت ہے۔ کیسے ہفت زبان آدمی تھے۔ کتنے شعبوں پر حاوی تھے۔ کس قدر گہرا اور زیادہ مطالعہ تھا کہ کوئی ایک موضوع چھڑ جاتا تو گھنٹوں بولا کرتے تھے۔ اس سے مل کر اور باتیں کر کے بلکہ سن کر انسان بہت کچھ حاصل کرتا تھا۔ یادگارِ زمانہ تھے یہ لوگ۔

بہر حال ان سے ان کی زندگی کے آغاز سے لے کر انجام تک کے بارے میں گفتگو رہی۔ پھر ہم نے پوچھا" سیف صاحب۔! آپ تو قیام پاکستان سے پہلے فلمی مصنف اور نغمہ نگار تھے۔ پھر قلم سے کنارہ کش کیوں ہو گئے ؟ "

بولے" آپ نے فلم انڈسٹری کیوں چھوڑ دی؟ "

ہم لاجواب ہو گئے۔

مسکرائے، کہنے لگے" بس، یہی میرا جواب ہے۔"

آخر میں پوچھا" سیف صاحب، آپ ادب اور فلم کے ماحول اور معیار کو بہتر بنانے کا نصب العین لے کر آئے تھے۔ ساری زندگی ان شعبوں میں کی آوارہ گردی میں گزاری۔ اب پچھلی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں؟ "

ایک سرد آہ بھری، بولے" آفاقی، سوچتا ہوں کہ ساری زندگی رائگاں ہی گئی۔ کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ "

حمید اختر صاحب کا بھی کم و بیش یہی جواب تھا۔

اگر علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی صاحب سے دریافت کیا جاتا تو شاید ان کا بھی یہی جواب ہوتا۔ جو ارادے، عزم اور مقاصد لے کر چلے تھے، آخری دنوں میں ان سب کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہوا دیکھا۔ تو پھر زندگی رائگاں ہی گئی نا۔

کیفی اعظمی کے حوالے سے کبھی ان کی فن کارہ بیٹی شبانہ اعظمی پہچانی جاتی تھیں۔ اب یہ نوبت آگئی تھی کہ عموماً کیفی اعظمی کا تعارف شبانہ اعظمی بن گئی تھیں کہ یہ کیفی اعظمی صاحب ہیں شبانہ اعظمی کے والد۔ دیکھئے، انسان کی زندگی میں کیسے کیسے انقلابات آتے ہیں۔

دیکھا جائے تو وہ چار پانچ نسلوں کے شاعر تھے۔ ہم جب پڑھنا سیکھ رہے تھے تو وہ نامور شاعر تھے۔ صرف شاعر ہی نہیں تھے، صاحب علم بھی تھے۔ اس زمانے میں سبھی صاحب علم ہوتے تھے مگر کیفی اعظمی اپنے ہم عصروں میں شاید سب سے زیادہ صاحب علم تھے۔ ان کی ادبی، سیاسی اور شاعرانہ عظمت کا بڑے بڑوں نے اعتراف کیا ہے۔

وہ بھی اعظم گڑھ کی مردم خیز زمین میں پیدا ہوئے تھے جو کہ یوپی میں ہے۔ کیفی اعظمی ہردوان میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ قصبہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ مغلوں کے عہد میں یہاں بڑی یادگار جنگیں لڑی گئی تھیں۔ نور جہاں کا پہلا شوہر شیر افگن بھی ایک زمانے میں ہردوان کا صوبے دار تھا۔

ان کا اصلی نام سید اختر حسین رضوی تھا۔ ایک بڑے زمیندار کے بیٹے تھے۔ نوکر چاکر، خدمت گار، عیش و عشرت آنکھ کھولتے ہی دیکھا تھا مگر قدرت نے ایسا حساس مزاج اور ذہن دیا تھا کہ عمر بھر غریبوں کے لیے ہی جدوجہد کرتے رہے۔ اس زمانے کے باذوق اور صاحب علم گھرانوں کے مانند ان کے گھر میں بھی شعر و ادب کا چرچا تھا۔ بچپن ہی سے شاعرانہ مزاج تھا۔ پہلی غزل انہوں نے دس گیارہ سال کی عمر میں لکھی تھی اور کیا غزل تھی کہ جسے اس زمانے کی عظیم مغنیہ اختری بائی فیض آبادی نے گانے کے لیے منتخب کیا اور اس طرح بچپن ہی میں اس کا کلام دور دور تک پہنچ گیا۔ غزل کا مطلع ملاحظہ کیجئے۔

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے

ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے

ذرا سوچئے، دس گیارہ سال کی عمر اور یہ غزل یہ قدرت کی کاری گری ہے جناب۔

شاعری کے آغاز میں عاشقانہ غزلیں لکھتے رہے کہ یہی شاعری کی عام روایت تھی مگر جب نوجوانی کے میدان میں قدم رکھا اور ارد گرد ظلم و ستم اور ناانصافیوں کا نظارہ کیا تو اشتراکیت کی طرف مائل ہو گئے۔ نوعمری ہی میں کمیونسٹ پارٹی میں باقاعدہ شامل ہو گئے۔ مزاج ایسا تھا کہ جس مدرسے میں داخل ہوئے وہاں یونین بنا کر ہڑتال کرادی۔ اس کے بعد انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ کئی انقلابات آئے مگر وہ اپنے نظریئے سے دستبردار نہ ہوئے۔

کیفی اعظمی پیدائشی شاعر تھے۔ اس لیے ہر طرح کی شاعری کی اور کمال حاصل کیا۔ رومانی، روایتی، عاشقانہ، انقلابی، فلمی جس شعبے کے بارے میں قلم اٹھایا لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ بلکہ یوں کہئے کہ شاعری کا حق ادا کر دیا۔ بڑے بڑے نقاد اور شاعران کے معترف تھے۔ فیض صاحب بھی ان کو بہت بڑا شاعر تسلیم کرتے تھے۔ وہ ساری زندگی قلم کا ہتھیار اٹھائے دنیا بھر کے سرمایہ داروں، منافع خوروں، ظالموں اور جاگیرداروں سے مصروف جنگ رہے۔ دشمن کو ہرا تو نہیں سکے مگر خود بھی ہار نہیں مانی، گویا اس لحاظ سے بھی سرخرو رہے۔

کیفی اعظمی غالباً 1941-42ء میں بمبئی پہنچے تھے اور پھر ساری زندگی اسی شہر آشوب میں گزار دی۔ وہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔ بڑے بڑے قلم کار اس سے وابستہ تھے۔ بمبئی ان سب کا گڑھ تھا۔ یہاں بڑے بڑے شاعر، ادیب، افسانہ نگار، فن کار یکجا ہو گئے تھے کہ اب جن کی مثال ایک بھی نظر نہیں آتے۔ اس وقت بمبئی میں یہ گلی کوچوں میں امڈے پڑتے تھے۔

بمبئی میں کیفی اعظمی نے عملی زندگی کا آغاز ایک رسالے کی ادارت سے کیا تھا۔ تیس روپے ماہانہ تنخواہ تھی اور بمبئی جیسا غدار شہر مگر دولت کی انہیں طمع نہ تھی۔ اگر دولت کی چاہ ہوتی تو زمینداری کے ٹھاٹ باٹھ تج کر کیوں آتے؟

کیفی اعظمی کی بیگم شوکت تھیٹر کی نامور اداکارہ تھیں۔ دونوں کی محبت مثالی تھی۔ دونوں فن کارانہ مزاج کے حامل تھے۔ شادی کے بعد تیس روپے ماہوار میں گزارا کرنا مشکل تھا اس لیے بیگم شوکت اعظمی نے ڈراموں میں اداکاری کو مستقل پیشہ بنالیا۔

بمبئی بہت بڑا فلمی مرکز تھا جہاں ادیبوں اور شاعروں کو فلموں کے لیے کام کر کے معقول معاوضہ مل جاتا تھا۔ دوستوں کے اصرار پر کیفی اعظمی نے بھی فلموں میں نغمہ نگاری شروع کر دی۔ عصمت چغتائی اور ان کے شوہر شاہد لطیف بھی ان کے ہم عصر، ہم خیال اور دوست تھے۔ ان دونوں نے فلم ''بزدل'' کا آغاز کیا تو کیفی اعظمی کو گیت نویسی کے لیے گھیر لیا۔ یہ فلمی گیت نگار کی حیثیت سے ان کی پہلی فلم تھی۔ یہ بہت معیاری اور خوبصورت فلم تھی۔ نمی اور پریم ناتھ نے مرکزی رومانی کردار کیے تھے لیکن کہانی کا مرکزی کردار کشور ساہو نے ادا کیا تھا۔ یہ انتہائی خوبصوت، انوکھا اور نفسیاتی کردار تھا۔ عصمت چغتائی نے جیسا کردار تخلیق کیا تھا، شاہد لطیف اور کشور ساہو نے اس کو ہو بہو اسکرین پر پیش کر دیا تھا۔ یہ ایک نفسیاتی مریض اور دہری شخصیت کا حامل کردار تھا جو اپنے بھائی سے بے پناہ پیار بھی کرتا تھا اور اس کا رقیب بھی تھا۔ دنیا کی نظروں میں وہ اوتار تھا لیکن در حقیقت اس کے اندر ایک شیطان چھپا ہوا تھا۔

''بزدل'' ہر لحاظ سے بہت اعلیٰ درجے کی فلم تھی۔ ہم نے بھی کئی بار دیکھی تھی۔ سعادت حسن منٹو صاحب کے گھر ہمارا آنا جانا تھا۔ اس فلم کے بارے میں ان سے بھی گفتگو ہوئی۔ انہوں نے اس قسم کے اور موضوع بھی ہمیں سنائے جنہیں فلم کے لیے لکھنے کا انہیں موقع نہیں مل سکا۔

کیفی اعظمی کو پہلے گیت کا معاوضہ پانچ سو روپے ملا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے دوسری فلموں کی نغمہ نگاری بھی کی لیکن فلمی نغمات کی آمدنی کمیونسٹ پارٹی کے فنڈ میں دے دیا کرتے تھے۔ گھر کے خرچ کے لیے تیس چالیس روپے دیتے تھے۔ باقی اخراجات بیگم شوکت اپنی اداکاری سے پورے کرتی تھیں۔ ذرا سوچئے کہ یہ کیسے لوگ تھے جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے محض زبانی باتوں اور خوشنما وعدوں پر یقین نہیں کرتے تھے بلکہ تکلیف سہتے تھے، دکھ اٹھاتے تھے۔ خود کو اور اپنے بیوی بچوں کو روکھی سوکھی کھلاتے تھے لیکن اپنے مقصد سے روگردانی نہیں کرتے تھے۔ اور ان کے بیوی بچے بھی قابل تعریف ہیں جو ان کے ساتھ پورا تعاون کرتے تھے۔ آج تو اولاد اور بیگمات اپنے اپنے گھر کے سربراہوں کو طعنے دے دے کر ان کی زندگی وبال کر دیتی ہیں کہ دیکھیئے، دوسرے لوگ کیسے عیش اڑا رہے ہیں۔ مگر ہمارا نالائق اور نکما باپ اپنی دیانت داری اور اصول پرستی کی خاطر ہمیں ہر آسائش سے محروم رکھتا ہے۔ ہمارے

معاشرے میں بڑھتی ہوئی کرپشن، بے ایمانی اور لوٹ کھسوٹ کا سبب بھی یہی ہے کہ اچھے برے کی تمیز ختم ہو چکی ہے۔ صرف پیسہ معیار ہے جو پیسا نہیں کھاتا وہ کام کے سلسلے میں تو دکھ اٹھاتا ہی ہے، اپنے گھر والوں کی نظروں سے بھی گر جاتا ہے اور شب و روز ان کے طعنے۔۔۔ سننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہم جب پرانے لوگوں اور گئے دنوں کے نوحے لکھتے اور بیان کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ دور اور وہ لوگ اب مر چکے ہیں۔ ان کا سوگ منانے اور ماتم کرنے کے سوا ہم کچھ اور نہیں کر سکتے۔ اس لیے ترقی اور دولت کی ریل پیل کے باوجود ہر شخص بے سکونی، بے اطمینانی اور بے چینی میں مبتلا ہے۔ انسان نے ترقی کے نام پر اپنا سبھی کچھ تو کھو دیا ہے اور پھر بھی اسے اپنے اس زیاں کا احساس نہیں ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ کیفی اعظمی نے جب فلم ”بزدل“ کے لیے اپنا پہلا فلمی گیت لکھا تو وہ اس وقت روپوش تھے کیونکہ حکومتی ادارے ان کی کھوج میں تھے۔ سرکار ان سے ناراض تھی۔ وہ چھپے پھرتے تھے۔ دن کہیں، رات کہیں۔ اس بے سکونی کے عالم میں انہوں نے ”بزدل“ کا نغمہ لکھا تھا۔ لتا منگیشکر کا گایا ہوا یہ نغمہ نمی پر فلمایا گیا تھا۔ اس کے بول اور طرز آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔

روتے روتے گزر گئی رات رے

آئی یاد تری ہر بات رے

اس فلم کے موسیقار ایس ڈی برمن تھے۔ بہت ماہر اور گنی موسیقار تھے۔ ان کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ ایک ریاست کی شہزادگی چھوڑ کر موسیقی کے عشق میں بن باس لے لیا تھا اور پھر فلمی دنیا میں ان مٹ یادیں چھوڑ گئے۔

کیفی اعظمی نے فلموں کے لیے نغمات لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور کافی مقبولیت بھی حاصل کی لیکن ایک تو وہ مزاج کے اعتبار سے فلمی شاعر نہ تھے دوسرے فلم کی کہانی اور موسیقار کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکتے تھے اس لیے دوسرے پیشہ ور نغمہ نگاروں کی طرح وہ یکسوئی سے یہ کام نہ کر سکے۔ ان کے لکھے ہوئے بہت سے نغمات بے حد

مقبول ہوئے لیکن بعد میں مقبولیت میں کمی واقع ہوگئی۔ یہاں تک کہ ان کا فلمی دنیا سے واسطہ بہت کم رہ گیا۔ان کے پاس فلمی دنیا کے لیے وقت نہ تھااور بھلا فلم والوں کوانہیں تلاش کرنے کی کیاضرورت پڑی تھی۔

اس طرح کیفی اعظمی صاحب کی فلمی مصروفیات تقریباً ختم ہوکررہ گئیں۔مگر یہ شخص پارٹ ون کا اختتام یاانٹرویل تھا کیونکہ قدرت انہیں ایک بار پھر فلمی صنعت میں واپس لانااور مقبول ومحبوب بناناچاہتی تھی۔

اس وقت جبکہ کیفی اعظمی فلمی نغمات لکھنے کاارادہ ترک کرچکے تھے،اداکار دیوآنند کے بڑے بھائی اور معروف وذہین ہدایت کار چیتن آنند کوایک فلم بنانے کی سوجھی۔چیتن آنند صاحب بہت کم،طویل وقفے کے بعد فلمیں بنانے کے عادی ہیں مگر جو فلم بھی بناتے ہیں وہ مختلف اور منفرد ہوتی ہے۔اس بار انہوں نے ”حقیقت“ کے نام سے ایک فلم بنانے کی ٹھانی اور یہ بھی طے کر لیاکہ اس فلم کے نغمات کیفی اعظمی ہی لکھیں گے۔کیفی صاحب نے بہت لیت و لعل کی لیکن چیتن آنند نے ایک نہ سنی اورانہیں فلم ”حقیقت“ کے گانے لکھنے پر آمادہ کرہی لیا۔وہ دوذہین، تعلیم یافتہ اور ترقی پسند فن کاروں کاملاپ تھاجس کے نیتجے میں ایک بہت خوبصورت فلم وجود میں آئی۔

عجیب بات یہ ہے کہ چیتن آنند کی یہ فلم باکس آفس پر بھی کامیاب ہوئی۔بس پھر کیاتھا،فلم سازوں نے کیفی اعظمی کے فلیٹ پرپڑاؤڈال دیے۔ہرایک کی خواہش تھی کہ وہ اس کی فلم کے لیے نغمہ نگاری کریں۔

اس طرح فلمی صنعت میں کیفی اعظمی نے دوسرا جنم لیا۔اس کے بعد انہوں نے بہت سی فلموں کے نغمات تحریر کیے۔وہ کم کام کرنے کے قائل تھے اور اس اصول پر قائم بھی رہے۔ اس کے باوجود انہیں فلمی نغمہ نگاری کے لیے وقت مخصوص کرناپڑایہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیاکہ فلم سازوں کے اصرار سے مجبور ہوکر وہ دوسرے کاموں کوملتوی کرکے نغمہ نگاری کی طرف متوجہ ہوگئے۔اس دور میں انہوں نے بہت سی فلموں کے خوبصورت اور شاعرانہ نغمات لکھے جن میں شعلہ وشبنم،لالہ رخ، ایک گاؤں کی کہانی، گیارہ ہزار لڑکیاں،قرار،پروانہ، گہرہ،ارتھ، انوکھی بات کے علاوہ کاغذ کے پھول،پاکیزہ اور ہیر رانجھا(اردو) جیسی فلمیں بھی شامل ہیں۔کاغذ کے پھول گورودت

کی فلم تھی۔ عام طور پر یہ تاثر ہے کہ یہ ان کی اپنی کہانی تھی۔ کسی حد تک یہ درست بھی تھا۔ اس فلم پر گورو دت نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ بہت محنت اور لگن سے یہ فلم بنائی گئی تھی لیکن بد قسمتی سے وہ کامیاب نہ ہو سکی حالانکہ نقادوں نے اسے گورودت کی بہترین فلموں میں سر فہرست قرار دیا ہے۔ ہم نے بھی یہ فلم دیکھی ہے مگر ہمارے خیال میں اس فلم کا منظر نامہ اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے حیرت ہے کہ گورودت جیسے ذہین اور تجربہ کار ہدایت کار نے بعض بنیادی خامیوں کی طرف بھی توجہ نہیں دی حالانکہ وہ اس فلم کو ایک شاہکار بنانا چاہتے تھے۔ اس فلم کی ناکامی کا سبب ہمارے خیال میں اس کی سست رفتاری اور بے جان اور غیر حقیقی منظر نامہ تھا۔ بہر حال، اپنا اپنا خیال ہے۔ کاغذ کے پھول سے کیفی صاحب کو بھی بہت امیدیں وابستہ تھیں مگر اس فلم کے نغمات بہت دلکش تھے جو آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔

''پاکیزہ'' کمال امروہوی کی یادگار فلم ہے۔ اس کی موسیقی نے فلم کی دلکشی اور حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس فلم کا سب سے زیادہ مقبول نغمہ یہ تھا۔

یوں ہی کوئی مل گیا تھا

سرِ راہ چلتے چلتے

یہ کیفی اعظمی نے لکھا تھا اور موسیقار غلام محمد نے اس کی انتہائی خوبصورت دھن بنائی تھی۔ یہ نغمہ ہمیشہ کیفی صاحب کی یاد دلاتا رہے گا۔

کیفی اعظمی نے فلم ''ہیر رانجھا'' میں ایک نیا تجربہ کیا۔ پہلا تجربہ تو فلم ساز نے یہ کیا کہ پنجابی کی اس کلاسیکی کہانی کو اردو میں فلمانے کا منصوبہ بنایا۔ پھر دوسرا تجربہ کیفی اعظمی نے یہ کیا کہ اس فلم کے تمام مکالمے منظوم لکھے۔ نثر کا کہیں بھی استعمال نہیں کیا۔ اس فلم میں گانے بھی تھے لیکن مکالمے سب کے سب منظوم تھے۔ اردو کی یہ بھارتی ''ہیر رانجھا'' 1972ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس سے پہلے 1970ء میں فلم ساز اداکار اعجاز درانی اور

مسعود پرویز نے پنجابی میں "ہیر رانجھا" بنا کر اس داستان کو واقعی امر کر دیا تھا۔ مسعود پرویز اس کے ہدایت کار تھے۔ نغمات و مکالمے احمد راہی نے لکھے تھے اور موسیقی خواجہ خورشید انور نے مرتب کی تھی۔ یہ ہر اعتبار سے ایک یادگار فلم ہے اور رہے گی۔ مگر ہندوؤں کا تعصب دیکھئے کہ انگلستان اور یورپ و امریکا میں انہوں نے یہ فلم دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کیونکہ یہ ایک پاکستانی فلم تھی۔ اسے آپ ان کی قوم پرستی قرار دیں یا تعصب کا نام دیں مگر ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ بھارتی ہندو پاکستان کی فلم دیکھنا پسند ہی نہیں کرتے۔ ایک بار ہم لندن گئے اور اپنے ایک پاکستانی دوست کو بہت شرمندہ کیا کہ انہوں نے "ہیر رانجھا" بھی نہیں دیکھی ہے۔ وہ ہمیں لے کر فوراً! ویڈیو شاپ پر گئے۔ حسبِ معمول یہ ایک بھارتی ہندو کی دکان تھی۔ ہم نے پوچھا "آپ کے پاس فلم "ہیر رانجھا" ہے۔"

"آہو جی" انہوں نے ایک ویڈیو نکال کر ہمارے حوالے کر دیا۔ ہم نے اس پر لگی ہوئی تصویریں اور تحریریں دیکھیں تو معلوم ہوا کہ وہ اردو کی ہیر رانجھا ہے۔

ہم نے کہا "ہمیں تو پنجابی کی فلم "ہیر رانجھا" کی ضرورت ہے جو پاکستان میں بنی ہے۔"

"اچھا!" وہ حیران ہو کر بولا "مجھے تو خبر نہیں جی۔ اپنے پاس اس کا ویڈیو بھی ہے۔"

ہم نے اردو کی "ہیر رانجھا" انہیں واپس لوٹا دی حالانکہ دیکھنے کو بہت جی چاہا لیکن سوچا کہ جب بھارتی ہم سے اتنے الرجک ہیں تو ہمیں ان کی فلمیں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر ہم نے دکان دار کو یہ ضرور بتا دیا کہ لالہ جی آپ نے یہ فلم نہ دیکھ کر اپنا بڑا نقصان کیا ہے۔ یہ تو پنجاب کی کلاسیک ہے۔"

فلم "گرم ہوا" کی کہانی اور مکالمے بھی کیفی اعظمی صاحب نے ہی لکھے تھے۔ اس فلم کا موضوع تقسیم ہند تھا جس میں بڑی غیر جانبداری کے ساتھ اس مسئلے کو پیش کیا گیا تھا لیکن بھارت میں ہندوؤں نے اس کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا اور الزام لگایا کہ اس فلم میں پاکستان نوازی کی گئی ہے۔ مگر باشعور لوگوں نے اس فلم کو بہت پسند کیا اور

سراہا۔اس فلم کی کہانی کے مصنف کی حیثیت سے بھارتی حکومت نے انہیں قومی ایوارڈ دیا تھا۔اس سال تو فلم فیئر ایوارڈ بھی اسی فلمی کو دیا گیا تھا۔

ان دونوں کے علاوہ کیفی اعظمی نے اور بھی کئی فلموں کی کہانیاں لکھی تھیں مگر جب بھارتی فلمی صنعت میں بے مقصدیت کا سیلاب آیا تو وہ رفتہ رفتہ فلمی صنعت سے کنارہ کش ہو گئے کیونکہ نہ تو فلموں میں کہانیاں باقی رہیں اور نہ ہی مقصدیت۔ایسے میں گانوں کی سچویشنز کیسے بن سکتی ہیں۔ چنانچہ تک بندی اور بے تکی اچھل کود کا رواج ہو گیا۔

کیفی اعظمی کی بیٹی شبانہ اعظمی نے فن اور سیاست کی دنیا میں بہت نام پیدا کیا ہے۔وہ پارلیمنٹ کی رکن بھی رہیں اور ایک بے خوف سماجی کارکن کی حیثیت سے بھی ہندو سماج کی خرابیوں کے خلاف بے خوفی سے آواز اٹھاتی رہی ہیں۔ شبانہ اعظمی نے کمرشل فلموں میں بھی بہت اچھی اداکاری کی لیکن انہوں نے زیادہ توجہ آرٹ فلموں پر مرکوز رکھی جن میں بہت کم معاوضہ ملتا ہے لیکن وہ بھی آخر کیفی اعظمی ہی کی بیٹی ہیں۔پیسہ ان کے نزدیک بھی ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک لطیفہ ہے کہ ایک بار ہالی ووڈ کے ایک مشہور پروڈیوسر کے اعزاز میں بہت شاندار تقریب منعقد ہوئی اور انہیں انعام واکرام سے نوازا گیا۔انہیں انعام دینے کے بعد اعلان کیا گیا کہ اب ایک ان سے بھی بڑے پروڈیوسر آپ کے سامنے آئیں گے۔

اسٹیج پر ایک موٹی،بدشکل سی خاتون مسکراتی ہوئی نمودار ہوئیں تو سب بہت حیران ہوئے انہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔

لوگوں نے پوچھا" انہوں نے کون سا کارنامہ سرانجام دیا ہے؟ "

جواب ملا" انہوں نے اس عظیم پروڈیوسر کو پروڈیوس کیا ہے۔یعنی ان کی والدہ ہیں اگر انہوں نے جنم نہ دیا ہوتا تو یہ عظیم پروڈیوسر کہاں ہوتے؟ "

شبانہ اعظمی کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دو بڑے بلکہ عظیم فنکاروں کی صاحب زادی ہیں۔ان کی عظمت اپنی جگہ لیکن کیفی اعظمی اور ان کی بیگم تعریف کی مستحق ہیں جن کی تعلیم و تربیت کی بدولت ہی شبانہ اعظمی نے یہ مقام حاصل کیا ہے۔

کیفی اعظمی کا لکھا ہوا ایک نغمہ محمد رفیع نے بہت پر سوز انداز میں گایا تھا۔

یہ دنیا یہ محفل، میرے کام کی نہیں

کیفی اعظمی سے پہلے محمد رفیع بھی یہی کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے اور اب کیفی اعظمی بھی چلے گئے یہ کہہ کر کہ یہ دنیا، یہ محفل میرے کام کی نہیں۔ اس نغمے کو ایک لافانی نغمہ کیا جا سکتا ہے۔

کیفی اعظمی فلمی نغمات میں بھی جدت پیدا کر دیتے تھے اور آسان سی بات کو نئے انداز میں کہہ کر اسے ایک نیا رنگ دے دیا کرتے تھے مثلاً لتا منگیشکر کا گایا ہوا یہ نغمہ۔

ملو نہ تم تو ہم گھبرائیں

ملو تو آنکھ چرائیں

ہمیں کیا ہو گیا ہے؟

ایک فلمی گانے میں لطیف جذبات و احساسات کی ایسی نازک اور نفیس عکاسی کیفی اعظمی جیسے شاعر ہی کر سکتے ہیں۔

کیفی اعظمی عمر بھر محنت کرتے رہے لیکن کافی عرصہ پہلے ان کو فالج کا حملہ ہوا تھا اور وہ کافی عرصے تک بالکل معذور ہو کر رہ گئے تھے۔اس کے بعد وہ کچھ سنبھل تو گئے لیکن بیماری نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ عمر کے ساتھ ساتھ مختلف بیماریوں نے بھی انہیں گھیر لیا جن میں اختلاجِ قلب کی بیماری بھی شامل تھی۔

زندگی کے آخری ایام میں کیفی صاحب ادبی اور سیاسی سرگرمیوں سے بہت دور ہو گئے تھے اور محض فلمی مصروفیات تک محدود ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود ادب اور شاعری ہی ان کی شناخت رہیں۔ ان کی نظموں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں سرمایہ، آخر شب، آوارہ، سجدے اور جھنکار شامل ہیں۔ انہوں نے غزلوں کے مقابلے میں زیادہ تر نظمیں ہی لکھی ہیں کیونکہ عموماً ترقی پسند شاعر غزل کو فرسودہ اور روحانی روایات کا حصہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ کیفی صاحب کی بعض نظموں نے بہت شہرت اور پذیرائی حاصل کی۔ ان کی نظمیں موضوعاتی اور طویل ہوتی تھیں جیسا کہ ان کے عنوانات ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک نظم کا عنوان ہے تلنگانہ۔ جنوبی بھارت میں تلنگانہ کے مقام پر عرصہ دراز تک اشتراکی اور انقلابی تحریک چلتی رہی جس نے بغاوت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ یہ نظم اسی موضوع کو اجاگر کرتی ہے۔ ان کی ایک نظم کا عنوان "ماسکو" ہے۔ حسن اور ابن مریم بھی ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ بھارتی حکومت کی وضع داری کہئے یا دنیاداری اور ظاہر داری کہ وہ اردو کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی کسی امتیاز کے بغیر اعزاز دیتی رہی ہے۔ بھارت کے تقریباً سبھی نامور اردو ادیب اور شاعر قومی ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔

کیفی اعظمی کو ان کی نظریاتی وفاداری کے باوجود بھارتی حکومت نے "پدم شری" کے اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا تھا۔ کاش پاکستان میں جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض جیسے تخلیق کاروں کو بھی اعلیٰ اعزازات سے نوازا جاتا۔ ہمارے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہی رہا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں شعرا کو ہی دیکھ لیجئے۔ اردو ادب میں ان کی مثال اب کوئی نہ ہوگا لیکن ہماری حکومتوں نے انہیں معتوب و مقموہی گردانا۔ اعزاز دینا تو دور کی بات ہے، سرکاری ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے ان کے طویل اور مفصل انٹرویوز تک نہیں لیے گئے۔ سوچئے تو یہ نقصان کس کا ہے؟ ظاہر ہے کہ ملک اور ادب کا، معاشرے کا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شبانہ اعظمی کیفی اعظمی کی اکلوتی بیٹی ہیں حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔ وہ ان کی بہت لاڈلی بیٹی ضرور ہیں اور انہوں نے اپنے والد کا نام روشن کرنے میں بھی بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ لیکن کیفی اعظمی کی دو اولادیں

ہیں۔ایک شبانہ اعظمی اور دوسرا ان کا بیٹا جسے عموماً پیار سے "بابا" کہا جاتا ہو گا۔ بڑے ہو کر انہوں نے یہی نام اختیار کر لیا۔ وہ بہت اچھے کیمرا مین ہیں۔

وقت نے کیا، کیا حسیں ستم

ہم رہے نہ ہم، تم رہے نہ تم

☆

تم جو مل گئے ہو تو یہ لگتا ہے

کہ جہاں مل گیا، کہ جہاں مل گیا

☆

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں

راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے

☆

جیت ہی لیں گے بازی ہم تم کھیل ادھورا چھوٹے نہ

پیار کا بندھن، جنم کا بندھن، جنم کا بندھن ٹوٹے نہ

☆

دو دل ٹوٹے، دو دل ہارے

دنیا والو صادقے تمہارے

☆

آج سوچا تو آنسو بھر آئے

مدتیں ہو گئیں مسکرائے

☆

بہارو، میرا جیون بھی سنوارو

انہوں نے بے شمار، بہت خوبصورت نغمات لکھے ہیں جن میں خیال کی نزاکت، احساس کی شدت، جذبات کی حدت اور طرز بیان کی ندرت قابل ذکر ہے۔

تقدیر کی لکیریں کیفی اعظمی بھی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہیں۔ کون سوچ سکتا تھا کہ کیفی اعظمی جیسا شخص، جس نے اپنا تن من دھن سب کچھ کمیونسٹ تحریک اور سوشلزم کے لیے وقف کر دیا ہے، اس کو ایک دن عصمت چغتائی اور شاہد لطیف زبردستی کھینچ کر نغمہ نگار کی حیثیت سے فلمی دنیا میں لے جائیں گے اور اس فلم کے گانے ایسے مقبول ہوں گے کہ پھر وہ فلم سازوں کی ضرورت بن جائیں گے۔ قسمت کے اتار چڑھاؤ کا نمونہ دیکھنا ہو تو کیفی اعظمی ہی کو دیکھ لیجئے۔ ایک مقبول گیت نگار بننے کے بعد وہ پھر فلمی دنیا سے دور ہو گئے تھے بلکہ فلم والوں نے انہیں فراموش ہی کر دیا تھا۔ اچانک ایک دن قدرت چیتن آنند کے دل میں یہ خیال پیدا کرتی ہے کہ تم فلم ”حقیقت“ بناؤ اور اس کے لیے کیفی اعظمی سے گیت لکھواؤ۔

ساحر لدھیانوی (عبدالحئ) کے بارے میں ہم نے ایک طویل مضمون سرگزشت میں لکھا تھا جو بعد میں "ساحر اعظم" کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کیلئے ہم نے ان گنت ذرائع سے

معلومات حاصل کی تھیں اور خاصی ریسرچ کی تھی۔ساحرلدھیانوی پر تحقیق کرنے والوں نے اس کو بھی اپنی ریسرچ میں شامل کرلیا۔اس بارے میں آج بھی مختلف اصحاب ہم سے رابطہ کرتے رہتے ہیں۔چندماہ قبل ہمیں ایک خط موصول ہوا۔سادہ الفاظ میں تحریر کردہ اس خط کوپڑھ کر ہم بہت خوش ہوئے۔جس کی وجہ آپ بھی جان لیں گے۔یہ خط ساحرلدھیانوی کی چھوٹی بہن کی جانب سے موصول ہوا تھا۔اس کا مختصر مضمون ملاحظہ کیجئے۔

''تعارف یہ ہے کہ میں ساحرلدھیانوی کی دوسوتیلی بہنوں میں سے چھوٹی بہن سکینہ ہوں ۔ میری بڑی باجی کانام ہاجرہ تھا۔وہ پانچ سال قبل فیصل آباد میں وفات پاگئی ہیں۔میں ضلع وہاڑی میں رہتی ہوں۔مجھے اپنے بھائی کے بارے میں کتابیں لکھنے والے تمام اہل قلم سے محبت بھی ہے اور ان کا میرے سر پر احسان بھی ہے۔دورافتادہ ہوں اس لیے خط لکھنے میں دیر ہو جاتی ہے مگر ایک بات آپ سے کر رہی ہوں۔آپ نے ساحر(عبدالحئیٰ) کے بارے میں فلمی انداز میں ایک بھرپور کتاب لکھی ہے جو دوسرے تمام لکھنے والوں سے زیادہ ہمہ گیر تاثر رکھتی ہے۔مجھے بہن کے طور پر اس میں بہت سی باتیں اور واقعات غلط یا الٹ پلٹ نظر آرہے ہیں ۔ مثلاًہمارے والد کانام فضل چوہدری تھا۔وہ سیکھے وال گاؤں کے زمین دار تھے اسی وجہ سے ''فضلا سیکھے والیا'' کے نام سے پوری جگراؤں تحصیل میں معروف تھے ۔ذیلدار فضل محمد کوئی اور تھے۔وہ میرے اور ساحر کے والد نہیں تھے۔ایسی بہت سی باتیں دوسروں نے بھی لکھی ہیں اور آپ نے بھی۔اس میں حمیداختر صاحب(ساحرلدھیانوی کے سب سے قریبی دوست ان کا حوالہ ٹھہرا)آپ نے ان کے مضامین سے جو کچھ لیا یا خود گفتگو کے ذریعے حاصل کیا وہ بہت زیادہ ہے۔کہیں کہیں غیر مستند باتیں بھی موجود ہیں۔مثلاًطلاق کے بعد ان کی والدہ سردار بیگم کے ذریعہ معاش کے بارے میں ہمارا والد کے ساتھ آنے جانیکا سلسلہ 1946ء میں ہوئی تھی توگھر کی اور شادی کی تمام اشیا سردار بیگم ہی کی مشاورت سے خریدی گئی تھیں ۔ اس شادی کے دوران ہی ساحر کی اپنی سب سے پہلی منگیتر سے ناراضگی ہو گئی تو اس نے والدہ کو آنے جانے سے روک دیا۔اس منگیتر کا اب میرے سوا کسی کو علم نہیں ہے نہ ہی پہلے کسی نے اس کا ذکر کیا ہے۔تفصیل اور مدعا اس خط کا یہ ہے کہ جو باتیں دوسروں کے ہاں(مضامین میں)غلط دیکھ رہی ہوں اگر آپ فرمائیں تو میں اپنے بیٹے معین نجمی کے ذریعے لکھوا کر مضمون کی شکل میں آپ کو بھیج دوں؟آپ اسے شائع کر کے سوانح نگاروں کی اصلاح کر دیں اور ساحر آعظم کے

دوسرے ایڈیشن میں درست کر دیں کہ آپ جیسا حقیقت پسند رائٹر تو سچ کے قریب ہونا چاہیے۔ یہ میں اسی صورت میں لکھوں گی اگر آپ حکم دیں گے۔ 1947 تک ساحر کے بارے میں بہن کے حوالے سے سچا مضمون تھوڑا لمبا ضرور ہو جائے گا مگر ہو گا صدفی صد درست۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میرے مرنے کے بعد کوئی ان باتوں کو صحیح (طور پر) نہیں بتا سکے گا اور حقائق پر پردہ ہی پڑا رہ جائے گا۔ اس لیے آج آپ کو لکھ رہی ہوں۔ فقط والسلام آپ کی بہن، ہمشیرہ ساحر لدھیانوی۔ سکینہ بی بی“

محترمہ سکینہ بی بی کا یہ خط ہمارے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ ہم نے اسی روزان کے لکھے ہوئے پتے پر انہیں جوابی خط لکھا اور درخواست کی کہ وہ جتنی جلد ممکن ہو سکے ساحر لدھیانوی کی ذاتی زندگی کے بارے میں ہمیں تفصیلی خط لکھیں۔ اس کے بعد ہم بے تابی سے ان کے جواب کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ کئی ماہ تک کوئی جواب موصول نہ ہونے پر ہم نے یاد دہانی کے طور پر انہیں دوبارہ خط لکھا اور ان سے ذاتی معلومات تحریر کرنے کی درخواست کی۔ ان کے پہلے خط پر کوئی تاریخ درج نہ تھی لیکن غالباً یہ فروری یا مارچ 2002ء میں ہمیں موصول ہوا تھا۔ ہمارے خط کے جواب میں 30 اپریل 2002ء کو ان کا دوسرا خط موصول ہوا۔ اس میں انہوں نے ہمیں قدرے اپنائیت سے بھائی آفاقی صاحب سے مخاطب کیا تھا۔ یہ خط بھی ملاحظہ کیجئے۔

”بھائی آفاقی صاحب قبلہ!

سلام مسنون۔

آج سے قریباً دو ماہ قبل میں نے خود ہی بذریعہ خط ساحر لدھیانوی سے متعلق کتاب کے بارے میں کچھ حقائق بتانے کی اجازت چاہی تھی۔ آپ کے خط کے بعد ان ہی دنوں میرے بیٹے معین نجمی باتھ روم میں وضو کرنے کے بعد کھڑے ہوئے تھے کہ گر گئے۔ اس شدت سے چوٹ آئی کہ کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بہاولپور وکٹوریا اسپتال میں آپریشن ہوا۔ ابھی تک وہ بیساکھی کے ذریعے صرف ایک ٹانگ پر بوجھ ڈال کر چل رہے ہیں۔ جوں ہی ان کی صحت سنبھلے گی

میں ان سے ساحر لدھیانوی کے بارے میں تیس چالیس صفحات پر مشتمل طویل مضمون ارسال کروں گی۔ مثلاً پہلی بات تو یہ کہ ساحر سردار بیگم کی اکلوتی اولاد نہ تھے۔ ان کی ایک بہن بھی تھیں جن کا نام ''بی بی'' تھا۔ ایک سال چار ماہ کی ہو کر وہ اسہال کے عارضے میں فوت ہو گئی تھیں۔ ساحر کے بچپن کو بہت رنگ بھر کر پیش کیا گیا ہے۔ 1926ء میں میری اور میری بڑی بہن ہاجرہ کی ایک ساتھ شادی ہوئی۔ اس وقت سردار بیگم عدالتی طور پر طلاق لے چکی تھیں۔ جو بھی زمین بکتی اس پر شفعہ کر کے وہ خریدار سے پیسے وصول کرتی تھیں۔ کچھ جیب خرچ میرے والد سے بھی لیتی تھیں۔ ہم دونوں بہنوں کی شادی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ شادی کے تمام اخراجات سامان، زیورات اور کپڑوں کی خریداری میری حقیقی والدہ فاطمہ بی بی کے بجائے سردار بیگم نے کی تھی کیونکہ فاطمہ بی بی دیہاتی سمجھی جاتی تھیں۔ سردار بیگم ہمارے خاندان میں سمجھدار اور باسلیقہ مشہور تھیں۔ جو وہ کہہ دیتی تھیں ساری دنیا ان کی بات کو مانتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ وہ واقعی باسلیقہ خاتون تھیں اس لئے ہم دونوں بہنوں کی شادی پر تمام گھریلو لوازمات ان ہی کے ذریعے ادا ہوئے تھے۔ ہم دونوں کی شادی خاندان کے قریبی لوگوں میں ہوئی تھی۔ اس وقت بھی والد صاحب کے کہنے پر سردار بیگم نے دونوں (لڑکوں) سے سوال و جواب کر کے انہیں پاس کر دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت طلاق کو سات سال ہو چکے تھے مگر سردار بیگم کا آنا جانا کبھی بند نہ ہوا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سوال و جواب کے وقت ہم تینوں بہن بھائی (بڑی بہن ہاجرہ، میں اور ساحر) اندر کمرے میں موجود تھے اور ہمارے پاس ساحر کی پہلی منگیتر انور (جو کہ ساحر کے ماموں شفیع کی بیٹی تھی) وہ بھی موجود تھیں۔ ساحر ان پر ہلکے پھلکے جملے کس رہے تھے کہ اچانک انور نے دیہاتی انداز میں کہا ''لمبی ناک والے'' کبھی سوچا ہے تمہاری ناک کیسی ہے؟''

یہ وہ مسئلہ ہے جہاں سے ساحر شروع ہوتے ہیں۔ وہ ایسی سچویشن میں صفر ہو جاتے تھے۔ قوت فیصلہ سے لیکر قوت اظہار تک وہ صرف اور صرف زیرو تھے۔ رومانوی انداز میں (اگر کسی) لڑکی کو ساتھ لے جاتے تو ساتھ میں ان کے دوست بھی ہوتے تھے۔ حمید اختر، فیض الحسن، احمد راہی اور اے حمید شاید میری اس بات کی تائید کریں کہ ساحر کو اپنے اور اپنی ''نامزد'' کے بارے میں خود ساختہ کہانی (بنانے) کا فن خوب آتا تھا۔ اسی لیے ایک مضمون ''معاشقوں کا جادوگر ساحر لدھیانوی'' ان کے سب سے قریبی دوست کرشن چندر نے بمبئی کے ایک رسالے میں چھپوایا تھا۔ اس

کی فوٹو اسٹیٹ دوسری قسط میں آپ کو بھجواؤں گی۔(یہ سب کچھ معین نجمی کے علم میں ہے مگر ابھی وہ اٹھنے سے قاصر ہے۔جوں ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوئے آپ کے پاس حاضر دفتر ہو جائیں گے۔وہ آپ کے بے حد مداح ہیں ۔ 1979ء تک (ان کا)(فلم لائن میں حزیں قادری، تنویر کاظمی اور بشر نیاز وغیرہ سے کہانی کے سلسلے میں واسطہ رہا ہے۔خیال تھا کہ وہ ساحر کے پاس چلا جائے گا مگر اکلوتا ہونے کی وجہ سے میں آڑے آئی۔جب ساحر فوت ہو گئے تو وہ (معین نجمی)دل برداشتہ ہو کر لاہور چھوڑ کر گھر آ گیا۔

"امرتا پریتم اور دوسرے عشق جو ساحر کو واقعی نمٹانے پڑے اور بہت مرحلوں سے گزرنا پڑا۔اس میں ایشور کور(جن کے عشق میں ساحر کالج سے نکلے)اس کی تفصیل بھی موجود ہ پھر مسرور اور خدیجہ مستور کی والدہ اور سردار بیگم کے درمیان رشتے داری ہوتے ہوتے بچ گئی کہ جہیز کا مطالبہ (1948)ء میں بہت زیادہ تھا۔

جب انہوں نے کہا کہ ہم جہیز دیں تو "بری" بھی برابر کی ہو گی تو رشتہ ختم ہو گیا۔

(یہ ایک انوکھا انکشاف ہے کہ ساحر لدھیانوی کی شادی ہاجرہ مسرور یا خدیجہ مستور سے ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔)

احمد ندیم قاسمی صاحب اس رشتے سے خوش نہ تھے۔وہ ان کے منہ بولے بھائی کی حیثیت سے ان کے مکان میں بھائی کی طرح رہتے تھے۔خالد احمد اور توصیف احمد چھوٹے تھے۔بہنوں کے تمام فیصلے ندیم صاحب ہی کے مشورے سے ہوتے تھے۔انہوں نے اس کے " کفارے" کے طور پر پھر خدیجہ مستور کی شادی اپنے بھانجے ظہیر بابر جیسے خوبصورت آدمی سے کروائی اور ہاجرہ مسرور کی شادی احمد علی صاحب ایڈیٹر "ڈان سے کروائی۔(نوٹ !اس وقت احمد علی خاں صاحب "پاکستان ٹائمز لاہور" سے وابستہ تھے)

"یہ اور بات ہے کہ 54 -1953ء میں ہاجرہ مسرور، ابراہیم جلیس اور حمید اختر ساحر کے کہنے پر بمبئی پہنچ گئے اور پروڈکشن میں مختلف عہدوں پر فائز کر دیے گئے۔تفصیل مضمون میں موجود ہے۔

(یہ خط ہمیں ابھی تک موصول نہیں ہوا۔)

"یہ خط بہت لمبا ہو جائے گا ۔اگلی قسط میں تفصیل اور فوٹو اسٹیٹ لے کر نجمی جلد ہی آپ کے پاس حاضر ہوں گے۔تاخیر کیلئے معذرت۔اس ساری کہانی میں والد کا نام غلط چل رہا ہے ۔ فضل محمد سیکھے وال ان کا نام ہے۔ سیکھے وال کے گاؤں کے مالک تھے اس لیے انہیں سیکھے والا کہا جاتا تھا۔فضل محمد ذیلدار جگراؤں میں تھے۔وہ حکیم فقیر محمد چشتی اور شفاالملک کے قریبی دوست اور میری بڑی بہن کے سسر تھے۔خوب تیز اور سمجھدار تھے۔

میرے والد نام کے جاگیر دار تھے۔جلد جال میں پھنس جاتے تھے۔ایک مولوی صاحب سے دوستی تھی۔وہ کہتے تھے فضل محمد بد معاشی نہ کرنا۔شادی کرتے رہنا چھوڑتے رہنا (نوٹ، بڑے کام کے مولوی صاحب تھے)اس طرح (میرے والد نے)گیارہ شادیاں کیں جو ہمارے علم میں ہیں۔ان میں سے پانچ بیوگان اور اولادوں کو جائیداد سے حصہ ملا۔ساحر کا حصہ مجھے اور میری بہن ہاجرہ میں برابر تقسیم ہوا۔ساحر کے دوست مرتضیٰ جج تھے۔یہ فیصلہ انہوں نے ساحر سے (خط کے ذریعے) کیا تھا۔(انہوں نے لکھا تھا) کہ میں نہیں آؤں گا ۔ (میرا حصہ) میری دونوں بہنوں کو دے دو۔باقی پھر۔دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ میرے بیٹے کو شفا دے اور وہ چلنے پھرنے لگ جائے تو یہ برسوں کے جمع شدہ راز اور مضامین آپ کی خدمت میں بھیج دوں اور فخر سے کہہ سکوں کہ۔۔۔

سپردم بر تو مایہ خویش را

تب تک کیلئے اجازت۔آپ کی بہن سکینہ بیگم۔ہمشیرہ ساحر لدھیانوی۔

نوٹ۔اگر آپ ان باتوں کے علاوہ اپنی کتاب کی رعایت سے کوئی خصوصی سوالات چاہیں ، ساحر کی زندگی کے مختصر معاشقوں کی تفصیلی داستان تو سوال بتادیں۔میں معلومات لکھ بھیجوں گی۔ساحر میرا بھائی تھا اور ہم بہنوں کی آئیڈیل شخصیت بھی۔"

اس خط کا ہم نے ترنت جواب ارسال کر دیا تھا اور حسب فرمائش سوالات کی ایک طویل فہرست بھی لکھ دی تھی تاکہ ساحر لدھیانوی کے بارے میں وہ معلومات جو صرف ان کی بہن ہی جانتی ہیں ،ادبی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو

جائیں۔اس خط میں بھی محترمہ سکینہ بی بی نے کچھ نئے انکشافات اور دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ساحر لدھیانوی کی شرمیلی طبیعت کی انہوں نے تصدیق کی ہے مگر یہ بھی بتایا ہے کہ وہ بے حد زود حس اور زود رنج تھے۔مزاج کے خلاف کوئی بات سن کر ناراض ہو جاتے تھے اور ملنا جلنا ترک کر دیا کرتے تھے۔ساحر کی نزاکت طبع کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ساحر لدھیانوی کے رشتے کیلئے خدیجہ مستور یا ہاجرہ مسرور سے بات چل رہی تھی مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔رشتے آسمانوں میں بنتے ہیں۔ارد گرد نظر ڈالیں تو اس کہاوت کی حرف بحرف تصدیق ہو جاتی ہے۔ اب ہمیں سکینہ بی بی کے تفصیلی خط اور ساحر کے بارے میں کرشن چندر کے تحریر کردہ مضمون کی فوٹو اسٹیٹ کا انتظار ہے۔ہم ان کے صاحب زادے معین نجمی کی صحت یابی کیلئے دعا گو ہیں۔دیکھیے۔اب پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

ہیوسٹن (امریکہ) سے ایک قابل احترام قاری جناب ملک عبدالوحید کا تصحیح نامہ پڑھا انہوں نے بالکل درست غلطی کی نشان دہی کرائی ہے۔سب سے زیادہ ان کی جس بات نے ہمیں بوکھلا دیا وہ ان کی اپنی عمر ہے۔انہوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ "وہی 74 سالہ جوان اگر جیتا رہا تو انشاءاللہ دسمبر کو 75 سال کا جوان ہو جائے گا۔انشاءاللہ۔"

اس لحاظ سے ملک عبدالوحید صاحب ہمارے بزرگ ہیں۔ان کی یادداشت بھی ماشاءاللہ جوانوں جیسی ہے۔انہوں نے جس فلم کے بارے میں تصحیح فرمائی ہے۔وہ انہیں یقیناً بخوبی یاد ہو گی کیونکہ جب یہ فلم انہوں نے دیکھی ہو گی تو وہ ہم سے عمر میں لگ بھگ سات آٹھ سال بڑے اور سمجھ دار تھے۔ہم نے یہ فلم اپنی ابتدائی عمر میں بلکہ کچھ تو بچپن میں دیکھی تھیں جن میں سے شاید ہی گنتی کی چند فلمیں ہوں گی جنہیں باشعور ہونے کے بعد دوبارہ دیکھنے کا موقع ملا ہو گا ۔ اس لیے اس قسم کی غلطیاں سرزد ہو جانا ایک قدرتی امر ہے۔ہم پھر ایک بار یہ عرض کریں گے کہ یہ تحریر ہم محض اپنی ذاتی یادداشت کے سہارے لکھ رہے ہیں اور جلد بازی میں بعض اوقات نظر ثانی کا موقع بھی نہیں ملتا۔اس لیے واقعات پر دوبارہ غور کرنے کی نوبت نہیں آتی۔عبدالوحید صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے۔نہ جانے ہم نے یہ "تکیہ کلام"، فلم "شاردا" میں واسطی سے کیوں منسوب کر دیا۔یہ اپنے دور کے عظیم کامیڈین چارلی صاحب ہی کا تکیہ کلام

ہے بلکہ اب یاد آیا کہ یہ تکیہ کلام بھی نہیں ہے بلکہ ایک گانے کا حصہ ہے فلم بینوں کو یہ اتنا پسند آیا تھا کہ انہوں نے اسے تکیہ کلام اور فقرے بازی کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ایک دوسرے پر نوجوان آواز کستے تھے کہ ''پلٹ تیر ادھیان کدھر ہے بھائی۔ اس فلم کا نام ''سنجوگ'' تھااور یہ ایک بہت دلچسپ کامیڈی تھی۔اس فلم میں واسطی صاحب نے بھی چارلی کے ساتھ ایک اہم کردار کیا تھا۔فلم کے دوسرے اداکاروں میں (جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے) انور حسین،اے شاہ شکارپوری بھی شامل تھے۔اے شاہ کا اس میں اہم کردار تھا۔یہ دراصل غلط فہمیوں کی کہانی ہے ۔ چارلی صاحب ایک شہر میں سیکریٹری کی ملازمت کے سلسلے میں جاتے ہیں لیکن انہیں اے شاہ شکارپوری راج کمار (یا کوئی اور اہم شخصیت) سمجھ لیتے ہیں۔اصلی صاحب سیکریٹری کی جگہ پہنچ جاتے ہیں اور ان کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے ۔ چارلی اس صورت حال سے جان چھڑا کر بھاگ نکلتے ہیں۔مہتاب اس فلم میں ہیروئن تھیں جو بعد میں سہراب مودی صاحب کی بیگم بن گئی تھیں اور کہتے ہیں کہ شادی ہی سہراب مودی کے زوال کا سبب بن گئی کیونکہ انہوں نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔انہوں نے ''جھانسی کی رانی'' جیسی قیمتی اور نادر تاریخی فلم بنائی جس میں مہتاب نے مہارانی جھانسی کا کردار کیا تھا۔اس فلم پر انہوں نے پانی کی طرح پیسہ بہایا تھا مگر فلم فلاپ ہو گئی۔اس کے بعد سہراب مودی کے زوال کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ پھر دوبارہ نہ سنبھل سکے۔

''سنجوگ'' میں ایک اور بہت دلچسپ گانا بھی تھا۔ ''لوٹ کے بُدّھو گھر کو آئے'' اس کے بول کچھ اس طرح تھے۔

سستے چھوٹے نہیں تو اے مہاراج

ہم ہوتے اور گھمرّ گھمرّ جیل کی چکی آج

ایسی خاطر بھاڑ میں جائے

جان بچی اور لاکھوں پائے

لوٹ کے بُدّھو گھر کو آئے

پرانے زمانے کی فلموں میں عموماً کسی کردار کا ایک تکیہ کلام ہوتا تھا جو بے حد مقبول ہو جاتا تھا۔ کئی بار تکیہ کلام کی شہرت کے باعث فلم بہت زیادہ کامیاب ہو جاتی تھی۔ پاکستانی فلموں میں بھی آغاز کے دنوں میں ''تکیہ کلام'' رکھا جاتا تھا۔ خاص طور پر شباب کیرانوی صاحب کی فلموں میں۔ وہ تکیہ کلام کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ جیسے زینت کا تکیہ کلام۔

''میں تو کہتی ہوں کھری بات چاہے کسی کو بری لگے''

رنگیلا کا تکیہ کلام ''میں نے ہانگ کانگ کے نلکوں کا پانی پیا ہے'' وغیرہ۔

پرانے زمانے کی انڈین فلموں میں کنہیالال کو دیکھ کر گاؤں کے دوسرے لوگ کہا کرتے تھے ''چاچا پسینہ آرہا ہے'' تو وہ کہتے تھے ''ہاں بیٹا۔ آرہا ہے اور آتا رہے گا۔''

فلم ''نجمہ'' (یا زینت) میں اداکار یعقوب کا تکیہ کلام بہت مقبول ہوا تھا۔ ہم کو دعائیں دو تمہیں قاتل بنا دیا۔ بھارتی اور پاکستانی فلموں میں ایسی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ پاکستان کی پنجابی فلموں میں بھی یہ رجحان بہت مقبول ہو گیا تھا اور ظریف، منور ظریف، رنگیلا اور ننھا کے تکیہ کلام فلم بینوں میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ مظہر شاہ ولن تھے مگر حزیں قادری اور دوسرے مکالمہ نگار ان کی فلموں میں دبنگ قسم کے فقرے بطور تکیہ کلام ضرور رکھا کرتے تھے۔ جو بے حد پسند کیے جاتے تھے اور کئی فلموں کی مقبولیت میں اضافے کا سبب بن جاتے تھے۔ ان کی ''بڑک'' بھی بہت پسند کی جاتی تھی۔ وہ بہت طرح دار، بانکے چھبیلے اور شان دار انسان تھے۔ اداکار بھی بہت اچھے تھے مگر فلم سازوں نے (اور قسمت نے) انہیں ولن بنا دیا تھا۔

ایک رات ہم مطالعے میں مصروف تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلی فون اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ انہوں نے پوچھا ''یہ آفاقی صاحب کا مکان ہے؟''

''جی ہاں۔ میں بول رہا ہوں۔''

''السلام علیکم۔ میرا نام انجینئر ظہور الدین ہے۔''

وہ پشاور سے بول رہے تھے۔ انہیں شکایت تھی کہ ہم نے دو مشہور و معروف پٹھان اداکاروں گل حمید اور اختر نواز کے بارے میں نہیں لکھا تو کیوں نہیں لکھا۔ اپنے تعارف میں انہوں نے بتایا تھا کہ وہ باقاعدگی سے فلمی الف لیلہ کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔

عرض کی کہ ان دونوں حضرات کے بارے میں لکھا جا چکا ہے۔ گل حمید کے بارے میں ہم نے بہت تفصیل سے لکھا تھا کیونکہ لاہور میں ہم ان سے ملتے رہے تھے۔ وہ ایک انگریزی سینما کے منیجر تھے اور نہایت شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ لمبا قد، گورا چٹا رنگ، سیاہ بال، پٹھانی ناک نقشہ، رعب دار آواز اور بے حد اسمارٹ۔ گرمیوں میں عموماً سفید قمیض اور پتلون پہنا کرتے تھے۔ بے حد خوش لباس، خوش اخلاق اور جامہ زیب انسان تھے۔ بعد میں ان سے بارہا ملاقاتیں ہوتی رہیں پھر وہ ہمارے دوست ثناءاللہ خاں گنڈاپور کے خسر بھی بن گئے۔ ایورنیو اسٹوڈیو، ایورنیو۔۔۔ پکچرز کے دفتر میں ان سے اکثر ملنا ہوتا رہتا تھا۔ وہ تھے تو پٹھان مگر بالکل انگریز تھے۔ بااصول، مہذب اور کھرے۔ آغا جی اے گل سے بھی صاف صاف بات کر لیتے تھے اور کیوں نہ کرتے۔ وہ کلکتہ میں ہیرو تھے تو اس زمانے میں انہوں نے انڈین فلموں کے بے تاج بادشاہ سیٹھ کرنانی سے دشمنی مول لے لی تھی اور اختلاف کی بنا پر نوکری کو لات مار کر چلے آئے تھے۔

سیٹھ نے کہا تھا میں اسے فلموں اور کلکتہ میں نہیں رہنے دوں گا۔ اختر نواز صاحب نے ڈیری فارم کا بزنس شروع کر دیا اور کلکتہ ہی میں رہے۔ بہر حال۔ ان کے واقعات بہت تفصیل سے ہم سپرد قلم کر چکے ہیں۔ چند دن پہلے ان کا عنایت نامہ موصول ہوا۔ انہوں نے ٹیلی فون پر بھی بتایا تھا اور اس خط میں بھی لکھا کہ وہ گل حمید اور اختر نواز کے بہت بڑے پرستار ہیں۔ گل حمید کے بارے میں انہوں نے ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ اس کی فوٹو کاپی انہوں نے ہمیں ارسال کی ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے گل حمید کے بارے میں بہت سی ایسی معلومات فراہم کی ہیں جو ہم حاصل نہیں کر سکے تھے۔

گل حمید کی ذاتی زندگی کی کہانی بھی کسی فلم کی کہانی سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ ظہور صاحب نے ان کے بارے میں اپنا جو مضمون ارسال کیا ہے اس میں فراہم کردہ معلومات کی بنا پر برصغیر کے اس عظیم ہیرو کے بارے میں یہ سطور لکھی جارہی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گل حمید اپنے زمانے میں برصغیر کے مقبول ترین ہیرو تھے۔ وہ پٹھان تھے۔ ان کی مادری زبان پشتو تھی۔ ضلع نوشہرہ کے موضع پیرپیائی میں انہوں نے جنم لیا تھا۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ناقدری اور نفسانفسی کا عالم ہے۔ یہاں تک کہ متعلقہ شعبوں سے تعلق رکھنے والے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے تک تاریخی ریکارڈ اکٹھا کر کے عوام کو ماضی کے فنکاروں اور تخلیق کاروں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے اور انہیں باخبر کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ جو قومیں اپنے ماضی کو یاد نہیں رکھتیں وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ہالی ووڈ اور اب بھارت میں پرانی فلمی ہستیوں کے بارے میں لکھی جانے والی کتابیں اور خصوصی طور پر بنائی جانے والی ویڈیو فلمیں دیکھتی ہیں تو ان میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں کسی نے یہ بتانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی خود ان کا ماضی کس قدر تابناک اور قابل فخر رہا ہے اور اس خاکستر میں کیسی کیسی چنگاریاں اور شعلے محوخواب ہیں کہنے کو ہمارے ملک میں علم و ادب اور فنون لطیفہ سے متعلق درجنوں سرکاری ادارے موجود ہیں جن پر قوم اب تک کروڑوں روپے صرف کرچکی ہے لیکن یہ آج تک کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکے۔ یہاں تک کہ اپنے اپنے شعبوں سے متعلق تاریخی ریکارڈ اور ضروری معلومات تک یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع نہیں کرسکے۔

فلمی صنعت کے حوالے سے ہمارے ملک میں کتنے سرکاری ادارے بن چکے ہیں۔ نیف ڈیک نے تو ابھی کچھ عرصہ قبل دم توڑا ہے، یہ ادارہ سالہاسال تک لاکھوں کروڑوں روپے لٹاتا رہا ہے لیکن کسی کو پرانی فلموں، پرانے فنکاروں اور تخلیق کاروں کے بارے میں تاریخی مواد یکجا کرنے اور انہیں سلیقے سے عوام تک پہنچانے کی توفیق نہ ہوسکی۔ اس کے علاوہ پاکستان فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن بھی سالہا سال تک اپنی شان و شوکت اور حکمرانی کا بگل بجاتی رہی ہیں۔ شان دار دفاتر، دعوتیں، کھانے، تقاریب، ملک ملک کے دورے، سب کچھ کیا لیکن پاکستان کی فلمی صنعت کے بارے میں کوئی ایک مختصر کتابچہ تک شائع نہیں کیا۔ پاکستان کے قیام سے پہلے اس علاقے میں کن مسلمان فنکاروں اور

تخلیق کاروں نے فلمی صنعت کا آغاز کیا اور انہوں نے نامساعد حالات میں کیسے کیسے کارنامے سرانجام دیے اس بارے میں کوئی تردد نہ کیا گیا۔ پاکستان فلم ایکسپورٹ کارپوریشن کے دفاتر لندن میں بھی تھے مگر قسم لے لیجئے جو اس ادارے نے لیپاپوتی کے سوا پاکستانی فلموں کو یورپ میں فروغ دینے کیلیئے دھیلے کا بھی کام کیا ہو بلکہ اس کے برعکس مشکلات ہی پیدا کرتے رہے۔ان کے مقابلے میں مختلف سر پھرے افراد نے بہت کام کیا ہے جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ جس ملک میں یہ بنیادی فرائض تک فراموش کر دیے جائیں اور سرکاری و نیم سرکاری یا پرائیویٹ ادارے محض اپنے حلوے مانڈے سے ہی غرض رکھیں اور اپنے فرائض کا احساس تک نہ کریں وہاں اس قسم کی مایوسی محرومی اور اپنے ماضی کی ثقافت، روایات اور افراد کے بارے میں لاعلمی عام ہو جاتی ہے۔

بہر حال۔ یہ ایک علیحدہ اور بے حد تکلیف دہ موضوع ہے۔ ہر قومی شعبہ اس بیماری میں مبتلا ہے۔اب اس کا ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔آپ اسے پس مرگ واویلا بھی کہہ سکتے ہیں۔اس کے باوجود ایسے قدردان بھی موجود ہیں جنہوں نے اپنے ہیروز اور پیش رو تخلیق کاروں اور فنکاروں کو دلوں میں بٹھا رکھا ہے۔ان میں ایک نام شاہد پردیسی کا بھی ہے۔انہوں نے تن تنہا فلموں کے بارے میں معلومات یکجا کر کے شائع کرنے کے سلسلے میں جو گراں قدر کام کیا ہے ہمارا کوئی سرکاری ادارہ اس کا عشر عشیر بھی نہ کر سکا۔شاہد پردیسی ایک جوان آدمی ہیں پرانی فلموں اور شخصیات کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کا اُنہیں دیوانگی کی حد تک شوق ہے۔ہم نے بھی ان سے بہت استفادہ کیا ہے۔اگر ان کے تحریر کردہ مضامین کو کمپیوٹر میں محفوظ کر لیا جائے اور انہیں کتابی صورت میں یکجا کر کے شائع کیا جائے تو یہ ایک نادر تاریخی کام ہو گا لیکن افسر تو شاید ان کا نام تک نہیں جانتے۔اداروں کے سربراہ ان کی موجودگی سے ہی یکسر بے خبر ہیں۔فنون لطیفہ سے متعلق ادارے آج بھی یہ کام کر سکتے ہیں لیکن انہیں اپنی دیگر شاہانہ مصروفیات سے فرصت ملے تو اس طرف بھی توجہ دیں اور یہ قریب قریب ناممکن ہے۔

گل حمید کی کہانی جو ظہور انجینئر صاحب نے ہمیں فراہم کی ہے، ان کے مطابق یہ بالکل مستند ہے اور انہوں نے کافی تحقیق کے بعد حاصل کی ہے۔اب گل حمید کی کہانی سنئے۔ یہ وہ ہیرو تھا جسے اس پس ماندہ دور میں بے شمار خطوط موصول

ہوا کرتے تھے۔ فلم بین اس کے شیدائی تھے۔ لڑکیاں اس کی دیوانی تھیں۔ اس کی وفات کی خبر سن کر کئی لڑکیوں نے خودکشی کرلی تھی۔ ایسی مثال صرف ہالی وڈ کے ایک ہیرو ''ویلنٹینو'' کی ہے جو اسپتال میں بیمار رہنے کے بعد فوت ہو گیا تو کئی لڑکیوں نے خودکشی کرلی تھی۔ وہ بھی عین جوانی میں دنیا سے رخصت ہوا تھا۔ گل حمید ہی کی طرح خوب رو اور شان دار شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا تذکرہ پہلے بھی کیا جاچکا ہے۔ یہاں تک کہ اس زمانے کی اکثر معروف ہیروئنیں اس کی جاذب نظر شخصیت اور مردانہ حسن و جمال کے باعث اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی تھیں۔

ظہور صاحب کی معلومات کے مطابق گل حمید کا طویل بیماری کے بعد 16 اپریل 1937ء کو انتقال ہوا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف 27 سال تھی۔

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مگر گل حمید نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز 1929ء میں پولیس انسپکٹر کے عہدے سے استعفیٰ دینے کے بعد کیا تھا اور 1937ء میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس طرح گل حمید کی اداکاری کا زمانہ چھ سات سال کے مختصر عرصے پر محیط ہے اس دوران میں بھی وہ ایک مرتبہ فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو گیا تھا مگر اے آر کاردار کے اصرار پر دوبارہ فلم ''چندر گپتا'' میں کام کیا۔ اس سے پہلے گل حمید نے خاموش فلموں میں اداکاری کی تھی۔ جب بولتی فلموں کا زمانہ آیا تو وہ اس کے تقاضے پورے نہ کرنے کے خیال سے فلموں سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ دراصل اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ گل حمید کا لب و لہجہ خالص پشتو انداز کا تھا۔ خاموش فلموں میں تو یہ کوئی برائی نہ تھی لیکن بولتی فلموں میں اداکاروں کے تلفظ اور لب و لہجے پر کافی توجہ دی جاتی تھی۔

چنانچہ کچھ عرصے کی بے روزگاری کے بعد کلکتہ سے کاردار صاحب کا تار موصول ہوا تو گل حمید نے فوراً بوریا بستر باندھا اور کلکتہ پہنچ گیا۔ کاردار صاحب نے ''چندر گپتا'' کے مرکزی کردار کیلئے گل حمید کو منتخب کیا تھا مگر گل حمید کا تلفظ اور لہجہ بہت کرخت تھا۔ گل حمید کو تلفظ بہتر بنانے کیلئے تربیت دی گئی جس کے بعد فلم کی شوٹنگ کا آغاز ہوا۔ اس فلم میں

سیتادیوی ہیروئن تھیں جو گل حمید کی پسندیدہ ہیروئن تھیں۔ ’’چندر گپتا‘‘ ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی اوراس طرح گل حمید کی فلمی زندگی کادوسرادور شروع ہوا۔

اس سے پہلے کی کہانی بھی سن لیجئے۔ ظہور صاحب کے مطابق گل حمید فرنٹیئر پولیس فورس میں سب انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔کانگریس کے ایک اجلاس کی رپورٹ کے سلسلے میں وہ لاہور پہنچاتو قسمت اس کے لیے بازو پھیلائے منتظر کھڑی تھی۔ یہاں اس کی ملاقات ایک دوست کے ذریعے اے،آر،کاردار صاحب سے ہوئی۔کاردار صاحب نے فلم سازی کاآغاز کردیا تھااورایک نامور فلم سازاور ہدایت کارتھے۔انہوں نے گل حمید کی شان دار شخصیت کودیکھا توفلموں میں کام کرنے کی پیشکش کردی۔ کہاں ایک اکھڑ پٹھان پولیس سب انسپکٹراور کہاں فلم کی اداکاری؟ مگر کاردار صاحب کی فلم کمپنی میں ملازمت کرلی۔

گل حمید کی اداکاری کاآغاز چھوٹے موٹے کرداروں سے ہوا تھا۔کاردار صاحب نے سب سے پہلے گل حمید کو فلم ’’صفدر جنگ‘‘ میں آزمایا۔1930ء میں فلم بریو ہارٹ ((BRAVE HEART)اس زمانے میں فلموں کے انگریزی نام رکھنے کارواج تھا(میں گل حمید نے ولن کی حیثیت سے کام کیااور تیسری فلم گولڈن ڈیگر میں انہیں ہیروبنادیا گیااس فلم میں گل حمید کی ہیروئن کلی زان تھی۔

کاردار صاحب کی اگلی فلم ’’ونڈرنگ ڈانسر‘‘ تھی۔کاردار صاحب اس فلم میں گل حمید کو ولن کے طور پر لیناچاہتے تھے مگر گل حمید کی درخواست پرانہیں ہیروکاسٹ کر لیا گیا۔اس فلم کی ہیروئن رقیہ خاتون تھیں۔ کہتے ہیں کہ گل حمید نے جتنی ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا تھارقیہ خاتون ان میں سب سے زیادہ خوب صورت اور شائستہ تھیں۔فلم کی شوٹنگ کے دوران میں ان دونوں کے بہت اچھے تعلقات ہوگئے تھے۔اس فلم نے کامیابی بھی حاصل کی مگر کچھ عرصے بعد گل حمید کی رقیہ خاتون سے کلکتہ میں ملاقات ہوئی توان کارویہ بدلا ہوا تھا۔گل حمید کیلئے یہ ایک صدمے سے کم نہ تھا۔

اسی دوران میں بولتی فلموں کا آغاز ہو گیا جس کی وجہ سے خاموش فلموں کے بہت فنکار بے روزگار ہو گئے۔ گل حمید بھی ان ہی میں شامل تھے مقبولیت کا دور دیکھنے کے بعد بے روزگاری نے گل حمید کو پریشان کر دیا۔ یہاں تک کہ بیکاری سے تنگ آ کر انہوں نے پولیس کے انگریز آئی جی سے درخواست کی کہ انہیں دوبارہ پولیس میں رکھ لیا جائے۔ آئی جی مسٹر پی لینڈ کو فلمی دنیا میں گل حمید کی کامیابیوں اور مقبولیت کا علم تھا۔ انہوں نے گل حمید کو سمجھایا کہ وہ حوصلہ نہ ہاریں اور فلمی دنیا سے ہی وابستہ رہیں۔ ایک نہ ایک دن انہیں کامیابی ضرور ملے گی۔

آئی جی پی لینڈ کے یہ الفاظ بعد میں حرف بحرف درست ثابت ہوئے۔ گل حمید نے دوبارہ کلکتہ کا رخ کیا کہ اس زمانے میں یہ بہت بڑا فلمی زندگی کا آغاز تھا۔ اے، آر، کاردار صاحب اس زمانے میں لاہور میں تھے۔ ایک روز گل حمید کو کاردار صاحب کی طرف سے بذریعہ تار اطلاع ملی کہ وہ ایک بولتی فلم کی تیاری کے سلسلے میں کلکتہ آ رہے ہیں۔ گل حمید ان سے ملاقات کریں۔ یہ گل حمید کی زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوا۔ کلکتہ میں کاردار صاحب کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے گل حمید کو اپنی متکلم فلم ""چندر گپتا"" کے مرکزی کردار کیلئے منتخب کر لیا۔ اس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

1933ء میں اے آر کاردار نے فلم ""سلطانہ"" بنانے کا اعلان کیا تو گل حمید اس کے ہیرو تھے۔ اب بولتی فلموں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ گل حمید کی جھجک بھی دور ہو چکی تھی اور وہ ایک بولتی فلم میں کامیابی سے اداکاری کا مظاہرہ کر چکے تھے جس کی وجہ سے ان میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ فلم ""سلطانہ"" کی ہیروئن زبیدہ خانم تھیں۔ ظہور صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ کیا یہ وہی مس زبیدہ تھیں جنہوں نے برصغیر کی پہلی بولتی فلم ""عالم آرا"" میں ہیروئن کا کردار کیا تھا؟ لیکن اغلب خیال یہی ہے کہ یہ وہ مس زبیدہ نہیں تھیں۔ انہیں کاردار صاحب نے ان کی ذاتی کشش اور خوب صورتی کو دیکھ کر منتخب کیا تھا۔

""سلطانہ"" کی نمائش ہوئی تو یہ ایک سپر ہٹ فلم ثابت ہوئی جس نے گل حمید کو برصغیر میں سب سے مقبول اور ہر دل عزیز ہیرو بنا دیا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اسی خطے سے تعلق رکھنے والے اداکار دلیپ کمار (یوسف خاں) نے اپنے عہد میں جو بے پناہ مقبولیت حاصل کی تھی گل حمید بھی ""سلطانہ"" کی ریلیز کے بعد اسی طرح مقبول اور محبوب ہو گئے

تھے۔ان کی شہرت خیبر سے راس کماری تک پھیل گئی تھی۔ فلم بین ان کے شیدائی تھے۔اس قدیم زمانے میں بھی بے شمار لڑکیاں (ذرا تصور فرمایئے کہ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے بھی من چلی لڑکیوں کا کیا عالم تھا۔ہم آج کی لڑکیوں کو الزام دیتے ہیں) انہیں خطوط لکھتی تھیں۔تصاویر اس زمانے میں اتنی عام نہیں تھیں اور نہ ہی اخبارات میں شائع ہوتی تھیں لیکن لڑکیاں سنیماؤں میں فلموں کے پوسٹر دیکھ کر ہی آہیں بھرا کرتی تھیں۔

بقول ظہور انجنیئر صاحب کے وہ خطوط میں والہانہ عشق کا اظہار کیا کرتی تھیں۔آٹو گراف اور تصاویر کی فرمائش کرتی تھیں۔گل حمید کے پاس اتنے بہت سے خطوط کا جواب دینا ممکن نہ تھا اس لیے وہ ان خطوط کے جواب گول کر جاتے تھے

فلم ''سلطانہ'' کے بعد گل حمید اپنی مقبولیت کے عروج پر پہنچ گئے تھے۔اس مقبولیت سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنی ذاتی فلم بنانے کا منصوبہ بنایا۔فلم کا نام '' خیبر پاس'' تھا جس کے ہیرو اور ہدایت کار گل حمید تھے۔اس فلم میں ان کی ہیروئن کوپر تھی۔یہ غالباً کوئی مغربی خاتون تھیں کیونکہ اس فلم میں ہیرو انگریزی حکومت کا ایک باغی تھا اور کمشنر کی بیٹی کو اٹھا کر لے گیا تھا اور جو بعد میں اس کے عشق میں گرفتار ہوگئی تھی مگر اس نے لڑکی کو بحفاظت والدین کے پاس واپس پہنچا دیا۔اس کہانی پر مبنی پاکستان میں کئی اردو پشتو فلمیں بنائی گئیں جن میں سے اکثر کو کامیابی حاصل ہوئی۔''خیبر پاس'' نے فقید المثال کامیابی حاصل کی اور سارے ملک میں اس کی دھوم مچ گئی۔ظاہر ہے کہ اس کامیابی کے بعد گل حمید کے ارادے بلند ہو گئے تھے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔گل حمید کی بیماری کا اچانک علم ہوا تھا۔اس سے پہلے وہ بالکل تندرست اور چاق و چوبند تھا۔علاج کرایا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ۔۔۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ گل حمید نے اس خیال سے اپنے آبائی گاؤں پیر پیائی جانے کا فیصلہ کیا کہ ممکن ہے آب و ہوا کی تبدیلی کے باعث افاقہ ہو جائے۔وہاں بھی پرانے اور تجربہ کار حکیموں اور ویدوں کا علاج کرایا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا بلکہ بیماری اور تکلیف میں اضافہ ہوتا رہا۔ اسی زمانے میں اے آر کاردار نے ''پکار'' کے نام سے ایک فلم

بنانے کا پروگرام بنایا۔ وہ اس فلم میں گل حمید کو کاسٹ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے گل حمید کو لانے کیلئے اداکار نذیر کو بطور خاص پیر پیائی بھیجا۔ اداکار نذیر گل حمید کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

وہ صحت منداور خوب صورت انسان بیماری کی وجہ سے انتہائی لاغر اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔ خود گل حمید نے بھی نذیر صاحب سے کہا کہ آپ نے میری حالت تو دیکھ ہی لی ہے۔ آپ کاردار صاحب کو جا کر بتادیں کہ وہ میراانتظار نہ کریں۔ شاید میری قسمت میں اب کلکتہ دیکھنا ہی نہ ہو۔ گل حمید کہ یہ الفاظ بحرف درست ثابت ہوئے۔ ان کی بیماری بڑھتی چلی گئی۔ اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شاید وہ کینسر میں مبتلا ہوگئے تھے۔ اس زمانے میں اس بیماری کے نام سے کوئی واقف نہ تھا۔ نہ ہی جدید ترین طریقوں سے ٹیسٹ کرنے اور علاج معالجے اور آپریشن کی سہولتیں موجود تھیں اس طرح یہ عظیم اور محبوب فنکار گھل گھل کر 16 اپریل 1937ء کو انتقال کر گیا۔

سارے ملک میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور فلمی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ کئی پرستار لڑکیوں نے خود کشی کرلی لیکن جانے والے کو واپس لانا کسی کے بس میں نہ تھا۔ اس طرح ہالی وڈ کے محبوب ترین ہیرو ایڈ ولف ویلنٹینو کی طرح ہندوستان کے اس محبوب ترین ہیرو نے بھی عین جوانی کے عالم میں دنیا کو خیر باد کہا۔ چند روز سوگ منایا گیا پھر دنیا کے دستور کے مطابق رفتہ رفتہ لوگ گل حمید کو بھول گئے۔ یہاں تک کہ آج بہت سے لوگ گل حمید کو بھول گئے۔ سوائے پرانے زمانے کے پرستاروں کے جو آج بھی گل حمید کی کمی محسوس کرتے ہیں اور انہیں یاد کرتے ہیں۔

ظہور انجنیئر صاحب نے یہ بھی درست لکھا ہے کہ گل حمید نے اس دور میں بھی اپنا اسلامی نام تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی جبکہ اداکاروں میں ہندوانہ نام رکھنے کا رواج تھا۔ حالانکہ یہ ضروری بھی نہ تھا۔ بہت سے مسلمان اداکار اس زمانے میں بھی اپنے اصلی ناموں سے معروف اور مقبول ہوئے تھے۔ گل حمید کی موت کے بارے میں یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ شاید کسی نے انہیں زہر دے دیا تھا۔ ''خیبر پاس'' کی ہیروئن کوپر کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے لیکن کوپر نے اس زمانے میں اپنی بے گناہی کا اعلان کیا تھا اور گل حمید کے خاندان والوں کو بھی یقین دلانے کی کوشش کی تھی یہ بالکل جھوٹا الزام ہے۔

گل حمید کے پرستاروں خاص طور پر لڑکیوں کے کئی ماہ تک خطوط موصول ہوتے رہے حالانکہ ساری دنیا کو علم ہو چکا تھا کہ اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن دل تو پاگل ہوتا ہے۔ ظہور صاحب نے اپنے مضمون کا اختتام ان سطور سے کیا ہے۔ ''اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ گل حمید کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ اس زمانے میں نہ اس کی تشخیص ہو سکتی تھی اور نہ علاج دریافت ہوا تھا اور یہی بیماری ان کی موت کا سبب بنی۔ امن گڑھ اور ہیڈ پل کی جانب جنوب میں اپنے وقت کا مقبول ترین ہیرو اور لاکھوں دلوں کی دھڑکن گل حمید اپنے آبائی قبرستان میں ابدی نیند سو رہا ہے۔ یہاں گزرتے ہوئے ایک دفعہ مجھے ان کا خیال آیا اور میں نے ایک انگریزی روزنامہ میں ایک خط بہ عنوان "THE FORGOTTON DILIP" شائع کیا جس کو قارئین کی طرف سے کافی پذیرائی ملی تھی''۔ گل حمید نے نہ تو ہندوانہ نام اختیار کیا اور نہ ہی اپنے نام کے ساتھ ''خان'' کا اضافہ کیا۔ صرف اپنے اصلی نام گل حمید ہی کو فلموں میں بھی اپنایا۔ یہ نام بذات خود ایک خوب صورت اور دلکش نام ہے جو کسی اضافے کا محتاج نہیں ہے۔

☆

خاموش اور بولتی فلموں کا ذکر چل نکلا ہے تو اس سلسلے میں ایک بہت دلچسپ بات کا تذکرہ کرنا بھی نامناسب ہو گا۔ ''اردشیر ایرانی'' ہندوستان کی پہلی ناطق فلم ''عالم آرا'' کے خالق تھے۔ پچھلے دنوں ان کے بارے میں ایک ماہنامے میں تعارفی مضمون شائع ہوا تھا جس میں مضمون نگار نے یہ دلچسپ انکشاف کیا تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح نے بھی ایک فلمی اداکار کے مقدمے کی پیروی کی تھی۔ یہ اداکار فلم ''عالم آرا'' کے ہیرو ماسٹر وٹھل تھے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ماسٹر وٹھل نے جب ''عالم آرا'' میں کام کیا تھا تو وہ کسی اور فلم کمپنی کی ملازمت میں تھے جس کی رو سے وہ کسی اور کمپنی فلم میں کام نہیں کر سکتے تھے مگر ملک کی پہلی بولتی فلم میں ہیرو کا کردار ادا کرنے کی بات ہی کچھ اور تھی اس لیے ماسٹر وٹھل سارے قاعدے قانون فراموش کر کے ''عالم آرا'' میں کام کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس طرح ان کا نام فلمی تاریخ کا ایک حصہ بن گیا۔ اس فلم کی ہیروئن زبیدہ تھیں۔ مس جلو (یہ اداکارہ نرگس کی والدہ جلو بائی ہیں) جگدیش سیٹھی، سہراب مودی، یعقوب اور پرتھوی راج بھی اس فلم کے اداکاروں میں شامل تھے۔ یہ فلم نمائش کیلئے

پیش ہوئی تو ان کی کمپنی نے ان کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا کہ وہ ہمارے تنخواہ دار ملازم ہیں اس لیے کسی اور فلم میں کام کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ اس مقدمے میں ماسٹر وٹھل کی جانب سے جس وکیل نے پیروی کی وہ محمد علی جناح تھے اور اپنی روایات کے مطابق وہ یہ مقدمہ جیت بھی گئے تھے۔ یہ ایک عجب اور دلچسپ واقعہ ہے جس کا بہت کم لوگوں کو علم ہو گا۔

قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بمبئی میں گزارا تھا جو کہ برصغیر کی فلمی صنعت کا اہم مرکز تھا۔ آج تک اس پہلو پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی کہ اس زمانے میں فلم دیکھنے کیلئے سینما گھر میں کبھی نہ پڑھا نہ سنا کہ کسی نے قائد اعظم کو کسی سینما گھر میں دیکھا ہو۔ محمد حنیف آزاد پاکستان کے بہت ممتاز کیریکٹر ایکٹر تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ بمبئی سے ہجرت کر کے کراچی آ گئے تھے۔۔ ان کی مستقل رہائش کراچی میں تھی مگر وہ فلموں میں کام کرنے کے سلسلے میں اکثر لاہور بھی آتے رہتے تھے۔ ہماری ان سے خاصی یاد اللہ تھی۔ ان کے بارے میں کافی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔ حنیف آزاد کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے آبائی شہر دہلی سے بھاگ کر اداکاری کے شوق میں بمبئی پہنچ گئے تھے مگر وہاں اداکار بننے کے بجائے قائداعظم کے دیدار کے شوق میں ان کی کوٹھی پر گئے تھے جہاں اس روز اتفاق سے ڈرائیور بن گئے۔ دراصل وہ قائداعظم کے دیدار کے شوق میں ان کی کوٹھی پر گئے تھے جہاں اس روز اتفاق سے ڈرائیوری کے امیدواروں کے انٹرویو لیے جا رہے تھے۔

آزاد صاحب بے خبری میں پکڑے گئے اور پھر خوش قسمتی سے قائد اعظم نے ان کا انتخاب بھی کر لیا حالانکہ وہ کار ڈرائیونگ سے ناواقف تھے لیکن قائداعظم کی ملازمت کے شوق و جوش میں ملازمت قبول کر لی۔ بعد میں جو واقعات پیش آئے وہ انہیں بہت احترام کے ساتھ مزے لے لے کر سناتے تھے۔ وہ کہیں سعادت حسن منٹو کے ہاتھ لگ گئے۔ منٹو صاحب نے ان سے کافی دیر تک بات چیت کی اور پھر ان کی تمام گفتگو ''میرا صاحب'' کے عنوان سے ایک خاکے کی صورت میں تحریر فرمائی۔ یہ خاکہ روزنامہ ''آفاق'' میں شائع ہوا تھا اور ہم ظہور عالم شہید صاحب کی جانب سے سنڈے ایڈیشن مرتب کرنے کے ذمے دار تھے۔ اس خاکے میں آزاد صاحب نے قائداعظم کی زندگی کے

کئی نامعلوم پہلو بھی بیان کیے تھے۔حنیف آزاد کا بیان اور منٹو صاحب کا انداز تحریر اس پر مستزاد۔یہ خاکہ اردو کے چند بہترین خاکوں میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔یہ تمام واقعات اس سے پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔اس وقت اس تذکرے کا مقصد یہ ہے کہ آزاد صاحب نے بھی قائداعظم کی زندگی کے اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالی کہ آیا وہ کبھی فلمیں دیکھتے تھے یا نہیں۔قیاس یہی ہے کہ قائداعظم کو فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور شاید انہوں نے کبھی کوئی فلم نہیں دیکھی۔کم از کم بمبئی کے دوران قیام میں تو نہیں دیکھی۔ممکن ہے لندن میں طالب علمی کے زمانے میں فلم بینی کی ہو۔(واللہ اعلم بالصواب)اگر کوئی صاحب اس بارے میں علم رکھتے ہوں تو ضرور دوسروں کی معلومات میں اضافہ کریں۔

یوں تو ہمارے ملک میں چار موسم ہوتے ہیں لیکن ان چار کے علاوہ ایک اور موسم بھی ہوتا ہے جسے فلمی ایوارڈز کا موسم کہنا چاہیے۔اللہ جنت نصیب کرے'' نگار'' کے مالک و مدیر الیاس رشیدی صاحب کو جنہوں نے پاکستان میں فلمی صنعت کی حوصلہ افزائی کے لیے نگار فلم ایوارڈز کا سلسلہ شروع کیا تھا۔اس کار خیر کا آغاز 1957ء میں ہوا تھا۔وہ دن ہے اور آج کا دن۔نگار فلم ایوارڈز کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔

الیاس رشیدی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔لیکن ان کے صاحب زادے اسلم الیاس رشیدی ان کی اس روایت کو جاری رکھے ہوئے ہیں حالانکہ پچھلے سالوں میں انگریزی محاورے کے مطابق پلوں کے نیچے سے بے اندازہ پانی بہہ چکا ہے۔اب نہ وہ فلم سازی رہی جو سال میں سوا سو کے لگ بھگ فلمیں بناتی تھی نہ وہ فلم ساز اور ہدایت کار رہے جن کے نام ہی فلموں کی خوب صورتی اور معیار کی ضمانت ہوتے تھے۔نہ وہ کہانی نویس ہیں مگر بھارتی میڈیا تو دم سادھے ہوئے بیٹھا ہی ہے مگر حیرت اس بات پر ہے کہ پاکستانی اخبارات و جرائد جو پاکستانی فلموں میں بھارتی فلموں کی چربہ سازی کا ڈھنڈورا ساری دنیا میں پیٹا کرتے تھے اور جن کی مہربانیوں سے بیرونی ملکوں میں پاکستانی فلموں کی مارکیٹ ہی ختم ہو کر رہ گئی۔۔۔اب وہ بھی دم بخود چپ سادھے بیٹھے ہیں اور پاکستانی فلموں کی کہانیوں،گانوں اور نغموں کی بھارتی چوری کے خلاف ایک لفظ بھی قلم بند نہیں کرتے۔یہ اپنوں کی مہربانیاں ہیں جنہوں نے ساری دنیا میں بھارتی فلم سازوں اور

تقسیم کاروں کو یہ پراپیگنڈا کرنے کا موقع دیا تھا کہ پاکستان میں تو بھارتی فلموں کے چربے بنائے جاتے ہیں پھر کیوں نہ اصلی بھارتی فلم دیکھ لی جائے بجائے بھونڈا چربہ دیکھنے کے۔ اس پراپیگنڈے کا سحر اس قدر موثر تھا کہ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں نے بھی پاکستانی فلمیں دیکھنی ترک کر دی تھیں اور بھارتی فلموں پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ سند اور تصدیق کے طور پر خود ہمارے اخبارات و جرائد پیش کیے جاتے تھے جو آئے دن قریباً ہر پاکستانی فلم پر بھارت کا چربہ ہونے کا ٹھپا لگا دیتے تھے۔

یہ سلسلہ 1960ء کی دہائی سے انگلستان اور یورپ میں جاری ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب امریکا اور ساری مغربی دنیا میں بھارتی فلموں کا ڈنکا بج رہا ہے اور وہ لاکھوں کروڑوں کا غیر ملکی زر مبادلہ حاصل کرتی ہیں۔ خیر۔ اب تو شکوہ شکایت کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی ہے کیونکہ گزشتہ بیس پچیس سالوں میں ہمارے ان پڑھ فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے پاکستانی فلموں کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے اور یہ اس قدر غیر معیاری ہوتی ہیں کہ خود پاکستانی بھی انہیں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ فلموں کی تعداد بھی گھٹ کر بیس پچیس سالانہ رہ گئی ہے جن میں اکثریت پنجابی اور پشتو فلموں کی ہوتی ہے ان کے معیار کے بارے میں سبھی جانتے ہیں لیکن پاکستانی فلمیں ہمیشہ سے ایسی نہ تھیں۔ ایک زمانے میں یہ محدود وسائل کے باوجود بھارت کی بڑی سے بڑی فلموں کے ہم سر تھیں۔

خیر۔ یہ ایک علیحدہ دکھ بھری داستان ہے۔ پاکستان میں فلمی صنعت اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے اور جو گنتی کی فلمیں تیار ہوتی ہیں ان کی اکثریت کو کسی بھی معیار سے فلمیں کہنا ہی زیادتی ہے۔ دنیا بھر میں سینما اور فلم سازی آسمان کو چھو رہے ہیں لیکن ہمارے ملک میں فلمیں اب تو گلی بن کر رہ گئی ہیں۔ معیار میں گراوٹ اور پستی تو ہر شعبے میں ہی کار فرما ہے لیکن فلمی صنعت کی حالت زار غالباً سب سے زیادہ خراب ہے اور اب تو اس پر آنسو بہانے والے بھی نہیں رہے۔ ذکر ہو رہا تھا ''نگار'' ایوارڈ کا۔ بھارت میں انگریزی کا معروف فلمی جریدہ ''فلم فیئر'' ہر سال فلم ایوارڈز تقسیم کرتا تھا جن کی بڑی اہمیت اور قدر و قیمت تھی پھر بھارتی حکومت نے بھی سرکاری پیمانے پر قومی صدارتی ایوارڈز اور دوسرے کئی قسم کے اعزازات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی پاکستان میں بھی پہلے صدارتی ایوارڈ اور

پھر ''نیشنل فلم ایوارڈ'' کا اجرا کیا گیا لیکن سرکار نے یہ بھاری پتھر چوم کر چھوڑ دیا۔ سالہا سال کے بعد نیشنل ایوارڈز تقسیم ہوتے ہیں وہ اعزاز کی جگہ شرمندگی اور ندامت کا ذریعہ ہیں۔ یہ موازنہ کرنے کی ضرورت صرف یہ بتانے کیلئے پیش آئی کہ ایک تن تنہا، درویش صفت صحافی نے پاکستانی فلمی صنعت کی حوصلہ افزائی اور قدر و منزلت کی خاطر فلم ایوارڈز کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ آج بھی ہر سال بلاناغہ تقسیم کیا جاتا ہے۔ جبکہ نیشنل ایوارڈز کی تقریب دیکھنے کو فلم والوں کی آنکھیں ترستی رہتی ہیں۔ اگرچہ اب اس ایوارڈ کا معیار بھی بوجوہ پہلے جیسا نہیں رہا مگر یہ آج بھی اپنی جگہ بھاری ہے۔ نگار فلم ایوارڈز کی کامیابی کو دیکھ کر دوسرے فلمی جرائد اور مختلف اداروں نے بھی فلم ایوارڈ تقسیم کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا اور اسے پبلسٹی، پیسہ کمانے کا ذریعہ بنا لیا پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب ایک مخصوص عہد میں فلم ایوارڈز ریوڑیوں کی طرح تقسیم ہونے لگے تھے۔ ان میں سے بہت سے کچھ عرصے وضع داری نبھانے کے بعد ختم ہو گئے تو ان کی جگہ دوسروں نے لے لی۔ اب رفتہ رفتہ فلم ایوارڈز کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب فلمیں ہی کم اور انتہائی غیر معیاری بن رہی ہیں تو فلم ایوارڈز تقسیم کرنے کا کوئی سبب باقی نہیں رہ گیا۔ فلم ایوارڈز کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم یہ بھی بتا دیں کہ ہماری فلمی صنعت میں کشادہ دلی اور عالی ظرفی ہمیشہ ایک کمیاب جنس رہی ہے۔ پہلے بھی یہ ہوتا تھا کہ جس فنکار یا تخلیق کار کو ایوارڈ نہیں ملتا تھا وہ دھاندلی اور بے ایمانی کے الزامات عائد کر دیا کرتا تھا۔ ایک زمانے میں یہ کام بھی کسی قدر وضع داری اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ فنکار عموماً اخباری بیانات جاری کرنے سے پرہیز کرتے تھے اور اپنی ناراضی اور ناپسندیدگی کا اظہار پرائیویٹ محفلوں میں شناساؤں کے سامنے ہی کیا کرتے تھے مگر رفتہ رفتہ فلموں کے ساتھ ساتھ فنکاروں اور انسانی قدروں اور ادب و آداب کا معیار بھی گرتا چلا گیا۔ اب جسے ایوارڈ نہ ملے تو وہ کھلے عام الزامات عائد کرتے نہیں ہچکچاتا۔ ہیروئن ایک دوسرے کے خلاف غلیظ اور بے ہودہ الزامات عائد کرنے سے بھی باز نہیں رہتیں۔

ایک بار جب نیشنل فلم ایوارڈز کی جیوری کے صدر جاوید اقبال تھے اور جیوری نے اپنے معیار پر رکھنے کے بعد ایوارڈز کا اعلان کیا تھا تو انجمن جیسی پرانی اور تجربہ کار اداکارہ نے کھلے بندوں اخبارات کو یہ بیان دیا تھا'' مجھے معلوم ہے کہ فلاں ہیروئن کو ایوارڈ کیوں ملا ہے۔ کیونکہ اس نے ججوں کا دل خوش کر دیا ہے جو میں نہیں کر سکتی'' اس قدر اخلاق و آداب

سے گراہوا بیان اور وہ بھی صف اول کی اداکارہ کی زبان سے۔الامان والحفیظ یہ تو محض ایک نمونہ ہے۔ایوارڈ سے محروم ہر شخص ایسے ہی الزامات عائد کرتا رہتا ہے۔ خصوصاً فلمی ہیروئنوں کے بیانات سے تو سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ مگر شکایت کی گنجائش نہیں ہے۔اس معیار اور کردار کے لوگوں سے بہتر اخلاق کی کیوں کر توقع کی جاسکتی ہے۔کاروباری رقابتیں ہر زمانے اور ہر ملک میں کارفرما رہی ہیں لیکن اظہار واحتجاج کا ایک طریقہ ہوا کرتا تھا۔صبیحہ خانم اور مسرت نذیر کی باہمی رقابت کا یہ عالم تھا کہ وہ دونوں کبھی بیک وقت ایک ہی چھت کے نیچے اکٹھی نہیں ہوئیں ۔ ایک کے رخصت ہو جانے کے بعد دوسری کی آمد ہوتی تھی لیکن کبھی ایک دوسرے کے خلاف الزامات اور زبان درازی کی نوبت نہیں آئی تھی۔

یہی عالم دوسری ہیروئنیں کا بھی تھا۔ایک وقت ایسا تھا جب پاکستان کی فلمی صنعت میں ممتاز ہیروئنوں اور ہیروز بہت بڑی تعداد میں تھے۔ان کی فلمیں بھی معیاری ہوتی تھیں۔انہیں فلم بین پسند بھی کرتے تھے مگر ظاہر ہے کہ ''نگار'' ایوارڈ تو ایک سال میں ایک ہی فنکار یا فنکارہ کو مل سکتا تھا پھر بھی اس قسم کے عامیانہ بیانات کبھی سننے میں نہیں آئے ۔ اس سے فلموں اور فلم سے وابستہ لوگوں کے معیار کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب فلم ایوارڈز کی کثرت ہوگئی۔ بہتر کارکردگی کا کوئی پیمانہ نہیں رہا جس کی وجہ سے ہر فنکار کے حصے میں کوئی نہ کوئی ایوارڈ آجاتا تھا لیکن اب رفتہ رفتہ ایوارڈز کی تعداد میں کمی پیدا ہو رہی ہے۔اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ملک میں فلم اسٹار بہت کم ہوگئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تقریبات میں فلم اسٹاروں کے دم قدم سے ہی رونق ہوتی ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ فلم اسٹاروں کی باہمی چپقلش کی وجہ سے بہت سے فنکار پیشگی شرط لگادیتے ہیں کہ مجھے ایوارڈ ضرور دیا جائے ورنہ پھر کوئی اور بندوبست کرلیں۔اب ظاہر ہے کہ ہر ایک کو تو ایوارڈ دیا نہیں جاسکتا پھر بھی بعض ہوشیار ایوارڈز دینے والے مختلف بہانوں سے سبھی کو مختلف ''کارناموں'' کے حوالے سے ایوارڈ دے کر انہیں مطمئن کردیتے ہیں۔اس کے باوجود تقریب میں رونق نظر نہیں آتی۔بنیادی وجہ یہ ہے کہ پہلے تو فلمی فنکار محض فلموں میں ہی کام کرتے تھے۔اب وہ طائفے بنا کر بیرونی ملکوں کے دوروں پر نکل جاتے ہیں اس لیے دستیاب نہیں ہوتے۔ان وجوہات کی بنا پر اب ایوارڈ کی اقسام اور تقریبات میں کمی کا ایک اور سبب بن گیا ہے۔

فلمی فنکاروں کی کمی پوری کرنے کیلیئے اب ٹی وی کے فنکاروں کا سہارا لیا جاتا ہے لیکن ٹی وی والے اپنے آپ چاہے کتنے ہی گن گائیں مگر یہ حقیقت ہے کہ فلمی ستاروں جیسی دلکشی اور کشش ان میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ کسی بھی رنگا رنگ تقریب میں فلمی ستاروں کی موجودگی اس کی رونق میں چار چاند لگا دیتی ہے۔

یہ تو ہمارے ملک کے فلمی ایوارڈز کی صورت حال ہے۔ بھارت کی فلمی صنعت کافی بڑی ہے۔ وہاں آٹھ سو سے زائد فلمیں بنتی ہیں جن میں ہندی (اردو) فلموں کی تعداد ڈیڑھ سو سالانہ کے لگ بھگ ہے لیکن وہاں بھی ممتاز اور قابل ذکر فنکار انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں پھر وہاں علاقائی زبانوں کی فلمیں بہت زیادہ ترقی یافتہ اور مقبول ہیں اس لیے ہندی فلموں کے ایوارڈ کے لیے مقابلے میں حصہ لینے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ ’’فلم فیئر ایوارڈ‘‘ آج بھی بالی وڈ کے مقبول ترین فلمی ایوارڈز سمجھے جاتے ہیں۔ یہ معتبر بھی ہوتے ہیں اور ان کے حاصل کرنے والوں کو واقعی خوش نصیب سمجھا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ صدارتی اور دیگر انعامات بھی ہر سال تقسیم کیے جاتے ہیں۔ بھارتی فلمی صنعت میں تعلیم یافتہ افراد بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اب وہاں جاہل اور ان پڑھ لوگوں کا قحط پڑ گیا ہے تو درست ہو گا۔ وہاں کے اداکار ، موسیقار ، فلمساز، ہدایت کار، مصنف اور دوسرے تمام ہنر مند اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تعلیم بھارتی فلمی صنعت کا کچھ نہیں بگاڑ سکی ہے اور وہاں اب بھی بیشتر فلمیں بے تکی، بے مغز اور بے سر وپا بنائی جاتی ہیں لیکن ان کے پیچھے بھی تعلیم یافتہ اور شائستہ افراد کا ہاتھ نظر آ جاتا ہے۔ ہر سال وہاں کچھ قابل ذکر بات یہ ہے کہ بھارت میں علاقائی زبانوں کی فلمیں بہت زیادہ ترقی یافتہ اور منافع بخش ہیں۔ ذہین اور تعلیم یافتہ افراد ان میں کثرت سے موجود ہیں ۔ تامل، گجراتی، مراہٹی، بنگالی ادب بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے جس کی وجہ سے وہاں عموماً اچھی کہانیاں اور اچھے موضوعات کو فلمایا جاتا ہے۔ اپنے علاقوں میں یہ فلمیں بہت زیادہ کامیاب ہوتی اور خوب پیسہ بھی کماتی ہیں ۔ ہندی (اردو کو اب وہاں ہندی کہا جاتا ہے) فلموں کے فلم ساز مقبول اور کامیاب علاقائی فلموں کو ہندی میں بنا کر بہت کامیابی اور منافع حاصل کرتے ہیں۔ یہ رواج وہاں بہت پرانا ہے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد مدراس کی کامیاب فلمیں جب اردو میں بنائی گئیں تو انہیں بے انتہا پذیرائی حاصل ہوئی یہاں تک کہ مدراسی ہیروئنیں بمبئی کی فلمی صنعت پر چھا گئیں۔ مدراس کی فلمی صنعت مالی اعتبار سے بھی بہت آگے بھی۔ فلم اسٹوڈیو بہت اچھے اور منظم تھے۔ فلم ساز دولت مند تھے۔ اس لیے جب انہوں نے بمبئی سے اردو کے مقبول ترین فنکاروں کو مدراس بلا کر فلمیں بنائیں تو نہ صرف بہت زیادہ دولت کمائی بلکہ فنکاروں کو بھی نہال کر دیا۔ بمبئی کے قرضہ لے کر فلم بنانے والے فلم سازان فنکاروں کو نہ تو اتنا زیادہ معاوضہ دے سکتے تھے اور نہ ہی یک مشت ادائیگی کر سکتے تھے جبکہ مدراس کے فلم ساز ایک ماہ یا ڈیڑھ ماہ کے لیے فنکاروں کی خدمات حاصل کر کے انہیں تمام معاوضہ ادا کر دیا کرتے تھے اور ایک ڈیڑھ مہینے میں انہیں فارغ بھی کر دیا کرتے تھے۔ اس کے برعکس بمبئی میں فلمیں سالوں میں بنتی تھیں اور معاوضہ کی ادائیگی بھی فلم بندی کی رفتار کے مطابق اقساط میں کی جاتی تھی۔ ایک زمانہ ایسا بھی آگیا تھا جب دلیپ کمار، راج کپور، دیو آنند، مینا کماری، نمی، نرگس جیسے فنکار مدراس کی فلموں میں کام کرنے کو ترجیح دینے لگے تھے۔

ذکر فلم ایوارڈ کا تھا اور بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ فلم ایوارڈز کے سلسلے میں آج بھی بمبئی کے فلم فیئر ایوارڈز ہی بالی وڈ کے معتبر ترین ایوارڈز سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں سرکاری ایوارڈز کو بھی زیادہ مقبولیت اور اہمیت حاصل نہیں ہے۔ جو نئی دہلی میں منعقد ہوتے ہیں۔ فلم فیئر ایوارڈز کے امیدواروں میں مقابلہ بہت سخت ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسی زمانے میں پاکستان میں نگار فلم ایوارڈز کے سلسلے میں ہوتا تھا۔ انعام پانے والے خوش نصیب کہلاتے ہیں اور ایوارڈ یافتہ ہونے کی وجہ سے ان کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ سرکاری ایوارڈز کے مقابلے میں فلم فیئر ایوارڈز کے ساتھ نقد رقم نہیں دی جاتی اس کے باوجود ان کی اہمیت اور قدر و منزلت فلم بینوں اور فنکاروں کے نزدیک بہت زیادہ ہے۔

بمبئی کی فلمی صنعت میں بھی فنکاروں میں کاروباری رقابتیں ہیں لیکن ایوارڈ سے محروم فنکاروں نے کبھی اوچھے اور عامیانہ بیانات نہیں دیئے۔غالباً یہ ان کی تعلیم وتربیت اور ایک مہذب ماحول میں رہنے کی وجہ ہے جس سے بدقسمتی سے ہماری فلمی صنعت یعنی لالی ووڈ یکسر محروم ہے۔

ہالی وڈ میں سب سے معتبر اور معروف فلم ایوارڈز ''آسکر ایوارڈز'' ہیں۔یوں تو امریکا ہی میں فلمی نقاد اور دوسرے ادارے بھی ایوارڈ تقسیم کرتے ہیں پھر دنیا میں مختلف مقام پر عالمی فلمی میلے منعقد ہوتے ہیں جہاں قابل ذکر فلموں کو ایوارڈز بھی دیے جاتے ہیں۔ان میں کینز کے مقام پر منعقد ہونے والے فلمی میلے اور اس میں تقسیم کیے جانے والے ایوارڈز بھی اہم سمجھے جاتے ہیں لیکن ''آسکر'' کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔عام طور پر اس میں امریکی فلموں ہی کو شامل کیا جاتا ہے لیکن غیر ملکی زبانوں کی پانچ فلمیں بھی اس کیلئے ہر سال نامزد ہوتی ہیں جن میں سے کسی ایک کو مجموعی طور پر بہترین غیر ملکی فلم کا ایوارڈ دیا جاتا ہے۔آسکر ایوارڈز کیلئے مختلف ممالک کے فلم ساز اپنی منتخب فلمیں بھیجتے ہیں جن میں سے ''آسکر'' کمیٹی کے ارکان پانچ بہترین فلموں کا انتخاب کرتے ہیں۔ان میں سے صرف ایک فلم کو مجموعی طور پر بہترین فلم کا ایوارڈ دیا جاتا ہے۔کسی پاکستانی فلم کو کبھی آسکر کیلئے نامزدگی کا مستحق نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ سچ پوچھئے تو کسی پاکستانی فلم ساز نے اس مقابلے میں اپنی فلم شامل کرنے کی جرات ہی نہیں کی۔اس کے برعکس کئی بار بھارتی فلمیں نامزد کی گئیں لیکن آسکر حاصل نہ کرسکیں۔ہدایت کار محبوب کی فلم ''مدر انڈیا'' بھی اس مقابلے میں شریک ہوئی تھی مگر انعام حاصل نہیں کر سکی۔اداکار و فلم ساز عامر خان کی فلم ''لگان'' اس مقابلے میں شریک تھی اور نامزد بھی کرلی گئی تھی۔عامر خان نے ایک ہنر مند کاروباری شومین کی طرح اپنی فلم کی امریکا اور یورپ کے طول و عرض میں بہت کامیابی سے پبلسٹی کی تھی جس پر لاکھوں ڈالر خرچ ہوئے۔انہوں نے اس فلم کے حوالے سے مختلف ملکوں میں خصوصی تقاریب بھی منعقد کیں جن میں بھارتی فلمی صنعت کا بہت چرچا کیا گیا۔بھارتی اخبارات کے مطابق وہ ایک سرکس کے ہمراہ آسکر کی مہم سر کرنے نکلے تھے لیکن تمام ہنر مند اقدامات کے باوجود ان کی فلم ''آسکر'' نہ حاصل کر سکی لیکن عامر خان نے اس کی پبلسٹی کیلئے جو حربے استعمال کیے تھے وہ رائگاں نہیں گئے۔یورپ اور امریکا میں ان کی فلم بہت اچھے داموں پر خرید لی گئی خان نے آسکر کا بھاری پتھر چوم کر چھوڑ دیا لیکن محاورے کے مطابق

آسکر کے پارس پتھر کو چھو لینے کی وجہ سے ان کی فلم ''سونا'' بن گئی اور انہوں نے ساری دنیا میں خوب دولت اور شہرت کمائی۔ اس وقت بھارتی فلمیں ساری دنیا میں دکھائی جاتی ہیں اور خوب کامیاب و کامران ہیں۔ فلم سازوں کو اب ''کماؤ پوت'' کہا جاتا ہے کیونکہ یہ ہر سال کروڑوں ڈالر کما کر لاتے ہیں۔ ہم اس پر حسرت و یاس کے اظہار کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ ہماری پاکستانی فلمیں تو اب ملک ہی میں دیکھنے کے لائق نہیں سمجھی جاتیں۔ باہر کے ملکوں میں ان کی کیا مارکیٹ اور پذیرائی ہو سکتی ہے۔ وہی فارسی کا قول ہے کہ تم نے اندر کون سا کارنامہ سر انجام دیا ہے کہ اب باہر والوں کو منہ دکھانے آ گئے ہو۔ ہمارے فلم سازوں کی ہوشیاری کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے باہر والوں کو منہ دکھانے کی جرات اور کوشش ہی نہیں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ جب اپنوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے تو باہر والوں کے سامنے کس منہ سے جائیں گے۔

بات آسکر ایوارڈ سے شروع ہوئی تھی اور بھارتی فلموں اور اس کی ثقافتی یلغار تک پہنچ گئی۔ امریکی آسکر ایوارڈز کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ ان کی کس قدر اہمیت ہے۔ آسکر حاصل کرنے والی فلمیں یکایک کروڑوں کمانے لگتی ہیں۔ اسی طرح آسکر حاصل کرنے والے فنکاروں اور ہنر مندوں کی عزت و تکریم میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی آمدنی میں بھی لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ آسکر کی۔۔۔ لگ بھگ پون صدی کی تاریخ میں کئی۔۔۔ فنکار اور ہنر مند اس اعزاز سے زندگی بھر محروم ہی رہے حالانکہ وہ اپنے اپنے شعبوں میں نہ صرف انتہائی کامیاب تھے بلکہ نقاد بھی ان کی عظمت کو تسلیم کرتے تھے اور فلم بین بھی ان کے شیدائی تھے۔ آسکر ایوارڈ بے شمار ہدایت کاروں اور فنکاروں نے حاصل کیا۔ بعض خوش نصیبوں کو ایک سے زائد بار بھی ملا مگر کتنی عجیب بات ہے کہ الفریڈ ہچکاک جیسے صاحب ہنر تخلیق کار اور ہدایت کار کو آسکر کے لائق نہ سمجھا گیا۔ ہچکاک کو تجسس کا بادشاہ کہا جاتا تھا۔ اس کی فلموں میں بے انتہا گہرائی اور نفسیاتی مسائل کا تجزیہ شامل ہوتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بے انتہا مقبول اور کامیاب بھی ہوتی تھیں۔ ساری دنیا میں فلم بین ہچکاک کی فلموں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ وہ عجیب و غریب موضوعات انوکھے انداز میں فلماتا تھا اور نرالے کردار تلاش کر کے پیش کرتا تھا۔ اس کی فلموں کی کہانیوں کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا تھا۔ وہ اپنی فلموں کے ذریعے کئی نفسیاتی الجھنیں اور گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کی ہر فلم

دیکھنے والوں کو سوچنے پر مجبور کر دیتی تھی۔اس کی فلموں کا کیمرا ورک، لائٹنگ اور زاویے سب سے مختلف اور انوکھے ہوتے تھے۔دنیا بھر کے لوگ ہچکاک کی فلمیں دیکھنے کے منتظر رہتے تھے۔وہ ہر بار ایک نیا موضوع اور نئے کرداران کے سامنے لاتا تھا اور شاید ہی اس کی کوئی فلم ناکام رہی ہو۔اس کی فلموں میں کام کرنے والے کئی فنکاروں، مصنفوں، اور ہنر مندوں کو آسکر ایوارڈ کے لائق نہ سمجھا گیا۔ہچکاک کو بھی اس کی پروانہ تھی۔وہ ساری زندگی نت نئے موضوعات پر خوب صورت اور سوچنے پر مجبور کرنے والی فلمیں بنانے میں مصروف رہا۔اس نے ''آسکر'' نہ ملنے پر کبھی شکوہ نہیں کیا۔کبھی اس کا تذکرہ تک زبان پر نہیں لایا۔مگر کہتے ہیں کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ہچکاک کے انتقال اس کی فلمیں کامیابی سے نمائش پذیر ہوتی رہیں۔مگر جب نقادوں اور اہل علم و فکر لوگوں نے ہچکاک کی فلموں کا تجزیہ شروع کیا اور انہیں کلاسیکی قرار دے کر طالب علموں کے کورس میں شامل کیا تو فلم والوں کو احساس ہوا کہ انہوں نے اس قدر عظیم تخلیق کار اور ہدایت کار کو ہمیشہ نظر انداز کیوں کیا حالانکہ وہ بے انتہا قدر و منزلت کا حقدار تھا۔وہ اپنی ذات میں ایک اسکول اور ایک ادارہ تھا جس کا ہم پلا آج تک پیدا نہیں ہوا۔چنانچہ اب فلمی صنعت کے مختلف اداروں نے اس کی بے بہا خدمات کا اعتراف کرنا شروع کر دیا ہے۔یہاں تک کہ اسے بعد از مرگ امتیازی خدمات کے سلسلے میں آسکر ایوارڈ بھی پیش کیا گیا ہے۔یہ الفریڈ ہچکاک کی نہیں دراصل خود آسکر ایوارڈ کی عزت افزائی ہے۔

مارلن مونرو کا نام کون نہیں جانتا۔ایک زمانہ اس کے حسن و جمال کا معترف ہے۔اس کی اداکاری کا ایک مخصوص انداز تھا۔بدقسمتی سے وہ اس قدر حسین پُرکشش اور جاذب نظر تھی کہ اس کی اداکارانہ صلاحیتوں پر کسی کی نظر ہی نہیں جاتی تھی۔وہ اس کے چہرے کی شگفتگی اور جسم کی شادابی کے پیچ و خم میں الجھ کر رہ جاتی تھا۔

مارلن مونرو کو فلمی دنیا میں ایک ''دیوی'' کا مرتبہ اس کی زندگی ہی میں حاصل ہو چکا تھا۔اس کی پراسرار جواں مرگی کے بعد اس کی توقیر میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔اس کے بارے میں بے شمار کتابیں لکھیں جا چکی ہیں۔اس کی فلموں کو ایک نادر ذخیرے کی حیثیت سے محفوظ کر لیا گیا ہے۔اس کی زندگی اور اداکاری کے مختلف پہلوؤں سے لیکر اس کی

ذاتی زندگی، ناکام محبتوں اور پر اسرار موت تک ہر پہلو کو کھنگالا جا رہا ہے۔جب تک وہ زندہ رہی ایک سپر اسٹار کہلائی۔اس کی فلمیں دیکھنے کیلئے لوگ دوسری تمام مصروفیات کو ترک یا ملتوی کر دیا کرتے تھے۔وہ جیتے جی ایک لیجنڈ ایک دیوی کا مرتبہ حاصل کر چکی تھی۔سابق امریکی صدر جان کینیڈی سے اس کے مراسم اب ایک کھلا راز ہیں۔صدر کینیڈی کی صدارتی تقریب کے افتتاح کے موقع پر مارلن مونرو نے سرخ رنگ کا خصوصی لباس تیار کرایا تھا اور صدر کے لیے خیر مقدمی گیت گایا تھا جس کی گونج آج تک وائٹ ہاؤس کے در و دیوار میں موجود ہے۔اس کا وہ سرخ گاؤن پچھلے دنوں مہنگے داموں نیلام ہوا ہے۔اس سے وابستہ ہر شے لاکھوں ڈالر میں فروخت ہو جاتی ہے۔

مارلن مونرو کی اداکاری کا مخصوص انداز تھا۔اس کی ہنسی اور مسکراہٹ دیکھنے والوں کے دلوں میں گدگدی پیدا کر دیتی تھیں۔سپر اسٹار بننے کے بعد وہ بے حد موڈی ہو گئی تھی۔دراصل وہ ذہنی سکون اور سچی محبت کی متلاشی تھی۔شہرت و دولت میں اسے زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔اس کی زندگی میں بے شمار لوگ آئے تھے جنہوں نے اسے شادی کے جھانسے بھی دیے تھے۔ان ہی میں جم کینیڈی اور ان کے چھوٹے بھائی رابرٹ کینیڈی بھی شامل تھے۔دونوں نے اسے محبت کے نام پر فریب دیے تھے۔مارلن مونرو کی موت یا خودکشی کے پیچھے ان دونوں ناکام محبتوں کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کی خودکشی یا قتل کے پس پردہ بھی ان دونوں ہی کا ہاتھ بتایا جاتا ہے۔

یہ کوئی قیاس آرائی نہیں۔اس بارے میں امریکا میں بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ان دونوں بھائیوں کا انجام بھی قاتلانہ حملوں کے ذریعے موت کی صورت میں سامنے آیا۔امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک میں آج تک ان دونوں کے قتل کا معما حل نہیں کیا جا سکا ہے۔جس طرح مارلن مونرو کی موت ابھی تک ایک معما ہی ہے۔بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ مکافات عمل یا قدرت کا انتقام ہے۔بہر حال۔یہ ایک علیحدہ داستان ہے جو پہلے بھی تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے۔اپنے نا آسودہ جذبات اور محرومیوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے مارلن مونرو نے اور بھی کئی لوگوں سے محبت کی اور ہر بار دھوکے کھائے۔یہاں تک کہ اس نے ایک کم شکل انسان سے محبت کی مگر کامیابی نہ ملی۔سوچنے کی بات ہے کہ کہاں مارلن مونرو۔۔ایک سیکس سمبل اور کہاں ہنری ملر جیسا صاحب علم و فکر ڈراما نویس مگر دونوں نے ایک

دوسرے میں اپنے دکھوں اور غموں کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش کی مگر مارلن منرو کو یہاں بھی سکون نہ سکا۔ بالآخر وہ عورت جسے یونانی دیویوں سے مشابہت دی جاتی تھی اور جس کے چہرے کو ہیلن آف ٹرائے کے چہرے کا متبادل قرار دیا جاتا تھا۔ دولت، شہرت اور کامیابیوں کی معراج تک رسائی حاصل کرنے کے باوجود مایوس و محروم اور تہی دست ہی رہی یہاں تک کہ ایک المناک فلمی کہانی کے کردار کی طرح پراسرار اور المناک انجام سے دوچار ہو گئی۔

آپ کو یہ جان کر حیرت نہیں ہوئی کہ مارلن منرو کو کبھی آسکر ایوارڈ کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ ذہنی سکون اور تسکین قلب کی طرح وہ عمر بھر آسکر ایوارڈ سے بھی محروم ہی رہی۔ اب ذرا مارلن منرو کی فلمی کامیابیوں کا جائزہ کیجئے۔

مارلن منرو کی فلمیں دیکھنے والے بڑے بڑے نقادوں کا کہنا ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے مارلن منرو اور فلمی کیمرا ایک دوسرے کیلیئے ہی بنائے گئے تھے۔ اس نے اپنی پیش رو انتہائی مقبول اور حسین اداکاراؤں کی جگہ پُر کر دی تھی بلکہ ان سے آگے نکل گئی تھی۔

دراصل یہ وہ اداکارائیں ہیں جنہیں ہالی وڈ کی تاریخ میں انمول اور ناقابل فراموش قرار دیا جاتا ہے۔ اپنے وقت کی گلیمر کوئین جین ہارلو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مجسمہ تھی مگر اسے اداکارہ کہنا سب سے بڑا مذاق ہے۔ اسے اداکاری کی الف ب تک نہیں آتی تھی۔ اس کے برعکس مارلن منرو نے کئی فلموں میں اپنی اداکاری سے دیکھنے والوں کو متاثر بلکہ مسحور کر دیا تھا۔ جسمانی حسن و جمال اپنی جگہ لیکن ڈائمنڈز آر گرلز بیسٹ فرینڈ، بس اسٹاپ، سیون ائر اِچ، سم لائیک اٹ ہاٹ، دیٹ اولڈ بلیک میجک، جنٹلمین پریفرز بلونڈز، آئی ایم تھرو ود لو (میں محبت سے بھر پائی) جیسی فلمیں اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کا شاہکار ہیں۔ اس قدر بے بہا حسن اور ایسی بے پایاں اداکاری اور صلاحیتوں کے باوجود مارلن منرو کو کبھی آسکر کے لائق نہیں سمجھا گیا حالانکہ آسکر حاصل کرنا ہالی وڈ کی ہر فنکارہ کا خواب ہوتا ہے۔ وہ تمام تقریبات میں شریک ہوتی رہی مگر صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے۔ ہاں صرف ایک بار اس کو اسٹیج پر آنے کی زحمت دی گئی تھی۔

جب 1951ء میں اس مشہور زمانہ اداکارہ نے اسٹیج پر آکر بہترین ساؤنڈ ریکارڈنگ کا ایوارڈ پیش کیا تھا۔ اس کے جذبات و احساسات اور محرومیوں کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ وہ یہ ایوارڈ پیش کرے گی۔ اسٹیج پر جانے سے پہلے وہ باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ شاید اپنی محرومی پر اور قدرت اور فلمی صنعت کی ستم ظریفی پر۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہالی وڈ کے فنکار اور تخلیق کار اکیڈمی کو سالانہ چندہ دیا کرتے ہیں مگر مارلن مونرو اپنی بے روائی کے باعث کئی بار چندہ ادا نہیں کر پائی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی یہ کوتاہی اکیڈمی کے ارکان کو ناگوار گزری ہو لیکن یہ کوئی ٹھوس وجہ نہیں ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اکیڈمی کے ارکان جو فلمیں دیکھ کر بہترین افراد کو نامزد کرتے ہیں شاید اس انتظار میں ہوں کہ مارلن مونرو کو کسی فلم میں اور بھی زیادہ اچھی اداکاری کا مظاہرہ کرنے کیلئے ابھی کافی وقت تھا۔ دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس کی عمر صرف 36 سال تھی جو ہالی وڈ میں بھرپور جوانی کی عمر تصور کی جاتی ہے۔

مارلن مونرو کو دوسرے غم کیا کم تھے کہ ایک آسکر نہ ملنے کی محرومی بھی ان میں شامل ہو گئی تھی۔ اپنی محرومیوں اور مایوسیوں کا غصہ اور جھنجلاہٹ وہ دوسروں پر اتارا کرتی تھی۔ فلم سازوں کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے پروائی کا تھا۔ ہالی وڈ میں جہاں وقت کی پابندی لازمی سمجھی جاتی ہے وہ ہمیشہ تاخیر سے شوٹنگ کیلئے سیٹ پر جاتی تھی۔ اس نے جس آخری فلم میں ہالی وڈ کے کنگ "کلارک گیبل" کے ساتھ کام کیا وہ بذات خود اپنے وقت کا سپر اسٹار تھا اور ساری فلمی صنعت اس کا احترام اور لحاظ کرتی تھی۔ اس کو فلمی صنعت میں "کنگ" کہا جاتا تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کے ساتھ شوٹنگ کیلئے بھی مارلن مونرو گھنٹوں تاخیر سے سیٹ پر پہنچتی تھی۔ وہ اس اثنا میں کھولتا اور جلتا رہتا تھا۔ کچھ عرصے بعد ہی اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ اس کی بیوی نے کہا تھا کہ اس کی موت کی ذمے دار مارلن مونرو ہے جس کی وجہ سے وہ فلم کی تیاری کے دوران میں شدید اعصابی تناؤ میں مبتلا رہتا تھا۔ دراصل یہ بھی مارلن مونرو کے احتجاج اور دنیا سے انتقام لینے کا ایک طریقہ تھا۔ مارلن مونرو جب دنیا سے گئی تو بالکل خالی ہاتھ تھی۔ یہاں تک کہ آسکر ایوارڈ سے بھی محروم تھی۔

ارلن مونرو کی اداکاری کا مخصوص انداز تھا۔اس کی ہنسی اور مسکراہٹ دیکھنے والوں کے دلوں میں گدگدی پیدا کر دیتی تھیں۔سپر اسٹار بننے کے بعد وہ بے حد موڈی ہوگئی تھی۔دراصل وہ ذہنی سکون اور سچی محبت کی متلاشی تھی۔شہرت و دولت میں اسے زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کی زندگی میں بے شمار لوگ آئے تھے جنہوں نے اسے شادی کے جھانسے بھی دیے تھے ۔ان ہی میں جم کینیڈی اور ان کے چھوٹے بھائی رابرٹ کینیڈی بھی شامل تھے۔دونوں نے اسے محبت کے نام پر فریب دیے تھے۔مارلن مونرو کی موت یا خودکشی کے پیچھے ان دونوں ناکام محبتوں کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کی خودکشی یا قتل کے پس پردہ بھی ان دونوں ہی کا ہاتھ بتایا جاتا ہے۔

یہ کوئی قیاس آرائی نہیں۔اس بارے میں امریکا میں بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ان دونوں بھائیوں کا انجام بھی قاتلانہ حملوں کے ذریعے موت کی صورت میں سامنے آیا۔امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک میں آج تک ان دونوں کے قتل کا معما حل نہیں کیا جا سکا ہے۔جس طرح مارلن مونرو کی موت ابھی تک ایک معما ہی ہے۔بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ مکافات عمل یا قدرت کا انتقام ہے ۔ بہر حال۔یہ ایک علیحدہ داستان ہے جو پہلے بھی تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے۔اپنے نا آسودہ جذبات اور محرومیوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے مارلن مونرو نے اور بھی کئی لوگوں سے محبت کی اور ہر بار دھوکے کھائے۔یہاں تک کہ اس نے ایک کم شکل انسان سے محبت کی مگر کامیابی نہ ملی۔سوچنے کی بات ہے کہ کہاں مارلن مونرو۔۔۔ایک سیکس سمبل اور کہاں ہنری ملر جیسا صاحب علم و فکر ڈرامانویس مگر دونوں نے ایک دوسرے میں اپنے دکھوں اور غموں کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش کی مگر مارلن مونرو کو یہاں بھی سکون نہ سکا۔بالآخر وہ عورت جسے یونانی دیویوں سے مشابہت دی جاتی تھی اور جس کے چہرے کو ہیلن آف ٹرائے کے چہرے کا متبادل قرار دیا جاتا تھا۔دولت، شہرت اور کامیابیوں کی معراج تک رسائی حاصل کرنے کے باوجود مایوس و محروم اور تہی دست ہی رہی یہاں تک کہ ایک المناک فلمی کہانی کے کردار کی طرح پراسرار اور المناک انجام سے دوچار ہوگئی۔

آپ کو یہ جان کر حیرت نہیں ہوئی کہ مارلن مونرو کو کبھی آسکر ایوارڈ کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ ذہنی سکون اور تسکین قلب کی طرح وہ عمر بھر آسکر ایوارڈ سے بھی محروم ہی رہی۔اب ذرا مارلن مونرو کی فلمی کامیابیوں کا جائزہ کیجئے۔

مارلن منرو کی فلمیں دیکھنے والے بڑے بڑے نقادوں کا کہنا ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے مارلن مونرو اور فلمی کیمرا ایک دوسرے کیلیئے ہی بنائے گئے تھے۔اس نے اپنی پیش روانتہائی مقبول اور حسین اداکاراؤں کی جگہ پُر کردی تھی بلکہ ان سے آگے نکل گئی تھی۔

دراصل یہ وہ اداکارائیں ہیں جنہیں ہالی وڈ کی تاریخ میں انمول اور ناقابل فراموش قرار دیا جاتا ہے ۔ اپنے وقت کی گلیمر کوئین جین ہارلو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مجسمہ تھی مگر اسے اداکارہ کہنا سب سے بڑا مذاق ہے۔اسے اداکاری کی الف ب تک نہیں آتی تھی۔اس کے برعکس مارلن مونرو نے کئی فلموں میں اپنی اداکاری سے دیکھنے والوں کو متاثر بلکہ مسحور کردیا تھا۔جسمانی حسن وجمال اپنی جگہ لیکن ڈائمنڈز آر گرلز بیسٹ فرینڈ' بس اسٹاپ' سیون ائرا چ' سم لائیک اٹ ہاٹ' دیٹ اولڈ بلیک میجک' جنٹلمین پریفرز بلونڈز' آئی ایم تھرو ود لو (میں محبت سے بھر پائی) جیسی فلمیں اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کا شاہکار ہیں۔اس قدر بے بہا حسن اور ایسی بے پایاں اداکاری اور صلاحیتوں کے باوجود مارلن مونرو کو کبھی آسکر کے لائق نہیں سمجھا گیا حالانکہ آسکر حاصل کرنا ہالی وڈ کی ہر فنکارہ کا خواب ہوتا ہے۔وہ تمام تقریبات میں شریک ہوتی رہی مگر صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے۔ہاں صرف ایک باراس کو اسٹیج پر آنے کی زحمت دی گئی تھی۔

جب 1951ء میں اس مشہور زمانہ اداکارہ نے اسٹیج پر آکر بہترین ساؤنڈ ریکارڈنگ کا ایوارڈ پیش کیا تھا۔اس کے جذبات و احساسات اور محرومیوں کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔یہ پہلے ہی طے ہوچکا تھا کہ وہ یہ ایوارڈ پیش کرے گی۔اسٹیج پر جانے سے پہلے وہ باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر روئی ۔ شاید اپنی محرومی پر اور قدرت اور فلمی صنعت کی ستم ظریفی پر۔ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہالی وڈ کے فنکار اور تخلیق کار اکیڈمی کو سالانہ چندہ دیا کرتے ہیں مگر مارلن مونرو اپنی بے روائی کے باعث کئی بار چندہ ادا نہیں کرپائی تھی۔بہت ممکن ہے کہ اس کی یہ کوتاہی اکیڈمی کے ارکان کو ناگوار گزری ہو لیکن یہ کوئی ٹھوس وجہ نہیں ہے۔ایک خیال یہ بھی ہے کہ اکیڈمی کے ارکان جو فلمیں دیکھ کر بہترین افراد کو نامزد کرتے ہیں شاید اس انتظار میں ہوں کہ مارلن مونرو کو کسی فلم میں اور بھی زیادہ اچھی اداکاری کا مظاہرہ

کرنے کیلیئے ابھی کافی وقت تھا۔ دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس کی عمر صرف 36 سال تھی جو ہالی وڈ میں بھرپور جوانی کی عمر تصور کی جاتی ہے۔

مارلن منرو کو دوسرے غم کیا کم تھے کہ ایک آسکر نہ ملنے کی محرومی بھی ان میں شامل ہوگئی تھی۔ اپنی محرومیوں اور مایوسیوں کا غصہ اور جھنجلاہٹ وہ دوسروں پر اتارا کرتی تھی۔ فلم سازوں کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے پروائی کا تھا۔ ہالی وڈ میں جہاں وقت کی پابندی لازمی سمجھی جاتی ہے وہ ہمیشہ تاخیر سے شوٹنگ کیلیئے سیٹ پر جاتی تھی۔ اس نے جس آخری فلم میں ہالی وڈ کے کنگ ''کلارک گیبل'' کے ساتھ کام کیا وہ بذات خود اپنے وقت کا سپر اسٹار تھا اور ساری فلمی صنعت اس کا احترام اور لحاظ کرتی تھی۔ اس کو فلمی صنعت میں ''کنگ'' کہا جاتا تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کے ساتھ شوٹنگ کیلیئے بھی مارلن منرو گھنٹوں تاخیر سے سیٹ پر پہنچتی تھی۔ وہ اس اثنا میں کھولتا اور جلتا رہتا تھا۔ کچھ عرصے بعد ہی اس کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ اس کی بیوی نے کہا تھا کہ اس کی موت کی ذمے دار مارلن منرو ہے جس کی وجہ سے وہ فلم کی تیاری کے دوران میں شدید اعصابی تناؤ میں مبتلا رہتا تھا۔ دراصل یہ بھی مارلن منرو کے احتجاج اور دنیا سے انتقام لینے کا ایک طریقہ تھا۔ مارلن منرو جب دنیا سے گئی تو بالکل خالی ہاتھ تھی۔ یہاں تک کہ آسکر ایوارڈ سے بھی محروم تھی۔

ہالی وڈ کی ایک اور اپنے زمانے کی معروف ترین اداکارہ مارلن ڈیٹرچ تھی۔ 1930ء کی دہائی میں مارلن ڈیٹرچ کو ہالی وڈ ہی میں نہیں ساری دنیا میں حسین ترین اداکارہ کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ مارلن ڈیٹرچ غیر امریکی تھی۔ اس نے زیادہ تر بیرونی ہدایت کاروں کے ساتھ فلموں میں کام کیا تھا مگر یہ فلمیں عالمگیر شہرت کی حامل تھیں۔ مارلن ڈیٹرچ نے زیادہ فلموں میں کام نہیں کیا۔ ان کی کل فلموں کی تعداد غالباً سات سے زیادہ نہیں۔ بے پناہ اور ہمہ گیر شہرت اور مقبولیت کے باوجود انہیں آسکر ایوارڈ کے لائق نہیں سمجھا گیا یہاں تک کہ جب انہوں نے پہلی امریکی فلم ''مراکو'' میں کام کیا تو اس فلم کے حوالے سے انہیں نامزد کیا گیا لیکن وہ ایوارڈ حاصل نہیں کر سکیں۔ مارلن ڈیٹرچ اس زمانے کی مقبول ترین اداکارہ تھیں۔ ان کی فلمیں بے پناہ کامیابی اور دولت حاصل کرتی تھیں اسی وجہ سے وہ اپنے

زمانے کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ تھیں۔ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اسکرین ہی کیلئے تخلیق کی گئی تھیں اور سینما کے پردے پر اس قدر حسین اور پرکشش نظر آتی تھیں کہ لوگ دیکھتے رہ جاتے تھے ۔ ان کی اداکاری کا ایک مخصوص انداز تھا۔سب سے زیادہ نمایاں اور منفرد ان کی آواز تھی جس میں ایک عجیب سرور وانبساط کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ مشہور ناول نگار ارنسٹ ،ہیمنگ وے نے (ان کے کئی ناول فلمائے بھی گئے تھے اور بے حد کامیاب ہوئے تھے مگر انہوں نے اپنے ناول پر مبنی فلم صرف ایک بار دیکھی تھی اور درمیان ہی میں اٹھ کر چلے گئے تھے۔ان کا خیال تھا کہ فلم والے ناولوں کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں)۔

ایک بار مارلن ڈیٹرچ کے بارے میں کہا تھا"اگر اس کے پاس آواز کے سوا کچھ نہ ہوتا پھر بھی وہ محض اپنی آواز سے لوگوں کے دل توڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔وہ بے حد خوبصورت ہے ۔ اس کے چہرے پر ایسی کشش اور خوبصورتی ہے جو زمانے کی گردش سے بے نیاز ہے۔وہ بولتی ہے تو لوگوں کے دل بے قابو ہو جاتے ہیں اور جب وہ چلتی ہے تو زمین اس کے ساتھ چلنے لگتی ہے۔"

ذرا غور فرمایئے کہ یہ خراج تحسین، ہیمنگ وے جیسے مایہ ناز اور خود پسند مصنف نے اس کو پیش کیا تھا مگر آسکر ایوارڈ کے ارکان شاید پتھر دل اور پتھریلی آنکھوں والے تھے کہ جن پر مارلن ڈیٹرچ کا کوئی جادو نہ چل سکا۔اس کو صرف ایک امریکن فلم کیلئے نامزد کیا گیا تھا مگر ایوارڈ اس کے حصے میں نہیں آیا تھا۔اس کی اکثر فلمیں کامیاب ہوئی تھیں مگر ایک فلم نے کامیابی حاصل نہیں کی۔مارلن اس قدر دل برداشتہ ہوئی کہ اس نے اس کے بعد کسی فلم ساز کی بڑی سے بڑی پیشکش بھی قبول نہیں کی۔دراصل وہ کامیابیوں اور کامرانیوں کی اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ ایک ناکامی بھی برداشت نہ کر سکی۔ بالآخر فلم ساز اس کو ایک فلم میں کام کرنے کیلئے آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔اس کا نام (DESTINY RIDES AGAIN) تھا۔اس فلم نے ایسی کامیابی حاصل کی کہ پچھلی فلم کی ناکامی کا صدمہ بھی اس نے بھلا دیا، مارلن نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اپنے عہد کی ایسی اداکارہ تھی جس کے اسکرین پر نمودار ہوتے ہی تماشائیوں میں بجلی کا کرنٹ دوڑ جاتا ہے اور وہ مدہوش بیٹھے اس کو تکتے رہتے ہیں۔

افسوس کہ یہ کچھ بھی کام نہ آیا اور مارلن ڈیٹرچ آسکر سے محروم ہی رہی۔ایک اور اداکارہ جوڈی گارلینڈ تھی۔اس کی اداکاری دیکھ کر بڑے بڑے نقاد ساکت رہ جاتے تھے۔"اے اسٹار از بورن" اور"جج منٹ ان نیور مبرگ" اس کی غیر فانی فلمیں کہی جاتی ہیں جن میں وہ اداکاری کی معراج پر نظر آتی ہے۔اس کی ہر فلم آسکر کی مستحق نظر آتی تھی مگر آسکر کے ججوں کو وہ کبھی نظر نہیں آئی اور نہ ہی وہ کبھی ان کی نگاہوں میں جچی۔آسکر ایوارڈ کے ارکان نے کبھی اس کو توجہ کے لائق نہیں سمجھا۔وہ بہت اچھی گلوکارہ بھی تھی۔لطف کی بات یہ ہے کہ وہ بھی باقاعدگی سے آسکر کا چندہ ادا نہیں کرتی تھی مگر اس کی کمی وہ آسکر تقریب میں نغمے پیش کر کے پوری کر دیا کرتی تھی مگر سنگ دل آسکر کے ججوں کے دل نہیں پسیجے۔کہا جاتا ہے کہ آسکر ایوارڈ کے سلسلے میں بھی پس پردہ سیاست کار فرما ہوتی ہے۔جوڈی گارلینڈ کی ایک خامی یہ تھی کہ وہ اپنے رفقا اور آسکر کے ارکان کے ساتھ بعض اوقات تلخ ہو جاتی تھی مگر اس کی سزا یہ تو نہ تھی کہ اسے آسکر ایوارڈ سے محروم کر دیا جاتا۔آسکر ملے یا نہ ملے اس سے جوڈی گارلینڈ کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔آج بھی اگر اس کی فلمیں دیکھی جائیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کتنی عظیم گلوکارہ اور اداکارہ تھی مگر حیف کہ آسکر ایوارڈ کے ججوں نے شاید اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ جوڈی گارلینڈ نے کبھی اس کا شکوہ نہیں کیا۔

ہم نے جب ہوش سنبھال کر انگریزی فلمیں دیکھنے کا آغاز کیا تو چند دوسرے اداکاروں کے ساتھ ساتھ کیری گرانٹ بھی ہمارے دل پسند ہیرو تھے۔وہ فلموں میں آتے ہی سپر اسٹار کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔انہوں نے لگ بھگ چالیس برس تک بہت سی یادگار اور ناقابل فراموش فلموں میں اداکاری کی اور ہر فلم میں دیکھنے والوں کے دل جیت لیے۔وہ فلم سازوں کے بھی اتنے ہی محبوب تھے کیونکہ ان کی بیشتر فلمیں سپر ہٹ ہوا کرتی تھیں۔وہ اپنے انداز کے منفرد اور انتہائی بے ساختگی سے فطری اداکاری کرنے والے فنکار تھے۔انہوں نے ہر قسم کے کردار کیے اور ہر ایک کے ساتھ پوری طرح انصاف کیا۔رومانی،ایکشن،کامیڈی غرضیکہ وہ کسی بھی قسم کے کردار میں نگینے کی طرح سج جاتے تھے۔انہیں بڑھاپے میں بھی سب سے خوبصورت اداکار کہا جاتا تھا۔وہ اسکرین پر اس قدر پر اعتماد اور بے تکلف نظر آتے تھے کہ دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اداکاری کر رہے ہیں۔دراصل وہ اداکاری کے قائل ہی

نہیں تھے۔وہ وہی کچھ کرتے تھے جو عام زندگی میں اس کردار سے توقع کی جاسکتی تھی اسی وجہ سے وہ کبھی اداکاری کرتے ہوئے نظر نہیں آتے تھے۔ایسا لگتا تھا جیسے حقیقی زندگی میں ایک شخص کو دیکھ رہے ہیں جس میں ذراسی بھی بناوٹ نہیں ہے۔انہوں نے بہت سی کامیاب ترین فلموں میں کام کیااور ہر فلم میں داد تحسین حاصل کی۔

"ٹو کیچ اے تھیف، نارتھ بائی نارتھ ویسٹ، منکی بزنس، ہز گرل فرائیڈے'' ان کی چند یادگار فلمیں ہیں۔وہ ہر کردار میں جان ڈال دیا کرتے تھے۔جس کی وجہ سے وہ سچ مچ یا جیتا جاگتا انسان نظر آنے لگتا تھا۔ذاتی زندگی میں بھی وہ انتہائی مہذب اور شائستہ انسان تھے۔ان سے کبھی کوئی اسکینڈل وابستہ نہیں کیا گیاحالانکہ انہوں نے چالیس سال طویل اداکارانہ زندگی میں اپنے عہد کی کامیاب اور حسین ترین ایکٹریسوں کے ساتھ کام کیا تھا۔ان کی فلمیں دیکھنے کیلئے تماشائی بے چینی سے منتظر رہتے تھے۔انہیں پبلسٹی کی محتاجی بھی نہ تھی۔صرف ان کا نام ہی کسی فلم کی باکس آفس کامیابی کی ضمانت تھا۔ان کی شخصیت انتہائی دلکش اور مقناطیسی تھی۔ان کا بولنے کا انداز بے ساختہ اور فطری تھا۔وہ ہر کردار میں وہی لگتے تھے جو ہدایت کار انہیں بنانا چاہتا تھا۔

چالیس سال کی ریاضت اور مقبولیت کے باوجود کیری گرانٹ کبھی آسکر ایوارڈ حاصل نہیں کرسکے۔انہیں ساری زندگی میں صرف دو بار آسکر کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ایک بار 1941ء میں فلم پینی سرینیڈ (PENNY SERENDAE) کیلئے اور دوسری بار 1944ء میں فلم ''لونلی ہارٹ'' کیلئے لیکن آسکر وہ ایک بار بھی حاصل نہ کرسکے۔وہ اس قدر عظیم فنکار تھے کہ بالآخر فلمی صنعت کو مجموعی طور پر یہ احساس ہونے لگا کہ کیری گرانٹ جیسے فنکار کو اعزاز سے محروم رکھ کر بہت بڑی ناانصافی کی جارہی ہے۔اس کی تلافی کیلئے 1969ء میں پوری فلمی صنعت کی جانب سے ایک شاندار تقریب میں انہیں ایک مجسمہ پیش کیا گیا تھا۔اسے آپ اشک شوئی بھی کہہ سکتے ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ کیری گرانٹ نے ایک بار بھی آسکر ایوارڈ نہ ملنے پر شکایت نہیں کی۔شاید آسکر خود سے کم تر سمجھتے تھے؟ کون جانے؟

ایک اور عظیم فنکار جو ایک روشن ستارے کے مانند یکایک اسکرین پر نمودار ہوا اور ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح اچانک افق سے گر کر زمین پر غائب ہوگیا۔اس کا نام جیمس ڈین تھا۔یہ ہماری جوانی کے دنوں کا ہیرو تھا۔جب وہ پہلی فلم ''ایسٹ آف ایڈن'' میں جلوہ گر ہوا تو ساری دنیا جیسے سحر زدہ ہو کر رہ گئی۔اس فلم میں اس نے ایک باغی نوجوان کا کردار ادا کیا تھا۔ذاتی زندگی میں بھی وہ ایسا ہی تھا۔''ایسٹ آف ایڈن'' سپر ہٹ فلم تھی اور اس کے ساتھ ہی جیمس ڈین بھی راتوں رات ایک بہت بڑا سپر اسٹار بن گیا تھا جس پر دوسرے سپر اسٹار رشک کرنے لگے تھے۔جیمس ڈین نے صرف تین فلموں میں اداکاری کی۔ایسٹ آف ایڈن‘ ربیل ود آؤٹ اے کاز REBEL WITHOUT A CAUSE اور جائنٹ(GIANT)جائنٹ میں بہت عظیم اور نامور فنکار بھی اس کے ساتھ موجود تھے مگر جیمس ڈین ان سب سے مختلف اور نمایاں نظر آتا تھا۔وہ اداکاری نہیں جادو کرتا تھا۔اس کا انداز بالکل فطری اور قدرتی تھا۔اس کی شخصیت میں جادو تھا۔اس کی غمگیں نگاہیں دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتی تھیں۔وہ صرف 24 سال کی عمر میں ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا مگر اس نو عمری میں بھی اس نے جتنی شہرت اور نام کمایا وہ بہت سے اداکار طویل عمر میں بھی نہیں کما سکتے۔اس کی اچانک حادثاتی موت پر ساری دنیا سوگوار ہوگئی تھی۔خدا جانے وہ کہاں سے آیا تھا اور کہاں چلا گیا۔

یوں تو وہ ساری دنیا میں مقبول ہوگیا تھا لیکن وہ امریکیوں کی آنکھوں کا تارا اور لڑکیوں کا راج دلارا تھا۔اس کا چلنے پھرنے‘ اٹھنے بیٹھنے‘ بات کرنے‘ سگریٹ پینے‘ ہنسنے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ فلم بینوں نے اس جیسا کوئی نہ تو اس سے پہلے دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے بعد انہیں ایسا اداکار نظر آیا ۔ اپنی مختصر سی زندگی میں ہی وہ اپنے پیچھے نوجوانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ چھوڑ گیا جو اس کی پیروی کرنا قابل فخر سمجھتا تھا۔اس نے اپنے عقیدت مندوں کا ہجوم اپنے پیچھے چھوڑا جو آج بھی اس کو یاد کرتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔اس کو کبھی آسکر ایوارڈ نہیں ملا مگر یہ کیا کم ہے کہ اپنی پہلی ہی فلم میں اسے آسکر کیلئے نامزد کیا گیا۔اس کی تیسری اور آخری فلم کیلئے بھی وہ نامزد کیا گیا تھا۔اسے دنیا سے جانے کی اتنی جلدی تھی کہ پلک جھپکنے میں وہ تین عظیم فلموں میں کام کر کے رخصت ہوگیا۔جب اسے ''ایسٹ آف ایڈن (EAST OF EDEN)''کیلئے نامزد کیا گیا تو وہ اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔اس کیلئے بھی اس کو

نامزدگی ملی تھی مگر آسکر نہ ملا۔ لوگ حیران ہیں کہ اگر وہ کچھ اور عرصے زندہ رہ جاتا تو کیا قیامت ڈھاتا ؟ ایک حادثے نے فلمی دنیا سے ایک انمول ہیرا چھین لیا۔ مگر غور کیجئے کہ آسکر کے ارکان کا دل اس کی جواں مرگی پر بھی نہ پسیجا۔

اور سب کو تو چھوڑیئے۔ چارلی چپلن کی بات کیجئے۔ چارلی چپلن سے کون واقف نہیں ہے انگلستان میں پیدا ہوا۔ ماں باپ کی علیحدگی کے بعد ماں نے اس کو اور اس کے چھوٹے بھائی کو جیسے تیسے پالا۔ وہ تھیٹر کی معمولی سی اداکارہ تھی جسے کئی بار ذہنی علاج کیلئے اسپتال جانا پڑتا تھا۔ ایسے میں یہ دونوں کم سن بھائی اکیلے رہتے تھے۔ رشتے داروں نے بھی کفالت نہیں کی تو چارلی نے کم عمری ہی میں کام کاج کرنا شروع کر دیا۔

چارلی نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ اس نے اداکاری اور زندگی کا مشاہدہ اپنی ماں سے سیکھا ہے۔ یہ دونوں بھائی دن بھر چھوٹے سے گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ ماں شام کو گھر آتی تو سارے دن کے واقعات اور دلچسپ قصے سناتی تھی۔ وہ جس شخص کا بھی تذکرہ کرتی تھی اس کا ہو بہو نقشہ کھینچ کر رکھ دیتی تھی کہ وہ کیسے چلتا ہے' کیسے بولتا ہے' کیسے ہنستا ہے' چارلی اور اس کا چھوٹا بھائی ہنس ہنس کر دہرے ہو جاتے تھے مگر خوشی کے یہ وقفے بہت مختصر ہوتے تھے کیونکہ اول تو ماں کی آمدنی بہت کم تھی دوسرے وہ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد اسپتال چلی جاتی تھی۔ وہ بے حد حساس اور نفاست پسند عورت تھی۔ غربت اور بے کسی کی زندگی گزارنے کے باوجود بہت خوبصورت گھر اور پر شکوہ زندگی کے خواب دیکھا کرتی تھی مگر ذہنی پریشانیوں نے اسے ذہنی مریض بنا دیا تھا۔ وہ آئے دن علاج کیلئے اسپتال میں داخل کر لی جاتی تھی اور یہ دونوں بھائی تنہا زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ رشتے دار مدد کے نام پر کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر چارلی نے تیرہ چودہ سال کی عمر میں کام کاج کرنا شروع کر دیا تھا۔ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا اسے موقع نہ ملا مگر دنیا بھر میں ایسا نام پیدا کیا کہ ضرب المثل بن گیا۔ اس کو قدرت نے زرخیز اور تخلیقی ذہن سے نوازا تھا۔ بچپن میں وہ انگلستان میں مختلف کام کرتا رہا۔ سرکس میں بھی اور پٹانگ حرکتیں کرنے پر ملازم رہا پھر موقع ملا تو امریکا روانہ ہو گیا۔

امریکا چارلی کیلئے ایک سنہری سرزمین ثابت ہوا۔اداکاری کا اس کو بچپن میں ہی شوق تھا۔ تھیٹر میں چھوٹے موٹے کام کرتا رہا پھر فلموں میں اداکاری کا انداز سب سے جدا تھا حالانکہ اس دور میں بڑے بڑے نامور کامیڈین امریکی فلموں میں موجود تھے۔چارلی نے بہت جلد سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔اداکار کی حیثیت سے کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد وہ ہدایت کار بن گیا ۔ اپنی فلموں کے اسکرپٹ بھی وہ خود ہی لکھتا تھا۔وہ خاموش فلموں کا زمانہ تھا فلم کے منظر کے ساتھ اس کا خلاصہ درج کر دیا جاتا تھا مگر چارلی کی فلموں میں اس کی بھی حاجت نہ تھی۔

اس کی ہر فلم خود اپنی ہی کہانی بیان کر دیتی تھی۔رفتہ رفتہ چارلی چیپلن نے اپنے تمام ہم عصروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔اب وہ فلم ساز بھی بن چکا تھا۔اپنے ذہنٗ تجربےٗ گہرے مشاہدے اور مسلسل مطالعے کی بنا پر اس نے اس عہد میں کئی یادگار فلمیں بنائیں جو ہمیشہ امر رہیں گی اور کلاسیکی فلموں میں شمار کی جائیں گی۔

چارلی کو سیاسی اور سماجی شعور بھی تھا۔اس کی فلمیں محض ہنساتی نہیں تھیں۔ہنسی ہنسی میں کچھ سوچنے پر بھی مجبور کر دیتی تھیں۔دی کڈٗ گریٹ ڈکٹیٹر وغیرہ جنگ کے عہد کی کہانیاں ہیں۔ گریٹ ڈکٹیٹر میں اس نے ہٹلر کا جی بھر کے مذاق اڑایا تھا۔اس کی فلموں کے مناظر ہی نہیں ایک ایک شاٹ بھی معنی خیز ہوتا تھا اور دیکھنے والوں کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا۔اپنی سیاسی بصیرت سے بھرپور فلموں کی وجہ سے اس کا شمار دنیا کے صف اول کے دانش وروں میں ہونے لگا۔اپنے عہد کے نامور ترین مصنفینٗ لیڈروںٗ اور حکومتوں کے سربراہوں سے اس کے برابر کے مراسم تھے جو اس کی خداداد اعلیٰ صلاحیتوں کے مداح تھے۔

چارلی نے پیسہ کمانے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی ماں کو انگلستان سے امریکا بلوا لیا ۔ اس سے پہلے اس نے ایک عالی شان اور خوبصورت مکان تعمیر کرایا جو اس کی ماں کی آرزوؤں کے عین مطابق تھا۔درودیوار کا سفید رنگٗ ہلکے گلابی پردےٗ پھولدار صوفے اور قالینٗ اعلیٰ ترین فرنیچر اور ماں کی پسندیدہ اشیا سے اس گھر کو سجایا گیا تھا۔وہ اشیا جن کی اس کی ماں محض آرزو ہی کیا کرتی تھی۔اس کیلئے وہ خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھیں مگر اس کے ہونہار بیٹے نے ان خوابوں کو حقیقت میں ڈھال دیا تھا۔

چارلی کی ماں کے خیر مقدم کیلئے پورا گھر سرخ گلابوں سے بھرا پڑا تھا۔ جو اس کے پسندیدہ پھول تھے مگر وہ انہیں حاصل کرنے سے معذور رہی تھی۔ اس ٹھاٹ باٹ کے ساتھ چارلی کی ماں اس پر شکوہ محل میں داخل ہوئی مگر اس وقت وہ عقل و شعور سے قطعی بیگانہ ہو چکی تھی۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے' کس ماحول میں ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے کو پہچاننے سے بھی قاصر تھی۔ چارلی کے لیے یہ ایک زبردست صدمہ اور ذہنی دھچکا تھا مگر قدرت کے آگے وہ بے بس تھا۔ ماں جب تک زندہ رہی چارلی نے اسے بے خبر شہزادی کی طرح رکھا حالانکہ وہ ان تمام چیزوں سے بالاتر اور بے خبر تھی۔

چارلی نے اپنی طویل خودنوشت میں یہ تمام واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔ لکھتے ہوئے خود بھی رویا ہے اور پڑھنے والوں کو بھی رلایا ہے۔ وہ ایک سیلف میڈ انسان تھا جو ذرے سے آفتاب بن کر ساری دنیا کو اپنی روشنی سے منور کر رہا تھا۔ امریکا نے عزت' دولت اور شہرت دی تھی اور چارلی نے امریکا کو اقوام عالم میں ایک معتبر مقام دلایا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی برطانوی شہریت ترک نہیں کی۔ وہ خود کو بڑے فخر سے ''برٹش'' کہا کرتا تھا۔ امریکی اس کے اس انداز سے نالاں تھے۔ مزید کشیدگی اس وقت پیدا ہوئی جب اپنے ترقی پسندانہ خیالات اور اشتراکیوں سے میل ملاپ کے باعث اسے کمیونسٹ قرار دے دیا گیا۔ کمیونسٹ ہونا اس وقت امریکا میں بہت بڑی گالی اور جرم عظیم تھا۔ میڈیا ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا۔ چارلی نے اس ذہنیت سے بیزار ہو کر امریکا چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ برطانیہ چلا گیا۔ باقی زندگی اس نے سوئزرلینڈ کے ایک پرسکون چھوٹے سے قصبے ویوے میں گزار دی۔

چارلی امریکا چھوڑنے پر کبھی نہیں پچھتایا البتہ امریکیوں کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ وہ کیسے در نایاب سے محروم ہو گئے ہیں۔ چارلی کو امریکا واپس لانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ وہ امریکا کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہہ چکا تھا۔ خاموش فلموں کے زمانے میں وہ بہت بڑا نام تھا۔ بولتی فلموں کا دور آیا تو چارلی چپلن نے فلم سازی اور اداکاری ترک کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ فلم کا ہر منظر بذات خود اپنی وضاحت کر دیتا ہے۔ مکالمے اس کے خیال میں فلم کے حسن کیلئے زہر قاتل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے فلم سازی سے قطع تعلق کر لیا۔ کافی زمانہ گزرنے کے بعد اس نے ایک رنگین

متکلم فلم بنائی مگر اس فلم کو بناتے ہوئے اس کو قطعی لطف نہیں آیا۔ وہ مکالمے لکھتا اور پڑھتا رہا۔ اس کے نزدیک مکالمے قطعی غیر ضروری چیز تھے۔ کافی عرصے تک فلم سازی' کہانی نویسی اور ہدایت کاری سے دور رہنے کی وجہ سے وہ وقت کے تقاضوں سے بھی لاعلم تھا۔ اس کی یہ فلم کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کے بعد چارلی چپلن نے کوئی فلم نہیں بنائی نہ ہی کسی فلم میں کام کیا۔ اسکے باوجود وہ ایک غیر فانی حیثیت کا مالک ہے۔ دنیائے فلم کی تاریخ اس کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس نے خاموش' بلیک اینڈ وائٹ فلموں کے زمانے میں شاہکار تخلیق کیے تھے جن کی مثال کوئی دوسرا پیش نہیں کرسکا۔ اس کی اداکاری کا انداز یہاں تک کہ حلیہ تک سب سے مختلف تھا۔ اس کی فلمیں بظاہر مزاحیہ نظر آتی تھیں مگر ان کے پیچھے پوشیدہ کرب' درد اور آنسوؤں کو ہر صاحب دل محسوس کرسکتا تھا۔ وہ ہنس کر اور ہنسا کر لوگوں کو سوچنے اور رونے پر مجبور کردیتا تھا ۔ ایسا عظیم فنکار نہ اس سے پہلے پیدا ہوا اور نہ ہی اس کے بعد۔

ستم ظریفی دیکھیے کہ چارلی چپلن جیسے تاریخ ساز اداکار اور ہدایت کار کو کبھی آسکر ایوارڈ نہیں دیا گیا۔ اس نے فلم سازی اور اداکاری کا آغاز 1964ء میں کیا تھا اور اپنی منفرد اداکاری اور بے مثال فلموں کی وجہ سے دنیا بھر میں سب سے زیادہ جانا پہچانا نام اور چہرہ تھا۔ دی گریٹ ڈکٹیٹر' گولڈ رش' سٹی لائٹس' دی سرکس' دی کڈ اس کے چند غیر فانی شاہکار ہیں۔

1947ء میں اس نے بلیک اینڈ وائٹ فلم موسیو وردو بنائی تھی کیونکہ وہ رنگین فلموں کا قائل نہ تھا۔ اس فلم کے لیے اسے آسکر کیلئے نامزد کیا گیا تھا مگر وہ آسکر حاصل نہ کرسکا۔ اس سے پہلے 1920ء میں اسے فلم ''دی سرکس'' کے لیے بہترین اداکار اور بہترین ہدایت کار کے زمرے میں نامزد کیا گیا تھا۔ وہ اس وقت ہالی وڈ کا سب سے زیادہ قابل تعظیم' معروف اور کامیاب اداکار تھا جس کی اداکاری سب سے مختلف تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس فلم کیلئے اسے نہ تو بہترین اداکار تسلیم کیا گیا اور نہ ہی بہترین ہدایت کار۔ بھلا اس سے زیادہ ستم ظریفی اور کیا ہوگی؟ افسوس کہ معنی خیز اور طنزیہ فلموں کیلئے بھی اسے آسکر کا مستحق نہیں سمجھا گیا ۔ دنیائے فلم کی اس عظیم شخصیت کو صرف دوبار نامزد کیا گیا مگر آسکر وہ ایک بار بھی حاصل نہ کرسکا لیکن اسے ہمہ گیر صلاحیتوں اور اداکاری کی وجہ سے ایک اعزازی

آسکر سے نوازا گیا۔ کچھ نقادوں کا کہنا ہے کہ چارلی چپلن کو آسکر ایوارڈ اس لیے نہیں دیا گیا کیونکہ اس کی شخصیت اس ایوارڈ کے مقابلے میں بدرجہا عظیم اور بلند تھی۔ وہ آسکر کے کسی پیمانے سے بھی بڑھ کر تھا۔ وہ انتہائی خود پسند' بہت زیادہ متنازعہ شخصیت تھا اور اپنے مقابلے میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ دنیائے ادب و صحافت کے نامور ترین لوگ اس سے ملنے کے مشتاق رہتے تھے اور اس کے پرستار تھے۔ بڑے بڑے عالمی سیاست دانوں کے ساتھ اس کے برابر کے مراسم تھے۔ وہ خود کو کسی نمائشی اعزاز سے بالاتر سمجھتا تھا اور یہ ایک حقیقت تھی۔

چارلی چپلن نے اس دور کی خاموش مختصر بلیک اینڈ وائٹ فلموں میں ذہنی بلوغت' سیاسی و سماجی شعور اور اعلیٰ ترین ہنر مندی کے جو نمونے پیش کیے ہیں' ہالی وڈ آج بھی ان کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے باوجود اس کو ایوارڈ کے قابل نہیں سمجھا گیا اور نہ ہی اس نے ایوارڈ دینے والوں کو کبھی گردانا۔ وہ انہیں فلمی دنیا کے بونے اور بالشتیے کہا کرتا تھا۔ یہ ہالی وڈ کے مشہور زمانہ آسکر ایوارڈ کے ججوں کی دیانت داری اور سوجھ بوجھ کی چند مثالیں ہیں۔ ہم اپنے ملک میں فلم ایوارڈ تقسیم کرنے والوں کو نکتہ چینی کا نشانہ بناتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں ۔ دنیا کے معزز ترین اور مشہور ترین فلمی ایوارڈ آسکر بھی مصلحتوں' سیاسی جوڑ توڑ اور ججوں کی ذاتی پسند و ناپسند کے تحت ہی تقسیم کیے جاتے ہیں۔

ہاں۔ الفریڈ ہچکاک کے سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ بعد از مرگ ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں بھی ایک اعزازی آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

امریکی فلمی صنعت میں تعصب ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ جن دنوں کمیونسٹوں اور اشتراکیوں کے خلاف امریکا کی سرد جنگ جاری تھی اس زمانے میں ہالی وڈ میں اشتراکی نظریات رکھنے اور ان کا اظہار کرنے والے فنکاروں' موسیقاروں'

ہدایت کاروں اور مصنفین کے خلاف ایک باقاعدہ تحریک چلائی گئی تھی اور ایک لحاظ سے ان کا حقہ پانی بند کر دیا گیا تھا ۔ امریکایوں تو جمہوریت، انسانی حقوق اور اظہار رائے کا حق دینے کے سلسلے میں چیمپئن بنتا ہے لیکن امریکی نقطہ نظر کے خلاف اظہار رائے کو وہاں کبھی پسند نہیں کیا گیا بلکہ کھلم کھلا ان کی مخالفت کی گئی۔ اس کے علاوہ امریکی ان فلم ساز فنکاروں اور تخلیق کاروں کو بھی پسند نہیں کرتے تھے جو امریکی شہریت اختیار کر کے اپنے سابق وطن سے قطع تعلق نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں کئی برطانوی اور دیگر ملکوں کے فنکاروں کی مثالیں موجود ہیں۔

اشتراکیت کے خلاف امریکی صنعت فلم سازی کے تعصب کا یہ عالم تھا کہ ایسے افراد قریب قریب بے روزگار اور بیکار ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں ہالی وڈ میں کئی ایسی شاہکار فلمیں بنائی گئیں جنہیں آسکر ایوارڈ کا مستحق بھی سمجھا گیا لیکن ان کے مصنف ایوارڈ لینے کیلئے سامنے اسٹیج پر نہیں آئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سب ''گھوسٹ رائٹر'' تھے۔ یعنی فرضی ناموں سے انہوں نے کہانیاں تحریر کی تھیں۔ اگر وہ آسکر وصول کرنے کے لیے اسٹیج پر جاتے تو ان کی اصلیت کا بھرم کھل جاتا۔ اس کے بعد وہ خود اور فلم ساز دونوں مشکل میں پڑ سکتے تھے۔

ہمیں یاد ہے کہ ہالی وڈ میں ایک بہت خوبصورت فلم بنی تھی جس کا نام ''دی بریوون THE BARVE)'' (ONE تھا۔ اس کی کہانی یہ تھی کہ ایک جاگیر دار کے سائیس کا کم سن بیٹا ایک گھوڑے سے بچپن ہی سے محبت کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ گھوڑا بڑا ہونے کے بعد بڑی بڑی ریسیں جیتتا ہے۔ جاگیر دار اس پر بہت فخر کرتا ہے لیکن ایک بار یہ گھوڑا رکاوٹوں والی ریس کے دوران میں زخمی ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی رکاوٹ سے خوف کھانے لگتا ہے۔

ڈاکٹر مشورہ دیتے ہیں کہ اس کا زخم ٹھیک نہیں ہو سکتا اس لیے بہتر ہے کہ سسک سسک کر مرنے کے بجائے اس کو گولی ماردی جائے جو کہ ایک عام طریقہ کار ہے۔ چھوٹا بچہ یہ سب سن لیتا ہے اور گھوڑے کی جان بچانے کیلئے ایک رات اس کو لے کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ راہ میں وہ بے شمار مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے لیکن بالآخر گھوڑے کو لے کر میڈرڈ پہنچ جاتا ہے۔ ایک بار وہ گھوڑے کی جان بچانے کیلئے پادری کی اجازت سے گھوڑے سمیت ایک گرجا گھر میں بھی پناہ

لیتا ہے ۔ آخر کار ایک دن ڈاکو اس قیمتی گھوڑے کو لے کر بھاگ جاتے ہیں اور اس کو بل فائٹرز کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔

بچہ اس کی تلاش میں سر گرداں اور پریشان ہے۔اس کی تلاش کے سلسلے میں وہ بُل رنگ میں جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہی گھوڑا بُل رنگ میں موجود ہے۔ایک بُل فائٹر تلوار تھامے اس پر سوار ہے اور بُل ان دونوں پر حملے کر رہا ہے۔بچہ یہ دیکھ کر چیخ پڑتا ہے۔اتفاق سے گھوڑے کا مالک جاگیر دار اور بچے کا باپ سائیس بھی وہاں موجود ہیں اور وہ بھی اپنے گھوڑے کو پہچان لیتے ہیں۔یہ گھوڑا بُل فائٹنگ کے طور طریقوں سے قطعی نا آشنا ہے اور ڈر یہ ہے کہ کہیں غضب ناک بل اس کو شدید یا ہلاک نہ کر دے۔ایک بار جب بل حملہ آور ہوتا ہے تو گھوڑا ڈر کر بھاگتا ہے۔سوار اس کی پشت سے گر چکا ہے مگر گھوڑا بل سے بچنے کیلئے بگٹٹ بھاگ رہا ہے۔سارے رنگ میں وہ دوڑتا پھرتا ہے پھر جان بچانے کیلئے تیزی سے بھاگتا ہوا بل رنگ کے انتہائی اونچے گیٹ کو بھی پھلانگ جاتا ہے جو کہ بجائے خود کسی کارنامے سے کم نہیں ہے۔سب تماشائی گھوڑے کی یہ مہارت اور تیز رفتاری دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں۔گیٹ پھلانگنے کے بعد بھی گھوڑا بھاگتا چلا جا رہا ہے یہاں تک کہ چھوٹا بچہ اس کے پاس جا کر چمکار کر روک لیتا ہے۔وہ گھوڑے کو لے کر دوبارہ فرار ہونا چاہتا ہے مگر اسی وقت جاگیر دار بھی اس کے باپ سمیت وہاں پہنچ جاتا ہے۔وہ گھوڑے کی کار کردگی اور بچے کی محبت اور وفاداری سے متاثر ہو کر یہ گھوڑا اس بچے کو انعام میں بخش دیتا ہے۔

یہ کہانی انتہائی دلچسپ انداز میں فلمائی گئی تھی اور اس کے مصنف کو آسکر ایوارڈ بھی دیا گیا مگر وہ تقریب میں ایوارڈ لینے کیلئے موجود نہ تھا۔وجہ یہ تھی کہ وہ ’’گھوسٹ رائٹر‘‘ تھا اور دنیا کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔

اسی زمانے میں ایسی فلم بھی بنائی گئی جس کا پس منظر اطالوی تھا۔یہ ایک بچے کی کہانی ہے جو اٹلی کے ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتا ہے اور اپنے پالتو گدھے سے بے حد محبت کرتا ہے۔وہ اس کے ساتھ بچپن ہی سے کھیلتا رہا ہے۔گدھا بڑا ہونے کے بعد شدید بیمار ہو جاتا ہے۔دوا دارو بے اثر ہوتے ہیں تو وہ پادری صاحب کے پاس دعا کرانے جاتا ہے مگر اس سے بھی افاقہ نہیں ہوتا۔پادری صاحب کہتے ہیں کہ تم روم جا کر پوپ سے دعا کراؤ۔ممکن ہے ان کی دعا قبول ہو جائے

اور تمہارا گدھا تندرست ہو جائے۔اب ساری کہانی یہ ہے کہ بچہ اپنے گھر والوں سے چھپ کر گدھے کو لیکر گاؤں سے بھاگتا ہے اور بے شمار مشکلات سے دو چار ہونے کے بعد ویٹی کن سٹی پہنچ جاتا ہے۔

گدھے کو وہ ایک محفوظ جگہ چھوڑ کر پوپ سے ملنے کی کوشش کرتا ہے مگر پوپ تک رسائی ناممکن ہے۔ہر طرف سخت پہرا اور بے شمار محافظ موجود ہیں جو اس کی خواہش سن کر ہنستے ہیں اور واپس گاؤں لوٹ جانے کو کہتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں ''پوپ ایک مصروف انسان ہیں۔وہ بھلا ایک گدھے کیلئے دعا کیوں کریں گے۔''

بچہ پھر بھی ہمت نہیں ہارتا اور بالآخر کسی نہ کسی طرح پوپ کے محل میں اور پھر اس کے کمرے تک پہنچ جاتا ہے۔پوپ اس کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔اسی اثنا میں محافظ بھی آجاتے ہیں اور بچے کو پکڑ کر لے جانا چاہتے ہیں۔بچہ پوپ سے فریاد کرتا ہے کہ یہ مجھے آپ سے نہیں ملنے دے رہے۔پوپ محافظوں کو واپس جانے کا حکم دے کر بچے کو اپنے پاس بلا کر اس کی آمد کا سبب دریافت کرتا ہے۔بچہ اس کو اپنی بپتا سنا کر درخواست کرتا ہے کہ براہ کرم میرے بیمار گدھے کیلئے دعا کریں تاکہ وہ صحت مند ہو جائے۔پوپ بچے کی مشکلات اور لگن سے متاثر ہو کر پیار سے اس کا سر تھپکتا ہے اور اس کے گدھے کی صحت مندی کیلئے دعا کرتا ہے۔بچہ گدھے کے پاس واپس پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ بالکل صحت مند اور چاق وچوبند ہے۔وہ پوپ کا غائبانہ شکریہ ادا کرتا ہے اور گدھے کو لیکر واپس اپنے گاؤں چلا جاتا ہے۔

یہ بھی ایک انتہائی دلچسپ اور خوبصورت فلم تھی۔اس کا نام ''نیور ٹیک نو فار این آنسر (NEVER TAKE NO FOR AN ANSWER) تھا جس کا مطلب یہ ہے انکار سن کر ہمت نہ ہارو۔کوشش جاری رکھو۔اس فلم کو بھی آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ہمارے ملک میں اس کو پہلی فلم کا چربہ قرار دے دیا جاتا کیونکہ دونوں فلموں کی تھیم ایک تھی۔مقصد ایک تھا۔دونوں کے مرکزی کردار ایک بچہ اور ایک جانور تھے۔دونوں کو اپنے مقصد کے حصول میں بے شمار مشکلات سے دوچار ہونا پڑا تھا لیکن دونوں کا اسکرین پلے اور کہانی بیان کرنے کا انداز یکسر مختلف تھا۔ان دونوں فلموں میں بچے کی اداکاری قابل تعریف تھی اور ہدایت کار نے ان فلموں کے تاثر میں چار

چاند لگا دیے تھے۔اس فلم کے اصلی مصنف کا بھی آج تک علم نہ ہو سکا۔وہ آسکر وصول کرنے کیلئے بھی اسٹیج پر نہیں آیا تھا۔کیونکہ وہ بھی ایک ''گھوسٹ رائٹر'' تھا۔اپنے سیاسی نظریات کی بنا پر اس کا حقہ پانی بند تھا۔امریکی فلمی صنعت اور ہالی وڈ کے تعصب کا یہ بھی ایک پہلو ہے پھر بھی امریکی خود کو انسانی حقوق کا علم بردار، جمہوریت اور آزادی اظہار کا چیمپئن کہتے ہیں۔

دنیا میں ہم آئے دن نت نئے تماشے دیکھتے ہیں، واقعات اور کہانیاں سنتے ہیں جن میں ناکام اور کامیاب لوگوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔کامیابی کیا ہوتی ہے؟ یہ تو ہر کوئی جانتا ہے۔کسی بھی شعبے میں ممتاز اور نمایاں مقام حاصل کرنا کامیابی کہلاتی ہے۔کچھ لوگ کامیاب ہو کر بے انتہا شہرت کماتے ہیں لیکن تہی دست ہی رہتے ہیں۔کچھ لوگ بے اندازہ دولت کماتے ہیں لیکن شہرت ان کو چھو کر بھی نہیں گزرتی۔کتنے ارب پتی، کروڑ پتی اور دولت مند لوگوں کو آپ جانتے ہوں گے جن کے بارے میں دوسرے لوگ (جن کا ان کے حلقے سے تعلق نہ ہو) کچھ بھی نہیں جانتے۔وہ ساری عمر دولت کے انبار سمیٹتے رہتے ہیں مگر گمنام ہی رہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ دولت مند لوگ مشہور شخصیات کے سہارے شہرت اور ناموری حاصل کرنے پر آنکھیں بند کر کے دولت صرف کر دیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں شہرت حاصل کرنے کا ایک طریقہ معروف لوگوں خصوصاً ستاروں کے ذریعے شہرت کمانا بھی ہے۔بہت سے اسمگلرز، بدمعاش، جواری، جاگیردار، زمیں دار اور دوسرے کاروباری حضرات محض نام کمانے اور کسی اداکارہ کا قرب حاصل کرنے کی خواہش اور آرزو لے کر فلمی صنعت میں در آئے۔کچھ نے نام کمایا۔بیشتر گمنام ہی رہے ۔ بے شمار دولت لٹا کر فلمی دنیا سے ایسے رخصت ہوئے کہ کسی کو ان کا نام بھی معلوم نہیں ہے۔

ناکامی کیا ہے؟ یہ کامیابی کا دوسرا رخ ہے۔ایسے بد قسمت لوگ صلاحیت، ذہن اور دوسری تمام خوبیوں کے مالک ہونے کے باوجود ساری عمر نہ تو دولت حاصل کر سکتے ہیں نہ شہرت۔حالانکہ ان سے کم تر صلاحیتیں اور قابلیت رکھنے والے لوگ سب کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔آپ نے بھی ایسے کئی افراد کو دیکھا ہو گا اور حیران ہوئے ہوں گے کہ آخر یہ زندگی کے میدان میں اتنے پیچھے اور پھسڈی کیسے رہ گئے۔حالانکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ہر طرح

کی صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے۔اس کے برعکس احمق، نااہل اور بے صلاحیت لوگوں نے شہرت اور کامیابی کے زینے بہت آسانی سے طے کر لیے۔آخر اس کا کیا سبب ہے؟اس بارے میں ماہرین نفسیات، عمرانیات اور ذہنی امراض کے ماہروں نے اپنے اپنے تجربات اور تحقیق کی بنا پر بے شمار کتابیں لکھ دی ہیں اور منطق، دلائل اور حقائق کی روشنی میں اس کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔جب کسی انسان کی تقدیر میں ہی کامیابی، شہرت اور دولت نہ ہو وہ چاہے کتنے پاپڑ بیلے، ان چیزوں سے محروم ہی رہتا ہے۔اس کی تمام تر صلاحیت، کوشش، محنت اور لگن رائیگاں ہی جاتی ہے۔خوش نصیب لوگ اس کے برعکس سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں اس کو خدا کی رضا کہتے ہیں، تقدیر کہتے ہیں۔قسمت کا لکھا تسلیم کرتے ہیں۔ہم نے اپنی خاصی طویل زندگی اور اس سے بھی زیادہ طویل اور گوناگوں تجربات و مشاہدات کی روشنی میں یہی دیکھا اور جانا ہے کہ انسان کو وہی کچھ حاصل ہوتا ہے جو اس کی تقدیر میں لکھ دیا جاتا ہے۔خواہ آپ ناکامی اور کامیابی کی ہزار تاویلیں پیش کریں۔اس حقیقت کو بدلا نہیں جا سکتا۔

قضا و قدر کا فلسفہ بھی یہی ہے۔یہ بھی ایک نظریہ ہے کہ انسان تدبیر سے اپنی تقدیر بدل سکتا ہے لیکن آپ نے خود مشاہدہ کیا ہو گا کہ یہ محض ایک مقولہ ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے کہ بھئی جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہونا ہی ہے پھر ہم بلاوجہ کیوں دوڑ دھوپ کریں۔جیسا کہ غالب نے کہا ہے کہ۔۔۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

آپ کہیں گے کہ دیکھیئے یہ شخص پھر غالب سے سند لے آیا مگر ایسا نہیں ہے۔ غالب بھی قضا و قدر کے مسئلے سے واقف تھے اور غالباً اس کے قائل بھی تھے مگر انہوں نے مایوسی اور ناامیدی سے ہمیشہ پہلو تہی کی ہے ۔جس قدر پریشانیاں غالب نے اٹھائی ہیں جتنے دکھ اور صدمے سہے ہیں جن ناکامیوں سے دوچار ہوئے ہیں جیسی ناقدری کا شکار

ہوئے ہیں اگر کوئی اور ہوتا تو حزن و ملال کی تصویر بن کر رہ جاتا۔ میر کی مایوسی اور فانی کی غم گینی کا مرقع بن کر رہ جاتا ۔۔۔ مگر غالب نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے کلام کی شوخی، شگفتگی اور زندگی کے بسارے میں امید افزا نقطۂ نظر ان کی زندہ دلی کا نمایاں ثبوت ہے۔ انہوں نے برے سے برے حالات میں بھی ہمت نہیں ہاری اور آخر دم تک اپنے مصائب و آلام پر اور خود اپنے آپ پر مسکراتے ہی رہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کوشش اور تگ ودو ہی نہ کرے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے غیب کا علم اپنے سوا کسی اور کو نہیں بخشا۔ ذرا تصور فرمایئے کہ اگر انسان کو اپنے مستقبل کے بارے میں علم ہو جاتا اور وہ یہ جان سکتا کہ قدرت نے اس کی قسمت میں کیا لکھ دیا ہے تو دنیا کا کیا رنگ ہوتا؟ جسے معلوم ہوتا کہ زمانے بھر کی خوشیاں، کامیابیاں اور کامرانیاں اس کا مقدر ہیں اور کسی وقت اس کی قسمت کا ستارہ جگمگائے گا تو وہ بھلا کوشش اور محنت کیوں کرتا۔ اطمینان سے بیٹھ کر اس وقت کا انتظار شروع کر دیتا جب اس کے دن پھریں گے۔ اسی طرح جس شخص کو یہ علم ہو جاتا کہ اس کی قسمت میں تو غربت، افلاس، بیماریاں، محرومیاں اور مایوسیاں ہی لکھی ہیں تو وہ بلاوجہ کوشش اور بھاگ دوڑ کیوں کرتا۔ صبر و شکر کر کے بیٹھ جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا نظم وضع کر دیا ہے جس کے باعث ہر انسان اچھے دنوں کی آس پر محنت اور کوشش میں لگا رہتا ہے کہ خدا جانے کب قسمت اس پر مہربان ہو جائے اور اس کے دن پھر جائیں۔

دنیا میں ایسے خوش نصیب لوگ بہت کم ہوتے ہیں کہ جو اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو عملی جامہ پہنتے دیکھتے ہیں۔ جس چیز کی وہ تمنا کرتے ہیں اللہ انہیں اس سے نواز دیتا ہے۔ راتوں رات فلم اسٹار یا فنکار بننے کے واقعات تو بہت سے ہیں مگر اداکار ریمبو کو جس طرح اداکار اور پھر ہیرو کا درجہ حاصل ہوا ہے اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ ریمبو گزشتہ کئی سالوں سے پاکستان کی فلمی صنعت کا ایک معروف فنکار ہے۔ اس نے کامیڈی کردار بھی کیے۔ سائیڈ ہیرو کے طور پر بھی کام کیا اور پھر کئی فلموں میں ہیرو کی حیثیت سے بھی جلوہ گر ہوا۔ آیئے ذرا اداکار ریمبو کی فلمی زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

چند سال قبل اسلام آباد کے ٹیلی ویژن سینٹر سے ایک ڈراما سیریز ''گیسٹ ہاؤس '' پیش کی جاتی تھی۔ یہ ایک پرائیویٹ

ہوٹل نما گیسٹ ہاؤس کی کہانی تھی جس میں گنے چنے کردار مستقل حیثیت رکھتے تھے۔ایک گیسٹ ہاؤس کے مالک تھے جو خاصے سنجیدہ اور رکھ رکھاؤ والے درمیانی عمر کے آدمی تھے۔یہ تعلیم یافتہ بھی تھے۔اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ بلند قامت، گورا رنگ، مناسب نقش و نگار۔یہ اس گیسٹ ہاؤس کے مالک تھے اور سیریز کی ہر قسط میں ان کی موجودگی لازمی تھی۔اس سیریز میں ہر بار ایک نئی کہانی پیش کی جاتی تھی مگر مرکزی کردار ہر ڈرامے میں نظر آتے تھے۔مالک کی ایک بیگم بھی تھی۔یہ بھی ایک سمجھ دار اور معقول خاتون تھیں لیکن کہانی کے مطابق مزاحیہ کردار میں بھی نظر آجاتی تھیں۔یہ کردار ثروت عتیق کے سپرد تھا جو ریڈیو کی ایک نامور فنکارہ تھیں۔ بعد میں اسٹیج اور ٹی وی ڈراموں میں بھی انہوں نے کام کیا جن میں سب سے زیادہ مقبولیت ''گیسٹ ہاؤس'' کو حاصل ہوئی۔ہر قسم کے کردار بہت عمدگی سے ادا کرتی تھیں۔ڈرامے میں یہ ایک کامیاب جوڑا تھا جو اولاد سے محروم تھا۔ میاں بیوی میں اچھی خاصی انڈراسٹینڈنگ تھی مگر بعض ڈراموں میں کہانی کی ضرورت کے مطابق آپس میں غلط فہمی بھی ہو جاتی تھی۔

اس ڈرامے میں ایک منیجر تھا۔یہ بالکل نئے اداکار تھے مگر انہوں نے بہت اچھا کام کیا تھا۔بعض اوقات استقبالیہ پر ایک لڑکی بھی نظر آتی تھی۔اس کردار کے فنکار بدلتے رہتے تھے۔ایک پولیس انسپکٹر بھی تھا جو بعض ڈراموں میں نظر آتا تھا۔یہ موٹا سا دلچسپ پولیس افسر بھی اچھا اداکار تھا لیکن ڈرامے کے مستقل کرداروں میں سب سے زیادہ دلچسپ کردار جان ریمبو کا تھا۔یہ ایک نوجوان شخص تھا جو ہوٹل میں صفائی کرنے پر مامور تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ جھاڑو یا صفائی کرنے کا کپڑا ہوتا تھا۔سر پر ایک رومال بندھا ہوتا تھا۔یہ ایک ان پڑھ کردار تھا جو فلمی اداکار بننے کا شوقین تھا۔اس زمانے میں ہالی وڈ کے کردار جان ریمبو کا بہت چرچا تھا۔ ریمبو بھی اسی سے متاثر تھا اور ہوٹل میں آنے والے ہر مہمان کو اپنا نام جان ریمبو بتاتا تھا۔یہ عام زندگی میں بھی داکاری کرتا رہتا تھا جس کی وجہ سے بعض اوقات بہت دلچسپ صورت حال پیدا ہو جاتی تھی۔

''گیسٹ ہاؤس''میں ہر بار ایک نئی کہانی پیش کی جاتی تھی مگر مذکورہ بالا کردار ہر ڈرامے میں موجود ہوتے تھے۔ریمبو اس ڈرامے کا سب سے دلچسپ اور مستقل کردار تھا۔ یہ عجیب و غریب حلیئے میں رہتا تھا۔میلا سا نیکر اور قمیص یا جرسی،

پیروں میں چپل یا ننگے پیر، سر پر ایک میلا اور گندہ سا رومال۔ ہاتھ میں جھاڑو یا بالٹی۔ یہ دراصل ایک جمعدار کا کردار تھا اور یہ طبقہ کام کے اوقات میں عموماً اسی حلیئے میں رہتا ہے۔ البتہ کام سے فارغ ہونے کے بعد صاف ستھرا لباس پہن کر ان کا حلیہ ہی بدل جاتا ہے مگر جان ریمبو کو اجلا اور صاف ستھرا لباس پہننا بہت ہی کم نصیب ہوتا تھا۔

ریمبو دیکھنے ہی میں ایک صفائی کرنے والا شخص نظر آتا تھا۔ اس کے مکالمے بھی اس ان پڑھ کردار کے مطابق ہی ہوتے تھے۔ ایک قابل تعریف بات یہ ہے کہ ''گیسٹ ہاؤس'' کو مختلف مصنفین نے لکھا اور مختلف ہدایت کاروں نے اس کی ہدایت کاری کے فرائض سر انجام دیئے لیکن تمام مستقل کرداروں کے حلیئے، بول چال اور عادات واطوار میں کبھی کوئی تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ مصنف کی خوبی تھی۔ ہدایت کار کی سوجھ بوجھ کا نتیجہ تھا یا کہ خود اداکاروں کی ذاتی توجہ، دلچسپی اور کاوش کا سبب تھا۔ بہر حال یہ ایک قابل ذکر اور قابل تعریف خوبی تھی۔ یہ ڈراما طویل عرصے تک چلتا رہا۔ اس میں معروف اور غیر معروف ہر طرح کے فنکاروں نے مختلف کہانیوں میں اداکاری کی لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اتنے اچھے، دلچسپ اور معیاری ڈرامے کو میڈیا میں اور نہ ہی ٹی وی کے حلقوں میں وہ پذیرائی مل سکی جس کا یہ مستحق تھا۔ اگر یہ کراچی یا لاہور سینٹر سے پیش کیا جاتا تو ہر طرف اس کا چرچا ہوتا۔ یہ ایک افسوسناک طرز عمل ہے جس میں تبدیلی ضروری ہے۔ اسلام آباد، کوئٹہ اور پشاور سے بھی محدود وسائل کے باوجود بہت اچھے بلکہ بعض اوقات کراچی اور لاہور کے ڈراموں سے بہتر ڈرامے پیش کیے جاتے ہیں مگر ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔

''گیسٹ ہاؤس'' تو مناسب اوقات میں پیش کیا جاتا تھا مگر عام طور پر ان مراکز کے ڈرامے رات گئے پیش کئے جاتے ہیں۔ آخر اس ترجیحی سلوک کا کیا سبب ہے؟ ان ڈراموں کو پرائم ٹائم میں کیوں نہیں دکھایا جاتا؟ مزید ستم یہ ہے کہ انہیں زیادہ اشتہارات بھی حاصل نہیں ہوتے حالانکہ اس کے برعکس کراچی اور لاہور کے دوسری اور تیسری بار پیش کئے جانے والے ڈراموں میں بھی اشتہارات کی بہتات ہوتی ہے۔ بعض اوقات تو اشتہارات کی کثرت دیکھنے والوں کو بیزار کر دیتی ہے۔ یہ پشاور، کوئٹہ اور اسلام آباد کے ٹی وی مراکز کے مارکیٹنگ کے شعبوں کی کوتاہی ہے یا کوئی اور وجہ؟ بہر حال یہ سراسر ناانصافی اور حق تلفی کے مترادف ہے۔

یہ توجملہ معترضہ سمجھ لیجئے۔ذکر ہورہا تھا ''گیسٹ ہاؤس'' اوراسکے ایک نمایاں کردار ریمبو کا۔ریمبو ہر مہمان اور ہوٹل کے کارکنوں یہاں تک کہ مالکوں تک سے بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے سے نہیں ہچکچاتا تھا۔گیسٹ ہاؤس میں آنے والے مہمانوں سے وہ زبردستی اپنا تعارف ان الفاظ میں کراتا تھا ''میرا نام ہے ریمبو، جان ریمبو'' پھر وہ اپنے بالوں کی ایک لٹ کو پیشانی پر ڈال کراداکارانہ پوز بنا کر کھڑا ہو جاتا اور اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرکے آنے والوں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا تھا۔اسکو فلم میں ہیرو بننے کا شوق بلکہ جنون تھا اسی لیے وہ حقیقی زندگی میں بھی ہر وقت اداکاری کا مظاہرہ کرتا تھا۔اسکو یقین تھا کہ ایک دن اس کے بھی دن پھر جائیں گے اور وہ ایک فلمی ہیرو بن کر شہرت اور دولت حاصل کرے گا۔اس کا حلیہ طرز گفتگو اور شکل وصورت دیکھ کر اس مضحکہ خیز خواہش پر دیکھنے والے ہنسی اڑاتے تھے۔ اس کے ساتھی کارکن اس کو مذاق کا نشانہ بناتے تھے مگر اس کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ''ریمبو۔۔۔ریمبو۔۔۔جان ریمبو'' ضرور بنے گا۔

''گیسٹ ہاؤس'' کا ٹی وی پروگرام کافی عرصے تک چلتا رہا کبھی اس میں بہت اچھے ڈرامے پیش کیے جاتے تھے۔کبھی ان کا معیار کچھ کم ہو جاتا تھا مگر جان ریمبو کا کردار ہمیشہ جان دار ہی ہوتا تھا۔اس میں خود ریمبو کی اداکاری کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔یوں لگتا تھا جیسے اس نے یہ کردار اپنے اوپر طاری کر لیا ہے اسے اوڑھ لیا ہے۔اسی کی زندگی کو اپنا لیا ہے۔وہ اس مضحکہ خیز احمقانہ کردار کو اس قدر خوب صورتی سے ادا کرتا تھا کہ رفتہ رفتہ یہ کردار ایک حقیقی چلتا پھرتا، جیتا جاگتا انسان محسوس ہونے لگا۔

پھر ایک روز ''گیسٹ ہاؤس'' بند ہو گیا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ ''ریمبو ریمبو، جان ریمبو'' کو بھی بھول گئے۔یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہالی وڈ کے جس اداکار سلویسٹر اسٹالون نے انگریزی فلم میں ریمبو کا کردار ادا کر کے عالمگیر شہرت حاصل کی تھی اور پھر اسکے بعد بھی کئی کامیاب ایکشن فلموں میں کام کیا تھا رفتہ رفتہ اس کی شہرت کا آفتاب بھی گہنا گیا۔سلویسٹر اسٹالون کا ذکر چلا ہے تو پھر اس بارے میں بھی کچھ بیان کر دیا جائے۔ سلویسٹر اسٹالون نے فلم ''راکی'' سے شہرت حاصل کی۔اس فلم میں اسنے ایک باکسر کا کردار ادا کیا تھا۔فلم کی کہانی میں مار پٹائی کے علاوہ

جذباتی مناظر بھی تھے جو عموماً مغربی ایکشن فلموں میں دیکھنے کو نہیں ملتے۔ ''راکی'' بے حد کامیاب ہوئی۔ ''راکی ۲'' بنائی گئی اور اسکو بھی بے پناہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ بس پھر کیا تھا ایک سلسلہ چل نکلا۔ پاکستانی فلم سازوں پر ہمارے ہاں لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جس قسم کی کہانی مقبول ہو جاتی ہے یہ پھر ہاتھ دھو کر اسی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں حالانکہ ہالی وڈ میں بھی یہی رواج رہا ہے۔

سلویسٹر اسٹالون اس حد تک خوبصورت انسان ہے کہ اس کی چمڑی سفید ہے۔ اس نے بہت محنت سے اپنا جسم ایک باڈی بلڈر کے مانند مضبوط اور متناسب بنایا تھا اور آج تک (مقبولیت کھودینے کے باوجود) اس کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ سلویسٹر سٹالون نہ صرف یہ کہ سخت ورزشیں کرتا ہے بلکہ جسم کے مسلز بنانے کے لیے قیمتی ادویات بھی استعمال کرتا ہے جو کچھ عرصے بعد انسانی صحت پر مضر اثرات ڈالتی ہیں مگر جسم کو متناسب اور مضبوط رکھنے کی دھن میں کون ان باتوں کی پرواکرتا ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب یہی جسمانی خوب صورتی شہرت اور دولت حاصل کرنے کا وسیلہ بھی بن جائے۔

سلویسٹر اسٹالون کی مذکورہ بالا دو خوبیوں کے سوا اس میں کوئی اور حسن یا خوبی نہیں تھی اور نہ ہے۔ وہ ایکشن فلموں میں انتہائی دشوار گزار کردار ادا کرتا رہا جن میں اداکارانہ صلاحیتوں کا کوئی دخل نہ تھا۔ نفرت، انتقام اور دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے ہر قسم کے اسلحے اور جسمانی قوت کا استعمال ہی اس کی اداکاری کی معراج تھی۔ کئی فلموں میں بیشتر مناظر میں وہ منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکالتا تھا۔ اسلحے کا اندھا دھند استعمال، ناقابل یقین انسانی قوت کا مظاہرہ اور مار کٹائی کے سوا اس کی اداکاری میں کوئی خوبی نہ تھی۔ وہ فلموں میں حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیا کرتا تھا۔ تن تنہا دشمن کی پوری فوج کو تہس نہس کر دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ درجنوں دشمنوں اور غنڈوں کے ہجوم کو وہ پلک جھپکنے میں تتر بتر کر دیا کرتا تھا۔ وہ بے پناہ قوت، جرات اور حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک تھا۔ بعض فلموں میں وہ اکیلا ہی دشمن کے خلاف کسی مشن پر جاتا اور فتح بالآخر اس کے قدم چوم لیتی۔ اس کی ان ناقابل یقین صلاحیتوں کو ساری دنیا کے فلم بین سراہتے تھے۔ ہمارے پاکستانی فلم بین بھی اسکے گن گاتے تھے۔ عام لوگوں کی بات نہیں ہے تعلیم یافتہ طبقہ جو

پاکستانی فلموں میں سو سو کیڑے نکالنے کا عادی ہے وہ بھی سلویسٹر اسٹالون کے کارناموں کو دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو پنجابی فلموں کے سب سے مشہور اور مقبول ہیرو سلطان راہی کو اداکار ہی تسلیم نہیں کرتے تھے۔

''وہ بھی کوئی ایکٹر ہے۔ نہ صورت نہ شکل۔ انتہائی بد شکل۔ اداکاری تو اس کے قریب سے نہیں گزری ہے اور حماقت کی انتہا یہ ہے کہ اکیلا درجنوں دشمنوں پر بھاری ہے۔ تن تنہا دشمنوں کی لاشوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیتا ہے۔ یار ہمارے فلم ساز، ہدایت کار اور کہانی نویس خدا کا خوف نہیں کرتے۔ بھلا کوئی ایک انسان ایسے کارنامے سرانجام دے سکتا ہے؟''

سلطان راہی کے بارے میں ان کے یہ خیالات تھے مگر یہی لوگ اکیلے سلویسٹر اسٹالون کو ایک ملک کی پوری فوج کے خلاف نبرد آزما ہنے اور اس پر فتح حاصل کر لینے پر کہتے تھے ''واہ صاحب کیا بات ہے۔ ہالی وڈ پھر ہالی وڈ ہے اور سلویسٹر اسٹالون کا تو جواب ہی نہیں ہے۔''

ہالی وڈ اور دنیا بھر کے فلم بین بھی بھیڑ چال کے شکار ہیں۔ جب تک اسٹالون کے سر پر کامیابی کا ہما بیٹھا رہا وہ مقبول ترین ہیرو رہا مگر پھر شاید لوگوں میں عقل، آگئی، شعور پیدا ہو گیا یا پھر فلموں میں اس کے کرداروں کی یکسانیت انہیں بیزار کرنے لگی۔ وجہ کچھ بھی ہو مگر اسٹالون کی فلموں کی کامیابی کا سلسلہ ایسا رکا کہ پھر اس کی بڑے سے بڑے بجٹ والی فلم بھی بری طرح ناکام ہونے لگی۔ ایک بار زوال کا آغاز ہوا تو پھر یہ سلسلہ کہیں بھی نہ رک سکا۔ یہ دیکھ کر فلم سازوں نے وہی کیا جو ساری دنیا کے فلم سازوں کا طرز عمل ہے۔ انہوں نے سلویسٹر اسٹالون کے بھاری معاوضے ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کو فلموں میں مرکزی کردار دینے سے منکر ہو گئے۔ اسٹالون کی جگہ دوسرے اس سے بھی زیادہ بد شکل لیکن طاقت ور، حیران کن کارنامے سرانجام دینے والے اداکاروں نے لے لی۔ اب سلویسٹر اسٹالون قریب قریب ایک بھولی ہوئی کہانی بن چکا ہے۔

اس کے برعکس سلطان راہی کو دیکھیئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی مقبولیت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔اس کے فلم بین اور مداح آخری دم تک اس کے پرستار ہی رہے۔جوں جوں سلطان راہی کی عمر اور پیٹ بڑھتا رہاتوں توں اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ فلم کی کامیابی کے لیے سلطان راہی کا نام ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ کہانی کیا ہے ہیروئن کون ہے۔ ہدایت کاری کے فرائض کس نے سرانجام دیے ہیں؟ فلم بینوں کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔انہیں تو بس سلطان راہی کو دیکھنے سے مطلب تھا۔وہ اس کی ہر ادا پر فدا تھے۔جب سلطان راہی کا اچانک پراسرار قتل ہوا اس وقت اس کی عمر ۵۵ سال کے لگ بھگ تھی مگر اس کی مقبولیت میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔لاکھوں لوگوں نے اس کے جنازے میں شرکت کی۔کہتے ہیں کہ گستاخ رسول ﷺ کو قتل کرنے والے غازی کے بعد لاہور شہر میں کسی کے جنازے میں اس قدر ہجوم نہیں دیکھا جو واقعی سوگوار اور اشک بار تھا۔

سلطان راہی اور سلویسٹر اسٹالون میں یہی فرق تھا مگر یہ مغرب زدہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔وجہ یہ ہے کہ اسٹالون کا رنگ گورا تھا۔وہ امریکی تھا۔ ہالی وڈ کی فلموں کا ہیرو تھا۔اس کے بعد اس میں کوئی اور خوبی مطلوب تھی نہ ضروری۔سلطان راہی اس سے بڑا اداکار تھا جس نے ایکشن اور ڈائیلاگ دونوں میں نام کمایا، البتہ حسن و وجاہت میں ذرا دونوں ایک لیول پر تھے۔

سلویسٹر اسٹالون کا تذکرہ برسبیل تذکرہ ہی آگیا کیونکہ اس کے ایک معروف و مقبول فلمی کردار ''ریمبو'' سے متاثر ہو کر افضل خان کا کردار تخلیق کیا گیا تھا۔ اس ڈرامے میں افضل خان کا نام ریمبو تھا۔ریمبو ریمبو جان ریمبو۔اس ڈرامے میں ریمبو، جان ریمبو جیسی حرکتیں کرتا تھا۔اسی کے انداز کو اپنانے کی کوشش کرتا تھا۔اس کردار کو آپ اصلی ریمبو کی پیروڈی سمجھ لیجئے مگر افضل خان نے اس خلوص سے یہ پیروڈی پیش کی کہ وہ بالآخر متعلقہ لوگوں کی نظروں میں آگیا۔

پھر ایک دن اخبار میں خبر شائع ہوئی کہ افضل خان جس نے ٹی وی سیریز ''گیسٹ ہاؤس'' میں ریمبو کا کردار ادا کیا تھا عن قریب ایک فلم '' ہیرو'' میں مرکزی کردار میں پیش کیا جائے گا۔ خبر پڑھ کر یقین نہیں آیا کہ ہمارا کوئی فلم ساز افضل خان جیسے ادکار کو اپنی فلم میں ہیرو کے طور پر روشناس کرائے گا۔ بعض اوقات اخبارات من گھڑت خبریں بھی

شائع کر دیا کرتے ہیں جو کبھی حقیقت کا روپ نہیں دھارتیں۔ سوچا یہ بھی شاید اسی قسم کی خبر ہو گی مگر کچھ عرصے بعد اس کی فلم کی شوٹنگ کی خبریں شائع ہونے لگیں۔ "ہیرو" میں صاحبہ نے ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ اظہار قاضی اس فلم کے ہیرو تھے۔ رنگیلا بھی اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ افضل خان نے اپنے لیے فلمی نام "ریمبو" ہی پسند کیا تھا۔ اسی نام سے انہوں نے اپنی پہلی فلم میں کام کیا اور پھر اس کے بعد اسی نام سے شہرت حاصل کی۔ فلم "ہیرو" کے فلم ساز عبدالرشید اور ہدایت کار سعید رانا تھا۔ اس فلم نے زیادہ کامیابی تو حاصل نہیں کی مگر ناکام بھی نہیں ہوئی۔ "ہیرو" 1992ء میں نمائش کے لیے پیش ہوئی تھی۔

یہ ریمبو کا فلمی دنیا میں آغاز تھا۔ اس کے بعد انہوں نے کئی فلموں میں اداکاری کی۔ مزاحیہ کردار ادا کرتے رہے پھر ترقی پا کر سائیڈ ہیرو بنا دیئے گئے۔ اس کے بعد فلم کے دو ہیروز میں سے ایک ہیرو ریمبو بھی ہونے لگے۔ گویا انہوں نے اپنے فلمی ہیرو بننے کے خواب کو تعبیر پاتے ہوئے دیکھ لیا۔ ایک علاقائی ٹی وی سینٹر کی ڈراما سیریز میں جمعدار کا کردار کرنے والا یہ معمولی شکل و صورت کا نوجوان بالآخر فلموں میں ہیرو بن گیا۔ جب انہیں سوٹ بوٹ اور جدید لباس میں دیکھا تو شکل و صورت اچھی لگی اور شخصیت بھی۔ کہتے ہیں کامیابی سے بڑھ کر کوئی کامیابی نہیں ہوتی۔ یہ مقولہ بارہا سچا ثابت ہوا ہے۔ ریمبو کے معاملے میں بھی اس کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی۔

ریمبو عرف افضل خان کو اگر خوش قسمت ترین انسانوں کی فہرست میں شامل کر لیا جائے تو یہ غلط نہ ہو گا۔ انہوں نے جو چاہا، وہ پا لیا۔ فلمی ہیرو بننے کا خواب دیکھا اور اس کی تعبیر بھی انہیں مل گئی۔ اداکارہ صاحبہ سے محبت کی اور شادی کرنے کا خواب دیکھا۔ بظاہر یہ بہت مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا تھا لیکن اللہ مہربان تو جگ مہربان۔

صاحبہ اپنے وقت کی نامور ہیروئن نشو کی صاحب زادی ہیں۔ نشو وہ خوش نصیب اداکارہ ہیں جنہوں نے اپنی پہلی فلم میں پاکستان کے دو سپر اسٹارز محمد علی اور ندیم کی ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ اب وہ اداکاری سے کنارہ کش ہو چکی ہیں۔ جب ان کی بیٹی صاحبہ نے فلموں میں اداکاری کی خواہش ظاہر کی تو نشو نے اس کی مخالفت کی مگر لاڈلی بیٹی کی ضد کے

آگے ہار مان لینے پر مجبور ہو گئیں۔ صاحبہ نے فلموں میں بتدریج ترقی کا سفر طے کیا۔ پہلے وہ فلم کی دو ہیروئنوں میں سے ایک ہیروئن ہوا کرتی تھیں پھر باقاعدہ اکلوتی ہیروئن کا درجہ بھی حاصل کر لیا۔

ریمبو کو اپنی پہلی ہی فلم میں صاحبہ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ صاحبہ کو اس نے پہلی نظر میں ہی پسند کر لیا تھا۔ جب قریب سے دیکھا اور ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تو یہ پسندیدگی محبت میں تبدیل ہو گئی۔ جس نے سنا ہنس کر رہ گیا۔ صاحبہ کو بھلا ریمبو سے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے لیے اچھے رشتوں کی کیا کمی ہے؟ صاحبہ نے پہلے پہلے ریمبو کو اہمیت کے لائق نہیں سمجھا لیکن ریمبو کی مستقل مزاجی کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے مگر ابھی راہ میں نشو کی مخالفت کی مضبوط دیوار حائل تھی۔

اخبار والوں کو ایک موضوع ہاتھ لگ گیا۔ آئے دن خبریں شائع ہونے لگیں۔

”ریمبو اور صاحبہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔

میں ریمبو کو صرف ساتھی اداکارہ سمجھتی ہوں صاحبہ۔

ہم دونوں کی ملاقات صرف فلموں کے سیٹ تک محدود ہے ریمبو۔

ریمبو صاحبہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔

صاحبہ کی والدہ نشو کی طرف سے شدید مخالفت۔

میں نے تو کبھی ریمبو سے شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ صاحبہ۔

صاحبہ کی شادی بہت دھوم سے ہو گی۔ جب ہو گی تو سب کو معلوم ہو جائے گا۔ نشو۔“

ایک سال سے زائد عرصے تک خبروں کا بازار گرم رہا۔

اور پھر ایک دن ریمبو اور صاحبہ کی شادی ہو گئی۔اب وہ والدین بھی بن چکے ہیں۔

ریمبو کی کامیابیوں کو دیکھ کر ہمیں شفیق الرحمن کا ایک افسانہ یاد آگیا۔اس کہانی میں ہیرو کے دوست شیطان ایک لڑکی سے محبت کرتے ہیں مگر اظہار کی جرات نہیں ہے۔ ہیرو سے شیطان کی حالت زار نہیں دیکھی جاتی مگر وہ انکی کم ہمتی اور جرات کے فقدان سے بھی واقف ہیں۔ یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے شیطان سے کہا گیا کہ ہمالیہ کی ایک چوٹی پر ایک کئی سو سالہ بزرگ کا ڈیرا ہے۔اگر ان سے تعویذ مل جائے تو دنیا کا کوئی کام ناممکن نہیں رہتا۔ایک اسکیم کے تحت ہیرو چند روز کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔ واپس لوٹتا ہے تو ایک تعویذ اسکے پاس ہے۔اس تعویذ کو اگربتی اور لوبان کی دھونی دی جاتی ہے اور تعویذ شیطان کے بازو پر باندھ دیتے ہیں۔ شیطان بہت مایوس ہیں مگر دوست کہتے ہیں کہ یہ نہ بھولو کہ بزرگ کا تعویذ تمہارے پاس ہے ہر مشکل اس کی برکت سے آسان ہو جائے گی۔

شیطان کو امتحان میں پاس ہونے کی توقع نہیں ہے۔ دوست کہتے ہیں کہ فکر نہ کرو کورس کی کچھ کتابیں تم پڑھو۔ کچھ ہم پڑھتے ہیں بے فکری سے کمرا امتحان میں جاؤ مگر شیطان کو کچھ بھی یاد نہیں ہے۔

”بے فکری سے نقل کرو۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

اگر پکڑا گیا تو۔۔۔“

”فکر مت کرو۔ تم پکڑے نہیں جا سکتے۔ جانتے نہیں کہ بزرگ کا تعویذ تمہارے بازو پر بندھا ہوا ہے۔“

شیطان امتحان میں نقل کرتے ہیں اور بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتے ہیں۔ ہیروئن کا باپ بہت بڑا افسر ہے۔ ہیروئن شیطان سے کہتی ہے کہ تم پہلے صاحب روزگار ہو جاؤ اسکے بعد ڈیڈی سے رشتے کی بات کرنا۔ ملازمت کا ایک اشتہار دیکھ کر دوست شیطان کو فوراً درخواست دینے کا مشورہ دیتے ہیں۔ شیطان کو امید تو نہیں ہے مگر تعویذ کے سہارے وہ درخواست دیتے ہی۔ انہیں انٹرویو کے لیے طلب کیا جاتا ہے مگر وہ سخت نروس ہو جاتے ہیں۔

''یار پریشان کیوں ہوتے ہو؟ ڈر کس بات کا۔ یاد نہیں بزرگ کا تعویذ تمہارے بازو پر ہے۔''

شیطان انٹرویو دینے جاتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اب وہ برسرِ روزگار ہیں دوست کہتے ہیں ''اب تم ہیروئن کے باپ سے جا کر ملو۔''

''یار وہ تو بہت انگریز قسم کا آدمی ہے سب اس سے ڈرتے ہیں۔''

''وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جا کر اس سے ملو اور رشتے کی بات کرو۔''

''مگر۔۔۔''

'مگر اگر کچھ نہیں بھول گئے؟ بزرگ کا تعویذ تمہارے بازو پر ہے۔''

اس دوران میں ہر کامیابی پر تعویذ پوش تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ موم جامے سے وہ تانبے کی اور پھر چاندی کی ڈبیا میں رکھ دیا جاتا ہے۔

شیطان ہیروئن کے باپ سے ملنے جاتے ہیں کئی دن تک ملاقات نہیں ہوتی۔ اس کے گھر پر ایک انتہائی خوفناک شکل کا کتا بھی ہے جس کو دیکھ کر شیطان کی روح فنا ہو جاتی ہے۔

دوست کہتے ہیں ''وہ دفتر میں نہیں ملتا تو تم گھر چلے جاؤ۔''

''مگر اس کا خوفناک کتا۔۔۔''

''تم کتے سے ڈرتے ہو۔ ارے شیر بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایک مضبوط چھڑی لے جاؤ کتا گڑبڑ کرے تو دو چار چھڑیاں رسید کرو۔ دم دبا کر بھاگ جائے گا۔''

''تم نہیں جانتے۔ وہ کتا خونخوار کتا ہے۔''

''عجیب احمق ہو۔ارے بھول گئے تمہارے بازو پر بزرگ کا تعویذ ہے۔''

شیطان ایک مضبوط سی چھڑی لے کر ہیروئن کے گھر جاتے ہیں۔ گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی خوں خوار کتا دانت نکوستا ہوا بھونک کر ان پر لپکتا ہے۔ پہلے تو وہ ڈر جاتے ہیں مگر پھر بزرگ کے تعویذ کی برکت یاد آجاتی ہے جوں ہی وہ حملہ آور ہوتا ہے اور نزدیک آتا ہے یہ اسکو جھڑ کر دو چار چھڑیاں رسید کرتے ہیں۔ وہ دم دبا کر اندر بھاگ جاتا ہے۔ شیطان کا حوصلہ مزید بلند ہو جاتا ہے۔

اندر سے ملازم باہر آتا ہے پوچھتا ہے ''کیا کام ہے؟''

''صاحب سے ملنا ہے۔''

شیطان اس کا اپنا نام بتاتے ہیں۔ان کی خود اعتمادی اور خوش لباسی سے مرعوب ہو کر وہ اندر چلا جاتا ہے اور پھر شیطان کو صاحب کے پاس لے جاتا ہے۔

صاحب ایک بارعب افسر نما انسان ہیں۔ آدھے سے زیادہ انگریز بھی ہیں۔ پائپ منہ سے نکال کر پوچھتے ہیں ''کیا بات ہے؟ مجھ سے تمہیں کیا کام ہے؟'' شیطان مرعوب ہو کر حوصلہ ہارنے لگتے ہیں مگر پھر تعویذ یاد آجاتا ہے اور اسکے ساتھ ہی ان کی خود اعتمادی بھی لوٹ آتی ہے۔

یہ بتاتے ہیں کہ میں آپ کی صاحب زادی سے شادی کا خواستگار ہوں۔

صاحب غور سے ان کا جائزہ لیتے ہیں ''ہوں۔ کیا کرتے ہو؟''

''فی الحال امتحان پاس کرنے کے بعد فلاں جگہ ملازمت کا آغاز کیا ہے۔''

وہ حقارت سے دیکھتے ہیں ''اتنی معمولی نوکری۔''

''سر۔جب آپ نے ملازمت کا آغاز کیا ہو گا تو آپ نے بھی معمولی کام سے شروع کیا ہو گا۔ آج آپ اتنے بڑے افسر ہیں۔اللہ نے چاہا تو ایک دن میں بھی ایسا ہی بلند مقام حاصل کر لوں گا۔''

صاحب صاف انکار کر دیتے ہیں کہ تم میری بیٹی کے لائق نہیں ہو۔آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔

شیطان مایوس ہو کر واپس لوٹتے ہیں۔

دوست کہتے ہیں ''ارے مایوس کیوں ہوتے ہو۔جانتے نہیں تمہارے بازو پر بزرگ کا تعویذ ہے۔''

''مگر اس نے آئندہ ملاقات سے منع کر دیا ہے۔''

''تو پھر کیا ہوا۔تم اس کا پیچھا نہ چھوڑو۔جیت تمہاری ہو گی تعویذ کی برکت سے۔''

شیطان صبح سویرے صاحب کے گھر کے دروازے پر پہنچ جاتے ہیں۔وہ انہیں نظرانداز کر کے دفتر چلے جاتے ہیں۔ دفتر سے باہر نکلتے ہیں تو شیطان باہر کھڑے نظر آتے ہیں۔وہ پھر نظرانداز کر کے کار میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں مگر شیطان دوستوں کے مشورے کے مطابق ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک ان کا پیچھا کرتے ہیں۔وہ کلب جاتے ہیں تو یہ وہاں موجود ہیں کسی پارٹی یا تقریب میں جاتے ہیں تو شیطان وہاں بھی موجود ہیں۔ صبح، شام، رات۔ ہر وقت اور ہر جگہ شیطان سائے کی طرح ان کا پیچھا کرتے ہیں۔آخر وہ تنگ آکر ایک دن انہیں بلاتے ہیں اور اپنی بیٹی کی شادی ان سے کر دیتے ہیں۔

دوست خوش ہیں۔شیطان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ان کی ہر خواہش پوری ہو گئی ہے۔ہر ناممکن کام ممکن ہو گیا ہے۔ تعویذ کو اب سونے کی ڈبیا میں رکھ دیا گیا ہے۔

ایک دن شیطان کہتے ہیں ''آخر دیکھنا تو چاہئے کہ بزرگ نے تعویذ میں کیا لکھا ہے؟''

ایک روز کمرے میں سفید براق چاندنیوں کا فرش بچھایا جاتا ہے۔ اگربتیاں اور لوبان جلایا جاتا ہے۔ سب لوگ باوضو ہو کر بیٹھ جاتے ہیں ایک روحانی ماحول طاری ہو چکا ہے۔ فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کانوں میں گونج رہی ہے۔ ہر طرف نور ہی نور ہے۔

ایک صاحب بسم اللہ پڑھ کر تعویذ کا خول اتارتے ہیں۔ اس کے اندر ایک موم جامے میں لپٹا ہوا کاغذ ہے۔ کاغذ کھول کر سب بے تابی سے پڑھتے ہیں۔ ٹیڑھے میڑھے انتہائی بدخط میں ایک فلمی گیت کا مکھڑا لکھا ہوا ہے۔

آیا کرو ادھر بھی مری جاں کبھی کبھی

دراصل شفیق الرحمن نے اپنے مخصوص انداز میں ہنسی ہنسی میں یہ سبق دیا ہے کہ اگر قوت ارادی سے کام لیا جائے اور احساس کمتری سے نجات حاصل کر کے خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا جائے تو کوئی کام بھی ناممکن نہیں ہے۔

جی چاہتا ہے کہ کسی دن ریمبو عرف افضل خان سے پوچھیں کہ انہوں نے کون سا تعویذ استعمال کیا تھا جو زندگی کے سفر میں ہر قدم پر کامیابیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ شیطان کی کامیابیوں کا راز تو ایک جعلی تعویذ تھا۔ ریمبو کی کامیابی کا کیا راز ہے؟

ریمبو نے سوسوا سو کے قریب فلموں میں کام کیا ہے جن میں اردو اور پنجابی فلمیں شامل ہیں۔ ان کی کئی سپر ہٹ فلموں نے کامیابی کے نئے معیار قائم کئے ہیں۔ اب فلم سازی کی رفتار کم ہو گئی ہے تو وہ اسٹیج ٹی وی اسکرین پر مصروف ہیں۔

☆

کراچی سے عرمان عرفانی صاحب نے ایک غلطی کی طرف توجہ دلائی ہے ہم نے ہندوستان کی پہلی ناطق فلم ''عالم آرا'' کے کرداروں میں ماسٹر وٹھل اور زبیدہ کے علاوہ اداکارہ مس بھگو کا نام بھی لکھا تھا اور ساتھ میں یہ بھی وضاحت

کی تھی کہ یہ اداکارہ نرگس کی والدہ جلو بائی ہیں۔ عرفانی صاحب کا کہنا ہے کہ اس فلم میں جلو بائی نام کی اداکارہ نے کام ضرور کیا تھا مگر یہ اداکارہ نرگس کی والدہ نہیں ہیں۔ ان کا نام جدن بائی تھا۔ یہ واقعی سہواً ہوا ہے۔ بے خیالی میں جلو بائی کو جدن بائی سے ملا دیا۔ جدن بائی کے بارے میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

اداکار گل حمید کے بارے میں گزشتہ دنوں ہم نے انجنیئر ظہور صاحب کے حوالے سے کچھ معلومات بیان کی تھیں۔ اب معلوم ہوا کہ وہ اکیلے ہی اس دور کے سپر اسٹار نہیں تھے۔ کچھ اور فنکار بھی اس زمانے میں ہندوستان کی فلمی صنعت میں بہت ممتاز اور نمایاں تھے۔ ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ابتدائی زمانے کے تھیٹر اور فلموں میں بہت زیادہ نمایاں اور ممتاز فنکاروں کی اکثریت مسلمان تھی۔ ہیروئن ہوں یا ہیرو۔ ہر شعبے میں مسلمان ہی سر فہرست نظر آتے تھے۔ یہاں تک کہ کہانی نویس شاعری اور موسیقی کے علاوہ گلوکاری کے شعبے میں بھی مسلمانوں ہی کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ ایک علیحدہ سوال ہے۔ اس کے بارے میں بھی بعض حضرات نے تحقیق کی ہے۔ فی الوقت اداکاروں کا تذکرہ چل رہا ہے۔

گل حمید کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا مگر انہوں نے اداکاری میں نام اور بہت بلند مقام پیدا کیا تھا۔ پٹھان اور پھر اس دور کے پٹھان۔ بھلا سوچئے کہ اس معاشرے میں یہ کس قدر مشکل مرحلہ تھا جب کوئی اصلی نسلی پٹھان اداکار بن جائے۔ وہ تو پھر بہت پہلے کی بات ہے۔ ہمارے شعور کے دور میں بھی ہم نے قیام پاکستان سے پہلے اور اس کے بعد یہی دیکھا کہ فلم، موسیقی اور اداکاری کو مسلم معاشروں میں بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ کسی بھی حیثیت سے فلموں سے وابستگی پر اعتراض کر دیا جاتا تھا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ جب ہم نے صحافی بننے کا فیصلہ کیا تو ہمارے خاندان میں اس پر کتنا شور مچایا گیا تھا۔ اس سلسلے میں کوئی اخلاقی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ دراصل اس زمانے میں صحافت اور غربت و مفلسی کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ صحافی نام تو پیدا کر لیتے تھے مگر معاشی اعتبار سے تکالیف اٹھاتے تھے اور خوشحالی سے ان کا دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ خصوصاً کارکن

صحافی تو ہمیشہ بھوکے اور کنگال ہی رہے لیکن اس وقت اس شعبے کو ایک بلند درجہ اور معاشرے میں ترجیحی حیثیت حاصل

تھی۔ صحافی مشن کے طور پر اخبارات سے وابستہ ہوتے تھے۔ پیسے کمانے کی غرض سے نہیں۔ پیسے کمانا تو دور کی بات ہے اکثر انہیں کئی کئی ماہ تک انتہائی قلیل تنخواہیں بھی ادا نہیں کی جاتی تھیں۔

اس کے بعد جب ہم نے کہانی نویس کی حیثیت سے فلمی صنعت میں قدم رکھا تو سارے خاندان نے اس کی مخالفت کی سوائے ہمارے والدین کے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔ ہمارے والد مرحوم (آکا میاں) اور اماں اس معاملے میں بہت لبرل اور روش خیال تھے۔ ہر اعتراض کے جواب میں ان کے پاس ایک ہی دلیل ہوا کرتی تھی ان کا کہنا تھا کہ جو شخص سمجھدار اور خاندانی روایات سے بخوبی آگاہ ہے وہ اپنا بھلا برا خوب اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے اپنی زندگی کے بارے میں فیصلے کرنے کا اسی کو حق حاصل ہے۔ ممکن ہے غلطیاں کرے، نقصان اٹھائے مگر بسم اللہ کے گنبد میں محصور کر کے اسے ذہنی طور پر معذور کر دینے کی بجائے بہتر ہے کہ اس کو خود ہی فیصلے کرنے اور غلطیاں کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ انسان وعظ و نصیحت سے اس قدر جلد نہیں سیکھتا جتنا کہ وہ اپنی غلطیوں سے سیکھتا ہے پھر اماں اور آکا میاں کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہم جلد بازی اور جذبات کے تحت کوئی فیصلہ نہیں کرتے۔ خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے ہیں۔ نتیجہ کیا نکلے؟ یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

ہم شاید یہ بھی بتا چکے ہیں کہ سنتوش کمار (موسیٰ رضا) اپنی تمام تر شہرت اور دولت مندی کے باوجود جب شادی کرنے نکلے تو اچھے گھرانوں کی لڑکیوں کے رشتے محض اس لیے انہیں نہ مل سکے کہ وہ اداکار تھے بہر حال وہ ایک اچھے خاندان میں شادی کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جمیلہ بھابی ایک مثالی بیوی ثابت ہوئی تھیں مگر جب سنتوش کمار نے صبیحہ خانم سے شادی کی تو سب کی انگلیاں اٹھ گئیں اور زبان چلنے لگی۔

"دیکھا۔ ہم نہ کہتے تھے ان اداکاروں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ اتنی اچھی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کر رہے ہیں۔"

ہم کہتے "مگر دوسری شادی تو بے شمار لوگ کرتے ہیں جو اداکار نہیں ہوتے۔"

جواب میں یہ منطق تھی مگر وہ کسی ایکٹریس سے تو شادی نہیں کرتے۔ ارے بھئی فلموں کا تو ماحول ہی خراب ہے۔ نمک کی اس کان میں جو بھی گیا نمک بن جاتا ہے۔"

ذرا تصور کیجئے کہ ایسے ماحول اور ان معاشرتی اقدار کے ہوتے ہوئے۔ گل حمید نے قیام پاکستان سے بھی کئی سال پہلے اداکاری کے میدان میں قدم رکھا اور نام پیدا کیا۔ حالانکہ ان کا تعلق تو ایک انتہائی قدامت پرست اور روایت پرست ماحول سے تھا پھر یہ بھی یاد رکھیے کہ اس زمانے میں پلے بیک گلوکاری کا وجود تک نہیں تھا۔ فنکاروں کو اپنے گانے مکالمے کے ساتھ ساتھ خود ہی گانے پڑتے تھے اسی لیے اس زمانے کے فنکاروں (اداکاروں) کے لیے گلوکاری بھی ایک لازمی شرط تھی۔ یہ وجہ ہے کہ تھیٹر اور فلم کے ابتدائی دور میں ہیروئنیں تو قریب قریب سب کی سب خاندانی پیشہ ور گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہیرو کے لیے بھی گانا لازم تھا۔ کچھ ہیرو خوش گلو تھے لیکن بعض ہیرو بے سری آوازوں میں گاتے تھے مگر تماشائیوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا تھا۔ موسیقی کے لیے بہت کم ساز استعمال کیے جاتے تھے اور سازندے طبلہ اور ستار وغیرہ لے کر آس پاس ہی چھپ کر بیٹھتے تھے۔ وہ مناسب سچویشن پر پس منظر موسیقی کے لیے بھی سازوں کو چھیڑتے رہتے تھے اور جب ہیرو یا ہیروئن نغمہ سرا ہوتے تھے تو وہ گانے کی دھن کے مطابق ساز بجانے لگتے تھے۔ ظاہر ہے کہ کافی ریاض اور ریہرسل کے باوجود وہ آج کے زمانے جیسا آرکسٹرا تو فراہم نہیں کرتے تھے مگر یہ نہ بھولیے کہ تماشائی اسی موسیقی پر فدا تھے اور سن سن کر جھومتے رہتے تھے۔

تھیٹر کے دور میں مکالمے بھی شاعرانہ اور کسی حد تک قافیہ ردیف کے پابند ہوتے تھے اور بہت زوردار قسم کے مکالمے ردھم کے لحاظ سے لکھے جاتے تھے مثلاً۔۔۔

ایک کردار ''توفیق کس حال میں ہے؟''

دوسرا کردار ''شیر لوہے کے جال میں ہے۔''

یہ آغا حشر کاشمیری کا مشہور مکالمہ ہے جو لوگوں کو آج بھی یاد ہے۔ان کی طرح دوسرے مصنف بھی وزن، قافیے اور ردیف کو پیش نظر رکھ کر مکالمے لکھا کرتے تھے۔

گل حمید بہت خوب رو، قد آور، سرخ و سفید رنگت کے مالک تھے۔آواز میں بھی دبدبہ تھا۔وہ اس زمانے کے نمبر ون ہیرو کہے جاسکتے ہیں جن کی فلمیں دیکھنے کے لیے پہلے ہی سینما گھروں کے سامنے تماشائیوں کی لمبی لمبی قطاریں لگ جاتی تھیں جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے خاموش فلموں سے انہوں نے اداکاری کا آغاز کیا تھا اور جب بولتی فلموں کا دور آیا تو واپس گاؤں چلے گئے تھے مگر بعد میں انہوں نے بولتی فلموں میں کام کیا اور اس قدر شہرت اور کامیابی حاصل کی جیسی کہ خاموش فلموں میں انہیں حاصل تھی۔

جن دنوں خاموش فلمیں بنا کرتی تھیں اس زمانے میں بھی سازندوں کی اہمیت تھی بلکہ زیادہ اہمیت اور ضرورت تھی۔ مختلف مناظر کے دوران میں یہ پس پردہ سازندوں کے ذریعے سین میں جان ڈال دیا جاتا تھا ورنہ تمام تر خاموش فلموں کے دوران میں تو ہال میں سناٹا ہی طاری ہو جاتا۔

ماسٹر نثار بھی گل حمید کے ہم عصر تھے۔ماسٹر نثار کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ کلاسیکی موسیقی سے بھی واقف تھے اور بہت سریلی آواز کے مالک تھے۔گل حمید گانے کے معاملے میں مشکل میں پڑ جاتے تھے حتی الامکان وہ گلوکاری سے گریز کرتے تھے۔بہت کم فلمیں ایسی ہوں گی جن میں انہوں نے گلوکاری کا مظاہرہ کیا ہو مگر محض خانہ پری کے لیے۔ اس کے برعکس ماسٹر نثار باقاعدہ گلوکار تھے۔

ماسٹر نثار نے اس زمانے کی سپر اسٹار اور حسین ترین ہیروئن کجن بائی کے ساتھ کئی فلموں میں کام کیا تھا۔ کجن کا پورا نام جہاں آرا کجن تھا۔ ان کے حسن وجمال کی داستانیں افسانہ لگتی ہیں مگر کہتے ہیں کہ واقعی وہ حسن وجمال کا پیکر تھیں۔ بہت اچھی گلوکارہ بھی تھیں اسی لیے سارا ہندوستان ان کا دیوانہ تھا۔ کجن بائی کے بارے میں لاہور سے محمد اسلم صاحب نے اے حمید کے مقبول کالم میں یہ معلومات بھی فراہم کی ہیں کہ کجن شاعرہ بھی تھیں اور انہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اعلیٰ خاندان کے مردوں کے لیے بھی میٹرک بہت اعلیٰ تعلیم خیال کی جاتی تھی۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ میڈن تھیٹر سے وابستہ ہو گئیں جہاں انہوں نے آغا حشر کاشمیری کی فلموں میں ہیروئن کا کردار کیا۔ مس کجن کو ملکۂ حسن کا خطاب دیا گیا تھا۔ انہیں شیر پالنے کا بھی شوق تھا۔ امیر ترین لوگ ان کے جوتے اٹھا کر بھی خوش ہوتے تھے۔

ماسٹر نثار کو گل حمید پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ وہ بہت اچھے کلاسیکی موسیقار بھی تھے اس لیے ان کی فلموں میں خاص طور پر زیادہ گانے رکھے جاتے تھے۔ فلم ”لیلیٰ مجنوں“ کے گانے اس قدر مقبول ہوئے تھے کہ بچہ بچہ گاتا پھرتا تھا۔ یہ ماسٹر نثار کی مقبولیت اور ہنر مندی کا بھرپور اظہار تھا۔

عبدالرحمن کابلی بھی اس زمانے کا ایک معروف اداکار تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ جس شخص کے نام کے ساتھ ”کابلی“ منسلک ہے اس کا تعلق صوبہ سرحد ہی سے ہو گا۔ عبدالرحمن کابلی خالص پٹھان ہونے کے باوجود بہت اچھا گلوکار بھی تھا۔ عبدالرحمن کابلی کو بھی انتہائی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ ان کے گائے ہوئے گیت بھی لوگوں کی زبانوں پر تھے۔

ایک اور ہیرو بھائی دیسا امرتسری تھا۔ وہ بہت خوب رو تھا۔ انہوں نے بہت سی فلموں میں اداکاری کی تھی جن میں سے ایک فلم ”رشک لیلیٰ“ بہت مقبول ہوئی تھی۔ اسکی ہیروئن مس زبیدہ تھیں جو عموماً گل حمید کے ساتھ ہیروئن کے کردار میں جلوہ گر ہوتی تھیں۔ اداکار کمار (یہ پاکستان آ گئے تھے اور ہدایت کار ایس اے حافظ کے والد تھے)

اشرف خاں، مظہر خاں نواب بھی اس دور کے بہت نمایاں اداکار تھے۔ اداکارہ ثریا کے ماموں ایم ظہور نے بھی اداکاری میں بہت نام پیدا کیا تھا۔ وہ بہت اچھے ولن اور اچھے اداکار تھے۔ اسی عہد کے ایک اور مسلمان اداکار جینت بھی تھے۔ ان کا تعلق بھی پشاور سے تھا مگر جینت ان کا فلمی نام تھا۔ وہ مشہور بھارتی اداکار امجد خاں کے والد تھے۔ جینت بہت طرح دار اور تنک مزاج تھے۔

پٹھان فنکاروں کا تذکرہ شروع ہوا تو ایک اور سرحدی فنکار کا ذکر بھی لازم ہو گیا۔ صاحب پٹھان تھے بلکہ خالص پٹھان۔ ان کا تعلق پشاور سے تھا۔ نئی نسل تو غالباًان کے نام سے بھی واقف نہیں ہے لیکن ہم نے قیام پاکستان سے

پہلے اور اس کے بعد ان کے کئی نغمات سنے تھے۔ ایک زمانے میں یہ بمبئی کے مقبول ترین گلوکاروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کا نام جی ایم درانی تھا۔

برصغیر کی فلمی موسیقی کے آغاز میں جن گلوکاروں نے اس فلمی صنعت کو اپنی آوازوں سے سجایا تھا ان میں جی ایم، درانی ایک ممتاز اور اہم نام ہیں۔ بہت میٹھی اور سریلی آواز کے مالک تھے۔ تلفظ اور لہجہ بھی بہت اچھا تھا۔ شین قاف بھی درست تھا۔ ان کے نغمات سن کر کوئی یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ ان کا تعلق صوبہ سرحد سے ہے اور وہ اصلی نسلی پٹھان ہیں۔

گلوکاری میں ان کا قدم رنجہ فرمانا اور ہماری پیدائش کا سال قریب قریب ایک ہی ہے۔ ہم ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ جی، ایم، درانی نے بھی لگ بھگ اسی سال ریڈیو پشاور سے اپنا پہلا نغمہ براڈکاسٹ کیا جو کہ پشتو زبان میں تھا۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ جس روز پشاور میں آل انڈیا ریڈیو کے مرکز کا افتتاح ہوا اسی روز جی ایم درانی نے افتتاحی پروگرام میں حصہ لیا۔ اس طرح دور رفتہ کے اکثر فنکاروں کی طرح ان کی فلمی زندگی کا آغاز بھی ریڈیو سے ہی ہوا تھا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ آخر اتنے پرانے زمانے میں بھی پٹھانوں کو فنون لطیفہ، خصوصاًاداکاری اور گلوکاری سے اس قدر لگاؤ کیوں تھا۔ اس زمانے میں یعنی ہمارے بچپن میں پٹھانوں کے بارے میں عام تصور " خوچہ۔ ام تمہارا ستیاناس

کردے گا'' قسم کے فقرے بولنے والوں کا تھا۔ ہم نے بچپن میں ٹیگور کی مشہور کلاسیکی کہانی ''کابلی والا'' پڑھی تھی اور پھر ہندوستان کے مختلف شہروں میں پٹھانوں کو خالص پٹھانی انداز میں اردو بولتے اور نسوار کھاتے بھی دیکھا تھا۔ ہم بھی عام طور پر پٹھانوں کو '' کابلی والا'' قسم کا پٹھان ہی سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب ہمیں معلوم ہوا کہ فلم ''سکندر '' کا ہیرو پرتھوی راج کپور ایک پٹھان ہے اور وہ نہ صرف معروف فلمی اداکار ہے بلکہ تھیٹر کا بھی بہت بڑا فنکار ہے تو ہمیں بہت حیرت ہوئی تھی حالانکہ یہ محض ہماری لاعلمی اور پٹھانوں کے بارے میں پائے جانے والے عام تاثر کا سبب تھا۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا پھر پرتھوی راج کے سارے خاندان نے ایک زمانے میں بمبئی کی فلمی صنعت پر اجارہ داری قائم کرلی تھی۔ دلیپ کمار اور ان کے بھائی ناصر خاں جیسے اداکاروں کا تعلق بھی پشاور ہی سے تھا۔ ضیاء سرحدی جیسے صاحب قلم لوگ بھی سرحد ہی کی سر زمین سے تعلق رکھتے تھے۔

جی ایم درانی کی کہانی مختصراً یہ ہے کہ انہیں بچپن ہی سے گانے کا شوق تھا بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف اداکاری کا شوق بھی رکھتے تھے چنانچہ بعد میں انہوں نے اداکاری بھی کی تھی لیکن ان کی اصل وجہ شہرت گلوکاری ہی بنی۔ درانی صاحب کو گلوکاری کا اتنا شوق تھا کہ اسکول کے زمانے میں بھی مشہور نغمات اور تقاریب میں نعتیں گایا کرتے تھے لیکن یہ کسی کو خیال تک نہ تھا کہ وہ فلموں کے گلوکار بن جائیں گے۔ انہوں نے جب سنا کہ پشاور میں ریڈیو اسٹیشن کا افتتاح ہونے والا ہے تو مچل گئے اور اپنے عزیزوں اور رشتے داروں میں سفارشیں تلاش کرنے لگے۔ بہر حال ایک عزیز کی سفارش پر انہیں ایک گانا پیش کرنے کا موقع مل گیا حالانکہ ہمارے خیال میں اس زمانے میں پشاور میں اچھے گلوکار اور فنکار ہی کتنے دستیاب ہوتے ہوں گے۔ انہوں نے اپنا پہلا ریڈیائی نغمہ پشتو زبان میں گایا تھا لیکن ان کی آرزو اردو فلموں میں گلوکاری کرنے کی تھی۔ ظاہر ہے کہ پشتو کے مقابلے میں اردو کا میدان بہت وسیع تھا اور اس کے ذریعے وہ ملک گیر شہرت اور بے شمار دولت حاصل کر سکتے تھے۔

انہیں ریڈیو سے پہلا نغمہ پیش کرنے کا معاوضہ پانچ روپے ملا تھا جو کہ اس زمانے میں بہت معقول تھا۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت پولیس کے سپاہی کی تنخواہ دو تین روپے ماہوار ہوتی تھی۔ ایک گانے کا پانچ روپے معاوضہ اور وہ بھی

ایک نو آموز اور نووارد گلوکار کے لیے بہت ''خطیر'' رقم تھی۔ رقم سے زیادہ گلوکاری کا موقع ملنے کی انہیں خوشی تھی۔ انہوں نے اپنے دوست احباب کو مٹھائی کھلائی اور داد وصول کی لیکن قدامت پرست رشتے داروں نے اعتراض بھی کیا۔ جب کسی پر کوئی کام کرنے کی دھن سوار ہو جائے تو اس کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ جی ایم درانی کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔

ریڈیو سے گلوکاری کرنے کے بعد ان کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ اب ان کے لیے پشاور میں رہ کر وقت ضائع کرنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ انہوں نے بوریا بستر سمیٹا اور لاہور پہنچ گئے۔

لاہور میں ماسٹر غلام حیدر موسیقار کی حیثیت سے اس وقت بھی شہرت یافتہ تھے۔ درانی صاحب نے ان کے پاس حاضر ہو کر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

ماسٹر غلام حیدر آوازوں اور فنکاروں کی پرکھ کے معاملے میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ جس شخص نے نور جہاں جیسی گلوکارہ کو موقع دیا اور فلم ساز کی مخالفت کے باوجود لتا منگیشکر سے فلمی گانا ریکارڈ کرایا تھا وہ جی ایم، درانی کے معاملے میں چوک گیا۔ ماسٹر غلام حیدر نے جی ایم درانی کا گانا سننے کے بعد فیصلہ دیا کہ تم گلوکار نہیں بن سکتے۔ بلاوجہ اپنا وقت ضائع نہ کرو کوئی اور کام کرو۔''

ماسٹر غلام حیدر جیسے موسیقار کا یہ فیصلہ ان کے لیے انتہائی مایوس کن تھا لیکن حوصلہ شکن نہیں تھا۔ دراصل جن لوگوں کو کسی کام کی لگن ہوتی ہے وہ اتنی جلدی حوصلہ نہیں ہارتے۔ ہم نے تو ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو کہ واقعی فنکار بننے کے لائق نہ تھے مگر ساری زندگی اسی کوشش میں لگے رہے اور اپنی زندگی ضائع کر دی۔ انہوں نے حاصل بھی کچھ نہیں کیا لیکن ان کے اندر کی لگن نے آخر دم تک ہار نہیں مانی۔

اب جی ایم درانی کے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ ریڈیو سے گلوکاری اور صداکاری کرنے پر اکتفا کریں مگر قدرت جب کسی پر مہربان ہوتی ہے تو اس کے لیے از خود راستے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جی ایم درانی کے ساتھ بھی ایسا

ہی ہوا۔لاہور اس زمانے میں فلمی صنعت کا مرکز تھا۔بہت سے کامیاب اور آرزو مند لوگ جوق در جوق بمبئی کا رخ کر رہے تھے اور یہ سلسلہ جاری ہی رہتا تھا۔

لاہور کے ایک ریستوران میں اتفاق سے جی ایم درانی کی ملاقات اے شاہ شکار پوری سے ہو گئی۔اے شاہ شکار پوری اداکاری کے میدان میں کوشاں تھے۔بعد میں وہ بہت کامیاب کامیڈین، فلم ساز اور ہدایت کار بھی بن گئے تھے۔جی ایم درانی نے انہیں اپنی ساری کتھا سنائی اور ماسٹر غلام حیدر کے فیصلے سے بھی آگاہ کر دیا۔اے شاہ شکار پوری ریڈیو پر درانی صاحب کی آواز سن چکے تھے۔انہوں نے جی ایم درانی کو مشورہ دیا وہ بمبئی جا کر قسمت آزمائی کریں ممکن ہے کامیابی حاصل ہو جائے۔

اے شاہ کی حوصلہ افزائی نے جی ایم درانی کے دل میں امید کی نئی کرن پیدا کر دی اور وہ اے شاہ شکار پوری کے ساتھ ہی لاہور سے بمبئی چلے گئے۔بمبئی میں اے شاہ ان کے لیے ایک مخلص دوست اور مددگار ثابت ہوئے۔ان کے بمبئی میں فلم سازوں اور ہدایت کاروں سے تعلقات تھے۔انہوں نے جی ایم درانی کو ان سب سے متعارف کرایا اور ان کے شوق اور صلاحیتوں کے بارے میں بتایا۔

سہراب مودی اس زمانے میں فلم ''صید ہوس'' بنا رہے تھے۔اس کی کہانی آغا حشر کاشمیری کے مشہور ڈرامے پر مبنی تھی۔اس وقت سہراب مودی فلم ساز، ہدایت کار اور اداکار کی حیثیت سے کافی کامیاب ہو چکے تھے۔

سہراب مودی نے جی ایم درانی کا ٹیسٹ لیا اور پاس کر دیا۔اس طرح انہیں گلوکاری کے علاوہ اداکاری کے لیے بھی چن لیا گیا۔اس زمانے کے دستور کے مطابق جی ایم درانی کو تیس روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا گیا جو کہ ایک نو آموز گلوکار کے لیے معقول معاوضہ تھا۔اسی طرح فلمی صنعت میں جی ایم درانی کے سفر کا آغاز ہوا۔

''صید ہوس'' میں درانی صاحب نے گیت بھی گائے اور اداکاری بھی کی۔فلم میں انہیں ایک مزاحیہ کردار دیا گیا تھا اداکاری ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی تھی دراصل ان کا بنیادی مقصد تو گلوکار بننا تھا۔

صید ہوس میں جی ایم درانی بہت اچھی گلوکاری کا مظاہرہ کیا۔خاص طور پران کی گائی ہوئی ایک غزل بہت زیادہ مقبول ہوئی۔غزل بہت اچھی تھی طرز بھی اچھی تھی۔جی ایم درانی نے اس گیت میں اپنا کلیجا نکال کرر کھ دیا تھابول یہ تھے

مستوں پہ عین فرض ہے پینا شراب کا

گھٹی میں میری پڑ گیا قطرہ شراب کا

پہلی فلم کے پہلے نغمے سے ہی انہیں مقبولیت حاصل ہو گئ۔

سہراب مودی نے انہیں اپنی اگلی فلم میں گلوکار اور اداکار کی حیثیت سے منتخب کر لیا۔جی ایم درانی کی امید بر آئی تھی مگر ادھر پشاور سے انہیں خصوصی بلاوا آگیا تو وہ اچانک بمبئ سے پشاور روانہ ہو گئے۔

سراب مودی کو انکی یہ حرکت بہت ناگوار گزری اور ڈسپلن کی خلاف ورزی کے جرم میں انہیں برطرف کر دیا گیا۔وہ اس برطرفی سے ناواقف تھے۔پشاور سے واپس بمبئ پہنچنے پر انہیں یہ بری خبر ملی تو وہ پریشان ہو گئے۔ایک بہت اچھے فلم سازادارے میں کام کرنے کا موقع ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور وہ ہاتھ ملتے رہ گئے تھے۔انہوں نے بمبئ کی فلمی صنعت میں بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر دوبارہ موقع نہ مل سکا۔مایوس ہو کر انہوں نے گراموفون کمپنی کا رخ کیا جہاں انہیں ملازمت تو مل گئ مگر ان کی پوسٹنگ دہلی میں ہو گئ۔مرتا کیا نہ کرتا۔وہ بمبئ سے بچشم نم دہلی روانہ ہوئے اور گراموفون کمپنی میں اردو اور پشتو کے گیت ریکارڈ کراتے رہے۔کام وہ گراموفون کمپنی میں کر رہے تھے مگر ان کا دل فلموں میں اٹکا ہوا تھا۔

قدرت نے انہیں دوبارہ موقع دیا۔انکی ملاقات مشہور موسیقار رفیق غزنوی سے ہو گئ۔رفیق غزنوی ان دنوں ریڈیو سے وابستہ تھے۔اس ملاقات کا یہ فائدہ ہوا کہ رفیق غزنوی نے انہیں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازمت دلوادی۔ریڈیو سے وہ گلوکاری اور صداکاری کرتے رہے۔یہ ایک اچھی ملازمت تھی سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی آواز ریڈیو کے ذریعے سارے ملک میں پھیل رہی تھی مگر جی ایم درانی مطمئن نہیں تھے۔وہ فلموں میں گلوکاری کا مزہ چکھ چکے تھے

اب کوئی اور کام انہیں نہیں بھاتا تھا۔ آخر ایک دن انہوں نے ریڈیو کی ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ رفیق غزنوی اور دوستوں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر ان کے سر پر تو فلم کا بھوت سوار تھا اور یہ وہ نشہ نہیں تھا جسے ترشی اتار دیتی۔ انہوں نے ریڈیو سے استعفیٰ دے دیا اور بمبئی کا ٹکٹ کٹا لیا۔ بمبئی میں ایک بار پھر وہ تھے اور فلمی نگار خانوں کے پھیرے۔ بہت کوشش کی مگر گوہر مراد ہاتھ نہ آیا۔ فلموں میں گلوکاری یا اداکاری کا کوئی موقع نہیں مل سکا تھا۔ ادھر بیکاری اور بے روزگاری نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ وہ بمبئی چھوڑ کر جانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ اچانک رفیق غزنوی کا تبادلہ دہلی سے بمبئی کے ریڈیو اسٹیشن میں ہو گیا۔ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ جی ایم درانی نے اپنی ناکامیوں کی داستان سنائی اور واپس جانے کے ارادے سے مطلع کیا مگر رفیق غزنوی اس بات کے حق میں نہ تھے۔ انہوں نے انہیں سمجھا بجھا کر ایک بار پھر ریڈیو میں کام کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح انہیں بمبئی میں رہنے کا بہانا مل گیا۔ اب پھر وہ تھے اور ریڈیو کے نغمے لیکن فلموں میں گلوکاری کرنے کی تمنا دل میں باقی تھی۔

جب کوئی کام درست ہونا ہوتا ہے تو اس کے لیے بہانے بن جاتے ہیں۔ قدرت کو جی ایم درانی کو فلموں میں ایک اور موقع فراہم کرنا تھا شاید اسی لیے انہیں بمبئی میں قیام کرنے کا موقع ملا تھا۔ ایک روز جی ایم درانی کی ملاقات موسیقار نوشاد سے ہوئی جو کہ اس وقت بھی نامور موسیقار تھے۔ نوشاد اس زمانے میں ایک فلم ''درشن'' کی موسیقی بنا رہے تھے۔ موسیقار نوشاد نے اس فلم میں گلوکار کی حیثیت سے جی ایم درانی کے دو گیت ریکارڈ کیے۔ بطور پلے بیک سنگر ''درشن'' ان کی پہلی فلم تھی۔ اس سے پہلے ان کے گائے ہوئے گانے خود ان پر ہی فلمائے گئے تھے مگر اس بار ان کی آواز کسی اور اداکار کے کام آرہی تھی۔

''درشن'' نمائش کے لیے پیش ہوئی اور بے حد کامیاب ہوئی۔ جی ایم درانی کے گائے ہوئے گیت بھی بہت پسند کیے گئے۔ گلوکار اور پلے بیک سنگر کی حیثیت سے یہ ان کی پہلی کامیابی تھی جو موسیقار نوشاد کی موہون منت تھی۔ نوشاد ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے اپنی اگلی فلم ''اسٹیشن ماسٹر'' کا ایک نغمہ بھی جی ایم درانی کی آواز میں ریکارڈ کیا۔ نوشاد کی موسیقی اور جی ایم درانی کی آواز ان دونوں کے ملاپ نے ایک بہت اچھے نغمے کو جنم دیا۔ یہ

ایک نیم کلاسیکی اور لوک طرز پر مشتمل تھا۔ یہ گانا بہت مقبول ہوا۔ اس طرح پلے بیک سنگر کی حیثیت سے جی ایم درانی ایک مستند گلوکار تسلیم کر لیے گئے۔

جب قسمت مہربان ہوتی ہے تو سبھی مہربان ہو جاتے ہیں۔ جی ایم درانی کو ایک اور اچھا موقع اس وقت ملا جب لاہور سے جانے والے موسیقار خواجہ خورشید نے اپنی پنجابی فلم ''کڑمائی'' کے لیے گلوکار کی حیثیت سے جی ایم درانی کا انتخاب کیا۔ بمبئی میں خواجہ خورشید انور کی پہلی فلم تھی۔ کام کے دوران میل جول بڑھا تو خواجہ صاحب نے ان کے شوق کے پیش نظر جی ایم درانی کو اپنا معاون بھی مقرر کر دیا۔

''کڑمائی'' میں جی ایم درانی کے گائے ہوئے نغمے بہت مقبول ہوئے۔ اس فلم میں واسطی نے مرکزی کردار ادا کیا تھا جو مزاحیہ انداز کا تھا۔ جی ایم درانی کی آواز میں ریکارڈ کیے ہوئے تمام گانے واسطی پر ہی فلمائے گئے تھے۔

واسطی اپنے دور کے بہت اچھے اور پسندیدہ اداکار تھے۔ ہلکے پھلکے کردار ادا کرنے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ لیکن بعض فلموں میں واسطی نے کریکٹر ایکٹر اور ولن کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ وہ دراز قد اور متناسب جسم کے وجیہہ آدمی تھے۔ اردو کا تلفظ اتنا اچھا تھا کہ جب اردو فلموں میں کام کرتے تھے تو کوئی لوگ انہیں اردو داں ہی سمجھتے تھے۔ حالانکہ ان کا تعلق پنجاب سے تھا بلکہ غالباً وہ لاہور کے رہنے والے تھے اداکاری کے شوق میں بمبئی چلے گئے تھے جہاں انہوں نے بہت مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔

''کڑمائی '' پنجابی فلم تھی اور ظاہر ہے کہ خالص پنجابی زبان میں بنائی گئی تھی اس لیے جب انہوں نے خوب صورت لب و لہجے کے ساتھ پنجابی کردار ادا کیا تو بہت سے لوگ جنہیں ان کے بارے میں علم نہ تھا بہت حیران ہوئے۔ واسطی کا کردار اس فلم میں مزاحیہ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب پنجابی فلموں میں مار پیٹ، تشدد اور بے ہودگی کا نام و نشان تک نہ ہوتا تھا۔ ہلکی پھلکی مزاحیہ فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ پنجابی فلموں کا یہ انداز قیام پاکستان کے بعد کافی عرصے تک قائم رہا پھر جب تشدد پر مبنی غنڈوں کی فلموں کو مقبولیت حاصل ہوئی تو فلم ۔۔۔ والوں کی روایتی بھیڑ چال کے مطابق سبھی فلمیں

مار کٹائی اور تشدد سے بھرپور نظر آنے لگیں۔اس رجحان نے پہلے تو تعلیم یافتہ طبقے کو پنجابی فلموں سے دور کیا اور پھر خواتین اور اہل خاندان کے ساتھ فلمیں دیکھنے والوں نے بھی ان سے پرہیز کارویہ اپنالیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پاکستان کی سبھی پنجابی فلمیں اس مخصوص رنگ میں رنگی نظر آنے لگیں۔ فلمی صنعت کو اس رجحان سے کافی نقصان پہنچا کیونکہ یہ فلمیں دیکھنے والوں کی تعداد محدود سے محدود تر ہوتی چلی گئی۔ بہر حال یہ ایک علیحدہ موضوع ہے جس کے بارے میں پہلے بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

جی ایم درانی کو بمبئی کی فلمی دنیا میں اب ایک معتبر اور مقبول پلے بیک سنگر کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔انہوں نے اس کے بعد کئی فلموں میں اپنی آواز کا جادو جگایا۔ رتن، نمستے، شاردا، مرزا صاحبان، سبق وغیرہ ان کی مشہور فلمیں ہیں۔انہوں نے بہت سے نامور موسیقاروں کے ساتھ کام کیا جن میں نوشاد، خواجہ خورشید انور قابل ذکر ہیں۔

اُس ادور میں جی ایم درانی ایک ممتاز گلوکار تصور کیے جاتے تھے۔انکے گائے ہوئے چند مقبول نغمے یہ ہیں۔

دنیا میں سب جوڑے جوڑے

عاشق پھریں ہیں اکیلے (فلم شاردا)

ہاتھ سینے پہ جو رکھ دو تو قرار آجائے۔

فلم ''مرزا صاحباں'' کا یہ نغمہ انہوں نے فلم کی ہیروئن نورجہاں کے ساتھ گایا تھا۔

کھائے گی ٹھوکریں یہ جوانی کہاں کہاں (فلم مرزا صاحباں)

خاموش فسانہ ہے۔

فلم ہیر رانجھا کے لیے یہ گانا انہوں نے لتا منگیشکر کے ساتھ گایا تھا۔

فلم ’’ ہیر رانجھا‘‘ کے مصنف فلم سازاور ہدایت کار ولی صاحب تھے اور یہ فلم اردو زبان میں تھی۔’’ہیر رانجھا‘‘ قیام پاکستان کے بعد نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔

گائے چلا جا۔گائے چلا جا

ایک دن تیرا بھی زمانہ آئے گا

فلم ’’ ہم لوگ‘‘ کا یہ گانا بے انتہا مقبول ہوا تھا۔اس فلم کے مصنف و ہدایت کار ضیا سرحدی اور موسیقار روشن

تھے۔فلم ’’ہم لوگ‘‘ اپنے عہد کی منفرد اور مختلف فلم تھی جس نے بمبئی کی فلمی صنعت میں ایک نئے رجحان کو جنم دیا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ حقیقی زندگی سے نزدیک اور مظلوم طبقے سے تعلق رکھنے والی یہ فلم کاروباری لحاظ سے بھی بے حد کامیاب ہوئی تھی۔

اسی زمانے میں جی ایم درانی نے فلم بھائی جان، کالے بادل، چاندنی رات اور دیگر کامیاب فلموں کے لیے گانے گائے جو سارے ملک میں گائے جاتے تھے۔’’ہم لوگ ‘‘میں جی ایم درانی نے ایک مختصر کردار بھی ادا کیا تھا۔فلم ’’چاندنی رات ‘‘ میں جی ایم درانی کا یہ نغمہ بہت مقبول ہوا تھا۔

چھورے کی ذات بڑی بے وفا

اس کے موسیقار نوشاد تھے۔یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس فلم کے فلم ساز نسیم بانو کے شوہر اور سائرہ بانو کے والد ایم احسان تھے جن کا تعلق لاہور سے تھا اور بعد میں وہ نسیم بانو کو طلاق دے کر لاہور واپس آ گئے تھے۔یہاں ہماری ان سے ایک دو سرسری ملاقاتیں ہوئیں۔بہت خوب صورت اور وجیہہ آدمی تھے۔ شائستگی اور بلند اخلاق کا نمونہ تھے ۔بہت آہستگی سے بات کرتے تھے۔ان سے ہماری ملاقات مزنگ چونگی پر واقع ایک سینما میں ہوئی تھی۔اس سے ملحق کوٹھی میں ہی وہ رہا کرتے تھے بعد میں اس کوٹھی کی جگہ یہ سینما تعمیر کیا گیا تھا۔

جی ایم درانی کا یہ دور انتہائی کامیابی اور عروج کا دور تھا مگر جب محمد رفیع فلموں میں جلوہ گر ہوئے تو انہوں نے دوسرے مرد گلوکاروں کو گہنا دیا جس طرح کہ لتا منگیشکر نے دوسری تمام خاتون گلوکاراؤں کو پس منظر میں ڈال دیا تھا۔ رفتہ رفتہ، جی ایم درانی کی مانگ کم ہونے لگی تو انہوں نے فلموں میں اداکاری شروع کر دی۔ اور کئی فلموں میں کریکٹر ایکٹر کے طور پر کام کیا لیکن گلوکار اور پلے بیک سنگر کی حیثیت سے جی ایم درانی رفتہ رفتہ قصہ پارینہ بن کر رہ گئے۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انہوں نے گلوکاری کا آغاز قیام پاکستان سے پہلے کیا تھا دیکھا جائے تو وہ پنکج ملک، سہگل، سریندر کے ہم عصر تھے۔ یہ سبھی اپنے دور کے مایہ ناز اور مقبول ترین گلوکار تھے۔

مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب موسیقی کے نئے انداز اور نئی آوازیں فلمی دنیا میں روشناس ہوئیں تو یہ سبھی فنکار ایک ایک کر کے گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو گئے حالانکہ ان سب کے گائے ہوئے نغمات آج بھی مقبول ہیں۔

فلمی موسیقی میں لوک دھنوں اور نیم کلاسیکی راگ راگنیوں پر مبنی نغمات کا رواج کم ہونے لگا اور جدید مغربی انداز کی موسیقی نے اس کی جگہ لے لی تو پرانے لوگ قصہ پارینہ بن کر رہ گئے۔ اس کے علاوہ گلوکاروں کی ایک نئی کھیپ فلمی دنیا میں آ گئی جنہوں نے بہت جلد اپنا سکہ جما لیا۔ ان میں محمد رفیع سر فہرست تھے۔ ان کے علاوہ مکیش اور کشور کمار کے علاوہ طلعت محمود نے بھی گلوکاری میں مقام پیدا کر لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان قمقموں کے سامنے پرانے چراغ کب تک جل سکتے تھے۔ ویسے بھی فلمی دنیا میں اداکاروں اور فنکاروں کے علاوہ موسیقاروں اور ہدایت کاروں کا بھی ایک مخصوص دور ہوتا ہے جس کے بعد گنتی کے نہایت اعلیٰ پائے کے فنکار ہی رہ جاتے ہیں لیکن کچھ عرصے بعد وہ بھی بتدریج پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ یہی زمانے کا دستور ہے۔ جی ایم درانی بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے تھے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ محمد رفیع جیسا گلوکار جس کا فلمی دنیا میں ڈنکا بجتا تھا ایک وقت ایسا آیا جب اسے بھی نظر انداز کیا جانے لگا۔ موسیقاروں میں نوشاد نے کافی ثابت قدمی دکھائی مگر اس کے بعد وہ بھی پس پردہ چلے گئے۔ اب ان لوگوں کے فن کے غیر فانی نقوش باقی رہ گئے ہیں جو کبھی مٹائے بھی نہیں مٹیں گے۔

جی ایم درانی مستقل طور پر بمبئی میں مقیم رہے۔البتہ وہ اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے کبھی کبھی پشاور کا چکر لگالیا کرتے تھے لیکن ان کا انتقال بمبئی میں ہوا۔پرانی موسیقی کا دور ختم ہواتو پرانے زمانے کے عظیم موسیقار اور گلوکار بھی بھلادیئے گئے۔جی ایم درانی اس معاملے میں تنہا نہیں ہیں۔انکے عہد کے دوسرے عظیم اور مایہ ناز فنکار بھی اب نئی نسل کے لیے اجنبی بن کر رہ گئے ہیں۔ جی ایم درانی کا انتقال چند سال قبل ہوا ہے۔ان کے انتقال کی خبر بھی شاید اخبارات میں شائع نہیں ہوئی۔ ممکن ہے چند فلمی اخبارات کے فلمی ایڈیشن میں چند سطور کی خبر شائع کی گئی ہو لیکن اتنے بڑے فنکار کی وفات پر جو آخری خراج تحسین ادا کرنا چاہئے تھا جی ایم درانی اس سے محروم ہی رہے۔

جی ایم درانی کی اس گمنامی کی موت سے ایک پاکستانی گلوکار کی یادیں بھی تازہ ہو گئیں جو کسی زمانے میں پاکستان کی فلمی صنعت کا مایہ ناز گلوکار تھااور جس کی خوب صورت میٹھی اور ریشمی آواز اپنے زمانے کے دوسرے بہت اچھے گلوکاروں سے بالکل مختلف تھی۔ یہ سلیم رضا تھے۔ سلیم رضا ان گلوکاروں میں سے ہیں جو اپنی آواز کی انفرادیت کے باعث محض گیت سن کر ہی پہچانے جاسکتے ہیں۔ مہدی حسن، احمد رشدی اور مسعود رانا کی آوازوں میں بھی یہی خصوصیت تھی۔

سلیم رضا کے بارے میں اس سے پہلے بھی بتایا جاچکا ہے لیکن جی ایم درانی کے ذکر کے ساتھ ان کا تذکرہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں میں کئی باتیں مشترک تھیں۔ مثلاً سلیم رضا نے بھی ۱۹۵۳ء میں ریڈیو کے ذریعے اپنی گلوکاری کا آغاز کیا تھا۔انہوں نے پہلا گانا ریڈیو پاکستان لاہور سے پیش کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جی ایم درانی بھارتی فلمی صنعت میں روبہ زوال ہو چکے تھے۔ سلیم رضا کافی عرصے تک ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہونے والے موسیقی کے پروگراموں میں اپنی آواز کا جادو جگاتے رہے یہاں تک کہ بابا جی اے چشتی کے کانوں تک ان کی سریلی آواز کی رسائی ہو گئی اور وہ ان کے توسط سے فلمی دنیا میں داخل ہوئے اور پھر لگ بھگ بیس سال تک ان کے نغمے پاکستانی فلموں کی مقبولیت میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔

سلیم رضا اور جی ایم درانی میں دوسری مشترک بات یہ تھی کہ ان دونوں نے عروج کے بعد زوال دیکھا۔ جی ایم درانی نے تو اداکاری کے ذریعے خود کو فلمی صنعت سے وابستہ رکھا لیکن سلیم رضا اداکاری کے کوچے سے قطعی ناواقف تھے۔

اس لیے جب فلم سازوں اور موسیقاروں نے ان کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں تو انہوں نے بے قدری اور بے روزگاری سے تنگ آکر ترک وطن کا فیصلہ کر لیا اور کینیڈا چلے گئے جہاں وہ چھوٹے موٹے پروگراموں اور اپنی قائم کردہ موزیک اکیڈمی کے ذریعے روزی کماتے تھے۔ پاکستان میں رہ کر انہوں نے اپنی آواز کے ذریعے زندہ رہنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ انہوں نے کمرشل فلموں کے لیے " جنگل" گائے۔ کمرشل فلموں کی موسیقی مرتب کی۔ ٹیلی ویژن کے لیے بھی کمرشل فلمیں بنائیں جن کی موسیقی بہت اچھی تھی لیکن یہ سب کچھ سلیم رضا کے لیے کافی نہ تھا۔ اپنے عہد کے نامور گلوکار کو یہ زیب بھی نہیں دیتا تھا مگر وہی بات ہے کہ روٹی تو کسی طور کما کر کھائے مچھندر۔

سلیم رضا اور جی ایم درانی میں ایک اور مشترک بات یہ تھی کہ دونوں نے اپنی جائے پیدائش سے دور وفات پائی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سلیم رضا جی ایم درانی سے پہلے قدرے کم عمری میں فوت ہوئے لیکن جی ایم درانی کی طرح ان کے انتقال کی خبر بھی خاموشی سے گزر گئی۔ بعض اخبارات میں چند سطور ان کے انتقال کے بارے میں شائع کی گئیں اور بس۔ یہ اس فنکار کا انجام تھا جس نے پاکستانی فلمی موسیقی میں بہت ممتاز مقام حاصل کیا تھا اور لگ بھگ بیس سال تک فلموں میں گلوکاری کرتے رہے تھے۔ ان کے بے شمار نغمات بے انتہا مقبول ہوئے اور آج بھی مقبول ہیں۔ بیس سالہ فلمی زندگی میں انہوں نے تین سو سے زائد فلموں کے لیے چھ سات سو کے قریب نغمات ریکارڈ کرائے جن میں سے بیشتر بہت مقبول نغمے تھے۔ وہ جی ایم درانی کے بہت عرصے بعد فلمی موسیقی میں آئے تھے مگر ان سے کافی عرصہ قبل دنیا سے رخصت ہو گئے۔

سلیم رضا 1932ء میں ایک عیسائی گھرانے میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۷ جولائی تھی۔ ان کا نام نوئیل ڈیاس رکھا گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ان کا خاندان پاکستان آگیا تھا جہاں انہوں نے لاہور میں رہائش اختیار کی۔ قیام پاکستان کے وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی۔ اکیس سال کی عمر میں انہوں نے ریڈیو پاکستان لاہور سے سلیم رضا کے نام سے گلوکاری کا آغاز کیا۔ 1953ء میں وہ ریڈیو سنگر بنے تھے۔ 1955ء میں موسیقار جی اے چشتی

نے فلم ''حقیقت'' میں انہیں پلے بیک سنگر کے طور پر فلموں میں متعارف کرایااور بہت جلد اپنی خوب صورت آواز اور گائیکی کے باعث وہ ایک مقبول فلمی گلوکار بن گئے۔انہوں نے بے شمار فلموں میں گلوکاری کی اور سپر ہٹ گانے گائے۔ان کے چند مشہور نغمات یہ ہیں۔

ا۔جان بہاراں رشک چمن (فلم عذرا)

۲۔اے دل کسی کی یاد میں، ہوتا ہے بے قرار کیوں (تیرا سہارا)

۳۔چاند تکے چھپ چھپ کے (عشق لیلیٰ)

۴۔زندگی میں ایک پل بھی چین آئے نا(ہم سفر)

۵ ۔اے نازنیں، تجھ سا حسیں کوئی نہیں (شمع)

۶۔آجا پاس میرے (چنگاری)

۷۔ تیری تصویر بناتا ہوں (موسیقار)

۸۔یارو مجھے معاف کرو میں نشے میں ہوں (سات لاکھ)

اس گیت کے ایک لاکھ سے زائد ریکارڈ فروخت ہوئے تھے جس پر گراموفون کمپنی ای ایم آئی نے انہیں چاندی کا بنا ہوا خصوصی ریکارڈ پیش کیا تھا۔

سلیم رضا نے اپنے عہد کے مقبول ترین اداکاروں کے لیے پلے بیک نغمے گائے تھے جن میں سنتوش کمار، درپن، یوسف خاں، اعجاز، کمال، حبیب علاؤالدینِ، طالش، سدھیر، اکمل شامل ہیں۔انہوں نے پاکستان کے قریب قریب

سبھی موسیقاروں کے لیے گانے ریکارڈ کرائے جن میں خواجہ خورشید انور، ماسٹر عنایت حسین، رشید عطرے، جی اے چشتی، مصلح الدین، فیروز نظامی، اسلم اقبال اور ماسٹر عبداللہ جیسے نامور اور ہنر مند موسیقار بھی شامل ہیں۔

اپنے طویل دور گلوکاری کے دوران میں انہوں نے بے شمار ایوارڈز بھی حاصل کیے تھے۔ اس زمانے کے سبھی فلمی ایوارڈ ان کے حصے میں آئے تھے۔ سلیم رضا نے 1965ء کی جنگ کے زمانے میں کئی مقبول ترانے گائے تھے۔ انہوں نے پاکستانی موسیقی اور ثقافت کے لیے خدمات سر انجام دی تھیں۔ ان کے اعتراف کے طور پر پاکستان آرٹس کونسل نے 1966ء میں انہیں ایک طلائی تمغہ بھی دیا تھا۔ گویا یہ وہ گلوکار تھا جسے سونے چاندی میں تولا جاتا رہا مگر شومئ قسمت کہ سونا چاندی اسکے کسی کام نہ آیا۔

بعض فنکار فلم بینوں اور تماشائیوں کے دلوں میں اپنی مقبولیت کھو بیٹھتے ہیں پھر ان کا فن روبہ زوال ہو جاتا ہے تو انہیں رفتہ رفتہ فراموش کر دیا جاتا ہے اور وہ پس منظر میں چلے جاتے ہیں لیکن سلیم رضا کے سلسلے میں یہ کہنا درست نہیں ہے۔ ان کی آواز کی خوب صورتی اور سریلے پن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ انہیں فلم بینوں اور تماشائیوں نے نہیں فلم سازوں اور موسیقاروں نے جان بوجھ کر نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کمرشل پروگراموں اور ٹی وی کے ذریعے اپنی آواز کا جادو جگاتے رہے مگر فلم سازوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ چھوٹے چھوٹے معمولی اور بے مقصد کام کر کے جب وہ اکتا گئے اور انہیں یہ احساس ہو گیا کہ پاکستانی فلم سازوں کو ان کی ضرورت نہیں ہے تو انہوں نے اپنے پیارے وطن کو خیر باد کہہ کر کینیڈا میں سکونت اختیار کر لی۔ بات یہ تھی کہ سلیم رضا کو صرف ایک ہی ہنر آتا تھا اور وہ صرف موسیقی اور گلوکاری کا ہنر تھا۔ اسکے سواوہ کسی اور ذریعے سے روزی نہیں کما سکتے تھے۔ جب انسان روزگار سے محروم ہو جائے تو وہ مایوسی کے عالم میں کئی ایسے فیصلے کر لیتا ہے عام حالات میں جن کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ترک وطن کا فیصلہ کر لیا تھا مگر کینیڈا جا کر بھی وہ خوش نہیں تھے اور پاکستان کی یاد ان کے دل سے محو نہیں ہو سکی تھی۔

سلیم رضا فلم سازوں اور موسیقاروں کی بے اعتنائی کا واحد شکار نہیں تھے۔ احمد رشدی اور مسعود رانا کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھا گیا۔ ان دونوں کی گلوکاری اور آوازوں کی خوبی میں ذرا سا بھی فرق پیدا نہیں ہوا تھا مگر فلم سازوں نے انہیں نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔ اسکا ایک سبب اردو فلموں کی تعداد میں کمی بھی تھا لیکن جتنی بھی اردو فلمیں بنائی جاتی تھیں ان کے لیے ان دنوں مایہ ناز گلوکاروں کی خدمات حاصل کی جاسکتی تھیں مگر فلم سازوں کی بھیڑ چال نے انہیں دوسرے گلوکاروں کی طرف متوجہ کر دیا۔ دراصل ان معاملات میں موسیقاروں کی ذاتی پسند و ناپسند، رشتے داریوں اور دوسری مصلحتوں کا بھی ہمیشہ دخل رہا ہے جو پاکستان کی فلمی صنعت کی بدقسمتی رہی ہے۔

احمد رشدی جیسا گلوکار بھارتی فلمی دنیا کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ جس طرح مہدی حسن کا کوئی بدل نہیں آسکا لیکن ان دونوں فنکاروں کو بھی ایسی ہی سرد مہری بلکہ بے مہری سے دوچار ہونا پڑا۔ مہدی حسن بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ دنیا بھر میں ان کے پروگرام بہت ذوق و شوق سے سنے جاتے تھے اور انہیں اس طرح ایک معقول آمدنی ہو جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خود ہی رفتہ رفتہ فلمی موسیقی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اول تو وہ ملک سے باہر ہوتے تھے۔ لاہور اور کراچی میں بھی انکی غیر فلمی مصروفیات بہت زیادہ تھیں اس لیے انہیں مالی لحاظ سے کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی لیکن احمد رشدی بھی سلیم رضا کی طرح صرف ایک ہی فن میں ماہر تھے۔ دوسرا کوئی کام نہیں کر سکتے تھے اس لیے چپ چاپ لاہور چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔ مالی پریشانیوں نے انہیں دل کے عارضے میں مبتلا کر دیا اور بالآخر اس بیماری دل نے انکا کام تمام کر دیا حالانکہ اس وقت ان کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ ظلم یہ ہے کہ ان کے گائے ہوئے نغمے گا گا کر آج کے بہت سے گلوکاروں نے شہرت اور دولت حاصل کی ہے۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔

مسعود رانا کا بھی یہی معاملہ تھا۔ وہ ایک مختلف اور منفرد آواز کے مالک تھے۔ انہوں نے لاتعداد مقبول اور سپر ہٹ گانے گائے مگر پھر ایسی ہوا چلی کہ مسعود رانا کے گانے موسیقاروں اور فلم سازوں کے لیے غیر ضروری ہو گئے۔ انہیں بھی مالی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن پھر خوش قسمتی سے کسی دوست کے مشورے اور تعاون سے انہوں نے ایک ریکروٹنگ ایجنسی قائم کر لی جس سے انہیں معقول آمدنی ہو جاتی تھی اور وہ باعزت زندگی گزارنے کے قابل تھے۔

درپن اور نیر سلطانہ جیسے فنکاروں نے بھی فلم سازوں کے نظریں پھیر لینے کے بعد بالآخر ریکروٹنگ ایجنسی ہی کا سہارا لیا تھا اور باعزت طریقے سے زندگی گزارتے تھے۔ درپن کے اچانک انتقال کے بعد ان کی بیوہ نیر سلطانہ نے یہ کاروبار بہت عمدگی سے سنبھالا اور مالی اعتبار سے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتی رہیں مگر ذرا غور فرمائیے۔ کہاں اداکاری اور کہاں بیرون ملک روانہ کرنے کے لیے ریکروٹنگ ایجنسی ؟ اور پھر درپن اور نیر سلطانہ جیسے فنکاروں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا گیا جو اپنے فن میں یکتا تھے۔ ہماری فلمی صنعت کا موجودہ حال زار اسی بے قدری اور احسان فراموشی کا نتیجہ ہے۔ اچھے، باصلاحیت ، ہنر منداور بلند و بالا شخصیات سے نجات حاصل کرنے کے بعد اس فلمی صنعت کو اسمگلروں، بدمعاشوں، جاہلوں اور غیر مہذب لوگوں کے ہاتھوں میں دے دیا گیا تو پھر انجام تو یہی ہونا تھا جو قوم اپنے قابل فرزندوں، فنکاروں، تخلیق کاروں، ہنر مندوں کی قدر نہیں کرتی وہ دنیا میں کبھی فخر سے سر اٹھاکر چلنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اپنے ہمسایہ ملک کی مثال دیکھ لیجئے۔ وہ اپنے کھلاڑیوں، فنکاروں، ہنر مندوں کی مبالغہ آمیز حد تک تعریف و توصیف اور پذیرائی کرتے ہیں جس کی وجہ سے ساری دنیا میں ان کا نام اونچا ہو جاتا ہے اور پھر یہی لوگ ملک و قوم کے لیے تجارتی، ثقافتی اور اخلاقی بلندی کا سبب بن جاتے ہیں۔

سلیم رضا کے المناک تذکرے سے بات کہیں اور پہنچ گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ محمد رفیع کے سوا سلیم رضا، احمد رشدی، مسعود رانا جیسے گلوکار بھارت میں موجود نہ تھے۔ مہدی حسن کی تو بات ہی الگ ہے۔ ان جیسا دوسرا تو شاید مدتوں دیکھنے اور سننے کو نہیں ملے گا مگر ہم نے ان فنکاروں کی کیا قدر دانی کی ہے ؟

سلیم رضا کو گلوکاری کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ آواز خداداد تھی۔ ہر قسم کا گانا وہ بڑی سہولت سے گا سکتے تھے۔ ان کی آواز کی پہنچ بہت دور تک تھی۔ مٹھاس اور سریلا پن اس قدر زیادہ تھا کہ ایک بار ایک سازندے نے یہ فقرہ چست کیا تھا کہ سلیم رضا کے گانے زیادہ دیر نہ سنا کرو، شوگر کی بیماری ہو جائے گی۔

جب انہوں نے شہرت اور کامیابی کا منہ دیکھا تو پھر موسیقی اور گائیکی کی باقاعدہ تربیت حاصل کرنے کی طرف بھی توجہ دی۔ ان کی موسیقی کے رموز و اسرار سکھانے میں یوں تو کئی بڑی فنکاروں نے حصہ لیا تھا مگر پیانو نواز ماسٹر صادق علی

اور موسیقار بابا چشتی اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ماسٹر صادق پیدائشی اندھے تھے۔سیاہ رنگت، گول چہرہ، پتلون قمیص پہنا کرتے تھے اور ہمیشہ ایک مسکراہٹ انکے چہرے پر جگمگاتی رہتی تھی۔ان کے کالے رنگ میں بھی ایک دلکشی تھی۔شاید یہ انکی اندرونی خوبیوں کا عکس تھا جو دیکھنے والوں کی نظر میں انہیں حسین بنا دیتا تھا۔

ماسٹر صادق پیانو بجانے میں اتنے ماہر تھے کہ بھارت کے بڑے بڑے موسیقار بھی ان کے قائل اور قدردان تھے۔ انہیں موسیقی پر مکمل عبور حاصل تھا۔عام طور پر ہلکی پھلکی باتیں اور ہنسی مذاق کرتے رہتے تھے مگر جب سنجیدگی سے موسیقی کے بارے میں گفتگو چھڑ جاتی تھی تو ماسٹر صادق موسیقی کے علم کا ایک سمندر نظر آتے تھے۔خواجہ خورشید

انور جیسے خود پسند اور تنک مزاج موسیقار بھی ماسٹر صادق کی عزت کرتے تھے۔ ماسٹر صادق نے سلیم رضا کی آواز کے حسن اور اسکی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا تھا اور انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ علم موسیقی باقاعدہ سیکھیں۔

اس اعتبار سے ماسٹر صادق علی سلیم رضا کے استاد تھے۔اس سے پہلے موسیقار چشتی نے بھی انہیں کافی تربیت دی تھی۔ چشتی صاحب ہی نے سلیم رضا کو فلمی دنیا سے متعارف کرایا تھا۔ان دونوں ماہرین فن نے سلیم رضا کو موسیقی کے سربستہ رازوں سے آگاہ کیا تھا جس کے بعد سلیم رضا کے فن میں مزید اعتماد، رچاؤ اور نکھار پیدا ہو گیا تھا۔

سلیم رضا نے پاکستان میں رہنے کے لیے بہت ہاتھ پیر مارے مگر دانہ پانی یہاں سے اٹھ چکا تھا اور وینکوور (کینیڈا) کی مٹی انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ ۱۹۷۵ء میں کینیڈا گئے تھے۔ابتدائی ایام میں خاصی مشکلات سے دوچار ہوئے مگر پھر رفتہ رفتہ اپنے ہی شعبے میں آمدنی کے ذرائع تلاش کر لیے۔انہوں نے موسیقی کا ایک اسکول بھی قائم کیا تھا جس میں مقامی ایشیائی لوگوں کے بچے کشاں کشاں کھنچے چلے آئے۔وہ اسٹیج شو اور دوسرے پروگراموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ان کے ذریعے ان کی خوب صورت آواز دور دور تک سنی جا سکتی تھی۔ایک بار وینکوور کے کوئن ایلزبتھ پلے ہال میں سلیم رضا کے اعزاز میں ایشین آرٹ کونسل کی جانب سے بہت بڑے اور کامیاب پروگرام کا اہتمام کیا گیا تھا۔

سلیم رضا نے کینیڈا میں نام پیدا کر لیا تھا اور معقول آمدنی بھی ہونے لگی تھی مگر پاکستان خصوصاً لاہور اور فلمی دنیا کی یادیں ان کے دل سے کبھی نہ مٹ سکیں۔ پاکستان سے جانے والوں سے بہت بے تابی سے یہاں کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ پاکستان سے ان کا ذہنی اور قلبی رشتہ ہمیشہ قائم رہا یہاں تک کہ ۲۳ نومبر ۱۹۸۳ء کو ان کی سانس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ امرتسر میں جنم لینے والا اور لاہور میں پروان چڑھنے والا نوئیل ڈیاس جو سلیم رضا کے نام سے مشہور ہوا بالآخر وینکوور کی خاک کا پیوند ہو گیا۔ ان کا اصلی اور پیدائشی نام بہت کم لوگ جانتے تھے۔ شاید وہ خود بھی بھول چکے ہوں گے۔ اس شخص کو ہماری فلمی صنعت، ریڈیو اور ٹی وی نے یکسر فراموش کر دیا۔ کبھی کبھار ریڈیو سے ان کا کوئی نغمہ پیش کر دیا جاتا ہے تو سننے والوں کے دلوں میں سلیم رضا کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے بارے میں کوئی پروگرام نہ تو ریڈیو سے پیش کیا گیا اور نہ ہی ٹی وی سے۔ رہے فلم والے تو ان کی تو بات ہی الگ ہے۔ یہ لوگ تو شاید کچھ عرصے بعد خود اپنے نام بھی بھول جاتے ہیں۔ عجیب بے خودی کا عالم ہے مگر یہ نہیں بھول جانا چاہئے کہ ان سب فنکاروں کا ہم پر قرض ہے جو واجب الادا ہے۔ انہوں نے ہماری فلمی صنعت کو سجانے سنوارنے اور بھارتی فلمی صنعت کا ہم پلا بنانے میں بہت نمایاں کردار ادا کیے تھے۔

کہتے ہیں کہ کلاسیکی تخلیقات ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ اس کی مثال حال ہی میں سامنے آئی ہے اور یہ ہے بھارت میں بنائی جانے والی فلم ''دیوداس'' ۔ اس فلم میں شاہ رخ خان نے دیوداس کا مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ اس وقت تک بھارت میں بنائی جانے والی فلموں میں سب سے مہنگی فلم ہے جس پر ۵۰۰ ملین بھارتی روپیہ صرف ہوا ہے۔ اس کا شور اور پبلسٹی اتنی زیادہ ہے کہ فلم جہاں بھی نمائش کے لیے پیش کی گئی وہاں سے پذیرائی ملی۔ بھارت کے علاوہ یورپ اور امریکا میں بھی اسکی کامیاب نمائش ہوئی ہے۔ کینز کے بین الاقوامی فلمی میلے میں اسے دکھایا گیا۔ اس تقریب میں فلم کے تمام اداکاروں اور ہنر مندوں نے شرکت کی۔ شاہ رخ خان کی فلموں کے فیسٹیول بھی یورپ کے ملکوں میں منعقد کرائے جا رہے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ بھارتی فلموں کی وجہ سے اس ملک کو کس قدر عالمگیر شہرت مل رہی ہے اس کی ثقافت اور فنون لطیفہ کے بارے میں دنیا والوں کو دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ ملک کا نام بھی ہو رہا ہے اور دولت کمانے کا کام بھی جاری ہے۔ اس سے پہلے عامر خان کی فلم ''لگان'' کو بھی اسی طرح ساری دنیا میں متعارف کرایا گیا

تھااس کوآسکرایوارڈ کے لیے منتخب کی جانے والی پانچ غیر ملکی زبانوں کی فلموں میں بھی شامل کیا گیا تھا۔اگرچہ یہ آسکر نہ حاصل کر سکی مگر شہرت اتنی ملی کی یورپ اورامریکا میں یہ ڈالروں کے انبار جمع کر رہی ہے۔دوسروں کی ترقی پر رشک کرنا جائز ہے لیکن اپنی حالت پراشک بہانا بھی ضروری ہے۔بھارتی فلمی صنعت اس وقت دنیا بھر میں مقبول ہے۔اپنے ملک اپنے کلچراور حکومت کا پراپیگنڈا کرنے میں بھی پیش پیش ہے۔غیر ملکی زرمبادلہ بھی کمارہی ہے۔ اس وقت ''دیوداس'' کا قصہ سنئے۔اکثرلوگ سمجھتے ہیں کہ موجودہ فلم'' دیوداس'' پچاس کی دہائی میں بنائی جانے والی ''دیوداس'' کے بعد دوسری بار بنائی گئی جس میں دلیپ کمار نے دیوداس کا کردارادا کیا تھامگر''دیوداس ''کی اصل کہانی بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ'' دیوداس'' کوئی فلمی کہانی نہیں ہے۔یہ بنگالی زبان کاایک معروف ومشہور ناول ہے جسے بنگلہ ادب میں کلاسیکی ناول کامرتبہ حاصل ہے۔''دیوداس'' کے مصنف سرت چندر چٹوپادھیہ ہیں جنہیں بنگلہ ادب میں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ ان کا یہ ناول بیسویں صدی کے آغاز میں شائع ہوا تھااور فوراً ہی اس کو کلاسیک کادرجہ دے دیا گیا۔اس کے کئی ایڈیشن دیکھتے دیکھتے نکل گئے۔یہ خالص ہندوبنگلہ تہذیب،مزاج اور پس منظر کی حامل کہانی ہے۔ اس میں سرت چندر چٹوپادھیہ نے اپنے عہد کی سچی اورانتہائی موثر کن تصویر پیش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنگالیوں نے اسے سرآنکھوں پر جگہ دی اورآج بھی''دیوداس ''ایک کثرت سے فروخت ہونے والا بنگلہ ناول ہے۔

جب ہندوستان میں فلمیں بنانے کاآغاز ہواتو سیٹھوں اوردوسرے کاروباری لوگوں نے عام لوگوں کی دلچسپی کے لیے عامیانہ قسم کی فلمیں بنانے کاآغاز کر دیا۔اچھے لکھنے والے مصنف اوراداکار کچھ عرصے بعداس میں آئے۔یہ بیشتر اسٹیج کے لکھنے والے اوراسٹیج پر کام کرنے والے فنکار تھے جنہیں تجربہ کار فنکار ہونے کی وجہ سے فلموں میں شامل کرلیا گیا۔اگرچہ اسٹیج اور فلم کی تکنیک میں بہت فرق تھالیکن ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں فلمی صنعت کاآغاز ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد نے کیا تھا۔سرمایہ داروں نے تجوریوں کے منہ کھول دیئے تھےاور غیر ملکی ہنر مندوں اور ماہرین کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ گویا بھارتی فلمی صنعت کاآغاز ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے کیا تھا۔

ناول ”دیوداس“ کو پہلی بار ۱۹۲۸ء میں خاموش فلموں کے دور میں بنایا گیا تھا۔ یہ ایک جذباتی اور رومانی داستان ہے جس میں آواز، مکالموں اور موسیقی کو نمایاں حیثیت حاصل ہونی چاہیئے مگر اس کہانی کا ایک اپنا تاثر اس قدر بھرپور تھا کہ خاموش فلموں کے دور میں بھی یہ ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ بنگالیوں کے دھیمے مزاج، رومانیت اور جذبات کی عکاسی کرنے والی یہ فلم بے زبانی کے باوجود سارے بنگال کی زبان بن گئی تھی اور ہر طرف اسکا چرچا ہونے لگا تھا۔ یہ کلکتہ کا واقعہ ہے جہاں فلمی صنعت بہت قدیم ہے۔ یہاں پہلے بنگلہ زبان میں فلمیں بنا کرتی تھیں۔ خاموش فلموں کے زمانے میں تو زبان کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی مگر جب ناطق فلموں کا دور آیا تو سرمایہ کاروں کو احساس ہوا کہ سارے

ہندوستان میں بہت بڑی مارکیٹ سے قطع نظر کر کے محض بنگال تک محدود رہنا کاروباری اعتبار سے مناسب نہ ہو گا۔ چنانچہ یہاں مختلف فلم ساز اداروں نے مختلف زبانوں میں فلمیں بنانے کا آغاز کر دیا۔

نیو تھیٹرز نئے رجحانات اور نئے نئے تجربات کرنے کے حوالے سے ایک منفرد فلم ساز ادارہ تھا۔ دوسرے بڑے فلم ساز ادارے بھی کلکتہ میں موجود تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کلکتہ میں اردو فلموں کے علاوہ پنجابی زبان میں بھی فلمیں بنا کرتی تھیں۔ اہل بنگال تو خوب صورت چہرے اور جسم دیکھ کر ہی خوش ہو جاتے تھے مگر یہ فلمیں پنجاب، سرحد اور سندھ میں اور اس کے بعد ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی بہت مقبول ہونے لگیں۔ ذرا سوچیۓ کہ اگر کلکتہ نہ ہوتا تو میڈم نور جہاں جیسی بے مثال فنکارہ کہاں سے سامنے آتیں؟

”دیوداس“ کو ناطق فلموں کے زمانے میں نیو تھیٹرز نے بڑے اہتمام سے بنایا۔ اس فلم کے ہدایت کار پی سی بروا تھے جو بذات خود بھی بہت اچھے اداکار تھے اور انہوں نے کئی فلموں میں کام کیا تھا۔ بروا ایک زمانے میں غیر منقسم فلمی صنعت کا ایک بہت بڑا نام تھا۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تخلیق کار اور فنکار اپنی نا قابل فراموش یادوں کے نقوش چھوڑ گیا ہے

بروا نے ”دیوداس“ میں مرکزی کردار کے لیے اس عہد کے معروف ترین گلوکار کے ایل سہگل کا انتخاب کیا۔ یہ ستم ظریفی بھی دیکھئے کہ سہگل کا تعلق پنجاب سے تھا مگر وہ بنگال میں اپنی اردو گائیکی اور غزلوں کے حوالے سے مشہور

ہوئے تھے۔ کہنے کو وہ پنجابی تھے مگر اس قدر مرنجان مرنج، دھان پان، نازک اندام تھے کہ لکھنوی نظر آتے تھے۔ ان کو قدرت نے دو ایسی صفات سے نوازا تھا جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔ پہلی خوبی انکی خوب صورت، سریلی اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز تھی اور دوسری خوبی ان کا چہرہ تھا۔ وہ سرتاپا ایک مظلوم، مغموم اور دنیا کے ستائے ہوئے انسان نظر آتے تھے۔ بولتے تھے تو پُر سوز اور درد بھری آواز دلوں میں اتر جاتی تھی۔ گاتے تھے تو سننے والا مسحور اور مغموم ہو جاتا تھا۔ بروا نے "دیوداس" میں سہگل کی آواز کو سب سے زیادہ اہمیت دی تھی۔ اس فلم میں ایک کے سوا تمام گانے سہگل کے گائے ہوئے تھے۔ ہر گانا سچویشن پر نگینے کی طرح جڑا ہوا لگتا تھا اور اس کو سن کر ایک دل شکستہ، مایوس اور غمگیں انسان کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی تھی۔ اس فلم کے تمام گانے سپر ہٹ ہوئے تھے۔

دیوداس فلم ۱۹۳۵ء میں ریلیز ہوئی تھی جب ہماری عمر دو سال تھی مگر جب ہم نے چلنا، بولنا اور سننا شروع کیا۔ اس وقت سے سہگل کی آواز، غزلوں اور گیتوں نے ہمیں اپنے حصار میں لے لیا وہ دن اور آج کا دن۔ سہگل کے گانے ہماری کمزوری ہیں۔

ظاہر ہے کہ "دیوداس" جب ریلیز ہوئی تو ہم نہیں دیکھ سکتے تھے مگر خوش قسمتی سے جب میٹرک میں پڑھتے تھے تو "دیوداس" دیکھنے کا موقع ملا جسے ہم اپنی خوش قسمت سمجھتے ہیں اگر ہم نے یہ فلم نہ دیکھی ہوتی تو سہگل، ناول دیوداس اور اس عہد کے ہندو بنگلہ ماحول اور تہذیب سے بے بہرہ ہی رہتے۔ بروا نے "دیوداس" کی کہانی کا مرکزی کردار سہگل یعنی دیوداس کو بنایا تھا۔

فلم میں اس کردار کا پورا نام دیوداس مکرجی تھا۔ اس کہانی کو بروا نے عشق و جذب میں ڈوبے ہوئے تین کرداروں میں تقسیم کر دیا تھا جسکا مرکزی نقطہ دیوداس تھا محبت میں ناکامی اور اپنے پیار سے محرومی کے بعد دیوداس مجسم مایوسی و الم بن کر رہ گیا تھا۔ بروا نے اس کردار کو مزید جاندار اور موثر کرنے کے لیے سہگل کے درد بھرے گانوں کا سہارا لیا تھا اور یہ گانے اس فلم کا لازمی حصہ بن کر رہ گئے تھے جس کے بغیر دیوداس کا تصور ہی ممکن نہ تھا۔ یہ وجہ ہے کہ جب اسکے

بعد مشہور ہدایت کار بمل رائے کے سپر ہٹ ہیرو دلیپ کمار کو مرکزی کردار سونپا۔ دلیپ کمار اس وقت تک بھارتی فلموں میں المیہ کرداروں کے بادشاہ کا مقام حاصل کر چکے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بمل رائے کا بہترین انتخاب تھا لیکن بمل رائے نے غلطی یہ کر دی کہ اس فلم میں دیوداس کے گانوں کو ایک طرف رکھ دیا۔ ساری فلم میں دلیپ کمار نے ایک بھی گانا نہیں گایا۔ صرف آخری حصے میں انہوں نے مرنے سے پہلے ایک گانا گایا تھا۔ اس زمانے کے ایک نامور نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سہگل کے گائے ہوئے گیت آج بھی لوگوں کے کانوں میں گونج رہے ہیں مگر دلیپ کمار والے دیوداس نے فلم میں صرف ایک ہی گانا گایا ہے اور وہ بھی عجب جناتی زبان میں گایا ہے جو کوئی تاثر نہیں چھوڑتا تھا۔ اس کوتاہی یا خامی نے ساری فلم کو متاثر کر دیا تھا۔ اپنے وقت کے تین سپر اسٹار بلکہ چار سپر اسٹار اس فلم میں کام کر رہے تھے یعنی دلیپ کمار، وجنتی مالا، چترا سین اور اپنے دور کے عظیم ہیرو موتی لال، بمل رائے کی ہدایت کاری بے داغ تھی۔ اداکاروں نے بھی اپنا کلیجا نکال کر رکھ دیا تھا۔ مناظر بے انتہا سادے، موثر اور قدرتی تھے۔ اس کے باوجود یہ فلم ہٹ نہ ہو سکی تھی۔ اس کا سبب سب نے ایک ہی قرار دیا تھا۔ گانوں کی عدم موجودگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سہگل کے گائے ہوئے گانے اور ان کا سراپا غم کردار فلم بینوں کے ذہنوں میں تازہ تھا اس لیے سہگل کی فلم سے اس فلم کا تقابل اور موازنہ قدرتی بات تھی۔ اس موازنے میں سہگل کا دیوداس جیت گیا اور دلیپ کمار المیہ اداکاری کا شہنشاہ شکست کھا گیا۔

موجودہ فلم دیوداس جس میں مرکزی کردار شاہ رخ خان نے ادا کیا ہے اور وہی اس کے فلم ساز بھی ہیں دراصل چوتھی بار بنائی گئی ہے۔ یہ فلم اس قدر وسیع پیمانے پر اور اتنے شکوہ کے ساتھ بنائی گئی ہے کہ دیکھنے والا فلم کی دوسری خوبیوں اور خامیوں کا نقادانہ جائزہ لینے کے بجائے حیرت زدہ ہو کر طلسم دیکھتا رہ جاتا ہے لیکن کیا یہ فلم صحیح معنوں میں اپنے موضوع کے ساتھ اور ناول کے ساتھ انصاف بھی کرتی ہے؟ تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ چونکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص کا اپنا پیمانہ اور اپنی ذاتی رائے ہوتی ہے۔ اگر آپ کی رائے اس کے برعکس ہے تو فبہا چشم ما روشن دل ماشاد۔

اس بحث کے آغاز کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ''دیوداس'' کی کہانی پیش کردی جائے۔

یہ بنگال کے ایک گاؤں کے زمین دار کی کہانی ہے۔ یہ اونچی ذات کا برہمن اور اچھا خاصا زمین دار ہے۔ اس کے دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا کاٹھ کا الو یعنی سیدھا سادہ اور ماں باپ کا فرماں بردار ہے۔ چھوٹا بیٹا دیوداس جسے پیار سے ''دیوا'' کہا جاتا ہے بچپن ہی سے شوخ و شریر اور رومانی مزاج کا حامل ہے۔ دیوداس کا باپ ایک سخت گیر زمین دار ہے جو دیوا کی شوخی اور شرارتوں کو پسند نہیں کرتا۔ دیوداس اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا اس لیے باپ اور بیٹے میں ناپسندیدگی اور فاصلہ پیدا ہوگیا ہے۔ ماں چھوٹے بیٹے سے بے حد پیار کرتی ہے مگر نہ تو اسے شرارتوں سے روک سکتی ہے اور نہ ہی اس کے باپ کو مار پیٹ اور سخت گیری سے روک پاتی ہے۔ وہ ایک خاموش تماشائی ہے جو دیوداس کی پٹائی پر دل تھام کر رہ جانے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتی۔

کہانی کا دوسرا مرکزی کردار پاربتی ہے جسے پیار سے پارو کہا جاتا ہے۔ دیوداس اور پارو بچپن ہی سے دوست ہیں اور ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ لڑتے جھگڑتے بھی ہیں مگر دور بھی نہیں رہ سکتے۔ اس لیے جلد ہی صلح ہو جاتی ہے اور دونوں ساتھ کھیل کر وقت گزارتے ہیں۔ پاربتی کا گھرانا بھی برہمن ہے لیکن ہندو مذہب اور سماج کے حساب سے یہ نچلی ذات کے برہمن ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ زمیں دار کے مقابلے میں پاربتی کے ماں باپ غریب ہیں مگر یہ دونوں نوعمری کی جس عمر میں ہیں اس میں یہ مسائل قابل غور نہیں سمجھے جاتے۔

دیوداس کی مسلسل شرارتوں سے عاجز آکر اس کا باپ اس کو کلکتہ کے ایک اسکول میں داخل کرادیتا ہے۔ دیوداس کا جی تو نہیں چاہتا اور نہ ہی ماں کی مامتا اجازت دیتی ہے مگر زمیں دار کے آگے کون بولے۔ اس کا فیصلہ آخری حکم ہے۔ جب زمیں دار بگھی میں سوار ہوکر دیوداس کو لے کر روانہ ہوتا ہے تو اس سے پہلے پارو اور دیوداس کو ملاقات کرنے کی مہلت بھی نہیں تھی پھر بھی وہ جاتے جاتے پکار کر پارو کو کہتا ہے کہ میں جلدی واپس آؤں گا۔ پارو مجبور دیکھتی رہ جاتی ہے۔ دیوداس کئی سال تک واپس نہیں آتا مگر پارو اس کی یاد کو دل میں سنبھالے بیٹھی ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ پیار بھی بڑھتا رہتا ہے۔ اسے دیوداس کا انتظار ہے۔

ایک روز اس کو خبر ملتی ہے کہ دیوداس واپس آرہا ہے۔ وہ خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ سنگار کر کے اس کی آمد کی منتظر رہتی ہے مگر دیوداس سیدھا اپنی حویلی چلا جاتا ہے۔ پارو کے لیے یہ پہلا صدمہ ہے۔

دوسرے دن دیوداس اس کے گھر آتا ہے۔ پارو سے اور اس کی ماں سے ملتا ہے۔ پارو شرما کر اوپر کے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ماں کو بیٹی کے جذبات کا علم ہے (یہ بھی خیال رہے کہ بنگالی معاشرہ اس معاملے میں ہمیشہ سے آزاد خیال رہا ہے) دیوداس پارو کے بارے میں دریافت کرتا ہے اور جب ماں بتاتی ہے کہ وہ شرما کر اوپر چلی گئی ہے تو وہ کہتا ہے میں وہیں جا کر اس سے مل لیتا ہوں۔

اس ملاقات کے بعد دونوں کو احساس ہوتا ہے کہ بچپن کی پسند اب پیار کی چنگاری میں بدل چکی ہے۔ دونوں شائستگی سے باتیں کرتے ہیں اور اپنے جذبات کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ پارو کی خوشی کا ٹھکانا نہیں ہے۔اس کو خوش دیکھ کر اس کی ماں اپنے شوہر سے کہتی ہے " دیوا کتنا اچھا لڑکا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔ کیا اچھا ہوا گر ان دونوں کی شادی ہو جائے مگر وہ ٹھہرے برہمن اور زمین دار"

شوہر کہتا ہے " ہم بھی گھٹیا ذات تو نہیں ہیں اور پھر ہماری بیٹی لاکھوں میں ایک ہے۔"

ماں دیوداس کے گھر رشتے کے لیے جاتی ہے۔ دلیپ کمار والی فلم میں یہ منظر نہیں دکھایا گیا۔ واپس آکر وہ شوہر کو بتاتی ہے کہ ان لوگوں نے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ہم اونچی ذات کے برہمن ہیں۔ زمین دار ہیں۔ یہ بات کرنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہ سوچا۔

پارو کا باپ بہت بگڑتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ لوگ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں آخر؟ ہم بھی برہمن ہیں۔ غریب ہیں تو کیا ہوا۔ ہماری بیٹی سارے گنوں پوری ہے اور خوب صورت بھی ہے۔ کئی پیغامات آئے ہوئے ہیں میں ایک ہفتے کے اندر اگر ان سے زیادہ بڑے زمین دار سے بیٹی کا بیاہ نہ کر دوں تو میرا نام بدل دینا۔

پارو دوسرے کمرے میں یہ سب سن رہی ہے مگر خاموش اور بے بس ہے۔ دیوداس کو بھی اس بات کا پتا چل جاتا ہے۔ وہ پارو سے مل کر بتاتا ہے کہ پتاجی نے یہ فیصلہ کیا ہے۔

پارو۔ ''اور تم چپ چاپ سنتے رہے۔'' دیوداس اپنی مجبوری اور بے بسی کا اظہار کرتا ہے۔ پارو کی محبت عشق کی حدود کو چھو رہی ہے۔ وہ کہتی ہے۔ ''کیا تم یہ ظلم برداشت کر لوگے۔'' دیوداس اداس اور غمگیں ہے مگر باپ کے فیصلے کے آگے مجبور ہے۔ کہتا ہے کہ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ وہ ماں کے ذریعے باپ سے بات بھی چھیڑتا ہے مگر باپ فیصلہ تبدیل کرنے کو تیار نہیں ہے۔

ادھر پاربتی کا باپ اس کی شادی ایک بڑے زمین دار سے طے کر دیتا ہے۔ یہ سن کر پارو تڑپ اٹھتی ہے۔ دیوداس بھی یہ خبر پا کر پارو سے ملتا ہے۔ پارو اس سے کہتی ہے کہ کیا ہم اور تم یہاں سے کہیں اور نہیں جا سکتے۔ دیوداس بتاتا ہے کہ میں تو پیسے کے لیے باپ کا محتاج ہوں اور پھر میں تمہاری اور تمہارے خاندان کی بدنامی بھی پسند نہیں کرتا۔ میں پتاجی سے ایک بار پھر بات کروں گا۔

دیوداس اپنے باپ سے بذات خود بات کرتا ہے۔ وہ اس کو برہمی سے ڈانٹ دیتا ہے اور کہتا ہے '' یہ سب میرے گھر میں نہیں چلے گا۔ اس گھر میں رہ کر تم میرے فیصلے کے پابند ہو''

دیوداس کہتا ہے '' ٹھیک ہے۔ تو پھر میں یہ گھر ہی چھوڑ دیتا ہوں''

وہ مختصر سامان سمیٹ کر سوٹ کیس میں رکھتا ہے اور چل پڑتا ہے۔ پرانا ملازم اور ماں اسکو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پکارتے ہیں۔ اس کے پیچھے دوڑتے ہیں مگر وہ کسی کی نہیں سنتا۔ بگھی میں سوٹ کیس ڈال کر چابک رسید کرتا ہے اور ریلوے اسٹیشن کے لیے چل پڑتا ہے۔

اگر کسی لکھنے والے کی تحریروں کو پڑھے لکھے لوگ پڑھیں تو اس میں خود لکھنے والے کا بھی فائدہ ہے اور خلق خدا بھی اس سے فیض حاصل کرتی ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ مضمون اہل علم اور صاحب ذوق حضرات بھی مطالعہ

کرتے ہیں اور اس قدر باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہیں کہ معمولی سے معمولی غلطی بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتی لہٰذا وہ فوراً تصحیح کر دیتے ہیں۔ آپ نے ''شیر آیا، شیر آیا دوڑنا'' کا قصہ تو سنا ہوگا۔ وہ یوں ہے کہ کسی گاؤں میں ایک شریر لڑکا رہا کرتا تھا۔ لوگوں کو حیران و پریشان کرنے میں اس کو لطف آتا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن قریبی ٹیلے پر چڑھ کر بھاگم بھاگ گاؤں میں آکر شور مچاتا تھا کہ وہاں جنگل میں ایک شیر آگیا ہے۔ جان بچا کر بھاگو۔ گاؤں والے پریشان ہو کر بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ بعد میں انہیں پتا چلتا تھا کہ شیر نہیں آیا، یہ محض صاحبزادے کا ''مذاق'' ہے لیکن پھر بھی احتیاطاً وہ یہ شور سن کر گھروں سے بھاگ جاتے تھے کہ مبادا شیر سچ مچ ہی آجائے۔ رفتہ رفتہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ شیر ویر کا دور دور تک نام و نشان نہیں ہے بلکہ اس علاقے میں شیر کی نسل ہی معدوم ہے۔

ایک روز لڑکے نے بہت زور شور سے واویلا مچایا کہ ''شیر آگیا۔ شیر آگیا۔''

گاؤں والوں نے اس کی فریاد پر کان تک نہیں دھرے۔ انہیں بعد معلوم ہوا کہ اس روز واقعی سچ مچ شیر آگیا تھا اور کوئی مدد نہ ملنے کی وجہ سے وہ لڑکے کو چیڑ پھاڑ کر کھا گیا۔ اس حکایت سے داناؤں نے یہ سبق سکھایا کہ دیکھو بلاوجہ بار بار لوگوں کو ایک ہی بات نہ بتاؤ ورنہ وہ یقین کرنا چھوڑ دیں گے اور آپ کا پھر وہی حشر ہوگا جو کہ اس لڑکے کا ہوا تھا۔ اب محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارا معاملہ بھی اب ''شیر آیا۔ دوڑنا'' جیسا ہوتا جا رہا ہے۔ ہم اشعار میں غلطیاں کر جاتے

ہیں۔ مشہور اشعار کسی دوسرے شاعر سے منسوب کر دیتے ہیں۔ توجہ دلائی جائے تو یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ دراصل صحیح شعر اور شاعر کا نام ہمیں معلوم تھا مگر بہت عجلت میں مضمون لکھتے ہیں۔ جس پر نظر ثانی کرنے کی مہلت تک نہیں ملتی۔ اس لئے بے خیالی میں (یا بد حواسی میں) کسی اور شاعر سے شعر منسوب کر دیتے ہیں۔ شروع شروع میں تو معقول اصحاب نے ہمارے اس عذر کو تسلیم کر کے غلطی کو در گزر کر دیا۔ البتہ تصحیح کا اعادہ نہ ہوا مگر کہاں تک کوئی یہ عذر تسلیم کرے۔ آخر تنگ آکر لوگوں نے ہمیں سچ مچ ٹوکنا شروع کر دیا۔ غلطیاں بھی درست کرتے ہیں اور شک و

شبے کا اظہار بھی کر دیتے ہیں کہ آخر شک کا فائدہ دے کر کب تک بری کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت ناصر زیدی کا تازہ ترین تصحیح نامہ اور تنبیہ نامہ ملاحظہ فرمایئے۔ نفسِ مضمون کا خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔ لکھتے ہیں۔

""آپ کہیں گے عجب فارغ شخص ہے۔ اسے اور کوئی کام نہیں؟ کیا کروں آپ کو پڑھے بغیر بھی رہا نہیں جاتا اور پڑھتا ہوں تو آپ کی ""عجلت میں لکھی ہوئی تحریر"" میں سے اس خیال سے غلطیوں کی نشاندہی کرنا فرض سمجھتا ہوں کہ جب یہ سلسلہ کتابی صورت میں چھپے تو اس وقت تو صحیح ہو جائے۔ عجلت کا عذر یا جواز قاری کے لئے بیکار ہوتا ہے اور وہ بھی ادب کے سنجیدہ قاری کے لئے۔ غلطی تو غلطی ہے۔ عجب میں ہو یا تساہل میں۔ خیر۔ آمدم بر سرِ مطلب۔ آپ نے ایک مشہور زمانہ شعر یوں درج کیا ہے۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

اور پھر یوں تمہید باندھی ہے کہ ""متذکرہ بالا شعر فانی بدایونی کا خوبصورت کلام ہے جو زندگی بھر حزن و ملال اور مایوسی کا شکار رہے اور مجسم اس کی تصویر بن کر رہ گئے تھے۔"" اس طویل اقتباس نے جو ظاہر ہے کہ فانی ہی کے کوائف پر مبنی ہے یہ امکان بھی نہیں چھوڑا کہ آپ کہہ سکیں۔ کمپوزر نے میر کو فانی بنا دیا ہو گا وغیرہ۔ شعر مذکورہ بالا فانی بدایونی کا ہر گز نہیں ""خدائے سخن"" میر تقی میر کا ہے۔ میر کی اسی غزل کا یہ مقطع بھی مشہور ہے۔

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم ان نے تو قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

اسی خطہ میں اس شمارے میں ایک جگہ آپ نے لکھا ہے کہ میر انیس کے بقول۔

وہ حبس تھا کہ لو کی دعا مانگتے تھے لوگ

یہ میر انیس نے ہر گز نہیں کہا، یہ ارشاد ہے حضرت جوش ملیح آبادی کا۔ صحیح شعر ملاحظہ ہو۔

اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ

وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

ناصر زیدی صاحب کا فرمانا بالکل بجا ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ میر انیس، جوش ملیح آبادی اور فانی بدایونی کی یہ غزلیں ہمیں بچپن ہی سے یاد ہیں۔ اب حافظہ لاکھ جواب دے جائے یہ اشعار تو جیسے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب اسے آپ عجلت کی جگہ غلط فہمی سمجھ لیجئے یا پھر اسے کچھ اور نام دے دیجئے۔ انسان غلطی کا پُتلا ہے۔ ہم بھی ان ہی پتلوں میں سے ایک ہیں۔ لوگ غلطیاں نکالتے رہیں مگر بقول فیض۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے۔

شاید آپ کہیں گے کہ بھائی یہ کس قسم کی پرورش کی جا رہی ہے تو حضرت پرورش کرنے والے بھی غلطیاں کرتے ہیں پھر وہی غالب کہ۔۔۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ

ناصر زیدی صاحب نے اس کوتاہی کی جانب بھی متوجہ کیا ہے کہ حضرت کیفی اعظمی کا اصل نام سید اختر حسین رضوی لکھا ہے۔ ان کا نام اطہر تھا۔ اس ضمن میں بھی اعترافِ جرم کر لیتے ہیں مگر ہم نے پچھلے دنوں میں اختر حسین ہی سنا اور پڑھا مگر یہ بھی عذر گناہ بدتر از گناہ سمجھ لیجئے۔ ہم یہ لکھنا بھی بھول گئے تھے کہ بھارتی حکومت نے کیفی اعظمی کو سب سے بڑا اعزاز ''پدم شری'' دیا تھا جو انہوں نے اردو کی حمایت میں احتجاجاً بھارتی حکومت کے اردو دشمن رویے کی وجہ سے واپس کر دیا تھا۔ یہ واقعی بہت بڑی بات ہے۔ وہ بھی آج کے دور میں جبکہ لوگ چھوٹے موٹے سرکاری اعزازات حاصل کرنے کے لئے بھی ہزار پاپڑ بیلتے ہیں۔ مگر دیکھئے صاحب۔ ہم حضرت کیفی اعظمی کی مکمل سوانح تو لکھ نہیں رہے تھے۔ ان کے تذکرے میں اور بھی بہت سی باتیں لکھنے سے رہ گئی ہیں مگر کہاں تک لکھیں۔ ایک تازہ خط میں ناصر صاحب نے۔۔۔

فلمی الف لیلیٰ 2010 علی سفیان آفاقی

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے

جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے

کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ شعر بالکل صحیح اسی طرح ہے اور وزن میں ہے۔ طلسم میں الف متصل ہے۔ یہ وزن میں تقطیع میں ''طلس مس'' آتا ہے جو جائز ہے۔ ہم اپنی ''بے وزنی'' کا پہلے ہی اعتراف کر چکے ہیں۔ تمام دیگر حضرات سے بھی یہی عرض کر سکتے ہیں کہ۔۔۔

بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

جن دنوں ہم میرٹھ میں میٹرک کا امتحان دے رہے تھے تو اپنے شوق میں اردو کے شعراء کے دیوان کھنگال بیٹھے

تھے اور بے شمار اشعار زبانی یاد تھے۔ اردو کے پرچے میں جب لکھنے بیٹھے تو قلم تھا کہ تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا پھر وہی عجلت یعنی ''وقت کم اور مقابلہ سخت'' والا معاملہ تھا اس لئے بے شمار اشعار لکھ ڈالے اور غلطی کے احتمال کے پیشِ نظر شاعر کا نام لکھنے سے گریز کرتے ہوئے صرف یہی لکھ دیا کہ ''بقول شاعر۔۔۔''

ممتحن پر ہماری قابلیت کا ایسا رعب پڑا کہ اس پرچے میں سو میں سے 90 نمبر بخش دیئے۔

اب ہم سوچتے ہیں کہ روز روز کی غلطیوں سے بچنے کے لئے ہم بھی ہر بار شاعر کا نام لکھنے کی بجائے ''بقول شاعر'' لکھ کر گزارہ کریں گے اور پڑھنے والوں سے پورے نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

رہا سوال کیفی اعظمی کا تو مرحوم ہر اعتبار سے بہت بڑے تھے۔ وہ دور ہی بڑے قد آور لوگوں کا تھا۔ جس کو دیکھئے باون گز کا۔ اب تو ہر طرف بالشیے ہی نظر آتے ہیں۔ جگر صاحب نے نئی نسلوں کے بارے میں ہی کہا ہے۔

جہل خرد نے دن یہ دکھائے - گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

جب کہ بیان کر چکے ہیں کہ فلمی الف لیلہ پڑھنے والوں میں سے کئی حضرات و خواتین خطوط یا ٹیلی فون کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک صاحب کا ٹیلی فون آیا اور حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

’’ہیلو‘‘

’’جی ہیلو‘‘

’’آپ آفاقی صاحب تو نہیں بول رہے؟‘‘

’’خوب پہچانا۔ میں ہی بول رہا ہوں۔‘‘

’’سنئے۔ آپ کی فلمی الف لیلہ میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں مگر یہ بتایئے کہ آپ نئی پرانی فلمی پریوں کے واقعات اتنی تفصیل سے کیوں لکھتے ہیں؟‘‘

’’ہم تو فلمی دیووں کے واقعات بھی تفصیل سے لکھتے ہیں۔‘‘

’’مگر عورتوں پر آپ زیادہ مہربان نظر آتے ہیں۔ طرح طرح سے ان کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ بہت سے غیر ضروری واقعات اور خواہ مخواہ کی تفصیلات بھی لکھ ڈالتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ پڑھنے والوں کا وقت ضائع ہو گا۔‘‘

’’سنئے صاحب! اگر آپ کو پسند نہیں ہے تو پڑھتے کیوں ہیں؟‘‘

’’جی وقت گزاری کے لئے۔ ستر بہتر سال کا ریٹائرڈ آدمی ہوں۔ یہ نہ پڑھوں تو کیا پڑھوں؟‘‘

’’یہ تو آپ کے اللہ اللہ کرنے کے دن ہیں۔ قرآن پاک کی تلاوت کیجئے۔ صحیح بخاری پڑھئے۔‘‘

’’وہ تو عبادت کے خیال سے پڑھتا ہوں۔ تفریح طبع کے لئے بھی تو کچھ پڑھنا چاہیے۔‘‘

''آپ کے اللہ اللہ کرنے کے دن ہیں۔ اللہ اللہ کیا کیجئے۔ اللہ سے لو لگائیے۔''

''وہ بھی کرتا ہوں مگر فارغ وقت میں کیا کروں؟''

''آپ بھی صحیح فرماتے ہیں۔ عمر کا یہی تقاضا ہے۔۔۔''

وہ بات کاٹ کر بولے ''عمر کی بات نہ کیجئے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ عمر بڑھنے سے جوش وجذبات گھٹ جاتے ہیں وہ جھوٹے بولتے ہیں۔ موقع ملے تو آج بھی عشق کرنے سے باز نہ آؤں۔ جوش ملیح آبادی کی طرح۔''

''انہوں نے تو جوانی میں بھی عشق کیے تھے بلکہ بچپن ہی سے عشق وعاشقی کا آغاز کر دیا تھا اور ہمیشہ کامیاب رہے۔''

''وہ خوش بخش انسان تھے۔ افسوس کہ ہمیں تو ایک عشق بھی راس نہ آیا۔ مجبوراً شادی کر لی۔''

آپ کو عشق کرنے پر افسوس ہے یا اس کے ناکام ہونے پر؟''

''دونوں پر۔ اچھا خدا حافظ۔''

انہوں نے فون بند کر دیا۔ ہم انہیں حضرت حفیظ جالندھری کا شعر سنانا چاہ رہے تھے مگر وہ بھی غالباً عجلت میں تھے۔

ایک بار میکلوڈ روڈ لاہور پر واقع ''دارالقیام ہوٹل'' کے ایک کمرے میں حضرت حفیظ جالندھری جلوہ فرما تھے۔ چاروں طرف مداحوں اور پرستاروں کا مجمع تھا اور وہ بہت اچھے موڈ میں بے تکان اشعار سنا رہے تھے۔ ''دارالقیام ہوٹل'' رتن سینما کے سامنے ایک بہت بڑا ہوٹل تھا۔ باہر ایک بڑا دروازہ تھا۔ اندر جاؤ تو بہت وسیع لان نما صحن تھا جس کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہاں دفاتر بھی تھے۔ بعض حضرات رہائش پذیر بھی تھے۔ لکشمی چوک پر مٹر گشت کرنے والے ادیب شاعر اور صحافی، موسیقار، گلوکار، فلمی ہدایت کار سبھی یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ بہت

یادگار محفلیں سجائی جاتی تھیں۔ گرمیوں کے موسم میں صحن یالان میں کچھ لوگ مجلس آرائی کرتے تھے۔ وہ فراغت، سکون اور آسودگی کا زمانہ تھا۔لوگ زندہ رہنے اور زندگی کو سلیقے سے برتنے کا ہنر جانتے تھے۔

یہ ان ہی بیتے دنوں کا تذکرہ ہے۔ حفیظ صاحب لپک لپک کر اپنے مخصوص ترنم میں شعر سنا رہے تھے اور حسب عادت درمیان میں فقرے بازی بھی کرتے جاتے تھے۔ کچھ منچلے سوالات کرتے تو ان کو بھی لاجواب کر دیتے۔

کسی نے پوچھا ''حفیظ صاحب۔ کبھی آپ نے سچا عشق بھی کیا ہے ؟''

فرمایا'' کبھی نہیں۔ ہمیشہ۔''

پوچھا'' پھر نتیجہ کیا نکلا؟''

جواب میں یہ شعر سنادیا۔

جب کبھی ہم نے کیا عشق پشیمان ہوئے

زندگی ہے تو ابھی اور پشیماں ہوں گے

اسی روز ان کی زبان سے یہ غزل بھی سنی جس کا ایک مصرعہ ضرب المثل بن چکا ہے۔

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف

اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

اس رات حفیظ صاحب نے بے دریغ اشعار اور قصے سنائے۔ اشعار کے متعلق تبصرے بھی کرتے رہے اور بعض اشعار کی شان نزول بھی بیان کر دی۔ وہ کیسے دن تھے اور کیسی راتیں۔ کیسے کیسے لوگ تھے اور کیسی کیسی محفلیں۔

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اس شعر میں اگر کوئی غلطی ہے تو اس کے لئے پیشگی معذرت!

*___*___*

بنگالی زبان کے کلاسیکی ناول پر بننے والی فلم ''دیوداس'' کا تذکرہ ادھورا رہ گیا تھا۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ اس ناول کو بنگلہ زبان میں بہت بلند مرتبہ حاصل رہا ہے۔ اس کے مصنف سرت چندر چٹو پادھیہ (بعض حضرات غلط فہمی کی بنا پر اسے سرت چندر بوس بھی کہتے ہیں حالانکہ یہ حقیقت سے بعید ہے۔ سرت چندر بوس ایک انقلابی تھے جنہوں نے انگریزی حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کو ایک منظم حیثیت دی تھی اور انڈین نیشنل آرمی (آئی این اے) تشکیل دی تھی۔ اس تنظیم میں مسلمانوں کی بھی بہت بڑی تعداد شامل تھی۔ دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہوتے ہی انڈین نیشنل آرمی نے بھی انگریزی فوج کے خلاف باغیانہ کارروائیاں شروع کردی تھیں اور جب جاپانی فوجوں نے ہندوستان کی جانب پیش قدمی کی تو انڈین نیشنل آرمی نے انگریزی افواج کے خلاف جاپانیوں کو ہر ممکن امداد فراہم کی۔ یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت اور بہت بڑا المیہ ہے کہ بالآخر ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکہ نے ایٹم بم گرا کر جنگ کا نقشہ ہی چشمِ زدن میں بدل کر رکھ دیا۔ جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے اور جنرل میک آرتھر کی کمانڈ میں امریکی افواج نے جاپان پر تسلط حاصل کرلیا۔ جنرل میک آرتھر نے جاپانیوں کی جانبازی اور بے خوفی کے پیش نظر ملک کا آئین ہی بدل دیا اور دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے جاپانیوں کی توجہ کا رخ انتقام اور جنگ جوئی سے ہٹا کر صنعتی ترقی کی جانب پھیر دیا۔ جاپان کو فوج رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ بادشاہ (شہنشاہ ہیروہیٹو) جسے جاپانی قوم خدا کا درجہ دیتی تھی اس کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک کیا گیا۔ جاپان میں جاگیرداری یکسر ختم کردی گئی اور تعلیم عام کرنے

کے لئے بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کی گئی۔ مختصر یہ کہ جاپان کے مزاج اور ماضی کو جنرل میک آرتھر نے یکسر

تبدیل کر کے اپنی قوم کے لئے ناقابل فراموش خدمات سر انجام دی تھیں۔

انڈین نیشنل آرمی کے ارکان بھی جاپانیوں کی طرح یا تو مارے گئے یا پھر تتر بتر ہو گئے۔ سرت چندر بوس ایسے لاپتہ ہوئے کہ ان کے بارے میں آج تک کوئی نہیں جانتا ہے وہ زندہ ہیں یا مر گئے اور ان کا کیا انجام ہوا؟ انگریزی حکومت نے انڈین نیشنل آرمی سے وابستہ افراد کو چن چن کر تلاش کیا۔ انہیں کڑی سزائیں دی گئیں۔ سرت چندر بوس ایک باغی انقلابی رہنما تھے جبکہ سرت چندر چٹو پادھیہ بنگالی زبان کے عظیم ناول نگار تھے۔ بنگالی ادب میں ان کا درجہ بہت بلند ہے یہاں تک کہ بہت سے لوگ تو ان کا موازنہ ٹیگور سے بھی کرتے ہیں۔

چٹو پادھیہ کا ناول پہلی بار 1928ء میں فلمایا گیا تھا۔ یہ خاموش فلموں کا دور تھا۔ مشہور بنگالی ہدایت کار اور اداکار بروا نے اس میں ہیرو کا مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ پی سی، بروا کو بنگالی فلموں میں بہت ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، انتہائی ذہین اور باصلاحیت فنکار اور ہنر مند تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے نامور فلم ساز ادارے نیو تھیٹرز کے لئے کئی لاجواب فلمیں بنائیں اور بعض فلموں میں اداکاری بھی کی تھی۔

''دیوداس'' بنگال میں اس قدر مقبول ناول تھا کہ جب ناطق فلموں کا دور آیا اور نیو تھیٹرز نے سارے ملک کی مارکیٹ کے پیش نظر اردو زبان میں فلمیں بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا تو اس معرکہ آرا ناول کو دوبارہ اردو میں فلمایا گیا۔ اردو ''دیوداس'' 1935ء میں نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی۔ وہ نغمہ بار فلموں کا عہد تھا اور سارے ہندوستان میں کے ایل سہگل کی گلوکاری کا سکہ چل رہا تھا۔ سہگل کے بارے میں ہم پہلے بھی تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ وہ جالندھر میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک قطعی غیر فلمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے موسیقی اور گلوکاری کی باقاعدہ تربیت بھی حاصل نہیں کی تھی مگر خداداد صلاحیتوں اور سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی سریلی آواز کی بنا پر وہ جب گلوکاری کی طرف مائل ہوئے تو اپنے زمانے کے عظیم ترین گلوکار قرار پائے۔ سہگل کی آواز ہندوستان کے گوشے گوشے میں گونجتی تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ ان جیسی عظمت، مقبولیت اور شہرت کسی دوسرے گلوکار کو حاصل نہ ہو سکی۔ محمد رفیع اپنے عہد کے نامور ترین گلوکار تھے مگر سہگل نے اپنے زمانے میں سارے ملک پر جس طرح راج کیا تھا رفیع انتہائی

مقبولیت حاصل کرنے کے باوجود وہ درجہ حاصل نہ کر سکے تھے۔ سہگل نے کچھ فلموں میں اداکاری بھی کی تھی کیونکہ اس زمانے میں گلوکاری کرنے والے اداکاروں کی بہت قدر و منزلت کی جاتی تھی۔

پی سی بروانے ''دیوداس'' کو فلمانے کا ارادہ کیا تو اس فلم میں ''دیوداس'' کے مرکزی کردار کے لئے سہگل کا انتخاب کیا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سہگل سراپا مجسم دیوداس تھے۔وہ دیکھنے میں ہی انتہائی مایوس، محروم، دل شکستہ اور شکست خوردہ انسان نظر آتے تھے۔ان کے چہرے اور آنکھوں میں یاسیت اور حزن و ملال کے قدرتی تاثرات موجود تھے۔''دیوداس'' میں ناول نگار نے اپنے ہیرو کا جو نقشہ کھینچا ہے سہگل اس کے لئے سو فیصد موزوں تھے۔یہ بھی حقیقت ہے کہ نہ تو اس وقت اور نہ ہی اس کے بعد ''دیوداس'' کے کردار میں کوئی بھی اداکار مجسم ''دیوداس'' نہ بن سکا۔یہاں تک کہ اپنے عہد کا بلکہ ہر دور کا عظیم ترین اداکار دلیپ کمار جسے المیہ اداکاری کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے وہ بھی ''دیوداس'' میں انتہائی اعلیٰ درجے کی اداکاری کا مظاہرہ کرنے کے باوجود ''دیوداس'' کے کردار کے ساتھ سہگل کی طرح انصاف نہ کر سکا۔بروا کی فلم ''دیوداس'' میں دیوداس کے دوست کا کردار بذات خود بروا نے ہی ادا کیا تھا اور بہت خوبی سے ادا کیا تھا۔پاربتی کے روپ میں جمنا اور طوائف چندر مکھی کے کردار میں راج کماری کو منتخب کیا گیا تھا۔یہ دونوں اس دور کی مقبول ہیروئنیں تھیں اور انہوں نے اپنے کرداروں کے ساتھ پوری طرح انصاف کیا۔اس فلم کے موسیقار تمر برن تھے جو اس زمانے کے چوٹی کے موسیقاروں میں شمار کیے جاتے تھے

''سہگل ''کی فلم ''دیوداس'' کو سہگل کے نغموں سے سجایا گیا تھا۔جو آج بھی ناقابل فراموش ہیں۔''دیوداس'' آخری وقت جب اپنا عہد نبھانے کے لئے ایک بیل گاڑی میں سوار ہو کر پارو کے گاؤں جا رہا ہے تو بیماری اور مایوسیوں کے باعث نڈھال ہے۔وہ بری طرح کھانس رہا ہے اور بار بار گاڑی بان سے پوچھ رہا ہے کہ گاؤں کب پہنچیں گے۔ اس سیچویشن پر سہگل نے ایک لافانی نغمہ گایا تھا جس کا مکھڑا یہ تھا۔

"دکھ کے دن اب بیتت ناہیں"

فلم کی اس سیچویشن کے اعتبار سے یہ نغمہ اور بھی زیادہ متاثر کن ہو گیا تھا۔ ایک ناکام عاشق، جسے زندگی سے کوئی لگاؤ نہ ہو اور جو زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہو جب درد بھری آواز میں یہ گیت گائے کہ اب یہ دکھ بھری زندگی کے دن کاٹے نہیں کٹتے۔

اس گیت کا انترہ اس طرح تھا۔

نہ کوئی میرا

نہ میں کسی کا

چھایا چاروں اور اندھیرا

تو سننے اور دیکھنے والوں کی آنکھوں سے بے اختیار اشک رواں ہو جاتے تھے۔" دیوداس" کی گزشتہ زندگی کی مایوسیاں اور محرومیاں اور ناکامیوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی تھی۔اس پر سہگل کا بیمار، دکھ بھرا چہرہ اور غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی آواز اس تاثر کو اجاگر کرنے میں سونے پر سہاگے کا کام کرتی تھی۔ سہگل نے اس فلم میں اور خصوصاً آخری مناظر جو اداکاری کی تھی اور جو دکھ بھرے نغمات گائے تھے یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی فلموں کی تاریخ میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ سہگل کی اداکاری اور گانوں نے فلم " دیوداس" کو امر کر دیا تھا۔1935ء میں بنائی جانے والی یہ فلم بہت سست رفتار تھی اور اس میں گلیمر کا نام ونشان تک نہیں تھا مگر یہ اپنے دور کی کامیاب ترین فلم ثابت ہوئی۔"دیوداس" ایک غیر فانی اور ضرب المثل کردار بن گیا۔عام زندگی میں ناکام محبت کرنے والوں کو"دیوداس" کہا جاتا تھا۔ اس فلم کا تاثر ناقابل فراموش اور انمٹ تھا۔

جب کوئی فلم اور فلم کردار لوک کہانیوں کے کرداروں کے مانند یادگار بن جائے تو پھر اس نقش کو مٹا کر نقش ثانی بنانا بہت مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب 1955ء میں بنگال کے کامیاب ہدایت کار اور فلم ساز بمل رائے نے ایک بار پھر"دیوداس" بنانے کا منصوبہ بنایا اور مرکزی کردار کے لئے دلیپ کمار جیسے عہد ساز اداکار سے رجوع

کیا تو دلیپ کمار بھی شش و پنج میں پڑ گیا۔ بمل رائے کی ''دیوداس'' 1955ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ گویا سہگل کی ''دیوداس'' کی نمائش کو بیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن وہ فلم دیکھنے والوں کی بہت بڑی تعداد بھی موجود تھی اور ان کے ذہن میں سہگل دیوداس نقشِ دیوار کی طرح کندہ ہو کر رہ گیا تھا۔

دلیپ کمار نے بھی یہ فلم دیکھی تھی۔ بمل رائے کی پیش کش کے بعد انہوں نے ایک بار پھر ''دیوداس'' دیکھی اور سہگل کے ادا کردہ کردار کو دوبارہ پیش کرنے کے خیال سے سوچ میں پڑ گئے۔ بمل رائے نے انہیں سمجھایا کہ ایک ناقابلِ فراموش فلم کو دوبارہ بنانا ایک بہت بڑا جوا ہے لیکن یہ ایک چیلنج بھی ہے۔ تم المیہ اداکاری کے بادشاہ کہلاتے ہو۔ یہ کردار تمہارے لئے موزوں ترین ہے۔ تمہارے سوا اس کے ساتھ کوئی دوسرا اداکار انصاف نہیں کر سکتا۔ ہمیں ایک چیلنج سمجھ کر یہ فلم بنانی ہو گی تاکہ جب ''دیوداس'' فلم کا ذکر ہو تو اس میں تمہارا اور میرا نام بھی اس فلم کو نئی زندگی دینے والوں میں شامل ہو۔ بہر حال۔ کافی سوچ بچار کے بعد دلیپ کمار نے اس کردار کو ادا کرنے کی ہامی بھر لی لیکن انہیں بخوبی احساس تھا کہ انہوں نے خود کو ایک بہت بڑی آزمائش میں ڈال لیا ہے۔

بمل رائے نے اس فلم کے لئے اپنے زمانے کے بہترین فنکاروں کو اکٹھا کیا۔ وجنتی مالا کو چندر مکھی کے روپ میں پیش کیا گیا۔ پاربتی کے لئے ان کی نظرِ انتخاب بنگال کی مقبول ترین اداکارہ سچترا سین پر اٹک گئی۔ ''دیوداس'' کے دوست کے کردار کے لئے انہوں نے موتی لال کا انتخاب کیا۔ موتی لال سپر اسٹار کہلاتے تھے اور ہندوستانی فلموں میں قدرتی اور بے ساختہ اداکاری کا رجحان پیدا کرنے والوں میں سر فہرست تھے۔ انہوں نے بے شمار یادگار کردار کیے تھے۔ اس فلم کی موسیقی کے لئے سلیل چوہدری کا انتخاب کیا گیا جو اس وقت کامیاب ترین موسیقاروں میں شمار کیے جاتے تھے۔

بمل رائے نے ایک غلط یا صحیح فیصلہ یہ کیا کہ اپنی فلم کو ''دیوداس'' کے نغموں سے محروم کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سہگل کے گائے ہوئے گیت اس وقت بھی گلی گلی گائے اور سنے جاتے تھے۔ یہ سوچنا کہ کوئی گلوکار سہگل کا نعم البدل ثابت ہو سکے گا۔ ناقابلِ تصور تھا۔ اسی لئے انہوں نے اپنی فلم میں برائے نام دیوداس کا ایک نغمہ رکھا تھا۔ دوسرے گانے ہیروئنوں میں تقسیم کر دیئے تھے جبکہ سہگل کی فلم میں نغمات ہی پر کہانی اور فلم کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

ایک لحاظ سے یہ فیصلہ درست بھی تھا مگر جن لوگوں نے سہگل کی ''دیوداس'' دیکھی تھی ان کے نزدیک یہ بہت بڑی خامی اور کوتاہی تھی۔ کسی بھی کامیاب اور مشہور فلم کو دوبارہ بنانا ہمیشہ ایک انتہائی مشکل چیلنج رہا ہے۔ ہالی ووڈ اور بھارت میں بھی ایسے تجربات کیے گئے مگر معدودے چند فلموں ہی کو کامیابی اور قبولِ عام حاصل ہو سکا۔ وجہ یہ ہے کہ دیکھنے والے پہلی فلم سے موازنہ کرتے ہیں جو کہ ان کے ذہنوں پر نقش ہوتی ہے۔ اس نقش کو مٹا کر نقشِ ثانی جمانا آسان کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی فلموں کے ری میک عموماً ناکام ہوتے ہیں۔

بمل رائے اور دلیپ کمار کی فلم ''دیوداس'' کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ دلیپ کمار کی لاجواب اداکاری اور بمل رائے کی ہدایت کاری کے باوجود صرف سہگل اور اس کے گانوں نے نہ ہونے کی وجہ سے یہ فلم کامیابی حاصل نہ کر سکی حالانکہ یہ اپنے دور کے مقبول ترین اور بہترین فنکاروں کی تخلیق تھی لیکن اگر کمی تھی تو سہگل کی یاس زدہ شخصیت اور اس کی درد بھری آواز کی۔ بمل رائے نے ناول کے مطابق بالکل حقیقی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اور کرداروں کو بھی اصل فلم اور ناول کے پیکر میں ڈھالنے کے لئے بہت محنت کی تھی لیکن بات نہ بن سکی۔ سہگل کی کمی ہر ایک نے بری طرح محسوس کی۔ خاص طور پر سہگل کے دلوں میں اتر جانے والے پرسوز نغمے یہ فلم دیکھنے کے دوران میں بھی ان کے کانوں میں گونجتے رہے۔ ہر منظر کا موازنہ وہ سہگل کی فلم سے کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک کلاسیکی فلم کو دوبارہ بنانے کے سلسلے میں یہ خطرات تو مول لینے ہی پڑتے ہیں۔ بڑے بڑے ناموں، ممتاز و مقبول فنکاروں اور بمل رائے کی ہدایت کاری بھی اس فلم کے ذریعے پہلی فلم کی یادیں بھلانے میں ناکام رہی تھی۔

بمل رائے اور دلیپ کمار کی فلم ''دیوداس'' کی نمائش کو لگ بھگ نصف صدی گزر گئی۔ ایک نئی نسل نئے زمانے کے تقاضوں اور جدید ترین فلموں کے ماحول میں پروان چڑھ کر جوان ہو گئی۔ سہگل کی فلم دیکھنے والے تو شاید خال خال ہی باقی ہوں گے لیکن دلیپ کمار کی ''دیوداس'' کو دیکھنے والوں کی بہت بڑی اکثریت بھی اب دنیا میں موجود نہیں ہے۔ 47 سال ایک طویل عرصہ ہے اور اس دوران میں دنیا میں جس قدر تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور نئے رجحانات اور فلم سازی کے نئے تجربوں نے جس طرح آج کے فلم بینوں کے ذوق کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

غالباً نئی ''دیوداس'' بنانے والوں کو اس کا بخوبی احساس اور اندازہ ہے۔اب فلموں میں روح باقی نہیں رہی، صرف چمک دار حسین جسم ہی دیکھنے کو رہ گیا ہے۔ حقیقت پسندی کی جگہ شان و شوکت اور گلیمر نے لے لی ہے۔یوں بھی اب زندگی بہت تیز رفتار ہو چکی ہے۔ہدایت کار سنجے لیلا بھنسالی اور شاہ رخ خان نے ان تمام لوازمات کا یقیناً بہت غور سے جائزہ لیا ہوگا اور اس کے بعد موجودہ ''دیوداس'' بنانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔دیکھا جائے تو یہ جوا بھی نہیں ہے۔پرانی فلموں سے موازنہ کرنے والے ہی باقی نہیں رہے تو پھر ڈر کس کا؟ چنانچہ انہوں نے ''دیوداس'' کو ایک نئے رنگ و روپ کے ساتھ پیش کرنے کا ارادہ کیا۔

ہدایت کار بھنسالی ایک کامیاب ہدایت کار ہیں۔ان کی فلم ''ہم دل دے چکے صنم'' نے بے پناہ کامیابی حاصل کی ہے۔شاہ رخ بلاشبہ آج کے سپر اسٹار ہیں اور ہر قسم کے کرداروں کے ساتھ انصاف کر کے انہوں نے اپنی اداکارانہ حیثیت تسلیم کر لی ہے۔موجودہ فلم بنانے والوں نے آج کے تمام تقاضوں اور فلم بینوں کی خواہشات کو پیش نظر رکھا ہے۔دو ہیروئنوں کے لئے انہوں نے آج کی سپر اسٹارز کا انتخاب کیا۔اگرچہ پاربتی کے کردار کے لئے ایک بہت اچھی اداکارہ کی ضرورت تھی مگر انہوں نے گلیمر اور حسن و جمال کو ترجیح دیتے ہوئے ایشوریا رائے کو اس کردار کے لئے موزوں خیال کیا۔طوائف کے کردار کے لئے سپر اسٹار اور بہت اچھی اداکارہ مادھوری ڈکشت کو چنا۔انہیں یہ احساس تھا کہ اس کردار میں ایک بہت اچھی اداکارہ کا ہونا لازمی امر ہے۔مادھوری نے اس کردار کے ساتھ حتی الامکان انصاف کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔حالانکہ وجنتی مالا نے نسبتاً زیادہ بہتر اداکاری کی تھی اور ان کا کردار بھی کافی طویل تھا۔ ایشوریا رائے کا انتخاب کرتے ہوئے انہوں نے یہ پرواہ نہیں کی کہ وہ حسین و جمیل تو ہیں مگر اداکاری کی آج کل ضرورت بھی کیا ہے۔خوبصورت چہرہ اور دلکش جسم اولین ضرورت ہے جو ایشوریا رائے نے پوری کر دی۔مادھوری نے اپنا مختصر کردار بہت خوبصورتی اور مہارت سے نبھایا ہے۔اگر انہیں مزید موقع ملتا وہ یقیناً اس کردار کے ساتھ پوری طرح انصاف کرتیں۔

''دیوداس'' کے دوست کے کردار کے لئے جیکی شروف کا انتخاب کیا گیا ہے باکس آفس پر آج بھی جن کی مانگ ہے

اور وہ ابھی تک مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ جیکی شیر وف کے کردار میں بھی کچھ تبدیلی کی گئی ہے لیکن سب سے بڑی خامی ان کی اداکاری ہے۔ انہوں نے جی بھر کر اوور ایکٹنگ کی ہے اور اس فلم میں اگر سب سے زیادہ خراب اداکاری کرنے والوں کا مقابلہ کیا جائے تو جیکی شروف سر فہرست نظر آئیں گے۔ ان کے مقابلے میں تو پرانے خاندانی گھریلو ملازم کے کردار ادا کرنے والے اداکار نے بہت اچھی اداکاری کی ہے۔

ہم سے اگر رائے لی جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ موجودہ فلم ''دیوداس'' آج کے زمانے کے اعتبار سے ایک بھرپور اور کامیاب کمرشل فلم ہے جس کو سجانے بنانے پر ہدایت کار نے پوری توجہ صرف کی ہے۔ شاندار اور پر شکوہ سیٹ، زیورات اور قیمتی ملبوسات میں لپٹی ہوئی خواتین، جدید تقاضوں کے عین مطابق رنگین اور سحر انگیز گانے اور ان کی مہنگی فلم بندی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب لوازمات اس '' دیوداس'' میں موجود ہیں لیکن اگر کوئی موجود نہیں ہے تو سرت چندر چٹوپادھیہ اور سہگل کا دیوداس۔ یہ فلم محض ایک خوبصورت جسم ہے جس میں روح نہیں ہے۔ اگر اس کو کوئی اور نام بھی دے دیا جاتا تو جس وسیع پیمانے پر فلم بنائی گئی ہے یہ ایک کامیابی فلم ہوتی۔ یہ ایک لو سٹوری ہے جسے کوئی بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کی بے پناہ کامیابی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ پرانی فلم ''دیوداس'' کو دیکھنے والے اور ان فلموں کا اس فلم سے موازنہ کرنے والے اب باقی نہیں رہے۔

نئی نسل کے فلم بینوں کو ''دیوداس'' کی کہانی کا پتا ہے نہ کرداروں، ماحول اور محبت کی شدت کا اندازہ ہے۔ ان کے نزدیک یہ بھی ایک خوبصورت فلم ہے۔ جس میں ہیرو کا نام دیوداس اور ہیروئن کا نام پاربتی ہے۔ ایک طرح دار طوائف بھی ہے جس کا نام چندر مکھی ہے۔ اگر ان ناموں کی جگہ دوسرے نام استعمال کیے جاتے تب بھی یہ ایک کامیاب فلم ہوتی کیونکہ اس کو ایک کامیاب فلم بنانے کے لئے فلم ساز، ہدایت کار اور اداکاروں نے بہت محنت کی ہے۔ بلکہ اگر اس کا نام ''دیوداس'' نہ ہوتا اور اس میں '' دیوداس'' کے دیگر کردار اور واقعات کی جگہ اسی قسم کے دوسرے واقعات ہوتے تو ہم جیسے لوگوں کو یہ فلم دیکھ کر مایوسی نہ ہوتی پھر یہ بھی ایک بات ہے کہ ہم پھر یہ فلم ہی کیوں دیکھتے؟ بھارتی فلمیں ہم برائے نام ہی دیکھتے ہیں۔ اس فلم کو دیکھنے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ اس کا نام

"دیوداس" ہے اور یہ اسی کہانی پر مبنی ہے۔

بہترین عکاسی، سیٹ، شان وشوکت، کروفر کسی چیز کی بھی اس فلم میں کمی نہیں ہے۔ ہیروئنوں کو پریوں کی طرح سجایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ غریب گھرانے کی لڑکی پارو بھی زرق برق لباس اور مکمل میک اپ میں نظر آتی ہے۔ چندر مکھی تو ہے ہی ایک طوائف اس لئے اس کی سجاوٹ اور زیب وزینت میں کس طرح کمی ہو سکتی ہے۔ مادھوری اس لباس، ماحول اور کردار میں خوب بچی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اصل کہانی کے مطابق اس کی سادہ زندگی اور طوائفیت سے کنارہ کش ہو کر ایک عام گھریلو زندگی بسر کرنے والا حصہ سرے سے فلم میں موجود ہی نہیں ہے۔ ہیروئنیں تو ہیروئنیں ہوتی ہیں۔ اس لئے سجنا اور بننا سنورنا ان کا حق ہے لیکن اس فلم میں ہیرو کی ماں، بھائی، دوسرے گھر والے یہاں تک کہ نوکرانیاں تک زرق برق ملبوسات اور زیورات میں لدی پھندی نظر آتی ہیں۔

فلم کا آغاز ہی شوروغل اور بے جا ہنگامہ سے ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دیوداس کی واپسی کی خبر آتی ہے اس لئے گھر کا ہر فرد خوشی سے دیوانہ ہو کر بھاگتا پھر رہا ہے۔ اس بھاگ دوڑ کے بہانے شاندار اور پر شکوہ محل نما سیٹ کے تمام حصے فلم بین کو دکھا دیئے جاتے ہیں۔ یہ ابتدائی سین کافی طویل اور غیر ضروری اوورایکٹنگ کا شکار ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر دیوداس واقعی تمام گھر والوں کا اس قدر لاڈلا اور ان کی آنکھوں کا تارا تھا تو آگے چل کر یہ محبت، لگاؤ اور لاڈ یک دم کہاں غائب ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا اس کے بعد بھی ماں کے سوا کسی نے دکھ یا افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ رہ گئی بھابی تو وہ روزِ اول ہی سے دیور کی دشمن تھی۔ دیوداس اور پاربتی کے ملاپ کی راہ میں بھاوج کی سازشوں کو بھی بہت بڑا دخل رہا ہے حالانکہ اصلی کہانی میں اس پہلو کو زیادہ اجاگر نہیں کیا گیا تھا۔

اب ذرا دیوداس کی بھی سن لیجئے۔ پہلے تو ہدایت کار نے اس کی آمد کی خبر پر وہ اودھم مچایا کہ خدا کی پناہ۔ حویلی میں ہر کوئی دیوانہ وار بھاگتا دوڑتا پھر رہا تھا اور ایک دوسرے کو مطلع کر رہا تھا کہ "دیو" دس سال کے بعد واپس آرہا ہے۔ خوشی کے مارے کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ یہ کافی طویل اور غیر ضروری حصہ ہے۔ اس کے بعد دیوداس صاحب بنفسِ نفیس تشریف لے آتے ہیں وہ چونکہ لندن سے آئے ہیں اس لئے سرتاپا انگریز بنے ہوئے ہیں۔

سر پر ہیٹ، لمبا اوور کوٹ، پتلون قمیض، ٹائی، انتہائی اپ ٹو ڈیٹ۔ اس حصے میں شاہ رخ خان نے اپنی روایت کے مطابق اداکاری کی ہے۔اس کے بعد جب وہ پاربتی سے ملنے کے لئے جاتے ہیں۔تب بھی ''دیوداسیت'' کا کوئی عنصر ان کی شخصیت میں نظر نہیں آتا۔ بعد کے مناظر میں شاہ رخ نے مناظر کے تقاضوں کے مطابق اداکاری کی ہے۔وہ ایک اچھا اداکار ہے لیکن اس کی اداکاری کا ایک مخصوص لگا بندھا انداز ہے۔یہی سب کچھ اس نے ''دیوداس'' کے کردار میں بھی کیا۔اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی ایک جگہ بھی "دیوداس" نظر نہیں آیا۔رہ گئے جیکی شیروف تو انہوں نے جی بھر کر اوور ایکٹنگ کی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص اداکاری کرتے کرتے بوڑھا ہونے کو آیا۔کئی فلموں میں ہیرو کے کردار بھی کیے مگر اسے شرابی کا کردار کرنا نہ آیا۔ہماری پاکستانی فلموں میں کئی معمولی اداکار بہت اچھے شرابی بن چکے ہیں مگر اب ان باتوں کو کون دیکھتا ہے۔ فلم دلچسپ، پر شکوہ، چمک دمک سے جگمگاتی ہوئی ہو۔ گاتی ہوئی خوبصورت ہیروئنیں ہوں۔رقص میں درجنوں دوسری لڑکیاں سنگت کے لئے موجود ہوں۔خوبصورت اور شاندار سیٹ ہوں۔ عکس بندی بہت اچھی ہو تو پھر آج کے فلم بینوں کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔یہ اس دور کی کامیاب ترین بھارتی فلم قرار پائی ہے اور مہنگی ترین بھی۔

پبلسٹی میں بتایا جاتا ہے کہ اس پر پچاس کروڑ روپے لاگت آئی ہے۔ فلم ساز لاگت کے بارے میں مبالغہ آرائی ضرور کرتے ہیں اس لئے یہ جائز سمجھا جاتا ہے۔ کتنی بھی مہنگی ہو یہ فلم بیس پچیس کروڑ میں تو ضرور بنی ہو گی لیکن اسے بھارتی فلمی تاریخ کی سب سے مہنگی فلم قرار دینا درست نہیں ہے۔

چلئے ! مان لیا کہ اس پر چالیس کروڑ لاگت آئی ہے لیکن یہ بھی یاد رہے کہ ساٹھ کی دہائی میں کے آصف کی فلم ''مغل اعظم'' دس بارہ کروڑ میں تیار ہوئی تھی۔ چالیس سال قبل کے دس بارہ کروڑ آج کے کم از کم ایک ارب تو بن ہی جائیں گے۔ اس لحاظ سے بھارتی فلمی تاریخ کی سب سے مہنگی (اور کافی حد تک بہت اچھی فلم مغل اعظم) تھی مگر ان دنوں بھارتی سیاست کی طرح بھارتی فلموں سے بھی مسلمان فنکاروں اور ہنر مندوں کو خارج کر دیا گیا ہے۔اس لئے کسی مسلمان کے کسی کارنامے کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ ''مغل اعظم'' دس سال کے طویل عرصے میں مکمل ہوئی تھی۔

اس دوران میں ایک بار اس کے فنکار بھی تبدیل ہوئے اور شوٹنگ کی ہوئی تمام فلم ضائع کر دی گئی۔ دلیپ کمار اور مدھو بالا کی فلم کی تکمیل میں بھی سات سال لگے تھے۔ اس فلم میں کے آصف نے بہت سے نئے تجربات کیے تھے جن پر دوسرے فلم ساز بلکہ ساری انڈسٹری کے لوگ کہتے تھے کہ یہ پاگل ہو گیا ہے۔ خوامخواہ جھک ہی مارے گا لیکن کے آصف نے کسی کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ اپنے کام میں ہمہ تن مصروف رہا۔ اس کی زندگی کا محور اور مقصد ''مغل اعظم'' تھی۔ پیسے اور شان و شوکت سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ ایک معمولی سے فلیٹ میں رہتا تھا جس میں پرانے صوفے پڑے ہوئے تھے۔ کار اس کے پاس نہیں تھی۔ ٹیکسی میں پھرتا رہا۔ فلم ساز ادارے سے اس کو تین ہزار روپے ماہوار لگی بندھی تنخواہ ملتی تھی جبکہ فلم کے تمام اخراجات کا اختیار اسے حاصل تھا۔ وہ ایک پرچی پر لکھ کر بھیج دیتا کہ حامل رقعہ کو دو لاکھ روپے دے دو اور فوراً ادائیگی ہو جاتی تھی لیکن اپنی ذات پر اس تنخواہ سے زیادہ ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔ اسے بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ ''مغل اعظم'' کو ایک یادگار فلم بنائے اور اس مقصد کے حصول میں وہ سو فیصد کامیاب ہوا۔

کے آصف نے ''مغل اعظم'' کے لئے شیش محل کا سیٹ تعمیر کرایا جس پر اس زمانے میں دس لاکھ روپے لاگت آئی تھی۔ اس کی دیواروں پر اور چھت پر شیشہ کاری ہوئی تھی۔ سیٹ پر قدم رکھو تو ہر طرف اپنا ہی عکس نظر آتا تھا۔ بمبئی کے فلمی جگادریوں نے اس پر بہت مذاق اڑایا کہ ہر طرف تو آئینے لگے ہیں۔ فوٹو گرافی کیسے ہو گی؟۔ کیمرہ اور یونٹ کے لوگ کہاں جائیں گے اور لائٹس کا عکس آئینوں میں لازماً نظر آئے گا۔ یار لوگوں نے یہ بات سرمایہ کار سیٹھ شاہ پور جی۔ پالن جی (یہ دو ارب پتی بھائی تھے) کو بھی سنا دی اور کے آصف کے خلاف خوب بھڑکایا۔ وہ پہلے ہی تنگ آئے ہوئے تھے۔ سالہا سال سے فلم بن رہی تھی مگر مکمل ہونے میں نہیں آتی تھی۔ آصف سے براہِ راست سوال نہیں کر سکتے۔ اس اثناء میں پانی کی طرح پیسہ بہایا جا رہا تھا۔

لوگوں کے بہکاوے میں آکر شاہ پور جی، پالن جی نے سوچا کہ آصف کی جگہ کسی اور ہدایت کار کو لے کر فلم مکمل کر لی جائے۔ ہر ہدایت کار نے آصف کے ڈر سے کانوں کو ہاتھ لگائے کیونکہ وہ انتہائی جھگڑالو اور تند خو مشہور تھے۔ فلمی دنیا

میں ''آصف دھانسو'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بالآخر قرعہ فال ایس ایم یوسف صاحب کے نام نکلا۔ یوسف صاحب نے معذرت کر دی کہ اس قسم کی فلمیں بنانا میری روش نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا۔ چلئے ایک بار چل کر شیش محل کا سیٹ تو دیکھ لیجئے اور بتایئے کہ اس پر شوٹنگ کیسے ممکن ہے؟

ایس ایم یوسف صاحب بڑے ہدایت کار تھے اور بہت نیک نام اور شریف انسان بھی تھے۔ اصرار پر سیٹ دیکھنے چلے گئے۔ آصف کو پتا چلا تو اس نے یوسف صاحب کو پیغام بھیجا کہ اگر کوئی اور ہدایت کار میرے سیٹ پر جاتا تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دیتا مگر آپ کا بہت احترام کرتا ہوں۔ آپ شوق سے شوٹنگ کیجئے اور شیش محل کے سیٹ پر ایک سین فلما کر دکھا دیجئے تو آپ کو مان جاؤں گا۔

یوسف صاحب پہلے ہی انکار کر چکے تھے۔ انہوں نے سیٹھوں سے بھی معذرت کر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ شیش محل کے سیٹ پر فلم بندی کرنا ایک ناقابل یقین اور حیرت انگیز بات تھی مگر کے آصف نے کیمرامینوں اور ماہرین کے مشورے سے بہت مفصل منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ جب فلم ریلیز ہوئی تو یہ سیٹ اور اس پر فلمائے گئے مناظر قابل دید اور ناقابل یقین تھے۔

''مغل اعظم'' خدا خدا کر کے مکمل ہو گئی تو سیٹھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب اس کی پبلسٹی کا مرحلہ آ گیا۔ پبلسٹی کے لئے پچاس لاکھ کا بجٹ بنایا گیا جو کہ اس زمانے میں ایک عام فلم کی لاگت ہوا کرتی تھی۔ ملک کا ہر شہر اور چپا چپا ''مغل اعظم'' کی خوبصورت پبلسٹی سے سجا دیا گیا۔ کے آصف کو معلوم تھا کہ فلم بینوں کا اشتیاق انہیں فلم دیکھنے پر مجبور کر دے گا۔ اس فلم کی ایڈوانس بکنگ پر پٹرول پمپ اور بڑے بڑے اسٹورز پر کی جا سکتی تھی۔ یہ اپنی نوعیت کی انوکھی اور پہلی مثال تھی۔ تماشائی ایڈوانس بکنگ کے لئے سینما گھروں، پٹرول پمپوں اور اسٹورز پر ٹوٹ پڑے۔ ''مغل اعظم'' نے ملک میں آمدنی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔

مگر یہ سب باتیں اب قصہ پارینہ ہو چکی ہیں۔ بھارتی میڈیا میں اب ان کا تذکرہ بھی نہیں کیا جاتا۔ اب نہ ''مغل اعظم

(پرتھوی راج) ہیں نہ انارکلی (مدھوبالا) کے آصف بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔اس داستان کا اہم کردار دلیپ کمار ہی اب بقیدِ حیات ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ''مغل اعظم'' کا آغاز اس کی تکمیل ،اس کا اعلیٰ معیار اور اس کی بے پناہ کامیابی کے آصف کا ناقابل فراموش کارنامہ تھا۔ایک ان پڑھ ،اجڈ اور اکھڑ شخص نے ہندوستان کی فلمی تاریخ بدل کرر کھ دی تھی۔آج کی '' دیوداس'' تو اس کے مقابلے میں سوائے گلیمر کی بھرمار کے اور کچھ نہیں ہے۔

*ـــ*ـــ*

پچھلے دنوں سعادت حسن منٹو صاحب کے بارے میں ایک مضمون پڑھا جس میں ان کی انفرادی تحریروں اور باغیانہ سوچ کا تذکرہ کیا گیا تھا۔منٹو صاحب کے افسانوں اور کہانیوں پر اس زمانے میں جتنے مقدمات ان کے خلاف دائر کئے گئے شاید ہی کسی دوسرے افسانہ نگار کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہو۔منٹو صاحب جب بمبئی میں تھے تو مقدموں کی پیروی کرنے کے لئے لاہور آیا کرتے تھے۔طویل سفر اور دوسری صعوبتیں برداشت کرتے تھے اور اخراجات الگ۔کسی ناشر کو تو یہ توفیق تک نہ ہوتی کہ ان کے مقدمات کا خرچہ ہی اٹھالیتا مگر منٹو کی ہٹ دھرمی یا اصول پرستی ملاحظہ ہو کہ وہ خدا کا بندہ بھی اپنی مرضی کی کہانیاں لکھنے سے باز نہیں آیا۔دیکھا جائے تو فیض صاحب کا یہ شعر ان ہی پر صادق آتا ہے کہ ـــ

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

منٹو کو بھی ایک جنونی یہ سمجھ لیجئے۔ان پر جس چیز کا جنون سوار ہو جاتا تھا پھر دوا دارو، تعویز گنڈے سب بیکار ہو کر رہ جاتے تھے۔انہوں نے اپنی ساری عمر اپنی مرضی اور پسند کے مطابق گزار دی۔مختصر سہی لیکن پھر بھی یہ احساس کیا کم ہے کہ جو جی میں آیا وہی کیا اور اس مختصر سی عمر میں بھی منٹو نے کہانیاں لکھنے کا ایک ناقابل شکست ریکارڈ قائم کر دیا۔ان ہی میں بہت سی کہانیاں شاہکار بھی تسلیم کی جاتی ہیں۔کہانی لکھنے اور کردار سازی کی خدا داد صلاحیت اللہ کی دین

تھی۔ منٹو صاحب نے اس نعمت کو دونوں ہاتھوں سے بے دریغ لٹایا۔ لوٹنے والوں میں خود غرض اور مفاد پرست ناشر شامل تھے۔ کوئی ایک بھی تو ایسا نہیں تھا جس نے منٹو کی بے بسی اور مجبوریوں اور اس کی عظمت کا نہ سہی کم از کم خدا کا خوف ہی کیا ہوتا۔ مگر ایک لحاظ سے انہیں یہ کریڈٹ دیا جا سکتا ہے کہ نہ وہ منٹو کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے بیدردی سے ان کی صلاحیتوں کو نچوڑتے اور نہ اردو ادب اتنے بہت سے شہ پاروں سے مالا مال ہوتا۔ ممکن ہے یہی ثواب ان کے کھاتے میں لکھ دیا جائے اور بخشش کا کوئی سامان ہو جائے۔ انہوں نے پیسے بٹورے اور اردو ادب کو شاہکار نصیب ہو گئے۔

منٹو صاحب کے ساتھ ہی عصمت چغتائی کا ذکر بھی آ گیا۔ اگر مردوں میں منٹو صاحب فحاشی پھیلا رہے تھے تو خواتین میں یہ کارنامہ عصمت چغتائی بڑی مستقل مزاجی سے سرانجام دے رہی تھیں۔ اگر منٹو نے ''بو''۔ '' ٹھنڈا گوشت'' اور ''کھول دو'' جیسی کہانیاں لکھیں تو عصمت چغتائی نے '' لحاف'' جیسا افسانہ لکھا جس پر سارے ملک میں بہت لے دے ہوئی مگر اس افسانے سے عصمت چغتائی کو بے پناہ شہرت بھی حاصل ہوئی۔ ان کا قلم بھی منٹو کے قلم کی طرح بے باک تھا۔ وہ بھی اپنے ماحول کے ڈھکے چھپے کرداروں کی تصور کشی کرتی تھیں، خصوصاً اس زمانے کے متوسط طبقے کی لڑکیوں کے پس پردہ جذبات واحساسات کی تصویر کشی کرنے میں انہیں جو ملکہ حاصل تھا وہ کسی دوسری مصنفہ کے حصے میں نہیں آیا۔ اس پر ان کا تیکھا اندازِ بیان، بے باک اور شوخ وشنگ فقرے اور زبان اور محاوروں کی چاشنی نے ان کے افسانوں کو ایک بالکل ہی جداگانہ حیثیت دے دی تھی۔

منٹو صاحب سے ہمیں ذاتی طور پر ملاقاتوں کا اعزاز حاصل رہا ہے اور ہم نے مختلف اوقات میں ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن۔۔۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

موقع ملا اور زندگی رہی تو ان کا یہ حق بھی ضرور ادا کریں گے۔ عصمت چغتائی سے ہماری شناسائی محض مطالعے کی حد

تک ہی رہی لیکن ان کی تحریروں اور ان کے بارے میں لکھے گئے مضامین کی وجہ سے یوں لگتا تھا جیسے ہم انہیں ذاتی طور پر بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ بہت اپنی اپنی سی لگتی تھیں۔ان کی تصویریں بھی دیکھتے رہے تھے اور ان کے بارے میں ایک خیالی تصویر بھی بنا رکھی تھی۔ جب وہ لاہور تشریف لائیں تو شباب کیرانوی صاحب نے اپنے اسٹوڈیو میں ان کے اعزاز میں لنچ کا اہتمام کیا تھا۔اس موقع پر ہمیں بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔پہلی بار وہ 1976ء میں پاکستان آئی تھیں اور دوسری بار 1985ء میں لاہور کا دورہ کیا۔ہماری ملاقات ان کے دوسرے دورے میں ہوئی تھی جو کہ ان کا آخری دورہ پاکستان تھا۔انہیں ہم بچپن سے پڑھتے آرہے تھے مگر اس زمانے میں ان کے بھائی عظیم بیگ چغتائی ہمارے پسندیدہ مصنف تھے۔ان کی مزاحیہ کہانیاں اور ناول آج بھی ہمیں یاد ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی نے اس زمانے میں اپنے مخصوص طرزِ نگارش اور اسلوب کی وجہ سے مزاح نگاری میں نام پیدا کیا تھا جب اور بھی کئی نامور مزاح نگار اردو ادب کو اپنی تحریروں سے دوام بخشنے میں مصروف تھے مگر ہر ایک کا انداز جدا اور موضوعات بالکل مختلف تھے۔

عصمت چغتائی سے ملاقات ہوئی تو وہ بزرگ بن چکی تھیں مگر ناک نقشہ اور باتوں میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔وہ 1915ء میں یوپی کے قصبے بدایوں میں پیدا ہوئی تھیں۔اس چھوٹے مردم خیز شہر نے اور بھی کئی نامور شاعر اور ادیب اردو ادب کو دیئے ہیں۔

شباب اسٹوڈیو پورے نکھار پر تھا۔موسم بھی بہت اچھا تھا۔شباب صاحب نے اپنے قریبی دوستوں اور چیدہ چیدہ ادبی شخصیات کو لنچ پر مدعو کیا تھا۔ہر طرف سبزہ زار اور گل ولالہ کی بہار تھی۔اس پر عصمت چغتائی کی کاٹ دار اور مزے دار باتیں۔اب وہ کافی عرصے سے فلمی اور ادبی حلقوں میں عصمت آپا کہلاتی تھیں۔اس مختصر سی غیر رسمی ملاقات میں ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور وہ اپنی باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتی رہیں۔عمر نے ان کے ذہن اور حسِ مزاح پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔یہ مختصر سی ملاقات ہمیشہ یاد رہے گی۔عصمت چغتائی ان چند ہستیوں میں شامل تھیں جن سے ملنے کی ہمیں خواہش رہی ہے۔

عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو میں تحریر کے علاوہ اور بہت سی باتیں بھی مشترک تھیں۔ مثلاً دونوں بمبئی میں رہتے تھے۔ دونوں نامور بھی تھے اور بدنام بھی۔ دونوں کا ادب کے علاوہ فلموں سے بھی تعلق تھا۔ دونوں منہ پھٹ اور لگی لپٹی رکھے بغیر بولنے اور لکھنے کے قائل تھے۔ اگر منٹو صاحب کے افسانوں پر مقدمے چلتے رہے تو عصمت چغتائی کی کئی کہانیاں بھی شدید نکتہ چینی کا موضوع بنتی رہیں۔

ان کا نام سن کر ہی لوگ خصوصاً خواتین ناک بھوں چڑھا کر کہتے ”توبہ توبہ۔ اس قدر بے شرم اور بے حیا عورت۔ خدا کی پناہ! میں نے اپنے گھر میں ان دونوں کی کتابوں اور کہانیوں کا داخلہ ممنوع قرار دے رکھا ہے۔“

”کن دونوں کی؟“

”ارے یہی سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی۔ ایک کے دیدے کا پانی مر گیا ہے اور دوسرا شرم و حیا کو گھول کر شراب کے ساتھ پی گیا ہے۔“

منٹو اور عصمت چغتائی کی ان مشترکہ خصوصیات کی بنا پر اس سے پہلے ادبی حلقوں میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاید منٹو اور عصمت کی شادی ہو جائے گی۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ یعنی ایک دیوانہ اور ایک دیوانی لیکن ان دونوں نے بے تکلفی اور دوستی کے باوجود کبھی شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔

عصمت چغتائی کا تعلق ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، شریف اور معزز گھرانے سے تھا۔ ان کے والد کا نام مرزا قسیم بیگ تھا۔ اتفاق سے وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ ایک بار کسی نے طنز آمیز لہجے میں لکھا تھا کہ وہ سب سے چھوٹی تھیں اسی لئے سب سے کھوٹی تھیں۔ حالانکہ وہ کھن کھناتا ہوا کھرا سکہ تھیں۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی انہوں نے افسانے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ امتیازی نمبروں سے بی اے پاس کرنے کے بعد وہ انسپکٹر آف اسکولز مقرر ہو گئی تھیں۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ وہ لکھنے کے معاملے میں بے دھڑک تھیں۔ جو جی چاہتا لکھ ڈالتی تھیں۔ کبھی رسم دنیا یا رواجوں کا انہوں نے پاس کیا نہ ہی پرانی روایات کو اپنایا۔ ان کے قلم کی بے باکی اور بے خوفی کا

اندازہ ان کے مضمون ''دوزخی'' سے لگایا جاسکتا ہے۔ دراصل یہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ تھا جو انہوں نے اپنے بھائی کی وفات کے بعد لکھا تھا۔ معترض لاکھ اعتراض کریں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ نہ صرف اردو ادب کے بلکہ دنیا کی ہر زبان کے خاکوں میں ایک نمایاں اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اس خاکے میں اتنی بے دردی سے اپنے بھائی کی زندگی کا نقشہ کھینچا تھا اور ان کی عادات و اطوار کو اس بے رحم انداز میں بیان کیا تھا کہ اسے پڑھ کر عام قاری کانوں کو ہاتھ لگاتے اور توبہ توبہ کرتے تھے۔

''توبہ توبہ۔ کیسی سنگ دل لڑکی ہے۔ اپنے مرے ہوئے بھائی کا بھی لحاظ نہیں کیا۔

دوسری فرماتیں ''بہن یہ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ سگا بھائی تو کیا کوئی اپنے دشمن کے بارے میں بھی اس طرح نہیں لکھ سکتا۔''

جو بھی کہا جائے وہ اپنی جگہ لیکن ''دوزخی'' کو ہمیشہ اردو میں ایک شاہکار کی حیثیت حاصل رہے گی۔ یہ ایک ناقابل فراموش تحریر ہے۔ عصمت چغتائی نے بلاکم و کاست اپنے بھائی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے لیکن اس بے رحم تحریر کے پیچھے ایک بہن کی محبت کے جذبات اور آنسو بھی لفظوں کے پیچھے چھپے ہوئے نظر آئے ہیں۔ ''دوزخی'' یکسر ایک نئے انداز کا خاکہ ہے۔ اس جیسا خاکہ اس کے بعد پھر کوئی نہ لکھ سکا۔

یہ خاکہ شاہد احمد دہلوی کے مشہور و معروف ادبی رسالے ''ساقی'' میں شائع ہوا تھا اور اس نے سارے ہندوستان میں دھوم مچا دی تھی۔ تعریف و تنقید کا ایک شور برپا ہو گیا تھا۔ اس کی حمایت میں بھی اور مخالفت میں بھی۔

اس سلسلے میں ایک اور واقعہ مشہور ہے اور یہ بالکل سچا واقعہ ہے۔

منٹو صاحب کی بہن اقبال نے یہ خاکہ پڑھا تو بہت بگڑیں۔ اپنے بھائی منٹو سے کہا'' یہ کتنی بے ہودہ عورت ہے۔ اپنے بھائی کو بھی نہیں بخشا۔ کم بخت نے کیسی کیسی فضول باتیں لکھی ہیں۔''

منٹو صاحب نے جواب میں کہا ”اقبال۔ اگر میری موت پر تم ایسا ہی مضمون لکھنے کا وعدہ کرو تو خدا کی قسم میں آج ہی مرنے کو تیار ہوں۔“

کسی لکھنے والے کی طرف سے دوسرے لکھنے والے کے لئے اس سے بڑا خراج تحسین اور کیا ہو گا اور وہ بھی سعادت حسن منٹو جیسے لکھنے والے کی طرف سے جو کہ اپنے آگے کسی اور کو گردانتا ہی نہ تھا۔ مگر عصمت چغتائی کے افسانوں اور تحریروں کے وہ بھی قائل تھے۔ جب کبھی عصمت چغتائی کا تذکرہ چھڑ جاتا تو منٹو صاحب کھلے دل سے ان کی تعریف کرنے میں ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔

عصمت چغتائی نے سعادت حسن منٹو سے تو شادی نہیں کی لیکن ایک فلمی مصنف کا انتخاب کر لیا۔ شاہد لطیف فلمی کہانی نویس تھے۔ صورت شکل اچھی تھی۔ تعلیم یافتہ، مہذب اور شائستہ انسان تھے لیکن ان کی تمام خوبیوں پر ایک خامی حاوی تھی۔ وہ کثرتِ مے نوشی کے لئے مشہور تھے۔ اس زمانے میں وہ بمبئی ٹاکیز میں کہانی نویس کی حیثیت سے ملازم تھے۔ نام بھی تھا اور معقول آمدنی بھی تھی۔ اس وقت تک عصمت چغتائی افسانہ نویس کی حیثیت سے مشہور ہو چکی تھیں۔ ان دونوں کی ملاقات بمبئی میں ہوئی اور ملاقاتیں بڑھتی رہیں یہاں تک کہ ایک دن خبر ملی کہ عصمت چغتائی اور شاہد لطیف شادی کر رہے ہیں۔ کسی کو یقین نہیں آیا کہ عصمت جیسی ذہین، سمجھ دار، خوش شکل اور مشہور لڑکی ایک شرابی کے ساتھ شادی کیوں کرے گی لیکن یہ ایک حقیقت تھی۔ عصمت چغتائی کے گھر والے بھی اس شادی کے حق میں نہیں تھے یہاں تک کہ خاندان کے کسی فرد نے اس شادی میں شرکت نہیں کی مگر عصمت چغتائی نے ہمیشہ من مانی کی تھی اور جو درست سمجھا وہی کیا۔ لہٰذا شادی کے معاملے میں بھی انہوں نے اپنے دل کی بات مانی۔ دنیا والوں کی انہوں نے پہلے کون سی پرواہ کی تھی کہ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں لوگوں کے اعتراض اور انگشت نمائی کو خاطر میں لاتیں؟ اس طرح ایک فلمی ادیب شاہد لطیف سے عصمت چغتائی کی شادی ہو گئی۔ ”آفاق“ میں ہمارے ساتھ خالد لطیف صاحب کام کیا کرتے تھے۔ اس سے پہلے وہ ”نوائے وقت“ میں بھی ہمارے ساتھ تھے۔

بہت خوبصورت اور وجیہہ نوجوان تھے۔ بعد میں وہ امریکی محکمہ اطلاعات سے وابستہ ہو گئے پھر ”اسٹار“ نیوز ایجنسی

میں بھی کام کیا۔انگریزی اخبار ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے سینئر رپورٹر بھی رہے۔1963ء میں انہوں نے اردو پریس سروس کے نام سے اردو میں خبر رسانی کا ایک ادارہ قائم کیا تھا گو کہ ہمارے ملک میں بالکل نیا تجربہ تھا۔انہوں نے یورپی ممالک سے اردو کے ٹیلی پرنٹر بنوا کر منگوائے۔یہ بھی ایک کارنامہ تھا۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایسے شخص کو حکومت ہر طرح امداد فراہم کرتی اور اس کی حوصلہ افزائی کرتی تاکہ انگریزی ٹیلی پرنٹرز سے اخبارات کی جان چھوٹ جاتی جو کہ آج بھی ہمارے اخبارات پر مسلط ہیں لیکن ہماری حکومتوں کو نہ تو کسی کے اچھے کام کو سراہنے کی فرصت ہے اور نہ ہی قومی زبان اردو سے کسی کو لگاؤ رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہیں برائے نام سرکاری گرانٹ سے زیادہ کسی اور چیز کا مستحق نہیں سمجھا گیا۔

خالد لطیف ایک آزاد منش اور بااصول نظریاتی صحافی تھے۔خدا کے فضل سے آج بھی موجود ہیں۔برف کی طرح سفید بال ہو چکے ہیں مگر ان کی رعنائی میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ان کی اس ذاتی جدوجہد، کاوش اور خلوص کی قدر تو کیا کی جاتی 1964 ء میں حکومت ان سے ناراض ہو گئی۔وجہ ؟1964ء کے صدارتی انتخابات میں انہوں نے مفاد پرستوں کے برعکس ایک خالص پاکستانی اور مسلم لیگی ہونے کی وجہ سے ایوب خاں کے مقابلے میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت میں مہم شروع کر دی۔حکمرانوں کی طبع نازک پر یہ ''گستاخی'' بہت بار گزری چنانچہ ناراض ہو کر حکومت نے ان کے ادارے کو ملنے والی سرکاری امداد روک دی۔انہوں نے جرمنی سے اردو ٹیلی پرنٹر بطور خاص تیار کروا کے درآمد کیے تھے۔حکومت کی سرکاری امداد بند ہونے کے باعث وہ یہ درآمد کردہ ٹیلی پرنٹر کسٹم سے نہیں چھڑا سکے۔ہرجانے اور سود کی رقم بڑھتی گئی۔قرض دار ہو گئے۔ بالآخر نیشنل بنک آف پاکستان نے یہ ٹیلی پرنٹر کسٹم سے آزاد کرا کے سرکاری خبر رساں ایجنسی اے پی پی کے حوالے کر دیئے۔اس طرح خالد لطیف کو بھاری مالی نقصان کے علاوہ ذاتی طور پر ذہنی صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔اس کے بعد بھی وہ لشتم پشتم اردو پریس سروس چلاتے رہے مگر ذاتی کوششوں سے یہ کام خوش اسلوبی سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔جب بہت زیادہ مقروض ہو گئے تو آخر کار اردو پریس سروس بند کر دی۔اس کے بعد بھی وہ تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے بلکہ آج کل بھی دل کا بائی پاس کروانے کے باوجود لکھنے پڑھنے میں مصروف ہیں۔پچھلے دنوں ان کی دو کتابیں شائع ہوئیں ہیں۔ایک

''طوائف'' جو کہ تیسری صدی ہجری کے عظیم ادیب الجاحظ کے رسالے کا ترجمہ ہے۔ جسے انہوں نے حواشی سے بھی آراستہ کیا ہے۔ دوسری کتاب ''سفر نامہ ابنِ فضلان'' ہے۔ یہ 921 عیسوی میں خلیفہ المقتدر کے سفیر احمد بن فضلان کے اتراک، باشرک، خزرستاں اور فارمنوں کے روسی علاقوں کے سفر و سیاحت پر مبنی ہے۔ خالد لطیف نے بہت تحقیق کے بعد حواشی بھی تحریر کیے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں علمی و ادبی حیثیت سے نادر روزگار ہیں۔ مگر آج کل ان چیزوں کی کون قدر کرتا ہے۔ انہوں نے ذاتی اخراجات پر بہت عمدگی سے یہ کتابیں شائع کر دی ہیں۔ نہ صلے کی تمنا ہے نہ ستائش کی پروا۔ اپنے شوق و ذوق کی تکمیل اور اہل علم و ہنر تک قیمتی و نادر معلومات پہنچانے کی غرض سے انہوں نے یہ کام کیا ہے۔ آپ کہیں گے عجب سر پھرا شخص ہے۔ جی ہاں۔ دنیا ایسے ہی سر پھروں کی بدولت تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کے سرمائے سے مالا مال ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ بذاتِ خود خالی ہاتھ ہیں۔

آپ سوچیں گے کہ اس موقع پر خالد لطیف صاحب کا تذکرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بات یہ ہے کہ جب شاہد لطیف اور عصمت چغتائی کی مشترکہ کاوشوں سے بنائی جانے والی فلمیں بمبئی سے لاہور آ گئیں تو ادب کے علاوہ فلم کے حوالے سے بھی عصمت چغتائی کا بہت چرچا ہوا۔ شاہد لطیف صاحب اس سے پہلے اتنے زیادہ نامور نہیں تھے۔ ان فلموں اور عصمت چغتائی کے شوہر کے حوالے سے ان کی شہرت کو بھی پر لگ گئے۔

ہم نے خالد لطیف صاحب کو معمول سے زیادہ عزت دینی شروع کر دی۔ عمر میں وہ ہم سے کچھ بڑے تھے۔ تجربے اور علم میں بھی زیادہ تھے مگر ساتھ کام کرنے کی وجہ سے بھی بہت بے تکلفی تھی جو کہ آج بھی اسی طرح قائم ہے۔ اگرچہ ملاقاتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ جب ہم نے ان کے لئے بطور خاص چائے کے ساتھ سموسے اور بسکٹ بھی منگوانے شروع کر دیئے تو وہ قدرے حیران ہوئے۔

ایک دن پوچھنے لگے ''آفاقی۔ کیا بات ہے۔ آج کل تم فضول خرچ ہو گئے ہو یا مجھ سے تمہیں کوئی کام ہے؟'' ''ہم نے کہا'' خالد صاحب۔ کام وام تو کچھ نہیں ہے۔ بس آپ کی عزت کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

بولے ’’اتنی زیادہ عزت افزائی کا سبب پوچھ سکتا ہوں؟‘‘

’’بھائی آپ عصمت چغتائی کے دیور اور شاہد لطیف صاحب کے بھائی ہیں۔ ہم ادیبہ کی حیثیت سے بھی عصمت چغتائی کے قائل ہیں اور اب فلموں کے حوالے سے بھی ان کی عظمت کو مان گئے ہیں۔ اس لئے ہماری نظروں میں اب آپ کی قدر و منزلت بھی زیادہ ہو گئی ہے۔‘‘

وہ اپنے مخصوص انداز میں ایک شائستہ قہقہہ لگا کر ہنسے اور کہنے لگے ’’آفاقی۔ تمہیں یہ سن کر مایوسی ہو گی کہ تمہارے اندازے بالکل غلط ہیں۔ میرا شاہد لطیف سے کوئی رشتہ نہیں ہے تو پھر عصمت چغتائی کا دیور کیسے ہو سکتا ہوں۔‘‘

ہم نے کہا’’یار کیوں مذاق کرتے ہو؟‘‘

کہنے لگے ’’مذاق تم کر رہے ہو۔ بندۂ خدا میں سچ کہہ رہا ہوں کہ شاہد لطیف سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔‘‘

ہم نے پہلے تو بے اعتباری سے انہیں دیکھا مگر ان کی مسکراہٹ سے اندازہ لگا لیا کہ وہ بالکل صحیح فرما رہے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ان کے سامنے رکھا ہوا سموسہ فوراً اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لیا۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ وہ خاطر مدارت بھی نہ رہی لیکن دوستی قائم رہی بلکہ بعد میں فاصلوں کے باوجود بڑھتی رہی۔

یہ لطیفہ ہمیں آج تک یاد ہے۔ انتظار حسین صاحب بھی ہمارے ساتھی تھے۔ انہوں نے سنا تو بہت ہنسے ’’یار آفاقی۔ میں تمہیں اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا تھا مگر تم تو اس سے بھی زیادہ بے وقوف نکلے جتنے کہ نظر آتے ہو۔ تم نے مجھ سے پوچھ لیا ہوتا۔ بلاوجہ چائے اور سموسے ضائع کیے۔‘‘

خیر۔ یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ ذکر تھا عصمت چغتائی اور شاہد لطیف کی شادی کا۔ یہ شادی بھی عصمت چغتائی نے خاندانی رسم و رواج سے بغاوت کر کے ہی کی تھی۔ بغاوت ان کے مزاج میں شامل تھی۔ وہ شاید پیدائشی باغی تھیں۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہیں مگر اپنی تحریریں اور یادیں چھوڑ گئی ہیں۔ ان کے انتقال پر بھی خاصا تنازعہ کھڑا ہو گیا تھا مگر وہ

ایک علیحدہ قصہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جو عورت زندگی بھر متنازعہ رہی ہو اس کی موت پر اگر تنازع نہ ہوتا تو تسلسل میں فرق پیدا ہو جاتا۔

یار لوگوں اور بے تکلف دوستوں نے منٹو صاحب سے اظہارِ ہمدردی کیا کہ حق ان کا تھا مگر عصمت چغتائی نے شادی کسی اور سے کر لی۔ منٹو صاحب ہنس پڑے۔ ان کے اور عصمت چغتائی کے ہمیشہ بہت اچھے مراسم اور میل جول رہا مگر دونوں میں سے کسی نے کبھی آپس میں شادی کرنے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ یہ محض قیاس آرائیاں تھیں جو کہ ان دونوں کی بے باک اور روایات شکن، تحریروں میں یکسانیت کے باعث جنم لیتی رہی تھیں۔

منٹو صاحب نے اس شادی پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کیا تھا۔ انہوں نے مختلف شخصیات کے جو خاکے تحریر کیے تھے ان میں عصمت چغتائی کے بارے میں ایک مضمون بھی شامل تھا۔ ان میں سے بیشتر مضامین روزنامہ ''آفاق'' کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوئے تھے جسے ہم مرتب کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ہمیں منٹو صاحب کے زیادہ قریب آنے کا موقع ملا۔ یہاں تک کہ ان کے فلیٹ پر بھی جا دھمکتے تھے۔ ان کی باتیں سنتے رہتے تھے اور موقع پا کر سوالات بھی کر لیتے تھے۔ منٹو صاحب میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور انہیں اپنے مخصوص انداز میں مشورے بھی دیتے رہتے تھے۔ ہمیں بھی انہوں نے ادب اور فلم کے بارے میں بہت مفید معلومات حاصل کرنے کا موقع دیا۔ یہ خاکے بعد میں ''گنجے فرشتے'' کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے تھے۔

عصمت چغتائی کے خاکے میں منٹو صاحب نے اپنی اور عصمت چغتائی کی شادی کے موضوع پر بھی تبصرہ کیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیے!

''اگر میں اور عصمت واقعی میاں بیوی بن جاتے تو کیا ہوتا؟ یہ اگر بھی کچھ اسی قسم کی اگر ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ

اگر منٹو اور عصمت کی شادی ہو جاتی تو اس حادثے کا اثر عہدِ حاضر کی افسانوی تاریخ پر ایٹمی حیثیت رکھتا۔ افسانے،

افسانے بن جاتے۔ کہانیاں مڑتڑ کر راکھ بن جاتیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ نکاح نامے پر ان کے دستخط ان کی آخری تحریر ہوتی لیکن سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ نکاح نامہ ہوتا؟ زیادہ قرین تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح نامے پر دونوں افسانے لکھتے اور قاضی صاحب کی پیشانی پر دستخط کر دیتے تاکہ سند رہے۔‘‘

عصمت چغتائی اور شاہد لطیف کی شادی کے بارے میں دونوں کے قریبی دوستوں کا خیال تھا کہ زیادہ دیر تک اس کا چلنا مشکل ہے۔ عصمت چغتائی کا آتش صفت مزاج اور شاہد لطیف کی کثرتِ مے نوشی ان خدشات کا سبب تھی لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ شادی آخر وقت تک قائم رہی یعنی شاہد لطیف کا انتقال ہوا تو عصمت چغتائی اور شاہد لطیف ایک خوشگوار گھریلو زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی دو بچیاں تھیں۔ بڑی بیٹی کا نام سیما تھا اور چھوٹی کا سبرینا۔ ان دونوں کو عصمت اور شاہد لطیف نے آزادانہ ماحول میں پالا تھا اور انہیں یہ آزادی دے دی تھی کہ وہ جو مناسب سمجھیں ویسا ہی کریں۔ ماں باپ نے کبھی ان پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ گویا عصمت اور شاہد لطیف ان لوگوں میں شامل نہیں تھے جو اپنی تحریروں اور تقریروں میں انسانی حقوق اور آزادی کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں مگر اپنی ذاتی زندگی میں ان اصولوں پر عمل نہیں کرتے جن کا وہ پرچار کرتے رہتے ہیں۔ ان دونوں میں منافقت اور دو عملی کا مادہ نہیں تھا۔ وہ جیسا لکھتے تھے اور کہتے تھے ویسا ہی کرتے بھی تھے۔

بچیوں نے اس آزادی کا اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق استعمال کیا۔ بڑی بیٹی سیما نے جب ایک ہندو لڑکے کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تو عصمت چغتائی نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ اس شادی کا انہیں کوئی دکھ بھی نہیں ہوا۔ دراصل عصمت چغتائی ذاتی طور پر مذہب کی قائل نہ تھیں۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کسی مذہب کی پابند نہیں تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ سارے مذہب اچھے ہوتے ہیں۔ کوئی جس مذہب پر بھی چلنا چاہے وہ اس کا حق ہے۔ دوسروں کو اعتراض کرنے یا روکنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے انہیں لامذہب یا دہریہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال کے بعد یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ اسلامی اصولوں کے مطابق انہیں دفن کیا جائے یا ہندو مت کے مطابق ان کی نعش کو نذر آتش کر دیا جائے؟

کچھ لوگ شمشان بھومی لے جا کر ہندووانہ طریقے سے کریا کرم کرنے کے حق میں تھے تو کچھ کا کہنا تھا کہ وہ ہزار مذہب سے برگشتہ سہی مگر انہوں نے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا تھا اور کبھی اپنا مذہب تبدیل کرنے کا اعلان نہیں کیا۔ اس لحاظ سے وہ مسلمان تھیں اس لئے ان کی آخری رسوم اسلامی شریعت کے مطابق ادا کی جائیں۔ اس زمانے میں کہا گیا کہ خود عصمت چغتائی نے بھی یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ مرنے کے بعد ان کی میت کو جلادیا جائے۔ واللہ اعلم باالصواب! بہر حال۔ آخر کار انہیں دفنانے کا فیصلہ کیا گیا اور اب وہ بمبئی کے ایک قبرستان میں پیوندِ زمین ہیں۔

عصمت چغتائی کے خاندان کا تعلق بدایوں سے تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ ملازمت کے سلسلے میں اور پھر لکھنے لکھانے کے سلسلے میں گھر اور گھر والوں سے دور ہی رہی تھیں۔ اپنی تحریروں اور آزاد خیالی کے پیش نظر بھی وہ خاندان کی منظورِ نظر نہیں تھیں لیکن خون کے رشتے بہر حال قائم تھے۔ شاہد لطیف سے شادی کرنے کے بعد انہوں نے بمبئی کو مستقل طور پر اپنا ٹھکانہ بنالیا تھا پھر فلمی مصروفیات نے دامن گیری کی اور وہ ہمیشہ کے لئے بمبئی کی ہو کر رہ گئیں۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے خاندان اور گھر کے بیشتر بلکہ سبھی لوگ پاکستان چلے آئے تھے مگر عصمت چغتائی بمبئی ہی میں مقیم رہیں۔ اپنے رشتے داروں سے ملنے کے لئے وہ صرف دو بار پاکستان آئی تھیں۔ پہلی بار 1976ء میں اور پھر دوسری بار 1985ء میں۔ ظاہر ہے کہ ان کی آمد سے ادبی حلقوں میں کافی ہلچل پیدا ہوئی تھی اور ادبی ہستیوں سے بھی ان کی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر وہ پاکستان آجاتیں تو کیا ویسی کامیابیاں اور شہرت حاصل کرلیتیں جیسی بھارت میں رہ کر ان کے حصے میں آئیں؟ وہاں ادبی حلقوں میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی پھر جب انہوں نے فلمی صنعت کا رخ کیا تو وہاں بھی انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ انہوں نے پیسہ بھی کمایا اور شہرت بھی حاصل کی۔ ایک قلم کار برصغیر میں جتنی کمائی کرتا ہے اور جس طرح زندگی بسر کرتا ہے وہ ہم سب جانتے ہیں۔ محض قلم کے ذریعے روزی حاصل کرنا اور باعزت زندگی گزارنا بہت مشکل کام ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی اور اب منیر نیازی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں پھر سعادت حسن منٹو کا احوال بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ اس زمانے میں پاکستان کی فلمی صنعت

مفلس و کنگال تھی مگر دوسرے شعبوں میں بھی منٹو کی کون سی قدر افزائی ہوئی۔ غالب کی طرح انہوں نے بھی اپنی ناقدریوں اور محرومیوں کا بارہا اپنی تحریروں میں شکوہ کیا ہے۔ غالب تو وضع دار آدمی تھے پھر ان کا زمانہ اور تھا۔ اولاد کے جھنجٹ سے بھی محفوظ تھے۔ سرکاری وظیفے اور چاہنے والوں کے سہارے دال روٹی چلا لیتے تھے مگر منٹو صاحب کے حالات یکسر مختلف تھے۔ انہوں نے بہتر وقت دیکھا تھا۔ ان کی قدر افزائی بھی ہوئی تھی۔ فراغت سے زندگی گزر رہی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد ان پر جو بیتی اب وہ ایک تاریخی ریکارڈ ہے۔ زمانے کی بے مہری اور تنگ دستی کے ہاتھوں ان کی زندگی جیتے جی جہنم بن گئی تھی۔ غم غلط کرنے کے لئے شراب کا سہارا لیا۔ اس نے ان سے بے وفائی تو نہیں کی مگر ان کی جان لے کر ہی ان کا پیچھا چھوڑا۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو عصمت چغتائی نے بمبئی میں بدرجہ بہتر زندگی گزاری تھی۔ فلموں سے انہیں معقول آمدنی ہوتی رہی۔ تحریروں سے بھی کچھ نہ کچھ ملتا رہتا تھا جو عزت اور آرام سے زندگی بسر کرنے کے لئے کافی تھا۔ حکومتی سطح پر بھی ان کو اعزازات سے نوازا گیا جس سے بے چارہ منٹو ہمیشہ محروم ہی رہا۔ بھارتی حکومت نے انہیں کئی ایوارڈ دیئے تھے جن میں مخدوم ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، اقبال سمان اور نہرو ایوارڈ شامل ہیں۔ گویا انہوں نے اپنے ہم عصر اور ہم قلم سعادت حسن منٹو کے مقابلے میں بہت پر آسائش اور پر سکون زندگی گزاری۔ اگر وہ پاکستان آجاتیں تو کیا ہوتا؟ یہ ایک بہت بڑا ''اگر'' ہے جس کا حتمی جواب نہیں دیا جا سکتا لیکن یہ تو طے ہے کہ معاشرہ ان کا ناک میں دم کر دیتا اور حکومت۔۔۔ حکومت ان کے پاس تک نہیں پھٹکتی۔ اعزاز تو کیا ملتا شاید جیل کی سزا مل جاتی۔ اس پر خیال آیا کہ آخر سعادت حسن منٹو کی ادبی خدمات کا ہمارے ملک میں حکومتی سطح پر کب اعتراف کیا جائے گا۔ کتنی حکومتیں اور کتنے ہی قسم قسم کے حکمراں آئے اور رخصت ہو گئے۔ ہر ایک نے بے شمار لوگوں کو نوازا۔ کچھ کو بر وقت اور کچھ کو وقت گزر جانے کے بعد۔ بعد از وفات ایوارڈز بھی دیئے گئے۔ تمغہ حسن کارکردگی تو اس قدر عام ہو گیا کہ ہما شما سب کی گردنوں پر لٹکا ہوا ہے مگر سعادت حسن منٹو جیسے عظیم، منفرد اور اپنے عہد کے نامور ترین افسانہ نگار کا کسی کو خیال تک نہ آیا۔ افتخار عارف صاحب ان دنوں ان امور کے مختار ہیں۔ خود بھی آزاد خیال اور کشادہ دل ہیں۔ کیا وہ سعادت حسن منٹو کو اس کی شان کے شایان اعزاز نہیں دلا سکتے؟ احمد فراز بھی اس کرسی پر متمکن رہے

ہیں۔ ترقی پسند اور باغیانہ مزاج اور اشعار کے حوالے سے بہت شہرت رکھتے ہیں مگر منٹو کا انہیں بھی خیال نہیں آیا۔ اس موقع پر محسن بھوپالی کا یہ شعر معمولی سی تبدیلی کے ساتھ بہت حد تک اس صورت حال پر صادق آتا ہے۔

نیرنگی سیاستِ دوراں تو دیکھئے

منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

اس شعر میں آپ ''سیاست'' کی جگہ ''ادب'' کا لفظ رکھ دیجئے۔ شعر منٹو صاحب کے حسب حال ہو جائے گا۔

دیکھئے۔ بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ داستانِ الف لیلہ جو ہوئی۔ بات سے بات اور کہانی سے کہانی تو ضرور نکلے گی۔

پہلے تو عصمت چغتائی کی ادبی کاوشوں کا ذکر ہو جائے۔ انہوں نے زمانہ طالب علمی ہی میں افسانے لکھنے شروع کر دیئے تھے اور آغاز ہی میں سب کو چونکا دیا تھا۔ موقر ادبی رسائل نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک قد آور ادبی شخصیت تسلیم کر لی گئیں۔ یقین کیجئے اس میں ان کی بے باک تحریروں کا اتنا زیادہ دخل نہیں ہے۔ وہ اس سے قطع نظر بھی بہت اچھی افسانہ نگار تھیں۔ انہیں فلم پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ اردو ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ خاندان میں ادبی و علمی ذوق کی بھی کمی نہ تھی۔ ان کے عام افسانہ نویس کی حیثیت سے بھی بہت سے مجموعے شائع ہوئے۔ ان کے ناولوں اور کہانیوں نے بھی خوب داد سمیٹی۔ ضدی، دل کی دنیا، دھانی بانکپن، چھوٹی موٹی، شیطان، ٹیڑھی لکیر، چوٹیں، ہم لوگ، دو ہاتھ، ایک بات، معصومہ، جنگلی کبوتر، تین اناڑی، عجب آدمی، ایک قطرہ خون ان میں نمایاں ہیں۔ انہوں نے خاکے بھی لکھے۔ اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر لکھا ہوا ان کا خاکہ ''دوزخی'' اور سعادت حسن منٹو کا خاکہ میرا دوست، میرا دشمن، مجاز اور بہت سے دیگر خاکے اردو ادب کا زیور بن گئے ہیں۔

انہوں نے اپنی بعض کہانیوں پر فلمیں بھی بنائیں۔ مثلاً فلم ''ضدی'' جب فلم کی شکل میں پیش کی گئی تو یہ ایک بہت خوبصورت اور معیاری فلم تھی جس میں ایک مخصوص ماحول کے علاوہ انوکھے کردار اکٹھے کر دیئے گئے تھے۔ اداکار دیو

آنند اور اداکارہ کامنی کوشل کی یہ پہلی فلم تھی۔اس سے پہلے کامنی کوشل نے دلیپ کمار کی ہیروئن کی حیثیت سے بہت شہرت (اور بدنامی بھی) حاصل کی تھی۔ ان دونوں کے عشق کی داستانیں اس زمانے میں بہت عام ہوئی تھیں۔

کامنی کوشل ایک شادی شدہ خاتون تھیں۔لاہور میں تعلیم حاصل کی تھی۔ریڈیو اور تھیٹر سے وابستہ رہی تھیں۔مسٹر سود ان کے بہنوئی تھے۔ان کے انتقال پر کامنی کوشل کی بہن نے دو بچے چھوڑے تھے۔کامنی کوشل نے ان بچوں کو ماں کا پیار دینے کی خاطر مسٹر سود سے شادی کرلی تھی۔یہ شادی بہت پائیدار ثابت ہوئی۔سود صاحب نے کامنی کوشل کی آزادی اور فلموں میں اداکاری پر کبھی پابندی نہیں لگائی مگر جب دلیپ کمار اور کامنی کوشل کے عشق کی داستانیں ہر زبان پر آگئیں تو کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کامنی کوشل سے صاف اور دوٹوک بات کی کہ تمہیں گھر اور دلیپ کمار میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔یہ گاڑی اس طرح نہیں چل سکتی۔کامنی کوشل نے بہن کے جن بچوں کی خاطر اتنی بڑی قربانی دی تھی وہ ان سے کس طرح دستبردار ہوسکتی تھیں۔لہٰذا انہوں نے دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے سے انکار کردیا۔اس بات کا بھی بہت چرچا ہوا۔فلم ”آرزو“ ان دونوں کی آخری فلم تھی۔عصمت چغتائی کی کہانی اور اسکرین پلے تھا۔ہدایت کار شاہد لطیف تھے۔نہ جانے یہ اتفاق تھا یا شعوری کوشش کہ ”آرزو“ کی کہانی اس وقت دلیپ کمار اور کامنی کوشل کے حالات زندگی کے عین مطابق تھی۔

بات ”ضدی“ کی ہو رہی تھی۔اس فلم کی بنیاد عصمت چغتائی کے ایک افسانے پر رکھی گئی تھی مگر جب یہ ایک مقبول اور مشہور فلم کی شکل میں سامنے آئی تو یہ اعتراض کیا گیا کہ یہ کہانی ایک ترکی ناول سے اخذ کی گئی ہے۔(غالباً اس کا نام ”ہماخانم“ تھا۔ٹھیک سے یاد نہیں رہا) حقیقت جو بھی رہی ہو لیکن عصمت چغتائی اور شاہد لطیف نے اس کہانی کو ایک خوبصورت اور موثر فلم کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔اس فلم کے موسیقار کھیم چند پرکاش تھے جو اپنی موسیقارانہ صلاحیتوں کے لئے مشہور تھے۔فلم میں گانوں کی سیچویشنز نہایت خوبصورتی سے نکالی گئی تھیں۔مختلف شعراء نے اس فلم کے لئے گیت لکھے تھے۔ معین احسن جذبی کی ایک غزل بھی اس میں شامل تھی جس کا مطلع یہ ہے۔

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں

جینے کی تمنا کون کرے

یہ دنیا ہو یا وہ دنیا

اب خواہش دنیا کون کرے

اس فلم میں جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے کہ سات گانے تھے اور سب کے سب سیچویشنز پر انگوٹھی میں نگینے کی طرح جگمگا رہے تھے۔ لتا منگیشکر، شمشاد بیگم اور کشور کمار کی آوازیں اور کھیم چندر پرکاش کی موسیقی سونے پر سہاگا تھی۔ دیو آنند نے اس فلم میں اپنی زندگی کی بہترین اداکاری کی تھی۔ کامنی کوشل نے بھی اپنا کردار خوب نبھایا تھا۔ نخشب جار چوی۔ راجہ مہدی علی خاں جیسے شعرا اس کے نغمہ نگار تھے۔ جب اتنے بہت سے فنکار یکجا ہو جائیں تو ایک شاہکار کیوں نہ تخلیق پائے؟ ''ضدی'' ہر اعتبار سے ایک مکمل اور خوبصورت فلم تھی۔ کہانی عصمت چغتائی کے برجستہ۔ سادہ اور دل میں چٹکی لینے والے مکالمے۔ شاہد لطیف کی ہدایت کاری، کھیم چندر پرکاش کی موسیقی اور دیو آنند۔ کامنی کوشل اور نواب کاشمیری کی اداکاری نے ''ضدی'' کو ایک ناقابل فراموش فلم بنا دیا تھا۔ یہ فلم 1948ء میں ریلیز ہوئی تھی اور سپر ہٹ فلم تھی۔ پاکستان میں بھی اس کی نمائش ہوئی تھی۔ یہ فلم بمبئی ٹاکیز نے بنائی تھی جس کے ڈائریکٹروں میں اس وقت اشوک کمار بھی شامل تھے۔ عصمت چغتائی کے ناول ''ضدی'' کی کہانی سن کر اشوک کمار نے فوراً فلمانے کا فیصلہ کر لیا۔ عصمت چغتائی کا بطور اسکرپٹ رائٹر اور شاہد لطیف کا بطور ہدایت کار انتخاب کیا گیا۔ اس فلم کا معاوضہ اس زمانے میں عصمت چغتائی کو دس ہزار روپے ملا تھا جو کہ وقت کے اعتبار سے بہت بڑی رقم تھی۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد عصمت چغتائی اور شاہد لطیف فلمی حلقوں میں مقبول و معتبر ہو گئے۔ اس ایک فلم ہی سے عصمت چغتائی نے اس زمانے میں جتنا معاوضہ حاصل کیا تھا شاید اس سے پہلے تمام ادبی تحریروں کے عوض اس کا عشرِ عشیر بھی انہیں نہ ملا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد ان کی ادبی سرگرمیاں کم ہو گئیں اور انہوں نے فلموں کو زیادہ وقت اور توجہ دینی شروع کر دی جو کہ ایک قدرتی بات تھی۔ اس طرح وہ بیک وقت ادبی اور فلمی تخلیق کے ذریعے اپنے ذوق کی تکمیل کر سکتی تھیں۔

عصمت چغتائی افسانہ نویس کی حیثیت سے تو سارے برصغیر میں جانی پہچانی جاتی تھیں مگر فلمی حلقوں میں ان کو صرف شاہد لطیف کے حوالے سے جانا جاتا تھا۔ وہ فلمی دنیا میں کیسے آئیں؟ یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔

فلم ساز، ہدایت کار اور اداکار نذیر صاحب ہندوستان کی فلمی صنعت کے مانے ہوئے فنکار تھے۔ فلم کے مذکورہ بالا تینوں شعبوں میں انہوں نے اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرکے اپنی دھاک بٹھادی تھی۔ فلم ساز، ہدایت کار اور اداکار کی حیثیت سے بھی وہ بہت ممتاز اور کامیاب حیثیت کے مالک تھے۔ بعد میں وہ پاکستان آگئے تھے اور سچ پوچھئے تو پاکستان میں فلمی صنعت کی بنیادیں رکھنے اور انہیں مضبوط کرنے میں نذیر صاحب کا نام نمایاں ہے۔ نذیر صاحب کا تذکرہ اور واقعات ہم تفصیل سے بیان کرچکے ہیں۔

عصمت چغتائی سے پہلی فلمی کہانی لکھوانے کا اعزاز نذیر صاحب ہی کو حاصل ہوا تھا۔ انہوں نے عصمت چغتائی سے ایک فلم کی کہانی لکھنے کی فرمائش کی۔ انہوں نے کچھ پس و پیش کے بعد ہامی بھرلی۔ دراصل اس زمانے میں بمبئی کی فلمی دنیا میں ہندوستان بھر کے ادیب اور شاعر اکٹھے ہوگئے تھے اور بہت کامیاب تھے۔ شہرت بھی کمارہے تھے اور دولت بھی۔ اعلیٰ پائے کے ادیبوں اور شاعروں کی شمولیت کے باعث فلموں کا معیار بھی بلند ہوگیا تھا۔ جوش ملیح آبادی، منٹو، کرشن چندر، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، راجندر سنگھ بیدی، تنویر نقوی، خواجہ احمد عباس، راجہ مہدی علی خاں، جاں نثار اختر جیسے ادیب اور شاعروں نے فلمی صنعت کی شان دوبالا کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ فلم میں انہیں دولت کے ساتھ شہرت بھی ملتی تھی، خوش حالی اور مالی آسودگی بھی۔ چنانچہ جب نذیر صاحب نے عصمت چغتائی سے کہانی لکھنے کی فرمائش کی تو یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ عصمت چغتائی کو بھی فلم کی قدر و قیمت کا علم تھا۔ خود ان کے شوہر فلمی کہانی نویس تھے۔ اس طرح عصمت چغتائی کو فلموں کی طرف راغب کرنے کا سہرا نذیر صاحب کے سر ہے۔ فلمی دنیا کی چمک دمک نے سبھی ادیبوں کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کردی تھی۔ عصمت چغتائی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔ انہوں نے اس موقع کو ہاتھ سے نہیں گنوایا اور فلمی زندگی کا آغاز کردیا۔

عصمت چغتائی اور نذیر صاحب کی پہلی فلم کامیڈی تھی۔ اس کا نام سن کر آپ ہنسنے لگیں گے۔ اس کا نام تھا

"(SWEET DIE) سوئٹ ڈائی عرف چھیڑ چھاڑ" تھا۔ کہیے۔ کیسا نام ہے؟ اس زمانے میں اس طرح کے نام رکھنے کا رواج تھا مگر تعجب یہ ہے کہ عصمت چغتائی جیسی روایت شکن مصنفہ اس نام پر کیونکر رضامند ہو گئیں؟

یہ فلم 1943ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اس کے گیت تنویر نقوی نے لکھے تھے جو اس زمانے میں بمبئی ہی میں تھے۔ اس کے فلم ساز تو خود نذیر صاحب تھے لیکن ہدایت کاری کے فرائض امر ناتھ نے سرانجام دیئے تھے۔ نذیر صاحب کے فلم ساز ادارے "ہند پکچرز" کی طرف سے یہ فلم بنائی گئی تھی۔ اس کے ہیرو نذیر صاحب تھے اور ہیروئن ستارہ تھیں۔ ستارہ غضب کی ڈانسر بھی تھیں اور اپنی بے باکی کے حوالے سے بدنامی کی حد تک مشہور تھیں۔ سنا ہے کہ اس زمانے میں ستارہ اور نذیر صاحب کے مراسم بھی تھے۔ اس کے دوسرے اداکاروں میں مشہور مزاحیہ اداکار گوپ، راج کماری اور مجید بھی شامل تھے۔ مجید صاحب بعد میں پاکستان آ گئے تھے۔ انہوں نے چند فلموں میں بھی کام کیا تھا پھر لاہور سے کراچی چلے گئے اور کچھ عرصے بعد انتقال کر گئے۔ بہت شریف، نیک اور شائستہ انسان تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں ساری زندگی فلمی دنیا میں گزار دینے والے لوگ بھی کتنے مہذب اور وضع دار ہوتے تھے۔

عصمت چغتائی کو اس فلم کی کہانی لکھنے کا معاوضہ تین ہزار روپے ملا تھا جو ان کے لئے بہت بڑی رقم تھی۔ ظاہر ہے کہ افسانہ نویسی کے ذریعے اس زمانے میں انہوں نے سالوں میں بھی تین ہزار نہیں کمائے ہوں گے۔ نذیر صاحب نے ایک ہزار روپیہ انہیں ایڈوانس کے طور پر دیا اور باقی رقم اسکرپٹ مکمل ہونے پر ادا کر دی۔ اس زمانے کے حساب سے تین ہزار روپے یوں بھی کافی معقول رقم تھی۔ جو عصمت چغتائی نے ایک دو مہینے میں کما لی۔ تب انہیں احساس ہوا کہ ادب کے مقابلے میں فلم کتنی فائدہ مند چیز ہے اور اسی لئے دوسرے بڑے بڑے نامور ادیب اور شاعر کشاں کشاں ادبی دنیا سے منہ موڑ کر فلمی دنیا کی راغب ہو رہے ہیں۔ ان کی پہلی فلم نے اوسط درجے کا بزنس کیا تھا۔ اس کو نہ تو سپر ہٹ کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی فلاپ۔ بہر حال ایک نئے فلمی مصنف کی حیثیت سے یہ ایک اچھا اور حوصلہ افزا آغاز تھا۔ اس زمانے میں گانوں کے ریکارڈ بنائے جاتے تھے اور ہر گیت کے ریکارڈ بھی نہیں بنتے تھے۔ فلم "چھیڑ چھاڑ" کے صرف ایک گانے کا ریکارڈ بنایا گیا۔ اس فلم کے کچھ گیت ایک فلمی شاعر رجن نے بھی لکھے تھے۔

اس فلم کی نمائش کے بعد عصمت چغتائی بچی کی ولادت کے باعث کچھ عرصے تک فلمی دنیا سے دور رہیں۔اس دوران میں یہ المیہ ہواکہ بمبئی ٹاکیز، نامور فلم سازادارہ اس کے مالک ہمنسورائے کی وفات کے باعث افراتفری کا شکار ہو گیا۔ ہمنسورائے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بے حد ذہین آدمی تھے۔مشہوراداکارہ دیویکارانی کے شوہر بھی تھے۔اس ادارے نے ہمیشہ تعلیم یافتہ لوگوں کی سرپرستی کی تھی اور ہر شعبے میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کا انتخاب کیا جاتا تھا۔بڑے بڑے نامور فنکاروں کو بمبئی ٹاکیز نے جنم دیااور شہرت سے مالامال کر دیا۔

اشوک کمارگنگولی کی مثال دیکھ لیجئے۔یہ سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لیبارٹری میں ملازم ہوئے تھے مگر ہمنسورائے اور ان کی فنکارہ بیگم نے ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگالیااور انہیں فلم کا ہیرو بنادیا۔اشوک کمار نہ صرف اس وقت کے بلکہ اس کے بعد کے زمانے کے بھی عظیم اداکاروں کی صف میں شمار کیے جاتے ہیں۔جنہیں لیجنڈ کا درجہ حاصل ہے۔اشوک کمار کی داستان مختصر طور پر پہلے بیان کی جاچکی ہے۔

بمبئی ٹاکیزوقتی طور پر بند ہو گیا تھااس لئے اس سے متعلق افراد بھی پریشانیوں کا شکار تھے۔اس زمانے میں سب لوگوں کو تنخواہوں پر ملازم رکھا جاتا تھا۔حالات کی وجہ سے شاہد لطیف کی نوکری بھی چلی گئی جس کی وجہ سے وہ بے حد پریشان تھے۔کوئی اور کام ملتا نہیں تھا۔ویسے بھی وہ ہر ایک فلم ساز کے پاس کام حاصل کرنے کی درخواست لے کر جانا کسر شان سمجھتے تھے۔

عصمت چغتائی کی پہلی فلم کامیڈی تھی جسے خاصی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔انہیں خیال آیاکہ کیوں نہ ایک کامیڈی فلم کی کہانی تیار کی جائے۔دونوں میاں بیوی تیار تھے۔عصمت چغتائی نے یہ آئیڈیا دیا کہ ان کے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی کہانیوں سے فلم کی کہانی اخذ کی جائے۔چنانچہ عظیم بیگ چغتائی کی تین مقبول کہانیوں کو یکجا کر کے ایک فلم کی کہانی عصمت چغتائی نے یہ کہانی مکمل کرنے کے بعد شاہد لطیف کو سنائی توانہیں بہت پسند آئی۔وہ فلمی صنعت کے لوگوں کو جانتے تھے۔پونا کے ایک فلم سازادارے کے مالک کوانہوں نے یہ کہانی سنائی توانہوں نے بھی بہت پسند کیا۔فلم کا نام ''شکایت'' تجویز کیا گیا تھااور یہ عظیم بیگ چغتائی کی تین انتہائی مزاحیہ کہانیوں کو ملاکر تیار کی گئی تھی

۔جب سیٹھ نے یہ کہانی سنی تو ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیااور اس فلم کو بنانے کا فیصلہ کر لیا۔اس طرح عصمت چغتائی کی دوسری فلم ''شکایت'' کا آغاز ہوا۔شاہد لطیف کو اس کی ہدایت کاری کے فرائض سونپے گئے۔انہوں نے اس سے پہلے صرف کہانیاں لکھی تھیں۔ہدایت کاری کا انہیں کوئی تجربہ نہیں تھا مگر خود اعتمادی کی بنا پر انہوں نے سیٹھ کی یہ پیش کش فوراً قبول کر لی۔اس طرح شاہد لطیف کی ہدایت کاری کا آغاز ہوا۔''شکایت'' ہدایت کار کی حیثیت سے ان کی پہلی اور مصنفہ کی حیثیت سے عصمت چغتائی کی دوسری فلم تھی۔

اس فلم کی بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کی گئی اور نامور فنکاروں کا انتخاب کیا گیا۔اس فلم میں ہیرو کے طور پر شیام کا انتخاب کیا گیا۔ان کے ساتھ نگار سلطانہ ہیروئن تھیں۔مزاحیہ اداکار آغا کے علاوہ معروف اداکارہ سنہا پربھا بھی اس کی کاسٹ میں شامل تھیں۔اس وقت کے دیگر اچھے معاون فنکار بھی اس میں اداکاری کر رہے تھے۔رشید عطرے صاحب نے اس کی موسیقی مرتب کی تھی۔رشید عطرے لاہور سے بمبئی گئے تھے اور ادیبوں اور شاعروں کی محفلوں میں شریک رہا کرتے تھے۔کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، نخشب جارچوی وغیرہ سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔یہی وجہ ہے کہ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرنے کے باوجود انہیں کہانی اور نغمات کا شعور تھا۔اس فلم کے نغمات نخشب جارچوی، جاں نثار اختر جیسے شاعروں نے لکھے تھے۔ اس وقت کے رواج کے مطابق دیگر شاعروں کے نغمات بھی اس میں شامل تھے۔ابھی یہ دستور نہیں ہوا تھا کہ ایک فلم کے تمام نغمات ایک ہی شاعر سے لکھوائے جائیں۔

عصمت چغتائی نے ہی اس فلم کے مکالمے بھی لکھے تھے مگر کئی مناظر میں عظیم بیگ چغتائی کے تحریر کردہ برجستہ مکالمے بھی شامل کر لئے تھے۔شاہد لطیف کی ہدایت کار کے طور پر یہ پہلی فلم تھی۔عصمت چغتائی کو بھی فلمی دنیا میں اپنا مقام بنانے کی خواہش تھی اس لئے دونوں میاں بیوی نے اس فلم کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے دل وجان سے محنت کی تھی مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

جب فلم ریلیز ہوئی تو ناکام ہو گئی۔یہ فلم 1948ء میں نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی۔فلم کی موسیقی اور نغمات اچھے تھے لیکن خالص کامیڈی شاید فلم بینوں کو پسند نہیں آئی۔وہ ڈرامے سے بھرپور فلمیں دیکھنے کے عادی تھے جس میں

رونادھونا بھی ہو اور المناک مناظر اور گانے بھی نظر آئیں۔ ہمیں یہ فلم دیکھنے کا اتفاق نہیں ہو سکا مگر رشید عطرے صاحب کا کہنا تھا کہ ایک اچھی فلم تھی مگر خالص مزاحیہ فلم ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ ہم نے ان کی اس بات پر بھروسہ کر لیا کیونکہ خود ہم بھی ایسے ہی تجربے سے گزر چکے تھے۔ہماری پہلی کہانی پر بنائی جانے والی فلم ''ٹھنڈی سڑک'' کا بھی یہی انجام ہوا تھا جو شروع سے آخر تک مزاحیہ تھی اور فلم دیکھنے والے ہنستے ہنستے کرسیوں سے نیچے گر جاتے تھے۔

ہمارے خیال میں یہ بہت بڑی کامیابی تھی مگر فلم کا پہلا شو ختم ہونے کے بعد پتا چلا کہ فلم کامیاب قرار نہیں پائی۔ہم صنوبر سینما کے سامنے بذات خود موجود تھے اور فلم دیکھ کر باہر نکلنے والوں سے فلم کے بارے میں ان کی رائے دریافت کر رہے تھے۔اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ کسی بھی فلم کے پہلے شو کے خاتمے پر باہر قطار میں کھڑے ہوئے تماشائی سینما کے اندر سے برآمد ہونے والوں سے فلم کے بارے میں ان کی رائے پوچھتے تھے۔اگر وہ تعریف کر دیں تو پھر ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے کھڑکی پر دھکم پیل شروع کر دیتے تھے لیکن اگر تعریف کی بجائے برائی کر دیں تو پھر قطار میں کھڑے ہوئے تماشائی دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جاتے تھے۔کم از کم لاہور میں تو یہی دستور تھا اور کسی حد تک آج بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

ہم نے ایک شخص سے پوچھا''کیوں بھئی۔ تمہیں فلم پسند کیوں نہیں آئی؟''

کہنے لگا'' بابو جی۔بس ہسا ہی ہسا ہے۔اشٹوری وشٹوری کچھ نہیں ہے۔''

ظاہر ہے کہ فلم ''شکایت'' میں بھی ہنسی مذاق ہی تھا۔کوئی دردناک کہانی اور المناک واقعات نہیں تھے اس لئے عصمت چغتائی، شاہد لطیف اور رشید عطرے کی کاوشوں کے باوجود یہ فلم کامیاب نہیں ہو سکی۔

''شکایت ''کی فلم بندی پونا میں ہوئی تھی۔یہ بھی ایک فلمی مرکز تھا۔ڈبلیو زیڈ احمد نے اپنا''شالیمار اسٹوڈیوز'' بھی پونا ہی میں بنایا تھا۔وہاں بمبئی کے فلم ساز بھی شوٹنگ کے لئے جایا کرتے تھے مگر پونا کو ایک ممتاز فلمی مرکز کی حیثیت

کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ان دنوں وہاں ایک فلم اکیڈمی بھی ہے جس سے فارغ التحصیل ہونے والے بھارتی فلمی صنعت کے مختلف شعبوں میں نمایاں ہیں۔ بمبئی والے، خصوصاً مرہٹی لوگ پونا کو پونے کہتے ہیں۔

''شکایت'' میں سبھی نغمات بہت اچھے تھے۔خاص طور پر جاں نثار اختر کے لکھے ہوئے یہ نغمے۔

اور کوئی رات بھر گاتا رہا

تیرا ملنا مجھ کو یاد آتا رہا

مرے لیے نہ مرے دل کی آرزو کے لئے

چلے بھی آؤ محبت کی آبرو کے لئے

اور نخشب کا تحریر کردہ نغمہ:۔

ان کی صورت جس نے دیکھی دیکھ کے گھبرا گیا

''شکایت ''کی تکمیل اور ناکامی کے بعد شاہد لطیف اور عصمت چغتائی بمبئی واپس آ گئے۔ ایک فلم کی ناکامی کا داغ لگ چکا تھا اس لئے فلم سازوں میں مانگ نہیں تھی۔ اس دوران میں بمبئی ٹاکیز کی باگ ڈور نئے لوگوں نے سنبھال لی تھی جن میں اشوک کمار بھی شامل تھے۔

اس بار عصمت چغتائی نے اپنے ناول ''ضدی'' کو فلم اسکرپٹ کی شکل میں ڈھالا اور شاہد لطیف نے اشوک کمار کو یہ کہانی سنائی تو انہیں بہت پسند آئی۔ ''ضدی ''کی تکمیل کا تذکرہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔اس فلم کے ہدایت کار بھی شاہد لطیف تھے۔ان کی پہلی اور عصمت چغتائی کی دوسری ناکامی کے بعد ''ضدی'' ایک سپر ہٹ ثابت ہوئی۔یہ فلم 1948ء میں نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی اور اس سال کی کامیاب ترین فلموں میں شامل تھی جسے نقادوں نے بھی

بہت سراہا تھا۔ فلمی دنیا میں کامیابی سے بڑھ کر اور کوئی کارنامہ نہیں ہوتا۔ فلم کامیاب ہو جائے تو اس سے وابستہ ہر شخص کامیاب ہو جاتا ہے اور فلم ساز اس کی تلاش میں سر گرداں ہو جاتے ہیں۔ یہی معاملہ ''ضدی'' کے بعد عصمت چغتائی اور شاہد لطیف کے ساتھ بھی پیش آیا۔ کھیم چندر پرکاش تو پہلے ہی صف اول کے موسیقار تھے۔ دیو آنند اور کامنی کوشل بھی مقبول فنکار تھے مگر اس فلم میں ان دونوں نے پہلی بار ایک ساتھ کام کیا تھا اور بہت اچھا کام کیا تھا۔ ان دونوں کی مانگ میں بھی مزید اضافہ ہو گیا۔

عصمت چغتائی کے لئے یہ فلم ایک خزانہ ثابت ہوئی۔ اسکرپٹ لکھنے کے لئے انہیں بیس ہزار روپے معاوضہ ملا تھا اور یہ بہت بڑی فلم تھی۔ ایک افسانہ نگار تو کسی ایک تخلیق کا اتنا معاوضہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر عصمت چغتائی صرف افسانہ نگاری ہی کرتیں اور ساری زندگی افسانے لکھتی رہتیں پھر بھی بیس ہزار مشکل ہی سے کماتیں۔ اس فلم نے ان کے لئے کامیابی اور آمدنی کی نئی راہیں کھول دی تھیں۔ اب وہ اور شاہد لطیف سکہ بند مصنف اور ہدایت کار تسلیم کیے جاتے تھے۔ فلم سازوں کی کمی نہیں تھی۔ ہر کوئی ان دونوں سے فلم بنوانے کا خواہش مند تھا۔

''ضدی'' کے بعد ان دونوں کی فلم ''آرزو'' کا آغاز کیا گیا اس فلم میں دلیپ کمار اور کامنی کوشل مرکزی کرداروں میں پیش کیے گئے تھے۔ اس وقت یہ فلمی جوڑی سب سے زیادہ مقبول تھی لیکن کسے معلوم تھا کہ ''آرزو'' ان دونوں کی رومانی آرزوؤں کی شکست ثابت ہو گی۔ دلیپ کمار اور کامنی کوشل کے عشق کی داستانیں عام ہو چکی تھی اور خبریں بھی گرم تھیں کہ کامنی کوشل کے شوہر مسٹر سود اور کامنی کوشل کے مابین کشیدگی پیدا ہو گئی ہے پھر واقفانِ راز یہ خبر لائے کہ آئندہ کامنی کوشل دلیپ کمار کے ساتھ کام نہیں کریں گی۔ ان خبروں نے بھی فلم بینوں میں ''آرزو'' دیکھنے کی آرزو کو دوچند کر دیا تھا۔

''آرزو'' کی کاسٹ میں ششی کلا، گوپ، رقاصہ ککو بھی شامل تھے۔ انل بسواس اس فلم کے موسیقار تھے۔ نغمات مجروح سلطان پوری اور پریم دھون نے لکھے تھے۔ یہ فلم 1950 ء میں نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی اور ہر اعتبار سے

ایک قابل دید اور یادگار فلم تھی۔ دلیپ کمار اور کامنی کوشل کی جدائی کی افواہوں نے اس کی کشش میں کچھ اور اضافہ کر دیا تھا پھر جان بوجھ کر یا انجانے میں عصمت چغتائی نے ایک ایسی کہانی تخلیق کی تھی جو ان دونوں فنکاروں کی حقیقی زندگی کی عکاس تھی۔ فلم کے رومانی اور المیہ مناظر میں دلیپ کمار اور کامنی کوشل نے اتنی اچھی اداکاری کی تھی کہ اس پر حقیقت کا گمان گزرتا تھا۔

"آرزو" اپنی موسیقی کے اعتبار سے بھی ایک ممتاز فلم تھی۔ یوں تو اس کے سبھی گانے ہٹ ہوئے تھے مگر مجروح سلطان پوری کا تحریر کردہ اور طلعت محمود کا گایا ہوا یہ ایک نغمہ گلی گلی گایا جاتا تھا۔ اس کے بول تھے۔

اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو

اپنا پرایا مہرباں نامہرباں کوئی نہ ہو

کچھ اور نغمات بھی بہت اچھے اور دل پر اثر کرنے والے تھے۔ مثلاً

کہاں تک تک ہم اٹھائیں غم جئیں بھی یا کہ مر جائیں

ارے ظالم زمانے تو بتا دے ہم کدھر جائیں

یہ گیت مجروح سلطان پوری نے لکھا تھا اور لتا کی آواز میں صدا بند کیا گیا تھا۔

انہیں ہم جو دل سے بھلانے لگے

وہ کچھ اور بھی یاد آنے لگے (مجروح سلطان پوری)

ایک سیچویشن پر دلیپ کمار، کامنی کوشل کو سنانے کے لئے بظاہر اس کی نند کے سامنے یہ گیت گاتے ہیں۔

اپنے پہلو میں سمجھتا تھا کہ دل رکھتی ہے تو

دل نہیں سینے میں ایک پتھر کی سل رکھتی ہے تو (شاعر۔ جاں نثار اختر)

ہمیں مار چلا یہ خیال یہ غم

نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے (مجروح سلطان پوری)

''آرزو'' کی کہانی کے بارے میں ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں۔ مختصراً یہ ایک رومانوی کہانی تھی۔ دلیپ کمار اور کامنی کوشل ایک گاؤں میں رہتے ہیں اور بچپن ہی سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں مگر دلیپ کوئی کام نہیں کرتے۔ جب کامنی کوشل کہتی ہے کہ شہر جا کر کام کرو تو وہ کہتے ہیں کہ تم سے جدا ہونے کی ہمت نہیں ہے۔ آخر ایک دن وہ بتاتی ہے کہ میرے رشتے آرہے ہیں۔ میں ہمیشہ تمہارے انتظار میں کنواری تو نہیں بیٹھی رہوں گی۔ اگر کماؤ گے نہیں تو میں کسی اور کی ہو جاؤں گی۔ غرضیکہ دلیپ کو بہت برا بھلا کہہ کر اور سمجھا بجھا کر شہر جانے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ دل پر پتھر رکھ کر جانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ ایک جھونپڑی میں رات گزارنے کے لئے رکتا ہے مگر پھر کٹیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ کٹیا میں آگ لگ جاتی ہے۔ صبح لوگ ایک جلی بھنی لاش دیکھتے ہیں تو اسے دلیپ کمار کی لاش سمجھتے ہیں۔ کامنی کوشل پر غم سے سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ کافی عرصے تک سوگواری کے عالم میں زندگی گزارتی ہے پھر مجبوراً اس کی شادی ایک زمیندار سے کر دی جاتی ہے جس کی حویلی میں وہ اور دلیپ کمار ایک بار گئے تھے اور کامنی اس کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئی تھی۔ دلیپ نے اس کو طعنہ دیا تھا کہ پھر ایسی ہی حویلی کے مالک سے شادی کر لے۔ اتفاق سے کامنی کی اسی زمیندار سے شادی ہو جاتی ہے۔ وہ بڑی عمر کا آدمی ہے لیکن بیوی سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کی ایک نوجوان بہن بھی ہے۔ کامنی زندہ تو ہے لیکن کھوئی کھوئی اور غمگیں رہتی ہے۔ جس کا سبب اس کا شوہر نہیں جان سکتا مگر اس کے لئے بہت پریشان رہتا ہے۔

ادھر دلیپ کمار شہر میں دن رات محنت کرتا ہے اور پیسے جمع کرتا ہے۔ وہ ایک معزز حیثیت بھی حاصل کر لیتا ہے۔ جب کافی رقم اکٹھی ہو جاتی ہے تو وہ خوشی خوشی گاؤں واپس آتا ہے جہاں اس کو کامنی کی شادی کا علم ہوتا ہے۔ اسے سخت

غصہ آتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ کامنی کوشل نے دولت کے لالچ میں زمیندار سے شادی کی ہے۔وہ اس کو بے وفا سمجھ کر اس سے نفرت کرنے لگتا ہے اور اس سے انتقام لینے کی تاک میں رہتا ہے۔

ایک روز اس کی ملاقات کامنی کوشل کے شوہر سے ہوتی ہے جو اس سے بہت متاثر ہوتا ہے اور اس کو اپنے گھر لا کر بیوی اور بہن سے تعارف کراتا ہے۔کامنی دلیپ کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔دلیپ بالکل انجان بن کر اس سے ملتا ہے۔کامنی کی نند دلیپ کمار کو پسند کرنے لگتی ہے۔اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس گھر میں اس کی آمدورفت ہو جاتی ہے۔اس کے بعد کے مناظر میں دلیپ کمار بظاہر کامنی کی نند سے محبت کی باتیں کرتا ہے لیکن در حقیقت کامنی سے مخاطب ہے۔وہ اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ ایک جوان شخص کا یوں ہمارے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ہمارے گھر میں ایک جوان لڑکی بھی ہے۔

شوہر کہتا ہے کہ مجھے یہ لڑکا بہت پسند ہے اور میری بہن بھی اسے پسند کرتی ہے۔کیا حرج ہے اگر ان دونوں کی شادی ہو جائے۔اس طرح دلیپ کو گھر میں آنے کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔کامنی کی نند سمجھتی ہے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ایک دن کامنی کوشل اس سے کہتی ہے کہ وہ تجھے دھوکا دے رہا ہے۔اس کی باتوں میں نہ آنا مگر نند کو یقین نہیں آتا۔

دلیپ کمار کامنی کوشل کو ذہنی اذیت پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہے اور ایک نفسیاتی مریضہ بن چکی ہے۔اس طرح یہ کہانی آگے بڑھتی ہے۔فلم کا انجام المناک ہے۔دلیپ کمار کو بعد میں اصلیت کا علم ہوتا ہے مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی ہے۔

’’آرزو ‘‘دیکھنے والوں پر ایک دیرپا تاثر چھوڑتی تھی۔جب ہم یہ فلم دیکھ کر سینما سے باہر نکلے تو کئی دن تک اسی کے حصار میں گرفتار رہے۔

عصمت چغتائی اور شاہد لطیف اب فلمی دنیا کے بڑے نام تھے۔انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے ذاتی فلم

سازادارہ ''فلم آرٹس'' قائم کرلیااوراس کے بینر تلے فلم ''بزدل'' بنانے کااعلان کردیا۔اس کی کہانی اور مکالمے عصمت چغتائی نے لکھے تھے۔ہدایت کار شاہد لطیف تھے۔نمی اور پریم ناتھ اس میں مرکزی رومانی کردار تھے مگر فلم کا سب سے اہم کردار کشور ساھو کو سونپا گیا تھااورانہوں نے یہ الجھاہوانفسیاتی کردار نہایت خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔یہ ایک زمیندار کا کردار تھاجوپریم ناتھ کا بڑابھائی تھااور بھائی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔وہ ایک نیک اور

انتہائی ہمدرد شخص مشہور تھاجس نے شادی نہیں کی تھی اور تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔

لیکن وہ پریم ناتھ اور نمی کے درمیان میں دیوار بن کر حائل ہوگیا۔اس کو نمی پسند آگئی تھی اور وہ اس کو حاصل کرناچاہتا تھا۔نمی اس کی مہربانیوں کو پہلے بڑے بھائی اور ایک دنیاترک کردینے والے انسان کی محبت سمجھتی رہی مگر کشور سادھو اس کی محبت میں سب کچھ بھول بیٹھااور نمی پر یہ ظاہر ہو گیا کہ اس کے ارادے کیاہیں۔چھوٹابھائی اس کو دیوتا کادرجہ دیتا تھا۔ دوسرے لوگ بھی اس کو دیوتاہی سمجھتے تھے مگر نمی کو معلوم ہوچکا تھاکہ دراصل وہ شیطان ہے جو کہ دیوتا کا روپ دھارے ہوئے ہے۔کشور ساھوپریم ناتھ اور نمی کے مابین فاصلے پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھاتاکہ اسے نمی کا قرب حاصل ہوسکے۔جب نمی نے تنگ آکر دبے لفظوں میں کچھ کہناچاہاتوپریم ناتھ نے اسے ڈانٹ دیااوراس سے ناراض ہوگیا کہ وہ ایک اوتاراور دیوتا کے بارے میں کس قدر پست خیالات رکھتی ہے۔

یہ ساری کہانی تین کرداروں کی کشمکش کی داستان ہے۔عصمت چغتائی نے ایک مشکل اور غیر روایتی کہانی کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا تھا۔کشور سادھو بذاتِ خود ایک ہدایت کاراور بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین انسان تھے۔انہوں نے فلموں میں اداکاری بھی کی تھی مگر بہت کم۔''بزدل'' کا کردارانہوں نےاس خوبی سے نبھایا تھاکہ اس پراصلیت کاگمان ہوتا تھااور یہ ان کی دہری شخصیت کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ جس شخص کو لوگ دیوتا سمجھ کر پوجتے ہیں وہ ایک لڑکی کی خاطر (جوکہ اس کے چھوٹے بھائی کی محبوبہ بھی تھی) ہوش و خرد سے بیگانہ ہوگیاہے مگراس نے اپنا ظاہری بھرم قائم رکھاہے۔ایک طرف تووہ پریم ناتھ کو نمی سے دور کرناچاہتا تھامگر دوسری طرف وہ چھوٹے بھائی سے بے پناہ پیار بھی کرتا تھااوراس کی معمولی تکلیف دیکھ کر بھی پریشان ہوجاتا تھا۔یہ ایک نفسیاتی کردار تھاجو کہ بھارتی

فلموں میں کبھی پیش نہیں کیا گیا تھا۔اس کے ساتھ انصاف کرنا بہت مشکل تھا مگر کشور ساھو، عصمت چغتائی اور شاہد لطیف نے اسے ایک سچ مچ کا جیتا جاگتا کردار بنادیا تھا۔

اس فلم کے موسیقار ایس ڈی برمن تھے۔ کیفی اعظمی اور شیلندر نے نغمات لکھے تھے جو کہ مشکل سیچوئیشنز کے عین مطابق تھے۔اس کے سبھی گانے ہٹ ہوئے تھے۔ یہ ایک انتہائی مشکل اور الجھا ہوا موضوع تھا۔

ہندوستانی اسکرین کے لئے یہ ایک انوکھا اور چونکا دینے والا تجربہ بھی تھا جس میں ایک شخص کی انسانی جبلت، خواہشات اور جذبات کو بہت عمدگی سے پیش کیا گیا تھا۔

ہم نے منٹو صاحب سے اس فلم کا تذکرہ کیا اور مختصراً کہانی بھی سنائی۔انہوں نے بھی اسے پسند کیا اور دیر تک اس قسم کے موضوعات کے بارے میں ان کہانیوں کا ذکر کرتے رہے جو وہ بنانا چاہتے تھے مگر انہیں پاکستان آنے کے بعد اس کا موقع نہیں ملا۔ وہ عصمت چغتائی کے معترف تھے حالانکہ وہ بہت کم ہی کسی اور کو خاطر میں لاتے تھے۔

''بزدل'' نے واقعی فلم بینوں کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔

عصمت چغتائی نے اگلی فلم کے لئے بھی ایک مختلف موضوع کا انتخاب کیا۔اس فلم کا نام ''شیشہ'' تھا۔نرگس کے ساتھ سجن نے اس میں مرکزی کردار کیا تھا۔ یہ ایک امیر زادی اور اس کے ملازم کے پیار کی کہانی تھی جسے عصمت چغتائی نے بہت سلیقے سے بنا سنوار کر پیش کیا تھا۔ عصمت چغتائی کی فلموں کے بارے میں ایک عجیب بات یہ تھی کہ انہوں نے افسانوں کے برعکس فلمی مکالموں میں بہت احتیاط برتی تھی اور بے باکی سے پرہیز کیا تھا۔

اس فلم کے نغمہ نگار شکیل بدایونی کے علاوہ مجروح سلطان پوری بھی تھے۔ایک اور شاعر نے بھی نغمات لکھے تھے جن کا نام یاد نہیں آرہا۔وہ زیادہ مشہور اور نمایاں شاعر نہیں تھے مگر وہ شریک فلم ساز بھی تھے۔اس فلم کے موسیقار غلام محمد اور ہدایت کار شاہد لطیف تھے۔ یہ فلم 1952ء میں نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی اور ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی تھی۔ عصمت چغتائی نے بہت اچھی سیچوئیشنز بنائی تھیں اور مکالمے تو ظاہر ہے کہ برجستہ، چست اور معنی خیز تھے۔

اس فلم کی موسیقی بھی بہت اچھی تھی۔ غلام محمد نے راگ راگنیوں میں گانوں کو ڈھالا تھا۔اس کے چند نغمے یہ تھے۔

جل جل کے مروں کچھ کہہ نہ سکوں

مجھ سا بھی کوئی ناکام نہ ہو(شاعر: شکیل بدایونی)

خوشی دل سے ہنسی ہونٹوں سے رخصت ہوتی جاتی ہے(عمرانصاری)

کسی کو بنانا کسی کو منانا

عجب ہے یہ دنیا عجب ہے زمانہ (مجروح سلطان پوری)

بے دردی نے درد مرا جانا نہیں

مرے دل نے جو کہا کبھی مانا نہیں

''شیشہ'' بھی ایک کامیاب اور مقبول فلم تھی۔

اگلی فلم ''فریب'' کی مصنفہ عصمت چغتائی تھیں مگر شاہد لطیف کے ساتھ مل کر انہوں نے ہدایت کاری میں بھی حصہ لیا تھا۔اس حیثیت سے یہ ان کی پہلی اور آخری فلم تھی۔اس فلم میں کشور کمار اور شکنتلا نے رومانی کردار ادا کیے تھے۔موسیقار انل بسواس تھے۔نغمات مجروح سلطان پوری نے لکھے تھے۔اس فلم میں بہت زیادہ گانے تھے مگر اتفاق سے اس کا میوزک ہٹ نہیں ہوا۔صرف دو تین گانے ہی مقبول ہوئے۔''فریب'' کو زیادہ کامیابی بھی حاصل نہیں ہوئی۔سچ تو یہ ہے کہ یہ فلم عصمت چغتائی اور شاہد لطیف کی پچھلی فلموں کے معیار کی نہیں تھی۔

ان کی اگلی فلم ''دروازہ'' تھی جس کی مصنفہ اور فلم ساز عصمت چغتائی تھیں۔شیکھر اور شیلا نے مرکزی کردار کیے تھے۔اس فلم کے موسیقار ناشاد تھے جو بعد میں پاکستان آ گئے تھے۔اس کے نغمات مجروح سلطان پوری اور خمار بارہ بنکوی نے لکھے تھے۔شاہد لطیف نے ہدایت کاری کی تھی۔اس فلم کی موسیقی بہت اچھی تھی۔ناشاد نے اس فلم میں ایک نئی گلوکارہ سمن کلیان پور کو متعارف کرایا تھا جنہوں نے بعد میں بہت زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ان کی

آواز لتا سے مشابہ تھی اس لئے کئی بار سننے والوں کو یہ خیال گزرتا تھا کہ لتا ہی گا رہی ہیں۔ یہ ایک کامیاب فلم تھی۔ اس کی موسیقی بھی پسند کی گئی تھی۔

چند نغمات یہ تھے۔

ایک دل ہے دو ہیں طلب گار بڑی مشکل ہے

کشمکش میں ہے میرا پیار بڑی مشکل ہے (خمار بارہ بنکوی)

آگ لگے اس ساون میں

چبھ گیا کانٹا من میں (مجروح سلطان پوری)

کوئی کس لئے میری محفل میں آئے

بجھی شمع ہوں میں کوئی کیوں نہ جلائے (مجروح سلطان پوری)

چلے ہم تو مبارک ہو زمانے کو بتا دینا

بس اپنی آرزو ہے تم ہمیں دل سے بھلا دیا (مجروح سلطان پوری)

ناشاد کو موسیقار کی حیثیت سے اس فلم سے بہت شہرت ملی تھی۔ سمن کلیان پور بھی اس کے بعد صف اول کی گلوکارہ بن گئی تھیں۔

1958ء میں عصمت چغتائی نے بطور فلم ساز اور مصنفہ ''لالہ رخ'' بنائی۔ اس کے ہدایت کار اطہر سراج تھے جو شاہد لطیف کے معاون رہ چکے تھے۔ طلعت محمود اس کے ہیرو اور شیلا ہیروئن تھیں۔ یہ ایک گھریلو فلم تھی۔ خیام نے اس فلم کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ محمد رفیع، طلعت محمود، آشا نے گلوکاری کی تھی۔ بد قسمتی سے یہ فلم فلاپ ہو گئی۔ جس سال ''لالہ رخ'' ریلیز ہوئی تھی اسی سال عصمت چغتائی کی ایک اور فلم ''سونے کی چڑیا'' بھی نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی۔ طلعت محمود اور نوتن اس کے مرکزی کردار تھے۔ عصمت چغتائی اس کی فلم ساز اور مصنفہ تھیں۔

اس کی ہدایت کاری کے فرائض شاہد لطیف نے ادا کیے تھے۔اوپی نیر اس کے موسیقار تھے۔یہ فلم کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔عصمت چغتائی نے ایک فلم ''سوسائٹی'' بھی بنائی تھی جس میں نمی اور ناصر خاں نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔شاہد لطیف اس کے ہدایت کار تھے۔یہ ایک معاشرتی فلم تھی اور کامیاب ہوئی تھی۔ایس ڈی برمن اس کے موسقار تھے نغمات ساحر لدھیانوی نے لکھے تھے۔''

سونے کی چڑیا'' کے بعد عصمت چغتائی اور شاہد لطیف فلمی صنعت سے دور ہو گئے تھے حالانکہ فلمیں تو ناکام اور کامیاب ہوتی رہتی ہیں۔عصمت چغتائی نے بھی فلموں کی کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ نہیں دی اور افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوگئیں۔شاہد لطیف کی مے نوشی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ان کی ذہنی صلاحیتیں متاثر ہوئی تھیں۔

1966ء میں فلم ساز وہدایت کار گورودت نے اپنی فلم ''بہاریں پھر بھی آئیں گی'' کی ہدایت کاری شاہد لطیف کے سپرد کردی۔دھرمیندر اور تنوجا نے اس میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔موسیقار اوپی نیر تھے۔

یہ فلم ناکام ہوئی جس نے شاہد لطیف کو ذہنی طور پر بہت متاثر کیا۔اس فلم کے دو تین گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔کیفی اعظمی اس کے نغمہ نگار تھے۔مے نوش تو وہ پہلے ہی تھے مگر غالباً عروج کے بعد زوال کا انہوں نے بہت زیادہ اثر لیا۔

کثرتِ شراب نوشی نے شاہد لطیف کے جسم کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ ناکامیوں نے ان کے ذہن کو اور زیادہ منتشر کر دیا۔ان کی شراب نوشی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا مگر اب اس کا کوئی علاج نہ تھا۔عصمت چغتائی بھی بے بس تھیں۔وہ ان صدمات سے جانبر نہ ہو سکے اور انتقال کر گئے۔

شاہد لطیف اور عصمت چغتائی کی مشترکہ کاوشوں نے کچھ بہت اچھی فلموں کو جنم دیا تھا۔کامیابیوں نے ان کے قدم چومے تھے۔شہرت بھی حاصل ہوئی تھی اور دولت بھی۔گویا مالی لحاظ سے وہ فکر مند نہ تھے۔شاہد لطیف کی موت نے عصمت چغتائی کو تنہا اور غم زدہ تو کر دیا تھا مگر انہوں نے حوصلہ نہ ہارا اور کاموں میں مصروف رہیں۔انہوں نے اس

کے بعد بچوں کے لئے چند دستاویزی فلمیں بھی بنائی تھیں جو کامیاب بھی ہوئی تھیں مگر عملی طور پر وہ فلمی دنیا سے بے تعلق ہو چکی تھیں۔

عرصہ دراز کے بعد انہوں نے ایک بار پھر فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ 1973ء میں انہوں نے فلم ''گرم ہوا'' کی کہانی اور مکالمے لکھے۔ اس فلم کی کہانی کا موضوع تقسیم ہند تھا۔ اسے بہت سے نقادوں نے ایک آرٹ فلم بھی قرار دیا تھا۔ موسیقی عزیز احمد خاں نے بنائی تھی اور نغمات کیفی اعظمی نے لکھے تھے۔

اس فلم کی تکمیل کے دوران میں بلکہ آغاز ہی میں ایک افسوس ناک صورت حال پیدا ہو گئی جب گانے لکھنے کے لئے یہ کہانی کیفی اعظمی کو سنائی گئی تو انہوں نے کہا کہ یہ کہانی تو میری ہے اس پر عصمت چغتائی کا نام کیسے دیا جا سکتا ہے۔ عصمت چغتائی کا دعویٰ تھا کہ یہ ان کی طبع زاد کہانی ہے۔ دو عظیم ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے مابین یہ تنازعہ حل ہونے کی بجائے بڑھتا ہی چلا گیا۔ کیفی اعظمی اور عصمت چغتائی کے ادب و شعر کے رشتوں کے علاوہ آپس میں گہرے تعلقات تھے۔ دونوں اردو ادب کی نامور شخصیات تھیں۔ اس کے باوجود یہ جھگڑا کوششوں کے باوجود حل نہ ہو سکا۔ دونوں نے اس کو اپنے وقار کا سوال بنا لیا تھا۔ فلم ساز اور ہدایت کار الگ پریشان تھے۔ بالآخر نوبت مقدمے تک پہنچ گئی اور یہ تنازعہ بمبئی ہائی کورٹ میں پہنچ گیا۔ عدالت نے دونوں فریقوں کے دلائل سنے۔ دونوں میں حقیقت اور سچائی تھی۔ عدالت کے لئے فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ عدالت کو ان دونوں کی عظمت اور ادبی مقام کا بھی احساس تھا۔ عدالت عالیہ نے کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ اس فلم کی کہانی پر عصمت چغتائی اور کیفی اعظمی دونوں کا نام دیا جائے۔ چنانچہ اس کی کہانی اور مکالموں پر ان دونوں کا نام دیا گیا۔ یہ صورتحال بمبئی بلکہ ساری بھارت کے ادبی اور فلمی حلقوں میں کافی عرصے تک موضوعِ بحث رہی۔ ہر ایک کو حیرت تھی کہ کیفی اعظمی اور عصمت چغتائی جیسے پرانے دوستوں اور وضع دار شخصیات کے مابین ایک معمولی بات پر بات اتنی بڑھ گئی کہ معاملہ ہائی کورٹ تک پہنچ گیا۔ یہ صورت حال دونوں میں سے کسی کے لئے بھی خوشگوار اور خوش آئند نہ تھی۔

''گرم ہوا'' ایک بہت کامیاب اور عمدہ آرٹ فلم تسلیم کی گئی تھی۔اس کے اداکاروں میں بلراج ساہنی، جلال آغا، اے کے ہینگل، گیتا، فاروق شیخ، شوکت کیفی(کیفی اعظمی کی بیگم) شامل تھے۔اس فلم میں اور بھی بہت سے اداکاروں نے مختلف کردار ادا کیے تھے کیونکہ اس کا موضوع ہی ایسا تھا کہ کہانی کا پھیلاؤ اور کینوس بہت وسیع تھا۔ہندو مسلم فسادات کے باعث کافی عرصے تک اسے سنسر کا اجازت نامہ نہیں مل سکا تھا مگر بالآخر اس کی نمائش ہوگئی اور اسے بہت سراہا گیا۔

اسی سال عصمت چغتائی کی لکھی ہوئی دوسری فلم ''برکھارت'' بھی ریلیز ہوئی تھی۔ عصمت چغتائی اس کی مصنفہ تھیں۔موسیقی لکشمی کانت پیارے لال نے بنائی تھی اور نغمات مجروح سلطان پوری نے لکھے تھے۔اس کے فلم ساز اور ہدایت کار امرناتھ تھے۔اداکاروں میں ریکھا، نوین نشچل مرکزی کردار تھے۔یہ فلم اوسط درجے کا بزنس کرسکی تھی۔اس کے بعد عصمت چغتائی نے کوئی فلمی کہانی تحریر نہیں کی۔غالباً فلمی صنعت سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا تھا لیکن انہوں نے کچھ دستاویزی فلمیں ضرور بنائی تھیں۔کچھ فلمیں بچوں کے موضوعات سے متعلق تھیں۔ انہوں نے مشہور شاعر اور ادیب علی سردار جعفری کی زندگی کے بارے میں بھی ایک دستاویزی فلم بنائی تھی۔اس کا نام غالباً ''میرے خواب'' تھا۔1975ء میں نمائش پذیر ہونے والی اس فلم کو ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا تھا اور سب کی خواہش تھی کہ اسی انداز کو جاری رکھتے ہوئے عصمت چغتائی دوسرے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بھی فلمیں بنائیں تو یہ نہ صرف اردو ادب کے لئے بلکہ فلم کے لئے بھی ایک قابل ذکر کارنامہ ہوگا۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ عصمت چغتائی نے ایک فلم میں اداکاری بھی کی تھی۔اس کا نام ''جنون'' تھا جو آرٹ فلموں کے معروف ہدایت کار شیام بینگل بنارہے تھے۔

اس فلم میں عصمت چغتائی کی اداکاری بجائے خود ایک کہانی ہے۔جس پر پھر لکھیں گے۔

بعض اوقات حقیقی زندگی میں بھی ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن پر افسانے یا فلمی کہانی کا گمان گزرتا ہے۔ہوسکتا

ہے خود آپ بھی ایسے واقعات وحادثات سے دوچار ہوتے ہوں یا آپ کے جاننے والے یا ارد گرد کے لوگوں کو ایسے تجربات حاصل ہوں۔افسانہ، کہانی،ڈراما، فلمی کہانی یہ سب داستان گوئی کی مختلف شکلیں ہیں لیکن اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی بنیاد بھی حقیقی واقعات اور کرداروں پر رکھی گئی ہے جن سے متاثر ہو کر افسانہ نویسوں نے افسانے لکھے اور ڈرامانویسوں نے کلاسیکی لازوال ڈراموں کو جنم دیا۔ڈرامے کی دنیا میں ولیم شیکسپئیر کا نام ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے زمانے کی زبان وبیان پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ان کے ڈراموں کے کردار زندہ جاوید ہیں۔ان میں آپ آج کے بے شمار لوگوں کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ شیکسپیئر کا ایک ایک فقرہ سونے میں تولنے کے قابل ہے اور ہر ایک فقرے کے پیچھے تلخ وشیریں اور ترش وحقیقی جذبات کا پرتو نظر آتا ہے۔خدا جانے بعض لوگ زندگی اور اتفاق کے بارے میں اور اس میں بسنے والے انسانوں کے احساسات وجذبات کے بارے میں اتنا کچھ کیسے جان جاتے ہیں ایک عام انسان کئی جنم لینے کے بعد بھی جن سے محروم رہتا ہے۔ شیکسپیئر اور غالب کو ایسے ہی انسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ان کے فکر رسا کی بلندی اور تخیل کی رسائی کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں میں گہرے مطالعے، مشاہدے اور گوناگوں تجربات بھی چمکتے نظر آتے ہیں۔آخر یہ کون لوگ تھے۔کہاں سے اتنے بہت سے انوکھے خیالات، واقعات، احساسات اور تجربات کو سمیٹ لائے تھے۔جن کا ذہن فطرت کے ہر پہلو کی تہ تک پہنچ کر بھی مسلسل سوالات کرتا رہتا ہے۔شاید اسی تلاش اور جستجو نے انہیں ان اوصاف سے مالامال کر دیا تھا۔یہ تو محض مثال کے طور پر دو نام ہیں۔ہر زبان کے ادب میں اور خود اردو ادب میں ایسے بے شمار نام موجود ہیں اگرچہ درجہ بہ درجہ ان کا نام لیا جا سکتا ہے۔

تذکرہ کہانی اور حقیقت کا تھا اور بات کہاں پہنچ گئی اور مرزا غالب کا ذکر پھر نوک زباں پر آ گیا۔غالب نے کہا تھا۔

بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

مگر خود غالب خستہ کے ذکر کے بغیر بھی بات نہیں بنتی۔آیئے ایک کہانی سنئے۔

قیام پاکستان سے قبل ایک متوسط خاندان لدھیانہ سے نقل مکانی کر کے دہلی میں جا کر آباد ہو گیا۔ لکھنؤ کے خاندانی جاگیر دار سے اس گھرانے کی ایک لڑکی کا آمنا سامنا ہو گیا اور شادی ہو گئی۔ قیام پاکستان کے موقع پر فسادات شروع ہوئے تو شوہر لکھنؤ میں تھے۔ بیوی بچے دہلی میں لاکھوں دوسرے مسلمانوں کی طرح جانیں بچا کر گھروں سے بھاگے اور ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی۔ اس مقبرے کے آس پاس مہاجر کیمپ میں ہزاروں لاکھوں ایسے ہی بے سروسامان بچے کھچے مسلمان خاندان پناہ گزین تھے۔ کچھ خوش قسمت خاندان کے تمام افراد بچ گئے تھے۔ بعض خاندانوں کے کئی افراد قتل و غارت کی نذر ہو گئے تھے۔

دہلی میں ہمایوں کے مقبرے سے جس مسلمان مہاجر خاندان کو موقع ملتا وہ پاکستان کی راہ لیتا تھا۔ متذکرہ خاندان نے بھی ہمایوں کے مقبرے کا کیمپ چھوڑا اور پاکستان کا رخ کیا۔ یہاں وہ کراچی میں آباد ہو گئے۔ لڑ بھڑ کر آئے تھے۔ ضروریات زندگی کا پورا سامان تک پاس نہ تھا۔ ایک عورت اس کے چھوٹے چھوٹے بچے جیسے تیسے زندگی کے دن گزارتے رہے۔ اس خاندان کی ایک موہنی صورت کی نازک اندام سرو قد بچی کو رقص کا شوق تھا۔ اسنے چھ سال کی عمر سے رقص کی تربیت حاصل کی۔ خوش قسمتی سے استاد بھی اچھے مل گئے۔ اس طرح اس نے رقص کے میدان میں قدم رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔ خاندان کی کفالت کا بوجھ اس کمسن بچی کے ناتواں کاندھوں پر پڑ گیا تھا مگر اپنی لگن، محنت اور ہنر مندی کے باعث اس نے اپنے خاندان کی کفالت کے فرائض سر انجام دیئے۔ وہ محفلوں میں اسٹیج پر اور بعد میں فلموں میں بھی رقص کرنے لگی۔ نام بھی کمایا اور پیسہ بھی۔

ادھر اس کے والد جب لکھنؤ سے اپنے خاندان کی تلاش میں دہلی پہنچے تو وہاں کچھ بھی نہ پایا۔ بہت تلاش کیا آخر ناامید ہر کر صبر کر لیا کہ جہاں بے شمار ہزاروں خاندان ہلاک ہو گئے ہیں شاید ان کے بیوی بچے بھی اسی کی زد میں آ کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

یہ لڑکی جب پاکستان آئی تو پانچ چھ سال کی تھی یا شاید اس سے بھی کم عمر۔ فلمی دنیا میں اپنا نام اور مقام پیدا کرنے کے بعد وہ بمبئی گئی اور وہاں ممتاز فلمی اداکاروں سے ملاقات ہوئی جب تعلقات مزید استوار ہوئے تو اس نے بمبئی کے فلمی

دوستوں سے اپنے بچھڑے ہوئے والد کا ذکر کیا اور ان کو تلاش کرنے اور ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ بمبئی کے بارسوخ اور بااثر فلمی اداکاروں کی مدد سے بالآخر وہ اپنے والد کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس وقت انہیں بچھڑے ہوئے پچیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ پانچ سالہ بچی اب تیس سال کی ہو چکی تھی۔ اس ملاقات کا احوال خود اس کی زبانی سنئے۔ ''میرے والد دوسری شادی کر چکے تھے۔ جب میں ان سے ملنے ان کی جاگیر پر گئی اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو دو آدمی ایک باریش، کمزور اور ناتواں ضعیف بزرگ کو سہارا دے کر مجھ سے ملوانے لائے۔ ایک گھنٹے کی اس ملاقات میں میں اتنا روئی جتنا زندگی بھر نہیں روئی تھی۔

میں نے ان سے کہا ''آج مجھے میری شناخت مل گئی ہے۔''

میں نے ایک گھنٹے بعد ان کے کانپتے ہوئے ہاتھ پکڑے اور لوٹنے کا قصد کیا۔ میرے چھ سات سوتیلے بھائی یوں تو بہت خلوص سے ملے مگر یہ سمجھے کہ شاید میں جائیداد میں حصہ مانگنے آئی ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں صرف اپنے باپ کو ایک نظر دیکھنے آئی تھی تاکہ مجھے میری شناخت مل جائے میں دوبارہ یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔ میں اس کے بعد دوبارہ وہاں کبھی نہیں گئی۔''

یہ کہانی پاکستانی فلمی صنعت کی معروف رقاصہ واداکارہ پنّا کی ہے۔ ان کا اصلی نام زرّیں ہے۔ پیار سے گھر والے پنّا کہتے تھے۔ پنّا ایک قیمتی پتھر بھی ہے۔ کسے معلوم تھا کہ یہ بچی ایک روز قیمتی جواہر کی طرح فلمی افق پر جگمگائے گی۔ پنّا نے فلمی دنیا میں اور اس سے پہلے پنّا کے نام سے اسٹیج پر کام کیا۔ کراچی میں اور سندھ کے مختلف شہروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر کے شہرت حاصل کی اور ان کا نام ایک رقاصہ کے طور پر جانا پہچانا گیا۔ یہاں تک کہ فلمی دنیا تک ان کی رسائی ہو گئی۔

پنّا کو یہ مراحل طے کرنے میں جن کٹھن حالات اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ پانچ برس کی عمر میں انہوں نے رقص کی باقاعدہ تربیت حاصل کرنی شروع کی تھی۔ اس ہنر میں کچھ حاصل کرنے کے لیے بہت

پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں جو کہ پنّا نے بھی بیلے بلکہ اپنی عمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ پاپڑ بیلے۔ابھی وہ گیارہ برس کی تھیں جب انہیں بیس پچیس افراد کے کنبے کی کفالت کی ذمے داریاں نبھانی پڑیں۔ان کا بچپن اور نوعمری کا زمانہ اس جدوجہد کی نظر ہو گیا۔

وہ اکثر تلخ لیکن تفخر آمیز لہجے میں کہا کرتی ہیں ''میں کبھی بچی نہیں رہی، کبھی گڑیوں سے نہیں کھیلی، کبھی گڈے گڑیوں کی شادی نہیں کی۔ کبھی ہم عمر بچیوں کے ساتھ نہیں کھیلی اسی لیے اس زمانے میں کوئی ہم جولی نہیں تھی۔''

لیکن پنّا کے ذکر کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے ایک اور ایسے واقعے کا تذکرہ کرنا بر محل ہو گا جس پر افسانے کا گمان گزرتا ہے۔پنّا تو اپنے والد سے بچھڑ گئی تھیں مگر اداکارہ دیبا اپنی والدہ سے جیتے جی محروم ہو گئی تھیں۔وہ اپنی پھوپھی اور پھوپھا کے ساتھ مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان آئیں تو انہیں اپنی والدہ کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ایک زمانہ گزر گیا۔وہ کراچی میں اپنی پھوپھی اور پھوپھا کے پاس پرورش پاتی رہیں مگر انہیں علم ہو چکا تھا کہ ان کی والدہ بقیہ حیات ہیں اور مشرقی پاکستان میں کسی جگہ ہیں۔والد کے سائے سے وہ محروم ہو چکی تھیں۔اب ان کی آرزو تھی کہ کسی طرح اپنی والدہ سے ملاقات کریں۔

یہ موقع انہیں عرصہ دراز کے بعد اس وقت میسر آیا جب وہ فلم ساز و اداکار رحمٰن کی فلم میں کام کرنے کے لیے ڈھاکا گئیں۔اس وقت وہ ایک معروف فلمی ہیروئن بن چکی تھیں۔ڈھاکا پہنچتے ہی انہوں نے اپنی کھوئی ہوئی والدہ کی تلاش اور جستجو کا آغاز کر دیا۔فلمی دنیا کے لوگوں نے ان سے تعاون کیا۔یہاں تک کہ وہ اپنی والدہ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ڈھاکا میں ماں بیٹی کی طویل عرصے کے بعد ملاقات ہوئی تو دونوں گھنٹوں گلے مل کر روتی رہیں۔ دونوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔بعد میں دیبا نے اپنی والدہ کو لاہور بھی بلایا اور اپنے سوتیلے بہن بھائی کی بھی پذیرائی کی یہ بھی ایک فلمی کہانی ہی لگتی ہے۔

اس قسم کے واقعات پاکستان کی فلمی دنیا میں اور بھی ہیں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ یہ افسانہ نما سچی کہانیاں فلمی

ہیر وئنوں ہی سے وابستہ ہیں۔

اداکارہ ممتاز نے ہیر وئن کی حیثیت سے بہت شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ عرصہ دراز کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ ان کے حقیقی والد انگلستان میں ہیں۔ ممتاز کے والد نے بیٹی کو اپنے پاس بلا کر رکھا اور انہیں بہت کچھ دیا۔ ایک اور ممتاز ہیر وئن انجمن کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ جب انہیں کافی عرصے کے بعد اپنے گمشدہ والد کا پتا ملا تو ملتان کے ایک بہت بڑے جاگیر دار تھے۔ اس قسم کی کہانیاں چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔

بہت سے کرداروں کا ہمیں علم ہو جاتا ہے مگر بے شمار داستانیں عام ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ چند فلمی ہیر وئنوں کی

داستانیں مختصر سنائی جاچکی ہیں۔ ہماری فلمی دنیا میں ایسے اور بھی بہت سے ڈرامائی واقعات موجود ہیں لیکن ان کے بہت سے کردار ان واقعات کو منظر عام پر لانے کے حق میں نہیں ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ فلمی کہانیوں میں کام کرنے اور فلم سازی کرنے والی بہت سی ہستیاں بذات خود کسی فلمی کردار سے کم نہیں ہیں۔

لیجئے۔ اب پنّا کی کہانی سنئے۔ پنّا کا اصلی نام زریں ہے گھریلو پیار کا نام پنّا ہے۔ اسی نام سے وہ رقاصہ کی حیثیت سے بھی معروف ہوئیں۔ ہدایت کار، فلم ساز ایس سلیمان کے ساتھ شادی کرنے کے بعد انہوں نے زمانہ عروج میں فلمی صنعت سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اب وہ زریں سلیمان تھیں۔ گویا جہاں سے انہوں نے سفر شروع کیا تھا دوبارہ وہیں پہنچ گئیں۔

رقص کی باقاعدہ تربیت انہوں نے استاد غلام حسین پٹیالے والے سے حاصل کی۔ استاد غلام حسین نواب آف جونا گڑھ کے خاندان کو بھی رقص سکھایا کرتے تھے۔ وہ گیارہ برس کی تھیں جب ایک اشتہاری مہم کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا۔ دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسی اشتہاری مہم کے لیے شمیم آرا بھی منتخب کی گئی تھیں۔ اس کام کا معاوضہ پنّا کو ایک سو روپے ملا تھا جو کہ بقول ان کے اس زمانے کے اعتبار سے معقول تھا کیونکہ اس وقت سونا اسی روپے تولہ تھا۔

یوں پنّا کو ایک بڑے گھرانے کی کفالت کی ذمے داریاں سونپ دی گئیں جن کو انہوں نے بہ خوبی نبھایا۔ انہوں نے اسٹیج پر بھی کام کیا۔ کلاسیکی رقص کے علاوہ انہوں نے سندھ کا کلاسیکی رقص بھی سیکھا اور سندھ میں وہ اس رقص کا مظاہرہ کرکے داد و تحسین حاصل کیا کرتی تھیں۔ اس طرح انہوں نے بتدریج رقاصہ کی حیثیت سے ایک مقام بنالیا۔ کراچی کے مختلف ہوٹلوں میں اس زمانے میں رقص پیش کیا جاتا تھا۔ اس دور میں ان محفلوں کی نمایاں ہستیاں دو ہی تھیں۔ ایک پنّا اور دوسری ایمی مینوالا۔ ایمی کا تعلق ایک معزز پارسی گھرانے سے تھا۔ ہوٹل میٹروپول کے مالک ان کے انکل تھے اور وہ اسی ہوٹل میں رقص کا مظاہرہ بھی کرتی تھیں۔ ایمی نے بھی بعد میں فلمی دنیا میں رقاصہ

کی حیثیت سے بہت کامیابی اور شہرت حاصل کی تھی۔ ہدایت کار و فلم ساز حسن طارق سے شادی کرنے کے بعد وہ فلمی دنیا سے ایسی کنارہ کش ہوئیں کہ پھر کسی فلمی تقریب میں بھی ان کی جھلک نظر نہ آئی۔

پنّا اور ایمی مینوالا کی داستان اس سے پہلے تفصیل سے بیان کی جاچکی ہے۔ دیکھا جائے تو ان دونوں میں بہت سی باتیں، خوبیاں اور مسائل مشترک ہیں۔

مثلاً دونوں نے کراچی میں رقص کی تربیت حاصل کی اور پھر رقص کے حوالے سے بہت نام پیدا کیا۔ دونوں نے

رقص کی باقاعدہ تربیت حاصل کی۔ رقاصاؤں کی حیثیت سے دونوں نے بہت نام پیدا کیا۔ غیر ملکی سربراہوں کے سامنے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور پاکستان کی مختلف بیرونی ممالک میں نمائندگی کی۔ پی آئی اے نے اس زمانے میں ایک ثقافتی طائفہ تربیت دیا تھا جن کے ناظم غالباً ضیاء محی الدین تھے۔ اس ادارے کے زیر اہتمام بہت سے ممالک میں ثقافتی مظاہرے کیے گئے۔ ناہید صدیقی بھی اس ادارے سے وابستہ رہ چکی ہیں جو بعد میں ضیاء محی الدین کی بیگم بن گئی تھیں۔ کافی عرصہ قبل ان دونوں کی بھی طلاق ہوچکی ہے۔

پنّا اور ایمی مینوالا دونوں نے فلمی دنیا سے وابستگی اختیار کی اور رقص کے حوالے سے بہت نام اور اونچا مقام حاصل کیا۔ ان دونوں نے اپنے عہد کے معروف ہدایت کاروں سے شادی کی اور شادی کے بعد عہد عروج ہی میں فلمی دنیا سے

علیحدگی اختیار کرلی۔ان دونوں کی ازدواجی زندگی مثالی کہی جاسکتی ہے۔ ہمارے نہ صرف پنّا اور ایمی سے بلکہ حسن طارق اور ایس سلیمان سے بھی قریبی تعلقات رہ چکے ہیں۔شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی ان دونوں گھروں میں ہمارا آنا جانا اور گھریلو معاملات میں مشورے دینے کا سلسلہ بھی جاری رہا ان دونوں نے بڑے خلوص اور ایثار کا مظاہرہ کیا اور گھریلو زندگی میں اس طرح خود کو ضم کردیا کہ ہم غیر فلمی بیگمات کو ان کی مثالیں دیا کرتے تھے۔دونوں ہی کے ازدواجی تعلقات ایک زمانے میں تلخیوں اور مشکلات سے دوچار ہوئے یہاں تک کہ طلاق کی نوبت آگئی۔

ایمی مینوالا نے طلاق کے بعد بھی فلمی زندگی سے رشتہ نہیں جوڑا۔وہ فلم والوں کے لیے ایک گمشدہ ہستی بن کر رہ گئی تھیں یہاں تک کہ ایک بار پھر وہ حسن طارق کی بیگم بن گئیں۔

پنّا نے طلاق کے بعد بہت سے کام کیے۔بیوٹی پارلر کھولا۔ڈیزائننگ کی۔رقص کی اکیڈمی قائم کرنے کے منصوبے بنائے لیکن فلموں سے وہ دور ہی رہیں۔ایمی اور طارق صاحب تو دوبارہ یکجا ہوگئے تھے۔اس بار ان کی زندگی انتہائی پرسکون اور خوش و خرم تھی۔طارق صاحب دل کے عارضے میں مبتلا تھے۔انہوں نے کچھ عرصہ بعد پھر ہدایت کاری شروع کردی تھی لیکن سجاد گل کی فلم ''سنگ دل'' کے سوا کسی اور فلم ساز نے انہیں زحمت دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔وہ ایک ناکام ہدایت کار قرار دیئے جاتے تھے۔مالی حالات بھی دگرگوں تھے۔گلبرگ میں کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے مگر غالباً پہلی بار حقیقی گھریلو زندگی اور مسرتوں سے آگاہ ہوئے تھے۔اپنی بیٹی کوکی اور بیوی ایمی کے ساتھ وہ انتہائی مطمئن اور خوش تھے۔سنگدل ریلیز ہوئی اور سپر ہٹ ہوگئی۔فلم سازوں کی دوبارہ قطاریں لگ گئیں۔طارق صاحب کی صحت بھی بہت بہتر ہوگئی تھی۔ وہ کئی فلم سازوں کے لیے فلم بنانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ہمارے ساتھ ایک ذاتی فلم بنانے کا بھی ارادہ تھا لیکن اچانک دل کا دورہ پڑا اور سب کچھ چھوڑ کر رخصت ہوگئے ایمی اور ان کی بیٹی ایک بار پھر خوشیوں سے محروم ہوگئیں۔بہر حال یہ ایک علیحدہ کہانی ہے جو پہلے سنائی جاچکی ہے۔

زریں سلیمان کو شادی کے بعد ہم نے ہمیشہ بھابی کہا۔دونوں میں علیحدگی کے بعد بھی عادتاً کئی بار انہیں بھابی کہہ دیا۔

جیسے میڈم نور جہاں اور اعجاز درّانی کی علیحدگی کے بعد ہم بعض اوقات میڈم کو بھابھی کہہ دیا کرتے تھے اور وہ مسکرا کر خاموش رہتی تھیں لیکن شادی کے بعد بھی زرین نے اپنا یہ پرانا نام ترک نہیں کیا۔

زریں (پنّا) کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے ایک ایرانی اور ایک اطالوی فلم میں بھی رقص کیا ہے۔ اطالوی فلم کے مصنف اشفاق احمد تھے۔ اس میں زریں نے دیوداسی کا کردار ادا کیا تھا اور اس حوالے سے کلاسیکی رقص پیش کیا تھا۔ اس رقص میں ان کی ہمراہی کے لیے دو ہزار لڑکیاں بھی تھیں۔

زریں نے سلیمان کے ساتھ پہلی بار فلم باجی میں کام کیا تھا جسے پاکستان میں ایک یادگار کلاسیکی فلم کی حیثیت حاصل ہے۔ اس فلم میں زریں کے ساتھ ایمی منیوالا نے بھی رقص کیا تھا۔ استاد اللہ رکھا نے اس فلم میں ان دونوں سے کتھک ڈانس کرایا تھا اور اس کو فلمانے سے پہلے طویل عرصہ ریہرسل کرائی تھی۔ زریں کا کہنا ہے کہ ریہرسلز کے دوران میں ان کے اور ایمی منیوالا کے پیروں سے خون نکلنے لگتا تھا مگر فن کی لگن میں ان دونوں نے اس کی پروا نہیں کی۔
''باجی'' کو زرّیں بھی ایک یادگار فلم قرار دیتی ہیں۔ جب وہ پنّا تھیں اور ابھی فلموں میں نہیں آئی تھیں تو انہیں فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق بلکہ ارمان تھا۔ فلم اس زمانے میں ایک باعزت اور باتوقیر میڈیم سمجھی جاتی

تھی اور فلموں سے وابستگی کسی اعزاز سے کم نہ تھی۔

سب سے پہلے فلم کے لیے فلم ساز و ہدایت کار ہمایوں مرزا نے کراچی میں پنّا کا ٹیسٹ لیا اور انہیں فیل کر دیا ان کے خیال میں وہ فلموں میں کام کرنے کے لائق نہیں تھیں۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ اس کے تین سال بعد ۱۹۵۹ء میں ہمایوں مرزا ہی نے انہیں اپنی فلم کے لیے سائن کر لیا۔ اس فلم میں رقص پیش کرنے کا انہیں پانچ سو روپے معاوضہ دیا گیا تھا مگر پنّا کو پیسوں کی پرواہ نہ تھی کیونکہ رقاصہ کی حیثیت سے وہ بہت نامور تھیں اور خوب پیسے کما رہی تھیں اس لیے فلم میں کام کرنے کے لیے وہ کم معاوضہ بھی قبول کرنے پر آمادہ تھیں۔

ایس سلیمان کے ساتھ زریں کی شادی محبت کی شادی ہے۔ پہلے وہ سلیمان کی ہدایت کاری سے متاثر ہوئیں جو رقص کو

فلمانے میں ماہر ہیں پھر وہ ان کی دلکش اور بے تکلف شخصیت سے متاثر ہو گئیں۔ یہ محبت ہمارے خیال میں بڑھ کر عشق کے درجے تک پہنچ گئی۔ زریں بھابی کو سلیمان سے عشق تھا۔ محبت کا یہ جذبہ دوطرفہ تھا۔ سلیمان نے بھی ان سے شادی کی خاطر خاندان کی مخالفت کا سامنا کیا اور انہیں اپنالیا۔ ۱۹۶۳ء میں ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ آغا طالش نے زریں کو منہ بولی بیٹی بنایا تھا اور وہ آخر دم تک اس رشتے کو نبھاتے رہے۔ اس شادی میں بھی نیّر سلطانہ کے علاوہ آغا طالش کا بہت نمایاں حصہ تھا۔

محبت کی شادی ایک سرشار کرنے والی شادی ہوتی ہے۔ ایس سلیمان اس وقت تک بڑے ہدایت کار نہیں بنے تھے۔ مالی حالات کافی دگرگوں تھے۔ گھر والوں کی مخالفت کے پیش نظر انہوں نے علیحدہ ایک معمولی سا گھر لے کر رہنے کا فیصلہ کیا۔ وہ گھر ہم نے بھی دیکھا ہے۔ ہم نے کراچی میں پنّا کا دور عروج بھی دیکھا ہے۔ اس آسائش کو چھوڑ کر ایک معمولی کوارٹر نما مکان میں زندگی بسر کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے لیکن سلیمان اور زریں دونوں نے ہنسی خوشی یہ آزمائشی دور گزارا۔ ہم نے انہیں ہمیشہ ہنستے مسکراتے ہی دیکھا۔ سلیمان کی فقرے بازی اور لطیفے اور زریں بھابی کی حاضر جوابی اور مسکراہٹ۔ وہ بھی خوب دن تھے۔ حالات کے ساتھ ساتھ اور غیر سنجیدگی کے باعث یہ اپنا ذاتی گھر نہیں بنا سکے حالانکہ ''اپنا گھر'' بنانا ہر عورت کی طرح زریں بھابھی کی حسرت رہی ہے مگر سلیمان نے ہمیشہ اس بات کو ہنسی میں اُڑا دیا۔ کئی بار ہم نے زرین بھابھی کی وکالت کی۔ لبنیٰ نے بھی دلائل دیے مگر سلیمان نے ہنسنے مسکرانے اور سر ہلانے کے سوا کچھ نہیں کیا حالانکہ وہ مالی اعتبار سے اور اپنے وسائل کے لحاظ سے ایک چھوڑ کئی گھر بنا سکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بچے بڑے ہو گئے۔ بیاہے گئے۔ صاحب اولاد ہو گئے۔ سلیمان اور زریں بھابھی میں علیحدگی ہو گئی مگر ان دونوں کی ذاتی مکان میں رہنے کی حسرت پوری نہ ہو سکی۔ آج بھی وہ دونوں اگرچہ الگ الگ ہیں لیکن کرائے کے مکانوں میں رہتے ہیں۔

زریں سے شادی ایس سلیمان کو بہت راس آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک کامیاب اور نامور ہدایت کار بن گئے انہوں نے فلم سازی بھی کی۔ ہدایت کاری بھی کی۔ بہت سی یادگار اور سپر ہٹ فلمیں بنائیں۔ دولت بھی کمائی اور عزت اور

شہرت بھی۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ اس سے پہلے کامیاب ہدایت کار نہیں تھے۔ سلیمان اس لحاظ سے خوش نصیب سمجھے جاتے ہیں کہ نوعمری میں (ابھی وہ ٹین ایجر ہی تھے) انہوں نے بھائی درپن صاحب کے لیے فلم ’’گلفام‘‘ کی ہدایت کاری کے فرائض سر انجام دیئے۔اس فلم میں درپن اور مسرت نذیر مرکزی رومانوی کردار تھے۔ یہ دونوں فن کار اس وقت اپنے عروج پر تھے۔ایسے نامور فن کاروں کو ہدایت دینے کا تصور ہی کسی نووارد، نوآموز اور نو عمر ہدایت کار کے ہاتھ پیر پھیلانے کا سبب بن سکتا ہے مگر ایس سلیمان ایسے کمزور دل لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ انہوں نے آنکھ کھول کر اور ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے آس پاس فلمی ماحول ہی دیکھا تھا۔ فلموں سے انہیں بے حد لگاؤ تھا۔ ان کا دل فلم اور فلم اسٹوڈیو کے سوا کہیں نہیں لگتا تھا۔ان کا دیوانگی کی حد تک بڑھا ہوا شوق دیکھ کر گھر کے بڑوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے شوق کی تکمیل کر دی جائے ورنہ شاید کسی اور شعبے میں وہ کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

اس ضمن میں ان کا معاملہ بھارتی اداکار و فلم ساز اور ہدایت کار راج کپور سے ملتا جلتا ہے۔راج کپور پرتھوی راج کپور جیسے فن کار اور اسٹیج کے مانے ہوئے اسٹار کے بیٹے تھے۔جب انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تو گھر والوں نے انہیں بلا کر یہ پوچھا کہ آئندہ وہ کس شعبے میں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔

جواب میں انہوں نے کہا ’’فلم اسٹوڈیو میں۔‘‘

یہ جواب سن کر سب حیران رہ گئے کہ یہ کس قسم کی تعلیم کا قصد ہے۔

انہوں نے بہت رسان سے سمجھایا ’’دیکھئے اگر کسی کو وکیل بننا ہوتا ہے تو وہ لا کالج میں داخلہ لیتا ہے۔ڈاکٹر بننے کا خواہش مند میڈیکل کالج میں داخل ہوتا ہے۔انجینئر بننے کا شوقین انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیتا ہے۔ میں اداکار اور ہدایت کار بننا چاہتا ہوں۔اس کی تعلیم کے لیے کوئی کالج موجود نہیں ہے اس لیے اسے سیکھنے کے لیے مجھے کسی فلم اسٹوڈیو میں ہی داخلہ لینا پڑے گا۔‘‘

اس پرانے زمانے میں بھی راج کپور کے بزرگوں نے اپنی من مانی کرنے کے بجائے بیٹے کے رجحان کو ترجیح دی اور

انہیں اس دور کے نامور مصنف، شاعر اور ہدایت کار کیدار شرما کے سپرد کر دیا۔ وہ اس زمانے کے مانے ہوئے ہدایتکار اور مصنف تھے۔ اپنے دور کی کلاسیکی فلم ''چترلیکھا'' اور مصنف اور گیت نگار تھے۔ فلمی حلقوں میں ان کا نام بہت عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ راج کپور فطری طور پر ایک فن کار اور تخلیق کار تھے۔ کیدار شرما جیسے ہنر مند استاد کی صحبت اور شاگردی میں رہ کر انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ کیدار شرما نے ان سے فلموں میں بھی اداکاری کرائی۔ اس لحاظ سے اداکاری اور ہدایت کاری دونوں شعبوں میں راج کپور کو متعارف کرانے اور ان کی صلاحیتوں کو صیقل کرنے والے کیدار شرما ہی تھے۔

ایس سلیمان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے ارد گرد فلمی ماحول ہی دیکھا تھا۔ فطری طور پر بھی وہ فلموں کی طرف مائل تھے۔ انہوں نے ایک فلم میں چائلڈ اسٹار کے طور پر بھی کام کیا تھا۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ بڑے ہو کر تم کیا بنو گئے تو انہوں نے جواب دیا ''ہدایت کار''

یہ ایک مختلف جواب تھا کیونکہ عموماً نوجوانوں کو اداکاری سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ اس طرح انہیں شہرت اور مقبولیت بھی ملتی ہے اور دولت بھی لیکن سلیمان نے اداکاری کے بجائے ہدایت کار بننے کو ترجیح دی حالانکہ ان کے بڑے بھائیوں نے اداکار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی تھی۔

ان کے بڑے سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور پھر انہوں نے بہت دانائی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ ان کے رجحانات کے پیش نظر سلیمان کو فلموں ہی میں جگہ بنانی چاہئے۔ چنانچہ وہ فلم اسٹوڈیو میں ''بھرتی'' کر دیئے گئے۔ اس زمانے میں فلم اسٹوڈیو واقعی درس گاہوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اپنے شعبے میں مہارت رکھنے والے اور انتہائی عالم فاضل لوگ اس سے وابستہ تھے۔ جن سے سلیمان نے بہت کچھ سیکھا۔

انہیں ہدایت کار کی حیثیت سے پہلا موقع دینے والا بھی ان کا بھائی درپن تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سلیمان کو خود اپنے آپ پر اور ان کے گھر والوں کو ان پر کتنا اعتماد تھا ورنہ کوئی بھی فلم ساز اتنی مہنگی اور بڑے فن کاروں کی فلم

ایک ''ٹین ایجر'' ہدایت کار کے حوالے کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔

سلیمان اپنے بھائی کے اعتماد پر پورے اترے۔ انہوں نے '' گلفام'' بنائی جو کہ ایک سپر ہٹ فلم تھی۔ اس کے بعد انہوں نے پھر ایک عدد کارنامہ سرانجام دیا۔ یہ فلم ''باجی'' تھی جسے پاکستان کی فلمی صنعت میں ایک کلاسیکی فلم کا درجہ حاصل ہے۔ درپن اور نیر سلطانہ اس فلم میں مرکزی کردار تھے۔ یہ ایک مختلف قسم کی رومانوی اور نفسیاتی فلم تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ایک نوعمر ہدایت کار نے ایک بہت مشکل اور پیچیدہ موضوع کو فلمانے کی جرات کی تھی اور پورے اعتماد کے ساتھ اس موضوع کے ساتھ انصاف کیا تھا۔ ''باجی'' کو پاکستان کی فلمی صنعت میں ہمیشہ ایک ممتاز مقام حاصل رہے گا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ فلم ایک نوعمر تخلیق کار کی صلاحیتوں کا نمونہ ہے۔ اس فلم کو دیکھنے کے بعد جب لوگ سید سلیمان کو دیکھتے تھے تو حیران رہ جاتے تھے کہ اس بظاہر کھلنڈرے نوعمر لڑکے نے فلم صنعت میں ایک نئی روایت قائم کر دی۔

سلیمان کی فلموں کی کامیابیوں کا سلسلہ پنّا ''زریں'' سے شادی کے بعد شروع ہوا۔ کہتے ہیں کہ ''ہر بیوی اپنی قسمت ساتھ لے کر آتی ہے۔'' یہ کہاوت زریں سلیماں پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ وہ اپنے پلو میں سلیمان کے لیے کامیابیاں، کامرانیاں اور خوشیاں لے کر آئیں۔ اللہ نے انہیں اولاد سے بھی نوازا۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی اس زمانے میں ایک ''مثالی'' گھرانا کہا جاتا تھا۔ سلیمان کو تو شب و روز فلموں کی شوٹنگ سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ بچوں کی پرورش کی ساری ذمے داری زریں سلیمان پر تھی۔ انہوں نے اپنا فرض بہ خوبی ادا کیا۔ بیٹی کی نوعمری ہی میں شادی کر دی۔ دراصل زریں پرانے خیالات کی قائل ہیں۔ ان کے مطابق لڑکیوں کو زیادہ دیر گھر نہیں بٹھانا چاہئے۔

دونوں بیٹوں کی رہنمائی کرنے میں بھی زریں کا ہاتھ نمایاں رہا ہے۔ اب سب بچے خود بھی بچوں والے ہو گئے ہیں اور کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن ان سب کے گھر بسانے اور انہیں کامیاب زندگی کی راہ دکھانے والی ماں گھر سے بے گھر ہو کر رہ گئی ہے۔ اتنے طویل عرصے کی رفاقت اور ہم آہنگی کے بعد اچانک جب ان دونوں کی علیحدگی کا معلوم

ہوا تو یقین نہیں آیا۔ایک خوش و خرم ہنستا بستا گھرانا یوں اجڑ کر رہ جائے گا کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا لیکن ہندی کہاوت ہے کہ ”جس تن لاگے وہ تن جانے“ یعنی جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔

کافی عرصے تک دونوں میں سے کسی سے ملاقات نہ ہو سکی پھر ایک دن سلیمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ حسب معمول خوش مزاج نظر آئے مگر کچھ بجھے بجھے سے تھے۔ وقت اور موقع نہ تھا کہ اس موضوع پر بات کی جاتی۔ وہ اس بارے میں سوال پر ہنس کر چپ ہو گئے۔

پھر ایک تقریب میں زریں بھابھی سے ملاقات ہوئی حسب معمول بہت خلوص اور گرمجوشی سے ملیں۔ ہم انہیں اٹھا کر ایک طرف لے گئے۔ پوچھا کہ یہ سب کیا ماجرا ہو گیا ہنس کر بولیں ”یہ لمبی کہانی ہے۔ کبھی فرصت میں بیٹھ کر سناؤں گی۔“

مگر ہمیں یہ لمبی کہانی سننے کی فرصت نہ مل سکی پھر ایک تقریب میں ان دونوں کو یکجا دیکھا۔ زریں کے پاس کار نہ تھی۔ سید سلیمان نے انہیں گھر چھوڑنے کے لیے اپنا ڈرائیور اور گاڑی حاضر کر دی۔ دونوں میں بات چیت بھی معمول کے مطابق ہوتی رہی۔ یہ علیحدگی کسی جھگڑے کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے غم گسار اور ہمدرد ہیں۔ ہم نے سوچا کہ جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ اتنی طویل رفاقت کے بعد ان دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ ہونا تھا۔ سو ہو گئے لیکن بہت معقول اور شائستہ انداز میں۔ نہ لڑائی، نہ جھگڑا۔ نہ شکوہ، نہ شکایت۔ کبھی اخبار میں بیان دینا تو کیا قریبی ملنے والوں سے بھی اس بارے میں بات نہیں کی۔ بچوں سے دونوں کا ملنا ہے دونوں بیٹوں کے پاس جا کر رہتے ہیں اور پوتا پوتی اور نواسا نواسی کی محبت بھری معصوم باتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

جب تک وہ پنّا تھیں انہوں نے رقص کے شعبے میں بڑی دھومیں مچائیں۔ غیر ملکی دورے بھی کئے۔ سکندر مرزا، ایوب خان اور بھٹو صاحب کے دور میں کلچرل وفود کے ہمراہ مختلف ملکوں میں اپنے فن کا مظاہرہ بھی کیا اور دونوں

ہاتھوں سے داد و تحسین کے ڈونگرے سمیٹے۔ اسٹیج پر اور بڑے بڑے باوقار ہوٹلوں میں اس زمانے میں رقص کے مظاہرے ہوا کرتے تھے جن کو دیکھنے کے لیے بڑے بڑے لوگ آیا کرتے تھے۔ پاکستان میں ابھی پیسے کی اتنی ارزانی اور فراوانی نہیں ہوئی تھی۔ پیسے والوں کے پاس تمیز و تہذیب اور وضع داری بھی تھی۔ وہ فن اور فنکاروں کی قدر کرنا بھی جانتے تھے۔ اب تو پیسے والوں کی کوئی کمی ہی نہیں ہے۔ پیسہ تو کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیا لیکن زندگی کا سلیقہ اور قرینہ نہیں سیکھا۔ ممکن ہے اگلی دو ایک نسلوں کے بعد ان میں بھی شعور پیدا ہو جائے۔

یہ سب کچھ چھوڑ کر ایک ابھرتے ہوئے خالی جیب ہدایت کار کے ساتھ شادی کرنا بڑے دل گردے کی بات ہے

لیکن محبت کا جذبہ ہر طاقت پر حاوی ہوتا ہے۔ پنّا نے ساری رونق، شان و شوکت اور آسائش کو خیر باد کہہ دیا اور زریں سلیمان بن گئیں۔ اپنے اس فیصلے پر وہ کبھی پشیمان نہیں ہوئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دونوں نے بہت سلیقے اور محبت سے ساتھ نبھایا۔ اچھے اور برے وقت میں ایک دوسرے کے رفیق اور شریک رہے۔ زرّیں نے پھر دوبارہ پلٹ کر فلموں کی طرف نہیں دیکھا۔ البتہ نئے چہروں کی تلاش، کہانیوں کے انتخاب، ملبوسات کے ڈیزائن میں وہ اپنے شوہر کی مشیر رہیں۔ صحیح معنوں میں شریک حیات بن کر زندگی بسر کی۔

زرّیں بھابی میں انکسار، خوش اخلاقی اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس محفل میں جاتی ہیں اور جس سے بھی ملتی ہیں ان سے ہمیشہ کے لیے تعلقات اور مراسم قائم ہو جاتے ہیں۔ اپنے فن پر انہوں نے کبھی

غرور نہیں کیا حالانکہ ہمارے ملک میں ان کے پائے کی رقاصائیں کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ رقص کا فن انہوں نے

بڑی محنت اور مشقت سے حاصل کیا۔ روزانہ پانچ پانچ سیر کے گھنگرو پیروں میں باندھ کر گھنٹوں ریاض کرتی تھیں۔ استاد غلام حسین پٹیالے والے، شادو خان اور رفیع انور جیسے ہنر مندوں سے بھی بہت کچھ سیکھا اور پھر سلیقے سے اس کا استعمال بھی کیا۔ میڈم آزوری، فقیر حسین ساگا، استاد اللہ رکھا اور دوسرے فن کاروں سے بھی بہت کچھ حاصل کیا پھر یہی فن انہیں روس، چین، اٹلی، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، ایران اور بہت سے دوسرے ملکوں میں لے جانے کا سبب بنا۔

انہوں نے کلاسیکی رقص کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے۔احمد بشیر کی فلم ''نیلاپربت'' میں بھارت ناٹیئم کاایسامظاہرہ کیاکہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ زرّیں افسانہ نگار بھی ہیں۔ان کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع ہے۔اس لیے افسانہ لکھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ ان کے ایک افسانے ''گڑیاٹوٹ گئی'' پراس وقت کے اکادمی ادبیات کے ڈائریکٹر فخر زماں نے انہیں دس ہزارروپے کاانعام بھی دیا تھا۔گویاوہ مستنداور انعام یافتہ افسانہ نگار ہیں۔اگرچہ ان کے افسانوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن جتنا بھی لکھا بہت اچھا لکھا۔

زرّیں زندگی کاایک اور پہلو بھی دلچسپ ہے۔فیض احمد فیض کی شخصیت اور شاعرانہ عظمت کاکسے علم نہیں ہے۔زرّیں کو صرف اتنامعلوم تھاکہ وہ بہت بڑے شاعر ہیں۔وہ ان کے کلام کی قدردان بھی تھیں۔حمید اختر صاحب نے فلم ''سکھ کا سپنا'' شروع کی تو اس کے نغمات گھیر گھار کر فیض صاحب سے لکھوائے۔اس کے ہدایت کار مسعود پرویز تھے۔فیض صاحب نہایت بامروت اور وضع دار آدمی تھے۔دوستوں کی بات ٹالنا ان کے لیے بہت مشکل تھا۔حمید اختر صاحب کے اصرار پر ان کی فلم کے نغمات لکھنے پر آمادہ ہوگئے۔اس فلم میں پنّا کے بھی دو رقص شامل تھے۔اس طرح دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔

پنّا اپنی بے تکلفانہ طبیعت سے مجبور تھیں۔ادھر فیض صاحب اس قدر منکسر المزاج تھے کہ انہیں دیکھ کراوران سے مل کر اندازہ ہی نہیں ہوتا تھاکہ وہ کیسی '' توپ'' چیز ہیں۔پنّا حسب عادت فیض صاحب سے بے تکلف ہوگئیں۔

فیض صاحب اپنی سادگی اور عاجزی کے ہاتھوں مجبور تھے۔یہ دوستی کس نوعیت کی تھی۔یہ خود زرّیں کی زبانی سنئے۔ یہ واقعات انہوں نے ایک انٹرویو میں بیان کئے تھے۔

''فیض صاحب بڑے پیارے انسان تھے۔انہوں نے مسعود پرویز کی فلم ''سکھ کا سپنا '' کے گیت لکھے تھے۔میں نے بھی اس فلم میں دو رقص فلم بند کرائے تھے اور اداکاری بھی کی تھی۔اس فلم کے دوران میں فیض صاحب سے قربت

بڑھی۔ وہ بڑے نفیس اور ملنسار آدمی تھے۔ مجھے تو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اتنے بڑے شاعر تھے۔ میں ان کے ساتھ بڑی گپیں لگاتی تھی۔ وہ تین مرتبہ انہیں بمبئی کلاتھ مارکیٹ بھی لے گئی اور فیض صاحب سے کہا کہ آپ میرے لیے اپنی پسند کے پردے اور صوفہ سیٹ دلوا دیں۔ وہ دیرینہ دوستوں کی طرح پیش آتے تھے اور کہتے تھے۔ ”بھئی پنّا تم مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو۔ مجھے ایک سگریٹ تو پینے دو۔۔۔“

میں ان کو گھسیٹ کر مارکیٹ لے جاتی تھی۔ وہ اتنے وضع دار انسان تھے کہ چپ چاپ میرے ساتھ چل پڑتے تھے۔ ان کے علاوہ میرے سید سبط حسن اور حمید اختر کے ساتھ بھی اچھے تعلقات رہے اور میں نے ان لوگوں سے بہت کچھ سیکھا۔“

زرّیں خوابوں پر بہت یقین رکھتی ہیں کیونکہ ان کے اکثر خواب سچے نکلتے تھے۔ زندگی کے بارے میں ان کا نظریہ بہت عجیب ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مجھے تو زندگی ایک ریلوے پلیٹ فارم کی طرح محسوس ہوتی ہے جہاں مختلف ریل گاڑیاں وقفے وقفے سے آتی جاتی رہتی ہیں۔ زندگی میں بھی آنا جانا لگا رہتا ہے۔ کوئی جلدی چلا جاتا ہے۔ کوئی دیر سے جاتا ہے۔ البتہ مجھے موت سے کبھی خوف نہیں آیا۔

ہماری ان سے پہلی ملاقات کراچی میں ہوئی تھی جب وہ پنّا تھیں۔ یہ غالباً ۵۸۔۱۹۵۷ء کا ذکر ہے۔ اس ملاقات کا احوال ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ یہ بہت عجیب ماحول میں ہوئی تھی۔ ہمارے ایک دوست کے کہنے پر انہوں نے ہماری عینک اتار لی تھی جس پر ہم بہت ناراض ہوئے۔ پنّا کو یہ واقعہ تفصیل سے یاد ہے اور وہ ہمیشہ سب کو سنا کر لطف اندوز ہوتی ہیں۔ ہم کئی بار لبنیٰ اور بچیوں کے ساتھ ان کے گھر گئے۔ انہوں نے لبنیٰ کو بھی یہ قصہ سنایا اور بہت ہنسیں وہ اپنے میاں کی شکایتیں ان کے سامنے ہی ہم سے کرتی رہتی تھیں اور وہ ہنستے رہتے تھے مگر جب ہم مذاق میں بھی لبنیٰ پر اعتراض کرتے تھے تو وہ فوراً ان کی طرف داری میں کھڑی ہو جاتی تھیں۔ کہا کرتی تھیں کہ آفاقی بھائی آپ کی بیوی بہت اچھی ہے۔ اس کی قدر کیا کریں۔

ہم کہتے دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ جواب میں وہ سنجیدگی سے انکی خوبیاں گنوانا شروع کر دیتی تھیں۔

ان کی شخصیت میں اپنائیت خلوص اور دلکشی ہے۔ گورا رنگ، دراز قد، متناسب جسم، کتابی چہرہ، موزوں نقش و نگار، سیاہ چمک دار آنکھیں۔ ہم ان سے کہا کرتے تھے کہ یہ چینی جاپانیوں جیسی آنکھیں کہاں سے لے آئیں۔ سلیمان کے بچوں کی شکلیں بھی بگاڑ دیں۔ چینی جاپانی کے خطاب پر وہ بہت ہنسا کرتی تھیں۔

آج کل وہ کراچی میں ہیں اور رقص کی اکیڈمی قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ پاکستانی فلم ہیروئنوں میں میرا اور نور نے ان کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی تھی۔ روایات کے مطابق میرا نے انہیں نذرانہ پیش کیا اور انہوں نے اس کے ہاتھ پر دھاگا باندھا تھا۔ میرا کی مصروفیات کی وجہ سے تربیت کا یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا لیکن پھر بھی انہوں نے رقص کے اسرار ور موز میرا کو سکھائے۔ نور کو بھی انہوں نے رقص کی تربیت دی تھی۔ ایک زمانے میں ناہید صدیقی کی بھی انہوں نے خاصی رہنمائی کی تھی۔ بہر حال بقول ان کے زندگی ایک ریلوے پلیٹ فارم کی طرح ہے۔ یہاں مختلف ٹرینیں آتی رہتی ہیں اور جاتی رہتی ہیں۔ لوگ ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ زرّیں بھابی کی زندگی بھی ایسے ہی واقعات سے عبارت ہے۔ مسافروں کے ملنے اور بچھڑنے کا سلسلہ جاری ہے اور اس کے ساتھ ہی سفر بھی۔ پنّا سے جو سفر شروع ہوا تھا وہ زرّیں بننے کے بعد جاری ہے۔ پنّا زمرد کو کہتے ہیں اور بقول ان کے یہ پتھر ان کے لیے بہت لکی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ بعض اوقات پتھر انسانوں سے زیادہ لکی اور کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔

طبلہ اور ہارمونیم دو ایسے ساز ہیں جن کے بغیر مشرقی موسیقی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہارمونیم کی مدد سے سروں کو تلاش کر کے دھن میں ڈھالا جاتا ہے۔ ہم نے بچپن میں دیکھا کہ بڑے بڑے خاندانی لوگ شوقیہ ہارمونیم بجانے کا فن سیکھتے تھے۔ گھنٹوں ریاض کرتے تھے اور پھر اس سے اپنا اپنے گھر والوں کا اور دوست احباب کا دل بہلایا کرتے تھے۔ ہمارے سب سے بڑے بہنوئی اعزاز مرزا مرحوم کا تعلق دریاباد سے تھا۔ یہ ثقافتی اور تہذیبی اعتبار سے ایک معروف شہر ہے۔ شہر کیا ہے چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہ پرانے دنوں کا ذکر ہے۔ لیکن عبد الماجد دریابادی جیسی عالم و

فاضل ہستیوں نے اسی چھوٹے سے قصبے میں جنم لیا تھا۔ دریاباد میں جنم لینے والے فن کاروں اور اہل علم و دانش کا تذکرہ کیا جائے تو ایک طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے چھوٹے چھوٹے قصبے اتنے بڑے بڑے لوگوں کی جنم بھومی بننے کا شرف حاصل کرتے تھے۔

برصغیر کے بے شمار چھوٹے چھوٹے قصبوں نے لاتعداد نامور ہستیوں کو جنم دیا جنہوں نے بعد میں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں لازوال مقام حاصل کیا۔ مثال کے طور پر امروہہ کو ہی دیکھ لیجئے۔ امروہہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا لیکن یہاں پیدا ہونے والے بچوں نے کہاں کہاں اپنے نام کے جھنڈے نہیں گاڑے۔ دراصل ثقافت اور فنون کے گہوارے ہمیشہ چھوٹے قصبے ہی رہے ہیں۔ پرانے زمانے میں بھی یہی نرسری کا کام دیتے تھے۔ بڑے شہروں میں پہنچ کر ان پتھروں کو تراش کر ہیرا بنا دیا جاتا تھا یا پھر قدر دان ان بیش قیمت جواہرات کو دریافت کر کے انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ علامہ اقبال نے غالباً ایسے ہی لوگوں کے لیے فرمایا ہے کہ

غربت میں جا کے چمکا

گمنام تھا وطن میں

دریا باد لکھنؤ کے نزدیک تھا۔ ریل گاڑی سے بہت مختصر وقت میں سفر طے ہو جاتا تھا۔ ہمیں دریاباد صرف ایک بار جانے کا اتفاق ہوا تھا جب قیام پاکستان کے بعد ہم پاکستان کے آنے کے لیے ''نو آبجیکشن'' سرٹیفکیٹ کے حصول کی خاطر سارے بھارت کے شہروں میں گشت لگا رہے تھے۔ دریاباد میں اپنے بہنوئی کے پاس بھی گئے۔ یہ گھرانا نہایت معزز اور بارسوخ سمجھا جاتا تھا۔ خیال تھا کہ شاید ان کے ذریعے لکھنؤ سے اجازت نامہ مل جائے ہمارے بہنوئی اعزاز مرزا ایک رشتے سے ہمارے ماموں بھی تھے اس لیے ہم ہمیشہ انہیں ماموں بھائی کہا کرتے تھے۔

دریا باد کی گلیوں اور سوئے ہوئے بازاروں سے گزر کر ان کے گھر پہنچے تو سب حیران رہ گئے۔ قدیم گھرانے اس وقت تک پرانی تہذیب کے امین تھے۔ وہی رکھ رکھاؤ، رہن سہن اور وہی طور طریقہ اور انداز وضع داری جس کی داستانیں

اب تک مشہور ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ وہ تہذیب اور وہ دنیا اب ایک داستان اور خواب وخیال بن کر رہ گئی ہے بلکہ بھولی ہوئی داستان کہنا زیادہ مناسب ہو گا اس لیے کہ ہماری نئی نسل اپنے ماضی سے یکسر بے خبر اور بے پرواہے لیکن اسکے لیے انہیں قصوروار نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ماضی کے رشتوں سے تعلق قائم رکھنا زندہ قومیں اپنا فخر سمجھتی ہیں۔ سبھی ادارے اور حکومتیں اس بارے میں بڑی سرگرم رہتی ہیں بَدقسمتی سے ہمارے ہاں کسی کو ان چیزوں کی پروا نہیں ہے۔ دریاباد میں ایک دن گزار کر ہم لکھنؤ چلے گئے۔ بہت سر مارا، کوشش کی لیکن مقصد حاصل نہ ہو سکا۔

یہ ۱۹۴۹ء کا ذکر ہے۔ بھارت میں فسادات کی وجہ سے کشیدگی ابھی تک موجود تھی۔ کیا ہندو، کیا مسلمان، پاکستان

آنے والوں کی مدد کرتے ہوئے سبھی ہچکچاتے تھے۔ قصہ مختصر یہ کہ بالآخر ہمیں یہ ''اجازت نامہ'' اپنے آبائی شہر بھوپال سے حاصل ہوا تھا جو ابھی تک ایک مسلم ریاست تھا اور بھارت میں ضم نہیں ہوا تھا۔ ایک مجسٹریٹ صاحب نے بلاخوف وخطر اور بے تامل قلم اٹھایا، نو آبجیکشن سرٹیفکیٹ بنوا کر اس پر مہر لگائی اور ہمارے حوالے کر دیا۔ اس طرح ہم قانونی اور جائز طریقے سے پاکستان پہنچ گئے۔ یہ داستان ہم پہلے بھی تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

ان باتوں کا تذکرہ اعزاز ماموں کے ہارمونیم کے حوالے سے آگیا ہے۔ انہیں ہارمونیم بجانے اور گانے کا شوق تھا۔ رات کو کھانے کے بعد ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے۔ پرانی غزلیں، قوالیاں اور شعرا کا کلام سناتے۔ گھر کے سب لوگ چاندنی کے فرش پر ان کے ارد گرد بیٹھ جاتے اور ان کی غزل سرائی سے رات گئے تک لطف اندوز ہوتے۔ بچوں کو زیادہ دیر تک جاگنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے انہیں سونے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا مگر ہم چھپ کر غزلیں اور پکے گانوں کے بول سنتے رہے تھے۔

ماموں بھائی کے شوق کا یہ عالم تھا کہ جہاں کہیں بھی جاتے تھے اپنا ہارمونیم ساتھ لے جاتے تھے۔ ہمیں تو ہارمونیم کے ساتھ ان کے گانے میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن وہ بار بار کہا کرتے تھے کہ طبلے کی سنگت کے بغیر گانے کا کیا مزہ لیکن ظاہر ہے کہ گھر میں طبلہ موجود نہیں تھا۔ اگر طبلہ کہیں سے تلاش کر کے مل بھی جاتا تو طبلہ بجانے والا

کہاں سے آتا؟ لیکن اس وقت سے ہمیں یہ احساس ہے کہ طبلہ بھی موسیقی کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ جب باشعور ہوئے اور موسیقی سے زیادہ آگہی حاصل ہوئی تو طبلے اور طبلہ نواز کی اہمیت کا بہ خوبی احساس ہو گیا پھر جب فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے تو اس کی مزید تصدیق ہو گئی۔

برصغیر میں اور پاکستان میں بڑے بڑے صاحب فن اور ہنر مند طبلہ نواز گزرے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ اگرچہ اب ان کی قدر و قیمت اور تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ مشرقی موسیقی کے روبہ زوال ہونے کے باعث ان پرانے سازوں کی ضرورت اور کھپت میں بھی نمایاں کمی واقع ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود کلاسیکی اور مشرقی موسیقی کے لیے طبلے کی اہمیت اور ضرورت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

ہم جن دنوں فلم سازی اور ہدایت کاری کرتے تھے تو طافو فلمی آرکسٹرا میں نامور طبلہ نواز تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ موسیقار بھی بن گئے۔ طبلہ تمام سازوں میں ایسی کلیدی حیثیت کا حامل ہے کہ بہت سے طبلہ نواز بعد میں بڑے نامور موسیقار بنے۔ بھارت کے موسیقار غلام محمد، نوشاد صاحب کے ساتھ طبلہ بجایا کرتے تھے اور ان کے معاون بھی تھے۔ شوکت علی نوشاد بھی طبلہ نواز ہی تھے۔ نخشب جارچوی نے اپنی فلم ''رخسار'' کے لیے انہیں موسیقار منتخب کر لیا۔ نوشاد صاحب بعد میں پاکستان چلے آئے اور پاکستان کی فلمی موسیقی میں انہوں نے بہت نام اور بلند مقام حاصل کیا۔

طبلہ نواز طبلے کے بغیر نامکمل ہے جس طرح بندوق اور تلوار کے بغیر سپاہی۔ طبلہ نوازوں کی تعداد اب کم ہوتی جا رہی ہے لیکن پیشہ ور گانے والوں کے لیے طبلہ ابھی تک اسی اہمیت کا حامل ہے جیسے مچھلی کے پانی۔ پرانے سازندوں کی آج بھی ضرورت پڑتی رہتی ہے اور اس حوالے سے سازوں کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔

پاکستان میں لاہور موسیقی کا گڑھ رہا ہے اور آج بھی ہے۔ پرانے سازندے اور ساز بنانے والے آج بھی لاہور میں موجود ہیں اور قدیم لاہور کے محلوں میں اپنے کام اور ہنر کا مظاہرہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم نے ایک بار ستار

بنانے والوں کی تلاش میں بڑی تحقیق کی تھی۔ صحافت ہی کے زمانے میں ہمیں ستار بجانے کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور ہم نے بڑی مشکل سے ستار حاصل کیا تھا لیکن یہ ساز جتنا مدھر اور اہم ہے اس کا ریاض بھی اتنا ہی ضروری اور مشکل ہے۔ ہم شوق کی فراوانی کے باوجود وقت نہ نکال سکتے تھے اس لیے ہمارا استاد ہمیشہ ہمارا منتظر ہی رہا اور بالا خر شکست و ریخت کی نذر ہو گیا۔ بعد میں ہماری بڑی صاحب زادی نادیہ کو ستار بجانے کا شوق ہوا تو ہمیں ایک بار پھر ستار کی ضرورت لاحق ہوئی اور اسکی تلاش میں سر گرداں ہوئے۔

ستار بجانے والوں کی طرح ستار بنانے والے بھی کمیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم نے نادیہ کے لیے ستار کس طرح حاصل کیا تھا یہ طویل داستان بھی ہم سنا چکے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک طبلہ ساز کے بارے میں معلوم ہوا تو کشاں کشاں شوق ہمیں اسکی تلاش میں لے گیا۔ شاہی محلے میں ان صاحب کا ڈیرہ اور دکان ہے۔ بڑی مشکل سے وقت نکال کر وہاں پہنچے۔ ان صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی لیکن معلومات حاصل ہو گئیں۔ گویا یہ سفر اور مشقت ادھورا اور نامکمل ہی رہا پھر بھی جو انکے بارے میں معلوم ہوا وہ بہت دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔

ان صاحب کا نام گلزار ہے اور عرفیت گلو ہے۔ شاہی محلے میں اپنی دکان میں طبلہ سازی کرتے ہیں۔ موسیقی کے دلدادہ ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ داستان گو بھی ہیں۔ موسیقاروں اور گانے والے استادوں کی بے شمار کہانیاں انہیں یاد ہیں جو سناتے بھی رہتے ہیں۔ شاہی محلے میں آنے والوں اور اس کی عظمت رفتہ کے واقعات بھی جانتے ہیں

اور سناتے ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک صاحب نے ان سے ملاقات کا احوال تحریر کیا ہے جو دلچسپی اور معلومات آفرینی کے سبب پیش کی جا رہا ہے۔

یہ خود ان کی زبانی سنئے:

"آداب، جناب والا، میرا نام گلزار ہے۔ میری فوٹو اور شکل دیکھ کر آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا پیشہ کیا ہے اور میں کام کرتا ہوں۔ جی ہاں، بازار حسن ہی میرا ٹھکانا ہے۔ یہی میرا ذریعہ اور روزگار بھی ہے۔ یہیں طبلہ سازی کرتا ہوں اور

طبلے بنا کر روزی کماتا ہوں اور روٹی کھاتا ہوں۔ میں ان کہانیوں، رسوائیوں اور بدنام واقعات سے بھی بہ خوبی واقف ہوں جو اس پیشے سے وابستہ ہیں لیکن آپ جو بھی خیال فرمائیں، میرا دھندا بہت معزز ہے اور میں اسے آرٹ اور ہنر کہتا ہوں۔ بہت سے لوگ مجھے نہیں گردانتے اور خاطر میں نہیں لاتے اس کے برعکس مجھے برا جانتے ہیں لیکن یقین کیجئے یہ اتنا ہی اہم اور معزز ہے جیسے ڈاکٹر، ٹیچر اور دوسرے پیشوں کے لوگ ہوتے ہیں۔

میرے والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں اس نان کباب کی دکان پر نوکری کروں جو آپ کو سامنے نظر آ رہی ہے اور جس کا مالک روزانہ ہزاروں کماتا ہے لیکن مجھے بچپن ہی سے موسیقی کا شوق تھا۔اسی تلاش میں رہتا تھا کہ کوئی مشورہ دینے والا مل جائے اور مجھے کسی صاحب فن تک پہنچادے۔آخر کار میری کوشش اور تلاش کامیاب ہوئی اور

مجھے استاد رحمت خان جیسا ہنر مند مل گیا۔استاد رحمت خان سے تو آپ واقف ہوں گے ؟ نہیں ہیں ؟ خیر ۔۔۔ یہ بھی

کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔پرانے فن کاروں اور ہنر مندوں کو اب کون جانتا ہے اور ان کی قدر کرتا ہے۔

بہر حال میں نے استاد رحمت خاں کی طبلہ سازی کی دکان میں تربیت لینے کے لیے نوکری کرلی۔جب میرے گھر والوں کو معلوم ہوا کہ میں نے شاہی محلے میں ایک طبلہ بنانے والے کے پاس نوکری کرلی ہے تو وہ بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا مگر شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا۔میں نے اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے یہ بھی برداشت کرلیا۔گھر والوں کی ناراضی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے مجھ سے صاف کہہ دیا کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ اور پھر ہمیں اپنی شکل بھی نہ دکھانا۔وہ میرے لیے بہت مشکل اور آزمائش کا وقت تھا لیکن کچھ پانے کے لیے مشکلیں تو جھیلنی ہی پڑتی ہیں اور بہت کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔بات دراصل یہ ہے کہ مجھے بچپن ہی سے موسیقی سے لگاؤ ہے۔یوں سمجھئے کہ موسیقی میری روح ہے۔اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ویسے بھی میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جو پیشہ اپنایا ہے وہ قابل شرم نہیں بلکہ باعث مسرت ہے۔موسیقی ایک ایسی چیز ہے جس سے ہر شخص لطف اندوز ہوتا ہے اور سکون حاصل کرتا ہے۔ لوگوں کو چاہئے کہ اپنی اس روایت کی حفاظت کریں اور اس سے وابستہ لوگوں کی حوصلہ افزائی کی

جائے۔ طبلہ بنانے کا ہنر اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ بھی فن کا حصہ ہے۔ کبھی آپ نے کسی کو طبلہ اور ڈھول بناتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہ بھی ایک شاعری ہے پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ اس کو برا کیوں سمجھتے ہیں۔ یہ ہماری منافقت اور دوغلا پن ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ وہی لوگ جو دن میں بڑے بڑے بول بولتے ہیں اور اپنے غیرت مند ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں ان میں اکثر رات کے اندھیرے میں شاہی محلے کے پھیرے لگاتے ہیں۔ دراصل اس بازار کی رونق ہی ایسے لوگوں کے دم سے ہے۔ یہ گھٹیا قسم کے ناچ گانے دیکھ کر ہی خوش ہو جاتے ہیں۔ انہیں اعلیٰ موسیقی اور رقص کا کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ یہاں یہ گھنگروؤں کی جھنکار میں سمت بیٹھے رہتے ہیں جبکہ ان کی بیویاں گھر پہ ان کے انتظار میں بھوکی بیٹھی رہتی ہیں۔ ہم جیسے بھی ہیں، ایسے دوغلے لوگوں سے تو بہتر ہیں۔ ہم کم از کم اپنے پیشے سے مخلص تو ہیں اور محنت مشقت کر کے اپنی روزی کماتے ہیں"

گلزار نے فلسفیانہ انداز میں کہا "کاش لوگ یہ سمجھ سکیں کہ موسیقی اور ناچ گانا ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔ اس پر شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو ایسا فن ہے جو صدیوں سے ہماری تہذیب کا حصہ بنا ہوا ہے۔ اس حقیقت سے انکار کرنا خود اپنے آپ سے انکار کرنے کے برابر ہے۔

میں شہر کے جس حصے میں کام کرتا ہوں۔ یہ تہذیبی لحاظ سے بہت قیمتی اور قابل قدر ہے۔ میں یہاں بیٹھ کے بے شمار کہانیاں دیکھتا اور سنتا رہتا ہوں۔ بس کچھ نہ پوچھئے کہ یہ کیسی عجیب دنیا ہے اور یہاں کیسے کیسے لوگ اور کیسے کیسے واقعات ہوتے ہیں۔ اگر میں سنانے بیٹھ جاؤں تو آپ لوگوں کو یوں لگے گا جیسے کوئی فلم دیکھ رہے ہیں بلکہ فلموں میں بھی ایسی سچی اور دردناک کہانیاں نہیں دیکھنے کو ملتیں۔ میں نے تو ایک عمر گزاری ہے اس محلے میں۔ کتنی ہی بچیاں میرے دیکھتے ہی دیکھتے بڑی ہو گئیں اور کیا سے کیا بن گئیں۔ کچھ برباد ہو گئیں اور کچھ کامیابیوں اور دولت سے کھیلنے لگیں۔ میرے لیے تو یہ سب بہنوں اور بیٹیوں کی طرح ہیں۔ یہاں جو نچلے درجے کی لڑکیاں اور عورتیں ہوتی ہیں ان کی زندگی جہنم سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ وہ اپنی مجبوریوں کا سودا کرتی ہیں۔ اپنے بچوں کی پرورش کے لیے کیا کچھ نہیں

کرتیں پھر بھی ان کے بچے فاقے کرتے ہیں۔ جو تماش بین یہاں آتے ہیں مجھے ان کی بے حسی اور سنگ دلی پر حیرت ہوتی ہے۔ وہ ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچوں کا انہیں کچھ خیال نہیں آتا۔ شرم تو ان لوگوں کو کرنی چاہئے مجھے شرم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں تو محنت کر کے حق حلال کی روزی کماتا ہوں۔"

یہ تو طبلہ ساز گلزار کی کہانی ہے۔ ایسی کہانیاں اور بے شمار کردار اور ہنر منداس محلے کے گردونواح میں بکھرے ہوئے ہیں۔ دراصل اب لاہور کا یہی ایک حصہ فنون لطیفہ کا مرکز بن کر رہ گیا ہے۔ سازندے اور ساز بجانے والے بھی یہیں تک محدود ہیں۔ یہ لوگ سالہاسال سے بلکہ پشتوں سے یہی کام کرتے چلے آرہے ہیں۔ پاکستان کے بڑے بڑے نامور موسیقاروں نے اسی جگہ جنم لیا۔ کتنے ہی گلوکار، گلوکارائیں اور فن کار اس خطے کی پیدائش ہیں۔ آپ کو کسی بھی مشرقی ساز کی ضرورت پڑے تو اسی جگہ جانا پڑے گا۔ اس کے سوا اب "آرٹ" کا کوئی اور ٹھکانا نہیں ہے

لاہور کے اس قدیم تہذیبی مرکز اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ کیسی کیسی نادر روزگار ہستیاں یہاں ڈیرے ڈالے ہوئے تھیں۔

ان ٹھکانوں اور ڈیروں پر نہ صرف لاہور کے بلکہ تمام برصغیر کے عظیم موسیقاروں اور گائکوں کی محفلیں جما کرتی تھیں۔ یہ سب اب خواب وخیال ہو کر رہ گئیں۔ بقول غالب

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش ونگار طاق نسیاں ہو گئیں

گئے سنہرے دنوں کارونا رونے والے اور بھی لوگ ہیں۔ پچھلے دنوں معروف کالم نویس عبدالقادر حسن صاحب نے بھی اپنے ایک کالم میں کچھ پرانی یادیں تازہ کی ہیں۔ عبدالقادر حسن پرانے صحافی اور کالم نگار ہیں۔ کسی زمانے میں رپورٹنگ اور ادارت کرتے تھے اب سمٹ کر صرف کالم نگار بن کر رہ گئے ہیں لیکن اس حیثیت سے بھی بہت ممتاز

ہیں۔لگ بھگ ہمارے ہی ہم عمر ہیں۔ ہم جن دنوں نوائے وقت اور آفاق میں کام کرتے تھے اسی زمانے میں عبدالقادر حسن صاحب نے اصلاح کے نامہ نگار کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا پھر صحافت کا شوق انہیں لاہور کھینچ لایا اور اس کے بعد سے لاہور ہی کے ہو کر رہ گئے۔ صحافت ہی ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ نیشنل پریس ٹرسٹ کے دور میں کچھ عرصے روزنامہ ''امروز'' کے مدیر بھی رہے۔اس اعتبار سے وہ مولانا چراغ حسن حسرت جیسے نادر روزگار کے گدی نشین کہے جاسکتے ہیں کہ ''امروز'' کے آغاز میں مولانا چراغ حسن حسرت ہی اس کے مدیر تھے۔ان کے بعد کئی لوگوں نے یہ گدی سنبھالی جن میں احمد ندیم قاسم صاحب بھی شامل ہیں۔

عبدالقادر حسن کے کالم کا عنوان ہے۔''غیر سیاسی باتیں'' لیکن اس کالم میں سیاسی تذکروں، تبصروں اور بوقلمیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بہت مقبول کالم ہے۔ اس کے عنوان سے عبدالقادر حسن کی جدت طبع کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سیاست کے علاوہ دنیا کے اور بھی بہت سے موضوعات اس کالم کی زینت بنتے رہتے ہیں اس لیے یہ غیر سیاسی لوگوں میں بھی بہت دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے کیونکہ موضوع کوئی قید نہیں ہے اس لیے اشہب خیال جس طرح کا بھی رخ کرلے عبدالقادر حسن اسی طرف گھوڑے دوڑا دیتے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے مفادات اور خود غرضیوں کے ایندھن سے دہکتی ہوئی سیاست کی آگ پر پانی چھڑکئے یا اسے کچھ دیر کے لیے ڈھانپ دیجئے اور ستار، سارنگی اور طبلے کے سروں اور دھنوں کا ذکر سنئے جو میں نے ابھی ابھی پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں سنی ہیں۔ایک جادو جگایا گیا، طلسمات کی دنیا آباد کی گئی۔ جسم وجاں گداز ہوگئے، پگھل گئے قطرہ قطرہ بن کر جذبات کی تپتی ہوئی لوح پر گرتے رہے۔ مدتوں بعد ستار اور سارنگی کا ملاپ دیکھا، سنا۔ فارسی کا ایک مصرع بار بار یاد آیا

زخمہ برتار رنگ جاں می زنم

ترجمہ نہیں کروں گا یہ صرف اس لیے ہے کہ جو فارسی کے اس آسان مگر پر کیف اور دردناک کیفیت کو

محسوس کر سکتے ہیں کہ ستار کے تاروں کو چھیڑنے پر جب رگ جاں پر ضرب پڑتی ہے تو پھر کیا ہوتا ہے؟ عالی کیف رکھنے والی موسیقی کی محفلیں اب ختم ہو گئیں۔ سازوں سے آشنا ہاتھ گم ہو گئے یا بوڑھے ہو گئے اور وہ آوازیں جوان سازوں سے چمک اٹھتی تھیں اب شاذ ہی سنائی دیتی ہیں۔ میں نے کبھی ایسی آوازیں سنی تھیں۔ لاہور کے باغ جناح تھیٹر میں حیات محمد خان سال بہ سال میٹھے موسم میں یہاں موسیقی کا میلہ منعقد کرتے تھے۔ یہاں میں نے اختری فیض آباد، مختار بیگم، استاد سلامت علی، نزاکت علی اور نہ جانے کن کن استادان فن کی زیارت کی تھی اور رات بھر ایک نہ ختم ہونے والی حیرت کے ساتھ دیکھا تھا۔

پھر میں نے وہ محفل بھی دیکھی تھی جب استاد بڑے غلام علی خان نے مادام نور جہاں کو اپنی شاگردی میں لیا تھا۔ بس یہ ایک رسم سی تھی لیکن خان صاحب پر ایسا موڈ طاری ہوا اور انہوں نے کچھ وقت کے لیے آواز کا ایسا جادو جگایا کہ مادام کے صحن کے پھول اور پتے بھی دم بہ خود ہو گئے اور وہ خود بے سدھ سی ہو گئیں۔

اس سے ایک بہت پرانی یاد تازہ ہوئی۔ وقت کا یہ عظیم موسیقار دو وقت کی روٹی کے لیے لاہور کی ایک معروف مغنیہ عنایت بائی ڈھیرو والی کا استاد بن گیا۔ میں ان دنوں لاہور آیا تو استاد کی تلاش میں اس مغنیہ کے گھر جا پہنچا۔ یہ دونوں موسیقار دو بار میرے گاؤں مجرا کر چکے تھے۔ صرف پانچ سو روپے لاہور آنے جانے کے خرچ کے عوض میں جو کوٹھوں کے آداب اور رسومات سے بالکل نا آشنا تھا اس آراستہ کمرے میں داخل ہو گیا جہاں اس وقت ریاض ہو رہا تھا۔ استاد سارنگی لیے ہوئے تھے اور عنایت بائی گا رہی تھی لیکن غلط گا رہی تھی۔ استاد نے اسے روک کر خود گانا شروع کر دیا اور پھر یہ بھول گئے کہ وہ صرف مغنیہ کی ایک غلطی کو درست کرنے کے لیے صحیح گا کر اسے تعلیم دے رہے ہیں۔ وہ گاتے چلے گئے اور عنایت بائی روتی چلی گئی۔ اس کے پاس ستار تھا جس پر اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں َ کچھ یاد نہیں اس سحر انگیز کیفیت میں کتنا وقت گزر گیا۔ تو اس وقت چونکا جب کسی نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں؟

پھر ان ہی دنوں کی بات ہے کہ خاں صاحب ہیرا منڈی کے چوک میں ایک چوبارے میں مقیم تھے۔ ان کے بھائی استاد برکت علی خاں بھی وہیں تھے۔ ایک بوڑھی طوائف جو غالباً خاں صاحب کی جوانی سے ان کی واقف تھی ایک لڑکا

لے کر حاضر ہوئیں۔ مٹھی سے کچھ رقم نکال کر خاں صاحب کی نذر کی اور عرض کیا کہ اس سے طبلہ سننے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ لڑکے نے جوڑی آراستہ کی اور حضرت امیر خسرو کا ایجاد کیا ہوا یہ ساز بجانا شروع کیا۔ کچھ دیر کے بعد جب لڑکے نے ہاتھ روکا تو بوڑھی طوائف نے خاں صاحب کی طرف دیکھ کر کچھ عرض کرنا چاہا تو انہوں نے کہا ”غلطی تو کبھی کبھار استاد قادر بخش سے بھی ہو جاتی ہے۔ یہ مشق جاری رکھے۔“

یہ اذن پا کر طوائف کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ دعائیں دیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی لیکن خاں صاحب نے اسے بٹھالیا اور جوانی کی باتیں شروع کر دیں کہ جب وہ بوسکی کا کرتہ پہن کر بازار سے گزرتے تھے تو ان کے معاصرین ان سے کتنا جلتے تھے۔ صدقے جاؤں آپ کے اس عہد جوانی کے اور ان محفلوں کے جن میں آپ کے سامنے کسی کو بلند آواز سے بات کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی اور بڑے بڑے آپ سے اجازت لے کر گانا شروع کرتے تھے۔

یہ باتیں سنتے ہوئے خاں صاحب گنگنانے لگے اور پھر سر منڈل اٹھا کر گانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک دوسری کوٹھری سے آواز آئی ”او اُلو کے پٹھے۔“

خاں صاحب نے پھر سر لگایا مگر جواب نہ ملا۔ دو تین بار سر بدلنے کے بعد اس کوٹھری سے ”ہوں“ کی آواز آئی

تب خاں صاحب نے راگ کے اگلے سروں کو چھیڑا۔ یہ ان کے والد اور استاد کی آواز تھی۔

یہ موسیقی کے درویش لوگ تھے۔ ہانڈی کے ڈھکن پہ گھی اور مرچ مسالا بازار سے لایا جاتا تھا۔ گوشت کے چند ٹکڑے اور تھوڑی سی سبزی، سالن تیار ہوتا تو تنور سے روٹی آتی اور موسیقی کے یہ بادشاہ کھانا کھاتے۔ البتہ رات کے کھانے سے پہلے خاں صاحب کچھ شغل کرتے اور اس دوران میں عموماً اپنے گانے کے پرانے معرکوں کا ذکر کرتے اور نوابوں، مہاراجوں کا جوان کو انعامات سے بھر دیا کرتے تھے۔ وہ بیش قیمت انعامات آواز کی طرح ہواؤں میں اڑا دیئے گئے۔ سوائے اس ایک قیمتی انگوٹھی کے جو خاں صاحب کی ایک انگلی میں موجود تھی اور جس پر ان کے کسی شاگرد کی نظر ضرور ہو گی کہ وہ کب اس سے خوش ہوتے ہیں۔

جید موسیقاروں کا یہ سنہری سلسلہ اب قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔ صرف ان کی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔ کبھی کبھار کوئی آواز سنائی دے جاتی ہے اور کبھی کسی ساز سے کوئی نغمہ پھوٹ پڑتا ہے لیکن اسے نہ کوئی سننے والا ملتا ہے اور نہ کوئی سمجھنے والا۔ ریڈیو ان لوگوں کی مستقل سیوا کرتا تھا پھر ٹی وی آیا تو ان لوگوں کو اس چھوٹی اسکرین پر بھی کام ملتا رہا۔ دو وقت کی روٹی تو کیا چلتی کچھ نہ کچھ مدد ہو جاتی تھی مگر اب موسیقی ہی بدل چکی ہے۔ سر کی اس نئی دنیا میں ان پرانے لوگوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ حیرت ہوئی جب ٹی وی کا یہ پروگرام دیکھا۔

از کجا می آید ایں آواز دوست۔

یہ عبدالقادر حسن کی کچھ یادیں ہیں۔ بہت باذوق انسان ہیں مگر صحافت کے خار زار میں پہنچ کر بڑے بڑے لہولہان ہو جاتے ہیں اور پھر خاص طور پر کالم نگار جنہیں ہر روز کالم لکھنا پڑتا ہے اور عموماً حالات حاضرہ، سیاسی امور اور ''سیاست والوں کے تذکرے کے بعد یہ مختصر کالم ختم ہو جاتا ہے۔

عبدالقادر حسن کو موسیقی سے رغبت ہے۔ کلاسیکی ادب کے بھی شائق ہیں۔ انہوں نے جوانی میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی جب کہ لوگ ان کو مردہ اور بے کار زبانیں سمجھ کر انگریزی کو اپنا قبلہ بنا رہے تھے۔ اب تو نہ ایسی محفلیں ہیں اور نہ ہی فراغت۔ وہ دن گئے جب ان محفلوں کے لیے ہم سب کے پاس وافر وقت ہوا کرتا تھا۔ ہر نمائش ہر مشاعرہ، موسیقی کی ہر محفل، ادبی مجالس میں حاضری دینا فرض سمجھ کر ادا کیا جاتا تھا۔ اچھی کتابیں تلاش کرنا اور ان کا مطالعہ کرنا زندگی کی ایک بنیادی ضرورت تھی۔ اچھی فلمیں دیکھنا سب سے بڑی تفریح تھی۔ پرانی کتابوں کی دکانوں پر گھنٹوں مطلب کی کتابیں تلاش کرتے تھے۔ کئی کئی کتابوں کا تو وہیں کھڑے کھڑے مطالعہ کر ڈالتے تھے۔ خصوصاً نئی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا یہ ایک پسندیدہ طریقہ تھا۔ قیمتی کتابوں کو خریدنے کی استطاعت نہیں تھی حالانکہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ روپے میں کوئی کتاب مل جایا کرتی تھی مگر جب کتابوں کے ڈھیرے بھری ہوئی دکانوں میں ہر موضوع پر بے شمار کتابیں موجود ہوں فیصلہ کرنے کا حوصلہ نہ ہو اور اتنی بہت سی کتابیں دامن دل کھینچ رہی ہوں تو پھر یہ بھی

ایک طریقہ تھا مطالعہ کرنے کا۔ان دنوں پرانی کتابوں کی دکانوں پر بہت سے بزرگوں اور پرانے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی تھی مگر علیک سلیک کے علاوہ بات کرنے کی فرصت نہ ہوتی تھی۔ نئی کتابوں کی دکانوں کے اندر قدم رکھنے کے لیے بڑے حوصلے اور دل گردے کی ضرورت تھی۔

دراصل یہ صبر اور برداشت کی آزمائش کا مرحلہ ہوتا تھا۔خدا جانے اور کتنی نئی کتابیں آگئی ہوں گی جنہیں پڑھنے کو دل بھی مچلے گا مگر وہاں سے خالی ہاتھ لوٹنا ہوگا۔دراصل یہ کتابوں کی ونڈو شاپنگ ہوا کرتی تھی پھر چائے خانوں میں بیٹھ کر کتابوں، فلموں، نمائشوں، موسیقی اور ادب کے بارے میں بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔چائے کا ہاف سیٹ منگا کر کسی بھی ریستوران میں بلا شرکت غیرے قبضہ ہو جایا کرتا تھا۔نہ ہوٹل کا مالک گھورتا اور بڑبڑاتا تھا نہ بیرا منہ بناتا تھا ایک کے بعد ایک کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور اسی مناسبت سے ہاف سیٹ چائے کے آرڈر بھی چلتے رہتے تھے۔اس زمانے میں ریستورانوں کے مالک اور ویٹر بھی علم پرور اور ادب دوست تھے۔ان کے لیے یہی امر باعث فکر تھا کہ ایسی بلند پایہ علمی و ادبی ہستیاں انکے ریستورانوں میں آتی ہیں۔موقع پا کر وہ لوگ بھی ان کی باتوں سے استفادہ کر لیا کرتے تھے۔اگر جیب میں پانچ روپے ہوتے تو سارا دن چائے خانوں میں گزارا جا سکتا تھا مختلف ریستورانوں میں مختلف نرخ تھے۔کہیں چائے کی پیالی دو آنے میں، کہیں ایک آنے میں مل جاتی تھی۔

ہاف سیٹ چائے چار سے چھ آنے تک اچھے ریستورانوں میں فراہم کی جاتی تھی۔شیزان جیسے بورژوا اور اعلیٰ پائے کے انگریزی ریستورانوں میں جو کہ بہت مہنگا سمجھا جاتا تھا آٹھ آنے پر ہیڈ چائے ملا کرتی تھی۔ایک چائے منگوایئے اور چاہے جب تک بیٹھے باتیں کرتے رہیے۔تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ویٹر کو اشارہ کیجئے وہ چائے دانی میں تازہ چائے اور دودھ دانی میں گرم دودھ لے کر آتا تھا۔دراصل اس زمانے میں دیال سنگھ منیشن میں شیزان کا نام ہی مرعوب کرنے کے لیے کافی تھا۔ہماشما کو تو اندر داخل ہونے کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ حالانہ حساب لگایا جائے تو یہ ریستوران مہنگا نہیں تھا۔اگر آپ دو گھنٹے وہاں بیٹھیں اور چار پانچ مرتبہ تازہ چائے طلب کریں تو حساب لگالیجئے کہ چائے کی ایک پیالی کتنے میں پڑ جاتی ہو گی پھر انتہائی مہذب، شائستہ اور رکھ رکھاؤ رکھنے والے لوگوں کی وجہ سے مثالی ماحول۔کیا مجال جو کوئی

بلند آواز میں بات کرے۔ صرف بھنبھناہٹ سی سارے ہال میں سنائی دیتی تھی کبھی کبھی کسی قہقہے کی آواز بلند ہو جاتی تھی تو سب گردنیں موڑ کر دیکھنے لگتے کہ یہ کون بد تمیز ہے۔ یہاں کھانسی کے وقت منہ پر ہاتھ رکھ لینا اور جمائی کے بعد ''سوری'' کہنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ریستوران مکمل ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ خوشبو سے مہکتا رہتا تھا جسمیں چائے، کافی سگریٹ، سگار اور پائپ کے تمباکو کی آمیزش سے ایک عجیب قسم کی خوشبو پیدا ہو جاتی تھی۔ غسل خانے اتنے صاف اور چمک دار کہ فرش پر بھی اپنا منہ دیکھ لیجئے۔ ایک جانب چھوٹی سی تپائی دھری ہوئی جس پر جوتا صاف کرنے کا برش بھی رکھا ہوتا تھا۔ عموماً ہر آنے والا پہلے غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھو کر فریش اپ ہوتا۔ ساتھ ہی اپنے جوتے کو بھی چمکاتا۔ جیب سے کسی امپورٹڈ، خوشبو کی چھوٹی شیشی نکال کر خوشبو لگاتا اور پھر اپنے من پسند اور ہم خیال دوستوں کی میز پر جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ شیزان کونٹی نینٹل تھا۔ چائے خانوں کی اس زمانے میں لاہور میں بہتات تھی۔ اس کے باوجود تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد نئے ریستوران کھلتے رہتے تھے۔ اہل ذوق اس کا جائزہ لینے کے لیے پہلے یا دوسرے روز ہی وہاں جانا واجب سمجھتے تھے مگر اپنے پرانے ٹھکانے کوئی نہیں چھوڑتا تھا۔ مال روڈ پر کافی ہاؤس، پاک ٹی ہاؤس، کیفے اورینٹ چائنیز لنچ ہوم کے عادی لوگوں کا بھلا نئے ریستورانوں میں کس طرح دل لگ سکتا تھا۔ ان ریستورانوں میں غیر محسوس اور غیر شعوری طور پر مختلف شفٹوں میں لوگ آیا کرتے تھے۔ صبح دس گیارہ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک مختلف لوگوں کی آمد کے اوقات تھے جو اپنے اپنے گروپ میں بیٹھ کر گپ شپ اور تبادلہ خیال میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں ہوٹل بازی تفریح کے ساتھ ساتھ تحصیل علم کا ذریعہ بھی تھا کہ بڑے بڑے دانش ور، اساتذہ، شاعر، ادیب، نقاد، سیاست داں، موسیقار، گلوکار اور صحافی یہاں اکٹھے ہو کر مختلف موضوعات کے بارے میں جب باتیں کرتے تو جیسے دبستاں کھل جاتا۔

چھوڑیئے کہاں تک پرانے وقتوں کے نوحے روئے جائیں۔ اب تو اس کے لیے بھی وقت اور فرصت نہیں ہے۔

کسی زمانے میں الزبتھ ٹیلر کے۔۔۔ نت نئے اسکینڈلز اور شادیوں کے بارے میں خبریں آتی تھیں جو ان کی فلموں سے زیادہ توجہ اور دلچسپی کا سبب بن جاتی تھیں۔ یوں بھی ان کی فلموں کی رفتار اتنی نہ تھی جتنی کہ ان کے اسکینڈلز اور

شادیوں کی۔اب وہ ۶۸ سال کی ہو چکی ہیں۔ سدا بیمار رہیں لیکن کیا مجال جوان کے مشاغل میں کوئی فرق آیا ہو۔ طویل بیماریوں اور زمانے کی رفتار نے بالآخر انہیں بوڑھا کر دیا۔اس کا اندازہ یوں ہوا کہ اب ان کے اسکینڈلز کا کوئی ذکر سننے میں نہیں آتا۔ شادی کے بارے میں بھی بالآخر انہوں نے خود ہی '' ہینڈز اپ'' کر دیئے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کا یہ بیان پڑھ کر بہت حیرت اور مایوسی ہوئی کہ اب وہ مزید شادی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتیں۔ایک زمانے میں انہوں نے شادیوں اور طلاقوں کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔انہوں نے آٹھ باقاعدہ شادیاں کیں جن سے ایک پرانے اداکار رچرڈ برٹن سے دوبارہ کی۔اب وہ فلاحی کاموں کے حوالے سے خبروں میں آتی ہیں۔ان کو اللہ نے سبھی کچھ دیا۔ شہرت، دولت مقبولیت، حسن وجمال، دنیاوی نعمتوں کی ان کے پاس کبھی کمی نہیں رہی یہاں تک کہ شوہروں تک کی قلت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ شادیوں کے معاملے میں انہوں نے ہاتھ کھینچ کرر کھا ورنہ ان کے رومانوں کو شمار کیا جائے اور اگر اپنے ہر محبوب سے وہ شادی کر سکتیں تو خدا جانے یہ تعداد کہاں تک جا پہنچتی۔

الزبتھ ٹیلر نے ''ایڈز'' کے خلاف جنگ کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس جان لیوا بیماری نے دنیا بھر میں بنی نوع انسان کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کے چند قریب ترین دوست اور رفقائے کار اس موذی مرض میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ویسے بھی اہل مغرب کی اور خصوصاً وہاں کے پیسے والے اور نامور لوگوں کی یہ خوبی قابل رشک ہے کہ وہ فلاحی کاموں میں نہ صرف بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں بلکہ اپنی جیب سے بھی بہت کچھ دیتے ہیں۔اس معیار پر پرکھا جائے تو ہمارے اور ان کے امیروں اور فن کاروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ لوگ اپنے مال و دولت سے ضرورت مندوں اور مستحقین کی مدد بھی کرتے ہیں۔ بیماریوں کی تحقیقات کے لیے فلاحی ادارے قائم کرتے ہیں، درسگاہیں اور میوزیم قائم کرتے ہیں مانا کہ ہمارے فن کاروں کے مقابلے میں ان کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہوتی ہے لیکن ہمارے فن کار اپنی حیثیت اور آمدنی کے مطابق تو بھلائی کے کاموں کے لیے تھوڑی بہت رقم نکال سکتے ہیں مگر افسوس کہ یہ بھی شاذ و نادر ہی سننے میں آتا ہے۔ فلاحی اور امدادی کاموں میں شرکت کے لیے بھی یہ معاوضے وصول کر لیتے ہیں۔ کوئی بہت زیادہ غنی ہوا تو وہ معاوضہ نہیں لیتا مگر آمدورفت کا فرسٹ کلاس کا ایئر ٹکٹ اور فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام وطعام کا مطالبہ ضرور

کرتا ہے۔ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ شاید الزبتھ ٹیلر کے بہت سے گناہ توان کے فلاحی اور انسانی ہمدردی کے کاموں کے صلے میں معاف ہو جائیں گے۔اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں ہے۔نہ جانے اسے کس بندے کی کون سی نیکی پسند آجائے اور وہ اس کی بخشش کر دے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے مولویوں اور اسلام کی تبلیغ کرنے والے اداروں نے حقوق اللہ پر بہت زور دیا ہے بلکہ جنت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بہت سے من گھڑت شارٹ کٹ بھی بتاتے رہتے ہیں مثلاً فلاں دن عبادت کرنے سے ستر ہزار نفلوں کا ثواب مل جاتا ہے یا فلاں آیت یا درود شریف پڑھنے سے نہ صرف تمام مشکلات آسان ہو جاتی ہیں بلکہ جنت کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔کم علم اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کی اکثریت مولوی صاحب کی اس قسم کی تاویلیں سن کر جنت کے لیے بکنگ کرا لیتی ہیں اور حقیقی اسلام کی روح سے نابلند ہی رہتی ہے۔ایک اور بہت بڑی کمی اور قباحت یہ ہے کہ ہمارے علماء سارا زور کلام حقوق اللہ پر ہی صرف کر دیتے ہیں۔ حقوق العباد اور بنیادی تہذیب و شائستگی کے آداب پر توجہ نہیں دیتے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ حقوق العباد کو اسلام میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔یہاں تک کہ فرمایا گیا ہے کہ میرے گناہ تو میں معاف کر سکتا ہوں لیکن مخلوق کے ساتھ کیے جانے والے ظلم و ناانصافی کو معافی اور درگزر وہی شخص کر سکتا ہے جو اس کا نشانہ بنے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری اکثریت بنیادی اخلاقی قدروں اور انسانی ہمدردی کے جذبوں سے تہی دامن ہے۔نماز، روزہ، حج، عمرہ، مزارات کی زیارت اور کسی حد تک زکوۃ کے بعد ایک عام مسلمان خود کو جنت کا حق دار سمجھنے لگتا ہے۔

اس کے برعکس مغرب میں معیار مختلف ہے۔مذہبی عبادات پر عمل کرنے والوں کی تعداد وہاں اتنی زیادہ نہیں ہے لیکن جہاں تک اخلاق و شائستگی اور بنیادی انسانی ہمدردی کا تعلق ہے وہ لوگ ہم مسلمانوں سے کہیں بہتر ہیں۔ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں۔ مصیبت زدوں سے ہمدردی کا اظہار اور ان کی امداد کرتے ہیں۔روز مرہ زندگی میں عموماً سچ بولتے ہیں۔ صاف گو ہیں، دھوکا اور فریب سے اجتناب کرتے ہیں۔دنیا بھر کے غریبوں، ناداروں، مصیبت زدگان اور بھوکوں کے لیے یورپ کے ملکوں میں باقاعدگی سے چندہ جمع کیا جاتا ہے۔دکانوں میں دنیا کے مختلف ممالک کے ضرورت مندوں کی امداد کے صلے میں چندے کے ڈبے رکھے ہوئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی ان میں سکے ڈالتے رہتے ہیں۔اس طرح انہیں انسانوں سے ہمدردی اور ان کے دکھوں کا مداوا کرنے کا سبق سکھایا جاتا

ہے۔اس بر عکس ہمارا آپ کا تجربہ اور مشاہدہ اس سے مختلف ہے۔ ہم مسلمان ہونے کے باوجود بنیادی اسلامی قدروں سے ناواقف اور ان کی طرف سے قطعی بری الذمہ ہیں۔ ہمارے ذاتی کردار پر مذہبی عبادات کا کوئی اثر نظر نہیں آتا بلکہ اکثر اس کے بر عکس ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ہماری تبلیغی جماعتوں سے وابستہ اصحاب حقیقتاً تبلیغ کے لیے اپنا قیمتی وقت وقف کرتے ہیں لیکن ان کی تبلیغ محض عبادات اور رسومات کی حد تک ہوتی ہے۔بنیادی انسانی کردار کی بہتری کے لئے وہ اپنی جدوجہد سے تبلیغ نہیں کرتے اور پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ مسلمانوں میں اسلام کی تبلیغ کرنے پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے۔اگر یہی وقت غیر مسلموں میں تبلیغ کرنے پر صرف کیا جائے تو یہ ایک موثر نتیجہ خیز اور با مقصد کام ہو سکتا ہے۔سب سے بڑھ کر ہمارا کردار ہے۔رسول اکرم ﷺ نے اپنے کردار سے لوگوں کو متاثر کیا تھا لیکن آج کے معاشرے میں کردار پر خاص توجہ نہیں دی جاتی۔اگر تبلیغ کرنے والا بذات خود ایک مثالی کردار کا مالک نہ ہوگا تو اس کی تبلیغ رائیگاں ہی جائے گی یا کم از کم اس کا اثر بہت کم ہوگا۔

مغربی فنکار ہماری اخلاقی اور مذہبی قدروں پر مطلق پورے نہیں اترتے لیکن انسانوں سے ہمدردی، محبت اور ان کے دکھوں کو دور کرنے کا جذبہ ان میں شدت سے موجود ہے۔ہمارے خیال میں وہ گناہوں کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں اور روز بروز دھنستے ہی جا رہے ہیں لیکن ان کی نیکیوں سے مفر ممکن نہیں ہے۔اس کی ایک مثال الزبتھ ٹیلر بھی ہیں۔

الزبتھ ٹیلر نے زندگی میں وہ سب کچھ کیا جسے ہم ”گناہ کبیرہ“ قرار دیتے ہیں مگر وہ نیکی کے کاموں میں مصروف رہیں۔ اب اپنی باقی ماندہ زندگی انہوں نے خدمت خلق کے لیے ہی وقف کر دیا ہے۔ہمارے محاورے کے مطابق یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ”نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی“ چوہوں کی گنتی تو مشکل ہے لیکن

دل بدست آور کہ حج اکبر است

کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو گناہوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے نیکیاں بھی سمیٹی ہیں۔

الزبتھ ٹیلر نے دنیا میں جو چاہا حاصل کر لیا۔ انہیں جوانی کے زمانے میں دنیا کی حسین ترین عورت کہا جاتا تھا اور یہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ الزبتھ ٹیلر فلموں میں کیمرے کی نظر سے جتنی حسین نظر آتی ہیں ذاتی زندگی میں اس سے کہیں زیادہ حسین اور دلکش ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے فرصت میں بیٹھ کر انہیں بنایا ہے۔ اپنے اسی حسن و جمال اور رعنائی و کشش کے باعث انہوں نے ایک عالم کو اپنا گرویدہ کیے رکھا۔ ایک طویل عرصے تک وہ محض اپنی خوب صورتی کے سہارے ہالی ووڈ کی سپر اسٹار کہلاتی رہیں۔ ان کی اداکاری میں پختگی تو بہت بعد میں پیدا ہوئی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اداکاری کے گر انہیں ان کے ''دوبار شوہر'' رچرڈ برٹن نے سکھائے تھے۔

رچرڈ برٹن بذات خود اسٹیج اور فلم کے بے بہا اداکار تھے ان کے ساتھ منسوب ہونے کے بعد الزبتھ ٹیلر کی اداکاری میں نکھار پیدا ہو گیا اور وہ صحیح معنوں میں اسٹار کے بجائے اداکارہ بن گئیں۔ انہوں نے اپنی اداکاری کے اختتامی دور میں آسکر ایوارڈ حاصل کئے اور نقادوں سے یہ منوالیا کہ وہ واقعی اداکارہ بن گئی ہیں۔

الزبتھ ٹیلر کی ۳۵ سال کم عمر کے شوہر سے شادی غالباً ان کا آخری تجربہ تھا۔ اب تو انہوں نے پچھلے دنوں خود اعلان کر دیا ہے کہ اب میں شادی نہیں کروں گی۔ رہی دوستی تو ان کے ایک دو انتہائی قریبی دوست آج بھی ان کے ہم جلیس نظر آتے ہیں۔ تنہائی کے مارے ہوئے مغربی معاشرے میں اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ سوشل سسٹم چاہے جتنا بھی بدل جائے انسانی فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ انسان ایک ''حیوان مجلسی'' ہے۔ یہ بالکل تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اب ان کی زندگی کا صرف ایک مقصد اور واحد مشن ''ایڈز'' کے خلاف جنگ ہے۔ وہ صرف اسی مقصد کے لیے تقریبات میں شرکت کے لیے گھر سے باہر نکلتی ہیں اور ایڈز کے موضوع پر تقاریر کرتی رہتی ہیں۔ اپنی گرہ سے بھی دیتی ہیں اور مختلف طریقوں سے چندہ بھی جمع کرتی ہیں۔ ''ایڈز'' کے لیے ریسرچ کے سلسلے میں انہوں نے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ ''الزبتھ ٹیلر ایڈز فاؤنڈیشن'' بھی موجود ہے۔ اس ادارے کے ذریعے وہ اب تک دنیا بھر میں کروڑوں اربوں ڈالر تقسیم کر چکی ہیں۔ پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ ''ایڈز'' کے خلاف ایک موثر

علاج دریافت کرلیا گیا ہے۔ آئندہ تین برس میں ''ایڈز'' کی موثر اور کار گردوائی بازاروں میں دستیاب ہونے لگے گی۔ اگر ایسا ہوا اور خدا کرے کہ ایسا ہو جائے تو اس میں ہالی ووڈ کی ایک ہیروئن الزبتھ ٹیلر کا بھی حصہ ہو گا۔

الزبتھ ٹیلر کی زندگی بھی عجیب ہی ہے۔ وہ پیدائشی خوب صورت ہیں۔ یوروپین بچے عموماً بہت پیارے ہوتے ہیں مگر جب الزبتھ ٹیلر پیدا ہوئیں تو اس بچی کے حسن وجمال کو دیکھ کر خود یوروپین بھی دنگ رہ گئے۔ اتنی خوب صورت بچی بہت کم دیکھنے میں آئی تھی۔ الزبتھ ٹیلر کے والدین امریکی تھے لیکن خود ان کا جنم لندن میں ہوا تھا۔ ۲۷ فروری ۱۹۳۲ء کو مسٹر فرانس اور ان کی بیگم مسز سارہ کے گھر ایک بچی نے جنم لیا جس کا نام الزبتھ رود منڈ ٹیلر رکھا گیا۔ ان کے والد کی لندن میں ایک آرٹ گیلری تھی اور ان کی والدہ اداکارہ رہ چکی تھیں۔ گویا فن کاری انہیں ماں باپ سے ورثے میں ملی ہے۔

الزبتھ ٹیلر نے بارہ سال کی عمر میں ۱۹۴۴ء میں ایک فلم ''نیشنل ویلویٹ'' میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ کہانی ایک نوعمر لڑکی کے عزم کی داستان ہے جو شہسواری میں اول نمبر حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگا دیتی ہے اور بالآخر اس مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ بارہ سال کی عمر میں ایک ماہر شہ سوار بننے کے لیے الزبتھ ٹیلر نے گھڑ سواری کی زبردست تربیت حاصل کی تھی لیکن یہ ان کی پہلی فلم نہیں تھی ان کی پہلی فلم ۱۹۴۲ء میں بنی تھی۔ اس سے پہلے ۱۹۳۹ء میں ان کے والدین لندن سے منتقل ہو کر کیلی فورنیا چلے گئے تھے اور یہیں سے الزبتھ کی اداکاری کا آغاز ہوا تھا۔ ان کی اداکاری اور خوب صورتی کو دیکھ کر ایم جی ایم جیسے ممتاز فلم ساز ادارے نے ان کے ساتھ معاہدہ کر لیا تھا۔ ایم جی ایم اس زمانے میں ہالی ووڈ کا سب سے بڑا اسٹوڈیو تھا۔ دو سال تک وہ مختلف چھوٹے کردار ادا کرتی رہیں۔ ۱۹۴۴ء میں ''نیشنل ویلویٹ'' میں انہوں نے مرکزی کردار ادا کیا اور کامیابی کی سند حاصل کرلی۔ بارہ سال کی عمر میں اداکاری کی سند حاصل کرنے والی اس نوعمر بچی کو خیال تک نہ تھا کہ وہ ہمیشہ کیلیے اداکاری کو اپنا رہی ہے۔ ابتدائی سالوں میں وہ فلموں میں اداکاری کو محض ایک تفریح سمجھتی تھیں لیکن جب انہیں بطور پیشہ وار اداکارہ کام کرنا پڑا تو ان پر یہ تلخ حقیقت آشکار ہوئی کہ ''چائلڈ اسٹار'' ہونا کتنا مشکل کام ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا کسی کو چائلڈ اسٹار نہ بنائے۔ اس

طرح بچے کا بچپن گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ الز ٹیلر کو اپنے والدین سے، فلم والوں سے اور عوام سے شکایت ہے کہ ان سب نے انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ والدین اور اسٹوڈیو نے پیسے کمانے کیلیے اور پبلک نے تفریح کے لیے استعمال کیا۔ اس کے بعد میڈیا کی باری آئی۔ اخبار اور ٹیلی ویژن والے الزبتھ ٹیلر پر ٹوٹ پڑے اور اس کی معصومیت اور خوب صورتی کو اپنی کاروباری کامیابی کا ذریعہ بنا لیا۔ آگے چل کر الزبتھ ٹیلر نے جس طرح دوسروں کو استعمال کیا غالباً یہ بچپن کے اسی تلخ تاثر کا ردعمل ہے۔

لز ٹیلر کو بچی سے نوعمر لڑکی اور نوعمر لڑکی سے ایک بھرپور نوجوان لڑکی بننے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ ممکن ہے یہ ماحول کا اثر ہو یا پھر تجربات یا مشاہدات نے اسے وقت سے پہلے بالغ کر دیا ہو۔ ایم جی ایم کے ایک ڈائریکٹر ہک مین کے بقول ”ہمیں تو احساس ہی نہیں ہوا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کس وقت لز بچی کی جگہ ایک ”انتہائی خوب صورت عورت بن گئی۔“

لز ٹیلر کو اپنے حسن و جمال کے باعث بہت جلدی اور بہت زیادہ پذیرائی مل گئی۔ اس کے بعد شادیوں اور اسکینڈلز کا دور شروع ہوا۔ اس کی وجہ سے بھی اس کے گلیمر، شہرت اور مقبولیت میں بے انتہا اضافہ ہوا۔ خدا جانے یہ سب کچھ وہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کرتی تھی یا غیر ارادی طور پر اسکینڈلز اور رومان اس کی زندگی میں جگہ حاصل کر لیتے تھے۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۵۰ء میں وہ ایک بہت بڑی باکس آفس اسٹار بن گئی جس کا نام دیکھ کر ہی پبلک سینما گھروں پر ٹوٹ پڑتی تھی۔ اس کی ہم عصر بہت سی اعلیٰ پیمانے کی اداکاروں کے مقابلے میں لز ٹیلر کی مقبولیت کم نہ تھی اور یہ سب گلیمر اور اسکینڈلز کے باعث ممکن ہوا تھا۔ اس نے بدنامیوں کے سہارے اپنی شہرت اور مقبولیت کو معراج تک پہنچا دیا اور اس شعر کو درست ثابت کر دیا کہ

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

بدنامی اور شہرت لز ٹیلر کی ہمیشہ ہم سفر اور ہم قدم رہی۔ اس کی ذاتی زندگی کی رنگین داستانیں عام لوگوں میں اس کی فلموں کی کہانیوں سے زیادہ مقبول ہو گئیں تھیں مگر لز ٹیلر کو اس کی پروا نہیں تھی۔ اس نے زندگی کامیابی سے بسر کرنے کا گر سیکھ لیا تھا۔

اتفاقات نے بھی لز ٹیلر کی بہت مدد کی۔ ۱۹۵۰ء میں اس نے ہلٹن ہوٹلز کے مالک نکی ہلٹن سے شادی کی اور ہر طرف اس کا چرچا ہو گیا۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ اسی سال اس کی فلم ''فادر آف دی برائڈ'' نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اس حسن اتفاق نے اس فلم کی کامیابی اور لز ٹیلر کے لیے ''دو آتشہ'' کا کام کیا۔ یہ لز ٹیلر کی پہلی شادی تھی مگر اس سے پہلے اس کے لاتعداد اسکینڈلز اور رومانس ساری دنیا کو زبانی یاد ہو چکے تھے۔ لز نے زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ اپنے ابتدائی تجربات کے بعد ہی سیکھ لیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ دنیا تمہیں اپنے مطلب کے لیے استعمال کرتی ہے تم بھی اپنے مطلب کے لیے دوسروں کو استعمال کرو اور اس نے اپنے اس اصول پر حرف بہ حرف ساری زندگی عمل کیا۔ اس نے جس طرح مختلف مردوں سے مراسم استوار کیے اور انہیں جس بے پروائی بلکہ بے دردی سے ختم کر دیا اس سے تو یوں لگا ہے جیسے اس کے سینے میں دل ہی نہ تھا اور نہ ہی احساس و جذبات۔ وہ مختلف لوگوں کو کھلونوں کی طرح استعمال کرتی رہی۔ جو پسند آیا حاصل کر لیا۔ جب دل بھر ا پھینک دیا۔ اس کی تمام زندگی ایسے ہی واقعات سے عبارت ہے۔ اگرچہ اس کا بیان یہ ہے کہ اس نے ساری زندگی میں صرف ایک شخص سے عشق کیا تھا اور وہ فلم ساز مائیک ٹوڈ تھا۔ وہ بہت نامور امیر کبیر اور سخت گیر آدمی تھا۔ اس کی فلم ''اراؤنڈ دی ورلڈ ان ۸۰ ڈیز'' نے اتنی کامیابی حاصل کی تھی کہ دوسرے فلم ساز اس پر رشک کرتے تھے۔ وہ اچانک ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ اس سفر میں لز ٹیلر بھی اس کے ہمراہ جانے والی تھی مگر عین وقت پر یہ پروگرام تبدیل ہو گیا۔ اللہ کی مصلحتیں وہی جانتا ہے۔ مرنے اور جینے کا بہانہ بنا دیتا ہے۔

مائک ٹوڈ کے بارے میں لز کا کہنا تھا کہ اسے صحیح معنوں میں اس سے عشق تھا۔ مائک ٹوڈ نے اس کو قیمتی تحائف سے لاد دیا تھا۔ اس کی ہر خواہش اور فرمائش پوری کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ مجھے صحیح معنوں میں اداکار رچرڈ برٹن

سے عشق تھا۔ اس سے لز نے دو بار شادی کی اور دونوں بار طلاق ہو گئی۔ بہر حال یہ بھی ایک علیحدہ داستان ہے۔

لز کی پہلی شادی ۱۸ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ انتہائی دولت مند دولہا اور اتنی ہی مشہور و مقبول دلہن۔ دنیا بھر میں ہلچل مچ گئی۔ اس کی فلم ''فادر آف دی برائیڈ'' ریلیز ہونے والی تھی۔ اس شادی کو فلم اسٹوڈیو والوں نے بھی خوب استعمال کیا۔ اس کا دلہن کا زرق برق لباس اور پھولوں کی سجاوٹ اسٹوڈیو کے ذمے تھی۔ اسٹوڈیو نے اس شادی سے خوب فائدہ اٹھایا۔

یہ شادی بھی محبت کی شادی تھی لیکن صرف چھ ماہ تک ہی قائم رہی چھ ماہ بعد طلاق ہو گئی اور مقامی قانون اور دستور

کے مطابق ایک ارب پتی شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے نتیجے میں لز کے حصے میں کروڑوں ڈالر آئے۔ شاید یہ تجربہ لز کو پسند آ گیا۔ اس کے بعد رومانس کے درمیانی وقفوں میں اس نے شادیوں اور طلاقوں کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ یوں وہ دونوں ہاتھوں سے بیش قیمتی تحائف اور دولت سمیٹتی رہی۔

اس طلاق کے چھ ماہ بعد ہی لز کو برطانوی اداکار مائیکل وائلڈ نگ سے سچی محبت ہو گئی۔ یہ محبت اتنی شدید تھی کہ فوراً چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا۔ ۱۹ سال کی عمر میں لز نے دوسری شادی کر لی۔ اس شادی کی بھی خوب دھومیں پٹیں۔ میڈیا اور فلم اسٹوڈیو والوں کے مزے آ گئے۔ اس شادی سے لز ٹیلر کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ایک مائیکل اور دوسرا کرسٹوفر لیکن شادی اور بچوں کی پیدائش کا لز کی مقبولیت اور کامیابی پر ذرا بھی اثر نہ پڑا۔ وہ اب ایک مانی ہوئی سپر اسٹار بن چکی تھی۔ اس کی یہ حرکت اور ہر ادا اسکے پرستاروں کو پسند تھی۔

۱۹۵۵ء میں لز نے فلم ''دی جائنٹ'' میں راک ہڈسن اور نو عمر باغی اداکار جیمز ڈین کے ساتھ کام کیا اور ان دونوں کے ساتھ جذباتی اور رومانوی تعلق قائم کر لیا۔ یہ فلم بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ جیمز ڈین کا ایک حادثے میں عین نوجوانی میں ہی انتقال ہو گیا۔ راک ہڈسن کے ساتھ لز کی دوستی قائم رہی لیکن شادی کی نوبت نہ آ سکی۔ کئی سال بعد راک ہڈسن کا انتقال ہوا تو یہ معلوم ہوا کہ وہ ''ایڈز'' میں مبتلا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ شادی نہ ہونے کا سبب یہ بھی ہو۔

لز نے ''ایڈز'' کے خلاف جو مہم شروع کی تھی اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے راک ہڈسن کی المناک موت کا بھی ہاتھ ہے۔ راک ہڈسن سے لز ٹیلر کی دوستی اس کے مرنے تک قائم رہی اور اس کی موت کے بعد بھی ''ایڈز'' کے خلاف مہم کی صورت میں وہ اس دوستی کو نبھا رہی ہے۔

۱۹۵۶ء میں مائیکل وائلڈ نگ اور لز کی طلاق ہو گئی۔ اس طلاق سے بھی لز کی بچوں کے علاوہ کافی ''مال دولت'' ہاتھ آیا۔ طلاق کو مشکل سے ایک سال گزرا ہو گا کہ لز کو فلم ساز مائیک ٹوڈ سے عشق ہو گیا اور ۱۹۵۷ء میں ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ مائیک ٹوڈ اور لز ٹیلر کی شادی کے نتیجے میں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام لیزا ہے۔ قدرت کو یہ ملن زیادہ دیر تک منظور نہ تھا۔ ایک سال بعد ہی مائک ٹوڈ فضائی حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ لز ٹیلر کو اس حادثے کا اتنا صدمہ تھا کہ وہ سوگ میں اپنے گھر میں بند ہو کر بیٹھ گئی۔

مائک ٹوڈ کے قریب ترین دوست اداکار و گلوکار ایڈی فشر نے اس زمانے میں غم گساری کی۔ ایڈی فشر نہ صرف مائیک ٹوڈ کا قریب ترین دوست تھا بلکہ اس کی بیوی اور اداکارہ ڈیبی رینالڈز لز ٹیلر کی بہترین دوست تھی۔ ایڈی فشر اور ڈیبی رینالڈز کی شادی محبت کی شادی تھی۔ ایڈی فشر لز ٹیلر کا غم غلط کرنے کی کوشش میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ دنیا یہ جان کر حیران رہ گئی جب اچانک معلوم ہوا کہ لز ٹیلر نے ایڈی فشر سے شادی کر لی ہے۔ اس شادی کی خاطر لز ٹیلر نے اپنا مذہب بھی بدل لیا اور یہودی مذہب اختیار کر لیا۔ ڈیبی رینالڈز کے لیے یہ ایک غیر متوقع اور عظیم صدمہ تھا۔ اس نے لز کا یہ جرم کبھی معاف نہیں کیا۔

ایڈی فشر نے اپنی محبوب بیوی اور دو بچوں کو چھوڑ دیا اور لز نے اپنے مذہب کو خیر باد کہہ کر یہودی مذہب اختیار کر لیا۔ اس طرح حساب برابر ہو گیا۔

لیکن یہ ہنگامی شادی بھی پائیدار ثابت نہ ہو سکی۔ لز ٹیلر نے مشہور فلم '' قلوپطرہ'' میں اداکاری کا آغاز کیا۔ یہ فلم روم میں بنائی جا رہی تھی۔ اس کا ہیرو رچرڈ برٹن تھا۔ لز کو رچرڈ برٹن سے محبت ہو گئی۔ ان کے رومان کی داستانیں دنیا بھر

میں پھیل گئیں حالانکہ وہ دونوں شادی شدہ تھے۔ایڈی فشر بھی اس اسکینڈل سے باخبر تھا مگر بے بسی سے تماشا دیکھتا رہا۔ابھی اس فلم کی شوٹنگ بھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ لز نے ایڈی فشر سے طلاق حاصل کر کے رچرڈ برٹن سے شادی کر لی۔

۱۹۵۸ء میں لز نے مشہور ڈرامانگار نینسی سی ولیمز کے ڈرامے پر مبنی فلم "دی کیٹ آن اے ہاٹ ٹن روف" میں اداکاری کی اور آسکر آیوارڈ کے لیے نامزد ہوئی۔ نینسی سی ولیمز نے لز ٹیلر کے بارے میں "لائف" میگزین میں ایک مضمون میں لکھا "لز ٹیلر اس عہد کی عظیم ہستی اور بہت بڑی اداکارہ ہے جس پر امریکا کو ناز ہے" مگر یہ بھی

ایک معما ہے کہ آخر لز زندگی سے کیا حاصل کرنا چاہتی ہے۔قیمتی تحائف۔کروڑوں ڈالر یا سچی محبت۔"

۱۹۵۹ء میں لز ٹیلر نے ایک اور معروف ڈرامے پر مبنی فلم "سڈنلی لاسٹ سمر" میں کام کر کے دوسری بار کے لیے نامزدگی حاصل کی۔یہ ڈراما بھی نینسی سی ولیمز کا لکھا ہوا تھا۔اس فلم کو لز ٹیلر کی بہترین فلم (بطور اداکارہ) کہا جاتا ہے۔ اس فلم کا ہیرو منٹگمری کلفٹ تھا۔فلم بندی کے دوران میں ان دونوں کے رومان کی داستانیں عام ہونے لگیں۔رچرڈ برٹن سے اس نے دوبارہ شادی کی اور طلاق حاصل کی۔

رچرڈ برٹن سے رومانس پر لز کو امریکی کانگریس نے بھی نکتہ چینی کی تھی۔یہاں تک کہ پوپ نے بھی ایک شادی شدہ عورت کے رومان کو گناہ قرار دیا تھا مگر لز ٹیلر کو کسی کی پروا نہیں تھی۔۱۹۶۴ء میں اس نے رچرڈ برٹن سے شادی کر لی۔ ان دونوں نے ایک بچی "ماریہ" کو گود لے لیا۔

رچرڈ برٹن کے ساتھ لز ٹیلر نے دس فلموں اور ایک ٹی وی ڈرامے میں کام کیا تھا۔ اسی دوران میں رچرڈ برٹن کے ساتھ اس نے فلم "ہوازافریڈ آف ورجینیا وولف" میں کام کر کے دوسری بار آسکر ایوارڈ حاصل کیا۔اس فلم کی کہانی بھی ایک مشہور ڈرامے سے اخذ کی گئی تھی۔"

۱۹۷۴ء میں ان دونوں میں طلاق ہو گئی مگر ۱۹۷۶ء میں لز ٹیلر نے دوسری بار رچرڈ برٹن سے شادی کر کے ایک نیا

ریکارڈ قائم کیا۔ رچرڈ برٹن سے شادی کا عرصہ طویل ترین تھا۔ اس دوران میں ان دونوں کے لڑائی جھگڑوں کی خبریں بھی عام تھیں۔ دونوں کے مزاج شعلہ اور آتش فشاں کی طرح تھے۔ بالآخر اس دوسری بار شادی کا نتیجہ بھی طلاق کی صورت میں ظاہر ہوا۔

لز ٹیلر کی ساتویں شادی ایک سیاست داں جان ورٹر سے ہوئی تھی۔ ۱۹۷۶ء میں ہونے والی اس شادی کا انجام بھی طلاق ہی تھا۔ ۱۹۸۶ء میں ان دونوں میں طلاق ہو گئی۔

اس دوران میں لز ٹیلر منشیات کی عادی ہو چکی تھی۔ ۱۹۸۳ء میں اس نے علاج کے لیے ایک علاج گاہ میں داخلہ لیا۔

وہ ہر طرح کے نشے کرنے کی عادت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس کلینک میں اس کی ملاقات لیری فولنسکی سے ہوئی اور وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ ۱۹۹۱ء میں لز ٹیلر نے اپنی عمر سے ۳۵ سال کم لیری سے شادی کر لی۔ یہ شادی بدمزگیوں اور لڑائی جھگڑے کے باوجود پانچ سال تک قائم رہی۔ لیری سے شادی کے لیے لز ٹیلر نے اسے ایک بھاری رقم بھی دی تھی۔ کیونکہ وہ ایک معمولی مزدور تھا۔ پانچ سال بعد لز ٹیلر اور لیری فولنسکی میں طلاق ہو گئی۔ اس مرتبہ پہلی بار طلاق کے عوض لز ٹیلر کو ایک بھاری معاوضہ ادا کرنا پڑا۔ یہ اس کی آٹھویں شادی تھی۔ ۱۹۹۶ء میں ان دونوں میں طلاق ہوئی تھی۔

۱۹۹۷ء میں لز ٹیلر جو بے شمار بیماریوں میں مبتلا رہ چکی تھی۔ دماغی ٹیومر میں مبتلا ہو کر کافی عرصے اسپتال میں رہی۔ ایک طویل علاج کے بعد وہ صحت یاب ہو گئی مگر اس کی رومانی داستانوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس کے بعد لز ٹیلر نے شادی نہیں کی۔ زندگی سے بھی لز ٹیلر کو عشق رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شدید ترین اور مہلک بیماریوں سے لڑ جھگڑ کر صحت یاب ہوتی رہی حالانکہ کئی بار اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

لز ٹیلر نے شادی کا ارادہ (فی الحال) ہمیشہ کے لیے ملتوی کر دیا ہے۔ اس کی صحت ٹھیک نہیں رہتی مگر اب اس نے ”ایڈز“ کے خلاف جنگ کی صورت میں ایک نیا مشغلہ اور مصروفیت تلاش کر لی۔

برصغیر کلاسیکی موسیقی میں خاص طور پر گائیکی میں ''تان سین'' ایک ایسا نام ہے جو ضرب المثل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ کوئی بہت بڑا گوّیا سامنے آئے تو لوگ اس کا موازنہ تان سین سے کرنے لگتے ہیں۔ اب تو خیر نہ وہ کلاسیکی موسیقی اور پکے راگ راگنیوں کا زمانہ رہا اور نہ ہی وہ مانے ہوئے گانے والے جن کا نام سن کر ہی موسیقی کے رموز سے واقف یہ لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے اور انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے لیکن ابھی یہ مسئلہ بھی متنازعہ ہے کہ کیا واقعی تان سین نام کا کوئی فنکار تھا بھی یا نہیں؟ برصغیر میں اس شعبے میں زیادہ نام اور شہرت حاصل کرنے والوں میں مسلمان سرفہرست نظر آتے ہیں۔ نت نئے ساز ایجاد کرنے والوں میں بھی مسلمانوں کا نام ہے اور سازندوں، موسیقاروں اور گوّیوں میں بھی مسلمان فن کاروں اور تخلیق کاروں کا ایک طویل کارواں نظر آتا ہے۔

یہ اس صورت میں ہے کہ جب مسلمانوں کے معاشرے میں موسیقی، ناچ گانے اور اس قسم کے دیگر فنون کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ علماء اسے خلاف شرع قرار دیتے تھے اور شریف گھرانوں میں موسیقی اور ناچ گانے کو گناہ عظیم سمجھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود اس فن پر مسلمانوں کی حکمرانی کا سبب کیا ہے؟

دراصل بعض گھرانوں نے کلاسیکی موسیقی کو عروج تک پہنچانے میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ شرفا بڑی حقارت سے انہیں مراثی یا پیشہ ور مغنی اور سازندے کہتے رہے لیکن ان کے اعزاز میں محفلیں سجا کر ساری ساری رات ان کے فن سے لطف اندوز بھی ہوتے رہے۔ بادشاہ، نواب، راجا، مہاراجا، ان کے سرپرست تھے جن کی قدر دانی اور عزت افزائی کے سبب ان فنون کو عروج حاصل ہوا۔ بادشاہت اور ریاستی حکمرانوں کے دور کو بہت برا اور معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک مطلق العنان طرز حکومت تھا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو موسیقی اور راگ درباری کے علاوہ رقص و سرور کا فن اس معراج تک نہ پہنچتا۔ فن کاروں پر ہی منحصر نہیں ہے۔ پہلوانوں اور فن کشتی بازی کے بھی یہی لوگ سرپرست اور قدردان تھے۔ اس زمانے میں برصغیر میں کیسے کیسے عظم نامور اور قد آور پہلوان پیدا ہوئے جو پشت ہا پشت تک اس میدان میں دندناتے اور جگمگاتے رہے۔

اس قدیم طرز حکومت کے خاتمے کا سب سے زیادہ نقصان فنون لطیفہ اور اس قسم کے ہنر مندوں اور کاریگروں کو ہی پہنچا۔ جنہوں نے اپنے اپنے شعبوں میں ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیئے تھے جو رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔ موجودہ میڈیا انہیں کتنا ہی نظر انداز کرے اہل ذوق کے دلوں سے انہیں کھرچا نہیں جا سکتا۔ آج کے پاپ میوزک کے دور میں بھی کسی پرانے راگ میں سریلی آواز سنائی دے جائے تو چلتے قدم رک جاتے ہیں اور سننے والے کیف و سرور کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ ایسے بلند پایہ علوم و فنون کو ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر کا دور وقتی طور پر دھندلا تو سکتا ہے مگر انسان کے بنیادی جذبوں اور تقاضوں کی تکمیل کے یہ ذرائع ہمیشہ قائم و دائم رہیں گے۔

جمہوریت کا دور دورہ ہوا تو نواب، ریاستیں، بادشاہ اور مہاراجا سب ایک ایک کر کے غائب ہوتے چلے گئے۔ اب صرف ان کی داستانیں باقی رہ گئی ہیں مگر اس انقلاب نے ہماری تہذیبی اور ثقافتی دنیا میں بھی ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیا جس نے قدیم اور روایتی فنون کے ان دروازوں پر قفل لگا دیے۔ یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ کلاسیکی موسیقی، گائیکی اور راگ داری کا بھی خاتمہ ہو گیا اور کشتی کے فن کا تو اب کوئی نام لیوا ہی نہیں رہا حالانکہ اس میدان میں غلامی کے دور میں بھی ساری دنیا میں ہندوستان کے پہلوانوں کے علم لہرا رہے تھے اور انہوں نے ہر جگہ اپنی طاقتوں اور ہنر مندی اور مستعدی کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔

کلاسیکی موسیقی کے سرپرست باقی نہ رہے تو ان پر بھی زوال آ گیا۔ جن استادان فن کو راجا مہاراجا اور نواب سونے میں تول دیا کرتے تھے اور ان کو درباروں میں جگہ دیتے تھے نئے دور میں وہ محض مراثی اور گانے بجانے اور ناچنے والے بنا دیئے گئے۔ بڑے بڑے استاد یہاں تک کہ استاد بڑے غلام علی خاں اور چھوٹے غلام علی خاں جیسے گائیک اور استاد سلیم اللہ خاں جیسے سارنگی نواز اور دیگر نامور سازندے اور موسیقار ریڈیو پاکستان سے دس پندرہ روپے کے چیک لے کر زندہ رہنے پر مجبور ہو گئے۔ ہمسایہ ملک بھارت نے اپنی تہذیبی روایات اور بہت حد تک پاکستان دشمنی کے تحت ان میں سے بہت سے فن کاروں کو بھارت بلا کر بہت توقیر دی۔ انہوں نے نام بھی کمایا اور دولت بھی۔ پاکستان کی محبت میں یہاں رہ جانے والے فاقہ کشی میں مبتلا ہو کر اور ناقدری کا نشانہ بن کر رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔ اللہ اللہ کیسے کیسے

آفتاب وماہتاب تھے کہ جن کی مثال اب زمانہ دوبارہ شاید ہی پیش کر سکے مگر ہم نے انہیں نہ تو احترام اور عزت دی۔ نہ بلند مقام اور نہ ہی پیٹ بھر کر کھانے کو روٹی۔ عیش و آرام اور آسائش کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

جمہوریت دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی آئی ہے۔ یہ نئے دور کا تقاضا اور انسانی طرز حکومت کا بہترین نمونہ ہے لیکن دوسرے ملکوں میں جمہوریت کے قیام نے فنون لطیفہ کو ٹھکانے نہیں لگایا۔ اس کے برعکس ان ممالک میں تہذیب و ثقافت اور فنون لطیفہ کو اور ان سے وابستہ افراد کو نہ صرف معزز محترم سمجھا جاتا ہے بلکہ ان پر ہن برسنے لگتا ہے۔ گویا نظام جمہوریت کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور طرز فکر اور معاشرے میں رہنے والوں کی ذہنی تربیت اور ذوق سلیم کو پروان نہ چڑھانے کا ہے۔ ہم کس کے سامنے رونا روئیں۔ کس سے شکایت کریں کہ ہمارے ملک میں تو نہ جمہوریت رہی نہ فنون لطیفہ اور ذوق سلیم کا وجود باقی رہا۔ یعنی دونوں طرح ہم گھاٹے میں ہی ہیں۔

خدا ہی ملا نہ وصال صنم

نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

علوم وفنون کے اس ”قتل عام“ کے نتیجے میں قدیم کلاسیکی موسیقی کا دامن بھی سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اگرچہ تھوڑے بہت پرانے زمانے کے اہل ذوق آج بھی باقی ہیں لیکن بہت محدود تعداد میں۔ سرکاری میڈیا نے ان باعث فخر فنون کو جس بے دردی سے ”کھدیڑا“ اور ٹھکانے لگایا ہے اس کی تفصیل بتانا لاحاصل ہے کہ سب اس سے واقف ہیں۔
ویسے بھی ہمارے ریڈیو اور ٹی وی نے دوسرے اہل علم اور صاحب فن لوگوں کے ساتھ کون سا اچھا سلوک کر رکھا ہے کہ شکوہ کیا جائے۔ زندگی کا ہر قابل ذکر دور قابل قدر شعبہ ان محکموں کے ہاتھوں زخموں سے فگار ہو کر لب دم ہے یا دم توڑ چکا ہے۔ دوسرے شعبوں میں کون سے اچھے کام ہوئے ہیں جو ٹی وی اور ریڈیو کے ”افسروں“ کا شکوہ کیا جائے۔ یہ تو تنخواہ دار لوگ ہیں۔ انہیں فنون لطیفہ سے کیا مطلب۔ اپنے مشاہروں، الاؤنسوں، ترقیوں سے سروکار

ہے۔بیورو کریسی نے ہر جگہ ایسا ہی تماشا شروع کرر کھا ہے۔ قیادت ہے نہیں، ظاہر ہے کہ یہی لوگ سیاہ وسفید کے مالک ہیں۔ان کے اس طرز عمل کا رد عمل ہر طرف ہر شعبے میں سایہ فگن نظر آتا ہے۔

بقول غالب وہی معاملہ ہے

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

خیر اس تکلیف وہ موضوع کو چھوڑیے۔کچھ اچھی اچھی باتیں کیجئے۔ہر وقت دل جلاتے رہنا بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے۔جو ہے جیسا ہے اس کے ساتھ گذارا تو کرنا ہے۔یہیں رہنا ہے۔یہیں جینا اور مرنا ہے صبر اور دعا کے سوا کیا چارہ ہے۔

ذکر ''تان سین'' کا ہو رہا تھا اور حسب معمول بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔آپ کہتے ہوں گے کہ عجیب کج بحث آدمی ہے۔ہر بات کا بتنگڑ بنالیتا ہے۔ مختصر اور '' ٹو دی پوائنٹ'' بات کرنے کا سلیقہ ہی نہیں تو اب تان سین کے بارے میں کچھ تذکرہ سن لیجئے۔

''تان سین'' کو برصغیر کی موسیقی اور گائیکی میں ایک دیومالائی حیثیت حاصل ہے۔''تان سین'' سے وابستہ بہت سی کچھ سچی جھوٹی (خدا جانے) داستانیں بھی مشہور ہیں۔قیام پاکستان سے پہلے بمبئی میں ''تان سین'' کے نام سے ایک فلم بھی بنی تھی جسمیں تان سین کا مرکزی کردار اس زمانے کے عظیم اور مقبول گائیک کے۔ایل سہگل نے ادا کیا تھا۔ یہ عہد اکبری کی کہانی ہے۔کہا جاتا ہے کہ تان سین شہنشاہ اکبر کے نورتنوں میں شامل تھا۔ بڑا مقام اور دبدبہ تھا۔ شہنشاہ اس کا گانا سنے بغیر سکون حاصل نہیں کر سکتے تھے۔مسلمانوں کا کہنا ہے کہ وہ مسلمان تھا اس لیے اہل موسیقی اسے یہاں تان سین کہتے ہیں۔ایک روایت یہ بھی ہے کہ سابقہ ریاست گوالیار میں جہاں تان سین کی قبر ہے اس پر ایک گھنا درخت سایہ فگن ہے جو شخص اس درخت کا ایک پتا کھالے وہ سریلا بن جاتا ہے۔اب تک کتنے لوگ اس

قبر کے درخت کا پتا کھا چکے ہیں، سنا ہے بہت سے لوگ یہ کام کرتے ہیں مگر ان میں سے کتنے سریلے ہوئے ہیں، یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ واللہ عالم بالصواب۔

فلم تان سین میں کہانی کی ضروریات کے مطابق تان سین کی ایک محبوبہ بھی تھی جسے "تانی" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ تانی کا کردار معروف گلوکارہ اور اداکارہ خورشید نے کیا تھا اور خوب گانے گائے تھے۔ خورشید کی آواز اور سریلے پن سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس زمانے میں پلے بیک سنگروں کا زیادہ رواج نہ تھا۔ ایسے فن کاروں کو اہمیت دی جاتی تھی جو خود گلوکار بھی ہوں۔ ان کی قدرو منزلت بھی زیادہ تھی اور معاوضے بھی۔

فلم کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ شہنشاہ اکبر کے دربار میں ایک اور گویّا تان سین کو چیلنج کرتا ہے۔ دونوں میں گائیکی کا مقابلہ ہوتا ہے جس میں تان سین فتح یاب ہوتا ہے۔ اس کے بعد دشمن شہنشاہ کے کان میں انتقاماً یہ بات ڈالتے ہیں کہ تان سین اگر ایسا ہی گویّا ہے تو اس سے کہئے کہ "دیپک راگ" گائے۔ روایت ہے کہ اس راگ سے بجھے ہوئے دیئے خود بہ خود روشن ہو جاتے ہیں۔ شہنشاہ کو یہ تجویز پسند آگئی اور انہوں نے تان سین سے فرمائش کر دی کہ دیپک

راگ سناؤ۔۔ تان سین کو علم تھا کہ اس راگ کو گانے سے گانے والے کے جسم پر چھالے پڑ جاتے ہیں اور اس کی زندگی کے لالے پڑ جاتے ہیں مگر حکم حاکم مرگ مفاجات۔

کلائمکس کے منظر میں تان سین (سہگل) دربار میں یہ راگ گاتے ہیں اور پھر یکے بعد دیگرے سارے دیے روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ گیت آج بھی بے حد مقبول ہے اس کا مکھڑا یہ ہے۔

دیا جلاؤ جگ مگ جگ مگ دیا جلاؤ۔

سہگل نے اس گانے میں گائیکی کا حق ادا کر دیا۔ دیئے تو جل گئے مگر تان سین کے جسم پر آبلے پڑ گئے اور وہ زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا ہو کر اپنے آبائی گھر چلا گیا۔ اس کا توڑ راگ میگھ ملہار بتایا گیا جو کہ گانا بہت مشکل تھا۔ تانی کی تو

جان پر بنی ہوئی تھی۔اس نے جان کی بازی لگادی اور میگھ ملہار گایااور ایسا جی جان سے گایا کہ تان سین کے جھلسے ہوئے بدن پر مرہم سازی کا کام کیااور وہ تندرست ہو گیا۔

اس گیت کا مکھڑا یہ تھا۔

برسورے برسورے۔

جب تک آسمان سے موسلادھار بارش نہ ہوئی ”تانی“ نے اپنی تانوں کا سلسلہ جاری رکھا۔آخر قدرت جوش میں آگئی۔پہلے بوندا باندی شروع ہوئی اور پھر ایسی موسلادھار بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہو گئے۔

اس فلم نے خصوصاً اس کی موسیقی نے زبردست مقبولیت حاصل کی۔اس کی کہانی کی بنیاد بھی روایات پر رکھی گئی تھی۔یہ مسئلہ پھر بھی حل نہ ہوا کہ اس کہانی میں صداقت کتنی ہے اور مبالغہ کتنا ہے؟ دراصل اس فلم کو دیکھنے والوں نے ایک فرضی کہانی سمجھ کر ہی دیکھا تھا کیونکہ تان سین کی داستان بھی عام لوگوں کے نزدیک لوک کہانیوں جیسی ہی ایک داستان ہے جس میں مختلف واقعات اور روایات کو اکٹھا کر دیا گیا ہے پھر لوگ یہ بھی سنتے رہے تھے کہ تان سین کے بارے میں یہ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مسلمان تھا یا ہندو۔اگر وہ ہندو تھا تو پھر گوالیار میں اس کا مقبرہ کیسے بن گیااور اگر یہ اس کا مقبرہ نہیں تو پھر کس کا مقبرہ ہے اس طرح تان سین ایک متنازعہ اور خیالی داستان کا کردار بن کر رہ گیا تھا چند حضرات نے تو یہ بھی لکھ دیا کہ اکبری دربار میں تان سین نام کا کوئی گویا ہی نہیں تھا۔اسی طرح کی متنازعہ کہانیاں ملادوپیازہ کے بارے میں بھی مشہور ہیں۔افسوس کہ ان کرداروں کے بارے میں کبھی باقاعدہ تحقیق و جستجو کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

بہر حال یہ حقیقت تھی یا افسانہ۔”تان سین“ ایک جانا پہچانا نام تھا اس لئے اس کی زندگی کے حالات پر مشتمل یہ فلم بے حد پسند کی گئی۔سہگل کا نام اس زمانے میں گائیکی کے لحاظ سے ایک طلسمی کشش رکھتا تھا۔کیا چھوٹا، کیا بڑا۔ہر شخص کے ایل سہگل کا دلدادہ اور اس کی آواز کا عاشق تھا۔یہ کہنا غالباً ایک حد تک مبالغہ نہ ہو گا کہ اس زمانے میں سہگل کو

گلوکار کی حیثیت سے قریب قریب اتنی ہی شہرت اور مقبولیت حاصل تھی جتنی کہ تان سین کے روایتی یا حقیقی کردار کو تھی۔ سہگل نے ہر قسم کے گیت، غزلیں اور نغمے گائے اور ایسے گائے کہ کوئی دوسرا نہ گا سکا۔ سہگل کی آواز میں قدرتی طور پر درد، سوز و گداز اور انتہائی دکھ بھرا سریلا پن تھا۔ اس کی آواز سن کر دل پر چوٹ سی لگتی تھی پھر اس کا گائیکی کا انداز بالکل جدا تھا۔ آواز اور گائیکی کے اعتبار سے سہگل ایک قطعی منفرد گلوکار تھا۔ ویسا نہ اس سے پہلے کوئی پیدا ہوا نہ بعد میں پیدا ہوگا۔ یہ بجا کہ اب سہگل کی گائیکی کا انداز متروک ہو گیا ہے۔ کئی کامیڈین اپنے پروگراموں میں اس کے انداز میں گیت گا کر سامعین کو ہنساتے ہیں لیکن یہ اس کی عظمت کا ایک ثبوت ہے۔ کسی دوسرے درجے کے فن کار کی نقل کون کرتا ہے۔ یہ درجہ بلند جسے ملنا ہوتا ہے اسی کو ملتا ہے۔ سہگل نے اس زمانے کے انداز گائیکی کو اپنایا تھا مگر سہگل نے غالب کی غزلوں کو بھی عوامی حلقوں تک پہنچا کر ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ ذرا تصور کیجئے کہ متحدہ ہندوستان میں سہگل کی گائی ہوئی غالب کی غزلوں پر ہر کوئی جھومتا تھا۔ غالب کی غزل تو اسکالرز کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک عام کم علم یا قطعی ان پڑھ جاہل اسے کیا سمجھے گا لیکن ایک تو الفاظ کی نشست و برخاست اور ان کا حسن انتخاب اور اس پر سہگل کی آواز ایسا جادو جگاتی تھی کہ کشمیر سے راسکماری تک یہ غزلیں مقبول تھیں اور بڑے ذوق و شوق سے سنی جاتی تھیں۔ یہ اردو ادب کی خدمت تھی جو ریکارڈنگ کمپنیاں کر رہی

تھیں اور اس سلسلے میں سہگل اور بیگم اختر جیسے فن کاروں کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

فلم ”تان سین“ نے سارے ہندوستان میں ہلچل مچا دی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ لوگوں نے سنی سنائی داستانوں کو حقیقت کا روپ دھارتے ہوئے دیکھ لیا۔ جس طرح سہراب مودی نے فلم ”پکار“ بنا کر شہنشاہ اور ملکہ نور جہاں کو زندہ انسانوں کا روپ دے دیا تھا اسی طرح فلم ”تان سین“ میں سہگل کے روپ میں عام لوگوں کو سچ مچ کا جیتا جاگتا ”تان سین“ نظر آگیا۔ وہ تکنیکی اعتبار سے قدیم، فرسودہ اور پسماندہ دور تھا مگر جب فلم بینوں نے تان سین کو دیپک راگ گاتے ہوئے سنا تو ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک سحر سا طاری ہو گیا تھا پھر جب دیپ جلنے شروع ہوئے تو تالیوں سے سارا ہال گونج اٹھا تھا۔ فلم تان سین میں ایک روایت اور داستان کو لوگوں نے اپنی آنکھوں سے

حقیقت کا روپ دھارتے دیکھا اور ششدر رہ گئے۔ دیپک راگ گانے کے نتیجے میں "تان سین" جس جسمانی اذیت میں مبتلا ہوا، وہ بھی ایک جاں گداز منظر تھا۔ سہگل نے اس تکلیف اور درد کی تاثرات کے ذریعے بھرپور عکاسی کی تھی۔ ہر دیکھنے والے کا دل تان سین کی ہمدردی میں دھڑک رہا تھا۔

اس کے بعد "تانی" کا کردار ابھر کر سامنے آیا۔ خورشید اپنے دور کی مقبول اور کامیاب ہیروئن تھیں۔ خوش شکل، دراز قد، تاثر سے بھری ہوئی آنکھیں۔ اس پر آواز ایسی کہ جیسے شہد کے چھتے میں سے شہد ٹپک رہا ہو۔

تان سین کی بے چارگی اور تکلیف پر تانی کی بے چینی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس درد کی دوا صرف میگھ ملہار راگ ہے۔ یہ فلم کا دوسرا کلائمیکس تھا جب تانی نے کھلے آسمان تلے آبلوں سے بھرے ہوئے تان سین کو چارپائی پر لٹایا اور میگھ ملہار شروع کیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ راگ واقعی پر اثر ہو گا یا نہیں مگر خورشید نے اس گانے کو ایسا دل لگا کر گایا کہ بالآخر قدرت کو بھی ترس آ گیا۔ پہلے صاف آسمان پر بادل گھر آئے جنہیں دیکھ کر تانی اور فلم بینوں کو یکساں طور پر مسرت ہوئی پھر بادل گرجنے لگے۔ بجلی چمکنے لگی۔ جب بوندا باندی شروع ہوئی تو ایک بار پھر سینما ہال جس میں سکوت مرگ طاری تھا یکایک تالیوں سے گونج اٹھا پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ بارش نے تان سین کے زخمی بدن کو نہلا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے جسم کے آبلے غائب ہو گئے اور وہ مکمل طور پر تندرست ہو گیا۔ فلم تان سین کی یہ کہانی تھی جو کہ سادہ لیکن موثر انداز میں پیش کی گئی تھی۔ اس زمانے میں اس قسم کے موضوعات پر فلمیں بنائی جاتی تھیں جو فلم بینوں کی معلومات میں اضافہ کرتی تھیں اور انہیں روحانی مسرت بھی فراہم کرتی تھیں

وہ قدیم دور تھا مگر فلموں کے موضوعات کے اعتبار سے بہت ترقی یافتہ تھا۔ آج محض بے مقصد، بے معنی اور بے ہنگم فلمیں ہی بنائی جاتی ہیں یا پھر پرانی کہانیوں کو توڑ مروڑ کر ان کا حلیہ بگاڑ دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک تازہ مثال فلم "دیوداس" ہے۔ فلم ساز، مصنف اور ہدایت کار نے پرانی کلاسیکی فلم کی نقالی ہے مگر اصل موضوع کی روح قبض کر لی۔ جسم کو البتہ زرق برق ملبوسات، قیمتی زیورات اور عالی شان محلات کے لبادوں میں لپیٹ دیا۔ اگر دیکھا جائے تو نئی دیوداس پرانی دیواس کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ اسے "دیوداس" کی پیروڈی کہہ لیجئے۔

فلم ''تان سین'' کی نمائش کے بعد ادبی فلمی رسائل میں ایک بار پھر یہ بحث چھڑ گئی کہ ''تان سین'' واقعی کوئی حقیقی کردار تھا یا محض خیالی پیکر اور تصور؟

دربار اکبری کے نو رتنوں میں سے ایک آب و تاب رکھنے والے رتن کے بارے میں پچھلے دنوں بھارت میں کچھ تحقیق کی گئی ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کلاسیکی موسیقی میں روح پھونکنے والی اس ہستی کی حقیقت کیا ہے اس بارے میں نئی دریافت سنئے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ پانچ سو سال قبل پندرھویں صدی کے آخری حصے میں بہار کے ایک گاؤں میں ایک برہمن مکرند پانڈے کے گھر ایک بچے نے جنم لیا۔ بچے کے رونے کی پہلی آواز ہی سریلی تھی۔ کہتے ہیں کہ مکرند پانڈے کافی عرصے سے اولاد سے محروم تھا۔ اس نے مشہور صوفی پیر محمد غوث کے آستانے پر جاکر درخواست کی کہ وہ اس کے لیے اولاد کی دعا کریں۔ اس زمانے میں (اور قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں بھی) ہندو، مسلمان صوفیوں اور اولیائے کرام کے آستانوں اور مزاروں پر جاکر منتیں مانا کرتے تھے۔ یہ ایک عام رواج تھا۔ برہمن پانڈے نے بھی بالآخر ایک صوفی سے ہی دعا کی درخواست کی اور ان کی دعا کے نتیجے میں اللہ نے مکرند پانڈے کو ایک لڑکے سے نوازا برہمن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے صوفی صاحب کے آستانے پر حاضری دے کر نذرانہ پیش کیا اور گاؤں میں کئی دن تک خوشیاں منائی گئیں۔ والدین نے اس بچے کا نام رام تانو رکھا۔ بعد میں یہی بچہ ''تان سین'' کے نام سے مشہور ہوا۔ گویا تان سین نے ایک ہندو گھرانے میں جنم لیا تھا۔

بچپن ہی سے رام تانو پڑھائی میں بہت تیز اور ذہین تھا۔ اسے نوعمری بلکہ بچپن ہی سے مناظر فطرت سے دلچسپی تھی۔ وہ اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ قریبی جنگلوں میں نکل جاتا تھا۔ اس کو پرندوں اور جانوروں کی آواز کی نقل کرنے کا شوق تھا اور وہ ایسی آوازیں نکالتا تھا کہ ان پر حقیقت کا گمان گزرتا تھا۔

ایک دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جنگل میں مختلف پرندوں کی آوازیں نکال رہا تھا کہ ہندو سادھوؤں کا ایک گروہ

وہاں سے گزرا۔ یہ لوگ موسیقار اور سازندے تھے۔ سادھو۔۔۔ گھنی جھاڑیوں کے پاس سے گزر رہے تھے کہ اچانک رام تانو نے درختوں کے پیچھے سے شیر کے دہاڑنے کی خوف ناک آواز نکالی تو سب سہم کر رہ گئے مگر جب جھاڑیوں کے پیچھے سے ایک پانچ سالہ بچہ باہر نکلا تو وہ اس کے فن سے بہت متاثر ہوئے۔ اس گروہ کا سربراہ ہری داس تھا۔ وہ خود بھی ایک بڑا مذہبی گورو اور موسیقی کا استاد تھا۔ ہری داس بچے کے اس ہنر سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی فرمائش پر رام تانو نے دوسرے پرندوں اور جانروں کی آوازیں بھی نکالیں جن پر اصل کا گمان گزرتا تھا۔ پنڈت ہری داس نے بچے سے اس کا نام اور پتا پوچھا اور پھر اس کے ساتھ اس کے باپ پنڈت مکرند پانڈے سے ملنے کے لیے گئے۔

ہری داس کو بچے کی آواز، ذہانت اور خداداد صلاحیتیں اتنی بھا گئی تھیں کہ اس نے اس کے باپ سے درخواست کی کہ بچے کو اس کی شاگردی میں دے دیں۔ ماں باپ نے صرف یہ شرط عائد کی کہ پنڈت ہری داس بھی اسی گاؤں میں قیام کریں گے اور بچے کو ان سے جدا نہیں کریں گے کیونکہ وہ ان کی منتوں اور مرادوں کا اکلوتا ثمر تھا۔ ہری داس نے یہ شرط قبول کر لیا۔ رام تانو کو اپنا شاگرد بنا کر موسیقی کی تعلیم دینی شروع کر دی۔ ہری داس نے بچے کو اپنی گائیکی کے انداز میں تربیت دی اور کلاسیکی موسیقی کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا۔ ہری داس کو راگ گیتوں پر عبور حاصل تھا لیکن دھرپد راگ میں اسے ایسی مہارت حاصل تھی کہ ایک دنیا اس کی معترف تھی۔ ہری داس کی شاگردی میں ذہین شاگرد نے نہ صرف موسیقی کی تربیت حاصل کی بلکہ روحانیت کا درس بھی لیتا رہا۔ ہری داس بذات خود ایک سادھو تھا اس لیے اس نے رام تانو کو ایک اچھا انسان بنانے پر بھی زور دیا۔ اس طرح رام تانو نہ صرف ایک اچھا گائیک اور موسیقار بنا بلکہ وہ ایک اچھا اور مکمل انسان بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب رام ناتو کے باپ کا آخری وقت آیا تو اسنے بیٹے کو وصیت کی کہ وہ گوالیار کے مشہور و معروف بزرگ اور صوفی پیر محمد غوث کے پاس حاضری دے۔ پیر محمد غوث بھی فن موسیقی کے ماہر تھے۔ پیر محمد غوث کی صحبت سے فیض حاصل کر کے رام تانو ایک بہت اچھا انسان اور موسیقار بن گیا۔ وہ اس کو باقاعدہ ریاض کراتے تھے کیونکہ وہ اس کی آواز اور صلاحیتوں سے متاثر تھے اور ان کے خیال میں وہ ایک غیر معمولی موسیقار اور گائیک تھا۔ اس نے ہری داس سے بھی موسیقی کی تربیت حاصل کی تھی خصوصاً دھرید گانے میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ ان سے جدا ہو کر پیر محمد غوث کی توجہ حاصل کرنا سونے پہ سہاگا تھا۔ باپ کی وصیت کے مطابق اس نے پیر

صاحب کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ پیر محمد غوث کے ساتھ رہ کر ہی اسے عربی اور فارسی موسیقی سے بھی واقفیت ہوئی۔ اس طرح وہ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے علاوہ عربی اور فارسی موسیقی کے رموز سے بھی آگاہ ہو گیا جو کہ ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ پیر محمد غوث ہی نے اسے "تان سین" کا نام دیا تھا۔ خیال ہے کہ یہ تان سائیں کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

تان سین نے ان دونوں استادوں سے تربیت حاصل کرنے کے بعد بہار کے سلطان محمد عادل کے دربار تک رسائی حاصل کرلی۔ سلطان محمد عادل اس کی ہنر مندی سے متاثر ہوا اور اسکو اپنے دربار میں ایک ممتاز مقام دے دیا۔ یہاں رہ کر تان سین نے دربار سے وابستہ دوسرے موسیقاروں سے بھی بہت کچھ سیکھا اور حاصل کیا۔ سلطان محمد عادل کے دربار سے وابستگی نے اسے شہرت اور عزت بھی بخشی اور بڑے بڑے موسیقاروں کی صحبت میں رہ کر ان سے سیکھنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ اس زمانے میں تان سین نے گووند سوامی جیسے موسیقاروں سے بھی استفادہ کیا۔ گووند سوامی ولبھ فرقے کے سربراہ بھی تھے لیکن موسیقی کے فن میں بھی انہیں بلند مقام حاصل تھا۔ تان سین کے گانے کی شہرت مغلیہ سلطنت کے عظیم شہنشاہ اکبر کے کانوں تک پہنچ گئی جو بذات خود ان پڑھ ہونے کے باوجود عالم فاضل اور ہنر مند افراد کی بے حد قدر کرتا تھا اور ان کی صحبت میں فیض بھی حاصل کرتا تھا۔ جب تان سین دارالحکومت اکبر آباد پہنچا تو اس کی شہرت اس سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔ شہنشاہ نے اسے اپنے دربار میں شرف باریابی بخشا اور اس کے فن کا مظاہرہ بھی دیکھا اور سنا۔ یہ اندازہ ہے کہ تان سین سولہویں صدی کے آغاز میں اکبر کے دربار سے وابستہ ہو کر اس کے پسندیدہ نورتنوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اپنی وفات تک تان سین دربار اکبری سے وابستہ رہا اس کا انتقال ۱۵۸۶ء عیسوی میں ہوا تھا۔

اکبر کے دربار میں رسائی حاصل کرنے سے پہلے تان سین وسط ہند کی ریاست ایوا کے راجا رام چندر کے دربار میں شاہی موسیقار کا مرتبہ حاصل کر چکا تھا۔ یہیں سے اس کی شہرت شہنشاہ اکبر کے دربار تک پہنچی تھی جو کہ فن کاروں

اور ہنر مندوں کا قدردان اور سرپرست تھا۔ وہ دنیا بھر سے مختلف علوم و فنون کے چیدہ چیدہ اور ممتاز افراد کو تلاش

کر کے اپنے دربار میں بلا لیتا تھا۔

تان سین سے پہلے دربار اکبری میں اس وقت کے اور بھی کئی نامور اور ممتاز موسیقار موجود تھے۔ شہنشاہ اکبر نے مہاراج رام چندر کے پاس اپنا ایلچی بھیجا اور خواہش ظاہر کی کہ تان سین کو دربار اکبری میں دہلی بھیج دیا جائے۔ عظیم المرتبت شہنشاہ کی فرمائش بھلا کس کی مجال تھی کہ ٹالتا۔ بظاہر یہ ایک فرمائش تھی لیکن حکم کا درجہ رکھتی تھی اور شہنشاہ اکبر کے حکم سے سرتابی کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ مہاراج رام چندر تان سین کو اپنے دربار سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ''حکم حاکم مرگ مفاجات'' کے تحت سینے پر پتھر رکھ کر تان سین کو شہنشاہ اکبر کے حوالے کرنا پڑا۔ اس طرح تان سین دہلی پہنچ گیا۔

کہا جاتا ہے کہ تان سین نے دو شادیاں کی تھیں۔ اس کی ایک بیوی ہندو تھی اور دوسری مسلمان۔ مسلمان بیوی کے ایما اور تلقین پر ہی تان سین نے اسلام قبول کر لیا اور مسلمان ہو گیا۔ اس طرح اسے میاں تان سین کہا جانے لگا۔ تان سین کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی جس کا نام سرسوتی تھا۔

تان سین جب دربار اکبری میں حاضر ہوا تو اپنے فن اور موسیقی میں مہارت کے باعث بہت جلد شہنشاہ کا قریبی اور دل پسند درباری بن گیا۔ شہنشاہ اکبر اس پر اتنا مہربان تھا کہ دربار کے علاوہ اسے اپنے دیوان خاص میں بھی شرف باریابی بخشتا تھا اور موسیقی کی یہ نغمہ بار محفلیں رات بھر جاری رہتی تھیں۔ تان سین کو درباری سے بڑھ کر اکبر کے مقرب خاص کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ شہنشاہ اس پر بے انتہا مہربان تھا اور وقتاً فوقتاً اسے انعام واکرام اور اعزازات سے نوازتا رہتا تھا۔ گائیکی اور موسیقی میں تان سین یکتا تھا۔ اس کے سامنے دوسرے موسیقاروں کے چراغ ماند پڑ گئے تو وہ اس سے حسد کرنے لگے۔ درباروں میں سازشیں ویسے بھی ہوا کرتی تھیں۔ تان سین کے حریفوں اور مخالفین نے تان سین کو نیچا دکھانے اور شہنشاہ کی نظروں سے گرانے کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی۔ فن کے مقابلے میں تو وہ تان سین کو شکست نہیں دے سکتے تھے کیونکہ اس دور کے بڑے بڑے نامور مانے ہوئے موسیقار تان سین کے ساتھ

موسیقی کے مقابلوں میں شرکت کر کے منہ کی کھا چکے تھے۔ گویا فن کے میدان میں تان سین کو شکست دینا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس مقصد کے لیے ایک ایسی سازش تیار کی گئی جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے ۔ دیپک راگ گانے کا شوشہ چھوڑا گیا۔ حریفوں کو یقین تھا کہ اول تو تان سین موثر انداز میں دیپک راگ گا کر چراغوں کو روشن ہی نہیں کر سکے گا اور اگر اس میں کامیاب بھی ہو گیا تو اس راگ کی تپش اسے جلا کر راکھ کر دے گی اور وہ یا تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا یا پھر خاکستر جسم کے ساتھ باقی زندگی انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزار دے گا۔

یہ ایک مکمل اور ""فول پروف"" منصوبہ تھا۔ چند درباریوں نے شہنشاہ اکبر کے کانوں میں یہ بات ڈالی کہ ان کے دربار میں تان سین جیسا مایہ ناز موسیقار موجود ہے تو کیوں نہ اس سے دیپک راگ سنا جائے جو کہ ایک انوکھا اور انتہائی مشکل راگ ہے اور تان سین ہی یہ راگ گا سکتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کو اس راگ کے اثرات اور رد عمل کا علم نہ تھا۔ دیپک راگ کے بارے میں اس کا اشتیاق اتنا بڑھا دیا گیا کہ آخر ایک دن شہنشاہ نے بھرے دربار میں تان سین سے فرمائش کر دی کہ وہ دربار میں دیپک راگ گائے اور ایک نئی مثال قائم کر دے کیونکہ اس سے پہلے کوئی موسیقار دیپک راگ گانے کی جرات نہیں کر سکا تھا۔ ظاہر ہے کہ اپنے وقار اور شہنشاہ کے حکم کے پیش نظر تان سین کے لیے

اس حکم سے سرتابی ممکن نہ تھی۔

""تان سین"" کو دیپک راگ کے مضمرات اور بعد میں اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نقصانات کا بہ خوبی علم تھا لیکن وہ یہ رموز شہنشاہ کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ اس کے مخالفین اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ہر دو صورت انہیں تان سین سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔ اگر وہ دیپک راگ کے ذریعے دیپ جلانے میں ناکام رہا تو شہنشاہ کی نظروں میں بے توقیر ہونے کے علاوہ اپنے بلند مقام سے بھی گر جائے گا۔ کامیابی کی صورت میں اس کی جان کے لالے پڑ جائیں گے اور وہ دربار اکبری میں اپنے حاضرین اور مخالفین کی راہ کی رکاوٹ بننے کے بجائے ہمیشہ کے لیے ان کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ یہ ایک مکمل اور بھرپور سازش تھی جس کا تانا بانا انتہائی ہوشیاری سے سوچ سمجھ کر بنا گیا تھا۔ حیرت اس

بات پر ہے کہ موسیقاروں اور فن کاروں جیسے سبک مزاج اور نفاست پسند لوگ اپنے ایک قابل قدر حریف کے خلاف اس قسم کی اخلاق سے گری ہوئی سازشوں میں ملوث ہو گئے تھے۔

تان سین کو اپنی فن کارانہ مہارت پر پورا اعتماد تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ یہ دیپک راگ گانے میں ناکام ہو جائے گا۔ یہ درست ہے کہ وہ اس راگ سے بہ خوبی واقف تھا۔ اس نے ہنر منداور بلند مرتبہ اساتذہ سے دیپک راگ سیکھا بھی تھا اور اس کے عواقب سے بھی آگاہ تھا لیکن عملی طور پر اس سے پہلے تان سین نے دیپک راگ گانے کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ یہ تجربہ ناکام بھی ہو سکتا تھا کیونکہ اس کا تذکرہ بہت قدیم کتابوں میں روایت کے طور پر کیا گیا تھا۔ خود تان سین کی زندگی میں یا اس سے کئی صدی قبل بھی ایسی کوئی مثال نہیں تھی جس میں کسی گائیک نے دیپک راگ گایا ہو اور دیئے روشن ہو گئے ہوں لیکن اسے اپنے اساتذہ کی تعلیم اور قابلیت پر پورا بھروسا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے جھوٹی اور من گھڑت کہانیاں سنا کر ایک فرضی راگ سیکھنے پر اصرار نہیں کر سکتے تھے پھر ان ہی اساتذہ نے اس کو راگ گانے والے کے انجام سے باخبر کر دیا تھا۔ غالباً اس کے استادوں کو بھی یہ علم اور احساس نہیں تھا کہ تان سین کی زندگی میں ایک مرحلہ ایسا بھی آئے گا جب اسے واقعی دیپک راگ گانے کا مظاہرہ کرنا پڑے گا اور وہ حکم عدولی کی جرات نہیں کر پائے گا۔

اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ جس طرح دیپک راگ کا عملی مظاہرہ پچھلی صدیوں میں نہیں کیا گیا تھا اس طرح میگھ ملہار کو بھی کبھی نہیں آزمایا گیا تھا۔ اگر دیپک راگ کی حقیقت اور اصلیت کو تسلیم کر لیا جائے اور میگھ ملہار کو بھی حقیقت مان لیا جائے تو سوال یہ تھا کہ میگھ ملہار کون گائے گا اور اس مشاقی اور مہارت سے گائے گا کہ دیپک راگ گانے والے کے سوختہ جاں میں از سر نو زندگی کی لہر دوڑنے لگے گی۔

دیپک راگ دراصل آگ اور شعلوں کا راگ تھا اس کے گانے سے گانے والے پر آگ برسنے لگتی تھی اور اس آگ کو کسی فائر بریگیڈ یا پانی اور دوسرے ذرائع سے ٹھنڈا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کا واحد علاج راگ میگھ ملہار تھا جو اس کے اثر کو زائل کر کے جسم میں ٹھنڈک اور پاکیزگی پیدا کر دے۔ ایسا ماہر اور یگانہ روز گار گانے والا کون ہے؟ اسے کہاں سے

تلاش کیا جائے اور کیونکر میگھ ملہار گانے پر آمادہ کیا جائے اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس کا گایا ہوا میگھ ملہار واقعی مطلوبہ تاثر پیدا کر سکے گا؟ تان سین اس ذہنی الجھن میں مبتلا تھا لیکن برملا اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

جب بھرے دربار میں اس کی گائیکی اور فنکارانہ عظمت و مہارت کو چیلنج کیا گیا اور خود شہنشاہ نے اسے دیپک راگ گانے کا حکم (اگرچہ یہ فرمائش تھی مگر حکم کا درجہ رکھتی تھی) جاری کر دیا تو تان سین کے لیے اسے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ خواہ اس کی خاطر اسے اپنی جان پر ہی کیوں نہ کھیل جانا پڑے۔

تان سین نے شہنشاہ کی خواہش کے آگے سر تسلیم خم کر دیا لیکن ریاض اور تیاری کے لیے چند روز کی مہلت دیے جانے کی التجا کی جو منظور کر لی گئی۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے۔

تان سین اسی مشکل سے دوچار تھا۔

تان سین ایک ایسا ماہر فن گویّا تھا کہ دیپک راگ گانا اس کے لیے کوئی مشکل اور ناممکن کام نہیں تھا لیکن وہ اس کے نتائج و عواقب سے بھی بہ خوبی واقف تھا جو اس کے استادوں نے موسیقی اور گائیکی کی تربیت دیتے ہوئے اسے سکھائے اور سمجھائے تھے۔ تان سین کو راگ ملہار گانے میں بھی کوئی مشکل درپیش نہیں تھی۔ وہ دوسرے راگوں کی طرح اس راگ سے بھی نہ صرف واقف تھا بلکہ اس کی تربیت بھی حاصل کر چکا تھا۔

تان سین کے لیے اصل مرحلہ دیپک راگ گانے کے بعد رونما ہونے والے حالات تھے۔ ظاہر ہے کہ دیپک راگ کے اثرات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وہ بذات خود راگ ملہار نہیں گا سکتا تھا کیونکہ جسمانی اور ذہنی لحاظ سے وہ اس کے قابل ہی نہ رہتا۔ اب سوال یہ تھا کہ راگ ملہار گا کر اس کے دکھوں کا علاج کون کرے؟

اکبر کے دربار میں ایسے ماہر موسیقار تھے جو راگ ملہار گا سکتے تھے لیکن وہ سب کے سب تان سین کے خلاف سازش

میں شریک تھے۔اس لیے ان سے کسی امداد یا فلاح کی امید نہیں رکھی جاسکتی تھی۔وہ ان میں سے کسی ایک پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا تھا لیکن شہنشاہ کے حکم سے سرتابی کی مجال بھی نہ تھی۔حکم حاکم، مرگ مفاجات۔اسے ہر صورت میں شہنشاہ کی فرمائش پوری کرنی تھی۔وہ اکبر کو موسیقی کے رموز سے آگاہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ شہنشاؤں کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ ان کے حکم کی تعمیل کے نتیجے میں تعمیل کرنے والا کس مشکل میں مبتلا ہو گا۔انہیں تو اپنے شوق کی تکمیل سے غرض ہوتی ہے۔پھر یہ مسئلہ بھی تھا کہ اگر وہ اکبر اعظم کو اس راگ گانے والے کے انجام سے مطلع کر کے اس حکم کو واپس لینے کی درخواست کرتا تو اس کے دشمن شہنشاہ کو یہ کہہ کر اس کے خلاف بھڑکا سکتے تھے کہ یہ دراصل دیپک راگ گانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا اس لیے بہانے تراش رہا ہے۔ایسی صورت میں تان سین کو نہ صرف ذلت اٹھانی پڑتی بلکہ وہ شہنشاہ کی نظروں میں بھی گر جاتا۔

اسی ادھیڑ بن میں یکایک اسے روپا کا خیال آیا۔روپا بھی اس کے گروہری داس کی شاگرد تھی۔وہ دونوں ایک ہی گاؤں میں پلے بڑھے تھے۔دونوں میں بے تکلفی بھی تھی۔تان سین کو یہ احساس بھی تھا کہ روپا اس کو پسند کرتی ہے تان سین کو بہ خوبی علم تھا کہ روپا راگ ملہار گا سکتی ہے۔اس کی سنگت میں تان سین کی بیٹی بھی ہم آواز ہو کر تان سین کو اذیت سے نجات دلا سکتی ہے۔تان سین نے روپا کو سندیسہ بھیجا اور وہ فوراً پہنچ گئی کیونکہ اگلے ہی روز اسے دیپک راگ گانا تھا۔اس تصور سے اسے قدرے اطمینان ہو گیا کہ ایک ایسی ہستی موجود ہے جو راگ ملہار گا کر اس کی مشکلات حل کر سکتی ہے۔

تان سین کے لیے اب یہ ذاتی وقار کا سوال بن گیا تھا کہ وہ شہنشاہ کی یہ فرمائش پوری کر کے نہ صرف اس کی نظروں میں سرخرو ہو جائے بلکہ دنیائے موسیقی پر بھی اس کی دھاک بیٹھ جائے۔اکبر موسیقی میں تان سین کو اپنا گرو مانتا تھا اور اس کی قدر و منزلت ایک گرو کی طرح ہی کرتا تھا۔وہ دیوان خاص کی نجی محفل میں بھی گھنٹوں اپنے گرو تان سین کے فن سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا اکبر کو اپنے گرو پر ناز تھا۔اس کا امتحان مقصود نہ تھا بلکہ دنیا کو یہ دکھانا تھا کہ اس

نے جس موسیقار کو اپنے گرو کا درجہ دیا ہے وہ صحیح معنوں میں بے مثال فن کار ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اگر اکبر کو دیپک راگ کے اثرات کا علم ہوتا تو وہ خود ہی اپنی فرمائش واپس لے لیتا اور اپنے گرو کی جان کو خطرے میں نہ ڈالتا۔ بہر حال اب یہ تان سین کے لیے ایک چیلنج بن چکا تھا۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی اپنی آبرو قائم رکھنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ وہ اپنے شہنشاہ کے فخر و غرور کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

مقرر وقت پر دیوان عام میں شہنشاہ نے دربار سجایا۔ دیوان عام کے باہر دوسرے اہم امراء اور ممتاز موسیقار بھی اپنی جگہوں پر براجمان ہو چکے تھے۔ تان سین کے مخالف بہت خوش تھے۔ اگر تان سین اس امتحان میں پورا اترتا تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ اور اگر وہ دیپک راگ گا کر دیئے جلانے سے قاصر رہتا تو اس کی عظمت کا سر بہ فلک مینار زمیں بوس ہو جاتا۔ دونوں صورتوں میں تان سین کی ہار تھی اور اس کے دشمنوں کی جیت۔

شہنشاہ سے کچھ فاصلے پر تان سین نے اپنی جگہ سنبھالی۔ روپا بھی حاضرین میں شامل تھی۔ سب لوگ دم بہ خود بیٹھے یہ عجیب و غریب تماشا دیکھ رہے تھے۔ جب تان سین نے الاپ شروع کیا تو انسان تو کیا درخت پودے اور در و دیوار بھی ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اس نے اپنی سریلی آواز میں الاپ کے بعد دیپک راگ شروع کیا۔ حاضرین پر کیف و سرور کی انوکھی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ محصور سے ہو کر رہ گئے۔ ایسی آواز اور ایسا راگ انہوں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

سب اس کی آواز اور راگ کے سحر میں کھو چکے تھے۔

رفتہ رفتہ راگ میں گرمی پیدا ہونے لگی۔ گانے والا تو بے خود تھا لیکن سننے والوں کی کیفیت بھی کچھ مختلف نہ تھی مگر جب راگ اپنے نقطہ عروج کی جانب چلا تو فضا میں گرمی سی پیدا ہو گئی۔

جیسے جیسے راگ آگے بڑھ رہا تھا حرارت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پہلے تو حاضرین اس تبدیلی سے بے خبر رہے لیکن جب درجہ حرارت میں مزید اضافہ ہونے لگا تو دیوان عام اور آس پاس کے باغات کی سرد ہوا گرم ہونے لگی۔ سب حیران تھے کہ اچانک گرمی میں اضافہ کیونکر ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد انہیں احساس ہوا کہ یہ درجہ حرارت گانے والے کی آواز

کے باعث بڑھ رہا تھا۔ حاضرین پسینے میں شرابور ہو گئے۔ آس پاس کے اشجار کے پتے خشک ہو گئے۔ حوض کا پانی گرم ہو کر ابلنے لگا یہاں تک کہ پانی میں سے بھاپ اٹھنے لگی۔ حاضرین اور شہنشاہ شدید گرمی محسوس کر رہے تھے اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے تغیرات بھی ان کی آنکھوں کے سامنے تھے لیکن اب تان سین ایسے مقام پر آ چکا تھا کہ اسے خود اپنا بھی ہوش نہ تھا۔ وہ راگ میں مگن گاتا رہا یہاں تک کہ گرمی انتہا کو پہنچ گئی۔ دیکھنے والوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا جب انہوں نے تان سین کے سامنے رکھے ہوئے دیپ ایک ایک کر کے روشن ہوتے دیکھے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے دیئے روشن ہو گئے۔ شہنشاہ بے اختیار تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تمام درباری بھی احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ سب اس عظیم موسیقار کو خاموشی کی زبان میں خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔

دیپ روشن ہو گئے تو ماحول کی تپش میں بھی رفتہ رفتہ کمی پیدا ہو گئی مگر تان سین بدستور اپنے راگ میں کھویا ہوا تھا۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ یکایک اس کے جسم میں کپکپاہٹ پیدا ہو گئی جیسے بہت سردی لگ رہی ہو۔ راگ ختم ہو چکا تھا۔ دیپ روشن ہو گئے تھے۔ شہنشاہ اور درباری تان سین کی ہنرمندی کے قائل ہو چکے تھے اور اب تان سین پر سب کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ وہ سر تا پا کانپ رہا تھا۔ سب لوگ اس کی اس کیفیت کو حیرت اور پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔

روپا پہلے تو راگ میں کھوئی رہی تھی۔ جب راگ ختم ہوا اور اس نے تان سین کی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھا تو اس کے ہاتھ پیر پھول گئے اور وہ یہ بھول گئی کہ دیپک راگ ختم ہوتے ہی اسے راگ ملہار شروع کرنا تھا تاکہ دیپک راگ کے اثرات پر قابو پا لیا جائے۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر تان سین کی حالت دیکھ رہی تھی۔ اس کے جسم پر آبلے پڑ چکے تھے اور وہ بالکل نڈھال سا ہو کر گر گیا تھا۔ شہنشاہ اور درباری حیران و پریشان دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے اور اس کا علاج کیا ہے۔

اچانک تان سین کی بیٹی سرسوتی نے لپک کر روپا کو جھنجھوڑا اور یاد دلایا کہ اسے فوراً راگ ملہار شروع کرنا ہے ورنہ

صورت حال قابو سے باہر ہو جائے گی۔

روپا یکایک ہوش میں آگئی۔ آگے بڑھ کر وہ تان سین کے پاس جا بیٹھی اور اس نے الاپ شروع کیا تو شہنشاہ اور درباریوں کو ایک اور نئے اور حیرت انگیز تجربے سے گزرنا پڑا۔

الاپ کے بعد راگ ملہار شروع ہوا اور حاضرین پھر ایک جادوئی کیفیت میں ڈوب گئے۔ جوں جوں راگ کی لے تیز ہو رہی تھی فضا میں تبدیلی رونما ہونے لگی تھی۔ یکایک آسمان پر بادل چھا گئے۔ سرد ہوا کے جھونکے چلنے لگے۔ اشجار جھومنے لگے اور پھر بادل گرجنے لگے۔ شہنشاہ اور درباری اس منظر کو بھی حیرت اور بے یقینی سے دیکھ رہے تھے۔ روپا نے راگ گانے میں اپنے تن من کا زور لگا دیا تھا۔ اسے خود علم نہیں تھا کہ وہ ایک تاریخ ساز کارنامہ سرانجام دے رہی ہے۔ اگر تان سین کی حالت زار اس کی آنکھوں کے سامنے نہ ہوتی تو شاید وہ اپنے فن کی معراج تک نہ پہنچتی۔ تان سین کی زندگی کو خطرے میں دیکھ کر اس کے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جی جان سے راگ گانے میں مصروف تھی۔

اور پھر درباریوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ گھنگھور گھٹائیں ایک دم برسنے لگیں۔ پہلے بوندا باندی ہوئی اور اس کے بعد موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ برستا ہوا پانی تان سین کے زخم خوردہ جسم پر مرہم کا اثر دکھا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حالت سنبھلنے لگی۔ آبلے غائب ہو گئے جیسے پانی انہیں اپنے ساتھ بہا کر لے گیا ہو۔ رفتہ رفتہ وہ نارمل ہونے لگا یہاں تک کہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ روپا کی طرف پیار اور عقیدت سے دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرانے لگا۔

راگ ختم ہوا تو جیسے ساری فضا ساکت ہو گئی۔ ہر شخص پانی میں شرابور تھا۔ شہنشاہ اور درباری اب تک اپنی اپنی جگہ پر کھڑے سحر زدگی کے عالم میں یہ جادو بھرا تماشا دیکھ رہے تھے۔ آج انہوں نے اپنی آنکھوں سے موسیقی کا جادو چلتا ہوا دیکھا تھا۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا مگر یہ ایک حقیقت تھی جو ان کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوئی تھی۔ راگ ملہار ختم ہوا تو دیئے بجھ گئے تھے۔ ہر طرف بہار کا ساسماں تھا۔ روپا راگ ختم کرنے کے بعد پیار بھرے

غرور سے تان سین کو دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ حقیقت فراموش کر چکی تھی کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی اور بھی وہاں موجود ہے۔

جب ہوش و حواس بحال ہوئے تو شہنشاہ اکبر بے اختیار آگے بڑھا اور اس نے تان سین کو گلے لگا لیا۔ درباری اور تان سین کے حریف اب ندامت سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ تان سین کو شہنشاہ نے اعزاز اور انعام و اکرام سے نوازا۔ اس کے ساتھ ہی روپا کے کمال فن کے اعتراف کے طور پر اسے بھی انعام سے نوازا گیا۔ شہنشاہ کی نگاہ میں اب تان سین کا مقام پہلے سے بھی بلند تر ہو گیا تھا۔

تان سین کو مکمل صحت یاب ہونے میں تین چار ماہ کا عرصہ لگ گیا۔ روپا اور تان سین کی بیٹی سرسوتی نے جی جان سے اس کی تیمار داری اور خدمت کی۔ یہاں تک کہ وہ مکمل طور پر تندرست ہو گیا اور دوبارہ دربار میں حاضری دینے لگا۔ اب اس کی حیثیت مستند ہو چکی تھی۔ اس کے حریفوں نے بھی اس کی برتری تسلیم کر لی تھی اور شہنشاہ تو اس پر پہلے سے زیادہ ناز کرنے لگا تھا۔ تاریخی واقعات میں اس بات کی باقاعدہ وضاحت موجود نہیں ہے کہ تان سین اور روپا نے اس کے بعد شادی کر لی تھی یا نہیں لیکن یہ ایک یقینی امر ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن گئے ہوں گے۔ فلم ”تان سین“

میں ان واقعات کو قدرے مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ تان سین دربار میں دیپک راگ گاتا

ہے۔ دیے روشن ہو جاتے ہیں اور اس کی حالت بہت بگڑ جاتی ہے۔ اس کی درخواست پر اسے اس کے گاؤں بھیج دیا جاتا ہے جہاں تانی اس کی یہ حالت دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے۔ تان سین کو کھلے آسمان تلے ایک چارپائی پر لٹا دیا جاتا ہے اور تانی راگ ملہار گاتی ہے۔ خورشید نے یہ گانا بہت خوب صورتی سے گایا تھا جو آج بھی یادگار ہے۔

تان سین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جن دنوں وہ ایک گائیک اور موسیقار کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ اس وقت ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی اپنے عروج پر تھی۔ موسیقی کا ٹھاٹیں مارتا ہوا ایک سمندر تھا جس میں ہر موسیقار ہاتھ

پاؤں مار رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت کلاسیکی راگوں کی تعداد چار ہزار کے قریب تھی۔ ظاہر ہے کہ ان تمام راگوں پر عبور حاصل کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ اس سمندر سے سیراب ہونا تو ہر کسی کے بس میں نہ تھا۔ ہر ایک اپنی استطاعت کے مطابق قطرے سمیٹ لیتا تھا۔

تان سین نے ان تمام راگوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد بے شمار راگوں کو بے سود اور غیر ضروری قرار دیا اور صرف چار سو راگ منتخب کیے۔ ایک باقاعدہ ترتیب اور نظام کے تحت ان راگوں کی درجہ بندی کی گئی۔ ان چار سو راگوں میں وہ راگ بھی شامل تھے جو تان سین نے تخلیق کیے تھے اور اس کے بعد کلاسیکی موسیقی کا حصہ بن گئے۔ تان سین نے دھرپد راگ بھی ایجاد کیا تھا۔ دراصل یہ دیوتاؤں کی تعریف میں گایا جانے والا راگ تھا۔ تان سین کے بعد دھرپد راگ آج بھی موجود ہے۔ ہندو اسے دیوی دیوتاؤں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے گاتے ہیں اور مسلمان شہنشاہوں اور تاج داروں کے دربار میں پیش کرتے ہیں۔

تحقیق کے مطابق تان سین کی دو بیویاں تھیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق ہندو گھرانے سے تھا اور دوسری بیوی مسلمان خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ مسلمان بیوی سے متاثر ہو کر تان سین نے بھی اسلام قبول کر لیا اور میاں تان سین کہلایا جسے مسلمان موسیقار استاد اعظم کا درجہ دیتے ہیں۔ تان سین کی اولاد میں چار بیٹے اور ایک بیٹی سرسوتی شامل ہیں۔ سرسوتی کو تان سین نے بذات خود موسیقی اور گائیکی کی تربیت دی تھی۔ تان سین کے بیٹوں کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے اپنے مایہ ناز باپ سے کتنا فیض حاصل کیا تھا مگر موسیقی کی تاریخ میں اس کے کسی بیٹے کا تذکرہ موجود نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں کر سکے تھے۔ البتہ اس کی موسیقی کے ورثے کو دوسروں تک پہنچانے میں اس کے داماد مصری سنگھ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس کے دو بیٹے بھی اس کے فن کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعے بنے تھے۔

کچھ ہندو مورخین نے لکھا ہے کہ اکبر نے شاہی خاندان کی ایک شہزادی سے تان سین کی شادی کر دی تھی۔ اس کا سبب

یہ بیان کیا جاتا ہے کہ تان سین دربار اکبری سے وابستہ ہونے سے گریز کر رہا تھا اس لیے اسے اپنے دربار کی رونق بنانے کے لیے شہنشاہ نے ایک شہزادی سے اس کی شادی کر دی تھی لیکن یہ ایک ناقابل یقین اور بودی دلیل ہے۔ بھلا کس کی مجال تھی جو شہنشاہ اکبر کے حکم سے سرتابی کرتا اور شہنشاہ کی عزت افزائی کے باعث خوشی سے پھولا نہ سماتا لہٰذا یہ ایک فرضی داستان معلوم ہوتی ہے۔

تان سین نے 26 اپریل 1586ء کو وفات پائی تھی۔ اس کی تجہیز و تکفین اسلامی طریقے سے کی گئی تھی۔ شہنشاہ اکبر بذات خود جنازے میں شریک ہوا اور اس کے درباریوں نے بھی جوق در جوق جنازے میں شرکت کی۔ جنازے کے ساتھ سازندے ساز بجاتے ہوئے چل رہے تھے۔ یہ ایک عظیم المرتبت موسیقار اور کئی راگوں اور سازوں کے خالق کے لیے ان کی طرف سے عقیدت بھرا نذرانہ تھا۔ تان سین کی وصیت کے مطابق اس کی میت کو گوالیار لے جایا گیا اور وہیں اسے دفن کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ اس کے استاد اور پیر محمد غوث بھی اس موقع پر بہ نفس نفیس موجود تھے۔ تان سین ان کا قابل فخر نامور شاگرد تھا۔ ایسے شاگرد پر وہ کیوں نہ ناز کرتے؟

تان سین کو ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کا باوا آدم اور بے تاج بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ تان سین نے ہندوستانی موسیقی میں عربی اور فارسی کی آمیزش سے جدت پیدا کر دی۔ موسیقی سے تعلق رکھنے والے گھرانے اس کی موسیقی کو روحانیت کے اعتبار سے بھی باعث تعظیم جانتے ہیں۔ تان سین ایک حقیقی جیتا جاگتا انسان تھا یا ایک افسانوی اور دیو مالائی کردار؟ یہ بجائے خود ایک تحقیق طلب موضوع ہے۔ بھارت میں اس ضمن میں کچھ کام کیا گیا ہے مگر پاکستان میں اس پہلو پر کسی نے توجہ نہیں دی۔

میاں تان سین کی کہانی آپ نے سنی۔ اس میں کتنی حقیقت ہے اور کتنا افسانہ؟ یہ جاننے کے لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ تقسیم ملک سے پہلے ہی اس شخصیت کے بارے میں تحقیق کی جاتی جبکہ یہاں تان سین کا وجود تاریخی حوالوں سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ تاریخ اکبری میں شہنشاہ کے نورتنوں کے ضمن میں گویّے تان سین کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔

موسیقی کے حلقوں میں بھی تان سین کو ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔ یہ روایت تو ہم نے اپنے بچپن میں بھی سنی ہے کہ بہت سے موسیقار اور گوّیے گوالیار جا کر تان سین کی قبر پر لگے ہوئے درخت کے پتے چبا کر سریلے بننے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ گوالیار میں تان سین کی قبر بھی موجود ہے اور اس کے بارے میں مختلف کہانیاں بھی مشہور ہیں اس کے باوجود حیرت کی بات یہ ہے کہ تان سین کے بارے میں کبھی تحقیقی کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

فلم '' تان سین'' میں مرکزی کردار اس زمانے کے نامور اور یکتا گلوکار کے ایل سہگل نے ادا کیا تھا۔ سہگل نے اس کردار کو زندہ جاوید کر دیا۔ اس فلم میں '' تانی'' کا کردار خورشید بانو نے کیا تھا جو اپنے زمانے کی معروف اداکارہ اور گلوکارہ تھیں۔ اس زمانے میں چند ہی اداکارائیں ایسی تھیں جو گلوکاری بھی کرتی تھیں۔ اس کی بہت زیادہ قدر و منزلت کی جاتی تھی اور انہیں معاوضے بھی دیے جاتے تھے۔ برصغیر کی فلمی تاریخ میں ایسے فن کاروں اور فن کاراؤں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان میں سہگل، پنکج ملک، کانن بالا، مناڈے (یہ بنگالی فنکار تھے) خورشید بانو، نور جہاں، ثریا، سریندر قابل ذکر ہیں۔ تان سین کا اتنی تفصیل سے ذکر کیا جائے اور اس کی فلمی محبوبہ اور نئی زندگی دینے والی مغنیہ ''تانی'' کو فراموش کر دیا جائے یہ انصاف سے بعید ہے۔ اس لیے فلم ''تان سین'' میں ''تانی'' کا کردار ادا کرنے والی فنکارہ خورشید بانو کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ضروری سمجھا گیا۔

خورشید بانو اپنے زمانے کی مانی ہوئی اداکارہ اور گلوکارہ تھیں۔ انہیں ''بلبل ہند'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ وہ غالباً برصغیر کی

پہلی گلوکارہ اور فن کارہ تھیں جنہیں موسیقی اور گلوکاری میں نمایاں حیثیت کی وجہ سے ''بلبل ہند'' کا خطاب ملا تھا۔ انہوں نے اپنی سریلی آواز اور فطری بے ساختہ اداکاری کے حوالے سے بہت نام پیدا کیا اور کئی سال تک فلمی دنیا پر راج کرتی رہیں۔

فلم '' تان سین'' 1943ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس وقت خورشید بانو اپنے عروج پر تھیں۔ ہماری

عمراس وقت صرف دس سال کی تھی مگر فلم بینی کے شوق اوراچھی موسیقی سے دلچسپی کے باعث ہم نے بہت ضد کرکے یہ فلم بھوپال ٹاکیزمیں دیکھی تھی اور زنانہ کمپارٹمنٹ میں خواتین کے ہمراہ دیکھی تھی۔ یہ خواتین فلم کے مختلف حصوں میں غمگیں ہوتی رہیں۔ کبھی کبھی سسکیوں کی آوازیں بھی آجاتی تھیں۔تان سین کے جسم پر آبلے پڑے توخواتین بے اختیار رونے لگیں۔جب تانی نے راگ ملہار شروع کیاتوانہوں نے دعائیں مانگنی شروع کردیں کہ یااللہ تان سین کو صحت مند کردے۔ان دل گداز مناظر سے ہم بھی بہت متاثر ہورہے تھےاور ہمہ تن فلم میں کھوئے ہوئے تھے یہاں تک کہ فلم کے خوش گوارانجام نے ہم سب کو خوش کردیااور خواتین رشتے داروں کے ساتھ ہم بھی خوشی خوشی سینماسے واپس گھر آگئے۔خواتین نے حسب معمول فلم کی کہانی لفظ بہ لفظ نہایت تفصیل کے ساتھ ان خواتین کوسنانی شروع کردی جوکہ فلم دیکھنے سے محروم رہ گئی تھیں۔ہمارے بچپن میں یہ ایک معمول بن گیاتھاکہ جو خاتون فلم دیکھ کرآتی تھیں وہ اس کی کہانی حرف بہ حرف تمام تفصیلات اور اپنے تاثروجذبات کے ساتھ دوسروں کو ضرورسناتی تھیں۔وجہ یہ تھی کہ سینماگھرجاکر فلم دیکھنے کی اجازت ہرایک کو نہیں ملتی تھی اس لیے وہ ان خوش قسمت خواتین کی زبانی فلم کی کہانی سن کر لطف اندوز ہوتی تھیں۔

فلم ”تان سین“ ہمیں بھی انتہائی خوب صورت اور پراثر لگی تھی۔دربار اکبری کی شان وشکوہ اورتان سین کے گیتوں نے ہمیں کافی عرصے تک اپنے سحر میں جکڑے رکھابلکہ آج بھی ہم ان گیتوں کو فراموش نہیں کرسکے ہیں۔تانی کے حسن وجمال اور سریلی آواز نے بھی ہمارے دل ودماغ پر گہرااثر کیاتھا۔کئی روز تک ہم ”تان سین“ کے جادو میں کھوئے رہے۔تان سین،تانی اوراکبر ہمارے خوابوں میں آتے رہے۔چند سال کے بعد جب ہم میرٹھ چلے گئے اوراپنی بہن سے ملنے کے لیے اکثر دہلی جانے لگے تودوبارہ فلم تان سین دیکھنے کاموقع ملا اوراس بار ہم اس فلم کو دیکھ کر پہلے سے بھی زیادہ متاثر ہوئے۔”تان سین“ کے نغمے آج بھی ہمارے کانوں میں رس گھولتے ہیں۔اس فلم کے ریکارڈ ہم نے پاکستان آنے کے بعد حاصل کیے تھے پھر کیسٹ کازمانہ آیاتوکیسٹ بھی تلاش کرلیے۔سہگل اور خورشید بانوکے گانوں نے ایک زمانے کواپنا گرویدہ کرلیاتھا۔جن کی مثال آج بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔

خورشید بانو کے بارے میں ہم مختصر تذکرہ پہلے بھی کر چکے ہیں۔اس بار لازم ہو گیا کہ قدرے تفصیل سے ان کا ذکر کیا جائے۔

خورشید بانو نے پندرہ سال کی عمر میں پہلی بار لاہور کی فلم ''سورگ کی سیڑھی ''میں کام کیا تھا پھر وہ کلکتہ چلی گئیں جہاں انہوں نے عشق پنجاب عرف مرزا صاحباں میں کام کیا۔یہ پنجابی فلم تھی۔اس فلم کی تکمیل کے بعد وہ اپنے بھائی کے ساتھ بمبئی چلی گئیں اور وہاں سپر اسٹار بن گئیں۔

خورشید بانو کی پہلی فلم ''سورگ کی سیڑھی'' کے لیے سید امتیاز علی تاج نے انہیں کام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔قابل ذکر بات یہ تھی کہ یہ مشورہ علامہ اقبال کے گھر پر دیا گیا تھا۔خورشید بانو چھوٹی عمر میں ہی علامہ اقبال کے گھر جانے لگی تھیں۔علامہ اقبال تک ان کی رسائی بھی ان ہی کی ایک نظم کے ذریعے ہوئی تھی۔یہ ایک دلچسپ اور تاریخی داستان ہے۔

خورشید بانو لاہور کی تحصیل چونیاں میں پیدا ہوئی تھیں۔تاریخ پیدائش تو انہیں یاد نہیں لیکن ان کی یادداشت کے مطابق ان کی ولادت 1920ء میں ہوئی تھی۔ان کا تعلق ایک سیدھے سادے مذہبی گھرانے سے تھا۔مذہب اس زمانے میں مسلمانوں کی زندگی میں بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔کیونکہ قریب قریب ہر گھر میں روزہ، نماز اور دیگر عبادات معمولات زندگی کا ایک حصہ تھیں۔خورشید بانو ان کا پیدائشی نام ہے۔فلموں میں بھی انہوں نے اسی نام

سے کام کیا اور اس زمانے کے رواج کے مطابق ہندوانہ نام رکھنے سے گریز کیا۔ان کے والد کا نام چراغ دین تھا۔وہ

ٹھیکیدار کے اہل مد تھے۔اس لیے لوگ انہیں منشی چراغ دین کے نام سے پکارتے تھے۔

ان کی عمر چار سال چار ماہ ہوئی تو محلے کی ایک خاتون نے انہیں تعلیم دینی شروع کر دی۔انہیں نورانی قاعدہ اور پھر عربی زبان کا سبق دیا۔پانچ سال کی عمر میں انہیں اسکول میں داخل کر دیا گیا۔وہ تیسری یا چوتھی جماعت میں تھیں

جب ان کے والد کا تبادلہ لاہور ہو گیا اور ان کے گھرانے نے بھاٹی گیٹ میں رہائش اختیار کرلی۔ ان کے والد اب کچہری میں کام کرتے تھے جس کا فاصلہ بھاٹی دروازے سے بہت دور نہ تھا۔ پیدل ہی چل کر وہ کچہری چلے جایا کرتے تھے۔

ان کے والد نے تو اپنی سہولت کی خاطر بھاٹی گیٹ میں رہائش اختیار کی تھی لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ یہ سب کچھ اللہ کی جانب سے ہو رہا ہے۔ اگر وہ بھاٹی گیٹ میں رہائش پذیر نہ ہوتے تو شاید خورشید بانو کبھی اداکارہ اور گلوکارہ نہ بنتیں۔ اپنی ابتدائی زندگی کے یہ واقعات انہوں نے ایک انٹرویو میں معروف صحافی یاسین گوریجہ کو بتائے تھے۔ گوریجہ صاحب نے یہ انٹرویو 1992ء میں ان سے کراچی جا کر لیا تھا۔ ہوا یہ کہ انور مقصود صاحب نے پی ٹی وی سے اپنا پروگرام سلور جوبلی شروع کیا تو یاسین صاحب نے ایک روز نیّرہ نور کو یہ گیت گاتے ہوئے دیکھا اور سنا۔

گھٹا گھنگھور گھور

مور مچاوے شور

مورے سجن آجا۔۔۔ آجا

مورے سجن آجا

یہ گانا خورشید بانو نے فلم ''تان سین'' کے لیے گایا تھا۔ اس فلم میں ان کے گائے ہوئے چھ گانے شامل تھے۔ حالانکہ کے ایل سہگل جیسے مایہ ناز گلوکار اور اداکار بھی اس فلم میں کام کر رہے تھے۔

اس پروگرام میں خورشید بانو بھی بہ نفس نفیس موجود تھیں اور ان کے کلوز اپ بھی گانے کے دوران میں اسکرین پر دکھائے گئے تھے۔ خورشید بانو خود اپنا ہی گایا ہوا مقبول نغمہ نیّرہ نور کی خوب صورت آواز میں سنتے ہوئے ماضی کے خیالوں میں کھوئی ہوئی نظر آتی تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ نیّرہ نور نے بھی اس نغمے کے ساتھ پورا انصاف کیا تھا۔ اسی پروگرام میں نیّرہ نور نے خورشید بانو کا گایا ہوا ایک اور گیت بھی سنایا۔

پنچھی باورا

چاند سے پریت لگائے

انور مقصود کے اس ہر دل عزیز پروگرام میں وہ مشہور و معروف ہستیوں کو مدعو کیا کرتے تھے جن کا تعلق مختلف شعبوں سے تھا اور جنہوں نے اپنے اپنے شعبوں میں ناقابل فراموش کارکردگی کا مظاہرہ کر کے شہرت دوام حاصل کی تھی۔ اسی پروگرام میں ماضی کے معروف باؤلر اور اوول کے ہیرو فضل محمود صاحب بھی موجود تھے۔ نیّرہ نور جب تک خورشید بانو کے گیت سناتی رہیں سننے اور دیکھنے والوں پر ایک سحر انگیز کیفیت طاری رہی۔ خورشید بانو بھی ماضی کے حوالے سے اور نغموں کی خوب صورتی کے باعث خیالوں میں کھوئی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

گیت کے خاتمے پر انور مقصود کے اصرار پر خورشید بانو اسٹیج پر تشریف لائیں تو سارا ہال پر جوش تالیوں سے گونج اٹھا۔ ایک نہایت خوب صورت اور باوقار شخصیت ٹیلی وژن کے کیمرے کے سامنے موجود تھی۔ جن لوگوں کو خورشید بانو کی فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا ان کی نگاہوں میں خورشید بانو کی جوانی کے ایام کی تصویر جگمگانے لگی۔ وہ دراز قد، مشرقی ، نقش و نگار کی مالک ایک پر اثر اداکارہ تھیں جن کی شخصیت، آنکھیں اور سنجیدہ تبسم ان کی شخصیت کا نمایاں

حصہ تھا۔ جب وہ تمکنت حسن و وقار کے ساتھ اسکرین پر نمودار ہو کر اپنی سوریلی آواز کا جادو جگاتی تھیں تو دیکھنے اور

سننے والے دم بہ خود رہ جاتے تھے۔

فیا سین گوریجہ صاحب نے بڑے احترام کے ساتھ ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔ خورشید بانو کو یہ احساس تھا کہ لاہور کا ایک معتبر صحافی ان سے انٹرویو کا طالب ہے۔ ان دنوں وہ فالج کے ہلکے سے حملے کے باعث صاحب فراش تھیں مگر انہوں نے یاسین صاحب کو ملاقات کا وقت دے دیا۔ آپ کے سامنے ان کی نجی زندگی کے واقعات کے حوالے سے جو معلومات پیش کی جا رہی ہیں وہ خود ان کی بیان کردہ ہیں جو انہوں نے انٹرویو میں یاسین گوریجہ صاحب کو بتائی تھیں۔ یہ داستان خود ان کی زبانی سنئے۔

''بھاٹی دروازے کے پرائمری گرلز اسکول میں داخلہ کے بعد مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ میری آواز بہت اچھی ہے۔ میں ابھی نو عمر بچی ہی تھی اور موسیقی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی اسکول میں پڑھائی شروع کرنے سے پہلے بچے دعا پڑھتے تھے ایک بار ٹیچر نے مجھے کلاس میں بلا کر اپنے پاس کھڑا کیا اور بلند آواز میں دعا سنانے کو کہا۔ میں نے :

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

سنائی، ٹیچر کو میری سنائی ہوئی دعا اتنی پسند آئی کہ انہوں نے اس کے بعد ہر روز صبح مجھے دعا پڑھنے کی ڈیوٹی سونپ دی۔ میں دعا پڑھتی تھی اور دوسری لڑکیاں اس کے بعد دہراتی تھیں۔ایک دن علامہ اقبال صاحب نے یہ دعا سنی تو اس کے بعد ان کا معمول بن گیا کہ وہ مجھے گھر بلا لیتے اور اکثر یہ دعا اور اس زمانے کی نعتیں سنتے تھے۔ایک نعت۔۔۔ میرے مولا بلالو مدینے مجھے۔انہیں بہت پسند تھی۔جب بھی میں یہ نظم گاتی تھی علامہ اقبال جانے کہاں کھو جاتے تھے پھر وہ جیسے جاگ جاتے اور کہتے ''جاؤ بیٹا چلم بھر کر لاؤ۔''

میں ان کے حقے کے لیے چلم بھر کر لاتی۔وہ پیار سے مجھے ایک پیسہ دیتے۔اس زمانے میں وہ پیسہ بھی ایک نعمت ہوتا

تھا کہ ایک پیسے کی چار پانچ چیزیں آجاتی تھیں پھر بھی دو پائیاں بچ جاتیں(اس زمانے میں روپیہ، آنہ، پائی ہوتے تھے اور پائیوں سے بھی بہت سی چیزیں خریدی جاسکتی تھیں) میں نے ابتدائی تعلیم اسی اسکول میں حاصل کی۔آٹھویں پاس کی تو مجھے اسکول سے اٹھا لیا گیا۔اس زمانے میں لڑکیوں کو زیادہ تعلیم دلانے کا رواج نہیں تھا پھر ہمارا گھرانہ بھی مذہبی قسم کا تھا۔''

یہ اعزاز فلمی اداکاراؤں میں خورشید بانو کے سوا کسی اور کو نصیب نہیں ہوا کہ مفکر قوم علامہ اقبال نے اس کی زبانی اپنی نظمیں اور نعتیں سنی ہوں۔اسے علامہ اقبال کا حقہ تازہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہو اور جسکی خوش اخلاقی سے خوش ہو کر علامہ صاحب ایک پیسہ ہی سہی انعام دیتے ہوں۔

یہ وہ ابتدائی ماحول تھا جس میں خورشید کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ان کے فلمی دنیا میں آنے کا سبب یہ ہے کہ بھاٹی دروازے میں اس زمانے میں اے۔آر کاردار، ایم،اسماعیل،لالہ یعقوب، عنایت بیگم اور بہت سے دوسرے فلمی فن کار رہتے تھے۔خورشید بانو کے بھائی کی لالہ یعقوب سے بہت دوستی تھی۔خورشید کو صرف گانے کا شوق تھااور وہ بھی انہوں نے باقاعدہ کسی سے نہیں سیکھا تھا۔ اداکاری سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر تقدیر میں اداکار بننااور اسی حیثیت سے بے مثال شہرت حاصل کرنا لکھا تھا سو ایسا ہو کر رہا۔

جب سید امتیاز علی تاج نے علامہ اقبال کے دولت کدے پر خورشید بانو کی زبان سے نظمیں اور نعتیں سنیں تو وہ بہت متاثر ہوئے۔اس زمانے میں وہ فلم ''سورگ کی سیڑھی'' (جنت کی سیڑھی) بنا رہے تھے۔انہوں نے خورشید بانو سے کہا وہ انکی فلم میں کام کریں اور گانا بھی گائیں۔خورشید بانو کے گھر کے حالات ان دنوں ٹھیک نہ تھے۔انہوں نے یہ بات اپنے بھائی کو بتائی۔انہوں نے اپنے دوست لالہ یعقوب سے مشورہ لیا تو انہوں نے بہت پر زور انداز میں اس پیش کش کو قبول کرنے کا مشورہ دیا۔اس وقت خورشید بانو کی عمرہ پندرہ سال تھی۔'' سورگ کی سیڑھی'' میں انہوں نے پہلی بار کام کیااور گانا بھی گایا۔یہ ایک معمولی سا کردار تھا۔فلم کا ماحول بہت اچھا تھا کیونکہ بہت اچھے اچھے لوگ اس میں کام کر رہے تھے اور سید امتیاز علی تاج جیسی ہستی اسکی ہدایت کار تھی۔

ابھی یہ فلم زیر تکمیل ہی تھی کہ کلکتہ سے ایک پارسی سیٹھ لاہور آئے۔انہوں نے خورشید بانو کو سیٹ پر کام کرتے ہوئے دیکھا تو ان کی شخصیت اور اداکاری سے کافی متاثر ہوئے۔وہ کلکتہ میں ایک پنجابی فلم بنا رہے تھے۔جس کے لیے انہیں ایک ہیروئن کی ضرورت تھی۔انہوں نے اس کردار کے لیے خورشید بانو کو بہت موزوں پایا تو فوراً انہیں پیش کش کر دی۔''سورگ کی سیڑھی'' مکمل ہونے کے بعد خورشید بانو اس فلم میں کام کرنے کے لئے اپنے بھائی کے ساتھ کلکتہ چلی گئیں۔لالہ یعقوب، بھائی دیسا، امیر علی اور عنایت بیگم وغیرہ بھی ان کے ساتھ گئے تھے۔

فلم کا نام عشق پنجاب عرف مرزا صاحباں تھا۔یہ خورشید بانو کی پہلی پنجابی فلم تھی۔اس فلم کی تکمیل کے بعد وہ اپنے

بھائی کے ہمراہ بمبئ چلی گئیں۔اب وہ اداکارہ اور گلوکارہ بن چکی تھیں۔لالہ یعقوب نے ان کے بھائی کو مشورہ دیا کہ بمبئ فلم کا بڑا مرکز ہے اور وہاں ترقی کے مواقع بھی زیادہ ہیں۔اس طرح خورشید بانو کلکتہ سے بمبئ پہنچ گئیں۔

خورشید بانو اس لحاظ سے بھی غالباً واحد اداکارہ تھیں جنھوں نے ایک ہی سال میں لاہور، کلکتہ اور بمبئ کی پانچ فلموں میں اداکاری کی۔ بمبئ میں اس سال ان کی تین فلمیں ریلیز ہوئی تھیں۔ان میں غیبی ستارہ، چراغ حسن اور ہم شکل شامل ہیں۔ بمبئ میں ہر زمانے میں ہر معیار کے فلم ساز اور ہدایت کار موجود رہے ہیں جو دوسرے درجے کی ایکشن اور جادوئی فلمیں بنایا کرتے تھے۔خورشید بانو کا واسطہ بھی آغاز میں ایسے ہی فلم سازوں سے پڑا تھا۔یہ 1935 کا ذکر ہے۔

اسی سال خورشید بانو سروج مووی ٹون سے وابستہ ہو گئیں۔1936ء میں اس ادارے نے فلم ''کیمیا گر'' بنائی جس کے ہیرو اس وقت کے معروف ہیرو ماسٹر نثار تھے۔ اسی سال اس کی فلم ''سپہ سالار'' بھی ریلیز ہوئی۔اس کی اگلی فلم ''اعلان جنگ'' تھی۔یہ فلم کامیاب تھی لیکن یہ دوسرے درجے کے فلم ساز کی کہانی تھی۔ ایسے ادارے عموماً ایکشن فلمیں بنایا کرتے تھے۔خورشید بانو نے ابھی تک بی کلاس فلموں ہی میں کام کیا تھا۔ان کی فلم ''دلربا'' اور ساقی بھی نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ایمان فروش کے بعد 1938ء میں انہوں نے ایک اچھے ہدایت کار ضیا سرحدی کی فلم ''افسانہ'' میں جیراج کے بالمقابل کام کیا۔اس جوڑی کو بہت پسند کیا گیا۔آئندہ دو سال میں خورشید

کو نسبتاً اچھی فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا۔1939ء میں خورشید کی آٹھ فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔

خورشید بانو کی قابل ذکر فلم ''آپ کی مرضی'' تھی جس میں انہوں نے نذیر، شوبھنا سمرتھ۔پرتھوی راج، گوپ، مبارک، مسعود اور کے این سنگھ جیسے نامور اداکاروں کے ساتھ کام کیا۔یہ فلم خاصی پسند کی گئی اور خورشید بانو کی شہرت اور عظمت کا آغاز اسی فلم سے ہوا تھا۔اس کے بعد ان کی فلم ''میری آنکھیں ''ریلیز ہوئی جس کے موسیقار کھیم چند پرکاش جیسے مانے ہوئے موسیقار تھے۔کھیم چند پرکاش پہلے موسیقار تھے جنہیں یہ احساس ہوا کہ خورشید کی آواز بہت اچھی اور سریلی ہے۔اس فلم کی موسیقی پسند کی گئی۔خورشید کی اگلی فلم '' دیکھا جائے گا'' تھی۔

1940ء خورشید بانو کے لئے ایک اہم سال تھا کیونکہ اسی سال ان کی لالہ یعقوب سے شادی ہوگئی تھی اور ان کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔اسی سال خورشید بانو کا رنجیت مووی ٹون جیسے بڑے فلم ساز ادارے سے معاہدہ ہوگیا۔یہ خورشید کی فلمی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔اس زمانے میں ہر آرٹسٹ کسی فلم ساز ادارے سے وابستہ ہوتا تھا۔ رنجیت مووی ٹون ایک باوقار اور معروف ادارہ تھا جو معیاری اور کامیاب فلمیں بنانے کے لیے مشہور تھا۔اس سے پہلے خورشید اسسٹنٹ فلمیں بنانے والے اداروں کے ساتھ منسلک رہی تھیں۔یہ پہلا ادارہ تھا جس میں خورشید کو پہلی بار ایک بڑے اور معیاری ادارے کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔

اس کمپنی سے وابستہ ہوتے ہی خورشید کی قسمت کھل گئی۔اس ادارے کی پہلی فلم ’’ہولی‘‘ تھی جس کے ہدایت کار اے آر کاردار تھے۔اس فلم میں بڑے اداکار تھے لیکن اس کی نمایاں خوبی اس کی موسیقی تھی جو کھیم چند پرکاش نے ترتیب دی تھی۔وہ خورشید کی مدھر آواز کا صحیح استعمال کرنے والے پہلے موسیقار تھے۔اسی فلم سے خورشید نے گلوکارہ کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔اس ادارے کی دوسری فلم ’’مسافر‘‘ تھی۔یہ ہر اعتبار سے ایک بڑی فلم تھی۔اسکی کاسٹ میں اپنے زمانے کے نامور اور مقبول فن کار شامل تھے جن میں ایشور لال،یعقوب، مرزا اشرف وغیرہ شامل تھے۔اس زمانے کے نامور ترین کامیڈین چارلی اسکے ہیرو تھے۔یہ ایک کامیاب فلم تھی۔1941ء میں اس ادارے کی فلم ’’بیٹی‘‘ ریلیز ہوئی جس کے موسیقار گیان دت اور ہدایت کار جینت ڈیسائی تھے۔اس فلم میں خورشید نے ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا اور چار گانے بھی گائے تھے جو سب کے سب ہٹ ہوگئے۔اب فن کارہ اور گلوکارہ کی حیثیت سے خورشید کا طوطی بولنے لگا تھا اور اس کی قسمت کا ستارہ عروج کی جانب رواں دواں تھا۔اسی سال خورشید اور موتی لال کی فلم ’’پردیسی‘‘ ریلیز ہوئی۔موتی لال اس وقت کے سپر اسٹار تھے اور ان کے ساتھ خورشید کی یہ پہلی فلم تھی۔یہ فلم موسیقی کی وجہ سے بھی ممتاز تھی۔اس میں تیرہ گانے تھے اور سبھی سپر ہٹ تھے۔چند گانے شاید آپ کو بھی یاد ہوں۔

پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا

یوں ہم کو نہ دنیا سے بیزار کیا ہوتا

موری اٹریا ہے، سونی موہن نہیں آئے

موتی لال اور خورشید کی جوڑی کو بے انتہا پسند کیا گیا۔اس فلم کی کہانی ایک انگریزی فلم سے اخذ کی گئی تھی۔اس کہانی پر لاہور میں تقسیم سے پہلے ایک یادگار۔۔۔ فلم ’’داسی‘‘ بنائی گئی تھی اور پاکستان میں نذرالاسلام نے ’’بندش‘‘ بنائی تھی۔یہ دونوں فلمیں بھی بہت کامیاب ہوئی تھیں اور موسیقی کے اعتبار سے بھی انہیں سراہا گیا تھا۔

اسی سال خورشید کی اگلی فلم ’’شادی‘ تھی جو منشی دل نے لکھی تھی جینت ڈیسائی اس کے ہدایت کار تھے اور موسیقی کھیم چند پرکاش نے بنائی تھی موتی لال اس کے ہیرو تھے۔مادھوری اور ایشور لال بھی اس فلم کے اہم کردار تھے۔اس فلم کی نمائش کے بعد ہر طرف خورشید کا چرچا ہونے لگا اور وہ سپر اسٹار بن گئیں۔خورشید اب مقبولیت کے عروج پر تھیں۔

یہ موقع مناسب جان کر ان کے شوہر لالہ یعقوب نے سوچا کہ کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے چنانچہ انہوں نے اپنی ذاتی پنجابی فلم ’’ہیولا‘‘ بنائی جس کے ہدایت کار منور ایچ قاسم تھے۔منور ایچ قاسم کی یہ بطور ہدایت کار پہلی فلم تھی۔منور ایچ قاسم صاحب نے بعد میں پاکستان آکر بھی فلمیں بنائیں جن میں ایک فلم ’آج کل‘ کے مکالمے ہم نے لکھے تھے۔خدا جانے کسی فقیر کی بددعا تھی کہ منور صاحب کی کوئی فلم کامیاب نہیں ہوئی بلکہ یہ بری طرح فلاپ ہوئیں۔منور صاحب کے واقعات ہم پہلے ہی کافی تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ان کی بیٹی کی منگنی اداکار اور ’’آج کل‘ کے بعد ہیرو سید کمال سے ہوئی تھی لیکن بعد میں قائم نہ رہ سکی۔بعد میں ان کی بیٹی کی شادی معروف و ممتاز بینکر زآغا عابد سے ہوگئی جو بی سی سی آئی کے خالق اور چیئر مین تھے۔

’’ہیولا‘‘ کی عبرت انگیز ناکامی بھی خورشید کو متاثر نہ کر سکی کیونکہ ان کا ستارہ عروج پر تھا۔اسی زمانے میں رنجیت مووی ٹون نے کلکتہ سے اس زمانے کے سپر اسٹار اور نامور گلوکار کے ایل سہگل کو فلم ’’بھگت سورداس‘‘ میں کام

کرنے کے لیے خصوصی طور پر بلایا۔ کے ایل سہگل کے نام کا ہر طرف ڈنکا بج رہا تھا۔ ان کے ساتھ خورشید بانو کا ہیروئن کی حیثیت سے کام کرنا کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔

اس فلم کی کہانی بہت انوکھی اور دلچسپ تھی۔ فلم کا ہیرو سورداس ایک طوائف کے عشق میں مبتلا ہو کر دنیا کی ہر چیز سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ طوائف کا کردار خورشید بانو نے بہت خوبی سے ادا کیا تھا۔ جب سورداس اپنی محبوبہ کی محبت میں دیوانہ ہو جاتا ہے تو طوائف ایک دن اس سے کہتی ہے کہ جتنی محبت تو اس سے کرتا ہے اگر اتنی ہی محبت وہ بھگوان سے کرے تو وہ لافانی حیثیت کا مالک ہو سکتا ہے۔ سورداس طوائف کے عشق میں اس قدر آگے بڑھ چکا ہے کہ اسے دیکھتے ہی دین دنیا سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ اس کمزوری کے پیش نظر وہ اپنی دونوں آنکھیں پھوڑ لیتا ہے کہ نہ وہ طوائف کو دیکھے گا اور نہ بھگوان سے دور ہو گا۔ اسی لیے وہ خود کو اندھا کر لیتا ہے۔ سورداس کا یہ جذبہ طوائف کو اتنا متاثر کرتا ہے کہ وہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ اگر سورداس دنیا کو نہیں دیکھ سکتا تو وہ بھی اس دنیا کو نہیں دیکھے گی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے اور اپنے بھگوان سے پراتھنا کرتی ہے کہ جب تک سورداس دنیا کو دیکھنے کے قابل نہیں ہو گا وہ بھی اپنی آنکھیں نہیں کھولے گی۔

ادھر سورداس خود کو بھگوان کی عبادت کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ اپنی زندگی اس کی پوجا پاٹ کے لیے وقف کر دیتا ہے اس کی عبادت دیکھ کر لوگ اسے بھگت سورداس کہنے لگتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں وہ بھگوان کا چہیتا بندہ تھا۔ طوائف نے بھی اپنی زندگی بھگوان کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان دونوں کی عبادت سے بھگوان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ پھر ایک معجزہ رونما ہوتا ہے اور بھگت سورداس کی دونوں آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں کی عبادت رنگ لے آتی ہے۔ طوائف بھی اپنی قسم کے مطابق آنکھیں کھول دیتی ہے۔ اس طرح ان دونوں کی دعائیں اور عبادت قبول ہو جاتی ہیں اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔

اس فلم کے گانے سپر ہٹ ہوئے تھے۔ چند گانے ملاحظہ کیجئے

1- مدھر مدھر گارے منوا!

مدھر مدھر گا

2-پنچھی بانورا

چاند سے پریت لگائے

3-جوں جوں پیت بڑھائے گا تو

توں توں گھٹتا جائے

''بھگ سورداس'' اس سال کی کامیاب اور مقبول ترین فلم ثابت ہوئی اور خورشید بانو ایک بار پھر بام عروج پر پہنچ گئیں۔

اسی سال خورشید بانو کی فلم ''چاندنی'' نمائش کے لیے پیش کی گئی۔اس فلم میں خورشید بانو نے ڈبل رول ادا کیا تھا۔وہ بیک وقت ماڈرن اور دیہاتی لڑکی کے روپ میں سامنے آئی تھیں۔

1943ء میں رنجیت کی کلاسیکی فلم ''تان سین'' آئی جس نے مقبولیت اور کامیابیوں کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔تان سین میں خورشید اور کے ایل سہگل ایک بار پھر یکجا ہوئے تھے اور اس فلم میں نہ صرف انہوں نے لاجواب اداکاری کی تھی بلکہ اس فلم کی موسیقی ایسی تھی کہ بھلائے نہ بھلائی جائے۔کے ایل سہگل اور خورشید نے اپنی گائیکی کا سکہ سارے ملک پر بٹھا دیا تھا۔انہیں گائیکی میں حرف آخر تسلیم کر لیا گیا تھا اور بڑے بڑے موسیقاروں نے انہیں عظمت کی سند دے دی تھی۔

تان سین کے سارے گانے سپر ہٹ تھے جن میں سے چند یہ ہیں۔

1- گھٹا گھن گھور گھور

مور مچاوے شور

مورے سجن آجا آجا

مورے سجن آجا(خورشید بانو)

2-وہ دن بھول گئے(خورشید بانو)

3-برسورے کالے بدروا برسو(خورشید بانو)

4-دکھیا جیارا روئے نیناں(خورشید بانو)

5-دیا جلاؤرے جگمگ جگمگ(کے ایل سہگل)

1944ء میں رنجیت کی فلم ""شہنشاہ بابر"" ریلیز ہوئی جس میں خورشید کے ساتھ شیخ مختار، سوشیل کمار، لالہ، یعقوب وغیرہ نے کام کیا تھا۔ کھیم چندر پرکاش اس کے موسیقار تھے۔وجاہت مرزا چنگیزی اس فلم کے مصنف اور ہدایت کار تھے۔یہ فلم بہت کامیاب ہوئی اس کی موسیقی فلم کی نمایاں خوبی تھی۔اس فلم کے چند یادگار گانے یہ

ہیں۔

1- بلبل آ

میں گاؤں پیار کے نغمے

تو بھی گا

2- محبت میں سارا جہاں جل رہا ہے

زمیں تو زمیں آسماں جل رہا ہے

رنجیت مووی ٹون کے مالک چندر لال شاہ تھے۔ وہ انڈین فلم انڈسٹری کے شہنشاہ کہلاتے تھے۔ بڑے بڑے نامور اداکاروں سے انکا معاہدہ تھا۔ انکی فلمیں اوپر تلے کامیاب ہو رہی تھیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہو گیا تھا کہ اگر وہ مٹی کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ سونا بن جاتی ہے لیکن ہر عروج کو ایک دن زوال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اب چندر لال شاہ کے عروج کا زمانہ ختم ہونے لگا تھا اور ان کا ستارہ گردش میں آگیا تھا۔ یہ وجہ ہے کہ ''شہنشاہ بابر'' کے بعد ان کی کامیابیوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اب ان کی فلمیں بری طرح فلاپ ہو رہی تھیں۔

''ممتاز محل'' شہنشاہ بابر کی کامیابی سے متاثر ہو کر دوسری تاریخی اور رومانی فلم بنائی گئی تھی جس کے مصنف اور ہدایت کار کیدار شرما جیسے ہنر مند انسان تھے۔ خورشید اس کی ہیروئن تھیں۔ یہ بڑے وسیع پیانے پر بنائی گئی تھی مگر بری طرح فلاپ ہو گئی۔ اس کے بعد وجاہت مرزا کی ہدایت میں دوسری فلم '' پربھو کا گھر'' ریلیز ہوئی اور سخت ناکامی سے دوچار ہوئی۔ رنجیت اور خورشید کی ایک اور فلم ''مورتی'' بھی فلاپ ہو گئی مگر اس فلم کا ایک گانا

" بدریا برس گئی اس بار" آج بھی لوگوں کو یاد ہے

1936ء میں فلم ''پھلواری'' کا بھی یہی حشر ہوا۔ رنجیت ایک بڑا فلم ساز ادارہ تھا اور بیک وقت کئی فلمیں بناتا تھا لیکن قسمت کے پھیر میں آ چکا تھا اسلیے اس کی ہر فلم ناکام ہو رہی تھی۔ اسکے ساتھ ہی خورشید بانو کے عروج کا دور بھی ختم ہو رہا تھا۔ ''پھلواری'' رنجیت کی آخری فلم تھی جس میں خورشید بانو نے کام کیا تھا اور ناکامی کا مزہ چکھا تھا۔ چندر لال شاہ جو کروڑپتی تھے، دیکھتے ہی دیکھتے کنگال ہو گئے۔ ان کا اسٹوڈیو اور دوسرے اثاثے فروخت ہو گئے تھے اور قرض میں انکا بال بال بندھ گیا تھا۔

جب رنجیت مووی ٹون کو زوال ہوا تو اس سے وابستہ ذاتی فلم ساز ادارہ قائم کر لیا اور بڑے اہتمام کے ساتھ ایک

تاریخی فلم ’’مہاراج پرتاپ‘‘ بنائی۔ایشور لال نے اس فلم میں خورشید کے ساتھ مرکزی کردار ادا کیا تھا۔یہ فلم بالکل فلاپ تو نہ ہوئی مگر اسے کامیاب بھی نہیں کہا جا سکتا۔

1946ء کا ہنگامہ خیز سال تھا۔1947ء میں سہراب مودی نے سوشل فلم ’’منجدھار‘‘ میں خورشید بانو کو کاسٹ کیا۔ماسٹر غلام حیدر اس فلم کے موسیقار تھے لیکن قسمت پر مہر لگ چکی تھی اس لیے یہ فلم بھی ناکام ہو گئی۔ 1947ء میں سینٹرل اسٹوڈیو نے فلم ’’مٹی‘‘ بنائی۔لوگ کہتے ہیں کہ بعض نام بہت منحوس ثابت ہوتے ہیں۔ ’’مٹی‘‘ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔یہ فلم بری طرح ناکام ہوئی۔بقول ایک مبصر کے فلم ’’مٹی‘‘ ریلیز ہوتے ہی مٹی میں مل گئی۔اس فلم میں خورشید اور صادق علی مرکزی کردار تھے۔

خورشید بانو کی شہرت رفتہ نے ابھی تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا اس لیے مسلسل ناکامیوں کے باوجود فلم ساز ان کو کاسٹ کر رہے تھے۔ایکٹر اور پروڈیوسر کمار نے بڑے زور و شور سے ایک سوشل فلم ’’آپ بیتی‘‘ کے نام سے شروع کی۔یہ فلم مکمل ہونے کے بعد خورشید نے بھارت چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے شوہر لالہ یعقوب کے ساتھ پاکستان آ گئیں۔’’آپ بیتی‘‘ ان کے پاکستان آنے کے بعد ریلیز ہوئی تھی اور یہ بھی فلاپ ہو گئی تھی۔

خورشید بانو نے بمبئی میں بہت عروج دیکھا تھا۔ایک لحاظ سے فلمی دنیا پر حکومت کی تھی۔نام اور دولت کمائی تھی۔

گلوکارہ اور اداکارہ کی حیثیت سے اپنا لوہا منوایا تھا مگر بالآخر جب وہ بمبئی سے پاکستان روانہ ہوئیں تو ایک ناکام ہیروئن کا ٹھپا ان پر لگ چکا تھا۔

پاکستان میں خورشید اور ان کے شوہر لالہ یعقوب کا پہلا پڑاؤ کراچی تھا۔پاکستان میں اس وقت فلمی صنعت نہ ہونے کے برابر تھی۔لاہور میں چند فلمیں بنائی گئی تھیں اور سب فلاپ ہوئی تھیں لیکن لاہور ہی پاکستان کا فلمی مرکز تھا۔خورشید بانو کے شوہر کا خیال تھا کہ ان دونوں کو بھی لاہور میں قیام کرنا چاہیے لیکن خورشید اس کے لیے رضامند نہیں تھیں۔وہ کراچی میں رہائش اختیار کرنا چاہتی تھیں۔اس کے علاوہ ان دونوں میں کچھ اور اختلافات بھی پیدا ہو چکے تھے۔یہی

اختلافات ان دونوں میں علیحدگی کا سبب بن گئے۔ خورشید اور لالہ یعقوب ایک طویل عرصے کی رفاقت کے بعد ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے اور ان میں طلاق ہو گئی۔

خورشید نے کراچی ہی میں قیام کرنا پسند کیا اور وہاں دو فلمیں ''فنکار'' اور ''منڈی'' میں کام کیا لیکن ناکامی کے اثرات ابھی تک بدستور باقی تھے۔ یہ دونوں فلمیں بھی بہت بری طرح فلاپ ہوئیں۔ ان میں سے ایک فلم ''منڈی'' کے ہدایت کار ہمارے دوست عزیز احمد تھے جو بعد میں لاہور آکر فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے سیکرٹری کے عہدے پر کافی عرصے تک فائز رہے۔ چند سال قبل اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔

خورشید بانو کی زندگی میں رفتہ رفتہ انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ مذہب سے انہیں ہمیشہ لگاؤ رہا تھا لیکن اب ان کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے فلمی صنعت میں ایک طویل عرصہ گزارا تھا لیکن ان کا دامن بدنامی سے ہمیشہ پاک رہا۔ مسلسل ناکامیوں کے علاوہ بھی ان کا دل اداکاری اور فلموں سے اکتا چکا تھا اور انہوں نے فلمی صنعت کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کراچی میں ایک خاموش اور پرسکون زندگی گزار رہی تھیں جب ایک ممتاز صنعت کار یوسف میاں نے ان سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ خورشید بانو فلمی دنیا کو خیر باد کہہ چکی تھیں اپنے شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے بعد وہ تنہا اور بے سہارا ہو گئی تھیں کچھ غور و خوض کے بعد بالآخر انہوں نے یوسف میاں کی پیش کش قبول کر لی اور بیگم یوسف میاں بن گئیں۔ فلمی دنیا اور اداکاری اب ان کے لیے ایک بھولا

ہوا خواب بن چکی تھی۔ اس وقت ان کی عمر بہ مشکل تیس سال ہو گی۔

اب وہ ایک ریٹائرڈ بزرگ خاتون کی زندگی گزار رہی ہیں۔ بیتے دنوں کی ناقابل فراموش یادیں ہی اب ان کا سرمایہ ہیں۔ ان کا بچپن اور علامہ اقبال کی شفقت اور حوصلہ افزائی کی یادیں وہ کیسے فراموش کر سکتی ہیں۔ انہیں یہ شرف بھی حاصل ہے کہ علامہ اقبال انہیں اپنے گھر بلا کر ان سے نعتیں اور نظمیں سنا کرتے تھے اور وہ ان کا حقہ بھی تازہ کیا کرتی تھیں۔ علامہ کا انعام میں دیا ہوا اور ایک ایک پیسہ وہ زندگی بھر نہیں بھول سکیں گی۔

زندگی اسی کا نام ہے۔ کہیں سے شروع ہو کر نہ جانے کہاں ختم ہو جاتی ہے۔ راہ میں کیسے کیسے مراحل سے گزرتی ہے۔ کبھی خوشی، کبھی غم۔ کبھی کامیابی تو کبھی ناکامی۔ اسی کا نام زندگی ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ خورشید بانو نے فلم میں ناکام ہونے کے بعد بھی ایک خوش گوار، پر سکون اور خوش و خرم زندگی بسر کی۔ شاید یہ علامہ اقبال کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ ان کی یادگار فلموں کی تعداد بھی ان کے ناقابل فراموش گانوں کی طرح بہت زیادہ ہے لیکن فلم ''تان سین ''کو ان فلموں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ ''تان سین'' کے ہدایت کار جینت ڈیسائی اور مصنف منشی دل تھے۔ موسیقار کھیم چند پرکاش اور خورشید بانو کی آوازوں نے لازوال گیتوں میں ڈھال دیا تھا۔ اس فلم میں سہگل تان سین تھے۔ ان کی محبوبہ تانی کا کردار خورشید بانو نے بہت خوب صورتی سے ادا کیا تھا۔ شہنشاہ اکبر کے روپ میں مبارک نے ایک باوقار اور بارعب کردار ادا کیا تھا۔ مغلیہ شہزادی کا کردار کملا چٹر جی نے ادا کیا تھا۔ تان سین کے خلاف ان کے مخالفین کی سازشوں کو اس شہزادی نے ہی الفاظ کا روپ دے کر شہنشاہ کے سامنے پیش کیا تھا کہ تان سین سے دیپک راگ سنا جائے۔ کملا چٹر جی مشہور اداکارہ سلوچنا چٹر جی کی بہن تھیں جن سے کیدار شرما نے شادی کر لی تھی۔ کیدار شرما انڈین فلم انڈسٹری میں مصنف، ہدیات کار اور گیت نگار کی حیثیت سے بہت ممتاز اور بلند حیثیت کے حامل تھے۔ ان کی یادگار فلمیں چتر لیکھا، بانورے نین اور جوگن انڈیا کی فلمی تاریخ میں کلاسیکی فلمیں تسلیم کی جاتی ہیں۔

فلم '' تان سین'' ایک عجیب و غریب فلم تھی۔ تاریخی پس منظر میں پائی جانے والی اس فلمی کہانی میں بہت اتار

چڑھاؤ اور ہر قسم کی دلچسپیاں تھیں۔ منشی دل نے اس کہانی کا تانا بانا بہت خوبصورتی اور ہنر مندی سے بنا تھا۔ تان سین اور تانی دونوں کے کرداروں کو اس کہانی میں یکساں اور مساوی حیثیت دی گئی تھی۔ تان سین نے اپنے فن کا مظاہرہ کئی بار کیا تھا۔ ایک بار بپھری ہوئی مست ہتھنی کو اپنے گانے سے رام کر لیا تھا۔ ایک منظر میں ہتھنی بے قابو اور غضب ناک ہو کر ہر چیز کو روندنے پر تلی ہوئی تھی جب تان سین نے ایک گیت گا کر اسے رام کر لیا۔ اس گیت کے بول یہ تھے۔

رم جھم رم جھم چال تمہاری

کاہے بھئی متواری

(ترجمہ: تمہاری چال میں رم جھم کا حسن ہے۔ تم دیوانی کیوں ہو رہی ہو؟)

اس کے مقابلے میں تانی ایک گیت گا کر جنگل کے ڈھور ڈنگروں کو ایک جگہ اکٹھا کر لیتی ہے۔ اس گانے کے بول یہ تھے۔

آؤ گوری

آؤ شاما

سانجھ بھئی گھر آؤ

اس کے بعد کلائمکس میں دیپک راگ اور دوسرے کلائمکس میں میگھ ملہار نے اس فلم میں ناقابل بیان حسن پیدا کر دیا تھا۔ اس فلم میں کل تیرہ گانے تھے جن میں سے چھ گانے سہگل نے گائے تھے۔ ایک دوگانا سہگل اور خورشید کی آواز میں تھا۔ جس کے بول تھے۔

مورے بالا پن کے ساتھی چھیلا

بھول جائیو نا

خورشید بانو کی آواز میں بھی چھ گانے تھے جو یہ ہیں

1- برسو رے، برسو رے۔

کارے بدردا مورے پیا پہ برسو

جیسے موری انکھیاں برسیں

2-آجا آجا مکھ دکھلا جا

3-پنگھٹ پہ مرے شیام بجائیں بنسریا

4-اودکھیا جیارا

5-اب راجا بھئے مورے بالم

وہ دن بھول گئے

6-آؤ گوری آؤ شاما

سانجھ بھئی گھر آؤ

دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ جن دنوں فلم " تان سین "کی نمائش ہو رہی تھی اس سال ملک میں اتنی موسلا دھار بارش ہوئی تھی کہ بڑے بڑے تمام دریاؤں میں سیلاب آگیا تھااور بہت سے دیہات غرقاب ہو گئے تھے۔ میگھ ملہار میں ایسے سہانے سر لگا دیئے ہیں کہ بارشیں رکنے کا نام نہیں لے رہیں۔ کسی گلوکارہ کے لیے اس سے بڑاانعام اور اعزاز بھلا کیا ہو سکتا ہے؟

پرانے موسیقاروں اور کلاسیکی موسیقی کی باتیں اب داستانیں ہو کر رہ گئی ہیں۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ہماری نئی نسل کو اپنی پرانی تہذیب و ثقافت یہاں تک کہ تاریخ تک سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ ہم جب چھوٹے تھے تو گھر میں اماں اور دوسرے بڑے لوگ تاریخی ہستیوں کے واقعات اور کہانیاں سناتے رہتے تھے۔ دین اور مذہب کے بارے میں بھی پہلی اور ابتدائی معلومات ہمیں ان ہی ذرائع سے حاصل ہوئی تھیں پھر جب ذرا بڑے ہوئے اور پڑھنا

سیکھ لیا تو خود ہی کتابیں اور رسالے پڑھنے لگے۔ اس طرح ہمارا اور ہماری نسل کا تاریخی اور تہذیب و ثقافت سے بچپن ہی سے رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید پختہ ہوتا گیا۔ اب نہ وہ مائیں اور بہنیں ہیں، نہ وہ گھر جہاں پڑھنے لکھنے کا شوق اور کتابوں اور رسالوں کے انبار لگے ہوں۔ اب تو رفتہ رفتہ گھروں سے کتابیں غائب ہی ہوتی جا رہی ہیں۔ جس قدر دولت منداور ترقی یافتہ گھرانا ہے کتابوں اور جرائد سے اتنا ہی تہی دست ہے۔ اب ٹی وی، ویڈیو، کمپیوٹر کا راج ہے۔ بچے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی کارٹون اور پھر کچھ بڑے ہونے کے بعد ٹی وی پروگرام اور فلمیں دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ بعض بچے تو اپنا تمام تر فارغ وقت ٹی وی کے سامنے ہی گزار دیتے ہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ شوق بھی بڑھتا رہتا ہے۔ اب کمپیوٹر نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے۔ کمپیوٹر ایک بہت فائدہ مند ذریعہ معلومات بھی ہو سکتا ہے اور اگر کوئی چاہے تو پل بھر میں دنیا بھر کے علم و فنون کے بارے میں قدیم و جدید معلومات حاصل کر سکتا ہے لیکن پھر وہی بات کہ ہمارے ہاں کمپیوٹر کو بھی محض تفریح بلکہ سستی تفریح کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ہمیں حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک جہاں یہ تمام ایجادات سالہا سال پہلے عام ہو چکی تھیں لیکن پڑھنے کا شوق اس کے باوجود وہاں کم نہیں ہوا۔ کتابیں، رسائل اور اخبارات لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتے ہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے ہاتھوں میں بھی کتابیں اور رسائل نظر آتے ہیں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ ہم لوگ ہر ایجاد کی خرابیوں کو ہی کیوں اپناتے ہیں۔ ان کی خوبیوں سے فیض یاب کیوں نہیں ہوتے؟ اس بارے میں ہم پہلے بھی اپنا نقطہ نظر بیان کر چکے ہیں۔ جن قوموں میں باشعور اور فہمیدہ قیادت کا فقدان ہوتا ہے وہ اپنی راہ متعین نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح گمراہی میں بھٹکتی رہتی ہیں اور زمانے کے تیز رفتار قدموں تلے کچلی جاتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں صرف دولت ہی سب سے اہم اور قابل قدر چیز ہے۔ اس کے جائز و ناجائز حصول کے لیے سب بگٹٹ اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں لیکن وقت اور زمانے کی دوڑ میں اتنے پیچھے رہ گئے ہیں کہ آگے جانے والے ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ یہ ترقی معکوس کہاں جا کر رکے گی۔ ختم بھی ہو گی یا نہیں؟

اسے کون روکے گا؟ حالات اور معاشرے کو کون بدلے گا؟ قوم کو صحیح راستوں کی جانب کون لے جائے گا؟ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ جس کے سائز میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ہر شخص مجسم ایک سوال بن کررہ گیا ہے۔ جب سبھی سوال ہوں تو جواب کون دے گا؟

اس اندھیرے میں کبھی کبھی بھٹکے ہوئے جگنو کی طرح روشنی کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی ذرہ چمک رہا ہے۔ ایسے ہی ایک صاحب کے بارے میں پچھلے دنوں معلوم ہوا تو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کوئی ایک فرد واحد جو دولت منداور صاحب وسائل بھی نہ ہو ایسے کام کیسے کر سکتا ہے؟ مگر کرنے والے کرتے ہیں، کررہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

ان سے ملئے۔ ان صاحب کا نام اللہ داد ہے۔ پختہ عمر کے خوش ذوق انسان ہیں۔ سنگلاخ علاقے کے شہر پشاور میں رہتے ہیں۔ درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں مگر موسیقی سے محبت کے معاملے میں بہت رئیس اور غنی ہیں۔ انہوں نے تن تنہا پرانے گانوں کی ایک لائبریری بنائی ہے جو ایک بڑے کمرے پر مشتمل ہے۔ فرش پر قالین ہے۔ اس کے علاوہ کوئی فرنیچر نہیں ہے۔ ہر طرف پرانی موسیقی کے ریکارڈ اور ریڈیو پروگرام بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے ہیں۔ اس کمرے میں سات ریڈیو گرام ہیں۔ اللہ داد صاحب کو پرانے ریکارڈ جمع کرنے کا شوق بلکہ جنون ہے۔

قدیم ترین ریکارڈ ان کی اس ''لائبریری'' میں موجود ہیں۔ برصغیر کے ہر نامور اور قابل ذکر گلوکار کے ریکارڈ اس کمرے میں موجود ہیں۔ قدیم ترین ریکارڈ 1905ء میں بنایا گیا تھا۔ یہ مغنیہ گوہر جان کے گانوں پر مشتمل ہے۔ گوہر جان کے بارے میں ہم اور آپ شاید نہیں جانتے تو پھر ان کا ریکارڈ کس نے سنا ہوگا؟ گوہر جان ایک پختون خاتون تھیں مگر کلکتہ میں رہتی تھیں۔ ان کا پہلا ریکارڈ 1905ء میں بنا تھا یہی اللہ داد صاحب کی لائبریری کا قدیم ترین ریکارڈ ہے۔ اسے آپ برصغیر کا قدیم ترین ریکارڈ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی یہ ریکارڈ 93 سال پرانا ہے۔ اگر کسی اور صاحب کے پاس اس سے زیادہ پرانا کوئی ریکارڈ ہو تو وہ بتائیں۔ موسیقی کے رسیاؤں کے لیے یہ ایک خوش خبری ہوگی۔

اللہ داد صاحب نے صرف ریکارڈ ہی اکٹھے نہیں کیے ہیں۔ان کے پاس آٹھ سو پرانی کلاسیکی فلموں کا ذخیرہ بھی موجود ہے۔ان میں وہ فلمیں بھی شامل ہیں جن کے پرنٹ اب دستیاب نہیں ہیں اس لیے ان کے ویڈیو بھی نہیں بنائے جا سکتے۔ان فلموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی موسیقی لاجواب اور لازوال ہے۔انہیں موسیقی سے لگاؤ ہے اس لیے انہوں نے فلمیں بھی وہی سمیٹ کر رکھی ہیں جو اپنی موسیقی کے حوالے سے یادگار ہیں۔

آٹھ سو فلموں کے علاوہ ان کے پاس ۱۴ ہزار ریکارڈ بھی ہیں۔چودہ ہزار کا عدد کہنے کو آسان لگتا ہے مگر کوئی ۱۴ سو ریکارڈ بھی جمع کرنے نکلے تو شاید بے نیل و مرام واپس لوٹ آئے۔

برصغیر کے سبھی پرانے اور ممتاز گلوکاروں کے ریکارڈ اس ذخیرہ میں شامل ہیں۔ایک زمانہ تھا جب ہندوستان کے طول و عرض میں نامی گرامی گلوکاروں کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ابھی ہندوستان تقسیم نہیں ہوا تھا۔جغرافیہ تبدیل نہیں ہوا تھا اور پھر آواز تو سرحدوں کی پابندی سے آزاد ہوتی ہے۔ایک لمحے میں ہوا کے دوش پر یہ ایک ملک سے دوسرے ملک تک اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پہنچ جاتی ہے۔اس کے لیے کسی پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ایک زمانے میں کملا جھریا کی آواز سارے ہندوستان میں گونجتی تھی۔کملا جھریا کلاسیکی گانے گاتی تھیں۔غزلیں، قوالیاں، پکے راگ اور ان کی آواز میں ڈھل کر ناقابل فراموش موسیقی میں تبدیل ہو جاتے تھے۔کملا جھریا نے ایک نعت بھی گائی تھی جو اس زمانے میں انتہائی مقبول ہوئی تھی۔نعت کے بول ملاحظہ کیجیے۔ہندی زبان کی نعت آپ نے شاید پہلے کبھی نہ سنی ہو۔

تمرے دیا کی ہے آس محمدؐ

پاپی ہوں کچھ نہیں پاس محمدؐ

ایک ہندو مغنیہ کی ہندی زبان میں گائی ہوئی یہ نعت سننے والوں پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دیتی ہے۔روح کی

گہرائیوں کو چھو لیتی ہے۔ دل و دماغ کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتی ہے۔ ایسے گانے سن کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وقت تھم گیا ہو اور آواز زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو گئی ہو۔

اللہ داد صاحب کی لائبریری میں اردو، ہندی، فارسی، پشتو، مراٹھی، بنگالی یہاں تک کہ انگریزی کلاسیکی گانوں کے ریکارڈ بھی موجود ہیں اُن میں فلمی گانے بھی ہیں اور غیر فلمی نغمے بھی ہیں۔ غزلیں، قوالیاں، نعتیں، بھجن ہر طرح کے گانے انہوں نے سمیٹ لئے ہیں۔ یہاں تک کہ فارسی زبان میں استاد میراں بخش کا گایا ہوا ایک قصیدہ بھی ان کے خزانے میں محفوظ ہے۔ یہ قصیدہ انہوں نے افغانستان کے شاہ امان اللہ خان کے دربار میں گایا تھا۔ اللہ داد صاحب کے پاس یہ اصلی ریکارڈ موجود ہے۔ ان کے پاس کون سے گانے والے کا ریکارڈ نہیں ہے۔ آپ نام لیجئے اور وہ ان کے گانوں کے ریکارڈوں کا ڈھیر آپ کے سامنے نکال کر رکھ دیں گے اور سنا بھی دیں گے۔ اس معاملے میں وہ بہت فیّاض ہیں۔ شوقین اور صاحب ذوق لوگ ہر روز ان کی اس لائبریری میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی پسند کے گانوں کی فرمائش کرتے ہیں۔ اللہ داد صاحب خندہ پیشانی سے ان کی فرمائش پوری کرتے ہیں۔ انہوں نے تمام ریکارڈ بہت سلیقے اور نفاست سے اس ترتیب سے رکھے ہیں کہ ایک لمحے میں مطلوبہ ریکارڈ نکال کر ریڈیو گرام میں رکھ دیتے ہیں۔ ان میں اختری بائی فیض آبادی، موتی بائی اور روشن آرا بیگم کی مایہ ناز غزلیں بھی شامل ہیں۔ نور جہاں، ثریا اور امیر بائی کرناٹکی کے سب سے پہلے گانوں کے ریکارڈ بھی ان کے پاس موجود ہیں۔ کے ایل سہگل کے تمام فلمی اور غیر فلمی گانوں کے ریکارڈ ان کے پاس حفاظت سے رکھے ہوئے ہیں۔ جنہیں وہ فرمائش کرنے پر بلا تامل بجا کر سنا دیتے ہیں۔ کنجوسی سے کام نہیں لیتے بلکہ انہیں صاحب ذوق لوگوں کو ان کے پسندیدہ گانے سنا کر دلی مسرت ہوتی ہے۔

اللہ داد صاحب کے پاس ایسی خاموش فلمیں بھی موجود ہیں جو 1895ء سے 1913 کے درمیان بنائی گئی تھیں۔ بر صغیر میں بنائی جانے والی پہلی فلم ''راجاہریش چندر'' کے شاٹس بھی ان کی لائبریری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ فلم دادا بھائی پھالکے نے بنائی تھی۔ آٹھ سو نادر فلموں کے گانے اور شاٹس ان کی لائبریری کی زینت ہیں۔ ابتدائی زمانے

میں ہر ریکارڈ پر مونو گرام بنا ہوتا تھا لیکن 1972ء کے بعد مونو گرام ریکارڈ بننا بند ہو گئے اب کوئی مونو گرام ریکارڈ

حاصل کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔

اللہ داد صاحب کو کلاسیکی ریکارڈ جمع کرنے کا شوق تھا جو رفتہ رفتہ جنون میں تبدیل ہو گیا۔یہی جنون بالآخر اس نادر روز گار ذاتی لائبریری کے قیام کا سبب بن گیا۔

یوں تو کوئی بھی کسی وقت ان سے اپنی پسند کا گانا سننے کی فرمائش کر سکتا ہے لیکن ہفتے میں دو بار اس کمرے میں باقاعدگی سے شوقین حضرات کی محفل آراستہ ہوتی ہے۔جن میں پرانی یادیں تازہ کی جاتی ہیں۔پرانی فلموں کے شاٹس دیکھے جاتے ہیں۔ پرانے گانے سنے جاتے ہیں۔اللہ داد صاحب کو ایسی محفلیں سجا کر بہت خوشی ہوتی ہے۔وہ ریکارڈ سنانے سے کبھی نہیں تھکتے،پرانی فلموں،گلوکاروں، گانوں اور اداکاروں کے بارے میں ان کی معلومات انتہائی وسیع ہیں۔ جنہیں وہ بڑے شوق سے سناتے ہیں۔ریکارڈ اور پرانی فلموں کو جمع کرنے کے سوا انہیں کوئی شوق نہیں ہے۔انہوں نے تو جیسے اپنی ساری زندگی اسی کے لیے وقف کر دی ہے۔ان کے اس شوق کا آغاز 1952 میں ہوا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی ساری پونجی ریکارڈ اور پرانی فلموں کے شاٹس جمع کرنے پر لگا دی۔جب ویڈیو کا دور آیا تو

انہوں نے پرانی فلموں کے ویڈیو جمع کرنے شروع کر دیئے جہاں بھی ملے انہوں نے منہ مانگے داموں خریدے ان کی ہر شام اسی لائبریری میں بسر ہوتی ہے ان کا اوڑھنا بچھونا، کھانا پینا یہی ریکارڈ اور فلمیں ہیں۔یہ صرف ایک شخص کی ذاتی جدوجہد اور شوق کی کہانی ہے۔اس کے بعد اس نادر خزانے کی حفاظت کون کرے گا؟یہ ایک سوالیہ نشان ہے اس کا جواب خود اللہ داد صاحب کے پاس بھی نہیں ہے انہیں مستقبل کی فکر نہیں ہے۔وہ اپنے حال میں مست اور بے خود ہیں۔ایسے کتنے ہی نادر روزگار فنی خزانے اس ملک میں بکھرے ہوئے ہیں۔ خزینے نہیں،انہیں تو دفینے کہنا زیادہ مناسب ہو گا کیونکہ ان کے بارے میں کوئی جانتا تک نہیں ہے کہ یہ کہاں دفن ہیں؟

اپنے ملک میں فن کاروں اور عظیم المرتبت ہستیوں کی ناقدری کی داستانیں عام ہیں۔ ہر ایک کو یہی شکایت ہے کہ دیکھئے صاحب،اس ملک میں فن کار کی کوئی قدر و منزلت ہی نہیں ہے لیکن آپ دنیا کے سب سے ترقی یافتہ،دولت مند،

طاقت وراور بزعم خود فن در فن کاروں کے قدرداں ملک امریکا کے بارے میں کیا کہیں گے اور آزادی اور مساوات کا علم بردار تصور کیا جاتاہے کہتے ہیں کہ وہاں تعصب کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ وہ ایک کشادہ دل اور قدرداں قوم ہے۔ وہاں ہر شخص آزاد اور مساوی حقوق کا حامل ہے۔ مذہب، نسل، رنگ کی یہاں کوئی تفریق نہیں ہے۔ یہ ان کی آزادی کی علامت ہے۔ اپنی اس خوبی کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے امریکیوں نے نیویارک کے ساحل پر ''آزادی کا مجسمہ'' نصب کر دیا ہے جو ساری دنیا کو آزادی، مساوات اور یکساں حقوق کی ضمانت دیتا ہے لیکن امریکیوں کا کوئی بھی روپ مصلحت اور منافع سے خالی نہیں ہوتا۔ ''آزادی کا مجسمہ'' سیاحوں کے لیے ایک دلکش اور پرکشش یادگار ہے جس کے ذریعے امریکی حکومت ہر سال کروڑوں اربوں ڈالر کماتی ہے۔ رنگ اور نسل نصف صدی پہلے تک امریکی معاشرے میں نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔ کالوں کو غلام اور کمتر مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ انہیں گوروں کے علاقوں، ریستورانوں اور تفریح گاہوں میں قدم رکھنے کی اجازت تک نہ تھی۔ رفتہ رفتہ دنیا بھر میں اس کے خلاف پرزور احتجاج کی بنا پر اور خود اپنا امیج بہتر بنانے کی غرض سے امریکیوں نے بڑی مشکل سے اس نسلی تفریق سے چھٹکارا حاصل کیا لیکن عملی طور پر کالے آج بھی امریکا میں دوسرے درجے کے شہری ہیں۔ گوروں کے مقابلے میں وہ انتہائی پسماندہ، بے بس اور قابل رحم لوگ ہیں۔ کوئی بھی امریکا جاکر بذات خود اپنی آنکھوں سے امریکیوں کی منافقت اور ''انسان دوستی'' کا یہ نمونہ دیکھ سکتا ہے۔

دنیا بھر میں یہ بات ضرب المثل کی طرح مشہور ہے کہ امریکا واضح امکانات اور روشن مستقبل کی سرزمین ہے۔ وہ جوہر قابل کی قدر اور آبیاری کرتی ہے۔ انہیں اس قدر نوازتی ہے کہ وہ پھر وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن اس ضرب المثل یا کہاوت کا دوسرا رخ بھی ہے جو عمومی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے۔ وہ یہ کہ امریکا نے بے شک دنیا بھر سے آنے والوں کے لیے بازو کشادہ کر دیئے اور انہیں مالامال کر دیا لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ ان ہنر منداور با صلاحیت لوگوں نے امریکا کو کس قدر مالامال کیا ہے۔ اگر یہ سرزمین صرف یورپ کے مجرموں اور بدکردار بگھوڑوں ہی سے آباد رہتی تو شاید آج کوئی اس کا نام تک نہ جانتا مگر دنیا بھر سے آنے والے گہر وجواہر نے اس ملک کو دنیا کا سب سے ترقی یافتہ اور دولت مند ملک بنا دیا۔ اس میں احسان مند کون ہے۔ اور محسن کون۔ کیا یہ حقیقت اور ستم ظریفی

نہیں ہے کہ امریکا۔۔۔میں قابل ذکر کارنامے سرانجام دینے والے وہی لوگ ہیں جو باہر سے یہاں آئے تھے۔یہ درست ہے کہ ان کو پتھروں سے تراش کر ہیرا بنانے میں امریکا کا ہاتھ ہے لیکن اگر یہ محض پتھر ہی ہوتے تو ہیرا کیسے بن جاتے؟امریکا میں آج بھی کروڑوں پتھر ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔اس جادوئی سرزمین نے سب کو ہیرا کیوں نہیں بنا دیا؟اس اعتبار سے دیکھئے تو یہ ان پر امریکا کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا امریکا پر احسان عظیم ہے جنہوں نے مجرموں اور اٹھائی گیروں کی اس سرزمین کو ایک حسین سانچے میں ڈھال دیا۔دور کیوں جاتے ہیں۔ایٹمی توانائی کو ہی دیکھ لیجئے۔امریکا نے یہ علم جرمنوں سے سیکھا جنہیں وہ پکڑ کر اپنے ملک میں لے آئے تھے۔کچھ روسیوں کے حصے میں آ گئے۔اس طرح یہ دونوں ممالک سپر پاور اور ایٹمی قوت بن گئے۔امریکا کی کی جانے والی ہر ایجاد کے پیچھے ایک غیر ملکی پناہ گیر کا ہاتھ ہے۔ہر سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ان ہی غیر ملکیوں کی مرہون منت ہے۔اسی طرح علم وفنون لطیفہ کے شعبوں میں بھی باہر سے آنے والوں نے اپنی گل کاری سے چمنستان کھلا دیئے۔

ایسے ہی لوگوں میں چارلی چپلن بھی شامل تھا۔

چارلی چپلن نے تھیٹر میں کام کیا۔اداکاری کی۔محنت مزدوری کی۔یہاں تک کہ اسے اپنا صحیح مقام مل گیا۔اس نے اداکاری،ہدایت کاری اور نت نئے موضوعات کو فلمانے کی نئی روایات قائم کیں۔یہاں تک کہ چارلی چپلن کے حوالے سے امریکا کا اور امریکا کے حوالے سے چارلی چپلن کا نام دنیا کے ہر شخص کی زبان پر آ گیا۔

چارلی چپلن نے اپنی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں امریکا کے لیے وقف کر دیں۔امریکا نے بھی اسے شہرت اور دولت سے مالا مال کر دیا مگر یہ تو کاروبار کا ایک لازمی حصہ ہوتا ہے۔چارلی چپلن نے جتنی دولت کمائی اس سے کہیں زیادہ دولت امریکا نے چارلی چپلن کے نام اور اس کی فلموں سے کمائی۔

چارلی چپلن کی فلموں نے امریکی فلمی صنعت کو جو شہرت اور وقار بخشا اس کا اندازہ زروجواہر سے نہیں کیا جا سکتا۔چارلی چپلن ایک زمانے میں ہر ملک اور قوم کے لیے گھریلو نام کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔مزاحیہ اور طنزیہ فلموں کے

حوالے سے وہ کل بھی ضرب المثل تھااور آج وفات کے سالہاسال بعد بھی ضرب المثل ہے۔ چارلی چپلن کے عہد میں ہالی ووڈ میں اور بھی بڑے اور نامور مزاحیہ اداکار تھے لیکن چارلی کو ان سب پر ذہنی اور فکری برتری حاصل تھی۔ چارلی چپلن کو مذاق مذاق میں معاشرے اور سیاست پر گہرے طنز کرنے پر جو قدرت حاصل تھی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ چارلی چپلن نے کسی کالج یا یونیورسٹی میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ نہ وہ ڈگری یافتہ تھا لیکن اپنی خداداد ذہانت، قابلیت اور مطالعے اور گہرے مشاہدے کے ساتھ ساتھ غور و فکر کی نعمتوں سے مالامال تھا۔ اور انتہائی لطیف، بھرپور اور دلکش انداز میں زندگی کی تلخیوں اور دکھوں کو ہنسی ہنسی میں اس طرح پیش کرتا تھا کہ اس کی ہر فلم ایک یادگار فلم بن جاتی تھی۔ چارلی چپلن اپنی فلموں کے اسکرپٹ بذات خود لکھتا تھا۔ فلم سازی اور ہدایت کاری بھی وہ خود ہی کرتا تھا۔ اسے موسیقی کا بھرپور شعور تھا چنانچہ وہ اپنی فلموں کی موسیقی بھی خود ہی ترتیب دیا کرتا تھا۔ وہ خاموش فلموں کا دور تھا۔ فلم کے ساتھ ''سب ٹائٹل'' یعنی لکھے ہوئے فقروں کے ذریعے مکالموں کا مفہوم مختصر طور پر پیش کر دیا جاتا تھا تاکہ کم تعلیم یافتہ اور محدود شعور رکھنے والے عام لوگ بھی اس کو سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔

چارلی چپلن اس سلسلے میں بھی کم سے کم تحریری مکالموں کا قائل تھا۔ دراصل وہ اتنا عظیم فنکار اور دانش ور تھا کہ محض خاموش مناظر بلکہ بعض اوقات تو ایک دو شاٹس یا چہرے کے تاثرات کے ذریعے سین کی وضاحت کر دیتا تھا اور ہر عمر اور طبقے سے تعلق رکھنے والے فلم بین اس کا مفہوم اور مقصد جان لیا کرتے تھے۔ چارلی چپلن کے بلند سیاسی شعور اور دانش مندی کے باعث اپنے عہد کے بڑے بڑے نامور ترین سیاست دانوں، مصنفین، شاعروں، نقادوں یہاں تک کہ حکمرانوں تک سے اس کے گہرے مراسم تھے اور چارلی چپلن سے ملنا اور اس کی مہمان داری کرنا اپنے لیے باعث مسرت اور باعث فخر جانتے تھے۔ برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل جیسی قدر آور شخصیت سے لے کر جارج برنارڈ شا جیسا مایہ ناز قلم کار بھی اس سے ملاقات کا متمنی رہتا تھا۔ چارلی چپلن کو زندگی کے ہر شعبے اور موضوع پر دسترس حاصل تھی۔ وہ جس قسم کی محفل میں شریک ہوتا تھا اسی کے تقاضوں کے مطابق انتہائی پر مغز اور خیال افزا

گفتگو کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چارلی چپلن کو محض کامیڈین ہی نہیں ایک مفکر، طنز کا ماہر اور سیاسی و سماجی شعور رکھنے والا دانش ور تسلیم کیا جاتا تھا۔

چارلی ایک ترقی پسند اور آزاد منش انسان تھا۔ دوسری عالم گیر جنگ میں وہ ہٹلر کی خونریزی اور دنیا کو فتح کرنے کی خواہش کو قابل مذمت سمجھتا تھا۔ اس موضوع پر اسکی فلم ''دی گریٹ ڈکٹیٹر'' کلاسیکی حیثیت رکھتی ہے۔ اس فلم میں انتہائی ہلکے پھلکے اور مزاحیہ انداز میں اس نے ایک آمر مطلق کا ایسا خاکہ پیش کیا ہے کہ آج تک اس کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ یہ اس قدر لطیف، دلچسپ اور معنی خیز فلم تھی کہ خود ہٹلر نے بھی فرمائش کر کے اس فلم کا پرنٹ منگوا کر خصوصی طور پر فلم دیکھی اور بہت لطف اندوز ہوا۔ گولڈ رش، دی کڈ اور ایسی دیگر فلموں نے چارلی چپلن کو شہرت اور عزت کے بلند ترین سنگھاسن پر بٹھا دیا تھا۔ وہ خواص و عام ہر ایک کا محبوب تھا۔ اس کی فلمیں نوع انسانی کے لیے فکر اور دلچسپی کا سامان فراہم کرتی تھیں۔ اسی لیے دنیا نے تسلیم کیا کہ چارلی چپلن اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد فنکار تھا۔ اس جیسی ہستی نہ اس سے پہلے پیدا ہوئی اور نہ ہی اس کے بعد اس کا نعم البدل سامنے آیا۔

چارلی چپلن نے اپنی محنت، لگن اور بے پناہ صلاحیتوں کے بل پر اپنی زندگی میں لازوال مقام حاصل کر لیا تھا۔ لوگ

اس کا نام سن کر ہنستے بھی تھے لیکن اس کا احترام بھی کرتے تھے۔ دنیا بھر نے اس کی صلاحیت اور قابلیت کا لوہا مان لیا تھا۔ اس کے ہمعصر اور حریف فن کار اس کے مقابلے میں بالشتیئے نظر آتے تھے۔ چارلی چپلن کی فلمیں امریکا کے لیے دنیا بھر سے دولت سمیٹ کر لا رہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی وجہ سے ہالی ووڈ کو ایک منفرد اور ممتاز حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جو بھی امریکا گیا وہ کامیاب ہوا اور اس نے ایک روشن مستقبل حاصل کر لیا لیکن دیکھا جائے تو حقیقت اس کے برعکس ہے۔ امریکا کو امریکا بنانے والے یہی باہر سے آنے والے مہاجر اور پناہ گزین ہیں۔ کون سا شعبہ ایسا ہے جس میں باہر کے لوگوں نے امریکا کو ترقی کی معراج پر نہیں پہنچایا۔ امریکا نے لوگوں کو اتنا نہیں دیا جتنا

ان لوگوں نے امریکا کو دے دیا۔ان ہی لوگوں میں چارلی چپلن بھی شامل ہے۔جس نے امریکا کو عظیم تر بنانے میں حصہ لیا۔

چارلی چپلن نے بے انتہا شہرت،دولت اور عزت کمائی۔اس نے اپنے بھائی کو بھی عیش کرائے اور مالی حالات درست ہونے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ اپنی بوڑھی اور بے سہارا ذہنی مریض ماں کو اپنے پاس بلالیا مگراس سے پہلے اس نے ایک شاندار محل نما مکان تعمیر کرایا جیسے گھر کے اس کی ماں خواب دیکھا کرتی تھی۔اپنی ماں کی پسند کے مطابق اس نے اس گھر کو بے دریغ دولت خرچ کر کے سجایا۔اس کی ماں کو گلاب کے پھولوں سے عشق تھا۔چارلی چپلن نے اس گھر کے باغ کو گلاب کے پھولوں سے باغ و بہار بنادیا جس روز اس کی ماں امریکا پہنچنے والی تھی اس روز چارلی چپلن نے ہالی ووڈ کے تمام گلاب خرید کر اپنے گھر کے چپے چپے میں سجادیے۔فرنیچر،پردے،قالین ہر چیز بیش قیمت اور اس کی ماں کی خواہشات کے مطابق تھی۔اس نے انگلستان میں اپنی ماں کی دیکھ بھال کے لیے ہمہ وقت دو نرسیں مقرر کی تھیں۔ امریکا کے گھر میں بھی کئی نرسوں کا انتخاب کیا گیا۔دوسرے نوکران کے علاوہ تھے۔چارلی کو یہ احساس تھا کہ اس کی ماں کو زندگی کی کوئی خوشی نہیں ملی۔وہ ایک فن کار اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والی عورت تھی مگر نہ تو اس کے فن کی قدر کی گئی اور نہ ہی کبھی اس کے خوابوں کی تعبیر ملی۔اس نے جوانی اور زندگی کا بیشتر حصہ شوہر کے رخصت ہو جانے کے بعد تنہا محنت مشقت کر کے گزارا تھا۔جب غموں کا زور بڑھ جاتا تھا تو وہ نفسیاتی علاج گاہ میں داخل کر دی جاتی تھی اور اس کے دونوں معصوم بچے رشتے داروں کے رحم و کرم پر یتیم خانوں کی پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔جوں ہی اس کی حالت سنبھلتی وہ فوراً واپس آکر اپنا چھوٹا سا پرانا فلیٹ سجاتی اور اپنے بچوں کو اپنے پاس لے آتی۔وہ تھیٹر میں چھوٹے موٹے کردار ادا کر کے اپنا گزارا کرتی تھی۔جس کا معاوضہ بہت کم ملتا تھا مگر وہ ہمیشہ ایک شاندار زندگی کے خواب دیکھا کرتی تھی اور ان خوابوں میں اپنے بچوں کو بھی شریک کر لیتی تھی۔چارلی نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ اس نے اداکاری اور مشاہدے کی دولت اپنی ماں سے حاصل کی تھی۔شام کو جب وہ گھر لوٹتی تو بچوں کی جسمانی آسائش کے لیے تو اس کے پاس بہت کم پیسہ ہوتا تھا لیکن وہ انہیں سارے دن کے واقعات اور مختلف کرداروں کی نقل پیش کر کے ہنسا ہنسا کے پاگل کر دیتی تھی۔وہ جس کردار کا بھی ذکر کرتی تھی عملی طور پر بھی اس کا ہو بہو نقشہ پیش کر

دیتی تھی۔ وہ اپنے بچوں کو خوب صورت لوگوں اور حسین مقامات کہانیاں سنایا کرتی تھی جہاں تک نہ تو خود اس کی رسائی تھی اور نہ ہی اس کے بچے اس دنیا میں قدم رکھ سکتے تھے مگر وہ ایک فن کار اور بلند خیال عورت تھی۔ خواب دیکھنا اور عالم تصور میں بچوں کو خوابوں کی سر زمین پر لے جانا ہی اس کے بس میں تھا۔ یہ فرض وہ بڑی خوبی سے سر انجام دیتی تھی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد بے کاری اور مالی پریشانیوں کی وجہ سے وہ ایک بار پھر اسپتال میں داخل کرا دی جاتی تھی۔ اس وقت نہ اسے اپنے بچوں کا ہوش رہتا تھا اور نہ خود اپنا۔ بے چارے معصوم بچے ایک بار پھر زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے لیے دنیا میں تنہا رہ جاتے تھے۔ چارلی چپلن چھوٹے موٹے کام کرکے اپنا اور اپنے چھوٹے بھائی کا پیٹ پالنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ محنت مزدوری کرتا تھا۔ مکانوں کے شیشے صاف کرتا تھا۔ اخبار فروخت کرتا تھا۔ گھروں کی گھاس کاٹتا تھا۔ غرض یہ کہ ایک ننھا بچہ جو بھی کام کر سکتا ہے وہ چارلی سر انجام دیتا تھا۔ وہ ایک غیور اور خوددار بچہ تھا۔ دوسروں کے رحم و کرم پر رہنا اسے پسند نہ تھا۔ بچپن کے یہی مشاہدات آگے چل کر اس کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے اور اس کی یادگار فلموں کے غیر فانی کرداروں میں ڈھل گئے۔

جب اچھے دن آئے تو چارلی نے اپنی ماں کو اس کے خوابوں کی تعبیر فراہم کرنے کی کوشش کی۔ جس روز وہ امریکا پہنچی تو چارلی اپنے بھائی کے ساتھ اس کا استقبال کرنے کے لیے بندرگاہ پر موجود تھا۔ اس نے اپنی ماں کے لیے اس کی پسند کے انتہائی قیمتی ملبوسات اور زیورات فراہم کیے تھے جن سے وہ ساری زندگی محروم ہی رہی تھی۔ چارلی اپنی ماں کو اپنی ترقی کی معراج دکھانا چاہتا تھا تاکہ اس کے زندگی بھر کے دکھوں کا مداوا ہو سکے مگر قسمت کو یہ منظور نہ تھا۔

چارلی چپلن کی ماں نے جب امریکا کی سرزمین پر قدم رکھا تو وہ اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بیٹوں کو بھی نہیں پہچان سکی۔ وہ خاموش بیٹھی خلا میں گھورتی رہتی تھی۔ خوشی یا غم کی کسی بات کا اس پر مطلق اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان تمام چیزوں سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

چارلی چپلن اپنی ماں کی یہ حالت دیکھ کر رو دیا اور بہت دیر تک روتا رہا دنیا کو ہنسانے والا اپنی ماں کو آنسوؤں کے تحفے کے سوا کچھ اور نہ پیش کر سکا۔

شاندار کار میں سوار ہو کر چارلی کی ماں اپنے محل نما گھر پہنچی تو ملازموں کی پوری فوج اس کی پذیرائی کے لیے موجود تھی ۔ تمام گھر گلابوں اور قیمتی پردوں، فرنیچر اور قالینوں اور نوادرات سے سجا ہوا تھا مگر چارلی کی ماں کے لیے یہ سب چیزیں بے معنی اور بے کار تھیں۔ وہ نہ کچھ سمجھ سکتی تھی نہ کسی خوشی یا غم کا اظہار کر سکتی تھی۔ وہ ایک زندہ لاش بن چکی تھی۔

چارلی اس رات صبح تک ماں کے کمرے میں اس کے سامنے بیٹھا روتا رہا مگر اس کی معمولی سی تکلیف پر بے چین ہو جانے والی ماں محض خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ نہ گلے لگایا نہ پیار کیا۔ نہ اس کے آنسو پونچھ کر اس کو تھپک کر بہلایا بچپن میں اس کی کہانیاں اور لوریاں سنانے والی ماں اپنے نامور اور عظیم بیٹے سے نہ کوئی بات کر سکی اور نہ اس کی کوئی بات سمجھ سکی۔

چارلی نے لکھا کہ اس روز مجھے دنیا اور زندگی سے نفرت ہو گئی اور انسان کی بے بسی اور لاچاری کا احساس ہوا۔ وہ سب کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں ہے۔ اس کی کوئی ہستی ہی نہیں ہے۔ وہ قدرت کے ہاتھ میں ایک کھلونے کی مانند ہے۔ ایک کٹھ پتلی ہے جس کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔

چارلی نے یہ غم بھی اپنے دل میں چھپا لیا اور کچھ دنوں بعد خود ہی اپنے زخموں کی مرہم پٹی کرنے کے بعد زندگی کے میدان میں کود پڑا۔ اب اس کی فلموں میں پہلے سے زیادہ گہرائی، گداز اور غم کا دھیما دھیما تاثر پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے زندگی کی حقیقت کو پا لیا تھا۔

کچھ عرصے بعد ایک بے حس و حرکت مجسمے کی طرح زندگی کے باقی ماندہ دن خاموش اور دنیا سے بے تعلقی کے عالم میں گزارنے کے بعد چارلی کی ماں دنیا سے رخصت ہو گئی۔ چارلی کو ساری زندگی یہ قلق رہا کہ اس کی ماں نہ تو اپنے بیٹے کی معراج دیکھ سکی اور نہ ہی اپنی خوابوں کی تعبیر۔ چارلی چپلن کی اپنی زندگی کی کہانی بھی کسی فلم سے کم دلچسپ اور سبق آموز نہیں تھی۔ یہ ایک ایسے شخص کی زندگی تھی جس پر سارا زمانہ رشک کرتا تھا جسے دنیا کی ہر نعمت میسر تھی

جس کی خوش قسمتی ضرب المثل تھی اور جو زندگی بھر ساری دنیا کو ہنساتا رہا تھا۔

امیر کیون کے نزدیک چارلی چپلن کے دو جرم ناقابل معافی تھے۔ ایک تو یہ کہ چالیس سال سے زیادہ عرصہ امریکا میں رہنے کے باوجود وہ بدستور انگلستان کا شہری ہی رہا اس نے امریکی شہریت حاصل نہیں کی۔

دوسرا جرم اس سے بھی بڑا تھا۔ وہ ایک ترقی پسند اور آزادی پسند انسان تھا۔ ترقی پسند خیالات کے باعث اس پر اشتراکی اور کیمونسٹ ہونے کا ٹھپا لگا دیا گیا جو اس زمانے میں ایک گالی اور امریکیوں کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا۔ چارلی نے اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ بدستور اپنے خیالات و نظریات کا اظہار کرتا تھا۔

حکومت نے اس کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی شروع کر دی۔ حکومت کے تابعدار میڈیا نے (آج کی طرح) اس کی کردار کشی اور اس کے خلاف نفرت پھیلانے کی مہم شروع کر دی۔ اس پر ملک سے غداری کے علاوہ بھاری ٹیکس، چوری اور دیگر الزامات بھی عائد کر دیئے گئے تھے۔ آزادی کے علم بردار امریکا کا قانون پوری قوت سے حرکت میں آچکا تھا۔ اٹارنی جنرل اور جج جیمز میک گرانرے نے چارلی چپلن کی گرفتاری اور اس کی جائیداد اور اثاثوں کی قرقی کے احکامات جاری کر دیئے تھے مگر چارلی چپلن کو اس کے وفادار دوست کافی عرصہ قبل ہی حکومت کے ارادوں سے آگاہ کر چکے تھے۔ اس نے مختلف اوقات میں اپنا سرمایہ امریکا سے باہر منتقل کر دیا تھا اور اثاثے بھی فروخت کر دیئے تھے۔

جس روز چارلی چپلن کو گرفتار کیا جانا تھا وہ اس سے پہلے ہی خاموشی سے اپنی فیملی کے تمام اراکین کے ساتھ صبح پانچ بجے بحری جہاز کوئین الزبتھ میں سوار ہو چکا تھا۔ اس کی شخصیت اور اصلیت کا سوائے اس کے انتہائی قریبی اور وفادار دوست فلمی صحافی اور نقاد جیمز ایگی کے کسی کو علم نہ تھا۔ امریکا کو شہرت اور عزت دینے والی ہستی چوروں کی طرح چالیس سال اس ملک میں بسر کرنے کے بعد رخصت ہو رہی تھی۔ تو اس کو الوداع کہنے کے جیمز ایگی کے سوا کوئی اور موجود نہ تھا کیونکہ کسی اور کو علم ہی نہ تھا۔ یہ ستمبر 1952ء کی سترہ تاریخ تھی۔

چارلی چپلن مصلحتاً جہاز کے عرشے پر بھی موجود نہ تھا۔ وہ اپنے کیبن کی کھڑکی سے جھانک کر اپنے جگری دوست جیمز

ایگی کو الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھ رہا تھا مگر جواب میں سامنے آکر اسے الوداع نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ چارلی چیپلن اور جیمز ایگی کی آخری ملاقات تھی کیونکہ اس کے بعد اس زمین پر دوبارہ قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ چند سال بعد جیمز ایگی کا ہارٹ فیل ہوگیا اور یہ دونوں دوست ایک دوسرے سے ملے بغیر ہمیشہ کے لیے ایک دسرے سے جدا ہوگئے۔ یہ داغ اور صدمہ ساری زندگی چارلی چیپلن کے دل سے نہ ہٹ سکا۔

انتظامیہ کو بھی چارلی چیپلن کی روانگی کا علم ہو چکا تھا مگر وارنٹ لے کر آنے والے کارندے اس وقت بندرگاہ پر پہنچے جب جہاز کھلے سمندر میں پہنچ چکا تھا۔ وہ ہاتھ ملتے رہ گئے۔

دو دن کے بعد ریڈیو سے چارلی چیپلن کی روانگی کی خبر نشر ہوئی تو ساری دنیا حیران رہ گئی۔ کسی کو یقین نہیں آیا کہ ملک کی خدمت کرنے والے اس عظیم شخص کے ساتھ ایسا توہین آمیز سلوک روا رکھا گیا ہے۔

یہ 1952ء کا واقعہ ہے۔ جو لوگ آج امریکی حکومت کی انسانیت کش پالیسی پر حیرت کا اظہار کر رہے ہیں وہ اس حقیقت سے لاعلم ہیں کہ اس معاشرے میں مخالف نظریات رکھنے والوں اور اس کا اظہار کرنے والوں کے لیے کبھی جگہ نہیں تھی۔ ایک امریکی جج نے مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے چارلی چیپلن کی عدم موجودگی میں اسے سزاوار قرار دیا اور امریکا میں چارلی چیپلن کے دوبارہ داخلے پر پابندی عائد کر دی۔ اس کی امیگریشن منسوخ کر دی گئی۔ عدالت نے حکم جاری کیا کہ اگر چارلی چیپلن دوبارہ امریکا کی سرزمین پر قدم رکھے تو اسے بطور مجرم عدالت میں پیش کیا جائے۔ عدالت نے امریکی قانون کی ایک شق کے تحت چارلی چیپلن کو ناپسندیدہ اور غیر ملکی قرار دے دیا۔ اس کے خلاف فرد جرم میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ اخلاقی طور پر بیمار اور کیمونسٹ ہے۔ دوسرے لفظوں میں چارلی چیپلن کو اس ملک میں داخل ہونے کے حق سے محروم کر دیا گیا جسے چالیس سال تک وہ اپنا گھر سمجھتا رہا تھا۔ جی ہاں یہ اسی امریکا کی نصف صدی قبل کی تصویر ہے جو اپنے آپ کو اظہار تقریر و تحریر کا داعی، حقوق انسانی کا علم بردار اور آزادی کا سب سے بڑا حمایتی کہتا ہے لیکن امریکی حکومت خود امریکی عوام اور دنیا بھر کے لوگوں کے دلوں سے چارلی چیپلن کی محبت، عقیدت اور عظمت کو نہ چھین سکی۔

جب چارلی چپلن اپنے وطن واپس پہنچاتو قوم نے اس کاوالہانہ استقبال کیالیکن امریکی حکومت کی ناراضگی کے خوف سے عوامی دباؤاور خواہش کے باوجود اسے "سر" کا خطاب نہیں دیا گیا۔وہ اپنے پرانے اور نئے دوستوں، پرستاروں اور ہم عصر فنکاروں اور ہنر مندوں سے ملا۔اپنا پرانا ایک کمرے کا فلیٹ دیکھنے کے لیے بھی گیا مگر اس کا دل بجھ چکا تھا۔اس کا خیال تھا کہ انگلستان اپنے فرزند کا کھلی بانہوں سے استقبال کرے گا۔اسے اعزاز و احترام سے لاد دیا جائے گا مگر یہاں بھی سیاسی مصلحتیں کار فرما تھیں۔

ان تلخ تجربات کے نتیجے میں چارلی چپلن کا دل فوت ہو گیا۔جس ملک کی شہرت پر اس کو ناز تھا اور جسے چالیس سال تک امریکا میں رہ کر بھی اس نے ترک نہیں کیا تھا جس کی یادوں کو اس نے سرمایہ حیات سمجھ کر سنبھال کر رکھا تھا اس کا وطن بھی اس کی قدر نہ کر سکا۔اس کا دل ایسا اچاٹ ہوا کہ وہ انگلستان کو خیر باد کہہ کر سوئزرلینڈ میں رہائش پذیر ہو گیا اور مرتے دم تک وہیں رہا۔ جنیوا سے اسی میل کے فاصلے پر ایک خوب صورت قصبے ویوے میں اس نے اپنی مستقل رہائش گاہ بنالی۔ جھیل کے کنارے یہ علاقہ جنت کا منظر پیش کرتا تھا مگر چارلی کو اب کسی اور جنت کی تلاش نہیں تھی۔اس نے دنیا کا ہر رنگ دیکھ لیا تھا اور دنیا کی بے رنگی اور نیرنگی نے اسے گھائل کر دیا تھا۔

چارلی چپلن جو ایک پیدائشی فن کار اور تخلیق کار تھا ایسا بددل ہوا کہ پھر فلمسازی کی طرف بھی اس نے توجہ نہیں دی۔ ساری دنیا منتظر تھی کہ چارلی چپلن نئی فلم کب بنائے گا مگر چارلی کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔فلم کبھی اس کا اوڑھنا بچھونا تھی۔اب وہ فلم کا نام بھی اپنی زبان پر نہیں لاتا تھا۔ فلمیں دیکھنا اس نے ترک کر دیا تھا۔دولت اور عزت کی اب بھی کمی نہیں تھی۔ وہ انتہائی آسائش کی زندگی بسر کر رہا تھا لیکن دنیا میں رہ کر بھی دنیا سے بیزار تھا۔کے ایل سہگل کا ایک گیت اس پر صادق آتا تھا۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں

چارلی چپلن کے بچوں نے عیش و عشرت کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔انہوں نے غربت، دکھ اور بے بسی کو دور سے

بھی نہیں دیکھا تھا۔اس پر چارلی رشک بھی کرتا تھااوران سے جلتا بھی تھا۔

کرسمس کے موقع پر چارلی چپلن کاولا بہت اہتمام سے سجایاجاتاتھا۔کرسمس ٹری اتنابڑاکہ دورہی سے جگمگاتا نظرآتا تھا۔کرسمس کے موقع پر ساراخاندان اس ولامیں اکٹھاہوکرخوشیاں مناتاتھامگر چارلی کیلیے کرسمس میں بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کے بچوں کابیان ہے کہ کرسمس کے دنوں میں وہ خاموش سب سے الگ تھلگ ایک کمرے میں بیٹھ کر بڑبڑاتارہتاتھا۔ایک باراس نے کہا''تم لوگ یہ سربہ فلک کرسمس ٹری دیکھتے ہومگرجب میں بچہ تھاتوکرسمس کے موقع پر ہمارے گھرمیں صرف ایک موم بتی جلائی جاتی تھی تم لوگ کتنے خوش نصیب ہو۔''

کرسمس پراس کے بچے،پوتے،نواسے نواسیاں سب اکٹھے ہوتے تھے۔قریبی گاؤں سے ایک پادری موسیوان موس ہر سال سانتاکلاز کے روپ میں آکربچوں کادل بہلاتے تھے۔وہ سالہاسال سے یہ کرداراداکررہے تھےاور بچوں میں قیمتی تحائف تقسیم کرتے تھے۔ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ چارلی کے تمام بچوں نےاس کے بیڈروم میں جنم لیاتھا۔ چارلی چپلن کمرے کے باہر موجودہوتاتھامگربیڈروم کادروازہ چوپٹ کھلارہتاتھا۔چارلی چپلن کہتا تھاکہ دنیامیں آنے والے بچے کے رونے کی آوازسنناچاہتاہوں۔اس کے خیال میں انسان کاآغازاورانجام رونے ہی پرہوتاہے۔دنیامیں پہلی بارآکر وہ روتاہےاوردنیاسےاس کے رخصت ہونے پردوسرے روتے ہیں۔

چارلی چپلن کوکرسمس سے پیارتھامگروہ اس کے برعکس اس موقع پر ہمیشہ بیزاری کااظہارکیاکرتاتھا۔عجیب بات یہ ہے کہ اس کاانتقال بھی1977ءمیں کرسمس کے روزہی ہواتھاوہ اپنے بستر پرلیٹا کرسمس کے جگمگاتے ہوئے درخت کو دیکھ رہاتھا۔کسی کومعلوم نہ ہواکہ کس وقت خاموشی سے وہ دنیاسے چلاگیا۔جب بچے،نواسے،نواسیاں،پوتے،پوتیاں ''میری کرسمس'' کہنے کے لیےاس کے بستر کے پاس گئے تووہ مرچکاتھا۔یوں لگتاتھاجیسے وہ پرسکون نیند میں ہے۔

چارلی چپلن کی موت ساری دنیا کے لیے ایک اہم خبر تھی۔جس نے جنگل کی آگ کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے ساری دنیاکو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ہرآنکھ نم اورہردل غم زدہ تھا۔امریکامیں ایک پینٹرچارلی چپلن کامعتقداورپرستارتھا۔اس نے

کچھ دیر آنسو بہائے اور پھر گلاب کے پھول خرید کر چارلی چپلن کے پرانے مکان پر گیا جہاں وہ کبھی رہتا تھا ایک پھول اس نے باہر کے دروازے پر رکھ دیا اور دوسرا مکان کے صحن میں۔ اس کے بعد وہ بھاگا بھاگا چڑھ کر اسٹوڈیو پہنچا۔ کرسمس کی تعطیلات کی وجہ سے گیٹ بند تھا۔ وہ اوپر سے چڑھ کر اسٹوڈیو کے اندر گیا اور اسٹوڈیو میں نصب امریکی پرچم کو نیچے کھینچ کر نصف بلندی پر کر دیا جیسا کہ قومی ہیروز اور سربراہان مملکت کے مرنے پر کیا جاتا ہے۔ یہ جھنڈا نصف بلندی پر اس وقت تک لہراتا رہا جب تک کہ تعطیلات ختم ہونے کے بعد اسٹودیو کا عملہ واپس نہ لوٹا۔ امریکا نے چارلی چپلن کی قدر نہیں کی تھی مگر اس کے ایک امریکی پرستار نے اسے بھرپور انداز میں خراج عقیدت پیش کر دیا تھا اس معمولی مصور کا نام مارک اسٹاک تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ جس اسٹوڈیو نے چارلی چپلن کی فلموں سے دنیا بھر میں نام اور بے تحاشا دولت کمائی ہے اس پر چارلی چپلن کا بھی حق تھا۔ اسٹاک اسٹوڈیو کا جھنڈا سرنگوں کرنے کے بعد اپنی کار میں سوار ہوا اور ایک تازہ پھول لے کر چارلی چپلن کی ماں کی قبر پر گیا مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں پہلے ہی ایک تازہ گلاب رکھا ہوا مسکرا رہا تھا یہ

گلاب کس نے رکھا تھا؟ یہ معما آج تک حل نہیں ہوا۔

امریکا سے دور سمندر پار سوئزرلینڈ کے ایک قصبے میں چارلی چپلن کی تدفین کی جا رہی تھی۔ اس قصبے میں اس نے اپنی باقی ماندہ زندگی خاموشی سے گزار دی تھی۔ 27 دسمبر 1977 کی صبح کو گیارہ بجے قصبے کے اینگلی کن چرچ میں مذہبی وصیت کے مطابق ایک پر فضا مقام کانز میں دفن کر دیا گیا۔ اس موقع پر اس کی وصیت کے مطابق صرف خاندان کے افراد ہی موجود تھے۔ البتہ برطانوی سفیر ایلن کیر بھی حکومت کی طرف سے نمائندگی کرنے کے لیے آ گئے تھے۔ چارلی چپلن کی تمام زندگی حیرت انگیز ڈرامائی واقعات سے بھری ہوئی ہے لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ ڈرامہ کرنے سے باز نہ آیا۔

تدفین کے دو ماہ بعد اچانک یہ انکشاف ہوا کہ چارلی چپلن کی لاش تابوت سمیت قبر سے غائب ہے۔ قبرستان کے ناظم

نے فوراً پولیس کو اطلاع دی۔ جب قبر کھودی گئی تو تابوت موجود تھا مگر میت غائب تھی۔ دنیا بھر کا پریس اور ٹی وی میڈیا قبرستان پہنچ گیا اور لمحے لمحے کی خبریں نشر ہونے لگیں۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ حرکت کس کی ہے؟ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ چارلی چپلن ایک یہودی تھا مگر اسے عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا تھا شاید یہ بات اس کے یہودی پرستاروں کو پسند نہ آئی ہو۔

پولیس نے سرگرمی سے تفتیش شروع کر دی۔ چند روز بعد چارلی کی بیوی اونا کو ایک گمنام ٹیلی فون کال موصول ہوئی جس میں کہا گیا کہ 60 لاکھ سوئس فرانک ادا کر کے میت واپس لی جا سکتی ہے۔

کسی میت کے اغواء برائے تاوان کی غالباً یہ پہلی اور انوکھی واردات تھی۔ چارلی چپلن جیسے ڈراما ساز شخص کی زندگی کا یہ بعد از مرگ ڈراما بھی دنیا بھر میں گفتگو کا موضوع بن گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حرکت ایک چوبیس سالہ بے روزگار نوجوان نے اپنے دوست کی مدد سے کی تھی۔ انہوں نے تابوت سے میت نکال کر کچھ فاصلے پر ایک سبزہ زار میں دفن کر دی تھی تاکہ تاوان وصول کرنے کے بعد اس جگہ کی نشاندہی کر دی جائے۔ انہوں نے اتنی مہربانی کی تھی کہ لاش کو ایک دوسرے تابوت میں رکھ کر دفن کیا تھا۔ یہ نئی جگہ ویوے سے بیس میل دور تھی اور انتہائی خوبصورت اور پر فضا تھی۔ اغوا کنندگان کا خیال تھا کہ چارلی چپلن جیسے فن کار کی آخری آرام گاہ کے طور پر یہ زیادہ بہتر اور خوب صورت مقام تھا۔

دریافت کے بعد چارلی چپلن کا تابوت دوبارہ اس کی قبر میں رکھ دیا گیا۔ جس کسان کی زمین پر اغوا کرنے کے بعد یہ تابوت دفن کیا گیا تھا اس نے خالی قبر کو محفوظ کر کے وہاں ایک کتبہ اور لکڑی کی ایک صلیب لگا دی ہے۔ اس مصنوعی قبر کے سرہانے ایک عصا بھی گاڑ دیا گیا ہے۔ چارلی چپلن کی فلموں میں اس کا مخصوص لباس، ہیٹ اور اس کی چھڑی لازم و ملزوم بن چکی تھی۔

چارلی چپلن نے خاموش فلموں کا دور ختم ہونے کے بعد فلم سازی ترک کر دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ خاموش فلموں

میں جس اختصار اور جامعیت سے انتہائی دلچسپ انداز میں کسی موضوع کو پیش کیا جاسکتا ہے بولتی فلموں میں اتنی ذہانت اور صلاحیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔اس کا کہنا تھا کہ فلموں میں مکالموں کی وجہ سے ان میں غیر ضروری طوالت اور بے مقصدیت پیدا ہو جاتی ہے۔جو منظر دو صفحات کے مکالموں کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے ایک خاموش فلموں میں چند تاثرات اور حرکات و سکنات کے ذریعے اسے زیادہ خوب صورتی سے فلم بینوں کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال آپ چارلی چپلن کی رائے سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن چارلی چپلن کے خیال میں بولتی فلموں کی ترویج کے بعد فلموں کا حسن ختم ہو گیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس نے متکلم فلمیں بنانے سے اجتناب کیا۔یوں بھی وہ امریکی حکومت کے طرز عمل کی وجہ سے بددل اور دل شکستہ ہو چکا تھا۔اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ امریکی حکومت کے متعصبانہ رویے نے دنیا کو ایک عظیم اور ذہین تخلیقی فلم ساز سے محروم کر دیا۔

امریکا کو خیر باد کہنے کے بعد چارلی چپلن کے بے انتہا شوق اور مشن کو پورا کرنے کے لیے ساری دنیا پذیرائی کو تیار تھی۔وہ کسی بھی ملک میں فلمیں بنا سکتا تھا مگر اس نے قطعی خاموشی اور قطع تعلق کا رویہ اختیار کر لیا۔ کافی عرصے بعد شاید خود اپنے شوق اور لگن کے ہاتھوں مجبور ہو کر یا پھر دوستوں کے مشورے پر اس نے ایک متکلم رنگین فلم

بنائی جس کا نام ''اے کنگ ان نیویارک'' تھا جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے یہ ایک طنزیہ فلم تھی جس میں بادشاہت اور امریکی نظام کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ساری دنیا چارلی چپلن کی نئی فلم کی منتظر اور مشتاق تھی۔

اس فلم کی نمائش کے بعد فلم بین اور چارلی چپلن کے شیدائی سنیما گھروں پر ٹوٹ پڑے لیکن دنیا اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ چارلی چپلن کی یہ فلم اس کے پرستاروں کی توقعات پر پوری نہ اتر سکی۔اس کی مختلف وجوہات تھیں۔

پہلی وجہ تو یہ تھی کہ چارلی چپلن عرصہ دراز سے فلمی دنیا اور فلم سازی سے دور رہا تھا۔دوسری وجہ یہ تھی کہ تیز رفتار زمانے میں اس اثناء میں بہت زیادہ تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں جن سے چارلی چپلن واقف نہ تھا۔وہ اپنے زمانے میں جس قسم کی خاموش فلمیں بناتا رہا تھا وہ اب قصہ پارینہ بن چکا تھا۔فلم کی تکنیک بدل چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی فلم

بینوں کی ضرورتیں، خواہشیں اور تقاضے بھی تبدیل ہو چکے تھے۔ تکنیکی لحاظ سے یہ ایک بے عیب فلم تھی اور اس میں چارلی چپلن کے پرانے انداز کی جھلک نظر آتی تھی مگر یہ فلم نہ تو نقادوں کے معیار پر پوری اتر سکی اور نہ ہی فلم بینوں کی توقعات پر پوری اتری پھر بھی بہت سے لوگوں نے فرض جان کر اس فلم کو دیکھا اور گم شدہ چارلی چپلن کو اس کی فلم میں تلاش کرنے کی کوشش کی مگر انہیں اپنا محبوب فلم ساز اور اداکار نظر نہ آیا۔ اس تجربے کے بعد چارلی چپلن کا دل فلم سازی کی طرف سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ یہ فلم اس کی آخری فلم ثابت ہوئی لیکن سچ تو یہ ہے کہ دنیا کافی عرصے قبل ہی چارلی چپلن کو کھو بیٹھی تھی اور یہ کارنامہ دنیا میں جمہوریت اور آزادی فکر و اظہار کے سب سے بڑے دعوے دار ملک امریکا نے سرانجام دیا تھا۔

جو بھی زی روح دنیا میں آتا ہے اسے ایک روز واپس جانا ہوتا ہے۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ کیسے کیسے لوگ دنیا میں آئے، مختلف میدانوں میں اپنے جوہر دکھائے، دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا اور رخصت ہو گئے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے

آج تم کل ہماری باری ہے

لیکن اب ایسا دور آ گیا ہے کہ جو بھی رخصت ہوتا ہے اس کی جگہ لینے والا کوئی نظر نہیں آتا اس لیے اب موت سے ڈر لگنے لگا ہے۔ یہ اپنے ساتھ ایسے ایسے لعل و گہر لے جاتی ہے جن کی مثال کوئی اور نہیں اور پھر ان کی جگہ لینے والا کوئی اور شخص دنیا میں نہیں آتا۔ اہل علم و فن پہلے ہی بہت کم ہیں۔ اب مزید کم ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید ایک وقت آئے گا جب ایسے لوگ عنقا ہو جائیں گے۔ صرف ان کا ذکر باقی رہ جائے گا۔ اسی لیے شاعر نے کہا ہے۔

کوئی روکے کہیں دست اجل کو

ہمارے لوگ مرتے جا رہے ہیں

پچھلے دنوں عظیم عالم، فاضل، محقق اور علمی روایات کے امین ڈاکٹر حمید اللہ بھی امریکی ریاست فلوریڈا میں انتقال کر گئے۔ یوں تو عمر کا بیشتر حصہ انہوں نے پیرس میں گزارا لیکن سفر آخرت کے لیے آخرا سٹیشن فلوریڈا کاتب ازل نے لکھ دیا تھا۔ یہ ڈاکٹر حمید اللہ کون تھے، کیا کرتے تھے، کن خوبیوں کے حامل تھے کیا انہوں نے کوئی کارنامہ بھی سر انجام دیا؟ بہت کم لوگ اس بارے میں جانتے ہیں۔ خود غرض، مفاد پرست، لالچی سیاست دانوں، گلوکاروں، فنکاروں، کھلاڑیوں کے بارے میں سب کو علم ہے مگر جب ڈاکٹر حمید اللہ کی وفات کی خبر آئی تو اول تو بہت سے لوگوں نے اسے اہمیت ہی نہیں دی اور اگر خبر پڑھ کر تبصرہ بھی کیا تو صرف اتنا کہا کہ یہ کون صاحب تھے۔ کیا کوئی بڑے ڈاکٹر تھے؟

ڈاکٹر حمید اللہ اپنا تعارف آپ تھے۔ مطلب یہ کہ ان سے متعارف ہونے کے لیے ان کی ذاتی مصروفیات، تصنیفات اور کارہائے نمایاں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جن کا تذکرہ آئے دن اخبارات کی زینت بنتا ہے۔ وہ انسانوں کے جس گروہ سے تعلق رکھتے تھے وہاں تک عام لوگوں کی نظروں کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ صرف وہی لوگ انہیں جان سکتے ہیں جنہیں علم کی طلب اور جستجو رہتی ہے اور ایسے اب کتنے لوگ باقی رہ گئے ہیں؟

ڈاکٹر حمید اللہ انتہائی صاحب علم و فضل اور عظیم محقق تھے۔ علم ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ مطالعہ ان کا مشغلہ اور مقصد زندگی تھا۔ وہ محض علم کی خاطر جیئے اور اس کی کھوج میں بہت دور نکل گئے۔ اتنی دور جہاں سے کوئی لوٹ کر واپس نہیں آتا۔ طویل علالت کے بعد انہوں نے امریکی ریاست فلوریڈا میں ۹۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور

رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی لاج

ان کی بے کسی یہ تھی کہ اہل وطن نے ان کی قدر نہ کی۔ وہ قدر و منزلت کے طلب گار بھی نہیں تھے دولت اور شہرت کے متلاشی بھی نہیں تھے۔ صرف اتنا چاہتے تھے کہ اپنے وطن میں رہ کر دین اور علم کی روشنی دوسروں تک پہنچائیں۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے جو کچھ حاصل کریں۔ ایک مدرس کی طرح اسے عام کر دیں لیکن ان کی یہ معصوم خواہش پوری نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر حمید اللہ ۱۹ فروری ۱۹۰۸ (۱۶ محرم الحرام ۱۳۳۲) میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلق ایک تعلیم یافتہ، روشن خیال متوسط گھرانے سے تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد سے ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں امتیاز کے ساتھ حاصل کیں۔ کچھ عرصہ جامعہ عثمانیہ میں ہی پڑھاتے رہے۔

تقسیم ملک سے کچھ پہلے اپنی تعلیم کے لیے جرمنی چلے گئے۔ وہاں انہوں نے بون یونیورسٹی سے بین الاقوامی قانون پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں اس میں ترمیم و اضافے کے بعد انہوں نے پہلی کتاب CONDUCT OF MUSLIM STATE تحریر کی۔ ڈاکٹر حمید اللہ جرمنی سے فرانس چلے گئے کیونکہ وہاں کی علمی فضا انہیں زیادہ سازگار محسوس ہوئی۔ فرانس کی سوربون یونیورسٹی میں انہوں نے عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے جن موضوعات پر ڈاکٹریٹ کی، ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا ذہنی رجحان کس طرف تھا۔ وہ اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے اور انہیں دوسروں تک پہنچانے کے متمنی تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے نو زبانوں پر دسترس حاصل کی تاکہ زیادہ سے زیادہ زبانوں میں موجود اسلام کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کر سکیں۔ انہوں نے جرمنی، فرانسیسی، ترکی، فارسی، عربی، انگریزی اور دیگر زبانوں پر دسترس حاصل کی تاکہ ان زبانوں میں دین و مذہب، تاریخ و ثقافت اور علوم و فنون کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا گہرا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد اسلام کی حقانیت و صداقت ثابت کر سکیں۔ دنیا کو مدلل، منطقی اور مختلف حوالوں سے سمجھا سکیں کہ انسانوں کے لیے اسلام ہی فلاح و نجات کا واحد راستہ ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کئی اعتبار سے ایک انوکھے اور منفرد انسان تھے۔مثال کے طور پر یہی دیکھئے کہ طویل عرصہ یورپ خصوصاً فرانس میں گزارنے کے باوجود انہوں نے فرانس یا کسی اور یورپی ملک کی شہریت حاصل نہیں کی۔اس کا سبب بھی وہ عجیب ہی بیان کرتے تھے۔وہ تقسیم ملک سے قبل جرمنی گئے تھے جب ریاست حیدر آباد ایک خود مختار سلطنت کی حیثیت رکھتی تھی۔اس کی علیحدہ فوج، ریلوے، پولیس، محکمہ ڈاک اور یہاں تک کہ پاسپورٹ بھی الگ تھا۔ڈاکٹر حمید اللہ دولت آصفیہ کے پاسپورٹ پر یورپ گئے تھے۔جب ملک تقسیم ہو کر بھارت اور پاکستان کے دو ملکوں میں بٹ گیا تو بقول ان کے ان کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ بھارت کا پاسپورٹ حاصل کریں۔ساری زندگی فرانس میں گزاردی مگر انہوں نے اس ملک کی شہریت بھی حاصل نہیں کی۔

دنیا کے کئی ممالک انہیں اپنا پاسپورٹ جاری کرنا اعزاز سمجھتے مگر انہوں نے کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا۔ دیکھا جائے تو انہوں نے ساری عمر پناہ گزین کی حیثیت سے گزاردی اور وہ اس طرح کہ جب فرانس کا ویزا ختم ہو جاتا تھا تو وہ کسی دوسرے ملک کا سفر کرتے اور پھر فرانس واپس چلے جاتے۔وہ کسی بھی ملک کے شہری نہیں تھے۔عمر کے لگ بھگ ۷۰ سال انہوں نے شہریت کے بغیر گزار دیئے۔پاکستان سے انہیں دلی وابستگی تھی۔یہاں تشریف بھی لائے ۔ کچھ عرصہ قیام کیا اور پھر واپس فرانس چلے گئے۔اس طرح کسی ملک کی شہریت اختیار کیے بغیر آخر کار وہ ایک ایسی دنیا میں چلے گئے جہاں جانے کے لیے کسی پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ان کی علمی پیاس کا یہ عالم تھا کہ انگریزی، عربی، فارسی، اردو اور فرانسیسی زبانوں میں بلا تکان لکھتے تھے۔ان کے علاوہ جرمنی، اطالوی، ترکی اور روسی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔وہ پیرس کے معروف تحقیقی مرکز سے تمام عمر وابستہ رہے اور ریٹائر ہونے کے بعد اسی کی پنشن پر گزارا کرتے تھے۔تصنیفات، لیکچر وغیرہ سے بہت بڑی آمدنی تھی جسے وہ فلاحی اور علمی کاموں کے لیے دے دیا کرتے تھے۔انہوں نے پیرس کے اس ادارے کے علاوہ عالم اسلام کی ممتاز درسگاہوں میں بھی درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیئے خصوصاً جامعہ استنبول سے کافی عرصے تک وابستہ رہے۔وہ ہر سال چند ماہ وہاں ضرور گزارتے تھے۔جامعہ اسلامیہ بہاول پور میں بھی ۱۲ خطبات دیئے جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ان

کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی تصنیفات مختلف زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ جن سے انہیں معقول آمدنی ہوتی تھی مگر اپنے پاس کچھ نہ رکھا۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی ساری زندگی مشرق اور مغرب کے علوم کو کھنگالنے میں صرف کی۔ انہیں دنیا کے مختلف فلسفوں پر عبور حاصل تھا لیکن ان کا اصل ماخذ قرآن وسنت اور معتبر اسلامی علوم تھے۔ اہل مغرب کے محققین نے جو تحقیقات کی ہیں ڈاکٹر حمید اللہ نے ایک لحاظ سے ان کا حق ادا کر دیا۔ تدوین حدیث کے سلسلے میں انہوں نے نمایاں کام کیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ حدیث کی کتابت رسول اکرم ﷺ کی زندگی ہی میں شروع ہو چکی تھی اور یہ سلسلہ خلفائے راشدین کے دور میں بھی جاری رہا۔ انہیں اس سلسلے میں ''صحیفہ ہمام'' کی نادر و نایاب تصنیف سے بہت مدد ملی۔ یہ مسودہ انہیں جرمنی کی ایک لائبریری سے دستیاب ہوا تھا۔ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اس اولین مسودے میں جو احادیث موجود ہیں وہ بعد میں لکھی جانے والی احادیث سے مختلف نہیں ہیں۔ انہوں نے حدیث کی صحت کو منوانے کے سلسلے میں گراں بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔

فرانسیسی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ اور دو جلدوں میں سیرت النبی ﷺ کی فرانسیسی زبان میں تصنیف بھی نا قابل فراموش کارنامے ہیں پھر اس سیرت کا انہوں نے بذات خود انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

اگرچہ سقوط حیدر آباد کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ نے پیرس میں سکونت اختیار کی تھی لیکن پاکستان کو وہ اپنا دوسرا وطن سمجھتے اور مانتے تھے۔ ان کی خواہش بلکہ آرزو تھی کہ پاکستان کی نظریاتی اور علمی تحقیق کی اسلامی روایات کو آگے بڑھایا جائے۔ وہ پاکستان کو اسلام کا گہوارہ دیکھنا چاہتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے مملکت خداداد کو اپنا ٹھکانا بنانے کا قصد کیا اور پیرس سے پاکستان چلے گئے حالانکہ وہاں وہ نہ صرف علمی اور تحقیقی کاموں میں مصروف تھے بلکہ گراں قدر مشاہرہ بھی پا رہے تھے۔ علامہ محمد اسد (لیوپولڈ) کی طرح وہ بھی بیرونی ملکوں کے عیش و آرام اور آسائشوں کو ترک کر کے پاکستان آئے تھے مگر علامہ اسد ہی کی طرح مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

پاکستان میں انہیں ادارہ تعلیمات اسلامی کے بورڈ کا رکن مقرر کیا گیا تھا۔ مفتی محمد سعید، علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ اسد اور مفتی محمد شفیق بھی اس بورڈ کے ارکان تھے۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ یہ ادارہ محض نمائشی مقاصد کی غرض سے قائم کیا گیا ہے تو مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ علامہ اسد (لیوپولڈ) بھی اپنے خوابوں کی تعبیر کو ناقابل حصول سمجھ کر واپس تشریف لے گئے تھے۔ افسوس کہ پاکستان دو مایہ ناز علمی شخصیات سے محروم ہو گیا لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ان دونوں حضرات نے باہر بیٹھ کر اسلام کی جو ناقابل فراموش خدمات ادا کیں اس کا عشر عشیر بھی وہ پاکستان میں رہ کر نہ کر سکے تھے۔

جس زمانے میں جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے زیر اہتمام خطبات مدارس کی طرز پر اسلامی دینی موضوعات پر خطبات کا سلسلہ شروع کیا گیا تو جامعہ کے اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالقیوم قریشی نے پیرس میں ڈاکٹر حمید اللہ سے رابطہ قائم کیا اور درخواست کی کہ وہ بھی جامعہ اسلامیہ میں توسیعی لیکچر دینے کی زحمت گوارا کریں تاکہ نئی نسل کو اسلام کے عالم گیر پیغام اور سیرت طیبہ ﷺ سے آگاہی حاصل ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے دعوت نامہ منظور کر لیا اور لیکچرز کے لیے پاکستان تشریف لائے اور ''عہد نبوی'' اور ''نظام تشریع و عدلیہ'' کے موضوع پر خطبہ دیا۔ سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو کسی نے سوال کیا کہ نماز میں رفع یدین جائز ہے یا نہیں؟

ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا ''اللہ تعالیٰ کو اپنے حبیب سے اتنی محبت تھی کہ وہ ان کے ہر عمل اور ہر

حرکت کو قیامت تک باقی رکھنا چاہتے تھے۔ اگر نبی اکرم ﷺ کی صرف ایک سنت پر سب مسلمان عمل کریں تو رسول اللہ ﷺ کی دوسری سنت اور دوسری حرکت غائب ہو جائے گی۔ لہذا اپنے حبیب کی ہر حرکت اور عمل کو محفوظ رکھنے کی خاطر مختلف آئمہ اور ممالک کے ذریعے انہیں محفوظ رکھنے کا بندوبست کر دیا۔ کبھی نہ سمجھنا کہ رفع یدین رسول اکرم ﷺ کے احکام کے خلاف ہے۔ وہ بھی اللہ کے رسول ﷺ کا ایک عمل ہے اور یہ بھی ان ہی کا عمل ہے۔ رسول کریم ﷺ نے کبھی اس طرح فرمایا اور کبھی دوسری طرح۔ لہٰذا دونوں سنت نبوی ﷺ ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم حضرت امام ابو حنیفہ کی طرح قانون سازی میں حکومت کی اجارہ داری کے حق میں نہیں تھے۔وہ اسے مسلمانوں کا نجی مسئلہ خیال کرتے تھے تاکہ عدلیہ کی طرح قانون سازی بھی حکومتی اثرو رسوخ سے آزاد رہے۔ اس طرح مسلمان علماء اور ماہرین قانون، آزادی کے ساتھ قانون سازی اور اس کی ترقی میں مشغول رہ سکتے تھے۔ اسے وہ اسلام کا حکم نہیں بلکہ اسلامی روایات قرار دیتے ہیں۔اس کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ حکومت کی اجارہ داری سے حکمرانوں کی سیاسی ضرورتوں کی تکمیل ہوگی اور عام آدمی کا مفاد متاثر ہوگا۔ عدلیہ کی آزادی بھی آزاد قانون سازی کا تقاضا کرتی ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق اور مطالعہ بہت گہرا تھا۔ ''خطبات بہاول پور'' میں انہوں نے یہ انکشاف فرمایا کہ ڈارون کا عالم گیر نظریہ ارتقاد راصل ''اخوان الصفا ''اور ابن مسکویہ کی کتاب ''الفوز الاصغر'' کا چربہ ہے۔انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ غالباڈارون نے یہ کتابیں کیمبرج میں پڑھی ہوں گی کیونکہ اس زمانے میں کیمبرج کے عربی نصاب میں یہ کتابیں شامل تھیں۔ڈارون کے چند خطوط اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ عربی زبان اور ادب کا مطالعہ بہت ذوق وشوق سے کرتا رہاہے۔

پاکستان میں ڈاکٹر صاحب کو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں سیرت چیئر کی سربراہی پیش کی گئی مگر انہوں نے یورپ میں اپنی علمی اور تبلیغی مصروفیات کا عذر پیش کرکے گریز کیا۔دراصل انہیں علم تھا کہ یہاں حکومتیں محض نمائشی مقاصد کے لیے ایسے کام کرتی ہیں جو کہ سراسر بے مقصد ہوتے ہیں۔ افسوس کہ پاکستان ایسے یگانہ روزگار

کی صلاحیتوں اور خدمات سے فیض حاصل نہ کرسکا۔

ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کا اصل میدان ہمارے دینی ورثے کا روایتی پہلو تھا۔انہوں نے ہماری علمی تاریخ کا روایت اور سند کے حوالے سے جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔مثال کے طور پر ڈاکٹر صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ اٹھارہویں صدی کا امریکی آئین دنیا کا پہلا آئین نہیں ہے بلکہ دنیا کا پہلا تاریخی اور تحریری دستور ''میثاق مدینہ'' ہے۔انہوں

نے یہ بھی تحقیق فرمائی کہ تدوین حدیث کا آغاز صحاح ستہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس سے پہلے بھی احادیث لکھی جاتی تھیں۔اس کی شہادت ''صحفیہ ہمام'' ہے۔ان کتابوں اور اس نظریے سے علمی دنیا پہلی بار ڈاکٹر صاحب کے توسط سے متعارف ہوئی۔ دنیامیں اس نایاب کتاب کے صرف دو قلمی نسخے دریافت ہو سکے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں کو پیش نظر رکھ کرایک مستند مجموعہ ترتیب دیا۔انہوں نے عہد نبوت کی دستاویزات کو بھی جمع کیااور انہیں مرتب کر کے شائع کیا۔ڈاکٹر صاحب کے ''خطبات بہاول پور ''میں ایسے کئی معاملات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔جہاد کے بارے میں ڈاکٹر حمید اللہ کا تاثر یہ ہے کہ جہاد دفاع کے لیے ہی کیا جا سکتا ہے۔رسول اکرم ﷺ نے جو جنگیں لڑیں وہ سب دفاعی تھیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ عجز وانکسار، شائستگی، سادگی اور درویشی کی ایک زندہ مثال تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی تحریروں اور خطبات کی وجہ سے تیس ہزار فرانسیسی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔کچھ لوگ ایسے لوگوں کی تعداد پچاس ہزار بتاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پر اسلام لانے والوں میں موریسن بوکائی جیسا دانش ور بھی شامل تھا جس نے اسلام لانے کے بعد ''بائبل، قرآن اور سائنس'' کے عنوان سے ایک یادگار کتاب لکھی جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن کا کوئی بھی نظریہ سائنس سے متصادم نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ پیرس کے ایک مکان کی تیسری منزل پر گزارا جہاں لفٹ تک نہ تھی۔وہ شب و روز تحقیقی اور تحریری کاموں میں مصروف رہتے تھے اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے تھے۔ ایک ملاقاتی نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا''پیرس میں کوئی زحمت تو نہیں ہوتی؟''

فرمایا''بس اتنی کہ تیس برس سے گوشت نہیں کھایا۔'' ڈاکٹر صاحب حلال و حرام کے امتیاز کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی حیرت انگیز ہے۔انہیں اپنی کتابوں سے بہت زیادہ آمدنی حاصل ہوتی تھی

لیکن اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے۔ان کا گزارہ پیرس کی سوربن یونیورسٹی کی پنشن پر تھا۔انہوں نے فرانسیسی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ شائع کرایا تھا۔فرانسیسی زبان میں سیرت النبی ﷺ بھی دو جلدوں میں مرتب کر کے شائع کرائی۔علامہ اقبال کے خطبات اور بال جبرائیل کے فرانسیسی تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں ان کے علاوہ اور بھی تصنیفات فرانسیسی زبان میں موجود ہیں جن سے انہیں بہت زیادہ آمدنی حاصل ہوتی تھی لیکن فقر،بے نیازی اور درویشی کا یہ عالم تھا کہ کچھ بھی اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔امام بخاریؒ کی طرح انہوں نے بھی کبھی شادی نہیں کی۔ تحقیق، تصنیف و تالیف ہی میں ساری زندگی بسر کر دی۔

۸۰ کی دہائی میں ڈاکٹر حمید اللہ کو دس لاکھ روپے کا قومی ایوارڈ ملا تھا۔ انہوں نے یہ ساری رقم ادارہ تحقیقات اسلامی کی لائبریری کو دے دی جو کہ اب ڈاکٹر حمید اللہ کی لائبریری کہلاتی ہے۔ان کے ایک عزیز دوست کا بیان ہے کہ ۱۹۸۲ء میں وہ لاہور تشریف لائے۔ایک پبلشر نے رائلٹی کی معقول رقم پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈاک خانے جا کر جیب سے ایک لمبی فہرست نکالی اور بے شمار فارم پر کر کے ساری رقم مختلف مستحق لوگوں کو ارسال کر دی اور خود ہاتھ جھاڑ کر اُٹھ آئے۔ان کی کتابیں،انگریزی،اردو، عربی،فرانسیسی، جرمنی،روسی، ترکی،ہسپانوی،اطالوی اور نہ جانے کتنی دیگر زبانوں میں شائع ہوتی رہتی تھیں اور ہر جگہ سے خطیر رقم موصول ہوا کرتی تھی لیکن وہ اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھتے تھے۔اپنی گزراوقات کے لیے سوربن یونیورسٹی سے پنشن کا ایک حصہ رکھ کر باقی پنشن بھی تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ ایک بار بنک سے پنشن کی رقم نکلوانے کیلئے بنک گئے تو معلوم ہوا کہ کسی فریبی نے گھر سے چوری ہو جانے والی چیک بک کے ذریعے بنک میں جمع شدہ ساری رقم نکلوالی ہے۔ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر

صبر و شکر کے ساتھ واپس لوٹ آئے قرض مانگنے یا کسی کا احسان لینے کے عادی نہ تھے۔پیسہ پاس نہ تھا۔کئی دن اسی

طرح گزر گئے اور کسی کو خبر تک نہ ہونے دی۔اپنے معمولات میں مصروف رہے۔ کئی دن گزر گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن بھوک سے بے دم ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ اسپتال لے جایا گیا۔ان کی اصلیت معلوم ہوئی تو ان کی ایک بھتیجی

کا پتا ملا جو فلوریڈا میں مقیم تھیں۔ انہیں نازک حالت میں فلوریڈا پہنچادیا گیا لیکن جانبر نہ ہو سکے۔ مشرق کا آفتاب، مغرب کے ایک دور دراز شہر میں غروب ہو گیا۔

ان کی زندگی کا یہ پہلو بھی انوکھا ہے کہ اس قدر شہرت اور ناموری کے باوجود ساری زندگی گمنامی اور گوشہ نشینی میں بسر کی۔ تنہائی میں خاموشی سے اپنے کام میں لگے رہے۔

پاکستان میں ان کی وفات کی خبر اخبارات میں بہت مختصر شائع ہوئی اور بس اس کے بعد کسی حاکم، کسی عالم، کسی سیاست دان، کسی دانش ور کو ان کی خدمات یاد دلانے یہاں تک کہ تعزیتی بیان جاری کرنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ کسی قوم کے زوال کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا۔ کیا زندہ قومیں ایسی ہوتی ہیں؟

ڈاکٹر حمیداللہ جیسے عالم بے بدل، درویش صفت انسان اب کہاں سے آئیں گے؟ جو قوم اس شخصیت کو پہچان کر اس کی قدر تک نہ کر سکی وہ ایسا کوئی دوسرا کیسے پیدا کر سکتی ہے؟ مگر ناامیدی گناہ ہے امید پر دنیا قائم ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ ''موت العالم، موت العالم'' یعنی ایک عالم کی موت ساری دنیا کی موت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر حمیداللہ آج کی دنیا میں ایک افسانوی اور فرضی کردار معلوم ہوتے ہیں مگر ان کی تخلیقات اور کارنامے ان کی حقیقت کی یاد دہانی کرانے کے لیے کافی ہیں۔

ان کی زندگی کے بعض پہلو انوکھے اور قابل ذکر ہیں۔ ان کی سادگی، انکسار، مروت اور اصول پرستی کی آج کے زمانے میں مثال نہیں مل سکتی۔ آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہو گی کہ ڈاکٹر صاحب نے عمر کا بیشتر حصہ فرانس اور یورپ کے مختلف ملکوں میں بسر کیا اور ویزے کے سلسلے میں مختلف ملکوں میں جاتے رہے لیکن انگلستان کی سرزمین پر انہوں نے کبھی قدم بھی نہیں رکھا حالانکہ وہ فرانس سے قریب ترین ملک ہے۔ اس کا سبب ایک بار انہوں نے یہ بیان کیا کہ انگریزوں نے میرے آزاد ملک ریاست حیدر آباد دکن کو بھارت کی غلامی میں دے دیا۔ میں اس ملک کی سرزمین پر قدم رکھنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔

جب پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی دستور سازی میں مصروف تھی تو ڈاکٹر حمید اللہ بھی اس سلسلے میں پاکستان آئے تھے۔ اسمبلی کی عمارت کے ایک حصے میں ہی ان کا دفتر تھا۔ وہ اسمبلی کے دفتر کرتہ پاجامہ میں ملبوس جایا کرتے تھے۔ پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں ہوتی تھیں۔ نہایت سادگی پسند تھے۔ بات رک رک کر دھیمے لہجے میں کرتے تھے۔ انہوں نے پیرس کے جس فلیٹ میں پہلی بار قیام کیا پھر ساری عمر اسی میں رہے۔ کرائے کا یہ فلیٹ مختصر تھا۔ باورچی خانے کے ایک مختصر گوشے کے سوا یہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ سامان میں سادہ کپڑوں کے چند جوڑے اور کھانے کے چند برتنوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ کھانے پینے کے معاملے میں بہت محتاط تھے۔ زمانہ طالب علمی ہی میں گوشت ترک کر دیا تھا۔ سبزی اور پنیر ان کی غذا تھی۔ بعد میں جب کسی نے بتایا کہ پنیر میں بھی جانوروں کی چربی شامل ہوتی ہے تو اس سے بھی پرہیز کرنے لگے۔

وقت کی پابندی ان پر ختم تھی، زمانہ طالب علمی ہی سے وہ وقت کی پابندی کے عادی تھے۔ تعلیم کے دوران میں صرف ایک بار تاخیر سے کلاس میں پہنچے۔ اس روز ان کی والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ تدفین کے فوراً بعد کلاس میں پہنچ گئے۔ چھٹی انہوں نے کبھی نہیں کی۔

پیرس میں انکے گرد علماء وفضلا کے علاوہ طالب علموں کا بھی مجمع لگا رہتا تھا جن میں وہ بے حد مقبول تھے۔ طلبا کے لیے وہ ہمیشہ وقت نکال لیا کرتے تھے۔ اپنے کپڑے اور کھانے کے برتن خود اپنے ہاتھ سے دھوتے تھے۔ یورپ میں زندگی گزارنے والا ایک شخص جو عہد جوانی میں بون اور پیرس چلا گیا ہو عمر کے لگ بھگ ۷۰ سال اس سادگی، درویشی، پارسائی کے عالم میں گزارے اور ہمہ وقت کام ہی میں مصروف رہے تا آنکہ بیماری اور بھوک کے ہاتھوں بے بس ہو کر اللہ کو پیارا نہ ہو جائے۔ جس نے معقول دولت کمائی ہو لیکن اپنی ذات پر خرچ نہ کی ہو بلکہ درسگاہوں اور لائبریریوں کی نذر کر دی ہو۔ ایسی کوئی اور مثال آپ کے سامنے ہو تو بتایئے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

اور پھر آج کے زمانے میں ؟توبہ کیجے

**

فلمی الف لیلہ کا آغاز ہماری خودنوشت داستان حیات کے طور پر ہوا تھا پھر رفتہ رفتہ ہماری زندگی کے ابتدائی اہم واقعات کے ساتھ اس میں صحافت، فلم، سیاست، مذہب اور ادب وشاعری کے نامور لوگوں کا تذکرہ بھی شروع ہو گیا۔ ہماری اپنی زندگی اور نجی معاملات کے بارے میں بات کرنا یا لکھنا ہمیں طبعاً پسند نہیں ہے اس لیے ہم نے زندگی میں شامل ہونے والے دوسرے لوگوں، واقعات اور شخصیات کا سہارا لیا تاکہ خود اپنا ذکر کم سے کم کیا جائے۔ جب صحافت اور ادب کے ساتھ ساتھ فلمی صنعت اور فلمی شخصیات کا تذکرہ زیادہ ہو گیا تو ہم نے اپنے تجربات اور مشاہدات کے علاوہ تاثرات اور شخصیات کی خاکہ کشی بھی شروع کردی۔ یہ ایک ملی جلی عجیب وغریب بارہ مسالے کی چاٹ کا رنگ اختیار کرنے لگی تو معراج صاحب اور فراز صاحب نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ اس کو فلمی تاریخ کے لیے ایک ریفرنس بنا دیا جائے۔ علمی وادبی اور صحافتی شخصیات کا ذکر بھی جاری رہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ صحیح معنوں میں ایک فلمی الف لیلہ کی صورت اختیار کر گئی۔

ہم نے بطور خاص قیام پاکستان سے پہلے لاہور کی فلمی صنعت اور فلمی شخصیات کا بیان کیا۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان اور کراچی میں فلمی صنعت کے قیام کا تذکرہ بھی تفصیل سے ہونے لگا۔ کچھ ہماری یادیں اور مشاہدات وتجربات وغیرہ تھے اور کچھ ہم نے مختلف ذرائع سے بھی ضروری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ذاتی تاثرات کے علاوہ اپنے عہد کے معروف اور ممتاز فن کاروں، لکھنے والوں، موسیقاروں، ہنرمندوں کا ذکر بھی ضروری تھا۔ اس میں ہندوستان کی شخصیات بھی شامل تھیں کیونکہ ہم نے اپنا بچپن اور لڑکپن ہندوستان میں گزارا تھا۔ فلم دیکھنے کا شوق تھا اس لیے اس زمانے کی فلمیں اور نمایاں شخصیات ہمارے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئیں۔ اس لیے ان کا ذکر بھی واجب

ہو گیا۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے پاک وہند کی فلمی تاریخ سازی کی ہے۔ انہیں کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے۔

اس داستان کو ہم نہ تاریخ کہہ سکتے ہیں نہ افسانہ۔ یہ شخصیات اور موضوعات کا ملغوبہ ہے پھر اس میں زمانے کی ترتیب کا بھی کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ جو بات جو واقعہ جو شخصیت ذہن میں آئی یا کسی نے توجہ دلادی اس کی داستان شروع کردی۔ جب ہم نے یہ خود نوشت شروع کی تھی تو اس وقت خود ہم کو بھی معلوم نہ تھا کہ رفتہ رفتہ یہ کیا صورت شکل اختیار کرلے گی۔ خدا جانے اب اس نے کیا روپ دھار لیا لیکن موضوع ایسا ہے کہ ایک داستان طولانی کے مانند جاری وساری ہے۔ ہر ماہ ایک باب لکھ دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ اس الف لیلہ کو ہر ذوق اور عمر کے لوگ پسند کرتے ہیں جس کا اظہار وہ مختلف طریقوں سے کرتے رہتے ہیں اور ہم تک اپنی آرا اور مشورے بھی زبانی، ٹیلی فون، فیکس اور خطوط کے ذریعے پہنچاتے رہتے ہیں۔ کئی حضرات و خواتین اس کا مطالعہ اس قدر باریک بینی سے کرتے ہیں کہ ہماری ذراسی غلطی اور لغزش بھی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہتی اور وہ اس کی تصحیح یا تصدیق کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے۔ اس داستان کا آغاز لگ بھگ آٹھ نو سال قبل ہوا تھا۔ خود ہم بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ کمبل کی طرح ہم سے چمٹ کر رہ جائے گی۔ لوگ پوچھتے ہیں یہ کب ختم ہوگی؟ اس کا جواب خود ہم کو بھی معلوم نہیں ہے۔ کبھی ایسا لگتا ہے کہ اب اس کو ختم کردینا چاہئے۔ آخر کوئی کہاں تک لکھے اور اس قدر تسلسل اور تفصیل کے ساتھ۔ لوگ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے ہیں تو لکھنے والے کی حالت کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ایک مشکل یہ ہے کہ یہ ہماری واحد مصروفیت نہیں ہے۔ دوسرے شعبوں میں بھی مصروفیات ہیں۔ اس پر باقاعدگی سے ہر ماہ قارئین کو الف لیلہ کی داستانیں سنانا بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے کوئی سزا بھگت رہے ہیں۔ تھک بھی جاتے ہیں، اکتا بھی جاتے ہیں مگر کردار اور واقعات ہیں کہ ہمارے ذہن کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہتے ہیں اور ہمیں یاد دلاتے رہتے ہیں کہ ہمارا کیا قصور ہے۔ ابھی تو ہم باقی رہ گئے ہیں۔ ان کی فرمائش پر بھی دھیان دینا پڑتا ہے مگر جب سوچتے ہیں تو واقعات، افراد اور تاثرات و مشاہدات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ نظر آتا ہے۔ یہ سلسلہ کب، کیسے اور کہاں ختم ہوگا؟ شاید لکھنے والا تھک کر قلم روک دے یا پھر زندگی بھر یہ سلسلہ جاری رہے۔ ایسا نہ ہو کہ نوبت یہاں تک آپہنچے !۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا

ہمی سو گئے داستاں کہتے کہتے

اس تحریر کا ایک اہم مقصد لوگوں کو اور آنے والی نسلوں کو اس دور کے (اپنی یادداشت کے مطابق) واقعات اور شخصیات سے آگاہ کرنا ہے۔ یہ محض حافظے کی جادوگری ہے کبھی ادھر ادھر سے مدد اور رہنمائی بھی حاصل کر لیتے ہیں لیکن بیشتر اپنی یادوں پر گزارا ہے اسی لیے غلطیاں بھی دانستہ یا نادانستہ سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ پڑھنے والے نشان دہی کرتے رہتے ہیں۔ ہماری معلومات میں اضافہ اور ہماری اصلاح کرتے رہتے ہیں۔

لیکن اس داستان میں ہم نے ایک بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ تذکرہ صرف واقعات، شخصیات، ان کے کارناموں اور ہمارے تاثرات تک ہی محدود رہے۔ یہ بڑے ہنر مند، گنی اور قابل احترام ہستیاں ہیں۔ اپنے اپنے میدانوں کے شہسوار اور اپنے اپنے شعبوں کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ انہوں نے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں۔ فن کار ایک عام انسان سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ غیر معمولی خداداد صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ قدرت انہیں ایسی خوبیوں سے نوازتی ہے جو ہر ایک انسان کے نصیب میں نہیں ہوتیں۔ یہ فن کار لوگ ہیں۔ اپنے ہنر کے بادشاہ، شہزادے اور شہزادیاں۔ انہیں ایک عام انسان کے معیار پر جانچنا مناسب ہی نہیں بلکہ ناانصافی ہے۔ یہ ایک عام انسان سے بلند ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اربوں افراد کی اس دنیا میں ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ اپنے ملک یا برصغیر میں ہی دیکھ لیجئے۔ جن ادبی و فلمی ہستیوں کا تذکرہ آپ کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے ان جیسے کتنے لوگ برصغیر میں گزرے ہیں؟ لگ بھگ ڈیڑھ دو ارب کی کثیر آبادی میں کتنے سہگل، مہدی حسن، نور جہاں، دلیپ کمار، محبوب خان، نوشاد اور ان جیسے لوگ پیدا ہوئے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر ان مخصوص لوگوں کو عام معیار پر جانچنا قرین انصاف نہ ہو گا۔

ایک اور پہلو جس کا خاص التزام رکھا جاتا ہے یہ ہے کہ ان کی ذاتی بشری کمزوریوں اور خاندانی نسب کو منفی انداز میں

پیش نہ کیا جائے کیونکہ اپنی فن کارانہ عظمت کے باعث یہ ان سے سے ماورا اور بلند تر ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہمارے دنیائے موسیقی کے مایہ ناز فن کار پیشہ ور گانے والے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور فن

کاراؤں کی آمد ایک زمانے تک پیشہ ور خاندانوں سے ہی ہوتی رہی ہے۔ یہ ناگزیر اور قدرتی امر تھا۔ جس معاشرے میں گانا اور ناچنا معیوب سمجھا جائے اور خواتین کا اداکاری کے میدان میں آنا قابلِ اعتراض اور باعث شرم تصور کیا جاتا ہو وہاں شریف خاندانوں کے اعلیٰ نسب لوگ ان شعبوں میں بھلا کیسے جلوہ گر ہو سکتے ہیں؟ ان نادر روزگار ہستیوں کو ان کے خاندانی نسب کے حوالے سے کم تر خیال کرنا بھی ایک غلطی اور خود فریبی ہو گی۔ ہمیں صرف ان کے فن پر توجہ دینی چاہئے۔ انہوں نے کروڑوں افراد کو جو خوشیاں، سکون، تفریح اور لطف عطا کیا ہے کیا وہ کافی نہیں ہے؟

ہمیں ایسے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں کہ فلاں فن کار کا تعلق پیشہ ور گھرانے سے تھا مگر ہم اسے گول کر گئے یا پھر ان کے بیان کردہ حقائق کے پیش نظر انہیں شریف گھرانوں سے منسوب کر بیٹھے حالانکہ جاننے والے ان کا خاندانی پس منظر بہ خوبی جانتے ہیں تو پھر ہم ان کی پردہ پوشی کیوں کرتے ہیں۔

ایسا ہی ایک خط ہمیں پچھلے دنوں پشاور سے انور اعجاز خان صاحب نے ارسال کیا ہے۔ خط کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انور اعجاز صاحب ایک جہاندیدہ، صاحب ذوق اور صاحب علم قاری ہیں۔ ہم نے گزشتہ داستانوں میں چند نامور گلوکاراؤں کا ذکر کیا تھا۔ ان کے خط کے کچھ حصے پیش خدمت ہیں؟

انہوں نے گلوکاراؤں کے خاندانی پس منظر کے بارے میں وہ معلومات فراہم کی ہیں جن سے ہم واقف ہیں چند واقعات بھی تحریر کیے اور لکھا ہے۔

''میرا ذاتی خیال ہے کہ جو کوئی بھی کسی گلوکارہ، اداکارہ یا اسی قبیل کے کسی فنکار کا تذکرہ بیان کرے تو صحیح اور حقیقت حال بیان کرے۔ ان کا ذاتی ''اپنے منہ میاں مٹھو'' والا بیان نہ لکھے بلکہ پردہ نشینوں کا اصل کردار ہی بیان کرے۔ جو لوگ ان فنکاراؤں اور ان کے فن سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ ان کی ذاتی زندگی، کردار، خاندان اور پیشے وغیرہ سے بھی خوف واقف ہوتے ہیں۔''

انور اعجاز خان صاحب کے اعتراض کا جواب خود ان کے خط کی آخری سطور میں موجود ہے جو لوگ ان تفصیلات سے

واقفیت رکھتے ہیں ان کے لیے ان کا بیان غیر ضروری ہو گا لیکن جو لوگ ناواقف ہیں اور انہوں نے اپنے محبوب فن کاروں کے بت اپنے ذہنوں کے مندروں میں سجا رکھے ہیں کیا ضروری ہے کہ ان کو یہ غیر ضروری باتیں بتا کر ان کے شیشے کے بنائے ہوئے تصورات پر سنگ زنی کی جائے۔ ویسے بھی وہ ان ہستیوں کو محض ان کے فن کے حوالے سے جانتے ہیں پہچانتے ہیں ان کے خاندانی پس منظر میں دلچسپی نہیں رکھتے پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ برصغیر کے ممتاز اور نامور فن کاروں، فن کاراؤں، ہنر مندوں اور تخلیق کاروں میں کتنی تعداد انہی خاندانی حسب نسب رکھنے والوں کی ہے۔ اگر ان خاندانوں اور پیشہ وروں کو خارج کر دیا جائے تو برصغیر کی ثقافت اور فنون لطیفہ میں باقی کیا رہ جائے گا؟ اس خطے میں بے شمار اعلیٰ نسب لوگ موجود ہیں جنہیں کوئی نہیں جانتا کیونکہ انہوں نے خلق خدا کو وہ خوشی، لطف و انبساط، فرحت اور تفریح فراہم نہیں کی جس کے لیے فنکار اور فن کارائیں ناقابل فراموش حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ کسی فنکار یا فنکارہ کا حوالہ اس کا فن ہوتا ہے نہ کہ خاندان؟

خط کے اگلے حصے میں انہوں نے کافی معلومات افزا باتیں لکھی ہیں۔

''آپ درست فرما رہے ہیں کہ چالیس کی دہائی میں آل انڈیا ریڈیو پر متحدہ ہندوستان کے صاحبان علم و فن اور عالی دماغ لکھاری اور شرفا اکٹھے ہو گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں اس وقت کے کنٹرولر جنرل سید احمد شاہ بخاری (پطرس) کا بھی ہاتھ ہے۔ پشاور کے مشہور بخاری برادران کا آل انڈیا ریڈیو اور پھر ریڈیو پاکستان کی بنیاد اور ساکھ بنانے اور شہرت قائم کرنے میں سب سے زیادہ عمل دخل رہا ہے۔ چالیس کی دہائی میں پشاور جیسے دور افتادہ اسٹیشن پر بھی سجاد سرور نیازی، قاضی سعید، فارغ بخاری، محسن احسان، خاطر غزنوی، حمید نسیم، پرتھوی راج کپور، الطاف گوہر اور ندیم قاسمی جیسے نامور اصحاب موجود تھے جو بعد میں فن اور ادب کی دنیا میں آفتاب و ماہتاب ہوئے۔

یہ بھی یاد دلا دوں کہ محترمہ شمشاد بیگم کو متعارف کرانے میں سجاد سرور نیازی کا ہاتھ ہے جو مشہور گلوکاراؤں ناہید نیازی اور نجمہ نیازی کے والد گرامی تھے۔ ان دنوں پشاور میں اردو گانے والوں کا کال تھا (اور اب بھی ہے) اس لیے دوسرے شہروں سے اچھا اور صاف اردو گانے والوں اور نئے فنکاروں کو تلاش کر کے پشاور ریڈیو سے پیش کیا جاتا تھا۔

شمشاد بیگم کا سب سے پہلا پروگرام آل انڈیا ریڈیو پشاور سے پیش کیا گیا تھا۔ موصوفہ کی مشہور نعت ۔

آیا ہے بلاوا مجھے دربار نبی سے

پشاور ریڈیو سے ہی نشر کی گئی تھی جس کی دھن اس وقت کے اسٹیشن ڈائریکٹر سجاد سرور نیازی مرحوم نے بنائی تھی ۔ پرتھوی راج نے بھی سب سے پہلے پشاور ریڈیو اسٹیشن سے ہی صداکاری کی تھی۔ مشہور عالم شہنائی نواز استاد بسم اللہ خاں نے بھی سب سے پہلا پروگرام پشاور ریڈیو سے ہی پیش کیا تھا۔ موصوف چند سال قبل بھارتی ہائی کمیشن میں بھارت کے یوم آزادی کا پروگرام کرنے آئے۔ انہوں نے شرط رکھی کہ وہ بھارتی ہائی کمیشن کے علاوہ صرف ریڈیو پاکستان پشاور پر پروگرام پیش کریں گے اور ضرور کریں گے چنانچہ انہوں نے پشاور اسٹیشن پر اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔“

انور اعجاز خاں نے محترمہ شمشاد بیگم اور مایہ ناز سارنگی نواز بسم اللہ خاں کا تذکرہ کتنے جذب واحترام سے کیا ہے۔ بسم اللہ خاں جیسا سارنگی نواز برصغیر میں دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ رہی شمشاد بیگم تو ان محترمہ کی آواز کا جادو آج بھی سر چڑھ کر بولتا ہے مگر انور اعجاز خاں نے ان دونوں فن کاروں کے خاندانی پس منظر کا حوالہ نہیں دیا؟ اس لیے کہ عطر وہ ہے جس کی خوشبو خود اس کی خوبی بیان کر دے نہ کہ عطار اس کی خوبیاں بیان کرے۔

سچ تو یہ ہے کہ برصغیر کے نامی گرامی فن کاروں اور فن کاراؤں میں سے عالی نسب ہستیوں کو چن چن کر الگ کر دیا جائے تو حاصل جمع کیا رہ جائے گا؟ ہمیں صرف فن کاروں کے فن سے تعلق رکھنا چاہئے کہ اسی حوالے سے وہ جانے جاتے ہیں اور اسی حوالے سے ان کا تذکرہ بیان کیا جاتا ہے۔ اہل فن ایک علیحدہ خاندان اور قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں ان کا شجرہ نسب ہی ان کا فن ہے۔

غالب نے کہا تھا ۔

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں

غالب کے زمانے میں بھی پری چہرہ لوگ یقیناً ہوتے ہوں گے مگر اس زمانے میں خواتین کے مشہور اور باپردہ رہنے کا رواج تھا۔اس کے باوجود لوگ ان کی جھلک دیکھ ہی لیا کرتے تھے۔غالب کو شاید گمان بھی نہ ہو گا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب پری چہرہ لوگوں کی کمی نہ ہو گی اور ہر کوئی ان چہروں کو دیکھ سکے گا۔

سہراب مودی نے جب فلم ''پکار'' کا آغاز کیا تو مغلیہ دور کی اس یادگار کہانی کے لیے انہوں نے شہنشاہ جہانگیر کے طور پر اپنے زمانے کے حسین ترین اور باوقار ترین اداکار چندر موہن کا انتخاب کیا اور نور جہاں کے کردار کے لیے ان کی نگاہ انتخاب نسیم بانو پر پڑی۔نسیم بانو کو ان کے ماہر پبلسٹی ایم اے مغنی صاحب نے پری چہرہ کا لقب دے کر اس فلم کی پبلسٹی کو ایک نیا رنگ دے دیا۔ ہم اس زمانے میں بہت چھوٹے تھے مگر اتنے بھی نہیں کہ فلم دیکھنے کا شوق نہ رکھتے ہوں۔ذوق و شوق بھی تھا اور جستجو بھی رہتی تھی کہ اب کون سی فلم نمائش کے لیے بھوپال ٹاکیز میں آئے گی

ہمارا بچپن ریاست بھوپال میں گزرا ہے۔دارالحکومت بھوپال ایک خوب صورت شہر تھا۔ اس زمانے میں وہاں ایک ہی سنیما گھر تھا۔سنیما دیکھنا رواج میں شامل نہیں ہوا تھا بلکہ معیوب سمجھا جاتا تھا۔اسے بائی سکوپ کہا جاتا تھا۔عورتیں تو عورتیں مرد بھی فلمیں دیکھنے کے حق دار نہیں سمجھے جاتے تھے۔خواتین بڑی مشکلوں سے گھروں سے اجازت لے کر ٹولیوں کی صورت میں سینما جاتی تھیں اور علیحدہ زنانہ کلاس میں بیٹھ کر فلم دیکھا کرتی تھیں۔اس کلاس میں کرسیوں کی جگہ بنچیں ہوا کرتی تھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ فلم بین اس چھوٹی سی کلاس میں سما جائیں۔اس کے باوجود رش کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کمرا کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا۔کوئی خاتون بیٹھی ہیں کوئی کھڑی ہیں۔سب ایک

دوسرے سے جڑ کر بیٹھتی تھیں پھر بھی دیوار سے لگ کر فلم دیکھنے والیوں کی کمی نہ تھی۔

ہم جیسا کہ پہلے بتا چکے ہیں کہ کسی کی گود میں یا کسی کے کندھے سے لگ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔اگر نظارہ صاف نہ دکھائی دے تو ادھر ادھر سے گھس گھسا کر خواتین کے پیروں میں جا بیٹھتے تھے اور جہاں بھی موقع ملتا جھانک کر فلم دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔اس کے باوجود دیکھنے والوں کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک منظر اور ایک ایک گانا

اور مکالمہ ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتا تھا۔ دوسری بار فلم دیکھنا ہر ایک کی قسمت نہ تھی اس لیے پہلی بار ہی میں اسے ”رٹ“ لیا جاتا تھا اور پھر خواتین گھر واپس جا کر انتہائی تفصیل سے مکالموں کے ساتھ ہر منظر کی زبانی تصویر کشی یوں کرتی تھیں کہ سننے والیوں کو فلم چلتی ہوئی محسوس ہونے لگتی تھی۔ فلم اگر تین گھنٹے میں ختم ہوتی تھی تو زبانی فلم دو چار دن تک چلی جاتی تھی۔

پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہم نے اس طرح جو پہلی فلم ضد اور بھوک ہڑتال کر کے دیکھی تھی وہ اشوک کمار اور لیلا چٹنس کی ”کنگن“ تھی۔ یہ ہمیں بے حد پسند آئی حالانکہ معاشرتی اور رومانوی کہانی تھی پھر جب ”بلبل بغداد“ دیکھی تو مہینوں اس کے سحر میں کھوئے رہے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے بلبل بغداد ہی نظر آتی تھی۔ ہم بہت روئے گائے بہت فیل مچایا کہ دوبارہ یہ فلم دیکھنے کا موقع مل جائے مگر نہ ملا۔ البتہ ایک بزرگ عزیز نے یہ تسلی دی کہ میاں چھوڑو یہ بلبل وبلبل ”پکار“ آنے والی ہے۔ وہ دیکھیں گے اور ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر مردانہ کلاس میں بٹھا کر دکھائیں گے۔ یہ ہمارے کزن یعنی تایا کے بڑے صاحب زادے فاروق علی بیگ تھے جنہیں ”نقو میاں“ کہا جاتا تھا۔ ہم سے پندرہ بیس سال بڑے تھے اس لیے ہم انہیں بھائی صاحب کہا کرتے تھے۔ وہ عمر کے اس فرق کے باوجود ہم سے کافی بے تکلف تھے اور ہماری دل جوئی کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

بھائی صاحب کے اس وعدے پر ہم کافی عرصہ جیئے ”پکار“ پہلے تو مکمل نہ ہوئی اور جب مکمل ہو گئی تو ہندوستان کے دوسرے شہروں میں اس کی نمائش شروع ہو گئی۔ بھوپال کی باری دیر میں آئی۔ اس تمام عرصے میں ہم بے تابی سے منتظر رہے۔ اخبارات میں فلمی اخباروں اور تصویروں کا گزر نہ تھا۔ چند فلمی پرچے تھے جن تک ہماری رسائی نہ تھی مگر خبریں ساری رکھتے تھے۔ یہ خبریں سینہ گزٹ کے ذریعے زبانی سفر کرتی رہتی تھیں اور موجودہ ٹی وی سے زیادہ ان کا حلقہ اثر تھا کیونکہ آج کل ٹی وی کے کئی چینل ہیں۔ اس وقت یہ زبانی چینل صرف ایک تھا اس لیے اس کی خبریں گھر گھر پہنچ جاتی تھیں۔

ہم نے ایک دن بھائی صاحب کو گھیر لیا ”بھائی صاحب ! آپ تو کہتے تھے کہ نور جہاں اور جہانگیر کی فلم ”پکار“ آئے گی تو دکھائیں گے۔“

”میاں صبر کرو۔ فلم یہاں آتو لے۔ تب ہی تو دکھائیں گے نا۔ خود سے فلم کی تصویر کھینچ کر تو نہیں دکھا سکتے۔“

”مگر وہ کب آئے گی۔“

”بس آئی کہ آئی۔ گوالیار میں تو آگئی ہے۔ بس اب اپنے بھوپال کی باری ہے۔ میاں ہم تو ایک بات جانتے ہیں ایسی فلم نہ کبھی بنی ہے نہ بنے گی۔ مغلیہ بادشاہوں کا نقشہ کھینچ کرر کھ دیا ہے کم بخت نے۔ کہنے کو پارسی ہے مگر کام مسلمانوں والے کرتا ہے۔ اب دیکھ لو۔ جہانگیر اور نور جہاں کے بارے میں فلم بناڈالی۔ سنا ہے کہ شاید اصلی جہانگیر اور نور جہاں بھی ایسے شاندار اور خوب صورت نہ ہوں گے۔ جانتے ہو کہ اس کی ہیر وئن کون ہے ؟“

”پری چہرہ نسیم۔“ ہم نے جھٹ جواب دیا۔ کافی عرصے سے سن جو رہے تھے ”اپنے ابا کو میاں تو دلی سے دیکھ آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پری چہرہ نسیم کے آگے تو اصلی پریاں بھی شرما جائیں۔ سچ مچ کی پری چہرہ ہے۔“

”بھائی صاحب۔ صرف اس کا چہرہ پریوں جیسا ہے یا وہ سب کی سب پری ہے ؟“

”میاں رہے نا آخر گھامڑ کے گھامڑ۔ بندہ خدا جس کا چہرہ پری جیسا ہو گا وہ تو ساری کی ساری پری ہو گی۔ چہرہ کسی اور کا جسم کسی اور کا کبھی سنا ہے ؟

”نہیں تو۔“

”بس تو پھر پری چہرہ نسیم سچ مچ کی پری ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کوہ قاف سے راستہ بھول کر ادھر آگئی ہے۔“

ہماری فلمی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں اس لیے مان لیا۔

آخر خدا خدا کرکے ''پکار'' بھوپال میں پہنچ گئی۔ ایسا ہجوم اور بے تابی کہ ٹکٹ ملنا ممکن نہ تھا ہمیں یہ بے قراری کہ ایسا نہ ہو ایک دو ہفتے بعد فلم چلی جائے اور ہم دیکھ نہ سکیں۔ اتنی اجازت اور توفیق نہ تھی کہ سینما گھر جا کر فلم کی تصویریں ہی دیکھ لیتے۔ بس دل ہی دل میں تلملا کر رہ جاتے تھے۔

بھائی صاحب نے ایک روز بتایا ''لو میاں کل کا ٹکٹ پکا ہو گیا۔''

''مگر بھائی صاحب ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اماں اور آکا میاں سے بات بھی کر لی ہے آپ نے؟''

''ارے میاں فکر کیوں کرتے ہو۔ ہم نے سارا بندوبست کر لیا مگر دیکھو کسی اور چیلے چانٹے کو نہ بتا دینا ورنہ مشکل ہو جائے گی۔ شیطانوں کی اس فوج کو بھلا کون لے جائے گا۔''

''اللہ قسم بھائی صاحب جو کسی کو بتائیں۔ بس آپ کل صبح پکی بات کر لیجئے۔ دیکھئے۔ اگر مجھے ساتھ نہ لے گئے تو کبھی آپ سے نہیں بولوں گا۔''

''میرے بھیا! میرے بچے۔ اطمینان رکھو اور اللہ پر بھروسا رکھو۔''

اللہ پر بھروسا کام آیا اور دوسرے دن ہم ''پکار'' دیکھنے پہنچ گئے۔

ہجوم ایسا کہ خدا کی پناہ۔ حد درجہ ہنگامہ، شور و غلِ بھاگ دوڑ اور چیخ و پکار۔ لوگ دیوانہ وار ٹکٹوں کے حصول کے لیے

بھاگے پھر رہے تھے لیکن بھائی صاحب نے پہلے ہی ٹکٹوں کا بندوبست کر لیا تھا اس لیے ہم دونوں تھوڑے سے دھکے کھانے کے بعد سینما کے اندر پہنچ گئے۔ یہ افراتفری کا عالم کافی دیر تک طاری رہا جس کے بعد رفتہ رفتہ لوگ اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے اور سارے ہال میں یکایک ایک پراسرار سناٹا چھا گیا۔

شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں کو دیکھنے کی تمنا ہر ایک کے دل میں بے تاب تھی۔ کوئی اونچی آواز میں بات تک نہیں

کر رہا تھا کہ مبادا شاہی آداب کی خلاف ورزی ہو جائے۔ بھائی صاحب نے سینما میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہمیں ضروری ہدایات دے دی تھیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ فلم بے ادبی اور بے پروائی سے دیکھنے والی نہیں ہے۔ یہ مغلیہ سلطنت کے ایک بہت مشہور و معروف شہنشاہ اور اس کی ملکہ سے تعلق رکھتی ہے جس کے حسن و جمال، ذہانت، ایجادات اور جدت پسندی کا ایک زمانہ قائل ہے۔

بھائی صاحب نے ہمیں یہ بھی بتادیا تھا کہ اس فلم کی کہانی دراصل عدل جہانگیری سے تعلق رکھتی ہے۔ جہانگیر کے عدل وانصاف کا سارے جہاں میں چرچا تھا ہم نے یہ بھی سنا اور پڑھا تھا کہ شہنشاہ نے اپنے محل کے سامنے ایک موٹی لوہے کی زنجیر بنوا کر لٹکا دی تھی جس کے آخری سرے پر مندروں اور گرجا گھروں جیسی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ دن اور رات کے کسی حصے میں بھی اگر کسی سے بے انصافی ہو رہی ہو اور وہ فوری انصاف کا طالب ہو تو یہ زنجیر عدل ہلا دے۔ فوراً سب کو خبر ہو جائے گی اور شہنشاہ کے حکم کے مطابق اسی وقت انہیں بھی اطلاع دے دی جائے گی۔ شہنشاہ کسی تاخیر کے بغیر سامنے جھروکے میں جلوہ گر ہو کر مظلوم کی فریاد سن کر موقع پر ہی (ضروری گواہیوں کے بعد جو فوراً پیش کر دی جاتی تھیں) فیصلہ سنا دیتا تھا جو کہ حکم آخر کا درجہ رکھتا تھا۔

ذرا غور فرمایئے کہ بادشاہت کے جس دور کو بڑا اور خرابیوں سے آلودہ سمجھا جاتا ہے اس زمانے میں عام آدمی کو کس طرح فوری انصاف مل جاتا تھا۔ اس کے برعکس آج کے جمہوری اور ترقی یافتہ دور میں پولیس کی فوج در فوج اور عدالتوں کا وسیع نظام ہونے کے باوجود عام آدمی زندگی بھر انصاف کے حصول کے لیے ترستا ہی رہتا ہے۔ فلم شروع ہوئی تو جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ سانس لینے کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

شہنشاہ جہانگیر کو بہ نفس نفیس انسانی پیکر میں دیکھ کر دیکھنے والے حیران تھے اور یہ بھول گئے تھے کہ یہ اصلی جہانگیر نہیں ایک اداکار چندر موہن ہے۔ اس کے بعد جب ملکہ نور جہاں جلوہ افروز ہوئیں تو سانسیں بھی رکنے سی لگیں۔ ہماری یہ مثال تھی کہ چہ پدی اور چہ پدی کا شوربا۔ یعنی اتنے نو عمر تھے کہ ذوق لطیف کی باریکیوں اور حسن جمال کی رعنائیوں کا بہ خوبی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے مگر جب ملکہ نور جہاں کو دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ ایسا حسن، ایسی تمکنت،

ایسا وقار اور جاہ و جلال اور اسکے ساتھ ساتھ دلکشی اور کشش۔ یقیناً یہ کوئی عام عورت نہیں ہو سکتی۔ یہ ملکہ نور جہاں ہی ہے جس کے عشق نے جہانگیر جیسے شہنشاہ کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔

فلم ''پکار'' کی کہانی کا موضوع نام ہی سے ظاہر ہے۔ سہراب مودی صاحب نے بہت تحقیق و جستجو کے بعد اس دور کے ملبوسات، سامان آرائش، طور طریقے اور آداب شاہی دریافت کر کے پیش کیے تھے دہلی کے میوزیم سے ملبوسات اور دوسری شاہانہ آرائش کے خاکے حاصل کئے گئے تھے۔ علما فضلا سے شاہی طور طریقیوں، رکھ رکھاؤ اور شہنشاہوں کے سامنے آداب شاہی کے بارے میں معلومات حاصل کی گئی تھیں اس پر طرہ کمال امروہوی کے مکالمے تھے جنہوں نے ہر کردار کے ساتھ اسی کی حیثیت کے مطابق مکالمے لکھے تھے۔ ان سب چیزوں نے باہمی آمیزش سے ایک سماں سا باندھ دیا تھا۔ دیکھنے والے اس بلیک اینڈ وائٹ فلم کو دیکھتے ہوئے بھی مغلیہ جاہ و جلال اور شان و شوکت کا بہ خوبی اندازہ لگا سکتے تھے۔ دیکھنے والوں پر جیسے کسی نے جادو کر دیا تھا۔ کسی کو کسی کی خبر تھی نہ ہوش۔ واقعی سہراب مودی نے ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ کمال امروہوی نے ایسے مکالمے تحریر کیے تھے جو آنے والے مکالمہ نگاروں کے لیے سالہا سال تک سند بن گئے۔

بادشاہ اور ملکہ کی آمد کس طرح ہوا کرتی تھی۔ درباریوں، امرا اور کنیزوں کا طرز عمل کیسا ہوتا تھا۔ ان سے تخاطب کے لیے کیسے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے اور شہنشاہ اور ملکہ کس انداز میں گفتگو کرتے تھے۔

مثلاً شاہ کی آمد کے موقع پر چوبدار کا اعلان ''باادب باملاحظہ ہوشیار، نگاہ روبرو۔ شہنشاہ ہند شاہ عالم، ظل الٰہی حضرت نورالدین جہانگیر تشریف لا رہے ہیں۔''

یہی انداز بعد کے لکھنے والوں نے بھی اپنایا۔ کمال امروہوی نے لکھنے والوں کو ایک نیا سا اسلوب اور انداز دیا۔

بادشاہ اور ملکہ کا تالی بجا کر کہنا ''تخلیہ'' اور حاضرین کا پچھلے پیروں ادب سے غائب ہو کر تنہائی فراہم کر دینا۔

بادشاہ کا رعب دار آواز میں گفتگو کرنا۔ ملکہ نور جہاں کے خلاف الزام سن کر فوری حکم دینا کہ ملکہ عالم کو حراست میں

لے کر زنداں میں قید کر دیا جائے۔ درباریوں کی حیرت اور بے حس و حرکت کھڑے رہنے پہ جہانگیر کا موٹی موٹی رعب دار آنکھوں سے گھورنا اور کڑک دار آواز میں کہنا۔

"تعمیل ہو" !

چند لمحے تو اہل دربار کو اپنے کانوں اور آنکھوں پر یقین ہی نہ آیا مگر پھر شہنشاہ کے گرج دار حکم پر ملکہ کو حراست میں لے لیا گیا۔

کمال امروہوی غضب کے مکالمہ نگار تھے۔انہوں نے دربار عام میں اور محل کے اندر نجی گفتگو کے لیے شہنشاہ اور ملکہ کی گفتگو کے لیے مختلف انداز کے مکالمے لکھے۔ نجی گفتگو میں محبت اور ملائمت کے ساتھ ساتھ شاہی دبدبہ بھی شامل ہوتا تھا لیکن دربار عام میں شہنشاہ سرتاپا جلال بن جاتا تھا۔

اس فلم میں زندان میں ملکہ کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا گیا جو عام قیدیوں کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا۔ کوئی رعایت نہیں دی گئی۔تانبے کی رکابی میں جوار کی سوکھی روٹی کھانے کو دی جاتی تھی جو ظاہر ہے کہ ملکہ کے حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی۔جب شہنشاہ زندان میں اپنی محبوب ملکہ بلکہ دل و جان کی مالکہ سے ملاقات کے لیے گئے تو شہنشاہ کے یہ مکالمے اس وقت سے آج تک یاد ہیں۔

"ملکہ !اگر تم ملکہ ہو تو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ جب چلو تو عوام کے دلوں کو روندتی ہوئی چلو۔انہیں کیڑے مکوڑے سمجھ کر قدموں تلے پامال کر دو۔"

ممکن ہے بعینہ یہ الفاظ نہ ہوں مگر قریب قریب یہی الفاظ تھے جو آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں۔

ملکہ نورجہاں ابتدائی مناظر میں شہنشاہ کی منظور نظر دکھائی گئیں لیکن قید کے دوران شہنشاہ نے جذبات کا قطعی اظہار نہیں کیا۔ وہ ایک سخت گیر ،انصاف پسند شہنشاہ کے روپ میں سامنے آیا۔

قصہ یہ تھا کہ ایک روز ملکہ نور جہاں شکار کھیل رہی تھیں کہ ان کے کمان سے نکلا ہوا ایک تیر دریا پر کپڑے دھونے والے ایک دھوبی کے سینے میں پیوست ہو گیا اور وہ مر گیا۔ بیوہ دھوبن نے واویلا کیا اور فریاد لے کر "زنجیر عدل" ہلانے کے لیے پہنچ گئی۔ لوگوں نے بہت سمجھایا مگر وہ باز نہ آئی۔ اسے اپنے شوہر کے خون کا بدلہ اور انصاف درکار تھا خواہ قاتلہ ملکہ نور جہاں ہی کیوں نہ ہو۔ یہ جہانگیر کے عدل و انصاف کا امتحان تھا۔

شہنشاہ نے مقدمے کی کارروائی کی۔ گواہوں کے بیانات اور ملکہ نور جہاں کا بیان سننے کے بعد فیصلہ دیا کہ جس طرح ملکہ کے تیر نے دھوبن کے شوہر کو ہلاک کر کے اسے بیوہ بنا دیا ہے اسی طرح دھوبن کو بھی حق حاصل ہے کہ تیر چلا کر ملکہ کے شوہر کو ہلاک کر دیا اور ملکہ کو بیوہ کر دے۔ یہ انتہائی ڈرامائی اور پر اثر منظر تھا۔ کسی کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ہر ایک پر سکتے اور بے یقینی کا عالم طاری تھا۔

یہ فیصلہ سن کر خود دھوبن بھی گم سم رہ گئی۔

کچھ دیر بعد دبی زبان سے درخواست کی گئی کہ اس فیصلے پر نظر ثانی فرمائی جائے مگر شہنشاہ نے غصے سے ابلتی ہوئی غضب ناک آنکھوں سے درباری کو گھورا اور کڑک دار آواز میں حکم دیا "حکم کی تعمیل ہو"!

دھوبن بھی اب شاید پچھتا رہی تھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے ساتھ یوں انصاف کیا جائے گا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، جسم لرز رہا تھا مگر شہنشاہ سامنے سینہ تانے کھڑے حکم دے رہے تھے کہ "ما بدولت کے حکم کی تعمیل ہو۔"

خود ملکہ نور جہاں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ چہرہ فق ہو گیا تھا۔ وہ خود کو (نادانستگی میں) سزاوار سمجھتی تھی

مگر اس کے نتیجے میں شہنشاہ کی زندگی دے کر مول چکانا پڑے گا اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ غمناک فریاد بھری نظروں سے شہنشاہ کو چپ چاپ دیکھ رہی تھی مگر بولنے کی تاب نہ تھی۔

یہ منظر اس فلم کا کلائمکس تھا اور یہ سچ ہے کہ ایسا ڈرامائی اور عجیب و غریب کلائمکس بہت کم فلموں میں دیکھنے میں آتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قاضی صاحب نے دست بستہ عرض کی کہ جہاں پناہ۔۔۔اسلام میں خوں بہا کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے۔ دھوبن کی مرضی دریافت کی گئی تو وہ خوں بہا لینے پر آمادہ تھی اس کا کہنا تھا کہ شہنشاہ کے انصاف کے ذریعے اس کا شوہر تو دوبارہ واپس نہیں آئے گا مگر ہندوستان یتیم اور رعایا کی کروڑوں عورتیں بیوہ ہو جائیں گی۔

خدا خدا کرکے یہ روح خشک کرنے والا کلائمکس ختم ہوا تو سب کی جان میں جان آئی۔ اس کے بعد شاہی محل کی خلوت میں ملکہ اور شہنشاہ کے مابین جو گفتگو ہوئی وہ ان کی باہمی محبت کا اظہار تھی۔ ملکہ نے فرمایا کہ اس فیصلے کے بعد میں خود بھی زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔

عدل جہانگیری کے بارے میں کتابوں اور تواریخ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ سہراب مودی نے تاریخ کے اسی باب کو فلم کا موضوع بنایا تھا اور اس خوب صورتی سے یہ کہانی پیش کی گئی تھی کہ دیکھنے والے ششدر رہ گئے تھے۔ ''پکار'' کو ان لوگوں نے بھی دیکھا جنہوں نے زندگی میں اس سے پہلے کوئی فلم نہ دیکھی تھی اور نہ ہی اس کے بعد دیکھی۔

ہماری اماں بھی ان ہی میں شامل تھیں۔ انہوں نے کبھی فلم نہیں دیکھی تھی مگر ''پکار'' دیکھنے کی فرمائش کی اور یہ فلم انہیں بہت پسند آئی۔ یہ ہماری کم سنی کے دنوں کا ذکر ہے۔ اس وقت ہماری عمر چھ سال ہو گی۔

ایک طویل عرصے بعد جب ہم نے اپنی پہلی فلم ''کنیز'' بنائی اور اسکا بہت شہرہ ہوا تو اماں کا دل بھی پسیجا اور ایک دن

انہوں نے پان کی گلوری منہ میں رکھتے ہوئے کہا ''بھئی سنا ہے تم نے پرانی تہذیب کے حوالے سے فلم بنائی ہے اور سب اس کی تعریف بھی کر رہے ہیں۔ میں بھی تمہاری یہ فلم دیکھنا چاہتی ہوں۔''

ہمیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کہ اماں خود سے ہماری فلم دیکھنے کی فرمائش کریں گی۔ ہم خوشی سے اچھل پڑے۔ فوراً سینما فون کیا اور بہترین سینما میں ایک خصوصی باکس کا اہتمام کرایا۔ یہ باکس نچلی منزل پر تھا تاکہ اماں کار سے نکل کر

چند قدم چلنے کے بعد باکس میں پہنچ جائیں۔اس طرح اماں نے فلم ‘‘کنیز’’ دیکھی۔

ہم اس وقت سینما میں موجود نہ تھے۔جب گھر پہنچے اور حسب عادت اماں کے پاس گئے تو وہ ہماری منتظر تھیں۔

‘‘بیٹا۔تم نے بہت اچھی فلم بنائی ہے۔دیکھو۔آئندہ بھی ایسی ہی فلمیں بنانا۔اللہ تمہیں خوش اور جیتا رکھے۔’’

ہم اماں سے لپٹ گئے۔اس سے بڑا اعزاز ہمارے لیے تمام فلمی ایوارڈ بھی نہ تھے جو ہمیں مختلف اداروں نے دیے تھے۔

اس زمانے میں ایوارڈ حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔صرف یہ دیکھئے کہ "کنیز "اور آغا جی اے گل اور شریف نیّر صاحب کی پہلی رنگین فلم ‘‘نائلہ’’ ایک ہی سال میں ریلیز ہوئی تھیں۔کئی ایک ممتاز ہدایت کاروں، فلم سازوں اور مصنفین کی فلمیں بھی مقابل تھیں۔شاید یہ اماں کی دعا کی برکت تھی۔

فلم ‘‘پکار’’ سہراب مودی کے فلم ساز ادارے منروا مووی ٹون کے تحت بنائی گئی تھی۔منروا مووی ٹون سہراب مودی اور ان کے بھائی کا ذاتی ادارہ تھا۔بمبئی کے سر کردہ فلم ساز اداروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔اس کا اپنا اسٹوڈیو تھا۔ اور بمبئی کے علاوہ کئی شہروں میں سینما گھر بھی تھے۔سہراب مودی اس زمانے میں فلمی دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔انہوں نے اوپر تلے کئی کامیاب ترین فلمیں بنائی تھیں جو موضوعات کے اعتبار سے بھی مختلف اور منفرد تھیں۔سہراب مودی فلم ساز اور ہدیات کار کے ساتھ بہت نامور اداکار بھی تھے۔اسٹیج اور تھیٹر کے زمانے سے وہ اداکاری کر رہے تھے۔اس لیے ان کی ایکٹنگ پر تھیٹریکل انداز کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔درمیانہ قد و قامت کے خوب صورت اور باوقار انسان تھے۔بڑی بڑی آنکھیں، نوکدار یونانی انداز کی ناک اور تیکھے نقش و نگار۔ان کی سب سے نمایاں خوبی ان کی آواز تھی۔بہت گھن گرج کے ساتھ مکالمے ادا کرتے تھے۔اردو کا تلفظ بہت اچھا تھا حالانکہ پارسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔انہوں نے اپنی محنت اور صلاحیت کے بل بوتے پر یہ بلند مقام حاصل کیا تھا۔ان کی اداکاری میں اسٹیج کا رنگ ہمیشہ غالب رہا۔آغاز میں انہوں نے مشہور ڈراموں پر مبنی فلمیں بھی بنائی تھیں جنہیں بہت کامیابی حاصل ہوئی۔

''پکار'' ۱۹۳۹ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی اور ہم نے غالباً ۱۹۴۰ء میں دیکھی تھی کیونکہ بھوپال میں فلموں کی نمائش قدرے تاخیر سے ہوا کرتی تھی۔

اس فلم میں ملکہ نور جہاں کا کردار اداکارہ نسیم جو دلیپ کمار کی بیوی سائرہ بانو کی ماں تھیں نے اس خوبی سے ادا کیا تھا کہ اس پر اصلیت کا گمان ہوتا تھا۔ شاید ملکہ نور جہاں کے کردار کے لیے نہ اس زمانے میں اور نہ اس کے بعد نسیم بانو سے زیادہ موزوں اداکارہ کا انتخاب ممکن ہی نہ تھا۔ نسیم بانو کو اگر حسن کی دیوی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ حقیقی زندگی میں بھی وہ ناقابل یقین حد تک حسین تھیں۔ کشیدہ قامت، بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، ستواں ناک، سجل نقشہ اور چہرے کے خدوخال، سرخ و سفید رنگت، سنہری بال(اس زمانے کی فلموں میں رنگت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا) ان کے سراپا میں ایک انوکھی کشش تھی۔ آنکھیں ہر تاثر کا اظہار کرنے پر قادر تھیں۔ چال میں وقار اور انداز گفتگو میں ایسی تمکنت تھی جو بہت سی سچ مچ کی شہزادیوں اور مہارانیوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ''پکار'' سے پہلے انہوں نے اور بھی کئی فلموں میں اداکاری کی تھی لیکن ''پری چہرہ'' کا لقب انہیں اس فلم میں دیا گیا تھا اور وہ صحیح معنوں میں پری چہرہ تھیں یوں تو ان کی اور بھی فلمیں ریلیز ہو چکی تھیں مگر ''پکار'' میں ملکہ نور جہاں کے کردار میں وہ انگوٹھی میں جڑے ہوئے نگینے کی مانند سج گئی تھیں۔ سارا ہندوستان اس فلم کا ''شہنشاہ جہانگیر کا اور خصوصاً ملکہ نور جہاں کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ بڑی عمر کے ایسے لوگوں نے بھی بطور خاص یہ فلم دیکھی تھی جنہوں نے ساری زندگی کوئی فلم نہیں دیکھی تھی اور نہ اس کے بعد کوئی اور فلم دیکھی۔ سب کا کہنا تھا کہ ملکہ نور جہاں اس سے بڑھ کر اور کیا

ہو گی۔ مغنی صاحب نے انہیں ''پری چہرہ' کا لقب بالکل صحیح دیا تھا۔

پری بھی اس سے زیادہ حسین نہیں ہو سکتی تھی۔ صرف کندھوں میں لگے ہوئے پروں کا فرق تھا جو پریوں کی تصویروں میں دکھایا جاتا تھا۔ وہ درحقیقت کوہ قاف سے اتری ہوئی کوئی پری ہی نظر آتی تھیں۔

یہ پری چہرہ نسیم ۱۹ جون ۲۰۰۲ء کو ممبئی میں انتقال کر گئیں۔ اس وقت ان کی عمر ۸۱ سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ طویل

عرصے سے بیمار تھیں اور گوشہ تنہائی میں خاموش اور گمنام زندگی بسر کر رہی تھیں۔اب زمانہ انہیں دلیپ کمار کی ساس اور سائرہ بانو کی والدہ کی حیثیت سے جانتا تھا۔ان کا دور عروج اور جاہ وجلال دیکھنے والے اب دنیا میں باقی ہی کتنے رہ گئے تھے۔انہیں قدرت نے حسن کا نمونہ بنا کر دنیا میں بھیجا تھا اور ان کی تخلیق میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔

نسیم بانو کی ننھیال کا تعلق کشمیر سے تھا جو حسن ورعنائی کے لیے مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کی نانی بھی حسن کا نمونہ تھیں اور ان کی والدہ شمشاد بیگم بھی اپنے زمانے میں حسن کی دیوی سمجھی جاتی تھیں۔وہ کشمیری نژاد تھیں اور امرتسر سے دہلی آکر آباد ہو گئی تھیں۔جہاں ان کے حسن وجمال اور گلوکاری کا بہت جلد چرچا ہو گیا۔شہرت دور دور تک پھیلی تو دہلی کے علاوہ دیگر علاقوں سے بھی پرستار آنے لگے۔یوپی کے ایک جاگیر دار نواب عبدالوحید خان بھی ان کے مداحوں میں شامل تھے۔یہ عشق اتنا بڑھا کہ انہوں نے اپنے خاندان کی مخالفت کے باوجود شمشاد بیگم سے شادی کر لی۔

اس زمانے میں ارباب نشاط سے شادی کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔جو لوگ اس ''جرم'' کے مرتکب ہوتے تھے عموماً انہیں خاندانی جائیداد سے عاق کر دیا جاتا تھا اور ان کا سماجی بائیکاٹ بھی کر دیا جاتا تھا۔اگر بیٹا اکلوتا یا لاڈلا ہوتا تو اہل خاندان یہ کڑوا گھونٹ پینے پر رضامند ہو جاتے تھے بلکہ باامر مجبوری، بہو کو وہ قبول نہیں کرتے تھے۔شوہر کے انتقال کے بعد خاندان والے ایسی بہوؤں کو گھر میں رکھنا پسند نہیں کرتے تھے اور انہیں گھر اور خاندان چھوڑنے پر

مجبور کر دیا جاتا تھا۔اس موضوع پر اردو میں کئی معروف ناول لکھے گئے ہیں اور بے شمار فلمیں بھی بنائی گئی ہیں۔ہدایت کار حسن طارق کو سعادت حسن منٹو کی طرح اس قسم کی مظلوم عورتوں سے بہت ہمدردی تھی اور یہ ان کا دل پسند موضوع تھا۔ان کی فلم ''شکوہ'' جس کے مصنفین میں ریاض شاہد اور ہم شامل تھے،اسی موضوع سے متعلق تھی۔ چند سال بعد ہماری پہلی ذاتی فلم ''کنیز'' کا موضوع بھی یہ تھا لیکن قدرے مختلف انداز میں اس مسئلے کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا تھا۔

مقصود یہ بتانا ہے کہ نواب عبدالوحید خاں نے جب یہ شادی کی تھی تو یہ بڑے دل گردے کا کام تھا۔عبدالوحید خاں

بہت دولت مند رئیس تھے۔انہوں نے نسیم بانو کی والدہ کو دہلی میں ہی ایک عالی شان مکان اور زندگی کی دوسری آسائشیں فراہم کر دی تھیں۔ گویا وہ کبھی ان کے خاندان کا حصہ نہ بن سکیں۔ پری چہرہ نسیم، شمشاد بیگم (چھمیاں بائی) اور نواب عبدالوحید خان کی اکلوتی بیٹی تھیں۔اس حیثیت سے وہ سارے گھرانے کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھیں۔ان کی کوئی فرمائش کبھی نہیں ٹالی گئی اور انہیں ہمیشہ ناز و نعم سے رکھا گیا۔ان کی تاریخ پیدائش ۲ جنوری ۱۹۲۲ء ہے۔وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھیں۔

اردو کا یہ محاورہ ان پر سو فیصد صادق آتا ہے۔ خوش قسمتی نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔سونے چاندی، ہیرے جواہرات کی ان کے پاس کبھی کمی نہیں رہی۔ہندوستان کے بڑے بڑے والیان ریاست، شہزادے اور ارب پتی صنعت کاران کے پرستاروں میں شامل تھے۔ شہرت اور دولت ان کی باندیوں کی طرح تھیں۔ کوئی عورت زندگی میں جن چیزوں کی تمنا کر سکتی ہے وہ سب نسیم بانو کو حاصل رہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ ذاتی زندگی میں بہت سادگی پسند تھیں ۔ زیورات کا استعمال بھی بہت کم کرتی تھیں حالانکہ ان کے پاس زیورات اور قیمتی ہیرے جواہرات کی کوئی کمی نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ ان کی جوتیوں میں بھی قیمتی ہیرے اور جواہرات لگے ہوئے تھے۔دولت اور شہرت اور دنیاوی آسائشوں کے اعتبار سے انہیں قدرت نے خوب نوازا تھا۔ حسن دیا تو بے حد و بے حساب جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ ’’پری چہرہ‘‘ کا لقب ان کے نام کا حصہ بن کر رہ گیا تھا اور وہ صحیح معنوں میں ان کی حق دار تھی۔

انہیں دہلی کے کانوینٹ اسکول میں داخل کیا گیا تھا جہاں سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔اس کانوینٹ میں ایک رئیس زادہ احسان بھی ان کا ہم جماعت تھا جو بعد میں میاں احسان کے نام سے مشہور ہوئے۔بعد میں انہوں نے نسیم بانو سے شادی کر لی تھی اور دونوں نے ایک مشترکہ فلم ساز کمپنی ’’تاج محل‘‘ پکچرز قائم کی تھی جس کے بینر تلے کئی فلمیں بنائیں گئیں۔سائرہ بانو جو دلیپ کمار کی بیگم ہیں میاں احسان ہی کی صاحب زادی ہیں ۔ اس بارے میں پہلے بھی تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔

نسیم بانو نے میٹرک کا امتحان دینے کے بعد مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ان کی والدہ انہیں ڈاکٹر بنانا چاہتی

تھیں مگر تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ وہ ایک اداکارہ بن گئیں اور سارے برصغیر میں انکی شہرت خوشبو کی طرح پھیل گئی۔

نسیم بانو (ہم اسی نام سے ان کا تذکرہ کریں گے) فلمی دنیا میں۔۔۔ کس طرح پہنچ گئیں؟ یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ کہتے ہیں کہ انہیں فلموں سے دلچسپی تھی اور فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ والدہ نے کبھی ان کی کوئی خواہش تشنہ نہیں چھوڑی تھی۔ اپنی نور نظر کی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے انہوں نے مزاحیہ جریدہ "چونچ" کے ایڈیٹر عنایت دہلوی سے رجوع کیا۔ آپ اس رسالے کے نام پر نہ جایئے۔ اپنے زمانے میں "چونچ" برصغیر کا بہت مقبول، بااثر اور کثیر الاشاعت پرچہ تھا۔ عنایت دہلوی اس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ایک اہم آدمی تھے جن کے ہر جگہ اور ہر شعبے میں مراسم تھے۔

عنایت دہلوی نے کلکتہ کے ارب پتی گجراتی سیٹھ سکھ لال کرنانی سے رابطہ قائم کیا جو کلکتہ کے بہت بڑے فلم ساز بھی تھے۔ ان کے دوسرے کاروبار بھی تھے۔ جہاز رانی میں بھی ان کا نام تھا۔ پنجاب کے معروف فلم ساز سیٹھ دل سکھ پنچولی کو سرمایہ فراہم کرنے والے بھی یہی سیٹھ کرنانی تھے۔ پنچولی سیٹھ ان کے لیے کلکتہ میں بھی فلمیں بناتے رہے اور پھر لاہور میں آکر بھی اسٹوڈیو بنایا اور بہت کامیاب فلمیں بنائیں۔ کرنانی سیٹھ صورت شکل کے معاملے میں بہت گئے گزرے تھے لیکن بڑے حسن پرست اور عاشق مزاج تھے۔ شباب کیرانوی مرحوم کے دوست اور مہربان کیمرہ مین اے حمید (جو علمی صنعت میں بھائی حمید کے نام سے مشہور تھے) کرنانی سیٹھ کے دلچسپ واقعات سنایا کرتے تھے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

کرنانی سیٹھ کلکتہ کے سب سے بڑے فلم ساز اور اسٹوڈیو کے مالک تھے۔ بڑے بڑے فنکار اور ہنر مندان کے باقاعدہ ملازم تھے جو کہ اس زمانے کا دستور تھا۔

عنایت دہلوی نے نسیم بانو کی سفارش کی تھی مگر جب کرنانی سیٹھ نے انہیں دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے اور نسیم بانو کا حسن و

جمال ہی دراصل ان کی سفارش ثابت ہوا۔

کرنانی سیٹھ کے پاس نہ پیسے کی کمی تھی نہ فلموں کی۔انہوں نے اپنی زیر تکمیل فلم ''اللہ کی تلوار'' میں نسیم بانو (روشن آرا) کو ہیروئن منتخب کر لیا۔اس فلم کے ہیرو اختر نواز تھے جو خالص اور کھرے پٹھان مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ اداکار تھے۔ سرحد کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے مگر فلمی اداکاری اور ہدایت کاری کا شوق انہیں کلکتہ لے گیا جو کہ فلم سازی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔وہ انتہائی خوب رو، دراز قد اور وجیہہ آدمی تھے۔ کرنانی سیٹھ نے فلم ''اللہ کی تلوار'' میں انہیں ہیرو کے طور پر کاسٹ کر لیا۔

''اللہ کی تلوار'' میں اداکاری شروع کی تو ہیرو اور ہیروئن کی حیثیت سے اختر نواز اور نسیم بانو کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملا۔یہ دونوں انتہائی شائستہ اور مہذب تھے۔کسی اوچھی حرکت کی ان سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی مگر فلمی دنیا کبھی اسکینڈلز سے خالی نہیں رہی۔اس زمانے میں بھی اسکینڈلز بنا کرتے تھے۔یہ وہ زمانہ تھا جب انڈیا کی فلمی دنیا میں کجن بائی کا شہرہ تھا۔سارے ملک میں ان کے حسن کا چرچا تھا اور وہ ایک مقبول اور کامیاب ہیروئن تھیں سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ کرنانی سیٹھ کی منظور نظر بھی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب انہوں نے نسیم بانو جیسی بے مثال حسینہ کو سیٹھ کرنانی کی کمپنی میں دیکھا تو حسد اور رقابت کا شکار ہو گئیں۔انہوں نے سیٹھ کرنانی تک یہ خبر پہنچائی کی اختر نواز اور نسیم بانو میں محبت کی پینگیں بڑھائی جارہی ہیں۔کرنانی سیٹھ یہ کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔انہوں نے پہلے تو اختر نواز صاحب کو بلا کر ان سے بات کی اور وضاحت چاہی۔اختر نواز ٹھہرے اکھڑ پٹھان۔انہوں نے صاف جواب دے دیا کہ آپ کو میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہی میں آپ کے سامنے جواب دہ ہوں۔

کرنانی سیٹھ یہ گستاخی اور خود سری برداشت نہیں کر سکتے تھے۔انہوں نے اختر نواز کو نہ صرف فلم سے علیحدہ کر دیا بلکہ یہ دھمکی بھی دی کہ انہیں فلمی دنیا سے نکال کر دم لیں گے۔اختر نواز صاحب نے ان کی نوکری اور اداکاری پر دو حرف

بھیجے اور کہا کہ رازق تو خدا ہے۔ میں کلکتہ ہی میں رہوں گا اور آپ کا محتاج بھی نہیں رہوں گا۔ آپ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر لیجئے۔

اختر نواز نے کلکتہ میں ڈیری فارم کھول کر دودھ بیچنے کا دھندا شروع کر دیا اور بہت کامیاب رہے۔

نسیم بانو نے یہ سنا تو انہوں نے بھی فلم ''اللہ کی تلوار'' میں کام کرنے سے انکار کر دیا اور سیٹھ کرنانی کی دھمکیوں کے باوجود کلکتہ چھوڑ کر بمبئی چلی گئیں۔ کرنانی سیٹھ نے مقدمے بازی کے ذریعے انہیں پابند کرنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکے اور نہ نسیم بانو کا کچھ بگاڑ سکے۔ نسیم بانو اس طرح کلکتہ سے بمبئی روانہ ہو گئیں اور ان کی پہلی فلم نامکمل ہی رہ گئی۔ اختر نواز بھی ڈیری فارم کا دھندا کرنے کے بعد کلکتہ سے لاہور چلے آئے۔ یہاں انہوں نے اداکاری اور ہدایت کاری کی۔ بعد میں آغا جی اے گل نے ان کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ آخری دنوں میں وہ ایورنیو اسٹوڈیوز کے منیجر تھے بڑے دبنگ اور صاف گو آدمی تھے۔ ان کی داستان بھی اس سے پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

بعض لوگوں کے خیال میں جہاں آرا کجن بائی کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہ تھا کیونکہ اب فلم ''مائی بی لوڈ My Beloved'' کے زمانے میں ان دونوں میں اختلافات ہو گئے تھے۔ اسی دوران میں نسیم بانو کلکتہ پہنچ گئیں تو سیٹھ نے کجن بائی کی جگہ نسیم بانو کو دینے کا فیصلہ کر لیا لیکن افسوس کہ ان کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔

شاید اللہ کو نسیم بانو کی بہتری مقصود تھی کہ وہ کلکتہ سے بمبئی چلی گئیں۔ بمبئی میں کسی فلم کی شوٹنگ دیکھنے گئیں تو فلم ساز، ہدایت کار اور اداکار سہراب مودی کی ان پر نظر پڑ گئی۔ سہراب مودی معروف فلم ساز و ہدایت کار تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز اسٹیج سے کیا تھا اور وہاں بھی بہت نام کمایا تھا۔

منروا مووی ٹون کے نام سے انہوں نے ذاتی ادارہ قائم کیا اور فلم سازی کا پروگرام بنایا تو اپنی پہلی فلم ''خون کا بدلہ خون'' کا آغاز کیا جو شیکسپیئر کے ڈرامے ''ہیملٹ'' سے ماخوذ تھی۔ روشن آرا کو نسیم بانو کا نام سہراب مودی نے ہی دیا

تھا۔ یہ نام انہیں بہت راس آیا۔ پہلی ہی فلم سپر ہٹ ثابت ہوئی۔ یہ فلم اسٹیج فلم کمپنی کے بینر تلے بنائی گئی تھی اور ۱۹۳۵ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس کے ہدایت کار بھی سہراب مودی تھے اور مرکزی کردار بھی انہوں نے ہی ادا کیا تھا۔ اس کی کاسٹ میں نسیم کی والدہ شمشاد بیگم عرف چھمیاں بائی بھی شامل تھیں۔ اس وقت کے دستور کے مطابق فنکار ایک ہی فلم کمپنی کے مستقل ملازم ہوا کرتے تھے اور یہ معاہدہ ایک خاص مدت یا فلموں کی مقررہ تعداد کے مطابق ہوتا تھا۔ اس فلم میں کام کرنے کے بعد نسیم بانو بھی کمپنی کی باقاعدہ ملازم ہو گئیں اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے بننے والی سہراب مودی کی فلموں میں وہی مستقل ہیروئن تھیں۔

''خون کا بدلہ خون'' عرف ہیملٹ کی کامیابی نے نسیم بانو کو راتوں رات سارے ملک میں مشہور کر دیا تھا۔ سہراب مودی نے منروا مووی ٹون کے نام سے فلم ساز ادارہ قائم کر لیا تھا۔ اس کمپنی کے ساتھ نسیم بانو کا ساتھ بہت دیر تک رہا اور اس کی بنائی ہوئی اکثر فلمیں سپر ہٹ ثابت ہوئیں۔ نسیم نے منروا مووی ٹون کی چھ فلموں میں اداکاری کی تھی جن میں ''پکار'' بھی شامل تھی۔

ان کی دوسری فلم ''خان بہادر'' تھی جس کی کاسٹ میں نسیم بانو، سہراب مودی اور صادق علی بھی شامل تھے۔ یہ فلم پہلی فلم سے بھی زیادہ کامیاب اور مقبول ہوئی جس کی وجہ سے نسیم بانو کا شمار سپر اسٹارز میں ہونے لگا۔

اس کے بعد ''طلاق'' کے نام سے فلم نمائش پذیر ہوئی۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے یہ ایک معاشرتی اور اصلاحی

موضوع تھا۔ سہراب مودی اس کے صرف فلم ساز و ہدایت کار تھے۔ نسیم بانو کے ساتھ جاگیر دار شیلا اور پریم ادیب اس کے مرکزی کردار تھے۔ میر صاحب نے اس کی موسیقی بنائی تھی۔ میر صاحب کو آج زمانہ بھول گیا مگر وہ اپنے عہد کے نامور اور ممتاز موسیقار تھے۔ فلم ''پکار' کی موسیقی بھی انہوں نے ہی مرتب کی تھی۔ اس فلم میں نسیم بانو نے بھی (اس زمانے کے رواج کے مطابق) اپنے گانے بذات خود گائے تھے۔ ان کا گایا ہوا ایک نغمہ ہمیں اس وقت سے آج تک یاد ہے۔ منظر یہ ہے کہ وہ محل میں ایک ساز لیے بیٹھی ہیں اور گا رہی ہیں۔ گانے کے بول یہ تھے۔

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے

بج رہا ہے اور بے آواز ہے

شکل وصورت کی رعنائی اور دلکشی اپنی جگہ مگر گلوکارہ کی حیثیت سے وہ اتنی کامیاب نہ تھیں۔ سیدھی سادی طرزوں میں گانے گایا کرتی تھیں۔ اس زمانے کے سادہ لوح فلم بینوں کے لیے یہی بہت اچھے نغمات تھے۔

''طلاق'' بھی بہت کامیاب فلم تھی۔ اسکے بعد سہراب مودی نے ایک بار پھر تھیٹریکل انداز کے موضوع پر فلم ''میٹھا زہر'' بنائی۔ اس فلم میں نسیم بانو کے ساتھ سہراب مودی ہیرو تھے۔ جاگیردار اور صادق علی بھی اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ اگلی فلم ''بسنتی'' تھی جس کے ہدایت کار کے ایم عثمانی تھے۔ یہ بھی ایک کامیاب فلم تھی لیکن اس کے بعد آنے والی فلم ''پکار'' ہندوستان کی فلمی صنعت میں یادگار اور تاریخ ساز ثابت ہوئی۔ اس فلم کے اداکاروں میں نسیم بانو کے ساتھ چندر موہن ہیرو تھے۔ سہراب مودی، سردار اختر (جو بعد میں محبوب صاحب کی بیگم بن گئی تھیں) صادق علی بھی شامل تھے۔ موسیقی میر صاحب نے ترتیب دی تھی۔ ''پکار'' کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ فلم ساز ہدایت کار اور اداکار کی حیثیت سے یہ سہراب مودی کا بہت بڑا نا قابل فراموش کارنامہ تھا۔ اس فلم نے انڈیا کی فلمی صنعت کو ایک نیا راستہ دکھایا تھا۔ یہ فلم ۱۹۳۹ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس نے کامیابی اور مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے تھے یہ اپنی مثال آپ تھی۔

اس فلم کے ساتھ ہی منروا مووی ٹون کے ساتھ نسیم بانو کے معاہدے کی مدت پوری ہوگئی تھی۔ سہراب مودی ایک نیا معاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے فلم ساز منہ مانگا معاوضہ دے کر نسیم بانو کو اپنی فلموں میں کاسٹ کرنا چاہتے تھے۔ ''پکار'' کی نمائش کے بعد نسیم بانو ایک ماورائی ہستی بن چکی تھیں۔ بڑے بڑے رئیس، شہزادے اور دولت مند انہیں تحائف پیش کر کے ان کی نظر عنایت کے محتاج تھے۔ محاورے کے مطابق نسیم بانو پر ہن برس رہا تھا۔ دولت تھی کہ سمیٹنے میں نہیں آتی تھی۔ ان کی شہرت اور مقبولیت کو ناپنے کا کوئی پیمانہ موجود نہ تھا۔

نسیم بانو نے کسی بھی فلم ساز کی پیشکش کو قبول نہیں کیا اور ایک نئے فلم ساز ادارے کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ اس کمپنی نے ''تاج محل'' اور ''قلوپطرہ'' کے نام سے دو فلموں کا آغاز کیا لیکن کوئی بھی فلم مکمل نہ ہو سکی اور یہ کمپنی بند ہو گئی۔ اگر یہ دونوں فلمیں ڈھنگ سے بن جاتیں تو ''پکار'' کی نور جہاں کے بعد تاج محل کی ملکہ ممتاز محل اور مصر کی ملکہ قلوپطرہ بھی نسیم بانو کی پہچان بن جاتیں مگر قدرت کو منظور نہ تھا۔ یہ ایک معمہ تھا کہ ملک کے مایہ ناز فلم سازوں کو ٹھکرا کر انہوں نے ایک نئے فلم ساز ادارے کی فلموں میں کام کرنا کیوں قبول کر لیا تھا۔ اس بارے میں کوئی نہیں جانتا۔

انہی دنوں نسیم بانو کا اپنے اسکول کے ساتھی میاں احسان کے ساتھ بہت میل جول ہو گیا تھا۔ میاں احسان بھی ایک خوب صورت، وجیہہ اور دولت مند نوجوان تھے۔ بچپن کی دوستی اب محبت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ فلم سازوں کی طرف سے رخ پھیر لینے میں اس محبت اور میاں احسان کی رائے کا بھی دخل ہو۔ ان دونوں کی محبت بالآخر شادی پر منتج ہوئی۔ میاں احسان اور نسیم بانو کے دو بچے ہیں۔ ایک سائرہ بانو اور دوسرے سلطان خاں۔ یہ تصدیق نہیں ہو سکی کہ سلطان خاں بھی میاں احسان ہی کی اولاد ہیں۔ کیونکہ ان کے نام سے اس بات کا اظہار نہیں ہوتا۔ بہر حال۔ میاں احسان سے نسیم بانو کی شادی ان کی پہلی اور آخری شادی ثابت ہوئی۔ علیحدگی کے بعد بھی انہوں نے دوسری شادی نہیں کی حالانکہ ان کے سامنے والیان ریاست کے رشتے بھی پیش کئے گئے تھے۔

نسیم بانو اور میاں احسان نے تاج محل پیکچرز کے نام سے ایک فلم ساز ادارہ بنا کر فلم سازی کا آغاز کر دیا تھا۔ اس

ادارے کی پہلی فلم ''اجالا'' تھی۔ اس کے ہدایت کار کے ایم عثمانی اور موسیقار خان مستانہ تھے۔ پرتھوی راج نسیم بانو کے بالمقابل ہیرو تھے۔ اس کے اداکاروں میں مرزا مشرف مبارک بھی شامل تھے۔ مصنف کمال امروہی تھے۔ یہ فلم ۱۹۴۲ء میں ریلیز ہوئی تھی اور بہت زیادہ کامیابی حاصل نہیں کر سکی تھی۔ کم از کم '' پکار'' کے مقابلے میں تو اسے ناکام ہی کہا جا سکتا ہے گویا یہ نیا سفر نسیم بانو کے لیے اداکارہ کی حیثیت سے کامیاب ثابت نہیں ہوا تھا۔

فلمستان لمیٹڈ نے نسیم بانو کو اپنی فلم ''چل چل رے نوجوان'' میں کام کرنے کی پیشکش کی جو انہوں نے منظور کرلی۔ اس فلم میں نسیم بانو نے پہلی بار اشوک کمار کے ساتھ کام کیا تھا اور اس کے موسیقار ماسٹر غلام حیدر تھے۔ رفیق غزنوی اور جگدیش سیٹھی بھی اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ اتنی بڑی کاسٹ اور کریڈٹ کے باوجود ''چل چل رے نوجوان'' ہٹ فلم نہیں تھی۔

تاج محل پکچرز کی دوسری فلم ''بیگم'' تھی۔ اس فلم کے مرکزی کردار نسیم بانو اور اشوک کمار تھے۔ یہ فلم بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ خدا جانے یہ سہراب مودی کی آہ تھی یا کسی فقیر کی بددعا کہ ''پکار'' کے بعد نسیم بانو کی کسی فلم کو اس کے عشر عشیر بھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ سہراب مودی آخر دم تک نسیم بانو کو اپنی فلموں میں کام کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش میں لگے رہے مگر دونوں کے ستارے اس کے بعد نہ مل سکے۔ سہراب مودی نے اس کے بعد ''پکار'' کے تجربے کو دہرانے کی غرض سے کئی پرانے دور سے تعلق رکھنے والی فلمیں بنائیں مگر وہ بات نہ پیدا ہو سکی۔ اداکارہ مہتاب سے شادی کرنے کے بعد انہوں نے بہت بڑے پیمانے پر تاریخی فلم ''جھانسی کی رانی'' بنائی تھی جو رنگین تھی۔ اس فلم کے لیے سہراب مودی نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ ان کے خیال میں یہ ان کی زندگی کی بہترین اور یادگار فلم تھی مگر تمام ترشان وشکوہ اور ماہرانہ ہنرمندی کے باوجود ''جھانسی کی رانی'' بری طرح فلاپ ہو گئی۔ یہ سہراب مودی کے لیے بہت بڑا دھچکا اور صدمہ تھا۔ انہوں نے اپنا سب کچھ اس فلم کی تکمیل پر لگا دیا تھا۔ اس کی ناکامی کے بعد وہ پھر سنبھل نہ سکے۔ اور نہ ہی دوبارہ وہ مقام حاصل کر سکے جو انہیں فلم ساز و ہدایت کار کی حیثیت سے انڈیا کی فلمی صنعت میں حاصل تھا۔

اس بارے میں ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ سہراب مودی نے تمام زندگی بھر مجرد رہنے کا عہد کیا تھا مگر مہتاب سے شادی کر کے انہوں نے یہ قسم توڑ دی جس کا کفارہ انہیں مسلسل ناکامیوں کی صورت میں ادا کرنا پڑا۔ واللہ اعلم بالصواب! اگر یہ کہا جائے کہ سہراب مودی اور نسیم بانو کو پھر کبھی '' پکار'' جیسا عروج حاصل نہ ہو سکا تو غلط نہ ہو گا۔

اگر سہراب مودی اپنے کھوئے ہوئے مقام کی تلاش میں ناکام رہے تھے تو نسیم بانو کے فلمی کیریئر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔انہوں نے اداکاری بہت کم کردی تھی۔ایک طویل عرصے بعد ۱۹۴۶ء میں ان کی دو فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ان میں سے ایک ''دور چلیں'' تھی اور دوسری ''میرا گیت'' ان دونوں فلموں کے نام تک کسی کو یاد نہیں ہیں جس سے ان کی کامیابی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اداکاری میں مسلسل ناکامیوں کے باوجود نسیم بانو کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔میاں احسان کے ساتھ ان کی شادی شدہ زندگی اطمینان سے گزر رہی تھی۔ دولت، شہرت اور مقبولیت کی کوئی کمی نہ تھی۔غرض یہ کہ اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ان کی آخر الذکر دونوں فلمیں درگاہ پکچرز کے بینر تلے بنائی گئی تھیں۔درگاہ دیوی کا نام بھی ان فلموں کو کامیاب نہیں کرا سکا تھا۔

تاج محل پکچرز کا ادارہ ابھی تک قائم تھا لیکن باقاعدگی سے فلم سازی نہیں کی جا رہی تھی۔۱۹۴۷ء میں تاج محل پکچرز اپنی تیسری فلم ''ملاقات'' بنائی۔اس کے ہدایت کار اور مصنف منشی دل تھے۔کھیم چندر پرکاش جیسے نامور موسیقار نے اس کی موسیقی ترتیب دی تھی۔اداکاروں میں نسیم بانو اور پریم ادیب نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔شاہ نواز اور ممتاز بھی اس کے نمایاں اداکار تھے۔'' ملاقات'' کو بھی متوقع پذیرائی اور کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

اس دوران میں پاکستان کا قیام عمل میں آنے کے انتظامات شروع ہو چکے تھے۔میاں احسان اور نسیم بانو کے مابین اختلافات کا آغاز بھی اسی نکتے سے ہوا تھا کہ میاں احسان اپنے وطن واپس آنے کے خواہش مند تھے۔میاں احسان کے والد خان بہادر محمد سلیمان چیف انجینئر کے عہدے پر فائز تھے۔وہ بہت دولت مند اور بارسوخ آدمی تھے۔میاں احسان ان کے لاڈلے بیٹے تھے اس لیے وہ ان کی کوئی خواہش نہیں ٹالتے تھے۔وہ نسیم بانو سے شادی کے حق میں نہ تھے لیکن بیٹے کی خواہش کے آگے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیے اور میاں احسان کو شادی کرنے کی اجازت دے دی۔

لیکن اس شادی سے پہلے راہ میں کئی رکاوٹیں حائل ہو گئیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ نسیم بانو کے مہربانوں میں

ریاست حیدر آباد دکن کے ولی عہد شہزادہ معظم جاہ بھی شامل تھے اور نسیم بانو کے ہاں ان کی کافی آمدورفت تھی۔ اس زمانے میں نسیم بانو کا نام کئی اور دولت منداور بااثر لوگوں کے ساتھ بھی منسوب ہوا تھا لیکن فلمی پریس کے محدود ہونے کی وجہ سے اسکینڈلز نہ بن سکے۔ شہزادہ معظم جاہ کی دلچسپی کے حوالے سے البتہ خبریں شائع ہوتی رہیں َشہزادہ معظم جاہ ایک بہت بڑی ریاست بلکہ سلطنت کے ولی عہد اور دنیا کے دولت مند ترین انسان کے فرزند تھے۔ شاہی کروفر بھی رکھتے تھے۔ شخصیت بھی شان دار تھی۔ ان کے اصرار پر ایک بار نسیم بانو اپنی والدہ کے ہمراہ حیدر آباد چلی گئیں جہاں عظیم الشان محل میں ان کے قیام کا اہتمام کیا گیا۔ کچھ عرصے بعد جہاں دیدہ شمشاد بیگم نے محسوس کیا کہ حیدر آباد جا کر انہوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ وہ ایک ایسا سنہری پنجرہ تھا جس سے نجات حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ شہزادے کی مرضی کے خلاف پتا تک نہیں ہل سکتا تھا اس لیے ان کی اجازت کے بغیر حیدر آباد کو خیر باد کہنا بھی ممکن نہ تھا۔ بہر حال شمشاد بیگم نے کسی طریقے سے حیدر آباد سے باہر نکلنے کی کامیابی حاصل کر لی اور اطمینان کا سانس لیا کہ ایک بہت بڑے جنجال سے جان چھوٹ گئی۔

نسیم بانو نے ریاست حیدر آباد سے واپس بمبئی پہنچ کر دوبارہ آزادی کی فضا میں سانس لیا۔ بہر حال اسے نسیم بانو کی خوش قسمتی ہی سمجھئے کہ وہ اس وبال سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ ورنہ شاید اس سنہری قفس سے کبھی باہر نہ نکل سکتیں۔

حیدر آباد سے واپسی پر ہی میاں احسان نے ایک بار پھر شادی کی خواہش ظاہر کی اور نسیم بانو نے اس شرط پر کہ انہیں

فلموں میں کام کرنے کی آزادی ہو گی میاں احسان سے شادی کر لی۔ میاں احسان نے ان کے شوق کی خاطر ہی تاج محل پکچرز بنا کر فلم سازی کا پروگرام شروع کیا تھا۔

جب تقسیم ملک کے ہنگاموں کا آغاز ہوا تو میاں احسان اور نسیم بانو کے مابین پہلی بار شدید قسم کے اختلافات پیدا ہو گئے اور بالآخر یہی اختلاف ان دونوں کی علیحدگی کا سبب بن گیا۔ نسیم بانو کسی قیمت پر بمبئی چھوڑنے پر آمادہ نہ تھیں۔ شوہر کو

چھوڑنا انہیں منظور تھا۔اس طرح میاں احسان بیوی بچوں کو چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ نسیم بانو شاید صرف ایک بار پاکستان آئی تھیں وہ بھی اپنی بیٹی کے ساتھ بہت مختصر قیام کے لیے۔البتہ دلیپ کمار کی بیگم کی حیثیت سے سائرہ بانو اپنے شوہر کے ہمراہ پاکستان آ چکی ہیں۔ میاں احسان نے نسیم بانو سے علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کافی غور و خوض اور تاخیر کے بعد کیا تھا۔ جب وہ قطعی مایوس ہو گئے تو علیحدگی کا فیصلہ کیا اور پاکستان واپس آ گئے۔

تاج محل پکچرز نے جو آخری فلم بنائی اس کا نام ''عجیب لڑکی'' تھا۔اس کے فلم ساز اور ہدایت کار میاں احسان تھے۔ انہوں نے پہلی بار ہدیات کاری کا تجربہ کیا تھا۔اس فلم کی موسیقی غلام محمد نے بنائی تھی۔ رحمان اس فلم کے ہیرو تھے۔ ششی کلا، آغا شیام کمار اور جنیت بھی اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ اس فلم کی ناکامی ان دونوں کے تعلقات کی ڈوبتی کشتی کے لیے آخری تنکا ثابت ہوئی۔

میاں احسان نے پاکستان کا رخ کیا اور اپنے بیوی بچے بمبئی کے حوالے کر آئے۔ پاکستان آ کر انہوں نے لاہور میں رہائش اختیار کی تھی اور یہاں جیل روڈ پر ایک سینما بھی بنایا تھا مگر پھر سب کچھ فروخت کر کے کراچی چلے گئے۔ کراچی میں بھی انہوں نے تین سنیما گھر بنائے۔ ان میں سے کتنے اب باقی ہیں اس کی تفصیل کا ہمیں علم نہیں ہے۔

لاہور میں میاں احسان صاحب سے ہماری چند ملاقاتیں ہوئیں۔ نہایت خوش اخلاق، شائستہ اور حسین آدمی تھے۔ان سے زیادہ ملاقاتوں کا موقع نہیں ملا مگر ان چند ملاقاتوں کا تاثر آج تک باقی ہے۔

میاں احسان پاکستان آ گئے مگر نسیم بانو نے اپنی فلمی مصروفیات جاری رکھیں۔ ۱۹۵۱ء میں فلمستان کی فلم ''شبستان''

ریلیز ہوئی جس میں ہیرو کا کردار شیام نے ادا کیا تھا۔ وہ پاکستان ٹی وی کی معروف اداکارہ، پروڈیوسر اور ہدایت کار ساحرہ کاظمی کے والد تھے اور اسی فلم کی شوٹنگ کے دوران میں شہسواری کرتے ہوئے گھوڑے سے گر کر دماغی چوٹ کی وجہ سے انتقال کر گئے تھے۔

''شبستان'' ہیرو شیام کے بغیر ہی جیسے تیسے مکمل کی گئی تھی۔ اسے زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ شیام اس وقت کے

مقبول اور کامیاب ہیرو تھے۔ ممکن ہے اگر یہ فلم ان کی موجودگی میں مکمل ہوتی تو شاید اس کا انجام کچھ اور ہوتا۔

اس سے پہلے نسیم بانو نے محبوب خان کی فلم ''انوکھی'' میں کام کیا تھا جو ایک سپرہٹ فلم تھی۔اس فلم کے موسیقار نوشاد اور گیت نگار شکیل بدایونی تھے۔ نسیم بانو کے ساتھ سریندر نے ہیرو کا کردار کیا تھا۔یہ محبوب صاحب کی اچھی اور یادگار فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔اس فلم میں پہلی بار ریلوے کا حادثہ کسی انڈین فلم میں بڑی ہنرمندی سے فلما کر پیش کیا گیا تھا اور فلم بینوں نے اسے بہت سراہا تھا۔اس فلم کے اداکاروں میں ککو(رقاصہ) مراد، پریم ادیب، بدھوایڈوانی وغیرہ بھی شامل تھے۔اس کی موسیقی سدابہار تھی۔ چند گانے شاید آج بھی آپ کو یاد ہوں۔

ا۔ کبھی دل دل سے ٹکراتا تو ہوگا

انہیں میرا خیال آتا ہوگا

۲۔جلے نہ کیوں پروانہ

شمع دکھا کر حسن کے جلوے بنادیں جب دیوانہ

جلے نہ کیوں پروانہ

۳۔ بھولنے والے یاد نہ

بھولنے والے یاد نہ آ

دیکھ ہمیں مجبور نہ کر

اپنی قسم دکھ دور نہ کر

ہم توجیۓ بس تیرے لیے

تو نے کچھ ایسے زخم دیے

ٹھیس لگی دل ٹوٹ گیا

بھولنے والے یاد نہ آ۔۔۔

نوشاد کی موسیقی اور محبوب کی ہدایت کاری نے اس فلم میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ اس کے سبھی گانے سپر ہٹ ہوئے تھے۔ نسیم بانو کو اس فلم سے ایک نئی فلمی زندگی ملی تھی۔

۱۹۴۹ء میں تاج محل پکچرز کی فلم ''چاندنی رات'' نے بھی بہت کامیابی حاصل کی تھی۔ اس طرح ان کی ناکامیوں کا دور ختم ہو گیا تھا۔ ''چاندنی رات'' کے فلم ساز اور ہدایت کار میاں احسان تھے۔ خوش قسمتی سے یہ بھی سپر ہٹ فلم تھی۔ اس طرح نسیم بانو نے کامیاب فلموں کا ہیٹ ٹرک مکمل کر لیا تھا۔ اس فلم کے موسیقار بھی نوشاد تھے اور گیت نگار شکیل بدایونی تھے جو عام طور پر نوشاد صاحب کے ساتھ نغمہ نگاری کرتے تھے۔ اس فلم کی موسیقی بھی بہت مقبول ہوئی تھی۔ شیام اس کے ہیرو تھے۔ الیاس، جلو بائی اور ککو بھی اس کے اداکاروں میں شامل تھے۔

۱۹۵۰ء میں خدا خدا کر کے سہراب مودی نسیم بانو کو اپنی فلم ''شیش محل'' میں کاسٹ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ نسیم بانو نے دس سال کے طویل عرصے کے بعد سہراب مودی کی فلم میں کام کیا تھا۔ اس کے فلم ساز و ہدایت کار سہراب مودی اور موسیقار وسنت ڈیسائی تھے۔ اداکاروں میں نسیم بانو کے ساتھ سہراب مودی، نگار سلطانہ، اے شاہ شکارپوری، مبارک اور پران اس فلم کی کاسٹ میں شامل تھے۔ یہ نسیم بانو کی کامیابیوں کا دور تھا اس لیے یہ فلم بھی سپر ہٹ ہو گئی۔

۱۹۵۲ء میں نسیم بانو کی فلم ''بے تاب'' ریلیز ہوئی جس کے ہدایت کار ہربنس اور موسیقار ایس ڈی باتش تھے۔ نسیم بانو کے ساتھ اشوک کمار ہیرو کے کردار میں پیش کئے گئے تھے۔ موتی لال، گیتا بالی اور مراد جیسے بڑے فنکار بھی اس فلم کے اداکاروں میں شامل تھے۔ یہ اوسط درجے کی فلم تھی۔

۱۹۵۲ء ہی میں نسیم بانو کی فلم ''سند باد دی سیلر'' نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی جس کے ہدایت کار نانا بھائی بھٹ تھے۔ چتر گیت اس کے موسیقار تھے۔ رنجن اس فلم میں ہیرو تھے۔ یہ فلم کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ اس کی کاسٹ میں نروپا رائے، شکیلہ، بھگوان اور پران قابل ذکر ہیں۔ یہ ایک تصوراتی اور ایکشن فلم تھی۔

۱۹۵۳ء میں نسیم بانو کی فلم ''باغی'' نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اننت ٹھاکر اس کے ہدایت کار تھے۔ موسیقی مدن موہن کی تھی۔ اس کے فلم ساز دلیپ کمار کے بڑے بھائی ایوب خان تھے۔ یہ فلم بھی زیادہ کامیابی نہیں حاصل کر سکی۔

اس فلم کے بعد کئی سال گزر گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے نسیم بانو نے اداکاری ترک کر دی ہے لیکن چار سال کے وقفے کے بعد ان کی فلم ''نوشیر واں'' نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اس کے فلم ساز و ہدایت کار سہراب مودی تھے۔ سی رامچندر نے اس کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ یہ ایک کاسٹیوم فلم تھی۔ سہراب مودی کے علاوہ مراد، بپن گپتا، مراد، آغا وغیرہ اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ خلاف توقع یہ ایک سپر فلاپ فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم کی نمائش ۱۹۵۷ء میں ہوئی تھی۔ یہ نسیم بانو کی آخری فلم بھی ثابت ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے کسی فلم میں کام نہیں کیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ ان کی فلمی اداکاری کا آغاز بھی سہراب مودی کی فلم سے ہوا تھا اور انجام بھی ان ہی کی فلم سے ہوا تھا۔ اس کے بعد فلم بینوں نے پری چہرہ نسیم بانو کو کبھی اسکرین پر نہیں دیکھا۔ ان کا انتقال ۲۰۰۲ء میں ہوا۔ اس طرح وہ قریب قریب ۴۵ سال تک فلموں سے کنارہ کش رہیں۔ انہیں فلمی تقریبات وغیرہ میں بھی نہیں دیکھا گیا۔ وہ ایک خاموش اور پرائیویٹ زندگی گزارتی رہیں۔

پری چہرہ نسیم بانو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ کوئی بھی انسان ہمیشہ زندہ نہیں رہتا مگر اپنی خوشگوار یا ناخوشگوار یادیں چھوڑ جاتا ہے۔ نسیم بانو جب تک زندہ رہیں ان کا جب بھی تذکرہ کیا گیا پری چہرہ نسیم کے ساتھ ہی کیا گیا۔ بمبئی کی فلمی دنیا میں رہ کر بھی وہ ایک پر وقار اور الگ تھلگ زندگی گزارتی رہیں۔ ان کے زمانہ عروج میں کئی بار بڑے لوگوں کے ساتھ ان

کانام منسوب کیا گیا جسے اسکینڈلز بھی کہا جاسکتا ہے مگر انہوں نے وضع داری اور رکھ رکھاؤ کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ میاں احسان سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد انہوں نے دوسری شادی بھی نہیں کی۔

نسیم بانو نے ایک تہذیب یافتہ اور شائستہ ماں کی نگرانی میں زندگی بسر کی تھی۔ طبعاً بھی وہ انتہائی شائستہ، بااخلاق اور باوقار خاتون تھیں۔ انہیں دیکھ کر ان سے مل کر اور ان کی گفتگو سن کر یوں لگتا تھا جیسے کسی شاہی خاندان کے چشم و چراغ سے مل رہے ہیں۔ ان کی ذات میں ایک عجیب سی تمکنت اور شاہانہ انداز تھا اس اعتبار سے وہ عام ایکٹریسوں سے یکسر مختلف تھیں۔

ان کے کردار کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے کبھی غیر شائستہ ملبوسات نہ تو ذاتی زندگی میں پہنے اور نہ ہی فلموں میں۔ طور طریقوں اور آداب محفل کے لحاظ سے وہ منفرد تھیں۔ ذاتی زندگی میں وہ بہت سادگی پسند تھیں۔ عام اور سادہ لباس زیب تن کرتی تھیں۔ بھڑکیلے، قیمتی ملبوسات اور زیورات سے انہیں دلچسپی نہیں تھی۔ حالانکہ ایک اندازے کے مطابق وہ انتہائی بیش قیمت زیورات اور جواہرات کی مالک تھیں۔ دیکھنے والوں کو وہ ایک عام، سادہ گھریلو خاتون معلوم ہوتی تھیں جسے اپنی شہرت، مقبولیت، دولت مندی اور حسن کا قطعی احساس نہ ہو۔ وہ کسی تکلف کے بغیر گفتگو کرتی تھیں لیکن ہر ایک کے ساتھ بے تکلف ہونا تو کیا ملاقات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں لیکن اس میں کسی غرور کا دخل نہیں تھا۔ ان کی سادگی کا اظہار ان کے گھر کو دیکھ کر ہو جاتا تھا۔ انتہائی دولت مند ہونے کے باوجود ان کا گھر نسبتاً سادہ تھا حالانکہ ثریا جیسی اداکارہ نے شاہانہ انداز میں رہائش اختیار کی تھی اور ان کے فلیٹ میں دروازوں کے ہینڈل بھی سونے کے تھے۔ ذاتی زندگی میں نسیم بانو میک اپ بھی نہیں کرتی تھیں۔ یہ رویہ انہوں نے آخر دم تک نبھایا۔ شاید انہیں احساس تھا کہ ان کا ملکوتی حسن کسی میک اپ کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اپنے ملبوسات کو رد و بدل اور ترمیم کے ساتھ دوبارہ قابل استعمال بنا لیتی تھیں۔ خوشبو سے انہیں والہانہ لگاؤ تھا۔ بہترین اور بیش قیمت خوشبو استعمال کرتی تھیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر انہیں عبور حاصل تھا۔ ان کی والدہ نے انہیں گلوکاری سکھانے کی بہت کوشش کی مگر سریلی آواز نہ ہونے کی وجہ سے وہ گلوکارہ نہ بن سکیں۔ رات کو سونے سے پہلے قرآن شریف کی تلاوت

ان کے معمول میں داخل تھی۔

نسیم بانواور میاں احسان نے اپنے دونوں بچوں کی تعلیم کو بہت اہمیت دی تھی۔وہ صرف ایک بار اپنی بیٹی سائرہ بانو کے ساتھ پاکستان آئی تھیں۔ان کا مختصر قیام کراچی میں رہا لیکن میڈم نور جہاں بذات خود انہیں لینے کے لیے کراچی پہنچ گئیں اور لاہور میں انہیں اپنا ذاتی مہمان بنا کر رکھا۔یہ ان کا پاکستان کا پہلا اور آخری دورہ تھا جس کے بارے میں بہت سے لوگوں کو علم نہیں ہے۔

نسیم بانو کو انگریزی اور اردو زبانیں آتی تھیں۔انہیں مطالعے کا بھی شوق تھا۔ جس زمانے میں انہوں نے کانوینٹ سے میٹرک پاس کیا تھا اس وقت ان کا تعلیمی معیار آج کے ایم اے پاس لوگوں سے بھی زیادہ بلند تھا۔وہ اردو اور انگریزی روانی سے بولتی تھیں۔میاں احسان بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ باپ کے فرزند اور بذات خود۔۔۔اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔وہ لندن سے انڈسٹریل کیمسٹری میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آئے تھے یہی وجہ ہے کہ دونوں نے اپنے بچوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی تھی۔

سائرہ بانو نے بمبئی کے بہترین اسکولوں میں تعلیم حاصل کی جس کے بعد انہیں سوئزر لینڈ بھیج دیا گیا تھا جب وہ سوئزر لینڈ سے واپس آئیں تو ان کے والد اور خود نسیم بانو کی ضد کے آگے ہار ماننی پڑی۔حسن وجمال کے حوالے سے انہوں نے بھی بہت شہرت حاصل کی تھی۔اگرچہ نسیم بانو کے مقابلے میں ان کا حسن ماند تھا۔سوئزر لینڈ میں رہ کر وہ بہت زیادہ آزاد خیال ہوگئی تھیں اس لیے فلموں میں انہوں نے کافی قابل اعتراض ملبوسات پہنے جن کا ان کی ماں کبھی تصور بھی نہیں کرسکتی تھیں۔آزادروی کے باعث ان کے اسکینڈلز بھی بنتے رہے۔یہ بھی معلوم ہوا کہ نسیم بانو کے اصرار پر ہی دلیپ کمار نے سائرہ بانو سے شادی کی تھی تاکہ انہیں مزید اسکینڈلز اور بے راہ روی سے محفوظ رکھا جا سکے۔یہ شادی بہت کامیاب ثابت ہوئی ہے۔اگرچہ اس دوران میں حیدر آباد کی ایک شادی شدہ خاتون عاصمہ کے ساتھ دلیپ کمار کی خفیہ شادی کا اسکینڈل بھی سامنے آیا تھا دلیپ کمار اس سے منکر تھے مگر عاصمہ کے پاس دستاویزی ثبوت موجود تھے۔بہر حال یہ قصہ بھی ختم ہوگیا اور سائرہ اور دلیپ کمار کی شادی محفوظ رہی اور آج بھی انہیں ایک

کامیاب ترین فلمی جوڑا تصور کیا جاتا ہے۔ دلیپ کمار اور سائرہ بانو اولاد سے محروم ہیں۔ زیادہ میل ملاپ اور تقریبات میں جانا بھی انہیں پسند نہیں ہے۔ اس لیے ان کی سماجی زندگی نسیم بانو کے گھر آمد و رفت تک ہی محدود رہی ہے۔

نسیم بانو طویل عرصے تک صاحب فراش رہنے کے بعد ۱۹ جون ۲۰۰۲ء کو دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اتنے طویل عرصے کے بعد وہ فلم بینوں اور عام لوگوں کے لیے گمنام ہو چکی تھیں۔ البتہ دلیپ کمار اور سائرہ بانو کے حوالے سے ان کا ذکر گاہے بگاہے سننے میں آجاتا تھا۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

پری چہرہ نسیم بھی انہی صورتوں میں سے ایک صورت تھیں۔ رہے نام اللہ کا۔

پری چہرہ نسیم بانو کا اصل نام روشن آرا تھا۔ ان کے بارے میں لکھتے ہوئے یکایک ایک روشنی سی جگمگائی اور ایک اور روشن آرا کا خیال آگیا بلکہ یاد تازہ ہو گئی۔

اگر نسیم بانو کو مغنی صاحب نے کمرشل ضرورتوں کے تحت پری چہرہ کا لقب دے کر متعارف کرایا تھا اور وہ اسم با مسمی ثابت ہوئیں تو یہ ایک اور بات ہے لیکن ہم جن روشن آرا بیگم کی یاد تازہ کرنے جا رہے ہیں انہیں کسی ایک شخص یا ادارے نے نہیں بلکہ موسیقی کے اساتذہ اور نامور معتبر نقادوں نے اتفاق رائے سے ''ملکہ موسیقی'' کا نام دیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ در حقیقت وہ موسیقی کی ملکہ تھیں۔ میڈم نور جہاں کو ملکہ ترنم کا اعزاز ان کے بعد حاصل ہوا تھا۔ یوں بھی یہ دونوں ہستیاں اپنے فن میں یگانہ ہونے کے باوجود دو الگ الگ دنیاؤں کی حکمراں تھیں۔ ملکہ ترنم کو کلاسیکی موسیقی پر بھی عبور حاصل تھا۔ وہ استاد بڑے غلام علی خاں کی مایہ ناز شاگرد تھیں لیکن انہوں نے ابتدا ہی سے اپنے لیے ہلکی پھلکی فلمی موسیقی اور غزل کا میدان چن لیا تھا۔ اگر وہ بھی روشن آرا بیگم کی طرح محض کلاسیکی موسیقی پر توجہ دیتیں تو اس وقت موسیقی کی دو ملکائیں یعنی ایک میان میں دو تلواریں موجود ہوتیں۔

ملکہ موسیقی کو بجا طور پر برصغیر کے موسیقاروں اور استادوں نے یہ خطاب عنایت کیا تھا۔ وہ ہر طرح اس کی مستحق

تھیں۔ کیا آواز تھی اور کس غضب کی گائیکی ۔۔۔

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

جب وہ نغمہ سرا ہوتی تھیں تو شعلے لپکتے ہی رہتے تھے لیکن یہ شعلے جلا کر خاکستر کرنے والے نہیں دلوں اور روح وذہن کو ٹھنڈک اور سکون پہنچانے والے تھے۔

ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم نے ۶ دسمبر ۱۹۸۲ء کو وفات پائی تھی۔ ان کے ''سایہ نما'' فنکار بھی ڈھونڈے نہیں ملتے اور غضب یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا اور مغرب زدگی نے اب کانوں کو سریلی آوازوں اور روح کو چھونے والے سروں سے یکسر محروم کر دیا ہے۔ ایک چیخ وپکار، شوروغل اور اچھل کود اور اس سے آگے ساتھ ساتھ عریاں جسموں کے مظاہرے اب موسیقی میں شامل ہو گئے تھے۔ اصلی موسیقی کا اصلی خوراک کی طرح نام ونشان تک نہیں رہا ہے۔

روشن آرا بیگم کے بارے میں ہم پہلے بھی تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اب اسے شکوہ یا نوحہ سمجھ لیجئے کہ ہم لوگ روشن آرا بیگم کو کتنی جلدی فراموش کر بیٹھے ہیں۔ نئی نسل کے سامنے تو روشن آرا بیگم کا نام لینا بھی ایک معما پیش کرنا ہے۔ ان سے پہلی والی نسل بھی دماغ پر زور ڈال کر کہتی ہے۔

'' روشن آرا بیگم ؟ ہاں۔ کچھ ذہن میں آتا تو ہے۔۔۔ کیا یہ کوئی اداکارہ تھیں ؟''

جنہیں موسیقی سے دلچسپی ہے اور وہ اس بارے میں جاننا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ معلومات دوبارہ فراہم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کم از کم وہ اس نام اور ان کے فن سے آشنا تو ہو جائیں گے۔

روشن آرا بیگم نے زندگی کا بیشتر حصہ پاکستان اور پنجاب میں گزارا لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ان کا تعلق کلکتہ سے تھا۔ ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، گھنے سیاہ لمبے بال اور خدوخال اس کے گواہ ہیں وہ کلکتہ والی تھیں اس لیے انہیں موسیقی سیکھنے اور اس میں کمال حاصل کرنے سے کون روک سکتا تھا۔ بچپن ہی سے گانے کی شائق تھیں پھر یہ شوق،

لگن، جذبہ اور دیوانگی بن گیا۔انہوں نے گائیکی میں بڑے بڑے استادوں سے سبق حاصل کیااور آموختہ یاد کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ سبق از بریاد ہو گیا۔

ان کی آواز کے شعلے اور گائیکی کا جادو آج بھی اتنا ہی مسحور کن اور حیرت انگیز ہے جتنا کہ ان کی زندگی میں تھا۔افسوس کہ روشن آرا بیگم نے مشینی اور صنعتی دور میں جنم لیا تھااور وہ بھی ایک ایسے ملک میں جہاں ملاؤں نے موسیقی کو حرام قرار دے رکھاہے اور شریف گھرانوں میں موسیقی سیکھنے والوں (اور سیکھنے والیوں) کو عجیب نظروں سے دیکھا جاتا ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ جس مذہب میں موسیقی کو حرام سمجھا گیاہے اسی نے برصغیر کے عظیم ترین موسیقاروں اور گویّوں کو جنم دیا اور ہندو مذہب جو موسیقی اور رقص کو اپنے مذہب کا ایک حصہ سمجھتاہے اس معاملے میں مسلمان فنکاروں کی بڑائی اور ہنر مندی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔اس شعبے میں برصغیر کے قریب قریب سبھی فنکار مسلمان تھے۔انہوں نے اپنے فن کی جوت سے کروڑوں دلوں کو روشن کیا۔انہیں کیف و سرور اور دلی مسرت سے ہمکنار کیا۔خدا جانے اس کے بعد بھی انہیں ''حلال'' ہونے کی سند مل سکتی ہے یا نہیں؟ بہر حال۔یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کا براہ راست معاملہ ہے۔وہ بڑا رحیم و کریم ہے۔کیا عجیب کہ ان سب

فنکاروں کو جنت میں داخل ہونے کا حکم جاری کر دے۔اگر غالب یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ۔۔۔

کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملالیں یارب

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

تو گانے والے بھی اس قسم کی درخواست بارگاہ خداوندی میں کر سکتے ہیں کہ یارب ! اہل جنت کی تفریح اور وابستگی کا یہ سامان بھی انہیں فراہم کر دے۔

روشن آرا بیگم جیسی مغنیہ ان سے پہلے کبھی پیدا ہوئی تھی؟اس کا ہمیں علم نہیں ہے مگر ان کے بعد کوئی دوسری روشن آرا بیگم دنیا میں نظر نہیں آئیں۔یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے کہ فنون لطیفہ کے میدانوں میں قحط الرجال کی سی کیفیت ہے۔

روشن آرا بیگم۔۔۔ابھی نو عمر ہی تھیں کہ بڑے بڑوں کو اپنی گائیکی سے حیران کر دیا کرتی تھیں اور یہ بنگال میں ہوتا تھا جو کہ موسیقی کا گہوارہ ہے۔

وہ قیام پاکستان سے قبل بھی لاہور آئی تھیں کہ اس شہر کو موسیقی کا مرکز خیال کیا جاتا تھا۔دراصل وہ آل انڈیا ریڈیو لاہور سے پروگرام پیش کرنے کے لیے لاہور آئی تھیں۔جس نے کلاسیکی موسیقی کے فروغ کے سلسلے میں بہت نمایاں کردار ادا کیا ہے۔یہ بخاری صاحب کا زرّیں دور تھا۔اب صرف اس کی یادیں رہ گئی ہیں۔

اس زمانے میں بھاٹی گیٹ کے اندر محلہ پیر گیلانیاں میں چن پیر کا آستانہ بھی تھا جو موسیقاروں کی زیارت گاہ تھا۔یہاں برصغیر کے بڑے بڑے موسیقار دور دور سے آکر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے اور ہنر مند استادوں سے سیکھتے تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ریڈیو سے ان کا پروگرام پیش کیا گیا تو اعلان کیا گیا کہ بمبئی والی روشن آرا بیگم اپنا فن پیش کریں گی۔انہیں بمبئی والی اس لیے کہا گیا کہ وہ ۱۹۳۰ء میں کلکتہ سے بمبئی چلی گئی تھیں اور ان کے فن کی اصل نشو نما اسی شہر میں ہوئی تھی۔(یہ شہر اب ممبئی کہلاتا ہے) ان کی جائے پیدائش بھی بمبئی ہی تھا۔وہاں منتقل ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ان کے استاد عبدالکریم خاں بمبئی میں مقیم تھے۔روشن آرا بیگم کئی سال تک استاد عبدالکریم خاں سے موسیقی سیکھتی رہیں۔

سعید ملک صاحب جو عہد نوجوانی سے موسیقی کے رسیا رہے ہیں انہوں نے بڑی بڑی یادگار محفلوں میں شرکت کی ہے اور ایسی ہستیوں کو روبرو بیٹھ کر سنا ہے جو اب قصہ کہانیاں بن چکے ہیں۔ان کا بیان ہے کہ ۱۹۴۱ء میں روشن آرا بیگم لاہور آئی تھیں اور چن پیر کے آستانے پر ایک محفل میں بڑے بڑے نامور موسیقاروں کے سامنے جب انہوں نے آواز بلند کی تو سب ان کے فنکارانہ ہنر مندی پر حیران رہ گئے۔ان کی آواز سریلی، نغمہ ریز اور تاثر سے بھرپور تھی ۔وہ اپنی آواز کے ذریعے ہر قسم کا تاثر پیدا کرنے پر قادر تھیں۔مشکل سے مشکل استھائی اور انترہ اس قدر آسانی اور روانی سے گاتی تھیں جیسے ندی بہہ رہی ہو۔

روشن آرا بیگم کو معلوم تھا کہ وہ جس فن کو سیکھنے جا رہی ہیں اس کے لیے ان تھک اور جان لیوا محنت اور مسلسل طویل ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ تربیت کے دوران میں آواز اور راگ راگنی پر عبور حاصل کرنا پڑتا ہے۔ وہ بھرپور آواز سے گاتی تھیں۔ مشکل اور باریک ترین، سُر طرز اور تانیں انتہائی آسانی سے کسی کاوش کے بغیر ادا کرسکتی تھیں۔ مرکیاں، پلٹے، آواز کا اتار چڑھاؤ اور دیر تک ایک ہی سُر پر قائم رہنا بہت مشکل کام ہے لیکن روشن آرا بیگم کے لیے یہ بالکل سہل تھا پھر ان کی گائیکی کا ایک منفرد انداز تھا۔ وہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۲ء تک اپنے سُروں کا جادو جگاتی رہیں۔ عمر اور وقت نے ان کی آواز اور فن کو چھوا تک نہیں تھا۔ ان کی آواز میں وہی نوجوانی کی چمک، اٹھان، ٹھاٹھ اور بھرپور تاثر تھا اور آخر وقت تک قائم رہا۔ لے کاری میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ موسیقی میں وہ کیرانہ گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ خصوصاً خیال اس خوبی سے گاتی تھیں کہ بڑے بڑے استاد داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ یہ فن انہوں نے استاد عبدالکریم خان اور ان کے عم زاد استاد عبدالوحید خاں سے سیکھا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد روشن آرا بیگم بمبئی سے پاکستان آگئی تھیں۔ اس وقت بھی وہ کیرانہ گھرانے کے انداز میں خیال کی گائیکی میں بے مثال سمجھی جاتی تھیں۔ استادوں نے انہیں آواز اور سروں کے ساتھ ساتھ راگ راگنیوں کی بھی ایسی تعلیم دی تھی اور انہوں نے اس قدر محنت، عرق ریزی اور لگن سے یہ سب حاصل کیا تھا کہ سننے والے رشک کرتے تھے۔ ان کا الاپ مخصوص تھا جسے وہ درجہ بدرجہ بڑھاتی جاتی تھیں۔ اسی میں وہ مختلف راگوں کو شامل کرکے دل کی دھڑکن تیز کرنے والی برقی تانیں بھی ملا لیتی تھیں انہوں نے ہمیشہ گائیکی کے بلند اصولوں اور وقار کو پیش نظر رکھا تھا۔

اپنے استاد سے انہیں اتنی عقیدت اور محبت تھی کہ ان کے گائے ہوئے نغمے گاتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے جس کی وجہ سے تاثر میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ ایک طرح سے استاد کی خدمت میں ان کا نذرانہ عقیدت ہوتا تھا۔

اپنے عہد میں انہیں عہد ساز مغنّیہ تسلیم کر لیا گیا تھا وہ گائیکی میں اپنی خداداد آواز اور فن کے ساتھ ساتھ ذہانت سے بھی کام لیتی تھیں۔انہیں کلاسیکی موسیقی کی تھیوری پر عبور حاصل تھا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے تو وہ یکتا تسلیم کی جاتی تھیں۔انہوں نے لگ بھگ چالیس برس تک اپنی آواز کا جادو جگایا اور دنیائے موسیقی پر صحیح معنوں میں حکمرانی کی۔ان کے خلاف کبھی کسی کو بغاوت کرنے کی جرات نہ ہو سکی۔انہوں نے پاکستان آکر یہاں کی موسیقی میں بھی نت نئے تجربات کیے اور اسے مالامال کر دیا۔

وہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان آئی تھیں۔لاہور ان کی سرگرمیوں کا مرکز تھا مگر ان کا قیام لالہ موسیٰ میں رہا۔یہ لاہور راولپنڈی کے درمیان میں ایک قصبہ ہے مگر روشن آرا بیگم کی رہائش گاہ بننے کے بعد اس کی عظمت اور رفعت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔محفلوں اور ریڈیو کے پروگراموں میں شرکت کے لیے لاہور آتی جاتی رہتی تھیں۔ان کی موسیقی اور گائیکی کی نزاکتوں اور خوبیوں کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور وہ صرف سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ریڈیو کے علاوہ ٹیلی ویژن سے بھی انہوں نے کچھ پروگرام پیش کیے مگر مغرب زدہ ٹی وی پر ان کی خاطر خواہ قدر نہیں کی گئی۔حالانکہ ایسے عظیم فنکار کسی قوم اور ملک کا سرمایہ ہوتے ہیں اور ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے اس کے بعد کہیں جا کر کوئی ایک ''دیدہ ور'' پیدا ہوتا ہے۔اب تو پاکستان ٹی وی نے روشن آرا بیگم کو جیسے بھلا ہی دیا ہے۔انہی کو کیا غزل گانے والے مایہ ناز فنکار مہدی حسن، غلام محمد، امانت علی خان جیسے بھی اب ٹی وی کی نظروں میں بے وقعت اور بیکار ہو کر رہ گئے ہیں۔البتہ ریڈیو پاکستان سے روشن آرا بیگم اور دوسرے گلوکاروں کی آوازیں سننے میں آ جاتی ہیں۔ روشن آرا بیگم ان ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے پاکستان کی کلاسیکی موسیقی کا رخ بدل دیا۔ایسی آوازیں اور ایسی ہستیاں اب کہاں۔۔۔؟

یہ آوازیں سننے کے لیے اب ہمارے کان ترستے ہی رہیں گے۔شاید ہم اسی کے مستحق ہیں۔

منیر نیازی کے پرستاروں کی آج کمی نہیں ہے۔ادب میں ان کا ایک امتیازی مقام ہے۔ ان کی شاعری کا اسلوب جدا اور انداز فکر و انداز پیشکش نرالا ہے۔یہاں تک کہ بڑے بڑے جغادری شاعر بھی اب ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف

کرتے ہیں اور موقع محل کے مطابق ان کے اشعار بھی استعمال کرتے ہیں۔ شاعر تو وہ آغاز ہی سے ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہے۔ آج بھی ان کے چالیس پچاس سال پہلے کے اشعار دیکھیے تو ان میں بھی وہی کیفیت رنگ اور سوز و گداز موجود ہے جو کہ بعد میں ان کی شاعری کی انفرادیت قرار پایا۔ ان کی فکر بھی وہی ہے اور زندگی بسر کرنے کا ڈھب بھی تبدیل نہیں ہوا ہے۔ وہ ایسے شاعر ہیں جو کسی دوسرے کو خاطر میں نہیں لاتے یہاں تک کہ نقادوں کو بھی کھری کھری سنا دیتے ہیں۔

یہ آج کی بات نہیں ہے۔ منیر نیازی کا جوانی میں بھی یہی انداز تھا جب وہ ابھی باقاعدہ سکہ بند شاعر تسلیم نہیں کئے گئے تھے۔ جب وہ بڑے بڑے شاعروں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بزرگانہ اور بلند حیثیت اختیار کرتے تو سننے والے ہنس پڑتے۔ شاعری اور گفتگو میں بھی منیر نیازی کے لب و لہجے اور اصطلاحوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ چڑیلیں، بدشکل لوگ، مکروہ چہرے، کند ذہن اور غبی انسان۔ لوگوں کے بارے میں یہ تبصرہ ہے کہ اس کا ذہن شاہ دولے کی چوہے کی طرح سکڑ کر رہ گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

منیر نیازی کے ساتھ کچھ دیر بیٹھئے تو اس قسم کے الفاظ اور اصطلاحیں آپ کو آج بھی سننے کو ملیں گی کہ آپ دنگ رہ جائیں گے۔ میرے نزدیک منیر نیازی نے گزشتہ چالیس پینتالیس سالوں میں کوئی ترقی نہیں کی اور اس لیے کہ وہ پہلے ہی اپنے زمانے سے سالہا سال آگے تھے۔ اسی لیے لوگ ان کی باتوں پر مضحکہ خیز انداز میں ہنستے تھے۔ یہ نہیں کہ اب منیر نیازی کا ذہن رسا مزید وسیع اور کشادہ ہو گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اب لوگوں کا ذہن ان کی بات سمجھنے کے قابل ہوتا جا رہا ہے کچھ اور وقت گزرے گا تو ان کے قدردانوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ موازنہ یا تقابل تو مقصد نہیں ہے لیکن میری ناچیز رائے میں ان کا معاملہ مرزا غالب جیسا ہے۔ مرزا کو بھی اپنے زمانے سے یہی شکایت رہی کہ وہ ان کی قدر نہیں کرتا حالانکہ۔۔۔

لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

پورا شعر سنے بغیر اس کا لطف نہیں آئے گا جو یوں ہے

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے

لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

ادھر معاصرین اور مخالفین کو ان کی مشکل پسندی بے مزہ اور بے معنی لگتی تھی ان کا کہنا تھا

مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یہ دو سو سوا دو سو سال پہلے کی باتیں ہیں۔ جوں جوں وقت گزر گیا اور لوگوں میں غالب کا کلام سمجھنے کا شعور پیدا ہوا تو وہ غالب کے اشعار میں معنی و مطالب نکالنے لگے یہاں تک کہ غالب کے اشعار کی شرحیں اور تفسیریں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس قدر نابغہ روزگار انسان تھا جس نے ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرعے میں ایک سمندر سمو دیا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے غالب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لوگوں کو اس کی بے پایاں

عظمت کا احساس ہونے لگا ہے۔ ہمیں آپ غالب کی طرفداری کا الزام نہ دیجئے گا کیونکہ یقین کیجئے۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

آپ کہتے ہوں گے کہ عجب آدمی ہے۔ غالب کے بغیر اس کی کوئی بات مکمل ہی نہیں ہوتی حالانکہ تذکرہ منیر نیازی کا ہو رہا تھا۔

منیر نیازی ممکن ہے عمر میں ہم سے کچھ بڑے ہوں مگر جوانی کے دنوں میں ہم عمر ہی تھے اس لیے خاصی یاری دوستی تھی۔ (یہ تحریر تب لکھی گئی جب وہ بقید حیات تھے) اس زمانے میں ملنے ملانے کے بہانے اور سامان بھی بہت زیادہ میسر تھے۔ منیر نیازی کے بارے میں ہم پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اس وقت ان کا تذکرہ ایک اور حوالے سے

کیا جارہا ہے۔ ہم یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ منیر نیازی کی شاعری اور سحر انگیز شخصیت کے ہم اس وقت سے مداح ہیں جب نہ تو وہ کسی کو گھاس ڈالتے تھے اور نہ ہی کوئی دوسرا انہیں خاطر میں لاتا تھا۔ گھاس وہ اب بھی کسی کو نہیں ڈالتے مگر ان کو خاطر میں لانے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

یہ سن ۵۱، ۵۰ کی بات ہے جب ان کی اور ہماری ملاقاتیں شروع ہوئی تھیں پھر ہم صحافت کے راستے فلمی صنعت میں چلے گئے۔ منیر نیازی نے بھی صحافت میں بہت ہاتھ پیر مارے مگر بات نہیں بنی۔ صحافی بننے کے لیے ایک خاص قسم کے ذہن اور سوچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ٹھہرے شاعر، اس لیے صحافت میں ان کا گزارہ نہ ہو سکا۔ انہوں نے اپنا ذاتی جریدہ ''سات رنگ'' بھی نکالا اور نقصان اٹھایا پھر مختلف رسائل و جرائد میں قلم برداشتہ مضامین لکھتے رہے مگر شاعری کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

یہی شاعری بالآخر انہیں فلمی دنیا میں لے گئی۔ ہم بھی اس وقت وہاں پہنچ گئے تھے۔ منیر نیازی کی باتوں پر سب لوگ دل کھول کر ہنستے تھے۔ (خود منیر نیازی پر نہیں ان کی باتوں پر) وہ بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ آج بھی کرتے ہیں۔ فلم اسٹوڈیو میں کھڑے ہو کر وہ برملا فلم کے اکثر ہدایت کاروں اور مصنفین کو بدصورت، مکروہ ذہن، شاہ دولہ کے چوہے اور غبی کہا کرتے تھے۔ خود بھی اپنی باتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے اور دوسرے بھی لطف اٹھاتے تھے۔

منیر نیازی (اور اسی عہد میں حبیب جالب) جیسے لوگوں کا فلمی دنیا میں گزارہ بہت مشکل تھا۔ حبیب جالب بھی صاف گو اور منہ پھٹ آدمی تھے مگر ان کا انداز قدرے بہتر اور مودبانہ ہوتا تھا مگر باز آنے والے وہ بھی نہیں تھے۔ خدا بخشے تنویر نقوی جیسے کشادہ قلب شاعروں، اداکار علاؤالدین جیسے اداکاروں، ریاض شاہد جیسے قدردانوں اور خلیل قیصر جیسے ذہین اور باشعور ہدایت کاروں کو جن کی بدولت منیر نیازی اور حبیب جالب دونوں کو فلمی دنیا میں ''داخلہ'' مل گیا۔ آغاز میں ان کی مطبوعہ مشہور غزلوں اور نظموں کو فلموں میں شامل کیا گیا جو بہت کامیاب ہوئیں۔ بعد میں ان سے سچویشن کے مطابق بھی گیت اور نغمے لکھوائے گئے مگر یہ ان دونوں حضرات کے لیے ناپسندیدہ کام تھا۔ بھئی شاعر تو اپنی مرضی سے اپنے موڈ میں لکھتا ہے مگر فلم کے لیے ایک مخصوص موقع محل کے لیے ایک مخصوص طرز کے مطابق

شاعری کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ موسیقاروں سے ان کی جھڑپیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ قدردان ہدایت کاروں کی بدولت ان کے ناز نخرے بھی برداشت کر لیے جاتے تھے ورنہ یہ لوگ کافی نازک مزاج تھے۔ وجوہات ظاہر ہیں۔

اسی ضمن میں ہم نے ناصر کاظمی صاحب کا واقعہ بھی بیان کیا تھا۔ ہدایت کار حسن طارق کو پہلی فلم ''نیند'' بنانے کا موقع ملا تو انہوں نے ایک انوکھی کہانی کا انتخاب کیا جو ریاض شاہد نے لکھی تھی۔ ہیروئین میڈم نور جہاں تھیں۔ ہیرو کے لیے اسلم پرویز لیے گئے جو دراصل پرلے درجے کے ولن تھے۔ یہ یکسر مختلف کہانی اور نرالے کردار تھے۔ جنہیں طارق صاحب نے علاؤالدین، اسلم پرویز، نور جہاں اور طالش جیسے فنکاروں کے ذریعے بہت خوب صورتی سے پیش کیا تھا۔

''نیند'' کے موسیقار رشید عطرے تھے۔ کافی ذہین تھے اور ادب و شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ بمبئی میں سعادت حسن منٹو، نجم نقوی، نخشب جارچوی جیسے لوگوں کی صحبت میں رہے۔ لاہور میں تنویر نقوی، ریاض شاہد، طالش، علاؤالدین جیسے باذوق لوگوں کا حلقہ احباب تھا۔ حسن طارق صاحب کی خواہش تھی کہ اس فلم کے نغمات ناصر کاظمی سے لکھوائے جائیں۔ ناصر کاظمی بڑی مشکل سے اس ''غیر شاعرانہ'' کام کے لئے رضامند ہوئے۔ انہیں اور عطرے صاحب کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔ ناصر کاظمی ایسے گئے کہ پلٹ کر دوبارہ فلمی دنیا کا رخ نہ کیا۔ طارق صاحب نے ان کے اچانک غائب ہونے کا شکوہ کیا تو پان کھاتے ہوئے بولے ''یار مجھے کہاں پھنسا دیا تھا۔ اپنے بس کا کام نہیں ہے۔''

حبیب جالب اور منیر نیازی کو یہ کریڈٹ دینا چاہئے کہ اپنی تمام تر نازک مزاجی کے باوجود انہوں نے فلموں کے لیے لکھا اور یہ حقیقت ہے کہ فلموں کی زیب و زینت میں اضافہ کر دیا۔

اس طویل تمہید کا مقصد ایک ایسے شخص سے متعارف کرانا ہے جو روزِ اول ہی سے منیر نیازی کا پرستار اور ان کی شاعرانہ عظمت کا قائل تھا۔ یہ موسیقار حسن لطیف للک تھے۔ حسن لطیف ان کا نام تھا مگر ساتھ میں ''للک'' کا

لاحقہ بھی لگا ہوا تھا۔ ہم نے کئی بار پوچھا کہ یہ 'للک'' کیا ہے مگر وہ ہنس کر ٹال گئے اور کم از کم ہم پر یہ راز فاش نہ ہو سکا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ انسان تھے۔ موسیقی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے اس کی باقاعدہ تعلیم بھی حاصل کی تھی اور ریڈیو سے وابستہ ہو گئے تھے مگر ان کا دل فلموں میں پڑا ہوا تھا۔ اس لیے فلمی نگار خانوں اور فلمی دوستوں میں ہی وقت گزارتے تھے۔ ریاض شاہد، تنویر نقوی، خلیل قیصر، علاؤالدین ان کے گہرے دوست تھے مگر نہ تو ان حضرات نے حسن لطیف کو کبھی موسیقار سمجھا اور نہ ہی حسن لطیف نے کبھی اشارے سے بھی یہ خواہش ظاہر کی کہ یار مجھ سے بھی تو فلم کی موسیقی بنواؤ۔

جب ہم سب اکٹھے ہوتے تو حسن لطیف ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے اور منیر نیازی کی غزلیں اپنی سریلی سوز بھری آواز میں طرز بنا کر سنایا کرتے تھے۔ ان کا خاص انداز یہ تھا کہ وہ گاتے ہوئے مستقل طور پر مسکراتے رہتے تھے۔ یہ بات ہم نے کسی اور موسیقار میں نہیں دیکھی۔

جس نے مرے دل کو درد دیا

اس شکل کو میں نے بھلایا نہیں

وہ شعر پڑھتے اور سر دھنتے۔ مسکرا مسکرا کر دوسروں سے بھی داد لیتے کہ دیکھو کیا کلام ہے۔

کیسے کیسے لوگ ہمارے دل کو جلانے آجاتے ہیں

اپنے اپنے غم کے فسانے ہمیں سنانے آجاتے ہیں

کیسے کیسے لوگ۔۔۔

یہ طرز بھی حسن لطیف ہی نے بنائی ہے جو شاعری سمیت دل میں اتر کر رہ جاتی ہے۔ حسن لطیف نے موسیقار کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز ۱۹۴۸ء میں کیا تھا جب انہوں نے ہدایت کار امین ملک کی فلم ''جدائی'' کے لیے

موسیقی بنائی تھی۔ یہ فلم ۱۹۵۰ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی ہے۔ بے حد غریبانہ حالات میں بنی تھی مگر اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی ان کے دو نغمات ہٹ ہوئے۔

دیکھ بدریا کالی (منور سلطانہ)

کوئی من پہ میرے چھائے رے (منور سلطانہ، علی بخش ظہور)

اس فلم کے دوسرے گیت بھی اچھے تھے مثلاً۔۔۔

کیسے گزرے کی زندگی غم میں

مگر نہ تو فلم چلی اور نہ اس کی موسیقی۔ ہر طرف بھارتی فلموں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس میں یہ بوندیں کہاں نظر آسکتی تھیں۔

حسن لطیف نے جن فلموں کی موسیقی بنائی ان کے بارے میں بعد میں سنائیں گے فی الحال فلم ''سسرال'' کے نغموں کا ذکر مناسب ہے۔ ریاض شاہد اس کے مصنف اور ہدایت کار تھے اور یہ فلم پرانے لاہور کے اصلی ماحول میں بنائی گئی تھی۔

ریاض شاہد نے اس کے لیے حسن لطیف کا انتخاب کیا اور انہوں نے موسیقاری کا حق ادا کر دیا۔ اس فلم کے سارے گانے ہٹ تھے۔ یہ ایک حقیقت کے قریب فلم تھی چمک دمک کم تھی مگر نازک اور اہم سوشل موضوع پیش کیا گیا تھا اس لیے قبول عام نہ حاصل کر سکی مگر حسن لطیف کے نغمے آج بھی گونج رہے ہیں۔

میڈم نور جہاں کا گایا ہوا یہ نغمہ جب ریکارڈ ہو رہا تھا اس وقت بھی ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور سامعین سانس روکے بیٹھے تھے۔ خود میڈم بھی آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

جا اپنی حسرتوں پہ

آنسو بہا کے سو جا

حسن لطیف نے اپنی پسندیدہ منیر نیازی کی غزل بھی خوب استعمال کی۔

جس نے مرے دل کو درد دیا

اس شکل کو میں نے بھلایا نہیں

مہدی حسن نے بھی اس نغمے میں سر، سوز و ساز، غم والم، حسرت و یاس سبھی کچھ بھر دیا تھا۔

اس فلم کے دوسرے گانے یہ تھے۔

۱۔ سو گئیں شہر کی گلیاں (آصف خاں)

۲۔ ادھر بھی دیکھیں ایک نظر تو کیا جائے گا آپ کا (احمد رشدی، آئرین پروین)

۳۔ کبھی مسکرا۔ کبھی جھوم جا۔ کبھی آہ بھر کے بھی دیکھ لے (احمد رشدی)

۴۔ آئے گا صنم جب۔ تب نہ جانے کیا ہو گا (نسیم بیگم)

اسی سال حسن لطیف کی دوسری فلم نے بھی دھوم مچا دی۔ یہ ہدایت کار اور اداکار دلجیت مرزا کی فلم ''برسات'' تھی۔

اس فلم کا ایک گیت دو مختلف مقامات کے لیے سلیم رضا اور میڈم نور جہاں کی آوازوں میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔

زندگی مجبور ہے لاچار ہے

سانس لینا بھی یہاں دشوار ہے

اس فلم کے دوسرے نغمات یہ تھے۔

ا۔ موہے بلم دیکھے۔اتراؤں لہراؤں (نور جہاں)

۲۔ یہی سوچ سوچ کر گم ہو جاتی ہوں (نور جہاں)

۳۔ نہ آنا نہ جانا۔ نظر کو چرانا (احمد رشدی)

یوں تو حسن لطیف نے اس سے پہلے بھی کئی فلموں کی اچھی موسیقی بنائی تھی مگر ۶۲ اور ۶۳ ان کے لیے بہت مبارک سال تھا۔

۱۹۶۳ء میں حسن طارق کی فلم ''شکوہ'' میں انہوں نے فلم کے موضوع اور ماحول کے اعتبار سے انتہائی پر اثر موسیقی ترتیب دی تھی۔

ا۔ آج محفل سجانے کو آئی (میڈم نور جہاں)

۲۔ اے دل غم زدہ ہر ستم بھول جا (سلیم رضا، ناہید نیازی)

۳۔ انکل ٹام اکیلا ہے (احمد رشدی)

۴۔ پھر دروازہ کھلا کوئی

۵۔ ہوا چلی ویرانوں میں (ناہید نیازی) یہ ایک یادگار فلم تھی اور اس کی موسیقی بھی اس کے شایان شان تھی۔

اس کے بعد حسب معمول ایک لمبا وقفہ آ گیا پھر ۱۹۶۵ء میں حسن لطیف نے فلم ''ساز و آواز'' کی موسیقی بنائی۔ اس

فلم کے گانے بھی بہت اچھے اور حسن لطیف کے مزاج کے مطابق تھے۔ مثلاً

ا۔ کیوں کہیں ستم یہ آسمان نے کیے (نور جہاں)

۲۔ میں نے پی لی، جرم کیا۔ برسات پہ بھی کچھ غور کرو (احمد رشدی)

۳۔ سنگیت نہ جانے۔ اور دکھلائے گا کب تک خواب سہانے (مہدی حسن)

۱۹۶۵ء میں فلم ''تیرے شہر میں'' کے لیے حسن لطیف نے بہت اچھی موسیقی ترتیب دی تھی۔ اس بار انہیں اپنی پسندیدہ منیر نیازی کی غزل استعمال کرنے کا موقع بھی مل گیا۔

ا۔ ان سے نین ملا کر دیکھو۔ یہ دھوکا بھی کھا کر دیکھو (نور جہاں)

۲۔ ہٹو ہم سے نہ بناؤ جھوٹی بتیاں (نور جہاں)

۳۔ میں پھرتا ہوں آوارہ۔ جیسے کوئی ٹوٹا تارہ (احمد رشدی)

۴۔ اللہ بخشے والدین کو۔ کیا خوب کہا کرتے تھے (احمد رشدی)

یہ دور حسن لطیف کے لیے بہت سازگار دور تھا۔ شوکت حسین رضوی کے بیٹے اکبر حسین رضوی نے فلم ''ماں بہو بیٹا'' کیلئے حسن لطیف کی خدمات حاصل کیں اور حسن لطیف نے موسیقی کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ ذرا دیکھئے۔

ا۔ لوگ دیکھیں نہ تماشا مری تنہائی کا (نور جہاں)

۲۔ جو کچھ ہو گا آج ہی ہو گا (مسعود رانا)

۳۔ نہ شاخ ہی رہی باقی نہ آشیانہ ہے (نور جہاں)

۴۔اب اور پریشاں نہ ہو مرے دل (مہدی حسن)

اس کے بعد پھر ایک وقفہ آیا(۱۹۶۸ء میں حسن لطیف کی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔

ہدایت کار ایم اسلم (یہ خلیل قیصر کے معاون رہے تھے) کی فلم ''میں زندہ ہوں ''ایک مختلف فلم تھی اس لیے کامیابی حاصل نہ کر سکی مگر حسن لطیف کی موسیقی اپنا کام کر گئی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس فلم میں حسن لطیف نے پہلی مرتبہ مزاحیہ اداکار رنگیلا کو پلے بیک سنگر کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔یہ ایک دوگانا تھا جو مالا اور رنگیلا کی آوازوں میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔اس کے بول یہ تھے۔

انکھیوں کی نندیا اڑ گئی۔

اس کے دوسرے نغمات یہ تھے۔

۱۔سو جا ری بھیا کی پیاری۔پل بھر کی یہ رات ہے (نور جہاں)

۲۔بولو کون خریدے گا۔اک مجبور کی آنکھ کا کاجل (نور جہاں)

۳۔دھیرے دھیرے بیتے دن۔صدیوں کی رات ہے (نور جہاں)

۶۹ میں ان کی فلم ''ڈاکٹر شیطان'' میں کوئی قابل ذکر بات نہ تھی۔۱۹۷۰ء میں ان کی پنجابی فلم ''دھرتی میرا پیار'' کی نمائش ہوئی مگر یہ فلم ناکام رہی۔ موسیقی بھی قابل ذکر نہ تھی۔انہیں پہلے ہی زیادہ کام نہیں ملتا تھا۔ان دونوں فلمون کی ناکامی نے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو ایک مناسب بہانہ فراہم کر دیا۔

ایک سچے فنکار کی طرح حسن لطیف للک کے دل میں ہمیشہ ایک آگ سی بھڑکتی رہتی تھی۔وہ موسیقی کے شعبے میں بہت کچھ کرنا چاہتے تھے مگر افسوس کہ انہیں موقع نہ ملا یہاں تک کہ ان کے بہترین دوستوں نے بھی ان کے من کی

اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کوئی تگ ودو نہیں کی۔ مانا کہ وہ دور پاکستان کی فلمی موسیقی کے لیے ایک سنہرا دور تھا۔ فلمی موسیقاروں میں بہت بہت بڑے نام موجود تھے اور تواتر کے ساتھ نئے موسیقار بھی اپنی کارکردگی کے بل پر اس فہرست میں جگہ بنا رہے تھے۔ ماسٹر غلام حیدر، فیروز نظامی، رشید عطرے، خواجہ خورشید انور جیسے نامور اور بلند پایہ موسیقار بمبئی کی فلمی دنیا سے اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ پھر یہاں پاکستان میں بھی ناشاد، ایم اشرف، روبن گھوش، بشیر، صفدر، ماسٹر عبداللہ پھر اسکے بعد دور میں نثار بزمی، سہیل رعنا، سلیم اقبال اور ایسے ہی ہنر مند اور اپنے فن پر عبور رکھنے والے بہت سے موسیقار پاکستان کی فلموں کو اپنی موسیقی کے سروں سے سجا رہے تھے۔

حسن لطیف کو ایک بہت مشکل عہد ملا تھا مگر انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے ثابت کر دیا تھا کہ عرصہ دراز تک محرومی کا دکھ سہنے اور اندر ہی اندر جلنے کڑھنے کی وجہ سے اپنے فن کے زنگ آلود ہو جانے کے باوجود وہ کبھی اپنی صلاحیتوں اور تخلیقی تمناؤں سے ناآشنا نہیں ہوئے تھے۔ مسلسل نظر اندازی حساس فنکاروں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ان کے دلوں کو مجروح اور ذہنوں کو بانجھ کر دیتی ہے۔ یہ حسن لطیف کا دل گردہ تھا کہ وہ ان سب صعوبتوں کو برداشت کرنے کے بعد جب بھی انہیں موقع ملا بہت اچھی موسیقی تخلیق کرتے رہے مگر جیسے جیسے انکی جوانی کے دن گزرتے گئے ان کے حوالے پست ہوتے چلے گئے۔ وہ شخص جو ۱۹۴۸ء سے موسیقی کا ایک سرمایہ اپنے ذہن میں سمیٹے بیٹھا تھا ۔۱۹۷۰ء تک کے طویل عرصے میں جوانی کے ولولوں سے اتنا زیادہ بہرہ مند نہ رہا تھا۔ تیس پینتیس سال کا عرصہ ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ ان سالوں میں حسن لطیف کو شاید تیس فلموں کی موسیقی بنانے کا موقع بھی نہیں ملا۔ حوصلہ افزائی اور مسلسل ریاض موسیقی کی غذا ہوتی ہے۔ جب موسیقار اس غذا سے محروم ہو جائے تو فاقہ کشی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ حسن لطیف کے ساتھ بھی پیش آیا۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو موسیقار ۱۹۶۸ء میں کامیاب تھا اور اس نے

ا۔ لوگ دیکھیں نہ تماشا میری تنہائی کا۔

۲۔نہ شاخ ہی رہی باقی نہ آشیانہ ہے۔

۳۔اب اور پریشاں نہ ہو مرے دل (فلم ماں بہو بیٹا) اور فلم کرشمہ کے لیے ایسی دھنیں اور نغمات بناتا رہا۔

۱۔اک مدت سے دل دیوانہ۔خوشیوں کا زمانہ بھول گیا۔

۲۔نہ دیکھئے ادھر ادھر کہ آیئے قریب۔

۳۔آجا آجا زندگی کو ہار دے۔

جیسی خوب صورت اور زندگی سے بھرپور دھنیں بناتا رہا تھا اور فلم ''میں زندہ ہوں'' کے لیے ایسے نغمات ترتیب دے چکا تھا۔

۱۔دھیرے دھیرے بیتے دن صدیوں کی رات ہے (مجیب عالم)

۲۔بولو کون خریدے گا اک مجبور کی آنکھ کا کاجل (نور جہاں)

۳۔ہری ہری رات آئی رے ساون کی (نور جہاں)

اور جو ۱۹۶۹ء میں ''ڈاکٹر شیطان'' جیسی موسیقی کی سچویشنز سے عاری فلم کے لیے بھی ایسے نغمات بنا چکا تھا۔

۱۔نور ہی نور ہے تری ان آنکھوں میں (منیر حسین)

۲۔گاتا جائے بنجارہ گلی گلی نگر نگر (احمد رشدی)

اگلے ہی سال فراموش کر دیا گیا۔

اس کے بعد انہوں نے ایک پنجابی فلم ''بلونت کور'' کی موسیقی مرتب کی لیکن ایم سلیم کی یہ فلم بھی ناکام ہوگئی۔ فلمی صنعت والوں نے حسب دستور انہیں فراموش کر دیا تھا۔ حسن لطیف للک کا بھی فلمی صنعت سے دل بھر چکا تھا۔ اس لیے دل برداشتہ ہو کر انہوں نے پھر ریڈیو پاکستان کا رخ کیا۔ ریڈیو کے لیے انہوں نے گیت اور ملی نغمے مرتب کیے مگر وہ ماحول ان کی پسند کا نہ تھا۔ صرف شوق پورا کرنے کی حد تک یہ مصروفیات ان کے لیے غنیمت تھیں۔ خدا جانے مسلسل محرمیوں کا غم یا کہ مسلسل فلمی صنعت کی بے حسی اور بے رخی کس چیز نے انہیں بالکل ہی مایوس کر دیا کہ اچانک ۹ نومبر ۱۹۸۰ء کو وہ ہارٹ فیل کی وجہ سے کراچی میں انتقال کر گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی۔ ان کی وفات کے آٹھ سال بعد خادم محی الدین کی فلم ''بانو'' کی نمائش ہوئی۔ یہ فلم بہت تاخیر سے ریلیز ہوئی تھی پھر بھی اس کی موسیقی اچھی خاصی تھی۔

حسن لطیف نے ایک طویل عرصہ فلمی دنیا سے وابستگی یا اس ماحول میں گزارا تھا۔ '' جدائی'' ان کی پہلی فلم تھی جو ۱۹۴۸ء میں شروع ہوئی مگر ۱۹۵۰ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ امین ملک کی اس فلم کے دو گانے سپر ہٹ تھے۔ دراصل یہ فلم فلاپ ہوگئی تھی اس لیے اس کے گانے بھی مقبول نہ ہو سکے۔ کچھ ریڈیو پاکستان کی مہربانی بھی ہمیشہ فلم والوں کے شامل حال رہی جو اچھے ''پاکستانی'' فلمی نغمے پیش کرنا ایک گناہ عظیم سمجھتے تھے۔ ریڈیو کا یہ سوتیلے پن کا رویہ ہمیشہ برقرار رہا۔

ان کی دوسری فلم ''پنجرہ'' تھی۔ امین ملک کی یہ فلم بھی کامیاب نہ ہوئی مگر اس کے نغمات نے مقبولیت حاصل کی تھی۔ تنویر نقوی اور مظفر طاہر نے نغمات لکھے تھے۔ شاید یہ گانے آپ نے بھی سنے ہوں۔

۱۔ اب نہ چھوٹے ساتھ۔ تمہارے ہاتھ مالک لاج ہماری (ملکہ پکھراج)

۲۔ کاہے کو من باورے۔ امیدوں کے دیپ جلائے (اقبال بیگم)

۳۔ اجڑ گئی ہے پریت۔ خوشی کے گیت میرا من کیا گائے۔

ہدایت کار امین ملک ہی کی ایک فلم ""غیرت"" کے لیے حسن لطیف نے بہت اچھی موسیقی بنائی تھی۔

ا۔دل پہ جلنے کا نشان باقی ہے (ایس ایم باتش)

۲۔آ۔۔۔جی بھر کے کر لے پیار (زینت بیگم)

۳۔دیکھ میل جول کا میلہ۔ملا کیا ساتھی البیلا۔(سلمیٰ بیگم)

وہ فلمی صنعت کا ابتدائی اور بہت ""غربت وافلاس"" کا زمانہ تھا۔فلمیں بنتی ہی نہیں تھیں اور جو برائے نام بنائی بھی جاتی تھیں تو محدود وسائل اور سہولتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے بھارتی فلموں کے کھلے مقابلے میں گم ہو کر رہ جاتی تھیں۔

حسن لطیف کی ابتدائی فلمیں ماسٹر غلام حیدر،ماسٹر عنایت حسین،رشید عطرے،کواجہ خورشید انور جیسے عظیم موسیقاروں کے دور میں بنی تھیں اور انہوں نے اپنی کارکردگی کے باعث موسیقاروں کی صف میں اپنا مقام پیدا کر لیا تھا جو کہ بجائے خود کسی کارنامے سے کم نہیں ہے۔

خادم محی الدین کی فلم ""آواز"" میں حسن لطیف کے چند گانے بہت پسند کیے گئے تھے۔

ا۔ساری دنیا دشمن ہے (منور سلطانہ)

۲۔دل کی بات زباں پر میری آئے (منور سلطانہ)

۳۔جب دل سے دل مل جائے (منور سلطانہ)

اس کے بعد ان کی فلم "دیوار" آئی مگر یہ فلم مقبول ہو سکی نہ اس کے گانے لیکن اسی سال خادم محی الدین کی سسپنس فلم ""مجرم"" میں حسن لطیف للک نے اپنی موسیقی سے سب کو متوجہ کر لیا مثلاً۔۔۔

۱۔اے چاند آسماں کے۔مرے چاند سے کہنا(کوثر پروین)

۲۔آج کوئی آئے گا۔پیار مرا شرمائے گا(کوثر پروین)

۳۔اداس راتوں میں تیری یادیں(فضل حسین)

خادم محی الدین کی فلم ’’خزاں کے بعد‘‘ میں حسن لطیف کی موسیقی پسند کی گئی۔

۱۔کس نے مسکرا کے بدل دیا میرا افسانہ(زبیدہ خانم)

۲۔پیار بھری محفل کا ہر ایک ترانہ ترا(زبیدہ خانم)

۳۔گری بجلی جلا پھر آشیانہ اب کدھر جائیں(زبیدہ خانم)

۴۔دل نہ لگانا کبھی دل نہ لگانا(زبیدہ خانم)

کراچی کی فلم ’’انوکھی‘‘ کے لیے ہیروئن شیلا رامانی اور موسیقار تمر برن کو بھارت سے بلایا گیا تھا۔یہی لہری کی پہلی فلم بھی تھی۔تمر برن فلم کے سات گانے بنا کر واپس چلے گئے تو باقی ماندہ دو گانے حسن لطیف نے بنائے تھے۔یہ گانے بھی سنیے۔

۱۔یہ فضا یہ رت سہانی

۲۔یہ سماں یہ چاند تارے(نذیر بیگم)

۳۔ترے ہونٹوں نے کہہ دیا(زبیدہ خانم)

فلم ’’ دیار حبیب‘‘ کے موسیقار بھی حسن لطیف ہی تھے۔اس فلم کے لیے حسن لطیف نے ایک نعت تخلیق کی تھی جو غیر فانی حیثیت اختیار کر گئی۔

شاہ مدینہ۔شاہ مدینہ۔یثرب کے والی۔سارے نبی تیرے در کے سوالی(یہ نعت سلیم رضا نے کورس میں گائی)

اس فلم کے چند اور گانے بھی مبقول ہوئے تھے۔

۱۔یارب ترے بندے جائیں کہاں(زبیدہ خانم)

۲۔پلکیں تو اٹھا نظریں تو ملا(فضل حسین،زبیدہ)

۳۔دل کسی کو دیجئے۔دل کسی کا لیجئے(زبیدہ خانم)

خادم محی الدین کی فلم ’’تنہا‘‘ کامیاب نہیں تھی مگر اس کا ایک تنہا گانا آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔

تم سے یہ تمنا نہ تھی دل کو ٹھیس لگانے والے(سلیم رضا)

۱۹۵۹ء میں انہوں نے پہلی پنجابی فلم ’’لکن میٹی‘‘ کی موسیقی بنائی لیکن اس کے گانے مقبول نہ ہوئے مگر فلم ’’شمع‘‘ کی موسیقی پسند کی گئی۔

۱۔ہائے ہائے یہ زمانہ۔کہے دیوانہ جسے چاہے

۲۔عجب یہ جہاں ہے۔لہو سے پیار بھری داستاں

۳۔اے نازنیں تجھ سا حسین۔ہم نے کہیں دیکھا نہیں

حسن لطیف نے ولی صاحب کی پنجابی فلم ’’سوہنی کمہارن‘‘ کی موسیقی بھی بنائی تھی مگر ان کی چند پنجابی فلموں میں

سے کوئی ایک بھی موسیقی کے اعتبار سے کامیاب نہ کہلائی۔ان کی چند مزید فلموں کے نام یہ ہیں۔

نذیر اجمیری کی "عزت"،امین ملک کی فلم "سنہرے سپنے"۔

یہ بھی ایک المیہ ہے کہ "عزت" کے فلاپ ہونے کی وجہ سے حسن لطیف کے یہ خوب صورت نغمے بھی نظر انداز کر دیئے گئے۔

ا۔ جھولا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے جھلایا

۲۔ سزا دی ہے نصیبوں نے

۳۔ بولیے نہ بولیے ہم تمہارے ہو لئے

قابل ذکر بات یہ ہے کہ حسن لطیف کو ناکامیوں، محرومیوں، مایوسیوں اور اپنوں کی بے وفائیوں نے کبھی بددل اور اداس نہیں کیا۔وہ جب بھی ملے ہنستے ہوئے ہی ملے۔زندگی سے انہیں دلچسپی تھی۔ہر اچھی اور خوب صورت چیز انہیں اچھی لگتی تھی۔اچھے دوستوں کی صحبت ان کے لیے ٹانک کی حیثیت رکھتی تھی۔ان کے ساتھ ہم نے تنویر نقوی، علاؤالدین اور لقمان صاحب کے گھروں میں بہت وقت گزارا۔ ان کے سامنے دوسرے موسیقار فلموں پر فلمیں بنا رہے تھے اور کامیابیاں سمیٹ رہے تھے۔حسن لطیف ہمیشہ ان کی تعریف کرتے ہوئے ہی نظر آئے۔کسی کی غیبت، برائی ان کے مزاج میں نہ تھی۔دل کھول کر دوسروں کے کاموں کی تعریف کرتے تھے۔طنز یا حسد کا کوئی شائبہ تک ان کی گفتگو میں نہیں ہوتا تھا۔

حسن لطیف خوش پوش اور خوش ذوق انسان تھے اور دوسروں کی خوش لباسی اور خوش ذوقی کی داد دینے میں بھی بخل سے کام نہ لیتے تھے۔

"واہ آفاقی صاحب۔۔۔کیا خوب صورت میچنگ ہے۔فان کلر کا سوٹ، گہری میرون رنگ کی ٹائی۔آپ ایسے خوب

صورت کپڑے کہاں سے لے آتے ہیں؟""

"لنڈے بازار سے" تنویر صاحب کہتے۔

"ہے تو درست مگر آفاقی صاحب کا ذوق بہت اچھا ہے۔"

وہ ہمیشہ صاف ستھرے خوش لباس نظر آئے۔ عموماً سوٹ، کوٹ پتلون اور قمیص پتلون پہنتے تھے۔ شلوار قمیص میں ہم نے کم ہی انہیں دیکھا۔ کسی کی بھی فلم ہٹ ہوتی تھی تو وہ خوش ہوتے تھے۔ اچھے گانوں کی دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ ان کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی تھی مگر آنکھوں اور چہرے پر ایک دکھ بھرا غم بھی سایہ فگن نظر آتا تھا۔ ان کی آواز بہت خوب صورت، سریلی اور بھرپور تھی۔

اسمیں ایک قدرتی سوز اور کرب تھا۔ ان کی دوسری باتیں ایک طرف مگر یہی ایک خوبی کیا کم ہے کہ انہوں نے منیر نیازی کو اس وقت دریافت کر لیا تھا جب بہت سے لوگ ان کے شاعرانہ وجود سے ہی منکر تھے۔ یہ غلط نہیں ہے کہ منیر نیازی کو فلمی دنیا سے متعارف کرانے اور پھر اس ذریعے سے ایک مقبول شاعر تسلیم کرانے کا سہرا حسن لطیف ہی کے سر ہے۔ انہوں نے منیر نیازی کی جو غزلیں اور نغمے ترتیب دیئے ہیں وہ کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ یہ ان کے

ادبی ذوق اور موسیقی کے رموز و اسرار سے مکمل واقفیت کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔

بعض لوگوں کو قدرت ان کی صلاحیتوں کے مطابق شہرت، عزت اور دولت نہیں عطا کرتی جبکہ اس کے برعکس بعض اوسط درجے کی صلاحیتوں کے حامل افراد بے پناہ مقبولیت، شہرت اور دولت سے نواز دیئے جاتے ہیں۔ اسے آپ قضا و قدر کے فلسفے کے سوا اور کس زمرے میں رکھیں گے۔ سچ ہے۔ وہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت۔ ہم خاکی انسان اس مسئلے پر مداخلت نہیں کر سکتے۔

پاکستان کے فلمی موسیقاروں میں فیروز نظامی کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ فیروز نظامی صاحب کے بارے میں

اس سے پہلے بیان کیا جاچکا ہے لیکن ان کے بہت سے مداحوں اور پرستاروں کو شکایت ہے کہ ان کے بارے میں اتنی تفصیل سے نہیں بیان کیا گیا جس کے وہ حق دار تھے۔امریکا سے ایک صاحب نے ٹیلی فون کے ذریعے شکوہ کرتے ہوئے فرمائش کی کہ فیروز نظامی صاحب کے بارے میں تفصیل بیان کی جائے۔

فیروز نظامی صاحب ۱۹۱۰ء میں لاہور پیدا ہوئے تھے اور ۱۵ نومبر ۱۹۷۵ء کو لاہور ہی میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اس طرح انہوں نے ۶۵ سال کی عمر پائی۔

فیروز نظامی کا تعلق موسیقی سے تعلق رکھنے والے ایک گھرانے سے تھا۔انہوں نے موسیقی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسکول اور کالج کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔اسلامیہ کالج لاہور سے بی،اے کرنے کے بعد وہ ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہوگئے۔یہ وہ زمانہ تھا جب خواجہ خورشید انور جیسے لوگ بھی ریڈیو سے وابستہ تھے۔موسیقی میں انہوں نے استاد (عبدالوحید خاں) تعلیم اور تربیت حاصل کی تھی۔لاہور سے ان کا تبادلہ دہلی ہوگیا جہاں سے انہوں نے ریڈیو کی ملازمت ترک کرکے فلمی دنیا میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔

وہ ۱۹۴۲ء میں بمبئی گئے تھے۔قسمت نے یاوری کی اور انہیں واڈیا مووی ٹون کی فلم ''وشواس'' کی موسیقی

مرتب کرنے کے لیے منتخب کرلیا گیا۔یہ فلم ۱۹۴۳ء میں ریلیز ہوئی تھی۔اس فلم میں فیروز نظامی کی موسیقی کو پسند کیا گیا اس وقت تک وہ ریڈیو کی ملازمت بھی کررہے تھے لیکن ''وشواس'' کی کامیابی کے بعد انہوں نے ریڈیو کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مکمل طور پر خود کو فلمی موسیقی کے لیے وقف کردیا۔

''وشواس'' کی کامیابی کے بعد انہیں تین فلموں کی موسیقی بنانے کا موقع ملا جن میں امنگ،اس پار اور بڑی بات شامل ہیں۔ان تینوں فلموں کی موسیقی اوسط درجے کی تھی۔واڈیا مووی ٹون کی دومزید فلموں پیا ملن اور شربتی آنکھیں میں بھی اگلے سال انہوں نے موسیقی مرتب کی۔پیا ملن کے ہدایت کار ایس ایم یوسف تھے۔انہوں نے ایس ایم یوسف کی ایک اور مشہور فلم ''نیک پروین'' کی موسیقی ترتیب دی تھی۔یہ فلم ایک معاشرتی اور اصلاحی فلم

تھی جو یوسف صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں بنائی تھی۔اس فلم کی ہیروئن راگنی تھیں۔یہ ایک کامیاب فلم تھی اور۱۹۴۶ءمیں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔

اس زمانے میں بمبئی میں بڑے بڑے نامور موسیقاروں کا شہرہ اور اجارہ داری تھی اس لیے کسی نووارد کو جگہ بنانے کے لیے بہت زیادہ تگ ودو کرنے کی ضرورت تھی۔فیروز نظامی ایک سادہ دل، سادہ لوح، کم آمیز اور اپنے کام سے کام رکھنے والے درویش صفت انسان تھے۔فلمی حلقوں میں زیادہ گھومنے کی انہیں عادت نہیں تھی۔

۱۹۴۷ء برصغیر کے لیے ایک ہنگامی اور تاریخی سال تھا۔ اس سال فیروز نظامی نے ایس ایم یوسف کی فلم ''پتی سیوا'' اور ہدایت کار انجم کی فلم ''رنگین کہانی'' کی موسیقی مرتب کی۔ان دونوں فلموں کو قابل ذکر کامیابی نہ مل سکی۔ ایس،ایم یوسف کی فلم ''پتی سیوا'' نیک پروین قسم ہی کی کہانی تھی جس کو ہندو ماحول میں فلمایا گیا تھا۔

فیروز نظامی کو اس وقت تک کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن اسی سال سید شوکت حسین رضوی کی فلم ''جگنو'' نے سارے ملک میں تہلکہ مچادیا تھا۔''جگنو'' میں دلیپ کمار اور نور جہاں مرکزی کردار ادا کئے تھے۔ کہانی اور ہدایت کاری سے قطع نظر اس فلم کی کامیابی میں فیروز نظامی کی موسیقی کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔''جگنو'' کے گانے گھر گھر گلی گلی گونجنے لگے اور آج بھی کلاسیکی فلمی موسیقی میں اس کا شمار ہوتا ہے۔محمد رفیع کی آواز کو اس فلم میں پہلی بار نہایت خوبی سے استعمال کیا گیا تھا۔محمد رفیع فیروز نظامی کے شاگرد بھی تھے۔''جگنو'' نے بھارتی فلمی صنعت میں ایک نئی روایت کو جنم دیا تھا۔''جگنو'' دلیپ کمار کی پہلی سپر ہٹ فلم تھی جس کے بعد انہوں نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا اور ہندوستان کے عظیم ترین اداکار کہلائے۔اس فلم میں پہلی بار شوکت صاحب نے موسیقی میں نئے تجربات کیے تھے۔اس کے چند گانے ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے (محمد رفیع، نور جہاں)

۲۔ ہمیں تو شام غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی۔ جہاں وہ ہوں وہیں اے چاند لے جا روشنی اپنی (نور جہاں)

۳۔ آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ (نور جہاں)

"جگنو" صحیح معنوں میں فیروز نظامی کی پہلی سپر ہٹ فلم تھی جس نے فیروز نظامی کو ایک ہی جست میں بمبئی کے چوٹی کے موسیقاروں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

اس فلم سے محمد رفیع اور دلیپ کمار کے ساتھ ساتھ فیروز نظامی کی شہرت کا بھی آغاز ہوا تھا۔

"جگنو" کی ریلیز کے بعد بمبئی میں ہر فلم ساز کی زبان پر فیروز نظامی کا نام تھا۔ اگر وہ بمبئی میں قیام کرتے تو یقیناً انہیں نامور فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی فلمیں مل جاتیں مگر قیام پاکستان کے بعد انہوں نے اپنی سرزمین میں رہنے کا فیصلہ کیا اور عروج اور دولت، شہرت ہر چیز کو چھوڑ کر پاکستان چلے آئے۔

دیکھا جائے تو بمبئی میں فیروز نظامی کا واحد کارنامہ "جگنو" کی موسیقی تھی۔ انہوں نے زیادہ کام پاکستان میں کیا مگر اسے بھی زیادہ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ان کی فلموں کی تعداد کبھی زیادہ نہیں رہی۔

پاکستان آکر انہوں نے فلمی مرکز لاہور میں قیام کیا جو کہ ان کا آبائی شہر بھی تھا۔ وہ کافی عرصے بعد اپنے وطن کی سر زمین پر واپس آئے تھے اور بہت خوش اور پر امید تھے۔

پاکستان میں اس وقت فلم سازی برائے نام ہی تھی۔ ہر طرح کی مشکلات کا سامنا تھا۔ یہاں ان کی پہلی فلم "ہماری بستی" تھی جس کے ہدایت کار مشکور قادری تھے۔ اس فلم میں اس زمانے کے رواج کے مطابق آٹھ گانے تھے۔ بد قسمتی سے "ہماری بستی" فلاپ ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی فیروز نظامی کے گانے بھی سامنے نہ آسکے حالانکہ اس فلم کی انہوں نے اچھی موسیقی بنائی تھی۔ چند نغمات ملاحظہ کیجئے۔

ا۔ محبت کرنے والوں پر کبھی تو ظلم کم ہوتے۔ نہ کرتے ہم محبت اور نہ ہم پر ستم ہوتے

۲۔ہم کسی کے ہو گئے کوئی ہمارا ہو گیا۔پیار کی دنیا میں جینے کا سہارا ہو گیا

۳۔چھپ گیا دن رات کالی آگئی

۴۔اک شہری بابو آیا۔سپنوں میں آن سمایا۔

یہ فلم ۱۹۵۰ء میں ریلیز ہوئی تھی۔اس وقت تک سید شوکت حسین رضوی بھی اپنے خاندان کے ساتھ لاہور آ گئے تھے۔یہاں انہوں نے شاہ نور اسٹوڈیو بنایا اور فلم سازی کا آغاز کر دیا۔

ان کی پہلی فلم پنجابی زبان میں تھی۔''چن وے'' میں ہدایت کار کی حیثیت سے میڈم نور جہاں کا نام دیا گیا تھا لیکن حقیقت میں اس کے ہدایت کار شوکت حسین رضوی ہی تھے۔پنجابی زبان پر مکمل عبور نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے اس فلم پر بطور ہدایت کار اپنا نام دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''چن وے'' کے لیے انہوں نے فیروز نظامی کو موسیقار کی حیثیت سے منتخب کیا۔''چن وے'' کی نمائش پر پاکستان بھر میں بہت زیادہ جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ پاکستان کی پہلی فلم تھی جو کسی نامور سکہ بند ہدایت کار اور فلم ساز نے بنائی تھی۔نور جہاں، شوکت حسین رضوی اور فیروز نظامی جیسے نام اس فلم سے وابستہ تھے۔جب یہ فلم نمائش کے لیے پیش کی گئی تو سینما گھر کے سامنے ٹریفک تھم گئی۔لاہور کے زندہ دل ''چن وے'' کو دیکھنے کے لیے سینما گھروں پر ٹوٹ پڑے۔

''چن وے'' میں فیروز نظامی کی موسیقی یادگار تھی۔اس کے کئی نغمے عوامی لوک گیتوں کی طرح مشہور اور مقبول ہو گئے۔

۱۔منڈیا سیالکوٹیا۔تیرے مکھڑے پہ کالا کالا تل وے۔میرا کڈھ کے لیے گیا دل وے(نور جہاں)

۲۔چنگا بنایا ای سانوں کھڈونا۔آپے بناؤں نا تے آپ ای مٹاؤناں(نور جہاں)

۳۔ چن دیا ٹوٹیا دلاں دیا کھوٹیا

۴۔ بچے جا منڈے موڑ توں۔ میں صدقے تیری ٹور توں (نور جہاں)

۵۔ جادو کوئی چلا گیا

۶۔ وے بھل نہ جاویں نیناں نال نیناں جوڑ کے

۷۔ باغ خوشی کے مہکے مہکے

یہ فلم ۱۹۵۱ء میں نمائش کے لیے لیے پیش کی گئی تھی اور اس کے معیار اور کامیابی کی وجہ سے پاکستان کی فلم صنعت میں نئے سرے سے خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ اس فلم کی کامیابی میں فیروز نظامی کی موسیقی نے نمایاں کردار ادا کیا تھا اور ایک بار پھر فیروز نظامی فلمی موسیقاروں کی صفوں میں سر فہرست آ گئے۔ اگلے سال یعنی ۱۹۵۲ء میں سبطین فضلی صاحب کی اردو فلم ''دوپٹہ'' نمائش کے لیے پیش کی گئی۔

''دوپٹہ'' ہر اعتبار سے ایک بلند پایہ معیاری فلم تھی۔ اس فلم میں نور جہاں اور اجے کمار نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ سدھیر سائیڈ ہیرو کے کردار میں تھے۔ اپنی وجاہت اور اداکاری کے معیار کی وجہ سے فلم بینوں کے دلوں میں سما گئے اور بعد میں سپر اسٹار کی حیثیت سے عرصہ دراز تک فلمی صنعت پر حکمرانی کرتے رہے۔ اس زمانے میں فلموں میں گانوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی۔ آٹھ نو گانے معمول میں داخل تھے۔

''دوپٹہ'' میں بھی نو گانے تھے اور قریب قریب سبھی ہٹ تھے۔ فیروز نظامی کی موسیقی اس فلم میں پورے عروج پر نظر آتی تھی۔ دراصل تجربے نے یہ بتایا کہ ایک اچھے اسکرپٹ اور اچھے ہدایت کار کے بغیر فیروز نظامی اپنے فن کے جوہر نہیں دکھا سکتے تھے۔ وہ بذات خود ایک تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ اردو، پنجابی اور انگریزی تینوں زبانوں پر انہیں عبور حاصل تھا۔ فلمی موسیقی سے دل برداشتہ ہونے کے بعد انہوں نے مضمون نگاری اور کالم

نویسی شروع کر دی تھی اور پاکستان ٹائمز جیسے معیاری اخبارات میں لکھا کرتے تھے۔

فلم ”دوپٹہ“ ایک ایسی فلم تھی جس نے پاکستان کی فلمی صنعت میں ایک نئی شمع جلائی تھی۔ ہر اعتبار سے یہ ایک معیاری فلم تھی۔ یہ وہ فلم تھی جس نے بھارتی فلم سازوں کو چونکا دیا تھا بلکہ فکر مند کر دیا تھا۔ انہیں پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ پاکستان کی جس فلمی صنعت کو وہ بے حد پس ماندہ اور کم تر سمجھ رہے تھے اس میں ایک انقلاب رونما ہو رہا ہے۔ ”دوپٹہ“ نے بھارتی فلم صنعت اور فلم بینوں کو نہ صرف پریشان کر دیا تھا بلکہ وہ مشتعل ہو کر ان سنیما گھروں کو نذر آتش بھی کرنے لگے تھے جہاں ”دوپٹہ“ نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ کاش پاکستان کی فلمی صنعت وہ معیار برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتی جو ”چن وے“ اور ”دوپٹہ“ نے قائم کیا تھا۔ ”دوپٹہ“ کے چند سپر ہٹ گانے یہ تھے۔

ا۔ چاندنی راتیں ہو چاندنی راتیں

سب جگ سوئے ہم جاگیں

تاروں سے کریں باتیں

چاندنی راتیں (نور جہاں)

۲۔ تم زندگی کو غم کا فسانہ بنا گئے

آنکھوں میں انتظار کی دنیا بسا گئے (نور جہاں)

۳۔ مورے من کے راجا آ جا صورتیا دکھا جا

۴۔ بات ہی بات میں

پہلی ملاقات میں

جیاموراکھو گیا

ہائے کسی کا ہو گیا(نور جہاں)

۵۔میں بن پتنگ اڑ جاؤں

ہوا کے سنگ لہراؤں

"دوپٹہ "میں فیروز نظامی کی موسیقی اور میڈم نور جہاں کی آواز نے مل کر اس فلم کی موسیقی کو لازوال بنادیا تھا۔ افسوس کہ فیروز نظامی کو اس کے بعد ایسی ٹیم اور ایسا موقع نہ مل سکا اور نہ ہی نور جہاں کی آواز انہیں اس فراوانی سے میسر آئی ورنہ ان کی اور پاکستانی فلمی موسیقی کی کہانی مختلف ہوتی۔

"دوپٹہ "پاکستانی فلم صنعت کے سمندر میں ایک بوند کی حیثیت رکھتی تھی۔ سبطین فضلی نے کم وسائل اور

جدید سہولتوں کی عدم فراہمی کے باوجود "دوپٹہ" جیسی فلم بنا کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ایک اچھی اور معیاری فلم بنانے کے لیے سرمائے سے زیادہ ذہانت اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ دوسرے لوگوں میں نہیں تھی۔

۱۹۵۵ء تک فیروز نظامی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔اس سال ان کی فلم "سوہنی "نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ ہدایت کار افضل جہانگیر کی فلم "شرارے" اور ہمایوں مرزا کی فلم "انتخاب" بھی اسی سال ریلیز ہوئی تھیں۔ "انتخاب "ہمایوں مرزا صاحب کی پہلی فلم تھی جو کراچی میں بنائی گئی تھی۔اس فلم میں انہوں نے نیر سلطانہ کو متعارف کرایا تھا۔ان فلموں نے زیادہ بزنس نہیں کیا۔فیروز نظامی کی موسیقی بھی اوسط درجے کی تھی۔

۱۹۵۶ء فیروز نظامی کے لیے ایک بہتر سال تھا۔اس سال ہدایت کار و مصنف نذیر اجمیری کی فلم "قسمت" نمائش

کے لیے پیش کی گئی اور بہت کامیاب ثابت ہوئی۔

"قسمت" میں سنتوش کمار اور مسرت نذیر نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ اسماعیل صاحب نے بھی ایک ناقابل فراموش بھول بھلکڑ کا کردار بہت خوب صورتی سے نبھایا تھا اس فلم کے چند گانے ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ پیار بھرا دل توڑنے والے

پیار کا دستور (کوثر پروین، افضل حسین)

۲۔ واری میں جاؤں

صدقے میں جاؤں گڑیا رانی (زبیدہ خانم)

۳۔ ہوں میری قسمت میں آشیانے

تیرا شکریہ اے بدلتے زمانے (روشن آرا بیگم)

۴۔ نگاہ یار ہی سمجھے نگاہ یار کی باتیں (ملکہ پکھراج اور عطا محمد قوال)

۵۔ تڑپ رہا ہے پیار

گئی میں ہار (زبیدہ خانم)

۶۔ کسی سے جب نصیب کے ستارے روٹھ جاتے ہیں (سلیم رضا)

۷۔ سو جا میرے چاندا ابھی سو جا (کوثر پروین)

"قسمت" ایک معاشرتی کہانی تھی جس میں میاں بیوی کے ناروا جھگڑوں کا عبرت ناک انجام خواب کے عالم میں دکھایا

گیا تھا یہ فلم ''طلاق'' کے نام سے بمبئی میں بھی بنائی گئی اور بے حد کامیاب رہی۔

''قسمت'' کے بعد فلمی دنیا نے ایک بار پھر فیروز نظامی کو فراموش کر دیا۔

۱۹۵۹ء میں فیروز نظامی نے دو فلموں کی موسیقی مرتب کی جن میں سے ایک انور کمال پاشا کے شاگرد آغا حسینی کی فلم ''سولہ آنے'' تھی اور دوسری ہدایت کار مسعود کی فلم ''راز''۔

''سولہ آنے'' میں اعجاز، نیلو اور مسرت نذیر اہم کردار تھے۔اس فلم کی موسیقی دلکش تھی خصوصاً دو گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔

۱۔روتے ہیں چھم چھم نین

اجڑ گیا چین

دیکھ لیا تیرا پیار

۲۔ہو گیا دل متوالا سجناں

ان کے علاوہ اس فلم کے یہ گانے بھی پسند کئے گئے تے۔

۱۔میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے (عنایت حسین بھٹی)

۲۔مجھے ہو گیا ہے تم سے پیار (احمد رشدی، ناہید نیازی)

راز ایک سسپنس اور جاسوسی فلم تھی جس کے ہدایت کار ہمایوں مرزا تھے۔یہ فلم انہوں نے لاہور میں بنائی تھی جس کے بعد وہ مستقلاً لاہور ہی میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔اس فلم میں اعجاز، شمیم آرا، مسرت نذیر اور علاؤالدین اہم کردار تھے۔

یہ ایک کامیاب فلم تھی۔اس کے یہ گانے مقبول ہوئے تھے۔

ا۔قصہ غم سنائے جا

اے زندگی رلائے جا(مبارک بیگم)

۲۔مان مان زمانہ ہے جوان (مبارک بیگم)

۳۔ میٹھی میٹھی بتیوں سے جیا نہ جلا

جارے بلم تجھے دیکھ لیا(زبیدہ خانم)

۴۔چل نہ سکے گی فورٹونٹی(۴۲۰) احمد رشدی

۵۔چھلک رہی ہیں مستیاں

خوشی میں جھوم اٹھا جہاں(احمد رشدی،زبیدہ خانم)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اول الذکر دو گانے مبارک بیگم کی آواز میں ریکارڈ کئے گئے تھے جو بھارت سے آئی ہوئی تھیں۔یہ محض پاکستانی فلم سازوں کے احساس کمتری کا ایک نمونہ ہے کیونکہ پاکستانی گلوکاروں کے گائے ہوئے نغمات زیادہ مقبول ہوئے تھے۔

مسعود بھارت سے آئے تھے جہاں انہوں نے ''دیور'' جیسی ہٹ فلم میں بطور ہیرو کام کیا تھا۔بہت شائستہ اور تعلیم یافتہ انسان تھے۔ ماڈل ٹاؤن میں رہا کرتے تھے اور ہم سے کافی میل جول بھی تھا۔۱۹۶۰ء میں انہوں نے فلم ساز و ہدایت کار کی حیثیت سے ایک فلم ''زنجیر'' بنائی تھی جس میں راگنی اور مسعود مرکزی کردار تھے۔ان کے صاحب زادوں نے بعد میں کراچی میں ایڈورٹائزنگ اور دستاویزی فلمیں بنا کر بہت کامیابیاں حاصل کیں۔

''زنجیر'' کے موسیقار فیروز نظامی تھے۔''زنجیر'' کامیاب نہ ہو سکی۔اصولاً تو اس کی موسیقی کو بھی فلاپ ہو جانا چاہئے تھا مگر فیروز نظامی کی موسیقی نے اپنا جادو جگایا۔اس فلم کے مندرجہ ذیل نغمات مقبول ہوئے تھے۔

۱۔ تھی وفا کی آرزو

تم بے وفا کیوں ہو گئے (سلیم رضا)

۲۔حال دل ان کو سناتے ہوئے ڈر لگتا ہے (سلیم رضا)

۳۔جس نے چرائی نیند ہماری

ہم اس کو پہچان گئے (سلیم رضا)

۴۔دل ہمارا زلف کی زنجیر کے قابل نہ تھا(سلیم رضا)

فیروز نظامی کا میوزک فلم کی ناکامی کے باوجود بہت مقبول ہوااور اس فلم کے نغمات آج بھی گونجتے ہیں۔

ہدیات کار مسعود پرویز کی فلم ''منزل'' کی موسیقی بھی فیروز نظامی کے سپرد کی گئی۔یہ فلم زیادہ مقبول نہ ہو سکی مگر فیروز نظامی کے چند نغمات جو میڈم نور جہاں نے گائے تھے بہت پسند کیے گئے۔

۱۔جگ میں کون ہمارا

کسے سناؤں کس نے دل لوٹ لیا(نور جہاں)

۲۔تو ہی بتادے چندا

چپکے سے دل میں کون آیا(نور جہاں)

۳۔ چھم چھم ناچے من مورا (نور جہاں)

۴۔ بیرن ہوگئی دنیا (نور جہاں)

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ فیروز نظامی اور میڈم نور جہاں کے اشتراک نے ہمیشہ بہت اچھے نغمات کو جنم دیا۔

۱۹۶۱ء میں انور کمال پاشا کی فلم ''منگول'' میں بھی فیروز نظامی نے موسیقی ترتیب دی تھی۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے یہ ایک کاسٹیوم فلم تھی۔ ایسی فلموں میں موسیقی کی گنجائش کم ہوتی ہے۔ ''منگول'' بری طرح فلاپ ہوگئی۔ فیروز نظامی کی موسیقی بھی ابھر کر سامنے نہیں آئی۔

پھر ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ فلم سازوں کو فیروز نظامی کا خیال تک نہ آیا۔ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے ایک پنجابی فلم ''سوکن'' کی موسیقی بنائی۔ اس کے ہدایت کار ان کے بیٹے عارف نظامی تھے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ فیروز نظامی کو پاکستانی فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے کس طرح نظرانداز اور فراموش کیا تھا کہ آئندہ نو سال تک کسی نے ان کی خدمات حاصل نہ کیں۔ اتفاق سے ان کے بیٹے عارف نظامی نے ۱۹۷۴ء میں ایک پنجابی فلم کی ہدایت کاری کی تھی جس میں سدھیر اور فردوس مرکزی کرداروں میں تھے۔ غالباً اپنے بیٹے کا دل رکھنے کی خاطر وہ اس فلم کی موسیقی بنانے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ ورنہ فلمی صنعت سے وہ قطعی طور پر برگشتہ اور بے تعلق ہو کر رہ گئے تھے۔ فلمی صنعت نے ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا تھا اس کے پیش نظر ان کی دل شکستگی حق بجانب تھی۔ افسوس کہ ایک ذہین باصلاحیت ہنر مند موسیقار کی ہماری فلمی صنعت نے قدر نہ کی۔ اس طرح نقصان میں فیروز نظامی نہیں خود فلمی صنعت رہی۔

فیروز نظامی سے ہماری ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ سرخ و سفید رنگت، سیاہ چمک دار بال، براؤن روشن آنکھیں درمیانہ قد، بھرا بھرا جسم، بڑی بڑی آنکھوں میں سرمے کی تحریر (ان کے علاوہ آنکھوں میں باقاعدگی سے سرمہ لگانے والوں میں تنویر نقوی بھی شامل ہیں) نرمی اور شائستگی سے گفتگو کرتے تھے۔ کم آمیز اور کم گو تھے۔ کسی کی برائی میں کبھی انہوں نے ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالا۔ البتہ تعریف کے قابل موسیقی کی دل کھول کر تعریف

کرتے تھے۔ قمیص پتلون اور کوٹ ان کا پسندیدہ لباس تھا۔ سادگی ایسی کہ اسٹوڈیو کی سیڑھیوں پر بلا تکلف بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے تھے۔ یہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ ہمیں بایو کیمک اور ہومیو پیتھک طریقہ علاج کی جانب مائل کرنے کے وہی ذمے دار ہیں۔

ایک دن ہم بھی ان کی سیڑھیوں میں بیٹھا دیکھ کر وہیں بیٹھ گئے۔ انہوں نے حسب دستور مزاج پرسی کی تو ہم نے بتایا پیٹ میں گیس بہت ہوتی ہے۔ تیزابیت کی وجہ سے بیزار رہتے ہیں وزن نہیں بڑھتا۔ پیٹ بھی اتنا کم ہے کہ قمیص پتلون پہن کر شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔

"وہ کیوں؟" انہوں نے پوچھا۔

ہم نے کہا "دیکھئے نا پتلون پہن کر کم از کم پیٹ کچھ تو نمایاں نظر آئے۔ اب آپ پتلون پن کر کتنے جامہ زیب اور بارعب لگتے ہیں۔"

وہ مسکرانے لگے بولے "آپ بایو کیمک علاج کیوں نہیں کرتے۔"

وہ کیا ہوتا ہے؟"

"آپ نہیں جانتے۔ بہت قدرتی اور موثر طریقہ علاج ہے۔ یہی ہومیو پیتھی کا سرچشمہ ہے۔"

پھر انہوں نے ہمیں ایک کتاب کا نام بتا کر کہا "یہ کتاب خرید لیجئے اور خود ہی اپنا علاج کیجئے۔ میری طرف دیکھئے۔"

ہم نے ان کے سرخ و سفید چہرے کو دیکھا۔

"میں ہمیشہ بایو کیمک علاج ہی کرتا ہوں۔" پھر انہوں نے اس طریقہ علاج کے بارے میں مختصراً بتایا۔ ہم نے دوسرے ہی دن یہ کتاب اور چند ادویات خرید لیں پھر ہومیو پیتھی کا شوق پیدا ہو گیا تو ہومیو پیتھک کتابیں بھی لے

آئے۔رفتہ رفتہ ہم محض ہومیو پیتھی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔اس کا سہرا فیروز نظامی کے سر ہے۔

فیروز نظامی صحیح معنوں میں ایک عالم فاضل آدمی تھے۔موسیقی پر انہیں عبور حاصل تھا۔غالباً وہ واحد پاکستانی موسیقار ہیں جس نے انگریزی میں موسیقی کے بارے میں ایک کتاب تحریر کی ہے جس کا نام History Development of Music ہے۔ اس قابل قدر کتاب سے کتنے لوگوں نے استفادہ کیا یہ ایک علیحدہ بات ہے۔

فلمی صنعت سے بے تعلق ہو کر انہیں قلق تو ہوا ہو گا۔اس قدر عروج حاصل کرنے کے بعد کسی کا فلموں سے دور ہو جانا خاص تکلیف دہ ہوتا ہے مگر فیروز نظامی نے اس کو دل کا روگ نہ بنایا۔وہ باصلاحیت اور تعلیم یافتہ انسان تھے۔اس لیے مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے رہے۔پاکستان ٹائمز کے علاوہ دوسرے جرائد اور اخبارات میں بھی لکھتے رہے۔دراصل ان کا مزاج فلمی صنعت کے ماحول کے مطابق نہ تھا نہ ہی وہ بلاوجہ فلمی حلقوں اور تقاریب میں شریک ہوا کرتے تھے۔انہیں گوشہ نشینی اور خاموشی سے پیار تھا۔روحانیت سے بھی دلچسپی تھی۔''سرچشمہ حیات'' کے عنوان سے انہوں نے روحانیت کے بارے میں بھی ایک کتاب لکھی ہے۔انہوں نے ۶۵ سال کی عمر پائی۔غالباً ہارٹ فیل ان کی وفات کا سبب بنا۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پاکستان کے معروف کرکٹر نذر محمد فیروز نظامی صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔مدثر نذر ان کے بھتیجے ہیں ان کے دوسرے بھائی بھی تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔اگر انہیں موسیقی کا شوق کشاں کشاں فلمی کوچے میں نہ لے جاتا تو وہ کسی بھی شعبے میں بہت کامیابیاں حاصل کر سکتے تھے۔فیروز نظامی نے ڈپٹی سیکرٹری کی حیثیت سے پنجاب آرٹس کونسل میں بھی فرائض سر انجام دیئے مگر موسیقی کے دلدادہ شخص کے لیے یہ سب اسی طرح تھا جیسے مچھلی کو پانی سے دور کر دیا جائے۔انہوں نے کبھی مایوسی اور شکایت کا اظہار نہیں کیا مگر یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے فلم سازوں کے سلوک نے انہیں ذہنی صدمہ پہنچایا تھا اور غالباً یہی ان کی وفات کا سبب بن گیا۔ان کا قصور یہ تھا کہ وہ ایک ایسے شعبے میں دلچسپی رکھتے تھے جس کا ماحول اور طریقہ کار ان کے مزاج کے مطابق نہ تھا لیکن ان کی

فنی عظمت سے انکار ممکن نہیں ہے۔اپنے کارناموں کی وجہ سے وہ برصغیر کے نامور موسیقاروں کی صف میں شمار کیے جاتے ہیں اگر مناسب مواقع اور سازگار ماحول نصیب ہوتا تو وہ پاکستان کی فلمی موسیقی کے لیے بڑے کارنامے سرانجام دے سکتے تھے۔اللہ تعالیٰ اس نیک، شریف النفس، درویش صفت انسان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دیں۔۔۔آمین!

مشہور نظم کا مصرعہ ایک فطری حقیقت کا اظہار ہے

بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں

تنہائی جنہیں دہراتی ہے

لیکن آج کل زندگی کچھ اس ڈھب کی ہوگئی ہے کہ تنہائی بہت مشکل سے میسر آتی ہے لیکن اس کی جگہ لینے کے لیے ٹیلی ویژن موجود ہے۔ٹیلی ویژن کی بہت سی خوبیوں اور خامیوں میں سے ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس پر جب پرانی فلموں کی نمائش کی جاتی ہے تو بیتے ہوئے دن اور گزرے ہوئے لوگوں کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور پھر انسان ایک بار ماضی کے دنوں میں پہنچ جاتا ہے۔

پچھلے دنوں ٹی وی پر ایک پرانی ہالی ووڈ کی فلم دیکھی جس میں ایوا گارڈنر نے مرکزی کردار کیا تھا۔ایوا گارڈنر کو دیکھ کر پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ چالیس پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں ہالی ووڈ میں بہت دلکش اور معیاری فلمیں بنائی جاتی تھیں۔بڑے بڑے مصنفین کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔فلم ساز اور ہدایت کار انتہائی تجربے کار اور فلم سازی کے تمام رموز سے بخوبی آگاہ ہوتے تھے۔یہ وہ زمانہ تھا جب فلم سازی محض دولت کمانے کا ذریعہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک شوق، جوش اور جذبے کا نام تھا۔فلم ساز اور ہدایت کار چوبیس گھنٹے فلموں کے ساتھ ہی رہتے تھے۔سوتے جاگتے۔اٹھتے بیٹھتے فلم ہی ان کے ذہنوں پر سوار رہتی تھی۔ایک لگن تھی۔آگ تھی جو دلوں میں بھڑکتی رہتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں جیسے ہنر مند اور فنکار ہالی ووڈ کے علمبردار تھے اب اعلیٰ سے اعلیٰ فنکار ان کے پاسنگ بھی نہیں ہیں۔تکنیک نے بہت ترقی کرلی ہے مگر خیال پیچھے رہ گیا ہے۔ تخیل مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔اداکاری کا معیار بدل چکا

ہے۔ حضرت جگر مراد آبادی کے مطابق وہی معاملہ ہے کہ ۔۔۔

ہوش خرد نے دن یہ دکھائے

گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

یہ المیہ صرف ہالی ووڈ تک ہی محدود نہیں ہے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی یہی حال ہے۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی جو فلم سازی کے حوالے سے دنیا بھر میں ایک امتیازی مقام کے حامل تھے ان کی فلموں کا تو اب نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ رہا ہالی ووڈ تو وہاں کا ماحول اور دستور بدل چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فلموں کے موضوعات بھی تبدیل ہو گئے ہیں۔ اداکاری کے وہ معیار نہیں رہے نہ ہی ہدایت کاروں میں ویسے قد آور، ذہین اور تخلیق کار لوگ نظر آتے ہیں۔ مشینوں کی بالادستی ہے۔ انسانی ذہن ان کے تابع ہو کر رہ گیا ہے۔

دور کیوں جاتے ہیں۔ ہندوستان کی فلمی صنعت کو ہی دیکھ لیجئے۔

ستر اور ساٹھ کی دہائی تک وہاں کیسی فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ کس قدر باصلاحیت ہنرمند اور کیسے مایہ ناز اداکار اور اداکارائیں اسکرین پر چھائی ہوئی تھیں۔ اب تکنیک کے اعتبار سے بھارتی فلموں نے بہت ترقی کی ہے۔ کروڑوں کے سرمائے سے فلمیں بنتی ہیں۔ آمدنی بھی کروڑوں میں ہوتی ہے اور خسارہ بھی کروڑوں میں کیونکہ بیشتر فلمیں بے مقصد، بے روح اور ناکام ہوتی ہیں پہلے جیسی دیو قامت شخصیات اب خواب وخیال ہو کر رہ گئی ہیں۔ پاکستان کی فلمی صنعت اس کے مقابلے میں کم عمر سہی لیکن ساٹھ ستر کی دہائی تک پاکستان میں بھی ایک سنہری دور تھا۔ مگر اب نہ وہ لوگ رہے نہ وہ فلمیں۔

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

ماضی کا نوحہ رونے کی بجائے کیوں نہ کچھ خوب صورت یادیں تازہ کی جائیں۔

ایک دن اچانک ٹیلی ویژن پر کلاسیکی فلموں کے ضمن میں اداکارہ ایواگارڈنر کی فلم ''دی کلرز'' دیکھی تو پرانا دور یاد آگیا۔آج کی نسل غالباًایواگارڈنر کے نام سے واقف بھی نہیں ہے۔اپنے زمانے میں ایواگارڈنر کوان کے اسٹوڈیو نے ''دنیاکی ہیجان خیز ترین حیوان'' کے نام سے متعارف کرایا تھا۔اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ ایواگارڈنر کے پیکر میں ایک حیوانی اور مقناطیسی کشش تھی۔یہ تو پبلسٹی تھی لیکن جب یہ ہیجان خیز ہستی معیاری فلموں میں جلوہ گر ہوئی توان کے سراپاحسن ورعنائی اور کشش انگیزی کے باعث دنیابھر میں رائے شماری کے بعد فلم بینوں نے متفقہ طورپرایوا گارڈنر کودنیاکی حسین ترین عورت کے لقب سے نوازا۔وہ اس لقب کی مستحق بھی تھیں۔

درازقد، متناسب جسم،(ان کی کمر صرف ۲۲انچ تھی) لیکن سر سے پیر تک دیومالائی دیویوں کی مانندان کے سراپامیں ایساتناسب تھاجو کہ اس زمانے کی حسین ترین ہالی ووڈ کی ہیروئنوں میں بہت کم اداکاراؤں کونصیب تھالیکن ایوا گارڈنر کے حسن میں ایک مخصوص اور منفرد کیفیت تھی۔ایواگارڈنر کے چہرےاور جسم کی رنگت شہداور دودھ کی آمیزش کی یاددلاتی تھی۔حقیقی زندگی میں وہ جس قدر حسین تھیں فلموں میں اس سے کہیں کم نظرآتی تھیں۔

ہم نے انہیں فلم ''بھوانی جنکشن'' کی لاہور میں شوٹنگ کے دنوں میں بہت قریب سے دیکھاہے۔بات کرنے کاموقع تونہیں ملالیکن موقع ملتابھی توشاید بات نہ کرپاتے۔انہیں لاہور کے ریلوے اسٹیشن پراسٹیورٹ گرینجر کے ساتھ کام کرتے ہوئے بہت قریب سے دیکھاتوسانس رک سی گئی۔لگ بھگ نصف صدی کے بعد بھی یہ منظر آنکھوں کے سامنے گھومتارہتاہے۔ان کارنگ بے بہاتھا۔کندن کی طرح دمکتاہوا۔آنکھوں کی رنگت ہری تھی جبکہ بال بالکل سیاہ تھے۔

ایوا گارڈنر کی خوب صورت آنکھوں میں مقناطیسی کشش تھی لیکن ایک اورخوبی یہ تھی کہ ان کی بھنویں گھنی اور قدرتی طورپرہلال کی طرح گولائی میں تھیں۔ہالی ووڈ کی اکثرہیروئنیں اس زمانے میں بھی بھنویں بنایاکرتی تھیں مگر ایوا گارڈنراس کی محتاج نہیں تھیں۔وہ جب سیٹ پریاکسی محفل میں نمودارہوتی تھیں توپھرسب کی نظریں ان پرمرکوز ہوکررہ جاتی تھیں۔

''بھوانی جنکشن'' کا یونٹ فلیٹیز ہوٹل میں مقیم تھا۔ لاہور کا ہر فرد ایوا گارڈنر کو دیکھنے کا شائق تھا۔ گورنر سے لے کر ایک عام راہ گیر تک انہیں ذاتی طور پر دیکھنے کا مشتاق تھا مگر ڈسپلن اتنا سخت تھا کہ گورنر صاحب کی دعوت بھی شکریے کے ساتھ مسترد کر دی گئی۔ ہدایت کار جارج کیوکر کا کہنا تھا کہ ہم یہاں فلم بنانے کے لیے آئے ہیں۔ وقت کم ہے اور کام زیادہ۔

پروڈکشن انچارج کی نگرانی میں ''بھوانی جنکشن'' کے یونٹ کے تمام افراد رات کو نو بجے سلا دیئے جاتے تھے کیونکہ کمروں کی روشنیاں گل کر دی جاتی تھیں۔ صبح آٹھ بجے انہیں شوٹنگ کے لیے تیار ہو کر لوکیشن پر موجود ہونا لازم تھا۔ تاخیر کی صورت میں ایوا گارڈنر اور اسٹیورٹ گرینجر جیسے سپر اسٹار بھی ہدایت کار کی جھاڑ کھایا کرتے تھے اور وہ بھی منظر عام پر۔ بہر حال یہ ایک الگ داستان ہے جو اس سے پہلے کافی تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے مگر اتنا یاد ہے کہ ایوا گارڈنر پر فلمی گانے کا یہ مکھڑا سو فیصد صادق آتا ہے کہ۔۔۔

یوں تو ہم نے لاکھ حسین دیکھے ہیں

تم سا نہیں دیکھا۔۔۔

''بھوانی جنکشن'' کی تکمیل کے وقت ایوا گارڈنر ایک سپر اسٹار بن چکی تھیں مگر یہاں تک پہنچنے کے لیے انہیں کانٹوں بھرے راستوں پر پتھریلی پگڈنڈیوں پر طویل سفر کرنا پڑا تھا۔ یہ مقام انہیں آسانی سے راتوں رات نہیں مل گیا تھا۔

آیئے آپ کو اپنے دور کی حسین ترین عورت کی کہانی سنائیں۔

ایوا گارڈنر کا اصلی نام ایوالوینیا گارڈنر تھا۔ وہ ۲۴ دسمبر ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئی تھیں۔ ابتدائی تعلیم اور کالج کی تعلیم انہوں نے نارتھ کیرولائنا میں حاصل کی تھی۔ وہ بچھڑے ہوئے والدین کی لڑکی تھیں۔ امریکی روایات کے مطابق ویسے بھی انہیں جوان ہونے کے بعد اپنی زندگی بذات خود بنانی تھی۔ پہلے خیال تھا کہ وہ سیکرٹری کے طور پر کوئی ملازمت کر لیں گی مگر ہالی وڈ کی رنگینیوں اور کشش نے انہیں بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا اور انہوں نے اداکارہ بننے کا فیصلہ کر لیا۔

امریکا بلکہ سارے یورپ کی نو عمر اور خوش شکل لڑکیوں کے لیے ہالی ووڈ ہی آخری منزل اور خواہشوں کی معراج تھی۔انہوں نے دیکھا سنا اور پڑھا تھا کہ اگر قسمت مہربان ہو جائے تو کس طرح ریستوران میں کام کرنے والی ویٹریس اسٹار بن جاتی ہے۔ معمولی سے کردار کرنے والی لڑکیوں اور چند ڈالرز کے عوض ماڈلنگ کرنے والی لڑکیوں پر اچانک قسمت کس طرح مسکراتی ہے۔ایسی بے شمار مثالیں ہر روز ان کے سامنے آتی رہتی تھیں۔ہالی ووڈ کی حیثیت عمرو عیار کی زنبیل کی مانند تھی۔زنبیل کے اندر تو دنیا کی ہر شے یہاں تک کہ پورا شہر تک سما جاتا تھا لیکن ہالی ووڈ میں دنیا کے ہر گوشے سے آنے والی خوش رو اور خوش اندام لڑکی کو کام مل جاتا تھا۔ فلم، اسٹیج، ٹیلی ویژن، نائٹ کلب، ماڈلنگ، کہیں نہ کہیں وہ اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتی تھیں۔ جس طرح قیام پاکستان سے پہلے سارے ہندوستان کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں گھروں سے بھاگ کر فلم اسٹار بننے کی خواہش دل میں لیے بمبئی پہنچ جاتے تھے اسی طرح سارے امریکا کی لڑکیاں اور نوجوان لڑکے ہالی ووڈ کا رخ کرتے تھے۔انہیں گھر سے بھاگنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی تھی۔گھر ہوتا ہی کہاں تھا جہاں سے وہ بھاگتے۔ماں کہیں تو باپ کہیں نو عمری ہی میں کمائی پر جت جاتے تھے۔اٹھارہ سال کی عمر ہوتے ہی وہ ہر طرح سے آزاد ہو جاتے تھے اور اپنی پناہ گاہوں اور چراگاہوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے تھے۔ بہت کم خوش نصیب تھے جو کامیابیوں سے ہمکنار ہوتے تھے ورنہ بہت بڑی اکثریت انسانوں کے اس مشینی جنگل میں گم ہو کر رہ جاتی تھی۔

ایوالیوینا گارڈنر نے بھی جوانی کے آنگن میں قدم رکھتے ہی ہالی ووڈ کو اپنی منزل ٹھہرا لیا۔ چھوٹے موٹے کاموں میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔اسے اپنے حسن و جمال کا بھی بخوبی احساس تھا۔ایسی حسین اور دل نواز لڑکی اگر ہالی ووڈ کی اسٹار بننے کا خواب دیکھ رہی تھی تو یہ اتنا غلط اور بے جا بھی نہ تھا۔وہ جس طرف سے گزرتی تھی بے شمار نگاہیں اس کا پیچھا کرتی تھیں۔کچھ رشک سے، کچھ حسد سے اور کچھ رفاقت اور دوستی کی تمنا لیے۔

ایوا نے ہالی ووڈ پہنچ کر حسب معمول زمانے کے سرد و گرم دیکھے۔ جس نے امید دلائی اس کے ساتھ رہنے لگی کیونکہ وہاں رہائش اور کھانا پینا بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ ساتھ رہنے کا معاوضہ اسے ڈالروں میں ادا نہیں کرنا پڑتا تھا اسلیے کہ

اس کے پاس ڈالر تھے ہی نہیں البتہ کھنکتا ہوا جسم اور دمکتا ہوا شاداب چہرہ ضرور تھا۔ یہی اس کی کل پونجی تھی جس میں سے وہ ضرورت کے مطابق اخراجات کرتی رہتی تھی۔ ایک معمولی سے کسان کی بیٹی ہالی ووڈ جیسے شہر میں اس سے زیادہ اور کیا حاصل کر سکتی تھی۔

کسی فوٹو گرافر نے اسے ماڈلنگ کا جھانسہ دیا اور کچھ تصاویر بنا کر میگزینز اور اشتہاری کمپنیوں کو دکھا بھی دیں۔ اس فوٹو گرافر کی مہربانی سے اس کو ماڈلنگ کا کام مل گیا۔ اس سے برائے نام آمدنی ہوتی تھی مگر خالی جیب کے مقابلے میں کم بھری ہوئی جیب بہرحال بہتر ہوتی ہے۔

ہالی ووڈ میں بھی فوٹو گرافروں اور ٹیلنٹ ایجنٹوں کے نام پر ایک بڑا مافیا ہمیشہ رہا ہے۔ ایسے لوگ بمبئی میں بھی ہیں اور لاہور میں بھی جو لڑکیوں کو اسٹار بنانے کا لالچ دے کر اپنا الو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔ ساری دنیا میں فلمی دنیا کا یہی انداز اور چلن ہے۔

ماڈلنگ کے راستے ایوا کو ایک ایجنٹ نے فلم اسٹوڈیو تک پہنچا دیا جہاں اسے پچاس ڈالر فی ہفتہ معاوضہ پر چند ناقابل ذکر کرداروں میں ایکسٹرا کے طور پر استعمال کیا گیا۔ درجنوں، سینکڑوں لڑکیوں کے ہجوم میں ایک ایوا گارڈنر کو بھلا کون دیکھتا اور یاد رکھتا جبکہ ہیرو اور ہیروئن بھی سین میں موجود ہوں۔ ظاہر ہے کہ تمام نظریں ان پر ہی مرکوز ہوتی ہیں۔ ان دنوں ایوا نے جو کام کیے وہ خود اس کے سوا کسی کو یاد نہیں ہیں۔ فلم کی ریلیز کے موقع پر وہ بڑے اشتیاق اور غور سے لڑکیوں کے غول میں خود کو تلاش کرتی تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب وہ سارے فلم بینوں کی مرکز نگاہ بن جائے گی۔ بہرحال یہ بہت کافی تھا کہ ایک فلم کمپنی نے اس کے ساتھ معاہدہ کر لیا تھا اور اسے ہر ہفتے پچاس ڈالر مل جایا کرتے تھے جو کہ اس زمانے میں اس کے لیے بہت بڑی رقم تھی۔

اس کو ایم جی ایم کے مالک لوئی بی میئر کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھا پھر کہا ”یہ تو نہ بات کر سکتی ہے نہ ایکٹنگ کر سکتی ہے۔ ویسے بھی اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ کبھی آرٹسٹ نہیں بن سکتی

یہ اس طرح کا واقعہ تھا جو ۱۹۵۰ء میں لاہور میں صبیحہ خانم کے ساتھ پیش آیا تھا۔ سید عطاءاللہ شاہ ہاشمی اس زمانے میں ایک معروف فلمی صحافی اور فلم ساز تھے۔ انہوں نے صبیحہ پر ایک نظر ڈالی اور کہا ''چھوٹا سا قد، گول چہرہ، اس لڑکی میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ کبھی آرٹسٹ نہیں بن سکتی۔''

مگر لاہور کے عطاءاللہ شاہ ہاشمی کی طرح ہالیووڈ کے تجربے کار فلم ساز اور اسٹوڈیو کے مالک لوئی بی میئر کا اندازہ بھی غلط تھا۔ آگے چل کر ایوا گارڈنر نے فلمی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ صبیحہ خانم کو پاکستانی اسکرین کی فرسٹ لیڈی قرار دیا گیا اور سالہا سال تک وہ بام عروج پر ہیں۔ دیکھئے تجربہ کار، جہاں دیدہ لوگوں کے اندازے بھی بعض اوقات کتنے غلط ثابت ہوتے ہیں۔ مگر ایوا گارڈنر نے ہمت نہیں ہاری۔ اسے جو بھی کردار ملتے رہے وہ ان کو بڑی محنت اور لگن کے ساتھ نبھاتی رہی۔ اس کی کارکردگی اور سب سے بڑھ کر حسن و جمال کی تابانی زیادہ عرصے تک چھپی نہ رہ سکی۔ رفتہ رفتہ اسے بہتر کردار ملتے رہے اچھے ہدایت کاروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تو اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اس طرح یہ سنگلاخ پتھر تراش خراش کے بعد ایک آنکھوں کو خیرہ کرنے والے ہیرے کی شکل اختیار کر گیا۔ اسے دنیا کی سب سے ہیجان انگیز حیوان کا لقب ملا۔ اس کے بعد دنیا کی حسین ترین عورت کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

ایوا گارڈنر کی ابتدائی فلموں نے قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔ اب تو شاید خود ہالی ووڈ کے فلم بینوں کو بھی ان کے نام یاد نہیں ہوں گے۔ مثلاً ان فلموں کے نام کسے یاد ہیں۔

ریجنا روما، پرسٹ آف لو، دی کڈ نیپنگ آف دی پریذیڈنٹ، سٹی آن فائر، دی سینٹی فل، دی بلیو برڈ۔ کیسنڈرا کراسنگ ایک ایسی فلم تھی جس نے اچھا بزنس کیا تھا اور اس میں فلم بینوں کو ایوا گارڈنر کچھ کام کرتے ہوئے نظر آئی تھی لیکن اس کے بعد بھی اس نے کئی قابل ذکر فلموں میں کام کیا۔

ایوا گارڈنر کو صحیح معنوں میں شہرت اور مقبولیت ۱۹۴۶ء میں معروف مصنف اور ناول نگار ارنسٹ ہیمنگوے کے ناول سے اخذ کردہ فلمی کہانی سے ملی تھی۔ ناول کا نام ''دی کلرز'' تھا یعنی قاتل۔ ارنسٹ ہیمنگوے کو اپنے ناول کا یہ فلمی

حلیہ پسند نہیں آیا تھا مگر فلم بینوں کے ذہنوں پر یہ فلم آج بھی نقش ہے۔ اس فلم میں ایوا گارڈنر کی خوب صورتی کو سلیقے سے استعمال کیا گیا تھا۔اس کے سیاہ چست مبلوسات اور پر کشش انداز قابل دید تھے۔اس فلم میں اس کے ساتھ ایک نئے اداکارہ برٹ لنکاسٹر نے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔بعد میں برٹ لنکاسٹر ہالی ووڈ کا سپر اسٹار بن گیا۔

یہ وہ فلم تھی جس نے ایوا گارڈنر کو واقعی اسٹار بنا دیا تھا۔سالہا سال کی مشقت، محنت اور صبر آزمائی کے بعد بالآخر وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔اس فلم میں ایوا گارڈنر کے بے پرواانداز کو فلم بینوں نے بہت پسند کیا تھا۔ اس نے بہت کھل کراداکاری کی تھی اور اپنے کردار میں جان ڈال دی تھی۔اس کے بعد ایوا نے اور بھی کئی فلموں میں کام کیا۔اب وہ ایک اسٹار بن چکی تھی۔اور لاکھوں کروڑوں دلوں پر راج کر رہی تھی لیکن اس کی دوسری قابل ذکر اور یادگار فلم میں ارنسٹ ہیمنگوے کے مقبول ناول سے اخذ کی گئی تھی۔"اسنوز آف کلی مینجارو"ایک ایسی فلم تھی جو افریقا کے پس منظر میں بنائی گئی تھی۔اس فلم میں اس نے ہالی ووڈ کے معروف اداکار گریگوری پیک کے ساتھ کام کیا تھا۔یہ فلم ۱۹۵۲ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی اور ساری دنیا میں کامیاب قرار پائی تھی۔

اگلے سال یعنی ۱۹۵۳ء میں اس کی ایک اور فلم نے دھماکا خیز بزنس کیا۔یہ بھی افریقا کے پس منظر میں بنائی گئی تھی۔ اس فلم میں کلارک گیبل جیسا مقبول اور عظیم ہیرو تھا۔جسے ہالی ووڈ میں ''کنگ'' کہا جاتا تھا۔اس فلم میں دو ہیروئنیں تھیں۔دوسری ہیروئن کا کردار گریس کیلی نے ادا کیا تھا جو بعد میں ریاست موناکو کے شہزادہ رینیئر کی بیگم بن کر فلمی دنیا سے کنارہ کش ہوگئی تھیں۔یہ افریقا کے جنگل میں بنائی جانے والی ایک لو اسٹوری تھی جس میں خوف، سسپنس اور تھرل کا عنصر بھی تھا۔یہ تین کرداروں کے گرد گھومتی تھی۔

ایوا گارڈنر اب ایک مسلمہ اور مستند سپر اسٹار بن چکی تھی۔اس کے بدلتے ہوئے موڈ کے چرچے عام ہو چکے تھے۔وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی اور ہر معاملے میں من مانی کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔آئے دن اس کے اسکینڈلز بھی منظر عام پر آتے رہتے تھے جن کی اسے مطلق پروانہ تھی۔شادیوں کا سلسلہ پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔اس نے پہلی شادی اداکار مکی رونی سے کی تھی۔یہ عجب انمل بے جوڑ شادی تھی۔مکی رونی ایک بڑا اسٹار تھا لیکن قد کے لحاظ سے وہ

بچہ لگتا تھا۔ان دونوں کے قد میں کم از کم دو فٹ کا فرق تو ضرور ہو گا لیکن ایوا کو اس کی پروانہ تھی۔عشق و محبت کے معاملے میں قد و قامت کون ناپتا ہے؟

ایوا گارڈنر کی دوسری شادی میوزیشن آرٹی شا سے ہوئی تھی۔ یہ بھی زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی اور پہلی شادی کی طرح اس کا انجام بھی طلاق کی صورت میں سامنے آیا۔

ایوا نے تیسری شادی امریکا کے نامور ترین گلوکار اور اداکار فرینک سیناترا سے کی تھی۔فرینک سیناترا شکل و صورت اور قد و قامت کے اعتبار سے ایوا کے ساتھ کھڑا ہوتا تو بالکل نہیں جچتا تھا۔اس زمانے وہ بہت دبلا پتلا اور مریل سا تھا۔بعد میں وہ اداکار بھی بنا اور وزن بڑھ جانے کی وجہ سے اس کی شخصیت میں بھی نکھار پیدا ہو گیا مگر یہ ایوا سے طلاق حاصل کرنے کے بعد کی باتیں ہیں۔فرینک سیناترا ایک گلوکار کی حیثیت سے سدا بہار گائیک ہے۔آج بھی امریکا میں بہت بڑا اور تاریخ ساز گلوکار قرار دیا جاتا ہے۔فرینک سیناترا نے بعد میں ایک فلم ''فرام ہیئر ٹو ایٹرینٹی'' میں ایک کردار بھی ادا کیا تھا لیکن اس کی وجہ شہرت گلوکاری ہی رہی ہے۔فرینک سیناترا اپنی شہرت اور گلوکاری کے باعث ہر عہد حکومت میں صدر امریکا کا قریبی دوست اور مہمان بنتا رہا ہے۔ڈونلڈ ریگن کے زمانے میں تو اس کی آمد و رفت وہائٹ ہاؤس میں اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ اسکینڈلز جنم لینے لگے تھے۔سرکار دربار میں اتنی پذیرائی اور اہمیت کا حامل ہونے کے باوجود فرینک سیناترا کو غیر قانونی دھندوں میں ملوث قرار دیا جاتا رہا وہ کئی نائٹ کلبوں اور کیسینوز کا مالک تھا۔کہا جاتا ہے کہ اس کے بدنام زمانہ مافیا کے ساتھ بھی ہمیشہ گہرے مراسم رہے ہیں جس کی وجہ سے اس کی غیر قانونی سرگرمیوں کے خلاف کبھی کوئی کاروائی نہیں کی گئی حالانکہ امریکی میڈیا میں کھلے عام اس پر مافیا سے ربط و ضبط رکھنے کے الزامات آئے دن لگائے جاتے تھے۔

فرینک سیناترا ایک رنگین مزاج اور عیاش طبع انسان تھا۔وہ ہالی ووڈ کی نامور اور ممتاز ترین ہیروئنوں میں بھی بہت مقبول تھا اور کہا جاتا ہے کہ شاید ہی کوئی قابل ذکر ہالی ووڈ کی ہیروئن ایسی ہو گی جس کے فرینک سیناترا سے مراسم نہ رہے ہوں۔

فرینک سیناترا کے ساتھ بھی ایوا گارڈنر کی شادی زیادہ عرصے تک نہ چل سکی۔ طلاق کے سلسلے میں ایوا گارڈنر اور فرینک سیناترا میں سے کسی ایک کو بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ ان دونوں میں بے پروائی اور ہرجائی پن کے جراثیم مشترک تھے۔ دونوں رنگین مزاج اور محض وقت گزاری کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایوا گارڈنر کی پہلی دو شادیاں بھی زیادہ عرصے تک نہیں چل سکی تھیں۔ ایوا کی متلون مزاجی اور بے لگام آزاد طبیعت کے باعث ایسا ممکن ہی نہ تھا۔ وہ کسی ایک کی ہو کر زندگی گزارنے کی قائل نہیں تھی۔

جس زمانے میں ایوا گارڈنر پے در پے شادیاں کر رہی تھی انہی دنوں ہالی ووڈ کی ایک اور حسین سپر اسٹار الزبتھ ٹیلر بھی اسی راہ پر گامزن تھی۔

اسی زمانے میں ایک بار ایوا گارڈنر نے اپنی شادیوں کے بارے میں انٹرویو دیتے ہوئے ایک صحافی سے کہا تھا "کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں اور الزبتھ ٹیلر آوارہ طبیعت ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں سینٹ کی طرح پاک ہیں۔ ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم منافق نہیں ہیں اور کوئی بات نہیں چھپاتے۔ کسی سے محبت کرتے ہیں تو دھڑلے سے کرتے ہیں۔ کسی سے مراسم بڑھاتے ہیں تو ان پر بھی پردہ نہیں ڈالتے جبکہ دوسری ہیروئنیں خود کو پارسا ظاہر کرنے کے لیے چوری چوری یہی سب کچھ کرتی ہیں جو ہم دونوں کرتے ہیں۔"

یہ بہت پرانی بات ہے۔ غالباً اس وقت تک الزبتھ ٹیلر نے بھی تین ہی شادیاں کی تھیں جن کی تعداد بعد میں آٹھ تک پہنچ گئی تھی۔ الزبتھ ٹیلر تو خواہ مخواہ بدنام ہیں۔ ایک اداکارہ ژاژا گیبور نے بھی سات باقاعدہ شادیاں کی تھیں اور اپنے دولت مند شوہروں سے طلاق کے ساتھ ساتھ لاکھوں ڈالر بھی وصول کیے تھے۔ وہ یہ بات نہیں چھپاتی تھیں کہ وہ محض دولت کی خاطر شادیاں کرتی ہیں اور صرف دولت مند لوگوں کو ہی یہ شرف بخشتی ہیں کیونکہ طلاق کی صورت میں وہ ان سے خرچے اور ہرجانے کے طور پر بھاری رقوم بھی بٹور لیا کرتی تھیں۔

ایوا گارڈنر کو الزبتھ ٹیلر کے مقابلے میں بدرجہا بہتر اداکارہ سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے کئی فلموں میں مخلوط نسل کی عورت

کے کردار بھی کیے تھے اور اس خوبی سے کیے تھے کہ وہ یادگار بن گئے۔ جیسے بھوانی جنکشن اور بیئر فٹ کانٹیسا، ذاتی زندگی میں ایوا گارڈنر۔۔۔ سیماب صفت تھیں اور انتہائی بے چین اور بے قرار ہستی تھیں۔ وہ کسی ایک مقام، شخص اور ماحول سے بہت جلد اکتا جاتی تھیں۔ انہوں نے جب بھی سنجیدگی اور لگن کے ساتھ کام کیا تو فلم بینوں اور نقادوں سے بہت داد حاصل کی لیکن پھر وہ اس یکسانیت والی زندگی سے بیزار ہو کر اداکاری سے کنارہ کش ہو گئیں

۷۰ کی دہائی میں وہ فلموں سے علیحدگی اختیار کر چکی تھیں حالانکہ فلم سازان کو اپنی فلموں میں کاسٹ کرنے کے خواہش مند تھے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک بیس سال کا طویل عرصہ انہوں نے فلموں سے بے تعلق ہو کر گزارا لیکن ان کی ذاتی زندگی کے ہنگاموں خصوصاً کثرت شراب نوشی کے حوالے سے ان کے بارے میں خبریں موصول ہوتی رہتی تھیں مگر انہوں نے دنیا والوں کی کبھی پروا نہیں کی۔ وہ اپنے حال میں مست رہنے کی قائل تھیں۔ فلمی دنیا سے قطع تعلق کرنے کے بعد وہ بیس سال تک اپنی مرضی اور خواہشات کے مطابق تنہا زندگی گزارتی رہیں۔ شراب، منشیات اور مختلف افراد ان کے رفیق رہے لیکن ان کے رفیقوں اور دوستوں میں تیزی سے تبدیلیاں آتی رہتی تھیں۔

ان کی زندگی کے آخری چند سالوں میں فلم، بین اور عام لوگ اپنے وقت کی اس حسین ترین اداکارہ کو فراموش کر چکے تھے۔ وہ گمنامی اور گوشہ نشینی میں زندگی بسر کر رہی تھیں۔ یہاں تک کہ ۲۵ جنوری ۱۹۹۰ء کو اچانک اخبارات میں نمونیے کے باعث ان کی موت کی خبر شائع ہوئی تو ان کے مداحوں اور پرستاروں کو یاد آیا کہ اس نام کی ایک حسین اداکارہ بھی کبھی فلمی دنیا پر اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دلوں پر راج کیا کرتی تھی۔ انہوں نے ۶۸ سال کی عمر پائی جس میں سے آخری بیس سال گمنامی کے گزرے۔ یہ اس عورت کی داستان ہے جسے ایک زمانے میں دنیا کی حسین ترین عورت کا خطاب دیا گیا تھا۔

ایوا گارڈنر ان بے باک اور بے لگام اداکاراؤں کی فہرست میں شامل ہیں جو اس زمانے میں بھی ہالی ووڈ کی بدنام اداکاراؤں میں سرفہرست تھیں۔ اس سے ان کی آزاد خیالی اور بے راہ روی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے مداحوں کی یادیں تازہ کرنے کے لیے ایوا گارڈنر کی چند معروف فلموں کے نام ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

ریجائنا ، پریسٹ آف لو، دی کڈنیپنگ آف دی پریذیڈنٹ، سٹی آن فائر، دی سینٹی نل دی بلیو برڈ، دی کیسینڈرا کراسنگ، پرمیشن ٹو کل، ارتھ کوئیک، میئر لنگ، دی بائیبل، سیون ڈیزان مے، ۵۵ ڈیزان پیکنگ، دی ریجنل دور ریڈ، دی نیکڈ ماجا، آن دی بیچ، دی سن آلسو رائنرز، اراؤنڈ دی ورلڈان ۸۰ ڈیز، بھوانی جنکشن، دی بیئر فٹ کینٹاسا، موگیمبو، دی اسنوز آف کلی مینجارو، مائی فار بڈن پاسٹ، پینڈورا اینڈ فلائنگ ڈچ مین، دی گریٹ سنر، ون ٹچ آف وینس، شی وینٹ ٹو دی ریسیس، ٹو گرلز اینڈ اے سیلر، بلونڈ فیور، لوسٹ اینجل، ینگ آئیڈیاز، ری یونین ان فرانس، دے ور ڈانسنگ۔

ایسے فنکار فلمی دنیا میں بہت کم ہوں گے جن پر قسمت کبھی مہربان نہ ہوئی۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ انہوں نے کم فلموں میں کام کیا تھا یا انہیں اچھے مواقع نہیں ملے تھے۔ جب کسی اداکارہ کو کئی سال تک فلموں میں کام کرنے کے بعد بھی کامیابی اور مقبولیت حاصل نہ ہو تو چند سال بعد وہ ہمت ہار جاتی ہے اور فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو جاتی ہے مگر بعض حوصلہ مند فنکار ہمت نہیں ہارتے اور مسلسل جدوجہد اور کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ آج ایک ایسی ہی فنکارہ کی داستان سنیے۔

اس اداکارہ کو سب نجمہ کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ پاکستان کی فلمی صنعت کے ابتدائی زمانے کی ہیروئنوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ نجمہ نے اداکاری کا آغاز بمبئی سے کیا تھا حالانکہ لاہور میں پیدا ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے ہدایت کاروں، موسیقاروں اور معتبر فلم ساز اداروں کے ساتھ کام کرنے کے باوجود نجمہ نے آٹھ سال تک بمبئی کی فلموں میں کام کیا۔ وہ ۱۹۴۰ء میں بمبئی گئی تھیں۔ فلمی زندگی کا آغاز سائیڈ ہیروئن کے کردار سے کیا اور کئی سال تک سائیڈ ہیروئن کے طور پر ہی کام کرتی رہیں۔ کافی عرصے بعد انہیں ۱۹۴۶ء میں ہدایت کار راجندر شرما کی فلم ''چہرہ'' میں ہیروئن کا کردار ادا کرنے کا موقع ملا تھا حالانکہ بمبئی میں اس کی پہلی فلم ''کنوارہ باپ'' تھی۔ یہ فلم ۱۹۴۱ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کے ہدایت کار کشور ساہو تھے جو ہندوستان کے ایک ذہین اور تعلیم یافتہ ہدایت کار اور اداکار تھے۔ عصمت چغتائی اور شاہد لطیف کی فلم ''بزدل'' میں کشور ساہو نے نمی اور پریم ناتھ کے ساتھ ایک یادگار کردار ادا کیا تھا۔

یہ ایک نفسیاتی دوہری شخصیت کے انسان کا کردار تھا۔ عصمت چغتائی نے جس خوب صورتی سے یہ کردار تراشا تھا۔ ہدایت کار شاہد لطیف نے اتنی ہی ہنر مندی سے اسے اسکرین پر پیش کیا تھا اور کشور ساہو نے اس کردار کو ایک جیتا جاگتا زندہ جاوید کردار بنا دیا تھا۔ کشور ساہو نے بمبئی میں کئی فلمیں بطور ہدایت کار اور اداکار بنائی تھیں جن میں سے بعض کو نقادوں اور فلم بینوں نے بہت سراہا تھا لیکن وہ بہت کم اور اپنی پسند سے کام کرنے کے عادی تھے اس لیے ان کی شہرت بھی محدود ہی رہی۔

"کنوارہ باپ" ایک مزاحیہ ہلکی پھلکی فلم تھی۔ کشور ساہو کے ساتھ پریتما داس گپتا نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ نجمہ کو اس میں ایک معمولی سا کردار ملا تھا مگر یہ نجمہ کے خوابوں کے تعبیر کے سلسلے میں پہلا قدم تھا۔ ان کو یقین تھا کہ اس فلم کے بعد انہیں بہت زیادہ فلموں میں کام کرنے کا موقع ملے گا۔ یہ فلم ۱۹۴۲ء میں ریلیز ہوئی تھی مگر خاص کامیابی حاصل نہیں کر سکی لیکن اس کے باوجود انہیں فلم "الجھن" میں پھر ایک معمولی سا کردار مل گیا۔ اس فلم میں مرکزی کردار مظہر خاں اور سردار اختر نے ادا کئے تھے۔ ان دونوں فلمون کے موسیقار چندر پال تھے۔ اگلے سال انہیں پھر دو فلموں میں معمولی سے کردار کرنے کا موقع مل گیا۔ جن میں سے ایک "آگے قدم" تھی جس کے ہیرو موتی لال اور ہیروئن انجلی دیوی تھیں۔ ۱۹۴۳ء ہی میں ان کی دوسری فلم " نئی زندگی" ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں نجمہ کو سائیڈ ہیروئن کا کردار دیا گیا تھا۔ شیخ مختار اور انیس خاتون اس فلم کے مرکزی کردار تھے قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کی کہانی مکالمے اور گانے آرزو لکھنوی نے لکھے تھے۔ نجمہ نے اس کردار کو نبھانے کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دی تھیں کیونکہ انہیں یقین تھا کہ اس کے بعد انہیں ہیروئن کا مرکزی کردار ضرور مل جائے گا لیکن یہ فلم کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کر سکی جس کی وجہ سے نجمہ کی آرزو بھی پوری نہ ہوئی۔

"نئی زندگی" کے بعد نجمہ ہیروئن تو نہ بن سکیں مگر " ڈاکٹر کمار" میں انہیں ویمپ کا کردار سونپا گیا۔ یہ ایک بہت اچھا کردار تھا جسے نجمہ نے بہت اچھی طرح نبھایا تھا۔ کشور شرما جیسے شخص اس کے ہدایت کار اور مصنف تھے۔ اس وقت کی کامیاب میوزک ڈائریکٹر سرسوتی دیوی نے اس کی موسیقی بنائی تھی۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود یہ فلم زیادہ

کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

۱۹۴۵ء میں نجمہ کی دو فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئیں جن میں سے ایک ''نصیب ''اور دوسری ''پیا ملن'' تھی۔ ان دونوں فلموں میں نجمہ نے سائیڈ ہیروئن کے کردار ادا کیے تھے۔ ''پیا ملن'' کے ہدایت کار ایس ایم یوسف اور موسیقار فیروز نظامی تھے۔ ''پیا ملن'' ایک کامیاب فلم تھی۔

خدا خدا کر کے ۱۹۴۶ء میں نجمہ کو فلم ''چہرہ'' میں ہیروئن کا کردار سونپا گیا۔ اس فلم میں نجمہ نے بہت اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس سال ان کی ایک اور فلم '' حق دار'' تھی۔ اس فلم میں بھی نجمہ نے ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کے ہیرو ہریش تھے۔ رفیق رضوی اس فلم کے ہدایت کار تھے ''حق دار'' ایک ناکام فلم تھی۔

۱۹۴۷ء میں نجمہ کی تین فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ ان میں ''پروانہ'' قابل ذکر ہے جس کی موسیقی خواجہ خورشید انور نے مرتب کی تھی۔ جے کے نندہ اس کے ہدایت کار تھے۔ اس فلم میں ثریا اور سہگل مرکزی کرداروں میں تھے۔ یہ ایک نغمہ بار فلم تھی جس کی موسیقی آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔ یہ ایک کامیاب فلم تھی جس میں نجمہ نے سائیڈ ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔

اسی سال ان کی دو فلمیں ''قسم'' اور ''شاہکار'' بھی نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ '' قسم'' میں نجمہ نے پریم ادیب کے ساتھ مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ سجاد جیسے موسیقار نے اس کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ نجمہ کی اداکاری اس فلم میں بھی بہت اچھی تھی۔ ''شاہکار'' میں نجمہ نے ایک بار پھر سائیڈ ہیروئن کا کردار کیا تھا۔ اس فلم کی کہانی اور مکالمے کمال امروہوی نے اور گیت آرزو لکھنوی نے لکھے تھے۔ یہ دونوں فلمی دنیا کے بہت ممتاز اور معتبر نام تھے۔ نجمہ کی یہ فلم بھی بے حد کامیاب ثابت ہوئی مگر کیونکہ وہ اس کی ہیروئن نہیں تھیں اس لیے بطور ہیروئن وہ نمایاں نہ ہو سکیں۔ شوبھنا سمرتھ اور پریم ادیب اس فلم کے مرکزی کردار تھے۔

۱۹۴۸ء میں بمبئی میں نجمہ کی فلم ''دل کی آواز'' تھی۔ اس کے فلم ساز اور ہدایت کار کرشن چندر جیسے نامور افسانہ

نگار تھے۔اس فلم میں بھی نجمہ سائیڈ ہیروئن تھیں۔انہیں بمبئی کی فلمی دنیا سے روشناس کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔

لاہور میں بھی اس وقت فلمیں بنا کرتی تھیں مگر بمبئی فلم مرکز تھا۔بمبئی میں انہوں نے کافی تگ ودو کی اور انہیں فلم "کنوارہ باپ" میں ایک معمولی کردار مل گیا۔انہوں نے بخوشی یہ کردار قبول کر لیا کیونکہ انہیں فلمی دنیا میں داخل ہونے کے لیے ایک موقعے کی تلاش تھی اور وہ پر یقین تھیں کہ ایک بار انہیں راستہ مل گیا تو وہ اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔انہوں نے اس زمانے کے رواج کے برعکس کوئی ہندوانہ فلمی نام رکھنے کی بجائے "نجمہ" کا نام اختیار کیا اور آخر وقت تک پھر اسی نام سے جانی پہچانی گئیں۔

نجمہ ۱۹۴۸ء میں اپنے وطن لاہور واپس آئی تھیں اور بمبئی میں کی فلموں کا تجربہ بھی ساتھ لے کر آئی تھیں۔پاکستان میں فلمی صنعت اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی جدوجہد میں لڑکھڑا رہی تھی۔نجمہ نے پاکستان میں ابتدائی فلموں میں اداکاری سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا۔پاکستان میں ابتدائی فلموں میں اداکاری سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا۔پاکستان میں ان کی پہلی فلم "تیری یاد" تھی۔ستم ظریفی دیکھئے کہ بمبئی میں کئی فلموں میں کامیاب اداکاری کرنے کے باوجود پاکستان میں انہیں ایک ویمپ کا کردار دیا گیا اس فلم کی ہیروئن آشا پوسلے تھیں۔داؤد چاند اس کے ہدایت کار تھے۔دلیپ کمار کے چھوٹے بھائی ناصر خاں جو اس وقت پاکستان میں تھے اس فلم کے ہیرو تھے۔"تیری یاد" ۱۹۴۸ء میں ریلیز ہوئی تھی اور فلاپ ہو گئی تھی۔اس لحاظ سے گویا بسم اللہ ہی غلط ہوئی تھی لیکن یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی کیونکہ اس زمانے میں پاکستان کی فلمی صنعت بے سروسامانی کے عالم میں تھی اور تمام ابتدائی فلمیں ناکامی سے دوچار ہوئی تھیں۔

پاکستان میں ان کی دوسری فلم "ہچکولے" تھی جس میں انہوں نے سدھیر کے ساتھ ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔یہ فلم کئی اعتبار سے امتیازی حیثیت کی حامل تھی۔رادھیکا اس فلم کی ہیروئن اور مہندر ناتھ اس کے ہیرو تھے۔

پاکستان کا قیام عمل میں آ چکا تھا اور ہر طرف ہنگامے ہو رہے تھے۔بمبئی کے مسلمان فنکار اور ہنر مند یا تو واپس پاکستان آ گئے تھے یا پھر واپسی کے لیے پر تول رہے تھے۔نجمہ بھی اپنے وطن کی سرزمین پر واپس آنے کے لیے تیاریاں کر رہی

تھیں۔

''دل کی آواز'' بمبئی میں نجمہ کی آخری فلم تھی۔ وہ ۱۹۴۱ء میں بمبئی گئی تھیں اور ۱۹۴۸ء میں سات سال کا طویل عرصہ گزارنے کے بعد جب پاکستان واپس آئیں تو انہیں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہ تھی۔ نہ تو وہ کوئی مستند اور مقبول ہیروئن تھیں اور نہ ہی سائیڈ ہیروئن کی حیثیت سے انہیں کوئی افتخار حاصل تھا۔ وہ ایک بڑی اداکارہ بننے کی تمنا لے کر لاہور سے بمبئی گئی تھیں لیکن افسوس کہ سات سال تک طویل جدوجہد کرنے کے باوجود وہ ادھورے خوابوں کے ساتھ واپس لوٹ آئیں۔

نجمہ کون تھیں۔ کہاں کی رہنے والی تھیں۔ فلمی دنیا میں کیسے آئیں؟

ان کا اصلی نام نسیم تھا۔ وہ ۱۹۲۲ء میں لاہور میں ایک معزز اور خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں۔ وہ اپنے والد عبدالرشید کی لاڈلی تھیں جو ان کی کوئی خواہش نہیں ٹالتے تھے۔ انہیں انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم دلائی گئی تھی۔ وہ ایک شائستہ گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں اور بہت اچھے ماحول میں انہوں نے تربیت حاصل کی تھی۔ وہ ایک خوش جمال، خوش اخلاق اور خوش کلام لڑکی تھیں۔ نسیم کو بچپن ہی سے اداکاری اور رقص و موسیقی کا شوق تھا۔ ان کے اس شوق کے پیش نظر ان کے والد نے انہیں بمبئی جا کر فلمی صنعت میں قسمت آزمائی کرنے کی اجازت دے دی۔ انہیں جس پہلی فلم میں ایک معمولی کردار ملا وہ ہدایت کار کشور ساہو کی ہلکی پھلکی فلم ''کنوارہ باپ'' تھی۔ وہی اس کے ہدایت کار تھے۔ پرتما داس گپتا اس کی ہیروئن تھیں۔ یہ فلم ۱۹۴۲ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ان کا فلمی نام نجمہ رکھا گیا تھا کیونکہ نسیم بانو کے نام سے ایک ہیروئن پہلے ہی موجود تھی۔ اس طرح انہوں نے ۱۹۴۱ء میں فلمی دنیا میں قدم رکھا تھا۔

نجمہ کی دوسری فلم ''الجھن'' تھی۔ اس میں بھی انہیں معمولی سا کردار ملا تھا مگر خوشگوار مستقبل کی آس میں وہ ہر فلم میں کام کرتی رہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ''آگے قدم'' میں کام کیا۔ جس کے ہیرو موتی لال اور ہیروئن انجلی دیوی تھیں۔ ۱۹۴۳ء میں ان کی ایک اور فلم ''نئی زندگی'' بھی نمائش کے لیے پیش کی گئی جس کے مصنف اور نغمہ نگار آرزو

لکھنوی تھے۔ شیخ مختار اس فلم کے ہیرو تھے۔ نجمہ نے اس فلم میں بہت اچھا کام کیا تھا۔اس کے بعد انہوں نے معاون اداکاروں کی حیثیت سے ''ڈاکٹر کمار'' میں ایک نفسیاتی کردار ادا کیا۔کشور ساہو اس کے ہدایت کار تھے۔آنے والے سالوں میں ''پیا ملن''، '' چہرہ'' اور ''مقدار'' شامل تھیں۔ہیروئن کی حیثیت سے ''چہرہ'' ان کی پہلی فلم تھی کمل زمیندار اس میں ہیرو تھے۔اب وہ ہیروئن بن چکی تھیں۔''حق دار''، ''پروانہ'' اور ''قسم'' میں بھی انہوں نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔یہ فلمیں ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز سال میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھیں۔ بمبئی میں ان کی ایک اور فلم ''شاہکار'' تھی۔ان کی بہترین اور کامیاب ترین فلم ''پروانہ تھی جس میں مرکزی کردار ثریا اور سہگل نے ادا کیے تھے۔خواجہ خورشید انور نے اس فلم کی ناقابل فراموش دھن بنائی تھیں۔''قسم'' بھی ان کی کامیاب فلم ثابت ہوئی تھی۔۱۹۴۸ء میں ممبئی میں ان کی آخری فلم ''دل کی آواز'' کی ریلیز کے بعد وہ پاکستان چلی آئیں۔

پاکستان میں انہوں نے '' تیری یاد'' میں ایک دلچسپ کردار ادا کیا تھا۔یہ نئے ملک میں ان کی فلمی زندگی کا آغاز تھا۔ آشا پوسلے اس کی ہیروئین اور ناصر خاں (دلیپ کمار کے بھائی) اس فلم کے ہیرو تھے۔دوسری فلم ''ہچکولے'' میں انہوں نے یادگار کردار ادا کیا تھا۔اس کے مصنف اور گیت نگار سیف الدین سیف تھے۔ماسٹر عنایت حسین اس کے موسیقار تھے۔اس کے فلم ساز شیخ محمد حسین اور ہدایت کار داؤد چاند تھے۔یہ فلم ۱۹۴۹ء میں ریلیز ہوئی تھی۔انتہائی خوبصورت اور دلکش موسیقی کے باوجود یہ فلم فلاپ ہوگئی۔''ہچکولے'' کے چند گانے آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔

میں پیار کا دیا جلاتا ہوں

تم چپکے چپکے، چپکے سے آنا

اس کا سب سے مقبول نغمہ تھا۔

گویا پاکستان میں بھی نجمہ نے ناکامیوں سے ہی آغاز کیا تھا۔

۱۹۵۰ء میں ان کی فلم ''ہماری بستی'' نمائش کے لیے پیش کی گئی۔اس کے مکالمے فاروق علی خاں نے اور کہانی مصنف واداکار شیخ اقبال نے لکھے تھے۔ایک نئے ہیرو کو اس فلم کے مرکزی رومانی کردار کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ مشکور قادری اس کے ہدایت کار اور مصنف تھے۔فیروز نظامی نے اس کی موسیقی بنائی تھی۔گیت مشیر کاظمی نے لکھے تھے۔یہ فلم بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے باوجود نجمہ نے حوصلہ نہیں ہارا۔وہ اس طویل سفر کے بعد بھی تازہ دم تھیں اور نئے نئے تجربات کرنے پر آمادہ تھیں۔

اس دوران انہیں ایک پنجابی فلم میں کام کرنے کا موقع ملا۔اس کا نام ''بلو'' تھا۔نجمہ بذات خود پنجابی تھیں۔پنجابی ان کی مادری زبان تھی اس کے باوجود '' بلو'' سے پہلے انہوں نے کسی پنجابی فلم میں کام نہیں کیا تھا۔حسن اتفاق دیکھئے کہ یہ پنجابی فلم ہی ان کی بہترین اور کامیاب ترین فلم ثابت ہوئی۔

اس زمانے میں پنجابی فلمیں مار دھاڑ سے محفوظ تھیں۔ہلکی پھلکی میوزیکل، مزاحیہ اور رومانی فلمیں بنا کرتی تھیں۔ ''بلو'' بھی ایک ایسی ہی دلچسپ اور طربیہ فلم تھی۔

اگرچہ یہ نجمہ کی پہلی اور آخری پنجابی فلم تھی لیکن اس کے باوجود اسی فلم کے ذریعے انہوں نے ایک بہترین اداکارہ کی حیثیت سے خود کو منوایا تھا۔ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ان کی خواہشوں اور کوششوں کا نقطہ عروج تھا۔اس فلم کے ہیرو درپن تھے۔اس زمانے میں اپنے اصلی نام عشرت کے نام سے اداکاری کرتے تھے۔وہ ایک خوب رو اور پرکشش نوجوان تھے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں عشرت فلمی دنیا کے ایک بڑے اداکار تھے۔ان کے بڑے بھائی موسیٰ رضا عرف سنتوش کمار نے ابھی کامیابیوں کا سفر شروع نہیں کیا تھا۔بابا چشتی نے اس فلم کی موسیقی ترتیب دی تھی۔اس فلم کی کہانی گاؤں کے میراثیوں سے تعلق رکھتی تھی۔یہ ایک بے حد دلچسپ، شگفتہ اور برجستہ مکالموں سے آراستہ فلم تھی۔بلو سے پہلے اس کا نام مراثی رکھا گیا تھا۔لیکن بعد میں تبدیل کر کے ''بلو'' کر دیا گیا۔اس فلم میں نجمہ کی اداکاری کو بہت سراہا گیا۔یہ ایک اوسط درجے کی کامیاب فلم تھی۔اس دور میں بھارت سے اعلیٰ درجے کی اردو

اور پنجابی فلمیں درآمد ہوا کرتی تھیں۔ جن کے مقابلے میں پاکستان کی نو آموز فلموں کی کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ یہ فلم ۱۹۵۱ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔

اس کے بعد نجمہ نے فلم ”ہرجائی“ میں کام کیا۔ بمبئی سے آئے ہوئے اداکار مسعود اس فلم کے ہیرو تھے۔ استاد فتح علی خاں نے اس کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ یہ فلم ۱۹۵۲ء میں ریلیز ہوئی اور ناکامی سے دوچار ہوگئی۔

اب نجمہ کو فلموں میں کام کرتے ہوئے لگ بھگ گیارہ برس گزر چکے تھے۔ اس دوران میں انہوں نے بمبئی اور لاہور میں مختلف اداروں میں مختلف ہدایت کاروں اور اداکاروں کے ساتھ کام کیا تھا لیکن پھر بھی اپنی دلکش شخصیت اور معیاری اداکاری کے باوجود وہ صف اول کی ہیروئن نہیں بن سکیں۔

پاکستان کے معروف فلم ڈسٹری بیوٹر اور اسٹوڈیو اونر باری ملک نے ان سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ باری ملک ایک کامیاب اور خوب صورت نوجوان تھے۔ فلمی دنیا میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ بعد میں انہوں نے پاکستان کا سب سے بڑا فلمی نگار خانہ باری اسٹوڈیو بنایا تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت خوش نصیب آدمی تھے۔ مٹی کو بھی ہاتھ لگاتے تو سونا بن جاتی تھی۔ آگے چل کر وہ پاکستان کی فلمی صنعت کے معماروں میں شمار ہوئے۔ انہوں نے یکے والی اور یار بیلی جیسی کامیاب ترین پنجابی فلمیں بنائی تھیں۔

نجمہ اور باری ملک کی شادی ایک کامیاب شادی تصور کی جاتی تھی۔ وہ تین بیٹوں اور ایک بیٹی کے والدین تھے۔ تمام بچے خوب صورت اور ذہین تھے لیکن بدقسمتی سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں میں اختلافات پیدا ہونے لگے۔ اس کا بڑا سبب باری ملک کا لاابالی پن اور رومان پسند طبیعت تھی۔ ان کا نام کئی ایکٹریسوں کے ساتھ منسوب ہوتا رہا اور کئی ہیروئنوں سے ان کے مراسم کی کہانیاں اسکینڈلز کی صورت میں سامنے آئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ گھریلو اختلافات پیدا کرنے کے اسباب بن گئے۔ نجمہ اور باری ملک میں فاصلے بڑھتے رہے۔

اس داستان کا کلائمکس اس وقت ہوا جب باری صاحب نے اداکارہ سلونی سے شادی کرلی اس رومان کا آغاز بھی حسب

معمول ہلکے پھلکے انداز میں ہوا تھا لیکن سلونی نے اس دل لگی کو دل سے لگالیا۔ وہ باری ملک کی محبت بلکہ عشق میں گرفتار ہوگئیں۔ باری صاحب ان سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں تھے مگر جب سلونی نے کئی بار خودکشی کرنے کی کوشش کی اور کسی صورت بھی اپنی ہٹ سے باز نہ آئیں تو باری ملک ان سے شادی کرنے پر مجبور ہوگئے۔

باری صاحب کے لڑکے اب جوان ہوچکے تھے اور اس جھگڑے میں اپنی ماں کے ہمنوا تھے۔ یہ گھریلو جھگڑے وقت کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کرتے گئے یہاں تک کہ باری ملک اپنا لاہور کا پھلتا پھولتا کاروبار اور وسیع اسٹوڈیو چھوڑ کر دبئی چلے گئے اور وہیں مستقل رہائش اختیار کرلی۔ لاہور بھی وہ گاہے بگاہے آتے رہے۔ اپنے دوسرے بیٹے فرخ باری کی شادی انہوں نے لاہور میں بہت دھوم دھام سے کی تھی جس میں فلمی صنعت کے ممتاز افراد نے شرکت کی تھی۔ باری ملک اور سلونی دو بیٹیوں کے والدین ہیں۔ اگرچہ وہ پہلی سی تلخی ہوگئی تھی لیکن تعلقات میں جو دراڑ پڑ گئی تھی وہ کسی طرح پر نہ ہوسکی۔ باری ملک نے مستقل طور پر جلا وطنی اختیار کرلی۔

اور پھر کچھ عرصے قبل نجمہ بھی علالت کے بعد لاہور میں انتقال کر گئیں۔ ۱۹۵۲ء میں "ہرجائی" کے بعد انہوں نے فلمی دنیا کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ یہاں تک کہ فلمی تقریبات میں بھی شرکت نہیں کرتی تھیں۔ وہ ایک خالص گھریلو خاتون بن کر رہ گئی تھیں۔ افسوس کہ اس کے باوجود وہ اپنے گھر کو بکھرنے اور ٹوٹنے سے نہیں بچا سکیں۔

نجمہ سے ہماری ملاقات باری صاحب سے ان کی شادی سے پہلے ہوئی تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ادب اور شاعری سے انہیں دلچسپی تھی۔ اچھے اشعار برمحل پڑھتی تھیں تو بہت حیرت ہوئی تھی کیونکہ ایک اداکارہ سے اس کی توقع نہیں کی جاتی تھی۔

نجمہ سے ہماری صرف ایک ملاقات ہوئی تھی جب ہم نے روزنامہ " آفاق" کے فلمی ایڈیشن کے لیے ان سے انٹرویو لیا تھا۔ اس بات چیت میں فلموں سے زیادہ ادب اور شاعری کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ سعادت حسن منٹو

صاحب کی وہ بہت بڑی مداح تھیں۔ منٹو صاحب کے بارے میں انکا ایک فقرہ ہمیں آج تک یاد ہے انہوں نے کہا تھا

”منٹو کے افسانے۔۔۔پڑھ کر امرتسر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔وہ چلتا پھرتا امرتسر تھے۔“

ہم لوگ آئے دن پاکستانی فلموں کے پست معیار کا رونا روتے رہتے ہیں اور سچ پوچھیئے تو بجا طور پر روتے ہیں مگر ہمارے ہاں فلمی صنعت کے زوال اور پست معیاری کے اسباب دوسرے ملکوں کے مقابلے میں قدرے مختلف ہیں مثلاً بھارتی فلمی صنعت کو دیکھ لیجئے۔وہاں آج پہلے سے زیادہ تعلیم یافتہ،ذہین اور ہنر مند لوگ فلمی صنعت سے وابستہ ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے لوگ بھی پرانی بھیڑ چال پر کیوں گامزن ہیں اور ایک ہی قسم کی فضول اور واہیات فلمیں کیوں بناتے ہیں جبکہ وہاں نہ سرمائے کی کمی ہے اور نہ ہی صلاحیتوں کی۔نئے چہرے وہاں کسی خاص کوشش کے بغیر ہی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ نئی نئی ہیروئنیں،نئے نئے ہیرو آئے دن فلموں میں نظر آتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان میں سے اداکار اور اسٹار بننے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔اس کے برعکس ہمارے ہاں نئے چہرے تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتے۔آج بھی وہی ڈھائی ہیرو اور ڈھائی ہیروئنیں ہیں حالانکہ یہ ماڈرن دور ہے۔ماڈلنگ،شوبزنس میں کام کرنا، ناچنا گانا اور ٹی وی یا فلموں میں اداکاری کرنا معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا پھر بھی کام کے لوگ ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔اچھی فلمیں نہ بنائے جانے اور اچھے ماحول کے فقدان کی وجہ سے معقول شائستہ اور تعلیم یافتہ افراد فلمی صنعت کا رخ نہیں کرتے پھر معیاری اردو فلمیں اتنی کم تعداد میں بن رہی ہیں اور انہیں بنانے والے بیشتر فلم ساز وہدایتکار ایسے ہیں کہ ان کے ساتھ کام کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔چنانچہ تعلیم یافتہ نوجوان اس گندگی میں اچھے مستقبل کی جستجو میں عمریں گزار دینے کے بجائے دوسرے شعبوں کا انتخاب کرتے ہیں۔

رہ گئیں ہیروئنیں اور ماڈلز تو ان کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن بدقسمتی سے ان کی اکثریت اداکاری سے نابلد ہوتی ہے۔ چہرے مہرے کے اعتبار سے بھی ان میں ہیروئنوں جیسی صفات نہیں ہوتیں۔ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اب بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں حرام کی دولت کی فراوانی کے باعث ذرا سی بھی خوش شکل لڑکیوں کو روپے پیسے کی کمی نہیں رہتی۔گمنام ماڈل لڑکیاں تک کوٹھیوں میں رہتی ہیں۔ قیمتی کاروں میں گھومتی ہیں۔کئی کئی موبائل ٹیلی فون اور سیکرٹری ساتھ رکھتی ہیں اور ان موبائلز کی گھنٹیاں ہر وقت بجتی رہتی ہیں۔خدا جانے انہیں کون سے کاروبار اور

ضروری فرائض سرانجام دینے ہوتے ہیں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی کسی وقت خاموش ہی نہیں ہوتی۔ جس کے بارے میں پوچھو تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈیفنس کے پوش علاقے میں رہائش ہے۔ ان لڑکیوں کے پاس دولت اور آسائشوں کی ریل پیل کے اسباب آپ اور ہم سب جانتے ہیں۔ ان ہی میں سے اگر کوئی با صلاحیت نکل آئے تو اس کے عشاق اور طلب گاروں کی تعداد اور بڑھ جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب محنت کیے بغیر ہی دولت اور دنیا بھر کی سیر ہاتھ آجائے تو اداکاری میں محنت کون کرے۔ لہٰذا ہماری ہیروئنوں کو فلموں میں اداکاری کے معیار یا فلموں کے حصول کے بارے میں کوئی پروا نہیں ہوتی اسی لیے ان کا اداکاری کا معیار کبھی بلند نہیں ہوتا۔ ان کے پاس دولت کمانے کے دوسرے ذرائع بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ فلم ٹی وی یا ماڈلنگ ان کے لیے محض پبلسٹی کا ایک ذریعہ ہے جو انہیں مفت اور فراوانی سے مل جاتی ہے۔ اس پبلسٹی کے سہارے وہ دولت کمانے کے دوسرے ذرائع آسانی سے تلاش کر لیتی ہیں۔ اچھی باصلاحیت اداکارائیں بھی اس تن آسانی اور بلا محنت کی دولت حاصل ہو جانے کے باعث اسکرین اور اچھی فلموں سے بے تعلق اور بے نیاز ہی نظر آتی ہیں۔ کم از کم بھارتی فلمی صنعت میں یہ صورت حال نہیں ہے۔ مغربی ملکوں اور ہالی ووڈ میں تو اس کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی معمولی ملازمتوں اور محنت مزدوری پر گزارہ کرتی نظر آتی ہے۔

ہالی ووڈ کے مسائل مختلف ہیں۔ وہاں یہ سب کچھ نہیں ہے لیکن پھر بھی معیاری فلمیں وہاں بھی بہت کم ہی بنائی جاتی ہیں۔ جو معیاری کہلاتی ہیں وہ بھی پرانے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ دراصل زمانے کے ساتھ مغرب کے فلم بینوں کے معیار بھی بدل گئے ہیں۔ مار دھاڑ، قتل و غارت، اچھل کود، جرائم کی مانگ ہے اس لیے ایسی ہی سنسنی خیز فلمیں بنائی جاتی ہیں جسے ہمارے موسیقاروں کی زبان میں رس اور مٹھاس سے عاری کہا جاتا ہے۔ جیسی فلموں کی دنیا بھر میں مانگ ہے۔ ہالی ووڈ کے فلم ساز ویسا ہی مال بنا بنا کر دنیا بھر میں بھیج رہے ہیں ظاہر ہے کہ انہیں تو دولت کمانے سے سرو کار ہے۔ اس کے باوجود وہاں اچھی معیاری فلمیں بن جاتی ہیں۔ اگرچہ بہت کم تعداد میں بنائی جاتی ہیں انہیں فلمی میلوں میں انعامات و اعزازات سے بھی نوازا جاتا ہے۔ اس طرح آمدنی کی کمی دوسرے طریقوں سے پوری ہو جاتی

ہے۔اور فلم ساز کی اشک شوئی ہو جاتی ہے۔

کافی عرصہ ہو گیا سینما گھر میں گئے ہوئے۔ کوئی اچھی فلم بھولے بھٹکے آجاتی ہے تو سینما گھر کی حالت زار، گندگی اور فلم بینوں کی بدتہذیبی راہ میں دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے اب بتایئے کہ ان حالات میں سینما گھر میں جا کر فلم کیسے دیکھی جائے؟

پچھلے دنوں جیمز بونڈ کی نئی فلم ''ڈائی این ادر ڈے'' نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ جیمز بونڈ کی فلموں میں سر پیر اور منطق نہ سہی کم از کم خوب صورت مناظر، حیرت انگیز کمالات اور جدید ترین ٹیکنالوجی کے مظاہر ضرور نظر آجاتے ہیں۔ایسی فلمیں سینما گھروں میں ہی دیکھی جا سکتی ہیں اور مزہ دیتی ہیں چھوٹے اسکرین پر ان کے کرتب، کمالات اور ہنگامہ خیزی کا وہ لطف نہیں آتا جو سینما کے کشادہ اسکرین پر آتا ہے۔ یہ فلم لاہور میں نسبتاً ایک اچھے سینما میں لگی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ صرف ایک ہی سینما میں اس نمائش ہو رہی ہے اور سارے شہر کے زندہ دل اسی پر ٹوٹے پڑے ہیں ایسے ہجوم میں اور طوفان بدتمیزی میں فلم دیکھنے کا خاک مزہ آئے گا۔ چنانچہ رش کم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں رش کم ہونے کی اطلاع فلم کے سینما سے چلے جانے کے بعد ملے جیسا کے عام طور پر ہوتا ہے۔

پرانے وقتوں کے لوگ پرانی باتوں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ دراصل ماضی ہر ایک کو اچھا لگتا ہے۔ ہر زمانے کا یہی دستور رہا ہے کہ ماضی کے دھندلکوں سے چھن کر جو یادیں اور تصویریں ذہن کے پردے پر آتی ہیں وہ بہت اچھی اور خوب صورت لگتی ہیں لیکن کم از کم پرانی فلموں کی حد تک یہ اصول اتنا بر محل نہیں معلوم ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کل جس قسم کی فلمیں بنائی جاتی تھیں، جس قسم کی کہانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ جتنے اچھے اداکار اور اداکارائیں تھیں جو خوب صورتی اور اداکاری دونوں میں اپنی مثال آپ تھیں جیسے ہنر مند، ذہین اور تخلیلات سے مالا مال ہنر مندوں کی بہتات تھی وہ اب آنکھوں کا سرمہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اب تو اداکاری اور حسن کا معیار ہی بدل گیا ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ پرانی فلمیں اور پرانے فنکاروں کو دیکھ کر آج کی نسل بھی انہیں پسند کرنے اور داد دینے پر

مجبور ہو جاتی ہے کیسے کیسے دلچسپ اور انوکھے موضوعات پر فلمیں بنائی جاتی تھیں اور کس قدر خوب صورتی سے فلمائی جاتی تھیں کہ دیکھنے والے ہمیشہ نئ فلموں کی آمد کے منتظر رہا کرتے تھے۔

باکس آفس اسٹار اسی زمانے میں ہوتے تھے۔ان کا نام ہی ان کے مداحوں کو کھینچ کر سینما گھروں میں لے جاتا تھا۔فلم اچھی ہو یا نہ ہوا پنے اپنے فنکاروں کے فن سے وہ ضرور لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ہر اداکار،اداکارہ اور ہدایت کار کے بارے میں لوگ جانتے تھے کہ ان کی فلم کیسی ہو گی اور بہت حد تک ان کی توقعات پوری بھی ہو جاتی تھیں۔

اس سال ۲۰۰۳ء میں پاکستان میں ویلنٹائن ڈے بھی بہت زور وشور سے منایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ آنے والے سالوں میں اس رجحان میں مزید اضافہ ہو گا۔ہم نے ویلنٹائن ڈے کا تذکرہ پہلی بار امریکا میں سنا تھا جب ہم وہاں جا کر رہے تھے۔کون جانتا تھا کہ ماہ و سال کی گردش تمام مغربی رسومات اور روایات کو ایک دن ہمارے دروازے پر لے آئے گی۔جس امریکی سے بھی ہم نے ویلنٹائن ڈے کے بارے میں معلوم کیا اس نے اپنے مخصوص لب ولہجے میں ایک لمبی تقریر کر دی۔خلاصہ اس کا ہم نے یہ نکالا کہ یہ دن سینٹ ویلنٹائن کی یاد میں منایا جاتا ہے جو محبت کے پیامبر تھے۔ان کی یاد میں اس روز پرانی محبتوں کو تازہ کیا جاتا ہے اور نئ محبتوں کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے۔اس روز ہر شخص اپنی محبوب شخصیت سے کہتا ہے کہ ''آئی لویو'' اور تحفے میں پھول دیتا ہے۔ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اظہار محبت اور محبت کرنے والے کے لیے صرف ایک ہی دن مخصوص کیوں ہے اور زبان سے یہ کہنا کیوں لازمی ہے کہ ''آئی لویو۔'

دیکھا جائے تو اب مغرب میں پیار محبت وقتی مشغلہ اور جنسی ضرورت تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں اس لیے ان کی زبان سے ''محبت'' کا لفظ سن کر ہنسی سی آجاتی ہے۔ جہاں تک ''آئی لویو'' کہنے کا تعلق ہے تو یہ سلسلہ تو سارے سال چلتا رہتا ہے لیکن عموماً یہ محبت چند روز سے زیادہ قائم نہیں رہتی۔

ہم لوگ تو سچ مچ محبت کرنے والے لوگ ہیں۔پیار، خلوص،ایثار، عشق و محبت اس سرزمین کی مٹی میں شامل ہے۔

جبکہ امریکا اور یورپ والوں کی محبت صرف ''آئی لو یو'' کہنے تک محدود ہے اور اس کی مدت بھی ہفتوں مہینوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔

ویلنٹائن ڈے سے برصغیر اور ہالی ووڈ کی رومانی فلموں کا خیال آگیا۔ یہ عجب تماشا ہے کہ جس طرح پاکستان اور ہندوستان والے بیتے زمانے کو سنہری دور کہتے ہیں اسی طرح امریکا کے پرانے لوگ بھی گئے دنوں کی فلموں کو سنہرے دور سے ہی یاد کرتے ہیں۔ گون ود دی ونڈ، کاسابلانکا، ربیکا، این افیئر ٹو ریمبر، سن فلاور۔۔۔ کتنی فلموں کے نام گنائے جائیں۔ یہ سب رومانی فلمیں تھیں اور ان کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ آئیے اس وقت چند ایسی ہالی ووڈ کی فلموں کا ذکر ہو جائے۔

''سابرینا'' ہدایت کار و مصنف بلی وائلڈر کی بہت خوب صورت فلم تھی۔ یہ ۱۹۵۴ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں آڈرے ہیپ برن ہیروئن تھیں۔ جو ایک لکھ پتی کے بیٹے ڈیوڈ کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھیں۔ مشکل یہ تھی کہ ڈیوڈ کی منگنی اس کے ڈیڈی نے ایک لکھ پتی کی بیٹی سے کر رکھی تھی۔ یہ منگنی دراصل کاروباری منگنی تھی۔ اس قسم کی رومانی فلمیں ایک زمانے میں برصغیر میں بھی کافی تعداد میں بنا کرتی تھیں۔ غریب لڑکی یا غریب لڑکے کی امیر خاندان کے لڑکے یا لڑکی سے محبت، ماں باپ اور دوسرے لوگوں کی طرف سے رکاوٹیں، کبھی ان کہانیوں کا انجام ہنسی خوشی ہوتا تھا۔ کبھی المناک۔ اس فلم میں ڈیوڈ کے والدین اس کے چھوٹے بھائی کو اس مشن پر روانہ کرتے ہیں کہ وہ سابرینا کی توجہ ڈیوڈ کی طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مبذول کر لے۔ آپکو اس کہانی سے اور بھی کئی کہانیاں یاد آگئی ہوں گی۔ کہنے کو یہ ایک عام سی کہنی ہے لیکن اسکرین پلے، ہدایت کاری اور اداکاری نے اسے ایک نیا رنگ اور تاثر دے دیا تھا۔ یہ خوب صورت رومانی فلم جس نے بھی دیکھی ہے کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔

ایک بہت پرانی فلم ''لو افیئر'' تھی۔ یہ پہلی بار ۱۹۳۹ء میں بنائی گئی تھی مگر اس کے بعد بھی کئی بار بنائی گئی۔ یہ بہت خوب صورت اور پر اثر فلم تھی مگر '' گون ود دی ونڈ'' جیسی بھاری بھر کم فلموں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی تھی اس لیے بہت زیادہ شہرت حاصل نہ کر سکی۔ اس کہانی کو کئی بار بنایا گیا کیونکہ یہ ایک دلوں کو چھو لینے والی کہانی تھی۔ یہ تازہ

ترین کوشش اداکارو ہدایت کاروارن بیٹی نے بنائی تھی مگر اسے ''مون'' کے نام سے بنایا گیا تھا۔اس کی کہانی بھی سادہ سی تھی۔فرانس کے معروف اداکار چارلس بوائراور آئرین ڈونے اس میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔

کہانی یہ ہے کہ یہ دونوں قطعی اجنبی لوگ جب اتفاق سے ملے تو رفتہ رفتہ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوگئے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس سے پہلے وہ دونوں ہی کہیں اور منگنی کر چکے تھے۔اس زمانے میں منگنی کو ہمارے معاشرے کی طرح وہاں بھی کافی اہمیت دی جاتی تھی۔یہ دونوں ایک پر آسائش بحری جہاز میں ہم سفر کی حیثیت سے ملے تھے لیکن کیوپڈ کے تیر کا شکار ہوگئے۔فیصلہ یہ ہوا کہ سفر ختم ہونے کے چھ ماہ بعد وہ نیویارک کی ایمپائر اسٹیٹ بلڈ نگ میں ملیں گے اور اگر اس وقت تک ان کی محبت اسی بھرپور انداز میں قائم رہی تو وہ اپنی اپنی منگنی توڑ کر آپس میں شادی کرلیں گے لیکن اتفاقات وحادثات نے ان کے اس منصوبے کو مکمل نہ ہونے دیا پھر کیا ہوا یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

بالکل اس قسم کی کہانی پر مبنی ایک فلم ''این افیئر ٹو ریمبر'' بھی تھی۔اس میں مرکزی کردار کیری گرانٹ اور ڈیبورا کار نے بہت خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔وہی بحری جہاز تھا۔وہی منگنی شدہ کردار تھے جو اپنے اپنے منگیتروں سے ملنے کے لیے نیویارک جارہے تھے۔دو اجنبی اسی طرح رفتہ رفتہ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوگئے اور پھر اسی وعدے پر بچھڑے کے ایک مقرر وقت کے بعد مقررہ جگہ ملاقات کریں گے۔اگر محبت کی شدت اسی طرح قائم رہی تو وہ شادی کرلیں گے۔ کیری گرانٹ مقررہ وقت پر پہنچ گئے اور رات گئے تک انتظار کرکے مایوس واپس لوٹے سمجھے کہ اس کی محبت سچی نہیں تھی۔وہ مجھے بھول گئی ہے۔کچھ عرصے بعد دونوں کی اتفاقاً ملاقات ہوگئی تو کیری گرانٹ نے سرد مہری سے بے وفائی کا طعنہ دیا۔یہ بعد میں معلوم ہوا کہ ہیروئین ایک حادثے کا شکار ہوکر ٹانگوں سے معذور ہوچکی تھی لیکن کیری گرانٹ نے اپنے کھوئے ہوئے پیار کو اپنا لیا۔ اس کہانی سے متاثر ہوکر ہندوستان اور پاکستان میں کئی فلمیں بنائی گئیں تھیں اور کامیاب بھی ہوئی تھیں۔جذبہ وہی محبت کا تھا مگر انداز پیشکش اور اداکاری کا حسن مختلف تھا اس لیے دونوں فلموں نے بے پناہ کامیابی حاصل کی تھی۔

ستر کی دہائی میں ایک فلم ''لو اسٹوری'' بھی آئی تھی۔یہ ایک ناول سے اخذ کی گئی تھی۔اس میں نئے اداکاروں کو منتخب

کیا گیا تھا۔ کہانی یہ تھی کہ نو عمر ہیرو اور ہیروئن کالج میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ ہیروئن غریب ہے جبکہ ہیرو کا باپ انتہائی دولت منداور مغرور ہے۔ باپ بیٹے کے مابین بھی تکلفات کا رشتہ موجود ہے۔ سارے فیصلے باپ کرتا ہے، ہیروئن کو باپ کی طرف سے شدید مخالفت کی توقع ہے مگر ہیرو کا کہنا ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی پہلی اور آخری فرمائش نہیں ٹالیں گے مگر وہی ہوا جو ہیروئن نے کہا تھا۔ دونوں نے باپ کی مرضی کے خلاف شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا حالانکہ اس صورت میں ہیرو کو باپ کی تمام دولت سے محروم ہو جانا تھا۔ ایک بے تکلف ہمزاد دوست کے ساتھ وہ شادی کی غرض سے پادری صاحب کی تلاش میں نکلے مگر کار حادثے کا شکار ہو گئی۔ ہیرو کئی دن تک بے ہوش رہا۔ ہیروئن کا چہرہ جھلس کر مسخ ہو گیا۔ دولت مند باپ نے سرمایہ خرچ کر کے اسپتال والوں کو ساتھ ملا لیا اور ہوش آنے پر ہیرو کے سوال پر بتایا گیا کہ ہیروئن حادثے میں ہلاک ہو چکی ہے۔ ہیرو کا دل کسی طرح یہ ماننے کو تیار نہ تھا۔ ادھر دولت مند باپ نے دھمکیوں اور لالچ کے ذریعے ہیروئن کو ہیرو کی زندگی سے نکل جانے پر آمادہ کر لیا اور کافی روپیہ خرچ کر کے اس کی پلاسٹک سرجری بھی کروادی۔ اس کے بعد کی کہانی خاصی طویل دلچسپ اور سسپنس سے پر ہے۔ آخر میں دونوں نے ایک دوسرے کو پا لیا۔ یہ بہت خوب صورت فلم تھی جسے پاکستان اور انڈیا میں مختلف تبدیلیوں کے ساتھ فلمایا گیا۔ شباب کیرانوی کی فلم ''میرا نام ہے محبت'' بھی اسی سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھی۔ اس میں ایک نیا فلمی جوڑا (غلام محی الدین اور بابرہ شریف) متعارف کرایا گیا تھا۔ اس فلم نے ریکارڈ ساز کامیابی حاصل کی تھی۔

ایک دلچسپ فلم ''برنگنگ دی بے بی'' بھی تھی۔ یہ ایک رومانٹک کامیڈی تھی۔ آڈرے ہیپ برن اور کیری گرانٹ اس میں مرکزی کردار تھے۔ کہتے ہیں کہ ایسی خوب صورت کامیڈی پھر نہیں بنی جس میں تمام وقت فلم بین ہنستے ہنستے پاگل ہو جاتے تھے۔ آڈرے ہیپ برن اس فلم میں ایک دولت مند شخص کی وارث تھیں۔ بے حد مغرور اور نخریلی۔ بے بی اس کے پالتو چیتے کا نام تھا جو اس کا بہت لاڈلا تھا۔ ہیروئن کو ایک ایسے شخص سے محبت ہو گئی جو غیر حاضر دماغ تھا اور محبت میں اسے قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ آڈرے ہیپ برن اسے حاصل کرنے کو اپنی ضد بنا لیتی ہے اور اسے نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے حالانکہ نیت نیک ہے۔ اس فلم کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس سے پہلے یہ

دونوں فنکار سنجیدہ ڈرامائی کردار کرنے کے لیے مشہور تھے اس لیے یہ کامیڈی فلم بینوں کے لیے مزید دلچسپ بن گئی تھی۔ان دونوں کرداروں اور دلچسپ واقعات نے اس کو ایک انوکھی اور یادگار فلم بنادیا تھا

کیری گرانٹ نے بعد میں ''منکی بزنس'' میں بھی کامیڈی کردار بہت خوب صورتی سے کیا تھا۔یہ بھی ایک رومانی کہانی تھی مگر باانداز دگر۔

''رومن ہالی ڈے'' ایک ایسی فلم ہے جسے دیکھنے والے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔اس کی کہانی اگرچہ برطانیہ کی شہزادی مارگریٹ کے کردار سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی مگر مصنف نیا سے ایک نادر اور بالکل اچھوتی فلم بنادیا تھا۔ گریگری پیک نے اسمیں ایک امریکی صحافی کا کردار ادا کیا تھا آڈرے ہیپ برن کی یہ پہلی فلم تھی اور اس میں انہوں نے بہترین اداکارہ کے طور پر آسکر ایوارڈ حاصل کیا تھا۔وہ ایک ریاست کی شہزادی کے کردار میں روم کے سرکاری دوسرے پر آتی ہیں مگر شاہی ادب آداب اور پابندیوں سے اکتائی ہوئی ہیں۔ایک رات خواب آور گولیاں کھلانے کے بعد ملازمہ انہیں سلادیتی ہے مگر وہ رات گئے موقع پاکر سادہ سے لباس میں محل سے باہر نکل جاتی ہیں ان کی ملاقات ہیرو گریگری پیک سے ہوتی ہے جو مہمان شہزادی سے انٹرویو حاصل کرنے کی فکر میں ہے مگر جب شہزادی اس حلیے میں اسے ملتی ہے تو وہ اسے نہیں پہچانتا اور نشے کی عادی لڑکی سمجھ کر محض سہارا دینے کی خاطر اپنے فلیٹ پر لے آتا ہے۔ صبح اجالے میں شہزادی کی تصویر دیکھ کر وہ اسے پہچان لیتا ہے مگر اس پر ظاہر نہیں کرتا۔اپنے فوٹو گرافر دوست کی مدد سے وہ شہزادی کو سارے روم کی سیر کراتا ہے اور فوٹو گرافر سگریٹ لائٹر جیسے کیمرے سے تمام تصاویر بناتا رہتا ہے۔ ادھر شہزادی کا عملہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ہیرو آخر تک ظاہر نہیں کرتا کہ وہ شہزادی کو پہچان گیا ہے اور نہ ہی شہزادی اسے اپنی اصلیت بتاتی ہے۔

یہ ایک دن شہزادی کے لیے اس لیے بھی یادگار ہے کہ اس نے شاہی پابندیوں سے آزاد ایک عام لڑکی جیسی زندگی گزاری ہے۔غیر محسوس طریقے پر دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں مگر شاہی ذمے داریاں راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔اگلی صبح شہزادی پورے شاہی کروفر کے ساتھ پریس کانفرنس میں شرکت کرتی ہے اور گریگری پیک اور

اس کے فوٹو گرافر دوست کو دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے۔ فوٹو گرافر تمام تصویریں شہزادی کی نذر کر دیتا ہے۔ ہیرو اپنے ایڈیٹر کو ان واقعات کی ہوا تک نہیں لگنے دیتا۔ پریس کانفرنس کے اختتام پر شہزادی سب صحافیوں سے مصافحہ کرتی ہے۔ معنی خیز مسکراہٹوں اور تاثرات کا تبادلہ ہوتا ہے اور شہزادی ایک بار پھر محل کے بلند دروازوں کے پیچھے غائب ہو جاتی ہے۔ ہیرو بڑے سے ہال میں تنہا کھڑا رہ جاتا ہے پھر تھکے تھکے دل شکستہ انداز میں واپس آتا ہے تو محل کے بلند و بالا برآمدوں میں اس کے جوتوں کی آواز گونج رہی ہے یہ ایک انتہائی خوب صورت رومانی فلم تھی مگر اس کا انداز بالکل مختلف تھا۔ ولیم وائلر اس کے ہدایت کار تھے اور یہ ان کی ناقابل فراموش فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔

اس فلم سے متاثر ہو کر ہندوستان اور پاکستان میں ضروری تبدیلیوں کے ساتھ مختلف فلمیں بنائی گئیں جن میں سے اکثر کامیاب ہوئیں۔

ایسی درجنوں بلکہ غالباً سینکڑوں فلمیں ہیں جن کا موضوع محض محبت تھا مگر ہر فلم دوسری فلم سے مختلف تھی۔ دیکھیئے اگر فرصت ملی تو پھر کچھ اور فلموں کا تذکرہ بھی کیا جائے گا۔ ہندوستان میں تقسیم سے پہلے اور بعد میں بھی بہت سی یادگار رومانی فلمیں بنائی گئیں جو آج بھی روز اول کی طرح شگفتہ، موثر اور تازہ ہیں۔ پاکستان میں بھی بہت سی ناقابل فراموش رومانی فلمیں بنائی گئیں۔ جنہیں فلم بین آج بھی یاد کرتے ہیں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

فلم ’’ پکار‘‘ کے سلسلے میں نسیم بانو اور سہراب مودی صاحب کا بطور خاص تذکرہ کیا گیا۔ سہراب مودی کے بارے میں اس سے پہلے بھی مختلف انداز میں بارہا بیان کیا جا چکا ہے لیکن۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ایک دوست نے اس طرف توجہ دلائی اور یہ احساس بھی دلایا کہ سہراب مودی ایک غیر مسلم اور پارسی نژاد شخص تھا مگر اس نے اردو اور مسلم تہذیب و تاریخ کی جس خوب صورتی سے عکاسی کی ہے اس اعتبار سے وہ ایک ممتاز اور قابل قدر شخصیت تھا جس کے بارے میں تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہے۔ جب سوچا تو خیال آیا کہ واقعی سہراب مودی

نے انڈین فلمی صنعت کے لیے تو بہت سے کارنامے سرانجام دیئے لیکن اردو اور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے بھی انہوں نے بہت نمایاں کام کیے جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ایک عظیم مغل شہنشاہ جہانگیر کے بارے میں ایک فلم بنانے اور اسے حقیقت سے قریب تر بنانے کے سلسلے میں سہراب مودی نے جس قدر لگن اور محنت سے کام کیا وہ بجائے خود کسی کارنامے سے کم نہیں ہے پھر اس نے مغل شہنشاہ کی عیاشی اور بے راہ روی کو موضوع بنانے کے بجائے جہانگیر کے عدل کو کہانی کا مرکزی خیال بنا کر کہانی کا تانا بانا بنا اور کسی جگہ بھی ''حدادب'' سے تجاوز نہیں کیا۔ اس فلم میں شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں کو واقعی شہنشاہ اور ملکہ کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے جاہ وجلال کا پوری طرح خیال رکھا گیا اور کوئی ایسی عامیانہ حرکت نہیں کی گئی جس سے توہین کا پہلو نکلتا ہو۔ یہ مانا کہ سہراب مودی کو تجارتی مصلحتوں کی خاطر اس بات کا ملحوظ رکھنا تھا تاکہ مسلمان اس فلم کی طرف متوجہ اور مائل ہوں لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ برصغیر کی آبادی کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ ان کے جذبات سے کھیل کر سہراب مودی زیادہ فائدہ اٹھا سکتے تھے لیکن ایک سچے، کھرے اور دیانت دار فلم ساز وہدایت کار کی حیثیت سے انہوں نے موضوع کے ساتھ انصاف کیا اور ہندوؤں کے جذبات کو بھی اس مہارت سے ایکسپلائٹ کیا کہ ہندو فلم بینوں کو بھی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا کہ اس فلم ''پکار'' کا کلائمکس، منظر نامے اور مکالمہ نویسی کی ہنرمندی کا ایک شاہکار ہے جس میں مصنف اور ہدایت کار نے کسی کا بھی پلڑا ہلکا نہیں ہونے دیا۔ شہنشاہ جہانگیر نے اپنی محبوب ترین ملکہ کو ذرا سی بھی رعایت نہیں دی اور انصاف کے معاملے میں ڈنڈی نہیں ماری لیکن مدعی کو جس انداز سے مطمئن کیا گیا وہ بھی فکر وخیال کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

ایک دھوبن کا شوہر ملکہ نور جہاں کے کمان سے نکلے ہوئے تیر کا نشانہ بن کر ہلاک ہو گیا۔ ہندوستان کے شہنشاہ کی ملکہ سے انجانے مین سرزد ہونے والا یہ جرم بہرحال ایک جرم تھا اور مدعی کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ رعایا کا ایک انتہائی پست طبقہ ہونے کے باوجود شہنشاہ سے انصاف طلب کرے اور اسکے اس دعوے کو آزمائے کہ وہ صحیح معنوں میں عادل اور منصف ہے مگر جب شہنشاہ نے اس مقدمے کا انتہائی غیر جانبداری سے فیصلہ سنایا تو سننے والوں کو اپنے کانوں

اور آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہندوستان کا عظیم اور قادر مطلق شہنشاہ اپنی رعایا کو انصاف دینے کے معاملے میں اس حد تک چلا جائے گا کہ جان کے بدلے جان لینے کا فیصلہ صادر کرے گا۔

فلم ''پکار'' میں سہراب مودی نے مغلیہ دور کے بارے میں جس قدر عرق ریزی اور گہری تحقیق سے کام لیا اتنی محنت تو آج کے جدید دور میں بھی کوئی نہیں کرتا۔ معمولی تفصیلات اور جزئیات تو ایک طرف ماحول تک کو پیش کرنے میں کسی قسم کی تحقیق و تلاش کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ سہراب مودی نے ''پکار'' کے لیے ملبوسات، اسلحہ، ظروف، سامان آرائش اور انداز مخاطب کے بارے میں گہری چھان بین کے بعد جو انداز پیش کیا بعد میں آنے والوں کے لیے بھی وہ مشعل راہ بن گیا۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہندوستان کی سب سے پہلی مسلم سوشل فلم ایک غیر مسلم پارسی فلم ساز و ہدایت کار سہراب مودی نے بنائی تھی جس کا نام ''خاندان'' تھا۔ اگر پیسہ ہی کمانا مقصود ہوتا تو ہندو مذہب کی کوئی داستان فلما کر کہیں زیادہ پیسہ کمایا جاسکتا تھا لیکن سہراب مودی نے مسلم سوشل کہانی بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس فلم کے ہیرو پریم ادیب تھے اور ولن کے کردار میں پہلی بار صادق علی کو پیش کیا گیا تھا۔ صادق علی نے بعد میں ایسا عروج حاصل کیا کہ باید و شاید۔ وہ ایک زمانے میں ''پرنس آف منروا'' کہلاتے تھے (منروا موی ٹون سہراب مودی کے فلم ساز ادارے کا نام تھا) اس فلم میں نسیم بانو نے بہت حقیقی اور خوب صورت انداز میں مسلمان گھرانے کی ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔

جہاں تک صادق علی کا تعلق ہے تقدیر نے (یا خود ان کے اعمال نے) انہیں کچھ عرصے بعد بہت برے حال کو پہنچا دیا۔ ان کا عروج و زوال دیکھ کر ہی اللہ کے اس حکم پر یقین آجاتا ہے کہ وہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت۔ صادق علی جو پرنس آف منروا کی حیثیت سے ہندوستانی اسکرین پر حکمرانی کرتے تھے بعد میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے تھے۔ صحت نے بھی جواب دے دیا تھا۔ انہوں نے زندگی کے آخری ایام کراچی میں گزارے اور انتہائی غربت آمیز حالات میں وفات پائی۔

سہراب مودی نے اس فلم میں بھی مسلم معاشرے کو صحیح انداز میں پیش کیا تھا جس سے ہندوستان کی غیر مسلم آبادی واقف نہ تھی۔ ملبوسات، رکھ رکھاؤ اور مسلم روایات کے اعتبار سے یہ ایک قابل تقلید فلم تھی۔ اس فلم میں پہلی مرتبہ ہندوستانی اسکرین پر کلمہ طیبہ پڑھوایا گیا تھا۔ روانگی سے قبل امام ضامن باندھا گیا۔ یہ معمولی سی جزءیات بھی سہراب مودی کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو سکیں۔ اس فلم کو حکیم فرخ نے لکھا تھا جو اسٹیج کے معروف ڈرامانویس تھے لیکن انتخاب تو بہر حال سہراب مودی ہی کا تھا اور خیال بھی انہی کا تھا۔ اس فلم میں خان بہادر صاحب کا مرکزی کردار سہراب مودی نے بذات خود ادا کیا تھا۔

''خاندان'' کی نمائش پر بھارت کے مسلمان دیوانہ وار ٹوٹ پڑے۔ فلم بھی بہت اچھی تھی اور ہندو فلم بینوں کے لیے بھی اس میں ایک ندرت تھی۔ اس لیے انہوں نے بھی سینما گھروں کے سامنے لمبی قطاریں لگا دیں۔ اس فلم کے ذریعے سہراب مودی نے نہ صرف ہدایت کار اور فلم ساز کی حیثیت سے اپنا لوہا منوالیا بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے دل بھی جیت لیے۔

پھر یہ بھی خیال کیجئے کہ اردو کے عظیم ترین شاعر مرزا غالب کے بارے میں فلم بنانے کا اعزاز بھی سہراب مودی کو حاصل ہے۔ غالب جیسے مشکل پسند اردو کے شاعر کے بارے میں کبھی کسی مسلمان فلم ساز اور ہدایت کار نے بھی فلم بنانے کا ارادہ نہیں کیا تھا لیکن سہراب مودی نے ''مرزا غالب'' بنا کر انوکھا تجربہ کیا۔ اس کہانی کو بھی ہم فرضی نہیں کہہ سکتے کیونکہ تاریخی شواہد اور واقعات کی روشنی میں مرزا غالب کی زندگی کا یہ پہلو سامنے آتا رہا ہے۔ سہراب مودی کا کمال فن یہ تھا کہ انہوں نے غالب کی غزلوں کو ہی فلم کے نغمات کے طور پر استعمال کیا۔ ان کی اس قدر آسان، عام فہم اور دل میں اتر جانے والے طرزیں بنوائیں کہ ہندوستان کا بچہ بچہ غالب کی غزلیں گاتا ہوا نظر آنے لگا۔

ثریا کی آواز کے جادو نے ان کے اثر کو دوبالا کر دیا تھا۔ اس فلم میں سہراب مودی نے مرزا غالب کی عظمت کا پوری طرح خیال رکھا تھا حالانکہ بہت عرصے بعد بھارت اور پاکستان میں اسی موضوع پر بنائے جانے والے ڈراموں میں مرزا غالب کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ جب پاکستان میں ''مرزا غالب'' کا چربہ بنایا گیا تو اس میں حقائق اور

اس زمانے کے ادب و آداب کو فراموش کر دیا گیا۔ پاکستان میں مرزا غالب کی غزلیں ملکہ ترنم نور جہاں نے گائی تھیں۔ گائیکی اور آواز کے حسن میں تو کچھ کلام نہیں لیکن تاثر اور سادگی کے اعتبار سے سہراب مودی بازی لے گئے تھے پھر بد قسمتی سے پاکستانی ''مرزا غالب'' میں دہلی کی تہذیب اور مرزا غالب کے کردار کو بھی صحیح طور پر پیش نہیں کیا گیا حالانکہ بعد میں بنائی جانے والی نقل کو اصل سے بدرجہا بہتر ہونا چاہئے تھا۔ جب ان امور پر نظر ڈالیں تو سہراب مودی کی ہنر مندی اور عظمت کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ بات بجائے خود منفرد اور قابل داد ہے کہ پہلی (اور شاید آخری بار) برصغیر کے کسی فلم ساز نے ایک معروف اور عظیم اردو شاعر کے بارے میں فلم بنانے کا ارادہ کیا اور اس کہانی کو کسی فلم کی کہانی میں فرضی کرداروں کے ساتھ پیش کرنے کی جگہ کو اس کے نام سے یہ فلم بنائی۔

معروف پاکستانی فلمی کہانی نویس اور ہمارے معزز دوست عزیز میرٹھی اسی زمانے میں بمبئی گئے تھے اور انہوں نے وہاں سینما ہاؤس میں ''مرزا غالب'' دیکھی تھی۔ وہ بمبئی سے واپس آئے تو اپنے ساتھ بے شمار ان کہی فلمی داستانیں بھی لے کر آئے۔ ہم اس زمانے میں صحافی تھے۔ بھارتی فلمی رسائل و جرائد پاکستان میں آسانی سے دستیاب تھے بلکہ بھارتی فلموں کی نمائش بھی معمول میں داخل تھی لیکن فلم، مرزا غالب کی پاکستان میں کبھی نمائش نہ ہو سکی۔ شاید کسی تقسیم کار نے انتہائی کامیاب اور بڑے ستاروں کی فلموں کے مقابلے میں ''مرزا غالب'' کو زیادہ منافع بخش نہ سمجھا ورنہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ''غالب'' کے بارے میں بنائی ہوئی اس فلم کو بطور خاص پاکستان میں نمائش کے لیے پیش کیا جاتا۔ ہمارے حصے میں اس کا بھونڈا چربہ ہی آیا تھا جس میں اداکاروں کا انتخاب نامناسب تھا اور قدیم دہلی کا ماحول قطعی ناپید تھا۔ حالانکہ اس فلم کے مکالمے مایہ ناز ادیب آغا شورش کاشمیری نے تحریر فرمائے تھے۔ آغا شورش بہت بڑے خطیب، ادیب اور صحافی تھے لیکن دہلی کی تہذیب اور ماحول سے ان کی واقفیت کتابوں کی حد تک تھی۔ یہی وجہ کہ غالب کے زمانے کے اردوئے معلیٰ کا اس فلم کے مکالموں میں شائبہ تک نہیں آیا۔ مرزا غالب کے کلیدی شاعرانہ کردار کے لیے جب سدھیر صاحب کے نام کا اعلان کیا گیا تو سب حیران رہ گئے کہ۔۔۔

پسلی پھڑک اٹھی نگہ انتخاب کی

اس کا سبب یہ تھا کہ سدھیر صاحب ایکشن فلموں میں کام کرنے کے سلسلے میں بہت شہرت رکھتے تھے اور فلم بینوں نے انہیں ''جنگجو ہیرو'' کا خطاب دے دیا تھا۔ ان کی اکثر فلمیں مار دھاڑ سے بھرپور اور خون خرابے سے شرابور ہوا کرتی تھیں۔ پھر ایک قابل ذکر بات یہ بھی تھی کہ وہ پنجابی فلموں کے سپر اسٹار کی حیثیت سے زیادہ مشہور تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ فلم نمائش کے لیے پیش کی گئی اور سدھیر صاحب کے شیدائیوں نے جوق در جوق سینما گھروں کا رخ کیا تو انہیں سدھیر صاحب کو انگرکھا اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس غزلیں پڑھتے ہوئے دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی۔ پہلا شو ختم ہوا اور تماشائی باہر نکلے تو باہر کھڑے فلم بینوں نے لاہور کی روایت کے مطابق ان سے فلم کی رپورٹ دریافت کی۔

سب نے ہاتھ ہلا کر بہت زور زور سے اعلان کی ''ڈبا فلم ہے۔ لالہ سدھیر کی ایک بھی فائٹ نہیں ہے۔''

پاکستانی'' مرزا غالب'' کے ساتھ صرف یہی ستم ظریفی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ہدایت کار کے خورشید صاحب تھے جو خالص پنجابی تھے اور اردو شاعری سے توان کا دور کا واسطہ بھی نہ تھا (فلمی گانوں کے سوا) فلم ساز بھی پنجابی تھے۔ مکالمہ نگاری کے لیے آغا شورش کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جو نامور ادیب، شاعر اور صحافی تھے مگر قدیم دہلی کی زبان، طور طریقوں اور تہذیبی راجوں سے ناواقف تھے۔ لالہ سدھیر مرزا غالب بنائے گئے تھے جو پنجابی فلموں کے مانے ہوئے سپر اسٹار تھے۔ اس پر مزید ستم یہ کہ زبان کی اصلاح کے لیے سیٹ پر۔ شاطر غزنوی صاحب ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ شاعر غزنوی صاحب فلمی مصنف تھے لیکن قدیم دہلی کی اردوئے معلی کے لب و لہجے، تلفظ اور ادائیگی کے انداز سے وہ بھی واقف نہ تھے۔ پاکستانی مرزا غالب کے برعکس سہراب مودی نے اپنی فلم کے لیے حسب معمول بہت چھان بین اور تحقیق کرائی تھی۔ قدیم ماحول اور تہذیب کی تربیت کے لیے پرانی دہلی والوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ان حالات میں پاکستانی'' مرزا غالب'' کو مرزا غالب کی پیروڈی کہنا زیادہ مناسب تھا۔ جب ہم نے اس فلم پر تبصرہ لکھتے ہوئے ان چیزوں کی نشان دہی کی تو سب لوگ ناراض ہو گئے۔ آغا شورش کے ساتھ ہم کام کر چکے

تھے اور ہمیشہ انہیں قابل احترام سمجھا تھا۔ ہمارا لکھا ہوا تبصرہ دیکھ کر انہوں نے بھی ناخوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ مولانا، اب کل کے لڑکے ہمیں زبان سکھائیں گے۔

بہر حال، یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ ذکر عزیز میرٹھی صاحب کا ہو رہا تھا۔ وہ جب بمبئی سے واپس آئے تو ان سے بمبئی کی فلمی دنیا کی روداد سننے کے لیے دوستوں کی محفل منعقد ہوئی۔ مرزا غالب اور سہراب مودی کی تعریف کرتے ہوئے عزیز میرٹھی صاحب کی زبان نہیں تھکتی تھی۔

کہنے لگے "آفاقی صاحب۔ سہراب مودی تو غضب کا جادوگر ہے۔ مرزا غالب کی غزلوں کو فلم میں اس طرح پیش کیا اور ایسا خوب صورت ماحول پیدا کر دیا کہ دیکھنے والے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ میں نے بمبئی کے سینما گھروں میں (جہاں کی زبان مرہٹی ہے اور وہاں بہت اچھی مرہٹی فلمیں بھی بنائی جاتی ہیں) تماشائیوں کو ساکت اور دم بخود بیٹھے دیکھا۔ خدا جانے غالب کی غزلیں ان کی سمجھ میں آ رہی تھیں یا نہیں آ رہی تھیں مگر سینما ہال میں ایسا سناٹا تھا کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اردو زبان سے قطعی نابلد ہزاروں افراد غالب کی غزلوں کو سن کر متاثر اور مرعوب ہو رہے تھے۔"

سہراب مودی کے بارے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ پارسی تھے۔ اردو سے بالکل نابلد تھے۔ نہ اردو لکھ سکتے تھے نہ پڑھ سکتے تھے لیکن اردو کا تلفظ اور مکالموں کی ادائیگی بے مثال تھی۔ انتہائی شائستہ زبان بولتے تھے۔ الفاظ کی ادائیگی، فقروں کا اتار چڑھاؤ ایسا کہ اہل زبان بھی سن کر رشک کرتے تھے۔ یہ صلاحیت خداداد بھی تھی اور اس کے لیے سہراب مودی نے خود بھی کاوش کی تھی۔ دراصل اسٹیج کے زمانے میں انہوں نے اداکاری کا آغاز کیا تھا جب ڈراموں میں اردو کا سکہ چلتا تھا۔ آغا حشر کاشمیری جیسے ڈرامانویس اور مکالمہ نگار تھے جو الفاظ سے کھیلنے میں مہارت رکھتے تھے۔ اس زمانے میں سہراب مودی نے اردو زبان سیکھی تھی مگر صرف بولنے کی حد تک۔ مکالمے انہیں رومن میں لکھ کر دیئے جاتے تھے۔ روزمرہ زندگی میں بھی وہ بہت عمدہ اردو بولتے تھے۔ ہدایت کار و فلم ساز لقمان جب دہلی سے فلم کے شوق میں بھاگ کر بمبئی پہنچے تو چند روز بعد انہیں سہراب مودی صاحب کے پاس ملازمت مل گئی۔

انہوں نے یہ احوال ایک مفصل انٹرویو میں بھی بیان کیا تھا جو ہم ان کی زبانی آپ تک پہنچا چکے ہیں۔جب لقمان صاحب جیسے دلی والے (نو عمر ہی سہی) سہراب مودی کی اردو کے قائل تھے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں یہ زبان بولنے پر کتنا عبور حاصل تھا۔

لقمان صاحب نے جب سہراب مودی کے ساتھ کام کا آغاز کیا تو وہ منروا کمپنی کے لیے بطور ہدایت کار فلم ''صید ہوس'' بنا رہے تھے۔وہ اس فلم میں مرکزی کردار بھی ادا کر رہے تھے۔نسیم بانو اس فلم کی ہیروئن تھیں۔ان کی والدہ شمشاد بھی اس فلم کے اداکاروں میں شامل تھیں۔

لقمان صاحب کو اس کمپنی میں سیٹنگ بوائے کی حیثیت سے ملازمت ملی تھی۔تنخواہ بیس روپے ماہوار مقرر ہوئی تھی جو کہ اس زمانے کے حساب سے کافی تھی۔لقمان صاحب کے ساتھ ہی اس زمانے میں حاجی محی الدین صاحب بھی منروا کمپنی کے آرٹ ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔حاجی محی الدین بعد میں پاکستان آ گئے تھے۔آرٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے انہوں نے بہت شہرت حاصل کی۔

اس فلم میں ناتھنکر نامی ایک مرہٹہ نوجوان بھی کام کر رہا تھا جس کا اردو تلفظ اور لب و لہجہ بہت خراب تھا۔لقمان صاحب کا تعلق چونکہ دہلی سے تھا اسی دہلی سے جس کے بارے میں داغ نے لکھا تھا

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔

ناتھنکر کی شوٹنگ کا آغاز ہوا تو غلط تلفظ کی وجہ سے کام روک دیا گیا اور سہراب مودی نے مشورہ دیا کہ تم اپنی زبان درست کرو مگر دو تین دن کی شوٹنگ کے باوجود ناتھنکر صحیح اردو نہ بول سکا۔اسی دوران میں ایک دن مودی صاحب نے لقمان صاحب کو ناتھنکر کو زبان کا تلفظ سکھاتے ہوئے سن لیا تو لقمان صاحب کی آواز اور لب و لہجے سے بہت متاثر ہوئے۔ناتھنکر کو تو کاسٹ سے خارج کر دیا گیا اور سہراب مودی صاحب نے لقمان صاحب کو اپنے کمرے میں بلایا۔

ایک سیٹنگ بوائے کے لیے ہدایت کار کی طرف سے بلاوا بہت بڑی اور تشویشناک بات تھی لقمان صاحب ڈرتے ڈرتے سہراب مودی صاحب کے کمرے میں پہنچے تو باقی روداد ان کی زبانی سنیئے۔

''میں ان کے کمرے میں پہنچا۔ان کا ذاتی ملازم عبدل مجھے ان کے روبرو لے گیا۔سہراب مودی بولے ''میاں اب ہم آپ کو میک اپ کروائیں گے اور آپ کی ٹرائی لیں گے۔''

ہم نے اثبات میں سرہلایا تو انہوں نے ہمارے میک اپ کا حکم دیا۔ناتھنکر کے ساتھ اسٹیج کی ایک لڑکی شگوفہ کام کر رہی تھی۔اس کے ساتھ ہمیں کھڑا کیا گیا تو ہمارا قد اس سے چھوٹا نکلا لیکن یہ کمی ہمارے نیچے دو کتابیں رکھ کر پوری کر دی گئی۔کیمرہ اسٹارٹ ہوا۔ہم نے مکالمہ ادا کیا مگر ری ٹیک ہوا۔ ملازم بولا پھر ری ٹیک ہوا مگر تیسرا شارٹ اوکے ہو گیا جس کے ساتھ ہی سہراب مودی کی نظر عنایت سے ہم اداکاروں کی صف میں شامل ہو گئے۔فلم بنی تو وہ فلاپ ہو گئی۔ اس کی کاسٹ میں میرا نام بھی شامل تھا۔میرا کردار پانچ چھ مناظر پر مشتمل تھا۔''

اس طرح لقمان صاحب اور سہراب مودی کا ساتھ ہو گیا جو کافی عرصے چلا۔اس زمانے میں اداکار وغیرہ سب اسٹوڈیو کے مستقل ملازم ہوتے تھے۔ تنخواہوں کا معیار بھی زیادہ نہیں تھا۔اس بات سے اندازہ لگالیجئے کہ فلم ''صید ہوس'' کے ہیرو انیل کمار تھے انہیں بطور ہیرو ۳۵ روپے ماہانہ ملتے تھے۔ معروف ترین ہیروئن کو سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔انیل کمار کے بارے میں یہ سن لیجئے کہ وہ مسلمان تھے اور یوسف خاں (دلیپ کمار) کے رشتے دار بھی تھے مگر اس وقت تک دلیپ کمار ہندوستانی اسکرین پر نمودار نہیں ہوئے تھے۔

لقمان صاحب نے چند فلموں میں مختصر سے کردار ادا کیے مگر پھر سہراب مودی نے انہیں اپنے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے منتخب کر لیا۔اس طرح ہدایت کاری میں لقمان صاحب کے پہلے استاد سہراب مودی تھے۔اس کے بعد خوش قسمتی سے وہ سید شوکت حسین رضوی کے شاگرد بن گئے تھے۔لقمان صاحب سہراب مودی کے چوتھے اسسٹنٹ تھے اور ان کا ابتدائی کام ''کلیپ'' دینا تھا۔

صید ہوس تو فلاپ ہو چکی تھی۔اس کے بعد اگلی فلم ''نغمہ دل عرف آتما ترنگ'' بھی بری طرح ناکام ہوگئی تو منروا فلم کمپنی دیوالیہ ہوگئی۔ منروا فلم کمپنی کے تین مالک تھے۔ایک سیٹھ پوناوالا، دوسرے ابراہیم سیٹھ ماچس والا اور تیسرے سہراب مودی۔ان تینوں نے مل کر یہ فلم کمپنی اور اسٹوڈیو بنایا تھا اور فلم '' صید ہوس'' شروع کی تھی جس کے ہدایت کار اور اداکار سہراب مودی تھے۔جب کمپنی کی دونوں فلمیں بری طرح فلاپ ہوگئیں تو یہ کمپنی دیوالیہ ہوگئی۔اس سے چندروز قبل سیٹھ پوناوالا کا انتقال ہو گیا تھا۔اس زمانے میں ہندوستان کی فلمی صنعت میں یہ دستور تھا کہ سرمایہ کار اور بڑے بڑے سیٹھ سود پر فلم کمپنی والوں کو قرض دیا کرتے تھے۔ برصغیر کی تقسیم سے پہلے بھی وہاں یہ دستور تھا اور آج بھی ہے۔ہندوستان کے بڑے بڑے فلم ساز اور ہدایت کار فلمیں بنانے کے لیے اپنی گرہ سے کچھ نہیں خرچ کرتے تھے اور نہ ہی آج کرتے ہیں۔ سرمایہ لگانے والوں کو صرف اپنے سرمائے اور منافع کی واپسی سے سروکار تھا اس لیے وہ فلم ساز اور ہدایت کار کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے اگر سرمایہ اور منافع مل گیا تو یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔

اگر نقصان بہت زیادہ ہو جاتا تھا تو وہ کمپنی اور فلم ساز کے اثاثے اور جائیداد وغیرہ قرق کر کے اپنا قرض وصول کر لیتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کی فلمی صنعت میں یہ بنیادی فرق ہمیشہ رہا اور آج بھی ہے۔ پاکستان کے فلم ساز فلم بنانے کے لیے کراچی، سندھ اور ڈھاکا کے تقسیم کاروں کے محتاج ہوا کرتے تھے (اب صرف پنجاب صوبہ سرحد کا ایک فلم سرکٹ اور کراچی سندھ بلوچستان کا دوسرا سرکٹ باقی رہ گیا ہے) فلم تقسیم کار اقساط میں رلا رلا کر طے شدہ رقم ادا کرتے تھے اور فلم سازوں کو اپنی مرضی کے مطابق فلمیں بنانے پر مجبور بھی کرتے تھے۔اپنی بے بسی کے باعث فلم سازان کے خواہشات کے تابع تھے وہ اداکاروں کے انتخاب، کہانی کے موضوعات اور دوسرے معاملات میں بھی مستقل دخل اندازی کرتے رہتے تھے۔پاکستان میں بھارتی فلموں کی چربہ سازی کے لیے بھی فلم تقسیم کاروں نے ہی فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو مجبور کیا تھا۔ ستم در ستم یہ کہ فلم مکمل کرنے کے بعد فلم ساز اپنی فلم تقسیم کار کے

حوالے کر دیتا تھا۔ ساری آمدنی کا حساب کتاب تقسیم کار کے پاس رہتا تھا۔ وہ عموماً فلم ساز کو نقصان ہی بتایا کرتا تھا فلم ساز بے بس ہو کر صبر کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں فلم ساز کبھی خوش حال نہیں ہوئے۔ ان کی محنت کی ساری کمائی تقسیم کار ہضم کرتے رہے اور اپنی تجوریاں بھرتے رہے۔ فلم ساز ہر فل کے مکمل ہونے کے بعد پھر از سر نو نئی فلم سے اپنی جد و جہد کا آغاز کرتا تھا اور منافع پھر تقسیم کار کے بینک میں پہنچ جاتا تھا۔

پاکستان میں فلم سازوں کی ایک قسم اور بھی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو سرمایہ لے کر آتے ہیں۔ اپنی مرضی سے ہدایت کار اور فنکار منتخب کرتے ہیں اور فلم کی کامیابی کی صورت میں سارا منافع بھی خود حاصل کر لیتے ہیں۔ فلم اگر ناکام بھی ہو جائے تو یہ رو پیٹ کر کچھ عرصے بعد اپنی لاگت پوری کر لیتے ہیں۔ ان فلم سازوں کی نسل پنجابی فلمیں بنانے کے منصوبے لے کر فلمی صنعت میں آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پیسے کے بل پر فلمی صنعت پر ان کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ ان میں زمین دار، صنعت کار، سینماؤں کے مالک، اسمگلرز اور غنڈے بدمعاش شامل تھے۔ لاہور آ کر ہر بڑا بدمعاش فلم ساز بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ غنڈوں اور بدمعاشوں کو ہیرو بنا کر پیش کیا گیا۔ شاید ہی کوئی نامی گرامی بدمعاش باقی رہا ہو جس کے نام پر فلم نہ بنائی گئی ہو۔

ہماری فلمی صنعت کی موجودہ حالت زار کے ذمے دار یہی پیسے والے فلم ساز ہیں جو تعلیم و تہذیب سے ناواقف اور زمانے کے تقاضوں سے یکسر ناآشنا ہیں۔ یہ ایک ہی قسم کی کہانیاں اور ایک ہی قسم کی فلمیں بنائے چلے جا رہے ہیں۔ فلم فلاپ ہو جائے تو بھی انہیں پروا نہیں ہوتی۔ تقسیم کاری کے باعث یہ کافی رقم کما لیتے ہیں اور اگر فلم ہٹ ہو جائے تو ان کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک فلم سے کروڑوں روپے کماتے ہیں۔ اس کے برعکس تعلیم یافتہ، ذہین اور ہنر مند لوگوں کے پاس کئی کئی ہٹ فلمیں بنانے کے باوجود سرمایہ نہیں ہوتا جس کی وجہ اوپر بیان کر دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ رفتہ رفتہ ماحول اور غیر صحت مند فلم سازی سے تنگ آ کر یکے بعد دیگرے فلمی صنعت سے رخصت ہو گئے۔ جب اچھے فلم ساز ہی نہ رہے تو اچھے تعلیم یافتہ اور ذہین ہدایت کار، اداکار اور ہنر مند کہاں سے آئیں گے۔ اس طرح رفتہ رفتہ پاکستان کی فلمی صنعت صرف پیسے والوں کے تسلط میں چلی گئی۔ وہی فلم ساز ہیں۔ وہی سینما گھروں کے

مالک ہیں۔ وہی تقسیم کار ہیں وہ اپنی مرضی اور پسند کی فلمیں بناتے ہیں اور اپنی ذہنی سطح کے مطابق بناتے ہیں۔ اپنے ہی جیسے لوگوں کو فلم یونٹ میں شامل کرتے ہیں۔ اب شاید آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہماری فلمی صنعت کی موجودہ زبوں حالی اور تباہی کا سبب کیا ہے؟ جس قسم کے لوگ پیسہ لے کر آئے انہوں نے ویسی ہی فلمیں بنائیں جو آرٹ، ہنر اور شائستگی سے عاری تھیں۔ چنانچہ فلمیں صرف ایک محدود طبقے کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئیں۔ ماحول کی خرابی اور فلموں کے موضوعات اور بے ہودگی کے باعث شرفاء اور ان کے گھر والوں نے سینما گھروں کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ آج کل کی فلمیں جو لوگ دیکھتے ہیں وہ خود بھی اپنے اہل خانہ کو سینما میں لے کر آنا پسند نہیں کرتے۔ فلموں کی کامیابی اور مقبولیت میں خواتین اور خاندانوں کا بہت بڑا ہاتھ ہوا کرتا تھا۔ اب پاکستان کی فلمیں اور سینما گھر ان کی سرپرستی سے محروم ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فضول اور بے مقصد فلموں کی مسلسل ناکامیوں کے بعد سینما گھر مسمار کیے جا رہے ہیں۔ دنیا بھر میں فلم اور سینما کا بزنس عروج پر ہے لیکن پاکستان میں فلمی صنعت اور سینما گھر سکڑتے جا رہے ہیں۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے لیکن اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ صرف حکومت ہی مناسب قانون سازی اور اس پر عمل درآمد کے ذریعے اس بیماری کا علاج کر سکتی ہے مگر پاکستان میں کبھی کسی بھی حکومت نے فلمی صنعت کو اہمیت نہیں دی نہ اس پر مناسب توجہ دی۔ سرپرستی تو دور کی بات ہے مختصر الفاظ میں پاکستان کی فلمی صنعت کی تباہی ان اسباب کا نتیجہ ہے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ سہراب مودی اور ہندوستانی فلمی صنعت کے حوالے سے یہ تذکرہ بھی ہو گیا لوگ اکثر دریافت کرتے ہیں کہ پاکستان کی فلمی صنعت میں سے اچھے ہنر مند اور تعلیم یافتہ لوگ کیوں رخصت ہو گئے۔ پاکستان کی فلمی صنعت کا یہ حال کیوں ہو گیا ہے؟ اس سوال کے جواب کی وضاحت کے طور پر حقائق بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اب سہراب مودی کا تذکرہ سنیے۔

منروا کمپنی کے دیوالیہ ہو جانے کے بعد تمام قرضے کا بوجھ سہراب مودی اور سیٹھ ابراہیم کے سر پر آن پڑا تھا۔ ان دونوں نے جیسے تیسے اس سے چھٹکارہ حاصل کیا۔ سہراب مودی نے کمپنی کے تمام قرضے اپنے ذمے لے کر اس کی

ملکیت سنبھال لی۔ سہراب مودی اور ان کے دو بھائی رستم مودی اور کیکی مودی نے منروا مووی ٹون کے نام سے اس کمپنی کا از سرنو آغا کیا۔ خوداعتمادی، جرات اور سب سے بڑھ کر اس کام سے واقفیت کی بنا پر سہراب مودی اور ان کے بھائیوں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ قدرت بھی ہمت والوں کا ساتھ دیتی ہے۔ سہراب مودی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے اس کمپنی سے بہت منافع کمایا۔ فلمیں بھی بنائیں اور سینما گھر بھی تعمیر کئے یا خریدے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب منروا مووی ٹون اور سہراب مودی انڈین فلم انڈسٹری کے دو بہت بڑے نام تھے۔ ان کی بنائی ہوئی فلمیں بے پناہ کامیابی حاصل کر رہی تھیں اور سارے برصغیر میں ان کا چرچا تھا۔

سہراب مودی کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ وہ اردو پڑھنے اور لکھنے سے قاصر تھے لیکن اردو کا لب ولہجہ اور تلفظ بہت اچھا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں کہانی اور موضوع کے بارے میں عبور حاصل تھا۔ غضب کے ہدایت کار اور اداکار بھی تھے۔ اسی لیے اردو سے نابلند ہونے کے باوجود انہوں نے لازوال اردو فلمیں بنا کر بھارت کی فلمی تاریخ میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا۔ چلتے چلتے یہ بھی بتا دیں کہ اردو فلموں کے عظیم ترین ہدایت کار محبوب بھی اردو سے واقف نہ تھے۔ نہ پڑھ سکتے تھے نہ لکھ سکتے تھے۔ ان کے ساتھ تو یہ المیہ تھا کہ وہ گفتگو بھی مرہٹی اور مارواڑی انداز میں کرتے تھے تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی لیکن بے پناہ ذہانت اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ کہانی اور ہدایت کاری کے شعبوں پر ان کی گرفت انتہائی مضبوط تھی۔ مضبوط قوت فیصلہ اور قوت ارادی کے بھی مالک تھے۔ ذرا غور کیجئے تو یقین نہیں آتا کہ ایک گاؤں کا رہنے والا یہ ان پڑھ شخص جو پندرہ سولہ برس کی عمر میں فلموں کے شوق میں گاؤں سے بھاگ کر بمبئی پہنچ گیا تھا۔ فلم کی دنیا میں ایک یادگار تاریخی حیثیت کا مالک بن گیا تھا جس کی عظمت کا اعتراف بالیووڈ کے نامور فلم ساز اور ہدایت کار بھی کرتے تھے۔ یہ سب قدرتی صلاحیتوں اور تقدیر کے معاملات ہیں۔ انسان کا ان میں مطلق دخل نہیں ہے۔

منروا مودی ٹون کے قیام کے بعد سہراب مودی نے ''خاندان'' کے نام سے ایک مسلم سوشل فلم کا آغاز کیا اور جب یہ فلم نمائش کے لیے پیش ہوئی تو سارے برصغیر میں کہرام مچ گیا۔ کمپنی کی پہلی فلم ہی سپر ہٹ ثابت ہوئی تھی۔

اس فلم نے منروا موی ٹون اور سہراب مودی کو صف اول کے فلم سازوں اور ہدایت کاروں میں لا کھڑا کر دیا تھا۔

اسی زمانے میں کمال امروہوی صاحب جو یوپی کے قصبے امروہہ کے رہنے والے تھے لیکن لاہور آ کر ایک لانڈری کی دکان چلاتے تھے فلم کے شوق میں ایک سفارش لے کر بمبئی پہنچ گئے۔ کمال امروہوی کی کہانی بھی سہراب مودی اور محبوب صاحب سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ان کی باضابطہ تعلیم تو واجبی تھی لیکن مطالعہ بہت زیادہ تھا۔ قدرت نے تخلیقی ذہن سے نوازا تھا۔ کہانی نویسی، مکالمہ نگاری اور شاعری تینوں اصناف میں انہوں نے سارے ہندوستان سے اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ بعد میں ہدایت کار بھی بن گئے اور محل، دائرہ اور پاکیزہ جیسی یادگار فلمیں تخلیق کیں۔

کمال امروہوی صاحب لاہور سے اپنی ایک کہانی کے کاغذات کا پلندہ بغل میں داب کر بمبئی پہنچے۔ کئی جگہ قسمت آزمائی کی لیکن ایک غریب نوجوان کو دیکھ کر ہی لوگ توجہ پھیر لیا کرتے تھے۔ ایک سفارش کے ذریعے وہ سہراب مودی صاحب تک پہنچ گئے۔

مودی صاحب اپنے سامنے ایک سادہ سے قمیص پاجامے اور شیروانی میں ملبوس نوجوان کو دیکھ کر قدرے حیران ہوئے مگر کمال امروہوی کی خوداعتمادی نے انہیں متاثر کیا۔ انہیں احساس تک نہ تھا کہ یہ نوجوان فلمی مصنف بھی بن سکتا ہے مگر جب کمال امروہوی نے انہیں اپنی کہانی سنائی تو سہراب مودی کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ کمال صاحب نے اس کہانی کا نام ''مسافر'' رکھا تھا مگر سہراب مودی نے اسے ''جیلر'' کے نام سے بنایا۔ سہراب مودی کی انسان شناسی کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے ایک نووارد، مفلوک الحال اجنبی نوجوان کی کہانی بنانے کا فیصلہ کیا اور کمال امروہوی اس لیے داد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے جو پہلا فلمی اسکرپٹ لکھا تھا وہ ''جیلر'' کے نام سے جب فلم کی صورت میں سامنے آیا تو سارے ملک میں دھوم مچ گئی۔ سہراب مودی نے کمال صاحب کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر کمپنی میں مصنف کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا جو کہ اس زمانے میں بہت بڑی تنخواہ تھی۔

''جیلر'' سپرہٹ فلم ثابت ہوئی۔ ہر طرف سے داد و تحسین اور نوٹوں کی بارش ہونے لگی ''جیلر'' نے سہراب مودی

کو فلم ساز و ہدایت کار کی حیثیت سے اور کمال امروہوی کو کہانی نویس اور مکالمہ نگار کی حیثیت سے ملک گیر شہرت دے دی تھی۔ سہراب مودی کی دونوں فلمیں اوپر تلے سپر ہٹ ہوئی تھیں۔ وہ ایک نیک دل، خدا ترس اور فیاض انسان تھے۔ تمام اسٹاف کو تین ماہ کا بونس اور انعامات دیے گئے۔ اب سہراب مودی اور منروا موویٹون بہت بڑا معتبر فلمی نام بن چکے تھے۔ بمبئی میں انہوں نے منروا ٹاکیز بھی خرید لیا تھا۔

سہراب مودی نے ان کامیابیوں کے بعد بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کی اور تین فلموں کا آغاز کیا۔ ایک فلم ''میں ہاری'' کے ہدایت کار جاگیر دار تھے۔ انہوں نے اپنے لیے ''پکار'' بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس فلم کی تیاری اور تحقیق پر بہت زیادہ توجہ دی گئی۔ دہلی، مراد آباد، آخر ملک کے دوسرے عجائب گھروں سے مدد لی گئی تاکہ فلم میں حقیقت کا رنگ پیدا ہو سکے۔ دنیا کے بہترین برتن، ملبوسات کے نمونے اور دیگر آرائشی اشیاء منگائی گئیں۔ چندر موہن کو شہنشاہ جہانگیر اور نسیم بانو کو نور جہاں کے مرکزی کرداروں میں پیش کیا گیا۔ اس فلم کی داستان پہلے سنائی جا چکی ہے۔ یہ ایک تاریخ ساز اور ریکارڈ ساز فلم ثابت ہوئی۔ ''پکار'' نے سارے ملک میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ اس فلم کی کامیابی پر کارکنوں کو چھ ماہ کا بونس دیا گیا تھا۔ سہراب مودی صرف گجراتی زبان جانتے تھے۔ لقمان صاحب دوبارہ ان سے منسلک ہو چکے تھے۔ انہیں معاون ہدایت کار کے ساتھ ساتھ گجراتی اسکرپٹ کو اردو میں ترجمہ کر کے پیش کرنے کی ذمے داری بھی سونپ دی گئی۔

لقمان صاحب سہراب مودی کے بہت معتقد اور معترف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سہراب مودی خود تو پارسی تھے مگر ہر مذہب کا احترام کرتے تھے۔ ''پکار'' کی کامیابی کی خوشی میں ہندو عملے نے شری نارائن کی پوجا کرنے کی تجویز پیش کی تو فوراً منظور کر لی۔ مسلمان اسٹاف نے میلاد شریف کی محفل منعقد کرانے کے لیے کہا تو اسٹوڈیو میں بہت احترام سے بڑے وسیع پیمانے پر میلاد شریف کرایا گیا۔ لقمان صاحب نے بتایا کہ جب میلاد شریف کی محفل شروع ہوئی تو سہراب مودی خود بھی سر پر رومال باندھ کر وہاں پہنچ گئے اور عام لوگوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ میلاد شریف کے دوران میں ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے آخر میں دعا کرائی گئی تو ان پر رقت طاری ہو گئی پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

منروا مووی ٹون کی دوسری فلمیں بھی کامیاب ہوئی تھیں مگر ''پکار'' نے تو ایک آفت مچادی تھی۔ یہ اس دور کی سب سے مہنگی فلم تھی جس پر تین لاکھ روپے لاگت آئی تھی۔ جب کامیابی حاصل ہوئی تو کروڑوں کمائے۔ سہراب مودی کو ''پکار'' کے تجربے سے یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ ایک عدد تاریخی فلم بنائی جائے۔ چنانچہ فلم ''سکندر'' کا آغاز کیا گیا۔

''سکندر'' کے بارے میں بھی ہم، پہلے بیان کر چکے ہیں پہلے ''سکندر'' کے مرکزی کردار کے لیے اداکار جینت کا انتخاب کیا گیا تھا جو مسلمان تھے۔ امجد خاں انہی کے بیٹے تھے۔ سہراب مودی کے اسٹوڈیو میں سگریٹ پینے کی ممانعت تھی مگر جینت نے یہ شرط نہ مانی تو انہیں تبدیل کر دیا گیا اور پرتھوی راج نے یہ کردار ادا کیا۔ قسمت بھی مہربان تھی۔ پرتھوی راج انگوٹھی میں نگینے کی طرح اس کردار میں فٹ ہو گئے تھے۔

''سکندر'' پر سہراب مودی نے دل کھول کر پیسہ خرچ کیا۔ فوج کے سپاہی حاصل کئے گئے۔ سارے ملک سے ہاتھی منگوائے گئے۔ جنگ کے مناظر میں ہزاروں افراد نے حصہ لیا۔ یہ فلم بہت بڑے پیمانے پر بنائی گئی تھی۔ اس فلم سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ کامیاب تو ہوئی مگر ''پکار'' جیسی کامیابی اور مقبولیت حاصل نہیں کر سکی پھر بھی اسے ایک عظیم فلم قرار دیا گیا اور سہراب مودی نے اس فلم سے بھی خوب پیسہ کمایا۔

انہوں نے ''سکندر'' کے بعد ''پرتھوولبھ'' اور پھر ''پھر ملیں گے'' بنائی۔ اس دوران میں لقمان صاحب کو سید شوکت حسین رضوی نے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی وہ سہراب مودی کی اجازت لینے گئے تو انہوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میری کمپنی کے لیے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ اس زمانے کا ایک حیرت انگیز واقعہ لقمان صاحب نے سنایا تھا جو خود ان کی زبانی سنیے۔

''اسکرپٹ کا کچھ کام باقی تھا ہم نے رات دیر تک کام کرنے کا ارادہ کیا۔ نو بجے کے قریب سہراب مودی صاحب ہمارے پاس آ گئے۔ پوچھا۔ کیا کر رہے ہو؟

ہم نے بتایا کہ اسکرپٹ مکمل کرنا ہے تاکہ کل آپ کے سپرد کر کے رخصت لے سکوں۔ یہ آخری خدمت ہے۔

وہ بولے۔اسے آپ بند کر دیں اور میرے ساتھ چلیں۔

سہراب مودی عموماً شام کو ساڑھے پانچ بجے اسٹوڈیو سے گھر چلے جاتے تھے اور پھر کھانا کھا کر گیارہ بجے رات کو لوٹتے تھے۔

ہم نے پوچھا ''صاحب۔آج آپ اس وقت اسٹوڈیو میں؟''

کہنے لگے ''باباحاجی علی چلنا ہے۔''

ہم اٹھے اور گاڑی میں ان کے ساتھ سوار ہو گئے۔ ہمارا اسٹوڈیو مشرقی ساحل پر تھا اور باباحاجی علی کی درگاہ مغربی ساحل پر تھی۔زیارت کے لیے سمندر کے بہت اندر جانا پڑتا تھا۔ باہر سڑک پر چھوٹے راستے کے قریب ایک مسجد تھی۔ جہاں لوگ نماز ادا کرتے تھے۔ مسجد میں ہر وقت کلام پاک کی تلاوت ہوا کرتی تھی جس سے ہمیشہ ایک نور سا رہتا تھا۔

مسجد میں پہنچ کر سہراب مودی ہم سے بولے ''وضو کرو۔''

ہم وضو کرنے لگے اور وہ ہمیں دیکھتے رہے پھر خود بیٹھے اور وضو کرنے لگے۔

ہم نے کہا'' صاحب جی۔وضو میں تو کلمہ پڑھا جاتا ہے۔''

انہوں نے نظریں اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور کلمہ پڑھا پھر بولے ''آپ کیا سمجھتے ہیں؟''

وضو کے بعد اٹھے اور جوتا ہاتھ میں پکڑ کر پتھروں پر چلتے ہوئے اندر گئے۔

وہاں ہم سے کہا''فاتحہ پڑھیے۔''

ہم نے بلند آواز میں فاتحہ پڑھنی شروع کی۔ان کی آنکھیں بند تھیں اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے۔دعا کے بعد باہر آئے اور ہم سے کہا ''کسی سے بولنا نہیں۔''

اپنی عبادات کے سلسلے میں انہیں ہم نے صرف یہ کرتے دیکھا کہ جب وہ آتے تو کمرے میں لگی ہوئی زرتشت کی تصویر پر ہار ڈالتے تھے۔''

لقمان صاحب نے سہراب مودی کے اسٹوڈیو میں ایک پینٹر اور سیٹنگ بوائے کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا تھا۔بعد میں اہل زبان ہونے کی وجہ سے وہ اداکاروں کی زبان درست کرنے کے فرض پر بھی مامور کر دیئے گئے۔اسسٹنٹ کی حیثیت سے انہوں نے کلیپ بوائے کے طور پر کام کا آغاز کیا تھا۔اپنی محنت،ذہانت اور لگن کے باعث وہ بہت جلد سہراب مودی کے قابل اعتماد کارکنوں میں شامل کر لیے گئے۔فلموں کی پبلسٹی لے کر انہیں بمبئی سے دہلی بھیجا جاتا تھا۔بعض اوقات بڑی بڑی نقدر قوم بھی ان کے ذریعے بمبئی اور دہلی کے لیے بھیج دی جاتی تھیں۔

لقمان صاحب نے سہراب مودی کے بارے میں ذاتی تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں جو تصویر پیش کی ہے وہ ایک سادہ، محنتی،فیاض اور نیک دل انسان کی ہے۔وہ اپنے کارکنوں پر ہمیشہ مہربان رہتے تھے۔ان کی ضرورت اور مشکل کے وقت ان کے کام آتے تھے۔ان کی حوصلہ افزائی کرنے میں بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔جب لقمان صاحب نے شوکت صاحب سے وابستہ ہونے کے لیے ان سے اجازت طلب کی تو انہوں نے کسی پس و پیش کے بغیر اجازت دے دی بلکہ ان کو روشن مستقبل بنانے کے لیے دعا بھی دی۔

شوکت حسین رضوی کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد لقمان صاحب کو بمبئی میں ایک فلم کی ہدایت کاری کرنے کی پیشکش کی گئی۔انہوں نے شوکت صاحب سے تذکرہ کیا تو انہوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور کارآمد مشورے بھی دیے۔

بمبئی میں جمعے کے مبارک دن لقمان صاحب نے عزیز غفور قاضی صاحب کے ادارے کے ساتھ فلم کی ہدایت کاری

کا معاہدہ کیا تھا۔ قاضی صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ بمبئی مسلم لیگ کے خزانچی تھے۔ جس وقت یہ معاہدہ سائن کیا گیا اس وقت آئی آئی چندریگر بھی وہاں موجود تھے جو قیام پاکستان کے بعد کابینہ میں شامل کیے گئے اور ان کے نام سے منسوب آئی آئی چندریگر روڈ کراچی کی ایک اہم شاہراہ ہے۔

لقمان صاحب خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے اور اپنی اس خوشی میں اپنے استادوں اور مہربانوں کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے۔ معاہدے کی نقل لے کر وہ سیدھے مٹھائی کی دکان پر پہنچے۔ وہاں سے پیڑوں کا ایک ڈبا سہراب مودی صاحب کے لیے پیک کرایا۔ (سہراب مودی پیڑے بہت شوق سے کھاتے تھے) ایک دوسرے ڈبے میں سید شوکت حسین رضوی کے لیے مٹھائی بندھوائی اور سب سے پہلے سہراب مودی صاحب کی تلاش میں ویسٹرن سینما پہنچ گئے۔ اس روز مودی صاحب کی فلم ”ایک دن کا سلطان“ نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی اور وہ فلم کا شو دیکھنے کے لیے سینما ہال میں موجود تھے۔

لقمان صاحب بے چینی سے فلم کے انٹرول کا انتظار کرنے لگے۔ انٹرول کے بعد جب سہراب مودی صاحب اپنے دفتر میں آئے تو لقمان صاحب نے سلام کر کے مٹھائی کا ڈبا پیش کر دیا۔

انہوں نے پوچھا ”یہ مٹھائی کس بات کی ہے؟“

انہوں نے بتایا کہ مجھے ہدایت کاری کے لیے ایک فلم ملی ہے۔ معاہدہ سائن کرتے ہی آپ کے پاس آیا ہوں۔“

سہراب مودی بہت خوش ہوئے اور کہا کہ فلم کا شو ختم ہونے تک ٹھہرو۔

شو ختم ہوا تو سہراب مودی دوبارہ اپنے دفتر میں تشریف لائے۔ مٹھائی کا ڈبا اپنے ہاتھوں سے کھولا۔ معاہدے کی کاپی سامنے ہی موجود تھی۔ سہراب مودی صاحب نے فوراً تمام عملے کو اکٹھا کر کے ان کو مطلع کیا اور مٹھائی ان میں تقسیم کرنے سے پہلے ایک پیڑا خود اپنے ہاتھ سے لقمان صاحب کے منہ میں ڈالا۔ دوسرا خود اپنے منہ میں ڈالا اور پھر لقمان صاحب کو مبارک باد اور مشورے دیے۔ ”شاباش۔ دیکھو بہت محنت سے فلم بنانا۔ یہ تمہاری پہلی فلم ہے۔“

یہاں سے لقمان صاحب، سید شوکت حسین رضوی کے پاس گئے۔ مٹھائی پیش کی اور صورت حال بتائی۔ وہ حسب معمول بہت خوش ہوئے۔ لقمان صاحب کو اپنے مخصوص انداز میں مشورے دیے اور کہا کہ دیکھو۔ عقل اور ہوش سے کام کرنا۔ دونوں استادوں نے بہت کھلے دل سے خوشی کا اظہار کیا اور دل سے مبارکباد بھی دی۔ اللہ اللہ کیسے عالی ظرف لوگ تھے۔

ضروری نوٹ:

یہ پہلی قسط سے 600 قسط تک کی داستان ہے۔ اگر باقی کی اقساط بھی مل سکیں تو آپ کو پیش کردی جائیں گی۔ آپ کو اتنے لمبے عرصہ تک کے صبر کا پھل پیش کرتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ حمیدی